ہماری ویب ای بُک

پروفیسر رفعت مظہر

PROF RIFFAT MAZHAR

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Prof. Riffat Mazhar"
at Hamariweb.com

امریکہ اور عالم اسلام

سُنا ہے کہ پاکستان میں صرف دو فیصد لوگ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ہیلری کلنٹن نے بھی یہی بات دہرائی اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ دو ارب سالانہ بھیک لینے کے باوجود ان پاکستانی بھکاریوں کی امریکہ سے نفرت سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ "پاکستان کی ساس" جب بھی پاکستان آتی ہے، یہ طعنہ ضرور دیتی ہے۔ جواباً شریر لوگ کہتے ہیں کہ دو ارب ڈالر کے بدلے میں ہم سالانہ دس ارب ڈالر اور ہزاروں لوگ ان کی جنگ میں جھونک دیتے ہیں۔ امریکہ ہماری جان چھوڑ دے ہم چار ارب سالانہ "بھتہ" دینے کو تیار ہیں۔ پھر بھی سودا مہنگا نہیں کہ سکون کے چند پل تو نصیب ہو جائیں گے۔ ویسے بھی یہ دو ارب ڈالر کونسے پاکستانی عوام کو ملتے ہیں۔ کچھ تو امریکہ خود ہی واپس لے جاتا ہے اور بچے کھچے ڈالروں سے راہبرانِ قوم کے چولہے جلتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر سارے ٹیکس گار پورا ٹیکس ادا کرنے لگیں تو پھر اس امریکی بھیک کی سرے سے ضرورت ہی نہ رہے۔ یہی بات جب میں نے ایک ٹیکس گزار سے کہی تو اس نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا "تم تو پیدائشی احمق ہو، میں نہیں"۔ میں نے چڑ کر پوچھا "کیا مطلب"؟۔۔۔۔۔ تو اس نے یہ کہتے ہوئے مجھے لاجواب کر دیا کہ "اگر قوم پورا ٹیکس بھی ادا کرنے لگے تو پھر بھی قوم کی حالت تو نہیں بدلے گی البتہ سوئس بینکوں میں پانچ سو ارب ڈالر

کی جگہ ، پانچ سو کھرب ضرور جمع ہو جائیں گے" ۔ گویا یہ طے ہوا کہ جو ، جیسا اور جہاں ہے اسے ویسا ہی رہنے دیا جائے کہ اسے چھیڑنے اور امریکہ کو چھوڑنے سے مزید خرابیوں کا احتمال ہے۔اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پھر ہیلری ہی نہیں ، میری بھی سمجھ سے بالا تر ہے کہ ہم امریکہ سے کیوں نفرت کرتے ہیں ؟۔ میں تو خیر پہلے بھی مخدومی و معظمی امریکہ کو اپنا مربی و محسن تصور کرتی تھی لیکن کچھ شر پسند بس "ایویں ای" شور مچاتے رہتے ہیں۔ یہ وہی شر پسند ہیں جو امریکہ کو "منصفِ اعلیٰ" کی بجائے "عالمی بدمعاش" کہتے ہیں۔ وہ بیچارہ اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرکے عالمِ اسلام کو آمروں سے نجات دلوانے میں مگن ہے لیکن ہم ناسپاسی کی انتہاؤں کو چھو رہے ہیں ۔ اب یہی دیکھیے کہ اس نے عراق ، افغانستان ، مصر اور اب لیبیا کو بھی آمروں سے پاک کر دیا ۔ کوئی دن جاتا ہے جب یمن اور شام بھی پاک ہو جائیں گے۔ایران کا نمبر تو خیر لگ ہی چُکا ہے لیکن سعودی عرب اور پاکستان میں سے کس کی باری پہلے آئے گی ؟ یہ ابھی طے نہیں ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ سعودی عرب کا نمبر پہلے لگے گا کیونکہ ایک تو امریکہ پاکستان کا پڑوسی ہے اس لئے جب جی چاہے گا "گند" صاف کر دے گا ۔ دوسرے پاکستانی راہبروں اور دانشوروں کی ایک کثیر تعداد پہلے ہی "عشقِ امریکہ" میں گرفتار ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہمہ وقت و ہمہ دم قوم کو "بے غیرتی" نامی حسینہ دلربا کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر کرنے کے لئے تن من لگائے بیٹھے ہیں۔ دھن میں نے اس لئے نہیں لکھا کہ اسی "امریکی دھن" کی خاطر

تو وہ اتنے پاپڑ نیل رہے ہیں۔جوں ہی ان " عاشقان " کی جانب سے "گرین سگنل"
موصول ہوا امریکہ "غیرت گروپ" کے مٹھی بھر شر پسندوں کا خاتمہ کرنے کے لئے
چھم سے آ جائے گا۔آمریت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا اور سلطانی جمہور کا
علمبردار پرویز مشرف ہاتھ میں علمِ جمہوریت تھامے ہماری راہبری و راہنمائی کے لئے
آن پہنچے گا۔اس کے بعد راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔۔۔۔

عالمی امن کے محافظ امریکہ کی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ضیاء الحق کا طیارہ
فضاؤں میں بکھیر دیا گیا کہ اُس کے اندر بغاوت کے جراثیم تیزی سے پرورش پا رہے تھے
لکھ کر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی " Friends, not master " ۔ایوب خاں نے
ماری اور امریکہ نے فوراً یحییٰ کو گود لے لیا جس نے اقتدار پر قبضہ جمانے سے بہت پہلے
I , will be he next " نیویارک میں نشہ میں دھت ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ
۔ذوالفقار علی بھٹو کا جرم تو خیر تھا ہی ناقابلِ معافی کہ " president of Pakistan
ایک معمولی اسلامی ملک اور ایٹمی طاقت کے خواب؟۔۔۔۔۔۔"چہ پدّی اور چہ پدّی کا"
شوربہ" ۔اُن کا نشانِ عبرت بننا تو روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔نواز شریف کو بھی بل
کلنٹن نے بہت سمجھایا تھا لیکن ضدی نواز شریف نہ مانے۔ان کا انجام بھی اسی دن طے
کر دیا گیا۔وہ تو سعودی شاہ اپنی ضد پر اڑ گئے وگرنہ آج ہم ایک اور "شہید" کی بڑے
اہتمام سے برسیاں اور سالگرہیں منا رہے ہوتے۔شاہ فیصل ، صدام حسین ، اسامہ بن
لادن

اور معمر قذافی کے جرائم کی فہرست بھی بہت طویل ہے لیکن ۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن بی بی بے نظیر شہید کا کیا قصور تھا؟۔ خیر کچھ نہ کچھ تو ہو گا ہی وگرنہ رحم دل امریکہ کسی پر کبھی زیادتی نہیں کرتا۔خبث باطن رکھنے والے لوگ یقیناً مجھ سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اپنی کتھا ہیرو شیما اور ناگا ساکی سے شروع کرکے ویت نام، کمبوڈیا، ایران اور عراق سے ہوتے ہوئے افغانستان تک آن پہنچیں گے۔درمیان میں ڈرون حملوں کا "تڑکا" بھی ضرور لگائیں گے۔سوال مگر یہ ہے کہ کیا "شر" کو ختم کرکے امریکہ نے کوئی جرم کیا ہے؟۔سارا امریکہ شر پسندی سے باز آنے کی دہائی دیتا رہتا ہے لیکن کوئی سننے کو تیار ہی نہیں۔ پھر بیچارہ امریکہ لاکھوں کروڑوں بندے نہ "پھڑکائے" تو کیا دنیا کو ایسے ہی چھوڑ دے۔؟

میرے میاں

میرے میاں بھی عجیب ہیں ۔پل میں تولہ ،پل میں ماشہ۔ کبھی سیلِ تُند خُو تو کبھی جوئے نغمہ خواں۔ہر سیاسی پارٹی کے کڑے نقاد مگر بہی خواہ بھی۔ کم از کم مجھے تو آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ ان کا کس سیاسی پارٹی سے تعلق ہے۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ سیّد مودودیؒ کو اپنا مرشدِ معنوی کہتے ہیں اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے خلاف شدید احتجاج کی پاداش میں جیل یاترا بھی کر چکے ہیں۔ شریف.برادران کے کپڑوں سے انہیں وطن کی مٹی کی سوندھی خُوشبو آتی ہے اور بی بی بینظیر کی شہادت کا کئی دنوں تک سوگ مناتے ہیں۔انہیں عمران خاں کی دیانت پر کوئی شک نہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ سیاسی ناپختگی کی بنا پر وہ دوسروں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ایم۔ کیو۔ایم کا نام سنتے ہی ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ قلم اتنا بد لحاظ کہ کسی کو بخشتا ہی نہیں ، نہ جھجک ، نہ شرم ، نہ مروت ، نہ لحاظ ۔ میں ایک دفعہ پوچھ بیٹھی کہ آخر کو میں آپ کی " نصف بہتر " ہوں آج یہ راز کھول ہی دیں کہ آپ کا کس سیاسی پارٹی سے تعلق ہے؟ ۔ مختصر جواب کہ "نصف بد تر " ! لکھاری صرف اپنے قلم کا سگا ہوتا ہے ، کسی سیاسی پارٹی کا نہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ فروری 1981 ء میں جب پی۔پی۔پی کے جیالوں کی پکڑ دھکڑ

شروع ہوئی تو میرے میاں جو اس وقت گورنمنٹ لیکچرر تھے، کو پکڑ کر سنٹرل جیل ساہیوال بھیج دیا گیا۔ الزام کیا؟ "Pro Bhutto Communist اور Active member of Al-Zulfiqar" ۔ سنٹرل جیل ساہیوال میں فاروق لغاری مرحوم سمیت پی۔پی۔پی کے چوٹی کے لیڈر نظر بند تھے۔ اب بھی جب وہ کبھی موڈ میں ہوتے ہیں تو جیل کی باتیں بڑے چسکے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ فاروق لغاری جب صدر بنے تو میں نے ازراہِ تفنن کہہ دیا کہ آپ بھی اپنے جیل کے ساتھی سے مل آئیں ۔انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور خاموش رہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود انہوں نے کبھی کسی جیل کے ساتھی سے دوبارہ ملاقات کی ہو۔ جیل میں گئے تو وزن 110 پونڈ تھا پلٹے تو 130 پونڈ۔ میں نے حیرت سے صحت کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ جیل بڑی زبردست جگہ ہے۔ نہ فکرِ فردا نہ غمِ دوش، کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں۔ ہر کوئی اپنی سوچوں میں گم، اپنے آپ میں مگن۔ سارا دن اور ساری رات لکھتے رہو، پڑھتے رہو۔ پھر کہنے لگے کہ جیل میں بڑا نظم و ضبط ہوتا ہے۔ اس بد نظم اور بے ترتیب قوم کے ہر فرد کو یکے بعد دیگرے کچھ عرصے کے لئے جیل بھیجنا چاہیے تاکہ ان میں کچھ تو نظم و ضبط کا مادہ پیدا ہو جائے۔ میں نے چڑ کر کہا جی ہاں! شائد اسی جیل یاترا کی بدولت ہمارے حکمران اور سیاست دان انتہائی منظم ہو کر قوم کو لوٹ رہے ہیں اور لاکھ سیاسی اختلافات ہوں لیکن اس معاملے میں ایک دوسرے کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف بد نظم عوام اگر کسی بنک سے چند ٹکے قرض لے

ہیں تو انہیں قرض کی واپسی کے لئے اتنا تنگ کیا جاتا ہے کہ وہ خود کشیاں کرنے لگتے ہیں
۔وہ خاموش رہے۔
بی بی جب پہلی بار وزیرِ اعظم بنی تو انھوں نے جیالوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کا اعلان کیااور کہاکہ ضیاء دور میں قربانیاں دینے والے جیالے رابطہ کریں۔میں نے کہا" مفت میں عمرہ ہو رہاہے آپ بھی ہو آئیں" ، تو کہنے لگے "جب میں جیالا ہوں ہی نہیں تو جاؤں کیوں؟۔ پوچھاکہ پھر جیل کیوں کاٹی ؟۔تو کہا" قائدِ اعظم کو خراب ایمبولینس کے ذریعے قتل کیا گیا اور " قائدِ عوام" کو عدالت کے ذریعے۔احتجاج میرا فرض تھا، کسی پر احسان نہیں۔۔۔۔۔ جیل سے چھوٹے تو ایجنسیاں پیچھے لگ گئیں۔تنگ آ کر "قطر" کھسک لئے۔وہاں دوہا میں ہم دونوں نے "پاکستان ایجو کیشن سنٹر" میں ملازمت اختیار کر لی۔لیکن "سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں" اور جہاں میرے میاں ہوں وہاں بھلا سکون کا کیا کام؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے پھر کبھی سہی۔بہر حال ہم کچھ عرصہ بعد ہی واپس آ گئے اور اپنا اپنا کالج پھر سے جوائن کر لیا۔تب سے اب تک "وہی ہے چال بے ڈھنگی، جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔"پرسوں نواز لیگ کی ریلی کے بعد کہنے لگے کہ
انقلابِ فرانس سے پہلے وہاں کے خائن اور بد دیانت بڑے بڑے جاگیر دار وڈیرے اور نواب لڑیاں اُٹھا اُٹھا کر ہر روز غریب کسانوں کی ہمدردی میں تقریریں کرتے اور ٹسوے بہاتے تھے ۔آج ہزاروں ایکڑ پر محیط محلوں

میں رہنے والے بڑی لے کے ساتھ جب حبیب جالب مرحوم کی نظم "میں نہیں مانتا"
گا رہے تھے تو مجھے یقین ہو چلا کہ اب انقلاب قریب آ لگا ہے۔ مجھے تو جوئے خوں صاف
نظر آنے لگی ہے۔پتہ نہیں حکمرانوں کو کیوں نظر نہیں آتی ؟۔ میں نے از راہِ مذاق یہ کہا
کہ کیا معاملہ ختم یا بچنے کی کوئی راہ بھی ہے ؟۔کہنے لگے کہ ایک راہ ہے کہ اگر 3 D's-
سے بچنے کی کوئی راہ نکل سکے۔ میں نے حیرت سے پوچھا "یہ تھری ڈیز" کیا بلا ہے ؟۔ تو
مسکرا کر کہنے لگے کہ "ڈرون، ڈینگی ، اور پی۔پی۔پی کے تین سیاسی ڈاکٹر" جو جلتی پر تیل
نہیں بلکہ پٹرول چھڑکتے ہیں اور جن کا ماضی میں پی۔پی۔پی کے ساتھ نہ کبھی نظریاتی
تعلق رہا ہے نہ سیاسی۔

حکیمانہ باتیں

تین سالہ مغزماری اور محنتِ شاقہ کے بعد باآخر میں نے بجلی ، گیس ، ڈیزل اور پٹرول کے بحران کا حل تلاش کر ہی لیا۔ وہ یہ کہ اگر ان کے استعمال پر مستقل پابندی عائد کر دی جائے تو "نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری" ۔آخر اس میں حرج ہی کیا ہے ؟۔ اگر ہمارے بڑے بوڑھے دیئے میں ٹکے، دو ٹکے کا تیل ڈال کر انتہائی خوش ، خوش حال اور مطمئین زندگی بسر کر سکتے ہیں تو بھاڑ میں جائے ایسی بجلی اور گیس جس نے بیٹھے بٹھائے سکون غارت کر دیا ہے۔ کم از کم روز روز کی چخ چخ سے تو نجات ملے گی اور ہمارا مربّی و محسن امریکہ بھی خوش ہو جائے گا جو پاک و ایران توانائی معاہدوں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑا ہے۔ توانائی کے اس بحران پر تو خیر اگلی صدی تک بھی قابو پانا ممکن نہیں کہ اس میں ہمارے مفلس راہبرانِ قوم کی روزی روٹی مضمر ہے لیکن یاد رکھیے کہ اگر میرے حکیمانہ مشوروں کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا گیا تو ہمارے دونوں "تیتر" اور "بٹیر" آپس میں لڑتے ہی رہیں گے اور وہ وقت دور نہیں جب قوم یہ یہ نظارہ کرے گی کہ

لڑتے لڑتے ہو گئی گم

ایک کی چونچ اور ایک کی دُم

لیکن میں چونکہ رجائیت پسند ہوں، اس لئے ہر گز مایوس نہیں کہ اپنے جنرل کیانی صاحب اس خلا کو پُر کرنے کے لئے ہر دم تازہ دم ہیں اور بہت ہی اپنے پیر پگاڑا صاحب تو اپنی چشمِ کرامت سے 22 نومبر سے پہلے ایسا ہوتا دیکھ بھی رہے ہیں۔امیدِ واثق ہے کہ محترم ہارون الرشید کے "کالمی درویش" بھی ایک آدھ دن میں پیر صاحب کی اس پیشین گوئی کی توثیق فرمادیں گے کیونکہ عمران خاں کو ایک دفعہ پھر "مقتدرہ" نے وزارتِ عظمیٰ کی نوید سُنا دی ہے۔

مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ آخر ڈیزل اور پٹرول جیسی فضولیات کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟۔ہماری سڑکیں گدھا گاڑیوں کے لئے تو موزوں ہو سکتی ہیں موٹر گاڑیوں کے لئے ہر گز نہیں کہ یہاں پیدل چلنے والا موٹر گاڑی والے سے پہلے منزلِ مقصود پہ پہنچ جاتا اپنا ڈیزل PSO ہے۔ چھک چھک کرتی ریل کا تیل وزیرِ ریل نے نکال دیا ہے۔اب سنبھال کے رکھے اور واپڈا بچے کھچے ریلوے سٹیشنوں کی بجلی بھی کاٹ دے کہ "رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتے ہیں "رہزن" کو"۔ ہمارے صاحبِ کرامت منیر نیازی تو بہت پہلے یہ کہہ گئے تھے کہ

صبحِ کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی اور جی لہو سے بھر گیا

، وہ تو ہم ہی احمق تھے جو اس شعر کا محبوب شھبوب سے تعلق جوڑتے رہے

حالانکہ منیر تو یہ کہنا چاہتے تھے کہ یہ آخری ریل اور آخری سیٹی ہے پھر اسے چراغِ رُخِ زیبا لے کر بھی ڈھونڈو گے تو "ملنے کی نہیں نایاب ہے یہ"۔ سوچتی ہوں کہ پہلے تو ہم بچوں کو قاعدے میں "ر" سے "ریل" رٹایا کرتے تھے اب کیا لکھیں گے ؟ اگر "ر" سے "رذیل" لکھا تو سامنے تصویر کس کی لگائیں گے ؟۔

P.I.A کو بھی اب پٹرول کی ضرورت نہیں کہ امریکہ نے اس میں تخریبی جرثوموں کی آمیزش کر دی ہے شاید اسی لئے لاہور سے جدّہ جانے والے جہاز اپنی مرضی سے کراچی لینڈ کر جاتے ہیں اور بیچارے پائلٹ کو یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ "خواتین و حضرات ! آج کراچی کو ہی جدّہ سمجھ کر گزارہ کر لیں"۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر امریکہ پاکستان سے اُڑنے والے ڈرون کو نیویارک سے کنٹرول کر سکتا ہے تو کہیں اس "تخریبی پٹرول" کے سبب وہ ہمارے کسی جہاز کو کھینچ کر "پینٹاگون" نہ اتار لے اور پھر آدھی رات کو ہمارے صدرِ مملکت کی نیند خراب کرکے یہ سوال کر دے کہ "تم ہمارے ساتھ ہو یا مخالف ؟ اور اگر ساتھ ہو تو ایٹمی پروگرام فوراً بند کر دو"۔ غالب امکان تو یہی ہے کہ جناب صدر امریکی دوستی اور بہترین ملکی مفاد میں ایٹمی پروگرام فوری "ٹھپ" کر دینے کا حکم صادر فرما دیں گے کہ ایسے ایٹمی پراگرام کا کیا فائدہ جو ہماری عزّت ، غیرت ، خودی اور خوداری کسی کا بھی محافظ نہیں اور جسے ہم نے محض "شب برات" پر پھُل جھڑیوں کی جگہ چلانے کے لئے رکھا ہوا ہے۔مذید یہ کہ ہمیں

پتھر کے زمانے میں جانے کا فی الحال کوئی شوق بھی نہیں۔ویسے اندر کی بات تو یہ ہے کہ "پینٹاگون" میں لینڈ کرنے والے مسافر تو بہر حال خوش ہوں گے کہ بیٹھے بٹھائے" امریکہ پہنچ گئے۔رہی امریکی ویزے کی بات تو وہ اگر نہ بھی ملے تو خیر ہے کہ ہم پاکستانی اِدھر اُدھر کھسکنے میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔

رہی سٹیل مل تو وہ تو کب کی قصہ پارینہ بن چکی۔وہ اب ڈیزل، پٹرول، بجلی اور گیس جیسی فضولیات سے مکمل بے نیاز ہو کر استراحت فرما رہی ہے۔البتہ ایک مسئلہ ضرور درپیش ہو گا کہ ہمارے محترم وزیرِ اعظم کی سواری کا کیا بنے گا؟۔میرے خیال میں ان کے لئے "صحرائی جہاز" یعنی اونٹ کا بند و بست کیا جا سکتا ہے جو معزز و محترم جانور ہونے کے علاوہ اپنی سرشت میں ہم پاکستانیوں جیسا بھی ہے۔ وہ بھی ہم عوام کی طرح کئی کئی دن بھوکا پیاسا رہ کر احتجاج کئے بغیر "سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے" گنگنا سکتا ہے۔پھر ہمارے راہبروں کو عوام کے کندھوں پر سواری کا بڑا شوق بھی ہے جسے عوام سرشت اونٹ کی سواری سے پورا کیا جا سکتا ہے۔کابینہ کے لئے بہترین نسلی گدھوں کا بند و بست کیا جانا چاہیے کہ ہمارے وزیروں کو محض "سواری" کا شوق ہے باقی جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ تو کہیں اور سے کوئی "اور" کرتا ہے۔تصور کیجئے کہ جب اسلام آباد کی "شاہراہِ دستور" پر "شتر سوار وزیرِ اعظم" اپنی کثیر

کابینہ کے ساتھ گزر رہے ہوں اور پروٹوکول کا عملہ "ہٹو، بچو" کا شور مچاتا ہوا اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہو، تو کیا دل خوش کُن نظارہ ہو گا۔
میری ان فہم وتدبّر سے لبریز حکیمانہ تجاویز کو کسی "تھنک ٹینک" کے سپرد بھی کیا جا سکتا ہے اور اس پر بھی بلائی جا سکتی ہے۔ اگر کسی آئینی ترمیم / تشریح یا من مانی APS کی ضرورت محسوس ہو تو "ڈاکٹر" بابر اعوان کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں کہ اب شریف الدین پیرزادہ" دستیاب نہیں۔ اگر نواز لیگ حسبِ سابق و عادت "پھڈا"" فردوس عاشق اعوان کے پاس موجود ہے۔ پہلوان "M.B.B.S " ڈالے تو اس کا علاج نما راجہ ریاض صاحب پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ جب سے "سینئر وزارت" چھوٹی ہے، وہ اُداس اور بوکھلائے بوکھلائے نظر آتے ہیں۔ ایم۔ کیو۔ ایم اوّل تو اعتراض کرے گی نہیں اور اگر کرے بھی تو ڈاکٹر ذوالفقار مرزا زندہ باد۔۔۔۔۔۔ اور حرفِ آخر یہ کہ یہ قوم کسی معقول بات پر ہرگز دھیان نہیں دیتی کہ اس میں صبر کی تاب نہیں۔ سچ ہی کہا ہے وزیرِ اعظم صاحب نے کہ "قوم بہت بے صبری ہے اور یہ معجزوں کا دور نہیں" ۔۔۔۔۔ اس لئے مرتی پھرے سڑکوں پہ رُسانوں کی"۔

آل پارٹی کانفرنس اور مشترکہ اعلامیہ

ہمارے یہ تجزیہ نگار بھی عجیب ہیں۔کچھ کے نزدیک آل پارٹی کانفرنس (APC) کا اعلامیہ امریکی انتظامیہ کو اس کی حیثیت یاد دلا گیا اور وہ اپنا تھوکا چاٹنے پر مجبور ہو گیا اور کچھ کے خیال میں باون (52) جماعتوں کی آٹھ ،نو گھنٹے کی پریکٹس محض وقت کا زیاں اور کارِ بیکار ٹھہری۔دونوا قسام کے تجزیہ نگاروں کی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ۔بیچ میں ہم جیسے " نو وارد " اور ' 'نوآموز" اِدھر اُدھر لڑھکتے پھرتے ہیں کہ دو جانب ہی سقہ لکھاری اور گھاگ تجزیہ نگار ۔۔۔ سوال دامن گیر ہے کہ کسے یاد رکھیں ، کسے بھول جائیں
اور اگر کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر لڑھکنیاں کھانیں لگیں تو لوگ "لوٹا" بلکہ "لوٹی" کہنے لگیں گے اور ہمیں مفت میں لوٹے بننے کا شوق ہر گز نہیں ۔البتہ اگر کوئی قدر دان مل جائے تو کوئی ہرج بھی نہیں کہ میدانِ صحافت کے کئی نامی گرامی پہلوان اکھاڑہ بدلنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کرتے ۔چاہوں تو کئی نام گنوا دوں لیکن جانتی ہوں کہ وہ سب "سنسر" کی نظر ہو جائیں گے اس لئے وہ جو کرتے ہیں ، کرتے پھریں "سانوں کی" ۔

پھر یہ بھی عین حقیقت ہے کہ ہر کسی نے اپنا اپنا قبلہ متعین کر رکھا ہے جس سے وہ سر
موانحراف کو بھی تیار نہیں۔کوئی اپنے مخصوص دائرے سے باہر جھانکنا گوارہ تک نہیں
میں کیڑے ہی کیڑے نظر آتے ہیں تو کوئی اس کو APC کرتا یہی وجہ ہے کہ کسی کو
تاریخِ پاکستان کی عظیم ترین کامیابی قرار دے رہا ہے،حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ بہت سی
میں بے شمار خامیاں بھی موجود ہیں۔سب سے پہلی بات جو APC خوبیوں سے مزیّن
بری طرح محسوس کی گئی وہ بلوچستان کی نمائندگی نہ ہونا تھی۔بیرونی دنیا میں ایک عام
تاثر یہ دیا جارہاہے کہ بلوچستان میں علیحدگی کی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں۔اگر بلوچ
میں شامل کر لیا جاتا تو امریکہ، جو گوادر APC رہنماؤں کو کسی بھی طریقے سے منا کر
پر نظریں گاڑے بلوچ لبریشن آرمی کا پشتیبان بن کر اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل چاہتا ہے،
اس کے لئے بِلا شبہ یہ ایک بہت بڑا دھماکا ثابت ہوتا۔ضروری تھا کہ محبِ وطن سابق
وزیرِ اعلیٰ بلوچستان اختر مینگل کو بہر صورت منایا جاتا اور ایسا کرنا جنابِ آصف
زرداری کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا کہ روٹھوں کو منانے میں انہیں مہارتِ تامہ حاصل
ہے۔سابق گورنر اور وزیرِ اعلیٰ بلوچستان نواب اکبر بگٹی مرحوم کے بیٹے طلال بگٹی کو یہ
گلہ ہے کہ انہیں سرے سے دعوت ہی نہیں دی گئی۔کاش کہ بلوچستان کو بھرپور نمائندگی
دی جاتی اور یہ آل پارٹی کانفرنس، آل پاکستان کانفرنس کا روپ دھار کر سامنے
آتی۔اس کے علاوہ

بھی کئی رجسٹرڈ پارٹیوں کو مدعو نہیں کیا گیا جبکہ کانفرنس میں ایسے چہرے بھی موجود تھے جنہیں شاید یہ قوم پہلی دفعہ ٹی۔ وی سکرین پر دیکھ رہی ہو۔ مزید یہ کہ یہ کانفرنس قومی یکجہتی کے لئے بلائی گئی تھی لیکن آٹھ، نو گھنٹے کی تگ و دو کے بعد بھی اپنا وہ تاثر قائم نہیں کر سکی جو تقاضائے وقت تھا۔ اگر اس کے مزید تین چار سیشن ہو جاتے تو ہرج ہی کیا تھا؟۔ شاید راہبرانِ قوم اندر بیٹھے تلملا رہے ہوں کہ کب جان چھوٹے اور وہ کب باہر جا کر اپنی پرانی ڈگر پہ آ سکیں۔ دیکھ لیجئے کانفرنس کے متفقہ اور مشترکہ اعلامیہ کے اگلے ہی دن ایک دفعہ پھر جوتیوں میں دال بٹنے لگی اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ " یہ کبھی نہیں سدھریں گے "۔

جو لکھاری یہ کہتے ہیں کہ کانفرنس کے " متفقہ اعلامیے " میں کچھ نہیں تھا ان کی نظر تو خیر کمزور ہو گی ہی لیکن بصد ادب ان کے فہم وتدبر میں بھی کمی ہے۔ یہ کانفرنس سلطان راہی مرحوم کی طرح "بڑھکیں" مارنے کے لئے نہیں بلائی گئی تھی (حالانکہ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا) بلکہ امریکہ کے ساتھ ہی ساتھ اقوامِ عالم کو بھی ایک پیغام دینا مقصود تھا جو میری ناقص رائے میں کما حقہ پہنچا دیا گیا۔ امریکہ جو ہماری نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی محافظ آئی۔ ایس۔ آئی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا تھا، اسے یہ پیغام پہنچ گیا کہ نہ صرف جناب زرداری اور گیلانی صاحب بلکہ تمام چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیاں

فوج اور آئی۔ایس۔آئی کی پشت پر پوری استقامت کے ساتھ کھڑی ہیں۔میاں نواز شریف کے یہ الفاظ کہ انہیں جنرل کیانی سے محبّت ہے کیونکہ وہ جمہوریت کی بقا کے لئے تگ و دو کر رہے ہیں، وائٹ ہاؤس کے لئے واضح اشارہ تھا کہ اگر قوم پر کڑا وقت آیا تو ہم سب ایک ہیں۔امریکہ کو واضح پیغام نہ پہنچانے کی دہائی دینے والے افلاطونی لکھاریوں سے سوال ہے کہ کیا یہ امریکہ کے منہ پر تھپڑ نہیں کہ وہ حقانی نیٹ ورک کے خلاف ایکشن لینے کے لئے طرح طرح کی دھمکیاں دے رہا ہے اور ہمارا اعلامیہ طالبان کے ساتھ مذاکرات کرکے انہیں قومی دھارے میں لانے پر زور دے رہا ہے۔کیا یہ واضح اشارہ نہیں کہ "مسٹر ڈو مور" اب "نو مور" ؟۔۔۔۔ چلتے چلتے یہ بھی بتلاتی چلوں کہ بعد از خرابیٔ بسیار ہی سہی لیکن "مولوی" بہرحال جیت ہی گئے کہ وہ روزِ اوّل سے ہی فوجی ایکشن کی بجائے مذاکرات پر زور دے رہے تھے اور عمران خان بھی ۔ تحقیق کہ اسی سے امن کی راہ نکلتی ہے اور یہی دینِ مبین کا سبق بھی ہے۔آخر میں بس یہی دُعا کہ اس "اعلامیے" کا بھی وہی حشر نہ ہو جو اس سے پہلے اعلامیوں کا ہو چُکا ہے۔

چنڈال چوکڑی

ملک کے طول و عرض میں جلسہ ، جلوسوں اور ریلیوں کا موسم شروع ہو چکا۔ گویا الیکشن کا سمے آن پہنچا۔ نواز لیگ نے بڑی ریلی نکالی تو کوئی معرکہ سرانجام نہیں دیا کہ ملک کے ساٹھ فیصد حصے پر اُن کی حکومت ہے۔ایم۔کیو۔ایم نے چھتیس گھنٹوں کے اندر بڑی ریلی نکال کر ثابت کر دیا کہ کراچی پر ان کا "رعب" ابھی تک برقرار ہے۔یہ ریلی جناب آصف زرداری کی حمایت میں نکالی گئی جو آج کل پی۔پی۔پی سمیت اپنی خوشدامن محترمہ نصرت بھٹو مرحومہ کے سوگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ کچھ شر پسند یہ بھی کہتے ہیں کہ پی۔پی۔پی کی "مادرِ جمہوریت" سولہ سال تک "کومے" میں رہیں اور خاندان میں کسی نے ان کی خبر نہ لی۔یہاں تک کہ وقتِ دمِ واپسیں ان کے سرہانے کوئی اپنا نہ تھا۔لاشوں پہ سیاست کرنے والی پی۔پی۔پی کو شاید آمدہ الیکشن میں ایک اور "لاش" کی اشد ضرورت تھی جو محترمہ نصرت بھٹو کی شکل میں مل گئی۔بات کہیں اور نکل گئی ، میں دراصل یہ عرض کرنا چاہتی تھی کہ حکومت میں رہ کر یا حکومتی مشینری استعمال کر کے جلسے ، جلوس اور ریلیاں نکالنا کوئی بڑی بات نہیں۔بڑی بات مگر عمران خاں نے کی ہے کہ مینارِ پاکستان پر ایک متاثر کن جلسہ کر ڈالا۔آئی۔ایس۔آئی کے مطابق تعداد ستّر ہزار تھی شاید اس سے بھی زیادہ ہو لیکن تعداد کی کمی بیشی سے

قطعِ نظر جلسے میں حاضرین کا جوش و خروش دیدنی تھا۔بلا شبہ تحریکِ انصاف کے کارکنان کی گزشتہ دو ماہ سے کی جانے والی کوششیں اور کاوشیں ثمر آور ہوئیں اور عمران خاں کو خود ان کی توقع سے کہیں بڑھ کر پزیرائی ملی۔

محترم عمران خاں نے تقریر سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ قبل یہ کہا کہ وہ ایک ایسا اعلان کرنے والے ہیں جس سے "انقلاب" آ جائے گا۔ہم انقلاب کی نوید سننے کے لئے بیتاب ہو گئے ۔ کھانا پینا چھوڑ کر ٹی۔وی پر نظریں جمائے بیٹھے رہے لیکن "نویدِ انقلاب" کو کان ترستے ہی رہے اور تقریر ختم۔عمران خاں چین تشریف لے گئے۔شاید چینی وزیرِ اعظم سے مشورے کے بعد وہ شہزاد رائے کے ترانوں کی گونج میں وہ اعلان فرمائیں ۔ میری بیٹی کہتی تھی کہ "ماما" اگر مجھے پتہ ہوتا کہ جلسے میں شہزاد رائے نے بھی آنا ہے تو میں بھی چلی جاتی کہ کنسرٹ کا کنسرٹ اور مستقبل کے وزیرِ اعظم کی جھلک مفت میں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ عمران خاں نے اپنی پوری تقریر میں کوئی نئی بات نہیں کی ۔ وہی گھسی پٹی مہنگائی ، کرپشن ، بد عنوانی ، اور امریکہ ۔ ویسے آفرین ہے ہمارے الیکٹرانک میڈیا پر کہ جو رائی کا پہاڑ بنانے میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں ۔میڈیا نے ذوالفقار مرزا کی "قُرآنی پریس کانفرنس" کی طرح اس جلسے کی بھی بھرپور "لائیو کوریج" کرکے وہ کمال دکھایا کہ تقریباً تمام سقہ لکھاریوں کو جلسے کی تعریف کرتے ہی بن پڑی ۔ میں یہاں وضاحت کر دوں کہ بخُدا میں عمران خاں کی

ہر گز مخالف نہیں ہوں بلکہ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ عمران خاں جو کچھ کہتے ہیں اس کا حرف حرف سچ ہے اور ان کی آواز ہر غیرت مند پاکستانی کی آواز ہے میں ہزار بار لعنت بھیجتی ہوں ایسے لکھاریوں پر جو جان بوجھ کر کسی کی مدح سرائی کرتے ہیں یا محض خُبثِ باطن کی بنا پر مخالفت۔ مانا کہ عمران خاں نے ایک بڑا متاثر کن جلسہ کیا لیکن ہم نے اس سے کہیں بڑے جلسے بھی دیکھے ہیں۔ بھٹو کے دور میں جبکہ ملک کی آبادی آج سے آدھی بھی نہیں تھی اور عوام ان عذابوں میں بھی مبتلا نہیں تھے جن میں آج ہیں تب بھی بھٹو کے جلسے اس سے کہیں بڑے اور حیران کن حد تک جذباتی ہوتے تھے۔ 1986ء میں محترمہ بینظیر شہید کا والہانہ استقبال اور منٹو پارک میں جلسہ کسی کو بھولا نہیں ہو گا۔ غالباً 1974ء یا 1975ء میں جب سیّد مودودیؒ کافی عرصہ بعد امریکہ سے علاج کروا کر لوٹے تو ان کے قافلے کا ایک سرا ایئرپورٹ اور دوسرا اچھرہ ان کے گھر تک پہنچ چکا تھا۔ 1970ء کی جماعتِ اسلامی کے "شوکتِ اسلام" کے جلسے اور جلوس کو آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔ دور مت جایئے ابھی چند دن پہلے اسلامی جمیعت طلبہ کا اجتماع انتہائی متاثر کن تھا اور تحقیق کہ اگر خُدا میڈیا کو اس اجتماع کی "لائیو کوریج" کی توفیق دیتا تو ان جوانوں کی تعداد عمران خاں کے جوانوں سے کسی بھی صورت میں کم نہ تھی۔ تو پھر کیا جماعتِ اسلامی بھی یہ اعلان کر دے کہ اس اجتماع کے بعد ان کی ستّر سیٹیں تو پکّی ہو گئیں اور ایسے دو تین اجتماعات کے بعد 272ء بھی ہو جائیں گی ؟۔

میرے

ایک انتہائی محترم بزرگ لکھاری، جنہیں عمران خاں سے والہانہ عشق ہے، نے فرمایا ہے کہ "پانی پت کی تیسری لڑائی جیتی جا چکی ہے" جبکہ ہم یہ سمجھتے ہیں لڑائی تو بہت دور کی بات ہے، ابھی تو "ہراول دستے" بھی آمنے سامنے نہیں آئے۔ان کی ایسی "بڑھکیں" کہیں آنے والے وقتوں میں انہیں "پانی پانی" نہ کر دیں۔وہ 40/30 سے 70 سیٹوں تک پہنچ گئے ہیں۔دیکھتے ہیں کہ 370 تک کب پہنچتے ہیں؟۔ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے 270 ہی لکھا ہو لیکن کاتب کی غلطی سے صرف 70 رہ گیا ہو۔وہ کہتے ہیں کہ۔۔۔۔"وہ نئی نسلوں کے جلو میں بھڑکتی مشعل اُٹھائے آ پہنچا ہے کہ اس دیار میں روشنی ہو۔محمد علی جناح کے بعد جو کرن کرن کو ترس گئی تھی"۔شاید میرے بزرگ لکھاری کا حافظہ بہت کمزور ہے وگرنہ وہ عمران خاں کو قائدِ اعظم ثانی ثابت کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتے کہ قائدِ اعظم کے بعد لیاقت علی خاں بھی تھے اور ہزار اختلافات کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو بھی اور عمران خاں تو ابھی نباضِ وقت ذوالفقار علی بھٹو کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچے۔اگر میرے محترم لکھاری عمران خاں سے واقعی مخلص ہیں تو خُدا را انہیں بانس پر چڑھانا بند کر دیں اور یہ کام قاف لیگ، پی۔پی۔پی اور ان کے زر خرید لکھاریوں تک رہنے دیں جو پہلے ہی بطریقِ احسن یہ ڈیوٹی سر انجام دے رہے ہیں تاکہ دائیں بازو" کے ووٹروں کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرکے پی۔پی۔پی کے لئے ایک دفعہ" پھر میدان ہموار کر دیں۔

محترم لکھاری نے اپنے کالموں میں عمران خاں اور ان کے ووٹروں کو "پند و نصائح" کی بھرمار کرکے سر سیّد احمد خاں ثانی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ان کا لکھا سر آنکھوں پر لیکن عالم وہی اچھا جو عامل بھی ہو۔وہ خود تو نرگسیت کے شکار ہیں جو یہ کہتے ہیں "فیصلہ یہ کہ اتوار کو ٹی۔وی سے گریز۔ پیر کو بارہ بجے تک پانچ دعوت نامے مل چکے تھے مگر گریز۔ چنڈال چوکڑی والے فارغ ہو چکیں تو عرض ہم بھی کریں" اللہ کرے کہ پانچ نہیں ،پانچ سو دعوت نامے ملیں لیکن جس "پیر" کا وہ ذکر کر رہے تھے اسی پیر کو ایک ٹی۔وی چینل پر میں نے خود انہیں "احسن اقبال" پر گرجتے برستے اور انہیں لتاڑتے دیکھا جس کا احسن اقبال نے گلہ بھی کیا۔۔۔۔۔ اور ہاں ۔۔۔۔ یہ "چنڈال چوکڑی" ؟ ۔۔۔۔ غالباً چنڈال چوکڑی کا مطلب فسادیوں ، کمینوں ، اور بد ذاتوں کا گروہ ہوتا ہے ۔ قرآن و حدیث کے بغیر لقمہ نہ توڑنے والے محترم صحافی کیا یہ بھول گئے کہ ربّ کردگار تو مشرکین کے بتوں کو بھی برا نہ کہنے کا حکم دیتا ہے ۔ تحقیق کہ اگر یہی "چنڈال چوکڑی" بد زبانی اور بد کلامی پر اتر آئی تو آپ اور آپ کے ممدوح کو بھاگتے راہ نہیں ملے گی ۔اس لئے ایک نصیحت میں بھی کر دوں کہ "نادان دوست" کا کردار ادا کرنا بند کر دیجئے کہ اگر آپ ایسے ہی گرجتے برستے رہے تو آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن آپ کا کپتان ضرور غیروں کی گگلی کا شکار ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اور چلتے چلتے انتہائی معذرت کہ میرا یہ مزاج نہیں لیکن پتہ نہیں کیوں میں بھی گرج برس گئی۔۔۔

ایک سوال

جب محرومیوں کی گھور گھٹائیں نا مرادیوں کے آنگن میں خیمہ زن ہو جائیں، جب آس کا پنچھی یاس کے قفس میں دم توڑ دے، جب اداسیاں بال کھولے ماتم کناں ہو جائیں، جب صحنِ چمن خزاں پورے عزم و استقلال سے یوں ڈیرے ڈال لے کہ بُلبُل اپنے گُل کے لئے نغمہ خوانی سے گریزاں ہو جائے، پپیہا "پی کہاں" کی رٹ چھوڑ دے، کوئل کی "کوکو" بند ہو جائے، سازندے مر جائیں اور سازوں کے تار ٹوٹ جائیں اور جب جھرنے خاموش ہو جائیں اور آبشاروں کے لب خشک ہو جائیں تو سمجھ لیجئے کہ ۔۔۔۔ اُس دور کے سلطاں سے کوئی بھول ہوئی ہے۔ میرے آقا کا تو دنیا بھر کے حکمرانوں کے لئے یہ فرمان ہے کہ " تُم میں سے ہر کوئی چرواہا ہے جس سے روزِ قیامت حساب لیا جائے گا" لیکن یہ کیسے چرواہے ہیں جو بھیڑیے بن کر اپنی ھی بھیڑوں کو ادھیڑ رہے ہیں؟۔ عجب قحط الرجال ہے کہ آنکھ کہیں ٹھہرتی ہی نہیں، نگاہوں میں کوئی جچتا ہی نہیں ۔۔۔۔ لیکن قوم کو کہیں تو رکنا ہو گا، کہیں تو ٹھہرنا ہو گا۔ ملک کی خاطر، اس کی بقا کی خاطر۔ اپنے آپ کی خاطر، اپنی اولاد کی خاطر ۔۔۔۔ سوال مگر یہ کہ کہاں؟؟؟

ایک ہی گھر کے چشم و چراغ

کیا آپ نے کبھی تربوز اور خربوزے کو دیکھا ہے؟

کیا کہا؟ ۔۔۔۔ کھایا بھی ہے؟ ۔۔۔۔ واہ!

میں نے بھی کھایا ہے ۔۔۔۔ بہت دفعہ کھایا ہے ۔۔۔۔ جب میں چھوٹی سی ہوتی تھی ناں ۔۔۔۔ بہت چھوٹی ۔۔۔۔ ابھی سکول میں بھی نہیں جاتی تھی ۔۔۔۔ تو پتہ میرے بابا جانی نے مجھے ایک پیاری سی بُک لا کر دی ۔۔۔۔ اس بُک میں تربوز بھی تھا ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ خربوزہ بھی ۔۔۔۔ اور بھی بہت ساری چیزیں تھیں ۔۔۔۔ بابا مجھے کہتے کہ پڑھو!

ت ۔۔۔۔ تربوز

اور خوشبو کہتی تھی ۔۔۔۔ آپ کو پتہ ہے کہ خوشبو کون ہے؟ ۔۔۔۔ نہیں پتہ؟ ۔۔۔ میں آپ کو بتاتی ہوں وہ میری پیاری سی دوست ہے ۔۔۔۔ اُس کی آنکھیں تو اتنی پیاری ہیں ۔۔۔۔ اتنی پیاری کہ میرا دل چاہتا ہے ان کو دیکھتی ہی رہوں ۔۔۔۔ ہاں تو خوشبو کہتی تھی کہ

ت ۔۔۔۔ تربوز نہیں ہوتا

ت ۔۔۔۔ ہندوانہ ہوتا ہے۔

میں نے بابا سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ خوشبو کے گھر جا کر تربوز،

ہندوانہ بن جاتا ہے۔

شائد کہ تیرے دل میں اُتر جائے میری بات

ہنستا، مسکراتا، بیگانوں کو اپناتا، اپنوں کے لئے دامانِ اُلفت وا کرتا، نا مرادوں کی جھولیاں مرادوں سے بھرتا، خوابوں کو حقیقتوں کے رنگ بخشتا، اشکوں کو گلابی شفقتوں کی نرم و نازک پنکھڑیوں سے صاف کرتا، خوشیاں بانٹتا، مسرتیں بکھیرتا روشنیوں سے جگمگاتا شہرِ قائد ان دنوں سوگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ خوف کے طویل سایوں تلے گہری اداسیاں خیمہ زن اور ہر کواڑ کے عقب سے کربناک سسکیوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ پورا شہر دہشت گردوں، بھتہ خوروں، قبضہ گروپوں اور اٹھائی گیروں نے یرغمال بنا رکھا ہے، جن سے رہائی کی کوئی راہ سجھائی دیتی ہے نہ دکھائی۔

سوال مگر یہ ہے کہ اتنے طاقت ور یہ یرغمالی آخر ہیں کون؟۔ وہی جنہیں کاتبِ تقدیر نے حقِ حکمرانی عطا کر رکھا ہے۔ تین اتحادی، تینوں حاکم اور تینوں ہی باہم الزام تراش۔ کیا اس عالمِ آب و گِل میں ایسا بھی ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ نمرود کی خدائی ہے جہاں بندگی میں بھی بھلا نہیں ہوتا؟۔ با ایں ہمہ، اصرار مگر یہ کہ فوج کو اقتدار نہیں سنبھالنا چاہیے مگر کیوں؟ کیا گزشتہ آمر ان سے زیادہ خائن، بد دیانت اور ظالم تھے؟ کیا یہ قوم کا

مقدر ٹھہرا کہ وہ ہمیشہ ان خواجاؤں، نیازیوں، اور بلند اختروں جیسے حکومتی کارندوں کے ہاتھوں لُٹتی رہے گی۔ اگر گیلانیوں نے اپنے اور حواریوں کے آلودہ دامنوں کی صفائی کے لئے کسی بد دیانتی کی باس سے متعفن وجود رکھنے والے " جاروب کش " کا انتظام کر لیا ہے تو کیا قوم پر لازم ٹھہرا کہ وہ سر تسلیم خم کرتے ہوئے کسی کو اپنی مدد کے لئے پکارنے کی گستاخی بھی نہ کرے؟ زرداری صاحب نے بجا طور پر بلند اختر کو موزوں ترین " شخصیت قرار دیا کہ " کند ہم جنس، باہم جنس پرواز " لیکن کتنے کربناک ہونگے وہ لمحے جب انتہائی دیانت دار منصف نے انتہائی بد دیانت شخص سے محض آئین کی پاسداری کی خاطر یہ سوچتے ہوئے حلف لیا ہو گا کہ یہاں محض بد دیانتوں کے " اختر " ہی بُلند ہوتے ہیں۔ محترم عرفان صدیقی نے سچ ہی لکھا ہے کہ " حکومتی مقناطیس ہر اس شخص کو کوسوں دور سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کے دامن پر نا اہلی کرپشن، فراڈ، بد دیانتی، خیانت یا شخصی کردار کی کمزوری کا کوئی داغ ہو " ۔ لیکن یہ، الزام تو کم و بیش ان کے ممدوحین پر بھی آتا ہے۔ کبھی قلم کی حرمت کا پاس کرتے ہوئے یہ بھی لکھ دیجئیے کہ دودھ کی دھلی نواز لیگ بھی نہیں ہے اور اسی بنا پر قوم ایک دفعہ پھر فوج کی طرف دیکھ رہی ہے کہ فوج برائی سہی پھر بھی بِلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ حکمرانوں کی موجودہ کھیپ سے کہیں چھوٹی بُرائی ہے۔ اور آج ذوالفقار مرزا کی " قُرآنی پریس کانفرس " کے بعد تو یہ حقیقت کھُل کر عیاں ہو گئی ہے کہ " پاکستان کھپے " کا نعرہ لگانے

والوں کے قول و فعل میں کتنا تضاد ہے یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ذوالفقار مرزا نے اپنی پریس کانفرس میں اپنا سارا زورِ بیاں ایم۔کیو۔ایم اور رحمٰن ملک کو ملک دشمن قرار دینے میں صرف کر دیا لیکن اے۔این۔پی کے بارے میں ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا ۔حالانکہ اس جرم میں اے۔این۔پی برابر کی شریک ہے اور ہر کوئی جانتا ہے کہ پشاور سے اسلحہ کس ڈیلر سے خریدا جاتا ہے اور کراچی میں کون وصول کرتا ہے۔ رہی پی۔پی۔پی کی بات تو اس کے گڑھ لیاری سے رینجرز نے اسلحے کے ڈھیر بھی برآمد کئے ہیں اور میڈیا والوں کو عقوبت خانوں کی سیر بھی کروائی ہے ۔مرزا صاحب شاید اس لئے طرح دے گئے ہیں کہ قُرآن سرپر اٹھا کر اے۔این۔پی اور پی۔پی۔پی کی بے گناہی ثابت کرنے کی اُن میں ہمت نہیں تھی ، وگرنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس حمام میں تینوں ننگے ہیں اور تینوں ہی برابر کے مجرم۔

کچھ تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ جناب زرداری کے قریبی دوست ذوالفقار مرزا نے یہ پریس کانفرس صدر زرداری کی ایماء پر ایم۔کیو۔ایم کو کونے میں لگانے کے لئے کی ہے ۔میں اس تجزیے سے اتفاق نہیں کر سکتی کہ اس پریس کانفرس سے ایم۔کیو۔ایم کو جو نقصان پہنچا لیکن پی۔پی۔پی کے پاس تو اپنے دفاع میں کہنے کے لئے کچھ بھی باقی نہیں بچا ۔اگر مرزا صاحب یہ جانتے تھے کہ ایم۔کیو۔ایم اور رحمٰن ملک صاحب ملک دشمن ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ صدر اور وزیرِ اعظم

بے خبر ہوں ؟۔ پھر مرزا صاحب نے تو اپنی پریس کانفرس میں متعدد بار یہ کہا کہ ہر اعلیٰ سطحی اجلاس میں پورے ثبوتوں کے ساتھ یہ سب کچھ صدر اور وزیرِ اعظم کے علم میں لایا گیا اگر ایسا ہی ہوا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ محترم زرداری صاحب ایک ملک دشمن جماعت کے ساتھ مفاہمت کے لئے اتنے بے تاب کیوں تھے، اُن کا گورنر کیوں سندھ پر مسلط کیا گیا اور اطاف حسین کی کل تک کاسہ لیسی کیوں کی جاتی رہی ۔؟ مستقبل قریب میں زبان زدِ عام ہونے والے ان سوالات کا پی۔پی کے پاس کوئی جواب نہیں ہو گا ۔شاید اسی لئے ذوالفقار مرزا کا دورانِ کانفرس ہی استعفیٰ قبول کر لیا گیا۔انہیں ایک ہفتہ تک ایوانِ صدر میں رکھا گیا، انہیں کسی سے بات نہیں کرنے کی اجازت تھی نہ ملنے کی اُن کے تمام فون بند تھے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی جاتی رہی ۔ ہو سکتا ہے کہ ، وعدے وعید لے کر انہیں جانے کی اجازت دی گئی ہو جن کو مرزا صاحب ایفاء نہ کر کے کہ ان کے دوست اور لیڈر کے مطابق " وعدے قُرآن و حدیث نہیں ہوتے " ۔

معزز قارئین ! میں نے محض چار دن پہلے اپنے کالم میں جس طرف اشارہ کیا تھا، آج ذوالفقار مرزا نے پورے ثبوتوں کے ساتھ کھول کے رکھ دیا لیکن بہرحال انہوں نے آدھا سچ بولا ہے، پورا سچ نہیں ۔ پھر بھی قوم کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے کراچی کے معاملے پر قوم کو گومگو کی کیفیت سے نکال

دیا اور دعا کی کہ چیف جسٹس انہیں طلب کریں تاکہ وہ تمام تر ثبوتوں کے ساتھ اپنی پریس کانفرس میں لگائے گئے الزامات کو سچ ثابت کر سکیں۔وہ سارے ثبوت چیف جسٹس صاحب ، چیف آف آرمی سٹاف ،آئی۔ایس۔آئی اور دیگر خفیہ ایجنسیوں کو دینے کو تیار ہیں ہمیں یقین ہے کہ محترم منصفِ اعلیٰ اپنی اولین فرصت میں ذوالفقار مرزا صاحب کو طلب فرمائیں گے کہ یہ کوئی عام معاملہ نہیں بلکہ وطنِ عزیز کی بقا کا سوال ہے ۔۔۔ بصد ادب ۔۔۔ بصد ادب اگر آج آپ نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہ کیا تو پھر مارشل لاء آئے گا۔۔۔ صرف مارشل لاء اور انتہائی معذرت کے ساتھ آنے والا مورخ اس مارشل لاء میں کہیں نہ کہیں آپ کا کردار بھی تلاش کرے گا۔۔۔۔

بھان متی کا کنبہ۔۔۔ اور۔۔۔ میڈیا

آل پارٹی کانفرنس اعلامیہ ابھی جاری نہیں ہوا تھا لیکن اندر کی ساری باتیں یکے بعد دیگرے باہر آتی جا رہی تھیں اور ہمیں گھر بیٹھے بٹھائے پتہ چل رہا تھا کہ "بھان متی کا کنبہ" اندر کیا گُل کھلا رہا ہے۔ اگر اندرونی کہانیاں یوں ہی طشت از بام ہونی تھیں تو "میڈیا کوریج" میں ہرج ہی کیا تھا؟۔ اگر میڈیا موجود ہوتا تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ افواہ طرازوں کو کُھل کھیلنے کا موقع نہ ملتا۔ خیر جو ہوا، سو ہوا لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے بھی پتہ چل گیا کہ پاکستان میں قومی قسم کی اٹھاون (58) سیاسی جماعتیں ہیں۔ چلئے پاکستان کسی لحاظ سے تو خوش حال اور خود کفیل ثابت ہوا ورنہ ہم تو ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ وطنِ عزیز میں ہر شئے کم کم ہی ہے، پر ------------

ایک معروف نیوز چینل پر بار بار یہ بریکنگ نیوز جاری تھی کہ وزیرِ اعظم کے کچن میں شرکاء کے لئے کھانے تیار ہو رہے ہیں اور مینو کے مطابق پہلے گرما گرم سوپ سے تواضع کی جائے گی، پھر چکن کڑاہی اور ویجیٹیبل رائس پیش کئے جائیں گے۔ افسوس کہ مذکورہ نیوز چینل نے ادھوری "بریکنگ نیوز" جاری کی، حالانکہ ہمیں گھر بیٹھے پتہ تھا کہ ساتھ رائیتہ اور سلاد، پینے کے لئے

کوک اور منرل واٹر، حتیٰ کہ ہاتھ صاف کرنے کے لئے ٹشو پیپرز بھی ہیں۔اگر متذکرہ نیوز چینل ادھوری کی بجائے پوری خبر نشر کرتا تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ قوم متحد ہو جاتی اور امریکہ دم دبا کر بھاگ جاتا۔لیکن مجھے جس بات پر بار بار غصہ اور اپنی کم عقلی پر افسوس ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ اگر میں نے بھی اپنی پارٹی رجسٹر کروائی ہوتی تو میں بھی اٹھتی بھاپ والے سوپ کے مزے لوٹ رہی ہوتی۔اگر مسرت شاہین اپنی پارٹی رجسٹر کروا سکتی ہے تو میں کیوں نہیں؟۔پھر یہ بھی تو ہے کہ وہاں تو "سنگل مین" کئی پارٹیاں پہلے سے ہی موجود تھیں اگر میں بھی ہوتی تو ہرج ہی کیا تھا؟۔

APC میں میاں نواز شریف نے حسبِ عادت اور حسبِ سابق یہ کہہ کر شنید ہے کہ سب کو حیران کر دیا کہ "دال میں کچھ تو کالا ہے" جبکہ محمود اچکزئی نے تو پوری دال کو ہی "کالا" قرار دے دیا۔اس سے پہلے جناب گیلانی نے اپنے افتتاحی کلمات میں امریکہ کے ساتھ ہر سطح پر مذاکرات کی خواہش کا اظہار کر دیا۔عمران خان بھلا کب کسی سے پیچھے رہنے والے تھے انہوں نے متفقہ اعلامیہ کے مسودے کو "ویٹو" کر دیا۔شکر ہے کہ شیخ رشید اس وقت اپنے قیمتی سگار سے کھیل رہے تھے وگرنہ عمران خان سے پہلے انہوں نے ویٹو کرنا تھا۔ایک انتہائی معروف اینکر پرسن حیران تھے کہ میاں نواز شریف پہلے تو APC شروع ہوئی تو وہ فوج جناب کیانی کے ساتھ ہنس ہنس کر مل رہے تھے لیکن جب پر ہی برس پڑے۔شاید

محترم اینکر پرسن نہیں جانتے ہوں گے کہ آج کل میاں صاحب کے اندر بھارتی محبّت کے سُوتے پھوٹ رہے ہیں۔شاید انہوں نے اِنہی جیسا بننے کی خاطر "بغل میں چھری، منہ میں رام رام" والے محاورے پر عمل کر ڈالا ہو۔ محترم اینکر پرسن اس میں بھی کسی بہت بڑی سازش کی بُو سونگھتے پائے گئے کہ جنابِ گیلانی نے جان بوجھ کر اپنی ایک طرف چوہدری شجاعت حسین اور دوسری طرف میاں نواز شریف کو بٹھا دیا۔شاید وہ اس میں میاں صاحب کی اہانت کا پہلو تلاش کر رہے ہوں کہ "کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی" اور یہ ہے بھی بجا کہ "چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک" لیکن میاں صاحب کے اطمینان کے لئے یہ کافی ہونا چاہیے کہ امریکی سفیر کیمرون منٹر ان کے بیان پر ہدیہ تبریک کے طور پر بہادری کا تمغہ پہنانے کو بے قرار ہیں۔اب ہو سکتا ہے کہ امریکہ میاں صاحب کی ایٹمی دھماکے کرنے کی گستاخی کو معاف کرتے ہوئے "ہتھ ہولا" کر لے اور مقتدر حلقوں کو یہ اشارہ دے دے کہ اگر اقتدار کا ہما میاں صاحب کے سر پر بٹھا دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ۔۔۔۔۔ زرداری صاحب ! "ہشیار باش"

معزز قارئین ! سوال یہ ہے کہ جس قوم کے راہبر قومی سلامتی کے اس نازک موڑ پر بھی انتہائی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے پائے جائیں ، سقہ اینکرز اور معروف نیوز چینلز کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے موضوع کو قومی خدمت قرار دینے لگیں ، اُس قوم کا حشر کسی تجزیے یا تبصرے کے بغیر ہی روزِ روشن کی

طرح عیاں ہے۔

سرجیکل آپریشن

محترم اوریا مقبول جان کہتے ہیں کہ امریکی افواج کا میراں شاہ پر سرجیکل آپریشن قوم کے لئے نیک فال ہو گا کیونکہ یہ منتشر قوم صرف ایسے ہی متحد ہو سکتی ہے۔بات تو سچی کی ہے اور سچ بھی کہ کرکٹ میچ پر پوری قوم ایسے متحد ہو جاتی ہے جیسے دلی کے لال قلعے پر جھنڈا لہرانے نکلی ہو۔بڑی ہی عجیب قوم ہے کہ جس کی صلاحیتیں میدانِ کارزار میں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور جو جنگ کو ایسے لیتی ہے جیسے شادی کی تقریب ہو۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 1965ء کی جنگ میں ہم "لاہوری" چھتوں پر چڑھ کرپاک فضائیہ کو انڈین لڑاکا طیاروں پہ جھپٹتے اور گراتے دیکھ کر" بو کاٹا" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔اب امریکہ نے دھمکی کیا دی کہ ہر نگاہِ شوق یہ سوال اٹھائے پھرتی ہے کہ کہیں امریکہ پیچھے تو نہیں ہٹ جائے گا ؟اگر کوئی کہہ دے کہ امریکہ میراں شاہ پر ایبٹ آباد جیسا سرجیکل آپریشن کرنے کی جرات نہیں کرے گا تو لوگ اسے ایسے گھورنے لگتے ہیں جیسے کچا ہی چبا جائیں گے ۔کل چھٹی کے دن جنرل اشفاق پرویز کیانی نے ہنگامی کور کمانڈرز کانفرنس طلب کرکے گویا پورے ملک میں میلے کا سا سماں پیدا کر دیا ہر طرف اسی کانفرنس کے چرچے ہیں اور چونکہ کانفرنس کا کوئی اعلامیہ جاری نہیں ہوا اس لئے افواہ طرازوں کی چاندی ہو گئی ۔اب جس کا جو جی چاہتا ہے ، اس اعتماد سے

بیان کرتا ہے جیسے جنرل کیانی کے پہلو میں وہی بیٹھا ہو۔پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر خبریں کم اور تجزیے اور تبصرے زیادہ دکھائی دینے لگے ہیں۔آئی۔ایس۔آئی کے سربراہ شاید نجی دورے پر سعودی عرب گئے ہوں یا پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق لیکن خبریں یہ بن گئی ہیں کہ وہ سعودی شاہ کو اعتماد میں لینے گئے ہیں۔چینی نائب وزیرِاعظم کے دورے کو بھی ایسے ہی تناظر میں دیکھا جا رہا ہے اور پاک، چین، سعودی فوجی مشقیں جو کہیں پہلے کی طے شدہ تھیں، وہ بھی جنگ کا ماحول پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ہر کوئی یہ کہتا نظر آئے گا کہ ہم امن پسند لوگ ہیں لیکن اگر امریکہ نے جارحیت کی تو اس کا منہ توڑ جواب دینا چاہیے۔حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ ایسی قیادت اور ایسے قومی انتشار میں ہم امریکہ تو کیا کسی چوہے کا منہ توڑنے کے قابل بھی نہیں۔البتہ اگر بقول اوریا مقبول جان امریکہ کا "سرجیکل آپریشن" واقعی قوم کو متحد کر سکتا ہے تو پھر امریکہ کیا ساری طاغوتی طاقتیں مل کر بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

امریکی مطالبہ ہے کہ ہم "حقانی" کے خلاف آپریشن کریں۔آخر ہم ان کی بات مان کیوں نہیں لیتے۔؟ تحقیق کہ حقانی پاکستان کا دشمن ہے اور ہمیں اسے فوراً پکڑ کر نشانِ عبرت بنا دینا چاہیے۔کیا ہم امریکی دوستی کا بھرم رکھتے ہوئے اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ فوری طور پر "حسین حقانی" کو پکڑ کر اپنے آپ

کو پتھر کے زمانے میں دھکیلے جانے سے بچالیں۔؟ رہی سراج الدین حقانی کی بات تو وہ پاکستان میں تھا ہی کب جو ہم اسے پکڑ لیں ۔ وہ تو خود بار بار کہہ چکا ہے کہ وہ اپنے ملک میں پاکستان سے کہیں زیادہ محفوظ ہے۔ رہی آئی۔ایس۔آئی اور حقانی نیٹ ورک کی مل کر قابل میں امریکی سفارتخانے پر حملے کرنے کی بات، تو میں تسلیم کرتی ہوں کہ وہ حملہ آئی۔ایس۔آئی نے ہی کیا تھا۔ اور وہ سفارتخانہ تو کجا وائٹ ہاؤس اور پینٹاگون پر بھی جب چاہے حملہ کر سکتی ہے کیونکہ آئی۔ایس۔آئی میں جو بھی بھرتی ہوتا ہے اسے گدی نشین وزیر اعظم گیلانی صاحب کی طرف سے ایک "سلیمانی ٹوپی" عنایت ہوتی ہے جسے پہن کر وہ دنیا کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے اور امریکہ جو سیٹلائٹ سے زمین پر رینگنے والی چیونٹی کو بھی دیکھ سکتا ہے، اس روحانی ٹوپی سے مات کھا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خبر دار امریکہ ! اب ہم یہ ٹوپیاں سارے شمالی وزیرستان میں تقسیم کرنے والے ہیں۔ اب ہمارے "ٹوپی مارکہ" طالبان تمہاری سرحدوں پر متعین نیٹو افواج کو چیرتے ہوئے نہ صرف افغانستان میں ہر جگہ تمہارے اڈوں پر حملہ آور ہوں گے بلکہ بحفاظت واپس بھی آ جائیں گے۔۔۔

عورت، ڈینگی، اور بجلی

میں نے اپنے پچھلے کالم میں ہی عرض کیا تھا کہ روٹھوں کو منانے کے فن میں صدرِ محترم کا کوئی ثانی نہیں۔دیکھ لیجئے کہ محض ایک ہی رات میں انہوں نے سبھی روٹھوں کو "با جماعت" منا کر نواز لیگ کے غبارے سے ہوا نکال دی اور میاں صاحبان جو ق لیگ کے ساتھ بات تک کرنے کو بھی تیار نہ تھے اب یہ کہتے پھرتے ہیں کہ :۔

هم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

ق لیگ کی طرف سے ٹکا سا جواب ملنے پر اب ان کی حالت کچھ یوں ہے کہ

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

لیکن مشتری ہشیار باش کہ چوہدری بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ۔ اگر ان کا وارث مصیبت میں نہ ہوتا تو ان کے رنگ اور ڈھنگ کچھ اور ہی ہوتے۔اب بھی کچھ پتہ نہیں کہ وہ کب الٹے پاؤں پھر جائیں کہ اس فن میں اُن کا بھی کوئی ثانی نہیں۔یہ وہی ڈیرے دار ہیں جنہوں نے اپنے ڈیرے پر دس دس فوجی وردیاں کلف لگا کر لٹکا رکھی تھیں۔کہ انہوں نے اپنے "آقائے ولی نعمت" کو دس بار وردی میں منتخب جو کروانا تھا۔لیکن جب "آقا" پر بُرا وقت آیا تو پھر "تو کون اور

میں کون" ۔ شاید اسی لئے اس " وچھوڑے " کے بعد اپنے ڈاکٹر نیازی صاحب، پرویز مشرف کے سامنے طنزیہ انداز میں یہ گنگناتے پائے گئے کہ

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

شاید انہیں اس "داغِ مفارقت" پر آئین کے کسی آرٹیکل کی کسی دفعہ کی کوئی ذیلی شِق تک نہیں ملی ہو گی اس لئے انھوں نے گنگنانے پر اکتفا کر لیا ورنہ وہ آئین سنانے سے کہاں باز آنے والے تھے۔ انھوں نے تو چوہدریوں کی "روٹی شوٹی" اور "مٹی پاؤ" کا بھی آئین کی رو سے سراغ لگانے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی ناکام رہے اور اسی لئے وہ سیاست پر تین حرف بھیج کر ایک دفعہ پھر میڈیکل کی کتابوں کی گرد جھاڑ کر ان کے مطالعے کی سعی بیکار میں مصروف ہیں۔ سعی بیکار اس لئے نہیں کہ خُدا نخواستہ ان کا حافظہ جواب دے گیا ہے بلکہ اس لئے کہ دیئے کی لو میں ان کی کمزور نظر کچھ دیکھ نہیں پاتی اور بجلی آہوئے صحرائی کی ناف کا مشک بن گئی ہے جس کی مہک سے محض اونچے ایوان ہی معطر ہو سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب جیسے "منجی نشین" نہیں۔ سنا ہے کہ حکومت نے ایک دفعہ پھر لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کا اعلان کر دیا ہے لیکن اب عوام اس اعلان پر یقین کرنے کو تیار نہیں کیونکہ اتنی مرتبہ تو ایم۔ کیو۔ ایم نے بھی حکومت کے ساتھ تعلقات کے خاتمے کا اعلان نہیں کیا ہو گا جتنی مرتبہ خود حکومت لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کا اعلان کر چکی ہے۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ ایم۔ کیو۔ ایم مہینہ بیس

دن اِدھر اُدھر منہ مارنے کے بعد واپس چلی آتی ہے اور پی پی پی بھی خوب جانتی ہے کہ ایم۔ کیو۔ ایم نے لوٹنا ہی لوٹنا ہے اس لئے اگر کسی جیالے سے سوال کیا جائے تو وہ بڑی لے میں گانے لگتا ہے کہ

وہ جہاں کہیں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

مہینہ بیس دن لوڈ شیڈنگ ختم ہوتی ہے۔ اس دوران بجلی بیچاری آ آ کر تھک جاتی ہے۔ تاًل کار دو چار ماہ کے لئے استراحت فرمانے چلی جاتی ہے۔ لیکن عوام اتنے بے صبرے ہیں کہ ڈنڈے مار مار کر اسے لوٹنے پر مجبور کر دیتے ہیں کتنی ظالم ہے یہ قوم بھی۔ کیا بجلی بیچاری کو ستانے کا حق بھی نہیں؟ لیکن کیا کیجئے ان مردوں کا کہ جنہیں ہر "مونث سے خُدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ مونث خواہ عورت ہو، بجلی ہو یا ڈینگی۔ اب دیکھیے ناں" جب سے مردوں کو پتہ چلا ہے کہ ڈینگی کی صرف مادہ کاٹتی ہے تب سے سبھی مرد ہاتھ دھوکے اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور جب خود کچھ نہیں کر سکے تو سری لنکا، انڈونیشیا حتیٰ کہ ازلی و ابدی دشمن بھارت سے بھی مدد کے طالب ہو گئے۔ اسی لئے میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ ان مردوں کا کچھ نہیں ہونے والا۔ یہ سدھرنے کے نہیں۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ بے خوابی کے شکار میاں شہباز شریف صاحب اس بیچاری ڈینگی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ انہیں بیچاری ڈینگی پر ترس بھی نہیں آتا۔ وہ کرتی ہی کیا

ہے ؟ صرف اپنی بھوک مٹانے کے لئے مردوں کا تھوڑا سا خون ہی تو چوستی ہے۔ ویسے تو میاں صاحب کسی کو بھوکا دیکھ نہیں سکتے۔ اگر وہ بھوکے کی بھوک مٹانے کے لئے "سستی روٹی" سکیم کا اجراء کر سکتے ہیں تو ڈینگی کے لئے "سستے خون" کا انتظام کیوں نہیں۔؟ ویسے بھی پاکستان میں آج کل جو شئے ارزاں ترین ہے وہ خون ہی تو ہے۔ چلتے چلتے یہ بھی سن لیجئے کہ "دروغ بر گردنِ راوی" آجکل حکومتِ پنجاب کے زیرِ انتظام سبھی محکمے چپکے چپکے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ "ڈینگی" کا خاتمہ نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ میاں صاحب ڈینگی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور وہ سبھی آرام فرما رہے ہیں۔

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ

اپنے یہ ذوالفقار مرزا بھی بڑی " پہنچی" ہوئی چیز ہیں۔ محض اپنا رستہ صاف کرنے کے لئے میڈیا پر آ کر کہا کہ الطاف حسین کے خلاف ثبوتوں کے بریف کیس بھر کر لے جا رہا ہوں ۔ مجھے روکنے اور ثبوت چھیننے کی کوشش کی جائے گی ۔ اب بھلا بیچاری پی۔پی۔پی انہیں روک اور ثبوت چھین کر "آ بیل مجھے مار" پر عمل کیسے کرتی ۔ لیکن مرزا صاحب نے پھر بھی "حفظِ ماتقدم" کے طور پر اپنے دوست اور صوبائی وزیر شرجیل میمن کو ساتھ لے لیا کہ ایک سے دو بھلے ۔ شرجیل میمن نے بھی حقِ دوستی ادا کرتے ہوئے اُف تک نہیں کی اور اپنی وزارت داؤ پر لگا بیٹھے ۔ اونچے ایوانوں کے باسی دو چار روز تو خاموش رہے لیکن جب ایم ۔ کیو۔ ایم نے یہ ثابت کر دیا کہ مرزا اور میمن نے ایک ہی جہاز میں ، ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر سفر کیا ہے تو محترم زرداری صاحب نے بھی متحدہ کو یقین دلا دیا کہ شرجیل میمن کے خلاف کاروائی ہو گی ۔ آخری خبریں آنے تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ کاروائی "پہلوِیار" میں بیٹھنے پر ہو گی یا ایک ہی جہاز پر سفر کرنے پر ؟ دوسری طرف جب بدزبان ، بدکلام لاریب بے باک ذوالفقار مرزا سے یہ سوال کیا گیا کہ انہوں نے "اپنے دوست" کو گرفتارِ بلا کیوں کر دیا ؟ تو کرارا جواب آیا کہ اگر اکٹھے بیٹھے یا سفر کرنے پر جواب طلبی ہوتی ہے تو یہ جواب طلبی تو سب سے پہلے

میری اہلیہ محترمہ فہمیدہ مرزا (سپیکر قومی اسمبلی) کی ہونی چاہیے جن کے ساتھ میں گھر میں بھی ہوتا ہوں اور پہلو میں بھی بیٹھتا ہوں ۔اب گیند بلکہ فُٹ بال پی۔پی۔پی کے کورٹ میں ہے۔دیکھیں جوابِ آں غزل کے طور پر پی۔پی۔پی کیا کہتی ہے یا باالفاظِ دیگر کیا "ٹامک ٹوئیاں" مارتی ہے۔یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہی کیس منصفِ اعلیٰ کی عدالت میں پیش ہو یا وہ "از خود نوٹس" لے لیں تو یا تو دونوں بری یا پھر دونوں گئے ۔۔۔۔ حیدر عباس رضوی کہتے ہیں کہ مرزا کے مُنہ کیا لگنا کہ اس نے تو اپنی بیوی کو بھی نہیں بخشا۔ بھولے رضوی صاحب کو کب یقین آئے گا کہ مرزا صاحب اپنے سمیت کسی کو بھی بخشنے کو تیار نہیں لیکن اس کے باوجود بھی کچھ سیاست دانوں اور "افلاطونی لکھاریوں" کو یقین ہے کہ مرزا صاحب اپنے "یارِ غار" کا لکھا اور ترتیب دیا گیا کھیل انتہائی خوبصورتی سے کھیل رہے ہیں تاکہ "پیپلز پارٹی کے سندھ" سے متحدہ کے شر پسندوں کی صفائی بلکہ صفایا کر دیا جائے۔بات تو دل کو لگتی ہے کہ "یارِ غار" سے پچھلے ساڑھے تین سالوں میں تقریباً تمام سیاسی بزرجمہروں کو تگنی کا ناچ نچایا اور اب بھی سبھی بھنوروں کی مانند طوافِ شمع میں دل و جاں سے مصروف ہیں۔انہیں کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

دامن پہ کوئی چھینٹ ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تُم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

لیکن جب مرزا صاحب کی آنیاں جانیاں دیکھتے ہیں تو عقل یہی کہتی ہے کہ یہ ڈرامہ نہیں کہ ایسا کرنے سے شاید متحدہ تو کونے میں لگ جائے لیکن مرزا صاحب کے بیانات سے پیپلز پارٹی کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ نا قابلِ تلافی ہے۔اب پی۔پی والے اتنے بھی عقل سے پیدل نہیں کہ دس بیس سیٹیں ہتھیانے کے چکر میں بہت کچھ گنوا بیٹھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اب جو کچھ لکھنے جا رہی ہوں اس پر بہت سی جبینیں شکن آلود ہو جائیں گی کہ ہمارے سیاست دان ہی نہیں بلکہ عوام بھی ہمیشہ سے چڑھتے سورج کو سلام کرتے رہے ہیں لیکن کیا کروں کہ دماغ کا خناس مجبور کر رہا ہے کہ لکھ دوں کہ مجھے عمران خاں ، ذوالفقار مرزا کے مماثل نظر آتے ہیں۔ویسے مجھے مماثلیں ڈھونڈنے کا مرض عرصہ ء دراز سے لاحق ہے اور اس موذی مرض کے ہاتھوں میں کئی بار اپنوں ، بیگانوں سے ٹھیک ٹھاک "عزت" بھی کروا چکی ہوں لیکن ۔۔۔

"مرض بڑھتا گیا ، جوں جوں دُعا کی"

کے مصداق جاننے والوں نے اس پر کان دھرنے چھوڑ دیئے ہیں ۔ اس لئے دُعا ہے کہ

بک رہی ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

کچھ نہ سمجھے ، خُدا کرے کوئی

اب دیکھیے ناں کہ عمران خاں اور ذوالفقار مرزا دونوں ہی بے باک اور سیماب پا ہیں ۔۔۔۔ دونوں سارے زمانے کے دشمن ہیں ۔۔۔۔ دونوں کی دوستی اور دشمنی کا کچھ پتہ نہیں چلتا ۔۔۔۔ دونوں الطاف حسین کے خلاف ثبوتوں کے بریف کیس بھر کر لندن یاترا کو گئے ۔۔۔۔ دونوں کو بہت بعد میں پتہ چلا کہ سیاست دان تو کرپٹ ہیں ۔۔۔۔ دونوں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے محبوب ترین ہیں ۔۔۔۔ دونوں نے اسمبلی کی نشست سے استعفیٰ دیا ۔۔۔۔ دونوں جان ہتھیلی پر رکھ کر کرپشن کے خاتمے کے لئے میدانِ عمل میں اترے ۔۔۔۔ ذوالفقار مرزا نے کئی دفع نائین زیرو اور گورنر ہاؤس (سندھ) کی یاترا کی ۔وہ کئی بار ن ، ق لیگ پر گرجے برسے ۔۔۔ دوسری طرف عمران خاں کو نواز لیگ کرپٹ نظر آئی تو جھنڈا لے کر پرویز مشرف اور متحدہ کے جلسے میں اُسی جگہ جا پہنچے جہاں انہوں نے گزشتہ دنوں عظیم الشان جلسہ کیا۔ مشرف کا ریفرنڈم میں بھرپور ساتھ دیا لیکن پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ انہیں وہی مشرف عامر نظر آنے لگا اور وہ قدم بقدم کرپٹ نواز لیگ کے ساتھ چلنے لگے ۔ ہر موقعے پر ان کا ساتھ دیا اور احتجاجی ریلیوں میں بھر پور شرکت کی لیکن پھر اچانک انہیں یاد آیا کہ نواز لیگ تو "کرپٹ" سیاست دانوں کی جماعت ہے ۔ ق لیگ کے خلاف ہمیشہ بولتے رہے لیکن لاہور کی قومی اسمبلی کا ضمنی انتخاب ق لیگ کے ساتھ مل کر لڑا۔ ایم۔ کیو۔ ایم کو "قائد" سمیت تباہ و برباد کر دینے کا عزم لے کر اٹھے لیکن پھر اچانک

خاموش ہو گئے اور یہ "چُپ کا روزہ" آج تک قائم ہے ۔۔۔۔ میں نے محض چند
مماثلتیں بیان کی ہیں باقی اپنے قارئین پر کہ وہ بھی تھوڑی سی دماغی ورزش کر کے اور
کئی مماثلتیں تلاش کر لیں گے ۔۔۔۔ اور ہاں اگر میرا لکھا درست نہیں تو ازراہِ کرم مجھے
بتلایئے گا ضرور تاکہ میں بھی اپنا "قبلہ" درست کر سکوں۔

سکیورٹی رسک

وہ شخص احمقوں کی جنت میں بستا ہے جو ابھی بھی سمجھتا ہے کہ آصف زرداری سکیورٹی رسک نہیں ہے۔اپنے مفادات کے اسیر آصف زرداری نے اپنی شاطرانہ چالوں سے ملک کو اُس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ جس کے بعد سوائے تباہی و بربادی کے کچھ باقی نہیں بچتا۔پاک فوج کے سپریم کمانڈر زرداری کا پہلے دن سے ہی ٹارگٹ نواز لیگ اور افواج پاکستان تھا۔جنرل کیانی واشنگٹن معاہدے کے تحت خاموش تھے اور زرداری نے اپنی شاطرانہ چالوں سے فوج کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔کچھ لوگ اس احمقانہ غلط فہمی میں رہے کہ پی۔پی۔پی ہمیشہ سے اسٹیبلشمنٹ کے خلاف تھی لیکن زرداری حکومت پی۔پی۔پی کی پہلی حکومت ہے جس کے اُس کے ساتھ خوشگوار تعلقات ہیں۔حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔زرداری نے اسٹیبلشمنٹ کو نیچا دکھانے کے لئے ایک نئی طرح نکالی۔ایک طرف انہوں نے فوج کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھے اور جب بھی کوئی کڑا وقت آیا تو جنرل کیانی کو امریکہ کے سامنے لا بٹھایا تاکہ گیلانی اور زرداری امریکہ کو یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکیں کہ وہ تو غلامانِ امریکہ ہیں۔ البتہ جنرل صاحب کے کچھ تحفظات ہیں جنہیں دور ہونا چاہیے۔ جبکہ دوسری طرف فوج کی طرف اٹھنے والی انگلیوں پر چُپ کا دروازہ رکھ لیا۔ اگر حکومت چاہتی تو ایبٹ آباد اور

پی۔این۔ایس مہران پر فوری طور پر کمیشن تشکیل دیئے جا سکتے تھے۔اگر 24 گھنٹوں
کے اندر ایسے کمیشن تشکیل دے دیئے جاتے تو پاک فوج کی طرف انگلیاں اٹھنے کا کوئی
جواز ہی باقی نہ بچتا ذاتی ملاقاتوں میں جنرل صاحب کو یہ مشورہ دیتے رہے کہ شمالی
وزیرستان میں آپریشن سے ملک افراتفری کا شکار ہو جائے گا۔جب کہ امریکہ بہادر کو
شہہ دیتے رہے کہ جنرل کیانی پر دباؤ مزید بڑھا دیا جائے ۔میرا ماتھا تو اُسی وقت ٹھنکا
تھا جب زرداری حکومت نے دہشت گردی کے خلاف آپریشن میں پاک فوج کو فری ہینڈ
دے دیا تھا۔حالانکہ کسی بھی ملک میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ
فیصلے جمہوری حکومت کرتی ہے اور اُن پر عمل درآمد فوج کا کام ہے ۔اس فری ہینڈ کی
بدولت دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں حکومت سے کہیں بڑھ کر فوج حرفِ تنقید
بنتی رہی ۔اب نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ جس کا جی چاہتا ہے فوج کے خلاف بولنے
لگتا ہے جو بلا شبہ خوفناک اور خطرناک ہے۔یہ وہی آصف زرداری ہیں ناں جن کے
خبثِ باطن کو بھانپتے ہوئے محبِ وطن بے نظیر شہید نے انہیں نیویارک تک محدود کر
دیا تھا۔۔۔۔باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔۔۔۔۔

بھکاری

قوم کو نوید ہو کہ امریکی ایوانِ نمائندگان میں پاکستانی امداد روکنے کا بل پیش کر دیا گیا ہے۔ گویا ہم تو ہرگز کشکول توڑنے کو تیار نہ تھے لیکن ہمارے بے لوث دوست نے خود ہی کشکول میں تھوکنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ کشکول تو خیر ہم در در پہ لئے پھرتے ہیں کہ بھکاری کبھی ایک در پر قناعت نہیں کرتا لیکن اب شاید ہمارا یہ راز طشت از بام ہو چکا ہے کہ ہم بھیک کے معاملے میں "عادی مجرم" ہیں اس لئے اپنے بیگانے سبھی منہ موڑ بیٹھے ہیں۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ پاکستانی عام بھکاری بہت سے سفید پوشوں سے کہیں زیادہ امیر اور خوش حال ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کہاں تک سچ ہے لیکن اتنا وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ہماری حکومتوں کا حال ایسا ہی ہے۔ جب یورپ اور امریکہ کو پتہ چلتا ہے کہ ہم پاکستانیوں کے تقریباً ایک ٹریلین ڈالر غیر ملکی بینکوں میں پڑے سڑ رہے ہیں تو اہلِ یورپ تو شاید محض جل بھن کر کباب ہی ہوتے ہوں گے لیکن امریکہ بہادر اپنا سارا غصّہ دھڑا دھڑ ڈرون حملوں کی صورت میں نکالتا ہے۔ امداد وہ روک نہیں سکتا کہ اس نے اپنے حواریوں کو چھ (6) ارب ڈالر دے کر پاکستانی قوم کو چھہتر (76) ارب ڈالر کا ٹیکا لگانا ہوتا ہے اور اسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ یہ ڈالر گھوم گھما کر پھر اسی کے بنکوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ آرزو ہے کہ

ربّ کردگار امریکہ کی "مت مار دے" اور وہ ہمیشہ کے لئے پاکستان کی امداد روک دے کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم بے شرمی، بے حیائی، بے غیرتی اور بے حمیّتی کے بحرِ بے کنار سے باہر آ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا ہو گا نہیں۔۔۔۔ ہر گز نہیں ہو گا کہ اس بد اعمال قوم کی دعائیں عرشِ بریں پر پہنچنے سے پہلے ہی واپس منہ پر مار دی جاتی ہیں۔ اس لئے اپنی آرزوؤں کی بے توقیری کو دیکھ کر یہی کہہ سکتی ہوں کہ "اے بسا آرزو کہ خاک شُدی"۔

لیجئیے میں بھی کیا سخت و سست باتیں کہہ گئی حالانکہ یہ میرا مزاج نہیں اور اگر مزاج ہو بھی تو قوم پہلے کون سی مسرتوں کے چمن زار میں شادمانیوں کی کلیاں چُن رہی ہے جو میں ان کو خشک "کالمی جھٹکا" دوں دراصل ہوا یوں کہ میرے میاں "ایویں خوامخواہ" کج بحثی پر اتر آئے اور حسبِ عادت دو چار سخت جملے بول کر باہر "ہوا ہو گئے"۔ مجھے پتہ ہے کہ اب وہ دو چار گھنٹے سے پہلے واپس آنے کے نہیں۔ اور اتنا صبر مجھ سے بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے میں نے اپنا سارا غصّہ "کالم" پر ایسے ہی نکال دیا جیسے افغانستان میں ذلت آمیز ہزیمت کے بعد امریکہ اپنا سارا غصّہ آئی۔ ایس۔ آئی پر نکالتا ہے۔ اسی لئے معذرت کے ساتھ اب میں اپنا کالم شروع کرتی ہوں۔

بات کچھ یوں ہے کہ آج یومِ سعید ہے کہ پاکستان کی تمام سیاسی پارٹیاں سر

جوڑ کر بیٹھنے والی ہیں لیکن تحقیق کہ ہر پارٹی کا اپنا اپنا "قبلہ" ہے اس لئے مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ

" کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا"

سے پہلے ہی یہ لطیفہ سنا کر قوم کو (APC) میاں نواز شریف صاحب نے تو اے۔پی۔سی نہال کر دیا ہے کہ "قوم متحد ہے" ۔قربان جاؤں اس اتحاد کے جس میں سیلابوں اور مچھروں پر سیاست کی جاتی ہے۔چلیئے مان لیا کہ قوم متحد ہے لیکن کیا راہبرانِ قوم بھی ؟۔۔۔کیا وہ بھی جن کے ایک ٹریلین ڈالر باہر پڑے ہیں جن کو امریکہ اپنے ایک اشارہء ابرو سے منجمد بلکہ ضبط کر اور کروا سکتا ہے۔۔۔۔کیا بزعمِ خویش قوم کے یہ محسن امریکی ڈانٹ سننے کے متحمل ہو سکتے ہیں ؟۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے، آپ بھی سن لیجئیے کہ ایک دفعہ "انجمنِ زن مریداں" نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنی بیویوں سے ہرگز خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ ابھی میٹنگ برخاست نہیں ہوئی تھی کہ بیویوں کو پتہ چل گیا۔بس پھر کیا تھا کسی نے ہاتھ میں ڈنڈا پکڑا، کسی نے جھاڑو اور کسی نے بیلنا اور چلیں حملہ آور ہونے ۔بیویوں کی آمد کی خبر پا کر سبھی خاوند سرپٹ بھاگ اٹھے لیکن ایک بیٹھا رہ گیا۔کچھ دیر بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تو ممبرانِ انجمنِ زن مریداں نے فیصلہ کیا کہ بیٹھے رہ جانے والے ممبر کی دلیری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے چیئر مین بنایا جائے گا۔ وہ اسے یہ خوش خبری سنانے کے

لئے واپس آئے تو پتہ چلا کہ موصوف تو کب کے مارے ڈر کے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اب قوم کو صرف یہ دیکھنا ہو گا کہ امریکہ کی ڈانٹ کھا کر کون ہے جو بیٹھا رہ جاتا ہے تاکہ اسے چیئرمین بنایا جاسکے۔ لیکن وہ چیئرمین محترم الطاف حسین تو ہرگز نہیں ہو سکتے کہ جنہوں نے APC کی غیر مشروط حمایت کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ ویسے بھی ڈاکٹر ذوالفقار مرزا عنقریب یہ کہنے والے ہیں کہ ایسی ہی غیر مشروط حمایت کی یقین دہانی وہ امریکہ کو بھی کروا چکے ہوں گے۔ وہ اسفندیار ولی بھی ہرگز نہیں ہو سکتے کہ APC کے فوراً بعد وہ نیویارک یاترا" پر نکل جائیں گے۔ زیادہ سر کھپانے کی کیا اس ضرورت ہے جو بھی چیئرمین بنے گا پتہ چل ہی جائے گا۔ البتہ یہ طے ہے کہ جو APC کے آنے والے "بڑھکیہ اعلامیے" پر یقین کرے گا اس سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہو گا۔ کہ ایسے بہت سے "اعلامیوں" کا حشر یہ قوم پہلے ہی دیکھ چکی ہے اور ہاں یہ بات لکھ کے رکھ لیجیئے کہ اس اعلامیے کے بعد امریکہ اپنے ڈرون حملوں میں پہلے سے کہیں زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرے گا کہ اس نے ہمیں ہماری "اوقات" بھی تو یاد دلانی ہے۔

مجبوریاں

دورِ حاضر میں غربت و افلاس فرد یا خاندان کا مسئلہ نہیں بلکہ قومی مسئلہ ہے۔۔۔ غربت سے مراد ایک فرد یا خاندان کا ایسی حالت میں زندگی بسر کرنا ہے جس میں اس کا معیارِ زندگی باقی تمام لوگوں کے معیارِ زندگی سے کم ہو اور وہ زندگی گزارنے کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہو۔ایک فرد، معاشرہ، قوم یا ملک اگر غربت جیسے سنگین مسئلے سے دوچار ہو جائے تو وہ دوسروں کا ہی دستِ نگر رہتا ہے۔اور وہ اپنی زندگی یوں جبرِ سلسل کی طرح کسی نہ کردہ جرم کی پاداش میں کاٹتا ہے۔یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی وجہ سے ایک غریب ملک ہمیشہ بڑی طاقتوں کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے کہ اب اُدھر سے کون سا حکم ملنے والا ہے جس کی بجا آوری کرنی ہے۔جس کے آگے ہاتھ میں کشکول لے کر بھیک مانگی جاتی ہے تو پھر اُس کے آگے سرِ تسلیم خم بھی کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ بھیک چھِن جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔۔۔۔۔ غربت تمام مسائل کی جڑ ہے جو بے روزگاری اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔جب پیٹ میں مارے بھوک کے چوہے دوڑ رہے ہوں۔۔۔ سر چھپانے کو چھت نہ ہو سردیوں کی یخ بستہ راتیں آسمان کی نیلی چھت تلے فُٹ پاتھ پر ٹھٹھر ٹھٹھر کر گزارنی پڑیں۔۔۔ جب پیرہن تار تار ہو کر جسم کو چھپانے میں ناکام رہے۔۔۔ اور باپ کے سامنے اُس کے

معصوم بچے بھوک سے بلک بلک کر جان دے رہے ہوں ۔۔۔ امیر کے کتّے بھی دودھ پئیں اور انسان کے بچے کو کچرے کے ڈھیر سے کھانے کو تلاش کرنا پڑے ۔۔۔۔ تو ۔۔۔ تو ایسے میں ایک مجبور باپ چور نہیں بنے گا ۔۔۔ ڈاکو نہیں بنے گا ۔۔۔ لُٹیرا نہیں بنے گا تو اور اُس سے کیا بننے کی توقع کر سکتے ہیں اُس وقت اُسے تو اپنے بچوں کی زندگی بچانے کے لئے قتل و غارت گری جیسے بھیانک جرائم بھی کرنے پڑیں تو دریغ نہیں کرے گا ۔۔۔۔ ایسے ہی روح فرسا حالات میں بدامنی اور قوانین سے انحراف جیسے جرائم جنم لیتے ہیں ۔ نظم و ضبط کا خاتمہ ہوتا ہے ۔۔۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ جن قوموں میں نظم و ضبط کا فقدان ہو جاتا ہے تو اُن کا نام و نشان صفحہء ہستی سے مٹ جایا کرتا ہے ۔ قومیں نظم و ضبط سے ہی مضبوط و طاقتور بنا کرتی ہیں ۔ جو قومیں غربت کا شکار ہوتی ہیں انہوں نے دوسروں کا سہارا تو کیا بننا ہے خود کو سہارا دینے کے قابل بھی نہیں رہتیں ۔ یہ دورِ حاضر کا ایسا مسئلہ ہے جو قومی حدود سے تجاوز کرکے عالمی شکل اختیار کر گیا ہے ۔ اس کی وجہ سے جرائم میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ گداگری ، جس کی اسلام نے پر زور مذمّت کی ہے ، دن بدن اس کی طرف بڑی سرعت سے رجحان بڑھ رہا ہے ۔ بلکہ گداگری تو ایک پیشے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے ۔۔۔

ایک وکیل بھیک مانگتا پکڑا گیا جب اس سے بھیک مانگنے کی وجہ پوچھی گئی تو

اس نے بتایا "میں وکالت جیسے با عزّت پیشے سے منسلک تھا مگر میں اتنا بھی نہیں کما سکتا تھا کہ گھر کا خرچ چلا سکوں ۔ایک دِن پریشان حال فُٹ پاتھ پر بیٹھ گیا کہ گھر کس منہ سے جاؤں ۔لوگ سمجھے کہ بھکاری ہے ۔انہوں نے خیرات دینا شروع کر دی ۔جب میں وہاں سے گھر جانے لگا تو میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ کھانے کا بندوبست کر سکوں ۔ شرم سے سر جھکا ہوا تھا مگر پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے جیب میں پیسے تھے ۔۔۔ دوسرے دن اسی شش و پنج میں تھا کہ کیا کروں ۔۔۔دِل منع کرتا تو دماغ کہتا، بس ایک دن اور ۔۔۔ پھر میں وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔۔۔ اور ۔۔۔ میں نے سوچا کہ بنا کچھ کئے مل جاتا ہے تو سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے ۔شروع میں کچھ دن ندامت محسوس ہوئی ۔۔۔آج میرے پاس سب کچھ ہے ۔گھر بھی اپنا ہے ۔
"

جب لوگوں کو محنت کا صلہ نہیں ملے گا ۔۔۔ملازمتیں نہیں ملیں گی ۔۔۔ بے روزگاری کا خاتمہ نہیں ہوگا ۔۔۔ تو غربت میں اضافہ تو ہوگا ۔۔۔ اور تب پڑھے لکھے لوگ بھی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائیں گے ۔۔۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک سے برائیاں ختم ہوں تو غربت کو ختم کرنا ہوگا۔اس کے لئے صنعتوں کو فروغ دینا چاہیے تاکہ بے روزگاری کا خاتمہ ہو۔ تعلیم کو فروغ دیا جائے ۔۔۔ گھریلو صنعت کاری کی جائے ۔۔۔ محنت و مشقت کی ترغیب دی جائے ۔۔۔ ایسے تربیتی مراکز زیادہ سے زیادہ قائم کئے جائیں جن میں فنی تعلیم دی جائے ۔۔۔

فضول خرچی کو روکا جائے ۔۔۔ زراعت کو فروغ دیا جائے ۔۔۔ غریب کسانوں کی مالی اعانت کی جائے ۔۔۔ ہمارا ملک زرعی ملک ہے ۔کاشتکاری جدید طریقے سے کی جائے ۔۔۔ایسی تمام رسومات کا خاتمہ کیا جائے جو اسلام کے بھی منافی ہیں اور ان پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے ، تاکہ یہی روپیہ مستحق لوگوں کے کام آئے ۔۔۔ معزوروں کے لئے فنڈز قائم کئے جائیں اور ان کو مستحق لوگوں تک پہنچانے کا بھی بندوبست کیا جائے ۔۔۔مزدور کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ دیا جائے ۔۔۔ آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ جلد سے جلد غربت کی لعنت کا خاتمہ ہو جائے ۔۔۔ آمین ۔

اگر چار بندے مر گئے تو کونسی قیامت آ گئی

ایبٹ آباد اور ہزارہ ڈویژن خون میں نہا گیا۔۔۔ لاٹھیوں گولیوں سے زخمیوں اور لاشوں کے ڈھیر لگ گئے ۔۔۔ ANP کے کرتا دھرتا الیاس بلور نے الیکٹرونک میڈیا پر آ کر کہا :

" اگر چار بندے مر گئے تو کونسی قیامت آ گئی "

واہ بلور صاحب ! خوب کہی آپ نے ۔۔۔ آپ کی نظر میں تو یہ مرنے والے سڑکوں پر رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑے تھے ناں جو چلتے ہوئے پاؤں کے نیچے آ کر کچلے گئے تو کسی کا کیا بگڑا بلکہ دھرتی کا بوجھ ہی ہلکا ہوا ۔۔۔ بلور صاحب ! آپ کے لئے تو قیامت تب ٹوٹتی جب ان کیڑے مکوڑوں کا تعلق آپ کے خاندان سے ہوتا ۔۔

ANP اپنے آپ کو صوبہ سرحد کی نمائیندہ جماعت نہ جانے کب سے سمجھنے لگی ۔ صرف اور صرف اابز حمایت حاصل کرنے پر نہ جانے اتنی بڑی خوش فہمی کا شکار کیوں ہو گئے ہیں ۔۔۔ اگر آپ بھول گئے ہوں تو میں آپ کو یاد کرواتی چلوں کہ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دورِ حکومت میں صرف چند سیٹیں لینے کے باوجود آپ کی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کو خیرات میں سرحد کی وزارتِ اعلیٰ عطا کر دی تھی ۔ یہ بات الگ ہے کہ بہت جلد بے آبرو ہو کر اس کوچے سے نکلنا پڑا ۔۔۔

اور اب آپ اپنی سیاست چمکانے کے لئے میری پاک دھرتی اور اس میں بسنے والوں کو آگ و خون کے حوالے کرکے یہ کہتے ہیں کہ " اگر چار بندے مر گئے تو کونسی قیامت آ گئی " اگر بے حسی کا یہی عالم رہا تو پاکستان میں کرغیزستان جیسا انقلاب آنے کو کوئی روک نہیں پائے گا۔۔۔ زرہ باہر نکل کر تو دیکھو ! ۔۔۔ عوام سڑکوں پر حکمرانوں کی نمازِ جنازہ ادا کر رہی ہے ۔۔۔ سرِ عام ٹیکس کی ادائیگی اور بِل جمع کروانے سے انکاری ہیں ۔۔۔ پاکستان کا کوئی گلی کوچہ ایسا نہیں ہے جہاں احتجاج نہ ہو رہا ہو ۔ یہ احتجاجی کسی بھی سیاسی پارٹی کے کارندے نہیں ہیں ۔ بلکہ اپنی ضرورتوں کے مارے ہوئے ہیں ۔ اور حکمرانوں کو یہ باور کروانے کے لئے سڑکوں پر نکلے ہیں کہ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے کہ جب تمہارے تخت دھڑام سے گرا دیئے جائیں گے ۔ تب تم خوابِ غفلت سے بیدار ہوگے ۔ ابھی بھی وقت ہے ۔۔۔ اپنی غلطیوں کو سدھار لو ۔۔۔ ورنہ پچھتانے کا بھی موقع ہاتھوں سے گنوا بیٹھوگے ۔ (پروفیسر رفعت مظہر)

جو چال بھی چلے یہ، نہایت بُری چلے

عظیم روسو نے کہا۔۔۔۔ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جہاں دیکھو وہ پا بہ زنجیر ہے" ۔۔۔۔ روسو کا یہی جملہ انقلابِ فرانس کی بنیاد بنا اور روسو اور ماہلی کے بہت بعد جاہل، اجڈ، گنوار اور بدبو دار جسموں والے کسانوں نے، جنھیں سیاست کی سرے سے کوئی شُد بُد نہ تھی، فرانس میں انقلاب برپا کر دیا اور وڈیروں، نوابوں اور جاگیر داروں کے سروں کی فصل تو کاٹی ہی گئی لیکن انقلابی ڈانٹون کے حکم پر اُن سرمایہ داروں کے سر پرست فرانسیسی شاہ لوئی کی کھوپڑی سے فرانس کی گلیوں میں فُٹ بال کھیلا گیا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ انقلابِ فرانس سے پہلے یہی وڈیرے اور جاگیر دار پورے فرانس میں جگہ جگہ جلسے کرتے ہوئے لڑیاں اُٹھا اُٹھا کر غریبوں کی ہمدردی میں ٹسوے بہاتے اور راتوں کو اپنے خلوت کدوں میں عیاشی کرتے ہوئے انہی بدبو دار کسانوں کی بیوقوفی پر قہقہے لگاتے۔ لیکن انتہائی احمق تو وہ خود تھے جو اپنے مستقبل سے مکمل طور پر بے خبر تھے۔

آج پورے پاکستان میں جگہ جگہ جلسے ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، ریلیاں ہو رہی ہیں اور غریبوں کی ہمدردی میں ٹسوے بہا کر "کرسی" کے حصول کی تگ و

دو جاری ہے۔تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجئے آج کے وڈیروں کے الفاظ بھی وہی ہیں جو فرانس کے وڈیروں کے تھے۔ وہی اداکاری، وہی ٹسوے اور وہی خلوت کدے۔ یہ خوش ہیں کہ یہاں "روسو" جیسے نظریات نہیں اس لئے انقلاب کا تصور محال است و جنوں۔ کتنے احمق ہیں یہ لیڈر جو اتنا بھی نہیں جانتے کہ روسو سے کہیں عظیم حضرتِ اقبال تو بہت پہلے یہ کہہ چکے ہیں کہ :-

اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

یاد رکھیئے کہ انقلاب ہمیشہ نظریات سے آتے ہیں، وہ نظریات خواہ روسو کے ہوں، کارل مارکس کے، خمینی کے یا اقبال کے۔روسو، مارکس اور خمینی کا انقلاب آچکا البتہ اقبال کا باقی ہے اور تحقیق کہ اس کا آنا طے ہے، آج آئے یا کل۔احمق ہیں ساڑھے تین سو اور ساڑھے تین ہزار کنالوں پر مشتمل گھروں میں بسنے والے وہ ارب پتی جو خوش ہیں کہ عوام "رج کے" بیوقوف بن رہے ہیں اور انھوں نے اپنی "واریاں" باندھ رکھی ہیں۔ عوام کبھی نہیں کہا کرتے کہ

" ہُن جان دیو، ساڈی واری آن دیو "

وہ تو آتے ہیں، چھا جاتے ہیں اور سروں کی فصل کاٹ کر "فُٹ بال" کھیلتے ہیں کیونکہ انہیں تو عادت ہوتی ہے فصل کاٹنے کی، وہ فصل خواہ کھیت کی ہو یا سروں کی۔

کل میرے چوبیس (24) بیٹے شہید ہو گئے۔ آج اُن کے جسدِ خاکی گھروں میں پہنچنے سے پہلے شاہ محمود قریشی گھوٹکی میں لڈیاں اُٹھا اُٹھا کر ملکی سلامتی کے لئے ٹسوے بہا رہے تھے۔ ساتھ بیٹھے عمران خاں مُسکرا رہے تھے کہ "لوٹوں" کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یہ وہی شاہ محمود ہیں جو آمر ضیاء الحق کی مجلسِ شوریٰ (جسے میں ہمیشہ شیطان کی مجلسِ شوریٰ کہتی ہوں) کے رکن، پھر نواز لیگ سے ہوتے ہوئے پی۔پی۔پی اور اب تحریکِ انصاف میں شامل ہو گئے۔۔۔۔۔ کل ایک لوٹا مجھے کہہ رہا تھا کہ کیا تمہیں اللہ نے اشرف المخلوقات اس لئے بنایا تھا کہ تم جھوٹ اور نا انصافی کا دامن تھام لو۔؟ آخر مجھ میں اور تمہارے سیاست دانوں میں کون سی قدر مشترک ہے جو تم لوگ اُنہیں مُجھ سے تشبیہہ دے کر میری توہین کرتے ہو۔ میں ایک باتھ روم میں پڑا پڑا جان ہار دیتا ہوں جب کہ یہ بندر کی طرح ڈال ڈال پھُدکتے پھرتے ہیں۔۔۔۔ میں گند صاف کرتا ہوں، یہ گند پھیلاتے ہیں۔۔۔ میں اپنے گھر (باتھ روم) سے عشق کرتا ہوں، یہ جگہ جگہ مُنہ مارتے پھرتے ہیں۔۔۔ میں بے لوث خدمت کرتا ہوں، یہ

ذاتی لالچ کے بغیر اپنے باپ کے بھی نہیں بنتے ۔۔۔ میری خدمت رحمت ، ان کی زحمت ۔ میرے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا اس لئے میں نے راہِ فرار اختیار کی لیکن یہ طے کر لیا کہ آئندہ سیاست دانوں کو "لوٹے" کہہ کر بے زبان لوٹوں کی ہر گز توہین نہیں کروں گی اور اگر کبھی موقع مِلا تو آئین میں 340 ویں ترمیم کروا کر سیاست دانوں کو لوٹا کہہ کر لوٹوں کی توہین کرنے والوں پر آئین کے آرٹیکل چھ (6) کے مطابق کارروائی کرنے کی سفارش کروں گی ۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو تشبیہہ کس سے دوں ۔ ؟ گھوڑا ، کتا وفادار ، گدھا خدمت گزار ، اُلو فلاسفر ، لُومڑ چالاک اور شیر جی دار ۔ لیکن ان میں ایسی کوئی بھی خوبی دور دور تک نظر نہیں آتی کہ یہ ملک و قوم کے وفادار ہیں نہیں ، خدمت کی انہیں عادت ، نہ سوچنے کی فرصت ، چالاکی کا یہ عالم کہ

کم ہوں گے اس بساط پر ان جیسے بد قمار

جو چال بھی چلے یہ ، نہایت بُری چلے

رہی جی داری کی بات تو یہ جوتے کھاتے رہتے ہیں اور "ہُن مار کے وکھ" کی تکرار کرتے رہتے ہیں ۔ ایٹم بم شبِ برات پر پھلجھڑیوں کی جگہ چلانے کے لئے رکھ چھوڑے ہیں ۔ غوری ، غزنوی اور حتف میزائل فاصلے ماپنے کے لئے F-16 ، رفتار جانچنے توپیں سلامی دینے اور جوان شہید کروانے کے لئے کہ انہیں مُنہ توڑ جواب دینے کا سرے سے آرڈر ہی نہیں ۔ ربِّ کعبہ کی قسم اگر شوقِ

شہادت سے سرشار میرے دیس کے ان کڑیل بیٹوں کو ایک اشارہ مل جائے تو یہ جرات و شجاعت کی لازوال داستانیں رقم کر دیں اور "نیٹو افواج" کو وہ سبق سکھائیں کہ اُن کی آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں۔ تسلیم کہ جنگ بدترین حل ہے لیکن اگر مرنا ہی ٹھہر گیا تو پھر طارق بن زیاد کی طرح "سفینہ" جلا کر ہی لڑا، مرا جا سکتا ہے کہ آئینِ جواں مردی یہی ہے۔

میرے وطن کے 24 تازہ شہیدوں! ہم تمہاری روحوں سے شرمندہ ہیں کہ ہم بے بس ہیں۔ ہم کچھ کر بھی تو نہیں سکتے سوائے بُزدل حکمرانوں کو اپنی "چوڑیاں" بھیجنے کے لیکن تحقیق کہ فرق پھر بھی نہیں پڑے گا کہ یہ اپنی بے حمیتی کی تمام حدیں پار کر چُکے ہیں۔

پاکستانیت کی مہک

جب آشاؤں اور امیدوں کے سارے دیپ بجھ جائیں ، محرومیوں کی گھور گھٹائیں نا مرادیوں کے آنگن میں خیمہ زن ہو جائیں ، خزائیں صحنِ چمن میں پورے استقلال سے یوں ڈیرے ڈال لیں ، کہ بُلبُل اپنے گُل کے لئے نغمہ خوانی سے گریزاں ہو جائے ، پپیہا "پی کہاں" کی رٹ چھوڑ دے اور کوئل کی " کو کو" بند ہو جائے اور جب آزادی کے گیت گانے والے رخصت ہو جائیں، سازوں کے تار ٹوٹ جائیں ، جھرنے خاموش ہو جائیں اور آبشاروں کے اب خشک ہو جائیں تو جان لیجئے کہ " اس دور کے سلطاں سے کوئی بھول ہوئی ہے"۔ میرے آقا کا تو حکمرانوں کے لئے یہ فرمان ہے کہ " تُم میں سے ہر کوئی چرواہا ہے جس سے روزِ قیامت حساب لیا جائے گا" لیکن یہ چرواہے کہاں سے آئے ہیں جو بے دھڑک اور بے دریغ اپنی ہی بھیڑوں کو ادھیڑ رہے ہیں؟ عجب قحط الرجال ہے ۔۔۔۔ عجب قحط الرجال کہ آنکھ کہیں ٹھہرتی ہی نہیں ، نگاہوں میں کوئی جچتا ہی نہیں ۔ لیکن کہیں تو رکنا ، کہیں تو ٹھہرنا ہو گا ، اپنی بقا کی خاطر ، اپنے وطن کی خاطر۔ سوال مگر دامن گیر ہے کہ کہاں؟ کیا PPP کے در پہ کہ جس نے ان ساڑھے تین سالوں میں ساڑھے تین صدیوں کی کرپشن کر ڈالی؟ جس کا فنِ حاکمیت ہر اُس خائن

اور بد دیانت کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے جسے اس فن میں مہارتِ تامہ ہو۔جو اپنے ہی وطن پر کی گئی جارحیت کو اپنی عظیم فتح قرار دیتے اور واشنگٹن پوسٹ میں احساسِ تفاخر سے لبریز مضمون لکھتے ہیں۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ تین سال تک قوم کو دھوکا دیتے رہے کہ پرویز مشرف نے بجلی پیدا کرنے کے ذرائع کی طرف توجہ نہیں دی۔اس لئے جتنی دیر تک کرایے کے بجلی گھر نہ منگوائے جائیں، مطلوبہ مقدار میں بجلی پیدا نہیں کی جا سکتی لیکن جب پوری قوم ڈنڈے لے کر سڑکوں پر نکل آئی تو محض چند گھنٹوں میں فالتو بجلی بھی پیدا ہونے لگی۔ واقفانِ حال چیخ رہے تھے کہ "رینٹل پاور" منصوبہ سوئس بنکوں میں اپنے اکاؤنٹس بڑھانے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔۔ان کا حرف حرف سچ ثابت ہوا۔حیرت ہوتی ہے کہ جناب گیلانی نے کمال ڈھٹائی سے یہ کیسے کہہ دیا کہ ہم بجلی کا بحران ختم کر کو تو PPP رہے ہیں۔اب نواز لیگ کے پاس سڑکوں پہ آنے کا کیا جواز باقی رہے گا۔ چھوڑیئے کہ اس کی کرپشن کی داستانیں لکھ لکھ کر لکھاری تھک اور سن سن کر کان پک گئے ہیں۔تو پھر کیا ق لیگ کی طرف رجوع کریں جس کا ماضی تو داغدار تھا ہی لیکن حال تو اس سے بھی سوا ہے؟ چوہدری برادران نے اپنے وارث کو بچانے کی خاطر اپنے آپ کو ان پستیوں میں گرا لیا ہے جس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ حسن نثار اور نذیر ناجی صاحب نے تو مداحی، مداہنت اور کاسہ لیسی کی حد کر دی۔ناجی صاحب تو خیر اپنی پرانی ڈگر پر ہی چل رہے ہیں کہ اسی فن کی بدولت وہ سموسے پکوڑے بیچتے بیچتے اس مقام تک آ پہنچے

لیکن اپنے آپ کو افلاطون سمجھنے والے حسن نثار کے لکھے اور کہے پر کیا اس مداحی کے
بعد بھی کوئی ذی ہوش اعتبار کر سکتا ہے۔؟ کیا وہ "حقیقت" سے آشنا نہیں؟ کیا چوہدری
برادران کا عشق، جنوں کی ساری حدیں پار کر گیا جو بد زبانی کو بے باکی سمجھنے والے
حسن نثار نے اپنے قلم کو اتنا آلودہ کر لیا؟۔ قوم تو چوہدری ظہور الٰہی مرحوم کی روح
سے سراپا سوال ہے کہ انہوں نے وراثت میں قوم کو کیا تحفہ بخشا اور حسن نثار سمجھتے ہیں
کہ مونس الٰہی نے نانا کی لاج رکھ لی۔ ناجی صاحب نے ظفر قریشی کی شہرت خراب
کرنے میں اپنی بھرپور توانائیاں صرف کی ہیں لیکن چاند پہ تھوکا اپنے ہی منہ پر پڑتا
ہے۔ یہ وہی ظفر قریشی ہیں جن پر چیف جسٹس آف پاکستان نے بھرپور اعتماد کا اظہار کیا
تھا اور قوم کو چیف جسٹس کے کہے پر اعتماد ہے، قلم فروشوں پر نہیں۔ وہ اگر وقتی طور پر
غلیظ سیاست کا شکار ہو بھی گئے تو کچھ فرق نہیں پڑتا کہ خلقِ خُدا نے اپنے دل کی کتاب
میں مونس الٰہی کے کارناموں کو محفوظ کر لیا ہے۔ حسن نثار کہتے ہیں کہ ہماری سیاست کو
یہ دلیر، پُراعتماد نوجوان سیاست دان مبارک۔ جی ہاں بالکل بجا کہا کیوں کہ ہماری
سیاست اب گیلانیوں اور زرداریوں کے سپرد ہے اور واقعی چوہدری اس میں بالکل فٹ
بیٹھتے ہیں۔ حسن نثار اور نذیر ناجی نے بار بار شہید نانا (چوہدری ظہور الٰہی) کا ذکر کیا
ہے۔ ذرا ظہور الٰہی پیلس جا کر یہ تو پوچھ لیجئے کہ "نانا" کو شہید کس نے کروایا تھا؟ اور
آج کل یہ دلیر، پُراعتماد مونس الٰہی کس کا ساتھی ہے؟۔ گگے

ہاتھوں نذیر ناجی اگر اپنے مربی و ممدوح جناب زرداری سے بھی پتہ کرلیں کہ "قاتل لیگ" کون ہے تو بہتوں کا بھلا ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ظفر قریشی کی ریٹائر منٹ کے بعد مونس الٰہی "پاکستانی ریمنڈ ڈیوس" بن چکا تھا جس کی رہائی طے تھی لیکن قوم کا حافظہ اتنا بھی کمزور نہیں کہ وہ ظفر قریشی کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک سے بے خبر ہو۔ ظفر قریشی نے سپیشل پراسیکیوٹر طلب کیا، جو نہ مل سکا۔ سپریم کورٹ کے وکیل چوہدری طاہر کو یہ ذمہ داری دینے کی استدعا کی لیکن بے کار۔اُس نے ڈی۔جی ایف آئی اے کو گیارہ خط لکھے لیکن کسی ایک کا جواب نہ آیا۔آفس کے دروازے اس پر بند کئے گئے اور آخر کار اُس نے یہ کہا کہ اگر سپیشل پراسیکیوٹر فراہم نہ کرنے کی بنا پر مونس الٰہی بری ہو گئے تو اس کی تمام تر ذمہ داری سیکرٹری داخلہ اور ڈی۔جی۔ایف۔آئی۔اے پر ہو گی۔ پھر وہی ہوا جو ہونا طے تھا کہ اس سے پہلے نیب نے گزشتہ دو سالوں میں NRO کیسز میں کسے سزا دلوائی ہے جو مونس الٰہی کو ملتی؟۔

ایم۔کیو۔ایم پر قوم تکیہ نہیں کر سکتی کہ وہ بیچاری تو خود "بے قائد" ہے۔ایم۔ایم۔اے کو سرحد حکومت دے کر دیکھ چکے اور اے۔این۔پی تو قیامِ پاکستان سے ہی آزمودہ ہے۔رہی عمران خاں کی بات تو ان کا حال بھی ماضی کی طرح کچھ قابلِ

ستائش نہیں کہ وہ سبھی سیاسی پارٹیوں کے راندہ و درماندہ لوگوں کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں حالانکہ ان کا دعویٰ کچھ اور تھا۔ان کے مدح خواں ہارون الرشید (جن کے قلم کی کاٹ سے کوئی بھی محفوظ نہیں) نے میاں اظہر کے تحریکِ انصاف میں شامل ہوتے ہی ان کی قصیدہ گوئی شروع کر دی۔ غالباً یہ وہی میاں اظہر ہیں جو پرویز مشرف کی تخلیق کردہ ق لیگ کے پہلے صدر تھے ۔کیا ہارون الرشید صاحب یہ بتلانے کی زحمت کریں گے کہ چوہدری برادران کیا دودھ کے دُھلے تھے جن کے ساتھ الحاق کرکے عمران خاں نے لاہور میں نواز لیگ کے خلاف انتخابی میدان سجایا ؟ اور جس اُمیدوار کو وہ سامنے لائے اس کے بارے میں کیا خیال ہے ؟ انہوں نے 23 اکتوبر کے کالم میں فرمایا ہے" فرید پراچہ نے ساری زندگی جماعت اسلامی کے ساتھ بتا دی لیکن کس چیز کے لئے ؟" عرض ہے کہ فرید پراچہ تو ساری زندگی جماعت میں گزار کر "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" کی عملی تصویر بن گئے لیکن ہارون صاحب تو اس عمر تک پہنچنے کے باوجود، محض اِدھر اُدھر لڑھکنیاں ہی کھا رہے ہیں یہی حال ان کے ممدوح عمران خاں کا ہے جنہوں نے پرویز مشرف کے جلسوں میں جھنڈے اٹھانے سے لے کر آج تک ہر سیاسی پارٹی کے در پر کم از کم ایک بار ضرور دستک دی ہے۔ آج جس نواز لیگ کے خلاف وہ زہر اُگل رہے ہیں کیا ان کے ساتھ لانگ مارچ کرتے ہوئے انہیں نہیں علم تھا کہ میاں برادران کے اثاثے بیرونی ممالک میں بھی ہیں ؟ ۔

حیرت ہوتی ہے کہ آخر ہارون الرشید یہ دعویٰ کس برتے پر کر رہے ہیں کہ عمران خاں 30/40 سیٹیں لے اُڑیں گے ۔کیا پنجاب کی 70% دیہی آبادی میں کوئی کپتان کو جانتا بھی ہے؟۔کیا سندھ کی دیہی اور شہری آبادی میں عمران خاں کا کوئی اثر و رسوخ ہے ؟۔کیا خیبر پختونخواہ میں تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی بھرپور نمائیندگی کے باوجود بھی عمران خاں تنہا پرواز کرکے کسی سیٹ کی توقع رکھتے ہیں ؟۔ بلوچستان میں تو شاید تحریکِ انصاف کا سرے سے وجود ہی نہیں البتہ پنجاب کے بڑے شہروں میں تحریک کا بڑا شور ہے لیکن اس شور میں بھی زیادہ تر حصہ الیکٹرانک میڈیا کا ہے۔یہ بجا کہ وہ نواز لیگ کے لئے پنجاب کے بڑے شہروں کی حد تک نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں لیکن کوئی سیٹ حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال مگر یہ ہے کہ اس کا فائدہ کس کو پہنچے گا؟۔یہ طے ہے کہ PPP کا جیالا مرتے دم تک جماعت نہیں چھوڑتا کہ اس کے پاس کوئی متبادل سرے سے موجود ہی نہیں ۔وہ زیادہ سے زیادہ اپنی ناراضگی کا اظہار یوں کرتا ہے کہ ووٹ ڈالنے نکلتا ہی نہیں جب کہ "دائیں جانب" کے ووٹروں کے پاس ہمیشہ متبادل موجود ہوتا ہے جس کا مشاہدہ ہم "پاکستان اسلامک فرنٹ" کی صورت میں کر چکے ہیں۔ موجودہ حالات میں نواز لیگ ، جماعت اسلامی اور تحریکِ انصاف ہی دائیں بازو کی جماعتیں ہیں جن کا انتخابی الحاق نہ ہونے کی صورت میں فائدہ صرف PPP کو ہی پہنچ سکتا ہے۔اب یہ سوچنا تحریکِ انصاف کا کام ہے کہ اس کا یہ سارا ہنگامہ کس کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے ہے

۔ تحریکِ انصاف کو یا پی۔پی۔پی کو؟۔ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن مجھے تو عمران خاں کے روپ میں پاکستانی سیاست کا دوسرا اصغر خاں نظر آ رہا ہے۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ "کل جگ" ہے، "ست جگ" نہیں۔ اس قحط الرجال میں قائدِ اعظم، اقبال اور لیاقت علی خاں کی تلاش محض حماقت ہے۔ اس لئے "موجودہ قیادت" میں سے ہی نسبتاً بہتر پہ ٹھہرنا ہو گا۔ میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ اپنی تمام تر شخصی اور سیاسی خامیوں کے باوجود میاں برادران میں اب بھی "پاکستانیت" کی مہک موجود ہے۔ بس یہی ایک مثبت پہلو ہے جو سب پر بھاری بھی ہے۔ گزشتہ دنوں پی۔پی۔پی کے شرجیل میمن صاحب ایک معروف چینل کے ٹاک شو میں بدنامِ زمانہ اور کی حمایت میں اپنی بھرپور توانایاں صرف کرتے ہوئے میاں NRO شرمناک برادران کے ملک سے بھاگ جانے کا ذکر کر رہے تھے۔ بصد ادب گزارش ہے کہ یہ الزام تو اور بھی بہت سے لوگوں کے سر آتا ہے۔ میاں برادران نے تو انتہائی نامساعد حالات میں سعودی شاہ کے اصرار اور بڑے میاں صاحب کے حکم پر ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ میاں شہباز شریف تو آخری لمحے تک ملک چھوڑنے کو تیار نہیں تھے اور میاں نواز شریف نے بھی وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہونے سے صاف انکار کر دیا پھر میاں نواز شریف کے اس جملے کی کاٹ کو بھی مدِّ نظر رکھنا ہو گا جو انہوں نے بظاہر ہنستے، بباطن روتے ہوئے کہا تھا کہ "لوگ کہتے تھے قدم بڑھاؤ نواز

شریف ، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ لیکن جب میں نے قدم بڑھایا تو پیچھے کوئی نہ تھا"۔
لیکن بے نظیر شہید تو نواز شریف کے دور میں خود ملک سے باہر گئیں اور پھر این۔آر۔او کی چھتری کے بغیر واپس نہ آئیں۔ان کی خود ساختہ جلا وطنی کا زمانہ تو شریف برادران سے کہیں زیادہ ہے۔پرویز مشرف نے پوری قطعیت سے یہ کہا تھا کہ وہ آصف زرداری کو کسی صورت میں رہا نہیں کریں گے مگر پھر ڈیل بھی ہوئی ، زرداری رہا بھی ہوئے اور ملک سے باہر بھیج بھی دیئے گئے ۔ایم۔کیو۔ایم کس منہ سے میاں برادران کو بھگوڑا کہہ سکتی ہے جبکہ ان کے قائد 1992ء میں رات کے اندھیرے میں فرار ہوئے اور ابھی تک اتنے خوف زدہ ہیں کہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔اے۔این۔پی کے بھگوڑوں کی افغانستان بھاگنے کی طویل تاریخ ہے۔ کسی نے خود ملک چھوڑا اور کسی سے چھڑوایا گیا تو پھر طعن و تشنیع کے لئے صرف میاں برادران ہی کیوں؟

کاش ایسا ہوتا۔۔۔

سوچوں پر تو کسی کی پابندی نہیں ہوتی ۔ وہ تو آزاد پنچھی کی طرح بنا پنکھ کہیں بھی پہنچ جاتی ہیں ۔اُن پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا جا سکتا ۔اسی لئے میں سوچ رہی تھی کہ ہمارے وطنِ عزیز کے وزراء کرام جو پاکستانی خزانے پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، کاش کہ میں اُن کی تعداد ہی نصف کر سکتی تاکہ ان کی بچی ہوئی تنخواہ اور دیگر اخراجات سے ان مجبور و بے کس عوام کی روزی روٹی کا ہی بندوبست ہو جاتا جو بھوکوں مر رہے ہیں ۔ان والدین کی کچھ تو مدد کر سکتی جو اپنی اولاد کو بھوکا مرتے دیکھ کر خودکُشی پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔یہ سینکڑوں کی تعداد میں اراکینِ اسمبلی کیا تیر مار رہے ہیں سوائے اس کے کہ ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں ۔۔۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہے ۔کیا ہمارے سربراہانِ مملکت چھوٹے گھروں میں نہیں رہ سکتے ؟جب کہ بیشمار پاکستانیوں کو فُٹ پاتھ پر چیتھڑے پہن کر ٹھٹھرتی ہوئی یخ بستہ راتیں گزارنا پڑتی ہیں ۔کڑکتی دھوپ میں کسی سڑک کا کنارہ اُن کا گوشہء عافیت ہوتا ہے ۔دودھ پیتے بچے بھوک سے بلک بلک کر جان دے دیتے ہیں ۔دوائی نہ ملنے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں ۔ دوسری طرف ایک چھینک آنے پر ہمارے کرتا دھرتا قومی لیڈر علاج کروانے کے لئے بیرونِ ملک پہنچ جاتے ہیں شائد وہ پاکستانی ڈاکٹرز کو ڈاکٹر ہی نہیں

سمجھتے۔کاش کہ ہمارے سربراہانِ مملکت نے اپنے عیش و عشرت کے علاوہ اپنی اس مجبور و بے بس عوام کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہوتا جن کی نگاہیں ہر لمحہ ان کی مدد کی متلاشی ہیں۔۔۔کاش ایسا ہوتا۔۔۔۔کاش۔۔۔

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ سوئس بینکوں میں پاکستان کا 500 (پانچ سو) ارب اور بھارت کا محض 15 (پندرہ)ارب ڈالر پڑا ہے۔ میرا رواں رواں خوشی سے کانپ رہا ہے کہ ہمارے ازلی وابدی دشمن بھارت کے سارے چور لُٹیرے، ڈان اور بھتہ خور مل کر بھی ہماری گردِپا کو نہیں پہنچ سکے۔اور وہ جو بچپن سے ہندو بنیئے کا "چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے" کا شور سُن سُن کر ہمارے کان پک گئے تھے، وہ بھی ٹائیں ٹائیں فش ہوگیا کہ ہمارے مدبّروں نے کھربوں "ٹکرے" لگا لئے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی۔بچت کے ایسے لازوال کارنامے سرانجام دینے والے محبّانِ ملک وملّت کو میرا سلام۔۔۔۔ قومی بچت کا یہ 500 ارب ڈالر جس کا ذکر کیا ہے یہ تو صرف سوئس بینکوں میں پڑا ہے۔ اگر امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس، اور دبئی میں پڑی "بچت" بھی شمار کرلی جائے تو بات اربوں سے نکل کر کھربوں ڈالر تک پہنچ جائے گی جسے سُن کر شاید چوہدریوں کا چوہدری اوباما بھی شرم سے ڈوب مرے کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی معشیت کو نہتے بوریا نشیں افغانیوں نے محض دس سالوں میں "کھائے ہوئے بھُس" کی مانند کر ڈالا اور اب 145 ٹریلین ڈالر کی مقروض امریکی قوم بڑی بوڑھی عورتوں کی طرح افغانیوں کو محض "کوسنے" دینے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ان گورے کالے امریکی بزرجمہروں

کو پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا کہ ان جھونپڑیوں میں بسنے والے افغانیوں کے پاس کھونے کے لئے ہے ہی کیا سوائے منہ میں رکھنے والے "بیڑے" کے۔ اگر انہیں بر وقت عقل آ جاتی تو آج دُنیا اوباما اینڈ کمپنی کو یہ نہ کہتی پھرتی کہ

اب اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں

اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں

جب کہ دوسری جانب یہی امریکی جنگ ہم بھی دس سالوں سے ہی لڑ رہے ہیں لیکن احمقانہ نہیں بلکہ بہ اندازِ حکیمانہ کہ ہم نے اس جنگ میں 80 بلین بھی جھونک دیئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ پتہ نہیں یہ جنگ اور کتنے عشروں تک چلے گی، ہم نے اپنا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں دینے کی خاطر اپنے کھربوں ڈالر بیرونی دنیا میں بھی پھیلا دیئے کہ جب اور جہاں جی چاہے گا جا بسیں گے کیونکہ ۔۔۔۔ "ہر مُلک، ملکِ ما است کہ ملکِ خُدائے ما است" ۔۔۔۔ اب ماشاءاللہ ہماری آمدہ نسلوں کے راہبروں کا مستقبل محفوظ ہے۔ جب چاہیں گے وطن کی خدمت کرنے پہنچ جائیں گے اور قوم دیدہ و دل فرشِ راہ کئے محبت کے پھولوں اور عقیدت کی کلیوں سے ان کا سواگت کرے گی۔ اُمید واثق یہی ہے کہ اگر ہمارے باتدبیر راہبرانِ قوم نے اسی رفتار سے "بچت مہم" جاری رکھی تو دس پندرہ سالوں بعد ہم پوری صدی کا "ٹیکس فری" بجٹ پیش کرنے کے قابل ہو جائیں

گے اور یہ بے وقوف امریکی ، جو ہمارے کشکول میں ایک سکہ تک ڈالنے کو تیار نہیں ، ہمارے ہاں نوکریوں کی بھیک مانگتے پھریں گے ۔ لیکن یہ طے ہے کہ "قومی ترقی" کے اس سنہرے دور کے حصول کے لئے اس کی راہ کی دو رکاوٹیں بہر حال دور کرنا ہوں گی ۔ایک تو بے باک میڈیا جو نت نئی کہانیاں سُنا سُنا کر اس ترقی کی راہ میں رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے کر رہا ہے اور دوسری اعلیٰ عدلیہ جو از خود نوٹس پہ نوٹس لئے چلی جا رہی ہے ۔ان رکاوٹوں پر قابو پانے کے لئے بزرگ مدبر پرویز مشرف کی مفت خدمات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں جن کا قول ہے کہ ۔۔۔۔

"کریں گے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا (HIT) ہم انہیں وہاں سے ہٹ"

ان سب کو میرا اسلام کہ ان میں سے کسی نے بھی ملک کو اجاڑنے میں کسر نہیں چھوڑ ی جو سب نہلے پہ دہلا ہی نہیں بلکہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں ۔۔۔

حق ادا نہ ہوا

تنکا تنکا اکٹھا کر کے گھونسلہ بنانا کتنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ جب حوادثِ زمانہ کی بے رحم آندھی اس گھونسلے کو اُڑا کر تنکا تنکا بکھیر دیتی ہے تو ٹوٹے ہوئے گھونسلے کے تنکے پھر سے جوڑنا اس یقین پر کہ یہ گھونسلہ پھر سے ٹوٹے گا۔۔۔ کس قدر صبر آزما بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ جس ربِّ کردگار نے اپنے پیارے بندوں کو دہکتی آگ میں گرتے دیکھا ہے۔۔۔ دریاؤں میں کودتے دیکھا ہے۔۔۔ اپنے جسم پر لکڑی کی میخیں گڑواتے دیکھ ہے۔۔۔ تپتے صحراؤں میں برہنہ جسم گھسٹتے دیکھا ہے۔۔۔ نہتے ۳۱۳ کو 1000 سے بے خوف لڑتے دیکھا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ 3000 کو 100000 (ایک لاکھ) سے نہ صرف لڑتے بلکہ بازی جیت کر پلٹتے دیکھا ہے۔۔۔ کیا وہ صرف چند تسبیحوں کے دانوں یا چند تعریفی کلمات سے خوش ہو جاتا ہے؟۔۔۔ ہاں! مگر ناراض بھی نہیں ہوتا۔ انسان جنت کی آرزو کرتا ہے اور اسے اپنے سے بہت دور خیال کرتا ہے۔۔۔ ان تسبیح کے دانوں سے کیا ہوگا؟۔۔۔ کیا اس کی بندگی کر سکو گے؟۔۔۔ تم نے کہا" میں نے اس کی بندگی کی۔۔۔ اس کے لئے اپنی جان وار دی"۔۔۔ غالب نے بھی کہا:

جان دی، دی ہوئی اس کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ان تسبیح کے دانوں سے کیا ہو گا ؟ ۔۔۔ زار و قطار روتے ہو ، رونے سے کیا ہو گا ؟ ۔۔۔ بیشک وہ رحیم و کریم ہے ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ دھاگے میں گرہ تو لگ جائے گی ۔ اس کو سمجھ سکتے ہو ؟ ۔۔۔ کبھی گلے لگایا ؟ کبھی اس کو سجدہ کیا ہے ؟ ۔۔۔ مگر ۔۔۔ یہ سب کچھ کرنے کا حکم تو اس نے دیا ہے تو اب کفِ افسوس کیوں ملتے ہو ؟ ۔۔۔ سنو ! وہ عظیم ہے جسے چاہے عرش پر جوتے سمیت بلا لے اور جسے چاہے فرش پر جوتے اتارنے کا حکم دے ۔۔۔ جسے چاہے طور پر جلوہ دکھائے ، اور جسے چاہے عرش پر بلا کر دوری کو بھی دور کر دے ۔۔۔ اسے دُور کہتے ہو ؟ جو تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے ۔۔۔ ان تسبیح کے دانوں سے کیا ہو گا ؟ ۔۔۔ ہاں ! اگر ہو گا تو اس سے جس کے بارے میں اس نے موسٰی سے کہا" موسٰی ! ذرہ سنبھل کر ، اب تیرے لئے دعا کرنے والے اب خاموش ہو چکے ہیں ۔۔۔ ہاں ان تسبیح کے دانوں سے کیا ہو گا ، جب تک کہ دل نہیں پکارے گا اور وہ خود نہیں کہے گا ۔۔۔

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کوّا چلا ہنس کی چال

کاش ہمارے حکمران غیرت مند ہوتے۔ عالم مگر یہ ہے کہ امریکہ کہتا ہے "ناچ میری بلبل کہ پیسا ملے گا" اور یہ دھمال ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ آج کل میڈیا اور لکھاریوں کے مرغوب ترین موضوع کا ذکر نہیں۔ ہرگز نہیں کہ مجھے "چسکے" لینے کی عادت نہیں۔ ہم تو ایک عشرے سے متواتر کئی انتہائی شرمناک "سانحات" کو گھول کر پی لینے کے عادی ہو چکے ہیں پھر منصور اعجاز کے مبینہ خط کی کیا حیثیت کہ اس سے کہیں بڑا اور شرمناک سانحہ ہم پہ گزر بھی چکا اور ہم نے بے حمیتوں کی طرح "اب کے مار" کے فارمولے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے "آئندہ برداشت نہیں کیا جائے گا" پر اکتفا کر لیا۔ اگر ہمارے چوبیس جوانوں کی شہادت کا جواب نیٹو کے 240 فوجیوں کی ہلاکت کی صورت میں دے کر نیٹو سے دست بستہ معافی مانگ لی جاتی تو شاید یہ کہا جا سکتا کہ "ہم زندہ قوم ہیں"۔ کون نہیں جانتا کہ امریکہ سے جس نے بغاوت کی ٹھانی اسے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اور میاں نواز شریف محض اس لئے میرے ہیرو ہیں کہ ایک ایٹم بم کی بنیاد رکھ کر پھانسی پر جھول گیا اور دوسرا ایٹمی دھماکے کر کے "بے وطن" ہو گیا۔ میں عرض کر رہی تھی کہ منصور اعجاز نے تو صرف ایک راز افشا کیا ہے یہاں تو پتہ نہیں کتنے شرمناک راز بے حمیتی کی چادر تان کر خوابِ گراں کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ شاید

اس لئے محترم وزیرِ اعظم نے کہا ہے "کر لو جو کرنا"۔البتہ عمران خان کچھ عرصہ پہلے تک امریکہ پر گرج برس رہے تھے لیکن آج کل وہ بھی خاموش ہیں۔غالباً امریکہ کی جانب سے بذریعہ کیمرون منشر قبولیت کی سند عطا ہونے کے بعد مخالفت کا کوئی جواز باقی نہیں بچتا ہو گا۔ویسے عمران خاں جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے اختلاف کی مطلق گنجائش نہیں لیکن پھر بھی میں انہیں عمران خاں کی بجائے "مہمان خاں" کہتی ہوں جس کی کئی وجوہات ہیں۔پہلی یہ کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ تو ہر سیاسی پارٹی حتیٰ کہ ہر کرپٹ لیڈر بھی کہتا ہے۔غضب کرپشن کی عجب کہانیاں تو عمران خاں سے کہیں بڑھ کر محترم عرفان صدیقی اور کامران خاں بیان کرتے ہیں پھر ان میں سے کسی کو وزیرِ اعظم کیوں نہ بنا لیا جائے ؟۔دہشت گردی پر خطبے اور امریکہ پر تبرہ بھیجنے میں دینی جماعتوں کا کوئی ثانی نہیں۔لوٹی گئی ملکی دولت کو واپس لانے کے لئے چیف صاحب "لٹھ" لے کر خائنوں کے پیچھے پڑے ہیں۔این۔ار۔او نظرِ ثانی کیس مسترد کیا ہو چکا اور بابر اعوان جھاڑ کھا کر گھر بیٹھ رہے ، خارجہ پالیسی کی خاں صاحب کو سرے سے کوئی شُد بُد نہیں اور مہنگائی کا رونا ان سے زیادہ کوئی اور نہیں رو سکتا جو اس کے ہاتھوں پس رہے ہیں۔وہ اپنے اسلام آباد کے ساڑھے تین سو کنال کے گھر میں بیٹھ کر مہنگائی کے بارے میں کیا جانیں۔انہوں نے اپنے مینارِ پاکستان کے جلسے میں اپنی تقریر سے قریباً ڈیڑھ گھنٹہ قبل کہا کہ وہ آج ایک ایسی بات کہنے جا رہے ہیں جس سے انقلاب آ جائے گا لیکن "دیکھئے ہم بھی

گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا" ۔۔۔۔ ہم نے ڈیڑھ گھنٹہ کنسرٹ دیکھا پھر عمران خاں کی طویل تقریر لیکن نہ کوئی انقلابی بات، نہ انقلاب۔وہی گھسی پٹی باتیں جنہیں سن سن کر کان پک چکے ہیں۔کیا وہ پٹواریوں اور تھانے داروں کی بات کرکے انقلاب لانا چاہتے ہیں ؟۔ پٹواریوں کا رونا تو انتہائی جابر مگر اعلیٰ منتظم گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان مرحوم بھی روتے رہے ہیں ۔خان صاحب نے کوئی نئی بات تو نہیں کہی ۔ پھر "لینڈ ریکارڈ" کمپیوٹرائز کرنے پر عرصہ دراز سے کام ہو رہا ہے جو تقریباََ پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ عرض ہے کہ ملک کی ستّر فیصد آبادی آج بھی بے گھر اور بے زمین ہے جس کا پٹواریوں سے کچھ لینا دینا نہیں اور اسی ستّر فیصد کی غالب اکثریت ووٹ ڈالنے باہر نکلتی ہے باقی تیس فیصد تو ووٹ کا جنجال سرے سے پالتی ہی نہیں۔رہی "تھانیداری الیکشن" کی بات تو کیا کوئی ذی ہوش یہ تصور بھی کر سکتا ہے کہ کسی چوہدری، وڈیرے یا سرمایہ دار کے علاوہ بھی کوئی تھانیداری الیکشن جیت سکتا ہے ؟تو کیا وہ ان لوگوں کے ہاتھ مزید مضبوط کرنا چاہتے ہیں ؟۔ کہیں یورپ،امریکہ کی پیروی کرتے کرتے ایسا نہ ہو کہ "کوّا چلا ہنس کی چال اور اپنی چال بھی بھول گیا"۔

دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ عمران خاں کے قول و فعل میں واضح تضاد ہے ۔وہ بات کرتے ہیں نئی اور دیانت دار قیادت کی لیکن اپنے گرد اکٹھے کر لئے ہیں سارے

راندہ درگاہ، لوٹے اور لُٹیرے اور مشر فیے۔آقا ﷺ کا فرمان ہے، "آدمی اپنے دوست سے پہچانا جاتا ہے۔ تم میں سے ہر کوئی دیکھ لے کہ کون کس سے دوستی رکھتا ہے" ۔ شیخ سعدی کہتے ہیں

با بداں کم نشیں کہ صحبتِ بد
گرچہ تُو پاکی تُرا پلید کنند

کیا خان صاحب اپنی پارٹی میں دھڑا دھڑ شامل ہونے والوں میں سے کسی ایک کی پاک دامنی کی قسم اٹھا سکتے ہیں۔؟ کیا خان صاحب ان کی معیت میں انقلاب لائیں گے ؟اگر اجازت ہو تو میں ان سب کا کچا چٹھا کھول کے رکھ دوں ؟اگر محض ایک دو جلسوں یا ریلیوں سے انقلاب بپا ہو سکتا تو کب کا ہو چکا ہوتا کہ پاکستان کی تاریخ اس سے کہیں بڑے جلسے جلوسوں سے بھری پڑی ہے۔با خبر حلقوں کے مطابق ان کے جلسے کو مقتدر قوتوں ، پی۔پی۔پی اور قاف لیگ کے زر خرید لکھاریوں نے غیر معمولی کوریج دے کر ان کو "بانس" پر چڑھا دیا ہے اور تحریکِ انصاف کی بالکل وہی اٹھان ہے جو ماضی میں اصغر خان کی تحریکِ استقلال کی تھی ۔اصغر خان بھی وزارتِ عظمیٰ کا حلف اٹھانے کے لئے "شیروانیاں" سلوا چکے تھے لیکن تاریخ کے اوراق میں گُم ہو گئے۔اور اب عمران خاں ؟

نہیں معلوم کہ "کس" کے اشارے پر الیکٹرانک میڈیا خان صاحب کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرتا چلا جا رہا ہے۔ تحقیق کہ میڈیا کا کردار انتہائی جانبدارانہ ہے اور یہ میڈیا کا حُسنِ کرشمہ ساز" ہی ہے جس سے عمران خاں ہواؤں میں اُڑنے لگے۔ اندازہ کیجئے کہ" اکابرینِ تحریکِ انصاف بار بار کہہ رہے تھے کہ پچاس ہزار کرسیاں لگائی گئی ہیں جبکہ ایک معروف نیوز چینل کا نمائندہ چیخ رہا تھا کہ میرے سامنے ستر ہزار کرسیاں لگی ہیں ۔پرویز رشید نے کہا کہ اتنی جگہ پر اگر کوئی پچاس ہزار کرسیاں لگا کر دکھا دے تو میں مستعفی ہو جاؤں گا لیکن میڈیا کے تقریباً تمام چینلز نے پچاس ہزار کرسیوں کو پچاس ہزار افراد میں بدل کر ان سے استعفیٰ طلب کر لیا جس کی آج تک تکرار جاری ہے۔۔۔ کہا گیا کہ عمران خاں کا جلسہ ایسے لوگوں کا اجتماع تھا جو کبھی گھروں سے باہر نہیں نکلے۔ مجھے تو کسی کے ماتھے پہ لکھا نظر نہیں آیا کہ "میں عشقِ عمران میں زندگی میں پہلی بار اپنے حجرے سے باہر آیا ہوں۔" پھر میڈیا کو کیسے پتہ چل گیا؟ کیا انہیں "کشف" ہوا تھا یا ہارون الرشید کے "کالمی درویشوں" نے بتلایا تھا؟۔۔۔ کہتے ہیں کہ جلسہ جذباتی نوجوانوں سے پُر تھا۔ معاف کیجئے گا جہاں کنسرٹ ہو وہاں ہلّہ گلہ تو ہوتا ہی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہلّہ گلہ اور جذباتیت تو انڈین "فلمی ایوارڈوں" میں ہوتی ہے۔ تحقیق کہ اگر گانے والوں کے ساتھ گانے والیاں بھی ہوتیں تو ہلہ گلہ کئی گنا بڑھ جاتا۔۔۔ سنا ہے کہ نوجوانوں کی اکثریت عمران خاں کے ساتھ ہے۔ اگر خُدا میڈیا کو سچ لکھنے، کہنے

اور دکھانے کی توفیق دیتا تو محض چند روز پہلے کے "اسلامی جمعیت طلبہ" کے لاکھوں سنجیدہ نوجوانوں کا سہ روزہ اجتماع بھی دکھاتا۔ان لاکھوں سرشار نوجوانوں کے مقابلے میں عمران خاں کے جلسے میں شریک نوجوانوں کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی۔۔۔آئی۔ایس۔آئی نے تعداد ستّر ہزار بتائی۔چلئیے شک کا فائدہ دیتے ہوئے اسے لاکھ سوا لاکھ کر لیتے ہیں لیکن پانچ لاکھ؟۔۔۔۔دوسری طرف لاہور سے کہیں چھوٹے شہر فیصل آباد کے دھوبی گھاٹ میں نواز لیگ کے جلسے کی تعداد خود تحریکِ انصاف لگ بھگ ایک لاکھ تسلیم کر رہی ہے۔نواز لیگ کے جلسے کے دوران تحریکِ انصاف کے میڈیا سیل کے نمبر 80022 سے ان کے کارکنان کو ایک میسج ملا جو یہ تھا۔

Composition of PML-N jalsa :- PaTwariies (3 buses each) 400x150=60,000 , secretaries of 298 union councils 289 X 30=8670 , Police men in plain clothes 5,000 , All the staff of divisional , District & Tehsil administration .

یہ تعداد کسی بھی صورت میں ایک لاکھ سے کم نہیں بنتی۔پھر تحریکِ انصاف نے ایسا کون سا تیر مار لیا جو لوگ تیس سے پھُدک کر ستّر سیٹوں تک جا پہنچے۔مزید یہ کہ اگر تحریکِ انصاف کے میسج کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نواز لیگ کے مطابق تحریکِ انصاف کا جلسہ اسٹیبلشمنٹ ،

پی۔پی۔پی اور قاف لیگ کی کوششوں کا ثمر تھا۔ایک لکھاری یہ قلمی بد دیانتی کیسے کر سکتا ہے کہ ایک کو سچّا اور دوسرے کو جھوٹا قرار دے دے کہ دودھ کے دھلے تو دونوں ہی نہیں ۔عمر چیمہ ، ثنا بُچہ کے انتہائی معقول اور چُبھتے ہوئے سوال کا جواب نہ دے سکے تو ہاایک لکھاری نے اپنے کالم میں انہیں ڈانٹ پلا دی اور عمران خاں کو کہا کہ اسے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے کہ کوئی "خاتون" میزبان بد تمیزی کا ارتکاب بھی کر سکتی ہے ۔کیا عمران خاں فرشتہ ہیں یا اوتار ؟۔

حرفِ آخر یہ کہ عمران خاں جو بار بار نواز لیگ سے اپنی "واری" مانگ رہے ہیں تو کیا وہ پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ چاہتے ہیں ؟۔انہیں تو یہ کہنا چاہیے کہ "زرداری جی جان دیو ساڈی واری آن دیو" ۔ویسے تحقیق کہ عوام اب اتنے باشعور ہو چکے ہیں کہ کم از کم ، واریاں مانگنے" والوں کو تو ہرگز "واری" نہیں دیں گے۔امیدِ واثق ہے کہ سارے" سیاسی "تیتر بٹیر" لڑتے لڑتے اپنی چونچیں اور دُمیں گم کر بیٹھیں گے اور "واری" وہ لے جائیں گے جو ہمیشہ اس کے انتظار میں رہتے ہیں۔

سیاسی لوڈشیڈنگ

بھلا ہو اس لوڈ شیڈنگ کا جس نے ہمیں بھی لکھاری بنا دیا۔ شدید ترین گرمی میں جب باغیانہ خیالات دماغی بھٹی میں تپنے لگتے ہیں تو ہم بے اختیار کاغذ قلم سنبھال لیتے ہیں۔ آج کل چونکہ انقلاب اور بغاوت جیسے الفاظ زبان زدِ عام ہیں، اس لئے ہمارے کالم بھی خواہ مخواہ ایسے ہی مقبول ہو جاتے ہیں جیسے محترم جاوید ہاشمی کی "ہاں میں باغی ہوں" محض اپنے نام کی بنا پر مقبول ہو گئی۔ حالانکہ ہم ان سے کہیں بہتر آپ بیتی لکھ سکتے تھے لیکن ہمیں کوئی جیل ہی میسر نہیں آئی یوں تو میاں شہباز شریف بھی بُلٹ پروف کی اوٹ سے ہاتھ لہرا لہرا کر انقلاب انقلاب پُکارتے رہتے ہیں لیکن اُن کے سیاسی وارث نے تو ہم پنجابیوں پر "مرغی حرام" کر رکھی ہے۔
کچھ لوگوں کو یقین ہے کہ یہ لوڈ شیڈنگ بھی امریکی سازش ہے۔ پتہ نہیں عمران خان کو کب علم ہو گا اور وہ کب دھرنا دیں گے۔ نذیر ناجی کا یہ "ڈرون سیاست دان" بھی عجیب ہے جسے پاکستان کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ دنیا فیملی پلاننگ پر کھربوں ڈالر خرچ کر رہی ہے جبکہ ہمارے دوست کی مہربانی سے نہ صرف ہماری آبادی مفت میں کم ہو رہی ہے بلکہ غریب حکمرانوں کو جھولیاں بھر بھر

کر ڈالر بھی مل رہے ہیں گویا "آم کے عام، گٹھلیوں کے دام" پھر بھی وسیع ظرف امریکہ نے کبھی احسان نہیں جتایا۔ وہ بیچارہ تو یہ بھی نہیں جتلاتا کہ اس کی ایک ڈرون پرواز پر کتنے ملین ڈالر صرف ہوتے ہیں اور ایک ایک خودکُش بمبار کی تیاری پر اسے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں؟۔ پھر بھی یہ گلہ کہ امریکہ ہمارا دوست نہیں؟۔

کتنے احسان ناسپاس ہیں ہم جو ایک چھوٹی سی امریکی "واردات" پر "ان کیمرہ بریفنگ" اور تحقیقاتی کمیشن پر اتر آئے۔ شاید اسی بنا پر ہمارے سیکرٹری خارجہ سلیمان بشیر کو تنگ آ کر یہ کہنا پڑا کہ "قوم پریشان نہ ہو ہمارے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔ اُن کی بات ہے تو پتے کی۔ ہم نے اپنے چالیس ہزار بندے مروائے، پانچ ہزار جوان شہید کروائے، ستر ارب ڈالر دہشت گردی کی نظر کیے، سو ارب ڈالر معشیت میں نقصان اُٹھایا، ریمنڈ رہا کیا، ایبٹ آباد کا سانحہ ہوا اور پی۔این۔ایس مہران میں گنتی کے چند دہشت گردوں نے ہمارا بھرم توڑا، لیکن مجال ہے جو ہمارے معمولاتِ زندگی میں بال برابر بھی فرق آیا ہو۔ کچھ احمق اسے بے غیرتی اور بے شرمی پر محمول کرتے ہیں حالانکہ یہی تو اعصاب کی مضبوطی ہے۔ پی۔این۔ایس مہران سے یاد آیا۔ سُنا ہے کہ اس پر بھی "ان کیمرہ بریفنگ" کا شور اُٹھا تھا لیکن جنرل کیانی نہیں مانے کہ فردوس عاشق اعوان پہلے بھی رونڈی" مار گئی تھیں۔"

ابا میاں کہا کرتے تھے کہ گرمی بڑی نعمت ہے۔ جتنی زیادہ گرمی پڑتی ہے اتنے ہی بیماریوں کے جراثیم ختم ہوتے ہیں۔اُس وقت ہمارا معصوم ذہن سوچا کرتا تھا کہ جہنم میں تو گرمی ہی گرمی ہو گی، وہاں تو سبھی صحت مند ہوں گے اور جنتی لوگ تو بیمار شمار ہی رہیں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تب ہمیں جہنم میں اُتنی ہی کشش محسوس ہوتی تھی جتنی کشش ہمارے گیلانی اور زرداری صاحب کو آج کل ڈرون حملوں میں ہوتی ہے۔ شائد اپنے مربی و محسن امریکہ اور اس کے ڈرون حملوں کے خلاف عاقبت نا اندیش سیاست دانوں کے متواتر شور و غوغا سے تنگ آ کر ہی زرداری صاحب طویل "مراقبے" سے نکلے اور نکلتے ہی خوب گرجے برسے۔انہوں نے فرمایا کہ عنقریب نیوز چینلز پر اداکار نہیں دانشور بیٹھیں گے۔ اسے کہتے ہیں "تنگ آمد بجنگ آمد"۔الیکٹرونک میڈیا نے بھی، مزاحیہ "ٹاک شوز" کی آڑ میں دُنیا جہان کے "بھانڈوں" کو ان کے پیچھے لگا کر ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ "اینکرز اور اینکرنیوں" کو نذیر ناجی "چھاتہ بردار" کہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں وہ "کھمبیاں" ہیں جو اُگنے پہ آتی ہیں تو بے تحاشا اور بلا سبب اُگ آتی ہیں ۔ جس بات سے میں خوف زدہ ہوں وہ یہ ہے کہ سُسر نے کہا تھا "تھوڑی سی پیتا ہوں، کوئی حلوہ تو نہیں کھاتا" جب کہ تین عشروں بعد داماد نے انتہائی حقارت سے میاں نواز شریف کے لئے "مولوی" کا استعارہ باندھا ہے۔ زرداری صاحب! ذرا بچ کے، یہ مولوی حلوہ کھاتے ہی

نہیں کبھی کبھی بانٹتے بھی ہیں۔ اگر بات پلّے نہ پڑی ہو تو "اعوان قلندر" سے پوچھ لیں جو حلوہ بانٹنے کی تاریخ کا ایک اہم حصّہ رہے ہیں۔ یہ اعوان صاحب بھی خوب ہیں۔ کبھی ڈاکٹر بن جاتے ہیں، کبھی قلندر۔ چند دن ہوئے ایک ٹی۔وی ٹاک شو میں اپنے بارے میں فرمارہے تھے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دِل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

وہ "قلندر" ہیں یا "مچھندر" یہ وہ جانیں یا راہا شااللہ لیکن ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر" بنے تو حریفوں کے جعلسازی کے طعنوں کے باوجود وہ آج بھی ڈاکٹر ہیں (سُنا" ہے کہ وہ رحمٰن ملک کے لئے بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری لائے تھے لیکن وہ بُزدِل نکلے اور بھاگ گئے)۔اب اگر بابر اعوان "قلندری" کے منصب پر فائز ہوئے ہیں تو کس کی مجال جو دم مار سکے البتہ ان سے پوچھنا پڑے گا کہ وہ کون سے قلندر ہیں؟ کیوں کہ لغت میں ڈگڈگی بجا کر بندر نچانے والے کو بھی قلندر کہتے ہیں۔

رہا میاں برادران کا معاملہ تو زرداری صاحب لاکھ انہیں صبر کے مشورے دیں ان پر کچھ اثر نہیں ہونے والا کیوں کہ اب ان کا "جھاکا" کھُل چُکا ہے۔زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ ۔ایک دفعہ پھر خوش الحان میاں شہباز شریف کسی سعودی

طیارے میں بیٹھتے سے گُنگنانے لگیں گے کہ :۔

ہم تو چلے پردیس ، ہم پردیسی ہو گئے

چھوٹا اپنا دیس ، ہم پردیسی ہو گئے

اور اس دفعہ تو انہیں لمبے چوڑے بریف کیس بھی ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تو پہلے ہی باہر پڑے ہیں ، البتہ محترم زرداری صاحب کے لئے ایک مخلصانہ مشورہ ہے (گر قبول افتد زہے عزو شرف) کہ آئیندہ اپنی تقریروں میں لفظ "لوہار" کے استعمال سے گریز کریں کیونکہ وہ محاورہ تو اُنھوں نے سُنا ہی ہو گا کہ :۔ "سو سُنار کی " ایک لوہار کی ،

بات لوڈ شیڈنگ سے شروع ہوئی اور کہیں دور نکل گئی ۔ بہر حال لگتا ہے کہ اب مستقل بنیادوں پر "سیاسی لوڈشیڈنگ " ہو گی ۔ کیونکہ اب جوتیوں میں دال بٹنے لگی ہے لیکن عوام خوش ہیں کہ ان کے شغل میلے کا کچھ تو سامان ہوا ۔۔۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

آقا ﷺ کا فرمان ہے "اللہ غیرت مند ہے اور غیرت مندوں کو پسند کرتا ہے" نانا کے کندھوں پر سواری کرنے والے حسینؓ کو نانا کا یہ فرمان یاد تھا، اچھی طرح یاد تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ خلافت کو ملوکیت میں ڈھالنے کی کوشش کرنے والے امیر معاویہؓ کے فیصلے کو وہ درست مان لیتے۔ امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں یزید کی خلافت کا اعلان کیا اور حضرت امام حسینؓ نے بیعت سے انکار کر دیا۔ آپؓ کو نانا کے دین سے سرِ مُو انحراف بھی گوارہ نہ تھا۔ انھوں نے یزیدیت کے خلاف جہاد کیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ دس ہزار یزیدیوں کے سامنے صرف بہتر افراد کا کنبہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا، سر کٹوانا پسند کیا، سر جھکانا نہیں۔ موت تو برحق ہے، وہ آنی ہی ہے لیکن شہید کی موت ۔۔۔۔۔ وہ موت ہے جس پر خود حکم ربّی ہے کہ "شہید کو مُردہ مت کہو، وہ زندہ ہے اور اپنے ربّ کے ہاں سے خوراک حاصل کر رہا ہے۔ پھر شہید بھی حسینؓ جیسا کہ جس نے آبروئے دینِ محمد ﷺ کی خاطر سر کٹوانے میں ایک لمحے کی ہچکچاہٹ بھی نہیں دکھائی، اُس شہادت پہ ہزار شہادتیں قُربان کہ جس نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر تا قیامت نانا کے دین کی آبرو رکھ لی۔ سچ کہا گیا کہ :۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

محترم ڈاکٹر صفدر محمود نے گزشتہ دنوں اپنے کالم میں لکھا تھا کہ "ہم مظلوم قوم ہیں"۔۔۔۔ ڈاکٹر کے تبحرِ علمی سے انکار ممکن ہی نہیں پھر بھی دست بستہ عرض ہے کہ مظلوم تو وہ ہوتا ہے جو چُپ چاپ ظُلم سہتا ہے کیونکہ اُس میں مقابلہ کرنے کی مطلق سکت نہیں ہوتی۔ ہمارے پاس تو دُنیا کی چھٹی بہترین فوج، جدید ترین سامانِ حرب، ایٹمی قوت، ٹھیک ٹھاک نشانے لگانے والے ایٹمی میزائل اور شوقِ شہادت سے معمور جرّی جوان ہیں۔ ہم ہزاروں میل دور بیٹھے امریکہ تک نہ پہنچ سکتے سہی لیکن جس طوطے میں امریکہ کی جان ہے، وہ تو ہمارے ایٹمی میزائیلوں کی زد میں ہے۔ کیا تل ابیب کے لئے ایک ہی ایٹمی میزائل کافی نہیں؟۔ محترم ڈاکٹر عبد القدیر خاں متعدد بار کہہ چکے ہیں کہ ہندوستان کا ایک ایک شہر ہماری ایٹمی پہنچ میں ہے۔ مانا کہ واشنگٹن اور نیویارک بہت دور ہیں لیکن امریکہ تو اپنے تمام تر سامانِ حرب، افواج، اور بحری بیڑوں کے ساتھ عراق، افغانستان، کویت اور پورے گلف میں موجود ہے۔ کیا یہ سارے مقامات ہمارے میزائیلوں کی زد میں نہیں؟۔۔۔۔ تسلیم کہ جنگ کسی بھی لحاظ سے درست نہیں ہوا کرتی اور عقلِ سلیم رکھنے والا کوئی بھی شخص کبھی جنگی جنون میں مبتلا نہیں ہوا کرتا۔ لیکن اگر جنگ مسلط کر دی جائے تو پھر؟ کیا طارق بن زیاد کی طرح سفینے جلا کر لڑا جائے یا سسک سسک کر ذلت کی موت

گلے لگائی جائے ؟ ۔۔۔۔ کیا یزیدیت کے خلاف حسینیت درست ہے یا کُوفیت ؟ ۔۔۔۔ نہیں محترم ڈاکٹر صاحب ! نہ حسین علیہ اسلام مظلوم تھے نہ یہ قوم ۔ البتہ حسینؓ جری تھے ، نڈر تھے ، بہادر تھے ، بے باک تھے ، سچائی کے علم بردار اور حق کی خاطر کٹ مرنے والے تھے ۔۔۔۔ لیکن ہم بزدل ، ڈرپوک ، اور بے حمیّت قوم ہیں کیونکہ یہ ہمی ہیں جنھوں نے اپنی ووٹوں کے ذریعے اس ملک کی باگ ڈور ایسے بزدل اور بے حمیّت لوگوں کے سپرد کی جو ایک امریکی دھمکی سے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں ۔ تحقیق کہ ہم نے اپنے جیسے لوگوں کا ہی انتخاب کرنا تھا کہ

کُند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کبوتر با کبوتر ، باز با باز

آج بڑے بڑے سقہ لکھاری اپنی ساری " قلمی توانائیاں " یہ ثابت کرنے میں صرف کر رہے ہیں کہ ہم میں امریکہ یا بھارت سے لڑنے کی سکت نہیں ۔ بجا ارشاد ۔۔۔۔ تو پھر اتنی فوج ، سامانِ حرب ، ایٹمی میزائیل اور ایٹم بم بنا کر قوم کو گھاس کھانے پر مجبور کیوں کیا جا رہا ہے ۔؟ دست بستہ کچھ امریکہ کے حوالے کر دیں اور کچھ بھارت کے تاکہ ہر گھر میں دو وقت کا کھانا تو پک سکے ۔ لیکن اتنا ضرور یاد رکھیئے گا کہ معمر قذافی کا زوال اُسی دن سے شروع ہو گیا تھا جب اس نے اپنا ایٹمی پروگرام ٹھپ کر کے سب کچھ جہازوں میں بھر کے

امریکہ کے حوالے کر دیا تھا۔ اگر آپ کو بھی قذافی جیسے انجام کا شوق ہے تو بسم اللہ اور اگر عزت کی زندگی درکار ہے تو پھر یاد رکھیئے کہ ویت نام سے افغانستان تک امریکہ نے جب بھی پنجہ آزمائی کی اُسے سوائے ذلتوں کے کچھ نہ ملا۔ سامنے کی بات ہے کہ نہتے افغانی طالبان کے پاس نہ کوئی لڑاکا طیارہ ہے نہ میزائیل، نہ کوئی آب دوز ہے نہ بحری جہاز، نہ ٹینک ہے نہ توپ اور ایٹم بم تو رہا دور کی بات اُن کے پاس تو کوئی سادہ بم بھی نہیں لیکن پھر بھی انھوں نے امریکہ اور اس کے حواریوں کو نہ صرف بھاگنے پر مجبور کر دیا بلکہ امریکہ کو دنیا کا مقروض ترین ملک بنا کر اُس کی معشیت کو برباد کر دیا۔ آج امریکہ 165 ٹریلین ڈالر کا مقروض ہو کر طالبان سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں کر ممکن ہوا۔؟ سادہ اور سیدھا جواب ہے کہ افغان غیرت مند تھا، بے غیرت نہیں۔ وہ کٹ تو سکتا ہے مگر جھک نہیں سکتا۔ لیکن ہمیں زندگی سے پیار ہے، ہم اسے بہت سینت سنبھال اور بچا بچا کے رکھ رہے ہیں حالانکہ یہ ایسی متاع ہے جسے پایانِ کار لُٹنا ہی لُٹنا ہے۔ البتہ یہ طے کرنا باقی ہے کہ ہمارے نصیب میں عزّت کی موت ہے یا ذلّت کی۔۔۔

کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

پاکستان بہرحال اس لحاظ سے لکھاریوں کی جنّت ہے کہ یہاں موضوعات کی کمی نہیں ، اور میرے جیسے نووارد بھی جب جی چاہے ، اُٹھیں اور قلم برداشتہ لکھتے چلے جائیں۔ قلم سنبھال کے لکھنے کی ضرورت نہ تحقیق و تدقین کی کہ جو لکھ دیا وہی سچ اور وہی حرفِ آخر۔ کسی کی مدح سرائی کرنی ہو تو ایک سو ایک جواز اور لتّے لینے ہوں تو ایک ہزار ایک۔جی چاہے تو عمران خاں ، نواز شریف اور آصف زرداری کی شان میں بیک وقت ایسے کالم لکھ دوں کہ لوگ انہیں قرونِ اولیٰ کے مسلمان سمجھنے لگیں اور ضد پہ آ جاؤں تو اُن کی مخالفت میں ایسے ثبوت لے آؤں کہ آئی۔ایس آئی ، سی۔آئی۔اے ، را اور موساد والے مُنہ دیکھتے رہ جائیں۔ بلکہ سوائے آئی۔ایس آئی کے دیگر بہت سے اہلکار مارے شرم کے خودکُشی کر لیں۔ آئی۔ایس۔آئی والے اس لئے نہیں کہ اسلام میں خودکُشی حرام ہے۔ چاہوں تو امریکہ کو عالمِ اسلام کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت کر دوں اور موڈ ہو تو قلمی شہنشاہی کے بل پر طالبان کو انسانیت کی اُن رفعتوں سے ہمکنار کر دوں کہ گھر گھر میں خودکُش جیکٹ تیار ہونے لگے۔اپنی معشیت دانی کے بل پر پل بھر میں اہلِ وطن کی فی کس آمدنی ہزاروں ڈالر فی گھنٹہ کر دوں یا راہبروں کے گھپلوں کی رفتار ماپ کر پاکستان کو دنوں میں اتھوپیا بنا دوں ۔پاکستان کو مضبوط ترین مملکت

ثابت کرنا یا کرزئی جیسے چوہوں سے قوم کو لرزہ براندام کر دینا بھی میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔

سوال مگر یہ ہے کہ میں کروں تو کیا کروں کہ
ایماں جو مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کُفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

سقہ لکھاریوں کی گروہوں میں بٹی ایک فوج ظفر موج جس کا ارسطو، افلاطون اور سقراط بھی پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ہر کوئی اپنے ثبوتوں کی پٹاری کھول کر بیٹھا ہے اور ضد یہ کہ اس کا کہا پتھر کی لکیر۔نہ تجزیہ نہ تحقیق بس ممدوح کی تعریف اور مخالفت پہ تنقید، کڑی تنقید، نفرتوں سے لبریز تنقید۔۔۔۔ایسے میں جھوٹ سے سچ نتھارنا کم از کم میرے جیسی نوآموز کے بس کی بات نہیں۔کسی کی بات کو رد کروں تو کیسے کہ وہ نامی گرامی اور ہم بے نام، وہ اوج ثریا پہ مقیم اور ہم پاتال کہ گہرائیوں کے مکیں۔پھر بھی ایک عامی کی حیثیت سے یہ عرض ضرور کروں گی کہ اس چلن سے کسی کا بھی بھلا نہیں ہو گا، نہ ملک کا نہ قوم کا اور نہ ہی حبیب و رقیب کا۔ایک سچے اور سُچے لکھاری کا مطمعِ نظر ملک و قوم کا بھلا ہونا چاہیے نہ کہ کسی انسان کا لیکن یہاں اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے ۔کوئی زرداری صاحب کے لئے رطب اللساں ہے تو کوئی نواز شریف کے لئے، کسی کو عمران خاں کی صورت میں نجات دہندہ نظر آتا ہے تو

کوئی چوہدریوں کے در پہ جبینِ نیاز خم کئے بیٹھا ہے۔چہار سو شخصیت پرستی ہی شخصیت پرستی نظر آتی ہے اور کچھ نہیں ۔حالانکہ نہ کوئی معظم ہے نہ مغلظ اور نہ کوئی بھگوان ہے نہ شیطان ۔ سبھی انسان ہیں محض انسان خصائص و نقائص کے خمیر میں گُندھے ہوئے انسان۔

یہی حال ہمارے الیکٹرانک میڈیا کا ہے ۔ کھُمبیوں کی طرح اُگے ہوئے بے شمار اینکر اور اینکرنیاں"۔چند ایک کو چھوڑ کے سبھی کا طریقہ واردات ایک کہ کسی نہ کسی طرح" بلائے گئے مہمانوں کو آپس میں لڑا کر مزہ لیا جائے ۔جہاں نوبت گالی گلوچ تک پہنچ جائے تو وہ پروگرام اعلیٰ ترین ۔اکثر پروگراموں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔انسان لاکھ چاہے کچھ پلّے نہیں پڑتا۔ آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ جب کوئی بات کر رہا ہو تو غور سے سُنا کرو اور درمیان میں مت ٹوکا کرو"۔ لیکن یہاں عالم یہ ہے کہ مجال ہے جو اینکر کسی مہمان کو ایک جملہ بھی مکمل کرنے دے ۔درمیان میں دس دفعہ ٹوکنا اور زچ کرنے کی پوری کوشش جس میں اکثر میزبان کامیاب رہتے ہیں ۔آخر یہ "ٹاک شو" کا کونسا انداز ہے جو ہم اپنائے ہوئے ہیں۔؟

کچھ بزر جمہر نیوز چینلز پر مستقل براجماں نظر آتے ہیں۔ جن کے تجزیے سُنکر بعض اوقات بے ساختہ ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ایک بہت ہی معروف نیوز چینل کے بہت ہی معروف تجزیہ نگار کو پیشین گوئیاں کرنے کا بہت شوق ہے جو سو فیصد سچ ثابت ہوتی ہیں کیونکہ ان کا طریقہ واردات ہی نرالا ہے۔ کل فرمارہے تھے کہ جناب آصف زرداری واپس نہیں آئیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ اگر اسٹیبلشمنٹ نے ایسا پروگرام فی الحال نہیں بنایا تو واپس آ بھی سکتے ہیں۔ سبحان اللہ ! کیا تجزیہ ہے ۔اگر واپس آ گئے تو موصوف سچّے اور اگر نہ آئے تو پھر تو سچّے ہیں ہی۔ویسے حیرت ہوتی ہے کہ آخر ہمارے میڈیا کو کیا ہو گیا ہے ۔؟ زرداری صاحب دبئی گئے اور وہ اکثر جاتے بھی رہتے ہیں ۔اگر اب چلے گئے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ۔؟ پی۔پی۔پی کے کچھ احباب نے کہا کہ انہیں دل کی تکلیف ہوئی جبکہ پی۔پی۔پی کے ہی ڈاکٹر عاصم نے کہا کہ وہ روٹین کے میڈیکل چیک اپ کے لئے گئے ہیں ۔ تحریک کے محمود الرشید نے کہا کہ انہیں "فٹس" پڑے تھے جبکہ ایک معروف صحافی نے کہہ دیا کہ انہیں ہلکا سا فالج کا اٹیک ہوا ہے ۔کچھ دور کی کوڑی لائے کہ وہ میموگیٹ سکینڈل کی ٹینشن برداشت نہیں کر سکے ۔ غرض جتنے مُنہ ، اتنی باتیں اور میڈیا پر شورِ قیامت ۔۔۔۔ سوال یہ ہے کہ آخر میڈیا کب ذمہ داری کا ثبوت دے گا۔؟ آخر "بریکنگ نیوز" کے شوق میں ہم کب تک افسانہ طرازیاں کرتے رہیں گے ۔؟ محترم زرداری اگر بیمار

ہیں تو اللہ انہیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے ۔ اگر بچوں سے ملنے گئے ہیں تو کچھ گناہ نہیں کیا اور اگر وہ واپس نہ آنے کے لئے گئے ہیں تو چند دنوں میں سب کچھ سامنے آ جائے گا پھر جی بھر کے تجزیے بھی کر لیں اور تبصرے بھی ۔ بلاول زرداری کو سندھی ٹوپی پہنے دیکھ کر تجزیوں اور تبصروں کی بھر مار ہو گئی کہ یہ "سندھ کارڈ" کے استعمال کی دھمکی ہے ۔اگر ایسا ہی ہے تو پھر وزیرِ اعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ تو ہمہ وقت "سندھ کارڈ" کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کے سر سے تو کبھی سندھی ٹوپی اُترتی ہی نہیں ۔ وزیرِ اعظم ہمہ وقت "یورپ کارڈ" کا استعمال کرتے ہیں کہ ان کے جسم سے "تھری پیس سوٹ" جدا ہی نہیں ہوتا۔پگوں والے ہزاروں پنجابی ہر وقت "پنجاب کارڈ" استعمال کرتے نظر آتے ہیں ۔اور کوئی پٹھان کبھی بھی اپنے روائتی لباس سے الگ نظر نہیں آتا اس لئے سب سے زیادہ "پختون کارڈ" تو خیبر پختون خواہ والے استعمال کرتے ہیں۔۔۔۔ ایسے تجزیئے اور تبصرے کرنے والے "افلاطونوں" سے دست بستہ عرض ہے کہ خُدا را لسانیت کو ہوا دینا بند کر دیجئیے اور اگر خُدا توفیق دے تو "ہم سب ایک ہیں" کا درس بھی دے دیا کیجیئے کہ اس وقت ملک و قوم کو سب سے زیادہ ضرورت اگر ہے تو قومی یک جہتی کی کہ اس کے بغیر نہ ہم مُلک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کر سکتے ہیں اور نہ ہی جغرافیائی سرحدوں کی ۔

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

قتالِ اعظم چنگیز خاں کو مسلمان آثارِ قیامت سمجھتے تھے اور عیسائی عذابِ الٰہی۔جرمنی کے شاہ فیڈرک ثانی نے انگلینڈ کے شاہ ہنری کو لکھا کہ وہ عذابِ الٰہی ہے جو ہمارے گناہوں کی پاداش میں نازل ہوا۔مشہور فلسفی راجر بیکن نے اسے دجال کا سپاہی قرار دیا لیکن عقلمند ایغور، تنومند فرایت ،، جفاکش مغل، خون خوار تاتاری، جری مرکیت اور مافوق الفطرت قوتِ برداشت رکھنے والے برفانی آبادیوں کے شکاری اُس صحرائے گوبی کے ان پڑھ، اُجڈ اور گنوار چرواہے کو "بوگدو" یعنی دیوتاؤں کا بھیجا ہوا قرار دیتے تھے۔دنیا کا واحد سالار جس سے اس کی سپاہ نے کبھی انحراف نہیں کیا، واحد حکمران جس کے خلاف کبھی بغاوت ہوئی نہ سازش۔وجہ صرف یہ کہ اس ان پڑھ نے پچاس اقوام کے لیے "یاسا" یعنی آئین ترتیب دیا اور پھر اسے نافذ کرکے بھی دکھایا۔"یاسا" میں چوری اور زنا کی سزا موت تھی۔کسی کو اتنی دیر تک خطاکار نہ سمجھا جاتا جب تک وہ رنگے ہاتھوں پکڑا نہ جاتا۔آپس میں لڑائی جھگڑا حرام اور سزا سخت۔جو مالِ غنیمت جس کے ہاتھ آتا، اسی کا ہو جاتا۔مکان کھُلے، چھکڑے لدے لیکن مجال ہے جو کبھی چوری ہوئی ہو۔ایک جنگ میں ایک بہت خوبصورت جڑاؤ خنجر ایک معمولی سپاہی کے ہاتھ لگا۔چنگیز خاں کو وہ خنجر بہت پسند آیا۔اس نے خنجر لینا چاہا لیکن سپاہی

نے صاف انکار کر دیا۔ سرداروں نے یہ جانا کہ اب سپاہی کی گردن تن سے جُدا کر دی جائے گی لیکن چنگیز نے اسے 100 سپاہیوں کی کمان سونپ دی۔

اس تمہید کا مقصد یہ تھا کہ زندہ قومیں ہمیشہ اپنے آئین و قانون کی پاسداری کرتی ہیں اور ہمیشہ سُرخ رو ہوتی ہیں۔ عالمی دہشت گرد امریکہ کا تیسرا صدر "تھانسن جیفرسن" جو ڈیمو کریٹک پارٹی کا بانی اور "اعلان نامہ آزادی" کا مصنف تھا، اس نے ہمیشہ اس خیال کی شدید مخالفت کی کہ آئین کی تشریح کا حتمی اختیار سپریم کورٹ کے پاس ہے اور کانگریس کی منظوری کے باوجود سپریم کورٹ کسی بھی آرٹیکل کو غیر آئینی قرار دے سکتی ہے۔ وہ تادمِ مرگ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ سپریم کورٹ اپنا کام کرتی رہی لیکن وہ کبھی اپنے ہی بانی کے بنائے ہوئے آئین کی PPP آڑے نہیں آیا۔ لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ دھجیاں بکھیر رہی ہے۔ کل فوزیہ وہاب نے برملا کہا کہ سپریم کورٹ "جانب دار" ہے کے دیگر اکابرین بھی برملا اس کا اظہار کرتے PPP ۔ سابقہ وزیرِ قانون بابر اعوان اور حکومت نے سپریم کورٹ کے گزشتہ اٹھارہ فیصلوں پر سرے سے PPP نظر آتے ہیں۔ پر کورٹ کے فیصلے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ لیکن NRO عمل ہی نہیں کیا اور اب بھی اسے سب سے زیادہ تلملاہٹ میمو سکینڈل پر ہوئی ہے۔ طرح طرح کی تاویلات اور کی سیکرٹری اطلاعات فوزیہ وہاب PPP عجیب و غریب قسم کے جواز تراشے جا رہے ہیں۔ کہتی ہیں کہ حسین حقانی کی طرف سے منصور اعجاز کو بھیجی

گئی "ای۔ میلز" پر چونکہ اس کے دستخط نہیں اس لیے ان کی کوئی حیثیت نہیں ۔کیا۔ کیا کو پوری forensic evidence کبھی کسی ای۔ میل پر دستخط بھی ہوئے ہیں۔؟ کیا دنیا کی ہر کورٹ تسلیم نہیں کرتی ۔؟ اور اس سے زیادہ احمقانہ بات بھی کوئی ہو سکتی ہے جو فوزیہ وہاب نے کہی ؟۔ بابر اعوان بھی آج متواتر نواز لیگ ، فوج اور عدلیہ پر گرجتے برستے رہے ۔ایک روز پہلے گیلانی صاحب نے بھی فرمایا کہ اگر ان کی حکومت ختم ہوئی تو پھر کبھی جمہوریت نہیں آئے گی ۔انتہائی محترم ذوالفقار بھٹو نے بھی فرمایا تھا کہ میرے جانے کے بعد ہمالیہ بھی روئے گا"۔۔۔۔"

ایک بے مثال لیڈر رخصت بھی ہو گیا لیکن ہمالیہ تو کُجا "شملہ پہاڑی" بھی نہیں روئی البتہ بابر اعوان اور رحمٰن ملک نے مٹھائیاں ضرور تقسیم کیں۔چاروں صوبوں کی زنجیر کی کربناک شہادت کا دُکھ بھی اس قوم نے سہہ لیا لیکن زنجیر قائم رہی اور ملک سلامت ۔عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فانی انسان کبھی ناگزیر نہیں ہوا کرتے ، البتہ آئین ناگزیر ، قانون ناگزیر ، بلا شبہ ناگزیر کہ اس کے بغیر کسی ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت ممکن ہے نہ نظریاتی سرحدوں کی لیکن بد قسمتی سے PPP اپنے ہی بنائے ہوئے آئین کو سو صفحات کی معمولی کتاب سمجھ کر ردی کی ٹوکری کی نذر کر رہی ہے۔

سمیت کسی بھی سیاسی پارٹی کی مخالف نہیں مگر ثنا خواں بھی نہیں البتہ جو PPP بخُدا میں نظر آتا ہے اسے پوری دیانت داری سے سپردِ قلم کرنے کی سعی ضرور کرتی ہوں۔ میرا تجزیہ درست بھی ہو سکتا ہے اور سرے سے غلط بھی ۔ یہاں صرف یہ عرض ہے کہ جب جنرل شجاع پاشا اور جنرل کیانی کہتے ہیں کہ وہ منصور اعجاز کی طرف سے پیش کیے گئے ثبوتوں سے مطمئین ہیں تو اس سے قطع نظر کہ منصور اعجاز کا ماضی میں کیا کردار رہا ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیوں نہیں ہونے دیتی۔ ؟آئی۔ایس۔آئی اور فوج PPP، نے کوئی فیصلہ کرنے یا انتہائی قدم اٹھانے کی بجائے تمام معاملہ سپریم کورٹ پر چھوڑ دیا کے پاس تو اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کا سنہری موقع ہاتھ لگا ہے PPP ہے۔ ۔وہ منصور اعجاز کو جھوٹا ثابت کرے اور اسٹیبلشمنٹ کو شرمندہ۔کچھ محترم سقہ تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ معاملہ اگر سپریم کورٹ میں نہ جاتا تو حالات اس نہج تک نہ پہنچتے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگر معاملہ سپریم کورٹ میں نہ جاتا تو پھر کسی بھی لمحے پاکستان کی فضا پانچویں بار "میرے عزیز ہم وطنوں" کی صدا سے گونج اُٹھتی ۔ میں احمقوں کی جنت میں نہیں بستی جو اس خوش فہمی میں رہوں کہ کوئی فوج کا راستہ روک سکتا ہے یقین جان لیجیئے کہ "عزیز ہم وطنوں" کی آواز پر لبیک کہنے اور دس بار وردی میں منتخب کروانے والے اب بھی ہزاروں ہیں اور آئین و قانون اور قلم فروشوں کی بھی کمی نہیں۔ایسا آمریت کے ہر دور میں ہوا اور تحقیق کہ جمہوریت کے سکڑے سہمے مریل سے پودے میں ابھی

اتنی سکت نہیں کہ وہ آمریت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکے۔تاریخی حوالوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ سبھی "تڑی باز" ہی سب سے پہلے مریل چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں گھستے ہیں یا نئے خُداؤں کے در پر سجدہ ریز۔ حق کی صدا بلند کرنے والے معدودے چند اصحاب کے لیے قال کوٹھڑیاں اور شاہی قلعہ تو ہے ہی۔اس لیے موقع غنیمت جانیئے کہ معاملہ سپریم کورٹ میں جانے کے بعد اسٹیبلشمنٹ اخلاقی طور پر پابند ہو کے رہ گئی ہے۔

معزز قارئین ! وہ 16 دسمبر ہی کی ایک ٹھنڈی دوپہر تھی جب ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ہماری عظمتوں کے تمغے نوچے گئے۔آج بھی 16 دسمبر ہی ہے جب ملک کی غیر محفوظ جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے باوجود ایک دفعہ پھر حکومت اور فوج مد مقابل ہیں ۔زندہ قومیں تو ہمیشہ تاریخ سے سبق حاصل کرتی ہیں۔ لیکن اقبال کے ان شاہینوں کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ کرگسوں کی سی سرشت چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ۔لے دے کے ایک عمران خاں تھے جو مانندِ شاہین پلٹتے ، جھپٹتے نظر آتے تھے۔لیکن اونچی اُڑان سے تھک کر وہ بھی بالآخر کرگسوں میں جا گرے۔ایک انٹرویو میں فرمایا، جن لوگوں کو پارٹی ٹکٹ دیا جائے گا ان میں اکثریت اچھے لوگوں کی ہو گی لیکن سبھی نہیں ، کچھ برے لوگ بھی ہوں گے۔ہم نے مگر یہی سنا،پڑھا اور دیکھا ہے کہ " ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے" ۔ محترمی ہارون الرشید کے "عصرِ رواں کے درویش

میں PTI کو تو میں نہیں جانتی جنہوں نے ایسے لوگوں کو "جھاڑ جھنکار" کہہ کر ان کی شمولیت کا جواز تراشا ہے۔ البتہ حضرتِ اقبالؒ کے مُرشدِ معنوی مولانا رومؒ یہ کہتے ہیں ہزار لُقموں میں ایک تنکے کو منہ کی زندہ حس پہچان لیتی ہے اور جب تک تنکا نکل نہ جائے مُنہ کو چین نہیں آتا"۔ خاں صاحب کا مُنہ تو ایسے بے شمار تنکوں سے بھر چُکا ہے پھر انہیں کیسے چین آتا ہو گا۔؟ اور اگر یہ مصلحتِ وقت ہے تو پھر میرے آقا ﷺ نے تو تمام مصلحتوں کو رد کرتے ہوئے یہ کہہ کر طاقت ور ترین قبیلے کی چور عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا کہ "ربِ کعبہ کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا۔" سیدنا صدیقؓ اکبر کو یہ واقعہ بھی یاد تھا اور قولِ رسول ﷺ بھی۔ صحابہؓ کرام نے عرض کیا کہ اسلام ابھی نیا نیا پھیلا ہے، مصلحتِ وقت ہے کہ زبردستی زکوات وصول نہ کی جائے۔ آپؓ نے فرمایا "قحافہ کے بیٹے کی کیا مجال کہ جو کام رسول ﷺ نے کیا اس سے سرِ مو بھی انحراف کرے۔ ربِ کعبہ کی قسم اگر اونٹ کی نکیل بھی کسی پر واجب ہوئی تو ابوبکرؓ اس کے خلاف بھی جہاد کرے گا"۔ پتہ نہیں "درویش" نے یہ کیسے کہہ دیا حالانکہ وہ بھی جانتے ہیں اور ہارون الرشید بھی کہ عمران خاں نے بڑی محنت سے یہ "جھاڑ جھنکار" اکٹھا کیا ہے اور محترم ہارون الرشید مزید کی تگ و دو میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ بہرحال ایسی نرالی منطق کو میں نہیں جانتی، میں نہیں مانتی" کہ بُرے لوگوں کو ٹکٹ دے کر انتخاب"

جیتو، ان کے ووٹوں سے وزیرِ اعظم بنو اور پھر ڈنڈا لے کر انہی پر چڑھ دوڑو۔ دُعا ہے کہ ربِّ کردگار راہبرانِ قوم کو صراطِ مستقیم پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کنّے کنّے جاناں اے بِلّو دے گھر

ایک چوہا اپنے بِل میں گھُسا بیٹھا تھا۔ تھوڑی دور ایک بلّی اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔۔بلّی کو بہت بھوک لگی تھی لیکن چوہا باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔آخر کار بلّی کو ایک ترکیب سوجھی ۔اس نے چوہے کو آواز دے کر کہا کہ "بھانجے ! اگر تم اس بِل سے نکل کر اُس بِل میں چلے جاؤ تو میں تمہیں 500 روپے انعام دوں گی "۔یہ سُنتے ہی چوہے نے بِل سے سر باہر نکالا لیکن پھر فوراً ہی اندر کر لیا۔بِلّی نے پوچھا "بھانجے ! کیا ہوا ؟۔"چوہا بولا "خالہ ! پیسے بوہتے تے پینڈاا تھوڑا، کوئی چکر اے "۔

(خالہ ! پیسے زیادہ اور فاصلہ کم ہے،یقیناً کوئی چکر ہے۔)

محترم عمران خاں آج کل قوم کو ذوالفقار علی بھٹو کے روٹی ، کپڑا اور مکان سے بھی زیادہ سہانے خواب دکھلانے میں مصروف ہیں ۔اُن کے دِل خُوش کُن بیانات سے یوں لگتا ہے کہ جیسے موسمِ گُل بامِ وطن سے بغل گیر ہونے کو ہے۔۔۔۔۔ مگر کیسے ؟ ۔۔۔۔۔ میں نے بھی ایک رات "احمقوں کی جنّت میں گزاری ۔ہُوا یوں کہ مجھے کام وام تو کوئی تھا نہیں اس لئے تخیل کی "پست پرواری" سے میں وزیرِ اعظم بن بیٹھی میں نے سوچا کہ میں کرپشن کا خاتمہ کر دوں گی ،

مہنگائی پر ضربِ کلیمی لگاؤں گی اور قرضہ خوروں کو اُلٹا لٹکا دوں گی۔ دودھ اور شہد کی نہروں کو "آخرت" کے لئے چھوڑتے ہوئے مُلک کو تیل، گیس، سونے، تانبے، کوئلے، اور لوہے کی دولت سے مالا مال کر دوں گی۔ تعلیم مکمل مفت اور عالمی معیار کے ہسپتالوں کا ایسا جال بچھادوں گی کہ پھر کسی کو چھینک آنے پر دبئ نہ جانا پڑے۔ قلعہ بند پولیس کو باہر نکال کر عوام کی حفاظت پر مامور کر دوں گی اور صنعتی لحاظ سے ملک کو کم از کم جاپان کے ہم پلہ ضرور کر دوں گی۔ بیرونی ممالک میں رکھی گئ ساری دولت واپس لا کر پاکستان کو امریکہ کے برابر کھڑا کرکے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کروں گی۔ چوری، ڈاکہ، اغوا برائے تاوان، کاروکاری، رشوت، سفارش، جنسی تشدد اور فسق و فجور کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکوں گی۔ پٹوار خانے بند اور پولیس، کسٹم، انکم ٹیکس وغیرہ میں کرپشن کرنے والوں کو نشانِ عبرت بنا دوں گی۔ ریلوے، پی۔آئی۔اے، سٹیل مِل اور ان جیسی دیگر پچاس کارپوریشنوں کو سونے کے انڈے دینے والی مُرغیوں میں ڈھال کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹیکس فری بجٹ پیش کیا کروں گی۔ جاگیر دارانہ نظام کو اپنی عظمتوں کے کلہاڑے سے پاش پاش کر دوں گی اور فرقہ واریت کے خاتمے کے لئے "افلاطونی" قانون سازی کروں گی۔ عورت کے حقوق کا ایسا تحفظ کروں گی کہ پھر کسی "وینا ملک" کو کسی دشمن مُلک میں چند ٹکوں کی خاطر "برہنہ" نہ ہونا پڑے۔ کشمیر تو خیر آزاد کرواؤں گی ہی لیکن کوشش یہ ہو گی کہ لگے ہاتھوں دِلّی کے لال قلعے پر سبز ہلالی پرچم

لہرا کر "سقوطِ ڈھاکہ" کا بدلہ بھی لے لوں۔مُلک کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کو ہمالیہ سے اونچا کر دوں گی اور نظامِ عدل ایسا بناؤں گی کہ زنجیرِ عدل کے ہلتے ہی انصاف سنہری سکّوں کی مانند چھن چھن کرتا جھولی میں آ گرے۔۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر ایسا نظام ترتیب دوں گی کہ فوج پھانسیوں اور "جلاوطنیوں" جیسے گھٹیا کام کرنے کی بجائے صرف سرحدوں پہ رہے اور کبھی شہروں کا رُخ کرنے کی جرات نہ کرے۔یوں تو میں نے اور بھی بہت کچھ سوچ رکھا تھا لیکن اچانک سوال دامن گیر ہُوا کہ ایسا کیوں کر ممکن ہو گا؟۔میں نے فوراً "خیالی پلاؤ" پکانا چھوڑ کر "خیالی گھوڑے" دوڑانے شروع کر دیئے،رات کا ایک پہر گذرا، پھر دوسرا، تیسرا اور جب آخری پہر آیا تو میں صرف سوئس بینکوں سے پیسے واپس لانے میں بھی کامیاب نہ ہو سکی۔اس لئے میں "وزارتِ عظمیٰ" کو " لات مار" کے سو گئی اور اگلے دن دوپہر تک سوتی رہی۔

سوچتی ہوں کہ "پینڈا تھوڑا تے پیسے بوہتے" لگتا ہے یہ بھی خاں صاحب کا کوئی چکر ہے اور پاکستان میں چکر تو صرف "کُرسی" کا ہوتا ہے جس کی بھُوک سے سبھی نڈھال ہوتے ہیں۔اسی کُرسی کی بھوک نے آج قصور میں خاں صاحب کے جلسے میں کارکنان کو اپنی کرسی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی کرسیاں بھی لے اُڑنے پر مجبور کر دیا۔اللہ کرے خاں صاحب کے من کی مراد پوری ہو لیکن یہ جو اُنھوں نے لوٹوں کا "مینا بازار" سجا رکھا ہے وہ مقرّر کسی "چکر" کی نشاندہی کرتا ہے

۔ بلاخوفِ تردید یہ "کرسی" ہی کی برکت ہے کہ آج "مشرف" کی فوج کا تیس افراد پر مشتمل ہراول دستہ بھی خاں صاحب کے ساتھ آن ملا اور ساتھ ہی اسرار الحق بھی ۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں خاں صاحب کے ہر جلسے میں ضرور شرکت کروں گی کیونکہ مجھے وہ روح پرور منظر دیکھنے کا بڑا شوق ہے جب سٹیج سے یہ "ترانہ" پاک وطن کی فضاؤں کو معطر کرے گا کہ

ٹکٹ کٹاؤ، لین بناؤ

کہنّے کہنّے جانا اے بِلّو دے گھر

دیکھناان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

نڈر، بے خوف، بے باک اور انتہائی جذباتی مخدوم جاوید ہاشمی کی نواز لیگ سے 24 سالہ رفاقت بالآخر اپنے اختتام کو پہنچی۔کتنے کربناک ہوں گے وہ لمحے جب ملتان کے ایک مخدوم نے اپنے ازلی و ابدی حریف ایک دوسرے مخدوم سے ہاتھ ملایا ہو گا اور کتنی شرم کی بات ہے نواز لیگ کے لئے جس نے اپنا ایک ایسا ساتھی کھو دیا جس نے مشرف کے دورِ آمریت میں بھی نہ صرف نواز لیگ کو زندہ رکھا بلکہ قوم کو آمر کے سامنے ڈٹ جانے کا سلیقہ بخشا۔مشرف نے اسے خریدنا چاہا، وہ بکا نہیں ،آئی۔ایس۔آئی و" فائل" کھولنے کے لئے کہا، کچھ ہِلا نہیں ۔جھکانے کے لئے حوالہ زنداں کیا لیکن مشرف نہیں جانتا تھا کہ وہ پسِ دیوارِ زنداں ایسے شخص کو بھیج رہا ہے جسے صرف ایک ہی سبق یاد ہے کہ

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہں

جیل سے "ہاں میں باغی ہوں" جیسے قلندرانہ نعرے لگاتا ہوا باہر آیا، قوم نے سر آنکھوں پہ بٹھایا لیکن اپنوں نے سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا۔کچھ اس کی مقبولیت سے خوفزدہ ہو گئے تو کچھ بے باکی سے ۔پارٹی میٹنگز میں اُس کی

آواز ہمیشہ "صدا الصحرا" ثابت ہوتی رہی لیکن وقت نے ثابت کیا کہ صرف وہی سچّا تھا ۔اس نے مرکزی کابینہ میں شمولیت کی شدید مخالفت کی لیکن نواز لیگ کے بقراطوں نے پرواہ نہ کی ۔جب نواز لیگ پتھر چاٹ کے پلٹی تو بجائے قربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کرنے والے جاوید ہاشمی کے چوہدری نثار کو قائدِ حزبِ اختلاف بنا دیا گیا۔ہاشمی صاحب فعال اپوزیشن کا کردار ادا کرنے کے لئے زور لگاتے رہے لیکن جماعت کے اندر بیٹھے افلاطونی سیاست دانوں کو "فرینڈلی اپوزیشن" میں عافیت نظر آتی رہی ۔اپنی بربادیوں کا سامان کرنے والی نواز لیگ کو ہوش اس وقت آیا جب پُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چُکا تھا۔اب محترم پرویز رشید فرماتے ہیں کہ "پتہ نہیں ہاشمی صاحب نے کن تحفظات کی بنا پر پارٹی چھوڑنے کا فیصلہ کیا" ۔پرویز رشید صاحب مشرف کی بغاوت کے موقع پر آرام سے گھر میں استراحت فرمانے والے چوہدری نثار اور قُربانیاں دینے والے جاوید ہاشمی کا فرق سمجھ میں آ جائے تو پھر یقیناً انہیں "تحفظات" کی سمجھ بھی آ جائے گی اور وہ اس حیرت کدے سے باہر نکل آئیں گے ۔پرویز رشید صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ہر شخص کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہے" بجا ارشاد لیکن کیا جاوید ہاشمی جیسے لوگ یونہی بیٹھے بٹھائے فیصلے کر لیا کرتے ہیں۔؟اور کیا اس میں پارٹی قیادت اور اُس کی پالیسیوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا؟پرویز صاحب ! اگر مخلص لوگ یونہی بد دل ہوتے رہے تو پھر

دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

ہاشمی صاحب کا ن لیگ جانا تو خیر طے تھا لیکن تحریکِ انصاف ؟ کیا ہاشمی صاحب مشرف کے کاسہ لیسوں کے درمیان سکون سے رہ پائیں گے ؟۔انتہائی باخبر حامد میر کہتے ہیں کہ سونامی" فوج کے کندھوں پہ سوار ہو کے آ رہا ہے۔تو کیا اب دبنگ ہاشمی فوج کے" کندھوں پر بیٹھ کے میدان میں اترے گا؟۔ میں تو جس ہاشمی کو یونیورسٹی کے زمانے سے جانتی ہوں وہ تو ہار ماننے والا نہیں تھا۔مانا کہ وہ بیمار تھا مگر جذبہ تو جوان تھا۔ہاشمی کہتے ہیں کہ میں نے بددِل ہو کر سیاست چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔کاش کہ وہ ایسا ہی کرتے یا پھر اپنی پارٹی بنا لیتے۔ تحقیق کہ اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو کوئی سیاست دان اس کی گردِپا کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ بہرحال پی۔ٹی۔آئی کو مبارک ہو کہ اب واقعی قومی درد کا حامل ایک شخص ان کی صفوں میں بھی آ گیا۔

کی مخالف ہوں ۔ بہ ربّ کعبہ ایسا ہر PTI میرے کچھ مہربان یہ طعنہ دیتے ہیں کہ میں گز نہیں ہے۔ میرا کسی بھی سیاسی پارٹی کے ساتھ کبھی بھی کوئی رابطہ نہیں رہا اور نہ ہی رابطے کی تمنا۔ میں اپنے کالموں میں نواز لیگ اور پی۔پی۔پی پر کڑی تنقید بھی کرتی رہی ہوں اور اچھے کاموں کی کھُل کر تعریف بھی۔کاسہ لیسی میری سرشت میں نہیں اور مداحی و مداہنت سے نفرت۔ میں جو کچھ دیکھتی ہوں اسے اپنی فہم کے مطابق لکھ دیتی ہوں۔ میرا تجزیہ درست بھی ہو

سکتا ہے اور سرے سے غلط بھی لیکن صحت مند تنقید وہ ہوتی ہے جس میں جذبہ تعمیر مضمر ہو۔ محض کج بحثی سے کسی کا بھلا نہیں ہوتا، نہ ملک کا، نہ قوم کا۔ اگر ہم اپنی اپنی پارٹیوں کے بند خول توڑ کر باہر نکلتے اور اپنے راہبروں کا کڑا احتساب کرتے تو ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن ہمارا المیہ تو یہ ہے کہ ہم ہمیشہ دلکش اور دِل پذیر نعروں کی بھینٹ چڑھتے آئے ہیں، راہبروں کے قول و فعل کو کبھی مدِ نظر نہیں رکھا۔ عمران خاں کے سے بہت سی توقعات وابستہ کر PTI مِنٹو پارک کے کامیاب ترین جلسے تک میں نے بھی رکھی تھیں کیوں کہ اس وقت تک خاں صاحب کا ایک ہی نعرہ تھا کہ وہ نئے پاکیزہ چہروں کے ساتھ انقلاب لائیں گے لیکن پھر خاں صاحب نے اچانک انہی گھسے پٹے آزمودہ چہروں کو ساتھ ملانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمانے لگے کہ ٹکٹ ہولڈروں کی اکثریت پاکیزہ لوگوں پر مشتمل ہو گی لیکن سبھی نہیں، کچھ بُرے بھی ہوں گے۔ اور آج کل یو ٹرن لیتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ میں آسمان سے فرشتے کہاں سے لاؤں، انہی لوگوں پر گزارہ کرنا پڑے گا۔ کوئی بتلائے کہ ان کے کس بیان پر اعتبار کروں؟ پہلے پر یا تیسرے پر؟ اگر ان کا آخری بیان حتمی سمجھ لیا جائے تو پھر پی۔ٹی۔آئی ہی کیوں؟ ن، ق لیگ یا پی۔پی۔پی کیوں نہیں کہ ڈال ڈال پھُدکنے والے یہ لوگ انہی سیاسی پارٹیوں کی پیداوار ہی تو ہیں؟ ان میں کون ہے جس نے کبھی حق کا ساتھ دیا ہو؟ کی مقبولیت کا گراف بہت نیچے آ گیا ہے۔ اگر PTI تحقیق کہ ایسے لوگوں کی شمولیت سے خاں صاحب اکیلے

کو ووٹ دے کر بڑے بڑے PTI میدان میں ڈٹے رہتے تو لوگ دیوانہ اور پروانہ وار بُرج الٹ دیتے جیسا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے جیالوں نے اُلٹے تھے ۔ وہ جیالے جن کی سرے سے کوئی سیاسی شناخت ہی نہیں تھی انہوں نے سارے پُرانے پاپیوں کو ملیا میٹ کرکے رکھ دیا لیکن اب عاشقانِ PTI کو یہ تلخ حقیقت تسلیم کرلینی چاہیے کہ PTI دیگر سیاسی پارٹیوں کی طرح محض ایک سیاسی پارٹی ہے ، کرسی کی دوڑ میں شامل ایک پارٹی ۔ پہلے یہ "خاندانِ سیاست" تین حصّوں میں منقسم تھا اب چار ہو گئے ۔ اب الیکشن ہوں نہ ہوں کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ہونا بہرحال وہی کچھ ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے ۔ پہلے PPP، نواز لیگ ، پھر ق لیگ اور اب شاید عمران لیگ یا آمر لیگ ۔ پتہ نہیں یہ قوم کب تک الیکشن الیکشن کھیل کر اپنی بربادی کا سامان کرتی رہے گی ؟ پتہ نہیں یہ کب اپنے خول سے باہر نکلے گی ؟ پتہ نہیں یہ کب راہبروں اور راہزنوں میں تمیز کرے گی ؟ پتہ نہیں یہ کب سارے نقشِ کُہن مٹانے کا فیصلہ کرے گی ؟ پتہ نہیں ۔۔۔۔ پتہ نہیں ۔۔۔۔

میں نہیں بھول سکتی

میں کسی بھی صورت یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ قوم عقل و شعور نہیں رکھتی۔ میرے سامنے کم از کم دو مثالیں ایسی ہیں جب قوم نے شعوری طور پر اپنی بھرپور طاقت کا مظاہرہ کیا۔ پہلی بار جب بھٹو نے روٹی، کپڑا اور مکان کا انقلابی نعرہ بلند کیا اور قوم نے لبیک کہا حالانکہ یہ وڈیرے اور جاگیر دار اُس وقت بھی اپنے اپنے حلقوں میں اپنی تمام تر رعونت کے ساتھ موجود تھے پھر بھی "بے ناموں" نے ناموں کو بُری طرح پچھاڑ دیا۔ اور دوسری بار جب ایم۔ایم۔اے دینِ مبین کی سربلندی اور امریکہ مخالف نعرہ لے کر میدان میں اُتری تو قوم نے تب بھی شعور کا ثبوت دیا اور سائیکل سوار "مُلّاؤں" نے ناموں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ الیکشن سے ہٹ کر قوم نے بھرپور شعور کا مظاہرہ اُس وقت کیا جب جناب جسٹس علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے اکیلے گھر سے نکلے اور پھر "کارواں بنتا گیا"۔ کسی نے لاٹھی گولی کی پرواہ کی، نہ آمر کی۔ تین، تین گھنٹوں کا سفر تیس تیس گھنٹوں میں طے ہوتا، خواتین بچے، بوڑھے اور جوان "اُس باغی" کی محض ایک جھلک دیکھنے کے لئے پہروں سڑکوں پر کھڑے رہتے اور بالآخر چیف صاحب کو "کرسی عدل" پر بٹھا کے دم لیا۔ اس لئے میں اس "نرالی منطق" کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ عمران خاں صاحب کو "Election Winning" امیدوار درکار تھے جو انہوں نے اکٹھے کر لئے

۔تاریخ کا سبق تو یہ ہے کہ اگر سچی لگن اور جذبہ تعمیر زندہ ہو تو ایک اکیلا بھی کروڑوں پہ بھاری ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے نعرہ مستانہ پہ لبیک کہنے والے لاکھوں کروڑوں بے لوث خود ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔چیف جسٹس اکیلے گھر سے نکلے ،امام خمینی اکیلے نے فرانس میں بیٹھ کر انقلاب برپا کر دیا۔ سترہ سالہ محمد بن قاسم کو اسی لگن نے نو آموز سپاہ کے ساتھ ملتان تک پہنچا دیا۔ اور اسی جذبے نے طارق بن زیاد کو سفینے جلانے پر مجبور کیا۔تاریخ بتاتی ہے کہ نہ محمد بن قاسم کے ساتھ کوئی کہنہ مشق سالار تھا، نہ طارق بن زیاد کے ساتھ ،ہاں مٹھی بھر جانثار ضرور تھے اور تحقیق کہ ایسے عمران خاں کے ساتھ بیشمار ہیں ۔لیکن تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ جرّی سلطان ٹیپو اور نڈر سراج الدولہ کا زوال میر جعفر اور میر صادق کے ہاتھوں ہوا جن پر وہ تکیہ کیے بیٹھے تھے۔دُکھ ہوتا ہے کہ عقابی شان سے ابھرنے والا عمران خاں بھی بے بال و پر نکلا۔

میں خاں صاحب کو نجات دہندہ سمجھنے والوں کی کڑی تنقید کا نشانہ بن رہی ہوں۔خُدا کرے کہ وہ نجات دہندہ ہی ہوں لیکن یا تو میرے اندر کوئی کجی ہے یا پھر میرے مہربان جھوٹ سے سچ کو نتھارنا ہی نہیں چاہتے۔آ قاﷺ کا فرمان ہے کہ " اندھا وہ نہیں جو بصارت سے محروم ہے بلکہ اندھا وہ ہے جس میں بصیرت نہیں" تحقیق کہ قومیں جب ربِ کردگار کی عطا کردہ بصارت و بصیرت سے پہلو تہی کرنے

لگتی ہیں تو پھر اُس کا قہر نازل ہوتا ہے۔فرمانِ ربی ہے "کیا یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ہر سال ایک یا دو بار مصیبت میں پھنسا دیئے جاتے ہیں پھر بھی توبہ نہیں کرتے ، نہ نصیحت پکڑتے ہیں " (سورہ توبہ)۔حال اپنا بھی یہی ہے، تحقیق نہ تدقیق، بس اپنے بنائے ہوئے بتوں کی پوجا، صرف پوجا۔

کہا جاتا ہے کہ فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے مُشرکینِ مکّہ کو بھی تو آقا ﷺ سیدھی راہ پر لے ہی آئے تھے۔دست بستہ عرض ہے کہ "عامیوں" کا موازنہ انبیاء سے کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں۔"چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک"۔پھر بھی عرض ہے کہ سرورِ دوجہاں ﷺ کے سامنے مشرکین تھے جنہیں ان کے دین سے ہٹا کر دینِ مبیں کی طرف راغب کیا جا رہا تھا جب کہ یہاں ایسا کوئی معرکہ درپیش نہیں۔مشرکین روا اور نا روا سے نا واقف تھے جب کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مکمل آگاہ۔جو ایک دفعہ صدقِ دل سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوا صحابی کہلایا۔یہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی عشروں سے اپنی خباثتوں میں گم ہیں۔اسی لئے سیانے کہہ گئے ہیں کہ "آزمودہ را آزمودن جہل است" اگر حضور ﷺ کے دور میں صحابہ اکرام رضوان علیہم تھے تو ابو جہل اور ابو لہب بھی اسی دور میں تھے اور ہاں بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔حضور ﷺ فتح مکّہ کے بعد امامت کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، صحنِ کعبہ میں انسانی سر ہی سر نظر آتے ہیں، حکمِ ربی ہوتا ہے کہ بغلیں کھول کر

دونوں ہاتھ کانوں تک لے جاؤ۔ جب ایسا کیا جاتا ہے تو بغلوں سے تڑاتڑ بُت گرنا شروع ہو جاتے ہیں اور صحنِ کعبہ بتوں سے بھر جاتا ہے۔ کیا پتہ کہ PTI میں دھڑا دھڑ شامل ہونے والے اپنی بغلوں میں حرص و ہوس کے کتنے بُت چھپا کر لائے ہیں۔ بجا کہ "دلوں کے بھید صرف خُدا جانتا ہے" لیکن اُس لم یزل نے ہمیں سوچنے کے لئے دماغ اور پرکھنے کے لئے آنکھیں بھی تو دی ہیں۔ ہم کیوں نہیں سوچتے کہ حضور ﷺ کا پالا "مدینہ النبی میں "گروہِ منافقین" سے پڑا تھا جن کا سردار عبد اللہ ابنِ ابی تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو محض ذاتی مفاد کی خاطر دھڑا دھڑ اسلام لائے لیکن دینِ مبین کو جب بھی ضرورت محسوس ہوئی، رفو چکر ہو گئے پھر جب کچھ بَن نہ پڑا تو حیلوں بہانوں اور منت سماجت سے لوٹ آئے۔ پی۔ٹی۔آئی والو! ذرا سنبھل کے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈال ڈال پر منڈلانے والے یہ بھنورے کل کلاں انہی جیسے نکل آئیں کہ میں تو جب بھی ان کا کچا چٹھا کھول کر بیٹھتی ہوں، حیران رہ جاتی ہوں کہ سرمایہ مِلّت ان ذہین و فطین نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیوں نہیں سوچتے؟۔ شاید یہ بھی جذبات کی رو میں بہہ گئے ہیں۔ لیکن اتنا قصور ان کا بھی نہیں کہ انہیں جو انقلاب آفریں خواب دکھائے گئے تھے یہ شاید ابھی تک ان کے سحر سے آزاد نہیں ہوئے۔

معزز قارئین! میں نے طے کر لیا ہے کہ آج کے بعد پی۔ٹی۔آئی پر کچھ نہیں لکھوں گی ۔میں انتظار کروں گی کہ یہ نسلِ نو خوابِ گراں سے کب جاگتی ہے

تاکہ میں بھی فخر سے کہہ سکوں کہ

گئے دِن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

میرے اب یہاں رازداں اور بھی ہیں

لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ مجھے بھی کبھی عمران خاں کی پُکار میں سچائی کی بُو آتی تھی ۔۔۔۔ میں "سیتا وائٹ" کو بھی بھول گئی اور اُن کے انگلینڈ میں گزارے ہوئے نا قابلِ ستائیش ماضی کو بھی ۔۔۔۔ میں یہ بھی بھول گئی کہ کبھی عمران خاں بذاتِ خود جھنڈا اُٹھائے آمر مشرف کے جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے ۔مجھے نہ یہ یاد رہا کہ آمر مشرف کے ریفرینڈم پر جب سارا پاکستان لعنت بھیج رہا تھا تو خاں صاحب گلی گلی ریفرینڈم کی حمایت میں جلوس نکال رہے تھے ۔۔۔۔ میں نے یہ بھی یاد نہیں رکھا کہ اسی ایم۔کیو۔ایم جس کے ساتھ آج کل وہ محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں ، کسی زمانے میں اسی کے قائد الطاف حسین کے خلاف ثبوتوں کے بریف کیس بھر کر اُسے قاتل ثابت کرنے کے لئے انگلینڈ جانے کا اعلان فرما رہے تھے ۔مجھے کیا ضرورت تھی یہ یاد رکھنے کی کہ جس مشرف کے خلاف وہ برملا اپنی نفرت کا اظہار کرتے چلے آ رہے تھے اُسی کی تخلیق کردہ قاف لیگ کے چوہدریوں کے کندھے سے کندھا ملا کر (جن کا مشرف کو دس بار وردی میں منتخب کروانے کا دعویٰ تھا) خاں صاحب ضمنی الیکشن میں حصّہ لیتے رہے۔ یہ سب بھول جانے کی وجہ وہ گُمان اور حسنِ ظن تھا کہ "حُر" حضرت حسینؓ کو

گرفتار کرنے کے ارادے سے گئے اور آپؓ کا خطبہ سُن کر یوں پلٹے کہ حضرت حُرؓ شہید کہلائے۔ لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شُدی" خاں صاحب نے تو قطار اندر قطار وہ لوگ اکٹھے کر لئے جن پر نیب کے کیس آج بھی عدالتوں میں ہیں، جن کے کارناموں کی فائلیں مقتدر قوتوں کے پاس محفوظ ہیں، جن پر قتل کے الزامات بھی ہیں، جعلسازی اور کرپشن کے بھی۔ جو محض کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ میں نہیں بھول سکتی وہ منظر کہ کراچی کے جلسے میں نیچے لوگ "عافیہ صدیقی" کی رہائی کے بینرز اُٹھائے کھڑے تھے اور اوپر عافیہ صدیقی کو اپنے ہاتھوں سے گرفتار کروانے والا خاں صاحب کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ مجھے اُس وقت "لال مسجد" کی بچیوں کی مسخ شُدہ لاشیں اور جلے ہوئے بستے بُری طرح یاد آئے جب سٹیج پر گردنیں اکڑا کر بیٹھے وہ قاتل نظر آئے جو لاٹھیاں اُٹھا اُٹھا کر اُس سانحے پر مشرف کے حق میں تقریریں کرتے رہے تھے۔۔۔۔ میں کیسے بھول جاؤں جامعہ حفصہ کے پچھواڑے بہتے ہوئے گندے نالے کو جو قُرآنِ پاک کے اوراق سے اٹا پڑا تھا؟ مجرم میرے سامنے تھے اور میں بے بس۔۔۔ جی نہیں، میں نہیں بھول سکتی۔۔۔۔ البتہ ایک شخص مجھے وہاں اجنبی اجنبی سا لگا۔۔۔۔ دیکھیں وہ "باغی" کب بغاوت کرتا ہے؟۔۔۔۔

ہیپی نیو ائیر

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

آج دسمبر کی 31 تاریخ ہے۔آج پھر ہر سال کی طرح ایک ایک کرکے ماضی کے دریچے کھُلنے لگے ۔۔۔ انگنت یادیں پے درپے موتیوں کی طرح لڑیوں میں پروتی چلی گئیں ۔۔۔ نقش اُبھرتے رہے ۔۔۔ تصویریں بنتی رہیں ۔۔۔ مٹتی رہیں ۔۔۔ تصور کی بنجر زمیں پر گلکاریاں ہوتی رہیں ۔۔۔ کبھی نغمے ۔۔۔ کبھی آنسو ۔۔۔ کبھی آہیں ۔۔۔ سب گڈمڈ ہوتے رہے ۔۔۔اور پھر ۔۔۔۔ اچانک ۔۔۔۔ ایک چہرہ اُبھرا ۔۔۔۔۔ ہنستی مسکراتی آپا شمیم کا چہرہ ۔۔۔ جوڑے میں سوٹ کے ساتھ میچنگ پھول لگانے والی ، اپنے بچوں کے کام کرتے ہوئے کبھی نہ تھکنے والی آپا شمیم ۔۔۔ جس کی جان اپنے بچوں کی خوشیوں میں اٹکی ہوئی تھی ۔۔۔ جس کے لیے اُس کی پوری کائینات اُس کا بیٹا راحیل اور بیٹی صائمہ تھے ۔۔۔

ماں ۔۔۔ ممتا کا اپنا انوکھا ہی انداز ہوتا ہے ، جس کے دل میں جذبات کی گہرائیاں پوری شدّومد سے اُبھرتی ہیں اور اپنی اولاد کو زمانے کی سرد و گرم ہواؤں سے بچانے کے لیے اس طرح اپنی اوٹ میں چھُپا لیتی ہے جیسے مرغی اپنے ننھے مُنّے چوزوں کو اپنے پروں تلے چھپا لیتی ہے ۔ماں کا پیار سُچے موتیوں

سے بڑھ کر قیمتی اور شہد سے میٹھا ہوتا ہے۔اُس کے تبسم کی اوٹ میں بچوں کی مسکراتی جبینیں چمکتی ہیں۔یہ مائیں ہی تو ہوتی ہیں جو زندگی کی تمام اُمیدیں اپنے بچوں سے وابستہ کیے، دُکھ پہ دُکھ جھیلتی چلی جاتی ہیں اور جب بچے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتے ہیں تو وہ یہ سمجھتی ہیں کہ دُنیا نے اُن کے سر پر کوہِ نور جڑا تاج رکھ دیا ہے۔گویا زندگی کا ہشاش بشاش پہلو بھی ماں سے جڑا ہے اور افسردہ بھی۔۔۔ماں کے بنا کائینات کی رنگا رنگی فضول و بے معنی ہے۔۔۔آپا شمیم بھی انہی ماؤں میں سے ایک تھی جو ساری زندگی اپنے بچوں کی خوشیوں کے لیے تگ و دو کرتی رہی آج اُس کے سر پر کوہِ نور جڑا تاج رکھنے کی باری آئی تھی۔۔۔گھر میں ہر طرف گہما گہمی تھی،۔۔۔خوشیوں کی برسات تھی۔۔۔اس لیے کہ جنوری کی 30 تاریخ کو راحیل کی شادی جو ہونے والی تھی۔۔۔تیاریاں زوروں پر تھیں۔۔۔راحیل نے ایک سال پہلے میڈیکل مکمل کیا تھا اب ہاؤس جاب بھی ختم ہونے کو تھا۔۔۔آج دسمبر کی 31 تاریخ تھی، ٹیلی وژن پر نیو ائیر کے رنگا رنگ پروگرام چل رہے تھے۔نئے سال کی مبارک باد دی جا رہی تھی۔رنگ و نور کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔موبائل فون پر دھڑا دھڑ مبارک باد کے میسجز آ رہے تھے۔۔۔گھر مین روڈ پر واقع ہونے کی وجہ سے باہر کی۔۔۔ہا۔۔ہو۔۔۔کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔۔۔کچھ آوارہ منش نوجوان بنا سلنسر کے موٹر بائیک پر ریسیں لگا رہے تھے۔۔۔ون ویلنگ کر رہے تھے۔۔۔کھڑکی میں سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔۔۔اتنے

میں چند منچلوں کا ٹولا گذرا جو سڑک کے بیچ گاتے بجاتے، جھومتے جھماتے جا رہے تھے ۔۔۔ دور کہیں آتش باری ہو رہی تھی ۔۔۔ میں بھی آپا شمیم کے ہاں ڈنر پر مدعو تھی ۔۔۔ کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر کا سارا منظر دیکھ رہی تھی اتنے میں راحیل کچھ سوچتے ہوئے بولا " بابا جانی ! ہم مسلمانوں کا سال تو ہجری ہے جب کفارِ مکہ کی 31 سالہ جبر و تشدد کا خاتمہ ہوا تھا " ۔۔۔ ہاں بیٹا راحیل ! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ نیو ائیر اور ویلنٹائن ڈے تو عیسائیوں کے تہوار ہیں لیکن آج کل مسلمانوں میں قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں ۔۔۔ تم دیکھ رہے ہو ناں کہ شدید سردی میں کتنی بے حیائی سے سڑکوں پر مدہوشی کی حالت میں رقص کرتے جا رہے ہیں ۔۔۔ ستم تو اس بات کا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ان تمام بے حیائی کی محفلوں اور اخلاق سوز پروگراموں کا انعقاد سرکاری سر پرستی میں ہوتا ہے ۔۔۔ اسی لیے تو آج کے دن پولیس بھی آنکھیں اور کان بند کیے بیٹھی ہے، شائد وہ بھی ہیپی نیو ایئر منانے میں مشغول ہیں ۔۔۔ صائمہ، جو بڑی دلچسپی سے اپنے بابا کی باتیں سُن رہی تھی اُس سے مزید برداشت نہیں ہوا اور بولی " بابا جانی ! کتنی بُری بات ہے کہ ہم عیسائیوں کی رسم کو اس جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے ناں ؟ " ۔۔۔ بیٹی ! تم صحیح کہہ رہی ہو ہمیں تو ہجری سال کو محرّم الحرام کا چاند دیکھ کر خوش آمدید کہنا چاہیے اور اس کے لیے پوری امت مسلمہ کی کامیابی و کامرانی کے لیے خصوصی دعائیں مانگنی چاہییں۔ اپنی بخشش کی دعائیں مانگنی چا

ہیں۔ حضرت عمرؓ کا یہ سنہری کارنامہ ہے کہ انہوں نے سنِ ہجری کا اجراء کیا اور آغاز محرم الحرام سے کیا کیونکہ اللہ نے محرم الحرام اور ذی الحجہ کو حرام مہینے قرار دیا ہے۔ جن میں جنگ و جدل اور لڑائی جھگڑا سب حرام قرار دیئے گئے ہیں۔ اسلام تو ہے ہی امن اور سلامتی کا مذہب اس لیے اسلامی سال کا آغاز بھی امن سے اور انجام بھی۔"

۔۔۔ راحیل کے بابا ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ٹھاہ ۔۔۔ ٹھاہ ۔۔۔ کی آوازیں آنے لگیں۔ راحیل جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔ پیچھے ہی صائمہ بھی ۔۔۔ ابھی راحیل دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ زناٹے کے ساتھ ایک بے رحم گولی آئی اور راحیل کے دل کے آر پار ہو گئی۔ شائد وہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ خون کا فوارہ ابھرا ۔۔۔ بہن کی چیخ سنائی دی ۔۔۔ سب بھاگے بھاگے اوپر گئے ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ راحیل نیو ائیر کی بھینٹ چڑھ چکا تھا ۔۔۔ کتنی ہی ماؤں کے لختِ جگر نیو ائیر کی بھینٹ چڑھے ہونگے ۔۔۔ کتنی ہی بہنوں کے بھائی داغِ مفارقت دے گئے ہونگے ۔۔۔ کبھی ون ویلنگ کرتے ہوئے تو کبھی گولی کا نشانہ بن کر ۔۔۔ کبھی نہ آنے کے لیے ۔۔۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ۔۔۔ ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ماں نے بیٹے کو خون میں لت پت دیکھا تو اپنے ارمانوں کے جنازے کو کندھا دینے کے خوف سے وہیں ڈھیر ہو گئی ۔۔۔ باپ حیران حیران آنکھوں سے کبھی بیٹے

کو تکے جا رہا تھا تو کبھی بیوی کو۔۔۔ بہن پر سکتے کا عالم تھا۔۔۔ ایک۔۔۔ صرف ایک پل میں ہنستا بستا گھر ویران کھنڈر بن گیا۔۔۔ وہ ماں جو اپنے بچے کی ذرا سی پریشانی پر یوں بلکتی تھی کہ اسے دیکھ کر دریا کی روانی بھی تھم جائے آج موت نے اُس کے لبوں پر مہر خامشی ثبت کر دی تھی۔۔۔ زندگی میں کبھی بیٹے کو تنہا نہیں چھوڑا تھا تو آج اپنے لختِ جگر کو اکیلا کیسے جانے دیتی۔۔ بیشک زندگی اُس ذاتِ پاک کی امانت ہے۔ ہم سب کو لوٹ کر آخر کار اپنے خالقِ حقیقی کے پاس ہی تو جانا ہے۔ فرق صرف آگے پیچھے کا ہے لیکن دائمی جدائی کی کسک پیچھے رہ جانے والوں کو بیقرار تو رکھتی ہے ناں۔۔۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں۔۔۔ اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اس سانحے کو آج 6 سال گذر چکے ہیں لیکن ہر سال جب دسمبر کی 31 تاریخ کو رقص و سرور کی یہ محفلیں اور سڑکوں پر ناچتی گاتی ٹولیوں کو دیکھتی ہوں تو وہی دلدوز منظر یوں آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے جیسے کسی نے فلم چلا دی ہو۔۔۔۔ نیو ائیر منانے والوں سے میرا یہ سوال ہے کہ یہ جو خوشیاں منائی جاتی ہیں۔۔۔ آخر کس بات کی؟؟؟

کیا زندگی کا ایک سال کم ہونے کی؟۔۔۔ کیا موت کے ایک سال مزید قریب آنے کی

؟ ۔۔۔ کیا ایسے تہوار کا اسلامی جمہوریہ پاکستان کی تہذیب و ثقافت سے کوئی تعلق ہے ؟ ۔۔۔ کیا یہ تہوار ہر لحاظ سے غیر شرعی نہیں ؟ ۔۔۔ کیا ایسے تہوار کی ہماری اقدار میں کہیں بھی گنجائش ہے ؟ ۔۔۔ کیا عیسوی سال ہی مسلمانوں کے لیے اہمیت کا حامل ہے ؟ ۔۔۔ اگر ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر ہم ہر سال اس تہوار کو منانے کے لیے کروڑوں روپیہ پانی کی طرح کیوں بہا دیتے ہیں ؟ ۔۔۔ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے ہمارے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سربراہان اس غیر شرعی رسم کی سرپرستی کیوں کرتے ہیں ؟ ۔۔۔ آخر کیوں ؟ ۔۔۔

نوٹس ملیاتے۔۔۔۔۔

کئی دنوں سے ذہن مائل ہو رہا تھا نہ ہی قلم قائل۔ کئی بار قلم پکڑا۔دو چار جملے لکھے اور پھر بیزاری میں قلم پھینک دیا۔آخر انسان لکھے تو کیا لکھے اور کیوں لکھے کہ جب اپنے لکھے سے کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ نہیں کہ ذہن کو گھُن چاٹ گیا ہو یا پاکستان میں راوی عیش ہی عیش لکھتا ہو۔ہم تو اس دیس کے باسی ہیں کہ جہاں ہر روز منصورِ حقیقت کو سولی پہ چڑھایا جاتا ہے، جہاں جا بجا آنسوؤں کے جھرنے بہتے ہیں اور جہاں کوچہ و بازار میں امراض کے تندوروں سے نکلے ہوئے جسم سسک سسک کر دم توڑتے ہیں۔ یہ وہ دھرتی ہے جہاں سارے معیشت دان بے بس ہیں کہ ہماری معیشت تو صرف پیٹ کی معیشت ہے جس کا علاج دورِ حاضر کے ماہرین کے پاس نہیں کیوں کہ ان کے نزدیک دو اور دو چار ہوتے ہیں جب کہ ہمارے نزدیک دو اور دو چار روٹیاں۔شاید یہ کرہ ارض کا واحد خطہ ہے جہاں آئین ساز ہی آئین شکن ہیں ۔صدرِ مملکت کے دِل کے بہت قریب ایک سابق وزیرِ قانون اور جعلی ڈاکٹر نے بے غیرتی، بے شرمی اور بے حیائی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ "نوٹس ملیاتے کچھ نہ ہلیا" ایک عام پنجابی بھی اس غلیظ جملے کا مطلب بہت اچھی طرح جانتا ہے جو اس بدزبان نے کہا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک معزز جسٹس نے یہاں تک کہہ دیا کہ انہیں اس گیارہ رُکنی بنچ سے

الگ کر دیا جائے۔ یہ وہی شخص ہے جو آمر ضیاء لحق کی کاسہ لیسی میں انسانیت کی ساری حدیں پار کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو اور بینظیر شہید کے لئے گندی زبان استعمال کیا کرتا تھا۔ یہ وہی ہے جس نے بھٹو کو پھانسی دینے والے جلاد تارا مسیح کے حق میں جلوس نکالا تھا۔ زرداری صاحب نے تو خیر چُن چُن کے اپنے گرد ایسے لوگ اکٹھے کر لئے ہیں جنہیں بی بی نے کبھی گھاس تک نہیں ڈالی تھی ۔ سوال مگر یہ ہے کہ آخر جیالوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے ؟۔ کیا انہوں نے کبھی سوچا کہ آخر پی۔پی۔پی کی زمامِ کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں کیوں ہے جن کا پی۔پی۔پی کے ساتھ ماضی میں شدید نفرت کا رشتہ تھا ؟۔ سُنا ہے کہ جیالا مرتے دم تک جیالا رہتا ہے لیکن یہ کیسے جیالے ہیں جو اپنے ہی دورِ حکومت میں شہید بی بی کے قاتلوں کا سُراغ تک نہیں لگا سکے ۔ زبانِ خلق ہمیشہ نقارہ خُدا ہوتی ہے ۔ اگر جیالا نامی یہ مخلوق بی بی کے قاتلوں کو واقعی نہیں جانتی تو پھر زبانِ خلق پہ ہی دھیان دے لے ، سب کچھ کھُل جائے گا۔ لیکن اگر وہ مصلحتاً خاموش ہیں تو پھر انہیں جیالا کہنا ہی "جیالے پن" کی توہین ہے ۔

مجھے افتخار محمد چوہدری نامی شخص سے کچھ لینا دینا نہیں ۔ کوئی انہیں کچھ بھی کہے ، مجھے کیا ۔ لیکن چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی توہین کرسی عدل ، میزانِ عدل اور ملک و قوم کی توہین ہے ، یہ توہین کسی بھی غیرت مند

پاکستانی کے لئے نا قابلِ برداشت ہے۔اعلیٰ عدلیہ کے انتہائی معزز و محترم اراکین کو یہ یاد رکھنا ہو گا کہ قوم نے نخلِ عدل کی اپنے خون سے آبیاری اس لئے نہیں کی تھی کہ ایک بد باطن سرِ عام اس پر کیچڑ اچھالے۔دست بستہ عرض ہے کہ ہمیں دیگر کیسز پہ کچھ لینا دینا نہیں لیکن یہ براہِ راست قوم کی توہین کی گئی ہے اس لئے ایسے بد فطرت کو نشانِ عبرت بنایا جانا عین انصاف ہے۔یہ مطالبہ ہم صدر اور وزیرِ اعظم سے بھی کر سکتے تھے لیکن وہ تو شاید "سیاسی شہید" بننے کے لئے خود ہی یہ سارا تماشہ رچا رہے ہیں ۔حالانکہ ان کے کرتوت ہی ایسے ہیں کہ اب وہ سیاسی شہید بنیں یا سندھ کارڈ لہراتے پھریں، قوم پر کچھ اثر نہیں ہونے والا۔

پی۔پی کی موجودہ حکومت کا گزشتہ چار سال سے طریقہ واردات ہی یہ رہا ہے کہ جب بھی ان کی کشتی منجدھار میں پھنستی ہے تو وہ قوم کی توجہ دوسری جانب مبذول کرنے کے لئے کئی نئے ایشو کھڑے کر دیتی ہے۔میموگیٹ سکینڈل اور NRO میں بری طرح پھنسنے کے بعد وزیرِ اعظم کو اچانک "سرائیکی صوبے" سے جنونی عشق ہو گیا اور MQM نے ہزارہ اور سرائیکی صوبے کی قرارداد قومی اسمبلی میں غالباً انہی کی شہہ پر پیش کر دی۔باقی سارے معاملات گئے بھاڑ میں اور اب صوبے صوبے کھیلتے ہوئے قومی اسمبلی میں جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔

یہ ایم۔ کیو۔ ایم بھی کیا خوب ہے۔ اس کی نہ تو پنجاب میں کوئی نمایندگی ہے اور نہ صوبہ خیبر پختون خواہ میں لیکن ان کے سینے میں درد انہی دو صوبوں کے لئے اٹھا ہے۔ جس صوبے کے ایک مخصوص حصے میں اس کی نمائندگی ہے اس کے باسی کہتے ہیں کہ سندھ کی تقسیم ان کی لاشوں پر سے گزر کر ہوگی۔ شاید ایم۔ کیو۔ ایم ابھی تک "جناح پور" کے سحر سے آزاد نہیں ہوئی۔ اس کا خیال ہوگا کہ اگر دیگر صوبوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں تو شاید ان کی بھی اُمید بر آئے ورنہ جو جماعت کراچی کے پانچ ضلعے بنانے پر تلملا اُٹھے اور مرنے مارنے پر اتر آئے، وہ بھلا ایسا کام کیوں کرے گی۔ ویسے ماشا اللہ یہ وہ "سبز قدم" جماعت ہے جو جب سے معرضِ وجود میں آئی ہے لوگوں کا چین اور سکون غارت ہو کے رہ گیا ہے۔ خود ان کا قائد موت کے خوف سے 1992ء سے انگلینڈ میں پناہ لئے بیٹھا ہے اور یہ کبھی پنجاب کو "ٹریاں" لگاتے ہیں اور کبھی خیبر پختون خواہ کو۔ یہ "بے قائد" جماعت پہلے اپنا کوئی قائد ڈھونڈ لے، پھر بات کرے۔ آخر یہ کب تک سات سمندر پار بیٹھے ایک غیر ملکی کے ذریعے قوم کو بیوقوف بنانے کی کوشش کرتی رہے گی۔ اگر قومی دھارے میں شامل ہونا ہے تو پھر قوم ہی سے کوئی راہبر تلاش کرنا ہوگا۔

میمو گیٹ اور عدالتی کمیشن

وزیرِ اعظم یوسف رضا گیلانی جعلی نمبر پلیٹ لگا کر لینڈ کروزر میں سپریم کورٹ تشریف لائے ،اپنی حفاظت پر کروڑوں خرچ کر ڈالے اور فرمایا کہ وہ سپریم کورٹ کے احترام میں آئے ہیں جبکہ دھرتی کو ماں کے جیسی کہنے والے اعتزاز احسن نے فرمایا کہ سوئس کورٹ کو خط نہ لکھنا بدنیتی پر مبنی نہیں ، خط لکھنے کی نیت ہے لیکن صلاحیت نہیں کیونکہ آئین اجازت نہیں دیتا۔خیال تھا کہ اعتزاز احسن کی پٹاری میں بہت کچھ ہو گا لیکن اتنے نامی وکیل نے وہی کچھ کہا جو ایک عام فہم شخص بھی کہہ رہا تھا شاید وہ یہ سوچ کر آئے ہونگے کہ ان کے احسانوں کے بوجھ تلے دبی عدلیہ انہیں دیکھتے ہی ہتھیار ڈال دے گی ا ورانہیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔اس سے قطع نظر کہ موصوف چند روز پہلے تک یہی ڈھنڈورا پیٹتے رہے کہ حکومت خط نہ لکھ کر غلطی کر رہی ہے اور اب بالکل متضاد سٹینڈ لے لیا ہے۔سوال مگر یہ ہے کہ اعتزاز صاحب یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ خط نہ لکھنے میں بدنیتی شامل نہیں تھی۔؟پہلی بات تو یہ کہ سوئس کیس سرے سے استثنا کا معاملہ ہی نہیں تھا۔اعلیٰ عدلیہ کے فیصلے کے مطابق حکومت کو ملک قیوم کی طرف سے لکھے گئے خط کو واپس لینا ہے کیوں کہ ایسا خط لکھنا کسی بھی اٹارنی جنرل کے دائرہِ اختیار میں نہیں آتا۔اس میں صدارتی استثناء کہاں سے

آ گیا ؟۔ اگر حکومت بضد ہے کہ یہ استثنائی معاملہ ہے تو پھر حکومت پچیس ماہ تک انتظار کیس کی سماعت کے دوران کیوں نہ اٹھایا ؟۔ دسمبر 09 NRO کیوں کرتی رہی یہ نکتہ کے دوران سپریم کورٹ بار بار کہتی رہی کہ اگر صدر کو استثنیٰ Re-View ہیں جب ہے تو درخواست کی جائے ، کیوں کہ یہ فیصلہ بھی سپریم کورٹ نے کرنا ہے کہ استثنیٰ ہے یا نہیں۔اب جب کہ کورٹ نے فیصلہ سنا دیا اور توہینِ عدالت کا الزام بھی عائد کر دیا گیا اب اعتزاز صاحب کو اچانک استثنیٰ یاد آ گیا ؟ کیا یہ صریحا بدنیتی نہیں تھی ؟ کیا یہ بَدنیتی ، نہیں تھی کہ کورٹ سے ایک ماہ کا وقت حاصل کر کے کسی نہ کسی صورت میں 23 نہ ہو سکے Re open فروری تک کیس کو لٹکا دیا جائے تاکہ سوئس عدالت میں کیس اور نہ رہے بانس ، نہ بجے بانسری، ؟۔بطور وکیل اعتزاز صاحب جتنے جی چاہے پینترے بدلیں لیکن بطور سیاست دان قوم ان سے یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہے کہ اس طویل نظم کا کیا ہوا جس سے قوم کو مستقبل کے سہانے خواب دکھا کر کئی ماؤں کی کوکھیں اجاڑی گئیں کئی گھروں میں صفِ ماتم بچھی اور کئی سہاگنوں کو بیوگی کی دہلیز پر اپنی چوڑیاں توڑنی، پڑیں؟ سانحہ 12 مئی کراچی کا حساب کون دے گا، زندہ جلا دیئے گئے وکلاء کی راکھ کو وہ کس گنگا میں بہانے کا مشورہ دیں گے ؟۔اگر ڈاکٹر اسرار شاہ کی کٹی ہوئی ٹانگوں اور ساہیوال کے تیزاب سے جھلسے ہوئے وکیلوں کی قربانیوں کا مآل یہی ہے تو پھر آفرین ہے اعتزاز صاحب پر۔

فیصلہ تو خیر کورٹ نے کرنا ہے جو یقیناً اعتزاز آحسن کا چہرہ دیکھ کر نہیں کیا جائے گا لیکن یہ بہر حال مسّلم الثبوت ہے کہ حکومت ججز کی بحالی سے لے کر کل تک بد نیت تھی اور آج بھی ہے۔ پچھلے دنوں حامد میر کو دیئے گئے انٹرویو میں صدر زرداری پوری قطعیت سے یہ کہہ چکے ہیں کہ سوئس حکومت کو خط لکھنا بے نظیر کی قبر کے ٹرائل کے مترادف ہے۔انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ بی بی شہید ہیں اور اسلام میں شہید کے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ بجا ارشاد لیکن بہتر ہوتا کہ زرداری صاحب پہلے دینِ مبین کے "فلسفہ شہادت" کو سمجھ لیتے یا کسی مفتی سے فتویٰ لے لیتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی ذات کا دفاع کرتے کرتے وہ "بی بی" کو بھی متنازع بنا دیں جیسے "بھٹو مرڈر کیس" کو Re open کروا کر وہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو متنازع بنا چکے ہیں۔ ہمارے ہاں تو کئی متنازع شہید ہیں۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک ضیاء الحق آمر تھے جب کہ کثیر تعداد انہیں بھی شہید گردانتی ہے۔ صدر صاحب تو خود ضیاء الحق کی قبر کا ٹرائل کروا رہے ہیں ۔ضیاء کے متوالے بھی تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ "شہید" کے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ البتہ اگر PPP "سیاسی شہادت" کی طلبگار ہے تو الگ بات ہے کہ PPP کو سیاسی اکھاڑے میں کودنے کے لئے ہمیشہ ایک شہید درکار ہوتا ہے۔اب کی بار "سیاسی شہادت ہی سہی ۔ویسے بھی محترم زرداری صاحب اس فن میں طاق ہیں۔انہوں نے تو اپنے پورے خاندان کو "بھٹو" بنا ڈالا،

سیاسی شہادت کو اصلی شہادت کا روپ دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے بد زبان و بد کلام بابر اعوان کو عدلیہ کی توہین کا ٹارگٹ دیا گیا تھا۔ اس نے اپنی معطلی پر ایک دفعہ پھر عدلیہ کی توہین کی لیکن اس بار اس نے انتہائی منافقت سے کام لیتے ہوئے "واللہ ھو خیر الرازِقین" کہہ کر اعلیٰ عدلیہ کو یہ پیغام دیا کہ معطلی کی اسے کوئی پرواہ نہیں۔ کیونکہ اس کا رزق ججز کے ہاتھ میں نہیں۔ بابر اعوان کی معطلی پر علی احمد کرد بڑے عرصے بعد ایک دفعہ پھر اپنی زلفوں کو لہراتے مٹکاتے نظر آئے۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ توہینِ عدالت کے قانون کو نہیں مانتے اور پارلیمنٹ کو چاہیے تھا کہ اٹھارھویں ترمیم میں آئین کے اس آرٹیکل کو بھی ختم کر دیتی۔ ایک وکیل کی زبان سے یہ جملے سن کر یقیناً وکلاء کے سر شرم سے جھک گئے ہونگے جب کہ ایک عام شہری یہ سوچ رہا ہے کہ اگر وہ علی احمد کرد کی زلفوں اور عدلیہ بحالی تحریک کے دوران کی گئی مجنونانہ حرکتوں پر لکھ دے تو کُرد صاحب فوراً ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کر دیں گے لیکن اگر ایک جعل ساز کورٹ کے احاطے میں یہ کہہ دے کہ "نوٹس ملیا تے ککھ نہ ہلیا" تو توہینِ عدالت کا قانون ہی ختم کر دیا جائے۔ کیا (خاکم بدہن) معزز و محترم جسٹس صاحبان علی کرد سے بھی "گئے گزرے" ہیں؟ شاید کرد صاحب پنجابی زبان سے نابلد ہیں وگرنہ وہ ایسی بات کبھی نہ کہتے کیونکہ اس جملے کے پنجابی میں انتہائی غلیظ معانی نکلتے ہیں۔ اعلیٰ عدلیہ نے بابر اعوان کی تمام تعلیمی اسناد اور دیگر ریکارڈ

منگوا لیا ہے اب سب کو پتہ چل جائے گا کہ پاکستان میں جعلی ڈاکٹر بھی وزارتِ قانون کا قلمدان سنبھال سکتے ہیں ، لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں ، اگر میٹرک پاس OGDC کے چیئر مین بن سکتے ہیں تو بابر اعوان وزیرِ قانون کیوں نہیں ؟ یہ NICLاور کلب مینجر اعلیٰ عدلیہ کے لئے بھی "ٹیسٹ کیس" ہے۔ تحقیق کہ اگر بابر اعوان کو اس کی سزا نہ دی گئی تو قوم کا عدلیہ پر سے بھی اعتماد اُٹھ جائے گا اور وہ یہ سوچنے میں حق بجانب ہو گی کہ اگر اعلیٰ عدلیہ میزانِ عدل کی حرمت کی حفاظت سے معذور ہے تو پھر اسے خاموشی سے مستعفی ہو کر گھر چلے جانا چاہیے ۔قوم خود ہی ان سے حساب لے لے گی۔ لیکن چیف صاحب تو یہ کہتے ہیں کہ "ہمیں اپنے فیصلوں پر عمل کروانا آتا ہے" ۔بجا ارشاد لیکن قوم عمل درآمد کی منتظر ہے کیونکہ کم از کم 55 فیصلے تو ایسے ہیں جن پر ابھی تک عمل نہیں ہوا اور میگا کرپشن کے سارے کردار کھلے عام دندناتے پھر رہے ہیں، مجرمان ایوانِ صدر یا ایوانِ وزیرِ اعظم میں پناہ لئے ہوئے ہیں ، عدلیہ جس پر مقدمہ درج کرنے کا حکم دیتی ہے اسے چیف سیکرٹری بنا دیا جاتا ہے اور جسے سزا دیتی ہے اسے ایوانِ صدر سے معافی مل جاتی ہے۔

محترم چیف صاحب ! سو صفحات پر مشتمل آئین نامی دستاویز تو اشرافیہ کے گھر کی لونڈی ہے ۔اگر ایسا نہیں تو پھر عوامی استحصال کے آرٹیکل 3 پر آج تک عمل کیوں نہیں ہوا ؟۔آرٹیکل 251 کے تحت 15 سال میں اردو کو قومی زبان کیوں نہیں

بنایا گیا؟۔ غداری کے آرٹیکل 6 اور نااہلی کے آرٹیکلز 62 اور 63 کو آج تک استعمال کیوں نہیں کیا گیا؟ اور سب سے بڑھ کر آرٹیکل 228 کے تحت اسلامی نظریاتی کونسل نے تمام قوانین کو 7 سال میں اسلامی ڈھانچے میں کیوں نہیں ڈھالا؟ آج تو اعتزاز احسن اپنی پارٹی کا حقِ نمک ادا کرتے ہوئے استثناء کے ڈھنڈورچی بنے پھرتے ہیں لیکن کچھ ہی عرصہ قبل اسی معزز عدالت میں پرویز مشرف کے استثنا کے خلاف وہ بڑے جذباتی انداز میں حضرت عمرؓ کے دور کی مثالیں دے رہے تھے۔ کیا ہوا جو اعتزاز صاحب نے پارٹی بدل لی ہے۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا آرٹیکل 248 واضح طور پر آرٹیکل 228 سے متصادم نہیں؟۔ اگر ایسا ہے تو پھر یا تو استثنائی آرٹیکل 248 کو ختم کر دیں یا 228 کو کیونکہ پارلیمنٹ جو چاہے کہتی پھرے۔ لیکن آئین کی تشریح کا اختیار تو بہرحال عدلیہ ہی کے پاس ہے

وزیرِ اعظم یوسف رضا گیلانی صاحب سرگودھا کے جلسہ عام میں فرما رہے تھے کہ بیساکھیوں پر آنے والے انقلاب نہیں لا سکتے۔ بالکل بجا کہا، ان کی حکومت واقعی ایم۔کیو۔ایم، اے۔این۔پی، ق لیگ اور ان جیسی کئی دیگر بیساکھیوں کے سہارے چل رہی ہے۔ اس سے انقلاب کی توقع رکھنا عبث ہے البتہ وہ کرپشن میں واقعی ایسا انقلاب لا چکی ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ پی۔پی۔پی مل بانٹ کر کھاتی ہے اسی لئے اس کے اتحادی خوش اور اس کی

اور میمو گیٹ سکینڈل میں بری NRO آواز پر لبیک کہتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ
طرح پھنسنے کے بعد اس نے ایم۔کیو۔ایم کو مدد کے لئے پکارا اور اس نے نئے صوبوں کا
جو خود تو کراچی کے پانچ ضلعے بنانے پر تلملا اٹھتی ہے وہ ہزارہ اور MQM شوشہ چھوڑا۔
سرائیکی صوبہ کی قرار داد اسمبلی میں لے آئی حالانکہ اس کی نہ تو سرے سے صوبہ خیبر
کی ملک میں افراتفری پیدا MQM پختونخواہ میں نمائندگی ہے اور نہ ہی پنجاب میں ۔یہ
کرنے کی محض ایک سازش ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔یوں محسوس ہوتا
جناح پور" کے سحر میں ابھی تک گرفتار ہے۔اس کا خیال ہوگا کہ " MQM ہے کہ جیسے
شاید اسی طریقے سے اس کے دیرینہ خواب کی تکمیل ہو سکے اور وہ 1992 ء کے
بھگوڑے قائد کو واپس لا سکے ۔اس معاملے میں اے۔این۔پی اور نواز لیگ کا موقف نہ
صرف صائب بلکہ قابلِ عمل بھی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جو پارٹی نئے صوبے بنانا چاہتی ہے
وہ آمدہ الیکشن میں اپنے ایجنڈے میں رکھے اور اگر عوام اسے کامیاب کریں تو بسم اللہ۔
آئینی ترمیم کے لئے دو تہائی اکثریت کسی صورت میں بھی حاصل نہیں کر سکتی MQM
۔یہ محض دیگر معاملات سے توجہ ہٹانے کا ایک ڈھونگ ہے ۔کیا پی۔پی۔پی ایسے
ہتھکنڈوں سے قوم کی توجہ این۔آر۔او اور میمو گیٹ سے ہٹا سکے گی؟ ۔یہ بجا کہ طرح
طرح کی دھمکیوں اور شدید امریکی دباؤ کی بنا پر منصور اعجاز نے پاکستان آنے سے انکار
کے سربراہ کے حلفی ISI کر دیا لیکن یہ عدالتی کمیشن تو چیف آف آرمی سٹاف اور
بیانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قائم کیا گیا تھا۔اس کو منطقی انجام

"Point کے معاملے پر اعلیٰ عدلیہ NRO تک پہنچانا بھی اب انہی کی ذمہ داری ہے۔
پر فیصلہ حکومتی ایماپر ہی آنا ہوتا تو قوم NRO پہ پہنچ چکی ہے۔اگر "of no return
کو پچیس ماہ کی سولی پر نہ لٹکایا جاتا۔اس لئے پی۔پی۔پی اپنی خواہش کے مطابق "سیاسی
شہید" تو بن سکتی ہے لیکن اپنی مرضی کے فیصلے نہیں کروا سکتی۔

محوِ حیرت ہوں کہ ۔۔۔۔

کوئی کچھ بھی کہے ، سچ مگر یہ ہے کہ بڑے بڑے بزر جمہر اور افلاطونی لکھاری اکثر خاک چاٹتے اور منہ کی کھاتے نظر آتے ہیں۔وجہ شاید یہ کہ ہماری دُنیائے سیاست کُل عالم سے "ذرا ہٹ کے" ہے۔لکھاری حضرات سیاسی اخلاقیات ، خودی ، خود داری اور غیرت و حمیّت کو مدِّ نظر رکھ کر تجزیہ کرتے ہیں جب کہ ہمارے سیاست دانوں کی موجودہ کھیپ کا ان "فضولیات" سے دور کا رشتہ بھی نہیں لیکن ۔۔۔۔۔۔" وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں" ۔۔۔۔۔۔۔کے مصداق نہ لکھاری اپنی قطعی اور الہامی تجزیہ نگاری سے باز آتے ہیں اور نہ وہ اُن کی درگت بنانے سے ۔ میں کئی ایسے معتبر لکھاریوں کو جانتی ہوں جو PPP حکومت کے خاتمے کی تاریخ پہ تاریخ دیتے چلے گئے ، حتیٰ کہ کچھ "بزرگوں" نے تو شرطیں بھی باندھ رکھی تھیں لیکن نہ "تخت نشیں" کا کچھ بگڑا نہ "گدی نشیں" کا ، البتہ انہوں نے قوم کو 8500 ارب کا ٹیکہ لگا کر بڑے رسان سے کہہ دیا کہ اب نہ اندر جا رہے ہیں نہ باہر اور نہ ہی اوپر ۔۔۔۔۔ گویا کہ کر لو جو کرنا ہے ۔۔۔۔ اندر اور باہر بھیجنے کا فریضہ تو خیر ہم نے فوج کے سپرد کر رکھا ہے جسے آج کل ایسے "فضول" کاموں میں ہاتھ ڈالنے کی فرصت نہیں ویسے بھی پڑھے لکھے فلاسفر ٹائپ جنرل کیانی صاحب کسی بھی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے "گہرے مراقبے" میں چلے

جاتے ہیں اس لئے ان سے کوئی توقع عبث ہے۔ فوج سے مایوس لکھاریوں کی امید بھری نظریں اعلیٰ عدلیہ پر اٹھتی رہیں لیکن ان کی لمبی لمبی تاریخوں نے بھی طبیعت "آوازار" کر دی۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو سارا غصہ نکل گیا بیچاری "نواز لیگ" پر۔ اب ہر کوئی یہ کہتا پھرتا ہے کہ صرف نواز لیگ ہی حکومت کو "ٹف ٹائم" دے سکتی تھی لیکن "بڑے بھائی" نے "چھوٹے بھائی" کی ایک نہ سنتے ہوئے "منہ بولے بھائی" کو ہمیشہ بحرانوں سے نکالا اور جب کبھی کسی "نویدِ خوش کُن" کی اُمید بندھی تو وہ خم ٹھونک کر میدان میں اترے اور تخت نشینوں کو صاف بچالے گئے پھر بھی یہ دعویٰ کہ "فرینڈلی اپوزیشن" نہیں ؟۔

خیر چھوڑ یئے اس اندر باہر کے فسانے کو۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ آخر "گدی نشینوں" کی پہنچ کہاں تک ہے کہ انہوں نے پوری قطعیت سے "اوپر" نہ جانے کا دعویٰ بھی کر دیا ؟۔ کیا انہوں نے (نعوذ باللہ) اللہ میاں سے بھی کوئی معاہدہ کر لیا ہے ؟ یا پھر وہ رعونیت کے اس مقام تک جا پہنچے ہیں جس تک معلوم تاریخ کے کئی لوگ پہنچے اور نشانِ عبرت بنا دیئے گئے۔ محترم گیلانی صاحب کو ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غرور و تکبر صرف ربِ ذوالجلال کے لئے ہے اور جب کسی فانی انسان نے ایسا دعویٰ کیا تو وہ نابود کر دیا گیا۔ انہوں نے 630 ملین روپے تقسیم کرکے بیسویں ترمیم منظور کروائی اور یہ کوئی ایسا کارنامہ تو نہیں تھا جس پر اتنا تکبر کیا جاتا۔ انہیں یہ بھی مدِّ مظر رکھنا ہوگا کہ بھوکوں مری قوم کو ان ترمیموں شرمیموں سے کچھ لینا دینا نہیں۔ انہیں تو

زندہ رہنے کے لئے "نانِ جویں" کی ضرورت ہے جو تا حال ان سے کوسوں دور ہے۔
انہیں یہ بھی یاد رکھنا ہو گا کہ وہ زمانہ لد گیا جب شاعر لوگ کہا کرتے تھے کہ
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
آج آنکھوں دیکھا لبوں پر بھی آتا ہے اور حضرتِ انسان اس حیرت کدے سے باہر بھی آ گیا ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ محترم عمران خاں تبدیلی کا نعرہ لگا کر میدان میں اترے تو خلقِ خُدا کا جمِ غفیر ساتھ ہو لیا لیکن جب دیکھتی آنکھوں نے وہی بوسیدہ چہرے خاں صاحب کے دائیں بائیں دیکھے تو بیزاری کا اظہار کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ شاہ محمود کے علی موسیٰ PPP قریشی کو اپنے حلقہ انتخاب کا بڑا زعم تھا لیکن انہی کے حلقے سے گیلانی نے لگ بھگ ایک لاکھ ووٹ لے کر شاہ صاحب کو یہ پیغام دے دیا کہ لوگ شاہ کو ووٹ دیا کرتے تھے۔ یہی حال جاوید ہاشمی کے انتخابی حلقے PPP، محمود قریشی کو نہیں کا ہوا جہاں سے نواز لیگ نے واضح کامیابی سمیٹی۔ شنید ہے کہ اب شاہ محمود قریشی سمیت کئی معتبر نام ایک بار پھر اُڑان بھرنے کو تیار ہیں۔ شاید اسی بنا پر کپتان کے قصیدہ گو بزرگ لکھاری کے کالموں میں وہ رعونت نظر نہیں آتی جو کچھ عرصہ پہلے تک تھی۔ ان کا جارحانہ انداز اب مصلحانہ روپ دھارنے لگا

ہے۔

معزز قارئین ! کچھ ناگزیر ذاتی مصروفیات نے ذہنی طور پر اتنا تھکا دیا تھا کہ شاید مزید چند روز کالم لکھنے سے گریز کرتی لیکن کالم لکھنے کی اچانک تحریک "وحیدہ شاہ" کیس کے فیصلے کی وجہ سے ہوئی۔ جب میں نے ایک سہمی ہوئی ہرنی کو دھاڑتی، چنگھاڑتی شیرنی کے قبضہ استبداد میں دیکھا تو سر شرم سے جھک گیا اور روح تک اس لئے گھائل ہو گئی کہ میں بھی ایک عورت ہوں اُس عورت کے وحشیانہ پن اور قانون کے رکھوالے دو (۲) سہمے ہوئے گیدڑوں کو دیکھ کر میں نے طے کر لیا کہ اب کبھی قلم نہیں اٹھاؤں گی کہ مجھے قلم کی بے حرمتی اور الفاظ کی بے توقیری ہر گز قبول نہیں لیکن کل الیکشن کمیشن کے دل خوش کن فیصلے نے حوصلہ بخشا۔ البتہ ایک بات بہر حال غور طلب ہے کہ محترم آصف زرداری کے مسلط کردہ سندھی چیف الیکشن کمشنر اور سندھ ہی کے صوبائی الیکشن کمشنر نے اس فیصلے سے اتفاق نہیں کیا اور یوں یہ فیصلہ اکثریتی بن گیا جسے بہر حال متفقہ ہونا چاہیے تھا۔ آخر یہ دو سندھی اصحاب پنجاب، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟۔۔۔۔۔۔

شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

تحقیق کہ چمن زارِ دہر میں خاموشی موت کے مترادف ہے اور جو قومیں راہِ عمل پر گامزن نہ ہوں وہ کبھی محبوبِ فطرت نہیں ٹھہر سکتیں کہ یہ اسی کا فرمان ہے "اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے آپ کو نہیں بدلتی (الرّعد)"۔ لیکن ہمارے ہاں اجتماعی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ ہم روا اور ناروا کی تفریق تک فراموش کر بیٹھے ہیں۔ آقا ﷺ نے تو برائی کو ہاتھ سے روکنے کا حکم دیا لیکن ہم اسے دل میں برا کہنے سے بھی ڈرتے ہیں۔

ہم نے ہنستے مسکراتے، بیگانوں کو اپناتے، اپنوں کے لئے دامانِ الفت وا کرتے، خوابوں کو حقیقتوں کے رنگ بخشتے، اشکوں کو گلابی شفقتوں کی نرم و نازک پنکھڑیوں سے صاف کرتے، روشنیوں کے شہر، شہرِ قائد کو قبضہ گروپوں اور بھتہ خوروں کے سپرد کر دیا۔ ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں کھُلی آنکھوں سے اپنی عظمتوں کے تمغے نوچتے طاغوتی ہاتھوں کو دیکھا۔ ریمنڈ ڈیوس، عافیہ صدیقی، سانحہ ایبٹ آباد اور سانحہ سلالہ چیک پوسٹ کی شکل میں اپنی غیرتوں کے جنازے اٹھائے لیکن کبھی پیشانی عرقِ ندامت سے تر نہ ہوئی۔ ہم نے محسنِ پاکستان کے ساتھ کیا کیا؟۔ عظیم فرانسیسی کیمیا دان انتونی ولائزر انقلابِ

فرانس کے بعد گرفتار ہوا۔جج نے اسے سزائے موت کا حکم سنایا۔جب اس کا سر قلم کیا جانے لگا تو اس کی بیوی نے جج کو مخاطب کرکے کہا "اس سر کو قلم کرنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگے گا لیکن ایسا سر دوبارہ پیدا کرنے میں صدیاں بیت جائیں گی" ۔ جج اپنی کرسی سے اٹھا، انتونی ولائزر کے پاس پہنچا، معذرت کے ساتھ اس کی سزا معاف کی اور کمرہ عدالت سے باہر چلا گیا۔ہم نے پہلے اپنے غیر ملکی آقاؤں کے حکم پر ڈاکٹر عبد القدیر خاں کو رسوا کرکے نظر بند کیا، پھر (وکی لیکس کے مطابق) جنابِ آصف زرداری نے امریکہ کو محسن پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی یقین دہانی کرائی۔اور اب۔۔۔۔

اب یہ "زندہ قوم" حکمرانوں کو 8500 ارب ڈکارتے اور "مٹی پاؤ ٹائپ" کمیشن بنتے دیکھ رہی ہے لیکن مجال ہے کہ اس کے کان پر جوں تک رینگی ہو۔

ایک محترم بزرگ لکھاری فرماتے ہیں کہ "میاں نواز شریف اور جنابِ زرداری کیا۔قومیں جب عزم اور ولولے کے ساتھ اٹھی ہیں تو نمرود و فرعون ہار گئے ہیں"۔ عرض ہے کہ نمرود و فرعون اللہ کے محبوب بندوں، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کی بنا پر قہرِ خُداوندی کا شکار ہوئے قوموں کے عزم و ولولے کی بنا پر نہیں۔ لیکن آپ جس شخص میں "پیغمبرانہ شان" دیکھ رہے ہیں وہ محض ایک انسان ہے، عام انسان۔ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ میاں نواز شریف نے تو اپنی تمام تر شخصی اور سیاسی خامیوں کے باوجود ایٹمی دھماکے کرکے نہ صرف

پاکستان بلکہ عالمِ اسلام کا سر فخر سے بلند کر دیا لیکن آپ کے کپتان کے دامن میں کیا ہے ؟۔ایک ورلڈ کپ ؟ جس میں کپتانی سے کہیں زیادہ قوم کی دعاؤں کا دخل تھا اگر آخری میچ میں مضبوط ویسٹ انڈیز غیر متوقع طور پر کمزور آسٹریلیا سے نہ ہارتا تو پاکستان سیمی فائنل میں بھی نہ پہنچ پاتا۔۔۔۔ یا پھر "شوکت خانم " اور " نمل یونیورسٹی" ؟۔ تسلیم کہ یہ خاں صاحب کے قابلِ ستائش کارنامے ہیں لیکن دنیا کی تاریخ تو ایسے مخیّر حضرات سے بھری پڑی ہے جنھوں نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے بغیر اس سے کہیں عظیم کارنامے سرانجام دیئے لیکن صلہ مانگا نہ ستائش ۔ آقا ﷺ کا تو فرمان ہے کہ مدد ایسے کرو کہ اگر دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو خبر تک نہ ہو لیکن ایک آپ ہیں کہ جگہ جگہ ڈنڈھورا پیٹتے پھرتے ہیں ۔اگر ایک لمحے کے لئے "وزارتِ عظمیٰ کا یہی معیار تصور کر لیا جائے تو پھر انتہائی محترم عبد الستار ایدھی کو صدر اور ان کے بیٹے کو وزیرِ اعظم بنا دینا چاہیے کہ عمران خاں دس جنم لے کر بھی محترم ایدھی کی گردِ پا کو نہیں پہنچ سکتے

انتہائی ادب سے گزارش ہے کہ صحافت ، عبادت ہی نہیں سیادت بھی ہے بشرطیکہ مداحی اور مداہنت سے پاک ہو کسی بھی شخص یا سیاسی جماعت سے نظریاتی وابستگی فطری امر ہے لیکن اس وابستگی کی آڑ میں کاسہ لیسی حرمتِ قلم کی پامالی کے مترادف ہے۔

آقا ﷺ کا فرمان ہے "اندھا وہ نہیں جو بصارت سے محروم ہے بلکہ

اندھا وہ جو بصیرت سے محروم ہے " جب کہ ہمارے اس بزرگ صاحبِ بصارت و بصیرت کا یہ عالم ہے کہ کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کے باوجود اپنے ممدوح پر تنقید کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔انہیں سوائے عمران خاں کے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر شدید ترین ردِ عمل کا خوف نہ ہو تو وہ خان صاحب کو قائدِ اعظم سے بھی بڑا لیڈر قرار دے دیں ۔ وہ فرماتے ہیں "سب اندازے ، سب سروے ، سارا پروپیگنڈا دھرا رہ جائے گا اور کپتان قائدِ اعظمؒ کی طرح خیرہ کن کامیابیاں حاصل کرے گا ۔" یہ تو خیر تبھی پتہ چلے گا جب کپتان صاحب اپنی ٹیم کے ساتھ میدان میں اتریں گے لیکن محترم لکھاری کی بصیرت کا یہ عالم ہے کہ موصوف 2009 سے PPP کی حکومت کے خاتمے کی تاریخ پہ تاریخ دیتے اور شرطیں باندھتے چلے آ رہے ہیں لیکن حکومت بھی سلامت اور زرداری و گیلانی بھی قائم و دائم ۔ موصوف فرماتے ہیں کہ "ایک ٹی ۔وی اینکر، نواز لیگ میں شامل ہونے والی تیز و طرار لیڈر اور ایک معروف انگریزی تجزیہ نگار ذاتی رنجشوں کی بنا پر عمران خاں کے خلاف ہیں ۔" عرض ہے کہ خاتون اینکر کا گناہ یہ ہے کہ انہوں نے تحریکِ انصاف کے سابقہ سیکرٹری اطلاعات عمر چیمہ سے یہ پوچھنے کی جسارت کر ڈالی کہ جب سوائے ڈی۔جی۔آئی ایس آئی کے تیز ترین میڈیا سمیت سارا پاکستان بے خبر تھا کہ میمو سکینڈل میں حسین حقانی بھی ملوث ہے تو پھر خاں صاحب نے مینارِ پاکستان کے جلسے میں حسین حقانی کا نام کیسے اور کس کے کہنے پر لے دیا ؟۔عمر چیمہ بغلیں جھانکنے لگے

اور ساری تحریکِ انصاف ہاتھ دھو کے خاتون لشکر کے پیچھے پڑ گئی۔" تیز و طرار لیڈر" نے الیکٹرونکٹ میڈیا پر عمران خاں کا دستخط شدہ "آفر لیٹر" دکھا دیا اس لئے معتوب ٹھہری۔ رہی انگریزی تجزیہ نگار کی تحریک میں شمولیت میں بے تابی کی بات تو خاں صاحب تو بلا امتیاز ہر کسی کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ انگریزی تجزیہ نگار کو انکار کر دیتے۔ یہ تو بزرگ لکھاری جانتے ہی ہوں گے کہ ضیاء سے زرداری تک مختلف سیاسی پارٹیوں کے مزے لوٹنے والے شاہ محمود قریشی نے پہلے سینئر وائس چیئر مین کا عہدہ لیا اور پھر تحریک میں شمولیت اختیار کی اور یہی کچھ بھنور ا صفت سیکرٹری اطلاعات نے بھی کیا۔ ویسے یہ عجب نظارہ بھی چشمِ فلک نے پہلی بار دیکھا ہو گا کہ انقلاب کا دعویدار ایک لیڈر کسی دوسرے کے جلسے میں جا کر اس سے اپنی پارٹی میں شمولیت کی بھیک مانگے۔

موصوف فرماتے ہیں" کپتان کبھی جھوٹ نہیں بولتا" ۔ انٹر نیٹ پر تو خیر خاں صاحب کے بارے میں جھوٹ سچ بہت کچھ مل جاتا ہے لیکن اس سے قطع نظر خود خاں صاحب نے اپنے اثاثے ڈکلیئر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ انہوں نے محترمہ جمائمہ خاں سے کچھ رقم ادھار لے کر لندن کا فلیٹ خریدا اور طلاق کے بعد جمائمہ خاں نے انہیں ایک" فلیٹ " گفٹ کیا۔ اسی دن جمائمہ خاں نے نیٹ پر یہ پیغام چھوڑا کہ انہوں نے نہ کبھی خاں صاحب کو ادھار دیا اور نہ ہی کوئی فلیٹ گفٹ

کیا۔ موصوف جانتے ہوں گے کہ خاں صاحب کا یہ نعرہ تھا کہ "تحریکِ انصاف آزمائے ہوؤں کو دوبارہ نہیں آزمائے گی" ۔ کیا انھوں نے ایسا ہی کیا ؟۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ ٹکٹ ہولڈرز کی غالب اکثریت پاک دامن لوگوں پر مشتمل ہو گی لیکن سبھی نہیں ۔ پھر فرمایا کہ آسمان سے فرشتے کہاں سے لاؤں ، انہی پر گزارہ کرنا ہو گا۔ اور آج کل فرما رہے ہیں کہ لیڈر اچھا ہو تو برے بھی اچھے بن جاتے ہیں ۔ کیا محترم تجزیہ نگار قوم کو یہ بتلانے کی زحمت فرمائیں گے کہ قوم خاں صاحب کے کس بیان پر اعتبار کرے ؟۔۔۔۔۔ باتیں تو بہت ہیں لیکن محترم لکھاری کے حضور فقط اتنی استدعا ہے کہ اس راندہ و درماندہ قوم پر رحم فرماتے ہوئے انسان کو انسان ہی رہنے دیں ، بھگوان نہ بنائیں ۔

ہر چند کہ زخمی ہیں قدم

دو سال سے اوپر ہونے کو آئے، جب میں نے پر مسرت لہجے میں اپنے میاں کو بتلایا کہ اعلیٰ عدلیہ نے NRO واصلِ جہنم کر دیا۔انہوں نے انتہائی بیزاری سے کہا " سُن بھی لیا اور دیکھ بھی "۔ پوچھا "کیا خوشی نہیں ہوئی ؟"۔ کہنے لگے "خوشی کس بات کی؟ ۔یاد رکھو ! یہاں فیصلے تو بہت ہوتے ہیں لیکن عمل درآمد کو ہمیشہ "نظریہ ضرورت" کھا جاتا ہے "۔ میں نے کج بحثی میں اُلجھنے کی بجائے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی۔ میاں صاحب نے اسی دن NRO فیصلے پر کالم لکھ کر اخبار کو بھیج دیا جس میں قانونی موشگافیوں کا حوالہ دیتے ہوئے پوری قطعیت سے لکھا کہ PPP دورِ حکومت میں اس پر عمل درآمد ممکن نہیں۔ اس دن مجھے بُری طرح سے اپنے اوپر تاؤ آیا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو ایسا بیہودہ اور بے تکا کالم ہر گز ہر گز نہ لکھنے دیتی۔ اگلے کئی روز تک پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر گرما گرم بحث میرا حوصلہ بڑھاتی رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ دھول بیٹھنے لگی اور لوگ NRO کو بھولتے چلے گئے۔

اب پتہ نہیں اعلیٰ عدلیہ کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ "گڑھے مُردے" اُکھاڑ بیٹھی لیکن "دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے" کے مصداق

اب کوئی پیشین گوئی کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ یہ "ملکی بادشاہوں" کے کیسز ہیں جنہیں "عدالتی بادشاہ" سُن رہے ہیں اس لئے احتیاط لازم ٹھہری خواہ اس میں دو چار عشرے ہی کیوں نہ لگ جائیں۔ البتہ یہ طے ہے کہ اگر ایسے کیسز میں مجھ جیسی کوئی مسکین ملوث ہوتی تو اعلیٰ عدلیہ نے کب کا "پھڑکا" دیا ہوتا۔ لیکن نہیں ۔۔۔۔۔۔ اگر میں ایسے کیسز میں ملوث ہوتی تو میں بھی ارب پتی ہوتی اور اعتزاز احسن یا بابر اعوان جیسے کروڑوں روپے بطور فیس لے کر مجھے بھی کہہ دیتے کہ "لگے رہو مُنّا بھائی" ۔ اگر کوئی بد طینت اعتزاز صاحب سے پوچھ بیٹھتا کہ محترم آپ کا تو دعویٰ تھا کہ "دھرتی ہو گی ماں کے جیسی" اب کیا ہوا۔ تو تُرت جواب ملتا کہ ہمارے لئے تو دھرتی ماں کے جیسی ہی ہے جو کروڑوں روپوؤں کی شکل میں ہمیں اپنی چھاتی کا خون پلا رہی ہے۔ اگر تمہارے ساتھ اس کا سلوک "سوتیلی ماں" کے جیسا ہے تو ہمارا کیا قصور؟۔ ہم نے یہی تو کہا تھا کہ دھرتی ماں کے جیسی ہو گی۔ اور بمطابق وزیرِ اعلیٰ بلوچستان، ماں، ماں ہوتی ہے، سگی ہو یا سوتیلی۔

اعلیٰ عدلیہ نے NRO کو کیا چھیڑا، گویا داستان کھُل گیا۔ میمو گیٹ، ایبٹ آباد کمشن اور توہینِ عدالت کے ساتھ ساتھ مہران بینک سکینڈل بھی۔ گویا میڈیا کی پانچوں گھی کے نامی پہلوان رانا ثنا اللہ اور راجہ ریاض روٹی شوٹی کھا PPP میں۔ اب نواز لیگ اور کر اور لسی شستی پی کر ایک بار پھر

اکھاڑے میں اتر آئے ہیں۔ اُدھر اپنے میاں نواز شریف بھی بڑے کائیاں ہیں۔ وہ ستانے کے لئے ہمیشہ کسی ایسے ہی موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ سو وہ حسبِ سابق و عادت لندن کھسک لئے اور گیلانی صاحب کو سپرد کر گئے میڈیا کے جنھوں نے کل سبزہ زار لاہور میں انہیں گھیر لیا لیکن انہوں نے بھی کھری کھری سنا کر صحافیوں کو لاجواب کر دیا۔ گیلانی صاحب نے فرمایا

ہم اپنے کام کر رہے ہیں جس کا"

" اعتراف ساری دُنیا کرتی ہے

واقعی جس صفائی اور دیدہ دلیری سے وہ قوم کا مال " نکرے" لگا رہے ہیں اس کا اعتراف پوری دُنیا کرتی ہے اور جو نہیں کرتا، وہ گھٹیا۔ یقین مانیئے کہ جب کبھی بھی گیلانی صاحب نے

" فنِ کرپشن کے تقاضے اور ہم "

نامی خود نوشت لکھی۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اس عالمِ آب و گِل کی واحد خود نوشت ہو گی جسے فوراً " گینیز بُک آف ورلڈ ریکارڈ" کے لئے منتخب Best seller لے کر اس خود نوشت کو Tips کر لیا جائے گا۔ ویسے وہ محترم زرداری صاحب سے کچھ طلسم کدے" میں بھی تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ مگر ایسا کریں گے نہیں کیونکہ وہ بھی" گدی نشین" ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ آقا کبھی کمیشن لینا نہیں بھولتے۔ محترم گیلانی" صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ

لوگوں کو پتہ ہے کہ جو کچھ بھی "
" ملے گا، ہم سے ہی ملے گا
قُربان جایئے اس ماہِ منور کی مانند تاباں سچائی کے۔ جی تو چاہتا ہے کہ باہر نکل کر "گیلانی کھپے، گیلانی کھپے" کے بلند آہنگ نعرے لگاؤں۔ واقعی انہوں نے جو فرمایا وہ پتھر پہ لکیر ہے کہ ظاہر ہے جنہوں نے کھایا ہو گا، اگر کچھ ملے گا تو انہی سے۔ کوئی ہے جو اتنی دیدہ دلیری سے "مالِ مسروکہ" کا اپنے پاس ہونے کا دعویٰ کر سکے ؟۔ شاید "جیالا پن" اسی کا نام ہے اور اگر جیالے یہ کہتے ہیں کہ
ہم سا ہو تو سامنے آئے " ۔۔۔۔۔ تو کچھ غلط بھی نہیں کہتے۔"
اور آخر میں حاکمانِ وقت کے حضور پنجہ استبداد میں پھڑ پھڑاتی خلقِ خُدا کی یہ دُہائی کہ

تم رکھ نہ سکے اپنی جفاؤں کا بھرم بھی
تُم نے میرا اُمید سے کم ساتھ دیا ہے
اے قافلے والو! میری ہمت کو سراہو
ہر چند کہ زخمی ہیں قدم، ساتھ دیا ہے

کس آئین کی پاسداری؟۔۔۔۔

میری شدید ترین خواہش ہے کہ میں محترم زرداری صاحب کے آگے "زانوئے تلمذ تہ" کرتے ہوئے ان کی شاگردی بلکہ "مریدی" اختیار کر لوں کہ معلوم تاریخ میں تو مجھے ان جیسا کوئی فطین نظر نہیں آتا۔ یہ الگ بات ہے کہ حاسدین ان کی اس فطانت کو ہمیشہ منفی رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں ان کی "مریدنی" تو بننا چاہتی ہوں لیکن اس میں کئی رکاوٹیں ہیں۔ پہلی یہ کہ ہم جیسے درماندوں کی "آستانہ عالیہ " (ایوانِ صدر) تک رسائی کہاں لیکن اگر ناممکن کو ممکن کر بھی لوں تو پھر یہ سوال دامن گیر کہ "مرشدِ مہرباں" کی خدمت میں کیا "نذرانہ" پیش کروں؟۔ بھلے زمانے میں تو شاگردی اختیار کرنے کے لئے لوگ کچے چاولوں کی پلیٹ پر "گُڑ کا ڈھیلا" سجا کر نذرِ استاد کیا کرتے تھے لیکن اب وہ زمانے لد گئے۔ ویسے بھی سنا ہے کہ "مرشد" نے اپنا ریٹ 10% سے بڑھا کر سینٹ پر سینٹ کر دیا ہے۔ ہم تو 10% دینے سے بھی کنی کتراتے تھے اب بھلا عمر بھر کی "جمع پونجی" نذر کرنے کا حوصلہ کہاں سے لائیں ؟۔ اپنی ایک ہمراز سے اس گھمبیر مسئلے پر مشورہ چاہا تو وہ لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ لاتے ہوئے یہ کہہ کر چلی گئی کہ

چند تصویرِ بتاں ، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

پتہ نہیں وہ نا ہنجار کیا کہہ گئی ، اپنے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔ اگر میرے معزز قارئین کو کچھ سمجھ آئی ہو تو ضرور آگاہ کریں وگرنہ نقصان ان کا اپنا ہی ہو گا کہ میں اس گومگو میں کچھ لکھ نہ پاؤں گی اور قارئین ایک "عظیم لکھاری" کی صلاحیتوں سے مستفید ہونے سے رہ جائیں گے ۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی پک رہا ہے جو باوجودیکہ اچھی طرح "بھُن" کر خوشبو تو نہیں دینے لگا پھر بھی رائے عامہ کے لئے "افشائے خیال" کر رہی ہوں کہ کیوں نہ جنابِ زرداری کا پیچھا چھوڑ کر محترم یونس حبیب کی شاگردی کا شرف حاصل کیا جائے کہ ایک تو ان سے ملنا دشوار نہیں ۔ محترم آج کل اکثر سپریم کورٹ کا طواف کرتے نظر آتے ہیں اور دوسرے وہ یقیناً زرداری صاحب سے زیادہ "پہنچے" ہوئے ہونگے ۔ تبھی تو زرداری صاحب انہیں "چاچا" کہتے ہیں وگرنہ کہیں ایک "پیر" کبھی دوسرے "پیر" کی کرامات کا یوں برملا اعتراف کرتا ہے ؟۔ عوام نے ان کی بزرگی کی ایک جھلک تو دیکھ ہی لی ہو گی کہ "بھتیجا" تو کبھی کبھار مخصوص اداروں سے چھیڑ چھاڑ کرتا تھا لیکن "چاچے" نے تو پورے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟۔

کبھی کبھی دل میں یہ خیال انگڑائیاں لینے لگتا ہے کہ کیوں نہ محترم گیلانی

صاحب کو آزمالوں لیکن فوراً ہی اس "مردود خیال" کو ذہن سے جھٹک دیتی ہوں کہ مجھے "قُربانی کی بکری" بننے کا ہر گز شوق نہیں جب کہ گیلانی صاحب خراماں خراماں قُربان گاہ کی جانب گامزن ہیں۔ (ان استحصالی مردوں نے محاوروں میں بھی اپنا ہاتھ اونچا ہی رکھا ہے۔ بھئی اگر قربانی کا بکرا ہو سکتا ہے تو بکری کیوں نہیں۔) پھر یہ بھی تو ہے کہ گیلانی صاحب کی طرح میرا کوئی بیٹا قومی یا صوبائی اسمبلی کا رُکن بھی تو نہیں جو میری گدی سنبھال کر میری تشنہ خواہشات کی تکمیل کر سکے۔ فردوس عاشق اعوان، بابر اعوان، فوزیہ وہاب، راجہ ریاض اور اس قبیل کے دیگر "بُزرگوں" سے چونکہ میں خود زیادہ "پہنچی" ہوئی شے ہوں اس لئے ان کی شاگردی کا سوچ بھی نہیں سکتی کہ سمندروں کی پیاس رکھنے والا بھلا ندی نالوں سے کب سراب ہوتا ہے۔ البتہ اعتزاز احسن Under Consideration ہیں کیونکہ مجھے ان میں "کاملیت" کی کچھ جھلک نظر آتی ہے۔ یوں تو میں نے ذوالفقار مرزا کے بارے میں بھی سوچا تھا لیکن ان کا "ڈرامہ" PPP کے ٹکٹ پر کامیاب کروا کر یہ بہت جلد فلاپ ہو گیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو ثابت کر دیا کہ

"جتھے دی کھوتی، اوتھے آن کھلوتی"

حرفِ آخر یہ کہ محترم گیلانی صاحب نے بہاولپور یونیورسٹی اور میلسی کے جلسہ عام میں جس طرح عدالت اور سیاست کو خلط ملط کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان کے

لئے ثمر آور ہے نہ ان کے "مہربان" کے لئے اور نہ ہی ملک و قوم کے لئے کہ 1973 ءکے آئین کے مطابق آئین کے کسی بھی آرٹیکل کی تشریح کا حتمی اختیار اعلیٰ عدلیہ کے پاس ہے، پارلیمنٹ کے پاس نہیں۔ اگر سپریم کورٹ کی تشریح کے مطابق خط لکھنا ضروری ہے تو پھر دُنیا کا ہر وکیل یہ کہے گا کہ "ہاں ضروری ہے"۔ گویا محترم گیلانی صاحب خط نہ لکھ کر اس آئین سے منحرف ہو رہے ہیں جس کی پاسداری کا انہوں نے حلف اٹھایا ہے۔ آئین سے انحراف کی کیا سزا ہو سکتی ہے؟، یہ وہ خود اور ان کے وکلاء خوب جانتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ بات شاید اب "توہینِ عدالت" تک محدود نہ رہے۔ میں محترم گیلانی صاحب کو یہ یاد دلانا چاہتی ہوں کہ یہ وہی آئین ہے جو PPP کے بانی بھٹو مرحوم کا عطا کردہ ہے جس پر جیالے آج بھی فخر کرتے ہیں۔ اب فیصلہ گیلانی صاحب نے کرنا ہے کہ انہوں نے قوم کے اُس متفقہ آئین کی پاسداری کرنی ہے جس کی تشریح کا اختیار سپریم کورٹ کے پاس ہے یا اِس آئین کی جس کی تشریح ایوانِ صدر" میں کی جاتی ہے؟۔"

تاریک راہیں

شمشیرِ سکندر کا طلوع ہوتے ہوتے رہ گیا۔بزرگ لکھاری کا دعویٰ تھا کہ 9 مارچ کو گوجر خاں میں "کپتان" ملک کے در و بام پر اس طرح چمکے گا کہ صدیوں کی تاریکی تحلیل ہو جائے گی۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔

دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پر تماشا نہ ہوا

9 مارچ کو ۲ بجے جلسہ شروع نہ ہو سکا کہ سترہ ہزار کرسیوں پر سترہ سو افراد بھی موجود نہ تھے۔ البتہ کرسیوں کی محافظ ڈنڈا بردار فورس مستعد۔۔۔ استفسار کیا کہ "سونامی کا کیا بنا؟"۔ جواب ملا کہ نمازِ جمعہ میں مصروف ہے۔ وقت گزرتا گیا، ظہر سے عصر ہوئی لیکن پنڈال ایک چوتھائی۔ کپتان اسلام آباد میں مضطرب و بے قرار۔۔۔۔ پھر خبر آئی کہ شاید جلسہ منسوخ کرنا پڑے، لیکن کوئی بہانہ بھی تو نہ تھا۔ آخر کار جلسے کی کاروائی شروع کرنے میں ہی عافیت جانی کہ جلسہ گاہ میں بیٹھے لوگ بھی اکتا کر آہستہ آہستہ کھسکنے لگے تھے۔ ابرار الحق کے ترانے بھی کوئی ہل چل پیدا نہ کر سکے تو چار و نا چار عمران خاں انتہائی بد دلی سے "سونامی" کی نوید سنا کر عازم سفر ہوئے۔ جو ہوا سو ہوا، لیکن حیرت ہوتی ہے "طوطا چشم" میڈیا پہ۔ گھنٹوں کی خبر منٹوں

میں اور "لیڈ سٹوری" کی جگہ اندرونی صفحات پر سہ کالمی خبر۔۔۔۔۔۔ اور بس۔

کوئی تین ماہ پہلے میں نے شدید ترین تنقید سے تنگ آ کر اپنے کالم میں لکھا تھا کہ اب میں تحریکِ انصاف پر اُس وقت تک قلم نہیں اٹھاؤں گی جب میرے انتہائی محترم قارئین جذبات کے بھنور سے نکل کر ادراک کے ساحل کو نہ چھُو لیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ خاں صاحب نے جتنی تیزی سے ترقی کی ہے اُس سے کہیں زیادہ تیزی سے تنزلی بھی ہو گی۔ کیونکہ اوّل تو مجھے یہ ترقی ہی انتہائی غیر فطری، جذباتی اور لمحاتی نظر آتی تھی۔ دوسرے اقتدار کے بھوکے جس طرح "رالیں ٹپکاتے" تحریکِ انصاف پر پل پڑے تھے وہ ہر ذی شعور کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا۔ اگر منٹو پارک کے انتہائی متاثر کُن جلسے کی کامیابی کو خاں صاحب سینت سنبھال کر رکھتے، نام نہاد اشرافیہ کے لئے تحریک کے در بند رکھتے، مشرفیوں اور لوٹوں لوٹیروں سے پرہیز کرتے اور صحافتی بزجمہروں کی لاف زنی پر کان نہ دھرتے ہوئے صرف نوجوانوں اور پسے ہوئے طبقے پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے تو تحقیق کہ وہ پی۔پی۔پی اور نواز لیگ کے لئے لمحہ فکریہ بن جاتے۔ انہیں ادراک ہونا چاہیے تھا کہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے یہ "چالاک لومڑ" اگر گزشتہ چھ عشروں سے کسی کے نہیں بن سکے تو ان کے کیسے بن پائیں گے۔

بجا کہ وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا لیکن اگر عزمِ صمیم ہو تو وقت کے منہ زور گھوڑے کی عنان کھینچ کر اُس کا رُخ موڑا بھی جا سکتا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ " اپنوں " سے ہاتھ ملا کر اپنی تمام تر توجہ ایک بال سے ایک ہی "وکٹ" گرانے پر مرکوز کر دیں کہ محض یہی ایک راہ ہے جس پر چل کر وہ حقیقی انقلاب کے داعی بن سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر اگر وہ دس، بیس سیٹیں لے بھی گئے تو سونامی تو کجا کرپشن کے سمندر میں کوئی "لہر" پیدا کرنے سے بھی قاصر رہیں گے۔ بخُدا میں کبھی بھی عمران خاں کی مخالف نہیں رہی اور نہ ہی اُن کی انقلابی تحریک سے مجھے کوئی اخلاف ہے۔ اختلاف ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ کون کمبخت یہ چاہے گا کہ ان چور لُٹیروں، بھتہ خوروں، قبضہ گروپوں اور قرضہ خوروں سے نجات نہ ملے ؟۔ کس بد فطرت کی یہ خواہش ہو گی کہ وطنِ عزیز میں عدل و انصاف کا بول بالا اور "دھرتی ماں کے جیسی" نہ ہو ؟۔ کسے کرپشن، مہنگائی، بدامنی، خودکُش حملے اور بم دھماکے پسند ہیں ؟۔ کون ڈرون حملوں کی شکل میں اپنی غیرت و حمیت کا جنازہ اٹھتے دیکھ سکتا ہے اور کب کسی نے چاہا ہو گا کہ ان کا دلیس میمو گیٹ، این۔آر۔او، رینٹل پاور اور مہران بنک جیسے سکینڈلوں کی زد میں رہے ؟۔ اگر عمران خاں انتہائی خوش نیتی سے دو دھاری تلوار بن کر طاغوتی طاقتوں کے خلاف سینہ سپر ہوئے ہیں تو ہر محبِ وطن پاکستانی کو ساتھ دینا چاہیے۔ سوال مگر یہ ہے کہ خاں صاحب جن راہوں پہ چل نکلے ہیں کیا وہ منزل کا پتہ دیتی ہیں ؟۔ میری دیانت دارانہ رائے تو یہ ہے

کہ نہیں ۔۔۔۔ ہر گز نہیں ۔ بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ جن تاریک راہوں پہ وہ چل نکلے ہیں وہ انہیں منزل سے دور تو کر سکتی ہیں منزل کا پتہ نہیں دے سکتیں ۔

گدی نشین

میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ہمارا میڈیا ہمیشہ یکطرفہ کاروائی کرتا ہے۔ جی چاہے تو ذوالفقار مرزا اور یونس حبیب جیسے لوگوں کو آسمان کی رفعتوں پہ پہنچا دے اور من میں آئے تو "عدل بِنا جمہور نہ ہوگا" اور "دھرتی ہوگی ماں کے جیسی" جیسے سہانے سپنے دکھانے اور چیف جسٹس کی ڈرائیوری پر فخر کرنے والے عظیم بلکہ عظیم ترین قانون دان اعتزاز احسن صاحب کو پاتال کی گہرائیوں میں پھینک دے لیکن آج ایک عظیم لکھاری کا یہ بیان پڑھ کر دل کو تسلی ہوئی کہ "وہ دِن دور نہیں جب وزیرِاعظم کی وکالت کرنے کا فیصلہ چوہدری اعتزاز احسن کے کیریئر کا بہترین فیصلہ ثابت ہوگا"۔ وگرنہ میں تو کئی دنوں سے پریشان بیٹھی تھی کہ آخر قوم کے اس "محسن" سے کونسا گناہ سرزد ہوا ہے جو میڈیا اس کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ گیا ہے۔اعتزاز احسن نے یہ کہہ کر سپریم کورٹ کے سات رُکنی بنچ کے چھکے چھُڑا دیئے کہ اُن کا موکّل ایک پیر اور "گدی نشین" ہے جس کے خلاف ایسی سخت زبان استعمال کرنے والے بنچ سے انصاف کی کوئی توقع نہیں۔اس لئے فوراً بنچ تبدیل کی جائے۔ وہ دراصل کہنا تو یہ چاہتے ہوں گے کہ ایسی سخت زبان استعمال کرکے بنچ نے ان کے موکّل کی توہین کی ہے اس لئے یہ کیس توہینِ عدالت کا نہیں بلکہ "توہینِ گدی نشین" کا بنتا ہے اور یہ کیس بنچ پر چلنا

چاہیے نہ کہ ان کے موکّل پر لیکن چونکہ وہ بہت "ٹھنڈے ٹھار" انسان ہیں اس لئے
کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے
کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے

اب سمجھ میں آیا کہ دوسرے "ٹھنڈے ٹھار" گیلانی صاحب نے کیوں تپ کر یہ کہا کہ میں وزیرِ اعظم ہوں چپڑاسی نہیں" ۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہاں کچھ چُوک گئے اور" گدی نشین" کی جگہ وزیرِ اعظم کہہ گئے۔یا پھر ہو سکتا ہے کہ آقا کی طرف سے یہی حکم ملا ہو۔ بہر حال پاکستان کے سارے پیروں اور گدی نشینوں کو نوید ہو کہ اب کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا کہ ان کی پُشت پر ایک گدی نشیں وزیرِ اعظم اور ایک عظیم ترین وکیل موجود ہے۔ توہینِ عدالت کا فیصلہ جو ہو، سو ہو لیکن یہ طے ہے کہ آئندہ کوئی بھی یوں گدی نشینوں کی توہین کرنے سے پہلے سو بار سوچے گا اور اگر پھر بھی "لوگ" باز نہ آئے تو فیصلے کے لئے پارلیمنٹ سے رجوع کیا جائے گا، عدلیہ سے ہرگز ہرگز نہیں کیونکہ عظیم تر قومی مفاد میں جنابِ صدر نے آئین کی تشریح کا حق عدلیہ سے واپس لے کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ تشریح وہ خود کریں گے اور جب جی چاہے گا "ربڑ سٹمپ پارلیمنٹ" سے اس کی منظوری لے لیں گے اور ایسا بھی ملک و قوم کے وسیع تر مفاد میں ہی ہو گا کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ پارلیمنٹ چوروں، لٹیروں

بھتہ خوروں، قرضہ خوروں، انگوٹھا چھاپوں اور جعلسازوں سے بھری پڑی ہے جو، صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہے البتہ بوقتِ ضرورت ہاتھ ضرور کھڑے کر دیتی ہے ۔۔۔۔۔آج ہی اخبار میں یہ خبر چھپی ہے کہ اکہتر 71 اراکینِ پارلیمنٹ ایسے ہیں جنھوں نے گزشتہ چار سالوں میں اپنے مُنہ سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا سوائے ہاتھ کھڑا کرنے کے۔ اگر خُدا نخواستہ اور خاکم بدہن یہ پارلیمنٹ تھوڑی سی بھی باشعور ہوتی تو پھر اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں ترامیم پہ پھڈا ڈال بیٹھتی اور آخر قوم نے چار سالوں میں پارلیمنٹ پر چھ ارب اس لئے تو صرف نہیں کیا کہ وہ "ایویں خوامخواہ" ہی پھڈا ڈالے۔ شاید اسی لئے گیلانی صاحب بار بار تنبیہہ کرتے رہتے ہیں کہ ادارے اپنی حدود میں رہیں اور

اتنا نہ اپنی جائے سے باہر نکل کے چل
دُنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

جب کوئی ادارہ اپنی "جائے" سے باہر نکل کے چلنے کی کوشش کرتا ہے تو گدی نشینوں کو انہیں سیدھا کرنا بھی آتا ہے اسی لئے تو ثناخوانِ زرداری اور معروف لکھاری نے اعلیٰ عدلیہ کو تنبیہہ کرتے ہوئے حقِ نمک یوں ادا کیا ہے کہ "اعلیٰ عدلیہ نے چینی کی قیمت مقرر کرکے اپنی حدود سے تجاوز کیا لیکن کسی نے تسلیم نہ کیا۔ یوں چینی کے فیصلے کی طرح عدلیہ کو خط لکھنے کے

فیصلے کے بارے میں بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اس فیصلے پر عمل درآمد کرنا بھی انتظامیہ کے لئے مشکل ہے"۔ آگے چل کر وہ دھمکی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "منتخب حکومت کے پاس عوامی طاقت ہوتی ہے اور عدلیہ کے پاس اخلاقی"۔ بات تو پتے کی ہے کہ عدلیہ کے فیصلوں پر عمل درآمد کروانے کے لئے "تھانیدار" تو گیلانی صاحب نے دینا ہے۔ وہ تھانیدار تو خیر کیا دیں گے البتہ عوام کا جمِ غفیر لے کر سڑکوں پر ضرور نکل آئیں گے۔ لیکن کچھ بد باطن یہ بھی کہتے ہیں کہ آمر مشرف کے پاس تو فوج کی طاقت بھی تھی اور قاف لیگ کی "جمہوری" حکومت بھی، پھر بھی اکیلے چیف جسٹس نے سبھی کا "ستیاناس" مار دیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تاریخ ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دہرانے لگے۔ PPP کو چاہیے کہ ایسے حاسدوں کی باتوں پر کان نہ دھرے اور خاطر جمع رکھے۔ میں وثوق سے کہتی ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو کتنا مزہ آئے کہ ۔۔۔۔ "خس کم، جہاں پاک" ۔۔۔۔

اپریل فول

دینِ مبیں کا حکم ہے کہ اپنے انداز و اطوار اور شباہت میں دوسروں کی پیروی مت کرو اور ہر حالت میں اپنی انفرادیت برقرار رکھو۔ چودہ سو سال ہوئے ہیں جب مدینہ النبی میں اسلامی تہذیب و تمدن اور معاش و معاشرت کی بنیاد ڈالی گئی اور آقا ﷺ نے اپنے اقوال و افعال اور اعمال کے ذریعے اپنی امت کی قدم قدم پر رہنمائی فرمائی ۔یہ میرے نبی کا اعجاز ہے کہ انہوں نے ہماری معاشی و معاشرتی زندگی کے کسی ایک پہلو کو بھی تشنہ نہیں رہنے دیا۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا ہم سنتِ نبوی پر عمل پیرا ہیں؟ ۔۔۔۔ بلا خوفِ تردید نہیں ۔۔۔۔ہر گز نہیں اور یہی نہیں بلکہ ہم نے تو اپنی تہذیب و معاشرت میں بھی غیروں کی پیروی کو افضل گردانا اور آج ہم غیروں کے تہوار بھی اسی جوش و جذبے سے مناتے ہیں جیسے یہ بھی ہماری تہذیب ہی کا حصہ ہوں۔ انہی تہواروں میں ایک "اپریل فول" بھی ہے لیکن شاید انگلیوں پہ گنے چند لوگ ہی جانتے ہوں کہ یہ یہودیوں کا تہوار ہے جسے بہار کی دیوی کو خوش کرنے کے لئے منایا جاتا ہے ۔

برِ صغیر میں پہلی بار انگریزوں نے اپریل فول 1857 ء کی جنگِ آزادی کے بعد آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے ساتھ رنگون جیل میں منایا۔ ایک بڑے تھال

پر کپڑا ڈال کر کچھ انگریز قیدی بادشاہ کے پاس گئے اور کہا "لو اپنا ناشتہ کر لو" ۔ بہادر شاہ ظفر نے تھال سے کپڑا ہٹایا تو اندر اس کے بیٹے کا کٹا ہوا سر پڑا تھا۔ شاہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور قید خانے کے در و دیوار انگریزوں کے قہقہوں سے گونج اٹھے ۔ اسی وقت کسی ستم ظریف نے کہا "بادشاہ! بُرا نہ ماننا آج اپریل فول ہے"۔
خالصتاً یہودیوں سے سمگل شُدہ یہ تہوار جو بِلا شبہ بر صغیر کے مُنہ پر تمانچہ ہے، آج ہمارے معاشرے میں ناسور کی طرح پھیل چُکا ہے اور مغرب زدہ معاشرے کے پڑھے طبقے میں اسے منانے کے لئے باقاعدہ تیاری کی جاتی ہے

حیرت ہوتی ہے کہ یہودیوں کے اس تہوار کو عیسائی بھی بھرپور طریقے سے مناتے ہیں لیکن شاید وہ بھی بے خبر ہیں کہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرکے رومیوں کی عدالت میں پیش کیا تو وہاں حضرت عیسیٰ کا مذاق اُڑایا گیا۔ انہیں پہلے یہودی سرداروں کی عدالت میں پیش کیا گیا اور وہاں مذاق اڑانے کے بعد رومی حاکم "پیلاطس" کے پاس بھیج دیا گیا۔ وہاں سے انہیں "ہیروڈیٹس" کی عدالت میں لے جایا" گیا اور پھر تفریحاً دوبارہ "پیلاطس" کے پاس بھیج دیا گیا۔ توما کی انجیل کے مطابق یہودی آپ کی آنکھیں بند کرکے آپ کے مُنہ پر تمانچے رسید کرتے ہوئے کہتے "اب اپنے الہام سے بتا تجھے کس نے مارا" حضرت عیسیٰ کو مختلف عدالتوں میں بھیجنے کا مقصد انہیں تکلیف پہنچانا اور مذاق

اڑانا تھا اور یہ سب کچھ اپریل ہی کے مہینے میں ہوا تھا۔
انسا ئیکلوپیڈیا لاروس" کے مطابق اہلِ یہود دراصل یہ دن حضرت عیسیٰ علیہ کو تکلیف " پہنچانے اور مذاق اُڑانے کی یادگار کے طور پر مناتے ہیں۔ دینِ مبین میں تو تمام انبیاء علیہ اسلام برابر ہیں اور اگر کوئی بد باطن ایسی گستاخانہ حرکت کرتا ہے تو فوراً دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ دینِ مبیں میں تو کسی "عامی" کو نشانہ تضحیک بنانا بھی انتہائی قبیح فعل تصور کیا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے "زیادہ نہ ہنسا کرو۔ زیادہ ہنسنے سے دل مُردہ ہو جاتا ہے" جب کہ حضرت علیؓ کا فرمان ہے "بے موقع مزاح دشمنی پیدا کرتا ہے" لیکن یہاں تو مزاح کی صورتِ حال یہ ہے کہ اسے اللہ کے پاک نبی کی بے حرمتی کی یادگار کے طور پر منایا جاتا ہے لیکن پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ عیسائی برادری اس تہوار کو کیسے مناتی اور برداشت کرتی ہے۔
کہا جاتا ہے کہ سترھویں صدی سے قبل سال کا آغاز بجائے جنوری کے اپریل میں ہوتا تھا ۔ موسم بہار بھی اسی ماہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے اسی مناسبت سے لوگ اپنی خوشی کا اظہار ہنسی مذاق سے کرتے تھے۔ بعد ازاں اسی کو "اپریل فول" کا نام دیا گیا۔ یہ اپریل فول" پاکستان میں یکم اپریل کو منایا جاتا ہے۔ اس دن کو بیوقوفوں کے دن سے " بھی تعبیر کیا جاتا ہے ہر عمر کے لوگ اپنے عزیز

و اقارب اور دوست احباب کو جھوٹے پیغام بھیج کر بیوقوف بنانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں کچھ لوگ تو اپنی بیویوں کو طلاق تک دے دیتے ہیں حالانکہ طلاق تو نشے کی حالت میں بھی ہو جاتی ہے چہ جائیکہ انسان ہوش و حواس میں ایسا بھونڈا اور خالصتاً غیر شرعی مذاق کرکے یہ کہہ دے کہ "میں نے تو اپریل فول منایا" حد تو یہ ہے کہ کچھ لوگ اس قسم کا مذاق کر جاتے ہیں جو دوسروں کے لئے جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جو بنا سوچے سمجھے ایسے بے تکے تہواروں کو بڑے فخر سے مناتے ہیں جس میں مسلمانوں کی تذلیل کی جاتی ہے۔

بیچارے حکمران

عجیب بلکہ عجیب و غریب ہے یہ قوم بھی۔ یہ خوب جانتی ہے کہ پاکستان ایک غریب ملک ہے اور اس کی کل آمدنی سے قومی درد میں ڈوبے راہبرانِ قوم کا پیٹ بھی مشکل ہی سے بھرتا ہے، پھر بھی کفایت شعاری نام کو نہیں۔ ادھر اپنے چیف صاحب ہیں جو لٹھ لے کر ہمارے معصوم لیڈروں کے پیچھے پڑے پائی پائی کا حساب مانگ رہے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ "بھلے آدمی" ان کا تو پہلے ہی طالبان اور دہشت گردوں نے "ٹینشن" دے دے کر بُرا حال کر دیا، رہی سہی کسر امریکی دھمکیاں پوری کر دیتی ہیں اور گاہے گاہے عسکری قیادت بھی جھٹکے دیتی رہتی ہے۔ یہ کیا کم تھے جو آپ بھی درمیان میں کود پڑے ہیں ؟۔ ایسے میں بندہ بیمار نہ ہو تو کیا ہو ؟۔ وہ تو شکر ہے کہ سات رُکنی بنچ نے دو ہفتوں کی مہلت دے دی وگرنہ ہو سکتا ہے کہ "بنچ" کو یقین دلانے کے لئے ڈاکٹر سے تین ماہ کے "کمپلیٹ بیڈ ریسٹ" کا میڈیکل سرٹیفیکیٹ بنوانا پڑتا اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ PPP کے پاس ڈاکٹرز کی کمی نہیں۔ اپنے ڈاکٹر بابر اعوان تو آجکل "ناراض شراض" ہیں لیکن اللہ سلامت رکھے ڈاکٹر رحمٰن ملک کو، وہ سرٹیفیکیٹ دینے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کرتے۔ دروغ بر گردنِ راوی ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان تو چھ ماہ کا میڈیکل سرٹیفیکیٹ دینے کے لئے پر تول رہی تھیں لیکن اعتزاز احسن نے تپ کر

کہا کہ کیوں میری روزی پر لات مارتی ہو۔ میں نے اور کیسز بھی لڑنے ہیں اور تم ہو کہ مجھے چھ ماہ کے لئے گھر میں نظر بند کرنے پہ تُلی ہوئی ہو۔ مجھے تو میرے ازلی دشمن آمر مشرف نے بھی محض ایک ماہ ہی ہاؤس ریسٹ کیا جس سے میرا کروڑوں کا نقصان ہو گیا۔ مشرف کا نام آتے ہی فردوس عاشق اعوان نے بھی تیوریوں پر بل ڈال کر کہا کہ خبردار جو محترم المقام مشرف کی شان میں میرے سامنے کوئی نازیبا بات کہی۔ وہ میرے "سابقہ باس" ہیں اور میں احسان ناسپاس" نہیں۔ وہ تو ڈاکٹر عاصم حسین نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ بات اگر ایوانِ صدر تک جا پہنچتی تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔ وہاں تو جو ہوا سو ہوا لیکن ہمارا ایچ بھی بڑا کائیاں نکلا۔ اس نے خطرہ بھانپتے ہوئے ٹھک سے دو ہفتے کی تاریخ دے کر سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔

بات کفایت شعاری سے شروع ہوئی لیکن "اینویں ای" کسی دوسری طرف نکل گئی تو آمدم بر سرِ مطلب ذکر ہو رہا تھا اس فضول خرچ قوم کا جس میں ذرا بھی حوصلہ نہیں۔ حکومت بجلی بچا کر کفایت شعاری کا درس دیتی ہے اور یہ ڈنڈے لے کر سڑکوں پہ نکل آتی ہے۔ اِدھر میاں شہباز شریف ہیں جو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے۔ ان کی خوشی مصیبت میں ہے بلکہ یہ ہے کہ قوم قوم خوب خوب ٹائر جلا PPP کا سبب یہ نہیں کہ رہی ہے اور "ڈینگی" چونکہ زیادہ تر ٹائروں میں پرورش پاتا ہے اس لئے اس موذی سے چھٹکارے کی سبیل خود بخود پیدا ہو گئی۔ شاید اسی

لئے انہوں نے اسلام آباد تک پیدل لانگ مارچ کا اعلان بھی کیا ہے۔ اُدھر بڑے میاں صاحب ٹھہرے قومی لیڈر اس لئے انہوں نے پورے ملک میں "ٹائر جلاؤ، ڈینگی مکاؤ" کا اہتمام کرتے ہوئے احتجاجی مظاہروں کا اعلان کیا ہے۔ ویسے انہیں کراچی جانے کی ضرورت نہیں کہ وہ تو پہلے ہی جل چکا ہے۔ یہ بھی شنید ہے کہ جناب آصف زرداری نے فوراً فون پر میاں صاحب کو گلہ کرتے ہوئے کہا "بڑے بھائی یہ کیا؟" تو میاں صاحب نے فرمایا کہ "چھڈ یار اب مجھے بالکل ایم۔کیو۔ایم ہی نہ بنا دے جو روز اعلان کرتی اور واپس لیتی ہے پھر بھی دو، چار احتجاج ہو لینے دے پھر چھوٹے میاں صاحب سے بات کروں گا اور ہاں مولانا فضل الرحمٰن کو کچھ لے دے کے تم خود سنبھال لینا"۔
محترم کپتان صاحب کے پاس چونکہ "سونامی" ہے جو نہ ڈینگی کا کچھ بگاڑ سکتا ہے نہ بجلی لا سکتا ہے۔اس لئے وہ فی الحال خاموش ہیں۔ ویسے خبر ہے کہ وہ محترم ہارون الرشید صاحب کے ساتھ طویل صلاح مشورے کے بعد جلد کوئی اعلان کرنے والے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک بال سے سارے ڈینگی اُڑانے کا "دل خوش کُن" اعلان فرما دیں اور ساتھ یہ بھی کہ "سونامی" کے فالتو پانی سے "ہزاروں من" بجلی پیدا کی جائے گی۔
پتہ نہیں آج قلم کیوں بار بار اصل موضوع سے پھسل کر کسی اور طرف نکل جاتا

ہے، حالانکہ میں نے آج صرف عوام کی درگت بنانے اور عوام کے ہاتھوں پسی ہوئی حکومت کے گُن گانے کے لئے ذہن بنایا تھا لیکن لگتا ہے کہ قلم بھی آج عوام سے ایسے ہی "ملی بھگت" کئے بیٹھا ہے جیسے ایم۔کیو۔ایم اور اے۔این۔پی بھتہ خوروں اور قبضہ گروپوں سے ۔۔۔۔۔اور ہاں لیاری والے بھی کسی سے کم نہیں۔

بہر حال عوام کو شرم آنی چاہیے کہ ان کی فضول خرچیوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے زرداری صاحب ناراض ہو کر لندن یاترا کو نکل گئے ہیں اور "گدی نشین" سی ڈل سدھار گئے۔ لیکن وہاں جا کر بھی "مُرشد" کا دل اپنے "مریدین" کی یاد میں مچلتا رہا ۔انہوں نے وہیں سے اس اعلان کے ساتھ اٹھارھویں مرتبہ لوڈ شیڈنگ کا نوٹس لے لیا کہ اگر اٹھارہ سو مرتبہ بھی نوٹس لینا پڑا تو ضرور لوں گا کہ آخر وہ اٹھارہ کروڑ کا منتخب کردہ وزیرِ اعظم ہیں کوئی چپڑاسی نہیں۔ وزیرِ اعظم کے اعلان کے ساتھ ہی مجوزہ وزیرِ اعظم نے اعلان فرما دیا کہ "لوڈ شیڈنگ ختم نہیں ہو گی"۔اب تو محترم چیف جسٹس صاحب کو یقین کر لینا چاہیے کہ ہمارے بیچارے وزیرِ اعظم کتنے بے بس ہیں۔ وہ تو "خط لکھنے" سمیت بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن "کوئی" کرنے دے تب ناں۔ یہی بات بیچارے اعتزاز احسن سات رکنی بنچ کو سمجھا سمجھا کے بیمار پڑ گئے۔ شاہ جی تو اس شاہ خرچ قوم کے ہاتھوں بجلی کی مدّ میں اڑائے گئے پی۔ایس۔او کے 215 ارب

کے ایک معتبر جناب تسنیم نورانی نے PPP روپے بھی دینے کو تیار ہو گئے تھے لیکن
ایک نیوز چینل پر یہ کہہ کر "کھوتا ہی کھوہ" میں ڈال دیا کہ حکومت خود پائی پائی کی
محتاج ہے، پیسے کہاں سے لائے ؟۔۔۔۔ اینکر کے سوال کرنے پر انہوں نے کہا کہ آمر
مشرف کے دور میں محض اس لئے بجلی موجود تھی کہ جب بھی حکومت بجلی پیدا کرنے
والی کمپنیوں کی مقروض ہوتی تھی تو مشرف کوئی نہ کوئی بندہ پکڑ کر امریکہ کے حوالے
کرکے پیسے بٹورتا اور کمپنیوں کے حوالے کر دیتا۔ ہماری حکومت چونکہ عوامی ہے اس لئے
ہم عوام کے ساتھ ایسا "ہتھ" نہیں کر سکتے۔ ان کی بات میں دم تو ہے۔پھر یہ بھی کہ
دشمنانِ ملک وملّت "کنٹینرز سپلائی بحال کرنے دیتے ہیں نہ امریکہ سے تعلقات اور "
جب "ان داتا" ہی ناراض ہو تو بھیک کہاں سے آئے ؟۔ وزیرِ اعظم تو قوم کی خاطر کنٹینرز
سپلائی بحال کرنے کا "رسک" بھی لے لیتے لیکن الیکشن سر پر ہیں اور " شر پسند " قوم
کو بھڑکانے اور بھٹکانے کے ماہر، اگر قوم بھٹک گئی تو پھر قوم کی "ایسی خدمت" کون
کرے گا؟۔۔۔۔۔ سب کچھ بجا لیکن قوم پوچھتی ہے کہ کیا امریکہ سے "حسین حقانی" کا
کچھ نہیں مل سکتا ؟۔ اور کیا حسین حقانی ملک و قوم کی خاطر اتنی سی قُربانی بھی نہیں دے
سکتے ؟۔

میں P.M ہوں Peon نہیں

پروفیسر مظہر

ربِ پروردگار کے ہاں تو سب برابر ہیں ۔ کسی عربی کو عجمی پر ، کسی گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں ۔ یہ تفریق تو انسانوں نے انسانوں کے لئے بنائی اور انسانوں پر آزمائی۔ نام رکھ دیا جمہوریت ۔۔۔ جمہوریت ، جس کی سربراہی جناب یوسف رضا گیلانی جیسے لوگ بھی کیا کرتے ہیں جو بڑی نخوت اور بڑے غرور سے کہتے ہیں "میں وزیرِاعظم ہوں چپڑاسی نہیں" ۔ دینِ مبیں میں مگر قوم کا سردار ہی قوم کا خادم ہوتا ہے۔ بلالِ حبشیؓ کو امیر المومنین عمرؓ سیدنا بلال کہہ کر پکارتے تھے۔ آقا ﷺ نے زیدؓ بن حارث کو اپنے حقیقی چچا حضرت حمزہؓ کا اسلامی بھائی بنایا تو حضرت حمزہؓ نے انہیں اپنی جائیداد کا وارث بھی قرار دے دیا۔ دونوں غلام ، بلالؓ بھی زیدؓ بھی اور دونوں سردار کہ تیرے ربّ کے ہاں کوئی چھوٹا نہیں ، کوئی بڑا نہیں مگر اعمالِ صالح ، جن کی پُرسش سے لرزہ براندام امیر المومنین عمرؓ رات کے اندھیرے میں کندھے پر اناج کی بوری اٹھائے بیوہ عورت کے گھر کی طرف رواں ۔ خادم نے عرض کیا" لایئے آقا یہ بوجھ میں اٹھا لوں" آپؓ کہتے ہیں "کیا تم روزِ قیامت میرے گناہوں کا بوجھ بھی اُٹھا لوگے ؟۔۔ رومی ایلچی آپؓ کے محل کا پتہ پوچھتا ہے ۔ لوگ کہتے

ہیں اُن کا کوئی محل نہیں، کہیں اِدھر اُدھر ہونگے۔ ایک بدّو عورت اشارہ کرتی ہے "وہ کھجور کے نیچے ننگی زمین پر سویا ہوا شخص ہی عمرؓ ہے"۔ ایلچی پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ بغیر کسی ہتھیار کے محض خوفِ خُدا دل میں لئے مسلمانوں کی عظیم سلطنت کا شاہ سو رہا ہے۔ آقا ﷺ نے فرمایا "جو اپنے لباس میں متکبرانہ انداز رکھے گا اللہ تعالی قیامت کے روز اُس کی طرف نگاہ بھی نہ ڈالے گا"۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ کو اپنا جسم ڈھانپنے کے لئے اپنے بیٹے سے چادر ادھار لینی پڑتی ہے جب کہ ایکڑوں پر محیط محل میں بسنے اور ستر ستر گاڑیوں کے حفاظتی حصار میں باہر نکلنے والے سید زادے کے سوٹ امریکہ، ٹائیاں انگلینڈ، اور جوتے فرانس سے آتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کی اس عالمِ آب و گِل میں آخری رات کو چراغ کا تیل بھی قرض کا آتا ہے اور گیلانی صاحب کے بقعہ نور بنے ایوانِ وزیرِ اعظم کا روزانہ کا خرچ لاکھوں میں۔ ان کی اہلیہ محترمہ جو کل تک بیٹے کی فیس تک نہ ہونے کا رونا روتی تھی آج لندن کے مہنگے ترین سٹور سے لاکھوں پونڈ کی خریداری کرتی نظر آتی ہیں لیکن۔۔۔ لیکن جی ہے کہ پھر بھی بھرتا نہیں۔ "ھل من مزید" کی بھوک ختم ہی نہیں ہوتی اور ہو بھی کیسے سکتی ہے کہ جب آقا نے ہی فرما دیا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں کسی کو پرواہ نہ ہو گی کہ اس نے مال کس طرح کمایا۔" اس کے پاس سونے سے بھری دو وادیاں بھی ہوں گی تو تیسری کی خواہش کرے گا"۔

محترم وزیرِ اعظم نے بالکل درست فرمایا کہ وہ چپڑاسی نہیں لیکن اس مملکتِ خُداداد میں قیصر وکسریٰ کے شاہوں جیسے انداز واطوار رکھنے والے حاکموں کی گنجائش بھی نہیں ۔ اگر یہ گنجائش پیدا کر دی گئی ہے تو اس کی صرف ایک ہی وجہ نظر آتی ہے کہ یہ قوم اپنے ایمان کے کمزور ترین درجے پر ہے ۔ یہ بجا کہ گیلانی صاحب چپراسی نہیں لیکن سپریم کورٹ کا حکم بھی وزیرِ اعظم کے لئے ہے کسی چپراسی کے لئے نہیں ۔ یہ بہرحال طے ہو چکا کہ اب کسی ایک کو تو قربانی دینا ہو گی ۔ پی ۔ پی ۔ پی کو اپنے وزیرِ اعظم کی یا پھر خاکم بدہن) سپریم کورٹ کو ناموسِ عدل کی ۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وزیرِ اعظم) کے اس "اعلانِ بغاوت" کے بعد اکابرین پی ۔ پی ۔ پی نے کوئی بھی غیر آئینی حربہ اختیار کرنے کی کوشش کی تو ایک دفعہ پھر قوم اور میڈیا ناموسِ عدل کی حفاظت کے لئے سپریم کورٹ کے شانہ بشانہ ہو گی ۔ شاید پی ۔ پی ۔ پی وہی غلطی دہرانے جا رہی ہے جو آمر مشرف کے زوال کا باعث بنی ۔ مشرف نے جن "کند ہتھیاروں" پر بھروسہ کیا وہی آج پی ۔ پی ۔ پی کے ساتھ کھڑے ہیں ۔ وہی ق لیگ ، وہی ایم ۔ کیو ۔ ایم اور مقابل وہی عدلیہ ، میڈیا اور عوام ۔

محترم گیلانی صاحب نے جس طرح سپریم کورٹ کے حکم کو جوتے کی نوک پہ رکھا ہے اس سے سوائے انارکی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو گا ۔ اگر بزعمِ خویش اٹھارہ کروڑ کے نمائندہ وزیرِ اعظم عدلیہ کا حکم ماننے سے انکار کر سکتے ہیں تو

اٹھارہ کروڑ عوام کیوں نہیں۔ ان کی جانب سے دیئے جانے والے دلائل محض جگ ہنسائی کا سبب بن رہے ہیں۔ اگر پارلیمنٹ نے صدر کو استثناء دیا ہے تو کیا سپریم کورٹ کو آئین کی تشریح کا حتمی اختیار ہندوستان کی پارلیمنٹ نے دیا ہے؟۔ اگر پی۔پی۔پی حکومت کو یہ قبول نہیں تو پھر آئین میں ایک اور ترمیم لا کر اعلیٰ عدلیہ سے یہ اختیار واپس لے لے۔ بصورتِ دیگر سپریم کورٹ کی حکم عدولی آئین سے بغاوت ہی تصور ہو گی۔ یہ فیصلہ اب گیلانی صاحب نے کرنا ہے کہ انہوں نے قوم کے اس متفقہ آئین کی پاس داری کرنی ہے جس کی حفاظت کا انہوں نے حلف اٹھایا ہے اور جس کی تشریح کا حق صرف اعلیٰ عدلیہ کے پاس ہے یا اس آئین کی پاسداری جس کی تشریح ایوانِ صدر میں کی جاتی ہے۔

کس کے سر کی قیمت؟

2 اپریل کو محترم رحمٰن ملک صاحب نے اتنی بریکنگ نیوز "چھوڑیں" کہ میڈیا پاگل ہوتے ہوتے بچا۔ حق تو یہ تھا کہ ملک صاحب یہ نیوز یکم اپریل کو چھوڑتے لیکن جنہیں "لمبی لمبی چھوڑنے" کی عادت پڑ چکی ہو وہ بے موقع بھی چھوڑتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ملک صاحب نے یہ سوچا ہو کہ اس "فول" قوم کے لئے ہر دن ہی "فرسٹ اپریل" ہوتا ہے۔ بہر حال جو بھی ہے پہلے بریکنگ نیوز سن لیجئے۔
موصوف فرماتے ہیں کہ "لیاری میں حالات معمول پر ہیں"۔ عین اسی وقت جب قوم ملک صاحب کے ارشاداتِ عالیہ سے مستفید ہو رہی تھی، لیاری میدانِ جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا اور پانچ قتل ہو چکے تھے۔ شاید ملک صاحب کے نزدیک پانچ، چھ حشرات الارض کے مسلے جانے کی کوئی اہمیت نہ ہو۔۔۔۔۔ دوسری بریکنگ نیوز یہ کہ "ایم۔کیو۔ایم اور اے۔این۔پی میں کوئی لڑائی نہیں" ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی کوئی ذاتی لڑائی نہیں۔ اصل لڑائی تو "بھتہ" اکٹھا کرنے کی ہے۔ کراچی کی بے تاج بادشاہ ایم۔کیو۔ایم بھلا کیسے برداشت کرے کہ اس کے "قانونی بھتے" میں سے "کوئی ایرا غیرا، نتھو خیرا" حصّہ دار بننے کی کوشش کرے۔ اُدھر واسکٹ والے سیّد صاحب کا یہ فرمان کہ "حقِ شاہی"

تو ادا کرنا ہی ہو گا۔ انہوں نے اس "شاہی" کے حصول کے لئے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ رکشا ڈرائیوری سے سینیٹر تک کے سفر میں کتنے کٹھن مقام آئے، یہ کوئی ان سے پوچھے۔ اب جب کہ انہوں نے کراچی کو پختونوں کے سب سے بڑے پاکستانی شہر میں ڈھال دیا ہے تو پھر وہ اپنا "حق" کیوں چھوڑیں؟۔ اگر ایم۔ کیو۔ ایم اور اے۔ این۔ پی اپنا اپنا حصّہ لیتے ہیں تو بیچارے لیاری والوں کا کیا قصور؟۔ وہ تو خدمتِ خلق کا جذبہ لے کر نکلے اور پیپلز امن کمیٹی" تشکیل دی۔ ظاہر ہے کہ جذبہ خدمت سے معمور امن کمیٹی کو اپنے" عظیم مقاصد کی تکمیل کے لئے پیسہ درکار ہے۔ ان کی غیرت گوارہ نہیں کرتی کہ ایدھی کی طرح کشکول اٹھا کر بھیک مانگتے پھریں۔ ایدھی تو بوڑھے، لاغر اور کمزور ہیں جبکہ یہ کڑیل جوان۔ اس لئے جو نہ دے اُس کی ایسی کی تیسی۔

تیسری بریکنگ نہیں بلکہ "تڑی نیوز" یہ کہ "میڈیا غیر ذمہ دارانہ رپورٹنگ سے باز آ جائے۔ میں نے غلط رپورٹنگ کی مانیٹرنگ کے لئے پیمرا کو خط لکھ دیا ہے"۔ یہ خبر سُن کر پہلے تو ہمارا سر گھوما پھر پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر ہم جلدی سے بیڈ پر "ڈھے" گئے۔ میری زرد رنگت اور سہما سہما چہرا دیکھ کر میاں نے پریشانی سے پوچھا کہ کیا ہوا؟۔ میں نے جب انہیں وہ خوفناک خبر سنائی تو وہ مسکرا کر بولے "مانا کہ تم جو کچھ لکھتی ہو وہ سراسر جھوٹ، بکواس اور بہتان طرازی کے زمرے میں آتا ہے لیکن یہ

رپورٹنگ نہیں اس لئے تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں، گھبرائیں اخبارات اور نیوز چینلز کے مالکان یا اینکرز۔ تمہیں کیا۔ یہ سن کر میری جان میں جان آئی لیکن اب فکر اس بات کی تھی کہ جو پروگرام میں بڑے شوق سے دیکھتی ہوں، کہیں وہ بند نہ ہو جائے۔مجھے تو اب محترم جنید سلیم کے بہت ہی عزیز "عزیزی" کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا ہے۔ان کی "شیش ناگ" جیسی مخبریاں تو نیمرا" کی زد میں آوے ای آوے ۔اگر عزیزی نہ ہوئے پھر جلترنگ کی سی ہنسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ویسے جنید سلیم صاحب بھی کم کائیاں نہیں۔ ہنستے ہنستے ایسے ایسے انکشافات کر جاتے ہیں کہ "اللہ توبہ"۔ ۔۔۔۔۔۔ بہرحال مشتری ہوشیار باش پھر نہ کہنا۔۔۔۔۔۔

کالم لکھنے کے دوران ہی خبر آئی کہ امریکہ نے جماعت الدعوہ کے حافظ سعید صاحب کے سر کی قیمت ایک کروڑ ڈالر یعنی لگ بھگ ایک ارب روپے مقرر کر دی ہے۔ایک نیوز چینل پر حافظ صاحب نے کیا خوب کہا "احمق امریکیو! کیا تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ سر کی قیمت تو اس شخص کی مقرر کی جاتی ہے جو مفقود الخبر ہو۔ میں تو گلیوں کا آدمی ہوں۔ ہر وقت گھر سے باہر ہر کسی کو نظر آتا ہوں"۔ جو کچھ کہتا ہوں،برملا کہتا ہوں اور لاکھوں کے مجمعے میں کہتا ہوں"۔۔۔۔۔ میں سمجھتی ہوں کہ دراصل یہ پاکستان کو امریکہ کی براہِ راست دھمکی ہے۔ نیٹو سپلائی کا معاملہ پارلیمنٹ میں ہے اور یہ سپلائی امریکہ کے

لئے زندگی موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے جبکہ دفاعِ پاکستان کونسل کے پلیٹ فارم پر یہ برملا اعلان کیا جا چکا ہے کہ نیٹو سپلائی بحالی کی مزاحمت کی جائے گی۔ اگر ہم واقعی ایک خود مختار قوم ہیں تو ہمیں یہ اختیار بھی ہے کہ ہم اپنی قومی سلامتی کے فیصلے خود کریں۔ اگر ہمیں اتنا بھی اختیار نہیں تو پھر امریکہ ہمیں اپنی "کالونی" کا درجہ کیوں نہیں دے دیتا کہ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری" ۔۔۔۔ اور امریکی ویزہ مفت ۔۔۔۔ پھر ہم کم از کم من موہن سنگھ کو یہ تڑی تو لگا سکتے ہیں کہ خبر دار! اگر ہم امریکیوں سے پنگا لیا تو ہم تمہیں پتھر کے زمانے میں دھکیل دیں گے۔

لیکن اگر ہمارے حکمرانوں میں رتی بھر بھی غیرت و حمیت ہے تو انہیں اوباما کے سر کی قیمت ایک ارب ڈالر مقرر کر دینی چاہیے اور درجہ بدرجہ باقی "معتبروں" کے سر کی بھی۔ البتہ ہیلری کلنٹن کو معاف کر دیا جائے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ چونکہ میں عورت ہوں اس لئے عورت کے حق میں ڈنڈی مار رہی ہوں، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام میں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو معاف کر دینے کا حکم ہے۔ اول تو یہ نا ممکنات میں سے ہے لیکن پھر بھی اگر کوئی سر پھرا اوبامہ کا سر لے آئے تو ہمارے حکمران اسے کہہ سکتے ہیں کہ " احمق ہو تم جو ہم پہ اعتبار کر لیا۔ ایسے روسیاہ" کا بھلا ہم کیا کریں گے ؟۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم تو خود کشکولِ گدائی لئے" در بدر

پھر رہے ہیں"۔ ہمارے حافظ صاحب کو تو "ستے خیراں" ہیں اور انشا اللہ رہیں گی البتہ پی۔پی۔پی کے ندیم افضل چن کی یہ بات حافظ صاحب کو پلے باندھ لینی چاہیے کہ انہیں اعجاز الحق اور شیخ رشید جیسے لوگوں سے بچ کے رہنا ہو گا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان کے سر کے پیسے کھرے کر لیں۔

قارئین! ایک آزاد شہری جسے اعلیٰ ترین عدلیہ تک مکمل طور پر شفاف اور بے گناہ قرار دے چکی ہے، جس کے پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے تمام ادارے گورنمنٹ کے منظور شُدہ ہیں اور جس کا پاکستان، استحکامِ پاکستان اور نظریہ پاکستان پر پُختہ یقین ہے امریکہ اُس کے سر کی قیمت مقرر کر دیتا ہے اور قوم کی طرف سے کوئی احتجاجی سسکاری تک سنائی نہیں دیتی۔ کیا ایسی قوم کو زندہ قوم کہلانے کا حق ہے؟۔ حکمرانوں کو تو چھوڑیئے کہ وہ تو ہیں ہی ایسے لیکن مجھے تو زندگی میں پہلی بار اپنے پاکستانی ہونے پر شرم محسوس ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ قوم کو کیا کہوں؟۔

کیا غم خوار نے رُسوا

پنجاب کے وسیع و عریض گورنر ہاؤس میں جنابِ آصف زرداری کی صدارت میں پنجاب کو فتح کرنے کے منصوبے تیار کیے جا رہے تھے۔ صفیں درست کی جا رہی تھیں اور دام ہم رنگِ زمیں بچھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اسی دوران "سلطنتِ زرداریہ" کے حاکم نے اپنے مخالفین کے خلاف دِل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے کئی "آف دی ریکارڈ" باتیں بھی کیں۔ بھولے بھالے پہلوان راجہ ریاض یہ سمجھے کہ "آف دی ریکارڈ" کا مطلب ریکارڈ پر لانا اور ریکارڈ کی طرح بجانا ہوتا ہے۔ وہ شاہ کی وفاداری میں سرشار وہاں سے کھسکے اور گورنر ہاؤس کے باہر مجمع لگا کر مُنہ کے گراموفون سے اندر کی ساری باتوں کا ریکارڈ بجا دیا۔ اب پتہ نہیں کہ چوہدری نثار کی "وِگ" کی جوؤں کا ذکر بھی زرداری صاحب نے ہی کیا تھا یا پھر شاہ پرستی میں "پہلوان جی" نے مرچ مصالحہ لگانا فرضِ عین سمجھا۔ اُدھر گورنر ہاؤس میں بیٹھے زرداری صاحب کو جب راجہ صاحب کی اس "واردات" کا علم ہوا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان نے سمجھا کہ سر درد ہے، وہ "پیناڈول" کی تلاش میں دوڑیں اور گورنر پنجاب ننھے مُنے لطیف کھوسہ جب دِل جوئی کی خاطر جنابِ صدر کے قریب پہنچے تو انہیں یہ بڑبڑاتے ہوئے پایا:۔

کیا غم خوار نے رسوا، لگے آگ اس محبّت کو

نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

بعد ازاں ایوانِ صدر کے ترجمان اور وزارتِ اطلاعات سے بار بار یہ بیان جاری ہوتا رہا کہ جنابِ صدر کے بیان کو سیاق و سباق سے ہٹ کر اور توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ زرداری صاحب نے بھی بڑی معصومیت سے یہ کہہ دیا "میں تو شریف برادران کے والد صاحب کی قبر پر فاتحہ کے لئے بھی گیا تھا" جی ہاں ! سب کو یاد ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب انہوں نے بلاول اور حسن نواز کو بھائی بھائی قرار دینے کا عہد کیا تھا لیکن "وعدے قُرآن و حدیث نہیں ہوتے" ۔ایوانِ صدر اور وزارتِ اطلاعات کی وضاحتوں کے باوجود ضدی نوازلیگیے نہیں مانے اور اب وہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی "ذوالفقار مرزاٹائپ" کوئی ڈرامہ ہی ہو کہ "رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی" کے مصداق "کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے"۔ بوجھ سارا بیچارے راجہ ریاض کے پہلوانی " کندھوں پر۔"

اگلے دن جنابِ صدر نے نسبتاً "ہتھ ہولا" رکھتے ہوئے فرمایا "شریف برادران کی گردن میں سریا میں نے ہی دیا تھا اور اب میں ہی نکالوں گا"۔ ان کی اس بات پر کوئی بھی ذی ہوش ہرگز یقین نہیں کر سکتا کیونکہ زرداری صاحب تو بلوچ ہیں جب کہ میاں برادران ٹھہرے "لوہاروں" کی اولاد جو مُنہ میں "لوہے کا

چمچہ" لے کر پیدا ہوتے ہیں اور پھر ساری زندگی سریا ہی موڑتے سیدھا کرتے گزار دیتے ہیں۔ بھئی ہم تو چار سالوں سے چیخ رہے ہیں کہ بھولے بھالے بڑے میاں صاحب نے جنابِ آصف زرداری کی گردن میں ایسا موٹا سریا دے دیا ہے کہ اب ان کی گردن غریبوں کی طرف مُڑنے سے یکسر عاری ہو چکی ہے۔ اگر ہمارے بلوچ سردار کسی "اونٹ شونٹ" کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہتے کہ "میں نے ہی میاں برادران کو اونٹ پر بٹھایا تھا اور اب میں ہی اتاروں گا" تو کوئی بات بھی تھی۔ ویسے یہ لوہار بھی عجب شئے ہیں کہ ایک چھوٹی سی نکیل بنا کر اچھے خاصے لمبے چوڑے اور بارعب اونٹ کو بلبلاتے ہوئے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

پتہ نہیں اپنے زرداری صاحب کو بیٹھے بٹھائے لوہار بننے کی کیا سوجھی ؟۔شاید دوسرے قبیلے میں گھُسنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے کہ پہلے بھلے چنگے زرداریوں کو "بھٹو" بنا دیا اور اب بقلم خود لوہار بن بیٹھے۔ بلاول بھٹو تو شاید اب بھول ہی چکے ہونگے کہ کبھی وہ بھی زرداری ہوا کرتے تھے۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ اگر کبھی عاشقانِ بھٹو کے ذہن میں بھی یہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ از راہِ محبت اپنی اپنی ذاتوں کے ساتھ بھٹو کا اضافہ بھی کر لیں تو پھر کچھ ایسے نام سامنے آیا کریں گے جیسے شرمیلا بھٹو فاروقی، سید خورشید بھٹو راجہ ریاض بھٹو، رانا نذیر بھٹو، فردوس اعوان بھٹو، سید،

قائم علی بھٹو، مرزا ذوالفقار علی بھٹو وغیرہ۔ پھر تو واقعی شریف برادران سے کہا جا سکتا ہے کہ اب تو "ہر گھر سے بھٹو نکلے گا تم کتنے بھٹو مارو گے"۔ پھر تو اتنے "بھٹوز" ہو جائیں گے کہ کپتان کا سونامی بھی بدنامی بن کے رہ جائے گا۔

ابھی کالم یہاں تک ہی پہنچا تھا کہ نیوز چینلز نے جنابِ زرداری کے بھارتی وزیرِ اعظم ہاؤس میں پہنچنے کی بریکنگ نیوز جاری کر دی۔ میں نے جب جنابِ زرداری کو گرم جوشی سے من موہن سنگھ صاحب سے ملتے دیکھا تو جل بھُن کے کباب ہو گئی۔ میرا غصہ اس لئے نہیں تھا کہ میں پاکستانی "بال ٹھاکرے" ہوں بلکہ اس لئے کہ بھارتیوں کو ہمارے پیارے صدر کا استقبال کرنا بھی نہ آیا۔ جس ملاقاتی کمرے میں ان کا استقبال کیا گیا اس سے کہیں بہتر تو ہمارے صدر کے چپڑاسیوں کے کمرے ہوتے ہیں۔ ایک ڈیڑھ فٹی پُرانی میز پر سادا پانی کے دو گلاس، دائیں بائیں دو کرسیاں اور بس۔ یوں تو بھارت اپنے آپ کو بڑی توپ شئے سمجھتا ہے لیکن اپنے وزیرِ اعظم کے کمرے کا پُرانا پھٹیچر فرنیچر تک تبدیل کر نہیں سکتا۔ سُنا تھا کہ ہندو بنیا یہ کہتا ہے "چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے" آج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ وہ ذرا آ کے ہمارا ایوانِ صدر دیکھیں۔ اگر آنکھیں پھٹی کی پھٹی نہ رہ جائیں تو نام نہیں۔ شاید انڈین پارلیمنٹ اسی لئے من موہن جی کو پاکستان نہیں آنے دیتی کہ کہیں ہمارا وزیرِ

اعظم ہاؤس دیکھ کر وہ بھی ایسے ہی وزیر اعظم ہاؤس کی ضد نہ کر بیٹھیں۔ ہمیں غریب جاننے والوں کے مُنہ پر اس سے بڑا طمانچہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم نے کھڑے کھڑے ایک ملین ڈالر کا نذرانہ دے ڈالا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ نذرانہ قومی خزانے سے گیا یا زرداری صاحب کی جیب سے کہ قومی خزانہ بھی اپنا اور زرداری صاحب بھی اپنے۔ شنید ہے کہ یہ ملاقات کامیاب رہی۔ جی ہاں ! اس لحاظ سے بہت کامیاب تھی کہ من موہن جی بولتے رہے اور زرداری جی سنتے۔ جب زرداری صاحب کے بولنے کی باری آئی تو من موہن جی ہنس کے بولے "چھڈو بادشاہو، روٹی شوٹی کھاؤ تے گھراں نوں جاؤ۔"

کراچی لہو کے بحرِ بے کنار میں غرق ہے۔۔ ذمہ دار کون؟

کراچی چوتھائی صدی سے لہو کے بحرِ بے کنار میں غرق ہے۔ روشنیوں کا شہر خباثتوں کے اندھیروں میں گم ہے۔ سوگوار فضاؤں میں بند کواڑوں کے پیچھے سہمے سمٹے اشرف ا لمخلوقات ، گھر گھر صفِ ماتم اور در در پہ نوحہ خوانی۔ مارشل لاء بھی آئے اور جمہوریتیں بھی لیکن اصلی آمر شہرِ قائد کی تقدیر بدل سکے نہ جمہوری آمر۔ سبھی جانتے اور سب کچھ جانتے ہیں مگر لبوں پہ مصلحتوں کی مہریں۔ حکمران چپ کہ پائے اقتدار میں لرزش نہ آ جائے ، میڈیا چپ کہ "کاروبار" تباہ نہ ہو جائے ، لکھاری چپ کہ اندھی گولی کی غذا نہ بن جائے اور مجبور و مقہور چپ کہ کہیں جبر کی ڈائن کچا نہ چبا جائے۔ ربِ لم یزل کی قسم یہ ادبی تصویر کشی نہیں نہ افسانوی رنگ آمیزی کہ لاشوں پہ ادبی تخیل کے رنگوں سے نقش و نگار بنانے والے سے زیادہ بد فطرت و بد طینت کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ تحقیق کہ روشنیوں کے اس شہر کی حالت ایسی ہی ہے بلکہ اس سے کہیں بدتر ۔ سوال مگر یہ ہے کہ ایسا کس نے کیا ، کیوں کیا اور کیسے کیا ؟۔ جواب ڈھونڈنے کے لئے ہمیں اٹھائیس سال پیچھے جانا ہو گا جب 18 مارچ 1984 ء کو جناب الطاف حسین نے مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائیزیشن کی بنیاد رکھی اور 87 ء میں مہاجر قومی موومنٹ قائم کی گئی۔ 1997ء میں قومی دھارے میں شامل ہونے کا نعرہ لگا کر مہاجر قومی موومنٹ

کو متحدہ قومی موومنٹ میں بدل دیا گیا لیکن قیادت بلا شرکتِ غیرے محترم الطاف حسین ہی کے پاس رہی جو 92 ء میں پاکستان سے فرار ہو کر لندن جا بسے ۔ اس سے قطع نظر کہ وہ پاکستان میں قتل کے کئی مقدمات میں مطلوب ہیں ۔ اکابرینِ ایم۔ کیو۔ ایم کہتے ہیں کہ پاکستان میں قائدِ تحریک کی جان کو خطرہ ہے اس لئے وہ واپس نہیں آ سکتے ۔ سوال مگر یہ ہے کہ جس شخص سے 2007 ء میں برٹش گورنمنٹ نے محترمہ بے نظیر بھٹو جیسی قد آور شخصیت کی پاکستان آمد پر زندگی کی باقاعدہ گارنٹی طلب کی ہو اسے بھلا اپنے گڑھ کراچی میں کیا خطرہ ہو سکتا ہے ؟۔ 2002ء سے آج تک حکمرانی کے مزے کیا اپنے " قائدِ تحریک " کی جان کی حفاظت بھی نہیں کر سکتی ؟ اگر MQM لوٹنے والی قائدِ تحریک کو یہ خطرہ القاعدہ، طالبان یا دہشت گردوں سے ہے تو جب ساری قیادت پاکستان میں بیٹھ کر ہی حالات کا سامنا کر رہی ہے تو الطاف بھائی لندن میں کیوں چھپے بیٹھے ہیں۔ قوم بھلا اپنی جان کے خوف سے لرزاں ایک "برٹش نیشنل " کی قیادت پر اعتبار و انحصار کیوں اور کیسے کرے ؟۔ قائدِ تحریک کو خطرہ بیگانوں سے ہے یا اپنوں سے یہ تو وہی بہتر جانتے ہیں لیکن ذوالفقار مرزا کی "قرآنی پریس کانفرنس " کے مطابق تو، قائدِ تحریک لندن میں بیٹھ کر ملک توڑنے کی سازشیں کر رہے ہیں اور متحدہ آج تک ذوالفقار مرزا کے کسی ایک الزام کا جواب بھی نہیں دے سکی ۔

متحدہ کی سیاسی سرگرمیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ متحدہ نہ تو مہاجرین کی نمائندہ جماعت ہے اور نہ ہی اردو بولنے والوں کی۔ البتہ حصولِ مقصد کے لئے مہاجرین کے حقوق کے تحفظ کا نعرہ ضرور لگایا گیا۔ سبھی جانتے ہیں کہ مہاجرین کی اکثریت مشرقی پنجاب کے اضلاع فیروز پور، امرتسر، گورداس پور اور جالندھر سے ہجرت کرکے آئی جس کی غالب اکثریت پنجابیوں پر مشتمل تھی جب کہ تاریخ بتلاتی ہے کہ قائدِ تحریک کو پنجابیوں سے شدید نفرت اور چڑ ہے۔ انہوں نے 8 اگست 86ء کو نشتر پارک کراچی میں بلائی گئی پہلی ہی میٹنگ میں فرمایا " Karachi is no more mini Pak " ۔ یکم مارچ 88ء کو انہوں نے پنجابیوں اور پختونوں کو براہِ راست حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے صوبوں میں واپس چلے جائیں جب کہ 14 اگست 1988ء کو فرمایا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے دروازے "Mini Pakistan" کہ کراچی نہیں بلکہ لاہور دوسروں کے لئے کھول دے"۔ لاہور کی آغوش تو پہلے دن سے ہی اپنے تمام پاکستانی بھائیوں کے لئے "وا" ہے اور ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے سندھی، بلوچی اور پشتون بھائی یہاں اپنے کاروبار کرتے اور پُر سکون زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں اور قیامِ پاکستان سے آج تک نہ تو کسی پنجابی لیڈر نے لسانی منافرت پھیلانے کی کوشش کی اور نہ ہی کوئی لسانی سانحہ رونما ہوا البتہ مہاجر قومی موومنٹ کی بدولت کراچی خونم خون ہو گیا اور حیدرآباد میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اب پتہ نہیں متحدہ قومی موومنٹ بنا کر وہ کسے بیوقوف بنانے کی کوشش

کر رہے ہیں اور کس برتے پر قائدِ تحریک لندن میں بیٹھ کر "اوئے جاگیر دارا" جیسی فلمی بڑھکیں لگا رہے ہیں ؟۔ پنجاب اور پنجابی تو انہیں آج بھی "خوش آمدید" کہتے ہیں لیکن پہلے یہ تو ثابت کر دیں کہ متحدہ نے پنجابیوں اور پختونوں سے ازلی نفرت سے دامن چھڑا لیا ہے کیونکہ فی الحال تو پرانی مہاجر قومی موومنٹ اور موجودہ متحدہ قومی موومنٹ میں سرِ مو بھی فرق نظر نہیں آتا۔

اردو بولنے ولوں کی نمائندگی کا دعویٰ بجا لیکن متحدہ کے افعال و اعمال اس کی ہر گز گواہی نہیں دیتے۔ کیونکہ 90 ,91 ء تک متحدہ کی دہشت گردی کا یہ عالم تھا کہ بلا تفریق و MQM امتیاز جس گھر یا دوکان پر کا جھنڈا نظر نہیں آتا تھا اسے نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے اغوا برائے تاوان روز مرہ کا معمول تھا اور مخالفین کے لئے خوفناک عقوبت خانے قائم تھے۔ بھتہ خوری اور کلاشنکوف کلچر اسی دور کی پیداوار ہے۔ اس دہشت گردی کا نشانہ پنجابیوں اور پختونوں کے ساتھ ہی ساتھ "اردو سپیکنگ" بھی بنتے رہے۔ 1990 ء میں جب آفاق احمد نے ایم۔ کیو۔ ایم حقیقی کے نام سے اردو بولنے والوں کی الگ جماعت بنائی تو متحدہ کی نفرت کا سب سے زیادہ نشانہ وہی بنی۔ "محصورینِ بنگلہ دیش" کی واپسی متحدہ کے منشور کا حصہ تھا لیکن چار بار حکومت کے مزے لوٹنے کے باوجود اس سلسلے میں نہ تو کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی اور نہ ہی اسمبلیوں میں

آواز اٹھائی گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ متحدہ کا ابتدا ہی سے یہ ایجنڈا تھا کہ کراچی، حیدرآباد، سکھر، شکارپور اور میرپور خاص کو ہر اس شخص سے بزورِ بازو پاک کر دیا جائے جو اس کا مخالف ہو۔ اس تناظر میں جناح پور منصوبہ حقیقتوں کے قریب تر نظر آتا ہے۔ آج تو اس منصوبے کو مصلحتوں کی دیمک چاٹ گئی لیکن تحقیق کہ تاریخ سچائی ضرور اگلتی ہے خواہ اس میں کتنا عرصہ ہی کیوں نہ لگے۔

1992ء میں ''آپریشن کلین اپ'' کے دوران الطاف حسین ملک سے فرار ہو گئے اور تب سے اب تک قتل و غارت گری مختصر وقفوں کے ساتھ جاری ہے۔ ہمیشہ سے ہوسِ اقتدار میں مبتلا MQM نے آمر مشرف کا بھرپور ساتھ دیا اور 2002ء کے انتخابات کے بعد پانچ سال تک حکمرانی کے مزے لوٹتی رہی لیکن جونہی مشرف نے اقتدار سنبھالا، PPP کے ساتھ شامل ہو گئی۔ لیکن یہاں اس کا PPP متحدہ مشرف سے آنکھیں پھیر کر واسطہ سیاست میں استادوں کے استاد جنابِ آصف زرداری سے پڑا جو خوب جانتے ہیں کہ مچھلی پانی کے بنا رہ سکتی ہے نہ متحدہ اقتدار کے بغیر۔ انہوں نے ایک طرف تو رحمٰن ملک کو متحدہ کے ساتھ نتھی کر دیا جب کہ دوسری طرف کراچی میں مضبوط قوت بن کر ابھرنے والی ANP کے ساتھ ذوالفقار مرزا کو۔ اب حالت یہ ہے کہ متحدہ اقتدار کی اس جنگ میں پیپلز پارٹی اور ANP کے درمیان پس رہی ہے اور ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' کے مصداق MQM حکومت

سے روٹھتی اور پھر فوراً ہی مانتی رہتی ہے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ ایک عام انسان بھی خوب جانتا ہے کہ متحدہ حکومت سے علیحدگی کا رسک نہیں لے سکتی۔ پچھلے دنوں ایک نیوز چینل پر متحدہ کے وسیم اختر نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ ان کے خلاف سب کچھ حکومت کروا رہی ہے لیکن پھر بھی وہ حکومت سے الگ نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر وہ الگ ہوئے تو MQM حکومت انہیں تباہ کر دے گی۔ یہ عین حقیقت ہے کہ اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہی ہے لیکن اس جنگ میں تباہی و بربادی کا نشانہ کراچی بن رہا ہے جہاں پہلے ایک مافیا تھا لیکن اب مافیا ہی مافیا ہیں۔

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

انتہائی محترم رضا ربانی صاحب پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں قومی سلامتی کمیٹی کی سفارشات پیش کر رہے تھے اور میری آنکھیں نیند سے بند ہوتی چلی جا رہی تھیں ۔اس لئے نہیں کہ میں کئی راتوں کی جاگی ہوئی تھی ،بلکہ اس لئے کہ ان کی سفارشات سن کر انتہائی بوریت ہو رہی تھی۔ لیکن ہم لکھاریوں کی یہ مجبوری ہوتی ہے کہ جتنی دیر تک اِدھر اُدھر سے مواد اکٹھا نہ کریں کالم کا پیٹ نہیں بھرتا۔

ہمارے معاشرے کا ایک کردار "کانگڑی پہلوان" بھی ہے۔ انتہائی نحیف و نزار، جسم میں جان نہیں، تیز ہوا اُڑا کر کسی درخت کی ٹہنی پر لٹکا دے لیکن باتیں بڑی بڑی اور اکڑ خوں حد سے زیادہ۔ ہمیشہ طاقتور سے پنگا اور خوب مرمت ہو جانے کے بعد زمیں سے کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھنا اور کہنا "ہن مار کے وخا" ۔ سچی بات ہے کہ مجھے تو اپنے سیاست دان، جن کا تعلق حکومت سے ہو یا حزبِ اختلاف سے سبھی "کانگڑی پہلوان ہی نظر آتے ہیں ۔۔بڑھک بازی میں یدِ طولیٰ لیکن وقتِ آزمائش :۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

ہر سال یہ پارلیمنٹ متفقہ قرارداد پیش کرتی ہے اور متن سب کا ایک " ہُن مار کے وخا" ۔ کوئی پوچھنے والا نہیں کہ جب 22 اکتوبر 2008 کی ان کیمرہ بریفنگ سے لے کر آج تک امریکہ نے کسی قرارداد کو جوتے کی نوک پہ نہیں رکھا تو 13 اپریل کی قرارداد سے کیا فرق پڑے گا ۔ بجٹ آنے والا ہے اور ان بھکاریوں نے آخرکار اپنے آقا سے بھیک مانگ کر ہی آتشِ شکم کو بجھانا ہے ۔ پھر اکڑ خوں کاہے کی ؟ ۔ مان کیوں نہیں لیتے کہ تم بھکاری تھے ، بھکاری ہو اور اگر کوئی معجزہ رونما نہ ہوا تو بھکاری ہی رہو گے ۔ لیکن معجزوں کا دور تو لد چکا ۔

جب اپوزیشن سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا امریکہ یہ کڑی شرائط مان لے گا ؟ تو ان کا واضح جواب ہوتا ہے کہ یہ سوال حکومت سے کریں ہمارا کام قوم کے بہترین مفاد میں متفقہ قرارداد پیش کرنا تھا ۔ آپ اتنا دیکھیں کہ ہم کیسی زبردست قرارداد لے کر آئے ہیں ۔ رہی اربابِ اختیار کی بات تو وہ بھی جو کچھ کرتے ہیں قوم کے بہترین مفاد میں ہی کرتے ہیں لیکن اگر کوئی مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے تو صرف یہ کہ "بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟" ۔ یہ بجا کہ ہمارے چوہے حرام کھا کھا کے بہت موٹے ہو گئے ہیں لیکن چوہا تو چوہا ہوتا ہے ۔ اگر یقین نہ آئے تو پیچھے مُڑ کر دیکھ لیجیے کہ جب "پاکستانی ساس" ہیلری کلنٹن نے 2010 ء میں پاکستان میں صحافیوں کے ایک پینل کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ کہا

اگر امداد نہیں لینی تو نہ لو، ہم کوئی زبردستی دے رہے ہیں" ۔تب سارے صحافی" ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے ۔ ہیلری نے پاکستان میں بیٹھ کر ہماری غیرتوں کے مُنہ پہ جو تمانچہ رسید کیا تھا اُس کی ہلکی سی گونج بھی اگر بھٹو کے ان وارثوں کو سنائی دیتی تو کہہ دیتے کہ "گھاس کھا لیں گے لیکن امداد نہیں لیں گے" ۔ لیکن ایسا ہوا نہیں اور نہ ہی ہونا تھا۔

ڈھلتی عمر کے لوگ تو مضمحل قویٰ کے ساتھ بہت سی مصلحتوں کا شکار ہو ہی جاتے ہیں لیکن میرا سوال تو اقبال کے ان شاہینوں سے ہے کہ کیا تم بھی اپنی اپنی زندگیاں یوں ہی ذلتوں کے غارِ عمیق میں غرق کر دوگے ؟۔اقبال کے یہ لاہوتی طیور جو دورِ جدید میں تیزتر میڈیا اور انٹرنیٹ کی بدولت بہت باخبر ہیں، کیا نہیں جانتے کہ "بددیانتی" کے علمبرداروں نے محض چار سالوں میں اتنی رقم ہڑپ کر لی ہے کہ جس سے اگلے کئی سالوں کا ٹیکس فری بجٹ پیش کیا جا سکتا تھا ؟۔یہ رقم ان "جونکوں" کے باپ دادا کی کمائی نہیں بلکہ ہماری ہی رگوں سے نچوڑا ہوا لہو ہے۔ ہماری چھوڑیے کہ ہم تو بھلی بُری گزار چکے لیکن کیا تم بھی ۔۔۔۔؟ سبق زندگی کا ہمیشہ یہی سنا، لکھا اور پڑھا کہ باپ دادا کے نقشِ قدم پہ چلو لیکن میں کہتی ہوں، ببانگِ دُہل کہتی ہوں کہ اگر ہمارے نقشِ قدم پر چلے تو ذلتیں اور رُسوائیاں ہی مقدر ٹھہریں گی ۔ کسی خارش زدہ کتے کی طرح سسک سسک کر مرنے سے کہیں بہتر ہے کہ شیروں کی طرح دھاڑتے ہوئے

نکلو اور ان خائنوں، بد دیانتوں، رسہ گیروں، بھتہ خوروں اور قبضہ گروپوں کی شہ رگ سے وہ سارا خون نچوڑ لو جس سے بے شرمی، بے حمیتی اور بد دیانتی کی باس آتی ہے۔ آخر کب تک یہ اربوں روپے ڈکار جانے والی پارلیمنٹ ایسی متفقہ قرار دادوں کی صورت میں قوم کا مذاق اُڑاتی رہے گی؟۔

محترم عمران خاں صاحب نے فرمایا ہے کہ پیپلز پارٹی، نواز لیگ اور مولانا فضل الرحمن سبھی آپس میں مل گئے ہیں۔ بجا ارشاد لیکن دعویٰ آپ کا بھی تو تھا کہ نیٹو سپلائی بحال نہیں ہونے دیں گے۔ مجھے تو چیچہ وطنی کے جلسہ عام میں آپ کی پُر جوش تقریر میں کہیں نیٹو سپلائی روکنے کا اعلان سنائی نہیں دیا۔ اب موقع ہے، قدم بڑھایئے اور اپنے اگلے لائحہ عمل کا اعلان کیجیئے۔ کون بد بخت ہو گا جو آپ کا ساتھ نہیں دے گا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ ایسا ہو گا نہیں اور نہ ایسا ہو سکتا ہے کہ جہاں امریکہ سامنے آ جائے وہاں سب کی گھگی بندھ جاتی ہے۔ پارلیمنٹ اپنی قرار دادیں پیش کرتی رہے گی، حکمرانی کے امید وار اپنی بڑھکیں لگاتے رہیں گے لیکن ہونا وہی ہے جو امریکہ چاہے گا کیونکہ ہمارے حکمران اور امریکی زر خرید لکھاری ہمیشہ قوم کو یہی سبق تو پڑھاتے چلے آ رہے ہیں کہ کیا ہوا جو سلالہ میں ہمارے چوبیس جوان شہید ہو گئے، کیا ہوا جو بیچ چوراہے تین شہریوں کو قتل کرنے والے ریمنڈ ڈیوس کو ہم نے دست بستہ واپس کر دیا کیا ہوا جو ایبٹ آباد میں امریکی اسامہ کو شہید،

کرکے لاش بھی ساتھ لے گئے، کیا ہوا جو پاکستانیوں کو امریکی ہوائی اڈوں پہ برہنہ کر دیا جاتا ہے اور بھارتی اداکار کو دو گھنٹے روکنے پر بھی معافی مانگ لی جاتی ہے، کیا ہوا جو ڈرون ہمارے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا شکار کرتے رہتے ہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ کیا اپنے آقا کے حکم سے روگردانی کے بعد ہم پتھر کے دور میں جانا پسند کریں گے؟۔ بتقاضائے عقل بہتر یہی ہے کہ ان روز روز کے ڈراموں کو چھوڑیں اور اپنے آقائے ولی نعمت کے حضور زانوئے تلمذ تہ کر دیں۔۔۔۔ سب کچھ بجا لیکن شاید وہ یہ مسلمہ اصول فراموش کر بیٹھے کہ

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

ہفتے کی صبح چار بجے قاتل سیاہ چین گلیشیئر کا اسی فٹ بلند برفانی تودہ گیاری سیکٹر کے بٹالین ہیڈ کوارٹر پر گرا جس کے نیچے 128 فوجی افسر و جوان اور گیارہ شہری دب گئے۔ عقل کہتی ہے کہ وہ بچھڑ چکے لیکن انہیں شہید لکھتے ہوئے قلم کی زبان پہ لکنت طاری ہو جاتی ہے کہ پتہ نہیں کتنے دل امید کی کچی ڈور سے بندھے، آشاؤں کے دیپ جلائے بیٹھے ہیں۔ جانے کتنے ننھے منے ہاتھ گلابی گالوں پہ اشکوں کے موتی سجائے توتلی دعائیں مانگ رہے ہیں، کتنی بہنوں کی ردائیں اس رحیم و کریم کے حضور پھیلی ہوئی ہیں، کتنی مائیں ربِ ذوالجلال سے اپنی جانوں کے عوض بیٹوں کی زندگی کی طلبگار ہیں اور جانے کتنی سہاگنیں آنکھوں میں امید کی شمعیں جلائے محوِ انتظار ہیں۔۔۔ ماہرین کہتے ہیں کہ

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

لیکن ہم پھر بھی مایوس نہیں کہ مایوسی کفر ہے۔۔۔ جو برف کی دبیز تہوں کے نیچے موت سے نبرد آزما ہیں، پوری قوم ان کے لئے دست بہ دعا ہے اور جو برف کی چادر اوڑھ کے سو گئے وہ حیاتِ جاوداں پا گئے کہ میرے رب کا فرمان ہے

شہید کو مردہ مت کہو، وہ زندہ ہے اور اپنے رب کے ہاں سے خوراک حاصل کر رہا ہے البتہ تم ادراک نہیں کر سکتے"۔

تسلیم بلکہ جزوِ ایماں کہ شہید کی موت میں قوم کی حیات مضمر ہے۔ سوال مگر یہ کہ کس قوم کی حیات ؟۔ کیا اُس قوم کی جس نے حقِ حکمرانی ایسے لوگوں کو بخش دیا جن کے اندر دھڑکتا دل ہے نہ رگوں میں دوڑتا لہو؟۔جب جنرل کیانی گیاری پر کھڑے ریسکیو آپریشن کی نگرانی کر رہے تھے عین اسی لمحے ٹویٹر پر بلاول زرداری کا پیغام آ رہا تھا کہ من موہن جی کا کھانا بہت مزیدار تھا"۔اِدھر یہ سانحہ عظیم اُدھر جنابِ زرداری اپنا" دورہ بھارت محض اس لئے ملتوی نہیں کرتے کہ جوتشی نے کہا تھا کہ اگر آٹھ اپریل کو اجمیر شریف حاضری دیں گے تو ساری بلائیں دور ہو جائیں گی۔ کیا زندہ قوموں کے رہنما ایسے ہی ہوتے ہیں ؟۔ سبھی جانتے ہیں کہ 1984 سے اب تک طوفانوں کی نذر ہونے والے تین ہزار سے زائد فوجی جوانوں کی شہادت کا اصل مجرم بھارت ہی ہے جس نے 1984ء کے موسمِ سرما میں ستر کلومیٹر پر پھیلے سیاچین گلیشیئر پر قبضہ کر لیا حالانکہ اس گلیشیئر کو ہمیشہ "نو مینز لینڈ" تصور کیا جاتا رہا۔صرف موسمِ گرما میں دونوں ممالک کے فوجی وہاں پہ ایک آدھ گشت کر لیا کرتے تھے۔ ہمارے جری جوانوں نے شجاعت کی نا قابلِ یقین داستانیں رقم کرتے ہوئے سیاچین کا پاکستانی حصہ تو دشمن کے قبضے سے آزاد کروا لیا لیکن تب سے اب تک کوہ

ہمالیہ کے اس سلسلے میں جگہ جگہ فوجی مورچے قائم ہیں۔ یہ عجب محاذِ جنگ ہے جہاں دونوں متحارب افواج کا مشترکہ دشمن یہی گلیشیئر ہے جو پانچ ہزار سے زائد بھارتی فوجیوں کی بھینٹ بھی لے چکا ہے۔ اس محاذ پر پاکستان سے چار گنا زیادہ اخراجات کرنے کے باوجود بھارت اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے حکمرانوں سے ایک ارب بیس کروڑ بھارتیوں میں سے کوئی ایک بھی یہ پوچھنے والا نہیں کہ آخر یہ بھینٹ کیوں دی جا رہی ہے؟۔

میں سیاچین کی خوفناکیوں سے غائبانہ اس لئے آگاہ ہوں کہ میرے داماد میجر ڈاکٹر اس علاقے کی اکیس ہزار فٹ اونچی "سیڈل پوسٹ" پر ڈیوٹی دے چکے ہیں۔ ان کی زبانی جو کچھ سنا وہ ناقابلِ یقیں سا لگتا ہے۔ بلند و بالا چوٹیوں پر بیٹھے یہ شاہیں صفت افسر و جوان عزم و ہمت کے وہ پیکر ہیں جو ہمہ وقت موت سے پنجہ آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ آکسیجن کی اتنی کمی کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے، نیند اور بھوک ختم ہو جاتی ہے، سر میں ہر وقت شدید درد کی شکایت رہتی ہے اور برف پر پڑتی سورج کی تیز شعاعوں کے انعکاس سے رنگت سیاہ پڑ جاتی ہے۔ "سنو بائیٹ" کا بہت سے جوان شکار ہو جاتے ہیں، کسی کی انگلیاں شہید ہو جاتی ہیں تو کسی کے ہاتھ اور کسی کے پاؤں لیکن پھر بھی جذبے جوان رہتے ہیں۔

سکردو سے سیاچین تک کا بیس بائیس دنوں پر محیط پیدل سفر در اصل موت کا سفر ہوتا ہے۔ موت کی اس وادی میں قدموں کے نیچے برف سے ڈھکی گہری کھائیاں اور چوٹیوں سے گرتے برفانی تودں اور طوفانوں کا قدم قدم پر سامنا کرتے یہ جری اپنی منزل کی طرف گامزن رہتے ہیں۔ راہ میں کئی ایسی جگہیں آتی ہیں جنہیں شہیدوں سے منسوب کیا گیا ہے اور ہر مقام کی الگ ہی داستان ہے۔ فوجی جوان جگہ جگہ رک کر فاتحہ خوانی کرتے اور اپنے جذبوں کو مہمیز دیتے ہیں۔ سیڈل سے پہلے آخری پوسٹ عبور کرنے کے بعد اگر بائیں مُڑ جائیں تو سامنے کے۔ٹو کی چوٹیاں نظر آنے لگتی ہیں جو سیاحوں اور کوہ پیماؤں کے لئے ہمیشہ باعثِ کشش رہی ہیں۔کے۔ٹو کی چوٹیاں سر کرنے کے لئے یہ واحد راستہ ہے جو صرف پاکستان سے جاتا ہے۔ دائیں جانب کا راستہ سیڈل پوسٹ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ "سیڈل" گھوڑے کی زین کو کہا جاتا ہے۔ اس پوسٹ کا نام سیڈل بھی اسی مناسبت سے رکھا گیا ہے کیونکہ اس کے دونوں جانب اونچی چوٹیاں اور درمیان میں ڈھلوان ہے۔ سیڈل کے ایک طرف پاکستانی اور دوسری طرف انڈین پوسٹیں ہیں اور درمیانی ڈھلوان کو "نالہ" کہا جاتا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں S.S.G کے میجر نیازی اپنے پچیس ساتھیوں سمیت گئے اور پھر کبھی لوٹ کے نہیں آئے۔ اب اسے "نیازی پوسٹ" کہا جاتا ہے۔ میرے داماد نے بتلایا کہ اس کی پوسٹنگ سے چار ماہ پہلے کیپٹن سعید اپنے بارہ ساتھیوں کے ہمراہ سیڈل کی طرف رواں تھے

کہ اچانک انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے اوپر کوئی سلائیڈ ٹوٹی ہو۔ اپنے ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے غور سے سنا تو گڑگڑاہٹ کی آواز زیادہ واضح سنائی دی۔ اس جری افسر نے ہمراہیوں کو اپنے جسموں سے بندھے رسے کھولنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا پھر فضا اللہ اکبر کی گونج فضاؤں میں آناً فاناً برف کا طوفان کیپٹن سعید سمیت چار غازیوں کو رتبہ شہادت سے سرفراز کرتا ہوا گہری کھائی میں گم ہو گیا۔ آج وہ جگہ "سعید پوسٹ" کے نام سے منسوب ہے۔ کیپٹن ڈاکٹر حلیم اللہ محض چند دن پہلے تک سی۔ایم۔ایچ راولپنڈی میں زیرِ علاج تھا لیکن جوں ہی طبیعت سنبھلی گیاری پہنچ گیا اور آج برف کی اسی فٹ موٹی چادر اوڑھے سو رہا ہے۔ سیاچین گلیشیئر میں ایسی بیشمار کہانیاں دفن ہیں، کس کس کا ذکر کریں؟۔ سیڈل تو صرف ایک پوسٹ ہے جب کہ کوہ ہمالیہ کے اس سلسلے میں ایسی بیشمار پوسٹیں قائم ہیں اور ہر پوسٹ کی الگ داستان لیکن مجال ہے جو کسی افسر یا جوان نے کبھی موت کی اس وادی میں قدم رکھنے سے انکار کیا ہو۔یہی نہیں بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شوقِ شہادت سے سرشار یہ غازی، یہ پُر اسرار بندے خود سیاچین جانے کی ضد کر بیٹھتے ہیں۔

چوٹیوں پہ بیٹھے ہوئے وطن کے ان محافظوں کی زندگی بھی وہاں عجب ڈھنگ سے گزرتی ہے۔ "اگلو" دو تہائی برف میں دھنسے ہوتے ہیں۔ ایک بار برف باری

شروع ہو جائے تو کئی کئی دن جاری رہتی ہے۔۔برف باری کے دوران دو جوان دن رات اگلوکے دروازے سے.برف ہٹاتے رہتے ہیں تاکہ تھوڑی بہت آکسیجن ملتی رہے۔ ہر پندرہ دن بعد ہیلی کاپٹر کھانے پینے کا سامان لے کر آتا ہے۔ لیکن بعض اوقات خراب موسم کے باعث ایک ایک ماہ تک ہیلی کاپٹر کاانتظار کرنا پڑتا ہے۔ایک بار ایسا بھی ہوا کہ کئی دنوں تک ہیلی کاپٹر نہ آیا اور ماچسوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔آخری بچی ہوئی ماچس کی آخری چند تیلیوں کو اس طرح سے سنبھال سنبھال کر رکھا جا رہا تھا جیسے وہ دنیا کی سب سے قیمتی شئے ہوں۔ موسم گرما میں یہ گلیشیئر زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے کیونکہ پگھلتی.برف کے ساتھ ہی جگہ جگہ ہزاروں فٹ گہری کھائیاں نمودار ہونے لگتی ہیں جو راستے مسدود کر دیتی ہیں۔ایک الٹا سیدھا قدم ہزاروں فٹ گہری کھائیوں میں دھکیل دیتا ہے۔

باتیں تو بہت سی ہیں لیکن یہیں پہ بس کرتے ہوئے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ شوقِ شہادت سے سرشار ان جری جوانوں کی دفاعِ وطن کی خاطر مر مٹنے کی تمنا کا کوئی مول نہیں سوائے بے پناہ محبتوں اور عقیدتوں کے پھول نچھاور کرنے کے۔ طالع آزماؤں کو چھوڑیے کہ وہ تو ہوسِ اقتدار کے بھوکے چند جرنیل ہوتے ہیں۔پاک فوج کے ان جوانوں کو یاد رکھیے جن کے حوصلے گیاری جیسے سانحے بھی پست نہیں کر سکتے۔

سیاسی شہادت کے شوقین

آج کل ہمارے نوجوان وزیرِ اعظم کچھ بوڑھے بوڑھے سے دکھائی دینے لگے ہیں۔ ہمیں تو فخر ہوتا تھا کہ ہمارے خوش لباس وزیرِ اعظم صاحب نے تو اپنے آپ کو ایسے فلمی ہیروز کی طرح سُپر فِٹ رکھا ہوا ہے جو پچاس کے پیٹے میں ہونے کے باوجود کسی کالج کے شریر طالب علم کا کردار نبھاتے نظر آتے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ ان کا موازنہ عامر خاں اور شاہ رُخ خاں سے کیا لیکن مجھے وہ ہمیشہ ان سے کچھ زیادہ ہی سمارٹ نظر آئے۔ لیکن اب شاید انہیں کچھ غمِ جاناں اور کچھ غمِ دوراں نے بوڑھا کر دیا ہے۔ ایک طرف پیپلز پارٹی کے لندن پلٹ چیئر مین بلاول زرداری ہیں جنھوں نے انہیں سوئس حکومت کو خط نہ لکھ کر "بھٹوز" سے وفا کا ثبوت فراہم کرنے کا حکم دے رکھا ہے جبکہ دوسری طرف سپریم کورٹ لٹھ لے کر پیچھے پڑی ہے۔ اعتزاز احسن کی وکالت بھی کام نہ آئی حالانکہ خیال یہی تھا کہ سپریم کورٹ جنابِ چیف جسٹس کے سابقہ "ڈرائیور" کا کچھ تو خیال کرے گی لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شُدی" سپریم کورٹ نے بھی آنکھیں پھیرلیں اور عدلیہ بحالی تحریک میں دی گئی قُربانیوں کو بھی فراموش کر دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عدلیہ کو ان کی صرف ایک نظم "دھرتی ہو گی ماں کے جیسی" کا عوض بھی نہیں دے سکتی باقی قُربانیاں تو الگ ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر دُکھ میں آ کر اعتزاز صاحب نے ایک

ایسی ہی نظم عدلیہ کے خلاف لکھ دی تو کہیں سب کچھ الٹ پُلٹ نہ ہو جائے۔
عدل بنا جمہور نہ ہو گا" کے نعرے لگانے والے اعتزاز احسن نے حقِ نمک ادا کرتے ہوئے عدل اور جمہور دونوں کو "طلاق" دے دی لیکن وائے قسمت کہ وہ بھی کسی کام نہ آئی۔ چار و ناچار انہوں نے سات رُکنی بنچ پر ہی اعتراض کر دیا لیکن بنچ نے ان کی چیخ وپکار پہ کوئی کان نہیں دھرا۔ ان دنوں انہیں اعتراض تو خیر ہر کسی پر ہے کہ کورٹ بات نہیں مانتا، میڈیا چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا ہے اور وکلاء طنز کے تیر برساتے رہتے ہیں۔ اس لئے بھلا وہ اعتراض نہ کریں تو اور کیا کریں ؟۔ سنا ہے کہ لوگوں نے انہیں "اعتزاز صاحب" کی بجائے "اعتراض صاحب" کہنا شروع کر دیا ہے لیکن ہمیں اس سے کیا لینا دینا، ہمیں تو گیلانی صاحب کی بے بسی دیکھ کر کچھ کچھ ترس بھی آنے لگا ہے۔ وہ بار بار دہائی دیتے ہیں کہ انہیں صدر سے وفا کی سزا مل رہی ہے لیکن "بکرے جان گوائی ، کھان والے نوں سواد نہ آیا" کے مصداق زرداری صاحب نے یہ کہہ کر ان کی ساری قُربانیوں پر پانی پھیر دیا کہ "گیلانی کو میری وفا کی نہیں بلکہ "تختِ لاہور" سے دشمنی کی سزا مل رہی ہے۔ سوال مگر یہ ہے کہ گیلانی صاحب کو حکم عدولی کی سزا کا سامنا تو سپریم کورٹ کی طرف سے ہے تختِ لاہور کی طرف سے نہیں۔ کیا سپریم کورٹ تختِ لاہور کے پایوں کے نیچے ہے جو اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی؟۔ زرداری صاحب تو خیر ٹھہرے بادشاہ کیا پتہ کل کلاں یہ

بھی کہہ دیں کہ بابر اعوان کا "دھڑن تختہ" بھی تختِ لاہور نے ہی کیا ہے اور روتی بسورتی فردوس عاشق اعوان سے اطلاعات کی وزارت چھیننے کی سازش بھی تختِ لاہور نے ہی رچائی تھی۔ یہ وزارت سے یاد آیا کہ میں چار پانچ دنوں سے انسائیکلو پیڈیا سامنے رکھ کے بیٹھی ہوں، مجھے ان نئے محکموں کی ہرگز سمجھ نہیں آئی جو کابینہ میں پندرہ نئے وزراء کی شمولیت کے بعد پیدا کئے گئے ہیں۔ محکموں تو ماریے گولی کہ ہمارے وزراء نے کون سا کام کرنا ہوتا ہے لیکن کم از کم ان محکموں کا مطلب تو انسائیکلو پیڈیا میں درج ہونا چاہیے تھا لیکن وہ بھی نہیں۔ تسلی ہوتی ہے تو صرف اتنی کہ جب جاوید چوہدری جیسے بہت پڑھے لکھے لکھاری اور اینکر کو سمجھ نہیں آئی تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں؟۔

بات گیلانی صاحب کی پریشانی کی ہو رہی تھی، نکل کسی اور طرف گئی۔ تو میں کہہ رہی تھی کہ گیلانی صاحب اپنی قُربانیاں رائیگاں جاتے دیکھ کر پریشان ہیں اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق وہ یہ نہ کہہ دیں کہ

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

تو نہیں اور سہی ، عمران خاں کے سونامی کی لہریں بھی پُکار رہی ہیں اور شریف برادران کی شرافت بھی ۔ سونامی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہاں کرسیوں کی لوٹ مار کی کھُلی چھُٹی ہے اور گیلانی صاحب ٹھہرے پیدائشی "کرسی" کے شوقین ۔ ویسے گیلانی صاحب بھی بھولے بادشاہ ہیں جو ایک کرسی کے پیچھے مارے مارے پھر رہے ہیں ، تحریکِ انصاف میں شامل ہو کر جتنی جی چاہے کرسیوں پہ ہاتھ صاف کرلیں ۔ سنا ہے کہ کل کوئٹہ کے جلسے میں قصور کے جلسے سے بھی زیادہ کرسیوں پہ ہاتھ صاف کیا گیا ہے ۔ اب یہ سوچنا اکابرینِ تحریکِ انصاف کا کام ہے کہ لوگ کپتان کی تقریر سننے آتے ہیں یا کرسیاں لوٹنے ؟۔ اگر یہی سونامی ہے تو پھر اس ملک کا اللہ ہی حافظ کہ اگر "شیدایانِ عمران خاں" کا آج یہ حال ہے تو کل حکومت ملنے کے بعد یہ کیا گُل کھِلائیں گے ؟۔

گیلانی صاحب تو شاید اپنی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی فیصلہ کر ہی بیٹھتے لیکن عبد القادر گیلانی اور علی موسیٰ گیلانی ان کے پاؤں کی زنجیر بنے بیٹھے ہیں ۔ عبد القادر کو دنیا کی مہنگی ترین بُلٹ پروف گاڑیوں کا شوق ہے جب کہ علی موسیٰ کی خواہشات بھی حد سے بڑھی ہوئی ۔ ان گیلانی برادران کو سوچنا چاہیے تھا کہ جس شخص نے اپنا آدھا گھر بیچ کر ملک و قوم کی خاطر الیکشن لڑا ہو وہ بھلا ان کی خواہشات کیسے پوری کر سکتا ہے ؟۔ اس میں بھلا گیلانی صاحب کا کیا قصور جو عبد القادر نے "حج سکینڈل" میں

وزیرِ حج کو جیل کی ہوا کھلا کر اپنی خواہش پوری کر لی اور علی موسیٰ نے "ریفیڈرین سکینڈل" میں صرف ہنی مون "جوگے" پیسے کما لئے۔اگر ہنی مون کے لئے بھی پیسے اکٹھے نہ ہوتے تو نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا کہ "ساس" تو کھڑے کھڑے لندن کے مہنگے ترین سٹور سے لاکھوں پاؤنڈز کی خریداری کر لیتی ہے اور "بہو" کے لئے ہنی مون تک کے پیسے نہیں۔ہو سکتا ہے کہ اسی بات پر ساس بہو میں "تُو تُو میں میں" شروع ہو جاتی اور بیچارے "شاہ جی" مزید پریشان ہو جاتے۔اُدھر اپنے چیف صاحب ہیں جو کسی پیاسے کو سمندر سے بقدرِ قطرہ شبنم بھی دینے کے روادار نہیں۔انہیں کیا پتہ کہ گھر چلانے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔اب کوئی یوں ہی بیٹھے بٹھائے اپنا گھر تو نہیں اجاڑ سکتا۔شاید اسی لئے گیلانی صاحب نے یہ طے کر لیا کہ چیف صاحب اپنا کام کریں اور وہ اپنا۔اور ہاں! چیف صاحب لاکھ کہیں کہ "ہمیں اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کروانا آتا ہے" لیکن بادشاہو! تھانیدار تو گیلانی صاحب نے ہی دینا ہے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کے لئے تھانیدار ہی نہ ملیں اور بدباطن دشمن گلی گلی یہ کہتے پھریں کہ

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخ زیبا لے کر

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

پروفیسر مظہر

پورا پاکستان جل رہا ہے ۔ گلگت بلتستان میں مذہبی تعصب کی آگ بھڑک رہی ہے ۔ کراچی ، کوئٹہ ٹارگٹ کلنگ اور خیبر پختونخواہ بم دھماکوں کی زد میں ۔ جغرافیائی سرحدیں محفوظ ہیں نہ نظریاتی ۔ گیاری میں آج بارھویں دن بھی وطن کی آن پر مر مٹنے والے ٹنوں موٹی برف کی چادر اوڑھے سو رہے ہیں ۔ لیکن ہماری مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کو بارہ روز کے بعد فرصت ملی البتہ کسی کو ابھی تک گلگت بلتستان جانے کی ضرورت محسوس ہوئی نہ وزیرستان میں عزم و ہمت کی لازوال داستانیں رقم کرنے والے جوانوں کی پیٹھ تھپتھپانے کی ۔ یہ مگر ضرور ہوا کہ ملتان میں بیٹھ کر زرداری صاحب نے اپنی گرتی ہوئی سیاسی ساکھ بچانے کے لئے الیکشن سے پہلے سرائیکی صوبہ بنانے کا اعلان کر دیا ۔ حالانکہ انہیں اس کی آئین اجازت دیتا ہے نہ ان کے پاس مینڈیٹ ۔ آئین کو تو خیر حکمرانوں نے پہلے ہی اپنے گھر کی لونڈی اور در کی باندی بنا رکھا ہے ۔۔ لیکن مینڈیٹ ؟ ۔ کیا وزیرِ اعظم صاحب کسی ایگزیکٹو آرڈر کے ذریعے سرائیکی صوبہ تشکیل دیں گے یا پھر آئین کے آرٹیکل 239 کی کلاز 4 کے تحت متعلقہ صوبائی اسمبلی دو تہائی اکثریت سے نئے صوبے کا بل پاس کرکے قومی اسمبلی میں بھیجے گی ؟ ۔ کیا پنجاب

اسمبلی میں حکمرانوں کے پاس دو تہائی اکثریت ہے ؟۔اگر نہیں تو پھر کس کو بیوقوف بنایا جا رہا ہے ؟۔

نئے صوبوں کی تشکیل سے کسی بھی سیاسی پارٹی کو اختلاف نہیں اور بہاولپور صوبہ تو ون یونٹ سے پہلے بھی موجود تھا۔ سوال مگر یہ ہے کہ صوبے انتظامی بنیادوں پر بنائے جائیں یا لسانی ؟۔ اگر لسانی بنیادوں پر ہی تشکیل مقصود ہے تو پھر بسم اللہ سب سے پہلے سندھ میں مہاجر صوبہ تشکیل دیں ، بلوچستان میں پختون صوبے کی بنیاد رکھیں ، خیبر پختونخواہ میں ہزارہ صوبہ کے علاوہ ایک اور صوبہ بھی تشکیل دیں کیونکہ خیبر پختون خواہ میں سبھی "پشتو سپیکنگ " تو نہیں۔ پھر پنجاب میں سرائیکی ہی نہیں پوٹھوہاری صوبہ بھی بنا دیجیے ، کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے ؟ اگر انتظامی بنیادوں پر تشکیل مقصود ہے تو پھر بھی تمام صوبوں کے نئے انتظامی یونٹ بنانے ہونگے ۔ البتہ اگر مقصد صرف پنجاب کے حصے بخرے کرنا ہے تو پنجاب کسی کے باپ کی جاگیر نہیں اور نہ ہی اتنا کمزور کہ جس کا جب جی چاہے ٹکڑے ٹکڑے کر دے ۔

پیپلز پارٹی نے اپنے انہی عزائم کی تکمیل کی خاطر پندرہ نئے وزراء کو کیبنٹ میں شامل کر لیا گیا حالانکہ اٹھارھویں ترمیم کے مطابق اراکین اسمبلی کی کل تعداد کے گیارہ فیصد سے زیادہ وزیر نہیں ہو سکتے لیکن اب ماشاللہ 370

کی اسمبلی میں 91 وزیر مشیر ہیں۔ اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لئے پندرہ میں سے تیرہ وزراء صرف پنجاب سے لئے گئے ہیں۔ سرائیکی صوبے کی تحریک عوام کے اندر نہیں، وڈیروں اور جاگیر داروں کے اندر جنم لے رہی ہے۔ شور اٹھتا ہے کہ سرائیکی پٹی کو پسماندہ کر دیا گیا ہے۔ بجا لیکن پسماندہ کرنے والے بھی تو وہی ہاتھ ہیں جو سرائیکی صوبے کا شور مچا رہے ہیں۔ تاریخ اٹھا کے دیکھ لیجئے ملک میں جمہوریت ہو یا آمریت حکمرانوں کی غالب اکثریت کا تعلق ہمیشہ جنوبی پنجاب ہی سے رہا ہے۔ یہ نواب وڈیرے اور جاگیر دار کبھی بھی جنوبی پنجاب کے عوام کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔

سرائیکی صوبے کے حق میں جذباتی تقریریں کرنے والے گیلانی صاحب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جنوبی پنجاب کے لئے مختص اڑتیں ارب روپوں میں سے چھتیس ارب روپے صرف ملتان پر کیوں خرچ کر دیئے؟۔ مانا کہ گیلانی صاحب نے عبد القادر گیلانی کو صوبے کا وزیرِ اعلیٰ بنانے کا خواب دیکھا ہوگا اور علی موسیٰ گیلانی کو "کھُل کھیلنے" کا موقع دینے کا بھی لیکن کیا گیلانی صاحب کے خوابوں کو حقیقت کا روپ بخشنے کے لئے ملکی سالمیت داؤ پہ لگا دی جائے؟۔ پتہ نہیں پیپلز پارٹی علاقائی، لسانی اور مذہبی تعصبات کو ہوا دے کر اپنے کون سے مقاصد کی تکمیل چاہتی ہے؟۔

حیرت ہوتی ہے کہ اگر سندھ کی تقسیم کی بات کی جائے تو سندھی چاقو چھریاں

تیز کرنا شروع کر دیتے ہیں ، خیبر پختونخواہ والے ہزارہ صوبہ کا نام سنتے ہی تیر و تفنگ لے کر باہر نکل آتے ہیں لیکن ۔۔ لیکن پنجاب ؟۔ پنجاب چونکہ بڑا بھائی ہے اس لئے بڑے بھائی صاحب" کا رویہ ہمیشہ مشفقانہ اور بلا وجہ معذرت خواہانہ ہوتا ہے ۔" عشروں سے "بڑے بھائی صاحب" گالیاں کھا رہے ہیں لیکن کبھی بدمزہ نہیں ہوئے ۔ کوئی علیحدگی کی بات کرے تو تڑپ اٹھتے ہیں ، پاکستان کھپے کا نعرہ لگانے والوں کے دیوانے ہو جاتے ہیں ، سندھی وزیرِاعظم اور پنجابی وزیرِاعظم کا موازنہ ہو تو لب سی لیتے ہیں ، کوئی سندھی ٹوپی اور اجرک کی بات کرے تو پریشان ہو جاتے ہیں اور دوسرے صوبوں سے آنے والی پنجابیوں کی لاشوں پہ چپکے چپکے رو لیتے ہیں ۔ حالانکہ کہنے کو پنجابیوں کے پاس بھی بہت کچھ ہے ۔ بھٹو دور کے مظالم اور میر مرتضےٰ بھٹو کی تنظیم الذوالفقار" کے ہاتھوں بہت سے پنجابیوں کا قتل کسی کو بھولا نہیں لیکن پھر بھی پنجاب" نے کبھی کسی سندھی ، سرحدی یا بلوچی کی تفریق نہیں کی نہ کسی نے سنا کہ پنجاب سے کبھی لسانی یا علاقائی تعصب کی بنا پر کوئی ایک قتل بھی ہوا ہو وجہ صرف یہ کہ "بڑے بھائی صاحب" دل سے سبھی کو پاکستانی سمجھتے ہوئے ہمیشہ اپنا دامانِ الفت وا رکھتے ہیں ۔ بھٹو نے پکارا تو لبیک ، بینظیر نے آواز دی تو صدقے واری ، زرداری صاحب نے بلایا تو دیدہ و دل فرشِ راہ ۔ چونسٹھ سالوں میں صرف چار ساڑھے چار سال (میاں نواز شریف کا دورِ حکومت) حقِ حکمرانی ملا تو اسی پر خوش ۔ اس کے باوجود بھی گالی پڑتی ہے تو

صرف پنجاب کو۔ اور اب گالی کے ساتھ سینے میں گولی اتارنے کے بھی منصوبے ؟۔
انتظامی بنیادوں پر نئے صوبوں کی تشکیل وقت کی ضرورت ہے لیکن تدبر وتدبیر اور فہم وفراست کے ساتھ ، تیزی و طراری اور موقع پرستی کے ساتھ نہیں ۔ نواز لیگ اور دیگر جماعتیں یہی موقف رکھتی ہیں اور ق لیگ بھی ۔ دو دن پہلے چوہدری پرویز الہی نے ایک ٹی۔وی ٹاک شو میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ وہ صرف انتظامی بنیادوں پر نئے صوبے بنانے کے حق میں ہیں ۔ لیکن پیپلز پارٹی اور ایم۔کیو۔ایم نہیں ۔ پیپلز پارٹی اپنی بقا کی جنگ میں مصروف ہے اور ایم۔کیو۔ایم "مہاجر صوبے" کی صورت میں اپنے
ادھورے خوابوں کی تکمیل چاہتی ہے ۔ آج تو مہاجر صوبہ صرف "وال چاکنگ" کی شکل میں نظر آتا ہے لیکن سرائیکی صوبے کے بعد مہاجر صوبہ نہ بنائے جانے کا کوئی آئینی ، قانونی اور اخلاقی جواز ہی باقی نہیں بچے گا۔ تب یہی ایم۔کیو۔ایم مہاجر صوبہ تحریک کا ہراول دستہ ہو گی ۔ اے۔این۔پی بیچ منجدھار میں ہے ۔ ایک طرف وہ شاہ زرداری کی وفاداری میں سرائیکی صوبے کی حمایت کرتی ہے تو دوسری طرف صوبہ ہزارہ کی مخالفت جہاں دو سال سے الگ صوبے کی تحریک جاری ہے۔ تحریک کے بانی بابا حیدر زماں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جس دن سرائیکی صوبہ بنا اسی دن سے ہزارہ میں سول نا فرمانی شروع کر دی جائے گی ۔

نئے صوبوں کی تشکیل سے پہلے کیا کسی نے اخراجات کا تخمینہ بھی لگایا؟۔ ہمہ وقت کشکولِ گدائی تھامے در در کے یہ بھکاری نئے صوبوں کے اخراجات کہاں سے پورے کریں گے ؟۔ کیا کرپشن کا خاتمہ ہو جائے گا یا لوٹے ہوئے اربوں ڈالر واپس آ جائیں گے ؟۔ زرعی ٹیکس کا نفاذ ہو گا یا نام نہاد اشرافیہ پورا ٹیکس ادا کرنے لگے گی ؟۔ ایوانِ صدر و وزیرِ اعظم کے اربوں روپے سالانہ اخراجات میں کٹوتی ہو گی یا وزیروں شزیروں کے اللے تللے بند ہو جائیں گے ۔ پچپن ہزار روپے فی منٹ صرف کرنے والی پارلیمنٹ بوریا نشیں" ہو جائے گی یا اراکینِ اسمبلی تنخواہیں اور مراعات لینا بند کر دیں گے ؟" ۔اگر ایسا کچھ نہیں ہو گا تو پھر کیا غریبوں کی رگوں کے لہو پہ نظر ہے ؟۔ لیکن یہ لہو تو پہلے ہی نچوڑا جا چکا ہے۔

عوامی بکرے

لگتا ہے کہ اپنے بلوچ سردار صاحب نے بہت سے "عوامی بکرے" پال رکھے ہیں اور ان کا جب جی چاہتا ہے کسی ایک بکرے کو قُربان کرکے اپنے خاندان کا صدقہ اتار لیتے ہیں۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق "خاندانِ زرداریہ" کے "وارثانِ نیک نام" کے مُنہ کو ابھی سے ان معصوم بکروں کے لہو کی چاٹ لگ گئی ہے۔ اب تو وہ بھی اپنی اپنی بولیوں میں ان بکروں کو قُربانی کے لئے تیار رہنے کا حکم صادر فرماتے رہتے ہیں۔ جنابِ صدر کا طریقہ واردات اب کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آنے لگا ہے۔ وہ پہلے ان بکروں کو اِدھر اُدھر مُنہ مارنے کی کُھلی چھٹی دے دیتے ہیں پھر جب بد ہضمی کی بدولت ان سے تعفن اُٹھنے لگتا ہے تو حکم دیا جاتا ہے کہ "چڑھ جا بیٹا سولی رام بھلی کرے گا"۔ یہی طریقہ اپنے بھولے بھالے گدی نشین پر بھی آزمایا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر گیلانی خاندان اپنی کرپشن کی طفیل چاروں طرف سے گِھر نہ چُکا ہوتا تو گیلانی صاحب کا فیصلہ مختلف ہوتا۔ لیکن انہوں نے عافیت اسی میں جانی کہ اپنی قُربانی دے کر بڑی محنتوں سے چار سالوں میں کمائی گئی اربوں کی جائیداد کو بچایا جائے لیکن وہ بھولے بادشاہ نہیں جانتے کہ اب ایسا ہونا ممکن نہیں نظر آتا کیونکہ اب عوام میں کچھ کچھ شعور جاگنے لگا ہے جس کی ایک جھلک تو قوم نے کل دیکھ لی کہ ملزم سے مجرم بن

جانے والے وزیرِ اعظم صاحب کی حمایت میں چند شہروں میں ننھی مُنّی "احتجاجیاں" نظر آئیں۔ کہیں بھی کسی بھی ریلی میں سو، پچاس سے زیادہ افراد نہیں تھے اور وہ بھی غنڈے جو سندھ کے مختلف شہروں میں جدید ترین اسلحے کے زور پر خاموش تماشائی بنی پولیس کے سامنے دوکانیں بند کرواتے رہے۔ بلوچستان بھی خاموش رہا اور خیبر پختونخواہ بھی اور پنجاب نے تو خاموش ہونا ہی تھا کہ وہاں تو تھانیدار شریف.برادران نے دینا ہوتا ہے گیلانی صاحب نے نہیں جب کہ پیپلز پارٹی تھانیدار کے بغیر کبھی احتجاجی جلوس یا ریلی نکالنے کی حماقت نہیں کرتی البتہ استقبالی جلوسوں کی الگ بات ہے۔ ایسا ہم نے بھٹو مرحوم کے دور میں بھی دیکھا جب پی۔این۔اے کی تحریک کے خلاف ایف۔ایس۔ایف اور "تھ فورس" کی حفاظت میں "بھٹو حمایت" جلوس نکلا کرتے تھے۔ تحقیق کہ اگر جیالے سڑکوں پر نکل آتے تو بھٹو کو کبھی پھانسی نہ ہوتی۔قُربانیاں دینے کا شور مچانے والی پیپلز پارٹی سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ بھٹو مرحوم کی پھانسی کے خلاف کتنے لوگوں نے کوڑے کھائے اور خود سوزیاں کیں؟۔ کوئی تاریخ کو مسخ کرنے کی ناکام کوشش کرے تو الگ بات ہے لیکن سچ تو یہی ہے کہ وہ انگلیوں پہ گنے ہوئے چند لوگ تھے۔

میں سیاستدان ہوں نہ سیاسی تجزیہ نگار۔ مجھے تو سیاست کی نہ صرف یہ کہ کوئی شُدبُد ہی نہیں بلکہ اتنا بھی نہیں پتہ کہ بھارت کے وزیرِ اعظم کا نام

من موہن سنگھ ہے اور امریکی صدر کا اوباما۔ پھر بھی میں اتنا ضرور جان گئی ہوں کہ اعلیٰ عدلیہ کے موجودہ فیصلے میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ تفصیلی فیصلہ تو خیر ابھی آیا نہیں لیکن تفصیلی فیصلے کا "عرق" تو یہی ہے کہ اعلیٰ عدلیہ نے بھی سیاست کھیلتے ہوئے بال پارلیمنٹ کی کورٹ میں پھینک دی ہے حالانکہ محترم جج صاحبان خوب جانتے ہیں کہ وہاں "بال" بیچاری کا کیا حشر ہو گا۔ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ عدلیہ کی تضحیک ہوئی جب کہ دوسری طرف سزا توہینِ عدالت کے سیکشن 5 کے تحت دی جاتی ہے حالانکہ یہ سزا آئین کے آرٹیکل 63-1 G کے تحت دی جانی چاہیے تھی جس کا ذکر تو ضرور ہے لیکن محض ڈرانے کے لئے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس آرٹیکل کے تحت وزیرِ اعظم نا اہل بھی ہو سکتے ہیں۔ شاید تفصیلی فیصلے میں یہ عُقدہ وا ہو جائے کہ اس آرٹیکل پر عمل در آمد کے لئے سپیکر کو حکم دیا جائے گا یا الیکشن کمشن کو۔ فی الحال تو پیپلز پارٹی خوش ہے کہ سیاسی شہید بن گئے اور وہ بھی مفت۔ جب کہ دوسری طرف اپوزیشن بھی بغلیں بجا رہی ہے کہ گیلانی جی نا اہل ہو گئے۔ اب اگلے چند دنوں تک دونوں جانب "ٹھا ٹھا" ہو گی اور پھر "ٹائیں ٹائیں فش"۔

قوم کو خوشی اس بات کی ہے کہ عدلیہ نے اسے گھر بیٹھے ایک ایسا وزیرِ اعظم عنایت کر دیا جس کی نظیر پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ اب دُنیا کو بڑے فخر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں دہشت گرد قرار دینے والو! اب شرم سے ڈوب مرو

کیونکہ ہم نے اپنے عمل سے اپنے آپ کو دُنیا کی ایسی شریف النفس قوم ثابت کر دیا ہے جو مجرم وزیرِ اعظم کو بھی سر آنکھوں پہ بٹھا سکتی ہے۔اب ہم بڑے ارمانوں سے اپنے مجرم وزیرِ اعظم کو 5 مئی سے محض اس لئے غیر ملکی دوروں پر بھیج رہے ہیں کہ ہر کوئی ہماری سادگی اور نرم دلی پر ایمان لے آئے۔

بات کہیں سے کہیں نکل گئی ، آمدم بر سرِ مطلب اپنے یوسف رضا گیلانی صاحب نے کم از کم یہ تو ثابت کر دیا کہ کوئی پنجابی کسی سندھی کی پیٹھ میں چھُرا نہیں گھونپ سکتا۔ بلا شبہ کل کے دُلہا گیلانی صاحب تھے اور باراتی اتحادی۔ ان پر جب گلاب کے پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جا رہی تھیں تو میں سوچ رہی تھی کہ اگر ساتھ ڈھولک کی تھاپ پر ہم دُولہے والے۔۔" بھی گا دیا جاتا تو مزہ دوبالا ہو جاتا۔ویسے تو اس میں بھی کوئی" مضائقہ نہیں تھا اگر اتحادی اور حواری بھنگڑا بھی ڈال دیتے۔یہ میاں نواز شریف صاحب تو بس "ایویں ای" رنگ میں بھنگ ڈالنے آ جاتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ وزیرِ اعظم کے ساتھ آئے ہوئے اتحادیوں سے قوم کو سوال کرنا چاہیے کہ وہ سپریم کورٹ کی حمایت میں آئے تھے یا زرداری کے پانچ سو کروڑ بچانے کے لئے ؟۔ خیر جانتے تو میاں صاحب بھی ہیں لیکن اگر نہیں جانتے تو دست بستہ عرض ہے کہ کوئی کسی کی حمایت میں آیا تھا نہ کسی کی دولت بچانے کے لئے۔وہ تو محض اپنے چور بھائیوں کی مدد کے لئے آئے تھے کہ کل کلاں ان پر بھی ایسا کڑا وقت آ سکتا

ہے۔ اگر چوہدری شجاعت نہ آتے تو کتنے احسان ناسپاس ٹھہرتے کہ ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب اسی حکومت نے ان کے بھتیجے اور سیاسی وارث کو صاف بچا لیا۔

اے۔این۔پی کی بلور فیملی کو اسی حکومت نے ریلوے سونپ کر ان کی نسلیں سنوار دیں، وہ بھلا کیسے نہ آتے ؟۔اور ایم۔کیو۔ایم نے بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا کہ اگر حکومت بچ گئی تو وہ حکومت کے ساتھ اور اگر کوئی "ہتھ" ہو گیا تو عدلیہ زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے حکومت سے الگ ہو جائیں گے کہ انہیں تو اب حکومت میں "آنے جانے" کی عادت سی ہو گئی ہے۔

کل جب لارجر بنچ نے گیلانی صاحب کو کٹھمرے میں آنے کا حکم دیا تو ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ تبھی اُن کا ایک ہاتھ اعتزاز احسن اور دوسرا فاروق ایچ نائیک نے ایسے تھام لیا جیسے قصائی بکرے کو قابو کرتا ہے۔ شاید انہیں خطرہ ہو کہ کہیں گیلانی صاحب ایسے ہی اُٹھ کے بھاگ نہ جائیں جیسے عیدِ قُربان کے موقع پر کئی قُربانی کے جانور نہ صرف بھاگ جاتے ہیں بلکہ لوگوں کو زخمی بھی کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ گیلانی صاحب تو اپنی قُربانی کا "رولا" بڑی دیر سے ڈالتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن جب اعلیٰ عدلیہ نے انہیں ساڑھے ستائیس سیکنڈ کی سزا سُنائی تو وہ کِھلکھلا اُٹھے۔ ان کا جی تو یقیناً قہقہہ لگانے کو چاہتا ہو گا لیکن مصلحت آڑے آئی کہ کہیں اعلیٰ عدلیہ ناراض ہو کر سزا میں مزید دس سیکنڈ کا

اضافہ نہ کر دے۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا لیکن سچی بات ہے کہ ہمارا کل کا دن بڑا خوشگوار گزرا اور اُمید یہی ہے کہ اگلے چند دنوں تک یہ میلہ لگا رہے گا اور زرداری صاحب اپنے "عوامی بکرے" قُربان کرتے رہیں گے۔ ذوالفقار مرزا اور بابر اعوان کی قُربانی کے بعد گیلانی صاحب "نیم قُربان" ہوئے۔ اب پتہ نہیں کس کی باری ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ رحمٰن ملک کی باری ابھی دور ہے۔ قوم کو یقیناً اس وقت بہت راحت محسوس ہو گی جب یہ "کالی ماتا کے بھگت" پلے پلائے ملک صاحب کی "بھینٹ" کا ارادہ کر لیں گے۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

16 دسمبر 2009ء کو این۔آر۔او کے حوالے سے آنے والا سترہ رکنی فُل کورٹ کا فیصلہ تو قصّہ پارینہ بن گیا ہے یا بنا دیا گیا ہے۔لیکن اسی کے تسلسل میں آنے والے توہینِ عدالت کے فیصلے نے پوری قوم کو "وخت" ڈال دیا ہے۔سات رُکنی لارجر بنچ تو گول مول فیصلہ دے کر محوِ خواب ہے لیکن سیاسی ’طرفین‘ کے بڑھک بازوں کی چاندی ہو گئی ۔الیکٹرانک میڈیا پر جنگ کا سا سماں ہے ،ٹاک شوز میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور مجال ہے جو ایک لفظ بھی پلّے پڑتا ہو۔اینکرز خوش ہیں کہ ان کی ریٹنگ "بھانڈوں" والے پروگراموں سے زیادہ ہو گئی ہے۔پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں تو ہم اپنے راہنماؤں کو باہم جوتم پیزار ہوتے دیکھنے کی سعادت سے محروم ہیں لیکن ٹاک شوز میں ان کی جھلک ضرور نظر آ جاتی ہے۔ہر اینکر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے پروگرام میں کم از ایک "جھگڑالو" خاتون ضرور موجود ہو۔اس معاملے میں پیپلز پارٹی خود کفیل ہے کیونکہ "کوسنے" دینے میں پیپلز پارٹی کی خواتین کا کوئی ثانی نہیں ۔جس ٹاک شو میں فوزیہ وہاب ،مہرین انور راجہ ،شرمیلا فاروقی،فردوس عاشق اعوان یا شازیہ مری میں سے کوئی ایک شامل نہ ہو وہ ٹاک شو پھُسپھسا اور پھیکا پھیکا سا لگنے لگتا ہے۔نواز لیگ اور تحریکِ انصاف اس دوڑ میں بہت پیچھے ہیں ۔ تحریک کی تو پھر بھی ایک آدھ خاتون جھلک دکھا جاتی

ہے لیکن نواز لیگ کے لئے یہ لمحہ فکریہ ضرور ہے۔انہوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے "مشرفی" ماروی میمن کو پارٹی میں شامل کرنے کا رسک بھی لیا لیکن وہ بھی آج کل منصہ شہود سے غائب ہے اس لئے پیپلز پارٹی کی خواتین کی "زبان دانی" سے کچھ گھبرا اور کچھ اکتا کر مشاہد اللہ خاں کو میدان میں اتارا گیا ہے۔وہ روزانہ چار پانچ پروگرام ریکارڈ کرواتے اور ایک "لائیو شو" میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔میں نے اپنی زندگی میں وہ واحد مرد دیکھا ہے جو "کوسنے" دینے میں تنِ تنہا اتنی خواتین کا "زنانہ وار" مقابلہ کر رہا ہے۔اگر پیپلز پارٹی کی کوئی خاتون ایک ہاتھ لہراتی ہے تو وہ اپنی "پوپلی" آواز کے ساتھ دونوں ہاتھوں کا انتہائی فنکاری سے یوں استعمال کرتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔شنید ہے کہ پی۔پی کی خواتین کسی بھی ٹاک شو میں جانے سے پہلے اینکر سے یہ گارنٹی لیتی ہیں کہ اس میں مشاہد اللہ خاں نہیں ہو گا لیکن اینکرز بھی ایسے کائیاں ہیں کہ عین موقعے پر خاں صاحب کو لا بٹھاتے ہیں۔ایک ٹاک شو میں خاں صاحب کا واسطہ ایک ایسے تجزیہ نگار سے پڑا جو اپنی بدزبانی میں مشہور ہیں۔اس ٹاک شو میں بھی تجزیہ نگار اپنی بدکلامی سے باز نہیں آئے اور پھر دونوں کے مابین گالی گلوچ کی محفل جم گئی۔تب سے اب تک میری شدید خواہش رہی ہے کہ دونوں کا پھر کسی اور ٹاک شو میں ٹاکرہ ہو لیکن ہم غریبوں کی پہلے کونسی کوئی خواہش پوری ہوئی ہے جو یہ ہوتی۔پھر بھی اللہ سلامت رکھے پی۔پی کی خواتین اور مشاہد اللہ کو جنکی بدولت ہمیں روزانہ

تفریح کے دو، چار گھنٹے میسر آ جاتے ہیں اور وہ بھی بالکل "مفت" ۔
دوسری جانب ہمارے "گدی نشیں" بھی کسی سے کم نہیں ۔وہ جب سے "ملزم" سے ترقی کرکے "مجرم" بنے ہیں ہر وقت "پھلجھڑیاں" چھوڑتے رہتے ہیں ۔کل ہی کہہ رہے تھے کہ مجھے مستعفی ہونے کے لئے کہتے ہیں ۔میں نے کوئی مرغی چُرائی ہے جو استعفیٰ دوں ۔بالکل بجا ارشاد کیونکہ ہمارے ہاں تو بدبخت اور ناہنجار "مرغی چور" کو "پانجا" بھی لگتا ہے اور جیل کی ہوا بھی کھانی پڑتی ہے ۔ہم تو وہ قوم ہیں جو چھوٹے چوروں کو چوراہے پہ لٹکا دیتے ہیں اور بڑے چوروں کو حاکم بنا دیتے ہیں ۔آپ تو ہمارے حاکم ہیں اگر آپ چھوٹی موٹی چوری کرتے تو ہم آپ کو بھی لٹکا دیتے ۔یہ نون لیگ جو آپ کو "گدی" سے کھینچنے کی سعی بیکار کر رہی ہے ہم اس کے ساتھ ہرگز نہیں کیونکہ ہم گدی نشینوں کا بہت احترام کرتے ہیں اور یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ "نذر نیاز" لینا گدی نشینوں کا پیدائشی حق ہے اور آئین کی رو سے عدلیہ سمیت ان سے یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا ۔اسی "گدی نشینی آئین" کی حفاظت کا انہوں نے حلف اٹھایا ہے اور اب وہ اپنے حلف کی خوب خوب پاسداری کر رہے ہیں۔
میں نے اپنے پچھلے کالم میں عرض کیا تھا "دو چار دن ٹھاہ ٹھاہ ہو گی اور پھر ٹائیں ٹائیں فش" ۔وجہ یہ تھی کہ اعلیٰ عدلیہ نے ایسا "ڈھل مل" فیصلہ

دیا تھا جس کی بدولت یہی کچھ ہونا تھا جو ہو رہا ہے۔ویسے اگر دو ٹوک فیصلہ آ بھی جاتا تو کون سا حکمرانوں نے تسلیم کرنا تھا لیکن اتنا ضرور ہوتا کہ حکومت اور اپوزیشن کا کردار کھُل کر قوم کے سامنے آ جاتا۔میاں نواز شریف صاحب نے کہہ دیا کہ اب Do کہیں نظر نہیں آتا۔چھوٹی موٹی "Do " والا معاملہ ہے لیکن ہمیں تو ان کا or die ریلیوں یا پارلیمنٹ میں شور شرابے سے حکومت کی صحت پر کچھ اثر نہیں پڑنے والا اور "Do" کو تحقیق کہ نواز لیگ اسمبلیوں سے استعفے کا رسک کبھی لے گی نہیں۔اس لئے ہم "Die" کی طرف زیادہ دھیان دے رہے ہیں۔۔۔۔دوسری طرف کپتان چھوڑ کر صاحب اپنے سونامی کو کھلا پلا کر موٹا کر رہے ہیں تاکہ "بوقتِ ضرورت کام آئے"۔انہوں نے کہہ دیا ہے کہ حکومتی اپیل کے بعد آنے والے فیصلے کو اگر حکومت نے تسلیم نہ کیا تو پھر "سونامی" کو زحمت دی جائے گی۔پنجابی کا ایک محاورہ ہے "ڈاچی اوس ویلے سوئے گی جدوں سائیں مر گئے" (اُونٹنی تب بچہ دے گی جب مالک مر گئے)۔ خاں صاحب خوب جانتے ہیں کہ کم از کم 2012ء میں تو اپیل کا فیصلہ آئے گا نہیں کیونکہ چیف صاحب یہ کہہ چُکے ہیں کہ اپیل سننے کے لئے 9 ججز درکار ہیں جبکہ فی الوقت صرف 6 ججز موجود ہیں اور خالی سیٹ صرف ایک۔گویا دو ایڈہاک ججز تعینات کرنے پڑیں گے۔ایڈہاک ججز کی منظوری وزیرِ اعظم نے دینی ہے اور لگتا یوں ہے کہ جب چیف صاحب ایڈہاک ججز کے نام حتمی منظوری کے لئے وزیرِ اعظم کے پاس بھیجیں گے تو وہ یہ کہیں گے "چھڈ یار، مذاق نہ کر"۔سچ ہے کہ بھلا

اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی کون مارتا ہے ؟۔یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام اپوزیشن جماعتیں اور وکلاء کی غالب اکثریت یہ کہہ رہی ہے کہ گیلانی صاحب اپنا استحقاق کھو چکے ہیں تو پھر چیف جسٹس صاحب کس وزیرِ اعظم کے پاس ایڈہاک ججز کی سمری بھیجیں گے ؟۔اگر وہ گیلانی صاحب کے پاس بذریعہ وزارتِ قانون سمری بھیجتے ہیں تو گیلانی صاحب اس کی منظوری دیں نہ دیں لیکن پیپلزپارٹی تو یہ شور مچا دے گی کہ جب چیف جسٹس صاحب یوسف رضا گیلانی صاحب کو وزیرِ اعظم تسلیم کرتے ہیں تو اپوزیشن کے پیٹ میں کیوں مروڑ اُٹھ رہے ہیں ؟۔اور اگر وہ سمری نہیں بھیجتے تو 9 رکنی بنچ کیسے تشکیل پائے گا؟۔اُلجھے ہوئے آئینی معاملات تو اور بھی بہت سے ہیں لیکن میں اپنے قارئین کو مذید ذہنی خلجان میں مبتلاء نہیں کرنا چاہتی کیونکہ سچی بات ہے کہ جوں جوں آگے بڑھتے جائیں ، اُلجھاوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ اگر "تیسری قوت" نہ آئی تو ہمیں نئے الیکشن کے لئے 2013 ء کا انتظار کرنا ہو گا۔تیسری قوت کے بارے میں جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حالاتِ موجودہ میں ان کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ احمقوں کی جنت میں بستے ہیں۔ایک شخص نے دوسرے سے سوال کیا کہ "اگر تم جنگل میں جا رہے ہو اور سامنے سے شیر آ جائے تو تم کیا کرو گے ؟"۔اس نے جواب دیا "جو کچھ کرے گا، شیر ہی کرے گا، میں نے کیا کرنا ہے"۔ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ جب فوج آنے کا ٹھان لیتی ہے تو آ ہی جاتی ہے اور سب سے پہلے بڑے بڑے بڑھک باز ہی اس کے

سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی یہ کہہ کر ہمیں بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کرے کہ فوج نہیں آئے گی البتہ فوج کے نہ آنے کی دعا ضرور کی جا سکتی ہے کیونکہ ہم جمہوری لوگ ہیں اور ہمیں جمہوریت سے عشق ہے خواہ وہ ہمارا کچومر ہی نکال کر کیوں نہ رکھ دے۔

بولتے فیصلے اور نواز لیگ

پروفیسر مظہر

مخنث "تسائی لون" چینی شہنشاہ "ہوتی" کے دربار کا معمولی عہدے دار تھا۔ 105 ء میں اس نے "کاغذ" ایجاد کیا اور شاہ کا مقرب ٹھہرا۔ لیکن طبقہ اشرافیہ کو بھلا کیسے قبول ہوتا کہ ایک "ہیجڑا" ان کا ہمسر ٹھہرے۔ محلاتی سازشیں شروع ہوئیں اور آخر کار تسائی لون شاہ کی نظروں سے گر گیا۔ اُمراء کے بہکاوے میں آ کر شہنشاہ نے اس کے لئے ایک انتہائی توہین آمیز سزا تجویز کرتے ہوئے اسے سرِ دربار ناچنے کا حکم دیا ۔غیرت مند تسائی لون نے شاہ سے اجازت لے کر غسل کیا، بہترین لباس زیبِ تن کیا اور دربار میں پہنچ کر زہر پی لیا۔تسائی لون تو اپنی غیرت پر قُربان ہو گیا لیکن چینی لوک گیتوں میں وہ آج بھی زندہ ہے۔

اے کاش! قومی غیرت کو غیروں کے جوتوں تلے روندنے کا سبب بننے والے یہ بھکاری حکمران غیرت مند ہوتے خواہ ہیجڑے ہوتے۔ لیکن یہاں تو ڈھٹائی اور بے شرمی کا یہ عالم ہے کہ "ملزم" پر پھول نچھاور کئے جاتے ہیں اور "مجرم" بن جانے پر مبارک سلامت کا شور اٹھتا ہے۔آئین سے وفاداری کا حلف اٹھانے والے

آئین شکنی کا جشن مناتے ہیں اور "عدل بنا جمہور نہ ہوگا" کی رٹ لگانے والے آئین کی من مانی تشریح کرکے اپنے ہی منہ پر کالک ملتے ہیں۔ استغاثہ اور صفائی کے وکلاء مل کر ملزم کو بچانے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں اور عدالت کی معاونت کے لئے طلب کئے جانے والے نیب زدہ اٹارنی جنرل عدالتی فیصلے کو غیر آئینی قرار دیتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جمہوری حکمران ہیں یا غنڈے موالی جنہیں ملک سے کوئی غرض ہے نہ قوم سے۔ جو آئین کو تسلیم کرتے ہیں نہ نظامِ انصاف کو۔ جن کا آئین ایوانِ وزیرِ اعظم سے شروع ہو کر قصرِ صدارت پہ ختم ہو جاتا ہے اور جمہوریت بے کس عوام کے لئے دو دھاری تلوار بن جاتی ہے۔ سچ کہا تھا ولیم جیمز نے کہ "شاید ہی کوئی درندہ ایسا ہو جو اپنی ہی جنس کو چیرتا پھاڑتا ہو سوائے انسان کے"۔

سپریم کورٹ کے فیصلے پر سجائی گئی پیپلز پارٹی کے جوکروں کی "منڈلی" خواہ کچھ بھی کہے لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ "ججز خود نہیں بولتے بلکہ ان کے فیصلے بولتے ہیں"۔ خناس کسی کے دماغ میں نہیں، محترم گیلانی سمیت سبھی جانتے ہیں کہ عدلیہ کے فیصلے میں کوئی بھی ابہام نہیں لیکن اعلیٰ عدلیہ کے ہر فیصلے پر "میں نہ مانوں" کی تکرار پہلے بھی جاری تھی اور اب بھی جاری ہے۔ عدلیہ کے غیر متوقع فیصلے سے حکمران بوکھلا گئے۔ اعتزاز احسن تو متواتر شور مچا رہے تھے کہ اگر توہینِ عدالت پر چھ ماہ کی سزا ہو بھی گئی تو وزیرِ

اعظم جیل میں بھی وزیرِ اعظم ہی رہیں گے ۔ یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عدالت توہینِ عدالت کے سیکشن 5 کے تحت تو تیس سیکنڈ کی علامتی سزا دے گی لیکن ساتھ ہی آرٹیکل 63 ون جی کے تحت ریفرنس بھی بھیج دے گی۔شاید اسی لئے بوکھلائے ہوئے اعتزاز احسن فیصلہ آنے کے کافی دیر بعد تک بھی یہ بتلانے سے قاصر رہے کہ عدلیہ ان کے ساتھ کیا "ہاتھ" کر گئی ہے ۔اب وزیرِ قانون یہ کہتے ہیں کہ "Likely to be come" کا مطلب ہے کہ نا اہل ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ عدلیہ نے یہ بھی تو کہا ہے کہ " عدلیہ کی تضحیک کی گئی اور عدالتی فیصلوں پر جان بوجھ کر عمل نہیں کیا گیا "۔اسکے بعد سپیکر کے پاس ریفرنس الیکشن کمیشن کو نہ بھیجنے کا کیا جواز باقی بچتا ہے ؟۔کیا سپیکر صاحبہ یہ کہہ دیں گی کہ ججز جھوٹ بولتے ہیں اور ان کی تضحیک نہیں کی گئی ؟۔ واضح رہے کہ چونکہ عدلیہ نا اہلی کا خود فیصلہ ہی "Likely to be come" نہیں کر رہی تھی بلکہ ریفرنس بھیج رہی تھی اس لئے لکھا جا سکتا تھا کیونکہ اگر عدالت نا اہلی کا فیصلہ ہی کر دیتی تو پھر عمل درآمد کے لئے کہتی ریفرنس نہ بھیجتی۔ وزیرِ اعظم 26 اپریل کو نو بجکر پچاس منٹ پر مجرم قرار دیئے جا چکے اب صرف نا اہلی کا نوٹیفیکیشن باقی ہے اور گیلانی صاحب آئین و قانون سے نابلد عوام کو یہ کہہ کر لاکھ گمراہ کرنے کی کوشش کریں کہ انہیں صرف سپیکر صاحبہ نا اہل "قرار دے سکتی ہیں لیکن یہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ سپیکر کی حیثیت محض "پوسٹ آفس

کی سی ہے۔

گیلانی صاحب نے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ اگر وہ وزیر اعظم نہ رہے تو آمدہ وزیر اعظم بھی خط نہیں لکھے گا۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ جو سمری ان کے پاس آئی انہوں نے اسی پر عمل کیا۔ بجا ارشاد کہ سمری بھیجنے والوں نے انہیں گمراہ کیا لیکن جب سپریم کورٹ نے انہیں بغیر کسی سمری کے خط لکھنے کا حکم دیا تو کیا انہوں نے وہ حکم مان لیا ؟۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ہمارا سامنا" سپریم کورٹ " اور "شریف کورٹ" دونوں سے ہے اور نواز لیگ پہلے سے جانتی تھی کہ فیصلہ کیا آنا ہے اسی لئے پہلے الیکشن کمشنر کے ریٹائر ہونے کا انتظار کیا گیا پھر جھٹ سے سپریم کورٹ نے ایکٹنگ الیکشن کمشنر بھیج دیا "۔اس بیان سے صاف نظر آتا ہے کہ پیپلز پارٹی کو عدلیہ پر سرے سے اعتماد ہی نہیں ۔جب عدم اعتمادی کا یہ عالم ہے تو پھر فیصلے کے خلاف اپیل کا ڈھونگ کیوں ؟۔نواز لیگ پر گرجتے برستے مجرم وزیر اعظم نے فرمایا کہ " نواز شریف دو بار موقع ملنے کے باوجود حکومت نہیں چلا سکے "۔ بجا ارشاد لیکن کیا محترمہ بینظیر چلا سکیں ؟۔پہلی بار تو دونوں کا " پھڈا" غلام اسحاق خاں سے پڑا جس نے انہیں چلتا کیا لیکن دوسری بار تو فاروق لغاری ان کا اپنا صدر تھا پھر اس نے بینظیر کی حکومت کا خاتمہ کیوں کیا ؟۔

یہ بھی عین حقیقت ہے کہ نواز شریف صاحب کی حکومت کے خاتمے کا سبب دونوں بار ہی ان کی معروف "کچن کیبنٹ" بنی جس کے مشوروں کو میاں صاحب صحیفہ آسمانی سمجھتے رہے اور اب بھی ان کے بزرجمہروں نے چار سال گزار دیئے اور پایا صرف "فرینڈلی اپوزیشن" کا طعنہ۔ دیر سے سہی لیکن بہرحال محسوس یوں ہوتا ہے کہ جیسے میاں صاحب کو اپنی غلطیوں کا ادراک ہو چکا ہے۔انہوں نے پہلے دن ہی فرما دیا کہ وہ مجرم وزیرِ اعظم کو نہیں مانتے اور تیس اپریل کو پریس کانفرنس میں پوری قطعیت سے یہ کہہ دیا کہ "اب "do or die" والا معاملہ ہے اور اگر اب بھی ہم باہر نہ نکلے تو یہ ملک و قوم سے غداری ہو گی۔" سب کچھ بجا لیکن انہوں نے تحریک کا لائحہ عمل پھر بھی نہیں دیا۔ یہ تو وہ جانتے ہی ہوں گے کہ بجٹ سیشن سر پر ہے اور بجٹ سیشن کے دوران نہ تو کوئی تحریک چلائی جا سکتی ہے اور نہ ہی آئینی طور پر وزیرِاعظم تبدیل کیا جا سکتا ہے۔اس لئے ان کے پاس گنے چُنے چند دن باقی ہیں۔ نواز لیگ کو یہ بھی یاد رکھنا ہو گا کہ عدلیہ کے پاس اپنی عزت و توقیر بچانے اور فیصلوں پر عمل درآمد کروانے کے لئے آرٹیکل 190 کے تحت سوائے فوج کو بُلانے کے کوئی آپشن باقی نہیں بچا۔کیانی صاحب بھی یومِ شہداء کے موقعے پر خطاب کرتے ہوئے اشاروں کنایوں میں یہ وارننگ دے گئے ہیں کہ ''آئین میں واضح طور پر قومی اداروں کی ذمہ داریوں کا تعین کر دیا گیا ہے۔آئین کے مطابق حالات ایسے نبھائیں کہ ملک

اور اداروں کے وقار میں اضافہ ہو"۔ اب یہ تو طے ہے کہ پیپلز پارٹی سیاسی شہادت کے لئے "گند" مچا رہی ہے اور مچاتی رہے گی اس لئے اگر عدلیہ کے طلب کرنے پر فوج آتی ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا سبھی جانتے ہیں لیکن کم از کم انتخابات کا ڈول تو فوج کی زیرِ نگرانی ہی ڈالا جائے گا جو نواز لیگ کے لئے سراسر گھاٹے کا سودا ہو گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ نواز لیگ کے لئے ہر لحاظ سے بھرپور تحریک چلانے اور اپنی ساکھ بچانے کا یہی آخری موقع ہے۔۔۔۔ میاں صاحب نے تحریکِ انصاف کو بھی اس احتجاجی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی ہے لیکن کپتان صاحب تو پہلے ہی حسبِ عادت فرما چکے کہ ابھی پیپلز پارٹی نے فیصلے کے خلاف اپیل کرنی ہے اور اپیل پر عدلیہ کا فیصلہ آنے کے بعد وہ اپنے "سونامی" کو آواز دیں گے۔ فی الحال تھکا ہارا سونامی استراحت فرما رہا ہے۔ گویا ہنوز دلی دور است"۔

لوڈ شیڈنگ یا عذابِ مسلسل

شب بیداری صوفیوں اور اللہ کے مقرّب بندوں کو بہت مرغوب ہے اور شب بیدار تو ہم بھی ہیں لیکن ہماری شب بیداری کا سبب لوڈ شیڈنگ ہے جو ہماری عوامی حکومت کا قوم کے لئے تحفہ ہے۔ شدید گرمی اور حبس میں جب کئی کئی گھنٹے بجلی بند رہتی ہے اور ہمارا ننھا مُنا یو پی ایس بھی احتجاجاً ٹیں ٹیں کرنے لگتا ہے تو ہم کھولتے ہوئے خون اور تپتے ہوئے ذہن کے ساتھ دہشت گردی کے کئی منصوبے سوچنے لگتے ہیں لیکن ہر منصوبہ اپنی نا معقولیت کی بنا پر ابتدا ہی میں دم توڑ دیتا ہے۔ پتہ نہیں کتنے منصوبے بنے اور بگڑے لیکن نہ تو ہم دہشت گرد بن سکے اور نہ ہی حکومت لوڈ شیڈنگ جیسی دہشت گردی سے باز آئی۔ ہماری مجبوری تو یہ ہے کہ ہمارا طالبان سے بھی کوئی رابطہ نہیں وگرنہ ان سے ہی کوئی دو چار گُر سیکھ لیتے۔ ویسے ہم نے اپنے تئیں یہ کوشش بھی کرکے دیکھ لی۔ ہوا یوں کہ ہم نے پچھلے دنوں ایک موٹے تازے "مولوی صاحب" کو سرِ راہ روک کر پوچھا کہ کیا اس کا طالبان سے کوئی رابطہ ہے ؟۔ اس ذاتِ شریف نے ہماری طرف دیکھا، گھُورا اور دوڑ لگا دی۔ جب سے مولوی صاحب فرار ہوئے ہیں تب سے ہمیں یقین ہو چلا ہے کہ امریکہ جھوٹا اور مکار ہے جو "ایویں خواہ مخواہ" ہمارے دینی مدارس پر افغانستان میں جنگجو بھیجنے کا الزام دھرتا ہے۔۔۔ ہیلری کلنٹن کہتی ہے کہ ایمن ا

الظواہری پاکستان میں ہے۔ہمارا اس "پاکستانی ساس" سے بھی کوئی رابطہ نہیں وگرنہ اس سے ہی ایمن الظواہری کا پتہ پوچھ کران کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر دیتے۔ ISI والوں سے اس لئے پوچھنے کا رسک نہیں لیا جا سکتا کہ اس میں ہمارے "غائب" ہو جانے کا قوی امکان ہے۔اور جوں ہی ہمارا اشمار "مسنگ پرسنز" میں ہوا میرے میاں نے قہقہے لگاتے ہوئے کہنا ہے کہ "خس کم جہاں پاک" ۔اگر اپنے چیف صاحب ہماری گم شدگی کا از خود نوٹس لے بھی لیں تو کچھ فرق نہیں پڑے گا کہ پہلے گمشدگان کون سے گھروں کو لوٹ آئے جو ہمارے واپس آنے کی اُمید ہو۔ویسے بھی اپنے میاں کو ایسی غیر متوقع خوشی دینے کی میں ہر گز روادار نہیں۔ مختصر یہ کہ چاروں طرف سے مایوس ہو کر میں محض خون کے گھونٹ پینے پر اکتفا کرتی ہوں اور کمزور انسانوں کی متاعِ خاص یعنی مغلظات" سے بھی پرہیز کرتی ہوں کہ ہم ادبی لوگوں کو یہ بے ادبی زیب نہیں دیتی" لیکن دل میں مغلظات کے کتنے سونامی جنم لیتے ہیں؟۔ نہیں بتا سکتی کیونکہ دلوں کے بھید تو صرف ربّ جانتا ہے اور ان رازوں میں بندوں کو شریک نہیں کیا جاتا۔ بہرحال اس لوڈ شیڈنگ سے مجھ پر یہ تو عیاں ہو گیا کہ لوگ خود کُش بمبار کیوں اور کیسے بنتے ہیں۔ہم صرف ایک لوڈ شیڈنگ کے ہاتھوں مرنے مارنے کو تیار ہو گئے لیکن جن کے پورے کے پورے خاندان ڈرون کی نذر ہو جاتے ہیں وہ خود کُش بمبار نہیں تو کیا امن و آشتی کے پیامبر بنیں گے؟۔

دوسری طرف ہمارے سزا یافتہ وزیرِ اعظم صاحب ہمیں گرمی میں بلکتا چھوڑ کر خود لندن کی سیر کو نکل گئے ۔سُنا ہے کہ حکومتِ برطانیہ نے صرف چھ افراد کو دورے کی دعوت دی تھی لیکن ہمارے گیلانی صاحب 90 مریدین بھی ساتھ لے کر پہنچ گئے ۔شاید حکومتِ برطانیہ پر رعب شوب ڈالنا ہو گا ۔مریدین کے لئے برطانیہ کے مہنگے ترین چرچل "ہوٹل میں 90 کمرے بُک کروائے گئے ہیں جن کا کرایہ دروغ بر گردنِ" راوی چھ کروڑ اور دورے کے کُل اخراجات کا تخمینہ پچیس سے تیس کروڑ ہے ۔اگر ہمارے گدی نشین اس مجبور و مقہور قوم پر رحم فرماتے تو ان روپوں سے چھ سات دن کی بجلی کا بندوبست تو ہو ہی سکتا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہم بھی دہشت گردی کے منصوبے نہ بناتے ۔لیکن کیا کریں کہ ہماری تو خاتونِ اوّل کو تو لندن کے مہنگے ترین سٹوروں سے کئی کئی لاکھ پونڈ کی خریداری کا شوق ہے ۔انہوں نے کہا ہو گا کہ "شاہ جی "اب موقع ہے، اور ایسے موقعے بار بار ہاتھ نہیں لگا کرتے اس لئے جتنا ہاتھ مار سکتے ہیں مار لیں۔ اب کی بار کتنے لاکھ پونڈ کی خریداری ہو گی ؟۔مجھے تو پتہ نہیں لیکن ہمارا جاسوس میڈیا سب سے کم ہے ؟۔ CIA پتہ لگا لے گا وہ کوئی

گیلانی صاحب کو انگلینڈ جیسے " غریب "ملک میں جا کر اپنی توہین کروانے کی کیا ضرورت تھی ؟دیکھیں ناں ! ان کے وزیرِ اعظم سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ گیلانی صاحب کے لئے الگ سے گاڑی منگوا لیتے ۔انہوں نے گیلانی صاحب کو اپنی

گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھایا اور جب باہر نکلے تو ٹریفک جام کی وجہ سے تقریباً ایک گھنٹہ رش میں پھنسے رہے۔ ہمارے گدی نشین سوچتے تو ہونگے کہ کن کنجوسوں سے پالا پڑ گیا ہے۔ کہاں پاکستان جیسا امیر ترین ملک جہاں وزیرِ اعظم ستّر ستّر گاڑیوں کے قافلے کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ سفر سے کئی کئی گھنٹے پہلے وزیرِ اعظم کی سلامتی کی خاطر ٹریفک بند کر دی جاتی ہے، عورتیں رکشوں میں بچے جنم دیتی ہیں اور ہم بڑے فخر سے ان کا نام رکشہ خاں" رکھ دیتے ہیں۔ دوسری طرف کہاں یہ مفلس برطانیہ کہ ایک گاڑی، دو" وزرائے اعظم اور وہ بھی ٹریفک میں پھنسے ہوئے۔ حکومتِ برطانیہ کو کم از کم اتنا تو احساس کرنا چاہیے تھا کہ ہمارے دبنگ وزیرِ اعظم ابھی تازہ تازہ سپریم کورٹ سے پھڈا ڈال کے آئے ہیں۔ ہے کوئی دنیا میں ایسا دلیر وزیرِ اعظم جو اعلیٰ عدلیہ کے فیصلوں کو جوتے کی نوک پہ رکھ کے غیر ملکی دورے پر نکل جائے؟۔ "ان سا ہو تو سامنے آئے"۔ سچی بات ہے کہ گیلانی صاحب سے اتنی جُرات اور ہمت کی توقع تو ہمیں بھی نہیں تھی۔ لیکن ہماری بے خبری کی انتہا دیکھیے کہ ہمیں اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ ہماری اعلیٰ عدلیہ تو سندھ کی ڈپٹی سپیکر محترمہ شہلا رضا کی تنخواہ دار ہے۔ انہوں نے فرمایا "یہ تنخواہ ہم سے لیتے ہیں اور ہمیں ہی اخلاقیات کا درس دیتے ہیں"۔ واقعی ان کا غصے سے کھولنا بلکہ کھولتے چلے جانا بالکل بجا تھا

کہ ، ایک تنخواہ دار کی اتنی جرات ؟۔ میں تو خود بھی اعلیٰ عدلیہ کی اس جرات پر بھری بیٹھی تھی لیکن میری ایک جاننے والی نے یہ بتلا کر مجھے ورطہ حیرت میں ڈال دیا کہ تنخواہ دار تو شہلا رضا بھی ہے بلکہ وزیرِ اعظم سمیت سارے وزیر مشیر اور اراکینَ پارلیمنٹ بھی اور جن سے عدلیہ تنخواہ لیتی ہے انہی سے شہلا رضا اور دیگر اصحاب کو بھی ملتی ہے۔ میں نے پوچھا "انہیں تنخواہ کون دیتا ہے"؟۔ جواب ملا "قومی خزانہ جسے عوام کی نس نس سے خون نچوڑ کر بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے "۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پسینہ لوڈ شیڈنگ نکال لیتی ہے اور خون قومی خزانہ۔ باقی بچے ہم جو ہمیشہ گنگناتے رہتے ہیں کہ "ہم زندہ قوم ہیں"۔ کچھ افلاطونی دانشور اس مصرعے کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ ہمارے اندر خونِ گرم کی لہریں موجزن ہیں اور کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی تڑپ بھی ۔ یہ ادب نا شناس بھلا کیا جانیں کہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اتنی ذلتوں اور رُسوائیوں کے باوجود بھی ہم میں زندگی کی رمق ابھی باقی ہے۔ کتنے ڈھیٹ ہیں ہم۔

دورہ برطانیہ پر ایک نظر

گُلستانِ گیلانی اور بوستانِ زرداری سے موسمَ گُل میں دانہ دُنکا چُگنے والے پنکھ پکھیرو تو خیر بہت ہیں اور مقدور بھر اپنی اپنی بولیاں بولتے بھی رہتے ہیں لیکن آجکل "بُلبلیں" ترنگ میں آ کر کچھ زیادہ ہی چہچہا رہی ہیں۔ لیکن باغبانوں کی یاد دہانی کے لئے عرض ہے قصیدہ گوئی بیں طاق یہ بُلبلیں موسمِ گُل کے جاتے ہی ٹھکانے بدل لیا کرتی ہیں کہ

مے کدہ اُن کا ٹھکانہ ، نہ حرم دروازہ
بادہ کش اُڑتی ہواؤں کی طرح ہوتے ہیں

جب سے ہمارے " مُنہ چھُٹ "گیلانی صاحب ان بلبلوں کو بدیش پھرا لائے ہیں ، اُن کی نغمہ سرائی کچھ زیادہ ہی جوبن دکھانے لگی ہے۔ ایسی ہی ایک چہچہاتی بُلبُل اس احساسِ تفاخر سے پھوُلے نہیں سما رہی کہ اسے جہاز میں گیلانی صاحب کے بالکل سامنے بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ لیکن موصوف کو یہ گلہ بھی ہے کہ اسے "چرچل ہوٹل" لندن میں صرف ناشتے پر ہی ہاتھ صاف کرنے کا موقع ملتا رہا جبکہ لنچ ڈنر باہر سے چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں منگوایا جاتا تھا (جس سے ظاہر ہے کہ اُن کی تنومند توند نہیں بھرتی ہو گی) ۔بندہ اُن سے پوچھے کہ یہ

کیا کم ہے کہ گیلانی صاحب ان کو برطانیہ لے گئے وگرنہ کوئی اور تو انہیں بدو ہلی لے جانا بھی گوارا نہ کرتا۔ ویسے گیلانی صاحب نے بھی تو ان "بدحال" لکھاریوں بلکہ بھکاریوں کے لئے اس "خوش حال" قوم کے خزانے پر ہی ہاتھ صاف کیا تھا،انھوں نے کونسا اپنی جیب کو تکلیف دی۔

موصوف نے وزیرِ اعظم کے دورہ برطانیہ کو انتہائی کامیاب قرار دیتے ہوئے 45 منٹ کی ون آن ون ملاقات پر حیرت کا اظہار کیا کیونکہ ان کے خیال میں کسی برطانوی وزیرِ اعظم نے کسی پاکستانی وزیرِ اعظم کو پہلے کبھی اتنے کھُلے وقت سے نہیں" نوازا"۔ محترم لکھاری اپنی معلومات درست فرمالیں کہ سفارتی پروٹوکول میں یہ کم از کم وقت ہے جو دو سربراہانِ مملکت کی ون آن ون ملاقات کے لئے طے ہے اور یہ مختصر وقت بھی گیلانی صاحب نے ڈیوڈ کیمرون کو یہ یقین دہانی کراتے گزار دیا کہ وہ حسب الحکم فوری طور پر "نیٹو سپلائی" بحال کر رہے ہیں۔ ویسے برطانوی وزیرِ اعظم کے لئے جن الفاظ کا چناؤ محترم لکھاری نے کیا وہ اُن کی غلامانہ ذہنیت اور کاسہ لیسی کا عکاس ہے جو کسی المیے سے کم نہیں۔ ایٹمی طاقت کے لحاظ سے ساتویں، آبادی کے لحاظ سے پانچویں اور سات لاکھ جری فوج رکھنے والی قوت کا سربراہ غیر ملکی دورے پر ہو اور "قلم فروش" بندگی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے یہ لکھیں کہ ڈیوڈ کیمرون نے کمالِ مہربانی کرتے ہوئے گیلانی صاحب کو 45 منٹ کی مُلاقات سے "نوازا" ۔۔۔۔ شرم تُم کو

مگر نہیں آتی۔

موصوف لکھتے ہیں کہ کیمرون نے گیلانی صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا"مسٹر پرائم منسٹر ! آپ پاکستان میں جمہوریت کو مستحکم کر رہے ہیں"۔ عرض ہے کہ برطانیہ کو "مدر آف ڈیموکریسی" کہا جاتا ہے۔وہاں پر تو محض معمولی سی الزام تراشی پر بھی وزراء مستعفی ہو جاتے ہیں۔سابقہ برطانوی وزیرِ اعظم ٹونی بلیر پر جب الزام لگا تو وزیرِ اعظم ہوتے ہوئے بھی ہر روز صبح سویرے پولیس کے دو معمولی عُہدے دار تفتیش کے لئے اُن کے گھر پہنچ جایا کرتے تھے۔برطانیہ میں کوئی تحریری آئین نہیں۔اُن کی روایات ہی اُن کا آئین ہیں جن پر معاشرہ سختی سے عمل پیرا ہے۔ایسے ملک کا وزیرِ اعظم جب کسی سزا یافتہ اور نظامِ عدل کے باغی وزیرِ اعظم کو جمہوریت کے استحکام کی مبارک باد دیتا ہے تو اُس تحسین کے پردوں میں چھُپے طنز و تعریض کے تیروں سے غیرت مند تو لازماً مارے شرم کے مُنہ چھپانے لگتے ہونگے لیکن لکھاری کے خیال میں ان تحسینی الفاظ سے بعض لوگوں کو جلن محسوس ہونے لگی ہے۔جی ہاں ! جلن اور ایسی جلن کہ اب تو کچھ حاسد ایسے لکھاریوں کو "گِدھ گروہ" کہنے لگے ہیں۔

کالم نویس نے بڑے فخر سے گیلانی صاحب کے مختلف اخباروں اور نیوز چینلز کو دیئے جانے والے انٹرویوز کا ذکر کیا ہے۔واقعی ایک شاہکار انٹرویو تو

کو بھی دیا۔ انٹرویو میں جب گیلانی صاحب سے سوال کیا گیا کہ دنیا CNN اُنھوں نے میں تو وزراء الزام لگتے ہی اخلاقی طور پر استعفے دے دیتے ہیں کیا آپ بھی دیں گے ؟۔ تو اُن کا افلاطونی جواب تھا کہ سپیکر کہیں گی تو سیٹ چھوڑ دوں گا۔ وہ یا تو اینکر کا سوال سمجھ ہی نہیں سکے کہ دُنیا میں اخلاقی روایات یہی ہیں کہ الزام لگنے پر ہی سیٹ چھوڑ دی جاتی ہے یا پھر وہ دُنیا پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہم اخلاقی طور پر اتنے دیوالیہ ہو چُکے ہیں کہ سیدھے ہاتھوں کچھ چھوڑنے کو تیار نہیں اور ہم تو وہ بھوت ہیں جو صرف لاتوں سے مانتے ہیں باتوں سے نہیں۔ خاتون اینکر نے انتہائی بد تمیزی سے یہ کہا کہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بات کریں۔ سبھی جانتے ہیں کہ یہ جملہ صرف اُس وقت بولا جاتا ہے جب دوسرے کو جھوٹا سمجھا جاتا ہے۔ کیا کسی سربراہِ مملکت کی اس سے زیادہ توہین بھی ممکن ہے ؟۔ سابقہ جیالے اور موجودہ سونامیئے محترم شاہ محمود قُریشی کل ایک نیوز چینل پر فرما رہے تھے کہ گیلانی صاحب کی انگریزی ایسی ہی ہے ۔ وہ جب پہلی دفعہ امریکی دورے پر گئے تو صدارتی تھنک ٹینک کے ساتھ گفتگو کے دوران پورا ہال قہقہوں سے گونجتا رہا۔ گیلانی صاحب یہ سمجھتے رہے کہ لوگ انکی ہلکی پھلکی باتوں سے لُطف اندوز ہو رہے ہیں جب کہ قہقہوں کا طوفان اس لئے آیا ہوا تھا کہ سوال گندم جواب چنے ۔ گیلانی صاحب ان کی انگریزی سرے سے سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے۔ اینکر نے کہا کہ گیلپ سروے کے مطابق 81 فیصد عوام ان کی حکومت کو کرپٹ سمجھتے ہیں ۔ حاضر جواب گیلانی صاحب

نے تُرت جواب دیا "آپ مُلک میں جمہوریت چاہتی ہیں یا آمریت؟"۔ گویا اگر جمہوریت ہو گی تو کرپشن تو ہو گی۔ یہ جمہوری فارمولا دُنیا میں صرف "گدی نشیں" کے ہاں ہی دستیاب ہے۔۔۔ CNN کی خاتون اینکر نے گیلانی صاحب سے ایک ایسا سوال بھی کیا جس کا ایسا جواب تاریخِ عالم میں پہلے کسی سربراہ نے نہیں دیا ہو گا۔ اینکر نے کہا 20 فیصد لوگ تنگ آ کر ملک چھوڑ جانا چاہتے ہیں۔ گیلانی صاحب نے جواب دیا "تو وہ جاتے کیوں نہیں انہیں روکا کس نے ہے؟"۔ اس پر خاتون اینکر دونوں ہاتھ باہر پھیلا کر انتہائی حیرت سے اُنہیں دیکھنے لگیں۔ بجا ارشاد لیکن دست بستہ عرض ہے کہ پاکستان کسی کے باپ کی جاگیر ہے نہ کوئی مفتوعہ علاقہ اس لئے گیلانی صاحب دو کروڑ انسانوں کو تکلیف دینے کی بجائے خود ہی اس مجبور و مقہور قوم کی جان چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟۔

لیجئے یہ ہم بھی کیا بیٹھے بٹھائے "لکھاری" بن بیٹھے اور وہ بھی "سیاسی لکھاری"۔ شاید ہم نے بھی اپنے نہاں خانہ دل میں یہ روگ پال رکھا ہے کہ اگر اپنے "شاہ جی" اِدھر اُدھر سے "کوڑا کرکٹ" اکٹھا کرکے ساتھ لے جا سکتے تھے تو پھر ہم کیوں نہیں؟ من حیث القوم ایسے ہی تو ہیں ہم۔ پہنچ سے دور ہوں تو انگور تھُو کھٹے اور ہاتھ آ جائیں تو شہد سے میٹھے۔ شاید اسی منافقت کی بنا پر 65 سال گزر گئے لیکن ہم "قوم" نہیں بن سکے۔

جمہوریت بمقابلہ عدالت

قوم کو نوید ہو کہ بالآخر جمہوریت نے عدالت کو چاروں شانے چت کر دیا۔اس "فتح مبیں" کا سہرا ہماری نڈر سپیکر ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کے سر رہا جنھوں نے "شاہ جی" کو بچا کر نہ صرف جمہوریت کو "عدالتی استبداد" سے بچایا بلکہ اپنے خاوند اور بیٹے کا سیاسی مستقبل بھی محفوظ ہاتھوں میں دے دیا۔ شنید ہے کہ ذوالفقار مرزا ایک بار پھر "قرآنی پریس کانفرنس" میں انکشاف کرنے والے ہیں کہ انہوں نے تو بار بار سپیکر صاحبہ کو تلقین کی کہ موقع اچھا ہے گیلانی صاحب کو رگڑا دے دو لیکن سپیکر صاحبہ نے نرگس سیٹھی کی طرح "وفاداری بشرطِ استواری" پر قائم رہتے ہوئے مرزا صاحب کو بھی ایسے ہی "نکرے" لگا دیا جیسے بی بی شہید نے اپنی زندگی میں زرداری صاحب کو لگایا ہوا تھا۔ ویسے بھی وہ جانتی تھیں کہ اگر گیلانی صاحب پر عدالتی شکنجہ کس دیا گیا تو جمہوریت کی عمارت دھڑام سے گر جائے گی۔ ہمارے ہاں ہمیشہ نظام اور سربراہ لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ بھٹو مرحوم نے کہا تھا "میرے جانے سے ہمالیہ بھی روئے گا"۔ ضیاء مرحوم نے کہا "اگر آپ مُلک میں اسلامی نظام چاہتے ہیں تو میں پانچ سال کے لئے صدر"۔ پرویز مشرف بھی کہتے تھے کہ پاکستان اور نظام کو اُن جیسا کمانڈو ہی بچا سکتا ہے۔ میاں نواز شریف بھی یہی رونا روتے ہیں کہ اگر انہیں موقع دیا

جاتا تو جمہوریت کی یوں دُرگت نہ بنتی لیکن آج ہیئرڈز سٹور لندن سے 21 ہزار پاونڈ زکا تازہ خرید کردہ کوٹ پہنے، کھِلی باچھوں اور دمکتے چہرے کے ساتھ گیلانی صاحب نے فرمایا "ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ جمہوریت فتح یاب ہوئی"۔

کوٹ سے یاد آیا کہ میں نے اپنے پچھلے کسی کالم میں یہ عرض کیا تھا کہ "شاہ جی" بطور وزیرِ اعظم اپنے آخری دورہ برطانیہ میں جی بھرکے خریداری کریں گے اور متعصب میڈیا را، موساد اور سی آئی اے کو جاسوسی میں پیچھے چھوڑتے ہوئے سب کچھ سامنے لے آئے گا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ گیلانی صاحب نے تو اپنی "غربت" کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہیئرڈز سٹور سے اپنے لئے صرف 80 لاکھ روپے (چون ہزار پاونڈ) کے تین کوٹ اور 20 لاکھ کا پرفیوم خریدا لیکن خاتونِ اوّل نے لاکھوں پاؤنڈ (کروڑوں روپے) کی گھڑیاں جیولری اور جوتے خرید ڈالے۔ دروغ بر گردنِ راوی، بڑھتی ہوئی خریداری کو دیکھ کر پریشان حال گیلانی صاحب نے اہلِ خانہ کے کان میں کہا کہ "ہتھ ہولا" رکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسی فضول خرچیوں کے باعث کل کلاں مجھے پھر اپنی "گھڑی" بیچنی پڑ جائے۔ "میڈیائی مخبر" یہ بھی بتاتے ہیں کہ بیگم صاحبہ ماتھے پر ناگواری سے بَل ڈال کر ہیئرڈز سٹور سے باہر نکلیں اور مزید خریداری کے لئے نسبتاً سستے سٹور میں گھُس گئیں۔ یہ تو خیر ویسے ہی بات سے بات نکل آئی۔۔۔ تو میں عرض کر رہی تھی کہ سپیکر صاحبہ کی طفیل ہمیں بھی پہلی بار جمہوریت کو سرخ رو ہوتے دیکھنے

کا موقع نصیب ہوا یہ الگ بات ہے کہ چیف صاحب کا یہ کہا اپنی قدر و قیمت کھو گیا کہ ہمیں اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کروانا آتا ہے"۔"

پارلیمنٹ کی کسٹوڈین کا دھماکے بلکہ کڑاکے دار فیصلہ تو آ گیا لیکن اب پتہ نہیں کیوں الیکٹرونک میڈیا پر چائے کی پیالی میں طوفان اُٹھانے والوں نے اپنی اپنی عدالتیں سجا رکھی ہیں۔ کوئی سپریم کورٹ کے 77 صفحات پر مشتمل فیصلے کو غیر آئینی کہتا ہے تو کوئی سپیکر کے پانچ صفحاتی فیصلے کو۔ حالانکہ جانتے سبھی ہیں کہ فیصلہ وہی جو ایوانِ صدر میں لکھا جائے اور وزیرِ اعظم کے من بھائے باقی تو بابا سب کہانیاں ہیں۔ میں بھی کافی دیر تک اس مسئلہ "فیثا غورث" میں اُلجھی رہی کہ آخر ماجرا کیا ہے کہ پوری قوم نے تو الیکٹرانک میڈیا کی بدولت صدر اور وزیرِ اعظم سے لے کر پیپلز پارٹی کے ایک عام سیاسی جوکر تک سبھی کو سرِ عام عدلیہ کی تضحیک کرتے دیکھا لیکن سپیکر صاحبہ کو عینک تو کجا محدب عدسے سے بھی ایسا کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ بعد از خرابیِ بسیار میاں نواز شریف کے اس بیان سے عُقدہ وا ہوا کہ "بھکاریوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی"۔ظاہر ہے جن کی اپنی کوئی عزت نہیں وہ کیا جانیں کہ توہین، تضحیک اور تذلیل کیا ہوتی ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ آئین میں اکیسویں ترمیم لا کر ہر ادارے کے لئے توہین و تضحیک کے الگ الگ معیار مقرر کئے جائیں تاکہ اداروں میں تصادم نہ ہو اور سپریم کورٹ پر بھی یہ واضح

ہو سکے کہ ہمارے ہاں توہین و تضحیک کا معیار کیا ہے۔ اعلیٰ عدلیہ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کو توہین سمجھ بیٹھتی ہے جو اداروں میں تصادم کا باعث بنتی ہیں۔

کچھ لوگ ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ سپیکر کے فیصلے کے بعد اب شاید نواز لیگ اسمبلیوں سے مستعفی ہو کر باہر آ جائے گی حالانکہ نواز لیگ تو امریکہ کا وہ "ساتواں بحری بیڑا" ہے جو 1971ء میں مشرقی پاکستان بچانے نکلا۔ بیڑا تو نہ پہنچا البتہ ملک ٹوٹ گیا۔ اکابرینِ نواز لیگ کے پاس یہ گھڑا گھڑایا بہانہ ہے کہ وہ پیپلز پارٹی کو فری ہینڈ نہیں دینا چاہتے کیونکہ خطرہ ہے کہ ان کے مستعفی ہونے سے پیپلز پارٹی اپنا چیف الیکشن کمشنر بھی لے آئے گی اور مرضی کی عبوری حکومت بھی۔ لیکن اکابرینِ نواز لیگ خود بھی خوب جانتے ہیں کہ اصل مسئلہ وہ نہیں جس کا وہ گلی گلی ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ انہیں شدید خدشہ ہے کہ کہیں مستعفی ہونے سے کہیں حالات اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ تیسری قوت کو بہانہ نہ مل جائے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فوج کو کبھی کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ جب آنے کی ٹھان لیتی ہے تو آ جاتی ہے۔ اس لئے اس مرحلے پر نواز لیگ کی جھجک اس کی سیاسی زندگی کے لئے فی الحال تو do or die کی طرف جاتی ہی نظر آ رہی ہے۔ میاں صاحب کہتے تو یہ ہیں کہ "لاتوں کے بھوت Die باتوں سے نہیں مانتے" لیکن وہ لات مارنے کو بھی

تیار نہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ جو لات وہ مارنا چاہتے ہوں اُس میں ابھی تک "میثاقِ جمہوریت" کا ہلکا ہلکا درد باقی ہو اور وہ اس انتظار میں ہوں کہ افاقہ ہونے پر "کس کے لات ماریں"

اُدھر اپنے کپتان صاحب نے اپیل کے بعد آنے والے فیصلے (جس میں ماہرینِ آئین و قانون کے مطابق کم از کم چھ ماہ کا عرصہ درکار ہے) کا بہانہ بنا کر اپنے مُنہ زور سونامی" کی طنابیں کھینچ رکھی ہیں۔ وہ گاہے اپنے سونامی کو سمجھاتے رہتے ہیں کہ "" ہنوز دِلی دور است"۔ ویسے بھی خاں صاحب کا ٹارگٹ صرف نواز لیگ ہے پیپلز پارٹی نہیں اور تکلف بر طرف مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے نواز لیگ اور تحریکِ انصاف کے ان تیتروں اور بٹیروں کا بالآخر یہ حشر ہو گا کہ

لڑتے لڑتے ہو گئی گم

ایک کی چونچ اور ایک کی دُم

اور میدان مارلے گی پیپلز پارٹی۔ اس لئے میں نے ہواؤں کا مزاج دیکھ کر ابھی سے مدح خوانِ پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنے رابطوں کو تیز تر کر دیا ہے کیونکہ مجھے چمڑی بھی عزیز ہے اور دمڑی بھی۔

آئین پاکستان اور نظریہ ضرورت

میں کافی عرصے سے پریشان بلکہ پشیمان اور احساسِ کمتری میں مبتلا تھی کہ سو، سوا سو صفحات پر مشتمل آئین نامی مقدس دستاویز دیکھی نہ پڑھی البتہ سُنی ضرور اور وہ بھی مختلف ٹاک شوز میں۔ لیکن جو کچھ سُنا وہ بھی مضحکہ خیز کہ عدلیہ، وکلا، اپوزیشن اور حکمرانوں سبھی کا اپنا اپنا آئین۔ عدلیہ آئین کی کچھ تشریح کرتی ہے تو ایوانِ صدر میں بیٹھے بزرجمہروں کے ہاں اُس تشریح کا تصوّر بھی غیر آئینی ہے۔اپوزیشن اپنے آئین کا ڈھنڈورا پیٹتی نظر آتی ہے تو دینی درسگاہوں میں کسی اور ہی آئین کا درس دیا جاتا ہے۔اب بندہ کس کے آئین پہ اعتبار کرے ؟۔اپنی تو اب یہ حالت ہے کہ

ایماں جو مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کُفر
کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے

میرا یہ احساسِ کمتری اُس لمحہ خوشگوار میں یکلخت ختم ہو کے رہ گیا ہے جب مجھ پر عیاں ہوا کہ آئین کی حفاظت کا حلف اٹھانے والے بھی ہماری طرح "نہلے" ہی ہیں۔ شک تو مجھے پہلے بھی تھا کہ "گدی نشینوں" کے پاس ایسی فضولیات کا مطالعہ کرنے کا وقت کہاں لیکن یقین تب آیا جب محترم گیلانی صاحب نے یہ

فرمایا کہ آئین اراکینِ اسمبلی اور سینیٹرز پر دوہری شہریت رکھنے کی کوئی قدغن نہیں لگاتا ۔گیلانی صاحب کے اِس بیان کے بعد میرا پہلا ردِ عمل تو یہی تھا کہ اعلیٰ عدلیہ نے "ایویں خوامخواہ ای" معصوم سی فرح ناز اصفہانی اور دبنگ رحمٰن ملک کی رُکنیت معطل کر دی ۔لیکن تھوڑی سی مغز ماری کے بعد پتہ چلا کہ آئین کے آرٹیکل 63-1 C میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص پاکستان کا شہری نہیں رہتا یا وہ کسی دوسرے مُلک کی شہریت حاصل کر لیتا ہے تو وہ پارلیمنٹ یا مجلسِ شوریٰ کا رُکن رہنے یا چُنے جانے کا اہل نہیں ہو سکتا ۔تب سے اب تک میں یہی سوچ رہی ہوں کہ اکیلے آئین کے محافظ گیلانی صاحب ہی آئین سے نابلد نہیں بلکہ الیکشن کمیشن سمیت "اس حمام میں تو سبھی ننگے ہیں" کہ اراکینِ پارلیمنٹ تو رہے ایک طرف ہمارے ہاں تو معین قریشی اور شوکت عزیز جیسے غیر مُلکی" بھی دھڑلے سے وزارتِ عظمیٰ کے مزے لے کر اپنے وطن لوٹ بھی چُکے" لیکن الیکشن کمیشن کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ شاید الیکشن کمیشن تو دستور سے واقف ہی ہو گا البتہ ہو سکتا ہے کہ "نظریہ ضرورت "آڑے آ گیا ہو ۔اللہ بھلا کرے اس نظریہ ضرورت کا جس کی بدولت یہ مُلک قائم و دائم ہے ۔اگر یہ نہ ہوتا تو ہمیں آرٹیکل 3 پر عمل کرتے ہوئے اُردو کو قومی اور دفتری زبان بنانا پڑ جاتا جس سے پورے "گلوبل ویلج" کو پتہ چل جاتا کہ کتنی ان پڑھ ، اُجڈ، جاہل اور گنوار ہے یہ قوم کہ جسے انگریزی بھی نہیں آتی ۔ پچھلے دنوں جب برادر مُلک تُرکی کے وزیرِ اعظم

طیّب اُردوان نے ہماری پارلیمنٹ سے اپنی قومی زبان تُرکی میں خطاب کیا تو مجھے اُن پر بہت ترس آیا کہ بیچارے تعلیمی میدان میں کتنے پیچھے رہ گئے۔ البتہ جب ہمارے راہبروں نے فَر فَر انگریزی بولی بلکہ جھاڑی تو میری گردن غُرور سے تن گئی اور مجھے اپنے غُلام ابنِ غُلام ہونے پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں اسی لئے خادمِ اعلیٰ کو بہت پسند کرتی ہوں کہ وہ بچوں کو "انگلش میڈیم" بنانے میں اربوں روپے صرف کر رہے ہیں اور کرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ اگر میری اُن تک رسائی ہوتی تو میں اُنہیں ضرور مشورہ دیتی کہ "خادمِ اعلیٰ" اُن کے شایانِ شان نہیں کیونکہ اس میں گنوارپنے کی مہک آتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ Great servent کہلانے لگیں۔

یقین مانیے کہ یہ نظریہ ضرورت بہت کارآمد شے ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو آرٹیکلز 62/63 پر عمل درآمد بھی ضرور ہوتا جس سے ہم نہ صرف اپنے راہبروں سے محروم ہو جاتے بلکہ ہماری اسمبلیوں میں بھی اُلّو بولنے لگتے کیونکہ اگر اِس معیار پر پورا اُترنا ہی مقصود ہے تو پھر الیکشن لڑنے کا فائدہ؟۔ بھاڑ میں جائے ایسی اسمبلی کی رُکنیت جو انسان کو ارب پتی بھی نہ بنا سکے۔ یہ بھی نظریہ ضرورت کا شاخسانہ ہے کہ ہر آمر غداری کے آرٹیکل 6 کی چھاتی پر اپنے فوجی بوٹ رکھ کر آیا اور ہم نے نہ صرف اُسے خوش آمدید کہا بلکہ دس، دس بار وردی میں منتخب کروانے کے دعوے اور وعدے بھی کیے۔ یہ الگ

بات ہے کہ ہم اپنے وعدے ایفاء نہ کر سکے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وعدے قُرآن و حدیث تو نہیں ہوتے۔ اگر نظریہ ضرورت نہ ہوتا تو تحقیق کہ قوم ضیاء الحق اور پرویز مشرف جیسے محبِّ وطن راہنماؤں سے محروم رہ جاتی۔

مجھے کبھی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر بھٹو مرحوم نے کیا سوچ کر آئین میں آرٹیکل 227 اور 228 کو شامل کرنے کی اجازت دی اور اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی ان آرٹیکلز کی دہشت ناکی کی طرف کسی کا دھیان تک نہیں گیا۔ ان آرٹیکلز کے مطابق سارے قوانین سات سال کے عرصے میں اسلامی سانچے ہیں تو نہ ڈھل سکے لیکن اگر آج بھی کوئی مردِ قلندر ان پر عمل درآمد کی ضد کر بیٹھا تو ہمیں کتنی خطرناک صورتِ حال کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ دین تو چور کا ہاتھ اور ڈاکو کا ہاتھ اور پاؤں کاٹنے کی سزا دیتا ہے۔ ذرا چشمِ تصوّر سے دیکھیے کہ ہماری اسمبلیوں میں کتنے لوگ صحیح سالم بیٹھے ہونگے اور بیوروکریسی میں کتنے؟۔ اس دورِ جدید میں ایسے آرٹیکل کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں جو ہمارے راہبروں کو معذور کر دیں البتہ آرٹیکل 248 زندہ باد۔ لیکن اس کا دائرہ صرف صدر اور گورنرز تک محدود کیوں؟۔ سارے اراکینِ اسمبلی اور بیوروکریٹس کو بھی اس سے بھرپور استفادے کا موقع ملنا چاہیے کیونکہ ہم جمہوری لوگ ہیں اور آئین کے مطابق سبھی کے حقوق برابر ہیں البتہ عوام کے نہیں کہ عوام کے لئے صرف فرائض ہی فرائض ہیں۔

تسلیم کہ مجھے آئین کی کوئی شُدبُد ہے نہ میرا اس سے کوئی سروکار کہ میرا آئین تو پیٹ سے شروع ہو کر پیٹ پر ہی ختم ہو جاتا ہے اور بقول نظیر اکبر آبادی میرا آئین تو یہ ہے کہ

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لئے؟
وہ سُن کے بولا، بابا خُدا تُم کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سورج نہ تارے ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں
دیوانہ آدمی کو بناتی ہیں روٹیاں
خود ناچتی ہیں اور نچاتی ہیں روٹیاں

لیکن شاید مہربانوں کو یہ ادراک نہیں کہ یہی دیوانگی انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے ۔۔۔۔انقلاب اور وہ بھی خونی انقلاب۔

حق آگیا اور باطل مٹ گیا

لڑکپن میں ہمیں مافوق الفطرت قصّے کہانیاں پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ "آنہ لائبریری" سے الف لیلوی داستانوں کی کتابیں کرائے پر لے کر نصابی کُتب کے اندر رکھ کر رات گئے تک پڑھنا ہمارا روزمّرہ کا معمول تھا اور اماں بیچاری یہی سمجھتیں کہ چشمِ بد دور "پڑھاکو بچی" بہت محنت کرتی ہے۔ ہم وقت کے ساتھ ساتھ اس چوری میں اتنے شاطر ہوتے چلے گئے کہ ہمارے سیاست دان بھی کیا ہوں گے۔ یہ بیچارے تو "سر منڈواتے ہی اولے پڑے" کے مصداق اُدھر لمبا ہاتھ مارتے ہیں اور اِدھر "عصائے افتخار" دیسی سوڈے کی بوتل کی طرح "ٹھاہ ٹھاہ" برسنے لگتا ہے لیکن ہم کبھی رنگے ہاتھوں تو کیا سفید ہاتھوں بھی نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبھی کبھی ایسا ضرور ہوا کہ چھوٹی بہن مناسب بھتہ نہ ملنے یا دیر ہو جانے پر "اماں عدالت" میں ریفرنس دائر کر دیتی لیکن ہم حکومتِ وقت کی طرح "میں نہ مانوں" کی ایسی بُلند آہنگ رٹ لگاتے کہ اماں بھی بے بس ہو جاتیں لیکن محض اپنا بھرم قائم رکھنے کی خاطر وہ ہمیشہ یہی کہتیں کہ "ہمیں اپنے فیصلوں پر عمل کروانا آتا ہے"۔ نہ اُن کے فیصلوں پر کبھی عمل ہوا اور نہ ہم اپنی عادت سے باز آئے البتہ وعدے وعید ضرور کرتے رہے لیکن وعدے کوئی قُرآن و حدیث تو نہیں ہوتے۔ آج کے حکمرانوں کا چلن دیکھ کر ہمیں رہ رہ کر اپنے اوپر غُصّہ آتا ہے کہ اگر

ہم نے بھی سیاست میں قدم رکھا ہوتا تو کامیابی ہمیشہ قدم چومتی اور ہم "زنجیر" نہ سہی چاروں صوبوں کی تقدیر تو بن ہی جاتے۔ خیر گذشت آنچہ گذشت، بات ہو رہی تھی، الف لیلوی داستانوں کی جن میں چشمِ زدن میں ناممکن کو ممکن کر دکھانے والا "چراغ کا جن" ہمیشہ ہمارا آئیڈیل رہا۔

شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ جنوں بھوتوں کا تصور بھی باطل ہوتا چلا گیا اور ہم بھی تخیلات کی پُر شکوہ وادیوں سے نکل کر عالمِ آب و گِل میں آتے چلے گئے لیکن اب اچانک کچھ ایسا ہوا کہ ہم چونک چونک اُٹھے۔ ہمیں یقین ہوتا چلا گیا کہ اُن الف لیلوی داستانوں میں کہیں نہ کہیں ضرور سچائی رہی ہو گی کہ اگراِس مادی دُنیا میں ملک ریاض جیسے افسانوی اور مافوق الفطرت کردار جنم لے سکتے ہیں تو چراغ کا جن کیوں نہیں۔ ملک ریاض جو صحافیوں، سیاستدانوں، جرنیلوں اور بیوروکریٹوں کو اپنی جیبوں میں بھرے پھرتا ہے، جس کے حکمرانوں ے ساتھ بھی اتنے ہی قریبی تعلقات ہیں جتنے اپوزیشن کے ساتھ۔ جو روزانہ لاکھوں غریبوں کو کھانا بھی کھلاتا ہے اور اربوں روپے مالیت کی زمین یوں "نگرے" لگاتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ جس کا حقیر ترین تحفہ بھی "بُلٹ پروف" گاڑی ہوتی ہے۔ جس کے خلاف سپریم کورٹ میں بیک وقت چار چار درجن کیس زیرِ سماعت ہیں پھر بھی وہ عدلیہ کو سینہ تان کر "تڑیاں" لگاتا نظر آتا ہے اور باعثِ شرم یہ کہ اُس کی تڑیوں کو سچ ثابت

کرنے والے بھاڑے کے ٹٹو بھی بہت۔ 1985ء سے پہلے سائیکل پر گھومنے والا وہ معمولی کلرک آج ذاتی جہاز کا مالک ہے۔ تحقیق کہ اُس کے قبضے میں کوئی جِن نہیں بلکہ وہ خود جِن ہے جو پلک جھپکتے اربوں کھربوں میں کھیلنے لگا۔ البتہ میرے تصوراتی جِن اور اِس جِن میں واضح فرق یہ ہے کہ میرا جِن چراغ کا غُلام لیکن اُس کے سبھی غلام۔
قانونِ فطرت مگر یہی ہے کہ ہر فرعونے را موسیٰ۔ اللہ تعالیٰ نے اِس دورے فرعون کے لئے بھی موسیٰ پیدا کر دیا۔ عظیم مفکر افلاطون کہتا ہے کہ بہتر ہے کہ اپنا مُنہ بند رکھو، مچھلی جتنی دیر تک اپنا مُنہ بند رکھتی ہے کانٹے میں نہیں پھنستی لیکن شاطر ریاض ملک نے مُنہ کھولا اور اپنے آپ کو ہی برباد کرتا چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ارسلان افتخار اپنے عظیم باپ کے لئے سرمایہ افتخار نہیں باعثِ آزار پہلے بھی بنا اور اب بھی لیکن طاغوتی طاقتوں کا نشانہ ارسلان کبھی نہ تھا۔ یہ تو چیف جسٹس صاحب کا گھیراؤ کرنے کا ایسا مکروہ منصوبہ تھا جو اُن کی بحالی کے ساتھ ہی ایوانِ صدر میں شروع ہوا، وزیرِ اعظم ہاؤس میں اِس کی نوک پلک سنواری جاتی رہی اور کاسہ لیس لکھاریوں کے ذریعے افواہوں کی شیطانی بھٹی میں کھولتا رہا لیکن وہ سبھی بھول گئے کہ "ربّ بہتر منصوبہ ساز ہے"۔ چیف جسٹس صاحب نے اچانک از خود نوٹس لے کر اُن کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا اور سبھی بیک زباں چلّا اُٹھے کہ اس پر

تو از خود نوٹس بنتا ہی نہیں ۔ کیوں ؟۔ شاید اس لئے کہ ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی تھا ۔پروگرام تو یہ تھا کہ سرگوشیوں کی صورت میں عوام کے ذہنوں میں یہ زہر گھولا جائے کہ علامتِ انصاف افتخار محمد چوہدری دیانت کے اُس معیار پر پورا نہیں اُترتے جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں ۔ لیکن ربّ اپنے بندوں کو کبھی رُسوا نہیں ہونے دیتا اُس خُدائے ذوالجلال نے تو اپنے بندے کا امتحان لینا بھی پسند نہیں کیا اور کچھ ایسا انتظام کر دیا کہ دُشمن خود بخود رسوائیوں کے پاتال میں گرتا چلا گیا ۔

دُنیا نیوز پر جس طرح سے مبشر لقمان اور مہر بخاری کا بھانڈا پھوٹا اور اُن کی شخصیت کا مکروہ پہلو طشت از بام ہوا وہ ہر اینکر اور لکھاری کے لئے باعثِ ندامت ہے۔ لیکن میں اسے کسی اور زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہوں ۔ مجھے تو اِس میں واضح طور پر ربِّ کائینات کی منصوبہ سازی نظر آتی ہے ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ٹاک شوز میں وقفے کے دوران کی گئی گفتگو کی ریکارڈنگ کی گئی ہو ۔ لیکن ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ وقفے کے دوران باقاعدہ سازشیں تیار کی جاتی ہوں ۔ ریکارڈنگ کرنے والے اصحاب یقیناً لائقِ تحسین ہیں جنھوں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر عدلیہ کے خلاف ہونے والی سازش کو نہ صرف بے نقاب کیا بلکہ ایسے اینکرز کے اصلی چہرے بھی سامنے لائے جو چند ٹکوں کی خاطر اپنے ضمیر کا ہمہ وقت سودا کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں ۔ ہم نے انہی کالموں

میں متعدد بار ایسے قلم فروشوں کا احتساب کرنے پر زور دیا لیکن نقار خانے میں تُوتی کی آواز کون سُنتا ہے۔اس میں کچھ کلام نہیں کہ صحافت عبادت ہے بشرطیکہ مداحی مداہنت اور کاسہ لیسی سے پاک ہو لیکن جہاں بڑے بڑے نامی گرامی پہلوان کثافت، میں لتھڑے ہوں وہاں کسی کے لکھے کا کون اعتبار کرے گا اور کیوں ؟۔اعلیٰ عدلیہ نے تو اس ٹاک شو کا از خود نوٹس لے کر ایک بنچ بھی تشکیل دے دیا ہے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات" ہی نکلے گا کیونکہ پاکستان میں ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور" جتنی دیر تک ہم من حیث القوم یہ ادراک نہیں کر لیتے کہ ہماری بربادیوں کا ذمہ دار کون ہے ،ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ سکینڈل پہ سکینڈل بنتے چلے جائیں گے اور اصل مسائل کے ہاتھوں کوئی تیل چھڑک کے آگ لگا لے گا، کوئی زہر کا پیالہ پی لے گا اور کوئی اپنے بیوی بچوں کو قتل کرکے خودکُشی کر لے گا۔کتنے بُزدِل ہیں یہ خود کشی کرنے والے لوگ۔ بھئی اگر مرنا ہی ٹھہر گیا تو دو چار کو واصلِ جہنم کرکے کیوں نہ مرا جائے۔

مرحبا عدلیہ

ہم نے تو گیلانی صاحب کے انگلینڈ کے دورے پر ہی صاف کہہ دیا تھا کہ یہ اُن کا بطور وزیرِ اعظم آخری دورہ ہے جس میں وہ اہلِ خانہ کے ساتھ مِل کر جی بھر کے ہلہ گُلا اور خریداری کریں گے کیونکہ میرے خیال میں یہ بُجھتے دیئے کی آخری لَو تھی ۔چنانچہ وہی ہوا جو ہم نے لکھا تھا۔ لیکن ہم ٹھہرے بے نام ، اناڑی لکھاری اس لئے ہماری بھلا کون سُنتا ہے البتہ اگر ہمیں بھی ملک ریاض کی طرف سے کچھ عنایت ہو جاتا تو ہمارا شمار بھی بڑے لکھاریوں میں ہونے لگتا لیکن "یہ نہ تھی ہماری قسمت" ۔ اس لئے اب طوہاً و کرہاً یہی کہا جا سکتا ہے کہ "جو دے اُس کا بھلا ، جو نہ دے اُس کا بھی بھلا"۔
اب جب کہ گیلانی صاحب "میکے" سدھار گئے تو اُن کے بارے میں کیا عرض کروں کہ جب کوئی مقابل ہی نہ ہو تو "یدھ" میں کیا مزہ۔اس لئے یہی دُعا کر سکتی ہوں کہ اللہ "گدی نشیں" کی گدی سلامت رکھے اور اُنہیں "تعویز گنڈے" میں دِن دُگنی رات چوگنی ترقی دے کہ اُن کے لئے یہی ایک روزن باقی بچا ہے جہاں سے اُمید کی کوئی کرن نظر آ سکتی ہے۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ "قُربان گاہِ زرداری" کی بھینٹ چڑھنے والے ہمیشہ قصہ پارینہ بن جاتے ہیں ۔ ذوالفقار

مرزا کو ایم کیو ایم کو خوش کرنے کے لئے قُربان کیا گیا اور بابر اعوان کو اعتزاز احسن کو خوش کرنے کے لئے ۔اہلِ دانش یہ سوال کر سکتے ہیں کہ گیلانی صاحب کی قُربانی کیوں دی گئی ؟۔کیا اعلیٰ عدلیہ یا نواز لیگ کو خوش کرنے کے لئے ؟۔جی نہیں ! گیلانی صاحب کی قربانی زرداری صاحب نے اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے لئے دی کیونکہ زرداری صاحب کی جائیداد کے وارث تو اُن کے بچے ہی ہیں جن کی جائیداد پر اعلیٰ عدلیہ غاصبانہ" قبضہ جمانے کی فکر میں ہے۔ بہرحال اب گیلانی صاحب کو چاہیے کہ ایوانِ" صدر سے کوئی آس ، کوئی اُمید نہ رکھیں اور چونکہ اب وہ فارغ ہیں اور راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے اس لئے اب "آ رہی تھی چاہِ یوسف سے صدا" جیسی ایک اور کتاب لکھیں جس کا مناسب ترین نام "مرے تھے جن کے لئے " ہو سکتا ہے۔اُس کے پہلے صفحے پر میری فرمائش پر یہ شعر ضرور لکھیں

ساڈے کولوں سوہنا مُکھڑا لُوکان لئی
سجناں نے بوئے اگے چِک تان لئی

بنا کے رکھ دیا ہے ، کو آپ بیتی Peon اگر سابقہ پی ایم صاحب جنہیں سپریم کورٹ نے لکھنے میں کوئی مسئلہ درپیش ہو تو میری خدمات حاضر ہیں ۔اگر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر شاعری میں اُستاد ابراہیم ذوق سے اصلاح لے لیا کرتے تھے تو ہم کوئی ذوق سے کم ہیں۔

بلا شبہ اعلیٰ عدلیہ نے تاریخی فیصلہ دے کر "میزانِ عدل" کے پائے مضبوط کئے ہیں وگرنہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم تو یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ انتہائی محترم سپریم کورٹ بھی ڈنگ ٹپاؤ" مہم پہ نکلی ہوئی ہے اور چوہدری شجاعت حسین کے "مٹی پاؤ" فارمولے پر من و عن عمل کر رہی ہے لیکن آج کے فیصلے کے بعد نہاں خانہ دِل سے بار بار یہ صدا بُلند ہو رہی ہے کہ مرحبا عدلیہ، مرحبا عدلیہ۔ اب چونکہ قوم کی آس ایک دفعہ پھر بندھ گئی ہے اس لئے دست بستہ عرض ہے کہ کرپشن کے بے شمار Pending کیسز کے فیصلے بھی اُسی سُرعت سے کر دیجئے جس سُرعت سے "سپیکر ریفرنس کیس" کا فیصلہ کیا ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ عدل میں تاخیر، عدل کے قتل کے مترادف ہے۔ ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ "عصائے افتخار" اس مجبور و مقہور قوم کے 8500 ارب روپے اُگلوانے میں بھی انشا اللہ کامیاب ہو جائے گا جو اِس حکومت کی چار سالہ کرپشن کی نظر ہو گئے۔

عدلیہ کے فیصلے کے بعد محترم اعتزاز احسن صاحب پر بہت سی انگلیاں اُٹھ رہی ہیں اور سب سے دلچسپ تو بابر اعوان صاحب کا یہ حاسدانہ تبصرہ ہے کہ "سو روپے کا وکیل کروگے تو یہی انجام ہو گا" لیکن اس میں بھلا اعتزاز بیچارے کا کیا قصور؟۔ اُنھوں نے تو سات رکنی بنچ کے فیصلے پر نظرِ ثانی کیلئے 270

صفحات پر مشتمل اپیل تیار کر رکھی تھی اور اب بھی تین رُکنی بنچ کے فیصلے پر نظرِ ثانی کے لئے راتوں رات 250 صفحات پر مشتمل اپیل تیار کر لی لیکن "حکمِ حاکم مرگِ مفاجات" کے مصداق دونوں اپیلیں دھری کی دھری رہ گئیں اور حاکمانِ وقت کی طرف سے اجازت ہی نہ ملی۔ اگر اُنہیں اپیل کرنے کا موقع مل جاتا تو وہ یقیناً اعلیٰ عدلیہ سمیت سبھی کے چھکے چھُڑاتے ہوئے یہ ثابت کر دیتے کہ سوئس حکام کو خط لکھنے میں ہی عافیت ہے وگرنہ یہ جانب دار عدلیہ نواز لیگ کے اشارے پر اگلے کئی وزرائے اعظم کا "دھڑن تختہ" کرنے پر تُلی بیٹھی ہے (آج اُنہوں نے ایک دفعہ پھر اپنا پُرانا بیان دُہرایا ہے کہ سوئس حکام کو خط لکھنے میں کوئی ہرج نہیں)۔ وزرائے اعظم سے یاد آیا کہ پتہ نہیں اب زرداری صاحب نے قُربانی کے لئے اگلا کون سا "بکرا" یا "بکری" تیار کر رکھی ہے۔ نام تو بہت سے ہیں لیکن سب سے مضبوط "بکرے" جنابِ احمد مختار تھے جنہوں نے شاہ محمود قریشی کی طرح کافی عرصے سے حلف اُٹھانے کے لئے شیروانی بھی سلوا رکھی ہے لیکن اُن پر چوہدری شجاعت حسین پھڈا ڈال کے بیٹھ گئے اس لئے اب اُن کی جگہ مخدوم شہاب الدین نے لے لی ہے۔ ویسے تو محترمہ حنا رُبانی کھر کا نام بھی آ رہا تھا لیکن شاید وہ اپنی کمزور صحت کے ہاتھوں مار کھا گئیں۔ مخدوب شہاب الدین کے بارے میں شنید ہے کہ جب اُن کے کسی عزیز نے یہ سوال کیا کہ وہ کس لئے عدلیہ کی بھینٹ چڑھنا چاہتے ہیں تو اُنھوں نے مُسکرا کر جواب دیا کہ پیپلز پارٹی کا تو اب دور دور تک بر سرِ اقتدار آنے

کا کوئی امکان نہیں اس لئے اگر اُنہیں وزارتِ عظمیٰ مل جاتی ہے تو نا اہلی کے بعد اُنہیں تا حیات سابقہ وزیرِ اعظم کی مراعات اور پروٹوکول تو ایسے ہی ملتا رہے گا جیسے سابقہ اڑھائی ماہ کے وزیرِ اعظم چوہدری شجاعت حسین کو مل رہا ہے۔ واقعی عمر کے اس حصے میں اگر ایسی پنشن مل جائے تو سبحان اللہ۔

معزز قارئین ! بات ارسلان افتخار کو دام میں لا کر جنابِ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے گرد گھیرا تنگ کرنے سے شروع ہوئی۔ منصوبہ تو یہی تھا کہ چیف صاحب کو اتنا بدنام کر دیا جائے کہ وہ خود ہی مستعفی ہو جائیں لیکن صیاد خود اپنے ہی دام میں گرفتار ہو گیا۔ ساری تدبیریں اُلٹی ہو گئیں اور ربِّ کردگار نے چیف صاحب کو اس تیسرے "یُدھ" میں بھی سُرخ رو کر دیا۔ یہ دینِ مبیں کا فیصلہ ہے جسے بہرحال سچ ہونا ہی تھا کہ "حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، تحقیق کہ باطل کو مٹنا ہی تھا"۔ قوم کا عدلیہ پر اعتماد بحال ہوا اور رُسوائیاں کس کا مقدر بنیں، سبھی جانتے ہیں۔

انقلاب کی دستک

شدید ترین گرمی اور بیس بیس گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ کے ستائے ہوئے عوام ایک نئے انداز سے سڑکوں پر نکل آئے۔ پیپلز پارٹی نے مسلم لیگ نواز پر الزام دھرا کہ سب کچھ پنجاب حکومت کی شہ پر ہو رہا ہے۔جب کہ میاں شہباز شریف صاحب نے ہاتھ جوڑ کر عوام سے املاک کو نقصان نہ پہنچانے کی اپیل کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ احتجاج کرنے والوں میں کچھ شر پسند بھی گُھس آئے ہیں۔شاید حالات کی سنگینی کا ادراک نہ تو مرکزی حکومت کو ہے اور نہ ہی پنجاب حکومت کو۔یہ تو اُس خانہ جنگی اور خونی انقلاب کی دستک ہے جس کا متعدد بار خود میاں شہباز شریف بھی ذکر کر چکے ہیں۔ لوڈ شیڈنگ کی بنا پر فیکٹریاں اور کارخانے بند ہو گئے، مزدور بھوکوں مرنے لگے اور زندگی کا پہیہ جام ہو کے رہ گیا۔اسی بھوک کے ستائے ہوئے عوام "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق لوٹ مار پہ اُتر آئے۔ پچھلے تین دنوں میں گوجرانوالہ ، فیصل آباد، خانیوال اور کمالیہ میں جو کچھ ہوا وہ اُس خونی انقلاب کا پیش خیمہ ہے جس کی دہائی گزشتہ چار سالوں سے اہلِ فکر و نظر دیتے چلے آ رہے ہیں۔ٹرینوں کو آگ لگانا، بینک لوٹنا،اے ٹی ایم توڑنا، تھانوں کو آگ لگانااور قومی و صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے گھروں پر دھاوا بولنا احتجاج نہیں بلکہ کسی اور جانب ہی اشارہ کر رہا ہے۔کیا حکمران یہ

نہیں دیکھتے کہ احتجاج کرنے والوں کی لاشیں گرتی چلی جارہی ہیں لیکن پھر بھی وہ پلٹ پلٹ کے حملہ آور ہو رہے ہیں۔یہ خونی احتجاج یکے بعد دیگرے مختلف شہروں کو اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جارہا ہے لیکن نتائج سے بے پرواہ حکمران ابھی تک اپنی کرپشن بچانے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ایسے میں سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا ہے۔

جو دانشور، لکھاری اور سیاست دان ابھی تک یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ عوام میں سیاسی شعور نہیں وہ جان لیں کہ محترم یوسف رضا گیلانی کی نا اہلی کے فوراً بعد لوڈ شیڈنگ، کرپشن اور مہنگائی کے خلاف احتجاج کرنے والے عوام نے احتجاج ختم کرکے بھنگڑے ڈالنے اور مٹھائیاں بانٹنی شروع کر دیں جو ان کی بھرپور شعوری پختگی کا مظاہرہ ہے۔سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد ان کی امیدوں کا چمن ایک بار پھر ہرا بھرا ہو گیا اور انہیں امید ہو چلی ہے کہ شاید اب حالات میں کچھ بہتری کے آثار نظر آنے لگیں لیکن بد قسمتی سے "ایں خیال است و محال است و جنوں"۔وجہ یہ کہ عین اُس وقت جب سپریم کورٹ فیصلہ سُنا رہی تھی، ایوانِ صدر میں سی ای سی کا اجلاس جاری تھا جس میں یہ طے کیا جا رہا تھا کہ جنابِ صدر ایک آرڈیننس کے ذریعے سپریم کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دے کر معاملہ دوبارہ پارلیمنٹ میں بھیج دیں۔جنابِ زرداری ایسا ضرور کرتے لیکن تمام اتحادی جماعتوں نے سپریم کورٹ کے فیصلے کو تسلیم کرنے

کا عندیہ دے دیا جس کی بنا پر حکومت کو چار و ناچار یہ تجویز واپس لینی پڑی اور نئے وزیرِ اعظم کے انتخاب کے آپشن پر آنا پڑا۔اس وقت وزارتِ عظمیٰ کے لئے سب سے مضبوط اُمید وار جنابِ مخدوم شہاب الدین ہیں۔ سوال مگر یہ ہے کہ مخدوم صاحب ہوں یا کوئی اور ، اُن کی وزارتِ عظمیٰ کتنے دن چلے گی ؟۔ سپریم کورٹ کے مزاج سے تو واضح نظر آتا ہے کہ وہ حکومت کو مزید وقت دینے کو تیار نہیں۔جونہی نیا وزیرِ اعظم حلف اٹھائے گا سپریم کورٹ این آر او عمل درآمد کیس میں اُسے سوئس حکومت کو خط لکھنے کا حکم دے گی۔ لیکن ہمہ مقتدر زرداری صاحب نے تو یہ اعلان فرما دیا ہے کہ "اگلا وزیرِ اعظم بھی سوئس حکومت کو خط نہیں لکھے گا"۔ گویا نئے وزیرِ اعظم پر بھی توہینِ عدالت کا اطلاق کرتے ہوئے گھر بھیج دیا جائے گا؟ یہ سلسلہ آخر کب تک جاری رہ سکتا ہے ؟۔ پھر سوال یہ بھی ہے کہ کیا نو منتخب وزیرِ اعظم اور ان کی کابینہ اس کرپشن ، مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ کر سکے گی ؟۔ میرے خیال میں ہر ذی فہم کا ایک ہی قطعی جواب ہو گا کہ نہیں ۔ایسی صورت میں کیا ہمارے سیاست دانوں نے حالات کی اس ہولناکی کا ادراک کیا ہے جس کا آنے والے دنوں میں ان کو سامنا ہو گا ؟۔جب حالات میں کوئی بہتری نہ پا کر پورا پاکستان مرنے مارنے پر تل جائے گا تو کیا فوج سمیت کوئی ادارہ بھی انہیں روک پائے گا؟۔ہمارے دانشور انقلاب کی باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن شاید انہیں اس کی دہشت ناکی کا ادراک نہیں یا شاید وہ ادراک کرنا ہی نہیں چاہتے ۔عرض ہے کہ جب پسینے سے بھیگے ہوئے بدبو

دار کسانوں نے فرار ہوتے فرانسیسی شاہ لوئی کو گرفتار کرکے پیرس کے چوراہے پر اس کا سر قلم کیا تو انقلابی ڈانٹون کے حکم پر شاہ لوئی کی کھوپڑی کے ساتھ کسانوں نے پیرس کی گلیوں میں فُٹ بال کھیلا۔ پھر ڈانٹون نے نفرت سے کھوپڑی پر تھوکتے ہوئے یہ کہا اس سر کے ٹکڑے کرکے اس کے دوست ملکوں کو بھیج دو"۔ پچھلے چند دنوں کے واقعات میں مجھے عوامی نفرت کی وہی بو محسوس ہوئی جس کا شاہ لوئی اور اس کے حواری ادراک کر سکے اور نہ ہی ہمارے حکمرانوں کو ادراک ہے۔ ایوانِ صدر کے بزرجمہر سیاسی چالوں کے بل بوتے پر اپنا وزیراعظم منتخب کروانے کی تگ و دو میں ہیں۔ شنید ہے کہ ق لیگ کے مطالبے پر ایک آرڈیننس کے ذریعے ڈپٹی پرائم منسٹر کا عہدہ پیدا کیا جا رہا ہے اور جنابِ پرویز الٰہی یہ عہدہ سنبھالنے کے لئے اپنا آپریشن ادھورا چھوڑ کر انگلینڈ سے آج رات وطن واپس پہنچ رہے ہیں۔ ادھر ایم کیو ایم نے اپنے مطالبات کی ایک طویل فہرست جنابِ زرداری کو تھما دی ہے اور اسی کی شہ پر مہاجر صوبہ تحریک کے صدر نے اپنی جد و جہد تیز کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن "تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو" کے فارمولے پر عمل پیرا ہیں اور زرداری صاحب کے دل کے بہت قریب اے این پی بھی خاموش تماشائی ہرگز نہیں۔

دوسری طرف نواز لیگ نے جنابِ مہتاب عباسی کو وزارتِ عظمیٰ کا امیدوار نامزد کرکے سیاسی جماعتوں سے رابطے شروع کر دیئے ہیں حالانکہ اکابرینِ نواز

لیگ خوب جانتے ہیں کہ یہ محض کارِ بیکار ہے۔میاں نواز شریف صاحب نے عدلیہ کے فیصلے کے بعد فرمایا کہ اگر اس حکومت کو مزید چھ ماہ مل گئے تو پھر تباہی ہی تباہی ہے ۔اسی دن جنابِ شہباز شریف سے ایک صحافی نے سوال کیا کہ کیا نواز لیگ اپنا امید وار لا رہی ہے تو میاں صاحب نے انتہائی تلخی سے فرمایا "آپ کو یہ خواب آیا کیسے ؟۔لیکن چند گھنٹوں کے اندر ہی یہ خواب حقیقت میں ڈھل گیا۔سوال مگر یہ ہے کہ کیا نواز لیگ اپنا امید وار لا کر موجودہ حکمرانوں کو گھر کی راہ دکھلانے میں کامیاب ہو جائے گی؟۔کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ اس" فضول پریکٹس "کی بجائے اپنی تمام تر توانائیاں فوری انتخابات کے مطالبے پر صرف کر دیتی ؟۔ادھر عمران خاں صاحب کی "سوئی" ابھی تک نواز لیگ پر ہی اٹکی ہوئی ہے۔وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ جنابِ زرداری کی صدارت میں شفاف انتخابات کا انعقاد نا ممکن ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے "تخیلاتی" سونامی کو سڑکوں پر لانے کے لئے تیار نہیں ۔اس لئے فی الحال تو حالات میں کسی بہتری کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا اور محسوس یوں ہوتا ہے کہ اداروں کا بد ترین ٹکراؤ ہونے کو ہے لیکن عوام کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں ۔ان کے مطالبات کچھ اور ہیں جن پر وہ اب قطعاً کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہی موجودہ حکمرانوں سے عوامی مطالبات پورے ہونے کی کوئی توقع ہے۔پھر اہلِ نظر خود ہی فیصلہ کر لیں کہ ہم کس راہ پہ گامزن ہیں۔

وزارتِ عظمیٰ مبارک ہو

قوم کو سلور جوبلی وزیرِ اعظم مبارک ہو۔ ویسے امید یہی ہے کہ اگلے چند ماہ یں مزید دو چار نئے وزرائے اعظم کا دیدار بھی نصیب ہو ہی جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ اپنے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی باری بھی آ ہی جائے لیکن اس بار تو وہ بال بال بچ گئے ۔پہلے تو اُن کی جیب یں ایم ایم اے کے بہت سے ووٹ تھے، پھر بھی اُن کا نشانہ خطا گیا لیکن اِس بار وہ محض سات ووٹوں کے ساتھ میدان میں کود پڑے۔شاید پامسٹ "سامعہ خاں" نے بتلایا ہو گا کہ سات نمبر بڑا لکی ہوتا ہے اس لئے رام بھلی کرے گا ۔ مولانا آخری لمحے تک ڈٹے رہے لیکن پتہ نہیں کیوں اچانک حوصلہ ہار بیٹھے اور دست بردار ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ آخری لمحے میں کوئی معجزہ رونما ہو ہی جاتا حالانکہ یہ معجزوں کا دور ہر گز نہیں ہے اب تو ہم اُنہیں یہی حوصلہ دے سکتے ہیں کہ "گرتے ہیں شاہسوار ہی میدانِ جنگ میں"

خیر مولانا صاحب تو جذبات کے ہاتھوں مار کھا ہی گئے لیکن زرداری صاحب کو پتہ نہیں کیا سوجھی کہ بیٹھے بٹھائے "راجہ رینٹل" کو قوم پر مسلط کر دیا۔ غُصہ اُنہیں سپریم کورٹ پر تھا اور نکال دیا بیچاری قوم پر۔ ویسے یہ حضرتِ انسان بھی بڑا ناشُکرا ہے جو کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ پہلے سبھی مُلتان کے سید

زادے کے پیچھے لٹھ لے کرپڑے رہے اور اب راجہ صاحب کے مہاراجہ بننے کے بعد کہتے ہیں کہ اس سے تو اپنے "گدی نشیں" ہی بہتر تھے، سمارٹ، خوش لباس اور خوش خوراک۔ لیکن لوگوں کا کیا ہے، یہ احسان نا سپاس تو مشرف کو بھی زرداری صاحب پر ترجیح دینے لگے ہیں حالانکہ محترم زرداری کے دورِ حکومت میں مال "ٹکرے" لگانے کے جتنے گُر ہم نے سیکھے، وہ پہلے کبھی سیکھے اور نہ آئیندہ سیکھ پائیں گے۔

اُدھر تمام لکھاری، صحافی اور دانشور بھی ہاتھ دھو کر راجہ پرویز اشرف کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ کوئی اُنہیں پراپرٹی ڈیلر کہتا ہے تو کوئی راجہ رینٹل، کوئی راجو بن گیا جنٹل مین تو کوئی راجہ بن گیا مہاراجہ۔ دست بستہ سوال ہے کہ اگر راجہ صاحب وزیرِ اعظم نہ بنتے تو پھر کیا آپ بنتے ؟۔ وہی جاٹ والی بات جس کے بیٹے نے کہا تھا کہ "ابا ! اگر بادشاہ مر جائے تو کون بادشاہ بنے گا ©پ ؟۔ باپ نے کہا" بادشاہ کا بیٹا"۔ بیٹے نے پھر کہا "اگر وہ بھی مر جائے تو؟"۔ باپ نے کہا "پھر اُس کا بیٹا"۔ بیٹے نے جب تین چار مرتبہ یہی سوال دہرایا تو باپ نے تنگ آ کر کہا" اگر ساری دُنیا کے بادشاہ بھی مر جائیں تو پھر بھی جاٹ کا بیٹا بادشاہ نہیں بن سکتا"۔ تو محترم لکھاریو اور دانشورو! اگر سارے پاکستان کے وزرائے اعظم اور متوقع وزرائے اعظم بحیرہ ِ عرب میں پھینک دیئے جائیں تو پھر بھی آپ نے تو قلم ہی گھسیٹنا اور دل کے پھپھولے ہی

پھوڑنے ہیں ۔آپ تو وزیرِ اعظم بننے سے رہے۔ اس لئے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کا فائدہ ؟۔ یہ پارلیمنٹ کا کام ہے ، اُسی کو کرنے دیں ۔البتہ موجودہ پارلیمنٹ میں اگر آپ کو کوئی بہتر "چوائس" نظر آتی ہے تو بتائیں۔ بھائی یہ تو "گٹر" ہے جس میں سبھی حشرات ایک جیسے ہی ہیں ، البتہ چھوٹے بڑے کا فرق ضرور ہو گا اور یہ پارلیمنٹ کوئی آسمان سے بصورتِ قہرِ خُداوندی نازل نہیں کی گئی بلکہ ہماری اپنی ہی منتخب کردہ ہے اور آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ رب جب کسی قوم پر قہر نازل کرنا چاہتا ہے تو اُس پر ظالم و جابر حکمران مسلط کر دیتا ہے ۔جب ہم نے یہ عذاب اپنے لئے خود ہی پسند کیا تو پھر یہ شور و غُل کیسا ؟۔

کہا جاتا ہے کہ ایک پراپرٹی ڈیلر کو قوم پہ مسلط کر دیا گیا جس نے کبھی سچ نہیں بولا ۔جنگ گروپ کے محمد مالک حلفاً کہتے ہیں کہ اربابِ ایم کیو ایم نے اُنہیں پوری قطعیت سے یہ بتلایا تھا کہ وہ کسی صورت میں راجہ پرویز اشرف کی حمایت نہیں کریں گے۔جب اُن سے وجہ پوچھی گئی تو اُنہوں نے کہا کہ وہ جھوٹ بہت بولتا ہے ۔ راجہ صاحب پر یہ بھی الزام ہے کہ جب وہ ایک وزارت نہیں سنبھال سکے تو پورا مُلک کیسے سنبھالیں گے ؟۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ رینٹل پاور سکینڈل میں نامزد مُلزم ہیں۔ بجا ۔۔۔ سب کچھ بجا لیکن دست بستہ عرض ہے کہ یہاں کون پراپرٹی ڈیلر نہیں ؟۔ ہم نے تو ملک ریاض کو اِس ملک کے سیاہ و

سفید کا مالک بنا دیا جس کا دھندہ ہی زمینوں پر غاصبانہ قبضہ اور اُن کی خرید و فروخت ہے ۔ایم کیو ایم تب راجہ پرویز اشرف پر الزام دھرے جب اُس نے خود کبھی سچ بولا ہو۔ محمد مالک صاحب کو تو ہم سے زیادہ پتہ ہے کہ ایم کیو ایم چار دفعہ حتمی اعلان کرکے حکومت سے الگ ہوئی اور پھر تھوک چاٹ کے واپس آئی ۔اُنھوں نے ایم کیو ایم کی باتوں پہ اعتبار کیا ہی کیوں ؟۔کیا وہ نہیں جانتے کہ بلیک میلنگ میں ایم کیو ایم کا کوئی ثانی نہیں اور حکومت کے بغیر وہ رہ نہیں سکتی۔یہ بجا کہ راجہ پرویز اشرف پانی اور بجلی کی وزارت نہیں سنبھال سکے لیکن سوال یہ ہے کہ آج تک ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والوں نے کون سا ہمالیہ سر کر لیا ہے جو یہ نہ کر سکیں گے ؟۔بجا کہ رینٹل پاور کے ملزم کو وزیرِ اعظم بنا دیا گیا لیکن عوام کی منتخب کردہ اسی پارلیمنٹ نے جنابِ زرداری کو بھی تو صدر بنایا تھا۔اُن پر تو بیشمار کرپشن کے مقدمات ہیں ۔اگر وہ صدر بن سکتے ہیں تو اُن کے اشارہ ابرو پر راجہ صاحب وزیرِ اعظم کیوں نہیں ؟۔شکر کریں کہ زاداری صاحب نے راجہ صاحب پر ہاتھ رکھا۔اگر وہ کسی دہشت گرد یا ٹارگٹ کلر پر ہاتھ رکھ دیتے تو ہم اُن کا کیا بگاڑ لیتے ؟۔ق لیگ ، ایم کیو ایم ،اے این پی اور فاٹا والوں نے تو پھر بھی اُنہی کا ساتھ دینا تھا۔کیونکہ ہر کوئی اپنی اپنی ذات کے گُنبد میں بند ہے ۔ملک جائے بھاڑ میں ۔

پاکستانی سیاست کا کوئی ضمیر ہے نہ سیاست دانوں کا۔ قول و فعل میں اتنا تضاد کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ راجہ پرویز اشرف کو "راجہ رینٹل" کا خطاب دینے والے اور رینٹل پاور سکینڈل میں سپریم کورٹ تک پہنچنے والے مخدوم فیصل صالح حیات نے کل اُنہی کے حق میں ووٹ ڈالا لیکن اُنہیں قطعاً ضمیر کی خلش محسوس نہیں ہوئی۔ کل کی قاتل لیگ ڈپٹی پرائم منسٹر بن گئی۔ چوہدریوں کو یہ خوف دامن گیر کہ کہیں اُن کا سیاسی وارث این آئی سی ایل سکینڈل میں دوبارہ گرفتار نہ ہو جائے۔ اے این پی کو سوائے پیپلز پارٹی کے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی کہ بڑی مشکل سے ہاتھ آئی حکومت کو کون جانے دیتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک طرف لیکن قصور کس کا ہے؟۔ کیا سیاست دانوں کا ہے؟۔ جی نہیں! بُت کا کبھی قصور نہیں ہوتا۔ لائقِ تعزیر تو ہمیشہ بُت تراش ہوتا ہے۔ یہ ہم ہی ہیں جنہوں نے اپنی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسے بُت تراش رکھے ہیں۔ جس سیاستدان میں ہمیں امانت، دیانت، صداقت، شرافت یا غیرت و حمیت کا شائبہ تک نظر آ جائے اُس کے ہم قریب بھی نہیں پھٹکتے کیونکہ ہمارے نزدیک ہر وہ شخص نا اہل ہے جو ہمارے غیر قانونی کام کروانے کے اہل نہیں اس لئے راجہ پرویز اشرف جیسے لوگ ہی اِس قوم کے مزاج کے عین مطابق ہیں۔۔۔۔ راجہ صاحب کو وزارتِ عظمیٰ مبارک ہو۔

سیاسی بساط

سپریم کورٹ کے تین رُکنی بنچ نے نو منتخب وزیرِ اعظم راجہ پرویز اشرف صاحب سے سوئس حکومت کو خط لکھنے کے بارے میں بارہ جولائی تک جواب طلب کر لیا جبکہ جنابِ آصف زرداری پہلے ہی فرما چکے ہیں کہ نیا وزیرِ اعظم بھی بینظیر کی قبر کا ٹرائل نہیں ہونے دے گا اور قائدِ اعظم کے مزار سے پہلے بھٹو مرحوم کے مزار پر حاضری دینے والے راجہ پرویز اشرف بھی خط نہ لکھنے کا عندیہ دے چکے ہیں۔ گویا ایک بار پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرانے جا رہی ہے۔ یہ اطلاعات بھی ہیں کہ چیف جسٹس صاحب کے گرد گھیرا تنگ کرنے اور انہیں گھر بھیجنے کے منصوبے بھی تیار کئے جا رہے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں نے پورا ملک یرغمال بنا رکھا ہو جس سے فی الحال نجات کی کوئی راہ دکھائی دیتی ہے نہ سجھائی کیونکہ فوج کا ملکی اندرونی معاملات میں مداخلت کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا اور نواز لیگ بدستور لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ فوجی آمریت کو کوئی بھی جمہوریت نواز پسند نہیں کر سکتا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فوج کی آمد کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ ملک پر قبضہ جما کر بیٹھ جائے ؟۔ کیا ملک کو اندرونی طور پر بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے دیکھ کر بھی فوج کا یہی کردار رہ جاتا ہے کہ وہ خاموش تماشائی بنی رہے

۔ تحقیق کہ محترم جنرل اشفاق پرویز کیانی صاحب بھرپور مداخلت کرتے ہوئے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر عدلیہ کی زیرِ نگرانی شفاف ترین الیکشن کروا کر نئی تاریخ رقم کر سکتے تھے لیکن جنرل صاحب فی الحال ایسا کچھ کرتے نظر نہیں آتے جبکہ دوسری طرف فوجی مخالفت سے بری طرح خائف میاں نواز شریف صاحب کوئی بھی دلیرانہ قدم اٹھانے سے مکمل طور پر گریزاں ہیں اور یہی نہیں بلکہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان ملک ، قوم اور جمہوریت دشمن لڑکھڑاتے حکمرانوں کو سہارا دے کر اس مقام تک لانے کا گناہِ بے لذت بھی نواز لیگ ہی سے سرزد ہوا۔2008ء سے اب تک کا ایک ایک لمحہ گواہ ہے کہ نواز لیگ اسی احتیاط پسندی کی طفیل مقبول ترین سیاسی جماعت کے درجے سے گرتی چلی گئی اور وہ عمران خاں جنہیں قوم ایک کھلاڑی سے زیادہ درجہ دینے کو ہرگز تیار نہ تھی ابھر کر سامنے آ گئے کیونکہ قوم کے پاس اور کوئی "آپشن" باقی نہیں بچی تھی۔عمران خاں کی اسی مقبولیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے "مشرفیے" دھڑا دھڑ تحریکِ انصاف میں شامل ہونے لگے اور مسلم لیگ نون جو اپنے "اصولی موقف کا ڈھول گلی گلی پیٹتی پھرتی تھی اس بری طرح خائف ہوئی کہ اپنے سارے اصولی" موقف تیاگ کر بچے کھچے "مشرفیوں" کو گلے لگانے میں ہی عافیت جانی۔اگر وہ انہیں گلے نہ لگاتے تو کم از کم یہ دعویٰ تو ضرور کر سکتے تھے کہ مسلم لیگ نواز با اصول سیاستدانوں کی جماعت ہے لیکن وہ اپنا یہ بھرم بھی قائم نہ رکھ سکی۔اُدھر بیچ منجدھار میں پھنسے دائیں بازو کے ووٹروں کا یہ عالم ہے کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہگزر کو میں

کیونکہ محترم عمران خاں صاحب عقابی شان سے جھپٹے ضرور لیکن مُردار خور گِدھوں کے جھُرمٹ میں بیٹھ کر انھوں نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے راہ و رسم شاہبازی

وہی سیاسی قلابازیاں جو ہمارے سیاستدانوں کا طُرہ امتیاز ہے، خاں صاحب بھی لگا رہے ہیں۔ سوائے الزام تراشیوں کے اُن کی پٹاری میں کچھ ہے نہیں اور پٹواریوں، تھانیداروں کا احتساب ان کا ایجنڈا ہے۔ جھوٹ ماشا اللہ اس تواتر سے بولتے ہیں کہ سچ کا گماں ہونے لگتا ہے جبکہ ان کے مدح سرا سینئر لکھاری کے ہر کالم کا ٹیپ کا مصرع یہی ہوتا ہے کہ "کپتان جھوٹ نہیں بولتا"۔ میں اپنے گزشتہ کسی کالم میں کپتان صاحب کی سچائی "کے بارے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں اس لئے اسے ایک طرف رکھتے ہوئے" محترم لکھاری سے صرف اتنا سوال ہے کہ قُرآن و حدیث کے بغیر لُقمہ نہ توڑنے والے اُن جیسے لکھاریوں کے نزدیک کیا سچائی کا یہی معیار ہے؟۔ کیا سچائی صرف وہی ہے جو ان

کے "کالمی درویش" بیان کرتے ہیں ؟۔ محترم لکھاری نے اپنے ایک کالم میں لکھا کہ راجہ پرویز اشرف صاحب گوجر خاں کے درویش کی دعاؤں کی طفیل وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہوئے ۔ عرض ہے کہ یا تو درویش نے راجہ صاحب کو وزارتِ عظمیٰ کی دعا نہیں دی ہو گی اور محترم لکھاری صریحاً جھوٹ بولتے ہیں ، یا پھر وہ درویش ہی نہیں کیونکہ رب کے مقرب بندے کسی خائن اور بد دیانت کو کبھی ایسی دعاؤں سے نوازا نہیں کرتے ۔ان کے "کالمی درویش" بھی بیان بدلنے کے ماہر ہیں ۔ کبھی یہ کہہ دیتے ہیں کہ خاں صاحب کا وزیرِ اعظم بننا طے ہو گیا اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ نواز لیگ کو اکثریت حاصل کرنے کے بعد حکومت کی تشکیل کے لئے عمران خاں کی ضرورت ہو گی کیونکہ پیپلز پارٹی کا پتا تو صاف ہو گیا ۔ عرض ہے کہ پیپلز پارٹی اپنے پورے قد کے ساتھ میدان میں موجود ہے اور اپنی شاطرانہ چالوں کی بدولت نواز لیگ اور تحریکِ انصاف دونوں کا پتا صاف کرنے کے لئے پر تول رہی ہے کیونکہ یہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جہاں نواز لیگ کو اس کی احتیاط پسندی لے ڈوبے گی وہیں تحریکِ انصاف کو اس کی "بڑھک بازی" ۔ کل ایک ٹاک شو میں تحریک کے سیکرٹری اطلاعات شفقت محمود صاحب نے فرمایا کہ پیپلز پارٹی ، نواز لیگ ، ق لیگ اور اے این پی سمیت سبھی سیاسی جماعتیں بری طرح ہار جائیں گی ۔جب اینکر نے کہا کہ کیا ایم کیو ایم بھی ؟ تو انہوں نے فرمایا "ہاں وہ بھی "جس پر سبھی شرکاء بے اختیار ہنس پڑے تو پھر موصوف نے خجالت سے کہا "شاید وہ کراچی سے چند سیٹیں جیت جائے" ۔ موصوف کے اس اعتماد کی وجہ IRI

کی وہ رپورٹس ہیں جن کا دھنڈورا عمران خاں سمیت سبھی تحریکیے.بڑی شدت سے پیٹتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن سچائی کے دعوے داروں کی اس جماعت کے کسی لیڈر کو آج تک یہ توفیق نہیں ہوئی کہ IRI کی رپورٹس کی اصل حقیقت سے قوم کو آگاہ کر سکیں۔ IRI کی سائیٹ کے مطابق یہ رپورٹ انیس کروڑ پاکستانیوں میں سے صرف 5900 افراد کی آراء پر مشتمل ہے جس میں پینتالیس فیصد آراء اٹھارہ سے پچیس سال تک کے نوجوانوں کی ہیں۔ بلوچستان، جہاں مقبول ترین جماعت کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے وہاں سے صرف 118 افراد کی رائے لی گئی اور صرف 41 افراد نے تحریکِ انصاف کے حق میں رائے دی۔ یہ رپورٹ صرف آئی آر آئی کی سائیٹ پر دستیاب ہے جسے اس نے شائع کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ کیا تحریکِ انصاف ایسی رپورٹس کو بنیاد بنا کر انتخاب جیت پائے گی ؟۔ اور کیا یہ عین حقیقت نہیں کہ دائیں بازو کے ووٹوں کی تقسیم کا گناہ آنے والا مورخ تحریکِ انصاف ہی کی جھولی میں ڈالے گا؟۔

"اداروں کی "ماں

لفظ "ماں" میں پتہ نہیں کیا جادو ہے کہ لبوں پہ آتے ہی مُنہ شہد کی سی مٹھاس سے بھر جاتا ہے۔یہ لفظ اتنا پاکیزہ ہے کہ اِس کی تقدیس سے پورا وجود سرشار ہو جاتا ہے۔اِس کے پیار کی انتہا یہ کہ ربِ کائینات نے اپنی محبت کا استعارہ ماں کی محبت سے باندھا ہے ۔ایثار کا یہ عالم کہ بقول عباس تابش

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش

میں نے اِک روز کہا تھا، مجھے ڈر لگتا ہے

لیکن پچھلے دِنوں نو منتخب وزیرِ اعظم راجہ پرویز اشرف صاحب نے پارلیمنٹ کو "ماں" کا درجہ دے کر کم از کم میرے وجود میں کانٹے بو دیئے۔میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا واقعی ہم اخلاقی گراوٹ کے اُس درجے تک پہنچ چُکے ہیں کہ چوروں، ڈاکوؤں ،لُٹیروں ،خائنوں ،بد دیانتوں ،قرضہ خوروں ،رسہ گیروں اور بھتہ خوروں کی "منڈلی" کو ماں جیسی پاکیزہ ہستی کے مترادف قرار دے دیں؟۔بھلے "راجہ رینٹل" صاحب اعلیٰ عدلیہ کو یہ پیغام دینا چاہتے ہوں کہ پارلیمنٹ ہر ادارے سے سپریم ہے اور اُس کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا لیکن اُنہیں ماں جیسے مقدس رشتے کی توہین کا حق بھی بہرحال کسی نے

نہیں دیا۔ میرا یہ کالم اُس مقدس ترین رشتے کے بارے میں ہر گز نہیں جسے دیکھ کر ربِ کریم کی رحمتوں کی آس بندھ جاتی ہے بلکہ اُس مصنوعی اور غیر فطری ماں کے بارے میں ہے جس کا وزیرِ اعظم صاحب نے تذکرہ کیا ہے۔

وزیرِ اعظم صاحب نے فرمایا کہ پارلیمنٹ تمام اداروں کی ماں ہے اور وزیرِ اطلاعات جناب قمر الزماں کائرہ نے جنابِ وزیرِ اعظم کے اسی فرمان کی گلی گلی تشہیر شروع کر دی۔تب سے اب تک میں یہی سوچ رہی ہوں کہ اگر پارلیمنٹ ماں ہے تو پھر کوئی نہ کوئی باپ بھی ضرور ہو گا کیونکہ باپ کے بغیر تو ماں کا تصور ہی ممکن نہیں۔اگر چشمِ تصور سے کسی "آمر" کو باپ سمجھ لیا جائے تو وہ تو اتنا سخت گیر ہوتا ہے جو "اماں جی کو طلاق دے کر گھر بٹھا دیتا ہے اور پھر جو من میں آئے کرتا ہے اور جاتا بھی اُس" وقت تک نہیں جب تک اللہ نہ اٹھائے یا قوم ڈنڈا نہ دکھائے۔اِس لئے ایسے باپ سے اللہ "اماں جی" کو محفوظ ہی رکھے تو بہتر ہے۔اگر سپریم کورٹ کو باپ کا درجہ دے دیا جائے تو وہ بھی "اماں جی" کو بہر حال من مانی نہیں کرنے دیتا اور اُس کو سیدھی راہ پر چلانے کی اپنے تئیں کوشش کرتا رہتا ہے لیکن اماں جی چونکہ کسی کی باتوں پہ کان دھرنے کی عادی نہیں اس لئے اُن کے مابین بھی "خانگی" جھگڑے جاری رہتے ہیں جن کا نقصان ماں کو پہنچتا ہے نہ باپ کو البتہ اولاد دربدر ہو کر خودکُشیاں ضرور کرنے لگتی ہے۔البتہ اگر اماں جی کے ہتھے کوئی "ڈوگر ٹائپ"

چڑھ جائے تو پھر وہ خوب کھل کھیلتی اور عیاشیاں کرتی پھرتی ہے۔ویسے یہ ماں ہے یا کالی ماتا" ؟جو ہر وقت اپنے ہی بچوں کا خون پیتی رہتی ہے لیکن اس کا پیٹ کبھی نہیں" بھرتا۔8500 ارب ڈکارنے اور ملک کو ناکام ترین ریاستوں میں تیرھویں نمبر پر لا پھینکنے کے باوجود یہ "کالی ماتا" روزِ اول کی طرح تشنہ ہے۔

محترم وزیرِ اعظم اور وزیرِ اطلاعات اسی اداروں کی ماں کا اٹوٹ انگ ہیں۔ لیکن کیا کبھی اُنھوں نے سوچا کہ جن ہاتھوں نے اُنہیں تراشا، وہ اُن کا کیا حشر کر رہے ہیں ؟۔کیا ان کا دھیان کبھی سسکتے، تڑپتے مجبور و مقہور عوام کی کسمپرسی کی طرف گیا؟۔ دُکھ تو یہ ہے کہ

جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں

وہ بولنے لگے تو ہمیں پہ برس پڑے

اداروں کی ماں کی رٹ چھوڑیئے کہ قوم اب اتنی بھی بے شعور نہیں کہ اُسے لفظی بازیگریوں سے بہلایا جا سکے۔پھر ہمارا ایمان یہ بھی ہے کہ پالیمنٹ سپریم ہے نہ کوئی دوسرا ادارہ اور نہ ہی عوام۔ سپریم اگر ہے تو فقط ربِ لم یزل جو فرش سے عرش تک ہر شے کا خالق بھی ہے، مالک بھی اور مختارِ کُل بھی۔ عوام، عدلیہ، انتظامیہ، مقنّنہ، فوج اور دیگر سبھی ادارے اگر اُسی

ذوالجلال کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط پر عمل کرتے ہیں تو ٹھیک وگرنہ کسی شخص پر بھی اُن کی اطاعت فرض نہیں۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے پہلے خطبے میں فرمایا کہ لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں۔ تم پر میری اطاعت صرف اُس وقت تک فرض ہے جب تک میں تمہیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنے کی تلقین کروں۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا ہماری موجودہ پارلیمنٹ اپنے کردار، اعمال اور افعال کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اِس کی اطاعت کی جائے اور اس کے احکامات کو فرضِ عین سمجھا جائے؟۔ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہر گز نہیں۔ اس لئے قوم اداروں کی اس ماں سے دست بستہ عرض کرتی ہے کہ اپنے "لچھن" درست کرلے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق قوم تو اُس کی دُرگت بنانے سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔ یقین مانیے کہ مجھے تو "عوامی مزاج" کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔

شنید ہے کہ "ماتاجی" اپنے اختیارات کو وسعت دینے کے لئے نیا کھیل کھیلنے اور اپنی راہ کے روڑے ہٹانے کے لئے "بڑے گھر" میں بیٹھ کر شاطرانہ منصوبہ بندیوں میں مصروف ہے۔ چیف جسٹس آف پاکستان جنابِ افتخار محمد چوہدری نے شاید اسی لئے بڑی صراحت سے یہ بتلا دیا ہے کہ پارلیمنٹ کی حدود کہاں تک ہیں اور اُسے آئین میں ترمیم کا کس حد تک اختیار ہے۔ پیپلز پارٹی اور اُس کے حواریوں کے لئے چیف صاحب کا یہ فرمان کافی ہونا چاہیے کہ پارلیمنٹ کو آئین

میں کسی بنیادی ترمیم کا ہرگز اختیار نہیں ۔اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ "اماں جی" کوئی "پنگا" لینے سے پہلے اپنی اداؤں پر غور کر لے لیکن اگر اُسے اتنا ہی شوق چُرایا ہے تو پھر "گھوڑا بھی حاضر ہے اور میدان بھی"۔ کوئی اِس غلط فہمی میں نہ رہے کہ قوم نواز لیگ کے لانگ مارچ کا انتظار کرے گی یا عمران خاں کے سونامی کا۔ کیونکہ حالات اب "مارو یا مر جاؤ" کی نہج پر آن پہنچے ہیں ۔ذہنوں میں پکنے والا لاوا کسی وقت بھی آتش فشاں کا روپ دھار سکتا ہے اور وہ لکھاری، دانشور اور تجزیہ نگار یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ بھوکوں مرتے عوام یں کسی احتجاج کی سرے سے سکت ہی باقی نہیں بچی۔ اُنہیں جان لینا چاہیے کہ طوفان کی آمد سے پہلے ہوائیں ہمیشہ ساکت ہو جاتی ہیں اور جب طوفان اُٹھتا ہے تو اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو نیست و نابود کرتا چلا جاتا ہے۔ عمران خاں صاحب کا سونامی تو ابھی بگولوں کی مانند اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے اور میاں برادران کا لانگ مارچ بھی "جاتی عمرا" کے طواف میں محو ہے لیکن "عوامی سونامی" آنے کو تیار بیٹھا ہے آج آئے یا کل۔

معاف کرو بابا

چند دن پہلے کی بات ہے کہ شدید گرمی اور حبس میں دوپہر کے وقت کسی عزیز کی عیادت کے لئے باہر نکلی۔ جونہی گاڑی اشارے پر رُکی تو خیرات مانگنے والوں نے دھاوا بول دیا۔ جب ایک فقیر نے گاڑی کے شیشے کو طبلہ سمجھ کر بجانا شروع کر دیا تو میں نے دروازے کا شیشہ تھوڑا سا نیچے سرکایا اور چڑ کر کہا "معاف کرو بابا" ۔ فقیر تو چلا گیا لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے میرے میاں نے اچانک قہقہہ لگا دیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا "کیا ہوا"؟۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے "مجھے آج تم بالکل ہیلری کلنٹن لگی ہو" ۔ میں نے کہا "کیا مطلب"؟۔ کہنے لگے "تُم نے بھی فقیر سے ویسی ہی معافی مانگی ہے جیسی ہیلری کلنٹن نے پاکستان سے مانگی تھی"۔ تب سے اب تک میں یہی سوچ رہی ہوں کہ میاں کے اس مزاحیہ جملے میں کتنی تلخ سچائیاں مضمر تھیں۔ ہیلری کلنٹن کے بیان کے فوری بعد امریکی وزارتِ خارجہ کی ترجمان وکٹوریہ نولینڈ سے صحافیوں نے جب ہیلری کلنٹن کی پاکستان سے معافی مانگنے کے متعلق سوال کیا تو وہ ہنستے ہنستے دہری ہو گئی اور کہا "میں وہ نہیں کہوں گی جو آپ میرے مُنہ سے کہلوانا چاہتے ہیں"۔ بعد میں کچھ صحافیوں کی ضد سے تنگ آ کر اُس نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کو سانحہ سلالہ پر افسوس ہے"۔

دوسری طرف ہمارے حکمرانوں نے خوشی کے شادیانے بجانے شروع کر دیئے۔ حکومتی حواری کاسہ لیس لکھاری دھڑا دھڑ اپنے کالموں اور ٹاک شوز میں یہ ثابت کرنے پر تُل گئے کہ آخر کار پاکستان نے امریکہ کو ناک رگڑنے پر مجبور کر دیا۔ وزیرِ اطلاعات قمر الزماں کائرہ (جو چوہدری برادران کی مہربانی سے وزیرِ اعظم بنتے بنتے رہ گئے) دلائل سے مسلح ہو کر پریس کانفرنس میں حکومت کے اس عظیم ترین کارنامے پر داد و تحسین وصول کرنے آ دھمکے۔ الیکٹرونک میڈیا کی چاندی ہو گئی اور ہر ٹاک شو میں یہی سوال کہ Sorry کا مطلب کیا ہوتا ہے؟۔ سارے جہاں کے بزر جمہر، ارسطو اور افلا طون سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ امریکہ نے معافی مانگی یا نہیں۔ لیکن کسی نے شاید ہیلری کلنٹن کے بیان پر توجہ نہیں دی۔ ہیلری نے کہا کہ جب پاکستانی وزیرِ خارجہ حنا رُبانی کھر نے اُنہیں ٹیلی فون کرکے بتلایا کہ پاکستان نیٹو سپلائی بحال کر رہا ہے تب میں نے سانحہ سلالہ پر Sorry کہا اور جانی نقصان پر افسوس کا اظہار کیا۔ گویا پہلے نیٹو سپلائی بحالی کی خوشخبری اور پھر معافی کی وصولی۔ ایسی معافی تو گینیز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج کی جانی چاہیے۔ حنا ربانی صاحبہ نے سانحہ سلالہ پر بڑی نخوت سے کہا تھا "صرف معافی ہی کافی نہیں تلافی بھی ضروری ہے"۔ سات ماہ پہلے وہ بلندی اور آج یہ پستی کہ معافی نہ تلافی۔ شاید ہماری وزیرِ خارجہ کے بار بار "گداگرانہ" سوال پر ہیلری کلنٹن نے بھی سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہہ دیا ہوگا "جا بابا! معاف کر"۔

قمر الزماں کائرہ صاحب فرماتے ہیں کہ قومی غیرت کا تقاضہ یہی تھا کہ نیٹو سپلائی بحالی پر کوئی معاوضہ طلب نہ کیا جاتا۔انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ہم تیں ، چالیس کروڑ ڈالر وصول کر بھی لیتے تو ہمارا تو کچھ نہ بنتا لیکن قومی دامانِ غیرت تار تار ہو جاتا ۔۔۔درست فرمایا، واقعی پاکستان کے عدیم النظیر حکمرانوں کے لئے یہ اونٹ کے مُنہ میں زیرے کے مترادف ہی ہوتا۔لیکن آپس کی بات ہے "اندر کھاتے" کیا کچھ وصول کیا ؟۔اُدھر ایوانِ صدر میں بیٹھے شاطروں نے قوم کی توجہ ہٹانے کے لئے عین موقعے پر توہینِ عدالت کا بِل پارلیمنٹ اور سینٹ سے منظور کروا لیا حالانکہ جانتے وہ بھی ہیں کہ سپریم کورٹ نے اسے پہلے ہلے میں ہی "پھڑکا کے" رکھ دینا ہے لیکن اس بِل سے بہرحال نواز لیگ اور تحریکِ انصاف کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔دونوں جماعتیں ہی پریشان تھیں کہ براہِ راست امریکی مخاصمت کیسے مول لی جائے۔اب وہ اپنا سارا وزن توہینِ عدالت بِل "پر ڈال کر امریکی غیض و غضب کا نشانہ بننے سے بال بال بچ گئے" ۔اُدھر امریکی سفیر کیمرون منٹر نے جاتے جاتے یہ کہہ کر بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑ دیا کہ نواز شریف اور عمران خاں نے یقین دلایا ہے کہ وہ امریکہ کے حامی ہیں "۔ نواز لیگ تو" خیر پہلے بھی امریکی مخالفت کی کبھی ڈھنڈورچی نہیں رہی اور نہ ہی کوئی سیاسی جماعت امریکہ حمایت کے بغیر "کُرسی" کا خواب دیکھ سکتی ہے۔لیکن امریکہ پر کڑی تنقید کرنے اور ڈرون

حملوں کے خلاف دھرنے دینے والے کپتان صاحب سے نوجوان نسل یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ "Brutus you too?"

اُدھر "مولوی صاحبان" بھی بڑے کائیاں نکلے۔ انہوں نے "حکومتی شرارت" پر کان نہ دھرتے ہوئے نیٹو سپلائی کے خلاف اسلام آباد تک لانگ مارچ کا اعلان کر دیا۔ شاید ان کے مخبروں نے اُنہیں یہ غلط اطلاع فراہم کر دی ہو گی کہ نیٹو کنٹینر پارلیمنٹ ہاؤس، ایوانِ صدر اور وزیرِ اعظم ہاؤس میں کھڑے ہیں جنہیں روکنا "عین عبادت ہے"۔ رحمٰن ملک صاحب نے جب طورخم یا چمن کی بجائے اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ کا سُنا تو کھِلکھلاتے ہوئے فرمایا "اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما"۔ شنید ہے کہ اُنہوں نے تو "لانگ مارچیوں" کے لئے "منجی بسترے" کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ ایسے انتظام و انصرام پر پہلے تو میں ٹھٹھکی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ دفاعِ پاکستان والوں کی بذریعہ شیخ رشید صاحب رحمٰن ملک سے کوئی "ڈیل" ہو گئی ہو اور انہوں نے ملک صاحب کو چُپکے چُپکے کہہ دیا ہو کہ ہم اپنا کام کرتے ہیں اور تُم "لگے رہو مُنا بھائی"۔ کیونکہ جس دن لانگ مارچ عازمِ سفر تھا عین اسی دن نیٹو کنٹینر افغان سرحد عبور کر رہے تھے۔ لیکن بعد میں ہم نے اِس خیالِ فاسد کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ویسے اِس میں تھوڑا تھوڑا یہ خوف بھی شامل تھا کہ اگر "مولوی صاحبان" ناراض ہو گئے تو کل کلاں کسی نے میری تو "نمازِ جنازہ" بھی نہیں پڑھانی۔ سچ تو یہی ہے کہ

ہم لاکھ چیں بچیں کریں، ہمیں بہرحال کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں مولوی صاحبان کا محتاج تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ شاید اکابرینِ دفاعِ پاکستان کونسل کو بھی اسلام آباد پہنچ کر یہ احساس ہو گیا کہ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں اس لئے اس لانگ مارچ کا نتیجہ تو یہی نکلا کہ صاحب نے کھایا پیا کچھ نہیں، پیالی توڑی، بارہ آنے"۔اب شنید ہے کہ 14، 15" جولائی کو چمن اور 17،18 کو طورخم میں براہِ راست نیٹو سپلائی روکی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ '' شریر" رحمٰن ملک صاحب ان چاروں ایام میں نیٹو سپلائی روک کر مُسکراتے ہوئے یہ کہیں گے

"اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر"

البتہ انتہائی محترم فرید احمد پراچہ کا ایک ٹاک شو میں یہ بیان ضرور حوصلہ افزاء ہے کہ نیٹو سپلائی بند ہو نہ ہو لیکن ہمارے لانگ مارچوں سے حکومت گھر ضرور چلی جائے گی" ۔میں شاید اِس بیان کو زیادہ اہمیت نہ دیتی لیکن حکومتی ایوانوں کے انتہائی قریب محترم نذیر ناجی کی گھبراہٹ دیکھ کر کچھ حوصلہ ہوا ہے۔اُنھوں نے آج اپنے کالم میں فرمایا ہے "دفاعِ پاکستان کونسل اگر سپلائی روٹ دوبارہ بند کرنے میں کامیاب نہ بھی ہوئی تو کم از کم حکومت کو ضرور لے بیٹھے گی"۔ ہم تو محترم نذیر ناجی صاحب کو یہی کہہ سکتے ہیں کہ "تیرے مُنہ میں گھی شکر"۔

فخرالدین جی ابراہیم

انتہائی بااُصول ،دیانتدار ،محبِ وطن اور کچھ کچھ ضدی محترم فخرالدین جی ابراہیم، جنہیں لوگ پیار سے "فخرو بھائی" بھی کہتے ہیں ، کی بطور چیف الیکشن کمشنر تقرری کو تازہ ہوا کا جھونکا قرار دیا جا رہا ہے۔اس تقرری پر حکومت بھی داد وصول کر رہی ہے اور اپوزیشن بھی ۔میڈیا پر واہ واہ کا اتنا شور کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی ۔ کوئی کمزور سی آواز بھی اس تقرری کے خلاف اٹھی ،نہ اٹھ سکتی ہے لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے ۔۔۔۔ شدید اختلاف ۔۔۔۔وجہ یہ نہیں کہ مجھے "فخرو بھائی " کی ذاتِ گرامی میں کوئی کجی نظر آتی ہے۔وجہ یہ کہ اُن کی امانت ،دیانت ، صداقت ، شرافت اور نجابت سے قطع نظر کیا ایک 85 سالہ نحیف و نزار شخص اپنے مضحمل قویٰ کے ساتھ یہ اہم ترین فریضہ ادا کر پائے گا؟۔ لاریب کہ اب ہم اُس مقام پر ہیں جہاں پاکستان کی بقاء شفاف ترین الیکشن میں مضمر ہے اور اگر اُس علیم و خبیر کی مہلت ابھی تک تمام نہیں ہوئی تو پھر غالباََ ملکی سلامتی کے لئے کچھ کر گزرنے کا یہ آخری موقع ہے ۔ایسے میں ملکی سلامتی کی عنان ایک پچاسی سالہ شخص کے ہاتھ میں دینا سمجھ سے بالاتر ہے ۔

کیا یہ سوچ ہی کچھ احمقانہ سی نہیں لگتی کہ چوروں ،لُٹیروں ، بھتہ اور قرضہ

خوروں کی اِس منڈلی میں چاروں طرف سے گِھرا ہوا شرافت کا ایک پُتلا اپنی "بوڑھی توانائیوں" کیساتھ اکیلا سبھی کا مقابلہ کرپائے گا؟۔ یہ بجا کہ محترم فخر الدین جی ابراہیم صاحب شفاف ترین ووٹر لسٹیں تیار کروانے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے اور کڑے اصول و ضوابط بھی۔ لیکن عمل درآمد کون کروائے گا؟۔ الیکشن کمشن کے اندر بھرے ہوئے "سیاسی گند" کو کون صاف کرے گا؟۔ میں نے بہت سے لوکل اور قومی انتخابات میں بطور پریزائیڈنگ آفیسر خدمات سرانجام دی ہیں اس لئے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ کبھی بھی اکیلے چیف الیکشن کمشن کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ اِس کے لئے ٹیم ورک کی ضرورت ہے اور سوال یہ ہے کہ کیا فخر الدین صاحب اس قلیل سے وقت میں ایک دیانت دار ٹیم تشکیل دے پائیں گے ؟ انہیں تشکیل دینے کے لئے "فری ہینڈ" مِل پائے گا؟۔ کیونکہ یہ تو سوچ ہی احمقانہ ہے کہ اس کے بغیر چیف الیکشن کمشنر صاحب کی ہر جگہ اور ہر مقام پر مضبوط گرفت ہو گی۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ الیکشن کمیشن کے اندر نچلی سطح پر حکومتی گُرگوں کی بھرمار ہے جنھیں سیاسی سطح پر نوکریوں سے صرف اسی لئے نوازا گیا ہے کہ وہ بوقتِ ضرورت کام آ سکیں۔ ایسے میں "فخرو بھائی" کیا کرلیں گے ؟۔ اور "پنبہ کُجا کُجا نہم" کے مصداق اس قلیل سے وقت میں کون کون سی خرابی دور کرپائیں گے ؟۔ یہ ایسا سلگتا ہوا سوال ہے کہ جس کا جواب ہمیں بہرحال تلاش کرنا ہو گا۔

میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ ہمیں اس وقت انسانی سروں کی فصل کاٹنے اور کھوپڑیوں کے مینار سجاتے کسی چنگیز خاں کی ضرورت ہے۔ صحرائے گوبی کا چرواہا چنگیز خاں جس کی آمد کا سُن کر دریاؤں کے رُخ بدل جاتے اور صحرا البِ مرگ پناہ گزینوں سے بھر جاتے۔ جس کی مافوق الفطرت قوت کو مسلمان آثارِ قیامت سے تعبیر کرتے اور عیسائی عذابِ الٰہی سے۔ جرمنی کے شاہ فریڈرک ثانی نے انگلینڈ کے شاہ ہنری کو لکھا کہ " یہ عذابِ الٰہی سے کم نہیں جو ہمارے گناہوں کی پاداش میں نازل ہوئے ہیں۔ یہ دراصل اسرائیل کے دس گمشدہ قبائل کی نسل سے ہیں جن کو "سامری جادوگر " کے سُنہرے بچھڑے کو پوجنے کی سزا دینے کے لئے ایشیا کے ویران صحراؤں میں بند کر دیا گیا تھا"۔ معروف فلسفی روجر بیکن نے لکھا " یہ دجال کے سپاہی ہیں جو اپنی آخری دہشت ناک فصل کاٹنے آئے ہیں"۔ سوال مگر یہ کہ میں نے ایسے شخص کا انتخاب کیوں کیا ؟۔ایسے شخص کا حوالہ چہ معنی دارد ؟۔ تو عرض ہے کہ اُسی اُجڈ، گنوار اور وحشی کو پچاس اقوام "بوگدو" یعنی دیوتاؤں کا بھیجا ہوا قرار دیتی تھیں۔ یہ وہی شخص تھا جس نے ایک بے لگام مجمعے کو عظیم الشان لشکر میں ڈھال دیا۔ یہ وہی سالار تھا جس سے اُس کی سپاہ نے کبھی انحراف نہ کیا، جس کے خلاف کبھی کوئی بغاوت ہوئی نہ سازش۔ وجہ ۔۔۔؟ وجہ صرف یہ کہ اُس نے پچاس اقوام کے لئے "یاسا" یعنی قانون ترتیب دیا اور اُس پر خود بھی پوری دیانت داری سے عمل کیا اور کروایا

بھی۔ ہمیں بھی کسی ایسے ہی چیف الیکشن کمشنر کی ضرورت ہے جس کی دہشت ناکی سے سبھی خوف زدہ ہوں اور جس کی دیانت کی گواہی ہر زبان پر ہو۔ انتہائی محترم فخر الدین جی ابراہیم صاحب کے اندر ایک خوبی تو لاریب ہے۔ اُن کی دیانت پر شک کرنے والا کوئی فاتر العقل ہی ہو سکتا ہے یا کوئی شر پسند لیکن دوسری خوبی (جو بہر حال خوبی تو نہیں لیکن ہمیں اس کی ضرورت ہے) اُنہیں چھو کر بھی نہیں گزری۔ فخر الدین جی ابراہیم صاحب کا ماضی یہی بتلاتا ہے کہ کسی بھی اختلاف کی صورت میں وہ پیچھے ہٹ جایا کرتے ہیں، خم ٹھونک کر میدان میں نہیں آتے۔ بھٹو مرحوم سے بینظیر شہید کے ادوار تک اُنھوں نے اصولوں پر سمجھوتا کرنے کی بجائے مراجعت میں ہی عافیت جانی۔ اٹارنی جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دیا، گورنری کو لات مار کر باہر آ گئے اور با وقار "جسٹس" کی سیٹ تیاگ دی لیکن آمر کے سامنے حلف نہیں اٹھایا۔ اب بھی مجھے ڈر ہے کہ عین موقعے پر، جب خباثتیں اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ اُن پر حملہ آور ہونگی تو وہ سبھی کچھ بیچ منجھدار میں چھوڑ کے واپس اپنے گوشہ عافیت میں چلے جائیں گے۔ جب آتش جوان تھا" تب یہ عالم تھا اور اب جبکہ"

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

میں نے یہاں اپنے جن خدشات کا اظہار کیا ہے اُن سے نہ صرف اختلاف ممکن ہے

بلکہ اسے سرے سے رد کرتے ہوئے بیشمار دلائل بھی دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں نے مُلکی حالات کے تناظر اور پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے شاطروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ گزارشات کی ہیں۔خُدا کرے کہ یہ سبھی اندیشہ ہائے دُور دراز ہوں۔ میری خواہش اور دُعا ہے کہ میرے یہ خدشات سرے سے غلط ہوں کہ یہ مُلکی سلامتی و بقاء کا مسئلہ ہے۔ پتہ نہیں کیسے میں نے اپنے مخصوص انداز سے ہٹ کر یہ سب کچھ لکھ دیا اور لکھتی چلی گئی ۔ خیر چھڈو جی "مٹی پاو ٹیپ ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ کسی نے بیل کو بد دُعا دی کہ اُسے چور لے جائیں تو اُس نے جگالی کرتے ہوئے مُسکرا کر کہا "سانوں کی، سائیاں تے پٹھے ای کھانے نے" (مجھے کیا میں نے تو چارہ ہی کھانا ہے، وہ اس مالک کے گھر سے ملے یا کسی چور کے گھر سے)۔ سو، چہرے بدل بدل کے جتنے بھی حاکم آ جائیں ہم جیسے محکوموں نے تو قلم ہی گھسیٹنا اور دِل کے پھپھولے ہی پھوڑنے ہیں۔ باوجودیکہ ہم بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا

رنج راحت فزاء نہیں ہوتا

نیٹو سپلائی کی بحالی

پروفیسر مظہر

گزشتہ کئی دنوں سے "Sorry " اور "Apology" کی بحث سن سن کر کان پک گئے ہیں۔ دانشور اور لکھاری دور کی کوڑیاں لاتے ہوئے نت نئے معانی و مفاہیم بیان کرکے اپنے تبحرِ علمی کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اُن کی اس بحث سے قوم کو کیا فائدہ پہنچنے والا ہے؟۔ سیدھی سی بات ہے کہ امریکہ اگر سوری نہ بھی کہتا تو نیٹو سپلائی تو بہرحال بحال ہونی ہی تھی کیونکہ ہمارے حکمرانوں کو اب "تھوک کے چاٹنے" کی کچھ عادت سی ہو چلی ہے وگرنہ ریمنڈ ڈیوس کی رہائی اور ایبٹ آباد آپریشن ہماری غیرتوں پر کوئی کم تازیانے تو نہیں تھے۔ آخر قوم کو کب سمجھ آئے گی کہ حکمرانوں اور ان کے بہت سے حواریوں کا خُدا وہ ربِ لم یزل نہیں جو خالق و مالکِ کائینات ہے بلکہ امریکہ ہے۔ امریکہ بھی ہمارے میڈیا پر لگ بھگ 65 ملین ڈالر ہمیں یہ یقین دلانے کے لئے صرف کر رہا ہے کہ اس عالمِ آب و گِل کی ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے۔ باقی تو سب پُتلیاں ہیں، محض پُتلیاں۔ سلالہ کے چوبیس شہید بھی حکمرانوں کے نزدیک کٹھ پُتلیاں ہی تو تھے۔ سیاسی اور عسکری قیادت کے اس متفقہ فیصلے پر فوج مگر بُری طرح بے چین ہے۔ شاید وہ ابھی تک امریکی خُداؤں کی بندگی پر

تیار نہیں۔ وزیرِ اطلاعات قمر الزماں کائرہ صاحب نے فرمایا کہ مسئلہ ٹرانزٹ فیس کا نہیں بلکہ غیرت کا تھا اس لئے ہم نے خود ہی فیس کا مطالبہ نہیں کیا۔ درست فرمایا لیکن ہماری قومی غیرت اس وقت کہاں جا سوتی ہے جب ہم کشکولِ گدائی لئے اسی کے در پہ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں؟۔ ہماری غیرتوں پہ اس وقت ضربِ کاری کیوں نہیں لگتی جب اِدھر نیٹو کنٹینرز افغانستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں اور اُدھر امریکی ڈرون وزیرستان میں ہمارے چوبیس پاکستانیوں کو شہید کر دیتے ہیں؟ (شاید یہ محض اتفاق ہو لیکن ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کے فوراً بعد بھی ڈرون طیاروں نے ریمنڈ کو چوبیس پاکستانیوں کے خون کی سلامی دی تھی)۔ تحقیق کہ بھکاری کی کوئی غیرت نہیں ہوتی اور نہ ان حاکموں کی ہے۔ آقا ﷺ کا فرمان ہے "اللہ غیرت مند ہے اور غیرت مندوں کو دوست رکھتا ہے"۔ لیکن یہ غیرت مند کیسے ہو سکتے ہیں جن کا رب ہی کوئی اور ہے۔ حکمت کی عظیم ترین کتاب کہتی ہے "جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لئے اُن کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا ہوتا ہے (العنکبوت)۔ لیکن کیا کیجئے کہ مکڑی کے گھر تعمیر کرنے والے ان حکمرانوں، حواریوں اور کاسہ لیس لکھاریوں کے نزدیک اس دورِ جدید میں یہ سب باتیں فرسودہ ہیں۔ چلیئے انتظار کرتے ہیں کیونکہ ہمارا تو ایمان ہے کہ "اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا" (سورہ نوح)۔

امریکی تنخواہ دار کچھ دانشور اپنی تمام تر توانائیاں یہ ثابت کرنے میں صرف کر رہے ہیں کہ امریکی مخاصمت سراسر گھاٹے کا سودا ہے کیونکہ ناراض امریکہ جب جی چاہے ہمیں پتھر کے زمانے میں دھکیل سکتا ہے۔ بجا ارشاد۔ سوال مگر یہ ہے کیا کسی مذہبی یا سیاسی جماعت نے آج تک یہ کہا ہے کہ امریکہ کے خلاف طبلِ جنگ بجا دیا جائے؟۔ مطالبہ ہے تو فقط یہ کہ پاکستان کو اپنی چراہ گاہ سمجھنے والے اس امریکی عفریت سے ہاتھ باندھ کر جان چھڑا لی جائے جو ہمیں "جہنم سے نکلا ہوا اتحادی" قرار دیتا ہے۔ ویسے ان بزرجمہروں کی خدمت میں عرض ہے کہ جتنا وہ ہمیں امریکہ سے خوف زدہ کر رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ تو امریکہ ہم سے خوف زدہ ہے۔ پچھلے دنوں پینٹا گون میں ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں امریکی صدر اوباما کو بریفنگ دیتے ہوئے یہ بتلایا گیا کہ پاکستان پر حملے کا آپشن سامنے رکھ کر فوراً مسترد کر دیا گیا کہ انیس کروڑ کے ایٹمی ملک پر حملہ انتہائی احمقانہ سوچ ہے۔ ایرانی صدر احمدی نژاد نے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ امریکہ انہیں نیست و نابود کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایران اسرائیل کو صفحہ ہستی سے مٹا دے گا اور اسرائیل تو وہ طوطا ہے جس میں امریکی جن کی جان ہے۔ لیبیا کا معمر قذافی جب تک ڈٹا رہا، بچا رہا۔ لیکن جوں ہی اس نے تمام ایٹمی اثاثے امریکہ کے حوالے کیے، اس کی بربادیوں کی سرگوشیاں فضاؤں میں گونجنے لگیں۔ جب تک امریکہ بہادر کو

مکمل یقین نہ ہوا کہ عراق کے پاس ایٹمی ہتھیار نہیں اس نے حملہ کرنے کی جرات نہیں کی۔ شمالی کوریہ آج بھی آکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا ہے اور ویزویلما اور بولیوبا بھی نابود نہیں ہوئے حالانکہ انہوں نے امریکہ سفیروں کو ذلیل کرکے نکالا۔ بے سرو سامان افغانی طالبان نے گزشتہ دس سالوں میں نیٹو افواج کا حشر کیا اور کر رہے ہیں وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ اگر ترکی ہمیشہ وہی کرتا ہے جو اس کے ملک و قوم کے بہترین مفاد میں ہوتا ہے تو ہم کیوں نہیں؟۔ پھر یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ امریکہ تو اب ہر ملک کا پڑوسی ہے اور ڈاکٹر عبدالقدیر نے متعدد بار کہہ چکے ہیں کہ بھارت کا بعید ترین شہر بھی ہمارے ایٹمی میزائیلوں کی زد میں ہے تو پھر کیا ہماراپڑوسی امریکہ ہمارے میزائیلوں کی زد میں نہیں اور کیا امریکہ اس سے بخوبی اگاہ نہیں؟۔

مسئلہ یہ نہیں کہ امریکہ ہمیں برباد کر دے گا بلکہ مسلہ یہ ہے کہ امریکہ ہمارے حکمرانوں کو نیست و نابود کر دے گا۔ کیونکہ ان کے سارے اثاثے تو امریکہ اور یورپ میں بکھرے پڑے ہیں اور اولادیں بیرونی یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم یا اپنے کاروبار میں مگن۔ ان کا پاکستان میں ہے کیا جو انہیں اس مٹی سے ہمدردی ہو؟۔ یہ تو اپنے آقا کے اشارہ ابرو پر یہاں آتے، تفویض کردہ ذمہ داریاں نبھاتے اور واپس چلے جاتے ہیں شاید اسی لئے "دوہری شہریت" کے خاتمے پر وہ بہت بے چین ہیں۔ لیکن ہم نے تو یہیں جینا مرنا اور اپنی راہوں کا خود

انتخاب کرنا ہے۔ فرمانِ ربی ہے "اللہ تعالے کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہیں بدلتی (الرعد)۔ یہ مغرب زدہ لکھاری لاکھ موشگافیاں کریں لیکن تاریخ کا سبق تو یہی ہے کہ قومیں جب عزم بالجزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں تو ہمیشہ کامران رہتی ہیں ۔اسلامی تاریخ ایسے بیشمار واقعات سے بھری پڑی ہے جہاں ربِ کردگار نے ہمیشہ قلت کو کثرت پر غالب کیالیکن ایسی مثالوں سے کچھ مہربانوں کے چہرے کھچ جاتے ہیں البتہ میرے سامنے سپین کافرانسسکو پیزارو ہے جس نے 1532 میں محض 177 سپاہیوں اور 62 گھوڑوں کے ساتھ پیرو جیسی سلطنت کو فتح کیا جس کی آبادی اس وقت بھی چھ ملین سے زیادہ تھی ،جس کے حکمران "انکا" کو ہندوستانی دیوتا کا درجہ دیتے تھے ، جس کے پاس بیشمار فوج اور دولت کی ریل پیل تھی ۔حیرت ہوتی ہے کہ سپین ہی کے ہرنینڈو کورٹیز نے پیزارو سے محض دس سال بعد 533 سپاہیوں (جن میں سے صرف تیرہ کے پاس پستول اور بتیس کے پاس تیر کمان تھے)چودہ توپوں ، سولہ گھوڑوں اور گیارہ بحری جہازوں کے ساتھ میکسیکو جیسے عظیم سلطنت کو فتح کیا۔ کورٹیز نے طارق بن زیاد کی طرح حملہ کرنے سے پہلے تمام کشتیاں جلا ڈالیں اور فتح یاب ہوا۔ ربِ کردگار بلا امتیاز ہر اس قوم کو فتح یاب کرتا ہے جس کا جذبہ جوان ہوتا ہے ۔میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اب اس قوم کا مقدر الیکشنوں سے نہیں بدلنے والا کہ جس غلیظ سیاست و جمہوریت سے اس قوم کو پالا پڑا ہے اس میں تو ایسی ہی پارلیمنٹ وجود میں آئے گی جیسی ہم بھگتتے رہے اور بھگت رہے ہیں۔

انقلاب یا انتخاب

پچھلے ہفتے شادی کی ایک تقریب میں اچانک مجھے ایک چہرہ بہت مانوس سا لگا۔ میں ذہن پر بھرپور زور دیتی رہی لیکن برسوں دور بیٹھی یادوں میں اٹکا وہ شناسا چہرہ ناشناسائی کی دھول میں گم ہی رہا۔ تقریب ختم ہوئی اور میں ان سوچوں کے ساتھ گھر آ گئی کہ

گئے دنوں کا سُراغ لے کر، کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ

گھر آ کر سونے کے لئے بستر پر لیٹی تو اچانک مجھے یاد آ گیا کہ وہ تو میری سکول کے زمانے کی دوست تھی۔اُس کی یاد کیا آئی گویا یادوں کا دبستاں کھُل گیا اور ماضی کے جھروکوں سے جھانکتی بچپن کی یادوں کی مہک نے میرے سارے تفکرات یوں چوس لئے جیسے سکول کے زمانے میں کاپی پر گری سیاہی کو ہمارا "سیاہی چوس" چوسا کرتا تھا۔ یاد آیا کہ بچپن میں ہمیں چھٹی بہت مرغوب ہوتی تھی اور غیر متوقع تعطیل تو اپنے ساتھ خوشیوں کی بہار لے کر آتی تھی۔ایک دن سکول پہنچے تو پتہ چلا کہ کسی بڑے رہنُما کی اچانک وفات کے سوگ میں دو دن کی چھُٹی کر دی گئی ہے۔

اُن کی وفات کا دُکھ تو خیر کیا ہونا تھا البتہ چھُٹی کا سُن کر ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ چھُٹی گزار کر واپس آئے تو ہمارا ننھا مُنا ذہن سوچنے لگا کہ بڑے صاحب کی وفات پر تو دو چھُٹیاں ہوئی ہیں لیکن اگر ہماری اُستانی صاحبہ راہی عدم کو لبیک کہہ جائیں تو پھر کتنی چھُٹیاں ہوں گی؟۔ بد قسمتی سے ہم نے اپنی اس (شادی پر نظر آنے والی) اکلوتی سہیلی کو رازداں بنالیا اور اُس کمبخت نے ٹیچر کو بتانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی ۔بڑے ہو کر جب "بے بھاؤ کی پڑنا" والا محاورہ ہماری نظر سے گزرا تو ہم محاورہ گھڑنے والے کے ذہنِ رسا پر عش عش کر اٹھے۔ ہماری نرم و نازک جلد پر خوب ہاتھ صاف کرنے کے بعد اُستانی جی ہمیں "بیٹھکیں" لگانے کا حکم دے کر یہ بھول گئیں کہ انہوں نے اس اشرف المخلوقات کو کس نا معقول کام پر لگا دیا ہے۔ اُس "نا قابلِ فراموش" دن کے بعد ہماری ننھی مُنی دُعاؤں کا محور محض اُستانی جی سے چھُٹکارا رہ گیا۔ جس دن ہمارے سالانہ امتحان کا رزلٹ آیا اُس دن ہم نے اپنے پاس ہونے کا نہیں بلکہ استانی جی سے چھُٹکارے کا جی بھر کے جشن منایا۔ اگلی کلاس میں پہنچے تو ہماری کلاس ٹیچر پہلی سے بھی سو گُنا کرخت نکلیں اور تھوڑے ہی عرصے میں ہم سابقہ اُستانی جی کو یاد کر کر کے رونے لگے۔ پُرخار راہوں پہ چلتے وہ سال ہم نے جیسے تیسے گزار لیا اور اگلی کلاس میں جاتے ہوئے "چھُٹکارے" کا ایسا جشن منایا کہ جشنِ نوروز بھی اُس کے سامنے پھیکا پڑ جائے۔ یقین مانیے کہ ہمارے پلے پڑنے والی تیسری کلاس ٹیچر صاحبہ تو پہلی

دو ٹیچرز کی بھی "اماں جان" نکلیں اور ہم بیچارے ایک دفعہ پھر اگلی کلاس میں پروموشن "کے انتظار میں دن گننے لگے۔ سوچتی ہوں کہ وہ دن تو بیت گئے لیکن بدلا تو" اب بھی کچھ نہیں۔اب بھی تبدیل ہوتی کلاس ٹیچر کی طرح کبھی آمریت کا ڈنڈا ہمارے سر پر پڑتا ہے تو کبھی جمہوریت کا۔

لوگ کہتے ہیں کہ گیا وقت پھر لوٹ کے نہیں آتا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ وقت کہیں جاتا نہیں بلکہ گول گول گھومتا رہتا ہے۔ جیسے سکول کے زمانے میں ہمیں نئی ٹیچر میں کشش محسوس ہوتی تھی بالکل ویسے ہی قوم کبھی آمریت کو خوش آمدید کہتی ہے تو کبھی جمہوریت کو لیکن بھلا کہیں بھی نہیں ہوتا۔ ہم نے ایوب کو فرشتہ کہا۔اُس کی آمد کے جشن منائے اور پھر رسوا کرکے گھر بھیج دیا۔ بھٹو کو قائدِ عوام اور نجات دہندہ قرار دیتے رہے لیکن اُسے بھی تارا مسیح کے سپرد کرکے "حلوے" کھائے اور کھلائے، مٹھائیاں بانٹیں اور جشن منائے۔ضیاء الحق کو اسلامی نظام کا عَلَم بردار جانا اور یہ سمجھا کہ اُس کے "اسلامی نظام" تلے دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی لیکن اُس سے بھی جلد ہی بیزار ہو گئے۔ وہ جب ہواؤں میں ہَوا ہو گیا تو خس کم جہاں پاک کہتے ہوئے بینظیر کے پیچھے چل پڑے۔اُن کے دَور میں جب کرپشن نے فن کی شکل اختیار کی تو کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ میاں نواز شریف آئے تو ہم نے سوچا کہ صنعت کار کا بیٹا ہے مُلک میں صنعتوں کا جال بچھا دے گا۔ لیکن قرضے لے کر ہڑپ کرنے کا رواج اُنہی کے

دور میں پڑا جو آج تک جاری ہے۔ مشرف کی بدترین آمریت بھی روتے پیٹتے بھگت لی ۔اُس کے دَور کو ملکی تاریخ کا بدترین دور کہا جاتا ہے لیکن تلخ حقیقت یہی ہے کہ پیپلز پارٹی کا جمہوری دور مشرف کے دورِ آمریت سے کہیں زیادہ بھیانک اور بدتر ہے۔ہم آمریت اور جمہوریت کے اِس گول گول گھومنے والے کھیل میں محض کٹھ پتلیاں میں ۔میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ آج بھی پاکستان کے 90 فیصد عوام جمہوریت کا مطلب جانتے ہیں نہ آمریت کا۔اُن کے نزدیک تو وہی اچھا ہے جو اُنہیں
روٹی، کپڑا، پانی، بجلی، گیس کا بندوبست کرے۔آج بھی بھٹو کی قبر کو محض اس لئے ووٹ مل رہے ہیں کہ اُس کے چاہنے والوں کو یقین تھا کہ اگر بھٹو زندہ رہتا تو روٹی، کپڑا اور مکان کا بندوبست ضرور کر دیتا۔ایسا ہی دل خوش کُن نعرہ لے کر عمران خاں میدان میں اُترے اور مقبول ہوتے چلے گئے۔ منٹو پارک لاہور کے یادگار جلسے کے بعد پُرانے پِٹے ہوئے چہروں نے تحریکِ انصاف پر یلغار کر دی اور آج یہ پارٹی بھی دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح محض ایک سیاسی پارٹی بن کے رہ گئی ہے کوئی انقلابی تحریک نہیں۔اُس کے انقلابی نعروں کا کھوکھلا پن اب بھدا محسوس ہونے لگا ہے اور ساتھ ہی یہ یقین بھی کہ ان سیاسی لیڈروں کے ہاتھوں قوم کا بھلا ہونے والا ہے نہ ووٹ سے کسی تبدیلی کا امکان شنید ہے کہ نگران سیٹ اپ کے لئے پیپلز پارٹی اور نواز لیگ میں خفیہ عہد و پیمان ہو چکے ہیں۔لیکن ابھی تک وزارتِ عظمیٰ کا سہرا سر باندھنے والے کسی دُلہا یا دُلہن کا نام سامنے نہیں آیا۔

نگران سیٹ اپ کی اس خفیہ ڈیل پر تحریکِ انصاف کا کہتی ہے کہ چور چوکیدار آپس میں مِل گئے ہیں ۔اب پتہ نہیں کہ تحریک کے نزدیک چور کون ہے اور چوکیدار کون کیونکہ اس کے بارے میں تحریک کے بزرجمہروں نے ابھی تک کوئی اعلان نہیں فرمایا ۔البتہ میاں شہباز شریف صاحب اکثر 40 چوروں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں جس سے عوام کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چور چوکیدار کے کھیل میں چور کون ہے اور چوکیدار کون لیکن ہمیں تو اتنا پتہ ہے کہ حمام میں سبھی ننگے ہیں ۔نام خواہ کچھ بھی رکھ دو، چور یا چوکیدار کام دونوں کا ایک ہی ہے اور یہ بھی وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کھیل اُس وقت تک ، جاری رہے گا جب تک قوم ان چوروں چوکیداروں کے احتساب کے لئے باہر نہیں نکلتی ۔پاکستان میں کھیل جمہوریت کا ہو یا آمریت کا کھلاڑی ہمیشہ ایک ہی خاندان سے منتخب کیئے جاتے ہیں جسے "خاندانِ حاکماں" کہا جا سکتا ہے ۔یہی لوگ چہرے اور نام بدل بدل کر حکومت کرتے رہتے ہیں ۔ایسے لوگوں سے چھٹکارا صرف انقلاب سے ممکن ہے انتخاب سے نہیں۔

تکلیف کے لئے معذرت خواہ

موجودہ سپریم کورٹ کے مسلمہ حریف، آئین و قانون کی من مانی تشریح کرنے والے نیب زدہ اٹھارنی جنرل عرفان قادر نے فرمایا ہے کہ پارلیمنٹ ہمہ مقتدر اور مختارِ کُل ہے اسے آئین میں کسی بھی قسم کی ترمیم کا مکمل اختیار ہے حتیٰ کہ اگر وہ چاہے تو نظامِ عدل کو ختم بھی کر سکتی ہے۔ یہ عرفان قادر کی مہربانی ہے کہ وہ یہیں تک محدود رہے، اگر وہ کہہ دیتے کہ پارلیمنٹ ملک بیچ کر پیسے کھرے بھی کر سکتی ہے تو کوئی اُن کا کیا بگاڑ لیتا ؟۔ عرفان قادر کو ٹھارنی جنرل ہونا تو دورِ آمریت میں چاہیے تھا لیکن پیپلز پارٹی بھی کسی سے کم نہیں۔ اس کے موجودہ دور میں تو آمریت بھی شرم سے مُنہ چھپاتی پھرتی ہے۔ ویسے تو اِس کا ہر دور ہی اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک "شہید" نے کرسی کے عشق میں آدھے ملک کا سودا کر ڈالا، بی بی شہید نے نہ صرف ایٹمی پروگرام "کیپ" کرنے تک کا عندیہ دے ڈالا بلکہ بھارت سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہوئے جہادِ کشمیر میں سرگرم مجاہدین کی فہرستیں تک بصد عجز و نیاز بھارت کے حوالے کر دیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے جرنیلوں کا جنھوں نے انہیں چلتا کیا وگرنہ ہمارا ایٹمی پروگرام خواب و خیال بن کے رہ جاتا اور ہم ہر روز ناشتے میں نہایت سعادت مندی سے بھارت سے جوتے کھانا عین عبادت سمجھتے۔

اسی "ملک مکاؤ" پروگرام کی تکمیل کی خاطر اب محترم" آصف بھٹو زرداری" میدانِ عمل میں ہیں لیکن طریقہ واردات ذرا مختلف۔پاکستان کے سارے بزر جمہر، افلاطون اور ارسطو سر جوڑ کر اِس "طریقہ واردات" کو سمجھنے کی سر توڑ کوشش کرتے رہے اور کر رہے ہیں لیکن ہمیشہ مُنہ کی کھاتے رہے اور کھا رہے ہیں۔پُرانے "پیپلیئے" بھی اس طریقہ واردات سے نا بلد ہیں البتہ جب کبھی اُن سے قوم کی کسمپرسی کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو اُن کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ ہمیں اس کا ادراک ہے اور ہم اس تکلیف کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

جنابِ زرداری کے سابقہ دوست اور تاحال (تھوڑے تھوڑے) ہمدرد میاں نواز شریف صاحب نے اپنے "یار" کی اداؤں کا تھوڑا تھوڑا ادراک کرتے ہوئے حفظِ ما تقدم کے طور پر اپنے دونوں بیٹوں، حسن اور حسین نواز کو انگلینڈ اور سعودی عرب میں "سیٹل" کر کے اپنا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں دے دیا ہے۔یہ تو میاں صاحب کی اس ملک و قوم پر خصوصی عنایت ہے کہ وہ کبھی کبھار پاکستان بھی تشریف لے آتے ہیں البتہ "قدم بڑھاؤ نواز شریف ہم تمہارے ساتھ ہیں" جیسے بیکار نعروں پر ہر گز کان نہیں دھرتے اور دھرنا بھی نہیں چاہیے کہ مومن ایک سوراخ سے دو بار ڈسا نہیں جاتا۔اُنھوں نے تو بہت پہلے ہی صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے

کہہ دیا تھا کہ " لوگ کہتے تھے کہ قدم بڑھاؤ نواز شریف ہم تمہارے ساتھ ہیں لیکن جب میں نے قدم بڑھایا تو سبھی بھاگ گئے۔ " قوم میاں صاحب کے اس تھوڑا کہے کو بہت سمجھے اور ان کے پاکستان یں کبھی کبھار "پڑاؤ" کو غنیمت جانے اور اُن کے بار بار پاکستان آنے کی تکلیف پر معذرت خواہ ہو۔ میاں شہباز شریف صاحب کا معاملہ البتہ مختلف ہے۔ وہ تا حال ڈٹے ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ کسی نے ایک جیالے سے پوچھا کہ ضیاء الحق مُلک کی کب جان چھوڑے گا؟۔ تو جیالے نے جَل کر جواب دیا "یہ آمر پورا قُرآن مجید سُنائے بغیر پیچھا چھوڑنے والا نہیں اور ابھی تو پہلا پارہ بھی ختم نہیں ہوا۔" بعینہٖ اُمید واثق ہے کہ لاہور کو پیرس اور استنبول کا ملغوبہ بنائے بغیر خادمِ اعلیٰ بھی چین سے بیٹھنے والے نہیں۔ اُنھوں نے جب سے لاہور کی "جڑیں" کھودنا شروع کی ہیں ہم نے باہر نکلنا ترک کر دیا ہے کیونکہ ہمیں اس کا تلخ تجربہ ہو چُکا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک عزیز کی شادی پر جانے کے لئے ہم خواتین کی مسلمہ عادت کے مطابق گھر سے دو گھنٹے لیٹ نکلے۔ باہر نکلے تو یوں محسوس ہوا جیسے "موئنجوداڑو" میں آثارِ قدیمہ کی تلاش میں کھدائی جاری ہو۔ ہر بڑی سڑک پر خندقیں کھُدی ہوئیں اور "تکلیف کے لئے معذرت خواہ" کے بورڈ مُنہ چڑاتے ہوئے۔ گلیوں میں گھومتے، خوار ہوتے چھ کلومیٹر کا سفر سولہ کلومیٹر میں طے کرکے جب متعلقہ جگہ پر پہنچے تو محفل اُجڑ چکی تھی اور دُلہا دُلہن کو لے کر "پھُر" ہو چُکا تھا۔ جی چاہا کہ باہر نکل کر زور زور سے چلاؤں کہ ہمیں ایسی امریکی نُما

معذرت" قبول نہیں لیکن پھر یہ سوچ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے کہ حکمرانوں" نے ایسی ہی معذرت پر امریکہ کا کیا بگاڑ لیا تھا جو ہم بگاڑ پائیں گے؟۔اگر ہماری زندگی میں لاہور پیرس بن گیا تو ایک دفعہ "پاکستانی پیرس" کا نظارہ کرنے ضرور جائیں گے ۔فی لحال باہر نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں کیونکہ مومن ہم بھی ہیں۔

اُدھر پاکستانی سیاست کے نو وارد جنابِ عمران خاں صاحب بھی آج کل زیادہ تر لندن کی ٹھنڈی ٹھنڈی فضاؤں میں گھومتے نظر آتے ہیں لیکن "جیسا دیس، ویسا بھیس" کے مصداق وہاں وہ قیمتی سوٹ میں نظر آتے ہیں۔ہم اپنے اس نوخیز سیاست دان کو شدید گرمی، حبس اور لوڈ شیڈنگ کی نذر نہیں کرنا چاہتے اس لئے خوش ہیں کہ وہ لندن میں مقیم اپنے وارثوں کا بہانہ بنا کر جلدی جلدی لندن یاترا کرتے رہتے ہیں اور سونامی بھی محوِ استراحت ہے۔ویسے بھی یہ کوئی جلسے جلوسوں کا موسم تھوڑا ہی ہے جو ہم خوامخواہ محترم نذیر ناجی صاحب کے "سونامی خاں" کو تکلیف دیتے پھریں۔ تحریکِ انصاف کے اکابرین یقیناً نوجوانوں سے معذرت خواہ ہونگے کہ اُنہیں ایک دو ماہ تک کسی میوزیکل کنسرٹ" سے مستفید ہونے کا موقع نہیں مل سکے گا۔"

یہ ساری معذرتیں ایک طرف لیکن مقامِ عبرت تو یہ ہے کہ آج کل پرنٹ ہویا

الیکٹرانک میڈیا، سبھی کا رویہ معذرت خواہانہ ہوتا جا رہا ہے۔ہم تو عرض کرتے ہی رہتے تھے کہ

اتنا نہ اپنی جائے سے باہر نکل کے چل
دُنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

لیکن ہم عامیوں کی کون سُنتا ہے؟۔ صحافی برادری نے "مشرفی آزادی" کا نہ صرف بھرپور فائدہ اٹھایا بلکہ "بھوکے جٹ کٹورا لبیا، پانی پی پی آپھریا" کے مصداق اپنی جائے سے اتنا باہر نکل گئے کہ عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ تینوں کی اصلاح کے ٹھیکیدار بن کر اپنی توندیں بڑی کرتے ہوئے اتنا اودھم مچایا کہ الحفیظ والاماں۔امریکی سفیر کیمرون منٹر سے حامد میر نے سوال کیا کہ پاکستان کی طاقتور ترین شخصیت کون سی ہے تو اس نے مُسکرا کر کہا"حامد میر"۔(میں دبنگ حامد میر صاحب کا بہت زیادہ احترام کرتی ہوں ۔یہاں کیمرون منٹر کا حوالہ یہ بتلانے کے لئے دیا ہے کہ عالمی رائے عامہ ہمارے اہلِ صحافت کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے)۔لیکن آخرکار" آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا" اور اب حالت یہ ہے کہ ساری توپوں کا رُخ میڈیا کی طرف ہو گیا ہے اور کوئی مانے نہ مانے سچ تو یہ ہے کہ وہ لکھاری، دانشور اور اینکر پرسنز جن کا کہا اور لکھا قوم حرفِ آخر سمجھتی تھی آج اپنی وہ حیثیت کھوتے چلے جا رہے ہیں اور نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اور حرفِ آخر یہ کہ ان "معذرتوں" کی بوچھاڑ میں پتہ نہیں یہ قوم کب ہاتھ باندھ کر ان سبھوں سے معذرت کرتے ہوئے اپنی دُنیا آپ پیدا کرنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہو گی۔

دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا

مشفق و مہربان سپریم کورٹ نے ایک دفعہ پھر حکمرانوں کو دو ہفتے کی مہلت دے دی ہے۔ جسٹس سعید کھوسہ نے کہا ہے" حکومت اگر چاہے تو کوئی قابلِ قبول حل نکل سکتا ہے "۔لیکن اونچے ایوانوں کے باسیوں کے نزدیک قابلِ قبول حل صرف یہ ہے کہ این آر او عمل درآمد کیس کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھُلا دیا جائے جب کہ سپریم کورٹ ہنوز خط لکھنے کی تکرار کر رہی ہے۔وفاق اپنے موقف سے سرِ مو گریز کو تیار نہیں اور اعلیٰ عدلیہ اپنے جاری شُدہ فیصلوں سے آئینی و قانونی طور پر انحراف نہیں کر سکتی۔کہا جا سکتا ہے کہ کسی قابلِ قبول حل کا کہیں دور دور تک کوئی امکان نہیں۔اس سے قطع نظر کہ عدلیہ اور وفاق کے اس تصادم کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ ہم نے سوئس بینکوں میں پڑے ہوئے 5 ارب روپوں کے لئے تو ملکی سلامتی تک کو داؤ پہ لگا دیا ہے لیکن جاری اخراجات کے علاوہ سٹیٹ بینک سے گزشتہ چار سالوں میں حاصل کیئے گئے 13 ہزار ارب روپوں کا کچھ پتہ نہیں کہ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ایمنسٹی انٹر نیشنل نے چار سالوں میں 8500 ارب کی کرپشن کا ذکر کیا تو سارے حکومتی کُرگے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے لیکن اب "گھر کے بھیدی" چیئر مین نیب نے کرپشن کی جو نشاندہی کی ہے اس کے مطابق تو چار سالوں میں کرپشن دس ہزار ارب روپے سے بھی زیادہ بنتی ہے

۔جس کی حکومتی حلقوں کی جانب سے آج تک کوئی تردید بھی نہیں آئی ۔مانا کہ ساٹھ ملین ڈالر ایک خطیر رقم ہے جسے ہر حال میں واپس آنا چاہیے لیکن ایفی ڈرین کیس میں تو 750 ملین ڈالر کی کرپشن ہوئی اور ملزمان عبوری ضمانتیں کروا کر دندناتے پھر رہے ہیں ۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ اعلیٰ عدلیہ میں زیرِ التواء کرپشن کے دیگر بیشمار کیسز کی کھلتی رہے گی NRO , NRO طرح یہ کیس بھی فائلوں کی زینت بن جائے گا اور قوم اور ہمارے دانشور یہ دل خوش کُن خبر سناتے رہیں گے کہ معاشرہ تغیر پذیر ہے اور اک جہانِ نو کی آمد آمد ہے ۔معاشرہ کتنا تغیر پذیر ہے ، اس کی ایک جھلک تو ان مہربانوں نے ملتان کے موجودہ ضمنی انتخابات میں دیکھ ہی لی ہو گی ۔

پیپلز پارٹی کو "مردہ گھوڑا" سمجھنے والے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں براجمان بزرجمہروں کو بھی ادراک ہو گیا ہو گا کہ عوامی شعور کی بیداری کا ہرگز وہ عالم نہیں جس کا ڈھنڈورا وہ ہر وقت پیٹتے رہتے ہیں ۔ایسا ہرگز نہیں کہ عبد القادر گیلانی کی جیت کا سہرا "جیالوں" کے سر ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دائیں اور بائیں کی تفریق صرف شہروں تک محدود ہے اور دور دراز دیہاتوں میں بسنے والوں کے ہاں ایسا کوئی تصور نہ ہونے کے برابر ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دیہاتوں میں بسنے والے تقریباً تین چوتھائی اکثریت آج بھی وڈیروں ، جاگیر داروں اور چوہدریوں کے قبضہ قدرت میں ہے اور آٹے میں نمک

برادر باغیوں کو نشانِ عبرت بنا دیا جاتا ہے۔ شہر میں بسنے والا ایک "دیہاڑی دار" مزدور تو حقِ رائے دہی کا آزادانہ استعمال کر سکتا ہے لیکن ایک پنجابی کسان یا سندھی ہاری ہر گز نہیں۔ اس کے علاوہ ذات برادری کی لعنت بھی اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ انتخابی نتائج پر اثر انداز ہوتی ہے۔ 80 فیصد سے زائد دیہی آبادی پر مشتمل حلقہ 51 گیلانیوں اور بوسنوں کا روایتی حلقہ ہے جس میں کبھی گیلانی جیتتے ہیں تو کبھی بوسن۔ شوکت بوسن نے تقریباً اتنے ہی ووٹ لئے جتنے بوسنوں کو ہمیشہ ملتے آئے ہیں البتہ عبدالقادر گیلانی کو اپنے باپ سے تقریباً پندرہ ہزار ووٹ کم ملے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ نہ تو سابقہ وزیرِ اعظم کی "سیاسی شہادت" کسی کام آ سکی اور نہ ہی سرائیکی صوبے کے نعرے نے کوئی اثر دکھایا۔ کہا جا سکتا ہے کہ پندرہ ہزار ووٹ کی کمی گیلانی صاحب کی "خاندانی کرپشن" اور عدلیہ سے محاذ آرائی کا نتیجہ ہو سکتی ہے لیکن دیہاتوں میں بسنے والوں کو کرپشن یا عدلیہ محاذ آرائی سے کچھ لینا دینا نہیں انہیں تو بس حکم ملتا ہے جس کی بجا آوری ان کا فرضِ منصبی ٹھہرتا ہے۔ میری ناقص رائے میں پندرہ ہزار ووٹوں کی کمی ان 35 فیصد بوگس ووٹوں کا شاخسانہ ہے جو موجودہ ووٹر لسٹوں سے منہا کر دیئے گئے اور گیلانی اس سے مستفید نہ ہو سکے۔

یہ بجا کہ موجودہ چیف الیکشن کمشنر انتہائی دیانتدار ہیں لیکن پھر بھی

پاکستانی "بی بی جمہوریت" کے ہوتے ملک کا بھلا ہو سکتا ہے نہ قوم کا۔ تلخ ترین حقیقت تو یہی ہے کہ انتخابات میں حصہ لینا کسی عامی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ تو کروڑوں، اربوں میں کھیلنے والے وڈیروں، جاگیرداروں اور صنعت کاروں کا شغل ہے۔ یہ "ایلیٹ کلاس" بظاہر تو باہم دست و گریباں نظر آتی ہے لیکن در حقیقت اس کے نہ صرف مفادات، مشترک ہیں بلکہ یہ قریبی عزیز داری اور رشتے داریوں کے بندھن میں جکڑی ہوئی بھی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسٹیبلشمنٹ، بیوروکریسی پر انہی "گھُس بیٹھیوں" کا مکمل کنٹرول بھی ہے۔ اگر دو یا تین چوروں میں سے کسی ایک کا انتخاب ہی اس قوم کا مقدر ٹھہرا تو ایسے میں دیانت دار چیف الیکشن کمشنر کیا کر لیں گے؟۔جب یہ عالم ہو کہ اگر پیپلز پارٹی سے سوال کیا جائے کہ ان کے چمن میں تو کرپشن "کھمبیوں" کی طرح اگی ہوئی ہے تو تُرت جواب آتا ہے کہ نواز لیگ کے چشموں کا پانی بھی تو گدلا ہے۔ اگر عدلیہ سے بے جا محاذ آرائی کا ذکر کیا جائے تو فرمان جاری ہوتا ہے کہ نواز لیگ تو عدلیہ پر حملہ آور ہو گئی تھی ہم تو صرف حکم عدولی کر رہے ہیں۔ البتہ تحریکِ انصاف دھڑلے سے سبھی کو چور قرار دیتی ہے۔ وجہ صرف یہ کہ ان کے "کپتان" کی ذات پر ابھی تک کوئی ایسا بڑا الزام نہیں آیا لیکن اگر تحریکِ انصاف کے ماتھے کا جھومر بنی مختلف سیاسی جماعتوں سے نکلے یا نکالے گئے چوروں کی "منڈلی" کے بارے یں سوال کیا جائے تو جواب آتا ہے کہ اگر سربراہ دیانت دار ہو تو باقی سب خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ سوال مگر یہ ہے کہ مفاد پرستوں

کا یہ ٹولہ کیونکر ٹھیک ہو سکتا ہے جو آیا ہی اس سونامی کے پانی سے اپنے مفادات کی آبیاری کے لئے ہے ؟۔اگر انہیں اپنے مفادات عزیز نہ ہوتے تو یہ اس وقت تحریکِ انصاف میں شامل ہوتے جب عمران خاں کی نہ صرف یہ کہ پُکار سننے والا کوئی نہیں تھا بلکہ گلی گلی میں ان کا مذاق بھی اڑایا جاتا تھا۔ان کا مینارِ پاکستان پر ایک کامیاب شو کیا ہوا کہ ڈال ڈال گھومنے والے سبھی پنچھی تحریکِ انصاف کے ابھرتے پیڑ پہ آ بیٹھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر خاں صاحب کس برتے پر انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں ؟۔

یومِ آزادی مبارک ہو

چار عشروں سے زائد ہونے کو آئے ، میں نے یومِ آزادی پر کبھی کالم لکھا نہ آزادی کا جشن منایا۔وجوہات تو کئی ہیں لیکن سب سے.بڑی وجہ یہ کہ یہ وہ پاکستان ہی نہیں جو اقبال کا خواب اور قائدِ اعظم کی شبانہ روز کوششوں ، کاوشوں اور محنتوں کا ثمر تھا۔کون کہتا ہے کہ یہ پاکستان 14 اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آیا؟۔بھائی یہ تو دسمبر 1971ء کی ٹھنڈی دھوپ میں ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں اُس وقت قائم ہوا جب ہماری عظمتوں کے تمغے نوچ گئے۔ تقسیم کی یہ نئی لکیر تو جنرل نیازی اور جنرل اروڑہ نے پلٹن میدان میں مل کر کھینچی تھی۔کاش کہ جنرل نیازی اُس ذلت کی زندگی پر شہادت کی موت کو ترجیح دیتے۔

قائد نے پاکستان بنایا، ہم نے گنوا دیا۔تب سے اب تک مختلف حوالوں سے بہت سے دانش ور اور مورخ ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کو ملک کو دولخت کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتے چلے آ رہے ہیں۔آج وہ دونوں ہی ہم میں موجود نہیں لیکن طُرفہ تماشہ یہ ہے کہ اُدھر مجیب الرحمٰن کی باقیات کی حکومت ہے اور اِدھر بھٹو کی باقیات کی۔اگر واقعی یہ دونوں ملک کو دولخت کرنے کے ذمہ دار تھے تو پھر تو گویا عوام نے یہ ثابت کر دیا کہ بھٹو اور

مجیب کی تقسیم درست تھی اور خاکم بدہن قائد اور اقبال کی تقسیم غلط۔ اگر بھٹو اور مجیب کے پیروکار مفقود ہو جاتے، اگر نسلِ کُہن کو اس سانحے کا دُکھ اور نسلِ نَو کو ادراک ہوتا، اگر ہم سقوطِ ڈھاکہ پر نوحہ خواں ہوتے اور اگر ہم نے کچھ تھوڑا بہت ہی سبق حاصل کیا ہوتا تو میں بھی یہ دن بڑے شوق سے مناتی اور پُکار پُکار کے کہتی کہ

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

لیکن ہمیں تو احساس ہے نہ ادراک۔ یہی نہیں بلکہ ہم نے تو سقوطِ مشرقی پاکستان کو اپنی یادوں کی سلیٹ سے یوں مٹا دیا ہے جیسے کوئی دوسری جماعت کا بچہ غلط سوال کو مٹا کر ہمیشہ کے لئے بھُلا دیتا ہے۔ آج نوجوان نسل سے مشرقی پاکستان کے بارے میں سوال کرکے دیکھ لیجیئے۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ حیرت سے آپ کا مُنہ تکنے لگیں گے۔ اس کے باوجود بھی میلوں ٹھیلوں کی شوقین یہ قوم "ہم زندہ قوم ہیں، پائیندہ قوم ہیں" گاتی ہے تو گاتی پھرے۔ مجھے تو بہر حال ایسا کہتے اور سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔

یہ نسلِ نَو بھلا کب جانتی ہے کہ دس لاکھ سے زائد انسانی جانوں کی قُربانی اور لگ بھگ نوے لاکھ افراد کی ہجرت کا ثمر ہے یہ پاکستان۔ اُنہیں پتہ ہی

نہیں کہ کتنے کرب انگیز لمحات اور دلدوز صدمات کا سامنا کرنے کے بعد اُن کے اجداد نے اِس دھرتی پر قدم رکھا۔ تقسیم کے واقعات پر ایسی بیشمار کتابیں لکھی جاچکی ہیں جنہیں پڑھ کر پتھر بھی رو اُٹھتے ہیں لیکن ابھی بھی بیشمار قصّے لوگوں کے ذہنوں میں دفن ہیں ۔مجھے ایک قریبی عزیز نے بتایا کہ اُس کے والد تو تقسیم سے پہلے ہی یہاں آ چکے تھے لیکن باقی پورا خاندان ہندوستان ہی میں تھا۔وہ بتایا کرتے تھے کہ ہندوستان سے جب بھی کوئی کٹی پھٹی ٹرین لاہور پہنچتی تو وہ دیوانوں کی طرح زندہ انسانوں اور لاشوں کے درمیان اپنے پیاروں کو تلاش کرتے ، مشرقی پنجاب سے آنے والے لُٹے پُھٹے قافلوں کے ایک ایک فرد کو روک روک کر اپنے پیاروں کے حلیے بتاتے اور پھر مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر پلیٹ فارم کی کسی بنچ پر ڈھے جاتے ۔اُمید و بیم کی ایسی کئی کربناک راتوں کے بعد آخر کار وہ لوگ آن پہنچے لیکن اپنے ساتھ جور و ستم کی کئی کہی اور چہروں پہ لکھی ان کہی داستانوں کے ساتھ ۔کچھ ہندوستان میں ہی خاک کا رزق ہو گئے اور جو بچ رہے وہ مُردوں سے بد تر۔اُسی خاندان کی ایک بڑی بوڑھی بتایا کرتی تھیں کہ دورانِ سفر ایک رات اُن کے لئے قیامت کی رات تھی ۔اُس رات خاندان کے سارے مرد سر جوڑ کے یہ طے کرنے بیٹھے کہ تمام عورتوں کو قتل کر دیا جائے تا کہ اُن کی عصمتیں سکھوں کے ہاتھوں تار تار ہونے سے محفوظ رہیں ۔ مخالفت سب سے زیادہ ایک جوشیلے نوجوان نے کی اور جنونی حمایت انور نامی اُس کے کزن نے ۔انور کی نئی نئی

شادی ہوئی تھی اور اللہ تعالٰے نے دُلہن کو حسن کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا ۔شائد اسی بناپر وہ اِس وہم میں مُبتلا تھا کہ سکھ لازماً اُس کی بیوی کو چھین کر لے جائیں گے ۔اُس رات انور اور اُس کی دُلہن کچھ فاصلے پر آرام کے لئے لیٹ گئے ۔اگلی صبح ایک دلخراش منظر سب کا منتظر تھا۔دُلہن کی شہ رگ کٹی ہوئی تھی اور انور غائب۔اُس دن کے بعد کسی نے اُس کی شکل نہیں دیکھی لیکن دُلہن کے چہرے پر جمی دہشت کو دیکھ کر عورتوں کے قتل کا ارادہ تَرک کرکے یہ فیصلہ کیا گیا کہ آخری دَم تک سکھوں کا مقابلہ کیا جائے اور اگر کچھ بَن نہ پڑے تو مرنے سے پہلے عورتوں کو مار دیا جائے ۔

یہ تو ایک چھوٹا سا قصہ تھا لیکن تقسیم کی خونی تاریخ تو ایسی بیشمار داستانوں سے اٹی پڑی ہے ۔اگر کسی کو اِس خون آلود تاریخ کا احساس و ادراک ہوتا تو پھر دُکھ کاہے کا کہ "خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا" اور تحقیق کہ آزادی کا نخلِ نَو اپنے متوالوں کے خون سے ہی تن آور درخت بنتا ہے ۔تاریخ کا سبق بھی یہی ہے، انسانیت کی معراج بھی یہی اور آئینِ فطرت بھی یہی۔ لیکن دُکھ تو یہی ہے کہ ہم نے نہ 1947ء کے سانحات کو یاد رکھا اور نہ 1971ء کے کَرب انگیز لمحات کو ۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پوری قوم ہی مرضِ نسیاں میں مُبتلا ہو ۔البتہ یہ قوم میلوں ٹھیلوں میں جی بھر کے اُودھم مچانا نہ ہر گز نہیں بھولتی ۔اب بھی یومِ آزادی کا شور گلی گلی میں ہے

۔گزشتہ سالوں کی طرح یہ دِن بھی "ہاو ہو" میں گزر جائے گا اور رات "ون ویلنگ" میں۔اگلے دن پھر "وہی ہے چال بے ڈھنگی، جو پہلے تھی سو اب بھی ہے "۔ہم پھر کسی مارچ، 14 اگست یا 6 ستمبر کے انتظار میں بیٹھ رہیں گے۔یہ پینسٹھواں یومِ 23 آزادی ہے جو ہم آج منا رہے ہیں لیکن ان پینسٹھ سالوں میں شاید پینسٹھ گھنٹے بھی ایسے نہیں گزرے ہونگے جب ہم نے اپنے گریبانوں میں جھانک کے اپنا محاسبہ کرتے ہوئے یہ سوچا ہو کہ ہم نے کیا کھویا، کیا پایا۔شاید ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا ہو گا کہ آزادی حاصل کرنا بہت مشکل ہے لیکن اُس آزادی کی حفاظت کرنا مشکل تر۔میں سمجھتی ہوں کہ بد نصیب ہے یہ قوم جسے قائدِ اعظم کے بعد کوئی ایک بھی ایسا رہنما نہیں ملا جو اسے درسِ بیداری دیتے ہوئے یہ پیغام دیتا کہ

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

انتخابی سروے اور سیاسی خوش گمانیاں

آجکل عوامی رجحانات پر مبنی جائزہ رپورٹس کا بہت چرچا ہے۔کچھ عرصہ پہلے تک اکابرینِ تحریکِ انصاف IRI کے سروے کو بنیاد بنا کر آشاؤں کے دیپ جلاتے اور تمناؤں کے محل تعمیر کرتے نظر آتے تھے۔اب نواز لیگ کو محترم اعجاز شفیع گیلانی کے گیلپ سروے میں اپنی تشنہ تکمیل آرزوئیں حقیقت کا روپ دھارتی نظر آنے لگی ہیں۔دونوں جماعتیں ان سروے رپورٹس کو لے کر بغلیں بجارہی ہیں لیکن ان سروے رپورٹس سے ہٹ کر کچھ زمینی حقائق بھی ہیں۔اگراِن حقائق کو تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو پیپلز پارٹی آج بھی ملک کی مضبوط ترین سیاسی جماعت ہے جس نے زیادہ تر ضمنی انتخابات میں شاندار کرکردگی دکھائی۔یہ کہہ دینا محض حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے کہ ضمنی انتخابات میں عوامی رجحانات عام انتخابات سے مختلف ہوتے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ ضمنی انتخابات آنے والے منظرنامے کی تھوڑی بہت جھلک ضرور دکھا جاتے ہیں۔

ہمارے "سیاسی افلاطون" خوب جانتے ہیں کہ پختہ عوامی شعور اور خواندگی کی بُلند ترین سطح کی بنا پر یہ جائزے ترقی یافتہ ممالک میں تو بڑی حد تک درست ثابت ہو سکتے ہیں لیکن پاکستان جیسے ملک میں ہر گز نہیں جہاں عوامی شعور

مفقود اور خواندگی کی شرح پست ترین ہے۔ ہمارے ہاں تو "طبقہ اشرافیہ" ہی نہیں، شہروں میں بسنے والے پڑھے لکھے عوام کی غالب اکثریت بھی "رائے دہی" کو محض کورِ بیکار سمجھتی ہے۔ دیہاتوں میں (جہاں تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے) ووٹ ڈالنے والا غریب طبقہ جاگیرداروں، وڈیروں، نوابوں، گدی نشینوں اور چوہدریوں کے زیرِ اثر محض احکامات کی بجا آوری کرتا ہے۔ جس ملک کے ساٹھ فیصد سے زائد عوام حق رائے دہی کے استعمال کے لئے گھروں سے باہر نکلنا بھی پسند نہ کریں، وہاں ایسے سروے اور جائزے بعید از قیاس اور "دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے" کے مصداق ہی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

ایسے عوامی جائزوں کی افیون کھا کر بے سُدھ ہو جانے والوں کے ہاتھ الیکشن کے ہنگام سوائے ہزیمت کے کچھ نہیں آنے کا اور نہ ہی پیپلز پارٹی کی طاقت کا غلط تخمینہ لگانے والے گوہرِ مقصود پا سکیں گے۔ محترم عمران خاں کو کاسہ لیسوں نے یہ یقین دلا دیا ہے کہ پیپلز پارٹی کا خاتمہ ہو چکا، صرف نواز لیگ باقی ہے۔ خاں صاحب کے قریبی صلاح کار سینئر لکھاری یہ کہتے رہتے ہیں کہ مقابلہ تحریکِ انصاف اور نواز لیگ کے درمیان ہے لیکن مجھے تو انتخابی اُفق پر اب بھی پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ہی چھائی نظر آتی ہیں۔ تسلیم کہ مینارِ پاکستان کے کامیاب جلسے کے بعد خاں صاحب سیاسی اکھاڑے کے تن و مند پہلوان بن کے اُبھرے لیکن اُنہوں نے بھی وہی غلطی کر ڈالی جو جینئس بھٹو نے کی تھی۔

1970ء کے الیکشن میں بھٹو مرحوم نے بڑے بڑے سیاسی گھرانوں کو اپنے ساتھ ملانا چاہا لیکن سبھی نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ لیکن اُن کے انقلابی نعرے کو عوام نے اتنی پذیرائی بخشی کہ "عامیوں" نے بڑے بڑے سیاسی بُرج اُلٹ دیئے۔ اس ذلت آمیز ہزیمت کے بعد وڈیروں اور جاگیرداروں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ دھڑا دھڑ پیپلز پارٹی میں شامل ہونے لگے۔ دوسری طرف وڈیرے ذوالفقار علی بھٹو نے بھی "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" کے مصداق اُنہیں خوش آمدید ہی نہیں کہا بلکہ عامیوں سے دامن بھی چھُڑاتے چلے گئے۔ 77ء کے انتخابات میں اُنہوں نے اشرافیہ کی غالب اکثریت کو پارٹی ٹکٹ سے نوازہ جس کا خمیازہ اُنہوں نے یوں بھگتا کہ ضیاء الحق کے حکومت پر قابض ہوتے ہی وڈیرے تتر بتر ہو گئے اور خود سوزیاں کرنے، کوڑے کھانے اور جیلیں بھگتنے کے لئے جیالے باقی رہ گئے۔ عمران خاں صاحب کو سیاسی اُفق پر یوں اُبھرتا دیکھ کر سیاسی گھرانے 1970ء کی غلطی نہیں دُہرانا چاہتے تھے اس لئے وہ دھڑا دھڑ تحریکِ انصاف میں شامل ہونے لگے اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ "اصلی تحریکیوں" کی جگہ "سونامیوں" نے لے لی ہے اور اب تو سونامی کو مہمیز دینے کے لئے "فرزندِ راولپنڈی" محترم شیخ رشید احمد بھی با دلِ نخواستہ تشریف لا چُکے ہیں۔ شُنید ہے کہ وہ ضدی" میاں برادران کو بار بار یہ پیغام بھیجتے رہے"

مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

بڑے میاں صاحب تو شیخ صاحب کے شَر سے محفوظ ہونے کے لئے عمرے کے لئے سُدھارے اور چھوٹے میاں صاحب نے پہلے کونسی کسی کی بات مانی ہے جو اب مانتے ۔ باقی بچے نذیر ناجی کے "سونامی خاں" جنھوں نے اپنے دِل کے بہت قریب سینئر لکھاری کے چیخنے چِلانے کے باوجود کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے شیخ صاحب کے 13 اگست کو سجائے گئے "التحریر چوک" (لیاقت باغ) میں جانا قبول فرما لیا۔ شیخ صاحب کے دشمن اور حاسد کہتے ہیں کہ لیاقت باغ کے جلسے میں اُتنے ہی لوگ تھے جتنے عام دنوں میں سیر کے شوقین آتے ہیں ۔ میں حاسدوں کی بات کا کبھی یقین نہ کرتی لیکن بُرا ہو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا جس نے حاسدوں کے کہے کی تصدیق کر دی ۔ لگتا ہے کہ میڈیا بھی شیخ صاحب کی مقبولیت کو دیکھ کر جَل بُھن کے کباب ہو گیا ہے ۔

اب ایک ایک سیٹ پر کئی کئی سونامی باہم دست و گریباں ہیں اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جونہی "ٹکٹ ہولڈرز" کا اعلان ہوا ، تحریکِ انصاف کو واقعی ہجرت کرنے والوں کے "سونامی" کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ اگر خاں صاحب ان "فصلی بٹیروں" کو گلے نہ لگاتے تو وہ یقیناً پیپلز پارٹی اور نواز لیگ کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہوتے لیکن خاں صاحب کو فکرِ فردا میں مگن کئی ایسی جونکیں چمٹ چکی ہیں جو اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھتی ہیں ۔ اُن کے ارسطوانہ

تجزیوں کے مطابق بد دل جیالے تحریکِ انصاف کو ووٹ دیں گے لیکن تاریخ تو یہی بتلاتی ہے کہ ناراض جیالا گھر تو بیٹھ رہتا ہے لیکن کسی دوسری جماعت کو کبھی ووٹ نہیں دیتا۔ میرے نزدیک "جیالوں کی حمایت" جیسے احمقانہ خیال اور ایک بال سے دو وکٹیں گرانے جیسے مجنونانہ منصوبوں کو ذہن سے کھُرچ دینے میں ہی عافیت ہے اور اگر پیپلز پارٹی کا مقابلہ کرنا ہے تو پچیس سے تیس فیصد تک ووٹ حاصل کرنے والی اس جماعت کا بہ اندازِ حکیمانہ مقابلہ کرنا ہوگا محض جذباتی نعروں یا سروے رپورٹوں کے بَل پر نہیں۔ یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ بی بی شہید کے دونوں ادوار میں پیپلز پارٹی کی "کولیشن گورنمنٹ" کبھی بھی اتنی مضبوط نہیں رہی جتنی جوڑ توڑ کے ماہر محترم آصف زرداری کی ہے۔ ق لیگ اور اے این پی اُس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہیں اور سندھ سے تعلق رکھنے والی ایم کیو ایم کو بھی سوائے پیپلز پارٹی کے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ اندریں حالات پیپلز پارٹی کو "مُردہ گھوڑا" سمجھ لینا احمقوں کی جنت میں بسنے کے مترادف ہے۔

عید اور مذہبی جوش وجذبہ

پروفیسر مظہر

رحمتوں اور برکتوں کا مینہ برساتا، بخشش کے ساماں کرتا ماہِ صیام رُخصت ہوا۔ یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے کہ اس ابرِ رحمت نے غلاموں کے دامانِ عصیاں کو یوں دھو ڈالا کہ جیسے انہوں نے کبھی گناہ کیا ہی نہ ہو لیکن بقّال اس ابرِ کرم سے بقدرِ قطرہ شبنم بھی نہ پا سکے ۔مایوس پھر بھی کوئی نہ گیا۔کچھ دائمی زندگی کی تگ و دو میں گوہرِ مُراد پا گئے ، اور کچھ دولتِ دُنیا سے نہال ہو گئے ۔اُنہیں حیاتِ جاوِداں کا خُمار ،اِنہیں تنعّمِ زیست سے پیار ۔اِک لکیر مگر کھنچ گئی ، تفریق عیاں ہو گئی ۔ایک طرف گدایانِ خُدا ، دوسری طرف سگانِ دُنیا۔ مصحفِ مجید نے آواز دی "جو لوگ بس اسی دُنیا کی زندگی اور اس کی خوش نمائیوں کے طالب ہوتے ہیں اُن کی کارگزاری کا سارا پھل ہم اُن کو یہیں دے دیتے ہیں ۔(ہود)

یادوں کے بند کواڑ کھولتی شُکرانے کی عید آئی ۔گزری رُتوں اور بھیگے موسموں کی ساری شبنمی عیدیں یادوں کا چمن مہکانے لگیں ۔بچپن ، لڑکپن اور پھر جوانی کی ساری عیدوں کا ایک ایک نقش اُبھرتا چلا گیا لیکن پھر طہارت ، پاکیزگی

اور اُجلے پن اِس سمندر میں تیرتی ساری عیدیں گزرے کَل کی عید کے ہاؤ ہو کے شور سے گھبرا کر گم ہوتی چلی گئیں اور میں اُداسیوں کے جلو میں سوچتا رہ گیا کہ

دِل تو میرا اُداس ہے ناصر

شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

میں تو اِس عید کو گیاری اور سلالہ کے شہیدوں اور لو لو سر کے مظلوموں کے نام کرنا چاہتا تھا لیکن رنگ میں بھنگ ڈالنے کا خوف دامن گیر ہوا۔ گئے دنوں میں جب سُرخی مائل آندھی اُٹھا کرتی تو بزرگ کہتے کہ کہیں کوئی مظلوم قتل ہوا ہے۔ لیکن اب تو روشنیوں کے شہر میں ہر روز مظلوموں کے لاشے گرتے ہیں، کوئٹہ کی سریاب روڈ مقتل گاہ میں ڈھل چکی اور پتہ نہیں کتنے مظلوم بچے، بوڑھے اور عورتیں ڈرون نامی دیو استبداد نے نگل لیے لیکن لال آندھی تو کُجا اب تو تیز ہوا کا جھونکا بھی نہیں آتا۔ وجہ شاید یہ کہ ہم نے اُس سے رُخ پھیر لیا جس کا فرمان ہے " جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لئے اُن کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی ہی کا ہوتا ہے (العنکبوت)۔

میڈیا کہتا ہے کہ "ملک بھر میں عید پورے مذہبی عقیدت و احترام اور جوش و

جذبے سے منائی جارہی ہے ۔کیا مذہبی جوش و جذبہ اسی کا نام ہے کہ نیوز چینلوں پر بھانڈ" قبضہ جما کر پھکڑپن ، ہزل گوئی ، جُگت بازی اور ذو معنی جملوں کی انتہا کر" دیں ؟۔کیا مزاحیہ شاعری کی آڑ میں فحاشی پھیلانا دینی اقدار کا تماشا بنانے کے مترادف نہیں ؟۔لیکن چینل مالکان کو تو "ریٹنگ" چاہیے اور اسی ریٹنگ کے شوق میں ایک نیوز چینل نے باقاعدہ مُجرے کا اہتمام کر ڈالا۔ایک ناچنے والی کسی فلمی گانے کی دھُن پر رقص کرتی اور سٹیج پر بیٹھے مردوں کو کھینچ کھینچ کر اپنے ساتھ لپٹا کر ٹھمکے لگاتی نظر آئی ۔کیا مذہبی عقیدت و احترام اسی کا نام ہے ؟۔

کہا جاتا ہے کہ نیوز چینلز کی بدولت عوام میں سیاسی شعور بیدار ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی الیکٹرانک میڈیا کی بدولت احترامِ آدمیت مفقود ہوتا جارہا ہے ، زبانیں دراز ہو رہی ہیں اور پگڑیاں اُچھالی جارہی ہیں ۔ایک زمانہ تھا کہ کسی پر تنقید بھی سات پانیوں سے دھو اور سات پردوں میں چھُپا کر کی جاتی تھی لیکن آج سرِ عام گالی بھی دی جاتی ہے اور گولی کی دھمکی بھی ۔اینکرز اپنی ریٹنگ بڑھانے کے شوق میں مخصوص جھگڑالو اور بدزبان مہمانوں کو دعوت دیتے ہیں ۔آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ جب کوئی دوسرا بات کر رہا ہو تو غور سے سنو اور بیچ میں مت ٹوکو۔ لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ اینکرز سمیت سبھی بیک وقت یوں بولتے ہیں کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی ۔

قصور شاید

اینکرز کا بھی نہیں کہ اِن کا پالا "بھانڈوں والے" پروگراموں سے آن پڑا ہے جن کی ریٹنگ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ اب تو یہ زہر ہمارے دانشوروں اور لکھاریوں کی زبانوں اور تحریروں میں بھی گھُلتا جا رہا ہے۔اُن کی اکثریت اپنے کالموں اور ٹاک شوز میں ایسی زبان استعمال کر جاتی ہے جس کا کچھ عرصہ پہلے تک تصوّر بھی ممکن نہ تھا ۔کچھ لوگ تو اخلاقیات کی ساری حدیں پار کر جاتے ہیں۔

اپنی بد گوئی ، بد لحاظی، بدمزاجی ، بد دماغی ، بد تمیزی اور بد کلامی میں دب مست و بد نام اپنے آپ کو ارسطو، افلاطون اور بزرجمہر کا بھی باپ سمجھنے اور اپنی تحریروں کو ، "صحیفہ آسمانی" کا درجہ دینے والے انتہائی نرگسیت کے شکار ایک معروف لکھاری" فرماتے ہیں "بے حس ، بے علم اور بے غیرت ہیں وہ لوگ جو زرداری کو طعنہ دیتے ہیں کہ "قاتل لیگ" کو گلے لگا لیا"۔ موصوف ٹاک شوز میں بھی ایسی ہی بدزُبانی کی بنا پر اکثر گالیاں کھاتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی بدمزہ نہیں ہوتے۔ وہ فنکار ایسے ہیں کہ قاف لیگ اور ایم کیو ایم کے گرد گھومتے گھومتے آج کل وہ عمران خاں پر بھی مہربان ہو چلے ہیں۔ محترم آصف زرداری کے اندازِ سیاست کے "صدقے واری" جانے کی وجہ صرف یہ کہ اُن کے ممدوحین کی جماعت ق لیگ ، پیپلزپارٹی کی اتحادی ہے۔زرداری صاحب کے جس اندازِ سیاست کے وہ مدح سرا ہیں ، ایسی سیاست تو کوئی انگوٹھا چھاپ

بھی کر سکتا ہے۔اپنی حکومت کا ابتدائی سال ڈیڑھ سال اُنھوں نے جھوٹ اور فریب کا سہارا لے کر گزارا اور آخری تین سال اتحادیوں کی منت سماجت کرتے اور اُن کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے۔ق لیگ، ایم کیو ایم اور اے این پی کو جب بھی اپنے مطالبات منوانے ہوتے ہیں، وہ علیحدگی کی ایک دھمکی دیتے ہیں اور جنابِ زرداری اور حواری چاروں شانے چت۔فوج کی جانب سے کوئی بھولی بھٹکی افواہ کانوں میں پڑتی ہے تو ملازمتوں میں توسیع کا خراج پیش کر دیا جاتا ہے۔جیسے ہندوستان کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو اپنا وظیفہ بڑھانے کے لئے حکومتِ برطانیہ کو درخواست بھیجنی پڑتی تھی ویسے ہی زرداری صاحب حکومت بچانے کے لئے اپنے اتحادیوں سے بھیک مانگنی پڑتی ہے ۔مولانا فضل الرحمن نے اِس مجبوری سے خوب فائدہ اُٹھایا لیکن جب سے ق لیگ اتحادی بنی ہے مولانا صاحب کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اُدھر اقتدار پر مُر مٹنے والے چوہدری صاحبان (قاتل لیگ) نے بھی چوہدری ظہور الٰہیؒ کے خون کا سودا کرکے اقتدار کے حمام میں چھلانگ لگانے میں ایک لحظے کی دیر نہیں کی ۔محترم لکھاری اگر کبھی فُرصت میں چوہدری صاحبان کے "لُٹو تے پھُٹو" پارٹی کے بارے میں سابقہ ارشادات پر غور فرمائیں تو

اُنہیں یقیناً اندازہ ہو جائے گا کہ بے غیرت وہ نہیں جو "قاتل لیگ" کو گلے لگانے کا طعنہ دیتے ہیں بلکہ وہ ہیں جنھوں نے ایسا کیا اور جنھوں نے اِس اقدام کو مستحسن جانا۔ محترم لکھاری کے نزدیک تو سیاست میں سب چلتا ہے لیکن ہم جیسے بے علم تو سیاست کو عبادت سمجھتے ہیں جس میں منافقت کی کوئی گنجائش نہیں۔

الیکٹرانک میڈیا کی شر پسندی

ہمیں تو پہلے ہی پتہ تھا کہ اپنے راجہ جی گوجر خانوی بہت سادہ اور معصوم ہیں لیکن ہم ٹھہرے نو وارد و نو آموز، ہماری بھلا کون سُنتا ہے لیکن اللہ بھلا کرے راجہ صاحب کا جنھوں نے سپریم کورٹ میں معصومانہ بیان دے کر ہماری باتوں کی تصدیق کر دی اور سامعین و ناظرین کے علاوہ پانچ رُکنی بنچ کے بھی دل موہ لئے اور بنچ نے بھولے بھالے راجہ جی کی مدتِ ملازمت میں بائیس روزہ توسیع کا اعلان کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ خلیل جبران کے فلسفے سے متاثر بنچ کے سربراہ جسٹس آصف سعید کھوسہ اُنہیں تسلیاں دیتے نظر آئے۔ حاسد کہتے ہیں کہ یہ محض طفل تسلیاں ہیں اور عیدِ قُربان سے پہلے راجہ جی کی قُربانی "ہووے ای ہووے" لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہماری مہربان عدلیہ اتنے سادہ و معصوم وزیرِ اعظم، جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ NRO کس بلا کا نام ہے کو وقفِ مصیبت کرنے سے گریز ہی کرے گی۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ اُنہیں جمعہ جمعہ "ساٹھ" دِن ہوئے وزیرِ اعظم بنے اِس لئے اُنہیں NRO کو سمجھنے کا وقت ہی نہیں مِلا اِس لئے اُنہیں چار چھ ہفتوں کی مہلت دی جائے تاکہ اپنے اِتحادیوں سے مشورہ کر سکیں۔ یہ سُن کر کسی ستم ظریف نے آواز لگائی "اتحادیاں نوں پُچھن دی کی لوڑ اے، گوجر خاں دے کسی ریڑھی والے نوں پُچھ لا اوہ وی دُس دیوے گا"۔ لیکن بنچ کو اُن کا بھول پن اور

معصومانہ ادا بھا گئی اور راجہ جی کو مہلت مِل گئی۔

محترم اعتزاز احسن فرما رہے ہیں کہ موجودہ حالات میں صرف راجہ جی ہی نہیں بلکہ انتخابات سے پہلے پانچ چھ مزید وزرائے اعظم کی قُربانی بھی نا گزیر ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ اعتزاز صاحب محض دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں کیونکہ اُن کے وزیرِ اعظم کو مہلت نہیں ملی اور راجہ صاحب کو عدلیہ تاریخ پہ تاریخ دیتی چلی جا رہی ہے البتہ یہ بات ضرور پریشان کُن ہے کہ "اندر کی بات" جاننے والے اعتزاز صاحب کے مطابق الیکشن سے پہلے مزید پانچ چھ قُربانیاں ہوں گی۔اگر عدلیہ فی وزیرِ اعظم قُربانی کا دورانیہ تین ماہ بھی رکھے تو پھر بھی الیکشن میں ابھی اٹھارہ ماہ ہونے چاہییں۔جب کہ حکومت کے پاس بس چھ ماہ باقی ہیں۔کہیں ایسا تو نہیں کہ تحریکِ انصاف والے صحیح پیٹ رہے ہوں کہ ن لیگ اور پیپلز پارٹی کی ملی بھگت سے انتخابات ایک سال لیٹ کروانے کا منصوبہ بنایا جا چُکا ہے۔اگر میاں شہباز شریف کے بیشمار ترقیاتی منصوبوں کو دیکھا جائے تو وہ تو چھ ماہ کجا،اٹھارہ ماہ میں بھی مکمل ہوتے نظر نہیں آتے اور میاں صاحب ہر گز گوارہ نہیں کریں گے کہ اُن کی محنتوں کا ثمر کوئی اور سمیٹ لے۔پہلے ہی اُنہیں بہت غصّہ ہے کہ عمران خاں صاحب نے شوکت خانم سے میاں نواز شریف کے نام کی تختی اُکھاڑ پھینکی ہے۔وہ اب پکّا بندوبست کرنے کے موڈ میں ہیں اِس لئے مشتری ہشیار باش۔

اُدھر راجہ صاحب اپنی معصومیت کے جھنڈے گاڑ رہے ہیں اور اِدھر جنابِ آصف زرداری نے فیصل رضا عابدی نامی ایک مخبوط الحواس شخص کو اعلیٰ عدلیہ، خصوصاً جنابِ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو بدنام کرنے کا ٹھیکہ دے دیا ہے جس میں ہمارے الیکٹرانک میڈیا کا بھرپور تعاون بھی شامل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کھمبیوں کی طرح اُگے ہوئے شُتر بے مہار بیشمار نیوز چینلز نے ابھی تک تو ملک و قوم کا کوئی بھلا نہیں کیا۔ پوری دُنیا میں میڈیا کی آزادی کا مطلب عوامی شعور کی بیداری ہوتا ہے اور تحقیق کہ میڈیا درسِ بیداری میں ایک منجھے ہوئے اُستاد کا رول ادا کرتا ہے لیکن ہمارا یہ مشرقی میڈیا" ساری صحافتی حدیں پار کرتا جا رہا ہے۔ چند ایک کو چھوڑ کر ہمارے بیشتر" اینکرز جان بوجھ کر (یا شاید مالکان کے دباؤ پر) ایسے لوگوں کو اپنے ٹاک شوز میں دعوت دیتے ہیں جنھیں ملک و قوم کی بجائے صرف اپنے ممدوح کے مفادات سے پیار ہوتا ہے۔ محترم آصف علی زرداری کی پٹاری میں ایسے کئی سانپ اور سنپولیے موجود ہیں جنھیں وہ وقتاً فوقتاً استعمال میں لاتے رہتے ہیں۔ اُنکی فنکاری یہی ہے کہ وہ خود پسِ پردہ رہ کر ایسے لوگوں کے ذریعے سے اپنے مخالفین کے خلاف زہر اُگلتے رہتے ہیں۔ فیصل رضا عابدی اُنہی میں سے ایک ہے۔ جس طرح سے وہ عدلیہ کی تضحیک کرتا ہے وہ کسی بھی غیرت مند پاکستانی کے لئے نا قابلِ برداشت ہے۔ لیکن ہمارے نیوز چینل اُسے اپنے ٹاک شوز میں بُلا کر

عدلیہ کی تضحیک کرواتے اور لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔اگر الیکٹرانک میڈیا کو اتنا ہی شوق ہے تو وہ پاگل خانے سے دو، دو چار، چار پاگل اپنے نیوز چینلز پر مستقل بٹھا لیں اور پھر سارا دن اُن کے ساتھ بحث کر کے لطف اندوز ہوتے رہیں۔مجھے یقین ہے کہ پاگل خانے کے پاگل فیصل رضا عابدی سے کہیں زیادہ اُن کی ریٹنگ میں اضافے کا باعث بن سکتے ہیں اور مالکان کو اشتہارات بھی خوب ملیں گے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب خود پیپلز پارٹی فیصل رضا عابدی سے لا تعلقی کا اظہار کرتی ہے تو پھر نیوز چینلز اُسے پیپلز پارٹی کے نمائیندے کے طور پر کیوں بُلاتے ہیں ؟۔کیا وہ خود بھی عدلیہ کی تضحیک میں فریق بننا چاہتے ہیں ؟۔جو کچھ وہ مخبوط الحواس شخص کہہ چُکا ہے اور متواتر کہہ رہا ہے اُس پر تو بیک وقت توہینِ عدالت کے کئی کیس بنتے ہیں لیکن آفرین ہے اعلیٰ عدلیہ پر جس نے ابھی تک صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سبھی جانتے ہیں کہ جنابِ آصف زرداری اور حواری ایسے حربوں سے عدلیہ کو بدنام کر کے اپنے مکروہ عزائم کو پورا کرنا چاہتے ہیں ۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا نیوز چینلز فیصل رضا عابدی جیسے لوگوں کے ذریعے جنابِ آصف زرداری کے ہاتھ مضبوط نہیں کر رہے ؟۔کیا وہ عدلیہ کی بدنامی کی مہم میں اپنا بھرپور حصّہ نہیں ڈال رہے ؟۔اور ایسا کر کے کیا وہ ملک و قوم کا بھلا کر رہے ہیں ؟۔اگر ہمارا الیکٹرانک میڈیا اتنا

ہی طاقت ور ہے تو ایم کیو ایم کے قائد محترم الطاف حسین کے خلاف ایسے ہی دو چار ٹاک
شوز کر کے دکھائیں ۔اُن کے خلاف بھی زہر اُگلنے والے بہت سے مِل جائیں گے لیکن
وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ایسا کرنے کی کسی بڑے سے بڑے چینل کی بھی ہمت نہیں
کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ ایم کیو ایم کبھی اُدھار
نہیں رکھا کرتی ۔یہ نیوز چینلز عابدی جیسے لوگوں کو بُلا کر محض اِس لئے "چسکے" لے
رہے ہیں کہ اُن کے خیال میں عدلیہ کے پاس ایسی کوئی توپ نہیں جس کے دہانے
پر باندھ کر ایسے پروگرام کر کے اپنی ریٹنگ بڑھانے والے اینکرز کو اُڑایا جا سکے۔ لیکن
شاید اُنہیں ادراک ہی نہیں کہ ملکی سلامتی کا عدل کے بغیر تصور بھی ممکن نہیں ۔

تحریکِ انصاف کی سیاست

پروفیسر مظہر

شیکسپیئر نے کہا "کچھ لوگ پیدائشی عظیم ہوتے ہیں، کچھ جد و جہد کرکے عظیم بنتے ہیں اور کچھ پر عظمت مسلّط کر دی جاتی ہے"۔ محترم عمران خاں کا شمار ایسے لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جن پر منٹو پارک کے کامیاب جلسے کے بعد عظمت مسلّط کر دی گئی۔اِس عظمت کے پیچھے اوّلین ہاتھ ایسے لکھاریوں کا تھا جنھوں نے اُنہیں محمود غزنوی، محمد غوری، صلاح الدین ایوبی، قائدِ اعظم ثانی اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ بنا کر وزارتِ عظمیٰ کا تاج اُن کے سر پر سجایا اور خود اُن کی کابینہ کے انتخاب میں مصروف ہو گئے۔بعد ازاں یہ فریضہ وہ پنکھ پکھیرو سرانجام دینے لگے جو موسموں کی ادا دیکھ کر ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔سیاسی بساط کے یہ شاطر اب تحریکِ انصاف کا اثاثہ ٹھہرے اور دوائے دل بیچنے والے خلوص کے بندے وقت کی نامہرباں دھول میں گم ہو گئے البتہ "کپتان" پر بِلا شرکتِ غیرے حق جتانے والے ایک سینئر لکھاری اپنا گورنر ہاؤس میں "فقیرانہ ٹھکانے" کا دیرینہ خواب بکھرتے دیکھ کر اب تلملاہٹ کا شکار ہیں۔وہ خاں صاحب کی "فرزندِ راولپنڈی" کے "التحریر" جلسے میں شرکت پر بہت سیخ پا نظر آئے۔سوال مگر یہ ہے کہ مشرف کے ڈھیروں ڈھیر کاسہ لیسوں کو

گلے لگاتے ہوئے تو اُن کی باچھیں کھِلی جا رہی تھیں اب اُس کے سب سے قریبی ساتھی پر اعتراض کیوں؟۔ اگر وجہ صرف یہ ہے کہ ماضی قریب میں شیخ صاحب نے خاں صاحب کی اہانت کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا تو ہماری سیاست میں یہ کوئی جُرم نہیں۔

ویسے موصوف کو یاد ہی ہو گا کہ جب تحریک میں شامل ہونے والوں کا سونامی آیا ہوا تھا تبھی کُچھ لوگوں کے اعتراض پر کپتان نے فرمایا تھا کہ آسمان کے فرشتے کہاں سے لاؤں، انہی پر گزارہ کرنا ہو گا۔ تب تو مدح سراؤں میں سے کوئی ایک بھی کپتان کو کنفیوشس کا یہ قول سُنانے والا نہیں تھا کہ "مچھلی دانے کو دیکھتی ہے دام کو نہیں اور نادان نفع کو دیکھتا ہے نقصان کو نہیں"۔

تحریکِ انصاف کے میسجز کے مطابق اُن کے رجسٹرڈ ممبران کی تعداد ایک ملین سے تجاوز کر چکی ہے۔ لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس ایک ملین میں سے تحریک کے ووٹر کتنے ہیں؟۔ بہت سے ایسے لوگوں کو تو میں بھی جانتا ہوں جو تحریک کے "موبائلی رجسٹرڈ ممبر" بھی ہیں اور شدید مخالف بھی۔ تحریکِ انصاف جس موبائلی ممبر شپ پر بھروسہ کیے بیٹھی ہے وہ پاکستان کی حد تک تو ہر گز لائقِ اعتبار نہیں کیونکہ یہ وہ خطۂ ارض ہے جہاں ستّر فیصد سے زائد آبادی کو نورِ علم کی کرنیں چھو کر بھی نہیں گزریں۔ یہ میسج لکھنا جانتے ہیں نہ پڑھنا اور یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے ذوق و شوق سے ووٹ دیتے ہیں کیونکہ

خارزارِ زیست کے انہی "انتخابی ایام" میں ہی اُنہیں اپنے "ہونے" کا احساس ہوتا ہے جس سے وہ جی بھر کے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔اب یہ تحریک کے بزرجمہر ہی بتا سکتے ہیں کہ اِن ستّر فیصد اصلی ووٹروں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے وہ کیا حکمت عملی اختیار کریں گے۔

اب تحریکِ انصاف کے چند رہنماؤں نے اپنے اثاثے بھی ظاہر کر دیئے ہیں اور اصلاحاتی ایجنڈا بھی۔سوال مگر یہ ہے کہ اِن اثاثوں کی جو مالیت ظاہر کی گئی ہے، کیا یہ اصحاب اُس سے دس گنا قیمت پر بھی وہ اثاثے فروخت کرنے کو تیار ہیں؟۔کیا خاں صاحب کی زرعی زمین کی مالیت واقعی وہی ہے جو ظاہر کی گئی۔اور سب سے اہم یہ کہ ظاہر کیے گئے اِن اثاثوں کے ذرائع کیا ہیں؟۔اور محترم "باغی" سو ملین سے زائد اثاثوں کے مالک کیسے بن گئے؟۔اِن جیسے بہت سے سوالوں کا جلد یا بدیر اکابرینِ تحریکِ انصاف کو جواب دینا ہو گا اور تحقیق کہ یہ اُن کے لئے بہت مشکل مرحلہ ہو گا۔رہا اصلاحاتی ایجنڈا تو اِس میں کون سا انقلابی پروگرام مضمر ہے؟۔یہ تو ہر سیاسی جماعت کا ایجنڈا بلکہ ہتھکنڈا تھا، ہے اور رہے گا لیکن اِس پر پہلے کبھی عمل درآمد ہوا اور نہ اب ہونے کی توقع ۔جن مگر مچھوں پر ہاتھ ڈالنے کی بات کی جا رہی ہے اُن کے بارے میں تو موجودہ وزیرِ خزانہ عبدالحفیظ شیخ کئی بار اپنی بے بسی کا اظہار کر چُکے ہیں۔اور اب تو ماشا اللہ اِن مگر مچھوں کی ایک قابلِ ذکر

تعداد تو تحریکِ انصاف کا اثاثہ ہے ۔کالے دھن کی سفید کرنے کی کوششیں پہلے کبھی بارآور ہوئیں نہ اب ہو نگی۔ موجودہ حالات میں فوجی بجٹ کم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور تحریکِ انصاف نے اخراجات میں کمی کا کوئی ایسا قابلِ عمل فارمولا بھی نہیں دیا جو کرپشن اور اللّے تللّوں کے آگے بند باندھ سکے۔یکساں نظامِ تعلیم کا سُن سُن کر کان پَک چُکے ہیں۔رہی طبّی اور تعلیمی بجٹ کے چھ گُنا اور پانچ گُنا کرنے کی بات تو اس کے لئے فنڈ کہاں سے آئیں گے ؟۔

انقلاب کی نوید سنانے والے خاں صاحب کی اپنی حالت اُس لڑکے کی سی ہے جو سمندر کے کنارے سنگریزوں سے کھیل رہا ہو جبکہ صداقتوں اور تلخ حقائق کا عمیق سمندر جوں کا توں سامنے پڑا ہو۔پہلے وہ عقابی شان سے جھپٹے لیکن جلد ہی تھک کر کرگسوں میں جا گرے ۔پھر انتہائی بے تکے انداز میں اپنے سونامی کو تختِ لاہور کی فصیلوں سے ٹکرانا شروع کر دیا جس سے یوں محسوس ہونے لگا کہ خاں صاحب کی نظر وزارتِ عظمیٰ پر نہیں بلکہ پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ پر ہے۔اُن کی تان ہمیشہ نواز لیگ پر ہی ٹوٹتی ہے ۔کیا اُن کے خیال میں کرپشن، مہنگائی ، دہشت گردی، بھتہ خوری اور ٹارگٹ کلنگ کی ذمہ دار نواز لیگ ہے ؟۔ اگر نہیں تو پھر صرف نواز لیگ ہی کیوں ؟۔

ہر ذی شعور یہی کہتا ہے کہ موجودہ حالات میں کوئی بھی سیاسی جماعت گُلستانِ سیاست کے پھل تنہا توڑ کھانے کے قابل نہیں۔ اسی لئے پیپلز پارٹی اپنے اتحادیوں کے ساتھ میمنہ، میسرہ سجائے کھڑی ہے۔ نواز لیگ بھی دیر سے سہی لیکن اب اپنے گھوڑوں کی زینیں کَس رہی ہے لیکن کپتان کو لفظی بازیگری کے ماہر اب بھی دل خوش کُن خواب دکھا کر "تنہا پرواز" کا درس دے رہے ہیں۔ لیکن کیا ایسا کرکے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے؟۔ ایسی معجزہ گری فی الحال تو ممکن نظر نہیں آتی البتہ اندیشہ ہے کہ کہیں خاں صاحب کا انجام بھی اصغر خاں اور "اسلامک فرنٹ" کے قاضی حسین احمد جیسا نہ ہو جائے کیونکہ ہم نے "ظالمو! قاضی آ رہا ہے" کے شور اور نغموں اور ترانوں کی گونج میں تحریکِ انصاف سے کہیں زیادہ بھرپور جلسے بھی دیکھے اور جلوس بھی لیکن نتیجہ برعکس پایا۔ کارلائل کہتا ہے "متواتر گرنے والے قطرے سنگلاخ چٹانوں پر اپنا نقش بنا لیتے ہیں لیکن تُند و تیز شور کے ساتھ چٹانوں سے ٹکرانے والے دھارے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتے"۔ تحریکِ انصاف کی تُندی اور تیزی دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ بھی اپنا نشان چھوڑے بغیر قصّہ پارینہ بن جائے گی۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ اپنے آپ کو جسمانی طور پر فِٹ بلکہ سُپر فِٹ رکھنا صرف اداکاروں اور اداکاراؤں کی مجبوری ہے کہ اِس میں اُن کی روزی روٹی مضمر ہوتی ہے۔ لیکن روزنامہ جنگ کے معروف تجزیہ نگار محمد صالح ظافر نے یہ انکشاف کرکے ہمیں ورطہ حیرت میں ڈال دیا کہ ہمارے رہبرانِ مُلک و مِلّت کی غالب اکثریت اپنے "بڑھاپے" کو سات پردوں میں چھپانے کی تگ و دو میں اکثر بیوٹی پارلرز جانا پڑتا ہے جہاں وہ پلکنگ، تھریڈنگ اور فیشل کرواکر "ابھی تو میں جوان ہوں" گنگناتے پارلیمنٹ سدھارتے ہیں۔

صالح ظافر کہتے ہیں کہ جنابِ آصف زرداری غیر مُلکی خضاب سے بال رنگتے ہیں۔ اُنہیں ایسا کرنے کا حق ہے کیونکہ سوئس مقدمات دوبارہ کھُلنے کی پندرہ سالہ مدّت تمام ہوچکی۔اب کوئی خط لکھے یا نہ راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔اگر ساٹھ ملین ڈالر صاف بچ جانے پر بھی دیسی خضاب ہی استعمال کرنا ہے تو تُف ہے ایسے ڈالروں پر۔۔۔

موصوف کہتے ہیں کہ راجہ پرویز اشرف اور یوسف رضا گیلانی دیسی خضاب استعمال کرتے ہیں۔راجہ صاحب تو یقیناً "دیسی نسخہ" ہی استعمال کرتے ہونگے کیونکہ نئے نویلے وزیرِ اعظم کو "لمبا ہاتھ" مارنے کا ابھی موقع

ہی نہیں ملا۔ رینٹل پاور کیس میں بھی لوگوں نے اُنہیں "راجہ رینٹل" تو بنا دیا لیکن وہ اپنے حصّے سے ابھی تک محروم ہیں اور امید واثق ہے کہ محروم ہی رہیں گے کیونکہ اب سب کچھ "عصائے افتخار" کی زد میں ہے۔اِس لیے اُن کے "دیسی نسخہ" استعمال کرنے میاں ، بیوی ، بچے سمیت)) "MBBS" کی سمجھ تو آتی ہے لیکن گدی نشین تو ما شا اللہ دھن سمیٹنے میں اپنے "بگ باس" سے بھی کئی ہاتھ آگے نکل گئے۔ وہ تو فرانسیسی جوتوں اور برطانوی سوٹوں اور ٹائیوں سے کم پر سمجھوتا کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے بالوں کو دیسی رنگ میں رَنگ لیں۔ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وزارتِ عظمیٰ چھِن جانے کے بعد وہ بھی سگھڑ گھریلو خواتین کی طرح کچھ پَس انداز کرنے کے چکر میں ہوں کیونکہ اب تو اُن کے ہونہار "بروا" بھی ایفیڈرین کیس میں بُری طرح پھنس چُکے ہیں۔ لیکن "چور چوری سے جائے ، ہیرا پھیری سے نہ جائے" کے مصداق وہ بہر حال اپنے بالوں کو دیسی خضاب سے رنگ کر اپنے نام پہ بٹہ لگانا ہر گز پسند نہیں کریں گے۔۔۔۔ خیبر پختونخواہ کے معمر ترین گورنر خضاب کا فراخدلانہ استعمال کرتے ہیں لیکن اپنی جیب پر بوجھ کم ہی ڈالتے ہیں۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ہمارے گورنر پنجاب کے سَر پر گنتی کے چند بال ہیں۔اُن کے پاس استعمال کے بعد بہت سا خضاب بچ جاتا ہے جسے وہ گورنر خیبر پختونخواہ کو بھیج دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "مُفت کی شراب تو مِلّا کو بھی حلال ہے" اِس لیے فراخ دلانہ استعمال تو ہو گا۔

رحمٰن ملک صاحب مجھے اسی لیے پسند ہیں کہ وہ ہمیشہ بازی لے جاتے ہیں۔ اُن کا "بیوٹی بکس" برازیل سے آتا ہے اور وہ اپنے چہرے کی مرمت دبئی کے ایک بیوٹی پارلر سے کرواتے ہیں ۔ہم تو یہ سمجھتے رہے کہ موصوف نوٹوں کے بریف کیس بھر کر "نکرے" لگانے دبئی جاتے ہیں۔ لیکن کھودا پہاڑ ، نکلا چوہا۔ وہ بیچارے بم دھماکوں ، خود کش حملوں، بھتہ خوری اور ٹارگٹ کلنگ کی ٹینشن سے اُجڑے چہرے کی مرمت کروانے جاتے رہے اور ہم اپنی کالمانہ پھُرتیوں سے اُن کے سفر میں ظالمانہ رنگ آمیزیاں کرتے رہے۔۔۔۔ محترم امین فہیم کا سَر اور مونچھیں جب کالی گھٹاؤں کا منظر پیش کرنے لگتی ہیں تو شرارتی بچے یہ آوازے کستے ہیں کہ "کی عمراے تے کی روگ نیں" جو ہمیں بالکل پسند نہیں کیونکہ اپنے لیڈروں کے بارے میں ایسے بیہودہ تبصرے سُن کر بہت شرم آتی ہے۔ کیا ہوا جو ہمارے مہربانوں نے شرم نامی مشروب کو گھول کر پی لیا ہے لیکن پھر بھی اطاعتِ امیر تو ہم پر فرض ہے اور ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم بھی ساری شرم گھول کر پی جائیں لیکن فی الحال قوم نے یہ فریضہ اراکینِ اسمبلی کے سپرد کر رکھا ہے جسے وہ بطریقِ احسن سرانجام دے رہے ہیں۔

بن سنور کر پارلیمنٹ میں آنا پارلیمنٹیرین کا آئینی حق ہو گا اِس لیے ہمیں اُن پر تنقید کا تو کوئی حق نہیں لیکن یہ سوال تو کر سکتے ہیں کہ بیوٹی پارلر

زر کے خطیر اخراجات کون برداشت کرتا ہے؟۔ ہمیں پارلیمنٹیرین سے تو جواب کی توقع نہیں اِس لیے اگر انصار عباسی صاحب کی تحقیقاتی ٹیم یہ ثابت کر دے کہ اِن اخراجات کا بوجھ بھی حکومتی خزانے پر پڑ رہا ہے تو میں بِلا تاخیر جنابِ چیف جسٹس آف پاکستان کو از خود نوٹس کی اپیل کر دونگی۔ یہ الگ بات ہے کہ میری اپیل کو محض اِس لیے در خورِ اعتنا نہ سمجھا جائے کہ چیف صاحب کے اپنے گھنے بالوں میں بھی چاندی کے تار جھلکتے دکھائی نہیں دیتے۔ پھر از خود نوٹس لینے میں یہ خطرہ بھی بہر حال موجود ہے کہ فیصل رضا عابدی جیسا بد لحاظ، مُنہ پھٹ اور بد زبان جعلی فائلوں کے پلندے لے کر ٹھک سے کسی ایسے چینل پر پہنچ جائے جو پہلے ہی جنابِ زرداری کی عنایاتِ خسروانہ کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو اور ہماری معصوم عدلیہ کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ آخر وزارتِ اطلاعات کا خُفیہ بجٹ دو سے چار ارب کرنے کا کچھ تو فائدہ ہونا چاہیے۔ اگر اِس بجٹ سے کچھ اینکر اور چینل مالکان بھی نہیں خریدے جا سکتے تو پھر بجٹ بڑھانے کا فائدہ؟۔

میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ لوگ عام انتخابات میں جماعت اسلامی جیسی "صالح" جماعت کو بھول کیوں جاتے ہیں؟۔ بھلا ہو جنابِ صالح ظافر کا جن کے انکشافات کی بدولت یہ عقدہ وا ہوا اور ہمیں بھی پتہ چل گیا کہ یہ جماعت اپنے "بڑھاپے" کے ہاتھوں مار کھا جاتی ہے۔ لوگ جب انتہائی محترم قاضی حسین احمد

اور جنابِ لیاقت بلوچ جیسے لوگوں کو دیکھتے ہیں تو اُن کے دل سے یہ آواز نکلتی ہے کہ یہ متقی اور پرہیزگار لوگ ہیں اِس لیے اِنہیں "دُعاوؤں" کے لیے رکھ کر ووٹ کسی کا چیئر مین لگوا سکے اور OGDC ایسے شخص کو دیا جائے جو اُن کے میٹرک پاس بیٹے کو ظاہر ہے کہ ایسا کام تو "گدی نشین" اور "راجہ رینٹل" جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں بیچارے سیاسی مولوی "اتنے جوگے" کہاں۔

میرے آقا ﷺ نے ایسے مردوں پر لعنت بھیجی ہے جو عورتوں کی سی شباہت اختیار کریں اور ایسی عورتوں پر بھی جو مردوں کی شباہت اختیار کرتی ہیں۔بناؤ سنگھار کی دینِ مبیں صرف عورتوں کو اجازت دیتا ہے، وہ بھی گھر کی چار دیواری کے اندر لیکن ہمارے ہاں تو سب اُلٹ ہو کے رہ گیا ہے۔سچ ہے کہ جب کسی قوم کی تباہی کا وقت قریب آ لگتا ہے تو سب سے پہلے اُمراء ہی بگڑتے ہیں اور ہمارے حکمرانوں کا حال تو اب قیصر و کسریٰ کے اُن حکمرانوں جیسا ہو گیا ہے جو بناؤ سنگھار میں صنفِ نازک سے کہیں آگے نکل گئے تھے ۔ایسے ملکوں کو کسی بیرونی حملہ آور کی حاجت نہیں ہوتی کیونکہ اُس کی تباہی اظہر من الشمس ہوتی ہے۔فُرقانِ حمید تو پُکار پُکار کر کہتا ہے کہ ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا لیکن جس دور میں ہم بس رہے ہیں اُس میں تو انسان شر ایسے مانگتا ہے جیسے خیر مانگنی چاہیے ۔ایسے میں بھلا رب اُس قوم کی حالت کیوں بدلے گا جسے خود اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو۔

رویتِ ہلال، عدلیہ اور راجہ جی

اللہ بھلا کرے خیبر پختون خواہ والوں کا جن کی بدولت ہمیں اکٹھی تین تین عیدیں منانے کا موقع ملا اور ہم پورا ہفتہ فکرِ فردا اور غمِ دوش سے بے نیاز۔ راوی عیش ہی عیش لکھتا رہا اور پوری قوم بھی "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی زندہ تصویر بنی رہی۔ عید کی خوشیاں تو ایک طرف لیکن مجھے یہ "ٹرو اور مرو" کی آج تک سمجھ نہیں آئی۔ میں نے لغت میں تلاش کرنے کی سعی کی لیکن معنی ندارد۔ گزرے وقتوں کی عیدوں کو کھنگالا لیکن بے سود۔ ایک "لال بجھکڑ" سے ٹرو، مرو کی وجہ تسمیہ جاننے کے لئے موبائل فون سنبھالا تو رحمٰن ملک صاحب کی "موبائلی دہشت گردی" آڑے آئی۔ تھک ہار کر اپنے افلاطونی دماغ کا سہارا لینا پڑا حالانکہ ہم اسے کم کم ہی تکلیف دیتے ہیں کیونکہ ہم بھی عوام میں سے ہیں اور ہمیں محترم عطاء الحق قاسمی کی طرح خود پر زیادہ بھروسہ کرنے کی عادت نہیں۔ ہمارے دماغ کی ایک پھڑکتی رگ نے انکشاف کیا کہ یہ ٹرو اور مرو دراصل عید الفطر کی "پاکستانی اولاد" ہیں جن کی وجہ پیدائش یہ ہے کہ ہم مساوات کے قائل ہیں اور چونکہ عید الاضحیٰ تین دنوں پر محیط ہوتی ہے اس لئے زیادتی ہوتی اگر ہم پورا ماہ بھوکے رہ کر بھی عید الفطر صرف ایک دن ہی مناتے۔

سُنا ہے کہ شر پسند یورپی اقوام نے سائنسی بنیادوں پر اگلے 200 سال کا قمری کیلنڈر بنا رکھا ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے محترم مفتی شہاب الدین پوپلزئیِ اور مفتی منیب الرّحمٰن کے خلاف گھناونی سازش ہے اور یہ دُشمنانِ دیں ہمیں گمراہ کرکے دین سے دُور کرنا چاہتے ہیں۔ہم تو ایسے کینڈروں شلنڈروں پر ہر گز اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔لیکن مفتی منیب الرّحمٰن صاحب سے گزارش ہے کہ وہ بھی مفتی پوپلزئی کی طرح ماہرینِ فلکیات پر صاد کرنے کی بجائے کھُلی آنکھوں سے "ہلالِ عید" دیکھنے کی کوشش کیا کریں خواہ اِس میں ہفتہ دس دن کی دیر سویر ہی کیوں نہ ہو جائے کیونکہ اگر عوام نے ماہرینِ فلکیات کی رویت کو ہی حتمی سمجھنا شروع کر دیا تو پھر "رویت ہلال کمیٹی کا وجود بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔کچھ شر پسند (جن سے ہم ہر گز متفق نہیں) یہ بھی کہتے ہیں کہ ماہرینِ فلکیات کی رویت کا عُلماء اور عوام، دونوں کو ہی فائدہ یوں ہے کہ اگر رویت ہلال کمیٹی نہ ہو تو اُس کے اتنے ڈھیر سارے ممبران (عُلمائ) کو بھی اعتکاف میں بیٹھنے کا موقع مل سکتا ہے جو اُن کا دینی حق ہے۔بھلے قوم کو اُن کے فتووں سے محروم ہی کیوں نہ ہونا پڑے لیکن اُنہیں تو قربِ الٰہی نصیب ہو جائے گا۔عوامی فائدہ یوں کہ دو مفتیوں کے درمیان "سینڈوچ" بنی قوم بھی سُکھ کا سانس لے گی۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم کسی بھی مفتی صاحب کے فتوے کو رد کرنے کی ہمت نہیں

رکھتے کیونکہ اِس میں ہم پر کُفر کا فتویٰ لگنے کے روشن امکانات ہیں۔ شہاب الدین پوپلزئی اور منیب الرّحمٰن دونوں پختون ہیں ، دونوں کا تعلق صوبہ خیبر پختونخواہ سے ہے اور دونوں ہی مفتی ہیں،اس لئے "کیدی منیئے تے کیدی نہ منیئے ؟" (ویسے کچھ لوگوں نے احتیاطاً دونوں کی مان کر دو ، دو عیدوں کا مزہ بھی لوٹا ہے ۔ وہ تو وزیرستان میں جا کر تیسری عید بھی منانے کے چکر میں تھے لیکن پے در پے ہونے والے ڈرون حملوں نے ڈرا دیا)۔اگر کسی ایک مفتی کا تعلق پنجاب وغیرہ سے ہوتا تو ہم ٹھک سے کہہ دیتے کہ "پنجابی مفتی" سرحدی مفتی کا استحصال کر رہا ہے اور یہ سب کچھ میاں شہباز شریف کی شہ پر ہو رہا ہے جو حلوہ بانٹ کر کھانا پسند نہیں کرتے لیکن سیّد خورشید شاہ نے رویت ہلال کمیٹی کے چیئر مین کا خیبر پختونخواہ سے انتخاب کرکے ہماری ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ۔اب یہ جنگ دو سرحدی مفتیوں کے مابین ہے اور مفتی چونکہ جھوٹ نہیں بول سکتے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ سارا قصور چاند کا ہے جو سال کے دس ماہ تو متفقہ رویت کے مطابق نظر آتا رہتا ہے لیکن رمضان اور شوال میں کسی حسینہ دلربا کی طرح کہیں چلمن کی اوٹ میں چلا جاتا ہے اور کہیں بام پہ آ کر دیدار کروا دیتا ہے ۔شاید یہ "وارداتیا چاند" بھی ہمیں شک کی اندھی وادیوں میں دھکیل کر اپنے مفتیان سے دور کرنا چاہتا ہے ۔اس لئے ہمارے نزدیک اِس کا واحد حل یہ ہے کہ ہم بھی اپنی عیدیں سعودی عرب کے ساتھ منانا شروع کر دیں۔

اُدھر مفتی شہاب الدین پوپلزئی اور مفتی منیب الرّحمٰن کا مقابلہ جاری ہے تو اِدھر عدلیہ اور انتظامیہ کے پہلوان "کسرت" میں مصروف ہیں اور قوم "نہ پائے رفتن ، نہ جائے ماندن" کے مصداق اِدھر اُدھر لڑھکنیاں کھا رہی ہے۔ وہ مذہبی معاملہ ہے تو یہ ملکی سلامتی کا لیکن بہتری کی کوئی صورت کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ آج (27 اگست) جنابِ راجہ پرویز اشرف سپریم کورٹ میں پانچ رُکنی بنچ کے سامنے پیش ہوئے اور فرمایا کہ گیلانی صاحب تو چار سال سے زائد وزیرِ اعظم رہے لیکن اُنہیں وزارتِ عظمیٰ سنبھالے ہوئے صرف ساٹھ روز ہوئے ہیں اِس لئے مزید چار چھ ہفتے کی مہلت دے دی جائے۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہ عدلیہ کے دروازے پر مہلت مانگنے آئے ہیں کیونکہ وہ چین کے دورے پر جا رہے ہیں ۔ایسے میں دُنیا کیا کہے گی کہ ایک "نوٹس زدہ" وزیرِ اعظم دورے پر آیا ہے۔ جوں جوں الیکٹرانک میڈیا پر خبر آ رہی تھی ، میری ساری ہمدردیاں راجہ جی کے ساتھ ہوتی چلی گئیں اور ایک جذبہء ترحم اُبھرتا چلا گیا ۔ اگر میں بنچ کی سر براہ ہوتی تو یقیناََ کہتی "توں لنگ جا، ساڈی خیر اے" لیکن بنچ کے سر براہ محترم آصف سعید کھوسہ نے بھی کوئی کَم شفقت کا مظاہرہ نہیں کیا ۔اُنھوں نے کہا کہ راجہ جی خط لکھنے کی تسلّی کروا دیں اور عیش کریں۔ لیکن راجہ جی بھلا ایسی تسلّی کہاں سے کرواتے ؟۔ لیکن یہاں اُن کی پُرانی "پراپرٹی ڈیلری" کے گُر کام آئے اور وہ بغیر کوئی تسلّی کروائے

بائیس دن کی مہلت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ محترم اعتزاز احسن نے بہت غصے اور دُکھ سے کہا کہ انجام تو راجہ جی کا بھی گیلانی صاحب جیسا ہی ہونا ہے لیکن اُنہیں بار بار مہلت مِل رہی ہے جب کہ ہمیں ایسی کوئی مُہلت نہیں دی گئی۔اعتزاز صاحب کا غُصّہ بالکل بجا ہے کیونکہ چیف جسٹس صاحب کے سابقہ "ڈرائیور" کا بہر حال اتنا حق تو بنتا تھا ۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ خط کا نہ لکھا جانا پتھر پہ لکیر ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ راجہ جی سپریم کورٹ سے مذید مہلت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں ۔لیکن رقیبانِ " راجہ رینٹل "کے خوش ہونے کی پھر بھی کوئی جا نہیں کہ "There is many a slip between the cup and the lip" ۔ابھی تو راجہ صاحب کو "ملزم " بھی نہیں ٹھہرایا گیا۔پہلے وہ مُلزم ٹھہرائے جائیں گے ، پھر چارج شیٹ تیار ہو گی ۔بعد ازاں وکلاءکے دلائل اور پھر کہیں جا کر فیصلہ۔اگر انتخابات 2014ء میں ہونے ہیں تو پھر تو راجہ جی کی گوجر خاں واپسی کا سوچا جا سکتا ہے لیکن اگر واقعی مارچ 2013ء تک انتخابات کا ہونا ٹھہر گیا تو پھر راجہ جی کے بعد نگران وزیرِ اعظم ہی آئے گا اور سپریم کورٹ کی طرف سے مہلت نہ سہی لیکن تاریخ پہ تاریخ تو ملتی چلی جائے گی کیونکہ ہمارے وکلاءاِس فَن میں بہت طاق ہیں۔

مکّا چوک

کراچی میں ایم کیو ایم کے مرکزی دفتر نائن زیرو سے ملحقہ چوک کا نام "مکّا چوک" ہے ۔چوک میں ایک بہت.بڑا مکّا بنا ہوا ہے جسے لوگ قائدِ تحریک محترم الطاف حسین کا مُکا قرار دیتے ہیں ۔ویسے یہ مکّا ہے.بڑی خطرناک شئے ۔اگر نشانہ درست بیٹھے تو بتیسی بھی باہر نکل سکتی ہے شاید اسی لیے میڈیا والے مکّا چوک سے کترا کر اور ایم کیو ایم سے نظریں بچا کر گزر جاتے ہیں۔اکثر لوگ تکّے سے صرف "یرکانے" کا کام لیتے ہیں ۔اگر سامنے والا "یرک" جائے تو ٹھیک وگرنہ خود "یرک جانا" تو اپنے ہاتھ میں ہوتا ہی ہے ۔اِس "یرکنے اور یرکانے" کے فَن میں جنابِ آصف زرداری بے مثل ہیں۔اُنھوں نے کئی سرکاری، غیر سرکاری اور صحافتی تکّے پال رکھے ہیں۔یہ تکّے دشمنوں پر تابڑ توڑ .برستے رہتے ہیں لیکن جونہی کوئی مُکّا بے اثر ہونے لگتا ہے ،جنابِ زرداری اُس کی جگہ نئے تکّے میدان میں لے آتے ہیں ۔فردوس عاشق ، ذوالفقار مرزا اور بابر اعوان نامی تکّے آجکل بے اثر ہو کر استراحت فرما رہے ہیں۔فہمیدہ مرزا نامی مُکا اپنی نا رکی کے ہاتھوں مار کھا گیا اور جوابی حملے میں پیپلز پارٹی کی بتیسی ہاتھ میں آ گئی جس کی تلخی آج بھی فضاؤں میں گھُلی نظر آتی ہے۔زرداری صاحب کے پاس ایک زنانہ مُکا ایسا بھی تھا جو کئی مردانہ مکوں پر بھاری تھا لیکن اُسے اللہ میاں لے گئے ۔سُنا

ہے کہ مرحومہ فوزیہ وہاب جنت میں بھی ٹکّے لہرا لہرا کر نواز لیگ کو کوسنے دیتی رہتی ہیں۔

جب دیسی ٹکّے کمزور پڑنے لگیں تو زرداری صاحب "ولائتی" ٹکوں کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتے ۔اِن میں سب سے خطرناک امریکی مُکا ہے جسے وہ قوم کو ڈرانے کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں۔اِس کام کے لیے مارکیٹ میں کرائے کے لکھاری عام دستیاب ہیں جو غیرت کی بات کرنے والوں کو "غیرت.بریگیڈ" کہہ کر چھیڑتے رہتے ہیں۔ قوم تو کچھ کچھ ڈر ہی جاتی ہے لیکن یہ "مولوی" ہرگز نہیں ڈرتے ۔زرداری صاحب تو "مولوی صاحبان" کو سمجھانے کی خاطر اکثر یہ گُنگناتے رہتے ہیں کہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن

دِل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اب پتہ نہیں یہ پختگیِ ایماں ہے یا "شرابِ طہورہ" کا لالچ کہ مولوی صاحبان مدبّر آصف زرداری کی باتوں پر ہرگز کان نہیں دھرتے اور ہمیشہ سُنی ان سنی کر دیتے ہیں۔

زرداری صاحب بھی خیر کچھ زیادہ پرواہ نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ خالی خولی بڑھکوں سے "نیٹو کنٹینرز" نہیں رُکا کرتے لیکن امریکہ کو "جھاکا" دینے کے لئے مولویوں کا ڈراوا بھی ضروری ہے۔ اگر یہ

تھوڑا بہت ڈر بھی نہ ہو تو پھر بھول جائیں امریکی امداد کو۔

یوں تو ہمارے خادمِ اعلیٰ بذاتِ خود نامی گرامی" لکّے" ہیں لیکن اُنھوں نے کچھ اضافی لکّے بھی پال رکھے ہیں،جن کی سربراہی رانا ثنا اللہ کے سپرد ہے۔کچھ ستم لکھاریوں اور دانشوروں کو حیرت ہوتی ہے کہ میاں برادران تو ساری "ریوڑیاں" آپس میں ہی بانٹ کھانے کے عادی ہیں،پھر رانا ثنا اللہ پر اتنا اعتماد کیوں؟۔قصّہ دراصل یہ ہے کہ وہ تو پہلے بھی کسی پر کم کم ہی اعتماد کیا کرتے تھے لیکن جب سے وہ جلا وطنی کا دُکھ جھیل کر آئے ہیں تب سے تو اُنھوں نے اعتماد کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے اور کریں بھی تو کیسے؟۔ اُنھوں نے جَلا وطنی کے زمانے میں ڈھونڈ ڈھانڈ کے سب سے کمزور شخص کو "پارٹی سربراہ" بنایا اور دروغ برگردنِ راوی اُسے ہر ماہ پانچ لاکھ روپے بھی بھیجتے رہے لیکن اُس کی گردن میں ایسا سریا آیا کہ وہ نہ صرف پارٹی چھوڑ گیا بلکہ ان پر آجکل سب سے زیادہ گرج،برس بھی وہی رہا ہے۔میاں شہباز شریف نے تو بڑے بھائی کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی تھی کہ وہ اکیلے ہی کافی ہیں لیکن بڑے بھائی صاحب نے سر پر تحریکِ انصاف کی لٹکتی تلوار کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اُنہیں آخرکار وزارتِ اعلیٰ کے علاوہ دیگر بیس وزارتیں اپنے پاس رکھنے کے لیے قائل کر ہی لیا۔

عمران خاں صاحب کی جماعت چونکہ ابھی نوزائیدہ ہے اِس لیے ٹھکوں کے معاملے میں ذرا کمزور ہے لیکن یہ کمی وہ "گالیوں" سے بخوبی پوری کر لیتی ہے جو اُس کا حق ہے۔ بھئی! کمزور اگر گالیاں بھی نہ دے تو کیا خاموشی سے "کُٹ" کھاتا رہے؟۔ ہمارے کچھ دانشوروں کو تحریکِ انصاف کے چیخنے چلانے پر بھی اعتراض ہے۔ بندہ اِن بھلے مانسوں سے پوچھے کہ نوزائیدہ بچے کو جب بھوک لگتی ہے تو کیا بنا چیخے چلائے اُسے دودھ مِل جاتا ہے؟۔ اور اقتدار کی جتنی بھوک نوزائیدہ تحریکِ انصاف کو ہے کسی اور کو نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بھوک کپتان صاحب کو نہ ہو لیکن "بھان متی کا کُنبہ" تو آیا ہی اقتدار کے مزے لوٹنے کے لیے ہے۔ اِس لیے "ہنگامہ" تو ہو گا۔

قاف لیگ کے پاس ایک ہی "مشرفی مُکا" تھا جسے وہ بہت سینت سنبھال کر رکھتی تھی۔ جب سے وہ "وچھوڑے" کا دُکھ دے گیا، وہ بیچاری ٹائیں ٹائیں فِش ہو کر آجکل اتحادی ٹھکوں پر گزارا کر رہی ہے۔ یہی حال عوامی نیشنل پارٹی کا ہے۔ "متھا" تو اُس نے ایم کیو ایم سے لگا لیا لیکن مقابلے میں لے آئے صرف شاہی سید مُکا۔ بھلا ایک ٹکے سے ایم کیو ایم کا کیا بگڑنے والا تھا؟۔ یہی وجہ ہے کہ زرداری صاحب بھی اے این پی کو کم کم ہی گھاس ڈالتے ہیں۔ دینی ٹھکوں پر کچھ بد بختوں نے دہشت گردی کا لیبل چسپاں کر دیا ہے۔ دینی جماعتیں لاکھ "رولا" ڈالیں کہ دین میں دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں لیکن سیکولر قوتیں

اُن کی ایک نہیں چلنے دیتیں۔اُدھر طالبان بھی اُن پر کم کم ہی اعتبار کرتے ہیں اور امریکہ تو ہے ہی اُن کا ازلی دشمن اِس لیے وہ بیچارے ہر وقت "وختت" میں پڑے رہتے ہیں۔ مکّے کبھی کبھار قائدین کے لیے بھی انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ قائدِ ملّت نے مُکّا لہرایا تو اللہ میاں نے بلا لیا اور قائدِ تحریک نے لہرایا تو انگلینڈ نے۔اب نہ قائدِ ملّت واپس آ سکتے ہیں اور نہ قائدِ تحریک۔اِس لیے ایم کیو ایم کو اپنی اوّلین فرصت میں " مکّا چوک "کا نام بدل دینا چاہیے۔برنارڈ شا کہتا ہے کہ "ماضی کی غلطیوں پر رونا اور پچھتانا مضحکہ خیز ہے کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے"۔اِس لیے ماضی کا ماتم کرنے کی بجائے تحریکی بھائیوں کو اپنے مستقبل کی فکر کرتے ہوئے اس چوک کا نام بدلنا ہی ہو گا۔اگر وہ مجھ سے مفت مشورہ طلب کریں تو میرے نزدیک اِس کا بہترین نام "نکٹ مکا" چوک ہونا چاہیے کیونکہ ایم کیو ایم کی تاریخ بتاتی ہے کہ نکٹ مکا کرنے میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔اِس لحاظ سے یہ چوک "اسم با مسمّٰی " بھی ہو جائے گا اور تحریکی بھائیوں کو پھر کبھی (خُدا نخواستہ) رات کے اندھیرے میں فرار ہونے کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑے گی۔

کیا وزیرِ اعظم پر آرٹیکل چھ کا اطلاق ہوگا؟

بعد ز خرابی بسیار بالآخر حکومت سوئس حکام کو خط لکھنے کے لیے آمادہ ہو گئی۔ وزیرِ اعظم نے وزیرِ قانون کو خط لکھنے کا حکم صادر فرما دیا لیکن بعض حلقے اب بھی شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وزیرِ قانون فاروق ایچ نائیک سے کسی کو خیر کی توقع نہیں۔ وہ بار بار بنچ سے خط لکھنے کے لیے وقت مانگ رہے تھے جبکہ جج صاحبان کا یہ کہنا تھا کہ وزیرِ قانون سب کچھ جانتے ہیں اور دو سطری خط لکھنے کے لیے دنوں یا ہفتوں کی ضرورت نہیں۔ بہر حال تکرار اور اصرار کے بعد وزیرِ قانون 25 ستمبر تک کی مہلت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سپریم کورٹ کے باہر وزیرِ اطلاعات قمر الزماں کائرہ نے میڈیا سے گفتگو کی۔ اُن کا چہرہ اُداسیوں کی آماجگاہ بنا ہا تھا جس کا اُنھوں نے برملا اقرار بھی کیا۔ بہت سے سوالوں کا جواب صرف اِس لیے نہ دے سکے کہ اِس سے پہلے وہ خط نہ لکھنے کے جذباتی حامی تھے۔ شاید اُنہیں شرم آتی ہو گی کہ اپنا تھوکا کیسے چاٹیں۔ لیکن ہمیں جو سب سے زیادہ پریشانی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کل کلاں کوئی سپریم کورٹ میں یہ درخواست لے کر چلا گیا کہ اپنے "راجہ رینٹل" نے آئین کے آرٹیکل چھ کی خلاف ورزی کی ہے تو ہمارے گجر خانوی وزیرِ اعظم کا کیا بنے گا؟۔ پیپلز پارٹی بھی اِس معاملے میں اُن کی کوئی مدد نہیں کر سکتی کیونکہ اُس کے اپنے

سابقہ وزیرِاعظم کہہ چکے ہیں کہ سوئس حکام کو خط لکھنا آئین کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ محترم گیلانی صاحب نے بار بار یہ کہا کہ اگر عدالت کا حکم مانتا ہوں تو آرٹیکل چھ لاگو ہوتا ہے جس کی سزا موت ہے اور اگر توہینِ عدالت کرتا ہوں تو اُس کی سزا چھ ماہ قید ہے اِس لیے میں چھ ماہ قید بھگتنے کو تیار ہوں خط لکھ کر پھانسی نہیں چڑھ سکتا۔ وہ تو چھ ماہ کی بجائے چھ سیکنڈ کی قید بھگت کر ملتان سدھارے لیکن اپنے پیچھے یہ سوال ضرور چھوڑ گئے کہ اگلا وزیرِاعظم توہینِ عدالت اور پھانسی کے پھندے میں سے کس کا انتخاب کرے گا؟اور یہ فیصلہ آج راجہ پرویز اشرف نے کر لیا۔اب پیپلز پارٹی کے پاس صرف دو ہی راستے ہیں ۔پہلا یہ کہ اپنے وزیرِاعظم کو اپنے ہی "فرمودات" کے مطابق پھانسی پہ چڑھا دیں اور دوسرا یہ کہ قوم کے سامنے یہ اقرار کریں کہ وہ تین سال تک محض "ڈرامے بازیاں" کرکے قوم کو بیوقوف بھی بناتے رہے ہیں اور عدلیہ کی تضحیک کے مرتکب بھی ہوتے رہے ہیں۔اُنہیں یہ اقرار کرنا ہو گا کہ خط لکھنے سے آئین کی خلاف ورزی نہیں ہوتی ۔ یہ محض اُن کا سیاسی ڈرامہ تھا۔

ہمیں دوسری پریشانی بلکہ غصّہ یہ ہے کہ ہمارے پیارے ، بیچارے "گدی نشیں" کو ہمہ مقتدر جنابِ زرداری نے مفت میں ہی بھگا بھگا کے مار دیا۔بڑھکیں وہ لگاتے رہے اور وزارتِ عظمٰی چھین کے لے گئے راجہ رینٹل جنہوں نے بڑے رسان

سے آج یہ کہہ دیا کہ خط لکھا جا رہا ہے اور وزیرِ قانون فاروق ایچ نائیک کو ملک قیوم کا سوئس حکومت کو لکھا گیا خط واپس لینے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

جنابِ آصف بھٹو زرداری اور بلاول بھٹو زرداری نے گیلانی صاحب کو تو بینظیر شہید کی قبر کا ٹرائل نہ کرنے کا حکم صادر فرما دیا لیکن ایسا حکم راجہ پرویز اشرف کو کیوں نہیں دیا ؟۔ گزشتہ تین سالوں سے حکومتی حلقے بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ بینظیر شہید کی قبر کا ٹرائل نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن گیلانی صاحب کو ملتان بھیج کر وہ ٹرائل پر راضی بھی ہو گئے اور صدارتی استثناء کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ اگر یہی کچھ کرنا تھا تو پھر ملتان کے سید زادے کا کیا قصور تھا؟ ۔ ویسے بھی اگر موازنہ کیا جائے تو وزارتِ عظمیٰ کی دوڑ میں گیلانی صاحب راجہ پرویز اشرف سے کہیں آگے نظر آتے ہیں ۔ راجہ صاحب جس وقت پراپرٹی ڈیلری" کر رہے تھے گیلانی صاحب اُس واقت بھی ضیاء الحق کی کابینہ کے وزیر" تھے ۔ اُنہیں وزارتِ عظمیٰ کا تجربہ بھی ہو گیا اور کرپشن کے وہ سارے گُر بھی از بر کر لیے جو کسی بھی پاکستانی حاکم کی سب سے بڑی کوالیفیکیشن تصور کیے جاتے ہیں ۔ وہ راجہ رینٹل سے زیادہ سمارٹ اور زیادہ خوش پوش تھے اور سُنا ہے کہ اُنہیں انگریزی بھی راجہ صاحب سے زیادہ آتی تھی اور آج قمر الزماں کائرہ صاحب نے یہ اقرار بھی کیا ہے کہ یوسف رضا گیلانی بڑے "جیالے" ہیں ۔ پھر سید زادے کو ایوانِ وزیرِ اعظم سے اُٹھا کر گرد ،

گرمی اور گورستان کے شہر کیوں بھیج دیا گیا؟۔
یہ عقدہ کبھی وا نہ ہوتا اگر سابقہ "گھر کے بھیدی" شاہ محمود قریشی کا یہ بیان سامنے نہ آتا کہ گیلانی صاحب کی تین سالہ "مدتِ ملازمت" پہلے سے طے تھی۔اب گھڑنے والے کہانی کچھ یوں گھڑتے ہیں کہ گیلانی صاحب کا جانا تو طے تھا ہی لیکن ایوانِ صدر کے شاطروں نے ایک پنتھ دو کاج کے مصداق یہ فیصلہ کیا کہ اُنہیں اعلیٰ عدلیہ کے ہاتھوں شہید کروایا جائے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔وہ شہید تو نہ ہو سکے البتہ اُن کا "جھٹکا" ضرور ہو گیا۔اب چونکہ مزید کسی "جھٹکے" کی ضرورت نہیں تھی اس لیے راجہ صاحب کو خط لکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ویسے بھی سوئس قانون کے تحت مقدمہ "ری اوپن" ہونے کی مدّت ختم ہو چکی ہے اور سوئس بنک میں پڑے ساٹھ ملین ڈالر کب کے "پھُر" ہو چکے اِس لیے بے ضرر خط لکھنے میں ہرج ہی کیا ہے۔
استثنائی آرٹیکل 248 کے بارے میں سپریم کورٹ بار بار کہتی رہی کہ اُس سے درخواست کر کے صدارتی استثناء کا فیصلہ لیا جائے لیکن زرداری حکومت یہ رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔اُسے ہمیشہ یہ بد گُمانی رہی اور آج بھی ہے کہ صدارتی استثناء پر فیصلہ اُن کے خلاف آئے گا۔اگر حکومت یہ استثناء مانگ لیتی تو یقیناً اعلیٰ عدلیہ آئین کے مطابق یہ استثناء دے دیتی اور سارا معاملہ بہت

پہلے ختم ہو جاتا۔ لیکن حکومت چونکہ روزِ اوّل سے ہی اعلیٰ عدلیہ کے بارے میں بدگمانی کا شکار تھی اِس لیے یہ معاملہ طول پکڑتا گیا اور ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ جنوبی اور شمالی پنجاب کے بعد اب وسطی پنجاب کی وزارتِ عظمیٰ کی باری ہے اور سیاسی جوتشیوں نے تو پیشین گوئیاں بھی شروع کر دی تھیں لیکن اپنے گجر خانوی وزیرِ اعظم نے خط لکھنے کا اقرار کرکے "کھوتا کھوہ" میں ڈال دیا۔ جس کا سب سے زیادہ نقصان ہم جیسے کالم نویسوں کو ہوا جن کے پاس طبع آزمائی کے لئے اور کوئی موضوع ہو نہ ہو این آر او تو ہوتا ہی تھا ۔ خیر اب بھی مرحوم و مغفور این آر او پر دو چار تعزیتی کالم تو لکھے ہی جا سکتے ہیں۔ اُمیدِ واثق ہے کہ آنے والے دنوں میں سارے چھوٹے بڑے لکھاری تعزیتی کالم لکھیں گے یا پھر فاروق ایچ نایک صاحب کی فطرت کو دِ نظر رکھتے ہوئے یہ ٹامک ٹوئیاں بھی ماری جا سکتی ہیں کہ خط کیسا ہو گا؟۔ طویل ہو گا کہ مختصر؟۔ اعلیٰ عدلیہ کو خط پسند آئے گا یا نہیں؟۔ سوئس کیسز ری اوپن ہونگے یا نہیں؟۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

اکیس ستمبر۔۔۔یومِ عشقِ رسول ﷺ

میرے آقا دُنیا سے تشریف لے گئے۔آپ کے وصال کی خبر سنتے ہی مدینے کی گلیوں میں کہرام بپا ہو گیا۔حضرت عمرؓ نے سُنا تو شدّتِ جذبات سے تلوار سونت لی اور فرمایا کون کہتا ہے کہ محمد وصال فرما گئے ؟۔جو کہے گا میں اُس کی گردن تَن سے جُدا کر دونگا۔صدیقِ اکبرؓ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور یہ قُرآنی آیات تلاوت فرمائیں کہ اگر ہم نبی کو تُمھارے درمیان سے اُٹھالیں تو کیا تُم اُلٹے پاؤں پھر جاؤگے ؟۔حضرت عمرؓ کا پورا جسم کانپنے لگا، تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی اور آپؓ زمین پر گر پڑے ۔

آپ کے وصال کے بعد موذّنِ رسول حضرت بلالؓ نے اذان دینی بند کر دی۔وجہ یہ تھی کہ جب وہ اشہدان محمدالرسول اللہ پر پہنچتے تھے تو سامنے آپ کو نہ پا کر اُن کی آواز تھر تھرا جاتی تھی۔آپ کے وصال کے کافی عرصہ بعد حضرت بلالؓ شام سے مدینہ تشریف لائے۔حضرت امام حسینؓ کو خبر ہوئی تو ملاقات کے لئے تشریف لے گئے ۔ملاقات پر حضرت حسینؓ نے حضرت بلال سے فجر کی اذان دینے کی خواہش کا اظہار کیا ۔آپؓ نواسہ رسول کی خواہش کو نہ ٹھکرا سکے۔صبح کے وقت حضرت بلالؓ نے مسجد کی چھت پر چڑھ کر جب اللہ اکبر کہا تو سارا مدینہ تھرّا

اُٹھا۔جب بلالؓ کی زبان سے اشہدان محمد الرسول اللہ نکلا تو مدینۃ النبی کا کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو زار و قطار روتا ہوا باہر نہ آگیا ہو۔

حضورِ اکرم وصال سے پہلے وصیّت فرمائی کہ اُن کا لباسِ مبارک حضرت اویس قرنیؒ کو عطا کر دیا جائے۔آپ کی وصیت کے مطابق حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ آپ کا لباس لے کر کوفہ پہنچے۔وادی قرن میں ملاقات پر انہوں نے دیکھا کہ حضرت اویس قرنیؒ کے مُنہ میں ایک بھی دانت نہ تھا۔حضرت علیؓ کے استفسار پر حضرت قرنیؒ نے مُسکرا کر کہا کہ جب انہیں پتہ چلا کہ غزوہ اُحد میں آقا کے دو دندان مبارک شہید ہو گئے تو اُنھوں نے اپنے سارے دانت توڑ ڈالے کیونکہ اُنہیں نہیں پتہ تھا کہ آپ کے کونسے دو دانت شہید ہوئے تھے۔

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ عشقِ رسول کے ایسے ہزاروں واقعات کی خوشبو سے مہک رہی ہے۔صدیاں گزر گئیں لیکن حبِ رسول میں کوئی کمی نہیں آئی۔آج بھی بِلا امتیاز ہر مسلمان عشقِ رسول میں سرشار نظر آتا ہے۔آقا کی حرمت پہ کَٹ مرنے کو ہر مسلمان مرد و زن سعادت و عبادت سمجھتا تھا، ہے اور تا قیامت سمجھتا رہے گا۔آج ہمیں سیکولر حلقوں کی طرف سے صبر و تحمل کا درس دیا جا رہا ہے لیکن مجھے اپنے ایمان کی انتہاؤں تک یقین ہے کہ میرے نبی کے متوالے کسی بڑے سے بڑے سا نحے پر تو صبر کر سکتے ہیں لیکن ایسی ناپاک جسارت

پر نہیں، ہر گز نہیں۔ یہ ہر مسلمان کا فرضِ عین ہے کہ وہ ایسی رقیق حرکت کرنے والوں کو اُن کے عبرت ناک انجام تک پہنچائے بغیر اپنے جذبات کو ٹھنڈا نہ ہونے دیں۔اِس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ہم جذبات میں آ کر اپنی ہی املاک کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیں لیکن سیکولر دانشوروں کے درسِ تحمل پر کان دھرنا بھی انتہا درجے کی بے غیرتی و بے حمیتی ہے۔ہمیں اپنے اندر عشقِ رسول کی وہی شمع روشن کرنا ہو گی جو غازی علم الدین کو شہادت کے منصب سے سرفراز کر گیااور جس کے بارے میں حضرتِ اقبال نے بڑی حسرت سے یہ کہا"ترکھانوں کا لڑکا بازی لے گیا"۔

مجھے اِس سے کچھ لینا دینا نہیں کہ یورپ اور امریکہ میں "اظہارِ رائے" کی آزادی کا معیار کیا ہے۔اِس پر بہت سے کالم لکھے جا چُکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں جن سے یہ امر مسّلم الثبوت ہے کہ امریکہ اور اہلِ یورپ کا حقِ آزادی رائے کا دوہرا معیار ہے ۔اُنھوں نے یہود و نصاریٰ اور مسلم اُمہ کے لیے آزادی رائے کے الگ الگ معیار مقرر کر رکھے ہیں۔ بھاڑ میں جائیں ایسے معیار جو "ہولوکاسٹ" جیسے فضول، بکواس اور بے بنیاد افسانے کے خلاف زبان کھولنے والے کو تو قتل کر دیں اور دو ارب مسلمانوں کے نبیِ برحق کے خلاف ناپاک جسارت کرنے والوں کو وائٹ ہاؤس میں پناہ دے دیں۔ویسے بھی یورپ اور امریکہ کے مادر پدر آزاد معاشرے نے اُنھیں لازمہ انسانیت سے خارج کر کے

حیوانیت کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اللہ تعا لے نے انسانوں کو قبیلوں اور گروہوں میں پیدا کیا ہے تاکہ اِن کی پہچان ہو سکے جبکہ کسی حیوان کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اُس کا باپ کون ہے۔یورپ اور امریکہ میں یہی صورتِ حال نظر آتی ہے اور وہاں تواب غالب اکثریت ناجائز بچوں کی پیدا ہوتی ہے اور کسی سے اُس کے باپ کا نام پوچھنا بھی انتہائی بد تہذیبی سمجھا جاتا ہے۔یہی نہیں بلکہ سویڈن اور ڈنمارک جیسے ملکوں میں کسی کے باپ کا نام پوچھنا قانوناً جُرم ہے۔یہ حیوانیت اب درندگی میں ڈھل چکی ہے۔ اور یہ تو ہر ذی فہم کا ماننا ہے کہ درندے کبھی سیدھے ہاتھوں سدھائے نہیں جا سکتے۔لیکن بد قسمتی سے ایسے درندوں کو سدھانے والے ہاتھوں (مسلم حکمران) پر اِن درندوں کے خوف سے رعشہ طاری ہے۔اگر وہ تھوڑی سی غیرت کا بھی مظاہرہ کریں تو ہفتوں یا مہینوں نہیں بلکہ دنوں میں اِن درندوں کو سدھایا جا سکتا ہے۔ عشقِ رسول کا تقاضہ تو یہی ہے کہ پوری اُمّتِ مُسلمہ اپنے حکمرانوں کو اِن درندوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے مجبور کر دے اور اگر وہ اپنی بے غیرتی اور بے حمیتی سے باز نہیں آتے تو سب کو اُٹھا کر سمندر میں غرق کر دے۔ تحقیق کہ جو مسلمان اب بھی مصلحتوں کی چادر اوڑھ کر دم سادھے پڑا رہتا ہے وہ ایمان کے کمزور ترین درجے پر ہے اور لاریب اُسے روزِ محشر اِس کا کڑا حساب اور جواب دینا ہوگا۔

21 ستمبر کو عُلماء کی ہڑتال کی اپیل پر لبّیک کہتے ہوئے مرکزی حکومت نے عام تعطیل کا اعلان کرکے اپنے بہت سے گناہوں کو دھو ڈالا ہے۔اب یہ ہر مرد وزن کا فرض ہے کہ وہ اکیس ستمبر کو پُرامن احتجاج میں شریک ہو کر عاشقِ رسول ہونے کا ثبوت دے ۔یہاں معاملہ سیاست کا نہیں ، دینِ مبیں کا ہے جس کا تقاضہ ہے کہ ہم حضور پر کثرت سے درود بھیجتے ہوئے گھروں سے نکلیں اورطاغوتی طاقتوں پر یہ ثابت کردیں کہ ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن حرمتِ رسول پر آنچ ہر گز نہیں۔آقا کا فرمان ہے تحقیق کہ تمہارا ایمان اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ میں تمہیں تمہارے" ماں باپ ، اولاد ، بہن بھائی ، عزیز ، رشتہ دار حتّیٰ کہ دُنیا کی ایک ایک چیز سے پیارا نہ ہو جاؤں"۔ توکیا ہم اکیس ستمبر کو گھروں سے نکل کر آپ کے اِس فرمان کے مطابق عاشقِ رسول ہونے کا ثبوت دیں گے ؟۔۔۔۔۔۔

یومِ حرمتِ رسول ﷺ پرپُر تشدّد احتجاج

آج سارا دن نبی کے پروانے سراپا احتجاج رہے۔ کوئی گلی کوچہ ایسا نہ تھا جہاں حُرمتِ رسول پہ کٹ مرنے کے جذبے سے سرشار اُمتیوں نے اپنے جذبہ عشق کا اظہار نہ کیا ہو لیکن اِس کے ساتھ ہی انتہائی دُکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ احتجاج اُنیس افراد کی جانوں کا نذرانہ لے گیا اور ہسپتال زخمیوں سے بھر گئے۔ اربوں روپے کی املاک کا نقصان تو شاید قابلِ برداشت ہو کہ انسان اپنی محنتوں سے اِس کا مداوہ کر سکتا ہے لیکن جانے والے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ دینِ مبیں میں ایسے ہنگاموں کی گنجائش ہے نہ اجازت ۔ہمارا دین تو حالتِ جنگ میں بھی نہ صرف بچوں ، بوڑھوں اور عورتوں سے در گزر کی تلقین کرتا ہے بلکہ کھڑی فصلوں کو اُجاڑنے کی بھی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔اِس لیے جِن لوگوں نے یہ اودھم مچایا وہ میرے نبی کے متوالے ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ تو ایسے شر پسندوں کا گروہ تھا جو ایک خاص مقصد کے تحت آیا اور اپنا کام دکھا گیا۔ سوال مگر یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟۔

کہتے ہیں کہ ایک مچھلی پورے تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور حبِّ رسول میں نکلے ہوئے انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں چند

ایسی گندی مچھلیاں گھُس گئیں جنھوں نے اپنی مذموم حرکتوں سے ایک انتہائی پاکیزہ مقصد کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی اور جو پیغام ہم یورپ اور امریکہ کو دینا چاہتے تھے وہ ادھورا رہ گیا۔ محترم قمر الزماں کائرہ اور رحمٰن ملک صاحب اِس کا الزام کبھی نواز لیگ اور کبھی دینی جماعتوں پر دھرتے ہیں لیکن اپنی اداؤں پر غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ تحقیق کہ اگر حکومتِ پاکستان پہلے دِن سے ہی بھرپور طریقے سے میدانِ عمل میں ہوتی تو نہ دینی جماعتوں کو موقع ملتا اور نہ عوام کو احتجاج کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی لیکن حکومت تو اُن دنوں "زرداری بچاؤ" مہم پہ نکلی ہوئی تھی ۔اُسے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا سوائے اپنا وزیرِ اعظم بھی بچانے اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اعلیٰ عدلیہ سے مزید وقت حاصل کرنے ۔مانا کہ حکومت اُس وقت بہت مصروف تھی لیکن آج ؟۔آج تو اکابرینِ حکومت باہر نکل کر جلوسوں اور ریلیوں کی قیادت کر سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اِس کی بھی توفیق نہیں بخشی ۔اگر راجہ پرویز اشرف یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے ٹھنڈے ٹھار سیکرٹریٹ میں چند مخصوص لوگوں کے سامنے تقریر فرما کر اُنھوں نے حق ادا کر دیا تو یہ اُن کی بھول ہے کیونکہ معاملہ کسی ریمنڈ ڈیوس کو بصد عجز و نیاز اپنے زمینی خُداؤں کے سپرد کرنے کا نہیں کہ جس پر یہ قوم رو دھو کے چُپ ہو رہے گی بلکہ معاملہ اُس ہستی بر حق کا ہے کہ جس کے بارے میں ایک انتہائی گنہگار مسلمان کا بھی یہ ایمان ہے کہ "بعد از خُدا بزرگ توئی قصّہ مختصر" ۔اگر حکومتِ وقت یہ

سمجھتی ہے کہ آج کے پُر تشدد ہنگاموں کے بعد قصّہ ختم ہو جائے گا تو یہ اُس کی بھول ہے ۔یہ تو ابتداء ہے جس کی انتہا وہ خونی انقلاب بھی ہو سکتا ہے جس میں پتہ نہیں کتنے فرعون، نمرود، شداد اور قارون غرق ہو جائیں گے ۔یہ ہو نہیں سکتا کہ بات میرے نبی کی شان کی ہو اور اُن کے اُمتیوں کو کسی پل چین آ جائے ۔لاریب کہ اِس کو اپنے منطقی انجام تک پہنچنا ہی ہے خواہ اِس کے لیے مسلم اُمہ کو اپنے سارے حکمرانوں کا "جھٹکا" ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

آج کے پُر تشدد ہنگاموں کے مراکز کراچی، پشاور، اسلام آباد اور لاہور رہے۔باقی پورے مُلک میں بھرپور احتجاج کیا گیا لیکن کہیں بھی نہ تو تشدّد ہوا اور نہ ہی توڑ پھوڑ۔ کراچی میں واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ احتجاجی ریلیاں نکالنے والے اور تھے اور لوٹ مار کرنے والے کوئی اور۔ جن لوگوں نے بینک، اے ٹی ایم اور دوکانیں لوٹیں، وہ وہی لوگ تھے جنھوں نے کراچی کو مقتل گاہ بنا رکھا ہے ۔یہ وہی بھتہ خور اور ٹارگٹ کلر ہیں جن کا نہ دین سے کوئی تعلق ہے اور نہ حبِ رسول سے ۔اُنہیں سندھ کی نا اہل حکومت نے کھُل کھیلنے کا موقع فراہم کیا جس کا اُنھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ پشاور میں پہلے بھی بیشمار دفعہ ویڈیو سینٹرز اور سی ڈی شاپس پر توڑ پھوڑ ہوتی رہی اور اُنہیں بم دھماکوں سے اُڑایا جاتا رہا۔آج مذہبی انتہا پسندوں کو نسبتاً بہتر موقع ملا اور اُنھوں نے دو سینما گھر جلا دیئے ۔لیکن جس وقت

انتہا پسند یہ توڑ پھوڑ کر رہے تھے اُس وقت وہاں دور دور تک پولیس کا نام و نشان نہ تھا شاید پشاور کی ساری پولیس "بلور برادران" کے سینما گھر کی حفاظت پر مامور ہو گی کیونکہ احتجاجی جب وہاں پہنچے تو پولیس نے سیدھی فائرنگ کی جس سے چار افراد جاں بحق ہوئے جن میں اے آر وائی نیوز کا ایک ڈرائیور بھی شامل تھا۔۔۔ اسلام آباد میں احتجاج کرنے والے امریکی سفارت خانے کے سامنے جا کر احتجاج ریکارڈ کروانا چاہتے تھے جس کی اجازت نہیں دی گئی جس کی بنا پر پولیس سے جھڑپیں ہوئیں اور یہی صورتِ حال لاہور میں بھی تھی جہاں احتجاج کرنے والوں کو امریکی قونصلیٹ جانے سے روکا گیا ۔

یومِ عشقِ رسول پر مذہبی جماعتوں کا کردار ہر گز لائقِ تحسین نہیں تھا۔ کسی بھی قابلِ ذکر مذہبی شخصیت نے احتجاجی ریلیوں کی قیادت کرنے کی سرے سے زحمت ہی گوارہ نہیں کی اگر مذہبی جماعتیں اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ محسوس کرتیں تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ سوال یہ بھی ہے کہ جس قسم کا احتجاج ہماری سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے آج یومِ عشقِ رسول " پر کیا کیا وہ اُن کے لئے جائز اور مناسب تھا ؟۔ کم از کم آج کے دن" تو اُنہیں اپنی سیاسی دوکان داری چمکانے سے باز رہنا چاہیے تھا۔ احتجاج میں شامل ہر جماعت خواہ وہ مذہبی تھی یا سیاسی ، اُس کے کارکنوں نے اپنی اپنی پارٹیوں کے جھنڈے اُٹھائے ہوئے تھے۔ شاید وہ آج بھی اپنی اپنی عددی قوت کا مظاہرہ کرنے نکلے تھے۔ کیا ، قومی

ملّی اور دینی یکجہتی اسی کا نام ہے؟۔کیا ہم اقوامِ مغرب کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ مقصد خواہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو، ہم ایک لمحے کے لیے بھی اپنے فرقے کو بھول سکتے ہیں نہ جماعت کو؟۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پوری قوم کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے گھروں سے نکلتی اور ہمارے حکمران اور مذہبی و سیاسی لیڈر اُس کی رہنمائی کرتے لیکن یہاں تو یہ عالم تھا کہ سارے مذہبی اور سیاسی لیڈر اپنے گھروں میں استراحت فرما رہے تھے اور قوم شُتر بے مہار کی طرح مُنہ اٹھائے اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی۔

کی آنکھوں کی چمک دیدنی NGO'S آج سیکولر دانشوروں اور امریکی امداد پر پلنے والی ہے۔وہ اِس احتجاج کی ناکامی پر بہت مسرور ہیں۔ وہ پہلے تو دبے لفظوں میں احتجاج کی مخالفت کر رہے تھے کیونکہ معاملہ مذہبی جذبات کا تھا اِس لیے اُن کی زبانوں پر لکنت طاری ہو جاتی تھی۔لیکن اب تو اُنہیں موقع ہاتھ آ گیا ہے۔وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں وہ کھُل کر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالیں گے۔دست بستہ عرض ہے کہ کوئی بھی مسلمان نہ پہلے پُر تشدد احتجاج کا حامی تھا، نہ اب ہے۔لیکن جہاں تک اپنے جذبات کے اظہار کا تعلق ہے وہ ہر عاشقِ رسول کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔

جو لوگ اِس موقعے پر احتجاج کی بجائے اپنی زندگیوں کو اسلامی سانچے میں

ڈھالنے کی تلقین کرتے ہیں اُن کا فرمان بجا لیکن دست بستہ عرض ہے کہ اگر آج ہمارے اندر عشقِ رسول کی اتنی سی رمق بھی باقی نہیں بچی کہ ہم کسی شاتمِ رسول کی ناپاک جسارت پر تڑپ اُٹھیں تو پھر یہی کہا جا سکتا ہے کہ

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

یہ بات آج کے ذہین و فطین اور فہیم دانشوروں کی سمجھ میں تو نہیں آئے گی لیکن یہ جذبہ عشق ہی تو تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں کودنے پر مائل اور اپنے بیٹے کے حلقوم پر چھُری چلانے پر قائل کیا۔اِن لوگوں کے نزدیک تو ہر شئے کو ماپنے کا محض عقل ہی ایک پیمانہ ہے لیکن یہ بھی تو ہے کہ

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے

عشق بیچارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

ہمارا ایمان ہے کہ مسلمان خواہ کتنا ہی گُنہگار کیوں نہ ہو، اُس کے اندر عشقِ رسول کی آگ بہر حال روشن رہتی ہے۔دینِ اسلام پر پی ایچ ڈی کرنے والے ایک یہودی سکالر کا کہنا ہے کہ مسلمان خواہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو وہ اپنے نبی کا نام سُنتے ہی تڑپ اُٹھتا ہے ۔اسی بنا پر دینِ اسلام کو کبھی زوال نہیں آ سکتا۔یہ الفاظ دینِ اسلام کے بدترین دشمن کے ہیں لیکن حیرت

ہوتی ہے ایسے مسلمان دانشوروں پہ جو اپنے ماں باپ کی شان میں گُستاخی پر تو مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں لیکن جن پر ہماری جانیں ، مال ، اولاد اور والدین قُربان ، اگر اُن کی شان میں کوئی گُستاخی کرے تو یہ پند و نصائح کے دفتر کھول بیٹھتے ہیں۔

احتجاج ہمارا حق ہے

پروفیسر مظہر

کل یومِ عشقِ رسول منایا گیا لیکن کیا عشق کبھی دنوں ، مہینوں یا سالوں کا محتاج بھی ہوا کرتا ہے ؟۔کیا عشق ناپ تول کے کیا جاتا ہے یا اسے پیمانہ روز و فردا سے ماپا جاتا ہے ؟۔ عشق تو وہ جذبہ جاوِداں ہے جو ہو گیا تو بس ہو گیا۔ایک مسلمان کا عشق تو اُس لمحہ پاک سے ہی شروع ہو جاتا ہے جب نو مولود کے کان میں اللہ اکبر کی پہلی صدا گونجتی ہے۔ہم بھلے زندگی کی پُر خار راہوں سے گزرتے ہوئے اِس جذبہ.بر حق کو محسوس نہ کر سکیں لیکن جب ٹھوکر لگتی ہے تو بے اختیار زبان سے "یا اللہ" ہی نکلتا ہے جو علامت ہے اس امر کی کہ بھلے ہمارے اذہان کو طاغوت نے بھول بھلیوں میں ڈال رکھا ہے لیکن دلوں کو مسخر تو وہ کر چُکا جو خالق و مالکِ کائینات ہے۔ تحقیق کہ دلوں کی تسخیر کا دوسرا نام عشق ہی ہے جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔اِس لیے کسی ایک دن کو عشقِ الٰہی یا عشقِ رسول کے لیے مختص کر دینا سمجھ سے بالاتر ہے۔

کل جو کچھ ہوا وہ ایک سانحہ تھا۔ سوگوار فضائے وطن میں ہر طرف زہر سا گُھلا نظر آیا۔آگ اور خون کی یہ بارش اکیس گھروں میں صفِ ماتم بچھا گئی ، ہسپتال

زخمیوں کی آہ و بقا سے گونجتے رہے اور نبی کے متوالے شرمندہ شرمندہ۔ قصور مگر کس کا ہے؟ لاریب اُن حاکمانِ وقت کا جنھوں نے اپنی سیاسی مجبوریوں کی بنا پر یہ دن منانے کا اعلان تو کر دیا لیکن قیادت کی سعادت سے محروم رہے۔ قصور ہے اِن گُرگانِ باتمیز کا جنہیں زعم تو اٹھارہ کروڑ عوام کی نمائندگی کا ہے لیکن وقت آنے پر وہ اُنہیں بے مہار چھوڑ کر اپنے یخ بستہ محلوں میں استراحت فرماتے رہے اور اُن مذہبی رہنماؤں کا جو سرشاری عشقِ نبی کے دعوے تو بہت کرتے ہیں لیکن عمل دوسروں پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر خُدا انہیں توفیق دیتا تو وہ الیکٹرانک میڈیا پر جلوہ گر ہونے کی بجائے اِن جلوسوں کی قیادت کرتے۔ لیکن یہاں تو یہ عالم ہے کہ بزورِ نطق دلوں میں اترنے والے عالم ناپید اور اہلِ قلم مفقود ہیں۔ اگر یہ قحط الرجال نہ ہوتا تو کوئی تو ہوتا جس کی باتوں کی شبنمی ٹھنڈک سے دلوں میں دہکتے الاؤ کچھ ماند پڑ جاتے۔

وزیرِ اعظم صاحب نے چند مخصوص لوگوں کے سامنے ایک جذباتی تقریر تو کر ڈالی لیکن ان کی زباں کہیں بھی دل کی رفیق نظر نہ آئی۔ اُن کے لہجے میں وہ حدّت سرے سے موجود ہی نہیں تھی جو کسی عاشقِ رسول کے لہجے میں ہوتی ہے۔ وہ کردار کے غازی تو کجا، گفتار کے غازی بھی نہ بن سکے۔ لیکن ایک راجہ پرویز اشرف پر ہی کیا موقوف یہاں تو عالمِ اسلام کے سارے حکمران اسی رنگ میں رنگے

نظر آتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ کے دل و دماغ شدتِ غم سے مفلوج اور زبانیں سلگ رہی ہیں لیکن پھر بھی وہ چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں گھُسے بیٹھے ہیں۔ وہ عاقبت نااندیش اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اپنے زمینی خُداوں کی چوکھٹ پہ سجدہ ریزی میں ہی عافیت ہے۔ اگر اُن میں عزم صمیم ہو تو ہر قدم پر اک نئی راہگزر ملتی ہے۔ دُنیا کے پچپن فیصد صارف اسلامی ممالک میں بستے ہیں۔ دُنیا جہاں کی ہر نعمت ان کے پاس ہے۔ زمین نے اپنے سارے خزانے ان کے سامنے اُگل دیئے ہیں۔ ایٹمی طاقت یہ ہیں اور اہلِ مغرب کے سارے بنک ان کی دولت سے معمور ہیں۔ اگر یہ یورپ اور امریکہ کا معاشی بائیکاٹ کر دیں تو اُن کی معیشت یہ دھچکا سہہ نہ سکے، اپنی دولت واپس لے آئیں تو بنک دیوالیہ ہو جائیں، تیل کی ترسیل بند کر دیں تو کہرام بپا ہو جائے اور اگر اقوامِ متحدہ کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں تو امریکی دُھن پہ ناچنے والی اِس "نائیکہ" کا کوٹھا ویران ہو جائے لیکن یہ کعبے کے متولی تو اُن "ابابیلوں" کے انتظار میں ہیں جو آسمانوں سے اتر کر کعبے کو بچانے آئیں۔ تحقیق کہ کعبے کا مالک تو اپنے کعبے کو بچا ہی لے گا لیکن انہیں نشانِ عبرت بنانے کے بعد۔ اُس نے انہیں اپنے گھوڑے تیار رکھنے کا حکم دیا اور انہوں نے اپنے عشرت کدے سجا لیے۔

روس کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے بعد امریکی پالیسی سازوں نے کہا کہ عالم

اسلام ابھی باقی ہے۔ ٹیکساس کے تیل کے تاجر اور چرچ کے نمائندے بُش نے نائن الیون کے فوراً بعد "صلیبی جنگوں" کا اعلان کر دیا۔ لیکن ہماری حرماں نصیبی کا یہ عالم ہے کہ انہی صلیبی جنگوں میں ہم اُس کے اتحادی ہیں۔ لاکھوں مسلمان شہید کر دیئے گئے اور کروڑوں کو شہید کرنے کی منصوبہ بندیاں ہیں۔ لیکن ہر اسلامی ملک اپنے تئیں یہی سمجھتا ہے کہ اُس کی باری نہیں آئے گی۔ باری تو آئے گی البتہ عریاں حقیقتوں سے نظریں چُرانے اور ظلمتوں سے خوف کھانے والے کبھی سپیدہ ٔ سحر نمودار ہوتے نہیں دیکھ پائیں گے۔ اُن کی ہوسِ زر وزیست نے اُمتِ مسلمہ کو ذلتوں کے غارِ عمیق میں دھکیل دیا ہے اور اب تو یہ عالم ہے کہ ہر مرحلہ زیست پہلے سے کڑا، آغوشِ اُمید خالی، خوشبوئیں گریزاں، موجِ صبا خفا اور دامانِ رحمت دور بہت دور نظر آتا ہے۔ حالی نے کہا تھا

زندہ رہنے کی ہے ہوس حالی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

یہ بے حیائی کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے کہ آج دینِ مبیں طاغوت کی زد میں ہے اور ہمارا احتجاج بھی گراں گزرتا ہے۔ معاملہ اُس نبی مکرم کا ہے کہ جس کا ذکر ہی اتنا عطر بیز ہے کہ فضائیں آگہی کی خوشبو سے معطر ہو جاتی ہیں۔ لیکن الیکٹرانک میڈیا پر براجمان سیکولر دانشور مُنہ ٹیڑھے کرکے طنز و

تعریف کا طوفان اُٹھائے ہوئے ہیں۔انسانی جانوں اور املاک کے زیاں کا دُکھ تو سبھی کو ہے لیکن پاکستان میں ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا۔بینظیر کی شہادت پر پھوٹ پڑنے والے ہنگاموں میں اس سے کئی گنا زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا، کراچی میں ہر روز اس سے زیادہ لوگ ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوتے ہیں، پشاور میں خودکُش حملوں اور بم دھماکوں میں ہر روز شہادتیں ہوتی ہیں، کوئٹہ میں روزانہ ایسے سانحے رونما ہوتے ہیں اور وزیرستان میں ہر روز معصوم ڈرون حملوں کی بھینٹ چڑھتے ہیں لیکن سیکولر دانشوروں کی غیرت نے کبھی جوش مارا نہ نیوز چینلز پر ایسی ہاہاکار مچی جیسی اب دیکھنے میں آ رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کہیں یہ سب کچھ ایک منظم سازش کے تحت کیا جا رہا ہو ؟۔ تحقیق کہ آقا کی ذات سے منسوب اِس دن کے موقعے پر ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، ہر گز نہیں ہونا چاہیے تھا۔سوال مگر یہ بھی ہے کہ اِس کے پیچھے کون سے ہاتھ کارفرما تھے ؟۔ سارے یورپ اور امریکہ میں لوگ سفارت خانوں کے سامنے جا کر اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتے ہیں لیکن پاکستان میں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جو ان ہنگاموں کا بنیادی سبب بنا۔جب اسلام آباد کا امریکی سفارت خانہ اور لاہور اور کراچی کے قونصلیٹ پہلے ہی خالی کروا کر عملے کو محفوظ مقامات پر منتقل کیا جا چکا تھا تو پھر احتجاج کرنے والوں کو وہاں تک جانے کی اجازت کیوں نہیں دی گئی ؟۔

سچ کی کڑواہٹ

پروفیسر مظہر

سچ کڑوا ہوتا ہے، مگر جو قومیں سچ کی کڑواہٹ محسوس کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں، کامران بھی وہی ٹھہرتی ہیں۔ہمارے ہاں البتہ سچ کہنے کا حوصلہ ہے نہ سننے کا، جو تاریخی تلخیوں پر بات کرے وہ قنوطی اور مردم بیزار۔کڑوا سچ مگر یہی ہے کہ پاکستانی تاریخ کا مورخ اگر پاکستانی ہوا تو مارے شرم کے ایک باب بھی نہ لکھ پائے گا، یورپین ہوا تو تمسخر اُڑائے گا، بھارتی ہوا تو احساسِ تفاخر سے جھوم جھوم جائے گااور امریکی ہوا تو تاریخ لکھنے کی ہر گز زحمت نہیں اٹھائے گا کہ غلاموں کی بھی کبھی کوئی تاریخ ہوا کرتی ہے۔اہلِ دانش کہیں گے کہ یہ مایوس ذہن کی سوچ ہے جبکہ مایوسی کفر ہے اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا حکم حکمت کی کتاب میں درج ہے۔بجا مگر یہ حکمِ ربی فرما برداروں کے لئے ہے نافرمانوں کے لئے نہیں۔سوال مگر یہ ہے کہ ہم کتنے فرمابردار ہیں ؟۔ کسی ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل یا آئی آر آئی سے سروے کروانے کی ضرورت نہیں ، اپنے دلوں کی "ٹرانسپرنسی" سے سروے کروالیجیئے کہ میرے آقا کا حکم یہی ہے۔

قائدِ اعظم نے فرمایا "ہمیں زمین کا ایک ایسا ٹکڑا چاہیے جسے ہم اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکیں"۔ہم نے وہ ٹکڑا حاصل کرکے اُس میں سارے تجربے کر ڈالے سوائے اسلام کے۔بانی پاکستان نے 9 مارچ 1940ء کو ہفت روزہ "ٹائم اینڈ ٹائیڈ" کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا "اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات ہے جو صرف خُدا اور بندے کے تعلق تک ہی محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو پر محیط ہے"۔ہم نے صدارتی نظام اپنایا اور پارلیمانی بھی ، آمریت بھی دیکھی اور جمہوریت کے جلوے بھی ، سوشلزم کو اپنی معیشت قرار دیا اور سرمایا دارانہ نظام کے آگے زانوئے تلمذ تہ بھی کیا لیکن حصولِ پاکستان کی اس "اساس" کو کبھی آزمانے کی زحمت نہیں کی البتہ ہر آئین میں تمام قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا عہد ضرور کیا۔یہ الگ بات ہے کہ ان پینسٹھ سالوں میں کبھی اپنا یہ عہد نبھانے کا خیال نہیں آیا ۔شاید ہم اپنے تہیں اپنے رب کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ مختارِ کُل تو ایسی چیزوں سے بے نیاز ہے البتہ ہمارا شمار "نافرمانوں" میں ضرور کیا جاچُکا ہوگا۔شاید ہماری ذلتوں کا سبب بھی یہی ہے اور مایوسیوں کی وجہ بھی یہی۔

سوال یہ ہے کہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہے کون سا اور کس دن کو ہم احساسِ تفاخر کے ساتھ منائیں؟۔کیا 65ء، 71 ء اور کارگل کے معرکے یا پھر یومِ

تکبیر ؟۔ ستمبر 65ء کی جنگ ہم نے جنگی ترانوں کی گونج میں شروع کی لیکن محض سترہ دن بعد ہی "تاشقند" کی چوکھٹ پہ ناک رگڑنے لگے ، دسمبر 71ء میں آدھا ملک گنوا کر "سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے" گانے لگے ، معرکہ کارگل میں اپنے جری جوانوں کی لاشیں اُٹھانے کا موقع بھی نہ مل سکا، یوم تکبیر کے ایک خالق نے ٹی وی پر پوری قوم سے معافی مانگی دوسرا جلا وطن کر دیا گیا اور ایٹم بم ہم نے شب برات پر پھُل جھڑیوں کی جگہ چلانے کے لئے رکھ لیا۔جب اپنا ملک بچا نہ سکے تو افغانستان بچانے نکل کھڑے ہوئے اور اپنے آپ کو ایک ایسی اندھی جنگ میں جھونک دیا جس میں پچاس ہزار پاکستانی شہید کروانے کے بعد بھی ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ یہ جنگ ہماری ہے یا امریکہ کی ۔

زندہ قومیں اپنی پالیسیاں خود مرتب کرتی ہیں لیکن ہمارے پالیسی ساز غیروں کے محتاج ہیں۔شاید اسی بنا پر ہماری پالیسیوں میں استقامت کا فقدان ہے ۔ہم نے امریکہ کے اشارے پر طالبان کے ساتھ مل کر جہاد کی ٹھانی اور پھر اُسی کے حکم پر طالبان ہی کے خلاف تلوار اٹھا لی ۔امریکہ ہمارا اتحادی ہے لیکن رحمٰن ملک صاحب کہتے ہیں کہ بلوچستان میں غیر ملکی ہاتھ کارفرما ہے۔ظاہر ہے کہ یہ خفیہ ہاتھ امریکہ کا ہو سکتا ہے یا بھارت کا۔ اہلِ درد تو دہائی دیتے چلے آ رہے تھے کہ بلوچستان ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے لیکن حکمرانوں،

کو اپنی کرپشن چھپانے سے فرصت تھی نہ جرنیلوں کو امریکی جنگ لڑنے سے اور اب جبکہ حالات ایسے موڑ پر پہنچ چکے ہیں کہ کسی وقت بھی کوئی بھی سانحہ رونما ہو سکتا ہے، حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک رینگتی نظر نہیں آتی۔ یہ کوئی ڈھکی چھُپی بات نہیں کہ گریٹر بلوچستان کی تشکیل اور گوادر کی بندرگاہ پر قبضہ امریکہ کا دیرینہ خواب ہے۔آبنائے ہرمز، گوادر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جہاں دُنیا کا تینتیس فیصد تیل گزرتا ہے ۔امریکہ گوادر پر قبضہ کرکے آبنائے ہرمز پر کنٹرول اور ایران کا گھیراؤ کرنا چاہتا ہے جو اقتصادی میدان میں تیزی سے دُنیا پر چھاتے ہوئے چین کو کسی بھی صورت قبول نہیں ۔شاید یہی وجہ ہے کہ پاک چین دوستی میں متواتر دراڑیں پڑتی چلی جا رہی ہیں۔ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی خاطر امریکہ نے نواب اکبر بگٹی کو اپنے پٹھو مشرف کے ہاتھوں شہید کروا کر اپنے لئے آسانیاں پیدا کر لی ہیں۔ایک طرف وہ پاکستان کا سٹریٹیجک پارٹنر ہے تو دوسری طرف کابل میں "بلوچ لبریشن آرمی" نامی تنظیم کی نہ صرف بھرپور سرپرستی کر رہا ہے بلکہ اُنہیں پچاس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ بھی دی جا رہی ہے ۔یہی وہ نوجوان ہیں جو بلوچستان میں دہشت گردی، نسلی فسادات اور فرقہ واریت کے ذمہ دار ہیں۔ عین ممکن ہے کہ "مسنگ پرسنز" کے معاملات میں بھی اُن کا کسی حد تک ہاتھ ہو اور یہ ایک خاص منصوبے کے تحت ایجنسیوں کو بدنام کرنے کی سازش ہو۔

لاپتہ افراد کا الزام 2007ء سے براہِ راست خفیہ ایجنسیوں پر لگایا جا رہا ہے۔ چیف جسٹس صاحب نے فرمایا ہے کہ کچھ ٹھوس شواہد ایف سی کی جانب اشارے کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن فوج اور حکومت اِس سے صریحاً انکاری ہیں۔ اختر مینگل صاحب البتہ یہ ماننے کو تیار نہیں اور اُنہیں ماننا بھی نہیں چاہیے کیونکہ اُن کا گھر تو خونم خون ہے وہ اگر فوج اور حکومت کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کر رہے ہیں تو کچھ غلط نہیں کر رہے کیونکہ مقتدر تو وہی ہیں اور عوام کی حفاظت بھی اُنہیں کا فرض ہے۔ اگر حکومت یا فوج یہ سمجھتی ہے کہ اس میں بیرونی ہاتھ ملوث ہے تو پھر اُس ہاتھ کو تلاش بھی اُنہی نے کرنا ہے اختر مینگل صاحب نے نہیں۔ ناراض بلوچوں کو مطمعن کرنے اور اُن کے حقوق کی پاسداری ہی سے معاملات میں سلجھاؤ کی کوئی کرن نظر آ سکتی ہے۔ یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ حکومت اس میں ملوث نہیں ہے۔ ہمیں اختر مینگل جیسے محبِ وطن شخص کی اس آخری کوشش میں اُن کا بھرپور ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اِس کے بعد شاید ہمیں موقع نہ مل سکے۔ اُن کے چھ نکات کو شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات نہ سمجھا جائے۔ اُن کے سارے مطالبات بالکل درست ہیں اور کوئی ایک مطالبہ بھی ایسا نہیں جس میں پاکستانیت کی جھلک نظر نہ آتی ہو۔

ایک اور تاریخی فیصلہ

پروفیسر مظہر

یہ حیاتِ ارضی اور خُمارِ ہستی تو حباب و سراب اور نفس کے پُر فریب خوابوں میں لپٹی ہوئی نیند کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ نیند اُس وقت ٹوٹے گی جب "ایک ڈانٹ پڑے گی اور سب اکٹھے ہو جائیں گے" ۔تب ہو گی اُس زندگی کی ابتدا جس کو موت نہیں اور تبھی زمین پر جبر و استبداد کے پرچم لہرانے اور فساد کی فصل اگانے والوں کو الگ کر دیا جائے گا۔ وہ فریاد کریں گے کہ اے اللہ تو ہمیں بس ایک بار دُنیا میں بھیج دے ، ہمیں تیری قسم ہم پھر ایسا نہیں کریں گے ۔ لیکن جواب ملے گا کہ تحقیق کہ اگر ہم تمہیں ہزار بار بھی دنیا میں بھیجیں تو پھر بھی تم ایسا ہی کروگے جیسا پہلے کرتے آئے ہو۔

روزِ حشر کا علم تو سبھی کو ہے کہ خالقِ کائینات نے اِس ازلی صداقت کو ہر ذی روح کی لوح حافظہ پر محفوظ کرکے بھیجا۔ لیکن ہم نے شعور کی آنکھ کھولتے ہی اسے دماغ کے کسی تاریک گوشے میں محض اس لئے پھینک دیا کہ پتہ نہیں قیامت کب آئے گی لیکن حکمت کی کتاب میں تو درج ہے کہ "اے نبی ان سے پوچھو کہ یہ کس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے لئے تو وہی قیامت کا دن ہے جب ان کی

آنکھ کی پتلی پھر جائے گی"۔ اندازہ خود لگا لیجیئے کہ قیامت ہم سے کتنی دوری پر ہے ؟۔ لیکن ہمیں تو بس یہ پتہ ہے کہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"۔ گویا ہم نے اس عالم کی نیستی سے آگہی کے باوجود اسے ہستی پر ترجیح دیتے ہوئے امانت ، دیانت ، صداقت ، شرافت ، سبھی کچھ تیاگ کر یہ سمجھا کہ عبدِ جہالت اور ابنِ حماقت تو وہ ہے جو ہستی کو نیستی پر ترجیح دیتا ہے ۔اگر یہ سچ نہیں تو پھر یہ بتلا دیجئے کہ کتنے قلمکار ہونگے جن کی صحافت قوس و قزح میں سجی صداقت اور قلب و نفس سے نکلی دیانت کی امانت دار ہے ؟۔ کون ہے جس کا قلم لفظوں کی خوشبو سے غسل کر کے صداقتوں کے نورانی آنچل سے بدن پونچھتا ہے ؟۔ کس زور آور کے ہاتھ سے کمزور محفوظ ہے اور کس حاکم کا بدن پُرسش کے خوف سے لرزہ براندام ہے ؟۔شام کے سفر کے دوران امیر المومنین حضرت عمرؓ کو ایک خیمے کے باہر ایک بوڑھی عورت بیٹھی نظر آئی ۔آپؓ نے قریب جا کر پوچھا "کچھ خبر ہے ، عمرؓ کا کیا حال ہے ؟۔بڑھیا نے کہا" شام روانہ ہو چکا، خُدا غارت کرے، آج تک مجھے اُس کی طرف سے کچھ نہیں ملا "۔آپ نے کہا" اتنی دور کا حال عمر کو کیا معلوم "؟۔بُڑھیا نے جواب دیا "رعایا کا حال معلوم نہیں تو خلافت کیوں کرتا ہے "؟۔یہ سُن کر حضرت عمر بے اختیار رو دیئے اور معافی مانگی۔ لیکن ہمارے حکمرانوں کو تو اپنے پیٹ بھرنے سے ہی فُرصت نہیں ۔اگر وہ واقعی حکمران ہوتے تو کسی معصوم ملالہ کی کنپٹی میں سوراخ ہوتا نہ وہ سیاست کی بھینٹ چڑھتی۔

پوری قوم تو اس وحشت ، درندگی اور قابلِ نفرت فعل پر یکسو ہو ہی گئی تھی لیکن یہ ہمارے الیکٹرانک میڈیا کو قبول تھا نہ دانشوروں کو کیونکہ ایسا کرنے سے نہ الیکٹرانک میڈیا کے مالکانوں کا کاروبار چمکتا تھا اور نہ ہی اینکرز کی "ریٹنگ" بڑھتی تھی ۔ حصولِ مقصد کیلئے انہوں نے مذہبی جماعتوں کو ٹارگٹ بنایا۔ ہر قابلِ ذکر مذہبی رہنما نے اس وحشیانہ فعل کی بھرپور مذمت کی لیکن اینکرز کرید کرید کر متنازع سوالات کرنے لگے ۔ ابتداء میں مذہبی رہنماؤں نے طرح دینے کی بھرپور کوشش کی لیکن بالآخر "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق وہ بھی کھُل کر سامنے آ گئے۔ ہمارا یہ قومی المیہ ہے کہ ہم اپنی رائے فائق اور دوسرے کی فاسد سمجھتے ہیں اور ہمارے ہاں احترامِ رائے کی سرے سے کوئی روایت ہی نہیں جس کی بنا پر تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ملالہ یوسف زئی کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ متنازع ہوئی اور پھر یہاں تک کہا اور لکھا جانے لگا کہ "گُل مکئی کے نام سے لکھی جانے والی ڈائری دراصل اوسط ذہن کی مالک ملالہ نے نہیں بلکہ " اسی سکول کی ایک ذہین بچی نے لکھی تھی جسے ملالہ کے والد ضیاء الدین نے ملالہ کے نام سے منسوب کرکے دنیا کے سامنے افشاء کر دیا۔ ضیاء الدین کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کے غیر ملکی میڈیا سے مراسم تھے ۔ ایک غیر ملکی چینل کا نمائندہ چھ ماہ تک اس "کے ساتھ رہا اور ملالہ پر حملے کے بعد ضیاء الدین کی مالی حالت میں "خاصی تبدیلی

نظر آنے لگی ۔ مجھے ان الزامات کی صحت سے انکار ہے لیکن اگر یہ سب کچھ سچ بھی ہو تو پھر بھی کیا دنیا کا کوئی قانون یا ادیانِ عالم میں سے کوئی دین کسی بد فطرت کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ کسی معصوم کی جان کے درپے ہو جائے ؟۔ پھر میرا دین تو ہے ہی محبتوں ، رحمتوں اور شفقتوں کا دین ۔ مصحف مجید کا حرف حرف پڑھ لیجئے ، آپ کو کہیں ایسا درس نہیں ملے گا۔ یہ کام تو جنونی کر سکتے ہیں یا ایسے ضمیر فروش جو عیشِ دنیا کی خاطر اپنے ملک وملت ہی نہیں بلکہ دین و ایمان کا سودا بھی کر لیتے ہیں ۔

بات جب ضمیر فروشی اور عیش کوشی کی ہو تو پھر کیا جنونی اور کیا دہشت گرد ، اس حمام میں تو سبھی ننگے نظر آتے ہیں۔ یہاں تو قدم قدم پر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو آنکھ کی پتلی پھرنے سے پہلے " سب کچھ اپنی جھولی میں سمیٹنے کی تگ و دو کرتے نظر" آتے ہیں ۔ کل سپریم کورٹ نے اصغر خاں کیس کے مختصر فیصلے میں لکھا کہ 1990 ء کے الیکشن میں دھاندلی ہوئی ، جنرل (ر) اسلم بیگ اور اسد درانی نے بنکار یونس حبیب سے چودہ کروڑ وصول کرکے چھ کروڑ سیاست دانوں میں بانٹے اس لئے اُن کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے اور ایف آئی اے ایسے سیاست دانوں کے خلاف تفتیش کرے جنھوں نے رقومات وصول کیں۔ سپریم کورٹ نے یہ حکم بھی دیا کہ ایوانِ صدر ، آئی ایس آئی یا ایم آئی کا سیاسی سیل فوری طور پر ختم کیا جاتا ہے کیونکہ یہ حلف کی خلاف ورزی ہے جس پر

کارروائی ہونی چاہیے۔ جنرل اسلم بیگ، جنرل اسد درانی اور یونس حبیب کے اقبالی بیان تو سامنے آ چکے ہیں لیکن کسی بھی سیاسی جماعت یا سیاسی شخصیت نے رقم کی وصولی کا اقرار نہیں کیا البتہ جنابِ وزیرِ اعظم نے ہنگامی پریس کانفرنس کرتے ہوئے یہ یقین دہانی کروائی ہے کہ مجرموں کو کٹہرے میں لایا جائے گا۔ان کے اس بیان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ پاکستان میں ایسا کوئی رواج نہیں لیکن اگر ایسا ہو گیا تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ صبحِ اُمید کی نوید ہو گی۔ یونس حبیب نے جن اصحاب پر الزام لگایا ہے وہ یا کم از کم اُن میں سے بیشتر قوم کے نزدیک انتہائی محترم و معتبر ہیں۔اگر وہ واقعی مجرم ہیں تو پھر قوم کی آنکھیں کھولنے کے لئے انہیں کٹہرے میں لایا جانا ضروری ہے۔

پیپلز پارٹی کے ہاں جشن کا سا سماں ہے۔وہ اپنی تمام تر توانایاں میاں نواز شریف پر صرف کرکے اپنی سیاسی دوکان چمکانے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ یہ فیصلہ ان کے لئے بھی لمحہ ء فکریہ ہونا چاہیے کیونکہ جس یونس حبیب نے میاں نواز شریف پر پینتیس لاکھ کی وصولی کا الزام لگایا ہے اسی نے محترمہ بینظیر شہید کو بھی پانچ کروڑ دینے کا اقرار کیا تھا۔اگر میاں صاحب نے پینتیس لاکھ وصول کیے ہیں تو پھر بی بی شہید نے بھی کیے ہونگے۔رقم کے لین دین کے علاوہ اکابرینِ پیپلز پارٹی نے شاید سپریم کورٹ کا فیصلہ غور سے نہیں پڑھا جس میں صاف لکھا ہے کہ ایوانِ صدر میں سیاسی سیل کا قیام حلف کی خلاف ورزی ہے۔اب یہ فیصلہ جنابِ صدر کو کرنا ہے کہ وہ صدارت سے

استعفیٰ دے کر قوم کے پاس واپس آتے ہیں یا سیاست تیاگ کر محض صدر بننا پسند
فرماتے ہیں؟۔

ملک میں ہر جگہ خیریت ہی خیریت ہے

پچھلے ماہ گھریلو امور میں ایسے الجھی کہ الجھتی چلی گئی اور کاغذ قلم سے ناطہ ہی ٹوٹ گیا ۔جب الجھاؤ میں سلجھاؤ کے کچھ آثار نظر آنے لگے تو میں نے اپنی پرانی ڈگر پہ واپس آنے کی ٹھانی ، لیکن یقین مانیے کہ روٹھا ہوا قلم میرے اور کاغذ کے درمیان سدِ سکندری بن کے کھڑا ہو گیا۔ وہ الفاظ جو کبھی باندیاں بن کر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے ایسے طوطا چشم نکلے کہ ہمارے ڈال ڈال پھُدکنے والے یہ "پنچھی" سیاست دان بھی اُن کا پانی بھرتے نظر آئے۔ میں گھنٹوں بلکہ پہروں قلم ہاتھ میں تھامے ایک ، محض ایک جملے کی تخلیق کو ترستی رہی لیکن عبث ، سب بیکار۔ تب مجھے زندگی میں پہلی بار یہ ادراک ہوا کہ نثر بھی نظم کی طرح "آمد" کی محتاج ہے ۔ ہر ، کہ ومہ کے اندر جذبات ، احساسات ، تصورات اور تخیلات کا طوفان موجزن ہوتا ہے جو ، جب اپنی حدوں سے باہر نکلتا ہے تو آنکھوں کے راستے بہہ نکلتا ہے اور اظہار کا آسان ترین ذریعہ بھی یہی ہے جس میں "ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا ہو" کے مصداق

کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے

زبان اظہار کا دوسرا ذریعہ ہے جس میں بھلے شستگی اور شائستگی نہ ہو ، زبان

پہ لکنت طاری ہو لیکن پھر بھی اپنے جذبات دوسروں تک پہنچا ہی لیتی ہے لیکن مشکل ترین کام اپنے احساسات کو مربوط کرکے احاطہ تحریر میں لانا ہے، جہاں ہر ہر لفظ کو قلم سنبھال سنبھال کے لکھنا پڑتا ہے۔ایسا "آمد" کے بغیر ممکن نہیں کہ "آورد" میں بھیگی روکھی پھیکی تحریروں کا کوئی خریدار نہیں ہوتا۔

غالب نے تو کہا تھا کہ

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے میری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

لیکن غالب تو بس ایک ہی تھا، ہم جیسے عامیوں کو تو اپنی "رُکتی طبع" کی روانی کے لیے سو سو جتن کرنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر کاغذ قلم سے رشتہ استوار ہوتا ہے۔ میں نے، بھی سو پاپڑ بیلنے کے بعد یہ رشتہ اُستوار کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے ڈیڑھ ماہ بعد ایک دفعہ پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔معزز قارئین! السّلامُ علیکم کے بعد عرض ہے کہ ملک میں ہر جگہ خیریت ہی خیریت ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ خیریت نہیں ہے، وہ جھوٹ بولتا ہے، بکواس کرتا ہے۔ایسے قنوطی اور مردم بیزار لوگوں کو کان سے پکڑ کر ایوانِ صدر اور وزیرِ اعظم ہاؤس لے جانا چاہیے جہاں راوی عیش ہی عیش اور کیش ہی کیش لکھتے لکھتے تھک بلکہ "ہپھ" چُکا ہے۔اُنہیں "جاتی عمرہ" کا نظارہ کروانا چاہیے جہاں ہر وقت مور ناچتے، کوئلیں کوکتی اور پپیہے "پی کہاں" کی رٹ لگاتے رہتے

ہیں۔اُنہیں ساڑھے تین سو کنال پر مشتمل اُس محل کی سیر کروانی چاہیے جہاں ایک " انقلابی" ہر وقت غریبوں کی حالتِ زار پر نوحہ خوانی کرتا رہتا ہے۔سُنا ہے کہ اب اُس انقلابی کا یہ دعویٰ ہے کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اُس کا یہ دعویٰ بجا لیکن ضرب المثل ہے کہ "کبوتر با کبوتر باز با باز، کند ہم جنس باہم جنس پرواز "اور

میرے آقا نے تو چودہ صدیاں پہلے فرما دیا تھا کہ آدمی اپنے دوست کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ تم میں سے ہر کوئی دیکھ لے کہ کون کس سے دوستی رکھتا ہے۔ شنید ہے کہ اُس انقلابی نے بھی اپنے جیسے ہی محلوں اور ہوائی جہازوں کے مالک چُن لیے ہیں اور اب سبھی مِل کر آہ وزاریاں کر رہے ہیں۔

بات اُن ناہنجاروں کی ہو رہی تھی جو غربت کا رونا روتے رہتے ہیں۔اُنہیں وزیروں، مشیروں کے محلات اور بیوروکریٹس کی کوٹھیوں میں لے جایئے جو "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔اگر پھر بھی اُن کے دماغ کا خنّاس انہیں کچوکے لگانے سے باز نہ آئے تو اُنہیں مکافاتِ عمل سے بے نیاز اُن ریٹائرڈ جرنیلوں سے ملوا لایئے جو آج بھی "بلڈی

سویلین "کو حقارت سے "شٹ اپ یو ایڈیٹ" کہنا اپنا فرضِ عین سمجھتے ہیں۔
سُنا ہے کہ پاکستان میں غربت بہت ہے لیکن مجھے تو وہ کہیں نظر نہیں آتی۔آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، وہ تو یہ ہے کہ پیدل چلنے والے آدھا آدھا گھنٹہ سڑک پار نہیں کر سکتے، بازاروں میں رش کا یہ عالم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے، بڑے بڑے سٹوروں پر قطاروں میں لگ کر سامان لینا پڑتا ہے اور پٹرول پمپوں، سی این جی سٹیشنوں پر گاڑیوں کی میلوں لمبی قطاریں نظر آتی ہیں۔ پھر بھی یہ رونا کہ پاکستان غریب ملک ہے ؟۔اگر اِن بزرجمہروں کے نزدیک جھونپڑیوں میں رہنے، فُٹ پاتھوں پر سونے اور کھیتوں کی مٹی میں مِل کر مٹی ہو جانے والوں کی وجہ سے ملک میں ہر جگہ خیریت نہیں ہے تو میں اسے تسلیم نہیں کرتی کیونکہ گدھوں، گھوڑوں اور بیلوں کے ذمہ جو کام ہوتا ہے، وہی کرتے ہیں۔ڈھور ڈنگروں کو کوئی محلوں میں سجا کر نہیں رکھتا۔دیکھنا یہ ہے کہ پینسٹھ سالوں سے جن لوگوں کی ملکیت یہ ملک چلا آ رہا ہے وہ پہلے سے غریب ہوئے یا امیر ؟۔بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی امارت کو چار چاند لگ گئے ہیں اور حالت یہ ہے کہ ملکی بینک اُن کی دولت کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہیں اسی لیے تو اب وہ اپنی دولت غیر ملکی بینکوں میں محفوظ کرتے جا رہے ہیں۔

آفرین ہے اِن گدھوں، گھوڑوں اور بیلوں پر جن کی محنتِ شاقہ سے اُن کے آقاؤں کے محل روشن ہیں۔ کسی غریب کی کُٹیا میں اگر دیا نہیں جلتا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا ہوا جو شیر خوار دودھ نہ ملنے سے بلک بلک کر جان دے دیتا ہے، کوئی مزدور دوائی کی عدم دستیابی کی بنا پر اپنی جان ہار دیتا ہے، کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی اگر کوئی "ڈھول ڈنگر" کسی مرسیڈیز کے نیچے آ کر دم توڑ دے، کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا اگر کسی کو نانِ جویں بھی میسر نہ آئے کہ ایسی کسی بھی وجہ سے ترقی کا پہیہ تو نہیں رُک جائے گا۔ یہ عمر خطابؓ کا دور تو ہے نہیں کہ امیر المومنین اِس خوف سے اناج کی باری اپنے کندھے پہ اٹھائے بیوہ کے گھر کی طرف گامزن ہونگے کہ روزِ محشر اُنھوں نے اپنے گناہوں کا بوجھ خود اُٹھانا ہے۔ یہ تو ماڈرن سیکولر دَور ہے جس میں یومِ محشر کا کوئی تصور ہے، نہ مرنے اور مر کے پھر جی اٹھنے کا۔ یہ زمینی خُدا اگر اپنی زبان سے اقرار نہ بھی کریں تو پھر بھی ان کی جبینوں پہ یہ لکھا صاف نظر آتا ہے کہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کلامِ اقبال کے عملی نفاذ کی ضرورت

ہمارے بعض سیکولر دانشور اپنی تحریروں اور تقریروں میں قوم کو ہمیشہ یہی درس دیتے نظر آتے ہیں کہ ہم مجبور، بے بس، لاچار اور کمزور ہیں اس لیے غیرت و حمیت کو بے شرمی اور بے حمیتی کی لوری سُنا کرسُلا دینا چاہیے کیونکہ زمینی خُداؤں کی چوکھٹ پہ سجدہ ریزی میں ہی عافیت ہے۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا ایٹمی قوتیں بھی کمزور ہوا کرتی ہیں؟۔ اگر ایک لمحے کے لیے یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ ہم کمزور ہیں تو پھر بھی ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبال نے تو درسِ خودی اُس وقت دیا تھا جب مسلمانانِ ہند مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گرے ہوئے تھے ۔انھوں نے فرمایا

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

☆

تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

ہمارے یہ دانشور کہتے ہیں کہ جہاں عقل کا دروازہ نہیں کھلتا وہیں غیرت کی

بات کی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک عقل کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ہم اپنی غیرتوں کو امریکی" شراب پلا کر مدہوش کر دیں۔ حیران ہوں کہ اسی کمزوری کا حوالہ دے کر" پرویز مشرف ڈراتا تھا اور اسی کمزوری کی بات موجودہ حکمران کرتے ہیں۔ جبکہ ملکی حفاظت پر مامور ہمارے دفاعی سائنس دان اپنی بھرپور اور توانا آواز میں ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دفاع نا قابلِ تسخیر ہے، جس کی کبھی تردید سامنے نہیں آئی۔ طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ پوری دنیا ہمارے ایٹمی پروگرام سے خائف ہے اور ہم پوری دنیا سے۔ 40 سال ہونے کو آئے ہم نے بھوکے رہ کر اپنا سب کچھ ملکی دفاع کے لئے قربان کر دیا اور اب جب کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے قابل ہوئے تو امریکہ کو خُدا مان لیا۔ ایٹم بموں، ایٹمی میزائیلوں اور آب دوزوں سے لیس دنیا کی بہترین جری فوج رکھنے والے بزدل حکمرانوں کے لئے ہی شاید علاّ مہ اقبال نے کہا تھا

مجھے روکے گا تو اے ناخُدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو، ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

یہ تو تاریخ کا ایک معمولی طالبِ علم بھی جانتا ہے کہ جس زمانے میں اقبالؒ نے شاعری شروع کی اس وقت مسلمانانِ ہند انتہائی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مایوسیوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو کوئی ایسا روزن بھی نظر نہیں آتا تھا جس سے امید کی کوئی کرن آتی۔ اس دورِ ابتلا میں بھی ترجمانِ حقیقت

حضرتِ اقبال نے فرمایا

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

انہوں نے سرزمینِ ہند کے مسلمانوں کو درسِ بیداری دیتے ہوئے فرمایا

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفان بھی ہے

☆

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

☆

کانپتا ہے دل ترا اندیشہء طوفاں سے کیا
ناخدا تُو، بحر تُو، کشتی بھی تُو، ساحل بھی تُو

لیکن دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ ہم کمزور بھی نہیں لیکن پھر بھی صرف "دشمنوں

کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ " سے مرے جا رہے ہیں۔ آج اگر اقبال زندہ ہوتے تو شرمندہ ہوتے کہ انہوں نے اپنی عمرِ عزیز ایسے لوگوں کے لئے صرف کر دی جو غیرت کا درس دینے والوں کو طنزیہ انداز میں "غیرت بریگیڈ" اور "غیرت لابی" جیسے ناموں سے پکارتے ہیں۔ شائد ایسے ہی دانشوروں اور حکمرانوں کے لئے حضرتِ اقبالؒ نے نظم " غلام قادر روحیلہ " لکھی تھی۔ جس میں بتلایا گیا ہے کہ غلام قادر روحیلہ نے تیموری شہزادیوں کو اپنے سامنے ناچنے پر مجبور کیا اور پھر تھوڑی دیر بعد وہیں پلنگ پر خنجر سرہانے رکھ کر لیٹا اور سو گیا کچھ دیر تک سوتے رہنے کے بعد وہ اٹھا اور انتہائی افسوس سے کہنے لگا کہ اس نے تو سونے کا محض بہانا کیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا کوئی شہزادی اسے غافل سمجھ کر اسے اسی کے خنجر سے قتل کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے یا نہیں ؟۔ لیکن کسی شہزادی کی غیرت و حمیت نہیں جاگی اور

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر

حمیّت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے

آج یہی حال ہمارا ابھی ہے۔ ڈرون حملے ہو رہے ہیں، سینکڑوں ریمنڈ دندناتے پھر رہے ہیں، سرحدی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں، اور ہم ؟۔۔۔ ہم جو ڈرون گرا سکتے ہیں، ریمنڈوں کی گردنیں اتار سکتے ہیں، اور دشمنوں کو دندان شکن جواب دے سکتے ہیں لیکن کچھ نہیں کرتے کہ

" حمیت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے "

افکارِ اقبال کی بہ اندازِ حکیمانہ نفی کرنے والے اِن دانشوروں کو کم از کم اخلاقی لحاظ سے تو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس ارضِ پاک کو اپنا ٹھکانہ بنائیں کیونکہ یہ اقبال ہی تھے جنھوں نے عروقِ مُردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑایا اور مسلمانانِ ہند کو ایک نظریے پر اکٹھا کیا۔ یہ انہی کا خواب تھا جسے بابائے قوم نے حقیقت کا روپ بخشا۔ قائد نے 24 مارچ 1940ء کو قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد بے ساختہ فرمایا "اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے"۔ لیکن جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اسے دیکھ کر تو بے ساختہ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ "اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو کتنے دُکھی ہوتے"۔

دہشت گرد کون۔۔۔۔؟

پروفیسر مظہر

پچھلے دنوں میرے دل کے بہت قریب ایک کالم نگار دوست میرے گھر تشریف لائے ۔اُن کے پاس انٹرنیٹ سے حاصل کی گئی ملالہ کی ڈائری ااور سلگتے ذہن میں سوالات کا طوفان تھا۔انھوں نے کاپی میرے سامنے پھینکتے ہوئے کہا" بتائیں ملالہ نے اس میں کون سی قابلِ اعتراض بات لکھی ہے "؟۔میں نے کہاکہ میں نے کب کہاکہ ملالہ نے کچھ غلط کہا ہے۔میں نے تو لکھا تھاکہ ایسی خبروں کی تردید ہونی چاہیے جن کے مطابق ڈائری ملالہ نے نہیں بلکہ کسی دوسری طالبہ نے لکھی تھی جسے ملالہ کے والد ضیاء الدین یوسف زئی نے ملالہ کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا۔ضیاء الدین کے غیر ملکی میڈیا کے ساتھ تعلقات تھے اور ایک غیر ملکی نمائندہ چھ ماہ تک اُسکے ساتھ رہا۔ملالہ پر حملے کے بعد اُس کے والد کی مالی حالت یکلخت تبدیلی دیکھنے میں آئی اور ملالہ کہتی ہے کہ داڑھی کو دیکھ کر مجھے فرعون یاد آ جاتا ہے۔ملالہ سے منسوب اِن خبروں کی آج تک تردید نہیں ہوئی۔

محترم دوست کو اعتراض تھا کہ ملالہ کے ساتھ عافیہ صدیقی اور ڈرون حملوں کو

کیوں نشتی کیا جا رہا ہے ؟ ان کا فرمان تھا کہ "فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص" ۔۔۔ میں ایسی شاعرانہ توجیحات کا قائل تو نہیں پھر بھی دست بستہ عرض کیا کہ محترم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں"۔مزید یہ کہ اگر ایک وحشیانہ اقدام کی بنا پر قوم کے پچھلے سارے زخم ہرے ہو جاتے ہیں تو کسی کو کیا اعتراض ہے ؟۔اگر ملالہ کے غم میں ٹسوے بہانے والے اوبامہ کے ڈرون اس سانحے کے اگلے ہی دن سکول کے اٹھارہ طالب علموں کی جان لے لیتے ہیں تو اس چنگیزیت کا ذکر کرنے میں کیا قباحت ہے ؟۔اگر اقوامِ متحدہ "ملالہ ڈے" مناتی ہے تو باجوڑ سکول کے اُن ہی معصوموں کا "ڈے" کیوں نہیں جنہیں ڈرون نگل گیا؟۔ملالہ بھی ہماری اور وہ معصوم شہید بھی ہمارے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ربِ کردگار کے کرم سے ملالہ زندگی کی طرف لوٹ آئی۔لیکن جن ماؤں کی کوکھ اجڑ گئی انہیں چنگھاڑتے درندے یہ پیغام دے رہے ہیں ۔

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا

ملالہ پر حملہ کس نے کیا، کیوں کیا اور کس مقصد کے لیے کیا؟۔یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب آنے والا وقت ہی دے سکتا ہے لیکن اگر مشام تیز ہو تو بہرحال کچھ اندازے ، کچھ تخمینے تو لگائے ہی جا سکتے ہیں۔

محترم کو یہ بھی گلہ تھا کہ مذہبی جماعتوں کے علماء طالبان اور خود کش حملوں کی مذمت نہیں کرتے۔ عرض ہے کہ تمام مکاتبِ فکر کے جید علماء بہت پہلے یہ فتویٰ دے چکے ہیں کہ خود کش حملے حرام ہیں۔یہی نہیں بلکہ افغانستان پر روسی جارحیت کے دوران القاعدہ نے خود کش حملوں کو "حرام موت" قرار دے کر مسترد کر دیا تھا البتہ کہیں بھی افراتفری پیدا کرنے کے لیے خود کش حملے اور ٹارگٹ کلنگ امریکہ کا یہ پسندیدہ ترین کھیل ہے۔نامور تجزیہ نگار سپنزک نے فارن پالیسی میگزین میں لکھا "پہلے خود کش پیدا کرو پھر اُن کے خلاف حملہ آور ہو جاؤ۔یہ ایک سادہ ، محفوظ اور کم خرچ طریقہ ہے۔یہ بڑے پیمانے پر ہلاکتوں اور نقصان کی گارنٹی دیتا ہے۔مرنے کی وجہ سے خود کش بمبار کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا اور میڈیا اور عوام پر اس کا گہرا اثر بھی پڑتا ہے"۔ سابق امریکی اسسٹنٹ سیکرٹری خزانہ پال گریگ رابرٹ نے "کاؤنٹر پنچ" میں لکھا" افغان جنگ کا اصل مقصد مزید دہشت گرد پیدا کرنا ہے کیونکہ امریکہ حکومت کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے دائرے کو وسعت دینے کے لیے مزید دہشت گرد اور مزید دہشت گردی درکار ہے"۔سوال مگر یہ ہے کہ امریکہ یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہے ؟اس کا جواب خود معروف امریکی معیشت دان پال بی فریل نے یوں دیا ہے "امریکی معیشت نہ زرعی ہے نہ صنعتی پیداوار کی۔آؤ ہم ایماندار بن جائیں اور یہ اعلان کریں کہ ہماری معیشت غیر اخلاقی ، مجرمانہ ، غضب ناک ، دھماکہ خیز اور انتہائی ظالمانہ جنگوں کی معیشت ہے ۔ہمیں جنگوں کی ضرورت اور جنگوں

سے پیار ہے۔جنگ ہمارے لیے تورات اور انجیل ہے"۔اگر اس امریکی ذہن کو مدِ نظر رکھا جائے تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کراچی اور کوئٹہ میں ٹارگٹ کلنگ کبھی بند نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ امریکی پالیسی کا حصّہ ہے اور ان مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے امریکہ نے حسین حقانی کے ذریعے سی آئی اے کے تین ہزار کارندے پورے پاکستان میں پھیلا رکھے ہیں۔یہ وہی حسین حقانی ہیں جنھیں میموگیٹ کمیشن غدار قرار دے چکا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ امریکہ نے ویت نام میں بھی ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے بڑے بڑے لیڈروں کو ٹارگٹ کرکے افرا تفری پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔جب ریٹائرڈ ایڈمرل لارڈ فشر تک یہ کہتے ہوں کہ 'جنگ میں اعتدال بیوقوفی ہے کیونکہ اس کا جوہر تشدد ہے"۔تو پھر نام نہاد طالبان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا بھی سمجھ میں آتا ہے ۔ایسا امریکہ لیبیا میں بھی کر چکا ہے۔جہاں اُس نے القاعدہ کے ساتھ معمر قذافی کے خلاف گٹھ جوڑ کیا۔ہیلری کلنٹن نے القاعدہ کے اتحادی اسلامک فائٹنگ گروپ کے رہنما محمود جبریل سے ملاقاتیں کیں ، القاعدہ کے رہنماؤں ابو اللیث ، ابو خراج ، سفیان بن قومو اور عبد الحکیم الحاسوی کو قذافی کے ساتھ لڑنے کے لیے ڈھیروں ڈھیر امریکی اسلحہ دیا گیا۔سفیان بن قومو القاعدہ کا وہ رہنما ہے جو گوانتاموبے جیل میں چھ سال گزار بھی چکا ہے۔عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ کی دوستی اور دشمنی

خالصتاً اُس کے ذاتی مفاد سے وابستہ ہوتی ہے۔اس لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ وہ اپنے زر خرید غلاموں کو طالبان کا روپ دے کر یہ سب کچھ خود ہی کروا رہا ہو۔ سبھی کو یاد ہے کہ 24 مارچ 2006ء کو پاک فوج نے عسکریت پسند نیک محمد سے امن معاہدہ کیا اور امریکہ نے 18 جون 2006ء کو اسے ڈرون حملے میں مار دیا۔30 جون 2006ء کو عسکریت پسندی کے مکمل خاتمے کے لیے معاہدہ ہونے والا تھا لیکن اسی دن امریکہ نے باجوڑ میں سکول پر ڈرون حملہ کرکے 80 بچے شہید کر دیئے اور یہ معاہدہ نہ ہو سکا۔کسے نہیں معلوم کہ سوات میں مولوی فضل اللہ کا گروپ ہی دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہے اور فضل اللہ کابل میں سی آئی اے کی پناہ میں ہے اس لیے اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ملالہ پر حملہ امریکی سازش کا حصہ ہے تو کچھ غلط بھی نہیں ہے۔میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ طالبان کے کئی نہیں بلکہ صرف دو گروپ ہیں۔ایک وہ جو افغانستان میں ملّا عمر کی سربراہی میں نیٹو افواج کو ناکوں چنے چبوا رہا ہے اور دوسرا وہ جو امریکی سرپرستی میں پاکستان میں دہشت گرد کارروائیوں میں ملوث ہے۔یہ نام نہاد طالبان کا وہی گروپ ہے جس کا دین سے کوئی تعلق ہے نہ ملک وملت سے۔یہ وہی گروپ ہے جس سے ملّا عمر کئی بار لاتعلقی کا اظہار کر چکے ہیں۔اس لیے دست بستہ عرض ہے کہ مذہبی جماعتوں کو رگیدنے اور نشانہ تضحیک بنانے کی بجائے ان ہاتھوں کو تلاش کریں جو فساد کی جڑ ہیں۔

حسینؑ ! تیرے لہو کی خوشبو

جوں جوں "یومِ عاشور" قریب آتا جا رہا ہے ، خوف کے گھنے سیاہ بادل پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لیتے چلے جا رہے ہیں ۔ کربلا کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے خودکُش حملوں ، بم دھماکوں ، انسانی لوتھڑوں اور آگ اور خون کی بارش کے سوا کوئی خبر ہی باقی نہیں بچی۔ گھر گھر میں صفِ ماتم بچھی ہے اور در در پہ نوحہ خوانی۔ جو بچ رہے اُن کے در و دیوار پہ بھی "اُداسی بال کھولے سو رہی ہے" ۔

آئینِ خُداوندی تو یہی ہے کہ وہ انسانوں کو اختلاف کا حق بھی دیتا ہے اور مہلت بھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو روزِ ازل ابلیس کو اختلاف کی اجازت ملتی نہ فرعون ، شداد اور نمرود کو ایک لحظے کی مہلت۔ جب اُس تخلیق کارنے تو ہر انسان کو اختلاف کا حق دے کر بھیجا تو پھر ہمیں اپنے افکار ، نظریات اور تصورات بزورِ بازو دوسروں پر ٹھونسنے کا کیا حق پہنچتا ہے ؟۔ لیکن ہم تو اسے اپنا مذہبی فریضہ گردان کر اخوت و محبت اور رواداری کی بجائے نفرت ، منافرت اور جبر و تشدد کا درس دینے لگے۔ جب سبھی کا اللہ ، رسول اور قُرآن ایک ہے تو پھر یہ نفرت و منافرت کیوں ؟۔ کیا یہ قُرآن و حدیث میں لکھا ہے یا فقہ کی کسی کتاب میں کہ اگر معاملاتِ دیں پر کوئی دینی بھائی آپ سے اختلاف کرتا ہے

تو اُسے کافر کہنا یا قتل کرنا جائز ہے؟۔ البتہ حکمت کی کتاب یہ ضرور کہتی ہے کہ جس نے بِلا وجہ کسی ایک شخص کا قتل کر دیا اُس نے گویا پوری خدائی کو قتل کر دیا۔ ہم تو عامی ہیں اور ہمارا دینی علم واجبی لیکن ہمارے علمائے کرام تو ماشاء اللہ بحرِ علمِ دیں کے شناور ہیں۔ وہ تو جانتے ہی ہونگے کہ صرف شرک، زنا اور خونِ ناحق ہی ایسے " کبائر" ہیں جن پر ربِّ کردگار سب سے زیادہ غضبناک ہوتا ہے۔ تو پھر یہ شیعہ سُنی فسادات اور فرقہ واریت کے دہکتے الاؤ کیوں؟۔ پھر یہ مخمصہ کیوں کہ فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھنے والوں میں سے کسے شہید کہا جائے؟۔ شیعہ کو یا سُنّی کو؟۔

اُدھر حاکمانِ وقت کے نِت نئے بیانات سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پوری قوم پر اَن دیکھی، اَن جانی جنگ مسلّط کر دی گئی ہو اور بد نصیبی کی انتہا یہ ہے کہ اِس جنگ کے متحارب گروہوں کے سالار عُلماء کرام ہی ہیں حالانکہ اگر احکاماتِ الٰہی کو مدِّ نظر رکھا جائے تو تمام فرقے اپنے اپنے عقائد پر قائم رہتے ہوئے بھی باہمی احترام، محبت اور اخوت کا رشتہ استوار رکھ سکتے ہیں۔

بصد ادب اہلِ تشیّع سے سوال ہے کہ کیا حسینؓ صرف اُنہی کے ہیں، کسی اور کے نہیں؟۔ اگر وہ سبھی کے سانجھے ہیں تو پھر یہ تفریق کیوں؟۔ اگر تقلید کی بجائے

تحقیق کی جائے تو اسلامی تاریخ تو یہ بتلاتی ہے کہ

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی

بو بکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ

ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی

کچھ فرق نہیں اِن چاروں میں

خُلفائے راشدین کے ہاں تو اخوت، محبت اور یگانگت کے ساتھ ہی ساتھ خانوادہ رسول کا احترام اپنی انتہاؤں کو چھوتا نظر آتا ہے لیکنا نتہائی معذرت کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ہمارے علمائے کرام کی ہی دین ہے جو ہم نے "یارانِ نبی" ہیں بھی تفریق و تقسیم کر کے اتنی دوریاں پیدا کر دیں جو ہر روز ایک نئے کربلا کو جنم دیتی ہیں۔

ایک دفعہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے بیٹے اور حضرت حسینؓ کھیل رہے تھے۔ کھیل کے دوران اُن کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تو حضرت امام حسینؓ نے کہا "ہٹ غلام زادے" ۔حضرت عمرؓ کا بیٹا بسورتا ہوا اپنے باپ کے پاس پہنچا۔اُس نے شکایت کی کہ حسینؓ نے اُسے غلام زادہ کہا ہے۔جب امیر المومنین نے یہ سُنا تو فرمایا "بیٹے بھاگ کے جا اور حسینؓ سے یہ لکھوا لا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا کہا بھول جائیں اور ہم اِس سعادت سے محروم رہ جائیں"۔ یہ

بھی تاریخ بتلاتی ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے جگر گوشوں، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو عین اُس وقت امیر المومنین حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر مامور کیا جب شر پسند اُن کی جان کے درپے تھے۔ اُس وقت حضرت علیؓ نے اپنے جگر گوشوں کی جان کی ہرگز پرواہ نہیں کی۔تاریخ یہ بھی بتلاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے متعدد بار برملا یہ کہا " اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ تو ہلاک ہی ہو گیا ہوتا"۔ لیکن ہم نے اخوت و محبت کے سارے درس بھلا کر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو ہی خدمتِ دیں سمجھ لیا۔کیا خونِ حسینؓ سے رنگین کربلا کی مٹی کا یہی درس ہے؟۔ شاعر نے کہا:۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

لیکن ہم ہر سال اپنوں کو ذبح کرکے کربلا کی یادیں تازہ کرتے اور اسلام کو " زندہ " کرتے رہتے ہیں۔حالانکہ تب تو حسینیت کے مقابل یزیدیت تھی لیکن اب؟۔۔۔اب تو ہر جانب حسینیت ہی حسینیت ہے۔ کون بد بخت ہے جو خانوادہ رسولؐ سے پیار نہیں کرتا اور کون مردود ایسا ہے جو یزید کو لعین نہیں کہتا یا اُس سے نفرت کا کھُلم کھلا اظہار نہیں کرتا؟۔جب اِس سانحہ عظیم پر ہر چشمِ مسلم اشکبار ہے تو پھر یہ فساد فی الارض کیوں؟۔پھر یہ کس کا اسلام ہے جو صرف اپنوں کا خون بہا کر ہی زندہ ہوتا ہے؟۔

حضرت امام حسینؓ نے طاغوت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ یہ جنگ کسی صورت میں نہیں جیت سکتے ، اُنھوں نے نانا کے دین کی سرفرازی کے لیے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے پورے خاندان کی شہادت قبول کر لی لیکن فسق و فجور کے آگے جھکنا گوارا نہ کیا۔کیا حسین ابنِ علیؓ نے اپنی جان اُمتِ مسلمہ کو جوڑنے کے لیے دی تھی یا توڑنے کے لیے ؟۔اگر جوڑنے کے لیے اور لاریب کہ جوڑنے کے لیے ہی دی تھی ، تو پھر ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے ہم ہی خونِ حسینؓ کی خُوشبو نہ پہچان سکے اور نہ ہی یہ جان پائے کہ کربلا کی مٹی میں کیا درس پنہاں ہے۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سبھی مل کر یومِ حسینؓ مناتے (خواہ اپنے اپنے طریقے سے ہی مناتے)اور وہی جذبہ خُلفائے راشدین کے دن مناتے وقت بھی نظر آتا لیکن ایسا ہوا نہیں اور نہ ہی ایسا ہوتا نظر آ رہا ہے جو لائقِ تحسین تو خیر کیا ہوگا البتہ جگ ہنسائی کا باعث ضرور ہے اور دیگر ادیانِ عالم کے طنز و تعریض کا سبب بھی ۔ ہمارے یہ دینی اختلافات ہی ہماری بربادیوں کا باعث ہیں جن سے ہمارا دشمن بھی بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔اسی فرقہ واریت کو بہانہ بنا کر پتہ نہیں را، موساد اور سی آئی اے کے کتنے ایجنٹ اپنی مذموم کارروائیوں میں مصروف ہیں لیکن ہم اُنہیں اپنا کھُلا دشمن بھی قرار نہیں دے سکتے کیونکہ حرف تو ہماری اپنی ذات پہ بھی آتا ہے۔

کسے ووٹ دوں ؟

پروفیسر مظہر

خلیل جبران نے کہا"ترس کھاؤ اُس قوم پر جو نئے حکمرانوں کا شہنائیوں سے خیر مقدم کرتی اور انہیں آوازے کس کر رخصت کرتی ہے "۔ہمارا مگر چار عشروں سے وطیرہ ہی یہی ہے اور جمہوری تاریخ "آوے ای آوے" اور "جاوے ای جاوے" کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے۔ہم نے اپنے ہی منتخب کردہ ہر حکمران کی آمد ہی نہیں بلکہ رخصت پر بھی بھنگڑے ڈالے ، مٹھائیاں بانٹیں لیکن ایک لحظے کے لیے بھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ قصور کس کا ہے؟ ۔ حکمرانوں کا یا ہماری چشمِ انتخاب کا ؟۔کیا یہ عین حقیقت نہیں کہ ہماری نظروں میں ہمیشہ وہی جچتا رہا جو ہماری ہر ناجائز خواہش کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو ؟۔کیا ہم شرفاء پر آوازے کستے اور اُنکی ضمانتیں تک ضبط نہیں کروا دیتے ؟ ۔ جنرل منٹگمری نے کہا تھا "اگر کسی قوم کے پاس ایٹم بم نہیں تو کوئی بات نہیں لیکن اگر نظریہ نہیں تو وہ قوم زندہ نہیں رہ سکتی"۔ہمارے پاس ایٹم بم تو ہے لیکن ہماری نگاہِ انتخاب ہمیشہ ایسے حکمرانوں پر پڑی جنہیں اپنے ایٹمی قوت ہونے کا ادراک ہوا نہ احساس۔ نظریہ بھی ہے لیکن "نظریہ ٔ ضرورت" ۔جس کا ہم اپنی تشنہ خواہشات کی تکمیل کے لیے ووٹ کے ذریعے بخوبی استعمال کرتے

ہیں،اور حکمران ذاتی خزانے کی آبیاری کے لیے ۔اسی نظریہ ضرورت کا موسم ایک بار پھر قریب آ لگا ہے اور اُمید واثق ہے کہ تاریخ ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دہرائے گی کیونکہ تاریخ کا سب سے بڑا سبق تو یہی ہے کہ تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا ۔لیکن برنارڈ شا کہتا ہے "ماضی کی غلطیوں پہ رونا مضحکہ خیز ہے کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے"۔

ہم اگر برنارڈ شا کی بات مان کر ماضی کی غلطیوں پہ رونا دھونا چھوڑ کر اپنے سدھار کے لیے تیار ہو بھی جاتے ہیں تو پھر بھی یہ سوال دامن گیر ہے کہ کسے ووٹ دیں؟۔ سیانے کہتے ہیں کہ "آزمودہ را آزمودن جہل است"۔تو پھر کیا پیپلز پارٹی کو جس کی تاریخ سقوط ڈھاکہ "سے ہوتی، عقوبت خانوں کی سیر کرواتی، نتھ فورسوں سے روشناس کرواتی" اور بے دریغ سیاسی قتل کرواتی ہوئی کرپشن کی انتہاؤں تک آن پہنچی ہے ۔یورینیم کی افزودگی کو 95 فیصد سے 5 فیصد تک لانے کی کوشش، سکھوں کی فہرستیں انڈیا کو پہنچانے اور ایٹمی پراگرام "کیپ" کرنے کی سعی جیسے الزامات اس کے علاوہ ہیں۔ پیپلز پارٹی اسغر خاں کیس کا شور تو بلند آہنگ سے مچاتی ہے لیکن آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حید گل کے بارے میں خاموش ہے جو سینہ تان کر کہتے ہیں کہ وہ آئی جے آئی کے خالق ہیں ۔وہ معدد بار بتا چکے ہیں کہ ان کا اوپن کورٹ ٹرائل کروایا جائے وہ ثابت کر دیں گے کہ آئی جے آئی کی تشکیل وقت کی ضرورت تھی ۔ لیکن پیپلز پارٹی یہ

"

رسک " کبھی نہیں لے گی کیونکہ بہت سے رازوں سے پردہ اٹھنے کا خطرہ ہے۔یہ وہی پاکستان کھپے " حکومت ہے جس نے قوم سے سب کچھ چھین لیا سوائے اکھڑتی سانسوں " کے ۔جس کے 1700 دن قوم نے انگلیوں پر گن گن کر گزارے اور اگلے سو، سوا سو دن گزارنا محال بلکہ نا ممکن ہوتا جا رہا ہے۔ایسے حکمرانوں کو کوئی کیسے ووٹ دے اور کیوں ؟

نواز لیگ کو یہ گلہ ہے کہ اسے موقع نہیں دیا گیا۔موقع تو ملا اور ایک نہیں دو، دو بار ملا لیکن "میڈاِن پاکستان" کا نعرہ لے کر اٹھنے والوں نے اپنے بچوں کو انگلینڈ اور سعودی عرب میں کاروبار کروانے ہی میں عافیت جانی۔ من میں "امیر المومنین" بننے کا ایسا سودا سمایا کہ سب کچھ بھلا بیٹھے ۔امیر المومنین تو نہ بن سکے البتہ جلا وطنی کا صدمہ سہنا پڑا ۔اُن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اقتدار کی "ریوڑیاں"ہمیشہ اپنوں میں ہی بانٹتے ہیں ۔اِس صنعتکار خاندان نے ابتلاء کا تو کئی بار سامنا کیا لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اُن کی دولت میں انتہائی سرعت سے اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔نواز لیگ سے بیزاری کے لیے یہی کافی ہے کہ اُس نے چار سال تک ایک ایسی حکومت کو سہارا دینے کا جرمِ عظیم کیا جس کا اصلی چہرہ چار ماہ میں ہی نظر آ گیا تھا۔

بلا شُبہ چوہدری ظہور الٰہی سیاست دانوں کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس

کا نام سنتے ہی اذہان و قلوب میں احترام انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ لیکن اُن کے وارث ؟ اور وارثوں کے وارث ؟ ۔وراثت اُنہیں ملی جنھیں بہر صورت اقتدار چاہیے ۔بھلے وہ اقتدار چوہدری ظہور الٰہی کے خون کا سودا کرکے ملے یا کسی آمر کے چرنوں کی دھول بن کر۔ آجکل چوہدری پرویزالٰہی اپنے کارنامے گنواتے نہیں تھکتے لیکن وہ کسی کو یہ ہرگز نہیں بتلاتے کہ ان کے "وارث" نے اُن کے دورِ اقتدار میں ایسے گُل کھلائے کہ لوگ مسٹر ٹین پرسنٹ "تک کو فراموش کر بیٹھے۔اپنے کارنامے گنواتے ہوئے چوہدری" صاحب کی تان ہمیشہ ریسکیو 1122 پر ٹوٹتی ہے لیکن یہ تو اک خواب تھا جو ایک شخص 1992 ء سے دیکھ رہا تھا۔اسے کارپردازانِ حکومت طنزاً کہا کرتے تھے " ڈاکٹر صاحب ! یہ امریکہ نہیں ، پاکستان ہے "۔ اور " ایں خیال است و محال است و جنوں " ۔ لیکن وہ شاید نہیں جانتے تھے کہ حصولِ مقصد کے لیے جذبہ جنوں ہی درکار ہوتا ہے ۔بلا شبہ یہ ڈاکٹر رضوان نصیر کی جنوں خیزی کا ہی کرشمہ تھا جو انھوں نے محض 14 ایمبولینسز کے ساتھ "گھوڑوں کے اصطبل" میں اِس سروس کے آغاز کی آفر بھی ہنس کر قبول کر لی ۔جب کئی ماہ تک ساتھیوں کو تنخواہ نہ ملی تو اُنہیں حوصلہ بھی دیا اور اپنی جیب سے پیسے بھی ۔ یہ ڈاکٹر رضوان نصیر کی کرشمہ سازی ہی تو ہے جو اُنھوں نے محض آٹھ سال میں پورے پنجاب کو بین الاقوامی معیار کی ایسی سروس فراہم کر دی کہ جس کا نام سُنتے ہی آغوشِ مادر کی سی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا ہے ۔اس لیے اِس مداحی کے حق دار ، چوہدری پرویزالٰہی نہیں

ڈاکٹر رضوان نصیر ہیں۔

کیا قوم کی نگاہِ انتخاب ایم کیو ایم، ایم ایم اے ےاے این پی پر پڑ سکتی ہے؟۔ایم کیو ایم جب سے وجود میں آئی ہے "شہر قائد" خونم خون ہے۔ٹی وی بیچ کر اسلحہ خریدنے کا حکم اسی کے قائد نے دیا تھا۔اعلیٰ عدلیہ کہتی ہے کہ کراچی کی ٹارگٹ کلنگ ادلے کا بدلہ ہے پھر بھی جب کراچی کو اسلحے سے پاک کرنے کی قرارداد سامنے آتی ہے تو "قائدِ تحریک" کو اِس میں سازشوں کی بُو آنے لگی ہے۔۔۔ایم ایم اے کو خیبر پختون خواہ کی حکومت ملی تو مولوی حضرات "حجروں" سے نکل کر لینڈ کروزروں میں سوار ہو گئے۔حکومت کا مزہ چکھنے کی خاطر سترھویں ترمیم کی منظوری کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا جسے پاکستانی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔۔۔اے این پی وہ جماعت ہے جس کے بانی کو پاکستان میں دفن ہونا بھی قبول نہ تھا اُنھوں نے جو گُل کھلائے وہ سبھی پر عیاں ہیں لیکن ریلوے کی تباہی سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔کراچی کے مظلوموں کے خون کے بہت سے دھبے اے این پی کے دامن پہ لگے صاف دکھائی دیتے ہیں۔

باقی بچے "کپتان صاحب "جنھیں ابھی تک "خدمت" کا موقع نہیں ملا لیکن وہ اپنی غیر متوقع کامیابیوں پر ایسے بوکھلائے کہ پھر سنبھل نہ سکے۔اُن کی نئی

بوتل میں "پُرانی شراب" بیچنے کی تگ و دو ابتداء ہی میں ناکامیوں کا شکار ہو گئی۔اُن کے مدح سرا سینئر لکھاری کہتے ہیں کہ عمران خاں میں واپس پلٹنے اور خود کو بحال کر لینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ دیکھتے ہیں کہ گُرگ ہائے باراں دیدہ اُن کو پلٹنے، جھپٹنے کا موقع دیتے ہیں یا نہیں۔۔۔ کوئی بتلائے کہ کیسے ووٹ دوں ؟۔۔۔

محبت اور اخوت کا رشتہ

اُس مختارِ کُل نے اِس اشرف المخلوقات ، مسجودِ ملائک کو اپنی نیابت سونپ کر دُنیا میں اختلاف کا حق دے کر بھیجا اور ساتھ ہی مہلت بھی مقرر کر دی۔ یہ مہلت اُس وقت تک تمام نہیں ہوتی جب تک کہ آنکھ کی پتلی نہ پھر جائے۔ یہی آئینِ خُداوندی ہے جو ازل سے جاری ہے اور تا ابد جاری رہے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو روزِ ازل ابلیس کو اختلاف کی اجازت ملتی نہ فرعون ، شداد اور نمرود کو ایک لحظے کی مہلت۔ جب اُس تخلیق کار نے تو ہر انسان کو اختلاف کا حق دے کر بھیجا تو پھر ہمیں اپنے افکار ، نظریات اور تصورات بزورِ بازو دوسروں پر ٹھونسنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ انتہائی تکلیف دہ امر تو یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام (خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں) اِس حقِ نا حق کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ جب سبھی کا اللہ ، رسول اور قُرآن ایک ، پھر پتہ نہیں کیوں ہم نے اپنے آپ کو فرقوں اور گروہوں میں بانٹ لیا اور وہ کہ جنہوں نے اخوت و محبت اور رواداری کا درس دینا تھا ، وہی نفرت ، منافرت اور جبر و تشدد کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ دینِ مبیں ہمیں اختلافِ رائے کا حق تو دیتا ہے لیکن کسی کی گردن کاٹنے کا ہرگز نہیں۔ یہ نہ تو قُرآن و حدیث میں لکھا ہے اور نہ ہی فقہ کی کسی کتاب میں کہ اگر دینی معاملے پر کوئی دینی بھائی آپ سے اختلاف

کرتا ہے تو اُسے کافر کہنا یا قتل کرنا جائز ہے البتہ حکمت کی کتاب یہ ضرور کہتی ہے کہ جس نے بلا وجہ کسی ایک شخص کا قتل کر دیا اُس نے گویا پوری خدائی کو قتل کر دیا۔ ہم تو عامی ہیں اور ہمارا دینی علم واجبی لیکن ہمارے علمائے کرام تو ماشاء اللہ بحرِ علمِ دیں کے شناور ہیں ۔کیا وہ نہیں جانتے کہ شرک ، زنا اور خونِ ناحق ربّ کے ہاں ایسے کبیرہ گناہ ہیں جن کی معافی نہیں۔ پھر یہ شیعہ سُنی فسادات کیوں، فرقہ واریت کے دہکتے الاؤ کیوں ؟۔ پھر یہ مخمصہ کیوں کہ فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھنے والوں میں سے کسے شہید کہا جائے ؟۔ شیعہ کو یا سُنّی کو؟۔

جوں جوں یومِ عاشور قریب آتا جا رہا ہے ، خوف کی چادر تنتی چلی جا رہی ہے اور اندیشوں کے سنپولیے سر سرانے لگے ہیں۔ اُدھر حاکمانِ وقت کے نِت نئے بیانات سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پوری قوم پر اَن دیکھی ، اَن جانی جنگ مسلّط کر دی گئی ہو اور بد نصیبی کی انتہا یہ ہے کہ اِس جنگ کے متحارب گروہوں کے سالار عُلماء کرام ہی ہیں حالانکہ اگر احکاماتِ الٰہی کو مدِّ نظر رکھا جائے تو تمام فرقے اپنے اپنے عقائد پر قائم رہتے ہوئے بھی باہمی احترام ، محبت اور اخوت کا رشتہ استوار رکھ سکتے ہیں۔

بصد ادب شیعہ حضرات سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا حسینؓ صرف اُنہی کے

ہیں، کسی اور کے نہیں؟۔اگر وہ سبھی کے سانجھے ہیں تو پھر یہ تفریق کیوں؟۔اگر تقلید کی بجائے تحقیق کی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی
بو بکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ

ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی
کچھ فرق نہیں اِن چاروں میں

خُلفائے راشدین کی تاریخ تو اخوت، محبت اور یگانگت کے ساتھ ہی ساتھ خانوادہ ٔ رسول کے احترام کا درس دیتی بھی نظر آتی ہے لیکن ہم نے "یارانِ نبی" ہیں بالقصدًا ذاتی تفریق و تقسیم سے اتنی دوریاں پیدا کر دی ہیں جو مٹائے نہیں مٹتیں۔ایک دفعہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے بیٹے اور حضرت حسینؓ کھیل رہے تھے۔کھیل کے دوران اُن کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تو حضرت امام حسینؓ نے کہا "ہٹ غلام زادے" ۔حضرت عمرؓ کا بیٹا بسورتا ہوا اپنے باپ کے پاس پہنچا۔اُس نے شکایت کی کہ حسینؓ نے اُسے غلام زادہ کہا ہے۔جب امیر المومنین نے یہ سُنا تو فرمایا "بیٹے بھاگ کے جا اور حسینؓ سے یہ لکھوا لا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا کہا بھول جائیں اور ہم اِس سعادت سے محروم رہ جائیں"۔ یہ بھی تاریخ بتلاتی ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے جگر گوشوں، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو عین اُس وقت امیر المومنین حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر

مامور کیا جب شر پسند اُن کی جان کے درپے تھے۔ اُس وقت حضرت علیؓ نے اپنے جگر گوشوں کی جان کی ہر گز پرواہ نہیں کی۔ اور یہ بھی اسلامی تاریخ ہی کا حصّہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے متعدد بار برملا یہ کہا کہ اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ تو ہلاک ہی ہو گیا ہوتا۔ لیکن ہم نے اخوت و محبت کے سارے درس بھلا کر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو ہی خدمتِ دیں سمجھ لیا ہے۔ کیا خونِ حسینؓ سے رنگین کربلا کی مٹی کا یہی درس ہے؟۔ ہمیں تو بچپن سے بزرگوں نے یہی درس دیا اور اساتذہ نے یہی سکھایا کہ

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

لیکن ہم تو ہر سال اپنوں کو ذبح کرکے کربلا کی یادیں تازہ کرتے اور اسلام کو "زندہ" کرتے رہتے ہیں۔ سوال مگر یہ ہے کہ تب تو حسینیت کے مقابل یزیدیت تھی لیکن اب؟۔۔۔ اب تو ہر جانب حسینیت ہی حسینیت ہے۔ کون بدبخت ہے جو خانوادہ رسول سے پیار نہیں کرتا اور کون مردود ایسا ہے جو یزید کو لعین نہیں کہتا یا اُس سے نفرت کا کھُلم کھلا اظہار نہیں کرتا؟۔ جب اِس سانحہ عظیم پر ہر چشمِ مسلم اشکبار ہے تو پھر جھگڑا کاہے کا؟۔ پھر یہ کس کا اسلام ہے جو صرف اپنوں کا خون بہا کر ہی زندہ ہوتا ہے؟۔

حضرت امام حسینؓ نے طاغوت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ یہ جنگ کسی صورت میں بھی نہیں جیت سکتے ، اُنھوں نے نانا کے دین کی سرفرازی کے لیے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے پورے خاندان کی شہادت قبول کر لی لیکن فسق و فجور کے آگے جھکنا گوارا نہ کیا۔لا ریب کہ حسینؓ نے اپنی جان اُمتِ مسلمہ کو جوڑنے کے لیے دی تھی توڑنے کے لیے نہیں۔یہ تو ہم ہی ہیں جو خونِ حسینؓ کی خُوشبو کو پہچان نہ سکے اور نہ یہ جان پائے کہ درسِ کربلا کی اصل روح کیا ہے۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سبھی مسلمان مل کر یومِ حسینؓ مناتے ، خواہ اپنے اپنے طریقے سے ہی مناتے اور وہی جذبہ خُلفائے راشدین کے دن مناتے وقت بھی نظر آتا لیکن ایسا ہوا نہیں اور نہ ہی ایسا ہوتا نظر آ رہا ہے جو لائقِ تحسین تو خیر کیا ہو گا البتہ جگ ہنسائی کا باعث ضرور ہے اور دیگر ادیانِ عالم کے طنز و تعریض کا سبب بھی ۔

یاد رکھیے کہ دین میں کوئی جبر نہیں اور ہر شخص کے اعمال و افعال کا حساب لینے والی صرف ایک ہی ہستی ہے جس نے کسی فانی انسان کو فیصلے کا ہر گز یہ حق نہیں دیا ۔ یہ فیصلہ بھی اُسی علیم و خبیر نے کرنا ہے کسی شیعہ یا سُنّی نے نہیں۔اُنہیں اگر حق ہے تو صرف اتنا کہ وہ محبت اور اخوت کے رشتے کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کر سکیں اور بس ۔

کیا پاکستان سیکولر سٹیٹ ہے

پروفیسر مظہر

مصحف مجید میں فیصلہ کر دیا گیا کہ جو اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ شعبہ ہائے زندگی پر محیط یہ احکاماتِ الٰہی کتاب اللہ میں درج ہیں، پوری صراحت کے ساتھ۔ سورہ المائدہ میں جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، زخموں کے برابر زخم اور چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر ہوا۔ سورہ النساء میں زنا کی سزا اور سورہ الانعام میں شرائعِ الٰہیہ کا مفصّل ذکر موجود ہے۔ ایک مسلمان کے لئے قُرآنِ کریم کے ایک حرف تک کا انکار بھی پورے قُرآن سے انکار کے مترادف ہے اور دینِ مبیں میں مرتد واجب القتل۔ اسی لیے جان و مال اور جابر حکمران کی پرواہ کیے بغیر پورے کا پورا اسلام میں داخل ہونے کا حکم ہے۔ میرے نبی نے فرمایا "سید الشہداء حمزہ ابنِ عبد المطلب ہیں اور وہ بھی جس نے جابر حاکم کے سامنے کلمۂ حق کہا اور قتل کر دیا گیا"۔ حسین ابنِ علیؓ نے فرمایا "جب تم جان لو کہ تم حق پر ہو تو پھر جان کی پرواہ کرو نہ مال کی"

اور اقبالؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے، جائے

تُو احکامِ حق سے نہ کر بیوفائی

لیکن ہمارے ہاں تو معاملہ ہی اُلٹ ہے۔ہم مسلمان ہوتے ہوئے بھی نصوصِ قُرآنی پر کج بحثی کرکے اپنے آپ کو بحرِ علم کے شناور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ہمارے سیکولر دانشوروں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کو شریعتِ الٰہی خصوصاً اسلامی تعزیرات میں وحشت و درندگی نظر آتی ہے۔ایک مغرب زدہ کہن سالہ خاتون کو تو کسی پل چین نہیں۔ہمارے کچھ ٹی وی اینکرز محترمہ کو علماء کے ساتھ بُلا کر "چسکے" لیتے اور ریٹنگ بڑھاتے رہتے ہیں۔وہ خاتون آزادی نسواں کی بات کرے یا سزائے موت کے خاتمے کی، ہمیشہ پٹڑی سے اُتر جاتی ہیں۔مدلل گفتگو سے کوسوں دور البتہ کج بحثی کی ماہر۔۔۔ اپنی بدکلامی میں مشہور ایک سقہ لکھاری کو مشاہیرِ عالمِ اسلام چور، ڈاکو اور لٹیرے نظر آتے ہیں جبکہ امریکہ اور اقوامِ مغرب عظمتوں کی معراج پر۔ایک اور معروف لکھاری، جنھوں نے قوم کو امریکہ سے ڈرانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، جبکہ کئی دانشوروں کا یہ نظریہ ہے کہ جہاں عقل کا دروازہ نہیں کُھلتا وہاں لوگ غیرت کی بات کرنے لگتے ہیں ۔ بجا، مگر آقا نے فرمایا "اللہ غیرت مند ہے اور غیرت مندوں کو دوست رکھتا ہے ۔ قولِ علیؓ ہے "کمینہ اپنی عزت کے بدلے مال کماتا ہے"۔اور قابلِ غور ہے اُم" المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا فرمان کہ "جب معدہ بھر جاتا ہے تو قوتِ فکر کمزور پڑ جاتی ہے اور حکمت و دانش کی

صلاحتیں گُنگ"۔ غالباً ان بادہ فروشانِ افرنگ کے معدے بھی بھر دیئے گئے ہیں اسی لیے ان پر حکمت و دانش کے دروازے نہیں کُھلتے اور نہ یہ اپنی بے حمیتی کے خول سے باہر نکل کر یہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اقوامِ عالم کی ساتویں اور عالمِ اسلام کی پہلی ایٹمی قوت ہونے کے باوجود ان زمینی خُداوٗں کی چوکھٹ پہ سجدہ ریزی کو سوائے بے غیرتی و بے حمیتی کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی ذی ہوش جنگ کو پسند نہیں کرتا لیکن اگر جنگ مسلط کر دی جائے تو زندہ قومیں پیچھے نہیں ہٹا کرتیں۔ ہم پر بھی 11/9 کی آڑ میں امریکہ نے جنگ مسلط کر رکھی ہے اور ہم پچاس ہزار انسانی جانوں اور اربوں ڈالرز کے نقصان کے باوجود تا حال امریکہ کے تلوے چاٹ رہے ہیں۔ کیا زندہ قوموں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے؟۔ یہ بزدلی، بے غیرتی اور بے حمیتی نہیں تو اور کیا ہے؟۔

شکم سیری کو ہی کعبہ مقصود بنانے والوں کے سامنے جب نصوصِ قُرآنی رکھی جاتی ہیں تو یہ لاجواب ہو کر واویلا کرنے لگتے ہیں کہ کس کی شریعت نافذ کی جائے؟۔ سُنی کی، شیعہ کی یا طالبان کی؟۔ حالانکہ جانتے یہ بھی ہیں کہ شریعت تو صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے شریعتِ الٰہی جس میں تحریف ناممکن ہے کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود ربِّ کردگار نے لے رکھا ہے۔ لیکن یہ سیکولر ٹولا ہمیشہ مسلکی اختلافات کو شریعت سے خلط ملط کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے

حالانکہ شرائع الٰہیہ پر کسی مسلک کا کوئی اختلاف نہیں۔ کسی مسلک کے علماء قتلِ عمد، ارتداد اور شادی شدہ زانی کو سزائے موت دینے کے خلاف ہیں نہ چور کا ہاتھ کاٹنے کے ۔کوئی فرقہ عورت کی مادر پدر آزادی کے حق میں ہے نہ کبھی کسی عالم نے خودکُش حملوں کو جائز قرار دیا ہے ۔مسالک کے مابین تمام تر اختلافات فروعی ہیں جن کا مل بیٹھ کر حل ممکن ہے ۔لیکن اگر سبھی مسالک متفق ہو بھی جائیں تو یہ پھر بھی نہیں مانیں گے کیونکہ ان مغرب زدہ لوگوں کو تقلیدِ مغرب میں ہی عافیت نظر آتی ہے ۔جس مغرب کی پیروی میں یہ قُرآنِ کریم کے احکاماتِ ناطق کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں، خود اُس کا یہ عالم ہے کہ انگلینڈ جہاں 1969 ء سے سزائے موت کا قانون ختم کر دیا گیا ہے وہاں اخبار "دی میل" کے حالیہ سروے کے مطابق 53 فیصد شہریوں نے اس قانون کے خلاف اور صرف 30 فیصد نے حق میں ووٹ دیا ہے ۔امریکی سروے کے مطابق 80 فیصد امریکی خوف میں مبتلا اور 70 فیصد عدم تحفظ کا شکار ہیں۔امریکی رسالے "سائیکالوجسٹ" کی مئی 2009ء کی رپورٹ کے مطابق 2004ء میں زنا بالجبر کے 94 ہزار کیس رجسٹر ہوئے ۔یہ تعداد 70 فیصد کے برابر تھی، 30 فیصد نے مقدمات درج ہی نہیں کروائے۔رپورٹ کے مطابق آجکل امریکہ میں 14 فیصد عورتیں جنسی جرائم کا شکار ہوتی ہیں۔2008ء میں قتل اور تشدد کے آٹھ لاکھ کیس درج ہوئے اور ڈکیتی کی ساڑھے چار لاکھ وارداتیں ہوئیں۔انسانی حقوق کے علمبردار اگر FBI کی ہر سال ستمبر میں شائع ہونے والی کرائم رپورٹس کا مطالعہ کر لیں تو

ان کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔

لیکن یہ ٹولہ نصوصِ قرآنی ماننے کو تیار ہے نہ آئینِ پاکستان کو۔ آئین کے آرٹیکل 228 کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے تمام قوانین کو سات سالوں میں اسلامی سانچے میں ڈھالنا تھا جو آج تک تشنۂ تکمیل ہے لیکن غنیمت ہے کہ یہ آرٹیکل ابھی تک آئین کا حصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ آئین سے انحراف پر آئینی آرٹیکل چھ لاگو ہوتا ہے جس کی سزا موت ہے۔ یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آرٹیکل 228 بھی موجود، جان کے بدلے جان کا واضح قرآنی حکم بھی موجود اور مرتد واجب القتل بھی اس کے باوجود لوگ تعزیرتِ الٰہی اور آئینِ پاکستان کا کھلم کھلا مذاق اُڑا رہے ہیں اور حکومت خاموش تماشائی۔ اگر حکومت ان دراز ہوتی زبانوں کو بند نہیں کر سکتی تو پھر آئین کو اُٹھا کر بحیرہ عرب میں پھینک دیجئے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام بدل کر سیکولر سٹیٹ آف پاکستان رکھ دیں کہ ایسا کرنے سے وہ لوگ بھی خوش ہو جائیں گے جو عوام سے یہ سوال کرتے ہیں کہ انہیں "سیکولر پاکستان چاہیے یا طالبان کا پاکستان" اور امریکی ایجنٹوں کو طالبان کا نام دے کر دینِ مبیں کو بدنام کرنے کی مذموم کوششیں بھی دم توڑ جائیں گی۔

بے خوف کپتان اور خوف زدہ نواز شریف

پروفیسر مظہر

ایک معروف سینئر کالم نویس اکثر ایسی "مجذوبانہ" باتیں کہتے اور لکھتے رہتے ہیں جو ہمارے پلے نہیں پڑتیں کیونکہ ہمارے پاس کوئی طوطا، مینا یا چڑیا تو ہے نہیں جو رازہائے درونِ خانہ چپکے سے کہہ دے، نہ ہمارا رابطہ کسی "کالمی درویش" کے ساتھ ہے جو ہمیں محترم کالم نگار کے "فرمودات" کی گہرائی اور گیرائی سے آگاہ کر سکے اور نہ ہی مشامِ تیز کہ ہواؤں کا رُخ پہچان سکیں۔ ہم تو بس اندازوں اور تخمینوں پر ہی گزارہ کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے موصوف کی باتیں ہم جیسے "نیچریوں" کی سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم اپنی کم علمی اور کوتاہ فہمی کی بنا پر میدانِ سیاست کے "بارھویں کھلاڑی" کے بارے میں اکثر لکھتے رہتے ہیں کہ "نیم حکیم، دیوے افیم"۔

محترم لکھاری نے اپنے حالیہ کالم میں حسبِ معمول انتہائی محترم عمران خاں کی مدح سرائی اور "رقیبوں کی ہجو" میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ فرماتے ہیں "نواز لیگ 56 فیصد آبادی پر قاف لیگ کے لوٹوں کی مدد سے براجمان ہے"۔ بلا شبہ پنجاب کی حد تک صحنِ چمنِ نواز لیگ "لوٹوں" کے دم قدم سے آباد ہے

لیکن لوٹے آٹے میں نمک برابر، غالب اکثریت لیگیوں کی۔ سوال مگر یہ ہے کہ کون سی سیاسی جماعت ایسی ہے جو لوٹوں سے مزیّن نہیں ؟۔انہی لوٹوں سے نجات کے لیے لوگ تحریکِ انصاف کی طرف پلٹے لیکن جلد ہی مایوس ہوگئے۔جس جماعت کے صدر، وائس چیئر مین اور سیکرٹریز تک سبھی لوٹے ہوں اسے دوسروں پر الزام دھرنے سے پہلے اپنی آلودہ دامانی پر بھی غور کر لینا چاہیے ۔۔۔ موصوف فرماتے ہیں "پروپیگنڈے کی جنگ میں ن لیگ کا پلہ بھاری ہے۔ایک آدھ کے سوا کوئی اختلاف کی جسارت کم ہی کرتا ہے۔ تقریباً سبھی میڈیا مالکان کے ساتھ گہرے مراسم ہیں۔ میڈیا میں تحریکِ انصاف کاچراغ نہیں جلتا"۔ عرض ہے کہ یہ کرشمہ ساز الیکٹرانک میڈیا ہی کا کمال تھا جس نے لاہور کے جلسے کی آٹھ گھنٹوں تک "لائیو کوریج" کرکے خاں صاحب کو ہواؤں کے دوش پر سوار کروایااور پھر ہر جلسے کی طویل لائیو کوریج اور ٹاک شوز میں تعریفوں کے انبار۔ناموں سمیت لکھاریوں کی غالب اکثریت نے تحسینِ تحریکِ انصاف میں کئی روز تک زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ لیکن اُڑتی چڑیاکے پَر گننے والے اخبار نویسوں کو جب احساس ہوا کہ "اِن تلوں میں تیل نہیں" تو پلٹ گئے۔کچھ اُلٹے پاؤں اور کچھ خراماں خراماں۔اب بھی شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی ٹاک شوز میں تحریک کی نمائیندگی نہ ہو۔رہی مفادات کی بات تو عرض ہے کہ اگر میڈیا مالکان نواز لیگ کے ہاتھوں بک چکے ہیں تو یقیناً موصوف کے پاس ثبوت بھی ہونگے۔وہ اکثر ٹاک شوز اور کالموں میں اپنے انتہائی با خبر ہونے کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں

اور یہ بھی کہ اگر کسی نے تنگ یا پریشان کیا تو سب کچھ اُگل دیں گے۔اپنے ایک کالم میں اُنھوں نے فرمایا کہ جی چاہتا ہے کہ سب کچھ اُگل دوں۔پھر فرمایا شاید اُگل بھی دوں اور آخر میں کہا کہ اپنی کتاب میں افشاء کروں گا۔اگر موصوف کی "پٹاری" بھٹو مرحوم کے "معاہدہ تاشقند" جیسی پٹاری نہیں تو کم از کم یہ راز تو اگل ہی دیں ورگرنہ اسے محض تہمت ہی سمجھا جائے گا اور وہ خوب جانتے ہیں کہ قُرآن و حدیث میں تہمتیں لگانے والوں کے بارے میں کیا ارشاد ہوا ہے۔

میٹرو بس منصوبے پر وہ رقمطراز ہیں کہ "شہباز شریف خزانہ لُٹا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اُنھوں نے لاہور کا ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا"۔جی ہاں ! انتہائی ضدی میاں شہباز شریف نے خزانہ لٹایا لیکن عوامی فلاح کے لیے۔پنجاب میں کم از کم کچھ ہلچل تو ہے ، باقی صوبوں کا بجٹ تو براہِ راست ذاتی خزانوں میں پہنچ جاتا ہے۔جس میڈیا گروپ سے موصوف منسلک ہیں ، اُسی نے ہزاروں طالبات کا سروے کروایا اور 78 فیصد طالبات نے شہباز شریف کے رفاہی کاموں کی حمایت کی۔موصوف یہ دور کی کوڑی بھی لائے ہیں کہ "یہ منصوبہ غیر قانونی ہے"۔تفصیل سے اُنھوں نے گریز کیا۔اگر بیان کر دیتے تو ہم جیسے بے خبروں کو بھی پتہ چل جاتا کہ عوامی فلاحی منصوبے غیر قانونی بھی ہوا کرتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں "پیپلز پارٹی اور ن لیگ میں مفاہمت ہے کہ ہر حال میں

عمران خاں کو روکا جائے"۔ عرض ہے کہ نواز لیگ تو بعد از خرابیِ بسیار اب تائب ہو اور اُس کے اتحادیوں کے PPP کر پیپلز پارٹی پر گرجتی برستی رہتی ہے لیکن خاں صاحب بارے میں مہر بلب ہیں البتہ کبھی کبھار خاں صاحب مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے زرداری صاحب کا ذکر کر جاتے ہیں۔ دوسری طرف پیپلز پارٹی اور اتحادیوں کا ہدف بھی نون لیگ ہی ہے تحریکِ انصاف نہیں۔ اس لیے کیوں نہ سمجھا جائے کہ نون لیگ کے خلاف سائن ہو چُکا ہے۔ NRO پیپلز پارٹی اور تحریکِ انصاف میں درونِ خانہ کوئی

محترم لکھاری نے خاں صاحب کے حق میں چھ مضبوط عوامل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ساکھ بہت اچھی، عوامی خدمت کا ریکارڈ شاندار، تبدیلی کی تمنا، خواتین اور سبکدوش" فوجیوں کے علاوہ پشتونوں میں بے پناہ مقبولیت کہ قبیلہ اپنے بہترین آدمی پر فخر کرتا ہے ۔ عرض ہے کہ خاں صاحب کی سیاسی ساکھ کو تو فی الحال گھُن لگ چُکا ہے جس کا اقرار" موصوف نے خود ہی یوں کر لیا کہ "بنیا پٹھان کے سینے پر بیٹھا رو رہا ہے"۔ یوں تو خاں صاحب کی ذاتی ساکھ پر بھی بہت سے سوال اُٹھ رہے ہیں۔ سیاست میں ذاتیات کو لانا بہرحال مناسب نہیں۔۔۔ عوامی خدمت کو اگر معیار بنایا جائے تو میں متعدد بار لکھ چُکا ہوں کہ اِس بنیاد پر تو ایدھی خاندان کو بلا شرکتِ غیرے اقتدار سونپ دینا چاہیے کہ فلاحی کاموں میں خاں صاحب دس بار جنم لے کر بھی اُن کی گردِ پا کو نہیں

پہنچ سکتے ۔۔۔ ڈال ڈال پھُدکنے والے پنچھیوں اور پھول پھول کا رس چوسنے والے بھنوروں کے جلو میں تبدیلی کی تمنا ؟۔ ایں خیال است و محال است و جنوں ۔ اگر خاں صاحب کو "شاہیں" مان بھی لیا جائے تو پھر بھی بقولِ اقبال

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے راہ و رسمِ شاہبازی

اگر پورے پاکستان سے نوجوانوں کو کسی ایک جگہ اکٹھا کرکے جلسہ کر لینے کا نام نئی نسل کی حمایت ہے تو پھر اسلامی جمیعت طلباء کے سالانہ اجتماعات میں تو تین، تین لاکھ نوجوان اکٹھے ہوتے ہیں اور جماعتِ اسلامی کے اجتماع میں دس، دس لاکھ افراد، لیکن جماعت کی پارلیمنٹ میں نمائندگی ہمیشہ بقدرِ اشکِ بُلبُل ہوتی ہے ۔۔۔ رہی خواتین میں مقبولیت کی بات تو تسلیم کہ جب "آتش" جوان اور کپتان تھا تب بے پناہ مقبول تھا لیکن اب ؟۔ اب ممدو جانے یا مدح سرا، ہمیں تو ایسا کچھ نظر نہیں آتا۔ سبکدوش فوجیوں میں "جنرل پاشا" کا تو سبھی کو علم ہے باقیوں کے بارے میں میرا علم ناقص ہے۔۔۔ جس لسانی اور گروہی تعصب کی سیاست نے پاکستان کو اس حال تک پہنچایا ہے موصوف اسی پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پشتون "اپنے قبیلے" کے آدمی پر فخر کرتے ہیں ۔ کیا نظریاتی سیاست اسی کا نام ہے؟۔

محترم فرماتے ہیں "خوفزدہ نواز شریف مقابلہ نہیں کر سکتا۔۔۔ بنیا پٹھان کے سینے پر بیٹھا رو رہا ہے۔۔۔ نگران حکومت قائم ہوتے ہی پولیس پٹوار سمیت سرکاری دباؤ برائے نام رہ جائے گا"۔ محترم لکھاری اگر "حالتِ جذب" سے نکل کر عالمِ رنگ و بو میں جھانک لیتے تو اُنہیں صاف نظر آ جاتا کہ "خوفزدہ بنیا" پٹھان کے سینے پر بیٹھا رو نہیں رہا بلکہ قہقہے لگا رہا ہے۔ شاید اُسے بھی ادراک ہو گیا ہو کہ اگلے ایک دو عشروں تک تو پٹھان میں اُٹھنے اور اُٹھ کر مارنے کی سکت نہیں۔ رہی پٹوار پولیس کی بات تو جب بی بی کی شہادت کے بعد پیپلز پارٹی کی بذریعہ امین فہیم مشرف سے مفاہمت ہو چکی تھی، عدلیہ اور الیکشن کمیشن آمر کی مٹھی میں تھے، پولیس پٹوار سب مقتدر چوہدریوں کے بس میں تھے اور میاں صاحبان کو وطن لوٹے محض چند دن ہوئے تھے، تب بھی وہ 56 فیصد کی حکومت لے اُڑے اب آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔۔۔

عوام کا آئین

باغی 1864ء میں الیگزنڈریا تک آ پہنچے۔امریکی فوجیں فورٹ سٹیونز میں جمع ہو گئیں ۔ابراہام لنکن قلعے کی چھت پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔جرنیلوں میں سے ایک نے قریب آ کر کہا"مسٹر صدر ! بہتر ہو گا کہ آپ نیچے اتر آئیں"۔لیکن لنکن نے کوئی توجہ نہ دی ۔تھوڑی دیر بعد لنکن سے پانچ فُٹ دور ایک سپاہی دشمن کی گولی سے ڈھیر ہو گیا اور تین فُٹ دور دوسرا۔اچانک ابراہام لنکن کو عقب سے گرجدار آواز سنائی دی"احمق ! نیچے اتر آؤ" ۔اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ایک کیپٹن کھڑا تھا۔"بہت خوب کیپٹن" کہہ کر ابراہام لنکن مسکراتا ہوا نیچے اتر گیا۔یہ کیپٹن آلیور وِنڈل ہومز تھا جو 1861ء میں ہاورڈ یونیورسٹی سے اپنی لاء کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر خانہ جنگی میں حصہ لینے کے لیے چل پڑا۔

اسی وینڈل ہومز کو بعد میں امریکی صدر روزویلٹ نے اِس اُمید پر سپریم کورٹ کا جج بنایا کہ وہ اُس کی مرضی کے مطابق عمل کرے گا لیکن ہومز نے پہلے بڑے مقدمے میں ہی اُس کے خلاف فیصلہ دے دیا۔روزویلٹ تو غصّے سے دیوانہ ہو گیا لیکن عوام بہت خوش تھے۔اُن کے خیال میں وہ ایک غیر جانبدار جج تھا۔آنے والے برسوں میں اُس کی "اختلاف پسندی" امریکی سپریم کورٹ کی روایت بن گئی۔ایک

دفعہ ایک اخباری رپورٹر نے ایک کاریگر سے پوچھا "تمہارے نزدیک وینڈل ہومز کی کیا اہمیت ہے"؟۔ اُس نے جواب دیا "وہ سپریم کورٹ کا سب سے جوان جج ہے جو بوڑھے ججوں سے ہمیشہ اختلاف کرتا ہے "اُس وقت ہومز ستاسی برس کا سینئر ترین جج تھا۔

آج کل سپریم کورٹ، خصوصاً چیف جسٹس جناب افتخار محمد چوہدری کو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں بلند آہنگ سے تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ انتہائی نا خوش حکمران اُنہیں نیچا دکھانے کے لیے ہر حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ جب سے حکمرانوں نے طوہاً وکرہاً عدلیہ بحال کی ہے، تب سے اب تک اُن کے خلاف سازشوں کے تانے بانے بُنے جا رہے ہیں۔ وکیلوں کو توڑنے کے لیے اُنہیں اربوں کے کیس دیئے گئے اور تیل کے ٹھیکے بھی۔ اینکرز کو خریدنے کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب الیکٹرانک میڈیا پر طوفان بد تمیزی بپا نہیں کیا جاتا۔ چُن چُن کر ایسے میزبانوں کو مدعو کیا جاتا ہے جن کے سینے بغض و عناد سے لبریز ہوں۔ اعلیٰ عدلیہ سے خُدا واسطے کا بیر رکھنے والی ایک بزعمِ خویش دبنگ خاتون وکیل آجکل بہت متحرک ہیں۔ وہ چونکہ خاتون ہیں اور سبھی جانتے ہیں کہ خواتین تو "طعنے مہنے" دینے میں یدِ طولیٰ رکھتی ہیں۔ محترمہ بھی آجکل اِس فن کا بے محابہ استعمال کر رہی ہیں۔ اپنے کام میں مگن عدلیہ کو دیکھ کر بے ساختہ محترمہ کی خدمت میں یہ عرض

کرنے کو جی چاہتا ہے کہ

نکالا چاہتا ہے کام تُو طعنوں سے کیا غالب
تیرے بے مہر کہنے سے وہ تُجھ پہ مہرباں کیوں ہو

محترمہ نے پچھلے دِنوں میموگیٹ نظرِثانی کیس میں سپریم کورٹ کے ایک "بنچ" کے سامنے ایک ایسی بات کہی جو قانون کی کتابوں میں سنہری حروف سے لکھی جانی چاہیے تاکہ ہر مفرور اُس سے مستفید ہو سکے۔انسانی حقوق کی علمبردار نے حسین حقانی کی عدم پیشی کا جواز پیش کرتے ہوئے فرمایا"میموکمیشن نے حسین حقانی کو غدار قرار دیا ہے۔کیا وہ یہاں آ کر جان ہار دیں؟۔اگر قانون اسی کا نام ہے تو پھر جنگل کا قانون کسے کہتے ہیں؟۔کیا محترمہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ اگر کسی مجرم کا جرم ثابت ہو جائے تو راہِ فرار اختیار کرنا اُس کا آئینی و قانونی حق ہے؟۔محترمہ سے بصد عجز و نیاز یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا قانون کی حکمرانی اسی کا نام ہے؟۔اِن دنوں بھارتی صوبہ بہار کے وزیرِ اعلیٰ ستیش کمار پاکستان کے دورے پر ہیں۔یہ وہ صوبہ ہے جسے کچھ عرصہ پہلے تک کرپشن اور بدعنوانی کے لحاظ سے بھارت کا بدترین صوبہ قرار دیا جاتا تھا لیکن آجکل بہترین۔ستیش کمار سے بار بار یہ پوچھا گیا کہ صوبہ بہار میں یہ انقلاب کیسے آیا؟۔اُن کا ہر جگہ ایک ہی جواب تھا کہ "رول آف لاء ہے"۔لیکن رول آف لاء کی جو تشریح محترمہ فرماتی رہتی ہیں اُس سے تو قومیں برباد ہوتی

ہیں، آباد نہیں۔

آجکل عدلیہ اور فوج کو باہم دست و گریباں کرنے کی کوششیں بھی عروج پر ہیں۔ محترم چیف آف آرمی سٹاف نے پچھلے دنوں آرمی آفیسرز سے چند باتیں کیں اور یہ محض اتفاق ہے کہ محترم چیف جسٹس افتخار چوہدری صاحب نے بھی اُسی دن 97 مینجمنٹ کورس کے شرکاء سے خطاب فرمایا جس کے بعد لال بجھکڑوں نے طرح طرح کی تاویلات پیش کرنا شروع کر دیں جو آج تک جاری ہیں۔ایک ایسے ہی لال بجھکڑ کی چڑیا" تو دور کی کوڑی لائی۔اُس چڑیا کو یہ الہام ہوا کہ ملک ریاض کے اچانک شعیب" سڈل کمیشن کے سامنے پیش ہو جانے میں بھی فوج کا ہاتھ ہے اور فوج ملک ریاض کے ذریعے سے چیف جسٹس صاحب کو کونے میں لگانا چاہتی ہے۔یہ تو محترم چیف آف آرمی سٹاف کی انتہائی دانشمندی ہے کہ انہوں نے "جوابِ آں غزل" کے طور پر کچھ نہیں کہا ورنہ "بکاؤ مال" نے تو کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔اگر یہ تصادم ہو جاتا تو پھر سوائے انا للہ پڑھنے کے کیا باقی بچتا؟۔

یوں تو ماشااللہ ہماری آئین ساز اسمبلی کا بھی یہ حال ہے کہ اگر ان آئین سازوں سے ء کے آئین کی چھوٹی سی کتاب کا امتحان لیا جائے تو صورتِ حال "خود بھی شرمسار ہو 73 مجھ کو بھی شرمسار کر" والی ہی ہو گی لیکن لاریب عوام،

تو کسی آئین کو نہیں جانتے۔ عوام کا آئین اور اُنکی معیشت پیٹ سے شروع ہو کر پیٹ پر ہی ختم ہو جاتی ہے اور اُنہیں ایسی ہی عدلیہ درکار ہے جو اُنکی آتش شکم کا کوئی علاج کر سکے ۔اس لیے جب تک عوام ساتھ ہیں یہ عدلیہ حکومتی سازشوں یا وکلاء کی گروہ بندیوں سے نہیں جانے والی ۔یہ بجا کہ سیاسی اور اقتصادی فیصلے سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہرین کو ہی کرنے چاہییں لیکن اگر وہاں چور ڈاکو اور لٹیرے برسراقتدار ہوں تو پھر؟ ۔۔۔ پھر کیا قوم اسی کو مقدر سمجھ کر صبر کر لے؟ ۔نہیں ، ایسا نہیں ہوتا اور نہ کبھی ہوا ہے ۔تاریخ کا سبق تو یہ ہے کہ ایسی حالتوں میں انقلاب آیا کرتے ہیں ۔۔۔ خونی انقلاب ۔اِن حکمرانوں ، وڈیروں ،نوابوں ، جاگیرداروں ، رسہ گیروں ، بیوروکریٹوں ، خائنوں اور بددیانتوں کو تو اعلیٰ عدلیہ کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فیصلوں کی شبنمی ٹھنڈک سے عوامی نفرتوں کے دہکتے الاؤ کو ٹھنڈا کرنے کی بھرپور سعی کر رہی ہے ۔یاد رکھیے کہ عدلیہ ہی عوام کی آخری اُمید ہے ۔اگر یہ اُمید بھی دم توڑ گئی تو پھر فرانس کی گلیاں ہونگی اور شاہ لوئی اور اُس کے حواریوں کے سر ۔۔۔۔

صحنِ چمن میں "لوٹوں" کی بہار

کہتے ہیں کہ ہنسی علاج غم ہے اور ایک خالص قہقہہ پاؤ بھر دیسی گھی کی طاقت کے برابر۔اگلے وقتوں میں شاہی درباروں میں مسخرے بھرتی کیے جاتے جو ایک دوسرے پر پھبتیاں کَس کر بادشاہوں کا دل بہلایا کرتے تھے۔پھر زمانہ بدلا، دورِ جدید کی چکاچوند نے اذہان و قلوب کو مسخر کر لیا،چرخ نیلی فام کی وسعتیں تسخیر ہونے لگیں اور پُرانے رسوم و رواج قصہ پارینہ بن گئے لیکن درباری مسخروں کا رواج قائم رہا اور تا حال قائم و دائم ہے۔فرق البتہ یہ پڑا کہ اب وہ وزیروں شزیروں اور درباری مشیروں کے روپ میں الیکٹرانک میڈیا پر جلوہ افروز ہوتے رہتے ہیں۔اُن کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے کہ وہ عوام کا مذاق اُڑا کر، اُن پر پھبتیاں کَس کر حکمرانوں کو خوش کرتے رہیں جبکہ دوسری طرف زندگی کی ہر نعمت سے محروم عوام کی حالت یہ ہے کہ

پہلے آتی تھی حالِ دل پر ہنسی\
اب کسی بات پر نہیں آتی

لیکن بھلا ہو ہمارے چیف الیکشن کمشنر جناب فخر الدین جی ابراہیم المعروف "فخرو بھائی" کا جن کی ایک "حرکتِ صالح" پر ہم خوب ہنسے اور محاورتاً نہیں

بلکہ حقیقتاً ہنستے ہنستے پیٹ میں بَل پڑ گئے۔

ہوا یوں کہ "فخرو بھائی" نے انتخابی نشانات کی فہرست سے "لوٹا" بے آبرو کرکے نکال باہر کیا اور اپنے تئیں یہ جانا کہ جیسے اُنھوں نے لوٹوں کا صفایا کر دیا۔ لیکن ہمارے معصوم اور بھولے بھالے فخرو بھائی شاید نہیں جانتے کہ شہد سے میٹھا یہ زہرِ ہلاہل تو اب پوری قوم کی نَس نَس میں سما چُکا ہے اور صرف سیاسی لوٹوں پہ تبرہ بھیجنے کا کچھ فائدہ ہے نہ ضرورت کیونکہ اب تو یہ عالم ہے کہ ہر گھر سے بھٹو نکلے نہ نکلے لوٹا ضرور نکلتا ہے کیونکہ لوٹا بننے کی تربیت تو گھر سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔اِس "گلوبل ویلج" کی ماڈرن مائیں جب آغوشِ مادر کو ترستے، حسرت و یاس کی تصویر بنے بچوں کو "آیا" کے سپرد کرکے انسانی حقوق اور آزادیِ نسواں کی جنگ جیتنے صبح دَم گھروں سے نکل کھڑی ہوتی ہیں تو یہ بچوں کے لیے مادر پدر آزادی کا اوّلین پیغام ہوتا ہے اور طفل سے ماں باپ کے اطوار ہی کی مہک آنا فطری امر بن جاتا ہے۔ جونہی وہ سنِ بلوغت کو پہنچتا ہے والدین کی "پارٹی" چھوڑ کر بیگم کی پارٹی جوائن کر لیتا ہے۔ جسے والدین کی پارٹی بدلتے ندامت نہیں ہوتی، اسے بھلا سیاسی پارٹی بدلنے میں کیا قباحت محسوس ہو گی۔ البتہ اکلاپے" کا رونا رونے والے والدین سے یہ ضرور پوچھا جانا چاہیے کہ اے انسانی" حقوق کے علمبردارو! کیا تُم نے کبھی اپنے بچوں کے حقوق کا بھی پاس

کیا ؟۔آقا نے فرمایا "وہ برباد ہوا، وہ برباد ہوا، وہ برباد ہوا"۔ صحابہ اکرام نے پوچھا یا رسول اللہ کون "؟۔آپ نے فرمایا "وہ کہ جس نے بوڑھے والدین پائے اور اُن کی خدمت کرکے جنت حاصل نہیں کی" ۔کیاانسانی حقوق کے اِن علمبرداروں نے اپنے بچوں کے اذہان و قلوب میں آقا کا یہ فرمان تہ در تہ بٹھایا ؟۔اگر نہیں تو پھر

اب کیوں اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں

اِس طرح تو ہوتا ہے ،اِس طرح کے کاموں میں

کڑواسچ تو یہی ہے کہ "لوٹا ازم" زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کرچُکا ہے۔لغت میں بے پیندے کا لوٹا "اُسے کہتے ہیں جو اِدھر اُدھر لُڑھکتا پھرے۔اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو" کیا وہ لوٹے نہیں جو اپنی "جنم بھومی" چھوڑ کر باہر لُڑھک جاتے ہیں، جو حکمرانی پاکستان پہ کرتے ہیں اوراپنی اولادوں کے لیے اِس ملک کی فضاؤں کو ناسازگار سمجھتے ہیں ، جو حلف توامریکہ ،برطانیہ ،کینیڈا، آسٹریلیا اور پتہ نہیں کس کس ملک سے وفاداری کا اُٹھاتے ہیں اور پاکستان کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھ کر حقِ حکمرانی جتانے آ جاتے ہیں ؟۔کیا وہ لوٹے نہیں جو اپنے رسوم و رواج چھوڑ کر ہندوآنہ رسوم و رواج کی طرف لڑھک جاتے ہیں ؟ ۔کیا وہ لوٹے نہیں جو اپنی تہذیب و تمدّن، ثقافت و معاشرت ، رہن سہن حتیٰ کہ لباس تک سے مُنہ موڑ کر تہذیبِ مغرب کے دامن میں پناہ لے لیتے

ہیں اور کیا وہ لوٹے نہیں جو ایک ایک سال میں تین تین میڈیا گروپ بدلتے رہتے ہیں ؟۔اگر ایسے دانشوروں کے بارے میں حُسنِ ظَن رکھتے ہوئے یہ تصور کر بھی لیا جائے کہ وہ خوب تر کی جستجو میں بھٹکتے رہتے ہیں تو پھر بھی ایسے دانشوروں کو کس نام سے پُکارا جائے جو حکومتوں کے بدلتے ہی سیاسی وفاداریاں بھی بدل لیتے ہیں ؟۔

سیاست سے ثقافت تک ہر جگہ چھائے ہوئے اِن لوٹوں کے ساتھ تو بُری بھلی گزر رہی تھی لیکن الیکٹرانک میڈیا پر چھا جانے والے "مذہبی لوٹوں" کے ساتھ گزارا ممکن نہیں ۔اِن میں یقیناً کچھ پڑھے لکھے بھی ہونگے لیکن غالب اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کا علم انتہائی ناقص ہے اور وہ اپنی علمیت کا رُعب جھاڑنے کے لیے دینِ مبیں کے خلاف کھُلم کھُلا باتیں کرتے رہتے ہیں اور بعض اوقات تو واضح احکامات کو ماننے سے بھی صریحاً انکار کر دیتے ہیں ۔ربِ کریم نے قصاص میں زندگی رکھی ہے لیکن یہ لوگ سزائے موت کو درندگی کا نام دیتے ہیں۔میرا دین محبتوں ، شفقتوں اور رحمتوں کا دین ہے لیکن یہ اسے ظُلم ، نفرت اور دہشت گردی کا دین ثابت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔اِن لوگوں نے کچھ مغربی سکالرز کے نام رَٹ رکھے ہیں جن کا وہ جا و بے جا استعمال کرتے رہتے ہیں ۔ابھی پرسوں الیکٹرانک میڈیا پر اکثر نمودار ہونے والی ایک خاتون نے ایک معروف مغربی سکالر کا حوالہ دے کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنا چاہا تو

ساتھ بیٹھے دوسرے صاحبِ علم دانشور نے کہا کہ محترمہ جھوٹ بول رہی ہیں۔اُس سکالر نے کبھی بھی ایسا کہا نہ لکھا۔ایسے "جھوٹ کی آڑھت" جمانے والے ہر دور میں مِل جاتے ہیں۔ہم جب یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ہمارے ایک ساتھی کلاس فیلو جب بحث کرتے ہوئے بُری طرح سے گھِر جاتے تو ہمیشہ یوں گویا ہوتے "آہا،آہا،آہا! فرمایا برٹ انگیل نے اپنی کتاب "دی میل اینڈ فی میل" میں کہ۔۔۔۔"۔اُس کے اِس تبحرِ علمی پر ہم ہمیشہ خاموش ہو جاتے۔موصوف کا یہ طریقہ واردات تھا کہ وہ ہمیشہ کسی نئے دانشور اور نئی کتاب کا حوالہ دیتے اور ہم پاگلوں کی طرح اُن کتابوں کی تلاش میں لائبریریوں کی خاک چھاننے لگتے۔ایک بار ہم نے بھی چِڑ کر کہہ دیا "واہ وا،واہ وا،واہ وا! فرمایا چنگ تان لی نے اپنی کتاب "ٹزی توان" میں کہ۔۔۔۔"۔اُس نے حیرت سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟"۔ہم نے رسانت سے جواب دیا "احمق! یہ کنفیوشس کا ہم عصر عظیم چینی فلاسفر تھا۔پنجاب پبلک لائبریری جا کر کتاب نکالو اور صفحہ 356 پڑھ لو"۔وہ کتاب تو خیر اُسے کیا ملتی لیکن اُسکے نِت نئے "حوالوں" سے نجات مل گئی۔آج بھی "مذہبی لوٹے" ایسے ہی بے سروپا حوالے دیتے رہتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک قُرقانِ حمید کے سامنے ایسے مغربی دانشوروں اور اُن کے چیلوں کی پرکاہ برابر بھی حیثیت نہیں۔ہماری رہنمائی کے لیے قُرآن و حدیث موجود ہیں اور ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے۔

طلباء یا غنڈے۔۔۔؟

دو تین روز پہلے ایک کام کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا۔ واپسی پر ماس کمیونی کیشن ڈیپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک عجیب منظر دیکھا ۔ڈیپارٹمنٹ کے سامنے بیں پچیس لڑکے کچھ لڑکوں کو بے دردی سے پیٹ رہے تھے اور ساتھ کھڑی لڑکیوں کی چیخیں ڈیپارٹمنٹ کے در و دیوار ہلا رہی تھیں ۔لڑکیوں کی خوفزدہ چیخوں نے میرے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھوڑی دیر بعد مار پیٹ کرنے والے لڑکے موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر آناً فاناً غائب ہو گئے۔ میں چند لمحے حیرت میں گم وہاں کھڑی رہی اور جب حواس نے ساتھ دیا تو وہاں کھڑے ایک شخص سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے ؟۔اُس نے انتہائی تلخ لہجے میں جواب دیا کہ مار پیٹ کرنے والوں کا تعلق اسلامی جمیعت طلباء سے ہے اور غنڈہ گردی کے ایسے واقعات روز مرہ کا معمول ہے ۔ میں نے اِس غنڈہ گردی کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا کہ وجہ تو کوئی بھی نہیں ہوتی بس یہ لوگ جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھا کھڑے دیکھتے ہیں وہیں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں ۔ میرے لئے یہ حیرت کا دوسرا بڑا جھٹکا تھا کیونکہ اسی مادرِ علمی کی آغوشِ محبت نے میری عطشِ علمی کو پروان چڑھایا اور اسی یونیورسٹی میں مَیں نے اسلامی جمیعت طلباء کے لیے دن رات کام کیا۔ مجھے آج بھی فخر ہے کہ میں فکرِ مودودیؒ سے متاثر ہوں اور فُرصت کے

ہر لمحے میں " تفہیم القُرآن " سے رہنمائی لیتی رہتی ہوں۔لیکن جس جمیعت سے میرا غائبانہ تعارف اُس روز ہوا،بخُدا میرے لیے وہ اجنبی تھی ۔۔۔ بالکل اجنبی۔مجھے اُن میں سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی فکر کی بُو ملی نہ باس ۔پتہ نہیں یہ اسلامی جمیعت طلباء کہاں سے آئی ہے ؟۔

گھر پہنچ کر بھی میں اپنی سوچوں سے اِس سانحے کو کھُرچ نہ سکی۔میرے سامنے وہ دَور تھا جب ہم اسی مادرِ علمی میں پڑھتے تھے ۔مخلوط تعلیم تو ہمارے دور میں بھی تھی لیکن اسلامی جمیعت طلباء کے نوجوانوں میں طالبات کا احترام کوٹ کوٹ کر بھرا نظر آتا تھا۔شاید اسی بنا پر طالبات کی غالب اکثریت اسلامی جمیعت طلباء کی جذباتی حامی بھی تھی ۔اب بھی مخلوط تعلیم ہی ہے لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ اب یونیورسٹی میں کئی ایسے ڈیپارٹمنٹ کھُل چکے ہیں جن کا ہمارے دور میں وجود تک نہ تھا۔اب نصابی ضرورت کے تحت تقریباً ہر ڈیپارٹمنٹ میں پریزنٹیشن کا رواج عام ہے اور اساتذہ کرام پریزنٹیشن کے لیے طلباء و طالبات کے مخلوط گروپ بھی تشکیل دیتے ہیں جس کی بنا پر طلباء و طالبات کا آپس میں رابطہ نا گزیر ہو جاتا ہے جسے کسی بھی صورت میں غلط یا نا مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔لیکن بنوکِ شمشیر اسلام پھیلانے کے یہ داعی پتہ نہیں کہاں سے وارد ہوئے ہیں جو اپنی حرکات و سکنات سے مولوی فضل اللہ کے حواری نظر آتے ہیں۔میں انتہائی ادب سے محترم لیاقت بلوچ صاحب اور

فرید پراچہ صاحب سے سوال کرتی ہوں کہ دیانت داری سے بتلائیں کہ کیا یہ وہی جمیعت ہے جو آپ لوگوں کے دَور میں ہوا کرتی تھی ؟۔ محترم فرید احمد پراچہ صاحب تو ہمارے ہی دور میں پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر تھے اور وہ گواہی دے سکتے ہیں کہ اُس دَور کی جمیعت سے ایسی غنڈا گردی کا تصور بھی محال تھا اور بلوچ صاحب کے دَور میں بھی ہمارا یونیورسٹی آنا جانا لگا رہتا تھا لیکن کبھی بھی اور کہیں بھی غنڈا گردی کا ایسا مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہمارے دَور میں ، البتہ پیپلز پارٹی کے پروردہ " سُرخے " غلام مصطفےٰ کھر کی سرپرستی میں غنڈا گردی کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے لیکن اس غنڈا گردی کے باوجود بھی وہ طالبات کا بہرحال احترام کرتے تھے۔ ہم نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اپنے کسی ساتھی طالب علم سے بات کرنا یا اُس کے ساتھ کھڑے ہونا ایسا جُرمِ عظیم ہے جس پر سزا واجب ہو جاتی ہے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح سے چند شر پسندوں کی دہشت گردی کی بنا پر سارے طالبان بدنام ہو رہے ہیں اسی طرح سے اپنے مفادات کے اسیر " گھُس بیٹھیوں " کی وجہ سے جمیعت بدنام ہو رہی ہے۔ ایسے عناصر ہمارے دَور میں بھی ہوتے تھے لیکن آٹے میں نمک کے برابر ۔ لیکن اب جمیعت میں فکرِ مودودیؒ سے متاثر نوجوان شاید آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

میرے ذاتی علم میں ہے کہ اکابرینِ جماعتِ اسلامی کی غالب اکثریت اِن

غنڈوں" سے نالاں اور بیزار لیکن مصلحتاً خاموش ہے۔اِن عناصر کے بارے میں جب" بھی سوال کیا جاتا ہے تو جماعت کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ اسلامی جمیعت طلباء کا نظم الگ ہے اور جماعتِ اسلامی کا اُن سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ۔جماعت کے اِس جواز کی صداقتوں پر کبھی بھی کسی نے یقین نہیں کیا اور ہمیشہ جمیعت کا کیا جماعت کو بھگتنا پڑتا ہے جس سے اکابرینِ جماعت بخوبی آگاہ ہیں ۔اب جب کہ قوم ایک دفعہ پھر اپنے رہنماؤں کو منتخب کرنے جا رہی ہے ، جماعتِ اسلامی کے اکابرین سے دست بستہ عرض ہے کہ وہ یا تو اسلامی جمیعت طلباء سے لا تعلّقی کا واضح اور واشگاف اعلان کرے یا پھر وہ گَند" صاف کرنے کی کوشش کریں جس سے اسلامی جمیعت طلباء بلکہ براہِ راست" جماعت اسلامی بدنام ہو رہی ہے ۔ملک کی منظم ترین جماعت کے لیے یہ کام ایسا مشکل بھی نہیں۔ میں یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ تحریکِ انصاف کے عروج کے دنوں میں جب مفاد پرست دھڑا دھڑ تحریک میں شامل ہو رہے تھے تب تحریکِ انصاف سے ہمدردی رکھنے والے لوگ پریشان ہو کر اکابرینِ تحریکِ انصاف کو یہ سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ ایسے لوگوں کا وجود تحریک کے لیے سراسر گھاٹے کا سودا ہے ۔لیکن تحریک کے بزرجمہروں کا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ "ہم آنے والوں کو کیسے روک سکتے ہیں"۔لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اِنہی "فصلی بٹیروں" کی وجہ سے تحریکِ انصاف کا گراف یوں گرنا شروع ہوا کہ لوگ دنگ رہ گئے ۔اب تحریک کے دانشور لاکھ یہ کہتے پھریں کہ اُن کے انتخابی اُمید وار

پاک صاف لوگوں پر مشتمل ہونگے ، کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں ۔یقیناً اب اُن کو ادراک ہو گیا ہو گا کہ جن لوگوں کو وہ بُرا بھلا کہتے رہے ہیں دراصل وہی اُن کے ہمدرد تھے۔اسی طرح سے اگر جماعتِ اسلامی یا اسلامی جمیعت طلباء یہ جواز گھڑتی ہے کہ وہ آنے والوں کو کیسے روک سکتے ہیں تو پھر اُن کا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔

پیرِ طریقت کا ولولہ انگیز خطاب

ہمارے انتہائی محترم پیرِ طریقت شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر حضرت مولانا طاہر القادری صاحب نے مینارِ پاکستان پر عظیم الشان جلسے سے خطاب کرکے اونچے ایوانوں میں زلزلہ بپا کر دیا۔ اُنھوں نے انتہائی کسرِ نفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بیس پچیس لاکھ کا مجمع ہے۔ بصد عجز و نیاز خدمتِ عالیہ میں عرض ہے کہ اتنی کم تعداد بیان کرکے ہم جیسے پیروکاروں کا دل مت توڑیے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے "محفوظ کیبن" میں تشریف فرما ہونے کی وجہ سے وہ درست اندازہ نہ لگا سکے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجمع تو دریائے راوی پار کرکے شاہدرہ اور کالا شاہ کاکو روندتا ہوا مریدکے تک جا پہنچا اور یہ بھی شنید ہے کہ دریائے راوی پر پکنک مناتے، کشتی رانی کرتے لوگ بھی پکنک چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ دوسری طرف چونکہ خادمِ اعلیٰ نے تخریب کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض جلسے کو ناکام کرنے کی خاطر گردو نواح کی ساری سڑکیں توڑ پھوڑ ڈالی تھیں اس لیے مجمع مال روڈ کو لبالب کرتا ہوا چوبرجی تک ہی پہنچ سکا جبکہ تیسری طرف اگر درمیان میں واہگہ بارڈر نہ پڑتا تو شاید مجمع ہندوستان تک جا پہنچتا۔ قارئین جو جلسے میں شرکت کی سعادتوں سے محروم رہ گئے، وہ خود ہی اندازہ لگا لیں کہ کیا مجمع چالیس پچاس لاکھ سے کم ہو سکتا ہے؟۔ ویسے ہم بھی کسرِ نفسی سے ہی

کام لے رہے ہیں وگرنہ تعداد تو اِس سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ حضرت مولانا نے فرمایا ہے کہ 14 جنوری کو اس سے ڈبل تعداد اسلام آباد کی طرف مارچ کرے گی۔ گویا لگ بھگ ایک کروڑ افراد اسلام آباد جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اِس لیے "اسلامابادیو" ہشیار باش۔

حسد کی آگ میں جل بھُن کے "سیخ کباب" ہونے والے خواہ کچھ بھی کہیں لیکن "سانچ کو آنچ نہیں" اور سچ یہی ہے کہ پیرِ طریقت نے پیپلز پارٹی اور نواز لیگ کو "پھڑکا کے" رکھ دیا ہے۔اسی لیے یہ دونوں جماعتیں سب سے زیادہ واویلا کر رہی ہیں۔ لیکن ہونا تو وہی ہے جو میرے پیرِ طریقت شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر حضرت مولانا طاہر القادری صاحب نے فرمانا ہے کیونکہ وہ کوئی کام "بشارت" کے بغیر نہیں کرتے۔اب بھی انہیں یقیناً بشارت ہی ہوئی ہو گی جو وہ آناً فاناً پاکستان آن پہنچے اور اپنے کشف و کرامات کے زور پر انسانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگا دیے۔میں نے یہی بات اپنی ایک جاننے والی سے کی تو اُس "مردود" نے میری باتوں کی تصدیق کرتے ہوئے مجھے انٹرنیٹ پر "مولانا کے خواب" دیکھنے کا مشورہ دیا۔میں عالمِ شوق میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جھٹ سے مولانا کا پہلا خواب دیکھنے میں محو ہو گئی۔ لیکن پہلے خواب پر ہی "لاحول" پڑھتے ہوئے نیٹ بند کر دیا۔یہ شر پسندی کی انتہا ہے جس میں یقیناً امریکی سی آئی اے ملوث ہے جس نے استعمال کرتے ہوئے اِن خوابوں Tricks سائنسی

کو مولانا سے منسوب کر دیا ہے۔اس لیے قارئین انٹرنیٹ پر خوابوں والی سائیٹ ہر گز نہ دیکھیں،اور اپنا ایمان مضبوط رکھیں کہ مولانا کبھی جھوٹ نہیں بولتے ۔اور یہ جو الیکٹرانک میڈیا پہ "چڑیا والے" صاحب بیٹھے ہیں ،اُن کے گمراہ کُن پراپیگنڈے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اُن کے "ٹاک شوز" ہر گز نہ دیکھے جائیں ۔ابھی کل ہی وہ اپنے پروگرام میں پُرانے "ٹوٹے" چلا رہے تھے جن میں پہلے کلپ" میں حضرت مولانا یہ فرماتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے اُنھوں نے کبھی" جھوٹ نہیں بولا۔ جبکہ دوسرے کلپ میں وہ انگلش میں فرماتے ہیں کہ شاتمِ رسول کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے اور اگر کوئی غیر مسلم حرمتِ رسول کے خلاف بات کرے تو اُسے سزا نہیں دی جا سکتی۔ تیسرا کلپ اُردو میں ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ کوئی شاتمِ رسول ، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، قابلِ گردن زنی ہے۔اگلے انگریزی کلپ میں فرمایا کہ حُرمتِ رسول کے قانون کا اُن سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی کبھی اُنھوں نے ایسا قانون بنوانے کی تگ ودو کی جبکہ آخری اُردو کلپ میں فرمایا کہ حُرمتِ رسول کا قانون صرف میں نے بنوایا اور اِس میں کوئی عالمِ دین میرے ساتھ نہیں تھا۔ فیصلہ خود ہی کر لیجئے کہ کیا مولانا جیسی برگزیدہ ہستی ایسے متضاد بیانات دے سکتی ہے ؟۔یقیناًیہ بھی امریکی سازش ہی ہے کیونکہ امریکہ چاہتا ہے کہ بھلے پیپلز پارٹی کی بجائے نواز لیگ ہی اقتدار کیوں نہ سنبھال لے لیکن شیخ الاسلام نہیں ۔۔۔۔ ہر گز نہیں ۔ لیکن یہ تو اب نوشتہ دیوار ہے کہ مولانا

آوے ای آوے" ۔طیور کی زبانی اُڑتی سی خبر یہ بھی ہے کہ ایم کیو ایم اور تحریکِ" انصاف والے بھی ڈر سہم کر مولانا کے سایہ عاطفت میں پناہ لینے کے لیے بیتاب ہیں ۔اگر حضرت مولانا نے کمال شفقتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُنہیں اپنے ساتھ ملا لیا اور ساتھ ہی فرزندِ راولپنڈی شیخ رشید احمد کا "تڑکا" بھی لگ گیا تو گجرات کے چوہدری پیپلز پارٹی کو داغِ مفارقت دینے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کریں گے ۔ویسے بھی وہ روٹی شوٹی" کی دعوت تو دے ہی چکے ہیں،اور کامیاب ترین جلسے کی مبارک باد بھی" ۔اگر ایسا ہو گیا اور یقیناً ایسا ہی ہونے جا رہا ہے تو پھر پیپلز پارٹی اور نواز لیگ کا "ٹھپ ہووے ای ہووے"۔

کچھ بکاؤ اور بقول سینئر لکھاری "بھاڑے کے ٹٹو" کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام نے آئین کی کتاب لہرا لہرا کر خلافِ آئین باتیں کیں اور اُن کا خطاب تضادات کا مجموعہ ہے ۔وہ کہتے ہیں کہ ایک طرف تو مولانا آئین کے بغیر لُقمہ توڑنے کو تیار نہیں جبکہ دوسری طرف وہ آئینی حکومت کے خلاف محاذ آرائی کے لیے عوام کو اُکسا رہے ہیں جو غیر آئینی ہے ۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مولانا آئین کی مقرر کردہ مدّت (90دن) کے ختم ہونے کے بعد بھی انتخابات کے انعقاد میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے جس کے لیے وہ آئین کے آرٹیکل 254 کا حوالہ دیتے ہیں جبکہ آئین کی تشریح کرنے کا حق رکھنے والے چیف جسٹس صاحب کا فرمان ہے کہ سوائے

خانہ جنگی کے انتخابات میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں ہو سکتی اور ملک میں خانہ جنگی کا ماحول ہر گز نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر فوج نے قبضہ کرنے کی کوشش کی تو وہ مزاحمت کاروں کی صفِ اوّل میں ہونگے جبکہ عدلیہ اور فوج کی شمولیت کے بغیر وہ کسی نگران حکومت کو تسلیم کرنے کو ہر گز تیار نہیں جو سراسر غیر آئینی ہے۔ تضادات تو یہ لوگ اور بھی بہت سے بیان کرتے ہیں اور اِنہیں بیان کرنے بھی چاہییں کہ اسی میں اُن کی روزی روٹی مضمر ہے لیکن عقل و شعور سے عاری یہ لوگ اگر پیرِ طریقت شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر حضرت مولانا طاہر القادری صاحب کے "اسرار و رموز" تک پہنچ پاتے تو پھر وہ بھی "مولانا" ہوتے، یوں دھکے نہ کھاتے پھرتے۔

باتیں تو اور بھی بہت ہیں اور نچھاور کرنے کے لیے عقیدت کے پھول بھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ "حقِ مریدی" ادا کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے لیکن اِس خوف کے پیشِ نظر نہیں لکھا جا رہا کہ کہیں اخبار والے میرے کالم کی قطع و برید نہ کر دیں۔ کوئی اور کالم ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن عقیدتوں بھرے اِس کالم کے ایک جملے کی بھی کمی منظور نہیں۔ اس لیے قارئین اسے عقیدتوں کے نذرانے کی پہلی قسط سمجھیں۔۔۔۔۔

اے قائدِ اعظم۔۔۔۔۔

25 دسمبر کا دن ہم پورے اہتمام سے مناتے ہیں۔اس روز بیشمار تقاریب بھی ہوتی ہیں اور ہم بھی بڑے ردھم سے گاتے ہیں

یوں دی ہمیں آزادی کہ دُنیا ہوئی حیران

اے قائدِ اعظم ! تیرا احسان ہے، تیرا احسان

لیکن شاید کسی کو بھی پاکستان کی فضاؤں میں پکارتی روح قائد کی سسکیاں سُنائی نہیں دیتیں جو یہ کہتی ہیں کہ کہاں ہے وہ پاکستان جس کے حصول کی خاطر میں نے اپنی جان تک کی پرواہ نہ کی۔ محترمہ فاطمہ جناح کے مطابق قائدِ اعظم بخوبی جان چُکے تھے کہ وہ سفر زندگی کی آخری گزرگاہ پر قدم رکھ چُکے ہیں لیکن اُس مردِ آہن کو تو کچھ بھی یاد نہیں تھا سوائے حصولِ مقصد کے اور مقصد ہندوستان میں پھیلے منتشر اور مایوس مسلمانوں کے لیے ایک ایسا قطعہ زمین حاصل کرنا جہاں وہ بِنا کسی روک ٹوک اپنے مذہبی عقائد کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔اپنی جدو جہد کے آخری دنوں میں اُن کی حالت یہ تھی کہ وہ کئی، کئی دن تک صاحبِ فراش رہتے لیکن جہاں کہیں اُن کی ضرورت محسوس ہوتی وہ اِس عالم میں پہنچتے کہ کسی کو اُن کے دمکتے چہرے پر بیماری کا شائبہ تک محسوس نہ ہوتا۔وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے لیکن ہم اُن کی کامیابی کا

بھرم بھی نہ رکھ سکے۔

شاید اسی لیے یہ دِن مجھے بُری طرح اُداس کر دیتا ہے اور میں چاہتے ہوئے بھی اُن کے یومِ پیدائش کی خوشیوں میں شریک نہیں ہو سکتی۔ میری آنکھوں کے میں 16 دسمبر 71ء کی وہ ٹھنڈی دھوپ جھلملانے لگتی ہے جب ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جنرل جگجیت سنگھ اروڑا نے ہماری عظمتوں کے تمغے نوچے، ہمارے "ٹائیگر" کو پنجرے میں بند کیا اور میرے قائدؒ کے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ وہ قیامت کی گھڑی ہی تو تھی جب اُدھر ہمارے نوّے ہزار فوجی اور شہری پابہ زنجیر ہوئے اور اِدھر "اِک شرابی" قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا "جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی، وقتی طور پر پیچھے ہٹ جانے کا نام شکست نہیں۔۔۔ آزادی کی شمع بچے بچے کے ہاتھ میں روشن ہے۔۔۔" لیکن اُس کی اِن خرافات پر تب دھیان دینے والا کوئی نہ تھا کہ گھر گھر میں تو صفِ ماتم بچھی تھی اور در در پہ نوحہ خوانی۔

پتہ نہیں بابائے قوم نے یہ کہا تھا یا نہیں کہ اُن کی جیب کے سکّے کھوٹے ہیں لیکن سچ اُگلنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ سکّے تو کھوٹے ہی تھے اور تا حال کھوٹے ہیں۔ افرا تفری، ہنگامے، دہشت گردی، فرقہ واریت، لسانی جھگڑے، مسالک کی جنگ، لوٹ مار، کرپشن، ٹارگٹ کلنگ اور اداروں کی

تباہی انہی کھوٹے سکّوں کی دین ہے جس میں یہ قوم عشروں سے مبتلا ہے۔سیاست میرا کبھی بھی موضوع نہیں رہا لیکن میں پاکستانی شہری تو ہوں اور ہر روز اُسی کَرب سے گزرتی ہوں جس سے ساری قوم گزرتی ہے۔اِس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی میرے کالموں میں سیاست در آتی ہے۔میں جب چلچلاتی دھوپ اور ٹھٹھرتی سردی میں ننّھے مُنّے معصوموں کو کام کرتے اور ہلکان ہوتے دیکھتی ہوں تو اکثر میری سوچوں میں حاکمانِ وقت کے بچے آ جاتے ہیں جو یورپ اور امریکہ کی فضاؤں میں ہمارے خون پسینے کی کمائی سے پرواز چڑھ رہے ہیں اور ہم ، غُلامانِ وقت اِس انتظار میں ہیں کہ کب ہماری گردنیں نئے طوقِ غُلامی سے آراستہ کی جائیں گی۔پھر میں اِس گرداب سے نکل نہیں پاتی ۔پھر مجھے امیر المومنین حضرت عمرؓ یاد جاتے ہیں جنہیں اپنا جسم ڈھانپنے کے لیے بیت المال سے صرف ایک چادر ملی ۔آپؓ طویل قامت تھے ، ایک چادر پورا جسم ڈھانپ نہیں سکتی تھی ۔دوسرے دن جب امیر المومنین صحابہؓ سے مشاورت کے لیے باہر تشریف لائے تو پورا جسم ڈھانپا ہوا تھا۔ایک عام صحابیؓ نے کھڑے ہو کر پوچھا "عمرؓ تمہارے حصّے میں تو صرف ایک چادر آئی تھی اس سے تم نے پورا جسم کیسے ڈھانپ لیا؟۔"آپ کے بیٹے نے فوراً کھڑے ہو کر کہا" میرے بابا کا قد لمبا ہے اور مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ امیرالمومنین اپنا پورا جسم بھی ڈھانپنے سے قاصر ہوں ۔اس لیے میں نے اپنے حصّے کی چادر بھی اُنہیں دے دی"۔لیکن ہمارے حکمرانوں کا یہ عالم ہے کہ اُنہیں عوام کا خون چوس چوس کر اپنے ذاتی خزانے بھرنے کے سوا

کوئی کام ہی نہیں۔ بابائے قوم نے تو کہا تھا "کام، کام اور صرف کام" لیکن ہمارے حکمرانوں نے کام کے لیے صرف مجبوروں اور مقہوروں کا انتخاب کر لیا۔ اُن کے دسترخوان وسیع ہوتے چلے گئے اور مقہوروں سے نانِ جویں بھی چھِن گئی۔

یوں تو ہم یومِ قائد بڑے جوش و جذبے سے مناتے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ نسلِ نَو کو حصولِ پاکستان کے لیے کی گئی لازوال قُربانیوں کا سرے سے علم ہی نہیں۔ انتہائی محترم عمران خاں صاحب نوجوانوں پہ اپنا حق جتاتے اور اُن کے ذریعے سونامی لانے کی باتیں کرتے ہیں لیکن وہ کبھی کسی بھی نوجوان کو کھڑا کرکے یہ پوچھنے کی زحمت بھی گوارہ کر لیں کہ قائدِ اعظم کون تھے اور اُنھوں نے یہ قطعہ ارضی کیسے حاصل کیا؟۔ وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ سوائے شرمندگی کے اُن کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا کیونکہ یہ نونہالانِ وطن فقط اتنا ہی جانتے ہیں کہ کراچی میں محوِ خواب ایک شخص کا نام قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ تھا جنھوں نے "غالباً" پاکستان بنایا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ہمیں یا ہمارے قائدین کو اسلاف سے کوئی غرض ہے نہ اُن کی تاریخ سے۔ خادمِ پنجاب میاں شہباز شریف بھی تعلیم کے نام پر اربوں صرف کر رہے ہیں لیکن کیا اساسِ پاکستان کی طرف کبھی اُن کا دھیان گیا؟۔ وہ چند سو، یا چند ہزار کو ایچی سن جیسے اداروں کے فارغ التحصیل طلباء کے مقابلے میں کھڑا کرنے کے لیے تو کمربستہ ہیں لیکن اُن کروڑوں بچوں سے بے خبر جو ہر روز روٹی کے چند ٹکڑوں کی خاطر سڑکوں کی

ڈھول چاٹتے نظر آتے ہیں۔ رہی پیپلز پارٹی تو اُسے دوسرے کاموں سے فُرصت کہاں کہ وہ ایسی بیکار باتوں پہ توجہ دے۔ البتہ اُس کے حواری دانشور قائدِ اعظم کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے ہمہ وقت لنگوٹ کَس کر تیار رہتے ہیں۔ اُنھیں شاید دو قومی نظریہ کا مطلب دوبارہ سمجھانا پڑے گا جس کی بنیاد پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ اُنھیں یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ دُنیا کی تمام اقوام جغرافیائی سرحدوں کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آتی ہے لیکن قومِ مسلم نظریہ کی بنیاد پر۔ اگر قائدِ اعظم سیکولر سٹیٹ ہی چاہتے تھے تو پھر ہندوستان کی تقسیم کا کوئی جواز ہی نہیں باقی بچتا کیونکہ ہندوستان تو آج بھی ایک سیکولر سٹیٹ ہی ہے۔ اُس سیکولر سٹیٹ میں ہندو جو حشر دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کا کر رہے ہیں وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ حضرتِ قائدِ اعظمؒ نے اِس کا ادراک بہت پہلے کر لیا اور وہ جو "امن کا سفیر" کہلاتے تھے، اُنھوں نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ہمیں زمین کا ایک ایسا ٹکڑا چاہیے جسے ہم اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکیں" ۔آج کا سیکولر دانشور خواہ کچھ بھی کہے لیکن یہ تاریخ ہے کہ قائد نے جس بنیاد پر یہ ٹکڑا" حاصل کیا وہ بنیاد لا الہ الا اللہ تھی، ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ رہے گی۔

کیا اسلام آباد التحریر اسکوائر بننے جارہا ہے؟

میر تقی میر کے سامنے دِلّی بار بار اُجڑی۔اُن کی پوری زندگی کبھی غنیم کا پیچھا کرنے اور کبھی شکست کھا کر بھاگنے میں صرف ہو گئی۔ سبھی ساتھی دِلّی سے لکھنو ہجرت کر گئے لیکن میر کا دل دِلّی میں کچھ ایسا اٹکا کہ دِلّی چھوڑنے کے خیال سے ہی ہَول اٹھنے لگتے ۔پھر چشمِ فلک نے یہ عجب نظارہ بھی دیکھا کہ امتدادِ زمانہ نے مجنونِ دِلّی کو بھی ہجرت پر مجبور کر دیا میر عازمِ سفر ہوئے اور راہ کی صعوبتیں برداشت کرتے جب لکھنو پہنچے تو حالت یہ تھی کہ سر میں دھول، دریدہ پیرہن، ننگے پاوں اور بڑھی ہوئی داڑھی ۔ظاہری حلیے سے یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی دیوانہ، کوئی سودائی جارہا ہو۔ میر اسی حالت میں شاعری کی ایک محفل میں جا پہنچے جہاں زرق برق لباس میں ملبوس شعراء اپنا کلام سُنا رہے تھے۔ شمعِ محفل جب گھومتے گھومتے میر صاحب کے قریب پہنچی تو کسی ستم ظریف نے از راہِ تفنن شمع میر صاحب کے سامنے رکھ کر کہا" حضرت! ارشاد"۔جس پر محفل کشتِ زعفران بن گئی تب میر تقی میر نے فی البدیہہ وہ اشعار کہے جو اُردو شاعری میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔اُنھوں نے فرمایا

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہس ہس پُکار کے

دِلّی کہ جو اِک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے وہاں تھے منتخب ہی روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

تب لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ تو اُستاد الاساتذہ میر تقی میر ہیں۔کاش کہ میرے وطن کے باسیوں کو بھی اِس سوہنی دھرتی سے اتنا ہی عشق ہوتا جتنا میر کو دِلّی سے تھا۔

کراچی میں ایم کیو ایم کے زیرِ اہتمام "سفرِ انقلابِ پاکستان" کا جلسہ جاری ہے۔عوام کا تا حدِّ نظر ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجود، شیخ الاسلام خطاب فرما چکے، قائدِ تحریک الطاف حسین کا خطاب جاری ہے لیکن میں اُسے سننے کی بجائے کالم لکھنے میں مصروف ہوں کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ قائدِ تحریک حسبِ سابق "اوئے جاگیر دارا" ٹائپ خطاب ہی فرما رہے ہونگے۔ایم کیو ایم کی بہر حال یہ صفت تو ماننی ہی پڑے گی کہ وہ آناً فاناً لاکھوں کا مجمع اکٹھا کر لیتی ہے۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سب کچھ "ڈنڈے کے زور پر" کیا جاتا ہے۔ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن مجمع تو مجمع ہی ہوتا ہے خواہ اصلی ہو یا جعلی۔لیکن میری کالم لکھنے کی تحریک کا سبب جلسہ ہے نہ خطاب بلکہ اُس دُکھ کا اظہار

کرنا ہے جو شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر حضرت مولانا، علّامہ طاہر القادری نے اُردو ادب کی اِس طالبہ کو پہنچایا۔ مولانا دینِ مبیں کے بارے میں جو کچھ بھی فرماتے رہے ہیں وہ قبول کہ ہم جیسوں کا علم بہر حال اُن کے مقابلے میں ناقص ہے لیکن اگر وہ میر و غالب کی روحوں پر احسانِ عظیم فرماتے ہوئے آئیندہ کے لیے اپنے خطبات میں اِن کے اشعار کا کچرا کرنے سے توبہ فرمالیں تو مہربانی ہوگی۔ اُنھوں نے اپنے خطبے میں میر تقی میر کے بالا اشعار کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے محض غلط سلط تین مصرعے ارشاد فرمائے اور بھرّائی ہوئی آواز میں اُن مصرعوں کو غالب سے منسوب کر دیا۔ مجھے تو خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں مولانا صاحب چھ سات سو صفحات کا فتویٰ ہی جاری نہ فرمادیں کہ یہ اشعار میر کے نہیں غالب ہی کے ہیں کیونکہ اِس معاملے میں وہ مہارتِ تامہ رکھتے ہیں ۔اگر ہزار پانچ سو کتابیں وہ لوگوں سے لکھوا کر اپنے نام سے چھپوا سکتے ہیں تو میر کو غالب اور غالب کو میر قرار دینا تو اُن کے لیے کونسا مشکل کام ہے۔ لیکن شکر ہے کہ حضرت علّامہ کو اللہ رسول اور قُرآن کی قسمیں اُٹھانے سے ہی فُرصت نہیں اِس لیے میر و غالب بال بال بچ گئے۔

میرا "سونامی" کے علمبردار انتہائی محترم عمران خاں صاحب کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ بھی قسمیں اُٹھانے کی خوب خوب پریکٹس کر لیں کیونکہ انقلاب کے داعی وہ بھی ہیں اور اُمیدِ واثق ہے کہ آئیندہ جلسے جلوسوں میں قسمیں

اُٹھانے کا مقابلہ ہی ہوا کرے گا۔ قائدِ تحریک تو ایک وڈیو خطاب میں قُرآنِ مجید لہرا لہرا کر پہلے ہی خوب پریکٹس کر چکے ہیں البتہ میاں برادران کے لیے ذرا مشکل ہو گی کیونکہ وہ قسمیں کھانے کے عادی ہیں نہ اُنہیں اِس کی پریکٹس۔ رہی پیپلزپارٹی کی بات تو اُنہیں قسمیں اٹھانے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں کھُلم کھُلا اور سینہ تان کے کرتے ہیں۔

مولانا طاہر القادری اور محترم الطاف حسین نے 14 جنوری کو اسلام آباد کو التحریر اسکوائر میں بدلنے کا اعلان فرما دیا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اُن کے چالیس لاکھ پیروکار لانگ مارچ میں شرکت کریں گے۔ میری حضرت مولانا سے استدعا ہے کہ وہ "چالیس" میں کمی بیشی کرلیں کیونکہ میاں شہباز شریف کو اِس ہندسے سے چِڑ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اِنہیں بھی چالیس چور قرار دے دیں۔ دوسری طرف اگر ایم کیو ایم کے پچیس تیس لاکھ افراد لانگ مارچ میں شرکت کرنے سے قاصر رہتے ہیں تو اُس کی قومی اسمبلی کی پچیس سیٹوں کا کیا فائدہ۔ ویسے بھی یہ اُن کے لیے باعثِ شرم ہو گا کہ وہ اتنی قلیل تعداد بھی اکٹھی نہ کر سکے۔ اُدھر چوہدری برادران نے بھی مولانا کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر دیا ہے۔ وہ بھی پاکستان کی ایک بڑی سیاسی جماعت کے سربراہ اور کرتا دھرتا ہیں اس لیے بیس پچیس لاکھ تو اُن کی ذمہ داری بھی ٹھہری۔ گویا محتاط ترین اندازے کے مطابق لگ بھگ ایک کروڑ سے زائد افراد کی شرکت متوقع ہے اس لیے اب

اسلام آباد التحریر اسکوائر بنے ہی بنے۔
نہ جانے کیوں میرا بار بار یہ لکھنے کو جی چاہ رہا ہے کہ "شرم تم کو مگر نہیں آتی" ۔ شیخ الاسلام تو مانا کہ اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر کسی ملکی یا غیر ملکی ایجنڈے کے تحت پاکستان تشریف لے آئے لیکن یہ ایم کیو ایم اور قاف لیگ کو کیا ہو گیا ہے ؟۔وہ تو حکومت کے مزے لوٹتی رہیں اور تا حال لوٹ رہی ہیں پھر ان کا مولانا قادری کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنا چہ معنی دارد۔ مولانا جو حکومت کے خلاف زہر اُگل رہے ہیں کیا حکومت کے ساجھی دار اُس جرم میں برابر کے شریک نہیں ؟۔ مولانا قادری کے پہلو میں بیٹھے محترم فاروق ستار کم از کم یہ شعر پڑھ کر ہی ہم جیسوں کو خوش کر دیتے کہ
کتنے شیریں ہیں تیرے لَب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوا
سابقہ وزیرِ اعظم یوسف رضا گیلانی نے آج جل بھُن کر یہ کہا کہ طاہر القادری تو حکومت کے خلاف لانگ مارچ کر رہے ہیں لیکن اپنے ڈپٹی وزیرِ اعظم صاحب کس کے خلاف لانگ مارچ کریں گے ؟۔اُدھر جنابِ صدر نے بھی ہنگامی طور پر وزیرِ اعظم اور دیگر اکابرینِ پیپلز پارٹی کو کراچی طلب کر لیا ہے جہاں بہت سے دھماکا خیز فیصلے ہونے کی توقع ہے ۔پہلا دھماکا تو غالباََ ہو بھی چُکا کہ

پیپلز پارٹی نے سندھ میں ایم کیو ایم کے دباو پر جاری کردہ لوکل گورنمنٹ آرڈی نینس پر نظرِثانی کا فیصلہ کر لیا ہے اور آغا سراج درانی نے اِس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔اِس آرڈی نینس کا خاتمہ ایم کیو ایم کے نزدیک اُس کی سیاسی موت کے مترادف ہے۔اِس لیے اُمید یہی ہے کہ ایم کیو ایم اِس دھمکی کو برداشت نہیں کر پائے گی۔اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ایم کیو ایم اپنا فائدہ دیکھتے ہوئے اُلٹے پاوں پھرنے میں دیر نہیں لگاتی۔اُدھر چوہدریوں کو بھی اقتدار کی بُری لَت نے بدمست کر رکھا ہے اگر پیپلز پارٹی نے اُنہیں بھی کوئی دھمکی لگا دی تو وہ بھی باقی بچ جانے والے دو اڑھائی ماہ کے اقتدار سے دور ہونا پسند نہیں کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ چراغِ رُخِ زیبا لے کر گلی گلی بھی پھرتے رہیں تو پھر بھی اب کبھی اقتدار کی دُلہن اُن کے نصیب میں نہیں آنے والی۔اگر ایسا ہو گیا تو پھر مولانا قادری کو جو مایوسی ہو گی سو ہو گی لیکن ہماری اپنی حالت یہ ہو گی کہ

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

سارے رَل کے سانوں پے گئے نیں

سچ کہا ہے بڑے میاں صاحب نے کہ "سارے رَل کے سانوں پے گئے نیں" ۔اس سے پہلے بھی یہ قوم اُن کے ساتھ "ہتھ" کر چکی ہے جس کا ذکر میاں نواز شریف صاحب نے مُسکراتے ہوئے یوں کیا"سب کہتے تھے کہ قدم بڑھاؤ نواز شریف ، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔لیکن جب میں نے قدم بڑھایا تو سبھی کِھسک لیے"۔اِس صریحاً دھوکا دہی کی واردات کے بعد میاں فیملی کو جلا وطنی کا دُکھ جھیلنا پڑا۔اور" دودھ کا جَلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے" کے مصداق میاں صاحبان جب طویل جلا وطنی کے بعد وطن لوٹے تو بہت محتاط تھے ۔یہ احتیاط ساڑھے تین برس تک جاری رہی اور پیپلز پارٹی عیش کرتی رہی۔ یہ احتیاط اگر جاری رہتی تو نواز لیگ کا مکمل "ٹھّو" ٹھَپ جاتا۔وہ تو بھلا ہو الیکٹرانک میڈیا کا جس نے "فرینڈلی اپوزیشن" کی اتنی تکرار کی کہ چھوٹے میاں صاحب بھڑک اُٹھے اور اُنھوں نے مودبانہ انگلی لہرا لہرا کر بڑے میاں صاحب کو تھوڑا بہت رام کر ہی لیا۔ویسے یہ چھوٹے بھائی سے پیار تھا جو بڑے میاں صاحب مان گئے ورگرنہ آج بھی زرداری صاحب کا نام سنتے ہی اُن کے دل میں گُدگدی ہونے لگتی ہے۔شاید اسی لیے وہ چھوٹے بھائی کو زرداری صاحب کے معاملے میں "ہتھ ہولا" رکھنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ محترم میاں نواز شریف کو حضرت علیؓ کا یہ قول ہر گز یاد نہیں کہ "جس پر احسان کرو اُس کے شر سے بچو"۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر حضرت مولانا علاّمہ طاہر القادری پر احسانات کی بارش کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے شر سے محفوظ رہنے کے طریقے بھی سوچ رکھتے۔ لیکن اُنہوں نے تو ناتواں طاہر القادری کو اپنے مضبوط کندھوں پر اُٹھا کر جبلِ نور کی اونچائیاں سَر کرتے ہوئے غارِ حرا تک پہنچا کر یہ جانا کہ مولانا موصوف اُن کے حق میں بھی دعائے خیر کریں گے جبکہ مولانا "گڑگڑا، گڑگڑا کر" اپنی وزارتِ عظمیٰ کی دُعا مانگتے رہے۔ اگر میاں صاحب عقلِ سلیم سے کام لیتے ہوئے اُس سنہری موقعے پر حضرت مولانا کو "جپھا" مار کر اُٹھاتے اور غارِ حرا سے نیچے دے مارتے تو اُنہیں آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا، نہ مولانا ماڈل ٹاؤن میں بیٹھ کر اُن کے سینے پر مونگ دلتے اور نہ ہی میاں شہباز شریف صاحب کو یہ کہنا پڑتا کہ "عوام اُن کا راستہ روکیں جو کسی اور کا ایجنڈا لائے ہیں"۔ لیکن یہ سب کچھ تو اُن کا اپنا ہی کیا دھرا ہے اِس لیے

اب کیوں اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اِس طرح تو ہوتا ہے، اِس طرح کے کاموں میں

میاں صاحبان کو حضرت علیؓ کا قول یاد نہ ہونے کی یوں تو اور بھی کئی مثالیں ہیں لیکن فقط ایک مثال اور۔۔۔ عرض ہے کہ میاں صاحب کا محترم جاوید ہاشمی

صاحب کے لیے پیار بھی ہمیشہ اپنی انتہاؤں کو چھوتا رہا۔جلا وطنی کے عرصے میں ہاشمی صاحب کو نون لیگ کی صدارت سونپ کر اپنا سیاسی وارث مقرر کیا، ہاشمی صاحب اپنی ملتان کی ذاتی سیٹ پر کبھی کامیاب نہیں ہوئے لیکن میاں صاحب نے اُنھیں چار چار سیٹوں پر الیکشن لڑوایا۔ملتان کے مضبوط ترین شاہ محمود قریشی پر ہاشمی صاحب کو ترجیح دی ۔خود ہاشمی صاحب کے بقول میاں نواز شریف صاحب اُن کی کار کا دروازہ خود کھول کر اُنھیں اندر بٹھایا کرتے تھے اور دروغ بر گردنِ راوی میاں برادران گاہے بگاہے ہاشمی صاحب کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔لیکن ہاشمی صاحب نے نواز لیگ کی بجائے تحریکِ انصاف کی "نرینہ اولاد" بننے کو ترجیح دی۔محترم حفیظ اللہ نیازی صاحب نے اپنے کالم میں محترم جاوید ہاشمی صاحب کو تحریکِ انصاف کی "نرینہ اولاد" ہی لکھا ہے جس سے مجھے مکمل اتفاق ہے لیکن پھر بھی میرے کچھ تحفظات ہیں۔سوچتی ہوں کہ اگر ہاشمی صاحب نرینہ اولاد ہیں تو پھر اُن سے پہلے تحریک میں شامل ہونے والے شاہ محمود قریشی، میاں اظہر، محمود علی قصوری، سردار آصف احمد علی اور دیگر بہت سے لوگ کس صنف سے تعلق رکھتے ہیں؟۔یہ تو ویسے ہی بات سے بات نکل آئی، میں عرض کر رہی تھی کہ محترم جاوید ہاشمی کے ساتھ پیار کی انتہا کرتے ہوئے بھی میاں صاحبان نے اُن کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوئی راہ نہیں نکالی۔اُنھیں سوچنا چاہیے تھا کہ جو شخص کسی ایک کو دھوکا دے سکتا ہے اُس کے لیے کسی دوسرے کو دھوکا دینا کچھ مشکل نہیں۔جاوید ہاشمی صاحب کی

تربیت جماعتِ اسلامی اور اسلامی جمیعت طلباء نے کی ۔ اُنہیں پنجاب یونیورسٹی کا مسلمہ سٹوڈنٹس لیڈر بنایا اور جماعت ہی کی طاقت سے وہ بھٹو مرحوم کے خلاف آگ اُگلتے اُگلتے سیاسی لیڈر بن گئے لیکن جونہی اُنہیں موقع ملا وہ چھلانگ لگا کر تحریکِ استقلال میں داخل ہوگئے۔ آمریت کے خلاف بڑھکیں لگانے والے ہاشمی صاحب نے آمر ضیاءالحق کی وزارت کو چوم کر سینے سے لگایا ، پھر نواز لیگ میں شامل ہوئے اور اب تحریکِ انصاف کی نرینہ اولاد۔اِس لیے میں کیسے مان لوں کہ میاں صاحب کو حضرت علیؓ کا قول یاد ہے۔

یہ بجا کہ پیپلز پارٹی ، قاف لیگ ، ایم کیو ایم اور اے این پی نے نواز لیگ کے خلاف ایکا کر لیا ہے اور تحریکِ انصاف تو ہے ہی اُس کی ازلی ابدی دشمن لیکن اِس کے باوجود بھی نواز لیگ کی مقبولیت کا گراف تیزی سے اونچا ہوتا چلا جا رہا ہے اور ضمنی انتخابات میں پیپلز پارٹی ، قاف لیگ اور تحریکِ انصاف کی بھرپور مخالفت کے باوجود نواز لیگ نے حیران کُن کامیابیاں سمیٹیں۔اگر میاں نواز شریف صاحب کی یہ سوچ ہے کہ یہ اُن کی جمہوریت کے لیے کی جانے والی چار سالہ کاوشوں کا ثمر ہے تو میں اِس سے اتفاق نہیں کرتی کیونکہ قوم کی جمہوریت تو پیٹ سے شروع ہو کر پیٹ پر ہی ختم ہو جاتی ہے ۔حقیقت بلکہ انتہائی تلخ حقیقت تو یہی ہے کہ کوئی آمر آئے یا جمہور نواز ، قوم کی سیاست روٹی ، کپڑا اور مکان کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے۔آپ سروے کروا کے

دیکھ لیجئے 90 فیصد کو تو لفظ "جمہوریت" کا سرے سے مطلب ہی نہیں معلوم۔ قصور اُن کا بھی نہیں کہ اُن کے آئین ساز لیڈروں (اراکینِ قومی اسمبلی) کا اگر آئین کی کتاب کا امتحان لیا جائے تو تحقیق کہ غالب اکثریت فیل ہو جائے گی ۔اس لیے جان لیجئے کہ قوم جمہوریت کے لیے قُربانیاں دینے والوں کو نہیں بلکہ روٹی ، کپڑا اور مکان کا بندوبست کرنے والوں کو ووٹ دیتی ہے ۔اگر نواز لیگ کی مقبولیت کا گراف دن بدن اونچا ہوتا چلا جارہا ہے تو اُس کی وجوہات یہ ہیں کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے عوام کو کرپشن ، مہنگائی ، بدامنی ، ٹارگٹ کلنگ ، لوڈ شیڈنگ اور بھتہ خوری کے سوا کچھ نہیں دیا۔ جتنی بھوک قوم نے روٹی ، کپڑا اور مکان کے داعیوں کے ہاتھوں دیکھی ہے اُس کا ردِ عمل یہی ہونا تھا جو ہو رہا ہے۔ دوسری وجہ تحریکِ انصاف کی بے پناہ مقبولیت کے بعد اُس کی سُرعت انگیز تنزلی ہے ۔اگر اکابرینِ تحریکِ انصاف اپنی بے پناہ مقبولیت کو سنبھال پاتے اور قدم قدم پر غلطیاں نہ کرتے تو آج نواز لیگ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ۔جب عوام نے تحریکِ انصاف میں بھی وہی دیمک زدہ چہرے دیکھے تو اُن کا ایمان متزلزل ہوا اور تحریک کا گراف گرتا چلا گیا جس کا فائدہ لا محالہ نواز لیگ کو ہی پہنچا۔ تحقیق کہ تحریکِ انصاف آج بھی ایک قوت ہے لیکن ایسی قوت کہ جو اب کسی کے لیے بھی لمحہ فکریہ نہیں۔ نواز لیگ کی مقبولیت کی تیسری بڑی وجہ قیادت پر ساڑھے چار سالہ دَور میں کرپشن کا کوئی الزام نہ آنا اور میاں شہباز شریف کی انتھک محنت ہے جس کا غیر ملکی ادارے

بھی اعتراف کرتے ہیں۔ اگر پنجاب میں بھی سندھ، سرحد اور خیبر پختونخواہ کی طرح ترقیاتی کام ہوتے نظر نہ آتے تو حشر اِس کا بھی وہی ہونا تھا جو پیپلز پارٹی کا ہو رہا ہے۔ اِس لیے بقول میاں صاحب اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ "سارے رَل کے ساتوں پے گئے نیں"۔ وہ اگر شجرِ عوام سے یوں ہی پیوستہ رہے تو یقیناً اُمید بہار رکھنا اُن کا حق ہے۔

ایجنڈا ایک ہی ہے

پروفیسر مظہر

گزشتہ 65 برسوں کی طرح 2012 ء بھی گزر گیا بدلا مگر کچھ بھی نہیں۔ ملکی حالات نہ قوم کا مقدر۔ ہم مسیحا کے انتظار میں تھے لیکن کاتبِ تقدیر نے ہماری قسمت میں معین قریشی ، شوکت عزیز ، مولوی طاہر القادری اور الطاف حسین جیسے برٹش ، امریکن اور کینیڈین لکھ دیئے ۔ سوال مگر یہ کہ کیا اتنا ہی قحط الرجال ہے کہ ہم ان " درآمد شُدہ " لوگوں کو اپنی آشاؤں اور اُمیدوں کا محور و مرکز بنا لیں ؟۔ کیا بانجھ ہو گئی ہے یہ دھرتی جو ہمیں ایک رہنما بھی نہیں دے سکتی ؟۔ اقبال نے فرمایا

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی ذرخیز ہے ساقی

ہم بھی نا اُمید نہیں کہ مایوسی کُفر ہے اور ہم کافر نہیں۔ ہمارے ایمان کی انتہا یہ ہے کہ یہ دھرتی انگڑائی لے کر اٹھے گی ، صحنِ چمن میں بہار آئے گی ، گُل کھلیں گے ، بُلبلیں چہچہائیں گی ، پپیہے پی کہاں کی رٹ لگائیں گے ، کوئلیں کُوکیں گی ، طیور نغمہ سنج ہونگے ، آشاؤں کی کھیتیاں ہری بھری ہونگی

اور پنہاریوں کے مدھر گیتوں کو بادِ نسیم و شمیم فضاؤں میں بکھیر کر مستیوں کی پرورش کریں گی۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا لیکن اِن "درآمدیوں" کے ہاتھوں نہیں کہ اِن کا تو ایجنڈا ہی کچھ اور ہے۔

کچھ فرق نہیں نام نہاد طالبان، دہشت گردوں اور اِن لوگوں میں کہ دونوں کا مقصد افرا تفری اور انارکی ہے۔ دہشت گرد نفاذِ شریعت کی آڑ میں دینِ مبین کو بدنام کرنے کے غیر ملکی ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں۔ حکیم اللہ محسود، ولی الرحمن اور احسان اللہ احسان نامی دہشت گردوں کی مذاکرات کی مشروط پیش کش میں ایک شرط دینِ اسلام کا مکمل نفاذ بھی تھی لیکن کل ہی اُنہوں نے چنگیزیت کی یاد تازہ کرتے ہوئے اکیس مغوی لیوی اہل کاروں کی گردنیں تن سے جُدا کر دیں۔ اسلام کے نام نہاد ٹھیکیداروں سے سوال ہے کہ قیدیوں کا قتل کس شریعت کا درس ہے؟۔ نہتے اور بے گناہ معصوم شہریوں کو خودکُش حملوں اور بم دھماکوں میں اُڑا دینا کہاں کا اسلام ہے؟۔ مساجد اور امام بارگاہوں پر حملے کرکے وہ کونسی سُنتِ رسول پر عمل پیرا ہیں؟۔ درسگاہوں کو ملیامیٹ کر دینا کس دین کا درس ہے؟۔ یہ کس دین پر عمل پیرا ہو کر ہر طرف بربادی کی فصل بو رہے ہیں؟۔ کیا وہ قُرآن و حدیث اور کسی بھی اسلامی فقہ سے کوئی ایک نظیر، کوئی ایک حوالہ بھی پیش کر سکتے ہیں؟۔ اگر نہیں تو پھر کیوں نہ اُنہیں وحشت و بربریت میں مشرکینِ مکّہ سے تشبیہ دی جائے اور کیوں نہ اُنہیں میر جعفر و

صادق کی طرح بیرونی قوتوں کے ایسے آلہ کار سمجھا جائے جنھیں جدید ترین اسلحہ سے لیس کرکے افرا تفری پیدا کرنے اور دینِ حق کو بدنام کرنے کے لیے کھُلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ حکیم اللہ محسود، مُلّا عمر کو اپنا لیڈر کہتا ہے لیکن مُلّا عمر نے ہمیشہ اِن لوگوں سے بیزاری اور لا تعلقی کا اظہار کیا ہے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ جتنے اسلام اور پاکستان کے دشمن ہیں اُتنے ہی افغان مجاہدین کے بھی۔

غیر جانبدار تحقیقاتی ادارے "کانفلکٹ مانیٹرنگ سنٹر" کی حالیہ رپورٹ کے مطابق صرف 2012ء میں افغان سرزمین سے پاکستان پر 745 حملے ہوئے۔ 371 حملے افغان اور نیٹو فورسز نے کیے۔ 52 بار فدائی حدود اور 12 مرتبہ زمینی حدود کی خلاف ورزی کی گئی۔ 376 حملے افغانستان میں چھُپے ہوئے پاکستانی طالبان نے کیے جن کے صوبہ کنڑ، ننگر ہار، پاکتیا اور پکتیکا میں محفوظ ٹھکانے ہیں جہاں اُنہیں مکمل آزادی ہے۔ وہ پاکستان میں دہشت گردی کی وارداتیں کرکے اپنے محفوظ ٹھکانوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔۔۔

ڈرون حملوں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجیے امریکہ نے ہر اُس شخص کو ڈرون کا نشانہ بنایا جو اُس کا شدید مخالف اور پاکستان کے لیے نرم گوشہ رکھنے والا تھا۔ امریکی "ڈومور" کی خواہش پر پورا نہ اُترنے والے بیت اللہ محسود کا پتا صاف کرکے حکیم اللہ محسود کو سامنے لایا گیا جو وحشت و بربریت میں لاثانی اور خودکُش حملوں

کا ایکسپرٹ مانا جاتا ہے۔اُس نے بِلا امتیاز ہسپتالوں، مارکیٹوں، بازاروں، شاہراہوں اور ہر ایسی جگہ جہاں نہتے عوام کا رش نظر آیا خود کُش حملوں اور بم دھماکوں کا نشانہ بنوایا۔ ستمبر 2009ء سے دسمبر 2011ء تک محض سوا دو سالوں میں 3150 نہتے عوام اُس کی بربریت کا نشانہ بن کر رزقِ خاک ہوئےاور 5750 زخمی اور معذور ہوئے۔اب بھی جو طالبان کمانڈر پاکستان کے بارے میں تھوڑی سی لچک دکھاتا ہے حکیم اللہ محسود کی مخبری پر اُسے ڈرون کی غذا بنا دیا جاتا ہے۔

سبھی جانتے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ کے دل میں پاکستانی ایٹمی پروگرام کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے جس کے خاتمے کے لیے وہ سازشوں کے تانے بانے بنتے رہتے ہیں۔سواتی دہشت گرد مولوہ فضل اللہ امریکہ کی پناہ میں ہے اور بلوچ لبریشن آرمی کا ہیڈ کوارٹر کابل میں جہاں بلوچی نوجوانوں کو سی آئی اے تربیت بھی دیتی ہے، جدید ترین اسلحہ اور ڈالر بھی۔اِن لوگوں کا کام بھی بلوچستان میں محض افراتفری پھیلانا ہی ہے آزادی کی جنگ لڑنا نہیں۔ نظریں چُرانے سے حقیقت نہیں بدلا کرتی اور حقیقت تو یہی ہے کہ امریکہ افراتفری پیدا کرکے ہماری ایٹمی قوت کا خاتمہ اور گوادر کی بندرگاہ پر قبضہ چاہتا ہے تاکہ آبنائے ہرمز سے گزرنے والے دُنیا کے ایک تہائی تیل پر قبضہ بھی کر سکے اور ایران کا گھیراؤ بھی۔اگر خُدا نخواستہ ایسا ہو گیا تو ہم اپنے

بہترین دوست چین کو اپنا بدترین دشمن بنالیں گے۔
افراتفری تو پہلے ہی عروج پر تھی۔اب اُس کو مہمیز دینے کے لیے مولوی طاہر القادری تشریف لے آئے ہیں اور دوسرا غیر ملکی اُن کی آواز میں آواز ملا کر باہر بیٹھا بڑھکیں لگا رہا ہے۔مقصد ان سبھی کا افراتفری اور انارکی ہے۔اپنے آپ کو شیخ الاسلام کہلوانے والے قادری صاحب کو اپنے اڑھائی گھنٹے کے خطبے میں آرٹیکل 254 تو یاد رہا لیکن کوئی بھی اسلامی آرٹیکل نہیں۔جن آرٹیکلز 62,63 کا ذکر وہ اپنے وجود کو لہرا لہرا کر کر رہے تھے،اُن پر خود پورا نہیں اُترتے کیونکہ عدالت اُنہیں ایک مقدمے میں جھوٹا قرار دے چکی ہے۔مولانا موصوف نے لانگ مارچ کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے اپنی بیوی کا زیور ہدیہ کرکے اپنے معصوم پیروکاروں سے کروڑوں بٹور لیے۔مولوی فضل اللہ نے بھی سوات میں نفاذِ شریعت کا ایسا ہی ڈرامہ کرکے بہت سے زیور اور پیسے بٹورے اور افغانستان میں امریکی پناہ میں جا بیٹھا۔پتہ نہیں مولانا صاحب کب اپنے ملک تشریف لے جائیں گے؟۔لیکن فی الحال نہیں کہ ابھی آقاؤں کے ایجنڈے کی تکمیل باقی ہے اور تین چار سالہ نگران وزارتِ عظمیٰ کا خواب بھی۔وزارتِ عظمیٰ کے حصول کے مرضِ بد میں وہ مشرفی آمریت کے دَور سے ہی مبتلاء ہیں۔بُرا ہو آمر کا جس نے مولانا کو وزارتِ عظمیٰ کا لالچ دیا اور مولانا نے اس کا خوب ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے قومی اسمبلی کی دو سو سیٹوں پر الیکشن لڑا

لیکن ساری "بشارتیں" اُلٹ ہو گئیں اور مولانا چاروں شانے چت۔اب مولانا برٹش نیشنل" کے ساتھ مل کر انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں اور تحقیق کہ مقصد" دونوں کا اپنی تشنہ خواہشات کی تسکین ہی ہے خواہ وہ کسی غیر ملکی ایجنڈے پر عمل پیرا ہو کر ہی کیوں نہ ہو۔حکومت کو چاہیے کہ وہ انہیں لانگ مارچ کے لیے "فری ہینڈ" دے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ عوام کے خون پسینے پر پلنے والی پولیس اور انتظامی ادارے لانگ مارچ سے مکمل طور پر بے نیاز ہو کر بدستور اپنے روز مرہ کے فرائض سر انجام دیتے رہیں گے ۔ توڑ پھوڑ یا قومی املاک کا نقصان مولانا کی جائیداد اور مدرسوں کی ضبطی سے پورا کیا جائے گا۔اُمیدِ واثق ہے کہ ان شرائط کے بعد مولانا لانگ مارچ سے دستبردار ہو جائیں گے کیونکہ گھاٹے کا سودا کرنا تو اُنھوں نے کبھی سیکھا ہی نہیں۔

کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا۔۔۔ بارہ آنے

میرے مُرشد شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر حضرت مولانا علّامہ طاہر القادری صاحب نے اسلام آباد میں چالیس لاکھ کا مجمع اکٹھا کر کے تاریخ عالم میں اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے امر کر لیا۔ چار دنوں تک اُنھوں نے اسلام آباد کو یرغمال بنا کے یزیدیوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور نہ صرف اپنے تمام مطالبات منوا لیے بلکہ حکومت وہ کچھ بھی مان گئی جس کا مُرشد نے تقاضہ بھی نہیں کیا تھا۔

جب سے مُرشد پاکستان تشریف لائے ہیں، اُن کے لکھاری مریدین میں چشمک جاری ہے۔ ہر کوئی بڑھ چڑھ کر اپنے آپ کو مریدِ اولی ثابت کرنے کی کوششوں میں مگن ہے لیکن میں اِس دَوڑ میں شامل نہیں کیونکہ لفظی بازیگری کی بجائے مَیں ہمہ وقت عملی طور پر مُرشد کے لیے کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی اُمنگوں کو جوان رکھنے کی تگ و دَو کرتی رہتی ہوں۔ ویسے بھی مَیں محترم عرفان صدیقی جیسی خوبصورت نثر لکھنے سے قاصر ہوں۔ اُن کے کالم پڑھ کر تو مولانا محمد حسین آزاد یاد آ جاتے ہیں جن کی نثر پڑھ کر ہم نظم کا مزہ لیا کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی صاحب کے سامنے تو ہم طفلِ مکتب ہیں اور کوئی کچھ بھی کہے، سچ تو یہی ہے کہ اُن کے اندازِ بیاں کے آگے سبھی طفلِ مکتب ہیں۔ میں ہمیشہ صدیقی صاحب

کے کالم بڑے اہتمام سے اور قاسمی صاحب کے چسکے لے لے کر پڑھتی رہتی ہوں لیکن جب سے یہ راز افشاء ہوا ہے کہ یہ حضرات بھی شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر حضرت مولانا علاّمہ طاہر القادری صاحب کے مریدین میں شامل ہیں ، ایک ان دیکھا ، ان جانا حسد میرے جسم میں سرایت کرچُکا ہے ۔بڑی کوشش کی کہ اِس حسد کو رشک میں بدل دوں لیکن عبث ، بیکار ، بے سود ۔ باوجودیکہ میرا دِل جَل بھُن کے سیخ کباب ہوچُکا ہے ، پھر بھی کم از کم یہ تسلی ضرور ہے کہ یہ حضرات صرف لفظی بازیگری سے دِل موہتے ہیں جبکہ میں اپنے مُرشد کے لیے میدانِ عمل میں ہوں ۔جب میں نے محترم عطاء الحق قاسمی صاحب کا "پیمپرز" والا کالم پڑھا جس میں قاسمی صاحب نے فرمایا تھا کہ اسلام آباد میں ٹائلٹوں کی عدم دستیابی کی بنا پر حضرت علاّمہ نے چالیس لاکھ پیمپرز کا آرڈر دے دیا تو میرا دِل فرطِ عقیدت سے جھومنے لگا اور اتنا جھوما کہ خود مجھے بھی چکر آنے لگے ۔ میری کیا مجال کہ میں قاسمی صاحب کی تردید کر سکوں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ حساب میں تھوڑے کمزور ہیں ۔چالیس لاکھ افراد کے لیے صرف چالیس لاکھ پیمپرز ؟۔ کیا لانگ مارچ کے شُرکاء "دائمی قبض" کا شکار تھے ؟۔ بہر حال میں جو بہت پریشان تھی کہ لانگ مارچ میں ہدیہ نہیں ڈالا ، مطمعن ہو گئی ۔ ہوا یوں کہ اِدھر میں نے قاسمی صاحب کا کالم پڑھا ، اُدھر میری بہو اپنے بیٹے (میرے پوتے) کے لیے پیمپرز لے آئی اور میں نے نظر بچا کر سبھی اُڑا لیے ۔ وہ سارے گھر میں پیمپرز تلاش کرتی پھری لیکن یہ بھی میرے مُرشد کی کرامت کا کرشمہ

ہے کہ جہاں میں نے پیمپرز چھُپائے ، وہاں پہنچ کر اُس کی بینائی چلی جاتی ۔ میں یہ پیمپرز مُرشد کو ہدیہ نہیں کر سکی کیونکہ بدلنے بوجہ حسد قاسمی صاحب سے رابطہ کرکے یہ نہیں پوچھا کہ پیمپرز کہاں پہنچانے ہیں اِس لیے پیمپرز ہدیہ نہ کرنے کا سارا گناہ بھی قاسمی صاحب کے سر ہی ہے۔

ویسے اوّل اوّل جب مُرشد نے زیورات ہدیہ کرنے کا حکم صادر فرمایا تو میں عجیب مخمصے کا شکار ہو گئی ۔ میرا دایاں ہاتھ زیورات کی طرف بڑھتا تو بایاں پوری شدّت سے اُسے واپس کھینچ لیتا۔ بعض اوقات تو یہ سوچ کر آنکھوں میں آنسو آ جاتے کہ کیا مُرشد سے عقیدت اتنی ہی کم ہے کہ اُسے زیورات پر قُربان کیا جا سکے ؟۔ میں کئی بار حوصلہ کرکے اُٹھی لیکن اندر بیٹھے شیطانِ رجیم نے دھکا دے کر گرا دیا۔اِس دوران میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے میاں سے گاڑی ہدیہ کرنے کو بھی کہا لیکن اُنھوں نے وہ بے نقط سُنائیں کہ میں خودکُشی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگی ۔ شکر ہے کہ میاں نے مُرشد کے بارے میں کچھ نہیں کہا ورنہ پتہ نہیں بات کہاں تک جا پہنچتی ۔ میرا ڈولتا ایمان مُرشد کے کشف و کرامات نے اُس وقت مضبوط کر دیا جب دور بیٹھے مُرشد نے اپنی اِس "جھلّی مریدنی" کے دِل کا حال جانتے ہوئے ایم کیو ایم کے کراچی والے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ عورتوں کو زیور اپنے خاوندوں سے بھی پیارے ہوتے ہیں۔ وہ خاوند چھوڑ سکتی ہیں ، زیور نہیں۔ میں چشمِ تصور سے دیکھ رہی ہوں کہ مُرشد

کی اہلیہ محترمہ نے بھی زیور دیتے وقت یہ فرمایا ہو گا کہ اگر آپ ایک عام انسان ہوتے تو میں خُلع لے کر زیورات بچا لیتی لیکن آپ چونکہ ولیِ کامل، مجددِ وقت اور مجتہد العصر ہیں اِس لیے آپ کی بارگاہِ عقیدت پر زیورات قُربان۔ شیطان ملک جیسے کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مُرشد کی اہلیہ محترمہ کے زیورات کی کشش نے جب زیورات کے انبار لگا دیئے تو مُرشد نے مُسکراتے ہوئے اہلیہ کو فرمایا کہ تُم اللہ والوں کی رمز کو کیا جانو۔ دیکھو ! میں نے تمہارے زیورات کو ہزار گُنا کر دیا۔ اب اِنہیں سنبھالو اور عیش کرو۔

سبھی نے دیکھا کہ کامیاب دھرنے کے بعد مُرشد فتح کے گیتوں کی گونج میں لاہور تشریف بھی لے آئے لیکن ہمارے الیکٹرانک میڈیا کے پیٹ میں اُٹھتے مروڑ ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔ ٹاک شوز میں چُن چُن کے ایسے مہمانوں کو بُلایا جا رہا ہے جو یہ ثابت کرنے کی سعیٔ لاحاصل کر رہے ہیں کہ شیخ الاسلام صاحب نے "کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا ۔۔۔ بارہ آنے"۔ وہ کہتے ہیں کہ حکومت نے اُن کا ایک مطالبہ بھی تسلیم نہیں کیا اور کیے گئے معاہدے میں کوئی ایک شق بھی ایسی نہیں جس کی آئین میں صراحت موجود نہ ہو۔ الیکشن کمشن تمام سیاسی جماعتوں کی مشاورت سے معرضِ وجود میں آیا اور آئین کے مطابق صدر، وزیرِ اعظم اور عدلیہ سمیت کوئی بھی اسے ختم نہیں کر سکتا۔ اِس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ الیکشن کمشن کے اربابِ اختیار خود ہی مستعفی ہو جائیں۔ الیکشن کمشن ہی

کی طرح سے نگران حکومت پارلیمنٹ کے اندر اور باہر کی تمام سیاسی پارٹیوں کی مشاورت سے معرضِ وجود میں آنے والی ہے۔ مولانا صاحب کا عدلیہ اور فوج سے مشاورت کا مطالبہ تسلیم کیا گیا نہ الیکشن کمشن کی تشکیلِ نَو کا۔ اسمبلیاں توڑی گئیں نہ صدر کو گھر بھیجا گیا۔ اُمیدواروں کی سکروٹنی پہلے تیرہ چودہ دنوں میں کی جاتی تھی اب ایک ماہ کی مدّت مقرر کر دی گئی لیکن اِس کے لیے آئینی ترمیم کی ضرورت ہے جو فی الحال ممکن نہیں۔

سب کچھ بجا لیکن یہ تو بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ شیخ الاسلام نے کم از کم یہ تو ثابت کر دیا کہ وہ جب چاہیں حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اب اگر حکومت یہ کہتے ہوئے کہ "معاہدے قُرآن و حدیث نہیں ہوتے" معاہدے سے مُکر جاتی ہے تو اِس میں بھلا شیخ الاسلام کا کیا قصور؟۔ ویسے بھی مُرشد کو دھرنے کے دوران ہی یہ بشارت ہو گئی تھی کہ جس معاملے میں چوہدری شجاعت حسین ملوث ہوں اُس میں فریقِ دوم کے لیے اللہ کی پناہ مانگتے ہوئے راہِ فرار اختیار کر جانے میں ہی عافیت ہے۔ کیونکہ ایسے معاملات میں فریقِ دوم کا انجام ہمیشہ اکبر بگٹی اور لال مسجد کے باسیوں جیسا ہوتا ہے۔ مُرشد نے تو جنابِ آصف زرداری کو طلب کیا تھا لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ چوہدری شجاعت فرشتہ اجل بن کر نمودار ہو گئے ہیں تو انہوں نے بھی بھلا بُرا معاہدہ کرنے میں ہی عافیت جانی کیونکہ جان بچانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

دُشمنانِ ملک و ملّت تو خیر ہر گز نہیں مانیں گے لیکن یہ عین حقیقت ہے کہ مُرشد نے اپنے اقوال، افعال اور اعمال سے یہ ثابت کر دیا کہ شیخ الاسلام کہلوانا صرف اُنہی کو زیبا ہے۔ سارا میڈیا اُن کے خلاف دِن رات زہر اُگلتا رہا اور حضرت بار بار بلکہ ہزار بار اُن کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ اُن کا دل اپنے محفوظ بنکر میں بھی اپنے عقیدت مند مردوں، عورتوں اور شیر خوار بچوں کی بدترین حالت دیکھ کر خون کے آنسو روتا رہا ۔اسی بنا پر وہ جب بھی خطاب کے لیے آتے تو دورانِ خطاب اُن کی آنکھیں بار بار ڈبڈبا جاتیں۔ کچھ نا ہنجار کہتے ہیں کہ کربلا میں تو حضرت امام حسینؓ اپنے احباب جیسے خیمے میں ہی مقیم تھے جبکہ یزیدیت کے خلاف نبرد آزما شیخ الاسلام تو اپنے بُلٹ اور بم پروف بنکر میں تشریف فرما تھے اور عقیدت مند لہو جماتی سردی میں کھُلے آسمان کے نیچے۔ اِن بد بختوں سے کوئی پوچھے کہ کیا حسینؓ کے دَور میں بُلٹ پروف بنکر ہوا کرتے تھے؟۔ اور کیا یہ ممکن تھا کہ چالیس لاکھ کا مجمع حضرت شیخ الاسلام کے بنکر میں سما جاتا؟۔ اب اگر سبھی عقیدت مندوں کے لیے بارہ، بارہ کروڑ کے بنکر بنائے جاتے تو اِس منصوبے پر کتنے عشروں میں عمل درآمد ہوتا؟۔ اور اگر امریکہ مُرشد کے کہنے پر اِس منصوبے پر اربوں کھربوں ڈالر صرف کر دیتا تو کیا امریکی معیشت کا دیوالیہ نہ نکل جاتا؟۔ اسی لیے مُرشد نے چارو ناچار صرف اپنے خاندان کو ہی بنکر میں محفوظ کر لیا۔ ویسے بھی جب عقیدت مندوں کو

پریشانی نہیں تو دوسروں کے پیٹ میں کیوں مروڑ اُٹھ رہے ہیں ؟۔

کہا گیا کہ حضرت امام حسینؓ نے تو یزید سے معاہدہ کرنے کی بجائے شہادت کو ترجیح دی ، یہ کیسے حسینیت کے پیروکار ہیں جو نہ صرف یزیدیت کے علمبرداروں سے معاہدہ کر رہے ہیں بلکہ اُنکی تعریف میں رطب اللساں بھی ہیں ؟۔ایسی باتیں کرنے والے کج فہم نہیں جانتے کہ جب اللہ چاہے تو کعبے کو صنم خانوں سے بھی محافظ مل جایا کرتے ہیں۔ مُرشد کو یقیناً بشارت مل چکی ہو گی کہ یہی یزیدی فوج کل حسینیت کی علمبردار ہو گی۔اسی لیے اُنھوں نے کھُلے دل سے اُن کی تعریف کی اور چونکہ اُنہیں شیطان ملک کی بدنیتی کا پتہ تھا اِس لیے اُنھوں نے اُسے جی بھر کے لعن طعن کی اور جوتے کی نوک پر رکھااور ایسا کرنے کا اُنہیں حق بھی تھا کیونکہ اسلام اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اجازت دیتا ہے البتہ معاف کر دینے کو بہتر گردانا گیا ہے۔اسی لیے جہاں شیخ الاسلام نے "بدتمیز" الیکٹرانک میڈیا کو معاف فرمایا وہیں شیطان ملک کو اُس کی حیثیت یاد دلا دی۔

مجمعے کو چالیس لاکھ تسلیم نہ کرنے والوں کے بارے میں تو مُرشد نے خود ہی فرما دیا کہ جھوٹے پر اللہ اور رسول کی ہزار بار لعنت لیکن مُرشد خواہ ناراض ہی کیوں نہ ہو جائیں ، اب میں افشائے حقیقت سے باز نہیں رہ سکتی۔ یہ بجا کہ

مُرشد اپنے ساتھ واقعی چالیس ہزار عقیدت مندوں کو ہی لے کر گئے۔ جس کی واحد وجہ چھوٹے سے اسلام آباد میں جگہ کی تنگی تھی۔ باقی کروڑوں "روتے کُرلاتے" عقیدت مندوں کو اُنھوں نے حکم دیا کہ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر لانگ مارچ میں شریک ہوں۔ اِس لحاظ سے تعداد کسی بھی صورت میں نو، دس کروڑ سے کم نہیں تھی پھر بھی مُرشد نے انتہائی کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے محض چالیس لاکھ پر ہی اکتفا کیا۔

انقلاب ۔۔۔ انقلاب

پروفیسر مظہر

کرپشن ، مہنگائی ، بھتہ خوری ، ٹارگٹ کلنگ ، خودکُش حملوں اور بم دھماکوں کے باوجود ارضِ وطن کی فضاؤں میں امیدوں اور آشاؤں کی توانا کرنیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں ۔بیباک میڈیا اور آزاد عدلیہ نے اذہان و قلوب کے دھندلے آئینوں کو یوں صیقل کیا ہے کہ اب ان میں ہر کسی کا باطنی عکس دکھائی دینے لگا ہے ۔ شعور کے نور نے شبِ تار میں دراڑیں ڈال دیں اور وہ دَور لد گیا جب مایوسیوں کی "بُکل" مارے یہ قوم کہا کرتی تھی کہ

دور لگے وہ وقت ابھی جب ٹھہری رات کے آنگن میں
پھیکا پڑ کے چاند ہمیں آثارِ سحر دکھلائے گا

لاریب یہ اُن ہزاروں شہیدوں کے لہو کی کرشمہ سازی ہے جس نے وطن کی مٹی کو بھگو کر ہمیں شعور اور آگہی کی اِس منزل تک پہنچایا اور ہماری کچھ کر گزرنے کی اُمنگوں کو پھر سے جوان کر دیا ۔

گھر گھر میں صفِ ماتم بچھی اور در در پہ نوحہ خوانی ہوتی رہی لیکن فراعینِ

وقت اپنی ذات کے گنبد میں گُم رہے۔ لہو ٹپکتا رہا، جمتا رہا اور پھر جمتے لہو کا پہاڑ کھڑا ہو گیا اور اب اسی پہاڑ کی چوٹیوں سے پھوٹنے والی نور کی کرنیں زمینی خُداؤں کو للکار رہی ہیں۔ قوم نے اپنے پیاروں کے ہزاروں لاشے اُٹھائے اور تقدیر پہ شاکر ہو کر اُنہیں دھرتی کی کوکھ میں چھپا دیا لیکن جب ضبط کے سارے بندھن ٹوٹے تو پھر چشمِ فلک نے وہ عجب نظارہ دیکھا جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرپائے گی۔ آفرین ہے اُن ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بوڑھوں کے حوصلے پر جنھوں نے اپنے وجود کے ٹکڑوں کو سڑک پر سجا کر قبرستانوں کا سا خاموش احتجاج کرکے پوری دُنیا کو لرزا دیا۔ کسی اور میں بھلا اتنی سکت اور تاب و تواں کہاں جو وہ لہو جماتی سردی میں کھُلے آسمان کے نیچے کفن میں لپٹے اپنے پیاروں کو تکتے تکتے اسّی گھنٹے گزار دے۔ تاریخ اُدھیڑ کے رکھ دیجیے، آپ کو ایسا دلدوز، اندوہناک اور کربناک احتجاج کہیں نہیں ملے گا۔ تحقیق کہ اگر بوکھلائے ہوئے حکمران گورنر راج کا اعلان نہ کرتے تو انقلاب آتا۔۔۔ خونی انقلاب، جس میں یہ سبھی غرق ہو جاتے۔ انقلاب تو خیر اب بھی آئے گا کہ "شہدائے کوئٹہ" نے انقلاب کی پہلی اینٹ رکھ دی ہے البتہ یہ طے ہونا باقی ہے کہ عوام یہ انقلاب ووٹ کی طاقت سے لائیں گے یا سروں کی فصل کاٹ کے۔

چشمِ بینا دیکھ رہی ہے کہ دورِ گراں خوابی گزر چکا اور وہ وقت قریب لگا ہے کہ

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے۔

انگڑائی لے کر بیدار ہونے والی حق و صداقت کی آندھیوں نے ہر مقہور کے ذہن میں یہ الفاظ رکھ دیئے ہیں کہ ہماری ماؤں نے ہمیں غلام نہیں جنا، نہ ہم سدھائے ہوئے بندر ہیں جو ہر صاحبِ مکر وریا کی ڈگڈگی پر ناچنے لگیں۔ منزل قریب آ گئی تو کچھ شعبدہ باز اپنے کرتب دکھانے میدان میں اُتر آئے۔ حکمرانوں کو تو گزرے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہی ہوگا اور قوم بد دیانتوں کو تاریخ کے کوڑے دان میں پھینکنے کے لئے بیتاب بھی ہے لیکن اِن "درآمدی رہزنوں" کے ذہنوں میں چھُپے زہر سے آگہی بھی ضروری ہے۔ اہالیانِ فکر و نظر اور صاحبانِ بصارت و بصیرت کا فرض ہے کہ وہ دھرتی ماں کا قرض اتارتے ہوئے قوم کو آگاہ کریں کہ یہ نو وارد جو یک سو قوم میں تفرقہ ڈالنے آئے ہیں منصورِ حقیقت نہیں ابنِ ابی ہیں اور حسینیت کا پرچار کرنے والے در اصل یزیدیت کے علمبردار ہیں کہ خلفائے راشدین کا نظام لوٹانے کا دعویٰ کرنے والے کبھی بارہ بارہ کروڑ لاگت کے بُلٹ پروف اور بم پروف کنٹینروں میں سفر کرتے ہیں نہ بُلٹ پروف لینڈ کروزروں میں۔ تینوں خلفائے راشدین نے یکے بعد دیگرے شہادت قبول کر لی لیکن بیت المال سے اپنی حفاظت کے لئے ایک درہم بھی صرف کرنا گوارا نہ کیا۔ لیکن یہ غیر ملکی مولوی موت کے خوف سے لرزہ براندام

چوہے کی طرح اپنے بُلٹ پروف بِل میں گھُسا بیٹھا ہے۔اُس شعبدہ باز نے لانگ مارچ سے پہلے اپنی وصیت لکھوائی حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ اُس پر خود کُش حملے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ خود کُش حملہ حکیم اللہ محسود کے حکم سے ہونا ہے اور حکیم اللہ امریکی ایجنٹ جبکہ مولوی امریکہ کا چہیتا اور دونوں کا مقصد اور ایجنڈا ایک ، انارکی اور صرف انارکی۔میں نے اپنے پچھلے کالم میں عرض کیا تھا کہ پاکستان کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے ہر طالبان کمانڈر کو حکیم اللہ کی مخبری پر ڈرون کا نشانہ بنا لیا جاتا ہے۔کالم کی اشاعت کے اگلے ہی روز جنوبی وزیرستان کے کمانڈر مُلّا نذیر کو ڈرون کی غذا بنادیاگیا ۔مُلّا نذیر کے بارے میں ہماری ایجنسیاں ہی نہیں بلکہ بہت سے واقفانِ حال بھی جانتے تھے کہ وہ حکومت سے مذاکرات کا جذباتی حامی تھا اور اسی بنا پر اُس کے حکیم اللہ محسود سے شدید اختلافات بھی پیدا ہو چکے تھے۔

جب کروڑوں ڈالرز سالانہ کی سیکولر دانشوروں اور این جی اوز پر سرمایہ کاری کے باوجود امریکہ حصولِ مقصد میں ناکام رہا تو اسے بھی ادراک ہو گیا کہ پاکستان کے دین سے والہانہ محبت کرنے والے مسلمانوں کے لیے یہ سیکولر دانشور اور این جی اوز، ناکافی ہیں ۔ تبھی اُس نے ایک ایسا مولوی بھیجنے کا فیصلہ کیا جو دینِ اسلام کی وہی تشریح کرتا ہے جو امریکہ کو مرغوب ہے۔میرا دین تو جھوٹے پر ہزار لعنت بھیجتا ہے لیکن اِس "مسیلمہ کذاب" کی پوری زندگی

ہی جھوٹ سے عبارت ہے۔اُس نے پہلے لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے مجمعے کو پچیس لاکھ اور پچیس میل تک پھیلا دیا اور اب جب کہ خفیہ ایجنسیاں اور سارا میڈیا چیخ رہا ہے کہ لانگ مارچ کا مجمع کسی بھی صورت میں چالیس پینتالیس ہزار سے زیادہ نہیں تو مولوی صاحب اسے چالیس لاکھ قرار دے رہے ہیں اور ساتھ یہ بھی کہ ابھی دس لاکھ لوگ پیدل بھی آ رہے ہیں ۔جب لانگ مارچ کے شرکاء کی تعداد دس سے پندرہ ہزار رپورٹ کی جا رہی تھی تب ایک ٹاک شو میں منہاج القرآن کے ترجمان ریاض قریشی نے یہ تعداد ایک لاکھ بتائی اور عین اسی وقت مولوی صاحب یہ تعداد دس لاکھ بتا رہے تھے ۔ مولوی صاحب سے اندھی عقیدت میں گم اس کے پیروکاروں کو عقلِ سلیم کا تھوڑا سا استعمال کرتے ہوئے یہ سوچنا چاہیے کہ کیا دینِ مبیں کے علمبردار اتنے جھوٹے بھی ہوا کرتے ہیں ؟۔انہیں یہ بھی مدِّ نظر رکھنا ہو گا کہ

قول کے کچے لوگوں سے نسبت پر کیسا ناز
دھوبی کے کُتّے کا کیا ہے ،جس کا گھر نہ گھاٹ

جو شخص تیئیس دسمبر سے اب تک سینکڑوں بار اپنے بیانات بدل چکا ہو ، حکومت سے تحریری معاہدہ کرکے مکر چکا ہو اور جس کے قول و فعل میں تضاد ہی تضاد ہو اسے دینِ مبیں کا علمبردار کہنا بذاتِ خود گناہِ کبیرہ ہے۔ مولوی صاحب نے اعلان فرمایا ہے کہ صدر ،وزیرِ اعظم اور وزراء سابق ہو گئے ، اسمبلیاں ختم

ہو چکیں اور اب سفرِ انقلاب شروع ہو گیا۔ اُس نے زرداری، پرویز اشرف، نواز شریف اور اسفندیار ولی کو قدم بوسی کے لیے حاضر ہونے کا حکم بھی دیا ہے۔ایسی باتیں کوئی مخبوط الحواس شخص ہی کر سکتا ہے اور سچ کہا ہے سینیٹر پرویز رشید نے کہ اسے شخص کو جیل بھیج دینا چاہیے یا پاگل خانے لیکن شاطر رحمٰن ملک کا پروگرام کچھ اور ہے۔ جس طرح وہ مولوی قادری کو ڈھیل دیتے جا رہے ہیں اس سے صاف نظر آتا ہے کہ ملک صاحب نے مولانا قادری کو بھی سوات کے صوفی محمد کے سے انجام کو پہنچانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔حکومت نے صوفی محمد کو ڈھیل دیتے دیتے اُس مقام تک پہنچا دیا کہ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور یہی حربہ اب مولوی طاہر القادری کے لیے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔

لانگ مارچ کا نوحہ

پروفیسر مظہر

قدیم یونانی لوک کہانی ہے کہ یونان کا ایک انتہائی خوبصورت شہزادہ ایک دن اپنے محل سے نکلا اور چہل قدمی کرتے ہوئے ایک تالاب کے کنارے جا پہنچا۔تالاب کے شفاف پانی میں اسے اپنا عکس نظر آیا تو وہ اپنی ہی بے پناہ خوبصورتی پر عاشق ہو کر تالاب کے کنارے بیٹھ گیا اور اپنے عکس کو تکتے تکتے مر گیا۔اس انتہائے خود پسندی کا دوسرا نام نرگسیت ہے جس کا عملی نمونہ اور چلتا پھرتا شاہکار مولوی طاہر القادری صاحب ہیں جو جب سے وارد ہوئے ہیں اپنے ہر خطبے اور ہر انٹرویو میں اپنے کارنامے اور اپنی خوبیاں گنواتے رہتے ہیں ۔"لمبی لمبی" ہانکتے ہوئے وہ وقت کا عنصر ہمیشہ بھول جاتے ہیں۔اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک ہزار ضخیم کُتب کے مصنف ہیں اور اُنہوں نے دُنیا کے نوّے ممالک میں ہزاروں لیکچرز اور خطبات دیئے ہیں۔اُن کی بے پناہ دیگر سرگرمیاں اس کے علاوہ ہیں ۔اگر انتہائی دیانتداری سے جائزہ لیا جائے تو اس وقت اُن کی عمر کم از کم ڈیڑھ سو سال ہونی چاہیے۔جب کہ اُن کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ 2004 سے 2012ء تک سرانجام دیا۔وہ خوب جانتے ہیں کہ اس نفسا نفسی کے دَور میں کسی کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ وہ تصدیق کرتا

پھرے۔ رہی قادر الکلامی اور جوشِ خطابت کی بات، تو برِ صغیر کی تاریخ میں عطاء اللہ شاہ بخاری اور ابو الکلام آزاد کے پائے کا کوئی مقرر پیدا ہوا اور نہ ہی شاید ہوگا۔ لیکن عطاء اللہ شاہ بخاری کو ہمیشہ یہ گلہ رہا کہ لوگ سُنتے اُنہیں لیکن ووٹ جناح کو دے آتے جو خود کہا کرتے تھے کہ "میری اُردو تانگے والے کی اردو ہے"۔

مولوی قادری صاحب نے ایک مخصوص ایجنڈے کی تکمیل کے لیے اپنے اندھے عقید تمندوں، اپنے تعلیمی اداروں کے طلباء، اساتذہ اور اُن کے خاندانوں کے علاوہ دہاڑی دار مزدوروں کو اسلام آباد میں اکٹھا کیا، آتے ہی تمام اسمبلیاں توڑیں، صدر اور وزیرِ اعظم کو گھر بھیجا، چیف جسٹس صاحب کو اپنا عقید تمند ظاہر کرکے مبارک بادیں وصول کیں، بار بار الٹی میٹم دیئے اور پیپلز پارٹی کے ایم این اے نبیل گبول کے مطابق بالآخر منتیں کرکے "یزیدی لشکر" کو معاہدے کے لیے بلایا اور ان سے بغلگیر ہو کر گھر سدھارے۔ پیپلز پارٹی کی ہی رُکنِ اسمبلی انوشہ رحمان کہتی ہیں کہ اس معاہدے کی ٹکے کی ویلیو نہیں۔ وزیرِ اطلاعات قمر الزماں کائرہ نے بھی ایک ٹاک شو میں بہ اندازِ حکیمانہ ثابت کر دیا کہ اِس معاہدے کی کوئی آئینی حیثیت ہے نہ قانونی۔ عقیدت کے اندھوں کو تو رکھیے ایک طرف، یہاں تو وہ صاحبِ علم بھی تلملاہٹ کا شکار ہیں جو مولوی صاحب سے انقلاب کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ بوستانِ

صحافت کے گلِ تابندہ، معروف دانشور اور رکنِ پارلیمنٹ نے اپنے کالم میں لانگ مارچ کا نثری نوحہ رقم کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں "جب روایتی سیاست کے قلعے کو لرزہ بر اندام کرنے والوں نے تبدیلی کا مارچ شروع کیا تو ہم نے نہایت بے اعتنائی سے آنکھیں پھیر لیں۔ اب ایسا موقع شاید ہماری زندگی میں کبھی نہ آئے گا۔ کم از کم میری عمر کے لوگوں کی زندگی میں تو نہیں"۔ آگے چل کر موصوف فرماتے ہیں "لاہور میں ہونے والی جمہوریت بچاؤ) کانفرنس جس میں کئی علماء اور قوم کے نجات دہندہ موجود تھے، کی) تصاویر دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا۔ اگر یہی افراد جمہوریت کے چیمپین ہیں تو پھر میرے جذبات کے لئے صحافتی زبان ناکافی ہے"۔

بجا ارشاد، سوال مگر یہ ہے کہ جب موصوف خوب جانتے تھے کہ ان اسمبلیوں اور سیاستدانوں سے قوم کا بھلا نہیں ہونے والا اور بقول مولوی قادری اسمبلیوں اور حکومتوں میں یزید، فرعون، شداد، نمرود، قارون، ڈاکو، چور، لٹیرے، جھوٹے، بد دیانت، بے شرم، بے حیا، بے غیرت، لعنتی، گماشتے اور دہشت گردوں کے سرپرست بیٹھے ہیں تو پھر وہ پانچ سال تک اسی پارلیمنٹ کا حصہ بن کر تنخواہ لیتے اور ٹی اے۔ ڈی اے کے مزے کیوں لوٹتے رہے؟۔ انہیں تو ابتدا ہی میں ایسی جمہوریت پر لعنت بھیج کر پرچمِ انقلاب تھام کر باہر نکل آنا چاہیے تھا کہ مولوی قادری سے زیادہ صاحبِ علم و مطالعہ تو وہ خود ہیں۔ شاید

ہماری سیاست کا یہی دوغلا پن ملک و قوم کو پنپنے دیتا ہے نہ جمہوریت کو۔ موصوف فرماتے ہیں "کیا ہم نے اسے کوئی تاریخی حقیقت سمجھ لیا ہے کہ جمہوریت میں ہی ہماری بقا ہے"؟۔جی نہیں، ہم تو اُس مکمل ضابطۂ حیات ہی میں قوم کی بقا سمجھتے ہیں جسے خود ربِّ لازوال نے مرتب کیا اور قیامت تک رہنمائی کے لیے کافی قرار دیا۔ جس کے بارے میں آقا نے فرمایا کہ اگر اس کو مضبوطی سے تھام لوگے تو تحقیق کہ کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ لیکن ہمارے سیکولر اور لبرل دانشوروں کو تو ایسی باتیں کرنے والوں سے بھی چڑ ہے۔ موصوف فرماتے ہیں "وہ لبرل اسلام، خواتین کی آزادی، اقلیتوں کے حقوق، عوامی جمہوریت کی بات کرتے ہیں اور لفظ "مولانا" سے چڑتے ہیں۔افسوس ہے اُن پر ہماری جمہوریت پسندی ان باتوں کو کیسے برداشت کر سکتی ہے"؟۔جب سے بھٹو مرحوم، نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا ہے تب سے ہی ہمارے دانشوروں کو لفظ اسلام کے ساتھ سابقے لاحقے لگانے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ہمارے نزدیک اسلام صرف اسلام ہے لبرل، سیکولر یا رجعت پسند اسلام نہیں۔اگر موصوف کے خیال میں لبرل اسلام کا مطلب خواتین کی شترِ بے مہار آزادی اور بغیر کسی محرم کے کھلے آسمان تلے نا محرموں کے ساتھ ڈیرے ڈالنا ہے تو اسلام اس کی ہر گز اجازت نہیں دیتا۔ مولوی قادری اور اس کے پیروکاروں کو چاہیے کہ وہ کسی ایسے دین کی پناہ میں چلے جائیں جو ایسی آزادی بخشتا ہو۔ ہمیں تو بہرحال قادری صاحب اور ان کے حواریوں کی کوئی ایسی دینی تشریح ہر گز قبول نہیں جو امریکہ اور یورپ کو

مرغوب ہو۔ حکمت کی کتاب میں یہودیوں اور نصرانیوں کو مخاطب کرکے ربِ کردگار نے کہا کہ اے نبی انہیں کہو کہ تمہارا دین نہ میرا دین۔ آو ہم دینِ ابراہیمی پر اکٹھے ہو جائیں۔ہم بھی بصد ادب کہتے ہیں کہ لبرل، سیکولر اور رجعت پسندانہ کو چھوڑیں اور آئیں اُس اسلام پر اکٹھے ہو جائیں جس کا حرف حرف کتاب میں درج ہے اور جس کی حفاظت کا ذمہ خود ربّ، کردگار نے اٹھایا ہے اور تحقیق کہ مولوی قادری دینِ مبیں کی روسے شیخ الاسلام تو کجا ایک عامی مسلمان کے معیار پر بھی پورے نہیں اترتے۔جو شخص بات تو خلفہ راشدین کی کرتا ہو، اپنے قافلے کو حسینی قافلہ قرار دیتا ہو، اللہ قُرآن اور رسول کی سینکڑوں قسمیں اُٹھا کر اپنے عقید تمندوں کو جذباتی کرنے کی کوشش کرتا ہو، ہزاروں کے مجمعے کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے ذرا شرم محسوس نہ کرتا ہو، جس کا پاکستانی سیاست میں حصہ ہو نہ رفاہی کاموں میں، جو خود پُر تعیش بنکر میں محفوظ اور پیروکاروں کو شدید سردی اور بارش میں کھڑا کرنے میں ذرا جھجک محسوس نہ کرتا ہو، جس کا ماضی آمروں کے تلوے چاٹتے گزرا ہو اور جو اتنا احسان ناسپاس ہو کہ انہی لوگوں کو یزید کہے جنھوں نے دَورِ ابتلاء میں قدم قدم پر اُس کا ساتھ دیا ہو اور اُس کی شناخت کا باعث ہوں، ایسے شخص کی باتیں کیسے لائقِ اعتبار قرار دی جا سکتی ہیں؟۔

لانگ مارچ میں بری طرح ناکامی کے باوجود بھی مولوی صاحب کامیاب ہیں کیونکہ

امریکہ سیکولر دانشوروں اور این جی اوز پر کروڑوں ڈالر صرف کرنے کے باوجود بھی وہ مقصد حاصل نہ کرسکا جو مولوی قادری نے کر دکھایا۔اب امریکہ اور اقوامِ یورپ کو یہ کہنے کا حق ہے کہ پاکستان ایسا ملک ہے جس کی حکومت دہشت گردوں کی سرپرستی کرتی ہے اور حکومتی رِٹ کا یہ عالم ہے کہ ایک "امپورٹڈ مُلا" بھی دارالحکومت پر قبضہ کرکے حکومتی ایوانوں میں زلزلہ بپا کرسکتا ہے۔امریکہ نے متعدد بار کہا کہ خطرہ ہے کہ کہیں دہشت گرد اسلام آباد پر قبضہ نہ کرلیں اور ہم اس کا مذاق اُڑاتے رہے لیکن آج مولوی قادری نے امریکہ کے کہے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

بی۔جے۔پی کا شوشہ

اللہ بھلا کرے ہمارے مدبر صدرِ مملکت جناب آصف علی زرداری کا جن کی فلسفیانہ سوچوں سے اور کوئی متاثر ہو نہ ہو میں تو عرصہ دراز سے زانوئے تلمذ تہ کیے بیٹھی ہوں۔مجھے ہمیشہ اُن میں شاعرِ مشرق حضرت اقبالؒ کے اُس شاہین کی جھلک نظر آتی ہے جو لہو گرم رکھنے کے بہانے تراشتا رہتا ہے۔اُنہوں نے فرمایا

پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کے پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

یہ محترم بلوچ سردار بھی لہو گرم رکھنے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے اور ہمراہیوں کو یہ سبق پڑھاتے نظر آتے ہیں کہ

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تُو تو نہیں خطرہ افتاد

اسی لئے ایک معاملہ ابھی بیچ منجدھار میں ہوتا ہے اور وہ دوسرا چھیڑ لیتے ہیں۔اُن کی اِس پریکٹس سے اُن کا اپنا لہو گرم ہو نہ ہو لیکن اپوزیشن کا لہو تو بعض اوقات اُبلنے لگتا ہے اور دور ہی سے ایسی آوازیں آنے لگتی ہیں

جیسے اُبلتی ہنڈیا سے ڈگ ڈگ کی آواز آرہی ہو۔ایسے میں مجھے بیچارے، بھولے بھالے چوہدری نثار پر بہت ترس آنے لگتا ہے جو عالمِ بے بسی میں لوگوں کو قائل و مائل کرنے میں مگن ہو جاتے ہیں لیکن سب عبث، بیکار، بے سود کہ صدرِ محترم نے الیکٹرانک میڈیاکے لیے ایسی ٹیم مقرر کر رکھی ہے جو کج بحثی میں یدِ طولیٰ رکھتی ہے اور بعض اوقات تواِس میدان میں وہ محترم ڈاکٹر طاہر القادری کو بھی مات دیتی نظر آتی ہے ۔اِس ٹیم کا" خواتین ونگ" تو اتنا دبنگ ہے کہ اپنے آپ کو بڑی "توپ شے" سمجھنے والے اینکرز بھی اُن کا پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔" نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو" مجھے تو بعض اوقات یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے وہ ابھی اُٹھ کر اینکر پر اپنے جوڈو کراٹے کے سارے داؤ آزمانا شروع کر دیں گی۔زرداری صاحب کے اسی "حسنِ انتخاب" کی وجہ سے لوگ بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ "ایک زرداری، سب پہ بھاری" ۔

عین اُس وقت جب انتخابات کی گہما گہمی شروع ہو چکی، زرداری صاحب نے قوم کے سَر پر پاکستانی "بی۔جے۔پی" کو لا بٹھایا۔بھارتیہ جنتا پارٹی (بی۔جے۔پی) نے ہمیشہ بھارت واسیوں کا سُکھ چین چھیننے کی کوشش ہی کی ہے اور خصوصاً اقلیتوں کے ساتھ تو اُن کی چھیڑ چھاڑ چوبیس گھنٹے جاری ہی رہتی ہے اور اب تو اُن کے وزیرِ داخلہ نے بھی بی۔جے۔پی کی صلاحیتوں کا اعتراف کر لیا ہے۔قوی اُمید ہے کہ پاکستانی بی۔جے۔پی بھی پاکستان میں علاقائی اور لسانی

منافرت پھیلانے میں بھارتی بی۔جے۔پی کا نعم البدل ثابت ہو گی اور امن کی آشا کے لیے ممد و معاون ثابت ہو گی۔

بہر حال جس کسی نے بھی "بہاولپور جنوبی پنجاب " یعنی بی۔جے۔پی جیسا نام تجویز کیا ہے اُس کی عظمتوں کو سلام کہ وہ خوب جانتا ہو گا کہ اب دما دم مست قلندر" ہووے ای ہووے" جس کی ہلکی پھلکی جھلکیاں تو میانوالی ، بھکر اور سرگودھا میں نظر آنا بھی شروع ہو گئی ہیں اور یہ تو ابھی" ابتدائے عشق ہے ، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا"۔ہمارے محترم ڈاکٹر طاہر القادری نے شہروں کو یرغمال بنانے کی رسم توڈال ہی دی ہے اور میں چشمِ تصور سے دیکھ رہی ہوں کہ آنے والے دنوں میں لوگ قادری صاحب کے دھرنے کو بھول جائیں گے بالکل ویسے ہی جیسے اُن کے مینارِ پاکستان پر جلسے کے بعد لوگ عمران خاں صاحب کے جلسے کو بھول گئے تھے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ "بہاولپور جنوبی پنجاب" جیسا معنی خیز نام اکابرینِ ایم کیو ایم نے ہی تجویز کیا ہو گا کیونکہ ایک تو وہ آجکل عشقِ پنجاب میں "گوڈے گوڈے" دھنسے نظر آتے ہیں اور دوسرے "کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے" اُن کی پالیسی کا جزوِ لاینفک ہے۔اُنہوں نے سوچا ہو گا کہ جب کراچی میں امن نہیں تو پھر ملک کے باقی حصوں میں کیوں ہو؟۔بی۔جے۔پی صوبہ بنانے کے حق میں لاٹھیاں اُٹھا اُٹھا کر نعرے لگانے والی ایم کیو ایم دراصل اپنے اُن تشنہ خوابوں کی تکمیل چاہتی ہے جو 1992 ء میں ادھورے رہ گئے اور

اُن کے قائد کو رات کے اندھیرے میں فرار ہونا پڑا۔ مفرور قائد نے پچھلے دنوں ایک ڈرون حملہ کیا جس میں اُن کا ٹارگٹ حضرت قائدِ اعظمؒ کی ذات تھی ۔ لیکن ہوا یہ کہ مفرور قائد اپنے چلائے ہوئے ڈرون میزائل کا خود ہی شکار ہو گئے ۔اُسی حملے میں اُنہوں نے سندھیوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں ، کہیں ایسا نہ ہو کہ اُردو بولنے والے الگ صوبے کا مطالبہ کر بیٹھیں ۔ یہ ہے وہ تشنہ خواہش جس کی تکمیل کے پیچھے ایم کیو ایم گزشتہ بیس سالوں سے دیوانہ وار دوڑ رہی ہے ۔اب اگر نئے صوبوں کی رسم چل نکلتی ہے تو ایم کیو ایم کو بھی بلا شرکتِ غیرے اپنا صوبہ مل جائے گا اور پھر "گلیاں ہو جان سونیاں وچ مرزا یار پھرے" ۔

سنجیدہ بات تو یہ ہے کہ پیپلز پارٹی نے جو بہاولپور جنوبی پنجاب صوبے کا شوشہ چھوڑا ہے اُس کی کوئی آئینی حیثیت ہے نہ قانونی۔ یہ محض جنوبی پنجاب سے کچھ سیٹیں ہتھیانے کا بہانہ ہے اور کچھ نہیں۔ قائدِ حزبِ اختلاف چوہدری نثار درست فرماتے ہیں کہ پیپلز پارٹی صوبہ بنانے میں مطلق دلچسپی نہیں رکھتی ۔ پنجاب اسمبلی نے بہاولپور اور جنوبی پنجاب ، دو الگ الگ صوبوں کی سفارشات کی گئی تھیں لیکن پیپلز پارٹی نے محض ہلچل مچانے کے لئے ایک ہی صوبہ بہاولپور جنوبی پنجاب بنانے کا شوشہ چھوڑ دیا۔ آئینی طور پر پنجاب اسمبلی کی منظوری کے بغیر پنجاب کے اندر نئے صوبے نہیں بن سکتے اور پنجاب اسمبلی ایک

کی بجائے دو صوبوں کی قرار داد متفقہ طور پر منظور کر چکی ہے۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نواز لیگ پنجاب کی تقسیم کے حق میں ہو نہ ہو لیکن پیپلز پارٹی ہر گز نہیں۔سچی بات تو یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ایک گھر کو ٹکڑوں میں بانٹ دینے کی حامی نہیں اور خصوصاًاُس وقت تو ہر گز نہیں ،جب صاف نظر آ رہا ہو کہ وڈیرے اور جاگیر دار محض ذاتی "بندر بانٹ" کے لیے یہ منصوبہ سازیاں کر رہے ہیں۔

اگر بہتری کے لیے پنجاب کی تقسیم ضروری ہے تو کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن پہلے کوئی بتائے تو سہی کہ اِس تقسیم ہیں عوام کی کون سی بہتری مضمر ہے اور اُن کا کون سا بھلا ہونے والا ہے ؟۔پہلے ہی پاکستان میں ہر بچہ پیدا ہوتے ہی پچاسی ہزار روپے کا مقروض ہو جاتا ہے۔اب اگر پنجاب کی تقسیم کر دی جائے تو کیا کسی نے اندازہ لگایا ہے کہ اس تقسیم کے بعد اخراجات کتنے گنابڑھ جائیں گے ؟۔نئے گورنر، نئی اسمبلیاں ، نئے وزرائے اعلیٰ اور وزراء کی فوج ظفر موج ،نئے چیف سیکرٹریز اور آئی جیز پر اُٹھنے والے اخراجات کتنے ہونگے ؟۔یہ تو طے ہے کہ جنوبی پنجاب کا صوبہ بنانے سے عوام کا تو مطلق کوئی بھلا نہیں ہو گا البتہ اِن کے لیے مختص بجٹ وزیروں شزیروں کی جیبوں میں ضرور چلا جائے گا۔شاید اسی کا ادراک کرتے ہوئے عوام نے نہ تو آج تک صوبہ جنوبی پنجاب کے لیے کوئی تحریک اٹھی ہے اور نہ ہی (آئی آر آئی کی

رپورٹ کے مطابق) جنوبی پنجاب کے عوام نیا صوبہ بنانے کے حق میں ہیں۔یہ سب کچھ چند وڈیروں، لٹیروں اور گدی نشینوں کے اذہان ہیں اپنی لوٹ مار کے لئے پکنے والی پلاننگ ہے۔

میلادالنبی ﷺ کے تقاضے

12 ربیع الاوّل آیا اور گزر گیا۔ ہم ہر سال یہ دن پورے تزک و احتشام اور مذہبی جوش و جذبے سے مناتے ہیں اور کیوں نہ منائیں کہ یہ دن میرے آقا وجہ وجودِ کائینات ، سید الثقلین ، امام القبلتین ، رحمت للعالمین ، نبی آخر الزماں ، احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفےٰ ﷺ کی ذاتِ مبارک سے منسوب ہے۔ اس دن ہم جی بھر کے چراغاں کرتے ، جلوس اور ریلیاں نکالتے ، درود و سلام کی محفلیں منعقد کرتے اور محافلِ شبینہ کا اہتمام کرنے کے باوجود بھی یہ سمجھتے ہیں کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" ۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا اتنے اہتمام کے باوجود بھی میرے آقا ﷺ کی رحمتیں ، برکتیں ، عنایتیں ، شفقتیں اور محبتیں ، ہم پر سایہ فگن ہوتی ہیں ؟۔ کیا ہماری دعائیں مستجاب ہوتی ہیں ؟۔ اور کیا ربِ کریم کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے ؟۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً نہیں۔ وجہ صرف یہ کہ آقا ﷺ کے فرمان کے مطابق اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہوتا ہے اور تحقیق کہ ہماری نیتوں میں کھوٹ ہی کھوٹ ہے ۔ ہم ایک طرف تو داعیانِ عشقِ رسولﷺ ہیں جبکہ دوسری طرف سگانِ دُنیا۔ حکمت کی کتاب کہتی ہے کہ اے نبی ہم تمہیں بتائیں کہ ان میں سب سے زیادہ بد نصیب کون ہے ؟۔ وہ کہ جس کی عبادتیں روزِ قیامت ہم اُس کے مُنہ پر دے ماریں گے ۔ لاریب ربِ کریم کو ایسی عبادتوں کی مطلق ضرورت نہیں جو

حیوانی جبلتوں اور نفسانی خواہشات پر قابو پانے سے قاصر رہیں۔

شاعرِ مشرق حضرتِ اقبالؒ کی شاعری میں اسی بے عملی اور دو عملی کا جا بجا نوحہ ملتا ہے۔وہ اپنی کشتِ ویراں سے نا اُمید تو ہر گز نہیں تھے لیکن اُنہیں یہ دُکھ ضرور تھا کہ

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

مَن اپنا پرانا پاپی ہے،برسوں میں نمازی بن نہ سکا

ہم نمازی تو شاید ہوں سوال مگر یہ ہے کہ کیسے ؟۔آقا کا فرمان ہے "نماز ایسے پڑھو کہ جیسے تُم خُدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر ایسی نہیں پڑھ سکتے تو کم از کم ایسی ضرور پڑھو کہ خُدا تمہیں دیکھ رہا ہے"۔لیکن ہماری نمازیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ نہ ہم خُدا کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اور نہ ہی یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ہماری نمازیں تو اُس جاٹ کی سی ہیں جو ایک دفعہ اپنے کھیتوں میں نماز پڑھ رہا تھا اور سسّی جو اپنے محبوب سے ملنے دیوانہ وار بھاگی چلی جا رہی تھی ،اس کے آگے سے گزر گئی۔جاٹ نیت توڑ کر اُس کے پیچھے بھاگا اور بالوں سے پکڑ لیا۔سسّی نے حیرت سے پوچھا "مجھ سے کیا خطا ہوئی"؟۔دیہاتی نے کہا میں نماز پڑھ رہا تھا اور تُو میرے آگے سے گزر گئی جس سے میری نماز باطل ہو گئی"۔سسّی نے مُسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا اور

کہا" واہ ربا ! ستی ایک دُنیاوی محبوب کے عشق میں اتنی دیوانی ہو گئی کہ اسے دائیں بائیں کی کچھ خبر نہیں اور یہ محبوبِ حقیقی کے آگے جھکا ہے اور پھر بھی جانتا ہے کہ ستی اس کے آگے سے گزر گئی"۔بس ایسی ہی ہوتی ہیں ہماری نمازیں بھی جن میں خشوع ہے نہ خضوع اور نہ ہی عشق کی آگ۔اقبالؒ نے ایسے ہی تو نہیں کہہ دیا تھا کہ

بُجھی عشق کی آگ ، اندھیر ہے

مسلماں نہیں ، راکھ کا ڈھیر ہے

تحقیق کہ ہم لاکھ درود و سلام کی محفلیں سجا لیں ، جلسے کر لیں ، جلوس نکال لیں لیکن سب عبث کہ یہ سب کچھ ہم صرف ایک مخصوص دن کے لیے اٹھا رکھتے ہیں ۔ہماری آنکھیں اشک بار تو ضرور ہوتی ہیں لیکن دلوں میں گداز پیدا نہیں کرتیں۔اور یہ گداز تب تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم اپنے دلوں کے اندر عشقِ مصطفوی ﷺ کی وہ جوت نہ جگا لیں جو ہمارا جُزوِ ایمان ہے ۔ میرے نبی کا فرمان ہے "تحقیق کہ تمہارا دین اُتنی دیر تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ میں تمہارے ماں باپ ، اولاد ، عزیز ، رشتہ دار حتیٰ کہ دُنیا کی ایک ایک شے سے پیارا نہ ہو جاؤں"۔اب اپنے دلوں سے گواہی لے لیجئے کہ اِس سے سچی گواہی کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ کیا واقعی ہم فرمانِ نبوی کے اِس معیار پہ پورا اُترتے ہیں ؟۔اگر نہیں اور تحقیق کہ نہیں تو پھر کیا فائدہ ایسی محافل کا اور ایسے چراغاں کا

میں تسلیم کرتی ہوں کہ ہم نفسا نفسی کے اِس دَور میں قرونِ اولیٰ کے مسلمان نہیں بن سکتے کہ اُنھیں تو سرورِ کائینات کی رہنمائی کی سعادت حاصل تھی۔اب بلالِ حبشیؓ کے سے عاشق کہاں کہ جنھوں نے آپ کے دُنیا سے تشریف لے جانے کے بعد محض اِس لیے اذان دینا چھوڑ دی کہ سامنے اُن کے محبوب تشریف فرما نہیں ہوتے تھے اور جب ایک دفعہ ہمت کرکے اذان کے لیے کھڑے ہوئے بھی تو جب نامِ محمد ﷺ لبوں پہ آیا تو سامنے آپ کو نہ پا کر غش کھا کر گر پڑے۔کہاں سے لائیں حضرتِ اویس کرنیؓ جیسے عاشق کہ جو بوڑھی ماں کی خدمت کی بنا پر ساری زندگی آقا کے دیدار سے محروم رہے ۔جب پتہ چلا کہ غزوہ اُحد میں محبوب کے دو دندان مبارک شہید ہو گئے تو اپنے سارے دانت صرف اِس لیے توڑ ڈالے کہ پتہ نہیں آپ کے کون سے دندان مبارک شہید ہوئے۔نہ غزوہ اُحد کے اُن شہداء کا سا کوئی عاشق ہو سکتا ہے جنھوں نے سارے تیروں تلواروں ،،برچھیوں ، نیزوں اور بھالوں کے وار اپنے جسموں پر سہہ ڈالے لیکن آقا ، کے چاروں طرف سیسہ پلائی دیوار کی مانند ڈٹے رہے۔ہم میں سے کوئی بھی اُس مقام تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن اُنہی عاشقانِ نبی کی پیروی کرتے ہوئے ہم اپنے آپ کو بدلنے کی سعی تو کر سکتے ہیں لیکن ہم تو مثل اُس بھڑکے ہیں جو ایک بار پروانوں کی محفل میں گیا اور کہا "مجھے بھی اپنے قبیلے میں شامل کر لو" ۔پروانوں

نے کہا "بسم اللہ ! لیکن ذرا پہلے جا کر دیکھ آؤ کہ کیا شہر میں روشنیاں جل اٹھی ہیں ؟۔ بھڑ اُڑا، شہر پہنچا تو دیکھا کہ سارا شہر جگمگا رہا تھا۔ اُس نے واپس آ کر پروانوں کو کہا" سارا شہر جگمگ جگمگ کر رہا ہے "۔ پروانوں نے کہا "تو ہمارے قبیلے میں شامل نہیں ہو سکتا"۔ بھِڑ نے حیرت سے سوال کیا "کیوں ؟ میں نے شرط تو پوری کر دی۔ اب کیوں شامل نہیں ہو سکتا؟"۔ پروانوں نے کہا "تُو اگر عاشق ہوتا تو وہیں جل مرتا، واپس نہ آتا"۔

حیرت ہی نہیں دُکھ بھی ہوتا ہے کہ ہم اِس بابرکت دن کو بھی ایک رسم کے طور پہ نبھاتے ہیں ۔ ہمارے سارے انٹرٹینمنٹ چینلز اِس دن کا بھرپور اہتمام کرتے ہیں لیکن وہی چینلز جہاں سے محض ایک دن پہلے درود و سلام کی پاکیزہ صدائیں فضاؤں کو معطر کر رہی ہوتی ہیں ، وہیں پر اگلے ہی دن وہی ڈرامے ، فلمیں ، ذو معنی جملے ، جگت بازی اور پھکڑ پن پورے اہتمام سے جاری و ساری ہو جاتا ہے اور ہم جن کے گلے "صدقے یا رسول اللہ" کے نعروں سے بیٹھ چکے ہوتے ہیں ، وہی ڈرامے اور فلمیں پورے ذوق و شوق کے ساتھ دیکھنے میں مگن ہو جاتے ہیں ۔ یہ دو عملی پورے معاشرے میں ناسُور کی طرح پھیل چکی ہے اور ہماری پوری معاشی و معاشرتی زندگی اسی دو عملی کے پنجہ استبداد میں جکڑی دکھائی دیتی ہے۔ معاشرے کی نَس نَس میں بھرے اِس موادِ بد کی جراحی کی کوئی صورت ، کوئی سبیل نظر بھی نہیں آتی ۔ فرقوں ، گروہوں اور نسلی تعصبات میں گھری اِس قوم کا قبلہ

درست کرنے کے لیے کون آئے گا، کچھ پتہ نہیں۔ یہ البتہ طے ہے کہ اِس قوم کا بھلا تب تک ممکن نہیں جب تک یہ شرارِ بولہبی سے دامن چھڑا کر چراغِ مصطفوی ﷺ کے حصول کی خاطر اپنا تَن مَن دھَن، سب کچھ نثار کرنے کے لیے تیار نہیں ہو جاتی۔

دم مست قلندر، دے دھرنا

مُرشد نے فرمایا "اگر میں دھرنا ختم کرنے کا اعلان نہ کرتا تو پانچ منٹ بعد مارشل لاء لگ جاتا "۔ یہ معرفت کی باتیں ہیں جو کم عقلوں اور کج فہموں کے "پلے "نہیں پڑنے والی۔اسی لیے سبھی "پھنے خاں" دانشور اپنی اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کر اندر کی بات تک پہنچنے کے لیے ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔کچھ نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "سپہ سالار" سے پوچھنا چاہیے کہ شیخ الاسلام نے پورے اعتماد کے ساتھ یہ بیان کیوں دیا ؟۔الیکٹرانک میڈیا پر بھی ہاہاکار مچی ہوئی ہے ۔ سبھی چڑیاں ، کوّے اور طوطے متحرک ہو چکے لیکن کسی کے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا۔دراصل ایسی اُلٹی سیدھی باتیں وہی لوگ کر رہے ہیں جنھوں نے کبھی مُرشد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا نہ اُن کی صحبتِ عارفانہ سے فیض یاب ہوئے ۔دروغ بر گردنِ راوی ، ہوا یوں کہ جب حکومت اپنی ضد ، ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سے باز آنے کی بجائے طعنوں سے کام نکالنے لگی تو مُرشد تنگ آ کر "مراقبے" میں چلے گئے ۔دورانِ مراقبہ جنرل اشفاق پرویز کیانی حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کیا "مُرشد ! اگر حکم ہو تو اُلٹا دوں اسلام آباد؟"۔ تبھی مُرشد اُنہیں "سٹینڈ بائی" کرکے مراقبے سے باہر آئے اور حجت تمام کرتے ہوئے فرعونوں ، شدّادوں ، نمرودوں ، قارونوں اور یزیدیوں کو آخری الٹی میٹم دے دیا ۔شنید ہے کہ دورانِ

مراقبہ انہوں نے چوہدری شجاعت حسین کو بھی طلب کر کے حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا
۔اسی بنا پر حکمرانوں کی دوڑیں لگ گئیں اور "اسلامابادیے" بال بال بچ گئے۔
اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مُرشد نے حکمرانوں کے وعدے، معاہدے پر اعتبار کر لیا، تو یہ اُس کی بھول ہے کیونکہ مُرشد اپنے کشف و کرامات کو استعمال میں لائے بغیر بھی جانتے ہیں کہ حکمرانوں کے نزدیک "وعدے قُرآن و حدیث نہیں ہوتے"۔اسی لیے (ایک دفعہ پھر دروغ بر گردنِ راوی) اُنھوں نے اپنے زیرِ تربیت "جانشینوں" کو درسِ صداقت دیتے ہوئے فرمادیا تھا کہ حکمرانوں کے وعدوں پر اعتبار بقولِ غالب ایسے ہی ہے کہ
تیرے وعدے پہ جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مَر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا
جب ایک جانشین نے بصد عجز و نیاز سوال کیا کہ پھر ایسے فرعونوں کے خلاف مُرشد نے اپنا پُر ہیبت "عصائے موسوی" استعمال کیوں نہیں کیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ کون احمق ایسی حکومت سے "خلاصی" کے لیے اپنی توانائیاں صرف کر سکتا ہے جسکا جانا ویسے بھی ٹھہر گیا ہو، یہ مارچ تو "تختِ لاہور" پر اپنا "رعب شُعب" قائم کرنے کے لیے تھا۔ہمارا اصل ٹارگٹ وہی ہیں جو "منہاج

القُرآن" کے لیے تھوڑی سی زمین اور ماضی بعید میں "نذر نیاز" دے کر یہ سمجھتے رہے کہ شیخ الاسلام اُن کے احسانوں کے بوجھ تلے دَب گیا۔اگر اُن میں تھوڑی سی بھی عقل ہوتی تو وہ حضرت علیؓ کا یہ قول یاد رکھتے کہ "جس پر احسان کرو، اُس کے شر سے ڈرو"۔ میں خاکِ پائے یارانِ نبی بھلا اِس قولِ علیؓ کو جھٹلانے کا گناہِ کبیرہ کیسے کر سکتا ہوں؟۔اِس لیے جب تک دَم میں دَم ہے میں اِنہیں "رگڑا" دینے کی سعی کرتا رہوں گا ۔جب سامعین نے مُرشد پاک کا یہ عارفانہ کلام سُنا تو تکبیر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے سبھی بیک زبان ہوئے کہ "سُبحان اللہ ! دین میں پورے کا پورا داخل ہونا اسی کو کہتے ہیں"۔

اب مُرشد نے پنجاب میں بھی "انقلاب مارچوں" کا اعلان فرما دیا ہے اور سبھی مریدین کمر بستہ۔ دوسری طرف نواز لیگ کے اکابرین کو ایک دفعہ پھر "کالی بلیاں" نظر آنے لگی ہیں ۔وہ کہتے ہیں کہ یہ بلیاں صرف نواز لیگ کا راستہ کاٹنے کے لیے چھوڑی گئی ہیں۔حالانکہ مُرشد بڑی صراحت سے یہ فرما چکے ہیں کہ اُن کی جنرل اشفاق پرویز کیانی صاحب سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ مُرشد نے زندگی میں کبھی" مصلحتاً بھی جھوٹ نہیں بولا"۔پھر بھی نواز لیگ کو خوابوں میں بھی کالی بلیاں آ آ کر ڈراتی رہتی ہیں۔اُنہیں چاہیے کہ الیکشن کی بھرپور تیاری کریں اور اِس وہم کو دل سے نکال دیں کہ کوئی "بنگلہ دیش فارمولا" بروئے کار آنے والا ہے۔ویسے شنید ہے

کہ نواز لیگ بھی حفظِ ما تقدم کے طور پر اپنی صفیں درست کر رہی ہے اور اسلام آباد کی "دھرنی" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے نواز لیگ نے "دھرنا بمقابلہ دھرنا" کی ٹھان تو لی لیکن نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سطحی سی عقل رکھنے والے بھلا شیخ الاسلام کی عالمانہ، فاضلانہ اور عاقلانہ سوچوں تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔انتہائی متحرک چوہدری نثار احمد نے چھوٹی بڑی تمام اپوزیشن جماعتوں کو دھرنے میں شمولیت کی دعوت دے ڈالی اور سبھی نے حامی بھی بھر لی۔دھرنے کا شور بھی بہت تھا لیکن ہوا یوں کہ

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمی سو گئے داستاں کہتے کہتے

چوہدری نثار صاحب کی دھرنے میں شمولیت صرف "مُنہ دکھائی" تک محدود رہی۔اُنہیں پتہ نہیں کس بات کی جلدی ہوتی ہے۔1999ء میں بھی وہ "وقتِ قیام" کھسک لیے اور گھر جا کر خود ساختہ "نظر بندی" میں مبتلاء ہو گئے۔اب بھی وہ جھلک دکھلا کر ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سَر سے سینگ۔اگر محترم لیاقت بلوچ اپنی بھاری بھرکم آواز میں جذباتی نعرے لگوا کر ماحول کو گرم نہ رکھتے تو اِس "دھرنی" کی داستاں تک بھی نہ ہوتی داستانوں میں۔بہرحال جن "کالی بلیوں" کے خلاف نواز لیگ نے دھرنے کی ٹھانی تھی وہ تو اب بھی میاؤں میاؤں کرتی پھرتی ہیں۔

پیپلز پارٹی خوش ہے کہ نواز لیگ کی ابھی "کپتان" سے جان چھوٹی نہیں تھی کہ شیخ الاسلام سے "متھا" لگ گیا۔ میاں نواز شریف صاحب یہ کہتے ہوئے کہ "سارے رل کے سانوں پے گئے نیں" عمرے کے لیے سدھار لیے۔سُنا ہے کہ آجکل وہ "ردِ بلا" کے لیے مسجدِ نبوی میں مصروفِ وظائف ہیں۔وہ جتنے جی چاہے وظیفے کرلیں پھر بھی مجھے یقین ہے کہ جیت بہر حال مُرشد کی ہی ہو گی کیونکہ حسینیت کے علمبردار شیخ الاسلام یزیدیت کے خلاف عَلمِ جہاد بلند کیے ہوئے ہیں اور ایسے معرکوں میں طاغوت کی ظاہری فتح اُس کی ابدی شکست کے مترادف ہوا کرتی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ کل کلاں جب انتخابات میں مُرشد کے حصّے میں بقدرِ اشکِ بُلبُل بھی نہ آیا تو یہ نون لیگئے طنز و تعریض کے تیروں کی بوچھاڑ کر دیں گے لیکن وہ پھر بھی ہمارے حوصلوں کو شکست دینے میں ناکام رہیں گے کیونکہ ہم ظاہر نہیں باطن میں جینے والے اُس قبیلے سے تعلق ہیں جس میں جذبہ شوقِ شہادت ہمہ وقت موجزن رہتا ہے اور مُرشد کے اندر تو شہادت کی تڑپ بے حد و حساب ہے۔اسی لیے اُنھوں نے اپنی وصیت بھی لکھوا دی ہے۔کچھ نا ہنجار کہتے ہیں کہ بھلا بُلٹ پروف اور بم پروف کنٹینروں میں شہادت کہاں سے گُھسے گی۔ یہ محض کمزوریِ ایماں ہے وگرنہ ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ایک روتا پیٹتا کالم

ابھی ہم خادمِ اعلیٰ کی "جنگلا بس سروس" کا "نوحہ" لکھنے کے منصوبے باندھ ہی رہے تھے کہ ہماری سب سے بڑی عدالت کے سب سے بڑے "قاضی" صاحب نے ہمارے مُرشد سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ یہ دِل کے پھپھولے تو خیر ہم بعد میں پھوڑیں گے پہلے ذرا جنگلا بس سروس جسے مسلم لیگ (نواز) نے آمدہ الیکشن میں کامیابی کے لیے بطور ہتھیار استعمال کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ محترم میاں نواز شریف صاحب فرماتے ہیں "ڈاکٹر طاہر القادری کا طریقہ درست ہے نہ نیت"۔ تو کیا چھوٹے میاں صاحب کی نیت اور طریقہ درست ہے ؟۔ ایک ایسا منصوبہ جسے کم از کم ایک دہائی میں مکمل ہونا چاہیے تھا اُسے محض گیارہ ماہ میں مکمل کرکے اُنھوں نے "Slow and steady wins the race" جیسے تاریخی مقولے کو غلط ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی ہے جو ہر گز قابلِ قبول نہیں کیونکہ اگر وہ اسی طرح سے مقولے پہ مقولہ غلط ثابت کرتے چلے گئے تو ہماری ساری علمی "تپیا" دریا بُرد ہو جائے گی اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ

بہ عہدِ نَو ہوا سارا ہی کاذب
بزرگوں نے ہمیں جو کچھ کہا تھا.

کوئی بتلائے کہ یہ کہاں کی ملک و قوم کی خدمت ہے کہ اربوں روپے کیڑے مکوڑوں پر صرف کرکے ہم جیسے دھرتی کے ماتھے کے جھومروں کو حسد کی آگ میں جھونک دیا جائے۔ پہلے جب ہم اپنی چمچماتی گاڑی میں کسی مصروف شاہراہ سے گزرتے تھے تو اطراف میں موجود "حشرات الارض" کو بسوں، ویگنوں کی طرف لپکتے دیکھ کر ہماری گردن میں سریا آ جاتا اور احساسِ تفاخر سے ہمارا رواں رواں کانپنے لگتا۔ تب ہمیں یہ یقین بھی ہو جاتا کہ صرف ہم ہی وہ چیدہ اور چنیدہ لوگ ہیں جنہیں اشرف المخلوقات کہلانے کا حق ہے اِن "فُٹ پاتھیوں" کو نہیں۔ لیکن ہماری ننھّی مُنی خوشیوں کے ازلی دُشمن بلکہ قاتل چھوٹے میاں صاحب کو یہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ اب ہم نیچے سڑک پر بھیڑ میں خوار ہوتے پھریں گے اور "ریپیڈ بس" کیڑے مکوڑوں کو بھر کر ہمارے سَروں کے اوپر سے زوں زوں کرتی گزر جایا کرے گی۔ یہ جنگلا سروس بنانے سے تو کہیں بہتر تھا کہ میاں برادران "بلاول ہاؤس" کراچی کے نواح میں اپنے لیے دس، دس ارب کے تین بُلٹ پروف گھر بنا لیتے جس سے ہماری عزتِ نفس مجروح ہونے سے بھی بچ جاتی اور نواز لیگ بھی اِس سے بھرپور سیاسی فائدہ بھی اِس طرح اٹھا سکتی کہ جنابِ آصف زرداری جو بحریہ ٹاؤن لاہور میں دس ارب کا گھر بنا کر اُن کے سینوں پر مونگ دَلنے آن وارد ہوئے ہیں، یہ تین، تین گھر بنا کر زرداری صاحب کے سینے پر "مونگ، ماش اور مسُور" تینوں دلنا شروع کر دیتے۔ لیکن میاں برادران بھلا ایسا کیوں کرتے، اُنھوں نے تو بقولِ مُرشد پیپلز پارٹی سے "مُک مکا" کر رکھا ہے۔ بہرحال

عزت سب کی سانجھی ہو نہ ہو پیاری سب کو ہوتی ہے اِس لیے ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب "فیروز پور روڈ" کو اپنے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دے دیں گے۔ ہمارا دوسرا فیصلہ یہ بھی ہے کہ یہ کیڑے مکوڑے لاکھ نواز لیگ کو ووٹ دیتے پھریں لیکن ہمارے "پُرکھوں" کی بھی توبہ جو پھر کبھی ایسی جماعت کا نام تک اپنی زبان پر لائیں جس نے ہماری ایک مقبوضہ سڑک" کو ہمارے لیے واہگہ بارڈر بنا دیا۔ اب بھی اگر چھوٹے میاں صاحب" کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ اپنے "طبقہ اشرافیہ" کی جانب پلٹنا چاہیں تو اُن کی درخواست پر ہمدردانہ غور کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ ریپڈ بس کے لیے بنائی گئی سڑک کو صرف اشرافیہ کے لیے مختص کر دیں۔ اگر وہ ہر جگہ یہ گُنگناتے پھرتے ہیں کہ ۔۔۔ ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو ۔۔۔ میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا۔ تو ہم بھی میاں صاحب کے بنائے ہوئے ایسے دستور کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں جو ہماری عزتِ نفس مجروح کرے۔

ابھی ہم دِل کے پھپھولے "ریپڈ بس" کی وجہ سے پھوڑ ہی رہے تھے کہ اعلیٰ عدلیہ نے اُن پھپھولوں پر نمک پاشی بھی شروع کر دی اور ہمیشہ حکم دینے کے عادی ہمارے پیرِ طریقت و شریعت کو واشگاف الفاظ میں "شیخ الاسلام" تسلیم کرنے کے باوجود، حکم دیا کہ پہلے وہ یہ ثابت کریں کہ وہ "امپورٹڈ" نہیں ہیں۔ کوئی عدالتِ عظمیٰ سے پوچھے کہ "کیا اُس نے ہمارے مُرشد کو "لنڈے کا مال

سمجھ رکھا ہے جو وہ یہ ثابت کرتے پھریں کہ وہ "میڈاِن پاکستان" ہیں "میڈاِن کینیڈا" نہیں ۔ ہمارے چیف صاحب کو شاید تجربہ نہیں کہ لنڈے کے مال کی مخصوص مہک سے تو فضا متعفن ہو جاتی ہے جب کہ حضرتِ شیخ الاسلام جہاں جہاں سے گزرتے ہیں، فضائیں عطر بیز ہوتی چلی جاتی ہیں۔اُنہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ کینیڈین شہریت کا حصول بہت جان جوکھم کا کام ہے۔مُرشد کو تو 1999ء میں ہی کینیڈا کی مستقل سکونت مل چکی تھی، وہ تو درمیان میں 2002ء کے انتخابات آن ٹپکے اور "ناہنجار آمر" نے مُرشد کو دست بستہ کہا کہ وہ اُسے داغِ مفارقت دینے کی بجائے اپنی صلاحیتیں پاکستان کے لئے بطور وزیرِ اعظم وقف کر دیں۔مُرشد نے کمال شفقتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس کی بات مان لی، الیکشن لڑا اور قلندرانہ قناعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف اپنی ہی سیٹ جیتی۔لیکن بدبخت آمر غُچہ دے گیا اور مُرشد مستعفی ہو کر کینیڈا سدھارے۔کچھ بَد خواہوں کی شہ پا کر شاید اب کچھ بد باطن یہ سوال بھی کھڑا کر دیں کہ شیخ الاسلام تو 1997ء میں ہی کینیڈین شہریت کے لئے درخواست دے چکے تھے اور اعمال کا دارومدار تو نیتوں پر ہوتا ہے جبکہ شیخ الاسلام کی "مسلمہ نیّت" ملک چھوڑ جانے کی تھی تو پھر وہ 2002ء کے انتخاب میں حصّہ لینے کے اہل کیسے ہو گئے ؟۔کسی بحث میں اُلجھے بغیر ایسی ابلیسانہ اور خبیثانہ" سوچیں رکھنے والوں کے لیے یہی جواب کافی ہے کہ حضرتِ شیخ" اُس وقت بھی اسمبلی کی نشست کو لات مار کر باہر چلے گئے تھے اور اب بھی وہ ایسی کرپٹ اسمبلی کا حصّہ بننے

کو تیار نہیں۔

لگتا ہے کہ ہمارے چیف جسٹس صاحب اور اُن کے ساتھی جج صاحبان مُرشد کے کشف و کرامات اور جلال سے آگاہ نہیں تھے اگر ایسا ہوتا تو وہ مُرشد سے ایسے "اوکھے اوکھے" سوالات کرتے نہ مُرشد کی درخواست کو ردی کی ٹوکری کی نظر کرتے۔شاید اعلیٰ عدلیہ کی اسی کم علمی اور بھولپن کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مُرشد تھوڑی دیر کے لیے جلال میں آئے اور پھر ٹھنڈے ٹھار ہو کر لاہور سدھارے۔البتہ یہ طے ہے کہ مُرشد الیکٹرانک میڈیا کو معاف کرنے کا ہر گز کوئی ارادہ نہیں رکھتے ۔اِس احسان نا سپاس میڈیا نے اُن سے اربوں روپے کے اشتہارات بھی ہتھیا لیے اور اب طوطا چشمی کی انتہا کرتے ہوئے اُنہی کا "میڈیا ٹرائل" بھی کر رہے ہیں۔ہر نیوز چینل گڑے مُردے اُکھاڑ رہا ہے۔ایک معروف اینکر نے یہ شوشہ چھوڑا کہ 1990ء میں نیک نام جسٹس اختر حسن ایک مقدمے میں مُرشد کو "نفسیاتی مریض" قرار دے چکے ہیں جبکہ آج ایک معروف لکھاری اُسی کا حوالہ دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ شیخ الاسلام نے سپریم کورٹ کے باہر اعلیٰ عدلیہ کے خلاف جو زہر اُگلا ہے اُس کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اعلیٰ عدلیہ اُنہیں توہینِ عدالت کا نوٹس دینے کی بجائے کسی ماہرِ نفسیات کے پاس بھیج دے۔سچ تو یہ ہے کہ ایسی باتیں کرنے والے بذاتِ خود نفسیاتی مریض ہیں جو مُرشد کی معرفت کی باتیں سمجھ ہی نہیں پائے۔

انتخابات کی ہنگامہ خیزیاں

وطنِ عزیز میں انتخابی بخار اپنے جوبن پر ہے اور صرف سیاستدان ہی نہیں عوام بھی آہستہ آہستہ اِس بخار میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سیاسی جماعتیں اپنے اپنے منشور پیش کرکے یہ سمجھ بیٹھی ہیں کہ عوام کو بیوقوف بنایا جا سکتا ہے جبکہ اپنی تمام تر سادگی اور بھولپن کے باوجود عوام میں بہرحال شعور کی ایسی لہر جاگ اُٹھی ہے جو ایسے کھلونوں سے بہلنے والی نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ 1970ء کے روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے سے لے کر 2008ء کے انتخابات تک کبھی کسی سیاسی جماعت نے اپنے منشور پر عمل کیا ہے، نہ آئیندہ کرنے کی توقع۔ ویسے اگر مختلف سیاسی جماعتوں کے منشور دیکھے جائیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہر سیاسی جماعت نے عوام کو بیوقوف بنانے کی اچھی کاوش کی ہے۔ کسی منشور میں مزدور کی تنخواہ سولہ اور کسی میں اٹھارہ ہزار مقرر کرنے کی نوید سنائی گئی ہے اور لوڈشیڈنگ کے خاتمے اور کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے نعرے تو ہر منشور کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ ہم تو ابھی انہی بلند بانگ "منشوری دعووں" میں اُلجھے ہوئے تھے کہ مولانا فضل الرحمٰن نے تو تمام منشوروں پر ڈرون حملہ کرتے ہوئے مزدور کی تنخواہ ایک تولہ سونے کے برابر کرنے کا اعلان کر دیا۔ مجھے یہ سُن کر ایک پرانا لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک بھوکی بلّی کافی دیر سے ایک چوہے کے بِل

سے باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی لیکن چوہا باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔آخر کار بلّی کو ایک ترکیب سوجھی ۔اُس نے چوہے کو بڑے پیار سے مخاطب کرتے ہوئے کہا بھانجے ! اگر تم اپنے بِل سے نکل کر اُس دوسرے بِل میں چلے جاؤ تو میں تمھیں پانچ سو روپے انعام دونگی"۔چوہے نے لالچ میں آکر بِل سے باہر مُنہ نکالا لیکن پھر فوراً ہی اندر کر لیا۔بلّی نے پوچھا "بھانجے کیا ہوا؟"۔چوہے نے جواب دیا"خالہ ! پیسے بوہتے تے پینڈا تھوڑا اے، کوئی چکر اے"۔ (خالہ ! پیسے زیادہ اور فاصلہ کم ہے اِس لیے کوئی گڑبڑ ہے)۔محترم مولانا فضل الرحمٰن کی اِس چھلانگ میں یقیناً کوئی نہ کوئی چکر ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ پاکستان میں "کُرسی" سے بڑا کوئی چکر تو ہو ہی نہیں سکتا۔ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت مولانا نے یہ سوچا ہو کہ اگلی صدی تک تو اُن کے وزیرِ اعظم بننے کا کوئی چانس نہیں اِس لیے کیوں نہ ایک تولہ سونے کے برابر تنخواہ مقرر کرنے کا شوشہ چھوڑ کر آنے والی حکومت کو پریشان کیا جائے۔

ایسے ہی شوشے محترم عمران خاں بھی چھوڑ رہے ہیں۔وہ کبھی 90 اور کبھی 9 دِن میں کرپشن کے خاتمے کا اعلان فرما رہے ہیں اور اب تو اُنہیں بھی محترم ڈاکٹر طاہر القادری کی طرح بشارتیں ہونے لگی ہیں۔اُنہیں بھی خواب میں "کلین سویپ" کی بشارت ہوئی اِس لیے اُنھوں نے فرمایا کہ عنقریب وہ ملک کے

وزیرِ اعظم ہونگے۔اُن کا فرمان بجا اور خواب بھی سچّا لیکن جس بات سے میں پریشان ہوں وہ یہ ہے کہ خاں صاحب تو متعدد بار یہ فرما چکے ہیں کہ وہ جنابِ زرداری کی صدارت میں وزارتِ عظمیٰ کا حلف نہیں اٹھائیں گے ۔اب اگر وہ جیت بھی جاتے ہیں تو وزیرِ اعظم تو پھر بھی نہیں بن سکتے کیونکہ تلخ حقیقت تو یہی ہے کہ جو بھی وزیرِ اعظم بنے گا اُس سے حلف تو بہر حال صدرِ مملکت جناب آصف علی زرداری نے ہی لینا ہے۔اِس لیے محترم خاں صاحب کا خواب کلین سویپ تک تو درست ہو سکتا ہے وزارتِ عظمیٰ تک نہیں۔اور اگر وزارتِ عظمیٰ ہی نہیں تو ایسے کلین سویپ کو کیا بھاڑ میں جھونکنا ہے۔

خاں صاحب نے پینتیس فیصد سے زائد نوجوانوں کو الیکشن کے اکھاڑے میں اتارا ہے جس پر اُنہیں فخر بھی ہے لیکن یہ نوجوان بھی تو ایسے ہی خانوادوں سے تعلق رکھتے ہیں جن سے چوہدری مونس الٰہی ، عبدالقادر گیلانی اور علی موسیٰ جیسے نوجوانوں کا تعلق ہے۔ خُدا کرے کہ یہ نوجوان ملک و قوم کے لیے نیک فال ثابت ہوں لیکن اگر یہ بھی مونس الٰہی علی موسیٰ گیلانی اور عبدالقادر گیلانی کے نقشِ قدم پر چل نکلے تو پھر ؟۔ویسے سچی بات ، تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے قائدین سے کبھی کوئی بد گمانی نہیں ہوئی اور ہم تو کہتے چلے آ رہے ہیں کہ ہمارے بھولے بھالے اراکینِ اسمبلی انتہائی پاک صاف ، دیانتدار اور ملک و قوم کی محبت میں سرشار ہیں لیکن ہم جیسوں کی کون سُنتا تھا۔وہ تو اللہ بھلا

کرے ہمارے الیکشن کمیشن اور عدلیہ کا جنہوں نے لگ بھگ ستائیس ہزار امیدواروں کے ہاتھ میں امانت، دیانت، صداقت اور شرافت کا سرٹیفیکیٹ تھما کر اُنہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی تنقید سے نجات دلا دی۔ اُدھر ہماری عدلیہ بھی شفقتوں اور عنایتوں میں کسی سے کم نہیں۔ جن دو اڑھائی سو افراد کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد ہوئے عدلیہ نے چند بد نصیبوں کے سوا سبھی کو صادق و امین قرار دے کر میدانِ عمل میں بھیج دیا ہے اِس لیے اب ہم بڑے فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جو دیانتداروں کی آماجگاہ ہے۔

دوسری طرف کچھ لوگ اب بھی یہ کہتے ہیں کہ اوّل تو انتخابات ہونے والے نہیں اور اگر ہوئے بھی تو یہ پاکستان کی تاریخ کے عجیب و غریب اور مضحکہ خیز انتخابات ہونگے۔ وہ کہتے ہیں ہم نے ملک ایسے آزاد الیکشن کمیشن اور آزاد نگران حکومت کے سپرد کر دیا ہے جن کی کوئی کَل سیدھی نہیں۔ پچاسی سالہ چیف الیکشن کمشنر کو نگران وزیرِ اعظم میر ہزار خاں کھوسو میں محض ایک خوبی نظر آئی کہ وہ ستاسی سال کے ہیں۔ شاید فخر الدین جی ابراہیم صاحب نے یہ سوچا ہو گا کہ کوئی تو ایسا ہو جو عمر میں اُن سے بھی بڑا ہو۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ نگران حکومت اور آزاد الیکشن کمیشن میں نِت نئے لطیفے جنم لے رہے ہیں۔ کھوسو صاحب تو استراحت ہی فرماتے رہتے ہیں جب کہ پنجاب کے چڑیا والے

وزیرِ اعلیٰ پہلے دن سے ہی بسنت منانے کے چکر میں تھے لیکن جب اُن کا کوئی بَس نہیں چلا تو اُنھوں نے سارا غصّہ اداروں کی اُکھاڑ پچھاڑ پر نکال دیا اور شفاف انتخابات کی آڑ میں اداروں میں وہ اُدھم مچایا ہے کہ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ حیرت ہوتی ہے کہ پولیس کے سَب انسپکٹرز کو ایک تھانے سے اُٹھا کر دوسرے تھانے میں بھیج دینے میں کہاں اور کیسے شفاف انتخابات مضمر ہیں؟۔ پھر شفافیت کا یہ فارمولا صرف پنجاب ہی میں کیوں آزمایا جا رہا ہے۔ دوسرے صوبوں کو بھی اِس سے مستفید ہونا چاہیے۔ اگر باقی صوبوں کے وزرائے اعلیٰ نا اہل ہیں تو ہم بخوشی اپنا وزیرِ اعلیٰ اُنہیں اُدھار دینے کو تیار ہیں۔ البتہ اُن کی "چڑیا" کے بارے میں کوئی وعدہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ آجکل وائٹ ہاؤس" میں خدمات سرانجام دے رہی ہے۔"

سیاسی جماعتیں اور نیا پاکستان

انتخابات ختم ہوئے ، نئی حکومتیں مرکز اور صوبوں میں معرضِ وجود میں آ گئیں اور اب نواز لیگ ہی نہیں بلکہ تحریکِ انصاف اور پیپلز پارٹی کا بھی کڑا امتحان شروع ہو گیا۔ قبل از انتخاب نواز لیگ اور تحریکِ انصاف نے بلند بانگ وعدے اور دعوے کیے البتہ پیپلز پارٹی کا سارا زور بھٹو اور بینظیر کی نوحہ خوانی پر رہا لیکن پتھر دل قوم ذرا بھی نہیں پگھلی اور انتخابات میں اُس کا وہ دھڑن تختہ کیا کہ اب اُس کے ہاں سچ مُچ کی صفِ ماتم بچھی ہے۔اب شاید پیپلز پارٹی کو سمجھ آ چکی ہو گی کہ" بھٹو کارڈ" استعمال نہیں ہو گا اور قوم اتنی بھی بیوقوف نہیں کہ عشروں تک بھٹو اور بینظیر کی قبروں کو ووٹ دیتی رہے۔

میاں برادران کو انتخابات میں خوب پزیرائی ملی اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ میاں نواز شریف صاحب کے چہرے پر جمی تفکرات سے لبریز گھمبیر خاموشی کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے ۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ جیت کر بھی ہار گئے ہیں۔وجہ شاید یہ ہے کہ مسائل کا دیو جو مُنہ کھولے سب کچھ نگلنے کو تیار بیٹھا ہے جس سے نجات کی کوئی راہ دکھائی دیتی ہے نہ سجھائی۔لوڈ شیڈنگ ، کرپشن ،

مہنگائی، خودکُش اور ڈرون حملے ایسے مسائل ہیں جن سے فوری طور پر چھٹکارہ ممکن نہیں اور قوم مزید وقت دینے کو تیار نہیں۔اِس وقت حکومت کا سب سے زیادہ زور لوڈشیڈنگ کے خاتمے یا کم از کم اُس میں معقول حد تک کمی پر ہے۔سوال مگر یہ ہے کہ اگر لوڈشیڈنگ پر قابو پا بھی لیا جائے تو کیا راوی عیش ہی عیش لکھنا شروع کر دے گا؟۔کیا بجلی آنے سے ڈرون حملے بند ہو جائیں گے یا کرپشن کے مگرمچھ قابو میں آ جائیں گے؟۔یقیناً ایسا کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔اسی لیے میاں برادران یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی کرنا ہے جنگی بنیادوں پہ کرنا ہے۔مجھے یقین ہے کہ میاں برادران اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرکے اِن معاملات کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنے کی سعی ضرور کریں گے۔وہ شاید بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی جائیں البتہ کاسہ لیس۔نظر آ رہا ہے کہ انتخابات سے پہلے جن کا قلم میاں برادران اور نواز لیگ کے خلاف زہر اگلتا تھا اب اُس میں آہستہ آہستہ شیرینی گھُلتی چلی جا رہی ہے۔خوشامد ایسا موذی مرض ہے جو انسان کی سُدھ بُدھ گنوا دیتا ہے اور بڑے میاں صاحب نے تو خوشامد کی کڑواہٹ کو کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔اُن کی آج بھی وہی معروف "کچن کیبنٹ" اُن کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہے جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ قوم ایک دفعہ پھر مایوس ہی ہو گی لیکن اگر میاں برادران نے اپنے ماضی اور طویل جلاوطنی سے کچھ سبق سیکھا ہوا تو پھر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جس نئے پاکستان کے نعرے عمران خاں صاحب لگا رہے تھے وہ نیا پاکستان میاں

برادران کے ہاتھوں تشکیل پائے گا۔

قوم نے اِس دفعہ سیاسی جماعتوں کو بڑا عجیب و غریب مینڈیٹ دیا ہے۔ پیپلز پارٹی کو سندھ تک محدود کرکے اُسے یہ موقع دیا ہے کہ وہ اپنے اعمال کو درست کر لے لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا کیونکہ سندھ پر ایک دفعہ پھر وہی حکومت مسلط کر دی گئی ہے جسے سندھی عوام پانچ سال تک بھگتتے رہے ہیں۔ سندھیوں نے تو طوہاً و کرہاً بھٹو اور بینظیر سے محبت کا حق ادا کر دیا لیکن جنابِ زرداری نے اُن پر پھر وہی پرانے لوگ مسلط کر دیئے۔ اب ستمبر کے بعد جب وہ عملی سیاست میں آئیں گے تو پتہ چلے گا کہ زرداری صاحب نے پچھلے پانچ سالوں سے یہ کوئی سبق سیکھا ہے یا نہیں؟۔ عمران خاں صاحب زیادہ سے زیادہ مرکز میں اپنی پارٹی کے پارلیمانی لیڈر ہی بن سکتے ہیں کیونکہ عددی اعتبار سے قائدِ حزبِ اختلاف پیپلز پارٹی کے خورشید شاہ بنیں گے خاں صاحب نہیں۔ اگر انہوں نے کسی سے بنا کر رکھی ہوتی تو شاید اِس بار ایم کیو ایم اُن کا ساتھ دیتی لیکن اُنہیں تو دو تہائی اکثریت کا اتنا یقین تھا کہ وہ کبھی ایک بال سے تین وکٹیں گراتے اور کبھی اپنے بلّے سے دوسروں کی "چھینٹی" لگاتے نظر آتے۔ یہی زعم اُنہیں تنہا پرواز کی طرف لے گیا جبکہ اُن کی پارٹی کا یہ حال تھا کہ

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا

بھان متی نے کُنبہ جوڑا

اِس کنبے کے کچھ پنچھی تو ٹکٹ نہ ملنے پر پھُر ہو گئے ، کچھ انتخابات کے بعد کھسک لیے اور کچھ کھسکنے کے لیے پَر تول رہے ہیں۔ خورشید محمود قصوری الیکشن ہارنے کے بعد گھر بیٹھ رہے اور اُن کی بھاوج تحریکِ انصاف کی جذباتی ترجمان اور خواتین ونگ کی صدر فوزیہ قصوری کو اب تحریکِ انصاف میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں۔ وجہ صرف یہ کہ اُنہیں قومی اسمبلی میں خواتین کی مخصوص نشست نہیں مل سکی۔ اِس لیے اُنھوں نے تحریکِ انصاف سے پرواز کر جانے میں ہی عافیت جانی۔ بلوچستان کی خواتین ونگ کی صدر بھی تحریکِ انصاف کو داغِ مفارقت دے چکی ہے اور بھی بہت سے لوگ باقی ہیں جو پرواز کے لیے پَر تول رہے ہیں ۔ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ تحریکِ انصاف کی تیزی سے مقبولیت اور پنچھیوں کا پروانہ وار فدا ہونا کچھ غیر فطری سا محسوس ہوتا ہے لیکن ہمیں جواباً وہ کچھ سُننا پڑتا تھا جسے احاطہء تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ محترم عطاالحق قاسمی صاحب نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ پیپلز پارٹی سندھ میں مقبول ہے ، نواز لیگ پنجاب میں اور تحریکِ انصاف فیس بُک پر۔ اُن کا لکھا حرف حرف سچ ثابت ہوا لیکن تحریکِ انصاف کے جذباتی کارکنوں نے انٹرنیٹ کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے اُنہیں بہت کچھ سُنا ڈالا۔

اب جبکہ صوبہ خیبر پختونخواہ میں تحریکِ انصاف کی حکومت قائم ہو چکی ہے، وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ خیبر پختونخواہ کے وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک عمران خاں کی ہدایات پر عمل کرنے کی بجائے مَن مانی کریں گے۔ عمران خاں صاحب تو اسد قیصر کو وزیرِ اعلیٰ بنانا چاہتے تھے لیکن طرّار پرویز خٹک نے اُن کی ایک نہیں چلنے دی۔ وہ پہلے ہی اپنا مضبوط گروپ بنا چکے تھے جس میں اُن کے خاندان کے تقریباً تمام بالغ افراد صوبائی اسمبلی کا الیکشن جیت کر اُن کے دست و بازو بن چکے تھے۔ اِس لیے ہوا وہی جو پرویز خٹک نے چاہا۔ اب خیبر پختونخواہ کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ خٹک صاحب صوبہ سنبھال نہیں سکیں گے جس کا براہِ راست نقصان عمران خاں صاحب کو ہو گا۔ شاید اسی لیے نواز لیگ نے ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے خیبر پختونخواہ کی حکومت تحریکِ انصاف کے سپرد کر دی اور مولانا فضل الرحمٰن کو بھی "ٹکرے" لگا دیا۔ یہ مولانا صاحب بھی عجیب ہیں۔ جس طرح جل بِن مچھلی نہیں رہ سکتی اُسی طرح مولانا صاحب بھی حکومت سے باہر نہیں رہ سکتے لیکن آفرین ہے نواز لیگ پر جس نے مولانا کی ایک نہیں چلنے دی اور اُنہیں مکھن سے بال کی طرح مرکز، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان سے نکال باہر کیا۔ اب مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم حکومت کے اتحادی ہیں وزارتوں کا فیصلہ بعد میں کر لیں گے۔ اب دیکھیں اِس زبردستی کے اتحادی کے کشکول میں کچھ گرتا ہے یا نہیں۔

نواز لیگ کی مفاہمتی پالیسی

لوگ 1988ء کا وہ زمانہ نہیں بھولے ہونگے جب وزیرِ اعظم بینظیر لاہور تشریف لاتیں تو پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ میاں نواز شریف اُن کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ تک جانا بھی گوارا نہ کرتے۔ پھر لوگوں نے میاں صاحب کو بینظیر کی شہادت پر ہچکیاں لے لے کر زاروقطار روتے بھی دیکھا۔ لوگ ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ وہ ضدّی نواز شریف کہاں گیا لیکن شاید یہ طویل جلاوطنی کا ثمر تھا جس نے میں صاحب کو یکسر بدل کے رکھ دیا اور اُنھوں نے جنابِ آصف زرداری جیسے لیڈروں سے بھی مفاہمت کی پالیسی اختیار کی اور زرداری صاحب کی تمامتر وعدہ خلافیوں کے باوجود اُسے برقرار بھی رکھا۔ یار لوگوں نے فرینڈلی اپوزیشن تک کے طعنے دیئے، ملّی بھگت کا شور مچایا لیکن میاں صاحب کی پالیسی میں سرِمُو فرق نہ آیا۔ یہ اُسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ آج میاں صاحب بلا شرکتِ غیرے برسرِ اقتدار ہیں اور پیپلز پارٹی سندھ کے دیہی علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ لوگ تو جنابِ زرداری کو سیاست کی شطرنج کا ماہر کھلاڑی گردانتے رہے اور خود زرداری صاحب بھی میاں صاحب کو یہ کہتے رہے کہ "اگر سیاست سیکھنی ہے تو ہم سے سیکھو" لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ زرداری صاحب تو سیاست کی الف بے میں اٹکے رہے اور میاں صاحب نے پورا سیاسی قاعدہ رٹ لیا۔ زرداری صاحب کے اِس "لوہار" نے

اپنے "مفاہمتی ہتھوڑے "کی ایک ہی ضرب سے پیپلز پارٹی کو اپنی مرضی کے قالب میں ڈھال کر "نکرے" لگا دیا اور یہ سچ ثابت کر دکھایا کہ "سو سُنار کی، ایک لوہار کی"۔اب زرداری صاحب کو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ پیپلز پارٹی کسی بین الاقوامی سازش کا نہیں بلکہ اُن کی "وعدہ خلاف سیاست "کا شکار ہوئی ہے۔زرداری صاحب خود تو خیر کبھی پارٹی کی جان نہیں چھوڑیں گے لیکن پیپلز پارٹی اگر کسی نہ کسی صورت میں اپنے وجود کو برقرار رکھنا چاہتی ہے تو اسے بہرحال "خاندانِ زرداریہ" سے پیچھا چھڑانا ہوگا۔

میاں صاحب کی اسی مفاہمتی پالیسی کے زیرِ اثر چوہدری نثار صاحب نے اسمبلی میں محترم عمران خاں صاحب کے غبارے سے ہوا نکال دی۔خاں صاحب نے قومی اسمبلی میں حلف اٹھانے کے بعد انہی باتوں کا ورد شروع کر دیا جنھیں سُن سُن کر کان پک چکے ہیں۔جواباً طرّار چوہدری نثار صاحب نے فرمایا کہ عمران خاں کی تقریر ایک اپوزیشن لیڈر کی نہیں بلکہ ایک انتہائی محبِّ وطن پاکستانی کی تقریر تھی اور ہم اُن کی ہر بات کی تائید کرتے ہیں۔اُنھوں نے کہا کہ خاں صاحب چار نہیں چالیس سیٹوں پر دھاندلی کے خلاف کوئی کمشن بنالیں ہم اُن کا بھرپور ساتھ دیں گے۔اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ جناب فخرالدین جی ابراہیم کا نام عمران خاں صاحب کی طرف سے ہی آیا تھا۔اِس کے باوجود بھی خاں صاحب انتخابی اصلاحات کا نیا مسودہ لے آئیں، ہم اُن کا بھرپور ساتھ

دیں گے۔چوہدری نثار صاحب کی تقریر کے دوران تحریکِ انصاف کے اراکینِ اسمبلی متواتر ڈیسک بجا کر اُنہیں داد دیتے رہے اور عمران خاں صاحب کو مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ چوہدری نثار کی تقریر سُن کر مجھے خوف آنے لگا ہے کہ کہیں لوگ ہمیں بھی "فرینڈلی اپوزیشن" نہ سمجھ بیٹھیں۔چوہدری نثار کا تدبر یہ تھا کہ

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی میرے تسلیم، سِپر کی صورت

وگرنہ اپوزیشن تو بڑی شدّت سے خاں صاحب کی صحت یابی کا انتظار کر رہی تھی اور خیال یہی تھا کہ کپتان کے آتے ہی ماحول گرم ہو جائے گا اور" سونامیے" اسمبلی کو بہا لے جائیں گے۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کئی دنوں سے بغلیں بجانے کی پریکٹس کر رہی تھی لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شُدی" نہ صرف یہ کہ ہوا کچھ بھی نہیں بلکہ اُلٹا تحریکیوں" نے چوہدری نثار کی تقریر پر ڈیسک بجا بجا کر اپنے ہاتھ سُرخ کر لیے۔اب" بااصول کپتان" کو چاہیے کہ تمام ڈیسک بجانے والوں کی جواب طلبی کرتے ہوئے" اُنہیں قوم سے معافی مانگنے کا حکم صادر فرمائیں کہ جب تحریکِ انصاف کا صدر معافی مانگ سکتا ہے تو یہ کس کھیت کی مولی گاجر ہیں۔پھر انٹرنیٹ پہ بیٹھے "سونامیوں" کو خوش بھی تو کرنا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ نواز لیگ کے اِس مفاہمتی رویے سے صرف پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم ہی نہیں، میں خود بھی بہت دُکھی اور پریشان ہوں۔ بھاڑ میں جھونکنا ہے ایسی جمہوریت کو جس میں ہلّہ گُلّا ہو نہ شور شرابا، گالی گلوچ ہو نہ جوتم پیزار۔ ایسی "ٹھنڈی ٹھار" جمہوریت کے گولے بنا کر چوسنے کا ہمارا کوئی موڈ نہیں کیونکہ ہمیں تو اپنے کالموں کے لیے مواد چاہیے جو صرف گرما گرم "جمہوریت" میں ہی میسر آ سکتا ہے۔ اگر ایسی جمہوریت میسر نہ ہو تو پھر کیا ہم "سائیکل رکشوں" پر کالم لکھنا شروع کر دیں؟۔ یہی پریشانی ہمیں ہر پَل بے کَل رکھتی تھی، وہ تو اللہ بھلا کرے کپتان صاحب کا جنھوں نے عید الفطر کے بعد ملک گیر تحریک اُٹھانے کا اعلان کر کے ہمارا فشارِ خون بلند کرنے کی کچھ سبیل کی۔ اب ہم ایک ایک دِن انگلیوں پر گِن کر گزار رہے ہیں اور ہماری عید تو تب ہو گی جب "کپتان صاحب" کا سونامی پورے ملک میں ٹھاٹھیں مارتا پھرے گا۔ اِس سونامی کی لپیٹ میں تو بہت پہلے سبھی آ جاتے لیکن ایک تو خاں صاحب ناگہانی حادثے کے سبب بستر سے لگ گئے اور دوسرے خاں صاحب انتخابات سے پہلے دو، تین ہفتوں میں "نو بال پہ نو بال" پھینکتے چلے گئے اور نواز لیگ چھکّے پہ چھکّا مارتی چلی گئی۔ اتنی غلطیوں کے باوجود دبنگ کپتان اب بھی یہی کہتے ہیں کہ "پکچر ابھی باقی ہے میرے دوست!"۔ کم از کم اِس معاملے میں تو ہم بھی اُن کے ہمنوا ہیں کیونکہ اِس میں ہمارا بھی بھلا ہے اور انٹرنیٹ کے "سیاسی

نو مولودوں "کا بھی، جو سونامی کے انتظار میں سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔ سونامیے تو سرے سے تسلیم کر ہی نہیں سکتے کہ اُن کے قائد کا فرمان غلط بھی ہو سکتا ہے۔جب قائد نے ٹی وی اینکر کو یہ لکھ کر دے دیا اور اپنے بچوں کو یہ تک کہہ دیا کہ اب تم سے میری اگلی ملاقات بطور وزیرِ اعظم پاکستان ہو گی تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اُن کے خوابوں کو چکنا چور ہونے دیا جائے ؟۔ سو یہ طے ہوا کہ چوہدری نثار لاکھ مفاہمت کی بات کریں اور میاں صاحب بھلے شوکت خانم میں عیادت کے لیے جاتے پھریں، "سونامیے" عمران خاں کی وزارتِ عظمیٰ سے کم پر کوئی سمجھوتا کرنے پر تیار نہیں ۔اگر کوئی سمجھتا ہے کہ تحریکِ انصاف نواز لیگ کی مفاہمتی پالیسی کے جھانسے میں آ جائے گی تو وہ بوڑھے ، بیمار جاوید ہاشمی سے عبرت پکڑے جس نے مفاہمت کے اصولوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میاں نواز شریف صاحب کو اپنا لیڈر کہہ دیا اور پھر سوشل میڈیا پر وہ طوفانِ بد تمیزی اُٹھا کہ باغی" کو ٹی وی پر آ کر یہ کہنا پڑا "بغاوت چھوڑ دی میں نے "۔ویسے جاوید ہاشمی" صاحب کو "کپتان" کے دربار ییں بطور مجرم حاضری دیتے وقت میاں نواز شریف صاحب تو ضرور یاد آئے ہونگے جو آگے بڑھ کر اُن کی گاڑی کا دروازہ کھولا کرتے تھے۔

تاریخی واردات

ویسے تو گزشتہ دَورِ حکومت کا ایک ایک دن پیپلز پارٹی کے لیے "ہر روز روز عید است ، ہر شب شبِ برات" کی عملی تصویر تھا لیکن سوئس کیسز میں زرداری حکومت نے اعلیٰ عدلیہ کے ساتھ جو "ہتھ" کیا اسے تو سُن کر ہر کوئی عش عش کر اُٹھا۔کچھ معتبر کالم نگار اسے "شرمناک واردات" قرار دیتے ہیں لیکن ہم تو اِس ذہانت ، فطانت ، چالاکی اور ہوشیاری پر مزے لے رہے ہیں۔سکول کے زمانے سے ہم "آنکھوں میں دھول جھونکنا" جیسا فضول محاوہ سُنتے چلے آ رہے تھے لیکن اس کے لغوی ، حقیقی یا مجازی معنی کبھی سمجھ میں نہیں آئے۔جب بھی ٹیچر نے اِس محاورے کو جملے میں استعمال کرنے کا حکم صادر فرمایا ہم نے ہمیشہ غلط استعمال پر ٹیچر سے پھینٹی ہی کھائی۔ پھینٹی کے بعد بھی ٹیچر نے نہ کبھی اس محاورے کا جملہ بنا کر دکھایا اور نہ ہی ہم نے پوچھنے کی ہمت کی کیونکہ سوال کرنے والے بچے ٹیچر کو زہر لگتے اور ہمیشہ بُرے انجام سے دوچار ہوتے ۔ہم چونکہ ذرا محتاط واقع ہوئے تھے اس لیے پھینٹی کے بعد حفظِ ما تقدم کے طور پر "زباں بندی" میں ہی عافیت سمجھتے رہے ۔اب ہمیں رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ کاش اُس زمانے میں بھی زرداری صاحب ہی کی حکومت ہوتی اور ہم ٹھک سے یہ کہہ کر "زرداری اور حواری اعلیٰ عدلیہ کی

آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب ہو گئے" ٹیچر کو لاجواب کر دیتے اور چھیتّی سے بچ جاتے ۔ بہرحال اب تو صرف کفِ افسوس ہی ملا جا سکتا ہے البتہ تا حال ہم اِس واردات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جس سے سکول کے زمانے میں پڑنے والی چھیتّی کی کوفت اور ندامت کچھ کم کم محسوس ہونے لگی ہے۔

ویسے کیا بات ہے "لفظی جادوگر" فاروق ایچ نائیک صاحب کی اِس تازہ واردات کی جس نے سپریم کورٹ کو بھی ہلا کر رکھ دیا کیونکہ ہمہ مقتدر اعلیٰ عدلیہ اپنے ساتھ ایسی کسی واردات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی ۔ اب "بڑے منصف صاحب" اپنے ساتھیوں سمیت شدید جھلاہٹ اور تلملاہٹ کا شکار ہو کر خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے ہیں ۔اُن کی تلملاہٹ کو دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نائیک صاحب نے اُن کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونکی بلکہ مرچیں ڈال دی ہیں۔یقیناً زرداری صاحب اور اُن کے حواری کل کلاں یہ کہتے نظر آئیں گے کہ "اُچی تھانویں نیو لگیا ،بڑی مصیبت بھاری" لیکن ہم خوش ہیں کہ ہمارے عظیم صدر صاحب نے عظیم ترین واردات کرکے فراڈیوں کی تاریخ میں اپنا نام سب سے اوپر لکھوا لیا۔اب ہم بھی اپنی گردنوں میں "سریا" ڈال کر بڑے فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ

"ہم سا ہو تو سامنے آئے"

آستانہ نواز لیگ کے مریدِ خاص ، وزیرِ اعظم کے دِل کے بہت قریب ، معتبر کالم نویس کہ جن کی خوبصورت نثر پڑھ کر ہمیں ہمیشہ مولانا محمد حسین آزاد یاد آ جاتے ہیں ، وہ فرماتے ہیں "کیا اکیسویں صدی کی کسی بے ننگ و نام ریاست میں بھی ایسی حیا باختہ واردات کا تصور کیا جا سکتا ہے ۔۔۔ حیف ہے وہ ریاست جس کے حکمران وارداتیے بَن جائیں" ۔پتہ نہیں محترم لکھاری کے نزدیک بے ننگ و نام ریاست کا تصور کیا ہے۔ جس ملک کا خزانہ خالی ہو اور اُس کے سرمایہ داروں کا کھربوں ڈالر بیرونی ممالک کے بینکوں میں پڑا گَل سَڑ رہا ہو ، جو چودہ ہزار ارب کا مقروض ہو ، جہاں پانچ سالوں میں پندرہ ہزار ارب کرپشن کے مگر مچھوں کے پیٹ میں جا چکا ہو، جہاں ہر روز خود کش حملے اور بم دھماکے ہوں ، جہاں ٹارگٹ کلر اور بھتہ خور سرِ عام دندناتے پھرتے ہوں اور جس ملک کی اپنی کوئی خارجہ پالیسی ہو نہ داخلہ ، وہ ریاست بھی اگر بے ننگ و نام نہیں تو پھر لغت سے لفظ "بے ننگ و نام" ویسے ہی نکال دینا چاہیے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں اور اسی پر فخر بھی کرتے ہیں کہ بے ننگ و نام ریاستوں کی فہرست میں صرف ہم ہی "گولڈ میڈل" کے حق دار ہیں اور ہماری جمہوریت کا تو حُسن ہی یہی ہے کہ ہم چُن چُن کر وارداتیوں کو مسندِ اقتدار پر بٹھائیں۔ مجھے حیرت بھی ہوتی ہے اور غصّہ بھی آتا ہے کہ ہم چھ کروڑ ڈالروں جیسی حقیر رقم کے لیے "ایویں خوامخواہ" زرداری صاحب کے پیچھے لَٹھ لے کر دَوڑ رہے ہیں حالانکہ زرداری صاحب نے پچھلے پانچ سالوں میں کرپشن کے "ایسے" بچّے جمورے

پیدا کیے ہیں جن کی وارداتوں کو دیکھ کر بعض اوقات خود زرداری صاحب بھی حیران رہ جاتے ہیں ۔ پچھلے پانچ سالوں میں یہ بچّے جمورے قوم کا پندرہ ہزار ارب ڈکار گئے ۔ ثبوت موجود ہیں اور یہ جمورے بھی زندہ وتابندہ لیکن مجال ہے جو کوئی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے ۔ محترم وزیرِ اعظم صاحب کا ٹارگٹ معیشت کی بحالی اور لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ ہے ۔اللہ اُنہیں اُن کے مقصد میں کامیاب کرے کہ اسی میں ملک و قوم کی بہتری مضمر ہے۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا وہ قوم سے کیا ہوا وعدہ ایفا کر رہے ہیں ؟۔جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میاں صاحب کے برادرِ خورد اور پنجاب کے خادمِ اعلیٰ اپنی "جذباتی انگشتِ شہادت" لہرا لہرا کر قوم کو یہ یقین دلاتے رہے کہ نواز لیگ کرپشن کی ایک ایک پائی وصول کرے گی اور وارداتیوں کو چوراہوں میں اُلٹا لٹکائے گی۔خود وزیرِ اعظم صاحب متعدد بار اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں ۔شاید اسی لیے قوم نے دعا کے ساتھ دوا کا بندوبست بھی کیا لیکن مسندِ اقتدار پہ جلوہ افروز ہونے کے بعد سے لے کر اب تک اُن کی زبان سے کرپشن کے مگر مچھوں کے بارے میں ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا۔اگر وہ اپنی ساری توجہ لوٹا ہوا مال اگلوانے میں صرف کر دیتے تو خالی خزانہ بھی بھر جاتا ، قرضوں کے بوجھ تلے دبی سسکتی معیشت میں بھی کچھ جان آ جاتی ، لوڈ شیڈنگ کا بندوبست بھی ہو جاتا اور بیرونی سرمایہ کاروں کا اعتماد بھی بحال ہو جاتا۔اگر فی الحال وارداتیوں پر ہاتھ نہ ڈالنا اُن کی "مفاہمتی پالیسی" کا حصّہ ہے تو قوم کو یہ منظور

نہیں۔اُنہیں یاد رکھنا چاہیے کہ قوم کے جذبات کا لاوا کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے جو سب کچھ بہالے جائے گا۔جَلاوطنی سے واپسی کے بعد ایک دفعہ بڑے میاں صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا "لوگ کہتے تھے کہ قدم بڑھاؤ نواز شریف ، ہم تمہارے ساتھ ہیں لیکن جب میں نے قدم بڑھایا تو سبھی بھاگ گئے"۔وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ میاں صاحب اب اگران وارداتیوں پر ہاتھ ڈالیں تو پوری قوم اُن کا بھرپور ساتھ دے گی کیونکہ روٹی ، کپڑا اور مکان جیسے دِل خوش کُن نعروں کی ڈسی ہوئی قوم نے اُنہیں مینڈیٹ ہی کرپشن کے خاتمے کا دیا ہے۔

وطنِ عزیز میں تعلیمی انحطاط

گھریلو مصروفیات کی بنا پر میں عموماً تقریبات میں شمولیت سے گریز ہی کرتی ہوں لیکن "غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ" کے اربابِ اختیار نے اتنے اصرار اور تکرار سے مدعو کیا کہ انکار کی گنجائش ہی باقی نہ بچی۔ تقریب میں جا کر مجھے احساس ہوا کہ اگر نیت میں خلوص اور عزم صمیم ہو تو انسان مالی مشکلات کے باوجود، کشکولِ گدائی تھامے بغیر بھی محیر العقول کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔ میری چونکہ ساری زندگی دشتِ درس وتدریس کی سیاحی میں گزری ہے اِس لیے بطور معلم تدریسی عمل میں میری دلچسپی فطری امر ہے۔ لیکن اِس سے بھی بڑھ کر دینِ مبیں میں علم کی اہمیت پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ میرے خیال میں حصولِ علم ہر مسلم مرد وزن کا فرضِ عین ہے اور تکمیلِ دیں تحصیلِ علم کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

فُرقانِ حمید میں درج کر دیا گیا کہ رَب کو جاننے والے اُس کے عالم بندے ہیں۔ میرے آقا کا فرمان ہے کہ ایک عالم ہزار عابدوں سے زیادہ وقیع ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے متعلق حضرتِ قائدِ اعظم نے زور دے کر فرمایا "ہمیں ایک ایسا زمین کا ٹکڑا درکار ہے جسے ہم اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکیں"۔ وہ قطعہ زمیں تو ربِّ کردگار نے ہمیں پاکستان کی صورت میں عطا کر

دیا لیکن بد قسمتی سے اِس "اسلامی تجربہ گاہ" میں ہر حکومت نے کم ترین توجہ تعلیم و تعلم پر ہی دی۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں تشنگیٔ علم گھٹنے گھٹتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔دور دراز دیہاتوں اور قصبوں کا تو بُرا حال ہے ہی لیکن شہروں میں بھی بیشمار بچے سکول جانے کی بجائے محنت مزدوری کرتے نظر آتے ہیں۔آج بھی پانچ سے سولہ سال تک کی عمر کے اڑھائی کروڑ بچوں کی تعلیم اربابِ اختیار کوئی توجہ نہیں دے رہے۔علم سے بیزاری کا یہ عالم ہے کہ ہماری رہبری کا دعویٰ کرنے والے جعلی ڈگریوں کا سہارا لے کر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچے اور پکڑے جانے پر آجکل عدالتوں میں پیشیاں بھگت رہے ہیں لیکن کسی جعلساز کی پیشانی عرقِ ندامت سے تَر دکھائی نہیں دیتی۔

سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی صاحب نے "پڑھا لکھا پنجاب" کا سیاسی نعرہ تو لگا دیا لیکن عملی طور پر ہوا کچھ بھی نہیں۔ہمارے خادمِ اعلیٰ صاحب نے دور دراز علاقوں میں خطیر رقم صرف کرکے دانش سکولوں کا اجراء کیا جن میں صرف غریب اور نادار بچوں کو جدید تقاضوں کے مطابق مفت تعلیم دی جاتی ہے۔یہ اقدام یقیناً لائقِ تحسین ہے، لیکن اگراِن دانش سکولوں پر صرف کی جانے والی رقم پہلے سے موجود گورنمنٹ سکولوں کی حالتِ زار بہتر بنانے میں صرف کی جاتی تو کیا دانش سکولوں سے کہیں بہتر نتائج برآمد نہ ہوتے؟۔شاید خادمِ اعلیٰ یہ سمجھتے ہوں کہ مفلس و نادار بچے صرف دور دراز علاقوں میں ہی

پائے جاتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جتنے بچوں کو اِن دانش سکولوں میں تعلیم دی جا رہی ہے اُس سے ہزار گُنا زیادہ ایسے بچے تو شاید صرف لاہور ہی میں مِل جائیں جن کے نانِ جویں کو ترستے والدین اُنہیں اعلیٰ پائے کے پرائیویٹ سکولوں میں داخل کروانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں میں ناقص معیارِ تعلیم سے بددِل ہو کر والدین نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کا رُخ کیا جس کی بنا پر تعلیم دھندا بن کے رہ گئی۔ اب یہاں علم فروشی کا یہ عالم ہے کہ گلی گلی ایسے پرائیویٹ تعلیمی ادارے کھُل چکے ہیں جِن کے ہاتھوں بچوں کا تعلیمی مستقبل برباد ہو رہا ہے۔ ایسے ہی ایک تعلیمی ادارے میں ، مَیں نے دسویں کلاس کو پڑھانے والے ایک اُستاد سے اُس کی تعلیمی استعداد کے بارے میں پوچھا تو اُس نے جواب دیا کہ وہ میٹرک کا امتحان دے رہا ہے۔ میں نے حیرت سے کہا کہ آپ تو خود میٹرک کو پڑھا رہے ہیں۔ اِس سے پہلے کہ ٹیچر جواب دیتا ، ادارے کے پرنسپل صاحب بول اُٹھے "دراصل ٹیچر میٹرک کے طلباء کو صرف وہی مضامین پڑھا رہا ہے جو وہ پاس کر چکا ہے"۔۔۔۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ شہروں میں ایسے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی بھرمار ہے لیکن حکومت نے اِن کے سدِّ باب پر کبھی توجہ نہیں دی۔

رہی معروف پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی بات تو اُن کی فیس، غریب تو رہے ایک طرف مڈل کلاس طبقے کی پہنچ سے بھی باہر ہے۔ یکساں نظامِ تعلیم کا شور سبھی ،

مچاتے ہیں لیکن کسی حکومت نے یکساں نظامِ تعلیم کے لیے کبھی کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ایسے اداروں کے مالکان ہمیشہ حکومتوں کے دست و بازو بن کر رہتے ہیں اور اکثر اسمبلیوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اِس تعلیمی انحطاط میں اگر کوئی شخص ، ادارہ یا این جی او خلوصِ نیت سے تعلیم و تعلم کی بہتری کے لیے کوشاں ہو تو اُس کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے روح رواں وقاص انجم جعفری اور اُن کے رفقائے کار بحر علم کے موتی چُن چُن کر پورے پاکستان کے ایسے علاقوں اور ایسے بچوں پر نچھاور کر رہے ہیں جہاں جہالتیں سایہ فگن تھیں۔اِس ٹرسٹ نے پنجاب ، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ کے ایسے دور دراز علاقوں کا انتخاب کیا جہاں آج بھی رابطہ سڑکوں کی بجائے بَل کھاتی کچی پگڈنڈیاں ہیں۔ٹرسٹ کو دور دراز دیہاتوں میں جہاں مناسب عمارت نہیں ملی ، وہاں کچے مکانوں میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ء سے جہدِ مسلسل میں مصروف یہ لوگ لائقِ تحسین ہیں جنہوں نے اپنی شبانہ روز1996 کاوشوں سے لگ بھگ ساڑھے تین سو سکول قائم کیے اور آج پچاس ہزار بچے وہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن کی غالب اکثریت مفت تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ پاکستان کے پسماندہ علاقوں میں بچوں کو اعلیٰ معیارِ تعلیم اور دینی بنیادوں پر ذہن سازی کرنے والا سب سے۔ٹرانیٹ ورک ہے جس کی سب سے۔بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ٹرسٹ خصوصی بچوں کو نارمل بچوں کے ساتھ زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہا ہے جو میرے خیال میں خصوصی بچوں کی نشوونما کا موثر ترین ذریعہ ہے۔جہالت کے اندھیروں میں علم کی شمعیں روشن کرنے والے اِس ٹرسٹ کی کارکردگی اِس مختصر سے کالم میں سموئی نہیں جا سکتی لیکن یہ طے ہے کہ اگر اسی مشنری جذبے سے آراستہ غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ جیسے ادارے قائم ہوتے رہے اور مخیّر حضرات اُن کی سرپرستی بھی فرماتے رہے تو وطنِ عزیز میں جہالت کے اندھیروں کو انتہائی سرعت سے دور کیا جا سکتا ہے۔دِل سے دُعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے اکابرین کے عزم کو جواں رکھے۔میں مخیّر حضرات سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ دِل کھول کر نادار بچوں کی تعلیم کے لیے مالی معاونت فرمائیں۔

ماہِ صیام اور لوڈ شیڈنگ

رحمتوں ،برکتوں اور مغفرتوں کے ماہِ مقدس کی آمد کا اہتمام ہم نے یوں کیا کہ اپنے میاں سے لڑ جھگڑ کر پاک چین دوستی کی علامت کے طور پر ایک ننّھا مُنّا جنریٹر خرید کر خُدا کا شکر ادا کیا کہ اب ایک تو لوڈ شیڈنگ کی ایسی تیسی کی جا سکے گی اور دوسرے ہمارا شمار بھی اشرافیہ میں ہونے لگے گا لیکن جنریٹر خریدتے وقت ہم یہ بھول بیٹھے کہ جب چین سے خریدے گئے ساٹھ ریلوے انجنوں میں سے کسی ایک نے بھی ریل کی پٹری پر دَوڑنے سے انکار کر دیا تھا تو پھر بھلا ہمارا ننّھا مُنّا سا جنریٹر کیسے سٹارٹ ہو سکتا ہے ۔طویل تگ و دو اور مکینکوں کی ٹامک ٹائیوں کے باوجود بھی جب ہم جنریٹر میں روح پھونکنے میں ناکام رہے تو ہم اُسے جنریٹر فروش کے پاس لے گئے لیکن اُس ضمیر فروش نے بھی مُنہ ٹیڑھا کرکے کہا ’’یہ چائینہ کا مال ہے ۔اِس کی کوئی گارنٹی ہے نہ واپسی‘‘۔ بعد از خرابیٔ بسیار اب ہم نے اپنے ’’نویں نکور‘‘ اور چمکیلے بھڑکیلے جنریٹر کو گیراج میں ایسی جگہ سجا کر رکھ دیا ہے جہاں ہر کسی کی نظر پڑے اور ہر کوئی ہمارے اشرافیہ میں سے ہونے کا یقین کر لے ۔ہمارا جنریٹر تو نہیں چلا لیکن شکر ہے کہ ’’رند کے رِند رہے ، ہاتھ سے جنت نہ گئی‘‘ کے مصداق ہم اپنے روزوں میں ملاوٹ سے بچ گئے ۔اب ہم بھی قرونِ اولیٰ کے سے مسلمانوں جیسے روزے رکھ کر

ثواب سمیٹیں گے۔ وہ لوگ اپنے روزوں میں ایئر کنڈیشنر اور پنکھوں جیسی نامعقول چیزوں کی ملاوٹ نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس زمانے میں بجلی تھی ہی نہیں۔

اِس ماہِ مبارک کی فضیلتوں کا بیان احاطۂ تحریر میں لانا ممکنات میں سے نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ انسان خلوصِ نیت سے روزے رکھے۔ شدید ترین گرمی اور حبس میں روزہ رکھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ ہم شکر گزار ہیں حاکمانِ وقت کے جنھوں نے ماہِ صیام کی فضیلتوں کو بڑھانے کے لیے لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ اتنا بڑھا دیا کہ اب بجلی کسی حسینۂ دلربا کی طرح کبھی کبھار چلمن پہ آ کے نظارہ کرواتی ہے اور جونہی وہ جھلک دکھلاتی ہے پوری قوم گنگنانے لگتی ہے

کس نے چلمن سے مارا نظارہ مجھے

حکومتِ وقت خوب جانتی ہے کہ ہم پاکستانی سیاست سے ثقافت تک ہر شَے میں ملاوٹ کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اس لیے حاکمانِ وقت نے یہ مناسب جانا کہ جو کچھ اُن کے اختیار میں ہے کم از کم اُس میں ملاوٹ نہ ہونے دی جائے۔ اِسی لیے مہربانوں نے لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ بڑھا کر قوم کو قرونِ اولیٰ کے سے خالص روزوں سے روشناس کر ایا۔ حکومت نے تو یہ سب کچھ قوم کی بہتری، بھلائی اور عاقبت سنوارنے کے لیے کیا لیکن کچھ بد باطن ایویں

خوامخواہ قوم کو بھڑکا کے سڑکوں پہ لانے کی سعی کر رہے ہیں۔ ایسے عاقبت نا اندیش لوگوں کو کم از کم ماہِ صیام کا تو کچھ احترام کرنا چاہیے لیکن اِن لوگوں کے پاس گھڑا گھڑایا جواز یہ ہے کہ اشرافیہ کے محل تو اب بھی روشن ہیں اور وہ اپنے ٹھنڈے ٹھار کمروں میں (پتہ نہیں روزے رکھ کر یا روزوں سے ڈر کر) گھُسے رہتے ہیں، یہ لوڈ شیڈنگ تو صرف غریب غربا پہ ہی وارد ہوتی۔ اب ہم نے بھی طے کر لیا ہے کہ ''کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے''۔

ہم تو ماہِ رمضان کی برکتیں اور رحمتیں سمیٹ ہی رہے ہیں لیکن کمزوریٔ ایماں میں مبتلاء اِس قوم کو کون سمجھائے جو ہر روز سڑکوں پر نکل کر ہاہاکار مچاتی نظر آتی ہے۔ ہمارے پانی بجلی کے وزیرِ محترم خواجہ آصف سیالکوٹی ہر روز ٹی وی پر آ کر قوم کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ قوم نے پیپلز پارٹی کی حکومت کو پانچ سال تک بھگت لیا لیکن اُنہیں تو حکومت سنبھالے صرف 45 دِن ہی ہوئے ہیں۔ محترم خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ اُن سے کہیں زیادہ عقلمند تو ''راجہ رینٹل'' نکلے جنہوں نے چھ ماہ کا جھانسا دے کر پوری قوم کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا دیا اور خود عیش سے پانچ سال پورے کر لیے جبکہ خواجہ صاحب نے پہلے دِن ہی حفظِ ما تقدم کے طور پر تین سال کے عرصے میں لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کا اعلان فرما دیا جو قوم نے رَد کر دیا کیونکہ اُس کے خیال میں تو میاں برادران کے پاس ایسا بوتل کا جن ہے جو پلک

جھپکتے ہی لوڈشیڈنگ کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ پھر خواجہ صاحب نے ماہِ رمضان میں پانچ گھنٹے لوڈشیڈنگ کی کمی کا دل خوش کُن اعلان فرمایا جس پر تا حال کسی بھی جگہ عمل درآمد نہیں ہو سکا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ محترم خواجہ آصف صاحب نے شاید تین سال کا وقت میاں شہباز شریف صاحب سے پوچھ کر نہیں دیا کیونکہ میاں صاحب تو انتخابات سے پہلے یہ کہہ چکے ہیں کہ اگر دو سال میں لوڈشیڈنگ کا خاتمہ نہ کر دوں تو میرا نام بدل دیں۔ ہو سکتا ہے تین سالہ مدت دیتے وقت خواجہ صاحب نے میاں صاحب کا کوئی اچھّا سا نام بھی سوچ رکھا ہو۔

اُدھر ہمارے پیارے میاں برادران ڈھیروں ڈھیر ''بیلٹ'' حاصل کرنے کے بعد ''بُلٹ'' کے چکر میں پڑ گئے۔ شنید ہے کہ حکومت اپنی اولین فُرصت میں کراچی میں بُلٹ ٹرین چلانے کا منصوبہ مکمل کرنے جا رہی ہے۔ سوال مگر یہ ہے کہ اگر بُلٹ ٹرین کو چلانے کے لیے بجلی ہی میسر نہ ہوئی تو کیا اُس ٹرین کو دھکے لگا کر ایک سٹیشن سے دوسرے سٹیشن تک لے جایا جائے گا؟۔ شاید حکومت نے پہلے سے ہی یہ منصوبہ بندی کر رکھی ہو کہ اگر بجلی میسر نہ ہوئی تو بُلٹ ٹرین کو دھکا لگانے کے لیے بیروزگار بھرتی کیے جائیں جس سے '' ایک پنتھ دو کاج'' کے مصداق ٹرین بھی چل پڑے گی اور بے روزگاری کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ یہی فارمولا اگر ریلوے کے وزیر خواجہ سعد رفیق صاحب بھی استعمال کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو پاکستان میں کوئی بے روزگار ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔

چھوٹے میاں صاحب المعروف خادمِ اعلیٰ پنجاب ،راولپنڈی ، فیصل آباد اور ملتان میں بھی ''ریپڈ بس'' چلانے کی تگ و دو میں ہیں۔اُنھوں نے ہتھیلی پہ سرسوں جماتے ہوئے محض گیارہ ماہ میں فیروز پور روڈ کو ''بھول بھلیوں'' میں بدل دیا۔ مجھے پچھلے دنوں انارکلی جانے کا اتفاق ہوا۔واپسی پر میں نے واپڈا ٹاؤن جانے کے لیے فیروز پور روڈ کا راستہ اختیار کیا۔لیکن ہوا یہ کہ میں فیروز پور روڈ کی بھول بھلیوں میں ایسی گم ہوئی کہ واپڈا ٹاؤن کی بجائے ''گجومتہ'' جا پہنچی۔ہمیں یقین ہے کہ ''زمیں جنبد نہ جنبد گُل محمد'' کے مصداق چھوٹے میاں صاحب پر ہم جیسوں کی گزارشات کا کچھ اثر نہیں ہو ، گا، پھر بھی کہے دیتے ہیں کہ جناب ! ریپڈ بس ضرور چلایئے لیکن اُن دیہاتوں اور قصبوں کا بھی کچھ خیال کر لیجئے جو مکمل طور پر اندھیروں میں ڈوب چکے ہیں۔یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اِس آس پر نواز لیگ کو ووٹ دیئے تھے کہ وہ اقتدار میں آ کر اُنہیں لوڈ شیڈنگ کے عذاب سے نجات دلائے گی۔ مانا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت اور اِس سے پہلے کی طویل آمریت نے ایسے گھمبیر مسائل کو جنم دیا ہے ، جنکے حل کے لیے ایک عرصہ درکار ہے لیکن اب قوم میں اتنا بھی صبر و قرار باقی نہیں کہ وہ مزید تین چار سال تک انتظار کر سکے۔ اللہ نہ کرے کہ یہ حکومت بھی ناکام ہو جائے کیونکہ اِس کے بعد تو محض گھور اندھیرے ہی باقی بچتے ہیں جو لاریب خونی انقلاب کی علامت ہوتے ہیں۔اپنے پچھلے پانچ سالہ

دَورِ اقتدار میں میاں شہباز شریف صاحب بار بار قوم کو خونی انقلاب سے ڈراتے رہے ہیں لیکن اب جبکہ وہ ہمہ مقتدر ہیں، وہ کوئی ایسا ''چمتکار'' کیوں نہیں دکھلاتے جو قوم کو اندھیروں سے اُجالوں میں لے آئے۔

میرے آئیڈیل سیاستدان

سیاستدانوں کی موجودہ کھیپ میں مجھے عمران خاں، شیخ رشید اور الطاف حسین ہی پسند ہیں باقی سب تو بس ''ایویں'' گزارا ہی ہیں۔اِنہیں پسند کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اِن کے خطاب سُن کر خون میں اتنا اُبال آتا ہے کہ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ دوسرے اِنھوں نے ہم جیسوں کے اندر میں بھی سیاسی جرثومے پیدا کر دیئے ہیں۔یہ جرثومے بھٹو مرحوم نے بھی جیالوں کے اندر پیدا کیے تھے لیکن اب یہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور نئے جرثوموں کے بارے میں ابھی تحقیق ہو رہی ہے کہ یہ ''بھٹوز'' کے پیدا کردہ ہیں یا ''زرداریز'' کے؟۔ اپنے آئیڈیلز کو دیکھ سُن کر ایک دفعہ تو میرا بھی جی چاہا کہ سیاسی پارٹی بنا لوں لیکن جب میرے میاں کو میری اِس '' عظیم سوچ'' کا پتہ چلا تو اُنھوں نے کہا'' تمہارے تو کالم بھی بعض اوقات تمہارے اخبار والے ڈکار جاتے ہیں اور تم چلی ہو سیاسی پارٹی بنانے'' ۔میاں کی جلی کَٹی سُن کر مجھے غصّہ تو بہت آیا لیکن پھر یہ سوچ کر خون کے گھونٹ پی لیے کہ ماہِ رمضان میں صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ بہر حال مجھے اب بھی یقین ہے کہ میں کم از کم ''عوامی لیگ'' جتنی بڑی ''نسوانی لیگ'' تو بنا ہی سکتی ہوں۔اِسی لیے میں نے سیاسی پارٹی کی تشکیل کا خواب دیکھنا نہیں چھوڑا۔ ویسے خواب دیکھنے میں ہرج ہی کیا ہے۔

آمدم بَر سرِ مطلب ، میں عرض کر رہی تھی کہ مجھے فقط تین سیاستدان ہی پسند ہیں ۔ویسے تو ذوالفقار مرزا اور مشاہد اللہ خاں بھی میرے پسندیدہ ہیں لیکن مرزا صاحب تو ویسے ہی سیاست سے دُم دبا کر بھاگ گئے اور مشاہد اللہ خاں ابھی کچے ہیں۔ وہ ٹاک شوز میں شیخ رشید بننے کی کوشش تو بہت کرتے ہیں لیکن ''کہاں گنگو تیلی ، کہاں راجہ بھوج''۔ شیخ صاحب تو براہِ راست میاں برادران سے ''متھا'' لگا کر بیٹھے ہیں۔ چند دِن پہلے ہی شیخ صاحب نے اپنی زبان کا ''گنڈاسا'' چلاتے ہوئے نواز لیگ کو کہا کہ وہ سیدھی ہو جائے ورنہ وہ لال حویلی اُٹھا کر پارلیمنٹ میں لے آئیں گے ۔تب سے اب تک میں یہی سوچ رہی ہوں کہ شیخ رشید صاحب اپنی ''لال حویلی'' رکھیں گے کہاں ؟اگر پارلیمنٹ کی چھت پر رکھ دی تو یقیناً چھت بیٹھ جائے گی اور اگر پارلیمنٹ کے پہلو میں سجا دی تو ''ریڈزون'' کا کِرچی کِرچی ہونا اظہر من الشمس ہے کیونکہ شیخ صاحب کی عوامی لیگ'' کے عوامی کارکُن وہاں ہمہ وقت دھما چوکڑی مچایا کریں گے ۔ لال حویلی'' کے پارلیمنٹ کے پہلو میں آنے سے پارلیمنٹیریز کو اتنا فائدہ ضرور ہو جائے گا کہ اُنہیں دہی بھلے ، فروٹ چاٹ اور سموسے پکوڑے وغیرہ پارلیمنٹ کے پہلو ہی سے مل جایا کریں گے البتہ '' ستّو'' نہیں ملیں گے کیونکہ اِس کا سٹاک اُنھوں نے اپنے بُرے وقتوں کے لیے سنبھال رکھا ہے۔شاید اُن کا خیال ہو کہ اگر (خُدانخواستہ) اُنہیں کبھی میاں نواز شریف صاحب کے

پاس جانا پڑ جائے تو وہ پہلے ''ستّو'' پی کر ٹھنڈے ٹھار ہو جائیں اور پھر ''نیویں نیویں'' ہو کر میاں صاحب کے دربار میں حاضری دے آئیں۔

عقیل و فہیم اور باصلاحیت شیخ صاحب سے کچھ عرصہ پہلے تک محترم عمران خاں سخت اوازار'' تھے اور قسمیں اٹھایا کرتے تھے کہ اُنہیں تادمِ مرگ شیخ رشید صاحب کی'' سنگت'' قبول نہیں لیکن جب اُنہیں شیخ صاحب میں اپنا ہی عکس نظر آیا تو اُنہوں نے'' ساری قسمیں بھول کر شیخ صاحب کو اپنے دل کے قریب کر لیا۔ دوسری طرف شیخ صاحب بھی ٹاک شوز میں کپتان صاحب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ خاں صاحب کے پاس تو''تانگے کی سواریاں'' بھی نہیں لیکن پھر سب کچھ ہَوا میں اُڑا کر وہ خاں صاحب کے تانگے میں سوار بھی ہو گئے کیونکہ اُنہیں ملک و قوم کی بہتری مقصود تھی۔کچھ بد باطن خاں صاحب کو ضدّی اور ہٹ دھرم کہتے ہیں ۔اگر وہ واقعی ایسے ہوتے تو کبھی بھی شیخ صاحب کو گلے نہ لگاتے۔وہ ضدّی اور ہٹ دھرم نہیں بلکہ بات کے سچّے اور قول کے پکّے ہیں۔البتہ کبھی کبھی وہ ملک و قوم کی خاطر عہد شکنی کر جاتے ہیں۔

ہم جہاں برطانیہ اور امریکہ کے انتہائی ممنون ہیں جنہوں نے اپنے حسنِ کرشمہ ساز کی بدولت ملالہ یوسف زئی کو بین الاقوامی شخصیت بنا دیا لیکن مغموم بھی ہیں کہ حکومتِ برطانیہ نے اپنے مخلص شہری اور ہمارے محبوب قائد جناب

الطاف حسین کے ساتھ ''ہتھ'' کر دیا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ الطاف بھائی کو امن کا نوبل انعام ملنے والا ہے لیکن اُنہیں قتل اور مَنی لانڈرنگ جیسے گھناؤنے جرائم میں ملوث کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تسلیم کہ ملالہ ناتراشیدہ ہیرا ہے جسے برطانیہ میں تراش خراش کرکے ہشت پہلو بنایا جا رہا ہے۔ ویسے تو تراش خراش کے لیے ہمارے پاس ایسی ڈھیروں ڈھیر ''ملالائیں'' ہیں لیکن انگریز کہتے ہیں کہ اگر وہ ساری ملالاؤں کو لے گئے اور اُن کے والدین کو ضیاء الدین یوسف زئی کی سی سہولتیں دینے لگے تو کچھ عرصہ بعد وہ خود پاکستان کے چوراہوں پر بھیک مانگتے نظر آئیں گے۔ ویسے بھی جب حصولِ مقصد کے لیے ایک ملالہ ہی کافی ہے تو پھر دوسری ملالاؤں پر ڈالر، پونڈ یا یورو صرف کرنے کی بجائے اُنہیں ڈرون حملوں کے ذریعے رزقِ خاک بنا دینے میں ہی مصلحت ہے۔

ملالہ تو بچی ہے جسے ''مدر ٹریسا'' بننے میں ابھی وقت لگے گا لیکن جس مرنجاں مرنج شخصیت کی صلاحیتوں سے حکومتِ برطانیہ فائدہ اٹھا سکتی تھی، اُسے کیوں ناراض کر دیا؟۔ سبھی جانتے ہیں کہ الطاف بھائی سے زیادہ نرم مزاج اور باغ و بہار شخصیت کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو اپنے ایک ہی خطاب میں تلاوت بھی کرتے ہیں، نعتیں بھی سُناتے ہیں، اور لہک لہک کر گانے بھی گاتے ہیں۔ ''اوئے جاگیر دارا!'' جیسی بڑھکیں تو وہ سامعین کو ''فریش'' رکھنے کے لیے لگاتے رہتے ہیں۔ لیکن اُن کی بڑھکوں کا غلط مطلب نکالتے ہوئے کپتان صاحب

نے اُن پر زہرہ شاہد کے قتل کا الزام لگا دیا۔ ہم تو ہمیشہ کپتان صاحب کو غائبانہ کہتے رہتے ہیں کہ ''پہلے تولو، پھر بولو'' لیکن وہ صرف بولتے ہیں، تولتے نہیں۔ اب ایم کیو ایم نے اُن پر پانچ ارب روپے کا ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کر دیا ہے۔ شُنید ہے کہ تحریکِ انصاف بھی ایم کیو ایم پر دس ارب کا دعویٰ کرنے جا رہی ہے لیکن جانتے دونوں ہی ہیں کہ پاکستان کی عدالتی تاریخ میں آج تک ایسے کسی دعوے کا کبھی فیصلہ نہیں ہوا۔ ایم کیو ایم کو چاہیے تھا کہ وہ بی بی سی کے خلاف دعویٰ دائر کرتی جس نے مَنی لانڈرنگ اور ڈاکٹر عمران خاں کے قتل کا شوشہ چھوڑا ہے۔ برطانوی عدالتیں تو ایسے دعووں کا ''فٹافٹ'' فیصلہ کر دیتی ہیں۔ کتنا مزہ آتا جب ایم کیو ایم کو بیٹھے بٹھائے پانچ ارب پاؤنڈ مل جاتے لیکن اکابرینِ ایم کیو ایم نے سوچا ہو گا کہ اگر انگریزوں نے کوئی چکر چلا کر اُنہیں ہی جھوٹا ثابت کر دیا تو پھر؟۔ شاید اسی لیے الطاف بھائی نے بی بی سی پر دعویٰ کرنے کی بجائے برطانوی حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یا تو وہ اپنی ''شرارتوں'' سے باز آ جائے یا پھر خطرناک نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ فی الحال تو برطانوی حکومت نے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ پولیس اور تفتیشی اداروں پر اُس کا کوئی کنٹرول نہیں لیکن شُنید ہے کہ ''اندر و اندری'' وہ پریشان اور خوف زدہ بہت ہے اور چپکے چُپکے کسی ایسی آئینی ترمیم کے چکر میں ہے جس کی بدولت تفتیشی ادارے اور پولیس اُس کے کنٹرول میں آ جائیں اور وہ الطاف بھائی کے

سامنے سُرخرو ہو سکیں۔

چلتے چلتے

انتہائی محترم چیف جسٹس آف پاکستان جناب افتخار محمد چوہدری نے عمران خاں توہین عدالت کیس میں ریمارکس دیتے ہوئے فرمایا ''روزانہ ہزاروں لوگ ہرزہ سرائی کرتے ہیں لیکن ہم اُس کا کوئی نوٹس نہیں لیتے لیکن عمران خاں صاحب چونکہ قدآور شخصیت ہیں اور اُن کے بیان کی اہمیت ہے اِس لیے اُنہیں عدالت میں طلب کیا گیا''۔ کپتان صاحب کے ثناخواں سینئر لکھاری تو عرصۂ دراز سے چیخ رہے تھے کہ خاں صاحب کے قد کاٹھ کا کوئی لیڈر قائدِ اعظم کے بعد پیدا ہی نہیں ہوااور خیال ہمارا بھی یہی تھا لیکن '' نون لیگیے'' مانتے تھے نہ ''پیپلیے'' ۔ شکر ہے کہ آج منصفِ اعلیٰ نے بھی خاں صاحب کو بڑا لیڈر تسلیم کرکے ہماری باتوں پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب اگر اُنہیں توہینِ عدالت پر جیل بھیج بھی دیا جائے تو کوئی غم نہیں کہ بڑے لیڈر جیلوں میں جایا ہی کرتے ہیں۔ چیف صاحب کے ارشادات سے پہلے ہم پریشان تھے کہ یہ ساری چھیڑ خوانی تو پیپلز پارٹی کے اکابرین نے کی اور عدلیہ کے خلاف کھُلم کھلا زہر اُگلا جبکہ خاں صاحب تو محض لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والوں میں سے تھے لیکن اب عقدہ یوں وا ہوا کہ سپریم کورٹ کے نزدیک اعتزاز احسن ، سیّد خورشید شاہ ، مخدوم امین فہیم اور رضا ربانی بھی اُن ہزاروں ہرزہ سرائی کرنے والوں میں شامل ہیں جن کا سپریم کورٹ

کوئی نوٹس نہیں لیتی ۔یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اعلیٰ عدلیہ نے یہ سوچا ہو کہ پیپلز پارٹی کے یہ جیالے تو نا قابلِ اصلاح ہیں اور خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اِس لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر کم از کم خاں صاحب کو تو بگڑنے سے بچایا جائے ۔شاید اسی لیے جناب جسٹس جواد ایس خواجہ نے فرمایا'' خاں صاحب بس لفظوں کا چناؤ درست کر لیں ''۔غالباً جسٹس خواجہ صاحب یہ کہنا چاہتے تھے کہ

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اِس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

ہم بھی چونکہ ہرزہ سرائی کرنے والے اُن ہزاروں لوگوں میں شامل ہیں جنہیں توہینِ عدالت کا کوئی خطرہ نہیں اِس لیے کہے دیتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں کیونکہ ''کپتان'' کی اسی ادا پر تو ہم جیسے ''سونامیے'' فدا ہیں۔اگر اُنھوں نے اپنا یہ دبنگ لہجہ چھوڑ دیا اور اپنے ''بلّے'' سے چھینٹی لگانے کے ارادے سے توبہ کر لی تو پھر ہم بھی مایوس ہو کر تحریکِ انصاف سے مُنہ موڑ لیں گے۔ جسٹس خواجہ صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''ہم تو شیشے میں بند تیرنے والی وہ مچھلیاں ہیں جِن پر سب کی انگلیاں اُٹھتی ہیں لیکن ہم جواب بھی نہیں دے سکتے ''۔اللہ رے ایسی بے بسی ۔۔۔۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ مچھلیاں ڈبے میں بند ہونے کے باوجود بھی اتنی طاقتور ہیں کہ ڈبے کے اندر تیرتی ،

اٹھکیلیاں کرتی بھی ایک وزیرِ اعظم کو گھر بھیج سکتی ہیں اور دوسرے وزیرِ اعظم کی جان بھی تب چھوٹتی ہے جب وہ اِن مچھلیوں کے آگے زانوئے تلمذ تہ کر دیتا ہے۔ انہی مچھلیوں کے ڈر سے کئی لوگ بیرونی ممالک کے کونوں کھدروں میں چھپے بیٹھے ہیں اور جو ہتھے چڑھ جاتا ہے اُسے یہی "مچھلیاں" مگرمچھ بن کر ڈکار بھی جاتی ہیں۔ اِن مچھلیوں کی اِس ادا پر تو پوری قوم فدا ہے۔ بخدا ہمیں اِن مچھلیوں سے بہت پیار ہے لیکن اِن کی آئینی طاقت کی خوفناکی سے ڈر بھی بہت لگتا ہے۔ اگر ہم ڈرتے نہ ہوتے تو برملا کہہ دیتے کہ ہمارے لیڈر نے کونسی ایسی قیامت ڈھادی تھی جو اُنہیں دھر لیا گیا۔ اگر دبنگ خاں صاحب نے کوئی غلط سلط بات کہی ہوتی تو وہ کبھی نہ کہتے کہ " جیل چلا جاؤں گا لیکن جھکوں گا، نہ معافی مانگوں گا اور ضرورت پڑی تو اعتزاز احسن کی پیش کش سے فائدہ اٹھاؤں گا"۔

سپریم کورٹ میں پیشی کے موقع پر خاں صاحب نے یہ باور کروانے کی کوشش بھی کی کہ وہ عدلیہ بحالی تحریک میں پورے " آٹھ دن "جیل میں رہے۔ بھولے بھالے خاں صاحب کو پتہ ہونا چاہیے کہ جب سپریم کورٹ نے اعتزاز احسن کی نظر بندی اور ڈرائیوری" کو بھی کوئی لفٹ نہیں کرائی تو پھر خاں صاحب کے " آٹھ دن " کس کھیت کی مولی ہیں۔ اعتزاز احسن کے اسی عدلیہ بحالی کے زعم نے یوسف رضا گیلانی کو گھر بھیجا اور اب عمران خاں اور حامد خاں کو بھی سرِ عام شرمندگی

اُٹھانی پڑ رہی ہے۔ اعلیٰ عدلیہ نے عدلیہ بحالی تحریک میں قربانیوں کی ''لازوال'' تاریخ رقم کرنے والے عمران خاں صاحب کے تحریری جواب کو مایوس کُن قرار دے کر مسترد کر دیا اور اٹھائیس اگست کو تفصیلی جواب داخل کرنے کا حکم صادر فرما دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ اعلیٰ عدلیہ تفصیلی جواب میں کسی ''معافی نامے'' کی توقع لگائے بیٹھی ہے لیکن ہمارے دبنگ کپتان صاحب ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔

دروغ بَر گردنِ راوی عدلیہ سے مایوس ہو کر اب محترم کپتان صاحب عنقریب ملتان کے ''گدی نشیں'' سے ملاقات کرنے والے ہیں تاکہ عدلیہ کے موڈ کے بارے میں اُن کی صلاحیتوں سے مستفید ہو سکیں۔ ہم دست بستہ عرض کریں گے کہ گدّی نشیں سے کہیں بہتر ''راجہ رینٹل'' ہیں کیونکہ راجہ صاحب نے معافی بھی نہیں مانگی اور اپنا دامن بھی صاف بچا گئے جبکہ گدّی نشیں چراغِ رُخ زیبا لے کر اب بھی اپنی وزارتِ عظمیٰ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ہم اپنے قائد کو یہ مفت مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ وہ اعتزاز صاحب کی باتوں میں آ کر
کہیں اُنہیں اپنا وکیل نہ کر بیٹھیں کیونکہ یہ اعتزاز صاحب ہی کی کرشمہ سازی تھی جس کی بدولت آج ملتان کا سیّد زادہ میر تقی میر کے شعر

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اِس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

کی عملی تصویر بنا نظر آتا ہے۔

کپتان صاحب کا معاملہ تو اٹھائیس اگست تک لٹک ہی گیا اِس لیے اسے یہیں چھوڑتے ہوئے اب ذرا صدارتی انتخاب پر بات ہو جائے۔ مسلم لیگ نواز کے ممنون حسین 432 ووٹ لے کر صدرِ مملکت بن گئے۔ جبکہ جسٹس (ر) وجیہہ الدین کے حصّے میں صرف 77 ووٹ آئے۔ صدارتی انتخاب کی تکمیل کے ساتھ ہی چیف الیکشن کمشنر فخرالدین جی ابراہیم المعروف "فخرو بھائی" مستعفی ہو کر گھر چلے گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ چیف الیکشن کمشنر صاحب نے اپنے ساتھیوں کے عدم تعاون کی بنا پر استعفیٰ دیا جبکہ ہم سمجھتے ہیں کہ فخرو بھائی "ایک دفعہ پھر مستعفی ہو کر گینز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام لکھوانا" چاہتے تھے۔ ہم نے تو بہت پہلے اپنے ایک کالم میں لکھ دیا تھا کہ فخرو بھائی کی صداقت، دیانت اور امانت پر کوئی اُنگلی نہیں اُٹھا سکتا لیکن اگر وہ بیچ منجھدار الیکشن کمشن کی کشتی کے پتوار چھوڑ کر گھر چلے گئے تو پھر۔۔۔؟ شکر ہے کہ اب کی بار وہ کم از کم الیکشن تو کروا گئے یہ الگ بات ہے کہ ہمارے قائد یہ کہتے ہیں کہ یہ پاکستان کی تاریخ کی عظیم ترین دھاندلی والے الیکشن تھے۔

محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں فرماتے ہیں "دودھ جلیبیاں بیچنے والے صدر بن گئے۔ ممنون حسین صاحب کی دودھ جلیبیوں اور دہی بھلّوں نے بڑے"

بڑوں کا ہاضمہ خراب کر دیا ہے۔وجہ شاید یہ ہے کہ ہمارے ہاں سوائے اشرافیہ کے اور کسی کو ایسے مناصب کا اہل سمجھا ہی نہیں جاتا۔ویسے بات تو دل کو لگتی ہے کہ کہاں کھرب پتی آصف زرداری صاحب اور کہاں سادہ و معصوم ممنون حسین، جنہیں محترم نواز شریف صاحب نے بیٹھے بٹھائے شناسائے محبت کرتے ہوئے وقفِ مصیبت کر دیا۔

یومِ آزادی کے تقاضے

برکتوں ، رحمتوں اور مغفرتوں کو اپنے جلو میں لیے ماہِ صیام آیا اور گزر گیا۔ خوش نصیبوں نے ربّ کی رحمتیں سمیٹیں اور بد نصیبوں کا دامن خالی رہا۔ الیکٹرانک میڈیا کے ہر چینل نے ماہِ رمضان کی مناسبت سے ایسے پروگرام مرتب کیے جن میں علمائے کرام کی ایمان افروز باتیں سُن کر یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے حضرتِ قائد نے ہمیں واقعی ایک ایسا قطعۂ زمین لے کر دیا جسے ہم اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکیں ۔ انٹرٹینمنٹ اور نیوز چینلز کے ماحول کی پاکیزگی قابلِ ستائش تھی اور حصولِ پاکستان کا مقصد ابھر کر سامنے آتا نظر آ رہا تھا۔

ماہِ صیام گزرا، شکرانے کی عید آئی اور ہر چینل نے عید کے پروگرام ایسے مرتب کیے کہ سب کچھ اُلٹ پلٹ کے رکھ دیا۔ دوپٹے اُتر گئے ، دین کی باتیں قصۂ پارینہ بن گئیں اور حمد و نعت کی جگہ ناچ گانے نے لے لی۔ تقریباً ہر چینل پر ’’بھانڈوں‘‘ کا قبضہ ، ہلّا گُلّا، شور شرابا ، ذو معنی جملے، ہزل گوئی ، جگت بازی اور ہلڑ بازی ۔ یہ بھی الیکٹرانک میڈیا کا تحفہ ہے جو اُس نے سارے سٹیج اداکاروں کو اپنے چینلوں کی زینت بنا کر قوم کے مجموعی اخلاق کو کینسر

زدہ کر دیا ہے۔اِس سے پہلے یہ لوگ محدود تھیڑوں میں پائے جاتے تھے لیکن اب گھر گھر تھیڑ سج گئے ہیں۔آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ قُربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ گھر گھر ناچ گانا ہو گا۔پچیس تیس سال پہلے تک انسانی سوچ بہر حال یہی ہو گی کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟۔لیکن اب الیکٹرانک میڈیا کی بدولت وہ سب کچھ سچ ثابت ہو گیا جو میرے آقا ﷺ کا فرمان تھا۔چینل پہ چینل بدلتے جایئے آپ کو ہر جگہ وہی کچھ نظر آئے گا جس کا دینِ مبیں سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا دینی علم تو واجبی سا ہے پھر بھی سوچوں کی یلغار یہی ہے کہ ماہِ صیام نے اِس قوم کے مجموعی مزاج پر کیا اثر چھوڑا ہے؟۔سوال یہ بھی ہے کہ کیا ہم نے اسی عہد کے ساتھ ربِّ لم یزل سے یہ قطعۂ زمین حاصل کیا تھا کہ ہم اِس میں اسلامی تہذیب و تمدن ، معاش و معاشرت اور ثقافت کو جَڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے؟۔

اب 14 اگست کی تیاریاں اپنے عروج پر ہیں۔ہم صرف یہی ایک دن بھرپور انداز میں منا کر اگلے ہی روز پھر اپنی اُنہی خباثتوں میں گم ہو جائیں گے جو ہماری نَس نَس میں سما چکی ہیں۔ہم یہ دن نہ تو قومی جذبے سے مناتے ہیں اور نہ ہی تجدیدِ عہد مقصد ہوتا ہے ۔سچ یہی ہے کہ اِس دن کی کشش محض اِس لیے ہے کہ ہم میلوں ٹھیلوں کے شوقین ہیں اور یہ دن ہمیں بھرپور تفریح مہیا کرتا ہے۔چودہ اگست کو ارضِ پاک میں ہر طرف یہ ترانہ گونجتا سنائی دے گا

یوں دی ہمیں آزادی کہ دُنیا ہوئی حیران
اے قائدِ اعظم تیرا احسان ہے، احسان

اُدھر روح قائد سب سے زیادہ بیقرار بھی 14 اگست کو ہی ہوتی ہے۔ مجھے تو روح قائد یہ سوال کرتی نظر آتی ہے کہ میرا پاکستان تو تم نے 1971ء کو دسمبر کی ٹھٹھرتی دھوپ میں ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں دولخت کر دیا، اب کیسا احسان اور کہاں کا احسان ؟۔

یہ یومِ آزادی بھی گزر جائے گا اور پچھلے پینسٹھ برسوں کی طرح اِس بار بھی یہ سوال چھوڑ جائے گا کہ کیا ہم نے ماضی سے سبق سیکھا ؟۔ لیکن تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ ہم تو لگ بھگ پچھلے سات عشروں میں ایک قوم میں بھی نہیں ڈھل سکے۔ ہم پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتون تو ہیں، پاکستانی نہیں۔ ہم شیعہ، سُنّی، بریلوی، دیوبندی اور اہلِ حدیث تو ہیں لیکن مسلمان نہیں۔ دین فرقوں اور گروہوں کی نفی کرتا ہے اور ہم فرقوں کو سینوں پر سجائے پھرتے ہیں۔ مسجد اللہ کا گھر ہے لیکن ہماری مساجد بھی اپنی اپنی ہیں۔ ہم ایسے نسلی، لسانی اور گروہی خول میں بند ہیں جنہیں توڑ کر باہر آنا ہمیں قبول نہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اچھے مسلمان یا اچھے پاکستانی بن سکیں ؟۔

خالی خولی بڑھکیں لگانے اور جذباتی نعرے بازی میں ہمارا کوئی ثانی نہیں۔ہم دِلی کے لال قلعے پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کی باتیں تو کرتے ہیں لیکن ہماری خواہش یہی ہوتی ہے کہ اگر مَن موہن سنگھ جی خود ہی ہمارا پرچم دلّی کے لال قلعے پر لہرا دیں تو کتنا اچھا ہو۔حضرتِ اقبال نے غلط تو نہیں کہا تھا کہ ۔

مسجد تو بنا دی شب بھر نے ، ایماں کے حرارت والوں نے
مَن اپنا پرانا پاپی ہے ،.برسوں میں نمازی بَن نہ سکا

ہم نے گھاس کھا کر ایٹم بم تو بنا لیا لیکن خوف کا یہ عالم ہے کہ بھارت ہمارا پانی بند کر دیتا ہے ، سرحدوں پر بلا اشتعال فائرنگ کرتا ہے ، پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی میں ملوث ہوتا ہے اور دھمکیاں بھی دیتا ہے لیکن ہم ''امن کی آشا'' کے ڈھنڈورچی بنے پھرتے ہیں ۔یہ صلح جوئی نہیں.بزدلی ہے اور ایسی.بزدل قوموں کا انجام روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔وطن کے دفاع کے لیے ہمارے پاس کیا ہے جو نہیں ہے ؟۔پوری دنیا ہماری ایٹمی قوت سے خوف زدہ ہے لیکن ہم میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ اپنے ہمسائے کو کہہ سکیں کہ لالہ جی آپ کی ''پوتر'' دھرتی کا ایک ایک انچ ہمارے حتف میزائلوں کی زد میں ہے ۔اگر ہم ڈوبیں گے تو تمہارے ہاں بھی رام رام جپنے والا کوئی نہیں بچے گا۔ہم

بھارت سے بات کریں یا امریکہ سے ہمارا انداز ہمیشہ معذرت خواہانہ اور رویہ غلامانہ ہوتا ہے۔ کوئی مجھے یہ تو بتلائے کہ ہم میں کون سی ایسی خوبی ہے جس کو بنیاد بنا کر ہم بھی کہہ سکیں کہ ہم زندہ قوم ہیں۔ اگر ہم میں زندہ قوموں کی کوئی ایک خوبی بھی باقی نہیں بچی تو پھر ہمیں یومِ آزادی کا جشن مناتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔

جشنِ آزادی منایئے اور جی بھر کے ہلّا گلّا کیجئے، وَن ویلنگ کرکے اپنی گردنیں تڑوایئے اور موٹر سائیکلوں کے سلنسر اُتار کر لوگوں کے کانوں کے پردے پھاڑیے، ساری رات سڑکوں پہ ہُلڑ بازی کیجئے۔ کس میں ہمت ہے جو آپ کو روک سکے کہ آج تو یومِ آزادی ہے۔ ایسی آزادی جسے ہم نے "مادر پدر آزادی" میں ڈھال رکھا ہے لیکن خُدارا آنے والے کل کو اپنے احتساب کے لئے رکھ چھوڑیے اور خود احتسابی کے عمل سے گزرتے ہوئے یہ حساب ضرور کیجئے کہ ہم نے

دھرتی ماں کا قرض کہاں تک ادا کیا ہے؟۔ اگر نتیجہ صفر آئے تو پھر کم از کم اتنا ضرور کیجئے کہ اگلے سال جشنِ آزادی میں شرکت سے گریز کیجئے کہ اِس سے بڑی بے شرمی کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

ہمسایہ ۔۔۔۔ ماں جایا

اگست میں ہم نے ماہِ صیام کو الوداع کہا، شکرانے کی عید منائی اور یومِ آزادی قومی ''جوش وجذبے'' کے ساتھ منایا۔ماہِ صیام اُمتِ محمدیہ ﷺ کے لیے ربِ لم یزل کا لا زوال تحفہ ہے جسے رحمٰن ورحیم نے خالصتاً اپنی ذات سے منسوب کرکے اِس کا اجر دینے کا وعدہ فرمایا لیکن ہم نے ماہِ صیام کا اجر سمیٹنے کی بجائے اسے بھی نمود و نمائش کے لیے مخصوص کر دیا۔اپنی انتہاؤں کو چھوتی مہنگائی میں صاحبِ ثروت لوگ مفلس و نادار لوگوں کی مدد کرنے کی بجائے اپنے ہی طبقے میں افطاریوں کی ''ریوڑیاں'' بانٹتے رہے۔ عید آئی تو مہنگائی نے آسمان کی رفعتوں کو چھو لیا اور سگ ہائے دُنیا نے ماہِ صیام کی رہی سہی کسر عید پر نکال دی۔ جنابِ خادمِ اعلیٰ سے بصد ادب یہ سوال تو کیا ہی جا سکتا ہے کہ لوڈ شیڈنگ کی تو کئی وجوہات ہوں گی لیکن آلو، مٹر، گوبھی، گاجر، کھیرا اور ٹماٹر ''شیڈنگ'' کی کیا وجوہات ہیں؟۔فروٹ کا بھاؤ پوچھنے پر چونکہ اختلاجِ قلب کا خدشہ رہتا ہے اس لیے ''مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے''۔

عید کے بعد 14 اگست کا ہلّا گُلّا شروع ہوا اور ہم نے حسبِ سابق ''دھوم دھڑکے'' سے یہ دن منا کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ ''ہم زندہ قوم ہیں ۔۔۔پائندہ قوم ہیں'' ۔زندہ قوموں کے اپنے ''پلّے'' کچھ ہو نہ ہو لیکن وہ اپنے قومی اور مذہبی تہواروں پر ''موجیں''

ضرور کرتی ہیں۔ ہم نے بھی اپنی آزادی پر خوب موجیں اُڑائیں۔ کچھ بد باطن اسے "مادر پدر آزادی" کا نام بھی دیتے ہیں لیکن کوئی اُن سے پوچھے کہ اگر ہلّا گُلّا اور دھوم دھڑکا بھی نہ کریں تو پھر دُنیا کو کیسے پتہ چلے کہ ہم بھی آزاد ہو گئے ہیں۔ ہم نے مرکزی دارالحکومت میں 15 اگست کی ڈھلتی شام کو اپنی آزادی کا بینظیر مظاہرہ کرکے دُنیا کو حیران کر دیا۔ ہوا یوں کہ سکندر نامی ایک بدبخت نے اکیلے ہی اسلام آباد کو مفلوج کرنے کی کوشش کی لیکن ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں نے انتہائی پھُرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف "پانچ گھنٹوں" کے اندر قومی رہنما زمرد خاں کی مدد سے اُس پر قابو پا لیا۔ پولیس اور رینجرز کی کثیر تعداد تو وہاں موجود تھی ہی، شنید ہے کہ فوجی جوان بھی "سٹینڈ بائی" تھے لیکن پیپلز پارٹی کے زمرد خاں "خوامخواہ" رنگ میں بھنگ ڈالتے ہوئے دہشت گرد پر جھپٹ پڑے جس پر سارا کریڈٹ وہ لے گئے اور باقی سب مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ خادمِ اعلیٰ نے تو زمرد خاں کی جرات کی تحسین کی لیکن رانا ثناء اللہ کہتے ہیں کہ زمرد خاں نے جرات نہیں، حماقت کی۔ اپنے یہ رانا ثناء اللہ بھی خوب ہیں۔ جب سے راجہ ریاض اسمبلی سے "آؤٹ" ہوئے ہیں رانا صاحب کا جی ہی نہیں لگتا۔ شاید اِسی لیے بوکھلائے ہوئے رانا صاحب کی "بونگیوں" سے خود نواز لیگ بیزاری کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ ہمارے ایک "خبرناکیئے" اینکر صاحب بھی فرماتے ہیں کہ زمرد خاں کو "تمغۂ شجاعت" کی بجائے "تمغۂ بیوقوفی" دینا چاہیے۔ اُن کے نزدیک یہ فنِ پہلوانی کا نہایت مخولیہ اور بھونڈا مظاہرہ تھا۔ بجا ارشاد لیکن اینکر موصوف اپنے بھانڈوں" کے ذریعے قومی اخلاق کو جن "بلندیوں" تک پہنچانے کی تگ و"

دو کر رہے ہیں اُس سے بھی سبھی آگاہ ہیں۔اُن کی اِن کاوشوں پر اُنہیں بھی کوئی تمغہ ضرور ملنا چاہیے ۔ میرے خیال میں اِس تمغے کا نام اگر ''تمغۂ حُسنِ بد تمیزی'' رکھ دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔اُن کی ''خدمتِ خبرناک'' میں عرض ہے کہ

کُند ہم جِنس ، باہم جِنس پرواز

کبوتر با کبوتر ، باز با باز

یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے ، کوئی شاہین کی سی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو کسی کو کبوتر بننے میں ہی عافیت محسوس ہوتی ہے۔ 14اگست کو قومی جذبہ دیکھ کر مَن موہن جی کو بھی جوش آ گیا اور اُنھوں نے مذاکرات کا عندیہ دیتے دیتے دھمکی ہی دے ڈالی لیکن اِس دھمکی کا مزہ نہیں آیا۔ بھولی بھالی صورت والے مَن موہن جی جب اپنی ''نیم زنانہ، نیم مردانہ'' آواز میں دھمکیاں دے رہے تھے تو ہماری ہنسی چھوٹ رہی تھی کیونکہ حکومتِ ہند سمیت سبھی جانتے ہیں کہ ہمارے میزائل ہندوستان کے ایک ایک انچ کو ایسے صحراؤں میں بدل سکتے ہیں جہاں صدیوں تک گھاس بھی نہ اُگے اور معلوم تاریخ تو یہی بتلاتی ہے کہ '' لالہ '' گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کرتا۔ ہمسایہ چونکہ ''ماں جایا'' بھی ہوتا ہے اِسی لیے ہم تو اِس بات کے قائل ہیں کہ اگر انڈین آرمی سرحدوں پر پیار بھری چھیڑ چھاڑ کرے بھی تو اُس کو اپنے میزائلوں سے ''ٹیرکانے'' کی بجائے ''امن کی آشا'' کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہیے ۔ایسا کرنے سے ''بڑا بھائی'' بھی خوش ہو جائے گا اور ہمارے پاکستانی سیکولر دوستوں کے سینوں میں بھی ''ٹھنڈ'' پڑ

جائے گی ۔رہی انڈین جارحیت کی بات تو، مجھے تو کہیں نظر نہیں آتی ۔ سر کریک ، سیاچن اور کشمیر تو قصہ ٔ پارینہ بن چکے اِس لیے اُن پر بات کرکے ہم نہ صرف اپنے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہیں بلکہ بڑے بھائی کو بھی چڑاتے رہتے ہیں ۔البتہ پانی کا مسلہ ذرا تازہ ہے لیکن اب تو بڑے بھائی نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے ہمارے دریاؤں میں اتنا پانی چھوڑ دیا ہے کہ ہم سب ''پانی پانی'' ہو گئے ہیں۔اگر ہم ہی اِس کو سنبھال نہیں پائے تو بیچارے بڑے بھائی کو موردِ الزام ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے؟۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ایک طرف تو ہم ہندوستان کے ''گنگا دھلے'' تہذیب و تمدن اور ثقافت و معاشرت کے شیدائی ہیں جب کہ دوسری طرف لال قلعے پہ جھنڈا لہرانے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ذرا سوچیں کہ '' سٹار پلس کلرزاور سونی'' کے بغیر زندگی کتنی سُونی سُونی اور بے کیف ہو جائے گی۔ایسے ٹی وی کو تو اُٹھا کر سڑک پر پھینک دینا چاہیے جس میں ہمارے مذکورہ محبوب انٹر ٹینمنٹ چینلز نہ ہوں ۔اسی طرح سے اگر شادی بیاہ کی رسومات میں سے ہندوانہ ثقافت کو نکال دیا جائے تو باقی ''گھاس پھوس'' ہی رہ جائے گا۔اگر کسی شادی میں مایوں ، مہندی اور بارات کا ہلّا گلّا نہ ہو تو اُسے شادی کون کہے گا؟۔کیا مزہ اُس شادی کا جس میں مہندی پر لڑکیاں ، لڑکے اکٹھے ڈانس نہ کریں اور بارات میں نوجوان ڈھول کی تھاپ پر وحشیانہ انداز میں رقص نہ کریں۔اگر ہم منافقت چھوڑ کر صرف اسلامی تہذیب و تمدن کا لبادہ اوڑھ لیں تو پھر سرحد پار کی رسومات کی سرے سے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں بچتی۔دیانت داری سے فیصلہ کیجئے کہ کتنے ہونگے جو

اِن رسومات کو تَرک کرنے پر آمادہ ہونگے ؟۔اگر یہ تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ ہو تو پھر شکریہ ادا کیجئے اپنے بڑے بھائی کا جس نے ہماری زندگی میں ہلچل کا سامان پیدا کر دیا۔

میڈیا اپنی اداؤں پہ غور کرے

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔ سرگوشیاں

لوگ فاتحین کا جاہ و جلال بھول جاتے ہیں لیکن حیات ارضی کو سراب اور خمارِ ہستی کو حباب سمجھنے والے اہلِ جنوں کو تا قیامت یاد رکھتے ہیں ۔کتنے فاتحین تاریخ کے اوراق میں گم ہو گئے لیکن ''قیس'' آج بھی دلوں میں محض اِس لیے زندہ ہے کہ وہ اہلِ جنوں میں سے تھا۔ عقیل و فہیم کہتے ہیں کہ زمرد خاں نے حماقت کی لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ شاید توانا اور پُر عزم روح کے حامل زمرد خاں نے یہ سوچا ہو کہ

گر بازی عشق کی بازی ہے ، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

فہم و فراست کو اولیت دینے والے عقلِ سلیم کے مالک کبھی دہکتی آگ میں کودا نہیں کرتے ۔ نمرود نے آگ دہکائی اور حضرت ابراہیمؑ کو کہا کہ خُدائے یکتا کی پرستش بند کر دو یا آگ کا ایندھن بن جاؤ۔ عقلِ عیار نے سرگوشی کی کہ جان بچاؤ لیکن عشق نے کہا کہ اگر خُدا ہے تو آگ بھی اُسی کے تابع ہے اور پھر چشمِ فلک نے یہ عجب نظارہ بھی دیکھا کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

حضرت حسینؓ کو بھی خوب علم تھا کہ وہ یزیدی لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آپؓ اگر چاہتے تو یزید کی بیعت کرکے اپنی اور اپنے خانوادے کی جان بچا لیتے لیکن مطلوب و مقصود نانا ﷺ کے دین کی عظمت ٹھہری اور وہ کربلا کی مٹی کو اپنے خون سے رنگین کرکے اہلِ جنوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لیے مسخر کر گئے۔ عالمِ اسلام کی تاریخ تو ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے لیکن بد قسمتی سے ہم جس دَور میں بس رہے ہیں وہ اہلِ جنوں کا نہیں اہلِ عقل کا دَور ہے جس میں ایسی ''حماقتوں'' کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ مجھ سمیت پاکستانیوں کی غالب اکثریت پیپلز پارٹی کے طرزِ حکمرانی سے نالاں بلکہ نفرت کرتی ہے اور بد قسمتی سے زمرد خاں کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے۔ اِس لیے صبا کو صَرصَر کہنا ہماری مجبوری ہے۔ چلیے مان لیا کہ زمرد خاں نے حماقت کی ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا کی گھنٹوں بلکہ پہروں کی ''لائیو کوریج'' کو کیا نام دیں؟۔ حماقت، بے باکی یا پھر (انتہائی معذرت کے ساتھ) ملک دشمنی۔ کیا یہ لائیو کوریج دُنیا پر یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ ہم اتنے نا اہل ہیں کہ صرف ایک دہشت گرد پورے شہر کو ہلا کے رکھ سکتا ہے۔

مانا کہ ہمارا الیکٹرانک میڈیا بہت بے باک ہے لیکن کیا یہ بے باکی ملک و قوم کی بدنامی کا سندیسہ تو نہیں لا رہی ؟۔کیا دُنیا میں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا ایسے واقعات کی لائیو کوریج کرکے اپنے ہی ملک کو بدنام کرے؟۔نیوز چینلز کے موجودہ کردار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ آمر مشرف نے بیشمار چینلز کی اجازت دے کر ملک و قوم کے خلاف سازش کی ہے۔ کھمبیوں کی طرح اُگے ہوئے بیشمار نیوز چینلز میں سے کتنے ہونگے جو دلی درد کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں؟۔کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہر چینل ریٹنگ بڑھانے کے شوق میں اپنی حدوں سے باہر نکلتا جا رہا ہے ؟۔ محترم چیف جسٹس صاحب جب چیئر مین پیمرا سے سوال کرتے ہیں کہ 15 اگست کو ملک کی بدنامی کا باعث بننے والے ''ڈرامے'' کی لائیو کوریج کو کیوں نہیں روکا گیا ؟۔تو چیئر مین پیمرا یہ انکشاف کرکے سب کو حیران کر دیتے ہیں کہ اُن کے پاس تو لائیو کوریج روکنے کا اختیار ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دُنیا میں کہیں بھی نیوز چینلز کو لائیو کوریج کا ایسا شتر بے مہار اختیار حاصل ہے ؟۔اگر نہیں تو پھر ہمارے چینلز کو یہ اختیار کسی خوف کے پیشِ نظر دیا گیا ہے ؟۔

بد قسمتی سے ہمارے ہاں غالب اکثریت ایسے چینل مالکان کی ہے جن کا نہ تو صحافت سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی ملکی بدنامی کی پرواہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں

نے خالصتاً کاروباری نقطہ نگاہ سے یہ چینل کھولے ہیں اور اب وہ نہ صرف ڈھیروں ڈھیر دولت کما رہے ہیں بلکہ اِنہیں ''مَن مانی'' کرنے کی کھلی چھوٹ بھی ہے کیونکہ یہ کھرب پتی خوب جانتے ہیں کہ آزاد اور بے باک میڈیا سے حکومت ہمیشہ خوفزدہ رہتی ہے۔ میڈیا کی آزادی ہر قوم کی ترقی کا جزوِ لاینفک ہوتی ہے لیکن ''مادر پدر'' آزادی قوموں کو پاتال کی گہرائیوں میں دفن بھی کر دیتی ہے۔

پاکستان کے انٹرٹینمنٹ چینلز ایسا کینسر ہیں جو اسلامی تہذیب و ثقافت کو تیزی سے چاٹ رہے ہیں۔ اِن چینلز پر آپ کو سب کچھ ملے گا سوائے اسلامی معاشرت کے۔ میرا موضوع یہ چینلز نہیں کیونکہ اہلِ مغرب کی تہذیب کی عکاسی کرنے والے یہ چینلز ملک کی بدنامی کا اُس طرح باعث نہیں بن رہے جیسے ہمارے نیوز چینلز۔ اِن چینلز کی ریٹنگ کی دَوڑ وطنِ عزیز کا ایسا نقشہ پیش کر رہی ہے جس میں ہری بھری کھیتیوں کی جگہ بھی دہشت گردی ہی اُگتی ہو۔ اِن کو کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ دنیا کے سامنے پاکستان کا ایسا نقشہ پیش کریں جہاں بادلوں کے پاکیزہ پانی سے جنم لینے والی نغمے الاپتی ندیاں بھی ہیں اور کہساروں کے پانی کے لطیف قطرات میں گُلوں کی مہک بھی جمی ہوتی ہے۔ جہاں مرغزاروں میں ہرن بھی چوکڑیاں بھرتے ہیں اور بُلبلیں نغمے بھی الاپتی ہیں۔ جہاں کھیتیاں سونا اُگلتی ہیں اور کسانوں کے مدھر گیتوں کی تانیں آج بھی

دلوں کو مسحور کرتی ہیں۔جہاں احترامِ آدمیت کو معراج انسانیت سمجھا جاتا ہے اور الفت و محبت کی فضا نفسا نفسی کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتی۔لیکن ہمارے یہ مہربان چینلز دُنیاکے سامنے ایسا نقشہ کیوں رکھیں گے جس سے ریٹنگ نہ بڑھتی ہو۔اِنہیں تو ہر وقت کسی ایسی خبر کی تلاش ہوتی ہے جو ہلچل اور دہشت پھیلانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ریٹنگ بڑھانے کے چکر میں یہ اپنے نیوز چینلز پر بھی ایسے مزاحیہ پروگرام تشکیل دیتے ہیں جن میں مزاح تو ہر گز نہیں ہوتا البتہ ہزل گوئی، جگت بازی اور ذو معنی جملوں کی بھرمار ضرور ہوتی ہے۔

ہمارے رہنما بہرحال ہمارے اپنے ہیں اور ہم نے انہیں اُن کی تمام تر خامیوں سمیت اپنایا ہے۔گھر کی بات اگر گھر میں رہے تو وہی بہتر ہوتا ہے، اگر باہر نکل جائے تو سوائے بدنامی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ہمارے چینلز انتہائی چابک دستی سے گھر کی بات کا ڈھنڈورا پوری دنیا میں پیٹ رہے ہیں۔بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کسی کی عزت بھی محفوظ نہیں۔اِن چینلوں پر بیٹھے ''بھانڈوں'' کے ذریعے رہنماؤں کی پگڑیاں جس طرح سے اچھالی جارہی ہیں اور جس انداز سے اُنہیں نشانۂ تضحیک بنایا جا رہا ہے وہ دُنیا پر یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہم سے زیادہ نا اہل کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

اب سونامی کہاں جائے گا؟

تحریکِ انصاف کے لیے ضمنی الیکشن کے نتائج انتہائی مایوس کُن رہے۔ عمران خاں صاحب اپنی میانوالی کی گھر کی سیٹ بھی نہ بچا سکے اور بلور خاندان کو بھی سیٹ واپس کرنی پڑی۔ شاید اسی لیے خاں صاحب نے فرمایا کہ اب اُن کی سونامی کا رُخ سندھ اور بلوچستان کی طرف ہوگا۔۔۔۔ پچھلے دنوں دوردراز گاؤں میں رہنے والی میری ایک رشتہ دار ملنے کے لیے آئی۔اُس نے انتہائی معصومیت سے سوال کِیا ''باجی! کیا یہ سونامی اتنی ہی خوبصورت ہے جو عمران خاں صاحب ہر وقت ''میری سونامی، میری سونامی'' کرتے رہتے ہیں''؟۔ مہمان کی بات سُن کر میری ہنسی چھوٹ گئی کیونکہ وہ یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ ''سونامی'' بھی ''وینا ملک'' ٹائپ کوئی خوبرو دوشیزہ ہے جس نے اِک عالم کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے۔اُس وقت ابلیس لعین نے میرے ذہن میں یہ خیال پیدا کرکے مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے کچھ نوجوان بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اَن دیکھی، اَن جانی ''سونامی'' کی زُلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو چکے ہوں لیکن میں نے اِس خیالِ بَد کو ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ میرے علم میں ہے کہ تحریکِ انصاف میں غالب اکثریت پڑھے لکھے لوگوں کی ہے۔ اپنی مہمان کو تو میں نے سمجھا دیا لیکن تب سے اب تک یہی سوچ رہی ہوں کہ ''سونامی'' تو سمندری طوفان کا نام ہے جو مذکر ہے مونث نہیں۔اِس

لیے خاں صاحب اگر ''میری سونامی'' کی بجائے ''میرا سونامی'' کہیں تو کوئی ہرج نہیں ۔

جب سے خاں صاحب نے سونامی کا رُخ سندھ اور بلوچستان کی طرف موڑنے کا اعلان کیا ہے ، ہماری تو راتوں کی نیند اُڑ گئی ہے۔ پتہ نہیں ہم پنجابیوں سے کیا خطا ہوئی جو خاں صاحب نے ہمیں اپنی ''سونامی '' سے محروم کرنے کی ٹھان لی ۔اگر اُنھوں نے الیکشن نتائج سے بد دل ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے تو دست بستہ عرض ہے کہ ہم پنجابی
سونامیے ''آج بھی اُن کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں لیکن اگر وہ ملکی '' چیف ISI اور بین الاقوامی سازشوں کا شکار ہو جائیں تو اِس میں ہمارا کیا قصور ؟۔ پہلے تو جنرل پاشا کا کچھ حوصلہ تھا لیکن پیپلز پارٹی نے ''خود تو ڈوبے ہیں صنم ، تم کو بھی لے ڈوبیں گے'' کے مصداق عین موقعے پر جنرل پاشا کو مدت ملازمت میں توسیع دینے سے انکار کرکے نہ صرف ہمارے ساتھ دھوکا کیا بلکہ ''نئے پاکستان'' کی بنیادوں کو بھی ہلا کے رکھ دیا جسے صریحاً ملک دشمنی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔پھرگیارہ مئی کو عدلیہ ، الیکشن کمیشن اور نگران حکومت نے مِل کر سونامی کے خلاف سازش کی اور اب ضمنی الیکشن میں کی گئی سازش میں فوج نے بھی حصّہ ڈال دیا ۔اِس تناظر میں پنجابی قصوروار نہیں ٹھہرتے ۔ بھلے سونامی سندھ اور بلوچستان میں مٹر گشت کرتا پھرے لیکن اِس پر ہمارا بھی حق ہے ۔اِس لیے دست بستہ عرض ہے

پھینکے ہیں طرف اوروں کے گُل بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بَر اندازِ چمن ! کچھ تو اِدھر بھی

ایک تو ہم عام اور ضمنی الیکشن کے زخموں سے چور ہیں اوپر سے مولانا فضل الرحمٰن تواتر سے عمران خاں صاحب پر یہودی ایجنٹ ہونے کا الزام لگاتے چلے آ رہے ہیں۔ جواباً خاں صاحب نے بھی کیا خوب کہا کہ '' مولانا صاحب کے ہوتے ہوئے کسی یہودی ایجنٹ کی ضرورت نہیں'' مولانا صاحب اور خاں صاحب کی اِس ''چشمک'' پر نواز لیگ نے سُکھ کا سانس لیا ہو گا۔ شنید ہے کہ بڑے میاں صاحب نے ''اندر کھاتے'' اپنے اراکینِ اسمبلی کواِس پیش رفت پر شکرانے کے نوافل ادا کرنے کی تلقین کی اور خیر سگالی کے طور پر یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ اور جنرل کیانی A.P.C سے پہلے عمران خاں سے ملاقات کریں گے ۔ یہ ملاقات خاں صاحب درِ دولت پر ہونی چاہیے تاکہ دشمنوں کو اُن کے قد کاٹھ کا اندازہ ہو۔

خاں صاحب نے حسبِ وعدہ ایک بال سے دو وکٹیں تو گرا ہی دیں لیکن تیسری وکٹ پر اُن کے ساتھ '' ہَتھ '' ہو گیا اور میاں برادران نے ایسی ''ٹَنگڑی'' ماری کہ ''کپتان صاحب'' چاروں شانے چِت ہو گئے۔ یہ ''فاؤل پلے'' تھا کیونکہ خاں صاحب کو بتایا ہی نہیں گیا کہ میاں برادران'' انتخابی ٹَنگڑی'' کے ماہر ہیں۔اِس'' فاؤل پلے''کا سارا غصّہ خاں صاحب نے مولانا فضل الرحمٰن پر

نکالنا چاہا لیکن شاید بھولے بھالے کپتان نہیں جانتے تھے کہ جس شخص سے وہ ''متھا'' لگا رہے ہیں وہ اِس میدان کا ماہر کھلاڑی ہے۔ لاریب ، بیان بازی میں اگر خاں صاحب انیس ہیں تو مولانا بیں۔

مولانا کہتے ہیں کہ عمران خاں اچھے خاوند ثابت ہوئے ، نہ باپ۔اِس لیے وہ اچھے سیاستدان کیسے ثابت ہو سکتے ہیں۔ مولانا جیسے گھاگ سیاستدان سے ایسی لایعنی اور بے معنی بات کی توقع نہیں تھی۔ اچھا خاوند تو ''ہوم گورنمنٹ'' کے تابع ہوتا ہے جسے امورِ خانہ داری سے ہی فُرصت نہیں ہوتی وہ امورِ مملکت کیا خاک سَرانجام دے گا۔اِس لیے اچھا سیاستدان بننے کے لیے ضروری ہے کہ بندہ اچھا خاوند یعنی ''زَن مرید'' نہ ہو۔

دراصل اب کی بار مولانا کو میاں نواز شریف سمیت کسی نے بھی ''لفٹ'' نہیں کرائی جس کا اُنہیں بہت قلق ہے۔ اسی غصّے میں وہ بے سر وپا باتیں کر رہے ہیں۔

ایک سچّے رہنما کے نزدیک قوم اُس کی اولاد کی مانند ہوتی ہے۔اِس لحاظ سے اگر عمران خاں صاحب کی محبت کی وراثت اُن کے چاہنے والوں میں تقسیم کی جائے تو اُن کے بیٹوں کے حصے میں شاید اتنا پیار بھی نہ آئے ، جتنا وہ دے رہے ہیں۔البتہ مولانا صاحب اپنی محبت کی ریوڑیاں صرف اپنوں میں ہی بانٹ رہے ہیں اور اُن کے خاندان کا شاید ہی کوئی فرد بچا ہو جسے مولانا اسمبلی میں لانے

کی تگ و دو نہ کر رہے ہوں۔اِس معاملے میں تحریکِ انصاف کے وزیرِ اعلیٰ اور سپیکر مولانا سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔وزیرِ اعلیٰ کی خالی کی گئی سیٹ پر اُن کے داماد اور سپیکر کی خالی کی گئی سیٹ پر اُن کے بھائی نے ضمنی الیکشن میں حصّہ لیا۔شاید اسی لیے عمران خاں صاحب نے یہ کہا ہے کہ چونکہ وہ "بیمار شمار" تھے اِس لیے وہ خیبر پختونخواہ حکومت کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکے۔ ہم تو خاں صاحب سے یہی استدعا کر سکتے ہیں کہ وہ مداخلت نہ ہی کریں تو اچھا ہے کیونکہ ایسی صورت میں وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک کے بُرا مان جانے کا قوی امکان ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پرویز خٹک صاحب KPK میں فارورڈ بلاک بنا کر بیٹھ جائیں اور خاں صاحب کے پاس صرف سپیکر ہی باقی بچے۔ عمران خاں کہتے ہیں کہ تحریکِ انصاف نے KPK سے نئے پاکستان کا آغاز کر دیا ہے۔ لیکن کچھ بَد باطن یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کا نام نیا پاکستان ہے کہ طالبان دِن دھاڑے ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی جیل توڑ کر اپنے سینکڑوں ساتھی چھُڑا لے جائیں تو اللہ ایسے "نئے پاکستان" سے بچائے۔ایسے بَد باطنوں کو مُنہ توڑ جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ خاں صاحب اب یہ راز اُگل دیں کہ یہ سب کچھ تو خیبر پختونخواہ کی حکومت نے جذبۂ خیر سگالی کے تحت کیا تھا تاکہ طالبان کا غصّہ کچھ ٹھنڈا ہو اور وہ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے تیار

ہو جائیں۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

دسمبر 2012ء بھی گزر گیا۔ گزشتہ ہر سال کی طرح ایک ایک کر کے ماضی کے دریچے وا ہوتے چلے گئے۔ انگنت یادیں پے درپے موتیوں کی طرح لڑیوں میں پروتی چلی گئیں، نقش اُبھرتے رہے، دھندلاتے رہے، تصویریں بنتی رہیں، مٹتی رہیں۔ تصور کی بنجر زمیں پر گلکاریاں ہوتی رہیں، رنگ بکھرتے رہے۔ کبھی نغمے، کبھی آنسو، کبھی آہیں، کبھی سسکیاں، سب گڈ مڈ ہوتے رہے اور پھر۔۔۔ پھر اچانک ایک چہرہ اُبھرا، ہنستی مسکراتی آپا شمیم کا چہرہ۔ اپنے بچوں کے کام کرتے ہوئے کبھی نہ تھکنے والی آپا شمیم۔ جس کی جان اپنے بچوں کی خوشیوں میں اٹکی ہوئی۔ جس کے لیے پوری کائینات اُس کا بیٹا راحیل اور بیٹی صائمہ تھے۔

ماں۔۔۔ ممتا کا انوکھا ہی انداز ہوتا ہے، جس کے دل میں جذبات کی گہرائیاں پوری شدّومد سے اُبھرتی ہیں اور اپنی اولاد کو زمانے کی سرد و گرم ہواؤں سے بچانے کے لیے اس طرح اپنی اوٹ میں چھُپا لیتی ہے جیسے مرغی اپنے ننھے مُنّے چوزوں کو اپنے پروں تلے۔ ماں کا پیار سُچے موتیوں سے بڑھ کر قیمتی اور شہد سے میٹھا ہوتا ہے۔ اُس کے تبسم کی اوٹ میں بچوں کی مسکراتی جبینیں چمکتی ہیں۔ یہ مائیں ہی تو ہوتی ہیں جو زندگی کی تمام اُمیدیں اپنے بچوں سے

وابستہ کیے ، دُکھ پہ دُکھ جھیلتی چلی جاتی ہیں اور جب بچے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتے ہیں تو وہ یہ سمجھتی ہیں کہ کسی نے اُن کے سر پر کوہِ نور جڑا تاج رکھ دیا ہو۔ گویا زندگی کا ہشاش بشاش پہلو بھی ماں سے جڑا ہے اور افسردہ بھی ۔ ماں کے بنا کائینات کی رنگا رنگی فضول و بے معنی ہے ۔آپا شمیم بھی انہی ماؤں میں سے ایک تھی جو ساری زندگی اپنے بچوں کی خوشیوں کے لیے تگ و دو کرتی رہی آج اُس کے سر پر کوہِ نور جڑا تاج رکھنے کی گھڑی آئی ۔ گھر میں ہر طرف گہما گہمی ، خوشیوں کی برسات اس لیے کہ جنوری کی 16 تاریخ کو راحیل کی شادی جو ہونے والی تھی۔ تیاریاں زوروں پر تھیں۔ راحیل نے ایک سال پہلے میڈیکل مکمل کیا تھا اب ہاؤس جاب بھی ختم ہونے کو تھا۔آج دسمبر کی ۳۱ تاریخ تھی ، ٹیلی ویژن پر نیو ائیر کے رنگا رنگ پروگرام چل رہے تھے ۔نئے سال کی مبارک بادی جا رہی تھی ۔رنگ و نور کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ موبائل فون پر دھڑا دھڑ مبارک باد کے میسجز آ رہے تھے۔ گھر مین روڈ پر واقع ہونے کی وجہ سے باہر کی ''ہا ہو کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ آوارہ منش نوجوان بنا سلنسر کے موٹر'' بائیک پر ریسیں لگا رہے تھے ۔ون ویلنگ کر رہے تھے۔ کھڑکی میں سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اتنے میں چند منچلوں کا ٹولا گذرا جو سڑک کے بیچ گاتے بجاتے ، جھومتے جھماتے جا رہے تھے ۔ دور کہیں آتش باری ہو رہی تھی ۔ میں بھی شمیم کے ہاں ڈنر پر مدعو تھی ۔ کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر کا سارا منظر دیکھ رہی تھی اتنے میں راحیل کچھ سوچتے ہوئے

بولا'' ۔ بابا جانی ! ہم مسلمانوں کا سال تو ہجری ہے جب کفارِ مکہ کی ۱۳ سالہ جبر و تشدد کا خاتمہ ہوا تھا'' ۔ ہاں بیٹا راحیل ! تم ٹھیک کہ رہے ہو ۔ نیو ائیر اور ویلنٹائن ڈے تو عیسائیوں کے تہوار ہیں لیکن آج کل مسلمانوں میں قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں ۔ تم دیکھ رہے ہو ناں کہ شدید سردی میں کتنی بے حیائی سے سڑکوں پر مدہوشی کی حالت میں رقص کرتے جا رہے ہیں ۔ ستم تو اس بات کا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ان تمام بے حیائی کی محفلوں اور اخلاق سوز پروگراموں کا انعقاد سرکاری سرپرستی میں ہوتا ہے ۔ اسی لیے تو آج کے دن پولیس بھی آنکھیں اور کان بند کیے بیٹھی ہے ، شائد وہ بھی،ہیپی نیو ایئر منانے میں مشغول ہیں ۔ صائمہ ، جو بڑی دلچسپی سے اپنے بابا کی باتیں سُن رہی تھی اُس سے مزید برداشت نہیں ہوا اور بولی'' بابا جانی ! کتنی بُری بات ہے کہ ہم عیسائیوں کی رسم کو اس جوش و خروش سے مناتے ہیں ۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے ناں ؟'' ۔ بیٹی ! تم صحیح کہہ رہی ہو ہمیں تو ہجری سال کو محرّم الحرام کا چاند دیکھ کر خوش آمدید کہنا چاہیے اور اس کے لیے پوری امت مسلمہ کی کامیابی و کامرانی کے لیے خصوصی دعائیں مانگنی چاہییں ۔ اپنی بخشش کی دعائیں مانگنی چاہییں ۔ حضرت عمرؓ کا یہ سنہری کارنامہ ہے کہ انھوں نے سنِ ہجری کا اجراء کیا اور آغاز محرم الحرام سے کیا کیونکہ اللہ نے محرم الحرام اور ذی الحجہ کو حرام مہینے قرار دیا ہے ۔ جن میں جنگ و جدل اور لڑائی جھگڑا سب حرام قرار دیئے گئے ہیں ۔ اسلام تو ہے

ہی امن اور سلامتی کا مذہب اس لیے اسلامی سال کا آغاز بھی امن سے اور انجام بھی۔'' ۔ راحیل کے بابا ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ٹھاہ ، ٹھاہ ۔ کی آوازیں آنے لگیں۔ راحیل جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔ پیچھے ہی صائمہ بھی ۔ ابھی راحیل دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ سنسناتے کے ساتھ ایک بے رحم گولی آئی اور راحیل کے دل کے آر پار ہو گئی ۔ شائد وہ اسی کا انتظار کر رہی تھی ۔ خون کا فوارہ ابھرا۔ بہن کی چیخ سنائی دی ۔ سب بھاگے بھاگے اوپر گئے ۔ لیکن ۔ راحیل نیو ائیر کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ کتنی ہی ماؤں کے لختِ جگر نیو ائیر کی بھینٹ چڑھے ہونگے ۔ کتنی ہی بہنوں کے بھائی داغِ مفارقت دے گئے ہونگے ۔ کبھی ون ویلنگ کرتے ہوئے تو کبھی گولی کا نشانہ بن کر۔ کبھی نہ آنے کے لیے ۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ۔ ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ماں نے بیٹے کو خون میں لت پت دیکھا تو اپنے ارمانوں کے جنازے کو کندھا دینے کے خوف سے وہیں ڈھیر ہو گئی ۔ باپ حیران حیران آنکھوں سے کبھی بیٹے کو تکے جا رہا تھا تو کبھی بیوی کو۔ بہن پر سکتے کا عالم تھا۔ ایک ، صرف ایک پل میں ہنستا بستا گھر ویران کھنڈر بن گیا۔ وہ ماں جو اپنے بچے کی ذرا سی پریشانی پر یوں بلکتی تھی کہ اسے دیکھ کر دریا کی روانی بھی تھم جائے آج موت نے اُس کے لبوں پر مہرِ خامشی ثبت کر دی تھی ۔

زندگی میں کبھی بیٹے کو

تنہا نہیں چھوڑا تھا تو آج اپنے لختِ جگر کو اکیلا کیسے جانے دیتی۔بیشک زندگی اُس ذاتِ پاک کی امانت ہے۔ہم سب کو لوٹ کر آخر کار اپنے خالقِ حقیقی کے پاس ہی تو جانا ہے۔ فرق صرف آگے پیچھے کا ہے لیکن دائمی جدائی کی کسک پیچھے رہ جانے والوں کو بیقرار تو رکھتی ہے ناں۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اس سانحے کو آج ۶ سال گذر چکے ہیں لیکن ہر سال جب دسمبر کی ۳۱ تاریخ کو رقص و سرور کی یہ محفلیں اور سڑکوں پر ناچتی گاتی ٹولیوں کو دیکھتی ہوں تو وہی دلدوز منظر یوں آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے جیسے کسی نے فلم چلا دی ہو۔نیو ائیر منانے والوں سے میرا یہ سوال ہے کہ یہ جو خوشیاں منائی جاتی ہیں۔آخر کس بات کی ؟

کیا زندگی کا ایک سال کم ہونے کی ؟۔کیا موت کے ایک سال مزید قریب آنے کی ؟۔کیا ایسے تہوار کا اسلامی جمہوریہ پاکستان کی تہذیب و ثقافت سے کوئی تعلق ہے ؟۔کیا یہ تہوار ہر لحاظ سے غیر شرعی نہیں ؟۔کیا ایسے تہوار کی ہماری اقدار میں کہیں بھی گنجائش ہے ؟۔کیا عیسوی سال ہی مسلمانوں کے لیے اہمیت کا حامل ہے ؟۔اگر ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر ہم ہر سال اس

تہوار کو منانے کے لیے کروڑوں روپیہ پانی کی طرح کیوں بہا دیتے ہیں ؟۔۔۔ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے ہمارے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سربراہان اس غیر شرعی رسم کی سرپرستی کیوں کرتے ہیں ؟۔۔۔ آخر کیوں ؟۔۔۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

روشنیوں کے شہر میں پھر آپریشن

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

عشروں سے خونم خون شہرِ قائد کو دیکھ کر بے اختیار لبوں پہ آ جاتا ہے

شہرِ دل ایک مدت ، اُجڑا بسا غموں میں

آخر اُجاڑ دینا اِس کا قرار پایا

مرکزی حکومت رینجرز اور پولیس کی مدد سے ایک دفعہ پھر کراچی میں آپریشن کرنے جا رہی ہے لیکن اِس بار کپتانی کا اعزاز سندھ کے وزیرِ اعلیٰ سید قائم علی شاہ کو بخشا جا رہا ہے ۔ ایم کیو ایم کا مطالبہ ہے کہ کراچی کو ٹارگٹ کلرز اور بھتہ خوروں سے نجات دلانے اور ''نو گو ایریاز'' کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ کراچی کو فوج کے سپرد کیا جائے ۔ حیرت ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک تو کراچی کو فوج کے حوالے کرنے کا مطالبہ کرنے والوں کے خلاف ایم کیو ایم مرنے مارنے پر اُتر آتی تھی لیکن آج وہ خود یہی مطالبہ کر رہی ہے ۔ اُدھر مرکزی یا صوبائی حکومت ایسے کسی مطالبے کو ماننے کے لیے تیار نہیں ۔ مرکز کا چونکہ کراچی کی بھتہ خوری ، ٹارگٹ کلنگ اور اغوا برائے تاوان سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں اور یہ خالصتاً صوبائی معاملہ ہے اِس لیے وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد کے بیانات میں تلخی کم اور شیرینی زیادہ ہے ۔ وہ جہاں سید

قائم علی شاہ کو مرکزی کابینہ کے اجلاس میں بلانا چاہتے ہیں وہیں فاروق ستار اور اے این پی کی نمائندگی کو بھی ضروری سمجھتے ہیں جبکہ ہم سمجھتے ہیں کہ جب نَس نَس میں موادِ بَد بھرا ہو تو پھر مصلحت نہیں، جراحی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ عملِ جراحی تکلیف دہ ہونے کے باوجود مریض کی زندگی بچانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

دوسری طرف پیپلز پارٹی کے حلقوں میں بھی ایم کیو ایم کے اِس مطالبے سے بہت بے چینی پائی جاتی ہے۔ایوانِ صدر کو عنقریب داغِ مفارقت دینے والے جنابِ آصف زرداری کی آس کی ڈوری صرف حکومتِ سندھ سے بندھی ہے۔اگر کراچی کو فوج کے حوالے کر دیا جائے تو زرداری صاحب کی یہ آس بھی ٹوٹ جائے گی۔اِس لیے پیپلز پارٹی کسی بھی صورت میں ایم کیو ایم کے اِس مطالبے کو تسلیم نہیں کرے گی۔اِس لیے یہ طے ہے کہ کراچی میں آپریشن کلین اپ تو ہو گا لیکن فوج نہیں، پولیس اور رینجرز کی طاقت کے ساتھ۔سوال مگر یہ ہے کہ کیا یہ آپریشن کامیاب ہو گا؟۔ میری فہم کے مطابق یہ آپریشن مزید خرابیوں کو جنم دے گا اور حالات میں سدھار کی بجائے بگاڑ کا اندیشہ بدرجہ اتم موجود ہے۔کیونکہ ہم آج بھی برائی کے تَن آور درخت کی شاخوں کی قطع و برید کے لیے تو تیار ہیں لیکن اُس کی جڑوں پر یا تو وار کرنا ہی نہیں چاہتے یا پھر اپنے اندر ایسا کرنے کی ہمت نہیں پاتے۔اِس نفسا نفسی کے دور میں ہر کوئی صرف اپنا دامن بچانے کی

فکر میں ہے۔جانتے سبھی ہیں لیکن کہتے ہوئے زبانوں پہ لکنت طاری ہو جاتی ہے کہ بُرائی جو کبھی صرف ایم کیو ایم کی صفوں میں موجود تھی آج پھیل کر پیپلز پارٹی اور اے این پی کا سیاسی ناسور بن چکی ہے اور جب تک یہ تینوں سابقہ اتحادی جماعتیں اپنے عسکری ونگز ختم نہیں کرتیں یا ریاستی طاقت کے بَل پراِن ونگز کو ختم نہیں کر دیا جاتا، کراچی میں امن کا خواب محض دیوانے کی بَڑ ہو گا۔یہ جماعتیں اپنے عسکری ونگز ہر گز ختم نہیں کریں گی اور میاں برادران اپنے سینوں پر ''میڈاِن پاکستان'' کے جتنے مرضی لیبل چپکاتے رہیں ، وہ پاکستان کی معاشی شہ رگ کراچی میں امن کی خاطر اتنا بڑا قدم ہر گز نہیں اٹھائیں گے کہ اِن جماعتوں کے اندر گھُس کر اِن کے عسکری ونگز کا خاتمہ کر دیں۔اِس لیے نتیجہ ''صاحب نے کھایا پیا کچھ نہیں ، گلاس توڑا ، بارہ آنے'' ہی رہے گا۔ کراچی کے تاجروں کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کرتے ، ٹسوے بہاتے ''الطاف بھائی'' شاید مرضِ نسیاں میں مبتلا ہیں اِس لیے وہ بھول گئے کہ برائیوں کے سارے نخل تو اُنہی کی کاوشوں کا ثمر ہیں۔یہ الطاف بھائی ہی کی آبیاری کا اعجاز ہے جو آج یہ نخل ایسے تن آور درخت بن چکے ہیں جنہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ناممکنات میں سے ہے۔نو گو ایریاز ، عقوبت خانے اور ٹارگٹ کلنگ سبھی مہاجر قومی موومنٹ کے جنم کے بعد کی پیداوار ہیں ۔اِس سے پہلے تو شہرِ قائد کی

آغوشِ محبت ہر کس و ناکس کے لیے وا رہتی تھی اور اِس کے دامن میں اتنی وسعت تھی کہ لاکھوں سما جاتے اور پتہ بھی نہ چلتا۔ لیکن ضیاء الحق مرحوم کی اشیرباد سے معرضِ وجود میں آنے والے اِس گروہ نے گھر گھر صفِ ماتم بچھا دی، کراچی خونم خون ہوا اور اِس کی روشنیاں منحوس اندھیروں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

قائدِ تحریک کو وہ وقت اچھی طرح یاد ہو گا جب اُنھوں نے اپنے کارکنوں کو گھر کا سامان بیچ کر اسلحہ خریدنے کا حکم دیا تھا۔ اسلحے کی خریداری آج بھی جاری ہے البتہ اسلحہ فروش بدل چکے ہیں۔ ڈی جی رینجرز میجر جنرل رضوان صاحب نے سپریم کورٹ میں اسلحے سے بھرے انیس ہزار کنٹینرز کی گُمشدگی کا براہِ راست الزام پورٹس اینڈ شپنگ کی وزارت پر لگایا۔ پتہ نہیں کس مصلحت یا دباؤ کے تحت میجر جنرل صاحب نے سپریم کورٹ میں دیئے گئے اپنے بیان سے انحراف کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ اُن کا بیان توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ جنرل صاحب کے بیان سے قطع نظر اِن کنٹینرز کی گمشدگی کے ذمہ دار تو محترم بابر غوری ہی ٹھہرتے ہیں جو طویل عرصہ تک پورٹس اینڈ شپنگ کے وزیر رہے۔ یہ اسلحہ صرف کراچی ہی نہیں، پورے پاکستان میں پھیلایا جا چکا ہے اور یہی اسلحہ مختلف مذہبی اور لسانی گروہ، بلوچ لبریشن آرمی اور طالبان بھی استعمال کر رہے ہیں۔

محترم الطاف حسین کہتے ہیں کہ آپریشن کلین ایسا نہیں ہونا چاہیے جیسا 92ء میں ہوا تھا ۔الطاف بھائی کا حکم سر آنکھوں پر لیکن کیا ہی بہتر ہوتا اگر وہ اِس آپریشن کی قیادت خود سنبھال لیتے کیونکہ اُن سے بہتر تو کوئی جانتا ہی نہیں کہ ایسے آپریشن کیسے نتیجہ خیز بنائے جا سکتے ہیں ۔اُن کی جماعت نے تو اپنے وجود کے ابتدائی دنوں میں ہی جماعت اسلامی جیسی منظم جماعت کو کونے میں لگا دیا ۔جب باغی گروہ ایم کیو ایم (حقیقی) نے سر اُٹھانا چاہا تو اُس کا وجود ہی ختم کر دیا ۔1992ء کے آپریشن میں حصّہ لینے والے دو سو پولیس اہلکاروں کو چُن چُن کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور چیف جسٹس صاحب کی کراچی آمد پر کراچی کو خونم خون کر دیا ۔اِس کے باوجود بھی

دامن پہ کوئی چھینٹ ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تُم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اِس لیے بہتر یہی ہے کہ وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد صاحب اِس آپریشن کی کپتانی قائم علی شاہ صاحب کی بجائے جناب فاروق ستار کے سپرد کرکے اُن کے تجربے اور صلاحیت سے مستفید ہوں۔اگر چوہدری نثار صاحب ایسا کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو ''مہاجر لبریشن آرمی'' بھی اُن کا دست و بازو بن سکتی ہے ۔چوہدری صاحب کہتے ہیں کہ ٹارگٹ کلرز، بھتہ خوروں اور اغوا کنندگان کی نشاندہی ہو چکی ہے۔اگر ایسا ہے تو پھر وہ یہ بھی جانتے ہونگے کہ اِن میں سے

کتنے لوگ مہاجر لبریشن آرمی کا حصہ ہیں، کتنے عزیر بلوچ کے ساتھی اور کتنے اے این پی کے شیدائی۔ محترم وزیرِ داخلہ انہی سیاسی جماعتوں کے حصار میں جو معرکہ سر کرنے نکلے ہیں اُس کے انجام سے کوئی عقیل و فہیم بے خبر نہیں اِس لیے ہم تو دست بستہ یہی عرض کر سکتے ہیں کہ

پکڑ کے زندہ ہی جس درندے کو تُم سدھانے کی سوچتے ہو
بدل سکے گا نہ سیدھے ہاتھوں وہ اپنے اطوار، دیکھ لینا

دروغ بَر گردنِ راوی

آج جنابِ آصف زرداری اپنے عرصۂ صدارت کی تکمیل کے بعد ایوانِ صدر کو داغِ مفارقت دے رہے ہیں۔ کوچ کی تیاریاں مکمل ہیں اور جنابِ زرداری اور حواری سامان سمیٹنے میں مصروف ۔اِس سامان میں جنابِ زرداری کو بیرونی ممالک سے ملنے والے تحائف بھی شامل ہیں ۔ عموماََ یہ تحائف قومی خزانے میں جمع کروا دیئے جاتے ہیں لیکن اگر کوئی سربراہ چاہے تو اِن کی مالیت کا دس فیصد ادا کرکے یہ تحائف وصول کر سکتا ہے ۔دروغ بَر گردنِ رؤف کلاسرا، جنابِ زرداری کو لگ بھگ 176 تحائف موصول ہوئے جن کی ''محبانِ زرداری'' نے 19 کروڑ روپے قیمت مقرر کی اور زرداری صاحب نے لگ بھگ دو کروڑ ادا کرکے یہ تحائف وصول کرکے یہ ثابت کر دیا کہ ''ہاتھی مرا سوا لاکھ کا''۔اِن تحائف کی اصل قیمت تو ہمیشہ صیغۂ راز میں رہے گی لیکن کچھ نہ کچھ اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ سابقہ وزیرِ اعظم شوکت عزیز کی اہلیہ کو کسی ملک کی خاتونِ اوّل نے ایک پرس تحفے میں دیا جس کی قیمت 300 روپے لگائی گئی اور ہماری خاتونِ اوّل نے 30 روپے نقد سکّہ رائج الوقت ادا کرکے وہ پرس وصول کر لیا۔اسی طرح اُنہیں 25 روپے مالیت کا ایک '' سکارف'' کا تحفہ مِلا۔اب پتہ نہیں ہماری خاتونِ اوّل نے اڑھائی روپے ادا کیے یا تین لیکن سکارف اُن کا ہو گیا۔بیگم شوکت عزیز کو

چاہیے تھا کہ یہ تحائف قبول کرنے کی بجائے پُرانی انارکلی کی کسی ریڑھی سے یہ چیزیں خرید کر اپنا شوق پورا کر لیتیں۔۔۔ جنابِ زرداری کے تحائف میں تین BMW گاڑیاں بھی شامل ہیں جنکی ''مارکیٹ ویلیو'' لگ بھگ 15 کروڑ روپے ہے۔ باقی 173 تحائف جن میں سونے کی گھڑیاں، سونے کے سکّے، سونے کے پن اور اسی جیسی دیگر قیمتی اشیاء شامل ہیں، اُن کی مالیت کا اندازہ خود لگا لیجئے۔ حیرت تو اِس بات پر ہوتی ہے کہ بیرونی ممالک کے سربراہان کو دیئے جانے والے تحائف تو ہمارے ٹیکسوں سے نچوڑے جاتے ہیں لیکن ہمارے سربراہان کو ملنے والے تحائف میں قوم کا حصّہ بقدرِ اشکِ بُلبُل بھی نہیں ہوتا۔

جو لکھاری، تجزیہ نگار یا اینکر جناب آصف زرداری کے پانچ سالہ عہدِ صدارت پر اُنہیں خراجِ تحسین پیش نہیں کرتا وہ انتہائی احسان ناسپاس ہے۔ زرداری صاحب نے اپنے دَورِ حکومت میں مسائل کا انبار لگایا اور لکھاریوں کے سامنے موضوعات کی سبیل لگ گئی جس پر اُنہیں زرداری صاحب کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے لیکن کئی احسان ناسپاس کالم نویسوں نے ابتداء ہی سے زرداری صاحب کے جانے کی تاریخیں باندھنا شروع کر دیں۔ وہ تاریخ پہ تاریخ دیتے چلے گئے اور زرداری صاحب ہونٹوں پہ معنی خیز مسکراہٹ سجائے ایوانِ صدر میں ڈٹے رہے۔ تجزیہ نگار حیران تھے کہ آخر اُن کے تجزیے زرداری صاحب کی ذات پہ آ کے بے بس کیوں ہو جاتے ہیں؟۔ کچھ لوگوں نے اسے میاں نواز شریف کی مفاہمتی پالیسی

کا کرشمہ قرار دیا اور ''ایویں خواہ مخواہ'' اُن پر فرینڈلی اپوزیشن کا الزام دھرنے لگے۔کچھ تجزیہ نگاروں نے اپنا سارا غصّہ ق لیگ اور ایم کیو ایم جیسے اتحادیوں پر اتارا لیکن بالآخر پتہ یہ چلا کہ زرداری صاحب کا پِیر بہت ''تگڑا'' تھا جس نے زرداری صاحب کے ساتھ صدارت کا پانچ سالہ ٹھیکہ کر رکھا تھا۔ پیر صاحب نے اُن کو اگلا پانچ سالہ صدارت پیکج'' دینے کی آفر بھی کی لیکن حیرت انگیز طور پر زرداری صاحب نے منع کر'' دیا۔اگر ہمارا رابطہ پیر صاحب سے ہوتا یا اُن کا کچھ اتا پتہ معلوم ہوتا تو ہم بھی چھوٹی موٹی وزارت ٹھیکے پر لینے کی کوشش کرتے لیکن ''اب پچھتائے کیا ہوت ، جب چِڑیاں چُگ گئیں کھیت'' ۔اب تو وزارتوں کی ریوڑیاں بَٹ چکیں اور ''ہاؤس فُل'' کا بورڈ لگ چُکا۔صرف بلوچستان میں چند سیٹیں خالی ہیں لیکن وہاں جاکر ''بلوچ لبریشن آرمی'' کی سے بچ بھی گئے تو ایجنسیاں ہمیں یوں BLA نرم غذا بننے کا ہمارا کوئی موڈ نہیں۔اگر غائب کر دیں گی جیسے گدھے کے سَر سے سینگ۔ ہمارا شمار ''مسنگ پرسنز'' میں ہونے پر ہمارے میاں تو بہت خوش ہونگے لیکن اُن کی خوشی ہمیں گوارا نہیں۔

شنید ہے کہ اب زرداری صاحب بحریہ ٹاؤن لاہور میں ملک ریاض کے عطا کردہ محل بلاول ہاؤس'' میں قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔ہم نے یہ محل دیکھا تو نہیں البتہ دیکھنے کی'' تمنّا بہت ہے۔سُنا ہے کہ اِس محل کی دیواریں تک ''بَم

پروف'' ہیں اور اِس محل میں طالبان تو کجا کوئی پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا۔ دروغ بَر گردنِ راوی کچھ خیر خواہانِ زرداری تو یہ بھی کہتے پائے گئے ہیں کہ زرداری صاحب نے اپنے پِیر صاحب کے وسیلے سے اللہ میاں کے ہاں یہ عرضداشت بھیجی ہے کہ چونکہ اِس مملکتِ خُداداد کو ابھی اُن کی اَشد ضرورت ہے اِس لیے ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت فی الحال اُن کا تبادلہ اِس دُنیا سے اُس دُنیا میں نہ کیا جائے۔ پیر صاحب چونکہ بہت پوہنچی ہوئی'' ہستی ہیں اِس لیے اُمیدِ واثق ہے کہ یہ ''عرضی'' بارگاہِ ربی میں شرفِ قبولیت سے ہمکنار ہو گی اور قوم اپنے ''عظیم لیڈر'' کی خُداداد صلاحیتوں سے عشروں تک مستفید ہوتی رہے گی۔

جس ذوق و شوق کے ساتھ میاں نواز شریف صاحب نے ایوانِ وزیرِ اعظم میں زرداری صاحب کا استقبال کیا اور اُن کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اُس سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زرداری صاحب نے میاں صاحب کی شدید خواہش بلکہ محبوبانہ ضد'' کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے لاہور میں قیام کا فیصلہ کیا ہو گا۔ تختِ لاہور'' والے ہوشیار رہیں کہ اب '' تختِ پاکستان'' سے مستفید ہونے والے بھی آن پہنچے ہیں ۔خادمِ اعلیٰ کے لیے تو یقیناً یہ لمحۂ فکریہ ہی تھا لیکن بڑے بھائی کا احترام مانع ہوا اور اُنھوں نے ''زر بابا'' کی گُدڑی جھاڑنے کی بجائے خاموشی کی دبیز چادر اوڑھ لی ۔

خادم

اعلیٰ تو ''زر بابا چالیس چوروں'' کے خلاف جوشِ خطابت میں مائیک اُلٹتے رہتے تھے لیکن بڑے بھائی کی ایک ہی ڈانٹ نے اُن کو سیدھا کر دیا۔ زرداری ، نواز شریف قربتوں کا ثمر آور ہونا اظہر مِن الشمس ہے اور قوم کو کچھ ملے نہ ملے زرداری صاحب کو جاتی عمرا کے ''کھدپائے'' اور بڑے میاں صاحب کو زرداری صاحب کے باورچی کی خاص ڈِش ''مسور کی دال'' کھانے کو ملتی رہے گی۔ اپنے میاں صاحب ٹھہرے کھانے کے شوقین ۔ وہ تو سیّد ممنون حسین کی ''ربڑی'' کھا کر اتنے ممنون ہوئے کہ ایوانِ صدر ہی اُنہیں سونپ ڈالا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک سیّد کی احسان سپاسی کرتے کرتے وہ دوسرے سید کو ناراض کر بیٹھے۔ اگر سید ممنون حسین کو ''پیوستہ رہ شجر سے ، اُمید بہار رکھ'' کی بنیاد پر ایوانِ صدر سونپا جا سکتا ہے تو سیّد غوث علی شاہ کی قُربانیاں بھی کچھ کم نہیں البتہ رانا ثناء اللہ کو اِس کا ادراک نہیں ۔ جلتی پر تیل چھڑکنے کے ماہر رانا صاحب کی جب سے راجہ ریاض سے سنگت چھوٹی ہے ، اُن کی ''بونگیوں'' میں تیزی آ گئی ہے۔ وہ کبھی ایم کیو ایم سے ''پنگا'' لیتے ہیں تو کبھی پرویز خٹک کو ''تیلی پہلوان'' کہہ کر چھیڑتے ہیں۔ شاید رانا ثناء اللہ صاحب کے اندر کا ''جیالا'' ابھی تک زندہ ہے جو اُنہیں ایسی ''شُرلیاں'' چھوڑنے پر مجبور کرتا رہتا ہے ۔ اُنھوں نے فرمایا ''غوث علی شاہ صاحب پارٹی چھوڑ کر نواز لیگ کا نہیں بلکہ اپنا ہی نقصان کریں گے''۔ اگر شاہ صاحب کی 25 سالہ اٹوٹ رفاقت کا یہی صلہ ہے تو پھر وہ وقت دور نہیں جب ''گلیاں ہو جان

سُنیاں ، وِچ مرزا یار پھرے'' کے مصداق نواز لیگ میں رانا ثناء اللہ جیسے لوگ ہی باقی رہ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نواز لیگ کو رانا صاحب کی '' شُرلیوں'' سے محفوظ رکھے۔

APC ایک اور

جب رومیوں نے سرا کیوس شہر کا محاصرہ کر لیا تو اُس وقت ارشمیدس ساحلِ سمندر کی ریت پر مختلف آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر کوئی مسئلہ حل کرنے میں مگن تھا۔ایک رومی سپاہی تلوار بے نیام کیے اُس کے سر پر آن پہنچا۔ارشمیدس کو رومی سپاہی کی مداخلت نا گوار گزری ۔اُس نے سپاہی سے کہا ''میرے دائرے خراب مت کرو'' ۔رومی سپاہی نے اسے مخاطب کرکے کہا کہ وہ اسے قتل کرنے کے ارادے سے آیا ہے ۔تب ارشمیدس نے کہا''اُس وقت تک انتظار کرو جب تک میں یہ مسئلہ حل نہیں کر لیتا ''۔

حصولِ مقصد کے لیے ارشمیدس جیسی لگن اور جذبہ درکار ہوتا ہے جو ہم میں مفقود ہے ۔شاندار عمارتوں ، دریاؤں ، پہاڑوں ، مرغزاروں ، آبشاروں اور لہلہاتی کھیتیوں کے مجموعے کا نام ریاست نہیں ۔ریاست اپنا فرض پہچاننے ، مواقع سے فائدہ اُٹھانے اور اپنے دفاع کی صلاحیت رکھنے والے ایسے انسانوں کے مجموعے کا نام ہے جو سچائی کی خاطر سقراط کی طرح زہر کا پیالہ بھی ہنس کر پی لیں لیکن ہمارے ہاں تو سیاست ہے ، صرف سیاست ، ایسی سیاست جو صرف ذاتی مفادات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ نیتوں کے فتور نے ہمیں منزل سے کوسوں دور پھینک دیا ہے جبکہ ہمارے حکمران قوم کو بیوقوف بنانے کے لیے ''نشستن ، گفتن

برخاستن'' تک محدود ہیں۔ میاں نواز شریف صاحب کے خلوصِ نیت پر کسی کو شک نہیں۔اُن کے چہرے پہ چھائی گھمبیر سنجیدگی اُن کے کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی اُمنگ کا پتہ دیتی ہے۔1999ء کے میاں صاحب کہیں نظر نہیں آتے۔حضرت علیؓ کا قول ہے ''جب انسان اپنی عقل میں پختہ ہو جاتا ہے تو اُس کا کلام مختصر ہو جاتا ہے''۔میاں صاحب بھی اِن دنوں سُنتے سب کی ہیں لیکن تبصرے سے گریز کرتے ہیں۔اپنی تمام تر خوش نیتی کے باوجود اُنھوں نے مسائل کے حل کے لیے غلط راہوں کا انتخاب کیا ہے۔اُنھوں نے آئینی اور جمہوری ضابطوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کراچی میں دو دن تک ہر سیاسی جماعت، ہر طبقۂ فکر، حکومتی اداروں، ایجنسیوں اور میڈیا سے تفصیلی مشاورت کے بعد ''ٹارگٹڈ آپریشن'' کا گجر بجا دیا لیکن اپنی ساری کوششوں، کاوشوں اور نیتوں کو اُس شخص کے سپرد کر دیا جس کا ٹریک ریکارڈ انتہائی مایوس کُن ہے۔وہ پہلے بھی نام نہاد وزیرِ اعلیٰ تھے اور اب بھی اویس مظفر ٹپی ہی وزارتِ اعلیٰ کا سارا کاروبار اپنے دامن میں سمیٹے بیٹھے ہیں۔ٹپی صاحب کیقبضوں کی داستانیں کراچی کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔تو کیا قائم علی شاہ صاحب، اویس مظفر ٹپی سے بسم اللہ کرنے کی سکت رکھتے ہیں؟۔ دوسری طرف کراچی کے 85 فیصد حصے کی دعوے دار ایم کیو ایم نے فی الحال تو خرابیٔ حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے عسکری ونگ کو ''انڈر گراوٴنڈ'' کر دیا ہے اور شاید اسی بنا پر اُس نے بڑے دھڑلے سے کراچی کو فوج کے حوالے کرنے کا شور مچایا۔سوال مگر یہ ہے کہ کیا ایم کیو ایم

عسکری ونگ کے بغیر کراچی میں اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے؟۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایم کیو ایم فی الحال اپنی عسکری قوت کو محفوظ کرکے دیگر سیاسی جماعتوں کے عسکری ونگز پر ضربِ کاری کی خواہشمند ہو؟۔ اے این پی کا اپنا عسکری ونگ ہے اور اُمیدِ واثق ہے کہ اُس نے بھی اپنے مسلح افراد کو اِدھر اُدھر کر دیا ہوگا۔اِس کے علاوہ دینی جماعتیں بھی فرقہ بندیوں میں اُلجھ کر کراچی کے امن کو تہ و بالا کرتی رہتی ہیں۔اِن حالات میں تو ضرورت ہمت، حوصلے اور اچانک ایکشن کی تھی لیکن ہمارے مہربانوں نے تو کراچی میں قیام کے دوران پوری جُزیات کے ساتھ اپنا پلان ظاہر کر دیااور ہمارے "محبِ وطن" الیکٹرانک میڈیا نے سب کچھ کھول کے بیان کر دیا۔کیااِن حالات میں دہشت گردوں، بھتہ خوروں اور ٹارگٹ کلرز پر ہاتھ ڈالنا ممکن ہے؟۔اب جبکہ دہشت گرد خوب جانتے ہیں کہ کون، کب، کہاں اور کیسے ایکشن کرے گا، تو کیا وہ اتنے ہی فاتر العقل ہیں کہ رینجرز کا شکار ہونے کے لیے گھروں میں بیٹھے رہیں گے؟۔ کراچی کے حالات اتنے خراب کبھی بھی نہیں رہے جتنے اب ہیں۔اِس کے باوجود بھی نا اہل آئی جی کے تبادلے کی افواہ پر پیپلز پارٹی چیخ اُٹھی جس سے اُس کی نیت کا فتور ظاہر ہوتا ہے۔ایک طرف تو میاں صاحب خود کہتے ہیں کہ کراچی کی پولیس سیاست زدہ اور انتہائی نا اہل ہے جبکہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر آئی۔جی پولیس کو تبدیل کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ اگر ماضی میں شعیب سڈل کی قیادت اور نصیر اللہ بابر کی جرات سے کراچی میں امن ہو سکتا ہے

تو پھر یہ آپریشن ذوالفقار چیمہ کے سپرد کرنے میں کیا قباحت ہے؟۔ٹارگٹڈ آپریشن کے کپتان سید قائم علی شاہ سے پہلا سوال ہی یہ کیا جانا چاہیے تھا کہ وہ کراچی میں امن چاہتے ہیں یا اپنی سیاست چمکانا؟۔سوال یہ نہیں کہ یہ آپریشن کامیاب ہوتا ہے کہ نہیں، سوال یہ ہے کہ اگر یہ آپریشن ناکام ہو گیا تو اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہولناک خرابیوں کا ذمہ دار کون ہو گا؟۔

اگراِس ڈھیلے ڈھالے آپریشن سے کچھ دہشت گرد ہاتھ آ بھی گئے تو کچھ فائدہ نہیں کیونکہ اُن کے خلاف کوئی گواہی دینے کو تیار نہیں ہو گا۔اگر کوئی تیار ہوا بھی تو مار دیا جائے گا اور اگر گواہی دینے کے لیے بچ گیا تو دہشت گردوں کو سزائے موت تو ہو گی نہیں کیونکہ پچھلے پانچ سالوں سے کسی ایک قاتل کو بھی تختۂ دار پہ لٹکایا نہیں گیا اور میاں نواز شریف صاحب بھی اُسی پالیسی پر عمل پیرا ہیں ۔حکمت کی عظیم الشان کتاب کہتی ہے قصاص میں حیات ہے'' جبکہ ہماری این جی اوز اور سیکولر دانشور پھانسی کا نام سُنتے ہی'' آگ بگولہ ہو جاتے ہیں ۔این جی اوز کو تو ایسے ہی کاموں کے لیے یورپ ، امریکہ سے ڈھیروں ڈھیر بھیک ملتی رہتی ہے اِس لیے اُن کا شور مچانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن سیکولر دانشور شاید صرف اپنی دانشوری کا رعب جھاڑنے کے لیے ایسا کرتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں رواج یہ بھی ہے کہ جس عہدِ جہالت اور ابنِ حماقت کا چہرہ دینِ مبیں کی باتوں پر کھچ جاتا ہے اور جو واضح احکاماتِ الٰہی سے

روگردانی کرتا ہے، ہم اُسی کو بڑا دانشور سمجھتے ہیں۔اب جبکہ ہماری نیتوں میں فتور ہے، دہشت گردوں اور بھتہ خوروں کو اِس آپریشن کے بارے میں سب خبر ہے، کوئی گواہی کے لیے تیار نہیں اور قانون کے شکنجے میں آنے والوں کے لیے سزائے موت نہیں تو پھر کراچی میں امن کا خواب دیکھنا احمقوں کی جنت میں بسنے کے مترادف ہے۔

9 ستمبر کو ایک دفعہ پھر اے پی سی کا شور ہے۔ سوال مگر یہ ہے کہ اِس سے پہلے منعقد کی جانے والی ایسی کئی کانفرنسز محض وقت کا زیاں ثابت ہوئیں تو اب اِس کانفرنس سے قوم کو کیا فائدہ پہنچے گا؟۔ میاں صاحب نے محض چند دن پہلے کراچی میں کانفرنس منعقد کی اور اب پھر دہشت گردی کے خلاف اے پی سی منعقد کی جا رہی ہے جس میں طالبان سے مذاکرات یا اُن کے خلاف طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ سوال مگر یہ ہے کہ جب طالبان کے بارے میں اے پی سی کے شُرکاء کے خیالات میں بُعد المشرقین ہے تو پھر یہ اے پی سی کیسے ثمر آور ہو سکتی ہے۔ طالبان اپنے غیر ملکی آقاؤں کی شہ پر ہمہ وقت حکومتی رِٹ کو چیلنج کرتے نظر آتے ہیں جبکہ حکومت مُلتجیانہ رویہ اپنائے ہوئے ہے۔اگر مفاہمتی مذاکرات ہی کرنے تھے تو پھر لگ بھگ پچاس ہزار عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو طالبان کی بھینٹ چڑھانے سے پہلے ہی کر لیے جاتے۔اب اگر اِن دہشت گردوں کو پوری قوت سے کُچلا نہیں جاتا تو بہرحال اِن

پچاس ہزار شُہداء کی روحیں حکمرانوں سے روزِ قیامت اپنے خونِ ناحق کا حساب ضرور
طلب کریں گی۔

کھرا سچ نہیں سفید جھوٹ

میں نے پاکستانی سیاست پر ہمیشہ ہلکے پھلکے کالم لکھے ہیں اور تجزیوں ، تبصروں سے گریز کیا ہے لیکن بعض اوقات کوئی خبر پڑھ کر یا ٹاک شو دیکھ کر خون کھول اُٹھتا ہے اور قلم بے ساختہ ایسے جملے لکھ جاتا ہے جو مزاج کے خلاف ہوتے ہیں ۔ ہم لکھاریوں کی یہ مجبوری ہے کہ ہم نے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے ہی اپنے کالموں کا مواد تلاش کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اپنے آپ پر جبر کرکے ایسے ٹاک شوز بھی دیکھنے پڑتے ہیں جن میں سچائی بقدرِ اشکِ بُلبُل بھی نہیں ہوتی۔

ہمارے الیکٹرانک میڈیا کی بدولت کھمبیوں کی طرح اُگے اینکرز اب میزبان کم اور سیاست دان زیادہ ہو گئے ہیں ۔ لاریب بہت سے ٹاک شوز میں پاکستانیت جھلکتی ہے لیکن کچھ ٹاک شوز ایسے بھی ہیں جن کے ''کھرے سچ'' سفید جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں ۔ ہمارے ایسے ہی ایک مہربان کو کچھ اللہ کے بندوں نے رنگے ہاتھوں اُس وقت پکڑا جب وہ ایک ارب پتی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے بھیک کا خواستگار تھا۔اُس بھکاری نما بلیک میلر کی وڈیو تقریباً تمام نیوز چینلز پر بار بار نشر ہوتی رہی اور بالآخر موصوف کو نیوز چینل سے نکال دیا گیا

لیکن حیرت انگیز طور پر ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی ایک دوسرے معروف چینل نے اُسے سینے سے لگا لیا۔اب موصوف اُس نیوز چینل پر بڑے ''ٹھُسے'' سے ٹاک شوز کرتے ہیں اور صریحاً جھوٹ بول کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کے بارے میں لکھ کر اپنے قلم کو ہرگز آلودہ نہ کرتی لیکن مجبوری یہ آن پڑی کہ لینکر موصوف نے اُس ادارے کو بدنام کرنے کی کوشش کی جس کے بارے میں ہر کسی کے دل سے صرف دعائیں نکلتی ہیں۔ موصوف نے ریسکیو 1122 کے تین ڈسٹرکٹ ایمرجنسی آفیسرز کو اپنے پروگرام میں بلا کر ڈی جی ریسکیو ڈاکٹر رضوان نصیر کو بدنام کرنے کی سعی کی ۔اِن میں سے ایک آفیسر تو وہ ہیں جو ملتان میں ڈسٹرکٹ ایمرجنسی آفیسر تھے ۔اُنھوں نے لائف جیکٹس کے بغیر بچوں کو کشتی میں بٹھایا اور دَورانِ ٹریننگ حادثہ ہونے پر آٹھ بچے اپنی جانیں گنوا بیٹھے ۔ موصوف کے خلاف بَد عنوانی کی بھی کئی شکایات تھیں ۔ نہیں معلوم کہ اُس کے خلاف کوئی ایکشن ہوایا نہیں ۔اگر اُسے پہلے ہی نشانِ عبرت بنا دیا جاتا تو شاید نوبت یہاں تک نہ پہنچتی ۔ دوسرے صاحب کو پریشانی یہ تھی کہ اُس کا وہاڑی سے میانوالی میں کیوں ٹرانسفر کیا گیا۔ موصوف کے خلاف بھی بہت سی شکایات تھیں۔ تیسرے صاحب میانوالی میں اپنا ہسپتال کھولے بیٹھے تھے DG صاحب نے تحریری طور پر DCO۔ موصوف کی بد کلامی کا یہ عالم ہے کہ میانوالی کے صاحب اُن کے خلاف تادیبی DG ریسکیو کو موصوف کے خلاف شکایت کی ۔اگر کارروائی کر رہے تھے تو کیا غلط کر رہے تھے ؟۔اِن اصحاب نے دیگر اضلاع کے

ڈسٹرکٹ ایمرجنسی آفیسرز کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی بھرپور کوشش کی لیکن کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔کیا اینکر صاحب کی یہ خواہش ہے کہ ایسی "گندی مچھلیوں" کی وجہ سے سارا تالاب گندا کر دیا جائے ؟۔

حقیقت یہ ہے کہ سچائی کے علمبردار اینکر موصوف کو اِن آفیسرز کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی ۔دراصل یہ حُبِ علیؓ نہیں ،بُغضِ معاویہؓ کا کھُلا اظہار تھا۔حقیقت یہ ہے کہ موصوف کو مسلم لیگ نواز سے اللہ واسطے کا بیر ہے اور وہ حکومتی اداروں کو بدنام اور بلیک میل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔پہلے وہ "ینگ ڈاکٹرز ایسوسی ایشن" کے نوجوان ڈاکٹرز کو جھانسا دے کر حکومت کو بدنام کرنے کی خاطر کئی پروگرام کر چکے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ قوم کا سرمایہ یہ نوجوان ڈاکٹر اب خدمتِ خلق میں مصروف ہیں اور یہ حکومت کا بھی فرضِ عین ہے کہ وہ اِن کی اَشک شوئی کے لیے ہر ممکن تدبیر کرے ۔ینگ ڈاکٹرز سے مایوس اینکر موصوف اب ریسکیو 1122 کے چند باغیوں سے مِل کر اُس ادارے پر کیچڑ اچھال رہے ہیں جو عوام کی اُمنگوں کا محور و مرکز ہے ۔ایک لکھاری ہونے کے ناطے میں عوام کی اِس ادارے کے ساتھ عقیدت سے بخوبی آگاہ ہوں۔اِس ادارے نے اپنی محیر العقول کارکردگی کی بنا پر لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا اور اِس تسخیرِ قلب کا سہرا بِلا شبہ ادارے کے سربراہ ڈاکٹر رضوان نصیر کے سر ہے جنھوں نے پنجاب میں ریسکیو 1122 کا خواب دیکھا اور آج وہ اِس

خواب کو حقیقت میں بدل کر لوگوں کی دعائیں سمیٹ رہے ہیں ۔اِس دھرتی پر مجبور و مقہور اور راندہ درگاہوں کو ہمیشہ حشرات الارض سمجھ کر کُچلا گیا۔ریسکیو 1122 واحد محکمہ ہے جو صبح و مسا انہی بے کَسوں کی خدمت میں مصروف ہے۔ شاید لہٰنکر موصوف کو محکمے کی یہ ادا پسند نہیں آئی ۔اسی لیے وہ ''سفید جھوٹ کو، کھرے سچ'' کا لبادہ اڑھا کر پھَٹ پڑے لیکن قوم پرِاس کا کچھ اثر نہیں ہونے والا کیونکہ اِس محکمے کی قابلِ ستائش کارکردگی قوم کے سامنے ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ آوازِ خلق نقارۂ خُدا ہوتی ہے اِس لیے بِلا خوفِ تردید کہہ سکتی ہوں کہ

'' آوازِ سگاں کم نہ کُند رزقِ گدارا''

یہ محکمہ انشا اللہ تمام آلائشوں سے پاک اسی طرح سے ترقی کرتا رہے گا اور ہم فخر سے کہتے رہیں گے کہ پاکستان میں ریسکیو 1122 کی صورت میں بین الا قوامی معیار کا کم از کم ایک ادارہ ضرور موجود ہے

لہٰنکر موصوف ''لائیو کال'' پر ڈی جی ریسکیو ڈاکٹر رضوان نصیر سے سوال کر رہے تھے اور حسبِ عادت ڈی جی صاحب کو جواب کا موقع دیئے بغیر انتہائی چالاکی سے معاملے کو اُلجھاتے چلے جا رہے تھے۔جو لوگ موصوف کا پروگرام دیکھتے رہتے ہیں وہ تو اُن کے طریقۂ واردات'' سے بخوبی آگاہ ہیں لیکن شاید''

ڈاکٹر رضوان نصیر آگاہ نہیں تھے۔ اُنہیں یقیناً اپنی اِس غلطی کا احساس ہوا ہو گا کہ اُنہیں ایسے ٹاک شو کا حصہ ہی نہیں بننا چاہیے تھا جہاں اینکر محض بدنام کرنے کے لیے بیٹھے ہوں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے آقا ﷺ کا تو یہ حکم ہے کہ "جب کوئی شخص بات کر رہا ہو تو اُس کی بات غور سے سُنو اور درمیان میں مَت ٹوکو"۔ لیکن ہمارے کچھ "چھاتہ بردار" اینکرز مہمان کو بات کرنے کا موقع نہ دے کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کی جیسے انہوں نے ہمالیہ سَر کر لیا۔ یہ اینکر موصوف بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ محترم کا اندازِ گفتگو ایسا ہے کہ سَر شرم سے جھُک جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک ٹاک شو میں وہ ایک راندۂ درگاہ سیاستدان کو خوش کرنے کی خاطر نو منتخب صدرِ مملکت سید ممنون حسین کے بارے میں طنزاً فرما رہے تھے "میں لاہور اور پنڈی سے دہی بھلے کی ریسیپی تلاش کر رہا ہوں تاکہ اگر کبھی ایوانِ صدر جانا پڑے تو مجھے دہی بھلے بنانے کا طریقہ آتا ہو"۔ موصوف کو یہ تو علم ہی ہو گا کہ صدر قوم کے باپ کی مانند ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے باپ کے کاروبار کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کرے اُس سے خیر کی توقع عبث ہے۔ اگر سیّد ممنون حسین دہی بھلے بنا کر بیچتے رہے ہیں تو کیا دہی بھلے بیچنا گالی ہے؟۔ کسی ارب پتی کے دَر کا بھکاری بن کر اپنی غیرت و حمیت کا سودا کرنے سے تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ سُنتِ رسول ﷺ پر عمل کرتے ہوئے اپنے بچوں کے لیے رزقِ حلال تلاش کیا جائے؟۔

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے ”روٹی کا ٹکڑا اور معمولی کپڑا اگر خیر و عافیت سے ملتا رہے تو اُس عیش سے بہتر ہے جس کے بعد ندامت اُٹھانی پڑے“۔ لیکن ہمارے ہاں تو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا سرے سے کوئی رواج ہی نہیں ۔ ہماری سیاسی ، سماجی ، معاشی اور معاشرتی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جہاں نمود و نمائش کو لازمۂ حیات نہ سمجھا جاتا ہو ۔ یوں تو سبھی محبِ وطن ہیں لیکن اگر اعمال پہ نظر دوڑائی جائے تو وطنِ عزیز کی محبت کا کوئی پرتو، کوئی قرینہ ، کوئی سلیقہ نظر نہیں آئے گا۔ ہمارے ہاں سیاست کاروبار میں ڈھل چکی ہے اور رہبرانِ قوم اِس ”عظیم کاروبار“ سے بھرپور لطف اندوز ہو رہے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ جب سیاسی طاقت چھِن جاتی ہے تو باقی ندامت ہی ندامت ۔ لیکن ہمارے مہربانوں نے تو ندامت کو بھی سیادت سمجھ لیا ہے ۔اِس قحط الرجال میں کوئی قلم ، کوئی زبان اور کوئی ہاتھ ایسا نظر نہیں آتا جو ہمارے اِن ”سیاسی کاروباریوں“ کو صراطِ مستقیم کی تلقین کرتا نظر آئے ۔ لے دے کے الیکٹرانک میڈیا کا بھروسہ تھا لیکن وہاں بھی اب صرف کاروبار ہی

نظر آتا ہے۔ آقا ﷺ کا فرمان ہے ''پیٹ سے بڑھ کر بدترین کوئی برتن نہیں''۔ مگر ہمارے ہاں تو حکمرانی ہی پیٹ کی ہے اور ہمارے اینکرز آتشِ شکم کی سیری کے لیے ریٹنگ بڑھانے کے چکر میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جس کا حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ریٹنگ کے چکر میں اب ہر نیوز چینل پہ تحقیق و تفتیش بھی ہوتی ہے، عدالتیں بھی لگتی ہیں اور جزا و سزا کا تعین بھی کیا جاتا ہے۔

دوسری طرف اِس نفسا نفسی کے عالم میں کسی کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ نیوز چینلز پر کہی گئی باتوں کی تصدیق کر سکے۔ جس طرح ہمارے علمائے کرام مساجد میں بیٹھ کر دین کی جو تشریح و تعریف کرتے ہیں، مبتدی اُسی پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لے آتے ہیں اور اسی سبب دینِ مبیں فرقوں اور گروہوں میں بٹ گیا ہے اسی طرح ہمارے اینکرز جو کچھ کہتے ہیں، قوم اُسی پہ اعتبار کر لیتی ہے۔ معروف مورخ ابنِ خلدون نے کہا ''جس ملک میں قبیلے بکثرت اور اہلِ عصبیت بہتات کے ساتھ ہوتے ہیں وہاں سلطنت کو کامل استحکام نصیب نہیں ہوتا''۔ اگر ابنِ خلدون اِس دَور میں ہوتا تو یقیناً وہ قبیلوں اور اہلِ عصبیت کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا کو بھی شامل کرتا۔ تسلیم کہ وطنِ عزیز میں آج بھی کچھ لوگ آبروئے صحافت کے علمبردار ہیں لیکن اِس بحرِ بے کنار میں بقدرِ قطرہ شبنم باقی سب ریٹنگ ہی ریٹنگ۔

آزاد اور بیباک اینکرز یہ سمجھتے ہیں کہ اُن سے بڑھ کر کون ہے جو امورِ مملکت بطریق احسن سرانجام دے سکے ؟۔ سیاست ، ثقافت ، معاش ، معاشرت ، طِب، سائنس ، ٹیکنالوجی اور امورِ داخلہ اور خارجہ کے اِن ماہرین کی صلاحیتوں سے مستفید نہ ہونا حکمرانوں کی نا اہلی کے زمرے میں آتا ہے لیکن ہماری ہر حکومت اِن کی صلاحیتوں سے بے بہرہ ہی رہی ۔ مشہور ایرانی شاعر ابنِ یمین کہتا ہے ''اے ابنِ یمین ! تُف ہے اُس مقام پر جہاں دو سو داناؤں کی قیمت ایک احمق سے بھی کم ہو'' ۔ ہمارے اینکرز کو بھی شاید یہی دُکھ ہے اور اسی وجہ سے عالمِ غیض میں وہ خوش اخلاقی کا دامن چھوڑ کر کھری کھری سناتے رہتے ہیں حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وجہ وجودِ کائینات ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو خوش اخلاق ہو اُس کے لیے جنت کے اعلیٰ درجے میں ایک گھر کا میں ضامن ہوں''۔

آجکل الیکٹرانک میڈیا کا موضوع کراچی اور اسلام آباد میں بلائی گئی آل پارٹیز کانفرنسز اور وفاقی کابینہ کے غیر معمولی اجلاس پر تنقید و تنقیص ہے لیکن ریٹنگ بڑھانے کے شوقین اینکرز کا دُکھ یہ ہے کہ اب تحریکِ انصاف سمیت تمام سیاسی جماعتیں ایک ہی ایجنڈے پر متفق نظر آتی ہیں اور فوج بھی اُن کا بھرپور ساتھ دینے کے لیے مستعد ہے اس لیے کسی بھی ٹاک شو میں بلائے گئے

مہمان باہم جوتم پیزار نظر نہیں آتے اور ظاہر ہے کہ اگر مہمانوں کے مابین تلخ کلامی نہیں ہو گی تو ریٹنگ کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔اِس ریٹنگ کو بڑھانے کے لیے ہمارے کچھ اینکرز نے اب یہ راہ نکالی ہے کہ اِدھر اُدھر سے غلط سلط مواد اکٹھا کرکے پروگرام ترتیب دینے شروع کر دیئے ہیں۔ پچھلے دنوں دو معروف نیوز چینلز پر ریسکیو 1122 کی کارکردگی کے بارے میں ٹاک شوز دیکھنے کا موقع ملا۔اِن ٹاک شوز کو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں بنا ہوا ریسکیو 1122 کی عظمتوں کا محل دھڑام سے نیچے آ گرا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ پاکستان میں کوئی ایک محکمہ یا ادارہ بھی ایسا نہیں جس کی صلاحیتوں پر ناز کیا جا سکے۔ لیکن جب میں نے حقائق کی جستجو کی تو پتہ چلا کہ سچ وہ نہیں جو اِن اینکرز نے پیش کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ محکمہ چھوٹی موٹی خامیوں کے باوجود آج بھی ڈی جی ریسکیو ڈاکٹر رضوان نصیر صاحب کی سربراہی میں قومی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی بھرپور صلاحیتیں صرف کر رہا ہے البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ محکمے کے اندر کچھ ایسی "کالی بھیڑیں" گھُس آئی ہیں جو مستقبل میں اِس محکمے کے لیے زہرِ ہلاہل ثابت ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر رضوان نصیر کا جُرمِ عظیم یہ ہے کہ اُنہوں نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار پنجاب ایمرجنسی سروسز" کی صورت میں ایک ایسا سیٹ اَپ ترتیب "

دینے کی سعی کی جو خالصتاً عوامی خدمت کے لیے تھا اور یہی نہیں بلکہ اُسے بین الاقوامی معیار تک بھی لے گئے۔ شاید اسی احساسِ جرم نے اُنہیں اینکر کے سامنے انتہائی جذباتی بھی کر دیا۔ اینکرز صاحب جو سوالات کر رہے تھے اُن کی معقولیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے ایک سوال یہ بھی کیا کہ ایمبولینسز کے اندر "وینٹی لیٹرز" کی کیا ضرورت تھی جب کہ اُنہیں کبھی استعمال ہی نہیں کیا گیا؟۔ ڈاکٹر صاحب نے بتکرار و اصرار یہ کہا کہ وینٹی لیٹرز استعمال ہو رہے ہیں لیکن اینکر اپنی ضد پہ قائم رہے۔ مانا کہ وینٹی لیٹر کے استعمال کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی لیکن اگر ضرورت پیش آ جائے اور مریض وینٹی لیٹر کی عدم موجودگی کی بنا پر مَر جائے تو کیا اینکر موصوف اُس کے قتل کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہونگے؟۔ موصوف نے محکمے سے نکالے گئے تین باغی ڈسٹرکٹ ایمرجنسی آفیسرز کی ملی بھگت سے مریض کا بہانہ بنا کر ایک ایمبولینس منگوائی اور بعد ازاں اُس ایمبولینس کے اندر موجود سامان کی ویڈیو بنا کر اپنے ٹاک شو میں دکھائی۔ سوال یہ ہے کہ کیا پبلک پراپرٹی کے اِس غلط استعمال پر اینکر موصوف کے خلاف تادیبی کارروائی نہیں ہونی چاہیے؟۔ اُنھوں نے باغی آفیسرز کے اِس تخمینے کو بھی تسلیم کر لیا کہ وینٹی لیٹر، کارڈیک مانیٹر اور Defibrillator کے علاوہ زندگی بچانے والے بہت سے قیمتی سامان کی مالیت محض اڑھائی لاکھ روپے ہے لیکن اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ بازار سے اِن کی مالیت کا خود تخمینہ لگا لیتے۔

اُنھوں نے یہ تو فرما دیا کہ بازار میں چائینہ سے منگوائی گئی ویگن بیس بائیس لاکھ میں ملتی ہے جبکہ ڈاکٹر رضوان نصیر نے یہ ویگن 44 لاکھ میں منگوائی لیکن یہ نہیں بتلایا کہ ویگن کو ایمبولینس میں تبدیل کرنے اور اُس میں زندگی بچانے والے انتہائی قیمتی آلات کی انسٹالیشن پر کتنے اخراجات ہوتے ہیں۔کیا ڈاکٹر رضوان نصیر صاحب کا قصور یہ ہے کہ اُنھوں نے باہر سے کروڑوں روپے مالیت کی ایمبولینس منگوانے کی بجائے ویگن کی قیمت سمیت محض چوالیس لاکھ میں ویگن کو ایمبولینس میں تبدیل کرنے کی کامیاب سعی کرکے قیمتی زرِ مبادلہ بچانے کی کوشش کی ؟۔اینکر موصوف کو یہ گلہ بھی ہے کہ بچپا سی فیصد سامان کا ٹھیکہ "احمد میڈکس" کو کیوں دیا گیا ؟۔ سوال مگر یہ ہے کہ اگر احمد میڈکس کے ریٹس سب سے کم تھے تو کیا ٹھیکہ زیادہ ریٹس والی کمپنی کو دیا جاتا ؟۔آخر میں صرف اتنی استدعا ہے کہ اگر کوئی محکمہ تا حال کرپشن سے پاک ہے اور اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لا رہا ہے تو اُس کی کارکردگی پر محض ریٹنگ بڑھانے کی خاطر اُنگلیاں اٹھا کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

آؤ! آپریشن، آپریشن کھیلیں

شہر قائد میں آپریشن جاری ہے، رینجرز اپنی بھرپور توانائیاں صرف کر رہے ہیں اور صدیوں کا تجربہ رکھنے والے سید قائم علی شاہ نے سارا محکمہ پولیس اُلٹ پُلٹ کر کے رکھ دیا اور الیکٹرانک میڈیا دھڑا دھڑ ٹارگٹڈ آپریشن کی بریکنگ نیوز جاری کر رہا ہے۔ ہمارے اینکرز کی بھی آجکل چاندی ہو گئی ہے کیونکہ اور کوئی موضوع ہو نہ ہو کراچی ٹارگٹڈ آپریشن کا موضوع تو ہے ہی۔ روشنیوں کے شہر میں اگر اب بھی روشنیاں نظر نہیں آتیں تو یہ قصور رمرکزیا سندھ حکومت کا نہیں بلکہ KESC کا ہے جو شہر قائد کو بجلی فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ اگر بجلی ہوتی تو جگمگ کرتا کراچی بھی نظر آنے لگتا۔ یہ تو بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ ٹارگٹڈ آپریشن کی بدولت امن کی فاختہ چونچ میں زیتون کی شاخ لیے کراچی کی فضاؤں میں امن اور شانتی کے گیت گانے آن پہنچی ہے اور اِس امن کا سہرا اُن ٹارگٹڈ کلرز، بھتہ خوروں، دہشت گردوں قبضہ گروپوں اور پرچی مافیاکے سر ہے جن میں سے کچھ مری، سوات، کاغان، اور کالام میں اپنی سالانہ چھٹیاں منانے چلے گئے اور کچھ وزیرستان، پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں اپنے عزیز و اقارب کو ملنے اور پاکستان کی سیر کرنے جا چکے

ہیں۔ شاید مرکز اور سندھ نے اِن بھتہ خوروں اور ''ماہر نشانے بازوں'' کی سالانہ تعطیلات کو مدِ نظر رکھ کر ہی یہ آپریشن ترتیب دیا ہو گا۔ اسی لئے ہمارے محترم وزیرِ داخلہ بڑے فخر سے سینہ تان کر یہ کہتے پھرتے ہیں کہ سارے ٹارگٹ کلرز کو پتہ چل گیا ہو گا کہ اب پاکستان میں اُن کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں بچی اور اُن کی واپسی کے سارے راستے مسدود کر دیئے گئے ہیں۔ وزیرِ داخلہ صاحب کے فرمان پہ سبھی سرِ تسلیم خم کیے بیٹھے ہیں۔ پیپلز پارٹی تو خود اِس آپریشن کا حصّہ ہے اِس لیے وہ خاموش ہے جبکہ تحریکِ انصاف خیبر پختونخواہ میں اِس بُرے طریقے سے پھنس چکی ہے کہ اب اُس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں اور ایم کیو ایم 1992ء میں ہونے والے آپریشن کی بنا پر اتنی سہمی ہوئی ہے کہ اب آپریشن کا نام سُنتے ہی اُس کی ''بولتی'' بند ہو جاتی ہے۔ رہی اے این پی، تو اُس بیچاری کے دامن میں ہے ہی کیا جس کے بَل پر وہ ''چوں چاں'' کرے۔ اِس لیے نواز لیگ کے لیے راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔

کراچی آپریشن سے پہلے تین ماہ تک اُس کی نوک پلک سنواری جاتی رہی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حکومتِ وقت کا انتہائی مدبرانہ اقدام تھا کیونکہ اسی تدبیر کی بدولت 33,000 سے زائد مجرمین کو اِدھر اُدھر کرنے میں حکومت کو بھرپور کامیابی ملی اور کراچی آپریشن کا پہلا فیز پُر امن طریقے سے مکمل ہو گیا۔ اگر حکومتِ وقت یہ مدبرانہ انداز اختیار نہ کرتی تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ

پولیس اور رینجرز کے 27,000 آفیسر اور جوان 33,000 "اپنے لوگوں" کا مقابلہ کر پاتے ۔ٹارگٹ کلرز اور بھتہ خوروں کی غالب اکثریت تو سالانہ تعطیلات پہ چلی گئی البتہ احمقانہ حد تک دلیر ظفر بلوچ ڈٹا رہا اور جان گنوا بیٹھا۔ بہتر ہوتا کہ ظفر بلوچ بھی عزیر بلوچ کے ساتھ دبئی کھسک لیتا اور آج زندہ ہوتا۔اب ظفر بلوچ کے والد نے ایم کیو ایم کے نبیل گبول کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کروا دیا ہے۔ گوجرانوالہ کے پہلوانوں سے مشابہت رکھنے والے نبیل گبول نے قوم پر اپنی بزدلی عیاں کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ تو چیونٹی تک کو نہیں مار سکتے بھلا ظفر بلوچ جیسے "دبنگ" کو کیسے ماریں گے ؟۔اُدھر میں ایم کیو ایم کے خلاف FIR باہر بیٹھے الطاف بھائی کو نبیل گبول کے خلاف کٹوائی گئی سازشوں کی بُو بلکہ بدبو محسوس ہونے لگی ہے۔اُنہوں نے فی الحال کوئی "بڑھک" تو نہیں لگائی لیکن اُمیدِ واثق ہے کہ عنقریب ہم الطاف بھائی کی" سلطان راہی مارکہ" بڑھکوں سے مستفید ہو سکیں گے۔

جو سینکڑوں لوگ گرفتار کیے گئے وہ یا تو ہیں ہی بے گناہ یا پھر ندیم ہاشمی کی طرح دو چار دنوں میں بے گناہ قرار دے دیئے جائیں گے اور اِس طرح سے کراچی آپریشن بطریق احسن اختتام پذیر ہوگا۔اِس آپریشن کے بعد "پردیسی" بھی اپنے دیس لوٹ آئیں گے اور الیکٹرانک میڈیا "اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما" جیسی بریکنگ نیوز سے سج جائے گا ۔فی الحال الیکٹرانک میڈیا کے پاس

کوئی ''سچی مچی'' کی بریکنگ نیوز نہیں اِس لیے مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے فنکشنل لیگ کی ایم پی اے نصرت سحر عباسی اور پیپلزپارٹی کی ڈپٹی سپیکر شہلا رضا کے مابین سندھ اسمبلی میں ''تُوتُو، مَیں مَیں'' جیسی بریکنگ نیوز ہی چل رہی ہیں۔ سندھ اسمبلی کے اجلاس میں نصرت سحر عباسی متواتر بولتی چلی جا رہی تھیں اور کرسیٔ صدارت پہ جلوہ افروز شہلا رضا کی تنبیہ کے باوجود خاموش ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ جس پر شہلا رضا کا میٹر بھی گھوم گیا اور پھر اراکینِ اسمبلی دونوں خواتین کی تُو تکار سے لطف اندوز ہونے لگے۔ شہلا رضا کے ہاتھ میں چونکہ اختیار کی تلوار تھی اِس لیے اُنھوں نے نصرت سحر عباسی کو نکال باہر کیا۔ اچھی بھلی عقلمند شہلا رضا کو اتنا تو علم ہونا چاہیے تھا کہ عورتیں جب بولنا شروع کرتی ہیں تو بولتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اُنہیں یہ بھی مدِّ نظر رکھنا چاہیے تھا کہ خواتین کے ازلی ابدی دشمن مرد حضرات اِس تُوتُو، مَیں مَیں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اِس لیے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح لڑکیاں تعلیمی میدان میں ہر جگہ لڑکوں کو پچھاڑ رہی ہیں اُسی طرح سیاسی میدان بھی بالآخر اُنہی کے ہاتھ رہے گا اور وہ وقت قریب ہے جب مرد کنگھی چوٹی اور میک اپ کرکے گھر بیٹھیں گے اور خواتین امورِ مملکت سَرانجام دیں گی۔ ویسے بھی میدانِ سیاست میں ہمارے مَردوں نے ہمیشہ ''مُردوں'' کا سا کام ہی کیا ہے اور ہمارے تو ''کمانڈو'' صاحب بھی ڈرتے ورتے کسی سے نہیں تھے

سوائے موت یعنی امریکہ کے اور یہی حال ہمارے ”آنے جانے“ والے جمہوری رہنماؤں کا ہے۔اِس لیے اگر مردوں کی حکمرانی کی بجائے ”عورت راج“ قائم کر دیا جائے تو وہ یقیناً ثمر آور ثابت ہو سکتا ہے۔ آنے والے حالات کی فضاؤں میں بُو سونگھتے اور موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے جنابِ آصف زرداری نے بھی اب بلاول کی بجائے آصفہ زرداری پر اپنی توانائیاں صرف کرنا شروع کر دی ہیں اور اُدھر میاں نواز شریف صاحب نے بھی حسن اور حسین نواز کو کاروبار میں لگا کر مریم نواز کو خارزارِ سیاست سے روشناس کرانے کی ٹھان لی ہے۔البتہ اگلے وقتوں کی ڈور سے بندھے شہباز شریف ابھی تک حمزہ اور سلیمان شہباز پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چھوٹے میاں صاحب اسم با مسمّٰی بننے کے چکر میں یہ سب کچھ کر رہے ہوں۔شہباز کی اُڑان ہمیشہ اونچی اور ”وکھری ٹائپ“ کی ہوتی ہے اور چھوٹے میاں صاحب کا بھی ہر کام انوکھا اور وکھری ٹائپ کا ہی ہوتا ہے اور یہ جو تحریکِ انصاف کے میاں محمود الرشید نے کہا ہے کہ میاں شہباز شریف وزیرِ اعظم بننے کی ریہرسل کر رہے ہیں، یہ دراصل میاں محمود الرشید کے اندرونی خوف اور شدید خواہش کی غمازی کرتا ہے ۔ محمود الرشید چاہتے ہیں کہ خادمِ اعلیٰ ، خادمِ اعظم بن جائیں اور اُنہیں پنجاب کی سیاست میں چھوٹے میاں صاحب جیسے ”ہمالیہ“ سے ٹکرانا نہ پڑے لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ خادمِ اعلیٰ تو اب بھی میاں نواز شریف صاحب کو باپ کا درجہ دیتے ہیں اِس لیے میاں محمود الرشید کی

یہ خواہش نا تمام ہی رہے گی۔

کہتے ہیں جس کو عشق

صرف ہمارے وزیرِ اعظم اور محترم عمران خاں ہی ''مبتلائے عشقِ طالبان''نہیں بلکہ حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے طالبان بھی اپنی محبوبانہ ضد اور ناز و انداز میں کسی سے کم نہیں گویا'' دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی'' ۔ شنید ہے کہ طالبان نے اپنے عاشقان کے عشق کی صداقتوں کو پرکھنے کے لیے 35 شرائط رکھی ہیں حالانکہ

کوئی شرط ہوتی نہیں پیار میں
مگر پیار شرطوں سے تم نے کیا

عشق کے اِس امتحان میں عمران خاں تو پورے اترتے دکھائی دیتے ہیں لیکن میاں نواز شریف نہیں کیونکہ سانحہ پشاور چرچ کے باوجود خاں صاحب اپنے ''محبوبان'' کو دفتر کھول کر دینے کے لیے بے قرار ہیں اور اگر خاں صاحب سے طالبان کے معاندانہ رویے کا ذکر کیا جائے تو وہ لال پیلے ہو کر کہتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اب پشاور میں سول سیکرٹریٹ کے ملازمین کی بس پر طالبان کے حملے میں بیس ملازمین کی شہادت پر خاں صاحب کو چاہیے کہ خیبر پختونخواہ کا وزیرِ اعلیٰ ہاؤس طالبان کے حوالے کر دیں تاکہ مذاکرات کی راہ ہموار ہو سکے۔ دوسری طرف میاں صاحب کا رویہ بزبانِ غالب کچھ یوں ہے کہ

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

اب اُنھوں نے دو ٹوک کہہ دیا ہے کہ طالبان پہلے ہتھیار پھینک کر آئینِ پاکستان کو تسلیم کریں، تبھی مذاکرات ہو سکتے ہیں۔ البتہ طالبان کو میاں صاحب سے وقتی جدائی بھی گوارا نہیں۔ میاں صاحب نے ''عزمِ چین'' کیا تو طالبان کو یہ جُدائی ایک آنکھ نہ بھائی اور اُنھوں نے چینی سیاحوں کو قتل کر کے اپنے دُکھ کا اظہار کر دیا۔ پھر میاں صاحب نیویارک کے لیے عازمِ سفر ہوئے تو لگ بھگ ایک سو مسیحی بھائی اِس عشق کی بھینٹ چڑھ گئے۔ نیویارک میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں میاں صاحب کے خطاب سے چند گھنٹے قبل طالبان نے پشاور سول سیکرٹریٹ کے 20 ملازمین کو اِس عشق کی بھینٹ چڑھا دیا۔ میاں صاحب اب غالباً 30 ستمبر کو واپس آ رہے ہیں اِس لیے میری تجویز ہے کہ پورا ملک ایئر پورٹ پہنچ کر خدمتِ عالیہ میں دست بستہ یہ استدعا کرے کہ اب اگلے پانچ سال تک وہ کسی بیرونی دورے پر نہ جائیں تاکہ طالبان کے اِس انوکھے

اظہارِ عشق سے محفوظ رہا جا سکے۔ لیکن شنید ہے کہ ''ضدّی'' میاں صاحب اکتوبر کے آخری ہفتے میں پھر تھائی لینڈ کے دورے پر جا رہے ہیں اِس لیے ابھی وقت ہے کہ قوم حفاظتِ خوداختیاری کا معقول بندوبست کر لے۔ رہبرانِ قوم کی حفاظت کے لیے کی جانے والی پولیس کی انتہائی مصروفیات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے قوم ٹوٹا پھوٹا بندوبست تو پہلے بھی کر ہی رہی ہے لیکن اب معقول بندوبست کرنا ہو گا کیونکہ طالبان کو بہت سے ''بَلی کے بکروں'' کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ہم نے جو کہنا تھا، کہہ دیا ''پھر نہ کہنا، ہمیں خبر نہ ہوئی''۔

لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ میاں برادران اور کپتان صاحب کے مابین سیاسی رقابت ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ عاشقانہ رقابت ہے۔ اسی لیے خاں صاحب اپنے رقیبانِ روسیاہ پر گرجتے برستے رہتے ہیں اور اسی رقابت میں بیچارے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو بھی رگڑا دیتے رہتے ہیں۔ ویسے تو خیر مولانا صاحب اتنے بیچارے بھی نہیں۔ وہ بھی جب دل کی بھڑاس نکالنے پہ آتے ہیں تو ''لمبی لمبی چھوڑتے'' ہیں لیکن خاں صاحب کا مقابلہ پھر بھی نہیں کر سکتے کیونکہ خاں صاحب بلا امتیاز گرجتے اور بلا خوف برستے ہیں جبکہ مولانا صاحب اپنا مستقبل محفوظ کرنے کی خاطر کبھی کبھی طرح بھی دے جاتے ہیں اور میاں نواز شریف تو جواب ہی نہیں دیتے۔

جب سے سپریم کورٹ نے کپتان صاحب کو توہینِ عدالت کیس سے بری کیا ہے تب سے قوم کو یہ پتہ چل گیا کہ آئین اور قانون کی رو سے لفظ ''شرمناک'' گالی نہیں ہے اِس لیے اب خاں صاحب سینہ تان کے اِس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔چرچ پر حملے کے چھ، سات گھنٹے بعد غصّے سے ''لال بھبھوکا'' عمران خاں نے فرمایا ''اُن لوگوں کو شرم آنی چاہیے جو اِس حملے پر سیاست کر رہے ہیں''۔اُنہوں نے یہ کہہ کر مخالفین کے مُنہ بند کر دیئے کہ اِس سے پہلے بھی پشاور میں 210 حملے ہو چکے ہیں۔گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر 210 حملوں کے باوجود بھی پشاور قائم و دائم ہے تو اِس حملے پر کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔یہاں کپتان صاحب کے مخاطب اے این پی کے میاں افتخار تھے جو خود کُش حملے کے بعد جائے وقوعہ پر سب سے پہلے پہنچے۔یہ وہی ہیں میاں افتخار ہیں، جن کا اکلوتا جوان بیٹا طالبان کی بھینٹ چڑھا۔اُنہوں نے مسیحی برادری سے اظہارِ یکجہتی کرتے ہوئے چند جملے کہے جن پر عمران خاں بھڑک اُٹھے۔دراصل خیبر پختونخواہ کے بے تاج بادشاہ، عمران خاں یہ اپنا آئینی اور قانونی حق سمجھتے ہیں کہ اُن کے معاملات میں دخل اندازی نہ کی جائے اسی لیے اُنہیں یہ مداخلتِ بے جا پسند نہیں آئی۔

اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ خاں صاحب آجکل کچھ

بوکھلائے بوکھلائے سے ہیں۔ وہ الیکشن سے پہلے 90 بلکہ 9 دنوں میں ملک سنوارنے کا دعویٰ تو کر بیٹھے لیکن 100 دنوں میں ایک چھوٹے صوبے کی افراتفری پر بھی قابو نہ پاسکے۔اُدھر نیٹو کنٹینرز بھی اُن کے سینے پر مونگ دلتے ہوئے دھڑا دھڑ گزر رہے ہیں اور ڈرون لہراتے، بَل کھاتے اُنہیں ''شرم'' دلا رہے ہیں اِسی لیے وہ بات، بے بات بھڑک اُٹھتے ہیں۔ اب اُنہوں نے فرمایا ہے کہ 180 دنوں میں قوم کو خیبر پختونخواہ میں واضح تبدیلی نظر آنے لگے گی۔اب پتہ نہیں اِن 180 دنوں میں گزرے 100 دن بھی شامل ہیں یا پھر ''ٹِڈوں سُڈوں پَیل'' یعنی نئے سرے سے گنتی ہو گی۔ بہرحال واضح تبدیلی کا ایجنڈا پیش کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا کہ وہ پٹواریوں کو سیدھا اور تھانیداروں کو مسلمان کر دیں گے۔جس طرح خادمِ اعلیٰ بیوروکریٹس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑے ہوئے ہیں اسی طرح کپتان صاحب کا ٹارگٹ پٹواری اور تھانیدار ہیں۔ جَل بھُن کے کباب ہوا ایک پٹواری کہہ رہا تھا کہ ہم ٹارگٹ ہیں اور ''ٹارگٹ کلر'' عمران خاں۔ کپتان صاحب نے پٹواریوں کو سیدھا کرنے کی بات تو خوب کہی لیکن یہ ہمارے علم میں بھی نہیں تھا کہ ہمارے ''تھانیدار'' مسلمان نہیں۔اب اگر اُنہوں نے تھانیداروں کو مسلمان کرنے کی ٹھان ہی لی ہے تو پھر اتنا بھی بتلا دیں کہ تھانیداروں کو کون سے مسلمان بنانے کا ارادہ ہے، شیعہ، سُنّی، اہلِ حدیث یا طالبان؟۔ میرے خیال میں تو تھانیداروں کے لیے ''طالبانہ اسلام'' بہتر ہو گا۔پھر بھی خاں صاحب اپنی اتحادی جماعتِ اسلامی

سے مشاورت کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ جماعت اسلامی بھی طالبان کے حق میں ہی ووٹ دے گی۔ایسی صورت میں ہمارے بیچارے تھانیدار خودکُش بمباروں سے محفوظ بھی ہو جائیں گے اور خاں صاحب کے محبوب بھی ٹھہریں گے۔ لیکن ایک خطرہ بہرحال رہے گا کہ کہیں تھانیدار بھی خودکُش جیکٹیں نہ پہن لیں۔ایسی صورت میں طالبان کے ساتھ ساتھ تھانیداروں کو بھی الگ سے دفتر کھول کر دینا پڑے گا تاکہ مذاکرات میں آسانی رہے۔ کپتان صاحب نے اپنے محبوب طالبان کو مذاکرات کے لیے دفتر کھول کر دینے کی تجویز کے علاوہ یہ بھی کہا ہے کہ حکومت طالبان کے خلاف ''سیز فائر'' کا اعلان کرے۔ باوجودیکہ کچھ بد باطن اِس تجویز کو انتہائی ''شرمناک'' اور احمقانہ قرار دیتے ہیں لیکن ہم کپتان صاحب کی اِس مدبرانہ اور ارسطوانہ تجویز کی بھرپور حمایت کرتے ہیں البتہ ہمیں خوف ہے کہ اگر یہ تجویز فوج کے گوش گزار کی گئی تو کہیں جمہوریت سے والہانہ محبت کرنے والے جنرل اشفاق پرویز کیانی کی طبع نازک پر یہ تجویز گراں نہ گزرے اور وہ مارشل لاء لگا کر یہ نہ کہہ دیں کہ ''کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے''۔

امن کی آشا

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

یونانی داستان گو ایسوپ کہتا ہے "مسلسل خوف کی حالت میں زندہ رہنے سے مرجانا کہیں بہتر ہے"۔ لیکن یہاں تو پاکستان سمیت پورا عالمِ اسلام حالتِ خوف میں ہے اور ہم شیر کی ایک دن کی زندگی پر گیدڑ کی سو سالہ زندگی کو محض اِس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ ہمیں اسی میں عافیت نظر آتی ہے۔ غالباً اسی کو امن کی آشا کا نام دیا جاتا ہے۔
لاریب اعتدال و میانہ روی دینِ مبیں کا درسِ اوّل لیکن اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم ہر زمینی خُدا کی چوکھٹ پہ سجدہ ریز ہو جائیں۔ دین جہاں امن و شانتی کا درس دیتا ہے وہیں اپنے گھوڑے تیار رکھنے کا حکم بھی صادر فرماتا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے "اللہ کے نزدیک دو قطروں سے زیادہ کوئی قطرہ پسندیدہ نہیں۔ ایک آنسو کا قطرہ جو اللہ کے خوف سے نکلا، دوسرا خون کا قطرہ جو اللہ کی راہ میں گرا"۔ اور یہ بھی میرے آقا ﷺ کا ہی فرمان ہے "اپنے مال کی خاطر لڑو، یہاں تک کہ آخرت میں شہیدوں میں شامل ہو جاؤ یا اپنا مال بچا لو"۔ لیکن جدیدیت کی اِس فضاء میں اِن کُہنہ باتوں پر دھیان دینے کی فرصت کہاں۔ ربِّ کائینات نے تو حکمت کی کتاب میں

فرما دیا کہ ''ہم نے قُرآن میں سب کچھ بیان کر دیا ہے''۔اور آقاﷺ نے اپنے آخری خطبے میں یہ گارنٹی دے دی کہ اگرِاس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رکھوگے تو قیامت تک گمراہ نہیں ہوگے لیکن ہم تارکِ قُرآن ہو کر رسوا ہو گئے۔ ہمیں ہر ''ازم'' میں کشش نظر آتی ہے خواہ وہ سوشلزم ہو یا کمیونزم ، کیپیٹل ازم یا سیکولر ازم لیکن اگر کسی ازم میں کشش نظر نہیں آتی تو وہ ہے ''اسلام ازم''۔اسی مکمل ضابطۂ حیات ، اسی ''اسلام ازم'' کے تحت مسلمانوں نے دنیا پر صدیوں ایسی حکومت کی جس کی نظیر تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملتی اور جس کا بَر ملا اقرار غیر مسلم بھی کرتے ہیں۔ پھر ہوا کچھ یوں کہ ہم نے اسلاف کی میراث سے روگردانی کرکے رسوا ہو گئے اور غیر سینے سے لگا کر حکمران۔

ہمارے سیکولر دانشوروں کی تان ہمیشہ اِس پر ٹوٹتی ہے کہ ہم پہلے اپنے آپ کو اِس قابل تو کرلیں کہ غیروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں۔بجا ارشاد ، سوال مگر یہ ہے کہ اگر ہم پر جنگ مسلط کر دی جائے تو پھر ؟۔تو پھر ہتھیار پھینک کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلتوں کے غارِ عمیق میں جا گریں یا پھر مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو جائیں ۔یہ بجا کہ ہم معاشی طور پر مضبوط نہیں لیکن جب مشرکینِ مکّہ نے مسلمانوں پر پہلی جنگ مسلط کی تب اُن کی معیشت کتنی مضبوط تھی ؟۔بدر کے میدان میں مسلمانوں کے پاس کتنا جنگی ساز و سامان تھا؟۔غزوۂ خندق میں پیٹ پر پتھر باندھ کر کس نے خندق کھودی تھی ؟۔ محمد

بن قاسم اور طارق بن زیاد کے پاس کتنی عددی قوت اور جنگی سازوسامان تھا؟۔تاریخِ عالم کا حرف حرف پڑھ لیجئے آپ کو سامانِ حرب اور عددی قوت کے لحاظ سے مسلمان اپنے دشمنوں سے کمتر لیکن جذبہء ایمانی سے سرشار نظر آئیں گے؟۔ میرا مطلوب و مقصود یہ ہر گز نہیں کہ ہم جنگی جنوں میں مبتلا ہو جائیں۔میں تو فقط اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سرِ دارا

غیرت بریگیڈ کا طعنہ دینے والوں کی خدمت میں عرض ہے کہ ہندوستان کا انچ انچ ہمارے ایٹمی میزائلوں کی زد میں ہے۔اُس کے باوجود بھی ہم دِلی کے لال قلعے پر جھنڈا لہرانے کے جنوں میں ہر گز مبتلاء نہیں لیکن کسی کو یہ بھی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ لاہور کے جمخانہ میں جام لنڈھانے کے جنوں میں مبتلاء ہو۔ کشمیر کو قائدِ اعظم نے اپنی شہ رگ قرار دیا تھا اور یہ آج بھی ہماری شہ رگ ہی ہے جہاں 6 لاکھ کشمیری جان دے ہزار لاپتہ ، سات ہزار ایسی خفیہ قبروں کی نشاندہی ہوئی جہاں ایک ایک قبر ٥ چکے ، 1 میں کئی کئی شہید دفن، عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں اور عقوبت خانوں میں مظلوموں پر وحشیانہ تشدد کیا جا رہا ہے۔اِس کے باوجود بھی جب ہمارے وزیرِ اعظم مسلۂ کشمیر کو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے کی بات کرتے ہیں تو من موہن جی کی تلملاہٹ

اُنہیں بوکھلاہٹ کے اُس مقام تک لے جاتی ہے کہ وہ ''دیہاتی بُڑھیا'' کی طرح اوباما کے سامنے شکایات کا دفتر کھول بیٹھتے ہیں۔ میاں نواز شریف صاحب جب از راہِ تفنن یہی بات کہتے ہیں تو مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہاتھوں کو لہرا لہرا کر نریندر مودی وائی تباہی بکنا شروع کر دیتے ہیں۔ میاں صاحب کا انٹرویو کرنے والے انڈین صحافی نے ٹویٹر پر یہ پیغام دیا کہ میاں صاحب نے ایسی کوئی بات نہیں کہی جس میں من موہن سنگھ کی تضحیک کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ اِس کے باوجود بھی جنگی جنوں میں مبتلاء بی جے پی اور انڈین پریس اور الیکٹرانک میڈیا نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ ہمارے امن کی فاختائیں اُڑانے والے تجزیہ نگار یہ کہتے ہیں کہ امن اور شانتی سے پاکستان کو اربوں ڈالر سالانہ کا فائدہ ہوگا اور بھوک اور افلاس کا خاتمہ کیا جا سکے گا۔ بجا لیکن اگر پاکستان کی مجموعی آبادی سے چار گنا سے بھی زیادہ (اسّی کروڑ) خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے ہندوستانی عوام کا حکومتِ ہند کو مطلق احساس نہیں تو ہم کیوں امن کی آشا کے لیے مرے جا رہے ہیں۔

میاں نواز شریف صاحب اور من موہن سنگھ صاحب کی ملاقات ناشتے پر طے تھی لیکن میاں صاحب اپنے ہوٹل سے ناشتہ کرکے نکلے اور من موہن جی سے ایک گھنٹہ پندرہ منٹ پر محیط ملاقات کی جس میں تمام متنازع مسائل پر بات ہوئی لیکن اسے محض ایک تعارفی تقریب ہی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ بھارت میں الیکشن کی آمد

آمد ہے اور تمام تر سروے کے مطابق بی جے پی کو کانگرس پر واضح برتری حاصل ہے اِس لیے اِس ملاقات کو مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کی ایک کوشش سے زیادہ وزن نہیں دیا جا سکتا ہے۔ نریندر مودی کا واویلا بھی الیکشن کیمپین کا ہی حصّہ ہے۔ دراصل انڈیا میں ہمیشہ ''کرش پاکستان'' الیکشن کا مرغوب ترین نعرہ رہا ہے جبکہ پاکستان میں ''کرش انڈیا'' کا نعرہ لگانے والوں کو کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو صرف انڈیا ہی ہمہ وقت جنگی جنوں میں مبتلاء نظر آتا ہے جبکہ اکابرینِ پاکستان نے ہمیشہ مذاکرات کو افضل گردانا۔ ہم تو اتنے محتاط ہیں کہ ''را'' کی بلوچستان میں واضح دراندازی'' کے باوجود احتجاج تک نہیں کرتے جبکہ ہندوستان میں ہونے والی ہر'' دہشت گردی میں حکومتِ ہند کو پاکستان ہی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ انڈین وزیرِ خارجہ سلیمان خورشید نے پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے بارے میں اپنے دِل کی بھڑاس نکالی۔ اللہ بھلا کرے وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد کا جنھوں نے سلیمان خورشید کے الزامات کا مُنہ توڑ جواب دیا اور کھری کھری سنائیں۔

جنابِ میاں نواز شریف کا اقوامِ متحدہ میں خطاب عوامی امنگوں کا آئینہ دار تھا۔ اُنھوں نے دھیمے مگر پُر وقار لہجے میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ایک آزاد و خود مختار ایٹمی قوت کے سربراہ کو زیبا تھا۔ اُنھوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر ڈرون حملوں پر اپنا موقف واضح کیا اور اقوامِ متحدہ کو بھی یہ کہہ کر

شرم دلائی کہ سات دہائیوں سے کشمیر کا مسئلہ اقوامِ متحدہ میں گل سڑ رہا ہے لیکن اسے آج تک لائقِ اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ وزیرِ اعظم کے خطاب سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ یہ ادراک کر چکے ہیں کہ اقوامِ عالم میں نئی صف بندی ہونے کو ہے جس میں انڈیا، افغانستان اور امریکہ ایک طرف اور پاکستان، ایران، چین اور روس دوسری طرف کھڑے نظر آنے کے واضح اشارے ملنا شروع ہو گئے ہیں۔ نیویارک میں امریکی، افغانی اور انڈین اکابرین کی بار بار ملاقاتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان سے نکلنے کے بعد امریکہ اپنے مفادات کا تحفظ انڈیا کے سپرد کرکے افغانستان میں پاکستان کے کردار کو فراموش کرنا چاہتا ہے۔ میاں صاحب نے بھی وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھالنے کے فوری بعد چین کا دورہ کرکے "عالمی غنڈے" امریکہ کو یہ واضح پیغام دے دیا کہ ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو"۔

اُف یہ مہنگائی ۔۔۔۔ توبہ توبہ

ہمارے وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب کی بھارتی وزیرِ اعظم من موہن سنگھ جی سے ناشتے پر ملاقات طے تھی جسے من موہن ''گول'' کر گئے۔ میاں صاحب کے ساتھ ''ہتھ'' تو من موہن جی نے کیا لیکن غصّہ نکلا بیچاری قوم پر اور اُنہوں نے بجلی ، پٹرول ، ڈیزل اور مٹی کے تیل کی قیمت میں ہوشربا اضافہ کرکے قوم کا تیل نکال دیا۔ بجلی کی قیمتوں میں اتنے اضافے پر ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ پٹرول اور ڈیزل کی قیمت بڑھنے کے ساتھ ہی ٹرانسپورٹرز کی چاندی ہو گئی اور اُنہوں نے کرایوں میں کہیں چالیس اور کہیں پچاس فیصد تک اضافہ کر دیا۔ میں نے اِس اضافے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گھریلو بجٹ بنانے کی ٹھانی لیکن حساب کتاب میں اُلجھ کر رہ گئی۔ اب یہی سوچا ہے کہ کسی نہ کسی ذریعے سے جنابِ اسحاق ڈار تک رسائی حاصل کرکے گھریلو بجٹ بنوا لوں لیکن سوچتی ہوں کہ خسارے کا بجٹ بنانے کے ماہر اسحاق ڈار صاحب نے اگر میرے ہاتھ میں بھی خسارے کا بجٹ تھما دیا تو پھر ؟۔ حکومت تو نوٹ چھاپ کر اور IMF سے قرضہ لے کر خسارہ پورا کر لیتی ہے لیکن ہمارے پاس نوٹ چھاپنے کی کوئی مشین ہے ، نہ IMF تک رسائی۔ اِس بے تکے اضافے کے خلاف ہم جنابِ چیف جسٹس سے از خود نوٹس لینے کی اپیل کرنے ہی والے تھے لیکن اللہ بھلا کرے چیف

صاحب کا جو ہم سے بھی تیز نکلے اور خود ہی ''کھڑاک'' کر دیا۔اب حکومت نےاِس نوٹیفیکیشن پر نظرِثانی کے لیے '' منتیں ترلے ''کرکے جمعے تک کا وقت مانگا ہے۔چیف صاحب نے وقت تو دے دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اب پاکستان میں نادر شاہی نظام نہیں چلے گا۔اگر ہم میاں صاحب کے ساتھ نیویارک گئے ہوتے تواِس از خود نوٹس کی نوبت ہی نہ آتی کیونکہ ہم میاں صاحب کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی خاطر اُنہیں سمجھاتے کہ من موہن جی کے ساتھ ناشتے میں اُنہیں سراسر نقصان تھا کیونکہ میاں صاحب ٹھہرے گوشت خور جبکہ من موہن جی سکھ ہونے کے باوجود ہندوؤں کی خوشی اور خوشنودی کی خاطر سبزی خور بن چکے ہیں۔اگر میاں صاحب کو ناشتے کی میز پر صرف ساگ پات اور ''گاؤ ماتا'' کا دودھ نظر آتا تو اُن کا بھوکے پیٹ رہ جانا اظہر من الشمس تھا اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ میاں صاحب بھوکے پیٹوں مذاکرات نہیں کر سکتے تھے۔وہ تو شدید ابتلاء کے دنوں میں جیل کی کوٹھری میں بھی سیّد ممنون حسین کی ''ربڑی'' کا بڑی شدت سے انتظار کیا کرتے تھے۔یہ اسی ربڑی کی کرشمہ سازی تھی کہ میاں صاحب نے سیّد ممنون حسین کو ایوانِ صدر ''دان'' کر دیا۔ ویسے تو پورا میاں خاندان بہت ''دیالو'' ہے۔ خادمِ اعلیٰ نے عمران خاں کو میانوالی میں ابھی ابھی نمل یونیورسٹی کے لیے ایک ہزار ایکڑ زمین '' دان'' کی ہے جس پر ساری نواز لیگ چیں بچیں ہے لیکن ربڑی کے بدلے صدارت کا تو گینز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں اندراج ہونا چاہیے۔۔۔۔

آمدم بر سرِ مطلب میں عرض کر رہی تھی کہ

خالی ساگ پات سے میاں صاحب بھوکے رہ جاتے اور اُن کے بھوکے پیٹوں مذاکرات کی میز پر بیٹھنے سے قوم کے نقصان کا شدید احتمال تھا۔ اُنہوں نے اپنے ہوٹل میں پہلے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور پھر مذاکرات میں بھولے بھالے من موہن جی کو خوب ''رگڑا'' دے آئے ۔اب ''کھسیانی بِلّی کھمبا نوچے'' کے مصداق انڈین میڈیا کہتا ہے کہ من موہن جی تو عنقریب وزارتِ عظمیٰ کو داغِ مفارقت دینے والے ہیں اِس لیے نیویارک میں جو کچھ ہوا اُس کی کوئی حیثیت نہیں۔اگر یہی بات تھی تو پھر نریندر مودی آخری وقت تک مذاکرات نہ کرنے کے لیے ''ٹیں ٹیں'' کیوں کرتے رہے ؟۔

من موہن جی کو رگڑا دینا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن بیچاری قوم کا کیا قصور تھا جسے بے جرم وخطا مہنگائی کی سولی پہ چڑھا دیا گیا ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قصور بھی سارا خود میاں صاحب کا ہے جنہوں نے ''آ بیل ! مجھے مار'' کے مصداق اقوامِ متحدہ میں دبنگ لہجہ اختیار کرتے ہوئے مسٔلہ کشمیر کو اجاگر کرکے پہلے من موہن کو ناراض کیا اور پھر ڈرون حملوں کی مذمت کرکے بارک اوباما کو۔ظاہر ہے کہ میاں صاحب کی اِس ''زیادتی'' کی شکایت تو من موہن جی نے اوباما ہی سے کرنی تھی کیونکہ نیویارک میں اُن کا اپنا اور تھا کون ؟۔اُدھر ''دُکھی'' اوباما نے بھی کہہ دیا ہو گا کہ میاں صاحب نے تو مجھے بھی نہیں بخشا۔ہو سکتا ہے کہ وہیں پر یہ طے ہوا ہو کہ اور تو کچھ کیا نہیں

جا سکتا اِس لیے کیوں نہ ناشتہ ہی ''گول'' کر دیا جائے۔ ''خود کردہ را علاجے نیست کے مصداق میاں صاحب نے اپنے پاؤں پہ کلہاڑی خود ماری اور غصہ نکالا بیچاری قوم'' پر۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قوم نے اپنے پیٹ کی خاطر ہی میاں صاحب کو دو تہائی اکثریت کا مینڈیٹ دیا لیکن اُنہوں نے تو پیٹ میں پڑے لقمے کو نکالنے کی بھی تگ و دَو شروع کر دی ہے۔ میاں صاحب ہی کے پچھلے ادوار میں ایک بار وزارتِ خزانہ کا قلمدان محترم سرتاج عزیز نے سنبھالا اور کچھ ہی عرصے بعد جلے بھنے لوگوں نے اُن کا نام ''سرچارج عزیز'' رکھ دیا۔ اب کی بار وزارتِ خزانہ کا قلمدان جنابِ اسحاق ڈار نے سنبھالا اور قوم سو دنوں میں ہی سرتاج عزیز کو ایسے ہی اچھے لفظوں میں یاد کرنے لگی جیسے لوگ آمر مشرف کے دَور کو پیپلز پارٹی کے دَور سے بہتر گرداننے لگے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ عنقریب جنابِ اسحاق ڈار کا نام بھی قوم ''اسحاق ڈر'' رکھنے والی ہے اور سو، سو کوس پر جب کوئی بچہ دودھ کے لیے روئے گا تو ماں کہے گی ''چُپ ہو جا کہیں اسحاق ڈر نہ آ جائے''۔

مانا کہ موجودہ حکومت کو مہنگائی کا عفریت سابقہ حکومت سے تحفے میں ملا ہے لیکن جو قیامت ہماری ''اپنی حکومت'' ڈھا رہی ہے وہ نا قابلِ یقیں ہے۔ بِلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسی مہنگائی کی ستائی قوم نے پیپلز پارٹی کو ''نکرے'' لگا کر نواز لیگ سے والہانہ پیار کا ثبوت دیا کیونکہ عوام یہ

سمجھتے تھے کہ میاں شہباز شریف صاحب الیکشن سے پہلے کہے گئے اپنے لفظوں کی توقیر کا احساس کرتے ہوئے بِلا امتیاز ہر کرپٹ کو چوراہوں پہ اُلٹا لٹکائیں گے ۔اُنھوں نے ”زر بابا، چالیس چوروں“ کی اتنا ”رٹا“ لگایا کہ لوگ کچھ کچھ یقین کرنے لگے لیکن ”خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا“ ۔ صحراؤں کی پیاس لیے جب قوم بعد از خرابیٔ بسیار کنوئیں پر پہنچی تو پتہ چلا کہ کنواں تو کب کا خشک ہو چکا۔اب پتہ نہیں یہ شدتِ عطش کیا گُل کھلائے گی۔اور کچھ ہو نہ ہو یہ بہر حال طے ہے کہ قوم میں مہنگائی کے اِس طوفان کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ۔ پیپلز پارٹی کے دَور میں خادمِ اعلیٰ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ اگر کرپشن اور مہنگائی پر قابو نہ پایا گیا تو خونی انقلاب آئے گا، جس میں سب کچھ بہہ جائے گا۔اُن کا لہک لہک کر یہ گانا کہ ”ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو۔۔۔ میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا“ بھی سب کو یاد ہے اوریقیناً خادمِ اعلیٰ بھی قوم سے کیے گئے وعدوں کو بھولے نہیں ہونگے۔اُنہیں یہ یاد رکھنا ہو گا کہ جب آس ٹوٹتی ہے اور اُمید کا دیپ بُجھتا ہے تو ردِ عمل بھی بہت سخت ہوتا ہے اللہ نہ کرے کہ ہمیں بھی کسی ایسے ہی خونی انقلاب کا سامنا کرنا پڑے جیسا فرانس میں آیا تھا۔دست بستہ عرض ہے کہ جن حالات کی بنا پر فرانس میں انقلاب آیا تھا ہمیں بھی کم و بیش اُنہی حالات کا سامنا ہے ۔اِس لیے اِس سے پہلے کہ سب کچھ ملیا میٹ ہو جائے ہمارے حکمرانوں کو سنبھلنا اور کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا ہو گا۔حاکمانِ وقت کو تو

شاید اُن کے حواری اور کاسہ لیس ''سب اچھا'' کی رپورٹ دے رہے ہونگے لیکن یہاں کچھ بھی اچھا نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ آنے والے طوفانوں کی سرگوشیوں سے فضائیں بھی لرزہ براندام ہیں۔ کاش کہ ''ہمارے اپنے'' حکمرانوں کو اِس کا ادراک ہو جائے۔

پاکستان عقلمندوں کے نرغے میں

پتہ نہیں ہمارے تجزیہ نگاروں کو پاکستان میں قحط الرجال کیوں نظر آتا ہے۔ میں تو اگر کسی ریڑھی والے انگوٹھا چھاپ سے بھی بات کروں تو مجھے اُس میں بھی خلیل جبران کی جھلک دکھائی دیتی ہے اِس لیے میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ پاکستان عقلمندوں کی عالمی منڈی ہے اور یہاں ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا بیوقوف نہیں ملتا کہ جسے عقل کی بات بتا کر اپنی ''عقلی بد ہضمی'' کا تدارک کیا جا سکے۔ اِس منڈی میں تھوک کے حساب سے ارسطو، افلاطون، بزرجمہر اور خلیل جبران ملتے ہیں لیکن اِن کی قدر و قیمت محض اِس لئے نہیں کہ ہر گھر سے بھٹو نکلے نہ نکلے، ارسطو ضرور نکلتا ہے۔ یہاں سارے سیاستدان، سارا میڈیا، سارے لکھاری اور عامی اپنے آپ کو عقلِ کُل ہی سمجھتے ہیں ۔جہاں عقل کی اتنی فراوانی ہو وہاں ہم جیسے تو ''ایویں خوامخواہ'' قلم گھسیٹتے رہتے ہیں حالانکہ ''فرق اِس تو مگر پڑتا نہیں کوئی''۔

ویسے تو ہمارے'' فرمودات'' بھی ''ارسطوانہ ''ہی ہوتے ہیں لیکن الیکٹرانک میڈیا پہ بیٹھے اینکرز کا تو جواب ہی نہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم اُن کے افلاطونی اندازِ تخاطب کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ ہمارے

اینکرز محض بھرتی کے لیے مہمان بلاتے ہیں جو بس ''ایویں ای'' ہوتے ہیں اور اکثر اُن پر طفلِ مکتب ہونے کا گماں گزرتا ہے۔شاید اسی لیے آجکل نیوز چینلز کے اینکرز باہم مل کر ٹاک شوز کرنے لگے ہیں۔ہم اکثر سوچتے ہیں کہ جس ملک میں سینکڑوں بزرجمہر الیکٹرانک میڈیا پر بیٹھ کر قوم کو درسِ بیداری دیتے ہوں اُس ملک کو بھلا کون ہزیمت سے دوچار کر سکتا ہے؟۔ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ عنانِ اقتدار انہی اینکرز کے سپرد کر دینی چاہیے لیکن مسٔلہ یہ ہے کہ اگر انہی اینکرز میں سے کوئی جذبۂ خدمتِ ملّی سے سرشار ہو کر الیکشن لڑنے کی ٹھان لے تو اُس کی ''صندوقچی'' ووٹوں کی عدم موجودگی کے سبب خود ہی شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہے۔کیا ہی اچھّا ہوتا جو حاکمانِ وقت حکومت کی باگ ڈور اینکرز کو سونپ کر خود چین کی نیند سوتے لیکن چین کی نیند اُن کے نصیب میں کہاں؟۔اب یہ اینکرز اُمیدِ فردا کے سہارے سیاستدانوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہوئے چینل چینل پھرتے رہتے ہیں۔آخر ''لوٹا کریسی'' کا بھرم بھی تو رکھنا ہوتا ہے ناں۔

ہمیں چونکہ دانشور کہلانے کا جنوں ہے اسی لیے آجکل ہم بھی اپنے سیکولر بھائیوں کی طرح جبینِ دانش پہ شکنیں ڈال کر نیم باز آنکھوں کے ساتھ مُنہ تھوڑا ٹیڑھا کرکے بات کرنے کی پریکٹس کر رہے ہیں۔ارسطوانہ ذہانت کے دعوے دار ہمارے سیکولر بھائی گزشتہ 66 سالوں سے قوم کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے

ہیں کہ قائدِ اعظم اور اقبال سیکولر پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ ہم چونکہ اُن کی "بزرجمہری" کے آگے زانوے تلمذ طے کر چکے ہیں اِس لیے ہم بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں" اور وہ جو حضرتِ قائدؒ نے یہ فرمایا تھا کہ ہمیں زمین کا ایک ایسا ٹکڑا درکار ہے جسے ہم اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکیں، وہ تو دراصل اُنھوں نے "گاندھی جی" کو چھیڑ" کر مزہ لینے کے لیے کہا تھا اور حضرتِ اقبالؒ نے بھی محض مسلمانانِ ہند کو خوش" کرنے کے لیے اپنی شاعری کی بنیاد ہی اسلام پر رکھی۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کو خسارہ

اُس کے سیکولر نظریات کے حامل ہونے میں بھلا کیا شک رہ جاتا ہے؟۔ قائد کے اولین سوانح نگار ہیکٹر بولائیتھو نے جو متعدد بار یہ لکھا اور مختلف حوالے دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قائدِ اعظم اسلامی نظریات کو بنیاد بنا کر سرزمینِ ہند کی تقسیم چاہتے تھے، اُس پر یقین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بولائیتھو تو تھا ہی جھوٹا۔ اُس نے یقیناً ہمارے "مولویوں" سے پیسے کھائے ہونگے۔ اگر کسی کو سچ جاننے کا شوق ہو تو اُسے ہمارے سیکولر دانشوروں سے رجوع کرنا چاہیے کیونکہ سچ کی "شب دیگ" صرف انہی سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے NGO's کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اگر پھر بھی تسلی نہ ہو تو لیکن اِس میں یہ

سے تعلق رکھنے والی ایسی خواتین سے رجوع کیا جائے NGO's احتیاط ضروری ہے کہ جو اپنی وضع قطع ، چال ڈھال ، گفت و شنید ، نشست و برخاست اور لباس میں پاکستانی کم اور یورپین زیادہ لگتی ہوں ۔صرف یہی خواتین عہدِ جدید کے تقاضوں پر پورا اُترتی ہیں اور صرف وہی قائد اور اقبال پر اتھارٹی ہیں ۔ایسی خواتین نیوز چینلز پر تھوک کے حساب سے دستیاب ہیں اور اینکرز اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے اکثر اِن کو بلا کر ساتھ کسی عالمِ دیں کو بٹھا دیتے ہیں کیونکہ اینکرز بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ خواتین ''مولویوں'' کے لتّے لینے کی ماہر ہیں ۔ باقی سب پاکستانی خواتین تو ابھی تک عہدِ عتیق سے رشتہ جوڑے بیٹھی ہیں۔یہ گھریلو خواتین عضوِ معطل اور معیشت پر بوجھ ہیں۔

رہبرانِ قوم کے فہم وفراست اور عقل و شعور میں تو کسی کو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ تو'' لاکھوں میں ایک ''اور چیدہ و چنیدہ ہوتے ہیں اور ہم بڑے اہتمام سے چلچلاتی دھوپ میں قطاروں میں لگ کر گھنٹوں انتظار کے بعد اُنہیں ووٹ دے کر منتخب کرتے ہیں۔لیکن حیرت تو اُس وقت ہوتی ہے جب قوم انہی رہبروں کے خلاف ڈنڈے لے کر باہر نکل آتی ہے اور یہ تماشہ کبھی کبھار نہیں بلکہ ہمیشہ ہوتا ہے۔اِس لیے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستانی قوم ہے ہی ''لوٹی'' جو اپنے تراشیدہ بتوں کو اپنے ہی ہاتھوں توڑنے پر تُل جاتی ہے اِس میں ہمارے ''لیڈروں'' کا کوئی قصور نہیں، قصور ہے تو صرف قوم کا جو اُلٹے پاؤں پھرنے

میں ذرا دیر نہیں لگاتی۔اب یہی دیکھ لیجیئے کہ قوم نے کتنے چاؤ سے بھنگڑے ڈالتے ہوئے نواز لیگ کو منتخب کیا اور اب اُسی کے خلاف سڑکوں پہ نکلی ہوئی ہے۔اگر ہمارے رہبران کی فہم وفراست کا اندازہ لگانا ہے تو اُن کی وزارتوں سے لگا لیجئے۔باقی وزارتیں تو بس ایویں ای ہوتی ہیں اصل وزارتیں تو داخلہ، خارجہ، خزانہ اور دفاع کی ہیں۔اللہ بھلا کرے امریکہ کا جہاں سے ہماری خارجہ پالیسی بن کر آ جاتی ہے، داخلہ پالیسی ہم نے طالبان کو ٹھیکے پر دے رکھی ہے اور امورِ خزانہ کے لیے IMF زندہ باد۔رہی وزارتِ دفاع تو اُس کی ہمیں سرے سے ضرورت ہی نہیں کیونکہ ہمارے پاس ایٹم بم ہے جسے جب جی چاہے گا چلا دیں گے کیونکہ بقول چوہدری شجاعت حسین ''ایٹم بم ہم نے شب برات پر پھُلجھڑیوں کی جگہ چلانے کے لیے نہیں رکھا ہوا''۔پوری دنیا ہمارے ایٹم بم سے خوفزدہ ہے اور ہم پوری دنیا سے۔یہ تو وہی ہوا کہ ایک دفعہ ایک ہندو نے ایک جاٹ کو نیچے گرا لیا اور اُس کی چھاتی پر بیٹھ کر رونے لگا۔ایک راہگیر نے پوچھا کہ کیوں رو رہے ہو'' ؟۔تو ہندو نے روتے ہوئے جواب دیا ''مینوں پتہ اے، جٹ چدوں وی اُٹھے گا، مینوں مارے گا''۔ہم نے جب سے ایٹم بم بنایا ہے، تب سے عالمِ خوف میں ہی ہیں۔اسی خوف کی بنا پر ہم نے محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو رسوا کیا اور یہی خوف ہمیں امریکہ کی اندھی، بے چہرہ جنگ میں دھکیل گیا۔پتہ نہیں یہ خوف اور کیا گُل کھلائے گا۔کاش کہ ہم نے گھاس کھا کر ایٹم بم نہ بنایا ہوتا۔

ہمارے علمائے دین بھی اپنے فہم وتدبر میں کسی سے کم نہیں۔ ہم نے تو یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہمارے علماء کا تبلیغِ دیں، امامت، نکاح اور جنازے پڑھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں لیکن اُنھوں نے اپنی فراست کے زور پر یہ ثابت کر دیا کہ زندگی کے ہر شعبے میں وہ مکمل فِٹ بیٹھتے ہیں۔ میدانِ سیاست میں علماء کے کردار سے مفر ممکن نہیں، جہاد میں اُن کا کوئی ثانی نہیں، تبلیغِ دین کے لیے اُنھوں نے کمال فراست سے اتنے فرقے بنا دیئے ہیں کہ جس کا جی چاہے اپنی مرضی کا دین منتخب کر لے۔ آجکل وہ اپنے ہی تراشیدہ طالبان کو اللہ رسول ﷺ کے واسطے دے کر قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اِن علمائے کرام کے طالبان نامی شاگردانِ رشید ''میں نہ مانوں'' کی رَٹ لگانے سے باز بھی نہیں آتے۔ اللہ بھلا کرے ہمارے علمائے کرام کا، اگر یہ نہ ہوتے تو ہماری تو کسی نے نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھانی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ غالب اکثریت کو تو نمازِ جنازہ آتی ہی نہیں۔ یہ غالب اکثریت میں نے مصلحتاً لکھا ہے تاکہ لوگ ناراض نہ ہو جائیں حالانکہ میں لکھنا یہ چاہتی تھی کہ ننانوے فیصد کو نمازِ جنازہ نہیں آتی۔

کوئی اُمید بَر نہیں آتی

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔ سرگوشیاں

ہم تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ صبحِ اُمید کا نورِ منور شبِ تار میں دراڑیں ڈالنے آن پہنچا اور وہ وقت قریب آن لگا جب فضائے بسیط میں تمناؤں کی تتلیاں جھولا جھولنے لگیں گی ، ہر بام پہ اُمیدوں کے دیپ روشن ہو جائیں گے اور لق و دق صحراؤں میں بھی آشاؤں کے پھول کھل اُٹھیں گے لیکن ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا ، جو سُنا افسانہ تھا'' ۔اب بھی وہی اُداسیوں کے ڈیرے ، آسیب کے مہیب سائے اور وہی رنج و محن میں ڈوبی کَرب کی صدائے بازگشت۔کچھ بھی نہیں بدلا سوائے چہرے بدلنے کے ، پچھلے دورِ آمریت ، پھر پیپلز پارٹی اور اب نواز لیگ۔۔۔ چہرے جدا ، جدا کرتوت ایک ۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میری ارضِ پاک کو کوئی آسیب روگ کی طرح چمٹ گیا ہو اور

دور لگے وہ وقت ابھی جب ٹھہری رات کے آنگن میں
پھیکا پڑکے چاند ہمیں آثارِ سحر دکھلائے گا

آمر مشرف اور پیپلز پارٹی نے قوم کو مایوسیوں کے بحرِ بے کنار میں یوں دھکیلا کہ اعتبار کا کوئی قرینہ ، کوئی سلیقہ باقی نہ بچا۔پھر عمران خاں

صاحب تشریف لائے۔ اُنہوں نے ایسے دل خوش کن خواب بُنے کہ قوم، خصوصاً نوجوان تصورات کی جنت نظیر وادیوں میں پہنچ گئے۔اِک شور اُٹھا اور ہر طرف خاں صاحب کی جے ،جے کار ہونے لگی لیکن خواب تو بہرحال خواب ہوتا ہے جو کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا ہے۔سیاسی نومولود کپتان صاحب سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ آمدہ الیکشن تک ہی اِن خوابوں کی پرورش کر لیتے۔الیکشن سے بہت پہلے وہ خواب چکنا چور ہو گئے اور آج تہی داماں عمران خاں صاحب اپنی غلطیوں کا الزام دوسروں پر دھر کر اپنے آپ کو مطمعن کرنے کی سعیٔ لاحاصل کرتے نظر آتے ہیں۔۔۔۔ میاں برادران خارزارِ سیاست کے کُہنہ مشق شناور ہیں۔ وہ جلا وطنی کا دُکھ بھی سہہ چکے ہیں اور اُن کے میڈان پاکستان'' ہونے میں بھی کسی کو کوئی شک نہیں۔اِن حالات میں عوام کے'' سامنے سوائے نواز لیگ کے کوئی ''آپشن'' ہی نہیں تھا اِس لیے قوم نے 2013ء کے انتخابات میں نواز لیگ کو پروانہ وار ووٹ دے کر اپنا آخری داؤ کھیلا۔میاں نواز شریف صاحب کی شدید خواہش دو تہائی اکثریت کا حصول تھا جسے قوم نے اُن کے دامن میں ڈال دیا۔اب میاں صاحب کے ایفائے عہد کی باری ہے جس کی قوم تا حال منتظر ہے۔حکومت کے ابتدائی دنوں میں میاں نواز شریف صاحب کے چہرے پر چھائی گھمبیر خاموشی اُن کے کچھ نہ کچھ کر گزرنے کے عزم کا پتہ دیتی ہے لیکن سو دن گزرنے کے بعد بھی کچھ نہ بدلا سوائے مہنگائی کے جو کم ہونے کی بجائے آسمانوں کی وسعتوں کو چھونے لگی ہے۔بقراط نے کہا ''جس دروازے سے شک اندر داخل ہوتا ہے، اُسی

دروازے سے اعتماد باہر نکل جاتا ہے''۔ پیمانۂ صبر لبریز کیے بیٹھی اِس قوم کے اذہان میں شکوک و شبہات کے سیاہ ناگ لہرانے لگے ہیں اور کوئی وقت جاتا ہے جب صبر کے اِن پیمانوں کے چھلک جانے سے وہ طوفانِ بَلاخیز اُٹھے گا جس میں ہر کہ و مہ خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا۔ اللہ نہ کرے کہ وہ وقت آئے کیونکہ اب بھی اگر کہیں اُمید کی ہلکی سی کرن نظر آتی ہے تو ''درِ نواز'' کے روزن سے ۔ لیکن نواز لیگ کو اپنی اداؤں پہ غور کرتے ہوئے یہ یاد رکھنا ہوگا کہ خوش قسمتی تمام چنچل لڑکیوں میں سب سے زیادہ شوخ و شنگ ہوتی ہے جو کسی جگہ لمبے عرصے کے لیے کبھی نہیں ٹھہرتی ۔ وہ آپ کے پاس آتی ضرور ہے لیکن جلد بھاگ جاتی ہے جبکہ بد قسمتی بڑی متانت سے تشریف لاتی ہے اور آپ کے بستر پر بیٹھ کر ''سینا پرونا'' شروع کر دیتی ہے ۔ خوش قسمتی اور بد قسمتی کے اِس چکر سے میاں برادران بخوبی واقف ہیں لیکن ہیگل کہتا ہے '' حکمرانوں نے تاریخ سے کبھی کچھ سیکھا نہ تاریخ سے اخذ شُدہ قوانین پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی ''۔

نواز لیگ جب عام انتخابات کے لیے کمربستہ تھی ، اُسے تب بھی خوب علم تھا کہ پیپلز پارٹی ملک کو اندر سے کھوکھلا کر چکی ہے ۔ اکابرینِ نواز لیگ یہ بھی جانتے تھے کہ معجزانہ تبدیلیاں ممکن ہیں نہ معیشت کو یکلخت رفعتوں سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے اِس لیے اب یہ واویلا کرنا محض کارِ بیکار ہے کہ

پیپلز پارٹی نے ملک کو کھو کھلا کرکے رکھ دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی میاں صاحب قوم کو اعتماد میں لے کر سب کچھ کھول کھول کر بیان کر دیتے لیکن اُنہیں تو بیرونی دوروں سے ہی فرصت نہیں۔ وہ جب کبھی ملک میں تشریف لاتے ہیں تو غریبوں کی ہمدردی میں ایک آدھ بیان داغ دیتے ہیں۔ نیویارک سے واپسی پر انہوں نے فرمایا ''بجلی کی قیمتوں میں اضافہ عام آدمی کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ ہم نچلے طبقے کے مفادات کا تحفظ کریں گے''۔ لیکن اُسی دن اُن کے دل کے بہت قریب وزیرِ اطلاعات پرویز رشید صاحب نے یہ بیان دینا اپنا فرض سمجھا کہ ''بجلی کی قیمتوں میں اضافہ کڑوی گولی ہے، بیمار معیشت کے علاج کے لیے کڑوی گولی کھانا پڑے گی ۔ جنابِ چیف جسٹس نے فی الحال تو یہ کڑوی گولی واپس کر دی ہے لیکن ساتھ ہی'' حکومت نے نیپرا سے بجلی کے نئے نرخ لانے کی درخواست بھی کر دی ہے۔ حکومت نے سپریم کورٹ میں یہ تحریری جواب داخل کیا ہے کہ نیپرا کی طرف سے نئے نرخ آنے کی صورت میں ان کا اطلاق یکم اکتوبر سے ہی ہوگا۔ گویا اِس کڑوی گولی کی تلوار بدستور لٹک رہی ہے۔ عالمی منڈی میں تیل کی قیمتیں کم ہو گئی ہیں لیکن حکومت نے اُن میں اضافہ کر دیا ہے جس سے فوری طور پر اشیائے خورونوش کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں۔ دست بستہ عرض ہے کہ قوم تو اب بھی کڑوی گولی نگلنے کو تیار ہے لیکن منتظر ہے کہ کب حاکمانِ وقت کے حلق سے ایک کڑوی گولی نیچے اُترے اور قوم دس، دس گولیاں پھانک جائے۔ کوئی اِس غلط فہمی میں نہ رہے کہ

اب قوم تو کڑوی گولیاں نگلتی رہے گی لیکن قوم کی رہبری کے دعوے دار اپنی عیاشیوں میں مگن رہیں گے۔ تحقیق کہ اب ہر کسی کو اپنی بے ڈھنگی چال کو سیدھا کرنا ہو گا کیونکہ اب کسی میں تاب و توانِ صبر باقی نہیں۔

مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والے میاں برادران کو یہ تو علم ہی ہو گا کہ دینِ مبین میں ''ایفائے عہد'' پر کتنا زور دیا گیا ہے اور اُنہوں نے الیکشن سے پہلے قوم کے ساتھ کتنے اور کون کون سے وعدے کیے تھے۔ میاں برادران سے والہانہ لگاؤ کی بنیادی وجہ ہی یہ تھی کہ انہوں نے بلند آہنگ سے متعدد بار کرپشن کے بڑے بڑے مگر مچھوں کو چوراہوں پہ لٹکانے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ حکمرانوں کی بسم اللہ ہی مگر مچھوں پر ہاتھ ڈالنے سے ہو گی لیکن یہاں تو یہ عالم ہے کہ ساڑھے تین ماہ گزر گئے، ابھی تک چیئر مین نیب بھی مقرر نہیں ہو سکا۔ چیئر مین نیب کے تقرر کے لیے نت نئے نام سامنے آ رہے ہیں لیکن کسی کو پیپلز پارٹی مسترد کر دیتی ہے تو کسی کو نواز لیگ۔ قائدِ حزبِ اختلاف سید خورشید شاہ وزیرِ اعظم سے ہر ملاقات کے بعد میڈیا کو یہی کہتے ہیں کہ اُنہیں چیئر مین نیب کے انتخاب کی جلدی نہیں۔ شاہ صاحب کا فرمان بالکل بجا ہے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر کسی سچے، کھرے اور غیر جانبدار چیئر مین نیب کا تقرر ہو گیا تو پیپلز پارٹی کی غالب اکثریت سلاخوں کے پیچھے نظر آئے گی۔ سوال مگر یہ ہے کہ نواز لیگ کو کون سا خوف مارے جا

رہا ہے ؟۔آئین کی اٹھارھویں ترمیم کے مطابق اگر قائدِ ایوان اور قائدِ حزبِ اختلاف کسی ایک نام پر متفق نہ ہوں تو آخری فیصلہ صدر نے ہی کرنا ہوتا ہے اور صدر ممنون حسین تو ملکی صدارت ملنے پر ویسے ہی میاں نواز شریف صاحب کے ممنون ہیں۔ پھر اتنی دیر کیوں؟۔کیا محترم خادمِ اعلیٰ اپنے باپ سمان بڑے بھائی کو یہ بتلانے کی زحمت کریں گے کہ انہوں نے کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا قوم سے ہزار مرتبہ وعدہ فرمایا۔۔۔۔ اور کیا چیئرمین نیب کی تقرری کے بغیر وہ ایفائے عہد کر سکتے ہیں؟۔

جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

مرکزی حکومت نے یکم اکتوبر سے بجلی کی قیمتوں میں محیرالعقول اضافہ کر دیا جسے سپریم کورٹ نے اِس بنیاد پر رد کر دیا کہ حکومت کو ایسے نوٹیفیکیشن کے اجراء کا حق نہیں۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ تھا کہ ایسا نوٹیفیکیشن جاری کرنے کا حق صرف نیپرا کو حاصل ہے۔اب اخباری اطلاع کے مطابق صارفین کے حقوق کا تحفظ کرنے والی ''میڈم نیپرا'' حکومتی فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے وہی اضافہ برقرار رکھنے کا نوٹیفیکیشن جاری کر دیا ہے۔ یہ اضافہ عیدِ قُربان پر اِس لیے کیا گیا ہے کہ حاکمانِ وقت عوام کی قُربانی چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عوام کو یہ کڑوی گولی بہر حال نگلنا پڑے گی۔ وزیرِ اطلاعات پرویز رشید صاحب نے قائدِ اعظم لائبریری کے زیرِ اہتمام سعید آسی کے کالموں کے مجموعے کی تقریبِ رونمائی میں فرمایا کہ حکومتی اخراجات میں 35 فیصد کمی کرکے سب سے پہلے کڑوی گولی ہم نے کھائی۔ کڑوی گولی کی مزید تشریح کرتے ہوئے انھوں نے بڑے دُکھ بھرے انداز میں فرمایا'' ہم اب بھی پُرانی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں اور اپنے کمروں کے پردے اور فرنیچر تک تبدیل نہیں کروائے''۔ واقعی یہ حاکمانِ وقت کی لازوال قُربانی ہے جسے گینیز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج ہونا چاہیے لیکن انگریز چونکہ ہمارے مخالف ہیں اور گینیز بُک اُن کی ملکیت ہے اِس لیے شاید اُس میں

تو یہ قُربانی درج نہ ہو البتہ مورخ اس قُربانی کو "تاریخ پاکستان" میں سنہری حروف میں لکھے گا۔ویسے تو ہم نے بھی کئی سالوں سے پردے تبدیل کیے ہیں نہ فرنیچر اس لیے ہمارا نام بھی تاریخ کی زینت بننا چاہیے اور جن 70 فیصد سے زائد لوگوں نے پردوں اور فرنیچر کا روگ سرے سے پالا ہی نہیں، اُن کے لیے تو الگ سے تاریخ مرتب ہونی چاہیے لیکن ایسا ہوگا کچھ نہیں کیونکہ ہم جس جمہوریت میں بَس رہے ہیں اُس کا تقاضا یہی ہے کہ عوام قُربانی دیں اور خواص اُس سے حظ اٹھائیں۔یہ رجعت پسندانہ اسلام تو نہیں کہ جس کے خلیفہ عمرؓ بدن پر موٹے کھدر کا کرتہ، سر پر پھٹا عمامہ، پاؤں میں پھٹی جوتیاں پہنے، کندھے پر مشکیزہ اُٹھائے بیوہ عورتوں کے گھروں میں پانی بھریں اور کام سے تھک کر مسجد کے کونے میں خاک کے فرش پر لیٹ کر سو جائیں۔مکے سے مدینے تک سفر کریں تو خیمہ ساتھ ہو نہ شامیانہ جہاں ٹھہرے کسی درخت پر چادر ڈال دی اور سائے میں پڑے رہے۔گھر کا خرچ دو درہم روزانہ۔پھر بھی منبر پر چڑھ کر کہیں "اے لوگو! اگر میں دنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم کیا کروگے"؟۔ایک شخص تلوار نیام سے نکال کر بولا" تمہارا سر اُڑا دونگا"۔حضرت عمرؓ ڈانٹ کر بولے "میں امیر المومنین ہوں، تُو میری شان میں یہ لفظ کہتا ہے"۔اُس شخص نے کہا"ہاں تمہاری شان میں"۔حضرت عمرؓ مسکرائے اور فرمایا "خُدا کا شکر ہے قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دیں"۔۔۔۔قوم تو ہم بھی ہیں اور قوم مسلم بھی لیکن

قحط الرجال کا یہ عالم کہ اِن فرنیچر، پردے اور گاڑیوں کو تبدیل نہ کرنے کے دُکھ میں مبتلاء حاکمانِ وقت کو سیدھا کرنے والا کوئی نہیں۔ ویسے محترم پرویز رشید صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ قوم نے اُن کی حکومت کو نئی گاڑیاں خریدنے کے لیے ووٹ نہیں دیئے تھے اور جس بُلٹ پروف گاڑی میں وہ سفر کرتے ہیں وہ 99.99 فیصد کی پہنچ سے کوسوں دور ہے۔

پھر بھی ہم جنابِ پرویز رشید کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اُنہیں جلد از جلد نئی چمچماتی بُلٹ پروف گاڑی مل جائے لیکن ساتھ ہی یہ عرضداشت بھی پیش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ چونکہ وزیرِ اطلاعات ہیں اِس لیے ہمارا ایک چھوٹا سا کام کر دیں۔ کام یہ ہے کہ اِس بیباک الیکٹرانک میڈیا کا قبلہ درست کرتے ہوئے اُسے راہِ راست پر لے آئیں۔ صبح سے سارے نیوز چینل قوم کو گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ گنوا کر یہ بتلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ملالہ یوسف زئی کو امن کا نوبل انعام ملنے میں کتنی دیر باقی ہے۔ جب گھڑیاں گِن گِن کر وہ وقت آیا تو انعام کوئی اور لے اُڑا۔ ہم نے سُکھ کا سانس لیا کہ چلو جو ہونا تھا سو ہو چکا اب ملک کی کوئی خیر خبر آئے گی لیکن ''یہ نہ تھی ہماری قسمت''۔ جونہی نوبل پرائز کا اعلان ہوا چینلوں پر دُکھی دُکھی سی دھنوں کے ساتھ سب نے یہ گانا شروع کر دیا۔

''تُم جیتو، یا ہارو، ہمیں تُم سے پیار ہے''

محترم نواز شریف صاحب نے نیویارک میں فرمایا کہ ملالہ میری بیٹی ہے۔میاں صاحب کے اِس بیان کے بعد زرداری خاندان بھلا کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔بلاول ، بختاور اور آصفہ زرداری کا مشترکہ بیان ہے ''ہم ملالہ کو وزیرِ اعظم دیکھنا چاہتے ہیں''۔شاید یہ حبِ علیؓ نہیں ، بغضِ معاویہؓ ہو کیونکہ اِن نوجوانوں کو یہ یقین ہو چلا ہے کہ اب اُن کی حکومت تو آنے کی نہیں اور نہ ہی ''پاپا'' کبھی ایوانِ صدر کا مُکھ دیکھ پائیں گے اگر نواز لیگ اپنی ''حرکتوں'' کی بنا پر غیر مقبول ہو بھی گئی تو کپتان صاحب اپنی باری لینے کے لیے بے تاب ہیں اِس لیے یورپ اور امریکہ کی ''چہیتی'' ملالہ زندہ باد۔اب تو ملالہ بھی کہتی ہے کہ پہلے وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی لیکن اب اُس کا ٹارگٹ وزارتِ عظمیٰ ہے۔پتہ نہیں پاکستان میں وزارتِ عظمیٰ اتنی سستی کیوں ہو گئی ہے کہ لوگ وزارتِ عظمیٰ سے کم پہ ٹھہرتے ہی نہیں ۔

اِس میں کچھ کلام نہیں کہ ہمارے الیکٹرانک میڈیا کا ''حسنِ کرشمہ ساز'' معجزے دِکھا سکتا ہے ،حالانکہ معجزوں کا دَور گزر چکا۔کچھ عرصہ پہلے مختاراں مائی نامی لڑکی کو میڈیا نے آسمان پہ چڑھایا ، این جی اوز نے مختاراں مائی کو مثال بنا کر حقوقِ نسواں کی دہائی دی اور یورپ و امریکہ تو ہمیشہ ایسے واقعات کے انتظار میں رہتے ہیں جنہیں بنیاد بنا کر دینِ مبیں کے

خلاف زہر اُگلا جائے۔ چنانچہ مختاراں مائی آسمان کی وسعتوں کو چھونے لگی۔جب اہلِ یورپ نے جی بھر کے زہر اُگل لیا اور این جی اوز کے پیٹ بھی ڈالروں سے بھر گئے تو مختاراں مائی قصۂ پارینہ بن گئی۔اب پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک مختاراں مائی کا کہیں نشان تک باقی نہیں۔

ملالہ یوسف زئی نے ”گُل مکئی“ کے نام سے BBC میں اپنی ڈائری کے اوراق بھیجنا شروع کیے اور وہیں سے اُس کے تیز و طرار والد ضیاء الدین یوسف زئی نے اپنی بیٹی کی مشہوری کا پلان ترتیب دیا۔جس ڈائری کی بنیاد پر ملالہ مشہور ہوئی اُس کے بارے میں یہ قصّے مشہور ہوئے کہ وہ ڈائری اُسی کی کلاس کی ایک دوسری لڑکی نے لکھی تھی جو ضیاء الدین یوسف زئی کے ہاتھ لگ گئی اور اُس نے گُل مکئی کے نام سے BBCمیں بھجوانے کا منصوبہ بنایا۔ بہرحال یہ تاریخ ہے اور تاریخ کبھی نہ کبھی سچ ضرور اُگلتی ہے۔البتہ یہ طے ہے کہ اگر طالبان ملالہ پر حملہ کرنے کی ”حماقت“ نہ کرتے ، ہمارا الیکٹرانک میڈیا معاملے کو آسمان کی رفعتوں تک نہ پہنچاتا اور یورپ و امریکہ کو دینِ مبیں کو طالبان کے حوالے سے بدنام کرنے کی ”خبیثانہ“ ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ تو آج یہ ملالہ بھی اُن ہزاروں ملالاؤں میں سے ایک ہوتی جو آج بھی وحشی امریکہ اور چنگیزیت کے علمبردار طالبان کی دہشت گردیوں کی بنا پر کھلے آسمان تلے سسکتی یہ دُعائیں کرتی نظر آتی ہیں کہ کاش اُن کے کان کو چھوتی ہوئی طالبان

اللہ کو پیاری ہے قُربانی

عید الاضحیٰ کو ہم اپنی زبان میں عیدِ قربان کہتے ہیں۔یہ دِن اُس قُربانی سے منسوب ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے حلق پر چھُری چلائی۔قربانی قبول ہوئی اور حضرت اسماعیلؑ کی جگہ دُنبہ قُربان ہوا۔اِسی دن کی مناسبت سے ہر صاحبِ استطاعت مسلمان سنّتِ رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے حسبِ استطاعت جانور ذبح کرتا ہے لیکن کچھ لوگوں نے اسے بھی نمودو نمائش کا ذریعہ بنالیا ہے۔ہمارے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر رہائش پذیر ایک شخص نے 4 اونٹ اور 12 بکرے ذبح کرکے پوری سوسائٹی میں اپنی امارت کی دھاک بٹھادی اور ہم جو دو بکرے لا کر اتراتے پھر رہے تھے، شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ربِّ کردگار کے نزدیک قُربانی پسندیدہ ترین فعل ہے۔اُس کی راہ میں جان قربان کرنے والے کے لیے اُس کا فرمان ہے ”شہید کو مُردہ مت کہو، وہ زندہ ہے اور اپنے رب کے ہاں سے خوراک حاصل کر رہا ہے البتہ تمہیں ادراک نہیں“۔مال کی قربانی بھی ربِّ کائینات کو مرغوب ہے اسی لیے حکمت کی عظیم ترین کتاب کہتی ہے ”میں بھوکا تھا، کیا تم نے مجھے کھانا کھلایا؟۔میں پیاسا تھا، کیا تم نے مجھے پانی پلایا؟“۔ سبھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالے بھوک اور پیاس سے بے

نیاز ہے۔اِس فرمانِ ربی سے مراد یہ ہے کہ اُس کی طرف سے عطا کیے گئے رزق میں سے اُس کی مخلوق کی خدمت کی جائے۔ہم قربانی تو ضرور کرتے ہیں اور مفلسوں، مسکینوں میں گوشت بھی تقسیم کرتے ہیں لیکن ایسا گوشت جسے ہم اپنے لیے پسند کرتے ہیں نہ اپنے امیر رشتے داروں کے لیے۔اب اللہ ہی جانتا ہے کہ ہماری نمائشوں بھری قربانی اُس کی بارگاہ میں کہاں تک قبول ہوتی ہے۔

میں بھی کیا قصّہ لے بیٹھی، عید تو جَلی کَٹی سنانے کی بجائے ہنسنے ہنسانے اور خوشیاں منانے کا دن ہے۔اگر خوشیاں منانے کے ساتھ ہی ساتھ ''ٹھُمکا'' بھی لگا لیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔اگر کوئی صرف ٹھُمکے دیکھنے کا شوقین ہو تو ٹی۔وی آن کرکے کوئی بھی پاکستانی چینل آن کرکے دیکھ لے جہاں مرد و خواتین اینکرز، اداکار، اداکارائیں اور بھانڈ متواتر تین دن سے ٹھُمکے لگاتے اور ہلّا گُلا کرتے نظر آ رہے ہیں۔انہی خوشیوں کی مناسبت سے ہماری گزری عید کے گزرے لمحات کا قصّہ بھی سُن لیجئے۔ہوا یوں کہ عید سے ایک روز پہلے ہم نے بکرے خریدے اور گھر کے لان میں باندھ کر اُن کی خاطر تواضع میں مصروف ہو گئے۔اُن میں سے ایک بکرا تو بڑا ''شریف'' لیکن دوسرا اکھڑ مزاج تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اُس کے اندر غصے کا سونامی ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔شریف بکرا اگرچہ موٹا تازہ اور خوب پلا ہوا تھا لیکن دُبلا پتلا غصیل بکرا پھر بھی اُسے ٹکر مارنے سے باز نہیں آتا تھا۔ہمیں اگرچہ اُن کی

لڑائی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا البتہ یہ خوف ضرور تھا کہ اگر کسی بکرے کا سینگ ٹوٹ گیا تو نقصان بہرحال ہمارا ہی ہو گا کیونکہ ایسا بکرا قُربان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے لاکھ کوشش کی کہ دونوں اپنی زندگی کے آخری چند گھنٹے صلح صفائی سے گزار لیں لیکن ہمارا اُردو ادب کسی کام آیا نہ شعر و شاعری اور نہ ہی کالم نگاری۔ تنگ آ کر ہم نے دونوں کے درمیان اتنا فاصلہ پیدا کر دیا کہ اب وہ ایک دوسرے کو گھور تو سکتے تھے، سینگ نہیں پھنسا سکتے تھے۔

اصل مسئلہ تب پیدا ہوا جب شام کو سونامی بکرے نے چلانا شروع کر دیا اور اُس کی آواز کے ساتھ ہی دائیں بائیں کے نوجوان بکروں نے بھی آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ہم بھاگم بھاگ باہر گئے اور بڑے جتن کرکے اسے چُپ کرایا لیکن جونہی ہم گھر کے اندر داخل ہوئے اُس نے پھر چلانا شروع کر دیا اور محلے کے بکروں نے بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرضِ عین سمجھا۔ ہماری ساری رات یونہی آنے جانے میں بیت گئی۔ صبح اُٹھتے ہی میاں سے کہا کہ نماز کے بعد قصاب کو ساتھ ہی لیتے آئیں لیکن واپسی پر میاں خالی ہاتھ آ گئے۔ ہم نے پوچھا ''کہاں ہے قصاب''؟۔ وہ بولے ''نایاب''۔ ہم نے کہا کیا مطلب؟۔ وہ بولے کہ آج موچی، تیلی، لوہار، ترکھان، نائی سبھی قصاب بنے ہوئے ہیں اصلی قصاب ملے گا تو قربانی بھی کر لیں گے۔ ہم نے پوچھا ''کیا اصلی قصاب کے سینگ، ہوتے ہیں یا وہ دُمدار ہوتا ہے'' ؟۔ لاجواب ہو کر ہمارے طالبان نما مسلمان میاں

نے غصّے سے کھولتے ہوئے کہا ''سارے عیسائی تو قصائی بنے ہوئے ہیں۔کیا کسی عیسائی کو پکڑ لاؤں''؟۔ مجھے میاں کی اِس ''رجعت پسندی'' پر بہت غصّہ آیا اور تبھی میں نے سوچا کہ اب خواہ کچھ بھی ہو جائے میں اپنی اوّلین فُرصت میں تحفظِ حقوقِ نسواں کی کسی این جی او کو ضرور جوائن کروں گی لیکن وقتی مصلحت کے تحت میں نے میاں سے لجاجت سے کہا کہ جو بھی ہو قصاب کا بندوبست تو بہرحال کرنا ہے۔لیکن میاں میری عرضداشت'' پر کان دھرے بغیر یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے کہ اب پچھلے'' پہر دیکھیں گے۔

جب ہمارے صبر کا پیمانہ چھلک کر نڈھال ہو گیا تو ہم نے تقریباً چیختے ہوئے کہا آپ قصاب ڈھونڈیں گے یا میں خود قصاب ڈھونڈنے نکل پڑوں''؟۔ میرا تیر نشانے'' پہ لگا، میاں کی غیرت نے انگڑائی لی اور وہ جوتا پہن کر بُڑبُڑاتے ہوئے باہر نکل گئے اور ہم انتظار کی کٹھن وادیوں میں گھومنے لگے۔اِس انتظار کی چبھن اِس لیے زیادہ محسوس نہیں ہوئی کہ ہماری محبوب حکومت نے ہمیں بجلی کے انتظار کی ''لذت'' سے خوب خوب روشناس کرایا ہوا ہے۔کوئی دو گھنٹے انتظار کی کوفت جھیلنے کے بعد ہم نے قصاب کی تلاش میں نکلے میاں کی تلاش میں اپنے بیٹے کو بھیجا۔وہ تھوڑی دیر بعد ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوا اور کہا ''بابا تو ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے ہیں''۔ رنج اور غصے سے ہماری آنکھوں میں آنسو آتے آتے رہ گئے۔خون کے گھونٹ پیتے ہوئے ہم نے ابھی

باہر جانے کا ارادہ باندھا ہی تھا کہ میاں ایک قصاب کو لے کر آن وارد ہوئے۔ قصاب کی ناقابلِ رشک صحت دیکھ کر ہماری ہنسی چھوٹ گئی اور ہم نے میاں کے کان میں کہا کہ کیا اڑھائی کلو وزنی یہ قصاب بکرا ذبح کر لے گا؟۔ میاں نے کہا یہ تو پتہ نہیں لیکن یہ اصلی اور نسلی قصاب ہے جس کی کئی لوگوں نے گارنٹی دی ہے۔ جب قصاب نے یہ کہا کہ وہ صرف ایک بکرا ہی ذبح کر سکتا ہے تو ہم نے جھٹ سے کہا کہ اِس "غصیل" بکرے کو ذبح کر دو جس میں گوشت تو پاؤ بھر نہیں لیکن ڈکارتا بھینسے کی طرح ہے۔ لیکن میرے میاں کی نظر موٹے تازے شریف بکرے پر تھی۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو میاں کہنے لگے کہ یہ اکیلا ہی کل سے پانچ سو روپے کا دانہ، چارہ ڈکار گیا ہے۔ میں نے میاں کو سمجھایا کہ یہ منحنی سا قصاب اُس بکرے کو ذبح نہیں کر سکے گا اِس لیے اُس کی قربانی اگلے دن تک اُٹھا رکھتے ہیں۔ بات میاں کی سمجھ میں آ گئی اور وہی بکرا ذبح کر دیا گیا جس کا میں نے کہا تھا۔

میرا کالم ابھی ادھورا ہی تھا کہ ٹی۔ وی پر بلاول زرداری کی تقریر شروع ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ نوجوان بلاول 18 اکتوبر 2007ء کے سانحہ کارساز پر بات کرے گا لیکن اُس نے آتے ہی نواز لیگ، تحریکِ انصاف اور ایم کیو ایم کو رگیدنا شروع کر دیا۔ یہ تو خیر بعد میں پتہ چلے گا کہ بلاول زرداری کتنے پانیوں میں ہے لیکن یہ بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُس نے اپنی شہید ماں

کی طرزِ تقریر کی نقالی کرنے کی بھرپور کوشش کی۔جیالے تو کبھی کبھار جھلک دکھلا کر غائب ہو جانے والے لندن کے باسی کے بارے میں یہی کہتے پھرتے ہیں کہ

گئے دنوں کا سراغ لے کر، کہاں سے آیا، کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ

لیکن حقیقت یہی ہے کہ بی بی شہید کا کوئی ثانی پیدا ہوا، نہ ہو سکے گا اور بلاول زرداری تو ہر گز نہیں کہ وہ تو ارضِ پاک کی مٹی کی خوشبو سے بھی ناآشنا ہے۔جنابِ آصف زرداری لاکھ کوشش کر لیں لیکن یہ طے ہے کہ کسی کے نام کے ساتھ بھٹو لگا دینے سے کوئی بھٹو نہیں بن جاتا۔بلاول زرداری نے جیالوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" ہم مل کر غریبوں کا خون پینے والے "شیر" کا شکار کریں گے"۔جس پر نواز لیگ کے مشاہد اللہ خاں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا " بلاول زرداری وڈیو گیم پر ہی شیر کا شکار کر سکتے ہیں ۔بلاول زرداری کو چاہیے کہ پہلے یہ تو پتہ کرے کہ اُس کی ماں کے قاتل کیوں نہیں پکڑے گئے"۔ایم کیو ایم اور تحریکِ انصاف نے بھی بلاول کی تقریر پر حسبِ توفیق تبصرے کیے۔نیوز چینلز کو نوید ہو کہ بلاول نے اپنی تقریر کی صورت میں اُنہیں عید کا تحفہ دے دیا ہے۔اُمید واثق ہے کہ اگلے کئی دنوں تک سارے ٹاک شوز اسی تقریر کے گرد گھومتے رہیں گے۔

کیا طالبان مذاکرات چاہتے ہیں؟

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔ سرگوشیاں

حضورِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ حکومتِ وقت کی کوششوں ، کاوشوں اور اے۔پی۔سی کے باوجود طالبان کی نیتوں کے فتور سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ امن کے خواہاں ہیں نہ مذاکرات کے ۔طالبان ترجمان شاہد اللہ شاہد کہتے ہیں کہ وہ آئینِ پاکستان کے تحت کبھی مذاکرات نہیں کریں گے کیونکہ پاکستانی آئین جمہوری اور سیکولر اقوام کا ایجنڈا ہے اور پاکستانی حکومت غلام اور بے بس ۔اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ پہلے سے زیادہ منظم ، مضبوط اور ہر قسم کے حالات کے لیے تیار ہیں ۔اُن کا یہ مطالبہ ہے کہ حکومت جنگ بندی میں پہل کرے ، ڈرون حملے بند کروائے جائیں اور قیدی رہا کیے جائیں ۔مذاکرات کے جنوں میں مبتلا عمران خاں صاحب کے بارے میں اُس نے کہا کہ اگر عمران خاں کو مذاکرات کا شوق ہے تو ''کفریہ نظام'' سے باہر آ کر بات کریں۔

جب سے حکومت نے مذاکرات کا ڈول ڈالا ہے طالبان نے دہشت گرد حملے تیز کر دیئے ۔اِن حملوں میں جنرل ، لیفٹیننٹ کرنل اور خیبر پختون خواہ کے وزیر

قانون سمیت بہت سے لوگ جن میں خواتین، بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے، اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ پشاور چرچ حملے کی ذمہ داری اگرچہ طالبان نے قبول نہیں کی لیکن اِس حملے کو وہ شریعت کے عین مطابق قرار دیتے ہیں۔ دینِ مبیں میں تو اقلیتوں کے حقوق اور اُن کے جان و مال کی حفاظت پر بہت زور دیا گیا ہے، پتہ نہیں یہ "طالبانی شریعت" کہاں سے آئی ہے اور یہ لوگ کس مذہب کے پیروکار ہیں جو اِس حملے کو جائز سمجھتے ہیں۔ طالبان کے ترجمان کے اِس انٹرویو کے بعد یہ سمجھنا احمقوں کی جنت میں بسنے کے مترادف ہے کہ طالبان امن کے خواہاں ہیں۔ طالبان جمہوریت کو مانتے ہیں نہ آئینِ پاکستان کو۔ جبکہ سپہ سالار جنابِ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے دو ٹوک الفاظ میں یہ کہا کہ اگر آئینِ پاکستان کے تحت امن مذاکرات کامیاب ہوتے ہیں تو سب سے زیادہ خوشی فوج کو ہو گی۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ فوج دہشت گردی کے خلاف نپٹنے کی بھرپور اور مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔ وزیرِ اعظم میاں محمد نواز شریف صاحب کہتے ہیں کہ ریاستی حکمرانی کو ہر قیمت پر یقینی بنائیں گے اور اگر دہشت گردوں کو آزادی کے مفہوم کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہے تو دہشت گردی کے خلاف بنائے جانے والے نئے قوانین کے تحت یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ وزیرِ اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کہتے ہیں کہ طالبان آئینِ پاکستان کو تسلیم کرتے ہوئے مذاکرات کا مثبت جواب دیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جنگ بندی میں پہل حکومت کو منظور ہے نہ فوج کو، ڈرون حملے امریکہ کر رہا ہے

اور باوجودیکہ پاکستان نے ڈرون حملوں کا معاملہ جنرل اسمبلی کی خصوصی کمیٹی میں اٹھاتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ڈرون حملے ہماری سلامتی اور خود مختاری کے لیے چیلنج ہیں اور جنگی زون سے باہر کسی بھی ملک کے خلاف ڈرون حملوں کا استعمال عالمی قوانین کے منافی ہے اور اقوامِ متحدہ کے تفتیش کار کی یہ رپورٹ بھی منظرِ عام پر آ چکی ہے کہ پاکستان پر 330 ڈرون حملوں میں 2200 افراد ہلاک ہو چکے ہیں جن میں بہت سے بے گناہ بھی تھے۔ لیکن امریکہ کے گھر کی باندی اور در کی لونڈی اقوامِ متحدہ وہی کرے گی جو امریکہ کی مرضی ہو گی۔ افواجِ پاکستان اور حکمران اِس بات پر متفق ہیں کہ جتنی دیر تک طالبان ہتھیار پھینک کر آئینِ پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے، اُن سے مذاکرات ممکن نہیں۔اِن حالات میں قومی غیرت و حمیت کا یہی تقاضہ ہے کہ طالبان کے خلاف بھرپور آپریشن کرکے حکومتی رٹ قائم کی جائے۔

طالبان سے مجوزہ مذاکرات کی ناکامی کے خدشات کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ امریکہ پاکستان میں امن چاہتا ہے نہ بھارت۔جنابِ نواز شریف کی ''امریکہ یاترا'' سے چند گھنٹے قبل امریکی وزارتِ خارجہ کے ایک اعلیٰ عہدے دار کا یہ بیان سامنے آ گیا کہ امریکہ نواز حکومت سے یہ جاننا چاہتا ہے کہ طالبان کے ساتھ مذاکرات کس مرحلے میں ہیں اور نواز حکومت کے پاس طالبان سے نپٹنے کا کیا منصوبہ ہے۔اب امریکہ میں محترم میاں نواز شریف صاحب سے ہر سطح پر یہ

سوال پوچھا جائے گا اور میاں صاحب کے جواب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مذاکرات کی ناکامی کے لیے منصوبہ بندی کی جائے گی کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ اِس سے پہلے جب بھی طالبان کے ساتھ سنجیدہ مذاکرات کی کوئی کوشش کی گئی ، امریکہ نے اسے سبوتاژ کر دیا ۔چند سال پہلے تک تو طالبان کے اندر بہت سے لوگ امن اور مذاکرات کے خواہاں تھے جنہیں امریکہ نے چُن چُن کر ڈرون حملوں کی غذا بنا دیا اور اب طالبان کے اندر سی۔ آئی۔اے ، اور را کے ڈھیروں ڈھیر ایسے ایجنٹ موجود ہیں جو امن کے ہر گز خواہاں نہیں ۔ اگر کچھ لوگ امن چاہتے بھی ہیں تو اُن کی کوئی آواز ہے نہ حیثیت ۔ پچھلے دنوں پنجابی طالبان کے امیر نے جب امن مذاکرات کو خوش آمدید کہا تو حکیم اللہ محسود نے اُسے مکھن میں سے بال کی طرح نکال باہر کیا۔ طالبان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے گروہ حکیم اللہ محسود کی چھتری تلے جمع ہیں ۔وہ سبھی حکیم اللہ کو اپنا امیر مانتے ہیں اور حکیم اللہ مذاکرات کا خواہاں نہیں۔اِس لیے اگر کبھی کسی دباؤ کے تحت مذاکرات ہوئے بھی تو اُن کی ناکامی یقینی ہے ۔

دوسری طرف ہمارے سیاست دانوں کو حالات کی نزاکت کا معمولی سا احساس ہے نہ ادراک ۔ہر جگہ سیاسی بازیگری ہے اور سیاست دان مجمع بازوں کی طرح قوم کو بے وقوف بنانے میں مگن ۔عمران خاں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھے ہیں ۔اُن کی حکومت کا وزیرِ قانون شہید ہو گیا، طالبانی خود کُش حملوں سے

پشاور میں صفِ ماتم بچھ گئی لیکن پھر بھی خاں صاحب جا و بے جا مذاکرات کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ بلاول زرداری نے اُنہیں ''بُزدل خاں'' کہہ کر پکارا تو پوری تحریکِ انصاف کے تَن بدن میں آگ لگ گئی۔ محترمہ شیریں مزاری نے اسے شرمناک گردانتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہ دونوں باپ بیٹا تو موت کے خوف سے اپنے ڈرائینگ روم سے باہر نہیں نکلتے۔مانا کہ خاں صاحب بہت بہادر ہیں لیکن لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ لاشوں پہ کھڑے ہو کے مذاکرات کی بات کرنا بزدلی ہے۔

اے۔پی۔سی میں پیپلز پارٹی نے حکومت کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا لیکن ''صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں'' کے مصداق۔ قائدِ حزبِ اختلاف سید خورشید شاہ کا بیان کچھ اور ہوتا ہے تو جنابِ آصف زرداری کی سمت کچھ اور۔ سیاسی نو مولود پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول زرداری نے تو ایک ہی جست میں ساری حدیں پھلانگ ڈالیں۔ بلاول زرداری کی تقریر سے صرف ایک دن پہلے جنابِ آصف زرداری نے فرمایا کہ سیاسی پارٹیاں اگر آپس میں لڑ پڑیں تو تیسری قوت فائدہ اٹھائے گی۔اُنہوں نے یہ بھی کہا ''قدم بڑھاؤ نواز شریف، ہم تمہارے ساتھ ہیں''۔ لیکن ہونہار فرزندِ ارجمند نے نواز لیگ کو بخشا، نہ تحریکِ انصاف کو اور نہ ہی ایم کیو ایم کو۔اُس نوجوان نے لگی لپٹی رکھے بغیر یہ کہا کہ آصف زرداری کمان ہیں اور میں اُس کا تیر، ہم مل کر غریبوں

کا خون چوسنے والے شیر کا شکار کریں گے۔ نوجوان زرداری نے کہا کہ پاکستان 1947ء میں آزاد ہو گیا تھا لیکن کراچی اب بھی لندن کا غلام ہے۔ ہم فون پر اُڑنے والی پتنگ کو کاٹ ڈالیں گے اور خیبر پختونخواہ کو سونامی سے بچائیں گے۔ لندن پلٹ بلوچ سردار نے یہ بھی کہا کہ عوام کی خاطر 2013ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے 100 سیٹوں کی قربانی دی۔ اُنھوں نے اپنے اِس جملے کی تشریح نہیں کی لیکن شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جیالوں کو دہشت گرد حملوں سے بچانے کی خاطر وہ میدان میں نکلے نہ انتخابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے سکے جس کی بنا پر پارٹی سکڑ، سمٹ کر سندھ تک محدود ہو گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کو اپنی کرپشن اور ''حرکتوں'' کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا۔ اگر پی پی پی نے عوامی خدمت کو اپنا شعار بنایا ہوتا تو وہ گھر بیٹھے بھی جیت جاتی۔

لاریب باہم دست و گریباں سیاست دانوں کو مطلق احساس نہیں کہ وطنِ عزیز کس نازک موڑ پر آن پہنچا ہے۔ ہم تو دست بستہ یہی گزارش کر سکتے ہیں کہ سیاست سیاست کھیلنے کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے پہلے دھرتی کے اُن دشمنوں سے تو نپٹ لیں جو دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور آپ اپنی حرکتوں کی طفیل کمزور سے کمزور تر۔

گزشتہ کئی سالوں سے ہم ایک ہی گوالے سے دودھ لیتے آ رہے ہیں۔ ہم اپنی بھرپور کوششوں اور کاوشوں کے باوجود تا حال یہ عقدہ وا نہیں کر سکے کہ گوالا دودھ میں پانی ملاتا ہے یا پانی میں دودھ۔ ہم گلے شکوے کرتے رہتے ہیں لیکن مجال ہے جو کبھی گوالے کے ماتھے پر شکن آئی ہو یا عرقِ ندامت سے پیشانی تَر۔ ہم نے جب بھی اُسے لیکچر پلایا اُس نے ایک ہی جواب دیا "بی بی لعنت ہے ملاوٹ کرنے والے پر، ہم تو حلال کی روکھی سوکھی کھانے والے ہیں"۔ چیخنا چلانا اور احتجاج کرنا ہمارا آئینی حق ہے جسے ہم بطریقِ احسن نبھاتے رہتے ہیں لیکن مسکرا کے ٹال دینا گوالے کی سرشت۔ ایک آدھ بار ہم نے گوالا بدلا بھی لیکن دودھ میں ڈُبکیاں لگانے کے باوجود بھینس کا اتا پتا نہ ملا۔ تھک ہار کر اُسی گوالے سے رجوع کرنا پڑا اور اب تو ہم نے گوالا نہ بدلنے کی قسم اٹھا رکھی ہے کیونکہ "رجوعِ مکرر" پر گوالے کے ہونٹوں پر آئی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ نا قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ ایک بار کسی نے تحفتاً ہمیں گاؤں سے خالص دودھ بھیجا جسے پی کر ہم سبھی بیمار پڑ گئے۔ اِس لیے گوالے کا "خالص ہائی جینک" دودھ اور ہم لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ ڈبے کے دودھ سے ہمیں اکبر الہ آبادی نے بہت پہلے ڈرا دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں

طفل سے بُو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے، تعلیم ہے سرکار کی

ایک بار ہم گوالے سے پوچھ بیٹھے کہ اُس نے کبھی تسلیم نہ کرنے کا گُر کہاں سے سیکھا ہے ؟۔ گوالا جھٹ سے بولا ''ابا بہشتی'' سے ۔ پھر باتونی گوالے نے ابا بہشتی کے کارنامے گنوانے شروع کر دیئے ۔اُس نے بتلایا کہ ابا بہشتی بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ پورے علاقے میں اُس کی دھوم تھی لوگ اُس سے ملنے کے لیے ترستے رہتے تھے لیکن وہ کسی سے نہیں ملتا تھا کیونکہ اُس کا زیادہ وقت تھانے کچہری میں گزرتا تھا۔ ہم نے حیرت سے پوچھا کہ کیا وہ اتنا بڑا ''عوامی خدمتگار'' تھا؟۔ گوالا کہنے لگا ''چھڈو جی ! اگر اُس کی خدمتوں کا پوچھنا ہے تو علاقے کے لوگوں سے پوچھو۔ علاقے کا شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں وہ نہ پہنچا ہو۔ ابا بہشتی کا ہاتھ اتنا صاف تھا کہ وہ بڑے بڑے چوہدریوں کی گائیں ، بھینسیں بھی ایسے نکال لے جاتا جیسے مکھن میں سے بال ۔ سبھی جان جاتے کہ یہ صاف ستھرا کارنامہ ابا بہشتی ہی کا ہے لیکن مجال ہے جو ''پُلس'' اُس سے کچھ اُگلوا سکی ہو۔ پُلس والے جب ''سچ پتّر'' سے اتّے کی خدمت کرتے کرتے تھک جاتے تو ابا کہتا ''بادشاہو ! تھوڑا ساہ کَڈ لوو۔ اسیں تے ایتھے ای آں ، کیہڑا نَس چلے آں''۔ اتّے کی خدمت سے نڈھال پولیس والوں کی غیرت انگڑائی لے کر جاگ اُٹھتی اور کئی کئی پُلسیے اُس پر ٹوٹ پڑتے ۔

میں نے غصّے سے کھولتے ہوئے پوچھا ''کیا یہ سب کچھ تمہارے لیے باعثِ فخر ہے ؟۔ گوالے نے جواب دیا ''ہاں جی یہ کام تو بڑے بڑے چوہدریوں، رسہ گیروں اور ''اُچیاں شاناں'' والوں کا ہے۔ اگر پولیس نے ابا بہشتی کو ''پُلس مقابلے'' میں پار نہ'' کر دیا ہوتا تو جتنی تیزی سے وہ ترقی کر رہا تھا، آج قومی اسمبلی کا ممبر ہوتا''۔ گوالے کے اِس جملے نے مجھے چونکا دیا اور میں ماضی کے اوراق پلٹنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میں اِس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ گوالے کا حرف حرف سچ تھا۔ نواز لیگ کو معروف کالم نگار حامد میر آخری اُمید'' کہتے ہیں لیکن کڑوا سچ تو یہی ہے کہ نواز لیگ نے بھی ابھی تک مایوس ہی'' کیا ہے ۔اِس مایوسی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میاں برادران نے انتخابی مہم میں قوم کو جو سہانے سپنے دکھائے ، اُن کی تعبیر اُلٹ ہو گئی اور آج ابا بہشتی جیسے کردار بھی طعنے مہنے'' دیتے نظر آتے ہیں۔ اپنے ''ابے'' کی کرپشن کی الف لیلوی داستانوں پر'' فخر کرنے والے بلاول زرداری کو بھی غریبوں کا خون چوسنے والا ''شیر'' نظر آنے لگا ہے ۔ گویا ''چھاج بولے تو بولے ، چھلنی بھی بولتی ہے ، جس میں ستّر چھید'' ۔ بلاول زرداری کی انقلابی تقریر قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ کے مَن کو بہت بھائی ۔اُنہیں بلاول کے اندر ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بینظیر بھٹو کی روحیں اودھم مچاتی نظر آنے لگی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بلاول کی تقریر نے سیاستدانوں میں ہلچل پیدا کر دی

ہے اور سبھی اُس پر گرجتے برسنے لگے ہیں ۔اپنے یہ شاہ صاحب بھی بڑی پہنچی ہوئی شئے ہیں ۔اپنی ''دبنگ موچھوں'' کے سائے میں وہ ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ سُننے والا تا دیر لطف اندوز ہوتا رہتا ہے ۔ ایک طرف تو وہ فرینڈلی اپوزیشن کا ایسا تاثر دیتے ہیں کہ تحریکِ انصاف جل بھُن کر کباب ہو جاتی ہے جبکہ دوسری طرف وہ شیر پر تیر کا نشانہ باندھنے سے بھی نہیں چوکتے ۔بلاول زرداری اپنے ''ابّے'' کو کمان سے تشبیہ دیتے ہیں اور اپنے آپ کو تیر سے لیکن پیپلز پارٹی کو مسئلہ یہ آن پڑا ہے کہ ''تیر'' تو نیا نویلا اور لشکارے مار رہا ہے جبکہ کُہن سالہ کمان اتنی بوسیدہ ہو چکی ہے کہ اب اُسے کاٹھ کباڑ کی نظر کر دینے میں ہی عافیت ہے لیکن شاید پیپلز پارٹی بھی اندر سے ''رجعت پسند'' ہے ۔اسی لیے اُس کی سیاست پہلے گڑھی خُدا بخش کے شہیدوں کے گرد گھومتی تھی اور اب اِس میں ''خاندانِ زرداریہ'' بھی شامل ہو گیا ہے۔اب ایک زرداری کمان ہے تو دوسرا تیر، بھٹوز کا تو نام و نشان نہیں ۔

تحریکِ انصاف کو سیّد خورشید شاہ کی حزبِ اختلاف کی قیادت قبول نہیں ۔اُس نے چار و ناچار شیخ رشید احمد کو قائدِ حزبِ اختلاف بنانے کی ٹھان لی ہے۔ کپتان صاحب کو پتہ تھا کہ ایم کیو ایم کسی بھی صورت میں کسی ''سونا میے'' کی حمایت نہیں کرنے والی اِس لیے قرعۂ فال شیخ صاحب کے نام نکلا۔اب شیخ صاحب ایم کیو ایم کو منانے کی بھرپور تگ و دو کر رہے ہیں لیکن اپنے مفادات کو ہر

لحاظ سے عزیز رکھنے والی ایم کیو ایم طرار شیخ رشید کو بھی غچہ دے جائے گی۔ اُس نے تو ابھی یہ بھی طے نہیں کیا کہ مرکز میں اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنا ہے یا میاں نواز شریف کی قیادت میں اقتدار کے مزے لوٹنے ہیں۔ایم کیو ایم کی قیادت خوب جانتی ہے کہ نواز لیگ شیخ رشید احمد کو قائدِ حزبِ اختلاف کی کرسی پر براجماں ہوتے نہیں دیکھ سکتی اِس لیے اُمیدِ واثق یہی ہے کہ نواز لیگ کا موڈ دیکھتے ہوئے وہ شیخ صاحب کو طرح دے جائے گی۔ اُس نے اپنی سندھ کی گورنری بھی بچانی ہے۔ سیاست میرا کبھی موضوع نہیں رہا اور نہ میں سیاست کی الف ، بے سے واقف ہوں۔ مجھے تو اپنے عظیم سیاستدانوں سے بھی واجبی سی واقفیت ہے۔ اگر کبھی کوئی بدباطن میرا امتحان لینے کی ٹھان لے تو ڈھول کا سارا پول کھُل جائے گا۔ پھر بھی دیکھ لیجئے کہ میں کتنے اعتماد سے سیاسی تجزیہ کر رہی ہوں۔ اگر کسی کو میرے اِس تجزیے سے اختلاف ہو تو وہ جائے ''بھاڑ میں'' مجھے اِس سے کیا۔ میں نے تو اپنے کالم کا پیٹ بھرنا تھا ، سو بھر لیا۔ ویسے بھی پاکستان میں ایسے ارسطوانہ تجزیے کرنے والے بیس ، تیس ہزار تو ہونگے ہی ، لشکر اور ''لشکرنیاں'' اِس سے الگ ہیں۔ اور اب تو ماشااللہ اداکار ، اداکارائیں اور بھانڈ بھی جا بجا تجزیے کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر اُنہیں کوئی نہیں پوچھتا تو میرا کونسا کسی نے سر پھاڑ دینا ہے۔ میرے ایک سونامیے قاری نے مجھے برقی پیغام بھیجا کہ

اتنا نہ اپنی جائے سے باہر نکل کے چل

دُنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ، سنبھل کے چل

تو عرض ہے کہ اِس معاملے میں میں بہت محتاط ہوں۔ میں نے کبھی طالبان کے خلاف لکھا ہے نہ ایجنسیوں کے۔ کیونکہ میں خوب جانتی ہوں کہ طالبان نے دارِ فانی سے کوچ کروانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور ایجنسیاں بندے کو یوں غائب کرتی ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ سپہ سالار جنرل اشفاق پرویز کیانی کا میں تہِ دل سے احترام کرتی ہوں اور جمہوریت کے لیے اُن کی خدمات کی معترف ہوں۔ جنابِ چیف جسٹس کی عظمتوں کے سامنے سب کچھ ہیچ ہے۔ اُن کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ اور خدمتِ عالیہ میں بصد عجز و نیاز یہ عرض

تُو جاں بھی مانگ لے تو حاضر ہے بے دریغ

تیرے لیے خلوص کی کوئی کمی نہیں

البتہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ اِن دونوں عظیم ہستیوں کی ریٹائرمنٹ کے بعد میرے اِن کے بارے میں خیالات کیا ہونگے کیونکہ میں بھی "بندہ بشر" ہوں اور اتنی ضدی ہرگز نہیں کہ "ایویں ای" اپنی بات پہ اڑی رہوں۔ ہاں سیاستدانوں پہ مَیں خوب ہاتھ صاف کرتی رہتی ہوں کیونکہ یہ بیچارے تو "ڈھول ڈنگر" ہیں۔ اِنھوں نے کونسا احتجاج کرنا ہے۔

وزیر اعظم کا دورہ امریکہ، توقعات، خواہشات

ناخواندہ ہسپانوی مہم جو فرانسسکو پیزارو نے پیرو کی ''انکا'' سلطنت فتح کرنے کا ارادہ کیا ۔''انکا''یعنی حکمران تمام اختیارات کا مالک ہوتا تھا اور ہندوستانی اسے ''اوتار'' یا نیم دیوتائی وجود تسلیم کرتے تھے۔ 1528ء میں شہنشاہ چارلس پنجم نے پیزارو کو ''پیرو'' فتح کرنے کا اختیار تو دے دیا لیکن اُس کو اِس مہم کے لیے صرف مالی امداد مہیا کی۔نڈر اور اولوالعزم پیزارو ستمبر1532ء میں محض 177 سپاہیوں اور 62گھوڑوں کے ساتھ اُس سلطنت کو فتح کرنے نکلا جس کے پاس کئی ہزار مسلح جنگجو، ساٹھ لاکھ سے زیادہ آبادی اور بے تحاشہ سونا اور چاندی کی مالک تھی ۔پیزارو نے اپنی ہمت ،جرات اور چالاکی سے اُس سلطنت کو فتح کیا جس کی آبادی جنوبی امریکہ کی تمام ریاستوں کی مشترکہ آبادی سے بھی زیادہ تھی ۔پیزارو نے حکمران'' اتاہولپا'' کو گرفتار کرکے قتل کر دیا اور تیس ملین ڈالر سے بھی زیادہ سونا چاندی لوٹ لیا۔ہمت و جرات کے علاوہ کٹر مذہبی ہونا بھی پیزارو کی اِس عظیم الشان کامیابی کی ایک وجہ تھی ۔ مرتے ہوئے اُس نے اپنے خون سے زمین پر صلیب کا نشان بنایا اور آخری لفظ جو اُس نے ادا کیا وہ ''یسوع'' تھا۔

عالمِ اسلام کی تاریخ تو ایسے محیر العقول واقعات سے بھری پڑی ہے۔ غزوہ بدر سے شروع کر لیجئے، تاریخ کے صفحات پر جا بجا ایسے ہی واقعات نظر آئیں گے۔ میں نے حضرت عمرؓ کے دَور کی فتوحات کا ذکر کیا ہے نہ محمد بن قاسم اور طارق بن زیاد کے کارنامے گنوائے ہیں لیکن تاریخ بہرحال یہی بتلاتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے جذبۂ ایمانی کے زور پر ہمیشہ اپنے سے کئی گنا بڑی طاقتوں کو زیر کیا۔ مشاہیر عالمِ اسلام کا ذکر کرنے کی بجائے میں نے فرانسسکو پیزارو کا ذکر محض اِس لیے کیا ہے کہ ہمارے بہت سے سیکولر دانشور اسلام کا نام سُنتے ہی بھڑک اُٹھتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ہر اُس شخص کو ہمالیہ سے بھی اونچا قرار دے دیا جاتا ہے جسے مغرب اپنا لے۔ ملالہ یوسف زئی جسے مغرب نے بیشمار اعزازات سے نوازا، اسے ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے آسمان کی رفعتوں تک پہنچا دیا لیکن علیم و خبیر ربِّ لازوال نے اُسے اُسی کے ہاتھوں رُسوا کر دیا۔ ضیاء الدین یوسف زئی اور کرسٹینا لیمب کی کاوشوں سے منظرِ عام پر آنے والی کتاب ''میں ملالہ ہوں'' نے ملالہ کی آڑ میں کھیلے جانے والے عالمی فتنہ گروں کے کھیل کو عیاں کر دیا۔ ملعون سلمان رُشدی کی کتاب '' سیٹانک ورسز'' کے منظرِ عام پر آتے ہی پورے عالمِ اسلام میں آگ لگ گئی لیکن ملالہ کو یہ آزادیٔ اظہارِ رائے نظر آتی ہے اور عاشقانِ رسول ﷺ مُلّا اور اُن کے پیروکاروں کا رجعت پسند ٹولہ۔ طالبان کہلانے والے دہشت گردوں کی غیر اسلامی اور غیر شرعی کارروائیاں تو قابلِ نفرت ہیں ہی لیکن ملالہ تو اُن سے بھی

کہیں آگے کی "پہنچی ہوئی شے" نکلی۔ جس ملک میں ملالہ کو چاہنے والوں کی کثیر تعداد موجود ہو وہاں لبوں پہ بے اختیار آ جاتا ہے کہ

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

عقل کو دنگ کر دینے والے کارنامے اُنہی لوگوں نے سرانجام دیئے جو اپنے جذبۂ ایمانی پر مضبوطی سے جمے رہے۔ ہم اُس دینِ مبیں کے پیروکار ہیں جو ہمیں اپنے گھوڑے ہمیشہ تیار رکھنے کا حکم دیتا ہے لیکن ہمارے سیکولر مہربان ہمیشہ یہی پرچار کرتے ہیں کہ ہمارے پاس تو کوئی "گھوڑا" ہی نہیں جسے تیار رکھا جائے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایمان مضبوط ہو اور عزم صمیم تو ہمارے پاس وہ سب کچھ ہے جو کسی بھی جارح کا مُنہ توڑ جواب دینے کے لیے کافی ہے، بس تھوڑی ہمت، جرات اور حوصلے کی ضرورت ہے۔

ہمارا ہمیشہ یہی المیہ رہا ہے کہ ہمارے کسی بھی حاکم نے کبھی بھی جارح امریکہ کے ساتھ کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی پر کبھی عمل نہیں کیا۔ آج تو قائدِ حزبِ اختلاف سید خورشید شاہ یہ فرماتے ہیں کہ "پاکستان کو امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنی چاہیے۔ پاکستان خود ایک طاقت ہے اور امریکہ پر دباؤ ڈال سکتا ہے اور امریکہ نے دنیا پر حکومت کرنے کے لیے

پاکستان کو آگ میں دھکیل رکھا ہے''۔ لیکن اپنے پانچ سالہ دورِ حکومت میں شاہ صاحب کی پیپلز پارٹی کو یہ سب کچھ کہنے کی ہمت ہوئی نہ توفیق۔ محترم عمران خاں بھی ابتداء میں امریکہ پر خوب گرجتے برستے رہے لیکن جونہی اُنہیں یقین ہونے لگا کہ وہ دو تہائی اکثریت حاصل کر لیں گے ، اُن کا امریکہ کے بارے میں رویہ انتہائی محتاط ہو گیا ۔انتخابی مہم میں وہ نواز لیگ اور مولانا فضل الرحمٰن پر گرجتے برستے رہے لیکن امریکہ کا نام لینا بھول گئے حالانکہ وہ اُس وقت بھی جانتے تھے کہ امریکہ کبھی ہمارا دوست تھا، ہے اور نہ ہو گا۔ یہ تو خیر امریکی دوستی کے قصیدے پڑھنے والے بھی جانتے ہیں کہ ہمیں کسی دشمن نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا اِس ''جہنم سے نکلے ہوئے'' دوست نے۔ 1948ء سے 2012ء یعنی آزادی سے اب تک امریکہ نے ہمیں 68 ارب ڈالر کی امداد دی ہے جبکہ 100 ارب ڈالر سے زائد تو ہم افغانستان میں لڑی جانے والی اندھی امریکی جنگ میں جھونک چکے ہیں ۔۔برباد معیشت اور پچاس ہزار انسانی جانوں کا زیاں بھی اسی جنگ کا تحفہ ہے ۔ایمنسٹی انٹر نیشنل کے ترجمان نے اپنی پریس بریفنگ میں ڈرون حملوں کو ماورائے عدالت قتل اور جنگی جرم قرار دیا ہے ۔ترجمان کے مطابق خفیہ ڈرون پروگرام امریکہ کو قتلِ عام کا لائسنس دیتا ہے۔ جبکہ ہمارا ''مخلص دوست'' امریکہ کہتا ہے ''ڈرون حملے عالمی قوانین کی خلاف ورزی نہیں ۔ڈرون حملوں کا آپشن کم سے کم انسانی جانوں کے زیاں کی وجہ سے اپنایا گیا''۔اِس کم سے کم انسانی زیاں کے بارے میں

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ کہتی ہے کہ پاکستان پر 400 ڈرون حملے ہوئے، 3600 افراد مارے گئے جن میں سے کم از کم 900 سے زائد مکمل طور پر بے گناہ تھے۔ میاں نواز شریف صاحب نے تو گی لپٹی رکھے بغیر ڈرون حملوں پر بارک اوباما کو اپنے تحفظات سے آگاہ کر دیا لیکن پریس بریفنگ میں اوباما ڈرون حملوں کے ذکر کو گول کر گئے البتہ میاں نواز شریف صاحب نے اُسی پریس بریفنگ میں ڈرون حملوں پر اپنے تحفظات کا ذکر کر دیا۔ اگر زمینی حقائق کو مدِ نظر رکھا جائے تو دو تہائی اکثریت کے حامل وزیرِ اعظم میاں محمد نواز شریف کو فوج کی بھرپور حمایت حاصل ہے، اپوزیشن نہ ہونے کے برابر اور قوم تا حال اُن سے اُمیدیں باندھے بیٹھی ہے اِس لیے یہی موقع تھا کہ امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی جاتی۔ یقیناً میاں صاحب کو بھی اِس کا ادراک تھا اسی لیے اُنھوں نے وائٹ ہاؤس میں اوباما کے ساتھ ملاقات کے دوران تمام حساس معاملات پر کھُل کر بات کی اور ڈرونز، ایڈ نہیں ٹریڈ، مسئلہ کشمیر، دہشت گردی اور عافیہ صدیقی کی رہائی جیسے مطالبات امریکی صدر کے سامنے رکھے۔ حکومتِ ہند کو اپنے دل کے بہت قریب رکھنے والے اوباما نے مسئلہ کشمیر کا ذکر گول کرتے ہوئے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ پاکستان بمبئی حملوں اور جماعت الدعوۃ پر مثبت رویہ اختیار کرے ۔ مجموعی طور پر یہ ایک تعارفی تقریب تھی جو مذاکرات کی راہ ہموار کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اِس دورے سے زیادہ توقعات رکھنا محض خوش فہمی ہو گی۔

واشنگٹن میں ''انسٹیٹیوٹ آف پیس'' سے خطاب کرتے ہوئے کہا'' ایک امریکی کال پر لیٹ جانے والے پاکستان کے حقیقی نمائندے نہیں۔امریکہ ہماری عزت کرے اور ہم سے اپنی عزت کروائے۔ڈرون حملے ہماری سلامتی کی راہ میں رکاوٹ ہیں جنھیں بند ہونا چاہیے ''۔اسی کی بازگشت نواز،اوباما ملاقات میں بھی سنائی دی۔یہ بجا کہ ہمارے وزیرِاعظم امریکہ سے خالی ہاتھ لوٹ رہے ہیں لیکن اُنھوں نے یہ پیغام ضرور دے دیا امریکہ کی باری ہے۔امریکہ کے دل میں Do more ہے کہ وہ مشرف نہیں اور اب بیٹھ کر ایسی کھری کھری باتیں شاید اس سے پہلے کسی حاکم کو نصیب نہیں ہوئیں۔اب سید خورشید شاہ صاحب کو مطمئن ہو جانا چاہیے کہ میاں صاحب نے شاہ صاحب کے فرمان کے مطابق واقعی ''امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر''بات کی۔

میں ملالہ ہرگز نہیں

سوات کی گُل پوش وادیوں ، چشموں اور جھرنوں کے درمیاں ایک بُلبُل کی اپنے گُل کے لیے پکار سنائی دی جو پربتوں کی ساری شہزادیوں کو چونکا گئی ۔یہ "گُل مکئی" تھی جسے "علم" نامی گُل سے والہانہ عشق تھا۔گُل مکئی کے اِس پیار کی مہکار نے سوات کی جنت نظیر وادیوں کے حسن کو چار چاند لگا دیئے اور ہر نوخیز کلی یہ پکار اُٹھی "میں گُل مکئی ہوں ، میں گُل مکئی ہوں"۔گُل مکئی کی ڈائری کے اوراق نے وقت کی طنابیں کھینچ دیں اور اسپِ تازی عَلَمِ عِلم لہراتا بگٹ ہواؤں کے دوش پہ سوار ہو گیا۔اِس گُل مکئی کے قلمی نام سے لکھنے والی نوخیز کلی کا تعارف اُس کے باپ ضیاء الدین یوسف زئی نے "ملالہ" کے نام سے کروایا اور جب طالبان نامی قابلِ نفرت وحشی درندے اُس پر حملہ آور ہوئے تو وادیٔ سوات ہی نہیں پاکستان کی ہر بچی پکار اُٹھی "میں ملالہ ہوں ، میں ملالہ ہوں"۔طالبان سے نفرت اور ملالہ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ اُس وقت اگر کسی لکھاری نے ملالہ کے خلاف لکھا یا کسی عالمِ دیں نے کچھ کہنا چاہا تو سبھی اُس کی مخالفت پر اُتر آئے ۔الیکٹرانک میڈیا پر ملالہ کو بھرپور کوریج دی گئی اور ہر چینل ایک ایک لمحے کی خبر عوام تک پہنچاتا رہا۔پرنٹ میڈیا پر بھی یہی عالم تھا اور شاید ہی کسی اور

سانحے پر اتنے کالم لکھے گئے ہوں جتنے ملالہ پر قاتلانہ حملے کے خلاف لکھے گئے۔ ہر شخص طالبان کے خلاف اپنی بھرپور نفرت کا درانہ اظہار کر رہا تھا اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی ملالہ کے خلاف بات کرے اور بچ کر نکل جائے۔ اتنے شدید عوامی ردِ عمل کی طالبان کو ہر گز توقع نہیں تھی اِس لیے وہ حیران و پریشان تھے کہ اُن سے یہ احمقانہ حرکت کیسے سرزد ہو گئی۔ لیکن جب سے ملالہ یوسف زئی کی کتاب ''میں ملالہ ہوں'' منظرِ عام پر آئی تو ہر پاکستانی بچی ایک دفعہ پھر پکار اُٹھی ''میں ملالہ نہیں، ہر گز نہیں'' اور ہر باغیرت باپ یہی کہتا نظر آیا کہ '' موت قبول ہے لیکن ضیاء الدین یوسف زئی بننا قبول نہیں، ہر گز نہیں''۔

جب بھولی صورت والی ملالہ پر وحشی طالبان نے قاتلانہ حملہ کیا تو اُس وقت میں نے اُس کی صحت یابی کے لیے ڈھیروں ڈھیر دعائیں مانگیں، اُس کی حالت سے آگہی کے لیے پہروں نیوز چینلز سے جُڑی رہی۔ ایک ماں ہونے کے ناطے میں چشمِ تصور سے ملالہ کی ماں کی بے کسی اور بے بسی کے نقشے کھینچتی اور اُس کرب کے تخمینے لگاتی رہی جس سے ملالہ کی ماں گزر رہی تھی۔ شاید وہ میری زندگی کا پہلا دن تھا جسے میں نے بنا کچھ کھائے پیئے گزار دیا۔ میرے میاں نے میرے اِس زبردستی کے ''روزے'' پر مجھے سمجھانا چاہا لیکن میں تلخ ہوتی چلی گئی، حتیٰ کہ میں نے اُنہیں طالبان کا ساتھی تک کہہ دیا جس کا مجھے زندگی بھر افسوس

رہے گا۔برمنگھم کے ہسپتال میں ملالہ کی مکمل صحت یابی تک میں اسی کی خبروں کے گرد گھومتی رہی ۔ملالہ کی صحت یابی کے بعدجب اہلِ یورپ نے اُس پر ایوارڈز اور نوازشات کی بارش کر دی تو میں چونک اُٹھی۔ربِ کریم نے کتابِ مبین میں پوری قطعیت سے یہ فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ یہودی اور نصرانی مسلمانوں کے کبھی دوست نہیں ہو سکتے اِس لیے میں حیران تھی کہ پاکستان کی ایک مسلمان لڑکی پر اتنی نوازشات کیوں ؟۔ایک طرف توسکول کے 80 معصوم بچوں کو ڈرون کی غذا بنا دیا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف سوات کے ایک سکول کی پندرہ سالہ بچی کو آسمان کی رفعتوں تک پہنچانا سمجھ سے بالاتر تھا۔ملالہ کو ملنے والے ایوارڈز کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا اور شاید ہی کوئی ایسا ایوارڈ بچا ہو جو ملالہ کا نصیبہ نہ ٹھہرا ہو ۔اُسے امن کے عالمی نوبل ایوارڈ کے اُمیدواروں کی فہرست میں بھی شامل کیا گیا اور جب یہ انعام کسی اور کی جھولی میں جا گرا تو لکھنے والوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ ملالہ کا قد اِس ایوارڈ سے بھی اونچا ہے ۔انتہائی محترم جناب حامد میر نے تو عالمِ غیض میں یہاں تک کہہ دیا کہ ’’اب شاید ملالہ کے مخالفین کے سینوں میں ٹھنڈ پڑ گئی ہو گی‘‘۔میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمعن کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ اہلِ یورپ و امریکہ طالبان کے شدید مخالف ہیں اِس لیے ملالہ پر نوازشات کی بارش ہو رہی ہے۔

پھر خبر آئی کہ ملالہ کی خود نوشت ''آئی ایم ملالہ'' عنقریب منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ سچے اور سُچے جذبوں میں گُندھی ملالہ کی تحریر ٹھَک سے دل میں اُتر جائے گی اور اِس معصومانہ تحریر کی بدولت نسلِ نَو کے اندر انگڑائیاں لیتا خونِ گرم ''علمی انقلاب'' کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ جس میں یقیناً نصرت وتائیدِ ربی بھی شامل ہو گی کیونکہ ربِّ کردگار اپنے عالم بندوں سے ہی پیار کرتا ہے اور اُس کا تو اپنے محبوب ترین نبی ﷺ کے لیے بھی اوّلین پیغام یہ تھا کہ ''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تمھیں تخلیق کیا''۔اور یہ بھی اُسی کا فرمان ہے کہ ربّ کو جاننے والے اُس کے عالم بندے ہیں ۔علم کی فضیلت کو میرے آقا ﷺ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ ''ایک عالم ایک ہزار عابدوں سے وقیع ہے''۔ لیکن جب میں نے ''آئی ایم ملالہ'' جستہ جستہ پڑھی تو میری ملالہ کے ساتھ ہمدردی کراہت میں بدل گئی ۔کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ملالہ کی معصومیت کو اُس کے باپ ضیاء الدین یوسف زئی اور برطانوی صحافی کرسٹینا لیمب نے مل کر کَیش کروایااور ''آئی ایم ملالہ'' ضیاء الدین یوسف زئی اور کرسٹینالیمب کی مشترکہ کاوش ہے کیونکہ اِس کتاب میں جو تاریخی حوالے دیئے گئے ہیں اور جس طرح تحریر پر مضبوط گرفت نظر آتی ہے وہ ایک منجھے ہوئے لکھاری کا کارنامہ ہی ہو سکتا ہے ایک پندرہ سالہ بچی کی کاوش نہیں۔میں سمجھتی ہوں کہ جس نے بھی یہ کتاب لکھی ،اُس نے اپنے خبثِ باطن کے ذریعے بہ اندازِ حکیمانہ اسلام اور پاکستان کو بدنام کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔مجھے

تجزیہ نگاروں کے تجزیوں سے اِس حد تک تو مکمل اتفاق ہے کہ یہ کتاب ملالہ کی بجائے کرسٹینا لیمب نے لکھی اور ضیاء الدین یوسف زئی نے مواد فراہم کیا کیونکہ ایک پروفیسر ہونے کے ناطے میں پندرہ سولہ سالہ لڑکیوں کی ذہنی استعداد سے بخوبی آگاہ ہوں اور وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ایسی پختہ تحریر اِس عمر کی لڑکیوں کے بَس کا روگ نہیں۔البتہ ملالہ کو معصوم کہنے والوں سے مجھے بھرپور اختلاف ہے۔وہ اتنی بھولی اور معصوم ہر گز نہیں جتنی نظر آتی ہے۔ویسے بھی پندرہ ، سولہ سال کی لڑکی کو بچی ہر گز نہیں کہا جا سکتا اور اُس وقت تو وہ ہر گز بچی نہیں رہتی جب ضیاء الدین یوسف زئی جیسا شاطر سائے کی طرح اُس کے ساتھ جُڑا ہو۔

ملالہ نے پاکستان ، افواج پاکستان اور علماء کے خلاف جی بھر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ۔وہ اپنی کتاب میں ایک طرف تو آمر مشرف کی تعریف و توصیف کرتی ہے جبکہ دوسری طرف آئی۔ایس۔آئی اور فوج کو طالبان کا ساتھی اور ہمدرد ظاہر کرتی ہے۔پاکستانی علماء کے بارے میں اُس کا اندازِ تحریر انتہائی تحقیر آمیز ہے۔قوم شاید اُسے اِس کوتاہی پر معاف کر دیتی (جس میں ،مَیں تو بہرحال شامل نہیں) لیکن اُس نے تو گستاخِ رسول ﷺ ملعون سلمان رُشدی کو بھی اِس قسم کی ’’ خبیثانہ آزادیٔ رائے ‘‘ کا اختیار دے دیا جس پر عالمِ اسلام کے ہر مسلمان کا تڑپ اُٹھنا ہی عین اسلام ہے۔ملعون رشدی نے ’’Satanic Verses‘‘

لکھ کر پورے عالمِ اسلام کے جذبات پر کاری ضرب لگائی جس پر پورے عالمِ اسلام میں شدید احتجاج ہوا اور بہت سے اعتدال پسند مغربی مصنفین نے بھی بھرپور مذمت کرتے ہوئے اِس کتاب کو گھٹیا درجے کی کاوش قرار دیا۔ دنیا جانتی ہے کہ ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن کسی گستاخِ رسول ﷺ کے حق میں لکھا گیا ایک لفظ بھی ہماری غیرتِ ایمانی پر تازیانہ ہے۔ لیکن ملالہ کی نزدیک مُلّا اور اُن کے حواری سلمان رشدی جیسوں کی آزادیٔ اظہار کا حق چھین رہے ہیں۔ شاید وہ گُم کردہ راہ لڑکی اور اُس کا ایمان فروش باپ نہیں جانتے کہ یہ معاملہ ہمارے عقیدے اور ایمان کا ہے اور ہم اپنے آقا و مولا ﷺ کی حُرمت و ناموس کی خاطر اپنی جان تک کو بھی نثار کر دینا عین عبادت سمجھتے ہیں۔ ضیاء الدین یوسف زئی نے تو اپنی بیٹی کو یورپ اور امریکہ میں قابلِ قبول بنانے کے لیے یہ گھٹیا ہتھکنڈا استعمال کیا لیکن ہمارا جذبۂ ایمانی کسی گستاخ یا اُس کے حواری کو کسی بھی قسم کی زباں درازی کی ہر گز اجازت نہیں دیتا۔ ملالہ کہتی ہے کہ پہلے وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی لیکن اب اُس کی نظریں پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ پر ہیں لیکن ہم کہتے ہیں کہ ''آئی ایم ملالہ'' جیسی گھٹیا کتاب لکھنے کے بعد اُس نے پاکستان واپسی کے سارے راستے مسدود کر دیئے ہیں۔ بلّی اگر چھیچھڑوں کے خواب دیکھتی ہے تو یہ اُس کا حق ہے۔ ویسے بھی خواب دیکھنے میں ہرج ہی کیا ہے۔

نواز حکومت کی کارکردگی

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔ سرگوشیاں

ریاست ہری بھری کھیتیوں ، دریاؤں ، پہاڑوں مرغزاروں، جھرنوں ، آبشاروں اور شاندار عمارتوں کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ ایسے انسانوں سے عبارت ہے جو اپنا فرض پہچانیں ،اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ مواقع سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے دفاع کی صلاحیت رکھیں ۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی نیابت عطا کی لیکن اُسے اپنی وحی کے تابع رکھا کیونکہ محدود عقلِ انسانی اُس وقت تک دنیا کی رہنمائی نہیں کر سکتی جب تک وہ اُس وحی الٰہی کے تابع نہ ہو جو اُس علیم و خبیر نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے انسان تک پہنچائی ۔مذہب انفرادی نہیں اجتماعی معاملہ ہے جو وحی الٰہی کے تابع ہے اور ہماری سیاسی ، سماجی اور معاشی و معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کو وحی الٰہی کے تابع رکھنے کے احکامات جاری کرتا ہے ۔ہمارا دین ہمیں اللہ ، رسول اللہ اور حاکمِ وقت کی اطاعت کا حکم دیتا ہے ۔اللہ اور اللہ کے رسول کے احکامات کی بجاآوری تو فرضِ عین ہے لیکن حاکمِ وقت کے احکامات کی پابندی اُسی وقت ہی کی جائے گی جب وہ وحی الٰہی کے تابع ہو ۔خلفائے راشدین کو اپنی ذمہ داریوں کا بخوبی ادراک و

احساس تھا۔ اسی بنا پر وہ رب کے خوف سے سہمے رہتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگیوں پر آقاﷺ کی اِس حدیث کو حاوی کر لیا تھا کہ ''تم میں سے ہر ایک راعی (چرواہا) ہے جس سے روزِ قیامت اُس کی بھیڑوں (رعایا) کا حساب لیا جائے گا''۔ ادراک ہمارے حکمرانوں کو بھی ہے لیکن وہ ماشاءاللہ خود ہی اتنے عقیل و فہیم ہیں کہ اُنہیں اپنی عقل کو وحیِ الٰہی کے تابع رکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ ایسے لوگوں کو سب سے زیادہ زیاں کار کہتے ہیں جو علم رکھنے کے باوجود اپنی عقل کو اپنی خواہشات کے تابع رکھتے ہیں۔ یہ کجی ہمارے حکمرانوں میں ہی نہیں بلکہ من حیث القوم بھی ہم اسی کا شکار ہیں۔ بقراط نے کہا ''جب موت ہمیں اپنے وقت میں سے ایک لمحہ بھی نہیں دیتی تو ہم موت کو اپنی زندگی میں سے کوئی لمحہ کیوں دیں''۔ لیکن ہم تو موت کو صرف دوسروں کے لیے دیکھتے ہیں اپنے لیے نہیں اسی لیے ہم ''ہنوز دِلی دوراست'' پر عمل پیرا ہو کر اپنی حیات کا ایک ایک لمحہ ضائع کرتے چلے جا رہے ہیں۔

یہ احکاماتِ الٰہی کی عدم پیروی اور اپنی عقل پر انحصار ہی کا شاخسانہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت کو تو عذابِ مسلسل سے تعبیر کیا ہی جاتا تھا لیکن وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب کو یہ دَور اتنا بھا گیا کہ اُنھوں نے جنابِ آصف علی زرداری کو الوداعی عشائیہ دیتے ہوئے یہاں تک فرما دیا کہ ہم

جنابِ آصف زرداری کے نقشِ قدم پر چلیں گے کیونکہ ہمارا ایجنڈا ایک ہے۔ جواباً جنابِ آصف زرداری نے بھی فرمایا کہ ''ہم میاں نواز شریف کی قیادت میں پانچ سال چلیں گے اور سیاست پانچ سال بعد کریں گے''۔ یار لوگوں نے تو یہی سمجھا کہ میاں صاحب محض رسماً یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں لیکن میاں صاحب نے عملی طور پر یہ سچ ثابت کر دکھایا۔ قوم نے اپنے عقیدتوں بھرے ووٹوں سے نواز کو محض اس لیے نوازا کہ اسے یہ توقع بندھ گئی تھی کہ دورِ ابتلاء تمام ہونے کو ہے اور صبحِ اُمید در و بام پہ اپنا نور بکھیرنے آن پہنچی لیکن ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا'' ۔آج صورتِ حال پیپلز پارٹی کے دَور سے بھی بدتر نظر آتی ہے اور مفلسی کی زنجیریں تو خیر کیا ٹوٹتیں ، بے کسوں ، بے بسوں ، مجبوروں اور مقہوروں کے گرد شکنجہ کچھ زیادہ ہی کَس دیا گیا ہے ۔کل میرا مالی کہہ رہا تھا ''صاحب جی ! اب میں کبھی نواز شریف کو ووٹ نہیں دوں گا ۔اُس نے تو زرداری صاحب کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے''۔ میں نے اُسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی اور جناب پرویز رشید کی ''کڑوی گولی'' کا حوالہ بھی دیا لیکن اُس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ہوتا بھی کیسے کہ ایک مفلس معیشت کی گتھیاں نہیں سلجھاتا ، اُس کی معیشت تو پیٹ سے شروع ہو کر پیٹ پر ہی ختم ہو جاتی ہے اور بھوک اور ننگ کا آج بھی یہ عالم ہے کہ

بھوک پھرتی ہے مرے دیس میں ننگے پاؤں
رزق ظالم کی تجوری میں چھپا بیٹھا ہے

جنابِ آصف زرداری اپنے پانچ سالہ عہدِ صدارت میں لگ بھگ دو سال غیر ملکی دوروں پر رہے۔ میاں نواز شریف صاحب نے چونکہ زرداری صاحب کے نقشِ قدم پر چلنے کا عہد کر رکھا ہے اِس لیے وہ بھی پاکستان میں صرف تھکاوٹ دور کرنے کے لیے آتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اِس معاملے میں وہ جنابِ زرداری کا ریکارڈ توڑنے پر تُلے بیٹھے ہوں۔ اگر اُن کے غیر ملکی دوروں سے قوم کا کچھ بھلا ہوتا نظر آتا تو ہم بھی جُدائی کا غم سہ لیتے لیکن یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ ہر کوئی وعدۂ فردا پہ ٹال رہا ہے۔ پچھلے دنوں وہ امریکی دَورے پر گئے اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُنھوں نے امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی لیکن حاصل۔۔۔؟ امریکہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ ڈرون حملوں پر اُس کی پالیسی تبدیل ہو گی نہ وہ کشمیر پر کسی ثالثی یا مداخلت پر تیار ہے۔ عافیہ صدیقی کی رہائی پر بھی وہ مزید بات کرنے کو تیار نہیں البتہ جماعت الدعوۃ پر پابندی اور اپنے ''قومی ہیرو'' شکیل آفریدی کی رہائی کے لیے اُس کی بے چینی قابلِ دید ہے۔ امریکہ کو کنٹرول لائن پر کشیدگی کا ذمہ دار بھی پاکستان ہی نظر آتا ہے اِس کے باوجود بھی میاں صاحب مسلۂ کشمیر پر امریکی ثالثی کے لیے بیتاب ہیں ۔شکر ہے کہ امریکہ اِس ثالثی کے لیے تیار نہیں۔ اگر خُدا نخواستہ وہ تیار ہو گیا تو لکھ کر رکھ لیجئے کہ فیصلہ بھارت کے حق میں ہی ہو گا کیونکہ بھارتی دوستی کی قیمت پر اُس کا جھکاؤ پاکستان کی طرف ہونا

ناممکن ہے۔ ''ٹریڈ'' کے معاملے میں بھی امریکہ پاکستان کے لیے اپنی پالیسیوں میں کسی نرمی کے لیے تیار نہیں۔اِس معاملے میں اُس کا سیدھا سادا بہانہ یہ ہے کہ امریکی پالیسیاں وہاں کے صنعت کاروں اور سرمایہ داروں سے مشاورت اور اُن کے مفادات کو مدِ نظر رکھ کر بنائی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ امریکہ اُس وقت کہہ رہا ہے جب وہ افغانستان سے اپنا جنگی ساز و سامان آہستہ آہستہ نکال رہا ہے اور 2014ء میں اُس میں یکلخت تیزی آنے والی ہے۔امریکہ کے پاس اپنا اسلحہ اور جنگی سامان نکالنے کا پاکستان واحد ذریعہ ہے کیونکہ مشرقِ وسطیٰ کے چھوٹے چھوٹے ممالک نے راہداری کی مد میں اتنی رقم کا مطالبہ کر دیا ہے جسے ادا کرنا امریکہ کے بَس میں نہیں جبکہ دوسری طرف امریکی اسلحے سے لدے کنٹینروں نے ہماری سڑکوں کو مکمل برباد کر دیا لیکن ہم میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ ہم امریکہ بہادر سے اِس توڑ پھوڑ کا اصل معاوضہ ہی طلب کر سکیں۔

بڑے میاں صاحب کو تو خیر غیر ملکی دَوروں سے ہی فرصت نہیں لیکن چھوٹے میاں صاحب بھی سب کچھ حمزہ شہباز صاحب کے سپرد کرکے بڑے بھائی کی پیروی کرتے ہوئے اب بیرونی دَوروں پر ہی رہتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے دَورِ حکومت میں قوم کو خادمِ اعلیٰ کے اندر جنّاتی صلاحیتیں نظر آنے لگی تھیں۔اُنہوں نے اربوں روپیہ صرف کرکے صرف گیارہ ماہ کے قلیل عرصے میں ''ریپڈ بس'' چلا دی

جو یقیناً آنے والی نسلوں کو بھی میاں صاحب کی یاد دلاتی رہے گی۔ سیانے کہتے ہیں کہ دشمن پر فتح حاصل کرنا بڑی بات نہیں، بڑی بات تو اُس فتح کو برقرار رکھنا ہے۔ ریپڈ بس بنانے کے بعد شاید میاں صاحب کی توجہ کسی اور طرف ہو گئی ہے۔ اربوں روپے کی لاگت سے تیار کیے گئے اِس منصوبے کے باوجود ٹریفک کی روانی میں سدھار نظر نہیں آتا۔ ریپڈ بس تو اپنے راستے پہ رواں دواں رہتی ہے لیکن اُس سے ہزار گنا زیادہ ٹریفک اب بھی جام رہتی ہے۔ اگر میاں صاحب ریپڈ بس کی بجائے موٹر سائیکلوں، رکشوں اور سائیکل رکشوں کے لیے سڑک کا ایک حصہ مختص کر دیتے تو نہ ٹریفک بلاک ہوتی اور نہ ہی اتنے ایکسیڈنٹ ہوتے۔ خادمِ اعلیٰ نے لاہور کی تقریباً تمام سڑکوں کو کھُلا بلکہ ''کھُلا ڈُلا'' کر دیا ہے لیکن تقریباً ہر سڑک پر بد نظمی کا یہ عالم ہے کہ آدھی سے زیادہ سڑک تجاوزات اور رکشوں، ریڑھیوں اور گاڑیوں کی پارکنگ کی زد میں آ چکی ہے۔ لاہور کی ٹریفک پولیس سے زیادہ نا اہل شاید ہی کوئی ہو۔ اگر خادمِ اعلیٰ کی یہ خواہش ہے کہ ٹریفک بِلا روک ٹوک ہر طرف رواں دواں رہے تو اُنہیں ٹریفک کے نظام کو بدلنا ہو گا کیونکہ ٹریفک کے نظام کی تبدیلی کے بغیر وہ تیس کیا ساٹھ ارب بھی صرف کر دیں مسئلہ حل نہیں ہو گا۔

سونامی کی آمد آمد

عشوہ، غمزہ، ناز، ادا، کیا ہے جو محترم عمران خاں ''کی'' سونامی میں نہیں ہے۔ وہ کبھی کبھی چلمن سے نظارہ مار کے غائب ہو جاتی ہے اور اب تو عرصۂ دراز سے اُس نے چلمن پہ آنا بھی چھوڑ دیا ہے لیکن عاشقانِ سونامی کو نوید ہو کہ اب وہ میک اپ کے بعد اپنی نوک پلک سنوار رہی ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ کب اپنی بھرپور حشر سامانیوں کے ساتھ رقیبانِ عمران خاں پر بجلیاں گرانے آن وارد ہو۔ ہمیں سونامی سے تو کچھ لینا دینا نہیں لیکن ہم ٹھہرے پاکستانی اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پاکستانی تھوڑے بہت تماشبین ضرور ہوتے ہیں اِس لیے ہم بھی چاہتے ہیں کہ سونامی اپنی اولین فُرصت میں چھم چھم کرتی باہر آ جائے اور پھر ''دمادم مست قلندر''۔ بھٹو مرحوم نے بہت پہلے دمادم مست قلندر کہا اور کرکے دکھایا، یہ الگ بات ہے کہ اِس ''دمادم'' میں ایک کی بجائے دو پاکستان معرضِ وجود میں آ گئے اور ہم نے ''اپنے پاکستان'' میں لہک لہک کر گانا شروع کر دیا کہ ''سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے'' لیکن اب ایسا ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ اب تو بیچاری پیپلز پارٹی اپنے وجود کی فکر میں مبتلا ہے اور ''میٹھا سچ'' تو یہی ہے کہ اب صرف پارٹی ہی باقی رہ گئی ہے ''پیپلز'' تو ہوا ہو گئے ۔ پیپلز پارٹی نے بلاول زرداری کے ذریعے کچھ ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن

سیاسی نو مولود، نو وارد اور نو خیز بلاول زرداری کی معصومانہ بڑھکوں نے دمادم مست قلندر کا سا سماں پیدا کرنے کی بجائے اُلٹا اثر دکھایا اور اب پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو جوابدہی مشکل ہو رہی ہے اِس لیے اس تماش بین قوم کی ساری اُمیدیں اب سونامی ہی سے وابستہ ہیں ۔اگر سونامی کی باگ ڈور شیخ رشید احمد کے سپرد کر دی جائے تو مزہ آ جائے ۔افواہ تو یہی تھی کہ تحریکِ انصاف قومی اسمبلی میں سید خورشید شاہ کی جگہ شیخ رشید احمد کو قائدِ حزبِ اختلاف لانا چاہتی ہے ۔سید خورشید شاہ بطور قائدِ حزبِ اختلاف سجتے تو بہت ہیں لیکن اپنے قد کاٹھ کے لحاظ سے بولتے نہیں۔دھیمے مزاج کے شاہ صاحب ہمیشہ دھیمے انداز میں ہی گفتگو کرتے ہیں جبکہ شیخ صاحب کا ''کھڑاک'' تو کسی نہ کسی نیوز چینل پر ہر روز سنائی دیتا ہے ۔ہم تو چاہتے تھے کہ شیخ صاحب قائدِ حزبِ اختلاف بن جائیں تاکہ قومی اسمبلی ہر روز ''کھڑکھڑاتی'' رہے لیکن کسی بد باطن نے تحریکی بھائیوں کے کان میں پھونک دیا کہ پارٹی کو اب انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے باہر نکلنا چاہیے اور شیخ صاحب کی ''شیخیاں'' چونکہ الیکٹرانک میڈیا تک محدود ہیں اِس لیے اِس ناقص تجویز سے باز رہنے میں ہی عافیت ہے۔شنید ہے کہ اکابرینِ تحریکِ انصاف نے شیخ صاحب کو قائدِ حزبِ اختلاف بنانے سے توبہ کر لی ہے اِس لیے اب ہمیں شیخ صاحب صرف نیوز چینلز پر ہی چیختے چلاتے بلکہ چنگھاڑتے نظر آئیں گے ۔

مجھے سونامی کی آمد کا اندازہ محترم شاہ محمود قریشی اور خیبر پختونخواہ کے وزیرِ اعلیٰ محترم پرویز خٹک کے حالیہ بیانات اور الیکشن کمیشن کے بلدیاتی انتخابات کا بگل بجانے سے ہوا اِس لیے میرے قارئین کو ہر گز اِس غلط فہمی میں مبتلاء نہیں ہونا چاہیے کہ میرے پاس بھی کوئی طوطا، مینا، چڑیا، کبوتر یا ''کالی درویش'' ہے۔ویسے بھی میں نے اگر کبھی کوئی مخبر'' رکھا تو اِن چھوٹے چھوٹے معصوم پرندوں کی بجائے کسی ہاتھی، گینڈے کا انتخاب'' کروں گی تاکہ باقی لکھاریوں پر ''رعب شُعب'' قائم ہو جائے۔شیر کا انتخاب ہر گز نہیں کروں گی کیونکہ حسد کے مارے لوگ جھٹ سے کہہ دیں گے کہ ''یہ تو نون لیگی ہے ۔اور آجکل تو نواز لیگ کے حامی لکھاری ''ایک ڈھونڈو، ہزار ملتے ہیں'' اور نواز لیگ'' کے کٹر مخالفین بھی اپنے قبلے کا رُخ نواز لیگ کی طرف موڑنے کی تگ و دَو میں ہیں اِس لیے مجھے فی الحال نواز لیگی کہلوانے کا کوئی شوق نہیں البتہ یہ وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ جب اپنی ''حرکتوں'' کے باعث نواز لیگ حزبِ اختلاف کے بنچوں پر جا بیٹھے گی تب میرا قلم اُس کا بھرپور ساتھ دے گا۔فی الحال تو قوم کو ''کڑوی گولی'' نگلنے کی نصیحت کرنے والوں کو میری کڑوی کسیلی باتیں برداشت کرنا ہونگی۔

شاہ محمود قریشی صاحب فرماتے ہیں کہ تحریکِ انصاف مہنگائی اور بجلی، پٹرول اور گیس کی بڑھتی قیمتوں کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کر رہی ہے جبکہ پرویز

خٹک صاحب نے تو امریکہ کے خلاف ''تقریباً'' اعلانِ جہاد ہی کر دیا ہے۔اُنھوں نے فرمایا کہ امریکہ ڈرون حملے بند کر دے، اگر ڈرون حملے بند نہ ہوئے تو ہم نیٹو کنٹینرز روک دیں گے ۔یہی بات کپتان صاحب نے بھی اینکر مبشر لقمان کو انٹرویو دیتے ہوئے زور دے کر کہی ۔ایسی جراتِ رندانہ صرف تحریکِ انصاف کے لوگوں میں ہی پائی جاتی ہے کیونکہ ابھی تک اُنھوں نے ''جلا وطنی'' کا مزہ نہیں چکھا۔میاں نواز شریف صاحب ایسی جرات کا ''سواد'' لے چکے ہیں ۔ہم نے گھاس کھا کر ''شب برات'' پر چلانے کے لیے ایٹم بم بنایا لیکن انوکھے لاڈلے میاں نواز شریف صاحب نے امریکی صدر بل کلنٹن کی دھمکیوں کے باوجود اُسے چاغی کے پہاڑوں میں چلا کر مبارک بادیں وصول کرنا شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انکل سام کے پٹھو مشرف نے اُنہیں جلا وطن کر دیا ۔طویل جلا وطنی کاٹ کر جب وہ واپس آئے تو مُسکراتے ہوئے کہا ''لوگ کہتے تھے قدم بڑھاؤ نواز شریف، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔لیکن جب میں نے قدم بڑھایا تو سبھی بھاگ گئے''۔یوں تو محتاط میاں صاحب نے بھی لندن پہنچتے ہی یہ بیان دے دیا ''ڈرون حملے ہماری خود مختاری کے خلاف ہیں جنہیں ہم کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ محض سیاسی بیان ہے۔ وہ تو صرف مودبانہ گزارش ہی کر سکتے ہیں البتہ یہ بھی بڑی بات ہے کہ اُنھوں نے یہ مودبانہ گزارش بھی ایک آزاد اور خود مختار ایٹمی قوت کے وزیرِ اعظم کے طور پر اوباما کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کی ۔پریس بریفنگ میں اوباما کے بعد جب میاں صاحب کی باری

آئی تو اُنھوں نے جیب سے ''بوٹی'' نکال لی۔ نہیں معلوم کہ اِس ''بوٹی'' کا خالق کون تھا لیکن یہ طے ہے کہ یہ بوٹی نواز ، اوباما ملاقات سے پہلے تیار کی گئی جسے ''کمرہ امتحان'' میں میاں صاحب نے پڑھ ڈالا۔ میں بوٹی کے خالق کو سلامِ نیاز پیش کرتی ہوں جسے پہلے سے علم تھا کہ بارک اوباما کیا کہیں گے اور جواباً میاں صاحب نے کیا کہنا ہے۔ خیر بات دوسری طرف نکل گئی ، میں عرض کر رہی تھی کہ محترم پرویز خٹک نے جراتِ رندانہ کا ثبوت دیتے ہوئے اِس ناتوانی میں بھی توانائی سے بھرپور آواز کے ساتھ امریکہ کو دھمکی ''کھڑکا'' کر یہ ثابت کر دیا کہ جسم نہیں دل لڑتے ہیں۔اب کوئی رانا ثنا اللہ صاحب سے پوچھے کہ ''تیلی پہلوان'' کون ہے؟۔پرویز خٹک یا وہ خود؟۔جب خٹک صاحب کا یہ بیان سامنے آیا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ اِس بیان پر وائٹ ہاؤس میں ''تھَر تھَلی'' مچ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ امریکی سفیر ہانپتے کانپتے بارگاہِ خٹک میں حاضر ہو کر معافی کے خواستگار بھی ہوں لیکن امریکی وزارتِ خارجہ کے اڑیل ''ٹٹو'' نے معافی مانگنے کی بجائے یہ کہہ دیا کہ ڈرون حملے بند نہیں ہونگے ۔ہمارے نزدیک امریکی وزارتِ خارجہ کے اِس بیان کی کوئی حیثیت نہیں البتہ یہی بات اگر اوباما کہے تو جانیں اور اگر اوباما نے بھی وہی کہہ دیا جو محکمہ خارجہ کے ترجمان نے کہا ہے تو پھر۔۔۔ تو پھر بھی نیٹو کنٹینرز تو بند نہیں ہونگے

کیونکہ پرانی تنخواہ پر کام کرنا ہماری سرشت میں شامل ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس معاملے میں تودمادم مست قلندر کے امکانات معدوم ہیں اِس لیے محترم شاہ محمود قریشی کے دم قدم سے ہی کسی رونق کا امکان ہے یا پھر بلدیاتی انتخابات سے۔یہ توپتہ نہیں کہ تحریکِ انصاف احتجاجی تحریک شروع کرتی ہے کہ نہیں لیکن بلدیاتی انتخابات تو طے ہیں جن میں دمادم مست قلندر بھی ہوگا اور سونامی بھی اِدھر اُدھر بھاگتی نظر آئے گی۔اِس لیے ہم نے ابھی سے آنے والے دنوں کی تیاری شروع کر دی ہے اور جی ہی جی میں خوش ہیں کہ ہمیں اپنے کالموں کا پیٹ بھرنے کے لیے ڈھیروں ڈھیر خوراک میسر ہو گی ۔فی الحال تو ہم اِدھر اُدھر سے خبریں پکڑ کر ہی گزارا کر رہے ہیں۔

کہتے کیوں ہو، گر کر نہیں سکتے

ہم نے تو اپنے پچھلے کالم میں ہی یہ عرض کر دیا تھا کہ ڈرون حملوں کے باوجود نیٹو سپلائی نہیں رُکے گی کیونکہ ہماری تاریخ یہی بتلاتی ہے کہ ہم احتجاج تو ہزاروں کی تعداد میں ریکارڈ کرواتے ہیں لیکن پھر تھک ہار کر اُسی تنخواہ پر کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عمران خاں صاحب نے اپنی پریس کانفرنس میں فرمایا کہ اگر ڈرون حملے نہ رکے تو ہم نیٹو سپلائی بند کر دیں گے ۔اِس سے پہلے خیبر پختونخواہ کے وزیرِ اعلیٰ جناب پرویز خٹک بھی یہی بات زور دے کر کہی لیکن امریکا اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا اور ایک دفعہ پھر ڈرون ''کھڑکا'' دیا اور ایسا کھڑکایا کہ تحریک طالبان پاکستان کا امیر حکیم اللہ محسود اور اُس کے قریبی ساتھی اُس کی غذا بن گئے۔ حکیم اللہ محسود کی ہلاکت جمعرات کو ہوئی جبکہ ہمارا تیز و طرار میڈیا اور وزارتِ داخلہ اِن ہلاکتوں سے بے خبر رہے۔ لیکن جب غیر ملکی نیوز ایجنسی کے ذریعے حکیم اللہ محسود کی ہلاکت کی خبر پہنچی تو سارے نیوز چینلز پر ''بریکنگ نیوز ''کا طوفان بپا ہو گیا۔جب ہر نیوز چینل یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا کہ نیوز سب سے پہلے اُس نے بریک کی ہے، اُس وقت بھی یا تو طالبان حکیم اللہ محسود کی ہلاکت کی تصدیق کرنے سے گریزاں نظر آئے یا پھر

ہمارے بھولے بھالے وزیرِ داخلہ۔دوسری طرف اِس ڈرون حملے کے بعد نہ تو خیبر پختون خواہ حکومت کی طرف سے کوئی بیان آیا اور نہ ہی اپنے خاں صاحب کی تلملاہٹ دکھائی یا سنائی دی البتہ جب حکیم اللہ محسود کی ہلاکت کی افواہ اُڑی تو سونامی نے بھی تھوڑی سی انگڑائی لی۔ہو سکتا ہے کہ مجھے ہی غلط فہمی ہوئی ہو اور تحریکِ انصاف کے رہنما ''اپنی'' سونامی کے گرد گھیرا ڈال کے بیٹھے نیٹو سپلائی بند کرنے کے طریقے سوچ رہے ہوں۔کپتان صاحب نے آج (2 نومبر) کور کمیٹی کا اجلاس طلب کر لیا ہے جس میں ہو سکتا ہے کہ نیٹو سپلائی بند کرنے کے بارے میں غور کیا جائے اور یہ فیصلہ کیا جائے کہ مستقبل قریب میں جب امریکہ افغانستان خالی کرکے واپس چلا جائے تو نیٹو کنٹینرز روکنے کا اعلان کر دیا جائے۔ظاہر ہے کہ اگر نیٹو سپلائی بند کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو اُس پر عمل درآمد کے لیے سال ڈیڑھ سال کا عرصہ تو درکار ہو گا ہی۔

چونکہ ہمیں بھی اپنے ''سونامیے'' ہونے پر فخر ہے اِس لیے ہمارے ذہن میں بھی نیٹو سپلائی بند کرنے کے کئی طریقے آئے اور ہماری فہم و فراست اور ذہنِ رَسا نے جو بہترین طریقہ سوچا وہ یہ ہے کہ چونکہ ہماری پارٹی کو ''انٹرنیٹ پارٹی'' کہا جاتا ہے اِس لیے ہم انٹرنیٹ پر نیٹو سپلائی بند کر دیں۔ہم نے اپنے میاں سے بھی نیٹو کنٹینرز بند کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تھا لیکن

اُنھوں نے حسبِ سابق ایسا جواب دیا جس سے ہم جَل بُھن کر ''سیخ کباب'' ہو گئے ۔اُنھوں نے کہا ''تُم جا کر کسی نیٹو کنٹینرز کے آگے دھرنا دے دو، اگر کنٹینرز تمھارے اوپر سے گزر گیا تو بھلے میں ''خس کم جہاں پاک'' کہوں لیکن تم ''شہیدِ پاکستان'' کہلاؤ گی اور قوی اُمید ہے کہ مجھے تمھاری شہادت کے عوض حکومتِ پاکستان سے پندرہ بیس لاکھ روپے بھی مل جائیں گے ۔ویسے تو حکومت کا ریٹ فی شہادت دو، چار لاکھ ہی ہے لیکن تمھاری شہادت چونکہ ''وکھری ٹائپ'' کی ہو گی اِس لیے بونس کے طور پر زیادہ پیسے ملنے کا قوی امکان ہو گا۔ دوسری طرف اگر تمھارے دھرنے سے کنٹینرز رُک گئے تو تمھاری ''بَلّے بَلّے'' ہو جائے گی اور تحریکِ انصاف کی طرف سے تمھاری قومی اسمبلی کی سیٹ پکی''۔ میرے میاں چونکہ پکّے نوازلیگیے ہیں اِس لیے تحریکِ انصاف کے خلاف زہر اُگلتے رہتے ہیں لیکن میں اُن کی زہرناک باتوں کا بُرا منانے کی بجائے اپنی دھن میں مگن رہتی ہوں۔ یہ چونکہ ہم ''سونامیوں'' کی عزت بے عزتی کا معاملہ ہے اِس لیے میں اب بھی دھڑا دھڑ نیٹو سپلائی روکنے کے طریقے سوچ رہی ہوں۔ نیٹو سپلائی روکنے کا ایک اور تیر بہدف نسخہ یہ ہے کہ کپتان صاحب طالبان کی خدمات حاصل کر لیں اور اُنہیں سمجھائیں کہ ڈرون چونکہ اُنہی کے ساتھیوں کو ''پھڑکا'' رہے ہیں اور حکیم اللہ محسود کی ہلاکت کے بعد اُن کی غیرتِ ایمانی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے خودکُش بمباروں کا رُخ نیٹو کنٹینرز کی طرف موڑ دیں۔ مجھے یقین ہے کہ دو چار کنٹینرز ہی ہوا میں بکھرنے پر اوباما پہلے سے

زیادہ "روسیاہ" ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ امریکی خود ہی اُسے اٹھا کر افریقہ کے جنگلوں میں پھینک آئیں اور ہم گنگنانے لگیں کہ "پہنچی وہیں پہ خاک، جہاں کا خمیر تھا"۔ یہ طریقہ یقیناً ثمر آور ہو سکتا ہے لیکن اِس میں ایک قباحت یہ ہے کہ طالبان کپتان صاحب پر کم کم ہی یقین کرتے ہیں اِس لیے اُنہیں طالبان کو سمجھانے کے لیے مولانا فضل الرحمٰن کی خدمات حاصل کرنی ہونگی جو شاید خاں صاحب کی غیرت و حمیت گوارا نہ کرے، اگر کر بھی لے تو سارا کریڈٹ مولانا صاحب لے اُڑیں گے اور ہو سکتا ہے کہ کریڈٹ کے ساتھ مولانا صاحب خیبر پختونخواہ کی حکومت بھی لے اُڑیں اور خاں صاحب ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ اِس نسخے کی خطرناکی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اِس نسخے کو چاروناچار ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

نیٹو کنٹینرز جذبۂ ایمانی سے بھی روکے جا سکتے ہیں جو ہمارے علماء کے ہاں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اگر علماء کرام سے تھوڑا سا جذبۂ ایمانی اُدھار لے کر استعمال میں لایا جائے تو یقیناً نیٹو سپلائی روکنے میں افاقہ ہو سکتا ہے۔ایسی صورت میں جماعتِ اسلامی تو ویسے ہی ہماری اتحادی ہے، جماعت الدعوۃ نے نیٹو سپلائی روکنے کا اعلان کر رکھا ہے بس سُنی اتحاد کونسل اور کچھ دوسرے علماء کو ساتھ ملانے کی ضرورت ہے۔ایسی صورت میں محترم جنرل حمید گُل کا جذبۂ ایمانی بھی کام میں لایا جا سکتا ہے اور جنابِ شیخ

رشید احمد کی ''بڑھکیں'' بھی کارگر ہو سکتی ہیں۔ویسے تو سونامی اکیلے ہی نیٹو کنٹینرز روک سکتی ہے لیکن سنا ہے کہ اتحاد میں برکت ہوتی ہے اور اگر اتحاد میں ایمان کا ''تڑکا'' بھی لگا دیا جائے تو یہ برکت اور بھی مضبوط ہو جاتی ہے۔مجھے تو یقین ہے کہ اگر یہ نسخہ استعمال کیا جائے تو ہم نیٹو کنٹینرز تو کیا وائٹ ہاؤس پر بھی سبز ہلالی پرچم لہرا سکتے ہیں۔اِس سے پہلے بھی ہم دِلّی کے لال قلعے پر ہلالی پرچم لہرانے ہی والے تھے کہ حکومتِ ہند نے منت سماجت شروع کر دی اور ہم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا لیکن امریکی فی الحال منت سماجت کی بجائے ''دھکے شاہی'' سے کام لے رہے ہیں جو مستقبل قریب میں نہ سہی، مستقبل بعید میں تو یقیناً اُن کا بیڑا غرق کر دے گی۔

چونکہ تا حال ہمارے گھوڑے تیار نہیں اور شنید ہے کہ ہمارے ایٹم بموں کو بھی پڑے پڑے دیمک اتنا چاٹ چکی ہے کہ اب وہ محض ''پھُل جھڑیاں'' رہ گئے ہیں اِس لیے نیٹو سپلائی روکنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پوری قوم یک زبان ہو کر امریکہ کو ''بد دعائیں'' دینا شروع کر دے۔عرصہ ہوا مسلمانوں کی دُعائیں بارگاہِ ربی میں مستجاب نہیں ہو رہیں اِس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنا سارا زور دُعاؤں کی جگہ بد دعاؤں پہ صرف کر دیں۔ویسے بھی یہ قوم بد دعاؤں کی ماہر ہے اور ہم نے تو ایسی ایسی بد دُعائیں ایجاد کر رکھی ہیں کہ پوری لغت مرتب کی جا سکتی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ

خُدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ہم اپنی حالت پر خوش اور مطمعن ہیں اور فی الحال اِس کو بدلنے کا کوئی پروگرام بھی نہیں ۔اسی اطمینانِ قلب کی بنا پر ہم یہ چاہتے ہیں کہ باقی دنیا بھی ہمارے جیسی ہو جائے ، اگر دُعاؤں سے نہیں تو بد دُعاؤں سے ہی سہی۔

ہمارے پاس ڈرون حملے روکنے کے بھی کئی نسخہ ہائے کیمیا موجود ہیں لیکن فی الحال ہم وہ ظاہر نہیں کر رہے کیونکہ ابھی تک حاکمانِ وقت نے ہماری خدمات سے استفادہ کرنے کی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا جس پر ہمیں حیرت ہے۔اسی حیرت کا اظہار جب ہم نے اپنے ایک جاننے والے سے کیا تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اگر حکومت تمہاری خدمات سے استفادہ کرکے ڈرون حملے رکوانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر طالبان کو کون سنبھالے گا؟۔اسی لیے حکومت بھرپور احتجاج تو کرتی ہے لیکن ڈرون رکوانے میں دلچسپی نہیں رکھتی ۔جاننے والے کی بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے اپنے نسخہ ہائے کیمیا کو پوٹلی میں باندھ کر آنے والے وقتوں کے لیے محفوظ کر لیا۔

خون سے خون دھونے کا راستہ

ہم خواب دیکھتے ہیں ۔حیاتِ جاودانی کا خواب جو مثلِ ساگر قلبِ انسانی میں جوار بھاٹا پیدا کرتے رہتے ہیں اور جس کی بے حد و حساب موجیں وقت اور تقدیر کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکراتی رہتیہیں ۔لیکن اس خواب کو بالآخر موت کے ہونٹوں پر بوسہ دینا پڑتا ہے ۔حیاتِ جاوداں کے حصول کی یہی خواہش کبوتر کو اس وقت آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جب اس کا بلی سے سامنا ہوتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ بلی کے خونی پنجہ استبداد سے بچ پائے ۔

انتہائی محترم وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب فرماتے ہیں'' خون کو خون سے دھونے کا راستہ چھوڑ دیا'' جبکہ وزیرِ اطلاعات پرویز رشید صاحب کا کہنا ہے '' جنگ کے مقابلے میں جنگ آگ بھڑکاتی ہے ۔ہماری حکومت آگ پر پانی ڈالنا چاہتی ہے آگ کو بھڑکانا نہیں ''۔یہ ارسطوانہ خیالات سے بجا لیکن سیانے تو یہ کہتے ہیں کہ شجرِ آزادی کو وقتاً فوقتاً محبِ وطن لوگوں اور ظالموں کے خون سے تروتازہ ہوتے رہنا چاہیے کیونکہ یہی اس کی کھاد ہے ۔یاد رہے کہ ہم اُس ''دینِ اوسط'' پیروکار ہیں جو امن کا پیامبر ہے لیکن ساتھ ہی اپنے گھوڑے تیار رکھنے کا حکم بھی دیتا ہے ۔یہ بجا کہ دین میں ظلم وزیادتی کی شدت

سے ممانعت کرتا ہے لیکن اپنے حق کی خاطر جان گنوانے والے کو شہید بھی قرار دیتا ہے ۔جنگ کے مقابلے میں جنگ نہ کرنے کا درس دینا زندہ قوموں کے وقار کے منافی اور بزدلی کی علامت ہے ۔زندہ ضمیر زمانے کی سختیاں برداشت کر سکتے ہیں ، صعوبتیں جھیل سکتے ہیں لیکن تذلیلِ ذات کے تیر ان کے لیے جان لیوا ہوتے ہیں ۔کیا اس سے زیادہ تذلیل کا کوئی اور پہلو بھی ہے کہ دور بیٹھا ''عالمی غنڈہ'' جب اور جہاں چاہتا ہے ڈرون حملہ کرکے ہماری غیرت و حمیت کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے اور ہمیں احتجاج کا حق بھی نہیں دیتا۔ عظیم بیگ عظیم کہتے ہیں

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

کیا قوم یہ سمجھ لے کہ اس نے ابھی گھٹنوں کے بل چلنا بھی نہیں سیکھا ؟۔ اگر ایسا ہی ہے اور ہمارا مستقبل قریب یا بعید میں خون کو خون سے دھونے یا جنگ کے بدلے میں جنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تو پھر اس مجبور و مقہور اور ناتواں قوم کو کس نا کردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے ؟۔ حاکمانِ وقت اپنا ایٹمی پروگرام امریکہ کے حوالے کرکے قوم کو سکھ کا سانس کیوں نہیں لینے دیتے ؟۔ کیا کوئی حاکمانِ وقت کو تاریخ کا یہ پیغام پہنچائے گا کہ قوموں پہ ابتلاء کے دور آتے رہتے ہیں لیکن نشیب و فرازِ زمانہ کی خوگر قومیں دل

برداشتہ ہونے کی بجائے نئے عزم کے ساتھ اٹھتی اور چھا جاتی ہیں۔ اقبال کا درسِ خودی بھی یہی ہے کہ

اگر عثمانیوں پہ کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

آج اگر ہم پر یہ دورِ ابتلاء ہے تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ قوم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرکے بلی کی غذا بن جائے۔ اگر مرنا ہی مقدر ٹھہرا تو پھر گیدڑ کی موت کیوں، شیر کی موت کیوں نہیں ؟۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ طبلِ جنگ بجا دیا جائے کہ کوئی فاتر العقل ہی جنگی جنوں میں بتلاء ہو سکتا ہے لیکن جب جنگ مسلط کر دی جائے اور قومی غیرت و حمیت کو نت نئے چیلنجوں کا سامنا ہو تو پھر زندہ قومیں نتائج کی پرواہ کیے بغیر ہتھیار اٹھایا ہی کرتی ہیں۔ سابقہ صدرِ مملکت جناب آصف علی زرداری نے کہا ''ہم ڈرون تو گرا لیں گے لیکن پھر۔۔۔؟''۔ جنابِ زرداری کے نقشِ قدم پر چلنے کا عندیہ دینے والے جنابِ نواز شریف کی آنکھوں کے سامنے بھی یہی ''پھر'' ناچ رہا ہے اور شاید اسی بنا پر وہ خون کو امن کے پانی سے دھونا چاہتے ہیں جو ممکن نہیں کہ تاریخِ عالم میں ایسی کوئی مثال سرے سے موجود ہی نہیں۔

ہم اندرونی اور بیرونی خطرات میں جس بری طرح سے گھر چکے ہیں اس کا حل راہِ

فرار نہیں عزم و ہمت ہے۔ وزیرِ داخلہ جناب چوہدری نثار علی خاں نے پریس کانفرنس میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو قوم کو نیا حوصلہ بخشنے کے لیے ضروری تھا۔اُن کے لب و لہجے کی تلخی اس امر کی غماز تھی کہ کئی دنوں سے کارِ آشیاں بندی میں مگن چوہدری صاحب کو اپنے جوڑے ہوئے تنکے بکھرنے کا شدید رنج ہے۔ انھوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر یہ کہا کہ امریکہ پاکستان میں امن کی ہر کوشش کو سبوتاژ کرنا چاہتا ہے اور امریکی ڈرون حملہ حکیم اللہ محسود پر نہیں امن پر کیا گیا ہے۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم امریکہ سے تعلقات اور تعاون پر نظرِ ثانی کریں گے۔ان کا یہ کہنا بھی بالکل بجا ہے کہ حکیم اللہ محسود پاکستانی قوم کا دشمن اور قاتل تھا۔اس مطلوب دہشت گرد کے سر کی حکومتِ پاکستان نے بھی پانچ کروڑ روپے قیمت مقرر کر رکھی تھی لیکن وہ طالبان کا امیر بھی تھا جس کے بغیر امن مذاکرات ممکن نہیں تھے۔ میاں شہباز شریف اور چوہدری نثار علی صاحب، دونوں نے کہا کہ پاکستان میں امریکی سفیر رچرڈ اولسن نے یہ گارنٹی دی تھی کہ دورانِ مذاکرات کوئی ڈرون حملہ نہیں کیا جائے گا جس کا امریکہ نے پاس نہیں کیا۔ دوسری طرف طالبان یہ کہتے ہیں کہ پاکستان اور امریکہ نے مل کر سازش کے تحت مذاکرات کا جھانسا دے کر یہ حملہ کیا۔ سراج الدین حقانی کا بیٹا نصیر الدین حقانی کہتا ہے کہ اب مذاکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پاکستانی طالبان اگر اس قسم کی بات کہتے ہیں تو بجا کہ وہ گم کردہ راہ سہی لیکن ہیں تو ہمارے اپنے لیکن افغانی پناہ گزیں

نصیر الدین حقانی کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ ہمارے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرے ؟۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنے حامی طالبان کو ساتھ لے کر افغانستان واپس جائے اور وہاں نیٹو افواج کے خلاف جہاد کرکے اپنا شوق پورا کرے۔ اگر حقانی گروپ اس زعم میں مبتلاء ہے کہ وہ حکومتِ پاکستان کی رٹ کو چیلنج کر سکتا ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔ افواج پاکستان جب چاہیں ان کو صفحہ ہستی سے اس طرح مٹا سکتی ہیں کہ ان کی ''داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں'' ۔ان کے پاس یہ آخری موقع ہے اور وہ جنابِ وزیرِ اعظم کے خون کو خون سے نہ دھونے کے بیان کو غنیمت سمجھیں اور اپنا بستر بوریا سمیٹ کر واپس چلے جائیں کہ یہی ان کے حق میں بہتر ہے۔

خلیل جبران کہتا ہے ''اگر تمہارے اندر لگن اور جذبہ نہیں تو بہتر ہے کہ سب کچھ ترک کرکے کسی مندر کے دروازے پر بیٹھ کر ان لوگوں سے بھیک مانگو جو لگن سے اپنے کام میں مگن ہیں''۔ ہمارے تجزیہ نگار سچ کہتے ہیں کہ جس قوم کے ہاتھ میں کشکولِ گدائی ہو اسے اپنے ان داتا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا کشکولِ گدائی تھامنے کی ذمہ دار قوم ہے یا وہ خون آلود ہاتھ جنھوں نے دستانے پہن رکھے ہیں۔ قوم تو سسک رہی ہے لیکن غیر ملکی خزانے آج بھی ہماری اشرافیہ کی دولت سے لبالب ہیں۔ کہاں گئے خادمِ اعلیٰ کے بلند بانگ دعوے اور وعدے ؟۔ قوم آج

بھی ہر چوراہے پر لگی ان ''سولیوں'' کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہے جن پر خائنوں اور بد دیانتوں کو الٹا لٹکایا جانا تھا۔ قوم کی آشاؤں کا محور و مرکز آج بھی نواز لیگ ہی ہے اور تحقیق کہ قوم ابھی تک امید کی اس ڈوری سے بندھی ہے جس کا خواب نواز لیگ نے دکھایا تھا۔ اگر میاں برادران ایفائے عہد کرتے ہوئے وہ سب کچھ کر گزریں جس کا قوم سے وعدہ کیا گیا تھا تو پھر نہ کسی کشکولِ گدائی کی ضرورت رہے گی اور نہ ہی ایسے بیانات کی جو مصلحتوں کی چادر اوڑھ کر دیئے جا رہے ہیں۔

اور ہم نے ڈرون گرا دیا

امریکہ تو اِس غلط فہمی میں مبتلاء رہا کہ ہم ڈرون گرا نہیں سکتے جبکہ اِس چھوٹے سے ریموٹ کنٹرول چیل نما پرندے کو گراتے ہوئے ہمیں شرم محسوس ہوتی رہی۔ مقابلہ برابر کا ہو تو کوئی مزہ بھی آئے لیکن یہاں تو عالم یہ ہے کہ جب یہ چیل اُڑتی ہے تو ہمارے شاہین اُسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیتے ہیں کہ یہ آئینِ شہبازی کے خلاف ہے۔

گورے سمجھتے تھے کہ ہم ڈر گئے حالانکہ ہم ''ڈرتے ورتے'' کسی سے نہیں۔یہی ثابت کرنے کے لیے ہم نے بھی ایک ڈرون گرا کر امریکہ کو یہ پیغام دے دیا کہ ''ہم زندہ قوم ہیں ، پائندہ قوم ہیں'' ۔

ہوا یوں کہ بہاولپور کے صحرا خیر پور ٹامیانوالی میں ہماری مسلح افواج عزمِ نَو چہارم کے نام سے جنگی مشقیں کر رہی تھی کہ اسی دوران امریکہ نے شمالی وزیرستان میں ڈرون حملہ کرکے حکیم اللہ محسود کو ''پھڑکا'' دیا۔ حکیم اللہ محسود کو انتہائی محترم امیرِ جماعتِ اسلامی سیّد منور حسن نے شہید قرار دے دیا اور جب مولانا فضل الرحمٰن سے پوچھا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ اگر امریکی حملوں سے کوئی کتا بھی مر جائے تو میں اُسے بھی شہید کہوں گا۔ سیاسی نو مولود بلاول زرداری نے سیّد منور حسن صاحب کے اِس بیان کے ردِ عمل میں

ٹویٹر پر جماعتِ اسلامی کو غدار قرار دے دیا اور ساتھ ہی پیپلزپارٹی کو ایک نیا نعرہ بھی بخش دیا کہ ''دہشت گردوں کا جو یار ہے، غدار ہے، غدار ہے''۔ بلاول نے مولانا فضل الرحمٰن کے بارے میں کچھ لکھنے سے شاید اِس لیے پرہیز کیا ہو گا کہ ماضی میں وہ پیپلزپارٹی کے اتحادی تھے اور مستقبل میں اتحادی ہونے کی اُمید جبکہ جماعت اسلامی سے اُن کا ''اِٹ کھڑکا'' تو بھٹو مرحوم کے دور سے جاری ہے۔ امریکی ڈرون حملے کے ردِ عمل میں ہمارے رہنما سَر جوڑ کر بیٹھے اور یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی تو کسی میں ہمت نہیں اِس لیے کوئی ''علامتی پیغام'' ہی پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ عزمِ نَو چہارم کی مشقوں کے آخری دن ڈرون گرانے کا فیصلہ ہوا۔ مہمانِ خصوصی میاں نواز شریف کے سامنے جب پاک فوج کے جوانوں نے کاندھے سے میزائل فائر کرکے ڈرون گرانے کا کامیاب عملی مظاہرہ کیا تو میاں نواز شریف مسکرا اُٹھے۔ میاں صاحب کی یہ مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔ اُن کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ڈرون گرانے کی مشق کرکے دراصل امریکہ کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ ''اب کے مار''۔ جبکہ مخالفین اِس مسکراہٹ کو کچھ اور ہی معنی پہناتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اِس مسکراہٹ میں پہلو میں بیٹھے جنرل اشفاق پرویز کیانی صاحب کے لیے یہ پیغام مضمر تھا کہ ''کر لو جو کرنا، اب کے میں ہاتھ آنے والا نہیں''۔ مخالفین کی یہ سوچ کچھ کچھ دل کو بھاتی ہے کیونکہ پہلے بھی شور مچا کہ ''قدم بڑھاؤ نواز شریف ! ہم تمہارے ساتھ ہیں'' لیکن جب

میاں صاحب نے قدم بڑھایا اور کچھ دور جا کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اکیلے ہی محوِ سفر تھے ۔میاں صاحب کا یہ سفر لگ بھگ آٹھ سالوں پر محیط تھا۔اِس لیے اب وہ اور تو سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن بلا سوچے سمجھے قدم نہیں بڑھا سکتے ۔اب اِس کام کے لیے اُنھوں نے رانا ثنااللہ کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے اور اگر کوئی معاملہ گھمبیر صورت اختیار کر جائے تو پھر خادمِ اعلیٰ تو ہیں ہی ۔

انوکھے لاڈلے محترم عمران خاں صاحب کو خوش ہو جانا چاہیے کہ حکومت نے اُن کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ''کھلونا ڈرون'' ہی سہی لیکن گرایا تو۔ ویسے بھی میدانِ سیاست میں ابھی اُن کی عمر کھلونوں سے کھیلنے کی ہی ہے ۔جب ایک دو عشروں کے بعد وہ پختہ کار سیاست دان بن جائیں گے تو پھر اصلی ڈرون بھی گرا لیں گے ، جلدی کاہے کی ہے۔رہی نیٹو سپلائی بند کرنے کی بات تو وہ بھی بند ہو جائے گی لیکن اُس کے لیے ایک سال صبر کرنا پڑے گا۔ کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور ہم تو چاہیں گے کہ خاں صاحب یہ میٹھا پھل کھا کر آرام سے بیٹھ رہیں۔امریکہ نے ایک سال کے اندر افغانستان سے کوچ کرنا ہی ہے اور سال بعد نیٹو کنٹینرز کا آنا جانا بھی مفقود ہو جائے گا اِس لیے خوامخواہ سونامیوں کو ''وخت'' میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے ۔

خیبر پختونخواہ کی حکومت نے ڈرون حملے بند کرنے کی 20 نومبر کی "ڈیڈلائن" دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اگر ڈرون حملے بند نہ ہوئے تو 21 نومبر کو نیٹو کنٹینرز بند کر دیئے جائیں گے۔ہم اپنے مربی و محسن، مکرمی و مخدومی، لائقِ صد احترام امریکہ سے دست بستہ گزارش کرتے ہیں کہ 20 نومبر تک کوئی ڈرون حملہ نہ کیا جائے اور اپنے حامی طالبان اور سی۔آئی۔اے کے ایجنٹوں کو بھی یہ ہدایت جاری فرما دی جائے کہ اِس دوران خود کش حملوں سے پرہیز کیا جائے۔20 نومبر کے بعد وہ جتنے جی چاہے حملے کر لے ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔اگر ہماری یہ عرضداشت بارگاہِ امریکہ میں شرفِ قبولیت حاصل کر لیتی ہے تو ہمارے کپتان صاحب کی کچھ لاج رہ جائے گی اور ہم سونامیوں کا دل بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔لیکن اگر امریکہ نے ہماری عرضداشت پہ غور کرنے کی بجائے اُسے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا تو ہم بہرحال "کنٹینرز" تو بند کریں گے ہی خواہ ہمیں بازار سے "کھلونا کنٹینرز" خرید کر ہی کیوں نہ بند کرنا پڑیں۔

خاں صاحب کہتے ہیں کہ وہ نیٹو کنٹینرز روکنے کے لیے مولانا فضل الرحمن کے پاس جانے کے لیے بھی تیار ہیں لیکن ہم کہے دیتے ہیں کہ خاں صاحب ایسی غلطی کرکے بہت پچھتائیں گے۔وجہ یہ ہے کہ مولانا صاحب خیبر پختونخواہ کی حکومت ہتھیانے کے لیے ہمہ وقت اپنے دانت تیز کرتے رہتے ہیں۔حکومت میں شمولیت کی

خاطر حکمرانوں کو بطور ''منجن'' استعمال کرنے میں وہ مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔میاں برادران فی الحال تو منجن بننے کو تیار نہیں لیکن ہمیں مولانا صاحب کی صلاحیتوں پہ بھروسہ ہے اور یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آج نہیں تو کل کامیابی مولانا صاحب کا ہی مقدر ٹھہرے گی۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے کپتان صاحب تحریکِ انصاف کو داغِ مفارقت دیتے دیتے رہ گئے۔انہوں نے ٹی۔وی اینکر کامران شاہد کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ اگر نیٹو کنٹینرز کی بندش کے بارے میں پارٹی مثبت فیصلہ نہ کرتی تو میں پارٹی چھوڑ دیتا۔اگرچہ اللہ سلامت رکھے خاں صاحب اب بھی پارٹی کے چیئرمین ہیں لیکن اب بھی مارے خوف کے ہمارے پاؤں تلے سے زمین محض اِس لیے کھسکتی جا رہی ہے کہ اگر کسی وقت عالمِ غیض میں خاں صاحب پارٹی چھوڑ کر لندن جا بیٹھے تو ہم سونامیوں کا کیا بنے گا؟۔امریکہ ہماری بات مانتا ہے نہ خاں صاحب کا غصّہ ٹھنڈا ہوتا ہے اِس لیے مجھے تو سونامیوں کا مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے۔نیٹو کنٹینرز کی بندش کے بارے میں خاں صاحب کی مَن مرضی کا فیصلہ آنے کے بعد خاں صاحب نے واشگاف الفاظ میں فرمایا'' خیبر پختون خواہ کی حکومت جاتی ہے تو جائے لیکن ہم نیٹو کنٹینرز روک کر دکھائیں گے'' ۔اُس وقت ساتھ کھڑے وزیرِ اعلیٰ جناب پرویز خٹک کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے اور مجھے وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ کمزور محسوس ہونے لگے

۔دروغ بر گردنِ راوی شنید ہے کہ خاں صاحب کے اِس بیان کو سننے کے بعد مولانا فضل الرحمٰن کے ہاتھ پاؤں خوشی سے پھول گئے اور کچھ بد باطن تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اِس خبر کے سنتے ہی مولانا کا وزن دس کلو بڑھ گیا اور آجکل وہ کھُلے کپڑے سلوانے کے چکر میں درزی کی تلاش کے ساتھ ہی ساتھ اپنی کابینہ کی تشکیل میں بھی مصروف ہیں۔

خودی کا سرِ نہاں

18دسمبر1971ء کی سرد سہ پہر کو جب ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ہماری عظمتوں کے تمغے نوچ گئے تو شاعر نے کہا

پھول لے کر گیا آیا روتا ہوا
بات ایسی ہے کہنے کا یارا نہیں
قبرِ اقبال سے آ رہی تھی صدا
یہ چمن مجھ کو آدھا گوارا نہیں

عروج وزوال آئینِ فطرت ہے جس سے مفر ممکن نہیں لیکن زندہ قومیں تاریخ سے سبق حاصل کرتے ہوئے گِر کر سنبھلتی ہیں اور درسِ اقبال بھی یہی ہے کہ

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

لیکن ہم تاریخ سے سبق حاصل کرنے کی بجائے بچے کھچے پاکستان کے بھی ٹکڑے کرنے کے درپے ہیں۔ ہم مصورو مفکرِ پاکستان حضرت علّامہ اقبالؒ کا 136واں یومِ پیدائش تو بزعمِ خویش انتہائی عقیدت و احترام سے منا رہے ہیں لیکن یہ کیسی عقیدت اور کیسا احترام ہے کہ ہم نے آج تک وطنِ عزیز میں کلامِ اقبالؒ

کے عملی نفاذ کی ضرورت کو محسوس ہی نہیں کیا۔ حضرتِ اقبال نے جس آزادی کا خواب دیکھا اُس کا محور و مرکز دینِ مبیں تھا اور وہ تو ایسی آزادی پہ بھی لعنت بھیجتے نظر آتے ہیں جو دین کے تابع نہ ہو۔ وہ فرماتے ہیں

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کو خسارہ

حضرتِ اقبالؒ اور قائدؒ کا تصورِ پاکستان یہی تھا اور اسی کے لیے اُنھوں نے حصولِ پاکستان کے لیے جدوجہد کی تاکہ اِس قطعۂ زمیں ، اِس ارضِ پاک پر دینِ مبیں کو عملی طور پر نافذ کیا جا سکے لیکن آج تک اقبالؒ کا خواب ادھورا ہے اِس لیے ہمیں یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ ہمیں اقبالؒ سے عقیدت ہے

ہمارے بعض سیکولر دانشور اپنی تحریروں اور تقریروں میں قوم کو ہمیشہ یہی درس دیتے نظر آتے ہیں کہ ہم مجبور ، بے بس ، لاچار اور کمزور ہیں اس لیے غیرت و حمیت کو بے شرمی اور بے حمیتی کی لوری سُنا کر سُلا دینا چاہیے کیونکہ زمینی خُداؤں کی چوکھٹ پہ سجدہ ریزی میں ہی عافیت ہے۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا ایٹمی قوتیں بھی کمزور ہوا کرتی ہیں ؟۔ اگر ہم افکارِ اقبال کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر اقبال تو عزم و ہمت کے شاعر تھے اور اُن کا جہاں تو ستاروں سے بھی آگے ہے جہاں غیرت و حمیت کی حکمرانی نظر آتی

ہے۔ انھوں نے فرمایا

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں

پہناتی ہے درویش کو تاج سرِ دارا

لیکن ہمارے سیکولر دانشور کہتے ہیں کہ جہاں عقل کا دروازہ نہیں کھلتا وہیں غیرت کی بات کی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک عقل کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ہم اپنی غیرتوں کو امریکی" شراب پلا کر مدہوش کر دیں۔ حیران ہوں کہ اسی کمزوری کا حوالہ دے کر" پرویز مشرف ڈراتا تھا اور اسی کمزوری کی بات پیپلز پارٹی کرتی رہی۔ شنید ہے کہ موجودہ حکمرانوں نے امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن تاریخ پاکستان یہ نہیں بتلاتی۔ ہمارے دفاعی سائنس دان اپنی بھرپور اور توانا آواز میں ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دفاع نا قابلِ تسخیر ہے لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ پوری دنیا ہمارے ایٹمی پروگرام سے خائف ہے اور ہم پوری دنیا سے۔ ہم نے بھوکے رہ کر ایٹم بم بنایا اور جب اقوامِ عالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے قابل ہوئے تو امریکہ کو خُدا مان لیا۔ ایٹم بموں، ایٹمی میزائیلوں اور آب دوزوں سے لیس دنیا کی بہترین جرّی فوج رکھنے والے حکمرانوں کو روح اقبال یہ پیغام دیتی نظر آتی ہے کہ

کیوں گرفتارِ طلسم ہیچ مقداری ہے تو

دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفان بھی ہے

☆

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے

نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

جبکہ ہمارے حکمرانوں کا رویہ یہ ہے کہ

مجھے روکے گا تو اے ناخُدا کیا غرق ہونے سے

کہ جن کو ڈوبنا ہو، ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

یہ تو تاریخ کا ایک معمولی طالبِ علم بھی جانتا ہے کہ جس زمانے میں اقبالؒ نے شاعری شروع کی اس وقت مسلمانانِ ہند انتہائی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔مایوسیوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو کوئی ایسا روزن بھی نظر نہیں آتا تھا جس سے امید کی کوئی کرن آتی ۔اس دورِ ابتلا میں بھی ترجمانِ حقیقت حضرتِ اقبال نے فرمایا

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار

فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

انہوں نے سرزمینِ ہند کے مسلمانوں کو درسِ بیداری دیتے ہوئے فرمایا

کانپتا ہے دل ترا اندیشہء طوفاں سے کیا
ناخدا تُو، بحر تُو، کشتی بھی تُو، ساحل بھی تُو

لیکن دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ ہم کمزور نہیں لیکن پھر بھی صرف "دشمنوں کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ" سے مرے جا رہے ہیں۔آج اگر اقبال زندہ ہوتے تو شرمندہ ہوتے کہ انہوں نے اپنی عمرِ عزیز ایسے لوگوں کے لئے صرف کر دی جو غیرت کا درس دینے والوں کو طنزیہ انداز میں "غیرت برگیڈ" اور "غیرت لابی" جیسے ناموں سے پکارتے ہیں۔ آج ڈرون حملے ہو رہے ہیں، سینکڑوں ریمنڈ وزیرستان میں دندناتے پھر رہے ہیں، سرحدی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں، اور ہم ؟۔۔۔ ہم جو ڈرون گرا سکتے ہیں، ریمنڈوں کی گردنیں اتار سکتے ہیں اور دشمنوں کو دندان شکن جواب دے سکتے ہیں لیکن ہم بے حمیتی کی "بُکل" مارے بیٹھے ہیں کہ "حمیّت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے "اقبال کے درسِ خودی نے عروقِ مُردہَ مشرق میں خونِ زندگی دوڑایا اور مسلمانانِ ہند کو ایک نظریے پر اکٹھا کیا۔اسی خواب کو بابائے قوم نے حقیقت کا روپ بخشا۔ قائدنے 24 مارچ 1940ء کو قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد بے ساختہ فرمایا "اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے"۔ لیکن جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اسے دیکھ کر تو بے ساختہ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ "اگر آج اقبال زندہ ہوتے

” تو کتنے شرمندہ ہوتے

شہید کون۔۔۔؟

سیدا لشہداء حضرت امام حسینؓ کا مطلوب و مقصود نانا کے دین کی سلامتی تھا۔آپؓ نے شہادت قبول کر لی لیکن یزید کی بیعت نہیں کی ۔ خانوادہ رسولﷺ پر دریائے فرات کا پانی بند کرنے والے مسلمان ہی تھے اور اُنھیں شہید کرنے والے بھی مسلمان جو نماز، روزے میں بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے اور شریعت کے پابند بھی تھے اور شنید ہے کہ یزید لعین تو حافظِ قُرآن بھی تھا۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا عالمِ اسلام کا کوئی مفتی ، کوئی عالم میدانِ کربلا میں ہلاک ہو جانے والے یزیدی فوج کے سپاہیوں کو شہید کہتا ہے یا کہہ سکتا ہے ؟۔ اگر جواب نفی میں ہے تو چار ہزار فوجیوں اور چالیس ہزار بے گناہ بوڑھوں ، بچوں ، جوانوں اور عورتوں کا قاتل حکیم اللہ محسود شہید کیسے ہو گیا ؟۔اور ہزاروں معصوم بچوں ، بوڑھوں اور عورتوں کے قتل میں ملوث ہونے والے طالبان کو یزیدی فوج کیوں نہ قرار دیا جائے؟۔

دینِ مبین کا واجبی سا علم رکھنے کے باوجود میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بظاہر مسلمان عبداللہ ابنِ ابی واصلِ جہنم ہوا اور اُس جیسے اور بھی بہت سے کہ میرے آقاﷺ کا فرمان ہے ’’اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے‘‘ ۔ اور حکمت کی

عظیم ترین کتاب میں درج کر دیا گیا کہ اے نبی ﷺ ہم تمھیں بتائیں کہ اِن میں سب سے زیادہ بد نصیب کون ہے ؟۔وہ کہ جس کی عبادتیں ہم روزِ قیامت اُس کے مُنہ پر دے ماریں گے (مفہوم)۔میرے لیے امیرِ جماعتِ اسلامی سیّد منور حسن انتہائی محترم ہیں ۔اُن کا تقویٰ ، پرہیز گاری اور حب الوطنی شک و شبہ سے بالاتر ہے اور منافقت ، جھوٹ اور دوغلے پَن سے وہ کوسوں دور ہیں لیکن وہ ہر وقت ''حالتِ جذب'' میں رہتے ہیں۔ سیاسی چالوں سے کوسوں دور سیّد صاحب سے جب بھی کسی اینکر نے انٹر ویو کیا وہ سیّد صاحب کے غیض و غضب کا نشانہ بنا۔۔سیّد صاحب بضد ہیں کہ حکیم اللہ محسود شہید ہے لیکن جب اُن سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیسے تو اُن کا جواب کبھی بھی تشفی آمیز نہیں ہوتا ۔اُن کے خیال میں چونکہ حکیم اللہ محسود مذاکرات کے لیے تیار ہو گیا تھا اِس لیے وہ شہید ہے ۔ہمارے پاس وزیرِ داخلہ اور وزیرِ اطلاعات کے ایک دو بیانات کے علاوہ کوئی ثبوت نہیں کہ حکیم اللہ محسود مذاکرات کا حامی تھا البتہ اپنی ہلاکت سے محض چند روز قبل اُس نے بی۔بی۔سی کو انٹرویو دیتے ہوئے جو کچھ کہا اُس سے تو صاف نظر آتا تھا کہ وہ مذاکرات نہیں کرنا چاہتا ۔اُس نے کہا کہ پہلے ڈرون حملے بند کیے جائیں ، وزیرستان سے افواج واپس بلائی جائیں ، گرفتار کیے گئے تمام طالبان کو رہا کیا جائے اور ہلاک ہونے والے طالبان کے ورثہ کو بھاری معاوضہ دیا جائے اس کے بعد مذاکرات کے بارے میں سوچا جائے گا۔کیا اِن شرائط میں سے کوئی شرط بھی ایسی ہے جو حکومتِ وقت کے لیے قابلِ قبول ہو

؟۔کیا ہم مفتوح تھے جو ہم سے ''خراج'' کا مطالبہ کیا جا رہا تھا؟۔
آل پارٹیز کانفرنس میں طالبان سے مذاکرات کے متفقہ فیصلے کے بعد طالبان نے اپنی کارروائیاں تیز کر دیں۔ پاک فوج کے میجر جنرل ثنا اللہ خاں نیازی، لیفٹیننٹ کرنل اور ایک فوجی کو شہید کیا، پشاور میں چرچ پر حملہ کیا، پشاور ہی میں قصہ خوانی بازار اور تحریکِ انصاف کے وزیرِ قانون کو شہید کیا۔سید صاحب کے ''شہید'' نے تو یہ تک کہہ دیا کہ چرچ پر حملہ شریعت کے عین مطابق ہے۔کیا انتہائی محترم سیّد منور حسن صاحب یہ بتلانے کی زحمت گوارہ کریں گے کہ کس شریعت میں نہتے اور بے گناہ غیر مسلموں پر حملہ جائز ہے؟۔ اور کون سی شریعت چالیس ہزار بے گناہ مسلمانوں کے قتل کو جائز قرار دیتی ہے؟۔ ربِّ کردگار تو ایک بے گناہ کے قتل کو پوری خُدائی کے قتل کے مترادف قرار دیتا ہے لیکن سیّد صاحب کا ''ہیرو'' چالیس ہزار بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے باوجود بھی شہید۔افواج پاکستان کے ترجمان نے بالکل درست اپنے غم و غُصے کا اظہار کرتے ہوئے جماعتِ اسلامی کو اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے کہا ہے کیونکہ سیّد صاحب کے سامنے سب سے بڑا سوالیہ نشان یہ ہے کہ ہمارے فوجی شہید ہیں یا نہیں؟۔ اُنھوں نے فرمایا کہ جب عالمِ اسلام کے خلاف لڑنے والے امریکی فوجی شہید نہیں تو پھر امریکہ کی مدد کرنے والے، اُس کی خاطر لڑنے والے اور اُنہیں خفیہ رپورٹس پہنچانے والے کیسے شہید ہو

گئے ؟۔دست بستہ عرض ہے کہ ہمارے فوجی جوان حکومتِ وقت کے حکم پر وطن کی حفاظت کے لیے مصروفِ جہاد ہیں اور دینِ مبیں کے مطابق صرف حکومتِ وقت ہی جہاد کا اعلان کر سکتی ہے کوئی مفتی، کوئی عالم اور کوئی مذہبی جماعت نہیں۔زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومتِ وقت نے پاک فوج کو وطنِ عزیز کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے جو حکم دیا وہ درست نہیں تھا لیکن یہ کہہ دینا کہ وطنِ عزیز کی مٹی کو اپنے خون سے رنگین کرنے والے فوجی افسر اور جوان شہید نہیں، کسی بھی صورت میں درست نہیں ۔

محترم سلیم صافی نے وہی سوالات مولانا فضل الرحمٰن کے سامنے بھی رکھے جو وہ سیّد منور حسن صاحب سے کر چکے تھے۔سیاسی بساط کے ماہر کھلاڑی مولانا فضل الرحمٰن کا ہر جواب سیاسی تھا اور وہ ہر سوال کو ہنستے مسکراتے ٹالتے جا رہے تھے البتہ حکیم اللہ محسود کو وہ بھی شہید سمجھتے ہیں۔اُنھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ''اگر امریکہ کسی کُتے کو بھی ہلاک کرے تو میں اسے بھی شہید کہوں گا''۔ مولانا صاحب کے اس بیان پر بہت لے دے ہوئی جس پر اُنھوں نے یہ کہنے میں ہی عافیت جانی کہ اُنھوں نے یہ امریکہ سے انتہائی نفرت کے اظہار کے طور پر کہا تھا۔ مولانا مفتی محمود کے فرزندِ ارجمند کو بہر حال یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ حالتِ غیض میں بھی کتے کو (نعوذ باللہ) شہید کہیں لیکن چونکہ مولانا اور اُن کی جماعت کی طرف سے بار بار وضاحتی بیانات آ چکے

ہیں اِس لیے اب اِس بحث کو ختم ہو جانا چاہیے ۔ویسے بھی مولانا کی نظریں چونکہ خیبر پختونخواہ کی حکومت کے حصول پر ہیں اور مولانا خوب جانتے ہیں کہ ایسے بیانات خیبر پختونخواہ کے عوام کو بہت مرغوب ہیں اِس لیے اُنھوں نے عوام کی نظروں میں اپنا سیاسی قد بڑھانے کے لیے یہ بیان داغ دیا۔ سلیم صافی صاحب نے بتکرار مولانا سے پوچھا کہ اگر تحریکِ انصاف نیٹو سپلائی بند کرنے کے لیے میدان میں اترے تو کیا مولانا اُن کا ساتھ دیں گے ؟۔ مولانا متواتر یہ کہتے ہوئے طرح دیتے رہے کہ تحریکِ انصاف کی نیت میں فتور ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ مولانا نیٹو سپلائی کی بندش اور ڈرون حملوں کے خاتمے کے لیے تحریکِ انصاف کے ہمنوا ہیں۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا تحریکِ انصاف نیٹو سپلائی بند کرے گی ؟۔ یا اگر عنانِ حکومت مولانا کے ہاتھ میں آ جاتا ہے تو وہ ایسا دلیرانہ قدم اٹھانے کی سکت رکھتے ہیں ؟۔ دونوں سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ تحریکِ انصاف اِس وقت یو۔ایس۔ایڈ کے ساتھ مل کر بہت سے منصوبوں پر کام کر رہی ہے اور تحریکِ انصاف کے رہنما امریکی اہلکاروں کے ساتھ مشاورت میں مصروف رہتے ہیں ۔امریکہ نے یو۔ایس۔ایڈ کے تحت کل 87 ارب روپے پاکستان میں مختلف منصوبوں پر صرف کرنے ہیں جن میں سے 50 ارب روپے خیبر پختونخواہ میں صرف کیے جا رہے ہیں اور یہ وہی منصوبے ہیں جن کا سارا کریڈٹ تحریکِ انصاف بڑے فخر سے لے رہی ہے۔اگر نیٹو سپلائی بند کر دی گئی تو یہ منصوبے شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے اور کپتان صاحب کا چھ ماہ میں خیبر

پختونخواہ کی تقدیر بدلنے کا خواب بھی ادھورا رہ جائے گا۔اِس لیے سیاسی بیانات کی حد تک تحریکِ انصاف جتنا جی چاہے شور مچائے وہ نیٹو سپلائی کی بندش جیسا ''کارِ بیکار'' ہر گز نہیں کرے گی۔ دوسری طرف مولانا صاحب خوب جانتے ہیں کہ جب تک خیبر پختونخواہ کی حکومت اُن کے ہاتھ آئے گی ، اُس وقت تک امریکہ افغانستان چھوڑ چکا ہو گا اور نیٹو سپلائی کی بندش کا معاملہ خود بخود دفن ہو جائے گا۔اِس لیے اُن کی شدید خواہش ہے کہ تحریکِ انصاف نیٹو سپلائی کی بندش جیسی حماقت کر کے مولانا صاحب کی حکومت کے لیے راہ ہموار کر دے۔

یکم محرم الحرام کو امیرالمومنین حضرت عمرؓ ابنِ خطاب شہید ہوئے اور 10 محرم کو نواسہ رسول ﷺ حضرت امام حسینؓ کے خون سے خاکِ کربلا کو لہو رنگ کر دیا گیا۔شاید اسی لیے ماہِ محرم میں فضائیں سوگوار رہتی ہیں اور چہار سُو ایک عجیب سی اداسی کا عالم طاری رہتا ہے۔

امیرالمومنین حضرت عمرؓ کی فضیلت کا اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ خاتم المرسلین ﷺ نے فرمایا ''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے ''اور حسینؓ تو تھے ہی نواسہ رسول ﷺ ۔ حضرت عمرؓ کا عہدِ خلافت بیشمار ایمان افروز واقعات سے مزین ہے اور صرف عالمِ اسلام ہی نہیں ، اقوامِ عالم میں بھی اُن کے عہدِ خلافت کو بطور نظیر پیش کیا جاتا ہے اور بیشمار یورپی مصنفین نے اُن کے عہدِ خلافت کی تحسین کی ہے ۔ذرا اندازہ کیجئے کہ ایک طرف تو امیرالمومنین روم اور شام پر فوجیں بھیج رہے ہیں ، خالدؓ بن ولید اور امیر معاویہؓ سے ملکی معاملات پر پوچھ گچھ کر رہے ہیں ۔ سعد بن وقاص ، ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کے نام احکامات لکھوا رہے ہیں جبکہ دوسری طرف بدن پر موٹے کھدر کا کُرتا ، سر پر پھٹا عمامہ ، پاؤں میں پھٹی جوتیاں

اور اِسی حالت میں کاندھے پر مشک اُٹھائے بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھرتے نظر آتے ہیں ۔جب تھک جاتے ہیں تو مسجد کے کونے میں خاک کے فرش پر لیٹ کر سو جاتے ہیں ۔راتوں کو گشت پر نکلتے کہ رعایا کی خبر گیری ہو سکے ۔ایک دن دورانِ گشت ایک عورت کو دیکھا جس کا بچہ بری طرح رو رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے غُصے سے عورت کو کہا بچے کو چپ کیوں نہیں کراتیں"۔ عورت نے کہا "عمرؓ نے حکم دیا ہے کہ بچے جب تک" دودھ نہ چھوڑیں ،بیت المال سے اُن کا وظیفہ مقرر نہ کیا جائے ۔اِس لیے میں نے بچے کا دودھ وقت سے پہلے ہی چھڑا دیا ہے تاکہ وظیفہ شروع ہو"۔ حضرت عمرؓ رونے لگے اور اُسی دن منادی کروادی کہ بچے جس دن پیدا ہوں ،اُسی دن سے اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے"۔آپؓ کے غلام کا بیان ہے کہ دورانِ گشت حضرت عمر نے ایک بیوہ عورت کے بچوں کو بھوک سے روتے دیکھا تو واپس آ کر بیت المال سے کھانے پینے کا سامان اُٹھایا اور غلام کو کہا "میری پیٹھ پر لاد دو"۔ غلام نے کہا "میں لے چلتا ہوں" ۔آپ نے فرمایا "کیا روزِ قیامت بھی میرا بوجھ تم اُٹھا لوگے ؟"۔

ایک دفعہ حضرت امام حسینؓ اور حضرت عمرؓ کے بیٹے گلی میں کھیل رہے تھے کہ دونوں لڑ پڑے ۔حضرت امام حسینؓ نے حضرت عمرؓ کے بیٹے کو کہا "ہٹ غلام زادے"۔ بیٹا روتا ہوا باپ کے پاس گیا اور کہا کہ حسینؓ نے اُسے غلام زادہ کہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو کہا "بیٹا ! بھاگ کر جاؤ اور حسینؓ سے یہی

بات لکھوالاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ حسینؓ انکار کر دیں اور ہم اِس سعادت سے محروم ہو جائیں"۔جس کی غلامی پر امیر المومنین حضرت عمرؓ کو فخر ہو، اُسی کے خون سے کربلا کی ریت کو رنگنے والے کوفیوں کے بارے میں بھلا کوئی مسلمان کلمۂ خیر کیسے کہہ سکتا ہے ۔ حسینؓ تو وہ نواسۂ رسول ﷺ تھے کہ جب آپ ﷺ دورانِ نماز سجدے میں جاتے تو حضرت حسینؓ پیٹھ پر سوار ہو جاتے اور میرے آقا ﷺ اُتنی دیر تک سجدے سے سر نہ اُٹھاتے جتنی دیر تک آپؓ اُتر نہ جاتے۔ننھے حسینؓ جب لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکلتے تو نگاہ پڑتے ہی آپ ﷺ بھاگ کر اُنہیں تھام لیتے لیکن اُسی حسینؓ اور اہلِ بیعت پر لعین یزیدیوں نے تین دن تک پانی بند کیے رکھا اور پیاسے خانوادہ رسول ﷺ کے ایک ایک فرد کو شہید کر ڈالا۔اگر امام حسینؓ چاہتے تو یزید کے ہاتھ پر بیعت کرکے اپنی جان بچا لیتے لیکن اُنہیں تو اپنے نانا ﷺ کے دین کی عظمت مقصود تھی، وہ تو گھر سے نکلے ہی نانا کے دین کو بچانے کے لیے تھے اِس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کسی لعین کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔تا قیامت سچائی کا یہ نور عالم کو منور کرتا رہے گا کہ

شاہ است حسینؓ، پادشاہ است حسینؓ
دیں است حسینؓ، دیں پناہ است حسینؓ

سر داد، نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بِنائے لا الٰہ است حسینؓ

کربلا کی لہو رنگ خاک آج بھی پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ دینِ مبیں کی رفعتوں کی خاطر دی جانے والی اِس عظیم ترین قُربانی کی نظیر تاریخِ عالم میں ملتی ہے، نہ ملے گی اور یہ بھی عین حقیقت ہے کہ شہادتِ حسینؓ دراصل مرگِ یزید ہے کیونکہ جہاں حضرت امام حسینؓ اور خانوادہ رسول ﷺ کے ساتھ بے پناہ محبت و عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے، وہیں یزید اور یزیدی فوج پر تبرا بھی بھیجا جاتا ہے اور تا قیامت بھیجا جاتا رہے گا۔ لاریب کوئی مسلمان اہلِ بیعت پر گزرے ہوئے اِس سانحۂ عظیم کی کوئی توجیہہ پیش کرکے گنہگار نہیں ہو سکتا لیکن انتہائی دُکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ وطنِ عزیز میں شیعہ سُنّی فسادات نے ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ جیسے اہلِ بیعت صرف شیعہ حضرات کے ہی ہیں کسی اور کے نہیں جبکہ سچ تو یہ ہے کہ دینِ مبیں کا ہر پیروکار ببانگِ دہل یہ کہتا ہے کہ ہمارے ہیں حسینؓ"۔"

چاہیے تو یہ تھا کہ تمام مسلمان مل کر خانوادہ رسول ﷺ پر اپنی محبتوں اور عقیدتوں کے پھول نچھاور کرتے لیکن یہاں تو یہ عالم ہے کہ ماہِ محرم کے آغاز ہی سے وجود پر کسی اَن دیکھے، انجانے خوف کی سیاہ چادر تَن جاتی ہے اور لب اِن دعاؤں سے تھر تھرانے لگتے ہیں کہ ربِ کردگار یہ دن خیریت سے گزار دے لیکن شاید ہم اپنی بداعمالیوں میں اتنا آگے نکل چکے ہیں کہ اب ہماری دعائیں

بھی بارگاہِ ربی میں مستجاب نہیں ہوتیں اور کہیں نہ کہیں ، کوئی نہ کوئی سانحہ رونما ہو جاتا ہے ۔جب حضرت امام حسینؓ کے ساتھ والہانہ عقیدت سے ہر مسلمان کا دل معمور ہے تو پھرپتہ نہیں وہ کون لوگ ہیں جو فساد بپا کرکے مسلمانوں کا خون بہارہے ہیں ۔ ایسا قبیح فعل کرنے والے مسلمان تو خیر کیا ہونگے ، وہ تو لازمۂ انسانیت سے بھی خارج ہیں ۔اہلِ تشیع کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ حبِّ حسینؓ میں حد سے گزر جاتے ہیں لیکن یہ بھی بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی خانوادہ رسول ﷺ سے محبت بھی بے مثل ہے۔کیا کسی کو کوئی شک ہے کہ اللہ ، یومِ آخرت انبیاء ، فرشتوں اور آسمانی کتب پر ایمان کے معاملے میں وہ تقاضۂ دینِ مبیں پہ پورے ، نہیں اُترتے ؟۔پھر اُن کو کافر کہہ کر فساد بپا کرنا کس دین کا درس اور کس شریعت کی پیروی ہے ؟۔ رہا اہلِ تشیع کے خانوادہ رسول ﷺ سے محبت کا انداز تو یہ اُن کا اور اللہ کا معاملہ ہے اور کسی بندے کو ہر گز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُن کو کافر قرار دے کر شَر پیدا کرنے کی کوشش کرے لیکن کیا کیجئے کہ کچھ دین کے ٹھیکے داروں نے پوری اُمتِ مسلمہ کو ایک ایسے مسئلے میں اُلجھاکے رکھ دیا ہے جس کا دینِ مبیں سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ۔دوسری طرف اہلِ تشیع بھی اپنے مخالف مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والوں پر بلا جھجک کفر کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں جس کی بنا پر نہ صرف شیعہ سُنّی فساد جنم لیتا ہے بلکہ پاکستان کی دشمن بیرونی قوتیں بھی اسی اختلاف کی آڑ لے کر وطنِ عزیز میں فساد بپا

کرکے نفرت کی آگ بھڑکاتی رہتی ہیں۔ وطنِ عزیز جس دَورِ ابتلاء میں مبتلا ہے اُس کا تقاضہ تو اخوت، محبت اور یگانگت ہے اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ تشیع اور اہلِ سنّت کے بہت سے جید علماء اِس فساد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے صبح ومسا کوشاں رہتے ہیں لیکن اُنہی کی صفوں میں گھُسے فسادی پھر بھی اپنا کام دکھا جاتے ہیں۔ جب حضرت امام حسینؓ ہر مسلمان کے لیے انتہائی محترم ہیں اور ربِّ علیم وخبیر نے اعمال کے حساب کا ایک دن مقرر کر رکھا ہے تو پھر ہمیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ ہم زمینی خُدا بن کر فیصلے کرتے پھریں۔ خیر کا تقاضہ تو یہی ہے کہ سبھی مسلمان فروعی مسائل میں اُلجھنے کی بجائے بیک آواز یہ کہیں کہ

"ہمارے ہیں حسینؓ"

تم رکھ نہ سکے اپنی جفاؤں کا بھرم بھی

میرے ایک انتہائی محترم لکھاری اور دانشور نے عصرِ حاضر کے ترقی پسند دانشوروں کو "ڈالر یافتہ ملالائی دانشور" کہہ کر گویا دریا بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب اُن کی ہیروئن طرابلس کی فاطمہ بنت عبداللہ کی بجائے سوات کی ملالہ یوسف زئی ہے جس نے پانچویں جماعت میں گُل مکئی کی ڈائری کے عنوان سے BBC اُردو ڈاٹ کام کی باقاعدہ رپورٹر کی حیثیت سے لکھنا شروع کیا۔ محترم کے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ پانچویں جماعت کی طالبہ کی تحریر ہو۔ محترم لکھاری کا فرمان بجا لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ملالہ یوسف زئی پیدائشی جینئس ہو اور کل کلاں اُس کی وہ ڈائری بھی منظرِ عام پر آ جائے جو اُس نے پہلی جماعت میں لکھی تھی۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے لکھاری اِس ڈائری کو بھی اُسی طرح اصلی ثابت کر دیں گے جیسے محترمہ بینظیر شہید کی شہادت کے بعد لکھی گئی وصیت کو اصلی ثابت کر دیا گیا تھا۔ جب سے ملالہ کی ڈائری منظرِ عام پر آئی ہے، مجھے رہ رہ کر اپنے بچوں پر غصّہ آ رہا ہے جنہیں پانچویں جماعت تک قلم سیدھا کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ یہی بات میں نے طنزاً اپنے ڈاکٹر بیٹے سے کہی تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا اِس عمر میں آپ کو قلم سیدھا کرنا آتا تھا؟"۔ میں لاجواب ہو گئی اور لاجواب ہونے کے بعد میرا غصّہ ہمیشہ عروج

پہ پہنچ جاتا ہے۔بیٹا چونکہ میری اِس عادت کو خوب جانتا ہے اِس لیے وہ جملہ کَس کر یہ جا، وہ جا۔

محترم لکھاری لکھتے ہیں کہ یہ ڈائری وسعت اللہ خاں لکھتا رہا جسے ملالہ سے منسوب کر دیا گیا۔میں چاہتے ہوئے بھی وسعت اللہ پر یہ الزام نہیں دھر سکتی کیونکہ ہتکِ عزت کا خطرہ ہے۔اگر وسعت اللہ خاں یا ملالہ یوسف زئی نے ہتکِ عزت کا دعویٰ کر دیا تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ فیصلہ اُنہی کے حق میں ہوگا کیونکہ اُن کے پیچھے امریکہ اور یورپ ہے جب کہ ہمارے پلّے کیا ہے سوائے غیرت و حمیت کے۔اِس غیرت و حمیت کی وسعت اللہ خاں یا اُن کے آقاؤں کے ہاں کوئی اہمیت نہیں۔وسعت اللہ خاں صاحب نے ایک ٹاک شو میں فرمایا ”جہاں عقل کا دروازہ نہیں کھلتا، وہاں غیرت و حمیت کی بات کی جاتی ہے“۔وسعت اللہ صاحب اپنی عقل کے زور پر شوق سے ڈالر اور پونڈ اکٹھے کریں لیکن ہماری عقل تو عشقِ مصطفوی ﷺ کے تابع ہے جہاں مطلوب و مقصود شہادت ہوتی ہے، مالِ غنیمت اور کشور کشائی نہیں اور عقل کے بارے میں ہمارا نظریہ تو بقولِ اقبالؒ یہ ہے

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

بہرحال میرا آج کا موضوع یہ نہیں تھا اور شاید آئندہ بھی نہ ہو کہ میں نے

ملالہ کے بارے میں جو کچھ لکھنا تھا پہلے ہی لکھ چکی۔ میں تو آج صاف صاف لکھنے اور بولنے والے اُس بے باک صحافی کو مبارک باد دینا چاہتی تھی جس نے امیرِ جماعتِ اسلامی سیّد منور حسن کا انٹرویو کرکے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو باغ باغ کر دیا۔ آجکل الیکٹرانک میڈیا کے اینکرز اسی ''دھوم دھڑکے'' میں مبتلاء نظر آتے ہیں اور پرنٹ میڈیا کے لکھاریوں نے بھی اِس پر لکھنا اپنا فرضِ عین سمجھ لیا ہے۔ میں کچھ عرصہ تو خاموش رہی لیکن جب بڑے بڑے اینکرز اور لکھاریوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا تو میں نے بھی سوچا کہ کیوں نہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیے جائیں اِس لیے آج کا کالم حاضر ہے۔

پتہ نہیں ہمارے سیّد صاحب کو کیا سوجھی کہ اُنہوں نے بیٹھے بٹھائے یہ ''کھڑاک'' کر دیا حالانکہ وہ افواجِ پاکستان کی قربانیوں کے بھی قائل ہیں اور اُنہیں وطنِ عزیز کے محافظوں کی غیرت و حمیت اور خلوص پر بھی کوئی شک نہیں۔ سیّد صاحب افواجِ پاکستان کی قُربانیوں کی ایک سے زائد بار تحسین کر چکے ہیں اور ہم بھی جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے ہمیشہ کُھل کر فوج کی حمایت کی اور افواجِ پاکستان کی ''بی۔ ٹیم'' کے طعنے بھی سہتی رہی لیکن یوں لگتا ہے کہ جیسے سیّد صاحب چوری چوری الطاف حسین برطانوی کی ''بڑھکیں'' اور ٹاک شوز میں شیخ رشید احمد کے ''کھڑاک'' دیکھتے رہتے ہوں۔ جیسے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے ویسے ہی ہمارے سیّد صاحب نے رنگ پکڑا اور دما

دم مست قلندر کر دیا۔اکابرینِ جماعت اسلامی نے معاملے کو سلجھانے کی لاکھ کوشش کی لیکن بے سود کہ ہمارے اینکرز کے پاس فی الحال اِس کے سوا کوئی موضوع نہیں اور اگر ہو بھی تو ہمارا ایک ضرورت سے زیادہ ''محبِ وطن'' نیوز چینل بار بار یہ ٹاک شو'' آن ایئر'' کرکے جلتی پہ تیل چھِڑکتا رہتا ہے۔ 10 محرم کو جب پوری قوم سانحۂ کربلا کے سوگ میں ڈوبی ہوئی تھی ، ''محبِ وطن'' نیوز چینل نے ایک دفعہ پھر اِس ٹاک شو کو آن ایئر کر دیا اور دینی جماعتوں کو سیدھا کرنے کے ''ٹھیکیداروں'' کے سینے ''ٹھنڈے ٹھار'' ہو گئے۔ طُرفہ تماشہ یہ ہے کہ دینِ مبیں کا نام سُن کر ''بِدکنے'' جانے والوں نے ہی یکلخت دین کو ٹھیکے پر لے لیا اور وہ کہ جن کی زبانوں پر اسلام کا نام لیتے ہی لکنت طاری ہو جاتی، آج شہید شہید پکار رہے ہیں۔یہ وہی لوگ ہیں جو افواجِ پاکستان کے شدید نقاد اور ڈالر کی پیداوار ہیں۔یہ '' مشرف بہ امریکہ''لکھاری اور اینکر اپنے مخصوص اور مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے لنگوٹ کَس کر جماعت اسلامی پر ٹوٹ پڑے۔انہیں اِس سے کچھ غرض نہیں کہ وطنِ عزیز 1971ء سے بھی بُرے حالات سے گزر رہا ہے اور جتنی قومی و ملّی یکجہتی کی آج ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔وزیرِ داخلہ جناب چوہدری نثار احمد نے دِلی درد کے ساتھ یہ اپیل کی کہ یہ موقع کون شہید اور کون نہیں کی بحث کا نہیں بلکہ ملک بچانے کا ہے۔اِس لیے پوری قوم ایک صفحے پر اکٹھی ہو جائے۔اُن کی اِس اپیل کا سیاسی جماعتوں نے تو اثر قبول کیا اور آئی۔ایس۔پی۔آر کی طرف سے

بھی خاموشی ہی ہے لیکن میڈیا جان نہیں چھوڑ رہا۔ جماعت اسلامی کی طرف سے بھی بار بار وضاحت آ چکی ہے لیکن بے سود۔ ہمیں بار بار یہ ٹاک شو دکھانے والے اِس نیوز چینل کی حب الوطنی کے بارے میں کوئی شک نہیں لیکن ایک دوسرے چینل پر بیٹھا ایک لینکر ''ایویں خواہ مخواہ'' کہانیاں گھڑ گھڑ کر لوگوں کو بدظن کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ دراصل یہ لینکر امن کا دشمن ہے اِس لیے امن کی آشا کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا جبکہ ہم ٹھہرے امن کے پجاری۔ ہمارے قائد کا فرمان ہے کہ ہم نے 9 سال تک جنگ کرکے دیکھ لی، اب امن کو بھی موقع دینا چاہیے۔ اسی امن کے حصول کی خاطر ہم 20 نومبر کو نیٹو سپلائی بند کرنے جا رہے ہیں۔ ہم نیٹو سپلائی کو بُرائی گردانتے ہیں اور بُرائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں ہی حکمت ہے اِس لیے ہمارا پروگرام تو یہی ہے کہ نیٹو کنٹینرز کو کراچی کی بندرگاہ پر ہی روک دیا جائے لیکن ہمیں سندھ کے وزیرِ اعلیٰ سیّد قائم علی شاہ کی حب الوطنی کا کچھ اندازہ نہیں۔ اگر تو وہ محبِ وطن ہوئے تو ہمارے ساتھ ہی کنٹینرز کے آگے دھرنا دیں گے وگرنہ پیپلز پارٹی کی حب الوطنی پر بھی ہزاروں سوالیہ نشان لگ جائیں گے۔

ہمارے دبنگ وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک صاحب نے تو اعلان کر دیا تھا کہ خیبر پختونخواہ کی حکومت نیٹو سپلائی بند کر دے گی لیکن اب ہمارے ''کپتان صاحب'' نے فرمایا ہے کہ تحریکِ انصاف کے کارکن نیٹو سپلائی بند کریں گے خیبر

پختونخواہ کی حکومت نہیں۔ اب پرویز خٹک تحریکِ انصاف کے کارکن کی حیثیت سے دھرنا دیں گے بطور وزیرِاعلیٰ نہیں۔ دراصل ہم ایسا صرف اِس لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں نواز لیگ کی نیت میں فتور نظر آ رہا ہے۔ ہمارے اکابرین کہتے ہیں کہ اگر اِدھر KPK کی حکومت دھرنا دیئے بیٹھی ہو اور اُدھر نواز لیگ ''اندیشہ نقضِ امن'' کا بہانہ بنا کر گورنر راج لگا دے اور مولانا فضل الرحمٰن کو گورنر بھی بنا دے تو پھر ہمارا کیا بنے گا؟۔

اُمید کی کرنیں

میرے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ وہ قومیں برباد ہو جاتی ہیں جو کمزوروں کو سزا دیتی لیکن زور آوروں کو چھوڑ دیتی ہیں (مفہوم)۔آج لال مسجد کا سانحہ اپنی کربناک یادوں کے ساتھ پھر تازہ ہو گیا۔آمر مشرف نے مولانا عبدالعزیز کو ایک سازش کے تحت گرفتار کیا اور صلح جُو غازی عبدالرشید کو ''محفوظ راستہ'' دینے سے انکار کر دیا۔غازی عبدالرشید شہید کر دیئے گئے اور چشمِ فلک نے ایک دفعہ پھر اپنی انتہاؤں کو چھوتی یزیدیت کا اُس وقت نظارہ کیا جب لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے معصوم بچوں اور بچیوں کے خون سے اُن کی درسی کُتب کے صفحات رنگین ہو گئے ، قُرآنِ پاک جلائے گئے اور جب الیکٹرانک میڈیا نے معصوم بچوں کے جلے ہوئے بستے دکھائے تو ہر آنکھ اشک بار ہو گئی ۔تب میں نے لکھا کہ آج غازی عبدالرشید کو محفوظ راستہ نہیں دیا گیا لیکن وہ دن ضرور آئے گا جب یزیدیت کا علم بردار آمر مشرف محفوظ راستے کی بھیک مانگے گا لیکن اُس پر کان دھرنے والا کوئی نہ ہو گا۔جب مشرف کو گارڈ آف آنر دے کر رخصت کیا گیا اور وہ خاموشی سے بیرونِ ملک پرواز کر گیا تب بھی مجھے یقین تھا کہ آمر ایک نہ ایک دن ربِّ لَم یزل کی پکڑ میں ضرور آئے گا کہ میرے ربّ کی رسّی جتنی دراز ہے اُس سے کہیں زیادہ اُس کی پکڑ مضبوط

ہے۔ میرا ایمان ہے کہ آمر اب ربِ جبار و قہار کی گرفت میں ہے اور مغرور و متکبر آمر کو نشانِ عبرت بنا دینے کی گھڑی آن پہنچی۔

وفاقی وزیرِ داخلہ چوہدری نثار علی خاں نے پرویز مشرف کے خلاف آئین کی پامالی، عدلیہ کی معزولی اور ججز کو پابندِ سلاسل کرنے کے اقدامات پر عدالتِ عظمٰی کے احکامات کی روشنی میں 18 نومبر سے آرٹیکل 6 کے تحت غداری کی کارروائی شروع کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ 3 نومبر 2007ء کے پرویز مشرف کے اقدامات سے متعلق FIA کی تین رکنی کمیٹی نے اپنی تحقیقات مکمل کر لی ہیں اور تحقیقاتی رپورٹ 18 نومبر کو سپریم کورٹ میں جمع کروا کر چیف جسٹس سپریم کورٹ سے مشرف کے خلاف مزید کارروائی کے لیے ہائی کورٹس کے تین جسٹس صاحبان پر مشتمل تین رکنی جوڈیشنل کمیشن بنانے کی استدعا کی جائے گی جو مشرف کے خلاف کارروائی کرے گا۔ وزیرِ داخلہ کے اِس اعلان کے ساتھ ہی تجزیوں اور تبصروں کا ایک طوفانِ بلا خیز اُمڈ آیا اور طرح طرح کی موشگافیاں ہونے لگیں۔ مشرف کے دل کے بہت قریب شیخ رشید احمد نے کہا کہ اقتدار میں آنے کے بعد نواز لیگ کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک شخص نہیں ادارے کے خلاف کیس ہے جس سے نیا پنڈورا بکس کھل جائے گا اور فوج نہیں چاہے گی کہ آرمی ایکٹ کی توہین ہو نہ ہی سعودی حکومت پسند کرے گی۔ شیخ صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ 3 نومبر کی ایمرجنسی پرویز مشرف نے ذاتی حیثیت میں بطور چیف آف آرمی سٹاف

لگائی تھی جس کا سارا ریکارڈ موجود اور محفوظ ہے۔مزید برآں اعلیٰ عدلیہ اِس ایمرجنسی کو پہلے ہی غیر آئینی قرار دے چکی ہے اِس لیے یہ سیدھا سادا غداری کا کیس ہے جس میں کوئی ابہام نہیں۔رہی افواجِ پاکستان کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی بات تو شیخ صاحب خاطر جمع رکھیں، فوج کا ہرگز مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں۔ویسے بزعمِ خویش ایک قومی لیڈر ہونے کا دعویٰ کرنے والے شیخ صاحب کو اتنا تو احساس ہونا چاہیے کہ فیصلے کسی کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کو مدِ نظر رکھ کر نہیں کیے جاتے اور جو قومیں ایسا کرتی ہیں، وہ برباد ہو جاتی ہیں۔

پیپلز پارٹی نے توقع کے عین مطابق معاملے کو الجھانے اور اٹکانے کی کوشش کی ہے۔پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول زرداری اور قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ دونوں نے ہی اِس بات پر زور دیا ہے کہ آرٹیکل 6 کے تحت مقدمہ 12 اکتوبر 99ء سے درج ہونا چاہیے۔شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مشرف کے خلاف اگر حکومت سنجیدہ ہوتی تو 12 اکتوبر 1999ء سے کیس بناتی جس میں مشرف کا ساتھ دینے والوں اور مشرف کے اقدام کو قانونی حیثیت دینے والوں سب کے خلاف آرٹیکل 6 کے تحت مقدمہ درج ہوتا۔اُنھوں نے طنزیہ انداز میں کہا ''اگر ہم شیر بن ہی گئے ہیں تو کرائم 12 اکتوبر 1999ء سے بنتا ہے۔آپ کچھ لوگوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں''۔پیپلز پارٹی اپنے دَورِ اقتدار میں تو بھیگی

بلّی بنی رہی اور اپنی قائد محترمہ بینظیر شہید کے قاتل کو گارڈ آف آنر دے کر رخصت کیا لیکن اب اسے بھی گرجنا برسنا آ گیا ہے۔چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری صاحب کے لیے اپنے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی نرم گوشہ نہ رکھنے والی پیپلز پارٹی کا مطمعٔ نظر یہ ہے کہ جج صاحبان کو اِس کیس میں شامل کرکے اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کی جائے ۔اپنے دَورِ اقتدار میں تو وہ شدید ترین خواہش کے باوجود عدلیہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکی لیکن اب وہ بدلہ لینے کے لیے نواز لیگ کا کندھا استعمال کرنا چاہتی ہے جو ممکن نہیں۔سیّد خورشید شاہ صاحب خوب جانتے ہیں کہ 12 اکتوبر 1999ء کے اقدامات پر کسی نے رٹ کی ، مقدمہ چلا نہ سپریم کورٹ کا کوئی فیصلہ آیا جبکہ 3 نومبر 2007ء کی ایمرجنسی کو اعلیٰ عدلیہ غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دے چکی ہے ۔اگر اکتوبر 99ء سے مقدمہ درج کرنا ہے تو پھر 1958ء کے ایوبی مارشل لاء سے کیوں نہیں ، پھر ضیاء الحق اور یحییٰ کے خلاف کیوں نہیں ؟کیا سیّد خورشید شاہ صاحب قوم کو ''ٹرک کی بتّی'' کے پیچھے لگانا چاہتے ہیں ؟۔

آمر مشرف کے خلاف کارروائی کے بارے میں کئی آئینی شوشے چھوڑے جا رہے ہیں ۔ڈاکٹر خالد رانجھا نے تو یہ کہہ کر قصّہ ہی ختم کر دیا کہ حکومتی اقدام غیر آئینی ہے ۔آئینی ماہر ڈاکٹر خالد رانجھا سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا آئین کے ایکٹ 1976ء کے سیکشن 3 میں کوئی ابہام ہے ؟اور کیا وہ 3 نومبر

۔ کی ایمرجنسی پر اعلیٰ عدلیہ کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتے ؟۔ یہ بجا کہ 1976ء2007 کے قانون کے مطابق خصوصی عدالت کے قیام میں چیف جسٹس صاحب کا کوئی رول نہیں لیکن اگر حکومت درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے چیف جسٹس صاحب سے ہائی کورٹس کے تین ججز کا پینل بنانے کی درخواست کرتی ہے تو اِس میں کیا غیر آئینی ہے؟۔ سبھی جانتے ہیں کہ میاں برادران آمر مشرف سے شدید نفرت کرتے ہیں اور یہ نفرت بلا وجہ بھی نہیں ۔ غیر جانبداری کا تقاضہ تو یہی تھا کہ حکومت اپنے آپ کو اِس تمام قضیے سے الگ کرتے ہوئے معاملہ عدالتوں پر چھوڑ دیتی ، جو حکومت نے کر دیا ۔ اگر حکومت کی طرف سے خصوصی عدالت کا قیام عمل میں آتا تو اِنہی لوگوں نے جانبداری کا الزام دھرنا تھا ۔ اب حکومت نے سارا معاملہ عدلیہ پر چھوڑ دیا ہے اِس لیے عدالتی فیصلے کا انتظار کیا جانا چاہیے ۔

کچھ تجزیہ نگاروں کے خیال میں عدالتی کمیشن کی تشکیل سے معاملہ لٹک جائے گا اور تاریخ پاکستان بتلاتی ہے کہ جب کبھی حکومت کسی معاملے کو لٹکانا چاہتی ہے تو کمیشن تشکیل دے کر اپنی جان چھڑا لیتی ہے ۔ اِس سلسلے میں عرض ہے کہ وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد نے اپنی پریس کانفرنس میں بار بار جوڈیشل کمیشن بنانے کی بات تو ضرور کی لیکن شاید یہ سب کچھ غلط فہمی میں ہوا کیونکہ وزارتِ قانون کے ڈرافٹ کردہ خط کے مطابق چیف جسٹس صاحب کو مقدمے کی

سماعت کے لیے ہائی کورٹس کے تین جج صاحبان کی خصوصی عدالت کی تشکیل کے لیے استدعا کی گئی ہے اور در حقیقت حکومت سپریم کورٹ کو یہ کیس تین رکنی سپیشل کورٹ کی ٹیم اپنی انکوائری مکمل کر چکی ہے FIA کے قیام کے لیے بھیج رہی ہے۔اِس کے علاوہ اور اُس نے بھی پرویز مشرف کے خلاف آرٹیکل 6 کے تحت ٹرائل کرنے کا مطالبہ کیا ہے ۔یہ عدالت کسی کمشن یا ٹریبونل کی طرز کی نہیں ہو گی بلکہ یہ ایک خصوصی عدالت ہو گی جس میں مقدمہ آگے بڑھے گا۔اب یہ پرویز مشرف پر منحصر ہے کہ وہ کس کس کے شریکِ جرم ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

آرٹیکل 6 کا پہلا ملزم

ہمارے پیارے اور فی الحال مجبور و مقہور کمانڈو پرویز مشرف کو حکومتِ وقت نے بقول ڈاکٹر خالد رانجھا صاحب ''بے جرم وخطا'' دھر لیا ہے کیونکہ کیس تو بنتا ہی نہیں۔اگر ایسا ہی ہے تو پھر ہمارے نزدیک یہ انتہائی زیادتی ہے۔اُدھر ہمارے محترم چیف جسٹس صاحب نے بھی کمال سُرعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومتی خط پانچوں ہائی کورٹس کے چیف جسٹس صاحبان کو بھیج کر 24 گھنٹوں کے اندر پانچ ججز صاحبان کے نام مانگ لیے ہیں۔ایسی تیزی کبھی دیکھی نہ سُنی۔ہم محترم چیف صاحب سے دست بستہ معافی مانگتے ہوئے یہی استدعا کر سکتے ہیں کہ وہ جاتے جاتے ہم پر یہ احسان ضرور کرتے جائیں کہ ہمارے ''کمانڈو'' کے لیے کوئی ''نظریۂ ضرورت'' تلاش کر دیں۔آخر پہلے بھی تو اعلیٰ عدلیہ نے کمال شفقتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے لیڈر کو تین سال دیئے ہی تھے ناں۔اب اُن سے کونسی ایسی انہونی سرزد ہو گئی جو ناقابلِ معافی وتلافی ہے ؟۔

مارشل لاء تو ایوب ، یحییٰ اور ضیاء نے بھی لگایا تھا لیکن اُس پر کوئی شور اُٹھا نہ ہنگامہ اور نہ ہی کسی نے آئین کی تقدیس کی بات کی۔ضیاء الحق صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ آئین سو صفحے کی (فضول سی)کتاب ہے جسے جب

چاہوں، پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دوں لیکن مشرف صاحب نے تو ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگایا اور اُس پر عمل کرکے بھی دکھایا۔ اُنہوں نے اِدھر اُدھر سے پاکستانی اکٹھے کیے اور پھر اُنہیں دہشت گرد ثابت کرنے کے بعد امریکی منڈی میں فروخت کرکے قومی خزانے کو ڈالروں سے بھر دیا۔ اگر مشرف ایسا نہ کرتے تو امریکہ ہمیں پتھر کے زمانے میں دھکیل دیتا جہاں ہمیں روٹی کپڑا ملتا نہ مکان اور نہ ہی انٹرنیٹ کی سہولت۔

ویسے آپس کی بات ہے کہ ہمیں پرویز مشرف صاحب پر آرٹیکل 6 کا اطلاق ہو جانے پر کوئی اعتراض ہے نہ پریشانی کیونکہ کسی کی ''چڑیا'' امریکی فضاؤں سے یہ پیغام لائی ہے کہ ہمارا آقائے ولی نعمت امریکہ ڈاکٹر شکیل آفریدی کو کچھ ہونے دے گا نہ پرویز مشرف کو اور بقول ڈپٹی سپیکر سندھ اسمبلی محترمہ شہلا رضا ''یہ سب ڈرامہ مشرف صاحب کو کلین چِٹ دینے کے لیے رچایا جا رہا ہے''۔ ہمیں تو صرف مقدمے کی ٹائمنگ پر اعتراض ہے۔ مشرف صاحب پر پاکستان آتے ہی تین مقدمات قائم ہوئے اور تینوں میں ہی اُن کی گرفتاری عمل میں آئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اُنہیں اپنے ہی گھر میں نظر بند کر دیا گیا اور گھر بھی ایسا کہ جہاں ہر کوئی نظر بند ہونے کی تمنا کرے۔ شنید ہے کہ اُن کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حکومت نے اُنہیں دل بہلانے کے لیے طبلہ، سارنگی بھی مہیا کر دیئے۔ دروغ بَر گردنِ راوی وہ نظر بندی کے دوران ہر وقت یہ گنگناتے رہتے

تھے کہ ''میں کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے''۔ پھر ہر کیس میں ضمانت کے بعد جب وہ اپنے بوٹوں کے تسمے باندھ کر دبئی پرواز کرنے ہی والے تھے تو وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد نے آرٹیکل 6 کا شوشہ چھوڑ دیا۔ پرویز مشرف کے وکیل احمد رضا قصوری فرماتے ہیں کہ چوہدری نثار احمد نے سانحہ راولپنڈی سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے یہ ''شتونگڑا'' چھوڑا ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ اُنہوں نے شتونگڑا کس کو کہا لیکن جسے بھی کہا خوب کہا۔ قصوری صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ پرویز مشرف انتہائی سُرعت سے عوام میں مقبول ہو رہے تھے اور حکومت نے اُن کی مقبولیت سے پریشان ہو کر اُنہیں کہا کہ یا تو ملک چھوڑ دیں یا پھر مقدمات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ مشرف صاحب نے ''اپنی مقبولیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے'' ملک چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا اِس لیے اب اُن پر آرٹیکل 6 کے تحت مقدمہ قائم کیا جا رہا ہے جو غیر آئینی اور غیر قانونی ہے۔ اُنہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ مشرف صاحب کے گھر کے سامنے ہر وقت 20 کیمرے اُن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بیتاب رہتے ہیں جو اُن کی مقبولیت کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ مجھے قصوری صاحب کی کہی گئی ایک ایک بات سے مکمل اتفاق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ بد باطن یہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی مشرف صاحب نے باہر جانے سے انکار کر دیا تھا تو پھر اُنہوں نے سندھ ہائی کورٹ میں یہ درخواست کیوں دائر کی کہ وہ اپنی والدہ سے ملنے کے لیے دبئی جانا چاہتے ہیں اِس لیے اُن کا نام ECL سے نکالا جائے۔ میرا خیال

بلکہ یقین ہے کہ یہ بھی ہمارے کمانڈو کے خلاف سازش ہے اور یہ درخواست یقیناً مشرف صاحب کے جعلی دستخطوں سے دائر کی گئی ہے کیونکہ ہمارا لیڈر ''ڈرتا، ورتا کسی سے نہیں'' ۔ویسے تو اِس جعلسازی پر از خود نوٹس تو بنتا ہے لیکن انتہائی محترم چیف صاحب آجکل انتہائی مصروف ہیں اِس لیے ہم اُنہیں تنگ نہیں کر سکتے ۔ہمیں یقین ہے کہ فوج اپنے سابقہ چیف کو تنہا نہیں چھوڑے گی اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں تو''بوٹوں'' کی کچھ کچھ آوازیں بھی سنائی دینے لگی ہیں لیکن اپنے شیخ رشید صاحب اندر سے ڈرے ، سہمے ہوئے لگتے ہیں کیونکہ اُن کے خیال میں ''فوج نے ستّو پیئے ہوئے ہیں''۔اگر واقعی ایسا ہے (فلسفیانہ سوچ رکھنے والے جنرل محترم اشفاق پرویز کیانی کی موجودگی میں تو یقیناً ایسا ہی ہے) تو پھر شیخ صاحب کی پریشانی بجا ہے کیونکہ جب ہمارے کمانڈو نے ایمرجنسی کا نفاذ کیا تو اُس وقت شیخ صاحب بھی وزیر باتدبیر تھے ۔اُنھوں نے تو بہت پہلے سے ایسے 881 افراد کی لِسٹ تیار کر رکھی ہے جن پر آرٹیکل 6 کے تحت مقدمہ درج ہو سکتا ہے اور اُس لسٹ میں اُن کا اپنا نامِ نامی اسمِ گرامی بھی موجود ہے۔ شیخ صاحب اِس لسٹ میں اپنا نام اوپر نیچے کرتے رہتے ہیں۔ شیخ صاحب کو یہ پریشانی بھی لاحق ہے کہ اُن کی پارٹی نے نیٹو سپلائی روکنے کے لیے تحریکِ انصاف کا ساتھ دینے کا اعلان کیا تھا۔اب اگر وہ بھی آرٹیکل 6 میں دھر لیے گئے تو نیٹو سپلائی کون روکے گا ؟۔یہ نیٹو سپلائی کا روکنا بھی ہم ''سونامیوں'' کی ''چھیڑ'' بن کے رہ گیا ہے۔کچھ بد

فطرت کہتے ہیں کہ پہلے خیبر پختونخواہ کی حکومت نے حکومتی سطح پر نیٹو سپلائی بند کرنے کا اعلان کیا پھر پتہ نہیں مَن میں کی آئی کہ نیٹو سپلائی کی بندش کو تحریکِ انصاف تک محدود کر دیا گیا۔ پہلے کہا گیا کہ 20 نومبر کے بعد کوئی کنٹینر گزرنے ہی نہیں دیا جائے گا پھر کہا کہ 20 نومبر کو ایک دن کا دھرنا دیا جائے گا اور اب 20 کی بجائے 23 نومبر ، کہ سانحۂ راولپنڈی ہو گیا ہے۔ مجھے کسی نے کہا کہ سونامیوں کو شکر کرنا چاہیے کہ اُن کے کپتان صاحب نے یہ نہیں کہہ دیا کہ سعودی عرب میں چونکہ چار حاجی وفات پا گئے ہیں اِس لیے دھرنا کینسل۔ میرا جی تو چاہا کہ اُس کا مُنہ توڑ دوں لیکن پھر سوچا کہ ٹویٹر پر اُس کو جواب دوں گی۔ اُس احمق کو کون سمجھائے کہ دھرنے کے لیے تو سارے بندے ہم نے پنڈی ، لاہور سے لے کر جانے تھے۔ اب اگر پنڈی میں حالات خراب ہو گئے ہیں تو دھرنا کیا اُس کا باپ دے گا؟۔ ایک بد باطن نے مجھے ایک لطیفہ سنایا جسے سُن کر پہلے تو میں لطف اندوز ہوتی رہی لیکن آخر میں اُس نے محترم جاوید چوہدری صاحب کے کالموں کی طرح جو نتیجہ نکالا اُس نے مجھے آگ بگولا کر دیا۔ اُس نے کہا کہ ایک زمیندار کے گھر میں ایک میراثی آیا۔ زمیندار نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اپنی بیوی سے کہا کہ کل جو بکرے کا گوشت آیا تھا وہ جلدی سے پکا دے۔ بیوی نے کہا کہ وہ گوشت تو ختم ہو چکا ہے۔ زمیندار نے کہا ''اچھا تو مرغ پکا دو'' ۔ بیوی نے کہا ''اب اندھیرا ہو چکا ہے ، مرغ کہاں سے آئے گا؟''۔ زمیندار نے کہا ''مہمان کو بھوک لگی ہے

چلو دال ہی پکا دو''۔ بیوی بولی ''گھر میں تو دال بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی تین چار گھنٹے بھگوئے بغیر دال پکتی نہیں''۔ زمیندار نے کہا ''اچھا تو پیاز میں نمک مرچ ڈال کر پیس لو لیکن جلدی کرو''۔ میراثی جو پاس بیٹھا سب کچھ سُن رہا تھا اچانک بول اُٹھا ''جیہڑا ایس توں ٹکرے او کافر ہو کے مرے''۔ اُس واقف کار نے لطیفہ سنانے کے بعد کہا ''اپنے کپتان صاحب کو کہنا کہ اب 23 نومبر سے نہ ٹکرے''۔

کچھ اپنی زباں میں

ہم اُس دیس کے باسی ہیں جہاں امن کی گنگا نہیں ، آگ و خون کے دریا بہتے ہیں ۔جہاں اذہان و قلوب کی کھیتیوں میں اخوت و محبت کی بجائے نفرتوں کے بیج ، بارود کی کھاد اور خون کی آبیاری کی جاتی ہے ۔جہاں زور آوروں کے ٹکڑے جنم لیتے ہی مقہوروں کے گرد جبر و قہر کے جال بنا شروع کر دیتے ہیں ۔جہاں ایک گروہ نسل در نسل آقا باقی سب غلام کہ ذلالت ، رذالت اور درد کی گرانی اُن کی وراثت ٹھہری ۔ جہاں اُن کے درِ دولت پر بھی سجدۂ عجز و نیاز کرنا پڑتا ہے جن میں تمیزِ فہم کا شائبہ تک نہیں ۔ جہاں دھرتی کی بے دَم ماتا کو اشرافیہ کا آسیب کسی روگ کی طرح چمٹ گیا ہے ۔ جہاں آہوانِ تشنہ لَب درندوں کی غراہٹیں سننے کے باوجود گھاٹ کی جانب محض اِس لیے رواں دواں ہیں کہ اُنہیں اِس کے سوا کوئی راہ دکھائی دیتی ہے نہ سجھائی۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے ''لوگوں میں سب سے برا وہ ہے جس کی تعظیم اُس کے شَر کے خوف سے کی جائے''۔ لیکن ہم منصورِ حقیقت نہیں کہ سچ کی سولی پہ چڑھ جائیں یا سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پی لیں ۔ہمارا سچ تو اُس ناجائز بچے کی مانند ہے جسے تہمتوں کے خوف سے چھپایا جاتا ہے اور خود ہمارے فہم و ادراک کی یہ حالت ہے کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اِک راہرو کے ساتھ
پہنچانتا نہیں ہوں ابھی رہبر کو میں

بوکھلائی ہوئی قوم کبھی نواز لیگ کی طرف دوڑتی ہے تو کبھی پیپلز پارٹی کی طرف۔ کبھی اپنی آرزوؤں کا محور تحریکِ انصاف کو بناتی ہے تو کبھی اُس کی آنکھ دینی جماعتوں پہ جا ٹھہرتی ہے لیکن گوہرِ مقصود کہیں ہاتھ نہیں آتا کہ اپنی فطرت میں سب ایک ہیں۔ ہم نے بندگی کا ہر انداز اختیار کرکے دیکھ لیا لیکن شاید یہ نمرود کی خُدائی ہے جہاں بندگی میں بھی بھلا نہیں ہوتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ جب ہم مشتِ خاک تو نشۂ نخوت سے کوسوں دور ہیں پھر بھی ہماری دعائیں بے اثر کیوں ہیں؟۔ شاید ہمیں ادراک ہی نہیں کہ حکمت کی کتاب میں تو درج کر دیا گیا ہے کہ خُدا اُتنی دیر تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلتا جتنی دیر تک اُسے خود اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو۔ اور یہ بھی مسلمہ سچائی ہے کہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

لاریب اکثریت پر اقلیت کی جابرانہ حکمرانی کا سبب یہ ہے کہ ہم خود بھی مختلف مذہبی، لسانی اور سیاسی گروہوں میں بَٹ چکے ہیں۔ابنِ خلدون نے کہا ”جہاں قبیلے بکثرت اور اہلِ عصبیت کی بہتات ہو وہاں سلطنت کو کبھی کامل

استحکام نصیب نہیں ہوتا''۔ہم قبیلوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی وہ قوم ہیں جس میں منافرت و عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ربِّ کریم کا تو انسان کو اپنی نیابت عطا کرتے ہوئے درسِ اوّل ہی یہی تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے لیکن ہمیں رب کی نیابت (نعوذ باللہ) راس نہیں آئی اِس لیے ابلیس کی نیابت اختیار کر لی۔ہم مسلم تو کہلاتے ہیں لیکن وادیٔ عمل میں قدم رنجہ فرمانے کی زحمت ہی نہیں کرتے۔ میرے آقا ﷺ کا فرمان ہے ''مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا کیونکہ اِس میں صراطِ مستقیم پر چلنے کا حکم ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے''۔لیکن بزعمِ خویش پیرویٔ رسول ﷺ کا دعویٰ کرنے اور اپنے آپ کو دین کا ٹھیکیدار کہلانے والے'' علمائے سُو'' کا یہ عالم ہے کہ وہ بال سے باریک صراطِ مستقیم پر چلنے کی بجائے ابلیس کے کھلے راستے پر چلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ہم تو عامی ہیں کہ جن کا دینی علم مساجد اور امام بارگاہوں تک محدود ہے۔ ہمارے پاس تو اتنا وقت ہی نہیں کہ حکمت کی اُس عظیم الشان کتاب کا مطالعہ کر لیں کہ جس کے ایک ایک حرف کا حساب دینا ہے۔ہمیں تو جو کچھ مسجدوں اور امام بارگاہوں سے ملتا ہے اُسی کو دین میں سمجھ لیتے ہیں ۔اِس لیے بِلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ شیعہ سُنّی فساد کا الزام ہم پہ نہیں دھرا جا سکتا اور تحقیق کہ مذہبی منافرت کو ہوا دینے والے شَر پسند ہی ابلیسیت کے علمبردار ہیں جن کے اپنے اپنے شہید ہیں اور اپنے اپنے غازی۔

لسانی اور مذہبی فرقوں اور گروہوں میں بٹی قوم پر اب طالبان کی صورت میں ایک اور عذاب نازل ہوگیا ہے۔ بجائے اِس کے کہ رہبرانِ قوم یکسو ہوتے اور علماء ایک نقطے پر اکٹھے ہوجاتے۔ اب یہ بحث چھِڑ گئی ہے کہ کون شہید ہے اور کون ہلاکا؟۔اِس بحث کا ہوا دینے والے محترم لکھاری

کہتے ہیں ''میرے نزدیک یہ بحث بہت ضروری ہے آج نہیں تو کل ہمیں یہ بحث کرنی ہو گی''۔ محترم لکھاری کا لکھا سَر آنکھوں پر لیکن پہلے یہ تو طے کرلیں کہ جنگِ جمل میں کون شہید تھا اور کون ہلاک۔کیا محترم لکھاری اِس بارے میں کوئی فتویٰ صادر فرمانے کی زحمت کریں گے ؟۔ سوال یہ بھی ہے کہ یہ کون طے کرے گا کہ شہید کون ہے اور ہلاک کون ؟۔کیا علماء کرام جو خود گروہوں میں بٹے ہیں ؟۔ کچھ طالبان کو دہشت گرد قرار دیتے ہیں اور کچھ جہادی۔ کچھ طاقت کے استعمال سے فتنے کا خاتمہ چاہتے ہیں تو کچھ کے نزدیک طالبان پچاس ہزار کیا پچاس لاکھ بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے باوجود بھی جہادی ہی رہیں گے۔اِس لیے اِس ''شہید اور ہلاک'' کی بحث کو چھیڑنا شَر کو ہوا دینے کے سوا کچھ نہیں۔مذاکرات کے حامی اصحاب سے سوال ہے کہ مذاکرات کس سے کریں؟ کیا مُلا فضل اللہ سے جو افغان حکومت کی پناہ میں ہے اور افغان حکومت امریکہ کی پناہ میں۔ کیا امریکی ڈرون ''کنڑ'' کا راستہ بھول گئے ہیں جہاں مُلا فضل اللہ برا جمان ہے ؟۔ یا اُسے محض اِس لئے نشانہ نہیں بنایا جاتا کہ امریکہ کو یقین

ہے کہ اُس کی موجودگی میں مذاکرات کی بیل منڈھے نہیں چڑھے گی نہ امریکہ چڑھنے دے گا کہ اُسے خوب ادراک ہے کہ ہم غیرت و حمیت کے کس مقام پر ہیں۔ ابھی کل ہی ہمارے مشیرِ خارجہ جناب سرتاج عزیز سینہ تان کر یہ کہہ رہے تھے کہ امریکہ نے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ مذاکرات کے دوران ڈرون حملہ نہیں کرے گا لیکن آج ڈرون حملہ کرکے اُس نے پتہ نہیں کس کی غیرت کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔

امن کی راہ اپنانے میں ہی حکمت ہے کہ میرا دین تو ہے ہی امن کا علمبردار لیکن تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے جب کہ ہمارے حکمران ایک ہاتھ سے بجانے کی سعیٔ بیکار کر رہے ہیں۔ طالبان حکمرانوں کو حکیم اللہ محسود کا قاتل سمجھتے ہیں اور اُن کے خیال میں وزیرِ اعظم کے دورۂ امریکہ کے موقعے پر حکیم اللہ محسود کے قتل کی سازش تیار کی گئی۔ جب کہ ہمارے حکمران ہر روز وضاحتوں کا دفتر کھول بیٹھتے ہیں۔ طالبان متواتر مذاکرات سے انکاری ہیں جبکہ حکمرانوں کی لجاجت اب بھی مذاکرات کی رَٹ لگاتی نظر آتی ہے۔ چلو مان لیا کہ ہم ''عالمی غنڈے'' سے مقابلے کی سکت نہیں رکھتے لیکن اگر چند ہزار طالبان کے خوف سے بھی حکومت سہمی سکڑی بیٹھی ہے تو پھر کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم حقِ حکمرانی طالبان کو تفویض کرکے خود بے غیرتی و بے حمیتی کی چادر اوڑھ کر سو جائیں۔

ڈر کاہے کا۔۔۔؟

معطل RPO زعیم قادری صاحب نے سانحہ راولپنڈی کی فیکٹ فائنڈنگ کمیٹی کو بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ راجہ بازار میں فائرنگ کے دوران اُن کے سکوارڈ کے لوگوں نے اُنہیں ایک گلی میں چھپا دیا اور خود ''موقع واردات'' سے فرار ہو گئے۔ بھئی جان تو سبھی کو پیاری ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ محافظ اپنے ''باس'' کو اکیلے چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہوں اِس لیے پہلے اُنھوں نے باس کو ''نکرے'' لگایا اور پھر یہ جا، وہ جا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ RPO صاحب نے اکیلے رہ جانے پر یہ ضرور گنگناتے رہے ہونگے کہ

کَلی کَلی جان ، دُکھ لکھ تے کروڑ وے

دُور جان والیا، مہاراں ہُن موڑ وے

یہ ابھی تک صیغۂ راز میں ہے کہ RPO صاحب گلی میں کس جگہ چھُپے۔ کیا وہ زمین پر اوندھے لیٹ گئے یا کسی گٹر کا ڈھکنا اُٹھا کر اندر داخل ہو گئے؟۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ''رعبِ تھانیداری'' میں اُنھوں نے کئی گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے ہوں لیکن کسی نے دروازہ کھولنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی ہو کیونکہ

آجکل لوگ پولیس سے کم کم ہی ڈرتے ہیں۔ویسے بھی آجکل قدم قدم پہ اتنے مقاماتِ خوف" درپیش ہیں کہ ہم نے "خوف" سے دوستی کر لی ہے۔سچ کہا تھا" غالب نے کہ

رنج سے خُوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مُجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

اب ہم اُن چیزوں سے نہیں ڈرتے جن سے ہمارے بزرگ ڈرا کرتے تھے کیونکہ ہمارے ڈر کی نوعیت بدل چکی ہے مثلاَ ہمیں ڈرانے کے لیے تو گلی کی نکڑ پہ بیٹھا سبزی فروش ہی کافی ہے جو شکل سے ہی دہشت گرد لگتا ہے اور اب تو وہ ایسا "ڈان" بن گیا ہے جس کے ہاں موجود ہر سبزی ہماری پہنچ سے باہر ہوتی ہے۔جب ہم سبزی خریدنے میں ناکام رہتے ہیں تو یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کتنا خوش نصیب ہے یہ ڈان جو اتنی ڈھیروں ڈھیر "انمول دولت" کے عین وسط میں کسی ناگ کی طرح پھَن پھیلائے بیٹھا ہے ۔ایک بار تو ہم نے بھی سوچا کہ ہم اپنے میاں سے کہیں کہ وہ جو سارا دِن گھر میں پڑے اینٹھتے رہتے ہیں، کم از کم سبزی کی دوکان ہی کھول لیں لیکن ہمیں بھی وہی مسئلہ فیثاغورث" درپیش ہے جس میں ہمارے حکمران اُلجھے ہوئے ہیں۔حکمرانوں کو امریکہ" کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا بہت شوق ہے اور ہمیں اپنے میاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔لیکن بلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟۔ویسے آپس کی بات تو یہ ہے کہ

آجکل ہم دُنیا کی کسی اور شے سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا ''ٹماٹروں'' سے ڈرتے ہیں۔یہ ٹماٹر شاید اللہ تعالیٰ نے بنائے ہی ڈرانے کے لیے ہیں۔پہلے اِن سے صرف سیاست دان ڈرتے تھے اب پوری قوم ڈرنے لگی ہے۔ہمارے انتہائی محترم چیف جسٹس صاحب نے بھی ''عالمِ خوف'' میں فرمایا کہ جس ملک میں ایک کلو ٹماٹروں اور ایک کلو مُرغی کے گوشت کی قیمت برابر ہو اُس ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔ہمارے بھولے چیف صاحب اپنی ''آئینی'' عینک سے اب بھی اُس زمانے کو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں جب لوگ رقیبوں پر ٹماٹروں اور گندے انڈوں کی بارش کیا کرتے تھے۔وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ چیف صاحب کو سبزی خریدنے کا سرے سے کوئی تجربہ ہی نہیں کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ اپنی جھنڈے والی بُلٹ پروف گاڑی میں بیٹھ کر حفاظتی حصار میں سبزی خریدنے نکل پڑیں۔اُنہیں تو کسی نے ٹماٹروں کی قیمت بتائی ہو گی جس پر اُنھوں نے ''از خود نوٹس'' لے لیا (ہمارے نزدیک چیف صاحب کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ از خود نوٹس ہی ہوتا ہے)۔حقیقت تو یہ ہے کہ آجکل تو ہر سبزی پکار پکار کر چیف صاحب کو از خود نوٹس لینے کی دہائی دے رہی ہے اور ٹماٹروں کو تو ہم اپنی امارت کا ''رعب شُوب'' ڈالنے کے لیے ایسی نمایاں جگہ پہ رکھتے ہیں جہاں ہر کسی کی نظر پڑے۔رہی انڈوں کی بات تو اگر کوئی انڈہ گندا نکل آئے تو پورا گھر پریشان ہو کر یہ عقدہ وا کرنے میں جُت جاتا ہے کہ آخر مُرغی نے گندا انڈہ کیوں، کیسے اور کِس سازش کے تحت دیا؟۔جدید ترین تحقیق کے مطابق اِس میں مُرغیوں کا قصور نہیں پایا گیا

وہ تو سارے انڈے صاف شفاف اور اُجلے اُجلے ہی دیتی ہیں لیکن کچھ انڈے ہوتے ہی گندے ہیں جن کے بارے میں حضرتِ اقبالؒ نے بھی کہا تھا کہ

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

ہمیں اقبالؒ کی ساری شاعری اور فلسفہ و تفلسف میں صرف اِس شعر سے اختلاف ہے کیونکہ یہاں گندے انڈوں کی اتنی بہتات ہے کہ اگر اُنہیں اٹھا کر گلیوں میں پھینکنا شروع کر دیا گیا تو اِس سے تعفن کا وہ سونامی اُٹھے گا کہ باقی ''کچھ'' نہیں بچے گا۔

سونامی سے یاد آیا کہ ہمارے انتہائی محترم عمران خاں صاحب ''کی سونامی'' 23 نومبر کو اپنے لاکھوں عاشقان کے جَلو میں چھَم چھَم کرتی نیٹو سپلائی روکنے جا رہی ہے۔بخُدا ہمیں آج پہلی بار اُس سونامی پر پیار آ رہا ہے جس میں غیرت و حمیّت کوٹ کوٹ کر بھری ہے وگرنہ ہم تو یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ ''حمیّت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے''۔ غیرت و حمیّت ہر مسلمان کا زیور ہے اور میرے آقا ﷺ کا فرمان ہے ''اللہ غیرت مند ہے اور غیرت مندوں کو دوست رکھتا ہے''۔اگر امریکہ سے ترقیاتی کاموں کے لیے پچاس ملین ڈالر لینے کے بعد بھی کپتان صاحب میں یہ ہمت ہے کہ وہ نیٹو سپلائی روک کر امریکہ کو

ناراض کر سکیں تو بسم اللہ ہم اُن کے ساتھ ہیں ۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا ایک آدھ دن کے علامتی دھرنے سے ''عالمی غُنڈہ'' سیدھا ہو جائے گا؟۔ عمران خاں صاحب نے تو ایک اینکر کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ خیبر پختونخواہ کی صوبائی کابینہ کا اجلاس طلب کر لیا گیا ہے جو مستقل بنیادوں پر نیٹو سپلائی روکنے کا فیصلہ کرے گی ۔ کابینہ کا اجلاس ہوا اور ''دیکھنے ہم بھی گئے پہ تماشہ نہ ہوا''۔ کابینہ کے اجلاس میں ایسے کسی فیصلے کا دور دور تک نام و نشاں ہی نہ تھا۔ اِس اجلاس پر سب سے خوبصورت تبصرہ جمیعت علمائے اسلام کے حافظ حمد اللہ کا تھا جنہوں نے کہا ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا، وہ بھی دُم کٹا''۔ پتہ نہیں یہ صوبائی کابینہ کی خاں صاحب سے بغاوت ہے یا تحریکِ انصاف کی مصلحت۔ اگر یہ محض کابینہ کی بغاوت ہے تو دِل سے دُعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ محترم عمران خاں کو استقامت بخشے اور اُنہیں طاغوت کے خلاف اِس جہاد میں کامران کرے اور اگر یہ مصلحت ہے تو ''سونامیوں'' کو مبارک ہو کہ اب کپتان صاحب بھی سیاست دان بنتے جا رہے ہیں۔

پاکستان میں ''شریفوں'' کی حکمرانی

میں جب بھی گھریلو ذمہ داریوں سے فرصت پا کر کالم لکھنے بیٹھتی ہوں ، میرے میاں خاموشی سے باہر کھسک لیتے ہیں۔عمر کے اِس حصّے میں اُن سے ''ایسا ویسا'' کوئی خطرہ تو بہر حال نہیں لیکن پھر بھی مردوں کا کیا اعتبار اس لیے اُن کی جاسوسی کرنے پر پتہ چلا کہ وہ ایک ہوٹل پر بیٹھتے ہیں ۔شریف نامی ہوٹل کے مالک کی ہوٹلوں کی چین ہے اور چونکہ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اِس لیے اُن کا ہوٹل سیاستدانوں کا ''پاک ٹی ہاؤس'' بنا رہتا ہے جہاں میرے میاں گھنٹوں بلکہ پہروں براجمان رہتے ہیں ۔ میاں نواز شریف صاحب چونکہ آجکل ''شریفوں'' پر بہت مہربان ہیں اِس لیے اگر وہ کمال مہربانی فرماتے ہوئے''ہمارے شریف صاحب'' کو کوئی حکومتی عہدہ عنایت فرما دیں تو میرے میاں مجھے بحفاظت واپس مل سکتے ہیں۔

میاں نواز شریف صاحب نے جب سے حکومت میں ایک اور''شریف'' کا اضافہ کرتے ہوئے لیفٹیننٹ جنرل راحیل شریف کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا ہے، ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اب پاکستان میں ''شریفوں'' کی حکومت ہے جس کا یہ نعرہ ہے کہ ''شرافت'' ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں ۔اِس لیے ڈرون حملوں پر

ہلکا پھلکا احتجاج ہی کافی ہے اور جس حکومت کے پاس ''شرافت'' جیسا انمول خزانہ ہو وہاں کھانے پینے جیسی فضولیات کی عدم دستیابی پر احتجاج کرنا صریحاً غیر آئینی ہے اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کسی بھی غیر آئینی حرکت پر آرٹیکل 6 لاگو ہوتا ہے جس کی سزا پرویز مشرف صاحب سے پوچھ لیں ۔بڑے میاں صاحب بیشک پاکستان کے سارے شریفوں'' کو شاملِ اقتدار کر لیں لیکن شریف الدین پیرزادہ سے ذرا دُور دُور ہی'' رہیں کیونکہ اُن کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔

وزیرِ اعظم صاحب نے ایک ہی دن میں چیف آف آرمی سٹاف، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی اور چیف جسٹس صاحب کی تقرری کا اعلان کر دیا۔ ویسے تو خواجہ آصف صاحب کو وزیرِ دفاع اور جنابِ پرویز رشید کو وزیرِ قانون و پارلیمانی امور کا اضافی چارج بھی اُسی دن دیا گیا لیکن یہ اضافی ذمہ داری محترم چیف جسٹس کی مہربانی سے ملی۔ چیف صاحب نے مسنگ پرسنز کے معاملے پر تاؤ کھاتے ہوئے وزیرِ دفاع کو طلب کر لیا جس کا چارج بھی جنابِ وزیرِ اعظم کے پاس تھا اِس لیے انہوں نے انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خواجہ محمد آصف صاحب کو وزیرِ دفاع مقرر کرتے ہوئے کہا کہ '' چڑھ جا بیٹا سولی رام بھلی کرے گا''۔ شنید ہے کہ اِس تقرری پر جب خواجہ آصف صاحب نے لیت و لعل سے کام لیا تو میاں صاحب نے اُنہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ فکر نہ کریں سپریم کورٹ

کے اِس بنچ میں ایک اور خواجہ صاحب بھی موجود ہیں جو یقیناً ''ہتھ ہولا'' رکھیں گے ۔اب اُنھوں نے سپریم کورٹ میں حاضر ہو کر یہ ذمہ داری لے لی ہے کہ 10 دسمبر تک ''مسنگ پرسنز'' کو پیش کر دیا جائے گا۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہونگے کہ 10 دسمبر کے بعد'' جلالی'' افتخار محمد چوہدری صاحب تو ہونگے نہیں اور'' جمالی'' چیف جسٹس جناب تصدق حسین جیلانی کو کوئی نہ کوئی چکر چلا کر ''رام'' کر ہی لیا جائے گا لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ اب سپریم کورٹ کا ہر معزز جج افتخار محمد چوہدری ہی بننا پسند کرتا ہے اور جنابِ جسٹس جواد ایس خواجہ نے تو چیف صاحب کو ''ولی اللہ'' بھی مان لیا ہے کیونکہ چیف صاحب نے جسٹس جواد خواجہ کو ایک دن پہلے ہی بتلا دیا تھا کہ اب وزیرِ اعظم لازماً وزیرِ دفاع مقرر کر دیں گے ۔ میاں صاحب نے جنابِ پرویز رشید کو محض حفظِ ما تقدم کے طور پر قانون و پارلیمانی امور کا اضافی چارج دیا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہمارے چیف صاحب کا جلال اپنی ملازمت کے آخری ہفتے میں بڑے بڑوں کو ''بھسم'' کرنے کے درپے ہے اِس لیے وہ کسی وقت بھی وزیرِ قانون کو بھی طلب کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف جنابِ پرویز رشید نے یہ بوجھ محض اِس لیے اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا لیا کہ ''ہنوز دِلّی دور است''۔اُمیدِ واثق ہے کہ جونہی جنابِ جسٹس تصدق جیلانی چیف جسٹس آف پاکستان کا عہدہ سنبھالیں گے ، میاں صاحب ایک دفعہ پھر وزیرِ اعظم ، وزیرِ خارجہ ، وزیرِ دفاع اور وزیرِ قانون و پارلیمانی امور بن جائیں گے ۔اِس کے باوجود بھی اگر اُن کا نام گینز

بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج نہیں ہوتا تو یقیناً اِس کے پیچھے بھی امریکہ کی ہی شرارت ہو گی جس پر ہم اور تو کچھ کر نہیں سکتے البتہ ''شدید احتجاج'' ضرور کریں گے اور بڑے میاں صاحب سے دست بستہ استدعا کریں گے کہ وہ غم غلط کرنے کے لیے ایک دفعہ پھر غیر ملکی دوروں پر نکل جائیں۔

جنابِ آصف زرداری کی طرح اِس بار میاں صاحب نے بھی ''کھبی'' دکھا کر ''سجّی'' ماری ۔وہ کہتے تو یہی رہے کہ اِس دفعہ سینئر موسٹ جرنیل ہی چیف آف آرمی سٹاف بنے گا لیکن سینئر موسٹ جنرل ہارون اسلم کو اعتبار نہ آیا۔یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے پیر''صاحب سے ''چِلّہ'' بھی کروایا لیکن شاید اُن کا پیر ''ماٹھا'' تھا اِس لیے ''چِلّہ'''' اُلٹا پڑ گیا اور جنابِ ہارون اسلم کو مستعفی ہو کر گھر سدھارے ۔شنید ہے کہ ہمارے تجزیہ نگار بھی آجکل غصّے سے کھول رہے ہیں اور ''چڑیا'' والے صاحب نے تو اپنی چڑیا کی گردن ہی مروڑ دی ہے جس نے غلط اطلاع دے کر اُنہیں شرمندہ کر دیا۔ تجزیہ نگاروں کو میاں صاحب پر تاؤ آنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے لیکن میاں صاحب نے ایک دفعہ پھر جنرل عبدالوحید کاکڑ اور جنرل پرویز مشرف کی طرح سنیارٹی میں تیسرے نمبر پر آنے والے جرنیل کو چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا۔شاید میاں صاحب کو تین کا ہندسہ بہت پسند ہے ۔اُمید واثق ہے کہ جنرل راحیل شریف ملک و قوم کے لیے بہتر انتخاب ثابت ہونگے کیونکہ اُن کا تعلق

اُس فوجی گھرانے سے ہے جس کی قربانیاں لازوال ہیں ۔ وہ میجر شبیر شریف شہید نشانِ حیدر کے چھوٹے بھائی اور میجر عزیز بھٹی شہید نشانِ حیدر کے رشتے میں بھانجے ہیں ۔شُہداء کے خاندان کا یہ سپوت انشاء اللہ وہی کرے گا جو ملک و قوم کے لیے بہتر ہو گا ۔کچھ لوگ محض شَر کو ہوا دینے کے لیے کہہ رہے ہیں کہ جناب راحیل شریف آمر مشرف کے بہت قریب تھے اِس لیے وہ پرویز مشرف پر دائر کردہ مقدمے کو پسند نہیں کریں گے ۔ یہ محض شَر پسندی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جنرل راحیل شریف صاحب اپنے آپ کو اِس کیس سے الگ ہی رکھیں گے ۔

اِدھر میاں صاحب دھڑا دھڑ تقریروں میں مصروف ہیں، تو اُدھر جناب عمران خاں نیٹو سپلائی روک کر اپنا سیاسی قد اونچا کرنے کی تگ و دَو میں ہیں۔ تحریکِ انصاف نے نامعلوم افراد کے خلاف ڈرون حملے کی FIR درج کروا دی ۔ آفرین ہے خیبر پختونخواہ کی پولیس پر جس نے دو تین دنوں میں ہی تفتیش کر کے مجرمان کا سراغ لگا کر قوم کو بتلا دیا کہ ڈرون حملے امریکہ اور CIA کرواتے ہیں۔اب FIR میں اُن کا نام درج کر دیا گیا ہے اور دروغ بَر گردنِ راوی ملزمان کی گرفتاری کے لیے انٹرپول کو بھی آگاہ کر دیا گیا ہے ۔ایک دفعہ پھر دروغ بَر گردنِ راوی امریکی صدر بارک اوباما مفرور ہیں اور CIA چیف بھی وائٹ ہاؤس پر انٹرپول کے کئی چھاپوں کے باوجود ہاتھ نہیں آئے ۔ تاحال مفقود الخبر ہے لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی آخر چھُری تلے تو آنا ہی ہے۔

الوداع جنرل پرویز کیانی، خوش آمدید جنرل راحیل شریف

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

اعلیٰ عسکری تربیت سے لیس، عظیم مفکر ارسطو سے ذہنی تربیت اور ہومر کی شاعری سے بصیرت حاصل کرنے والے سکندرِ اعظم نے اپنی گیارہ سالہ عسکری زندگی میں کبھی شکست کا منہ نہ دیکھا۔ وہ ہمیشہ اپنی فوج کی کمان خود کرتا اور کبھی اپنے فوجیوں کو ایسا خطرہ مول لینے کے لیے نہ کہتا جس سے وہ خود نہ گزر سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جنگجو سکندر کئی مرتبہ زخمی بھی ہوا۔ جب سکندر کی فتوحات کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا تو ایرانی شہنشاہ نے اُسے پیغام بھیجا کہ وہ اپنی نصف سلطنت کے عوض اُس سے امن معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔ تب سکندر کے قریبی دوست اور سالار ''پارمینیو'' نے کہا ''اگر میں سکندر ہوتا تو یہ پیشکش فوراً قبول کر لیتا''۔ سکندر نے مسکرا کر کہا ''ہاں میں بھی قبول کر لیتا، اگر میں پارمینیو ہوتا''۔ ہمارے سپہ سالار، گہرے مطالعے کے شوقین، سیاسی بصارت کے حامل اور فلسفیانہ سوچ رکھنے، اگلے مورچوں پر بار بار جانے اور شہداء سے والہانہ محبت رکھنے والے محترم جنرل اشفاق پرویز کیانی اگر چاہتے تو پیپلز پارٹی کے بدترین دَورِ حکومت میں کسی بھی وقت جمہوریت کی بساط لپیٹ سکتے تھے لیکن لوگ چھ سال تک انتظار ہی کرتے رہے اور

جنابِ شیخ رشید نے تو مایوس ہو کر کہنا شروع کر دیا کہ ''فوج ستو پی کر سوئی ہوئی ہے'' ۔جنرل کیانی بھی یقیناً جمہوریت کی بساط لپیٹ دیتے اگر وہ شیخ رشید ہوتے۔
پیپلز پارٹی کی بدترین جمہوری آمریت میں کالم نویسوں نے کالموں کی بھرمار کر دی، تجزیہ نگار پوری قطعیت کے ساتھ حکومت کے خاتمے کی تاریخ پہ تاریخ دیتے چلے گئے اور میموگیٹ سکینڈل کے بعد تو جنابِ آصف زرداری نے بھی ایوانِ صدر میں کئی راتیں اِس خوف کے تحت جاگ کر گزار دیں کہ نہ جانے کب فوجی بوٹوں کی گونج سے ایوانِ صدر کی راہداریاں گونج اُٹھیں لیکن ''آرمی ہاؤس'' میں گھمبیر خاموشی ہی طاری رہی ۔یہ بجا کہ اب بھی آسمان کی وسعتوں کو چھوتی مہنگائی، بدامنی، دہشت گردی، خود کش حملے اور بم دھماکے جاری ہیں اور حکمرانوں کے پاس قوم کو دینے کے لیے بھوک ننگ کی ''سوغات'' کے سوا کچھ بھی نہیں، پھر بھی فضائے بسیط میں اُمیدوں کے دیئے ٹمٹمانے لگے ہیں اور برملا کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی یہ ساتویں بڑی طاقت خراماں خراماں جمہوریت کے زینے طے کرتی جا رہی ہے ۔یقیناً اذہان و قلوب کو بتدریج مسخر کرنے والے اِس جمہوری انقلاب کا سہرا جنابِ جنرل اشفاق پرویز کیانی کے سَر ہے جنھوں نے جمہوریت کی مضبوطی کو اپنا نصب العین بنا لیا۔یہ جنرل صاحب کا جمہوریت سے لگاؤ ہی تھا جو قوم کو 2013ء کے انتخابات تک لے گیا اور خائنوں، بد

دیانتوں اور کرپشن کے مگر مچھوں کو تاریخ کے کوڑے دان میں پھینکنے کا سبب بنا۔ فوج پر تنقید ہمیشہ لکھاریوں کے لیے شجرِ ممنوعہ رہی لیکن کیانی صاحب کے دَور میں لکھاریوں نے افواج پاکستان اور ایجنسیوں کے خلاف خوب قلم گھسیٹے۔ دراز ہوتی زبانوں سے متواتر نکلنے لگا کہ اگر فوج نے اقتدار سنبھالا تو قوم، میڈیا، وکلاء اور سول سوسائٹی سڑکوں پر نکل آئے گی۔ انہی دنوں میں نے اپنے ایک کالم میں عرض کیا تھا کہ فوج کے آنے پر اُسے بہت سے حواری سیاستدان بھی مل جائیں گے اور دس بار وردی میں منتخب کروانے والے بھی لیکن جنرل صاحب اِس سے بدتر حالات میں بھی جمہوریت کی بساط لپیٹنے کو تیار نہیں ہونگے کیونکہ جو جمہوریت کو ماں بن کر جوان کرنے کی تگ و دو میں ہو وہ اپنے ہاتھوں سے اُس کا گلا کیسے گھونٹ سکتا ہے۔ آج وقت نے ثابت کر دیا کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی صاحب نے جو کچھ کہا اُسے سچ کر دکھایا۔

ہمارے کچھ لکھاری اور تجزیہ نگار یہ سمجھتے ہیں کہ طرح طرح کی موشگافیاں کرکے ہی اُن کا صحافتی قد اونچا ہو سکتا ہے۔ اُن کی سوچ اور اپروچ ہمیشہ منفی ہی رہتی ہے اور وہ قوم کے اندر مایوسی پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایسے ہی ایک صاف صاف لکھنے والے لکھاری کا کالم پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خارجہ، داخلہ، دفاع اور دیگر امورِ مملکت افواج پاکستان ہی کے ذمے ہیں۔ وہ فرماتے کہ جنرل راحیل شریف کو کئی چیلنج درپیش ہیں۔ پہلا

چیلنج نواز شریف سے تعلقات ہے کیونکہ ”تاریخ کا سبق یہی ہے کہ فوجی سربراہوں کے ساتھ میاں نواز شریف کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے“۔اگر موصوف تعلقات کی اِس ناخوشگواری کے اسباب بھی بیان کر دیتے تو قوم اُن کی ممنون ہوتی۔ویسے موصوف یہ تو جانتے ہی ہونگے کہ آئینی تقاضوں اور اپنے حلف کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ایک آرمی چیف حکومتِ وقت کو عسکری معاملات میں رائے تو دے سکتا ہے، مجبور نہیں کر سکتا اور جمہوری تقاضہ بھی یہی ہے کہ آرمی چیف حکومتِ وقت کے احکامات کی بجا آوری کرے۔ دوسرا چیلنج دہشت گردی اور انتہا پسندی سے نپٹنا ہے،فوج کی قُربانیوں کا اعتراف نہیں کیا جارہا اور اِس معاملے میں قوم بدترین کنفیوژن کا شکار ہے۔ویسے اگر طبع نازک پہ گراں نہ گزرے تو اِس کنفیوژن کو پیدا کرنے اور پھر اُس کو ہوا دینے والے بھی موصوف خود ہی ہیں۔ موصوف کہتے ہیں کہ ہندوستان سے کشیدگی اور امریکہ افغانستان کے ساتھ پیچیدہ تعلقات کے بارے میں فوج اور سول قیادت کی سوچ میں ہم آہنگی نہیں، بعد المشرقین ہے۔ عدلیہ اور میڈیا کی فعالیت کی بنا پر فوج اور میڈیا میں چپقلش ہے۔مشرف کا مقدمہ اور مسنگ پرسنز تناؤ کا موجب ہیں اور پارلیمنٹ اپنی بالا دستی کی کوشش میں عسکری اداروں کے روایتی کردار کو محدود کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔محترم لکھاری نے جن چیلنجز کا ذکر کیا ہے اُن سے نپٹنا حکومتِ وقت کا کام ہوتا ہے فوج کا نہیں اور اگر یہ سب کچھ فوج نے ہی کرنا ہے تو پھر اِس جمہوری حکومت پر اربوں روپے ضائع کرنے کی کیا

ضرورت ہے ؟۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ موصوف شاید ذہنی طور پر صرف مارشل لاء کو ہی پسند کرتے ہی اُنھوں نے لسانی تعصب کو ہوا دینے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ چونکہ جنرل راحیل ''شریف'' بھی ہیں اور لاہوری بھی اِس لیے شریف برادران کا حسنِ انتخاب ٹھہرے۔ محترم دور کی کوڑی لاتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ شریف برادران جنابِ پرویز کیانی کو پرویز مشرف کے گروپ کا ہی سمجھتے رہے اسی لیے جنرل کیانی کی ریٹائرمنٹ کا وقت آنے تک پرویز مشرف کے خلاف غداری کا مقدمہ شروع کرنے سے گریز کیا جاتا رہا۔شاید موصوف مرضِ نسیاں میں مبتلاء ہیں جو اتنا بھی نہیں جانتے کہ میاں نواز شریف کے وزارتِ عظمیٰ کا حلف اٹھانے سے بھی پہلے جنرل کیانی میاں صاحب سے ایک طویل ملاقات کر چکے تھے اور وزارتِ عظمیٰ کے بعد تو جنرل صاحب اور میاں صاحب کے درمیان کئی خوشگوار ملاقاتیں ہوئیں۔ رہی پرویز مشرف کے خلاف آرٹیکل 6 کے تحت مقدمے کی بات تو کیا موصوف نہیں جانتے کہ FIA کی کمیٹی گزشتہ تین ماہ سے مشرف کے خلاف انکوائری کر رہی تھی اور اُس وقت جنرل کیانی ہی چیف آف آرمی سٹاف تھے جنھیں اعتماد میں لیا جا چکا تھا۔ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ پرویز مشرف میجر شبیر شریف شہید کے کلاس فیلو اور قریبی دوست تھے اوراُنھوں نے ہمیشہ جنرل راحیل شریف کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھا۔ اگر میاں برادران یہ سمجھتے کہ پرویز مشرف کے کیس میں فوج کی طرف سے مداخلت کا کوئی خطرہ ہے تو وہ کم از کم جنرل راحیل شریف صاحب کو تو کبھی آرمی چیف نہ بناتے۔

لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

یہ نواز لیگ والے تو بس ''ایویں تصویری شیر'' ہی ہیں جن کی آمد پر ''رَن وَن'' کچھ بھی نہیں کانپتا۔ خادمِ اعلیٰ کی انگشتِ شہادت ہلتی دکھائی دیتی ہے نہ وہ مائیک گراتے نظر آتے ہیں ۔شاید وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سے ہوں کہ انہوں نے ''زر بابا، چالیس چوروں'' کو جو گلیوں میں گھسیٹنے کے وعدے اور دعوے کیے تھے اُن کا دور دور تک نام و نشان نہیں ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پانچ سالہ محنت کے بعد تھک گئے ہوں اسی لیے اپنے خلفِ رشید حمزہ شہباز کو سب کچھ سونپ کے استراحت فرما رہے ہوں البتہ حبیب جالب کا شعری مجموعہ اب بھی اُن کے سرہانے دھرا رہتا ہے اور وہ چوری چوری شعر بھی یاد کرتے رہتے ہیں تاکہ بوقتِ الیکشن کام آئیں ۔ محترم میاں نواز شریف آجکل بیرونی ممالک کے دوروں پر ہی رہتے ہیں ۔دراصل وہ بیرونی سربراہان کو یہ یقین دلانے جاتے ہیں کہ اب وہ واقعی ''وزیرِ اعظم'' بن گئے ہیں ، سرور پیلس کے جَلاوطن نواز شریف نہیں ۔ نواز لیگ کے پلّے ہے ہی کیا سوائے رانا ثناء اللہ کے ، باقی وزراء تو اتنے مفقود الخبر ہیں کہ قوم کو اُن کا نام تک بھی یاد نہیں ۔ صرف رانا ثناء اللہ ہی ہیں جن کی بڑھکوں سے صرف ماحول ہی نہیں سیاسی پارٹیاں بھی ''گرما گرم'' ہو جاتی ہیں۔ وزیرِ اطلاعات و نشریات محترم پرویز

رشید صاحب آجکل رانا ثناء اللہ لائل پوری کی نقل کرتے ہوئے ''بڑھکیں'' مارنے کی سعی تو کر رہے ہیں لیکن اُن کا چہرہ اتنا معصوم اور اندازِ گفتگو میں اتنی شرافت و نزاکت ہوتی ہے کہ اُن کی بڑھکیں سُن کر ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔
ایک زمانہ تھا جب قائدِ تحریک محترم الطاف حسین کی بڑھکوں سے بھی لوگ لرزہ بَر اندام ہو جاتے تھے لیکن اُنہوں نے بڑھکوں کا ایسا ''اتوار بازار'' لگایا کہ اب سبھی کہتے ہیں کہ ''یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں''۔ محترم عمران خاں کی بڑھکوں میں بھی بڑی حدت ہوا کرتی تھی لیکن نہ وہ ایک بال سے تین وکٹیں گرا سکے اور نہ ہی شریف برادران کو ''چھٹی باری'' لینے سے روک سکے۔ وہ بڑھکیں آج بھی مارتے ہیں لیکن اُن کا اثر صرف سٹیج پر ہوتا ہے جو خاں صاحب کی بڑھک سنتے ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ ویسے جب سے خاں صاحب نے میدانِ سیاست میں قدم رکھا ہے لوگ ''سٹار پلس'' کے ڈرامے بھول گئے ہیں۔ وہ تقریر کرتے ہیں تو آکسٹرا کی دھنوں کے ساتھ اور اگر موڈ میں آ جائیں تو سٹیج پر ہی نماز کی نیت باندھ لیتے ہیں۔ ہماری ایک پیپلز پارٹی بھی ہوا کرتی تھی جو اب صرف خوابوں، خیالوں میں ہی زندہ ہے اور وہ جیالا کلچر جو کبھی تھرتھلی'' مچا دیا کرتا تھا اب مرحوم و مغفور ہو چکا۔ پارٹی کے چیئرمین بلاول زرداری'' کبھی کبھی انگلینڈ سے تشریف لا کر ایک خطاب پڑھ کر سنا دیتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے یومِ تاسیس کے موقعے پر اُنہوں نے اپنے نانا ذوالفقار علی بھٹو کی

طرح آستینیں چڑھانے کی کوشش کی تو نیچے لکھا ہوا پڑھنا بھول گئے۔ جماعت اسلامی کے ترازو'' میں شروع سے ہی تین چار ''باٹ'' ہوتے ہیں جو تا حال برقرار ہیں لیکن '' اگر اُن کی تنظیم کو دیکھا جائے تو اُس کا کوئی ثانی نہیں۔ مولانا فضل الرحمن زور تو بہت لگا رہے ہیں لیکن اُن کی دال گلتی نظر نہیں آتی۔ اے۔این۔پی میں وراثتی جھگڑا اِس عروج کو پہنچ چکا ہے کہ اب ماں بیٹا تلواریں سونت کر آمنے سامنے ہیں۔ مایوسیوں کے اِس دَورِ کرخت میں اُمید کی آخری کرن بَس شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر علامہ طاہر القادری ہی رہ گئے ہیں جو انقلاب لانے کے لیے بس پہنچنے ہی والے ہیں۔

ہم نے بھی دراصل اہالیانِ وطن کو یہ نویدِ سعید سنانے کے لیے قلم اُٹھایا ہے کہ اب اصلی شیر کی آمد آمد ہے، باقی باتیں تو ہم محض مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کر گئے۔ شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر علامہ طاہر القادری نے وقت کے فرعونوں، شدادوں، نمرودوں اور قارونوں کو للکارتے ہوئے ملک کے طول و عرض میں مظاہروں کا اعلان کر دیا ہے اور پہلا مظاہرہ غالباً 20 دسمبر کو ہونے جا رہا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ شیخ الاسلام بھی شیخ رشید جیسے ہی ہونگے جو ہر وقت ٹی۔وی پر بیٹھ کر خالی خولی بڑھکیں لگاتے رہتے ہیں تو یہ اُس کی بھول ہے۔ ہمارے شیخ الاسلام پچھلے سال انہی دنوں میں اپنے جلال کی دھاک بٹھا چکے ہیں۔ اگر عین وقت پر ایم۔کیو۔ایم دھوکا نہ دیتی، جنرل

کیانی مُنہ نہ پھیرتے اور چیف جسٹس صاحب بھی طرح نہ دے جاتے تو شیخ الاسلام نے تو قوم کو کہہ ہی دیا تھا کہ ’’ مبارک ہو، مبارک ہو۔۔۔آدھا کام آج ہو گیا باقی کل ہو جائے گا‘‘۔اب کپتان صاحب ہاتھ ملتے ہوئے بار بار کہتے ہیں کہ ڈاکٹر طاہر القادری جو کچھ کہتے تھے سب سچ ثابت ہوا۔اگر خاں صاحب اُس وقت یقین کر لیتے اور شیخ الاسلام کی کلاہ و دستار کے پیچھے پناہ کے خواستگار ہو جاتے تو آج نہ ڈرون حملے ہوتے اور نہ نیٹو سپلائی روکنے کی ضرورت پیش آتی کیونکہ امریکہ کے لیے شیخ الاسلام کا نام ہی کافی تھا ۔بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا اگر اب بھی خاں صاحب ہمارے مُرشد کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر لیں تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ایک بال سے وہ تین تو کیا تیرہ وکٹیں بھی گرا سکتے ہیں ۔ایک وکٹ تو خاں صاحب اپنی معروف بالنگ کے ذریعے گرا لیں گے اور باقی بارہ وکٹوں کو ہمارے مُرشد کا جلال بھسم کر دے گا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ پچھلی بار بھی مُرشد کا وجدان اُنہیں بتلا چکا تھا کہ پیپلز پارٹی کا جانا ٹھہر چکا ہے۔اپنے کشف و کرامات کے زور پر وہ سمجھ چکے تھے کہ اگر اُنہوں نے اپنا کرامتوں بھرا ’’عصائے موسوی‘‘ استعمال نہ کیا تو ’’تختِ لاہور‘‘ کو ’’تختِ پاکستان‘‘ بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔اُس وقت تو مُرشد حجت تمام کر کے چلے گئے لیکن اب ’’ ایکشن‘‘ کا سے آن

پہنچا۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ حکمرانوں کو اپنے اعمال و افعال کی درستی کے لیے جتنا وقت دیا جاچکا ہے وہ کافی ہے اور اب اُنہیں ''سیدھا'' کرنے کے لیے مُرشد کو اپنا ''عصائے موسوی'' لہرانا ہی ہو گا۔

کچھ لوگ سوال کرتے ہیں کہ شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر علامہ طاہر القادری آخر ''ٹھنڈے ٹھار'' موسم کا انتخاب ہی کیوں کرتے ہیں؟۔ یہ فہم و ادراک سے کوسوں دور عقل کے اندھے اتنا بھی نہیں جانتے کہ پاکستان میں مفلسی اُن انتہاؤں پر ہے کہ غریبوں میں اب لنڈے بازار سے بھی گرم کپڑے خریدنے کی سکت باقی نہیں بچی اِس لیے اگر لہو گرم رکھنے کے لیے اتنا بھی ہلّا گُلّا نہ ہو تو یہ بیچارے بے موت مر جائیں ۔ویسے بھی شیخ الاسلام نے خود تو 500 سے زائد کتابیں لکھی ہی ہیں جن کے بارے میں کچھ بد بخت یہ کہتے ہیں کہ لکھوائی گئی ہیں ۔اتنی عظیم تصانیف کے باوجود مُرشد نہ صرف حضرتِ اقبالؒ کے معتقد ہیں بلکہ افکارِ اقبالؒ کی عملی تصویر بھی ہیں جنھوں نے کہا تھا

پلٹنا جھپٹنا جھپٹ کر پلٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

اقبال کا یہ شاہیں بھی اپنا لہو گرم رکھنے کی کوئی نہ کوئی سبیل تلاش کرتا رہتا ہے ۔اِس بار بھی دسمبر ، جنوری کی لہو جماتی سردی میں مُرشد قوم کا

لہو گرم رکھنے کے لیے تشریف لا رہے ہیں اور امید واثق ہے کہ جونہی سردی کا زور ٹوٹے گا تو مُرشد واپس تشریف لے جائیں گے۔

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں

پروفیسر مظہر

حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا ”جو خوش اخلاق ہو اُس کے لیے جنت کے اعلیٰ درجے میں ایک گھر کا میں ضامن ہوں“۔ لیکن ہمارے ہاں تو بڑھک بازی اور بد اخلاقی نے اذہان و قلوب کو ایسے مسخر کیا ہے کہ اب ہر کوئی اِن کا اسیر نظر آتا ہے۔ لکھنے اور لکھاری اپنی ریٹنگ بڑھانے کے چکر میں اور سیاستدان اپنا سیاسی قد اونچا کرنے کے جنوں میں اخلاقیات کو بھلا کر بڑھکوں کے سہارے زندہ ہیں۔ ہمارے ایک بزعمِ خویش رہبر جو 1992ء سے مفقود الخبر تو نہیں البتہ مفرور ضرور ہیں، گاہے بگاہے گرجتے برستے رہتے ہیں۔ برطانوی شہری محترم الطاف حسین اکثر ”ڈرامے“ کرتے رہتے ہیں۔ سلطان راہی مرحوم کی طرح بڑھکیں، کبھی استعفیٰ دینے کی دھمکیاں تو کبھی لہک لہک کر گانے جیسے ڈرامے اُن کی شخصیت کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب کی بار اُنہوں نے فرمایا ہے ”جماعت اسلامی پر پابندی لگائی جائے“۔ اُن کا حکم سَر آنکھوں پر لیکن اِس پابندی کے حقدار تو وہ خود اور اُن کی جماعت ہے جس کا وطیرہ ہی دھونس، دھاندلی ہے۔ جس کا باقاعدہ عسکری ونگ اور عقوبت خانے ہیں جس نے ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خوری کو رواج دیا، جس کے ”جناح پور“ جیسے منصوبے منظرِ عام پر آئے اور جس نے روشنیوں کے شہر قائد کو

نحوستوں کے بحرِ عمیق میں دھکیل دیا۔اُنھوں نے فرمایا” جماعت اسلامی کے کارکن فوج پر حملے کر رہے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی غیر ملکی عناصر کے ذریعے ملک توڑنا چاہتی ہے “۔تا حال تو جماعت اسلامی پر افواج پاکستان پر کسی حملے کا کوئی ثبوت موجود ہے نہ غیر ملکی عناصر کے ساتھ رابطے کا اور جماعت پر تو فوج کی ”بی ٹیم“ ہونے کا الزام ہمیشہ لگتا رہا اور اب بھی لگتا ہے البتہ یہ محترم الطاف حسین صاحب ہی تھے جنھوں نے ہندوستان میں بیٹھ کر فرمایا کہ ہندوستان کی تقسیم نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن آج وہ سینہ تان کر یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان مہاجروں کی قربانیوں سے معرضِ وجود میں آیا۔وہ کہتے ہیں کہ اسلامی جمیعت طلباء دہشت گردوں کا ٹولہ ہے جسے گرفتار کرنے والا کوئی نہیں جبکہ ایم کیو ایم کے کارکنوں کو چُن چُن کے گرفتار کیا جا رہا ہے ۔عرض ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی جمیعت دشمنی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے جس کی بنا پر آئے روز کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا ہوتا رہتا ہے۔ پوری یونیورسٹی کو ”شادی ہالوں“ میں بدل کے رکھ دینے والے انتہائی نا اہل منتظم وائس چانسلر چونکہ خود تو حالات کو سنبھالنے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں اس لیے پولیس کو طلب کرنے کے بہانے تراشتے رہتے ہیں ۔یونیورسٹی کی حالتِ زار پر تو کوئی توجہ نہیں دیتا البتہ وائس چانسلر کی مدتِ ملازمت میں توسیع پہ توسیع ہوتی چلی جا رہی ہے ۔محترم الطاف حسین صاحب کی خدمت میں اطلاعاً عرض ہے کہ ہنگامہ کرنے والے طلباء

گرفتار بھی ہوتے ہیں اور جماعتِ اسلامی اُن سے لاتعلقی کا بَرملا اظہار بھی کرتی ہے جبکہ دوسری طرف کراچی میں آپریشن کے دوران جتنے دہشت گرد گرفتار ہوتے ہیں اُن کی غالب اکثریت کا تعلق ایم۔کیو۔ایم سے ہی نکلتا ہے اور ایم۔کیو۔ایم بھی اُنہیں اپنے کارکن ہی قرار دیتی ہے۔ محترم الطاف حسین کہتے ہیں کہ حکومت اور ایجنسیاں مہاجروں کے خلاف اقدامات ختم کردے۔ حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ کراچی میں آپریشن سے پہلے یہ طے کیا گیا تھا کہ وزیرِ اعلیٰ سندھ کی زیرِ نگرانی اِس آپریشن کی باقاعدہ مانیٹرنگ کی جائے گی تاکہ کسی کے ساتھ زیادتی کا احتمال باقی نہ رہے۔یہ سب کچھ طے کرتے وقت ایم۔کیو۔ایم سمیت سبھی دینی اور سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لیا گیا تھا۔ یہ مانیٹرنگ اب بھی کی جارہی ہے اور وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد ہر وقت وزیرِ اعلیٰ سندھ اور گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ وزیرِ اعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ وہی ذاتِ شریف ہیں جن کے ساتھ ایم۔کیو۔ایم پانچ سال تک حکومت کے مزے لوٹتی رہی اور ڈاکٹر عشرت العباد تو ہیں ہی اُن کے اپنے۔اِس کے باوجود بھی اگر ایم۔کیو۔ایم مطمئن نہیں تو پھر۔۔۔۔۔۔

محترم الطاف حسین نے حسبِ سابق بڑھک بازی سے کام لیتے ہوئے فرمایا کہ ''ہمیں کمزور نہ سمجھا جائے اگر ہمارے کارکنوں کو جنوں آگیا تو رینجرز اور پولیس

بھی گھروں سے باہر نہیں نکل سکے گی ''۔ یہ تو خیر سبھی جانتے ہیں کہ گھروں کا سامان بیچ کر اسلحہ خریدنے کا قائدِ تحریک کا تین عشرے پہلے والا فرمان تا حال برقرار ہے اور ایم۔ کیو۔ ایم کا عسکری ونگ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور جدید ترین اسلحے سے لیس ہے لیکن اِس کے باوجود بھی محترم الطاف حسین شاید کسی غلط فہمی میں مبتلاء ہیں۔ اُنہیں پتہ ہونا چاہیے کہ حکومت تا حال مصلحت سے کام لے رہی ہے وگرنہ ٹارگٹ کلرز، بھتہ خوروں اور دہشت گردوں کو چیونٹی کی طرح مسل کے رکھ دینا رینجرز اور پولیس کے لیے سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ویسے تو محترم الطاف حسین کو چاہیے تھا کہ وہ پاکستان میں آکر خود تفتیش کر لیتے لیکن اگر وہ اتنے دلیر ہوتے تو 1992ء میں پاکستان میں رہ کر حالات کا مقابلہ کرتے، رات کے اندھیرے میں فرار نہ ہوتے۔ بیس سال سے زائد عرصہ گزر چکا، قائدِ تحریک کی خود ساختہ جلا وطنی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی جبکہ دوسری طرف جماعت اسلامی کے کوئی چھوٹے سے چھوٹے رہنما نے بھی کبھی ملک سے فرار ہونے کا سوچا تک نہیں۔ وہ جیلیں بھگتتے اور تشدد سہتے ہیں لیکن ڈٹ کھڑے رہتے ہیں۔ میں جماعت اسلامی کا ترجمان تو نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جماعت کا دامن کرپشن سے پاک ہے جس کا اعتراف اُس کے بدترین دشمن بھی کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف وہ کونسا ایسا الزام ہے جو ایم۔ کیو۔ ایم پر دھرا نہیں جاتا۔ اِس کے باوجود بھی محترم الطاف حسین صاحب فرماتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی پر پابندی لگا کر ایم۔ کیو۔ ایم کو شترِ بے مہار چھوڑ دیا جائے

۔میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے دل، روشنیوں کے شہر کراچی کو امن کا گہوارہ بنانا ہے تو اُس کا واحد حل یہ ہے کہ فوری طور پر ایم۔کیو۔ایم کو کالعدم قرار دیا جائے کیونکہ جتنے افراد طالبان کے ہاتھوں شہید ہو چکے ہیں، کم و بیش اُتنے ہی سابقہ مہاجر قومی موومنٹ اور موجودہ متحدہ قومی موومنٹ کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔

محترم الطاف حسین نے فرمایا ہے ''اگر مہاجر میرے ہاتھ سے نکل گئے تو فوج بھی کنٹرول نہیں کر سکے گی''۔ عوام کو یوں بھڑکانا اور اُنہیں تصادم کی راہ دکھانا یقیناً ملک و قوم سے غداری کے زمرے میں آتا ہے۔الطاف حسین صاحب نے اپنی تقاریر میں جو انداز اختیار کر رکھا ہے اُس پر یقیناً آرٹیکل چھ لاگو ہوتا ہے۔اگر حکومتِ وقت کسی مصلحت کے تحت ایسا کرنے سے گریزاں ہے تو شہرِ قائد کی رونقیں بحال کرنے کی خاطر کم از کم الطاف حسین صاحب کے آڈیو، وڈیو خطاب پر پابندی ہی عائد کر دے۔اگر حکمران اتنا کرنے کی سکت بھی نہیں رکھتے تو پھر لکھ کے رکھ لیجیے کہ کراچی کی رونقیں کبھی بحال نہیں ہونگی۔

ریڈ کارپیٹڈ احتجاج

کوئی ہے جو ہمارے رہبر محترم عمران خاں صاحب کی انوکھی ، لاثانی اور لافانی سیاست کامقابلہ کر سکے ؟۔اُنھوں نے جب سے میدانِ سیاست میں قدم رنجہ فرمایا ہے ، وہ تاریخ پہ تاریخ رقم کرتے چلے جا رہے ہیں ۔ہم نے بہت سے جلسے جلوس بھی دیکھے اور جماعت اسلامی کے دھرنے بھی لیکن جو انوکھا اور نرالا پن ہمیں تحریکِ انصاف کے ہاں ملتا ہے اُس کی نظیر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔

جب تحریکِ انصاف اور جماعت اسلامی نے خیبر پختونخواہ کے وزیرِ اعلیٰ ، وزراء اور اراکینِ اسمبلی کے ہمراہ 5 دسمبر کو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے ڈرون حملوں کے خلاف دھرنے کی ٹھانی تب سبھی عقیل و فہیم سَر جوڑ کر بیٹھے اور '' ایجنڈا ''صرف ایک تھا کہ کچھ ایسا کیا جائے جس کی نظیر اقوامِ عالم میں بھی کہیں نہ ملتی ہو ۔دھرنے کا طریق کار طے ہوا جسے اتنا خفیہ رکھا گیا کہ تیز و طرار پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی ۔5 دسمبر کو پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد سے آدھا کلومیٹر دور کنٹینر لگا کر سڑک کو دونوں طرف سے بند کر دیا گیا ، انتہائی خوبصورت شامیانوں کے نیچے

ریڈ کارپٹ'' بچھائے گئے اور سٹیج ایسے تیار کیا گیا جیسے وہاں کسی ''دُلہا میاں'' نے'' بیٹھنا ہو۔ اطراف میں قطار اندر قطار لگی قیمتی اور آرام دہ کرسیاں عجب بہار دکھا رہی تھیں۔ شاید اتنی خوبصورت اور قیمتی کرسیاں اِس لیے رکھی گئی ہوں کہ اُن پر قومی و صوبائی اسمبلی کے اراکین نے بیٹھنا تھا جن سے کم از کم یہ توقع تو ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ جاتے سمے کرسیاں بھی اٹھا کر لے جائیں گے۔ محترم عمران خاں صاحب اپنی ''سونامی کے ہمراہ سٹیج پر جلوہ افروز ہوئے اور یوں تحریکِ انصاف اور جماعتِ اسلامی کے'' اراکینِ قومی و صوبائی اسمبلی کے ''ریڈ کارپیٹڈ'' دھرنے کا ایسا آغاز ہوا جس نے ایسی تاریخ رقم کی جس کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔

دھرنے سے محترم عمران خاں صاحب نے خطاب فرمایا آجکل دو ''مقرر'' ہی ایسے ہیں جو ہمیں بہت پسند ہیں ، ایک عمران خاں اور دوسرے بلاول زرداری۔ رانا ثنا اللہ صاحب کو کسی جلسے سے خطاب کرتے دیکھنے کا تو کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن اپنی مختصر گفتگو کے دوران بھی ''تیلی'' لگانے میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ رانا صاحب میں اعتماد اتنا کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ ہی نہیں ، پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ بھی اُنہی کے پاس ہو۔ ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا جسے پنجابی میں ''پنگا لینا'' کہتے ہیں ، رانا صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔ لیکن ہمیں کیا ، یہ نواز لیگ اور رانا ثنا اللہ کا ذاتی

معاملہ ہے اور ہمیں تانک جھانک کی عادت نہیں۔ رانا صاحب کی اِن ''مجنونانہ حرکتوں'' کا جواب بھی نواز لیگ کو ہی دینا پڑ رہا ہے اور پڑتا رہے گا۔ بلاول زرداری اپنی ''یورپی'' تعلیم مکمل کرنے کے بعد ''پاکستانی'' سیاسی سکول میں داخل ہو گئے ہیں اور ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' کے مصداق آجکل سیاسی الف، بے رَٹ رہے ہیں، لہجہ البتہ انگریزوں والا ہی ہے اور یہ تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ٹویٹر پر جاری ہونے والے اُن کے پیغامات کوئی گھاگ سیاسی ''پلپلیا'' ہی جاری کرتا ہے، بلاول زرداری نہیں۔ لیکن مشتری ہوشیار باش'' بلاول زرداری کی رگوں میں محترمہ بینظیر شہید کی سیاست اور'' جنابِ آصف زرداری کی شاطرانہ چالوں سے بھرپور خون دَوڑ رہا ہے جو کسی نہ کسی طرح ضرور رنگ لائے گا۔ فی الحال تو اُن کی تقریر سُن کر ہنسی ہی آتی ہے

محترم عمران خاں کا خطاب سُن کر تو بندہ ''خواہ مخواہ'' جذباتی ہو جاتا ہے۔ وہ بات ہی ایسی کرتے ہیں جو ہم سونامیوں کے دل میں ''ٹھاہ'' کرکے لگتی اور تیر کی طرح پیوست ہو جاتی ہے۔ اُنھوں نے دھرنے کے دوران خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر مرکزی حکومت نے خیبر پختونخواہ کی حکومت گرانے کی کوشش کی تو ہم اُن کی حکومت گرا دیں گے۔ رانا ثنا اللہ ٹائپ کچھ ''لیگیئے'' کہتے ہیں کہ ہم نے تو خود تحریکِ انصاف کو خیبر پختونخواہ کی حکومت بھیک میں دی ہے اور

ایسا کرتے ہوئے عزیز از جاں مولانا فضل الرحمن کو بھی ناراض کر دیا۔ ہم بھلا خاں صاحب کی حکومت کو گرانے کی کوشش کیوں کریں گے ؟۔ ہم نے تو طے کر رکھا ہے کہ اگر خاں صاحب کی گرتی حکومت کو سنبھالا دینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہم فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں گے ۔ لیکن ہم ''سونا میہ'' خوب جانتے ہیں کہ نواز لیگ نے اگر ایسا کیا تو وہ ''حبِ عمران خاں'' میں تو ہر گز نہیں ہو گا کیونکہ اُن سے خیر کی توقع رکھنا احمقوں کی جنت بسانے کے مترادف ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تحریکِ انصاف کو خیبر پختونخواہ کی حکومت وہاں کے بگڑے حالات کو مدِ نظر رکھ کر دی گئی تاکہ تحریکِ انصاف سے حکومت سنبھل نہ پائے اور وہ ''رج کے'' رُسوا ہو جائیں لیکن ہماری حکومت نہ صرف چل بلکہ دَوڑ رہی ہے۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے تو ہماری نیٹو کنٹینروں کے پیچھے لگتی دَوڑیں دیکھ لے۔

کچھ بَد بخت یہ کہتے ہیں کہ قومی اسمبلی کے بقدرِ اشکِ بُلبُل اراکین کے ساتھ عمران خاں دو تہائی اکثریت کی مالک نواز لیگ کی حکومت کو کیسے گرا سکتے ہیں ؟۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خاں صاحب نے پیپلز پارٹی سے بنا کر رکھی ، نہ ایم۔ کیو۔ ایم اور اے۔ این۔ پی سے ۔ مولانا فضل الرحمن کا پارہ تحریکِ انصاف کا نام سنتے ہی صرف چڑھ ہی نہیں جاتا بلکہ اُن کے ''ذہنی تھرما میٹر'' کو توڑ کر باہر اُبل پڑتا ہے۔ وہ تو ہر وقت پوری تحریکِ انصاف کو

کچا چبا جانے کے موڈ میں نظر آتے ہیں۔ آفتاب احمد خاں شیرپاؤ سے بھی خاں صاحب دامن چھڑا چکے ہیں۔ صرف ایک جماعت اسلامی ہی بچی ہے جو ''فی الحال'' ساتھ نبھاتی چلی جارہی ہے لیکن پارلیمنٹ میں اُن کے اراکین کی تعداد اتنی ہے کہ ڈھونڈنے کے لیے بھی دو، چار گھنٹے تو درکار ہونگے ہی۔ پھر کس برتے پر خاں صاحب نے یہ کہا کہ وہ مرکزی حکومت کو گرادیں گے ؟۔اِن افلاطونوں کو اتنا بھی نہیں پتہ کہ حکومت گرانے کے لیے عددی اکثریت نہیں، ہمت و حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمارے کپتان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ویسے بھی حکومت گرانے والے دھرنوں کی ''سپیشلسٹ'' جماعت اسلامی سونامیوں کے اُبلتے خون کے ساتھ ہے اور اب تو ہمارے مُرشد شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری کی بھی پاکستان آمد آمد ہے، اُس لیے نواز لیگ کی حکومت گرانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ۔۔۔ بھئی ہم نے تو امریکہ کی دَوڑیں لگوادیں اور اُس نے عرقِ ندامت سے تَرپیشانی کے ساتھ کہہ دیا کہ وہ خیبر پختونخواہ کے راستے جاری نیٹو سپلائی کو روک رہا ہے، پھر یہ نواز لیگ کس کھیت کی مولی گاجر ہے ؟۔

جیسے ہم نے نیٹو سپلائی روکی ہے، ویسے ہی ڈرون حملے بھی روک کر دکھائیں گے لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ مرکزی حکومت تحریکِ انصاف کے پاس ہو اور عمران خاں صاحب وزیرِ اعظم۔ اگر قوم اِس ملک کا بھلا چاہتی ہے تو اُسے ایک نہ ایک دن ہم سونامیوں کے ساتھ مل کر کپتان صاحب کو وزیرِ اعظم بنانا ہی ہوگا

کیونکہ اِس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ مشہور محاورہ ہے کہ ''آج کا کام کل پر مت چھوڑو''
اِس لیے کیوں نہ ہم آج ہی خاں صاحب کو وزیرِاعظم بنانے کے لیے نکل پڑیں۔

مہنگائی مار گئی

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے روٹی، کپڑا اور مکان کا دل پذیر نعرہ لگا کر بینظیر کامیابی حاصل کرتے ہوئے بڑے بڑے بُرج اُلٹ دیئے۔ وہ اپنے دورِ حکومت میں روٹی دے سکے نہ کپڑا اور مکان لیکن یہ نعرہ پیپلز پارٹی کی پہچان بن گیا۔ محترمہ بینظیر بھٹو شہید نے یہی نعرہ استعمال کیا اور جنابِ آصف زرداری نے بھی لیکن جنابِ زرداری کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ غربت ختم کرنا ممکن نہیں اِس لیے اُنھوں نے غربت کی بجائے ''غریب مکاؤ'' میں ہی عافیت جانی۔ اپنے پانچ سالہ دَورِ اقتدار میں اُنھوں نے مقدور بھر ''غریب مکانے'' کی کوشش کی، کرپشن کے مگر مچھوں کو کھُلی چھوٹ دی جو کھربوں ڈکار گئے لیکن یہ غریب بھی شاید ڈھیٹگی کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ جنابِ آصف زرداری نے جاتے جاتے یہ ذمہ داری اپنے ''پیروکار'' جنابِ میاں نواز شریف کو تفویض کر دی جو آجکل اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بھرپور کوشش و کاوش کر رہے ہیں اور اُمیدِ واثق ہے کہ پیٹ میں جانے والی ہر شے کو غریبوں کی پہنچ سے کوسوں دور کرنے کے بعد وہ بچے کھُچے غریب ''مکا'' ہی لیں گے۔ ویسے بڑے میاں صاحب اگر یہ ذمہ داری خادمِ اعلیٰ کے سپرد کر دیتے تو بہت جلد مثبت نتائج سامنے آ جاتے کیونکہ اُنہیں ڈھیٹگی سے

دو، دو ہاتھ کرنے کا خوب تجربہ ہے اور اب تو صورتِ حال یہاں تک آن پہنچی ہے کہ بچے کھچے ڈینگی جان بچانے کی تگ و دَو میں ہیں۔ محترم عمران خاں صاحب نے بھی شاید خادمِ اعلیٰ کی نقل کرتے ہوئے محض نوے دن میں ملک سے کرپشن کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اُنہیں مرکز کی بجائے خیبر پختونخواہ کی صوبائی حکومت ملی جہاں چھ ماہ کے دَوران کسی کو کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا اے۔این۔پی چھوڑ کر گئی تھی۔ شاید خاں صاحب کے 90 دن مرحوم ضیاء الحق کے 90 دنوں جیسے ہوں جن کا دَورانیہ 9 سالوں پہ محیط ہوتا ہے۔

میرا ناسازئ طبع کی بنا پر آج کالم لکھنے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ طبیعت کی ناسازی کی وجہ یہ تھی کہ آج بجلی کا بِل دیکھ کر میرے چودہ کیا، چوبیں طبق روشن ہو گئے اور دماغ تو ایسا روشن ہوا کہ مجھے گزشتہ کئی دنوں سے لوڈ شیڈنگ نہ ہونے کا سبب معلوم ہو گیا۔ جب سے بِل دیکھا ہے ہم گھر میں بجلی سے چلنے والی ایک ایک شے بند کرکے بیٹھے ہیں۔ میں نے تو میاں کو کہہ دیا کہ بازار سے وہ لالٹین لے آئیں جسے لوگ عشروں پہلے چلایا کرتے تھے۔ میاں نے مُسکرا کر کہا کہ وہ لالٹین تو لے آتے ہیں لیکن مٹی کا تیل تو بجلی سے بھی مہنگا ہے، وہ کیسے چلائیں گے؟۔ میاں کی بات سمجھ میں آ گئی اِس لیے میری صبح سے کوشش ہے کہ ماہانہ گھریلو اخراجات میاں کے سپرد کرکے اپنے آپ کو ''برین ہیمرج'' سے بچالوں لیکن وہ اُس رقم کو ہاتھ لگانے کی بجائے کانوں کو ہاتھ

لگانا شروع کر دیتے ہیں۔

سبھی جانتے ہیں کہ میں نے نواز لیگ کے حق میں بہت سے کالم لکھے جس پر مجھے طعنے بھی سُننے پڑے۔اب اگر میں ''لوٹی'' بن کر تحریکِ انصاف میں شامل ہو بھی جاؤں تو وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ مجھے ناقابلِ اعتبار سمجھا جائے گا اِس لیے بہ امرِ مجبوری فی الحال میں نواز لیگ کی حامی ہی ہوں البتہ شدید خواہش ہے کہ لوگ جوق در جوق 22 دسمبر کو خاں صاحب کے مہنگائی کے خلاف احتجاج میں شریک ہوں ۔ میں گھر بیٹھی دعائیں تو ضرور کرتی رہوں گی لیکن احتجاج میں شریک نہیں ہو سکتی کہ میری ''سیاست دان'' لکھاریوں اور لِنکروں کی طرح ''لوٹا'' بننے کی عادت ابھی پختہ نہیں ہوئی۔

خاں صاحب کے 22 دسمبر کے احتجاج کا سُن کر مجھے انتہائی محترم قاضی حسین احمد مرحوم و مغفور کے دھرنے یاد آ گئے۔یہ غالباََ بی بی شہید کے دوسرے دَورِ حکومت کے آخری دنوں کی بات ہے جب قاضی صاحب نے حکومت کے خلاف دھرنا دینے کا اعلان فرمایا ۔ قاضی صاحب کے دھرنوں سے حکومتِ وقت ہمیشہ لرزہ بَر اندام ہو جایا کرتی تھی۔ حکمرانوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر یہ طے کیا کہ جو ''باریش'' شخص بھی نظر آئے اُسے گرفتار کر لیا جائے۔ مولوی عبد الرزاق کی نان چنے کی ننھی مُنی دوکان مسجد کے پاس ہی تھی۔وہ نماز پڑھ کے مسجد سے

باہر نکلے تو شومئ قسمت مسجد کے سامنے گھات لگائے پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ مولوی صاحب نے اُنہیں لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ اُن کا قاضی صاحب کے دھرنے سے کوئی تعلق نہیں اور وہ تو نان چنے فروخت کرتے ہیں۔کچھ واقف کاروں نے بھی پولیس کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اُن کا ایک ہی جواب تھا کہ اُنہیں ہر داڑھی والے کو ہر حالت میں گرفتار کرنے کا حکم ہے۔قصّہ مختصر مولوی عبدالرزاق پولیس کے ٹرک کی نذرِ ہوئے۔بقول مولوی صاحب پولیس کو راستے میں جہاں بھی کوئی داڑھی والا نظر آیا اُسے ٹرک میں ٹھونستے چلے گئے اور واہگہ بارڈر کے پاس جا کر ٹرک ایسے خالی کیا جیسے کچرے کے ٹرک کو خالی کرتے ہیں۔ مولوی صاحب جب کئی گھنٹے بعد ہانپتے کانپتے اپنی دوکان پر پہنچے تو وہاں خالی برتن اُن کا مُنہ چڑا رہے تھے۔۔۔ عمران صاحب کے ساتھ چونکہ جماعتِ اسلامی بھی اِس احتجاج میں شریک ہے اِس لیے اُنہیں خصوصی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ویسے بھی وزارتِ قانون کا قلم دان رانا ثنا اللہ صاحب کے پاس ہے جن سے کسی بھی قسم کی کوئی بھی توقع کی جا سکتی ہے۔وہ سونامی کا رُخ تو نہیں موڑ سکتے لیکن سونامی میں گند ضرور گھول سکتے ہیں۔

جب محترم وزیرِاعظم نے یہ فرمایا کہ اُنہیں سمجھ آتی ہے نہ پانی بجلی کے وزیر خواجہ آصف کو کہ لوڈشیڈنگ کیسے ختم ہو گئی ؟۔تب خواجہ صاحب یہ سوچتے ہوئے زیرِلَب مسکرا اُٹھے کہ جب بجلی کے بِل لوگوں کے ہاتھ میں ہونگے تو

وہ خود ہی لوڈشیڈنگ کے خاتمے کا سبب جان جائیں گے ۔ہمارے یہ خواجہ صاحب بھی بہت ''پہنچی ہوئی'' شے ہیں۔ پہلے تو وہ تین چار ماہ تک الیکٹرانک میڈیا پر ''بجلی بچانے'' کے طریقے بتاتے رہے لیکن لوگ اُن کے پند و نصائح کو مُسکرا کے ٹالتے رہے ۔سچ ہے کہ لاتوں کے بھوت بھلا باتوں سے کب مانتے ہیں چنانچہ خواجہ صاحب سیالکوٹی نے جلال میں آ کر ایسی ''لات'' چلائی کہ سارے ''بھوتوں'' کی بولتی بند ہو گئی اور اب تو محترم عمران خاں جیسے ''امیر کبیر'' بھی بجلی کا بِل دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں ۔حسبِ حال والے ''عزیزی''کا یہ مفید مشورہ مجھے بہت پسند آیا ہے کہ دِل کے مریض بجلی کا بِل دیکھنے سے پرہیز کریں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ خواجہ صاحب نے سینہ تان کے فرمایا تھا کہ 200 یونٹس تک بجلی کے پرانے ریٹس ہی رہیں گے اور ہم نے بھی گھر میں بجلی بچت کی ایمرجنسی نافذ کرکے لگ بھگ 200 یونٹ ہی صرف کیے لیکن بِل پھر بھی چار ہزار سے بھی زیادہ آ گیا۔اب یہ خواجہ صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ پاکستان میں اُنیس ، بیس روپے فی یونٹ بجلی استعمال کرنے والوں کی تعداد کتنی ہو گی ؟۔بجلی کے اِن ریٹس کو دیکھ کر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ لوگ بلدیاتی انتخابات میں نواز لیگ کو ووٹ دیں ، نہ دیں لیکن لوڈ شیڈنگ ہرگز نہیں ہو گی ۔نواز لیگ کے بزرجمہر کہتے ہیں کہ تین چار سال میں بجلی کے ریٹس کم ہو جائیں گے ۔بجا

ارشاد لیکن اُس وقت تک توپُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوگا اور پتہ نہیں حقِ حکمرانی کس کا نصیبہ ٹھہرے۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دِل

جب شیر کی طرح دھاڑنے اور شاہین کی طرح جھپٹنے والے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے گھر کی راہ لی تو ہم نے یہ سوچ کر سُکھ کا سانس لیا کہ چلو چیف صاحب نے جو آئینی "مارشل لاء" لگایا ہوا تھا کم از کم اُس سے تو جان چھوٹی اور اب راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔ جہاں جی چاہے مُنہ مارو اور جسے جی چاہے "پھڑکا" دو۔ مَن میں آئے تو "میٹرک پاس" کو کسی بڑی کارپوریشن کا چیئرمین لگا دو اور جی چاہے تو ایک ہی دن میں قومی خزانے سے اربوں نکلوا کر ڈکار جاؤ۔ کوئی پوچھنے والا ہو گا نہ "از خود نوٹس" لینے والا۔ محترمہ عاصمہ جہانگیر تو چیف صاحب کی رخصتی کے لیے ایک ایک دن گِن کر گزار ہی رہی تھیں لیکن سب سے "سیانے" تو جنابِ نواز شریف نکلے جنھوں نے انتہائی پھرتی دکھاتے ہوئے چیف صاحب کی ملازمت کے آخری دنوں میں خواجہ آصف صاحب کو قُربانی کا بکرا بنایا اور خود بال بال بچ گئے۔ ویسے ہمارے فوجی جوان بھی کچھ کم "طرار" نہیں۔ جب چیف صاحب نے توہینِ عدالت میں آئی۔ جی۔ ایف۔ سی کو طلب کیا تو میجر جنرل صاحب نے CMH میں داخل ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ تو "دردِ دل" میں مبتلاء ہیں۔ اگر یہ دردِ دل وہی ہے جسے عرفِ عام میں "ہارٹ اٹیک" کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُنھیں شفائے کاملہ

عطا فرمائے اور اگر یہ میرؔ و غالبؔ والا شاعرانہ میٹھا میٹھا دردِ دل ہے تو اِس کا علاج تو حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کے پاس بھی نہیں تھا تبھی تو غالبؔ نے جل بھُن کے یہ کہا تھا کہ

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

اگر میجر جنرل صاحب بر وقت چیف صاحب کی آئینی ''دوکانِ حکمت'' پر پہنچ جاتے تو شاید وہ جاتے جاتے کوئی نہ کوئی علاج ڈھونڈ ہی لیتے لیکن

وہ جو بیچتے تھے دوائے دِل
وہ دُکان اپنی بڑھا گئے

اب تو جرنیل صاحب کا واسطہ جناب تصدق حسین جیلانی جیسے '' حکیم '' سے پڑنے والا ہے جنہوں نے ابتداء ہی سے ''بے اصولی'' کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔دُنیا جہان کا اصول تو یہی ہے کہ ''ہر کہ آمد، عمارتِ نَو ساخت'' لیکن چیف جسٹس صاحب نے یہ بیان داغ کر ہمارا تو ''بیڑا غرق ''کر دیا کہ ''جسٹس افتخار محمد چوہدری میرے رول ماڈل ہیں'' ۔ گویا اب وہ بھی جسٹس چوہدری صاحب ہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے ۔اگر واقعی ایسا ہو گیا تو پھر ہم جو بڑے بڑے منصوبے بنا کر بیٹھے تھے ، اُن کا کیا ہو گا؟۔کیا ہماری اعلیٰ عدلیہ نہیں

جانتی کہ اُس کے این۔آر۔او کو غیر آئینی قرار دینے سے پانچ سال تک کتنی افراتفری رہی ، کتنے دل ٹوٹے، کون کون دکھی ہوا اور لوگوں نے کیسی کیسی بد دعائیں دیں؟۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دہرانے جا رہی ہے۔ہم تو حضرت غوث الاعظم جیلانیؒ کی اولاد سے یہ توقع لگائے بیٹھے تھے کہ وہ بَس دعاؤں اور تعویز دھاگوں تک ہی محدود رہیں گے اور ہمارا شمار بھی بہت جلد اُن کے مریدین میں سے ہونے لگے گا لیکن اُنھوں نے تو محترم افتخار محمد چوہدری کو اپنا ''رول ماڈل'' قرار دے کر ہمارا دِل ہی توڑ دیا۔یقین جانیئے کہ چیف جسٹس صاحب کی رخصتی پر بہت سے دلوں میں لڈو صرف پھوٹے ہی نہیں ، نگلے بھی گئے۔ محترم عمران خاں صاحب تو بس ''ایویں ای '' کہتے رہے کہ وہ ایک بال سے تین وکٹیں گرائیں گے لیکن چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی سترہ رکنی ٹیم نے تو ''کُشتوں کے پُشتے'' لگا دیئے۔اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی اُنہیں صبر نہیں آیا۔اب بھی سپریم کورٹ کا ہر معزز جج یہی کہتا ہے کہ وہ افتخار چوہدری ہے ۔۔۔ افتخار چوہدری ہے۔ بھئی اگر ایسا ہی ہے تو ہمیں ہمارا چیف جسٹس ہی واپس کر دیں کیونکہ ہم ایک افتخار محمد چوہدری کو تو جیسے تیسے بھگت ہی لیں گے لیکن سترہ ''چوہدریوں'' کو بھگتنا حکومت کے بَس کا کیا، فوج کے بَس کا روگ بھی نہیں۔

اصل موضوع سے ہٹ کر عرض ہے کہ گولڈن شیک ہینڈ کے تحت 1997ء سے فارغ کیے گئے

ملازمین کی کمیٹی نے میرے ساتھ رابطہ کیا اور اپنے معاشی قتل کی داستانِ غم U.B.L سنائی۔اُن کے مطابق میاں محمد نواز شریف کے گزشتہ دورِ حکومت میں 5146 ملازمین کو جبری ریٹائر کیا گیا۔یہ ہزاروں ملازمین گزشتہ سولہ سالوں سے انصاف کے منتظر ہیں لیکن انصاف محوِ استراحت ہے۔اِن برخاست شُدہ ملازمین میں سے 50 دِل کا دورہ پڑنے سے جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے اور 200 سے زائد خود کشی کر چکے ہیں۔ہو سکتا ہے کہ محوِ خواب انصاف بچ رہنے والے باقی لوگوں کے صفحۂ ہستی سے مِٹ جانے کے انتظار میں ہو تاکہ ''نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری''۔برخاست شُدہ ملازمین کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ تو کہتے تھے کہ اگر دریائے فرات پر کُتا بھی مر جائے تو روزِ قیامت اُن کی پرسش ہو گی لیکن ہماری اسلامی حکومت کے مسلمان حکمرانوں کے کانوں پر ہماری حالتِ زار دیکھ کر بھی جوں تک نہیں رینگتی۔ہم اپیلیں کر کرکے تھک چکے ہیں لیکن کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ہمارے سابقہ چیف جسٹس صاحب جو چینی کی قیمت بڑھنے پر بھی ازخود نوٹس لے لیا کرتے تھے، اُنہیں بھی اپنے آٹھ سالہ ''دَورِ انصاف'' میں اِس معاشی قتل پر از خود نوٹس لینا یاد نہ آیا۔''ایمپلائز ہیومین اینڈ سوشل رائیٹ موومنٹ کمیٹی یونائیٹڈ بنک'' کے اراکین کے اِس معاشی قتل پر بیان کردہ حقائق کے مطابق بِلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے ساتھ صریحاً زیادتی کی گئی ہے۔اُن کے مطابق عالمی مالیاتی اداروں، ورلڈ بینک اور آئی۔ایم۔ایف کے رولز کے مطابق کسی بھی ادارے میں گولڈن شیک

ہینڈ کی صورت میں فارغ کیے جانے والے ملازمین کو سو فیصد مراعات دے کر رخصت کیا جاتا ہے جبکہ سولہ سال پہلے محترم میاں نواز شریف کے نااہل مشیروں کے مشورے میں ڈاؤن سائیزنگ کی گئی اور ملازمین کو 100 فیصد کی بجائے صرف UBL 50 پر فیصد مراعات پر ٹرخا دیا گیا جو عالمی مالیاتی ادوروں کے رولز کی صریحاً خلاف ورزی تھی حالانکہ مالیاتی اداروں نے بینک ملازمین کو فارغ کرنے کے لیے مالی امداد بھی دے رکھی تھی۔ میاں نواز شریف صاحب کی جلاوطنی کے دوران 2002ء میں UBL کے فارغ شُدہ ملازمین کا ایک وفد خانہ کعبہ میں میاں صاحب سے ملا۔اس وفد کے مطابق میاں صاحب نے نہ صرف اِس زیادتی پر اظہارِ افسوس کیا بلکہ بر سرِ اقتدار آنے کی صورت میں بقیہ 50 فیصد مراعات ادا کرنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ اگر حقائق یہی ہیں تو پھر ہم محترم وزیرِ اعظم صاحب سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اِن ملازمین کی داد رسی کرتے ہوئے اپنے وعدے کی لاج رکھیں گے کیونکہ وہ جنابِ آصف زرداری تو ہیں نہیں جن کے نزدیک ’’وعدے قُرآن و حدیث نہیں ہوتے‘‘۔ ہمیں یقین ہے کہ نوجوانوں کو معاشی طور پر مضبوط کرنے کا عزم لے کر نکلنے والے میاں نواز شریف صاحب اگر نوجوانوں پر اربوں روپیہ صرف کر سکتے ہیں تو معاشرے کے اِن پِسے ہوئے ڈھلتی عمر کے لوگوں کو اُن کا حق بھی ضرور دلائیں گے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

وقتِ رحلت حضرت خالدؓ بن ولید کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔پاس کھڑے تیمار دار صحابیؓ نے کہا ''خالدؓ ! کیا موت کا خوف ہے''؟۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے بچشمِ نم کہا'' موت کا کیسے خوف کہ یہ توبَر حق ہے۔میں تواِس لیے رو رہا ہوں کہ میں نے شوقِ شہادت میں دشمن کی صفوں میں گھُس گھُس کر حملے کیے لیکن شہادت نصیبہ نہ ٹھہری''۔لاریب ایک مومن کا مطلوب و مقصود ہی شہادت ہوتا ہے اور مُلّا عبد القادر شہید کا مطلوب و مقصود بھی یہی تھا۔

آج سولہ دسمبر ہے۔ یہ دن جب بھی آتا ہے میری عمر کے لوگوں کو بُری طرح اُداس کر دیتا ہے۔یہ وہی دن ہے جب ہم نے حضرتِ اقبالؒ کے خوابوں کو چکنا چور کرکے حضرت قائدِ اعظم کا احسان اتار پھینکا۔یہ وہی دن ہے جب جنرل نیازی نے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں اپنی غیرتوں کے تمغے نوچ کر جنرل اروڑا کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔یہ وہی دن ہے جب 90ہزار عاشقانِ پاکستان پابہ زنجیر ہوئے اور مجید امجد مرحوم نے لکھا''ریڈیو پر اِک قیدی مجھ سے کہتا ہے۔۔۔۔

میں زندہ ہوں۔۔۔۔ سُنتے ہو ! میں سلامت ہوں ''۔ لیکن نسلِ نَو کو تو شاید پتہ بھی نہیں ہو کہ یہ سانحہ کب ، کیوں اور کیسے رونما ہوا ۔ البتہ اِس سانحے کے ذمہ داروں میں بھٹو ، یحیٰ اور شیخ مجیب الرحمٰن کا نام ہی لیا جاتا ہے ۔ بھٹو پھانسی پہ جھولے ، شیخ مجیب الرحمٰن اپنے پورے خاندان سمیت (سوائے شیخ حسینہ واجد کے) قتل ہوئے اور یحیٰ گمنامی اور ذلت کی موت مرا۔

مُلّا عبد القادر کی شہادت نے دولخت ہوتے پاکستان کے زخموں کو کرید کے رکھ دیا ۔ بنگلہ دیش کی وزیرِ اعظم شیخ حسینہ واجد نے شاید مُلّا عبد القادر کی پھانسی کے لیے ماہِ دسمبر کا انتخاب کیا ہی اِس لیے تھا کہ وہ ہمارے زخموں کو تازہ کر سکے لیکن اُس وحشی عورت کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ یہ زخم بھرے ہی کب تھے جو ''ہرے'' ہوتے ۔

مُلّا عبد القادر شہید کو میں نے کبھی دیکھا ، نہ ملاقات ہوئی اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے الیکٹرانک میڈیا کی بدولت پہلی بار اُنہیں ٹی ۔ وی سکرین پر دیکھا لیکن میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وہ حضرت ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے فکر سے متاثر تھے اور میں بھی ۔ مجھے مُلّا عبد القادر شہید کی موت پر دُکھ ہے ، نہ صدمہ البتہ فخر ضرور ہے کیونکہ ربّ ِ کردگار نے حکمت کی عظیم ترین کتاب میں یہ درج کر دیا ہے ''شہید کو مُردہ مت کہو ، وہ زندہ ہے اور اپنے ربّ کے

ہاں سے خوراک حاصل کر رہا ہے البتہ تمہیں اِس کا ادراک نہیں''۔اِس لیے مجھے فخر ہے کہ اب بھی عالمِ اسلام میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کا مطلوب و مقصود محض اور محض شہادت ہے۔پھانسی کی رات بھی مُلّا عبد القادر شہید کے سامنے سیّد مودودی کی تفہیم القرآن کھلی تھی جس میں درج تھا ''غم نہ کرو، افسردہ نہ ہو، تُم ہی غالب رہو گے''۔اور پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ غالب تو مُلّا عبد القادر ہی رہا اور یزیدیت کے علمبردار ایک دفعہ پھر بدترین ہزیمت سے دو چار ہوئے۔پوری دنیا یزیدیت کے علمبرداروں پر لعن طعن کر رہی ہے اور مُلّا عبد القادر شہید کا نام زبان پر آتے ہی عقیدتوں بھری سرشاری پورے وجود کو گھیر لیتی ہے۔مجھے بدر کا میدان یاد آ رہا ہے جب دینِ مبیں کی طاغوت سے پہلی جنگ ہوا ہی چاہتی تھی۔ایک صحابیؓ آقا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مٹھی میں چند کھجوریں پکڑی ہوئی تھیں، عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ ! کیا جنت میں اِس سے بہتر کھجوریں ملیں گی''؟۔آقا ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا ''تحقیق کہ اِن سے بدرجہا بہتر''۔تب اُس صحابیؓ نے کھجوریں پھینک کر کہا اب جنت کی کھجوریں ہی کھاؤں گا''۔پھر جنت کی کھجوریں کھانے کا شوق اُس صحابیؓ کو'' رُتبۂ شہادت سے سرفراز کر گیا۔مُلّا عبد القادر شہید تو جنت کی خوراک سے لطف اندوز ہو رہے ہیں لیکن شیخ حسینہ واجد کے حصّے میں کیا آیا سوائے ذلت و رسوائی کے ؟۔اِس کے باوجود بھی میرا ایمان ہے کہ قدرت حسینہ واجد سے ضرور انتقام لے گی۔یہ بجا کہ ربّ کی رسی دراز ہے لیکن اُس

کی پکڑ بھی اُتنی ہی مضبوط۔انشاء اللہ ایک دِن ایسا ضرور آئے گا جب یہی کٹہرا ہوگا، یہی پھانسی کا پھندا اور یہی حسینہ واجد۔بس انتظار کیجئے۔۔۔۔ تھوڑا انتظار۔

سولہ دسمبر کے سانحے کے پیچھے کئی عوامل تھے جن پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔اِس مختصر سے کالم میں اتنی گنجائش ہی نہیں کہ اِس سانحے کی وجوہات پہ تبصرہ کیا جائے البتہ جماعت اسلامی کی ''البدر'' اور ''الشمس'' کے خلاف آگ اُگلنے والے سیکولر تجزیہ نگاروں سے یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی کو پاکستان مخالف جماعت کہنے والو ! تُم اُس وقت کہاں تھے جب اسی جماعت کے نوجوان پاک فوج کے کندھے سے کندھا ملا کر قائدِ اعظم کے پاکستان کو بچانے کے لیے قُربانیاں دے رہے تھے ؟مُلّا عبد القادر شہید تو پھانسی کی رات بھی اپنے آخری خط میں یہ لکھ گئے '' اللہ پاکستان کے مسلمانوں اور میرے بنگلہ دیش کے مسلمانوں پر آسانی فرمائے اور دشمنانِ اسلام کی سازشوں کو ناکام کر دے'' لیکن ہمارے سیکولر دانشوروں کو تو خیر کیا توفیق ہوتی ، حاکمانِ وقت بھی مہر بلب اور اِس سانحے کو بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ قرار دے رہے ہیں۔سوال مگر یہ ہے کہ مکتی باہنی اور بھارتی افواج کے خلاف سینہ سپر ہونے والے غیر بنگالی کس کی جنگ لڑ رہے تھے ؟۔کیا پاکستان بچانے کی ؟۔اگر جواب ہاں میں ہے تو پھر بنگلہ دیش کے کیمپوں میں بد ترین

زندگی گزارنے والے بنگلہ دیشی ہیں یا پاکستانی ؟۔سوال یہ بھی ہے کہ اگر بنگلہ دیش میں جاں بحق ہونے والے ہمارے فوجی جوان شہید تھے اور لا ریب وہ شہید ہی تھے تو پھر البدر اور الشمس کے جوان شہید کیوں نہیں ؟۔اگر وہ بھی ''شہدائے پاکستان'' ہی ہیں تو پھر اُن کے خلاف دراز ہوتی زبانوں کو لگام دینے والے کہاں جا سوئے ہیں ؟۔اور اُن شہداء کے ورثاء کو محبانِ پاکستان قرار دے کر انتہائی عزت و احترام سے پاکستان کیوں نہیں لایا جاتا ؟۔وزیرِ اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف نے 1992ء میں بنگلہ دیش کی وزیرِ اعظم خالدہ ضیاء صاحبہ کے ساتھ اسلام آباد میں کی گئی مشترکہ کانفرنس میں بنگلہ دیش میں محصور ہونے والوں کو ''محصورینِ پاکستان'' قرار دے کر پاکستان لا کر پنجاب میں آباد کرنے کا وعدہ فرمایا تھا جو تا حال ایفا نہیں ہوا۔ 1988ء میں رابطہ عالمِ اسلامی اور حکومتِ پاکستان نے ایک بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کیے جس کے مطابق اِن محصورین کو پاکستان لا کر آباد کرنا تھا لیکن وہ معاہدہ بھی تا حال تشنۂ تکمیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں محمد نواز شریف کو ایک دفعہ پھر دو تہائی اکثریت کے ساتھ پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ سے نوازا ہے۔کیا وہ اپنے موجودہ دَورِ حکومت میں اپنا 1992ء میں کیا گیا وعدہ ایفاء کریں گے ؟۔یاد رہے کہ ہم نے گزشتہ کئی عشروں سے لگ بھگ 20 لاکھ افغانیوں کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔اُن میں سے

بیشمار ایسے ہیں جن کے پاس پاکستانی شناختی کارڈ بھی موجود ہیں اور وہ یہاں اپنا کاروبار بھی جمائے بیٹھے ہیں اور جب جی چاہتا ہے بم دھماکے بھی کر دیتے ہیں۔پاکستانی حکومت خوب جانتی ہے کہ کتنے ہی غیر ملکی دہشت گرد ہیں جو انہی افغانیوں کے ہاں پناہ لیتے ہیں لیکن حکومتِ وقت نے پاکستان پر بننے والے اِس بوجھ پر کبھی توجہ نہیں دی اور نہ ہی کبھی ایسی کوئی کوشش ہوئی ہے کہ اِن زبردستی کے ''مہمانوں'' کو اُن کے اپنے ملک میں بھیجا جاسکے البتہ اڑھائی لاکھ محصورینِ بنگلہ دیش شاید ہماری معیشت پر بہت بڑا بوجھ ہیں جو چار عشروں سے زائد گزرنے کے باوجود تا حال پاکستانی کہلانے کے حق سے محروم ہیں۔

”وزیرِ اعظم کی“ یوتھ لون سکیم

ایک بہت پرانا گھِسا پٹا لطیفہ ہے کہ شیخ چلی ایک درخت پر چڑھ کر اُسی شاخ کو کاٹ رہا تھا، جس پر وہ بیٹھا تھا۔ قریب سے گزرنے والے ایک شخص نے شیخ چلّی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس سے کہا کہ ”اِس شاخ کو کاٹنے سے باز رہو، گر جاؤگے“۔ شیخ چِلّی نے ماتھے پر بَل ڈال کر کہا ”جاؤ بابا! اپنا کام کرو“۔ وہ شخص اپنی راہ ہو لیا لیکن وہ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ درخت کی شاخ کٹی اور شیخ چِلّی دھڑام سے نیچے آ رہا ۔ وہ زمین سے اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا اُس شخص کے پیچھے بھاگا۔ پاس پہنچ کر شیخ چِلّی نے اُس شخص کے پاؤں پکڑ لیے ۔ اُس شخص نے حیرت سے پوچھا ”اب کیا ہوا“؟۔ تب شیخ چِلّی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا ”میں آپ کے ہاتھ پہ بیعت ہونا چاہتا ہوں، آپ ولی دَوراں ہیں کیونکہ آپ کو پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ میں گرنے والا ہوں“۔

جس جس کو ہمارے ہاتھ پہ بیعت کرنی ہو، ابھی سے کر لے کیونکہ ہماری الہامی کیفیات نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ وزیرِ اعظم کی یوتھ لون سکیم ثمر آور نہیں ہو گی ۔ ہمارے پاس اِس سکیم کی ناکامی کے دلائل نہیں اور نہ ہی ہم اِس فضول

بحث میں اُلجھنا چاہتے ہیں کہ یہ سکیم ناکام کیوں ہو گی۔ہمیں تو اور بہت سے تجزیہ نگاروں کی طرح الہام ہوا ہے کہ اِس سکیم نے ناکام ہونا ہی ہونا ہے البتہ اِس سکیم کی ناکامی کی ایک وجہ جو ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اِس میں عمر کی حد 45 سال مقرر کی گئی ہے اور ہم ٹھہرے 45 سال سے زیادہ۔جس سکیم سے ہم مستفید نہیں ہو سکتے اُس کی کامیابی بھلا کیسے ممکن ہے۔ ویسے تو پہلے بھی ہم اِس سکیم کے بارے میں وہم میں مبتلاء تھے کیونکہ ہمارے بڑے بوڑھے یہ کہہ گئے ہیں کہ قرض ایک لعنت ہے اور ہمیں چچا غالب بھی یاد ہیں جو فرما گئے کہ

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دِن

اِس کے علاوہ اِس قرضے میں ''سود'' کا عنصر بھی شامل ہے جو حرام ہے اِس لیے اگر ہم اِس سکیم سے مستفید نہیں ہو سکتے تو اِس میں ہمارا ہی بھلا ہے۔ویسے آپس کی بات ہے کہ اگر ہم 45 سال سے کم کے ہوتے تو سب کچھ بھول کے ایک دفعہ تو ضرور ''قرض کی مے'' سے لطف اندوز ہوتے لیکن ہمارے لیے چونکہ انگور کھٹے ہیں اِس لیے ہمیں یقین ہے کہ اس سکیم کی ناکامی کے بعد حکومت کو بھی ''کھٹی ڈکاریں'' آنے لگیں گی اور ہماری اپنی'' حکومت کے پاس تو ہاضمہ درست کرنے کے لیے کوئی ''فرینڈلی گولی'''' بھی نہیں اور بقول وزیرِ اطلاعات حکومت کے

میڈیکل بکس'' کی ساری گولیاں ہی کڑوی ہیں۔''

اَب جب کہ ہماری الہامی کیفیات نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ یہ سکیم ناکام ہو گی تو پھر سوال یہ ہے کہ حکومت جانتے بوجھتے ہوئے بھی یہ ''کڑوی گولی'' نگلنے کی کوشش کیوں کر رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اِس کے پیچھے بھی امریکہ کا ہاتھ ہے۔ وہاں بیٹھے بارک اوباما نے امریکی یوتھ کو بھڑکا کر اپنے پیچھے لگایا اور امریکہ کا صدر بن بیٹھا۔ اِدھر ہمارے کپتان صاحب نے بھی یہی فارمولا استعمال کرتے ہوئے پاکستانی یوتھ کو ساتھ ملا کر ''ڈھول ڈھمکا'' شروع کر دیا جس کا توڑ کرنے کے لیے ہمارے خادمِ اعلیٰ نے ''رج کے'' لیپ ٹاپ تقسیم کرکے نواز لیگ کو ''سونامیوں'' سے صاف بچا لیا۔ اب ایک دفعہ پھر حکومت امتحان گاہ میں ہے، بلدیاتی انتخابات سَر پر ہیں اور عمران خاں صاحب یوتھ کو ساتھ ملا کر پنجاب میں مہنگائی کے خلاف ہنگامہ بپا کرنے والے ہیں اِس لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ یوتھ کو اعتماد میں لیا جاتا اور ظاہر ہے کہ اِس دَورِ جدید میں پیسے کے بغیر کون اعتماد کرتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ محترم خاں صاحب مہنگائی کے خلاف یہ تحریک خیبر پختونخواہ سے کیوں شروع نہیں کرتے؟۔ یہ سب سازشی لوگ ہیں جو خوب جانتے ہیں کہ خیبر پختونخواہ میں تو پہلے ہی مہنگائی پنجاب سے کہیں زیادہ ہے اور وہاں حکومت بھی سونامیوں کی ہے اِس لیے وہ چاہتے ہیں کہ خاں صاحب ''پٹھانوں'' کو چھیڑ ''کر اپنے آپ کو ''وخت

میں ڈال لیں۔

یوتھ لون سکیم کی چیئرپَرسن محترمہ مریم نواز شریف نے ایک ٹاک شو میں جو فرمایا وہ ہمارے مَن کو بہت بھایا۔جب اُن سے یہ سوال کیا گیا کہ اگر یہ سکیم ناکام ہو جاتی ہے تو کیا اِس کی ناکامی کا بوجھ وزیرِ اعظم برداشت کر سکیں گے ؟۔ محترمہ مریم نواز نے جواباً پوری قطیعت سے کہا کہ ساڑھے چار سال بعد جب آپ سے دوبارہ ملاقات ہو گی تو حکومت بڑے فخر سے کہہ سکے گی کہ اُس نے '' یوتھ '' کو اُس کے پاؤں پر کھڑا کر دیا ۔اُنھوں نے قدرے جذباتی انداز میں کہا کہ جب 100 ، ارب روپیہ پانچ خاندانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اُس قرضے کی واپسی کی کوئی سبیل بھی نہیں نکلتی تو کسی کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی لیکن اگر حکومت 100 ، ارب روپیہ ایک لاکھ نوجوانوں میں تقسیم کرکے اُنہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کر رہی ہے تو کیڑا کاری کا طوفان بپا ہو گیا ہے۔ محترمہ مریم نواز کی اِس بات میں کوہ ہمالیہ جتنا وزن ہے ، واقعی ہماری اشرافیہ نے کھربوں ڈکار کر نشان تک نہ چھوڑا اب جب ہماری یوتھ کے ''ڈکارنے'' کی باری آئی ہے تو لوگوں کے پیٹ میں کیوں مروڑ اُٹھنے لگے ہیں ۔یوتھ تو یہ کہتی ہے کہ ہمیں تو اِس سمندر سے بقدرِ قطرۂ شبنم بھی نہیں مل رہا اور ہم تو یہ شکوہ کرنے والے تھے کہ

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم

بخیلی ہے یہ ، رزاقی نہیں ہے

لیکن یہاں تواِس ''قطرۂ شبنم''پر بھی ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔بندہ پوچھے کہ اگر ہمارے نوجوانوں میں اتنا بھی تقسیم نہ کیا جاتا تو پھر کیا آمدہ بلدیاتی انتخابات محترم عمران خاں کی ہتھیلی پر رکھ دیئے جاتے ؟۔اُدھر خاں صاحب کی ''سونامی'' اونچے سُروں میں مہنگائی مار گئی'' الاپ رہی ہے اور خود تحریکِ انصاف ''لنگوٹ ''کَس کر 20 دسمبر کو'' اکھاڑے میں اُترنے والی ہے اور اِدھر ہماری انتہائی معزز و محترم کورٹس بھی ایسی ''طوطا چشم'' نکلی ہیں کہ ہر فیصلہ نواز لیگ کے خلاف ہی جا رہا ہے۔حکومت نے چیئرمین نادرا کو نوکری سے نکالا تو اسلام آباد ہائی کورٹ نے اُسے دو گھنٹوں میں بحال کر دیا، چیئرمین پیمرا کو برخاست کیا تو اُس کی بحالی میں بھی دو گھنٹوں سے زیادہ نہیں لگے ۔ سپریم کورٹ کے نئے نویلے چیف جسٹس جناب تصدق حسین جیلانی نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے ہوئے نواز لیگ کو ہی ''پھڑکایا'' ۔ محترم عمران خاں چار حلقوں میں ووٹوں کی تصدیق کے لیے کئی مہینوں سے چیخ رہے تھے لیکن کہیں شنوائی نہیں ہو رہی تھی ۔ محترم چیف جسٹس صاحب نے الیکشن کمیشن کو ''لتاڑتے'' ہوئے 15 دنوں کے اندر رپورٹ طلب کر لی اور ہمیں بھی زندگی میں پہلی بار الیکٹرانک میڈیا پر ہنستے مسکراتے خاں صاحب کا دیدار کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور خاں صاحب نے بھی کہہ دیا'' اب سپریم کورٹ صحیح فیصلے

کر رہی ہے"۔اِن حالات میں چاروں طرف سے گھری ہوئی نواز لیگ کے ہاتھ سے نسلِ نَو بھی نکل جاتی تو پھر باقی کیا بچتا؟۔ہمارے خیال میں یوتھ پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے 100 ، ارب روپے کا"جُوا" مہنگا نہیں۔اگر کچھ نوجوانوں نے اپنا مستقبل سنوار لیا تو اُسے "پرافٹ" سمجھ کر جشن منائیے۔

بلدیاتی انتخابات اور احتجاجی سیاست

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

بد نصیبی ہے ، فقط بد نصیبی کہ زباں نے دل کی رفاقتوں سے مُنہ موڑ لیا ہے اور چشمِ بینا کے مشاہدوں سے یکسر مختلف جا بجا جھوٹ کی فصل اگائی جا رہی ہے ۔اِس قحط الرجال میں کوئی ایسا اہلِ فکر و نظر اور صاحبِ بصارت و بصیرت نظر نہیں آتا جو جھوٹ سے سچ کو نتھار کے رکھ دے البتہ ''نا روا'' کو ''روا'' کہنے والے ایسے بیشمار جو مسیحائی کے دعویدار بھی ہیں اور یہ ضِد بھی کہ اُنہیں مسیحا مان لیا جائے ۔لیکن گرگٹ کی طرح پَل پَل رنگ بدلنے والوں پر کیسے ایمان لے آؤں کہ

قول کے کچے لوگوں سے نسبت پہ کیسا ناز
دھوبی کے کتے کا کیا ہے جس کا گھر نہ گھاٹ

ہر کسی کی اپنی اپنی ڈفلی ہے اور اپنا اپنا راگ اور ڈُگڈگی بجا کر ''تماشا'' کرنے والے بھی ڈھیروں ڈھیر ۔ہم فقط بندر کہ جنہیں ناچنا تو آتا ہے ، نچانا نہیں ، ہر گز نہیں ۔ میڈیا آزاد ہوا تو ہم نے سُکھ کا سانس لیا کہ اب جمہورت پلے گی ، بڑھے گی ،

پھولے گی، پھلے گی لیکن میڈیا کچھ زیادہ ہی ''آزاد'' اور بے باک ہو گیا۔ یہ آزادی و بے باکی بھی گوارا تھی کہ کوئی تو ہے جو اونچے ایوانوں کے باسیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہے۔ لیکن میڈیا کے مہربانوں نے اپنے اپنے قبلے سجا لیے۔ عوامی افراتفری کے لیے تو ''مُلّا'' ہی کافی تھے جنھوں نے قوم کو فرقوں میں بانٹ کر اپنی آڑھت سجا رکھی ہے لیکن آزاد وبیباک میڈیا نے اُن سے بھی کئی ہاتھ آگے نکل کر قومی یکسوئی ویکجہتی کو ہی بھسم کر ڈالا۔ الیکٹرانک میڈیا کے ہر چینل کا ہر اینکر اپنے اپنے خداؤں کی چوکھٹ پہ سجدہ ریز نظر آتا ہے اور پرنٹ میڈیا کا ہر لکھاری اپنے اپنے ممدوح کی مدح سرائی میں مشغول۔ ریٹنگ بڑھانے کے شوق نے اُس یکسوئی کو دریا برد کر دیا ہے جسکی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ اب سچ کے کھلیانوں کو جھوٹ کے بارود نے یوں اُجاڑا ہے کہ سچ کی کھیتیوں میں سرسوں کے پھولوں کی طراوت سے ذہنی بالیدگی قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔

محترم عمران خاں صاحب نے لاہور کی مال روڈ پر محفل سجائی۔ اجتماع مہنگائی کے خلاف تھا لیکن اِس محفل میں مہنگائی کا مارا کوئی ایک بھی نظر نہ آیا۔ ہر سو میلے کا سا سماں تھا، بھنگڑے ڈالے جا رہے تھے، بندر نچائے جا رہے تھے اور موسیقی کی دھنوں سے دل گرمائے جا رہے تھے۔ مہنگائی کا تو صرف بہانہ تھا، اصل قصہ یہ تھا کہ محترم عمران خاں صاحب نے بلدیاتی انتخابات جیتنے

کا ڈول ڈالا اور ایک دفعہ پھر اپنے سونامی کو لے کر محوِ سفر ہوئے۔ پہلا پڑاؤ ''تختِ لاہور'' کہ اُسے سَر کرنے کی خواہش نے خاں صاحب کو عرصۂ دراز سے بے چین کیا ہوا ہے۔ ایک تماشا ڈاکٹر طاہر القادری نے بھی دکھایا تھا، وہ بھی کنٹینر پر سوار ہو کر ملک بچانے نکلے تھے لیکن نیتوں کے فتور نے اُنہیں اپنا بستر بوریا سمیٹ کر اپنے دیس کینیڈا'' جانے پر مجبور کر دیا۔ اب ایک تماشا تحریکِ انصاف دکھا رہی ہے۔ وہی کنٹینر، '' وہی سردیوں کی ٹھٹھرتی شامیں، وہی ٹسوے، وہی ڈُگڈگی اور اُس پر ناچنے والے بھی وہی۔ محترمہ مریم نواز کہتی ہیں کہ ''لاہوریے'' بڑے ظالم ہیں جنہوں نے پہلے خاں صاحب کو ووٹ نہیں دیئے اور اب اُن کے احتجاج میں بھی شریک نہیں ہوئے جبکہ میاں محمود الرشید اور عبد العلیم کامیاب شو پر مبارکبادیں وصول کر رہے ہیں۔ پنڈی والے شیخ رشید صاحب کو انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آنے لگا اور شاید شیخ صاحب کے اسی ''سمندر'' سے متاثر ہو کر خاں صاحب نے بھی کہہ دیا کہ اب قوم کو پتہ چل گیا ہو گا کہ 11 مئی کو دھاندلی ہوئی تھی۔ اِس احتجاج کو کوئی 10 ہزار کا اجتماع کہہ رہا ہے تو کوئی بیس ہزار کا لیکن تحریکِ انصاف کے نزدیک یہ مجمع پچاس ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان تھا۔ اگر حاضرین کی تعداد پچاس، ساٹھ ہزار بھی تھی تو پھر بھی اسے کامیاب شو قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تحریکِ انصاف نے بلدیاتی انتخابات کے لیے منتخب کردہ اپنے ٹکٹ ہولڈرز کو اِس احتجاج میں بھرپور شرکت کا حکم دے رکھا تھا۔ سبھی جانتے

ہیں کہ مقامی سطح پر ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں ذاتی تعلقات کا عنصر سب سے موثر کردار ادا کرتا ہے۔اِس لحاظ سے یہ تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔اِس لیے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بلدیاتی انتخابات کے نتائج کے بعد تحریکِ انصاف ایک دفعہ پھر دھاندلی کا علم بلند کیے سڑکوں پر ہو گی۔

اگر تحریکِ انصاف کا یہ احتجاج واقعی مہنگائی کے خلاف تھا تو پھر خاں صاحب کو یہ احتجاج خیبر پختونخواہ میں اپنی ہی حکومت کے خلاف کرنا چاہیے تھا جہاں مہنگائی کا عفریت مفلسی نہیں، ہر مفلس کو نگلتا جا رہا ہے اور اشیائے خورو نوش کی قیمتیں پنجاب سے کہیں زیادہ ہیں۔خاں صاحب سے جب بھی یہ سلگتا سوال کیا جاتا ہے کہ خیبر پختونخواہ میں اتنی مہنگائی کیوں ہے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے ہیں۔یادش بخیر، اُنھوں نے یہ فرمایا تھا کہ قوم کو چھ ماہ کے اندر خیبر پختونخواہ حکومت میں واضح فرق نظر آنے لگے گا۔چھ ماہ تو گزر چکے لیکن وہ "فرق" کہیں نظر نہیں آتا البتہ اپنوں کو جی بھر کے نوازنے کا سلسلہ ضرور دراز ہوتا چلا جا رہا ہے۔اب تو خاں صاحب کو یہ ادراک کر لینا چاہیے کہ یہ جذباتی قوم تھوڑی بے وقوف ضرور ہے لیکن اتنی بھی نہیں جتنا کہ اُنھوں نے سمجھ رکھا ہے۔اُنھوں نے مینارِ پاکستان پر ایک انتہائی موثر اور کامیاب شو کا انعقاد کرکے اہلِ سیاست و ثروت کے ایوانوں میں ہلچل تو ضرور پیدا کی لیکن اُن کی نیت اُس وقت قوم پہ آشکارا ہو گئی جب

اُنھوں نے وہی پرانے ، پھٹے ہوئے اور دیمک زدہ چہرے اپنے ساتھ ملا کر یہ اعلان کر دیا کہ آسمان سے فرشتے کہاں سے لاؤں ، انہی سے گزارا کرنا ہوگا۔اُس دن سے اوجِ ثریا پہ مقیم خاں صاحب کی تنزلی کا سفر شروع ہوا جو تا حال جاری ہے اور تب تک جاری رہے گا جب تک خاں صاحب تلخ حقیقتوں کا ادراک نہیں کر لیتے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ نواز لیگ نے قوم کو مایوس کیا ہے ، بہت مایوس لیکن کچھ لوگ وقت کے عنصر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اب بھی اس سے اُمیدیں باندھے بیٹھے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ تا حال نواز لیگ کو ملکی سطح پر کسی مشکل صورتِ حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔اگر تحریکِ انصاف کے عقیل و فہیم اصحاب کپتان صاحب کو یہ مشورہ دیتے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں صوبہ خیبر پختونخواہ کو ایک ماڈل صوبہ بنانے میں صرف کر دیں تو شاید یہ صرف نواز لیگ ہی نہیں ، دیگر سیاسی جماعتوں کے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہوتا اور جب لوگ خیبر پختونخواہ کو بطور ''ماڈل'' پیش کرنے لگتے تو اقتدار کے ایوانوں میں بھی کچھ ہلچل محسوس ہونے لگتی اور مقتدر ہستیاں اپنا سیاسی مستقبل بچانے کے لیے قوم کی اشک شوئی کی طرف متوجہ ہو جاتیں ۔اگر پھر بھی اونچے ایوانوں میں ہلچل پیدا نہ ہوتی تو لاریب خاں صاحب قوم کے واحد اور مسلمہ رہنما بن کر اُبھرتے اور اُنہیں دھرنوں کی ضرورت ہوتی نہ احتجاجی سیاست کی ۔لیکن خاں صاحب نے اپنا

اندازِ سیاست بدلا نہ مستقبل قریب میں بدلنے کے آثار نظر آتے ہیں۔ بخدا جی یہی چاہتا ہے کہ خاں صاحب قوم کی بھلائی کے لیے کچھ ایسا کر گزریں کہ ہم جیسے ناقدین بھی بے اختیار اُن کی تحسین کرنے لگیں لیکن خاں صاحب نے جو وطیرہ اختیار کر رکھا ہے اُسے دیکھ کر تو سوائے مایوسیوں کے اور کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سجھائی۔ کاش کہ قدرے ضدی لیکن عزمِ صمیم کے حامل، انتھک محنت کرنے اور ناکامیوں سے دل برداشتہ نہ ہونے والے محترم عمران خاں صاحب راہِ راست اختیار کرتے ہوئے اپنے سونامی کا رُخ کرسیَ اقتدار کی بجائے مجبوروں اور مقہوروں کی طرف موڑ لیں کہ اسی میں اُن کا بھلا ہے اور ملک و قوم کا بھی۔

تحریکِ انصاف اور پیپلز پارٹی میں قُربتیں اور فاصلے

سیاست کے سینے میں دِل ہوتا ہے نہ اِس کا کوئی مذہب۔بقول جنابِ آصف زرداری سیاسی وعدے قُرآن و حدیث نہیں ہوتے کہ توڑنے والا گناہ گار بن جائے ۔یہاں تو سب چلتا ہے۔۔۔چلتا کیا، دوڑتا ہے اور حالات و واقعات ہی طے کرتے ہیں کہ کس کی دوستی اچھی اور کس کی دشمنی۔یہاں مشرف کے پہلو میں جگہ پانے والے ''فنکار'' میاں نواز شریف صاحب کے سینے سے چمٹے دکھائی دیتے ہیں اور پیپلز پارٹی کے وزارتِ عُظمیٰ کے امیدوار تحریکِ انصاف کی وائس چیئرمینی حاصل کرکے اتراتے پھرتے ہیں ۔محترم عمران خاں متعدد بار یہ اعلان کر چکے کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ کسی قسم کی کوئی ایڈجسٹمنٹ نہیں ہو گی لیکن اب چوری چوری ،چُپکے چُپکے بلدیاتی انتخابات میں کامیابی کے لیے رابطے بھی ہو رہے ہیں اور وعدے وعید بھی ۔پیپلز پارٹی کے '' نوخیز ''چیئرمین بلاول زرداری ایک تیر سے دو شکار کرنے کی تگ و دَو میں ہیں ۔اُنہیں ایک طرف تو لاہور میں تحریکِ انصاف کے احتجاج میں بڑی کشش نظر آتی ہے لیکن ساتھ ہی وہ تحریکِ انصاف کے نیٹو سپلائی کے خلاف دھرنوں کے شدید مخالف بھی ہیں ۔مہنگائی کے خلاف احتجاجی دھرنے میں اِس لیے کشش کہ اِس سے نواز لیگ کو ''ٹَف ٹائم'' ملتا ہے اور نیٹو سپلائی کی بندش کے اِس لیے خلاف کہ امریکہ کی خوشنودی مقصود ہے۔

پاکستان میں جمہوریت کا حُسن یہی ہے کہ جب اور جہاں جی چاہے قدم رنجہ فرمایئے آپ کو ہر سیاسی گھر اور دَر پر ''اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما'' لکھا ملے گا۔ ہمارے بھولے بھالے سیاسی نومولود کپتان صاحب نے اِس اندازِ سیاست سے ہٹ کر چلنا چاہا لیکن جب وہ میدانِ عمل میں کودے تو ادراک ہوا کہ ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا''۔ اب وہ بھی تھوڑے تھوڑے سیاسی ہوتے جا رہے ہیں اور اُن کی مُنہ زور، ہٹ دھرم ''سونامی'' کو بھی سمجھوتوں کی سیاست نے رام کر لیا ہے۔ اب خاں صاحب میں وہ گرمیٔ کلام نظر آتی ہے نہ اُن کی سونامی میں سرکشی۔ اہلِ سیاست کا یہ انوکھا اور نرالا اندازِ سیاست ہم جیسے جاہلوں کی سمجھ سے بالاتَر ہے۔ پیپلز پارٹی اور تحریکِ انصاف ایک طرف تو مِل بیٹھ کر بلدیاتی انتخابات میں پنجاب میں نواز لیگ کے خلاف منصوبے باندھ رہی ہیں جبکہ دوسری طرف نواز لیگ، تحریکِ انصاف اور ایم کیو ایم سمیت تقریباً تمام سیاسی جماعتیں پیپلز پارٹی کے خلاف مِل کر بلدیاتی انتخاب لڑ رہی ہیں۔ محترم عمران خاں نے جہاں پیپلز پارٹی کے خلاف ''ہتھ ہَولا'' رکھا ہوا ہے وہیں پیپلز پارٹی تحریکِ انصاف کی تحسین بھی کرتی ہے اور تنقید بھی۔

قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر سیّد خورشید شاہ نے فرمایا کہ لاہور میں

تحریکِ انصاف کے اجتماع کو دیکھ کر حکمرانوں کو آنکھیں کھولنی چاہئیں لیکن ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی فرما دیا کہ اگر مہنگائی کم نہ ہوئی تو عمران خاں کے جلسے سے دَس گنا زیادہ لوگ سڑکوں پر لے آئیں گے۔ گویا اُن کے خیال میں اصل سونامی پیپلز پارٹی کے پاس ہے جسے اُس نے ابھی تک چھپا کے رکھا ہوا ہے۔ ''کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے'' کی عملی تصویر بنے شاہ صاحب نے فرمایا کہ مہنگائی صوبائی نہیں، وفاقی معاملہ ہے۔اِس کے باوجود بھی اگر عمران خاں سندھ میں آ کر احتجاج کرنا چاہتے ہیں تو یہ اُن کا جمہوری حق ہے۔اِس کے ساتھ ہی شاہ صاحب نے خاں صاحب کے 6 جنوری کو سندھ میں احتجاج کرنے کے حوالے سے ''زیرِ مونچھ'' مُسکراتے ہوئے فرمایا کہ خیبر پختونخواہ میں تو ٹماٹر 2 روپے کلو، آٹا 5 روپے کلو اور گھی مفت ملتا ہے۔اِس لیے ظاہر ہے کہ وہ وہیں احتجاج کریں گے جہاں مہنگائی ہو گی۔شاہ صاحب نے تو ازراہِ تفنن یہ کہا لیکن یہ عین حقیقت ہے کہ ہمارے پختون بھائی خاں صاحب سے یہی توقع لگائے بیٹھے تھے۔اُن کا خیال تھا کہ بجلی تو اُنہیں پہلے ہی مفت ملتی ہے، اب اگر یہ اشیائے خورونوش بھی مفت ملنا شروع ہو جائیں تو اِن ایامِ مفلسی میں کم از کم ''نسوار'' کے پیسے تو بچ ہی رہیں گے۔ہمارے خواجہ محمد آصف سیالکوٹی نے تو کمال شفقتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بندوبست کر ہی دیا تھا لیکن تحریکِ انصاف طرح دے گئی۔ہوا یوں کہ عمران خاں صاحب نے لاہور میں احتجاجی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بجلی کی مہنگائی وفاقی معاملہ ہے

اگر وفاقی حکومت بجلی کا انتظام ہمارے سپرد کر دے تو ہم بجلی سستی کر دیں گے ۔ ہمارے خواجہ آصف بھی بڑے کائیاں ہیں ۔ اُنہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً کہہ دیا کہ بسم اللہ ، وہ بجلی کا انتظام خیبر پختونخواہ حکومت کے حوالے کرنے کو تیار ہیں اور انتظار میں ہیں کہ کب خیبر پختونخواہ کی حکومت بجلی کا انتظام سنبھالتی ہے ۔ دراصل خواجہ صاحب تو پہلے ہی اُن پختون بھائیوں سے ''اوازار'' بیٹھے تھے جو بجلی تو بڑے دھڑلے سے استعمال کرتے لیکن بِل دینے کی بجائے نسوار خرید لیتے ۔ اُنہیں بار بار وہ ''فیڈر'' بند کرنے پڑتے جہاں 95 فیصد لوگ بِل ہی نہیں دیتے تھے ۔ شنید ہے کہ خیبر پختونخواہ میں اوسطاً 40 فیصد بجلی کا بِل ادا کیا جاتا ہے اور باقی ہڑپ کر لیا جاتا ہے ۔ خواجہ صاحب کے اِس بیان حکومت ''وَخت'' میں پڑ گئی اور وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک پہلے سے بھی کمزور KPK کے بعد دکھائی دینے لگے ہیں ۔ محترم پرویز خٹک خوب جانتے ہیں کہ وہ اوّل تو اپنے پختون بھائیوں سے بجلی کا بِل وصول ہی نہیں کر پائیں گے اور اگر زور زبردستی سے بِل وصول سے تحریکِ انصاف کا پتّا صاف ہو جائے گا کیونکہ خیبر پختونخواہ کے KPK کر بھی لیا تو عوام حکومتیں بدلنے کے بہت شوقین ہیں ۔ ویسے بھی آفتاب احمد شیرپاؤ کی علیحدگی کے بعد تحریکِ انصاف کی حکومت کچھ کمزور کمزور سی دکھائی دینے لگی ہے اور محترم مولانا فضل الرحمٰن حکومت سنبھالنے کے لیے ہر وقت ''ڈنڈ بیٹھکیں'' لگاتے رہتے ہیں ۔ مولانا صاحب یہ سنہری موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے ۔

دروغ بَر گردنِ راوی محترمہ شیریں مزاری نے تو صاف کہہ دیا کہ ''چھڈ خواجہ ! مخول نہ کر'' ۔اُنھوں نے خواجہ آصف صاحب کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ خواجہ صاحب کو اپنی وزارت سنبھالنی چاہیے اور پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے سے گریز کرنا چاہیے ۔محترمہ شیریں مزاری صاحبہ کا فرمان بالکل بجا ہے کیونکہ تحریکِ انصاف پہلے ہی کے معاملات سنبھالے نہیں سنبھل رہے ، ڈرون حملے بند نہیں KPK ، بوکھلائی ہوئی ہے ہو رہے اور نیٹو سپلائی کی بندش کے دھرنوں نے ''سونامیوں'' کو مضمحل کر دیا ہے ۔اُدھر لاہور کے احتجاج میں بھی وہ مزہ نہیں آیا جو تحریکِ انصاف کے جلسوں میں آیا کرتا ہے اِس لیے محترمہ شیریں مزاری نے اگر کہا تو سچ کہا کہ

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری ، راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ، ہم بیزار بیٹھے ہیں

سے پونے پانچ روپے فی KPK محترم جہانگیر ترین فرماتے ہیں کہ مرکزی حکومت حکومت کو فروخت کرتی KPK یونٹ کے حساب سے بجلی خریدتی ہے اور پھر مہنگے داموں ہے ۔اُنھوں نے جو کچھ کہا وہ بھی بالکل سچ ۔سوال مگر یہ ہے کہ کیا مہنگے داموں بجلی فروخت کرنے کے باوجود مرکزی حکومت سارا ''ریوینیو'' اکٹھا کرپاتی ہے ؟۔خواجہ آصف صاحب جو اعداد و شمار بتاتے ہیں اُس کے مطابق تو

مہنگے داموں بجلی فروخت کرنے کے باوجود بھی سودا گھاٹے کا ہی ہے۔ اب جب کہ خواجہ حکومت کو ''پیسکو'' کا چارج سنبھالنے کا عندیہ دے دیا ہے تو KPK آصف صاحب نے اب خیبر پختونخواہ حکومت کو دیر نہیں کرنی چاہیے۔

ایک تخیلاتی سیاسی جماعت کا خاکہ

پاکستان کی ''حاضر سٹاک'' سیاسی جماعتوں کی انتہائی مایوس کُن کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال اُبھرتا ہے کہ اب اِس سیاسی خلا کو کون پُر کرے گا؟۔ ہمیں محترم عمران خاں کی کم از کم اِس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ آسمان سے فرشتے تو اُترنے سے رہے، گزارہ تو انہی لوگوں کے ساتھ کرنا ہوگا۔اس لیے ''عالمِ بَد دِلی'' میں سوچتی ہوں کہ کیوں نہ تمام سیاسی جماعتوں کے چیدہ و چنیدہ لوگوں کو اکٹھا کرکے ایک نئی سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی جائے۔ اگر شیخ رشید، فیصل رضا عابدی، ذوالفقار مرزا، رانا ثناءاللہ اور اِن جیسے کچھ دوسرے لوگ مان جائیں تو یقیناً ایک ایسی عظیم الشان سیاسی جماعت معرضِ وجود میں آ سکتی ہے جس کا ڈسا پانی بھی نہ مانگے۔ وجہ یہ کہ شیخ رشید اونچے سُروں میں ایسی ''لمبی لمبی'' چھوڑتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، ذوالفقار مرزا کو اپنی بات منوانے کا فَن آتا ہے۔ اگر کوئی یقین کرنے سے ہچکچائے تو وہ فوراً قُرآنِ پاک سر پہ رکھ کر قائل کر لیتے ہیں، فیصل رضا عابدی لفظوں کی ایسی زنجیر بناتے ہیں کہ مجال ہے جو کوئی اِس زنجیر کو توڑ کر اُن کی گفتگو کے اندر گھُس سکے۔اُن کی تو ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ ''وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی'' اور اپنے رانا ثناءاللہ فیصل آبادی نے ''تیلی'' لگانے میں پی

ایچ۔ڈی کر رکھی۔ویسے بھی یہ اصحاب الیکٹرانک میڈیا میں ہمیشہ ''اِن'' رہتے ہیں اور جیسے ہماری کوئی حکومت امریکی مدد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح کوئی سیاسی پارٹی الیکٹرانک میڈیا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ہمارا ''کرشمہ ساز'' الیکٹرانک میڈیا چاہے تو کسی کو آسمان کی رفعتوں تک پہنچادے اور چاہے تو پاتال میں گرادے۔
پارٹی کے اراکین پر ''رعب شُعب'' ڈالنے کے لیے راجا ریاض کی ''پہلوانی خدمات'' حاصل کی جاسکتی ہیں۔اُنہیں جماعت کے ''عسکری ونگ'' کا انچارج بنانا بھی ثمر آور ہو سکتا ہے۔آئینی موشگافیوں کے لیے شریف الدین پیرزادہ سے بہتر کوئی نہیں۔وہ آجکل پرویز مشرف کو آئینی تلوار سے صاف بچالے جانے کی تگ ودَو میں ہیں لیکن اُمید ہے کہ نئی پارٹی کی تشکیل تک وہ فارغ ہو جائیں گے۔پیرزادہ صاحب آئین کے اندر ہمیشہ ایسی راہ نکال لیتے ہیں جس سے ڈکٹیٹر نہال ہو جاتے ہیں۔سمجھ میں نہیں آتا کہ اچھے بھلے عقلمند زرداری صاحب نے پیرزادہ صاحب کی خدمات حاصل کرکے اپنے وارث بلاول کو اصلی اور آئینی ''بھٹو'' کیوں نہیں بنالیا۔اگر وہ بَر وقت ایسا کر لیتے تو نقلی بھٹو بلاول''کے مقابلے میں اصلی بھٹو'' فاطمہ'' کی کمر کَس کے میدان میں اُترنے کی'' نوبت نہ آتی۔

اپنی اور بیگانی خواتین کو ''سیدھا'' کرنے کے لیے محترمہ فردوس عاشق اعوان انتہائی مناسب ہیں۔ عدلیہ کو ''راہِ راست'' دکھانے کے لیے ڈاکٹر بابر اعوان کا ''منت ترلا'' کیا جا سکتا ہے البتہ اُن سے یہ ضرور کہا جائے گا کہ وہ اشعار کے جا و بے جا استعمال سے گریز کریں۔ ہمارے سیکولر بھائی تو یہ ماننے کو ہر گز تیار نہیں کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا۔ اُنھوں نے قائدِ اعظمؒ کی صرف 11 ستمبر 1948ء والی تقریر رَٹ رکھی ہے جس میں قائدِ اعظمؒ نے غیر مسلم اقلیتوں کی مکمل معاشی، معاشرتی اور مذہبی آزادی کا اعلان کیا تھا لیکن یہ یاد نہیں کہ قائدؒ نے سینکڑوں مرتبہ یہ کہا کہ وہ ایک ایسے ملک کے حصول کی جدو جہد کر رہے ہیں جسے مسلمان اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکیں۔ ہم نے یہی سُنا، پڑھا اور لکھا کہ پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔۔ لا الہ الا اللہ۔ اِس لیے ہماری سیاسی جماعت میں ایک ایسی قد آور مذہبی شخصیت کی بہر حال ضرورت ہے جو ''سیاست نہیں، ریاست بچانے'' کی تگ و دَو کرے۔ کیا وہ مذہبی شخصیت شیخ الاسلام حضرت مولانا ڈاکٹر طاہر القادری کے سوا بھی کوئی ہو سکتی ہے؟۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے لاکھوں مریدوں کے زور پر جب اور جہاں جی چاہے اِس بگڑی ''نسلِ نَو'' کو سیدھا کر سکتے ہیں۔ ویسے تو یہ کام طالبان سے بھی لیا جا سکتا ہے لیکن ایسا کرنے سے ایک تو امریکہ کی ناراضی کا خطرہ ہے جو ہم مول نہیں لے سکتے اور دوسرے طالبان اپنی کلاشنکوفوں سمیت آئیں گے اور ہم ٹھہرے تھوڑے ڈرپوک۔ یہ

الگ بات کہ پرویز مشرف کی طرح ''ہم بھی ڈرتے ورتے کسی سے نہیں'' ۔
جی تو بہت چاہتا ہے کہ ہم مولانا فضل الرحمن صاحب کو بھی اپنی پارٹی میں شمولیت کی دعوت دیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک و قوم کی '' بہتری ''کی خاطر مولانامان بھی جائیں گے لیکن وہ پارٹی کی صدارت سے کم پر راضی نہیں ہونگے جبکہ ہمارے نزدیک اِس عُہدے کے لیے محترم الطاف حسین سے بہتر کوئی نہیں کیونکہ ایک تواُن کی ''اوئے جاگیر دارا'' ٹائپ تقریروں سے بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور دوسرے وہ اُس دیس کے باسی ہیں جس کی غلامی پر ہمیں آج بھی ناز ہے۔ مولانا فضل الرحمن کی بابرکت'' خدمات سے مستفید ہونے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تحریکِ انصاف'' کی طرح ''حسبِ ضرورت'' چیئرپینی'' کے ساتھ صدارت کا عہدہ بھی تشکیل دے دیا جائے لیکن مولانا صاحب محترم جاوید ہاشمی کی طرح بے اختیار صدارت ہر گز قبول نہیں کریں گے ۔اِس کے علاوہ چونکہ مولانا صاحب کے ہاتھوں پارٹی کے ''ہائی جیک'' ہونے کا خطرہ بھی ہر وقت سَر پر منڈلاتا رہے گااِس لیے الطاف حسین ہی بہتر ہیں کیونکہ اُن کا تا دَمِ زیست پاکستان آنے کا کوئی خطرہ نہیں ۔وہ انگلینڈ میں بیٹھ کے بڑھکیں لگائیں گے اور ہم پاکستان میں فائدہ اُٹھائیں گے۔رہی پارٹی کا نام رکھنے کی بات تو ہم نے اپنی پارٹی کا نام '' ہلّا گُلّا پارٹی'' سوچ رکھا ہے۔پہلے ہم نے ''پھڈے باز پارٹی'' سوچا تھا لیکن یہ کچھ غیر پارلیمانی سا لگا

اِس لیے اُسے تَرک کر دیا۔

ابھی میں نے اپنی یہ تجویز اپنے میاں کے سامنے رکھی ہی تھی کہ ہوٹل والے ''مسٹر شریف'' ساگ لے کر آ گئے۔ ساگ ہماری بچپن ہی سے کمزوری ہے اور شریف کے گھر کے پکے ہوئے ساگ میں تو اُس کے خلوص کی مہک بھی شامل تھی لیکن باتیں وہ ''کڑوی کسیلی'' کر گئے۔ میرے میاں نے جب میری یہ ''ارسطوانہ'' بلکہ ''افلاطونی'''' تجویز شریف کے سامنے رکھی تو اُس نے تُرت جواب دیا کہ اتنا ''وخت'' کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سارے کام تو عمران خاں صاحب کی تحریکِ انصاف پہلے ہی سرانجام دے رہی ہے۔ اُن کے جلسے جلوسوں میں ہلّا گُلّا بھی ہوتا ہے اور دھوم دھڑکا بھی، وہاں دھمال بھی ڈالی جاتی ہے اور میوزیکل کنسرٹ کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ اُس نے کہا کہ شیخ رشید تو پہلے ہی ہمہ وقت خاں صاحب کے پہلو میں پائے جاتے ہیں اور مولانا طاہر القادری سے خاں صاحب ویسے ہی متاثر ہیں۔ اِس لیے نئی پارٹی بنانے کی بجائے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ مجوزہ پارٹی کے ''اعلیٰ دماغوں'' کو بھی تحریکِ انصاف میں شامل کر لیا جائے۔ شریف کے اِس مشورے کو سُن کر میں جَل بُھن کے ''سیخ کباب'' ہو گئی اور اُسے کھری کھری سنانے کو جی تو بہت چاہا لیکن ایک تو گھر آئے مہمان کا احترام واجب تھا دوسرے یہ بھی کہ اُس کے ساگ سے آئیندہ بھی لطف اندوز ہونے کی توقع تھی۔ اِس لیے اُسے میں نے کوئی سخت جواب نہیں دیا۔

ڈاکٹر طاہر القادری کا دوسرا حملہ

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔ سرگوشیاں

لفظ ''مولانا'' سے چِڑنے لیکن شیخ الاسلام کہلوانے کے جنون کی حد تک شوقین مولانا طاہر القادری ایک دفعہ پھر حکمرانوں پر حملہ آور ہو گئے لیکن اِس دفعہ وہ نیلسن منڈیلا جیسا انقلاب لانے کے لیے آئے ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ نیلسن منڈیلا کا انقلاب تھا ، یہ طاہر القادری کا انقلاب ہو گا۔ لیکن نیلسن منڈیلا نے تو کئی عشرے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن مولانا صاحب نے شاید پکڑے جانے کے خوف سے محترم الطاف حسین کی طرح فی الحال ''ویڈیو لنک'' کے ذریعے خطاب میں ہی عافیت جانی ۔ غالباََ اُنھوں نے سوچا ہو گا کہ جب انقلاب کی فصل پَک جائے گی تو پھر کینیڈا سے تشریف لائیں گے ۔ پہلے وہ ''سیاست نہیں ، ریاست بچاؤ'' کا نعرہ لے کر اُٹھے تھے لیکن اب کی بار یہ نعرہ ''انقلاب یا شہادت'' میں بدل دیا گیا ہے ۔ اپنے ہر خطبے اور انٹرویو میں اپنے جھوٹے سچے کارنامے گنوانے والے انتہائی نرگسیت کا شکار مولانا طاہر القادری نے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے وہی ہتھکنڈا استعمال کرنے کی کوشش کی ہے جو بھٹو مرحوم نے استعمال کیا تھا ۔ مولانا نے ہر بیکار کو کاروبار ، ہاری کو زمین ، بے گھر کو پانچ مرلے کا گھر اور مفلس کو روٹی

کپڑا دینے کی نوید سنائی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ جب ہمارا انقلاب آئے گا تو ایک سال کے اندر دہشت گردی کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا جائے گا۔ عوام کو خوش نما خواب دِکھا کر بیوقوف بنانے والے مولانا صاحب شاید یہ نہیں جانتے کہ گھٹنوں کے بَل رینگتی جمہوریت اب بلوغت کو پہنچ چکی اور قوم شعوری پختگی کی بہت سی منازل طے کر چکی ہے۔اب وہ کسی مداری یا شعبدہ باز کی باتوں میں آنے والی نہیں ۔ محترم عمران خاں صاحب پورے خلوص کے ساتھ قومی بیداری کا پرچم بلند کرکے اُٹھے لیکن جونہی اُنھوں نے ''آزمودہ چہروں'' کو تحریکِ انصاف میں شامل کیا، قوم نے بیزاری کا اظہار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ پیپلزپارٹی اپنے پانچ سالہ دَورِ حکومت میں عوامی مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام ہوئی تو عوام نے اُسے صرف سندھ تک محدود کر دیا۔ مولانا کو سمجھ لینا چاہیے کہ اب قوم صرف ٹھوس پروگرام اور قابلِ یقین لائحہ عمل پر ہی اعتماد کرتی ہے اور بقول نظیر اکبر آبادی اب تو یہ عالم ہے کہ

کَل جگ نہیں ، کَرجگ ہے یہ ، یاں دِن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے ، اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

مسلم لیگ (ن) حصولِ حکومت کے بعد اب اپنے آپ کو بُری طرح گرفتارِ بلا محسوس کر رہی ہے حالانکہ اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو نواز لیگ کم کم ہی قصوروار نظر آتی ہے۔ اُسے پیپلزپارٹی کی طرف سے ایک قحط زدہ ملک ملا

جسے سنبھالنا شاید کسی کے بَس میں بھی نہ ہوتا۔اوراِس جنجال سے نکلنے کی بھرپور تگ و دَو کے باوجود عوام اُسے مزید وقت دینے کو تیار نہیں۔نواز لیگ نے جب اقتدار سنبھالا تو پاکستان تقریباً عالمی تنہائی کا شکار ہو چکا تھا۔وزیرِ اعظم نے اقتدار سنبھالتے ہی چین کا دورہ کیا اور چین کو ٹرانسپورٹ ، کان کنی اور نیوکلیئر انرجی میں سرمایا کاری کی طرف مائل کیا۔پھر مَن موہن سنگھ ، حامد کرزئی اور بارک اوباما کے علاوہ برادر اسلامی ملک ترکی کے وزیرِ اعظم سے ملاقات کی۔آج ترکی مختلف منصوبوں میں پاکستان کی بھرپور معاونت کر رہا ہے۔توانائی کے سنگین بحران پر قابو پانے کے لیے ترکمانستان اور ایران سے گیس کے علاوہ یورپ سے سولر انرجی کی ٹیکنالوجی کے حصول کی کوشش کی جا رہی ہے۔موجودہ حکومت کی سب سے بڑی کامیابی یورپی یونین کو ٹیکسٹائل مصنوعات کی بَر آمد ہے جس سے کپڑے کی صنعت کا پہیہ رواں ہو جائے گا اور بے روزگاری میں قابلِ ذکر کمی آئے گی۔اِس کے باوجود بھی نواز لیگ کی مقبولیت کا گراف دن بدن گرتا چلا جا رہا ہے جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ عوام کو مہنگائی کے طوفان کا سامنا ہے اور قوم میں اتنا صبر وقرار باقی نہیں کہ وہ حکومت کو اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے مزید وقت دے سکے۔جبکہ دوسری طرف مولانا طاہر القادری شیخ چلّی کے ایسے منصوبے لے کر وارد ہوئے ہیں جن کی تکمیل کے لیے مولانا کو ایک اور جنم لینا ہو گا۔اگر تیس چالیس سال پہلے مولانا نے قوم کو یہ خواب دکھائے ہوتے تو شاید وہ بھی بھٹو مرحوم کی طرح

کلین سویپ'' کر جاتے لیکن فی زمانہ ''ایں خیال است و محال است و جنوں'' ۔''
ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ ملک میں فرقہ واریت کا خاتمہ ضروری ہے۔اُنھوں نے فرمایا کہ حضرت قائدِ اعظمؒ کی روح مجرموں سے سوال کرتی ہے کہ کیا میں نے دو سو خاندانوں کے لیے پاکستان بنا کر دیا تھا''؟۔ واقعی پاکستان دو سو'' خاندانوں کے لیے تو نہیں بنا تھا لیکن دین کے اُن نام نہاد ''ٹھیکیداروں'' کے لیے بھی ہر گز نہیں بنا جن کا جب جی چاہتا ہے ملک کو مفلوج کرنے آ دھمکتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی شخص نے قائدِ اعظمؒ سے پوچھا کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں ؟۔ قائدِ اعظمؒ نے مسکرا کر کہا ''میرا وہی فرقہ ہے جو میرے نبی ﷺ کا تھا'' ۔ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے جو کچھ کہا وہ قابلِ ستائش ہے لیکن پہلے اُنھیں یہ کام اپنے گھر سے شروع کرنا چاہیے ۔ سبھی جانتے ہیں کہ مولانا کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اِس لیے سب سے پہلے تو مولانا کو اپنا فرقہ ترک کرنا ہو گا۔ اِس کے بعد ہی وہ کسی دوسرے کو فرقہ واریت کے خاتمے کا درس دے سکتے ہیں۔ اپنے فرقے سے چمٹے رہنے کی صورت میں کون ہے جو اُن کے اِس ''درس'' پر کان دھرے گا ؟۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا ہے کہ '' ہمیں مُلّا اِزم چاہیے نہ انتہا پسندی''۔ انتہا پسندی کا دینِ مبیں سے دور کا بھی واسطہ نہیں کیونکہ میرے

دین میں جا بجا میانہ روی اور اعتدال کا درس دیا گیا ہے۔ایک عالمِ دین کی حیثیت سے مولانا صاحب کیا یہ وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے کہ کیا میانہ روی اسی کا نام ہے کہ خود تو کروڑوں روپے کی لاگت سے تیار کردہ پُر تعیش کنٹینر میں استراحت فرمائی جائے اور اندھے عقیدت مندوں، عورتوں، شیر خوار بچوں، دیہاتیوں، دیہاڑی داروں اور اپنے سکولوں کے اساتذہ کو لہو جماتی سردی میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے۔کیا دینِ مبیں کا یہی درس ہے کہ خود تو کینیڈا میں اپنے گرما گرم گھر میں بیٹھ کر قوم کو ایک دفعہ پھر شدید ترین سردی میں مال روڈ پر احتجاج کا حکم صادر فرمایا جائے؟۔ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ مولانا صاحب نے پچھلے سال کیا اور اب بھی کر رہے ہیں، وہ سب انتہا پسندی کے زمرے میں ہی آتا ہے۔رہی مُلّا اِزم کی بات تو بہتر تھا کہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب لفظ مُلّا" کی تشریح بھی کر دیتے کیونکہ ہم تو آج بھی ڈاکٹر صاحب کو مُلّا ہی سمجھتے ہیں۔" مولانا فرماتے ہیں کہ " 1947ء میں ملک نہیں تھا، قوم تھی آج ملک ہے لیکن قوم نہیں"۔یہ بجا کہ قوم آج مختلف مذہبی اور لسانی گروہوں میں بٹی ہوئی ہے لیکن اِس میں قصور قوم کا نہیں بلکہ اُن کا ہے جو مذہبی منافرت پھیلا کر اپنے آپ کو "شیخ الاسلام کہلواتے اور اپنے نام کے ساتھ لمبے چوڑے القابات لگوا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔یا" پھر قصور اُن کا جو لسانی منافرت کے

ذریعے ہر وقت "کرسی" کے حصول کی خاطر رال ٹپکاتے رہتے ہیں۔اِس کے باوجود بھی بقولِ اقبال

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اِک درد سا دل میں ہوتا ہے

پاکستان کے سابق صدر، چیف آف آرمی سٹاف اور بہادر کمانڈو جو ''ڈرتے ورتے کسی سے نہیں ''کو غداری کیس میں پیشی کے لیے خصوصی عدالت جانے سے پہلے اچانک دل میں ''کچھ کچھ '' ہونے لگا۔ یہ تو طے ہے کہ دل میں اُٹھنے والا یہ درد ''میٹھا میٹھا'' ہر گز نہیں تھا کیونکہ اِس صورت میں تو مشرف صاحب فوراََ طبلہ ، سارنگی لے کر بیٹھ جاتے اوراِس درد کا خود ہی علاج کر لیتے۔ یہ یقیناََ معروف معنوں میں ''ہارٹ ٹیک'' بھی نہیں تھا کیونکہ اِس صورت میں محترمہ صہبا مشرف اپنے ''سرتاج'' کو یوں بے یار ومددگار چھوڑ کر دبئی ہر گز نہ جاتیں۔اب سوال یہ ہے کہ یہ درد کی کونسی قسم تھی ؟۔۔۔۔ میری پانچ سالہ نواسی جب اپنی ماں کے ساتھ باہر جانے کی ضد کرتی ہے تو اُسے ٹالنے کے لیے اُس کی ماں جب یہ کہہ دیتی ہے کہ ''ٹیکہ لگوانے جا رہے ہیں تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اُسے باہر جانے پر مجبور نہیں کر سکتی۔اُس کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ ''میں نے ٹیکے والے انکل کے پاس نہیں جانا''۔ لگتا ہے کہ کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہمارے کمانڈو کو بھی درپیش تھی اور وہ بھی خصوصی عدالت کو ''ٹیکے والے انکل'' ہی سمجھ رہے تھے اسی لیے گاڑی میں بیٹھنے سے گریزاں پرویز مشرف صاحب کا دل ''دھک دھک کرنے لگا''اور جب اُن کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا گیا تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹ

گئے اور اِس سے پہلے کہ وہ بھاگ کر گھر میں داخل ہو جاتے ،اُن کی حفاظت پر مامور کمانڈوز نے اُنہیں گھیر گھار کر گاڑی میں بٹھا دیا لیکن گاڑی میں بیٹھتے ہی اُنھوں نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی ۔اخباری اطلاعات کے مطابق اِس شدید ترین سردی میں بھی پرویز مشرف صاحب کی پیشانی پسینے سے تَر تھی۔ تیسری بار شاید وہ اِس شرط پر گاڑی میں بیٹھے کہ اُنہیں خصوصی عدالت کی بجائے آرمڈ فورسز انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی راولپنڈی میں لیجایا جائے گا۔ چنانچہ اُن سے کیا گیا وعدہ ایفاء ہوا اور راول چوک سے گاڑی اسلام آباد کی بجائے راولپنڈی کی AFIC طرف مُڑ گئی جہاں چاک و چوبند فوجی جوان مشرف صاحب کو حفاظتی حصار میں لینے کے لیے بیتاب تھے ۔اب وہ فوج کے حصار میں ہیں اور اُن کے وکلاء سمیت کسی بھی شخص کواُن سے ملنے کی اجازت نہیں ۔

دروغ بَر گردنِ راوی AFIC کے ماہر ترین ڈاکٹرز کا بورڈ مشرف صاحب کے ٹیسٹوں کو سامنے رکھ کر گھنٹوں حیران و پریشان بیٹھا رہا کیونکہ ٹیسٹوں کے اندر ''گوڈے گوڈے'' اُترنے کے باوجود اُنہیں اندر سے ''دُکھ'' نہیں ملا اسی لیے مشرف صاحب کی انجیو گرافی کرنے کی بجائے یہ طے کیا گیا کہ مزید تسلی کے لیے مشرف صاحب کی میڈیکل رپورٹس غیر ملکی آقاؤں کے پاس انگلینڈ بھیج دی جائیں ۔ شنید ہے کہ رپورٹس دیکھنے کے بعد اُنھوں نے مشرف صاحب کو کسی صحت افزاء

مقام پر جانے کا مشورہ دیا ہے۔اگر مہربان ’’میاں برادران‘‘ چاہیں تو مشرف صاحب کو مری میں موجود اپنے محل نما گھر میں ٹھہر سکتے۔مشرف صاحب ہمارے سابق صدر اور سپہ سالار ہیں اور بقول چوہدری شجاعت حسین ’’سپہ سالار آئین شکن تو ہو سکتا ہے ، غدار نہیں‘‘ ۔جب مشرف صاحب غدار ہی نہیں تو کیا اُن کا اتنا بھی حق نہیں بنتا کہ چلیئے وزیرِ اعظم ہاؤس پر نہ سہی میاں برادران کے گھر پر ہی قابض ہو سکیں؟۔

بوستانِ سیاست کے گُلِ نوخیز جناب بلاول زرداری کہتے ہیں کہ ’’یقین نہیں آتا بُزدل مشرف نے کبھی بہادر فوج کی وردی پہنی ہوگی۔یہ بیماری محض ڈرامہ ہے ، حقیقت جاننے کے لیے غیر جانبدار میڈیکل بورڈ تشکیل دیا جائے‘‘ ۔بلاول زرداری کے اِس بیان نے یہ راز بھی افشاء کر دیا کہ پرویز مشرف کی اِس ’’بیماریٔ دِل‘‘ نے متحدہ قومی موومنٹ کو کتنا بے چین کیا ہے۔اب یہ کوئی راز نہیں رہا کہ ایم۔کیو۔ایم کے نہاں خانۂ دِل میں اب بھی مشرف صاحب کے لیے کچھ ’’یوں یوں‘‘ ہوتا ہے۔ایم۔کیو۔ایم کی رابطہ کمیٹی کے رُکن محمد انور نے کہا کہ بلاول کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اُن کے والد آصف زرداری نے سوئس عدالتوں میں حاضری سے بچنے کے لئے پاگل پن کا سرٹیفیکیٹ عدالت میں جمع کروایا تھا۔گویا ایم۔کیو۔ایم نے یہ تسلیم کر لیا کہ ماضی میں جنابِ آصف زرداری نے ڈرامہ کیا تھااور اب پرویز مشرف بھی ڈرامہ ہی کر رہے ہیں ۔اِس کے

باوجود بھی ہم سمجھتے ہیں کہ متحدہ کے اربابِ اختیار کو یہ یاد رکھنا ہوگا کہ مشرف ایک آمر تھا اور پیپلز پارٹی جمہوریت پر یقین رکھنے والی سیاسی جماعت ہے۔ پیپلز پارٹی کی اچھی یا بُری حکمرانی سے قطع نظر جمہوریت کا آمریت سے موازنہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں لیکن چونکہ متحدہ قومی موومنٹ میں آمریت ہی آمریت ہے اور آمرِ مطلق باہر بیٹھ کر پوری پارٹی کو اپنی مرضی سے چلا رہا ہے اِس لیے متحدہ کو ہمیشہ آمریت ہی راس آتی ہے۔

ہمارے مہاجر بھائی الطاف حسین فرماتے ہیں کہ مشرف کی تذلیل اُن کے مہاجر ہونے کی بنا پر کی جا رہی ہے جو کہ تین کروڑ مہاجروں کی تضحیک و تذلیل کے مترادف ہے۔ الطاف بھائی کی باتوں پر لوگ زیادہ دھیان نہیں دیتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ الطاف بھائی ہمیشہ حالتِ جذب'' میں رہتے ہیں اور اسی بنا پر وہ ہر روز اپنا بیان بدلتے رہتے ہیں۔ پہلے'' اُنہوں نے فرمایا کہ سندھ کا شہری اور دیہی بجٹ ففٹی ففٹی یا پھر الگ مہاجر صوبہ اور اگر اُن کی بات نہ مانی گئی تو پھر'' الگ ملک''۔ جب اُن کی اِس ''افلاطونی'' تقریر پر چاروں طرف سے مذمتی بیان جاری ہونے لگے تو اُنہوں نے صرف ایک دن کے وقفے کے بعد اپنا بیان بدلتے ہوئے فرمایا کہ سندھ میری ماں ہے اور کوئی اپنی ماں کے ٹکڑے نہیں کرتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ'' سندھ نمبر وَن ''سندھی لے لیں اور ''سندھ نمبر ٹو'' مہاجروں کو دے دیں۔ ماں نمبر وَن اور ماں

نمبر ٹو کا یہ انوکھا اور نرالا تصور پیش کرکے الطاف بھائی نے ہماری نظروں میں اپنا قد بہت اونچا کر لیا ہے کیونکہ ہم خود بھی مہاجر ہیں اور مہاجر تو مہاجر ہوتا ہے خواہ وہ اُردو بولنے والا ہو یا پنجابی بولنے والا۔ ہم نے تو بہت چاہا کہ پنجاب میں بسنے والے لگ بھگ پانچ کروڑ پنجابی مہاجرین اکٹھے ہو کر آدھے پنجاب کا الگ صوبہ بنالیں لیکن ہمارے پاس ''الطاف بھائی'' جیسا کوئی لیڈر نہیں۔ ہمارا ''مَتھا'' تو میاں برادران سے لگا ہے جو ہیں تو ''مہاجر'' ہی لیکن نئے صوبے کی بات سُنتے ہی بھڑک اُٹھتے ہیں۔

آمدم بَر سرِ مطلب، ہم نہیں جانتے کہ مشرف صاحب واقعی بیمار تھے یا پھر یہ سب کچھ محض ڈرامہ تھا۔ اگر وہ بیمار ہیں تو اللہ تعالےٰ اُنہیں صحتِ کاملہ عطا کرے تاکہ وہ عدالتوں کا سامنا کرکے نشانِ عبرت بن سکیں اور اگر وہ بیمار نہیں ہیں تو پھر وہ اِس ''فلاپ'' ڈرامے کے مصنف اور ہدایت کار کو ''کوسنے'' دیں جنھوں نے ایسا بیکار ڈرامہ سٹیج کرکے ہمارا وقت ضائع کیا۔ اِس سے ہزار گُنا بہتر تو سٹار پلس کے ڈرامے ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دُنیا میں اُس شخص سے زیادہ بد نصیب کوئی نہیں ہو گا جس کی بیماری کو بھی لوگ ڈرامہ سمجھیں۔ اپنے آپ کو ''قومی ہیرو'' قرار دینے والے پرویز مشرف صاحب کو اب تو ادراک ہو جانا چاہیے کہ وہ مقبولیت کے کس درجے پر فائز ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سارا ڈرامہ مشرف صاحب کو باہر کھسکانے کے لیے رچایا

جارہا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں ایسا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ اب گیند عدلیہ کی کورٹ میں ہے جہاں مشرف صاحب کی تقدیر کا فیصلہ ہوگا اور سزا کی صورت میں حکومتِ وقت اُن کی سزا معاف کرکے ملک سے باہر بھجوانے کا رِسک کبھی نہیں لے گی کیونکہ ایک تو یہ صریحاً سیاسی خودکشی ہوگی اور دوسرے اگر مشرف کو معاف کیا گیا تو پھر بلوچستان کو پاکستان سے الگ ہی سمجھیں۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

ہم نے ''گرگٹ'' نہیں دیکھا اور نہ ہی ہمیں علم ہے کہ یہ رنگ کیسے بدلتا ہے البتہ پاکستانی سیاست دانوں کو دیکھ کر کچھ کچھ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔ سیاست دان ہی کیا، ہر طبقے میں یہ ''گرگٹی خوبی'' بدرجہ اتم موجود ہے البتہ ہمارا ''انگوٹھا چھاپ'' طبقہ اِس سے محروم ہے کیونکہ یا تواُنہیں پتہ ہی نہیں کہ رنگ کیسے بدلا جاتا ہے یا پھر وہ ابھی تک اپنی ''غیرتوں'' کے خول میں بند ہیں اور اِس ''غیرتی خول'' کو توڑ کر باہر آنا پسند ہی نہیں کرتے۔ احمق ہیں یہ لوگ جو ''اپنی تو جہاں آنکھ لڑی، پھر وہیں دیکھو'' پر تا حال عمل پیرا ہیں اور ''پیوستہ رہ شجر سے، اُمیدِ بہار رکھ'' کی عملی تصویر نظر آتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاں تنگ وافلاس ہمیشہ ڈیرے ڈالے رہتی ہے لیکن مجال ہے جو یہ لکیر کے فقیر اپنی جگہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہوں۔ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو غیرت و حمیت نامی کسی ''چڑیا'' سے سِرے سے واقف ہی نہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جو رنگ بدلتے دیر نہیں لگاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کی رفعتوں کو چھونے لگتے ہیں۔ہم سمجھتے ہیں کہ یہی طبقہ عقیل و فہیم ہے اور باقی سب احمق۔ اِس طبقے پر پہلے صرف سیاست دانوں کی اجارہ داری تھی لیکن اب ماشا اللہ ہمارے لکھاری، تجزیہ نگار اور دانشور بھی اِس میں شامل ہوتے جا رہے ہیں

اور امید واثق ہے کہ بہت جلد اِس طبقے پر سے سیاست دانوں کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔

ہمیں آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ اِن عقیل و فہیم لوگوں کو ''لوٹا'' کیوں کہا جاتا ہے ؟۔ ہمیں تو بہر حال ایسی کوئی مماثلت نظر نہیں آتی جس کی بنا پر اہلِ سیاست کو لوٹوں سے تشبیہ دی جا سکے۔ لوٹا بلا امتیاز ہر کسی کا خادم ہے جب کہ سیاستدان مخدوم اور لوٹا ہمیشہ خاموش رہتا ہے جبکہ سیاستدان پارلیمنٹ ہو یا الیکٹرانک میڈیا، ہر جگہ ''لمبی لمبی'' چھوڑتے رہتے ہیں اِس لیے ضروری ہے کہ پارلیمنٹ متفقہ طور پر ایسی آئینی ترمیم لائے جس میں کسی بھی شخص کو ''لوٹے'' سے تشبیہ دینے پر آرٹیکل 6 کا اطلاق ہو البتہ اگر کوئی ''بد ہضمی'' کا شکار ہو جائے اور پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگیں تو وہ لوٹے کی جگہ گرگٹ'' استعمال کر سکتا ہے۔ ویسے بھی ہم نے گرگٹ کے بارے میں جو کچھ پڑھا'' اور سُنا ہے اُس کے مطابق تو ہمارے رہنما اور گرگٹ بھائی بھائی ہی لگتے ہیں۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی اور چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری ہماری تاریخ کے دو ایسے کردار ہیں جن کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جاتا رہے گا لیکن ہمارے ''گرگٹوں'' نے اُنہیں بھی متنازع بنانے کی ٹھان لی

ہے۔چوہدری برادران ، جن کی حیثیت اب شیخ رشید صاحب جتنی بھی نہیں رہی ، اُنھوں نے خبروں میں ’’اِن‘‘ رہنے کی ایک نئی طرح نکالی ہے۔چوہدری شجاعت حسین صاحب فرماتے ہیں کہ 3 نومبر 2007ء کی ایمرجنسی میں وہ خود ، چوہدری پرویز الٰہی اور جنرل اشفاق پرویز کیانی شامل تھے اِس لیے پرویز مشرف اکیلے ملزم نہیں ۔اُنھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری صاحب نے پی۔سی۔او کے تحت حلف اٹھا کر پرویز مشرف کے 12 اکتوبر 1999ء کی بغاوت آئینی تحفظ دیا ،اِس لیے وہ بھی شریکِ جرم ہیں ۔چوہدری صاحب کو یہ پریشانی بھی لاحق ہے کہ پرویز مشرف صاحب کو غدار کیوں کہا جا رہا ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ سپہ سالار غدار نہیں ہوتا اِس لیے مشرف صاحب کو غدار نہیں ، آئین شکن کہا جائے۔عرض ہے کہ میر جعفر بھی سپہ سالار ہی تھا جسے مسلمہ ننگِ ملّت ، ننگِ دین ، ننگِ وطن کہا جاتا ہے اِس لیے قوم کو چاہیے کہ اپنے سابق وزیرِ اعظم جناب چوہدری شجاعت حسین کی بات مانتے ہوئے پرویز مشرف صاحب کو غدار کہنے کی بجائے ننگِ ملّت ، ننگِ دین ، ننگِ وطن کہا کرے ۔چوہدری صاحب کافی تاخیر سے مشرف کی حمایت میں لنگوٹ کَس کر اکھاڑے میں کودے ہیں جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ پہلے چوہدری صاحب بہت مصروف تھے اور شنید ہے کہ وہ رقیبانِ روسیاہ سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو جدید ای ٹیکنالوجی سے لیس کر رہے تھے اور اخباری اطلاع کے مطابق اپنے حالیہ غیر ملکی دورے پر اُنھوں نے ایک تیز رفتار آئی پیڈ بھی حاصل کر لیا ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ ای

ٹیکنالوجی آج کی زندگی ہے جس کے بغیر آگے بڑھنے کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اِسی ای ٹیکنالوجی کے حصول کی وجہ سے چوہدری صاحب تھوڑے لیٹ ہو گئے لیکن اب اُتنی ہی تیزی اور تیز رفتاری کے ساتھ وہ میدانِ عمل میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دِن اُن کا آئی پیڈ اُنہیں مشورہ دے کہ وہ خصوصی عدالت کے سامنے پیش ہو کر خود ہی یہ اقرار کر لیں کہ غداری کے مقدمے کا اصل ملزم پرویز مشرف نہیں بلکہ وہ خود ہیں اِس لیے پرویز مشرف کو باعزت بَری کر کے اُنہیں اور اُن کے بھائی چوہدری پرویز الٰہی کو ''ٹنگ'' دیا جائے۔ خصوصی عدالت نے بھی اُن کی بات فوراً مان لینی ہے کیونکہ خصوصی عدالت خوب جانتی ہے کہ چوہدری پرویز الٰہی تو مشرف صاحب کو دَس بار وردی میں منتخب کروانے کا گلی گلی ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے اِس لیے ہم چوہدری پرویز الٰہی صاحب کو یہ مفت مشورہ دیں گے کہ اگر وہ اپنی جان بچانا چاہتے ہیں تو اپنی اولین فُرصت میں چوہدری شجاعت صاحب کا آئی پیڈ غائب کر دیں۔ اگر اُن کے پاس آئی پیڈ چھپانے کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہ ہو تو اِس خدمت کے لیے ہم ہمہ وقت تیار ہیں۔

اپنے الطاف بھائی کو بھی چوہدری شجاعت صاحب کے ساتھ ہی ''مشرف حمایت'' کا احساس ہوا اور اُنہوں نے مشرف صاحب کو مہاجر ظاہر کر کے ''گود'' لے لیا۔ آجکل وہ مشرف کو لوریاں دے کر اُن کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن شنید ہے کہ ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے ہمارے کمانڈو، الطاف بھائی کی کسی بات پر

یقین کرنے کو تیار نہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ الطاف بھائی کا کیا اعتبار، وہ صبح ایک بیان دیتے ہیں اور شام کو دوسرا۔ اِس کے علاوہ وہ جا و بیجا اتنی ''بڑھکیں'' لگا چکے ہیں کہ اب اُن کی ساری بڑھکوں کی ''پھُوک'' نکل چکی ہے۔ اب تو اُن کی دھمکیوں سے نائن زیرو والے بھی نہیں ڈرتے پھر بھلا نواز لیگ کیا اثر لے گی ۔ ہمارے بھولے بھالے کمانڈو شاید نہیں جانتے کہ الطاف بھائی نے اُن کی حمایت میں اُنہیں ''مہاجر'' قرار نہیں دیا تھا بلکہ یہ تو نواز لیگ کے لیے پیغام تھا کہ ''ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں''۔ یہ الگ بات ہے کہ نواز لیگ پر اِس کا ''کَکھ'' اثر نہیں ہوا۔ اگر اونچے ایوانوں میں ہماری پہنچ ہوتی اور ہمیں یقین ہوتا کہ ہماری آواز، صَدا بصحرا ثابت نہیں ہو گی تو ہم ضرور کہتے کہ ایم۔ کیو۔ ایم کی جھولی میں ایک آدھ مرکزی وزارت ڈال کر اُس کی اشک شوئی کرنا عین عبادت ہے۔

ہمارے کچھ لکھاری بھائیوں کو بھی جنابِ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی ریٹائرمنٹ کے بعد اُن کے عہدِ اقتدار میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں اور کچھ کالم نگاروں نے تو اُن کے خلاف پورے پورے کالم لکھ مارے ہیں۔ کراچی کے شہید ایس ایس پی چوہدری اسلم دہشت گردوں کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ وہ بُزدل ہیں جو چھُپ کر وار کرتے ہیں ۔ اگر وہ مرد کے بچے ہیں تو سامنے آ کر وار کریں۔ ہم بھی افتخار محمد چوہدری صاحب کے مخالفین کے بارے میں یہی کہتے ہیں

کہ اگر وہ مَرد کے بچے ہوتے تو چوہدری صاحب کی ریٹائرمنٹ سے پہلے بات کرتے
۔ ویسے بھی چاند پر تھوکنے سے تھوک ہمیشہ اپنے مُنہ پر ہی گرتا ہے اِس لیے کوئی کچھ بھی
کہے یہ بہرحال طے ہے کہ انتہائی محترم افتخار محمد چوہدری عوام کے دِلوں کو مسخر کر چکے
ہیں۔

وجہ وجودِ کائینات کی آمد

پروفیسر مظہر۔۔۔۔ سرگوشیاں

سید المرسلین ، خاتم النبیین ، فخرِ موجودات ، وجہ وجودِ کائینات حضرت محمد ﷺ عالمِ انسانیت کے لیے وہ عظیم انقلاب لے کر آئے جس نے کفر و شرک ، وحشت و بربریت ، ظلم و جبر ، نا انصافی اور جہالت کے سارے بُت پاش پاش کرکے سسکتی خزاں رسیدہ انسانیت کو کیف و مستی سے لبریز بہاروں سے روشناس کرا دیا۔آج ہم اُسی عظیم ترین ہستی کا یومِ ولادت باسعادت منا رہے ہیں جس کی ذاتِ گرامی کو ربِّ کائینات نے وہ عظمت و رفعت اور مقامِ بلند عطا فرمایا جس پر روزِ ازل سے کوئی دوسرا جلوہ افروز ہوا ، نہ تا ابد ہو گا۔یوں تو ربِّ کریم نے حکمت کی کتاب میں درج کر دیا کہ تمام نبی آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اُن کے درجات اُن کے ربّ کے ہاں ہیں لیکن اُسی حکمت کی کتاب میں میرے آقا ﷺ کے لیے "مقامِ محمودہ" کی نوید بھی درج ہے۔یہ وہی افضل ترین مقام ہے جسے مفسرین مقامِ شفاعت بھی کہتے ہیں اور روزِ قیامت اسی مقام پر کھڑے ہو کر آقا ﷺ اپنی اُمت کی شفاعت کی دُعا فرمائیں گے۔یہ مقام بس میرے نبی ﷺ کے لیے ہی مخصوص ہے اور کسی کے لیے نہیں۔اسی کتابِ حکمت میں " ورفعنا لک ذکرک" بھی درج ہے جو گواہی ہے میرے رَبّ کی کہ میرے آقا سے بڑھ کر کسی کا ذکر بلند ہے ، نہ ہو سکتا ہے۔اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے

کہ آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جبرائیل امینؑ میرے پاس آئے اور اُنھوں نے کہا ''
میرا اور آپ کا رب مجھ سے سوال کرتا ہے کہ میں نے کس طرح آپ کا ذکر بلند کیا
؟۔میں نے کہا ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے'' ۔تب جبرائیل امینؑ نے فرمایا '' اللہ تعالٰی کا''
ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ آپ ﷺ کا ذکر بھی کیا جائے گا
۔ عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجے جانے والے بھی میرے آقا ﷺ ہی ہیں اور آپ''
ﷺ پر کثرت سے درود بھیجنے کا حکم بھی ربِ کائینات نے ہی دیا ہے۔اِس لیے یہ تو
طے ہے کہ

'' بعد از خُدا بزرگ توئی ، قصّہ مختصر''

وجہ وجودِ کائینات ختم المرسلین حضرت محمد ﷺ نے حیاتِ انسانی کی معاشی ، معاشرتی ، سیاسی ، سماجی اور مذہبی زندگی کے ایک ایک پہلو کو منور کرنے کے لیے ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا فرمایا جو ہر لحاظ سے مکمل اور کامل ہے اور اُس پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہوئے اپنے آخری خطبے میں یہ ارشاد بھی فرما دیا کہ اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ کی سُنت کو مضبوطی سے پکڑنے والے تا قیامت گمراہ نہیں ہو سکتے ۔لا ریب وطنِ عزیز میں حُبِ رسول ﷺ نے ہر مسلمان کے دل کو یوں مسخر کر رکھا ہے کہ اہلبیت کا وہاں سے گزر ممکن ہی نہیں ۔ حبِ رسول ﷺ ہی وہ واحد محور و مرکز ہے جس پر ہم سب بِلا امتیاز ایک ہیں ۔یومِ ولادتِ رسول ﷺ پر ہم اپنی ایمان افروز عقیدتوں کا بھرپور اظہار بھی کرتے ہیں ۔میلاد کی

محافل سجاتے، گھروں اور مساجد میں چراغاں کرتے، سڑکوں اور بازاروں میں جھنڈیاں لگاتے اور جلوسوں میں باآوازِ بلند درود شریف بھی پڑھتے ہیں۔اس دن ہر گھر اور ہر دَر روشنیوں کا عجب مسحور کُن نظارہ پیش کرتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے فضائیں بھی حبِ رسول ﷺ سے معطر ہو گئی ہوں لیکن ۔۔۔ لیکن جوں ہی یہ دن تمام ہوتا ہے ہمارے اندر کے سہمے سُکڑے شیطان سینہ تان کر باہر آ جاتے ہیں اور ہم حبِ رسول ﷺ کے تمام تقاضوں کو بھلا کر شیطانِ رجیم کی غلامی کا طوق اپنے اپنے گلے میں سجا لیتے ہیں ۔پھر وہی فرقہ واریت، وہی گروہوں میں بٹی قوم، وہی لسانی فسادات اور وہی مباحث کے ''شہید کون ؟''۔ حالانکہ حبِ رسول ﷺ کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہم جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر اُس مکمل ضابطۂ حیات کے لیے باہر نکل پڑیں جس کے نفاذ کے بعد ہمارے گمراہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اِس کی ضمانت خود میرے آقا ﷺ نے دی ہے لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ ایک تو من حیث القوم ہماری پختگیَ ایماں کا یہ عالم ہے کہ

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
مَن اپنا پرانا پاپی ہے،برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اور دوسرے کس کی شریعت اور کس کا دین نافذ کریں ؟، شیعہ کا، سُنی کا،بریلوی کا، دیو بندی کا، اہلِ حدیث کا یا پھر طالبان کا؟۔یہ فرقہ واریت کا عفریت ہمارے علمائے کرام کا عطا کردہ ایسا تحفہ ہے جس نے سیکولر طبقے کو

بجا طور پر یہ کہنے کا حق دے دیا ہے کہ فی زمانہ (نعوذ باللہ) اسلام کا نفاذ ممکن ہی نہیں ۔ہمارے دائیں بازو کے سیاستدان ہوں یا بائیں بازو کے ، سبھی کو وہ جمہوریت مرغوب ہے جس میں بقولِ اقبالؒ ''بندوں کو گنا کرتے ہیں ، تولا نہیں کرتے'' ۔دینِ مبیں میں تو صرف ''صاحب الرائے'' کو ہی رائے دینے کا حق ہے ہر ''صاحب الرائے'' کو نہیں لیکن جمہوریت میں فاتر العقل کا بھی ایک ووٹ ہوتا ہے اور مسلمہ دانشور کا بھی ایک ہی ۔اسی لیے جمہوریت بہترین انتقام ہے اور اِس منتقم مزاج جمہوریت کا رول بھی صرف راندۂ درگاہ لوگوں پہ چلتا ہے ۔اِس جمہوریت کے تحت جو آئین بھی بنا لیجئے ، اُس کا نفاذ صرف مجبوروں اور مقہوروں پر ہی ہو گا اور یہ آئین اشرافیہ کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا ۔یہ بھی جمہوریت کا ہی ثمر ہے کہ مفلس جرم کرے تو بد ترین کال کوٹھری اور مقتدر کرے تو پُر تعیش گھر میں نظر بندی ۔ مفلس کے لیے قانونی چنگیزیت ہمہ وقت تیار اور مقتدر کے لیے ''مردِ بیمار'' ۔

اب جبکہ یہ طے ہے کہ ہم اُس مکمل ضابطۂ حیات کو نافذ کرنے کے اہل نہیں جو صرف مسلمانوں ہی نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کے لیے ربِ کردگار کا عظیم تحفہ ہے اور جسے میرے نبی ﷺ نے عملی طور پر نافذ کرکے یہ ثابت کر دیا کہ اِس سے مکمل کوئی ضابطۂ حیات ہو ہی نہیں سکتا ، تو کیا ہم اجتماعی نہ سہی اپنی انفرادی زندگی میں اسے اپنی ذات اور اپنے خاندان پر نافذ کرنے کے قابل بھی

نہیں ؟۔ کیا روح محمد ﷺ کا یہ تقاضہ نہیں کہ اگر ہم واقعی عاشقانِ رسول ﷺ ہیں تو پیروئ رسول ﷺ کو اپنی زندگی کا محور و مرکز بنا لیں ؟۔ ہم ''انجمن غلامانِ رسول ﷺ '' اور '' انجمن عاشقانِ رسول ﷺ '' بنانے میں تو بہت تیز ہیں لیکن کیا ہماری عملی زندگی میں حبِ محمد ﷺ کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی نظر آتی ہے ؟۔ میرے آقا ﷺ نے تو جو کچھ ارشاد فرمایا ، اُس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا اور لاریب ہماری معاشی ، معاشرتی اور مذہبی زندگی کے ہر پہلو کی عملی شہادت میرے نبی ﷺ کے وجود کی صورت میں پوری صراحت کے ساتھ نظر بھی آ رہی ہے اور یہ اعجاز ہے میرے آقا ﷺ کا کہ وہ ہر شخص اور ہر شعبۂ زندگی کے لیے عملی نمونہ ہیں ۔ پھر کون ہے جو روزِ قیامت کہہ سکے کہ وہ راہِ راست سے محض اِس لیے بھٹک گیا کہ اُس کے سامنے کوئی مثال ہی نہیں تھی ۔ یومِ ولادتِ رسول ﷺ پر چراغاں بجا جلسے جلوس اور میلاد کی محافل بھی درست کہ یہ ہماری عقیدتوں کا کھلا اظہار ہے ۔ سوال مگر یہ ہے کہ 365 دنوں میں سے صرف ایک دن اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرکے باقی سَچے اور سُچے عاشقانِ رسول ﷺ بَن پاتے ہیں ؟۔ پتہ نہیں یہ کمزوریٔ عشق ہے یا کمزوریٔ ایماں کہ ہم کائینات کی محبوب ترین ہستی کے تتبع میں ایک لمحہ بھی گزارنے کو تیار نہیں ، دعویٰ پھر بھی یہ کہ ہم عاشقانِ رسول ﷺ ہیں ۔

گزشتہ کئی دنوں سے میری طبیعت بہت ''اوازار'' ہے۔ہر وقت گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔نقاہت کا یہ عالم ہے کہ تین ، چار کلومیٹر دوڑنے سے ہی سانس پھول جاتا ہے اور ''گٹے گوڈے'' جواب دے جاتے ہیں ۔ خوراک اتنی کم ہو گئی ہے کہ صرف تین ، چار نان ایک آدھ پلیٹ بریانی ، کچھ چکن تکّے اور چند سیخ کباب بھی کھا لوں تو معدہ جواب دے جاتا ہے اور کھٹی ڈکاریں حشر کر دیتی ہیں ۔ صرف دس ، بارہ گھنٹے انٹرنیٹ پر متواتر بیٹھنے کے بعد ہی کمر درد شروع ہو جاتا ہے اور پاؤں سوج جاتے ہیں، چکر آنے لگتے ہیں اور بازوؤں میں درد کی ٹیسیں اُٹھنا شروع ہو جاتی ہیں ۔ نظر اتنی کمزور کہ درخت کی آخری شاخ پہ بیٹھی چڑیا کی چونچ میں دبا ''تنکا'' تک نہیں دیکھ پاتی ۔ دل کی دھڑکن اتنی بے ترتیب کہ مارے خوف کے گھریلو ملازمہ تک کو نہیں ڈانٹ سکتی۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ میں ''عارضۂ قلب میں مبتلاء ہوں لیکن جب میں نے اپنے فیملی ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اُس ''اللہ مارے'' نے میرا مکمل چیک اپ کرنے کے بعد مُسکرا کر کہا کہ ''عمر کا تقاضہ ہے''۔اُس بد تمیز کو اتنا بھی نہیں پتہ کہ خواتین سے اُن کی عمر کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔ ڈاکٹرز پر سے اعتماد اُٹھ جانے کے بعد میں نے حاذق حکیموں سے رجوع کیا اور اُن کے مجرّب

نسخے استعمال کرنا شروع کر دیئے لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔اب میں روزانہ ''نہار مُنہ'' اپنے میاں کو کہتی ہوں کہ وہ مجھے علاج کے لیے جرمنی یا فرانس لے جائیں لیکن میرے میاں بھی ایسے ''مکھی چُوس'' ہیں کہ ہر روز طرح دے جاتے ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ''کمانڈو'' جناب پرویز مشرف بیمار نہیں ، وہ انتہائی ظالم ، جابر اور چنگیزیت کے عَلم بردار ہیں۔جب مجھے ''اتنی سی عمر'' میں بارہ ، چودہ بیماریاں ہو سکتی ہیں تو 70 سالہ بوڑھے کمانڈو کو کیوں نہیں۔ یہ جو احمد رضا قصوری نے غصّے سے ''نیلے پیلے'' ہو کر صحافی کو ڈانٹ پلائی ، اُس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مشرف صاحب واقعی بیمار ہیں جس کی بنا پر قصوری صاحب جیسا ''دبنگ'' وکیل بھی بوکھلاہٹ کا شکار ہے۔ اگر قصوری صاحب نے اُس صحافی کو لفافے لینے والا انڈیا کا ایجنٹ کہا ہے تو ظاہر ہے کہ اُن کے پاس اِس کے ثبوت بھی ہونگے۔ قصوری صاحب کے اِس ''انکشاف'' پر جنابِ چیف جسٹس آف پاکستان کا ''اَز خود نوٹس'' تو بنتا ہے دوستو۔ ویسے بھی جب سے جنابِ افتخار محمد چوہدری ریٹائر ہوئے ہیں ، اعلیٰ عدلیہ بھی روکھی پھیکی ہو گئی ہے ، نہ کوئی اَز خود نوٹس اور نہ توہینِ عدالت۔ افتخار محمد چوہدری صاحب تو رونق لگائے رکھتے تھے لیکن موجودہ چیف جسٹس صاحب تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ''ٹھنڈے ٹھار'' ہیں۔چیف صاحب کی اِس گھمبیر خاموشی کا

سب سے زیادہ نقصان ہم لکھاریوں کو ہوا ہے جنہیں اب لکھنے کے لیے سپریم کورٹ سے مرچ مصالحہ'' ملتا ہے نہ چٹخارے دار خبر۔ وہ تو اللہ بھلا کرے اسلام آباد ہائی'' کورٹ کا جس کے دَم قدم سے یہ رونقیں بحال ہیں اور دھڑا دھڑ ''چٹ پٹی'' خبریں ملتی رہتی ہیں۔اُدھر جو ''خصوصی عدالت'' بنائی گئی ہے وہ بھی بَس ''ایویں ای'' ہے۔اُس نے ابھی تک تو کوئی ''کھڑاک'' نہیں کیا اور نہ ہی مستقبل میں کوئی اُمید۔ البتہ حکومتی پراسیکیوٹر اکرم شیخ صاحب اور ''کمانڈو'' کے وکیل رانا اعجاز کی ''تُو تُو، مَیں مَیں'' سے پتہ چلتا رہتا ہے کہ خصوصی عدالت ابھی زندہ ہے۔ شنید ہے کہ اپنے احمد رضا قصوری بھی خصوصی عدالت میں پچھلے بنچوں پر بیٹھ کر مُنہ کے آگے ہاتھ رکھ کے شیخ اکرم پر آوازے کَستے رہتے ہیں جو عدالت میں موجود لوگوں کی تفریح کا باعث بنتے ہیں۔
ویسے خصوصی عدالت اتنی بھی ''ایویں'' نہیں جتنا کچھ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔اُس نے ایک دفعہ پھر گیند اے ایف آئی سی کی طرف لڑھکا دی ہے۔ عدالت نے پرویز مشرف صاحب کی بیماری کے بارے میں تین سوالات پر مشتمل ایک سوال نامہ جاری کرتے ہوئے میڈیکل بورڈ تشکیل دینے اور 24 جنوری کو رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا ہے ۔یہ تینوں سوالات ہی ایسے ہیں جن پر ہمارے کمانڈو کے وکلاء کو فوری طور پر نظرِثانی کی اپیل دائر کر دینی چاہیے کیونکہ عدالت کا ہر سوال

ہمارے محبوب کمانڈو کو ''بے جرم وخطا'' پھانسنے کا جال ہے۔پہلا سوال یہ ہے ''کیا پرویز مشرف کی بیماری کی نوعیت اتنی سنگین ہے کہ وہ نقل و حرکت یا عدالت میں پیش ہونے کے قابل نہیں'' ۔ظاہر ہے کہ بیماری کی نوعیت تو سنگین ہی ہے لیکن مشرف صاحب کیا (خُدانخواستہ)کَومے میں ہیں جو نقل و حرکت بھی نہ کر سکیں۔اُن کی عدم حاضری کا سبب یہ ہے کہ خصوصی عدالت کا نام سُنتے ہی ہمارے بہادر کمانڈو کے دِل کی دھڑکن تیز، رنگ زرد اور ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں اِس لیے اِس ''بیماریٔ دِل'' کے سبب اُن کا فی الحال خصوصی عدالت جانا ممکن نہیں۔دوسرا سوال یہ ہے '' کیا دَورانِ علاج پرویز مشرف کی سرجری کی گئی یا آئندہ کرنے کا منصوبہ ہے ؟''۔یہ تو خصوصی عدالت سمیت سبھی جانتے ہیں کہ مشرف صاحب کی سرجری نہیں ہوئی اِس لیے سوال کے اِس حصّے کا جواب تو نفی میں ہی ہوگا۔سوال کے دوسرے حصّے میں اگر میڈیکل بورڈ یہ کہہ دیتا ہے کہ سرجری کی ضرورت نہیں تو مشرف صاحب کو عدالت میں پیش ہونا پڑے گا جو ہمیں ہرگز قبول نہیں۔اگر بورڈ یہ کہتا ہے کہ سرجری کرنی پڑے گی تو ہم اپنے بہادر کمانڈو کے پیٹ پر ''ایویں خوامخواہ'' چھبیس ٹانکے لگوانے کو ہرگز تیار نہیں ۔ خصوصی عدالت کا تیسرا سوال یہ ہے ''پرویز مشرف ہسپتال میں کب تک زیرِ علاج رہیں گے ؟''۔اِس کا جواب تو صرف خصوصی عدالت ہی دے سکتی ہے ۔ عدالت قوم کو بتلائے کہ وہ کسی عاشقِ صادق کی طرح اپنے ''محبوب'' مشرف کے انتظار کی اور کتنی گھڑیاں گِن گِن کر گزار سکتی ہے ؟۔ ظاہر ہے کہ مشرف صاحب

کو جن 9 خطرناک بیماریوں نے گھیر رکھا ہے اُن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے پاکستان میں تو دو، چار سال کا عرصہ تو لگے گا ہی۔ اگر عدالت کو زیادہ جلدی ہے تو پرویز مشرف صاحب کو باہر بھیج دے تاکہ وہ دیگر پاکستانی اشرافیہ کی طرح بیرونِ ملک اپنا علاج کروا سکیں۔ اگر مشرف صاحب ملک ہی میں رہتے ہیں تو پھر بھی خصوصی عدالت کا فیصلہ جو بھی ہو، ''پنچھی'' نے تو بہرحال اُڑ ہی جانا ہے، جس کا قوم کو بہت دُکھ ہو گا کیونکہ قوموں کو ایسی ہستیاں کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی ہیں جو ملک و قوم کی اتنی خدمت گزار ہوں جتنے مشرف صاحب۔

ڈاکٹر عطاء الرحمن صاحب نے مشرف صاحب پر ایسا چشم کشا کالم لکھا ہے جسے پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مشرف صاحب نے قومی ترقی اور خوشحالی کے ایسے درخشاں باب رقم کیے ہیں جن کی ہماری تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ اُن کے دَور میں مہنگائی اپنے عروج پر تھی نہ ڈالر 60 روپے سے بڑھا۔ اُنہی کے دَور میں میڈیا اتنا آزاد ہوا کہ کھمبیوں کی طرح سے نیوز چینلز اُگنے لگے اور آسمان سے اینکرز اور ''اینکرنیاں'' چھاتہ برداروں کی طرح اُترے اور نیوز چینلز پر ایسے قابض ہوئے کہ عقل دنگ رہ گئی۔ مشرف صاحب کے دَور میں ہی گلی گلی CNG سٹیشن کھُلے اور راوی اشرافیہ کے لیے عیش ہی عیش لکھنے لگا۔ اُنہوں نے اپنے شَرپسند مخالفین کو چُن چُن کر قتل کروا کے اپنی بہادری اور طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ یہ ہمارے ہر دلعزیز کمانڈو ہی تھے جنھوں نے

اکتوبر 99ء کو فضاؤں ہی سے دو تہائی اکثریت کی حامل منتخب حکومت کو چلتا کیا کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اِس ''بلغمی مزاج'' قوم کو جمہوریت راس نہیں آتی ۔ حکم عدولی پر چیف جسٹس سعید الزماں صدیقی اور دیگر پانچ جسٹس صاحبان کو گھر بھیجنا بھی اُنہی کا کارنامہ ہے ۔ حیرت ہے کہ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے اپنے سینئرز سے عبرت حاصل نہ کی اور عَلمِ بغاوت بلند کر دیا جس کا خمیازہ بھی اُنہیں بھگتنا پڑا ۔ 1971ء کے بعد سے ہماری بہادر افواج نے ''میدانِ کارزار'' کا مُنہ تک نہیں دیکھا تھا جس کی بنا پر اُس کی صلاحتیں زنگ آلود ہو رہی تھیں اِس لیے ہمارے کمانڈو نے ''چوری چھُپے'' کارگل کا معرکہ سَر انجام دیا ۔ اگر ہمارے اُس وقت کے وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب امریکہ جا کر جنگ بندی نہ کرواتے تو یہ جنگ تو ہم جیت ہی چکے تھے ۔ حاسدینِ مشرف کہتے ہیں کہ کمانڈو نے اکبر بگٹی کو شہید کیا ، جامعہ حفصہ میں قُرآن پڑھتی بچیوں کو فاسفورس بموں کی غذا بنا دیا اور وہ کمانڈو ''دلیر'' اتنا تھا کہ صرف ایک کال پر امریکہ کے سامنے چاروں شانے چِت ہو گیا ۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ ایسی غیرت و حمیت کو بھاڑ میں جھونکنا ہے جو ہمیں پتھر کے زمانے میں دھکیل دے ۔ وقت کا تقاضہ یہی تھا کہ بے غیرتی کی ''بِگل'' مار کر عمرِ عزیز کو بے حیائی اور بے حمیتی کے لقمے کھلاتے ہوئے نعرہ لگایا جاتا کہ ''سب سے پہلے پاکستان'' ۔ اگر یہی کچھ ہمارے کمانڈو نے کیا تو کیا غلط کیا؟

سٹفن لی کاک نے کہا "اگر مجھے ایک یونیورسٹی تعمیر کرنے کے لیے کہا جائے تو میں سب سے پہلے تمباکو نوشی کا کمرہ تعمیر کرواؤں گا۔اُس کے بعد اگر کچھ رقم بچ گئی تو خواب گاہیں اور اُن سے منسلک لائبریری اور دار المطالعہ (سٹڈی) تعمیر کیے جائیں گے اور اگر اِس تمام کام کے بعد بھی کچھ رقم بچ گئی تو چند پروفیسر حضرات اور درسی کُتب حاصل کر لی جائیں گی"۔ہمارے حکمران بھی سٹفن لی کاک کی طرح سب سے پہلے اپنی ذات کو دیکھتے ہیں ، پھر اپنے خاندان اور عزیز واقارب کو اور اگر کچھ بچ رہے تو پھر ملک و قوم کی طرف نگاہ کرنے کی زحمت بھی کر لیتے ہیں ۔ "اوّل خویش ، بعد درویش" ہمارے ہر حکمران کو مرغوب ہے اسی لیے وہ دل و جان سے اِس پر عمل کرتے ہیں اور چونکہ اِس غریب ملک میں "خویش" کا پیٹ ہی پوری طرح بھر نہیں پاتا اِس لیے بیچارہ "درویش" مُنہ تکتا اور ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ جاتا ہے۔ ویسے پاکستانی درویشوں کے پاس بھی کم از کم ایک شے تو وافر مقدار میں ہے جسے حکمرانوں کی نذر کرتے ہوئے وہ کبھی خِسّت کا مظاہرہ نہیں کرتے ۔وہ شے ، وہ خزانہ "بَد دُعاؤں" کا ہے جو ہمارے درویش جھولیاں بھر بھر کر حکمرانوں پہ لٹاتے رہتے ہیں لیکن حکمرانوں پر اِن بَد دُعاؤں کا "کَکھ" اثر نہیں ہوتا۔

ہمارے محترم عمران خاں صاحب ڈیڑھ دو سال سے میاں برادران کو سمجھا سمجھا کے تھک گئے ہیں کہ ''میاں جی جان دیو ، ساڈی واری آن دیو'' لیکن کپتان صاحب کے درد و غم سے بے خبر میاں نواز شریف ہمیشہ مُسکرا کے ٹال دیتے ہیں ۔جب سے وہ چلا وطنی کاٹ کے آئے ہیں ایسے ''کائیاں'' ہو گئے ہیں کہ ہمارے کپتان صاحب کی ''واری'' دور سے دور تر ہوتی چلی جا رہی ہے ۔ تحریکِ انصاف والے کہتے ہیں کہ میاں صاحب ''روندی'' مار رہے ہیں جو صریحاً بے ایمانی اور ''گیم'' کے اصولوں کے منافی ہے'' ۔اصول تو یہی ہے کہ جب ایک ٹیم اپنی باری لے لیتی ہے تو دوسری کے لیے جگہ چھوڑ دیتی ہے ۔ لیکن ہمارے میاں برادران تو کسی دوسرے کے لیے میدان خالی ہی نہیں چھوڑتے ۔ تحریکِ انصاف والے یہ بھی کہتے ہیں کہ میاں صاحبان نے تو گھر کی دو ٹیمیں بنا رکھی ہیں ، ایک پیپلز پارٹی اور دوسری نواز لیگ جو اپنی اپنی باری بھگتاتی رہتی ہیں اور سوائے '' ڈنڈے والوں ''کے، جنہیں بزبانِ زرداری ''بِلّے'' کہا جاتا ہے ، کسی کو اپنے اندر گھُسنے ہی نہیں دیتیں ۔یہ بِلّے بھی خوب ہیں کہ جب جی چاہتا ہے دودھ پی کر مونچھوں کو زبان سے چاٹتے نکل جاتے ہیں جس سے قوم کو تو خیر کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ''دودھ'' اُس کے نصیب میں پہلے تھا نہ اب ہے لیکن ''واریاں'' لینے والے بہت چیں بچیں ہوتے ہیں ۔ کیونکہ '' واری'' اُن کی ہوتی ہے اور لے ''بِلّا'' جاتا ہے ۔ محترم آصف زرداری کہتے ہیں ''ایک بِلّا پھنس گیا ہے ،

اب جانے نہ دینا‘‘۔زرداری صاحب کا حکم سَر آنکھوں پر سوال مگر یہ ہے کہ جب یہی بِلّا‘‘ایوانِ صدر میں طبلے سارنگی پر ’’راگ ملہار‘‘ الاپتا رہتا تھا،تب توزرداری ’’ کا احسان۔ NRO صاحب نے اُسے کچھ نہیں کہا۔شاید اُس کے ’’پنجوں‘‘ کا خوف ہویا پھر اب زرداری صاحب نواز لیگ کو’’وقفِ مصیبت‘‘کرنے کے لیے وزیرِاعظم صاحب کو ہَلا شیری‘‘ دے رہے ہیں۔مقصد یہ کہ پیپلز پارٹی کی’’واری‘‘ فَٹا فَٹ آ جائے لیکن ’’ اطلاعاً عرض ہے کہ کاتبِ تقدیر نے بِلّے کے ناخن اکھاڑ پھینکے ہیں اور ویسے بھی وہ آجکل بیمار شمار‘‘ رہتا ہے۔سُنا ہے کہ وہ عارضۂ قلب میں مبتلاء ہے لیکن لوگ نہیں مانتے’’ سے AFIC ۔یہ دشمنانِ ملک وملّت کہتے ہیں کہ اگر اُسے دل کی تکلیف ہوتی تو وہ انجیو گرافی کروالیتا لیکن اُس نے انجیو گرافی سے صاف انکار کر دیا ہے کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ اندر سے ’’کَکھ‘‘ نہیں نکلنا۔کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انجیو گرافی تو دل کی ہوتی ہے اور ہمارے مشرف صاحب کے ہاں تو دِل نامی کوئی شے موجود ہی نہیں پھر کِس کی انجیو گرافی اور کیسی انجیو گرافی ؟۔کچھ لوگوں کے خیال میں یہ معاملہ ’’کچی لسّی‘‘ کی طرح بڑھتا ہی چلا جائے گا اِس لیے وہ نواز لیگ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ’’مٹی پاؤ‘‘ ۔برطانوی مصنف ایرِیل اوک کہتا ہے ’’وہاں ایک آمر کی لاش بڑی بے ہنگم اور کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔اُس کے تمام واقف کار اُس کا مضحکہ اُڑانے کے ساتھ ساتھ اُسے بُرے ناموں سے یاد کر رہے تھے ، لیکن میں رو رہا تھا کیونکہ میں اُسے

پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا''۔ ہمارا اِبّا بھی آجکل '' علیل شلیل '' ہے جبکہ قوم اُس کی صحت یابی کی منتظر۔ لیکن یہ انتظار ''مٹی پاؤ'' کے لیے نہیں بلکہ ۔۔۔۔

بات دوسری طرف نکل گئی ، میں عرض کر رہی تھی کہ ہمارے کپتان صاحب کی ''واری دور ہوتی چلی جارہی ہے جس کا ہم ''سونامیوں'' کو بہت دُکھ ہے اور ہمیں رہ رہ کر'' نواز لیگ پر غصّہ بھی آرہا ہے۔ویسے تو ہم جب جی چاہے اپنی سونامی کے زور پر اس حکومت کو ''چلتا'' کر سکتے ہیں لیکن ہمیں ملک و قوم کی بہتری مقصود ہے۔اگر نواز لیگ واقعی مُحبِّ وطن جماعت ہے تو وہ اِس کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے خود ہی ''پاسے'' ہو جائے اور ''کُرسی'' ہمارے کپتان صاحب کے لیے چھوڑ دے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ ایسا کرے گی نہیں کیونکہ وہ محبِ وطن نہیں ''امریکی غلام'' ہے اسی لیے ہمارے خاں صاحب نے فرمایا ہے '' حکمرانوں نے پاکستان کو امریکی غلامی میں پھنسا دیا ہے اور وہ امریکیوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں ''۔ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کو صرف ہمارے ''دبنگ'' خاں صاحب ہی امریکی غلامی سے نجات دلا سکتے ہیں اِس لیے عوام کو چاہیے کہ اپنی اوّلین فُرصت میں لیگیوں کے نیچے سے کُرسی کھینچ کر اپنے گھر لے جانے کی بجائے خاں صاحب کے سپرد کر دیں۔

محترم عمران خاں صاحب نے آج پھر فرمایا کہ میاں برادران چھ باریاں لے چکے اور اب ساتویں باری کے لیے اپنی اگلی نسل کو تیار کر رہے ہیں۔ بات تو سچ ہے مگر مخالفین تحریکِ انصاف کہتے ہیں کہ کپتان صاحب کو ایک چھوٹے صوبے (خیبر پختونخواہ) میں بطور ''ٹیسٹ'' جو باری دی گئی اُس میں تو تا حال وہ چاروں شانے چِت ہیں۔ اُنھوں نے تو 180 دنوں میں صوبے کی تقدیر بدلنے کا اعلان کیا تھا لیکن بدلتی تقدیر کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ شاید اسی لیے وہ سب کچھ تیاگ کر اب طالبان سے مذاکرات کا ''بگل'' کچھ زیادہ ہی شدّت سے بجانے لگے ہیں۔ اُنھوں نے حکومت سے کہا ہے کہ اگر اُس سے مذاکرات نہیں ہوتے تو تحریکِ انصاف کو موقع دے۔ میاں نواز شریف صاحب یہ موقع تو دینے کو تیار ہیں لیکن مینڈیٹ کے بغیر خالی خولی موقع تو بیکار ہے اور مینڈیٹ تو تبھی مل سکتا ہے جب خاں صاحب وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر جلوہ افروز ہوں۔ ظاہر ہے کہ نواز لیگ یہ رِسک لے نہیں سکتی اِس لیے مذاکرات تو ''ٹائیں ٹائیں فِش'' ہی سمجھیں۔ اب اگر مذاکرات نہیں تو پھر حکومت کو طوعاً وکرہاً طالبان کے خلاف ایکشن ہی لینا پڑے گا۔ انتظار کیجئے، اگلے دو چار روز میں اِس کا فیصلہ ہونے کو ہے۔

شنید ہے کہ طالبان بھی اب ''واری'' لینے والوں کی قطار میں شامل ہو گئے ہیں لیکن موسموں کی ادا یہ بتاتی ہے کہ عمران خاں صاحب کی ''واری'' آئے گی نہ

طالبان کی ''شریعتی باری''۔ البتہ کسی ''نئے نویلے'' چلّے کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کب دودھ پینے آ دھمکے۔ رہی ہماری بات تو ہم تو بادشاہ گر ہیں، ہم باریاں دیتے ہیں، لیتے نہیں۔ شاید اِسی لیے بھٹو مرحوم نے کہا تھا کہ ''طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں''۔

خوش آمدید بلاول زرداری

1970ء کے پہلے عام انتخابات کے وقت ہم لاہور کالج برائے خواتین میں پڑھا کرتے تھے۔ سیاسی جرثومے تو ہمارے خون میں پہلے ہی موجود تھے لیکن کالج کی زندگی میں ہمارا خونِ گرم ہر وقت کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی اُمنگ جوان رکھتا۔ اُنہی دنوں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اپنے روحانی ''ڈیڈی'' ایوب خاں سے ناراض ہو کر سیاسی اکھاڑے میں کودے اور ہم نے اُن کی قصیدہ گوئی اپنا شعار بنا لیا۔ ہمارے ساتھ کالج کی اور بھی بہت سی ''جیالیاں'' ایشیا کو ''سُرخ'' کرنے کی فکر میں غلطاں رہتیں۔ پھر الیکشن ہوئے اور بھٹو مرحوم کے ''روٹی، کپڑا اور مکان'' نے ایسا جھاڑو پھیرا کہ کوئی کلاہ و دستار سلامت نہ رہی۔ پھر ''اصلی'' سیاست شروع ہوئی جس سے ہمارا مشرقی بازو الگ ہو گیا اور ہم پیپلز پارٹی سے الگ۔ تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو، شیخ مجیب الرحمٰن اور اندرا گاندھی سقوطِ ڈھاکہ کے ذمہ دار تھے لیکن ہم اِس کا فیصلہ اللہ اور تاریخ پر چھوڑتے ہیں۔

بھٹو مرحوم کے بعد اُن کی ہونہار بیٹی بینظیر نے دو دفعہ عنانِ اقتدار سنبھالی۔ تیسری دفعہ جنابِ آصف زرداری پیپلز پارٹی کے سیاہ و سفید کے مالک

بنے لیکن چوتھی دفعہ پیپلز پارٹی سکڑ سمٹ کر سندھ تک محدود ہو گئی اور اب پارٹی کے تَنِ مُردہ میں جان ڈالنے کے لیے بلاول زرداری سامنے آئے ہیں اور اُس نوجوان نے ہم جیسوں کو بھی یہ سکھا دیا ہے کہ ''ٹویٹر'' کا درست استعمال کیسے کہتے ہیں۔ بلاول نے طالبان کے بارے میں جو دلیرانہ موقف اختیار کیا ہے، اُس پر بعد میں بات ہو گی پہلے دہشت گردی کی نئی لہر پر محترم عمران خاں صاحب کے ردِ عمل پر بات ہو جائے۔

مذاکرات کے جذباتی حامی جنابِ عمران خاں نے فرمایا ''ہم اپنی فوج کے ساتھ ہیں۔ اگر آپریشن کا فیصلہ کر لیا گیا ہے تو سیاسی قیادت کو ہمیں اعتماد میں لینا چاہیے''۔ خاں صاحب ایک بڑی سیاسی جماعت کے سَربراہ ہیں اِس لیے یہ اُن کا حق بنتا ہے کہ اُنہیں اعتماد میں لیا جائے۔ ویسے بھی یہ زیادتی ہے کہ حکومت اور فوج خاں صاحب کو بتلائے بِنا ''چوری چوری، چُپکے چُپکے'' طالبان کو ''پھڑکانے'' کا پروگرام بنا لے اور خاں صاحب مذاکرات کے ڈھنڈورچی بنے گلی گلی ''اَمن کی آشا'' کے گیت گاتے پھریں۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ وزیرِ اعظم اور آرمی چیف سے خاں صاحب کی ملاقاتیں کروائی جا رہی تھیں اور کہاں یہ کہ وزیرِ داخلہ بھی ''مُکھ'' موڑ بیٹھے ہیں۔ کیا یہ 'کھُلا تضاد نہیں'' ؟۔ پہلے تو وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد صاحب ہی خاں صاحب کو چھوٹی موٹی ''سچی جھوٹی'' خبر دے کر اُن کا دل بہلا دیا کرتے تھے لیکن اب اُنہوں نے بھی لفٹ کروانی بند کر دی ہے۔ شاید خاں صاحب کے تکرار اور اصرار نے ہمارے وزیرِ داخلہ کو تھکا دیا ہو

۔ویسے تو وہ جوان آدمی ہیں اور اتنی جلدی تھکنے والے بھی نہیں لیکن آجکل پتہ نہیں کیوں کچھ لوگ اُن کی جوانی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔ ہمارے ایک محترم لکھاری مظہر برلاس صاحب اپنے کالم میں لکھتے ہیں " وزیرِ داخلہ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کیا کریں ۔اُنہیں چاہیے کہ وہ پرانے زمانوں کی طرح رُوپ بدل کر سامنے آئیں بلکہ اُنہیں ایسا کرنے کی بھی ضرورت نہیں ، وہ صرف وِگ اُتار کر اپنا اصل ''چہرہ'' سامنے لے آئیں ۔دہشت گردوں کو ''وِگ'' کا پتہ نہیں ''۔ مجھے برلاس صاحب بھی طالبان کے کچھ حامی ہی لگتے ہیں ۔وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے جوان بلکہ نوجوان وزیرِ داخلہ صاحب ''وِگ'' کے بغیر بوڑھے ، لاغر اور بیمار بَن کر سامنے آئیں تاکہ طالبان اُن پر چھا جائیں ، لیکن ہم ایسا ہرگز نہیں چاہتے کیونکہ دُشمن کے سامنے ''تگڑا'' بَن کر جانا بھی جنگی حکمت عملی کا حصّہ ہوتا ہے۔ویسے بھی ''وِگ'' کی بدولت ہمارے کم از کم دو لیڈر تا دمِ مَرگ بوڑھے نہیں ہو سکتے ایک چوہدری نثار احمد اور دوسرے اپنے شیخ رشید۔ تحقیق کہ قوم کو اُن کی ''بابَرکت وِگوں'' سے پیار ہے۔

بلاول زرداری نے انٹرنیٹ میں گھُس کر پرویز مشرف کو ''بزدل ''تو کہہ دیا ، اگر وہ احمد رضا قصوری کے سامنے مشرف کو بزدل کہتے تو پھر اُنہیں '' لگ پتہ جاتا'' ۔انتہائی محترم ڈاکٹر صفدر محمود نے اپنے کالم میں لکھا ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں احمد رضا قصوری بے فکرے طلباء کو محظوظ کرنے کے لیے

کندھے پر بندریا بٹھا کر گول دائرے میں سائیکل چلایا کرتے تھے، جس کے وہ عینی شاہد ہیں۔اپنے کالم کے آخر میں وہ لکھتے ہیں ''میں نے قصوری صاحب کو جنرل مشرف کے وکیل کی حیثیت سے صحافیوں پر برستے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے آج بھی اُس کے کندھے پر بندریا بیٹھی ہوئی ہے۔بھلا وہ بندریا کون تھی؟ سہمی ہوئی بندریا؟'' ۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بڑھتی عمر کے ساتھ انتہائی محترم ڈاکٹر صفدر محمود کی بینائی کچھ کمزور ہو گئی ہے کیونکہ آجکل قصوری صاحب کے کندھے پر بندریا نہیں بلکہ سہما ہوا بندر بیٹھا ہے جس کے بارے میں شنید ہے کہ وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔

کچھ لوگ پرویز مشرف صاحب کے خلاف کہی گئی باتوں کو افواج پاکستان کی توہین قرار دیتے ہیں جو سِرے سے غلط ہے کیونکہ افواج پاکستان کی عظمتوں سے انکار ممکن ہی نہیں۔اگر لاکھوں فوجی بھائیوں میں ایک مشرف جیسا بھی پیدا ہو جائے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ۔اگر الفت و محبت اور عزت و احترام کا یہی معیار مقرر کر لیا جائے جیسا کی مشرف صاحب کے حامی کہتے ہیں تو پھر حضرت لوط علیہ اسلام کی بیوی، حضرت نوح علیہ اسلام کی بیوی اور بیٹے اور حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے باپ کو بھی انتہائی عزت و احترام دینا ہر اہلِ کتاب پر واجب ہو گا جبکہ ایسا نہیں ہے۔مشرف صاحب کا تو افواج پاکستان کے ساتھ محض اتنا سا رشتہ ہے کہ وہ اِس محترم ادارے کا ایک ایسا فرد تھا جس نے اپنے

ہی ادارے کو اپنی ''کرتوتوں'' کی بنا پر بدنام کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔اِس لیے اگر انگلیوں پر گنے چند ''عاشقانِ مشرف ''اپنے ہیرو لیکن '' قومی زیرو'' کو محض بچانے کی خاطر افواج پاکستان کی بدنامی کا جواز تراش رہے ہیں تو یہ بالکل لغو اور بے بنیاد ہے اور پاک فوج بھی خوب جانتی ہے کہ اِس ''ٹولے'' کا مقصد کیا ہے۔ویسے بھی اب پر عدمِ اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ادارے AFIC تو مشرف صاحب نے اپنے ہی ادارے کے ماہر ترین ڈاکٹرز سے انجیو گرافی کروانے سے انکار کر دیا ہے اگر ہمارے ''بہادر کمانڈو'' پاکستان سے کھِسک لینے کے لیے بہانے تراش رہے ہوں تو الگ بات ہے ورنہ جہاں تک ہم جانتے ہیں ،انجیو گرافی ایک عام سا ٹیسٹ ہے جو بیشمار پرائیویٹ ہسپتالوں میں بھی ہو رہا ہے اور اِس وقت پاکستان کے مختلف ہسپتالوں میں کم و بیش 150 انجیو گرافی مشینیں کام کر رہی ہیں۔ اپنے آمرانہ دَورِ حکومت میں مشرف صاحب متواتر یہ رَٹ لگاتے رہتے تھے کہ اُن کی جان و مال سب کچھ پاکستان کے لیے ہے اور ''سب سے پہلے پاکستان'' اُن کے لبوں سے پھسلتا رہتا تھا لیکن آج اُسی پاکستان میں وہ ایک معمولی سا ٹیسٹ کروانے کے لیے بھی تیار نہیں۔

میں لکھنے بیٹھی تھی نونہالِ صحنِ چمنِ زرداری عزیزم بلاول کی سیاست میں آمد پر لیکن بات کہیں کی کہیں نکل گئی اور کالم کا پیٹ پھولنے لگا۔اِس لیے بلاول پر پھر کسی وقت تفصیل سے لکھوں گی۔ فی الحال صرف اتنا ہی کہ بلاول

زرداری کی سیاست میں آمدہٹری دھماکے دارثابت ہو رہی ہے۔ پہلے وہ اپنے ''سیاسی انکلوں'' کے پیچھے ایسے پڑے کہ سبھی کانوں کو ہاتھ لگانے لگے پھر پلٹے تو آمر مشرف کو رگڑے پہ رگڑا دیتے چلے گئے اور یہاں تک کہہ دیا ''لگتا نہیں کہ بُزدل مشرف نے کبھی فوجی وردی بھی پہنی ہو''۔ آجکل طالبان کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ کبھی دبئی اور کبھی اپنے محفوظ ترین گھر میں بیٹھ کر کہہ رہے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مستقبل بعید میں بھی اُن کا باہر نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ اپنے گھر میں ہی وزیرِ اعظم بن کر قوم سے خطاب کرتے تو نظر آتے ہیں لیکن گلیوں میں نکل کر بے کسوں کے آنسو پونچھنے کو ہرگز تیار نہیں۔ بی بی شہید جب قوم سے خطاب کرتیں تو ساتھ بھٹو مرحوم کی تصویر ہوتی، آصف زرداری بھٹو مرحوم اور بی بی شہید دونوں کی تصاویر کے جلو میں خطاب کیا کرتے تھے جبکہ بلاول زرداری کے ''وزیرِ اعظمی'' خطاب میں دونوں کی بجائے بابائے قوم کی تصویر نظر آتی ہے جس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پیپلز پارٹی کو بھی ادراک ہوگیا ہے کہ اب لوگ بھٹو مرحوم اور بی بی شہید کی قبروں کو ووٹ نہیں دیں گے۔ ویسے پیپلز پارٹی نے بلاول زرداری کو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا ''بہروپ'' دے کر ڈرامہ خوب کیا ہے۔

کہیں دیر نہ ہو جائے

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔ سرگوشیاں

کہ کرپشن، مہنگائی، دہشت گردی، طالبان اور امریکہ پر اتنا کچھ اور اتنی بار لکھا جا چکا ہے کہ اب یہ موضوعات گھِس پٹ چکے ہیں۔اسی لیے تقریباً ہر کالم نویس ''گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل'' کی سی کیفیت میں مبتلاء رہتا ہے کیونکہ یہی وہ مسائل ہیں جنھوں نے عشروں سے ارضِ پاک کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ رکھا ہے۔اگر حالات میں بہتری کی کوئی صورت نظر آتی تو لکھنا محال نہ ہوتا لیکن بدلتے سیاسی موسموں کے باوجود حالات ہمیشہ جوں کے توں رہتے ہیں اور قوم کو ''ہر کہ آمد، عمارتِ نَو ساخت'' کی سی کیفیت کبھی نظر نہیں آئی۔ حکومتیں بدلتی ہیں اور کچھ چہرے بھی لیکن ایجنڈا سبھی کا ایک ہی ہوتا ہے۔

نواز لیگ کی حکومت سے عوام کو بہت سی توقعات وابستہ تھیں اور خیبر پختونخواہ میں تحریکِ انصاف کی حکومت سے بھی، لیکن دونوں نے مایوس کیا ۔۔۔۔ بہت مایوس۔

تحریکِ انصاف کی ''جذباتی'' سیاست کا تو محور و مرکز ہی یہ تھا اور ہے کہ

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیر

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

لیکن وہ درد، تڑپ، کسک، جلن اور لگن ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔ تحریکِ انصاف کے ''بہی خواہوں'' کو یہ بہت برا لگے گا لیکن سچ یہی ہے کہ تا حال محترم عمران خاں صاحب کا ہر'' ایکشن ''حصولِ اقتدار کی تگ و دَو کرتا نظر آتا ہے۔لاریب خاں صاحب محبِ وطن ہیں۔ حصولِ اقتدار ہر محبِ وطن شہری کا آئینی حق ہے لیکن اِس کی بھی کچھ حدود و قیود ہیں ۔اب ایسا بھی نہیں کہ حصولِ جاہ کے عشق میں بتلاء ہو کر کوئی اِس مقام تک پہنچ جائے کہ

گر بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا

گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

انتہائی محترم خاں صاحب آجکل یہی کچھ کر رہے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی تقریباََ ہر سیاسی جماعت اُن کے اِس اندازِ سیاست کی نقاد ہے اور سوائے اُن کی اتحادی جماعت اسلامی کے کوئی ایک جماعت بھی ایسی نہیں جو اُن کے اِس طرزِ سیاست سے نالاں نہ ہو ۔اگر محترم عمران خاں واقعی قومی و ملیّ خدمت کے جنوں میں بتلاء ہیں تو پھر اُنہیں اپنی اداؤں پہ غور کرنا ہو گا۔

تحریکِ انصاف سے تو پھر بھی یہ خیال کرتے ہوئے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے کہ

وہ کارزارِ سیاست کی نوزائیدہ اور نَو وارد جماعت ہے جسے حکمرانی کا تجربہ نہیں لیکن نواز لیگ تو اِس میدان کی کُہنہ مشق کھلاڑی ہے اور خوب جانتی ہے کہ مشکل گھاٹیوں کو کیسے پار کیا جاتا ہے۔آٹھ ماہ گزر چکے لیکن نواز لیگ ابھی تیاری کے مراحل میں ہے اور تا حال کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ اُس نے کیا کرنا ہے ۔میاں برادران کا یہ انوکھا اور نرالا اندازِ سیاست دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سیاست کے سَر کش گھوڑے کی طنابیں کھینچنے کی اُن میں سکت ہی باقی نہیں بچی ۔بجا کہ ''دودھ کا جَلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے'' اور میاں برادران تو ایک نہیں دو،دو مرتبہ ''دودھ کے جَلے'' ہیں لیکن ایسی احتیاط بھی کس کام کی جو قوم کے اعتماد کو ہی متزلزل کر دے ۔ہم یہ تو ہر گز نہیں کہتے کہ ''قدم بڑھاؤ نواز شریف ، ہم تمہارے ساتھ ہیں '' ۔کیونکہ میاں صاحب اس کا مزہ چکھ چکے ہیں لیکن دست بستہ یہ ضرور عرض کرتے ہیں کہ احتیاط لازم لیکن اِس سے پہلے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے بہتر یہی ہے کہ جو کچھ کرنا ہے کر گزریے کہ اب قوم کے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو ہے ۔

آل پارٹیز کانفرنس میں تمام سیاسی جماعتوں نے متفقہ طور پر نواز لیگ کو مذاکرات یا ایکشن کا مینڈیٹ دیا لیکن تا حال حکومت گومگو کی کیفیت سے دوچار نظر آتی ہے جبکہ اِس دوران طالبان نے متواتر دھماکے کرکے فوجی جوانوں

سمیت بہت سے شہریوں کو شہید کر دیا۔بنّوں میں افواج پاکستان پر براہِ راست حملہ کرنے کے بعد طالبان کے ترجمان شاہد اللہ شاہد نے یہ کہا کہ وہ مذاکرات کے لیے تیار ہیں جو جلتی پر تیل چھڑکنے کے مترادف تھا۔فوج نے ردِ عمل میں جارحانہ کارروائی کرکے طالبان کو یہ درست پیغام دے دیا کہ اب مزید صبر کی گنجائش نہیں ، وہ ایک ماریں گے تو ہم دَس ۔شنید ہے کہ وزیرِ اعظم صاحب نے بھی چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف کو بھرپور جواب دینے کا عندیہ دے دیا ہے لیکن اب بھی حکومتِ وقت میں جھجک کا واضح عنصر نظر آتا ہے۔طالبان نے ایک دفعہ پھر مذاکرات کی پیش کش کرکے حکومتی بیقراری میں اضافہ کر دیا ہے۔اور اب ایک دفعہ پھر ایوانِ اقتدار کے بزرجمہر سَر جوڑ کر بیٹھ گئے ہیں حالانکہ صاف نظر آ رہا ہے کہ افواج پاکستان کی بھرپور جوابی کارروائی سے پریشان ہو کر طالبان نے یہ سیاسی چال چلی ہے۔ اب کہا جا رہا ہے کہ طالبان کے چالیس ، پچاس گروہوں میں سے اچھّے اور بُرے طالبان کو الگ کیا جائے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت کے پاس ایسی کونسی چھلنی ہے جس میں چھان پھٹک کر وہ اچھّے اور بُرے طالبان کو الگ کرے گی ۔ حقیقت تو یہی ہے کہ طالبان کے سبھی گروہ اِس وقت خود کش حملوں اور بم دھماکوں میں ملوث اور مُلا فضل اللہ کی چھتری کے نیچے ہیں ۔کیا حکومت کے لیے یہ کافی نہیں کہ طالبان کا متفقہ امیر مُلا فضل اللہ حکومت کا باغی اور بھگوڑا ہے ؟۔کیا حکومت اور ہماری انٹیلی جنس ایجنسیاں نہیں جانتیں کہ مُلا فضل اللہ کے پاس افغانی

پاسپورٹ ہے اور وہ اُسی پاسپورٹ پر بیرونی ممالک کے دورے بھی کرتا ہے ؟۔اور سلگتا ہوا سوال یہ کہ کیا افغانستان میں سرِ عام پھرنے اور بیرونی دَورے کرنے والے مُلا فضل اللہ کو واصلِ جہنم کرنا امریکہ کے لیے کوئی مسلہ ہے ؟۔جب مُلا فضل اللہ ''کنڑ'' میں افغان حکومت کی پناہ میں تھا تب بھی امریکہ کے لیے اسے ''شکار'' کرنا کوئی مسلہ تھا، نہ اب ہے لیکن امریکہ ایسا ہر گز نہیں کرے گا کیونکہ اُسے پاکستان میں بَدامنی بہت مرغوب ہے۔

یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سبھی طالبان آئینِ پاکستان کے باغی ہیں اِس لیے علمائے کرام کی طرف سے چھیڑی گئی اچھے اور بُرے طالبان کی بحث فضول ہے۔مذہبی اور مسلکی مباحث کی تاریخ بہت پرانی ہے۔جب ہلاکو کے سپاہی بغداد کی فصیلوں پر کمندیں ڈال رہے تھے تب بغداد کے طول و عرض میں پانچ سو جگہوں پر بغداد کے علماء مذہبی و مسلکی مناظروں میں اُلجھے ہوئے تھے۔سکوتِ بغداد کی خون آشام داستان اب تاریخ کا حصہ ہے لیکن کوئی بھی مورخ بغداد کی تباہی میں علماء کے کردار کو نظر انداز نہیں کر سکتا ۔آج بھی وہی صورتِ حال ہے۔کچھ مذہبی گروہ ''طالبانی شریعت'' کو عین اسلام قرار دیتے ہیں تو کچھ کھلی دہشت گردی۔جب دست بستہ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا اسلام بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی اجازت دیتا ہے ؟۔تو جواب دیا جاتا ہے کہ ایسا اور ''را'' کے ایجنٹ ہیں۔ اگراِس CIA کرنے والوں کی مذمت کی جانی چاہیے کیونکہ یہ

جواز کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر مُلا فضل اللہ تو مسلمہ غیر ملکی ایجنٹ ہی ٹھہرے گا کیونکہ اُس کے ترجمان احسان اللہ احسان اور شاہداللہ شاہد بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بعد سینہ تان کر ''ذمہ داری'' قبول کرتے ہیں ۔کیا طالبانی عشق میں مبتلاء انتہائی محترم علمائے کرام مُلا فضل اللہ اور اُس کے ساتھی طالبان کو دہشت گرد قرار دیتے ہوئے حکومتِ وقت سے اُن کے خلاف کارروائی کا تقاضہ کریں گے ؟۔اگر نہیں تو پھر کیا پاکستان کی تاریخ کا یہ خونچکاں باب لکھتے ہوئے مورخ علماء کے اِس کردار کو نظر انداز کر پائے گا؟۔

اَن دیکھی ، اَن جانی اور اندھی موت سے لرزہ بَر اندام لوگوں کے بارے میں یونانی داستان گو ایسوپ کہتا ہے ''مسلسل خوف کی حالت میں زندہ رہنے سے مَر جانا بہتر ہے'' ۔فرانسس بیکن کہتا ہے ''میں نے موت کے بارے میں غور و فکر کیا اور اُسے خوف سے انتہائی کم تر درجے کا پایا''۔ قوم کے سَر سے تو ہر روز بلکہ دن میں کئی کئی بار موج خوں گزرتی ہے لیکن آفرین ہے اُن حال مستوں پر جو خاموشی سے موت کو گلے لگا لیتے ہیں ۔یہ تو طالبان بھی جانتے ہی ہوں گے کہ اُن کی تمام تر دہشت گردی اور خباثتوں کے باوجود یہ بہادر اور عزمِ صمیم کی مالک قوم کاروبارِ حیات میں یوں مگن رہتی ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور طالبانی درندگی کی بھینٹ چڑھنے والے شہیدوں کے کٹے پھٹے جسم بھی پکار پکار کے یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ

کرو کج جبیں سے سرِ کفن ، میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن ، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
ایسی قوم کو بھلا کون شکست دے سکتا ہے۔

ہمارے سیاسی بازی گر

ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا کہ اپوزیشن کے دل میں ہمارے وزیرِ اعظم کی محبت اتنی کُوٹ
کُوٹ کر بھری ہے کہ اب اُسے جدائی کا ایک لمحہ بھی گوارا نہیں۔ قومی اسمبلی کے حالیہ
اجلاس میں قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا
''آنکھیں ترس گئیں کہ ایوانِ وزیرِ اعظم کا دروازہ کھُلے اور وزیرِ اعظم (چھَن سے)
پارلیمنٹ میں آ جائیں'' ۔اُنھوں نے یہ بھی کہا ''ہمیں لیڈر کی ضرورت ہے ، وزیرِ
اعظم آ کر کہیں کہ وہ ہمارے لیڈر ہیں۔ پیپلز پارٹی اُن کے ساتھ ہے ''۔اللہ ہمارے
وزیرِ اعظم کو نظرِ بَد سے بچائے ، اتنی مقبولیت تو دیکھی ، نہ سُنی۔ کیا ہی اچھّا ہوتا کہ
جب سیّد خورشید شاہ تقریر فرما رہے تھے تو ''بیک گراؤنڈ'' میں مدھر دھنوں کے
ساتھ یہ گانا بھی چل رہا ہوتا

اکھیاں اُڈیکٹ دِیاں، دل واجاں ماردا

آ جا پردیسیا ، واسطہ ای پیار دا

لیکن شاید ایسا مصلحتاً نہیں کیا گیا کیونکہ خطرہ تھا کہ کہیں بلاول زرداری ٹویٹر پر یہ ''آہ و
بکا'' شروع نہ کر دیں کہ پارلیمنٹ کو ''پنجابی ثقافت'' اجاگر کرنے کے لیے استعمال کیا
جا رہا ہے۔ ویسے تو بلاول کے ہونٹوں

پر کبھی پنجاب کا نام نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں ''مَرسوں مَرسوں ، سندھ نہ دیسوں'' لیکن اگر کبھی کسی سَر پھرے نے سندھی ٹوپی اور اَجرک کے مقابلے میں ''پنجابی پگ اور دھوتی'' کا دِن منانے کی ٹھان لی تو بلاول کیا پوری پیپلز پارٹی اِس ''لسانیت'' کے خلاف تلواریں سونت کر باہر نکل آئے گی۔ سچ ہے کہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ۔کسی شخص نے دوسرے سے پوچھا کہ شیر انڈے دیتا ہے یا بچے ؟۔دوسرے شخص نے جواب دیا''شیر جنگل کا بادشاہ ہے ، اُس کا جب جی چاہتا ہے انڈے دے دیتا ہے اور جب جی چاہے بچے''۔ پیپلز پارٹی بھی بادشاہ ہے اور بادشاہوں کی جماعت۔ ''رَوا'' اور'' نا رَوا'' کی تفریق وہی ہے جو پیپلز پارٹی کا مَن چاہے۔ وہ سندھی ثقافت کو اجاگر کرکے بہت مستحسن قدم اٹھا رہی ہے لیکن ''جاگ پنجابی جاگ'' جیسے نعروں پر چیں بچیں بھی بہت ہوتی ہے ۔

آمدم بَر سَرِ مطلب ، نواز لیگ کے ''مجنونِ کُہنہ'' اپنے شیخ رشید صاحب بھی پارلیمنٹ میں خوب گرجے برسے ۔دراصل شیخ صاحب کو میاں نواز شریف پر غصہ ہی بہت ہے کیونکہ ہزار ''منتوں ترلوں'' کے باوجود میاں صاحب ''تَرکِ تعلقات'' پر اَڑے رہے اور شیخ صاحب'' نَویں مرتبہ'' وفاقی وزیر بننے سے بال بال بچ گئے ۔اگراِس ''تناظر'' میں دیکھا جائے تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ حصولِ وزارت کے معاملے میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب شیخ رشید صاحب سے کہیں زیادہ

پہنچی ہوئی" شے ہیں لیکن مولانا کا ذکر بعد میں۔ شیخ صاحب نے پارلیمنٹ میں فرمایا" کہ اگر کوئی رُکنِ اسمبلی چالیس روز تک غیر حاضر رہے تو اُس کی سیٹ خالی ہو جاتی ہے اِس لیے سپیکر صاحب وزیرِ اعظم کی غیر حاضری پر اپنا فیصلہ دیں۔ سپیکر صاحب نے فرمایا کہ وزیرِ اعظم صاحب کی چھٹی کی درخواست آئی ہوئی ہے لیکن شیخ صاحب نے "میں نہ مانوں" کی رَٹ لگائے رکھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب میاں نواز شریف صاحب کو دیکھے بنا اُداس ہو جاتے ہیں اِس لیے وہ بار بار اپنا مطالبہ دہراتے رہتے ہیں لیکن میاں صاحب کا خیال ہے کہ "قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا"۔ اُن کے سامنے "مُرشد ملتانی" کی مثال موجود ہے جو پارلیمنٹ کا کوئی اجلاس کبھی نہیں چھوڑتے تھے لیکن جب اعلیٰ عدلیہ کے ہاتھوں اُن کا جانا ٹھہر گیا تو "بے وفا" پارلیمنٹ میں سے "کَس نَمے پُرسَد کہ بھیا کون ہو"۔ راجہ رینٹل کَم کَم ہی پارلیمنٹ کو اپنا دیدار کرواتے تھے اسی لیے اپنی مدت پوری کر گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کی وزارتِ اعظمیٰ مدت ہی بقدرِ اشکِ بُلبُل تھی۔ اسی فارمولے کے تحت اگر ہمارے وزیرِ اعظم پارلیمنٹ کو مکمل طور پر فراموش کر دیں تو پانچ سال پورے کرنے کی گارنٹی ہم دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہمارے وزیرِ اعظم دو تہائی اکثریت کے باوجود بہت محتاط ہیں اور پارلیمنٹ سے دور دور ہی رہتے ہیں۔ پارلیمنٹ سے کیا وہ تو اسلام آباد سے بھی دُور دُور رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ویسے تو وہ اکثر بیرونی دَوروں پر ہی رہتے ہیں لیکن اگر پاکستان میں ہوں

توپھر بھی اسلام آباد کی بجائے مَری یا لاہور میں ہی پائے جاتے ہیں۔ قوم کے محبوب میاں صاحب خوب جانتے ہیں کہ اُنہیں جلاوطنی کا دُکھ کیوں جھیلنا پڑا اِس لیے وہ اپنا فارغ وقت پارلیمنٹ کی بجائے آرمی چیف جناب راحیل شریف کے پہلو میں گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اندریں حالات ہمارا پارلیمنٹ کو یہی مشورہ ہے کہ وہ میاں صاحب کا "کھہڑا" چھوڑ دیں لیکن اگر پارلیمنٹ بضد ہے تو پھر "اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر"۔

جب یہ افواہ اُڑی کہ جنابِ وزیرِ اعظم آج پارلیمنٹ کو اپنا دیدار کروانے والے ہیں تو تقریباََ سبھی "عشاق" اپنی شکایات کی "پوٹلیاں" باندھ کر پارلیمنٹ میں آ دھمکے۔ دیدہ و دِل فرشِ راہ تھے لیکن وزیرِ اعظم صاحب طرح دے گئے۔ جس پر عشّاق نے شدید ترین احتجاج کیا۔ مجبوراََ وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد کو یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وزیرِ اعظم صاحب بہت جلد پارلیمنٹ کو اپنا دیدار کروائیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آنے والے دِنوں مین چوہدری نثار احمد صاحب بھی یہ کہتے پائے جائیں گے کہ "وعدے قُرآن و حدیث نہیں ہوتے"۔ محترم عمران خاں صاحب نے فرمایا کہ چوہدری نثار احمد صاحب کی نیت پر کوئی شک نہیں لیکن اِس مشکل صورتِ حال میں ہمیں بھی اعتماد میں لیا جائے کیونکہ "ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں"۔

دُکھی عمران خاں صاحب کو نواز لیگ نے جس مصیبت میں گرفتار کر دیا ہے وہ سمجھ میں آنے والی ہے۔ نواز لیگ خود تو "پاسے" ہو گئی اور ہمارے بھولے بھالے خاں صاحب کا "متّھا" اُس گھاگ سے لگا دیا جسے اقتدار کے بغیر "بد ہضمی" ہو جاتی ہے۔ جس طرح جَل بِن مچھلی نہیں رہ سکتی، اُسی طرح مولانا فضل الرحمٰن کی اقتدار کے بغیر تَڑپ پھڑَک" بھی دیدنی ہوتی ہے۔ وہ ہر دَور میں اقتدار کے ایوانوں میں ہی گھومتے" نظر آتے ہیں اور جونہی اُنہیں احساس ہوتا ہے کہ حکومتی کشتی منجدھار میں پھنس گئی ہے وہ کشتی سے چھلانگ لگانے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ مولانا نے بہت تگ و دَو کی اور، منت سماجت بھی لیکن نواز لیگ اُنہیں خیبر پختونخواہ کی حکومت سونپنے پر راضی نہ ہوئی ۔ مولانا نے اقتدار کے بغیر پچھلے آٹھ ماہ جس عالمِ کَرب میں گزارے اُس کا اندازہ صرف مولانا ہی کر سکتے ہیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ اگر خیبر پختونخواہ کی حکومت نہیں تو میاں برادران کم از کم اتنے "بد لحاظ" تو ہر گز نہیں ہو سکتے کہ اُنہیں مرکزی وزارتوں میں حصّہ بھی نہ دیں لیکن نواز لیگ طرح دیتی رہی اور مولانا صاحب کی بے چینی کا یہ عالم رہا کہ

بستر کی ہر شکن سے پوچھ اُس کی بے قراری
کاٹی ہو رات جس نے کروٹ بدل بدل کے

نواز لیگ جب طالبان کے معاملے میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گئی، تب اُسے

مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا مُنہ بند کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اُس نے مولانا صاحب کے آستانۂ عالیہ پر دو وزارتوں کا ''چڑھاوہ'' چڑھا دیا۔اب مولانا کی جمیعت علمائے اسلام مرکزی حکومت کا حصّہ ہے اور حکومت طالبان کے خلاف آپریشن کرنے جا رہی ہے۔ مولانا صاحب کو مسلہ یہ درپیش ہے کہ اگر وہ ڈٹ کر آپریشن کی مخالفت کرتے ہیں تو مرکزی وزارتیں بھی ہاتھ سے جاتی ہیں اور کشمیر کمیٹی کی چیئرمینی بھی۔اِس کے علاوہ خیبر پختونخواہ کی حکومت کے حصول کا خواب تو پورا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔شاید یہی وجہ ہے کہ حکومت سے طالبان کے خلاف آپریشن نہ کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے مولانا کی زبان میں مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے اور لہجہ درخواست گزار کا سا لیکن تحریکِ انصاف کے خلاف بات کرتے ہوئے مولانا کی زہرناکی اپنی انتہاؤں کو چھونے لگتی ہے۔ویسے مولانا صاحب ہیں بڑے ''کائیاں ''اور چو مکھی لڑائی کے ماہر۔وہ ایک طرف تو مرکزی حکومت میں شامل ہیں جبکہ دوسری طرف حفظِ ماتقدم کے طور کے ساتھ مل کر تحریکِ انصاف کے خلاف ANP پر خیبر پختونخواہ میں پیپلز پارٹی اور متحدہ محاذ'' بنانے کی تگ و دَو بھی کر رہے ہیں۔ بلدیاتی انتخابات میں تحریکِ انصاف'' کے خلاف متفقہ امیدوار کھڑے کرنے کے لیے خیبر پختونخواہ میں پیپلز پارٹی ، اے این پی اور جمیعت علمائے اسلام کا مشترکہ اجلاس ہو چکا ہے اور اِن جماعتوں کے اکابرین حتمی نتیجے پر بھی پہنچ چکے ہیں۔یہ پیغام ہے مولانا کا نواز لیگ کے لیے کہ ''تُو نہیں ، اور سہی''

۔

شکنجہ کَس گیا

ہمیں بچپن ہی سے حضرت قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ سے والہانہ لگاؤ ہے۔وجہ یہ نہیں کہ ہمیں بچپن یا لڑکپن ہی سے حضرتِ اقبالؒ کی شاعری میں موجود فلسفہ و تفلسف کی سوجھ بوجھ تھی یا حضرت قائدِ اعظمؒ کی مسلمانانِ ہند کے لیے کوششوں اور کاوشوں کا کچھ پتہ تھا، بلکہ اِس لگاؤ کی وجہ یہ تھی کہ برِ صغیر کی اِن دو عظیم ترین ہستیوں کے یومِ پیدائش اور وفات پر سکول میں چھٹی ہوا کرتی تھی اور چھٹی ہمیں بچپن ہی سے بہت مرغوب ہے۔اِس چھٹی کا مزہ اُس وقت اور بھی دوبالا ہو جاتا تھا جب غیر متوقع طور پر چھٹی کا اعلان ہو جاتا اور ہم اپنے ''بَستے'' اُٹھائے چیختے چلاتے گھروں کو دَوڑ اُٹھتے ۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دِن پاکستان کے کسی بڑے لیڈر کے جہانِ فانی سے کُوچ کر جانے کے سوگ میں حکومت نے چھٹی کا اعلان کر دیا اور اِس سوگ کی کیفیت سے مکمل طور پر بے بہرہ ہمارا دل قہقہے لگانے لگا۔گھر پہنچ کر ہمارا افلاطونی ذہن یہ سوچنے لگا کہ اگر ایک بڑے آدمی کی وفات پر ایک چھٹی ہو سکتی ہے تو ہماری ''اُستانی جی'' جو اُس وقت ہمارے نزدیک بہت بڑی ہستی تھیں ، اُن کی وفات پر کتنی چھٹیاں ہو سکتی ہیں ؟۔ہماری یہ چھٹی حساب کتاب کرتے غارت ہو گئی لیکن عُقدہ وا نہ ہوا۔ اگلے دن سکول پہنچنے پر ہم نے چھٹی کے بارے میں اپنی سب

سے عزیز دوست کو اپنے اِن عالمانہ خیالات سے آگاہ کر کے مشورہ چاہا۔ وہ بد بخت ویسے تو شروع سے ہی کاسہ لیس تھی لیکن اُس دِن تو ایسی طوطا چشم نکلی کہ محض ''نمبر ٹانکنے'' کے لیے ٹیچر کو سب کچھ بتا دیا۔ اُس کے بعد پوری کلاس کے سامنے ہماری جو ''درگت'' بنی اُس کا احوال لکھنے کے لیے الگ کالم کی ضرورت ہے۔ اُس دن کے بعد سے جب تک ہم اُس کلاس میں رہے، ٹیچر کا شکنجہ ہمیشہ ہمارے گرد کَسا ہی رہا اور گاہے بگاہے ٹیچر صرف شکنجہ ہی نہیں بلکہ ہمارے بھی ''نَٹ بولٹ'' کَستی رہیں۔ ہم نے اُس دن کے بعد سے یہ سوچتے ہوئے اپنی اُس راز دان ''دوست'' سے ہمیشہ کے لیے ناطہ توڑ لیا کہ

کیا غم خوار نے رُسوا، لگے آگ اِس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا راز داں کیوں ہو

حضرتِ اقبالؒ اور بابائے قوم سے ہمیں آج بھی محبت ہے لیکن یہ محبت اب عقیدت میں ڈھل چکی ہے۔ مسلمانانِ ہند کے لیے اُن کی کوششوں اور کاوشوں کا ہر کوئی معترف ہے اور جو نہیں اُسے پاکستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ حضرتِ قائدؒ نے اسلام کی تجربہ گاہ کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں سے لَڑ کر یہ '' قطعۂ ارض''حاصل کیا، یہ الگ بات ہے کہ ہم آج تک اسے اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال نہیں کر سکے اور نہ مستقبل میں ایسی کوئی امید ہے۔ طالبان جو''اسلامی شریعت'' بندوق کے زور پر نافذ کرنا چاہتے ہیں، اُس کا

دین سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ہمارے علماء کرام کا یہ حال ہے کہ ہر کسی کی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ۔فرقوں میں بٹے علماء ، جو ایک دوسرے کی امامت میں نماز تک ادا کرنے کے روادار نہیں ، وہ کیا خاک نفاذِ اسلام کریں گے ؟۔حاکمانِ وقت کے پاس بھی گھڑا گھڑایا بہانہ یہ ہے کہ کِس کی شریعت نافذ کریں ؟۔شیعہ کی ، سُنّی کی ،.بریلوی کی ، دیو بندی کی یا اہلِ حدیث کی ؟۔ہمارے قائدین کا یہ عالم ہے کہ اُنہیں اپنی ذات کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگانے والے پرویز مشرف صاحب نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کے بعد سب سے پہلے کُتّوں کے ساتھ تصویر کھنچوا کر اہلِ یورپ و امریکہ کو یہ پیغام دیا کہ وہ اُنہی میں سے ایک اور اُنہی کا غلامِ بے دام ہے ۔مشرف اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ ڈرتے ورتے کسی سے نہیں لیکن اُن کا یہ فرمان صرف پاکستانیوں کے لیے تھا امریکہ کے لیے نہیں کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ جیسے ''چِت'' وہ امریکہ کے سامنے ہوئے ، دنیا میں اور کوئی نہ ہوا ہو گا۔اب یہ بہادر کمانڈو بیماری کا کے ڈاکٹروں کو AFIC میں لیٹا ہوا ہے اور سَچ تو یہی ہے کہ اُس نے AFIC بہانہ بنا کر بھی ''وَخت'' میں ڈالا ہوا ہے ۔اُنھوں نے تو اِس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اپنی میڈیکل رپورٹ میں یہ لکھ دیا کہ مریض اُن سے علاج نہیں کروانا چاہتا اِس لیے اُسے باہر بھیج دیا جائے ۔لیکن اپنے اکرم شیخ صاحب ''دھاڑنے'' لگے اور میڈیکل رپورٹ پر 13 اعتراضات اُٹھاتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ رپورٹ مرتب کرنے

والے بورڈ کے چیئر مین صاحب کو عدالت میں طلب کیا جائے کیونکہ وہ رپورٹ پر جرح کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے خصوصی عدالت کا جس نے ٹھنڈا پانی پلا کر شیخ کی رپورٹ پر کسی قسم کا AFIC صاحب کا غصّہ ٹھنڈا کیا اور اپنے فیصلے میں یہ لکھ دیا کہ شک و شبہ کیے بغیر اُسے تسلیم کیا جاتا ہے لیکن مشرف امریکہ نہیں جا سکتے (ہماری زبان کے میڈیکل بورڈ کی رپورٹ میں ایسی کوئی بات AFIC میں فرار نہیں ہو سکتے) کیونکہ نہیں کہی گئی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ چلنے پھرنے سے قاصر ہیں اِس لیے خصوصی عدالت میں پیش نہیں ہو سکتے۔ خصوصی عدالت نے مشرف صاحب کے قابلِ ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کرتے ہوئے اُنہیں 7 فروری کو عدالت میں طلب کر لیا ہے اور آئی جی اسلام آباد کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ عدالتی حکم کی تعمیل کروائیں۔ کچھ لوگوں کا میں AFIC خیال ہے کہ فوج عدالتی احکامات کی تعمیل کے لیے آئی جی اسلام آباد کو گھُسنے ہی نہیں دے گی۔ لیکن یہ سب ''عاشقانِ مشرف'' کی خوش فہمی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ فوج عدالتی احکامات کی راہ میں کبھی بھی رکاوٹ نہیں بنے گی۔ اب مشرف صاحب اور اُن کے حواریوں کو بھی یہ پتہ چل جائے گا کہ انتہائی محترم چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف، مشرف حمایت میں کہاں تک جا سکتے ہیں۔ اب مشرف صاحب کے وکیل احمد رضا قصوری صاحب کا یہ ہمہ وقتی راگ بھی بند ہو جائے گا کہ '' فوج مشرف کا ٹرائل نہیں ہونے دے گی کیونکہ مشرف کا ٹرائل فوج کی توہین ہے''۔
عدالتی فیصلے کے بعد ''مشرفی بزرجمہر'' احمد رضا قصوری نے کہا

کہ اُنھوں نے سات فروری کے لیے لائحہ عمل تیار کر رکھا ہے جسے اُنھوں نے اپنی پوٹلی میں بند کرکے اپنے کوٹ کی بائیں جیب میں ڈالا ہوا ہے اور یہ پوٹلی اب سات فروری کو ہی کھلے گی۔ احمد رضا قصوری کی پوٹلی میں جو کچھ بھی ہو گا وہ مشرف صاحب کے نقصان میں ہی جائے گا کیونکہ نادان دوست سے ہمیشہ دانا دُشمن بہتر ہوتا ہے اور قصوری صاحب کے بارے میں تو بَرملا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ہوئے تُم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اب مشرف صاحب کے گرد آئینی و قانونی شکنجہ مکمل طور پر کَسا جا چکا ہے اور اُن کی فرار کی ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اب ملزم کو عدالت میں پیش ہونا ہی ہو گا اور ایسا تو ہونا ہی تھا کیونکہ بقول خواجہ سعد رفیق مشرف قوم کا نہیں، اللہ کا مجرم ہے اور اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔ ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ جامعہ حفصہ کی بچیوں کو فاسفورس بموں کی غذا بنانے والے، اکبر بگٹی کو شہید کرنے والے، ڈاکٹر عافیہ صدیقی سمیت بہت سے بے گناہ پاکستانیوں کو امریکہ کے ہاتھوں بیچنے والے، سینکڑوں فوجی جوانوں کو کارگل کی جنگ کا ایندھن بنانے والے اور مُکّے لہرا لہرا کر اپنے آپ کو "طاقتِ کُل" ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے پرویز مشرف اب اُس ربِّ جبار و قہار کی پکڑ میں ہیں جس کی رَسّی تو دراز ہوتی ہے لیکن پکڑ مضبوط، بہت مضبوط۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

حکمت کی عظیم الشان کتاب میں درج کر دیا گیا ہے ''یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی اور مغفرت کے بدلے عذاب''۔ کون بَد بخت مسلمان ایسا ہو گا جو وطنِ عزیز میں اسلامی نظام کا نفاذ نہ چاہتا ہو۔پاکستان تو قائم ہی لا الہ اللہ کی بنیاد پر ہوا تھا اور سیکولر دانشور جتنی جی چاہے قلمی موشگافیاں کریں یا الیکٹرانک میڈیا کو اپنے خیالات کے پرچار کے لیے استعمال کریں لیکن صاحبانِ بصارت و بصیرت خوب جانتے ہیں کہ اس دھرتی کی بنیادیں اٹھانے والے معمار کے ذہن میں معمولی سی کجی بھی نہیں تھی ۔معمارِ پاکستان حضرتِ قائدؒ نے اِس دھرتی کو اسلام کا قلعہ قرار دیا اور فروری 1948ء میں امریکی عوام کے نام پیغام میں پاکستان کو پریمیئر اسلامی ریاست کہا۔سیکولر دانشور قائدؒ کی جس 11 اگست 1947ء کی تقریر کا بار بار حوالہ دیتے ہیں اُس میں بھی اسلام کے وہی روشن اصول بیان کیے گئے ہیں جو میرے آقا ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں بیان کیے تھے ۔56 کا آئین ہو ، 62 کا یا 73 کا، سبھی کی بنیاد اسلام اور نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے ۔اِس لیے یہ تو

طے ہے کہ آج نہیں تو کل بہر حال تمام قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالا ہی جانا ہے ، سوال مگر یہ ہے کہ کیا اِس دھرتی کا مقدر کون سی شریعت ہو گی ؟۔ شیعہ کی ، سُنّی کی ، دیو بندی کی یا اہل حدیث کی ؟۔ دین کو فرقوں اور گروہوں میں بانٹنے والے عوام نہیں علمائے اکرام ہیں اور طالبان جو بندوق کے زور پر اپنی شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں ، وہ ، بھی اُنہی کے مدرسوں سے پڑھ کر نکلے ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ وزیرِ داخلہ جناب چوہدری نثار احمد اور محترم عرفان صدیقی نے طالبان کی طرف سے کیے گئے ''بھونڈے'' مذاق کو بھی خوش آمدید کہا۔ مفاہمت کے جنوں میں مبتلاء حاکمانِ وقت جس ''طالبانی ناسور'' پر مفاہمت کی مرہم رکھنے کی تگ و دَو میں ہیں ، اُس کی ناکامی اظہر مِن الشمس ہے کیونکہ ناسور کے اندر بھرے موادِ بَد کو عملِ جراحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ حاکمانِ وقت کو بعد از خرابیَ بسیار ''جراحی'' کی طرف لوٹنا ہو گا کیونکہ یہ طالبانی ٹولہ وہ ہے ''جس نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی اور مغفرت کے بدلے عذاب'' ۔ کوئی ذی شعور کبھی نہیں چاہے گا کہ وطنِ عزیز میں آگ اور خون کا کھیل کھیلا جاتا رہے۔ ہر کسی کی اولین خواہش اور دعا یہی ہے کہ مذاکرات ہوں اور کامیاب ہوں لیکن تلخ حقیقت یہی ہے کہ طالبان کی غالب اکثریت نہ پہلے کبھی مذاکرات کی حامی تھی اور نہ اب ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک

تو طالبان کا ترجمان شاہد اللہ شاہد ببانگِ دہل کہتا تھا کہ ’’جنگ جاری رہے گی اور فوج پر حملے بھی‘‘ ۔شاہد اللہ شاہد کے اِس بیان کے بعد طالبان نے ارضِ پاک کو بے گناہوں کے خون سے رنگین کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اِس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے لیکن جب افواجِ پاکستان نے پلٹ کر بھرپور جواب دیا اور پاکستان کے کونے کونے سے طالبان کے خلاف صدائیں بلند ہونے لگیں، تب طالبانی حلقوں کی جانب سے مذاکرات کی رَٹ لگائی جانے لگی اور حاکمانِ وقت جو اپنے آپ کو ذہنی طور پر ایکشن کے لیے تیار کر چکے تھے ایک دفعہ پھر امن اور شانتی کی فاختائیں اڑانے لگے ۔وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب کے قومی اسمبلی میں پالیسی بیان سے پہلے ہر کوئی یہی سمجھتا تھا کہ وزیرِ اعظم طالبان کے خلاف ایکشن کے لیے پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیں گے لیکن اُنھوں نے چار افراد پر مشتمل مذاکراتی کمیٹی کا اعلان کرکے دھماکہ کر دیا ۔اب طالبان نے جس پانچ رکنی مذاکراتی کمیٹی کا اعلان کیا ہے اُس کا طالبان سے براہِ راست تو کوئی تعلق نہیں لیکن وہ طالبان کے لیے نرم گوشہ رکھنے اور مذاکرات کے حامی ضرور خیال کیے جاتے ہیں ۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ طالبان کے مقرر کردہ کمیٹی پاکستان کے آئین کو تسلیم کرتی ہے اور آئینی حدود کے اندر ہی مذاکرات کی حامی ہے جبکہ طالبان پاکستانی آئین کو کسی بھی صورت میں ماننے کو تیار نہیں ۔طالبانی کمیٹی کے ارکان جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں اور اسی کے تحت الیکشن لڑتے اور اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں جبکہ طالبان جمہوریت کو ’’کفریہ

نظام'' کہتے ہیں۔ وہی طالبان جنھوں نے محترم عمران خاں کو اپنا مذاکراتی نمائندہ مقرر کیا، کچھ عرصہ پہلے اُنہی کے ترجمان شاہد اللہ شاہ نے کہا تھا کہ ''اگر عمران خاں کو مذاکرات کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے وہ کفریہ نظام کو چھوڑ کر باہر آئیں''۔ عمران خاں صاحب اور مولانا فضل الرحمن نے مذاکراتی کمیٹی کا حصّہ بننے سے انکار کر دیا ہے۔ مولانا سمیع الحق صاحب نے کہا کہ عمران خاں صاحب کو ضرور مذاکراتی عمل میں شریک ہونا چاہیے اور اگر اُنھوں نے ایسا نہ کیا تو اُن کی ساکھ بُری طرح مجروح ہو گی لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر خاں صاحب نے طالبان کی مذاکراتی کمیٹی میں شمولیت کی حامی بھر لی ہوتی تو یہ اُن کی سیاسی موت ہوتی اور قوم اُنہیں ہمیشہ '' طالبان خاں'' ہی کہا کرتی۔ طالبان کے استاد مولانا سمیع الحق کہتے ہیں کہ مذاکرات سے پہلے تمام طالبان قیدیوں کی رہائی ضروری ہے۔ مولانا صاحب کا ہر وقت طالبان سے رابطہ رہتا ہے اور وہ طالبان کے راز داں بھی ہیں اِس لیے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مولانا صاحب کی تجویز نہیں بلکہ طالبان کا مطالبہ ہے۔ کیا آئینِ پاکستان اُن دہشت گردوں کو رہا کرنے کی اجازت دے گا جن کے ہاتھ ہزاروں بے گناہ پاکستانیوں کے خون سے رنگے ہیں ؟۔ اگر آئین و قانون میں ایسی گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے تو پھر اُن سبھی قیدیوں کو بھی رہا کرکے عام معافی کا اعلان کرنا ہو گا جن کے کیسز دہشت گردی کورٹ میں جاری ہیں یا جنھیں سزا دی جا چکی ہے۔ حاکمانِ وقت خود ہی سوچ لیں کہ کیا وہ تمام قاتلوں ، ڈاکوؤں

دہشت گردوں اور ٹارگٹ کلرز کو رہا کرنے کی متحمل ہو سکتی ہے؟۔ میرے آقا ﷺ کا فرمان تو یہی ہے کہ وہ قومیں برباد ہو جاتی ہیں جو زور آوروں کو چھوڑ دیتی اور کمزوروں کو سزا دیتی ہیں۔ اسلامی شریعت کے علم بردار کہلانے والے طالبان کو چاہیے کہ آقا ﷺ کے اِس فرمان پر عمل کرتے ہوئے صرف طالبان قیدیوں کو نہیں بلکہ تمام قاتلوں کی رہائی کا مطالبہ کریں۔

لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز نے حکومتِ وقت سے اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا ہے۔ مولانا صاحب کا فرمان بجا اور تحقیق کہ یہ ہر مسلمان کی آرزو ہے لیکن یہ مولانا بھی جانتے ہیں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں کیونکہ ہمارے علماء اکرام مسالک کے مباحث میں اتنا الجھ چکے ہیں کہ ایک عامی مسلمان کو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ دین کی اصل روح کیا ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ حکومتِ وقت بھی اِس معاملے میں خاموشی کی "بُکل" مارے ہوئے ہے کیونکہ شیعہ، سُنّی، دیو بندی، بریلوی اور اہلِ حدیث فرقوں میں دینِ مبیں کے پچانوے فیصد احکامات پر اتفاق کے باوجود صرف پانچ فیصد فقہی مسائل ایسے ہیں جنھوں نے اتحادِ اُمت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔یہ کام صرف آئین کے تحت تشکیل دی گئی اسلامی نظریاتی کونسل ہی کر سکتی ہے جو عرصۂ دراز سے فعال نہیں۔

مذاکراتی کمیٹی کے علاوہ طالبان نے مذاکرات کی نگرانی کے لیے دَس رکنی طالبان کمیٹی بھی قائم کر دی ہے اور یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ طالبان کی تین رکنی کمیٹی، حکومت کی چار رُکنی کمیٹی سے مذاکرات کرے گی اور پھر یہ کمیٹی طالبان کے امیر، مُلّا فضل اللہ کی قیادت میں تحریکِ طالبان کی سیاسی اور مرکزی شوریٰ کے ارکان سے ملاقاتیں کرے گی ۔طالبان کے اِس انتظام و انصرام کا تو تبھی فائدہ ہو گا جب مذاکرات کے ایجنڈے پر اتفاق ہو گا۔ خُدا کرے کہ کوئی متفقہ ایجنڈا سامنے آ جائے لیکن فی الحال تو ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔

سیاست کے رنگ چوکھے

بدلتے موسموں کے ساتھ ساتھ پاکستانی سیاست کے رنگ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اگر کچھ بدستور ہے تو یہ کہ اشرافیہ ہمیشہ ٹھنڈی چھاؤں کے مزے لوٹتی ہے اور مجبوروں، مقہوروں کا مقدر بدن کو جھلسا دینے والی چلچلاتی دھوپ۔ اس عالمِ بے قراری میں قوم اپنے رہنماؤں کو آزما آزما کے تھک چکی لیکن گوہرِ مقصود سے محروم ہی رہی۔ قوم نے پیپلز پارٹی، نواز لیگ، ایم ایم اے، قاف لیگ اور تحریکِ انصاف سبھی کو آزمایا اور پینتیس سال آمروں کو دے کر بھی دیکھ لیا لیکن نتیجہ صفر ہی نکلا۔ زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی لیکن جب سے طالبان کا عنصر زندگی میں شامل ہوا ہے، خوف کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ موت سے مفر ممکن نہیں کہ اِس کا مزہ تو ہر ذی روح کو چکھنا ہے لیکن "طالبانی موت" کا خوف ہی انسان کو ادھ موا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ہمارے پاس بلٹ پروف گاڑیاں ہیں نہ بم پروف گھر اور نہ ہی سینکڑوں محافظ۔ ہمیں تو بہرحال تلاشِ رزق میں نکلنا ہی ہوتا ہے۔ زندہ بچ رہے تو "بونَس" سمجھ کے خوش ہو رہے وگرنہ موت تو ہے ہی۔ اِس غیر یقینی صورتِ حال میں وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب نے جب مذاکراتی ٹیم کا اعلان کیا تو قوم نے سُکھ کا سانس لیا۔ سبھی سیاسی جماعتوں نے وزیرِ اعظم کا بھرپور

ساتھ دینے کا اعلان کیا البتہ اپنے مولانا فضل الرحمن صاحب کچھ اُکھڑے اُکھڑے سے نظر آئے۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ شاید نصیبِ دشمناں طبیعت ناساز ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ جب وزیرِ اعظم صاحب پارلیمنٹ میں مذاکراتی کمیٹی کے اراکین کے نام بتا رہے تھے تب مولانا صاحب کے دل پر چھُریاں چل رہی تھیں کیونکہ میاں صاحب نے مولانا صاحب کے ازلی دشمن عمران خاں صاحب کی سفارش پر اُن کے مشیر رُستم شاہ مہمند کو تو مذاکراتی کمیٹی میں شامل کر لیا لیکن مولانا صاحب سے مشورہ تک کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ مولانا صاحب یقیناً پارلیمنٹ میں گرجتے برستے لیکن پارلیمنٹ کا ''مُوڈ'' دیکھ کر غصّہ پی گئے لیکن چلتے چلتے یہ ضرور کہہ گئے کہ اگر اُن سے ''مفت مشورہ'' کر لیا جاتا تو وہ اچھا مشورہ ہی دیتے البتہ پارلیمنٹ سے باہر نکل کر صحافیوں کے سامنے اُنھوں نے اپنے دل کا غبار خوب نکالا۔

2002ء میں ہونے والے انتخابات میں جماعت اسلامی کی مہربانی سے مولانا فضل الرحمن کی ایم ایم اے کو غیر متوقع کامیابی نصیب ہوئی اور مولانا صاحب خیبر پختونخواہ کے سیاہ و سفید کے مالک بنے اور مرکز میں قائدِ حزبِ اختلاف کا مزہ چکھا۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ حکمرانی کا نشہ اتارے نہیں اترتا اور ''چھٹتی نہیں یہ کافر مُنہ سے لگی ہوئی'' کے مصداق مولانا صاحب کو بھی وہ

سنہرے دن بھلائے نہیں بھولتے۔ وہ دن آج بھی اُن کا سرمایۂ حیات ہیں جب وہ خیبر پختونخواہ کے بِلا شرکتِ غیر مالک ہوا کرتے تھے۔ مولانا صاحب تو وزارتِ عظمیٰ کے بھی اُمیدوار تھے لیکن قوم بال بال بچ گئی۔ خیبر پختونخواہ کی حکومت چھِن جانے کے بعد بھی مولانا صاحب کا مطمعٔ نظر ہمیشہ حکومت میں شمولیت ہی رہا۔ پیپلز پارٹی کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ وہ بائیں بازو کی جماعت ہے لیکن مولانا صاحب عالمِ دیں اور کَٹر مذہبی ہونے کے باوجود بھی جنابِ آصف زرداری کے پہلو میں جا بیٹھے۔ پھر جب نئے انتخابات کا ڈول ڈالا جانے لگا تو مولانا صاحب کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ اب نواز لیگ کی باری ہے اِس لیے اُنہوں نے حکومتی اتحاد چھوڑ کر ''جاتی عمرا'' کے درشن شروع کر دیئے۔ اُدھر جَلا وطنی کی ''بھٹی'' میں تَپ کر کُندن بن جانے والے میاں نواز شریف صاحب بھی آخر تک مولانا صاحب کو ''لارے لَپّے'' لگاتے رہے۔ بالآخر مایوس مولانا صاحب کو چار و ناچار اکیلے ہی انتخابی میدان میں کودنا پڑا۔ انتخابات کے بعد اُنہوں نے میاں نواز شریف صاحب کی بہت منت سماجت کی لیکن میاں صاحب تو عمران خاں صاحب کو خیبر پختونخواہ کی حکومت سونپ کر ''مزے'' لینے کے چکر میں تھے اِس لیے مولانا کی دال نہ گلی۔

سیاسی جماعتوں سے مایوس مولانا فضل الرحمٰن کو طالبان کا کچھ آسرا تھا لیکن ''بے وفا'' طالبان نے بھی مولانا صاحب سے یہ سلوک کیا کہ

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

طالبان نے جس ''مذاقی کمیٹی'' کا اعلان کیا، اُس میں بھی مولانا صاحب سے مشورہ کیے بغیر چوری چوری، چُپکے چُپکے مفتی کفایت اللہ کو کمیٹی کا رُکن نامزد کر دیا۔شاید مولانا صاحب یہ بھی برداشت کر لیتے لیکن طالبان نے تو حد ہی کر دی اور مولانا صاحب کو زہر'' لگنے والے عمران خاں ہی نہیں مولانا سمیع الحق اور امیرِ جماعتِ اسلامی'' خیبر پختونخواہ پروفیسر ابراہیم کو بھی اُسی کمیٹی کا رُکن بنا دیا۔ مولانا صاحب مولانا سمیع الحق سے ہمیشہ ''آوازار'' رہتے ہیں، جماعتِ اسلامی کے بارے میں اُن کا خیال ہے کہ ایم ایم اے کی پیٹھ میں چھُرا گھونپنے والی یہی جماعت ہے اور کپتان صاحب سے اُن کا ''اِٹ کھڑکا'' تو جاری ہی رہتا ہے۔اِس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسا طالبانی ''خودکُش'' حملہ تھا جس نے مولانا صاحب کے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیئے اور مفتی کفایت اللہ جو بھاگم بھاگ مولانا سمیع الحق کے پاس پہنچنے ہی والے تھے اُنہیں ''عصائے فضل الرحمانوی'' نے راستے میں ہی روک لیا۔اُدھر مولانا سمیع الحق پریس کانفرنس میں بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ مفتی کفایت اللہ اُن سے رابطے میں ہیں اور بس پہنچنے ہی والے ہیں لیکن اُس ''بھولے بادشاہ'' کو کیا پتہ تھا کہ پنچھی کے پَر کاٹ دیئے گئے ہیں ۔ مولانا فضل

الرحمٰن نے مجلسِ عاملہ کے اجلاس کے بعد پریس کانفرنس کرتے ہوئے فرمایا کہ اُن کا اِس مذاکراتی عمل سے کچھ لینا دینا نہیں اور مفتی کفایت اللہ طالبان کی مذاکراتی کمیٹی کا حصّہ نہیں۔ پریس کانفرنس میں بھی مولانا صاحب کا زور اسی پر تھا کہ چونکہ اُن سے مشورہ نہیں کیا گیا اور نہ ہی فروری 2013ء میں اُن کی طرف سے بلائی گئی آل پارٹیز کانفرنس کی متفقہ سفارشات کو تسلیم کیا گیا اِس لیے وہ مذاکرات سے مکمل علیحدگی کا اعلان کرتے ہیں۔

اُدھر طالبان نے دوسری سیاسی چال یہ چلی کہ محترم عمران خاں صاحب کو بھی اپنی پانچ رُکنی کمیٹی کا رُکن نامزد کر دیا۔ شاید اُن کے ذہن میں خیال ہو کہ خاں صاحب اپنی سونامی'' کی ساری صلاحتیں ''طالبانی شریعت'' کے لیے صَرف کر دیں گے لیکن خاں'' صاحب بھی اب تھوڑے تھوڑے ''سیاسی'' ہوتے جا رہے ہیں۔ اُنہیں پتہ تھا کہ پہلے تو لوگ از راہِ تفنن اُنہیں ''طالبان خاں'' کہتے تھے لیکن اگر وہ طالبانی کمیٹی کے باقاعدہ رکن بن گئے تو پھر اُن کا طالبان خاں ہونا نوشتۂ دیوار بَن جائے گا۔ وہ طالبان کو دو ٹوک جواب بھی نہیں دے سکتے تھے کیونکہ یہ ''رسمِ عاشقی'' کے خلاف ہوتا اِس لیے کا سہارا لیا۔ طالبان یہ کہہ سکتے تھے کہ کپتان صاحب کے عشق کی CEC اُنھوں نے اپنی صداقتیں مشکوک ہیں لیکن بچت یوں ہو گئی کہ خاں صاحب کے مشیر رُستم شاہ مہمند پہلے ہی حکومتی مذاکراتی کمیٹی کے رُکن تھے اِس لیے خاں صاحب نے

کمیٹی میں اپنی موجودگی ثابت کر دی اور یوں اُن کے ’’عشقِ طالبان‘‘ کا بھانڈا ’’بیچ چوراہے‘‘ پھوٹتے پھوٹتے رہ گیا۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی

کرپشن ، مہنگائی ، بے روزگاری، توانائی کا بُحران اور دہشت گردی ایسے مسائل ہیں جن پر خواہ مخواہ مغز ماری کر کے ہم اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے رہتے ہیں ۔ کرپشن ایک فن ہے اور اِس فن کے اُستادوں کی "اُستادی" اور ذہنی استعداد پر بے ساختہ واہ واہ کرنے کو جی کرتا ہے لیکن ہم ایسے نا معقول ہیں کہ اُن کے پیچھے لَٹھ لے کر پڑے ہیں ۔ اِس فَن میں طاق ہونے کے لیے بہت محنت کرنا پڑتی ہے جو ہم جیسے کاہل الوجود اور ناقص العقل لوگوں کے بَس کا روگ نہیں اور بجائے اِس کے کہ اِس فَن میں طاق ہونے کے لیے خود بھی کچھ تگ و دَو کریں ہم اُلٹا فنکاروں پر لعن طعن شروع کر دیتے ہیں ۔اصل بات یہ ہے کہ کرپشن اشرافیہ کا مشغلہ ہے جو نسل در نسل چلتا رہتا ہے اور ہم ٹھہرے اشرافیہ کے ازلی ابدی دشمن اِس لیے مارے حسد کے جلتے کُڑھتے رہتے ہیں اور یہ جو میڈیا والے "غضب کرپشن کی عجب کہانیاں" سناتے رہتے ہیں ، یہ بھی محض ہمارا جی جلانے کے لیے ہی ہوتی ہیں لیکن "جلے ہماری جوتی"۔

ہمارے افلاطونی تجزیہ نگار مہنگائی کا تعلق کرپشن سے جوڑتے ہوئے کالموں کی بھرمار کیے ہوئے ہیں ۔جسے اور کوئی موضوع نہ ملے وہ کرپشن اور مہنگائی کا

رونا رونے بیٹھ جاتا ہے حالانکہ مہنگائی کا تعلق خالصتاً ہماری اپنی ذات سے ہوتا ہے ۔جب ہر شادی شُدہ جوڑا اپنے گھر کی ’’کرکٹ ٹیم‘‘ بنانے پر تُل جائے تو پھر ’’اِس طرح تو ہوتا ہے ،اِس طرح کے کاموں میں‘‘۔ ایمان لگتی کہیے کہ کیا کوئی حکومت اتنے کھلاڑیوں‘‘ کو روزگار مہیا کرنے کی سکت رکھتی ہے ؟۔جب بھٹو مرحوم جیسے ’’نباضِ وقت‘‘ بھی ’’روٹی ، کپڑا اور مکان‘‘ جیسے نعرے سے ’’تائب‘‘ ہو گئے تو پھر نواز لیگ کِس کھیت کی مولی گاجر ہے ؟۔ یہ بھی مدِ نظر رہے کہ ہماری ہر دَور کی ’’بھوکوں مرتی‘‘ حاکم اشرافیہ تو خود بینکوں سے قرضے لے لے کر اپنا پیٹ پالتی اور ’’دیوالیہ‘‘ ہو کر قرضے معاف کرواتی رہتی ہے ، وہ بھلا اِن بھوکے ننگوں کو کہاں سے روزگار مہیا کرے ؟۔ مہربانوں سے مایوس اِس قوم کی ساری اُمیدیں اب کپتان صاحب سے وابستہ ہو گئی ہیں اور ہر کوئی یہ سوچنے لگا ہے کہ اُس کی ’’کرکٹ ٹیم‘‘ کو کپتان صاحب کی ’’سونامی‘‘ پناہ دے تو دے اور کوئی اِس قابل نہیں ہے ۔لیکن خود خاں صاحب کا تو یہ عالم ہے کہ کَلّی کَلّی جِند ، دُکھ لکھ تے ہزار وے‘‘ ۔ایک طرف اُن کی سونامی ’’نیٹو کنٹینرز‘‘ روکے کھڑی ہے تو دوسری طرف وہ ’’غمِ طالبان‘‘ میں گھُلی جا رہی ہے ۔پنجاب میں نواز لیگ سے ’’متھا‘‘ لگا ہوا ہے تو خیبر پختونخواہ میں مولانا فضل الرحمٰن دھاڑ رہے ہیں ۔اُن کے اپنے پرویز خٹک صاحب بھی جب جی چاہے مَن مانی کر جاتے ہیں اور سیاسی جماعتیں بھی بقدرِ جُثہ کپتان مخالفت میں اپنا حصّہ ڈالتی رہتی ہیں ۔اِس لیے کہا جا سکتا ہے

کہ خاں صاحب بھی ایسے ہی ناکام ہونگے جیسے خصوصی عدالت پرویز مشرف صاحب کو بُلانے میں ناکام ہو رہی ہے۔

توانائی بحران پر ہمارا نقطہَ نظر دوسروں سے ذرا مختلف ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ قوم کے لیے بجلی ، گیس اور ڈیزل پٹرول کی وافر موجودگی سراسَر گھاٹے کا سَودا ہے کیونکہ اِن سہولیات نے ایک تو ہماری جیبوں میں ''کَکھ'' نہیں رہنے دیا اور دوسرا ہمیں مجبورِ محض بنا کے رکھ دیا ہے۔کتنا اچھا تھا وہ دَور جب دیہات کی صحت افزاء فضاؤں میں مٹی کی ہنڈیا کے نیچے لکڑیاں جلائی جاتیں اور بُجھتی آگ کو ''پھونکنی'' سے دہکانے کے مزے لُوٹے جاتے لیکن جب سے اِس ''ٹُٹ پَینی'' گیس کا رواج ہوا ہے ، زندگی کی ساری ہلچل ہی ختم ہو کے رہ گئی ہے۔گیس آتی نہیں اور چولہا جَلتا نہیں۔ویسے تو گیس نہ ہونے کا ہمیں فائدہ بھی ہے کہ گھر میں کھانا پکانے کے ''وَخت'' سے آزاد ہو گئے ہیں لیکن مسلہ یہ آن پڑا ہے کہ ہمارا گیزر بھی بند ہو گیا ہے۔اب اِس لہو جماتی سردی میں بھَلا گیزر کے بغیر نہانے کا رِسک کون لے۔دیہاتوں کی راتیں بھی سحر انگیز ہوا کرتی تھیں۔رات کے وقت ، گرمیوں میں گھروں کے کَچّے کھُلے صحنوں میں پانی کا چھڑکاؤ کرکے چارپائیاں ڈالنا، مٹی کی سوندھی سوندھی نَشہ آور خوشبو اور لالٹین کی مَدھم لَو میں نیند کی پریوں کا جھولا جھُلانا اپنا ہی مزہ دیتا تھا۔سچ تو یہی ہے کہ گھروں میں لگے اے سی ٹھنڈک ضرور دیتے ہیں

لیکن لوریاں دے کر سلاتے نہیں کیونکہ بجلی کے بِل کا خوف ہی بے چین رکھتا ہے
۔مجھے تو ابھی سے ہَول اُٹھنے لگے ہیں کہ جب اِس کڑکڑاتی سردی میں بھی بجلی کا بِل پانچ
ہزار سے کم نہیں آتا تو اُس وقت کتنا بِل آئے گا جب اے سی اور پنکھے چلنے لگیں گے۔
دہشت گردی کا مسئلہ بھی حل ہوا ہی سمجھیں کیونکہ حکومت اور طالبان کی کمیٹیوں کا پہلا
اجلاس ہو چکا ہے اور میڈیا بریفنگ میں ہمارے کوآرڈینیٹر محترم عرفان صدیقی کی
خوشی دیدنی تھی ۔اُنہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اجلاس میں افہام و تفہیم کی ایسی
فضاء قائم تھی کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ایک ہی کمیٹی ہو۔ کمیٹی تو ویسے ایک ہی
تھی کیونکہ دونوں طرف ہی ''اپنے لوگ'' بیٹھے ہوئے تھے اور طالبان فی الحال
پردے''میں ہیں۔ لیکن اُمید ہے کہ جلد ہی یہ پردہ چاک ہو جائے گا اور ہم بھی''
دیدارِ طالبان'' سے مستفید ہو سکیں گے ۔ہمارے وزیرِ اطلاعات جناب پرویز رشید''
صاحب تو اتنے بے تاب ہیں کہ جب طالبان نے یہ تقاضہ کیا کہ کمیٹی کو ہیلی کاپٹر کے
ذریعے شمالی وزیرستان بھیجا جائے تو اُنہوں نے کہا ''ہیلی کاپٹر تو کیا کمیٹی کو اپنے کندھوں
پر لے جانے کو تیار ہوں''۔جب سے جنابِ پرویز رشید کا یہ بیان آیا ہے تب سے ہم
سوچ رہے ہیں کہ اگر ہمارے وزیرِ اطلاعات واقعی جنابِ عرفان صدیقی کو اپنے کندھوں
پر بٹھا کر جانبِ منزل رواں دواں ہو جائیں تو وہ کتنے

سالوں میں شمالی وزیرستان پہنچ سکیں گے ؟۔پرویز رشید صاحب کو ایسا کرنے سے پہلے جنابِ نواز شریف سے ضرور مشورہ کرلینا چاہیے کیونکہ اُنہیں اِس کا تجربہ ہے اور وہ ایک دفعہ مولانا طاہر القادری کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر غارِ حرا تک لے جا چکے ہیں۔ طالبان سے معاملات تو افہام و تفہیم سے آگے بڑھ ہی رہے تھے لیکن لال مسجد کے مولانا عبد العزیز کو بیٹھے بٹھائے جوش آگیا اور اُنہوں نے یہ دھماکہ کر دیا کہ وہ نفاذِ شریعت کی یقین دہانی تک مذاکرات میں نہیں بیٹھیں گے۔اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ پاکستان کے آئین کو نہیں بلکہ قُرآن و سُنعت کو مانتے ہیں اور آئینی حدود کی شرط سے مذاکرات میں تعطل پیدا ہوگا۔مولانا صاحب کی دیکھا دیکھی طالبان ترجمان شاہد اللہ شاہد نے بھی یہ کہہ دیا "مذاکرات قُرآن و سُنعت کے تحت ہوں گے ، وہ کوئی اور قانون نہیں مانتے۔طالبان کو شریعت کے علاوہ کوئی اور قانون منظور ہوتا تو جنگ ہی نہ کرتے ۔ ہماری جنگ نفاذِ شریعت کے لیے ہے"۔ہم سمجھتے ہیں کہ نفاذِ شریعت ہر مسلمان کی آرزو ہے اور ہمارا آئین بھی اِس کی تصدیق کرتا ہے اور اسلامی نظریاتی کونسل بھی تمام قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ہی بنائی گئی تھی ۔اِس لیے طالبان کا یہ مطالبہ ناجائز نہیں۔سوال مگر یہ ہے کہ پاکستان میں شریعتِ محمدی ﷺ کا نفاذ اُس کی اصل روح کے مطابق کیا جائے یا

اُن ''شریعتوں'' کے مطابق جو ہمیں علمائے اکرام کے ہاں وافر مقدار میں ملتی ہیں
؟۔ بہرحال اگر نیت میں خلوص ہو تو یہ مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے کیونکہ ہمارا اللہ ،
رسول ﷺ اور قرآن ایک ہی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تو ''خلوص'' نامی جنس نایاب
ہے شاید اسی لیے لوگ مذاکرات کی کامیابی سے مایوس ہیں البتہ ہم رَبّ کی رحمت سے
مایوس نہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آج نہیں تو کل صحنِ چمن میں بہار ضرور آئے گی۔

مذاکرات، توقعات، خدشات

پروفیسر مظہر۔۔۔۔ سرگوشیاں

ڈرون طیاروں کی چھاؤں میں سنجیدہ، با معنی اور با مقصد مذاکرات کی تگ و دَو شروع ہو گئی۔ بد بخت ترین ہے وہ شخص جو مذاکرات کی کامیابی کے لیے دعا گو نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ سیکولر نظریات کے حامل تجزیہ نگاروں کو یہ مذاکرات ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ وجہ صرف یہ کہ اگر مذاکرات کامیاب ہو جاتے ہیں تو اِس ارضِ پاک میں شریعتِ محمدی ﷺ کا نفاذ ممکن ہو جائے گا جو ہمارے سیکولر بھائیوں کو کسی بھی صورت گوارا نہیں، اُنہیں تو شاید ''اسلام'' کے نام سے ہی چِڑ ہے۔ اسی لیے اُنکی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وطنِ عزیز کا نام اسلامی جمہوریہ کی بجائے سیکولر جمہوریہ پاکستان رکھ دیا جائے۔ اِس معاملے میں وہ اکثر حضرت قائدِ اعظمؒ کو گھسیٹنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں البتہ سبھی کی تان اسی پر ٹوٹتی ہے کہ مذاکرات ہی بہتر راہ ہے حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ مذاکرات کی کامیابی کا منطقی نتیجہ شریعتِ محمدی ﷺ کا نفاذ ہی ہے جو اُنہیں قبول نہیں۔ اسی لیے وہ مذاکرات کی ناکامی کے بارے میں دلائل کے انبار لگاتے رہتے ہیں۔

مذاکرات کی کامیابی کی شدید ترین خواہش پالنے کے باوجود ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ کامیابی اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے کیونکہ مذاکرات کی راہ میں کئی ایسی دشوار گزار گھاٹیاں ہیں جنہیں پار کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔آقا ﷺ کا فرمان ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور یہ تو طے ہے کہ وزیرِ اعظم میاں محمد نواز شریف خلوصِ دل اور خلوصِ نیت سے مذاکرات کی گاڑی منزلِ مقصود تک پہنچانے کے خواہاں ہیں اور پوری قوم کی آرزو بھی یہی ہے کہ آگ اور خون کی اِس بارش کا خاتمہ ہو جائے لیکن بہت سی قوتیں ایسی ہیں جو مذاکرات کو ناکام کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئی ہیں ۔اِن قوتوں کا سرخیل امریکہ ہے جسے پاکستان میں کسی بھی صورت میں امن گوارا نہیں ۔پہلے مذاکرات کو ناکام بنانے کے لیے حکیم اللہ محسود کو ڈرون کی غذا بنایا گیا اور اب مذاکراتی کمیٹی کے اوپر ڈرون طیاروں کی چھاؤں کرکے واضح پیغام دیا گیا۔وزیرِ داخلہ جناب چوہدری نثار احمد کو جب مولانا سمیع الحق نے یہ بتلایا کہ مذاکراتی کمیٹی کو بار بار جگہ تبدیل کرنی پڑ رہی ہے کیونکہ ڈرون پروازیں جاری ہیں تو چوہدری نثار احمد نے یہ جواب دیا کہ اگر ڈرون حملہ ہوا تو یہ پاکستان دشمنی ہو گی ۔جذباتی سہی لیکن غیرت کا تقاضہ تو یہی تھا کہ امریکی سفیر کو یہ پیغام دیا جاتا کہ اگر فوری طور پر ڈرون واپس نہ گئے تو اُنہیں مار گرایا جائے گا لیکن ایسا ہوا نہیں اور شاید کبھی ہو گا بھی نہیں ۔اقبالؒ نے کہا تھا کہ

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سرِ دارا

ایران نے اپنی غیرتوں کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے امریکی ڈرون اتار لیا اور شمالی کوریا نے بھی امریکی طیارہ مار گرایا۔وہ دونوں ملک آج بھی زندہ اور دہشت گرد امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں حالانکہ دونوں میں سے کوئی بھی ایٹمی قوت نہیں لیکن دُنیا کی ساتویں بڑی ایٹمی قوت ہونے کے باوجود ہم میں اتنی سکت بھی نہیں کہ ہم امریکی سفیر کو بلا کر احتجاج ہی ریکارڈ کروا سکیں ؟۔بطور مسلم ہمارا یہ ایمان ہے کہ یہ حیاتِ ارضی مانندِ سراب ہے۔موت کا بے رحم ہاتھ بہادر اور بزدِل کو ایک ساتھ دبوچتا ہے اور فنا کی انگلیاں دونوں کی ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں۔ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تختِ شاہی پہ وہی متمکن ہوتے ہیں جن کی روحیں توانا اور پُر عزم ہوتی ہیں۔اِس کے باوجود بھی ہمارے حکمرانوں کے ہاں جبر کے پرچم لہرانے اور مقہوروں پر ظلم کے انگارے برسانے والے ہی معتبر ٹھہرتے ہیں۔وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ قوم تو مَر مٹنے کو تیار ہے اگر یقین نہ آئے تو ایک عشرے سے جاری اُس خوں ریزی کو دیکھ لیں جو پچاس ہزار سے زائد انسانی جانوں کو نگل گئی لیکن پھر بھی ہنگامہ ہائے زیست میں کچھ فرق نہ آیا، کوئی چوہوں کی طرح سے اپنے بِل میں گھُسا، نہ کسی کی جبیں خوف سے عرق ریز ہوئی

۔بم دھماکے اور خود کش حملے ہوتے رہے لیکن قومی زندگی ایک لحظے کے لیے بھی رُکی ، سُکڑی نہ سمٹی۔اگر واقعی ہمارا یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک دِن معین ہے تو پھر جھجک کیوں؟۔شاید حکومت کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہوں گی جن کی ہمیں گھر بیٹھے خبر ہے ، نہ ہو سکتی ہے۔

لاریب پوری قوم مذاکرات کے لیے یکسو ہے اور مذاکرات ہی قوم کا اجتماعی فیصلہ ہے ۔سوال مگر یہ ہے کہ کیا طالبان بھی مذاکرات کے خواہاں ہیں ؟اور کہیں ایسا تو نہیں کہ طالبان کو اپنی صفیں درست کرنے کے لیے کچھ عرصہ درکار ہو جسے وہ مذاکرات کی آڑ میں حاصل کرنا چاہتے ہوں ؟۔الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے طالبان کے جو پندرہ مطالبات سامنے آئے ہیں اُن میں سے کچھ کا تعلق دینِ مبیں سے ہے۔یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا اور آج بھی پاکستان میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کے دل اللہ ، رسول اللہ ﷺ اور قُرآن کی محبت سے معمور ہیں اِس لیے طالبان کے اِن مطالبات سے انکار صریحاً دین سے انکار ہے۔وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہر مسلمان طالبان کے اِن مطالبات کا حامی ہی ہو گا لیکن طالبان کا اوّلین مطالبہ تو ’’ڈرون حملوں کی بندش‘‘ ہے حالانکہ طالبان خوب جانتے ہیں کہ یہ حملے امریکہ کروا رہا ہے۔تو کیا طالبان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حملے حکومتِ پاکستان کی ایماء اور مرضی سے ہو رہے ہیں؟۔اگر ایسا ہے تو پھر مذاکرات کی کامیابی مشکوک ہو جاتی ہے اور اگر وہ

یہ سمجھتے ہیں کہ حملے ’’عالمی دہشت گرد‘‘ امریکہ خود ہی کروا رہا ہے اور حکومتِ پاکستان اِس معاملے میں بے بَس ہے تو پھر یہ مطالبہ ہی سرے سے نا جائز ہے۔طالبان کا یہ مطالبہ بھی ہے کہ ڈرون حملوں میں تباہ ہونے والے مکانات کی از سرِ نَو تعمیر کروائی جائے اور مرنے والوں کو معاوضہ دیا جائے۔شاید طالبان بھول گئے ہیں کہ اُن کہ دہشت گردی کی بھینٹ پچاس ہزار سے زائد انسانی جانیں چڑھ چکی ہیں اور اُن کے بم دھماکوں اور خود کش حملوں سے کھربوں روپے کا مالی نقصان بھی ہو چکا ہے۔کیا طالبان اِس نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے تیار ہیں ؟۔اگر نہیں تو پھر وہ ایسا مطالبہ ہی کیوں کرتے ہیں جسے پورا نہ کیا جا سکے۔طالبان کا یہ مطالبہ بھی ہے کہ گرفتار قیدیوں کو رہا کیا جائے۔یہ ایسا مطالبہ ہے جسے آئینی حدود کے اندر رہ کر ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔کیا ہمارا آئین و قانون اجازت دے گا کہ سنگین نوعیت کے مقدمات میں ملوث ملزمان کو رہا کر دیا جائے ؟۔طالبان یہ بھی چاہتے ہیں کہ فاٹا سے افواجِ پاکستان کو واپس بلا لیا جائے لیکن یہ تو مذاکرات کی کامیابی سے مشروط ہے اور ایسا تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب طالبان کی طرف سے کوئی قابلِ قبول گارنٹی مِل جائے لیکن طالبان ایسی کوئی گارنٹی دینے کے اہل اِس لیے نہیں کیونکہ وہ اقرار کرتے ہیں کہ طالبان کے کئی گروہ ایسے ہیں جو اُن کے بَس میں نہیں۔اب تو طالبان کا ’’احرار الہند‘‘ نامی ایک ایسا فدائی گروپ منظرِ عام پر آ گیا ہے جس نے حکومت اور طالبان کے درمیان جاری مذاکرات سے

لا تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے شہری علاقوں میں براہِ راست دہشت گردی کی کارروائیاں کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ احرار الہند کے علاوہ بھی کئی گروپ ایسے ہیں جنہیں امریکہ اور بھارت کی مکمل آشیرباد حاصل ہے۔ اِن گروہوں کا کام ہی افراتفری پھیلانا ہے۔ اِن حالات میں افواج پاکستان کی واپسی ممکن نظر نہیں آتی۔ اگر طالبان کی نیت میں خلوص ہے تو اُنہیں بہرحال اپنے مطالبات میں لچک پیدا کرنی ہو گی۔

ویلنٹائن ڈے

گزشتہ دنوں میری ایک عزیزہ کا فون آیا۔اُس نے بتلایا کہ وہ لوگ ویلنٹائن ڈے منانے لاہور آ رہے ہیں۔میں نے انتہائی شائستگی سے جواب دیا کہ اِس تہوار کا ہمارے دین سے کوئی تعلق ہے نہ اسلامی معاشرت سے۔میں نے اُسے سمجھانے کی خاطر یہ کہا کہ ہمیں اسلامی اقدار اور کلچر کو فروغ دینا چاہیے کہ اِسی میں فلاح کی راہ نکلتی ہے۔میری عزیزہ نے یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا کہ میری سوچیں ابھی تک ہزاروں سال پہلے کے دَورِ جاہلیت میں گھوم رہی ہیں، جبکہ زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔تَب سے اب تک میں یہی سوچ رہی ہوں کہ ہم ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں یا تنزلی کی ؟۔معلوم تاریخ سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں معاشرے کا وجود تک نہیں تھا اور اقدار سے بے نیاز، برہنہ انسانوں اور حیوانوں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ہزاروں سالوں کی گردشِ لیل و نہار کے بعد معاشرہ وجود میں آیا، مرد اور عورت کا فرق واضح ہوا اور نسوانی حیا کو جسم ڈھانپنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔پھر حضرتِ انسان نے ''یُوٹَرن'' لیا اور آج یہ عالم ہے کہ یورپ و امریکہ کے سمندری ساحلوں پر ہمیں اُسی دَور کی جھلک نظر آتی ہے جسے ہم ''پتھر کا زمانہ'' کہتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ کیا روشن خیالی کے نام پر منایا جانے والا ویلنٹائن ڈے ہمیں ترقی کی جانب لے جا

رہا ہے یا تنزلی کی؟۔

یوں تو طبقۂ اشرافیہ میں ویلنٹائن ڈے کافی عرصے سے منایا جا رہا ہے لیکن اِس کو عروج مشرف صاحب کے دَورِ حکومت میں ہوا اور 2000ء سے لے کر اب تک اِس تہوار کو پورے اہتمام سے ایسے منایا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مقدس فریضہ ہو۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ پاکستانیوں کی غالب اکثریت کو یہ بھی نہیں پتہ کہ "ویلنٹائن" کس بَلا کا نام ہے اور اِسے پورے اہتمام سے کیوں منایا جاتا ہے کیونکہ ہمیں تو بس اِس سے غرض ہے کہ ہلّا گُلّا ہو خواہ کیسے بھی ہو۔ یوں تو ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں یہ دعا مانگتے ہیں "(اے اللہ) ہمیں سیدھا راستہ دکھا، اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، نہ کہ اُن لوگوں کا جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ گمراہوں کا"۔ لیکن ہمارے اعمال اِس کی مطلق گواہی نہیں دیتے۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے اعمال تو اُن گمراہوں جیسے ہیں جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ ہم نے وہ کلچر تو کب کا چھوڑ دیا جو میرے آقا ﷺ کی سنتِ اطہر کی خوشبوؤں سے معمور تھا۔ اب تو ہمیں وہ سارے تہوار اچھے لگتے ہیں جن کا اسلامی معاشرے سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہم ہندوؤں جیسی مایوں، مہندی کرتے ہیں، پیلے بسنتی جوڑے پہنتے ہیں، بسنت مناتے ہیں اور ویلنٹائن ڈے۔ یہ معصومانہ کوتاہی نہیں بلکہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی شعوری نافرمانی اور اُن کے احکامات کا مذاق اُڑانے کے

مترادف ہے۔

ویلنٹائن ڈے ایسا تہوار ہے جس کے خلاف بھارت کی انتہا پسند ہندو تنظیموں میں بھی شدید ردِ عمل پایا جاتا ہے اور وہ بھی اِسے فحاشی اور ہندوانہ تہذیب کے حق میں زہرِ ہلاہل سمجھتی ہیں اور عیسائی پادری بھی اِس دن کو مکروہ خیال کرتے ہیں۔ بنکاک میں ایک پادری نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ایسی دکانوں کو نذرِ آتش کر دیا جہاں ویلنٹائن ڈے کے کارڈز اور پھولوں کے گلدستے فروخت ہو رہے تھے۔ یورپ و امریکہ کے الیکٹرانک میڈیا پر بھی اِس دِن کے حوالے سے کوئی خصوصی پروگرام نہیں ہوتا لیکن ہمارے پاکستانی چینلز اِس دِن کو بڑے اہتمام سے مناتے ہیں۔ اِس دن کی مناسبت سے پروگرامز ترتیب دیئے جاتے ہیں اور سٹوڈیوز کو پھولوں اور غباروں سے بھر دیا جاتا ہے ۔ عجیب بات ہے کہ جہاں سے یہ رسمِ بَد پھوٹی وہاں تو اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا لیکن ہم، ذہنی طور پر غلام ابنِ غلام ،اس دن کو ایسے ہی مناتے ہیں جیسے اپنے مذہبی تہواروں کو ۔

14 فروری کو منائے جانے والے ویلنٹائن ڈے کو انسائکلوپیڈیا بک آف نالج میں "محبوبوں کے لیے خاص دن" لکھا گیا ہے۔ روایت یہ ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں روم میں ویلنٹائن نام کا ایک پادری ایک راہبہ کے عشق میں گرفتار ہوا

۔چونکہ عیسائیت میں راہبہ کے ساتھ نکاح جائز نہیں تھا اِس لیے ویلنٹائن نے ایک کہانی گھڑی اور اپنی محبوبہ کو یہ بتلایا کہ اُسے خواب میں بشارت ہوئی ہے کہ اگر 14 فروری کو جنسی تعلقات قائم کر لیے جائیں تو اسے گناہ نہیں سمجھا جائے گا۔راہبہ نے ویلنٹائن کی بات پر یقین کر لیا اور دونوں نے کلیسا کی روایت کی دھجیاں اُڑا دیں ۔اِس گناہ کا پتہ چلنے پر دونوں کو قتل کر دیا گیا لیکن کچھ نوجوانوں نے ویلنٹائن کو ''شہیدِ محبت'' کے درجے پر فائز کر دیا۔آج بھی چرچ اسے جنسی بے راہروی کی تبلیغ قرار دیتا ہے جب کہ بے راہروی کے شکار یورپ کا نوجوان طبقہ اِس دن خوب ہلّا گلّا کرتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ ''یومِ محبت'' نہیں ''یومِ اوباشی'' ہے۔

آقاﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو شخص جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اُنہی میں سے ہو گا''۔لیکن ہم اہلِ یورپ کی مکمل مشابہت اختیار کرنے کے باوجود بھی اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں ۔پاکستان کے پوش علاقوں، انگلش میڈیم تعلیمی اداروں ، کلبوں اور فائیو سٹار ہوٹلوں میں تہذیبِ مغرب کے غلام خاندانوں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ویلنٹائن ڈے پر بڑے بڑے ہوٹلوں میں ''ویلنٹائن ڈنر'' کرتے ، موبائل فونوں پر محبت کے پیغامات بھیجتے ، اپنے محبوب کو ویلنٹائن کارڈز اور گلاب کے پھول پیش کرتے ہیں ۔شہروں میں طلباء اور طالبات کی ٹولیاں دن بھر پھول خریدتی نظر آتی ہیں اور اکثر نوجوان لڑکے راہ چلتی

لڑکیوں کو پھول پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اب ہمارا معاشرہ بھی ”مادر پدر آزاد“ ہو گیا ہے۔اِس معاملے میں ہمارا الیکٹرانک میڈیا بھی کسی سے پیچھے نہیں۔جونہی 14 فروری کا سورج طلوع ہوتا ہے چینلز پر محبت کے پیغامات کی بھرمار ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہمارا الیکٹرانک میڈیا بھی یورپ کے حیا باختہ اور جنس پرست معاشرے کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کرتا ہو کیونکہ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی چینل نے کوئی ایسا پروگرام ترتیب دیا ہو جو ہمارے نوجوانوں کو ”ویلنٹائن ڈے“ کی اصلیت سے آگاہ کر سکے۔

دینِ مبیں میں صحت مند تفریحات کی ہر گز ممانعت نہیں لیکن ایسی تفریحات اور ایسی مسرتوں کی ہر گز گنجائش نہیں جن سے ابلیسیت کی بُو آتی ہو۔ میرا دین پاکیزہ اقدار کو فروغ دینے کی تلقین کرتا ہے بے حیائی کی نہیں۔رَبِّ کردگار نے حکمت کی عظیم ترین کتاب میں درج کر دیا کہ ”یقیناً جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں کے گروہ میں بے حیائی پھیلے ، وہ دُنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں“ (النور) ۔لیکن ہمارا معاشرہ محبت کے نام پر بے حیائی کو فروغ دیتا چلا جا رہا ہے اور ہمارے سیکولر ذہن کے حامل اصحاب اسی عریانی ، فحاشی اور بے حیائی کو روشن خیالی کا لبادہ اوڑھا کر قابلِ قبول بنانے کی تگ و دَو میں ہیں۔ محبت تو ایک پاکیزہ جذبہ ہے جو اللہ اور اُس

کے بندے کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتا ہے اور محبت وہی جو اپنے رَب سے کی جائے ۔اُس محبوبِ حقیقی نے سورہ البقرہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ ''ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں''۔محبوبِ حقیقی کی محبت کے بعد اُس کے بندوں سے محبت بہترین عمل قرار دیا گیا ہے لیکن یہ محبت بھی اللہ کی رضا کی خاطر کی جاتی ہے۔اِس محبت کے حصول کا آسان ترین طریقہ باہمی سلام ہے۔آقا ﷺ نے فرمایا''کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز کا پتہ نہ دوں کہ جب تُم اس پر عمل کرنے لگوگے تو تُم میں محبت پیدا ہو جائے گی۔یہ وہ ہے کہ آپس میں سلام کو خوب پھیلاؤ''۔لیکن ہم نے فحاشی کو محبت کے معنی دے کر اپنی روشن خیالی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

ہم نے یومِ ولادتِ رسول ﷺ مذہبی جوش و جذبے کے ساتھ منا کر آقا ﷺ سے اپنی عقیدتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ یومِ قائد پر بھی ہم لہک لہک کر گاتے رہے ’’اے قائدِ اعظم ! تیرا احسان ہے، احسان‘‘۔ جب یومِ اقبالؒ آیا تو فکرِ اقبال کے اسرار و رموز پر محفلیں سجائیں اور یومِ دفاع پر فضائیں ’’اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا‘‘ جیسے ترانوں سے گونجتی رہیں۔ پھر ہمیں خیال آیا کہ کہیں اہلِ مغرب ہمیں ’’رجعت پسند‘‘ ہی نہ سمجھ بیٹھیں اِس لیے توازن قائم رکھنے کی خاطر ہم نے 14 فروری کو روم کے پادری ’’ویلنٹائن‘‘ کا دن بھی ایسی دھوم دھام سے منایا جیسے ویلنٹائن بھی عالمِ اسلام کی کوئی بَرگزیدہ ہستی ہو۔ شہروں میں سُرخ گلاب ختم ہو گئے اور شنید ہے کہ سُرخ گلاب کا ایک ایک پھول سو سے دو سو روپے تک فروخت ہوتا رہا۔ ہمارا باغیچہ تو سُرخ گلابوں سے اَٹا پڑا ہے، اگر مجھے پہلے پتہ ہوتا تو کسی ’’گُل فروش‘‘ سے سودا ہی مار لیتی۔ جوں جوں یہ دِن گزرتا گیا، میرا غصّہ بھی بڑھتا گیا۔ یہ غصّہ کسی اور پر نہیں، اپنے سُرخ گلابوں پر آ رہا تھا جنھوں نے ہمیں بَروقت بتلایا ہی نہیں کہ آج کے دن اُن کے نرخ ایسے ہی بڑھ جاتے ہیں جیسے موجودہ دَورِ حکومت میں بجلی کے۔ خیر ہم نے بھی طے کر لیا

ہے کہ اگلے سال پہلے سے بندوبست کرکے رکھیں گے تاکہ ہمیں ایک دفعہ پھر نہ کہنا پڑے کہ ''اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت'' ۔ اگر اگلے سال ڈھیروں ڈھیر پیسے اکٹھے ہو گئے تو ہم بھی ''ویلنٹائن زندہ باد'' کے نعرے اُسی طرح لگائیں گے جس طرح ہمارے الیکٹرانک میڈیا نے لگا کر خوب ہاتھ رنگے۔

ویلنٹائن ڈے نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ پاکستان '' بستی ہے دِل والوں کی'' اور ہمیں بھی پتہ چل گیا کہ ہماری اسمبلیوں کی روشن خیال خواتین بھی ماشاء اللہ بہت ''دِل والیاں'' ہیں ۔اُس دِن پنجاب اسمبلی بھی مارے حیا کے اُس وقت سُرخ ہو گئی جب ہماری خواتین ایم پی ایز سُرخ لباس پہن کر اسمبلی میں تشریف لائیں اور مرد حضرات نے بھی ''حسبِ توفیق'' سَروں پر سُرخ ٹوپیاں اور جیبوں میں سُرخ رومال سجائے ۔اتنے '' سُرخ لباس''تو کبھی بیاہ شادیوں میں نظر نہیں آئے جتنے پنجاب اسمبلی میں نظر آ رہے تھے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ''ہماری رہنماؤں'' کو سُرخ رنگ بہت بھا گیا ہو۔ہمیں یقین ہے کہ پادری ویلنٹائن کی روح اِنہیں دیکھ دیکھ کر ''صدقے واری'' جاتی رہی ہو گی ۔ ویسے سُرخ رنگ تو خون کا بھی ہوتا ہے جس کی پاکستان میں بہت اَرزانی ہے اور جو ہر روز پاکستان کے کسی نہ کسی کونے میں بہتا ہی رہتا ہے ۔

ویلنٹائن ڈے پر الیکٹرانک میڈیا بھی خوب مزے اُڑاتا رہا۔ عاشقوں نے محض پانچ روپے کے ایس ایم ایس کے ذریعے اپنے محبوب کو پیغام بھیجا اور الیکٹرانک میڈیا نے اُسے چوم کر نشر کر دیا۔ میں نے جب بھی ٹی وی آن کیا، مجھے محبتوں کے پیغام ہی نظر آئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے پورے پاکستان پر ''مجنوں'' کے خاندان نے قبضہ کر لیا ہو۔ اگر پاکستان کا مطلب ''عشق و عاشقی'' ہے تو پھر ہم درست سمت میں جا رہے ہیں لیکن اگر لاالٰہ الا اللہ ہے تو پھر بصد ادب مجھے یہ کہنے دیجئے کہ تمام تر خوں ریزی کے باوجود طالبان سچے ہیں اور اِن حالات میں پاکستان کو اگر کوئی طاقت بچا سکتی ہے تو صرف نفاذِ شریعتِ محمدی ﷺ۔ میں نے لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز کو بہت سے ٹی وی ٹاک شوز میں سُنا اور ہر ٹاک شو کے بعد میرا یہ تاثر بڑھتا ہی چلا گیا کہ مولانا صاحب بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔ جب مولانا کو یہ بتلایا جاتا کہ آئین میں حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالےٰ کی ہے اور ہمارا کوئی بھی قانون قُرآن و سنت کے متضاد نہیں بَن سکتا تو ہمیشہ اور ہر ٹی وی چینل پر اُن کا ایک ہی جواب ہوتا کہ ''میں آئین کو نہیں، قُرآن و سنت کو مانتا ہوں''۔ مولانا صاحب کی اِس ہٹ دھرمی پر بہت غصّہ آتا لیکن آج کے ''ویلنٹائن ڈے'' کی خرافات نے یہ سارا غصّہ ٹھنڈا کر دیا ہے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ مولانا صاحب درست کہتے ہیں کیونکہ جب 1973ء سے اب تک کسی بھی حکومت نے آئین پر عمل ہی نہیں کیا اور اسلامی نظریاتی کونسل کی تمام

سفارشات ردی کی ٹوکری کی نظر کی جاتی رہی ہیں تو پھر ایسے آئین کا کیا فائدہ ؟۔ اگر بقول ضیاء الحق مرحوم آئین محض سو صفحات کی فضول سی کتاب ہے جسے زور آور جب جی چاہے ردی کی ٹوکری میں پھینک سکتا ہے تو پھر ایسا آئین ''بگڑی نسلوں'' کے سدھار کا سبب بھی نہیں بن سکتا۔ ہمارا دین تو پورے کا پورا اسلام میں داخل ہونے کا حکم دیتا ہے ۔ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا کہ ہم احکاماتِ الٰہی میں اپنی پسند و نا پسند کو بھی شامل کر لیں لیکن ہم تو قُرآن و سُنت کے صرف ایسے احکامات کو ہی تسلیم کرتے ہیں جو ہماری آزادی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتے ہوں ۔اِن رکاوٹوں پر قابو پانے کے لیے ہم نے بنا رکھی ہیں جو غیر ملکی فنڈز پر چلتی ہیں اور جن کا کام ہی دینی NGO's سینکڑوں ایسی پہ ہمارا آئین کوئی پابندی لگاتا ہے ، نہ NGO's رکاوٹوں کے خلاف زہر اُگلنا ہے ۔ایسی قانون۔

سُلگتا سوال مگر یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بندہَ خُدا آئین کو مکمل اسلامی سانچے میں ڈھال کر پاکستان میں شریعت کا نفاذِ کر بھی دیتا ہے تو کیا بگڑی نسلیں سُدھر جائیں گی ؟۔ شائد نہیں کیونکہ جِس قوم کے مقدر میں بلاول زرداری جیسے لیڈر لکھ دیئے جائیں اُس قوم کا اللہ ہی حافظ ہے ۔بلوچستان کے سابقہ وزیرِ اعلیٰ نے ایک بار کہا کہ ''ڈگری ، ڈگری ہوتی ہے خواہ وہ اصلی ہو یا جعلی'' ۔ہم نے اِس جملے پر اُن کا خوب مذاق اُڑایا اور ایک عرصے ، تک اِس

جملے سے لوگ محظوظ بھی ہوتے رہے۔اب نوجوان بلاول زرداری کہتا ہے کہ ''بلاول بلاول ہوتا ہے۔ خواہ وہ بلاول بھٹی ہو یا بلاول زرداری''۔لیکن کوئی اِس جملے سے، محظوظ ہونے والا ہے، نہ مذاق اُڑانے والا کیونکہ آکسفورڈ کا پڑھا بلاول زرداری ذوالفقار علی بھٹو کا نواسہ اور بینظیر شہید کا بیٹا ہے۔شنید ہے کہ محترم آصف زرداری اپنے وارث کی اِن ''حرکات'' پر بہت نالاں ہیں لیکن کر کچھ نہیں سکتے کیونکہ انٹرنیٹ کی پیداوار یہ نسلِ نَو نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا کرنے میں اتنی مگن ہے کہ اُسے کسی کی بات سُننے کی فُرصت ہی نہیں۔یہ انٹرنیٹ بھی ایسی عجیب شے ہے جو بڑے بڑوں کا دماغ خراب کر دیتی ہے۔ مشرف صاحب اِسی انٹرنیٹ پر اپنے چاہنے والوں کے پیغامات پڑھ کر پاکستان آئے اور ''ہڑکی'' میں بُرے پھنسے۔ محترم عمران خاں کی ''سونامی'' بھی اِسی انٹرنیٹ پر دو تہائی بلکہ تین چوتھائی اکثریت سے جیت گئی لیکن میدانِ عمل میں اُس کے حصّے میں ''ککھ'' نہ آیا۔اُسے محض خیبر پختونخواہ کی حکومت پر گزارا کرنا پڑا اور وہ بھی نواز لیگ کی مہربانی سے۔ تحریکِ انصاف چونکہ انٹرنیٹ پر بے مثال کامیابی حاصل کر چکی تھی اِس لیے اُسے یہ غیر متوقع شکست ہضم نہیں ہو رہی اور وہ تا حال دھاندلی کا شور مچا رہی ہے۔اُسے سوتے جاگتے صرف دھاندلی ہی کے خواب نظر آتے ہیں۔پی سی بی کے چیئرمین ذکا اشرف کو اُن کے عہدے سے ہٹا کر جب نجم سیٹھی کو چیئرمین بنایا گیا تو تحریکِ انصاف نے کہا کہ نجم سیٹھی نے عام انتخابات میں نواز

لیگ کی پینتیس سیٹوں کو "پنکچر" لگائے اور نواز لیگ نے محنتانے کے طور پر نجم سیٹھی کو پی سی بی کی چیئرمینی سونپ دی۔ حقیقت اللہ جانے یا نجم سیٹھی، ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ اِس انٹرنیٹ نے گھر گھر "سیاپا" ڈال دیا ہے۔ اب بلاول بھی اِسی انٹرنیٹ کا سہارا لے کر پاکستان فتح کرنے چلا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اگلی بار سندھ کی حکومت بھی ہاتھ سے نکل جائے۔

مجھے یقین ہے

میں نے ابھی تک اَمن کی فاختہ کو مُنہ میں زیتون کی شاخ دبائے محوِ پرواز تو نہیں دیکھا پھر بھی مجھے یقین ہے کہ بہار آفریں موسم قریب آ لگا ہے۔ میرے یقیں کا محور، مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی بے لَوث کارکردگی اور شبانہ روز محنت ہے۔ اگر ایک طرف نوجوان بلاول زرداری نے موہنجوداڑو سے سندھ کی پانچ ہزار سالہ بوڑھی ثقافت کو کھود کر نکال باہر کیا ہے تو دوسری طرف حمزہ شہباز جیسے جوان کی سرپرستی میں ہمارے اُنتیس ہزار سے زیادہ نوجوانوں نے شدید بارش اور ژالہ باری کے باوجود سب سے بڑا انسانی پرچم بنا کر گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام لکھوا لیا ہے۔ پاکستانی نوجوانوں نے سابقہ (مشرقی) پاکستانی نوجوانوں سے یہ ریکارڈ چھین کر دسمبر 1971ء کے سکوتِ ڈھاکہ کا بدلہ چکا دیا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ مشرقی پاکستان اگر بنگلہ دیش نہ بنتا تو آج بنگلہ دیشی نوجوانوں کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا ۔ خیبر پختونخواہ میں سونامی امریکیوں کا راستہ روکے کھڑی ہے اور تلملاتے امریکی اُس کا ''کَکھ'' نہیں بگاڑ سکتے۔ جتنے طویل عرصے سے ''سونا میے'' نیٹو سپلائی روکے ہوئے ہیں وہ بھی ایک عالمی ریکارڈ ہے۔ تحریکِ انصاف کو چاہیے کہ وہ اپنی اولین فُرصت میں گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ سے رجوع کریں۔ بلوچستان کے وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر عبدالمالک کی گرفت

اتنی مضبوط ہے کہ اب وہاں راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ اگر بی آر اے، ہزارہ کمیونٹی کے زائرین کو شہید کرتی، ریلوے ٹریک دھماکے سے اُڑاتی اور گیس کی پائپ لائینوں کو تباہ کرتی رہتی ہے تو اِس میں ڈاکٹر عبدالمالک صاحب کا کوئی قصور نہیں کیونکہ ''کلّی کلّی جِند، دُکھ لکھ تے کروڑ'' کے مصداق شریف النفس ڈاکٹر عبدالمالک اکیلے کِس کِس کے دانت کھٹے کر سکتے ہیں؟۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ احتجاج کرنے والوں کے ساتھ خود بھی دَھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اُمیدِ واثق ہے کہ بی آر اے ڈاکٹر صاحب کے شریفانہ احتجاج'' پر صدقے واری جاتے ہوئے خود ہی ہتھیار پھینک دے گی اور وہ کام'' جو طاقت سے نہیں ہو سکا ''شرافت'' سے پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ شرافت کا دامن تو خیر ہماری مرکزی حکومت نے بھی بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے لیکن مقابل میں طالبان کچھ ''اَکھڑ'' واقع ہوئے ہیں۔ وہ دھماکوں کی ذمہ داری بھی قبول کرتے ہیں اور ساتھ ہی جنگ بندی کا عندیہ بھی دے دیتے ہیں۔ اُنھوں نے ایف سی کے 23 مغوی اہلکاروں کو شہید کرکے یہ کہا ہے کہ وہ اگلے 24 گھنٹوں میں جنگ بندی کا اعلان کر سکتے ہیں بشرطیکہ جنوبی وزیرستان سے فوج واپس چلی جائے۔ محترم عمران خاں تو یہی چاہتے ہیں کہ فوج کا انخلاء ہو تاکہ طالبان بھی ہتھیار پھینک دیں لیکن وزیرِ اعظم میاں نواز شریف نے کہا ہے کہ قومی سلامتی کے منافی کسی مطالبے پر غور نہیں ہو گا۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ امن مذاکرات کی کامیابی کے لیے وہ جائز اور مناسب اقدامات کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ ہےتہ

نہیں فوج کے انخلاء کا مطالبہ جائز ہے یا نا جائز لیکن مولانا سمیع الحق نے یہ کہہ دیا ہے کہ قوم ایک دو روز میں خوشخبری سُنے گی اِس لیے اچھّے کی اُمید ہی رکھنی چاہیے۔

اِس تمام تر حکومتی تگ و دَو کے بعد بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ حالات بہتری کی طرف نہیں جا رہے تو وہ فاترالعقل ہے۔ پنجاب یوتھ فیسٹیول اور ''سندھی ثقافت'' کی تابناک کامیابی کے بعد مجھے تو یقین ہو چلا ہے کہ اب امریکی ریشہ دوانیاں بھی بند ہو جائیں گی، معیشت کا پہیہ بھی چلنے لگے گا، کرپشن اور مہنگائی کا خاتمہ بھی ہو جائے گا، قبضہ گروپ بھتہ مافیہ ٹارگٹ کلرز بھی اپنے بلوں میں گھُس جائیں گے، آمر مشرف کو قرار واقعی سزا بھی مل جائے گی، ڈالر بھی پچاس روپے کی سطح تک پہنچ ہی جائے گا اور بم دھماکے خود کش حملے تو ختم ہونے ہی والے ہیں۔ کوئی اور یقین کرے نہ کرے مجھے تو بہرحال یقین ہے اور اِس یقین کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ہماری اسمبلیوں میں مفلس و نادار لوگ بھی منتخب ہو کر پہنچنے لگے ہیں۔ ہم تو یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ اسمبلیوں میں ''ہم جیسوں'' کی کوئی گنجائش نہیں لیکن اللہ بھلا کرے وزیرِ خزانہ جناب اسحاق ڈار کا جنہوں نے تمام تر مخالفت کے باوجود اراکینِ اسمبلی کی ٹیکس ڈائریکٹری شائع کرکے نئی تاریخ رقم کر دی جس سے ہمیں بھی پتہ چل گیا کہ ہماری اسمبلیوں میں بیٹھے اراکین بیچارے تو ''نانِ

جویں'' کے بھی محتاج ہیں اور ہم ''ایویں خوامخواہ'' اُن پر گرجتے برستے رہے۔اِس تاریخی ٹیکس ڈائریکٹری کے مطابق قومی اسمبلی کے 319 میں سے 315 ارکانِ پارلیمنٹ کے پاس کار، بینک اکاؤنٹ ، زیورات اور شیئرز نامی کوئی چیز نہیں۔پنجاب اسمبلی کے 345 ارکان اور خیبر پختونخواہ کی 18 خواتین ارکان کے پاس نقدی ہے نہ جیولری۔100 میں سے 86 سینیٹرز بیچارے بھی ''بے'' کار ہیں اور اُن کے پاس بھی بینک اکاؤنٹ ، زیورات اور شیئرز کی مَد میں ''کَکھ'' نہیں۔152 ارکانِ سندھ اسمبلی کے اثاثے ''کھودا پہاڑ، نکلا چوہا'' کے مصداق چھ لاکھ سے بھی کَم نکلے اور ہمارے 100 ارکانِ پارلیمنٹ تو ایسے ہیں جو نادہندہ ہیں۔جن ارکان کو ہم ارب کھرب پَتی سمجھتے تھے وہ بھی بس ''ایویں ای'' نکلے اور محض چند ہزار روپے ٹیکس ہی دے سکے۔اِس تاریخی ٹیکس ڈائرکٹری میں لکھا تو اور بھی بہت کچھ ہے لیکن کالم میں اتنی گنجائش نہیں اِس لیے یہیں تک محدود رہتے ہوئے عرض ہے کہ جس ملک کی اسمبلیوں میں اتنے ''عام آدمی'' بیٹھے ہوں اُس ملک کو ترقی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا کیونکہ مفلس کا درد آشنا کوئی مفلس ہی ہو سکتا ہے اور ہماری اسمبلیوں میں تو مفلسوں کا ''مینا بازار'' لگا ہوا ہے۔جب ارکانِ اسمبلی پیدل ، رکشوں ، سائیکل رکشوں ، ویگنوں اور بسوں میں دھکے کھاتے اسمبلیوں میں پہنچتے ہونگے تو کیا اُنہیں قومی عُسرت کا خیال نہیں آتا ہو گا؟۔ہم تو یہی سُنتے آئے ہیں کہ خواتین کو زیورات سے بے پناہ پیار ہوتا ہے لیکن ہماری

خواتین ارکان نے یہ ثابت کر دیا کہ اصل سکون تو ملک و قوم کی بے لَوث خدمت میں ہے، زیورات میں نہیں۔ لیکن ہمارا ''شرارتی'' الیکٹرانک میڈیا کسی کو چین سے رہنے نہیں دیتا اور کیمرے لے کر CIA کے ایجنٹوں کی طرح اسمبلیوں کے باہر گھات لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ ہمارے کیمرہ مینوں کی نظر اُن خواتین پر تو پڑتی نہیں جو پڑوسنوں سے اُدھار کپڑے مانگ کر اسمبلیوں میں آتی ہیں لیکن قوم کو گمراہ کرنے کے لیے ''چمکارے مارتی'' خواتین کو ضرور فوکس کرتے ہیں۔ یوں تو ہمارا الیکٹرانک میڈیا بہت تیز و طرار بنتا ہے لیکن اُسے اتنا بھی نہیں پتہ کہ اسمبلیوں میں آنے والی 90 فیصد سے زائد گاڑیاں '' مانگے تانگے ''کی ہوتی ہیں یا کرائے کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اراکینِ اسمبلی کی اِس حالتِ زار کو دیکھ کر میرا جی لہو سے بھَر گیا ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک ایسی NGO بناؤں گی جو ''اندر کھاتے'' اِن مفلس ارکانِ اسمبلی کی مدد کرتی رہے۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے NGO بناتے وقت بہت سی گھاٹیاں سَر کرنی ہونگی کیونکہ NGO's بیرونی ممالک کی امداد کے سہارے چلتی ہیں اور میرا تو فی الحال کسی سے رابطہ نہیں۔ اگر زکواۃ، عطیات اور قُربانی کی کھالیں اکٹھی کرنے کا پروگرام بنایا تو مولوی حضرات کے ساتھ ساتھ محترم عمران خاں اور ایم کیو ایم والوں کی ناراضی کا خطرہ ہے۔ اِس کے باوجود بھی میں یہ کام ضرور کروں گی کیونکہ اسی میں ملک و قوم کا بھلا ہے اِس لیے ''مجھے یقیں ہے ''کہ کامیابی میرے قدم چومے گی۔

سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

وفاقی وزیرِ اطلاعات و نشریات پرویز رشید نے راولپنڈی آرٹس کونسل کی تقریب میں شرکت کے بعد میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے بجا طور پر طالبان سے سوال کیا ہے کہ وہ بتلائیں کہ کس شریعت میں قیدیوں کے گلے کاٹنے کی اجازت ہے ؟۔اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ جنیوا معاہدے کے تحت بھارت نے بھی 90 ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں سے ایسا سلوک نہیں کیا اور ہمارے پاس جو بھارتی جنگی قیدی تھے ، ہم نے بھی اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اسلام نے بتایا ہے۔ جنابِ پرویز رشید کے اِس بیان سے اختلاف ممکن ہی نہیں اور باوجود اِس کے کہ میاں نواز شریف صاحب پر طالبان سے مذاکرات ختم کرنے کے لیے شدید دباؤ ہے ، وہ امن کو ایک اور موقع دینا چاہتے ہیں اسی لیے حکومتی کمیٹی نے یہ اعلان کیا ہے کہ غیر مشروط جنگ بندی کے بغیر بات آگے نہیں بڑھے گی جبکہ طالبان تا حال مشروط جنگ بندی پر زور دے رہے ہیں ۔ایف سی کے 23 مغوی قیدیوں کے گلے کاٹنے اور اُن کی ویڈیو جاری کرنے کے بعد یہ تو طے ہو گیا کہ طالبانی شریعت میں نظامِ عدل کی نوعیت کیا ہے ۔ 23 شہید اہلکار تو ایف سی سے تعلق رکھتے تھے جن کے بارے میں ''طالبانی شریعت'' یہ کہہ سکتی ہے کہ وہ طالبان کے خلاف جنگ میں مصروف تھے لیکن اُن کے پاس 50 ہزار سے زائد بے گناہوں کے خون سے

ہاتھ رنگنے کا کیا جواز ہے؟۔ حکمت کی کتاب میں درج کر دیا گیا ”جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اُس کی سزا جہنم ہے، وہ اُس میں ہمیشہ رہے گا۔ اُس پر اللہ کا عذاب نازل ہو گا۔ اُس پر اللہ کی لعنت ہے اور اللہ نے اُس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے النساء)۔ اب طالبان خود ہی فیصلہ کر لیں کہ اُن کے دامن کتنے بے گناہوں کے خون)“ سے تر ہیں اور جس قُرآن و سنت کی حکمرانی کے لیے اُنہوں نے ہتھیار اُٹھا رکھے ہیں، وہی قُرآن و سنت اُنہیں کیا پیغام دیتے ہیں۔

طالبان سے مذاکرات یا آپریشن کا فیصلہ تو ہونے کو ہے، سوال مگر یہ ہے کہ کیا ہمارے نظامِ عدل کی بنیاد قُرآن و سنت ہی ہے؟ اور کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا قانون اور ہماری تعزیرات صرف کمزوروں تک محدود ہوں؟۔ ہم ہر روز ہزاروں پاکستانیوں کو تھانے کچہریوں میں دھکے کھاتے دیکھتے ہیں اور مجرموں کو سزا پاتے بھی لیکن جب ایک آمر کو بطور ملزم کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا ہے تو اخبارات کی ”شہ سُرخیاں“ بن جاتی ہیں اور الیکٹرانک میڈیا گھنٹوں ”لائیو کوریج“ میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کیوں؟، شائد اِس لیے کہ باقی سبھی تو ”بلڈی سویلین“ تھے لیکن مشرف صاحب سابقہ آرمی چیف جسے سَو خون بھی معاف ہیں۔ غداری کیس کی تیئیسویں سماعت پر جب مشرف صاحب عدالت میں پیش ہوئے تو تجزیہ نگاروں نے کہا کہ مشرف کی پیشی آئین کی بالادستی کا تاریخی دن ہے

۔بات وہی جو میرے آقا ﷺ نے کہی کہ ’’وہ قومیں برباد ہو جاتی ہیں جو زور آوروں کو معاف کرتی اور کمزوروں کو سزا دیتی ہیں‘‘۔سنگین غداری کیس کے نامزد ملزم پرویز مشرف صاحب جس دھج سے خصوصی عدالت میں پہنچے وہ بھی اب تاریخ کا حصّہ ہے۔اُن کی آمد کے موقع پر پنڈی، اسلام آباد میں سکیورٹی ریڈ الرٹ رہی، دو متبادل راستوں پر روٹ لگایا گیا، پولیس اور رینجرز کے لگ بھگ 1300 اہلکار روٹوں پر تعینات کیے گئے، اعلیٰ پولیس افسروں کی چھٹی منسوخ کر دی گئی، بم ڈسپوزل سکواڈ نے خصوصی عدالت کے احاطے کی خوب چھان پھٹک کی اور کمرۂ عدالت میں جیمر نصب کئے ۔تب کہیں جا کر 17 گاڑیوں پر مشتمل اُس شخص کی ’’بارات‘‘روانہ ہوئی جس پر سنگین غداری کا الزام ہے۔خصوصی عدالت نے بھی انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہوئے سابق صدر کو ملزم نہیں بلکہ مشرف صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔مشرف صاحب کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے ہی کرسی پر بیٹھ گئے اور جج صاحبان کے آنے پر بھی کھڑے ہونے کی زحمت گوارانہ کی۔خصوصی عدالت کے سربراہ جسٹس فیصل عرب جو مشرف صاحب کو کرسی پر براجماں دیکھ چکے تھے، نے مشرف صاحب کو براہِ راست کٹھہرے میں کھڑا ہونے کا حکم دینے کی بجائے مشرف صاحب کے وکیل انور منصور سے سوال کیا کہ مشرف صاحب کہاں ہیں ؟۔تب انور منصور صاحب نے مشرف صاحب کو کٹھہرے میں کھڑا ہونے کے لیے کہا۔کٹھہرے میں کھڑے مشرف صاحب کی شان بھی نرالی تھی ۔اُن کے پیچھے رینجرز کے جوانوں کا حفاظتی دستہ ایستادہ تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی

سربراہِ مملکت قوم کو مخاطب کرنے کے لیے روسٹرم پر کھڑا ہو۔ احمد رضا قصوری کی درخواست پر مشرف صاحب کو فوراً ہی کرسی پر بٹھا دیا گیا اور جب خصوصی عدالت نے سابق صدر پر فردِ جرم عائد کرنی چاہی تو وکلاء صفائی کی جانب سے یہ اعتراض اٹھایا گیا کہ پہلے یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ مقدمہ کی سماعت عدالت کے دائرہ اختیار میں ہے بھی یا نہیں۔ عدالت نے اپنے مختصر فیصلے میں فرد جرم اور ملزم کی عدالت میں مزید پیشی سے متعلق فیصلہ جمعہ تک مؤخر کر دیا اور یوں صرف بیس، بائیس منٹ تک کمرۂ عدالت میں ٹھہرنے کے بعد مشرف صاحب اِس شان سے واپس گئے کہ اُن کے احاطۂ عدالت سے باہر نکل جانے تک خصوصی عدالت کے جج صاحبان سمیت تمام افراد کمرۂ عدالت میں محبوس رہے۔ اِس چشم کشا کارروائی کے بعد کم از کم اتنا اندازہ تو ضرور ہو گیا کہ ہمارا نظامِ عدل کتنی مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔

مشرف صاحب کی عدالت میں آمد و رفت کے دوران پنڈی اور اسلام آباد کے رہائشی گھنٹوں خوار ہوتے رہے۔ اُن کی اِس شاہانہ پیشی پر عوام کے خون سے نچوڑے گئے کروڑوں روپے صرف ہوئے لیکن فرد جرم پھر بھی عائد نہ ہو سکی۔ اگر مشرف صاحب کی عدالت میں پیشی کا یہی نتیجہ نکلنا تھا تو پھر کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ خصوصی عدالت اپنے دائرہ اختیار کا تعین کرنے کے بعد ملزم کو عدالت میں طلب کرتی لیکن ہمارے ہاں تو معاملہ کچھ یوں ہے کہ ”نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا

ہے رکاب میں'' ۔ مشرف صاحب اے ایف آئی سی کے وی وی آئی پی روم میں محوِ استراحت ہیں اور چک شہزاد میں اُن کے خالی گھر پر رینجرز، پولیس اور ایجنسیوں کے جوان پتہ نہیں کیوں تعینات کیے گئے ہیں۔ مشرف صاحب ایک بار تو عدالت میں حاضر ہو گئے لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ اب دوبارہ وہ آتے بھی ہیں یا نہیں۔ شنید ہے کہ اے ایف آئی سی کے ڈاکٹرز نے اُن کی ''مخدوش حالت'' کے پیشِ نظر اُنہیں عدالت جانے سے منع کیا تھا لیکن وہ اپنے ''رِسک'' پر عدالت آئے ۔ حیرت ہوتی ہے کہ اے ایف آئی سی کے ماہر ترین ڈاکٹرز جب خصوصی عدالت کو یہ لکھ کر دے چکے ہیں کہ مریض'' کی حالت مخدوش ہے تو پھر وہ مریض کا علاج نہ کرنے کا رِسک کیوں لے'' رہے ہیں ؟۔ اگر مشرف صاحب کو اے ایف آئی سی کے ڈاکٹرز کی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں تو پھر اُنہیں ڈسچارج کیوں نہیں کیا جاتا ؟۔ کیا دُنیا میں اے ایف آئی سی کے سوا کوئی ایسا ہسپتال بھی ہے جہاں مریض علاج بھی نہ کروانا چاہتا ہو اور اُسے ڈسچارج بھی نہ کیا جائے ؟۔ ہو سکتا ہے کہ مشرف صاحب کو محض اِس لیے ڈسچارج نہ کیا جا رہا ہو کہ بوقتِ ضرورت اُن کا میڈیکل سرٹیفیکیٹ پیش کر کے عدالت میں حاضری سے استثناء حاصل کیا جا سکے اور پھر ۔۔۔ پھر یہ سلسلہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہی ہوتا چلا جائے ۔

بہر حال آثار تو یہی بتلاتے ہیں کہ یہ ڈرامہ طول تو پکڑ سکتا ہے مشرف کی سزا کا باعث نہیں بن سکتا کیونکہ ہمارت نظامِ عدل میں مقدمات دنوں ، مہینوں نہیں بلکہ سالوں پر محیط ہوتے ہیں۔

تھری اِن وَن کمانڈو

تصورات و تخیلات کی حسین وادیوں کی سیر کرنے میں پیسہ صَرف ہوتا ہے نہ محنت کرنی پڑتی ہے البتہ انسان ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر اپنے مَن کی ساری مرادیں پا لیتا ہے۔ہم نے بھی سیاست کے اکھاڑے میں اُترنے کے لیے بہت سے سہانے سپنے سجا رکھے ہیں کیونکہ ہمارے مشاہدے میں ہے کہ جس کسی نے میدانِ سیاست میں قدم رکھا، آن کی آن میں فرش سے عرش تک جا پہنچا۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہم ''ٹیں ٹیں'' کرتی پروٹوکول کی گاڑیوں کے جلَو میں ''روٹ لگی'' سڑکوں پر محوِ سفر ہوں اور سڑکوں پر کھڑے ''کیڑے مکوڑے'' عالمِ حسرت میں ہمیں تکتے رہ جائیں۔ عالمِ تخیل میں تو ہم ایسا سفر کئی بار بلکہ دِن میں کئی کئی بار کر چکے ہیں لیکن عالمِ آب و گِل میں اِس کی نوبت ابھی تک نہیں آئی ۔اِسی لیے ہمارا عزمِ مصمم ہے کہ ہم لازماً کسی نہ کسی سیاسی جماعت کا دَر کھٹکھٹائیں گے ۔یہ تو خیر طے ہے کہ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے حاضر سٹاک میں ہماری کوئی گنجائش نہیں ۔اسی لیے ہم نے سوچ رکھا تھا کہ جنابِ پرویز مشرف کی آل پاکستان مسلم لیگ جوائن کر لی جائے ۔اِس جماعت کو جوائن کرنے کی کئی وجوہات تھیں ۔پہلی یہ کہ اِس جماعت میں کوئی بھی بڑا عہدہ آسانی سے مِل سکتا تھا ۔ایک عہدہ کیا، اگر ہم چاہیں تو بیک وقت تین چار عہدوں پر بھی قبضہ جما سکتے ہیں کیونکہ فی

الحال تمام سیٹیں خالی پڑی ہیں۔دوسرے یہ کہ اِس جماعت کا مستقبل بہت ''روشن'' دکھائی دیتا ہے کیونکہ بیرونی ممالک میں ہمارے لیڈر کو چاہنے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے اور سوشل میڈیا کی تو سب سے بڑی جماعت ہے ہی آل پاکستان مسلم لیگ۔ کسی زمانے میں تحریکِ انصاف کا بھی سوشل میڈیا پر بہت چرچا تھا لیکن اب وہ میدانِ عمل میں ہے اور اُس کی جگہ آل پاکستان مسلم لیگ لے چکی ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ ہمیں پاکستان سے بہت پیار ہے اور یہ واحد سیاسی جماعت ہے جس کا نعرہ ''سب سے پہلے پاکستان'' ہے۔چوتھی اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اِس جماعت کی سَربراہی اُس عظیم شخصیت کے پاس ہے جو ڈرتے ورتے کسی سے نہیں اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ سیاست دانوں میں وہ واحد شخص ہیں جو کئی سال تک ایٹمی پاکستان کے سیاہ و سفید کے مالک اور ''تھری اِن وَن'' رہے جو اُن کی ''ارسطوانہ حکمت'' کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ عقیل و فہیم پرویز مشرف صاحب نے مکّے لہراتے ہوئے بیک وقت صدرِ پاکستان، چیف آف آرمی سٹاف اور چیف ایگزیکٹو کے عہدے ایسے سنبھالے کہ اُن کے آگے کسی کو دَم مارنے کی مجال نہیں تھی۔اِنہی خوبیوں کی بنا پر ہم آل پاکستان مسلم لیگ کا حصّہ بننے کے لیے کمربستہ تھے لیکن خصوصی عدالت نے دھماکہ کرکے ہمارے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔

ہمیں یقین تھا کہ خصوصی عدالت آرمی ایکٹ کے تحت پرویز مشرف صاحب کا مقدمہ

ملٹری کورٹ میں بھیج کر چین کی بانسری بجائے گی لیکن پتہ نہیں عدالت کے مَن میں کیا آئی کہ اُس نے پرویز مشرف صاحب کی درخواست مسترد کرتے ہوئے یہ فیصلہ سنا دیا کہ سنگین غداری کا مقدمہ صرف اور صرف خصوصی عدالت کا اختیار ہے اور کوئی دوسری عدالت یہ مقدمہ سننے کا اختیار نہیں رکھتی ۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں یہ بھی لکھا کہ 1977 ء کے جس آرمی ایکٹ کا حوالہ دیا گیا ہے اُس ایکٹ کو 1981ء میں کالعدم قرار دیا جا چکا ہے اِس لیے پرویز مشرف پر آرمی ایکٹ کا اطلاق نہیں ہوتا ۔ خصوصی عدالت نے پرویز مشرف پر فردِ جرم عائد کرنے کے لیے اُنہیں 11 مارچ کو طلب کر لیا ہے ۔ مشرف صاحب کے وکلاء بجا طور پر کہتے ہیں کہ یہ ایک بُرا فیصلہ ہے جسے وہ تسلیم نہیں کرتے ۔ احمد رضا قصوری کہتے ہیں کہ پرویز مشرف نے بطور آرمی چیف ایمرجنسی لگائی اِس لیے اُن کا مقدمہ ملٹری کورٹ میں ہی چلنا چاہیے ۔ فیصل چوہدری کہتے ہیں کہ فیصلہ خلافِ قانون ہے ، ہم اِس کا جائزہ لے رہے ہیں اور جلد ہی قانونی ٹیم کا اجلاس بلا کر فیصلہ چیلنج کیا جائے گا ۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ 11 مارچ تک بہت سے قانونی آپشن موجود ہیں گویا ''ہنوز دِلّی دُور است'' ۔ وکلاء کے اِن اُمید افزاء بیانات کے بعد ہمارا نہ صرف حوصلہ بڑھا بلکہ ہم نے اُمید کی ٹوٹی ڈور کو ایک دفعہ پھر ''گانٹھ'' دے لی ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ''ہمارے لیڈر'' کا مقدمہ ملٹری کورٹ میں آ گیا تو پھر راوی عیش ہی عیش لکھے گا کیونکہ وہاں سبھی اپنے ہیں اور یہاں سبھی بیگانے ۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر مقدمہ

ملٹری کورٹ میں چلا گیا تو پھر سب سے پہلے ہمارے لیڈر کو 21 توپوں کی سلامی دی جائے گی ، پھر گارڈ آف آنر اور آخر میں با عزّت و باوقار رخصتی جبکہ خصوصی عدالت کی شدید ترین خواہش پر مشرف صاحب جب عدالت آئے تو بنچ کے سَربراہ جناب جسٹس فیصل عرب نے اُن کے وکیل انور منصور سے استفسار کیا کہ اُن کے مؤکل کہاں ہیں جس پر انور منصور نے پرویز مشرف صاحب کی طرف اشارہ کیا تو جسٹس فیصل عرب صاحب نے کہا ''مسٹر مشرف ! آپ کھڑے ہو جائیں''۔ سابق صدر ، چیف آف آرمی سٹاف اور چیف ایگزیکٹو (تھری اِن وَن) نہ صرف کھڑے ہو گئے بلکہ عدالت کو ٹھُک سے سلیوٹ بھی دے مارا۔ کچھ بد باطن کہتے ہیں کہ خوفزدہ پرویز مشرف نے زرد رنگ اور پھولی سانسوں کے ساتھ عالمِ بے اختیاری میں سلیوٹ کیا حالانکہ سبھی جانتے ہیں کہ ہمارے تھری اِن وَن کمانڈو ڈرتے ورتے کسی سے نہیں۔ کچھ مشرف مخالف تجزیہ نگار یہ بھی کہتے ہیں کہ پاک فوج مشرف صاحب سے ''اوازار'' ہے کیونکہ اُن کے دَور میں افواجِ پاکستان کی شہرت کو شدید دھچکا لگا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے اور ایں خیال است و محال است و جنوں۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے کمانڈو کو اے ایف آئی سی کی صورت میں ایک ایسی پناہ گاہ میسر آ گئی ہے جہاں پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ واقعی ''بیمار شمار'' ہیں اور بیماری کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ سوائے اے ایف آئی سی کے وی وی آئی پی روم کے کوئی اور جگہ اُن کے لیے مناسب نہیں۔ اگر حاکمانِ وقت کے دِل میں مشرف

صاحب کا وی وی آئی پی روم کانٹے کی طرح چبھتا ہے تو اُنہیں چاہیے کہ مشرف صاحب کو بغرضِ علاج بیرونِ ملک جانے کی اجازت دے دیں کیونکہ یہ تو طے ہے کہ اُن جیسی عظیم ترین'' ہستی کا علاج اے ایف آئی سی کے ڈاکٹروں کے بَس کا روگ نہیں۔اِسی'' لیے ہمارے کمانڈو اِن ''عامی'' ڈاکٹرں سے اپنا علاج کروانے کا رِسک نہیں لے رہے اور اُنہیں رِسک لینا بھی نہیں چاہیے کیونکہ وہ ملک و قوم کا ایسا سرمایہ ہیں جِن کی قومی خدمات کا اعتراف امریکہ بھی کرتا ہے اور طالبان بھی۔امریکہ ڈرون اور طالبان خود کُش حملوں کی صورت میں ہر وقت مشرف صاحب کو یاد کرتے رہتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ یہ احسان ناسپاس قوم امریکہ کو پسند کرتی ہے نہ طالبان کو۔ہم امریکہ سے ڈالر بھی لیتے ہیں اور اُسے آنکھیں بھی دکھاتے ہیں اور طالبان جو ''ہمارے اپنے'' ہیں ، اُن کے خلاف بھی ہمہ وقت کمربستہ رہتے ہیں۔اب تو حکمرانوں نے بھی کُھل کر کہہ دیا ہے کہ ''تُم ایک مارو گے تو ہم دو'' ۔اللہ بھلا کرے محترم عمران خاں ، سید منّور حُسن صاحب ، مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق کا جو آج بھی کسی موہوم سی اُمید کے سہارے مذاکرات کا ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ویسے اگر حاکمانِ وقت مناسب سمجھیں تو وہ ہمارے ''تھری اِن وَن'' کمانڈو کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ اُنہیں امریکہ سے نپٹنے کا بھی تجربہ ہے اور طالبان سے دو، دو ہاتھ کرنے کا بھی۔

آئینِ پاکستان قُرآن و سُنت کی روشنی میں

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔ سرگوشیاں

کئی بار لکھ چکا کہ قحط الرجال ہے۔ ایسا قحط الرجال جس میں علم و حکمت کے بند کواڑوں میں کوئی ایسا روزن بھی نہیں جس سے روشنی کی ہلکی سی کرن بھی پھوٹتی دکھائی دے ۔یقیناً سچائی کی شمعیں روشن کرنے والے چند اہلِ قلم بھی ہونگے ۔ لیکن وہ بھی مہر بلب کہ کہیں لوگ اُنہیں رجعت پسند سمجھ کر تضحیک و استہزا کے نَشتر نہ چلانے لگیں حالانکہ یہ اہلِ نظر کا فرضِ عین ہے کہ جہاں تک ہو سکے ابدی صداقتوں کی مشعلیں روشن کرکے بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کی سعی کریں ۔ میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ جہاں بُرائی دیکھو ،اُسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرو۔ اگر یہ سکت نہ پاؤ تو زبان سے بُرا کہو اور اگر ایسا بھی نہ کر سکو تو دِل میں بُرا کہو اور یہ تمہارے کمزور ترین ایمان کی نشانی ہے (مفہوم) ۔ لیکن ہم تو ایمان کے کمزور ترین درجے پر بھی نہیں ۔ ہم میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ کوئی صحافت کے "کاریگروں" اور NGO's کی اُن خواتین کا مُنہ توڑ جواب دے سکیں جن کی گفتگو میں زہرناکی اور ضمیر استہزاء کے خمیر میں گُندھا نظر آتا ہے ، جنہیں مُنہ ٹیڑھا کرکے دین ، اکابرینِ دین اور اسلامی تاریخ میں کیڑا کاری کی عادت پڑ چکی ہے ، جن کے قلم اور زبانیں ہر

وقت شعلے اُگلتی رہتی ہیں ، جن کے غلامانہ ذہن مغرب کی نکالی میں اتنا آگے نکل چکے ہیں کہ بے ثبات سایوں کو بھی مہرِ درخشاں ثابت کرنے میں جتے رہتے ہیں اور جن کی کجی اور کج بحثی اب نا قابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔

فرقانِ حمید میں درج کر دیا گیا" رَب کو جاننے والے اُس کے عالم بندے ہیں "۔ یہی عالم بندے جب دینِ مبیں کا پیغام لے کر عرب کے ریگزاروں سے اُٹھے تو شَرق تا غرب پھیلتے چلے گئے لیکن ہمارے "بزعمِ خویش" فہیم و عقیل سیکولر دانشور ایک طرف تو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف وہ قُرآن کی بجائے افکارِ مغرب سے جنوں کی حد تک پیار کرتے ہیں۔ حالانکہ جس دین کی پیروی کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اُس نے تو حکمت کی کتاب میں پوری صراحت سے یہ درج کر دیا "ہم نے قُرآن میں سب کچھ بیان کر دیا ہے"۔ لاریب قُرآن کا مقصود لوگوں کو سمجھانا ہے لیکن نصیحت تو وہی پکڑتے ہیں جن کے دل خوفِ خُدا سے لبریز ہوں ۔ سچ کہا شاعرِ مشرق نے کہ

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قُرآن ہو کر

مسلم لیگ نواز سے تعلق رکھنے والے ہمارے ایک نامی لکھاری جو رُکنِ پارلیمنٹ بھی رہ چکے ہیں ، آجکل "کالمی درویشوں" والے لکھاری کی طرح نواز لیگ کے

خلاف آگ اُگلتے رہتے ہیں۔وجہ یہ کہ 2013ء کے انتخابات میں نواز لیگ نے اُنہیں ''ٹکٹ'' سے محروم رکھا۔اِس لیے اُن کا نواز لیگ کے خلاف آگ اُگلنا فطری ہے۔اِس لیے ہمیں اُن کی اِس زہرناکی سے کوئی غرض نہیں لیکن موصوف نے اپنے کالم میں دینی حوالے سے جو زہر اُگلا ہے وہ بہرحال ایک عامی مسلمان کے لئے بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ہمیں اِس سے کچھ غرض نہیں کہ موصوف ایمان کے کس درجے پر ہیں کیونکہ یہ اُن کا اور اللہ کا معاملہ ہے لیکن جب وہ اپنے غیر شرعی افکار کا یوں بابانگِ دہل پرچار کریں گے تو پھر معاملہ اُن کی ذات سے نکل کر ہر مسلمان کے جذبات کا بن جاتا ہے۔موصوف نے اپنے کالم میں ''بازارِ حُسن'' کا نوحہ لکھتے ہوئے فرمایا ہے ''اب وہ گلیاں جہاں بالکونیوں سے حسین چہرے جھانکتے تھے اور جہاں سے طبلے کی تال، ہارمونیم کے سُر اور پازیب کی جھنکار دل میں مدھ بھرے جذبات جگاتے تھے، اب وہاں جوتوں اور کھُسوں کی دکانیں کھُل گئی ہیں''۔دست بستہ عرض ہے کہ ناچ گانے کی محفلیں تو مکمل طور پر غیر اسلامی اور غیر شرعی ہیں لیکن حصولِ رزق کے لیے جوتوں اور کھسوں کا کاروبار نہ تو غیر اسلامی ہے اور نہ ہی غیر شرعی۔موصوف کہتے ہیں ''لاہور کی پیشہ رو حسیناؤں کے بہت سے گروہ سمندر پار دبئی کے قدر دانوں کے پاس چلے گئے۔یہ ریاست اسلامی ہے لیکن رقص و موسیقی نے اُن کے قدیم مذہبی تصورات اور نیکی اور پرہیز گاری کے جذبات کے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں کیا لیکن یہاں مذہبی تصورات ہمیشہ خطرے کی زد میں سمجھے جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے

کہ ہمارے علماء ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے اور ہمیں زیادہ سے زیادہ مسلمان بنانے کو اپنی زندگی کا فریضہ بنائے ہوئے ہیں''۔ عرض ہے کہ ایک عالمِ دین کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ وہ مسلمانوں کو احکاماتِ الٰہیہ سے متواتر آگاہ کرتا رہے جو ہمارے علماء سرانجام دے رہے ہیں۔

مجددِ وقت، مجتہد العصر سیّد ابو الاعلیٰ مودودی کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ ''جب پاکستان وجود میں آ گیا تو مولانا نے وقت ضائع کیے بغیر اس ''غیر اسلامی ملک'' کی طرف ہجرت کی اور اپنے مذہبی تصورات کی ترویج کے لیے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ کاش مولانا مودودی اُن نظریات پر قائم رہتے جن کا اظہار اُنھوں نے مسٹر جناح کے حوالے سے تواتر کے ساتھ کیا اور اِس غیر اسلامی ملک میں ہجرت نہ کرتے تو شاید ہماری قسمت بہت مختلف ہوتی''۔ موصوف نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ اگر موصوف خود ہجرت کر کے کہیں اور چلے جاتے تو یہ پاکستان اور پاکستانیوں پر اُن کا احسانِ عظیم ہوتا کیونکہ پاکستان جس مقصد کے لیے معرضِ وجود میں آیا وہ مقصد محترم لکھاری کی طبع نازک پر گراں گزرتا ہے البتہ حضرت ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی ساری زندگی اسی مقصد کے حصول کے لیے صرف کر دی لیکن محترم لکھاری کو اُس مقصد کے حصول کی بجائے ناچ گانے اور ''بازارِ حسن'' میں ہی کشش نظر آتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہمہ وقت بابائے قوم کو سیکولر ثابت کرنے کی سعیِ

لاحاصل کرتے رہتے ہیں۔اِس بحث میں اُلجھے بغیر کہ بابائے قوم کا مطمعٔ نظر سیکولر پاکستان تھا یا اسلامی پاکستان ،کیا موصوف یہ بتلا سکتے ہیں کہ ہمارا آئین اسلامی ہے یا سیکولر ؟۔کیا یہ آئین اُس پارلیمنٹ نے منظور نہیں کیا تھا جس میں علماء کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی ؟۔اور کیا اسی آئین کے تحت موصوف نے پارلیمنٹ میں حلف نہیں اٹھایا تھا؟ ۔اِس آئین کے آرٹیکل 1 کے مطابق ملک کا نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے ۔آرٹیکل 2 میں مملکت کا مذہب اسلام اور قردادِ مقاصد آئین کا ابتدائیہ ہے ،'' آرٹیکل 227 میں تمام قوانین کو قُرآن و سُنت کے مطابق وضع کرنے کی گارنٹی دی گئی ہے اوراِس مقصد کے حصول کے لیے آرٹیکل 228 کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام اور آرٹیکل 203 کے تحت وفاقی شریعت کورٹ کے قیام کا ذکر ہے ، آرٹیکل 260 کے تحت حضورِ اکرم ﷺ کو خاتم النبیین اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا ہے ،آرٹیکل 62 اور 63 میں اراکینِ پارلیمنٹ سینٹ و صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے لیے شرائط بتائی گئی ہیں ۔یہ شرائط اسلامی نظام کے عین مطابق ہیں ۔آرٹیکل 42 اور 91 کے مطابق صرف مسلمان ہی صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم بننے کے اہل قرار دیئے گئے ہیں ۔اگر آئینِ پاکستان کو اُس کی اصل روح کے مطابق نافذ کر دیا جائے تو لاریب یہ ایک مکمل اسلامی آئین ہے ۔محترم کالم نگار نے ایک پارلیمنٹیرین کی حیثیت سے یقیناً ہم سے زیادہ آئین کا مطالعہ کر رکھا ہو گا ۔کیا اُنہیں حسین چہروں ، طبلے کی تھاپ ، ہارمونیم

کے سُر اور پازیب کی جھنکار کے لیے اِس آئین میں کوئی گنجائش نظر آئی ہے؟۔ اُنھوں نے انتہائی کرب کے عالم میں لکھا ہے کہ ہماری قسمت میں مولانا محمد احمد لدھیانوی اور بھارت کے حصے میں فلمی شاعر ساحر لدھیانوی آ گئے۔ ساحر لدھیانوی کے ناقابلِ فراموش فلمی گیت برِ صغیر کے کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن گئے جب کہ محمد احمد لدھیانوی کی ہدایت گناہ گار انسانوں کو اِس دُنیا اور اُس کی الائشوں سے نجات دلاتے ہوئے فی الفور آسمانوں کی راہ دکھاتی ہے۔ عرض ہے کہ کسی مے نوش فلمی شاعر کا کسی عالمِ دین سے موازنہ بہر حال صحافتی آداب کے منافی ہے اور اخلاقی آداب کے بھی۔

اُمیدِ بہار رَکھ

ہمارے انتہائی متحرک خادمِ اعلیٰ کا ''کُکھ'' پتہ نہیں چلتا کہ وہ کَب کہاں ہونگے۔اُن کی بے چین روح کو ایک پَل بھی قرار نہیں۔یہ بجا کہ پاکستان میں توانائی کا بحران ہے لیکن ہمارے خادمِ اعلیٰ کے اندر بجلیاں ہی بجلیاں بھری ہیں۔ہماری حکومت ''ایویں خوامخواہ'' توانائی کے لیے غیروں کے ''ہِنتیں تَرلے'' کرتی رہتی ہے، اگر خادمِ اعلیٰ کے اندر بھری ''بجلیوں'' سے استفادے کی کوئی سبیل نکل سکے تو پورے ملک کے جگمگا اُٹھنے کی گارنٹی ہم دیتے ہیں۔خادمِ اعلیٰ میاں شہباز شریف اور صدرِ پاکستان سیّد ممنون حسین '' چین یاترا'' کر بھی آئے اور ہمیں خبر ہی نہ ہوئی۔سیّد ممنون حسین تو بس '' سیر شَیر'' ہی کرنے گئے تھے لیکن خادمِ اعلیٰ ایسے متحرک ہوئے کہ شہد سے میٹھے چینی دوستوں نے اُن کا مُنہ چینی سے بھر دیا اور چینی حکومت نے نہ صرف سات سالوں میں 30 ارب ڈالروں کے منصوبوں کی حامی بھر لی بلکہ چینی وزیرِ اعظم صاحب نے ریپڈ بَس کی طرح کے لاہور میں ''ریپڈ ٹرین'' بھی پاکستان کو دینے کا اعلان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہ پاکستانیوں کے لیے تحفہ ہے۔اِس سے پہلے خادمِ اعلیٰ نے تُرک حکومت سے دوستی گانٹھ رکھی تھی جِس کی واضح نشانیاں لاہور میں جا بجا نظر آتی ہیں۔اگر خادمِ اعلیٰ اسی طرح چین اور

ترکی کے دَورے کرتے رہے اور اِن حکومتوں کی عنایاتِ خُسروانہ بھی جاری رہیں تو اُمید واثق ہے کہ بہت جلد تُرک اور چینی باشندے پاکستان میں نوکریاں ڈھونڈتے نظر آئیں گے۔ چینی دَورے سے واپسی کے بعد خادمِ اعلیٰ میاں شہباز شریف نے فرمایا ہے کہ یہ پاکستان کی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ چین کی اعلیٰ قیادت نے معاشی تعاون کی اتنی بڑی کمٹمنٹ دی ہے۔ اُنھوں نے مزید فرمایا ''چین نے اپنا فرض ادا کر دیا اب ہمیں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اگر ہم نے کوتاہی دکھائی تو قوم ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی''۔ خادمِ اعلیٰ کے اِس اُمید افزاء بیان کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اگلے پانچ برسوں میں حکومت ملک کی تقدیر بدلنے کی کوشش ضرور کرے گی۔ پچھلے پانچ برسوں میں خادمِ اعلیٰ نے جس جنّاتی طاقت سے لاہور کا نقشہ بدلا ہے وہ بھی کسی عجوبے سے کم نہیں۔ ہم کم از کم دس بار اپنی گاڑی پر فیروز پور روڈ سے گزرے اور ہمیشہ راستہ بھولے۔ اب ہم نے پختہ ارادہ باندھ لیا ہے کہ کسی وقت فیروز پور روڈ کی بھول بھلیوں کو ''پڑھنے'' کے لیے نکل کھڑے ہونگے تاکہ گیارھویں مرتبہ نہ بھولیں۔ خادمِ اعلیٰ صاحب کے کارنامے تو اتنے ہیں کہ اُن پر پورا تھیسز لکھا جا سکتا ہے لیکن اُن کے نقاد اپنے ''آقاؤں'' کو خوش کرنے کے لیے ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں لیکن ہمارے تو دِل سے دُعا نکلتی ہے کہ ''اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے'' کیونکہ لاریب

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے

زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

خادمِ اعلیٰ کی ارضِ پاکستان کے لیے لگن، کسک اور تڑپ کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ وہ "طالبانی مسلے" کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اگر خادمِ اعلیٰ اپنی "انگشتِ شہادت" ہلاتے میدان میں کود پڑے تو ہمیں یقین ہے کہ عنقریب طالبان بھی اُن کا دَم بھرتے نظر آئیں گے۔ خادمِ اعلیٰ تو جو کہتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں لیکن پاکستانی سیاست کے "سلطان راہی" جناب الطاف حسین خالی خولی "بڑھکوں" سے کام نکالنے کی "کوشش" کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی بڑھکوں کا جنابِ آصف زرداری اور رحمٰن ملک پر تو بہت اثر ہوتا تھا لیکن میاں نواز شریف صاحب اور چوہدری نثار احمد صاحب مسکرا کر ٹال جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے نواز لیگ سے مایوس الطاف بھائی نے نہ صرف فوج کی طرف رجوع کر لیا ہے بلکہ "اندر کھاتے" سندھ حکومت میں شمولیت کے لیے گرین سگنل بھی دے دیا ہے۔ اُنھوں نے کراچی میں ایک دفعہ پھر "کھڑاک" کرتے ہوئے فرمایا "طالبان کا جو یار ہے، وہ ملک کا غدار ہے"۔ افواجِ پاکستان سے اظہارِ یکجہتی کے لیے نکالی گئی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ طالبان کے حامی پاکستان کے دوست نہیں بلکہ منافق ہیں۔ اُن کی "کڑاکے دار" تقریر کا نشانہ اب کی بار جماعتِ اسلامی اور تحریکِ انصاف بنی رہی۔ جماعتِ اسلامی کے تو الطاف بھائی ازلی و ابدی دشمن ہیں اور جماعت اُن کے "ھتکنڈاسے" کا نشانہ

بنتی ہی رہتی ہے لیکن اب ''نئی نویلی'' تحریکِ انصاف کی بھی خیر نہیں۔ گزشتہ دنوں الطاف بھائی نے امیرِ جماعت اسلامی سید منّور حسن صاحب کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اور ایم کیو ایم نے سندھ اسمبلی میں جماعتِ اسلامی پر پابندی لگانے کا مطالبہ کر دیا۔ دَر جوابِ آں غزل ، جماعت اسلامی کے ترجمان نے کہا کہ الطاف حسین نے سید منور حسن کی بات کو سیاق و سباق سے الگ کرکے غلط رنگ دینے کی کوشش کی۔ ترجمان نے یہ بھی کہا '' لندن میں بیٹھ کر برطانوی حکومت کو خط لکھ کر پاکستان کی آئی ایس آئی کو نَتھ'' ڈالنے کے لیے تعاون پیش کرنے والے کِس مُنہ سے حب الوطنی کا دعویٰ کر رہے'' ہیں۔ ایم کیو ایم دہشت گردی اور بوری بند لاشوں کا کلچر پھیلانے والی جماعت ہے ۔ہم سمجھتے ہیں کہ دراصل الطاف بھائی کو غصّہ '' سکاٹ لینڈیارڈ'' پر ہے جس نے اُن'' کا جینا حرام کر رکھا ہے لیکن وہ نکال جماعت اسلامی اور تحریکِ انصاف پر رہے ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ قومی دھارے میں شامل دونوں جماعتیں محب وطن اور آئین کی عملداری پر مکمل یقین رکھتی ہیں البتہ ایم کیو ایم پر بہت سے الزامات لگتے رہے اور لگ رہے ہیں ۔جماعت اسلامی کے طالبانی کمیٹی کے رُکن پروفیسر ابراہیم بار بار یہ کہہ چکے ہیں کہ مذاکرات صرف پاکستانی آئین کے تحت ہی ہو سکتے ہیں اور امیرِ جماعت بھی پاکستانی آئین کے تحت ہی مذاکرات کے حامی ہیں۔ محترم عمران خاں صاحب تو مذاکرات سے تقریباً توبہ کر ہی چکے ہیں۔ اُنھوں نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ ہتھیار اٹھانے والے طالبان کے خلاف آپریشن

ہونا چاہیے البتہ جو مذاکرات کرنا چاہتے ہیں اُن کے ساتھ مذاکرات کیے جائیں ۔اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ طالبان کے خلاف آپریشن سے پہلے وہاں پر بسنے والے لاکھوں لوگوں کا مناسب بندوبست ہونا چاہیے ۔خاں صاحب کے اِس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی ذہنی طور پر طالبان کے خلاف آپریشن کے لیے تیار ہیں ۔اُدھر طالبان کے ترجمان شاہد اللہ شاہد بار بار کہہ رہے ہیں کہ وہ مذاکرات میں ڈیڈ لاک ختم کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن حکومت امن مذاکرات کے لیے سنجیدہ نہیں ہے ۔مذاکرات کی یہ ''دُہائی'' کبھی تمام پاکستانی محبِ وطن دینی اور سیاسی جماعتیں دیتی رہیں لیکن طالبان نے میں نہ مانوں'' کی رَٹ لگائے رکھی ۔وہ اگر کبھی مذاکرات کے لیے آمادہ بھی ہوئے تو'' ایسی کڑی شرائط کے ساتھ کہ جنھیں تسلیم کرنا حکومت کے بَس کا روگ نہیں تھا۔اب جب کہ ''تنگ آمد ، بجنگ آمد'' کے مصداق حکومت نے افواجِ پاکستان کو فری ہینڈ دے دیا ہے تو طالبان مذاکرات کی دہائی دے رہے ہیں ۔اب جبکہ طالبان کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے بھی بیزار ہو چکے ہیں تو مجموعی عوامی تاثر بھی طالبان کو یہ پیغام دیتا نظر آتا ہے کہ ''اب اُنھیں ڈھونڈ ، چراغِ رُخِ زیبا لے کر'' ۔ بعد از خرابیٔ بسیار ہی سہی لیکن ہم اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ طالبان ہمارے اپنے ہیں ، ہم نے اسی دھرتی پر اکٹھے رہنا ہے اور ہمارا جینا مرنا بھی سانجھا ہے اِس لیے مذاکرات میں ہی عافیت ہے البتہ جس طرح ٹیچر اصلاح کی خاطر کچھ شرارتی بچوں کے کان مروڑ کر اُنہیں سیدھا کرتا ہے اُسی طرح فلاح کی

راہ پانے کے لیے ایسے طالبان کو سیدھا کرنا ضروری ہے جو کسی بھی صورت مذاکرات کے لیے تیار نہیں۔ سچ کہہ گئے ہیں سیانے کہ ”لاتوں کے بھوت ، باتوں سے نہیں مانتے“۔

اب کہاں جائیں ہم

ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا کہ ہمارے گھر میں کوئی خفیہ فیکٹری لگی ہوئی ہے۔اِس راز سے پردہ تَب اُٹھا جب گیس کا 22 ہزار روپے کا بِل دیکھ کر ہمارے چودہ کیا سولہ طبق روشن ہوگئے۔ ہم عالمِ بَد حواسی میں بہت دیر تک بِل تکتے رہے پھر جب تھوڑا ہوش آیا تو بِل کا مطالعہ شروع کر دیا لیکن مجال ہے جو "کچھ" سمجھ میں آیا ہو۔بِل کو سمجھنے کی خاطر جب اپنے میاں کے پاس پہنچے تو مارے حیرت کے وہ بھی اُچھل پڑے لیکن پھر حسبِ عادت جلد ہی پُرسکون ہو گئے اور کہا، مجھے نہیں پتہ اِس میں کیا لکھا ہے،بَس ملازم کو بھیج کر بِل جمع کروا دو لیکن میں نے ضد کی کہ گیس کے محکمے کے پاس جا کر بِل ٹھیک کروا لائیں کیونکہ اتنا بِل آ ہی نہیں سکتا۔ میاں تو میری بات پر کان دھرنے کو تیار ہی نہیں تھے لیکن ہمارے اصرار و تکرار کے بعد اُنھوں نے اپنے مہربان ہوٹل والے شریف کو فون کرکے بُلا لیا۔شریف نے بھی ہمیں لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ تو گھر گھر کی کہانی ہے اور گیس کے بِل دیکھ کر ہر گھر میں کہرام بپا ہے۔لوگ دفتروں میں دھکے کھا رہے لیکن کوئی شنوائی نہیں اِس لیے بہتر یہی ہے کہ بِل جمع کروا دیا جائے لیکن ہماری ایک ہی ضد تھی کہ بِل میں گَڑبڑ ہے اِس لیے اِسے ٹھیک کروانا ہمارا آئینی و قانونی حق ہے۔ہم نے شریف کو کہا کہ یہ تو حکومت

ہی ''شریفوں'' کی ہے اِس لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے بِل ٹھیک کرواؤ۔ ہماری ضِد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے میرے میاں اور شریف دونوں گُلبرگ میں سوئی گیس کے ہیڈ آفس چلے گئے۔ ''مِرچ مصالحے'' کے بغیر ہیڈ آفس کی جو کہانی اُنھوں نے سُنائی، وہ کچھ یوں تھی کہ ہیڈ آفس کا مین گیٹ بند تھا اور باہر سڑک پر سینکڑوں کی تعداد میں مَرد اور عورتیں ''انٹری پاس'' کے لیے شہد کی مکھیوں کی طرح کھڑکیوں کے ساتھ چمٹے ہوئے بے بسی کی تصویر بنے نظر آتے تھے کیونکہ ''کمپلینٹ'' کا وقت صرف بارہ بجے تک تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ سوئی گیس کا ہیڈ آفس نہیں، وزیرِ اعظم ہاؤس ہو جہاں پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا۔ بعد از خرابیٔ بسیار جب وہ متعلقہ آفیسر کے پاس پہنچے تو اُس نے کوئی بات سُنے بغیر مُسکراتے ہوئے کہا کہ بِل فوراً جمع کروا دیں وگرنہ میٹر کَٹ جانے پر کم از کم اگلے چھ ماہ تک میٹر نہیں لگے گا۔ میرے میاں اُسی وقت بھاگم بھاگ بینک پہنچے اور بِل جمع کروا کر دَم لیا۔ وہ جب غصّے سے لال بھبھوکا گھر واپس آئے اور اُن کا غُصّہ دیکھ کر ہماری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدَن میں لہو نہیں۔

ہم چونکہ تھوڑے ضدی اور ہَٹ دھرم واقع ہوئے ہیں اِس لیے اپنے طور پر معاملے کی تہ تک پہنچنے میں جُٹ گئے۔ ہم پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ سوئی گیس کا محکمہ عوام کی چمڑی اُدھیڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ محکمے نے اپنی

کرپشن اور ''لاسِز'' چھپانے کے لیے انوکھا اور نرالا'' طریقۂ واردات'' نکالا ہے۔ خصوصی ہدایات کے تحت میٹر ریڈر سردیوں میں دو، دو ماہ تک ریڈنگ نہیں کرتے اور محکمہ تھوڑے تھوڑے بِل بھیجتا رہتا ہے۔ مقصد یہ کہ ریڈنگ کسی نہ کسی طرح ''Slab 3 '' تک پہنچ جائے جس کی قیمت 530 روپے فی MMBTU ہے جبکہ Slab وَن کے ریٹس 106 اور ٹو کے 212 روپے فی MMBTU ہیں۔ محکمہ اُسی وقت بِل جاری کرتا ہے جب ریڈنگ سلیب تین تک پہنچ جائے اور اِس طرح وہ پانچ گُنا زیادہ بِل وصول کر سکے۔ دوسرا طریقۂ واردات یہ ہے کہ بِل آخری تاریخ سے محض ایک دِن پہلے آتا ہے تاکہ خوف زدہ صارفین بھاگم بھاگ بِل جمع کروا دیں۔ اِس صریحاً بے ایمانی پر ''اَز خود نوٹس'' لینے والے پتہ نہیں کہاں جا سوئے ہیں۔ موجودہ حکومت، جو عوام کی اُمنگوں کا محور ہے اور ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اگر خُدانخواستہ یہ حکومت بھی ناکام ہو گئی تو پھر آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اِس کے کارپردازوں کو کیا یہ بھی پتہ نہیں کہ بھوکوں مرتے عوام کی بے بسی جب اپنی انتہاؤں کو چھونے لگتی ہے تو خونی انقلاب آتے ہیں۔ مسلمہ حقیقت بھی یہی ہے کہ

دیوانہ آدمی کو بناتی ہیں روٹیاں
خود ناچتی ہیں اور نچاتی ہیں روٹیاں

اور تاریخ کا سبق بھی یہی کہ ''فرزانے'' کبھی ''دیوانوں'' کے آگے ٹھہر نہیں

سکے۔ پیپلز پارٹی کے دَورِ حکومت میں خادمِ اعلیٰ میاں شہباز شریف اپنی تقریروں میں بار بار حبیب جالب کے اشعار پڑھتے اور حکمرانوں کو خونی انقلاب سے ڈراتے رہتے تھے لیکن شاید اب وہ بھی سب کچھ فراموش کرکے نئی دُنیائیں آباد کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں بھی طبقۂ اشرافیہ میں سے سمجھ لیا گیا ہو۔ عرض ہے کہ کسی گاؤں میں ایوب نامی ایک جولاہا رہتا تھا جس کی پہلے بھینس مری، پھر گائے، پھر بکری اور آخر میں اُس کی بیٹی بھی دارِ فانی سے کُوچ کر گئی۔ ایوب جولاہے نے آسمان کی طرف مُنہ کرکے کہا ''میرے مولا! لگتا ہے کہ آپ کے فرشتوں کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں ایوب جولاہا ہوں، ایوب نبی نہیں جو مجھے اتنی آزمائشوں میں ڈال دیا گیا ہے''۔ ہم بھی حکمرانوں کی خدمت میں یہی عرض کریں گے کہ وہ اِس غلط فہمی کو دور کرلے کہ قوم طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اُس پر اُتنا ہی بوجھ ڈالا جائے، جتنا کہ وہ برداشت کرسکے۔

ہمیں میاں برادران کے دِلی درد، صلاحیتوں اور پاکستان سے محبت پر آج بھی اعتماد ہے لیکن یہ ضرور کہے دیتے ہیں کہ اگر مہنگائی کی ماری قوم کا یہی حال رہا اور بد دل قوم نے یہ کہنا بند کر دیا کہ ''قدم بڑھاؤ نواز شریف، ہم تمہارے ساتھ ہیں'' تو پھر اُن کے سارے منصوبے دھڑام سے نیچے آن گریں گے، جس سے زیادہ بد قسمتی کی بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ مانا کہ اِس

وقت دہشت گردی کا عفریت حکمرانوں کو گھیرے ہوئے ہے لیکن قوم کی بد حالی اُس سے بھی بڑا عفریت ہے۔ دہشت گردی پر تو قابو پایا جا سکتا ہے اور جس خلوصِ نیت سے اکابرینِ حکومت اِس کام میں جتے ہوئے ہیں اُسے دیکھ کر یقین ہونے لگا ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے گا لیکن اگر ''مقہور'' قطار اندر قطار باہر نکل آئے تو اُنہیں قابو میں لانا نا ممکن ہو گا۔ ہمیں ادراک ہے کہ یہ مہنگائی موجودہ حکومت کی پیدا کردہ نہیں اسی ادراک کے ساتھ قوم جیسے تیسے زندگی گھسیٹ بھی رہی ہے لیکن جس طرح سے ''یوٹیلٹی بِلز'' میں صریحاً زیادتی کی جا رہی ہے وہ کسی بھی صورت میں قابلِ برداشت نہیں۔ غالباً حکمرانوں تک سڑکوں پہ نکلے عوام کا یہ احتجاج تو پہنچ ہی چکا ہو گا کہ سوئی گیس کے محکمے نے صریحاً زیادتی کرتے ہوئے ہزاروں روپے کے بِل بھیج کر لوگوں کے گھریلو بجٹ تہس نہس کر دیے ہیں۔ ابھی تو بہت تھوڑے لوگ سڑکوں پر نکلے ہیں لیکن کیا حکومت یہ چاہتی ہے کہ پوری قوم ہی سڑکوں پر نکل آئے؟۔ آخر میں اپنے، بالکل اپنے حکمرانوں کی خدمت میں یہ قومی نوحہ کہ

تُم رَکھ نہ سکے اپنی جفاؤں کا بھرم بھی
تُم نے میرا اُمید سے کم ساتھ دیا ہے
اے قافلے والو ! میری ہمت کو سراہو
ہر چند کہ زخمی ہیں قدم، ساتھ دیا ہے

طالبان کا اعلانِ جنگ بندی

پروفیسر مظہر۔۔۔۔ سرگوشیاں

حکم دیا گیا '' رَبّ کی رحمت سے مایوس نہ ہو''۔ مایوس ہم نہیں مگر اندر بیٹھا شک کا شیطان وسوسوں کے تانے بانے بُنتا چلا جا رہا ہے۔ قطار اندر قطار جنم لینے والے سوالات وسوسوں کی چلچلاتی دھوپ میں اذہان و قلوب کو جھلسا رہے ہیں اور اندیشوں کے سیاہ ناگ چہار سُو اپنے پھَن پھیلائے کھڑے ہیں۔ ایسے میں طالبان کا یکطرفہ اعلانِ جنگ بندی آشاؤں کی گھنی چھاؤں محسوس ہوتا ہے۔ اِس دل خوش کُن اعلان نے ایسے کئی سوالات کو جنم دے دیا ہے جنہوں نے پوری قوم کو بے چین و بیقرار کر دیا ہے۔ خُدا کرے کہ ہمارے یہ ''اندیشہ ہائے دُور و دراز'' سرے سے غلط اور بے بنیاد ہوں اور طالبان کے اِس اعلان کے بعد وطنِ عزیز میں امن و سکون کی فاختائیں ڈیرہ جما لیں۔ ایسا ہونا ممکنات میں سے ہے، شرط مگر یہ کہ نیتوں میں فتور نہ ہو۔ ذہنی خلجان کا سبب بننے والے سوالات یہ ہیں کہ کیا طالبان کے تمام گروہ اِس جنگ بندی پر عمل کریں گے؟۔ کیا طالبان نے آئینِ پاکستان کو مان لیا ہے؟۔ کیا نفاذِ شریعت کا مطالبہ ختم ہو گیا ہے؟۔ کیا طالبان قیدیوں کی رہائی سے پیچھے ہٹ گئے؟۔

اور کیا طالبان واقعی ہتھیار پھینک کر مذاکرات کے لیے آمادہ ہو گئے ؟۔
یہ تو طے ہے کہ طالبان کے تمام گروہ اس جنگ بندی پر ہر گز عمل نہیں کریں گے ۔ وجہ یہ کہ حکومت ، طالبان کے حامی علمائے اکرام اور تمام مذہبی و سیاسی جماعتیں متفق ہیں کہ طالبان کے بہت سے گروہ بیرونی طاقتوں کے ہاتھوں کے ایسے کھلونے ہیں جن کا کام ہی پاکستان میں افراتفری پیدا کرنا ہے۔یہ دہشت گرد مذاکرات کے حامی طالبان کے زیرِ اثر بھی نہیں۔اِس لیے فوری طور پر دہشت گردی کی کارروائیوں کا خاتمہ ممکن نہیں البتہ اِن میں کمی ضرور ہو سکتی ہے ۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دورانِ مذاکرات یہ فیصلہ کون کرے گا کہ دہشت گردی کی کارروائیاں مذاکرات کے حامی طالبان کی طرف سے ہو رہی ہیں یا دہشت گردوں کی طرف سے ؟۔کیا دہشت گردی کی کسی بھی کارروائی کے بعد شکوک و شبہات جنم نہیں لیں گے ؟۔ حکومت نے تو واضح اعلان کر دیا ہے کہ جہاں بھی حملہ ہوا وہاں جواب دیا جائے گا اسی لیے طالبان کے یک طرفہ اعلان کے باوجود خیبر ایجنسی میں گن شپ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے فضائی کارروائی کرکے ''ملا تماچی'' کے ٹھکانوں کو تباہ کیا گیا۔دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا طالبان نے آئینِ پاکستان کو تسلیم اور نفاذِ شریعت کا مطالبہ ختم کر دیا؟۔ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا اور نہ طالبان کی طرف سے کی گئی جنگ بندی کا اعلان غیر مشروط ہے ۔طالبان کے ترجمان شاہد اللہ شاہد نے واضح طور پر کہا ہے کہ اُن

کی مذاکراتی کمیٹی نے حکومت کو جو تجاویز دی تھیں، اُن کا مثبت جواب دیا گیا اور عمل درآمد کی یقین دہانی کروائی گئی اسی لیے جنگ بندی کی گئی۔ یہ امر اب صیغۂ راز میں نہیں کہ حکومت اور طالبان کی مذاکراتی کمیٹیوں کے وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد کے ساتھ خفیہ اجلاس ہوتے رہے اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہی مولانا سمیع الحق نے یہ اعلان کیا کہ دو، تین دِن کے اندر قوم کو خوش خبری ملے گی۔ مذاکرات میں "ڈیڈ لاک" پیدا ہونے سے پہلے طالبانی شرائط یہ تھیں کہ طالبان کے ریاستی اداروں کی قید میں طالبان کے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو رہا کیا جائے، جنوبی وزیرستان سے فوج نکالی جائے اور شریعت کا نفاذ کیا جائے حکومت اور ایجنسیاں پہلے ہی یہ اعلان کر چکی ہیں کہ اُن کی قید میں کوئی بچہ، بوڑھا یا عورت نہیں اِس لیے طالبان کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا جا سکتا۔ وزیرستان سے فوج نکالنے کی گنجائش اِس لیے نہیں کہ طالبان خود یہ اقرار کرتے ہیں کہ کچھ طالبانی گروہ اُن کے دائرۂ اختیار میں نہیں اور وہ اپنی مَن مانیاں کرتے ہیں۔ ایسے دہشت گرد گروہوں کی سَرکوبی کرنے کے لیے فوج کا وزیرستان میں رہنا ضروری ہے اور درپیش صورتِ حال میں حکومت اپنی حکمت عملی تبدیل نہیں کر سکتی۔ نفاذِ شریعت کا اعلان آئینِ پاکستان کے ساتھ منسلک ہے اور سوائے طالبان کے سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا آئین ایک مکمل اسلامی آئین ہے بشرطیکہ اِس کا مکمل نفاذ کر دیا جائے۔ جبکہ طالبان ہمارے آئین کو مکمل اسلامی آئین ماننے کے لیے سرے

سے تیار ہی نہیں۔اِس لیے کہا جا سکتا کہ نہ تو طالبان نے غیر مشروط جنگ بندی کا اعلان کیا ہے اور نہ ہی مذاکرات کی بیل منڈھے چڑھتی نظر آتی ہے کیونکہ طالبان اپنی شرائط پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں اور حکومت کے لیے اِن شرائط پر عمل درآمد ممکن نہیں۔ حیرت یہ ہوتی ہے کہ طالبان نے جب بھی صلح جوئی کی بات کی شُہداء کی لاشوں پر کھڑے ہو کر کی۔یکم مارچ کو خیبر ایجنسی میں پولیو ورکرز کی حفاظت پر مامور بارہ خاصا داروں کو شہید کرکے جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔اِس سے پہلے 23 ایف سی اہلکاروں کے گلے کاٹ کر جنگ بندی پر آمادگی کا اظہار کیا۔اِس اعلانِ جنگ بندی کے بعد مولانا سمیع الحق صاحب کہتے ہیں کہ حکومت مثبت کردار ادا کرے۔عرض ہے کہ حکومت نے تو ہمیشہ مثبت کردار ہی ادا کیا ہے اور بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب کی شدید ترین خواہش بھی یہی ہے کہ معاملات کشت و خون کی بجائے مذاکرات کے ذریعے حل کیے جائیں۔یہی وجہ ہے کہ وزیرِ اعظم صاحب نے طالبان کے جنگ بندی کے اعلان کے فوراً بعد چیف آف آرمی سٹاف کو حملے روکنے کے لیے کہا اور وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد نے طالبان کے خلاف فضائی کارروائیاں روکنے کا اعلان بھی کر دیا۔یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ تمام مذہبی و سیاسی جماعتیں مذاکرات ہی کی حامی تھیں لیکن طالبان کی پُر تشدد کارروائیوں کے بعد تحریکِ

انصاف سمیت تمام جماعتیں ذہنی طور پر طالبان کے خلاف ایکشن کے لیے تیار ہو گئیں لیکن طالبان نے اچانک جنگ بندی کا اعلان کرکے دھماکہ کر دیا۔اب جب کہ طالبان نے یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کیا ہے تو سوائے ایم کیو ایم کے سبھی جماعتوں نے بیک زبان اِس جنگ بندی کا خیر مقدم کیا ہے۔ ایم کیو ایم کی منطق چونکہ ہمیشہ انوکھی اور نرالی ہوتی ہے۔اِسی نرالی منطق کے تحت ایم کیو ایم کے جنابِ فاروق ستار کہتے ہیں کہ طالبان کے جنگ بندی کے اعلان پر وہ افسردہ ہیں اور کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ۔اُنہیں یہ بھی دُکھ ہے کہ حکومت نے اُنہیں اندھیرے میں رکھا کیونکہ اُن کے خیال میں حکومتی کمیٹی نمائشی تھی اور سبھی فیصلے کمیٹی سے بالا بالا ہو رہے تھے۔ایم کیو ایم کا نقطۂ نظر تو تبھی سامنے آئے گا جب اُس کے قائد الطاف حسین صاحب کوئی بیان دیں گے البتہ مولانا فضل الرحمن صاحب نے اسے طالبان کا مدبرانہ فیصلہ قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ حکومت فوری طور پر اے پی سی بلائے۔دراصل مولانا صاحب کا المیہ یہ ہے کہ مذاکرات کے حامی اور فعال کردار ادا کرنے والے مولانا سمیع الحق کے مولانا شدید مخالف ہیں اور محترم عمران خاں صاحب بھی اُنہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔اِس لیے مولانا صاحب کی شدید خواہش ہے کہ یہ دونوں اصحاب پیچھے ہٹ جائیں اور مولانا صاحب فعال کردار ادا کرکے یہ تمغہ اپنے گلے کی زینت بنا لیں۔ مولانا صاحب کی اِس خواہش کا احترام بجا، سوال مگر یہ ہے کہ کیا طالبان اُن کا اُسی حد تک احترام کرتے ہیں جس حد تک

کہ مولانا سمیع الحق کا؟۔ اور کیا یہ مناسب ہوگا کہ جب تمام تر اندیشوں اور وسوسوں کے باوجود مذاکراتی عمل کے شروع ہونے کے کچھ امکانات نظر آنے لگے ہیں تو مولانا اپنی سیاسی چالوں سے اُس روزن کو ہی بند کردیں جہاں سے اُمید کی ہلکی ہلکی کرنیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔

سانحات پر بھی سیاست

سیاست ، صرف سیاست ۔۔۔ سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں ۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گھٹی میں پڑی سیاست ہمارے اکابرین کو ہر دَم بے کَل و بے چین رکھتی ہے اور وہ انتظار میں رہتے ہیں کہ اُنہیں کب ایسا موقع ملے جس پر وہ اپنی سیاست بگھار سکیں۔زندہ قومیں ابتلاء میں بتلاء اور وقفِ مصیبت ہوتی لیکن اپنے اتحاد و یگانگت اور عزمِ صمیم کی بدولت مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے کامران بھی ہوتی ہیں ۔جنگِ عظیم دوم کے جرمنی اور جاپان کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں ۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ قومیں صدیوں تک بھی اُبھر سکیں گی لیکن آج وہ ایک دفعہ پھر دُنیا پہ چھائی ہوئی ہیں لیکن ہمارے ہاں تو ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کا نام ہی سیاست ہے ۔رجوع اللہ کی طرف بھی نہیں کہ ہم نے تو کئی چھوٹے چھوٹے خُدا بنا رکھے ہیں ۔ کوئی نہیں کہتا ''اے مالک ! ہم پر سخت حکم نہ بھیج ، جو ہم سے پہلے لوگوں پر بھیجے گئے ۔اے پروردگار ! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو ہم برداشت نہ کر سکیں ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر ، ہم سے دَر گزر فرما ، ہم پر رحم فرما ، تُو ہی ہمارا مولا ہے ''۔ سبھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے جنوں میں بتلاء ہیں ۔

اسلام آباد کچہری پر خود کُش حملہ اور فائرنگ ہوئی۔ایک سیشن جج، خاتون وکیل سمیت پانچ وکلاء اور اوپن یونیورسٹی کے ڈائریکٹر سمیت گیارہ افراد لُقمۂ اجل بنے۔لواحقین کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی اور ہمیں اپنی سیاست کو صیقل کرنے کا موقع۔جب سے یہ مَوجِ خوں سَروں سے گزری ہے، الیکٹرانک میڈیا سمیت چہار سُو حکمرانوں کو نشانہ تضحیک و تنقید بنایا جارہا ہے اور حکمرانوں کے بھی وہی گھسے پِٹے جملے کہ تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دے دی گئی، چوبیس گھنٹے میں رپورٹ طلب کر لی گئی، ذمہ داروں کو نشانِ عبرت بنا دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ سیاست دانوں کے ''باجماعت'' مذمتی بیانات جنہیں سُن سُن کر کان پَک چکے ہیں۔ایسا ہم عشروں سے سُنتے چلے آرہے ہیں اور تادَمِ زیست سُنتے ہی رہیں گے لیکن ''اے بَسا آرزو کہ خاک شُدی''، دہشت گردوں کو نشانِ عبرت بننے کی آرزو کے انتظار میں آنکھیں پتھرا جائیں گی۔یہ ہم اِس لیے کہہ رہے ہیں کہ صرف کہنے کی حد تک تو قوم ایک صفحے پر ہے لیکن میدانِ عمل میں بکھری ہوئی۔ سبھی جانتے ہیں کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں اور جنگ بھی ایسی کہ جس میں مقابلہ کھُلے نہیں چھُپے بُزدل دشمن سے ہے جو کہیں بھی اور کسی کو بھی نشانہ بنا سکتا ہے۔اِس ادراک کے باوجود بھی طنز کے تیر اور تنقید کے نشتر۔الیکٹرانک میڈیا کی چاندی ہو گئی، ریٹنگ آسمانوں کو چھونے لگی اور مرد و خواتین اینکرز اپنی دوکانیں سجا کر بیٹھ رہے۔پارلیمنٹ میں وہ بھی بول اُٹھے جنہیں بولنے کا ڈھنگ ہے نہ سلیقہ۔نشانہ صرف حکومت اور حکومتی

وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد۔ سبھی کی ایک ہی رَٹ کہ وزیرِ داخلہ نے چند روز پہلے اپنی پریس کانفرنس میں یہ کیوں کہا کہ اسلام آباد مکمل طور پر محفوظ ہے، ریپڈ ایکشن فورس کہاں گئی ؟اور 26 انٹیلی جنس ایجنسیاں کِس مرض کی دوا ہیں ؟۔ چوہدری صاحب کا بھی گھڑا گھڑایا جواب کہ سابقہ ادوار میں اِس سے بھی زیادہ خوفناک سانحے ہوتے رہے ہیں لیکن وہ ایک لفظ نہیں بولے اور اب بھی اُنہوں نے سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں ہونے والے سانحات پر صوبائی حکومتوں پر تنقید نہیں کی۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جب اُنہوں نے تنقید نہیں کی تو اُن پر نشتر زنی کیوں ؟۔اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ حکومت دہشت گردوں کا آخری سانس تک تعاقب جاری رکھے گی اور پوری قوم بہادری کے ساتھ دہشت گردوں کے سامنے سینہ سَپر رہے گی۔ عرض ہے کہ قوم تو عشروں سے دہشت گردوں کے خلاف سینہ سپر ہے ہی، یہی وجہ ہے کہ بم دھماکوں اور خود کش حملوں کے باوجود قوم کے معمولاتِ زندگی میں رائی کے دانے کے برابر بھی فرق نہیں آیا۔سب کچھ ویسا ہی ہے، وہی میلے ٹھیلے اور وہی شاہد آفریدی کے دو چھکوں پر ساری رات ڈھول ڈھمکے اور جشن لیکن حکمران ابھی تک گومگو کی کیفیت سے باہر نہیں نکلے اور اب تو اپوزیشن کو بھی یہ کہنے کا موقع ہاتھ آ گیا ہے کہ حکمران بُزدلی دکھا رہے ہیں۔

اسلام آباد میں دہشت گردی کے خوفناک واقعے کے بعد ہمارے حکمران بھی یہ

سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ کہیں یہ سب کچھ طالبان کا ہی تو کیا دھرا نہیں ؟۔اور کہیں ایسا تو نہیں کہ ''احرار الہند'' نامی گروہ بھی طالبان ہی کا حصّہ ہو ؟۔وزیرِ دفاع خواجہ محمد آصف نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ اُنہیں طالبان کے اعلانِ لا تعلّقی پر یقین نہیں اور یہ بات سو فیصدی تسلیم شُدہ ہے کہ اسلام آباد پر حملے کے حوالے سے طالبان کو علم ہو گا کہ یہ کِس گروہ نے کیا ہے کیونکہ اِن سب کا ''مین حَب'' شمالی وزیرستان ہے ۔اِس لیے طالبان نہ صرف حملے کی مذمت کریں بلکہ اِس گروہ کی نشاندہی بھی کریں ۔اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ایسے حملے بند نہیں ہوتے تو حکومت کے پاس آپریشن کا آپشن موجود ہے ۔
چوہدری نثار احمد نے بھی پارلیمنٹ میں پالیسی بیان دیتے ہوئے فرمایا ''طالبان کی طرف سے دہشت گردی کے واقعات سے اعلانِ لاتعلّقی کافی نہیں ۔اُنہیں ایسے لوگوں کی مذمت بھی کرنی ہو گی اور نشاندہی بھی ''۔جبکہ طالبان کے ترجمان شاہد اللہ شاہد نے صاف کہہ دیا کہ پس پردہ ہاتھوں کو تلاش کرنا ہمارا کام نہیں اور اگر جنگ بندی کے اعلان کے دوران کوئی بھی پُر تشدد واقعہ رونما ہوا تو اُن کا اِس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا ۔حکومتی وسوسوں (جنہیں وسوسے کہنا شاید اِس لیے مناسب نہ ہو گا کہ حکومتیں ہمیشہ اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی اطلاعات کی بنیاد پر ہی کوئی بیان جاری کرتی ہیں) اور طالبان کے کھَرے جواب نے مذاکرات کی کامیابی کو مشکوک بنا دیا ہے اور ایک دفعہ پھر یہ اندیشے سَر اُبھارنے لگے ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ طالبان نے اپنی

صفیں درست کرنے کے لیے ایک ماہ کی مہلت حاصل کرنے کا ڈرامہ رچایا ہو۔

مجھے نواز لیگ سے کچھ لینا دینا نہیں اور نہ میں حاکمانِ وقت کی مدح سرائی کی لعنت میں گرفتار ہوں۔ میں نے تو ہمیشہ ''ہلکے پھُلکے'' کالم لکھنے کو ترجیح دی ہے کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ اِس دَورِ ابتلاء میں اگر میرے کالم کسی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکان کا سبب بھی بَن سکیں تو یہ عین عبادت ہو گی لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کَرب کی لہریں پورے وجود کا گھیراؤ کرکے سارا مزاح ہوا میں اُڑا دیتی ہیں۔ سانحات اور بھی بہت سے گزرے لیکن ہم نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اب نہ جانے کیوں مجھے خاک و خون میں لَت پَت فضہ نامی وہ تیئیس سالہ معصوم بچی گھیرے کھڑی ہے جو بیرونی ملک سے تازہ تازہ لاء کی ڈگری لے کر لوٹی اور اسلام آباد کچہری میں درندوں کی وحشت کا نشانہ بَن گئی۔ احرار الہند نامی گروہ کے خون آشام وحشی درندے جو تحقیق کہ یزیدیت کے علمبردار ہیں، کِس نفاذِ شریعت کی بات کرتے ہیں؟۔ میرے آقا ﷺ کی شریعت میں تو صرف پیار ہی پیار ہے۔ آپ ﷺ تو عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے اور آپ ﷺ کا دِل تو جانوروں اور پرندوں پر ظلم ہوتے دیکھ کر بھی تڑپ اُٹھتا تھا ۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لعین گروہ شریعتِ محمدی ﷺ کا علمبردار ہے البتہ یہ ضرور کہ لازیٔ انسانیت سے تہی ابلیس مَردود کے یہ ساتھی انسانیت کے کھلے دشمن ہیں جن کو نیست و نابود کرنا اور ارضِ وطن کو

اُن کے غلیظ وجود سے پاک کرنا ہر مسلمان کا فرضِ عین ہے۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب ہم سب سیاست تیاگ کر بِلا امتیاز دھرتی ماں کا حق ادا کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ کہے دیتی ہوں کہ وہ قومیں برباد ہو جاتی ہیں جو قومی سلامتی کے معاملات پر بھی سر جوڑ کر نہیں بیٹھتیں۔

ہمت نہ ہارنا

پیپلز پارٹی کے سینیٹر رحمٰن ملک نے کہا ''طالبان کے تمام گروپوں کی نانی ایک ہی ہے ۔مذاکرات کے لیے حکومت کی نیت سو فیصد صاف اور طالبان سو فیصد بَدنیت ہیں ''۔ سچ کہا ہے اپنے رحمٰن ملک سیالکوٹی نے کیونکہ کھرے کھوٹے کی پہچان بھلا ملک صاحب سے زیادہ کِس کو ہے ۔ بھٹو مرحوم کی پھانسی پر چوہدریوں کے محل میں مٹھائیوں کے ٹوکرے لے جانے والے ملک صاحب کو پیپلز پارٹی کے دوبارہ بَر سرِ اقتدار آتے ہی ادراک ہو گیا کہ ''کھَری'' صرف پیپلز پارٹی ہی ہے ، باقی سب ''کھوٹے'' ہیں ۔اِس سے پہلے ضیاء الحق مرحوم نے پیپلز پارٹی کو ''رگڑا'' ہی اتنا دیا تھا کہ ملک صاحب نے مٹھائیاں بانٹنے ہی میں عافیت جانی کیونکہ اُس وقت تو بڑے بڑے بزرجمہروں کا بھی پیپلز پارٹی کے بارے میں یہی خیال تھا کہ

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

لیکن ضیاء الحق مرحوم نے پیپلز پارٹی کو جتنا دبایا وہ اُتنی ہی اُبھری اور ملک صاحب بھی پھُدک کر ''اپنی جماعت'' میں آ گئے ۔اب وہ نواز لیگ کے بارے

میں ''میٹھی میٹھی'' باتیں کر رہے ہیں اور اُنہیں نواز لیگ کی نیت بھی سو فیصد صاف نظر آنے لگی ہے اِس لیے ہمیں کچھ شَک سا ہونے لگا ہے کہیں ملک صاحب کا اگلا ٹارگٹ نواز لیگ ہی نہ ہو کیونکہ ہواؤں کا رُخ پہچاننے والے ملک صاحب کی ''آنیاں، جانیاں'' ہمیشہ باکمال ہوتی ہیں۔ ویسے ہم اکابرینِ نواز لیگ کو یہ ''مُفت مشورہ'' دیں گے کہ اگر ایم کیو ایم کی زباں بندی مقصود ہو تو ملک صاحب کی خدمات حاصل کر لیں کیونکہ صرف اُنہی کی ''گیدڑ سنگھی'' سے ایم کیو ایم مدہوش ہوتی ہے۔

ملک صاحب نے یہ بھی بالکل بجا کہا کہ طالبان کی ''نانی'' ایک ہی ہے لیکن یہاں وہ تھوڑی ''ڈنڈی'' مار گئے ہیں کیونکہ صرف طالبان ہی نہیں بلکہ ساری اشرافیہ اور سارے صاحبانِ جاہ و حشم کی نانی بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ یہ نانیاں، دادیاں تو ہم جیسوں کی ''وَکھو، وَکھ'' ہوتی ہیں جن سے ہم بچپن میں جنوں بھوتوں کی کہانیاں سُننے کا کام لیتے ہیں لیکن صاحبانِ اقتدار چونکہ خود ''جِن بھوت'' ہوتے ہیں اِس لیے وہ ایک ہی ''نانی'' پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ نانی بھی ایسی ''کائیاں'' کہ سب کچھ اپنے نواسوں کے مُنہ میں ہی ٹھونستی رہتی ہے۔ کوئی بھوکوں مرتا ہے تو مَرے، اِن کی بَلا سے۔ تھَرپارکر میں پچھلے تین ماہ میں 126 بچوں نے بھوک کے ہاتھوں بِلک بِلک کے

جان دے دی لیکن ہمارے حاکموں نے سندھی ثقافت اجاگر کرنے کے لیے 3 ارب روپے پھونک ڈالے۔ سندھ کے وزیرِ خوراک کہتے ہیں کہ اُنھوں نے تو گندم مہیا کر دی لیکن اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ خود جا کر گندم تقسیم کرتے پھریں۔ بجا کہا وزیرِ خوراک نے کیونکہ وہ حضرت عمرؓ تو ہیں نہیں کہ امیر المومنین ہونے کے باوجود اپنے کندھے پر اناج کی بوری اُٹھائے بیوہ عورت کے گھر کی طرف رواں دواں ہوں۔ غلام نے کہا کہ اناج کی بوری مجھے دے دیجئے''۔ تب فاروقِ اعظمؓ نے یہ تاریخی جملہ کہا ''کیا روزِ قیامت میرے گناہوں کا بوجھ بھی تم اُٹھاؤ گے''؟۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر بلاول زرداری کہتے تو یہی وزیرِ خوراک کندھے پر گندم اُٹھائے ننگے پاؤں بلاول کے محل کی طرف دوڑ اُٹھتے۔ ہمارے انتہائی محترم چیف جسٹس سپریم کورٹ تصدق حسین جیلانی نے سابق چیف جسٹس محترم افتخار محمد چوہدری صاحب کے خط پر از خود نوٹس لے لیا ہے ۔ اگر افتخار محمد چوہدری صاحب ریٹائر نہ ہو گئے ہوتے تو اُنھوں نے بہت پہلے دھماکہ'' کر دینا تھا لیکن اب تو اُن کے دَورِ منور کی صرف یادیں ہی باقی رہ گئی'' ہیں۔ ملک ریاض صاحب نے بھی تھر کے قحط زدگان کے لیے 20 کروڑ روپے دینے کا نہ صرف اعلان کر دیا بلکہ اُن کا ذاتی طیارہ اور ہیلی کاپٹر ڈاکٹروں، نرسوں کی ٹیم لے کر تھر پہنچ بھی گیا۔ اُنھوں نے تھر کے قحط زدگان کے لیے ''بحریہ دستر خوان'' قائم کرنے کا اعلان بھی کیا ہے

رحمٰن ملک صاحب نے تو کہہ دیا کہ سارے طالبان کی نانی ایک ہی ہے لیکن ہمارے وزیرِ داخلہ نے سابقہ وزیرِ داخلہ کے بیان کی تردید اپنا فرضِ عین سمجھتے ہوئے یہ فرمایا کہ طالبان کی اکثریت ملک دُشمن نہیں بلکہ محبِّ وطن اور امن کی خواہاں ہے۔ وزیرِ داخلہ کے اِس بیان کا قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید صاحب نے بہت بُرا منایا حالانکہ وہ نواز لیگ کی باتوں کا کم کم ہی بُرا مناتے ہیں۔ خود حکومتی حلقوں میں بھی اِس معاملے میں بہت بے چینی پائی جاتی ہے۔ ہمارے وزیرِ دفاع خواجہ محمد آصف نے تو اپنے سیالکوٹی بھائی رحمٰن ملک کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر طالبان نے جنگ بندی کرنی ہے تو مکمل ہونی چاہیے۔ جنگ بندی کی خلاف ورزی پر آپریشن ہو سکتا ہے جس میں کئی ماہ نہیں لگیں گے۔ مارچ کے مہینے میں ہی مارچ کرنا پڑے گا، اب حملہ ہوا تو اُسی زبان میں جواب دیا جائے گا، طالبان کا یہ جواز قبول نہیں کر سکتے کہ کوئی اور گروپ حملے کر رہا ہے"۔ اُن کے خیال میں صورتِ حال اتنی خوفناک ہے کہ وہ اِس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتے۔ گویا خواجہ آصف صاحب کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ سارے طالبان کی نانی ایک ہی ہے اِس لیے اگر مکمل جنگ بندی نہ ہوئی تو "مکمل آپریشن" ضرور ہو گا اور عنقریب ہو گا۔ اب پتہ نہیں وزیرِ داخلہ سچ کہتے ہیں یا وزیرِ دفاع لیکن اتنا اندازہ تو ہو گیا کہ خود اکابرینِ حکومت بھی ایک صفحے پر نہیں۔ جب حکومتی حلقوں کا یہ حال ہے تو پھر دیگر سیاسی جماعتوں نے کیا خاک ایک صفحے

پر ہونا ہے۔

دوسری طرف وزیرِ اعظم میاں محمد نواز شریف صاحب کی شدید ترین خواہش ہے کہ آپریشن کی نوبت نہ آئے۔شاید اسی بنا پر طالبان سے مذاکرات کا دوبارہ ڈول ڈالا گیا ہے۔شنید ہے کہ اب کی بار طالبان سے براہِ راست خفیہ مذاکرات کیے جائیں گے اور فوج بھی مذاکراتی عمل کا حصّہ ہو گی۔ہمارے ہاں یہ رواج سا ہوگیا ہے کہ جہاں کہیں فوج کا ذکر آئے، سیاسی جماعتیں اپنی سیاست ''بگھارنا'' شروع کر دیتی ہیں۔سیّد خورشید شاہ کہتے ہیں کہ فوج کو مذاکرات میں شامل کرنا انتہائی خطرناک ہو گا۔غلام احمد بلور کہتے ہیں کہ فوج کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا تو مارشل لاء لگ جائے گا۔چوہدری شجاعت حسین بھی مذاکراتی عمل میں فوج کی شرکت کے شدید مخالف ہیں اور مولانا فضل الرحمٰن توآجکل اپنے آپ سے بھی روٹھے ہوئے ہیں۔سوال مگر یہ ہے کہ کیا یہ فوج ہماری اپنی نہیں ؟۔کیا دہشت گردی کے خلاف جنگ میں سب سے زیادہ قُربانیاں فوج ہی نے نہیں دیں ؟۔کیا طالبانی گروہوں کے بارے میں سب سے زیادہ با خبر افواجِ پاکستان نہیں ؟۔اور کیا یہ بھارتی فوج ہے جس کی شمولیت سے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں۔یہ تو طے ہے کہ مذاکراتی عمل میں فوج کی شرکت یا عدم شرکت، ہر دو صورتوں میں اگر مذاکراتی عمل ناکام ہوتا ہے تو پھر بھرپور آپریشن ہی آخری حل ہے۔اِس لیے مذاکراتی عمل میں فوج کی شرکت سے کون سے ''خطرناک

نتائج'' نکل سکتے ہیں اور کس مارشل لاء کا خطرہ ہے؟۔ حقیقت یہ ہے کہ ملکی حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میاں صاحب یہ چاہتے ہیں کہ وہ یک سو ہو کر توانائی کے بحران کی طرف توجہ دیں۔اُنھوں نے خود کہا کہ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے سکیورٹی ٹھیک کریں یا توانائی کا بحران''۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ تمام تر تفتیش کے باوجود میاں صاحب کا عزم جواں ہے۔اُنھوں نے کہا ''ہمت نہیں ہاریں گے، چیلنجز کا مقابلہ کریں گے''۔اگر ہمارے ''محبِّ وطن'' سیاست دان اپنا اپنا راگ الاپنا بند کر کے ملکی سلامتی کی خاطر حکومت کے دست و بازو بننا پسند فرمائیں تو ناممکن کچھ بھی نہیں۔

انساں کو ایسا کبھی خونخوار نہ دیکھا

سمجھا دیا گیا کہ ''دُنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاعِ قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں'' (القرآن)۔ فرما دیا میرے نبی ﷺ نے ''جو دُنیا سے محبت کرے گا وہ اُسے دھوکا دے گی، جو اس کی اطاعت کرے گا وہ اسے گمراہ کرے گی، جو اِس کا حلقہ بگوش ہو گا وہ اُس پر ستم ڈھائے گی۔ مبارک باد کے قابل ہے وہ شخص جو اِس سے الگ رہا اور تباہ ہوا وہ جو اُس کی طرف جھک گیا''۔ لیکن حبِّ دنیا میں مگن ہمارے حکمران تو ربِّ کردگار کا یہ فیصلہ بھی بھول گئے کہ حقوق العباد میں کوتاہی پر معافی کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں، نہ اُنہیں میرے آقا ﷺ کا یہ فرمان یاد رہا کہ ''تم میں سے ہر ایک راعی ہے جس سے روزِ قیامت اُس کے ریوڑ کا حساب لیا جائے گا''۔

عین اُس وقت جب وزیرِ اعظم میاں نواز شریف اور جنابِ آصف زرداری باہوں میں باہیں ڈالے تھر کول پراجیکٹ کا افتتاح کرکے قوم کو نئی دنیائیں سجانے کی نوید سنا رہے تھے، اُسی ''تھر'' میں ماؤں کی گودوں کے شیر خوار بھوک کے ہاتھوں سسک سسک کر دم توڑ رہے تھے۔ عین اُس وقت جب پیپلز پارٹی کے شہزادے بلاول زرداری کی خواہش اور ضد پر سندھی ثقافت کو اجاگر کرنے کے لیے عدیم

المثال سندھ فیسٹیول پر پانچ ارب روپے صرف کیے جا رہے تھے، تھر کے بیمار دواؤں کی عدم فراہمی پر تِل تِل مَر رہے تھے۔ عین اُس وقت جب تھر پار کر کے بے کس و بے بس اور مجبور و مقہور عوام حصولِ رزق کی تلاش میں صحرا کے سرابوں میں سرگرداں تھے سندھ کے گوداموں میں پڑی گندم کی 47 ہزار بوریاں گَل سڑ رہی تھیں۔ عین اُس، وقت جب نواز لیگ کے ''وارثِ اعلیٰ'' گینیز بُک آف ورلڈ کے ریکارڈ میں نام لکھوانے کے شوق میں کروڑوں، اربوں پھونک رہے تھے، ''مِٹھی'' کی ماؤں کی سونی گودیں دہائی دے رہی تھیں کہ

اِس دَورِ منّور میں سرِ ارض ہے جیسا
انسان کو ایسا کبھی خونخوار نہ دیکھا

یہ ایک دِن کا قصہ ہے نہ کسی ناگہانی آفت کا شاخسانہ۔ یہ سب کچھ تو گزشتہ چار ماہ سے حکمرانوں کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا، یہ الگ بات ہے کہ حکمرانوں کی آنکھوں پہ چڑھی ثروت و نخوت اور جاہ و حشم کی چربی نے اُنہیں ایسا ''کور چشم'' بنا دیا کہ اُنہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ یہ کور چشمی شاید برقرار ہی رہتی اگر الیکٹرانک میڈیا میں شور نہ مچ جاتا۔ یہ الیکٹرانک میڈیا بھی بڑی خاصے کی شے ہے۔اِس کا اپنا یہ حال ہے کہ

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آج چیخنے ''چنگھاڑنے'' والا الیکٹرانک میڈیا چار ماہ تک کہاں سویا رہا ؟۔ کیا تیز و طرار میڈیا کے کانوں تک یہ خبر نہیں پہنچی ہو گی کہ '' موروں کا مسکن'' اب موت کے مسکن میں ڈھل چکا ہے ؟۔ پتہ میڈیا کو سب تھا لیکن سوال ''ریٹنگ'' کا آن پڑا کہ جس خبر کی ریٹنگ زیادہ ہو گی وہی میڈیا کے مَن کو بھائے گی ۔ پہلے طالبان ، اینٹی طالبان کی بریکنگ نیوز جاری تھیں ، نت نئے انکشافات ہو رہے تھے اور الیکٹرانک میڈیا کی دوکانداری خوب چمک رہی تھی ۔ اب ''مذاکرات کی اُمید'' پر معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑا تو ہمارے بے باک میڈیا کو تھرپارکر یاد آ گیا ۔ اب جس نیوز چینل کو دیکھو وہیں تھرپارکر کا نوحہ جاری ہے ۔ بس دو چار دنوں کی بات ہے ، جب میڈیا کے ہاتھ کوئی ہلچل مچا دینے والا موضوع لگ گیا تو پھر کہاں کا تھرپارکر اور کونسا تھرپارکر ؟۔ پھر بھی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا شکریہ کہ اُس نے دیر سے سہی لیکن فراعینِ وقت کو جھنجھوڑا تو ۔

سندھ حکومت نے اپنوں کو نوازنے کے لیے ریلیف ، بحالیات اور پراونشل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی جیسے تین تین محکمے بنا رکھے ہیں ۔ ایک وفاقی حکومت کا ادارہ نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی بھی ہے جس کا صوبوں کے ساتھ مکمل رابطہ ہوتا ہے ۔ ہر سال اِن اداروں کے لیے اربوں روپے کو بجٹ مختص کیا جاتا ہے ۔ اِن

اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلسل مانیٹرنگ کرکے حکومت کو آگاہ کرتے رہیں تاکہ کوئی المیہ جنم نہ لے سکے۔ ضلعی انتظامیہ اور ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے فرائضِ منصبی میں بھی یہ شامل ہے کہ وہ کسی بھی متوقع المیے کا بَر وقت تدارک کرنے کی تدابیر کریں۔ اور ماشاءاللہ تھر میں ہمارے قومی اسمبلی کے دو اور صوبائی اسمبلی کے چار عوامی نمائندے بھی ہوتے ہیں جو ووٹ مانگتے وقت زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں لیکن وقت آنے پر ایسے غائب ہوجاتے ہیں جیسے گدھے کے سَر سے سینگ۔ کسی جانب سے شور اُٹھا نہ کسی کو کان وکان خبر ہوئی۔ اگر پتہ چلا تو الیکٹرانک میڈیا سے، باقی سب سوئے رہے۔ آج سندھ کے وزیرِ اعلیٰ سید قائم علی شاہ بر ملا اپنی کوتاہیوں کا اقرار کر رہے ہیں لیکن قوم سوال کرتی ہے کہ اِس ''قتلِ عمد'' ، اِس دہشت گردی کا مقدمہ کس کے خلاف درج کرایا جائے ؟۔ ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹیز کے خلاف ، انتظامیہ کے خلاف ، عوامی نمائندوں کے خلاف یا پھر خود وزیرِ اعلیٰ کے خلاف ؟۔ اگر طالبان کے ہاتھوں یہی 200 بچے شہید ہو جاتے تو پورے ملک میں شورِ قیامت اُٹھتا اور ہر زبان پر ایک ہی مطالبہ ہوتا کہ اِن دہشت گردوں کو نیست و نابود کر دیا جائے لیکن جس دہشت گردی کا ارتکاب سندھ حکومت کے اربابِ اختیار نے کیا ہے ، اُس لہو کا حساب کس سے مانگیں ؟۔ کیا سیکرٹری ہیلتھ سے جو وزیرِ اعلیٰ کا داماد ہے یا پھر ڈپٹی کمشنر سے جو مخدوم امین فہیم کا داماد ہے ؟۔ سندھ حکومت تو بڑے فخر سے یہ کہتی رہی ہے کہ اُس نے پانچ سالوں

میں تعلیم اور صحت پر پانچ سو ارب روپیہ صرف کیا اور ریکارڈ بھی تصدیق کرتا ہے کہ اربوں روپے ادویات پر صرف ہوئے۔ پھر وہ اربوں کی ادویات کہاں گئیں کہ ہسپتالوں میں تو کسی کو ایک روپے کی گولی بھی نصیب نہیں۔

سچ کہا ولیم جیمز نے کہ ”انسان سب درندوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ سوائے انسان کے شاید ہی کوئی درندہ ایسا ہو جو اپنی ہی جنس کو چیرتا پھاڑتا ہو“۔ تھرپارکر میں قحط کے ہاتھوں ماؤں کی چھاتیاں سوکھ گئیں، نمونیے، ہیضے اور وبائی امراض نے ننھی کلیوں کو مرجھا دیا، پھول بِن کھلے مرجھا گئے، ہر گھر میں نوحہ خوانی اور ہر دَر پہ ماتم لیکن ”مَرسوں مَرسوں، سندھ نہ ڈیسوں“ کا نعرہ لگانے والا بلاول زرداری اپنے پُر تعیش محل میں آرام کرتا رہا لیکن لطیفہ یہ کہ وزیرِ اعلیٰ قائم علی شاہ فرماتے ہیں کہ بلاول زرداری تھرپارکر کی اِس نہ گفتہ بہ حالت پر بہت پریشان ہیں اور وہ دن میں چار چار مرتبہ تھر کی صورتِ حال پوچھتے ہیں۔ وزیرِ اعلیٰ سندھ طوہاً و کرہاً ”مٹھی“ تک تو پہنچے لیکن صحراؤں کی خاک چھاننے کی ہمت نہ پا کر بارہ لذیذ ڈشز سے مزین ”لنچ“ تناول فرما کر گھر کو سدھارے۔ شرجیل میمن کہتے ہیں کہ تھر کے دور دراز علاقوں میں پہنچنا مشکل ہے۔ شاید اسی لیے شرجیل میمن صاحب نے بھی تھر کے اُن 24 سو دیہاتوں تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کی جہاں تا حال امدادی کارروائیاں شروع ہی نہیں ہو سکیں۔ وہ بھی صرف مٹھی تک پہنچے

اور لنچ تناول فرما کر لَوٹ آئے۔ سندھ کے وزیر خوراک نے کمال بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہاں تک فرما دیا کہ گندم فراہم کر دی گئی تھی، تقسیم کرنا میرا کام نہیں اور سندھ ہی کے وزیر دوست محمد کے رشتے داروں نے چودہ ہزار بوریوں پر مشتمل گندم کے گوداموں کو تالے لگا کر یہ ثابت کر دیا کہ بھلے شداد، نمرود اور فرعون واصل جہنم ہوئے لیکن زمینی خُدا اب بھی زندہ ہیں۔

''کمانڈو'' کی ایک اور درخواست

حاکمانِ وقت پتہ نہیں ہمارے ''کمانڈو'' کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے بیٹھے بٹھائے اُن کے خلاف غداری کا کیس گھڑ کر اُنہیں ''وخت'' میں ڈال دیا جس پر اُنہیں اپنا سجا سجایا محل چھوڑ کر AFIC میں پناہ لینی پڑی۔ اُنہوں نے خصوصی عدالت کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ ''طبلے سارنگی'' سے دوری کی بنا پر اُن کے دِل کی دھڑکنیں بے قابو ہوئی جاتی ہیں لیکن خصوصی عدالت نے اُن کی درخواست کو دَرخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے ٹکا سا جواب دے دیا۔ ویسے تو ہمارے محترم پرویز مشرف صاحب نے خصوصی عدالت کو اتنی درخواستیں لکھی ہیں کہ گینیز بُک آف ورلڈ ریکارڈ والے اُنہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں لیکن AFIC کے فوجی ڈاکٹرز یہ کہتے ہیں کہ ہمارے کمانڈو کے پاس تو پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا، تُم کس کھیت کی مولی گاجر ہو۔ گینیز بُک والے تو خیر خصوصی عدالت کی تلاش میں بھی ہیں جس نے مشرف صاحب کی درخواستوں کے پہاڑ کو یکسر مسترد کرکے ورلڈ ریکارڈ قائم کر دیا لیکن آہ بیچارے گینیز بُک آف ورلڈ ریکارڈ والے جن کی رسائی خصوصی عدالت تک بھی نہیں۔ ہمارے کمانڈو جو ڈرتے ورتے کسی سے نہیں، نے ایک درخواست میں خصوصی عدالت سے یہ بھی استدعا کی کہ وہ بظاہر تو فِٹ بلکہ سُپر فِٹ ہیں لیکن درحقیقت ''آرمی

ہاؤس'' اور ''ایوانِ صدر'' کی یادوں نے اُن کے اندر بہت توڑ پھوڑ کی ہے جس کی ''ریپیئرنگ'' کروانے کے لیے وہ اپنے بیرونی آقاؤں کے پاس جانا چاہتے ہیں اس لیے ہمدردی کی بنیاد پر اُنہیں بیرونِ ملک جانے کی اجازت دی جائے۔وہ وعدہ کرتے ہیں کہ عدالت جب بھی اُنہیں حاضری کا حکم دے گی وہ پہلی فلائیٹ پکڑ کر واپس آ جائیں گے لیکن عدالت کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ جب اعلیٰ عدلیہ میمو گیٹ سکینڈل والے سابق سفیر حسین حقانی تک کو واپس لانے سے قاصر رہی تو پھر سابق صدر، سابق چیف آف آرمی سٹاف اور سابق چیف ایگزیکٹو پرویز مشرف کو بھلا خصوصی عدالت بھلا کیسے واپس لا سکتی ہے؟۔رہی ''مشرفی وعدے'' کی بات تو عدالت خوب جانتی ہے کہ مشرف صاحب نے ٹی وی پر قوم کو خطاب کرتے ہوئے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ دسمبر تک وردی اتار دیں گے۔اسی شرط پر سترھویں ترمیم منظور ہوئی لیکن مشرف صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ اُنہیں تو پتہ ہی نہیں تھا کہ وردی تو اُن کی ''کھال'' ہے اور بھلا کوئی اپنے ہاتھوں سے اپنی کھال اُتارتا ہے؟۔ایم ایم اے والے بیچارے آج بھی مشرف صاحب کی اِس چالاکی پر مُنہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔اپنے پراسیکیوٹر اکرم شیخ صاحب نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ

تیرے وعدے پہ جیئے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مَر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

ویسے بھی ہمارے ہاں ایوانِ صدر کے باسیوں کے وعدے قُرآن و حدیث نہیں ہوتے اِس لیے جنابِ پرویز مشرف کی یہ استدعا بھی بے کار ہے۔

اب مشرف صاحب نے خصوصی عدالت کو ایک اور درخواست لکھ دی ہے جس میں 3 نومبر 2007ء کی غیر آئینی ایمرجنسی کو تسلیم کرتے ہوئے اُنھوں نے یہ لکھا ہے کہ اِس ایمرجنسی لگانے میں وہ اکیلے نہیں بلکہ 269 لوگ شامل تھے جن میں سابق آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی، پی سی او ججز، کور کمانڈرز اور چاروں صوبائی گورنرز کے علاوہ سابق وزیرِ اعظم شوکت عزیز اور اُن کی کابینہ بھی شامل تھی۔ گویا اب مشرف صاحب کا اپنے ہمراہیوں کو یہ پیغام دے دیا ہے کہ اگر وہ اُن کی حمایت میں باہر نہیں آتے تو نہ سہی اب وہ ''خود تو ڈوبے ہیں صنم، تُم کو بھی لے ڈوبیں گے'' کے مصداق کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے'' ۔اِن 269 لوگوں کے بارے میں ہمارا علم ناقص ہے البتہ جن لوگوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں اُن میں ہمارے ''پنڈی وال'' شیخ رشید احمد اور مشرف صاحب کو دَس بار وردی میں منتخب کروانے کے دعوے کرنے والے چوہدری پرویز الٰہی تو شامل ہیں ہی اور چوہدری شجاعت حسین نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایمرجنسی لگوانے والوں میں وہ بھی شامل ہیں۔شاید اسی خطرے کو بھانپتے ہوئے شیخ صاحب ایک سال سے الیکٹرانک میڈیا پر حکومت کو متنبہ کرتے چلے آرہے ہیں کہ کمانڈو کومت چھیڑنا کیونکہ بات اگر چل نکلی تو پھر دور تلک جائے گی لیکن

کسی نے اُن کی باتوں پر کان نہیں دھرا۔ اب حکومتی ضد کو دیکھتے ہوئے چار و ناچار مشرف صاحب کو یہ کہنا ہی پڑا کہ اُن کے ساتھ دیگر 269 لوگوں پر بھی سنگین غداری کا مقدمہ درج کیا جائے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اگر ایسا ہو گیا تو پھر خصوصی عدالت کے چھوٹے سے کمرے میں یہ 269 ''ملزمان'' اور اُن کے لگ بھگ ایک ہزار وکلاء کیسے سمائیں گے؟۔اِس کے لیے حکومت کو قبل اَز وقت کوئی نہ کوئی مناسب بند و بست کر لینا چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ خصوصی عدالت کے لیے کوئی سٹیڈیم بہتر رہے گا۔ ویسے بھی آجکل ہمارے سارے سٹیڈیم طالبان کی مہربانی سے خالی پڑے بھاں بھاں کر رہے ہیں اِس لیے خصوصی عدالت ہی اُن کا بہتر مصرف رہے گا۔ ویسے ہماری پیاری حکومت مالی لحاظ سے آجکل ''کمزور شمزور'' ہے اِس لیے اگر خصوصی عدالت کی کارروائی دیکھنے کے لیے ٹکٹ لگا دی جائے تو ہم گارنٹی دیتے ہیں کہ ایسا ''کھِڑکی توڑ'' رَش پڑے گا کہ گینیز بُک آف ورلڈ ریکارڈ والے بھی انگلیاں مُنہ میں داب لیں گے۔اِس سلسلے میں انتظام و انصرام کے لیے جناب حمزہ شہباز اور جناب رانا مشہود کی خدمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ اُنہیں ورلڈ ریکارڈ بنوانے کا تجربہ بھی ہے اور شوق بھی۔ اگر ہماری اِس ''مدبّرانہ تجویز'' پر عمل کیا گیا اور صرف چار چھ ماہ ہی خصوصی عدالت کا کیس چل گیا تو ہم گارنٹی دیتے ہیں کہ اگلے پانچ سالوں کے ٹیکس فری بجٹ کے لیے پیسہ اکٹھا ہو جائے گا اور جنابِ اسحاق ڈار کو اِدھر اُدھر سے مال اکٹھا کرکے ڈالر کو سو روپے تک لانے کی ضرورت ہی

نہیں رہے گی کیونکہ ڈالر خود ہی شرمندہ ہو کر پچاس روپے تک آ جائے گا۔اگر ’’آم کے آم ، گٹھلیوں کے دام‘‘ کے مصداق میاں برادران کی خواہش کی تکمیل بھی ہو جائے اور ڈھیروں ڈھیر پیسہ بھی اکٹھا ہو جائے تو ایسا کرنے میں ہرج ہی کیا ہے۔

یہ سب کچھ تو رکھیے ایک طرف ، اب ہماری وزارتِ داخلہ نے ہمارے محترم کمانڈو کو محض ’’ڈرکانے‘‘ کے لیے شوشہ چھوڑا ہے کہ مشرف صاحب کی جان کو بہت خطرہ ہے القاعدہ اور طالبان نے اُن راستوں کو ’’مارک‘‘ کر لیا ہے جن سے گزر کے مشرف ، صاحب نے خصوصی عدالت جانا ہے اور مشرف صاحب کی حفاظت پر مامور اُن کے حفاظتی دستے میں سے ہی کوئی اُن پر حملہ کر سکتا ہے اور بارود سے بھری گاڑی بھی ٹکرا سکتی ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں اور یہ محض ہماری وزارتِ داخلہ کی شرارت ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ 26 ایجنسیاں ، رینجرز اور پولیس کے ہزاروں جوان صرف ایک شخص کی حفاظت بھی نہ کر سکیں؟۔دراصل وزارتِ داخلہ کے اربابِ اختیار نہیں چاہتے کہ ہمارے بہادر کمانڈو خصوصی عدالت میں پیش ہوں ۔وہ تو چاہتے ہی یہی ہیں کہ مشرف صاحب عدالت میں پیش نہ ہوں اور خصوصی عدالت اُن کی عدم پیشی کو جواز بنا کر اُنہیں ’’دَھر‘‘ لے ۔مشرف صاحب سے والہانہ عشق کرنے اور اُن کی خاطر بندے بندے سے ’’مُنہ ماری‘‘ کرنے والے احمد رضا قصوری صاحب نے تو اعلان بھی کر دیا ہے کہ مشرف

صاحب خصوصی عدالت میں پیش نہیں ہونگے ۔اگر ایسا ہو گیا تو ہماری شرارتی وزارتِ داخلہ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ہم اپنا کالم مکمل کر کے ٹی وی پر نظریں گاڑے بیٹھے ہیں لیکن شنید ہے کہ موسم کی خرابی کی بنا پر خصوصی عدالت کے ججز کا طیارہ لیٹ ہو گیا ہے ۔ویسے خیال ہمارا بھی یہی ہے کہ مشرف صاحب آج عدالت نہیں آئیں گے ۔

ڈار بمقابلہ ڈانواں ڈول ڈالر

جب سے شعور کی وادی میں قدم رکھا ہے، پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ہم پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی خبریں ''چسکے'' لے لے کر پڑھ اور سُن رہے ہیں۔ اللہ بھلا کرے وزیرِ خزانہ جناب اسحاق ڈار کا جِن کی کرشمہ سازی سے ڈالر دھڑام سے نیچے آ گرا اور ہمارے بیرونی قرضوں میں 700 ارب روپے کی کمی ہو گئی جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر پاکستانی کا قرضہ بھی چار ہزار روپے تک کم ہو گیا۔ ہمارے دِل میں لڈو پھوٹنے کی وجہ یہ نہیں کہ ڈالر کی قدر کم ہو گئی بلکہ یہ ہے کہ ہم نے زندگی میں پہلی دفعہ سَٹہ باز ٹیکسٹائل لابی کے گھروں میں صفِ ماتم بچھی دیکھی۔ یہ لابی تو بیرونی ممالک سے اپنی برآمدات کی وصولی پانچ ارب ڈالر تک حاصل کرنے کی عادی تھی جس کا ڈار صاحب نے ''بیڑا غرق'' کرکے رکھ دیا۔ ہم نے تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ ہر وزیرِ خزانہ بڑے مگر مچھوں کے مفادات کا تحفظ ہی کرتا ہے لیکن ڈار صاحب نے تو اُنہی مگر مچھوں پہ چھُری چلا دی۔

ویسے ہمارے یہ ڈار صاحب ہیں بہت ''شرارتی''۔ جب ہمارے ''لال حویلی'' والے شیخ رشید صاحب نے لال پیلے ہو کر کہا کہ اگر ڈالر 98 کی سطح پر آ گیا تو وہ

اپنی نشست سے مستعفی ہو جائیں گے ۔تب ڈار صاحب نے یہ سوچا کہ شیخ صاحب سے جان چھڑانے کا یہ سنہری موقع ہے جسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے ۔اُنھوں نے چوری چوری ،چُپکے چُپکے" ڈیڑھ ارب ڈالر اکٹھے کرکے قومی خزانے میں جمع کروا دیئے" ۔جب پوچھنے والے نے ڈار صاحب سے پوچھا کہ یہ ڈالر کہاں سے آئے تو اُنھوں نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا کہ قوم آم کھانے سے غرض رکھے ،پیڑ گننے سے نہیں ۔اُدھر شیخ صاحب جنھیں کہیں سے اِن ڈالروں کی "سُن گُن" مِل گئی تھی نے حکومت کو "الٹی میٹم" دے دیا کہ وہ چوبیس گھنٹوں کے اندر یہ بتلا دے کہ یہ ڈیڑھ ارب ڈالر کہاں سے آئے ، ورنہ وہ خود بتلا دیں گے ۔چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد اب الیکٹرانک میڈیا شیخ رشید صاحب کو ایسے ہی تلاش کر رہا ہے جیسے کبھی امریکہ اسامہ بن لادن کو تلاش کیا کرتا تھا لیکن شیخ صاحب کی "مارکیٹ ویلیو" اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ وہ مشکل ہی سے ہاتھ آتے ہیں ۔اینکر وسیم بادامی نے اُنھیں پتہ نہیں کہاں سے ڈھونڈ لیا اور پہلا سوال ہی یہ کر دیا کہ وہ کب مستعفی ہو رہے ہیں؟ ۔شیخ صاحب جو پہلے ہی تَپے" بیٹھے تھے ، نے جواب دیا کہ چونکہ پارلیمنٹ میں وہ غریبوں کی واحد آواز ہیں" اِس لیے مستعفی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ویسے بھی اُنھیں یقین ہے کہ ڈالر پھر چَڑھ جائے گا کیونکہ یہ ڈالر ہے کوئی گری پڑی پاکستانی کرنسی نہیں ۔شیخ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ اُنھوں نے 98 روپے کی بات کی تھی جبکہ ڈالر کی قیمت آج بھی ساڑھے اٹھانوے"روپے ہے اِس لیے"

اسحاق دار صاحب کا یہ کہنا غلط ہے کہ " اگر میں شیخ رشید کی جگہ ہوتا تو مستعفی ہو جاتا ۔جب ڈنکر نے بات "گھما" کر بار بار شیخ صاحب سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ" ڈیڑھ ارب ڈالر کہاں سے آئے تو شیخ صاحب نے تَپ کر کہا کہ اُس ڈنکر جیسے دو تین تو وہ ہر وقت اپنی جیبوں میں لیے پھرتے ہیں۔اسحاق ڈار صاحب کے ہاتھوں شکستِ فاش کے علاوہ شیخ صاحب کو یہ غصّہ بھی ہے کہ عمران خاں صاحب نے اُن سے مشورہ کیے بغیر میاں نواز شریف صاحب سے ملاقات بھی کر لی اور خلافِ عادت میاں صاحب اور اُن کے ہمراہیوں کی خوب خاطر تواضع بھی کی ۔حالانکہ ہم نے تو یہی سُنا تھا کہ خاں صاحب یہ دیکھے بغیر کہ کوئی بڑا آیا ہے یا چھوٹا ہمیشہ "بسکٹوں" پر ہی ٹَرخا دیتے ہیں ۔اب شیخ صاحب کو یہ پریشانی بھی لاحق ہے کہ اگر خاں صاحب بھی ہاتھ سے نکل گئے تو پھر اُن کا کیا بنے گا۔

ڈیڑھ ارب ڈالر کا قصّہ چونکہ اب زباں زدِ عام ہو چکا ہے اِس لیے ہم بھی بتلائے دیتے ہیں کہ جب اسحاق ڈار صاحب نے شیخ صاحب کا "نکو ٹھپنے" کا ارادہ کیا تو اُنھوں نے میاں نواز شریف صاحب سے یہ کہا کہ اگر شیخ صاحب سے جان چھڑانی ہے تو پھر ابھی یا کبھی نہیں۔ میاں صاحب نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ ، جھٹ سے اپنی ذاتی گارنٹی پر سعودی عرب سے ڈیڑھ ارب ڈالر اٹھا لیے اور جونہی یہ رقم پاکستانی اکاؤنٹ میں منتقل ہوئی ، روپے نے مستحکم ہو کر ڈالر

کو اُس کی ''نانی'' یاد دلا دی۔ سعودی عرب سے ملنے والے اِن ڈالروں کے بارے میں طرح طرح کی موشگافیاں ہو رہی ہیں اور ہمارے تجزیہ نگار بھی دور کی کوڑیاں لانے میں مگن ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہماری موجودہ ''میڈاِن پاکستان'' حکومت ملکی مفادات کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ شیخ صاحب ! ہوشیار باش، شنید ہے کہ ابھی ڈیڑھ ارب متحدہ عرب امارات سے بھی آنے والے ہیں جس سے ڈالر 80 روپے سے کم کی سطح پر آنے کا امکان ہے۔اِس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی ''بڑھکوں'' کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں اور غریبوں کی ہمدردی میں ''ٹسوے'' بہانے جیسے ڈرامے بند کر دیں کیونکہ پہلی بار تو صحنِ گلشن میں آشاؤں اور اُمیدوں کے پھول کھلنے کا یقین سا ہونے لگا ہے کیونکہ ڈالر کی قدر کم ہو جانے سے ہر پاکستانی کی عالمی قوتِ خرید میں 10 فیصد تک نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اب اُمید ہو چلی ہے کہ اگلے ڈیڑھ دو ماہ میں اشیائے خورونوش کی قیمتیں بھی عوام کی قوتِ خرید میں آ جائیں گی۔آنے والے کَل کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن فی الحال خوش ہو لینے میں ہرج ہی کیا ہے۔

چلتے چلتے یہ بھی سُن لیجئے کہ خصوصی عدالت نے پرویز مشرف صاحب کے نا قابلِ ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے۔ حکم میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر پرویز مشرف عدالت میں آنے سے انکار کرتے ہیں تو پھر اُنہیں 31 مارچ کو گرفتار

کرکے خصوصی عدالت میں پیش کیا جائے۔ خصوصی عدالت کی اِس صریحاً ناانصافی کے خلاف ''مشرف لَورز'' نے ''والہانہ احتجاج''کی نئی تاریخ رقم کر دی۔اُنھوں نے اے ایف آئی سی کے سامنے ڈھول کی تھاپ پر ایسا والہانہ احتجاجی رقص کیا کہ دُنیا جھوم جھوم اُٹھی۔اِس والہانہ احتجاج سے بچنے کے لیے خصوصی عدالت نے تو یہ عندیہ دے دیا تھاکہ اگر پرویز مشرف عدالت میں حاضر ہونے سے قاصر ہیں تو اُن کے وکلاء کو فردِ جرم پڑھ کر سنا دی جائے لیکن مشرف صاحب کے وکیل انور منصور نے صاف کہہ دیا کہ سکیورٹی خدشات کی وجہ سے مشرف صاحب عدالت میں پیش نہیں ہو سکتے اور پڑھ کر سنا دینے سے فردِ جرم عائد نہیں ہوتی جس پر چار و ناچار خصوصی عدالت نے یہ حکم جاری کر دیا کہ اگر 31 مارچ کو پرویز مشرف عدالت میں آنے سے انکار کرتے ہیں تو اُنہیں گرفتار کرکے پیش کیا جائے کیونکہ فوجداری مقدمات میں اتنی تاخیر نہیں کی جا سکتی۔مشرف صاحب کے وکیل احمد رضا قصوری کہتے ہیں کہ جب حکومت کے ماتحت ادارے ایف سی، رینجرز اور پولیس مشرف صاحب کو عدالت میں پیش نہیں کرسکے تو 31 مارچ کو کون سی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔اُنھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عدالتیں وارنٹ گرفتاری جاری کرتی رہتی ہیں اصل مسئلہ تو گرفتاری کا ہے اور اُنہیں یقین ہے کہ افواجِ پاکستان اپنے سابق آرمی چیف کو ہتھکڑی نہیں لگنے دے گی۔دست بستہ عرض ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں شاید مشرف صاحب سے زیادہ متنازع شخصیت اور کوئی نہیں ہو گی۔اُنہیں چاہیے کہ اِس سے پہلے کہ فوج پر انگلیاں اُٹھنے لگیں اور فوج

تنگ آ کر انہیں اے ایف آئی سی سے ڈسچارج کروا دے، بہتر یہی ہے کہ وہ عدالت میں پیش ہو جائیں کیونکہ یہ تو طے ہے کہ اِس مقدمے نے بہرحال اپنے منطقی انجام کو پہنچنا ہی ہے۔

سعودی تحفے کا مچ گیا شور

پاکستان میں ڈیڑھ ارب ڈالر کیا آئے کہ گلی گلی میں شور مچ گیا کہ کہاں سے آئے ہیں یہ ڈالر، کس نے دیئے ہیں یہ ڈالر، کیوں دیئے ہیں یہ ڈالر؟۔وزیرِ خزانہ جنابِ اسحاق ڈار سے شرطیں باندھنے والے لال حویلی کے شیخ رشید احمد نے پارلیمنٹ کی جان چھوڑنے کے لیے اب نئی شرط باندھتے ہوئے یہ کہہ دیا ہے کہ وزیرِ خزانہ پہلے بارہ اشیاء کی قیمتیں کم کریں پھر مستعفی ہوں گا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ شرائط پوری کر بھی دی جائیں تو پھر بھی شیخ صاحب پارلیمنٹ سے چمٹے رہیں گے کیونکہ کاٹھ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی۔ تحریکِ انصاف کی مہربانی سے شیخ صاحب کی ہنڈیا میں ایک بار آیا ہوا اُبال بار بار نہیں آئے گا۔ویسے بھی شیخ صاحب کا ''اِٹ کھڑکا'' جاری ہی رہتا ہے۔وہ جو بات بھی کرتے ہیں، پوری قطعت کے ساتھ اور شرط باندھ کر کرتے ہیں۔اُنہیں شرطیں باندھنے کا اتنا شوق ہے کہ اگر اُنہیں کوئی اور نہ ملے تو وہ لال حویلی کے نیچے سموسے پکوڑے بیچنے والے کے ساتھ بھی شرط باندھ لیتے ہیں۔ دروغ بَر گردنِ راوی ، ہمیشہ ہارتے مگر کبھی شرط پوری نہیں کرتے۔ شاید اسی لیے وہ پرویز مشرف کے دل کے بہت قریب تھے کیونکہ مشرف صاحب کو بھی ''مُکر جانے'' کی پرانی عادت ہے۔

لیکن اچھے بھلے سیانے سید خورشید شاہ

صاحب کو پتہ نہیں کیا ہوا جنھیں دال میں کالا نہیں بلکہ پوری دال ہی کالی نظر آنے لگی ۔اب اُن کے ریکارڈ کی سوئی ایک ہی جگہ پر اٹک گئی ہے کہ کیوں ، کیسے اور کہاں سے آئے ہیں یہ ڈالر؟۔ویسے قصور خورشید شاہ صاحب کا بھی نہیں کیونکہ اُن کی تو بلاول زرداری نے ''مَت'' مار کے رکھ دی ہے ۔شاہ صاحب جو بھی بیان دیتے ہیں بلاول زرداری ٹویٹر کا سہارا لے کر اُس سے اُلٹ بیان داغ دیتے ہیں جس پر شاہ صاحب سوائے تلملانے کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتے ۔منجھے ہوئے سیاست دان سیّد خورشید شاہ صاحب نے طالبان کے معاملے میں گیند جب بھی حکومت کے کورٹ میں پھینکنے کی کوشش کی بلاول زرداری نے اُسے درمیان ہی سے اُچک لیا۔شاہ صاحب کہتے ہیں کہ اگر مذاکرات کرنے ہیں تو جلد کریں اور نتیجہ خیز کریں جبکہ بلاول مار دھاڑ سے بھرپور فلم چلانے کے خواہش مند ہیں ۔انوکھا لاڈلا بلاول زرداری ''کھیلن کو'' چاند مانگتا ہے جبکہ پیپلز پارٹی کے پاس ٹوٹا ہوا تارا بھی نہیں ۔اُدھر جنابِ آصف زرداری بھی خاموشی کی ''بُکل'' مار کر دبئی سدھار گئے ۔اگر وہ ملک میں موجود ہوتے تو شاید پیپلز پارٹی میں بھی تھوڑی بہت ہلچل ہوتی لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آصف زرداری صاحب نے سیاست سے پکّی پکّی ''ریٹائرمنٹ'' لے لی ہو۔آمدم بَر سرِ مطلب ، اسحاق ڈار صاحب نے پہلے تو یہ بتلانے سے ہی صاف انکار کر دیا کہ ڈالر کہاں سے آئے ہیں لیکن جب ہر کسی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ نواز حکومت نے قومی مفادات کا سودا کر لیا ہے تو ڈار صاحب نے بھی اقرار کر لیا کہ

برادر اسلامی ملک سعودی عرب نے یہ غیر مشروط ''تحفہ'' دیا ہے۔ یہ تحفے والی بات شاہ صاحب کو ہضم نہیں ہوئی کیونکہ اُن کے دَورِ حکومت میں تو کوئی اُن کو قرضہ تک دینے کو تیار نہیں ہوتا تھا، بھلا تحفہ کون دیتا اور وہ بھی ڈیڑھ ارب ڈالر کا؟۔شاید اسی بنا پر تجزیہ نگاروں نے بھی دور کی کوڑیاں لاتے ہوئے اِس ''تحفے'' کی کَڑیاں شام کے باغیوں سے ملانا شروع کر دیں کیونکہ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ سعودی عرب شام کے صدر بشار الاسد کی حکومت کا خاتمہ چاہتا ہے۔ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے لیے بھی ایسی خبریں کسی ''تحفے'' سے کم نہیں ہوتیں۔الیکٹرانک میڈیا پر سبھی اینکر اپنی اپنی دوکانیں سجا کر بیٹھ گئے کیونکہ سوال ''ریٹنگ'' کا تھا۔وہ تو اللہ بھلا کرے وزیرِ اعظم کے خارجہ امور کے مشیر جنابِ سرتاج عزیز کا جنہوں نے میڈیا کے شور اور خورشید شاہ صاحب کی بیقراری کو بھانپتے ہوئے بالآخر یہ بتلا ہی دیا کہ سعودی عرب کی امداد مکمل طور پر غیر مشروط ہے اور پاکستان شام کے باغیوں کی مدد کے لیے اسلحہ بھیج رہا ہے نہ جنگجو۔یہ امداد پاکستان ڈویلپمنٹ فنڈ کی مَد میں دی گئی ہے اور اُسی کے لیے استعمال ہو گی ۔

اُدھر ہمارے اسحاق ڈار صاحب بھی کچھ زیادہ ہی'' مخولیے ''ہو گئے ہیں۔موجودہ صورتِ حال سے وہ بھرپور لطف اندوز ہو رہے ہیں اور الیکٹرانک میڈیا بھی کسی ''بریکنگ نیوز''کے لیے اُن کے پیچھے مارا مارا پھر رہا ہے۔اب ڈار صاحب نے

محض شیخ رشید صاحب کو ''چڑانے'' کے لیے ''چٹکے'' لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ڈیڑھ ارب تو کیا پاکستان ڈویلپمنٹ فنڈ میں تو پچیس ارب ڈالر آنے والے ہیں۔ شیخ رشید صاحب یقیناً یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے ہونگے کہ اگر اُن کی ''بارہ مصالحوں والی'' بارہ شرائط بھی پوری ہو گئیں تو پھر پارلیمنٹ سے چمٹے رہنے کے لیے کون سا بہانہ باقی رہ جائے گا؟۔ اتنا تو ہمیں بھی پتہ ہے کہ متحدہ عرب امارات سے سے بھی ڈیڑھ ارب ڈالر ملنے والے ہیں لیکن 25 ارب ڈالر؟۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر قوم کو خوشیاں منانی چاہییں کہ اُس کے بھی دن پھرنے والے ہیں۔

موجودہ حکومت نے جب اقتدار سنبھالا تو ہمارے زرِ مبادلہ کے ذخائر ساڑھے سات بلین ڈالر تھے جو آمدہ اطلاعات کے مطابق جون 2014ء تک 16 بلین ڈالر تک پہنچنے کی امید ہے جس سے ڈالر مزید سستا ہو گا اور درآمدی اشیاء کی قیمتوں میں 10 سے 15 فیصد تک کمی آئے گی۔ حکومت 500 ملین ڈالر کے یورو بانڈز بھی جاری کر رہی ہے اور G3 , G4 لائسنس کی نیلامی سے بھی ایک بلین ڈالر حاصل ہونگے۔ گویا قوم کے لیے راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔ وزیرِ خزانہ صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ بین الاقوامی تجزیہ کاروں کے تجزیوں کے مطابق تو 2050ء تک پاکستان دُنیا کی اٹھارھویں بڑی معیشت بن جائے گا لیکن اگر اُن کی حکومت قائم رہی تو وہ زیادہ سے زیادہ 2025ء تک پاکستان کو دُنیا کی اٹھارھویں بڑی

معیشت بناکے دَم لیں گے ۔ گویا محض گیارہ سال بعد ہم کئی یورپی ممالک سے بھی آگے نکل جائیں گے ۔ اسحاق ڈار صاحب کا یہ دعویٰ ایسا ہے کہ عقل اسے تسلیم کرنے سے عاری ہے ۔ ویسے بھی حکمرانوں کی باتوں پر یقین کرنے والے احمق ہی ہوتے ہیں لیکن ہمیں چونکہ اِس ''حماقت'' میں بھی سرور آنے لگا ہے اِس لیے ہم یہ سوچتے ہوئے جنابِ اسحاق ڈار کے اِس دعوے پر یقین کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں کہ انہوں نے پہلے جو کہا، وہ کرکے دکھایا۔ بچپن سے سُنتے چلے آ رہے ہیں کہ پاکستان اتنا امیر ملک ہے کہ عنقریب بیرونی ممالک سے لوگ پاکستان میں نوکریاں ڈھونڈتے پھریں گے لیکن سَپنا تو پھر سَپنا ہوتا ہے، تا حال تو ہم ہی دیارِ غیر میں حصولِ رزق کی خاطر دھکے کھاتے پھرتے ہیں ۔ عقل تو اب بھی یہی کہتی ہے کہ کچھ نہیں بدلے گا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے ''عقلِ عیار'' کو الماری میں بند کرکے تالا لگا دیا ہے جس کی بنا پر اب ہمیں بھی یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ جیسے سَپنے سچ ہونے کا موسم قریب آن لگا ہے ۔ قوم کی دُعائیں موجودہ حکومت اور اسحاق ڈار صاحب کے ساتھ ہیں اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ''لگے رہو ڈار بھائی''۔

ڈالروں کا شور، میاں صاحب کی وضاحتیں

برِ صغیر کی تاریخ میں 23 مارچ1940ء خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اِس دن دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کے قیام کی قرار داد پیش کی گئی۔ماضی کے جھرونکوں سے جھانکتا ہوا یہ دن یاد دلاتا ہے اُن سحر انگیز نعروں کی جب ہندوستان کے ہر مسلمان کی زبان پر یہ نعرہ تھا"پاکستان کا مطلب کیا، لاالہ اللہ"۔ہم آج بھی یہ دِن پورے تزک واحتشام سے مناکر "قراردادِ پاکستان کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں لیکن 24 مارچ کو سب کچھ فراموش کرکے اپنی ذات میں ایسے گم ہوتے ہیں کہ پھر ہمیں اپنا ملک یاد رہتا ہے نہ قوم اور نہ ہی وہ مقصد جس کی خاطر یہ ملک حاصل کیا گیا۔کیاہماری معاشی ، معاشرتی سیاسی ، سماجی ، ثقافتی اور مذہبی زندگی کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا ہے جسے ہم احساسِ تفاخرکے ساتھ دُنیاکے سامنے پیش کر سکیں ؟۔شاید بلکہ یقیناً نہیں۔ وجہ صرف یہ کہ ہمیں اپنے وجودکے سواکچھ دکھائی دیتا ہے نہ سجھائی۔البتہ میلوں ٹھیلوں اور قومی دِن منانے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں۔ ہم تو ٹھہرے گفتارکے غازی اور وہ بھی ایسے کہ جدھر دیکھواُدھر افلاطون اور ارسطو ہی نظر آتے ہیں۔اپنے آپ کو" عقلِ کُل" سمجھنے کی بیماری ہمارے پڑھے لکھے طبقے ، خصوصاً تجزیہ نگاروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔جس کا جی

چاہے وہ بابائے قوم کو سیکولر بنا دیتا ہے اور جس کے ذہن میں آئے وہ اُنہیں ''کٹر مُلا'' کے روپ میں پیش کر دیتا ہے۔ ہمیں حضرت قائدِ اعظم کے فرمودات بیان کرنے کا تو بہت شوق ہے لیکن یہ طے ہے کہ عمل کی ذمہ داری ہم نے دوسروں کو سونپ رکھی ہے ۔ہمارے ہاں یہ بھی رواج عام ہوتا جا رہا ہے کہ ہم سیدھی سادھی بات میں بھی ٹیڑھ تلاش کرنے میں جُتے رہتے ہیں۔

میں نے اپنے کالموں میں بار بار لکھا کہ موجودہ حکومت قومی مفادات کا سودا کرے گی نہ گھاٹے کا لیکن چونکہ بزرجمہروں نے ڈیڑھ ارب ڈالروں کا ناطہ ملکِ شام کے اندرونی خلفشار سے جوڑنے کی ٹھان رکھی تھی اِس لیے اُن کی ایک ہی ضد تھی کہ ''کوئی چکر ہے'' اور یہ چکر سوائے شام کے اور کوئی ہو نہیں سکتا کیونکہ سعودی عرب کا شام سے ''اِٹ کھڑکا'' چل رہا ہے۔ میرے کالم پر طنز و تعریض کی بوچھاڑ بھی ہوئی اور قلم فروشی کے طعنے بھی سُننے پڑے۔ لیکن میں بھی چونکہ تھوڑی ضدی واقع ہوئی ہوں اِس لیے میں بھی ڈٹی رہی۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے اپوزیشن کے ''عظیم'' سیاستدان اور عظیم ترین'' تجزیہ نگار جو موشگافیاں کر رہے ہیں، اُن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ'' نہیں۔

جب سعودی ولی عہد پاکستان تشریف لائے تو ہمارے تجزیہ نگاروں نے شور مچا دیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔اُس وقت تجزیوں کی تان اِس بات پہ توڑی جا رہی تھی

کہ سعودی ولی عہد پرویز مشرف کو چھڑوانے آئے ہیں۔ جب ڈیڑھ ارب ڈالر ملے تو کہا جانے لگا کہ یہ شام کے باغیوں کو ہتھیاروں کی سپلائی کے لیے ملا ہے اور باغیوں کی مدد کے لیے فوج بھیجی جا رہی ہے۔ برطانوی شہری الطاف حسین صاحب نے حسبِ سابق بڑھکیں ''لگاتے ہوئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حکومت اگر فوج کو کسی دوسرے ملک'' جانے کا حکم دے تو وہ انکار کر دے۔ دراصل ہمارے اچھے بھلے ''الطاف بھائی'' کو سکاٹ لینڈ یارڈ والوں کی نِت نئی ''شرارتوں'' نے بوکھلا کے رکھ دیا ہے۔ اپنی اِس بوکھلاہٹ کا اُنہیں احساس بھی ہے اور ادراک بھی۔ اسی لیے وہ جب بھی خطاب فرماتے ہیں تو ساتھ ہی احتیاطاً کچھ ایسا بھی فرما دیتے ہیں کہ

بَک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے، خُدا کرے کوئی

تَرس آتا ہے بیچاری ایم کیو ایم پر جو کافی عرصے سے سیاست تیاگ کر الطاف بھائی کے ارشاداتِ عالیہ کی وضاحتیں دیتی نظر آتی ہے۔ الطاف بھائی کو ''قوم'' سے خطاب کرنے کا جنون کی حد تک شوق ہے اور ایم کیو ایم میں ابھی کوئی ''مائی کا لعل'' ایسا پیدا نہیں ہوا جو اُنہیں کہہ سکے کہ ''قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا'' کے مصداق اُن کی تقریریں سُننے والا کوئی نہیں سوائے اُن مجبوروں اور مقہوروں کے جنہیں دروغ بَر ''گردنِ راوی ''ڈنڈے

کے زور پر اکٹھا کیا جاتا ہے یا پھر بیچارہ الیکٹرانک میڈیا جسے اپنے "چینلز" عزیز ہیں ۔وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم دو سیاستدان ایسے ہیں کہ جن کی بات سننے سے پہلے ہی حاکمانِ وقت کانوں میں روئی ٹھونس لیتے ہیں ۔ایک الطاف بھائی اور دوسرے اپنے لال حویلی والے شیخ رشید صاحب جو ہر روز کسی نہ کسی نیوز چینل پر وہی "بَونگیاں" مارتے دکھائی دیتے ہیں جنہیں سُن سُن کر کان پک گئے ہیں بلکہ کئی لوگوں کے تو کان بہنا بھی شروع ہو گئے ہیں ۔

سعودی ولی عہد کے بعد بحرین کے شاہ حمد بن عیسیٰ الخلیفہ تشریف لائے ۔یہ بحرین کے شاہ کا چالیس سال کے بعد پہلا دورہ تھا ۔اُن کا ایئرپورٹ پر ایسا شاندار استقبال ہوا کہ کبھی دیکھا ، نہ سُنا ۔وزیرِ اعظم اور اُن کی کابینہ ، تینوں مسلح افواج کے چیفس اور وزیرِ اعلیٰ پنجاب بنفسِ نفیس اُن کے استقبال کے لیے موجود تھے ۔ایسا شاندار استقبال دیکھ کر میں بھی سوچنے لگی کہ اب ہمارے پیارے "شاہ حمد" صاحب کی جیبوں کی بھی خیر نہیں۔شنید ہے کہ حکمرانوں نے ستّرہ اٹھارہ معاہدے بحرین کے ساتھ بھی "پھڑکا" دیئے ہیں ۔ہمارے ایک بہت معروف سینئر لکھاری جو کسی زمانے میں میاں نواز شریف صاحب کے دل کے بہت قریب اور اُن کے "سپیچ رائٹر" ہوا کرتے تھے لیکن جب آصف زرداری صاحب بَر سرِ اقتدار آئے تو وہ صحنِ چمنِ زرداری کی بُلبلِ ہزار

داستان بُن کر نواز لیگ میں کیڑے نکالنے لگے۔اُنھوں نے بحرین کے شاہ کے اِس والہانہ استقبال کو دیکھ کر اپنا جو'' ارسطوانہ تجزیہ'' فرمایا،اُسے پڑھ کر انسان کے چودہ کیا سولہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں''میرا کبوتر یہ پیغام لایا ہے کہ یہ رقم بحرین کے شیخ حمد بن عیسیٰ الخلیفہ نے جمع کروائی ہے۔فرمائش البتہ سعودی عرب کی تھی جو بحرین کے دفاعی امور کا ذمہ دار ہے۔وہاں کئی سالوں سے اندرونی بغاوتوں نے، حکومت کے لیے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔بادشاہ سلامت کو تربیت یافتہ افرادی قوت کے ساتھ ساتھ تربیت دینے والوں کی بھی ضرورت ہے اور بغاوتوں اور ہنگاموں پر قابو پانے کے لیے درکار اسلحہ کی بھی۔رقم وہ ایڈوانس جمع کروا چکے ہیں، اب مال خریدنے آئے ہیں۔میرے کبوتر کی چٹھی میں تو یہی لکھا ہے۔اگر یہ غلط ہے تو پھر آپ بتا دیں کہ یہ رقم کس کی ہے''؟۔ہم نے کوئی چڑیا، طوطا مینا یا کبوتر تو پال نہیں رکھا اور نہ ہی ہماری جیب ایسے کبوتروں کے ''دانے دُنکے'' کا بوجھ برداشت کر سکتی ہے اِس لیے ہماری سمجھ میں تو جو کچھ آیا، لکھ دیا، یہ الگ بات ہے کہ اکثر سچ ہی ثابت ہو۔اب میاں نواز شریف صاحب نے سینئر کالم نگار اور اپنے پرانے ''بیلی'' کا مُنہ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ پاکستان سے کسی ملک نے فوج مانگی اور نہ ہی ہمارا کہیں اپنی افواج بھیجنے کا ارادہ ہے ۔اُدھر بحرین نے بھی اِن قیاس آرائیوں کی پُر زور تردید کی ہے۔بحرین کے وزیرِ خارجہ خالد بن احمد بن الخلیفہ نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے

کہا ''بحرین نے پاکستان ڈویلپمنٹ فنڈ میں نہ تو کوئی رقم دی اور نہ ہی ایسا کوئی وعدہ کیا جبکہ پاکستان کی جانب سے بھی ایسی کوئی درخواست نہیں کی گئی ''۔ ہمیں یقین ہے کہ اب محترم سینئر لکھاری ایسے ''جھوٹے'' کبوتر کو ذبح کرکے'' ڈکارنے''کے لیے ڈھونڈ رہے ہونگے جو ''ایویں خوامخواہ'' لمبی لمبی چھوڑ کر اُن کی بدنامی کا باعث بن رہا ہے۔

کرکٹ کا بخار

بخار کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جن میں سب سے خطرناک ''کرکٹ کا بخار'' ہے جس میں ہم اکثر مبتلاء رہتے ہیں۔ میچ جیتنے کی صورت میں افاقہ بھی ہو جاتا ہے لیکن اکثر بخار کا پارہ چڑھا ہی رہتا ہے۔یہ بخار اُس وقت اپنی ساری حدیں پار کر جاتا ہے جب پاکستان اور انڈیا کا میچ ہو رہا ہو۔یوں تو میچ سے پہلے الیکٹرانک میڈیا پر متواتر یہ نغمہ الاپا جاتا رہتا ہے کہ ''تُم جیتو یا ہارو، ہمیں تُم سے پیار ہے'' لیکن میچ ہارنے کی صورت میں وہی الیکٹرانک میڈیا طنز کے تیر برساتا ہے اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی قوم جو تبصرے کر رہی ہوتی ہے اُسے اگر کھلاڑی اپنے کانوں سے سُن لیں تو شاید ہمیشہ کے لیے کھیلنے سے توبہ کر لیں۔ کھیل تو کھیل ہوتا ہے جس میں ایک ٹیم نے ہارنا ہی ہوتا ہے لیکن ہماری تو یہ ضد ہے کہ ''ہم ہیں پاکستانی، ہم تو جیتیں گے''۔جس دن کرکٹ میچ ہو، اُس دن پوری قوم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ''لسوہڑے'' کی طرح ٹیلی وژن سے چپک رہتی ہے اور پھر ہر بال پر جو تجزیے اور تبصرے ہوتے ہیں اُنہیں سُن کر تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ہمارے لکھاری تو ''کچھ'' بھی نہیں پیدائشی تجزیہ نگار تو یہ قوم ہے جو میچ کے دوران ''الہامی کیفیات'' میں مبتلاء ہو جاتی ہے۔میرا ڈاکٹر بیٹا میچ والے

دن ڈاکٹر کم اور تجزیہ نگار زیادہ بن جاتا ہے۔اُس نے میچ بھی دیکھنا ہوتا ہے اور بار بار یہ بھی کہنا ہوتا ہے کہ ''میچ فِکس ہے اِس لیے دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں'' البتہ ہمارا کوئی کھلاڑی اگر چوکا یا چھکّا لگائے تو سب سے بلند نعرہ بھی وہی لگاتا ہے۔وہ اکیلا ہی کافی تھا لیکن اب اُس کے ساتھ شریف بھی مل گیا ہے۔یوں تو اُس ''ذاتِ شریف'' کا ہوٹل کا کاروبار ہے لیکن میچ والے دن کونسا ہوٹل اور کہاں کا ہوٹل۔نصیحت البتہ وہ بھی سبھی کو یہی کرتا ہے کہ میچ دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ہر میچ اور ہر بال ''فِکس'' ہوتا ہے۔

پچھلے دنوں ایشیا کپ میں انڈیا کے خلاف چھکّے لگا کر شاہد آفریدی نے جاوید میانداد کی یاد تازہ کر دی۔ایک چھکّا لگانے پر ''مالا مال ''تو جاوید میانداد بھی ہوئے تھے لیکن آفریدی کے چھکّوں نے تو اُسے ''نہال'' ہی کر دیا اور یہ 1992ء کا ورلڈ کپ جیتنے کا ثمر تھا جو محترم عمران خاں صاحب شوکت خانم جیسا عظیم کینسر ہسپتال بنانے میں کامیاب بھی ہوئے اور آج خیبر پختونخوا حکومت کے مزے بھی لوٹ رہے ہیں۔

ورلڈ کپ کے میچ میں دِلّی کے لال قلعے T 20 افسوس، صد افسوس کہ اب کی بار ہم نے پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کا سنہری موقع کھو دیا۔اگر ہماری کرکٹ ٹیم

جذبۂ ایمانی'' سے سرشار ہو کر کھیلتی اور ناقص فیلڈنگ ، بیٹنگ اور باؤلنگ نہ کرتی تو یہ'' جھنڈا تو ہم نے لہرا ہی دیا تھا۔ چلیں انڈیا نہ سہی آسٹریلیا تو ہم نے فتح کر ہی لیا۔ ویسے بھی آسٹریلیا امیر ملک ہے اور انڈیا میں غربت ہی غربت اِس لیے آسٹریلیا کی فتح قوم کو مبارک ہو۔ ہم نے اِس سے پہلے بھی کئی بار انڈیا کو شکست دی لیکن وہ ہمیشہ ''رونڈی'' مارتے ہوئے کہہ دیتا ہے کہ ''اب کے مار'' لیکن ہم اپنی کرکٹ ڈپلومیسی کے ہاتھوں مجبور ہیں اِس لیے اُسے بار بار تو نہیں مار سکتے نا۔ اور کچھ ہو نہ ہو ، ہماری کرکٹ ڈپلومیسی ہمیشہ کامیاب رہی ہے۔ اگر میچ انڈیا میں ہو رہا ہو تو ہمارے سربراہان بِن بلائے ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی کرکٹ ڈپلومیسی کے تحت ایک بار ہمارے صدر ضیاء الحق مرحوم انڈیا میچ دیکھنے گئے اور اُس وقت کے وزیرِ اعظم راجیو گاندھی کے کان میں ایٹمی جنگ چھیڑنے کا سندیسہ تک دے ڈالا جس پر راجیو جی کا رنگ پیلا پڑ گیا اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ہمارے ''گدی نشیں'' بھی میچ دیکھنے گئے تھے لیکن وہ میچ ہم ہار گئے۔ تب قوم کا تبصرہ یہ تھا کہ ہمارے وزیرِ اعظم تو کرکٹ ٹیم کو میچ ہارنے کا پیغام دینے گئے تھے۔ ہمارے ''چڑیا والے'' چیئر مین کرکٹ بورڈ کو بھی رپورٹر یہی کہتے تھے کہ وہ جو میچ بھی دیکھنے جاتے ہیں ، ہم وہی ہار جاتے ہیں۔ آسٹریلیا سے میچ جیتنے کے بعد ہمارے چیئر مین فخر سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اُنہوں نے میڈیا کو مخاطب کرکے کہا ''دیکھ لو ! میں بنگلہ دیش میں ہوں ، اِس کے باوجود ہم میچ جیت گئے

ہیں''۔ہمارے پیارے ''ٹُک ٹُک'' مِصباح کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ جس میچ میں وہ ''ہاف سینچری'' کر لیں، وہ میچ ہم ہار جاتے ہیں۔ایشیا کپ فائنل میں مِصباح نے یہ روایت برقرار رکھی۔جونہی اُن کی ہاف سینچری ہوئی کرکٹ کے سبھی شوقین پکار اُٹھے ''لو جی! ہم میچ ہار گئے'' اور ہوا بھی ایسے ہی۔

بہرحال ''دیر آید، درست آید'' کے مصداق ہماری کرکٹ ٹیم نے آسٹریلیا سے میچ جیت لیا اور ہم نے بھی میچ جیتنے کی خوشی میں مبارک باد کی مٹھائی انٹرنیٹ پر ڈال دی ۔جسے ''شوگر'' نہ ہو، وہ شوق فرما سکتا ہے۔ویسے کسی نے ہمیں ''میسج'' بھیجا کہ ہم نے ''اُس کی مٹھائی'' چوری کرکے نیٹ پہ رکھی ہے۔اُس ''بھولی بادشاہ'' کو اتنا بھی علم نہیں کہ ہم پاکستانی ہیں جو چھوٹی موٹی چوریوں کو ''لفٹ'' نہیں کروایا کرتے۔بات اگر کروڑوں، اربوں کی ہوتی تو ہم بھی اپنی ''اشرافیہ ''کی طرح سینہ تان کر اپنی کاریگری'' پر فخر کرتے لیکن ایسی چھوٹی موٹی چوریاں ہماری توہین کے مترادف ہیں'' جس پر ہم ہتکِ عزت کے دعوے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مٹھائی ہے تو زبردست لیکن اسے دیکھ کر صرف ''للچایا'' جا سکتا ہے، کھایا نہیں جا سکتا۔لیکن ہم کہتے ہیں کہ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔اگر یہ قوم گزشتہ 66 سالوں سے صبر کرتے ہوئے ایسے ''حکمرانوں'' کو بھگت سکتی ہے تو ہماری

مٹھائی پر بھی صبر کرلے۔ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن یہ مٹھائی انٹرنیٹ سے ضرور باہر آئے گی۔یہ الگ بات ہے کہ بقول جنابِ آصف زرداری ''وعدے قرآن و حدیث نہیں ہوتے''۔ویسے بھی آجکل انٹرنیٹ کا دَور ہے اور اگر انٹرنیٹ سیاسی جماعتیں ہو سکتی ہیں تو انٹرنیٹ مٹھائی کیوں نہیں ؟۔کچھ عرصہ پہلے تک تحریکِ انصاف کو بھی ''انٹرنیٹ پارٹی''کہا جاتا تھا لیکن اب وہ بھی انٹرنیٹ سے باہر نکل کر صوبہ خیبر پختونخوا کی حکومت سنبھالے بیٹھی ہے۔اسی طرح سے ہماری مٹھائی کے بھی انٹرنیٹ سے باہر آنے کے روشن امکانات ہیں، بس تھوڑے صبر کی ضرورت ہے۔

بات ہو رہی تھی دلّی کے لال قلعے پر جھنڈا لہرانے کی۔ہماری کرکٹ ٹیم نے تو یہ موقع گنوا دیا لیکن اب قوم کی نظریں جماعت الدعوۃ کے حافظ سعید صاحب پر گڑی ہیں جنہوں نے'' احیائے نظریۂ پاکستان مارچ'' سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا '' ہم نے مسلم اکثریتی علاقے بھارت سے چھڑوا کر تکمیلِ پاکستان کے ایجنڈے کو مکمل کرنا ہے ۔دیگر مقررین نے بھی کہا کہ ہندو ہمارا ازلی دشمن ہے جس سے دوستی اور تجارت'' نہیں ہو سکتی۔ہمارے امیرِ جماعتِ اسلامی سیّد منور حسن صاحب نے بھی فرمایا ''بھارت سے دوستی کا مطلب کشمیریوں سے دشمنی ہے۔نواز شریف بھارت سے دوستی کی باتیں کرکے کشمیریوں کے زخموں پر نمک نہ چھڑکیں ''۔سیّد صاحب اور حافظ سعید صاحب کے ارشادات سے مفر ممکن نہیں۔ تحقیق کہ یہ

ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے اور قوم کا بچہ بچہ یہ سمجھتا ہے کہ ہندو بنیا کبھی ہمارا دوست نہیں ہو سکتا۔ ہم لاکھ امن کی آشاؤں کے دیپ جلائیں، اُدھر سے نفرت ہی ملے گی، محض نفرت۔ سوال مگر یہ کہ کیا دین مبیں کے حکم کے مطابق ہم نے اپنے گھوڑے تیار کر رکھے ہیں؟۔ اگر نہیں تو پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا زور تو صِرف ملّی نغموں اور ''کَرش انڈیا'' جیسے نعروں پہ صَرف ہوتا رہے اور دشمن اپنی چال چل جائے۔ ماضی میں بھی ''کَرش انڈیا'' کا گلی گلی میں شور تھا لیکن ہوا یہ کہ انڈیا نے ہمیں ہی کَرش کرکے دو، دو'' پاکستان بنا دیئے جن میں سے ایک اب بنگلہ دیش کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اِس لیے بہتر یہی ہے کہ یا تو ہم اپنے آپ کو اِس قابل بنا لیں کہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں یا پھر کرکٹ کے میدانوں میں ہی انڈیا کو ''کَرش'' کرکے اپنا شوق پورا کرتے رہیں۔

قائد کا مطلوب و مقصود

23 مارچ کو ملک بھر میں 75 واں یومِ پاکستان ملّی جوش و جذبے سے منایا گیا۔ دِن کا آغاز مساجد میں خصوصی دعاؤں اور توپوں کی سلامی سے کیا گیا ملک بھر کے چھوٹے بڑے شہروں میں یومِ پاکستان کے حوالے سے تقاریب منعقد کی گئیں، پرچم لہرائے گئے اور سارا دِن ملّی نغموں کی گونج میں ہم نے یہ ثابت کرنے میں گزار دیا کہ ''ہم زندہ قوم ہیں، پائندہ قوم ہیں''۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ جس دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہم ہر سال یہ دِن مناتے ہیں، پاکستان کی غالب اکثریت کو اُس نظریے کا علم ہے نہ ادراک۔ وہ نظریہ اب یا تو تاریخ کے اوراق کی زینت ہے یا پھر درسی کُتب میں ملتا ہے۔ جس جوش و جذبے سے ہم اپنے مذہبی و قومی دن مناتے ہیں اگر اس جوش و جذبے کا عشرِ عشیر بھی ہم وطن کی مٹی کا حق ادا کرنے کے لیے صرف کر دیتے تو آج یہ خطہ جنت نظیر بن جاتا لیکن ہم تو شاید اُس قومِ بنی اسرائیل کی مانند ہیں جس پر ربِّ کریم نے کھانے کے لیے من و سلویٰ اتارا، سروں پر بادل کی چھت تان دی اور عنایات کی بارش کر دی لیکن وہ احسان ناسپاس قوم بغاوت سے باز نہ آئی اور ربِّ کریم کی بارگاہ میں ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ٹھہری۔ ہمیں بھی وہ ساری دنیاوی نعمتیں عطا کی گئیں جو کسی بھی قوم کو عظمتوں سے روشناس کرانے کے لیے کافی تھیں لیکن ہم ہاتھ پہ

ہاتھ دھرے منتظرِ فردا رہے اور ربّ کا یہ فرمان بھی بھول گئے کہ اللہ کسی قوم کی حالت اُتنی دیر تک نہیں بدلتا جب تک اُسے اپنی حالت خود بدلنے کا خیال نہ ہو۔ بلند بانگ دعوؤں اور تقریروں میں تو ہمارا کوئی ثانی نہیں لیکن جب عمل کی باری آتی ہے تو ہم تقدیر کا بہانہ بنا کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے دیتے ہیں۔ ہماری حالت تو بقولِ اقبال یہ ہے کہ

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
مَن اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

مسلمانانِ ہند نے لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے کر زمین کا یہ ٹکڑا حاصل کیا اور حضرت قائدِ اعظمؒ کا مطلوب و مقصود بھی ایک ایسا پاکستان ہی تھا جسے اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ اُنہوں نے 6 مارچ 1940ء کو رسالہ ٹائم اینڈ ٹائیڈ'' میں اپنے مضمون میں لکھا ''اسلام محض مذہب نہیں بلکہ ایک نظامِ'' حیات ہے جو صرف خُدا اور بندے کے تعلقات تک محدود نہیں بلکہ اپنے پیروکاروں کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو پر محیط ہے۔ وہ اُن کے باہمی تعلقات، اُن کے کلچر، قانون اور پوری معاشرتی زندگی پر حاوی ہے''۔ ہمارے سیکولر دانشور خواہ کچھ بھی کہیں لیکن یہ عین حقیقت ہے کہ قائدِ اعظمؒ کی حصولِ پاکستان کی جدوجہد کا محور و مرکز اسلامی ریاست ہی تھا کیونکہ وہ صرف اسلام کو ہی مکمل ضابطۂ حیات سمجھتے تھے

۔ قائد سے والہانہ محبت کرنے والے ڈاکٹر صفدر محمود صاحب نے اپنے کالم میں لکھا'' 4 مارچ کو شیلاگ کے جلسے میں خواتین سے خطاب کرتے ہوئے قائد نے فرمایا کہ ہر مسلمان کے پاس قُرآنِ کریم کا ایک نسخہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی رہنمائی خود کر سکے کیونکہ قُرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے''۔8 ستمبر 1945ء کو عید پر اپنے پیغام میں اُنھوں نے فرمایا'' اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، قُرآن ایک مکمل کوڈ ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے اور اسوۂ حسنہ کا اتباع ہی ہماری نجات کی ضمانت دیتا ہے''۔اس صراحت کے باوجود بھی ہمارے مغرب زدہ سیکولر دانشور اور فارن NGO,s فنڈنگ پر پلنے والی کے اربابِ اختیار یہ ثابت کرنے کی سعیٔ بیکار کرتے رہتے ہیں کہ قائد کا مطلوب و مقصود سیکولر پاکستان تھا۔اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے وہ ہمیشہ قائد کی 11 اگست کی تقریر کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اُنھوں نے فرمایا تھا'' اب تم سب آزاد ہو اور پاکستان میں تمھیں اِس بات کی پوری آزادی ہے کہ اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جا کر اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرو''۔اگر اللہ ہمارے سیکولر بھائیوں کو عقلِ سلیم عطا کرے تو عرض ہے کہ یہی عین اسلام ہے اور حضورِ اکرم ﷺ کے آخری خطبے کے عین مطابق۔آپ ﷺ کا فرمان ہے ''خُدا کی نظر میں سب انسان برابر ہیں اور تم میں سے ہر ایک کی جان و مال واجبِ احترام ہے۔تُم پر لازم ہے کہ کسی حالت میں بھی ایک دوسرے کی جان و مال پر حملہ نہ کرو۔آج میں ذات، نسل

اور قومیت کے تمام امتیاز اپنے پاؤں تلے روند کر مٹا رہا ہوں''۔ سیکولر دانشوروں سے سوال ہے کہ کیا حضورِ اکرم ﷺ نے مدینہ النبی میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تھی یا سیکولر ریاست کی ؟۔ اگر مدینہ منورہ میں قائم کی جانے والی ریاست اسلامی تھی تو پھر قائدِ اعظمؒ کے ہاتھوں تشکیل پانے والی یہ ریاست اسلامی کیوں نہیں ہو سکتی ؟۔ سوال یہ بھی ہے کہ اگر قائد کا مطلوب و مقصود ایک سیکولر ریاست ہی تھی تو پھر تقسیمِ ہند کی سرے سے ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ ایک سیکولر ریاست کا تصور تو کانگرس پہلے ہی پیش کر چکی تھی۔گاندھی کے خط کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے 17 مارچ کو قوم کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ''ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ لفظ ''قوم'' کی ہر معقول تعریف اور قومیت کے ہر صحیح معیار کی رو سے ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں ۔ ہم ایک مختلف تہذیب و تمدن کے وارث ہیں ۔ ہماری اپنی زبان ہے اور اپنا ادب ، ہماری اقدار، ضابطۂ اخلاق ، قوانین ، رسمیں ، نظامِ تقویم ،تاریخ ، روایتیں ، آرزوئیں اور صلاحیتیں سب دوسروں سے الگ ہیں ۔ہمارا نقطۂ نظر اور اندازِ فکر دوسروں سے یکسر مختلف ہے ، ۔ 14 دسمبر 1940ء کو کنگز وے ہال لندن میں تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا'' ہم ایک ایسی آزاد مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں ہم اپنی مرضی اور ''مخصوص'' تصورات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں ۔ جمہوریت کا تصور مسلمانوں کی گھٹی میں پڑا ہے ۔اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب میں مسجد میں نماز پڑھنے جاتا ہوں تو میرا شوفر اکثر میرے ساتھ کھڑا ہوتا ہے

ہے۔''

دینِ مبیں کو مکمل ضابطۂ حیات قرار دینے والے بابائے قوم صرف عبادات ہی نہیں بلکہ معاشی و معاشرتی زندگی کے ہر شعبے میں دین کی رہنمائی اور عملداری کے خواہاں تھے قائدِ اعظمؒ کے اولین سوانح نگار ہیکٹر بولائتھو نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ کراچی، ریڈیو سٹیشن کے ریکارڈ روم میں قائدِ اعظمؒ کی تقریر کا وہ گراموفون ریکارڈ موجود ہے جس میں انہوں نے فرمایا ''مغربی معاشی نظام، معاشی عدل کے تقاضے پورے کر سکا نہ بین الاقوامی مخاصمت کا مداوہ کر سکا۔ گزشتہ نصف صدی میں جو دو عالم گیر جنگیں ہوئی ہیں ان کی ذمہ داری زیادہ تر اسی معاشی نظام پر ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے مخصوص تصورات و مقاصد کے مطابق اپنے اقتصادی نظام کی تشکیل کریں اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نمونہ پیش کریں جو انسانی مساوات اور معاشی انصاف کے اسلامی تصورات کا آئینہ دار ہو۔ اس طرح وہ مشن بھی پورا ہو جائے گا جس کے لیے ہم نے بہ حیثیت مسلمان اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے''۔ اس کے باوجود بھی اگر محض انگریزی لباس پہننے، سر ڈنشا کی بیٹی سے شادی کرنے اور بری، بحری، فضائی چیفس، دو صوبوں کے گورنر اور ملٹری سیکر ٹری انگریز مقرر کرنے کی بنا پر حضرتِ قائدؒ کو سیکولر ذہن کا حامل قرار دینے پر مصر ہے تو کیا کہا جا سکتا ہے۔ تاریخی حقیقت تو یہی ہے کہ سر ڈنشا کی بیٹی کو مسلمان

کرکے شادی کی گئی لیکن جب اُن کی اپنی بیٹی نے ایک پارسی سے شادی کی تو قائدِ اعظم نے تا دمِ مرگ بیٹی کی شکل نہیں دیکھی۔ انگریزی لباس کی اسلام میں کوئی ممانعت ہے نہ غیر مسلموں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی۔ سر آرچی بالڈ رولینڈز متحدہ ہندوستان کے آخری وزیرِ خزانہ، جارج کیننگم صوبہ سرحد اور فرانسس موڈی سندھ کے گورنر تھے جن کی خدمات سے استفادہ کیا گیا۔ ایڈمرل جیفر کو بحری فوج کی کمان صرف اِس لیے سونپی گئی کہ اُس وقت صرف دو پاکستانی آفیسر ایسے تھے جن کا تجربہ آٹھ سال تھا۔ یہی حال بَری اور فضائی فوج کا تھا۔ اِن اصحاب کی خدمات سے فائدہ اُٹھانے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ قائدِ اعظم کا مطلوب و مقصود سیکولر پاکستان تھا۔ 24 مارچ 1940ء کو قرار دادِ پاکستان کی منظوری کے بعد قائدِ اعظمؒ نے مطلوب الحسن سید کو کہا ’’اگر اقبالؒ آج زندہ ہوتے تو یہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے کہ ہم نے بالآخر وہی فیصلہ کیا جس کی انہیں آرزو تھی‘‘۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ اقبالؒ کے تصورات کا محور و مرکز خودی تھا اور اُن کے نزدیک ’’خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ‘‘۔ (باقی بشرطِ زندگی پھر کبھی)

چَل اُڑ جا رے پنچھی

ہم نہ کہتے تھے کہ ہمارا کمانڈو ڈرتا ورتا کسی سے نہیں۔ سب نے دیکھا کہ پرویز مشرف صاحب نے غداری کیس کی 36 ویں سماعت پر ''کٹہرے'' میں کھڑے ہو کر اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کو ''مردانہ وار'' سُنا۔ اُن کی خصوصی عدالت میں عدم حاضری کسی خوف کی بنا پر نہیں تھی۔ در حقیقت ہمارے کمانڈو چاہتے ہی یہ تھے کہ جب اُن کا جی چاہے، تبھی وہ عدالت میں جائیں تاکہ یہ اثر زائل ہو سکے کہ مُکّے لہرانے والے کمانڈو پر کوئی ''زور، زبردستی'' بھی ہو سکتی ہے۔ پرویز مشرف صاحب نے صحتِ جرم سے انکار کے بعد خصوصی عدالت میں ''تاریخی خطاب'' فرمایا۔ اُن کی آواز کی گھَن گَرج سے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کبھی ''بیماریٔ دِل'' میں مبتلاء بھی ہوئے ہوں گے۔ اُنہوں نے فرمایا'' ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے، ترقی و خوشحالی لانے اور عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے والا شخص کسی طور پر غدار نہیں کہلایا جا سکتا۔ میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر اور اپنی بوڑھی ماں اور بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اپنے دَور میں ایک پیسے کی کرپشن نہیں کی اور اپنے آٹھ سالہ دور میں ملک کے لیے جو کچھ کیا وہ پاکستان کی ساری تاریخ پر بھاری ہے''۔ کچھ مشرف مخالف ''بد باطن'' یہ کہتے ہیں کہ پرویز مشرف

صاحب نے واقعی ”ایک پیسے“ کی کرپشن نہیں کی کیونکہ ایک پیسے کے سکّے کا تو پاکستان میں وجود ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی تو اسے کوئی فقیر تک قبول نہ کرتا۔اُنھوں نے تو کروڑوں، اربوں اکٹھے کیے جس کی واضح مثال یہ ہے کہ اُنھوں نے پاکستان میں اپنے جو اثاثے ظاہر کیے اُن کی مالیت بھی کروڑوں نہیں، اربوں میں ہے۔بیرونی ممالک میں خریدی گئی جائیداد اِس کے علاوہ ہے۔بھلا ایک گورنمنٹ ملازم، خواہ وہ چیف آف آرمی سٹاف ہی کیوں نہ ہو، اتنی جائیداد کا مالک کیسے ہو سکتا ہے؟۔لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ واقعی کمانڈو نے ملک کے لیے جو کچھ کیا، وہ ساری پاکستانی تاریخ پر بھاری ہے کیونکہ پاکستان کیا، دُنیا کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی سربراہِ مملکت نے اپنی قوم کی بیٹیوں تک کو غیروں کے ہاتھ بیچ ڈالا ہو یا اپنی دھرتی کو غیروں کے استعمال کے لیے یوں کھول دیا ہو کہ جیسے اِس کا کوئی ”والی وارث“ ہی نہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ہمارے کمانڈو نے واقعی ایسی تاریخ رقم کی ہے کہ حمزہ شہباز صاحب کو سارے کام ادھورے چھوڑ کر، اپنی اولین فرصت میں پرویز مشرف صاحب کا نام گینیز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں لکھوانا چاہیے۔اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہونگے کہ میاں خاندان کے ”وارثِ اعلیٰ“ نے محض حسد کی بنا پر ایسا نہیں کیا اور ابھی تک وہ اپنے خاندان کی جلاوطنی کا دُکھ نہیں بھولے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ''محبوب لیڈر'' اب بیرونِ ملک جانے کو تیار بیٹھے ہیں لیکن ایسا وہ اپنی مرضی سے کر رہے ہیں، کسی خوف کی بنا پر نہیں۔ دراصل تین ماہ تک AFIC کی ''قیدِ تنہائی'' کاٹنے کے بعد ہمارے ''ہر دلعزیز رہنما'' کچھ ''اوازار'' سے ہو گئے ہیں اِس لیے وہ اب اپنی ''مخصوص دِل چسپیوں'' کی دنیا میں پھر سے لوٹنا چاہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ '' جمہور'' منہ دیکھتے رہ گئے اور ریمنڈ ڈیوس پھُر سے اُڑ گیا۔ اب پھر جمہور تلملاتے رہ جائیں گے اور کمانڈو پرواز کر جائے گا۔ شاید جمہوریت اسی کا نام ہے کہ جمہور'' کی سُنی جائے، نہ مانی۔ شنید ہے کہ ایک خلیجی ملک کا طیارہ نور خاں ایئر بیس'' پر پہنچ چکا اور سب تیاریاں مکمل، بَس گرین سگنل کا انتظار۔ تقویت اِس خبر کو یوں بھی پہنچتی ہے کہ سُننے میں یہ بھی آیا ہے کہ مشرف صاحب کو AFIC سے ڈسچارج کر کے گھر بھیجا جا رہا ہے تاکہ ''شَر پسند میڈیا'' یہ نہ کہہ سکے کہ فوج نے بالآخر اپنے چیف کو باہر بھیج کر ہی دَم لیا۔ اِن '' بھولے پنچھیوں'' کو کون سمجھائے کہ ہمہ مقتدر ادارہ آج بھی صرف فوج ہی ہے۔ یہ بجا کہ جنرل کیانی صاحب کے چھ سالہ دَور میں فوج کے بارے میں ایسا تاثر کافی حد تک کم ہوا اور کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''فوج ستّو پی کر سوئی ہوئی ہے'' لیکن پرویز مشرف کیس نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا'' ۔ آخر قوم نے اِس کیس سے کیا حاصل'' کرنا

چاہتی ہے؟۔کیا عدل کی حکمرانی جو فی الحال تو ناممکن ہے۔جب سے ٹرائل شروع ہوا ہے قوم کے خون پسینے سے حاصل کیے گئے کروڑوں روپے مشرف صاحب کی سکیورٹی پر، صرف ہو چکے ہیں لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ قوم کو ''سو جوتے بھی مارے جائیں گے اور سو پیاز بھی کھلائے جائیں گے''۔شاید اسی کو بھانپتے ہوئے لال مسجد والے مولانا عبدالعزیز نے بھی کہہ دیا ہے کہ مشرف کو معافی دے کر انگلینڈ بھیج دیا جائے اور اُس کی سکیورٹی پر صرف ہونے والے کروڑوں روپے ''تھَر'' کے مظلومین کو بھیج دیئے جائیں۔ہمیں مولانا صاحب کی اِس تجویز سے مکمل اتفاق ہے اور وجہ یہ ہے کہ ہم بنفسِ نفیس''پرویز مشرف صاحب کی سکیورٹی پر کیے جانے والے انتظامات کو بھگت چکے'' ہیں۔ہوا یوں کہ ایک عزیز کی رحلت پر 31 مارچ کو راولپنڈی جانا پڑا۔راولپنڈی پہنچ کر ہم نے سڑکیں گھومنا شروع کیں لیکن ہر جگہ پرویز مشرف صاحب کی سکیورٹی کے لیے لگا ''روٹ'' ہمارا مُنہ چڑاتا رہا۔دراصل ہمارا ''روٹ'' بھی وہی تھا جو ہمارے کمانڈو کا تھا۔اِس لیے نہ پائے ماندن، نہ جائے رفتن کے مصداق ہم ایک جگہ گاڑی روک کر کھڑے ہو گئے۔میاں کی متواتر بڑبڑاہٹ ہمارے کانوں میں رَس گھولتی رہی۔ہم خوش تھے کہ ہمارے کمانڈو نے اقتدار میں نہ ہوتے ہوئے بھی پورے پنڈی کو جام کرکے عوام کو ''وخت'' میں ڈال دیا ہے۔لگ بھگ ایک گھنٹہ انتظار کے بعد ہمارے کمانڈو کا قافلہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ہم نے اُچک اُچک کر قافلے کی گاڑیاں گننے کی کوشش کی لیکن بے سود کیونکہ قافلہ ہی اتنا بڑا

تھا کہ گنتی مشکل تھی۔ جو لوگ ہمارے کمانڈو کی مقبولیت کے منکر ہیں اُنہیں، جس شان سے ہمارے کمانڈو باہر نکلتے ہیں، اُس کا نظارہ کروا دینا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ ایسی شان دیکھ کر وہ خود ہی شرمندہ ہو جائیں گے۔ میرے میاں "نمازِ جنازہ" میں شرکت سے تو محروم رہ گئے، لیکن ہم خوش تھے کہ ہم نے اپنے کمانڈو کی "عظمتوں" کا نظارہ کرکے اپنی آنکھیں "ٹھنڈی" کر لیں۔

بات ہو رہی تھی پرویز مشرف صاحب کے بیرونِ ملک جانے کی۔ خصوصی عدالت نے تو صاف کہہ دیا کہ اُس نے تو پرویز مشرف صاحب کا نام ای سی ایل میں ڈالنے کا حکم نہیں دیا۔ یہ فیصلہ وزارتِ داخلہ کا ہے اِس لیے اُسی سے رجوع کیا جائے۔ گویا جو بال حکومت نے خصوصی عدالت کی کورٹ میں پھینکی تھی، خصوصی عدالت نے وہی بال "ٹھُگلی" مار کر حکومتی کورٹ میں واپس پھینک دی۔ اِس کے باوجود بھی وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب فرماتے ہیں کہ سابق صدر کا معاملہ عدالت میں ہے۔ صدرِ مملکت ممنون حسین صاحب کا فرمان ہے کہ وہ وزیرِ اعظم صاحب کی سفارش پر عمل کریں گے۔ شنید ہے کہ میاں صاحب نے نواز لیگ کے سینئر رہنماؤں کو ظہرانے پر بُلا لیا ہے۔ اندازہ یہی ہے کہ ظہرانے پر پرویز مشرف صاحب کی بیرونِ ملک روانگی کے بارے میں صلاح مشورہ کیا جائے گا۔ اپنے وزیرِ دفاع خواجہ محمد آصف "سیالکوٹی" کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پرویز مشرف صاحب کو راتوں رات جانے دیں۔ ہو سکتا ہے کہ خواجہ صاحب کا پروگرام

پرویز مشرف صاحب کو فُل پروٹوکول اور گارڈ آف آنر کے ساتھ باہر بھیجنے کا ہو۔آخر وہ ہمارے سابق چیف آف آرمی سٹاف ، سابق صدر اور سابق چیف ایگزیکٹو (تھری اِن وَن) ہیں۔اُنہیں بھلا ''ایویں ای'' کیسے جانے دیا جا سکتا ہے۔البتہ اِس سارے افسانے میں وہ بالکل خاموش ہیں جنہیں وزیرِ داخلہ کہا جاتا ہے حالانکہ اُنہیں تو بولنے کا ''شوق ای'' بہت ہے۔

حکومت سے توقعات اور خدشات

مسلم لیگ (ن) اِس لحاظ سے بڑی ''مالا مال'' ہے کہ اُسے ورثے میں اتنا ڈھیروں ڈھیر ملا، جو اُس سے سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ خودکش حملے، بم دھماکے، مہنگائی، بھوک، ننگ، خالی خزانہ، لوڈشیڈنگ، بربادیوں کے بحرِ بے کنار میں غوطے کھاتی معیشت، برداشت کی حدیں توڑتے عوام اور سب سے بڑھ کر طالبان اور پرویز مشرف۔ خادمِ اعلیٰ نے تو حسبِ سابق دِل بہلانے کے بہانے ڈھونڈھ لیے لیکن بڑے میاں صاحب کے حصّے میں آئے طالبان اور پرویز مشرف۔ وہ دل ہی دل میں یہ تو ضرور کہتے ہونگے کہ

حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو مَیں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گَر کو مَیں

یوں تو میاں صاحب نے محترم پرویز رشید کو ''نوحہ گری'' کافریضہ ادا کرنے کا حکم دے رکھا ہے اور پرویز رشید صاحب گاہے بگاہے روتے پیٹتے عوام کو ''کڑوی گولیاں'' کھانے کی تلقین بھی کرتے رہتے ہیں لیکن عبث کہ یہ دھیمے مزاج کے پرویز رشید صاحب کے بَس کا روگ نہیں۔ اگر خواجگان (خواجہ آصف، خواجہ سعد رفیق) میں سے کوئی ہوتا تو کوئی بات بھی تھی لیکن پرویز رشید صاحب تو جب انتہائی جلال میں ہوتے ہیں، تب بھی اُن کے فطری ''دھیمے پَن'' کو دیکھ کر

بے ساختہ ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔

جَلا وطنی کی کوکھ سے جَنم لینے والے میاں صاحب اُس باغ و بہار شخصیت کے مالک میاں نواز شریف سے یکسر مختلف نظر آتے ہیں۔ طبیعت میں ٹھہراؤ، چہرے پر گھمبیر خاموشی اور ہونٹ تو جیسے مسکرانا بھول ہی گئے ہوں۔ لیکن ایک بات ہے کہ طبیعت کا جیالاپَن تا حال برقرار ہے اِسی لیے تو اُنہوں نے پرویز مشرف صاحب کا نام ECL سے نکالنے سے صاف انکار کر دیا اور یہ جواز بناتے ہوئے بال ایک دفعہ پھر عدلیہ کی کورٹ میں پھینک دی کہ سندھ ہائی کورٹ کے حکم پر پرویز مشرف کا نام ECL میں ڈالا گیا تھا، اب اُسی سے رجوع کیا جائے۔ مشرف صاحب بھی ماشاء اللہ صحت یاب ہو کر رات کے 2 بجے AFIC کے پچھلے دروازے سے نکل کر گھر سدھار چکے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے عدالتی پیشی نے اُن کے دِل کے ''بائی پاس'' کا سا کام کر دکھایا ہو۔ اِس لیے اگر کوئی ''ہمارے کمانڈو کو ECL میں ڈال کر اپنا شوق پورا کرنا چاہتا ہے تو کرتا پھرے کیونکہ ہمارے لیڈر'' کا نام اب ''چَک شہزاد'' میں وہ سب کچھ میسر ہے جس کی قوم صرف تمنّا ہی کر سکتی ہے، حاصل نہیں۔

اُدھر خادمِ اعلیٰ ہیں کہ طوفانوں کا رُخ موڑنے کے لیے ہمہ وقت بیتاب۔ بیوروکریٹس، جو کسی زمانے میں '' فراعینِ وقت''ہوا کرتے تھے، اب اُن کے سامنے سہمے

ہوئے کبوتر بنے بیٹھے ہیں۔ بھلا یہ بیوروکریٹس کس کھیت کی مولی ہیں، خادمِ اعلیٰ تو اپنے وارثِ اعلیٰ کو بھی یہی درس دیتے رہتے ہیں کہ

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ہمہ وقت، ہمہ تَن و ہمہ دَم مصروفِ پیکار خادمِ اعلیٰ ایک پَل کے لیے چین سے بیٹھتے ہیں، نہ کسی کو بیٹھنے دیتے ہیں۔ خود تو شاید وہ بے خوابی کے مَرض میں مبتلاء ہیں لیکن دوسروں کی نیند ''ایویں خوامخواہ'' اُڑائے رکھتے ہیں۔ اگر کوئی دَست بَستہ عرض کرے کہ ''سرکار سانوں وی ساہ کَڈ لَین دیو'' تو فوراً ارشاد ہوتا ہے

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دَم ہے اگر تُو، تو نہیں خطرۂ افتاد

وہ جب کبھی غیر ملکی دَورے پہ نکل جاتے ہیں تو سبھی سُکھ کا سانس لیتے ہیں لیکن یہ ''سُکھ چَین'' وقتی اور لمحاتی ہوتا ہے کیونکہ وہ پلک جھپکتے میں جھولی بھَر کر لوٹ آتے ہیں۔ پتہ نہیں اُن کے پاس کون سی ''گیدڑ سِنگھی'' ہے جس کے زیرِ اثر وہ غیر ملکی سَربراہان کو مَدہوش کرکے، جھولیاں بھر لاتے ہیں۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک خاں صاحب نے KFC کے آپریٹر کو فون کرکے

اپنا آرڈر لکھواتے ہوئے کہا "4 فرائڈ چکن، 6 زنگر برگر، 6 ہاف لٹر پیپسی اور چپس" ۔آپریٹر نے مؤدبانہ انداز میں کہا "سَر! کس کے نام پر"؟۔ خاں صاحب نے فرمایا اللہ کے نام پر"۔ خادمِ اعلیٰ بھی اپنے "پلّے" سے کچھ نہیں دیتے، سب کچھ مفت میں "بٹورتے ہیں۔ چین سے 32 ارب ڈالر کے منصوبے اور ترکی سے پتہ نہیں کیا، کیا کچھ وصول کر چکے ہیں لیکن بہت کچھ وصول کرنے کی تمنّا۔اُنہوں نے آپریشنز اور خطرناک ملزموں کی گرفتاری کے لیے لاہور، ملتان، راولپنڈی، فیصل آباد، سرگودھا اور بہاولپور میں پولیس فورس کو ہیلی کاپٹرز دینے کا منصوبہ بنایا لیکن منصوبہ بنانے سے پہلے چین اور ترکی سے مالی معاونت کا وعدہ بھی لے لیا۔ شنید ہے کہ فی الحال 6 ہیلی کاپٹرز لاہور، راولپنڈی اور ملتان کی پولیس کو دیئے جا رہے ہیں۔ چلو اچھا ہی ہوا کہ اب ہمارے پولیس والے بھی فضاؤں میں تیرتے پھریں گے۔ پہلے تو بیچارے شدید گرمی میں "ناکوں" پر "سِکّ سَڑ" جاتے تھے جس کا سارا غصّہ وہ عوام پر ہی نکالتے تھے ۔اب شاید فضائی نگرانی ہی سے بات بَن جائے۔

تین چار روز پہلے چنیوٹ میں خطاب کرتے ہوئے خادمِ اعلیٰ نے قوم کو یہ خوشخبری سنائی کہ پنجاب حکومت اور چینی کمپنی میٹالرجیکل کارپوریشن آف چائنہ کے مابین لوہے کے ذخائر کی دریافت کے حوالے سے تاریخی معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں اور ابتدائی معلومات کے مطابق چنیوٹ میں لوہے کے اعلیٰ

کوالٹی کے اربوں، کھربوں ڈالر کے ذخائر موجود ہیں۔ زمین کی تہہ میں موجود لوہے کے ذخائر کے معیار اور مقدار کا حتمی تعین کرنے کے لیے مذکورہ چینی کمپنی نے 18 ماہ کا وقت مانگا لیکن چھوٹے میاں صاحب نے اپنی انگشتِ شہادت زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا کہ نہیں، صرف 10 ماہ میں یہ رپورٹ مل جانی چاہیے۔ اب بیچاری چینی کمپنی ''وَخت''میں پڑی ہو گی۔ ہم تو یہی عرض کریں گے کہ میاں صاحب ''ہَتھ ہولا رکھیں'' یہ چینی کمپنی ہے، آپ کے بیوروکریٹس نہیں۔ خادمِ اعلیٰ نے چنیوٹ میں دُنیا کی سب سے بڑی سٹیل مِل لگانے کا اعلان بھی کیا۔ بہت جلد پتہ چل جائے گا کہ سٹیل مِل لگانے کے لیے اُنھوں نے کس کا ''گلا'' تاڑ رکھا ہے۔ ویسے اگر کوئی میرا مشورہ مانے تو پہلے والی بیچاری، مصیبت کی ماری ''سٹیل مِل'' بھی خادمِ اعلیٰ کے سپرد کر دینی چاہیے۔ جس سے خادمِ اعلیٰ کا شوق بھی پورا ہو جائے گا اور شاید برباد سٹیل مِل کے دن بھی پھِر جائیں۔ کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ یہ یقیناً خادمِ اعلیٰ کی صحبت ہی کا اثر ہو گا جو وزیرِ خزانہ جناب اسحاق ڈار نے رنگ پکڑا اور (پتہ نہیں کہاں سے) ڈیڑھ ارب ڈالر حاصل کر لیے۔ ڈار صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ایک دوست ملک کی طرف سے تحفہ ہے لیکن یہ بات پیپلز پارٹی کو ''ٹھنڈے پیٹوں'' ہضم نہیں ہو رہی۔ قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ صاحب اپنی

مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بار بار حکومت سے پوچھتے ہیں ”بتاؤ ! کیا چکر ہے“ ۔دراصل پیپلز پارٹی والے اِس لیے پریشان ہیں کہ اُن کے دَور میں تحفہ تو دور کی بات ہے کوئی اُنہیں ادھار دینے کو بھی تیار نہیں تھا۔ نواز لیگ کو ڈیڑھ ارب ڈالر ”ایویں ای“ کیسے مِل سکتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی اِس تلملاہٹ کا مزہ لیتے ہوتے ہوئے حکومت تا حال ڈٹی ہوئی ہے کہ یہ ”تحفہ“ غیر مشروط ہے ۔دراصل یہ پھڈا اِس لیے پڑا کہ جب دوست ملک“ نے ڈیڑھ ارب ڈالر دیئے تو ساتھ ہی ”شرارتی“ میڈیا نے شور مچا دیا“ کہ یہ پیسے سعودی عرب نے وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب کی ذاتی گارنٹی پر دیئے ہیں ۔اب ظاہر ہے کہ اگر یہ ”تحفہ“ ہے تو گارنٹی کیسی اور اگر واقعی گارنٹی دی گئی ہے تو کِس بات کی ؟۔ پیپلز پارٹی تو شور مچا رہی ہے لیکن تحریکِ انصاف بالکل خاموش ہے ۔وجہ شاید یہ ہو کہ محترم عمران خاں صاحب تو خود ”بٹورنے“ میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں اور وہ تو اِس فن میں اتنے ماہر ہیں کہ ”کھالیں“ تک اتار لیتے ہیں اِس لیے تحریکِ انصاف نے سوچا ہو گا کہ اگر اُن کا رہنما اِس فن میں طاق ہو سکتا ہے تو کوئی دوسرا کیوں نہیں ؟۔

سویلین بالادستی کی طرف پہلا قدم

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

یہ کوئی الف لیلوی داستاں ہے نہ گُل و بُلبل کا قصہ کہ سنا، مزہ لیا اور بھلا دیا۔ یہ تو جمہوریت کی مضبوطی اور آمریت کے خاتمے کی جنگ ہے۔ اگر جمہوری قوتیں مضبوط ہو گئیں تو صحنِ چمن بادِ نسیم و شمیم کے جھونکوں سے معطر ہو جائے گا وگرنہ خزاؤں کی بادِ سموم سے واسطہ تو ہے ہی۔ خرابئ قسمت یہ کہ قوم کا واسطہ ایس ایم ظفر جیسے ماہرینِ آئین و قانون سے ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آئین و قانون پر عمل ضروری ہے لیکن امورِ مملکت میں بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ لا ریب گزشتہ 66 سالوں سے یہی ''بہت کچھ'' ہماری قومی زندگی کو گھُن کی طرح چاٹتا رہا اور نظریۂ ضرورت بھی اسی ''بہت کچھ'' کی کوکھ سے جنم لینے والا وہ ناسور ہے جس پر کسی ''جراح'' کو کبھی نشتر زنی کی ہمت نہیں ہوئی۔ یہ بھی اسی نظریۂ ضرورت کا پڑھایا ہوا سبق ہے کہ جہاں کمزور کی گردن ہاتھ آئی، اُسے سولی پر چڑھا دیا اور اگر زور آور کا سامنا ہو گیا تو بھیگی بلی بن گئے۔ حکمت کی کتاب ایسی ہی قوموں کے بارے میں کہتی ہے ''اگر تم منہ موڑو گے تو وہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہونگے''۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ حرف حرف پڑھنے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ''میں الزام اس کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا'' ۔ ہمیشہ یہی ہوتا آیا کہ جب بھی کسی طالع آزما نے حکومت پر قبضہ کیا تو تمام سیاسی جماعتیں اُس کی پشت پر کھڑی ہو گئیں ۔ کہا جا سکتا ہے کہ بھٹو مرحوم کی پھانسی اور میاں نواز شریف کی جلا وطنی کی اصل ذمہ دار پاکستان کی سیاسی جماعتیں ہی تھیں ۔ جب ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا تو سوائے پیپلز پارٹی کے تمام سیاسی جماعتیں ضیاء الحق کی دست و بازو بن گئیں ۔ ایسا ہی میاں نواز شریف صاحب کے ساتھ بھی ہوا اور ایک آمر کو دَس بار وردی میں منتخب کرانے کے دعوے دار پیدا ہو گئے ۔ مارشلاؤں کی چھتری تلے بے اختیار سول حکومتیں تشکیل پاتی رہیں لیکن فیصلہ ساری کا کُلّی اختیار ہمیشہ فوجی قیادت ہی کے پاس رہا۔ اگر کبھی مارشل لاء کی چھتری کے بغیر ٹوٹی پھوٹی سول حکومتیں قائم بھی ہوئیں تو فوج نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اُنہیں چلتا کیا۔ پیپلز پارٹی کے پچھلے پانچ سالہ دَورِ حکومت میں بھی حساس نوعیت کے فیصلے فوج ہی کرتی رہی اور اندرونی نوعیت کے فیصلے بھی فوجی قیادت کے صلاح مشورے سے ہی کیے جاتے رہے ۔ سول حکومتوں کے لیے کرپٹ فوجی کیس میں فوج نے دو ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرلز اور ایک NLC جرنیل ہمیشہ شجرِ ممنوعہ رہے میجر جنرل کا ٹرائل کرنے سے سول حکومت کو یہ کہتے ہوئے روک دیا کہ اِن اصحاب کا

ٹرائل فوج خود کرے گی لیکن آج تک ایسا نہیں ہوا۔رائل پام کیس میں بھی فوجی جرنیلوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور اصغر خاں کیس بھی سرد خانے کی نذر ہو چکا ہے۔مسنگ پرسنز کا معاملہ بھی گھمبیر صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔سابقہ ڈکٹیٹر پرویز مشرف کے خلاف آئین شکنی کے کیس میں اسٹیبلشمنٹ کا رویہ سب کے سامنے ہے۔شاید یہ دنیا کی واحد مثال ہو کہ ایک ملزم کو تین ماہ تک ملٹری ہسپتال کے وی وی آئی پی روم میں رکھا گیا لیکن نہ تو اُس کا علاج ہوا، نہ ہی ڈسچارج کیا گیا۔اصول تو یہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ہسپتال سے علاج کروانے سے انکاری ہو تو اسے فوری طور پر ڈسچارج کر دیا جاتا ہے لیکن اگر مریض پرویز مشرف جیسا ہو تو پھر شاید اصول و ضوابط الماری میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔اسٹیبلشمنٹ نے قدم قدم پر ایسے ثبوت چھوڑے جنہیں دیکھ کر ایک عام فہم انسان بھی بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ پرویز مشرف صاحب کو" مقتدر قوتوں" کی آشیرباد حاصل تھی اور اب بھی ہے۔خفیہ ایجنسیوں نے وزارتِ داخلہ کو پرویز مشرف صاحب کی سکیورٹی کے بارے میں خط بھیجا لیکن اُس خفیہ خط کی ایک کاپی پرویز مشرف کے وکیلوں تک بھی پہنچا دی گئی جس کی بنا پر وہ عدالت میں حاضری سے بچ گئے۔پھر جس انداز سے اُن کے وکلاء خصوصی عدالت کے ججز کی کھلم کھلا توہین کرتے رہے اُس سے بھی صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی مضبوط ہاتھ کی شہ پر ایسا کر رہے تھے۔پرویز مشرف صاحب کے وکیل خالد رانجھا سے جب ایک اینکر نے سوال کیا کہ وکلاء بار بار توہین

عدالت کے مرتکب کیوں ہو رہے ہیں تو اُن کا جواب تھا کہ ایسا سب کچھ پرویز مشرف کی ہدایت پر کیا جا رہا ہے۔ کیا وکلاء ایسا پرویز مشرف جیسے بے اختیار شخص کی ایماء پر کر رہے تھے؟۔ یقیناً انہیں کوئی مضبوط گارنٹی ہی دی گئی ہو گی جو اُن کی زبانیں اتنی دراز ہوتی چلی گئیں کہ قانونی تاریخ کا یہ انوکھا واقعہ بھی چشمِ فلک نے دیکھا کہ خصوصی عدالت کے ججز وکیلوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے واک آؤٹ کر گئے۔

پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں ہی جلاوطنی کا دکھ جھیلنے والے میاں نواز شریف کی مسلم لیگ شعور کی اُس منزل تک پہنچ چکی تھی جہاں فیصلے ذاتی نہیں، ملکی مفادات کو مدِّ نظر رکھ کر کیے جاتے ہیں۔ نواز لیگ ''فرینڈلی اپوزیشن'' کے طعنے سنتی رہی لیکن میاں نواز شریف صاحب کا کندھا ہمیشہ پیپلز پارٹی کے لیے حاضر رہا۔ سیاست دان مذاق اڑاتے اور تجزیہ نگار طنز کے تیر برساتے رہے لیکن میاں صاحب نے اپنی سوچ نہ بدلی۔ شاید جلا وطنی کی بھٹی میں تپ کر کُندن بن جانے والے میاں صاحب کو یہ ادراک ہو چکا تھا کہ اگر پیپلز پارٹی کی حکومت کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی تو پھر ایک دفعہ پھر مارشل لاء کا دکھ جھیلنا پڑے گا۔ اگر کسی کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے تو کہا جا سکتا ہے کہ دن بدن مضبوط ہوتی جمہوریت میاں نواز شریف کی اسی ''فرینڈلی اپوزیشن'' کا وہ ثمر ہے جس نے حکومتِ وقت کو وہ جراتِ رندانہ عطا کی کہ

پرویز مشرف کیس میں وزیرِ اعظم صاحب نے یہ کہہ کر مقتدر قوتوں کو صاف جواب دے دیا ہے کہ ''قانون اپنا طے شدہ راستہ خود اختیار کرے گا اور اس میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی''۔ افواجِ پاکستان کے شدید ترین دباؤ، چیف آف آرمی سٹاف اور ڈی جی آئی ایس آئی کی جنابِ وزیرِ اعظم سے بار بار ملاقاتوں کے باوجود قانون نے اپنا طے شدہ راستہ ہی اختیار کیا اور جنرل (ر) پرویز مشرف پر فردِ جرم عائد بھی ہوئی اور حکومت نے اُن کی بیرونِ ملک روانگی کی درخواست بھی مسترد کر دی جس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ ملک میں سویلین بالا دستی قائم کیے جانے کی طرف موجودہ حکومت نے پہلا قدم اٹھا دیا ہے۔ ایسا صرف اس بنا پر ہوا کہ اب کی بار سیاسی جماعتیں ایک آمر کی بجائے جمہوری حکومت کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہو گئیں اور سوائے ایم کیو ایم کے کوئی بھی قابلِ ذکر سیاسی جماعت آمر پرویز مشرف کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ اب تو سبھی یک زبان ہیں کہ آئین شکنی کے اِس کیس کو اپنے منطقی انجام تک پہنچنا چاہیے۔ اب تمام سیاسی جماعتیں ایک امتحان گاہ میں ہیں اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ سرخ رو ہو کر نکلتی ہیں تو جمہوریت مستحکم ہو گی اور اسٹیبلشمنٹ پس پردہ چلی جائے گی۔ فی الحال تو یہی نظر آ رہا ہے کہ سول قیادت ہی فیصلہ سازی میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہے لیکن یہ بھی عین حقیقت ہے کہ میاں نواز شریف صاحب نے اپنے آپ کو ایک دفعہ پھر کڑے امتحان میں ڈال لیا ہے۔ جلاوطنی کا ٹنے کے بعد جب میاں

صاحب پاکستان آئے تو ایک دفعہ صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے از راہِ تفنن کہا "لوگ کہتے تھے قدم بڑھاؤ نواز شریف، ہم تمہارے ساتھ ہیں لیکن جب میں نے قدم بڑھایا تو میرے پیچھے کوئی بھی نہ تھا"۔ میاں صاحب ایک دفعہ پھر قدم بڑھا چکے، اب یہ تمام سیاسی جماعتوں، عدلیہ، میڈیا اور عوام کا فرض اور دھرتی ماں کا حق ہے کہ اپنے تمام سیاسی اختلافات بھلا کر کم از کم اس معاملے میں میاں صاحب کے قدم سے قدم ملا کر یہ ثابت کر دیں کہ وہ جمہوریت کی مضبوطی کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہیں لیکن اگر اب بھی سیاسی ماہر اپنی چالیں چلتے رہے اور ایک دفعہ پھر (خدا نخواستہ) اکتوبر 1999ء جیسا کوئی سانحہ ہو گیا تو پھر "ہماری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں"۔

نوجوان بلاول زرداری کا خطاب

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی برسی کے موقعے پر گڑھی خدا بخش میں نوجوان بلاول زرداری نے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق اپنے فنِ تقریر کے خوب جوہر دکھائے ۔ ذوالفقار علی بھٹو کے نواسے اور بینظیر شہید کے بیٹے بلاول نے اپنے نانا اور اپنی ماں کی یاد تازہ کر دی لیکن اُن میں کہیں جناب آصف علی زرداری کی جھلک محسوس نہیں ہوئی کیونکہ زرداری صاحب اپنے پانچ سالہ دَورِ حکومت میں مفاہمت کی چھُری دوسروں کے گلے پر پھیرتے رہے جبکہ بھٹو مرحوم اور بی بی شہید ، دونوں ہی لگی لپٹی رکھے بغیر بہت کچھ کہہ جاتے تھے اور یہی کچھ بلاول نے بھی اپنی تقریر میں کیا ۔ویسے مجھے تو یہ "باپ بیٹے" کی ملی بھگت ہی لگتی ہے کیونکہ پیپلز پارٹی کے دَور میں خادمِ اعلیٰ زرداری صاحب پر گرجتے ، برستے رہتے جبکہ میاں نواز شریف صاحب مفاہمت کے پھول بکھیرتے نظر آتے ۔جب کبھی بات ذرا آگے نکل جاتی تو بڑے میاں صاحب کسی سے مشورہ کیے بغیر ایوانِ صدر بھی جا پہنچتے ۔اب زرداری صاحب بھی وہی حربہ استعمال کر رہے ہیں ۔بلاول زرداری گرجتا ، برستا ہے اور آصف زرداری صاحب مفاہمت کی مرہم لگاتے رہتے ہیں ۔ میاں برادران تو بلاول کی باتوں کا جواب نہیں دیتے لیکن رانا ثناء اللہ صاحب کی پیٹھ ضرور تھپتھپاتے

رہتے ہیں اور رانا صاحب بھی حقِ نمک ادا کرتے ہوئے خوب کھری کھری سناتے رہتے ہیں۔ویسے بھی رانا صاحب کسی زمانے میں پیپلز پارٹی کے ''جیالے'' رہ چکے ہیں اور وارث شاہ نہ عادتاں جاندیاں نیں'' کے مصداق رانا صاحب کے اندر کا جیالا ابھی تک'' زندہ و پایٗندہ'' ہے اِس لیے بلاول کی باتوں کا جواب دینے کے لیے رانا صاحب کا'' نام ہی کافی ہے'' ۔''

بلاول کی تقریرِ ''دِل پذیر'' سُن کر آصف زرداری بہت خوش ہوئے اور کہا''آج کی شام ، بلاول کے نام'' ۔پتہ نہیں بلاول صاحب نے کونسا ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے جو آصف زرداری صاحب خوشی سے نہال ہو گئے۔نوجوان بلاول نے تو ابھی خارزارِ سیاست میں قدم بھی نہیں رکھا اور نہ وہ آزمائش کی بھٹی میں تپ کر کندن بنا ہے اِس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ جنابِ آصف زرداری نے شفقتِ پدری کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ کہہ دیا۔سچ تو یہی ہے کہ جنابِ آصف زرداری خوب جانتے ہیں کہ بلاول ابھی بچہ ہے اور سیاست کے کسی ایک گُر سے بھی نابلد۔یہ سبھی جانتے ہیں کہ بلاول تقریر کریں یا ٹویٹر پر پیغام لکھیں ، اُن کی پالیسی پیپلز پارٹی کی پالیسی سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔وہ تو میں حکومت کو APC طالبان پر گرجتے ،برستے رہتے ہیں جبکہ اُنہی کی پارٹی نے مذاکرات کا مکمل اختیار دیا تھا اور قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ گاہے بگاہے پارلیمنٹ اور میڈیا میں اِس کی تصدیق بھی کرتے رہتے ہیں۔آج بلاول یہ کہتے

ہیں" قائدِ اعظم کو کافرِ اعظم کہنے والوں کے ساتھ مذاکرات ہو رہے ہیں اور مذاکرات کے نام پر آنکھوں والے اندھوں سے راستہ پوچھ رہے ہیں"۔ لیکن کیا اُس وقت بلاول میں سیّد خورشید شاہ حکومت کو مذاکرات کا مینڈیٹ APC خوابِ غفلت میں تھے جب دے رہے تھے یا پھر یہ سمجھا جائے کہ یہ پیپلز پارٹی کی پالیسی نہیں بلکہ خورشید شاہ صاحب کا ذاتی فیصلہ تھا؟۔

بلاول کہتے ہیں "حکومت نے ملک کو پیشہ ور بھکاری بنا کے رکھ دیا ہے"۔ہمیں بلاول سے مکمل اتفاق ہے، سوال مگر یہ ہے کہ کِس حکومت نے ؟۔۔۔ مسلم لیگ نواز کو تو حکومت سنبھالے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دِن ہوئے ہیں۔اِس سے پہلے تواُن کے "بابا" ہی پانچ سال تک پاکستان کے سیاہ و سفید کے مالک رہے اور یہ اُنہی کے "دورِ منوّر" کی کرامت" تھی کہ ہر روز غضب کرپشن کی ایسی ایسی عجب کہانیاں منظرِ عام پر آتی رہیں" جنہیں سُن کر عقل دنگ رہ جاتی۔خادمِ اعلیٰ بھی پیپلز پارٹی ہی کے دَور میں "زر بابا، چالیس چوروں" کا ڈھول پیٹتے اور اُن کو اُلٹا لٹکانے کی باتیں کرتے رہے۔یہ الگ بات ہے کہ اب اُن کا رویہ "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" کا سا ہو گیا ہے ۔حقیقت یہی ہے کہ قوم نے نواز لیگ کو مینڈیٹ ہی اِحتساب کا دیا تھا اور وہ منتظر ہے کہ نواز لیگ کب اپنا وعدہ ایفاء کرتی ہے۔نوجوان بلاول کو یاد رکھنا چاہیے کہ جب اُن کے بابا نے حکومت چھوڑی تھی تب قومی خزانے

میں صرف چھ ارب ڈالر تھے جو اب اسحاق ڈار صاحب کی ''جادو گری'' سے دَس ارب ڈالر تک پہنچ چکے ہیں اور اُن کے وعدے کے مطابق 30 جون تک سولہ ارب ڈالر ہو جائیں گے۔ بلاول سوال کرتے ہیں'' ڈیڑھ ارب ڈالر کہاں سے آئے اور اگر نیت صاف تھی تو قوم سے یہ بات کیوں چھپائی گئی اور کیا یہ ڈیڑھ ارب ہمارے نوجوانوں کے سَر کی قیمت ہے؟''۔ اُنہیں سوال کرنے کا حق ہے لیکن اب تو یہ ایک ریڑھی بان کو بھی پتہ ہے کہ یہ ایک ''دوست ملک'' کی طرف سے تحفہ تھا اور جنابِ وزیرِ اعظم سمیت تمام اکابرینِ حکومت بھی بار بار یہ کہہ چکے ہیں کہ یہ امداد غیر مشروط ہے اور خُدا نخواستہ یہ ہمارے جوانوں کے سَر کی قیمت نہیں۔ اِس وضاحت کے بعد کیا اِس سوال کے بار بار دہرائے جانے کی ضرورت باقی رہتی ہے ؟۔ ویسے بھی قوم کو آم کھانے سے غرض ہے پیڑ گننے سے نہیں اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ موجودہ حکومت قومی غیرت و حمیّت کا، کبھی سودا نہیں کرے گی۔

بلاول نے یہ بھی کہا ''پنجاب کو دہشت گردوں کے ہاتھوں یرغمال بنتے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ بھٹو ہوتے تو یہ حال نہ ہوتا''۔ پنجاب تو اللہ کے فضل سے محفوظ ہاتھوں میں ہے البتہ کراچی لہو، لہو ہے۔ بلاول زرداری کو چاہیے کہ وہ کراچی کا دھیان کریں جہاں سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے عسکری وِنگ بنا رکھے ہیں۔ جہاں کسی کی جان محفوظ، ہے، نہ مال۔ جہاں بوری بند لاشیں ملتی ہیں

بے گناہوں کی ٹارگٹ کلنگ کی جاتی ہے، بینک لوٹے جاتے ہیں اور دن دہاڑے ''بھتے'' کی پرچیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔ ویسے اگر بھٹو آج زندہ ہوتے تو پھر بھی یہی حال ہوتا کیونکہ ستاسی سال کے بھٹو سیاست سے ریٹائر ہو کر گھر میں آرام کر رہے ہوتے۔ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ سیّد قائم علی شاہ جب بھی بولتے ہیں کوئی نہ کوئی ''پھُلجھڑی'' ہی چھوڑتے ہیں۔ بھٹو مرحوم کی برسی پر اُنھوں نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''بھٹو نے قوم سے جو وعدے کیے، پورے کیے''۔۔۔ شاہ جی! بھٹو مرحوم نے قوم سے صرف ایک وعدے پر ووٹ حاصل کیے تھے اور وہ وعدہ تھا ''روٹی، کپڑا اور مکان'' کا۔ یہ وعدہ بھٹو مرحوم پورا کر سکے نہ اُن کے وارث۔ آج بھی پیپلز پارٹی اُسی روٹی، کپڑے اور مکان کے نعرے کو سینے سے لگا کر جیالوں کو بیوقوف بنانے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے لیکن اب تو جیالے بھی اتنے عقلمند ہو گئے ہیں کہ اُن کے نہاں خانۂ دل سے یہ آواز نکلتی سنائی دیتی ہے کہ

تیرے وعدے پہ جیئے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مَر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

بلاول کہتے ہیں ''جاگ میرے پنجاب جاگ، پاکستان جل رہا ہے'' یہی تو ہم کہتے ہیں کہ جاگ، پنجابی جاگ''۔ کیا بلاول زرداری نہیں جانتے کہ اگر کوئی غلطی سے بھی سندھ'' کی تقسیم کی بات کر دے تو سندھی بھائیوں کے تَن بدن

میں آگ لگ جاتی ہے۔ خیبر پختونخوا میں ہزارہ صوبہ کی بات کرنے پر پختون بھائی تلملاء اُٹھتے ہیں لیکن جس کا جب جی چاہتا ہے پنجاب کے ٹکڑے، ٹکڑے کرنے کی بات کرکے اپنے آپ کو مسلمہ لیڈر کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ پنجابی ہی ہے جس کے ہاں لسانی منافرت کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ بلاول صاحب نے تو بڑے فخر سے کہہ دیا ''مر سوں مَرسوں، سندھ نہ دیسوں'' لیکن وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کوئی پنجابی یہ نعرہ نہیں لگا سکتا کہ ''مَرسوں مَرسوں، پنجاب نہ دیسوں'' کیونکہ ہم صوبوں پر نہیں پاکستان پر یقین رکھتے ہیں۔ اِس کے باوجود بھی گالی پڑتی ہے تو صرف پنجاب کو۔

افواج پاکستان ہمارا فخر

جو لوگ ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کے مابین غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ، وہ ملک کی خدمت کر رہے ہیں ، نہ قوم کی ۔پاکستان کی چھیاسٹھ سالہ تاریخ پاک فوج کی لازوال قربانیوں سے بھری پڑی ہے ۔ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے علاوہ قدرتی آفات میں بھی فوجی جوان سول اداروں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں اور بلا شبہ اُن کی کارکردگی دیگر اداروں سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے ۔ صبح و مسا دھرتی کو اپنے خون سے سینچنے والے کڑیل جوانوں سے محبت ہمارے خون میں رَچ بَس چکی ہے ۔ایک ایوب ، ایک یحیٰی، ایک ضیاء اور ایک پرویز مشرف کی وجہ سے یہ جذبۂ محبت مدھم پڑا ، نہ پڑ سکتا ہے کیونکہ یہ اُن کے ذاتی افعال و اعمال تھے اور ایسا کرتے وقت اُنھوں نے سوائے اپنے چند قریبی ساتھیوں کے کسی سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ دینِ مبیں کی تاریخ میں حضرت ابراہیمؑ کا باپ، حضرت لوطؑ کی بیوی اور حضرت نوحؑ کا بیٹا ، ربِّ ذوالجلال کے ہاں راندۂ درگاہ ٹھہرے لیکن کیا اِس بنا پر اُن انبیاءؑ کی توقیر میں (نعوذ باللہ) کوئی فرق پڑا ؟۔ روزِ محشر ہر کسی کو اپنے اپنے اعمال کا حساب خود دینا ہو گا ۔اُس نفسا نفسی کے عالم میں باپ کام آئے گا نہ بیٹا، ماں سفارش کرے گی نہ بہن ۔اگر ربِّ کریم نے اُخروی اور ابدی زندگی کے لیے

باپ کے اعمال کا ذمہ دار بیٹے کو قرار دیا، نہ بیٹے کے اعمال کا باپ کو تو پھر اِس چند روزہ فانی زندگی میں یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ پاک فوج کے کچھ سابق سَربراہوں کے افعال و اعمال پر تنقید دراصل افواج پاکستان پر تنقید ہے جو اُس کی بدنامی کا باعث بنتی ہے؟۔اگر پرویز مشرف صاحب نے جس آئین کے تحت حلف اُٹھایا، اُسی آئین کو توڑنے کے مرتکب ہوئے ہیں تو کیا اُن سے محض اِس لیے صرفِ نظر کیا جائے کہ وہ پاک فوج کے سَربراہ رہ چکے ہیں؟۔اور کیا آقا کا یہ فرمان (نعوذ باللہ) فراموش کر دیں ''وہ قومیں برباد ہو جاتی ہیں جو طاقت وروں کو چھوڑ دیتی اور کمزوروں کو سزا دیتی ہیں''۔کیا اُس عدل کو فراموش کر دیں جس پر دینِ مبیں کی یہ عظیم الشان عمارت اُستوار ہے؟۔میڈیا پر باتیں فتح مکّہ کے موقعے پر عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے میرے آقا کی عام معافی کی ہو رہی ہیں۔عرض ہے کہ مکّہ تو مسلمانوں نے فتح کیا تھا اور مفتوحین کو حضورِ اکرمؐ نے چند نرم شرائط کے ساتھ عام معافی دے دی لیکن یہاں تو کوئی فاتح ہے نہ مفتوح، یہاں تو ایک آئین شکن ملزم کا معاملہ ہے اور کیا ہم نہیں جانتے کہ ایک دفعہ جب ایک طاقتور قبیلے کی عورت نے چوری کی تو حضورؐ نے اُس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔صحابہ نے عرض کیا کہ اِس عورت کو معاف کر دیا جائے کیونکہ قبیلہ طاقتور ہے اور شَر کا اندیشہ ہے۔تب حضورؐ نے فرمایا'' ربِّ کعبہ کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی ہوتی تو میں اُس کا ہاتھ کاٹنے کا بھی حکم

دیتا'' (مفہوم)۔

اکتوبر 1999ء میں محترم نواز شریف نے اپنا آئینی حق استعمال کرتے ہوئے جنرل ضیاء الدین بٹ کو افواج پاکستان کا نیا سربراہ بنانے کی کوشش کی اور ایسا کرتے ہوئے میاں صاحب کے سامنے کارگل کی جنگ اور پرویز مشرف صاحب کی باغیانہ روش تھی۔اگر آئین وزیرِاعظم کو یہ حق نہیں دیتا تو پھر میاں صاحب قومی مجرم ہیں اور اگر یہ اُن کا آئینی حق تھا تو پھر کیا پرویز مشرف صاحب قومی مجرم نہیں ٹھہرتے؟۔ فوج ایک باوقار ادارہ ہے جس کا احترام سب پر لازم لیکن میاں نواز شریف صاحب بھی تو سولہ کروڑ عوام کے منتخب نمائندے تھے۔کیا اُن کا احترام واجب نہیں تھا؟۔ کیا ہم دینِ مبیں کا یہ حکم بھول گئے کہ اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور حاکمِ وقت کی ۔سوال یہ ہے کہ اکتوبر 1999ء میں حاکمِ وقت کون تھا، پرویز مشرف یا میاں نواز شریف؟۔اگر میاں نواز شریف ہی حاکمِ وقت تھے تو پھر کس کی اطاعت واجب تھی؟۔ پرویز مشرف صاحب کے دَور میں میاں نواز شریف صاحب کے ساتھیوں پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے گئے اور جو سلوک خواجہ محمد آصف، خواجہ سعد رفیق اور پرویز رشید صاحب کے ساتھ روا رکھا گیا وہ اتنا کریہہ اور گھناؤنا ہے کہ خود اِن اصحاب کی زبانیں گُنگ۔اِس انسانیت سوز سلوک کے باوجود سبھی نے اپنی ذاتی رنجشوں کو بھلا کر جب کئی بار یہ کہا کہ اُنھوں نے پرویز مشرف کو معاف کر

دیا تو پھر ہمیں بھی اُن کے کہے پہ یقین کر لینا چاہیے ، حالانکہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا بھی عین اسلام ہے ۔اِن اصحاب نے پرویز مشرف صاحب کے معاملے میں وہی رویہ اختیار کیا جو حضرت علیؓ نے ایک یہودی کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ حضرت علیؓ نے دَورانِ جنگ ایک یہودی کو زمین پر گرایا اور اُس کی چھاتی پر بیٹھ کر اُس کی گردن تَن سے جدا کرنے ہی والے تھے کہ اچانک یہودی نے آپؓ کے مُنہ پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ اُس کی چھاتی سے اُتر گئے اور اُسے معاف کر دیا۔ یہودی کے استفسار پر آپؓ نے فرمایا ''پہلے میں تمہیں اللہ ذوالجلال کی خاطر قتل کرنا چاہتا تھا لیکن تمہارے میرے مُنہ پر تھوکنے سے اِس میں میری ذاتی رنجش بھی شامل ہو گئی ۔اِس لیے میں نے تمہیں معاف کر دیا''۔ میاں فیملی ، خواجگان اور پرویز رشید صاحب تو ذاتی رنجش معاف کر چکے لیکن قومی جرم معاف کرنے کا حق تو اُنہیں بھی حاصل نہیں ۔ ایسے طالع آزما جو آئین کو سو صفحات پر مشتمل ایک فضول سی کتاب سمجھتے ہیں ، اُن پر تنقید ہمارا حق ہے اور فرض بھی ، جو ہم ادا کرتے رہیں گے لیکن اِس کا یہ کہاں مطلب نکلتا ہے کہ ہمیں افواجِ پاکستان سے پیار نہیں ؟۔ بات اشرافیہ کی نہیں عامیوں کی ہے جو اپنے رکشوں ، ویگنوں ،ٹرکوں اور ٹیکسیوں کے پیچھے ''پاک فوج کو سلام'' لکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پاکستان کی آبادی اگر بیس کروڑ ہے تو پونے بیس کروڑ یہی ''عامی'' ہی تو ہیں ۔

میرے کچھ مہربان میرے کالموں پر طنز و تعریض کے تیروں کی بوچھاڑ کرتے رہتے ہیں ۔بعض اوقات اُن کی طعنہ زنی نا قابلِ برداشت ہو جاتی ہے ۔اِس کے باوجود بھی میں نے ضبط کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔کہا جاتا ہے کہ ہم ''بھاڑے کے ٹٹو '' اور قلم فروش ہیں۔اگر کسی سیاسی جماعت کی پالیسیوں سے اتفاق کرنا جُرم ہے تو یہ جرم ہم سے سرزد ہوتا ہی رہے گا۔اِس لیے اپنے مہربانوں کی خدمت میں عرض ہے

نکالا چاہتا ہے کام تُو طعنوں سے کیا غالب

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

مسلم لیگ نواز کو پسند کرنے اور اُس کی پالیسیوں کو ملک و قوم کے لیے بہتر خیال کرنے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم افواجِ پاکستان کے ساتھ محبت و یگانگت کے سارے رشتے بھلا چکے ہیں ۔فوج پر تنقید اگر کروں تو خود میری ذات بھی اِس کی زد میں آتی ہے کیونکہ میری بیٹی میجر ڈاکٹر ہے جو بلوچستان کے دور دراز اور خطرناک علاقوں میں خدمات سرانجام دے چکی ہے۔میرا میجر ڈاکٹر داماد ''سیاچن ''کی بلند ترین چوٹی بالتورو'' پر خدمات سرانجام دے چکا ہے اور آجکل بھی اُس علاقے میں تعینات ہے'' جو براہِ راست طالبان کی زد میں ہے۔ہم اُس کَرب سے بخوبی آگاہ ہیں جو اپنے جگر گوشوں کو خطرناک

ترین علاقوں میں بھیج کر والدین کو ہوتا ہے۔ مجھے وہ دِن بخوبی یاد ہیں جب میری بیٹی بلوچستان میں اپنے فرائضِ منصبی ادا کر رہی تھی اور وہاں ہر روز بم دھماکے اور ٹارگٹ کلنگ ہو رہی تھی۔ وہ دِن بھی بھلائے نہیں بھولتے جب میرا داماد سیاچن کی بلند ترین چوٹی پر بیٹھا تھا اور ہمارا اُس سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے اُس شہید لیفٹیننٹ کو بھی منوں مٹی کے سپرد کیا جو ''وانا'' میں اپنی پہلی ہی پوسٹنگ پر گیا اور منصبِ شہادت سے سرفراز ہوا۔ میرے خاندان کے کئی افراد اب بھی افواجِ پاکستان میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں، اِس لیے کسی کو ہمیں یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ہمیں پاک فوج سے پیار ہے یا نہیں۔ ہمارا واضح نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی کے ذاتی افعال و اعمال کو کسی ادارے کی بدنامی سے جوڑنا بد دیانتی کی انتہا ہے لیکن بَدقسمتی تو یہ ہے کہ ہمارا الیکٹرانک میڈیا محض اپنی ریٹنگ بڑھانے اور چند ٹکوں کے اشتہارات کے چکر میں سول اور عسکری قیادت کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی بھرپور سعی کر رہا ہے جو کسی بھی لحاظ سے مناسب ہے نہ لائقِ تحسین۔

جلتی پہ تیل

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

وزیرِ داخلہ چوہدری نثار علی خاں نے یہ اعتراف تو کر لیا کہ کچھ بیانات کی وجہ سے حکومت اور فوج کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی لیکن اِس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ حکومت اور فوج کا قبلہ ایک ہے اور جتنی بہتر ورکنگ ریلیشن شپ آج ہے، پہلے کبھی نہیں تھی کیونکہ اُنہیں ادراک ہے کہ فوج، حکومت تعلقات کی مضبوطی ملک کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ خواجہ سعد رفیق کہتے ہیں کہ اُن کی باتوں کا کچھ حلقوں نے بُرا منایا لیکن اقرار وہ بھی کرتے ہیں کہ ملکی ترقی و سلامتی کے لیے عدلیہ اور فوج کا احترام ضروری ہے البتہ خواجہ صاحب بضد ہیں کہ اُنھوں نے جو کچھ کہا، درست کہا اور وہ اپنی باتوں پر اب بھی قائم ہیں۔ وزیرِ دفاع خواجہ محمد آصف البتہ بہ اندازِ حکیمانہ اپنی باتوں کی وضاحت کر چکے اور کر رہے ہیں۔ سوال مگر یہ ہے کہ آخر حکومتی حلقوں کی جانب سے ایسا کیا کہہ دیا گیا جس نے افواجِ پاکستان میں ہلچل مچا دی اور عسکری قیادت کا کون سا بیان ایسا تھا جس کی بنا پر یہ سمجھا جائے کہ ''میرے عزیز ہموطنو!'' کی گونج ایک دفعہ پھر سنائی دینے والی ہے؟۔ ہم

سمجھتے ہیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں اور یہ سب کچھ ''رائی کا پہاڑ'' بنا دینے والے میڈیا کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

یہ بجا کہ خواجہ محمد آصف اور خواجہ سعد رفیق کے بیانات قدرے سخت تھے لیکن یہ افواج پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ اُس آمر کے خلاف تھے جس سے صرف ایک منتخب حکومت کا تختہ اُلٹنے کا جرم ہی سرزد نہیں ہوا بلکہ اُس کے جرائم کی فہرست تو اتنی طویل ہے کہ اُس پر کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اُس نے احساسِ تفاخر کے ساتھ اپنی ''خود نوشت'' میں جتنے جرائم کا اعتراف کیا ہے کہ انہی جرائم کی پاداش میں اُس کی اگلی ساری زندگی جیل میں گزر سکتی ہے۔ اگر غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو عیاں ہو جاتا ہے کہ میاں نواز شریف صاحب کی منتخب حکومت کا تختہ الٹنے والے پرویز مشرف صاحب نے میاں صاحب اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا کہ انسانیت مارے شرم کے مُنہ چھپانے لگے جبکہ اِس کے برعکس مشرف صاحب اپنے پُر تعیش محل میں ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں جس کے بارے میں کوئی عامی صرف سوچ ہی سکتا ہے۔ پرویز مشرف صاحب کی حفاظت پر عوام کے خون سے نچوڑے گئے کروڑوں روپے صرف ہو رہے ہیں اور وہ جب باہر نکلتے ہیں تو اُن کی حفاظت کا ایسا بندوبست ہوتا ہے جو امریکی صدر بارک اوباما کو بھی نصیب نہیں۔ دوسری طرف میاں نواز شریف صاحب کو جب ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا ہوتا تو جہاز میں بھی ہتھ کڑیوں سے باندھ دیا جاتا

۔پرویز مشرف صاحب کے جرائم کی فہرست تو طویل ہے لیکن کیا دنیا کی کوئی بھی عدالت میاں برادران کا کوئی ایسا جرم ثابت کر سکتی ہے جس کی بنا پر اُن سے ایسا سلوک روا رکھا گیا کہ اُنہیں اپنے باپ کو لحد تک میں اتارنے کی اجازت نہ دی گئی؟۔پرویز مشرف اور اُس کے حواریوں نے تو ہر اُس شخص کے ساتھ بھی انسانیت سوز سلوک کیا جس کا میاں برادران کے ساتھ تھوڑا سا بھی تعلق تھا۔خواجہ محمد آصف، خواجہ سعد رفیق اور پرویز رشید صاحب کے ساتھ کیے جانے والے بہیمانہ سلوک کا کیا جواز تراشا جا سکتا ہے ؟۔یہ سبھی انسان ہیں جن کے جذبات و احساسات مُردہ نہیں ہیں۔اگر جذبات کی رو میں بہہ کر اُن کی زبانوں سے پرویز مشرف کے خلاف کوئی ایک آدھ جملہ پھسل ہی گیا تو ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔کیا مشرف صاحب اتنے ہی ''پَوتر'' ہیں کہ اُن کے بارے میں قومی زباں بندی کا حکم صادر کر دیا جائے ؟۔اگر ایسا ہی ہے تو پھر قوم کو یہ بھی بتلا دیا جائے کہ یہ جمہوریت کی کونسی قسم ہے جس میں ''جمہور'' یہ کہتے نظر آئیں کہ

یہ کیسا دستورِ زباں بندی ہے تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

وزیرِ داخلہ نے بالکل درست کہا کہ ''ایک مخصوص ٹولہ رات آٹھ سے گیارہ بجے تک اشتعال انگیزی کے چکر میں لگا رہتا ہے''۔ایسا کہتے ہوئے اُن کا لہجہ

انتہائی نرم اور انداز مودبانہ تھا کیونکہ معاملہ ہمارے بے باک الیکٹرانک میڈیا کا تھا جس سے آجکل ہر کوئی پناہ مانگتا ہے۔چوہدری نثار نے الیکٹرانک میڈیا سے مودبانہ درخواست کی کہ وہ اپنے نیوز چینلز پر اشتعال پھیلانے والے اصحاب کو بلانے سے گریز کریں۔لہجہ نرم سہی لیکن اندرونی تلخی اور بے بسی بہر حال عیاں تھی کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ''ریٹنگ'' کا اسیر الیکٹرانک میڈیا اور کھمبیوں کی طرح اُگے ہوئے اینکرز اُن کی باتوں پر کان نہیں دھریں گے۔ہمارے الیکٹرانک میڈیا کو توبریکنگ نیوز جاری کرنے کا اتنا شوق ہے کہ وہ بریکنگ نیوز پہلے جاری کرتے ہیں، تصدیق بعد میں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک افواہ کو لے کر اُٹھتے ہیں اور پھر اُس کی صداقتوں میں جُت جاتے ہیں۔اُنہیں ایسے راندہ درگاہ مہمان انتہائی عزیز ہیں جو ''مُنہ پھَٹ'' ہوں۔آپ کو یاد ہو گا کہ کسی زمانے میں ہمارے الیکٹرانک میڈیا کو ''قُرآنی پریس کانفرنس'' کرنے والا ذوالفقار مرزا انتہائی عزیز تھا اور اینکرز اُس کا انٹرویو کرنے کے لیے دھکے کھاتے پھرتے تھے۔آج وہی ذوالفقار مرزا اپنے گھر میں موجود ہے لیکن کوئی اُسے مُنہ لگانے کو تیار نہیں۔انتہائی بد تمیز اور مُنہ پھٹ فیصل رضا عابدی محض اِس لیے الیکٹرانک میڈیا کو مرغوب رہا اور ایک حد تک اب بھی ہے کہ وہ تاریخ ساز چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری صاحب کے خلاف بولتا ہے۔ڈاکٹر طاہر القادری صاحب دینی علم کے لحاظ سے انتہائی محترم ضرور ہیں لیکن ''شخصی خامیوں'' سے مبرا ہر گز نہیں۔ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات

ہے جب اسی الیکٹرانک میڈیا کی کرشمہ سازیوں نے اُنہیں آسمان کی رفعتوں تک پہنچا دیا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے پاکستان میں سوائے ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کے اور کچھ باقی بچا ہی نہیں ۔آجکل الیکٹرانک میڈیا کے کاغذوں میں وہ بھی استراحت فرما رہے ہیں ۔سدا بہار شیخ رشید احمد صاحب ہمیشہ الیکٹرانک میڈیا کی آنکھوں کا تارا رہے ہیں کیونکہ وہ جھوٹ اِتنے اعتماد سے بولتے ہیں کہ سچ کا گماں ہونے لگتا ہے ۔ جلتی پہ تیل چھڑکنے کے جتنے وہ ماہر ہیں اُتنا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔اُنھوں نے فرمایا کہ خواجہ محمد آصف افواجِ پاکستان کے ناپسندیدہ ہیں اور اُنہیں جان بوجھ کر وزیرِ دفاع بنایا گیا ہے جس کا خمیازہ میاں نواز شریف صاحب کو بھگتنا پڑے گا ۔وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ’’ حکومت تیزی سے 12 اکتوبر 1999ء کی طرف بڑھ رہی ہے ۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اپریل بڑا اہم ہے اور یہ سال میاں نواز شریف کی حکومت کے حوالے سے بڑا کٹھن ہوگا۔ وہ گھر چلے جائیں گے یا امیر المومنین بن جائیں گے ‘‘ ۔ایسی باتوں سے چونکہ الیکٹرانک میڈیا کی ریٹنگ بڑھتی ہے اسی لیے شیخ صاحب ہر روز کسی نہ کسی چینل پر براجماں نظر آتے ہیں ۔میڈیا سے بہتر کون جانتا ہے کہ اس قسم کی تاریخیں شیخ صاحب دیتے ہی رہتے ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے کیونکہ اُن کی سیاسی آڑھت میں فروخت کرنے کے لیے ایسی افواہوں اور پیشین گوئیوں کے سوا بچا ہی کیا ہے ۔ شیخ صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ’’سیاسی ہیجڑوں کے ذریعے فوج کو ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے۔ یہ وزراء خود

نہیں بول رہے بلکہ اُن کے اندر نواز شریف بول رہا ہے ''۔ میاں نواز شریف صاحب تو خواجگان'' کے بیانات پر اُن کی سرزنش کر بھی چکے البتہ قوم ہی بہتر فیصلہ کر سکتی ہے '' کہ آیا ''سیاسی ہیجڑے'' وہ ہیں جو ''پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ'' کی عملی تصویر ہیں یا وہ جو ڈال ڈال پہ پھدکتے نظر آتے ہیں۔ شیخ صاحب نے نواز لیگ چھوڑی اور پرویز مشرف کے ہمنوا بن گئے۔ پھر قاف لیگ جوائن کر لی اور جب پرویز مشرف صاحب کو زوال آیا تو نواز لیگ کی منت سماجت کرتے پائے گئے۔ جب کسی نے گھاس نہ ڈالی تو اُس کی چھتری تلے پناہ لے لی جسے کسی زمانے میں وہ ''تانگے کی سواریوں'' والا لیڈر قرار دیا کرتے تھے۔ ہمیں تو اب بھی یقین ہے کہ نواز لیگ کے ایک اشارے پر وہ میاں نواز شریف صاحب کے قدموں میں بیٹھنے کو عین سعادت سمجھیں گے۔ اب پتہ نہیں ''سیاسی ہیجڑا'' کون ہے۔

ظالمو ! ''سونامی'' پھر آرہی ہے

ہم سب کالم نگاروں کے ''سانجھے'' محتسب جناب شاہد خورشید بڑی خاصے کی چیز ہیں ۔وہ اتنے ''ویہلے'' ہیں کہ ہر روز کالم نگاروں کو اُن کی غلطیوں کی نشاندہی سے مزیّن ''ای میلز'' بھیجتے ہیں اور مفادِ عامہ کے لیے یہی ''ای میلز'' اڑھائی تین ہزار دیگر لوگوں کو بھی بھیجتے رہتے ہیں ۔ بڑے بڑے نامی گرامی کالم نگاروں کے کالموں میں درج کیے گئے اشعار کی غلطیاں نکالنا اُن کا محبوب مشغلہ ہے اور اب تو ماشاء اللہ وہ ''ہجوں'' تک کی غلطیاں بھی نکال باہر کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہمیں تو اپنا لکھا پڑھنے کی فرصت بھی نہیں ہوتی لیکن ''یہ صاحب'' روزانہ سینکڑوں کالم کیسے پڑھ ڈالتے ہیں ۔ ویسے ہمیں بھی جب کوئی کام نہیں ہوتا اور ایس ایم ایس کے ذریعے کوئی لطیفہ بھی ہمارے موبائل کی زینت نہیں بنتا تو ہم بھی اُن کی ''ای میلز'' سے لطف اندوز ہو لیتے ہیں ۔ اپنے اندازِ تخاطب میں وہ نقاد کم اور ''ماشٹر'' جی زیادہ لگتے ہیں ۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی کالم نگاروں کے لیے تحریکِ انصاف کی اُس ''سونامی'' کی مانند ہیں جس نے اوّل ، اوّل تو بڑے بڑوں کے چھکّے چھُڑا دیئے لیکن جب لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ تو خالی خولی ''بڑھکیں'' ہی ہیں تو پھر '' میڈم سونامی'' ایسے غائب ہوئی جیسے گدھے کے سَر سے سینگ۔ ویسے

تو فی الحال خورشید شاہد کی ''دست درازیوں'' سے کوئی بھی محفوظ نہیں لیکن اب کالم نگار بھی اُن کے ''طریقۂ واردات'' کو کچھ کچھ سمجھنے لگے ہیں اِس لیے مُسکرا کر ٹال جاتے ہیں۔ ایک اور بات کہ وہ ہمیشہ اُردو کالم نگاروں کی غلطیوں کی نشاندہی انگریزی میں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ اُردو سے اتنی نفرت؟۔ شاہد خورشید صاحب سے جان کی امان پاؤں تو ''ڈرتے ڈرتے'' عرض کروں کہ تحریکِ انصاف کے ناقدین آجکل یہ گُنگناتے پھرتے ہیں کہ

بہت شور سُنتے تھے پہلو میں دِل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خوں نہ نکلا

واقعی آجکل سونامی کی شوریدہ سری مفقود ہے اور وہ شور جو الیکشن سے پہلے تھا اُس کا تو ڈھونڈے سے بھی نشاں نہیں ملتا۔ پہلے تو ہم انتظار میں رہتے تھے کہ دیکھیں اب سونامی کب اور کہاں کا رُخ کرے گی۔ ہم سے بھی کہیں زیادہ الیکٹرانک میڈیا سونامی کے اشتیاق میں مَرا جاتا تھا کیونکہ اُن دنوں تو الیکٹرانک میڈیا کی ''چاندی'' ہو گئی تھی لیکن جونہی ''مَرجانے'' 2013ء کے الیکشن ہوئے ہماری سونامی بھی ''ٹھُس'' ہو گئی۔ حالانکہ ہمیں اُمیدِ واثق تھی کہ الیکشن کے ''دھاندلے'' ضرور رنگ لائیں گے اور چڑیا والے صاحب کے 35 پنکچروں پر حشر بپا ہو گا۔ لیکن ہوا یوں کہ اپنے بڑے میاں صاحب محترم خاں صاحب کی عیادت کے لیے شوکت خانم کینسر ہسپتال جا پہنچے اور دورانِ عیادت

پتہ نہیں کیا کیا عہد و پیاں ہوئے کہ سارا معاملہ ہی ''ٹھپ'' ہو کے رہ گیا۔ ہلکی پھلکی موسیقی تو پھر بھی جاری رہی لیکن عوامی ''دھوم دھڑکے'' کا کوئی مظاہرہ دیکھنے کا شوق پورا نہ ہو سکا۔ اب شاید ہمارے بھولے بھالے خاں صاحب کو کچھ کچھ ادراک ہو گیا ہے اسی لیے ہلچل مچانے اور محوِ خواب سونامی کو جگانے کے لیے تحریکِ انصاف نے ماہِ مئی میں ریلیاں نکالنے کا پروگرام ترتیب دیا ہے ۔ دروغ بَر گردنِ راوی ''اندر کھاتے'' میرے عظیم قائد شیخ الاسلام ڈاکٹر طاہر القادری صاحب سے بھی معاملات ''طے'' پا چکے ہیں لیکن قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ صاحب تا حال ''فرینڈلی اپوزیشن'' کے چکر میں ہیں اِس لیے پیپلز پارٹی کا فی الحال باہر نکلنے کا کوئی موڈ نہیں لیکن اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق اکیلے کپتان صاحب ہی سب کی ''کِلیاں'' اُڑانے کے لیے کافی ہیں ۔ ہم بھی بڑے زور و شور سے تیاریوں میں مصروف ہیں کیونکہ جہاں ہمارے دو ، دو عظیم لیڈر موجود ہوں ، وہاں ہماری شمولیت تو اظہر من الشمس ہے ، یہ الگ بات ہے کہ ہماری شمولیت جسمانی نہیں ، روحانی ہو گی ۔

ہمارے ''کپتان'' صاحب نے مشترکہ جد و جہد کے لیے لال حویلی والے شیخ رشید احمد کو بھی شرفِ ملاقات بخش دیا ۔ شنید ہے کہ ڈالروں کے ریٹس کی کمی کے بارے میں شیخ صاحب کی بڑھکوں اور پھر راہِ فرار اختیار کرنے پر کپتان صاحب

نے شیخ صاحب سے کہا کہ ''پہلے تولو، پھر بولو'' تو شیخ صاحب نے بھی تُرکی بہ تُرکی جواب دیا کہ تولنے کے لیے ''ترازو'' تو خاں صاحب کے پاس بھی نہیں البتہ ''ترازو'' والی جماعت کے ساتھ الحاق ضرور ہے۔ خاں صاحب محض اِس لیے چُپ ہو رہے کہ وہ پہلے ہی تحریکِ انصاف کے اندر پیدا ہونے والے فارورڈ بلاک کے ہاتھوں ''وَخت'' میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ سونامی جس نے رقیبانِ روسیاہ کو تہس نہس کرنا تھا، اُس نے اب تحریکِ انصاف کو ہی تہس نہس کرنے کی ٹھان لی ہے۔

اُدھر ہمارے میاں نواز شریف صاحب ہیں کہ اپنی پرانی عادتیں چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ۔ پیپلز پارٹی کے دَورِ حکومت میں جب کبھی معاملات خراب ہونے لگتے تو میاں صاحب ایک لحظے کی دیر کیے بغیر ایوانِ صدر میں جنابِ آصف زرداری کے پاس جا پہنچتے اور بھڑکتے معاملات کو ''ٹھنڈے ٹھار'' کر آتے ۔اب وہ یہی ''ہتھ'' ہمارے کپتان صاحب کے ساتھ بھی کر رہے ہیں۔ جب کبھی خاں صاحب کا ''چھکا'' مارنے کا موڈ بنتا ہے تو میاں صاحب کی میٹھی میٹھی باتیں آڑے آ جاتی ہیں ۔ ایک بار تو میاں صاحب اچانک خاں صاحب کے گھر ہی پہنچ گئے ۔وہاں پہنچ کر اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ ''جاتی عمرا'' پہنچ گئے ہوں ۔در اصل بڑے میاں صاحب کے استقبال کے لیے موجود اکثر چہرے مسلم لیگ نواز ہی کے ''مفرور'' تھے اِسی لیے میاں صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہی دفتر

پہنچ گئے ہوں۔ ویسے اپنے بڑے میاں صاحب ہیں بڑے مقبول۔ اُن کی یہ مقبولیت اپنی پارٹی سے کہیں زیادہ اپوزیشن میں پائی جاتی ہے۔ پارلیمنٹ کا اجلاس ہو یا سینٹ کا، میاں صاحب کے دیدار کو ترستی نگاہیں آہ و بکا کرتی اور ''نیر بہاتی'' رہتی ہیں۔ اب اِس گروہِ عاشقان'' نے ''تنگ آمد، بجنگ آمد'' کے مصداق سینٹ کے قواعد میں ترمیم'' کرکے ایک ایسی قرار داد منظور کر لی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد لیکن ''رسمِ عاشقی'' کے سراسر خلاف ہے کیونکہ محبوب کی بات مانی جاتی ہے، منوائی نہیں جاتی۔ قرارداد ایم کیو ایم کے سینیٹر طاہر مشہدی نے پیش کی جسے کثرتِ رائے سے منظور کر لیا گیا۔ قرار داد کا متن یہ تھا کہ وزیرِ اعظم ہفتے میں ایک بار سینٹ اجلاس میں لازماً آئیں گے۔ اِس قرارداد پر نواز لیگ کے سینیٹر ظفر علی شاہ بہت چیں بجبیں ہوئے جس پر طاہر مشہدی نے کہا کہ اُنہیں بائیس دن ہو گئے انتظار کرتے اور اب تو حالت یہ ہو گئی کہ ''ہر اِک آہٹ پہ یہ سمجھا کہ شاید اب وہ آئے ہیں'' لیکن میاں صاحب نہیں آئے۔ ظفر علی صاحب نے تپ کر کہا کہ الطاف حسین بائیس سال سے ملک نہیں آئے لیکن ہم نے تو کوئی ہنگامہ نہیں کیا۔ شاہ صاحب کے اِس ''قلندرانہ نعرے'' پر سینٹ میں وہ شورِ قیامت اُٹھا کہ اللہ کی پناہ لیکن شکر ہے کہ نوبت ہاتھا پائی تک نہیں پہنچی۔ ویسے ہمیں یقین ہے کہ وزیرِ اعظم صاحب اب بھی سینٹ میں نہیں آئیں گے کیونکہ محبوب کبھی محب کی مرضی کے تابع نہیں ہوا کرتا۔

کیسے یاد رکھوں، کیسے بھول جاؤں

طالبان نے جنگ بندی ختم کر دی۔ پرویز مشرف نے اپنی معاونت کرنے والوں کے ٹرائل کا مطالبہ کر دیا۔ نواز زرداری ملاقات میں جمہوریت کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا عزم کیا گیا۔ قومی سلامتی کمیٹی کے اجلاس میں حکومتی و فوجی قیادت نے طالبان سے مذاکرات جاری رکھنے لیکن حملوں کا بھرپور جواب دینے پر اتفاق کر لیا۔ پچھلے ایک ہفتے میں سامنے آنیوالی اِن تبدیلیوں کی بھیڑ میں گم ہم سوچ رہے ہیں کہ ''کیسے یاد رکھوں، کیسے بھول جاؤں''۔ یہ تمام معاملات ایسے ہیں جن پر
ہماری ''ارسطوانہ'' اور ماہرانہ رائے اشد ضروری ہے اور اگر ہم نے اپنے تجزیوں کی ''پوٹلی'' نہ کھولی تو ملکی و قومی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں لیکن مسئلہ یہ آن پڑا ہے کہ یہ تمام معاملات کسی ایک کالم میں سما نہیں سکتے اور اگر ہم نے انہیں زبردستی اپنے کالم میں ''گھُسیڑنے'' کی کوشش کی تو ''اخباری قینچی'' چلنے کا اندیشہ ہے اِس لیے ہمارا خیال ہے کہ ہر موضوع کو تھوڑا تھوڑا ''ٹھونگا'' مار لینے میں ہی عافیت ہے لیکن سب سے پہلے کچھ ذکر پنجاب کے ہر دِلعزیز خادمِ اعلیٰ صاحب کا کہ جن کے پُر مغز بیانات سے ہم ہر روز مستفید ہوتے ہیں۔ الحمرا ہال میں منعقدہ تقریب جب اپنے عروج پر پہنچی تو اچانک بجلی بے

وفائی کر گئی اور جب پورے ہال میں گھُپ اندھیرا چھا گیا، تب خادمِ اعلیٰ میاں شہباز شریف کو اپنے سارے بھولے بسرے وعدے یاد آ گئے۔ اسی لیے اُنہوں نے یہ کہنا مناسب سمجھا "لوڈ شیڈنگ کو فوری طور پر ختم کرنا حکومت کے بَس میں نہیں لیکن اِس پر قابو پانے کے لیے دِن رات کام جاری ہے"۔ زرداری صاحب نے تو رسانت سے فرما دیا تھا کہ "وعدے قُرآن و حدیث نہیں ہوتے" لیکن خادمِ اعلیٰ نے یہ جواز تراشا کہ "جب اقتدار سنبھالا تو خزانے کی حالت دیکھ کر ہمارے ہوش کے ساتھ ہاتھوں کے طوطے بھی اُڑ گئے"۔ ہم تو سمجھے تھے کہ صرف لکھاریوں نے ہی "جاسوس پرندے" پال رکھے ہیں لیکن اب پتہ چلا کہ ہمارے خادمِ اعلیٰ کے ہاں بھی ایسے طوطے ہیں جو "پھُر پھُر" اُڑ کر اُنہیں کم از کم یہ خبر تو دے ہی جاتے ہیں کہ قوم کِن عذابوں کا شکار ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ بجلی کے بِل دیکھ کر تو ہمارے ہاتھوں کے طوطے بھی "پھُر پھُر" اُڑنے لگے ہیں اور ہم لوڈ شیڈنگ کو نعمتِ خُداوندی سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

آجکل موبائل فون کمپنیاں اپنے صارفین کو زیادہ سے زیادہ بیلنس استعمال کرنے کے لیے طرح طرح کے انعامات کا لالچ دیتی رہتی ہیں۔ شاید چھوٹے میاں صاحب نے بھی انہی انعامی سکیموں سے متاثر ہو کر ایک "مزیدار" انعامی سکیم کا اعلان کر دیا۔ اُنہوں نے اِنرولمنٹ مہم 2014ء کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا

کہ جس حلقے کا ایم پی اے اپنے حلقے میں سو فیصد داخلے کروائے گا، اُسے وزیرِ تعلیم بنایا جائے گا۔ہم چونکہ ایم پی اے نہیں اِس لیے ہمارا وزیرِ تعلیم بننے کا کوئی چانس بھی نہیں اور جب چانس ہی نہیں تو پھر یہ کہنے میں کیا ہرج ہے کہ " خادمِ اعلیٰ صاحب ! آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے "۔البتہ ہم یہ ضرور سوچ رہے ہیں کہ وزیرِ تعلیم تو ایک ہی ہوتا ہے اور اگر سارے ایم پی ایز نے اپنے اپنے حلقوں میں سو فیصد داخلے کروا دیئے تو کیا پنجاب میں ساڑھے تین سو سے زائد وزرائے تعلیم ہونگے ؟۔ایک اور بات جو ہمارے ذہنی خلجان کا باعث بن رہی ہے ، وہ یہ ہے کہ اگر تحریکِ انصاف کا کوئی ایم پی اے محض شرارتاََ اپنے حلقے میں سو فیصد داخلے کروا کے میاں صاحب سے وزارتِ تعلیم کے قلمدان کا مطالبہ کر بیٹھا تو پھر یقیناََ خادمِ اعلیٰ صاحب کا حشر بھی شیخ رشید احمد جیسا ہونے کا قوی امکان ہے ، جنھوں نے ڈالرز کے ریٹس اٹھانوے روپے تک آنے کی صورت میں اپنے نشست سے مستعفی ہونے کی "بڑھک" ماری اور اسحاق ڈار صاحب نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ڈالر کے ریٹس 98 کیا 96 روپے تک جا پہنچا دیئے لیکن شیخ صاحب ہیں کہ ابھی تک اپنی سیٹ سے چمٹے ہوئے ہیں ۔اُدھر ہمارا "شرارتی" الیکٹرانک میڈیا دِن میں کئی کئی بار یہ "بڑھک" نشر کرکے شیخ صاحب کا "حشر نشر" کرتا رہتا ہے۔

ویسے اگر شیخ رشید صاحب لال حویلی میں "پیشین گوئیوں" کی دوکان کھول لیں

تو اُن کی ''دوکانداری'' چمکنے کی گارنٹی ہم دیتے ہیں کیونکہ وہ بھولے بھالے عوام کو بیوقوف بنانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔اُن کی کوئی بھی پیشین گوئی کبھی درست ثابت نہیں ہوئی ،اِس کے باوجود بھی نیوز چینلز اُنہیں بڑے شوق سے بلاتے اور عوام بڑے شوق سے سُنتے ہیں۔اُنہوں نے بار بار فرمایا کہ حکمرانوں میں پرویز مشرف کو کٹھمرے میں کھڑا کرنے کی جرات ہی نہیں لیکن حکمرانوں نے اُنہیں کٹھمرے میں کھڑا کر دیا۔پھر کہا کہ فوج پرویز مشرف پر قائم مقدمے کو شدت سے ناپسند کرتی ہے لیکن فوج نے اُنہیں اپنے ہاتھوں سے پہلے خصوصی عدالت میں بھیجا اور پھر اے ایف آئی سی سے ڈسچارج بھی کر دیا۔پھر خواجگان کے ''متنازع'' بیانات پر شیخ صاحب کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور اُنہوں نے یہ فرمانا شروع کر دیا ''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اپریل کا مہینہ حکمرانوں پہ بھاری ہے اور 2014ء میں میاں نواز شریف صاحب کو یا تو ملک سے باہر بھیج دیا جائے گا یا پھر وہ امیر المومنین بن جائیں گے ''۔لیکن یہ مہینہ وزیرِ اعظم صاحب پر اِس طرح سے ''بھاری'' پڑا کہ آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے اُنہیں کاکول پاسنگ آؤٹ پریڈ میں بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی دعوت دے ڈالی اور میاں صاحب نے وہ دعوت قبول بھی کر لی۔شیخ صاحب تو خیر ہیں ہی لیکن ہمارا الیکٹرانک میڈیا بھی کسی سے کم نہیں جو اُس ''پھَپھے کُٹنی'' کا کردار ادا کر رہا ہے جو پورے محلے میں لگائی بجھائی کرکے لطف اندوز ہوتی رہتی ہو۔آجکل الیکٹرانک میڈیا سیاستدانوں کے کئی کئی

سال پرانے بیانات نشر کرکے معاملات کو ٹھنڈا کرنے کی بجائے جلتی پہ تیل ڈال رہا ہے ۔حکومت یہ کہہ کہہ کے تھک چکی کہ تمام قومی امور پر سیاسی و عسکری قیادت ایک صفحے پر ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا پر صرف جنگ وجدل سے بھرپور ''شاہکار'' ہی نظر آتے ہیں ۔ نواز زرداری ملاقات کے دوران بھی اِس تناؤ کی بازگشت اُس وقت سنائی دی جب جنابِ آصف زرداری نے اِس کا ذکر کیا۔تب میاں صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ تناؤ الیکٹرانک میڈیا پر ہے یا پھر کچھ لوگوں کے ذہنوں میں ۔ قومی سلامتی کونسل کے اجلاس میں بھی مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا رہااور قوم و عسکری قیادت ، تمام ملکی معاملات خصوصاً طالبان سے مذاکرات یا جنگ پر یکسوُ نظر آئی۔ اب وہ تمام افواہیں ایک ایک ، کرکے دَم توڑ رہی ہیں جو چائے کی پیالی پر طوفان اٹھانے والوں نے پھیلا رکھی تھیں ۔آخر میں یہ کہ آخر طالبان اِس خوش فہمی میں کیسے مبتلاء ہو گئے کہ وہ حکومت کا مقابلہ کر سکتے ہیں ؟۔ہنسی آتی ہے طالبان ترجمان کے اِس بیان پر کہ ''ساتھیوں کی مخالفت کے باوجود جنگ بندی کا تحفہ دیا لیکن حکومت نے مناسب جواب نہیں دیا''۔شاید طالبان کو ادراک ہی نہیں کہ اچھی بھلی عوامی اور سیاسی مخالفت کے باوجود حکمرانوں نے طالبان کو مذاکرات کا تحفہ دیا لیکن طالبان نے اسے حکومت کی کمزوری سمجھ لیا۔وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر طالبان اپنے ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے تو پھراُن کا قصۂ پارینہ بن جانا اظہر من الشمس ہے۔

صحافت پر ایک اور حملہ

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

ارسطو نے کہا"ریاست نام ہے آزاد اشخاص پر مشتمل ایک خاندان کا" ۔اسی کا نام جمہوریت ہے جو ہمارے ہاں مفقود ہے ۔ہم نے نام تو"اسلامی جمہوریہ پاکستان" رکھ دیا لیکن سچ تو یہی ہے کہ یہ خطۂ ارض اسلامی ہے نہ جمہوری ۔یہ کیسی جمہوریت ہے جس میں " جمہور" کی آواز کو دبانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے اور یہ کون سی " شریعت " ہے جو انسانی کھوپڑیوں سے فُٹ بال کھیلنے سے ہی وجود میں آ سکتی ہے ۔انسانوں کے اِس جنگل ،اِس گلوبل ویلج کا کڑوا سچ تو یہی ہے کہ

اِس دَورِ منور میں سرِ ارض ہے جیسا
اِنسان کو ایسا کبھی خوں خوار نہ دیکھا

محب الوطن باپ وارث میر کا دبنگ، نڈر اور بیباک بیٹا حامد میر کراچی میں خون میں نہلا دیا گیا۔اُس کے جسم میں چھ گولیاں اتار دی گئیں لیکن اُس نے موت کا بھی اُسی دلیری سے مقابلہ کیا جو اُسے وارث میر سے وراثت میں ملی تھی ۔ وہ اب بھی زندہ ہے اور معالجین کے مطابق خطرے سے باہر۔ مر بھی کیسے سکتا

تھا کہ ”کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر مَر نہیں سکتا، موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے
ال عمران)“۔ حامد میر پر قاتلانہ حملے کی وکلاء، میڈیا، سول سوسائٹی صحافیوں،)
سیاستدانوں اور حکمرانوں، سبھی نے بھرپور مذمت کی اور مختلف شہروں میں احتجاج بھی
ہوا۔جنابِ وزیرِ اعظم نے حملہ آوروں کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے ایک
کروڑ روپے انعام اور تحقیقات کے لیے تین رکنی جوڈیشل کمشن بنانے کا اعلان بھی کیا
۔سندھ حکومت نے بھی حملہ آوروں کی اطلاع دینے والے کے لیے پچاس لاکھ روپے
انعام کا اعلان کیا۔اِن حکومتی اقدامات کی تحسین کے باوجود سوال یہ ہے کہ کیا جوڈیشل
کمشن کسی نتیجے پر پہنچ پائے گا اور کیا جوڈیشل کمشن کی رپورٹ منظرِ عام پر آ پائے گی
؟۔تاریخ تو یہی ہے کہ یہاں ٹارگٹ کلنگ ہوتی ہے، گواہ مارے جاتے ہیں، سیاست
دانوں کا قتل ہوتا ہے، علماء کو ٹارگٹ کیا جاتا ہے اور کمشن بھی بنتے رہتے ہیں لیکن
نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کہ ہم تو اُس دیس کے باسی ہیں جہاں دھرتی کی بے دَم
ماںتا کی فریاد سننے والا کوئی نہیں، جہاں ذہنوں میں چھپا زہر اب فضاؤں میں گھلنے لگا
ہے، جہاں صرف زور آور کی چنگھاڑ ہی سنائی دیتی ہے مجبور کی پکار نہیں۔جہاں دستِ
طلب پر صرف محرومیاں ہی اُگتی ہیں اور کاسۂ امید ہمیشہ خالی ہی رہتا ہے اور جہاں کسی
کو ”دستانے پہننے کی ضرورت ہی نہیں کہ زور آوروں کے ہاتھ پہ لگا لہو کسی کو دکھائی
ہی نہیں دیتا۔

حامد میر پر قاتلانہ حملے کی جتنی بھی مذمت کی جائے، کم ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ نڈر اور بے باک صحافی بہت جلد صحت یاب ہو کر اپنی صحافتی ذمہ داریاں سنبھال لے کہ قوم اُسے دیکھنا، سُننا اور پڑھنا پسند کرتی ہے لیکن جس طرح حامد میر کے بھائی، عامر میر نے جذبات کی رو میں بہہ کر الزام تراشیاں شروع کیں، جس انداز سے پاکستان کے سب سے بڑے میڈیا گروپ نے اُن الزامات کو اچھالا اور کئی کئی گھنٹوں پر محیط ٹاک شوز میں آئی ایس آئی کو ہدفِ تنقید بنایا گیا، وہ کسی بھی صورت میں لائقِ تحسین نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ'' (المائدہ)۔ہم یہ نہیں کہتے کہ آئی ایس آئی اِس قاتلانہ حملے میں ملوث نہیں۔یقیناً ہماری ایجنسیوں میں کچھ مُنہ زور اور آمرانہ سوچ رکھنے والے بھی ہونگے کہ طاقت کا نشہ ہی ایسا ہے لیکن اِن ایجنسیوں کی قومی اور ملّی خدمات سے مفر بھی ممکن نہیں۔آئی ایس آئی تو دشمنوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے

اور امریکہ اور انڈیا کی حکومتوں کا سارا زور ہی آئی ایس آئی پر الزام تراشیوں پر صرف ہوتا ہے۔اگر ہم بھی ایسے بے باکانہ انداز میں اپنی ایجنسیوں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگیں تو گویا ہم نے مخالفین کی باتوں پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔اِس کے باوجود بھی آئی ایس آئی کے اربابِ اختیار کو جواب دینا ہوگا کیونکہ عامر میر کے مطابق حامد میر کا تحریری بیان اور

ویڈیو موجود ہے جس میں انہوں نے اپنے اوپر کسی بھی حملے کی صورت میں آئی ایس آئی کے چیف جنرل ظہیر الاسلام اور کچھ دیگر اصحاب کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے اِس لیے آئی ایس آئی کو اپنے دامن پر لگے اِس داغ کو دھونا ہی ہوگا اور حاکمانِ وقت کو بھی حضرت عمرؓ کا یہ فرمان یاد رکھنا ہوگا کہ ''اگر کسی کی وجاہت کے خیال سے قانون کا پلڑا اُس کے حق میں جھک جائے تو اللہ کی بادشاہت اور قیصر و کسریٰ کی حکومت میں کیا فرق ہوا؟''۔ یہ امر اب کسی سے بھی پوشیدہ نہیں کہ ہائی پروفائل جرنلسٹ حامد میر اور ایجنسیوں کے مابین تلخی چلی آ رہی تھی اور ایجنسیاں خصوصاً مسنگ پرسنز کے حوالے سے حامد میر سے نالاں بھی تھیں لیکن اِس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ میر صاحب پر حملہ آئی ایس آئی ہی نے کیا ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی تیسری قوت نے حامد میر اور ایجنسیوں کے مابین تلخی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو۔ جس کسی نے بھی یہ حملہ کیا وہ کامیاب رہا کہ پوری دنیا میں آئی ایس آئی پر انگلیاں اُٹھ رہی ہیں اور خصوصاً انڈیا اور امریکہ کا الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا تو اس پر دھمالیں ڈال رہا ہے۔ حامد میر پر قاتلانہ حملے سے جتنی بدنامی آئی ایس آئی کی ہوئی اور جس انداز سے ہم نے خود ہی اسے پوری دنیا میں بدنام کر دیا، اُس کی تحسین کیسے کی جا سکتی ہے ؟۔ سوال یہ بھی ہے کہ کیا آئی ایس آئی کو نہیں پتہ تھا کہ حامد میر پر قاتلانہ حملے کی صورت

میں اُس پر انگلیاں اٹھیں گی ؟۔اگر پتہ تھا تو پھر کیا آئی ایس آئی ایسا احمقانہ اقدام کر سکتی تھی ؟۔سوال یہ بھی ہے کہ کیا پاکستان میں کئی ایسی غیر ملکی ایجنسیوں کے ایجنٹ کام نہیں کر رہے جن کی ذمہ داری ہی پاکستان کو اندرونی طور پر کمزور کرنا اور سول اور ملٹری اداروں کو آپس میں لڑانا ہے ؟۔کیا غیر ملکی ایجنسیاں ایسا نہیں کر سکتیں ؟۔کیا طالبان ایسا نہیں کر سکتے ؟۔آج تو طالبان کے ترجمان شاہد اللہ شاہد نے حامد میر پر حملے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ہم نے اُسے قبول بھی کر لیا حالانکہ ٹویٹر پر پنجابی طالبان نے اِس حملے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے یہ لکھا کہ حامد میر کو طالبان مخالفت ، ملالہ یوسف زئی کی حمایت اور اُس کے سیکولر نظریات کی سزا دی گئی ہے۔ لیکن آئی ایس پی آر کے ترجمان میجر جنرل عاصم باجوہ صاحب کے مذمتی بیان کو در خورِ اعتناء نہ سمجھا۔میجر جنرل عاصم باجوہ صاحب نے نہ صرف اِس حملے کی بھرپور مذمت کی بلکہ غیر جانب دارانہ انکوائری کا مطالبہ بھی کیا۔حقیقت یہی ہے کہ حامد میر پر قاتلانہ حملہ ایسا ہشت پہلو ہے کہ اِس کے صرف کسی ایک پہلو کو مدِ نظر رکھ کر حقائق تک نہیں پہنچا جا سکتا۔دبنگ حامد میر سے دشمنی کے سلسلے بہت دراز ہیں ۔اُنہیں کراچی میں ٹارگٹ کیا گیا اور کراچی ایسی جگہ ہے جہاں ہر روز ٹارگٹ کلنگ ہوتی ہے۔صحافیوں کے قتل کے الزامات ایم کیو ایم پر بھی لگتے رہے ہیں اور یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ ایم کیو ایم بھی حامد میر سے نالاں تھی ۔وہ

طالبان کی ہِٹ لسٹ پر بھی تھے اور ایجنسیوں سے بھی اُن کے تعلقات بہتر نہیں تھے ۔اِن حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کوئی بھی غیر ملکی ہاتھ اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے اُن پر حملہ کروا سکتا ہے ۔یہ کہنا بھی حقائق کے منافی ہے کہ صرف آئی ایس آئی ہی حامد میر کی موومنٹ سے واقف ہو سکتی ہے کیونکہ صرف اسی کے پاس صحافیوں کے فونز ٹیپ کرنے کا سسٹم موجود ہے ۔اگر ایسا ہی ہے تو پھر کیا کراچی میں بہت سے علماء ، صحافیوں اور سیاستدانوں کی ٹارگٹ کلنگ میں بھی آئی ایس آئی ہی ملوث ہے ؟۔کیا ایس ایس پی چوہدری اسلم اور ایکسپریس نیوز کے تین ملازمین کے خون سے بھی آئی ایس آئی نے ہی ہاتھ رنگے ؟۔اگر صرف آئی ایس آئی ہی بہت با خبر ہے تو پھر بہت سے حساس مقامات پر ہونے والے حملوں کو کس کھاتے میں ڈالیں گے ؟۔حقیقت یہی ہے کہ با خبر اور بھی بہت ہیں اور شاید ہماری ایجنسیوں سے بھی زیادہ با خبر۔

کمانڈو کراچی سدھار گئے

آج ایک معروف نیوز چینل پر ایک ایسی خبر نشر ہو رہی تھی جسے سُن کر ہم چونک اُٹھے۔ خبر یہ تھی کہ ایک لاہوری خاتون نے اپنے میاں کے خلاف مقدمہ درج کروایا ہے کہ اُس کے شوہر نے اُس کے پیٹ میں ''ٹریکر'' فِٹ کروا دیا ہے تاکہ اُس کی نقل و حرکت کا پتہ چل سکے۔ یہ خبر شاید ابھی تک NGO,s کی خواتین تک نہیں پہنچی لیکن ہمیں یقین ہے کہ جونہی یہ خبر آزادیِ نسواں کی علمبرداروں تک پہنچے گی تو اِک شورِ قیامت اُٹھے گا اور پوری دُنیا کو پتہ چل جائے گا کہ پاکستانی خواتین کتنی آزاد و خود مختار ہیں۔ ویسے اِس ''بیہودہ'' حرکت پر جلسے جلوس اور ریلیاں نکالنے کا تو ہمارا حق بنتا ہے کیونکہ اگر احتجاجی ریلیاں نہ نکالیں تو ہماری NGO,s کو یورپ اور امریکہ سے ملنے والی ڈھیروں ڈھیر امداد کے بند ہونے کا شدید خطرہ ہے۔ ہم جب بھی آزادیٔ نسواں یا حقوقِ نسواں کی بات کرتے ہیں تو پتہ نہیں مردوں کے پیٹ میں کیوں ''مروڑ'' اُٹھنے لگتے ہیں؟۔ وہ تو اللہ بھلا کرے NGO,s کی خواتین کا جو ہماری آزادی کی جنگ میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہوتیں تو ہم تو مَر ہی گئے ہوتے۔

خاتون کے پیٹ میں ٹریکر فِٹ کرنے کا واقعہ سُن کر ہمارے ذہن میں ایک اچھوتا

اور نرالا خیال یہ آیا ہے کہ اگر حکومت کو ہمارے عظیم ''کمانڈو'' سے اتنا ہی خطرہ ہے کہ وہ موقع پا کر باہر کھسک لیں گے تو حکومت اُن کے پیٹ میں بھی ٹریکر فِٹ کروا دے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بِلّی کے گلے میں گھنٹی کیسے باندھیں؟۔ ہمارے کمانڈو تو انجیو گرافی بھی پاکستان میں کروانے سے انکاری ہیں کہ اُن کے خیال میں یہاں سبھی ''نالائق'' بستے ہیں، پھر بھلا وہ اپنے پیٹ میں ''سوراخ'' کیسے کروالیں۔ کمانڈو نے جب اسلام آباد سے کراچی جانا تھا تو پہلے تو مختلف روٹ لگائے گئے اور ہر روٹ کی سڑک کو گھنٹوں بند رکھا گیا۔ پھر ایئر پورٹ پر تمام جہازوں کو ''گراؤنڈ'' کر دیا گیا اور فضاء میں پرواز کرنے والے جہازوں کو اُتنی دیر تک لینڈ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جب تک اُن کا طیارہ پرواز نہیں کر گیا۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری ''باخبر'' ایجنسیوں نے یہ اطلاع دی ہو کہ فضاء میں پرواز کرنے والے جہاز طالبان سے بھرے ہوئے ہیں اور اگر اُنہیں لینڈ کرنے کی اجازت دی گئی تو کمانڈو کا بچنا محال ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا پرویز مشرف صاحب بخیریت اپنی بیٹی کے گھر پہنچ گئے۔ وہ اُسی سڑک سے گزرے جس پر حامد میر کا جسم گولیوں سے چھلنی کیا گیا لیکن حامد میر تو محض ایک صحافی اور اینکر ہے۔ وہ کوئی سابقہ صدر، چیف آف آرمی سٹاف اور آل پاکستان مسلم لیگ کا بانی صدر تو نہیں تھا کہ اُس کے لیے سڑکوں پر روٹ لگایا جاتا اور آرمی اور رینجرز کی گاڑیوں کے جلوس میں گھر تک پہنچایا جاتا۔ پرویز مشرف کی کراچی آمد پر سب سے خوبصورت تبصرہ قائدِ

حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ کا تھا۔اُنھوں نے فرمایا کہ مشرف صاحب کی کراچی آمد اُن کی بیرونِ ملک روانگی کا پہلا مرحلہ ہے۔اب وہ ملک سے نکل جائیں گے اور الزام سندھ حکومت پر آ جائے گا۔ویسے حیران ہم بھی ہیں کہ آخر پرویز مشرف صاحب اپنے چَک شہزاد کے محل کو چھوڑ چھاڑ کر کراچی کیوں سدھارے؟۔اُن کے محل میں تو اُنہیں دُنیا جہان کی ہر سہولت میسر تھی اور دل بہلانے کا سامان بھی۔پھر آخر کونسی ایسی آفت آن پڑی کہ وہ اپنی پسندیدہ ترین چیزوں کو داغِ مفارقت دے کر کراچی آ گئے ۔اگر اُنہیں اے ایف آئی سی کے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں تھا تو پی این ایس شفاء تو اُس سے کہیں کم تر درجے کا ہسپتال ہے۔اگر وہ ''بیماریٔ دل ''میں مبتلاء ہیں تو پھر اے ایف آئی سی ہی بہتر تھا لیکن لگتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے بلکہ پوری دال ہی کالی ہے۔اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ پرویز مشرف صاحب کے جسم میں بھی ''ٹریکر'' فِٹ کرکے اُنہیں کھُلا چھوڑ دیا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا جائے کہ پاکستان کی غریب حکومت اُن کی سکیورٹی پر اُٹھنے والے اخراجات کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ہمیں بھی اب تھوڑا تھوڑا یقین ہونے لگا ہے کہ ہمارا کمانڈو بالآخر کھسک ہی جائے گا۔ویسے ایک بات ہے کہ ہمارے الطاف بھائی بھی تو دھڑلے سے باہر بیٹھے ہیں اور میمو گیٹ سکینڈل والے حسین حقانی بھی۔اگر مشرف صاحب بھی وہاں چلے جائیں تو ہرج ہی کیا ہے کہ ''خوب گزرے گی جو مِل بیٹھیں گے دیوانے تین'' ۔

ہمارے ایک بہت معروف لکھاری اور دانشور جو کسی زمانے میں نواز لیگ کے ثناخواں اور پارلیمنٹ کے رکن تھے ، آجکل نواز لیگ پر گرجتے برستے رہتے ہیں۔ وجہ صرف یہ کہ 2013ء کے الیکشن میں مسلم لیگ نواز نے اُنہیں پارلیمنٹ کا ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا جو ہمارے نزدیک سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ اتنے عظیم لکھاری اور ارسطوانہ ذہن کے مالک دانشور، جن کے بارے میں بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ’’بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا‘‘ اُسے بھلا ٹکٹ نہ دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟۔ عظیم لکھاری نے اپنے کالم میں میاں نواز شریف صاحب کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ وہ فوج کے ساتھ اُلجھاؤ کی پالیسی اختیار کرتے رہتے ہیں اور کسی پُر اسرار اور گہرے نفسیاتی مسلے کی وجہ سے دفاعی اداروں کے ساتھ نباہ کرنا دشوار پاتے ہیں۔ محترم لکھاری کہتے ہیں’’ وزیرِ اعظم نے اپنے بے لچک رویے اور اصول پرستی کا نمونہ بنتے ہوئے ریٹائرڈ اور حاضر سروس آفیسرز کو تاؤ دلا دیا ہے اور وہ سوچ رہے ہیں کہ جب شریف برادران قید میں تھے تو مشرف نے اعتدال کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُنہیں بیرونِ ملک جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن اب جب آرمی چیف پر ایسا وقت آیا تو سول حکومت لچک کا مظاہرہ کرنے کو تیار نہیں‘‘۔ اُنھوں نے یہ بھی لکھا’’ سوچنے کی بات ہے کہ پرویز مشرف کے اتنے وسیع فارم ہاؤس کے گرد بم پروف دیوار بنانے سے دبئ کا ٹکٹ کہیں زیادہ سستا پڑتا۔ کیا ہم براہِ کرم اِس موضوع پر

بات کرتے ہوئے آئین اور قانون کی حکمرانی کی باتیں کرنے سے احتراز نہیں کر سکتے ۔عرض ہے کہ جہاں تک پُر اسرار اور گہرے نفسیاتی مسئلے کا تعلق ہے تو محترم لکھاری" اِس بارے میں ہم سے کہیں بہتر جانتے ہونگے کیونکہ اُن کا اور میاں برادران کا ساتھ بہت پرانا ہے البتہ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ٹکٹ نہ ملنے کے غم میں محترم لکھاری گہرے نفسیاتی مریض بن چکے ہیں۔ جہاں تک فوج کو تاؤ دلانے کا تعلق ہے تو اُس کا نظارہ اُنھوں نے پی ایم اے کاکول کی پاسنگ آوٹ پریڈ میں کر ہی لیا ہو گا جہاں میاں نواز شریف صاحب کو بطور مہمانِ خصوصی بلایا گیا حالانکہ 2013ء کی پاسنگ آوٹ پریڈ میں جنرل اشفاق پرویز کیانی نے میاں صاحب کو دعوت نہیں دی تھی اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں تھا لیکن شاید جنرل راحیل شریف نے میڈیا پر اُٹھنے والے طوفان کو مدّ نظر رکھتے ہوئے میاں صاحب کو دعوت دی تاکہ گَرد بیٹھ جائے اور ہُوا بھی ایسا ۔آج سیاسی اور عسکری قیادت کے مابین تناؤ قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔۔۔مکرر عرض ہے کہ یہ بجا کہ دبئی کا ٹکٹ بہت سستا ہے اور بم پروف دیوار بہت مہنگی لیکن کیا کوئی ملک آئین و قانون کی حکمرانی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے؟۔ محترم لکھاری نے اپنے کالم میں ایڑی چوٹی کا زور یہ ثابت کرنے میں لگا دیا ہے کہ میاں نواز شریف صاحب آمریت کی پیداوار ہیں لیکن شاید کسی گہرے نفسیاتی مسئلے کی وجہ سے وہ خود ہی یہ اقرار بھی کر گئے کہ اُنہیں آمریت ہی مرغوب ہے کیونکہ جس آئین و قانون سے احتراز کا وہ درس دے رہے ہیں وہ صرف آمروں کا

ہی شیوہ ہے۔

کھڑاک پہ کھڑاک

یوں تو پاکستان میں ہر روز چھوٹے موٹے کھڑاک ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن بعض کھڑاک ایسے ہوتے ہیں جن کی گونج دیر تلک سنائی دیتی رہتی ہے ، جیسے معروف اینکر اور قلم کار حامد میر پر قاتلانہ حملہ جس میں اُنھوں نے موت کو تو شکست دے دی لیکن مخالفین اور ناقدین کی زبانوں پہ لگے قفل بھی کھل گئے ۔الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر الزامات کا طوفان بپا ہے اور نیوز چینلز باہم دست و گریباں ۔ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ اہلِ صحافت کے ہاں بہت ''ایکا'' ہے لیکن اِس لڑائی نے عیاں کر دیا کہ ہمارے یہ ''اصلی تے وَڈے'' حکمران بھی اُسی '' نفسا نفسی'' کا شکار ہیں جس میں کبھی ہمارے جمہوری حکمران ہوا کرتے تھے ۔90 کی دہائی میں پیپلز پارٹی اور نواز لیگ بھی ایک دوسرے کو ''سکیورٹی رِسک'' قرار دیا کرتے تھے لیکن ''مارشل لائی رَگڑے'' نے اُنہیں اتنی عقل ضرور عطا کر دی کہ اب اُن کے ہاں وہ بھی خالص ، سَچے اور سُچے محبِ وطن قرار پائے جو اربوں کھربوں ڈکار گئے۔

دوسرا کھڑاک حامد میر کے بھائی عامر میر نے ISI کے چیف جنرل ظہیر الاسلام پر براہِ راست الزام لگا کر کر دیا۔ عامر میر تو الزام لگا کر چُپ ہو رہے

لیکن نیوز چینلز پر ایسا ''دھوم دھڑکا'' شروع ہوا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔اِس دھوم دھڑکے میں کسی نے نہ تو پنجابی طالبان کے اِس بیان کو لفٹ کرائی کہ وہ حملے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور نہ ہی مہمند ایجنسی کے امیر عمر خراسانی کو، جس نے کہا اِس طرح تو ہوتا ہے، اِس طرح کے کاموں میں'' ۔البتہ ہمارے وزیرِ اعظم صاحب'' نے اِس شور وغُل سے پریشان ہو کر فوری طور پر اعلیٰ سطحی تحقیقاتی کمیشن قائم کر دیا اور حملہ آوروں کی اطلاع دینے والے کے لیے ایک کروڑ روپے کا اعلان بھی۔ سندھ حکومت بھی لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہو گئی ۔اُس نے پچاس لاکھ انعام کے ساتھ بھی شامل ہے ISI چار پانچ ایجنسیوں پر مشتمل ایسی تفتیشی ٹیم مقرر کر دی جس میں کی شکایت پر پیمرا کو پاکستان کے سب سے ISI ۔اُدھر ہمارے خواجہ آصف سیالکوٹی نے بڑے میڈیا گروپ کی بندش کا لکھ کر ایسا کھڑاک کر دیا جس نے بڑے بڑوں کی بولتی'' بند کر دی۔''

ایک کھڑاک اُس وقت ہوا جب وزیرِ اعظم صاحب حامد میر کی عیادت کے لیے آغا خاں ہیڈ کوارٹر۔تب ISI ہسپتال جا پہنچے اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف پاکستان کے سارے بزرجمہر، افلاطون اور ارسطوایک ہی'' سُر'' میں یہ راگ الاپنے لگے کہ چونکہ وزیرِ اعظم صاحب حامد میر کی عیادت کے لیے گئے جسے افواجِ پاکستان نے پسند نہیں کیا اِس لیے ردِ عمل کے طور پر جنرل راحیل

ہیڈ کوارٹر چلے گئے تاکہ حکومت کو اپنی ناپسندیدگی کا واضح پیغام دیا جا سکے ISI شریف ۔کیا ہمارے اُڑتی چڑیا کے پَر گِن لینے والے میڈیا کو اتنا بھی نہیں پتہ تھا کہ وزیرِ اعظم اور آرمی چیف دونوں کے ''وِزٹ'' پہلے سے طے شُدہ تھے ؟۔ بہرحال وزیرِ اعظم صاحب نے گوادر جا کر ایسا کھڑاک کیا کہ سبھی بزرجمہروں کے مُنہ لٹک گئے ۔اُنھوں نے میڈیا کو مخاطب کرکے کہا ''میرے بائیں جانب آرمی چیف اور دائیں طرف وزیرِ اعلیٰ بلوچستان ہیں اور ہم پاکستان کی تعمیر و ترقی اور اُسے امن کا گہوارہ بنانے کے لیے ایک میز پر بیٹھے تھے ''۔اِس سے پہلے جب وزیرِ اعظم ہیلی کاپٹر کے ذریعے پی این ایس کَرم ایئر بیس پر پہنچے تو چیف آف آرمی سٹاف اُن کے استقبال کے لیے موجود تھے ۔ وزیرِ اعظم صاحب نے تو سول اور عسکری اداروں میں تصادم کروا کر اپنی ''آڑھت'' چمکانے والوں کو واضح پیغام دے دیا لیکن اگر میاں صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ ''افلاطونی دانشور'' اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں گے تو یہ اُن کی خام خیالی ہے ۔آج بھی ٹکٹ نہ ملنے کا متواتر ''سیاپا'' کرنے والے دانشور نے لال حویلی والے کی طرح، اپنے کالم میں اداروں کے تصادم کا رونا ہی رویا ہے ۔شاید یہ کوئی '' نفسیاتی کجی'' ہو جو اُنہیں ہر پَل بے کَل رکھتی ہے۔پرویز مشرف کو تو پاکستانی ڈاکٹروں پر اعتبار نہیں لیکن حکومت اِس عظیم دانشور'' کا تو نفسیاتی علاج کروا ہی سکتی ہے ۔تو کیا حکمران اپنے ''سابق ساتھی'''' کی دِگرگوں حالت پر غور فرمائیں گے ؟۔

کھڑاک تو پرویز مشرف صاحب نے اسلام آباد سے کراچی ''ہجرت''فرما کر بھی کیا لیکن یہ کھڑاک حامد میر پر قاتلانہ حملے کے شور میں دَب کر محض ایک چھوٹی سی ''کھڑاکی'' بَن کر رہ گیا۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حامد میر پر حملہ کروایا ہی اِس لیے گیا کہ اُس کے شور میں پرویز مشرف صاحب کا معاملہ دَب جائے اور وہ چپکے سے کھسک لیں لیکن ایسا ہوا نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ سندھ حکومت خوب جانتی ہے کہ جب مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی تو اُس وقت ریمنڈ ڈیوس کو چپکے سے ''فرار'' کروا کر سارا بوجھ نواز لیگ کی پنجاب حکومت پر ڈال دیا گیا اور مرکزی حکومت پنجاب کی بے بسی پر چَسکے'' لیتی رہی ۔اب اگر پرویز مشرف سندھ سے فرار ہو کر کسی دوسرے ملک'' سدھار جاتے ہیں تو سارا بوجھ سندھ حکومت پر آن پڑے گا جو اُسے کسی بھی صورت قبول نہیں ۔ویسے ''میثاقِ جمہوریت'' کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ریمنڈ ڈیوس اگر پنجاب سے گیا تھا تو پرویز مشرف کو سندھ ہی سے جانا چاہیے لیکن ''بے اصولی''تو پیپلز پارٹی کے خمیر میں ہے اِس لیے ایسا ہونا ممکن نہیں۔اب منظور وسان صاحب لاکھ کہیں کہ اُن کے خواب'' کے مطابق پرویز مشرف دس دِنوں کے اندر پاکستان سے چلے جائیں گے ،'' ہمیں یقین نہیں ۔ویسے بھی وسان صاحب کے خوابوں کی تعبیر ہمیشہ اُلٹ ہی ہوتی ہے ۔

ویسے تو ایک کھڑاک ایم کیو ایم نے بھی سندھ حکومت میں شمولیت اختیار کرکے کر دیا لیکن ہم اسے دَر خورِ اعتناء نہیں سمجھتے کیونکہ ایم کیو ایم کی ''آنیاں جانیاں'' تو لگی ہی رہتی ہیں ۔اُس نے پہلے مرکزی حکومت میں شمولیت کی بھرپور کوشش کی اور اسی حوالے سے وہ سندھ حکومت پر گرجتی برستی بھی رہی لیکن میاں برادران آجکل کسی کو کَم کَم ہی ''گھاس'' ڈالتے ہیں اِس لیے چار و ناچار ایم کیو ایم نے سندھ حکومت میں شمولیت پر اکتفا کر لیا۔ویسے ہمیں یقین ہے کہ اگر کبھی ''خُدانخواستہ'' نواز لیگ کو ایم کیو ایم کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ سندھ حکومت کو داغِ مفارقت دینے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہیں لگائے گی۔ ہم نے پہلے کبھی الطاف بھائی کے ''کھڑاکوں'' کو کوئی اہمیت دی ہے ، نہ اب دینے کو تیار ہیں البتہ تحریکِ طالبان نے جنگ بندی کا خاتمہ کرکے ضرور کھڑاک کرنے کی کوشش کی ۔اُنھوں نے ہمارے چار جوان شہید کیے تو ہم نے اُن کے چالیس ''پھَڑکا'' دیئے ۔اب طالبان مذاکرات کے لیے تیار ہیں اور اُن کے ترجمان شاہد اللہ شاہد کہتے ہیں کہ ''ہم تو مائل بہ کَرم ہیں ، کوئی سائل ہی نہیں ''۔ایک کھڑاک تحریکِ انصاف بھی 11 مئی کو کرنے جا رہی ہے ۔ محترم خاں صاحب نے کہہ دیا کہ 11 مئی کو شروع ہونے والی تحریک کا کوئی ''اَنت'' نہیں ۔شاہ محمود کہتے ہیں کہ اُن کی سونامی ''سب کچھ بہالے جائے گی ۔اِس دفعہ سونامی کو ڈاکٹر طاہر القادری کی آشیرباد'' بھی حاصل ہے اور وہ بھی کیل کانٹے سے لیس ہو کر کینیڈا سے پاکستان آنے ہی والے ہیں۔ ہم تو خوش

ہیں کہ خوب ”ہلا گلا“ ہوگا اور ہمیں اپنے کالموں کا پیٹ بھرنے کے لیے ڈھیروں ڈھیر مواد میسر ہوگا لیکن خطرہ ہے تو صرف ایک بات کا کہ کہیں سونامی اپنا رُخ پھیر کر تحریکِ انصاف کے ساتھ ہمارے مُرشد ڈاکٹر طاہر القادری کو بھی بہا نہ لے جائے۔ سمجھ سے بالاتَر ہے کہ آخر تحریکِ انصاف اور ہمارے ”مُرشد“ کو آخر شدید گرمی اور شدید سردی میں ہی ”کھڑاک“ کرنے کی کیوں سوجھتی ہے؟۔ کیا ”سونامیوں“ اور مریدین“ کا امتحاں مقصود ہے؟“

یہ بے لگامی کب تلک

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

حضرت عمرؓ نے فرمایا ''امیر المومنین صرف اُس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے جب اُسے یقین ہو جائے کہ رعایا میں سے ہر ایک کو گیہوں کی روٹی میسر ہے''۔ لیکن ہمارے ''مہربانوں'' کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ کسی مفلس کی ''کُٹیا'' میں جھانک کر دیکھ سکیں۔ اُن کے نزدیک تو یہ سب ''کتابی'' باتیں ہیں جن پر اِس ''دَورِ منور'' میں عمل ممکن نہیں۔ اُدھر ''رعایا'' بھی با کمال کہ کھیتی بے بَرگ و ثمر، کم نصیبی کی سیاہ رات ختم ہونے کا کوئی امکاں نہ آمدِ صبح کی گواہی دینے والا کوئی مہرباں، مزدور اور کسان کے ماتھے کے پسینے سے زور آوروں کی تجوریاں لبا لَب لیکن مجبوروں، مقہوروں کے چولہے خاموش، پھر بھی سب کچھ نصیبہ جان کر قبول، کوئی شکوہ نہ شکایت، زبانیں زنگ آلود اور لبوں پہ مہرِ خاموشی۔ شہروں میں تھوڑی بہت ہل چل لیکن دیہاتوں میں بسنے والے 70 فیصد کو فہم نہ ادراک۔ اقبالؒ کا درسِ خودی تو یہ تھا کہ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

لیکن اِس قوم کے خمیر میں تو انقلاب کے جرثومے سرے سے موجود ہی نہیں البتہ

اتنا ضرور کہ پاؤں فگار قوم کی نگاہوں کو اب کوئی چچتا ہی نہیں۔شاید اسی لیے انتخابات کے ہنگام غالب اکثریت گھروں میں بیٹھی چھٹی منا رہی ہوتی ہے۔آقاﷺ کا فرمان تو یہ ہے ''تم میں سے ہر ایک راعی (چرواہا) ہے جس سے روزِ قیامت اُس کی بھیڑوں کا حساب لیا جائے گا'' لیکن ہمارے حکمرانوں کو تو اتنا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ

فرشتوں نے جسے سجدہ کیا تھا
وہ کل فُٹ پاتھ پہ مُردہ پڑا تھا

بائرن نے کہا ''زندگی اُس پنڈولم کی مانند ہے جو آنسوؤں اور قہقہوں کے درمیان جھولتا رہتا ہے''۔لیکن ہمارے آنگن کی کھیتیوں میں تو صرف آنسوؤں کی فصل اُگتی ہے اور ذہن کے اُفق پر اگر کوئی خیال آتا بھی ہے تو سسکیوں میں ڈوبا ہوا۔اب تو ہم بارود کی بُو سے اتنے مانوس ہو چکے کہ اگر کوئی دن خیریت سے گزر جائے تو اُداس ہو جاتے ہیں ۔بائرن کے ''قہقہوں'' کی تلاش میں اگر کبھی کسی نیوز چینل کا مزاحیہ پروگرام دیکھنے بیٹھ بھی جائیں تو طبیعت مزید بد مزہ ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ہم بھانڈوں کے ''محلے'' میں آ گئے ہوں ۔امام غزالیؒ نے کہا ''تمسخر بالعموم قطع دوستی ، دل شکنی اور دشمنی کا باعث بنتا ہے''۔لیکن ہمارے نیوز چینلز پر تو پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں ، تمسخر اُڑایا جاتا ہے ، جملے کَسے جاتے ہیں اور جگت بازی

ہزل گوئی کو فن کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ سچ کہا برٹرنڈرسل نے ’’یہ وہ دَور ہے جس، میں انسانیت کا خطرناک ترین دشمن خود انسان ہے‘‘۔

قوم نے یہ جان کر میاں برادران سے بہت سی توقعات وابستہ کر لیں کہ اُمید کی کچھ کرنیں اُنہی کی منڈیروں پر چمکتی دکھائی دیتی تھیں لیکن ایک سال ہونے کو آیا، بدلا کچھ بھی نہیں سوائے چہروں کے۔ قوم کو جن پہ تکیہ تھا وہی عالمِ بَد حواسی میں لیکن قصور اُن کا بھی نہیں کہ عنانِ حکومت سنبھالنے سے پہلے اُنہیں ادراک ہی نہیں تھا کہ اُنہیں وراثت میں اِک اُجڑا دیار ملے گا۔ اُن کی کاوشوں سے شاید قوم کا کچھ بھلا ہو بھی جاتا لیکن افواہیں پھیلانے، ٹانگیں کھینچنے اور طنز کے تیر برسانے والے ڈھیروں ڈھیر۔ سیاست دان سڑکوں پہ آنے اور دانشور چائے کی پیالی میں طوفان اُٹھانے پر تیار۔ ’’خواجگان‘‘ نے پرویز مشرف کے خلاف چند جملے کیا بولے گویا بھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈال دیا۔ یار لوگوں نے اپنی اپنی ڈفلیاں اُٹھائیں اور یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ میاں نواز شریف صاحب نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا۔ اُدھر جنرل راحیل شریف کے اِس جملے نے بَد خواہوں کی آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھا دی کہ ’’فوج اپنے وقار کا ہر قیمت پر تحفظ کرے گی‘‘۔ سوال مگر یہ ہے کہ اِس جملے میں بغاوت کی بُو کہاں سے آتی ہے؟۔ اگر جنرل صاحب یہ نہ کہتے تو پھر کیا یہ کہتے کہ فوج اپنے وقار کے تحفظ سے قاصر ہے؟۔ کیا یہ ایک عام سا جملہ نہیں

جسے ہم ’’عامیوں‘‘ کی زبان سے بھی دِن میں کئی کئی بار سُنتے ہیں ؟۔ لیکن یہاں تو مسلہَ یہ آن پڑا کہ اپنی دانشوری کا رعب کیسے جھاڑا جائے۔ پھر وزیرِ اعظم صاحب زخمی حامد میر کی عیادت کے لیے چلے گئے تو طرح طرح کی موشگافیاں ہونے لگیں۔ لیکن کسی نے یہ نہیں سوچا کہ میاں نواز شریف اور جنرل راحیل شریف کی گزشتہ چھ ماہ میں جتنی ملاقاتیں ہوئی ہیں اتنی تو شاید گزشتہ چھیاسٹھ برسوں میں بھی سربراہانِ مملکت کی آرمی چیفس سے نہیں ہوئی ہونگی۔ اگر سیاسی اور عسکری قیادت کے مابین اتنا ہی تناؤ ہے تو پھر یہ روز روز کی ملاقاتیں چہ معنی دارد ؟۔ دراصل ہمارا المیہ یہ کہ ’’دَورِ مشرف‘‘ میں بے شمار نیوز چینلز آن ایئر ہوئے جن کی بدولت صحافیوں کی کایا کلپ ہو گئی۔ دولت و شہرت گھر کی باندی اور طاقت دَر کی لونڈی ٹھہری۔ داخلہ اور خارجہ پالیسیاں نیوز چینلز پر ترتیب پانے لگیں، فیصلے عدالتوں کی بجائے نیوز چینلز پر ہونے لگے اور بقول نذیر ناجی ’’چھاتہ بردار‘‘ اینکروں کی فوج ظفر موج نے سب کچھ اُلٹ پلٹ کرکے رکھ دیا۔ ڈرائیڈن کہتا ہے ’’نقاد میں نفرت کا جذبہ شدید ہوتا ہے اور وہ محاسن سے زیادہ معائب کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے‘‘۔ ہمارے ہاں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ ہر کسی کا اپنا اپنا قبلہ اور اپنا اپنا کعبہ۔ اپنوں کی مدح سرائی میں ہمارا کوئی ثانی نہ غیروں کو طنز و تعریض کے نشتروں سے گھائل کرنے میں۔

انتہائی معقول قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ نے محترم عمران خاں صاحب سے کہا ہے کہ ملکی حالات ہر گز اجازت نہیں دیتے کہ کسی قسم کی تحریک چلائی جائے اِس لیے خاں صاحب حکومت مخالف تحریک چلانے میں جلد بازی نہ کریں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ وقت کا تقاضہ ہے کہ میڈیا ہو یا عسکری قیادت، سیاست دان یا حکمران، اپوزیشن یا حکومت، سب کو مل کر بیٹھنا چاہیے"۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ عمران خاں صاحب گیارہ مئی کو ضرور باہر نکلیں گے کیونکہ جس کا صلاح کار "لال حویلی" والا ہو اُس سے بھلا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے؟۔ ہمیں محترم خاں صاحب کی حب الوطنی پر تو کوئی شک نہیں لیکن جس طرح سے وہ کچھ لوگوں کی باتوں میں آ کر اپنی "ضد" پال رہے ہیں اُسے حب الوطنی ہر گز نہیں کہا جا سکتا۔ میاں برادران سمیت اکابرینِ نواز لیگ میں ہزار خامیاں ہونگی اور ہیں لیکن یہ دھرتی جن اندرونی و بیرونی خطرات میں گھری ہوئی ہے اُن کا تقاضہ تو یہی ہے کہ پہلے ملک بچا لیں پھر سیاست بھی ہوتی رہے گی۔ لیکن خاں صاحب جن "عقیل و فہیم" لوگوں میں گھِرے ہوئے ہیں، وہ اُنھیں ہر گز ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ اُدھر انتہائے نرگسیت کے شکار کینیڈین مولانا صاحب بھی ایک دفعہ پھر کمر کَس کر میدان میں اترنے والے ہیں۔ مولانا صاحب جب پہلے تشریف لائے تو اُنھوں نے کاسہ لیسی کرتے ہوئے عسکری قیادت اور اعلیٰ عدلیہ کو جھانسہ دینے کی کوشش کی لیکن جب دونوں نے ہی گھاس نہ ڈالی اور ایم کیو ایم نے بھی بیچ منجدھار چھوڑ دیا تو مولانا صاحب "بڑے بے آبرو

ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے" کی عملی تصویر بنے کینیڈا سدھار گئے۔اب وہ محترم عمران خاں کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی تگ ودَو میں ہیں جس میں اُنہیں فائدہ ہی فائدہ نظر آ رہا ہے۔اگر تحریک کامیاب ہو گئی تو مولانا کی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل ہو جائے گی اور ناکامی کی صورت میں نو مولود تحریکِ انصاف تو یقیناً یہ جھٹکا سہہ نہیں پائے گی البتہ مولانا کچھ کھوئے بنا پھر سے "اپنے دیس" سدھاریں گے۔

باقی جو بچا، وہ مہنگائی مار گئی

ہمارے پاس باقی بچا ہی کیا ہے جسے مہنگائی مار سکے۔ ہم تو اپنا دِل جمہوریت کے حسین قدموں میں رکھ کر عرصۂ دراز سے گاتے چلے آ رہے ہیں کہ ''رکھ دیا قدموں میں دِل نذرانہ، قبول کر لو'' لیکن مجنونانِ جمہوریت سے ناخوش ''میڈم جمہوریت'' ہمارے دلوں کو متواتر ٹھکراتی چلی جا رہی ہے اور ہمارے کچھ دانشوروں کے خیال میں اب تو نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ وہ عنقریب روٹھ کر ''مَیکے'' چلی جائے گی۔اگر ہم حضرتِ اقبالؒ کے دَور میں ہوتے تو وثوق سے کہہ سکتے تھے کہ جمہوریت کا ''مَیکا'' انگلستان ہے لیکن اب کچھ پتہ نہیں کیونکہ اب اِس کا حلقہ وسیع اور اسے اِدھر اُدھر مُنہ مارنے کی عادت۔دُنیا کی سب سے حسین جمہوریت تو ہمارے پڑوس میں بستی ہے لیکن وہاں بھی اسے انسانی خون کی چاٹ لگ چکی ہے۔ ہم عشق کے ماتوں کی شدید ترین خواہش تو یہی ہے کہ ہماری جمہوریت نہ روٹھے، بھلے وہ اپنے عشوہ، غمزہ، اور ناز و ادا سے کُشتوں کے پُشتے لگاتی رہے لیکن اگر وہ روٹھ گئی تو ہم بھی بَد لحاظ ہو کر پہلے اُسے یہ طعنہ دیں گے کہ

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سَر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دِل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ور پھر ''میڈم آمریت'' کے دَرِ نیاز پہ جبینِ نیاز رکھ دیں گے کہ ہمارے نزدیک تواِن دونوں میں پاکستان کی حد تک '' کُچھ'' فرق نہیں ۔اگر فرق ہے بھی تو صرف اتنا کہ میڈم جمہوریت اپنے حُسن کے زور پر ''ھل مَن مزید''کی خواہش رکھنے والے عاشقوں کا خون چوستی ہے اور آمریت بمثلِ ''کالی ماتا'' ۔شاید اسی لیے اقبالؒ نے بھی کہا تھا کہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پَری

لیکن ہمارے ہاں تو یہی ''دیو استبداد'' جمہوریت کا حُسن ہے اور اسی کے ہم گھائل ۔ٹارگٹ کلنگ ، بھتہ خوری ، مہنگائی ، کرپشن ، سب جمہوریت کا حُسن ہی تو ہیں ۔جی تو بہت چاہتا ہے کہ ''حُسنِ جمہوریت'' پر مزید لکھیں اور ڈھیروں ڈھیر لکھیں لیکن خوف دامن گیر ہے کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ہم میاں نواز شریف صاحب کو ''امیر المومنین'' بنتے دیکھنا چاہتے ہیں ۔ویسے آپس کی بات ہے کہ اگر وہ امیر المومنین بَن جاتے ہیں تواِس میں کوئی ہَرج بھی نہیں کہ اسلام میں تو ''امیر المومنین'' ہی ہوتا ہے ۔لیکن مسئلہ یہ آن پڑا ہے کہ پاکستان میں تو ''مومنین'' کی تعداد اتنی بھی نہیں جتنی پرویز مشرف کے حق میں نکالی گئی ریلیوں کے شرکاء کی ہوتی ہے ۔کچھ حسد کے مارے تو یہ

بھی کہتے ہیں کہ ''آل پاکستان مسلم لیگ'' کے کارکنان کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی اُن کا کیس لڑنے والے وکلاء کی ۔ لیکن اِس ''حاسدانہ تجزیے'' کو میجر جنرل راشد قریشی تسلیم کرنے کو تیار ہیں نہ احمد رضا قصوری اور نہ ہی شیخ رشید احمد۔ عظیم وکیل احمد رضا قصوری تو یہ بات سُنتے ہی بھڑک اُٹھتے ہیں اور باقاعدہ ڈانس کرتے ہوئے غدار ہے ، غدار ہے ، غدار ہے کی رَٹ لگانا شروع کر دیتے ہیں جبکہ راشد قریشی صاحب کے خیال میں افواج پاکستان پرویز مشرف صاحب کی پُشت پناہ ہیں اور افواج پاکستان کے حوالے سے ہی اٹھارہ کروڑ عوام بھی کہ فوج بھی تو ہماری اپنی ہی ہے۔ البتہ شیخ صاحب کا معاملہ کچھ مختلف ہے ۔ وہ آج بھی تصورات کی دُنیا میں آمریت کے وزیرِ باتدبیر بنے بیٹھے ہیں ۔اُن کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ڈھیروں ڈھیر ''منتوں ترلوں'' کے باوجود بھی میاں برادران نے اُنہیں گھاس نہیں ڈالی اِس لیے اب وہ حُبِ علیؓ نہیں ، بغضِ معاویہؓ کے تحت پرویز مشرف کا ساتھ دے رہے ہیں ۔ بات مومنین کی تلاش سے چلی تھی ، نکل کہیں اور گئی ۔ آمدم بَر سرِ مطلب ہم کہہ رہے تھے کہ مومنین کا امیر بننے کے لیے مطلوبہ تعداد میسر نہیں ۔اِس کے لیے مولانا فضل الرحمٰن ، مولانا سمیع الحق اور محترم (مولانا) عمران خاں سے رجوع کرنا ہوگا۔ ویسے تو انتہائی محترم سیّد منور حسن صاحب بھی اِس معاملے میں مؤثر ہو سکتے تھے لیکن آجکل جماعت اسلامی کی امارت سیّد صاحب سے سراج الحق صاحب کی طرف ہجرت فرما چکی ہے اور سراج الحق صاحب کے بارے میں عام تاثر یہی ہے

کہ وہ ''مولوی'' کم اور سیاست دان زیادہ ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن سے آجکل نواز لیگ کا ''اِٹ کھڑکا'' چل رہا ہے اور مولانا سمیع الحق تو ہیں ہی ''مُوڈی''۔۔۔۔جی میں آئے تو عطاء کے دریا بہا دیں اور ضد پہ آ جائیں تو لگی لپٹی رکھے بغیر کھَری کھَری سنا دیں۔البتہ تلاشِ مومنین کے سلسلے میں کپتان صاحب کی خدمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ اوّل تو طالبان کی قیادت خاں صاحب پر کَم کَم ہی اعتبار کرتی ہے، دوسرے خاں صاحب اِن دنوں اپنی ''سونامی'' کو سجانے، سنوارنے میں مصروف ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ جب 11 مئی کو اُن کی سونامی ''چھَم چھَم'' کرتی باہر نکلے تو اُس کے حُسن کے ''لشکارے'' سے سبھی بَدہوش ہو جائیں اِس لیے وہ بھلا تلاشِ مومنین میں میاں صاحب کی مدد کیوں کرنے لگے ؟۔کہا جا سکتا ہے کہ فی الحال بڑے میاں صاحب کے امیر المومنین بننے کا کوئی چانس نہیں اِس لیے اِس موضوع کو ادھورا چھوڑتے ہوئے ہم پَلٹتے ہیں اصل موضوع یعنی مہنگائی کی طرف کہ جس کی خاطر ہم نے قلم تھاما اور جس نے ہماری راتوں کی نیند حرام کر رکھی ہے۔

جب وزیرِ خزانہ جناب اسحاق ڈار صاحب نے اپنا دعویٰ سچ کر دکھایا اور ڈالر کو 98 سے بھی نیچے 96 روپے کی سطح پر لے آئے تو ہم نے جی بھَر کے خوشیاں منائیں اور اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کے لیے طرح طرح کے منصوبے باندھنے

لگے۔خیال تو یہی تھا کہ اب مہنگائی تہس نہس ہو جائے گی لیکن ''اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا'' ۔ڈالر جیسی مؤثر دوا بھی مہنگائی کے ''مَرضِ مہلک'' کے لیے'' لا دوا'' ثابت ہوئی اور جونہی ڈالر نے نیچے کی طرف سفر شروع کیا مہنگائی رفعتوں کی طرف گامزن ہو گئی اور آج یہ عالم ہے کہ سَستی ترین سبزی ''آلو'' بھی 70 روپے کلو مل رہے ہیں۔ شنید ہے کہ رمضان شریف کی برکتیں ''سمیٹنے'' والے 80 , اِسے 100 روپے تک لا کر چھوڑیں گے ۔اُدھر یوٹیلٹی بِلز قیامت ڈھا رہے ہیں۔ بجلی کے ریٹس دیکھ کر تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ اب بجلی آنے پر ہر دِل سے یہ ''آہ'' نکلتی ہے کہ یہ ''مَرجانی'' کیوں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی اور جونہی بجلی جاتی ہے سبھی سُکھ کا سانس لیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ موسمِ گرما کی آمد کے ساتھ ہی ہم نے گھر میں مارشل لاء لگا دیا ہے اور آمریت کے سارے حربے آزماتے ہوئے ''ذاتی لوڈ شیڈنگ'' شروع کر دی ہے۔ہم نے یہ حکم نامہ بھی جاری کر دیا ہے کہ اب دو میں سے کوئی ایک چیز ہی ملے گی ، روٹی یا بجلی۔ اُدھر ہمارے وزیرِ خزانہ صاحب نے یہ ''روح فَرسا'' خبر سُنا کر ہمارے بریں ہیمرج کا پکّا بندوبست کر دیا ہے کہ ملازمین کی تنخواہوں میں صرف 10 فیصد تک اضافہ ہی ممکن ہے۔حاکمانِ وقت سے دَست بَستہ گزارش ہے کہ یہ 10 فیصد زکواۃ'' بھی وہ قومی خزانے میں جمع کروا دیں تاکہ ملکی اثاثے بڑھ سکیں۔ہمارا کیا ہے'' ہم تو پہلے بھی گزارہ کر ہی رہے تھے اور اب بھی جیسے تیسے جی ہی لیں گے ۔ایک ،

درخواست ہمیں اپنے وزیرِ خزانہ صاحب سے بھی کرنی ہے جو یہ ہے کہ خُدا کے واسطے ڈالر کو پھر پہلے والی سطح پہ لے آئیں تاکہ مہنگائی نیچے آ جائے۔

یومِ شہداء اور ملّی یکجہتی

ہمارے موبائل فون پر SMS کے ذریعے یا تو ''سیاسی لطیفے'' آتے ہیں یا پھر موبائل فون کمپنیوں کی طرف سے طرح طرح کے میسجز جن میں راتوں رات امیر بننے کے ''نسخہ ہائے کیمیا'' درج ہوتے ہیں۔ کوئی کمپنی ہمیں زبردستی لاکھوں روپے تھمانا چاہتی ہے تو کوئی نئی نویلی لشکارے مارتی گاڑی دینے کے لیے بیتاب۔ ہمیں توبَس اتنا ہی کرنا ہوتا ہے کہ موبائل کمپنیوں کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے تھوڑا سا ''لوڈ'' کروالیں اور پھر عیش ہی عیش۔ ہم ایسا ضرور کرتے لیکن اپنا تو یہ حال ہے کہ ''یوٹیلٹی بِلز'' کی ادائیگی کے بعد شِکم سیری کے لیے بھی کچھ نہیں بچتا تو لوڈ کہاں سے کروائیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی ''اشرافیہ'' کی ہمارے خلاف گہری بلکہ گھناؤنی سازش ہے اور اِس سازش میں یقیناً امریکی CIA کا ہاتھ بھی ہوگا کیونکہ پاکستان میں جتنی سازشیں پلتی اور پنپتی ہیں وہ امریکہ سے ہی دَرآمد کی جاتی ہیں۔

موبائل کمپنیاں توہمیں دِل خوش کُن SMS بھیجتی ہی رہتی ہیں لیکن یہ لطیفہ باز ''ایویں خوامخواہ'' ہمیں ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ہم تو اتنے ''قنوطی'' ہیں کہ خوشی کی خبر میں بھی غم تلاش کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور بادِ

بہاری میں بھی چلّا اُٹھتے ہیں کہ

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری ، راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ، ہم بیزار بیٹھے ہیں

پڑھا جس نے ہمارے اوسان خطا کر دیئے اور ہم دَرِ SMS ابھی کل ہی ہم نے ایک ایسا
نواز لیگ پر زانوئے تلمذ تہ کرکے اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کے جو منصوبے باندھ
یہ تھا ’’پاکستان میں جتنے ’’مونچھوں والے‘‘ چیف SMS رہے تھے وہ سب ہَوا ہو گئے ۔
آرمی سٹاف آئے ، سبھی نے مارشل لاء لگایا لیکن سارے ’’کلین شیوڈ‘‘ چیف آف آرمی
سٹاف جمہوریت نواز نکلے ۔اگر کسی کی میاں نواز شریف صاحب تک رسائی ہو تو وہ اُنہیں
پڑھا تو SMS بتلا دے کہ مونچھیں تو جنرل راحیل شریف کی بھی ہیں‘‘۔جب ہم نے یہ
ہم سوچنے بیٹھ گئے کہ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرانے جا رہی ہے ؟۔اپنے میاں سے ذکر
کیا تو اُنہوں نے کہا ’’میں ایسی فضولیات پر یقین نہیں رکھتا‘‘ لیکن ہماری تسلی نہ ہوئی
اور ہم دِل ہی دِل میں ایوب خاں سے جنرل راحیل شریف تک سبھی کی مونچھوں کا
موازنہ کرنے لگے ۔ہم وہم میں پڑ چکے تھے کہ جس کی جتنی بڑی مونچھ ہو گی وہ اُتنی ہی
جلدی مارشل لاء لگائے گا۔ہمارے اِس وہم کی بنیاد ضیاء الحق مرحوم کی ’’عظیم الشان‘‘
مونچھیں تھیں لیکن وہ تو اللہ بھلا کرے انتہائی محترم چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل
شریف کا جنہوں نے جی ایچ کیو راولپنڈی میں پانچویں

یومِ شُہداء کے موقعے پر ایسا خطاب کیا کہ ''سَواد'' آ گیا۔ اُنھوں نے فرمایا'' فوج جمہوریت اور آئین کی بالا دستی پر یقین رکھتی ہے۔ باغی آئین و قانون کی پابندی قبول کریں ورنہ اُن سے نپٹنے میں کوئی شک نہیں''۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا'' قوم نے ہمیشہ افواج کا ساتھ دیا۔ ہر آنے والا دن فوج اور عوام کے رشتے کو مضبوط کرے گا اور افواج پاکستان دیگر سکیورٹی اداروں کے ہمراہ خطرات کے خلاف دیوار بن کر کھڑی رہیں گی''اُنھوں نے پولیس کی صلاحیتوں، قُربانیوں اور میڈیا اور سول سوسائٹی کے کردار کو جنرل صاحب کے اِس خطاب پر ''تپّی'' NGO,s بھی سراپا۔ دروغ بَر گردنِ راوی بیٹھی ہیں۔ اُن کا گِلہ یہ ہے کہ جنرل صاحب نے سبھی کی تعریف کی لیکن ملک و قوم کی بہتری کی خاطر دِن رات امریکہ اور یورپ سے پیسے اکٹھے کرنے والی NGO,s کی خدمات کو یکسر فراموش کر دیا۔ یہ خطاب جمہوریت نواز حلقوں کے کانوں میں رَس گھول گیا لیکن کچھ ایسے بھی ہونگے جن کے کانوں میں یہ پِگھلا ہوا سیسہ بَن کر ٹپکا اور وہ جَل بھُن کر کباب بلکہ ''چِھتر کباب'' ہو گئے۔ ایک صاحب جو کسی زمانے میں میاں نواز شریف صاحب کے دِل کے بہت قریب ہوا کرتے تھے اور شُنید ہے کہ میاں صاحب کے ''سپیچ رائٹر'' بھی وہی تھے لیکن جونہی میاں فیملی کو زوال آیا تو محترم لکھاری نے ''پارٹی بدلنے'' میں ایک لحظے کی دیر بھی نہیں لگائی اور بوستانِ زرداری کی بُلبلِ ہزار'' داستان بن کر چہکنا شروع کر دیا۔ محترم لکھاری سے جب نیوز کاسٹر نے چیف آف آرمی سٹاف کے خطاب پر تبصرہ

کرنے کو کہا تو اُنہوں نے لوگوں کو ذہنی خلجان میں مبتلاء کرنے کے لیے فرمایا کہ چیف صاحب کے اِس جملے کا کوئی بھی مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ ''ہماری اندرونی اور بیرونی خطرات پر گہری نظر ہے''۔ایک اور صاحب جو بیک وقت کالم نویس بھی ہیں، اینکر بھی مزاحیہ اداکار بھی ہیں اور عالمِ دین بھی۔اُنہوں نے بھی یومِ شُہداء کے حوالے سے ایک، کالم لکھا ہے جس میں شُہداء کا تو کہیں ذکر تک نہیں البتہ میاں برادران کی ''اچانک'' لندن روانگی پر تلملاہٹ ضرور نظر آتی ہے۔اُن کے خیال میں میاں برادران کی اچانک لندن روانگی دراصل ''یومِ شُہداء'' کی تقریب میں شرکت نہ کرنے کا بہانہ تھی۔ وہ کہتے ہیں ''موجودہ حکمرانوں کی کچھ عادات ایسی ہیں جنہیں بدلنے کے لیے ہر دَور میں کسی ''مسیحا'' کا آنا لازمی ہے۔اب اگراِس مرتبہ پھر ''مسیحا'' آ جائے تو کسی کو الزام نہ دیجئے گا''۔ عرض ہے کہ ایوب، یحیٰی، ضیاء اور پرویز مشرف جیسے جن ''مسیحاؤں'' کی اُنہیں تلاش ہے، وہ تو آنے سے رہے کیونکہ اب پُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور جمہوری سفر کے خَد و خال واضح ہونے لگے ہیں۔ جنرل راحیل شریف صاحب نے بھی اپنے خطاب میں کم از کم یہ ضرور ثابت کر دیا کہ اُن کی جمہوریت کے ساتھ کمٹمنٹ کسی بھی دوسرے جمہوریت نواز سے کم نہیں۔اِس لیے محترم لکھاری کی کسی مسیحا'' کی آمد کی خواہش تو بہرحال ادھوری ہی رہے گی البتہ اطلاعاً عرض ہے کہ ''یومِ شُہداء''کی تقریب محترم جنرل اشفاق پرویز کیانی نے شروع کی اور کسی بھی

تقریب میں صدرِ مملکت کو مدعو کیا گیا نہ وزیرِ اعظم اور نہ ہی اِس کی ضرورت محسوس کی گئی کیونکہ یہ ایک خالصتاً فوجی تقریب ہے جس میں افواجِ پاکستان کے شُہداء کی لازوال قُربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے اور یہ خراجِ تحسین افواجِ پاکستان کے سَربراہ ہی کو ہی زیبا ہے۔ موصوف نے اپنے کالم کے آخر میں "دو خبروں والا" ایک لطیفہ بھی درج کیا ہے۔ ہمارے پاس بھی محترم لکھاری کے لیے دو خبریں ہیں۔ ایک بُری اور دوسری بہت بُری۔ بُری خبر یہ ہے کہ وزیرِ اعظم اور جنرل راحیل شریف قدم قدم پر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ سیاسی اور عسکری قیادت میں کوئی اختلاف نہیں اور بہت بُری خبر یہ کہ ایک ہی صفحے پر موجود یہ دونوں رہنما افواہیں پھیلانے والوں کو "صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے تیار۔

شُہداء پر عقیدتوں کے پھول نچھاور کرنا ہمارا دینی و ملّی فریضہ تو ہے ہی لیکن یہ بھی مدِّ نظر رہے کہ ربِّ ذوالجلال کے ہاں شُہداء کا رُتبہ اتنا عظیم ہے کہ میرے آقا ﷺ نے فرمایا "ربِّ کعبہ کی قسم میری یہ خواہش ہے کہ میں شہید ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید ہو جاؤں ۔۔۔ (مفہوم)"۔ عالمِ اسلام، کے عظیم سپہ سالار خالدؓ بن ولید کی آنکھوں سے دَمِ واپسیں آنسو رواں ہو گئے۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ ابنِ خطاب سرہانے کھڑے تھے۔ اُنھوں نے فرمایا "خالد! کیا موت سے

ڈر لگتا ہے؟''۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے کہا ''نہیں امیر المومنین ! موت سے کیا ڈرنا ۔ میں تو اِس لیے رو رہا ہوں کہ طبعی موت مَر رہا ہوں، شہادت نصیب نہیں ہوئی حالانکہ میں جذبہِ شوقِ شہادت میں دشمن کی صفیں چیرتا ہوا نکل جاتا تھا''۔ یہ ہمارے ایمان کا حصّہ ہے کہ شہید صرف ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے اور اُسے ہر گز موت نہیں آتی کیونکہ میرے رَبّ نے حکمت کی کتاب میں یہ درج کر دیا ہے کہ شہید زندہ ہے اور اپنے رَبّ کے ہاں سے خوراک حاصل کر رہا ہے۔ یہ بجا کہ شُہداء کے لواحقین عارضی جدائی کا دُکھ سہہ رہے ہیں لیکن اُنہیں یہ سوچ کر اطمینانِ قلب نصیب ہو جانا چاہیے کہ رَبِّ کعبہ نے اُن کے پیاروں کو جس عظیم منصب کے لیے چُنا ہے اُس کی خواہش تو ہر مومن مسلمان کے دِل میں پَلتی ہے لیکن یہ ہر کسی کے نصیب میں کہاں۔

کھیلن کو مانگے چاند

ہمیں میاں نواز شریف صاحب کی وزارتِ عظمیٰ پر کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر وہ جَلاوطنی سے پہلے والے میاں صاحب ہوتے لیکن اب تو مُدّت ہوئی، اُنھوں نے ''کھڑاک'' کرنا بند کر دیا ہے۔ یہ'' دونوں بھائی ''جب جی چاہتا ہے انتہائی خاموشی سے باہر کِھسک لیتے ہیں اور پلٹتے ہیں تو کبھی اربوں ڈالر اور کبھی اربوں پاؤنڈز سے جھولیاں بھر کے لوٹتے ہیں۔ بندہ پوچھے ہم نے ایسی دولت کا کیا کرنا ہے جس میں کوئی ''دھوم دَھڑکا'' ہی نہ ہو۔ اُدھر اسحاق ڈار صاحب ہیں جو ڈالروں میں گوڈے گوڈے ''کھُب'' چُکے ہیں۔ شنید ہے کہ اب ہمارے اثاثے چودہ ارب ڈالر تک پہنچ چکے ہیں لیکن ہم تو پھر بھی یہی کہیں گے کہ ہمیں ایسی ''ٹھنڈی ٹھار'' جمہوریت ہرگز قبول نہیں۔ اگر صرف خادمِ اعلیٰ ہی جمہوریت کو گرم رکھنے کی کوئی سبیل کر لیتے تو ہم صبر شکر کرکے بیٹھ رہتے۔ پہلے تو شیخ رشید صاحب عسکری قیادت کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اُس نے ''ستّو'' پی رکھے ہیں لیکن اب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری حکومت نے ''ستّو'' پی رکھے ہیں اِس لیے ہم تو اُسی کا ساتھ دیں گے جو قوم کا لہو گرم رکھنے کے بہانے تلاش کرے۔ تحقیق کہ یہ کام یا تو ہمارے کپتان صاحب بطریقِ احسن سَر انجام دے سکتے ہیں یا پھر مُرشد طاہر القادری۔

محترم عمران خاں کے اندازِ سیاست سے جَل بھُن کر کباب ہونے والے کم از کم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ خاں صاحب کی سیاست کے رنگ انوکھے اور چوکھے ہیں ورنہ کون اتنا جرّی اور دلیر ہوگا جو بیک وقت نواز لیگ، سابق چیف جسٹس آف پاکستان، الیکشن کمیشن، نگران وزیرِ اعظم، پنجاب کے نگران وزیرِ اعلیٰ، ریٹرننگ آفیسر، ملٹری انٹیلی جینس اور پاکستان کے سب سے بڑے میڈیا گروپ کو للکارتے ہوئے اُن پر الیکشن 2013ء میں کھُلی دھاندلی کا الزام لگائے۔ ہماری ''سونامی'' تو سب کچھ بہالے جانے کو تیار تھی اور خاں صاحب نے تو کچھ اینکرز کو پورے اعتماد کے ساتھ یہ لکھ کر بھی دیا تھا کہ تحریکِ انصاف 125 سے زاید سیٹوں پر کامیاب ہوگی اور دروغ بَر گردنِ راوی، اپنے بیٹوں کو بھی کہا تھا کہ اب اُن سے اگلی ملاقات بطور وزیرِ اعظم ہوگی لیکن ہوا یہ کہ سبھی نے ''ایکا'' کر لیا اور کہا تو میاں نواز شریف صاحب نے تھا کہ ''سارے رَل کے سانوں پَے گئے نے'' لیکن عملی طور پر ''ہتھ'' ہمارے کپتان صاحب کے ساتھ ہوگیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور چڑیا والے صاحب ''پینتیس پنکچر'' نہ لگاتے تو خاں صاحب نے تو ایک بال سے تین وکٹیں گرا ہی دینی تھیں۔ خیبر پختونخوا میں البتہ ''فیئر'' الیکشن ہوئے اسی لیے تحریکِ انصاف جیت بھی گئی اور حکومت بھی بنا لی۔ وجہ یقیناً یہ تھی کہ طالبان کے خود کُش حملوں کے خوف سے کسی نے خیبر پختونخوا کا رُخ نہیں کیا اور وہاں

دھاندلی نہیں ہو سکی۔ جس اعتماد سے کپتان صاحب بات کرتے ہیں، اُس اعتماد کو لوگوں نے انانیت کا نام دے دیتے ہیں۔ خواجہ سعد رفیق کہتے ہیں کہ خاں صاحب اپنی انا کے خول میں بند ہیں جبکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ انانیت سے زیادہ غیرت و حمیت ہے اور غیرت ہے.بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں

پہناتی ہے درویش کو تاج سرِ دارا

ہمیں یقین ہے کہ 11 مئی کو اُٹھنے والی تحریک کے نتیجے میں یا تو ہمارے خاں صاحب وزیرِ اعظم بَن جائیں گے یا پھر کوئی طالع آزما جمہوریت کی بساط لپیٹ دے گا۔ اگر حاضر سٹاک'' سیاستدانوں کو ہماری وزارتِ عظمٰی قبول ہے تو ٹھیک وگرنہ ''کھیڈاں'' گے نہ کھیڈن دیاں گے''۔

عمران خاں صاحب کو ادھورے سَچ سے نفرت ہے۔ وہ جب بھی بولتے ہیں، پورا سچ بولتے ہیں اور لگی لپٹی رکھے بغیر بولتے ہیں۔ اُنھوں نے ISI کی حمایت میں پاکستان کے سب سے بڑے میڈیا گروپ کو خوب لَتاڑا اور اُس کا مکمل بائیکاٹ کر دیا لیکن دوسری طرف یہ بھی کہہ دیا کہ لاہور میں MI کے حاضر سروس بریگیڈیئر نے دھاندلی کرکے نواز لیگ کو جتوایا۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ سابقہ چیف جسٹس آف پاکستان بھی دھاندلی میں شریک تھے اِس لیے اُن پر بھی آرٹیکل چھ

لاگو ہونا چاہیے۔اب تو ''سینئر لکھاری'' نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ چیف جسٹس صاحب دھاندلی میں شریک تھے ۔اِن دنوں سینئر لکھاری کا میلان ایک دفعہ پھر تحریکِ انصاف کی طرف ہو گیا ہے لیکن اب ہم ''سونا میے'' اُن پر اعتبار کرنے والے نہیں۔ویسے بھی تحریکِ انصاف کو اتنے ''لائق فائق'' لوگوں کی ضرورت نہیں ۔ اب مخالفین شور مچا رہے ہیں کہ خاں صاحب یا تو اپنے الزامات کے ثبوت پیش کریں یا پھر خود آرٹیکل چھ کے لیے تیار رہیں کیونکہ آئین کی رو سے افواجِ پاکستان اور عدلیہ کو بدنام کرنے والے پر آرٹیکل چھ لاگو ہوتا ہے ۔ہمیں یقین ہے کہ خاں صاحب کے پاس ثبوت موجود ہونگے اور وہ 11 مئی کو اسلام آباد کے ڈی چوک میں ایک ایک کرکے سارے ثبوت سامنے لے آئیں گے اور ہر ثبوت سے پہلے ایک نغمہ بھی سنایا جائے گا ۔ویسے بھی شیخ رشید صاحب کے عوامی رنگ ، شاہ محمود قریشی کے مدبرانہ انداز اور خاں صاحب کے ''پورے ٹبّر'' کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے ؟۔

خاں صاحب نے بہت اچھا کیا جو ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کو الگ سے تحریک چلانے کے لیے کہا کیونکہ ''دو مُلّاؤں میں مُرغی حرام'' ہونے کا شدید خطرہ تھا جب دو عظیم ترین لیڈر کسی ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو پھر یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ ''کسے یاد رکھوں ، کسے بھول جاؤں''۔ ویسے بھی ہم خاں صاحب کی سیاست سے متاثر ہیں اور ڈاکٹر طاہر القادری تو ہیں ہی ہمارے

مُرشداِس لیے کم از کم ہم تو یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں کہ وزارتِ عظمیٰ کا تاج کس کے سَر پر سجایا جائے۔ محترم عمران خاں کی ڈاکٹر طاہر القادری سے بہ اندازِ حکیمانہ پیچھا چھڑانے کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ خاں صاحب طالبان کے اتنے بڑے حامی ہیں کہ لوگوں نے اُنہیں ''طالبان خاں'' کہنا شروع کر دیا جبکہ ڈاکٹر طاہر القادری تو طالبان کے خلاف ستّر صفحات پر مشتمل فتویٰ صادر فرما چکے ہیں ۔اِس لیے اگر دونوں ایک ہی پلیٹ فارم استعمال کرتے تو وہ تو ''چُوں چُوں کا مربّہ'' بَن جاتی اور کتنا عجیب محسوس ہوتا کہ ایک ہی سٹیج پہ خاں صاحب طالبان سے مذاکرات کے حق میں دلائل دے رہے ہوتے اور اُسی سٹیج پہ ڈاکٹر طاہر القادری طالبان کے خلاف فتویٰ صادر فرما رہے ہوتے ۔اِس لیے یہی بہتر ہے کہ '' سونامی '' فاتح اسلام آباد بَن کے اُبھرے اور ڈاکٹر طاہر القادری راولپنڈی کو فتح کریں ۔ یہ فیصلہ بعد میں کر لیں گے کہ کِس کے حصّے میں کیا آئے گا۔کچھ حاسد یہ کہتے ہیں کہ 11 مئی کو واقعی آخری معرکہ ہو گا جس کے بعد مولانا طاہر القادری ایک دفعہ پھر کینیڈا چلے جائیں گے ، شیخ رشید احمد اپنی لال حویلی کے تھڑے پہ بیٹھ رہیں گے اور خاں صاحب کی سونامی ندی نالے کی شکل اختیار کر لے گی ۔رہی پورے سچ کی بات تو کپتان صاحِب نے تو کبھی ادھورا سچ بھی نہیں بولا ، پورے سچ کی بھلا اُنہیں توفیق کہاں ۔ لیکن یہ سب کَج بحثیاں ہیں اور ہم کَج بحثوں سے مَتھا نہیں لگاتے۔

میدان سج گیا

قوم کو مبارک ہو کہ اداکارہ وینا ملک پاکستان آ چکی ہیں ۔اُس نے پریس کانفرنس میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے سیاست میں حصّہ لینے کا عندیہ تو دے دیا لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کرے گی یا اپنی ذاتی سیاسی جماعت بنائے گی ۔اگر اُس کا کسی سیاسی جماعت میں شمولیت کا ارادہ ہوا تو پھر ہماری اُس سے گزارش ہو گی کہ وہ تحریکِ انصاف میں شمولیت اختیار کر لے شاید اسی لیے شیخ رشید احمد صاحب نے وینا ملک کو 11 مئی کے دھرنے میں شرکت کی دعوت دے ڈالی جس پر وینا ملک نے کہا ''شیخ صاحب ہمارے بزرگ ہیں ''۔وینا ملک کے اِس جملے پر پتہ نہیں ویناکے شوہرِ نامدار سمیت سبھی حاضرین کیوں کھلکھلا کے ہنس دیئے ۔پریس کانفرنس میں وینا ملک نے یہ انکشاف بھی کیا '' جب بِلّی نہیں ہوتی تو چوہے ڈانس کرنے لگتے ہیں ۔اب میں پاکستان میں آ گئی ہوں ، سب کو سیدھا کردوں گی ۔'' عوام کو نوید ہو کہ اب وہ چوہوں کی بجائے بِلّی کے ''ڈانس'' سے محظوظ ہو سکیں گے۔اُس نے یہ بھی کہا کہ ہسپتال بنانا اُس کا خواب ہے اور وہ فلم انڈسٹری کے لیے ایک NGO بنانا چاہتی ہے ۔پتہ نہیں ہمارے گلوکاروں اوراداکاروں کے سَر پر ہسپتال بنانے کا بھوت کیوں سوار ہو گیا ہے ، جسے

بنانے کے لیے تُلا بیٹھا ہے۔اِس سے NGO دیکھو، ہسپتال بنانے کے چکر میں ہے یا پھر پہلے اداکارہ میرا بھی ہسپتال بنانے کے لیے حکومت سے زمین مانگتی پھر رہی تھی۔اب اِس دَوڑ میں وینا بھی شامل ہو گئی ہے۔بہرحال یہ اُن کا ذاتی فعل ہے، ہمیں اِس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ہم توبَس یہ چاہتے ہیں کہ وینا تحریکِ انصاف میں شامل ہو کر آج (مئی) کے احتجاجی جلسے میں شریک ہو۔ 11

آج اسلام آباد کے ڈی چوک میں میدان سجے گا اور محترم عمران خاں کی سونامی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو کر یہ اعلان کرے گی کہ ”ہم سا ہو تو سامنے آئے“ ۔جبکہ دوسری طرف مُرشد کے پروانے، دیوانے، مستانے راولپنڈی میں دھمال ڈالیں گے۔ حق تو یہی تھا کہ ہم بھی ”بنفسِ نفیس“ ریلی اور جلسے میں شرکت کرتے لیکن قسمت کے لکھے کو بھلا کون ٹال سکتا ہے۔اِدھر ہم نے رختِ سفر باندھا، اُدھر سورج دیوتا جلال میں آگیا۔ہم ٹھہرے تھوڑے تھوڑے ”بَرگر فیملی“ کی قبیل کے اِس لیے طے یہی کیا کہ ٹھنڈے ٹھار کمرے میں بیٹھ کر ہی ٹی وی سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی شرکت کو یقینی بنایا جائے۔ویسے بھی ہم ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کونسی راہ اپنائی جائے کیونکہ دونوں ہی ہمارے پسندیدہ لیڈر ہیں۔اِس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ دونوں میں سے جو بھی وزیرِ اعظم بنے گا، ہم اسی کے

ساتھ ہونگے۔ ہماری عدم شرکت کے باوجود اتنا ہمیں یقین ہے کہ ڈی چوک کے جلسے میں لاکھ دو لاکھ کا مجمع تو معمولی بات ہے ویسے بھی میڈیا اگر ساتھ دے تو دَس پندرہ ہزار کو بھی لاکھ دو لاکھ دکھانا الیکٹرانک میڈیا کے بائیں ہاتھ کا کام ہے لیکن ہمیں اِس کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم ''دھاندلی'' پر یقین رکھنے والے لوگ نہیں۔

چند دِن پہلے مُرشد ڈاکٹر طاہر القادری نے ایک انٹرویو میں فرمایا کہ اُن کے لاہور کے جلسے میں بیس بیس میل تک لوگ کھڑے ہوئے تھے اور اب جب وہ خود پاکستان تشریف لائیں گے تو ایک کروڑ ''نمازی'' حکومت چھین لیں گے ۔ ۱۱ مئی کو تو صرف اگلا لائحہ عمل طے کرنے کی کال دی جا رہی ہے جس میں اُن کی موجودگی ضروری نہیں ۔ جبکہ مُرشد کے ایک مرید ٹی وی ٹاک شو میں کہہ رہے تھے کہ ایک کروڑ کے مجمعے کی بات کرکے مُرشد نے ''کسرِ نفسی'' سے کام لیا ہے ، دَر حقیقت یہ مجمع دو سے تین کروڑ تک کا ہو گا۔ اینکر نے مُسکراتے ہوئے کہا کہ یہ تین کروڑ سمائیں گے کہاں تو مُرید سے تو جواب بَن نہ پڑا لیکن اگر ہم وہاں ہوتے تو اینکر کو کہتے کہ اگر مُرشد لاہور جیسے شہر میں تینتیس ، تینتیس کلو میٹر پھیلا ہوا جلسہ کرکے دکھا سکتے ہیں تو دو ، تین کروڑ کی کیا حیثیت ہے ؟۔ اُس نا اہل اینکر کو اتنا بھی نہیں پتہ کہ تینتیس کلو میٹر لمبے اور تینتیس کلو میٹر چوڑے مجمعے میں تو پانچ کروڑ بندے سما سکتے ہیں

۔اُس وقت بھی مُرشد نے کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے فقط پچیس تیس لاکھ پر ہی اکتفا کر لیا حالانکہ مجمع تو پانچ کروڑ کا تھا۔

ہم نے تو اپنے پچھلے کالم میں ہی کہہ دیا تھا کہ اگر ہمارے کپتان صاحب کو وزیرِ اعظم نہ بنایا گیا تو پھر ''کھیڈاں گے ، نہ کھیڈن دیاں گے'' ۔اب وزیرِ اعظم صاحب نے بھی یہ کہا ہے'' یہ کیا کہ جیت گئے تو ٹھیک ، ہار گئے تو دھاندلی کا شور مچا دیا۔ایک بار میں عمران خاں کے پاس گیا تھا اب اُن کا فرض ہے کہ وہ بھی اپنے مسئلے کے حل کے لیے میری چائے کی دعوت قبول کریں اور وزیرِ اعظم ہاؤس آ کر بتائیں کہاں دھاندلی ہوئی، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ کھیڈاں گے ، نہ کھیڈن دیاں گے''۔ بجا ارشاد ! ہمارے کپتان صاحب ضرور وزیرِ اعظم ہاؤس آئیں گے اور اِسی تگ و دَو میں وہ دِن رات ایک کیے ہوئے ہیں لیکن مہمان بَن کر نہیں ، وزیرِ اعظم بَن کر۔ میاں نواز شریف صاحب کی اِس دعوت کو عمران خاں صاحب نے مسترد کرتے ہوئے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ ''یہ غیر مہذب طریقہ ہے اور وزیرِ اعظم اپنے عہدے اور منصب کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سیاسی جماعتوں کو جلسوں میں اِس طرح مذاکرات کی دعوتیں نہ دیا کریں''۔ہم نے جب اِس غیر مہذب اور ''طنزیہ'' دعوت کا شکوہ ایک ''نون لیگیئے'' سے کیا تو اُس کے تَن بدن میں آگ لگ گئی ۔اُس نے تقریباََ چلاتے ہوئے کہا ''بَس چُپ رہو ، ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے''۔اُس نے کہا کہ جب

کپتان صاحب ہر سیاسی جماعت کو ''رگڑا'' دیتے ، کرپشن کے الزام لگاتے اور کبھی ایک بال میں تین وکٹیں گرانے ، کبھی مولانا ڈیزل اور کبھی ''میاں جی ہُن جان دیو ، ساڈی واری آن دیو'' جیسے غیر پارلیمانی جملے بولتے تھے ۔تب کیا اُنہیں احساس نہیں تھا کہ ''سیر کو سَوا سیر'' بھی مِل سکتا ہے ؟۔وزیرِ اعظم صاحب نے تو مسائل کے حل کے لیے انتہائی پیار سے وزیرِ اعظم ہاؤس آنے کی دعوت دی ہے۔ یہ غیر مہذب کہاں سے ہو گئی ؟۔ہم نے اُس نون لیگیئے کی '' جَلی کَٹی'' کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا کیونکہ ہمیں تو پتہ تھا کہ یہ ساری تلملاہٹ وزارتِ عظمیٰ کے ہاتھ سے نکلنے کے خوف کی ہے۔ وزارتِ عظمیٰ بَس اب دو، چار ہاتھ کے فاصلے پر ہے اور ہم نے بھی طے کر لیا ہے کہ اب کی بار اِسے لیے بغیر ٹلیں گے نہیں۔

شیخ رشید احمد چونکہ ''مستقبل شناس '' ہیں اور وہ بھی بھانپ چکے ہیں کہ دھاندلی کی پیداوار 35 پنکچروں والی موجودہ اسمبلی اب اپنے انجام کو پہنچنے والی ہے ۔اِس لیے اُنہوں نے بھی یہ کہہ دیا کہ اگر اُن کے کسی ایک کارکُن نے بھی اُنہیں استعفیٰ دینے کے لیے کہا، وہ استعفیٰ دے کر اسمبلی سے باہر آ جائیں گے ۔اِس سے پہلے بھی اُنہوں نے استعفے کی بات کی تھی لیکن وہ تو اسحاق ڈار صاحب نے اُن کے ساتھ ''ہتھ'' کر دیا اور ایویں'' وقتی طور پر ڈالر کے ریٹس 98 کی سطح تک لے آئے جس پر شیخ صاحب نے'' احتجاجاََ'' استعفیٰ''

نہیں دیا لیکن اب جبکہ اُنہیں اچھی طرح سے علم ہے کہ یہ اسمبلی کچھ دنوں کی مہمان ہے وہ مستعفی ہونے کو تیار ہو گئے ہیں۔یہی نہیں بلکہ اُنھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے، میں ایسی اسمبلی پر لعنت بھیجتا ہوں''۔اب ظاہر ہے کہ اتنا کچھ کہنے کے بعد وہ اسمبلی'' میں تو جائیں گے نہیں البتہ اُن کے ازلی ابدی دشمن نواز لیگئے لازما آئین کے کسی ایسے آرٹیکل کی تلاش میں ہونگے جس کے مطابق پارلیمنٹ کی اِس توہین پر کوئی لمبا چوڑا کیس بنتا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر شیخ رشید احمد اور فیصل رضا عابدی کو جیل جانے کا اتنا شوق کیوں ہے۔

کہاں گئی سونامی؟

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

حضرت علیؓ کا فرمان ہے ''زبان ایک ایسا درندہ ہے کہ اگر تُو اسے کھُلا چھوڑ دے تو عین ممکن ہے کہ تجھے ہی پھاڑ کھائے''۔ حقیقت مگر یہی ہے کہ وجودِ انسانی میں سب سے زیادہ نافرمان زبان ہی ہے۔ محترمہ شیریں مزاری کہتی ہیں کہ عمران خاں بے باک ہیں ۔بے باکی بجا مگر

گرمی سہی کلام میں ، لیکن نہ اِس قدر

کی جس سے بات ، اُس نے شکایت ضرور کی

پہلے بھی خاں صاحب نے عدلیہ کے لیے ''شرمناک'' جیسالفظ استعمال کیا اور پھر توہینِ عدالت کے خوف سے اعلیٰ عدلیہ میں کھڑے ہو کر انتہائی بھولپن سے یہ کہہ دیا کہ اُنہیں تو پتہ ہی نہیں تھا کہ ''شرمناک'' گالی ہوتا ہے۔اب ڈی چوک اسلام آباد میں اُنھوں نے ایک دفعہ پھر ریٹرننگ آفیسرز (ججز) کے لیے یہی لفظ استعمال کرتے ہوئے کہا'' ریٹرننگ آفیسرز شرم سے ڈوب مریں''۔اب پتہ نہیں چیف جسٹس آف پاکستان کب اَز خود نوٹس لیتے ہوئے خاں صاحب کو عدالت میں طلب کرتے ہیں۔ سچ کہا بقراط نے کہ ''قدرت نے دماغ کو دِل سے ارفع درجہ عطا

کیا ہے اِس لیے جذبات کو ہر حالت میں عقل کے تابع رکھنا لازم ہے ''۔ لیکن انتہائے نرگسیت کا شکار محترم عمران خاں تو اپنی انانیت کے خول سے باہر نکلنے کو تیار ہی نہیں ۔ قوم نے اُن کی پذیرائی کی اور جی بھر کے کی کیونکہ کوہِ الم کے نیچے سسکتی قوم نے یہ جانا کہ اُسے وہ مسیحا مل گیا جس کی وہ اِک مدت سے متلاشی تھی لیکن خاں صاحب تو صرف ''کُرسی'' کے شیدائی نکلے ۔ عریاں حقیقت تو یہی ہے کہ قومی ضیاء سے منور ہونے والے کپتان صاحب نے قومی درد کی مسیحائی کی بجائے صرف وزارتِ عظمیٰ کو ہی اپنا مطلوب و مقصود جانا کیونکہ وہ اپنے بیٹوں سے وعدہ کر چکے تھے کہ اب اُن سے ملاقات بطور وزیرِاعظم ہو گی۔ وزارتِ عظمیٰ کی خواہش پالنا ہر پاکستانی کا حق ہے اور خاں صاحب کا بھی لیکن اُنھوں نے تو ابتدا ہی میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ رہبری و رہنمائی کے سرے سے اہل ہی نہیں ۔ قوم نے اُنہیں خیبر پختونخوا کا حقِ حکمرانی بخشا اور وہ جو محض چھ ماہ میں صوبے کی تقدیر بدلنے کے دعویدار تھے ، خود اتنی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے کہ اب ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں'' ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈی چوک اسلام آباد میں عمومی توقع سے کہیں کم لوگوں نے شرکت کی ۔

تحریکِ انصاف کے سبھی مقررین نے ڈی چوک کے اِس مجمعے کو ''انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر'' کہا جبکہ غیر جانبدار تجزیہ نگاروں کے مطابق مجمع

ستائیس سے اٹھائیس ہزار کے درمیان تھا البتہ تحریکِ انصاف بضد کہ مجمع ایک لاکھ۔
اوّل تو ڈی چوک اسلام آباد میں تیس ہزار سے زیادہ کی گنجائش ہی نہیں اور دوسرے یہ کہ جلسہ گاہ میں صرف بارہ ہزار کرسیاں رکھی گئی تھیں جن پر ایک لاکھ لوگ نہیں بیٹھ سکتے۔ لیکن اگر تحریکِ انصاف کی ''ضد'' مان لیجائے تو پھر بھی کروڑوں روپے صرف کرکے بیس کروڑ کے پاکستان سے ایک لاکھ افراد اکٹھے کرنا کونسی بڑی بات ہے ؟۔ اِس جلسے میں کم و بیش ستّر فیصد لوگ خیبر پختونخوا سے آئے جہاں تحریکِ انصاف کی حکومت ہے۔ اب یہ خاں صاحب یا پرویز خٹک صاحب ہی بہتر جانتے ہونگے کہ اِس ستّر فیصد میں پٹواریوں اور تھانیداروں کی کاوشوں کا ثمر کتنے لوگ تھے ؟۔ اگر خاں صاحب یہی جلسہ خیبر پختونخوا میں کر لیتے تو شاید اُن کا کچھ بھرم رہ جاتا لیکن خاں صاحب اور اُن کے حواری تو اسی پر مطمعن ہیں اور خوش بھی۔ شیخ رشید نے تو مجمعے کو دیکھ کر یہاں تک کہہ دیا کہ اگر خاں صاحب اعلان کریں تو ''خُدا کی قسم'' دَس منٹ میں یہ اسمبلی ختم کر دی جائے گی۔ آقا ﷺ کا فرمان ہے ''بُرے دوستوں سے بچو کیونکہ وہ تمہارا تعارف بن جاتے ہیں''۔ کاش کہ خاں صاحب نے اپنے گرد ایسے لوگوں کو اکٹھا نہ کیا ہوتا جنہیں ربِّ کردگار کی جھوٹی قسمیں اٹھاتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوتی۔
خاں صاحب نے فرمایا کہ حکومت نے لوگوں کو جلسہ گاہ میں آنے سے روکنے کے لیے

ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن ملٹری ڈکٹیٹر کی نرسری کے پلے ہوئے لوگ اُنہیں روک نہیں سکے ۔ لیکن آخری ملٹری ڈکٹیٹر کی نرسری کے پلے ہوئے تو خود عمران خاں اور مولانا طاہر القادری ہیں جو آمر مشرف کے دَور میں ایک دوسرے سے بڑھ کر شاہ کی وفاداری کا ثبوت دیتے رہتے تھے ۔ پرویز مشرف کے جلسوں اور ریفرنڈم میں خاں صاحب اور مولانا صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ۔ خاں صاحب کے پہلو میں بیٹھے شیخ رشید صاحب تو ہر ڈکٹیٹر کی نرسری کی بلبلِ ہزار داستان تھے اور چوہدری برادران بھی انہی نرسریوں میں پَل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں اِس لیے دوسروں کو تو پاپی وہ کہے جس نے خود پاپ نہ کیا ہو ۔ خاں صاحب کو یہ بھی شکوہ ہے کہ اُن کا مینڈیٹ چوری کر لیا گیا اور امپائر نیوٹرل نہیں تھے ۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا امپائر خاں صاحب کے مشورے اور مرضی سے منتخب نہیں کیے گئے ؟ ۔ خاں صاحب الیکشن کمشن ، نگران وزیرِ اعلیٰ نجم سیٹھی اور سابقہ چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری پر جانبداری کا الزام دھرتے ہیں جبکہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ الیکشن سے پہلے خاں صاحب کو فخر الدین جی ابراہیم پر اندھا اعتماد تھا اور اُنہیں خاں صاحب کے مشورے سے ہی چیف الیکشن کمشنر بنایا گیا ، چیف جسٹس صاحب کی بحالی کا وہ ہمیشہ کریڈٹ لیتے رہے اور الیکشن سے پہلے اُن کے نزدیک نجم سیٹھی سے بہتر کوئی نگران وزیرِ اعلیٰ ہو نہیں سکتا تھا لیکن دو تہائی اکثریت نہ ملنے پر خاں صاحب کے ہاں یہ سبھی "بے ایمان" قرار پائے ۔ الیکشن 2013ء سے پہلے احسن اقبال صاحب نے

سچ کہا تھا کہ ''عمران خاں صاحب الیکشن کمشن اور نگران حکومتیں اپنی مرضی کی منتخب کر لیں لیکن صرف اتنا لکھ کر دے دیں کہ اگر وہ الیکشن ہار گئے تو دھاندلی کا شور نہیں مچائیں گے''۔یوں لگتا ہے کہ جیسے احسن اقبال صاحب نے کپتان صاحب پر پی ایچ ڈی کر رکھی ہو۔

الیکشن 2013ء کے موقع پر یورپی یونین ، دولتِ مشترکہ ، نیشنل ڈیموکریٹک انسٹی ٹیوٹ آف انٹر نیشنل آفیئرز ، ایشین نیٹ ورک فار ری الیکشن اور جوائنٹ انٹر نیشنل الیکشن آبزرویشن مشن ، سبھی نے انتخابات کو آزادانہ اور منصفانہ قرار دیا لیکن چونکہ وزارتِ عظمیٰ خاں صاحب سے دور ہوتی چلی گئی اِس لیے یہ سبھی بھی بے ایمان ٹھہرے ۔خاں صاحب سندھ میں دھاندلی کی بات کرتے ہیں ، نہ بلوچستان میں اور خیبر پختونخوا میں تو الیکشن ہوئے ہی فیئر اینڈ فری ہیں کیونکہ وہاں نتائج شگفتِ بہار بن کر ٹپکے اور خاں صاحب کو نہال کر گئے ، البتہ پنجاب۔۔۔ پنجاب میں تحریکِ انصاف نے پنجاب اسمبلی کی 286 اور قومی اسمبلی کی 138 نشستوں پر انتخاب لڑا اور اِن کُل 424 نشستوں میں سے 30 نشستوں پر تحریکِ انصاف کے امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوئیں اور دھاندلی کی شکایت صرف 15 اُمیدواروں نے کی ۔تازہ ترین صورتِ حال یہ ہے کہ شکایت کنندگان پچھلی چار پیشیوں سے ٹربیونل میں جاتے ہیں اور دھاندلی کے ثبوت پیش نہ کر سکنے کی بنا پر ہر پیشی پر چالیس ہزار روپے جرمانہ کروا کر لوٹتے ہیں

۔اِس کے باوجود بھی خاں صاحب اگر کہتے ہیں تو "پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے"۔
نپولین نے کہا "اگر تم ہر بھونکنے والے کُتّے پر کھڑے ہو کر پتھر پھینکنا شروع کر دوگے تو کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ پاؤگے"۔ یہ بجا کہ نواز لیگ نے ابھی تک کچھ نہیں کیا لیکن اُن کا جذبہ، جنوں اور کچھ کر گزرنے کی اُمنگ بہرحال جواں نظر آتی ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں جما کے وہ دکھا نہیں سکتے تھے کہ اُنہیں سب کچھ ملا ہی تباہ حال تھا۔اب بھی اگر وہ چھوٹی موٹی رکاوٹوں اور "شرارتوں" پہ اٹکے رہے تو پھر کچھ بَن نہ پائے گا۔اُنہیں چاہیے کہ وہ گزرتی ساعتوں کو امام بنا کر حصولِ منزل کا اہتمام کریں۔ میاں شہباز شریف کہتے ہیں کہ "ترقی اور خوشحالی کا راستہ نہ روکا جائے"۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر عزم صمیم ہو اور لگن جواں تو دُنیا کی کوئی طاقت راہ کی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

آگئے، تے چھاگئے

11 مئی ہمارے لیے دوہری خوشیاں لے کر آیا۔ایک طرف عمران خاں گرج اور دوسری طرف ڈاکٹر طاہر القادری بَرس رہے تھے۔ سبھی جانتے ہیں کہ ہمارے تو پسندیدہ ترین رہنما صرف عمران خاں، طاہر القادری اور الطاف بھائی ہی ہیں اور باقی ''حاضر سٹاک'' سیاستدان تو بَس ''ایویں ای'' ہیں۔ ڈی چوک میں مَنچلوں اور ''مَنچلیوں'' کا جوش و جذبہ اپنے جنوں کی ساری حدیں پھلانگ کر باہر نکلنے کو بیقرار تھا۔اُن کے والہانہ رقص کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اب انقلاب ''آوے ای آوے'' ۔اُدھر مُرشد طاہر القادری نے 60 شہروں میں بیک وقت ریلیاں نکال کر گینز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام لکھوا لیا۔ریکارڈ تو خیر مُرشد نے اُس وقت ہی بنا لیا تھا جب اُنھوں نے سو سے زائد ملکوں کے دَوروں اور تبلیغی و سیاسی لیکچروں کے باوجود ایک ہزار کتب کی تصنیف بھی کر ڈالی اور وہ بھی محض آٹھ سال کے قلیل عرصے میں۔ وہ چونکہ کینیڈا میں بیٹھے ہیں اِس لیے ''آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل'' کے مصداق اُن کے کارنامے سوائے ہم جیسے ''مریدین'' کے کسی کو نظر نہیں آتے۔ویسے بھی وہ اپنی تشہیر سے ''گریزاں'' ہی رہتے ہیں اور تشہیری مہم پر پیسہ صرف کرنا گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں لیکن جہاں سوال ملک و قوم کا آن پڑے، وہاں ''رج

کے ''تشہیری مہم بھی چلاتے ہیں اور نیوز چینلز کو ''نہال'' بھی کر دیتے ہیں۔اب کی بار وہ ''نظر کی خرابی'' کے باعث پاکستان تشریف نہیں لائے۔شنید ہے کہ اُنھوں نے آنکھوں کا آپریشن کروایا ہے۔ویسے بھی اُن کے ''کنٹینر'' پر کام جاری تھا کیونکہ پچھلی بار اسلام آباد کی لہو جماتی سردی میں کنٹینر کو بھی ''ٹھنڈ'' لگ گئی تھی اِس لیے اب وہ انقلاب کی ''فائنل کال'' پر ہی تشریف لائیں گے۔کنٹینر سے یاد آیا کہ کچھ بَد بختوں نے مُرشد پر الزام دھرا کہ اُن کے کنٹینر کی تیاری پر بارہ کروڑ روپے صرف ہوئے جو بالکل جھوٹ، لغو اور بے بنیاد ہے اور ہمارے ''مصدقہ عِلم'' کے مطابق کنٹینر پر گیارہ کروڑ پچانوے لاکھ پچانوے ہزار پانچ سو پچیس روپے ننانوے پیسے لاگت آئی۔اگر کوئی ہمیں چیلنج کرے تو ہم ثابت بھی کر سکتے ہیں۔خیر یہ تو ماضی کا قصہ ہے جبکہ ہم ''حال'' میں جینے والے لوگ اور حال کی صورتِ حال یہ ہے کہ اب کی بار مُرشد نے عوامی انقلاب کی نوید سناتے ہوئے یہ فرمان جاری کر دیا ہے کہ وہ کرپٹ حکمرانوں کو بہت جلد ملک سے ''کِک آؤٹ'' کر دیں گے۔مُرشد کے قہر و غضب سے بچنے کے لیے اب خادمِ اعلیٰ بھی بار بار کہہ رہے ہیں کہ اگر کوئی ایک ''دھیلے'' کی کرپشن بھی ثابت کر دے تو وہ سیاست چھوڑ دیں گے۔مُرشد نے فرمایا کہ جو لوگ اُنہیں ''کینیڈوی'' کہتے ہیں، وہ سُن لیں کہ کینیڈا سے پاکستان آنے میں صِرف تیرہ گھنٹے لگتے ہیں اور وہ عنقریب پاکستان آ کر انقلابی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے ملک کو ''کرپٹ نظام'' سے ہمیشہ کے لیے

نجات دلا دیں گے ۔اُنھوں نے کہا کہ ملک میں 35 صوبے بنائیں گے ، ہر صوبے میں سپریم کورٹ ، ہر ضلعے میں ہائی کورٹ اور ہر تحصیل اور یونین کونسل میں سیشن کورٹ اور سِول عدالتیں قائم کی جائیں گی جن میں کم و بیش 10 لاکھ افراد کی کھپت ہو گی ، غریبوں کو روزگار ، پانچ لاکھ ایکڑ مفت اراضی ، مفت مکانات ، مفت تعلیم اور آدھی قیمت پر کھانے پینے کی اشیاء مہیا کی جائیں گی ۔ میں نے مُرشد کا یہ عظیم منصوبہ جب ایک جاننے والی کو بتلایا تو اُس نے مجھے ایک گھِسا پٹا لطیفہ سنایا ، آپ بھی سُن لیجئے ۔ایک بِلّی بہت بھوکی تھی اور چوہا تھا کہ اپنے بِل سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔آخر کار بِلّی کو ایک ترکیب سوجھی اور اُس نے چوہے کو مخاطب کرکے کہا ''بھانجے ! اگر تُم اِس بِل سے نکل کر اُس بِل میں چلے جاؤ تو مَیں تمھیں پانچ سو روپے دونگی ''۔چوہے نے لالچ میں آ کر پہلے تو اپنے بِل سے تھوڑا سا مُنہ باہر نکالا لیکن فوراً ہی اندر گھُس گیا۔ بھوکی بِلّی نے چِلاتے ہوئے کہا ''بھانجے ! کیا ہوا؟''۔چوہا بولا ''خالہ ! پَینڈا تھوڑا ، تے پیسے بوہتے نیں ۔اے کوئی چکر اے'' (خالہ ! پیسے کَم اور فاصلہ زیادہ ہے اِس لیے کوئی چکر ہے)۔ لطیفے پر ہمیں ''تَپ'' تو بہت چڑھی لیکن '' اندرو اَندری'' خوفزدہ بھی بہت ہوئے کہ اُس کمبخت کی باتوں میں دَم تو تھا۔اُس وقت سے ہم اسی حساب میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ اگر سپریم کورٹوں کے 35 چیف جسٹس ہونگے تو ہائی کورٹوں کے کتنے ہونگے ؟۔ کتنے جسٹس ، کتنے سیشن جج اور سول جج ہونگے

؟۔35 وزرائے اعلیٰ اور گورنرز کے علاوہ کتنے وزیر باتدبیر، کتنے مشیر سشیر، اور کتنے پارلیمانی سیکرٹریز ہونگے۔35 چیف سیکرٹریز کے ساتھ کتنے سیکرٹری، ایڈیشنل، ڈپٹی اور اسسٹنٹ سیکرٹری ہونگے؟۔یہ سلسلہ تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہی ہوتا جا رہا تھا جبکہ دَس لاکھ افراد کی کھپت تو یہیں پوری ہو گئی اِس لیے ہم نے ''مٹّی پاؤ'' پالیسی پر عمل کرتے ہوئے یہ سوچا کہ ''سانوں کی''۔ہمارے مُرشد چونکہ ''ہَرنی والے پیر'' بھی ہیں، شیخ الاسلام بھی، ڈاکٹر بھی، علامہ بھی اور وکیل بھی، اِس لیے اُنہوں نے کچھ نہ کچھ تو سوچ ہی رکھا ہو گا ویسے مُرشد کے اِس منصوبے کا اتنا فائدہ تو بہرحال ضرور ہو گا کہ ہر سیاسی جماعت کے حصّے میں کچھ نہ کچھ ضرور آ جائے گا اور پھر راوی عیش ہی عیش لکھے گا۔

ہمارے ''الطاف بھائی'' نے جب پاکستان آنے کی ٹھانی تو اُن کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔اُنہوں نے پاکستانی پاسپورٹ کے لیے ''سَچی مُچی کی'' درخواست دے ڈالی لیکن وزارتِ داخلہ وہ درخواست ''ڈکار'' گئی اور اب ''مَیڈم وزارتِ داخلہ'' کہتی ہے کہ الطاف بھائی نے تو سرے سے کوئی درخواست ہی نہیں دی۔ہم وزارتِ داخلہ کو خبردار کرتے ہیں کہ ذرا اُس وقت سے جب الطاف بھائی کی ''بڑھکوں'' سے کپتان صاحب کی سونامی سے بھی بڑی سونامی آ جائے گی۔ابھی تو ایم کیو ایم نے صرف اتنا کہا ہے کہ اگر الطاف بھائی کو

شناختی کارڈ اور پاسپورٹ نہ دیا گیا تو کراچی کو ایک سال کے لیے بند کر دیا جائے گا لیکن اگر الطاف بھائی نے حکم صادر فرما دیا تو ایم کیو ایم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاکستان کو بھی بند کر سکتی ہے۔اِس لیے وزارتِ داخلہ باقی سب کام ادھورے چھوڑ کر شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کا بندوبست کرے وگرنہ ہم بھی یہ کہنے پر مجبور ہونگے کہ ''ٹھنڈا سا اُٹھاؤ الطاف بھائی ، ہم تمہارے ساتھ ہیں'' ۔

ہمارے '' عظیم رہنما'' عمران خاں نے بالآخر اسلام آباد کے ڈی چوک کو '' التحریر سکوائر'' میں بدل ہی دیا۔ ہمیں تو یہ انسانوں کا سمندر لگتا تھا لیکن تجزیہ نگاروں کو صرف ستائیس ، اٹھائیس ہزار۔ بہرحال مجمع جتنا بھی تھا ، سونامیے بھی خوش تھے اور اپنے شیخ رشید احمد بھی۔ شیخ صاحب نے تو کپتان صاحب کو یقین دلانے کے لیے ''خُدا کی قسم'' اُٹھا کر صرف دَس منٹ میں اسمبلی الٹنے کا دعویٰ بھی کر دیا لیکن خان صاحب آڑے آ گئے اور اسمبلی اُلٹنے سے بال بال بچ گئی۔ ویسے ''آدھا کام'' تو 11 مئی کو اسلام آباد کے ڈی چوک میں ہو ہی گیا ، باقی آدھا 23 مئی کو فیصل آباد میں ہو جائے گا اور اسمبلی بھی خود بخود اُلٹ جائے گی اور یہ صرف اور صرف حکمرانوں کی ہَٹ دھرمی کی وجہ سے ہو گا کیونکہ کپتان صاحب تو بار بار یہ کہتے رہے کہ الیکشن میں کی جانے والی دھاندلیوں کا کوئی حل تلاش کر لیں لیکن جب حکمرانوں کے کانوں پر جُوں

تنگ نہ رہنگی تو" تنگ آمد، بجنگ آمد" کے مصداق ہم "سونامیوں" نے بھی طے کر لیا
کہ

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

شاہوں اور مخدوموں کی سرزمیں

یوں تو پاکستان میں شاہوں اور مخدوموں کی کوئی کمی نہیں اور سیاسی پارٹیاں ، خصوصاً پیپلز پارٹی تو اِن سے بھری پڑی ہے لیکن ہمارے پاس تو صرف ایک ہی ’’شاہ صاحب‘‘ تھے جنہیں حکومت نے پکڑ کر جیل میں بند کر دیا۔اُن کا اصلی نام تو کچھ اور ہے لیکن وہ جانے اور پہچانے ’’ڈبل شاہ‘‘ کے نام سے جاتے ہیں۔اب ہمارے شاہ صاحب با عزت بری ہو گئے لیکن اِس ’’قومی اہمیت‘‘ کے معاملے کو الیکٹرانک میڈیا نے لفٹ کرائی نہ پرنٹ نے۔ ویسے بھی ہمارا الیکٹرانک میڈیا آپس میں ہی ’’گتھم گتھا‘‘ ہے جِس کی بنا پر ہم جیسے انجان بھی بہت کچھ جان چکے ہیں اور مزید جاننے کی توقع ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکلوتے شاہ صاحب کا معاملہ ’’اَندر واَندری‘‘ دَم گھُٹ کے مَر گیا ہے۔ڈبل شاہ کسی افسانوی کردار کی طرح عرصۂ دراز تک لوگوں کے ذہنوں پر چھایا رہا اور بڑے بڑے لوگ اُس کے دَرِ نیاز پر زانوئے تلمذ تہ کرتے رہے لیکن پھر اُس کی مقبولیت کو کسی کی نظر کھا گئی اور اُسے سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا گیا۔اب ہمارے شاہ صاحب ایک دفعہ پھر ’’اِن ایکشن‘‘ ہو نگے اور دروغ بَر گردنِ راوی اُنہوں نے اعلان کیا ہے کہ اب وہ ڈبل کی بجائے ’’ٹرپل شاہ‘‘ بَن کر اُبھریں اور ’’ایک کے تین‘‘ دِیا کریں گے ۔ سچّی بات ہے کہ

آجکل ہم تو دھڑا دَھڑ پیسے جمع کرنے میں مصروف ہیں تاکہ ''شاہ جی'' کو پاس جمع کروا کے تین گُنا کرسکیں۔ویسے ہم نے یہ بھی سوچ رکھا ہے کہ ہم شاہ صاحب سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ اور کچھ دیں نہ دیں ہمیں ہمارے یوٹیلٹی بلز ''جوگے'' پیسے ضرور دے دیا کریں۔

سیاسی جماعتوں کے ''شاہان'' کا تو لینے والا ہاتھ ہی ہمیشہ سامنے رہتا ہے ،دینے والا شاید سرہانے دھرے دھرے سوگیا ہے جبکہ ہمارے ''ٹرِپل شاہ'' ایک کے تین دیتے ہیں۔ایک ہمارے ''صدیوں پرانے'' سید قائم علی شاہ بھی ہیں ۔لوگ کہتے ہیں کہ سندھ کی تاریخ اتنی پرانی نہیں ، جتنے پُرانے ہمارے شاہ جی ۔ کراچی کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قائم علی شاہ صاحب کو ہمارے وزیرِ اعظم جناب نواز شریف نے کہا''شاہ کھیلیں ، ٹیسٹ میچ نہ کھیلیں''۔ جواباً شاہ صاحب نے فرمایا''ہم اچھی T 20 ! جی باولنگ اور بیٹنگ کی کوشش کر رہے ہیں ۔یقیناً شاہ صاحب نے درست فرمایا ہوگا لیکن اُنہیں شاید پتہ نہیں کہ ہمارے ''ٹُک ٹُک مصباح'' بھی اچھی بیٹنگ ہی کرتے ہیں لیکن میچ ہمیشہ ہار جاتے ہیں ۔اگر ہمارے شاہ جی بھی اچھی بیٹنگ کے شوق میں ''ٹُک ٹُک'' کرتے رہے تو خُدانخواستہ کراچی کا میچ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ویسے تو شاہ صاحب نے ''میچ فِکسنگ'' کرتے ہوئے مخالف ٹیم (ایم کیو ایم) کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے لیکن نتیجہ صفر رہنے کا ہی امکان ہے کیونکہ ایم کیو ایم کا کچھ

پتہ نہیں کہ وہ کب کھسک لے۔ ویسے بھی اپنے شاہ صاحب عمر کے جس حصّے میں ہیں اُس میں تو ٹکٹ ٹک بھی غنیمت ہے۔ یہ بھی مدِ نظر رہے کہ وہ جناب آصف علی زرداری جیسے ''گُرو'' کے چیلے ہیں، جو ''ٹھنڈا ٹھار'' میچ کھیلتے ہوئے پورے پانچ سال تک وِکٹ پر جمے رہے۔ لوگ جھولیاں اُٹھا اُٹھا کر اُن کی رُخصتی کی دعائیں مانگتے رہے، تجزیہ نگار تاریخ پہ تاریخ دیتے رہے لیکن ''بلوچ'' ڈٹا رہا۔ اب محض ''مُنہ کا سَواد'' بدلنے کے لیے وہ اپنے وارث بلاول زرداری کو سامنے لے آئے ہیں لیکن بلاول ٹویٹر سے باہر نکلنا پسند ہی نہیں کرتا۔ شنید ہے کہ زرداری صاحب اپنے وارث کی ''ٹویٹریوں'' سے تنگ آ کر ایک دفعہ پھر لنگوٹ کَس کر میدانِ عمل میں کودنے کو تیار ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب پیپلز پارٹی میں قطار اندر قطار شاہ اور مخدوم ہی نظر آتے تھے۔ قائم علی شاہ، خورشید شاہ، سید یوسف رضا شاہ، مخدوم فیصل صالح حیات، مخدوم شاہ محمود، مخدوم امین فہیم اور مخدوموں کے مخدوم، شاہوں کے شاہ ''راجہ رینٹل'' سبھی پیپلز پارٹی کے تابندہ و درخشندہ ستارے ہوا کرتے تھے لیکن پھر فیصل صالح حیات اور شاہ محمود روٹھ گئے اور شنید ہے کہ ایک اور مخدوم بھی عنقریب روٹھنے والے ہیں۔ اُدھر نواز لیگ نے مخدوموں اور شاہوں کا روگ کَم کَم ہی پالا ہے۔ اُس کے پاس لے دے کے ایک مخدوم جاوید ہاشمی اور دوسرے سید غوث علی شاہ تھے۔ جاوید ہاشمی صاحب کو تحریکِ انصاف نے اغوا کر لیا اور غوث علی شاہ ''نکرے'' لگے بیٹھے ہیں۔ شنید ہے کہ جاوید ہاشمی کو آجکل نواز لیگ کی

یاد بہت ستا رہی ہے اسی لیے وہ گاہے بگاہے یہ اعلان بھی کرتے رہتے ہیں کہ اُن کا جب جی چاہے گا نواز لیگ میں واپس چلے جائیں گے لیکن میاں برادران کی طرف سے کسی گرمجوشی کا اظہار نہ پا کر ہاشمی صاحب چُپ ہو رہتے ہیں۔جاوید ہاشمی کی اِن دھمکیوں کا بہرحال اتنا اثر ضرور ہوا ہے کہ اب اُنہیں بھی شاہ محمود قریشی جتنی اہمیت دی جانے لگی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ تحریکِ انصاف کے ''بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے'' ۔وہ جب سڑکوں پہ نہیں ہوتی تو ''سونامیوں'' پر مُردنی سی چھا جاتی ہے۔شاید اسی بنا پر کپتان صاحب نے الیکشن کے ایک سال بعد ''دھاندلی تحریک'' شروع کر دی۔ کپتان صاحب نے ''کُنڈے'' ڈال کر شاہ محمود قُریشی کو اپنی طرف کھینچ تو لیا لیکن نکلے وہ بھی ٹھنڈے ٹھار'' جو تحریکِ انصاف کا مزاج ہر گز نہیں۔ تحریکِ انصاف تو شعلہ فشانی و'' شعلہ بیانی پر یقین رکھنے والی ایسی جماعت ہے جس کے مقدر میں شیخ رشید احمد جیسے لوگ لکھ دیئے گئے ہیں۔لُقمان حکیم نے کہا ''جب پہلی بار عقل میرے پاس آئی تو میں نے پوچھا ''تُو کون ہے؟''۔اُس نے کہا ''عقل''۔ میں نے پوچھا ''کہاں رہتی ہے؟''۔اُس نے کہا ''سَر میں''۔پھر میرے پاس تقدیر آئی۔ میں نے پوچھا ''تُو کہاں رہتی ہے؟''۔اُس نے کہا ''سَر میں''۔ میں نے حیرت سے کہا کہ سر میں تو عقل رہتی ہے ۔تقدیر نے ہنس کر جواب دیا ''جب میں آتی ہوں تو عقل رخصت ہو جاتی ہے''۔ سبھی جانتے ہیں کہ تحریکِ انصاف آئی اور چھا گئی۔یہ یقیناً خاں صاحب کی سولہ سالہ محنتوں کا ثمر تھا۔ لیکن کاتبِ تقدیر خاں صاحب کے

اِس ''اَوج'' کو دیکھ کر مُسکرا رہا تھا۔ یہ بھی شاید تقدیر ہی کی کرشمہ سازی تھی کہ خاں صاحب نے ہر اُس شخص کو گلے لگا لیا جس سے قوم پہلے ہی ''اوازار'' تھی۔ پھر جو کچھ ہوا سب کے سامنے ہے۔،

ایک شاہ جی ہمارے سیّد خورشید شاہ ہیں جو چہرے مُہرے سے تو انتہائی کرخت نظر آتے ہیں لیکن ہیں وہ زرداری صاحب سے بھی زیادہ ٹھنڈے ٹھار۔ ہمارے کپتان صاحب ہمیشہ شاہ صاحب کی ''ٹھنڈی اداؤں'' پر کھولتے رہتے ہیں۔ کپتان صاحب تو یہی چاہتے ہیں کہ ساری اپوزیشن مِل کر نواز لیگ کا ''ٹھکّو ٹھپ'' دے لیکن خورشید شاہ صاحب ہمیشہ طرح دے جاتے ہیں۔ ڈی چوک اسلام آباد کے ''کامیاب'' جلسے کے بعد بھی کپتان صاحب نے شاہ صاحب کو منانے کے لیے دو مخدوموں پر مشتمل وفد بھیجا۔ شاید کپتان صاحب کا خیال ہو کہ شاہوں کو شاہ ہی منا سکتے ہیں لیکن اُن کا یہ وار بھی خالی گیا اور خورشید شاہ صاحب نے یہ کہہ کر ٹکا سا جواب دے دیا کہ موجودہ حالات میں اپوزیشن کا مظاہروں کے لیے سڑکوں پر آنا اور افراتفری پھیلانا کسی بھی صورت میں مناسب نہیں۔ اب تحریکِ انصاف اپنی احتجاجی تحریک تو جاری رکھے گی مگر اکیلے ہی۔ شاید ناقدین یہ کہیں کہ '' قاف لیگ بھی تو ہے''۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قاف لیگ کا ہونا، نہ ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا کیونکہ قاف لیگ کے پلّے ہے ہی کیا سوائے سیّد مشاہد حسین کے اور یہ ''شاہ جی'' بھی آجکل منظر سے ''آؤٹ'' ہی ہیں۔

خُدارااب بَس کریں

چھیاسٹھ برس گزر گئے لیکن آدھا پاکستان گنوا کر بھی ہمیں سمجھ نہیں آئی کہ ہماری کھیتیاں بے برگ و ثمر کیوں ہیں ، ہمارے کھلیانوں میں آگ کیوں اُگتی ہے ، ہماری تمنائیں زنگ آلود کیوں ہیں اور ہماری دعائیں مستجاب کیوں نہیں ہوتیں؟۔وجہ شاید یہ کہ ہمارے ایمان و ایقان کی بنیادیں ہی منہدم ہو چکی ہیں اور قصور وار ہم سب، کوئی چھوٹی برائی میں مگن تو کوئی بڑی برائی میں۔آقا ﷺ نے فرمایا ”وہ طویل سفر میں ہے ، پراگندہ حال ، غبار آلود ، دو، دو ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہتا ہے اے ربّ ! اے ربّ ! ۔ مگر اُس کا کھانا حرام ، پینا حرام ، لباس حرام اور حرام کی غذا سے نشو و نما پا رہا ہے ۔بھلا ایسے شخص کی دُعا کب سُنی جائے گی “۔ہم نے اپنے ربّ سے یہ وعدہ کرکے زمین کا ٹکڑا حاصل کیا کہ ہم اسے اسلام کی تجربہ گاہ بنائیں گے لیکن ہم اپنا وعدہ بھول گئے اور ربّ نے اپنی رسی دراز کرتے ہوئے ہمیں کھلا چھوڑ دیا ۔ اب عالم یہ کہ اچھائی اور سچائی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی ، چہار سو ابلیسیت ہی ابلیسیت ۔
باہم مصروفِ پیکار الیکٹرانک میڈیا پتہ نہیں کس ملک و قوم کی خدمت کر رہا ہے

اور کس مذہب کی ترجمانی۔پاکستان کے سب سے بڑے میڈیا گروپ کے ایک مارننگ شو نے ملک بھر میں آگ لگا دی، معاملے کو انتہاؤں تک لے جانے والا بھی الیکٹرانک میڈیا۔یہ سب کچھ حبِ علیؓ نہیں بغضِ معاویہؓ کے تحت ہو رہا ہے اور مقصد محض حصولِ زر۔نیوز چینلز کے اِس تصادم میں علماء بھی برابر کے شریک اور عالم وہی کہ اُدھر ہلاکو کے سپاہی کمندیں ڈال کر بغداد کی فصیلیں پھاند رہے تھے اور اُدھر بغداد کے علماء پانچ سو جگہوں پر مناظروں میں مصروف۔پھر بغداد کا جو حشر ہوا وہ تاریخ کا حصّہ۔آج بھی دہشت گرد امریکہ ہمارے سروں پر بیٹھا ہے، آر ایس ایس کا پروردہ نریندر مودی ہندوستان میں دو تہائی اکثریت سے جیت چکا۔یہ وہی مُودی ہے جس نے الیکشن کے ہنگام کہا تھا کہ وہ پاکستان میں چھپے ہوئے داؤد ابراہیم کو اسی طرح اٹھا لائے گا جیسے امریکہ اسامہ بن لادن کو لایا تھا، یہ وہی مُودی ہے جسے مسلم کش فسادات کا ہیرو کہا جاتا ہے۔یہ وہی مُودی ہے جس کی پارٹی میں کوئی ایک مسلمان بھی نہیں اور یہ وہی مُودی ہے کہ ''اکھنڈ بھارت'' جس کا خواب ۔۔۔اُدھر طالبان سے مذاکرات میں طویل تعطل۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مذاکرات کا باب بند ہو چکا۔تحریکِ طالبان پاکستان کے سربراہ مُلّا فضل اللہ نے اپنے ''فدائین'' کو مقابلے کے لیے تیار رہنے کا حکم دے دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ جن خود کش حملہ آوروں سے رابطہ نہیں اُن تک بھی پیغام پہنچا دیا جائے کہ وہ خود کش حملوں کے لیے تیار رہیں۔اِس کے باوجود بھی علماء کو کچھ پرواہ

نہ "بے باک" میڈیا کو اور نہ ہی وزارتِ عظمٰی کے خواب دیکھنے والوں کو۔ سبھی اپنی دھن میں مگن۔

سب سے بڑے میڈیا گروپ نے اپنے مارننگ شو میں اہلِ بیت کی شان میں جو گستاخی کی وہ ناقابلِ معافی و تلافی ٹھہری۔ تحقیق کہ ہر مسلمان کی جان بھی اہلِ بیت پہ قربان سوال مگر یہ ہے کہ ہم کدھر جائیں؟۔ہمارے علماء تو خود دو واضح گروہوں میں تقسیم، ہو چکے ہیں۔ایک طرف جلسے جلوس، ریلیاں اور کفر کے فتوے، تو دوسری طرف معاف کر دینے کے لامحدود دلائل۔ایک طرف یہ دلیل کہ معافی کا حق صرف اُنہیں کو حاصل ہے جن کی شان میں گُستاخی کی گئی تو دوسری طرف سے یہ کہ اللہ اگر چاہے تو تمام گناہ معاف کر دیتا ہے سوائے شرک کے اور یہ بھی کہ جس نے اپنے گناہوں سے توبہ کی ربِ کریم اُس کے گناہوں کو یوں دھو ڈالتا ہے جیسے اُس نے کبھی گناہ کیا ہی نہ ہو اور یہی نہیں بلکہ اُس کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔فتوے دونوں طرف اور درمیان میں پِستے ہوئے عوام کہ جنہیں کوئی راہ دکھائی دیتی ہے، نہ سجھائی۔ سوال یہ بھی ہے کہ کیا ایسا پہلی بار ہوا ہے اور کیا اسی الیکٹرانک میڈیا پر اسلامی شعائر کا مذاق نہیں اُڑایا جاتا؟۔کیا یہ عین حقیقت نہیں کہ NGO,s کی کچھ خواتین مادر پدر آزاد معاشرے کی تشکیل کی تگ و دَو میں اپنی حدوں سے باہر نکل چکی ہیں؟۔کیا وہ احکاماتِ الٰہیہ کا مذاق اُڑاتی اور نصوصِ قُرآنی سے روگردانی

نہیں کرتیں؟۔اگر کتابِ حکمت کے کسی ایک حرف کا انکار بھی پورے قُرآن کے انکار کے مترادف ہے تو پھر ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کا ''پیمرا'' کہاں ہے؟۔کیا سو چکا یا بِک چکا؟۔کیا ہمارے پیمرا کو نظر نہیں آتا کہ یہی خواتین ہمارے الیکٹرانک میڈیا کی محبوب و مرغوب اور ہر روز کسی نہ کسی چینل پر براجمان۔لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو گا کہ اُن کی زباں بندی کی کوئی سبیل کی جائے۔وجہ صرف یہ کہ ایسی خواتین امریکہ اور یورپ کی پروردہ ہیں جن پر ہاتھ ڈالنے کا سوچتے ہوئے بھی ہمارے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

ہمارے نیوز چینلز جرائم، خصوصاً جنسی بے راہ روی کے معاملات کو اچھالتے اور ''چَسکے'' لے لے کر بیان کرتے ہیں، مقصد اصلاحِ معاشرہ نہیں، ریٹنگ محض ریٹنگ کہ جتنی ریٹنگ زیادہ ہو گی اُتنا ہی زیادہ ''دھَن'' اکٹھا ہو گا۔دَھن کی ''دُھن'' میں مست نیوز چینلز مالکان کے حکم پر ترتیب دیئے گئے جرائم پر مبنی یہ پروگرام معاشرے کی اصلاح نہیں بگاڑ کا باعث بن رہے ہیں اور کوئی غیرت مند خاندان ایسے پروگراموں کو اکٹھے بیٹھ کر دیکھ ہی نہیں سکتا۔ٹاک شوز میں وہ اُدھم مچا ہوتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔یہ عین حقیقت ہے کہ اپنے مُنہ سے جہالت کا کوئی بھی اقرار نہیں کرتا ماسوائے اُس شخص کے کہ دوسرے نے ابھی بات ختم نہ کی ہو اور وہ اپنی بات شروع کر دے۔میرے آقا ﷺ کا یہ فرمان بھی کسی کو یاد نہیں کہ جب کوئی دوسرا بول رہا ہو تو اُتنی دیر تک

خاموش رہو جب تک کہ وہ اپنی بات ختم نہ کر لے لیکن ہمارے اینکرز جو ماشاء اللہ خود سیاست دانوں سے بھی بڑے سیاست دان ہیں، کسی مہمان کو کم کم ہی بولنے کا موقع دیتے ہیں اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ دوسرے کی بات ابھی ادھوری ہوتی ہے اور وہ درمیان میں کود پڑتے ہیں۔ اُدھر ٹاک شوز کے شُرکاء کا یہ عالم کہ باہم تُو تکار، محض تو تکار اور کج بحثی۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ سبھی بیک وقت بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اینکر خوش کہ ریٹنگ بڑھ رہی ہے۔ اگر نوبت گالی گلوچ تک پہنچ جائے تو اینکر کی ریٹنگ آسمان کی رفعتوں کو چھونے لگتی ہے۔ مزاحیہ پروگرام ''تھیٹروں'' میں ڈھل چکے ہیں جہاں پگڑیاں اچھالی جاتی اور ذو معنی جملوں اور پھکڑپن کی بھرمار نظر آتی ہے۔ وہی سٹیج اداکار اور اداکارائیں جو کبھی مخصوص جگہوں پر اپنے ''فَن'' کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور جن سے ''مخصوص ذہنیت'' کے لوگ ہی ''مستفید'' ہوا کرتے تھے، وہ سب اب الیکٹرانک میڈیا کی مہربانی سے گھر گھر پھیل چکے ہیں۔ اُن کی زہرناکی نَسلِ نَو کی رگوں میں یوں سرایت کر چکی ہے کہ اقبال کا ''شاہیں'' اب ''کَرگسوں'' سے بھی بَدتَر نظر آتا ہے۔ دینِ مبیں تو ہنسنے ہنسانے کی خاطر جھوٹ بولنے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے لیکن ہمارے مہربان ''بھانڈوں'' کا واہیات جھوٹ طبیعت پر بوجھ۔ امام غزالیؒ نے فرمایا تمسخر بالعموم قطع دوستی، دِل شکنی اور دشمنی کا باعث بنتا ہے''۔ لیکن ہمارے مزاحیہ'' پروگراموں میں سوائے تمسخر کے، کچھ ہوتا ہی نہیں۔ کیا یہی اسلام

ہے اور دین مبین کی تعلیمات بھی یہی ؟۔الیکٹرانک میڈیا آزاد اور بے باک سہی لیکن
اپنی حدوں سے اتنا بھی باہر نہ نکل جائے کہ قوم ایسے میڈیا سے اللہ کی پناہ مانگتے ہوئے
اسے بند کرنے کا مطالبہ کر بیٹھے۔

ہزاروں ہی شکوے ہیں

جب چوہدری ذکاء اشرف کی چیئرمینی کو اسلام آباد ہائی کورٹ کی نظر کھا گئی تو جنابِ وزیرِ اعظم کی نگاہِ انتخاب نجم سیٹھی پر پڑی اور اُنہیں کرکٹ بورڈ کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ ذکاء اشرف دہائی دیتے ہائی کورٹ چلے گئے اور جب بحال ہو کر لَوٹے تو سیٹھی صاحب کی چیئرمینی کی چڑیا پھُر سے اُڑ کر چوہدری ذکاء اشرف کے کندھے پر جا بیٹھی ۔ پھر ایسی بادِ سموم چلی کہ ذکاء صاحب کی چیئرمینی کا چمن ایک مرتبہ پھر اُجڑ گیا اور چڑیا بوستانِ سیٹھی صاحب میں چہچہانے واپس آ گئی ۔ کہا تو چوہدری ذکاء اشرف نے یہی تھا کہ اب وہ چیئرمینی کی دَوڑ سے بیزار ہو گئے ہیں لیکن وہ ''اندرواندری'' لگے رہے اور اپنی ''مٹی پاؤ'' پالیسی کا شور مچاتے مچاتے پھر سے بحال ہو گئے۔ نجم سیٹھی صاحب کو چوہدری صاحب کی اِس بحالی پر بہت ''وَٹ'' چڑھا کیونکہ بَد خواہوں نے بغلیں بجاتے ہوئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ''بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے'' ۔ سیٹھی صاحب کی اِس بیقراری کو بھانپتے ہوئے اُنہیں ''اونچے ایوانوں'' کی طرف سے تسلی دے دی گئی اور بین الصوبائی رابطے کی وزارت نے ہائی کورٹ کے اِس ''ظلمِ عظیم'' پر سپریم کورٹ میں نوحہ خوانی شروع کر دی جس سے متاثر ہو کر سپریم کورٹ نے چوہدری ذکاء اشرف کی بہتر

گھنٹے کی چیئرمینی کو ''پھڑکا'' کے رکھ دیا اور یوں چوہدری صاحب کی چیئرمینی سے محبّت نے اُنہیں بقول میر اُس مقام تک پہنچا دیا کہ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اِس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

سچّی بات تو یہ ہے کہ ہمیں چوہدری ذکاء اشرف ہی پسند تھے کیونکہ وہ جنابِ آصف زرداری کا انتخاب تھے اور ہم سمجھتے ہیں کہ زرداری صاحب کا ''انتخاب'' کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے تو زرداری صاحب کے پانچ سالہ دَورِ حکومت کو دیکھ لے ، یقین کیے بنا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ دوسری طرف سبھی جانتے ہیں نجم سیٹھی صاحب کو اُن 35 پنکچروں کی بدولت چیئرمینی ملی جن کا تذکرہ ہمارے کپتان صاحب بار بار کر رہے ہیں۔ یہ 35 پنکچر قوم کو بہت کنفیوز کر رہے ہیں ۔ میری ایک جاننے والی نے پوچھا ''باجی ! یہ ہر ٹی وی چینل پر ہر روز 35 پنکچروں کا شور مچا ہوتا ہے ، کیا ٹی وی والوں نے پنکچروں کی دوکانیں کھول لی ہیں ؟''۔ میں نے مُسکرا کر کہا ''نہیں ، دراصل نواز لیگ پر الزام آتا ہے کہ اُس نے الیکشن 2013ء میں نجم سیٹھی کے ذریعے دھاندلی کرکے تحریکِ انصاف کے 35 اُمیدواروں کو ہرا دیا ہے''۔ وہ بولی ''اچھا ! اب سمجھی کہ نجم سیٹھی صاحب نے تحریکِ انصاف کے 35 اُمیدواروں کی ''پھُوک'' نکال دی ۔ میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نجم''

سیٹھی نے نواز لیگ کے 35 پنکچر اُمیدواروں کو پنکچر لگا کر جتوا دیا ہو۔
میری جاننے والی تو چلی گئی لیکن بات پتے کی کر گئی کہ ''کیا ٹی وی والوں نے پنکچروں کی دوکانیں کھول لی ہیں؟''۔اُس نے جو بات کہی وہ ''بات تو سَچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی''۔ ہمارے نیوز چینلز کا حُسنِ کرشمہ ساز جو چاہے کر سکتا ہے۔خاک کو عالمِ پاک میں ڈھالنا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل، شاہ کو گدا اور گدا کو شاہ بنانے کے ماہر اور پگڑیاں اچھالنے میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔وہ جب اور جسے چاہیں کئی کئی گھنٹے کی ''لائیو کوریج'' دے کر آسمان کی رفعتوں تک پہنچا دیں اور جسے چاہیں ''غضب کرپشن کی عجب کہانیاں'' سُنا سُنا کر برباد کر دیں۔ایک نیوز چینل کا اپنے ''مَن بھاتے'' کپتان صاحب سے آجکل ''پھڈا'' چل رہا ہے۔یہ وہی نیوز چینل ہے جس نے الیکشن کے دنوں میں تحریکِ انصاف کو 376 منٹ اور نواز لیگ کو 336 منٹ کوریج دی اور کپتان صاحب کے گِر کر زخمی ہونے پر 167 منٹ جو دیگر نیوز چینلز سے کہیں زیادہ تھی، وہی نیوز چینل آجکل خاں صاحب کے خلاف اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر رہا ہے اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے اُن کے بیانات پر مشتمل ایسی ''ویڈیوز'' نکال کر نشر کرتا جا رہا ہے جس سے ہم ''سونامیوں'' کا حَشر نَشر ہو رہا۔اُدھر ہمارے کپتان صاحب بھی عجیب ہیں کہ ایویں خوامخواہ'' اُس چینل سے پھڈا لے بیٹھے۔پتہ نہیں اُنہیں یہ اعلان کرنے کا کِس''

حکیم'' نے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی نیوز کانفرنس میں اُس چینل کے خلاف ثبوتوں کے'' ٹوکرے'' بھَر کر لائیں گے۔ لیکن جب کپتان صاحب نیوز کانفرنس کرنے بیٹھے تو اُن کی'' پٹاری'' سے کچھ بھی نہ نکلا اور ایک دوسرا چینل جو ثبوت ملنے کی خوشی میں ''ڈنڈ'' بیٹھکیں'' لگا رہا تھا، اُس بیچارے کا معاملہ بھی ٹائیں ٹائیں فِش ہو گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سارا قصور خاں صاحب کے اُن ''صلاح کاروں'' کا ہے جو اُنہیں اُلٹی پٹیاں پڑھاتے رہتے ہیں اور وقت آنے پر صاف مُکر بھی جاتے ہیں۔ خاں صاحب نے میاں نواز شریف کی وِکٹری سپیچ'' کے بارے میں یہ فرمایا کہ اُس نیوز چینل نے سب سے پہلے میاں'' صاحب کی وِکٹری سپیچ کروا کر دھاندلی کی بنیاد رکھ دی۔ یہ وِکٹری سپیچ دراصل ریٹرننگ آفیسرز کے لئے پیغام تھا کہ میاں صاحب کو اتنی سیٹیں ضرور مل جانی چاہییں جن سے وہ کسی کی مدد کے بغیر حکومت بنا سکیں۔ خاں صاحب کے اِس اعتراض پر ''نون لیگیئے'' یہ کہتے ہیں کہ اگر ریٹرننگ آفیسرز اتنے ہی میاں برادران کے قبضۂ قدرت میں تھے تو اُنہیں پہلے ہی یہ ہدایات جاری کر دی جاتیں، ٹی وی پر آ کر سب کے سامنے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس چینل کے خلاف آجکل خاں صاحب آگ اُگل رہے ہیں، اُس چینل نے یہ وکٹری سپیچ سب سے پہلے نہیں کروائی۔ یہی بات جب محترمہ شیریں مزاری صاحبہ سے پوچھی گئی تو اُنہوں نے صاف مُکرتے ہوئے کہا کہ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں۔ خاں صاحب نے الزام لگایا کہ نجم سیٹھی کی وجہ سے اُس چینل کو سری لنکا کے خلاف سیریز کے

نشریاتی حقوق دیئے گئے لیکن بڈنگ کمیٹی کے ہیڈ، احسان مانی، جو شوکت خانم میموریل ہسپتال کے بورڈ آف گورنرز کے ممبر اور آڈٹ کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں، اُنھوں نے دو ٹوک الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ ''بڈنگ'' میں کسی قسم کی کوئی دھاندلی نہیں ہوئی اور نشریاتی حقوق انتہائی دیانتداری سے دیئے گئے۔ کپتان صاحب نے یہ الزام بھی لگایا کہ اُس نیوز چینل نے گیارہ بج کر بیس منٹ پر میاں صاحب کی وِکٹری سپیچ کرا دی جو کہ نا مناسب اور کھلی دھاندلی تھی۔ اب جبکہ تمام ٹی وی چینلز نے نارووال کے حلقہ پی پی 136 کے ضمنی انتخاب کا رات ساڑھے سات بجے ہی نواز لیگ کے اُمیدوار کی فتح کا اعلان کر دیا تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ سچ تو یہی ہے کہ انتخابات 2013ء کے ہنگام ہمارے کپتان صاحب تو ہسپتال میں داخل تھے اور یہ سب کیا دھرا اُن کے صلاح کاروں کا ہے کہ جنھوں نے جو کچھ بتلایا، خاں صاحب نے وہی سچ جانا۔ اگر خاں صاحب ہمیں اپنا مشیرِ خصوصی مقرر کر لیتے تو ہم یقیناً کوئی ایسا چکر چلاتے کہ ہمارے دو تہائی امیدوار بِلا مقابلہ ہی منتخب ہو جاتے کیونکہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ''دھاندلے'' کرنے والی نواز لیگ تو سیدھے ہاتھوں ہمیں ایک صدی بعد بھی جیتنے نہیں دے گی۔ افسوس کہ تحریکِ انصاف نے ہماری خدمات سے استفادہ نہیں کیا اور اب ''اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت''۔ ہم نے تو تحریکِ انصاف کی خاطر پرویز مشرف صاحب کو سمجھانے کی بھی بہت کوشش کی لیکن وہ تو تھا ہی فاشسٹ۔ لوگ کہتے ہیں کہ اعلیٰ عدلیہ سے

پنگا" لینے کی وجہ سے پرویز مشرف کو یہ دن دیکھنے پڑے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اُن کا زوال تو اُسی وقت شروع ہو گیا تھا جب وہ اپنے وعدے سے مُکر گئے اور کپتان صاحب کی جگہ میر ظفر اللہ جمالی کو وزیرِ اعظم بنا دیا۔ اگر پرویز مشرف صاحب یہ غلطی نہ کرتے تو وہ آج بھی صدر ہوتے اور ہمارے عظیم خان صاحب وزیرِ اعظم۔

خطرات میں گھِرا پاکستان اور ہماری سیاست

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

سرحدوں پر امن کے دیپ جلانے والے سیکولر دانشوروں کو نوید ہو کہ بھارت نے بڑی شان سے سیکولرازم کا جنازہ نکالتے ہوئے ”کالی کے بھگت“ کے سر پر وزارتِ عظمیٰ کا تاج سجا دیا۔ بھارتی انتخابات کی تاریخ میں شاید یہ پہلی بار ہوا کہ بی جے پی اور اُس کا اتحادی 543 کے ایوان میں سے 337 نشستیں لے اُڑے جن میں سے 283 سیٹیں کالی کے بھگت کی ہیں ۔63 سالہ نریندر مودی نامی یہ ” بھگت“ مسلمانوں کا ازلی ابدی دشمن ہے لیکن ایک خوبی بھی ضرور کہ اتنی جرات کا مالک کہ ”بغل میں چھُری ، مُنہ میں رام رام“ پر عمل پیرا نہیں ۔ اُس نے 67 سالہ بھارتی تاریخ میں پہلی بار سیکولرازم کو محض ایک ڈھونگ قرار دیتے ہوئے کہا ”میں اِس جھوٹے سیکولرازم کو ختم کر دونگا جس میں اقلیتوں کو فائدہ پہنچتا ہے ۔اُس کا اشارہ واضح طور پر ہندوستان میں بسنے والے 25 کروڑ مسلمانوں کی طرف تھا۔ نریندر مودی نے یہ بھی کہا کہ ہندو مذہب اور تہذیب بھارت کے لیے اہم ترین ہے اور اسی میں بھارت کی بقا ہے ۔اُس نے اُس ”راشٹر سیوک سنگھ“ کی گود میں پرورش پائی جس کی بنیاد ہی مسلمانوں سے نفرت پر رکھی گئی تھی ۔ نریندر مودی نے آر ایس ایس کے پلیٹ فارم سے ہمیشہ بھارتی مسلمانوں کے خلاف اپنی نفرت کا کھل کے اظہار کیا اور گجرات میں اسی کی شمہ

پر ہزاروں مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔یہ بجا کہ گجرات کے سابق وزیرِ اعلیٰ نریندر مودی کو بھارتی سپریم کورٹ نے اِس خونِ ناحق سے.بری الذمہ قرار دے دیا لیکن کوئی بھی غیر جانبدار مورخ اسے کبھی بھی معصوم قرار نہیں دے سکتا۔جب ہمارے وزیرِ اعظم جناب نواز شریف نے نریندر مودی کی تقریبِ حلف.برداری میں شرکت کا حتمی فیصلہ کیا تو ایک نیوز چینل پر ایک متعصب ہندو تجزیہ نگار یہ کہہ رہا تھا کہ چونکہ نریندر مودی نے حلف.برداری کی تقریب میں تمام سارک سر.براہان کو دعوت دی تھی اِس لیے پاکستان کے وزیرِ اعظم کو بھی مدعو کرنا پڑا۔

باوجود اِس کے کہ پاکستان کے خلاف سازشیں اور نفرتیں بھارت کی گھٹی میں پڑی ہیں اور نریندر مودی جنابِ نواز شریف کے بارے میں اہانت آمیز الفاظ کہہ چکے ہیں ، وزیرِ اعظم پاکستان نے تقریبِ حلف.برداری میں شرکت کا فیصلہ کرکے ایک مستحسن قدم اٹھایا۔اُنہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا کہ ہمارا دین امن و آشتی کا سبق دیتا ہے اور امن کے لیے کی جانے والی ہر کوشش ربِ کریم کو مرغوب ہے۔میاں صاحب نے فرمایا ہے کہ وہ ہمسایہ ممالک سے دوستی چاہتے ہیں اور اُن کا دورہ بھارت تنازعات کے حل میں مددگار ثابت ہو گا۔اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ اُن کے دورے کے دوران تمام متنازع امور پر بات ہو گی۔جنابِ نواز شریف کی 27 مئی کو بھارتی وزیرِ اعظم اور صدر سے ملاقات طے ہے جس میں یقیناً

میاں صاحب لگی لپٹی رکھے بغیر تمام متنازع امور پر بات کریں گے لیکن اِن ملاقاتوں سے توقعات وابستہ کرنا عبث ہے۔صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ

جی چاہتا ہے چھیڑ کے ہوں اُن سے ہم کلام
کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بھارت کو یہ پیغام جاتا کہ ملکی سلامتی کے معاملات پر ہم سب ایک ہیں لیکن پاکستان میں تو سیاستدان ، حکومت ، اپوزیشن ، میڈیا اور حکومتی ادارے باہم دست و گریباں ہیں۔طالبان سے مذاکرات کا دور دور تک پتہ نہیں ،مُلا فضل اللہ اپنے فدائین کو تیار رہنے کا حکم دے رہا ہے، محترم عمران خاں کی سونامی سڑکوں پر ہے ، مولانا طاہر القادری غیر ملکی ایجنڈے کے تحت پاکستان میں افرا تفری پیدا کرنے کے لیے کمر بستہ ہیں اور ہمارے رہنما الزامات و جوابی الزامات کی دھُن میں مگن اپنی رہی سہی ساکھ بھی کھو رہے ہیں۔اِن حالات میں کسی خوشخبری کی محض دعا ہی کی جا سکتی ہے لیکن ہماری تو دعائیں بھی مستجاب نہیں کہ ہمارے اعمال ہی ایسے ہیں۔
تقریباََ تمام مذہبی و سیاسی جماعتوں نے کچھ تحفظات کے ساتھ اِس بھارتی دورے کی حمایت کی ہے لیکن ہمارا اندرونی خلفشار اتنا بڑھ چکا ہے کہ یہ دورہ لا حاصل ہی رہے گا۔وجہ صرف یہ کہ ہمیں ملک و قوم سے کہیں بڑھ کر کرسی عزیز

ہے اور اسی کرسی کی تگ و دَو میں عمران خاں صاحب سڑکوں پہ ہیں۔ وہ اپنے صوبے میں تو کوئی انقلاب آفریں تبدیلی لانے سے قاصر رہے لیکن فیصل آباد میں نواز لیگ پر دھڑلے سے یہ الزام لگا دیا کہ ایک سال گزرنے کے باوجود حکومت لوگوں کی زندگیوں میں کوئی بہتری لانے سے قاصر رہی۔ ایسا کہتے ہوئے شاید خاں صاحب بھول گئے کہ اُنہوں نے پہلے 90 اور پھر 180 دنوں میں خیبر پختونخوا کی تقدیر بدلنے کا اعلان کیا لیکن 360 دنوں میں بھی صوبے کے حالات میں بگاڑ ہی پیدا ہوا، سدھار نہیں۔ اب وہ اپنی اِس ناکامی کا غصّہ پنجاب پر نکال رہے ہیں جو کسی بھی صورت میں ایک قومی لیڈر کے شایانِ شان نہیں۔ وہ ہر پندرہ بیس دن بعد کروڑوں روپے صرف کرکے سونامیوں" کو کسی ایک جگہ اکٹھا کرکے میلہ لگا لیتے ہیں۔ ڈی چوک اسلام آباد کے" بعد اُنہوں نے فیصل آباد میں "میلہ" لگایا اور اب یہ اعزاز سیالکوٹ کو بخشنے جا رہے ہیں۔ سوال مگر یہ ہے کہ خاں صاحب یہ سب کیوں اور کِس کے اشارے پر کر رہے ہیں ؟۔ اگر تحریکِ انصاف کو 2013ء کے انتخابات میں دھاندلی کا شکوہ تھا تو احتجاج کا بہترین اور مروّجہ طریقہ تو یہی تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو حلف اٹھانے سے منع کرکے سڑکوں پر نکل آتے۔ ایسا کرتے ہوئے یقیناً اُن کی باتوں میں وزن بھی ہوتا اور ہمدردی کا عنصر بھی پیدا ہوتا لیکن یہ کیا کہ ایک طرف خیبر پختونخوا حکومت کے مزے لوٹے جا رہے ہیں، پنجاب میں قائدِ حزبِ اختلاف کی کرسی پر قابض ہیں اور دھاندلی کا شور بھی۔ خاں صاحب تو شاید بھول چکے ہوں لیکن قوم

کو یاد ہے کہ پیپلز پارٹی کے دَورِ حکومت میں وہ نواز لیگ کے خلاف آگ اگلتے ہوئے ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ نواز لیگ پنجاب لیگ حکومت کے مزے بھی لُوٹ رہی ہے اور مرکز میں اپوزیشن کا ڈھونگ بھی رچا رکھا ہے۔یہ ''فرینڈلی اپوزیشن'' ہے اور نواز، زرداری مِل بانٹ کر کھا رہے ہیں۔اب یہی سب کچھ تحریکِ انصاف بھی کر رہی ہے۔کیا یہ بھی فرینڈلی اپوزیشن ہی ہے؟۔

جلسے جلوس اور ریلیاں نکالنا سیاستدانوں کا حق ہے کیونکہ کہتے ہیں کہ جمہوریت کا حُسن'' یہی ہے لیکن اگر نوبت گالی اور گولی تک پہنچ گئی تو پھر کچھ باقی نہیں بچے گا'' ۔ تحقیق کہ اگر زباں ، دراز ہو جائے تو زیاں بَن جاتی ہے۔ فیصل آباد کے جلسے میں شیخ رشید احمد نے جو زباں استعمال کی وہ (انتہائی معذرت کے ساتھ) کسی سیاستدان نہیں غنڈے کی زبان تھی ۔اُنھوں نے کہاکہ وہ فیصل آباد نہیں آنا چاہتے تھے کیونکہ یہاں انتہائی ''بَدبُودار'' اور'' ہیجڑا'' رانا ثناء اللہ رہتا ہے جو شکل سے ''رانا''ہر گز نہیں لگتا ۔مگر یہ خاں صاحب کی ضد تھی اِس لیے اُنہیں آنا پڑا۔ شیخ صاحب نے یہ بھی کہاکہ نواز شریف نے دہی بھلے اور چاٹ بنانے والے کو ملک کا صدر بنا دیا ہے۔ شیخ صاحب خود تو دھڑلے سے کہتے ہیں کہ وہ ''تھڑے'' کی سیاست کرتے ہیں لیکن صدرِ مملکت (جو قوم کا باپ ہوتا ہے)کے بارے میں ایسے الفاظ کا چناؤ اُن کے دوغلے پَن اور ذہنی پستی کی علامت ہے۔ صدرِ مملکت نے تو زندگی

میں کبھی دہی بھلے بنائے نہ بیچے لیکن واقفانِ حال خوب جانتے ہیں کہ شیخ صاحب کا ماضی کیا ہے۔کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، شاہ محمود قریشی، جن کی زبان میں لکھنویت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے، وہ بھی شیخ صاحب سے رنگ پکڑ رہے ہیں ۔فی الحال تو شاہ محمود صاحب نے اسی پر اکتفا کیا'' ایک طرف فیصل آباد کے لعل اور دوسری طرف نصیبو لال۔ تحریکِ انصاف کو فیصل آباد کے لعل اور نواز لیگ کو نصیبو لال مبارک ہو''۔آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا۔

اب تخت گرائے جائیں گے

اسلام آباد کو فتح کرنے کے بعد سونامی نے فیصل آباد کا رُخ کر لیا اور تسخیرِ فیصل آباد کے بعد اب فتح کے شادیانے بجاتی ہوئی سیالکوٹ کی جانب رواں دواں ہے جہاں اُس کا ''ٹاکرا'' خواجہ آصف سیالکوٹی سے ہونے والا ہے۔ہم پہلے سے کہے دیتے ہیں کہ ''چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک''۔کہاں ہماری سونامی اور کہاں خواجہ آصف۔اب کی بار جس ''دھواں دھار ''انداز میں ہماری سونامی نکلی ہے اُس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ''اب تخت گرائے جائیں گے، اب تاج اچھالے جائیں گے ''۔اِس کا کچھ کچھ اندازہ تو لیگیوں کو بھی ہو گیا ہے۔کَل ایک '' لیگیئے'' سے ملاقات ہوئی تو اُس نے جَل بھُن کر کہا کہ ''ہم جانتے ہیں کہ یہ کِن قوتوں کے اشارے پر ہو رہا ہے ''۔ہم نے کہا کہ ہم تو ٹھہرے نِرے بُدھو اور جاہل۔آپ ہی یہ بتلا دیں کہ آپ کا اشارہ کِن قوتوں کی طرف ہے؟۔اُس نے کہا ''اتنا بھولا بننے کی ضرورت نہیں، ہم تو پہلے ہی ''وَخت'' میں پڑے ہوئے ہیں۔کیا آپ چاہتی ہیں کہ ہمارے پلّے ''ککھ'' نہ رہے۔ہاں اتنا ضرور کہے دیتے ہیں کہ حکومت بہرحال ''شریفوں'' کی ہی رہے گی، نواز شریف نہ سہی راحیل شریف سہی۔آپ کے ''کپتان شریف ''تو ہاتھ ملتے ہی رہ جائیں گے اور وہ جو آپ کو خیرات میں خیبر پختونخوا کی حکومت

دی گئی ہے، وہ بھی ہاتھ سے جائے گی‘‘۔حضرت علیؓ کا قول ہے ’’یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کیا کہہ رہا ہے‘‘۔ویسے بھی حکمت کی عظیم الشان کتاب میں درج کر دیا گیا ’’اچھی بات اپنے اثر کے لحاظ سے اُس درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں زمین کی تہہ میں ہوں اور شاخیں آسمان (کی بلندیوں) پر‘‘۔سچی بات ہے کہ اُس لیگیئے کی بات دِل کو چھو گئی اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر مآلِ کار یہی ہے تو پھر دھوپ میں جلنے کا فائدہ؟۔پھر ذہن میں آیا کہ ہمارے کپتان صاحب نے تو قومی خدمت کے جذبے‘‘ کے تحت آمر پرویز مشرف سے بھی سمجھوتہ کر لیا تھا۔اگر کوئی اور طالع آزما‘‘ آ جائے گا تو اُس سے سمجھوتہ کرنے میں ہرج ہی کیا ہے۔اِس کا کم از کم اتنا فائدہ تو ہو گا کہ اِس ’’سڑی بُسی‘‘ جمہوریت سے نجات مِل جائے گی اور میاں برادران سے بھی ۔ویسے بھی ہمارے کپتان صاحب بار بار یہ کہتے ہیں کہ ’’جمہوریت ہے کہاں جو ڈی ریل ہو گی‘‘اور اب تو تحریکِ انصاف پنجاب کے صدر اعجاز چوہدری نے بھی صاف کہہ دیا ہے کہ اگر موجودہ حکومت سے جان چھڑانے کے لیے سسٹم ڈی ریل ہوتا ہے تو ہو جائے ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔،

ہمیں آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ اگر خیبر پختونخوا میں ہماری حکومت مشکلات کا شکار ہے تو اِس سے دوسروں کے پیٹ میں مروڑ کیوں اُٹھنے لگتے ہیں۔ابھی تو ہم نے کرکٹ کے میدانوں سے سیاست کے میدانوں کی طرف سفر کا آغاز ہی کیا ہے۔اِس

لحاظ سے ہم میدانِ سیاست کے نو وارد و نو مولود ہیں اِس لیے قوم کو ہمیں بیس، تیس سال تو دینے ہی ہونگے تاکہ ہم بھی کرکٹ کے کھلاڑی کی بجائے سیاست کے کھلاڑی بن سکیں۔ لیکن یہاں تو یہ عالم ہے کہ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا کہ ''لے دے'' شروع ہو گئی ۔ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی میاں برادران کی ہمارے خلاف سازش ہے کہ خود تو پنجاب جیسا ''ہرا بھَرا'' صوبہ سنبھال لیا اور ہمیں پھینک دیا پہاڑوں میں مولانا فضل الرحمٰن کے طعنے سننے اور طالبان کی غذا بننے کے لیے ۔اِس صریحاً ناانصافی پر ہم احتجاج کا حق محفوظ رکھتے ہیں ۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی جماعت کے اکابرین چونکہ موٹے تازے اور صحت مند ہیں اِس لیے وہ ہر وقت ہمارے ''سمارٹ'' وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک کا مذاق اُڑاتے رہتے ہیں ۔حافظ حسین احمد کہتے ہیں ''پتلا پرویز پروٹوکول کے بغیر وزیرِ اعلیٰ لگتا ہی نہیں ۔اُس نے عمران خاں سے پروٹوکول لینے کے لیے پنجاب پولیس پر رشوت کا الزام لگایا''۔یہ بجا کہ پرویز خٹک صاحب اپنی سادگی کی بنا پر رعب داب والے وزیرِ اعلیٰ نہیں لگتے لیکن ایسی بھی کوئی بات نہیں کہ پنجاب پولیس اُنہیں سِرے سے پہچان ہی نہ پائے ۔ قصّہ یوں ہے کہ پرویز خٹک صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پنجاب سے خیبر پختونخوا جا رہے تھے کہ راستے میں پولیس نے اُن کی گاڑی روک لی۔پرویز خٹک صاحب نے اُنہیں لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ خیبر پختونخوا کے وزیرِ اعلیٰ ہیں لیکن پولیس اہلکاروں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔قصور پولیس کا بھی نہیں کہ اُس کا واسطہ تو چوہدری

پرویز الٰہی اور میاں شہباز شریف جیسے ''ٹھکے والے'' وزرائے اعلیٰ سے پڑتا رہا اور پڑ رہا ہے، وہ بھلا پرویز خٹک صاحب کو کیسے وزیرِ اعلیٰ مان لیتے۔ ویسے ہم نے اِس پر بھی غور کیا ہے کہ کہیں یہ پنجاب حکومت کی شرارت تو نہیں تھی۔ اگر یہ شرارت تھی تو پھر یقیناً اِس کے پیچھے رانا ثناء اللہ کا ''ہَتھ'' ہو گا۔ ہم خٹک صاحب کے ساتھ کیے گئے اِس سلوک پر بھی احتجاج کا حق محفوظ رکھتے ہیں اور کہے دیتے ہیں کہ اگر ہمارے احتجاج اسی طرح سے اکٹھے ہوتے رہے تو پھر ''دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں''۔

ویسے تو ہمارے لال حویلی والے شیخ صاحب نے فیصل آباد کے جلسے میں رانا ثناء اللہ کو ایسا بھرپور جواب دیا کہ '' فیصل آبادیے'' خوش ہو گئے اور اُمید تو یہی ہے کہ اب رانا صاحب ہمارے ''سلِم، سمارٹ'' وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک کو ''تیلی پہلوان'' کہنا چھوڑ دیں گے لیکن اگر اُنھوں نے تیلی پہلوان کی رَٹ نہ چھوڑی تو ہم کپتان صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ شیخ رشید صاحب کو مستقل فیصل آباد میں شفٹ ہونے کا حکم دیں تاکہ وہ رانا ثناء اللہ کا ''ٹکو ٹھَپ'' سکیں۔ شیخ صاحب نے اپنے خطاب کے دَوران یہ فرمایا کہ عیدِ قُربان سے پہلے قُربانی ہو گی۔ پھر اُنھوں نے عمران خاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا سُن لیجئے خاں صاحب ! عیدِ قُربان سے پہلے قُربانی ہو گی''۔ اب پتہ نہیں شیخ صاحب'' کِس کی قُربانی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اگر شیخ صاحب کسی ایک جگہ ٹِک

کر بیٹھتے تو ہم بھی کچھ اندازہ لگاتے لیکن اُنہیں تو ایک پَل بھی چین نہیں۔ نواز لیگ چھوڑی تو سیدھے پرویز مشرف کے ''چرنوں'' میں جا بیٹھے۔ قاف لیگ کو داغِ مفارقت دے کر اپنی ''ننھی مُنی'' عوامی لیگ بنا لی۔ عوامی لیگ کے پرچم تلے دو انتخابات میں مُنہ کی کھائی تو ہمارے کپتان صاحب کے چرن چھونے میں ہی عافیت جانی۔ آج تک تو وہ سونامیوں کے لیے دیدہ و دِل فرشِ راہ کیے بیٹھے ہیں۔ کل کی اللہ جانے یا شیخ رشید جانیں۔

ہم نے اپنے کالم کے شروع میں یہ عرض کیا تھا کہ حالات اب اِس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ اب تخت گرائے جائیں گے۔ اب تاج اُچھالے جائیں گے''۔ وجہ یہ تھی کہ ایک تو'' سونامی اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ میدان میں ہے۔ دوسرے ہمارے مُرشد طاہر القادری بھی پاکستان آیا ہی چاہتے ہیں اور ایم کیو ایم بھی بڑی بڑی ریلیاں نکال رہی ہے۔ ہم نے تو ساری زندگی یہی لکھا، پڑھا اور سُنا کہ حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ فادر آف دی نیشن اور لیڈر آف دی نیشن ہیں لیکن اب پتہ چلا کہ ہمارا علم کتنا ناقص ہے۔ ہم ایم کیو ایم کے شکر گزار ہیں جس نے ہماری تصحیح فرما دی کہ اصل فادر آف دی نیشن اور لیڈر آف دی نیشن تو ہمارے ''الطاف بھائی'' ہیں۔ کراچی کی سڑکوں اور گلی محلوں میں یہی نعرے درج ہیں لیکن کتنی بد قسمتی کی بات ہے کہ ہم 1992ء سے اپنے فادر آف دی نیشن سے دور ہیں۔ وہ تو پاکستان آنے کو بے تاب ہیں لیکن جب کبھی

بھی اُنہوں نے واپسی کا ارادہ کیا، ہم نے اُنہیں سختی سے منع کر دیا کیونکہ پاکستان میں ایک تو اُن پر کئی مقدمات درج ہیں اور دوسرے اُن کی جان کو خطرہ ہے۔ ہم اپنے ایم کیو ایم کے بھائیوں سے کہیں گے کہ الطاف بھائی واپس آ ئیں نہ آ ئیں، وہ اپنے ''جناح پور'' کے منصوبے پر کام جاری رکھیں لیکن نام کی اِس تبدیلی کے ساتھ کہ اب جناح پور کو ''الطاف پور'' میں بدل دیں۔

جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

3 جون کو بیک وقت دو سانحے رونما ہوئے۔ایک تو باآخر لندن پولیس کے ''بدمعاشوں'' نے ہمارے الطاف بھائی کو ''دَھر'' لیااور ایم کیو ایم نے ''دَھرنا'' دے کر پورے کراچی کو مفلوج کر دیا اور دوسرے ہمارے پیارے ''اسحاق ڈالر'' صاحب نے پرانے بجٹ کو نئے کپڑے پہنا کر میاں نواز شریف صاحب سے ''شاباشی'' بھی بٹور لی اور اُن کے ساتھ ''ہَتھ'' بھی کر گئے۔اب سارے کاروباری دھڑا دھڑ قیمتیں بڑھانے میں مصروف ہیں اور گورنمنٹ ملازمین سڑکوں پر، جو 10 فیصد اضافے کو اونٹ کے مُنہ میں زیرے کے مترادف قرار دیتے ہیں ۔ہمیں یقین ہے کہ یہ ملازمین ہفتہ ، دَس دن ''پھینٹی'' کھا کر اُسی تنخواہ پہ گزارہ کرتے نظر آئیں گے ۔ایم اے تک اکنامکس ہم نے بھی پڑھی اور نچوڑ یہ نکالا کہ غالب اکثریت کی اکنامکس پیٹ سے شروع ہو کر پیٹ پر ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن ڈار صاحب کی اکنامکس میں تو پیٹ کا سِرے سے ذکر ہی نہیں ہوتا۔اب تو ہم بھی شیخ رشید کی طرح یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اسحاق ڈار صاحب کو اکنامکس کا تو ''کَکھ'' پتہ نہیں البتہ اُنھوں نے دُنیا کی طویل ترین بجٹ تقریر کرکے ''گینیز بُک آف ورلڈ ریکارڈ'' میں اپنا نام ضرور لکھوا لیا۔ جو بجٹ تقریر سُننے کے لیے پارلیمنٹ میں ''پھنس'' گئے ، اُنھوں نے سوتے جاگتے اور اونگھتے یہ تقریر سُنی اور بجٹ تقریر کے خاتمے پر

کانوں کو ہاتھ لگایا کہ اب کبھی ڈار صاحب کی بجٹ تقریر نہیں سُنیں گے۔ہم نے بھی بڑے شوق سے یہ تقریر سُننا شروع کی لیکن ڈار صاحب نے ابھی پَون گھنٹے کی تمہید ہی باندھی تھی کہ بجلی داغِ مفارقت دے گئی۔ایک گھنٹے کے کَربناک انتظار کے بعد جب بجلی لوٹی تو ڈار صاحب کو موجود پایا اور ہم آلتی پالتی مار کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے۔ڈار صاحب کی نامکمل تقریر کے دَوران ہی بجلی پھر چلی گئی اور جب دوسری بار لوٹی تو ڈار صاحب پھر موجود۔ہم اِس بجٹ تقریر سے مایوس تو ضرور ہوئے لیکن ''بور'' ہرگز نہیں کیونکہ سینکڑوں اقساط پر مشتمل ''سٹارپلَس'' کے ڈرامے دیکھ دیکھ کر ہمارا ''سٹیمنا'' بہت بڑھ چکا ہے اِس لیے ڈار صاحب کی اِس ''طویل دَورانیے'' کی تقریر نے ہمیں اُونگھ تک نہیں آئی۔لوگ کہتے ہیں کہ ہم نواز لیگ کے ''کاسہ لیس'' اور ''بھاڑے کے ٹٹو'' ہیں اور ہم نے لوگوں کہی ایسی باتوں کا کبھی بُرا بھی نہیں مانا لیکن نواز لیگ نے تو اِس بجت میں ہمارے ''کاسے'' میں کُچھ نہیں ڈالا۔اب بجٹ کی تعریف کریں بھی تو کیسے ؟۔لیکن کوشش کرنے میں ہرج نہیں ہوتا اِس لیے ہم نے بھی بہت ''مَتھا'' مارا لیکن ناکام رہے۔اب کی بار قارئین اِس ''کَڑوے کسیلے'' کالم پر ہی گزارہ کریں۔

کہا جارہا ہے کہ بجٹ متوازن اور عوام دوست ہے لیکن 14 کھرب خسارے کا بجٹ متوازن ہو سکتا ہے، نہ عوام دوست۔جب بجٹ خسارے کا ہے تو پھر خود انحصاری

کی منزل بھی دور ہے اور یہ خسارہ بھی ہمارے خون سے ہی کشید کیا جائے گا۔ شاید اسی لیے بجٹ تقریر کے فوراً بعد حمزہ شہباز نے بَرملا کہہ دیا کہ عوام کو "کڑوی گولی" نگلنی پڑے گی۔ یہ کڑوی گولی پچھلے بجٹ پر وزیرِ اطلاعات پرویز رشید کھلا رہے تھے، اِس بجٹ پر حمزہ شہباز صاحب اور ہو سکتا ہے کہ اگلے بجٹ پر خادمِ اعلیٰ بھی یہی کڑوی گولیاں لے کر عوام کے پیچھے بھاگتے نظر آئیں۔ کیا میاں نواز شریف صاحب قوم کو کڑوی گولیاں کھلانے پر اسحاق ڈار صاحب کو مبارک باد دے رہے ہیں؟۔ کیا وزیرِ اعظم ہاؤس اور ایوانِ صدر کا "خرچہ" بڑھانا ضروری تھا؟۔ کیا 25 کروڑ کی گاڑیاں منگوائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا؟۔ بینظیر انکم سپورٹ فنڈ کو 118 ارب تک بڑھا کر کیا حکومت قوم کو بھکاری بنانا چاہتی ہے؟ اور یہ وزارتوں کے سیکرٹ فنڈز کیا بَلا ہیں؟۔
حکومت نے گھی، تیل اور سیمنٹ تو مہنگا کر دیا لیکن 1800 CC سے زائد گاڑیوں پر ٹیکس اور ڈیوٹی کم کر دی۔ ڈار صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ گھی کو تو مہنگا ہونا ہی چاہیے کہ اس سے کولیسٹرول بڑھتا ہے جو دِل کے دورے کا سبب بنتا ہے اور غریب عوام پرویز مشرف تو ہیں نہیں کہ AFIC کے وی وی آئی پی رومز میں مہینوں استراحت فرماتے رہیں اِس لیے اُنہیں گھی، تیل کے بغیر ہی سبزیاں اُبال کے کھانے کی عادت ڈالنی چاہیے بشرطیکہ اُن کی جیب سبزیاں خریدنے کی اجازت دیتی ہو۔ ڈار صاحب کے خیال میں سیمنٹ کے مہنگے ہونے کا بھی غریبوں پر

کچھ اثر نہیں پڑتا کہ اُنھوں نے کونسا محل کھڑے کرنے ہوتے ہیں ۔ وہ تو اپنی ''کچی کٹیا سے بڑی گاڑیوں پر ٹیکس ، ڈیوٹی کم کرنے کا کم CC میں ہی مگن رہتے ہیں ۔ 1800''
اد کم اتنا فائدہ تو ضرور ہو گا کہ دُنیا کو یہ پتہ ضرور چل جائے گا کہ ہم کوئی ''بھوکے ننگے'' نہیں اور یہ جو ہم کشکولِ گدائی لیے دَر دَر پھرتے رہتے ہیں ، وہ تو ہماری عادت ہے ضرورت نہیں۔ رہی فون کالز پر ٹیکس ، ڈیوٹی کم کرنے کی بات تو ''ویہلے عاشقوں'' کو نوید ہو کہ اسحاق ڈار صاحب نے اُن کی بیقراری کو بھانپتے ہوئے کال ریٹس مزید کم کر دیئے ہیں ۔ اب وہ چاہے ساری رات کال کرتے رہیں اُن کی جیب پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

دروغ بَر گردنِ راوی، ہمارے حکمرانوں نے حکومتِ برطانیہ سے درخواست کی تھی کہ اگر الطاف بھائی کو گرفتار کرنا ناگزیر ہے تو 3 جون کو کیا جائے تاکہ حکومت سکون سے بجٹ پیش کر سکے کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ بجٹ پر سب سے زیادہ ''رولا'' ایم کیو ایم ہی ڈالتی ہے ۔ اُدھر بجٹ تقریر کی تیاریاں ہو رہی تھیں ، اِدھر الطاف بھائی کو لندن میں حراست میں لے لیا گیا جس پر ایم کیو ایم اپنے ''سیاپے'' میں پڑ گئی ۔ نیوز چینلز بھی اسی ''بریکنگ نیوز'' کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے اور کسی کو بجٹ کا دھیان ہی نہ رہا۔ اب بھی نیوز چینلز پر الطاف بھائی ہی چھائے ہوئے ہیں اور بجٹ کا دور دور تک نام و نشان نہیں ۔ الطاف بھائی شدید علالت کے باعث لندن کے ولنگٹن ہسپتال میں داخل ہیں ۔ اللہ سے دعا

ہے کہ وہ جلد صحت یاب ہو کر ''بڑھکیں'' لگاتے گھر لوٹیں کیونکہ '' اُن کی بڑھکوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے''۔ ہم ڈرتے ڈرتے ایم کیو ایم سے یہ سوال کرتے ہیں کہ الطاف بھائی کو تو لندن کے ''بدمعاشوں'' نے گرفتار کیا ہے، اِس میں بیچارے پاکستان، خصوصاً سندھ، کا کیا قصور ؟۔ یہ تو وہی ہوا '' ڈِگا کھوتے توں، کَن مروڑے کمہاری دے'' (گِرا گدھے سے، کان مروڑے کمہارن کے) ۔منیر نیازی نے کہا تھا

جُرم آدم نے کیا اور نسلِ آدم کو سزا
کاٹتا ہوں زندگی بھر میں نے جو بویا نہیں

ایسا ہی کچھ ایم کیو ایم بھی پاکستانیوں کے ساتھ کر رہی ہے۔اُس نے مارکیٹیں کھولنے کی ڈھیلی ڈھالی اپیل تو کر دی لیکن ہمارے الطاف بھائی کا ''ٹھکا'' ہی اتنا ہے کہ مارکیٹیں کھُل سکیں، نہ ٹرانسپورٹ بحال ہوئی۔ بہرحال ایم کیو ایم نے بھی اِس شدید ترین ٹینشن کے باوجود اپنا حوصلہ برقرار رکھتے ہوئے جس طرح اپنے کارکنان کو کنٹرول کیا وہ لائقِ تحسین ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ الطاف بھائی کی گرفتاری کا سب سے زیادہ فائدہ حکمرانوں کو ہوا کہ اب کی بار بجٹ پر کوئی '' رَولا'' پڑا، نہ ہَلّا گُلّا ہوا اور سب سے زیادہ نقصان ہمارے مُرشد ڈاکٹر طاہر القادری کو کہ اُن کا انقلاب اسی

رَولے گَولے'' میں گُم ہوگیا۔لندن سے تو یہ خبریں آرہی تھیں کہ ہمارے مُرشد'' چوہدری.برادران'' کے کندھوں پر سوار ہو کر اسی ماہ پاکستان تشریف لا رہے ہیں'' کیونکہ اُنہیں خواب میں ''بشارت'' ہوئی ہے کہ ''ہُری'' اُن کے انتظار میں اشکبار ہے لیکن الطاف بھائی نے گرفتار ہو کر اُن کی ساری بشارتوں کا ''سَوا ستیاناس'' مار دیا۔پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ مُرشد جلد آئیں گے اور چھا جائیں گے البتہ چوہدری.برادران کو ذرا محتاط رہنا پڑے گا کیونکہ مُرشد جس کے کندھوں پر سواری کرتے ہیں، اُسی کی جڑوں میں بیٹھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ایک بار میاں نواز شریف صاحب بھی ہمارے مُرشد کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر غارِ حرا تک لے کر گئے تھے۔اُس کے بعد میاں صاحب کے ساتھ کیا ہوا، وہ سب تاریخ ہے۔

اُمت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

پروفیسر مظہر۔۔۔۔ سرگوشیاں

حکمت کی کتاب میں درج کر دیا گیا ''تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو لوگوں پر طعن اور برائیاں کرنے کا خوگر ہے''۔ ہم نے مگر ہوسِ جاہ میں سب کچھ بھلا دیا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی نسلوں کی جدوجہد سرمایۂ افتخار اور لازوال لیکن پھر زوال ہی زوال۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے لیے دمِ واپسیں خراب ایمبولینس، پہلے وزیرِ اعظم کا قتل، پھر اقتدار کی ایسی بندر بانٹ کہ جواہر لال نہرو کو کہنا پڑا ''میں اتنے پاجامے نہیں بدلتا جتنے پاکستان میں وزیرِ اعظم بدلتے ہیں''۔ پھر ایوب، یحیٰی، ضیاء اور پرویز مشرف کے طویل مارشل لاء اور انہی مارشل لاؤں کے دوران پاکستان دو ٹکڑے ہوا، ایک وزیرِ اعظم کو پھانسی، ایک کی جلاوطنی اور ایک کی شہادت لیکن پھر بھی تاریخ سے کچھ سیکھنا نہ سیکھنے کی تمنا۔ حکمت و دانائی کسی ایک قوم کا ورثہ ہوا کرتی ہے نہ کسی خاص خطے تک محدود۔ یہ تو پورے عالمِ انسانیت کا ورثہ ہے جس سے بلا امتیازِ مذہب وملت ہر کوئی استفادہ کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں افکار و تخیلات کے چراغ روشن کرنے والے ایسے لوگ موجود رہے جن کے افکار میں گہرائی اور گیرائی، الفاظ میں ندرت، معنی میں وسعت اور زبان میں

فصاحت و بلاغت دلوں کو جھنجھوڑتی رہی لیکن خرابئ قسمت یہ کہ ہم شدید ترین قحط الرجال کا شکار اور ہمارے علمائے دین جنہیں اصلاح معاشرہ کا فریضہ تفویض کیا گیا، خود مُنہ سے آگ اُگلتے ہوئے یہ بھی بھول بیٹھے کہ ''ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اُس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دُکھ ہو'' (ال بقرہ)۔

اپنے آپ کو مجتہد العصر اور ولی کامل کہلوانے کے شوقین مولانا طاہر القادری نے وزیرِ اعظم پاکستان میاں نواز شریف کے بارے میں جو زبان استعمال کی وہ مولانا صاحب کے پیروکاروں کی چشم کشائی کے لیے کافی ہے۔اُنھوں نے ایک نیوز چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا'' یہ بدمعاش، بے شرم، بے حیا اور ملک دشمن حکومت ہے جسے فوراً کِک آؤٹ'' کر دینا چاہیے۔۔۔یہ دھاندلی کا نام نہاد وزیرِ اعظم، لوٹ مار کا وزیرِ'' اعظم اور پاک فوج کو بے عزت کرنے والا وزیرِ اعظم ہے''۔سوال یہ ہے کہ کیا کسی بھی عالمِ دین کو ایسے الفاظ زیب دیتے ہیں ؟۔ہمارا دین تو مشرکین کے بتوں کو بھی برا کہنے سے منع کرتا ہے جبکہ ایک عالمِ دین جس کا ماضی گواہ ہے کہ اُس نے وزارتِ عظمیٰ کے چکر میں ایک آمر کے دَر پر زانوئے تلمذ تہ کیا، آج ایک منتخب وزیرِ اعظم کے لیے ایسی زبان استعمال کر رہا ہے۔آقا ﷺ کا فرمان ہے ''علم دو طرح کا ہوتا ہے، ایک علم تو وہ جو زبان سے گزر کر دل میں جگہ پاتا ہے، یہی علم

قیامت میں کام آئے گا اور ایک علم وہ ہے جو صرف زبان تک رہتا ہے، دل تک نہیں پہنچتا۔ یہ علم اللہ کی عدالت میں اُس آدمی کے خلاف حجت اور دلیل بنے گا"۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سینکڑوں کتابیں لکھنے کا دعویٰ کرنے والے مولانا طاہر القادری علم تو ضرور رکھتے ہونگے لیکن یہ علم اُن کا کچھ بگاڑ نہیں پایا۔ مولانا صاحب شوق سے پاکستان آئیں لیکن افلاطون کا یہ قول ضرور یاد رکھیں کہ "سخت کلام آگ کا وہ شعلہ ہے جو ہمیشہ داغ چھوڑ جاتا ہے"۔ اُن کا کروڑوں روپے کی لاگت سے تیار کردہ پُر تعیش کنٹینر بھی بدستور موجود ہے، بھولے بھالے مریدین بھی اور اُن کے سکولوں کے مجبور و مقہور اساتذہ و طلباء بھی۔ وہ یقیناً ایسی "نوٹنکی" دوبارہ بھی دکھا سکتے ہیں جیسی وہ دسمبر 2012ء میں دکھا چکے۔ اُنہیں بیرونی خفیہ ہاتھوں کی مدد بھی حاصل ہے اور افرا تفری پھیلانے کے لیے بیرونی امداد بھی بہت لیکن یہ ضرور یاد رہے کہ ناکامی و نامرادی اُن کا مقدر بنی اور بنتی رہے گی۔

خرابئ حالات سے ہر کوئی آگاہ سوائے "کُرسی" کے پجاریوں کے۔ ہر نیا دن کسی نہ کسی اندوہناک واقعے کو جنم دیتا ہے۔ رات ساڑھے گیارہ بجے کراچی ایئر پورٹ پر 10 دہشت گردوں نے حملہ کر دیا جنھیں پاک فوج کے جوانوں نے واصلِ جہنم کیا لیکن قیمتی تنصیبات کی حفاظت کرتے ہوئے اے ایس ایف، رینجرز اور پولیس کے 16 جوان بھی شہید ہو گئے۔ اُدھر تفتان میں دو ہوٹلوں پر فائرنگ

اور دستی بموں کے حملے سے 25 زائرین جاں بحق اور جیش الاسلام کے چار حملہ آور واصلِ جہنم ہوئے۔ یہ کوئی ایک دن کا قصہ نہیں یہ خونیں کھیل تو ہر روز کھیلا جاتا ہے۔اِدھر یہ عالم کہ

خدشوں نے جہاں دی نہ میری آنکھ بھی لگنے
اُس شہر کا اِک شخص بھی بیدار نہ دیکھا

اور اُدھر "کُرسی" کی تگ و دَو، دعویٰ مگر پھر بھی حب الوطنی کا۔ وہ جو کبھی آمر پرویز مشرف کا طواف کیا کرتے تھے، آج ایک دفعہ پھر اکٹھے ہونے کی تگ و دَو میں۔ چوہدری برادران اور مولانا طاہر القادری کی لندن میں ملاقات ہو چکی، ایم کیو ایم بھی یقیناً ساتھ دیتی اگر اُس کے قائد جنابِ الطاف حسین "گرفتارِ بلا" نہ ہوتے، جنابِ عمران خاں فی الحال دور دور۔ خدشہ یہ کہ کہیں "پکی پکائی" مولانا صاحب نہ لے اُڑیں ۔"نیوز چینلی" سیاستدان شیخ رشید احمد کی شدید خواہش کہ ساری اپوزیشن جماعتیں مل کر نواز لیگ کے خلاف محاذ کھولیں لیکن بُری طرح ناکام پھر بھی وہ اُمیدِ بہار رکھے ہوئے۔ یہ سب کچھ نواز لیگ حکومت کو ناکام کرنے کے لیے کیونکہ نواز لیگ ملکی ترقی کے نِت نئے منصوبوں کا آغاز کر رہی ہے جو عمران خاں کو قبول نہ طاہر القادری کو کیونکہ اِن منصوبوں کی کامیابی سے دونوں کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں ۔خاں صاحب کے ثناء خواں سینئر لکھاری کو بھی یہ سب منصوبے نمائشی

لگتے ہیں۔وہ کہتے ہیں ''نواز لیگ نمائشی اور چمکتے دمکتے منصوبوں پر روپیہ لٹانے میں مصروف ہے۔عوام سے بے نیازی، مَن مانی اور میڈیا کے ہارے ہوئے جواری کی پشت پناہی کے طفیل شریف حکومت کے دن گنے جا چکے۔ملک کو وسط مدتی انتخاب کی طرف لے جانا چاہیے''۔سینئر لکھاری نے اپنے ''کالمی درویشوں'' کے زور پر ایک عرصے تک تو لوگوں کو بیوقوف بنائے رکھا لیکن اب لوگ اُن کی باتوں پر کَم کَم ہی یقین کرتے ہیں کہ اُنہیں پتہ چل چکا کہ لکھاری کے محبوب ''قائدِ اعظم ثانی'' اگر وزارتِ عظمیٰ کی تگ و دَو میں ہیں تو وہ خود پنجاب کی گورنری کے لیے بے تاب۔وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ فی الحال نواز لیگ کا کوئی متبادل نہیں لیکن فطری بغض سے دامن بھی بچا نہیں پاتے۔کہتے ہیں ''متبادل کیا ہے؟ تحریکِ انصاف؟ اُسے تشکیلِ نَو کی ضرورت ہے۔عہدیدار بدل ڈالنے کی کہ بعض تو باقاعدہ جرائم پیشہ ہیں۔دہشت گردی پر عمران خاں کا مؤقف بچگانہ ہے۔اقتدار مل بھی جائے تو بے سود اور نتیجہ ناکامی''۔یہی بات تو میاں نواز شریف صاحب نے کہی تھی کہ جن سے ایک صوبہ نہیں سنبھالا جا رہا، وہ پورے ملک کو کیا سنبھالیں گے۔ویسے بھی جتنے منصوبے نواز لیگ شروع کر چکی ہے اُن کا اگر ایک تہائی بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا تو وسط مدتی کیا اگلے پندرہ سالوں تک بھی نواز لیگ کی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں۔

سینئر لکھاری نے یہ بھی فرمایا'' وزیرِ اعظم لندن گئے اور سرمایا کاروں کو ترغیب دینے کی کوشش کی ۔ایک نے کہا'' آپ کی اپنی دولت تو لندن میں پڑی ہے ''۔تب فرمایا حکمرانی کے لیے پاکستان موزوں ہے مگر قیام کے لیے ہرگز نہیں''۔ قُرآن وحدیث'' کے بغیر لقمہ نہ توڑنے والے سینئر لکھاری شاید نہیں جانتے کہ دینِ مبیں میں تہمت لگانے والے کے لیے سخت ترین عذاب ہے۔ لیکن وہ ایسی باتیں کرجاتے ہیں جن کا سَر ہوتا ہے نہ پیر۔اُن کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ''باخبر ذرائع''کا حوالہ دیتے ہیں اور اکثر یہ بھی کہتے ہیں ''نام نہیں بتاؤں گا لیکن اگر کسی نے زیادہ تنگ کیا تو بتا بھی دوںگا''۔ لیکن آج تک ایسا نہیں ہوا کہ اُنھوں نے ''باخبر ذرائع'' کا نام بتایا ہو۔وجہ شاید یہ ہے کہ مَن گھڑت باتوں کے راوی وہ خود ہی ہوتے ہیں۔

تمہیں وطن کی فضائیں سلام کہتی ہیں

اتوار کی رات لگ بھگ ساڑھے 11 بجے اچانک نیوز چینلز پر "بریکنگ نیوز" شروع ہو گئیں کہ کراچی ایئر پورٹ کے جناح ٹرمینل پر دہشت گردوں نے حملہ کر دیا ۔ تھوڑی دیر بعد ہی نیوز چینلز پر آگ اور دھوئیں کے بادل اُٹھتے دکھائی دینے لگے ۔میڈیا کے رپورٹرز کو اصل صورتِ حال کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کیونکہ کسی کو ایئر پورٹ کے اندر جانے کی اجازت تھی نہ باہر آنے کی البتہ یہ خبریں اا رہی تھیں کہ اے ایس ایف کے اہلکار انتہائی جرات اور بہادری سے دہشت گردوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور اُنہیں ایک مخصوص جگہ سے آگے نہیں جانے دیا جا رہا۔ اگر دہشت گرد جناح ٹرمینل میں داخل ہو جاتے تو نا قابلِ تصور تباہی ہوتی ۔لگ بھگ رات 12 بجے فوج ، رینجرز ، اے ایس ایف اور پولیس کے مکمل کوارڈینیشن سے آپریشن شروع ہوا جو صبح ساڑھے چار بجے تک جاری رہا۔اِس آپریشن میں تمام 10 دہشت گرد جہنم کا ایندھن بنے اور ہمارے 29 افراد نے جامِ شہادت نوش کیا جن میں اے ایس ایف کے 11 ، پی آئی اے کے 6 ، پولیس اور رینجرز کا ایک ایک فرد شامل ہے ۔باقی تمام افراد بھی ایئر پورٹ پر ہی اپنے فرائض سر انجام دے رہے تھے ۔اِس آپریشن میں اے ایس ایف کے جوانوں نے اپنی جرات ، ہمت اور بہادری کی لازوال داستان رقم کرتے ہوئے

جدید

ترین اسلحے سے لیس دہشت گردوں کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔20 منٹ کے قلیل ترین وقت میں پاک فوج، رینجرز اور پولیس کے دستے ایئر پورٹ پہنچ گئے اور ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں تمام دہشت گردوں کا صفایا کر دیا البتہ آپریشن کلین اَپ صبح ساڑھے چار بجے تک جاری رہا۔ آفرین ہے اُن جوانوں پر جنھوں نے قومی اثاثوں کی حفاظت کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا اور سلام اُن ماؤں کو جنھوں نے وطن کی آن پر قُربان ہونے والے ایسے جَری سپوتوں کو جنم دیا۔

کراچی ایئر پورٹ پر حملہ کرنے والے دہشت گرد انتہائی تربیت یافتہ اور جدید ترین اسلحہ ٹرپلِ ٹو، جنگ میں استعمال ہونے والے روشنی، AK 47 سے لیس تھے۔اُن کے پاس کے شَیل، دستی بم، پٹرول بم، ڈیٹونیٹر، 9 آواگون گولے، ایس ایم جیز، خود کش جیکٹس اور راکٹ لانچرز کے علاوہ خون کو فوری طور پر روکنے والے فیکٹر 8 انجکشن اور بلڈ بیگ بھی موجود تھے۔ دہشت گردوں کے پاس چنے، کھجوروں اور خشک روٹیوں کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کراچی ایئر پورٹ کے جناح ٹرمینل پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کرکے آئے تھے۔ سوال مگر یہ ہے کہ جب 5 جون کو ہی وفاقی وزارتِ داخلہ نے ایسے دہشت گرد حملوں کی حکومتِ سندھ کو اطلاع دے دی تھی تو پھر بَر وقت ایسے انتظامات کیوں نہ کیے گئے جن کی بدولت ''سانحہ ایئرپورٹ'' سے بچا جا سکتا ؟۔ سوال یہ بھی ہے کہ اتنے بھاری بھر کم اسلحے کے ساتھ دہشت گرد ایئر پورٹ میں داخل ہونے میں کیسے کامیاب ہو

گئے؟۔ظاہر ہے کہ یہ دہشت گرد کراچی ہی کے کسی علاقے سے اُٹھ کر آئے ہونگے۔کیا خون میں لتھڑے کراچی کی سکیورٹی اتنی ہی ناقص ہے کہ 10 افراد اسلحے سے بھرے بھاری بھرکم بیگ کندھوں پر لٹکائے ایئرپورٹ کی جانب محوِ سفر ہوتے ہیں اور اُنہیں کسی بھی چیک پوسٹ پر روکا تک نہیں جاتا؟۔اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ دہشت گرد ایئر پورٹ کے عقب میں واقع کچی آبادی سے نکل کر آئے ہونگے۔اگر ایسا ہی ہے تو کیا کبھی کسی سکیورٹی ایجنسی کا دھیان حساس ترین علاقے کی اِن کچی آبادیوں کی طرف بھی گیا؟۔ڈی جی رینجر سندھ میجر جنرل رضوان اختر کہتے ہیں کہ کراچی میں دہشت گردوں کو روکنے کا کوئی مؤثر انتظام نہیں جبکہ وزیرِ اعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ کے پاس گھڑا گھڑایا جواب یہ تھا کہ وزارتِ داخلہ کی طرف سے حملے کی اطلاع تو تھی لیکن ایئرپورٹ کی سکیورٹی مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے۔اگر اے ایس ایف کے جوان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دہشت گردوں کے آگے سیسہ پلائی دیوار نہ بن جاتے تو آج ساری دنیا کی انگلیاں ہماری طرف اُٹھ رہی ہوتیں۔کیا اُس وقت بھی شاہ صاحب دنیا کو یہی پیغام دیتے کہ وہ اِس تمام معاملے سے لاتعلق ہیں کیونکہ سکیورٹی کی ذمہ داری وفاقی حکومت کے پاس ہے؟۔محترم عمران خاں اِن ناقص سکیورٹی انتظامات پر طعنہ زن ہیں اور سینئر لکھاری ہارون رشید کہتے ہیں ’’اگر حکومت میں شرم ہوتی تو وہ مستعفی ہو جاتی‘‘۔بجا ارشاد، لیکن ہمارے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں، اگر ہوتا تو سب سے پہلے خیبر پختونخوا کی حکومت مستعفی ہوتی جس کی

آنکھوں کے سامنے طالبان بنوں جیل توڑ کر اپنے 300 ساتھیوں کو لے اُڑے ۔جی ایچ کیو، پریڈ لین مسجد، کامرہ ایئر بیس اور پی این ایس مہران جیسے سانحات پر کس نے استعفیٰ دیا تھا، جو آج کوئی دیتا؟۔

وزیرِ داخلہ چوہدری نثار کہتے ہیں کہ کچھ ایسے شواہد ملے ہیں جن سے حملے کے اشارے ایک ملک کی طرف جا رہے ہیں جبکہ وفاقی وزیرِ اطلاعات پرویز رشید کہتے ہیں " حملہ آور مرنے نہیں قبضہ کرنے آئے تھے اوراِس واقعے میں غیر ملکی ہاتھ نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔واقعے میں وہ قوتیں ملوث ہو سکتی ہیں جو پاکستان کو تنہا کرنا چاہتی ہیں"۔نام لیتے ہوئے شاید چوہدری نثار اورپرویز رشید صاحب کے ہونٹوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ دہشت گردوں سے جدید ترین بھارتی اسلحہ برآمد ہوا جس کی تصدیق ڈی جی رینجرز سندھ میجر جنرل رضوان اختر صاحب نے بھی محتاط انداز میں کی۔

ہمارے وزیرِ داخلہ وِ اطلاعات یہ تو جانتے ہی ہونگے کہ طالبان کے ترجمان شاہد اللہ شاہداس حملے کی ذمہ داری قبول کر چکے ہیں۔شاہد اللہ شاہد نے کہا ہے" طالبان نے حکیم اللہ محسود کی موت کا بدلہ لیاہے اور یہ ابھی ابتداء ہے، مزید حملے کریں گے ۔کراچی ایئر پورٹ پر حملہ پاکستانی حکومت کے لیے پیغام ہے کہ طالبان ابھی زندہ ہیں" اِس سے پہلے فتح جنگ میں پاک فوج کے دو کرنل شہید کیے گئے اور اُن کی شہادت کی ذمہ داری بھی طالبان نے قبول کی ۔ سوال

مگر یہ ہے کہ اگر ہمارے وفاقی وزراء کے بقول ایئر پورٹ حملے میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہو سکتا ہے اور دہشت گردوں سے برآمد ہونے والا اسلحہ بھی بھارتی ہی ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ طالبان ایسے غیر ملکی ایجنٹ ہیں جن کا نصب العین ہی پاکستان کی تباہی ہے۔اِس صورت میں طالبان کے ساتھ مذاکرات اور نرمی کا برتاؤ چہ معنی دارد؟۔ شاہد اللہ شاہد کے اقرار کے بعد محترم عمران خاں نے اِس حملے کی شدید مذمت کی ہے اور امیرِ جماعتِ اسلامی محترم سراج الحق صاحب نے بھی۔ شاہ محمود قُریشی کہتے ہیں ”معصوم شہریوں کی جانوں سے کھیلنے والوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔طالبان نے کراچی حملے کی ذمہ داری قبول کرکے امن تباہ کر دیا۔پاکستان کے امن کو تباہ کرنے والوں کے خلاف آپریشن کی حمایت کریں گے“۔ سبھی جانتے ہیں کہ تحریکِ انصاف اور جماعتِ اسلامی مذاکرات کی جذباتی حامی ہیں۔ اب جبکہ تحریکِ انصاف اور جماعتِ اسلامی کو بھی ادراک ہو گیا ہے اور جب چیف آف آرمی سٹاف جناب جنرل راحیل شریف ایک سے زائد مرتبہ یہ کہہ چکے ہیں کہ پاک فوج دہشت گردوں سے نپٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے تو پھر حکومت کس انتظار میں ہے؟۔یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی اگر کوئی مذاکرات کی حمایت کرتا ہے تواُس سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ مذاکرات کس سے کیے جائیں؟۔کیااِن وطن دشمنوں سے جو چھپ کر وار کرتے ہیں اور دیدہ دلیری سے ذمہ داری قبول کرتے ہیں؟۔کیا اُن سے، جن کے دامن پچاس ہزار سے زائدپاکستانی عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے خون سے

آلودہ ہیں ؟۔ کیا اُن سے جو آڑ تو شریعتِ محمدی ﷺ کی لیتے ہیں لیکن کردار میں ابلیسیت کے علمبردار ہیں ؟۔ کیا اُن سے جو بیرونی قوتوں کے آلہ کار بن کر اپنی ہی دھرتی کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں؟۔ کیا اُن سے جن کے وجود کی بدولت پاکستان کی فضائیں ہمہ وقت خوف و دہشت سے لبریز رہتی ہیں ؟۔

پھر آگیا ہوں گردشِ دَوراں کو ٹال کے

شیخ الاسلام ، مجتہد العصر پروفیسر ڈاکٹر علّامہ طاہر القادری ایک دفعہ پھر یہ کہتے ہوۓ کینیڈا سے تشریف لا رہے ہیں کہ

ساقی میرے خلوص کی شدت کو دیکھنا
پھر آگیا ہوں گردشِ دَوراں کو ٹال کے

پچھلی بار جب وہ پاکستان تشریف لائے تو مقصد تب بھی انقلاب تھا لیکن اُن کے ساتھ ''ہتھ'' ہو گیا۔ایم کیو ایم عین وقت پر ساتھ چھوڑ گئی ، تحریکِ انصاف نے سرے سے ''لفٹ''ہی نہ کروائی اور اعلیٰ عدلیہ نے بھی وقت آنے پر ''جھنڈی'' کرا دی لیکن سب سے بڑا دھوکا تو پیپلز پارٹی نے دیا۔ عین اُس وقت جب اسلام آباد میں تخت گرانے اور تاج اچھالنے کا سمے قریب آن لگا تو پیپلز پارٹی کے اکابرین ''کنٹینر'' میں آ دھمکے ۔مفاہمت کی یاداشت پر دستخط ہوئے ، کچھ زبانی وعدے وعید بھی ہوئے اور مُرشد نے دھرنا ختم کر دیا۔ پھر پیپلز پارٹی حسبِ عادت صاف مُکر گئی اور مُرشد کو کینیڈا لوٹنا پڑا۔ لیکن اب کی بار وہ بھرپور تیاریوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔اِس دفعہ انقلابی فوج کا میمنہ چوہدری برادران سنبھالیں گے اور میسرہ شیخ رشید۔ فوج کے وسطی حصّے کی کمان کمانڈو

پرویز مشرف کے پاس ہو گی کیونکہ سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کے مطابق پندرہ دِن بعد وہ ہر لحاظ سے آزاد و خود مختار ہونگے۔ویسے سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے پر بھی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اور کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ پرویز مشرف کے ساتھ ''ہتھ'' ہو گیا ہے کیونکہ چودہ دِنوں بعد حکومت سپریم کورٹ میں اپیل کر دے گی اور پرویز مشرف طبلے کی تھاپ پر یہ گاتے رہ جائیں گے ''میں کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کِس کے لیے''۔سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے پر سب سے خوبصورت تبصرہ ڈاکٹر خالد رانجھا نے یہ کیا کہ ''یہ فیصلہ He ہے نہ She ۔

مُرشد کی ریزرو فوج کی کمان ایم کیو ایم کے سپرد ہو گی اور عدلیہ کے ''زباں بندی'' کے فیصلے کے بعد مبشر لقمان نے بھی ''اینکری'' چھوڑ کر شیخ الاسلام کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا ہے۔یقیناً ''لمبی لمبی چھوڑنے'' کا شعبہ مبشر لقمان ہی کے سپرد ہوگا البتہ تحریکِ انصاف اب بھی دور دور ہی ہے۔وجہ شاید یہ کہ عمران خاں اپنی ''سونامی'' کے ذریعے انقلاب بپا کرنا چاہتے ہیں جو تباہی و بربادی کی علامت ہے جبکہ مُرشد کوئی پتّا تک ہلائے بغیر ''محبتوں بھرے'' انقلاب کے داعی ہیں۔ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کہیں ''دو ملّاؤں میں مُرغی حرام'' نہ ہو جائے کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ کپتان صاحب اور مولانا صاحب ، دونوں ہی اپنے آپ کو وزارتِ عظمیٰ کے لیے فِٹ بلکہ

سُپر فِٹ'' سمجھتے ہیں۔ویسے اگر تحریکِ انصاف بھی اِس عظیم الشان انقلابی تحریک میں'' شامل ہو جاتی تو کہا جا سکتا تھا کہ پرویز مشرف کے سارے سابقہ ساتھیوں کا ''اَکٹھ'' ہو گیا ہے۔اگر ایسا ہو جاتا تو پھر کتنا مزہ آتا جب ہم اپنے ''مسلمہ رہنماؤں'' عمران خاں، مولانا طاہر القادری، چوہدری برادران، پرویز مشرف اور شیخ رشید کی قیادت میں محوِ سفرِ انقلاب ہوتے۔مبشر لقمان ہاتھ میں ''بھونپو'' پکڑے نعرے لگواتے اور ہم گلے پھاڑ پھاڑ کر ''آوے ای آوے اور جاوے ای جاوے'' جیسے نعرے لگاتے۔اب ہمیں 20 جون کو شیخ صاحب کے ''تاریخی'' ٹرین مارچ، 22 جون کو بہاولپور میں عمران خاں کی سونامی اور 23 جون کو مولانا طاہر القادری کے انقلابی مارچ میں ''وَکھو وَکھ'' شریک ہونا پڑے گا۔ابھی تک تو ہمارا پختہ ارادہ ایسا ہی کرنے کا ہے لیکن کبھی کبھی اندر بیٹھا شیطان ہمیں ورغلاتا رہتا ہے کہ 29 جون سے رمضان شریف شروع ہو رہا ہے، اگر ہم شوقِ انقلاب میں نکل پڑے تو مارے تھکن کے ہمارا ''کَکھ'' نہیں رہے گا اور ہم رمضان شریف کی برکتیں سمیٹنے سے محروم رہ جائیں گے۔اِس لیے یہ تجویز بھی زیرِ غور ہے کہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر ہی ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے لگاتے رہیں اور'' ایک پنتھ، دو کاج'' کے مصداق رمضان شریف کے لیے اپنی توانائیاں بھی بچالیں اور انقلابی مارچ میں شرکت کا فرضِ منصبی بھی ادا کرلیں۔جن خواتین و حضرات کو ہماری اِس تجویز سے اتفاق ہو، وہ شوق سے ہماری پیروی کر سکتے ہیں، ہمیں کوئی اعتراض ہو گا ''نہ ہمارے ''رہنماؤں

کو۔

شیخ الاسلام نے فرمایا ’’میں 23 جون کو 20 کروڑ عوام کی خاطر آ رہا ہوں۔ فوج اسلام آباد کی سکیورٹی سنبھالے کیونکہ حکومت کے طالبان سے رابطے ہیں اور وہ دہشت گردی کرواسکتی ہے۔ اگر مجھے نقصان پہنچا تو میاں نواز شریف، میاں شہباز شریف، خواجہ آصف، خواجہ سعد رفیق، پرویز رشید، عابد شیر علی اور رانا ثنا اللہ ذمہ دار ہونگے‘‘۔ دروغ بَر گردنِ راوی چوہدری نثار احمد اِس طویل فہرست میں اپنا نام نہ پا کر غصّے سے کھول رہے ہیں اور یہ کہتے پائے گئے ہیں کہ کیا مولانا صاحب کے نزدیک وہ خواجگان‘‘ سے کم طاقتور ہیں جو اُن کا نام اِس فہرست میں شامل نہیں؟۔ بہرحال یہ ’’ معاملہ نواز لیگ جانے یا مولانا طاہر القادری، ہمیں اِس میں سَر کھپانے کی ضرورت نہیں البتہ ہم یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ طالبان تو ملک کے چپّے چپّے میں موجود ہیں اِس لیے شیخ الاسلام کی سکیورٹی کے لیے پورا ملک ہی فوج کے سپرد کر دیا جائے اور جب فوج کو ایک دفعہ تکلیف دے ہی دی گئی تو پھر اِس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ دَس بارہ سال کے لیے ملکی انتظام و انصرام فوج کے سپرد کر دیا جائے، ہم اپنے ’’ انقلاب ‘‘کا شوق دَس بارہ سال بعد پورا کر لیں گے۔ حکومت تو کسی کی حفاظت سے پہلے ہی قاصر ہے اور، کسی بھی سانحے پر الزام تراشیوں کے ذریعے دامن چھڑانے کی کوشش کرتی ہے ۔ سانحہ کراچی ایئر پورٹ میں سات مزدوروں کے

قتلِ عمد کا مقدمہ پتہ نہیں تارِیخ کِس کے خلاف درج کرے گی۔ یہ وہی مزدور تھے جو جان بچانے کی خاطر ایک کمرے میں گھسے اور دہکتی ''نارِ نمرود'' میں زندہ رہنے کی جد و جہد کرتے ہوئے گھنٹوں زندہ بھی رہے۔ فیضان نامی ایک شخص تو دوپہر دو بجے تک مدد کی اپیلیں کرتا رہا لیکن دہشت گردوں کا صفایا کرنے کا جشن مناتے حکمرانوں کو خبر تک نہ ہوئی کہ کوئی مجبور زندہ جل رہا ہے۔ لیکن شیخ الاسلام مزدور ہیں نہ مجبور۔ اُن کی خاطر تو ایسے بیس کروڑ مزدور بھی قُربان۔ مُرشد جب پچھلی بار انقلاب لانے کے لیے آئے تھے تو مجمع 30 لاکھ کا تھا، اب کی بار 30 کروڑ کا ہوتا اگر ہماری آبادی 20 کروڑ نہ ہوتی۔ اتنے بڑے مجمعے کو کنٹرول کرنا حکومت کے بَس کا روگ نہیں اِس لیے ملک کو فوج کے حوالے کر دینا ہی بہتر ہے۔

اُدھر شیخ رشید احمد 20 جون کو تاریخی ٹرین مارچ کر رہے ہیں جبکہ خواجہ سعد رفیق ایویں خوامخواہ'' ٹانگ اڑائے بیٹھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 65 افراد کے لیے 500'' مسافروں کو وقفِ مصیبت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر شیخ صاحب کو ٹرین مارچ کا اتنا ہی شوق ہے تو پوری سپیشل ٹرین بُک کروائیں۔ شیخ رشید کہتے ہیں کہ اگر اُن کے پاس کروڑوں روپے ہوتے تو وہ عمران خاں کے جلسوں میں تقریریں کرنے کی بجائے خود ہی بڑے بڑے جلسوں کا انتظام کر لیتے۔ گویا شیخ صاحب نے بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑ دیا کہ عمران خاں صاحب پیسے کے زور پر اتنے بڑے بڑے

جلسے کرتے ہیں۔شاید اسی لیے جاوید ہاشمی نے کہا تھا کہ شیخ رشید صاحب ہمیں پھنسا کر خود کھسک جاتے ہیں۔ شیخ رشید نے یہ کہا ہے ''ہم خود کُش سیاستدان ہیں اور اپنا تابوت کندھے پر لیے پھرتے ہیں''۔ شیخ صاحب تو بقول جاوید ہاشمی موقع پا کر کِھسک لیں گے اور تابوت پتہ نہیں کس کے حصے میں آئے گا اور کس کی سیاسی موت ہو گی۔ شیخ صاحب کے '' عظیم الشان'' ٹرین مارچ کا استقبال سابقہ پرائم منسٹر چوہدری شجاعت اور سابقہ ڈپٹی پرائم منسٹر چوہدری پرویز الٰہی گجرات میں کر رہے ہیں۔چوہدری پرویز الٰہی نے انکشاف کیا ہے کہ اِس ٹرین مارچ میں اُن کے لوگ بھی شامل ہیں۔اب پتہ نہیں اِن ٹرین مارچیوں'' میں قاف لیگ کے کتنے ہیں اور عوامی لیگ کے کتنے ؟۔'' 68

دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کا آغاز

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

چند ماہ پہلے جب حکومتی ادارے اور کچھ سیاسی و مذہبی جماعتیں طالبان سے مذاکرات کا ڈول ڈال رہے تھے تب میں نے اپنے کالم میں عرض کیا کہ طالبان شریعت نہیں ابلیسیت کے ایسے علم بردار ہیں جن کی دہشت گردی کے سبب معیشت کا دس ہزار ارب روپے سے زائد کا نقصان ہو چکا، پچاس ہزار سے زائد پاکستانی بچے، بوڑھے، جوان اور عورتیں شہید ہوئے اور چھ ہزار سے زائد فوجی جوانوں کی شہادتیں ہوئیں۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد مذاکرات چہ معنی دارد؟۔ میرے نزدیک مذاکرات کی ناکامی اظہر من الشمس تھی جس کا میں نے اپنے کالموں میں بار بار ذکر بھی کیا۔ میری ناقص رائے یہ تھی کہ دہشت گرد اپنی مذموم حرکات سے باز نہیں آ سکتے کیونکہ دہشت گردی اُن کے خمیر میں گندھ چکی ہے اور وہ مذاکرات کا بہانہ بنا کر اپنی صفیں درست کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ حکمران محض وقت ضائع کر رہے ہیں کیونکہ

پکڑ کے زندہ ہی جس درندے کو تم سدھانے کی سوچتے ہو
بدل سکے گا نہ سیدھے ہاتھوں وہ اپنے انداز دیکھ لینا

بالآخر وہی ہوا اور جونہی طالبان نے اپنی صفیں درست کیں، کراچی ایئر پورٹ پر خوفناک حملہ کر دیا۔اِس حملے کے بعد حاکمانِ وقت یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ بَس! اب بہت ہو چکا۔ شمالی وزیرستان میں آپریشن تو تیرہ اورچودہ جون کی درمیانی رات کو ہی شروع کر دیا گیالیکن پندرہ جون کو حکومتی سطح پر بھی اِس کا اعلان کرتے ہوئے آئی ایس پی آر کی طرف سے ایک بیان جاری ہوا جس میں یہ کہا گیا کہ حکومت کی ہدایت پر شمالی وزیرستان میں بھرپور آپریشن شروع کر دیا گیا ہے اور یہ آپریشن آخری دہشت گرد کے خاتمے تک جاری رہے گا۔افواجِ پاکستان نے اِس آپریشن کا نام حضورِ اکرم ﷺ کی تلوار کے نام پر ''ضربِ عضب'' رکھا ہے۔یہ تلوار آقا ﷺ کو حضرت سعد بن عبادہ نے دی اور غزوۂ بدر و اُحد میں استعمال بھی ہوئی اور یہ تلوار آج بھی قاہرہ کی جامع حسین میں موجود ہے۔''ضربِ عضب'' کا لغوی مطلب ''ضربِ کاری'' ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ارضِ پاک کے جرّی جوان دہشت گردوں پر کاری ضرب لگا کر اُنہیں نشانِ عبرت بنا دیں گے۔ انشاء اللہ یہ آپریشن ضرور کامیاب ہو گا کیونکہ ہمارے غازی اللہ کے سپاہی ہیں جنہیں شکست سے دوچار کرنا کسی بھی طاغوتی طاقت کے بس کا روگ نہیں۔

امریکہ کی عرصۂ دراز سے یہ خواہش اور کوشش تھی کہ افواجِ پاکستان شمالی وزیرستان میں آپریشن کریں، اب جبکہ یہ خواہش پوری ہونے جا رہی ہے تو

امریکہ سے یہ دو ٹوک سوال کیا جانا چاہیے کہ وہ پاکستان کے ساتھ ہے یا دہشت گردوں کے ؟۔ اگر وہ پاکستان کے ساتھ ہے تو اُسے افغانستان کے صوبہ کنڑ میں پناہ لینے والے تحریکِ طالبان پاکستان کے امیر مُلّا فضل اللہ اور ساتھی دہشت گردوں کو نیست و نابود کرنا ہوگا، بصورتِ دیگر ہمیں فوری طور پر امریکی جنگ سے نکل جانا چاہیے ۔حکومتِ پاکستان نے افغان حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ سرحدوں کو ''سِیل'' کردے تاکہ دہشت گرد افغانستان کی طرف فرار نہ ہونے پائیں ۔وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ افغان حکومت ایسا کچھ نہیں کرنے والی کیونکہ اُسے پاکستان میں افراتفری بہت مرغوب ہے ۔سرحدوں کی نگرانی کا کام بھی ہمیں خود ہی کرنا ہوگا۔

دِل خوش کُن امر یہ ہے کہ قوم کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتوں کی غالب اکثریت بھی اِس آپریشن پر متفق و متحد ہے ۔قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ نے حسبِ سابق انتہائی مدبرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ ''حکومت نے ہمیں اعتماد میں نہیں لیا، پھر بھی ہم حکومت کے ساتھ ہیں''۔اے این پی اور ایم کیو ایم نے بھی حکومت اور فوج کا بھرپور ساتھ دینے کا اعلان کیا۔سُنّی اتحاد کونسل اور مجلس وحدت المسلمین نے بھی دہشت گردوں کے خلاف فوجی آپریشن کو قومی خواہشات کا آئینہ دار قرار دیا البتہ مولانا فضل الرحمٰن نے مذاکرات کو محض ڈھونگ قرار دیا اور تحریکِ انصاف نے محتاط رویہ اختیار کرتے

ہوئے کور کمیٹی کا اجلاس طلب کر لیا۔ یہ تو طے ہے کہ طالبان سے مذاکرات کی حامی اور مخالف دونوں قوتیں ہی محبِ وطن ہیں اور دونوں کا مقصد حصولِ امن ہی ہے۔ اب جب کہ حکومت نے مذاکرات کی کوشش کرکے دیکھ لی، جو بُری طرح ناکام ہوئی، تو مذاکرات کی حامی، خصوصاً تحریکِ انصاف اور جماعتِ اسلامی کو چاہیے کہ وہ افواج پاکستان کے شانہ بشانہ کھڑی ہوں اور حکومت کی دست و بازو بنیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مؤثر عوامی قوت رکھنے والے محترم عمران خاں بھی ملکی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قومی سلامتی کی خاطر اپنی تحریک کو مؤخر کر دیں گے۔ مولانا طاہر القادری بھی 23 جون کو پاکستان تشریف لانے والے ہیں۔ وہ ضرور تشریف لائیں لیکن کسی انقلاب کے لیے نہیں بلکہ قومی و ملّی یکجہتی کے لیے کیونکہ حب الوطنی کا تقاضہ یہی ہے۔

انتہائے نرگسیت کا شکار کچھ لکھاری اپنی بزرجمہری کا رعب جھاڑتے ہوئے یہ گمراہ کُن پراپیگنڈہ کر رہے تھے کہ حکومت اور فوج ایک صفحے پر نہیں۔ اُن کی آنکھیں اب کھُل جانی چاہیئں کیونکہ افواج پاکستان کے ترجمان نے پوری قطعیت کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ آپریشن حکومت کی ہدایت پر کیا جا رہا ہے۔ آج وزیرِ اعظم بھی پارلیمنٹ کو اعتماد میں لے رہے ہیں لیکن وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اپنے گندے تزویراتی مقاصد میں مگن کچھ دانشور طرح طرح کی موشگافیاں کرتے رہیں گے اور ہمارا الیکٹرانک میڈیا بھی رائی کا پہاڑ بناتا

رہے گا کیونکہ جو خبر الیکٹرانکٹ میڈیا کے کانوں پر گرتی ہے وہ کچھ سے کچھ بن کر نکلتی ہے۔ 2008ء کے الیکشن میں نواز لیگ کے ٹکٹ پر ایم این اے منتخب ہونے والے ایک معتبر لکھاری آجکل نواز لیگ کے خلاف آگ اُگلتے رہتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے کالم میں حکومت اور فوج کی باہمی چپقلش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ''آخری مرتبہ نواز شریف وزیرِ اعظم بنے تو اُنہیں اقتدار کو سبوتاژ کرنے میں اڑھائی سال لگ گئے۔ تاہم اِس مرتبہ اُنھوں نے سستی اور غفلت کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا اور ایک سال سے بھی کم عرصہ میں خود کو اُس مقام پر لے آئے ہیں''۔ موصوف کے خیال میں فوج اپنی مرضی سے فاٹا میں کارروائیاں کر رہی ہے اور آئی ایس آئی کو بھی جی ایچ کیو سے ہی ہدایات مِل رہی ہیں، حکومت کہیں موجود نہیں۔ نہیں معلوم کہ یہ موصوف کا ''مدبرانہ'' تجزیہ تھا یا اطلاع لیکن آئی ایس پی آر کے حالیہ بیان سے واضح ہو گیا کہ کالم نگار موصوف کا پراپیگنڈہ انتہائی گمراہ کُن اور سرے سے غلط تھا۔ ایسے لکھاری پیپلز پارٹی کے دَورِ حکومت میں بھی تاریخ پہ تاریخ دیتے رہے لیکن اُن کی ساری ''بشارتیں'' اور پیشین گوئیاں ہمیشہ غلط ثابت ہوتی رہیں۔ موصوف کہتے ہیں '' اب کی بار اسٹیبلشمنٹ سیاسی حکومت کے خلاف براہِ راست کچھ نہیں کرے گی بلکہ پسِ پردہ رہ کر داؤ کھیلے گی۔ ماضی میں بھاری بوٹوں کی دھمک آنا شروع ہو جاتی تھی لیکن اِس بار زیرک انداز اپنایا جا رہا ہے۔ شائد محترم لکھاری کے خیال میں فوج کا زیرک انداز یہ ہو کہ وہ ایسی سیاسی قوتوں کی'' پشت پناہی کرے

جو نواز لیگ کو ''ٹف ٹائم'' دے سکتی ہوں۔اسی لیے اُنھوں نے فرمایا ''عمران خاں کے جلسوں میں شُرکاء کی تعداد میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔دوسری طرف ڈاکٹر قادری اپنی شعلہ بیانی سے جون کی تمازت میں سیاسی درجہ حرارت میں اضافہ کرنے (نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں) کینیڈا سے تشریف لایا ہی چاہتے ہیں''۔کیا موصوف یہ سمجھتے ہیں کہ طاہر القادری اور عمران خاں کی پُشت پر اسٹیبلشمنٹ کا ہاتھ ہے ؟۔اول تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے لیکن اگر خُدا نخواستہ ایسا ہونے جا رہا ہوتا تو پھر محترم لکھاری سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسی صورت میں وہ جمہوری قوتوں کا ساتھ دیں گے یا اسٹیبلشمنٹ کا؟۔

آپریشن ضربِ عضب

بالآخر حکومت نے وہی فیصلہ کیا جو قوم کے دِل کی آواز تھی ۔شمالی وزیرستان میں افواج پاکستان نے آپریشن ''ضربِ عضب'' شروع کر دیا۔یہ افواج پاکستان کا نواں بڑا آپریشن ہے ،اِس سے پہلے آٹھ بڑے آپریشن کیے جا چکے جن میں آپریشن فریڈم ، المیزان ، راہِ حق ، زلزلہ ، راہِ راست ، شیرِدل ، راہِ نجات اور آپریشن کوہِ سفید شامل ہیں۔یہ تمام آپریشن نائن الیون کے بعد شروع ہوئے جن میں افواج پاکستان کو اپنے اہداف کو سَر کرنے میں تو بھرپور کامیابیاں ملیں لیکن انہیں محض اِس لیے جزوی طور پر کامیاب کہا جا سکتا ہے کہ القاعدہ اور طالبان کی مرکزی قیادت اِدھر اُدھر بکھر گئی اور پھر پورا پاکستان بم دھماکوں اور خود کُش حملوں کی زد میں آ گیا۔اِس بار آپریشن ''ضربِ عضب'' نہایت احتیاط اور باریک بینی سے تیار کیا گیا ہے ۔یہ شمالی وزیرستان کے 4707 مربع کلومیٹر علاقے میں نہیں بلکہ یہ تحریکِ طالبان پاکستان، اسلامی موومنٹ آف اُزبکستان اور پاکستان مخالف القاعدہ کے مخصوص ٹھکانوں کے خلاف کیا جا رہاہے۔ مسلح افواج نے سب سے پہلے شمالی وزیرستان کو دیگر علاقوں سے علیحدہ کیا، پاک افغان سرحد کی کڑی فضائی نگرانی شروع کی پھر میراں شاہ اور میر علی کو محاصرے میں لے کر آپریشن شروع کر دیا۔اُدھر

افغان حکومت سے بھی درخواست کی گئی ہے کہ افغان علاقوں پکتیا، خوست اور پکتیکا کے داخلی راستوں کو بند کر دیا جائے تاکہ دہشت گرد فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکیں ۔

طالبان کے ساتھ مذاکرات اور معاہدے ہمیشہ بے نتیجہ ہی رہے اور ہر معاہدے کا اختتام فوجی آپریشن پر ہوا۔ ماضی کی حکومتیں طالبان کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے ساتھ معاہدے کرتی رہیں جو چند ماہ کے بعد ختم ہو جاتے لیکن نواز حکومت نے پہلی مرتبہ تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں کے بھرپور مینڈیٹ کے ساتھ تحریکِ طالبان پاکستان کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیا اور طالبان کی طرف سے ایک ماہ کی جنگ بندی کا معاہدہ ہوا ۔ اُس وقت بھی طالبان کو قریب سے جاننے والے بہت سے دفاعی تجزیہ نگاروں کا یہی خیال تھا کہ طالبان مذاکرات کے لیے مخلص نہیں اور چونکہ اُنہیں نئی صف بندی کے لیے وقت درکار ہے اِس لیے وہ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے تیار ہوئے ہیں۔ دفاعی تجزیہ نگاروں کا کہا سچ نکلا اور محض ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی طالبان نے اپنی کارروائیاں دوبارہ شروع کر دیں ۔ سانحہ کراچی ایئر پورٹ مذاکرات کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا اور نہ چاہتے ہوئے بھی حکومت کو آپریشن کا ''آپشن'' استعمال کرنا پڑا۔ ہمیں یقین ہے کہ انشاء اللہ سوات اور جنوبی وزیرستان کی طرح اِس بار بھی کامیابی جرّی جوانوں کے قدم چومے گی اور یہ ارضِ پاک امن کا گہوارہ بن جائے گی ۔

آپریشن ''ضربِ عضب'' کے ساتھ ہی وہ تمام افواہیں بھی اپنی موت آپ مر گئیں جو کافی عرصے سے حکومت اور فوج کے مابین چپقلش کے بارے میں پھیلائی جا رہی تھیں ۔آئی ایس پی آر نے دو ٹوک الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ حکومت کی ہدایت پر آپریشن ضربِ عضب شروع کر دیا گیا ہے اور آپریشن کے بارے میں وزیرِ اعظم صاحب کو مکمل طور پر با خبر رکھا جا رہا ہے۔اِس کے باوجود بھی ہمارے بے باک الیکٹرانک میڈیا کے کچھ عناصر طرح طرح کی موشگافیاں کر رہے ہیں ۔ایک نیوز چینل پر یہ گرما گرم بحث جاری تھی کہ فوج فرنٹ لائن پر ہے اور حکومت کا کہیں پتہ نہیں ۔ظاہر ہے کہ اگرآپریشن افواجِ پاکستان نے کرنا ہے تو فرنٹ لائن پر بھی وہی ہو گی اور حالات کے مطابق فوری فیصلے کرنے کا اختیار بھی ۔ایسا بے تُکا اور شر انگیز پراپیگنڈا کرنے والے عناصر کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے نیوز چینل اپنی حُب الوطنی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے ایسے نام نہاد دانشوروں اور تجزیہ نگاروں سے گریز کریں ۔ایک نیوز چینل پر ایک معروف ٹی وی اینکر یہ کہہ رہے تھے ''وزیرِ اعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف نے اپنی اور اپنے خاندان کی سکیورٹی کے لیے کور کمانڈر لاہور سے مدد طلب کی ہے۔ وزیرِ اعلیٰ پنجاب کو اپنی اور اپنے خاندان کی سکیورٹی کی تو فکر ہے ، بیس کروڑ عوام کی نہیں''۔ہم نہیں جانتے کہ اینکر موصوف کے اِس بیان میں کتنی سچائی ہے لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ عین اُس وقت جب وطنِ عزیز حالتِ جنگ

میں ہے۔ اِس قسم کی باتیں کرکے قوم میں مایوسی پھیلانے کی کوشش کرنے والے نہ تو ملک کی خدمت کر رہے ہیں نہ قوم کی۔ اُنہیں علم ہونا چاہیے کہ ہمیشہ ''چومکھی'' لڑائی لڑنے والی قومیں ہی کامیاب و کامران ہوتی ہیں اور موجودہ جنگ میں کامیابی بھی صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب قوم، سیاستدان، سول سوسائٹی اور خصوصی طور پر پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا فوج کے شانہ بشانہ ہو۔ وزیرِ اعظم جناب نواز شریف نے بھی پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیتے ہوئے اپنے پالیسی بیان میں اسی پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ حصولِ مقاصد کے لیے پوری قوم کو مسلح افواج کا ساتھ دینا ہوگا۔ اُنہوں نے آپریشن کی حمایت کرنے والی سیاسی جماعتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ''ہم مذاکرات کر رہے تھے جبکہ دوسری جانب ہماری تنصیبات کو نشانہ بنایا گیا۔ ہماری نیک نیتی پر مبنی پیش رفت کو اُسی جذبے کے ساتھ نہیں لیا گیا۔ کراچی حملے کے بعد مشاورت سے آپریشن کا فیصلہ کیا گیا۔ اب مقاصد کے حصول تک آپریشن جاری رہے گا اور ملک کو ہر حالت میں دہشت گردوں سے پاک کیا جائے گا''۔ ملک کی تمام چھوٹی، بڑی سیاسی جماعتوں نے آپریشن کی کھُل کر حمایت کی ہے سوائے جماعتِ اسلامی اور جمیعت علمائے اسلام (ف) کے۔ مولانا فضل الرحمٰن کی طرف سے تو اِس آپریشن کے بارے میں کوئی واضح بیان سامنے نہیں آیا لیکن جماعتِ اسلامی کو اگر گلہ ہے تو صرف یہ کہ آپریشن سے پہلے اُسے اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ محترم بھائی فرید احمد پراچہ نے ایک ٹی وی ٹاک شو میں کھُل کر کہا کہ جماعتِ اسلامی

حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھانے والوں کی ہر گز حمایت نہیں کرتی اور ہم اِس آپریشن کے مخالف نہیں ۔ جو گلہ جماعت اسلامی کو ہے وہی تحریکِ انصاف اور دیگر سیاسی جماعتوں کو بھی ہے ۔ قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ نے کہا کہ حکومت نے آپریشن کے بارے میں اُن سے مشورہ نہیں کیا اِس کے باوجود پیپلز پارٹی حکومت کے ساتھ ہے ۔ کپتان صاحب حکومت کے ساتھ تو ہر گز نہیں البتہ فوج کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں ۔ تحریکِ انصاف نے تو ملکی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہاولپور میں 22 جون کو ہونے والے جلسے کو معطل کر دیا ہے البتہ مولانا طاہر القادری 23 جون کو پاکستان تشریف لا رہے ہیں اور ہم پریشان کہ افواجِ پاکستان تو آپریشن ضربِ عضب میں مصروف ہے ، اب ہمارے مُرشد کی سکیورٹی کا کیا بنے گا؟۔حکومت نے تو شاید مُرشد کی سکیورٹی کی خاطر اُنہیں گرفتار کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا لیکن مُرشد نے آگ اُگلتا یہ بیان جاری کر دیا کہ اگر اُنہیں گرفتار کیا گیا تو انقلاب مہینوں یا دنوں میں نہیں ، گھنٹوں میں آ جائے گا۔اِس بیان کے بعد یقیناً حکومت کے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو گی ۔ ویسے چاہتے ہم بھی یہی تھے کہ مُرشد کو گرفتار کر لیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے کم از کم اُن کی جان کو لاحق خطرات تو ختم ہو جاتے ۔ رہی انقلاب کی بات ، تو اُس کا کیا ہے انقلاب تو آتے رہتے ہیں اور آتے ہی رہیں گے ۔ ہمیں تو مُرشد کی جان عزیز ہے ۔ شیخ رشید احمد کے ٹرین مارچ کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا ۔ وہ تو شاید پارلیمنٹ میں اِس کا اعلان کرنے والے تھے

لیکن کتنی بُری بات ہے کہ سپیکر صاحب نے اُن کا مائیک ہی بند کروا دیا۔ دلچسپ صورتِ حال اُس وقت پیدا ہوئی جب حسبِ روایت سیّد خورشید شاہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ساتھ ہی عمران خاں بھی کھڑے ہو گئے۔ کائیاں وزیرِ اعظم صاحب نے موقعے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے سپیکر صاحب کو کہا کہ چونکہ سینٹ میں اُن کا انتظار ہو رہا ہے اِس لیے اُنہیں اجازت دی جائے۔ یہ کہہ کر وزیرِ اعظم صاحب تو ''ہوا ہو گئے'' اور خاں صاحب مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ شیخ صاحب نے بند مائیک پر بھی چلانا شروع کر دیا کہ اِس ''ہَتھ'' پر واک آؤٹ تو بنتا ہے دوستو! لیکن ''نقار خانے میں تُوتی کی آواز کون سُنتا ہے''۔ اِس اجتماعی بے حِسی پر شیخ صاحب نے اکیلے ہی واک آؤٹ کر کے تاریخ رقم کر دی۔

آپریشن ضربِ عضب

بالآخر حکومت نے وہی فیصلہ کیا جو قوم کے دِل کی آواز تھی ۔شمالی وزیرستان میں افواج پاکستان نے آپریشن ''ضربِ عضب'' شروع کر دیا۔یہ افواج پاکستان کا نواں بڑا آپریشن ہے ،اِس سے پہلے آٹھ بڑے آپریشن کیے جا چکے جن میں آپریشن فریڈم ، المیزان ، راہِ حق ، زلزلہ ، راہِ راست ، شیرِدل ، راہِ نجات اور آپریشن کوہِ سفید شامل ہیں۔یہ تمام آپریشن نائن الیون کے بعد شروع ہوئے جن میں افواج پاکستان کو اپنے اہداف کو سَر کرنے میں تو بھرپور کامیابیاں ملیں لیکن انہیں محض اِس لیے جزوی طور پر کامیاب کہا جا سکتا ہے کہ القاعدہ اور طالبان کی مرکزی قیادت اِدھر اُدھر بکھر گئی اور پھر پورا پاکستان بم دھماکوں اور خودکُش حملوں کی زد میں آ گیا۔اِس بار آپریشن ''ضربِ عضب''نہایت احتیاط اور باریک بینی سے تیار کیا گیا ہے۔یہ شمالی وزیرستان کے 4707 مربع کلومیٹر علاقے میں نہیں بلکہ یہ تحریکِ طالبان پاکستان، اسلامی موومنٹ آف اُزبکستان اور پاکستان مخالف القاعدہ کے مخصوص ٹھکانوں کے خلاف کیا جا رہاہے۔ مسلح افواج نے سب سے پہلے شمالی وزیرستان کو دیگر علاقوں سے علیحدہ کیا ، پاک افغان سرحد کی کڑی فضائی نگرانی شروع کی پھر میران شاہ اور میر علی کو محاصرے میں لے کر آپریشن شروع کر دیا۔اُدھر افغان حکومت سے بھی درخواست کی

گئی ہے کہ افغان علاقوں پکتیا، خوست اور پکتیکا کے داخلی راستوں کو بند کر دیا جائے تاکہ دہشت گرد فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

طالبان کے ساتھ مذاکرات اور معاہدے ہمیشہ بے نتیجہ ہی رہے اور ہر معاہدے کا اختتام فوجی آپریشن پر ہوا۔ماضی کی حکومتیں طالبان کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے ساتھ معاہدے کرتی رہیں جو چند ماہ کے بعد ختم ہو جاتے لیکن نواز حکومت نے پہلی مرتبہ تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں کے بھرپور مینڈیٹ کے ساتھ تحریکِ طالبان پاکستان کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیااور طالبان کی طرف سے ایک ماہ کی جنگ بندی کا معاہدہ ہوا ۔اُس وقت بھی طالبان کو قریب سے جاننے والے بہت سے دفاعی تجزیہ نگاروں کا یہی خیال تھا کہ طالبان مذاکرات کے لیے مخلص نہیں اور چونکہ اُنہیں نئی صف بندی کے لیے وقت درکار ہے اِس لیے وہ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے تیار ہوئے ہیں۔دفاعی تجزیہ نگاروں کا کہا سچ نکلا اور محض ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی طالبان نے اپنی کارروائیاں دوبارہ شروع کر دیں۔سانحہ کراچی ایئر پورٹ مذاکرات کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا اور نہ چاہتے ہوئے بھی حکومت کو آپریشن کا ''آپشن'' استعمال کرنا پڑا۔ہمیں یقین ہے کہ انشاء اللہ سوات اور جنوبی وزیرستان کی طرح اِس بار بھی کامیابی جرّی جوانوں کے قدم چومے گی اور یہ ارضِ پاک امن کا گہوارہ بن جائے گی۔

آپریشن ''ضربِ عضب'' کے ساتھ ہی وہ تمام افواہیں بھی اپنی موت آپ مر گئیں جو کافی عرصے سے حکومت اور فوج کے مابین چپقلش کے بارے میں پھیلائی جا رہی تھیں ۔آئی ایس پی آر نے دو ٹوک الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ حکومت کی ہدایت پر آپریشن ضربِ عضب شروع کر دیا گیا ہے اور آپریشن کے بارے میں وزیرِ اعظم صاحب کو مکمل طور پر باخبر رکھا جا رہا ہے۔اِس کے باوجود بھی ہمارے بے باک الیکٹرانک میڈیا کے کچھ عناصر طرح طرح کی موشگافیاں کر رہے ہیں ۔ایک نیوز چینل پر یہ گرما گرم بحث جاری تھی کہ فوج فرنٹ لائن پر ہے اور حکومت کا کہیں پتہ نہیں ۔ظاہر ہے کہ اگر آپریشن افواجِ پاکستان نے کرنا ہے تو فرنٹ لائن پر بھی وہی ہو گی اور حالات کے مطابق فوری فیصلے کرنے کا اختیار بھی ۔ایسا بے تُکا اور شر انگیز پراپیگنڈا کرنے والے عناصر کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے نیوز چینل اپنی حُب الوطنی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے ایسے نام نہاد دانشوروں اور تجزیہ نگاروں سے گریز کریں ۔ایک نیوز چینل پر ایک معروف ٹی وی اینکر یہ کہہ رہے تھے ''وزیرِ اعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف نے اپنی اور اپنے خاندان کی سکیورٹی کے لیے کور کمانڈر لاہور سے مدد طلب کی ہے۔ وزیرِ اعلیٰ پنجاب کو اپنی اور اپنے خاندان کی سکیورٹی کی تو فکر ہے ، بیس کروڑ عوام کی نہیں''۔ہم نہیں جانتے کہ اینکر موصوف کے اِس بیان میں کتنی سچائی ہے لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ عین اُس وقت جب وطنِ عزیز حالتِ جنگ میں ہے ، اِس قسم کی باتیں کرکے قوم میں مایوسی پھیلانے کی کوشش کرنے والے

لشکر ملک کی خدمت کر رہے ہیں نہ قوم کی۔ اُنہیں علم ہونا چاہیے کہ ہمیشہ ’’چو مکھی‘‘ لڑائی لڑنے والی قومیں ہی کامیاب و کامران ہوتی ہیں اور موجودہ جنگ میں کامیابی بھی صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب قوم، سیاستدان، سول سوسائٹی اور خصوصی طور پر پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا فوج کے شانہ بشانہ ہو۔ وزیرِ اعظم جناب نواز شریف نے بھی پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیتے ہوئے اپنے پالیسی بیان میں اسی پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ حصولِ مقاصد کے لیے پوری قوم کو مسلح افواج کا ساتھ دینا ہوگا۔ اُنہوں نے آپریشن کی حمایت کرنے والی سیاسی جماعتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ’’ہم مذاکرات کر رہے تھے جبکہ دوسری جانب ہماری تنصیبات کو نشانہ بنایا گیا۔ ہماری نیک نیتی پر مبنی پیش رفت کو اُسی جذبے کے ساتھ نہیں لیا گیا۔ کراچی حملے کے بعد مشاورت سے آپریشن کا فیصلہ کیا گیا۔ اب مقاصد کے حصول تک آپریشن جاری رہے گا اور ملک کو ہر حالت میں دہشت گردوں سے پاک کیا جائے گا‘‘۔ ملک کی تمام چھوٹی، بڑی سیاسی جماعتوں نے آپریشن کی کھُل کر حمایت کی ہے سوائے جماعتِ اسلامی اور جمیعت علمائے اسلام (ف) کے۔ مولانا فضل الرحمٰن کی طرف سے تو اِس آپریشن کے بارے میں کوئی واضح بیان سامنے نہیں آیا لیکن جماعتِ اسلامی کو اگر گلہ ہے تو صرف یہ کہ آپریشن سے پہلے اُسے اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ محترم بھائی فرید احمد پراچہ نے ایک ٹی وی ٹاک شو میں کھُل کر کہا کہ جماعتِ اسلامی حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھانے والوں کی ہرگز حمایت نہیں کرتی اور ہم اِس

آپریشن کے مخالف نہیں۔ جو گلہ جماعت اسلامی کو ہے وہی تحریکِ انصاف اور دیگر سیاسی جماعتوں کو بھی ہے۔ قائدِ حزبِ اختلاف سید خورشید شاہ نے کہا کہ حکومت نے آپریشن کے بارے میں اُن سے مشورہ نہیں کیا اِس کے باوجود پیپلز پارٹی حکومت کے ساتھ ہے۔ کپتان صاحب حکومت کے ساتھ تو ہرگز نہیں البتہ فوج کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ تحریکِ انصاف نے تو ملکی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہاولپور میں 22 جون کو ہونے والے جلسے کو معطل کر دیا ہے البتہ مولانا طاہر القادری 23 جون کو پاکستان تشریف لا رہے ہیں اور ہم پریشان کہ افواجِ پاکستان تو آپریشن ضربِ عضب میں مصروف ہے، اب ہمارے مُرشد کی سکیورٹی کا کیا بنے گا؟۔ حکومت نے تو شاید مُرشد کی سکیورٹی کی خاطر اُنہیں گرفتار کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا لیکن مُرشد نے آگ اُگلتا یہ بیان جاری کر دیا کہ اگر اُنہیں گرفتار کیا گیا تو انقلاب مہینوں یا دنوں میں نہیں، گھنٹوں میں آ جائے گا۔ اِس بیان کے بعد یقیناً حکومت کے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو گی۔ ویسے چاہتے ہم بھی یہی تھے کہ مُرشد کو گرفتار کر لیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے کم از کم اُن کی جان کو لاحق خطرات تو ختم ہو جاتے۔ رہی انقلاب کی بات، تو اُس کا کیا ہے انقلاب تو آتے رہتے ہیں اور آتے ہی رہیں گے۔ ہمیں تو مُرشد کی جان عزیز ہے۔ شیخ رشید احمد کے ٹرین مارچ کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ وہ تو شاید پارلیمنٹ میں اِس کا اعلان کرنے والے تھے لیکن کتنی بُری بات ہے کہ سپیکر صاحب نے اُن کا مائیک ہی بند کروا دیا۔

دلچسپ صورتِ حال اُس وقت پیدا ہوئی جب حسبِ روایت سیّد خورشید شاہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ساتھ ہی عمران خاں بھی کھڑے ہو گئے۔ کائیاں وزیرِ اعظم صاحب نے موقعے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے سپیکر صاحب کو کہا کہ چونکہ سینٹ میں اُن کا انتظار ہو رہا ہے اِس لیے اُنہیں اجازت دی جائے۔ یہ کہہ کر وزیرِ اعظم صاحب تو ''ہوا ہو گئے'' اور خاں صاحب مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ شیخ صاحب نے بند مائیک پر بھی چِلانا شروع کر دیا کہ اِس ''ہَتھ'' پر واک آؤٹ تو بنتا ہے دوستو! ۔ لیکن ''نقار خانے میں تُوتی کی آواز کون سُنتا ہے''۔ اِس اجتماعی بے حِسی پر شیخ صاحب نے اکیلے ہی واک آؤٹ کرکے تاریخ رقم کر دی۔

قصور کس کا۔۔۔؟

17 جون کا خونی دِن پنجاب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ دِن 2 خواتین سمیت گیارہ افراد کی جان لے گیا اور 80 سے زائد زخمی ہوئے۔ سوال مگر یہ کہ قصور کس کا ہے ؟۔ حکمرانوں کا، پولیس کا، علاّمہ طاہر القادری کا یا اُن عقیدت گزیدہ معصوموں کا جو جان کی بازی ہار گئے ۔شاید قصور معصوموں کا ہی ہو گا کہ ''ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات''۔ معاملہ صرف اتنا کہ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ منہاج القُرآن سیکریٹریٹ اور علاّمہ طاہر القادری کی رہائش گاہ کے ارد گرد سڑکوں پر لگے بیریئر ہٹانا چاہتی تھی جبکہ مولانا کے عقیدت مندوں کو یہ منظور نہ تھا۔ پھر پولیس اور عقیدت مندوں کے مابین طویل تصادم اور مَوجِ خوں سَر سے گزر گئی۔ کئی گھروں میں صفِ ماتم بچھی لیکن بگڑا کسی کا کچھ نہیں، پنجاب حکومت کا نہ طاہر القادری کا البتہ قومی و ملّی جذبات سے عاری کچھ اپوزیشن جماعتوں کی آنکھوں کی چمک میں کئی گُنا اضافہ ضرور ہو گیا۔ عملی طور پر سیاسی موت سے دوچار چوہدری برادران یکلخت ''اِن ایکشن'' ہوئے، لال حویلی والے نے بڑھکیں لگاتے ہوئے اپنا ٹرین مارچ ملتوی کرکے مولانا کی قیادت میں پناہ ڈھونڈ لی اور محترم عمران خاں نے بھی اپنا 23 جون کا ملتوی شدہ جلسہ 27 جون کو کرنے کا اعلان کر دیا۔ خاں صاحب سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا دہشت

گردی کے خلاف جنگ ختم ہو گئی جو اُنھوں نے پھر سے سیاسی جلسے جلوس اور ریلیاں نکالنے کا اعلان کر دیا ہے ؟۔

دراصل ہمیں لاشیں بہت مرغوب ہیں اور لاشوں پر سیاست بھی ۔ اسی لیے تو علامہ طاہر القادری اپنے پیروکاروں کو جانیں قُربان کرنے کا حکم دیتے رہے۔ عینی شاہدین کے مطابق منہاج القُرآن مرکز سے پولیس پر متواتر خشت باری ہوتی رہی ۔ اسی دوران مولانا نے ٹویٹر پر پیغام جاری کیا ''یہ میرے کارکنوں کی پہلی آزمائش ہے ، وہ اپنی جانیں قُربان کر دیں گے لیکن سَر نہیں جھکائیں گے ''۔ منہاج القُرآن مسجد کا مقرر عقیدت مندوں کو ''شہادت'' کی تحریک دیتے ہوئے متواتر یہ کہتا رہا ''مجاہدو! وقتِ شہادت آن پہنچا۔ تمہارے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے نہ ہٹنے پائیں''۔ منہاج القُرآن کے سکیورٹی انچارج ایس پی (ر) الطاف شاہ نے پولیس کو دو ٹوک الفاظ میں کہا '' ماریں گے یا مَر جائیں گے'' ۔اِس ہَٹ دھرمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا صاحب کو حصولِ مقصد کے لیے 11 لاشوں کا '' چیک'' مِل گیا جسے وہ پاکستان واپسی پر کیش کروانے کی بھرپور کوشش کریں گے ، قومی سلامتی جائے بھاڑ میں ۔

مولانا نے ویڈیو لنک پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اِس قتلِ عمد کی ایف آئی آر میاں برادران ، خواجگان ، رانا ثناء اللہ ، پرویز رشید اور چوہدری نثار

احمد کے خلاف کٹوائی جائے گی۔ علّامہ صاحب جسے چاہیں نامزد کر سکتے ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ اشتعال دلانے والا بھی اُتنا ہی مجرم ہوتا ہے جتنا کہ جُرم کرنے والا اور اپنے اندھے عقیدت مندوں کو اشتعال دلانے میں علّامہ صاحب نے بھی کوئی کَسر تو اُٹھا نہیں رکھی۔ اُنہوں نے تو انتشار پھیلانے کے لیے ذوالفقار مرزا، ریاض ملک اور الطاف حسین کی طرح قُرآن مجید کا سہارا لیتے ہوئے کلام اللہ ہاتھوں پر اٹھا کر" اینکر" کو انٹرویو دے ڈالا۔ علّامہ صاحب سے سوال ہے کہ کیا ربِ کردگار نے حکمت کی آسمانی کتاب اِس لیے نازل فرمائی کہ جس کا جب اور جہاں جی چاہے ہاتھوں پہ اُٹھا کر جھوٹی سچی باتیں کرتا رہے ؟۔ مولانا صاحب نے یہ بھی فرمایا" میاں برادران آٹھ سال تک اُن کے جوتے اُٹھاتے رہے، شہباز شریف آٹھ سال تک اُن کے جوتے کھولتے اور باندھتے رہے اور نواز شریف کندھوں پر اُٹھا کر غارِ حرا تک لے کر گئے۔ میاں نواز شریف صاحب نے ماڈل ٹاؤن میں اپنی ذاتی آٹھ کنال زمین دینے کی کوشش بھی کی لیکن اُنہوں نے انکار کر دیا"۔ مولانا صاحب کو انکار کرنا ہی چاہیے تھا کیونکہ اُن کی نگاہ تو اُس 100 کنال زمین پر تھی جسے بعد ازاں کوڑیوں کے مول مولانا صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے "جِس پر احسان کرو، اُس کے شَر سے بچو"۔ مولانا صاحب بھلے احسان کرنے والے میاں برادران کو "رگڑا" دیتے رہیں لیکن قوم کو معاف کر دیں کیونکہ قوم نے اُن پر کبھی ایسا کوئی" احسان" کرنے کی غلطی نہیں کی جس کی سزا دینے کے لیے وہ کینیڈا

سے تشریف لا رہے ہیں۔ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں" میرے پیروکاروں نے ڈنڈوں اور اینٹوں کی مدد سے تین مرتبہ پولیس کی دَوڑیں لگوائیں لیکن چوتھی مرتبہ اُوپر سے" حکم آنے پر پولیس نے گولی چلا دی"۔ اگر پنجاب پولیس بَربریت پہ اُتر ہی" آئی تھی تو مولانا نے بھی اپنے پیروکاروں کو صبر کی بجائے سَر کٹانے کا ہی حکم دیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر پیریئر ہٹ بھی جاتے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی اور مولانا کی شان و انانیت میں کیا فرق آ جاتا ؟۔ مولانا نے اپنے پیروکاروں کو مزید مشتعل کرنے کے لیے فرمایا کہ اگر وہ جاں بحق ہو جائیں تو انقلاب کی تکمیل تک اُن کی لاش کو دفن نہ کیا جائے۔ پاکستان تو پہلے ہی خونم خون ہے اب ایسی کون سی کسر باقی بچی ہے جسے وہ پورا کرنا چاہتے ہیں ؟۔

میں نے جب ایک نیوز چینل پر ہلاکتوں کی خبر سنی تو بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا کہ یہ سانحہ تو نواز لیگ کی سیاسی موت کے مترادف ہے۔ رائے عامہ بھی سو فیصد یہی تھی کہ نواز لیگ نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری اور سَراسَر گھاٹے کا سَودا کیا۔ اگر ایک عام آدمی کی یہ سوچ ہو سکتی ہے تو کیا عشروں سے خارزارِ سیاست میں بھٹکنے والے میاں برادران اِس سے بے بہرہ ہونگے؟ (ویسے بھی اپنی انقلابی تحریک کے لیے لاشوں کی ضرورت علّامہ صاحب کو تو ہو سکتی ہے، میاں برادران کو ہرگز نہیں)۔ پوری دُنیا میں ہر تفتیش کا محور و مرکز

یہی ہوتا ہے کہ کسی بھی واردات کا فائدہ کس کو پہنچ سکتا ہے اور نقصان کس کو۔ صاف ظاہر ہے کہ اِس سانحے سے علّامہ طاہر القادری کا سیاسی قد یک لخت بہت اونچا ہو گیا اور میاں برادران کی مقبولیت پر ضربِ کاری لگی۔ اِسی سازش کو بھانپتے ہوئے میاں شہباز شریف صاحب نے 20 جون کو وزیرِ قانون رانا ثناءاللہ سے استعفیٰ طلب کر لیا اور اپنے پرنسپل سیکرٹری ڈاکٹر توقیر کو بھی فارغ کر دیا۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہائی کورٹ کے عدالتی کمیشن پر اعتماد نہیں تو متاثرین سپریم کورٹ کا کمیشن بنوا لیں لیکن علّامہ صاحب تو وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ کے استعفوں سے کم پر تیار ہی نہیں۔ علّامہ صاحب تو دسمبر 2012ء میں بھی پیپلز پارٹی کی حکومت کے استعفے سے کم پر تیار نہیں تھے۔ اُنھوں نے اُس وقت بھی بارہا یہ کہا کہ وہ ہرگز کینیڈا نہیں جا رہے لیکن پھر خاموشی سے کھسک بھی لیے۔ اِس لیے اُن کی باتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے عدالتی کمیشن کو یہ ضرور انکوائری کرنی چاہیے کہ پولیس کی سربراہی کرنے والے ایس پی ماڈل ٹاؤن طارق عزیز کی ڈوریاں کہاں سے ہلائی جا رہی تھیں۔ وہ خوب جانتا تھا کہ سارے نیوز چینل کے کیمرے ہنگامے کی کوریج کر رہے ہیں۔ اِس کے باوجود اُس نے گُلو بٹ نامی غنڈے کو پولیس کی سربراہی سونپ کر نواز لیگ کی بربادیوں کی مذموم داستان رقم کرنے کی کوشش کی اور پورے الیکٹرانک میڈیا کے سامنے اُس غنڈے کو گلے بھی لگایا۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ یہ سب کچھ اُن کے علم میں لائے بغیر کیا گیا ہے۔ سوال مگر یہ ہے کہ جب یہ

سب کچھ انتہائی باخبر خادمِ اعلیٰ کی ناک کے نیچے ہو رہا تھا تو اُنہیں اِس کی خبر تک کیوں نہ ہوئی ؟۔جب اُنھوں نے پولیس کو واپس بلانے کا حکم دیا تو اُس پر عمل درآمد کیوں نہ ہو سکا؟۔جب اُنھوں نے سانحے کے ذمہ داروں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا تو کیا کوئی ایک گرفتاری بھی عمل میں آئی ؟۔میاں صاحب یہ تو کہتے ہیں کہ اگر وہ قصوروار ثابت ہوئے تو مستعفی ہو کر ہر سزا بھگتنے کو تیار ہونگے۔سوال مگر یہ ہے کہ اگر وہ مستعفی ہو بھی گئے تو پھر کیامنوں مٹی تلے دفن ہو جانے والے زندہ ہو جائیں گے ؟۔ایک صوبے کے ''چیف ایگزیکٹو'' کی حیثیت سے اُنہیں بہرحال قوم کو یہ جواب تو دینا ہی ہو گا کہ صوبے پر اُن کی گرفت کیوں اور کیسے اتنی ڈھیلی پڑ گئی کہ اتنا بڑا سانحہ رونما ہو گیا؟۔۔۔حرفِ آخر یہ کہ اِس وقت جب پاک فوج کے غازی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں قُربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کر رہے ہیں، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پوری قوم افواجِ پاکستان کی پشت پر کھڑی نظر آتی لیکن ہمارے الیکٹرانک میڈیا نے آپریشن ضربِ عضب کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے سانحہ ماڈل ٹاؤن پر مزید انتشار پھیلانے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ابھی تک ہر نیوز چینل سارا دِن اِسی سانحے پر پروگرام نشر کرکے الاؤ کو مزید بھڑکانے کی بھرپور کوشش میں ہے۔مقصد محض یہ کہ ریٹنگ بڑھتی رہے، مالکان کی تجوریاں بھرتی رہیں اور اِن کی تنخواہوں میں اضافہ ہوتا رہے۔کیا اسی کا نام حب الوطنی ہے؟۔

مولانا طاہر القادری کا انقلاب

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔ سرگوشیاں

مولانا طاہر القادری ایک دفعہ پھر ''پُرامن'' انقلاب لانے پاکستان پہنچ چکے ہیں لیکن انقلاب تو نام ہی ایک نظام کو ختم کرکے دوسرے نظام کو لانے کا ہوتا ہے جو ہمیشہ خون آلود ہوتا ہے۔ پھر پتہ نہیں مولانا کی ''پٹاری'' سے کونسا ایسا انقلاب ظہور پذیر ہونے والا ہے جس میں ایک پتا بھی نہیں ہلے گا اور انقلاب آ جائے گا۔ مولانا کو اگر یہ خوش فہمی ہے کہ وہ پاکستان کے ''امام خمینی'' ہیں تو اُنہیں علم ہونا چاہیئے کہ ایران کا بچہ بچہ امام خمینی پر جان نچھاور کرنے کو تیار تھا جبکہ مولانا صاحب کا حلقۂ اثر اتنا محدود ہے کہ صرف ایک بار عام انتخابات میں اُس وقت حصہ لیا جب اُنہیں ایک آمر کی بھرپور پُشت پناہی بھی حاصل تھی اِس کے باوجود بھی وہ بمشکل اپنی سیٹ ہی حاصل کر پائے۔ طاہر القادری صاحب میاں برادران کی طرف سے قوم کو دیا گیا ایک ایسا تحفہ ہیں جسے وہ خود بھی بھگت رہے ہیں اور قوم بھی۔ مولانا صاحب کے ماضی کو کریدنے سے احتراز کرتے ہوئے مولانا سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا اُنہیں خطرات میں گھرے پاکستان کی سلامتی کا رائی کے دانے

کے برابر بھی احساس ہے؟۔اِس وقت جب پوری قوم دہشت گردی کے خلاف یکسو تھی اور اللہ کے سپاہی شوقِ شہادت میں دہشت گردوں کے خلاف مصروفِ پیکار، مولانا اپنے کرتب دکھانے تشریف لے آئے۔اُدھر ہمارا الیکٹرانک میڈیا بھی باکمال جو مولانا کو منصورِ حقیقت ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے۔اہالیانِ فکر و نظر اور صاحبانِ بصارت و بصیرت میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو جھوٹ کی اِس اُگتی فصل کی قطع و برید کے لیے نعرۂ مستانہ بلند کر سکے۔سبھی اپنی تمناؤں کے اسیر اور ناروا کو روا کہنے میں مگن ۔

جب بھی یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ شبِ تار چھٹنے کو ہے اور دورِ گراں خوابی کے انجام کا وقت قریب آن لگا تبھی کچھ شعبدہ باز مکر وریا کی ڈُگڈگی بجاتے آن پہنچتے ہیں اور ہم بھی وہ سدھائے ہوئے بندر جوہر صاحبِ مکر وریا کی ڈُگڈگی پر ناچنے لگتے ہیں۔ابھی ایک سال پہلے نواز لیگ کو بھرپور مینڈیٹ سے اسی قوم نے نوازا اور ایک سال میں نواز لیگ نے جو کچھ کرکے دکھایا وہ عمومی توقعات سے کہیں بڑھ کر تھا لیکن پھر پتہ نہیں اچانک کیا ہوا کہ الیکٹرانک میڈیا پر نواز لیگ کے خلاف بھرپور مہم شروع کر دی گئی اور بالآخر میاں نواز شریف صاحب کو بھی یہ شکوہ کرنا پڑا کہ چند نیوز چینل کوئی اور ہی دنیا دکھا رہے ہیں۔محترم عمران خاں کی تحریکِ انصاف سے لاکھ اختلافات کے باوجود یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ انتخابات میں نواز لیگ کے بعد سب سے زیادہ

ووٹ تحریکِ انصاف کو ملے ، ایک صوبے میں اُس کی حکومت ہے اور پاکستان کے سب سے بڑے صوبے میں اُن کا قائدِ حزبِ اختلاف۔ تحریکِ انصاف اگر کوئی احتجاجی تحریک شروع کرتی ہے تو اُس کا کچھ جواز بھی بنتا ہے لیکن مولانا طاہر القادری ؟۔ مولانا صاحب نے انتخابات میں حصّہ لیا نہ وہ موجودہ نظام کو تسلیم کرتے ہیں ۔انتخابی سیاست سے وہ کوسوں دور بھاگتے ہیں اور اُن کی زبان پر ہر وقت انقلابی سیاست کا ورد جاری رہتا ہے ۔کینیڈین حکومت سے وفاداری کا حلف تو وہ اٹھا چکے لیکن اپنی ''جنم بھومی'' کا اُنہیں بقدرِ قطرۂ شبنم بھی احساس نہیں ۔اُنہیں پاکستان آنے سے کوئی نہیں روک سکتا کیونکہ وہ پاکستان کے ''بھی'' شہری ہیں ۔سوال مگر یہ ہے کہ کیا کسی ایک شخص کی تمناؤں کی تکمیل کی خاطر پورے ملک کی سلامتی کو داؤ پر لگایا جا سکتا ہےَ ؟۔سوال یہ بھی ہے کہ آخر مولانا صاحب کا ایجنڈا کیا ہے اور اُن کی ڈوریاں کون ہلا رہا ہے ؟۔وزیرِ داخلہ چوہدری نثار احمد کا یہ سوال بالکل درست ہے کہ'' طاہر القادری لاہور کی بجائے اسلام آباد کیوں اترنا چاہتے ہیں ''۔اُنھوں نے یہ بھی کہا ''کوئی غلط فہمی اور شک و شبہ میں نہ رہے کہ غیر آئینی طور پر حکومت گرانے کا دعویٰ اور عزم رکھنے والوں کے خلاف قانون حرکت میں نہیں آئے گا''۔ قانون کو حرکت میں آنا ہی چاہیے کہ اسی میں قومی سلامتی مضمر ہے لیکن یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ ماڈل ٹاؤن جیسا کوئی سانحہ دوبارہ رونما نہ ہونے پائے ۔مولانا صاحب اپنے انقلاب میں 11 لاشوں کا خون شامل کرکے پاکستان

تشریف لائے ہیں اور اُن کی تو شدید خواہش ہو گی کہ اُنہیں مزید لاشوں کا ''تحفہ'' ملے لیکن اگر خُدا نخواستہ ایسا ہو گیا تو نواز لیگ کی بنیادیں تو ہلیں گی ہی ، قومی سلامتی کو بھی شدید خطرات لاحق ہو جائیں گے ۔الیکٹرانک میڈیا کی آنکھ نے جو کچھ دکھایا اُس کے مطابق تو راولپنڈی اسلام آباد کی پولیس انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتی رہی جبکہ دوسری طرف مولانا صاحب کی ڈنڈا بردار فوج ، جس میں خواتین بھی شامل تھیں ، پولیس کی دوڑیں لگواتی رہی ۔ مولانا کے اِن مرد و زن پیروکاروں کی مزاحمت کی بدولت پولیس کے 30 جوان شدید زخمی حالت میں ہسپتالوں میں پڑے ہیں جبکہ مولانا کے عقیدت مندوں کو خراش تک نہیں آئی ۔ میری ناقص رائے میں حکومتِ وقت نے مولانا طاہر القادری کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے کر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔اگر اُنہیں فری ہینڈ دے دیا جاتا تو کوئی قیامت نہ ٹوٹ پڑتی ۔جب حکومت اچھی طرح سے جانتی ہے کہ چوہدری برادران اور شیخ رشید جیسے راندۂ درگاہ سیاست دانوں کے سوا کوئی بھی مولانا کی تحریک کا حصّہ بننے کو تیار نہیں تو پھر اتنی بوکھلاہٹ کیوں ؟۔

حکومت نے بہت اچھا کیا جو مولانا کے طیارے کا رُخ اسلام آباد سے لاہور کی طرف موڑ کر اُس شَر سے قوم کو محفوظ کر دیا جو مولانا صاحب پھیلانا چاہتے تھے ۔ہر صاحبِ دل پاکستانی یہی سوچ رہا تھا کہ راولپنڈی سے لاہور تک کا

زمینی سفر انتہائی خطرناک ہو گا کیونکہ دہشت گردی کے خلاف جس جنگ میں ہم مبتلاء ہیں، وہ کسی بارڈر پہ نہیں بلکہ پورے پاکستان میں لڑی جا رہی ہے اور مولانا صاحب جنھوں نے امریکی اور یورپی طاقتوں کو خوش کرنے کے لیے طالبان کے خلاف کئی صفحات پر مشتمل فتویٰ جاری کر رکھا ہے، وہ اِس زمینی سفر میں طالبان کا آسان ترین ٹارگٹ ہوتے۔ مولانا تو خیر بُلٹ پروف اور بم پروف گاڑی میں ہی ہوتے لیکن اُن کے ہزاروں ہمراہیوں کی جانوں کو بہر حال خطرات لاحق ہوتے اور یہ بھی طے ہے کہ اگر خُدا نخواستہ ایسا کوئی خود کش حملہ ہو جاتا تو مولانا صاحب نے اِس کا ذمہ دار بھی حکومت کو ہی ٹھہرانا تھا۔ وہ تو پہلے ہی حفظِ ما تقدم کے طور پر یہ اعلان فرما چکے ہیں کہ میاں برادران دہشت گردوں کے ساتھی ہیں اور اُن پر دہشت گرد حملہ کروایا جا سکتا ہے اِس لیے فوج اُن کی سکیورٹی سنبھالے۔ حکومت کے طیارے کا رُخ موڑنے کے حکیمانہ اقدام سے مولانا کا یہ ''منصوبہ'' بھی ناکام ہو گیا اور فی الحال شَر پھیلنے سے تو رُک گیا ہے لیکن مولانا صاحب نے طیارے سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا ہے جبکہ وزیرِ اطلاعات پرویز رشید صاحب کے مطابق مولانا کا طیارے سے باہر سے انکار غیر ملکی طیارے کو ہائی جیک کرنے کے مترادف ہے۔ مولانا کا مطالبہ ہے کہ اُنہیں حکومت پر اعتماد نہیں، وہ اپنے گھر جانے کو تیار ہیں لیکن فوج کے اعلیٰ افسران کے ہمراہ۔ ڈاکٹر رحیق عباسی حکومت کا پیغام لے کر طیارے میں پہنچ چکے ہیں۔ فی الحال تو مولانا اپنی ضد پر اڑے

ہوئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر حکومت نے مولانا کو اسلام آباد کی بجائے لاہور ایئر پورٹ پر پہنچا دیا ہے تو انشاء اللہ گھر بھی پہنچا ہی دیا جائے گا۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا

پہلے کراچی ایئر پورٹ کا سانحہ پھر ماڈل ٹاؤن میں لاشوں اور زخمیوں کے انبار اور اب عین اُس وقت پرعلامہ ڈاکٹر طاہر القادری کی پاکستان آمد جب افواج پاکستان دہشت گردی کے خلاف مصروفِ پیکار اور محاذ پورا پاکستان ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ارضِ پاک کو کس کی نظر کھا گئی جو سکوں محال ہوا جاتا ہے اورمایوسیاں ہر گھراور ہر دَر پر بال کھولے سو رہی ہیں ۔ سوچتی ہوں کہ مایوسیوں کے اِس گھور اندھیرے کو مہمیز دوں یا اُمید کی جوت جگائے رکھنے کی سعی کروں ۔مایوسیاں پھیلانے کے لیے تو ہماراالیکٹرانک میڈیا بھی موجود ہے ، حکومت مخالف سیاست دان بھی اور بہت سے کالم نگار بھی اِس لیے میں نے طے کر لیا ہے کہ آگ اور خون کی برستی بارش میں بھی اپنا ہلکا پھُلکا انداز برقرار رکھتے ہوئے اُمیدوں کے چراغ روشن رکھنے کی سعی کرتی رہوں گی ۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر طاہر القادری انقلاب لانے لاہور پہنچ چکے ہیں ۔میں نے اُن کی آمد پر پہلے اپنے کالم کا عنوان ''کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے'' سوچا کیونکہ مُرشد کے بہت سے متوالوں نے ایسے ہی ''بینرز'' اُٹھا رکھے تھے لیکن ایک تواِس میں حکمرانوں کی شدید ناراضی کا خطرہ تھا کیونکہ

پاکستان میں تو ایک ہی ''شیروں کی جماعت'' ہے اور دوسرے عین ممکن تھا کہ مُرشد بھی ناراض ہو جاتے کہ اُنہیں اُن لوگوں کے ساتھ ملا دیا جن کے ساتھ اُن کا عشروں سے ''اِٹ کھڑکا'' چل رہا ہے۔اِس لیے میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ ''شاہین'' والا عنوان محض اِس لیے منتخب کیا کہ ایک تو مُرشد ہمہ وقت محوِ پرواز رہتے ہیں (وہ پَرواز خواہ بذریعہ جہاز ہو یا بذریعہ بشارت) اور دوسرے اُنہیں جھپٹنے ، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کا شوق ہی بہت ہے ۔ وجہ بزبانِ اقبالؒ یہ کہ

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پِسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

مُرشد کو بھی اِن ''جمہوری'' کبوتروں پر جھپٹنے میں بہت مزہ آتا ہے اسی لیے تو وہ'' اپنے وطن'' کینیڈا سے بار بار جھپٹتے اور جھپٹ کر پلٹتے رہتے ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ مُرشد کے'' انقلاب پارٹ ٹُو'' پر حکومت ڈری ، سہمی ، سُکڑی اور بوکھلائی ہوئی ہے ، اسی لیے اُس نے ایمریٹس کے طیارے کا رُخ اسلام آباد سے لاہور کی طرف موڑ دیا اور چوہدری شجاعت حسین سمیت عقیدت مندوں کی کثیر تعداد اسلام آباد کے باہر مُنہ دیکھتی رہ گئی ۔سب سے بڑا'' ہتھ'' تو چوہدری پرویز الٰہی کے ساتھ ہوا جو گجرات میں مولانا کے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے اور اُنہوں نے تو ''کاروانِ انقلاب'' کی پیٹ پُوجا

کے لیے 500 دیگیں بھی پکا رکھی تھیں لیکن حکومتی ''شر پسندوں'' نے طیارے کا رُخ موڑ کر چوہدری صاحب کے انتظام و انصرام کا ''سوا ستیاناس'' مار دیا۔ شنید ہے کہ چوہدری صاحب کئی گھنٹے تک دیگوں کے سامنے بیٹھ کر یہ گنگناتے رہے کہ ''ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں''۔اِس حکومتی ''دہشت گردی'' پر بھرپور احتجاج کا حق تو بنتا ہے دوستو۔اُدھر لال حویلی والے شیخ صاحب اپنے چار افراد پر مشتمل ''عظیم الشان'' قافلے کے ہمراہ راولپنڈی کی سڑکوں پر گھومتے رہے لیکن اُنہیں ایئر پورٹ تک جانے والا راستہ ہی نہ ملا۔ تھک ہار کر اُنھوں نے اپنے ''محبوب'' الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے علامہ صاحب تک اپنی بے بسی اور بیقراری کا عالم پہنچا ہی دیا۔ ہمیں شیخ صاحب کے ساتھ دِلی ہمدردی بھی ہے اور خوشی بھی۔ ہمدردی اِس لیے کہ ایک شیخ دوسرے سے ملاقات نہ کر سکا اور خوشی اِس بات کی کہ شیخ صاحب ''چھینٹی'' سے بال بال بچ گئے۔ دروغ بَر گردنِ راوی، اطلاعات تو یہی ہیں کہ حکومتی کارندوں کو حکم دیا جا چکا تھا کہ اور کچھ ہو نہ ہو، شیخ صاحب جہاں بھی ملیں اُنہیں بھرپور ''گیدڑ کُٹ'' لگائی جائے۔ علامہ صاحب کے طیارے نے جب لاہور ایئر پورٹ پر لینڈ کیا تو کچھ حکومتی اہل کاروں نے طیارے کے اندر جا کر کہا کہ اسلام آباد آ گیا ہے، باہر تشریف لے چلیں، آپ کے ہزاروں چاہنے والے آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔تب مُرشد جلال

میں آ گئے اور ڈانٹتے ہوئے فرمایا ''میں نے ساری زندگی جہازوں پہ سفر کیا ہے کوئی تانگوں'' پر نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ لاہور کا ایئر پورٹ ہے اسلام آباد کا نہیں اِس '' لیے میں ہر گز نیچے نہیں اتروں گا کیونکہ مجھے ''بشارت'' ہوئی ہے کہ باہر پنجاب حکومت نے دہشت گردوں کو پولیس کی وردیاں پہنا کر کھڑا کیا ہوا ہے جن سے میری جان کو شدید خطرہ ہے۔ میں تبھی طیارے سے باہر آؤں گا جب فوجی قیادت بنفسِ نفیس مجھے ''جان کی امان'' کی گارنٹی دے گی'' ۔ علامہ کے اِس انکار پر وزیرِ اطلاعات پرویز رشید صاحب نے میڈیا پر آ کر یہ ''رولا'' ڈال دیا کہ ڈاکٹر طاہر القادری نے طیارہ ہائی جیک کر لیا ہے۔ میں نے جب ایک ''نواز لیگیئے'' سے کہا کہ طیارہ تو حکومت نے اغوا کر کے اسلام آباد کی بجائے لاہور پہنچا دیا اور اب مُرشد پر الزام تراشی کی جا رہی ہے تو اُس نے جواباً کہا ''آپ کی بات بالکل بجا، ہم تو طیارے کو صرف ایک ایئر پورٹ سے دوسرے ایئر پورٹ کی طرف لے کر گئے لیکن ہمیں کیا پتہ تھا کہ طیارے کے اندر ایک بڑا ''دہشت گرد'' بھی موجود ہے جو پورے طیارے کو ہی ہائی جیک کر لے گا''۔ اُس کے اِس بے تُکے اور فضول جواب پر میں سوائے جَل بُھن کر سیخ کباب ہونے کے اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

ہمارے شیخ الاسلام پورے 5 گھنٹوں تک طیارے کی فرسٹ کلاس میں فوجی قیادت کا انتظار کرتے رہے۔ وہ فوجی قیادت کی تلاش میں ''چراغِ رُخِ زیبا'' لے کر

طیارے سے باہر بھی نہیں آ سکتے تھے کہ جان کا خطرہ تھا اور نہ ہی اُن کے پاس اے ایف آئی سی جیسا کوئی ٹھکانہ، جہاں وہ پرویز مشرف کی طرح پناہ لے لیتے اِس لیے چار و ناچار اُنہوں نے اپنی شرائط میں نرمی کرتے ہوئے صرف اسی پر اکتفا کر لیا کہ اُنہیں بُلٹ پروف گاڑی مہیا کی جائے، اُن کے اپنے سکیورٹی گارڈز کو طیارے تک آنے کی اجازت دی جائے اور گورنر پنجاب اُنہیں لینے کے لیے خود طیارے میں آئیں کیونکہ گورنر صاحب برطانیہ کے شہری رہ چکے ہیں اِس لیے اُن پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ بوکھلائی ہوئی حکومت نے اُن کی ساری شرائط مِن و عَن تسلیم کر لیں اور وہ جہاز سے باہر آ گئے ۔ جہاز سے باہر آ کر پتہ نہیں اُنہیں کیا ''بشارت'' ہوئی کہ اُنہوں نے چوہدری پرویز الٰہی کے ساتھ بُلٹ پروف گاڑی میں سفر کرنا مناسب سمجھا اور چوہدری صاحب کی ایئر پورٹ آمد کے بعد ہی وہ محوِ سفر ہوئے۔ اِس طرح ہمارے انقلاب کا پہلا ''سین'' اختتام پذیر ہوا۔ اب مُرشد ماڈل ٹاؤن میں محوِ استراحت ہیں، جونہی وہ باہر آئیں گے دوسرا ''سین'' شروع ہو جائے گا۔

حرفِ آخر یہ کہ راولپنڈی میں مُرشد کے دیوانوں، پروانوں اور مستانوں نے خوب دھمال مچائی اور پولیس کی ایسی ''دھلائی'' کی کہ ''کوئی یہاں گِرا، کوئی وہاں گرا''۔ راولپنڈی کے ہسپتال زخمی پولیس والوں سے بھرے پڑے ہیں۔یقیناً حکومت کو بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ شیخ الاسلام کا انقلاب کیسا

ہو گا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مولانا ایک دفعہ پھر کینیڈا واپس چلے جائیں گے تو یہ اُس کی بھول ہے کیونکہ اب کی بار تو اُنھوں نے اپنی پُرانی جرابیں تک بھی کینیڈا میں نہیں چھوڑیں۔ وہ سفینے جلا کر آئے ہیں اور اب انقلاب لا کر ہی دَم لیں گے۔

جانے نہ پائے

پتہ نہیں ہمارے حکمرانوں کو کیا شوق چُرایا ہے کہ ہمہ وقت ''کڑکی'' تھامے شکار کی تلاش میں رہتے ہیں۔ پہلے ہمارے ''معصوم'' پرویز مشرف کو پھانسا (حالانکہ پیپلز پارٹی نے اپنے دَور میں اُنہیں بہت سینت سنبھال کے رکھا ہوا تھا)۔ عرصہ ہو گیا مشرف تڑپ، پھڑک رہے ہیں لیکن ظالم حکمرانوں کی ''کڑکی'' کا دروازہ کھُلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اُدھر فوجی بھائیوں کو بھی پرویز مشرف کی بے قراری پر دھیان دینے کی فُرصت نہیں کیونکہ وہ خود دہشت گردوں کے شکار پر نکلے ہوئے ہیں۔ اب تو ہمارے کمانڈو کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ طبلے کی تھاپ پر گنگناتے رہتے ہیں کہ

تیرے وعدے پہ جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مَر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

اُدھر میاں نواز شریف صاحب نے نئی ''کچن کابینہ'' بنا لی ہے جس پر چوہدری نثار احمد کا مطلق زور نہیں چلتا۔ نئی کچن کابینہ ''حق کا پرچم لے کر اُٹھو، باطل سے ٹکراؤ۔۔۔ مارو یا مَر جاؤ'' جیسے نسخۂ کیمیا پر عمل کرتے ہوئے کسی بھی صورت پرویز مشرف کا نام ECL سے نکالنے کو تیار نہیں۔ چوہدری

نثار اکثر دِل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے خادمِ اعلیٰ کے پاس آتے رہتے ہیں۔ خادمِ اعلیٰ چوہدری صاحب کی اَشک شوئی کو تو اپنا "فرضِ عین" سمجھتے ہیں لیکن ساتھ ہی مُنہ بسورتے" ہوئے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ بڑے بھائی کے سامنے تو اُن کی "ہلتی انگشتِ شہادت" بھی فالج زدہ ہو جاتی ہے، بھلا زبان کھولنے کی جرات کہاں۔ تسلیم کہ پرویز مشرف کا معاملہ آہستہ آہستہ بوسیدہ ہوتا جا رہا ہے اور عنقریب قصۂ پارینہ بھی بن جائے گا کیونکہ اب الیکٹرانک میڈیا کو بھی مشرف صاحب میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی اور جس کا "کھسرا" الیکٹرانک میڈیا چھوڑ دے وہ تو ویسے ہی منصۂ شہود سے غائب ہو جاتا ہے لیکن حکمرانوں کی تازہ "واردات" ملاحظہ ہو کہ اب وہ FIA نامی "سَٹرکی" لے کر شیخ الاسلام کے شکار کو نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ پرویز رشید کہتے ہیں "طاہر القادری صاحب پرویز مشرف کی طرح آئے تو اپنی مرضی سے تھے لیکن جائیں گے قانون کی مرضی سے"۔ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ کابینہ میں سب سے باخبر وزیرِ اطلاعات ہوتا ہے لیکن اللہ رے بے خبری، ہمارے وزیرِ اطلاعات کو اتنا بھی علم نہیں کہ مُرشد تو اُسی آئین و قانون کی "ایسی تیسی" کرنے کے لیے اپنا "دیس" چھوڑ کر پاکستان تشریف لائے ہیں۔ وہ ایسی "نامعقول جمہوریت" پر لعنت بھیجتے ہیں جس میں ایک مجتہد العصر، ولیٔ کامل، پیرِ طریقت و شریعت، شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر کو عام انتخابات میں صرف ایک ہی نشست کے قابل سمجھا جائے اور باقی سب کچھ جاہل، اُجڈ اور گنوار سمیٹ لے

جائیں۔ ''مولانا انقلاب'' کو بشارت ہوئی ہے کہ اُن کے ''چُٹکی'' بجاتے ہی حکومت غائب ہو جائے گی۔ کچھ عقیدت مندوں نے مُرشد سے دَست بستہ پوچھا کہ کہیں اُن کی چٹکی'' پورا ملک ہی تو غائب نہیں کر دے گی، کیونکہ اُن کے پاس تو کسی اور ملک کی'' شہریت بھی نہیں۔ مُرشد نے جلال میں آ کر نعرۂ مستانہ بلند کیا اور فرمایا ''میری چٹکی میرے حکم کے تابع ہے، ملک کو کچھ نہیں ہو گا۔ یہ چٹکی صرف اُن کے لیے بنائی گئی ہے جو ''ایویں خوامخواہ'' اپنے احسان گنواتے رہتے ہیں''۔ حکمرانو! ہوشیار باش، یہ الطاف بھائی کی '' بڑھکیں'' نہیں بلکہ سَچ مُچ ایسا ہونے جا رہا ہے اور ڈرو اُس وقت سے جب چٹکی'' کا وقت قریب آن لگے۔''

کچھ عقل سے عاری کہتے ہیں کہ طاہر القادری صاحب کا تو حال اُس شخص جیسا ہے جو خالی جیب میلے میں جا گھُسے، اسی لیے وزیرِ اعظم صاحب نے بھی کہا تھا '' پلّے نئیں دھیلہ، تے کَردی میلہ میلہ'' ۔طاہر القادری کی پٹاری میں ہے ہی کیا سوائے چوہدری برادران اور شیخ رشید جیسے کھوٹے سکوں کے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اِن عقل کے دشمنوں کو نہیں پتہ کہ کبھی کبھی کھوٹا سِکّہ بھی کام آ جاتا ہے اور پھر وہ پیرِ طریقت و شریعت ہی کیا جو کھوٹے کو کھَرا ثابت نہ کر سکے۔ دُنیا دیکھے گی کہ ہماری انقلابی فوج کے میمنہ اور میسرہ سنبھالنے والے چوہدری برادران اور شیخ رشید ہی انقلاب لائیں گے۔ ویسے تو

انقلابی مارچ'' کے لیے مُرشد نے مُحترم عمران خاں کو بھی ''لاہوری صُلح' ماری تھی'' لیکن خاں صاحب ایسے ''بِتّی'' ہوئے کہ جان چھڑانی مشکل ہو گئی ۔وہ تو ''پھڈا'' اِس بات پہ پڑ گیا کہ انقلابی مارچ کی قیادت کون کرے گا ؟۔خاں صاحب کا فرمان تھا کہ تباہ کاریوں میں اُن کی ''سونامی'' کا کوئی ثانی نہیں جبکہ شیخ الاسلام ''ضدّی خاں'' کو یہ سمجھاتے سمجھاتے ''اوازار'' ہو گئے کہ اُن کے عقیدت مندوں کے بحرِ بے کنار کے مقابلے میں سونامی '' ککھ'' بھی نہیں ۔اُنہوں نے تو خاں صاحب کو یہ بھی کہا کہ وہ اپنی سونامی کا موازنہ اُن کے جیالے مریدین سے کر کے دیکھ لیں جنہوں نے راولپنڈی میں پولیس کو ایسی ''پھینٹی'' لگائی کہ اب راولپنڈی کی آدھی پولیس ہسپتالوں میں پڑی ہائے ہائے کر رہی ہے ۔ دونوں اپنی اپنی ضِد پر اَڑے رہے اور پھر راہیں جُدا ہو گئیں ۔اِس کے باوجود مقصد پھر بھی ایک کہ میاں برادران کو سعودی عرب بھیج کر ہی دَم لیں گے ۔ہم بھی انتظار میں ہیں کہ جیت کا سہرا کِس کے سَر بندھتا ہے ۔ جو بھی کامیاب ہوا ہم اُسی کی جانب ''لُڑھک'' جائیں گے۔خاکم بدہن ، اگر دونوں ہی ناکام ہو گئے تو پھر نواز لیگ تو ہے ہی ۔ ویسے بھی لوگ اب تک تو ہمیں ''نواز لیگیا'' ہی سمجھتے ہیں ۔اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم لوٹے بلکہ ''لوٹی'' ہیں تو اُسے اپنا قبلہ درست کر لینا چاہیے کیونکہ ایک بہت معروف مذہبی سکالر جب ایک چینل سے ''پھُدک'' کر دوسرے چینل میں گئے تو اُنہوں نے فرمایا'' چینل کوئی مذہب نہیں ، جسے تبدیل نہ کیا جا سکے'' ۔اُن کے اِس

ارسطوانہ فتوے کو سیاستدانوں پر بھی ''اپلائی'' کیا جا سکتا ہے اور ہم لکھاریوں پر بھی کیونکہ سیاسی جماعت بھی کوئی مذہب تو نہیں کہ جسے تبدیل نہ کیا جا سکے اور ہم لکھاریوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ جب جی چاہے پارٹی بدل لیں۔اگر کوئی نا معقول ہمیں چڑھتے سورج کا پجاری'' کہے تو کہتا رہے، ہمارے پاس تو ''عظیم'' مذہبی سکالر کا فتویٰ'' موجود ہے۔

یوں تو حکمران کپتان صاحب کو بھی پھانسنے کے لیے اُن کے گرد گول گول گھومتے رہتے ہیں لیکن کپتان صاحب بھی بڑے کائیاں ہیں۔وہ کبھی اونچا شارٹ کھیلتے ہی نہیں جو کیچ ہونے کا خطرہ ہو یہ الگ بات ہے کہ بڑے میاں صاحب پھر بھی ''گگلی''پھینکنے سے باز نہیں آتے۔پہلے عیادت کے بہانے شوکت خانم چلے گئے، پھر خاں صاحب نے ضِد کی تو چیف آف آرمی سٹاف سے ملاقات کروا ڈالی۔وزیرِ اعظم ہاؤس میں چائے کی دعوت پر بلانے کی کوشش کی، بات نہ بنی تو خاں صاحب کے گھر ''بنی گالہ'' جا پہنچے اور اب جب کہ خاں صاحب بہاولپور میں جلسے کی تیاریوں میں مصروف تھے تو پروگرام کو تہس نہس کرنے کے لیے بنّوں کے آئی ڈی پیز کیمپس کا دورہ کرنے کی دعوت دے ڈالی اور ساتھ ہی یہ لالچ بھی کہ جنرل راحیل شریف بھی وہاں موجود ہونگے۔خاں صاحب نے بھی چھکا'' مارتے ہوئے رانا ثنا اللہ کے ''تیلی پہلوان'' کو ساتھ بھجوا دیا اور خود'' بہاولپور جا کر ایسا ''کھڑاک'' کیا کہ حکمرانوں کے چودہ کیا چوبیں طبق روشن ہو گئے ۔اب اُنھوں نے چار

سیٹوں کی بجائے پورے الیکشن کو ماننے سے ہی انکار کر دیا ہے اور حکومت کو ایک ماہ کا الٹی میٹم'' دیتے ہوئے چار ایسے مطالبات پیش کیے ہیں جنہیں پورا کرنا حکومت کے دائرۂ اختیار میں ہی نہیں۔اب 14 اگست کو خاں صاحب کم از کم 10 لاکھ سونامیوں کے ساتھ اسلام آباد پہنچیں گے اور پھر دما دَم مَست قلندر۔ویسے خاں صاحب نے یا تو کَسرِ نفسی سے کام لیا ہے یا پھر جوشِ جذبات میں اُن کی زبان ''غوطہ'' کھا گئی اور وہ لاکھ کہنے کی بجائے 10 لاکھ کہہ گئے۔اگر شیخ الاسلام ایک کروڑ انقلابیوں کے 100 ساتھ باہر نکل سکتے ہیں تو کیا خاں صاحب اتنے ہی ''گئے گزرے'' ہیں کہ ایک کروڑ سونامیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے؟۔

لانگ مارچ یا کوئیک مارچ

ماہِ صیام کا رحمتوں بھرا عشرہ شروع ہو گیا۔ ویسے تو رحمتیں سمیٹنے کا موقع ہمارے قاسم مسجد والے مفتی شہاب الدین پوپلزئی نے ایک دِن پہلے ہی اُس وقت فراہم کر دیا تھا جب انہوں نے رات 12 بجے ''چاند چڑھایا'' اور پھر اپنے ''پوپلے'' مُنہ سے چاند کی رویت کا اعلان بھی کر دیا لیکن ہم ٹھہرے سدا کے ''بَد نصیب'' جو اِس موقعے سے استفادہ نہ کر سکے۔ دروغ بَر گردنِ راوی مفتی پوپلزئی کے پاس ایک بہت لمبا سا بانس ہے جس پر ہر وقت ایک چاند لٹکا رہتا ہے اور جب مفتی صاحب کا موڈ بنتا ہے وہ بانس پکڑ کر چاند چڑھا دیتے ہیں۔ مفتی پوپلزئی تو چاند چڑھانے میں ''خود کفیل'' ہیں لیکن ہمارے رویت ہلال کمیٹی والے مفتی منیب الرحمٰن ہمیشہ ''پھڈا'' ڈال دیتے ہیں۔ وہ مفتی پوپلزئی کے چاند کو چاند سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ چونکہ دونوں ہی مفتی ہیں اور دونوں ہی درست کیونکہ ''مفتی'' کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا اِس لیے ''چُپ کر، دَڑ وَٹ جا''۔۔۔ ماہِ صیام میں روزہ دار اور ذخیرہ اندوز دونوں ہی فائدے میں رہتے ہیں، روزہ دار رَب کی رحمتیں اور برکتیں سمیٹ کر جبکہ ذخیرہ اندوز کئی گُنا منافع کما کر۔ کچھ لوگ اگر کماتے بے تحاشہ ہیں تو رَب کی راہ میں خرچ کرنے میں بُخل سے کام نہیں لیتے۔ انہی میں سے ایک بحریہ ٹاؤن کے چیئرَ مین ملک

ریاض بھی ہیں ۔اُنھوں نے پاکستان کے 471 امیر ترین لوگوں کو شرم دلاتے ہوئے شمالی وزیرستان کے ایک چوتھائی آئی ڈی پیز کی مکمل کفالت کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ دیا کہ وہ آپریشن "ضربِ عضب" کو کامیاب بنانے کے لیے پاک فوج اور حکومت کی تمام ضروریات پوری کرنے کو تیار ہے خواہ اِس پر اربوں روپے ہی خرچ کیوں نہ ہو جائیں ۔اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اُنھوں نے اپنے 75 فیصد اثاثے صرف اور صرف پاکستان کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مختص کر دیئے ہیں۔حیران ہوں کہ ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو ہر وقت اپنا تَن مَن دَھن ارضِ پاک پر نچھاور کرنے کو تیار رہتے ہیں جبکہ دوسری طرف وہ ذخیرہ اندوز جنھیں ملک و قوم کی پرواہ، نہ دین کی ۔اُن کا اللہ ، رسول ، دین ، ایمان سب کچھ پیسہ ہے اور وہ ہمیشہ اِس تاک میں رہتے ہیں کہ کب اور کیسے پیسہ کمایا جائے ۔ماہِ صیام میں اُن کی حریص آنکھوں کی چمک میں کئی گُنا اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ اسی ماہ میں اُن کی تجوریاں لبا لَب ہو جاتی ہیں ۔اور ہم جیسے مُنہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔اِس ماہِ صیام پر پتہ نہیں ہم سے کیسے "چُوک" ہو گئی جو سحر و افطار کے لیے اشیائے خور و نوش کا ذخیرہ کرنے سے بے نیاز رہے ۔پھر جب سحری و افطاری کا سامان خریدنے نکلے تو پتہ چلا کہ بازار میں تو ہر شَے ڈالروں کے بھاؤ مِل رہی ہے ۔لاکھ سَر پٹکا لیکن ہر شَے پہنچ سے باہر۔تھک ہار کر سبزی کی دوکان پہ کھڑے ہو گئے اور سبزی فروش سے سبزیوں کے بھاؤ معلوم کرنے لگے۔جب پانچ ، چھ سبزیوں کے بھاؤ پوچھ

چکے تو سبزی فروش نے تَپ کر کہا ''آپ کے مطلب کی کوئی سبزی میرے پاس نہیں''۔
اُس مُنہ پھَٹ اور زبان دراز کے کورے جواب نے ہمارے تَن بدن میں چنگاریاں تو ضرور بھریں لیکن کر بھی کیا سکتے تھے سوائے خون کے گھونٹ پینے کے۔ البتہ دِل میں یہ ضرور سوچا کہ ایسے نا معقولوں کا علاج کپتان صاحب کا '' لانگ مارچ''ہی ہو سکتا ہے۔اِس لیے مصمم ارادہ باندھ لیا کہ اب تو ہم بھی اِس لانگ مارچ میں ضرور شریک ہونگے ۔اگر کسی سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر خاں صاحب نے اپنا لانگ مارچ ملتوی کر دیا تو پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہمارے ''بابائے انقلاب'' ڈاکٹر طاہر القادری تو کرکے یہ ثابت کر دیا کہ اب APC میدان میں ہیں ہی ۔اُنھوں نے تو ایک بھرپور انقلاب ''آوے ای آوے''۔اقبالؒ نے کہا

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرورِ اوّل ، دیتے ہیں شراب آخر

ہمارے شیخ الاسلام بھی چونکہ '' وہیں کہیں کے'' ہیں اِس لیے اُنھوں نے بھی یہی '' نسخۂ کیمیا'' استعمال کرتے ہوئے APC کا مشترکہ اعلامیہ اُس کے انعقاد سے پہلے ہی تیار کر لیا APC کے مقررین اپنا جوشِ خطابت دکھا رہے تھے ،اِدھر نیوز چینلز کے ۔اُدھر شریر'' بار بار مشترکہ اعلامیہ کی کاپی دکھا ناظرین کو محظوظ کر رہے تھے۔مُرشد کی اِن '' پھُرتیوں'' کو دیکھ کر تو''

ہمیں بھی یقین ہو چلا ہے کہ دنوں مہینوں میں نہیں بلکہ گھنٹوں میں بھی انقلاب آ سکتا ہے۔ویسے بھی پورے ملک کی ''کریم'' تو مُرشد کی قیادت میں اکٹھی ہو گئی ہے اور جہاں چوہدری برادران ، شیخ رشید ، احمد رضا قصوری ، اور غلام مُصطفیٰ کھَر جیسے عقیل و فہیم اور مقبول ترین لیڈر اکٹھے ہو جائیں اور جس انقلابی تحریک کو الطاف بھائی کی بڑھکوں کا تَڑکا'' نصیب ہو جائے اُس کی کامیابی تو اظہر من الشمس ہے۔ کپتان صاحب'' البتہ کچھ اُکھڑے اُکھڑے سے ہیں لیکن شیخ رشید کا دعویٰ ہے کہ وہ خاں صاحب کو بھی بابائے انقلاب'' کی قیادت پر راضی کر لیں گے۔جہاں اتنے سارے امر ، اکبر ، انتھونی'' اکٹھے ہو جائیں وہاں انقلاب تو ''آوے ای آوے''۔بس ذرا ماہِ صیام کو گزر لینے دیجیئے پھر آپ ''سٹار پلس'' کے ڈرامے بھول جائیں گے کیونکہ جہاں مُرشد کا دِل پذیر خطاب ، الطاف بھائی کی بڑھکیں ، شیخ رشید کے ''پھوکے فائر'' ہوں ، چوہدری پرویز الٰہی کی ''اللہ کے فضل و کرم سے'' کی گونج ہو اور جنابِ پرویز مشرف کے ''گُلو بَٹ'' احمد رضا قصوری آئینی و قانونی مُو شگافیوں کے لیے موجود ہوں وہاں بھلا ''سٹار پلس''کی کیا حیثیت۔ویسے اگر شیخ رشید کے دعوے کے مطابق خاں صاحب کی سونامی ساتھ نبھانے کو تیار ہو گئی تو اِس کے دو فائدے ہونگے۔ایک تو یہ کہ سبھی ''یارانِ مشرف''ایک بار پھر اکٹھے ہو جائیں گے اور دوسرے ایسے حکمرانوں سے بھی جان چھوٹ جائے گی جو ایویں خواہ مخواہ'' ملکی ترقی کا بہانہ بنا کر پاکستان کو یورپ بنانے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ بندہ''

پوچھے اچھے بھلے ''اسلامی پاکستان'' کو یورپ بنانا بھلا کہاں کی عقلمندی ہے ؟۔ بھلے ہمارا لانگ مارچ ، کوئیک مارچ ہی میں کیوں نہ بدل جائے ،ہم حکمرانوں کی اِس سازش کو ہر گز کامیاب نہیں ہونے دیں گے کیونکہ اگر حکمران کامیاب ہو گئے تو پھر تو ''ہماری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں ''۔اگر ہم نہیں تو پھر قوم کے لیے'' کوئیک مارچ'' ہی بہتر ہے۔ ویسے بھی لانگ مارچ اور کوئیک مارچ میں فرق ہی کتنا ہے، لانگ مارچ سیاستدان خود کرتے ہیں جبکہ کوئیک مارچ فوجی بھائی سیاستدانوں کو کروادیتے ہیں جس کا قوم کی صحت پر تو ''ککھ'' اثر نہیں پڑتا البتہ سیاستدانوں کو ''تریلیاں'' ضرور آنے لگتی ہیں۔

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا

پروفیسر مظہر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

ذاتی خواہشوں کے صحرا میں بھٹکنے والے کیا جانیں کہ اُن کا فرض اور دھرتی کا قرض کیا ہے ۔اہلِ دانش جانتے ہیں کہ اُن کا تصوراتی و تخیلاتی ''انقلاب'' محض سراب اور اُن کا بحرِ بے کنار محض حباب۔ درآمدی ''ہُنر مند'' کے قلب و ذہن میں چھپے زہر سے آگہی ضروری مگر قوم کو آگاہ کون کرے کہ قائدانہ صلاحتوں کا قحط ۔سرخ آندھیاں اٹھنے کو بے تاب مگر فکر و نظر، فہم و ادراک اور بصارت و بصیرت جنسِ نایاب۔بصیرت سے محروم حکومتی ''صلاح کار'' ایک ایسے شخص کے تنِ مردہ میں پھر سے روح پھونک گئے جسے عدالت نے ''مسلمہ جھوٹا'' اورایسا نفسیاتی مریض قرار دیا جو بے ساختہ جھوٹ بولتا ہے۔ جھوٹ کی انتہا یہ کہ ان کے دعوے کے مطابق انہوں نے ایک ہزار ضخیم تصانیف ، ہزاروں لیکچرز اور دنیاکے 90 ممالک میں خطبات اور دیگر بے پناہ مذہبی و سیاسی سرگرمیاں 2005ء سے 2012ء تک محض سات سالوں میں سرانجام دیں ۔شاید'' حضرت'' جانتے ہونگے کہ قوم ''حساب کتاب'' میں ذرا کمزور ہے ۔ویسے اگر کوئی حساب کرنے بیٹھ جائے تو تصانیف ، خطبات اور لیکچرز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ''حضرت'' کی عمراِس وقت بھی کم از کم ڈیڑھ سو سال تو ہونی چاہیے ۔حکومتِ پنجاب کی بوکھلاہٹ کے طفیل

محترم کا سیاسی قد اونچا ہوا۔ سنا تو یہی تھا کہ خادمِ اعلیٰ کی صوبہ پنجاب پر گرفت اتنی مضبوط ہے کہ ان کی مرضی کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا لیکن سب ''ڈھول کا پول'' ۔خادمِ اعلیٰ کی ناک کے عین نیچے اتنا بڑا سانحہ ہو گزرا لیکن انہیں خبر تک نہ ہوئی ۔پتہ نہیں حکمرانوں کے ہاں اتنا قحط الرّجال کیوں ہے۔ مانا کہ

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا

زمیں کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے

حکمرانوں کا ''میڈان پاکستان'' ہونا شک و شبہ سے بالاتر لیکن ''صلاح کاروں کی بصارت و بصیرت پر مطلق نظر نہیں ۔معیار محض ذاتی تعلق، استواریٔ وفا اور استرضا۔ بجا کہ ایسے لوگ کسی بھی سیاسی جماعت کا انمول اثاثہ ہوتے ہیں لیکن مدِ نظر رہے کہ ''عقلِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اواست'' ۔اور یہ بھی کہ ہوسِ جاہ کے بھوکے بھیڑیے محض پلک جھپکنے کے منتظر۔ جلسے جلوسوں، لانگ مارچوں اور دھرنوں سے حکومتیں تبدیل نہیں ہوا کرتیں البتہ فوج ۔۔۔۔ مانا کہ فوج بعد از خرابیٔ بسیار اپنی حدود و قیود پہچان چکی، یہ بھی تسلیم کہ پاکستان کے حالات لیبیا جیسے ہیں نہ مصر و شام جیسے ۔بلاشبہ نواز لیگ کے پاک فوج کے ساتھ جتنے بہتر تعلقات آج ہیں، پہلے کبھی نہ تھے اور سب سے بڑھ کر چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف کا ''فوجی مزاج'' کسی بھی طالع آزمائی کی راہ

میں سب سے بڑی رکاوٹ۔ لیکن یاد رہے کہ حکومت کو دباؤ میں رکھ کر اپنی بات منوانے کے لیے کسی کا کندھا بھی تھپتھپایا جا سکتا ہے۔اس لیے بس اتنی سی احتیاط کہ

اتنا نہ اپنی جائے سے باہر نکل کے چل
دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ، سنبھل کے چل

اس وقت ملکی سلامتی کو بیک وقت دہشت گردوں اور سیاسی مداریوں سے خطرہ ہے اور ایجنڈا دونوں کا ایک ،افراتفری محض افراتفری اور نتیجہ انارکی ۔ مولانا قادری تو کسی بیرونی ایجنڈے کی تکمیل کی خاطر ہر سال پاکستان پر یلغار کر دیتے ہیں لیکن کیا عمران خاں بھی ؟ ۔۔۔ ہرگز نہیں ، خاں کی حب الوطنی کسی بھی شک و شبے سے بالاتر ہے ، لیکن وہ جو ہم سمجھتے تھے کہ صحرائے سیاست کی سترہ سالہ آبلہ پائی کے بعد خاں صاحب میدانِ سیاست کے منجھے ہوئے کھلاڑی بن چکے ہونگے لیکن ہمارا خیال غلط نکلا۔ وہ تو ابھی تک وہیں کھڑے ہیں جہاں سے آغازِ سفر کیا تھا۔ارسطو نے کہا "ہر غلطی آپ کو کچھ نہ کچھ سکھا سکتی ہے بشرطیکہ آپ سیکھنا چاہیں"لیکن خاں صاحب تو شاید سیکھنے کے موڈ میں ہی نہیں کیونکہ اگر انہوں نے کچھ سیکھا ہوتا تو تحریکِ انصاف کبھی بھی جھوٹ کی فصل کو ہوسِ جاہ کی ٹپکتی رالوں سے پروان چڑھانے کی تگ و دو کرنے والے کی APC میں شرکت کرکے زانوئے تلمذ تہ کرتی نہ حالت جنگ میں کسی لانگ مارچ کا اعلان

کرتی ۔"کالمی درویشوں" والے سینئر لکھاری نے بار بار کہا اور لکھا کہ "کپتان جھوٹ نہیں بولتا" لیکن خاں صاحب کی مختصر سی سیاسی زندگی سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہیں سچ بولنے کی عادت ہی نہیں اور ان کی سیاسی دوکان پر سب کچھ بکتا ہے سوائے سچ کے ۔یوں تو بہت سے حوالے دیئے جا سکتے ہیں لیکن منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے محض اتنا ہی کہ خاں صاحب صالح قیادت کا علم بلند کرکے نکلے لیکن

ابتداء ہی میں مر گئے سب یار

عشق کی کون انتہا لایا

انہوں نے ایسے "صالحین" اکٹھے کیے کہ خود ہی کہنا پڑا "سبھی نہیں لیکن اکثریت صالح افراد پر مشتمل ہو گی"۔ پھر کمند یہاں ٹوٹی کہ "آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے ، انہیں سے گزارہ کرنا پڑے گا"۔جب ان کے اس فرمان پر ہلچل مچی تو فرما دیا کہ انتظار کریں ٹکٹ صرف "صالحین" کو ہی دیا جائے گا۔الیکشن کے بعد ایسے صالحین منتخب ہوئے جو باہم جوتم پیزار۔دعویٰ یہ کہ 90 دن میں ملک کی تقدیر بدل دیں گے لیکن 400 دنوں میں ایک چھوٹے صوبے کی تقدیر بھی نہ بدل سکے۔الیکشن کے ہنگام چیف جسٹس ، چیف الیکشن کمشنر ، نگران وزیرِ اعظم ، نگران وزرائے اعلیٰ خصوصاً نجم سیٹھی پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور ضد کرکے عدلیہ کی زیرِ نگرانی انتخابات کروائے لیکن الیکشن

ہارنے کے بعد سبھی چور ٹھہرے اور ریٹرننگ آفیسرز کا کردار ''شرمناک'' ۔میں نے بطور پریزائیڈنگ آفیسر کئی انتخابات میں ڈیوٹی دی اس لیے خوب جانتا ہوں کہ پولنگ کا وقت ختم ہونے سے زیادہ سے زیادہ 2 سے 3 گھنٹے بعد نتیجہ پولنگ ایجنٹس کے ہاتھ میں اور رات 9 بجے تک تقریباً ہر امیدوار کے پاس مکمل رزلٹ پہنچ جاتا ہے ۔اگر رات ساڑھے گیارہ بجے میاں صاحب نے کارکنوں کا شکریہ ادا کر دیا تو اس میں دھاندلی'' کہاں سے آ گئی ؟۔اگر ریٹرننگ آفیسرز واقعی نواز لیگ کے قبضۂ قدرت'' میں تھے تو کیا میاں برادران فاتر العقل تھے جو دھاندلی کا انتظام قبل ار وقت کرنے کی بجائے ریٹرننگ آفیسرز کو اپنا پیغام الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پہنچاتے ؟۔اگر دھاندلی اسی کا نام ہے تو پھر خاں صاحب جو الیکشن سے پہلے نیوز چینلز کے اینکرز کو لکھ لکھ کر دے رہے تھے کہ وہ دو تہائی اکثریت سے جیتیں گے ، اسے کیا نام دیں گے ؟۔بین الاقوامی ''پول'' اور تجزیے تو نواز لیگ کی ہی واضح اکثریت دکھا رہے تھے پھر وہ کونسا غیبی''ہاتھ تھا جس نے خاں صاحب کو دو تہائی اکثریت کی یقین دہانی کروائی ؟۔اگر'' تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو نواز لیگ تو اُس وقت بھی قومی اسمبلی کی 90 سے زیادہ سیٹیں اور پنجاب کی حکومت بھی لے گئی جب وہ اپنے بدترین دشمنوں میں گھری ہوئی تھی ۔اس وقت تو یہ عالم تھا کہ بہت سی سیٹوں پر نواز لیگ کو مناسب امیدوار ہی نہ ملے لیکن جہاں بھی اُن کے امیدوار کھڑے ہوئے ، تقریباً جیتے ۔کیا اُس وقت میاں برادران نے پرویز مشرف کے ساتھ مل

کر دھاندلی کی تھی ؟۔ انداز مزاحیہ سہی لیکن سچ کہا ہے پرویز رشید صاحب نے کہ اگر نواز لیگ کے بس میں ہوتا تو وہ پنکچر لگانے کی بجائے تحریکِ انصاف کی پوری ٹیوب ہی پھاڑ دیتی ۔اہلِ سیاست نہ سہی لیکن قوم تو دیکھ رہی ہے کہ ایک طرف تو دہشت گردی کے خلاف اللہ کے سپاہی مصروفِ جہاد، شمالی وزیرستان کے انسانوں کا سمندر، گرمی اور بھوک سے بلک بلک کر جان ہارنے والے شیر خوار، سنگلاخ چٹانوں پر پیدل سفر کرتی بوڑھی عورتیں اور ناتواں کہن سالہ مرد جبکہ دوسری طرف ہوسِ اقتدار کے حریص سب کچھ تہس نہس کرنے کے لیے تیار۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ

اِس دورِ منور میں سرِ ارض ہے جیسا
انساں کو ایسا کبھی خونخوار نہ دیکھا

رحمتیں، برکتیں، مغفرتیں سمیٹ لو

حکمت کی عظیم الشان کتاب کہتی ہے کہ رَب کو جاننے والے اُس کے عالم بندے ہیں اور میرے آقاﷺ کا فرمان ہے ''ایک عالم ہزار عابدوں سے وقیع ہے''۔ یہ بھی فرما دیا گیا کہ علم حاصل کرو خواہ کہیں سے بھی ملے۔ آقا کے اِس فرمان سے واضح ہوتا ہے کہ علم سے مراد صرف دینی علم ہی نہیں بلکہ علم کی ہر شاخ ہے کیونکہ کسی غیر مسلم سے تو دینی علم کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ علم کی فضیلت اِس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ خاتم المرسلینؐ کا فرمان ہے کہ حصولِ علم کا ایک ایک لمحہ عبادت میں گزرتا ہے۔ قُرآنِ مجید اور احادیثِ مبارکہ میں حصولِ علم پر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ اسی کی بدولت ہمیں اللہ، رسول اللہ اور دینِ مبیں کا ادراک ہوتا ہے اور یہی رَبِ لازوال اور رحمتِ دو عالم کی محبت کا باعث بنتا ہے لیکن کم علمی اور کَج فہمی کی بنا پر ہماری عبادات رَبِ کردگار کے ہاں مستجاب نہیں ہوتیں۔ ہماری نمازوں میں سرور نہیں، روزے محض فاقہ کشی، زکواۃ و حج محض نمود و نمائش اور جسے اللہ حج کی توفیق دیتا ہے، اُسے حاجی کہلانے کا اتنا شوق کہ اگر حاجی نہ کہیں تو اُس کی جبیں شِکن آلود ہو جاتی ہے۔ زکواۃ ہم ایسے دیتے ہیں جیسے کسی پر احسان کر رہے ہوں حالانکہ حضورؐ کا حکم ہے کہ خیرات ایسے کرو کہ اگر دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں کو خبر نہ

ہو۔ عبادات کا ہماری نجی زندگی پر پرکاہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ ایسی عبادات کی رَبِ کردگار کو قطعاً ضرورت نہیں اسی لیے فرما دیا گیا ''اے نبی! ہم تمہیں بتائیں کہ اِن میں سب سے زیادہ بَد نصیب کون ہے۔ وہ جس کی عبادتیں قیامت والے دِن ہم اُس کے مُنہ پر دے ماریں گے''۔

ماہِ صیام میں افطار پارٹیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ لاریب کسی روزہ دار کو افطاری کروانا عین ثواب ہے لیکن افطاری تو اُسی کا حق ہے جو خود اِس کی استطاعت نہ رکھتا ہو جبکہ ہماری افطار پارٹیوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو نانِ جویں کا محتاج ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنی ہی قبیل کے لوگوں کو اکٹھا کرکے نمائش کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ محض اِس لیے ہے کہ ہم نے تحصیلِ علم کو ثانوی حیثیت دے رکھی ہے اور ہر حکومت سالانہ بجٹ میں تعلیم و تعلم کے لیے بقدرِ قطرۂ شبنم رقم مختص کرتی ہے۔ صاحبِ حیثیت لوگ شعبۂ تعلیم کی طرف آئے ضرور لیکن محض پیسہ بٹورنے کے لیے۔ آپ کو اسی معاشرے میں ایسے لوگ ملیں گے جنھوں نے پیسے کے زور پر سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کھولیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا شمار پاکستان کے 400 امیر ترین لوگوں میں ہونے لگا۔ ایسے اداروں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کا محض خواب ہی دیکھا جا سکتا ہے اور نانِ جویں کے محتاج تو ایسے خواب دیکھنے سے بھی پرہیز ہی کرتے ہیں۔ یہ بجا کہ تعلیم و تعلم کو کاروبار میں

ڈھالنے والوں نے دولت تو ڈھیروں ڈھیر اکٹھی کر لی لیکن اگر کوئی کہے کہ وہ دین کی خدمت کر رہے ہیں یا ملک و قوم کی تو اِس سے بڑا جھوٹ کوئی نہیں ہو گا۔ میرا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ سبھی لوگ ایسے ہیں کیونکہ میں ذاتی طور پر چند ایسے اداروں کو جانتی ہوں جنھوں نے اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کی خاطر ترسیلِ علم کا بیڑا اُٹھایا۔ بِلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ''غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ'' اِن میں سے ایک ہے۔

ایک چبوترے پر قائم کی گئی اسلام کی اولین درسگاہ کا نام ''صفہ'' تھا جہاں نادار صحابہ ا کرام بیٹھا کرتے اور میرے آقا نہ صرف اُن کی تمام حاجتیں پوری کرتے بلکہ اُنہیں درس بھی دیا کرتے تھے۔ آقا کے تتبع اور سُنتِ رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے کچھ اصحاب نے تعلیم و تعلم کے لیے ''غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ'' قائم کر کے محیر العقول کارنامہ سرانجام دیا۔ غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ نے کالم نگاروں کے اعزاز میں ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا اور مجھے بھی اپنے صدر دفتر میں آنے کی دعوت دی۔ میں نے لیت و لعل سے کام لیا۔ وجہ یہ تھی کہ میں اکثر ایسے پروگراموں میں شمولیت سے گریز ہی کرتی ہوں لیکن تکرار اور اصرار ہی اتنا تھا کہ انکار کا یارا نہ رہا۔ جب میں وہاں پہنچی تو دیکھا کہ وہاں ملک کے چیدہ چیدہ صحافی اور لکھاری موجود تھے اور سید وقاص جعفری ڈاکومنٹری کے ذریعے اُنہیں ٹرسٹ کے مختلف تعلیمی منصوبوں سے آگاہ کر

رہے تھے۔یقین مانیئے کہ اگر میں ''غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ'' نہ جاتی تو نہ صرف قوم کے اِن باہمت جوانوں کے ساتھ تعارف سے محروم رہتی بلکہ حضرتِ اقبالؒ کے اِس شعر پر میرا ایمان بھی ہمیشہ متزلزل رہتا کہ

نہیں ہے نہ اُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نَم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

تہی داماں ''غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ'' کے اربابِ اختیار نے وہ کچھ کر دکھایا جو ستاروں پہ کمند ڈالنے کے مترادف ہے۔ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ بڑی بڑی NGO's تعلیمی ادارے کھولنے کے لیے بڑے بڑے شہروں کا انتخاب کرتی ہیں اور پھر انہی اداروں کی آڑ میں ڈھیروں ڈھیر ملکی وغیر ملکی امداد بھی اکٹھی کرتی رہتی ہیں لیکن پتہ نہیں یہ کیسے لوگ ہیں جنہوں نے ایسے چھوٹے چھوٹے گاؤں ، قصبوں اور دور دراز بستیوں کا رُخ کیا جن کا نام سُن کر بھی اشرافیہ کی روحیں لرز اُٹھتی ہیں شاید یہ وہی مردانِ حُر ہوں جنہیں اقبالؒ کا یہ سبق یاد ہو کہ

تُو بچا بچاکے نہ رکھ اسے ، تیرا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے ، نگاہِ آئنہ ساز میں

غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ نے 1995ء میں پاکستان کے دور دراز پسماندہ دیہاتوں میں

کم اور بے وسیلہ خاندانوں تک علم کی رسائی کا بیڑا اُٹھایا اور محض 18 سالوں میں 35 اضلاع میں 325 سکول قائم کرکے پاکستان کے سب سے بڑے تعلیمی نیٹ ورک کا اعزاز حاصل کر لیا۔اِن سکولوں میں 2400 سے زائد اساتذہ اور 48000 سے زائد طلباء تعلیم و تعلم کی شمعیں روشن کیے ہوئے ہیں۔وسائل کی قلت کے باوجود یہ مردانِ حق شناس صبح و مساء تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ٹرسٹ کے سکولوں میں 24000 سے زائد یتیم و مستحق بچوں کو نصابی کُتب سے لے کر یونیفارم تک تعلیمی ضرورت کی ہر شئے مفت فراہم کی جاتی ہے اور اِن بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے عیدین اور دیگر تہواروں پر بچوں میں تحائف بھی تقسیم کیے جاتے ہیں۔ٹرسٹ کے اربابِ اختیار اب ہر ضلع میں ایک ماڈل سکول اور مرکزی سطح پر یونیورسٹی کے قیام کے علاوہ ٹیکنکل کورسز کے اجراء اور ایک ہزار سے زائد معذور بچوں کو تعلیم کی فراہمی کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔وطنِ عزیز کے طول وارض میں علم کی شمعیں روشن کرنے کا عزم لے کر نکلنے والے یہ اصحاب اپنے اِس مقصد میں بھی انشاء اللہ ضرور کامیاب ہونگے۔اِن کی کامیابی اظہر مِن الشمس سہی لیکن کیا ہمارا فرض نہیں کہ ہم دامے ، درہمے ، قدمے ، سخنے اِن کی مدد اور حوصلہ افزائی کریں ؟۔ماہِ صیام کا تقاضہ تو یہی ہے کہ آپ اپنی زکواۃ کے لیے ایسے اداروں کا انتخاب کریں جو واقعی اِس کے حق دار اور اتنے عقیل و فہیم ہوں کہ وہ اِس کا بہترین مصرف تلاش کر سکیں۔میں ذاتی طور پر سمجھتی ہو کہ غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ واحد تو نہیں لیکن اُن

اداروں میں سے ایک ضرور ہے جہاں آپ کی اعانتوں اور زکواۃ کے ضائع ہو جانے کا
کوئی خطرہ نہیں ۔ٹرسٹ کا بینک اکاؤنٹ 0081-0007 4-01-047153 -بینک
الحبیب گارڈن ٹاؤن لاہور ہے ۔یاد رکھیے کہ کسی ضرورت مند بچے کو تعلیم کے زیور
سے آراستہ کرنا سُنتِ رسولؐ ﷺ ہے اور صدقہ جاریہ بھی ۔آیئے ہم سب مل کر ایسے
لوگوں کی حوصلہ افزائی کریں جو نونہالانِ وطن کو 100 فیصد خواندہ بنانے کا عزم لے
کر نکلے اور جنھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ اُن کی نیتوں میں کھوٹ ہر گز
نہیں ۔

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

پروفیسر مظہر۔۔۔۔ سرگوشیاں

دُنیائے قدیم کے عظیم فاتح سکندرِ اعظم نے جب لبنان کے ایک شہر ''طائر'' کا محاصرہ کیا تو دورانِ محاصرہ اُسے شاہِ ایران کی طرف سے پیغام وصول ہوا کہ امن معاہدے کے بدلے شاہِ ایران سکندر کو اپنی نصف سلطنت دینے کو تیار ہے۔ سکندر کے دوست پارمینیو کو یہ پیش کش بہت مناسب معلوم ہوئی۔ اُس نے سکندر کو مخاطب کرکے کہا ''اگر میں سکندر ہوتا تو یہ پیش کش فوراً قبول کر لیتا''۔ سکندر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا''ہاں ! میں بھی قبول کر لیتا اگر میں پارمینیو ہوتا''۔

جنرل (ر) اشفاق پرویز کیانی بھی 2010ء میں شمالی وزیرستان میں آپریشن شروع کر دیتے اگر وہ جنرل (ر) اطہر عباس صاحب ہوتے۔ لیکن وہ توپہ سالار تھے اور خوب جانتے تھے کہ کس وقت کیا کرنا ہے۔ اُنہوں نے وہی کچھ کیا جو اُس وقت ملک و قوم کے بہترین مفاد میں تھا۔ سبھی متفق تھے کہ 2010ء میں شمالی وزیرستان میں آپریشن کے لیے حالات سازگار نہیں تھے۔ اُن دنوں تو جنرل اطہر عباس نے بھی بطور ڈی جی، آئی ایس پی آر متعدد بار یہ کہا کہ فوج باجوڑ،

سوات اور جنوبی وزیرستان میں اپنی پوزیشن مستحکم کر رہی ہے اِس لیے فی الحال شمالی وزیرستان کا محاذ کھولنا مناسب نہیں لیکن اب پتہ نہیں کون سی ایسی کایا کلپ ہو گئی کہ جنرل صاحب نے یک غیر ملکی نیوز چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے جنرل اشفاق پرویز کیانی کو شدید تنقید کا نشانہ بنا ڈالا۔اُنھوں نے فرمایا کہ 2010ء میں مذہبی عسکریت پسندوں کے خلاف آپریشن کا فیصلہ کر لیا گیا تھا اور 2011ء میں تیاری بھی مکمل کر لی گئی لیکن جنرل کیانی تذبذب اور ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئے جس کی بنا پر قوم کو بے حد نقصان اُٹھانا پڑا ، ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں ، قومی اداروں پر خوفناک حملے ہوئے اور دہشت گرد قوت پکڑتے چلے گئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا فوج میں طویل عرصے تک ملازمت کے باوجود بھی جنرل اطہر عباس یہ بھی نہیں جان سکے کہ قومی معاملات میں راز داری کی کیا اہمیت ہے ؟۔کیا اُنہیں معاملے کی نزاکت کا احساس نہیں ہوا یا پھر تھری سٹار جنرل نہ بننے کے غم نے اُنہیں سب کچھ بھلا دیا ؟۔ جنرل صاحب بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ تک فراموش کر بیٹھے کہ عین اُس وقت جب افواجِ پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں ، اُن کے اِس انٹرویو سے فوج کا مورال کتنا ڈاؤن ہو گا اور ملک و قوم کی کتنی بدنامی ۔اُن کے انٹرویو سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اب تک پاکستان کے منتخب جمہوری حکمرانوں کو نام نہاد اور عضوِ معطل ہی سمجھتے ہیں اور اُن کے خیال میں فیصلہ کُن قوت اب بھی فوج ہی ہے۔سوال یہ ہے کہ اگر تاخیر کے ذمہ دار جنرل

کیانی تھے تو کیا سیاسی قیادت بے بس تھی ؟۔ کیا حتمی فیصلہ منتخب قیادت نے کرنا ہوتا ہے یا فوج نے ؟۔ اور کیا فوج سیاسی قیادت کے فیصلے سے بغاوت بھی کر سکتی ہے ؟۔ اگر اِن تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر جنرل کیانی تاخیر کے ذمہ دار کیوں کر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ اور کسی معاملے میں ہو نہ ہو لیکن دہشت گردی کے خلاف جنگ کے معاملے میں عسکری اور سیاسی قیادتیں ہمیشہ ایک صفحے پر ہی رہی ہیں اور اب بھی جب شمالی وزیرستان میں آپریشن کا فیصلہ کیا گیا تو آئی ایس پی آر کی جانب سے یہ بیان جاری ہوا کہ "سیاسی قیادت کی ہدایت پر شمالی وزیرستان میں آپریشن شروع کر دیا گیا ہے"۔ 2010ء میں شمالی وزیرستان آپریشن کے بارے میں صرف عسکری قیادت ہی نہیں، سیاسی قیادت بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھی جس کی سب سے بڑی وجہ شمالی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک" کی موجودگی تھی۔ حقانی نیٹ ورک کو پاکستان کا دوست سمجھا جاتا" ہے اور ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کا یہی خیال تھا کہ اگر امریکی دباؤ پر شمالی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک کے خلاف بھی آپریشن شروع کر دیا گیا تو کل کلاں جب امریکہ افغانستان سے چلا جائے گا تو وہاں پاکستان کے حق میں آواز بلند کرنے والا کوئی بھی نہیں ہو گا۔ اب بھی حقانی نیٹ ورک کے انخلاء تک شمالی وزیرستان میں آپریشن کو روکا گیا اور اب جو غیر ملکی دہشت گرد شمالی وزیرستان میں چھپے بیٹھے ہیں اُن کا

حقانی نیٹ ورک سے کوئی تعلق نہیں۔تذبذب کی دوسری وجہ یہ تھی کہ سوات باجوڑاور جنوبی وزیرستان میں افواج پاکستان کامیاب تو ہو چکی تھیں لیکن اپنی پوزیشن، مستحکم کرنے کا مرحلہ درپیش تھا اوران علاقوں سے ہجرت کرنے والے لاکھوں افراد کی مدد اور اُنہیں واپس اپنے گھروں میں بھیجنے جیسے مسائل بھی تھے۔

شمالی وزیرستان میں آپریشن نہ کرنے کی تیسری وجہ وہ مذہبی و سیاسی جماعتیں تھیں جو ہر حال میں مذاکرات کی حامی تھیں اور جنہوں نے اچھے اور بُرے طالبان کی نئی اختراع نکال کر اسے اپنے دلائل کی بنیاد بنایا۔جب بھی اُن سے خود کش حملوں اور بم دھماکوں میں معصوم جانوں کے زیاں کا ذکر کیا جاتا تو وہ بڑی رسانت سے کہہ دیتے کہ یہ بُرے طالبان ہیں اور ہم اچھے طالبان کا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔اچھے اور برے طالبان کی یہ بحث آج بھی جاری ہے لیکن یہ کوئی بتلانے کو تیار نہیں کہ ایسا کون سا فارمولا ہے جس کے تحت اچھے اور برے طالبان کی تمیز کی جا سکے۔اب جب کہ شمالی وزیرستان میں آپریشن شروع کر دیا گیا تو انہی لوگوں کے دل میں اُن پانچ لاکھ آئی ڈی پیز کا درد جاگ اُٹھا ہے جنہیں بنوں اور اُس کے گرد و نواح میں آباد کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے ۔آئی ڈی پیز کی بے گھری سے بے چین ہونے والے اِن سیاسی و مذہبی عناصر کو اللہ تعالےٰ نے یہ توفیق تو نہیں دی کہ وہ آئی ڈی پیز کے ساتھ ڈیرے ڈال بیٹھ رہیں البتہ اپنے آرام دہ گھروں میں بیٹھ کر وہ اِن کے غم میں

کھلے ضرور جا رہے ہیں۔

جنرل (ر) اطہر عباس خواہ کچھ بھی کہیں لیکن قوم جنرل کیانی کا صرف یہی احسان بھلا نہیں پائے گی کہ اُنہوں نے جب فوج کی کمان سنبھالی تو اُس وقت فوج مکمل طور پر سیاست زدہ ہو چکی تھی جس سے عوام کی نظروں میں اُس کا امیج بُری طرح مجروح ہوا ۔اُنہوں نے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ سنبھالتے ہی مختلف سول اداروں میں کام کرنے والے تمام فوجیوں کو واپس بلا لیا اور کور کمانڈرز کی میٹنگ بلا کر یہ حکم دیا کہ فوج کسی بھی صورت میں 2008ء کے انتخابات میں مداخلت نہیں کرے گی جس سے پرویز مشرف صاحب کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور جمہوریت کو ایک دفعہ پھر پنپنے کا موقع مل گیا۔آج بھی ایسے سیاستدانوں کی کمی نہیں جنہیں جنرل کیانی محض اِس لیے اچھے نہیں لگتے کہ انہوں نے پیپلز پارٹی کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر مارشل لاء نہیں لگایا۔ سبھی جانتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں بہت سے مواقع ایسے بھی آئے جب تقریباً تمام دانشوروں اور تجزیہ نگاروں کا یہی خیال تھا کہ اب حکومت کا جانا اور فوج کا آنا ٹھہر گیا لیکن جمہوریت پسند اور جمہوریت نواز جنرل اشفاق پرویز کیانی کے پائے استقلال میں لرزش نہ آئی ۔آج اگر ملک میں جمہوریت پنپ رہی ہے تو اِس میں غالب حصہ جنرل کیانی کی کوششوں، کاوشوں اور صبر و تحمل کا ہے۔یہ جنرل کیانی ہی تھے جنہوں نے ہمیشہ امریکہ کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور اُس کے ''ڈو مور'' کے مطالبے کو پرکاہ برابر حیثیت نہ دی۔ یہ بجا کہ امریکہ 2010ء سے ہی شمالی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک کے خلاف آپریشن کے لیے زور ڈالتا چلا آ رہا تھا لیکن پاکستان کی سیاسی قیادت کے علاوہ جنرل کیانی بھی یہی سمجھتے تھے کہ حقانی نیٹ ورک کے خلاف آپریشن اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے، اِس لیے اِس مطالبے پر کبھی کان نہیں دھرے گئے۔ بے تحاشہ امریکی ڈرون حملے بھی اسی مطالبے سے روگردانی کا ردِ عمل تھے۔ اب بھی امریکی مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے نہیں بلکہ قومی و ملی سلامتی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ آپریشن کیا جا رہا ہے البتہ امریکہ سے یہ ضرور مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ اب جبکہ شمالی وزیرستان میں آپریشن شروع کر دیا گیا ہے تو امریکہ بھی اپنے ''ڈرونز'' کا رُخ افغانستان کے علاقے ''کنڑ'' اور اُس کے گرد و نواح کی طرف پھیر دے جہاں مُلّا فضل اللہ اور اُس کے ساتھی چھپے بیٹھے ہیں۔ شمالی وزیرستان کے دہشت گردوں سے ہم خود نپٹ لیں گے۔

قوم کو انقلاب مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو

پروفیسر رفعت مظہر ۔۔۔۔ قلم درازیاں

لال حویلی والے شیخ رشید احمد نے فرمایا کہ حکمرانوں سے نجات کا وقت قریب آن لگا ۔ قوم انتظار کرے، 15 دنوں کے اندر اِس حکومت کا ''دَھڑن تختہ'' ہو جائے گا۔ شیخ صاحب نے ٹرین مارچ کے بغیر ہی یہ نویدِ دِل پذیر سنا کر ہمیں اتنا خوش کر دیا کہ ہم نے بھی جوش میں آ کر اُنہیں ''قومی نجات دہندہ'' قرار دے دیا (اب اُنہیں اِسی نام سے لکھا اور پکارا جائے) ۔ہماری طرح الطاف بھائی کو بھی شیخ صاحب کا یہ اعلان بہت بھایا اور اُنھوں نے بھی اپنی ''کلاشنکوف'' شیخ صاحب کو دینے کا اعلان کرتے ہوئے اُنہیں اپنا ''معتمدِ خاص'' مقرر کر دیا۔ افواجِ پاکستان کے ساتھ اتحادِ یکجہتی کے لیے منعقد کیے جانے والے عظیم الشان جلسے میں افوجِ پاکستان کا ذکر محض تمہیدی اور مُنہ کا سواد بدلنے تک محدود رہا۔ اصل معاملہ تو شیخ صاحب کے ''کلاشنکوفی عُہدے'' کا اعلان تھا یا پھر نویدِ انقلاب۔ الطاف بھائی نے فرمایا کہ پہلے دہشت گردوں کا صفایا ہو گا اور پھر اُن کا انقلاب جاگیرداروں اور کرپٹ سیاستدانوں کا احتساب کرے گا اور ہتھکڑیاں شیخ صاحب کے پاس ہونگی۔ واہ جی واہ ! شیخ صاحب تو ایسے ''حضرت'' نکلے کہ مولانا طاہر القادری اور عمران خاں کو

بھی مات دے گئے۔ شیخ الاسلام نے ابھی تک ''انقلاب'' کی تاریخ نہیں دی، خاں صاحب کا '' ملین مارچ'' ابھی دور ہے اور ''چڑیا والے'' صاحب کہتے ہیں کہ خاں صاحب کا ملین مارچ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جہاں خاں صاحب کا ملین مارچ ہونا ہے وہیں تو 14 اگست کو فوج پریڈ کر رہی ہوگی ۔دراصل چڑیا والے بھائی کو خاں صاحب پر غصّہ ہی بہت ہے اِسی لیے وہ ایسی ''بونگیاں'' مار رہے ہیں ۔اُن کے غُصّے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خاں صاحب اُن کی ''چڑیا'' کے پیچھے ہاتھ دھو کرپڑ گئے ہیں اور دوسرے ہر وقت اُن کے محبوب چینل کا ''ٹھکو ٹھپنے'' کے چکر میں رہتے ہیں۔اِسی لیے چڑیا والے نے سونامیوں کو محض گمراہ کرنے کے لیے کہہ دیا کہ ملین مارچ نہیں ہو سکتا۔ہم سمجھتے ہیں کہ اگر 14 اگست کو فوج اور سونامیے مِل کر مارچ کریں تو یہ '' سِول عسکری'' دوستی کی ایسی مثال ہوگی جس پر ساری دنیا عش عش کر اُٹھے گی ۔اِس لیے ملین مارچ تو ''ہووے ای ہووے''۔یہ الگ بات ہے کہ اب اِس کی ضرورت باقی نہیں بچی کیونکہ شیخ صاحب نے اِس سے پہلے ہی حکمرانوں کو گھر بھیجنے کا ''فیصلہ'' کر لیا ہے اور اب تو میاں برادران کا بستر بوریا ''گول'' ہونے میں صرف دَس دن ہی باقی بچے ہیں ۔ضدّی میاں برادران جب بھی ضِد میں آ کر کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو ہمیشہ نقصان ہی اٹھاتے ہیں ۔لال حویلی والے نے بھی میاں برادران کے بہت ''منتیں تَرلے'' کیے اور دروغ بَر گردنِ راوی وہ تو میاں برادران کے پاؤں پڑنے کو بھی تیار تھے لیکن ہَٹ دھرم میاں برادران نے تو اپنے پاؤں پر بھی

پہرے بٹھا دیئے اِس لیے ''تنگ آمد، بجنگ آمد'' کے مصداق شیخ صاحب نے بھی سوچا کہ

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

اب شیخ صاحب بڑے ''ٹھُسّے'' سے نیوز چینلز پر بیٹھ کر ایسی ایسی ''دُر فنطنیاں'' چھوڑ رہے ہیں کہ نیوز چینلز والے تو اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں لیکن اپنے ''تاریک مستقبل'' سے بے نیاز میاں برادران تاحال ''ستّو پی کر'' سو رہے ہیں۔ وجہ شاید یہ ہو کہ وزیرِ اعظم اور آرمی چیف کے مابین جتنی افہام و تفہیم آج ہے، پاکستان کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ تھی اور جس کے ساتھ فوج ہو اُسے بھلا ''کس بات کا خوف اور کاہے کا ڈر''۔ پہلے چودھری نثار احمد وزیرِ اعظم اور آرمی چیف کے درمیان رابطے کا کام کیا کرتے تھے لیکن اِس معاملے میں بھی وزیرِ اعظم صاحب نے ''خود کفیل'' ہونا مناسب سمجھا اور چودھری صاحب کو مکھن سے بال کی طرح نکال باہر کیا۔ جس پر پہلے تو چودھری نثار بہت ''چیں بچیں'' ہوئے پھر ''مُنہ بسور کر'' گھر بیٹھ رہے۔ خادمِ اعلیٰ سے چودھری صاحب کا یہ دُکھ دیکھا نہ گیا۔ وہ چودھری نثار کو ساتھ لے کر ''جاتی عمرا'' جا پہنچے اور ۔۔۔ اور جو میاں صاحب کے ''دستر خوان'' پر بیٹھ جائے وہ بھلا پھر جائے گا کہاں؟۔

آمدم بَر سرِ مطلب ، شیخ صاحب کی ''تِلملاہٹ'' کا اصل سبب یہ ہے کہ اُن کی بے پناہ صلاحیتوں سے استفادہ کرنے والا کوئی باقی نہیں بچا اور وہ ''یوسفِ بے کارواں'' کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہیں ۔ شیخ صاحب کی حالت کا اندازہ خود ہی لگا لیجئے کہ وہ جو کبھی کپتان صاحب کو ''تانگے کی سواریوں والا لیڈر'' کہہ کر چھیڑا کرتے تھے، اُسی کے چَرنوں'' میں بیٹھنا پڑا۔ اُدھر ''ضدّی خاں'' نے شیخ صاحب کو گلے سے لگا کر بہت سے ''سونامیوں'' کو ناراض بھی کر لیا اور اب وہ شیخ صاحب کی صلاحیتوں سے مستفید ہونے کو بھی تیار نہیں ۔ اسی لیے'' شیخ الپنڈی'' نے خاں صاحب سے ''اوازار'' ہو کر شیخ الاسلام کے '' حُجرے'' میں پناہ لے لی ۔ اُدھر شیخ الاسلام نے بھی ''حکومتی بڑھکوں'' سے پریشان ہو کر اپنے انقلاب کو فی الحال'' مشاورت کی الماری ''میں بند کرکے تالا لگا دیا۔ شنید ہے کہ ایک دفعہ پھر وہ اپنے ''جوتے جرابیں'' پیک کرنے میں مصروف ہیں ۔ شیخ الاسلام کی بَد دلی کو تاڑتے ہوئے'' شیخ الپنڈی'' نے نائین زیرو کی راہ لی۔ اب شیخ رشید اور الطاف بھائی مِل کر بڑھکیں لگایا کریں گے ۔ جاگیر دارو ! ہوشیار باش ، اب تمہارا پالا دو ، دو بڑھک بازوں سے پڑنے والا ہے۔

اگر شیخ الاسلام اور شیخ الپنڈی گجرات کے چودھریوں کے ساتھ مل کر اکٹھے

عازمِ انقلاب'' ہوتے تو دو گھنٹوں میں انقلاب کا آنا اظہر من الشمس ہو جاتا لیکن '' چودھری شجاعت حسین تو ابتداء ہی میں اتنے ''اوازار'' ہو گئے کہ مولانا فضل الرحمٰن کو دِل کی بات کہہ بیٹھے۔ اُدھر مولانا فضل الرحمٰن نے بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑ دیا اور اب چودھری شجاعت صاحب ہر کسی کو روک روک کر یہ کہہ رہے ہیں کہ

کیا غم خوار نے رُسوا، لگے آگ اِس محبّت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا راز داں کیوں ہو

دروغ بَر گردنِ مولانا فضل الرحمٰن، مولانا نے قہقہے لگاتے ہوئے فرمایا کہ چودھری شجاعت حسین پارلیمنٹ کی مسجد کے ''حُجرے'' میں تشریف لائے تو مولانا نے چودھری صاحب سے پوچھا کہ اُنہیں مولانا طاہر القادری کی قیادت قبول کرنے کی کیا سوجھی؟۔ چودھری صاحب کہنے لگے '' نواز لیگ نے مرکز اور پنجاب سنبھال لیا، سندھ پیپلز پارٹی لے اُڑی، خیبر پختونخوا تحریکِ انصاف کے حصّے میں آ گیا اور بلوچستان ڈاکٹر عبدالمالک کے حصّے میں۔ ہمارے لیے باقی بچا ہی کیا تھا سوائے طاہر القادری کے''۔ چودھری صاحب کہتے ہیں کہ ''جو باتیں مولانا صاحب نے کہیں، اِن کا تو اِس ملاقات میں ذکر تک نہیں ہوا۔ اس کی گواہی سابق وزیرِ اعلیٰ اکرم خاں درانی بھی دے سکتے ہیں''۔ شنید ہے کہ ''اندر کھاتے'' چوہدری صاحب نے مولانا سے شکوہ بھی کیا لیکن مولانا نے پھر قہقہے

لگاتے ہوئے کہا ''چودھری صاحب ! روزہ رکھ کے جھوٹ تو نہیں بولا جاتا ناں''۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمٰن جیسے جید عالمِ دین کی زبان سے جھوٹ نکل ہی نہیں سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ چودھری صاحب نے اِس ملاقات میں نہ سہی ، کسی اور ملاقات میں یہ باتیں کہی ہوں ۔ویسے چودھری صاحب اگر اکرم خاں درانی کی گواہی دلانا چاہیں تو اپنا شوق پورا کر لیں ، ہمیں یقین ہے کہ درانی صاحب بھی مولانا کے حق میں ہی گواہی دیں گے ۔ منجھے ہوئے سیاست دان چودھری شجاعت حسین اگر اپنی زبان پر تھوڑا سا کنٹرول کر لیتے تو کم از کم یہ نوبت تو نہ آتی کہ اب مولانا طاہر القادری عصائے مُوسوی'' ہاتھ میں لیے اُنہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اُدھر چودھری پرویز '' الٰہی گجراتی بھی آجکل '' فُل ایکشن'' میں ہیں ۔اُنہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے '' نواز حکومت کو گرانے کے لیے ہر دروازہ کھٹکھٹائیں گے''۔آخری خبریں آنے تک تو چودھری برادران صرف ایک ہی دَر کے ''سوالی'' تھے لیکن اب چونکہ وہ دَر بند ہو چکا اور گھر والا خود بے گھر و بے دَر ،اس لیے چودھری برادران اب '' کاسۂ گدائی'' لیے دَر دَر بھٹکتے پھر رہے ہیں ۔ دیکھتے ہیں کہ اُن کا کاسۂ گدائی اقتدار کی بھیک سے لبالب ہوتا ہے یا نہیں۔

صادق و امین کی جنگ

انقلاب کی راہ تکتے تکتے ہم ڈھلتی عمر تک جا پہنچے لیکن پتہ نہیں وہ کہاں کھو گیا۔ انقلاب کے داعی تو بہت آتے رہے لیکن انقلاب نہیں آیا۔ ایوب خاں بنیادی جمہوریت کی صورت میں انقلاب کے داعی ہوئے۔ یحییٰ خاں کا انقلاب ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ''جنرل اروڑا'' چھین کر لے گیا اور بھٹو کے سوشلسٹ انقلاب کو ضیاء کا اسلامی انقلاب ڈکار گیا۔ اسلامی انقلاب کے نام پر ایم ایم اے نے بھی ''رج کے'' ووٹ لیے اور صوفی محمد نے بھی خوب نام کمایا۔ مُلّا فضل اللہ المعروف ''مُلّا ریڈیو'' بھی اپنا ''حق کا پرچم'' لے کر اُٹھا اور اب چوہے کی طرح افغانستان کے صوبے ''کنڑ'' میں چھپا بیٹھا ہے جبکہ اُس کے انقلاب کو فوجی بھائی بڑی تیزی سے ''ہضم'' کرتے جا رہے ہیں۔ اِس کے باوجود بھی ہمیں یقین ہے کہ پاکستان میں آٹا دال ملے نہ ملے، انقلاب ضرور ملے گا کیونکہ اب انقلابی عَلم ایک نہیں بیک وقت کئی ''انقلابیوں'' کے ہاتھ میں ہے اور سبھی کو انقلاب کی جلدی بھی بہت۔ عمران خاں کی انقلابی سونامی نئے پاکستان کی تگ و دَو میں ہے۔ اللہ نہ کرے یہ ''نیا پاکستان'' ویسا ہی ہو جیسا یحییٰ خاں بنا کر دے گئے۔ مولانا قادری سبز انقلاب کے داعی، الطاف بھائی کا جاگیرداروں کے خاتمے کا انقلاب، شیخ رشید اور چوہدری برادران کا ''سازشی انقلاب''۔ یہ سب ایک طرف لیکن جو انقلاب

ارسلان افتخار لا رہا ہے وہ تو ''چکٹ دے پھٹے'' ٹائپ ہے۔ وہ نوجوان عمران خاں کی بہاولپور میں کی جانے والی تقریر پر ایسا بھڑکا کہ '' چَل سوچَل''۔ ہم نے تو ڈرتے ڈرتے کئی بار ''سونامیوں'' سے استدعا کی کہ

گرمی سہی کلام میں ، لیکن نہ اِس قدر

کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی

لیکن ہم جیسوں کی بھلا کون سُنتا ہے۔ اب سبھی سونا میے غصّے میں بَل کھا رہے ہیں لیکن ''خود کردہ را علاجے نیست''۔ ہم تو اب یہی کہہ سکتے ہیں کہ

اب کیوں اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں

اِس طرح تو ہوتا ہے، اِس طرح کے کاموں میں

ارسلان افتخار جو کچھ کہہ رہا ہے اُس کی بازگشت تو 2013ء کے انتخابات میں بھی اُس وقت سنائی دی جب نواز لیگ نے الیکشن کمیشن میں عمران خاں کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا لیکن بعد ازاں اسے ذاتی زندگی میں مداخلت تصور کرتے ہوئے اعتراض واپس لے لیا گیا۔ لیکن ارسلان افتخار اپنے والد چیف جسٹس (ر) افتخار محمد چوہدری کی سرِعام توہین برداشت نہ کر سکا اور آرٹیکل 62,63 کا سہارا لے کر الیکشن کمیشن پہنچ گیا۔ یہ قصہ تو شاید سبھی کے علم میں ہو گا کہ لارڈ بیرن وائٹ کی بیٹی سیتا وائٹ جس کا اصل نام ''لوزا وائٹ'' تھا، کی عمران خاں

سے پہلی ملاقات 1985ء میں برطانیہ کی آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہوئی۔ بن بیاہی سیتا وائٹ کے ہاں 1992ء میں ایک بچی پیدا ہوئی جس کا نام ''ٹیرین جیڈ'' رکھا گیا۔ سیتا وائٹ نے 1995ء میں لاس اینجلس کورٹ میں یہ دعویٰ دائر کر دیا کہ عمران خاں ہی بچی کا والد ہے۔ 14 جولائی 1997ء میں لاس اینجلس کورٹ نے سیتا وائٹ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ سیتا وائٹ تو اب اِس دُنیا میں نہیں لیکن عمران خاں صاحب نے بھی اِس سلسلے میں کبھی کوئی واضح جواب نہیں دیا البتہ ٹیرین کی عمران خاں کی سابقہ بیوی جمائما خاں کے ساتھ کئی تصاویر موجود ہیں اور جمائما نے یہ اقرار بھی کیا کہ ٹیرین عمران خاں کی ہی بیٹی ہے۔ ارسلان افتخار کہتا ہے کہ عمران خاں صاحب نے الیکشن کمیشن میں کاغذاتِ نامزدگی پُر کرتے ہوئے صرف اپنے دو بیٹوں کا ذکر کیا اور ٹیرین کا love child کہیں ذکر نہیں اِس لیے آرٹیکل 62 کے تحت وہ قومی اسمبلی کی رکنیت کے اہل نہیں رہے۔ ارسلان نے اِس سلسلے میں علماء کرام سے فتویٰ مانگا اور اسلامی نظریاتی کونسل سے بھی۔ علماء کرام تو خیر آجکل ماہِ رمضان کی افطاریوں میں اتنے مصروف ہیں کہ اُنہیں سَر کھجانے تک کی بھی فرصت نہیں، فتویٰ کہاں سے دیں۔ رہی اسلامی نظریاتی کونسل کی بات تو اُس نے آج تک کونسا قانون اسلامی شریعہ کے مطابق ڈھالا ہے، جو اب ڈھالے گی اِس لیے ارسلان کو چاہیے کہ وہ شیخ الاسلام سے رجوع کرے کیونکہ ایک تو شیخ الاسلام فتوے دینے میں لاثانی ہیں اور دوسرے آرٹیکل 63/62 کا ٹھیکہ آجکل اُنہی کے پاس ہے۔ البتہ یہ احتیاط کہ چونکہ شیخ

الاسلام اِن دنوں تھوڑے تھوڑے مائل بہ عمران خاں ہیں اِس لیے بہتر ہوگا کہ اِس سَرم گُستری کے ''توڑ'' کے لیے ارسلان نذر نیاز لے کر جائیں۔اُمید واثق ہے کہ افاقہ ہوگا۔

ہم پاکستانیوں کی یہ عادت سی ہو گئی ہے کہ ہر الزام بغیر سوچے سمجھے امریکہ پر دھر دیتے ہیں۔ قوم کو خاں صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے اِس ''قومی عادتِ بَد'' سے چھٹکارا دلوانے کے لیے الزامات کا رُخ امریکہ سے موڑ کر ''میاں برادران'' کی طرف کردیا ہے۔ ابھی ہماری یہ عادت ''کچی'' ہے لیکن جلد ہی ''پکی'' بھی ہو جائے گی اور امریکہ بھی سُکھ کا سانس لے گا۔ ارسلان افتخار کے الیکشن کمیشن سے رجوع کرنے پر ارسطوانِ تحریکِ انصاف نے سوچا کہ یہ امریکہ کی سازش تو ہو نہیں سکتی،یقیناً یہ میاں برادران کی ہی چال ہو گی۔ پھر سبھی بزرجمہر سَر جوڑ بیٹھے اور فیصلہ یہ ہوا کہ وزیرِ اعظم صاحب کی رکنیت کو بھی چیلنج کر دیا جائے۔ پھر عمران خاں کے بعد تحریکِ انصاف کے سب سے زیادہ جذباتی رُکنِ اسمبلی مراد سعید کو میاں صاحب کے کاغذاتِ نامزدگی کی نقول لینے کے لیے الیکشن کمیشن بھیج دیا گیا۔ اب میاں نواز شریف اور عمران خاں میں صادق و امین کی جنگ چھِڑ چکی ،دیکھیں نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ میں نے یہی بات جب ایک نون لیگیئے کو بتائی تو اُس نے ماتھے پر بَل ڈالتے ہوئے کہا ''ڈِگا کھوتے توں تے کَن مروڑے کمیاری دے''۔

قصّہ ایک افطاری کا

شدید ترین گرمی، حبس اور لوڈ شیڈنگ میں پتہ نہیں ہمیں کیا سوجھی کہ ایک افطار پارٹی کا اہتمام کر بیٹھے۔طے یہ ہوا کہ ڈھیروں ڈھیر نیکیاں سمیٹنے کے لیے بازار سے کچھ نہ منگوایا جائے اور گھر میں ہی ''بنفسِ نفیس'' افطاری کے تمام پکوان تیار کیے جائیں۔میاں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ بیس، پچیس افراد کی افطاری کا گھر میں انتظام ممکن نہیں لیکن ہماری بھی ایک ہی ضد کہ نیکیوں میں کسی دوسرے کی شراکت قبول نہیں ۔ تھک ہار کر میاں نے ہتھیار ڈال دیئے اور ہم اپنی جیت پر دِل ہی دل میں مسرور ہونے لگے لیکن ایک ایسی غلطی کر بیٹھے کہ جس کا خمیازہ بعد میں بھگتنا پڑا۔ ہوا یوں کہ ہم گھریلو ملازمہ کو اعتماد میں لیتے ہوئے اُس کے سامنے یہ انکشاف کر بیٹھے کہ اگلے روز افطاری پر کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ میں نے ملازمہ کی مُٹھی میں کچھ کَڑکَڑاتے نوٹ رکھتے ہوئے اُسے جلدی آنے کی تاکید کی اور اُس نے بھی جلدی آنے کا ''پکّا'' وعدہ کر لیا لیکن بعد ازاں ثابت یہ ہوا کہ صرف حکمرانوں کے ہی نہیں عوام کے وعدے بھی قرآن و حدیث نہیں ہوتے۔اگلے روز ہم ملازمہ کے انتظار میں بیٹھ گئے لیکن اُس نے تو گویا نہ آنے کی قسم اُٹھا رکھی تھی۔ہماری بیقراری کو دیکھتے ہوئے میاں نے زیرِ لَب مسکراتے ہوئے کہا

آئے عشاق، گئے وعدہ فردا لے کر
اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

سچی بات ہے کہ میاں کا یہ طنز میرے تَن بدن میں آگ لگا گیا لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے کہ ''خود کردہ را اعلاجے نیست''۔جب آس کی ڈوری ٹوٹ گئی اور ہمیں یقیں ہو چلا کہ ''اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا'' تو ہم نے حوصلہ کرکے کچن کی راہ لی۔کچن میں پہنچ کر چھوٹی بیٹی کو مدد کے لیے پکارا تو وہ ''تھرمامیٹر'' تھامے میرے پاس چلی آئی اور مجھے تھرمامیٹر کی جھلک دکھا کر کہنے لگی ''ماما! مجھے تو ایک سو ایک سے بھی زیادہ بخار ہے''۔ میری یہ آخری موہوم سی اُمید بھی دَم توڑ گئی اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں کسی صحرا میں اکیلی کھڑی شدتِ عطش سے نڈھال ہو چکی ہوں۔بہت سے لمحے ایسے ہی گزر گئے لیکن پھر ہم نے ساری نیکیاں اکیلے ہی سمیٹنے کا پروگرام بنا کر افطاری کا اہتمام شروع کر دیا۔ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ محترمہ لوڈ شیڈنگ چھم چھم کرتی آن وارد ہوئی اور یہ اُس کی آمد کا اعجاز تھا کہ پانی بھی اُس کے جلوۂ حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے ''خُشک'' ہو گیا۔پانی کی عدم موجودگی پر میں نے بے ساختہ اپنے سَر پر ہاتھ مارا تو ہاتھوں پہ لگا ہوا آٹا میرے بالوں میں یوں گھس گیا جیسے آجکل پاک فوج کے جری جوان دہشت گردوں کے ٹھکانوں کے اندر گھس گھس کر اُن کا شکار کر رہے ہیں۔

ایک گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد بجلی تو آ گئی لیکن پانی کے آتے آتے مزید بیس منٹ لگ گئے۔ جونہی نل میں پانی آیا بجلی پھر کسی حسینۂ بے وفا کی طرح دغا دے گئی۔ میں نے جلدی جلدی کچن کے سارے برتنوں کو پانی سے بھرنا شروع کر دیا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب میرے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا اور میں بیچ میں کھڑی ہو نقوں کی طرح یہ سوچ رہی تھی کہ برتن تو سارے پانی پانی ہو گئے، کھانا کس میں پکے گا؟۔ اب برتنوں سے یکے بعد دیگرے پانی نکالنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر حوصلہ پکڑا اور برتنوں سے پانی نکالنا شروع کر دیا۔ ''سَر منڈاتے ہی اَولے پڑے'' کا محاورہ تو ہم بچپن سے ہی سنتے آئے تھے لیکن اُس کی عملی تصویر اُس وقت سامنے آئی جب عین اُس وقت ''ہمسائی'' آن ٹپکی جب میں کام میں جُتی ہوئی تھی۔ وہ کوئی لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھی رہی اور پھر جاتے ہوئے یہ کہہ گئی کہ ''آپ کا بہت سا وقت لے لیا، اب چلتی ہوں''۔ میں نے مروتاً بھی اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میرے پاس وقت کم تھا اور نیکیوں کے حصول کے لیے مقابلہ سخت۔ سُنا ہے کہ ہمسائے ماں جائے ہوتے ہیں لیکن اگر ''ماں جائے'' ایسے ہی ہوتے ہیں تو اِن سے اللہ کی پناہ۔

داستان طویل ہے اور میرے ''ننھے منّے'' کالم میں اتنی گنجائش نہیں کہ قصۂ

درد بیان کر سکوں۔ بہر حال میں چھ بجے تک اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی اور پھر ناچار اپنے میاں کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ گھر میں تو افطاری کا اہتمام ممکن نہیں اِس لیے بازار سے ہی کچھ منگوا لیں۔ میرے میاں پہلے تو بہت چیں بجبیں ہوئے لیکن بالآخر مان گئے کہ سوال ہماری ''ناک'' کا تھا اور ہم کسی کے سامنے ناک کٹتے نہیں دیکھ سکتے۔افطاری کے لیے بھاگم بھاگ سامان اکٹھا کرنے کے مرحلے سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن عین افطاری کے موقعے پر میرے ہاتھوں کیا پاؤں کے بھی طوطے اُڑ گئے جب مجھے یاد آیا کہ افراتفری میں افطاری کے لیے ٹھنڈا پانی اور جوس فریزر میں رکھنا بھول گئی تھی۔ویسے فریزر میں رکھنے یا نہ رکھنے سے کچھ فرق تو پڑنے والا نہیں تھا کیونکہ ہمارے مہربانوں کی بدولت بجلی تو کجا،فریج اور فریزر بھی نہیں چلتے اور AC کے وولٹیج ہی اتنے آتے ہیں کہ جن سے پنکھوں کی سپیڈ بھی اتنی کہ چلتے پنکھے کے پَر گِن لو۔اُدھر ہمارے خواجہ آصف سیالکوٹی نے بھی ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے کہہ دیا کہ ''ٹُٹ پینی'' بجلی اُن کے بَس سے باہر ہو گئی ہے اِس لیے قوم جھولیاں اُٹھا اُٹھا کر بارش کی دُعا کرے۔اُنہوں نے تو خیر یہ بھی کہہ دیا ''انجن کی خوبی نہ کمالِ ڈرائیور۔۔۔خُدا کے سہارے چلی جا رہی ہے''لیکن سوال تو یہ ہے کہ ایوانِ صدر، وزیرِ اعظم ہاؤس، گورنر ہاؤسز، پارلیمنٹ ہاؤس اور وزرائے اعلیٰ کے ایوانوں میں بجلی کہاں سے آتی ہے؟۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے ''امیر

المومنین اُس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے جب اُسے یقین ہو جائے کہ رعایا میں سے ہر ایک کو گیہوں کی روٹی مِل رہی ہے''۔ لیکن یہاں تو جُرمِ ضعیفی کی سزا مَرگِ مفاجات کی صورت میں مِل رہی ہے۔ قصّہ مختصر ہم نے کسی نہ کسی صورت مہمانوں کو افطاری تو کروادی لیکن آئندہ کے لیے گھر میں افطاری کا اہتمام کرنے سے توبہ کر لی۔ ہم نے سوچا کہ اگر ہمارے حکمران بڑے بڑے ہوٹلوں میں افطاریوں کا اہتمام کر سکتے ہیں تو ہم چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں کیوں نہیں۔

افرا تفری کا سبب کون۔۔۔۔؟

محترم احسن اقبال نے پریس کانفرنس میں فرمایا کہ مسلم لیگ نون کی حکومت پر جو دباؤ نظر آ رہا ہے اُس کی وجہ پرویز مشرف کے وہ دوست ہیں جو پیچھے بیٹھے ڈوریاں ہلا رہے ہیں۔اگر آج حکومت اِس مسئلے کو نظر انداز کر دے تو یہ دباؤ ختم ہو جائے گا لیکن اِس کے لیے پارلیمنٹ کو آئین میں ترمیم کرنا پڑے گی جس کے مطابق سیاستدانوں اور فوجی ڈکٹیٹروں کے لیے الگ الگ قانون بنانا ہوگا تاکہ سیاستدانوں کو جب جی چاہا،لٹکا دیا اور فوجی ڈکٹیٹروں کو گارڈ آف آنر دے کر رخصت کر دیا۔احسن اقبال صاحب کی پریس کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے انتہائی محترم بھائی عطاء الحق قاسمی نے اپنے کالم کے آخر میں لکھا ہے "۔۔۔باقی رہی پرویز مشرف کو بیرونِ ملک جانے کی اجازت دینے کے حوالے سے میری رائے،تو وہ وہی ہے جس کا اظہار اِن کالموں میں کرتا چلا آ رہا ہوں،مگر میرے نزدیک یہ فعل وہ سور ہے جو ہنگامی حالت میں شرعاً کھانے کی اجازت ہے"۔مجھے قاسمی صاحب کے اِس تجزیے سے مکمل اتفاق ہے،آخر ہم نے ایک تہتر سالہ بیمار "بُڈھے" کو لٹکا کر کونسا ہمالیہ سَر کر لینا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اِس معاملے کے بیچ تو خود مسلم لیگ نون میں دو آراء پائی جاتی ہیں۔خادمِ اعلیٰ اور چودھری نثار احمد پرویز مشرف کو بیرونِ ملک جانے کی اجازت دینے کے زبردست حامی ہیں

جبکہ ''خواجگان''اور پرویز رشید ایسی بات زبان پر لانے والوں کے خلاف تلواریں سونت کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔البتہ بڑے میاں صاحب کو ایسے ''فضول''کاموں میں سَر کھپانے کی پہلے فُرصت تھی نہ اب ہے۔وہ تو اِسی بات پر خوش ہیں کہ اُن کی اور عسکری قیادت کی آجکل گاڑھی چھنتی ہے اِس لیے راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔جتنی بار وہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف سے ملاقاتیں کر چکے ہیں،اُنہیں مدِ نظر رکھتے ہوئے تو اُن کا نام گینیز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج ہونا چاہیے۔

عطاء بھائی نے اپنے کالم میں جو یہ فرمایا ہے کہ ہنگامی حالت میں ''سور'' کھانا شرعاً جائز ہے،اِس پر یقین نہ کرنے کی بظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ وہ ایسے مذہبی گھرانے کے سپوت ہیں جس کی وجاہتِ علمی سے مفر ممکن نہیں۔باوجودیکہ اندر سے چھوٹے موٹے مفتی عطا بھائی خود بھی ہیں لیکن ہم نے بہتر جانا کہ کسی سند یافتہ مفتی صاحب سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ویسے تو پورا پاکستان ہی ''مفتیان'' سے بھرا پڑا ہے اور سب سے بڑے مفتی تو ہمارے وہ لکھاری اور تجزیہ نگار ہیں جن کے تجزیوں اور تبصروں کو من و عن قبول کرنا عین عبادت ہے کیونکہ اگر قبول قبول نہ کہا جائے تو وہ ٹھک سے ''بھاڑے کے ٹٹو'' جیسے فتوے بھی صادر فرما دیتے ہیں۔لیکن ہم ٹھہرے تھوڑے ''وہمی''اِس لیے ایک عالمِ دین تک جا پہنچے جس نے ہمیں مزید الجھا کے رکھ دیا۔اُس نے فتویٰ

دیا کہ ''سور'' کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، جن میں سے کچھ کو بحالتِ مجبوری کھانا شرعاً جائز ہے اور کچھ کو کھانا ناجائز خواہ بھوک کے ہاتھوں موت ہی واقع کیوں نہ ہو جائے۔ اب عطاء بھائی کیا کہتے ہیں بیچ اِس ''فتوے'' کے؟۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ایم کیو ایم، قاف لیگ، مولانا طاہر القادری اور شیخ رشید تاحال ''عشقِ مشرف'' میں مبتلاء ہیں اور یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ اِن کی ڈوریاں ہلانے والے کون ہیں لیکن میاں نواز شریف صاحب کی مسلم لیگ نے بھی اِن لوگوں کو ''بانس'' پر چڑھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ سانحہ ماڈل ٹاؤن کی صورت میں مولانا طاہر القادری کو بیٹھے بٹھائے لیڈر بنا دیا اور چودھری برادران تو کسی ایسے روزن کی تلاش میں تھے ہی جہاں سے اُمید کی کوئی کرن نظر آئے۔ اُنہیں مولانا طاہر القادری کی شکل میں ''جائے اماں'' مِل گئی اور وہ وہیں کے ہو رہے۔ اِدھر اُدھر لڑھکنیاں کھانے والے شیخ رشید کا عالم یہ ہے کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اِک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

وہ کبھی کپتان صاحب کی طرف لڑھکتے ہیں تو کبھی مولانا طاہر القادری کی طرف۔ پچھلے دِنوں وہ اور چودھری برادران بِن بلائے ''آستانۂ قادریہ'' پر جا

پہنچے تو مولانا طاہر القادری نے عالمِ غیض میں اُنہیں ایک گھنٹے تک باہر بٹھائے رکھا۔ شیخ صاحب کراچی میں ایم کیو ایم یاترا بھی کر آئے اور الطاف بھائی سے ''تمغۂ کلاشنکوف'' بھی وصول کر لیا لیکن پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ وہ عمران خاں صاحب کے ساتھ ہیں حالانکہ خاں صاحب نے تو واشگاف الفاظ میں ایم کیو ایم کو ''مافیا'' قرار دے رکھا ہے۔ شیخ صاحب یہ سب کچھ حبِ علیؓ میں کر رہے ہیں نہ بغضِ معاویہؓ میں۔ اُن کی نظر تو چھوٹی موٹی وزارت پر ہے، خواہ وہ نریندر مودی ہی سے کیوں نہ مل جائے۔ اُدھر جنابِ نواز شریف نے یہ کہہ کر شیخ رشید کو نہال کر دیا کہ ''جنہیں خود استعفیٰ دینا چاہیے وہ ہم سے استعفیٰ مانگتے ہیں''۔ اب شیخ صاحب گلی گلی یہ شور مچاتے پھر رہے ہیں کہ وہ بھی بہت ''پہنچی ہوئی شے'' ہیں اسی لیے تو وزیرِ اعظم نے اُن سے استعفیٰ مانگا ہے۔

جنابِ آصف زرداری نے تو جنابِ نواز شریف کو بادشاہ نہ بننے کی تلقین کی ہے لیکن اصل بادشاہ تو ایم کیو ایم ہے جسے شاید خود بھی یاد نہیں کہ اُس نے کتنی بار پیپلز پارٹی کی حکومت کو داغِ مفارقت دیا اور کتنی بار گلے سے لگایا۔ پیپلز پارٹی کے منظور وسان کہتے ہیں کہ ہمارا اور ایم کیو ایم کا رشتہ میاں بیوی جیسا ہے لیکن ''میاں'' ہم ہیں۔ ویسے وسان صاحب نے بات سچّی کی کہی ہے۔ پیپلز پارٹی کے دَورِ حکومت میں ایم کیو ایم کا کردار اُس جھگڑالو

بیوی کا سا ہی رہا ہے جو ہر دو تین ماہ بعد روٹھ کر میکے چلی جاتی ہو۔شاید اسی لیے وسان صاحب نے پیپلز پارٹی کو خاوند کا درجہ دے کر ایم کیو ایم کو بیوی بنا دیا۔آجکل یہ ''بیوی'' مولانا طاہر القادری سے پیار کی پینگیں.بڑھا رہی ہے لیکن اُمیدِ واثق یہی ہے کہ وہ ایک دفعہ پھر شیخ الاسلام کو بیچ منجدھار چھوڑ کے چلی جائے گی کیونکہ ''وارث شاہ نہ عادتاں جاندیاں نیں''۔

انجامِ گلستاں کیا ہو گا

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔سرگوشیاں

رحمتوں اور برکتوں کے ماہِ مبارک آہستہ آہستہ اپنے اختتام کی طرف گامزن ہے۔ جن کے نصیب تابناک وہ جھولیاں بھر بھر کے رَب کی رحمتیں سمیٹ رہے ہیں لیکن کچھ ایسے کم نصیب بھی جنہیں رحمت نہیں ، دولت کی حرص یا جاہ کی۔پوری دنیا میں مسلمان ماہِ صیام کی آمد کے ساتھ ہی قیمتیں انتہائی کم کر دیتے ہیں لیکن پاکستان میں مہنگائی ماہِ صیام کے لوازمات میں سے ہے اوراب کی بار تو بے حد و حساب۔ حکمران مقدور بھر مہنگائی کے عفریت سے نبرد آزما لیکن بے بَس ۔خادمِ اعلیٰ اپنی بھرپور توانائیاں صرف کر رہے ہیں ، نیت میں فتور بھی نہیں اِس کے باوجود بھی زورآوروں کے جبڑوں سے ٹپکتے ''عوامی لہو'' کی روانی میں شمہ بھر فرق نہیں۔ مجبوروں کے دستِ طلب پہ اُگتی محرومیاں دیکھ کر بھی یہ فراعینِ وقت قارونِ دوراں بننے کی تگ و دَو میں مگن ۔اُدھر مہنگائی کا دیو اور اِدھر اسی مقدس مہینے میں حکمرانوں کی جانب سے لوڈشیڈنگ کا تحفہ۔آگ برساتے سورج اور شدید حبس سے جان لبوں تک آ پہنچی ۔حکمرانوں نے لوڈشیڈنگ کے خاتمے کے حسیں خواب تو دکھائے لیکن تعبیر اُلٹ۔ سحری اور افطاری کے اوقات میں بھی لوڈشیڈنگ کا عذاب ۔شنید ہے کہ شارٹ فال سات ہزار میگا واٹ تک جا پہنچا ہے جو بذاتِ خود ایک ریکارڈ ہے۔ محترم وزیرِ اعظم نے شدید ترین

لوڈ شیڈنگ پر اظہار برہمی کیا تو وزیرِ پانی و بجلی خواجہ آصف صاحب نے قوم سے معافی مانگتے ہوئے کہہ دیا کہ لوڈ شیڈنگ پر قابو پانا اُن کے بَس میں نہیں ، قوم بارانِ رحمت کی دعا کرے جس سے باقی روزے اور عید اچھی گزر جائے گی۔ خواجہ صاحب کا حکم سَر آنکھوں پر لیکن ہماری تو دعائیں بھی مستجاب نہیں ہوتیں البتہ یہ ضرور کہ ہمیں مر مر کے جینے کی کچھ عادت سی ہو چلی ہے۔ سچ کہا ہے عوامی شاعر طاہر حنفی نے

کچھ ایسے دھوپ سے مانوس ہو گئے بدن
گھنے درختوں سے بچنے لگے ہیں ہم لوگو

گرمی سے جان لبوں پر اور اِدھر جاہ و حشمت کے پجاری لانگ مارچ اور انقلاب کی تیاریوں میں مگن۔ نواز لیگ نے بھی کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دیا جس کی تحسین کی جا سکے البتہ حکمرانوں کی تگ و دَو سے اُمید کی جو کرنیں پھوٹتی دکھائی دینے لگی تھیں اور صحنِ چمن کے بے بَرگ و ثمر درختوں پر پھوٹتی کونپلوں کے جو آثار ہویدا ہونے لگے تھے وہ کچھ مہربانوں کو پسند نہیں آئے کیونکہ اگر بوستانِ وطن میں بہار آ گئی تو اُن کا سیاسی مستقبل مخدوش ہو جائے گا۔ شاید اسی لیے 14 اگست کے لانگ مارچ کا اعلان کر دیا گیا اور ایسا کرتے ہوئے یہ تک نہیں سوچا گیا کہ قوم حالتِ جنگ میں ہے ، افواج پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں قربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کر رہی

ہے اور قومی و ملی یکجہتی کی جتنی آج ضرورت ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔ تاریخِ عالم تو یہی بتلاتی ہے کہ جب ملکی سلامتی کا مرحلہ درپیش ہو تو پوری قوم سیسہ پلائی دیوار بن جاتی ہے لیکن ہمارے رہنماؤں کو شاید جلدی ہی بہت ہے۔

مولانا طاہر القادری کا تو اِس جمہوری نظام میں سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں اِس لیے اُن کا ذکر کیا کرنا لیکن محترم عمران خاں، جن کی حب الوطنی کسی بھی شک و شبے سے بالاتر ہے، وہ بھی آئی ڈی پیز کو بے یار و مددگار چھوڑ کر 14 اگست کی فنڈ ریزنگ کے لیے لندن جا پہنچے۔ اسے خاں صاحب کی ضد، انانیت یا نرگسیت، کچھ بھی کہہ لیجیئے لیکن یہ بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ انتہائے خود پسندی کا شکار ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ اُن کی نگاہوں میں کوئی جچتا ہی نہیں۔ اُنہوں نے لندن میں پی ٹی آئی کے 14 اگست کے مارچ کے لیے ہونے والی فنڈ ریزنگ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''نواز لیگ، پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم، تینوں ہی مافیا ہیں۔ انہوں نے 11 مئی کے الیکشن میں ہر سطح پر دھاندلی کی۔ تینوں جماعتیں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات نہیں چاہتیں۔ ہمارے مارچ سے پاکستان کو حقیقی آزادی ملے گی۔ اِس دن پاکستان حقیقی معنوں میں اپنی منزل پر پہنچے گا''۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کپتان صاحب کو بھی مولانا طاہر القادری کی طرح سے ''بشارتیں'' ہونے لگی ہیں اور انہی بشارتوں کے زیرِ اثر وہ اپنے آپ کو

ایوانِ وزیرِ اعظم کا ''باسی'' سمجھ بیٹھے لیکن جب وہ عالمِ خواب سے عالمِ آب و گِل میں واپس آئے تو پتہ چلا کہ ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا فسانہ تھا''۔ چاہیے تو یہ تھا کہ خاں صاحب یہ سوچتے کہ آخر اُن کی پارٹی کو کون سے ایسے سرخاب کے پَر لگے تھے جو قوم مبتلائے عشقِ تحریکِ انصاف ہو جاتی۔ نواز لیگ، پیپلز پارٹی اور آمر پرویز مشرف کی جماعت قاف لیگ سے نکلے یا نکالے گئے لوگ ہی تو تھے جنہیں سینے سے لگا کر خاں صاحب ''نیا پاکستان'' بنانے چلے تھے۔ اگر قوم نے ''آزمودہ را آزمودن جہل است'' کے مصداق پہلی بار ایسے لوگوں کو رد کر دیا تو کیا بُرا کیا؟۔ خاں صاحب جس انداز سے تحریک لے کر اُٹھے تھے اگر اُس پہ قائم رہتے تو تحقیق کہ وہ بھی بھٹو مرحوم کی طرح بڑے بڑے بُرج الٹ دیتے لیکن اُنہوں نے تو ابتدا ہی میں قوم پر یہ عیاں کر دیا کہ ''ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ''۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کارزارِ سیاست کے نَو وارد اور نَو آموز عمران خاں صاحب کی نیت تو نیک تھی اور کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی امنگ بھی لیکن وہ محض اِس لیے مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکے کہ اُنہوں نے سیاست کی اونچی نیچی گھاٹیاں عبور کیں اور نہ سنگلاخ زمینوں پہ چل کے پاؤں فگار کیے۔ اُنہیں یاد رکھنا ہو گا کہ محض خواب دیکھنے اور اندازے لگانے سے گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آتا بلکہ

مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمین سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

اگر خاں صاحب ''کھیڈاں گے ناں کھیڈن دیاں گے'' پر عمل پیرا ہیں تو اُن کی یہ خواہش بھی ادھوری ہی رہے گی کیونکہ صرف ایک ہی طاقت جمہوریت کا تختہ اُلٹ سکتی ہے جو فوج ہے اور دہشت گردی میں بُری طرح اُلجھی ہوئی فوج اِس وقت طالع آزمائی کے موڈ میں ہر گز نہیں کیونکہ کسی مارشل لاء کی سوچ سے پہلے فوج کے سامنے یہ ضرور ہو گا کہ ''پنبہ کُجا کجا نہم''۔ عسکری قیادت کو سوچنا ہو گا کہ کیا فوج اکیلے دہشت گردی، لوڈشیڈنگ، مہنگائی، بھتہ خوری اور ٹارگٹ کلنگ پر قابو پا سکتی ہے؟۔کیا خونم خون کراچی کو پھر سے روشنیوں کا شہر بنا سکتی ہے؟۔کیا بلوچستان کو قومی دھارے میں شامل کر سکتی ہے؟۔کیا پورے ملک میں پھیلے دہشت گردوں کا قلع قمع کر سکتی ہے؟۔کیا اقتصادی پابندیوں کی صورت میں ملک کو سہارا دے سکتی ہے؟۔اگر جواب نفی میں ہے تو پھر سلگتا ہوا سوال یہ کہ کیا فوج بھوکوں مرتی مشتعل قوم کو سنبھال سکتی ہے؟۔اگر نہیں تو پھر مارشل لاء کا موہوم سا بھی خطرہ نہیں۔ایسے میں خاں صاحب کا لانگ مارچ چھوٹی موٹی افراتفری پھیلانے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ڈی چوک اسلام آباد یا التحریر اسکوائر

شیخ الاسلام نے فرمایا ہے کہ انقلاب کے بعد کم از کم 10 لاکھ ''صالحین'' کو شریکِ اقتدار کیا جائے گا۔ اُنھوں نے تاجروں، کسانوں، علماء، طلباء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کو جلد از جلد اپنی CV's منہاج القرآن میں جمع کروانے کی ہدایت کی ہے تاکہ اُنہیں شریکِ اقتدار کیا جاسکے۔ شیخ الاسلام کی اِس ہدایت کے بعد ہمیں بھی یقین ہو چلا ہے کہ اب انقلاب ''آوے ای آوے''۔ ہمارے اندر تو پہلے سے ہی انقلاب کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجود ہے اور ویسے بھی ہم آجکل ''ویہلے'' اور نواز لیگ سے کچھ کچھ مایوس بھی ہیں کیونکہ وہ ہمیں ''اندر کھاتے'' کُکھ بھی نہیں دیتی جبکہ ہم پر ''بھاڑے کا ٹٹو'' جیسا الزام لگانے والے ہزاروں اِس لیے سوچا کہ کیوں نہ مُرشد کے ہاں اپنی CV جمع کروا کر قسمت آزمائی کریں۔

مُرشد نے صرف دس لاکھ افراد کو اقتدار میں شامل کرنے کا عندیہ دیا ہے جبکہ اُنکے چاہنے والے تو ایک کروڑ سے بھی زائد ہیں اور وہ خود فرما چکے ہیں کہ '' ایک کروڑ نمازی جب باہر نکلیں گے تو انقلاب آ جائے گا''۔ ہم سوچتے ہیں کہ اگر صرف دَس لاکھ ''انقلابی'' شریکِ اقتدار ٹھہرے تو باقی نوے لاکھ کا کیا بنے گا؟۔ شاید مُرشد نے اقتدار ''شفٹوں'' میں منقسم کرنے کا منصوبہ بنا رکھا

ہو یعنی صبح ایک اقتداری شفٹ، دوپہر کو دوسری، شام کو تیسری اور رات کو
چوتھی۔ایسی منصوبہ بندی سے بھی شاید سبھی ''صالحین'' کی کھپت تو نہیں ہو لیکن کچھ نہ
کچھ گزارہ ہو ہی جائے گا۔اُدھر محترم عمران خاں کی تحریکِ انصاف میں
بھی ''صالحین''کی کوئی کمی نہیں اِس لیے شیخ الاسلام کو اُنہیں بھی اقتدار میں حصّہ دینا ہو
گااور اب تو جنابِ آصف زرداری نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے
ہوئے ''انقلابیوں''کی حمایت کر دی ہے اِس لیے اقتدار کی چھوٹی موٹی ''چُسکی''پر تواُن
کا بھی حق ہے۔شیخ رشید عرصہ چھ سال سے ''حق کا پرچم لے کر اُٹھو، باطل سے
ٹکراؤ۔۔۔۔مارو یا مَر جاؤ''گاتے پھر رہے ہیں اِس لیے وہ تو شاملِ اقتدار ہونگے ہی البتہ
چودھری برادران کے بارے میں شنید ہے کہ اُنھوں نے اپنے وارث مونس الٰہی کو
شاملِ اقتدار کرکے خود ''اللہ سے لَو لگانے''کا نہ صرف پروگرام بنا رکھا ہے بلکہ منہاج
القرآن میں ایک کونہ بھی تاڑ لیا ہے۔نائن زیرو کے باسیوں کا بھی بندوبست کرنا پڑے
گا کیونکہ وہاں تو سبھی ''صالحین''ہی بستے ہیں۔اب اگر سبھی صالحین کو شریکِ اقتدار کرنا
ٹھہر ہی گیا تو پھر پرویز مشرف کا کیا قصور؟۔وہ تو کسی زمانے میں اِن سبھی صالحین
کے ''سردار''ہوا کرتے تھے۔آجکل ہماری طرح وہ بھی ''ویہلے''ہی ہیں لیکن بیمار
شمار۔اُنکی نمائندگی کے لیے احمد رضا قصوری کو شامل کیا جا سکتا ہے کیونکہ صالح تو وہ بھی
ہیں۔مُرشد نے اپنے ''وارثان''جو چہرے مہرے، چال ڈھال، اندازِ گفتگو حتیٰ کہ لباس
تک میں بھی اپنے ''عظیم

باپ''کی نقل کرتے ہیں،اُن کے بارے میں یہ امر صیغۂ راز ہی میں رکھا ہے کہ اُن کا''اقتداری عہدہ'' کیا ہو گا؟۔

اُدھر شاہ محمود قُریشی نے یہ تاثر دیتے ہوئے کہ اُنکی سونامی کی حیثیت تو انقلابیوں کے مقابلے میں ''کَکھ'' بھی نہیں، محض اقتدار میں زیادہ سے زیادہ حصّہ بٹورنے کے لیے کہہ دیا کہ اُن کے لانگ مارچ میں 12 لاکھ افراد ہونگے۔پھر بھی ایک کروڑ کے مقابلے میں بارہ لاکھ کی کیا حیثیت۔بہتر تو یہی تھا کہ سونامیے بھی ہم انقلابیوں کے ساتھ مِل جاتے اور وہ جو کہتے ہیں کہ ''نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں''اُس کی عملی تصویر نواز لیگ کو نظر آ جاتی اور اُسے بھی پتہ چل جاتا کہ قوم اگر لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے پیپلز پارٹی کو ''نکرے''لگا سکتی ہے تو نواز لیگ کس کھیت کی مولی ہے۔ویسے تو نواز لیگ نے ایک ''شیر دے پتر''کو بجلی کے پیچھے لگا دیا کہ شاید اُس کی دھاڑ سے بجلی سہم جائے گی لیکن بجلی پر تو کچھ اثر نہیں ہوا البتہ قوم سہم چکی ہے کیونکہ ''وَڈے وزیر''نے ٹھینگا دکھاتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ ''اللہ اللہ کرو اور گرمی سے مَرو''۔ہمارا انقلاب تو اُونچے ایوانوں پر دستک دے رہا ہے پھر بھی مُرشد نے کمال مہربانی کرتے ہوئے وزیرِ اعظم صاحب کو مناظرے کا چیلنج دے دیا تاکہ حجت تمام ہو سکے لیکن وزیرِ اطلاعات پرویز رشید نے ایک عالم کو دوسرے عالم سے لڑانے کی گھناؤنی سازش کرتے ہوئے نواز لیگ کی طرف سے مولانا

طاہر اشرفی کو اکھاڑے میں اتار دیا۔اب مولانا طاہر اشرفی صاحب مُرشد کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں لیکن کہاں ایک عام عالمِ دین اور کہاں پیرِ طریقت و
شریعت، مجتہد العصر، شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری۔شاید مولانا اشرفی کو نہیں پتہ کہ میاں نواز شریف صاحب تو شیخ الاسلام کو امام مہدیؑ بھی ماننے کو تیار ہو گئے تھے۔یہ انکشاف مُرشد نے 21 جولائی کو ایک معروف اینکر کو انٹرویو دیتے ہوئے کیا۔اُنہوں نے حلفاً فرمایا ''ایک دِن میاں نواز شریف مجھے کمرے میں لے گئے اور دروازے کی اندر سے ''چٹخنی'' لگا کر کہا کہ وہ مجھے امام مہدی ماننے کو تیار ہیں۔بَس اتنا بتا دیں کہ کیا آپ واقعی امام مہدی ہیں تاکہ وہ فخر سے کہہ سکیں کہ امام مہدی کا دیدار کرنے والے پہلے شخص وہ ہیں''۔اینکر یہ سُن کر طنزیہ انداز میں مسکراتا رہا۔پہلے بھی اُس نے مُرشد کو جھوٹا ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی اور مُرشد کی
پرانی ''ویڈیوز'' دِکھا دِکھا کر یہ ثابت کرنے کی سعی کرتا رہا کہ مُرشد یورپ میں اگر ایک بیان دیتے ہیں تو پاکستان میں اُس کے بالکل اُلٹ۔اُس بَد لحاظ اینکر نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ کِس ''عظیم ہستی'' کے سامنے بیٹھا ہے۔یہ بجا کہ وہ اینکر اپنی اِس سازش میں اس حد تک تو کامیاب رہا کہ مُرشد بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو گئے لیکن ہمارا ایمان ایسے شَر پسندانہ حملوں سے ڈولنے والا نہیں۔اُس اینکر کا ایک گھنٹے کا ''لائیو شو'' صرف آدھے گھنٹے تک محدود رہا اور پھر کوئی وجہ بتائے بغیر نیوز چینل سے وہ پروگرام یوں غائب ہوا جیسے

گدھے کے سَر سے سینگ۔ اب پتہ نہیں اُس لشکر کا کیا حشر ہوا ہو گا۔ ویسے اگر اُسے ویسی ہی ’’پھینٹی‘‘ لگا دی گئی ہو جیسی مُرشد کے ’’عقید تمندوں‘‘ نے راولپنڈی پولیس کو لگائی تھی تو ہم خوشی سے باغ باغ ہو جائیں گے۔

ہماری باری کب آئے گی؟

سندھ اسمبلی کی ڈپٹی سپیکر محترمہ شہلا رضا نے بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑتے ہوئے کہہ دیا کہ ''NRO میں طے پایا تھا کہ پاکستان میں تین عام انتخابات تک مارشل لاء نہیں لگے گا۔اِس معاہدے پر عمل درآمد کی ضمانت امریکہ، برطانیہ، متحدہ عرب امارات اور خود فوج نے دی تھی''۔اِس سے پہلے سابق وزیرِ اعظم یوسف رضا گیلانی نے پرویز مشرف کے بارے میں معاہدے کا انکشاف کرکے اپنی ہی پارٹی کو ''وَخت''میں ڈالے رکھا اور اب شہلا رضا نے دھماکہ کر دیا۔گیلانی صاحب کے بارے میں تو پتہ نہیں لیکن شہلا رضا نے جو کہا سچ کہا کیونکہ خواتین ''جھوٹ''کم کم ہی بولتی ہیں۔اُن کے جھوٹ بھی بہت معصومانہ ہوتے ہیں، مثلاََ اگر سالن میں غلطی سے دوبار نمک ڈل جائے تو یہ کہہ دینا کہ اب کی بار ''مُوا''نمک ہی خالص آگیا ہے یا پھر چولہے پہ ہنڈیا جَل جائے تو محکمہ سوئی گیس کو کوسنے دینے بیٹھ جانا کہ یکلخت گیس کا پریشر زیادہ کرکے ہنڈیا جلا دی۔بڑے بڑے جھوٹ بولنا مَردوں کا شیوہ ہے۔ہمارے رہنما جب الیکٹرانک میڈیا پہ بیٹھتے ہیں تو اتنی لمبی لمبی چھوڑتے ہیں کہ بے ساختہ ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔شہلا رضا ایک تو خاتون ہیں اور دوسرے پیپلز پارٹی کی ''جیالی''اِس لیے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے سچ کہا ہے۔اب پیپلز پارٹی لاکھ ''رولا''ڈالے کہ شہلا رضا کا بیان غلط، گمراہ کُن اور حقائق کے

منافی ہے لیکن سانپ تو نکل گیا، لکیر پیٹنا کارِ بیکار۔ نواز لیگ والے بغلیں بجا رہے ہیں کہ کی ''کڑکی'' میں پھنس گئی اور وہ بھی اپنی ہی ''جیالی'' کے NRO پیپلز پارٹی ایک دفعہ پھر ہاتھوں۔ یوں تو نواز لیگ کا این آر او سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن یہ ضرور ہوا کہ جب محترمہ بینظیر شہید کو اسی این آر او کے تحت پاکستان میں داخلے کی اجازت ملی تو میاں برادران کی پاکستان آمد کی راہیں کھُل گئیں۔ اُس وقت پرویز مشرف نے زور تو بہت مارا کہ میاں فیملی پاکستان نہ آسکے لیکن سعودی شاہ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ اگر بینظیر صاحبہ پاکستان جا سکتی ہیں تو پھر میاں برادران کو روکنے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ میاں برادران بھی ''میثاقِ جمہوریت'' کے تحت جانتے ہی ہونگے کہ ''آقاؤں'' نے جمہوریت کو فقط پندرہ سال دیئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے کپتان صاحب کو بھی سابق آئی ایس آئی چیف جنرل احمد شجاع پاشا نے بتلا دیا ہو گا کہ ''وقت کم ہے اور مقابلہ سخت''۔ اسی لیے ہمارے کپتان نواز لیگ کے ''ترلے'' کرتے رہے کہ ''میاں جی ہُن جان دیو، ساڈی واری آن دیو''۔ شاید اُن تک بھی یہ خبر آن پہنچی ہو گی کہ اب نواز لیگ کی باری ہے اسی لیے وہ ہمیشہ اپنا سارا زور نواز لیگ پر ہی صرف کرتے رہے۔ ویسے ہم ''سونامیوں'' کے آنگن میں بھی اقتدار کے پھولوں کی بہار آ جاتی اگر جنرل پاشا کو مدت ملازمت میں توسیع مل جاتی۔ پیپلز پارٹی تو توسیع کے لیے تیار تھی لیکن سابق آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی آڑے آ گئے اور ہمارے خواب

ادھورے رہ گئے۔چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سے تو کپتان صاحب نے اُن کی ریٹائرمنٹ کے بعد پوچھ لیا کہ ''وہ کتنے میں بِکے؟''لیکن جنرل کیانی کے بارے میں تا حال خاموش ہیں حالانکہ ریٹائر وہ بھی ہو چکے ہیں اور ہماری وزارتِ عظمیٰ کے خوابوں کو چکنا چور کرنے والے بھی وہی۔بس ایک فوج ہی باقی بچی ہے جس پر خاں صاحب نے الیکشن میں دھاندلی کاالزام نہیں لگایالیکن اب شاید یہ الزام بھی لگ جائے کیونکہ نوازلیگ نے یکم اگست سے تین ماہ کے لیے اسلام آباد کوآرٹیکل 245کے تحت فوج کے سپرد کر دیا ہے۔اب اسلام آباد کی حفاظت فوج کی ذمہ داری ہے اور فوج اِس سلسلے میں جو بھی قدم اٹھائے اُسے پاکستان کی کسی بھی کورٹ میں چیلنج نہیں کیا جا

سکتا۔اُدھر ہمارے خاں صاحب تخت گرانے اورتاج اچھالنے کاارادہ باندھ کر14 اگست کو عازمِ اسلام آباد ہونے والے ہیں۔اب تحریکِ انصاف کا مقابلہ نوازلیگ نہیں فوج کے ساتھ ہے۔اِس کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ ہمارے کپتان کے بڑھتے قدم کوئی روک نہیں سکے گااور ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع مِل جائے گا کہ 2013ء کے الیکشن کی دھاندلی میں فوج بھی برابر کی شریک ہے اور ہم فخر سے یہ کہہ سکیں گے کہ ''سارے رَل کے سانوں پے گئے نیں''۔

شہلا رضا کے اِس انکشاف کے بعد یہ عقدہ بھی وا ہوا کہ ہم ''ایویں خواہ مخواہ''آمروں کو موردِ الزام ٹھہراتے رہے حالانکہ وہ بے چارے تو''آقا''کے

حکم پر ہی سرِ تسلیم خم کیا کرتے رہے اور اب چونکہ آقا کا حکم ہے کہ تین عام انتخابات تک بی بی جمہوریت'' سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی اِس لیے مارشل لاء کا بھی کوئی خطرہ'' نہیں۔اِس معاہدے کے تحت صورتِ حال کچھ یوں بنتی ہے کہ ''باریوں'' کی اِس تقسیم میں پہلی باری پیپلز پارٹی، دوسری نواز لیگ اور تیسری پھر پیپلز پارٹی۔جنابِ آصف زرداری کو یہ خطرہ تھا کہ اگر عین موقعے پر امریکہ نے بھی کہہ دیا کہ ''وعدے قُرآن وحدیث نہیں ہوتے'' تو پھر اُنکا کیا بنے گا۔اسی لیے وہ حفظِ ما تقدم کے طور پر تجدیدِ عہد کی خاطر قبل از وقت ہی امریکہ جا بیٹھے۔لیکن امریکی تو''قول کے سچے''اور کھرے لوگ ہیں اِسی لیے اُنھوں نے نہ صرف تجدیدِ عہد کیا بلکہ صدر نہ ہوتے ہوئے بھی جنابِ زرداری کو صدارتی پروٹوکول دیا اور ازراہِ تفنن بھی اُن سے یہ تک نہیں پوچھا کہ اُن کے نزدیک ''وعدوں کی حقیقت''کیا ہے۔اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ'' ساڈی واری کِتھے گئی؟''۔ہمارے کپتان صاحب اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ پیپلز پارٹی اتنی وسیع ظرف نہیں کہ حکومت سونامیوں کے سپرد کر دے۔اسی لیے وہ نواز لیگ سے حصولِ حکمرانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔یوں تو میاں برادران وسیع الظرف ہیں ہی لیکن اتنے بھی نہیں کہ اپنی باری کا ہی ''جھٹکا'' کروا دیتے۔پھر بھی اُنھوں نے کمال مہربانی کرتے ہوئے حکومت میں خیبر پختونخوا نامی ایک چھوٹا سا ''داغدار'' حصّہ خاں صاحب کے سپرد کرکے یہ ثابت کر دیا کہ اُنہیں مِل بانٹ کر کھانے کی عادت ہے۔ویسے یہ عادت بھی جَلا وطنی کے بعد ہی پیدا

ہوئی، پہلے تو وہ اقتدار کی ”ریوڑیاں“ آپس میں ہی بانٹ لیا کرتے تھے۔ نواز لیگئے کہتے ہیں کہ اُنہوں نے تو خاں صاحب کو خیبر پختونخوا کی حکومت اِس لیے دی تھی کہ وہ ”آدابِ سلطانی“ سیکھ سکیں تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے لیکن خاں صاحب کو تو جلدی ہی بہت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جلدی کیوں نہ ہو، اگر نواز لیگ پانچ سال پورے کر گئی تو پھر ہماری باری تو کبھی نہیں آئے گی۔ اسی لیے خاں صاحب نے برملا کہہ دیا ہے کہ وہ 14 اگست کو اسلام آباد میں ٹو نٹی، ٹونٹی نہیں، ٹیسٹ میچ کھیلنے جا رہے ہیں اور واپس تبھی لوٹیں گے جب ”تاجِ سلطانی“ اُنکے سر پر ہوگا۔

میٹھی عید، کڑوی سیاست

ماہِ صیام گزرا، شکرانے کی میٹھی عید آئی اور اپنے ساتھ ہمارے بچپن کی ساری یادیں بھی گھیر لائی۔ گئے دنوں کا سراغ لگاتے ہم اپنے گھر کے آنگن کی اُس رنگ رنگیلی شام میں جا پہنچے جہاں ہمیں ہاتھوں پہ لگی مہندی کی لیپ ہی دُنیا جہان کی سب سے بڑی نعمت محسوس ہوتی تھی۔ پھر وہ سہانی صبح جب مہندی کے رنگوں کا مقابلہ ہوتا، اماں سویاں کھانے کے لیے پکار پکار کے تھک جاتیں لیکن ہم مہندی مقابلے میں مگن۔ اُس زمانے کی سویاں۔۔۔۔؟۔ ہاتھوں کی بنی سویوں کے اوپر شکر کی تہ اور ڈھیروں ڈھیر دیسی گھی، سویاں کھاتے سے اُنگلیوں کی پوروں سے ٹپکتے خالص دیسی گھی کی مہکار ہمیں آج بھی یاد ہے۔ گھر والوں سے تو ''ڈان'' بن کر عیدی وصول کرتے لیکن عید ملنے کے لیے آئے ہوئے عزیزوں، رشتے داروں کا صرف مُنہ تکتے اور جونہی کسی ''بڑے'' کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھتا، ہمارے دِل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔ عید کی ''کمائی'' چوری چوری گننا اور بار بار گننا، ہمیں سب ہے یاد ذرا ذرا۔۔۔۔ عید کا دِن پلک جھپکتے گزر جاتا اور شام کو ہماری حالت بقول ناصر کاظمی یوں ہو جاتی کہ

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

جب تھوڑے بڑے ہوئے تو عید کے ساتھ ''ٹرو'' کا ٹکڑا بھی لگ گیا لیکن بات یہیں نہیں رُکی بلکہ کچھ عیدیں گزرنے کے بعد ٹرو کا بھائی ''ترو'' بھی آ گیا اور عید الفطر بھی عید الاضحیٰ کی طرح تین دِن کی ہو گئی۔ ہم تو چاند رات پر ہمجولیوں کے ساتھ مِل کے گھر کے آنگن میں بیٹھ مہندی لگایا کرتے تھے لیکن نسلِ نَو بازاروں کا رُخ کرتی ہے اور وہ طوفانِ بد تمیزی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ بازاروں میں تِل دھرنے کی جگہ نہیں بچتی اور مَنچلے گھروں میں واپسی کی راہ بھول جاتے ہیں۔ یہ ہنگامہ فجر تک جاری رہتا ہے اور گھر آ کر نسلِ نَو یوں بے سُدھ ہوتی ہے کہ پھر کہاں کی نمازِ عید۔ اب کی بار حکومت نے عید پر ڈھیروں ڈھیر چھٹیاں کر دیں اور مَنچلوں نے یوں مزے اُڑائے کہ سینکڑوں ''وَن ویلنگ'' کرتے ہوئے ہسپتالوں میں جا لیٹے اور کراچی میں چالیس افراد کو سمندر کی لہریں چاٹ گئیں۔ تفریحی مقامات کا یہ عالم کہ مری اور نتھیا گلی کی طرف جانے والی ساری سڑکیں ''جام'' ہو گئیں اور تفریح کے لیے آنے والوں کو راتیں سڑکوں پر گزارنی پڑیں۔ صرف مری میں پچاس ہزار موٹر سائیکلیں، ایک لاکھ بیس ہزار کاریں اور پانچ لاکھ افراد جا پہنچے۔ یہ سب کچھ اُس وقت ہوا جب ہمارے جری جوان قُربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کر رہے ہیں اور دَس لاکھ آئی ڈی پیز کیمپوں میں بے یار و مددگار۔ جب ارضِ فلسطین طاغوت کے پنجۂ استبداد میں ہے اور غزہ کی سرزمین پر آسودۂ خاک میرے آقا ﷺ کے جدِ اکبر کی لحد پکار پکار کے یہ کہہ رہی ہے کہ

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

لوگ کہتے ہیں کہ جیسے کپتان کے لانگ مارچ سے گھبرا کر حکومت نے اسلام آباد فوج کے حوالے کر دیا، ویسے ہی لوڈشیڈنگ سے گھبرا کر اتنی چھٹیاں کر دیں۔اِن چھٹیوں کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو بَس یہی کہ ''مَرجانی''لوڈشیڈنگ سے چھٹکارا مِل گیا۔ہفتہ بھر ہونے کو آیا بجلی اپنے قدموں پہ جمی کھڑی ہے اور ہم پریشان کہ اتنا بِل کون ادا کرے گا؟۔ہمیں یقین ہے کہ لوڈشیڈنگ میں یہ حیران کُن کمی ہمارے کپتان کے ''آزادی مارچ''کی وجہ سے ہے لیکن ہمارے کپتان صاحب نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ ''اب تخت گرائے جائیں گے،اب تاج اچھالے جائیں گے''۔خواجہ سعد رفیق کہتے ہیں کہ 13اگست کی شام تک مذاکرات کی کوشش کی جائے گی لیکن کپتان نے کہا'' نون لیگ سے مذاکرات کا دروازہ بند ہے،اب 14اگست کو فیصلہ کُن جنگ ہوگی۔نئے انتخابات کے سوا کچھ قبول نہیں اور مطالبات کی منظوری تک دھرنا جاری رہے گا''۔میرے میاں رجعت پسند نون لیگئے ہیں جبکہ ہم ٹھہرے نسلِ نَو کے ترجمان اِس لیے ہمارا اسلام آباد جانا تو بنتا ہے یہ الگ بات ہے کہ پتہ ہمیں بھی نہیں کہ وہاں جا کر کرنا کیا ہے۔میاں کہتے ہیں کہ اپنا بستر بوریا سمیٹ کر اسلام آباد جانا کیونکہ تمہیں وہاں پونے چار سال تک بیٹھنا پڑے گا۔ہم نے وجہ پوچھی تو اُنہوں نے کہا اگلا الیکشن اتنی دیر بعد ہی ہے۔ہم نے

کہا اگر مولانا قادری دو گھنٹوں میں انقلاب لا سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں ؟۔اب تو مولانا صاحب بھی ’’اندر کھاتے‘‘ ہمارے ساتھ مل چکے ہیں اِس لیے اِن طوفانوں کا رُخ کوئی نہیں موڑ سکتا‘‘۔میاں نے کہا مولانا قادری بھی ’’ڈی چوک‘‘میں دیہاڑی دارمزدوروں، سکول ٹیچروں اوراُن کے خاندانوں کو ساتھ لے کر انقلاب لانے آئے تھے۔دیہاڑی دار تواگلے دِن ہی کھسک لیے اور بھاگ ٹیچر بھی جاتے خواہ اُنہیں نوکری سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑتے لیکن پیپلزپارٹی نے کچھ جلدی کردی اور مولانا اپنے انقلاب میں نئی ’’پھکّی‘‘ شامل کرنے کینیڈا سدھار گئے۔یادرکھو خاں صاحب کے 90 فیصد سے زیادہ حمائتی ’’برگر فیمیلیز‘‘ سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ تو ’’منرل واٹر‘‘ بھی طوہاََو کرہاََ ہی پیتے ہیں، بھلا اسلام آباد میں بے یارومددگار کتنی دیر ٹِک سکیں گے ؟۔اُنہوں نے کہا کہ ویسے توخاں صاحب کے لیے سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور ارسلان افتخار ہی کافی ہیں جو خاں صاحب کا سارا کچا چٹھا کھولنے کے درپے ہیں اور شنید ہے کہ اب تو وہ انتیسویں روزے پر خاں صاحب کا چوکڑی مار کر آئی ڈی پیز کے ساتھ لنچ تناول فرمانا بھی اپنے کیس کا حصّہ بنا رہے ہیں کیونکہ جب پورے پاکستان کا روزہ تھا توخاں صاحب سرِ عام کھاتے پیتے نظر آئے اور ساتھ بیٹھے اسرارالحق صاحب ایک آنکھ دبا اور ہاتھ لہرا کر کھانے کی تعریف کرتے پائے گئے جو آرٹیکل 63/62 کی صریحاََخلاف ورزی تھی۔اگر خاں صاحب آئی ڈی پیز کے ساتھ عید منانا چاہتے ہی تھے تو روزہ رکھ کر بنوں جاتے اور آئی ڈی پیز میں تحائف تقسیم کرکے واپس آ

جاتے۔ رمضان شریف کے آخری روزے کے دوران دعوت اُڑانے کی کیاتُک تھی؟۔ ہم نے کہا اگر نواز لیگ ہمارا چار حلقوں کا مطالبہ تسلیم کر لیتی تو یوں ''وَخت'' میں تو نہ پڑتی۔ میاں نے کہا کہ اِس نعرے سے قوم کو تو بیوقوف بنایا جا سکتا ہے لیکن کسی عقیل وفہیم کو نہیں۔ اگر ملک میں آئین نامی کوئی چیز ہے تو پھر یہ بھی عین حقیقت ہے کہ آئین کی رو سے حکومت خاں صاحب کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کر سکتی کیونکہ حکومت الیکشن کمیشن کے اختیارات میں مداخلت کر سکتی ہے نہ عدلیہ کے اختیارات میں اور چار حلقوں میں انگوٹھوں کے نشانات کی تصدیق کا اختیار یا تو الیکشن کمیشن کے پاس ہے یا پھر عدلیہ کے۔ ہم نے کہا کہ آپ اپنی ارسطوانہ باتیں اپنے پاس ہی رکھیں، ہم تو انقلاب لانے چلے ہیں اور تبھی لوٹیں گے جب انقلاب آ جائے گا اور اگر کسی نے ہمارے انقلاب کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کی تو ہماری سونامی اُسے خس وخاشاک کی طرح بہالے جائے گی۔ میاں نے کہا کہ انقلاب تو خیر کیا آئے گا البتہ ''پھینٹی'' کے امکانات روشن ہیں اور یہ تو تم جانتی ہی ہو گی کہ نواز لیگ کو اور کچھ آئے نہ آئے ''گیدڑ کُٹ'' کی بہر حال وہ ماہر ہے۔ کج بحثی سے ہمیں ہمیشہ نفرت رہی ہے جبکہ میرے میاں نے تو کج بحثی میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے اِس لیے ہم نے اُن سے مزید سَر کھپانا مناسب نہ سمجھا اور نہ ہی اُن کی کڑوی کسیلی باتوں سے ہمارے پایۂ استقلال میں لغزش آئی کیونکہ ہم اپنے لیڈر کے سچے پیروکار ہیں۔ وہ بھی جب ایک فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر ''زمیں جنبد نہ جنبد، گُل محمد نمی جنبد''۔ ہم نے حکومت کو بہت وقت دے کے

دیکھ لیا لیکن

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر

دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

کیا مڈِٹرم انتخاب ممکن ہیں؟

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

محترم عمران خاں کی احتجاجی سیاست میں آہستہ آہستہ تشدد کا عنصر شامل ہوتا جا رہا ہے اور اب وہ بھی مولانا طاہر القادری کی طرح کھلم کھلا دھمکیاں دیتے نظر آتے ہیں۔ مولانا قادری تو جو کچھ بھی کرتے ہیں افراتفری اور انارکی کے مخصوص غیر ملکی ایجنڈے کے تحت ہی کرتے ہیں لیکن مولانا فضل الرحمن کی خوفناک الزام تراشیوں کے باوجود عمران خاں کے بارے میں تا حال لوگ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ انہیں بھی ملک میں انارکی پھیلانے کے لیے ''فارن فنڈنگ'' ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خاں صاحب کے شدید ترین مخالفین بھی ان کی طرزِ سیاست کو محض ''احمقانہ'' کہنے پر اکتفا کرتے ہیں لیکن یہ بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ اب مولانا قادری اور عمران خاں دونوں کی سیاست ایک ہی رُخ اختیار کرتی چلی جا رہی ہے اور دونوں ہی تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ورکرز کنونشن سے عمران خاں صاحب نے جو کچھ کہا لفظی ہیر پھیر کے ساتھ وہی کچھ مولانا قادری نے بھی اپنی پریس کانفرنس میں کہا۔ عمران خاں صاحب نے فرمایا کہ اگر انہیں نظر بند کیا گیا تو اُنکے کارکُن پورا ملک بند کر دیں گے جبکہ قادری صاحب نے یہ کہا کہ اگر اُن کے یومِ شہداء کی راہ میں رکاوٹ ڈالی

گئی تو 10 اگست کو جاتی عمرا میں یومِ شہداء منائیں گے۔ خاں صاحب کہتے ہیں کہ مذاکرات کا باب بند ہو چکا، اب جنگ ہو گی صرف جنگ اور مقصد کے حصول تک اسلام آباد میں بیٹھیں گے۔ قادری صاحب فرماتے ہیں کہ ایک کروڑ نمازی انقلاب کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ اُنہیں تو یہ ''بشارت'' بھی ہو گئی ہے کہ ماہِ اگست میں ہی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اُدھر عمران خاں صاحب ایک لاکھ موٹر سائیکلوں کا رُخ اسلام آباد کی طرف کیے بیٹھے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ اُن کے احتجاجی مارچ میں کم از کم دس لاکھ افراد ہونگے۔ مولانا طاہر القادری کہتے ہیں کہ جو پولیس والا اُن کی راہ کی رکاوٹ بنے کارکن جتھے کی صورت میں اُس پولیس والے کے گھر پر حملہ آور ہو جائیں جبکہ عمران خاں راہ کی رکاوٹ بننے والی پولیس کو پھانسی پر چڑھا دینے کی دھمکی دے رہے

ہیں۔ مقصد دونوں کا ایک، انارکی، انارکی محض انارکی۔ دونوں ہی انتہائے نرگسیت کے شکار اور اپنے آپ کو عظیم ترین رہنما تصور کرنے والے۔ اسی لیے دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کی قیادت میں احتجاجی مارچ کے لیے تیار نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا قادری 12 اگست کو ہی اسلام آباد میں جا بیٹھیں گے اور خاں صاحب 14 اگست کو اُن کے ساتھ مل جائیں گے۔ شیخ رشید اور چودھری برادران کی سیاست تو یہی تھی لیکن مولانا قادری نے عین موقعے پر اپنی راہیں جدا کر لیں اور انقلاب مارچ کی بجائے اگست کو لاہور میں یومِ شہداء منانے کا اعلان کر دیا۔ 10

مولانا طاہر القادری تو پارلیمانی سیاست پر یقین رکھتے ہیں نہ اُن کا پارلیمنٹ میں کوئی حصہ ہے لیکن خاں صاحب اسی پارلیمنٹ کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی مولانا طاہر القادری کی راہ پر چل نکلے ہیں جس کی بنا پر وہ سیاسی تنہائی کا شکار ہوگئے اور اب کوئی بھی سیاسی جماعت اُن کا ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ خیبر پختونخوا حکومت میں شریک تحریکِ انصاف کی اتحادی جماعت اسلامی اور عوامی جمہوری اتحاد نے اِس لانگ مارچ سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ جمہوریت کسی صورت ڈی ریل نہیں ہونی چاہیے۔ امیرِ جماعتِ اسلامی سراج الحق نے خیبر پختونخوا اسمبلی تحلیل کرنے کی تجویز کو سختی سے رَد کرتے ہوئے کہا کہ خیبر پختونخوا کے عوام نے صوبائی اسمبلی کو توڑنے کی تجویز کو پسند نہیں کیا البتہ تحریکِ انصاف اگر صوبائی اسمبلی چھوڑنا چاہتی ہے تو یہ اُس کا حق ہے۔ ایم کیو ایم نے بھی اِس لانگ مارچ سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے اور پیپلز پارٹی کے سید خورشید شاہ تو روزِ اول سے ہی اِس کی مخالفت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے کہ عمران خاں کا ایجنڈا کیا ہے۔ ایجنڈا تو خیر کچھ کچھ واضح ہوتا چلا جا رہا ہے اور اب تو صاف نظر آنے لگا ہے کہ خاں صاحب کا ایک ہی مطمعِ نظر یعنی وزارتِ عظمیٰ کا حصول اِس سے کم پر وہ کسی صورت راضی نہیں لیکن یہ منزل تو ابھی دور بہت دور نظر آتی ہے، کیونکہ موجودہ حکومت کو ہٹانے کی صرف تین ہی راہیں ہیں۔ پہلی یہ کہ میاں نواز شریف صاحب رضاکارانہ طور پر حکومت تحریکِ انصاف کے سپرد کر دیں، دوسری یہ کہ

تحریکِ عدم اعتماد کے ذریعے وزیرِ اعظم کو فارغ کر دیا جائے اور تیسری مارشل لاء۔ وزیرِ اعظم صاحب بھلا رضاکارانہ طور پر حکومت کیوں چھوڑنے لگے؟۔ البتہ تحریکِ عدم اعتماد لانا تحریکِ انصاف کا جمہوری حق ہے لیکن یہاں مسئلہ یہ آن پڑا کہ خاں صاحب کی ''پٹاری'' میں صرف 35 ووٹ جبکہ دوسری طرف نواز لیگ کے پاس 307۔ تحریکِ عدم اعتماد کی کامیابی کے لیے دو تہائی اکثریت یعنی 227 ووٹ درکار ہیں جبکہ خاں صاحب کے پاس مطلوبہ تعداد کا دسواں حصہ بھی نہیں۔ اِس لیے یہاں بھی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ تیسری راہ مارشل لاء کی ہے لیکن موجودہ حالات میں فوج کسی بھی صورت میں مارشل لاء کی متحمل نہیں ہو سکتی لیکن اگر ایک لمحے کے لیے یہ تصور کر بھی لیا جائے کہ خاں صاحب کے لانگ مارچ کی وجہ سے مارشل لاء بھی لگ سکتا ہے تو اس صورت میں بھی خاں صاحب کے ہاتھ تو کچھ نہیں آئے گا البتہ اُن کی سیاسی موت ضرور ہو جائے گی۔ ذرا ماضی میں جھانک کر دیکھئے، بھٹو دور میں پی این اے کی تحریک عروج پر تھی اور اصغر خاں مقبول ترین لیڈر۔ نتیجہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کی صورت میں نکلا اور اصغر خاں سیاسی شطرنج کی بساط سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے اور ضیاء الحق مرحوم کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہونے والی جماعتِ اسلامی کو اسی مارشل لاء نے تیس سال پیچھے دھکیل دیا اور اُسے اپنا سیاسی سفر نئے سرے سے شروع کرنا پڑا۔ اب اگر خاں صاحب کی تحریک کے نتیجے میں مارشل لاء آتا ہے تو قوم اُنہیں ہی موردِ الزام ٹھہرائے گی جو اُن کی سیاسی موت کے مترادف ہوگا۔ اگر لانگ مارچ کی صورت میں

جمہوریت مضبوط اور خاں صاحب کی منزل قریب ہوتی نظر آتی تو ہم بھی یہی کہتے کہ یہ خاں صاحب کا جمہوری حق ہے لیکن ایسا ہونا کسی بھی صورت میں ممکن نہیں۔ اگر خاں صاحب کو دھاندلی کی شکایت تھی تو اُنہیں چاہیے تھا کہ وہ اپنے اراکینِ اسمبلی کو حلف اُٹھانے سے منع کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آتے تاکہ قوم اُنکی باتوں پر دھیان بھی دیتی لیکن خاں صاحب نے انتخابی نتائج کو تسلیم بھی کیا اور خیبر پختونخوا حکومت کے مزے بھی لوٹے۔ اب سوا سال بعد اچانک اُنھوں نے وسط مدتی انتخاب کا مطالبہ کر دیا اور وہ اپنے اراکین سے اسمبلی کی رکنیت سے استعفے کا تقاضہ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں جس کی بنا پر اُن کی اپنی جماعت میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ عمومی خیال یہی ہے کہ اراکینِ اسمبلی کی غالب اکثریت مستعفی ہونے سے انکار کر دے گی۔ اب صرف ایک ہی راہ باقی بچتی ہے کہ خاں صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ پارلیمنٹ، ایوانِ صدر اور وزیرِ اعظم ہاؤس پر یلغار کر کے زبردستی حکومت چھین لیں۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟۔

حکومت تو گئی.....

مُرشد کو ''بشارت'' ہو گئی کہ اِسی ماہ میں جمہوریت کا جنازہ بڑی دھوم سے نکلنے والا ہے۔ یہ ابھی مُرشد نے طے نہیں کیا کہ میاں برادران کو پاکستان میں رہنے کی اجازت ہو گی یا پھر اُنہیں دوبارہ جَلاوطن کر دیا جائے گا۔ یوں تو ہم پہلے ہی جانتے تھے کہ کچھ غیبی قوتیں مُرشد کے ساتھ ہیں لیکن یہ نہیں پتہ تھا کہ وہ اتنی طاقتور بھی ہیں کہ 20 کروڑ عوام کے منتخب نمائندوں کو یوں پلک جھپکتے گھر بھی بھیج سکتی ہیں۔ مُرشد نے اگر کہا ہے تو پھر ٹھیک ہی کہا ہو گا کہ ماہِ اگست میں حکومت کو گھر بھیج دیا جائے گا۔ یہ بھی اُن کی مہربانی ہے کہ اُنھوں نے حکومت کو بستر بوریا سمیٹنے کے لیے بیس پچیس دِن کی مہلت دے دی وگرنہ وہ تو دو گھنٹے میں بھی انقلاب لا سکتے ہیں۔ مُرشد شاید فی الحال اپنے ''جلال'' کو آوارہ دیتے لیکن اُن کے اندر دھڑکتا نرم و نازک دِل قوم کی حالتِ زار پر رو رو کر حکمرانوں سے ''اوازار'' ہو چکا ہے اِس لیے اُنہیں طوہاً و کرہاً اپنے جلال کو آوار دینی پڑی۔ وہ چونکہ بہت ''احسان سپاس'' بھی ہیں اور ابھی تک میاں برادران کے ماضی میں کیے گئے احسانات نہیں بھولے۔ اسی لیے اُنھوں نے کہہ دیا کہ اب جبکہ حکومت کا جانا ٹھہر گیا تو میاں برادران خود فیصلہ کر لیں کہ پہلے وزیرِ اعظم استعفیٰ دیں گے یا پھر پہلے وزیرِ اعلیٰ

کو گھر بھیجنا پڑے گا۔

شیخ الاسلام نے چودھری برادران اور شیخ رشید کے ساتھ مل کر فیصلہ تو یہی کیا تھا کہ وہ اپنے مریدین کو ساتھ لے کر 12 اگست کو ہی ڈی چوک جا کر ہلّا گُلا کریں گے اور عمران خاں صاحب 14 اگست کو اپنی سونامی کے ساتھ اُن سے آن ملیں گے۔ وجہ یہ تھی کہ مُرشد کے مریدین تو ڈی چوک پر مہینوں بیٹھ سکتے ہیں کیونکہ اُن میں کچھ تو دیہاڑی دار مزدور ہوتے ہیں جن کا ہم پر کوئی احسان نہیں، کچھ مُرشد کے سکولوں کے اساتذہ اور اُن کے خاندان جنہیں اپنی نوکریاں عزیز ہوتی ہیں اور کچھ عقیدتوں بھرے مریدین جبکہ ''برگر فیملیز'' سے تعلق رکھنے والے سونامیے تو دو چار گھنٹوں میں ہی ''اوازار'' ہو جاتے ہیں اِس لیے دھرنے میں رنگ بھرنے کے لیے ضروری ہے کہ مُرشد مع اپنے مریدین پہلے ہی ڈی چوک جا کر بیٹھ رہیں۔ لیکن اُسی رات اُنہیں خواب

میں ''بشارت'' ہوئی کہ فی الحال ڈی چوک جانا مناسب نہیں اِس لیے اگلے دِن اُنہوں نے 10 اگست کو لاہور میں ہی یومِ شہداء منانے کا اعلان کر دیا اور چودھری برادران جو ایک دِن پہلے قہقہے لگا لگا کر صحافیوں کے ہر سوال کے جواب میں یہ کہہ رہے تھے کہ ''کل بتائیں گے'' وہ اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔ آخری خبریں آنے تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ مُرشد 10 اگست کو ہی حکومت کو گھر بھیجنے والے ہیں یا پھر 31 اگست تک کا انتظار کریں گے۔ اگر مُرشد کی ''جلالی طبیعت'' کو مدِ نظر رکھا جائے تو 10 اگست کو ہی ''حکومت تو گئی'' لیکن اگر اُن کے دِل

کی ''نازکی'' مدِ نظر ہو تو پھر 31 اگست تک۔ بعض سونا میسے کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام نے کپتان صاحب کے ساتھ دو خفیہ ملاقاتوں میں پکا وعدہ کیا تھا کہ وہ لانگ مارچ کا بھرپور ساتھ دیں گے لیکن اب وہ یوٹرن لے کر نواز لیگ کے ساتھ مل گئے ہیں لیکن ہم کہتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ اُنہوں نے توخُدا کی قسم اُٹھا کر کہا ہے کہ وہ سانحہ ماڈل ٹاؤن کے 16 شُہداء کی جانوں کا بدلہ 16 حکومتی کارندوں سے لیں گے جن میں وزیرِ اعظم اور پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بھی شامل ہیں۔اِس لیے یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ مُرشد کی ''اندر کھاتے'' نواز لیگ سے کوئی ڈیل ہو گئی ہو گی البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ مُرشد کو یہ ''بشارت'' ہوئی ہو کہ میاں برادران تو گئے اور اب اُن کی راہ کا اصل ''روڑا'' تو عمران خاں ہے اِس لیے خاں صاحب کے ہاتھ مضبوط کرنا سراسر گھاٹے کا سَودا ہے اور یہ جو شیخ رشید اور چودھری برادران اُنہیں عمران خاں کے ساتھ مِل جانے کے مشورے دے رہے ہیں وہ دراصل حبِ علیؓ نہیں بغضِ معاویہؓ ہے۔اب یہ تو پتہ نہیں کہ چودھری برادران اور شیخ رشید کِس طرف لڑھکتے ہیں لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم بیچ چوراہے کھڑے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔جِس کا پلڑا بھاری نظر آیا، اُسی کی طرف ''لڑھک'' جائیں گے کیونکہ کامیاب صحافت اسی کا نام ہے۔

مُرشد نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر حکومت نے یومِ شُہداء کی راہ میں رکاوٹ

پیدا کرنے کی کوشش کی تو پھر ''دما دَم مست قلندر''۔ پھر یومِ شُہداء جاتی عمرا میں بیٹھ کر منایا جائے گا۔ مُرشد کے اسی بیان سے ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ 10 اگست کو حکومت تو گئی۔ اِس ارسطوانہ اندازے کی وجہ یہ ہے کہ رانا ثناء اللہ کی عدم موجودگی کے باوجود خادمِ اعلیٰ مُرشد کو سیدھے ہاتھوں تو مُرشد کو یومِ شہداء منانے نہیں دیں گے اِس لیے جاتی عمرا جا کر یومِ شُہداء منانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر سانحہ ماڈل ٹاؤن سے سبق حاصل کرتے ہوئے حکومت نے ہمیں فری ہینڈ دے دیا تو ہم خود سانحہ ماڈل ٹاؤن جیسا کوئی ''ڈرامہ'' رچا کر حکومت کو چلتا کریں گے کیونکہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ ویسے بھی مُرشد یہ جو باہر سے ڈھیروں ڈھیر سرمایہ لے کر آئے ہیں اُسے کہیں تو صرف کرنا ہی ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا تو بیرونی دوستوں کی ناراضی کا شدید خطرہ ہے۔ ویسے میاں برادران بھی ''اندر کھاتے'' خوش ہی ہونگے کہ اُنکے ''روٹھے مُرشد'' بنفسِ نفیس جاتی عمرا تشریف لا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مُرشد جاتی عمرا میں بھی منہاج القُرآن کی ایک شاخ کھولنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ میاں برادران اگر مُرشد کو ماڈل ٹاؤن میں منہاج القرآن کے لیے لمبی چوڑی زمین کا تحفہ دے سکتے ہیں تو جاتی عمرا میں بھی دے ہی دیں گے کیونکہ وہ اِس قسم کے ''با

برکت'' کام بہت شوق سے کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو بڑے میاں صاحب کو ایک دفعہ پھر شیخ الاسلام کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر غارِ حرا تک لے جانے کی سعادت نصیب

ہو سکتی ہے لیکن اگر اِس کا موقع نہ ملا تو پھر بھی چھوٹے میاں صاحب کو تو مُرشد کے جوتے اتارنے اور پہنانے کی سعادت بار بار نصیب ہوتی رہے گی۔ حکومت کا کیا ہے، وہ تو آنی جانی شَے ہے، اگر میاں برادران کے پاس نہیں تو مُرشد کے پاس سہی، رہے گی تو گھر میں ہی۔ اور وہ جو خورشید شاہ صاحب بار بار کہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کسی صورت حکومت کو گرنے نہیں دے گی، وہ تو بَس ''ایویں ای'' مُنہ کا سواد بدلنے کے لیے کہتے ہیں۔ شاہ صاحب کے ''اصلی تے وَڈے'' لیڈر آصف زرداری صاحب تو کچھ اور ہی کہتے ہیں اور ''اندر و اندری'' اپوزیشن لیڈروں سے ملاقاتیں کر کے اُنہیں ''مفید'' مشورے بھی دیتے رہتے ہیں۔ اُنھوں نے تو میاں نواز شریف صاحب کو بھی کہہ دیا کہ ''وزیرِ اعظم بَن، بادشاہ نہ بن''۔ چومکھی لڑائی کے ماہر جناب آصف زرداری بھی ہماری طرح دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ وہ بھی جس کا پلڑا بھاری دیکھیں گے اُسی طرف لڑھک جائیں گے اور خورشید شاہ صاحب کو بھی مجبوراً اُدھر ہی لڑھکنا ہوگا۔ ویسے پلڑا تو ہمیشہ ہمارے مُرشد کا ہی بھاری ہوتا ہے اِس لیے ہمیں پکا یقین ہے کہ ''حکومت تو گئی''۔۔۔۔ اور اگر حکومت نہ گئی تو لکھ کے رکھ لیجیے کہ ''مُرشد تو کینیڈا گئے''۔

ہم آرہے ہیں

لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے کپتان صاحب کو ملک و قوم نہیں "کُرسی" سے محبت ہے اوراِس محبت کی جنگ میں وہ اپنا پُرانا "بال ٹمپرنگ" والا حربہ بھی استعمال کرنے سے نہیں چونکتے کیونکہ "جنگ اور محبت میں سب جائز ہے" لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ بالکل غلط اورالزام تراشی ہے کیونکہ خاں صاحب تولگ بھگ چودہ ماہ سے اپنی سونامی کو سمجھابجھا کر ٹھنڈا کرتے رہے لیکن "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق "سونامی" اب بپھر چکی ہے اور خاں صاحب کی بھی سُنی ان سنی کر دیتی ہے۔ سونامی کہتی ہے کہ خاں صاحب نے اپنے بیٹوں سے وعدہ کیا تھا کہ اُن سے اگلی ملاقات بطور والد نہیں وزیرِاعظم ہو گی۔اُسے یہ بھی علم ہے کہ خاں صاحب ضد کے پکے اور تھوڑے "ہٹ دھرم" واقع ہوئے ہیں اِس لیے اب وہ اتنی دیر تک اپنے بیٹوں سے نہیں ملیں گے جب تک وزیرِاعظم نہیں بن جاتے۔اُدھر میاں برادران کی جاری پالیسیوں اور منصوبوں کو دیکھ کر تویوں محسوس ہوتاہے کہ کپتان صاحب کا اِس جنم میں تووزیرِاعظم بننے کادور دور تک کوئی امکان نہیں۔ گویاخاں صاحب کو بیک وقت دودُکھ جھیلنا ہونگے۔ایک "کرسی" سے دوری کا دُکھ اور دوسرا بیٹوں سے جدائی کا۔ یہ صورتِ حال سونامی کو ہر گز قبول نہیں اسی لیے یہ طے ہے کہ اب معرکہ ہوگا،آخری معرکہ۔ حکمرانوں کے لیے بُری اور ہمارے لیے اچھی خبر یہ ہے کہ اب شیخ الاسلام

اور کپتان صاحب ایک ہی بولی بول رہے ہیں اور دونوں کا نقطۂ ارتکاز حکومت کا خاتمہ ہے لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ خاں صاحب حکومت کے خاتمے کے بعد الیکشن چاہتے ہیں جبکہ مولانا قادری صاحب انقلاب اور کڑا احتساب۔ سوچ کا یہ معمولی فرق بھی عنقریب دور ہو جائے گا۔ ہم نے ایک لیگئیے کو جب بڑے فخر سے یہ خبر سنائی تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا ''چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ اب ایک ہی ہلّے میں دونوں کا صفایا ہو جائے گا''۔ ہم نے کہا ''ایسی ہی خوش فہمیوں کی بدولت آپ کو پہلے بھی جَلاوطن ہونا پڑا''۔

مولانا صاحب نے تو قوم کو خوشخبری سنادی ہے کہ میاں برادران نے اپنا سامان باندھ لیا ہے اور وہ پاکستان سے کھسک لینے کو تیار بیٹھے ہیں۔ اب کی بار اُن کی منزل امریکہ ہے کیونکہ سعودی حکومت نے میاں برادران کو پناہ دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف میاں شہباز شریف کہتے ہیں کہ قُرآنِ پاک کی جھوٹی قسمیں اُٹھا کر قوم کو گمراہ کرنے والا عالمِ دین ہو ہی نہیں سکتا۔ مولانا طاہر اشرفی نے شیخ الاسلام کی گرفتاری کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر جامعہ حفصہ کی طالبات ڈنڈے اُٹھائیں تو اُنہیں فاسفورس بموں سے اُڑا دیا جاتا ہے لیکن منہاج القرآن کے سامنے ڈاکٹر طاہر القادری کی مریدنیاں ''ڈنڈے اٹھائے بیٹھی رہیں تو اُنہیں کچھ نہیں کہا جاتا۔ اشرفی صاحب کو پتہ ہونا چاہیے کہ یہ ''آستانۂ قادریہ'' ہے جہاں جمال نہیں جلال ہی جلال ہے۔ حکومت نے

کنٹینر لگا کر منہاج القرآن کی طرف جانے والے راستے تو بند کر دیئے لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ مُرشد کے ایک اشارے پر سارے کنٹینر بھاپ بن کر اُڑ جائیں گے۔ اُنھوں نے اپنی ڈنڈا بردار فورس کو حکم دیا جس نے پہلے پولیس کی دوڑیں لگوائیں اور پھر پلک جھپکتے میں منہاج القرآن کی طرف جانے والے راستوں کی ساری رکاوٹیں دور کر دیں۔ رہا شیخ الاسلام کی گرفتاری کا معاملہ تو سوال یہ ہے کہ بِلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟۔ یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ بِلّی ہی ''شیر'' پر حاوی نظر آتی ہے اور اب تو منہاج القرآن کی ''خونخوار'' بلیوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ شیخ الاسلام کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جانیں قُربان کر دیں گی۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو مختلف گروہوں میں منقسم کر کے شیخ الاسلام کی حفاظت بھی شروع کر دی ہے۔ ویسے اِن حکومتی ''بھولے بادشاہوں'' کو اتنا تو علم ہونا چاہیے تھا کہ ہم نے انقلاب کا نعرہ ''ایویں ای'' تو نہیں لگا دیا تھا۔ ہم نے اپنے گھوڑے تیار رکھے اور مُرشد کے حکم پر سروں پہ کفن بھی باندھ لیے لیکن ''بادشاہ'' استراحت فرماتے رہے۔ مُرشد کے حکم پر سبھی ایک ہاتھ میں کیل لگے ڈنڈے، دوسرے میں ڈھال، مُنہ پر گیس ماسک اور سروں پر ہیلمٹ ڈالے جب باہر نکلے تو پولیس کی دوڑیں لگوا دیں اور حکومت جو تین دِن سے کنٹینر لگا کر ''ہپھ'' چکی تھی اُس کی اِس کوشش کو تہس نہس کرتے ہوئے سارے کنٹینر لمحوں میں الٹا کے رکھ دیئے۔ یہی نہیں بلکہ شیخ الاسلام کے دیوانوں، پروانوں اور مستانوں نے پورے ملک میں وہ ''دھمال'' ڈالی اور پولیس کا ایسا حشر کیا کہ ''کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں

گرا''۔ گوجرانوالہ کے علاقہ سادھوکی میں 51 پولیس اہلکار زخمی ہوئے اور کچھ اغوا۔ خوشاب کا تھانہ ریکارڈ سمیت جلادیا، حوالات توڑ کر تین خطرناک ڈاکوؤں کو رہا کروایا اور ڈی ایس پی سمیت چار پولیس اہلکاروں کو اغو کر لیا تاکہ ''بوقتِ ضرورت'' کام آئیں۔ یہی نہیں بلکہ اب تو میاں شہباز شریف کی ناک کے عین نیچے اور اُن کے گھر سے چند قدم دور منہاج القرآن کے سامنے سے بھی چھ پولیس اہلکاروں کو یرغمال بنالیا گیا ہے۔ اب تو ''بادشاہوں'' کو پتہ چل گیا ہوگا کہ شیخ الاسلام کی ڈنڈا بردار فورس اُن کے احکامات کو ''صحیفۂ آسمانی'' سمجھتی ہے۔ میں نے ایک نواز لیگیئے سے کہا کہ حکومت ایک چھوٹے سے علاقے (ماڈل ٹاؤن) میں تو اپنی رِٹ قائم کر نہیں سکی، پورے ملک میں کیا خاک کرے گی۔ اُس نے تَپ کر جواب دیا کہ حکومت اِن ''دہشت گردوں'' کو چیونٹی کی طرح مَسل سکتی ہے لیکن طاہر القادری کی کوشش ہے کہ اُسے سانحہ ماڈل ٹاؤن کی طرح مزید لاشیں مِل جائیں جو ہم ہونے نہیں دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت طاقت کا بھرپور استعمال نہیں کر رہی۔ میں نے کہا کہ اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ مُرشد کے پروانے صرف ڈنڈا بردار فورس تک محدود ہیں تو وہ یہ خوش فہمی دِل سے نکال دیں۔ یہ تو ہمارا صرف ہراول دستہ تھا، ہمارے پاس ٹھیک ٹھیک نشانے لگانے والوں کی کمی ہے نہ جدید ترین اسلحے کی۔ ذرا وقت کو آگے کھسکنے دیں، پھر ایسا دمادم مست قلندر ہوگا کہ ہمارے بیرونی دوست خوش ہو جائیں گے اور یہ جو عزیز بھائی اور معروف کالم نگار رؤف طاہر نے اپنے کالم میں لکھا ہے کہ ''ایک دوست کی تجویز ہے ۔ قائدِ انقلاب کی اشتعال انگیز تقاریر کی وڈیو اسلام

آباد میں کینیڈین سفارت خانے کو بھجوا کر پوچھا جائے کہ فتنہ وفساد پر ابھارنے والی اِس کے شہری کی اِن سرگرمیوں پر کیا کارروائی کی جائے''۔ بھائی رؤف طاہر کے دوست بھی حکمرانوں کی طرح ''بھولے بادشاہ'' ہی ہیں کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ منہاج القرآن کا میڈیا سیل پہلے ہی نہ صرف کینیڈا بلکہ اپنے دیگر بیرونی دوستوں کو ایک ایک لمحے سے باخبر رکھ رہا ہے بلکہ اُن سے ہدایات بھی لے رہا ہے۔ کینیڈین حکومت کی تو اپنے شہری'' کے کارناموں پر باچھیں کھلی جا رہی ہیں، پنجاب حکومت لاکھ کینیڈین سفارت'' خانے کو خط لکھے، وہ اپنے ''کارآمد'' شہری کی شہریت منسوخ نہیں کرنے والی۔

آخر میرا قصور کیا

ہم نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ کپتان صاحب اور مولانا قادری کی
''اندر کھاتے'' دو ملاقاتیں ہو چکی ہیں اور 14 اگست کو سونامی مارچ اور انقلابی مارچ
اکٹھے ہو جائیں گے۔ دونوں اکٹھے تو ہو گئے لیکن یہ ابھی تک طے نہیں
ہو سکا کہ ''قیادت'' کس کے پاس ہو گی۔ اصولاً تو قیادت کے حقدار شیخ الاسلام ہی
ٹھہرتے ہیں کیونکہ ایک تو اُنہوں نے نہ صرف اپنے عقیدت مندوں
سے ''مارو یا مَر جاؤ'' کا بار بار حلف لیا بلکہ انقلابی مارچ سے بھاگنے والوں کو شہید کرنے
کا بھی حکم دیا۔ دوسرے خاں صاحب کے پاس صرف 10 لاکھ لوگ ہیں جبکہ علامہ
صاحب کے پاس ایک کروڑ جاں نثار۔ ہمیں خطرہ ہے تو صرف ایک کہ کہیں ''دو مُلاّؤں
میں مُرغی حرام'' نہ ہو جائے کیونکہ خاں صاحب کہہ سکتے ہیں ''مولانا! ہمارے پاس
تو خیبر پختونخوا کی حکومت بھی ہے اور پنجاب اسمبلی میں قائدِ حزبِ اختلاف بھی جبکہ آپ
کے پاس تو ''کَکھ'' بھی نہیں سوائے منہاج القرآن کے''۔ خاں صاحب شیخ الاسلام کو یہ
بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب پرویز مشرف دونوں کو الگ الگ وزارتِ عظمیٰ کا لالچ دے
کر مُکر گیا، تب مولانا صاحب تو کینیڈا کھسک گئے لیکن اُنہوں نے تو پاکستان میں رہ
کر جدوجہد کی اِس لیے ''کُرسی'' پر اُن کا حق ہے۔ اُدھر علامہ صاحب بھی خاں صاحب
کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُنہیں تو متعدد بار ''بشارت'' ہو چکی ہے اور اُن کے
پاس ''بشارتوں'' کا مکمل

ریکارڈ بھی موجود ہے اسلیے ”کُرسی“ پرآئینی، قانونی، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی حق اُنہی کا ہے۔

میاں نواز شریف صاحب نے وژن 2025ء کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ لانگ مارچ کرنے اور دھرنے دینے والوں سے پوچھتے ہیں کہ آخر حکومت کا قصور کیا ہے؟۔ جانتے میاں نواز شریف صاحب بھی ہیں لیکن اگر وہ اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہتے تو چلیں ہم کہے دیتے ہیں کہ اُنھوں نے حضرت علیؓ کا یہ قول یاد نہیں رکھا کہ ”جس پر احسان کرو، اُس کے شَر سے ڈرو“۔ جس جگہ علامہ کارکنوں کو یہ حکم دے رہے تھے کہ اگر وہ قتل کر دیئے جائیں تو عدالتوں پہ انحصار نہیں کرنا بلکہ میاں نواز شریف، اُنکے خاندان کے تمام مردوں اور ”کچن کابینہ“ کو قتل کر دینا، یہ وہی جگہ ہے جو میاں صاحب نے بطور چیف منسٹر پنجاب ایک حکم کے ذریعے مولانا طاہر القادری کے سپرد کی تھی۔ اُن کا دوسرا قصور یہ ہے کہ اُن کے میڈیا سیل کی کارکردگی انتہائی ناقص ہے جس کی بنا پر تقریباً تمام معروف نیوز چینلز ہر وقت اُن کی حکومت میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں جبکہ مولانا طاہر القادری کو اگر چھینک بھی آئے تو نیوز چینلز اُن کی ”متبرک چھینک“ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے سارا دِن گزار دیتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ 8 اگست کو اُن کے 7 کارکن قتل کر دیئے گئے۔ حکومتی حلقوں کی جانب سے اِس کی تردید آئی نہ بال کی کھال اتارنے اور ”اندر کی خبریں“ لانے والے الیکٹرانک

میڈیا کو سچ بولنے کی توفیق ہوئی۔ اسی الیکٹرانک میڈیا پر ایک کارکن کی موت کی خبر نشر ہوئی لیکن جونہی مولانا صاحب نے 7 کارکنوں کی موت کا ذکر کیا، سارے میڈیا کو سانپ سونگھ گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ حکومت جھوٹ بولتی ہے کہ تصادم میں پولیس کے 3 جوان شہید ہوئے۔ الیکٹرانک میڈیا تصادم میں شہید ہونے والے پولیس کے جوانوں کی بار بار نمازِ جنازہ دکھاتا رہا لیکن مولانا کے اعلان کے بعد یہ خبر بھی ''ہوا ہو گئی''۔ نیوز چینلز کی ''طنابیں'' کھینچنے والا پیمرا عالمِ مستی میں خراٹے لے رہا ہے اور الیکٹرانک میڈیا اعلانِ بغاوت کرنے والوں کی گھنٹوں بلکہ پہروں ''لائیو کوریج''۔ اِس شترِ بے مہار میڈیا کو حب الوطنی کے تقاضے کون سمجھائے؟۔ لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس خالد محمود نے بھی مولانا قادری کی اشتعال انگیز تقریر کی

میڈیا پر ''لائیو کوریج'' پر دُکھ اور حیرت کا اظہار کر دیا لیکن پیمرا خراٹے ہی لیتا رہا۔ میاں صاحب کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ اُنہیں جب بھی اقتدار ملتا ہے وہ ملک کی تقدیر بدلنے کے لیے نئے نئے منصوبے شروع کر دیتے ہیں اور اب کی بار تو اُنھوں نے حد ہی کر دی کہ بیرونی ممالک کی مدد سے پورے ملک میں اربوں ڈالر کے منصوبوں کا بیک وقت آغاز کر دیا جو خاں صاحب کو ہضم ہو رہا ہے نہ علامہ کو، کیونکہ اگر اُن کے دَورِ حکومت میں ایک تہائی منصوبے بھی مکمل ہو گئے تو پھر نواز لیگ کی اگلی تین چار ''باریاں'' تو پکی۔ میاں صاحب کو خود ہی سوچنا چاہیے کہ کپتان صاحب یا مولانا قادری کو اگر اسّی، پچاسی سال کی عمر میں وزارتِ عظمیٰ ملے تو اُنہیں کیا خاک مزہ آئے گا۔

محترم عمران خاں نے قوم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ 11 اگست کو پریس کانفرنس میں پورے ثبوتوں کے ساتھ 2013ء کے انتخابات میں ہونے والی دھاندلی کے بارے میں بتلائیں گے۔ لیکن بتلایا ''کچھ'' بھی نہیں سوائے بغیر ثبوت دھاندلی میں تین چار نئے نام شامل کرنے کے۔ اُنھوں نے ایک دفعہ پھر 35 پنکچروں کا ذکر کیا اور چار حلقوں کا بھی۔ اُنہیں یہ بھی گلہ ہے کہ اِس دفعہ سب سے زیادہ 15 لاکھ ووٹ مسترد ہوئے۔ نوازلیگ کہتی ہے کہ فافن (فری اینڈ فیئر الیکشن نیٹ ورک) جس کا خاں صاحب اپنی تقریروں میں بار بار ذکر کرتے ہیں، اُسی کے مطابق الیکشن 2013ء میں ہزار میں سے 32 ووٹ مسترد ہوئے جبکہ 2008ء میں ہزار میں سے 28 اور 2002ء میں 25 ووٹ مسترد ہوئے اور یہ مارجن اتنا نہیں کہ اسے دھاندلی کہا جاسکے۔ 35 پنکچروں کے بارے میں خاں صاحب کا مؤقف یہ ہے کہ اِن میں فتح کا مارجن مسترد شُدہ ووٹوں سے کم تھا اور اگر مسترد شُدہ ووٹ ''رَنراَپ'' کو دے دیئے جائیں تو وہ جیت جاتا ہے۔ خاں صاحب کا فرمان بجا لیکن اِن 35 حلقوں میں سے صرف 6 حلقوں میں تحریکِ انصاف کے امیدوار رَنراپ تھے باقی تمام حلقوں میں تیسرے اور چوتھے نمبر پر۔ دوسری بات یہ کہ اِن 35 حلقوں میں نوازلیگ کے 12 اُمیدوار کامیاب ہوئے، باقی سیٹوں میں سے 4 پیپلزپارٹی، 6 آزاد اور 13 قاف لیگ، اے این پی، جماعتِ اسلامی، جے یو پی اور این پی پی کے حصّے میں آئیں۔ اِس لیے خاں صاحب کو تمام سیاسی جماعتوں کو موردِ الزام ٹھہرانا چاہیے صرف نوازلیگ

کو نہیں اور سب سے پہلے تو اپنی اتحادی جماعتِ اسلامی سے پوچھنا چاہیے کہ اُس نے پنکچر کیسے لگائے؟۔4 حلقوں کی صورتِ حال یہ ہے کہ فافن ہی کی رپورٹ کے مطابق 1 میں دھاندلی NA حلقہ 110 میں کوئی دھاندلی نہیں ہوئی جبکہ خود خاں صاحب کے حلقہ کے 58 کیسز ریکارڈ ہوئے۔ حلقہ 110 میں خواجہ آصف کے خلاف تحریکِ انصاف کے عثمان ڈار نے پٹیشن دائر کی لیکن ٹریبونل میں پیش ہونے کی بجائے بیرونِ ملک کاروباری دوروں پر رہے جس پر اُنہیں 30 ہزار روپے جرمانہ بھی ہوا اور پٹیشن خارج کر دی گئی۔ 4 حلقوں میں جہانگیر ترین کا حلقہ بھی شامل ہے جہاں جہانگیر ترین کو آزاد اُمیدوار نے شکست دی اور نواز لیگ تیسرے نمبر پر رہی۔ سپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق کبھی تحریکِ انصاف کے صفِ اوّل کے لیڈر ہوا کرتے تھے۔ وہ خاں صاحب کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔ اسی لیے اُنہوں نے کہا کہ وہ خاں صاحب کو ہر سہولت دینے کو تیار ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اگر دھاندلی ثابت نہ ہوئی تو عمران خاں قومی اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں گے۔ الیکشن ٹریبونلز نے نواز لیگ کے سب سے زیادہ (10) اراکین کو ناکام
قرار دیا اور تحریکِ انصاف کے صرف 2 کو۔ اِن پٹیشنز میں پیپلز پارٹی کے 6 اور 8
آزاد درخواست گزاروں کو فائدہ ہوا۔ تحریکِ انصاف کے ہارنے والے اُمیدواروں میں سے صرف 58 نے الیکشن ٹریبونلز میں درخواستیں دیں، 42 کا فیصلہ ہو چکا اور کسی ایک پر بھی دھاندلی ثابت نہیں ہوئی۔ خاں صاحب کا الزام ہے کہ 2008ء میں نواز لیگ نے لاکھ ووٹ لیے، یہ 2013ء میں ڈیڑھ کروڑ کیسے بن گئے؟۔ یہی سوال خاں صاحب 68 سے بھی کہ تحریکِ انصاف نے 2002ء میں

پورے ملک میں صرف ایک لاکھ پچاس ہزار ووٹ لیے، یہ 2013ء میں 78 لاکھ کیسے بن گئے؟۔کیا تحریکِ انصاف نے بھی دھاندلی کی ہے؟۔

آزادی اور انقلاب مارچ ایک ہی سڑک پر

لوگ کہتے ہیں کہ مولانا طاہر القادری اور محترم عمران خاں کی آگ اُگلتی تقریروں کی بنا پر قوم کو 300 ارب کا ٹیکہ لگ چکا، سٹاک مارکیٹ کریش کر گئی، روپیہ ایک دفعہ پھر ڈالر کے مقابلے میں تیزی سے نیچے گرنے لگا اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے لیکن حکومت گومگو میں رہی۔ میری عزیز دوست شاعرہ مہرین چودھری کہتی ہیں کہ اگر یہی لانگ مارچ مہنگائی، بَدامنی اور لوڈشیڈنگ کے خلاف نکالے جاتے تو پوری قوم ساتھ دیتی لیکن یہاں تو کسی کو آپریشن ضربِ عضب کا بھی خیال نہیں۔ میں نے کہا کہ حالتِ جنگ میں تو ہم بھی ہیں لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ ہم کرسی کے حصول کی جنگ کر رہے ہیں جبکہ جَری جوان سرحدوں کی حفاظت کی جنگ۔ اللہ کے سپاہی تو انشاء اللہ سُرخ رو ہونگے ہی لیکن یہ طے ہونا ابھی باقی ہے کہ آزادی اور انقلاب مارچ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ اگر دھرنا طوالت پکڑ گیا تو سونامیوں اور انقلابیوں کی جھولی میں بھی کچھ نہ کچھ آن گرے گا لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ مولانا قادری کے عقیدت مند تو پھر بھی دو چار روز بیٹھ رہیں گے لیکن ہمارے نرم و نازک ''سونا میے'' تو ایک دِن میں ہی مرجھا جائیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس کا ''سٹیمنا'' زیادہ ہے، سونامیوں اور انقلابیوں کا یا حکومت کا؟۔

محترم خاں صاحب نے فرمایا تھا کہ اُن کے آزادی مارچ کے ساتھ ایک لاکھ موٹر سائیکل ہونگے اور ایک لاکھ سات ہزار موٹر سائیکل تو تحریکِ انصاف کے پاس رجسٹر بھی ہو چکے تھے لیکن ہماری ''مخولیہ'' حکومت کہتی ہے کہ گوجرانوالہ ٹول پلازہ پر جب گنتی کہ گئی تو خاں صاحب کے سونامی مارچ کے ساتھ صرف 237 موٹر سائیکل تھے۔ حسّاس اداروں کی رپورٹ کے مطابق تحریکِ انصاف کے لانگ مارچ میں 75 لینڈ کروزرز، 22 ٹرک، 21 بسیں اور 230 کاریں شامل تھیں جن میں زیادہ سے زیادہ 5400 افراد ہی سوار ہو سکتے ہیں جبکہ دوسری طرف انقلاب مارچ میں 964 کاریں، 162 بسیں، 90 کوسٹرز، 92 منی بسیں اور 26 ٹرک شامل تھے جن میں زیادہ سے زیادہ 16000 افراد سوار ہو سکتے ہیں۔ یہ حسّاس ادارے بھی بَس ''ایویں ای'' ہیں۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ کیا یہ کسی یونین کونسل کے کونسلر کا جلوس تھا؟۔ کچھ تو خُدا کا خوف کریں، مانا کہ ہم دَس لاکھ لوگ اکٹھے نہیں کر سکے لیکن یہ تعداد دَس ہزار سے بہر حال زیادہ تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اتنے لوگ ہی اسلام آباد جانے تھے تو پھر حکومت ''وَخت'' میں کیوں پڑی ہوئی تھی؟۔ اُدھر حکومتی حلقے بیچارے تو خود پریشان و پشیمان ہیں کہ اگر تعداد اتنی ہی ''شرمناک'' ہونی تھی تو پھر اُس نے ''ایویں خواہ مخواہ'' گُلو بٹوں اور پومی بٹوں کو ''وَخت'' میں ڈالے رکھا۔ حسّاس اداروں کی رپورٹ پر طیش میں آ کر مولانا صاحب نے یہ راز بھی افشاء کر دیا کہ سانحہ ماڈل ٹاؤن میں 14 نہیں بلکہ 50 افراد قتل ہوئے۔ چودہ کے جنازے

پڑھا دیئے گئے جبکہ باقی حکومت کے ''گلوبٹوں'' نے غائب کر دیئے۔ دروغ بَر گردن راوی جب رپورٹر نے مولانا سے یہ سوال کیا کہ اِن چھتیس افراد کے لواحقین کہاں ہیں اور اُنھوں نے احتجاج کیوں نہیں کیا تو مولانا طیش میں آ گئے اور رپورٹر کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ اُن کا انقلاب مارچ 32 کلومیٹر لمبا تھا۔ مولانا صاحب چونکہ شیخ الاسلام بھی ہیں اِس لیے وہ تو جھوٹ بول نہیں سکتے اِس لیے یہ ماننا ہی پڑے گا کہ حکومت جھوٹ بولتی ہے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں ''جھوٹ'' ہی جمہوریت کا حسن ہے۔ مُرشد نے یہ بھی کہا کہ اُن کا قافلہ پانچ، چھ لاکھ افراد پر مشتمل ہے جو اسلام آباد پہنچتے پہنچتے دَس لاکھ ہو جائے گا۔ جب کسی ''شریر'' صحافی نے مولانا سے سوال کیا کہ انھوں نے تو ایک کروڑ ''نمازیوں'' کے ساتھ انقلاب مارچ کرنا تھا تو پھر دَس لاکھ کیوں؟۔ تَب مولانا نے مُسکرا کر کہا (ویسے مولانا کم کم ہی مسکراتے ہیں) کہ مروت بھی کوئی شَے ہوتی ہے۔ اُن کی کپتان صاحب کے ساتھ نئی نئی دوستی ہوئی ہے اور چونکہ خاں صاحب نے دَس لاکھ کے مارچ کا اعلان کیا تھا اِس لیے اُنھوں نے بھی یہی مناسب جانا کہ دَس لاکھ عقیدت مندوں کے ساتھ ہی انقلاب مارچ کیا جائے۔ ویسے ہم پریشان تھے کہ اسلام آباد کی تو کل آبادی پندرہ لاکھ ہے پھر یہ بیس لاکھ سمائیں گے کہاں؟۔ لیکن ہم یہ بھول گئے کہ یہاں بھی مُرشد کی ''کرامت'' رنگ دکھائے گی۔ اب دیکھ لیجئے کہ بیس لاکھ افراد صرف ایک ہی سَڑک پر سما گئے۔

گیارہ بج چکے لیکن دھرنا ابھی تک شروع ہوا، نہ مُرشد کا خطاب۔ عقیدت مند اڑھائی تین
گھنٹے تک تو مُرشد کو تلاش ہی کرتے رہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اُن کی طبیعت خراب ہو گئی
تھی اِس لیے اُن کے ''قریبی عقیدت مند'' چپکے سے اُنہیں ایمبولینس میں لٹا آئے تا کہ وہ
آرام کر لیں۔ اُدھر خاں صاحب نے بھی فرمایا چونکہ وہ چالیس گھنٹے سے سو نہیں سکے اِس
لیے قوم کے بہترین مفاد میں دھرنا دوپہر تین بجے تک ملتوی کیا جاتا ہے۔ آخری خبریں
آنے تک خاں صاحب بنی گالہ میں استراحت فرما رہے ہیں اور مُرشد ایمبولینس میں۔ رہی
انقلاب اور آزادی مارچ کے ''خواتین و حضرات'' کی بات تو وہ اسلام آباد کی سڑکوں
پر بارش سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ ''سونامیے'' اور ''انقلابیے'' تو بھیگے
ہوئے موسم کا مزہ لے رہے ہیں جبکہ حامد میر کہتے ہیں '' دھرنے کا زور ٹوٹ گیا ہے
اور سفینۂ غمِ دھاندلی بارش کے پانی میں ہچکولے کھا رہا ہے''۔ مشاہد اللہ خاں کہتے ہیں کہ
عمران خاں دھرنا درمیان میں چھوڑ کر بنی گالہ چلے گئے اور اب لوگ سڑکوں
پر ''رُل'' رہے ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا البتہ ہمارے کچھ
پٹھان بھائی بیمار ضرور ہو گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ پٹھان بھائی ''نسوار'' کے بغیر رہ
نہیں سکتے۔ ہم نے ایک نیوز چینل پر لانگ مارچ میں شریک ایک پٹھان بھائی کو کہتے
ہوئے سُنا کہ '' نسوار ہمارے لیے CNG کا کام کرتی ہے اور اِسے مُنہ میں رکھتے ہی
ہمارا گاڑی سٹارٹ ہو جاتی ہے''۔ اب ایک تو اُن کا نسوار کا کوٹہ ختم ہو چکا ہے دوسرے
طوفانی بارش جس کی بنا پر خیبر پختونخوا سے آئے ہوئے کُل سات سو ''سونامیوں'' میں
سے پونے

KPK سے پانچ سو بیمار پڑ چکے ہیں لیکن اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ شنید ہے کہ نسوار کا تازہ کوٹہ لایا جارہا ہے جس کے پہنچتے ہی پٹھان بھائی تازہ دم ہو کر پھر ڈھول کی تھاپ پر رقص کرنے لگیں گے۔

سِول نافرمانی اور جتھا راج

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

شرمناک،انتہائی شرمناک،18 معصوم طوفانِ بادوباراں کی بھینٹ چڑھ گئے اور 80 سے زائد ہسپتالوں میں بے یارومددگار۔ہر ہسپتال میں ایمرجنسی کا نفاذ لیکن صوبے کا سربراہ موسیقی کی دھن پر سٹیج پر ناچتا رہا،بنی گالہ کا ''لاڈلا'' جھومتا رہا اور ''امریکی بھگوڑا'' دھمال ڈالتا رہا۔سچ کہا مولانا فضل الرحمٰن نے کہ ''یہ آزادی نہیں ناچ مارچ ہے''۔دھرنا کپتان صاحب کا ہو یا مولانا طاہر القادری کا،ہر جگہ بھنگڑے اور ڈانس ہی نظر آتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بیس پچیس ہزار مرد وزن مل کر پکنک منا رہے ہوں۔ مولانا طاہر القادری اپنے مقصد میں کامیاب کہ اُن کا تو ایجنڈا ہی افرا تفری اور انارکی ہے۔میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ آخر خودکُش بمبار کیسے بنائے جاتے ہیں اور یہ کس ناجیے کے لوگ ہیں جو ہنس کر موت کو گلے لگا لیتے ہیں لیکن میری یہ الجھن مولانا قادری نے دور کر دی۔اگر کوئی ''برین واشنگ'' کے فن میں طاق ہونا چاہے تو مولانا صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر دے۔تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُن کے خطبات میں ایسا سحر اور اداکاری اتنی پرفیکٹ ہے کہ سامع اور ناظر مسحور۔عقیدت گزیدہ کی تو بات ہی کیا،اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی اُن کے سحر میں گرفتار۔انٹرنیٹ مولانا کے کارناموں سے لبالب لیکن یہ عالم وفاضل اِس

پر دھیان دینے کو تیار نہیں۔ وہ سوات کے مولانا صوفی محمد کو تو دہشت گرد قرار دیتے ہیں لیکن جب مولانا قادری وہی مطالبات لے کر سامنے آتے ہیں تو اُنہیں
بلا جھجک ''مُرشد'' تسلیم کر لیتے ہیں۔ شاید یہ ''حُبِ علیؑ نہیں، بغضِ معاویہؓ '' ہے اور وہ اپنے بغض میں اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ میاں برادران کا نام سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ جب ایسے عقیل و فہیم لوگوں کی راہیں اُلجھ چکی ہوں تو پھر قوم کی بربادیوں کا نوحہ پڑھ لینا چاہیے کیونکہ یہی تو وہ لوگ تھے جن سے ناتراشیدہ ہیروں کی تراش خراش کا کام لیا جانا تھا۔

دھرنا دیئے بیٹھے رہنما تو اپنی ضد میں اٹل ہیں ہی کہ اُن کا ایجنڈا ہی یہی ہے لیکن میاں برادران بھی کسی سے کم نہیں۔ میری یہ مجال کہاں کہ کہہ سکوں ''نیرو چین کی بانسری بجا رہا ہے'' لیکن یہ کہنے کی جسارت ضرور کہ میاں صاحبان کا رویہ نا قابلِ فہم ہے۔
مانا کہ وزیرِ اعظم صاحب کے پاس دو تہائی اکثریت ہے اور 342 کے ایوان میں 307 اُن کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہیں لیکن یہ دو تہائی اکثریت تو اُس وقت بھی تھی جب آمر مشرف نے اُن کی حکومت کا تختہ اُلٹا۔ تاریخ تو یہی بتلاتی ہے کہ سازشی عناصر ہمیشہ قلیل اقلیت میں ہوتے ہیں جو اپنی سازشوں کے بَل بوتے پر اکثریت پر اکثر حاوی ہو جاتے ہیں لیکن نواز لیگ اب بھی اپنی اکثریت کے زعم میں مبتلاء اور میاں برادران کا رویہ یہ کہ

کب دہلا ہے آفاتِ زمانہ سے میرا دل

طوفاں کو جو آنا ہے تو دروازہ کھلا ہے

مولانا طاہر القادری تو ''فارن فنڈنگ'' کے سہارے اپنے مغربی آقاؤں کے ایجنڈے کی تکمیل کی خاطر ہر سال پاکستان پر حملہ آور ہو جاتے ہیں البتہ ''انوکھے لاڈلے'' کے بارے میں حسنِ ظن تھا کہ اُس کا خمیر پاک وطن کی مٹی سے اُٹھا ہے اور اُس کی چاہتوں کا محور و مرکز پاکستان ہے، محض پاکستان۔ لیکن ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا تھا، جو سُنا افسانہ تھا''۔ محترم خاں صاحب نے ثابت کر دیا کہ ہوسِ اقتدار کی تگ و دَو میں وہ بھی کسی سے کم نہیں۔ اُنھوں نے ایک لاکھ موٹر سائیکلوں اور دس لاکھ انسانوں کے ہجوم کے ساتھ اسلام آباد پر حملہ آور ہونے کی ٹھانی لیکن اپنے مقصد میں بُری طرح ناکام ہوئے۔ تب اُن کی ''انانیت'' نے اُنھیں ایسا درس دیا کہ سبھی انگشت بدنداں۔ اُنھوں نے سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اُن کی چاہتوں کا محور و مرکز دھرتی ماں نہیں ''کُرسی'' ہے محض کرسی۔ خاں صاحب جانتے ہی ہونگے کہ سول نافرمانی کی تو تاریخ ہی یہی ہے کہ یہ ہمیشہ بیرونی غاصبوں کے خلاف شروع کی جاتی ہے اپنے ملک اور اپنی حکومت کے خلاف نہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہونگے کہ یہ صریحاً غیر آئینی فعل ہے جس پر آرٹیکل چھ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک صوبے میں اُن کی اپنی حکومت ہے اور اُن کے وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک واشگاف الفاظ میں یہ کہہ چکے ہیں کہ اُنکی حکومت مستعفی نہیں ہو گی۔ اگر سول

نافرمانی کی تحریک کامیاب ہوجاتی ہے (جس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں)
تو پھر پرویز خٹک صاحب خیبر پختونخوا کی حکومت کیسے چلا پائیں گے؟۔ اگر خاں صاحب کو سول نافرمانی کا اتنا ہی شوق ہے تو اُنہیں چاہیے کہ پہلے وہ اِس پارلیمنٹ سے مستعفی ہوں جسے وہ جعلی قرار دے رہے ہیں۔ پرویز خٹک صاحب کو خیبر پختونخوا حکومت سے دست بردار ہونے پر آمادہ کریں اور پھر سول نافرمانی کا شوق پورا کر لیں۔

خاں صاحب ہمیشہ وطنِ عزیز کو قائدِ اعظم کا پاکستان بنانے کے دعوے کرتے رہے اور اُن کے کاسہ لیس لکھاری اُنہیں ''قائدِ اعظم ثانی'' کے خطاب سے نوازتے رہے لیکن پتہ یہ چلا کہ خاں صاحب کا آئیڈیل تو گاندھی ہے اور وہ فرموداتِ قائدِ اعظم نہیں، فرموداتِ گاندھی پر عمل پیرا ہیں۔ سول نافرمانی کی تحریک کے اعلان سے ذرا پہلے اُنھوں نے بنی گالہ میں ایک نیوز چینل کی اینکر پرسن کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ اُن کا سٹائل ''گاندھی'' جیسا ہے۔ شاید خاں صاحب نہیں جانتے کہ جب گاندھی جی نے ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو قائدِ اعظم نے اسے تسلیم کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ کانگرس بھی چھوڑ دی۔ پوری قوم تو آج بھی محمد علی جناحؒ کو ہی قائدِ اعظم تسلیم کرتی ہے اور انشاء اللہ تسلیم کرتی رہے گی البتہ سونامیوں کو نوید ہو کہ ان کے قائدِ اعظم گاندھی جی ہیں۔

وزیرِ خزانہ جناب اسحاق ڈار کہتے ہیں کہ ’’ پہلے پاکستان اقتصادی طور پر دیوالیہ ہونے کے قریب تھا لیکن حکومت کی محض ایک سالہ کارکردگی کی بنا پر دُنیا بھر کی اقتصادی سروے رپورٹس سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ پاکستان بہتری کی جانب گامزن ہے۔اب دھرنوں کی سیاست سے ایک دفعہ پھر سبھی چونک اُٹھے ہیں اور IMF کے وفد نے بھی پاکستان آنے سے انکار کر دیا ہے۔اِس افراتفری میں ساڑھے چار سو ارب کا نقصان ہو چکا اور سٹاک مارکیٹ کریش کر گئی‘‘۔جنابِ اسحاق ڈار کو علم ہونا چاہیے کہ محترم عمران خاں کے ایوانِ اقتدار تک پہنچنے کی صرف ایک ہی راہ تھی کہ پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن نہ ہو سکتا اور خاں صاحب ’’نئے پاکستان ‘‘ کا نعرہ لگا کر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچ جاتے ۔لیکن ڈار صاحب نے خاں صاحب کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔اقتصادی طور پر مضبوط پاکستان میں بھلا کپتان صاحب کی گنجائش کہاں ؟۔

چلو، چلو! اسلام آباد چلو

آپریشن ضربِ عضب دھرنوں کی دھول میں گم ہوگیا، آئی ڈی پیز کی بے بسی و بے کسی پر مایوسیوں کی سیاہ چادر ڈال دی گئی اور ہم نے انقلاب کی خاطر ''چلو، چلو! اسلام آباد چلو'' کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے دھرنے کے شرکاء کی تعداد سے مایوس ہو کر پوری قوم کو دھرنے میں شرکت کی اپیلیں کرنا شروع کر دیں اور محترم خاں صاحب نے سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کرکے قائدِ اعظمؒ کا احسان اتارنے کی تگ ودَو۔ اگر خُدانخواستہ سِول نافرمانی کی تحریک کامیاب ہو گئی تو پھر خاکم بدہن ہمیں ایک دفعہ پھر اُسی کرب سے گزرنا پڑے گا جس سے دسمبر 1971ء کو گزرنا پڑا تھا۔ ہم تو کرب سے آشنا ہیں کہ بچشمِ نَم پاکستان کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا لیکن نسلِ نَو کو کیا پتہ کہ یہ کرب کیا ہوتا ہے۔ ہمارا جینا مرنا تو اسی دھرتی سے جُڑا ہوا ہے۔ رہنماؤں کا کیا ہے اُن کے تو پوری دُنیا میں ٹھکانے ہیں۔ یہاں نہ سہی تو وہاں سہی۔ سوچنا تو نسلِ نَو کو ہے کہ کہیں اُن کے جذبات سے کھیلا تو نہیں جا رہا؟۔ کہیں اُن کی معصومیت کو لہو میں ڈبو کر ہوسِ اقتدار کی راہوں کو ہموار تو نہیں کیا جا رہا؟۔ کہیں کوئی خفیہ ہاتھ افراتفری اور انارکی پیدا کرکے قائدؒ کے پاکستان کے مزید ٹکڑے تو نہیں کرنا چاہتا؟۔ اُنہیں ایک لحظے کے لیے رُک کر یہ سوچنا ہوگا کہ اوّلیت کسے ہے، ملک کو یا اقتدار کے پجاریوں کو؟۔ اُنہیں

یہ بھی سوچنا ہوگا کہ کیا احتجاجوں اور تحریکوں کے لیے یہ وقت مناسب ہے؟۔ کپتان صاحب بھلے اِس سے بھی کوئی بڑی تحریک لے کر اٹھتے اور میاں برادران کو گھر بھیج دیتے لیکن قوم کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتے وقت کیا انہوں نے سوچا کہ اقتدار کی اِس جنگ میں اُن ماؤں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی جن کے کڑیل جوان سرحدوں کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں، اُن بہنوں کا کیا حال ہوتا ہوگا جن کے وجیہہ و شکیل بھائی اپنے قدموں پہ چل کر گئے اور آئے پاکستان کے جھنڈے میں لپٹے ہوئے تابوتوں میں، اُن سہاگنوں کا کیا عالم ہوتا ہوگا جن کے سہاگ وطن کی آبرو پر قربان ہو گئے۔ بوڑھے باپ یہ سوچتے تو ضرور ہونگے کہ اُنہوں نے اپنے جگر گوشوں کی قربانی کیوں دی؟۔ کیا ایسے لوگوں کے لیے جن کی ہوس کے خونی پنجے ملکی سالمیت کو اُدھیڑ کے رکھ دینے کے درپے ہیں؟۔

مولانا قادری نے کینیڈا میں بیٹھ کر یہ دعویٰ کیا تھا کہ اُن کے انقلاب میں ایک کروڑ لوگ شامل ہونگے اور ایک پتا ہلے بغیر انقلاب آ جائے گا لیکن ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا''۔ وہ بیس، پچیس ہزار عقیدت مند بھی اکٹھے نہ کر سکے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اسی کو پانچ، چھ لاکھ ظاہر کر رہے ہیں۔ چلیں پانچ چھ لاکھ بھی مانے لیتے ہیں مگر ایک کروڑ۔۔۔۔؟۔ مولانا کہتے ہیں کہ ایک پتا ہلے بغیر انقلاب آ جائے گا لیکن انقلاب تو ہوتا ہی لہو رنگ ہے اور نخلِ انقلاب کی آبیاری ہمیشہ لہو سے

ہوتی ہے کیونکہ اسے لہو بہت مرغوب ہے۔فرانس میں انقلاب آیا اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انسانوں کو چاٹ گیا۔روس کے انقلاب میں لگ بھگ پچیس لاکھ،امریکی سول وار میں چھ لاکھ اور ماؤزے تنگ کے طویل ترین ثقافتی انقلاب میں تیس لاکھ لوگوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ہمارے پڑوس میں امام خمینی کے انقلاب میں شاہ ایران نے ساٹھ ہزار مار دیئے اور انقلاب کے بعد امام خمینی کے پیروکاروں نے سوا لاکھ۔تاریخ تو یہی بتلاتی ہے کہ انقلاب ہمیشہ خونی ہی ہوتے ہیں لیکن مولانا صاحب کا ''سبز انقلاب'' پتہ نہیں کیسے خوں رنگ نہیں ہوگا۔ہو سکتا ہے کہ کینیڈا سے امپورٹ کیے گئے انقلاب خوں رنگ نہ ہوتے ہوں۔یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مولانا کے نزدیک انقلاب بھی کوئی جنسِ بازار ہے جسے جب جی چاہا،پیسے دے کر خرید لیا۔مایوس کُن دھرنے اور گھٹنے کے الٹی میٹم جیسے فلاپ شو کے بعد اب مولانا نے پاکستانی عوام سے اپیلیں کرنی 48 شروع کر دی ہیں کہ وہ جلد از جلد اسلام آباد پہنچ کر اُن کے دھرنے میں شامل ہوں۔اُن کا فرمان ہے ''اب گھروں میں بیٹھنا حرام ہے''۔لیکن شاید مولانا خود بھی نہیں جانتے کہ کچھ عقیدت مندوں کے سوا کوئی اُنہیں عالمِ دیں تک ماننے کو تیار نہیں، مفتی تو بہت دور کی بات ہے۔ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ اللہ کے نام پر حاصل کیے گئے اِس ملک میں افراتفری پھیلانا اور اسے انارکی کی طرف دھکیل کر لے جانا گناہِ کبیرہ اور حرام ہے۔

عمران خاں صاحب نے بھی دھرنے کے شرکاء کی تعداد سے مایوس ہو کر سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی اور میاں برادران کو استعفوں کے لیے 48 گھنٹوں کا الٹی میٹم دے دیا لیکن چوبیس گھنٹے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ خود سوائے خیبر پختونخوا کے ساری اسمبلیوں سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا۔ خیبر پختونخوا سے اِس لیے نہیں کہ وہاں اُن کی اپنی حکومت ہے اور وہاں الیکشن کروانے کے لیے آسمان سے فرشتے اُترے تھے۔ اگر وہاں بھی اسی کرپٹ الیکشن کمشن کی زیرِ نگرانی انتخابات ہوئے تو پھر وہاں بھی یقیناً دھاندلی ہوئی ہوگی۔ اگر پرویز خٹک کی حکومت بھی دھاندلی ہی کی پیداوار ہے تو پھر وہاں استعفے کیوں نہیں؟۔ جب پورے پاکستان نے سول نافرمانی کو یکسر مسترد کر دیا تو خاں صاحب نے استعفوں کا آپشن استعمال کرتے ہوئے ''ریڈزون'' میں داخلے کا اعلان بھی کر دیا اور دھرنے کے شرکاء کی انتہائی مایوس کُن تعداد کو دیکھتے ہوئے لاہور اور خیبر پختونخوا کے ''سونامیوں'' کو اسلام آباد پہنچنے کی اپیل بھی کر دی۔ اُنھوں نے سونامیوں کو پُرامن رہنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ آج (19 اگست) کو ریڈزون کراس کیا جائے گا۔ پتہ نہیں خاں صاحب کس کو بیوقوف بنا رہے ہیں، جب ریڈزون کراس ہوگا تو خون تو بہے گا۔ قوم کے جذباتی بچے اور بچیاں تو خاں صاحب کی پکار پر لبیک کہہ رہے ہیں لیکن خاں صاحب کے اپنے بیٹے اور تحریکِ انصاف کے اکابرین کے بچے بچیاں اپنے گھروں میں استراحت فرما رہے ہیں۔ سونامیے ریڈزون ضرور کراس کریں لیکن اِس شرط کے ساتھ کہ صرف عمران خاں صاحب نہیں بلکہ ان کے بیٹے اور تحریکِ انصاف کے تمام رہنماؤں کے

خاندان صفِ اول میں ہوں اور کارکن پیچھے۔

دراصل سیاسی نَو وارد خاں صاحب کو پتہ ہی نہیں تھا کہ دھرنے میں کیا مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ پہلے دن تو وہ اپنے بنی گالہ میں بنائے گئے محل میں کھسک لیے لیکن دوسرے دن ''عاجزانہ درخواست'' کے باوجود سونامیے ڈٹ گئے اور خاں صاحب کو وہیں گدا بچھا کر لیٹنا پڑا۔ اُس وقت اُن کی حالت یہ تھی کہ

بستر کی ہر شکن سے پوچھ اُس کی بے قراری
کاٹی ہو رات جس نے کروٹ بدل بدل کے

خاں صاحب تین گھنٹے تک کروٹیں بدلتے رہے اور جب دیکھا کہ سونامیے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہیں تو چپکے سے ''پھُر'' ہو گئے۔ بنی گالہ میں جب ایک نیوز چینل کی اینکر پرسن نے سوال کیا کہ خاں صاحب نے راہِ فرار کیوں اختیار کی تو اُن کا جواب تھا کہ مارچ کے شُرکاء تو اِدھر اُدھر اپنا بندوبست کر لیتے ہیں، کچھ مساجد اور مارکیٹ کے غسل خانوں میں چلے جاتے ہیں اور کچھ جھاڑیوں کو ہی غسل خانے سمجھ لیتے ہیں اور چونکہ اُنہیں بھی نہانا ہوتا ہے اِس لیے وہ بنی گالہ آ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قوم کے غم میں گھلے جانے والے کپتان صاحب عام سے گندے غسل خانوں میں تو نہیں جا سکتے۔ اُن کے 300 کنال پر مشتمل محل میں تو کروڑوں کی لاگت سے تیار کیے گئے ''باتھ رومز'' ہیں۔ پھر بھلا وہ عوام کے لیے بنائے گئے

غلیظ غسل خانوں میں کیوں جائیں۔

جمہوریت کا حسن تو یہی ہے کہ ـــــ

اسلام آباد کے ریڈزون میں تاریخ رقم ہو رہی ہے۔ یہ تاریخ اِس لحاظ سے منفرد ہے کہ ''سونامیے'' وہاں بنیاد تو نئے پاکستان کی رکھ رہے ہیں لیکن سماں پکنک کا سا۔ مرد وزن ہی نہیں رہنماء بھی محوِ رقص۔ دھرتی جھوم رہی ہے اور غُصے سے دشمنوں کے سر گھوم رہے ہیں۔ ہمیں اگر پتہ ہوتا کہ اسلام آباد میں ''چھینٹی'' کا کوئی امکان نہیں تو ہم بھی اِس ''میوزیکل کنسرٹ'' سے لطف اندوز ہو آتے لیکن ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ نون لیگ والے چھینٹی کے ماہر ہیں اور اُن کے پاس گُلو، بِلو، پومی، نومی اور پتہ نہیں کون کون سے ''بُٹ'' ہیں جو یوں حملہ آور ہوتے ہیں کہ

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تُم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

یہ تو اب پتہ چلا کہ ریڈزون میں تو راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔ ہمیں یہ بھی بتلایا گیا تھا کہ دھرنے کا مطلب کسی ایک جگہ ٹِک کر بیٹھ رہنا ہوتا ہے جو ہمیں منظور نہیں تھا لیکن کیا پتہ تھا کہ ''ماڈرن دھرنوں'' میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ یہاں تو رات آٹھ بجے کے بعد محفل گرم ہوتی ہے اور دو بجے اپنے عروج

پر۔ پھر سبھی ''اسلام آبادیے'' اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں اور خاں صاحب بنی گالہ یا کنٹینر میں۔ لڑکیوں کو ٹی وی پر والہانہ رقص کرتے دیکھ کر تھوڑا بہت محظوظ تو ہم بھی ہو لیتے ہیں لیکن NGO'sکھلی کی آزادیٔ نسواں کی علمبردار خواتین کی تو باچھیں جا رہی ہیں کیونکہ جو وہ عشروں میں نہ کر پائیں، کپتان صاحب نے دنوں میں کر دکھایا۔ نواز لیگیئے کہتے ہیں کہ خاں صاحب نے دھرنے میں شرکاء کی تعداد سے مایوس ہو کر میوزیکل کنسرٹ کا سہارا لیا ہے۔ اور یہ جو خاں صاحب ہر وقت اکھڑے اکھڑے سے نظر آتے ہیں، اُس کی وجہ بھی یہی کہ خاں صاحب نے نعرہ لگایا دَس لاکھ کا اور آئے دَس ہزار بھی نہ۔ شنید ہے کہ گوجرانوالہ میں خاں صاحب نے ناشتہ کرنے سے انکار کر دیا اور چِلّاتے ہوئے کہا کہ اُنہیں بندے چاہییں، ناشتہ نہیں۔ بندے تو نہیں ملے البتہ اب خاں صاحب کو ''کسی'' کی انگلی اٹھنے کا انتظار ہے جبکہ وہاں تو یہ عالم ہے کہ ''وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے''۔

کوئی اِن لیگیوں سے پوچھے کہ کیا ہمارے کپتان صاحب مداری ہیں جو ڈُگڈُگی بجا کر مجمع اکٹھا کر لیں گے؟۔ کیا ہم نے بار بار نہیں کہا تھا کہ ہمارا دھرنا ''تاریخی'' ہوگا؟۔ کیا معلوم تاریخ میں کسی نے کبھی ناچ گانے والے دھرنے کا ذکر بھی سُنا ہے؟۔ اگر نہیں تو پھر ہمارا ''میوزیکل دھرنا'' تاریخی ہی ہوا ناں۔ ویسے بھی ہمیں تو پتہ ہی تھا کہ ہمارے نرم و نازک ''سونا میے'' چند گھنٹوں میں ہی مرجھا جائیں گے اسی لیے ہماری کروڑوں پہ بھاری ''کور کمیٹی'' نے

انتہائی عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ملک کے چوٹی کے گلوکاروں کو پہلے سے ہی ''بُک'' کر رکھا تھا۔ لیگیئے تو یہی چاہتے تھے کہ ماں باپ سے دور ہمارے ''ننھے منے سونا میے اُداس ہو جائیں اور ریڈزون کی سڑک پر بیٹھ کر رونا شروع کر دیں لیکن ہم'' بھی اِن لیگیوں کی فطرت سے خوب واقف ہیں اِسی لیے ہم نے اپنے معصوم سونامیوں کے جی بہلانے کا پورا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ اب بھی ہم دھرنے کا ''میوزیکل کنسرٹ'' ختم ہونے سے پہلے ہی یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ اگلے دن کون کون سے گلوکار آئیں گے تاکہ دلچسپی برقرار رہے۔ ویسے مُنہ کا سواد بدلنے کے لیے ہمارے پاس لال حویلی والے شیخ رشید بھی ہیں جو گاہے بگاہے سٹیج پر ایسے ہی نمودار ہوتے ہیں جیسے ٹی وی ڈراموں کے وقفوں کے دوران اشتہار۔

ویسے تو ہم شیخ الاسلام کے انقلاب مارچ کے بھی اُتنے ہی حامی ہیں جتنے کپتان کے آزادی مارچ کے۔ لیکن تعداد میں آزادی مارچ سے کہیں زیادہ ہونے کے باوجود مولانا کا انقلاب مارچ ''روکھا پھیکا'' سا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب رات آٹھ بجے کے بعد میوزیکل کنسرٹ شروع ہوتا ہے تو مولانا کے انقلابیے بھی کھسک کر سونامیوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور ''میلہ'' بھر جاتا ہے۔ مولانا نے پہلے تو دو تین دن صبر کیا لیکن پھر انہوں نے حالات کو بھانپتے ہوئے نہ صرف جنگی ترانوں اور قوالیوں کی اجازت دے دی بلکہ فرمائش کر کے جنگی ترانہ ''اے مردِ مجاہد جاگ ذرا، اب وقتِ شہادت ہے آیا'' سُنا اور اس پر جھومتے بھی

رہے۔ مولانا کو جھومتے دیکھ کر عقیدت مند بھی دھمال ڈالنے لگے۔اب وہاں قوالیوں اور ترانوں پر دھمال توڈالی جاتی ہے لیکن وہ مزہ کہاں جو میوزیکل کنسرٹ میں ہے۔

چودھری نثار احمد نے پریس کانفرنس کرتے ہوئے اِس دُکھ کا اظہار کیا ہے کہ محترم عمران خاں اور مولانا طاہر القادری اپنی بات پر قائم نہیں رہے۔اُنہوں نے کہا کہ اُن کے پاس دونوں کی تحریر موجود ہے کہ وہ ریڈزون میں داخل نہیں ہونگے لیکن دونوں ہی یوٹرن لیتے ہوئے اپنے وعدے سے مکر گئے اور ریڈزون تک آن پہنچے۔اُنہوں نے اِن وعدہ خلافیوں پر شدید رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ کبھی اعتبار نہیں کریں گے۔اب تواُن کی حالت یہ ہے کہ

تیرے وعدے پہ جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

چودھری نثار صاحب کو تیس سال ہوگئے سیاست میں آئے ہوئے لیکن اُنہیں ابھی تک اتنا بھی پتہ نہیں چلا کہ یہی تو ہماری سیاست بلکہ جمہوریت کا حسن ہے۔اب توجنابِ آصف زرداری کا کہا گیا جملہ ''وعدے قُرآن وحدیث نہیں ہوتے''زبان زدِ عام ہو گیا ہے لیکن بھولے چودھری صاحب اب بھی دُکھ کا اظہار کر رہے ہیں۔ویسے بھی ہمارے مُرشد تواِس حکومت کو تسلیم ہی نہیں کرتے اوراُنہوں نے توحکومت کی

طرف سے بھیجا گیا کھانا سڑک پر پھینکوادیا اور ''واٹر باؤزر'' یہ کہہ کر واپس بھجوادیے کہ

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آیا تھا دَورِ جام

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مولانا صاحب کی دیکھا دیکھی محترم عمران خاں نے بھی سونامیوں کو حکومت کی طرف سے بھیجا گیا پانی پینے سے منع کر دیا۔ مولانا کہتے ہیں، چودھری نثار احمد کا کیا اعتبار کہ اُنھوں نے پانی میں کوئی ایسی چیز ملادی ہو جس سے انقلابیوں کے پیٹ خراب ہو جائیں۔ ویسے یقین تو نہیں آتا لیکن ہو سکتا ہے کہ اِس معاملے میں بھی مولانا صاحب کو ''بشارت'' ہو گئی ہو۔ ہمارے یقین نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ چودھری نثار احمد اپنی پریس کانفرنس میں خود یہ کہہ رہے تھے کہ ریڈزون سے اتنا تعفن اُٹھ رہا ہے کہ کھڑا ہونا محال ہے۔ اگر وہ پانی میں پیٹ خراب کرنے والی کوئی دوائی ملا دیتے تو پھر تو ریڈزون میں تِل دھرنے کی جگہ بھی نہ بچتی اور چودھری صاحب ٹھہرے وزیرِ داخلہ جنھیں بار بار ریڈزون آنا پڑتا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ چودھری صاحب نے ایسا کچھ نہیں کیا ہو گا لیکن اُدھر چونکہ معاملہ ہماری عقیدتوں کا ہے اِس لیے ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ خاکم بدہن مولانا کو کوئی ''اُلٹی پُلٹی'' بشارت ہو گئی ہو گی۔ اب یہی سوچا جا سکتا ہے کہ چودھری صاحب نے انقلابیوں کو ''وَخت'' میں ڈالنے کے لیے ضرور دوائی ڈالی ہو گی

تاکہ خود ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر انقلابیوں کی بے بسی کا "چسکے" لے لے کر نظارہ کریں۔

ہر الیکشن میں دھاندلی

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

پاکستان کی تاریخ میں کوئی ایک الیکشن بھی ایسا نہیں گزرا جس پر دھاندلی کا شور نہ مچا ہو سوائے 1970ء کے انتخابات کے۔ بھٹو صاحب نے الیکشن کروائے اور پی این اے دھاندلی کا شور مچاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئی۔ نتیجہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کی صورت میں سامنے آیا۔ ضیاء الحق کی حادثاتی موت کے بعد1988ء سے 1996ء تک چار الیکشن ہوئے اور چاروں میں دھاندلی کا شور مچا اور ایک دوسرے کو سکیورٹی رسک قرار دیا جاتا رہا۔ ''جمہوری'' سیاست دانوں کی انہی '' حرکتوں'' کی بنا پر مقتدر حلقوں کی ڈوریاں ہلتی رہیں، وزرائے اعظم گھر بھیجے جاتے رہے اور بالآخر اکتوبر 1999ء میں پرویز مشرف نے جمہوریت کی بساط لپیٹ دی اور میاں برادران جلاوطن کر دیئے گئے۔ یہ سب کیا دھرا سیاست دانوں کا اپنا ہی تھا۔ مجھے یہاں ایک مشہور کہاوت یاد آ رہی ہے۔ ایک شخص نے ایک بولنے والا طوطا پالا اور اُسے متواتر یہ جملہ رٹاتا رہا کہ ''پوست کے ڈوڈے پر مَت بیٹھو، اگر بیٹھو گے تو پھنس جاؤ گے''۔ ایک دن طوطا اُڑا اور گھر سے باہر پوست کے کھیت میں جا کر ایک پودے پر بیٹھ گیا۔ اُس کے دونوں پاؤں پوست کے لیس دار مادے میں پھنس گئے۔ اُس نے اُڑنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ اب

طوطا پوست کے ڈوڈے پر بیٹھا چلا رہا تھا ''پوست کے ڈوڈے پر مَت بیٹھو، اگر بیٹھوگے تو پھنس جاؤگے''۔یہی حال ہمارے جمہوریت نواز رہنماؤں کا رہا۔وہ بلند آہنگ سے جمہوریت کے گیت توگاتے رہے لیکن اعمال وافعال سارے غیر جمہوری۔

بار بار کی ٹھوکروں کے بعد باالآخر میاں نواز شریف صاحب اور محترمہ بینظیر شہید کو ہوش آہی گیااورمیثاقِ جمہوریت کی شکل میں یہ طے ہوا کہ اب ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کاکام بند کر دینا چاہیے۔2008ء کے الیکشن میں حقِ حکمرانی پیپلزپارٹی کے حصے میں آیااور نواز لیگ اپوزیشن بینچوں پر بیٹھی۔پیپلزپارٹی کے اِس دور میں جہاں نواز لیگ نے مختلف اوقات میں پیپلزپارٹی پر بھرپور تنقید کی،وہیں برملا یہ بھی کہاکہ وہ پیپلزپارٹی کی حکومت کو گرنے نہیں دے گی۔پیپلزپارٹی کی بدترین دورِ حکومت کے دوران تجزیہ نگار حکومت کے خاتمے کی تاریخ پہ تاریخ دیتے رہے لیکن حکومت ڈٹی رہی جس کی واحد وجہ یہ تھی کہ نواز لیگ حکومت کے خاتمے کی کسی سازش میں شریک ہونے کو تیار نہیں تھی۔نواز لیگ نے ''فرینڈلی اپوزیشن'' کے طعنے تو سہے لیکن وقت نے ثابت کیاکہ اگر نواز لیگ ایسانہ کرتی توہم آج بھی آمریت کی کڑی دھوپ میں یہی دہرا رہے ہوتے کہ ''پوست کے ڈوڈے پر مَت بیٹھو، اگر بیٹھوگے تو پھنس جاؤگے''۔صحرائے سیاست کی عشروں تک خاک چھاننے والوں کو تو

ہوش آ گیا لیکن سیاسی نو وارد اب بھی ملک کو مارشل لاء کی طرف دھکیلنے کی تگ و دو کر رہے ہیں اور نعرہ یہ کہ ’’نیا پاکستان‘‘ بنانے جا رہے ہیں۔ایک نیا پاکستان بھٹو اور مجیب نے بنایا تھا اب نیا پاکستان ایک ایسا کرکٹر بنانے جا رہا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ چونکہ اُس نے 1992ء کا ورلڈ کپ جتوایا تھا اور وہ شوکت خانم جیسے عظیم ہسپتال کا بانی ہے اِس لیے وزارتِ عظمیٰ پر پہلا حق اُسی کا ہے۔دست بستہ عرض ہے کہ اگر کرکٹ کی بنیاد پر کسی کا حقِ حکمرانی تسلیم کیا جانا ہی ٹھہرا تو پھر جاوید میاں داد، انضمام الحق اور محمد یوسف اُس سے کہیں بڑے بلّے باز اور وسیم اکرم اور وقار یونس کہیں بڑے بالر تھے تو پھر کیوں نہ انہی میں سے کسی ایک کو وزیرِ اعظم بنا لیا جائے۔اگر خدمتِ خلق کو مدِ نظر رکھا جائے تو کپتان صاحب عبدالستار ایدھی کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔اِس لحاظ سے تو سوائے عبدالستار ایدھی کے خاندان کے کوئی اور حقِ حکمرانی کے قابل ٹھہرتا ہی نہیں۔پاکستان کو اسلامی دنیا کی پہلی ایٹمی طاقت بنانے والے محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبد القدیر خاں بھی وزارتِ عظمیٰ کی اِس دوڑ میں شامل کیے جا سکتے ہیں کیونکہ اگر ورلڈ کپ جیتنے کی بنا پر کپتان صاحب وزارتِ عظمیٰ کے دعوے دار ہو سکتے ہیں تو ایٹمی پاکستان کے خالق محسنِ پاکستان کیوں نہیں؟۔

انتخابات میں حصہ لینا ہر پاکستان کا جمہوری حق ہے اور خاں صاحب نے اِس

جمہوری حق کو خوب خوب استعمال بھی کیا۔اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خاں صاحب کو بھرپور پذیرائی بھی ملی۔بہت سے تجزیہ نگاروں کے نزدیک 2013ء کے انتخابات میں جتنی پذیرائی تحریکِ انصاف کو ملی وہ بھی حیران کُن ہے لیکن خاں صاحب کہتے ہیں کہ وہ فاسٹ بالر ہیں اِس لیے اُن سے صبر نہیں ہوتا۔خاں صاحب کو یاد رکھنا ہو گا کہ قومی سلامتی کرکٹ کی مانند کوئی کھیل نہیں کہ جب چاہا بال ٹیمپرنگ کر لی۔یہ مجبور و مقہور عوام کی تقدیر کا مسٔلہ ہے جسے خاں صاحب محض ایک کھیل قرار دے رہے ہیں ۔اُن کے موجودہ احتجاج نے لگ بھگ چھ سو ارب کا نقصان کر لیااِس لیے اِس سے پہلے کہ قوم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور خاں صاحب کو کہیں جائے اماں نہ ملے ، وہ اُسی پر اکتفا کرلیں جو پاکستان کی تمام جمہوری قوتیں اُنہیں دینے کی کوشش کر رہی ہیں ۔اگر خاں صاحب نہیں تو اُن کی جماعت کے معتدل سیاستدانوں کو تو یہ پتہ ہی ہو گا کہ وزیرِ اعظم صاحب سے تیس دِن تک کا استعفیٰ طلب کرنا انتہائی مضحکہ خیز ہے۔یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کسی ملزم کو سزا پہلے سنا دی جائے اور مقدمے کی کارروائی بعد میں شروع کی جائے۔اگر خاں صاحب کو سپریم کورٹ پر اعتماد ہے تو پھر اُس کے فیصلے کا انتظار کیا جائے اور اگر دھاندلی ثابت ہو جائے تو پھر پوری قوم یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہو گی کہ نوازلیگ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابندی لگا دی جائے لیکن اگر دھاندلی ثابت نہ ہو یا صرف اتنی ہی دھاندلی ہوئی ہو جتنی ہر الیکشن میں امیدوار انفرادی سطح پر کرتے رہتے ہیں

تو پھر خاں صاحب اپنی سزا خود ہی تجویز کر لیں۔

اب تحریکِ انصاف سے وابستہ سابق ایڈیشنل سیکرٹری الیکشن کمیشن آف پاکستان افضل خاں عدلیہ کو بدنام کرنے کے لیے میدان میں ہیں۔اُنھوں نے سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری، سابق چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی اور جسٹس (ر) ریاض کیانی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے وہی الزام تراشیاں کی ہیں جنھیں محترم عمران خاں سُن سُن کر کان پک گئے ہیں۔یہ تمام الزامات اِس لیے بھی مضحکہ خیز ہیں کہ افضل خاں صاحب نے الزامات کی بارش کرنے کے بعد کہا "یہ سب کچھ سچ ہے لیکن میرے پاس اِس کا کوئی ثبوت نہیں"۔اِس لیے ایسے بے تکے الزامات پر بات کرنا محض وقت کا زیاں ہے۔

ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

محترم عمران خاں نے سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی طرف سے بھیجے گئے ہتکِ عزت کے نوٹس کے جواب میں چھ صفحات پر مشتمل ''معذرت نامہ'' بھیجا جس میں اُنھوں نے چودھری صاحب کو پاکستان کے ہر ڈیری فارم کا ''مکھن'' لگانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اُنھوں نے ملک میں قانون کی حکمرانی، آئین کی بالادستی اور عدلیہ کی آزادی کے لیے افتخار محمد چودھری کے عہد ساز فیصلوں کو سلام پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اُن سے '' مایوسی میں ''سخت زبان استعمال کرنے کی غلطی ہو گئی۔اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ مستقبل میں جب کبھی کسی فوجی طالع آزما کے دل میں اقتدار پر شب خون مارنے کی خواہش اٹھے گی تو افتخار محمد چودھری کا فیصلہ اُس کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑا ہو گا۔اُنھوں نے یہ بھی لکھا کہ وہ سابق چیف جسٹس کی خدمات کے معترف ہیں اور چیف جسٹس صاحب نے آزاد عدلیہ کے لیے جس طرح فوجی آمر کا مقابلہ کیا اُس پر پوری قوم اُن کو سلام پیش کرتی ہے۔اُنھوں نے اقرار کیا کہ اُن سے الفاظ کے چناؤ میں غلطی ہوئی جس پر وہ سابق چیف جسٹس صاحب سے در گزر کے خواستگار ہیں۔خاں صاحب کے اِس ''معذرت نامے''پر ابھی لے دے ہو ہی رہی تھی کہ انھوں نے ایک اور ''یوٹرن'' لے لیا اور دھرنے کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر چیف جسٹس صاحب پر برس پڑے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اُن کے

مینڈیٹ کی چوری میں سب سے بڑا ہاتھ افتخار محمد چودھری کا ہے۔ مجھے یہاں ایک پرانا گھسا پِٹا لطیفہ یاد آ رہا ہے، آپ بھی سُن لیجیے۔ ایک وزیر نے ایک دفعہ پاگل خانے کا دورہ کیا۔ وہاں اُس کی ملاقات ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ وجیہہ و شکیل شخص سے ہوئی۔ دَورانِ گفتگو وزیر صاحب اُس شخص سے بہت متاثر ہوئے اور پوچھا کہ وہ پاگل خانے میں کیوں ہے؟۔ اُس شخص نے جواب دیا کہ وہ پاگل ہرگز نہیں، درحقیقت اُس کے رشتہ داروں نے اُس کی جائیداد ہتھیانے کے لیے سازش کرکے اُسے پاگل خانے بھجوا دیا۔ وزیر نے کہا ''فکر نہ کرو۔ میں ابھی تمہاری رہائی کا حکم جاری کرواتا ہوں''۔ یہ کہہ کر وزیر صاحب واپس جانے کے لیے پلٹے تو اُس شخص نے اُن کی کمر پر زور سے لات رسید کرتے ہوئے کہا ''بھولنا نہیں''۔ وزیر نے مسکرا کر کہا ''اب تو بالکل نہیں بھولوں گا''۔ ہمیں یقین ہے کہ سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری صاحب بھی ''اب تو بالکل نہیں بھولیں گے''۔ پتہ نہیں یہ محترم عمران خاں صاحب کا بھولپن ہے یا کچھ اور لیکن وہ آجکل بہرحال یہی کچھ کر رہے ہیں۔ وہ صبح ایک بات کرتے ہیں تو شام کو دوسری۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ صرف اِس لیے ہو رہا ہے کہ خاں صاحب کی سچائی پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں اور وہ غصّے، دُکھ اور پریشانی کے عالم میں وہ کچھ بھی کہہ جاتے ہیں جو قومی سطح کے کسی بھی لیڈر کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔

اُدھر سونامیے دھرنے سے آہستہ آہستہ کھسکتے جا رہے ہیں جبکہ دوسری طرف شیخ

الاسلام کے عقیدت مند ایسے دھرنا دیئے بیٹھے ہیں کہ اُن کے درمیان سے ہوا کا گزرنا بھی محال ہے۔ اگر علامہ صاحب تھوڑی سی ہلچل محسوس کرتے ہیں تو فوراً حضرت امام حسینؓ کی کربلا کی اُس رات کا ذکر لے بیٹھتے ہیں جب آپؓ نے چراغ گُل کروا دیئے اور فرمایا کہ رات کے اندھیرے میں جو اُن کا ساتھ چھوڑ کے جانا چاہتا ہے، چلا جائے، اُنہیں کوئی گلہ نہ ہوگا۔ جب دوبارہ چراغ جلائے گئے تو کوئی ایک شخص بھی اپنی جگہ سے ہلا تک نہ تھا۔ علامہ صاحب بھی اپنے آپ کو حسینیت کے علمبردار کہتے ہیں جو یزیدیت کے خلاف میدان میں نکلے ہیں۔ وہ بھی اپنے عقیدت مندوں کو متواتر یہ کہتے رہتے ہیں ''میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں، جو میرا ساتھ چھوڑنا چاہے چھوڑ جائے''۔ ایسا کہتے ہوئے اُن کی آواز ہمیشہ بھرّا جاتی ہے اور پلکیں نَم۔ ویسے علامہ صاحب کو کبھی آنکھیں بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ عقیدت مند پہلے ہی شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ یوں تو علامہ صاحب مسحور کر دینے کے فن میں یکتا ہیں لیکن عقیدت مندوں کی تائید حاصل کرنے کا فَن اُنھوں نے الطاف بھائی سے سیکھا ہے۔ الطاف بھائی نے بھی متعدد بار ایم کیو ایم کی قیادت سے دست بر داری کا اعلان کیا لیکن پھر ''پبلک کے پُرزور اصرار پر'' اعلان واپس لیتے رہے۔ اب علامہ صاحب بھی وہی حربہ اپنے عقیدت مندوں پر آزما رہے ہیں اور الطاف بھائی کی طرح کامیاب بھی ہیں۔ شاید اسی قدرِ مشترک کی وجہ سے علامہ صاحب اور الطاف بھائی کی گاڑھی چھنتی ہے۔

ویسے تو خاں صاحب نے بھی سونامیوں کا دل بہلانے کے لیے ''میوزیکل کنسرٹ'' کا اہتمام کیا اور یہ حربہ کچھ دن کامیاب بھی رہا لیکن خاں صاحب کے پرانے لنگوٹیے ''چودھری نثار احمد نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ اُنہوں نے 25 اگست سے'' وفاقی حکومت کے تمام تعلیمی ادارے کھولنے کا اعلان کر دیا۔ اب لڑکے لڑکیاں تو اپنے اپنے تعلیمی اداروں کے ہو رہے اور خاں صاحب کا شو فلاپ۔ شُنید ہے کہ 25 اگست کی شام کو دھرنے میں شریک سونامیوں کی تعداد صرف گیارہ سو تھی۔ دروغ بَر گردنِ راوی، اب خاں صاحب اپنے دوست چودھری نثار کی اِس شرارت پر متواتر گُنگنا رہے ہیں کہ

دیکھا جو تیر کھاکے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

سونامیوں کی مایوس کُن تعداد کو دیکھتے ہوئے خاں صاحب نے
بالآخر اپنا ایک ''پتّا'' استعمال کر ہی ڈالا۔ تحریکِ انصاف سے وابستہ سابق ایڈیشنل سیکرٹری الیکشن کمشنر محمد افضل خاں نے محترم عمران خاں کے ''پسندیدہ
نیوز چینل'' کو انٹرویو دیا جس میں اُنہوں نے تقریباً وہی الزامات دہرائے جو ہم کئی ماہ سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ اِس انٹرویو کی سب سے مزیدار بات یہ تھی کہ افضل خاں صاحب کے پاس الزامات کی صداقت کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا لیکن اُن

کی بھی کپتان صاحب کی طرح یہی ضد تھی کہ کسی بھی ثبوت کے بغیر اُنہیں ''صادق'' تسلیم کرلیاجائے لیکن قوم کیسے یقین کرے کہ اُنھوں نے تو ''فخرو بھائی'' کو بھی دھاندلی میں ملوث قرار دے دیااور سابق چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی کو بھی۔ جسٹس (ر) ریاض کیانی صاحب نے اپنی طویل پریس کانفرنس میں افضل خاں کاسارا کچا چِٹھا کھول کے رکھ دیااور یوں خاں صاحب کا یہ ''پتّا'' بیکار ہی گیالیکن اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ابھی خاں صاحب کی ''پٹاری'' میں بہت کچھ باقی ہے اور پٹاری کامُنہ اُس وقت تک کھلتا رہے گا جب تک وہ نیاپاکستان بناکر شادی نہیں کرلیتے۔ ویسے ہمارا تو خاں صاحب کو یہی مشورہ ہے کہ پہلے شادی کرلیں پھر آرام سے نیاپاکستان بنالیں۔

ڈینگی کا موسم پھر آگیا

جدید ترین ''امریکی تحقیق'' سے پتہ چلا ہے کہ انسانوں کا خون چوس چوس کر کچھ ڈینگی سیاسی بھی ہو جاتے ہیں ۔اِس لیے ہم نے بھی اِن کو دو حصّوں یعنی سیاسی اور غیر سیاسی میں تقسیم کر دیا ہے۔غیر سیاسی ڈینگی تو وہ تھے جو دو سال پہلے لاہور پر حملہ آور ہوئے اور بڑے بڑوں کے چھکّے چھڑا دیئے۔ ہسپتال مریضوں سے بھر گئے اور حکیموں، نیم حکیموں کی بھی چاندی ہو گئی۔انہی نیم حکیموں میں سے کسی ستم ظریف نے یہ مشہور کر دیا کہ پپیتے کے پتے ابال کر پینے سے ڈینگی کا مرض ختم ہو جاتا ہے۔ہمارے گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ ایک پپیتے کا بڑا خوبصورت درخت تھا۔جونہی اُس بَد بخت نیم حکیم کی بات ہَوا کے دوش پر سوار ہو کر لاہور کے گلی کوچوں میں پہنچی ہمارے گھر کے سامنے دِن رات سوالیوں کی بھیڑ نظر آنے لگی ۔سولہ فٹ اونچے پپیتے کے پتے ایک ایک کرکے جھڑتے چلے گئے اور جذبہء خدمت سے سرشار پپیتا گنجا ہوتا چلا گیا۔آخر کار نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ پپیتے کی چاند پر محض چند بال (پتے) ہی باقی رہ گئے۔پپیتے کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ فخر سے گردن اکڑائے یہ کہہ رہا ہو کہ ''دیکھا، حضرتِ انسان کو آخر کار میری اہمیت کا احساس ہو ہی گیا۔'' اس کی مقبولیت کو دیکھ کر میں من ہی من

میں خوف زدہ بھی تھی کہ اگر ہمارے رہبروں کے کانوں میں اس کی مقبولیت کی بھنک پڑ گئی تو پھراس کی خیر نہیں اور خصوصاً خادمِ اعلیٰ صاحب جو ڈینگی کی ''ڈینگوں'' پر پہلے ہی تاؤ کھائے بیٹھے ہیں کہیں سارا غصہ میرے پپیتے پر ہی نہ اتار دیں۔ ویسے بھی میاں برادران مقبولیت کے میدان میں کسی کو آگے نکلتا دیکھ ہی نہیں سکتے۔شاید اسی بنا پر وہ اقتدار کی ساری ''ریوڑیاں'' ہمیشہ آپس ہی میں بانٹ کھاتے ہیں۔اسی لیے میں اپنے پپیتے کی مقبولیت پر خوش ہونے کی بجائے خوفزدہ تھی ۔ایک دن جب میں سو کر اٹھی تو ایک دردناک منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا، سولہ فٹ کے پپیتے کی جگہ ایک آٹھ فٹ کا ڈنڈا کھڑا میرا مُنہ چڑا رہا تھا۔میں نے آنکھیں مل مل کر دیکھا لیکن ہونی کو بھلا کون ٹال سکتا ہے۔رات کے کسی پہر کسی ''ٹارگٹ کلر'' نے پپیتے کے آخری چند پتے اتارنے کی خاطر اسے جھکانے کی کوشش کی لیکن غیرت مند پپیتے نے جھکنے پر ٹوٹنے کو ترجیح دی۔میں نے سوچا، اب یہ کس کام کا؟لیکن باقی رہ جانے والا پپیتا تو اب بھی اسی شان سے تن کر کھڑا تھا۔

ڈینگی کی دوسری قسم ہمیشہ نیم سیاسی ہی رہتی ہے اِس لیے وہ بیرونی طاقتوں کی ہدایات اور ''فارن فنڈنگ'' پر زندہ رہتی ہے۔اُسے ایک مخصوص ''سکرپٹ'' دیا جاتا ہے جس سے وہ سرِ مُو اِدھر اُدھر نہیں ہوتی۔آجکل ''سیاسی ڈینگی'' ایک دفعہ پھر حملہ آور ہو چکا ہے۔ یہ '' ڈینگی ''اگر لاہور تک محدود رہتا تو خادمِ

اعلیٰ اِس سے دو، دو ہاتھ کر لیتے۔ اُنہوں نے تو اِس کے گرد گھیرا بھی ڈال رکھا تھا لیکن کچھ ''نیم حکیموں'' کے بہکاوے میں آ کر اُسے کھُلا چھوڑ دیا گیا اور اب یہ نیم سیاسی ڈینگی پارلیمنٹ کے آس پاس بھنبھناتا پھر رہا ہے جس سے حکومت ''وَخت'' میں پڑی ہوئی ہے۔ یہ بھی سائنسی تحقیق ہی ہے کہ ڈینگی کی صرف مادہ کاٹتی ہے، اور نَر اُس کی حفاظت کرتا ہے۔ مادہ بھی دِن کی روشنی میں ہر گز نہیں کاٹتی بلکہ ملگجا اندھیرا ہونے کا انتظار کرتی ہے۔ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سُنا ہے کہ لاہور سے ہجرت کرکے اسلام آباد پہنچنے والے ڈینگیوں میں ''مادہ ڈینگیوں'' کی بہتات ہے اور یہ ساری ''ڈینگیاں'' ہر روز شام کو اکٹھی ہو کر خوب ہلّا گلّا کرتی ہیں جو رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ اِن ڈینگیوں نے حکومت کی ناک میں دَم تو کر ہی رکھا ہے لیکن اب قوم بھی ''اوازار'' ہو گئی ہے کیونکہ خون تو ہمارا ہی چوسا جا رہا ہے جو ایک ہزار ارب روپے سے زائد کا چوسا جا چکا ہے۔

حکمران کہتے ہیں کہ اُنہیں مادہ ڈینگیوں پر رحم آتا ہے اِس لیے وہ کوئی ایکشن نہیں کرتے لیکن حکومت تو ''لکھنویت مزاج'' کبھی نہ تھی، پھر یہ ''لکھنویت مزاجی'' کا لبادہ اوڑھ کر اِن ڈینگیوں کو ''لاتوں'' کی بجائے ''باتوں'' سے رام کرنے کی سعی کیوں؟۔ اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ ''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے'' اور اُسے بالآخر لاتوں پر آنا ہی پڑے گا لیکن اُس وقت تک شاید بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ اگر حکومت نے ایکشن نہ کرنے کا مصمم ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر ''منت

تَرلا'' کرکے اِن ڈینگیوں سے جان چھڑالے۔ اگر یہ حربہ بھی ناکام ہو جائے تو پھر حکمران خاموشی کی ''بُکل'' مار کر گھر چلے جائیں، قوم اِن ڈینگیوں سے خود ہی نپٹ لے گی۔

سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے دَور میں تو لمحوں میں ''از خود نوٹس'' ہو جایا کرتے تھے اور فیصلے بھی دھڑا دھڑ آتے۔ تب ہم سوچا کرتے تھے کہ یہ جو ہماری اعلیٰ عدلیہ ہر کام میں ہاتھ ڈالتی چلی جا رہی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے بیپتے کے پتوں کی طرح اِس کے پات بھی ایک ایک کرکے جھڑتے چلے جائیں اور یہ بھی ایک دِن ہمارے بیپتے کی طرح ''ٹُنڈ مُنڈ'' اکیلی کھڑی رہ جائے۔ لیکن ہم غلط تھے۔ ہمیں آج افتخار محمد چودھری بُری طرح یاد آ رہے ہیں کیونکہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہونے کے باوجود اعلیٰ عدلیہ تاریخ پہ تاریخ دیتی چلی جا رہی ہے۔ ''ڈینگی متاثرین''میں وہ خود بھی شامل ہے لیکن پھر بھی وعدہ فردا پہ ٹالتی رہتی ہے۔ اگر افتخار محمد چودھری ہوتے تو تحقیق کہ وہ اب تک کوئی نہ کوئی دھماکہ کر چکے ہوتے لیکن شریف النفس چیف جسٹس ناصر الملک نے صرف یہی کہنے پر اکتفا کیا کہ ''اگر ہماری بات نہ مانی گئی تو پھر ہم آرٹیکل 190 کا سہارا لیں گے''۔ قوم یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اس ڈینگی کا علاج ہمارے ان ''نیم حکیموں'' کے پاس نہیں، ہرگز نہیں کیونکہ ''امپورٹ'' کیے گئے اِس وائرس سے آہنی ہاتھوں سے ہی نپٹا جا سکتا ہے جس کے

لیے حکومت تیار نہیں۔ اس لیے اب اِس وائرس کا علاج عدل کی نشتر زنی سے ہی ممکن ہے۔ ایسے میں قوم اُمید بھری نظروں سے اُس کی طرف ہی دیکھ رہی ہے کیونکہ یہی ایک ادارہ ایسا بچا ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر سکتا ہے اور جس کے فیصلوں پر قوم کی غالب اکثریت آج بھی اعتماد کرتی ہے۔ اگر اب بھی عدل کے ایوانوں میں ہلچل نہ مچی تو پھر کوئی نہ کوئی طالع آزما ایک دفعہ پھر سینہ تانے کھڑا ہوگا اور اُسے دَس بار وردی میں منتخب کروانے والے بھی ہزاروں مل جائیں گے۔

بھانڈا پھوٹ گیا

فلک بوس چوٹیوں، گُل پوش وادیوں، بَل کھاتی ندیوں، گُنگناتے جھرنوں، دھرتی کو سیراب کرتے دریاؤں، سونا اُگلتے کھیتوں کھلیانوں اور دُنیا جہاں کی نعمتوں سے مالا مال رَبِّ لازوال کی عطا کردہ اِس دھرتی کو جانے کِس کی نظر کھا گئی کہ جب سے یہ معرضِ وجود میں آئی ہے یہاں صرف سازشیں ہی اُگتی اور پھلتی پھولتی رہتی ہیں۔ مورخ تو جو لکھے گا سچ ہی لکھے گا لیکن لکھے گا کیا؟۔ کیا یہ کہ ہم نے بانیٔ پاکستان کو دمِ واپسیں اُس ایمبولینس میں ڈال دیا جو راستے میں ہی خراب ہو گئی یا یہ کہ قائدِ ملت کو سرِ عام خون میں نہلا دیا گیا لیکن ہم اُن کے قاتلوں کا سراغ تک نہ لگا سکے؟۔ کیا یہ لکھے گا کہ ہم نے ایک وزیرِ اعظم کو سُولی پہ لٹکا دیا اور اُسی کی وزیرِ اعظم بیٹی کو بے جرم وخطا شہید کر دیا؟۔ کیا یہ لکھے گا کہ ہم نے ایک دو تہائی اکثریت کے حامل وزیرِ اعظم کو اُس کے خاندان سمیت جَلاوطن کر دیا پھر یہ کہ اُسی منتخب وزیرِ اعظم کو اپنے باپ کو لحد میں اتارنے کی اجازت بھی نہ دی؟۔ کیا یہ لکھے گا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ملک کو دو ٹکڑے کر دیا اور بچے کھچے پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے درپے ہیں؟۔ کیا یہ لکھے گا کہ ہم نے تین عشروں سے زائد مارشل لاؤں کو پالا پوسا اور آمروں کو دَس بار وردی میں منتخب کروانے کے دعویداروں

کواپنا مسلمہ لیڈر مانا؟۔ کوئی بتلائے تو سہی کہ آخر مورخ ایسا کیا لکھے گا کہ جس پہ آنے والی نسلیں فخر سے سَر اُٹھا کر کہہ سکیں کہ ہمارے اسلاف نے ہمیں یہ ''تحفۂ زریں'' دیا ہے؟۔ میں تو جب بھی تاریخِ پاکستان کے اوراق پلٹتی ہوں تو بے ساختہ لبوں پہ آ جاتا ہے

شہرِ دل ایک مدت اُجڑا بسا غموں میں

آخر اُجاڑ دینا اِس کا قرار پایا

اسلام آباد کی شاہراہِ دستور پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ تماشہ ہے نہ ڈرامہ۔ وہاں تو ''نئے پاکستان'' کی بنیاد رکھی جا رہی ہے، ایسا پاکستان جس میں دستور کی کوئی گنجائش ہو گی نہ قانون کی۔ آئین ہو گا تو بس ایک کہ ''جِس کی لاٹھی، اُس کی بھینس''۔ ایسا پاکستان کہ جس میں وزیرِ اعظم کے خطاب سے پہلے ''ناچ گانے'' کی محفلیں سجائی جائیں گی۔ ایسا پاکستان جس میں رہنما حصولِ مقصد کے لیے اپنے بچوں کو انگلینڈ، دبئی اور کینیڈا جیسے محفوظ مقامات پر روانہ کر کے قوم کے معصوم بچوں کے خون سے ہولی کھیلیں گے۔ ایسا پاکستان جس میں رہنما سرِ عام گندی زبان استعمال کریں گے۔ جس میں ''قلم'' کو جنسِ بازار سمجھ کر بولی لگائی جائے گی اور ہر شخص کی ایک قیمت مقرر ہو گی۔ ایسا پاکستان جس میں انانیت اپنی انتہاؤں کو پہنچ کر فرعونیت میں ڈھل جائے گی۔ مجھے تو ایسا ہی نیا پاکستان نظر آ رہا ہے کسی اور کو شاید کوئی دوسرا ہی جہان نظر آتا ہو۔ کپتان صاحب پارلیمنٹ کے جنگلے

توڑ کر بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ نیا پاکستان بن رہا ہے۔پی ٹی وی کی عمارت پر دھاوا بول کر اُس پر قبضہ کیا جاتا ہے اور ظاہر ایسے کیا جاتا ہے کہ جیسے دِلی کے لال قلعے پر سبز ہلالی پرچم لہرا دیا گیا ہو۔کپتان صاحب اور قادری صاحب کے لیے اپنے دلوں میں اُلفتوں، محبتوں اور عقیدتوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر رکھنے والوں سے دست بستہ سوال ہے کہ کیا دس بارہ یا پندرہ بیس ہزار افراد پر مشتمل شَر پسندوں کو حکومت چیونٹی کی طرح مَسل دینے کی طاقت نہیں رکھتی ؟۔کیا اِن شَر پسندوں کے رہنماؤں کا کوئی ایک مطالبہ بھی آئینی ہے ؟۔کیا جمہوری ملکوں میں اپنے مطالبات منوانے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے ؟۔کیا پاکستان میں جنگل کا قانون ہے ؟۔کیا آئین کو جلا کر قانون کی حاکمیت سے دست بردار ہو جانا چاہیے ؟۔اگر ان سبھی سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر کپتان صاحب اور قادری صاحب کا کونسا مطالبہ ایسا ہے جو اِس معیار پر پورا اُترتا ہے ؟۔ سبھی کہتے ہیں کہ وزیرِ اعظم کے استعفے کا مطالبہ غیر آئینی نہیں۔بجا، بالکل بجا لیکن وزیرِ اعظم کو گھر بھیجنے کا طریقِ کار بھی آئین ہی میں درج ہے۔کیا آئین میں کہیں لکھا ہے کہ وزیرِ اعظم ہاؤس میں گھُس کر زبردستی حکومت پر قبضہ کر لیا جائے ؟۔اگر الیکشن میں دھاندلی کی شکایت ہے تو اِس شکایت کے ازالے کے لیے عدالتیں موجود ہیں لیکن خاں صاحب اور قادری صاحب تو اپنی اپنی عدالتیں سجائے بیٹھے ہیں جہاں مدعی بھی وہ خود ہیں اور منصف بھی خود۔

خاں صاحب کہتے ہیں ''جو لوگ مجھے بچپن سے جانتے ہیں، اُنہیں پتہ ہے کہ میں کسی سے کنٹرول نہیں ہوتا اور اپنی مرضی کرتا ہوں''۔ شکر ہے کہ خاں صاحب کے مُنہ سے ایک سچ بھی نکل گیا ورنہ ہم تو یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ خاں صاحب کو سچ بولنے کی عادت ہی نہیں۔ یہی گلہ جاوید ہاشمی صاحب کو بھی ہے۔ پورا پاکستان جانتا ہے کہ جاوید ہاشمی نڈر، بے خوف اور بے باک انسان ہے۔ ہم تو جاوید ہاشمی کو اُس وقت سے جانتے ہیں جب وہ پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کا صدر تھا اور اپنے پرائے سبھی کہتے تھے کہ وہ بیوقوفی کی حد تک بہادر اور سچا انسان ہے۔ اُس کی عشروں پر محیط سیاسی جدوجہد نے بھی یہ ثابت کیا کہ وہ بِکتا ہے نہ جھکتا۔ اُس نے پارلیمنٹ ہاؤس کے گیٹ کے سامنے کلمہ طیبہ کی چھاؤں میں کپتان صاحب کے بارے میں دہلا دینے والے انکشافات کیے۔ ہاشمی صاحب نے کہا ''عمران خاں نے کہا کہ وہ فوج کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ''بیچ والے'' کہتے ہیں طاہر القادری کے ساتھ چلو۔ سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ہماری مرضی کا آ رہا ہے۔ سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس اور ججز سے معاملات طے پا گئے ہیں، ہماری درخواست پر وہ نواز شریف اور شہباز شریف کو ہٹا دیں گے۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ ستمبر 2014ء میں انتخابات ہونگے''۔ ہاشمی صاحب نے یہ بھی کہا'' عمران خاں کسی منصوبہ بندی کے تحت اسلام آباد آئے ہیں مگر یہ پتہ نہیں کہ یہ کس کا منصوبہ ہے اور سکرپٹ کہاں لکھا گیا''۔ اب بھی الیکٹرانک میڈیا پر ہاشمی کے انہی انکشافات کا شور مچا ہوا ہے اور اِن ٹاک شوز میں جو قدرِ مشترک نظر آتی ہے وہ یہی ہے کہ سیاستدانوں، تجزیہ نگاروں کی غالب اکثریت کے

مطابق جاوید ہاشمی کے الزامات رد نہیں کیے جا سکتے کیونکہ ایک تو وہ تحریکِ انصاف کا صدر رہے اور دوسرے اُس کا کبھی کوئی جھوٹ سامنے نہیں آیا۔ ہمارے نزدیک فوج اور عدلیہ دونوں ہی انتہائی محترم ادارے ہیں۔ جب سے پاکستان بنا ہے افواجِ پاکستان قربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کرتی چلی آ رہی ہیں اور سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کے بعد اُبھر کر سامنے آنے والی اعلیٰ عدلیہ کی تحسین بھی پوری دنیا میں ہو رہی ہے لیکن محض حصولِ اقتدار کی خاطر کپتان صاحب متواتر جھوٹ بول کر اپنے ساتھیوں کو گمراہ اور اِن دو انتہائی محترم اداروں کو بدنام کرتے رہے۔ انتہائی محترم چیف جسٹس آف پاکستان ناصر الملک نے تحریکِ انصاف سے بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطوں کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ عمران خاں سے زندگی میں صرف ایک دفعہ اُس وقت ملے جب وہ قائم مقام چیف الیکشن کمشنر تھے۔ آئی ایس پی آر نے بھی اِن الزامات کی سختی سے تردید کر دی ہے۔ اب قوم خود فیصلہ کر لے کہ سچا کون اور جھوٹا کون؟۔ بہرحال باغی نے ایک دفعہ پھر بغاوت کر کے اُن ''سرگوشیوں'' کو زبان عطا کر دی ہے جو کافی عرصے سے سنائی دے رہی تھیں۔ اگر یہ سب سچ ہے تو ہم باغی کی عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے کپتان صاحب سے کہتے ہیں

اتنا نہ اپنی جائے سے باہر نکل کے چل
دُنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ، سنبھل کے چل

لوجی ! ہم جا رہے ہیں

ایک معروف اخبار کے لکھاری نے ڈاکٹر طاہر القادری کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھا کہ آصف زرداری، نواز شریف اور مولانا فضل الرحمٰن جیسے رہنماء بھٹو، ضیاء اور مولانا مفتی محمود کی نسبت سے مشہور ہوئے ۔ لیکن ڈاکٹر طاہر القادری لمحہ موجود کی وہ واحد شخصیت ہیں جن کی قامت آوری کسی بیساکھی کی مرہونِ منت نہیں۔ کالم نگار موصوف شاید بھول گئے کہ ''نسبت'' تو علامہ صاحب کی بھی ہے، بڑی مضبوط نسبت، ایسی نسبت جس کی ہر راہ میاں برادران کے گھر پر ختم ہوتی ہے۔ علامہ صاحب کو میاں محمد شریف مرحوم جیسی مضبوط ''بیساکھی'' میسر آئی جس نے علامہ صاحب کو فرش سے اُٹھا کر عرش تک پہنچا دیا۔ یہ کہانی اتفاق مسجد کے '' امام'' سے شروع ہو کر ''القادریہ' سے ہوتی ہوئی منہاج القرآن پر ختم ہوتی ہے اور ہر موڑ پر ''میاں برادران'' ہی کھڑے نظر آتے ہیں اِس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ علامہ صاحب بنا کسی بیساکھی کے اِس مقام تک پہنچے ۔

محترم لکھتے ہیں ''اور کون ہے ایسا جس نے ایک ہزار سے زائد زندہ جاوید کتابیں تصنیف کی ہوں''۔ ہم سوچ میں پڑ گئے کہ اگر مولانا نے ایک کتاب صرف ایک ماہ میں بھی تصنیف کی ہو تو پھر بھی ہزار کُتب 83 سال میں لکھی جا سکتی ہیں

اور اگر مولانا نے 20 سال کی عمر سے کتابیں لکھنا شروع کی ہوں تو اُن کی عمر اِس وقت سال تو ہونی چاہیے لیکن ذرا ٹھہریے، خود مولانا کے فرمان کے مطابق اُنہوں نے 103 یہ ایک ہزار کتابیں 2005ء سے 2012ء کے درمیان لگ بھگ سات، ساڑھے سات سال کے عرصے میں لکھی ہیں۔ یہ بھی مولانا صاحب کا ہی فرمان ہے کہ 100 سے زائد ممالک میں منہاج القرآن کی شاخیں ہیں جہاں وہ لیکچر دینے جاتے رہتے ہیں اور اُن کے لیکچروں اور خطبات کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔۔۔ یہاں آ کر ہماری عقل نے کام چھوڑ دیا ہے کیونکہ سات، ساڑھے سات سال کے عرصے میں تو مولانا اگر بنا کھائے پیئے، سوئے اور لیکچر دیئے متواتر لکھتے ہی چلے جائیں، پھر بھی ایک کتاب لگ بھگ 60 گھنٹوں میں لکھی گئی جو کسی عامی کے لیے تو ناممکن ہے لیکن شاید علامہ جیسی ''پہنچی ہوئی'' ہستی کے لیے نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ''فرشتے'' کتابیں لکھ لکھ کر مولانا کے سرہانے رکھ جاتے ہوں۔ ہم مولانا کو دروغ گو بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ ایسا کہنا دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے۔ ہمارا ایمان اُس وقت تھوڑا متزلزل ہوا جب مولانا نے 2012ء میں مینارِ پاکستان لاہور میں پچاس ساٹھ ہزار کے مجمعے کو تیس لاکھ کا اجتماع قرار دیا۔ لیکن ہم غلط تھے کیونکہ یہ معرفت کی باتیں ہیں جو بھلا ہم جیسے لوگ کیا جانیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے مولانا کے ایک قریبی عقیدت مند کا جس نے ہمیں سمجھایا کہ مجمع تو پچاس ساٹھ ہزار کا ہی تھا، باقی انتیس لاکھ پچاس ہزار ''فرشتے'' تھے جو صرف مولانا کو نظر آ رہے تھے۔ پیپلز پارٹی کے دَور میں

مولانا نے اسلام آباد کے ڈی چوک میں دھرنا دیا، تب ایک اینکر نے مولانا کے ایک عقیدت مند سے سوال کیا کہ دھرنے میں اندازاً کتنے لوگ ہونگے ؟۔ عقیدت مند نے جواب دیا ’’لگ بھگ ایک لاکھ تو ہونگے ‘‘۔تب اینکر نے کہا کہ مولانا تو کہتے ہیں 20 لاکھ کا مجمع ہے۔تب عقیدت مند بغلیں جھانکنے لگا۔شاید وہ ابھی معرفت کے اُس مقام تک نہیں پہنچا ہو گا جہاں ’’فرشتے‘‘ نظر آنے لگتے ہیں لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ کالم نگار موصوف معرفت کے اُس مقام تک پہنچ چکے ہیں۔

محترم کالم نگار فرماتے ہیں ’’کوئی کہہ رہا تھا میڈیا ڈاکٹر طاہر القادری کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے، اُن کا تو اسمبلی میں ایک بھی نمائندہ موجود نہیں۔اِس شخص سے میری اتنی سی عرض ہے کہ تعصب کی عینک اتار کر ڈاکٹر صاحب کے ارد گرد دیکھئے، وہاں آپ کو سابق وزیرِ اعظم چودھری شجاعت، سابق وزیرِ اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی، سابق وفاقی وزیر شیخ رشید، سابق وزیرِ خارجہ سردار آصف احمد علی بھی دکھائی دیں گے۔کتنے اور ایم این اے چاہئیں آپ کو؟‘‘۔واقعی یہ تو ہم بھول ہی گئے کہ 342 کی اسمبلی میں دو ایم این اے تو مولانا کے ساتھ بھی ہیں لیکن شیخ رشید کا تو ’’کچھ‘‘ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس کے ساتھ ہیں۔اُنھوں نے تحریکِ انصاف کے ساتھ استعفیٰ دینے کی بڑھک تو مار دی لیکن گھر جاتے ہی مکر گئے اور اب کہتے ہیں ’’پہلے نواز شریف کا استعفیٰ لوں گا، پھر خود دوں گا‘‘۔ شیخ صاحب خوب جانتے ہیں کہ میاں صاحب کبھی استعفیٰ نہیں دیں گے اِس لیے شیخ

صاحب کی ''ممبری'' بھی پکی البتہ کپتان صاحب ابھی تک ڈٹ کر کھڑے اور مرنے مارنے پر تُلے بیٹھے ہیں۔آفرین ہے خاں صاحب کی ہمت اور حوصلے پر کہ ''سونا میے''ایک ایک کرکے کھِسک گئے،پارٹی کا صدر ''داغِ مفارقت'' دے گیا،وائس چیئرمین نے پارلیمنٹ کواپناسیاسی کعبہ قرار دے کر ہر وہ بات کہہ دی جو خاں صاحب کبھی نہ کہتے،پارٹی ٹوٹ پھوٹ کا شکاراورایم این ایزاورایم پی ایزکی غالب اکثریت استعفے دینے سے انکاری لیکن ''ضدّی خان''اب بھی ''کھیلن کومانگے چاند''۔ دراصل معاملہ ملک وقوم کانہیں،اُس کی شادی کا ہے جواُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ''نیاپاکستان''نہیں بَن جاتا۔ویسے خاں صاحب اگرہماری مانیں تواعلان کردیں کہ بنی گالہ میں اُن کا اپنا وسیع وعریض گھرہی دراصل نیاپاکستان ہے۔کیونکہ ایسے اعلان سے کم از کم اُن کی شادی توہوجائے گی۔ ایسے اعلان کے بغیرتواُن کی شادی کادور دور تک کوئی امکان نہیں۔ویسے جانتے وہ خود بھی ہیں کہ ''معاملہ گَڑبَڑہے''۔اسی لیے اُنھوں نے کہہ دیا'' پارٹی میں تقسیم شروع ہو گئی۔پتہ چل گیاکہ مشکل وقت میں ساتھ دینے والے کون ہیں اور سونامی سے فائدہ اُٹھانے والے کون۔اسی لیے اب یہ میچ ٹوئنٹی ٹوئنٹی نہیں،لمباچلے گا''۔کتنالمباچلے گا؟کچھ پتہ نہیں لیکن اگرزیادہ لمباچلاتوہمارے کپتان صاحب کو بھی علامہ صاحب کی طرح 38 ادویات کاسہارالیناپڑسکتاہے۔علامہ صاحب کہتے ہیں کہ وہ آجکل بہت معمولی خوراک لیکن 38 ادویات استعمال کررہے ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ ادویات کا تعلق انسان کے

جذبات، احساسات، عادات، سوچ، قوتِ فیصلہ اور ذہنی نفسیات سے ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا انہی ادویات کے زیرِ اثر اپنے جذبات کی انتہاؤں تک پہنچ کر قوتِ فیصلہ سے محروم ہو جاتے ہوں۔ ہم تو حاکمانِ وقت کو یہی مشورہ دیں گے کہ وہ پولیس سے مشورہ کر کے کسی ماہر چور کی خدمات حاصل کریں اور مولانا کا ''میڈیکل بکس'' چوری کروالیں، پھر ''نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری''۔ میڈیکل بکس کی عدم موجودگی پر مولانا اعتدال میں آ کر کینیڈا لوٹ جائیں گے اور قوم سُکھ کا سانس لے گی۔ ویسے بھی جب سے شاہ محمود قریشی نے قومی اسمبلی میں مولانا کے خلاف ''ایف آئی آر'' کٹوائی ہے، مولانا کا دِل کچھ ٹوٹ سا گیا اسی لیے اُنھوں نے اپنے عقیدت مندوں کو کہہ دیا کہ جو مجبور ہیں وہ چلے جائیں۔ ایک راز کی بات جو مولانا کے ایک قریبی عقیدت مند نے ہمیں بتلائی، یہ ہے کہ مولانا کو جو آخری ''بشارت'' ہوئی اُس میں بتلایا گیا کہ پہلی ساری بشارتیں منسوخ کر دی گئی ہیں اور اب ''اصلی تے وَڈی'' اور آخری بشارت یہ ہے کہ پاکستان میں اُن کی دال نہیں گلنے والی اِس لیے اِس سے پہلے کہ حکومت اُن کا نام ای سی ایل میں ڈال دے، وہ چپکے سے کینیڈا کھسک لیں۔

پہنچی وہیں پہ خاک

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔سرگوشیاں

ایک شخص حضرت بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ''اپنا کرتا بطور تبرک مجھے دے دیجئے، میں اِس سے برکت حاصل کروں گا''۔ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا ''میں اگر تمہیں اپنی چمڑی بھی اتار کر دے دوں تو وہ بھی تمہارے لیے سود مند نہ ہو گی کیونکہ کسی زبان دراز کو کوئی تبرک فائدہ نہیں پہنچا سکتا''۔ محترم عمران خاں نے خارزارِ سیاست میں قدم رکھتے ہی جس غیر پارلیمانی زبان کی ''طرح'' ڈالی اُسے نرم سے نرم الفاظ میں ''بازاری'' زبان ہی کہا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف انتہائے نرگسیت کے شکار، شیخ الاسلام کہلوانے کے شوقین مولانا طاہر القادری جب سے پاکستان تشریف لائے ہیں تب سے اب تک اپنے عقیدت مندوں کو قائل کرنے کے لیے ساڑھے پانچ سو مرتبہ ''اللہ کی عزت'' کی قسم اُٹھا چکے ہیں جبکہ میرے دین کا یہ طے شدہ فیصلہ ہے کہ زیادہ قسمیں کھانے والا جھوٹا ہوتا ہے۔ مولانا نے دھرنے کی رات کو لیلۃالقدر قرار دے کر دینِ مبیں کا مذاق اُڑانے کی جسارت کی لیکن حیرت ہے کہ کسی مفتی نے اِس ناپاک جسارت پر اب تک کوئی فتویٰ نہیں دیا۔

حضرت علیؓ کا قول ہے ''زبان ایک ایسا درندہ ہے کہ اگر تُو اُسے کُھلا چھوڑ دے

تو عین ممکن ہے کہ تجھے ہی پھاڑ کھائے''۔اسلام آباد کے ڈی چوک میں اِس قولِ علیؓ کو ہم سچ ہوتا دیکھ رہے ہیں۔خاں صاحب جو آندھی، طوفان کی طرح اُٹھے اب ڈی چوک کے ایک کونے میں سُکڑے سمٹے بیٹھے ہیں۔خاں صاحب کے مدح سرا ''کالمی درویشوں'' والے لکھاری نے اپنے کالموں میں سینکڑوں بار لکھا ''کپتان جھوٹ نہیں بولتا'' لیکن وقت نے ثابت کیا کہ کپتان کی کھیتی میں سوائے جھوٹ کے اور کوئی فصل اُگتی ہی نہیں۔ڈی چوک کے 24 دنوں میں اُنھوں نے اتنے جھوٹ بولے کہ شمار ممکن نہیں لیکن ایک آخری جھوٹ کہ ''حکومتِ پاکستان جھوٹ بولتی ہے، چین کے صدر تو پاکستان کے دورے پر آ ہی نہیں رہے تھے''۔اُنہیں ایسی اطلاعات پہنچانے والا ٹی وی اینکر خود اتنا بڑا جھوٹا ہے کہ کوئی بھی عقیل و فہیم شخص اُس کی باتوں پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔چینی وزارتِ خارجہ نے تصدیق کر دی کہ پاکستانی سیاست کی صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دونوں ملکوں کی باہمی رضامندی سے دورہ منسوخ ہوا۔خاں صاحب کے لیے انتہائی مایوس کُن خبر یہ کہ چینی سفارت خانے نے بیان جاری کر دیا ہے کہ ''طے شُدہ معاہدوں پر مکمل عمل درآمد ہوگا اور سیاسی حالات معمول پر آتے ہی دورے کو حتمی شکل دی جائے گی''۔اُسی کذاب اینکر کو انٹرویو دیتے ہوئے خاں صاحب نے یہ بھی فرمایا'' چین سے 32 ارب ڈالرز 7 فیصد سود پر حاصل کر کے قوم کو مزید مقروض کیا جا رہا ہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان نے چین سے کوئی قرض نہیں لیا۔یہ 32 ارب ڈالرز کے معاہدے ہیں جو چینی صنعت کاروں کے ساتھ کیے گئے۔ساری سرمایہ کاری چینی صنعت کار ہی کریں

گے اور چینی حکومت پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے والے صنعت کاروں کو ہر ممکن سہولت فراہم کرے گی لیکن خاں صاحب نے اِن سب پر پانی پھیرنے کی محض اِس لیے کوشش کی کہ اگر یہ منصوبے شروع ہوگئے تو پھر خاں صاحب کی وزارتِ عظمیٰ خواب وخیال بن کے رہ جائے گی۔

دھرنوں کی مایوس کُن تعداد دیکھ کر دونوں رہنما بھائی ، بھائی بن چکے ہیں۔اب دونوں کا ایجنڈا ایک اور دونوں ہی انارکی پھیلانے کی تگ ودو میں مگن ۔اس لیے
بَرملا کہا جاسکتا ہے کہ ''پہنچی وہیں پہ خاک، جہاں کا خمیر تھا''۔ مسٹر اور مولانا کے دھرنے ڈی چوک کے انتہائی متعفن ماحول میں اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ڈی چوک کو التحریر سکوائر میں بدلنے کا خواب دیکھنے والوں کی ہر تدبیر اُلٹی ہو رہی ہے۔خاں صاحب بار بار وزیرِاعظم کو مصر کے صدر حسنی مبارک کا طعنہ دیتے ہیں لیکن جانتے وہ خود بھی ہیں کہ التحریر سکوائر پر لاکھوں کا مجمع تھا،پوری قوم انقلابیوں کے ساتھ تھی اور حسنی مبارک نے اپنا اقتدار بچانے کے لیے لگ بھگ 900 لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جبکہ خاں صاحب کی ''جوہڑ''میں بدلتی سونامی محض چند سو افراد پر مشتمل ہے۔ البتہ رات کو ''میوزیکل کنسرٹ'' کے شوقین پنڈی اسلام آباد کے لڑکے ،لڑکیاں ہلا گُلا کرنے اور جسم تھرکانے ڈی چوک پہنچ کر دھرنے کو رنگین بنا دیتے ہیں۔ مسٹر اور مولانا کی تو یہ شدید خواہش تھی اور ہے کہ ڈی چوک کو خون میں نہلا دیا جائے تاکہ اُنہیں لاشوں پر سیاست کرنے

کا موقع مل سکے۔ شاید ایسا ہو بھی جاتا لیکن سانحہ ماڈل ٹاؤن کے بعد حکومت محتاط ہو گئی اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اِس لیے مسٹر اور مولانا کا لاشوں پر سیاست کرنے کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ چارو ناچار خاں صاحب نے یہ اشارے دینے شروع کر دیئے کہ فوج اُن کی پشت پر ہے۔ وہ کبھی امپائر کی انگلی کھڑی ہونے کا اشارہ دیتے تو کبھی اپنی کور کمیٹی کو کہتے ''وہ'' کہتے ہیں کہ ایسا کر دو، ویسا کر دو لیکن یہ جھوٹ بھی زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور ''باغی'' نے بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑ دیا۔ جونہی تحریکِ انصاف کے اراکینِ پارلیمنٹ کو یہ ادراک ہوا کہ کپتان جھوٹ بولتا ہے تو اُن میں پھوٹ پڑ گئی جس کا اقرار خود خاں صاحب نے بھی کیا۔ تحریکِ انصاف کے تین اراکین نے تو ویسے ہی مستعفی ہونے سے انکار کر دیا، پانچ اراکین نے استعفے عمران خاں صاحب کے نام لکھے
جو غیر آئینی تھے اور اب باوثوق ذرائع تصدیق کر رہے ہیں کہ تحریکِ انصاف کے کم از کم اراکین نے سپیکر قومی اسمبلی سے خفیہ ملاقات کرکے استدعا کی ہے کہ اُن کے 20 استعفوں پر عمل درآمد روک دیا جائے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر خاں صاحب کی پٹاری میں تو محض چند ''سکے'' ہی بچتے ہیں، کیا وہ اِن کھوٹے سکوں کے زور پر انقلاب لانے کے داعی ہیں؟۔ ویسے تو یہ خبریں بھی آ رہی ہیں کہ عنقریب شاہ محمود قریشی
صاحب، جہانگیر ترین، اعظم سواتی اور شیریں مزاری سے مِل کر عنقریب تحریکِ انصاف سے خاں صاحب کا پتا کاٹنے والے ہیں اور تحریکِ انصاف کے اراکینِ پارلیمنٹ کی غالب اکثریت نے اُن کو ساتھ دینے کی یقین دہانی بھی کروادی ہے۔

اُدھر مولانا قادری کو بھی چودھری صاحبان یقین دلاتے رہے کہ ''وہ'' اُن کے ساتھ ہیں لیکن دھرنوں کی شرمناک ناکامی کے بعد بوکھلائے ہوئے چودھری شجاعت نے ایک طرف توسابق آرمی چیف کوانتخابی دھاندلی میں ملوث قرار دے دیا جبکہ دوسری طرف فوج کومارشل لاء لگانے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ فوج کی مزاج شناسی کادعویٰ کرنے والے کچھ ریٹائرڈ فوجی بھی ایک مخصوص ایجنڈے کے تحت حکومت کے خلاف زہر اُگلتے رہے اور ہمارا آزاد اور بیباک میڈیا جلتی پہ تیل ڈالتا رہا۔ تقریباً تمام نیوز چینلز 24 گھنٹے مسٹر اور مولانا کے گرد گھومتے اور اُن کی ''لائیو کوریج'' کرتے رہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ الیکٹرانک میڈیا کا کاروبار اشتہارات پہ چلتا ہے لیکن اِن چوبیں دنوں میں اشتہارات بھی تقریباً بند ہوگئے۔ سوال یہ ہے کہ مسٹر اور مولانا نے اِن نیوز چینلز کو کتنے میں خریدا؟۔ اُدھر پیمرا کا یہ عالم کہ بے بس، مکمل بے بس۔ مانا کہ آئین ہمیں اظہارِ رائے کی آزادی دیتا ہے لیکن بانئ پاکستان نے تو یہ فرمایا تھا کہ ''آزادی کا مطلب بے لگام ہو جانا نہیں۔ اِس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ آپ جو رویہ چاہیں اختیار کریں اور جو جی میں آئے کر گزریں۔ آزادی ایک بھاری ذمہ داری ہے جسے سوچ سمجھ کر استعمال کرنا ہوتا ہے''۔ یہ کیسی آزادی ہے جو بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہو رہی ہے اور الیکٹرانک میڈیا بربادیوں کی داستان رقم کرنے والوں کا بھرپور ساتھ دے رہا ہے۔

بَس ! بہت ہو چکا

ہر ناکامی کے دامن میں کامرانی کے پھول ہوتے ہیں، شرط مگر یہ کہ ہم کانٹوں میں نہ اُلجھ جائیں اور یہ بھی طے ہے کہ جو شخص ناکامی کا کڑوا گھونٹ پینے کو تیار نہیں ہوتا اُسے کامیابی کا میٹھا امرت بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بَل چلے

تاریخِ عالم میں ایسے بیشمار واقعات ملتے ہیں جہاں بڑے بڑے سالاروں کو پیہم ناکامیوں کے بعد ہی کامرانی نصیب ہوئی لیکن ایسے لوگ جو ناکامیوں سے بوکھلا کر عقل وشعور کا دامن چھوڑ دیتے ہیں وہ کبھی کامران نہیں ہوتے۔ اسلام آباد میں دھرنا دیئے بیٹھے رہنماؤں کے چہروں پر بوکھلاہٹ صاف نظر آتی ہے۔ خاں صاحب کسی بھی صورت میں ناکامی کا کڑوا گھونٹ پیتے ہوئے نئے عزم کے ساتھ ”سیاسی اکھاڑے“ میں اترنے کو تیار نہیں۔ اِس لیے اُنہیں کامیابیوں کا امرت بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ڈی چوک اسلام آباد میں نئے پاکستان کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ ایک پاکستان اقبالؒ کا خواب تھا جسے قائدِاعظم نے سچ کر دکھایا لیکن یہ پاکستان ہمیں پسند نہ آیا اور جلد ہی ہمیں اِس پاکستان سے

اکتاہٹ محسوس ہونے لگی اور ہم ''نیاپاکستان'' بنانے کی تگ ودَو کرنے لگے۔ ہماری کوششیں ثمر آور ہوئیں اور دسمبر1971ء میں ذوالفقار علی بھٹواور شیخ مجیب الرحمٰن نے مل کر ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں نئے پاکستان کی بنیادر کھی۔ نئے پاکستان میں ہم نے اپنا آئین بنایااوراُسے ایک ایسی ''مقدس'' دستاویز قرار دیا جس پر عمل درآمد ''گناہِ کبیرہ'' ٹھہرا۔ اب ہم ایک دفعہ پھراس پاکستان سے ''اوازار'' ہو چکے ہیں اور اب کی بار ہم چارنئے پاکستان بنانے کی تگ ودَو کر رہے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ بھٹواور مجیب کی طرح نئے پاکستان کی سعی کرنے والے کرداراب بھی دو ہی ہیں، عمران خاں اور طاہر القادری۔ چہرے بدل گئے مگر نعرے وہی البتہ اِن نعروں کو رنگین بنانے کے لیے جو حربے استعمال کیے جا رہے ہیں اُن کا پہلے رواج نہ تھا۔ یہ نئے پاکستان کی بنیادر کھنے والوں کی دین ہے کہ ہم ''تھرکتے'' ہوئے نعرہ زن ہوتے ہیں اور نئے پاکستان کے رہنما بھی۔

کچھ پانے کے لیے کچھ نہ کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔ اقبالؒ نے بھی کہا تھا کہ ''خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا''۔ ہم بھی نیاپاکستان بنانے کے شوق میں فی الحال ''کھو'' ہی رہے ہیں۔ تین ملکوں کے سربراہ اپنے دَورے منسوخ کر چکے، ڈیڑھ ہزار ارب کا نقصان ہو چکا، آپریشن ضربِ عضب سے قوم کی توجہ ہٹ چکی، سٹاک مارکیٹ ڈانواں ڈول اور ڈالر بلندیوں کی طرف گامزن اِس پہ مستزاد سیلاب کی تباہ کاریاں جو سینکڑوں جانیں لے چکااور اربوں روپے کا نقصان لیکن آزادی اور انقلاب مارچ کے

دعویدار کرکٹ کھیلتے اور ''میوزیکل کنسرٹ'' سجاتے نئے پاکستان کا جشن منا رہے ہیں۔ کپتان صاحب تو بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ نئے پاکستان کی بنیاد رکھ دی گئی لیکن قوم کا ''موڈ'' کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔

پہلی بار ایسا ہوا کہ قوم نے اِن رہنماؤں کو یہ پیغام پہنچا دیا کہ ہم سدھائے ہوئے بندر نہیں جو ہر مداری کی ڈگڈگی پر ناچنے لگیں۔ چند ہزار ایک طرف اور پوری قوم دوسری طرف، چند ایم این اے ایک طرف اور پوری پارلیمنٹ دوسری طرف۔ آخر کپتان صاحب اور قادری صاحب کو وہ ہزیمت کیوں نظر نہیں آتی جو روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے۔ علامہ قادری کو تو چھوڑ یئے کہ اُنہوں نے تو بالآخر کینیڈا ہی لوٹنا ہے لیکن خاں صاحب سے تو لوگوں نے اُمید کے بہت سے رشتے باندھ رکھے تھے اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ قوم اُنہیں متبادل قیادت بھی سمجھنے لگی تھی لیکن ڈی چوک کے ایک ہی دھرنے نے سب کچھ عیاں کر دیا اور اب تحریکِ انصاف اپنا وجود بچانے سے بھی عاری نظر آنے لگی ہے۔ سچ کہا تھا ارسطو نے '' ضد حماقت سے شروع ہو کر ندامت تک ختم ہوتی ہے''۔ کہا جا سکتا ہے کہ خاں صاحب نے اپنے ہاتھوں اپنی بربادیوں کی داستان لکھی اور یہ جانتے بوجھتے قوم سے اپنا ناطہ توڑا کہ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ\
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

حضرت عمرؓ کا یہ قول ہے ''حکومت کے منصب کے لیے ایسا شخص سب سے موزوں ہے کہ جب وہ اِس منصب پر فائز نہ ہو تو قوم کا سردار نظر آئے''۔ لیکن کنٹینر پر کھڑے خاں صاحب کسی بھی صورت میں قوم کے سردار نظر نہیں آتے۔ پاکستان میں کئی صدور اور وزرائے اعظم آئے لیکن کسی نے کبھی سٹیج پر کھڑے ہو کر ایسی حرکات نہیں کیں جو خاں صاحب کر رہے ہیں۔ ہمیں اِس سے کوئی غرض نہیں کہ کپتان صاحب کے دعوؤں اور وعدوں میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا لیکن جس طرح سے وہ گانوں پر جھومتے اور اپنی تقریروں میں بازاری زبان استعمال کرتے ہیں اُسے دیکھ اور سُن کر سَر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ عالمی برادری بھی کیا سوچتی ہو گی کہ ہم کِس معیار کے لیڈر پیدا کر رہے ہیں۔ جب ہمارے رہنماہی سٹیج پر کھڑے ہو کر ڈانس کر رہے ہوں تو پھر نسلِ نَو کا ناچنا طے ہے کیونکہ اُس نے اپنے رہنماؤں کی پیروی کرنی ہوتی ہے۔

خاں صاحب نے دعوے تو بہت کیے اور قوم کی آشاؤں کو مہمیز بھی بہت دی لیکن سب کچھ خواب و خیال نکلا۔ بنوں میں لگ بھگ دَس لاکھ آئی ڈی پیز بے یار و مددگار پڑے ہیں لیکن خاں صاحب نے وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک سمیت خیبر پختونخوا کی ساری کابینہ کو اپنے پاس دھرنے میں بٹھا رکھا ہے۔ جس دن پشاور میں طوفانی بارشوں نے 18 افراد کو نگل لیا، اُسی دن وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک اور تحریکِ انصاف کے

خیبر پختونخواکے صدر اعظم سواتی ڈی چوک میں ڈانس کا مقابلہ کر رہے تھے۔ میوزیکل کنسرٹ کے بعد خٹک صاحب اور خیبر پختونخواکے وزراء KPK کے گیسٹ ہاؤس میں چلے جاتے ہیں، خاں صاحب بنی گالہ کے محل میں، تحریکِ انصاف کے دیگر رہنماء سرینا ہوٹل میں، میوزیکل کنسرٹ کے شوقین لڑکے لڑکیاں واپس پنڈی، اسلام آباد اپنے گھروں میں اور باقی رہ جاتا ہے خالی کرسیوں کا سونامی یا تین چار سو بے یار و مددگار۔ کیا دھرنے ایسے ہی دیئے جاتے ہیں اور تحریکیں ایسے ہی چلتی ہیں؟۔ پہلے خاں صاحب تقریر سے پہلے یہ کہا کرتے تھے "(اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں"۔ لیکن اب اُنھوں نے یہ کہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ شاید شرم دامن گیر ہوتی ہوگی کہ ایک طرف اللہ کا نام اور دوسری طرف ہلّا گلّا اور میوزیکل کنسرٹ۔ ہم تو اب بھی خاں صاحب کو یہی مشورہ دیں گے کہ عافیت اسی میں ہے کہ سیلاب کا بہانہ بنا کر کِھسک لیں لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ خاں صاحب نے اپنے آپ کو بند گلی میں

قید کر لیا ہے۔ مراجعت وہ کر نہیں سکتے اور آگے کوئی راستہ بچا نہیں۔ جس امپائر کی انگلی کھڑی ہونے کی آس میں وہ بند گلی میں پہنچے، وہ امپائر تو حکومت کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا ہے۔ پھر وہ کس "غیبی قوت" کے انتظار میں ہیں؟۔

کہیں یہ سزا تو نہیں۔۔۔؟

علامہ اقبالؒ نے کہا

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

ربِ کریم نے کائنات کی اسی ''ناتمامی'' کو دور کرنے کے لیے انسان کو عقل و شعور کی دولت عطا کرکے حکم دیا ''ڈھونڈو زمین و آسمانوں میں''۔ اقوامِ مغرب نے اسی حکم پر عمل پیرا ہو کر آسمان کی رفعتوں کو چھو لیا لیکن ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا رہے ۔اب یہ عالم ہے کہ جونہی کسی قدرتی آفت کا سامنا ہوتا ہے تو حکمران اسے ''اذنِ ربی'' کہہ کر دامن چھڑا لیتے ہیں اور علماء بداعمالیوں سے منسوب کر دیتے ہیں البتہ سیکولر ذہن رکھنے والے اصحاب کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ سزا ہے تو پھر ''اشرافیہ'' کو ملنی چاہیے جو زمینی خُدا بنے بیٹھے ہیں نہ کہ مجبوروں، مقہوروں اور مفلسوں کو۔ بجا، مگر اشرافیہ کو ہمارے سروں پر مسلط کرنے والے بھی
تو یہی ''مجبور و مقہور'' ہی ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ الیکشن کے ہنگام ''ایلیٹ کلاس'' تو اپنے گھروں سے باہر نکلنا پسند ہی نہیں کرتی لیکن خطِ غربت سے نیچے بسنے والے بڑے ذوق و شوق سے قطار اندر قطار ووٹ ڈالتے ہیں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ فرقوں، گروہوں اور ذات پات میں بٹی قوم ابھی تک شعور کی اُس منزل تک پہنچ ہی نہیں سکی جہاں وہ سود و زیاں کا ادراک کرتے ہوئے اپنے نمائندوں

کاانتخاب کرکے۔ہم سمجھتے ہیں کہ قصور ''بتوں'' کانہیں،اُن کوتراش کر ''بھگوان''کادرجہ دینے والے ہاتھوں کاہے اور سزا کے حقدار بھی وہی ہیں۔اِس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ حکمران اشرافیہ بری الذمہ ہے۔آقاﷺ کافرمان ہے ''تُم میں سے ہرایک راعی (چرواہا) ہے جس سے روزِ قیامت اُس کے ریوڑ کاحساب لیاجائے گا''۔لاریب حساب تو ہوگا،کڑاحساب، حکمرانوں کا بھی اور ایسے حکمران منتخب کرنے والوں کا بھی۔

پتہ نہیں پاکستان کو کِس کی نظر کھا گئی کہ اب یہاں صرف لاشوں کاکاروبار ہوتاہے۔''انقلابیوں'' کواپنے انقلاب کے لیے لاشوں کی ضرورت،اقتدار پر رال ٹپکانے والوں کو حصولِ اقتدار کے لیے لاشوں کی ضرورت اور نفاذِ شریعت کے علمبرداروں کوخودساختہ شریعت کے لیے لاشوں کی ضرورت۔یہ ضرورتیں ابھی درمیان میں ہی ہوتی ہیں کہ کوئی نہ کوئی آفت ٹوٹ کر کشتوں کے پشتے لگادیتی ہے۔

اسلام آباد کے ڈی چوک میں دھرنا دیئے انقلابیوں کی تخریب کاریاں ابھی جاری تھیں کہ پنجاب ڈینگی کی زد میں آگیا۔منصوبہ سازابھی ڈینگی سے دو،دوہاتھ کرنے کے منصوبے باندھ ہی رہے تھے کہ قیامت خیز طوفانوں اور سیلابوں نے آن

گھیرا۔ سینکڑوں دیہات صفحۂ ہستی سے مِٹ گئے، لاکھوں ایکڑ پر کھڑی فصلیں برباد ہو گئیں، مال مویشی ڈھور ڈنگر سب پانی میں بہہ گئے، سینکڑوں زندگیوں کے چراغ گُل ہوئے اور گھر گھر میں ماتم اور دَر دَر پہ نوحہ خوانی ہونے لگی۔ لاکھوں بے خانماں مردوزن بے یارومددگار، کھانے کو کچھ نہ سَر چھپانے کو جگہ۔ افواجِ پاکستان اور ریسکیو 1122 سَر توڑ کوششوں میں مصروف لیکن کوہساروں سے بلند اور سمندروں سے وسیع تباہی کے آگے بے بَس۔ میاں برادران اب ''لنگوٹ'' کَس کر میدان میں ہیں۔ ایک ایک دن میں کئی کئی جگھوں پہ دَورے ہو رہے ہیں، بلند بانگ دعوے اور وعدے کیے جا رہے ہیں لیکن سیلاب زدگان کے لبوں پر تو یہی ہے کہ

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

سچ کہا ہے کسی سیانے نے کہ ''ویلے دی نمازتے کویلے دیاں ٹکراں''۔ خادمِ اعلیٰ پچھلے ساڑھے چھ سال سے پنجاب کے بِلا شرکتِ غیرے مالک۔ اُن کی اَنتھک کوششوں اور کاوشوں کا بھی ایک زمانہ معترف۔ نکتہ چیں لاکھ کہیں لیکن ہائی ویز، اُوور ہیڈز میٹرو بس اور بُلٹ ٹرین کی افادیت سے مفر ممکن نہیں لیکن قدرتی آفات کی طرف، شاید اُن کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ تقریباً ہر سال شدید بارشوں اور سیلاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اربوں کا نقصان ہوتا ہے اور انسانی جانوں کا بھی۔ سیلاب کو چھوڑیے کہ یہ مرکز کا مسئلہ ہے لیکن طوفانی بارشوں کا علاج

تو ممکن ہے۔ صوبائی دارالحکومت لاہور کا یہ عالم کہ تھوڑی بہت بارش سے بھی نقشہ بگڑ جاتا ہے۔اربوں روپے کی لاگت سے بنائی جانے والی سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہیں، گٹر اُبل پڑتے ہیں اور ہر طرف تعفن پھیل جاتا ہے۔ وجہ یہ کہ برساتی نالے بھی قبضہ گروپوں کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ سُنا تھا کہ ''ڈیزاسٹر مینجمنٹ'' نامی کوئی ادارہ بھی ہے۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ تحقیق کہ اِن قدرتی آفات پر قابو پایا جا سکتا ہے، شرط مگر یہ ہے کہ خادمِ اعلیٰ اُسی ذوق و شوق سے اِس طرف بھی توجہ دیں جس ذوق و شوق سے وہ اپنے پسندیدہ کاموں کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

محترم وزیرِ اعظم صاحب فرماتے ہیں کہ ''یہ آفت ناگہانی ہے اور ہمیں اِس کے بارے میں کچھ اندازہ ہی نہیں تھا۔ عرض ہے پاکستان میں پہلا سیلاب 1950ء میں آیا جس میں لگ بھگ ایک ہزار گاؤں تباہ ہوئے۔ پھر 1955ء میں سیلاب آیا جو سات ہزار دیہات بہا لے گیا۔ تب سے اب تک 21 بڑے سیلاب آ چکے ہیں اور ہر بار تباہی و بربادی کے وہی مناظر ہوتے ہیں جو آجکل نظر آ رہے ہیں۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ سیلاب ہمیشہ ایسے ہی تباہی مچاتے رہیں گے۔ وجہ یہ کہ سیلابوں کی روک تھام کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ دریاؤں پر کثرت سے ڈیم بنائے جائیں لیکن ہماری جمہوری حکومتیں ڈیم بنانے میں کبھی بھی سنجیدہ نہیں رہیں۔ بھارت میں ہزاروں ڈیم بن چکے اور سینکڑوں زیرِ تعمیر لیکن پاکستان میں اوّل تو کسی حکمران کا اِس

کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا اور اگر دھیان جائے بھی تو سیاست کی نظر ہو جاتا ہے۔ ایوبی دَورِ آمریت میں وارسک ، منگلا اور تربیلا سمیت سات بڑے ڈیم بنے اور پرویز مشرف کے دَور میں بھی سات چھوٹے ڈیم پایۂ تکمیل تک پہنچے۔ اگر آمر پرویز مشرف اپنے دَور میں ڈنڈے کے زور پر کالاباغ ڈیم بنا جاتے تو شاید اپنے گناہوں میں کچھ کمی کر لیتے لیکن اُنھوں نے بھی ''سیاست زدہ'' ہو کر کالاباغ ڈیم بنانے سے توبہ کر لی۔ نوازلیگ ہمیشہ سے ہی کالاباغ ڈیم بنانے کے حق میں تھی لیکن قومی وملّی یکجہتی کا بہانہ بنا کر راہِ فرار اختیار کرتی رہی۔ اب بھی اگر کالاباغ ڈیم کی رَٹ چھوڑ کر چھوٹے ڈیموں کا جال بچھا دیا جائے تو نہ صرف بھارت کی آبی جارحیت سے نجات مل سکتی ہے بلکہ لوڈشیڈنگ پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے۔

ہر آنکھ یہاں آنسوؤں کا جھرنا ہے

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

جب تک خون میں دھڑکن اور نطق سلامت ہے، ہم بولتے اور لکھتے رہیں گے کہ قحط الرجال نے اِس خطۂ بے نظیر کی نَس نَس میں ایسا موادِ بَد بھر دیا ہے جس کی جراحی اِس ''اشرافیہ'' کے بَس کا روگ نہیں کیونکہ یہ متعفن مواد انہی کی ''کرشمہ سازیوں'' سے پیدا ہوا۔ طبقۂ اشرافیہ کو تو ''مسجودِ ملائک'' سے اتنا بھی پیار نہیں جتنا یہ اپنے کتوں سے کرتے ہیں۔ گئے دنوں کے اوراق پلٹتے ورق ورق پر یہی لکھا نظر آتا ہے کہ قوم کا مقدر کاسۂ گدائی اور اس کے خون سے کشید کیا ایک ایک قطرہ اشرافیہ کے لیے ''مشروبِ شاہی''۔ قوم کا ظرف تو سمندروں جیسا لیکن یہ نام نہاد اشرافیہ، یہ تَن اُجلے مَن میلے لوگ بخیل ابنِ بخیل جنہوں نے اپنی زمینوں کے گرد بڑے بڑے بند باندھ کر بستیوں کی بستیاں اُجاڑ کر رکھ دیں لیکن اُن کی پیشانی عرقِ ندامت سے تَر ہوئی نہ حکمرانوں میں اتنی ہمت کہ اُنہیں نشانِ عبرت بنا دیں۔ ہوں گے بہت مداح سرائی کرنے والے لیکن جب ہر طرف بہتی لاشوں کا طوفان اُمنڈ آیا ہو تو صرصر کو صبا کیسے کہہ دوں۔ مجھے تو وہ لاشیں نظر آتی ہیں جن کے مردہ ہونٹوں پر یہ سوال چپک کر رہ گیا ہے کہ ''آخر ہمارا قصور کیا تھا؟''۔ مجھے تو اُس بوڑھے کی دہائی نے بے کل کر رکھا ہے جس کی زیست کا سارا ترکہ نذرِ آب ہوا۔ میں تو بچشمِ نَم اُس باپ کی آہ و بکا سُن رہا ہوں جس کے کڑیل جوان پانی

میں بہہ گئے اور ننھی منی نسلِ نَو بھی۔ مجھے تو وہ ماں بے چین کر رہی ہے جو گود میں اپنے معصوم بیٹے کی لاش اُٹھائے ہر آنے جانے والے کو ٹکر ٹکر گھورتی جا رہی تھی۔ کہانیاں بیشمار، کہی بھی اور اَن کہی بھی لیکن لکھنے کا یارا نہیں۔ سوچتا ہوں کہ بے بس و بے کَس مظلوم ربِ لم یزلِ سے یہ فریاد تو ضرور کرتے ہونگے کہ

نہیں ہے کچھ نہاں تجھ سے خُدایا
سلوک ہم سے جو دنیا نے کیا ہے

یہ بجا کہ حکمران سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ میاں برادران کی کاوشیں بھی بجا مگر ہم وزیرِ اعظم صاحب کا یہ کہا تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ یہ ناگہانی آفت ہے جس کا پہلے سے کچھ پتہ نہیں تھا۔ قوم کو سیلابوں کا سامنا تو 1950ء سے ہے۔ چھوٹے موٹے سیلابوں کو چھوڑیے ،اب تک 21 ایسے بڑے سیلاب آ چکے ہیں جن کی تباہ کاریوں کی داستانیں اب بھی زباں زدِ عام ہیں۔ پھر یہ ناگہانی آفت کیسے قرار دی جا سکتی ہے ؟۔ چلیں حکمرانوں کو تو غفلت اور کوتاہی کا طعنہ دے کر چُپ ہو رہے کہ اِس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں لیکن اُن رہنماؤں کا کیا کیجیے کہ جنہوں نے 13 ستمبر کو جشن منانے کا اعلان کر رکھا تھا؟۔ اُس وزیرِ اعلیٰ کے لیے سزا کا انتخاب کون کرے گا جو ایک ماہ سے اپنے صوبے کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اسلام آباد میں دھرنا دیئے بیٹھا ہے ؟۔

ماؤزے تنگ نے کہا ''سو طرح کے پھولوں کو بہار دکھانے دو، سو طرح کے افکار کو مقابلہ کرنے دو۔ خوشبو وہی حاوی ہوگی جو بہتر ہے، رنگ وہی غالب آئے گا جو حقیقی ہے''۔ خاں صاحب کے اول تو کوئی افکار ہی نہیں تھے لیکن اگر کچھ لوگ بضد ہیں کہ تھے تو پھر بھی اُن کے رنگ پھیکے پڑ گئے اور قوم نے اُنہیں رَد کر دیا۔ جاوید ہاشمی کہتے ہیں ''دھرنوں کا کوئی انجام نہیں، ظالموں نے عمران خاں کے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا''۔ راستہ تو تھا، بڑا باوقار راستہ۔ خاں صاحب اپنی انانیت کے خول سے باہر آتے اور سیلاب کا بہانہ بنا کر دھرنا مؤخر کر دیتے لیکن وہ تو عالمِ غیض میں ہیں۔ شاید اُن کے نہاں خانۂ دل میں بھی یہ تمنا انگڑائیاں لے رہی ہو کہ

خواہش تو ہے کہ دل کو سکوں آشنا کریں
کم ہوں نہ شورشیں ہی لہو کی تو کیا کریں

لیکن ایک تو وہ اسیرِ انانیت ہیں اور دوسرے اُنہیں یقین دلا دیا گیا تھا کہ ''وہ'' اُن کے ساتھ ہیں اِس لیے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ دھرنے میں دس لاکھ لوگ ہیں یا دس ہزار۔ ''وہ'' کا بھانڈا پہلے جاوید ہاشمی نے پھوڑا اور پھر پاک فوج کے ترجمان میجر جنرل آصف باجوہ نے کھُل کر کہہ دیا کہ ''فوج کا موجودہ سیاسی بحران سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ آئین کی پاسداری

اور جمہوریت کے تسلسل پر یقین رکھتی ہے''۔اُنھوں نے یہ بھی کہاکہ ''سکرپٹ رائٹر کی باتوں پر افسوس ہوا۔یہ سیاسی بحران ہے اور سیاسی جماعتوں نے مِل بیٹھ کر حل کرنا ہے''۔فوجی ترجمان کے اِس بیان کے بعد تحریکِ انصاف کے غبارے سے رہی سہی ہوا بھی نکل گئی اور خاں صاحب جو پہلے امپائر کی انگلی اُٹھنے کے اشارے دیا کرتے تھے اُنہیں بھی یہ کہناپڑا ''عدلیہ سے کوئی توقع ہے نہ فوج سے، جوکچھ کرنا ہے عوام نے ہی، کرنا ہے''۔یہ بجاکہ جوکچھ کرتے ہیں عوام ہی کرتے ہیں سوال مگر یہ ہے کہ کیا20 کروڑکے پاکستان میں تین، چارہزار لوگ انقلاب لا سکتے ہیں؟۔کیاخاں صاحب کے نئے پاکستان کا تصوریہی ہے جس کی جھلکیاں ہم دھرنوں میں دیکھ رہے ہیں؟۔کلامِ منورتودرسِ حیادیتا ہے اوراجدادکاورثہ بھی یہی لیکن خاں صاحب
تومادرپدرآزادمعاشرے کی بنیادوں پرنیاپاکستان استوار کرنے کی تگ ودَو میں ہیں اورایسا کرتے ہوئے وہ یہ تک بھول بیٹھے کہ قومی وملی یکجہتی کے تقاضے کیاہیں۔قولِ علیؑ ہے ''جلدبازکامیابی سے، تیزمزاج درست اقدام سے اور جھوٹا عزت سے ہمیشہ محروم رہتاہے''۔خاں صاحب کی جلدبازی اظہر من الشمس ہے۔اُنھوں نے عقیل وفہیم اصحاب کے باربارمنع کرنے کے باوجودعین اُس دن دھرنے کاپروگرام بنایاجب پوری قوم جشنِ آزادی کی خوشیاں منارہی تھی۔حکومت نے بھی خاں صاحب سے استدعاکی کہ وہ اپنادھرناموَخر کردیں لیکن خاں صاحب کو توجلدی ہی بہت تھی۔لاریب تیزمزاجی اورغضب ناکی میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔وہ عالمِ غیض میں ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جنہیں سُن کر سرشرم سے

جھک جاتے ہیں۔ رہی جھوٹ کی بات تو کبھی ہم بھی اُنہیں سچا اور کھرا انسان سمجھا کرتے تھے لیکن جب وقت نے طنابیں کھینچیں تو قوم نے اپنے سامنے ایک ایسے انسان کو کھڑا پایا جسے سچ بولنے کی عادت ہی نہیں۔ اب یہ عالم ہے کہ اُن کے دھرنے میں یا تو تواتر سے جھوٹ بولا جاتا ہے پھر میوزیکل کنسرٹ اور ہلا گُلا۔ اگر نئے پاکستان کا یہی تصور ہے تو اللہ وطنِ عزیز کو ایسے پاکستان سے بچائے۔

بَن کے رہے گا "نیا" پاکستان

ہم تو دھرتی ماں کے پیار میں ڈوب کر اُس کی فریاد پر لبیک کہتے ہوئے انقلاب کے لیے نکلے تھے لیکن حکمرانوں کو ہماری یہ ادا پسند نہیں آئی اور بالآخر اُنھوں نے وسیع پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ شیخ الاسلام کہتے ہیں کہ حکومت نے عوامی تحریک کے 30 ہزار کارکُن پکڑ لیے۔ وہ کہنا تو تیس لاکھ چاہتے تھے لیکن کسی نے مولانا کے کان میں کہہ دیا کہ تیس لاکھ کچھ زیادہ ہی ہو جائیں گے اِس لیے تیس ہزار پر ہی اکتفا کرنا بہتر ہے لیکن حکمرانوں کو تیس ہزار بھی "چبھنے" لگے اور اُنھوں نے کہہ دیا کہ پاکستان کی کل 31 جیلوں میں قیدیوں کو رکھنے کی گنجائش ہی تیس ہزار نہیں تو پھر مولانا کے کارکُن کہاں گئے؟۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے قیدی کارکُن کہاں ہیں لیکن مولانا جو کہتے ہیں، ہمیشہ سچ ہی کہتے ہیں اِس لیے حکومت کو ہمارے یہ تیس ہزار کارکُن تو پورے کر کے دینے ہی ہونگے۔ اگر حکومت نے ایسا نہ کیا تو ہمارا اگلا دھرنا وزیرِ اعظم ہاؤس کی چھت پر ہو گا۔ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اسلام آباد کے ڈی چوک میں دھرنے سے دستبردار ہو رہے ہیں۔ یہ دھرنا تو اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک دھرنے میں شریک آخری شخص بھی کھسک نہیں جاتا۔

ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ ایک دو روز بعد ہی حکومت کا "پھینٹی" پروگرام شروع

ہو جائے گا کیونکہ حکومت کے پاس گُلو بِلّو، پومی نومی بٹوں کی کمی نہیں لیکن حکومت کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتے ہوتے ایک ماہ بیت گیااور اب اسلام آباد کی پولیس دھرنا دینے والوں پر ایسے جھپٹ رہی ہے جیسے شاہیں کبوتر پر۔اُس نے تو ہمارے ڈی جے بَٹ کو بھی نہیں چھوڑا۔ قصور اُس کا فقط اتنا تھا کہ جب سارے ''بَٹ'' حکومت کے ساتھ ہیں تو پھر وہ اکیلا تحریکِ انصاف میں کیوں گھُسا بیٹھا ہے؟۔ہمارے بیچارے عوامی تحریک کے ڈپٹی سیکرٹری تاریخ بھگتنے گئے اور دھر لیے گئے۔وہ تو اللہ بھلا کرے الیکٹرانک میڈیا کا جس نے شور مچا دیا اور عوامی تحریک کے کارکن اُنہیں چھڑا لائے۔ہم پہ الزام ہے کہ ہم نے PTV پر قبضہ کیا، پارلیمنٹ کا گیٹ توڑا اور ریڈزون کے درختوں کو آگ لگادی۔یہ بجا لیکن پوری قوم جانتی ہے کہ مُرشد نے صرف گملے نہ توڑنے کا اعلان کیا تھا، باقی کسی شے کا نہیں۔کوئی بھی غیر جانبدار مبصر آ کر دیکھ سکتا ہے کہ اسلام آباد میں ایک گملا بھی نہیں ٹوٹا اور وہ جو ریڈزون کے سارے فُٹ پاتھ اُدھیڑ کے رکھ دینے کا الزام ہے، تو وہ تو ہم نے حفاظتِ خود اختیاری کے تحت کیا کیونکہ اسلام آباد میں پتھر دستیاب نہیں تھے۔اگر ہم فُٹ پاتھ توڑ کر پتھر حاصل نہ کرتے تو پولیس کے ''گھُٹنے'' کیسے سینکتے؟۔

ہم تو بڑے سکون سے اسلام آباد میں بیٹھے تھے لیکن ''شریر'' حکومت نے ''ایویں خوامخواہ'' ہم سے ''پنگا'' لے کر ہمارے پُر سکون دھرنے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔سو ہم نے بھی سوچا کہ

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچئے

اب جس تھانے میں بھی ہمارے ساتھی قید ہوتے ہیں، ہم وہاں دھاوا بول کر اپنے ساتھیوں کو مکھن میں سے بال کی طرح نکال لے جاتے ہیں۔ ابھی کل ہی ہمارے کپتان صاحب نے بھارہ کہو کے تھانے پر دھاوا بولا اور اپنے 11 ساتھیوں کو نکال لے گئے۔ سونامیوں کا تو یہ اصرار بھی تھا کہ تھانے کے تمام اہلکاروں کو معطل کر دیا جائے لیکن خاں صاحب نے کمال مہربانی کرتے ہوئے صرف اپنے ساتھیوں کی ہتھکڑیاں کھلوانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ اگر آئی جی سمیت تمام اہلکاروں کو معطل کر دیتے تو ملک میں انارکی پھیل جاتی جو خاں صاحب کو ہرگز منظور نہیں تھا کیونکہ ''نئے پاکستان'' میں انارکی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب ہم جمعے کو پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا اجتماع کرنے جا رہے ہیں اور ایک محتاط ترین اندازے کے مطابق اِس اجتماع میں کم از کم 50 لاکھ انقلابیے اور سونامیے تو ہونگے ہی۔ کیا اب بھی حکومت کو پتہ نہیں چلا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں ؟۔ اگر طالبان بنّوں جیل توڑ کر اپنے تین سو ساتھیوں کو چھڑوا سکتے ہیں تو کیا ہم اتنے ''گئے گزرے'' ہیں کہ کسی چھوٹے موٹے تھانے سے اپنے ساتھیوں کو چھڑا بھی نہیں سکتے ؟۔

ہم نے توپارلیمنٹ پر قبضہ کرلیا تھااور پی ٹی وی کی نشریات بھی بند کروادی تھیں تاکہ اُن ''کو سہولت رہے لیکن چودھری شجاعت صاحب ''اُدھر'' سے حکم لے آئے اور ہمیں '' طوہاو کرہاڈی چوک پر واپس آنا پڑا۔ ہمیں تو اب بھی پختہ یقین ہے کہ ''وہ'' ہمارے ساتھ ہیں کیونکہ ہمیں اِس کی گارنٹی چودھری برادران اور شیخ رشید نے دی ہے لیکن پتہ نہیں پاک فوج کے ترجمان میجر جنرل عاصم باجوہ صاحب کیوں ''اوکھی اوکھی'' باتیں کرنے لگے ہیں۔ کل بھی اُنھوں نے برطانوی نشریاتی ادارے کو انٹرویو دیتے ہوئے
فرمایا''فوج سیاست میں ملوث ہے نہ ہی ملک میں جاری سیاسی بحران میں کسی فریق کی حمایت کر رہی ہے۔ فوج کا شروع سے ایک ہی موقف رہاہے کہ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے اور اسے سیاسی طریقے سے ہی حل کیا جانا چاہیے۔ فوج کسی ایک فریق کا ساتھ دینے کی متحمل نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ پوری قوم کی فوج ہے۔ ہم نے نہ پہلے کسی ایک فریق کی حمایت کی ،نہ آئندہ کریں گے''۔پاک فوج کے ترجمان کے اِس بیان پر ہم پریشان تو بہت ہوئے لیکن پھر چودھری شجاعت صاحب نے ''اندر کھاتے''ہمیں تسلی دے دی کہ جنرل صاحب ''ایویں مخول'' کر رہے ہیں۔
اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم کسی کمزوری کے تحت پارلیمنٹ سے واپس ڈی چوک آئے تو یہ اُس کی بھول ہے۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ ایک تو ہم وہاں محصور ہو کر رہ گئے تھے اور دوسرے اعلیٰ عدلیہ دھمکیوں پر اُتر آئی تھی اِس لیے ہم نے ''کھلی

ڈلی'' جگہ پر جانے میں ہی عافیت جانی۔ اب وہاں تنور بھی لگ گئے ہیں، تازہ سبزیوں اور گوشت کی دوکانیں بھی، موچی نائی بھی اپنی دوکانداری چمکا رہے ہیں اور پکی پکائی تازہ روٹی بھی مل جاتی ہے البتہ ''بیوٹی پارلر'' ابھی تک نہیں کھلے جس سے خواتین میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ دروغ بَر گردنِ راوی ہمارے رہنماؤں نے دو، چار بیوٹی پارلر والوں سے رابطہ بھی کیا لیکن فی الحال کوئی اپنا پارلر کھولنے کو تیار نہیں۔ لیکن کوئی بات نہیں ہم کونسا ڈی چوک سے جا رہے ہیں۔ چھوٹے اور بڑے بھائی کا حکم ہے کہ وزیرِ اعظم کے استعفے تک ہمیں یہیں رُکنا ہے اور اتنا تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ وزیرِ اعظم صاحب کبھی استعفیٰ نہیں دیں گے اِس لیے جب بیوٹی پارلر والوں کو پکا یقین ہو گیا کہ ہم یہاں سے جانے والے نہیں تو دو، چار پارلر کھُل ہی جائیں گے۔

ہم نے تو پارلر والوں کے لیے ہزار روپے کا نوٹ ابھی سے سنبھال کر رکھ لیا ہے جس پر ''گو نواز گو'' لکھا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بازار میں تو اب اِس نوٹ کی ''ککھ'' قیمت نہیں البتہ ڈی چوک میں کھلے بیوٹی پارلر والوں کو ڈرا دھمکا کر یہ نوٹ ''چلا'' ہی لیں گے۔ ہم نے تو شیخ الاسلام کے حکم پر اپنے کرنسی نوٹوں پر ''گو نواز گو'' لکھ لیا لیکن علامہ نے اگلے دِن ہی کرنسی نوٹوں پر نعرے لکھنے کی مہم واپس لے لی۔ باخبر ''ذرائع'' کے مطابق علامہ صاحب کو خواب میں یہ ڈانٹ پڑی کہ ''کبھی ریسرچ بھی کر لیا کرو''۔ جس پر علامہ ہڑبڑا کر اُٹھے

اور ریسرچ کرنے پر پتہ چلا کہ کوئی سیاسی یا غیر سیاسی نعرہ لکھنے سے کرنسی نوٹ محض کاغذ کا بیکار پُرزہ رہ جاتا ہے۔اِس لیے اُنہوں نے اگلے ہی دن یہ حکم واپس لے لیا لیکن عقیدت مندوں کو تو ''چُونا'' لگ گیا۔

مستند ہے اُن کا فرمایا ہوا

جنابِ آصف زرداری کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ وہ تھوڑے ''مخولیے'' ہیں۔اُنہوں نے ازراہِ تفنن یہ کہہ دیا''میاں صاحب! وزیرِاعظم بنیں، بادشاہ نہ بنیں''محترم آصف زرداری کا یہ ''مخول'' دھرنے والوں کو ایسا بھایا کہ ''بڑے اور چھوٹے بھائی'' نے میاں صاحب کو کہنا ہی ''بادشاہ''شروع کردیا۔ اب تو ہمارے مُنہ سے بھی کبھی کبھی وزیرِاعظم کی بجائے بادشاہ نکل جاتا ہے۔میاں صاحب کو بادشاہ کہنے کی توجیح یہ کہ وہ اقتدار کی ساری ''ریوڑیاں''اپنوں میں ہی بانٹ دیتے ہیں۔بات تو سچ ہے مگر بادشاہت کے جرثومے تو خاں صاحب اور علامہ صاحب میں بھی کلبلاتے رہتے ہیں۔علامہ صاحب نے منہاج القرآن کا جو بورڈ آف گورنر بنایا ہے اُس کے چیئرمین وہ خود ہیں، سینئر وائس چیئرمین اُن کے بیٹے حسن محی الدین، وائس چیئرمین حسین محی الدین، بیوی، بہو، اور دو بیٹیاں بورڈ آف گورنرز کی اراکین ہیں اور یوں کُل 13 اراکین میں سے سات علامہ صاحب کے فیملی ممبرز ہیں۔چونکہ چار ممبرز پر مشتمل افراد کی موجودگی میں میٹنگ طلب کی جا سکتی ہے اِس لیے علامہ اپنے گھر (کینیڈا) میں ہی میٹنگز طلب کرکے فیصلے کرتے رہتے ہیں۔پُر لطف بات یہ ہے کہ اگر بورڈ کے تمام (12) اراکین کسی معاملے میں مولانا سے اختلاف کریں تو مولانا کے پاس ''ویٹو''پاور ہے اور وہ اکیلے ہی کوئی بھی فیصلہ کر سکتے ہیں۔یہی حال شوکت

خانم کے بورڈ آف گورنر کا ہے۔ وہاں بھی غالب اکثریت خاں صاحب کے قریبی عزیزوں پر مشتمل ہے اور خاں صاحب خود چیئرمین۔ ویسے بھی بادشاہت تو سوائے جماعت اسلامی کے تقریباً ہر سیاسی جماعت میں پائی جاتی ہے۔ جنابِ الطاف حسین ایم کیو ایم کے تاحیات قائد، پیپلزپارٹی بھٹوخاندان کی وراثت، مونس الٰہی چودھری برادران کا سیاسی وارث اور چودھری شجاعت حسین قاف لیگ کے صدر۔ اے این پی کے قائد باچا خاں پھر اُن کے بیٹے خاں عبدالولی خاں اور اب پوتے اسفندیار ولی خاں۔ جمعیت علمائے اسلام (ف) بھی مولانا فضل الرحمٰن اور اُن کے بھائیوں کا طواف ہی کرتی رہتی ہے اِس لیے محض نواز لیگ پر ''بادشاہت'' کا الزام دھرنا درست نہیں۔

علامہ صاحب فرماتے ہیں ''ہم 35 دنوں سے استقامت کا پہاڑ بنے بیٹھے ہیں''۔ بجا ارشاد لیکن آپ کو تو ''بشارت'' ہوئی تھی کہ جب آپ باہر نکلیں گے تو 2 گھنٹوں میں انقلاب آ جائے گا لیکن انقلاب تو ایک ہزار گھنٹوں میں بھی نہیں آیا۔ کہیں بشارت اُلٹ تو نہیں ہو گئی؟۔ یہ بجا کہ عقیدت منداستقامت کا پہاڑ بنے بیٹھے ہیں لیکن کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی ''ڈنڈا بردار'' فورس نے عورتوں اور بچوں کو یرغمال بنا رکھا ہے۔۔۔۔ علامہ صاحب نے فرمایا ''پاکستان میں انسان، حیوانوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں''۔ ظاہر ہے کہ جب ''مُرشد'' کروڑوں کی لاگت سے تیار کردہ پُرتعیش کنٹینر میں ہوں اور عقیدت مند سڑکوں پر ''رُل'' رہے ہوں تو زندگی حیوان سے بدتر ہی ہو گی۔ علامہ کا اعلان

تو خلفائے راشدین کا دَور لوٹانے کا ہے اور مثالیں بھی وہ عالمِ اسلام کی ہی دیتے ہیں لیکن عقیدت مندوں کے ساتھ سڑک پر سونا تو در کنار، وہ تو دِن میں ایک دو بار کنٹینر سے باہر آ کر اپنا دیدار کرواتے اور پھر واپس کنٹینر میں چلے جاتے ہیں۔جب ایک عالمِ دین اور اسلامی نظام کے داعی کے قول و فعل میں اتنا تضاد ہو تو پھر پیروکاروں کی زندگی حیوانوں سے بدتر نہیں ہو گی تو اور کیا ہو گی۔۔۔۔علامہ صاحب نے فرمایا ''وزیرِ اعظم نے استعفیٰ نہ دیا تو اُٹھا کر کچرے میں پھینک دیں گے''۔دراصل علامہ صاحب کسی کا ادھار رکھنے کے قائل نہیں۔ایک بار میاں نواز شریف صاحب علامہ صاحب کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر ''غارِ حرا''تک لے کر گئے تھے۔علامہ صاحب وہی احسان اتارنے کے لیے میاں صاحب کو اٹھا کر ''کچرے''میں پھینکنا چاہتے ہیں۔علامہ صاحب تو دُبلے پتلے تھے اِس لیے میاں صاحب اُنہیں کندھوں پر بٹھا کر غارِ حرا تک لے گئے لیکن میاں صاحب تو ماشاء اللہ بھاری بھرکم ہیں، ''منحنی'' سے علامہ صاحب اُنہیں کیسے اُٹھا پائیں گے؟۔ویسے بھی میاں صاحب نے ''حفظِ ماتقدم''کے طور پر پوری پارلیمنٹ کا بوجھ بھی اپنی جیبوں میں ڈال رکھا ہے اِس لیے اگر علامہ صاحب کو ایسی کوئی ''بشارت''ہوئی ہے تو اُس کے بھی اُلٹ ہونے کا اندیشہ ہے۔

محترم عمران خاں کہتے ہیں ''بقر عید کی تیاری کر لی ہے، میرا بکرا یہیں ذبح ہو گا۔ایک سال بھی بیٹھنا پڑا تو بیٹھیں گے''۔نواز لیگئے کہتے ہیں کہ اگر خاں

صاحب دھرنا ایک کی بجائے چار سال تک لے جائیں تو وہ وعدہ کرتے ہیں کہ چار سال بعد وزیرِاعظم کے استعفےٰ سمیت خاں صاحب کے تمام مطالبات بنا کسی حیل وحجت کے تسلیم کر لیں گے۔ویسے بھی دھرنوں کی وجہ سے پوری قوم میں ''خونِ گرم'' کی لہریں موجزن ہیں،ڈی چوک میں اچھا بھلا بازار بھی کھل گیا ہے۔لنڈے کے کپڑے بھی بکنے لگے ہیں،بہت سے لوگوں کی روزی روٹی بھی لگ گئی ہے۔الیکٹرانک میڈیا کا شغل بھی لگا ہوا ہے اور سب سے بڑھ کر ہمیں بھی اپنے کالموں کے لیے دھڑا دھڑ مواد مل رہا ہے۔ہم تو ابھی سے یہ سوچ سوچ کے ہلکان ہو رہے ہیں کہ اگر ''مُک مکا'' ہو گیا تو پھر ہمارا کیا بنے گا اور ہم اپنے کالموں کے لیے مواد کہاں سے لائیں گے۔اِس لیے ہماری بھی علامہ صاحب اور خاں صاحب سے پُرزور اپیل ہے کہ وہ کم از کم چار سال

تو بیٹھیں۔۔۔۔رہی قربانی کی بات تو لیگیوں کا خیال ہے کہ اگر بکرے کی جگہ شیخ رشید کی قربانی دے دی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔اِس سلسلے میں علامہ قادری فوراََ آٹھ سو صفحات کا فتویٰ بھی جاری کر دیں گے کیونکہ وہ تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ انقلاب کے لیے اگر چار پانچ ہزار لوگوں کی قربانی دینی پڑے تو کوئی ہرج نہیں۔اُنہوں نے تو ''کفن ڈرامے'' کے دوران کچھ عورتوں کو روتے دیکھا تو پکار کر کہا ''مجھے تمہارے آنسوؤں نہیں،خون کی ضرورت ہے''۔اِس لیے شیخ رشید کی قربانی کا فتویٰ دینا تو اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

خاں صاحب کہتے ہیں ''دھرنے کی وجہ سے لوگ جاگ گئے ہیں''۔ لوگ کہتے ہیں کہ خان ''سچ'' نہیں بولتا۔ لیکن دیکھ لیں کہ خاں صاحب نے کتنی سچی بات کہی ہے۔ دھرنے میں جاکر دیکھیں آپ سبھی لوگوں کو جاگتے پائیں گے۔ وجہ یہ کہ ڈی چوک میں سونے کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں۔ اسی لیے تو خاں صاحب ہر روز بنی گالہ کے محل میں چلے جاتے ہیں۔ ویسے بھی اب تو ڈی چوک سے اتنا تعفن اُٹھتا ہے کہ اُس کی بَدبُو فیض آباد تک پہنچ رہی ہے اِس لیے کہاں کا سونا اور کیسا سونا۔۔۔۔ سینیٹر مشاہداللہ خاں نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ہمارے کپتان صاحب کو ''قائدِ انقلابِ کوکین'' اور وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک کو ''قائدِ انقلابِ ٹُھمکا'' قرار دے دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ''میں یہ نہیں کہتا کہ خاں صاحب نشہ کرتے ہیں لیکن نشئی کی پکّی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی بات کو بار بار دہراتا چلا جاتا ہے''۔ یہ راز کی باتیں ہیں، مشاہداللہ خاں جانیں یا عمران خاں، دونوں ہی خان ہیں، وہ مِل بیٹھ کے فیصلہ کر لیں کہ ''اندر کی بات'' کیا ہے، ہم اِس مسئلے میں پڑنے والے نہیں۔ ویسے اگر مشاہداللہ خاں یہ سمجھتے ہیں کہ دھرنا ''ٹُھس'' ہو گیا ہے تو یہ اُن کی غلط فہمی ہے۔ دھرنا اگر ''دھرنی'' میں بدل گیا تو کیا ہوا ''امپائر'' تو ہمارے ساتھ ہے۔ ہم نے تو لندن جاکر خفیہ ملاقات کرنی ہے، نیا سکرپٹ لکھنا ہے اور حکومت پھر ''وَخت'' میں۔

مشکلات میں گھری جمہوریت

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

دھرنوں کا چہلم ہو چکا۔ ''رہنما''مگر کسی موہوم اُمید کے سہارے اب بھی دھرنوں کی سڑی بُسی متعفن لاشیں کندھوں پہ اُٹھائے پھر رہے ہیں۔ دراصل دھرنے والوں کو تو یقین دلا دیا گیا تھا کہ اُن کے آزادی،انقلاب مارچ کے گوجرانوالہ پہنچنے سے پہلے ہی میاں برادران کی سیاسی بساط لپیٹ دی جائے گی اور وہ سمجھ بیٹھے تھے کہ موسمِ گُل قریب آ لگا اور شاخِ اُمید پھل پھول لانے کو ہے لیکن پارلیمنٹ کی جانب سے ایسی بادِ سموم چلی کہ اُن کی اُمیدوں کا چمن اُجڑ کے رہ گیا۔ آس یاس میں ڈھل گئی اور اُن کی کتابِ سیاست کے اوراق پر سوائے نااُمیدیوں کی آڑی ترچھی لکیروں کے کچھ باقی نہ بچا۔ اب وہ بزبانِ شاعر کہتے پھرتے ہیں کہ

بے معنی، بے کیف ہوئی ہے آنکھ مچولی تاروں کی
نکلا چاند بھی گہنایا ہے سازش سے اندھیاروں کی

میں یہ تو نہیں کہتا کہ ''اِس طرح تو ہوتا ہے ،اِس طرح کے کاموں میں ''لیکن یہ ضرور کہ انا، ضد، نرگسیت اور لفظوں کی زہرناکی کا یہی انجام ہوتا ہے جو کپتان صاحب کا ہوا اور ہو رہا ہے۔ خاں صاحب یہ تو ضرور جانتے ہونگے کہ قوم نے اُن کی پکار پر محض اِس لیے لبیک کہا کہ نوابوں، وڈیروں، جاگیرداروں، صنعتکاروں

اور سرمایہ داروں کے ذاتی مفادات کے گرد گھومتی ''پاکستانی جمہوریت'' سے لوگ بے زار ہو چکے تھے۔ وہ ایسی جمہوریت چاہتے تھے جو مطلق العنانی کو جڑ سے اکھاڑ کر ''جمہور'' کی حکمرانی قائم کر سکے۔ وہ ایسی متعفن جمہوریت نہیں چاہتے تھے جو اشرافیہ کے گھر کی باندی اور دَر کی لونڈی بن کے رہے۔ جب خاں صاحب نے اُنہیں ایسی ہی جمہوریت کے سندر سپنے دکھائے تو قوم، خصوصاً نوجوانوں نے اُنہیں یک لخت آسمان کی رفعتوں تک پہنچا دیا۔ اُن دنوں خاں صاحب کے شدید ترین مخالف تجزیہ کاروں کے قلم بھی اُن کے خلاف کچھ لکھنے سے پہلے تھر تھرانے لگتے تھے۔ تب واقعی قوم یہ سمجھنے لگی تھی کہ اُسے بالآخر ایک ایسا رہنما مل گیا جو اُن کے دُکھ سُکھ کا ساجھی ہوگا۔ لیکن عمران خاں کی مقبولیت کا یہ گراف الیکشن سے بھی پہلے اُس وقت دَم توڑ گیا جب تحریکِ انصاف میں وہی لوٹے، لُٹیرے اور دیمک زدہ چہرے دھڑا دھڑ شامل ہونے لگے جن پر نگاہ پڑتے ہی ''اُبکائیاں'' آنے لگتی ہیں۔ تب ہر طرف سے صدائیں بلند ہونے لگیں کہ یہ بار و میرے آزمائے ہوئے ہیں''۔ پھر 2013ء کے انتخابات ہوئے۔ نتیجہ تجزیہ'' نگاروں کے عمومی تجزیوں اور بین الاقوامی سروےز کے عین مطابق آیا۔ خاں صاحب نے میاں صاحب کو کامیابی پر مبارک باد دی اور میاں صاحب نے شدید ترین مخالفت کے باوجود خیبر پختونخوا کی حکومت تحریکِ انصاف کا حق قرار دے دیا۔ تب قوم شاداں کہ جمہوریت پٹڑی پر چڑھ گئی۔

لیکن خاں صاحب کے مدح سراتواُنہیں الیکشن سے بہت پہلے یقین دلا چکے تھے کہ وہ
دو تہائی اکثریت سے کامیاب ہونگے اِس لیے کپتان صاحب یہ شکست ہضم نہ
کرپائے۔خاں صاحب کی اسی بے چینی نے اُنہیں اُس ''سازش''کا اسیر بنادیا جس کے تانے
بانے لندن میں بنے گئے اور وہ ایسی تاریک راہوں پہ چل نکلے جن کی کوئی منزل نہیں
ہوتی۔لندن میں ہونے والی عمران قادری ملاقات کو سابق چیف آف آرمی سٹاف
جنرل اسلم بیگ ایسی عالمی سازش قرار دیتے ہیں جس میں امریکہ،برطانیہ
اور کینیڈا شامل تھے۔وہ کہتے ہیں ''سازش کرنے والے چاہتے تھے کہ فوج مداخلت کرکے
اقتدار پر قبضہ کرلے۔عمران خاں اور طاہرالقادری کو سازش پر عمل کے صلے میں
اقتدار کالالچ دیاگیالیکن جنرل راحیل شریف نے تمام سازش ناکام بنادی''۔جنرل (ر)
اسلم بیگ نے یہ بھی کہاکہ عسکری قیادت کواِس سازش کاپہلے سے علم تھا۔اگر جنرل
راحیل شریف فیصلہ کرنے میں دیر کرتے توملک کابڑا نقصان ہوتا۔اُنہوں نے کہا''
امریکہ خطے میں اپنی شکست کاانتقام پاکستان میں انتشارپھیلا کرلیناچاہتاہے''۔جنرل
صاحب کی باتوں پراس لیے بھی یقین کرنے کوجی چاہتاہے کہ ایک تو تحریکِ انصاف کے
صدر جاوید ہاشمی پہلے ہی اِس سازش کے بارے میں بہت سے انکشافات کرچکے ہیں
اور دوسرے عمران خاں صاحب اگرامریکی پالیسیوں کے اتنے ہی مخالف ہیں توشاہ
محمود قریشی کیوں باربار امریکی سفیر سے خفیہ ملاقاتیں کرتے رہتے ہیں۔یہ سازش کوئی
ایسی خفیہ بھی نہیں تھی کیونکہ اِس کاوزیراعظم صاحب کو بھی بہت پہلے علم
ہوچکا تھااور شُنید ہے کہ اُنہوں نے

مکمل ثبوتوں کے ساتھ آرمی چیف کو اِس سے آگاہ بھی کر دیا تھا۔
یہ ماننے بنا کوئی چارہ بھی نہیں کہ خاں صاحب اور قادری صاحب کو واقعی یقین دلا دیا گیا تھا کہ فوج کے مضبوط ہاتھ اُن کی پشت پر ہیں اور ''اقتدار'' اُن کا منتظر۔ ہونگے ''کچھ'' اپنی خواہشوں کے اسیر ریٹائرڈ جرنیل اور شیخ رشید، چودھری برادران جیسے ناکام سیاستدان جنھوں نے خاں صاحب اور علامہ قادری کو یہ یقین دہانی کرائی لیکن وہ جنرل راحیل شریف کی جمہوریت نوازی کو شکست نہ دے سکے۔ جب آئی ایس پی آر کی طرف سے بار بار یہ کہا جانے لگا کہ فوج سیاسی معاملات میں ہرگز مداخلت نہیں کرے گی تو خاں صاحب نے بھی امپائر کی انگلی اُٹھنے کا تذکرہ چھوڑ کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ عدلیہ سے کوئی اُمید ہے نہ فوج سے، جو کچھ کرنا ہے عوام نے ہی کرنا ہے۔ آسکر وائلڈ نے کہا ''کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ زندگی کے سبق ہمیں اُس وقت ملتے ہیں جب وہ ہمارے لیے بیکار ہو جاتے ہیں''۔ خاں صاحب کو بھی اُس وقت پتہ چلا ''جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت''۔ جب وہ بہت کچھ گنوا چکے اور دھرنا ''دھرنی'' میں بدل گیا تب افسوس، ندامت اور شکست کے شدید احساس نے بوکھلائے ہوئے خاں صاحب کو ایسا ضدی شخص بنا دیا جس نے ''غیر پارلیمانی'' زبان کی انتہا کر دی۔ اُدھر میاں برادران نے بزدلی کے طعنے سہہ لیے لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور مذاکرات پر زور دیتے ہوئے خاں صاحب کو یہی پیغام بھیجتے رہے کہ

بجا کہ ایک تُند خو ہو تُم ہزاروں میں
ملا ہے ظرف ہمیں بھی سمندروں جیسا

میاں برادران ایسے کبھی نہ تھے لیکن شاید وہ جلاوطنی کی بھٹی میں تپ کر کُندن بن چکے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ قوم کی خوش نصیبی ہے لیکن اگر وہ یہ سب کچھ وقتی مصلحت کے تحت کر رہے ہیں تو پھر جمہوریت کا اللہ ہی حافظ ہے۔

بہت شور سُنتے تھے

اسلام آباد کے ڈی چوک میں بیالیس روز سے بیٹھے ہجوم کی حالت اب بھوکے بھیڑیوں کے اُس غول کی مانند ہے جواِس انتظار میں ہوتے ہیں کہ جونہی کسی کی آنکھ جھپکے اور دوسرے اُسے چیر پھاڑ کھائیں۔ عمران خاں اور مولانا قادری کی ساری سیاست کا دارو مدار اب حکومت کی کسی ممکنہ غلطی پر ہی ہے کیونکہ اب اُنہیں اِس کے سوا کوئی راہ دکھائی دیتی ہے نہ سجھائی۔ دھرنے ''دھرنیوں'' میں بدل چکے ،الیکٹرانک میڈیا''نکھ'' موڑ کر سیلابوں کی کوریج اور دوسری سرگرمیوں میں مگن ہوچکا اور قوم بھی ''اوازار''۔جاوید ہاشمی کہتے ہیں کہ دھرنوں پر ایک ارب روپے سے زائد صرف ہو چکے اور ڈی جے بَٹ بھی کروڑوں کما گیا۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ خاں صاحب نے ملکی اور غیر ملکی ''مخیّر''حضرات سے چودہ اگست کے دھرنے کے لیے جو چندہ اکٹھا کیا تھاوہ ختم ہو گیا۔ قصور خاں صاحب کا بھی نہیں ۔وہ سمجھتے تھے کہ بَس دو، چار دنوں میں حکومت کا ''دھڑن تختہ'' ہوجائے گا اور وہ فتح کے شادیانے بجاتے اپنے بنی گالہ کے محل میں لوٹیں گے لیکن حکومت ہی ''بُزدِل'' نکلی اور دھرنا طول پکڑتا چلا گیا۔

اُدھر حکمرانوں کا یہ عالم ''دودھ کا جَلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا

ہے ''۔ سانحہ ماڈل ٹاؤن کا سبق اُنہیں اَز بَر ہے اِس لیے وہ پہلے تولتے ، پھر بولتے ہیں جبکہ مسٹر اور مولانا تو صرف بولتے ہی بولتے ہیں ۔ سکرپٹ کے مطابق تو امپائر کی انگلی بہت پہلے کھڑی ہو جانی چاہیے تھی لیکن مسٹر اور مولانا کے ساتھ ''ہتھ'' ہو گیا۔ انگلی کھڑی تو ہوئی اور بڑے بھرپور انداز میں ہوئی لیکن جمہوریت کے حق میں ۔ فوج میں نئی تقرریوں نے رہی سہی کسر بھی نکال دی اور افواہ سازی کے سارے کارخانے بند ہو گئے ۔ چھ میجر جنرلوں کو ترقی دے کر لیفٹیننٹ جنرل بنا دیا گیا اور کراچی کے سابق ڈی جی رینجرز لیفٹیننٹ رضوان اختر کو ڈی جی آئی ایس آئی مقرر کر دیا گیا۔ وہ 8 نومبر کو جنرل ظہیر الاسلام کی جگہ اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالیں گے ۔ منگلا ، گوجرانوالہ ، کراچی اور پشاور کے کور کمانڈرز کو تبدیل کر کے اُن کی جگہ ترقی پانے والے لیفٹیننٹ جنرلز نوید مختار ، بلال حسین ، غیور محمود اور ہدایت الرحمٰن کو مقرر کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ویسے تو ''روٹین'' کا حصّہ ہے لیکن ہمارے کچھ مہربانوں، خصوصاً الیکٹرانک میڈیا نے موجودہ ترقیوں سے پہلے اسے افواہ سازی کے لیے خوب استعمال کیا اور آئی ایس پی آر کی جانب سے بار بار کی وضاحت کے باوجود چائے کی پیالی پر طوفان اُٹھاتے رہے ۔ بہرحال اِن ترقیوں اور تقرریوں کے بعد افواہ سازی کا ایک کارخانہ تو بند ہوا، اب دیکھیں ہمارا بے باک الیکٹرانک میڈیا کون سے نئے گُل کھلاتا ہے۔

دھرنے میں شریک سونامیوں اور انقلابیوں کو حوصلہ بخشنے کے لیے امپائر کی انگلی والا مضبوط ترین حربہ تو ناکام ہوا،شاید اسی لیے اب دھرنوں کو پورے ملک میں پھیلائے جانے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔اتوار 21 ستمبر کو کراچی میں اِس کی پہلی جھلک نظر آئی اور اب 28 ستمبر کہ مینارِ پاکستان پر سونامیوں کا دھرنا ہو گا۔کراچی کے اجتماع کو یقیناً مایوس کُن قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ متاثر کُن بھی نہیں تھا کیونکہ اڑھائی کروڑ کے شہر کراچی میں ایم کیو ایم دو گھنٹے کے نوٹس پر اِس سے کہیں بڑا اجتماع کر سکتی ہے اور جماعت اسلامی بھی۔بہرحال اسلام آباد کے دھرنے کے مقابلے میں یہ متاثر کُن ضرور تھا۔شاید اسی لیے خاں صاحب بھی بڑے سرشار نظر آئے اور بار بار پیپلز پارٹی کو للکارتے رہے ۔اُنھوں نے کہا کہ بھٹو کے نام پر عوام سے جھوٹے وعدے کیے جاتے رہے اور ہاریوں کا استحصال کیا جاتا رہا۔اُنھوں نے اندرونِ سندھ کے سندھیوں کو مخاطب کرکے کہا کہ وہ آ رہے ہیں اور وہ وڈیروں کا مقابلہ کرکے دکھائیں گے۔اب تو خاں صاحب للکارنے میں الطاف بھائی کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ہم نے کئی دفعہ کسی ایسے خوش نصیب شخص یا جماعت کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جو کپتان صاحب کے مَن بھاتا ہو لیکن ناکام رہے ۔شاید خاں صاحب کی یہ عادت ہو کہ

جی چاہتا ہے چھیڑ کے ہوں اُس سے ہمکلام
کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں

خیال تو یہی تھا کہ خاں صاحب ایم کیو ایم پر گرجیں ،برسیں گے لیکن شامت آ گئی پیپلز پارٹی کی ۔پیپلز پارٹی والے اب خاں صاحب کی باتوں کا جواب تو دے رہے ہیں لیکن وہ مزہ کہاں جو خاں صاحب کے مُنہ سے جھڑتے ''پھولوں''میں ہے ۔البتہ ایک غلطی بہرحال ہو گئی کہ تحریکِ انصاف کے وائس چیئر مین شاہ محمود قریشی ،جاوید ہاشمی کو چھیڑ بیٹھے ۔اچھے بھلے ''سیانے بیانے'' شاہ محمود کو پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ باغی کو ''داغی'' قرار دے بیٹھے ۔اُنہیں علم ہونا چاہیے تھا کہ اِن دنوں جاوید ہاشمی کو چھیڑنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے ۔اب ہاشمی صاحب ایک دفعہ پھر ''چھِڑ'' گئے ہیں اور قوم خوش کہ نِت نئے انکشافات ہو رہے ہیں ۔ویسے آپس کی بات ہے کہ اگر ہاشمی صاحب پارٹی بدلنے کی بنا پر ''داغی'' قرار دیئے جاتے ہیں تو یہ الزام تو شاہ محمود قریشی کی ذات پر بھی آتا ہے ۔ہاشمی صاحب تو بَرملا اقرار کرتے ہیں کہ اُنہوں نے پانچ دفعہ بغاوت کی لیکن شاہ محمود صاحب نے اِس معاملے میں چُپ کا روزہ رکھا ہوا ہے حالانکہ وہ بھی ضیاء الحق کی مجلسِ شوریٰ کے رکن رہے پھر نواز لیگ کی وزارت کا مزہ چکھتے ہوئے پیپلز پارٹی میں آن دھمکے اور وزیرِ خارجہ کا عہدہ اِس وعدے پر سنبھالا کہ پیپلز پارٹی کے آخری دو سالوں میں اُنہیں محترم یوسف رضا گیلانی کی جگہ وزیرِ اعظم بنایا جائے گا لیکن گیلانی صاحب بھی ''گدی نشین'' تھے اور اُنہوں نے یہ گدی ''ایویں ای'' حاصل

نہیں کر لی تھی ۔وزارتِ عظمیٰ حاصل کرتے کرتے شاہ محمود صاحب وزارتِ خارجہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔اُس وقت قریشی صاحب کی یہ حالت تھی کہ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اِس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اِدھر اُدھر لڑکھڑاتے شاہ محمود صاحب کو ایک دفعہ پھر اپنی پرانی پارٹی ''نواز لیگ'' کی یاد ستانے لگی لیکن وہاں جاوید ہاشمی براجماں تھے اِس لیے وہاں بھی دال نہ گلی اور چار و ناچار شاہ صاحب تحریکِ انصاف کے وائس چیئر مین بن گئے ۔شاید کپتان صاحب نہیں جانتے کہ اُن سے بھی کہیں زیادہ شاہ محمود قریشی وزارتِ عظمیٰ کے حسین خوابوں کی دنیا میں رہنے والے شخص ہیں ۔وہ تحریکِ انصاف میں جہانگیر ترین اور اعظم سواتی سمیت اپنا مضبوط گروپ تشکیل دے کر اپنی راہ کے آخری ''روڑے'' جاوید ہاشمی کو بھی فارغ کروا چکے ہیں ۔ہم تو یہی دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کپتان صاحب کو شَر پسندوں کے شَر'' سے محفوظ رکھے کیونکہ یہ حقیقت تو بہر حال مسلمہ ہے کہ خاں صاحب نسلِ نَو'' کی اکثریت کے اب بھی ہیرو ہیں اور اگر اُن کی پارٹی کے اندر بغاوت نہ ہوئی اور خاں صاحب کو گِر گِر کے سنبھلنے کا سلیقہ آ گیا تو وہ ملک و قوم کے لیے اثاثہ ثابت ہونگے۔

ماہنامہ ’’پھول‘‘ صدقۂ جاریہ

لگ بھگ بیس بائیس سال پہلے ’’ماہنامہ پھول‘‘ نظروں سے گزرااور میں نے اسے ایک اچھی کاوش جانا۔پھر ہنگامۂ ہائے روز و شب میں ایسی اُلجھی کہ اِس کے مطالعے کا موقع ہی نہ ملا۔ویسے بھی ذہن میں یہی تھا کہ یہ میگزین بچوں کے لیے ہےاِسی لیے اِس کی طرف دھیان نہیں گیاالبتہ میرے بچے اسے بہت شوق سے پڑھتے رہے اور میگزین بھی باقاعدگی سے گھر آتا رہا۔فُرصت کے کچھ لمحات میسر ہوئے تو میں نے ماہنامہ پھول کی ورق گردانی شروع کر دی اور جوں جوں پڑھتی گئی میری دلچسپی کو مہمیز ملتی چلی گئی۔یوں تواِس کے سرِورق پر ’’ہر عمر کے بچوں کے لیے‘‘لکھا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خوبصورت ماہنامہ بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور خواتین سب کے لیے ہے اوراِس کے مضامین کی گہرائی اور گیرائی ہر کسی کو اپنے سحر میں جکڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ستر، اسّی صفحات پر مشتمل اِس ماہنامے میں ہماری معاشی و معاشرتی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر سیر حاصل مواد مل جاتا ہے۔یہ ماہنامہ صرف ’’پھول‘‘ نہیں بلکہ پھولوں اور کلیوں کی مہکار میں گُندھا ایسا گُلدستہ ہے جس سے روح میں طراوت اور شبنمی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے گھریلو بچیوں کی تعلیم و تربیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اُردو ادب میں ایک نئی طرح ڈالی اور فنِ تربیت کو دلچسپ اور دل پذیر بنانے کے لیے قصّے کہانیوں کا انداز اختیار کیا جسے اُردو ادب میں ناول نگاری کے اولین نمونے بھی قرار دیا جاتا ہے ۔ڈپٹی نذیر احمد کے بعد بہت سے ناول لکھے گئے اور افسانے بھی لیکن جو مطمعٔ نظر ڈپٹی، صاحب کا تھا وہ کسی بھی قلمکار کے پیشِ نظر نہ رہا۔ماہنامہ پھول کے مطالعے کے بعد میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتی ہوں کہ میرِ صحافت جناب مجید نظامی مرحوم کے نہاں خانۂ دِل میں بھی وہی جذبہ کارفرما تھا جس کی بنیاد ڈپٹی نذیر احمد نے رکھی اور اُنھوں نے بھی نونہالانِ وطن کی تربیت کے لیے ماہنامہ پھول کا اجراء کیا۔پچیس سال پہلے لگایا جانے والا یہ نخلِ نَو آج ایک تَناور درخت کا روپ اختیار کر چکا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اِس نَوع کے اُردو رسالوں میں اِسے دُنیا بھر میں منفرد اور مقبول ترین مقام حاصل ہے۔

پاکستان سے والہانہ محبت کرنے والے مجید نظامی مرحوم کی بصارت و بصیرت اور دُور اندیشی ہی تھی جو اُنھوں نے ماہنامہ پھول کے لیے بہترین ٹیم کا انتخاب کیا جو محترم شعیب مرزا کی زیرِ نگرانی خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے۔شعیب مرزا صاحب کی محنت اور لگن ماہنامہ پھول کے ایک ایک صفحے پر جگنوؤں کی طرح جھلملاتی نظر آتی ہے۔میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی مجید نظامی مرحوم کی

بصارت کا مُنہ بولتا ثبوت ہے کہ اُنھوں نے شعیب مرزا صاحب جیسے شخص کا انتخاب کیا جنھوں نے اِس ماہنامے کو آسمان کی رفعتوں سے روشناس کروا دیا۔یوں تو مجید نظامی صاحب کے وطن کی محبت میں گُندھے بے شمار کارنامے ہیں جنھیں اِس دھرتی سے پیار کرنے والا کوئی بھی شخص کبھی بھُلا نہیں پائے گا لیکن یہ بھی عین حقیقت ہے کہ اُنھیں اَمر" کرنے کے لیے ماہنامہ پھول جیسا "صدقۂ جاریہ" ہی کافی ہے۔"

مجید نظامی مرحوم کی زندگی کا محور و مرکز ہی جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا تھا۔حکومت کسی آمر کی ہو یا جمہوری آمر کی وہ بے دھڑک "حق کی بات" کہہ جاتے۔ شاید وہ پاکستان میں بھی خلفائے راشدین جیسے نظام کی آرزو رکھتے تھے کہ جہاں کوئی بھی خلیفۂ وقت سے یہ سوال کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو کہ "عمرؓ ! بیت المال سے تو آپ کے حصّے میں صرف ایک چادر آئی تھی یہ دوسری چادر کہاں سے آ گئی؟"۔اور امیرالمومنین یہ فرمائیں "میں طویل القامت ہوں اور ایک چادر سے پورا جسم نہیں ڈھانپ سکتا تھا اِس لیے میرے بیٹے نے مجھے اپنی چادر مستعار دے دی"۔شاید نظامی صاحب کا کَرب یہ بھی تھا کہ اُنھیں جمہوری لبادے کی اوٹ میں بادشاہت جھلکتی نظر آتی تھی جبکہ وہ تو چودہ سو سال پہلے کے ایسے دَور کے آرزومند تھے جس میں مجمعِ عام میں خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے سوال کیا کہ "اے لوگو ! اگر میں دُنیا کی طرف

جھک جاؤں تو تم کیا کروگے ؟''۔ مجمعے میں موجود ایک شخص نے اپنی تلوار نیام سے نکال کر کہا ''میں آپ کا سَر اُڑا دوں گا''۔ حضرت عمرؓ نے اُس شخص کو ڈانٹتے ہوئے غصّے سے کہا ''تُو امیر المومنین کی شان میں یہ الفاظ کہتا ہے ''۔اُس شخص نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''ہاں ! آپ کی شان میں ''۔یہ سُن کر حضرت عمرؓ بہت خوش ہوئے، منبر سے نیچے اُترے اور اُس شخص کو گلے لگا کر فرمایا ''اللہ کا شکر ہے۔ قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو وہ مجھے سیدھا کر دیں ''۔لیکن پاکستان جیسا ملک جو وڈیروں نوابوں، جاگیرداروں اور صنعت کاروں کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہاں نظامی صاحب ، مرحوم کے خواب کو تعبیر ملنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔اس کے باوجود بھی اُس ''مردِ قلندر'' نے نہ صرف یہ آرزو پالی بلکہ ساری زندگی اسی جد و جہد کی نذر بھی کر دی۔

مَرسوں مَرسوں

سندھیوں کی ایک خوبی کی تو بہرحالِ تحسین کی جانی چاہیے کہ وہ اپنی ''دھرتی ماں'' سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔اُن کے سیاسی اختلافات خواہ کتنے بھی ہوں لیکن جب بھی سندھ کی تقسیم کی بات ہوتی ہے تو وہ سارے اختلافات بھلا کر ایک ہو جاتے ہیں۔سندھ کی صدیوں پرانی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ جب کبھی سندھ پر دَورِ ابتلاء آیا تو سندھیوں نے اپنی جانیں دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔انگریزوں اور سندھیوں کی جنگ کے درمیان ایک سندھی سپوت ہوشو شیدی نے دمِ واپسیں یہ نعرہ لگایا''مرسوں مَرسوں، سندھ نہ ڈیسوں''۔تب سے اب تک سندھ کی ہر ماں اپنے بچے کو پہلا سبق یہی دیتی ہے۔ یہ نعرہ آجکل انتہائی مقبول کہ بلاول زرداری اپنی ہر تقریر میں یہ نعرہ ضرور لگاتے ہیں ۔اُدھر ہم پنجابیوں کا یہ عالم کہ ہمیں اِس سے کچھ لینا دینا نہیں کہ پنجاب کے دو ٹکڑے ہوتے ہیں یا دوہزار ۔نوے کے عشرے میں ایک نعرہ سنائی دیا ''جاگ پنجابی جاگ، تیری پگ نوں لگ گیا داغ'' لیکن اس نعرے کو کہیں بھی پذیرائی نہ ملی اور بالآخر یہ ''ٹھُس'' ہو گیا۔ جنوبی پنجاب کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک چلی تو سندھیوں ، پختونوں اور ایم کیو ایم سے کہیں زیادہ زور و شور سے پنجابی سیاستدان پنجاب کے ٹکڑے کرنے کی مہم میں نکل کھڑے ہوئے لیکن آفرین

ہے سندھیوں پر کہ اگر کہیں سے سندھ کی تقسیم کی ہلکی سی صدا بھی آتی ہے تو سارے سندھی مرنے مارنے پر تُل جاتے ہیں۔

ایم کیو ایم کے قائد الطاف بھائی کی آتشِ شوق ایک دفعہ پھر بھڑکی اور اب کی بار اُنہوں نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے سندھ سمیت پورے پاکستان کو 20 صوبوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کر دیا حالانکہ مقصد اُن کا مہاجروں کے لیے الگ صوبے کا حصول ہی ہے۔ الطاف بھائی کا یہ مطالبہ کوئی نیا نہیں وہ تو 1992ء سے ایسی ''شُرلیاں'' چھوڑتے چلے آ رہے ہیں۔ اُن کی شدید ترین خواہش ہے کہ مہاجروں کے لیے ایک ایسا صوبہ بنا دیا جائے جس کے وہ بلا شرکتِ غیرے مالک ہوں۔ الگ صوبہ تو نہ بن سکا لیکن الطاف بھائی کو رات کے اندھیرے میں ملک سے فرار ہونا پڑا۔ تب سے اب تک وہ لندن میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کیے بیٹھے ہیں۔ الطاف بھائی کے مطالبے کے جواب میں بلاول زرداری نے کہا ''مرسوں مَرسوں، سندھ نہ ڈیسوں''۔ تب الطاف بھائی کی رَگِ ظرافت پھڑکی (جو اکثر پھڑکتی رہتی ہے) اور انہوں نے بلاول کو مخاطب کرکے کہا ''تُم ابھی بچے ہو، ابو کو بلاؤ۔ اگر مرسوں مَرسوں، سندھ نہ ڈیسوں تو پھر سارا لیسوں''۔ تحریکِ انصاف نے بھی صوبوں کی تقسیم کے خلاف بات کی تو ایم کیو ایم جلال میں آ گئی اور تحریکِ انصاف کے خلاف احتجاجی جلسہ کر ڈالا لیکن پھر ''اندر واندری'' پتہ نہیں کیا ''کھچڑی'' پکی کہ الطاف بھائی نے تحریکِ انصاف کو خوش آمدید بھی

کہہ ڈالا اور کپتان نے کراچی میں متاثر کُن جلسہ بھی کر دکھایا۔ ہو سکتا ہے کہ اِس سلسلے میں لال حویلی والے کی خدمات حاصل کی گئی ہوں۔ ہمارے یہ شیخ رشید بھی بڑی خاصے" کی شَے ہیں۔ وہ جوڑ توڑ کے ماہر ہیں اور اُنہیں میڈیا میں "اِن" رہنے کا فن" بھی آتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق وہ گزشتہ دَس ماہ میں الیکٹرانک میڈیا کو 170 انٹرویو دے چکے ہیں۔ گویا 300 دنوں میں 170 انٹرویو جو یقیناً ایک ورلڈ ریکارڈ ہے جس کا اندراج گینز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں تو ہونا ہی چاہیے۔ اُن کے "عزمِ صمیم" کا کیا کہوں کہ تحریکِ انصاف کے سو فیصد سونا میے اُن سے نفرت کرتے ہیں لیکن وہ پھر بھی کپتان صاحب کے پہلو میں پائے جاتے ہیں اور شنید ہے کہ خاں صاحب سب سے زیادہ سُنتے بھی اُنہی کی ہیں۔ وجہ یہ کہ شیخ صاحب "سبز باغ" دکھانے کے ماہر اور خاں صاحب تو رہتے ہی خوابوں خیالوں کی دنیا میں ہیں۔ خاں صاحب کے ساتھ اب علامہ قادری بھی شریک ہو گئے ہیں اور دھرنوں کی "ڈرامائی تشکیل" کی ذمہ داری علامہ صاحب نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ اسی لیے علامہ صاحب کبھی کفن لہراتے ہیں، کبھی قبریں کھُدواتے ہیں، کبھی روتے رلاتے ہیں اور کبھی "خون" مانگتے ہیں۔ وہ تو یہی بشارت" لے کر نکلے تھے کہ پانچ سات ہزار لاشیں تو مل ہی جائیں گی لیکن حکومت" ستّو" پی کر سوئی رہی۔ اسی لیے علامہ صاحب نے وزیرِ اعظم ہاؤس، پی ٹی وی اور" پارلیمنٹ پر دھاوا بھی بولا لیکن اُن کی کشت و خوں کی یہ کوشش بھی رائیگاں ہی گئی کیونکہ وہ جدھر بھی گئے حکومت نے یہی

کہا ''میرا دَر کھلا ہے، کھلا ہی رہے گا تمہارے لیے''۔ اُدھر کپتان صاحب کی آتشِ شوق نے اُنہیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ اب اُنہیں اتنے ناموں سے پکارا جاتا ہے کہ یاد رکھنا مشکل۔ طالبان خاں اور سونامی خاں تو اُن کے پرانے نام تھے ،اب اُن میں بہتان خاں ،انتشار خاں ،دھرنا خاں اور آوارہ خاں بھی شامل ہو گئے ہیں ،آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ خاں صاحب نے بھی زور تو بہت مارا، سول نافرمانی کا اعلان کیا، سونامیوں کو حکومتی بینکوں سے لین دین سے منع کیا، ہنڈی کے ذریعے رقم بھیجنے کا کہا، خانہ جنگی کی دھمکی دی اور اپنا بنی گالہ کا بجلی کا بِل دھرنے والوں کے سامنے جلا کر بھی دکھایا (یہ الگ بات ہے کہ زمان پارک لاہور والے تینوں بِل ''اندروں اندری''ادا بھی کر دیئے) لیکن ناکامی مُنہ چڑاتی رہی۔ چھوٹے بڑے بھائی نے ہر حربہ آزما کے دیکھ لیا لیکن سوئی حکومت کو جگا نہ سکے اور اب یہ عالم ہے کہ

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں ،کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماریٔ دِل نے آخر کام تمام کیا

اِن ساری ناکامیوں کا اگر کوئی ذمہ دار ہے تو صرف علامہ صاحب اور کپتان صاحب کہ کپتان صاحب نے دَس لاکھ کے ہجوم اور ایک لاکھ موٹر سائیکلوں کا دعویٰ کیا۔ شاہ محمود نے کہا ،دَس نہیں بارہ لاکھ لیکن جب لاہور سے نکلے تو صرف پانچ ہزار اور دو سو موٹر سائیکل ،اسلام آباد پہنچے تو دَس ہزار۔ اُدھر

بوکھلائی ہوئی حکومت ''ایویں خوامخواہ'' چالیس ہزار وردی والے لیے استقبال کو تیار ۔ تین دِن بعد ''لاہوریے'' تو ''پھُٹ'' گئے لیکن ڈی جے بَٹ کی مہربانی سے پنڈی وال اور اسلام آبادیے ''میوزیکل کنسرٹ'' میں ناچتے گاتے رہے ۔ایسا دھرنا کبھی دیکھا نہ انقلاب جس میں ہر روز ناچ گانے کی محفل ہو ۔علامہ قادری نے پہلے ایک کروڑ عقیدت مندوں کے ساتھ دو گھنٹے میں انقلاب لانے کا دعویٰ کیا ،پھر وہ بھی ''چھوٹے بھائی'' کے تتبع میں دَس لاکھ پہ آ گئے لیکن اپنے سکولوں کے بچوں ، ٹیچروں اور اُن کے خاندانوں ، دیہاڑی دار مزدوروں اور عقیدت مندوں کے جلو میں جب اسلام آباد پہنچے تو تعداد بمشکل بیس پچیس ہزار اور اب ''دھرنوں کے چہلم'' کے بعد بمشکل پانچ چھ ہزار جسے وہ انسانوں کا سمندر کہتے ہیں ۔جب کسی ندی نالے کو سمندر کہا جائے گا تو پھر یہی حال ہو گا جو آجکل ''دھرنا بازوں'' کا ہو رہا ہے۔

حرفِ آخر یہ کہ مرسوں مَرسوں، سندھ نہ ڈیسوں، پنجاب نہ ڈیسوں ، بلوچستان نہ ڈیسوں اور خیبر پختونخوا نہ ڈیسوں جیسی باتیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن کاش کہ دھرتی ماں کو کوئی ایسا رہنماء بھی مل جائے جو یہ کہے کہ ''مَرسوں مَرسوں ، پاکستان نہ ڈیسوں''۔

تحریکِ انصاف کے پیچ

تحریکِ انصاف نے مینارِ پاکستان کے سائے تلے ایک دفعہ پھر بھرپور جلسہ کرکے یہ ثابت کردیاکہ اُس کے چاہنے والوں کی اب بھی کمی نہیں۔ماننا پڑے گا کہ جس طرح بھٹو مرحوم نے غریبوں کو متحرک کیا تھا،اُسی طرح عمران خاں صاحب نے بھی ایک ایسے طبقے کو متحرک کر دیا جواِس سے پہلے گھروں سے نکلنا گوارہ ہی نہیں کرتا تھا۔ یہ اپر مڈل کلاس جو سیاسی جلسے جلوسوں میں شرکت کرنے والوں کامذاق اُڑایا کرتی تھی اب پورے جوش و خروش اور اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ متحرک ہے۔اِس کلاس کا روٹی ،کپڑا اور مکان ہر گز مسئلہ نہیں کیونکہ اِس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے ۔اِس طبقے کے لوگوں کی دلچسپیاں ذرا مختلف ہیں اوربنیادی طور پر یہ طبقہ ''ہلّاگُلّا'' کا شوقین نظر آتاہے۔ کپتان صاحب نے اسی کومدِّ نظر رکھتے ہوئے سیاسی جلسے جلوسوں میں ایک نئی طرح ڈالی ۔وہ جہاں اپنی تقریر کاآغاز قُرآنی آیات سے کرتے ہیں،وہیں اسرار الحق جھوم جھوم کر یہ بھی گاتے ہیں''اَج میرا نچنے نوں جی کردا''۔اب کپتان صاحب جہاں بھی جاتے ہیں ڈی جے بٹ نے وہاں پہلے ہی میوزیکل کنسرٹ کا اہتمام کر رکھا ہوتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ عمران خاں کے بعد اگر کوئی سب سے زیادہ پاپولر ہے تو وہ ڈی جے بٹ ہی ہے جس کی موسیقی پر لڑکے لڑکیاں ہی نہیں بڑے بوڑھے اور خود خاں صاحب اور اُن کے ساتھ کنٹینر

پر کھڑے تمام لوگ جھوم رہے ہوتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگر یہ لکھ دیا جائے کہ تحریکِ انصاف کے جلسوں اور دھرنوں میں سیاست کم اور موسیقی زیادہ نظر آتی ہے تو ایسا طوفانِ بدتمیزی بپا ہوتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ ہم نے نواز لیگ، پیپلزپارٹی، ایم کیوایم اور قاف لیگ کے خلاف بھرپور کالم لکھے لیکن اِن سیاسی جماعتوں کے چاہنے والوں کی طرف سے کبھی اخلاق سے گرا ہوا تبصرہ نہیں آیا لیکن جونہی تحریکِ انصاف کے بارے میں کسی "کڑوے سچ" کی نشاندہی کی جائے تو سونامیے ننگی اور گندی گالیوں پر اتر آتے ہیں۔ یہ ایسی سچائی ہے جس سے عمران خاں انکار کر سکتے ہیں نہ اکابرینِ تحریکِ انصاف۔ لاہور کے انتہائی متاثرکُن جلسے میں خاں صاحب نے ایک مصلح کا کردار ادا کرتے ہوئے سچ بولنے پر لمبا چوڑا لیکچر دے ڈالا۔ اُنھوں نے اقبالؒ کا ایک شعر بھی غلط سلط پڑھا اور پھر خود ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اُنہیں شعر یاد نہیں رہتے۔ اُسی شعر کے حوالے سے صداقت شجاعت، اور عدالت پر لیکچر دیا۔ سوال مگر یہ ہے کہ کیا سچ بولنا صرف عوام کے لیے رہ گیا ہے اور سیاست دان اِس سے مبرّا ہیں؟۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے خاں صاحب نے 14 اگست سے اب تک اتنے یوٹرن لیے ہیں کہ حساب رکھنا مشکل۔ اُنھوں نے بآوازِ بلند بجلی کے نرخوں میں اضافے پر احتجاج کیا۔ یہ احتجاج تو پوری قوم ہی کر رہی ہے لیکن کیا خاں صاحب یہ نہیں جانتے کہ مشترکہ مفادات کونسل میں چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ نے

تین برس تک بجلی اور گیس کے نرخ بڑھاتے چلے جانے پر اتفاق کیا تھا اور چاروں صوبوں کے اہم سیاسی رہنما اِس فیصلے پر متفق بھی تھے ۔اگر خیبر پختونخوا کے وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک صاحب نے خاں صاحب کی ایماء کے بغیر بجلی اور گیس کے نرخ بڑھانے پر اتفاق کیا تو پھر خاں صاحب کو پرویز خٹک صاحب کی جواب طلبی کرنی چاہیے اور اگر یہ سب کچھ خاں صاحب کی مرضی سے ہوا تو پھر ایسا احتجاج چہ معنی دارد؟۔خاں صاحب سینکڑوں بار پارلیمنٹ کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے اسے مافیا قرار دے چکے ہیں لیکن اُن کے اپنے صوبے خیبر پختونخوا کا یہ حال ہے کہ 82 فیصد اراکینِ اسمبلی ٹیکس چور ہیں ، 90 فیصد بجلی چوری ہوتی ہے ،کے پی کے کے گیارہ وزراء پر بَد عنوانی کے باقاعدہ مقدمات درج ہیں، وزیرِ اعلیٰ دھرنوں میں پائے جاتے ہیں اور 23 میگا پراجیکٹس پر کام ٹھَپ ہے ۔اِس کے علاوہ دَس لاکھ آئی ڈی پیز بنوں میں بے یار و مددگار پڑے ہیں ۔اگرِان مجبور و مقہور آئی ڈی پیز نے پشاور میں دھرنے کی ٹھان لی تو کیا خاں صاحب سنبھال پائیں گے ؟۔

شرجیل میمن کہتے ہیں'' تحریکِ انصاف کو اسرائیل سے فنڈنگ ہو رہی ہے اور تبدیلی ناچ گانے سے نہیں آتی''۔ہم آج بھی خاں صاحب کو محبِ وطن ہی سمجھتے ہیں اور ہمارا حسنِ ظَن یہی ہے کہ تحریکِ انصاف کو ہر گز ''فارن فنڈنگ'' نہیں ہوتی لیکن یہ بھی عین حقیقت ہے کہ دھرنوں کی وجہ سے ملکی ترقی کا پہیہ جام ہو کے رہ گیا ہے اور اُمید کی ساری کرنیں نااُمیدی کے گھور اندھیروں میں

ڈھل گئی ہیں۔ جبکہ خاں صاحب اب بھی اپنی انانیت کے بُت کو پاش پاش کرنے کو تیار نہیں۔ اُنھوں نے اپنے چاہنے والوں کو سِول نافرمانی کا درس دیتے ہوئے مجمعے کے سامنے اپنا بجلی کا بِل تو جلا ڈالا لیکن یہ سَچ بولنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ زمان پارک کے بجلی کے تینوں بِل ادا ہو چکے، جہانگیر ترین نے اپنے سارے بِل اور ٹیکس بَروقت ادا کیے اور شاہ محمود قریشی نے بھی اپنے گھر ملتان میں لگے ہوئے بجلی کے آٹھ میٹروں کے بِل ادا کر دیئے۔ خاں صاحب نے لاہور کے جلسے میں یہ بھی فرمایا کہ جب وہ وزیرِ اعظم بنیں گے تو پنجاب کے گورنر ہاؤس کی دیواریں گرادی جائیں گی، وزرائے اعلیٰ ہاؤسز اور گورنر ہاؤسز کو لائبریریوں اور یونیورسٹیز میں ڈھال دیا جائے گا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ خاں صاحب نے سچ نہیں بولا کیونکہ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو خیبر پختونخوا کے گورنر ہاؤس کو نہ سہی وزیرِ اعلیٰ ہاؤس کو تو ختم کر ہی سکتے تھے لیکن سولہ ماہ گزرنے کے باوجود بھی اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ گیارہ کروڑ افراد خطِ غُربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں اور وہ وزیرِ اعظم بن کر غریبوں کی تقدیر بدل دیں گے۔ دست بستہ عرض ہے کہ ملک و قوم کی تقدیریں بدلنے والے نہ تو سینکڑوں کنال پر محیط محلوں میں رہتے ہیں اور نہ ہی اِس طرح سے اندرونِ ملک طیاروں میں سفر کرتے ہیں جیسے خاں صاحب آجکل کر رہے ہیں۔ اُنھیں ایسے بلند بانگ دعوے نہیں کرنے چاہیے جن پر عمل اُن کے بَس میں نہ ہو۔

آخر میں یہ قوم حکمرانوں سے سوال کرتی ہے کہ اُسے توٹریفک کا اشارہ توڑنے پر سزا مل جاتی ہے لیکن سول نافرمانی کا اعلان کرنے ،پارلیمنٹ ہاؤس ،پی ٹی وی اور وزیرِاعظم ہاؤس پر حملہ کرنے والوں کے ساتھ وی آئی پی سلوک کیوں ؟۔ تحریکِ انصاف کے جن 25 افراد نے استعفے دیئے وہ آئین کی رو سے اپنی سیٹیں کھو چکے پھر سپیکر صاحب کس قانون کے تحت استعفے اپنے پاس رکھ کے بیٹھے ہیں ؟۔

ابو جہل کون ؟

عمرو بن ہشام مشرکینِ مکہ کا سردار تھا۔ مشرکین کے تمام قبائل میں اُسے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور مشرکینِ مکہ اُسے ابوالحکم یعنی دانائی کا باپ کہہ کر پکارتے تھے۔ میرے آقا ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ عمر بن خطاب اور عمر بن ہشام، دونوں میں سے کسی ایک کو مسلمان کر دے۔ آقا ﷺ کی دُعا قبول ہوئی اور حضرت عمرؓ بن خطاب دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے لیکن یہ سعادت عمر بن ہشام کے حصّے میں نہ آئی اور وہ ہمیشہ کے لیے ابو جہل یعنی جہالت کا باپ قرار پایا۔ اب بھی یہ عالم ہے کہ اگر کسی شخص کو ابو جہل کہہ کر پکارا جائے تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتا ہے۔۔۔۔ عشقِ عمران میں ڈوبے ایک محترم لکھاری کا خیال ہے کہ پاکستانی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں ایسے ابو جہل اتنی وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں کہ گلو بادشاہ کی حکومت چاہے تو وہ اُنہیں برآمد بھی کر سکتی ہے۔ یہ فیصلہ وقت پر چھوڑ دیجیے کہ ابو جہل کون ہیں، وہ جو موجودہ حالات میں دھرنوں کی سیاست کو ملک و قوم کے لیے زہرِ ہلاہل سمجھتے ہیں یا وہ جو ایک ایسے شخص کو "کُرسی" تک پہنچانے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کر رہے ہیں جسے صرف اقتدار کی ہوس ہے۔ جس نے نعرہ تو یہ لگایا کہ اُس کی جماعت میں صرف باکردار لوگ ہی شامل ہو سکتے ہیں لیکن اپنے دائیں بائیں ایسے لوگوں کو اکٹھا کر

لیا جن کے خلاف بقول شخصے انقلاب آنا چاہیے ۔جس نے پاکستان میں ایک ایسا سیاسی کلچر متعارف کرایا جس کی بنیاد ہی انا، ضد اور ٹکراؤ ہے۔ جس نے غیر پارلیمانی اور بازاری زبان کو سیاست کا حصّہ بنا کر اُسے آلودہ کر دیا اور جسے سچ بولنے کی سرے سے عادت ہی نہیں۔یہ سیاسی کلچر ملک کے لیے بہتر ہے نہ قوم کے لیے، عمران خاں کے لیے بہتر ہے نہ اُن کے مدح سراؤں کے لیے۔

بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ تحریکِ انصاف کا 28 اکتوبر کا جلسہ متاثر کُن تھا لیکن یہ لاہور کی تاریخ کا سب سے بڑا جلسہ ہر گز نہیں تھا۔یہ ایسا ہی سفید جھوٹ ہے جیسا ڈی چوک اسلام آباد میں ہر روز اُس وقت بولا جاتا ہے جب پانچ چھ ہزار کے مجمعے کو ''انسانوں کا سمندر'' کہہ دیا جاتا ہے ۔اِس جلسے کو لاہور کی تاریخ کا سب سے بڑا جلسہ قرار دینے والے لکھاری یا تو مرضِ نسیان میں مبتلاء ہیں یا پھر '' بغضِ نواز لیگ ''میں اتنا آگے نکل چکے ہیں کہ سچائی لکھتے ہوئے اُن کے ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔بینظیر بھٹو کا استقبالی جلوس اِس سے کہیں بڑا تھا اور حضرت مولانا مودودیؒ جب امریکہ سے علاج کروا کر وطن لوٹے تو جلوس کا ایک سرا لاہور ایئر پورٹ اور دوسرا اچھرہ اُن کی رہائش گاہ تک پہنچ چکا تھا۔یہ غالباً 1974ء کی بات ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ اُس وقت لاہور کی آبادی کروڑوں میں نہیں، چند لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔دور مَت جایئے، اسی مینارِ پاکستان کے سائے تلے علامہ طاہر القادری

نے جو جلسہ کیا تھا وہ خاں صاحب کے جلسے سے کہیں بڑا تھا۔ ویسے بھی برِ صغیر کی تاریخ تو یہی بتلاتی ہے کہ جلسے جلوسوں اور دھرنوں سے ووٹ نہیں ملا کرتے۔ 1970ء کی الیکشن مہم میں جماعتِ اسلامی کے شوکتِ اسلام کے جلسے اور ریلیاں دیکھ کر حیرت گم ہو جاتی تھی لیکن انتخابات میں بازی لے گئے بھٹو مرحوم اور جماعتِ اسلامی کی جھولی خالی رہ گئی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کہا کرتے تھے کہ لوگ جوق دَر جوق اُن کے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں لیکن ووٹ جناحؒ کو دے آتے ہیں۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خاں صاحب قائدِ اعظم کے جانشیں ہیں لیکن ''چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک''۔ حضرت قائدِ اعظمؒ کو اُن کے ڈاکٹر اُن کی بیماری کے بارے میں کھُل کر بتا چکے تھے لیکن پاکستان بنانے کی لگن میں اُنھوں نے اپنی بیماری کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور یہی نہیں بلکہ اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو بھی اپنی بیماری کے بارے میں کسی کو بتلانے سے سختی سے منع کر دیا۔ اُنھوں نے پاکستان حاصل کیا اور پھر سال سوا سال بعد ہی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جبکہ دوسری طرف محترم عمران خاں کے ایک دھرنے نے ہی اُن کی شخصیت کا ایک ایک پرت کھول کے رکھ دیا۔ سونامیے اسلام آباد کی سڑکوں پر بے یار و مددگار ''رُلتے'' رہے اور خاں صاحب اپنے بنی گالہ کے محل میں استراحت فرماتے رہے۔ قائدِ اعظم کے بارے میں اُن کے دشمن بھی تسلیم کرتے تھے کہ اُنھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن محترم خاں صاحب نے گزشتہ پچاس دنوں میں

اتنے یوٹرن لیے اور اتنے جھوٹ بولے کہ حساب رکھنا مشکل۔ صرف چند کاغذات کو ہوا میں لہرا دینے سے جھوٹ تو سچ میں نہیں بدل سکتا البتہ جز وقتی یقین کیا جاسکتا ہے لیکن جب سچائی سامنے آتی ہے تو پھر لوگوں کا ردِ عمل بھی انتہائی خوفناک ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے آج تک جتنے بھی دعوے کیے ہیں اُن میں سے کسی ایک کا ثبوت بھی نہ تو وہ خود پیش کر سکے اور نہ ہی اُن کے قصیدہ گو۔ ایسے لکھاریوں کے بارے میں تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کر دے تاکہ وہ اپنی ''ابوجہلانہ'' روش ترک کرکے راہِ راست اختیار کر سکیں اور اُس شخص کے دست و بازو بننے سے گریز کریں جس کی ہوسِ اقتدار نے اُسے ''ہیرو'' سے ''زیرو'' بنا کے رکھ دیا۔

آجکل ''گو نواز گو'' کا بہت شور ہے۔ یقیناً جس نے بھی یہ نعرہ ایجاد کیا وہ دِل کی گہرائیوں سے میاں نواز شریف کا حامی ہوگا۔ عقل کے اندھے ''سونامیوں'' کو اتنا بھی نہیں پتہ کہ گو نواز گو کا مطلب ''قدم بڑھاؤ نواز شریف'' ہے اور یقیناً جو لوگ پاکستان کو معاشی طور پر اپنے قدموں پر کھڑا ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں، یہ نعرہ اُن کے دِل کی آواز ہے اِس لیے اکابرینِ نواز لیگ کو اِس نعرے پر تلملانے کی بجائے مُسکرانا چاہیے البتہ یہ گُلو، بِلو، تومی، پومی اور توفی بَٹ والا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ پتہ نہیں اِن ''بٹوں'' کو کیا ہوا ہے کہ جہاں کہیں سونامیوں کو دیکھتے ہیں، یہ اپنا

چھینٹی پروگرام'' شروع کر دیتے ہیں حالانکہ ہم تو بیچارے سونامیوں کو مظلوم سمجھتے ہیں'' کیونکہ یہ تو خوابوں خیالوں میں اپنے آپ کو پورے ملک کے بادشاہ بلکہ شہنشاہ سمجھ بیٹھے تھے لیکن جب عالمِ آب و گِل میں واپس آئے تو پتہ چلا کہ ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا''۔اب تو ماشاءاللہ تحریکِ انصاف کے پاس بھی ایک ایسا''بَٹ'' موجود ہے جو اِن سارے بَٹوں پر بھاری ہے۔نام اُس کا ہے ڈی جے بَٹ اور اُس کے بغیر خاں صاحب کے سارے جلسے روکھے پھیکے اور پھسپھسے لگنے لگتے ہیں۔وہ دو دِن کے لیے جیل کیا گیا خاں صاحب کے دھرنے کی ساری رونقیں بھی ساتھ ہی لے گیا۔شکر ہے کہ اُسے رہائی ملی اور سونامیوں کے چہرے بھی خوشی سے دمکنے لگے، یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ رہائی بُری طرح کھٹکنے لگی۔دراصل یہ وہی لوگ ہیں جو قوم کے نونہالوں کو ناچتے گاتے دیکھ نہیں سکتے۔اسی لیے تو محترم عمران خاں کے ایک مدح سَرا نے ایسے لکھاریوں کو لفافہ یافتہ میڈیا کے کارندوں، مراسیوں،ڈوم ڈھاریوں، بھانڈوں، کفش برداروں اور قصیدہ نگاروں کے نام سے یاد کیا ہے اور درست یاد کیا ہے کیونکہ ماڈرن معاشروں میں یہی کچھ تو ہوتا ہے جو خاں صاحب کے جلسوں میں ہو رہا ہے۔

سب پہ بھاری

پیپلز پارٹی کے مدار المہام جنابِ آصف زرداری نے پنجاب فتح کرنے کے شوق میں بحریہ ٹاؤن لاہور کے ''بم پروف'' محل میں اپنا قیام بڑھا دیا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ قیام خاصا طویل ہوگا کیونکہ اب تو اُنہوں نے اپنے کروڑوں کی ملکیت کے بیس گھوڑے بھی محل میں منگوا لیے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے انہی گھوڑوں پر بیٹھ کر پنجاب فتح کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہو۔ آجکل وہ اپنے محل میں بیٹھ کر نئی نئی ''شُرلیاں'' چھوڑ کر مزہ لیتے رہتے ہیں اور ''صاف چھُپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں'' کے مصداق کبھی عشقِ نواز میں ''گوڈے گوڈے'' دھنسے نظر آتے ہیں تو کبھی طنز کے تیر برساتے۔ انداز اُن کا ''محبوبانہ'' ہی ہوتا ہے اِس لیے نواز لیگ صرف کَسمسا اور تلملا کے رہ جاتی ہے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ پیپلز پارٹی اور پنجاب لازم و ملزوم ہیں اور وقت آنے پر وہ ثابت کر دیں گے کہ پیپلز پارٹی پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہے۔ چو مکھی لڑائی کے ماہر جنابِ زرداری کی یہ ساری ''شرارتیں'' محض اِس لیے ہیں کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ نواز لیگ فی الحال پلٹ کر جواب دینے کے قابل نہیں لیکن حیران کُن بات تو یہ ہے کہ اُنہوں نے بھی الیکشن 2013ء کو ''آر اوز'' کا الیکشن قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ''اگر میں اُس وقت کہہ

دیتا کہ میں حلف نہیں لیتااور عمران خاں سمیت دوسری جماعتیں بھی ہمارے ساتھ آجاتیں تواِس سے ملک میں بحران پیدا ہو جاتا۔اسی لیے ہم نے ملک، قوم اور جمہوریت کے وسیع تر مفاد میں ایسا نہیں کیا"۔زرداری صاحب کے اِس بیان کے بعد تو بے ساختہ لبوں پہ آجاتا ہے کہ

"لو وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

نوازلیگ کو اگر پتہ ہوتا کہ بالآخر الزام اُسی پہ آنا ہے تو وہ نگران حکومتوں پر ہی "پھڈا"ڈال کے بیٹھ رہتی لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ویسے بھی لوگوں کی یادداشت" اب اتنی بھی کمزور نہیں کہ اُنہیں یہ تک یاد نہ ہو کہ ساری نگران حکومتیں پیپلزپارٹی نے بنائیں۔سندھ، خیبر پختونخوااور بلوچستان کے الیکشن کمشنر پیپلزپارٹی نے مقرر کیے ۔سارے گورنر پیپلزپارٹی کے مقرر کردہ اور خود زرداری صاحب ایوانِ صدر میں براجمان۔اگر اتنی طاقت رکھنے کے باوجود بھی واقعی دھاندلی ہوئی اور پیپلزپارٹی کے ساتھ "ہتھ" ہوگیا تو پھر تو اُس کی نااہلی روزِروشن کی طرح عیاں ہے اور اُسے حکمرانی بلاول زرداری کی طرح یہ تسلیم کرنے سے PPP کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔آخر اکابرین کیوں ہچکچاتے ہیں کہ "جیالے"اُن سے مایوس ہو چکے تھے جس کی سزا بہرحال پیپلزپارٹی ہی کو ملنی تھی۔اِس میں کوئی شک نہیں کہ

پیپلزپارٹی کی جڑیں عوام میں اب بھی ہیں لیکن اب عوامی شعور بھی 1971ء جیسا نہیں ۔الیکٹرانک میڈیا کی بدولت یہ شعور اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ لوگ ووٹ ڈالنے سے قبل تھوڑا بہت سوچنے لگے ہیں۔اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر آج بھی پیپلزپارٹی کو بھٹو مرحوم یا بینظیر شہید جیسا کوئی لیڈر میسرآ جائے تو وہ پاکستان کی سب سے بڑی پارٹی بن سکتی ہے لیکن ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے''۔

جنابِ آصف زرداری نے فرمایا'' تحریکِ انصاف اور نوازلیگ دونوں کی سوچ ایک جیسی ہے میں نوازلیگ اور تحریکِ انصاف کی لڑائی کا مزہ لے رہا ہوں ،کارکُن بھی مزہ لیں''۔ہمارے لیے تو یہ ہرگز انکشاف نہیں کیونکہ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ پیپلزپارٹی نوازلیگ کی مدد نہیں بلکہ اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہی ہے اور اُسے ادراک ہو چکا ہے کہ تحریکِ انصاف اپنی تمام تر حماقتوں کے باوجود پیپلزپارٹی سے دو قدم آگے ہی ہے اور اگلی باری اگر نوازلیگ کی نہیں ہوتی تو پھر تحریکِ انصاف کی ہوگی ،پیپلزپارٹی کی نہیں۔اسی لیے پیپلزپارٹی ایک تیر سے دو شکار کرنے کے چکر میں ہے۔ وجہ خواہ جلسوں کو''میوزیکل کنسرٹ''میں بدلنا ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ تو بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ تحریکِ انصاف کو بندے اکٹھے کرنے کا فن آگیا ہے۔ویسے بھی تحریک کے پاس شیخ رشید جیسے ''جوکر' موجود ہیں جو گاہے بگاہے اپنے فَن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں

۔ملتان میں شیخ صاحب کا ''سواگت ''انڈوں اور جوتوں سے ہوا۔وہ تو شیخ صاحب کی خوش قسمتی کہ ہوٹل کی لابی کے شیشے آڑے آگئے وگرنہ نوازلیگیئے تو شیخ صاحب کا جھٹکا'' کر ہی دیتے۔دروغ بَر گردنِ راوی ،لابی کے اندر بیٹھے شیخ صاحب یہ کہتے پائے'' گئے کہ نوازلیگ جب بھی کرتی ہے ادھورے کام ہی کرتی ہے ،اگر انڈے پھینکنے ہی تھے تو ساتھ ''سلائس'' بھی پھینک دیتے۔اُنھوں نے پریس کانفرنس میں اِس بات کا بھی اعتراف کر لیا کہ قُربانی سے پہلے قُربانی نہیں ہو سکی لیکن ساتھ ہی جواز یہ گھڑا کہ اُن کا بکرا ''داغی'' ہوگیا۔اُس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ،دانت جھڑ گئے اور دُم غائب ہو گئی اِس لیے وہ قربانی کے قابل نہ رہا۔اُنھں نے یہ بھی فرمایا کہ اب قربانی تو ہو نہیں، سکتی اِس لیے ''جھٹکا'' ہوگا۔ غالباً شیخ صاحب کا اشارہ محترم جاوید ہاشمی کی طرف تھا جنھوں نے پانچویں بار بغاوت کرتے ہوئے تحریکِ انصاف کے سارے پول کھول دیئے۔ہم کہتے ہیں کہ چلو باغی تو داغی ہو گیا لیکن شیخ صاحب توتاحال صحیح سلامت ہیں ۔اُن کے دانت جھڑے ،نہ دُم کَٹی اور نہ ہی وہ لنگڑے قرار دیئے گئےاِس لیے اگروہ واقعی عشقِ عمران سے سرشار ہیں تواُن کی قُربانی نہ سہی ''جھٹکا''توکیا ہی جاسکتا ہے تاکہ اُبھرتی ہوئی تحریکِ انصاف کو ''خون''میسر آسکے۔ مولانا قادری یہ فتویٰ تو دے ہی دیں گے کہ نظریۂ ضرورت کے تحت ''جھٹکے ''کا خون بھی قابلِ قبول ہوجاتا ہے۔اِس سے پہلے اِسی نظریۂ ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے مولانا صاحب عید کی نماز کی امامت کر چکے ہیں حالانکہ

شریعت کا واضح فیصلہ ہے کہ کوئی معذور شخص امامت نہیں کروا سکتا۔اب ہمارے علمائے کرام ''ایویں ای رَولا'' ڈالتے پھر رہے ہیں کہ ڈی چوک میں مولانا قادری کی امامت میں ہونے والی نماز غیر شرعی ہے کیونکہ مولانا نے کُرسی پر بیٹھ کر نماز کی امامت کی۔ایک تو ہمارے یہ ''مُلّا'' بہت رجعت پسند ہیں۔وہ اپنے ''حجروں'' سے نکلنا پسند ہی نہیں کرتے۔اگر وہ باہر نکلتے تو اُنہیں پتہ چلتا کہ کینیڈا میں شرعی امامت ایسی ہی ہوتی ہے جیسی مولانا نے ڈی چوک میں کی۔ بھئی اگر بقول وزیرِاعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ شراب پی کر مرنے والے بھی شہید ہوتے ہیں تو پھر کُرسی پر بیٹھ کر امامت بھی کروائی جا سکتی ہے اور شیخ صاحب کا ''جھٹکا'' بھی ''شہادت'' قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ شیخ صاحب ایسا ہرگز نہیں کریں گے کیونکہ

ہیں کواکب کچھ ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا ، یہ بازیگر کھُلا

حافظ حسین احمد کے خیال میں تو بیگانی شادی میں ''شیدا'' دیوانہ ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ شیدا''عمران خاں سے اپنی بے عزتی کا بدلہ چکا رہا ہے۔ایک بار خاں صاحب نے ایک'' ٹی وی ٹاک شو میں کہا تھا کہ وہ شیخ رشید کو اپنا ''چپڑاسی'' بھی رکھنے کو تیار نہیں۔ شیخ صاحب نے خاں صاحب کا یہ طنزیہ جملہ اپنے ''پلّے'' باندھ لیا اور لگے مناسب وقت کا انتظار کرنے۔جونہی اُنہیں

موقع ملا، انہوں نے خاں صاحب کو ''پھڑکا'' کے رکھ دیا لیکن شیخ صاحب کی شیخیاں'' دیکھیے کہ وہ اب بھی خاں صاحب کے دِل کے بہت قریب ہیں۔ بہرحال شیخ'' رشید جانیں یا عمران خاں ''سانوں کی''۔

سیاست و صحافت کی بدلتی قدریں

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

سیاست بلاشبہ سیادت ہے اور سعادت بھی۔شرط مگر یہ کہ اِس میں صداقت ،امانت ،دیانت اور شرافت کی چاشنی ہواور قوم کا سردار اپنے قول و فعل سے قوم کا خادم نظر آئے۔لیکن یہ کیسی سیاست ہے جس میں محض کثافت ہی کثافت ہے؟۔یہ کیسی سیاست ہے جس میں پگڑیاں اچھالی جاتیں اور طنز کے تیروں سے مخالف کو گھائل کرکے لطف اندوز ہوا جاتا ہے ؟۔جس میں عدم برداشت کا یہ عالم کہ ذاتیات تک اترنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی ؟۔جس میں ''کُرسی'' سے محبت کی جنگ میں ناروا کو بھی روا سمجھا جاتا ہے ؟۔اور یہ کیسی سیاست ہے جس کے رنگ انوکھے اور ناقابلِ یقین ہیں ؟۔ بھٹو دَور تک تو جلسے جلوسوں میں ڈھول کی تھاپ کو بھی معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن اب تو ماشاء اللہ ڈی جے بَٹ بھی ہوتا ہے اور عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی بھی ۔''اَج میرا نچنے نوں جی کردا'' گانے والے بھی اور رہنماؤں سمیت گانوں پر والہانہ رقص کرنے والے بھی۔مان لیا کہ یہ نسلِ نَو کو متوجہ اور متحرک کرنے کا حربہ ہوگا لیکن قائدین کی بَدزبانی اور بَد کلامی ؟۔ کہہ لیجئے کہ زبان کی یہ تختی بھی نونہالانِ وطن کے اندر خونِ گرم کی لہریں تازہ دَم کرنے اور اُنہیں جھپٹنے ،پلٹنے کے گُر سکھانے کی سعی

ہے لیکن جھوٹ ؟۔ تسلیم کہ جھوٹ کی آڑھت سجانے کا مقصد اہلِ وطن کو اپنے سیاسی رقیبانِ روسیاہ'' سے متنفر کرنا ہے لیکن قومی و ملّی سلامتی ،حبِّ وطن اور دھرتی ماں'' کا قرض ؟۔ کیا یقین کر لینا چاہیے کہ ہمارے رہبروں کو غرض ہے تو صرف ''راج سنگھاسن'' سے ،باقی سب جائے بھاڑ میں۔ یہ سوال تو پھر بھی تشنۂ جواب ہی رہے گا کہ اگر خاکم بدہن ملک ہی نہ رہا تو پھر اِن کی ''راج گدی'' کا کیا بنے گا اور یہ حکومت کس پر کریں گے ؟۔اِس لیے بتقاضۂ عقل انہیں راج کرنے کے لیے کم از کم زمین کا یہ ٹکڑا تو بچا لینا چاہیے جس کا نام پاکستان ہے اور جس کے بنانے میں اِن کا ہاتھ ہے نہ اِن کے پُرکھوں'' کا۔ لیکن یہ تو جانے انجانے میں اسی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تُلے بیٹھے'' ہیں۔

چلیں یہ سیاست تو اشرافیہ کا کھیل ہے اور اِس کھیل میں ہار جیت بھی اُنہی کی ہوتی ہے لیکن ہماری صحافت ٹیڑھی چال کیوں چلنے لگی۔ کسی بھی معاشرے میں صحافی مصلح کا کردار ادا کرتا ہے اور اُس کی تنقید و تنقیص میں ہمیشہ اصلاح مضمر ہوتی ہے لیکن بد قسمتی یہ ہوئی کہ سیاسی کثافت ہماری صحافت میں بھی دَر آئی ہے ۔ہر لکھاری کا اپنا اپنا قبلہ اور اپنا اپنا کعبہ اور ہر کوئی اپنے اپنے ممدوح کی مدح میں مگن ۔ یہاں تک تو شاید قابلِ قبول بھی ہوتا کہ نہ تو کسی کی سوچوں پر پہرہ بٹھایا جا سکتا ہے اور نہ ہی تحریر و تقریر کی آزادی کا حق چھینا جا سکتا ہے لیکن عدم برداشت کے زہریلے نشتر اب ہمارے

کالموں میں بھی نظر آنے لگے ہیں۔ سبھی نہیں لیکن بہت سے لکھاری اب گالی گلوچ اور طنز و تعریض کو ہی اپنی تحریروں کا حسن سمجھنے لگے ہیں اور نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ جسے کچھ عرصہ پہلے تک گالی سمجھا جاتا تھا وہ نسلِ نَو کی روز مرہ گفتگو میں مستعمل ہو تی جا رہی ہے ۔ایک محترم لکھاری جو کبھی کبھار کپتان صاحب کے جلسوں میں بھی نظر آجاتے ہیں ،وہ خاں صاحب کے عشق میں اتنا آگے نکل گئے کہ عقل و فہم سے تہی نظر آنے لگے ۔ محترم جاوید ہاشمی کی تحریکِ انصاف سے علیحدگی کے بعد اُنھوں نے لکھا "سیلف میڈ مخدوم، مجہول ،بوگس ،بَدبودار، باغی ہمیشہ کی طرح بکاؤ نکلا۔۔۔۔ ضیاء الحق کے فوجی بوٹ کا یہ تسمہ اور نواز شریف کے جوتے کا تلوا بننے تک یہ ایک احمق ایجی ٹیٹر کے سوا کچھ بھی نہ تھا"۔ محترم کالم نگار اگر یہی سب کچھ شاہ محمود قریشی کے بارے میں بھی لکھ دیتے تو ہم اُن کی عظمت کو سلام کرتے کیونکہ ہاشمی اور قریشی ،دونوں کا ماضی بالکل ایک جیسا ہے لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا،شاید وقت کا تقاضہ ہو گا اور موصوف توہمیشہ بہتے ہی وقت کے دھاروں کے ساتھ ہیں۔ کسی زمانے میں اُن کے ممدوح وہ ہوا کرتے تھے جو ایک آمر کو دَس بار وردی میں منتخب کروانے کے دعوے دار تھے اور یہ تو موصوف جانتے ہی ہونگے کہ جہانگیر ترین ،خورشید قصوری ،شیریں مزاری اور اُن جیسے کئی اور بھی اُسی درخت کے پتے ہیں جویَت جھڑ کا موسم آتے ہی جھڑے ،اُڑے اور خاں صاحب کی جھولی میں آ گرے۔اُن کے بارے میں موصوف کی زبان خاموش کیوں ہے؟۔ رہاکالموں

میں غیر پارلیمانی الفاظ کے استعمال کا مسئلہ تو موصوف کی یہ پُرانی اور پختہ عادت ہے جس کا وہ کئی بار مزہ بھی چکھ چکے ہیں۔

ایک اور محترم لکھاری جو انتہائی خوبصورت نثر لکھنے کے ماہر ہیں (یہ الگ بات ہے کہ اُن کے کالموں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ادبیات میں کم از کم پی ایچ ڈی ہونا ضروری ہے) اُنھوں نے بھی آجکل کپتان صاحب اور علامہ صاحب کے عشق میں ڈوب کر جو کالم لکھنا شروع کیے ہیں اُن میں اپنی ہی برادری کے لوگوں پر رکیک حملوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔اُن کے کالم پڑھ کر دُکھ کی ایک لہر پورے جسم میں سرایت کر جاتی ہے کیونکہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ صاحبِ علم بھی ہیں اور ذاتی زندگی میں انتہائی شفیق بھی ۔اُنھوں نے چند معروف اینکرز اور کالم نویسوں کا نام لے کر لکھا ہے کہ وہ تھرڈ کلاس قسم کی جگت بازی کرتے ہیں اور محدود سوچ کے گنبدِ بے در کے اسیر اپنی بے ہنگم فکر کے ننھے مُنے کنویں کے خوردبینی میڈک ہیں ۔وہ بوزنے، نرگسیت کے شکار، نفسیاتی مریض، ہوسِ زر کے مارے اور سستی شہرت کی سولی پہ چڑھے فطری بالشتیے، سیاسی بونے اور ذہنی ناٹے، حمد و ثنا اور تعریف و توصیف کرکے دہاڑی لگانے والے، اپنی اوقات اور اصلیت بھولنے والے ہیں ۔۔۔۔ محترم لکھاری کے کالم کا کسی نے بھی جواب نہیں دیا اِس لیے کہنا ہی پڑتا ہے کہ

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

گالیاں کھاکے بھی بے مزہ نہ ہوا

اُنھوں نے اپنے ''عصائے موسوی'' سے نَو مولود و نَو آموز کالم نگاروں کی دُرگت بناتے ہوئے کہا کہ یہ خواتین و حضرات کالم کو اُگالدان سمجھ کر اُبکائیاں کرتے پھرتے ہیں ۔حالانکہ یہ جانتے ہی نہیں کہ کالم کسے کہتے ہیں ۔حیرت اُن مدیرانِ کرام کے انتخاب پر جو اقرباء نوازی کے منفی جذبے سے مغلوب ہو کر اِن کی بے ہنگم تحریروں کو کالم کا عنوان دے کر شائع کرتے ہیں حالانکہ اِن کا اصل مقام صرف اور صرف کوڑے دان ہے ۔یہ ناطے اور ناطیاں عمران خاں کی کردار کشی کی مہم لانچ کیے ہوئے ہیں ۔یہ گلے سَڑے بوسیدہ ، غلیظ ، متعفن ، مکروہ اور بَد بودار نظام کے فلتھ ڈپو کے کیڑے مکوڑے ہیں ۔۔۔اِن کی لیڈری میں عمران خاں کا کونسا اقدام کیل بن کرچُبھ رہا ہے اور اِس کی ٹیسیں اُن کے قلب و جگر کو کیوں زخمارہی ہیں ۔دست بستہ عرض ہے کہ یہ ناطے ناطیاں محترم لکھاری کی طرح ''پیدائشی کالم نگار''نہیں اگر میرے بَس میں ہوتا تو میں اِن سبھی کو اکٹھا کرکے محترم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر دیتا۔رہی لیڈری میں چبھن کی بات تو عرض ہے کہ اُنھوں نے ابھی تک خاں صاحب کو ولی سمجھا ہے نہ غوث وقطب اور نہ ہی نبی (نعوذ باللہ) ۔اسی لیے وہ خاں صاحب کی شان میں ایسی گستاخیاں کرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خاں صاحب ہوسِ اقتدار میں ملک و قوم کو تباہ کرنے پہ تُلے ہوئے ہیں ۔مکرر عرض

ہے کہ یہ کالم نگاری کی کونسی قسم ہے جس کا استعمال میرے محترم کالم نگار آجکل کر رہے ہیں ۔شاید اُنھوں نے اپنے رہنما کی پیروی کو اپنا فرضِ عین سمجھ لیا ہے کہ ایسی زبان تو خاں صاحب اور مولانا صاحب ہی استعمال کر سکتے ہیں اور یہ تو طے ہے کہ

کند ہم جنس ، باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر ، باز با باز

پیسہ پھینک، تماشہ دیکھ

بستیاں تو بستے بستے بستی ہیں پھر پتہ نہیں کیوں کپتان صاحب اور مُرشد نے اسلام آباد کے ڈی چوک میں اتنی محنتوں سے بسائی اپنی بستی اپنے ہی ہاتھوں سے اجاڑ کے رکھ دی۔ وہ جگہ جہاں ہر طرف رونقیں ہی رونقیں تھیں اب وہاں اُلّو بولنے لگے ہیں۔ ہم جیسے ''نَو مولود و نَوآموز'' لکھاریوں کے لیے تو یہ کسی سانحے سے کم نہیں کیونکہ ہم تو خوش تھے کہ ہمیں اپنے کالموں کا پیٹ بھرنے کے لیے وافر مواد مل رہا تھا لیکن ہماری اُمیدوں پر پانی پھر گیا اور ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب مواد ''کہاں سے'' ملے گا۔ ہمیں تو یقین تھا کہ یہ دھرنے ساڑھے تین سال تک اپنی بہاریں دکھاتے رہیں گے کیونکہ پھر تو الیکشن ہو ہی جانے تھے لیکن مُرشد اور کپتان نے ہمارے خوابوں کو چکنا چور کرتے ہوئے ہمیں یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ''جن پہ تکیہ تھا، وہی پتّے ہوا دینے لگے''۔اِس اُجڑی بستی نے تو ہمارے کالموں کی دُنیا ہی اجاڑ کے رکھ دی جس کے بعد ہم بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیوں نہ اپنی ذاتی سیاسی جماعت ہی بنا لی جائے تاکہ اِس قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔اب ہم نے اپنی سیاسی جماعت کا ڈھانچہ تقریباً مکمل کر لیا ہے۔بَس نوک پلک سنوارنا باقی ہے یا پھر ایجنڈا۔۔۔۔لیکن ایجنڈا ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں کیونکہ ہمارا ایجنڈا بھی وہی ہے جو خاں صاحب اور

علامہ صاحب کا ہے۔اِس ایجنڈے کی تکمیل کے لیے ہم بھی ''فنڈ ریزنگ'' کے لیے نکلنے والے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بیرونی دوست ہمیں مالامال کر دیں گے اور اندرونی دوست تو نوٹ، سپورٹ اور ووٹ دلائیں گے ہی۔ پروگرام تو ہم نے بھی یہی بنایا تھا کہ لندن میں بیٹھ کے گوہرِ مقصود کے حصول کا پلان مرتب کریں لیکن مسئلہ یہ آن پڑا کہ ہمارے پاس تو لندن کے ریٹرن ٹکٹ ''جوگے'' پیسے بھی نہیں تھے اِس لیے گھر بیٹھ کر ہی پلان ترتیب دینا پڑا۔ اب تو ہم نے چوری چوری، چپکے چپکے ''قائدانہ پریکٹس'' بھی شروع کر دی ہے اور خوابوں خیالوں میں اپنے گھر کی سب سے اونچی کُرسی پر بیٹھ کر کئی مرتبہ قوم سے خطاب بھی کر چکے ہیں۔ یہ خواب ہی تو ہیں جن کے ہم بلا شرکتِ غیرے مالک ہوتے ہیں اور بِلا روک ٹوک جب جی چاہے راج سنگھاسن پر براجمان ہو سکتے ہیں۔ اِس لیے خواب دیکھنے میں حرج ہی کیا ہے۔

فیصل آباد کے عظیم الشان جلسے کے شُرکاء کی تعداد مُرشد نے تین سے چار لاکھ بتائی جبکہ نجی ٹی وی چینلز اسے بیس سے تیس ہزار تک قرار دے رہے ہیں اور حکمرانوں نے تو حد ہی کر دی جنھوں نے انسانوں کے اِس سمندر کو محض دَس بارہ ہزار کا مجمع قرار دے دیا۔ اپنی انہی حرکتوں کی بنا پر تو حکمران ''وَخت'' میں پڑتے اور چاروناچار اُن لوگوں کو مدد کے لیے پکارتے رہتے ہیں جنھیں عام حالات میں وہ مُنہ لگانا بھی پسند نہ کریں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جلسے میں

فانی انسانوں کی تعداد تو دَس بارہ ہزار ہی تھی لیکن "فرشتوں" کی تعداد چار لاکھ سے بھی زیادہ، جو صرف مُرشد کو ہی نظر آ رہے تھے اِسی لیے اُنھوں نے اِس مجمعے کو انسانوں کا سمندر قرار دیا اور یہ تو ہمارے عقیدے کا جُزوِ لاینفک ہے کہ مُرشد کبھی جھوٹ بولتے ہیں نہ عمران خاں کیونکہ دونوں "بھائی بھائی" ہیں۔ بھائی بھائی بن جانے کے بعد تو "دو مُلّاؤں میں مُرغی حرام" والا خطرہ بھی ٹَل چکا ہے اور آنے والے دنوں میں دونوں بھائی حقِ حکمرانی والا وہی فارمولا استعمال کرنے والے ہیں جو امریکہ کی مہربانی سے افغانستان میں استعمال ہوا۔ اِس فارمولے میں چونکہ ہماری کوئی گنجائش نکلتی نظر نہیں آتی ،اسی لیے ہم نے اپنی الگ پارٹی بنانے کی تگ و دَو شروع کر دی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں جب ہم بھی جلسے کیا کریں گے تو کچھ بَد بخت لوگ شرکاء کی تعداد سو ڈیڑھ سو ہی بتایا کریں گے کیونکہ وہاں بھی اُنہیں لاکھوں فرشتے نظر نہیں آنے کے۔

مُرشد نے اپنے "فیصل آبادی" خطاب میں فرمایا کہ وہ پنجاب کے ہر ڈویژن کو صوبہ بنائیں گے ، فیصل آباد میں سپریم کورٹ کا بنچ، تمام اضلاع میں ہائی کورٹ کے بنچ اور یونین کونسلوں میں سیشن کورٹ قائم ہوں گے۔ پاکستان کا سارا قرضہ چھ ماہ میں ادا کر دیا جائے گا ،اشیاء کی قیمتیں آدھی کر دی جائیں گی اور وکلاء کی فیس ریاست ادا کرے گی ۔اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ قوم اُنہیں

نوٹ، ووٹ اور سپورٹ دے دے، وہ قوم کو قائدِ اعظم کا پاکستان لوٹا دیں گے لیکن اگر کسی نے نوٹ اپنی جیب میں سینت سنبھال کر رکھے، سپورٹ اور ووٹ کسی اور کی جھولی میں ڈال دیئے تو پھر انقلاب آئے گا نہ قائدِ اعظم کا پاکستان ملے گا۔ ہمیں مُرشد کے اِن فرمودات سے مکمل اتفاق ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر قوم ہماری نومولود پارٹی کو نوٹ، ووٹ اور سپورٹ دے دے تو ہم بھی پاکستان کو امریکہ بنا کے دکھا دیں گے۔ ہم چونکہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے والوں میں سے ہیں اِس لیے ہم فی الحال اپنی تحریک کا آغاز لاہور سے کریں گے اور ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ ہم لاہور کو
شرقی، غربی، شمالی، جنوبی اور وسطی لاہور میں تقسیم کرکے پانچ نئے صوبے بنا دیں تاکہ لاہوریوں" کو پانچ پانچ "خادمِ اعلیٰ" میسر ہوں اور اُنہیں کسی ایک خادمِ اعلیٰ پر" انحصار نہ کرنا پڑے۔ ویسے بھی ہمارے خادمِ اعلیٰ بیچارے اکیلے بھاگ بھاگ کر تھک چکے ہیں اور اب اُنہیں آرام کی اشد ضرورت ہے۔ اگر وہ تھک نہ چکے ہوتے تو کیسے ممکن تھا کہ وہ سانحہ ماڈل ٹاؤن سے بے خبر رہتے۔ اِس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ماڈل ٹاؤن کو الگ صوبہ بنا دیا جائے تاکہ ایسا سانحہ دوبارہ رونما نہ ہو سکے۔ یہ وسطی صوبہ ہو گا اور باقی چار صوبے اِس کے "گرداگرد" گھومنے والے ہونگے۔ ہم نے یہ بھی سوچ رکھا ہے کہ لاہوریوں کو بِلا امتیاز روٹی، کپڑا، مکان، صحت، تعلیم اور دیگر چھوٹی بڑی تمام سہولیات مفت فراہم کی جائیں۔ ہر محلے کا اپنا ہائی کورٹ ہو اور ہر گلی میں ایک سیشن جج اور ایک

تھانہ بنا دیا جائے تاکہ فیصلے عشروں نہیں، گھنٹوں میں ہونے لگیں۔ہمارا یہ بھی منصوبہ ہے کہ ہر گھر میں نادرا کی شناختی کارڈ بنانے کی مشین فراہم کر دی جائے تاکہ جونہی کوئی بچہ پیدا ہو، اُس کا شناختی کارڈ بنایا جا سکے۔ بھلا یہ کیا ہوا کہ شناختی کارڈ بنانے کے لیے پہلے اٹھارہ سال انتظار کیا جائے اور پھر لمبی لمبی قطاروں میں لگ کر گلتے سڑتے رہیں۔ہماری انہی سُستیوں نے تو ہمیں یہ دِن دکھائے ہیں۔ہم تو یہ بھی چاہتے ہیں کہ جونہی کوئی ذی روح اِس عالمِ آب و گِل میں وارد ہو تو فوری طور پر اُسے ووٹ دینے کا حق دے دیا جائے۔ہمیں یقین ہے کہ محترم عمران خاں ہماری اِس تجویز سے نہ صرف اتفاق کریں گے بلکہ خوشی سے باغ باغ ہو جائیں گے کیونکہ اُن کے جلسوں میں بچوں کی تعداد زیادہ اور ووٹ دینے والوں کی کم ہوتی ہے۔پہلے بھی بچوں کو ووٹ کا حق نہ دے کر تحریکِ انصاف کے ساتھ ''دھاندلی'' کی گئی۔اب جب کہ تمام سہولیات خود ہی فراہم کرنے کی ذمہ داری اٹھا لی ہے تو پھر لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تمام جمع پونجی فوری طور پر ہمارے پاس جمع کروا دیں تاکہ ہم الیکشن جیت کر اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

لالہ جی ! جان دیو

یوں تو پہلے بھی ارضِ وطن پہ کڑا وقت آتا رہا لیکن اب کی بار جس عہدِ اشوب کا سامنا ہے اُس کی شدتوں کا یہ عالم ہے کہ " دُعا" کے ساتھ "دوا" کی بھی اشد ضرورت ہے۔ لیکن " دوا" ہم کر نہیں سکتے کہ اِدھر اندرونی خلفشار کا عفریت دِن دُگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور اُدھر قحط الرجال کا یہ عالم کہ کوئی نگاہوں میں جچتا ہی نہیں۔ جچے بھی کیسے کہ کسی کو ملک کی پرواہ نہ قوم کی، اقتدار کے بھوکے بھیڑیے پلک جھپکنے کے انتظار میں ۔ سیاست کے رنگ ڈھنگ یہ کہ منافقانہ " بین اور نوحہ خوانی" کے لیے لاشوں کی اشد ضرورت ۔ سبھی مسیحا لیکن مسیحائی سے کوسوں دور کہ یہ تو ڈھونگی ہیں ، محض ڈھونگی۔ سچ تو یہی ہے، کڑوا سچ کہ حقِ حکمرانی خواہ کسی کو بھی ملے، قوم کا مقدر اندھیرے ہیں، گھور اندھیرے۔ ہماری دعائیں خالق و مالک کے ہاں مستجاب نہیں کہ اعمال کا دارومدار تو نیتوں پر ہوتا ہے اور ہماری نیتوں کا فتور اظہر من الشمس جبکہ لوحِ مقدر پہ لکھ دیا گیا کہ

خُدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ہم میلوں ٹھیلوں کے شوقین ، جلسے جلوسوں اور ریلیوں میں "آوے ای آوے"

اور ''جاوے ای جاوے'' کے فلک شگاف نعرے تو لگاتے ہیں لیکن عمل سے عاری۔ نگاہِ انتخاب کا یہ عالم کہ ووٹ دیتے وقت رنگ و نسل کے بتوں کو پاش پاش کرنے کی ہمت نہ فرقہ بندیوں سے باہر نکل کر سوچنے کی جرات۔ نتیجہ یہ کہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں قوم کی تقدیر تھما دیتے ہیں جنہیں سرے سے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ قومی و ملّی تقاضے کیا ہیں۔ کتنے ہونگے پارلیمنٹ اور سینٹ میں بیٹھے رہنما جنہیں آئین کی شُدبُد ہو؟۔ شاید ایک دو فیصد یا اِس سے بھی کم۔ جب یہ عالم ہو تو پھر غیروں کی غلامی ہی مقدر ٹھہرتی ہے۔

اسی اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت گزشتہ ایک ماہ سے پاکستان کے خلاف کھلی جارحیت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ کنٹرول لائن اور ورکنگ باؤنڈری پر مسلسل گولہ باری جاری ہے اور آئی ایس پی آر کے مطابق یکم اکتوبر سے اب تک ورکنگ باؤنڈری کی چوبیں اور کنٹرول لائن کی چھبیس مرتبہ خلاف ورزی ہو چکی جس سے کئی شہادتیں ہوئیں اور ہزاروں بے گھر بھی ہوئے۔ یہ شاید اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں وزیرِ اعظم نواز شریف کی تقریر کا رِد عمل ہو جہاں اُنہوں نے عوامی امنگوں کے عین مطابق کشمیر کے بارے میں واضح اور دوٹوک مؤقف اختیار کرتے ہوئے عالمی ضمیر کو جھنجوڑنے کی کوشش کی لیکن ہمارے ''بھولے'' وزیرِ اعظم اتنا بھی نہیں جانتے کہ عالمی ضمیر ہے کہاں جسے وہ جھنجھوڑنے نکلے تھے۔ اب تو پوری دُنیا میں ''جس کی لاٹھی، اُس کی بھینس'' پر ہی عمل کیا جاتا ہے۔

عالمی ''ڈان'' اور دہشت گرد امریکہ، دوسروں پر دہشت گردی کا الزام لگا کر مَن مانی کرتا رہتا ہے۔ وہ تو پاکستان کو بھی بقول آمر مشرف '' نشانِ عبرت'' بنا دیتا لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے پاس ایٹم بم ہے جسے ہم نے بقول چودھری شجاعت حسین شب برات پر پھلجھڑیوں کی جگہ چلانے کے لیے نہیں رکھ چھوڑا۔ امریکہ اب اپنے ''دیس'' میں تو پایا نہیں جاتا۔ وہ تو ہمارے ہی دائیں بائیں ہے اور خوب جانتا ہے کہ یہ قوم ایٹم بم چلانے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ اسی لیے وہ آنکھیں بھی دکھاتا ہے اور محتاط بھی رہتا ہے لیکن شاید ہمارا پڑوسی ہندوستان کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہے۔ 2002ء میں گجرات کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے انتہا پسند نریندر مودی نے جب سے عنانِ حکومت سنبھالی، سرحدوں کی خلاف ورزی شروع ہو گئی جو تا حال جاری ہے۔ مودی جی سے بھلا کون بہتر جانتا ہوگا کہ پاکستان کی کُل آبادی سے بھی چار گُنا زیادہ لوگ تو ہندوستان میں خطِ غُربت سے نیچے بستے ہیں، 50 کروڑ سے زائد کے پاس باتھ روم کی سہولت نہیں، 40 کروڑ کورے ان پڑھ اور لگ بھگ اتنے ہی بجلی کی سہولت سے محروم۔ اُدھر پاکستان میں بھی سب اچھا نہیں۔ حالات دونوں ملکوں کے تقریباً ایک جیسے ہی ہیں۔ اس مسلمہ حقیقت سے بھی مفر ممکن نہیں کہ قوموں کی تقدیریں جنگ سے نہیں امن سے بدلا کرتی ہیں اب مودی صاحب خود ہی فیصلہ کر لیں کہ اُن کے لیے امن بہتر ہے یا جنگ؟۔ اُنہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ شہادت ہمیشہ مسلمان کا مطلوب و مقصود رہا ہے لیکن ہندو والے

کو زندگی بڑی عزیز ہوتی ہے۔ہم پر حملہ کرکے لالہ جی کے ہاتھ تو کچھ نہیں آئے گا البتہ جب ہمارے ایٹمی میزائل محوِ پرواز ہوئے تو پھر ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں''۔ہم دِلّی کے لال قلعے پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کے زعم میں مبتلاء ہیں نہ ایسا کوئی خواب دیکھتے ہیں لیکن کسی بھی جارحیت کی صورت میں پوری دِلّی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سکت ضرور رکھتے ہیں۔ہم امن کی خواہاں ہیں لیکن ربِّ کریم کے حکم کے عین مطابق ہمارے گھوڑے بھی تیار ہیں۔جیت کے غازی کہلائیں گے اور مَر گئے تو شہید، گویا

گر بازی عشق کی بازی ہے ، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ،ہارے بھی تو بازی مات نہیں

اکھنڈ بھارت کا خواب صرف نریندر مودی ہی نہیں سارے ہندوستانی سیاستدان دیکھتے چلے آرہے ہیں۔اسی لیے تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی ہمارے اوپر جنگ مسلط کر دی گئی اور کشمیر کی یہ جنگ ایک سال دو ماہ تک جاری رہی پھر کشمیریوں کا حقِ خودارادیت تسلیم کرتے ہوئے جواہر لعل نہرو نے کہاکہ اگر کشمیریوں نے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ نہ کیاتو وہ بغیر کسی حیل وحجت کے کشمیر خالی کردیں گے لیکن آج تک اِس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ ستمبر 1965ء میں ہم پرجنگ مسلط کی گئی اوراکیس روزہ اِس جنگ میں ہماری بہادر افواج نے بھارت کو ناکوں چنے چبوائے۔1971ء میں ہندوستان زبردستی مشرقی پاکستان میں گھس آیااور مکتی

باہمی کے ساتھ مل کر پاکستان کو دولخت کر دیا۔ سچ تو یہی ہے کہ یہ جنگ ہندوستان نے نہیں جیتی، پاکستانی سیاستدانوں نے اندرونی خلفشار کی بنا پر ہاری تھی۔ اُس وقت بھی اگر پاکستان ایٹمی قوت ہوتا تو ''لالہ'' مشرقی پاکستان میں افواج بھیجنے کی کبھی جرات نہ کرتا۔ ایک جنگ راجیو گاندھی بھی ہم پر مسلط کرنا چاہتا تھا لیکن ضیاء الحق مرحوم کرکٹ میچ دیکھنے کے بہانے ہندوستان جا پہنچے اور مسکراتے ہوئے راجیو گاندھی کے کان میں یہ بھی کہہ آئے کہ پاکستان ایٹم بم بنا چکا ہے اور اگر ہندوستان نے جنگ مسلط کرنے کی حماقت کی تو پاکستان ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر ایٹم بم چلا دے گا۔ ضیاء الحق کی اِس تنبیہ کے بعد راجیو گاندھی کا رنگ پیلا پڑ گیا اور ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو گیا۔ لالہ جی! مکرر عرض ہے کہ ہمارے پاس گنوانے کے لیے کچھ بھی نہیں لیکن اگر ہم ''کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے'' کے فارمولے پر عمل پیرا ہو گئے تو پھر آپ کے پاس بھی ''ککھ'' باقی نہیں بچے گا اِس لیے اپنی ''چمڑی'' بچانے کے لیے ایسی شرارتوں سے باز رہنا ہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔

نوبل انعام یافتہ ملالہ

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

دہشت گردوں کے حملے نے پاکستان کی بیٹی ملالہ یوسف زئی کو یکایک بین الاقوامی شہرت کی رفعتوں سے روشناس کرا دیا۔ نوبل انعام ملنے سے پہلے بھی اہلِ مغرب نے اُسے بیشمار انعامات سے نوازا جو یقیناً ہر پاکستانی کے لیے باعثِ فخر تھا لیکن اِس کے ساتھ ہی ایک پاکستانی مسلمان بچی پر مغرب کی یہ نوازشات بھی ناقابلِ فہم تھیں۔ یہ عقدہ تب وا ہوا جب ملالہ کی کتاب I am Malala منظرِ عام پر آئی۔ اِس کتاب کے مطالعے کے بعد کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ مغرب نے سولہ سترہ سالہ معصوم ملالہ کی معصومیت کو کس طرح کیش کرانے کی کوشش کی۔ کتاب کی مصنفہ تو ملالہ یوسف زئی ہے لیکن دراصل یہ کرسٹینا لیمب کی خباثتوں کا شاہکار ہے جس میں ملالہ کے باپ ضیاء الدین یوسف زئی نے بھی اُس کا بھرپور ساتھ دیا۔ ضیاء الدین کی پُراسرار شخصیت کے بارے میں سوات میں کئی کہانیاں زبان زدِ عام ہیں۔ اُس کے گھر میں کئی غیر ملکی آ کر ٹھہرتے رہے جن میں میڈیا کے نمائندے بھی تھے اور غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹ بھی۔ اِس بحث میں پڑے بغیر کہ کیا دس سالہ ملالہ ہی گُل مکئی کے قلمی نام سے ڈائری لکھ رہی تھی یا کوئی اور، یہ طے ہے کہ کل کی گُل مکئی اور آج کی

ملالہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔اُس نے اپنی کتاب میں مذہب، سیاست، معاش اور معاشرت سبھی پر مغربی ایجنڈے کے عین مطابق لکھا۔کتاب میں ناموسِ رسالت کے قانون، حدود آرڈیننس اور پاکستانی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے خلاف جو کچھ بھی لکھا گیا وہی مغربی ایجنڈا بھی ہے اور یہ کہے بنا کوئی چارا نہیں کہ برطانیہ میں چادر اوڑھے نظر آنے والی ملالہ نے مغربی تصورات کی بھرپور نمائندگی کی۔وہ خود تو چادر اوڑھتی ہے لیکن حیرت ہے کہ ضیاء الحق کے ہاکی ٹیم کی لڑکیوں پر ''شارٹس''پہننے کی پابندی پر سخت تنقید بھی کرتی ہے۔اُسے ضیاء الحق مرحوم محض اِس لیے ناپسند ہیں کہ وہ ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔روشن خیال پرویز مشرف کی اِس لیے تحسین کہ اُس نے ٹی وی پر ڈانس دکھانے، ویلینٹائن ڈے اور نیو ایئر منانے کی اجازت دی۔شاید ملالہ نہیں جانتی کہ دینِ مبیں میں اِس قسم کی خرافات کی مطلق اجازت نہیں قُرآنِ کریم میں جابجا''حیا'' کی تاکید کی گئی ہے اور آقا ﷺ کا بھی فرمان ہے ''حیا اور ایمان، دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔اِن میں سے کوئی ایک اٹھا لیا جائے تو دوسرا خود بخود اُٹھ جاتا ہے''۔اور ایسا بھی نہیں کہ کسی کو قُرآنِ مجید کی سمجھ نہ آتی ہو کیونکہ حکمت کی کتاب میں درج ہے کہ ''ہم نے آسان کر دیا قُرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے۔پس ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا؟'' (القمر)۔لیکن اگر کوئی نصیحت پکڑنا ہی نہ چاہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔اگر ہم اسلامی شعائر کے عین مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں

تو پھر

گر تُو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جُز بہ قُرآں زیستن

ملالہ کو اِس پر بھی اعتراض ہے کہ ضیاء الحق نے مرد کی ایک اور عورت کی دو گواہیوں کے قانون کو نافذ کیا۔ لیکن یہ ضیاء الحق کا نہیں ،اللہ کا قانون ہے جس کی شاید ملالہ کو خبر نہیں۔وہ یہ بھی کہتی ہے کہ قُرآن میں کہیں نہیں لکھا کہ عورت مرد کی محتاج (Dependent) ہے۔اُسے سورۃ النساء پڑھ لینی چاہیے جس میں واضح طور پر مرد کو عورت کا نگہبان مقرر کیا گیا ہے اور ملالہ کا بطور مسلم یہ جزوِ ایماں ہونا چاہیے کہ قُرآن کے کسی ایک حرف کا انکار پورے قُرآن کے انکار کے مترادف ہے۔یا پورا قُرآن اپنالو یا سارے کا سارا چھوڑ دو۔مانا کہ اِس ''دورِ منور'' کے تقاضے کچھ اور ہیں اور اب تو ہماری سیاست بھی ''میوزیکل کنسرٹ '' اور ناچ گانے کے بغیر ادھوری اور روکھی پھیکی نظر آتی ہے لیکن ہمیں ایسی ریاست قبول ہے نہ سیاست و جمہوریت جو دین سے دور کر دے۔ سچ کہا اقبالؒ نے

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کو خسارہ

ملالہ کو یاد ہونا چاہیے کہ حضرت قائدِ اعظمؒ نے اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر یہ ملک حاصل کیا تھا اور 14 اگست 1947ء کو جب آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائدِ اعظمؒ سے کہا کہ پاکستان میں مغل بادشاہ اکبر کا نظام رائج کر دو تو قائدِ اعظمؒ نے ایک لحظے کی تاخیر کے بغیر کہا "نہیں، سلطنتِ مدینہ کا نظام"۔ آئینِ پاکستان میں بھی کسی ایسے قانون کی ہر گز گنجائش نہیں جو قُرآن و سنت کے مطابق نہ ہو۔اِس لیے آئین کے عین مطابق تمام قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا ہم پر واجب ہے۔ناموسِ رسالت ﷺ کا قانون ہمارے ایمان کا حصہ ہے اور خون میں شامل ۔ ملالہ ملعون رشدی کے لیے اپنے دل میں جتنی بھی ہمدردی رکھے ، ہمارے نزدیک تو وہ واجب القتل ہی ہے۔یاد رہے کہ صرف اسلام ہی نہیں بلکہ دیگر ادیانِ عالم میں بھی شاتمِ رسول کی یہی سزا مقرر کی گئی ہے۔

ملالہ کہتی ہے کہ "اگر ہم نے ایٹم بم پر اتنا پیسہ صرف نہ کیا ہوتا تو پاکستان میں اُسی پیسے سے بہت سے سکول کھل سکتے تھے"۔ حصولِ علم کی افادیت سے انکار ممکن ہی نہیں۔دینِ مبیں میں بھی حصولِ علم کی بار بار تلقین کی گئی ہے لیکن اِس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ کسی ایک مقصد کے حصول کی خاطر دوسرے کو فراموش کر دیا جائے۔ہمارا دین جہاں حصولِ علم پر زور دیتا ہے، وہیں اپنے گھوڑے تیار رکھنے کا حکم بھی ہے۔اگر ہم نے ایٹم بم نہ بنایا ہوتا تو

آج اکھنڈ بھارت کا خواب پورا ہو چکا ہوتا اور اگر 1971ء میں ہم ایٹمی قوت ہوتے تو ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ہماری غیرتوں کے تمغے نہ نوچے جاتے۔ پوری قوم جانتی ہے کہ بیرونی قوتوں کے دل میں ہماری ایٹمی صلاحیت محض اِس لیے کانٹے کی طرح چبھتی ہے کہ پاکستان وہ واحد اسلامی مملکت ہے جو ایٹمی قوت بھی رکھتی ہے۔ ملالہ کو بھی اِس ایٹمی صلاحیت پر فخر ہونا چاہیے نہ کہ پریشانی۔ افواجِ پاکستان پر تنقید کرتے ہوئے ملالہ کہتی ہے کہ ”کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ فوج اسامہ کی موجودگی سے لاعلم تھی البتہ ہر کوئی یقین رکھتا ہے کہ آئی ایس آئی کو اسامہ کہ ایبٹ آباد میں موجودگی کا علم تھا“۔ سبھی جانتے ہیں کہ سانحہ ایبٹ آباد کے بعد پاکستان مخالف بیرونی قوتیں مسلسل یہی الزام تراشی کرتی رہی ہیں کہ اسامہ بن لادن آئی ایس آئی کی پناہ میں تھا۔ اب ملالہ یوسف زئی بھی انہی کی آواز میں آواز ملا رہی ہے اِس لیے یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ ملالہ اہلِ مغرب کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے اور اُس پر نوازشات کی بارش کی وجہ بھی یہی ہے۔ اِس کے باوجود بھی ہمارا حسنِ ظن یہی ہے کہ ملالہ معصوم ہے اور جب وہ شعور کی پختگی تک پہنچے گی تو اُسے اپنی اِس غلطی کا احساس ضرور ہوگا۔

ایک دفعہ پھر علیحدگی

کراچی کے متاثرکُن جلسے میں بلاول زرداری کی سیاسی رونمائی ہوگئی جس میں اُنہوں نے اپنے سیاسی ''انکلوں'' پر گرج برس کر اپنے جیالوں کو یہ پیغام دیا کہ ''کل بھی بھٹو زندہ تھا،آج بھی بھٹوزندہ ہے''۔ نوازلیگ کے ''انکلوں'' نے توپلٹ کے جواب نہیں دیا کیونکہ وہ بیچارے تو خود گرفتارِبلا ہیں البتہ محترمہ مریم نوازصاحبہ نے یہ ہلکا پھلکا ٹویٹ کیاکہ ''بلاول بھٹوزرداری نے کسی کو اوئے ،اوئے نہیں کہا''۔ محترمہ مریم نوازکا یہ ٹویٹ ہمیں نوازلیگ کی بے بسی کی داستان سُناگیا۔اگر سانحہ ماڈل ٹاؤن نہ ہوا ہوتا اور نوازلیگ دھرنوں کے عذاب میں مبتلاء نہ ہوتی تو پھر ایسا ''کرارا'' ردِعمل سامنے آتاکہ نوخیزبلاول کے ہوش ٹھکانے آجاتے۔ بلاول نے تحریکِ انصاف کے بارے میں انتہائی سخت زبان استعمال کرتے ہوئے کپتان صاحب کو ''کٹھ پُتلی خاں'' کہہ کر مخاطب کیااور کہا''ہم کبھی امپائر کی انگلی پر نہیں ناچے ،بُزدلو! دھرنوں کے ہیلمٹ سے باہر نکلواور دہشت گردوں کی بالنگ کا سامنا کرو''۔لیکن حیرت ہے کہ کپتان صاحب یہ کہہ کر طرح دے گئے کہ بلاول ابھی بچہ ہے اور ہم بچوں کی باتوں کا جواب نہیں دیتے۔ایم کیوایم مگربلاول کی اتنی سی بات بھی ہضم نہیں کر سکی کہ ''ایم کیوایم بیس سال سے کراچی پر حکمرانی کر رہی ہے 2018ء میں جب شفاف انتخابات

ہونگے تو کراچی کو اصل آزادی ملے گی اور ہر طرف ''بوکاٹا، بوکاٹا'' ہوگا'' ۔اُس نے بلاول کی اِس معصوم ''شرارت'' پر احتجاج کرتے ہوئے سندھ حکومت سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ایم کیوایم کے ڈپٹی کنوینر خالد مقبول صدیقی نے کہا کہ بلاول کی تقریر کے بعد ساتھ چلنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ پیپلز پارٹی جاگیرداروں اور وڈیروں کی پارٹی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ جہاں جاگیرداری اور وڈیراشاہی ہو وہاں انصاف اور تعلیم ہو۔خالد مقبول صدیقی نے طنزاً یہ بھی کہا'' سیاست کے کاروبار میں حسب نسب بھی تبدیل کر دیا جاتا ہے۔بلاول زرداری سے سوال ہے کہ وہ کونسا پیمانہ ہے جس کی بنا پر وہ چیئرمین بنائے گئے؟۔اگر پیمانہ موروثیت ہے تو بھٹو کا وارث بھٹو ہو سکتا ہے زرداری نہیں۔بلاول بمبینو سینما کے وارث تو ہو سکتے ہیں پیپلز پارٹی کے نہیں''۔

اِس سے پہلے ذوالفقار مرزا بھی ایسے ہی بیانات دیا کرتے تھے جس کی بنا پر ایم کیوایم اکثر روٹھ جایا کرتی تھی اور بیچارے رحمٰن ملک ''وَخت'' میں پڑ جاتے لیکن پتہ نہیں اُن کے پاس ایسی کون سی ''گیدڑ سنگھی'' تھی کہ ایم کیوایم ''فٹافٹ'' مان جاتی۔نواز لیگ نے بھی بابا رحمٰن ملک کی اسی گیدڑ سنگھی کو دھرنے والوں پر آزمانا چاہا لیکن یہاں ''باباجی'' بُری طرح ناکام ہو گئے۔وجہ شاید یہ ہو کہ ایم کیوایم والے تو پہلے ہی ماننے کے لیے تیار بیٹھے ہوتے ہیں جبکہ دھرنے والے ''میں نہ مانوں'' کے علمبردار۔

اب ایم کیوایم نے ''پانچویں بار'' سندھ میں پیپلزپارٹی کی حکومت سے علیحدگی کا اعلان کرکے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا ہے جس کی بنا پر اُس کا نام بھی گینز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں آنا ضروری ہو گیا ہے۔ سندھ کے بھولے بھالے وزیرِاعلیٰ سید قائم علی شاہ نے سندھ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ایم کیوایم والے پچھلے پانچ سالوں میں کبھی روٹھے کبھی مانے اور ہم کاروبارِ سلطنت چلانے کی بجائے اُنہیں منانے میں ہی لگے رہے۔ ہم، نے پہلی بار ''شاہ جی'' کو کچھ غصّے میں دیکھا،اسی لیے اُنھوں نے عالمِ غیض میں یہاں تک کہہ دیا'' اگر چیلنج کیا گیا تو ثبوت سمیت بیان کردوں گا کہ گرفتار ملزمان کا تعلق کس جماعت کے ساتھ ہے''۔ گویا شاہ صاحب کی یہ ایم کیوایم کو دھمکی تھی کہ ''نہ چھیڑ ملنگاں نوں''۔ ویسے شاہ صاحب خاطر جمع رکھیں، ایم کیوایم کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ اللہ سلامت رکھے رحمٰن ملک صاحب ''اِن ایکشن'' ہو چکے ہیں اور اُمید واثق ہے کہ عنقریب ایم کیوایم یہ کہتے ہوئے واپس آجائے گی کہ

ساقی میرے خلوص کی شدت کو دیکھنا
پھر آگیا ہوں گردشِ دَوراں کو ٹال کے

امیرِ جماعتِ اسلامی محترم سراج الحق نے کہا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جس طرح جَل بِن مچھلی نہیں رہ سکتی،اُسی طرح حکومت کے بغیر ایم کیوایم کا جینا

محال ہے۔شاید اسی لیے بلاول بھی ایم کیوایم کو رَگڑا دے گئے لیکن یہ رَگڑا کچھ زیادہ ہو گیا اور خالد مقبول صدیقی کو یہ کہنا پڑا ''الطاف حسین کا جینا حرام کرنے والے بتائیں کہ کیا اُنھوں نے اپنی ماں کے قاتلوں کا جینا حرام کیا؟۔ مرتضٰی بھٹو کے قاتلوں کا جینا حرام کیا اور ذوالفقار علی بھٹو کے قاتلوں کا جینا حرام کیا؟''۔بلاول کے اِس ''رَگڑے'' کے بعد لال حویلی والے کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی ہے کیونکہ پیپلزپارٹی اور ایم کیوایم کی اِس چپقلش کے بعد شیخ صاحب کو قائدِ حزبِ اختلاف بننے کے '' خطرناک اور خوفناک خواب نظر آنے لگے ہیں۔''

ایک سوال خالد مقبول صدیقی صاحب سے کہ جب ایم کیوایم جانتی تھی کہ پیپلزپارٹی وڈیروں اور جاگیرداروں کی ایسی جماعت ہے جس میں کسی کا بھلا ممکن نہیں تو پھر وہ چھ سال تک پیپلزپارٹی سے چمٹی کیوں رہی؟۔رہی سیاست میں حسب نسب تبدیل کرنے کی بات تو جب ایک ایٹمی ملک کی سربراہی کی اُمید ہو تو پھر ایک کیا ، ہزار زرداریوں کو بھی بھٹو بنایا جا سکتا ہے۔ویسے بھی پاکستان میں موروثیت کا پیمانہ ہم خود ہی مقرر کرتے ہیں اِس لیے بھٹو کا وارث بھٹو ہونا ضروری نہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ ملک پر حکمرانی کرنے والا ''خاندانِ حاکماں'' کا ہی کوئی فرد ہو۔اِس خاندان کی تین نسلیں تو ہم پر حکمرانی کر چکیں ،اب چوتھی نسل تیار ہے۔دیکھیں اب حمزہ شہباز ، مریم نواز

بلاول زرداری، سلیمان خاں، قاسم خاں، حسن محی الدین، حسین محی الدین اور مونس الٰہی میں سے کس کے سَر پر اقتدار کا ہُما بیٹھتا ہے۔ بلاول زرداری کو میدانِ سیاست میں ابھرتے ہوئے دیکھ کر کپتان صاحب نے بھی اپنے دونوں بیٹوں، سلیمان خاں اور قاسم خاں کو پہلو میں بٹھا کر یہ اعلان کر دیا کہ میاں نواز شریف کے استعفےٰ تک وہ بھی دھرنے میں ہی رہیں گے۔ علامہ قادری بھلا کسی سے کیوں پیچھے رہتے، اُنھوں نے بھی مینارِ پاکستان کے جلسے میں اپنے بیٹوں حسن محی الدین اور حسین محی الدین کو خوش آمدید کہہ دیا۔ چودھری برادران نے مونس الٰہی کی سربراہی میں کمیٹی قائم کر دی جو قاف لیگ کے جلسوں اور ریلیوں کا اہتمام کرے گی۔ حمزہ شہباز اور مریم نواز تو پہلے ہی سیاسی اکھاڑے میں موجود ہیں البتہ شیخ رشید احمد اور الطاف بھائی اِس معاملے میں پیچھے رہ گئے۔ شیخ صاحب نے تو شادی ہی نہیں کی اور الطاف بھائی کی بیٹی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اب اگلے الیکشن میں قوم انہی رہنماؤں کے حق اور مخالفت میں "آوے ای آوے" اور جاوے ای جاوے" کے نعرے لگاتی نظر آئے گی تاکہ سوہنی دھرتی کو قدم قدم آباد" رکھا جا سکے۔

گمشدہ آئین کی تلاش

56 اور 62 کے آئین کے بعد پارلیمنٹ نے 1973ء میں متفقہ آئین پاس کیا جسے آج بھی ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی کاوشوں کا ثمر کہا جاتا ہے۔ پیپلز پارٹی جب بھٹو مرحوم کے کارنامے گنوانے پہ آتی ہے تو سب سے پہلے اسی آئین کا بڑے فخر سے ذکر کرتی ہے ۔ہم نے اِس آئین کا ذکر تو بار بار سُنا تھا لیکن دیدار کبھی نہیں کیا۔ایک بار مَن میں آئی کہ ''ویہلے'' بیٹھنے سے بہتر ہے کہ آئین کا دیدار ہی کر لیا جائے لیکن جب تلاش شروع کی تو پتہ چلا کہ یہ آجکل مفقودالخبر ہے۔ویسے بھی بقول ضیاء الحق مرحوم یہ سو صفحے کی ایک فضول سی کتاب ہے جس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو برطانوی جمہوریت میں ''تاجِ برطانیہ'' کی ہے۔اسی لیے اِس کو کوئی سیاستدان پڑھنے کی کوشش کرتا ہے نہ تجزیہ نگار اور نہ ہی کوئی مذہبی رہنما۔ شنید ہے کہ اِس آئین کے 283 آرٹیکلز ہیں جن میں سے کسی ایک پر بھی عمل کرنا ہم ''کسرِ شان'' سمجھتے ہیں ۔اگر کہیں بہت مجبوری آن پڑے تو ہم اِس کو الماری میں بند کرکے اُس پر ''نظریۂ ضرورت'' کا بھاری بھر کم تالا لگا دیتے ہیں ۔ بیس سالوں تک تو ضیاء الحق اور پرویز مشرف نے اِس آئین کو ''لفٹ'' نہیں کروائی اور نظریۂ ضرورت سے ہی کام چلاتے رہے لیکن سیاسی رہنماؤں نے بھی اِس سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ وہ بھی جب جی چاہتا ہے اِس میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں

کرتے رہتے ہیں، گویا آئین نہ ہوا، موم کی ناک ہوا کہ جس طرف جی چاہا موڑ لیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا آئین وہ بھینس ہے جو ہر ''تگڑے'' کی لاٹھی کے تابع ہے اسی لیے ہر کسی کا اپنا اپنا آئین ہے۔

ایک آئین طالبان نے دیا جس کی بنیاد قتل و غارت اور تباہی و بربادی ٹھہری۔ اِس آئین میں شریعت کا ''تڑکا'' لگا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ معصوم بچوں عورتوں اور بوڑھوں کا قتل نہ صرف جائز بلکہ عین اسلام ہے۔ آجکل افواجِ پاکستان کے جری جوان اِس ''طالبانی آئین'' کا قلع قمع کرنے میں مصروف ہیں اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم اِس آئین سے تو جلد چھٹکارا مل جائے گا۔ ایک آئین لندن میں بیٹھی ملالہ مرتب کر رہی ہے جس میں ملعون رشدی اور احمدیوں سے ہمدردی اور پاک فوج سے بیزاری کے آرٹیکلز شامل کیے جا رہے ہیں۔ ملالہ کے آئین میں حدود آرڈیننس کی کوئی گنجائش ہے نہ شاتمِ رسول کو سزا دینے کی اور نہ ہی اسلامی نظریاتی کونسل کی۔ ملالہ کا آئین اِس لحاظ سے بہت طاقتور اور خطرناک ہے کہ پورا یورپ اور امریکہ اُس کی پُشت پر ہے۔ اگر کسی نے اِس آئین کو چھیڑنے کی کوشش کی تو اُس کو پتھر کے زمانے میں دھکیلنے کی دھمکی برقرار ہے۔

ایک آئین علامہ طاہر القادری کا بھی ہے جسے ''کنٹینر آئین'' کہا جا سکتا ہے۔ اِس

آئین کی بنیاد ''لمبی لمبی چھوڑنے'' پر رکھی گئی ہے اور پچھلے 75 دنوں میں یہ آئین نہ صرف علامہ کے عقیدت مندوں بلکہ مخالفین کو بھی ازبَر ہو چکا ہے۔ مولانا ایسے سندر سپنے دکھاتے ہیں کہ پھر وہی گھسا پِٹا لطیفہ یاد آ جاتا ہے کہ بھوکی بلّی چوہے کے انتظار میں تھی لیکن چوہا اپنے بِل سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ تنگ آ کر بلّی نے چوہے کو مخاطب کرکے کہا ''بھانجے! اگر تم اِس بِل سے نکل کر اُس بِل تک جاؤ تو پانچ سو روپیہ انعام دوں گی''۔ چوہے نے لالچ میں آ کر بِل سے سر باہر نکالا لیکن پھر فوراً ہی اندر کر لیا۔ بلی نے پوچھا ''بھانجے کیا ہوا؟''۔ چوہے نے جواب دیا ''خالہ! پیسے بوہتے تے پینڈا تھوڑا، کوئی چکر اے''۔ حضرت بھی قوم کو لالچ تو بہت دے رہے ہیں اور اُن کی اقتدار کی بھوک تو ''بھوکی بلّی'' سے بھی زیادہ ہے لیکن سوائے عقیدت مندوں کے اُن کی باتوں پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں۔ اب اُنہوں نے عقیدت مندوں کی مضبوطی کے لیے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اُن کے پاس ''جِنّات'' ہیں جو اُنہیں پوری دُنیا کی خبریں پہنچاتے رہتے ہیں۔ اِس لیے اگر کوئی خبر جھوٹی نکلے تو اُسے کسی شرارتی جِن کی شرارت سمجھا جائے۔ یوں تو مریدین اپنے مُرشد پر ''اَنّے وا'' اعتماد کرتے ہیں لیکن وہ اُس وقت سے کچھ بد دِل ہو گئے ہیں جب سے مولانا نے ووٹ اور سپورٹ کے ساتھ ''نوٹ'' بھی مانگنے شروع کر دیئے ہیں۔ مولانا کے عقیدت مند تو اِس آس میں اُن کا ساتھ دے رہے تھے کہ اُن کی روٹی روزی کا بندوبست ہونے والا ہے لیکن مولانا نے تو اُلٹا نوٹ ہی

مانگنے شروع کر دیئے۔دھرنے کے خاتمے پر ایک خاتون پریشانی کے عالم میں کہہ رہی تھی کہ وہ تو دھرنے میں اِس لیے آئی تھی کہ اُس کے کھانے پینے کا بندوبست ہو جائے گا ۔ستّر دِن تو آرام سے گزر گئے لیکن اب مولانا نے دھرنے کے خاتمے کا اعلان کر دیا ہے۔اب روٹی کہاں سے ملے گی؟۔ہم سمجھتے ہیں کہ علامہ نے اچانک دھرنے کے خاتمے کا اعلان کرکے نہ صرف کپتان صاحب بلکہ عقیدت مندوں کے بھی دل توڑ دیئے ہیں ۔شاید اسی لیے اب کپتان صاحب نے بھی ''نوٹ'' مانگنے شروع کر دیئے ہیں تاکہ مولانا کو کچھ تو مالی نقصان پہنچے۔ہم نے تو اپنے ایک کالم میں بہت پہلے یہ خدشہ ظاہر کر دیا تھا کہ ''دو مُلّاؤں میں مُرغی حرام'' کا سانحہ کسی وقت بھی پیش آ سکتا ہے۔لگتا ہے کہ ''مسٹر اور مُلّا'' اب اُسی طرف محوِ سفر ہیں۔پتہ نہیں حضرت کو اچانک یہ کیا سوجھی کہ مقصد کے حصول تک دھرنا ختم نہ کرنے کے بار بار دعوؤں کے باوجود اچانک کہہ دیا کہ ''سامان سمیٹو اور گھر جاؤ''۔سونامیے کہتے ہیں کہ مولانا کی نواز لیگ سے ڈیل ہو گئی ہے اور وہ بِک گئے لیکن نواز لیگ کے صدیق الفاروق کہتے ہیں کہ مولانا کو ''غارِ حرا'' سے حکم آیا تھا کہ میاں نواز شریف آپ کو کندھوں پر بٹھا کر غارِ حرا تک لے گئے تھے اِس لیے اِس احسان کا بدلہ اتارتے ہوئے دھرنا ختم کر دو۔ہو سکتا ہے کہ صدیق الفاروق صاحب کی بات سچ ہی ہو کیونکہ مولانا فضل الرحمٰن بھی کہتے ہیں کہ علامہ صاحب شیخ الاسلام نہیں ''شیخ الالہام''ہیں۔مولانا فضل الرحمٰن تو یہ بھی کہتے ہیں کہ دھرنے تو

دِن کو ہوتے ہیں، رات کو تو مُجرے ہوتے ہیں لیکن ہمیں اِس سے اتفاق نہیں کیونکہ زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے۔اب راتوں کو بھی ''دھرنے'' ہی ہوتے ہیں۔
جب ہم نے 73 کے آئین کی تلاش میں بھٹو مرحوم کے وارثوں کو بھی کھنگالنے کی کوشش کی تو ہم پر اُس وقت حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب پتہ چلا کہ بھٹو مرحوم کا خود ساختہ'' وارث بلاول تو خود اِس آئین کا باغی ہے۔ہم نے واقفانِ حال سے'' استفسار کیا تو جواب آیا کہ ''ہر کہ آمد، عمارتِ نَو ساخت''۔ بلاول تو میدانِ سیاست میں آیا ہی اِس لیے ہے کہ سارے'' نقشِ کہن'' مٹا دے۔اسی لیے تو اُس نے اپنے ٹویٹ میں لکھا'' میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں پاکستان کو ایک وزیرِ اعظم مسیحی کمیونٹی سے بھی ملے''۔ بھٹو مرحوم تو بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ 73 کے آئین میں جتنی اسلامی شقیں ہیں اتنی دُنیا کے کسی اسلامی ملک کے آئین میں نہیں۔اُنھوں نے قومی اسمبلی میں اپنے خطاب میں اسلامی شقوں کو آئین کی بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ شقیں اسلامی روایات کی ضامن ہوں گی۔یہ بھٹو کا ہی آئین ہے جس میں درج ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا صدر یا وزیرِ اعظم صرف مسلمان ہی بن سکتا ہے لیکن نو وارد و نَوخیز بلاول اِسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔یہ بلاول کے نانا کا آئین ہے اِس لیے اُسے آئین کی بنیاد تک تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ابھی تو بلاول نے زبانی نئے آئین کی بنیاد رکھی ہے، آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا۔۔۔ حرفِ آخر یہ کہ ہم

گمشدہ آئین کی تلاش میں ہیں جسے ملے وہ ہمیں ضرور خبر کر دے اور اگر آئین خود پڑھے
تو گھر لوٹ آئے ، ہم اُس کے لیے بہت اُداس ہیں ۔

پیپلز پارٹی کی تگ ودَو

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

اندازِ سیاست خواہ کیسا بھی ہو، تنقید و تنقیص اور تعریف کی خواہ کتنی بھی بوچھاڑ ہو، ہمارا حسنِ ظن یہی ہے کہ محترم عمران خاں صاحب محبِ وطن بھی ہیں اور اُن میں کچھ کر گزرنے کی اُمنگ بھی تاحال جواں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ جذبات کے بحرِ بے کنار میں یوں بہتے چلے جارہے ہیں کہ ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں''۔بقراط نے کہا ''قدرت نے دماغ کو دِل کا امام بنایا ہے اِس لیے جذبات کو ہر حالت میں عقل کے تابع رکھنا لازم ہے لیکن خاں صاحب نے ہمیشہ دل کی سُنی، دماغ کی نہیں۔ اگر اُنھوں نے گزرتی ساعتوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے حصولِ منزل کو جزوِ ایقان بنایا ہوتا تو لاریب وہ آج نہیں تو کل کامیابی سے ضرور ہمکنار ہوتے لیکن جذبات کی رو میں بہہ کر وہ بہت کچھ گنوا بیٹھے اور بچا کھچا بھی داؤ پہ لگائے بیٹھے ہیں ۔ تحریکِ انصاف نے 2013ء کے انتخابات میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی اور ووٹوں کی تعداد کے لحاظ سے پیپلز پارٹی کو پیچھے چھوڑتے ہوئے پاکستان کی دوسری بڑی سیاسی قوت بن کر اُبھری۔ اگر وہ پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالنے کی زحمت کر لیتے

تو اُن پر عیاں ہو جاتا کہ ''امپائر'' کی انگلی ہمیشہ اپنے لیے ہی کھڑی ہوتی ہے کسی سیاستدان کی حمایت میں نہیں۔ نواز لیگ اور پیپلز پارٹی نے تو تاریخ سے سبق حاصل کر لیا اور تیسری قوت کا راستہ روکنے کے لیے ایک دوسرے کی حمایت کا ''غیر تحریری'' معاہدہ بھی کر لیا لیکن خاں صاحب سے چُوک ہو گئی اور وہ اپنے پہلے ہی سیاسی امتحان میں بُری طرح ناکام ہو گئے جبکہ دوسری طرف چھوٹی بڑی تمام سیاسی جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی ہو گئیں اور خاں صاحب کے حق میں ایک صدا بھی بلند نہ ہوئی۔ وجہ وہ جانتے ہی ہونگے کہ اُنہوں نے ہر سیاسی جماعت کو اپنی شدید ترین تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اتنی دوریاں پیدا کر لیں کہ کوئی اُن کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اِس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ راوی اب نواز لیگ کے لیے عیش ہی عیش لکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خاں صاحب اب بھی متوسط طبقے کے نوجوانوں میں بہت مقبول ہیں اور اُن کی یہ مقبولیت نواز لیگ کے لیے لمحہ فکریہ بھی ہے۔

تحریکِ انصاف کے دھرنوں کی ناکامی کے بعد اب پیپلز پارٹی ایک دفعہ پھر پنجاب فتح کرنے کے خواب دیکھنے لگی ہے لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ خرابیٔ بسیار کے باوجود بھی تحریکِ انصاف پنجاب میں پیپلز پارٹی سے کہیں زیادہ مقبول ہے جس کا واضح ثبوت ملتان کا ضمنی الیکشن ہے جس میں جیالوں نے پیپلز پارٹی کو بری طرح مسترد کر دیا۔ اکابرینِ پیپلز پارٹی کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ اب

اُن میں کوئی بھٹو ہے نہ بینظیر اور بلاول تو ابھی بچہ ہے۔ بجا کہ کراچی کے جلسے میں بلاول کا آہنگ بہت بلند تھا اور تقریر جوشیلی۔ وہ بار بار بھٹوازم کے نعرے بھی بلند کرتا رہا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کالج کا کوئی سٹوڈنٹ تقریری مقابلے میں حصہ لے رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے عوام کی طرف سے وہ پذیرائی نہ مل سکی جو تحریکِ انصاف کے جلسوں میں نظر آتی ہے۔ جس'' بھٹوازم'' کا پرچار بلاول زرداری نے اپنی تقریر میں کیا اُس کی بنیاد ہی روٹی، کپڑا اور مکان پر رکھی گئی تھی۔ بھٹو مرحوم اپنے اس نعرے کو عملی جامہ تو نہ پہنا سکے البتہ اُن کی کرشماتی شخصیت کا سحر برقرار رہا اور جیالوں کو یقین کہ وہ اپنا عہد ضرور ایفا کریں گے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر جیالوں کے سارے خواب توچکناچور ہو گئے البتہ یہ یقین برقرار رہا کہ اگر بھٹو زندہ رہتے تو جیالوں کے خواب حقیقت کا روپ دھار لیتے۔ بینظیر شہید کے سیاست میں قدم رکھتے ہی جیالوں کو یوں محسوس ہوا جیسے ذوالفقار علی بھٹو زندہ ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ چشمِ فلک نے آمر کی موجودگی کے باوجود بینظیر کا فقید المثال استقبال دیکھا۔ محترمہ بینظیر اپنے والد کی کربناک موت کو اپنی سیاست کا محور و مرکز بنا کر ''زندہ ہے بھٹو زندہ ہے'' جیسے جذباتی نعروں سے جیالوں میں خونِ گرم کی لہریں موجزن کرتی رہیں اور اسٹیبلشمنٹ کی بھرپور مخالفت کے باوجود 1988ء کا انتخاب جیت گئیں۔ 1990ء میں اُن سے اقتدار چھن گیا لیکن 1993 ء میں پھر برسرِ اقتدار آ گئیں۔ 1997ء میں اُنہی کی پارٹی کے

منتخب کردہ صدر فاروق لغاری مرحوم نے اُن کی حکومت پر شدید ترین بدعنوانی کے الزامات لگا کر اُنہیں چلتا کیا۔ یہ عین حقیقت ہے کہ اپنے اِن دونوں ادوار میں بینظیر شہید جیالوں کو مطمعن نہ کر سکیں۔ 2008ء کے انتخابات سے پہلے وہ شہید کر دی گئیں اور اسی خونِ ناحق کی بدولت پیپلز پارٹی ایک دفعہ پھر برسرِ اقتدار آ گئی۔ اپنے اِس پانچ سالہ دور میں پیپلز پارٹی نے کرپشن کی انتہا کر دی اور اپنی جماعت سے مکمل طور مایوس جیالوں نے 2013ء کے انتخابات میں اُسے سندھ تک محدود کر دیا۔ اب ایک دفعہ پھر پیپلز پارٹی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اب کی بار بینظیر شہید کے بیٹے بلاول کو سامنے لایا گیا ہے تاکہ ہمدردی کا ووٹ حاصل کیا جا سکے۔ شُنید ہے کہ آصفہ زرداری بھی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میدانِ سیاست میں قدم رکھ رہی ہے۔ اپنی ساری تگ ودو کے باوجود پیپلز پارٹی اب اپنے شہیدوں کی قبروں کے طفیل ووٹ حاصل کرنے میں ناکام ہی رہے گی کیونکہ ایک تو اُس نے جیالوں کو اپنے اِس پانچ سالہ دَورِ حکومت میں انتہائی مایوس کیا اور دوسرا وہ وقت کا عنصر فراموش کر بیٹھی ہے۔ اکابرینِ پیپلز پارٹی کو یہ ذہن میں رکھنا ہو گا کہ وہ نسل جو پینتالیس سال پہلے ذوالفقار علی بھٹو کی شیدائی تھی، اب مفقود ہو چکی ہے اور اُس نسلِ کہن کی جگہ نسلِ نَو نے لے لی ہے، جس کا بھٹو مرحوم سے نہ تو کوئی تعارف ہے اور نہ ہی جذباتی رشتہ۔ یہ نسلِ نَو اب یا تو نواز لیگ کے ساتھ ہے یا پھر تحریکِ انصاف کے ساتھ۔ یہ نسلِ نَو شعور کی اُس منزل پر ہے کہ بلاول زرداری

جیسے نوجوان اُسے گمراہ کر سکتے ہیں نہ بلاول اپنے نانا ذوالفقار علی بھٹو کا نعم البدل ثابت ہوسکتا ہے اِس لیے فی الحال تو پیپلز پارٹی کی پنجاب میں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

جائیں تو جائیں کہاں

ہم تو سیاست پہ کالم لکھ لکھ کے خود چھوٹے موٹے سیاستدان بن گئے لیکن ''اصلی تے وڈے'' سیاستدانوں کی صحتِ سیاست پر ہمارے کالموں کا ''کَکھ اثر نہ ہوا۔ باوجودیکہ ہم نے اُنہیں سمجھانے کی سرتوڑ کوشش کی کہ ہم ''ارسطوِ دوراں'' ہیں اور صرف ہمارا فرمایا ہوا ہی مستند ہے لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ویسے اگر جوں رینگتی بھی تو کسی کو پتہ نہ چلتا کیونکہ اُن کے کان تو صرف سِکّوں کی جھنکار سُننے کے لیے ڈیزائن کیے گئے ہیں۔ جب ہم نے وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آخر ہمارے ''ارسطوانہ فرمودات کا اُن پر اثر کیوں نہیں ہوتا، تو انکشاف ہوا کہ وہ خود افلاطون یعنی ارسطو کے اُستاد ہیں اِس لیے ہم نے عافیت اسی میں جانی کہ اپنے مفت مشوروں کی پٹاری کو بند کرکے بیٹھ رہیں۔ ویسے بھی ہمارے ایک مہربان نے مشورہ دیا ہے کہ ''ہُن ایناں دی جان چھڈ وی دیو''۔ اُن کا مشورہ ہمارے لیے ایسے ہی حکم کا درجہ رکھتا ہے جیسے عقیدت مندوں کے لیے شیخ الاسلام، سونامیوں کے لیے عمران خاں اور متحدہ کے لیے الطاف بھائی کا حکم۔ اپنے مہربان کے مشورہ نما حکم کے مطابق ہم تو کمبل چھوڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں لیکن کمبل ہی ہمیں نہیں چھوڑتا۔ اب یہی دیکھئے ناں کہ ہمارے شیخ الاسلام نے پاکستان آتے سے

یہ اعلان کیا تھا کہ وہ کینیڈا سے اپنی جرابیں تک سمیٹ لائے ہیں اِس لیے اب کبھی واپس نہیں جائیں گے لیکن وہ ہم جیسے عقیدت مندوں کو بلکتا چھوڑ کر یورپ اور امریکہ کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ویسے ہمارا حُسنِ ظن یہی ہے کہ اُن کی جرابوں کا ایک آدھ جوڑا کینیڈا میں رہ گیا ہوگا جسے وہ واپس لانے گئے ہیں۔ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ''انقلاب'' کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی خاطر بیرونِ ملک جا رہے ہوں۔ویسے بھی ''ڈالروں میں چندہ اکٹھا کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔بہرحال ہم نے چونکہ سیاست پر ''قلم درازی'' نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے اِس لیے اِس موضوع کو یہیں چھوڑتے ہیں۔

جب ہم یہ طے کر بیٹھے کہ اب سیاست پر ''مُنہ ماری'' نہیں کرنی تو یہ سوال ہمارے سامنے پہاڑ بَن کے کھڑا ہو گیا کہ لکھیں تو لکھیں کیا۔ہمیں تو سوائے سیاست کو ''ٹھونگے'' مارنے کے اور کچھ آتا ہی نہیں ،وجہ یہ کہ ہمارے ہاں سیاسی موضوعات ایک تو تھوک کے حساب سے دستیاب ہیں اور دوسرے یہ موضوعات ہوتے گرما گرم ہیں۔اب تو ہم بھی بڑے لکھاریوں کی طرح چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے کا گُر سیکھتے جا رہے ہیں اور اللہ بھلا کرے الیکٹرانک میڈیا کا جس نے پوری قوم کو اِس فن میں طاق کر دیا ہے ۔اب تو یہ عالم ہے کہ ہر کوئی'' لنگوٹ کَس کے'' مناظرے کے لیے تیار نظر آتا ہے۔

چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے کا ایک مظاہرہ ایم کیو ایم کے ہاں اُس وقت دیکھنے کو ملا جب اُس نے لفظ ''مہاجر'' پر طوفان بپا کر دیا۔ہمارے مرنجاں مرنج قائدِ حزبِ اختلاف

سید خورشید شاہ نے لفظ مہاجر کو جس تناظر میں گالی قرار دیا وہ اُس سے یکسر مختلف تھا جس کا شور ایم کیوایم مچا رہی ہے۔شاہ صاحب نے بات ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کے متعلق کی لیکن ایم کیوایم نے اِس کی کڑیاں ہجرتِ مدینہ سے ملا کر پھڈا ڈال دیا۔ سبھی جانتے ہیں کہ جہاں آقا ﷺ کا ذکر آتا ہے وہاں ہر مسلمان جذباتی ہو جاتا ہے۔ایم کیوایم مطالبہ تو مہاجر صوبے کا کرنا چاہتی تھی جس کے لیے کوئی سندھی بھی تیار نہیں اِس لیے اُس نے پیپلزپارٹی کو ''نُکرے'' لگانے کے لیے ''کیہڑا تے کیہڑا سہی'' کر دیا۔سید خورشید شاہ صاحب کی بار بار کی وضاحت اور معذرت کے باوجود متحدہ قومی موومنٹ پر ''کُکھ'' اثر نہ ہوا اور وہ اب رائی کا پہاڑ بنانے پہ تُلی بیٹھی ہے۔ایم کیوایم کو نہیں چاہیے کہ وہ مہاجر صوبے کی خواہش کی تکمیل کے لیے مذہبی انتہا پسندی کا راستہ اختیار کرے۔ویسے بھی مہاجرین تو پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہمارے اجداد بھی ہندوستان سے ہی ہجرت کرکے پاکستان آئے۔ایم کیوایم مہاجرین کی ایک محدود اور ''مخصوص'' تعداد کی نمائندہ جماعت ہے اِس لیے وہ سارے مہاجرین کی ٹھیکیداری'' چھوڑ دے۔ویسے اکابرینِ ایم کیوایم کو اتنا تو پتہ ہی ہوگا کہ خورشید شاہ'' صاحب خود بھی مہاجر ہیں اور خانوادۂ رسول ﷺ سے تعلق رکھنے والے شاہ صاحب کے اسلاف نے تو صدیوں پہلے ہندوستان ہجرت کی تھی اوراس حوالے سے کراچی میں بسنے والے مہاجرین کا سید خورشید شاہ سے کوئی مقابلہ ہی نہیں کیونکہ وہ قدیمی مہاجر ہیں جبکہ ایم کیوایم کو پاکستان ہجرت کیے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ

دِن ہوئے ہیں۔اگر شاہ صاحب کا وہی مطلب ہوتا جو ایم کیوایم زورزبردستی اُن کے سَر تھوپنے کی کوشش کر رہی ہے تو ہم بھی ایم کیوایم کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے لیکن یہاں تو صاف عیاں ہے کہ یہ سب کچھ مہاجر صوبے کی تگ ودَو کا حصّہ ہے ۔جہاں تک مہاجر صوبے کے مطالبے کا سوال ہے تو یہ مطالبہ ہرگز ناجائز نہیں اور ایم کیوایم کو آئینی طور پر نئے صوبے کے مطالبے کا حق بھی پہنچتا ہے لیکن یہ حق آئین میں درج طریقِ کار کے مطابق ہی مِل سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ''چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے''۔ ہم بھی کچھ ایسی ہی اُلجھن میں مبتلاء ہیں۔بیٹھے تھے اِس عزمِ صمیم کے ساتھ کہ سیاسی دسترخوان کا ایک لقمہ بھی نہیں توڑنا لیکن پوری روٹی ''ڈکار'' گئے۔چلیں اپنے کالم کا رُخ پھر ''غیرسیاسی باتوں'' کی طرف موڑتے ہیں کیونکہ اگر ایم کیوایم پیپلزپارٹی سے پھڈا لیے بیٹھی ہے تے ساڈوں کی''۔خوش ہو تو نوازلیگ کہ دھرنے بھی کمزور ہوگئے اور آنکھیں دکھانے'' والی پیپلزپارٹی بھی ''وَخت''میں پڑ گئی۔لیکن نوازلیگ کو اتنا بھی خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آج کے دشمن گزرے ہوئے کل میں دوست تھے اور آنے والے کل کو اُن کا دوست بننا اظہر من الشمس کیونکہ ایک تو ''سریع الحرکت'' رحمٰن ملک ''اِن ایکشن'' ہیں اور دوسرے منظور وسان صاحب کو بھی دوستی کے خواب آنے لگے ہیں۔

نہ مِٹ سکے گا یہ خونِ ناحق

کَرب کی لہروں پہ سوار، رنج والم میں گُندھا یومِ عاشور آن پہنچا۔فضائیں سوگوار، سَر سراتی ہواؤں میں سِسکیوں کی گونج۔ قلم میں سکت نہ الفاظ کی وہ سواریاں جن پر اپنے جذبات کو سوار کرکے کربلا بھیج سکوں۔چودہ صدیاں بیت گئیں لیکن سانحۂ کربلا پر وقت کی دھول کا ایک ذرہ بھی نہ جم سکا۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ ابھی کل کی بات ہو کہ خانوادۂ رسولؐ پر پانی بند کر دیا گیا۔دریائے فرات بھی حیران وپریشان اورپشیمان کہ اگراُس کا پانی اہلِ بیت کے لیے نہیں تو پھر یہ خُشک کیوں نہیں ہو جاتا۔ 10 محرم کی صبح ، صبحِ بے نور اور شام ،شامِ غریباں۔ نانا ﷺ کے دوشِ مبارک پہ سواری کرنے والے حسینؓ ابنِ علیؓ کا سَر جونہی نیزے پر سوار ہوا، کوفیوں نے خوشی کے شادیانے بجائے۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ طاغوت فتح یاب ہوا اور ابلیسیت کامران ٹھہری لیکن ایسا کبھی ہوا نہ ہو سکتا ہے کہ ''حق'' کی ہار ہو اور ''باطل'' کی جیت اسی لیے کوفیوں کے کانوں ،آنکھوں اور دلوں پر لگی جہالت کی مہروں نے اُنہیں آسمانوں سے اترتی فرشتوں کی یہ منادی سُننے ہی نہ دی کہ

شاہ است حسینؓ ،پادشاہ است حسینؓ
دیں است حسینؓ ،دیں پناہ است حسینؓ

سَر داد، نہ داد دست دَر دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا اِلہ است حسینؓ

حسینؓ کی جیت ہوئی اور یزید ہمیشہ کے لیے لعین ٹھہرا۔ منصفِ اعلیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ ''قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے''۔ ابدی حقیقت بھی یہی ہے اور دینِ مبیں کی اصل روح بھی یہی کہ ''جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا جہاد ہے''۔ حسینؓ ابنِ علیؓ نے نہ صرف کلمۂ حق کہا بلکہ اُس پر اپنے خون کی مہرِ تصدیق بھی ثبت کر دی۔ آپؓ نے فرمایا ''جب تم جان لو کہ تم حق پر ہو تو پھر جان کی پرواہ کرو نہ مال کی''۔ آپؓ پر یہ حق پوری طرح عیاں ہو چکا تھا کہ یزید لعین ہر گز اِس قابل نہیں کہ اُمتِ مسلمہ کی باگ ڈور اُس کے سپرد کر دی جائے۔ وہ کسی ذاتی منفعت کے لیے نہیں، نانا کے دین کو بچانے نکلے تھے، اسی لیے اُنھوں نے فرمایا ''مجھ جیسا کوئی یزید کی بیعت نہیں کر سکتا''۔ یہی وہ ابدی وآفاقی پیغام تھا جسے سیّد الشہدا نے اپنے خون سے رقم کیا۔ یہ خونِ حسینؓ ہی کی دین ہے کہ حسینیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عدل اور یزیدیت جبر کی علامت ٹھہری ۔ نوجوانانِ جنت کے سردار حسینؓ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے اور ابلیسیت کا علمبردار یزید راندۂ درگاہ۔ سوال مگر یہ ہے کہ جس دین کو بچانے کے لیے حسینؓ ابنِ علیؓ نے اپنا پورا خاندان قُربان کر دیا، اُس دین کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا؟۔ کیا سانحۂ کربلا کا سوگ منا کر ہم نے وہ حق ادا

کر دیا جس کے لیے خانوادہ رسولؐ نے اپنے معصوم اور پاکیزہ خون سے کربلا کی ریت کو لہو رنگ کیا؟۔ کیا یہ عین حقیقت نہیں کہ یہاں گفتار کے غازی تو لاکھوں کروڑوں لیکن کردار کا غازی ایک بھی نہیں ؟۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ہم آرٹیکل 62 اور 63 سے محض اِس لیے خوفزدہ ہیں کہ یہ دینِ مبیں کے عین مطابق ہیں اور اگر سپریم کورٹ نے اِن آرٹیکلز کی اصل روح کے مطابق فیصلہ کر دیا تو ہماری اسمبلیوں میں اُلو بولنے لگیں گے ؟۔ کیا قائدِ اعظم نے یہ نہیں کہا تھا کہ اُنہیں زمین کا ایک ایسا ٹکڑا چاہیے جسے وہ اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکیں؟۔ 73 کا آئین سَر آنکھوں پر لیکن کوئی بھی مسلمان جس میں ایمان کی رَتی بھر رمق بھی باقی ہے وہ اِس آئین کو اُس وقت تک ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوگا ،جب تک اس کی ایک ایک شق قُرآن کے عین مطابق نہ ہو جائے کیونکہ ہمارے نزدیک تو قُرآن ہی مکمل ضابطۂ حیات ہے ۔ابنِ علیؓ کا درس تو یہی تھا کہ حق کی خاطر جان کی پرواہ کرو نہ مال کی لیکن حق ہے کہاں ؟۔ آجکل تو الیکٹرانک میڈیا پر واضح احکاماتِ ربی کا مذاق اُڑایا جاتا ہے ،اسلامی تعزیرات کو وحشت و بَربریت سے تعبیر کیا جاتا ہے ،اسلامی تعلیمات کو رجعت پسندی کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے اور ملّی جذبہ وجنوں کو ’’غیرت بریگیڈ‘‘ کا نام دے کر طنز کے تیر برسائے جاتے ہیں ۔اِس کے باوجود بھی دعویٰ یہ کہ ہم مسلمان ہیں اور اہلِ بیت کی محبت سے سرشار۔ کیا سانحۂ کربلا کا درس یہی ہے کہ دین کو فرقوں میں بانٹ کر ایک دوسرے پر ایسے تہمتیں دھری جائیں

کہ ’خانوادۂ رسولؐ اور ”یارانِ نبیؐ“ دو متحارک گروپوں میں منقسم نظر آنے لگیں؟۔
حقیقت تو یہی ہے کہ

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی ۔۔۔بو بکرؓ و عمر، عثمانؓ و علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبیؐ ۔۔۔کچھ فرق نہیں اِن چاروں میں

کیا کوئی بھی شخص اُس وقت تک مسلمان کہلوانے کا دعویٰ کرسکتا ہے جب تک کہ وہ خانوادۂ رسول کی محبت سے سرشار نہ ہو یا یارانِ نبیؐ کی الفت میں گرفتار نہ ہو؟۔ کیا کربلا کی عظیم قربانی کا درس یہی ہے کہ جس کو جی چاہے کافر قرار دے دو؟۔ بجائے اِس کے کہ اِس دِن کے تقاضوں کے عین مطابق ہم اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ”یومِ عاشور“ اکٹھے مِل کر منائیں، ہمارے ہاں تو یہ رواج سا ہوگیا ہے کہ جونہی محرم شروع ہوتا ہے ہم لفظی اور حقیقی تلواریں سونت لیتے ہیں۔ حکومت سب کچھ بھلا کر عزاء داروں کی حفاظت میں جُت جاتی ہے اور قومی ہاتھ دُعا کے لیے کہ اللہ تعالیٰ یہ دَس دِن خیریت سے گزار دے لیکن تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی چھوٹا یا بڑا حادثہ رونما ہو ہی جاتا ہے۔ میرا دین تو کسی بھی کلمہ گو کو کافر کہنے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے لیکن یہاں تو شیعہ سُنّی کو اور سُنی شیعہ کو بَرملا کافر بھی کہتے اور ایک دوسرے کی جان کے درپے بھی ہوتے ہیں۔ کلمہ گو دونوں ہی اور ختمِ نبوت پر ایمان رکھنے والے بھی۔ تمام انبیاء علیہ

اسلام، آسمانی کُتب، فرشتوں اور یومِ آخرت پر ایمان لانے والے بھی، پھر کافر کون ؟۔ پھر جلسے جلوسوں پر دہشت گرد حملے کرنے والے کون ؟۔ وہ کون ہیں جو کائنات کی اِس عظیم ترین قُربانی کی اصل روح کو بھلا کر اپنی مرضی کا دین بنائے بیٹھے ہیں؟۔ کیا واقعی وہ مسلمان ہیں؟۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے

یوں تو مرزا بھی ہو، سیّد بھی ہو، افغان بھی ہو
تُم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اقبالؒ اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں

یومِ عاشور ہم نے یزید کو بُرا بھلا کہتے ہوئے گزار کر گویا ''حقِ حسینیت'' ادا کر دیا۔ اب اگلے سال پھر انہی دنوں میں ہم تجدیدِ حبِ اہلِ بیت کریں گے تاکہ سند رہے کہ ہم مسلمان تھے، ہیں اور رہیں گے۔ دراصل وقت کا گھوڑا اتنی تیزی اور تیز رفتاری سے سرپٹ ہے کہ ہم بڑی مشکلوں سے عیدین، میلادالنبیؐ اور محرم کے مواقع پر اپنی یادوں کی دھول میں اَٹے ''دین'' کے لیے وقت نکال پاتے ہیں۔ شاید ہم اِن ایام کو بھی بھول ہی جاتے لیکن یہی تو وہ ایام ہیں جن میں ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ چونکہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے اِس لیے ہم بھی ''بقلم خود'' مسلمان ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' میں رہ رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر متحدہ ہندوستان کیا بُرا تھا۔ ہمارے ہاں کچھ قومی دِن بھی پائے جاتے ہیں جنہیں ہم بڑے ذوق و شوق سے منا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے وطن کی مٹی سے بہت پیار ہے۔ 23 مارچ اور 14 اگست کو ہم اپنے جذبۂ حب الوطنی کو مہمیز دیتے ہوئے ساری رات سڑکوں اور چوراہوں پر ہلّا گلّا کرتے ہیں، قائدِ اعظم ڈے ''اے قائدِ اعظم تیرا احسان ہے احسان'' گاتے گزارتے ہیں، یومِ دفاع کی آمد پر ہمارا جذبۂ جنوں اور شوقِ شہادت آسمان کی رفعتوں کو چھونے لگتا ہے اور ہم دلّی کے لال قلعے پر سبز

ہلالی پرچم لہرانے کے سندر سپنے دیکھتے ہوئے ”اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا“ گاتے رہتے ہیں البتہ 16 دسمبر (سقوطِ ڈھاکہ) ہم خاموشی سے گزار دیتے ہیں۔ دراصل یہ ہماری غیرتوں کو جھنجھوڑنے کا دِن ہے اور چونکہ ہمارا تعلق ”غیرت بریگیڈ“ سے نہیں اور نہ ہی ہم یہ مانتے ہیں کہ

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ ودَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

اِسی لیے ہم افواجِ پاکستان کے شانہ بشانہ ”متحدہ پاکستان“ کی جنگ لڑنے والے بنگلہ دیشیوں کی پھانسی کی سزاؤں کو بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ قرار دیتے ہوئے ٹال دیتے ہیں۔ ویسے بھی آجکل ہم خود اتنے ”وَخت“ میں پڑے ہوئے ہیں کہ جماعت اسلامی بنگلہ دیش کے رہنماؤں کی پھانسیوں پر مذمتی قرارداد منظور کرتے ہوئے بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ کُل مِلا کے یہ آٹھ دَس دِن ہی تو ہیں جن میں ہم نے یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ ہم پشتینی مسلمان اور غیرت مند پاکستانی ہیں۔ باقی 355 دِن ہمارے اپنے ہوتے ہیں جن میں ہم سیاست سے ثقافت تک ہر جگہ مِلاوٹ کرنے میں آزاد ہوتے ہیں جس کی بنا پر ہر جگہ کثافت ہی کثافت نظر آنے لگتی ہے لیکن ہم کسی کو ہرگز یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ ہماری ”کارستانیوں“ پر تنقید کرے۔ ارے ! ہم حضرتِ اقبالؒ کا ذکر تو بھول ہی گئے۔ ”یومِ اقبال“ بھی ہم بڑے ذوق وشوق سے مناتے ہیں حالانکہ ہمیں ایسا

کرنے کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ ہم ”درسِ اقبال“ کو مانتے ہیں نہ اُن کے ”تصورِ پاکستان“ کو۔اُنھوں نے جس پاکستان کا خواب دیکھا اور قائدِ اعظم نے جس خواب کو سچ کر دکھایا وہ تو کچھ اور ہی تھا۔اب جس پاکستان میں ہم بَس رہے ہیں اُس میں تو ہمیں اقبالؒ کے تصورات کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی ۔ ہمارے سیکولر بھائی کہتے ہیں کہ یہ تصوراتنا رجعت پسندانہ ہے کہ دَورِ جدید میں کہیں ”فِٹ“ بیٹھتا ہی نہیں۔

تصورِ اقبالؒ تو یہ ہے کہ ملوکیت ، جمہوریت ، اشتراکیت اور اشتمالیت سبھی ایسے نظام ہیں جو جسم کو تو غذا مہیا کرتے ہیں روح کو نہیں جبکہ اسلام ایسا نظامِ حیات ہے جو جسم اور روح کو یکساں غذا مہیا کرتا ہے ۔اُنھوں نے لکھا ”مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے بَدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیویٹ عقائد کا نام ہےاِس لیے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف سٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ، انفرادی ہے نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اِس کا مقصد عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے“۔اسی لیے اُنھوں نے فرمایا

نظامِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبالؒ کے تصورِ ریاست کا محور و مرکز سوشلزم ہے نہ سرمایہ دارانہ نظام۔ وہ تو ایسے کسی بھی نظام کی نہ صرف نفی کرتے ہیں بلکہ اُس سے مکمل بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کو خسارہ

لیکن ہمارے سیکولر تجزیہ نگار تو یہ کہتے ہیں کہ دین ہمارا ذاتی معاملہ ہے، اِس کا بھلا سیاست سے کیا تعلق ؟۔اُنہیں یہ خوف دامن گیر ہے کہ اگر دین کو سیاست سے الگ نہ کیا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ''مولوی'' حکومت پر قابض ہو جائیں ۔افغانستان میں جب مُلّا عمر نے اسلامی ریاست قائم کرنا چاہی تو یہی سیکولر طبقہ اُن کے شدید ترین مخالفین کی صفِ اوّل میں نظر آنے لگا کیونکہ اِن کے نزدیک اسلامی تعزیرات وحشیانہ ہیں اور شخصی آزادی بھی ایسی ہونی چاہیے جسے مادر پدر آزادی کہا جاتا ہے ۔جب نائن الیون کے بعد امریکہ نے افغانستان پر یلغار کی تو سیکولر طبقے کے سینے میں ''ٹھنڈ'' پڑ گئی اور امریکی درندگی پر اُن کے قلم خاموش ہی رہے ۔اب بھی وہ اقوامِ مغرب کی مثالیں دیتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ جب سے اِن اقوام نے دیں کو سیاست سے جُدا کیا ہے وہ ترقی کی منازل تیزی سے طے کرتی جا رہی ہیں

جبکہ اقبالؒ تو یہ کہتے ہیں کہ

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ کاری ہے

لیکن کیا کیجئے کہ یہ ''جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری'' ہی ہمارے مَن کو بھاتی ہے اور ہم اسی تہذیبِ حاضر کے اسیر ہیں جس کی بِنا اقوامِ مغرب نے ڈالی اور جس کے خلاف حضرتِ اقبالؒ نے ساری زندگی جہاد کیا لیکن اُن کے دردِ نہاں کو سمجھنے والے شاید بہت کم تھے اسی لیے اُنھوں نے کہا

اقبال اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

دامن کو ذرا دیکھ۔۔۔۔

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

میرے دوست شریف کے اندر سیاسی جرثومے ہر وقت کُلبلاتے رہتے ہیں اور بعض اوقات تو اُس کی بصارت و بصیرت انتہائی متاثر کُن ہوتی ہے۔ کل میں نے اُس کے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر محترم عمران خاں کا خطاب سُنا۔ خاں صاحب کے خطاب کے بعد شریف نے کہا کہ خاں صاحب تو اُس وقت بھی کچھ نہیں کر سکے جب اُن کے اور علامہ قادری کے دھرنوں کی دھوم تھی ،حکومت بوکھلاہٹ کا شکار اور فشارِ خون بلند تو اب 30 نومبر کو وہ کیا کر لیں گے ۔اب تو قادری صاحب کا ساتھ بھی نہیں اور، دھرنے میں بھی سو ڈیڑھ سو افراد سے زیادہ نہیں ہوتے ۔ میں نے کہا کہ ارسطو کا قول ہے ''ہر غلطی آپ کو کچھ نہ کچھ سکھا سکتی ہے بشرطیکہ آپ سیکھنا چاہیں''۔ لیکن افسوس کہ خاں صاحب کی انا اور ضِد نے اُنہیں اپنی غلطیوں سے کچھ سیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سیاسی حلقوں میں اُن کے دھرنوں کا مذاق اُڑایا جانے لگا ہے ،پارٹی میں واضح انتشار ہے اور حکومت بھی اُن کے دھرنوں کو سیریس نہیں لے رہی۔اُنھوں نے کہا ہے کہ اگر دھاندلی کی انکوائری سپریم کورٹ کا جوڈیشل کمیشن کرے اور کمیشن میں ایم آئی اور آئی ایس آئی بھی شامل ہو تو کمیشن کی رپورٹ تک وہ دھرنا تو ختم نہیں

کریں گے لیکن نواز شریف صاحب سے استعفے کا تقاضہ بھی نہیں کریں گے۔اگر کمیشن کا فیصلہ آیا کہ دھاندلی ہوئی ہے تو میاں صاحب کو استعفیٰ دینا پڑے گا۔محترم وزیرِ اعظم تو 4 ماہ پہلے ہی انکوائری کے لیے سپریم کورٹ کو خط لکھ چکے ہیں لیکن ایک طرف تو خاں صاحب چیف جسٹس آف پاکستان محترم ناصر الملک پر بھرپور اعتماد کا اظہار کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ نواز شریف کے ہوتے ہوئے کیسے غیر جانبدار انکوائری ہو سکتی ہے اور اب تو اُنھوں نے یہ غیر آئینی مطالبہ بھی کر دیا ہے کہ کمیشن میں آئی ایس آئی اور ایم آئی بھی شامل ہو۔خاں صاحب کے اِس مطالبے سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہیں سپریم کورٹ پر بھی اعتبار نہیں اسی لیے وہ جوڈیشل کمیشن میں آئی ایس آئی اور ایم آئی کی شمولیت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ خاں صاحب نے خود ہی مراجعت کی ساری راہیں مسدود کر دی ہیں اور اب وہ اپنے پیروکاروں کے ذہنوں میں اپنے لیے ہمدردی پیدا کرنے کی خاطر ایسی شرائط پیش کر رہے ہیں جن پر عمل درآمد ناممکن ہو۔شاید وہ اِس انتظار میں ہیں کہ حکومت سانحہ ماڈل ٹاؤن جیسی کوئی حماقت کر بیٹھے تاکہ اُن کے دھرنوں میں پھر سے جان پڑ جائے۔اُدھر حکومت ایسی کسی حماقت کے ''موڈ''میں نظر نہیں آتی اِس لیے نظر یہی آتا ہے کہ خاں صاحب کی نرگسیت ،انا، ضد اور غصّہ اُن کی ندامت پر ختم ہوگا۔شریف نے کہا ''لیکن خاں صاحب کے جلسوں میں تو ٹھیک ٹھاک رونق ہوتی ہے اور مجمع بھی چارج''۔میں نے کہا کہ عطاالله شاہ بخاری کہا کرتے

تھے ''لوگ میری تقریر سُننے کے لیے جوق در جوق آتے ہیں لیکن ووٹ جناحؒ کو دے آتے ہیں''۔پاکستان کی انتخابی تاریخ سے عیاں ہے کہ جلسے جلوسوں اور ریلیوں سے الیکشن نہیں جیتے جا سکتے۔شریف نے کہا ''خاں صاحب سمیت ملک کی تقدیر بدلنے کے دعوے تو سبھی کرتے ہیں لیکن آج تک بدل تو کوئی بھی نہیں سکا''۔میں نے کہا کہ یہ بجا کہ ملک کی تقدیر کوئی نہ بدل سکا۔خاں صاحب نے بھی چھ ماہ میں خیبر پختونخوا کی تقدیر بدلنے کا اعلان کیا لیکن اٹھارہ ماہ گزرنے کا باوجود بھی معاملہ جوں کا توں ہے۔بد قسمتی سے ہمیں ایسا کوئی رہنما نہیں ملا جو ملک کی تقدیر بدل سکے۔ساٹھ کی دہائی میں کوریا کی ایکسپورٹ ساٹھ ملین اور پاکستان کی دو سو ملین ڈالر تھی۔تب کوریا کے ماہرین کی ایک ٹیم پاکستان سے یہ سیکھنے کے لیے آئی کہ پاکستان کی معاشی ترقی کا راز کیا ہے۔آج کوریا کی ایکسپورٹ لگ بھگ چھ سو بلین ڈالر اور پاکستان کی صرف دو سو بلین ڈالر۔جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پاکستان 35 سالوں تک آمریت کے دیوِ استبداد کے جبڑوں میں رہا۔اسی دوران بھارت سے دو جنگیں بھی ہوئیں اور ملک بھی دو ٹکڑے ہوا لیکن سیاسی جماعتوں نے بھی معاشی میدان میں کوئی کارنامہ سرانجام نہ دیا۔چشمِ بینا حسرت ویاس کی تصویر بنی سب کچھ دیکھتی رہی لیکن صاحبانِ مکروریا اپنی ہی جھولیاں بھرتے رہے ۔جب اُمید کی کرن پھوٹی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ میری دھرتی کی بے دَم مامتا کی فریاد سُنی جانے والی ہے۔دستِ طلب پر اُگتی محرومیوں کی جگہ اُمیدوں کے پھول کھلنے والے ہیں اور

کاسۂ اُمید لبالب ہونے والا ہے تو خاں صاحب اور قادری صاحب ترقی کی راہ میں سدِ سکندری بن گئے۔ اُنھوں نے قوم کو مایوسیوں اور محرومیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیلنے کی کوشش تو کی لیکن باشعور قوم نے اُنہیں بُری طرح مسترد کر دیا۔ چین کے صدر تو دھرنوں کی وجہ سے پاکستان نہ آ سکے لیکن میاں نواز شریف 12 نشستوں والے چھوٹے طیارے میں انتہائی مختصر وفد کے ساتھ چین جا پہنچے اور کامیابیاں سمیٹ لائے۔ چینی حکومت کے ساتھ 45 ارب ڈالر کی انویسٹمنٹ کے 19 معاہدے ہوئے اور چینی قیادت نے پاکستان کے ساتھ لازوال دوستی کی تجدید کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی ساری ترقی اور معاشی استحکام چین کی حکمتِ عملی کا بنیادی ستون ہے"۔ چینی" صدر شی جن پنگ نے پاکستان کو "آہنی دوست" قرار دیتے ہوئے کہا "چین پاکستان کی ترقی و خوشحالی میں ہر ممکن تعاون کرے گا اور مستقبل میں دونوں ملکوں کی دوستی مزید مضبوط ہوگی"۔ چینی قیادت نے پاکستان کو آہنی دوست اُس وقت قرار دیا جب پاکستان کو اِس کی اشد ضرورت تھی۔ امریکی وزارتِ دفاع کی حالیہ اشتعال انگیز رپورٹ اور بھارتی ریشہ دوانیوں کے تناظر میں چین کا پاکستان کے ساتھ لازوال دوستی کا عہد کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ اگر چین کے ساتھ کیے گئے معاہدوں پر عمل درآمد ہو گیا تو پھر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی تقدیر بدل جائے گی اور غربت و افلاس قصۂ پارینہ۔ محبِ وطن عمران خاں صاحب سے قوم یہی توقع کرتی ہے کہ وہ اپنے دھرنے ختم کر کے ترقی کے اِس سفر میں اپنا بھرپور

حصہ ڈالیں۔

پھر کھڑاک ہونے کو ہے

شنید ہے کہ مُرشد 16 نومبر کو اپنے وطن کینیڈا سے آبائی وطن تشریف لا رہے ہیں۔ ہم ابھی تک اِس مخمصے میں ہیں کہ مُرشد پاکستان میں ''مہاجر'' ہوتے ہیں یا کینیڈا میں ۔یہ مخمصہ تو صرف ایم کیوایم والے ہی دور کر سکتے ہیں کیونکہ وہ لفظ ''مہاجر'' پر اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں لیکن ہم تو ایم کیوایم کی ''بڑھکوں'' سے اتنے خوفزدہ ہیں کہ اُن سے پوچھنے کی جسارت بھی نہیں کر سکتے ۔کچھ بَدبخت کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام ''کینیڈوی'' ہی ہیں اسی لیے تو وہ ''ڈیل'' کے پیسے ''ٹھکرے'' لگانے کینیڈا گئے اور اب سانحہ ماڈل ٹاؤن میں جاں بحق ہونے والوں کی ''دیت'' وصول کرنے آرہے ہیں ۔جونہی حکمرانوں نے اُن کا حساب بیباک کیا وہ واپس کینیڈا پرواز کر جائیں گے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ مُرشد خود کہہ چکے ہیں کہ جو ڈیل ثابت کر دے اُسے 5 کروڑ روپے انعام دیا جائے گا اور یہ تو اظہرمِن الشمس ہے کہ مُرشد نے کبھی ''جھوٹ'' بولا نہیں بولا البتہ وہ یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز''۔شاید اسی لیے انہوں نے پہلے تو یہ فرمایا کہ انقلاب تک دھرنا جاری رہے گا اور جو دھرنے سے اُٹھ کر جائے اُسے شہید کر دیا جائے لیکن جب اُنہیں دال گلتی نظر نہ آئی اور وہ محسوس کرنے لگے کہ دھرنا محض کارِبیکار ہے

تو اُنہوں نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے اپنے ''چھوٹے بھائی'' سے مشورہ کیے بغیر دھرنا ختم کرکے کھسک لینا ہی مناسب جانا۔ مولانا تو ''پھُر'' ہوگئے لیکن خاں صاحب تاحال ڈی چوک اسلام آباد میں ڈٹے ہوئے ہیں اور تب تک ڈٹے رہیں گے جب تک یا تو وزیرِ اعظم استعفیٰ نہیں دے دیتے یا پھر تحریکِ انصاف ریزہ ریزہ ہو کر بکھر نہیں جاتی ۔ہمارے وزیرِ اعظم صاحب بھی عجیب ہیں ۔اگر اُن کے اندر بقدرِ اشکِ بُلبُل بھی جذبہ حب الوطنی موجزن ہوتا تو وہ ایک انتہائی محبِ وطن جماعت کو بکھرنے سے بچانے کے لیے ہی استعفیٰ دے دیتے لیکن وہ استعفیٰ دینے کی بجائے چین اور جرمنی کی ''سیر'' کو نکل گئے۔ اب ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق خاں صاحب نے رحیم یار خاں کے جلسے میں لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ 30 نومبر کے بعد دھرنا پُر امن نہیں رہے گا۔ ہم جو 30 نومبر کے دھرنے میں شمولیت کے لیے کمربستہ تھے اب یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ اگر حکومت نے ''کُٹنے سیکنے'' کا پروگرام بنا لیا تو پھر ہمارا کیا بنے گا ؟۔ ویسے ہمیں یقین ہے کہ ہماری شمولیت کے بغیر بھی ''سونامی'' نے سب کچھ بہا لے جانا ہے ، یہ کوئی پیپلز پارٹی والی ''نیلوفر'' نہیں جو کناروں پر پہنچنے سے پہلے ہی دَم توڑ دے ۔ یہ تو ایسی ''پہنچی ہوئی شئے ہے جس کے آگے ''کترینہ'' اور ''ریٹا'' کی بھی کوئی حیثیت نہیں اِس لیے طے ہے کہ ہماری سونامی نیا پاکستان بنا کر ہی دَم لے گی ۔جب ہماری کامیابی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے تو پھر 30 نومبر کے دھرنے میں ہماری شمولیت یا عدم شمولیت سے ''کچھ'' اثر نہیں

پڑنے والا۔ اب ہم 30 نومبر کا سارا دِن ٹی وی کے آگے بیٹھ کر ''گو نواز گو'' کے نعرے لگاتے رہیں گے ۔اسے کہتے ہیں ''ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آئے''۔

ہمارے کپتان صاحب نے اپنی تقریر میں حکومت سے کچھ گلے شکوے بھی کیے ہیں ۔اُنھوں نے دُکھی دُکھی سے لہجے میں فرمایا کہ حکومت نے اُن کے بنی گالہ کے گھر کی بجلی کاٹ دی ہے اوراب وہ ''موم بتّی'' چلا کر گزارا کر رہے ہیں ۔جب سے ہم نے یہ سُنا ہے ،ہمارا خون متواتر کھَولتا جا رہا ہے ۔ہمارے گھر میں ایک ننھّامُنّا جنریٹر پڑا ہے جسے ہم کسی نہ کسی طریقے سے بنی گالہ پہنچا ہی دیں گے لیکن کہے دیتے ہیں کہ حکمران اُتنا ہی ظلم کریں جتنا کہ وہ سہہ سکیں ۔ویسے حیرت ہے کہ محترم جہانگیر ترین اپنا طیارہ تو خاں صاحب کو دے سکتے ہیں اور بُلٹ پروف گاڑی بھی تو کیا ایک جنریٹر خرید کر نہیں دے سکتے ؟۔خاں صاحب نے یہ شکوہ بھی کیا ہے کہ حکومت اُن سے مشورہ کیے بغیر ہر کام اندر واندری'' کر لیتی ہے۔ حکومت نے جسے صدر بنایا ہے اُنہیں اُس کا نام بھی یاد نہیں'' ۔یہ حکومت کی دوسری بڑی زیادتی ہے ۔اگر وہ خاں صاحب سے مشورہ کر لیتی تو یقیناً محترم ممنون حسین صاحب سے بہتر ''چوائس'' مِل جاتی اور عین ممکن ہے کہ خاں صاحب محترمہ شیریں مزاری کا نام تجویز کر دیتے کیونکہ خاں صاحب کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ تحریکِ انصاف وہ واحد جماعت ہے جس نے خواتین میں سیاسی شعور

بیدار کیا۔ ہم تو مانتے ہیں کہ ایسا ہی ہے لیکن پیپلز پارٹی والے کہتے ہیں کہ خواتین میں شعور پیدا کرنے والی صرف پیپلز پارٹی ہی ہے جس نے محترمہ بینظیر شہید کو پاکستان کی پہلی خاتون وزیرِ اعظم بنایا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر خاں صاحب کا دعویٰ سچ ہے تو پھر وہ یہ اعلان بھی کر دیں کہ اگر تحریکِ انصاف ''کبھی'' برسرِ اقتدار آئی تو کسی خاتون رُکن کو ہی وزارتِ عظمیٰ کا منصب عطا کیا جائے گا۔ خاں صاحب نے یہ گلہ بھی کیا کہ وزیرِ اعظم جب بھی بیرونی دورے پر جاتے ہیں اپنے ساتھ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ شہباز شریف کو لے جاتے ہیں، خیبر پختونخوا کے وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک اُنہیں کیوں یاد نہیں رہتے۔ جوابِ آں غزل کے طور پر محترم پرویز رشید صاحب نے فرمایا کہ شہباز شریف صاحب صنعتکار اور معاشی میدان کے ماہر کھلاڑی۔ اسی لیے وزیرِ اعظم صاحب چین کے دورے میں اُنہیں ساتھ لے کر گئے ہیں۔ اگر چین میں کوئی ثقافتی پروگرام ہوا تو وہ وعدہ کرتے ہیں کہ پرویز خٹک صاحب کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ سوال مگر یہ ہے کہ اگر ثقافتی پروگرام میں کوئی میوزیکل کنسرٹ بھی ہوا تو خٹک صاحب تو تھوڑے بہت ہاتھ چلا کر گزارا کر لیں گے لیکن پرویز رشید صاحب کیا کریں گے؟۔ ویسے پرویز رشید صاحب کے اندر آجکل رانا ثناء اللہ اور راجہ ریاض کی روحیں حلول کر چکی ہیں اسی لیے وہ ''اَوکھی اَوکھی'' باتیں کرنے لگے ہیں جو جلتی پر تیل کا کام دے رہی ہیں۔ پرویز رشید صاحب کی ایسی ہی ''اَوکھی'' باتوں سے تنگ آکر خاں صاحب نے بھی کہہ دیا کہ دھاندلی کی تحقیقات کے لیے سپریم

کورٹ کا ایسا جوڈیشل کمیشن بنے جس میں آئی ایس آئی اور ایم آئی کے نمائندے بھی شامل ہوں۔اب حکومت ایک دفعہ پھر ''وخت'' میں پڑ گئی ہے کیونکہ آئین ایسے کسی جوڈیشل کمیشن کی اجازت نہیں دیتا اور ایسے جوڈیشل کمیشن کے بغیر خاں صاحب دھرنا ختم کرنے کو تیار نہیں۔

اُمید بہار رکھ

عشروں سے اقتدار پر قابض وہی سٹیٹس کو کے نمائندے ہیں جن کے اجداد یا تو پاکستان کے مخالف تھے یا پھر حصولِ پاکستان کی جدوجہد سے لا تعلق۔اسی بنا پر قومی سیاست میں "سٹیٹس کو" مضبوط سے مضبوط تر اور جمہوریت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جارہی ہے۔ہم لاکھ آزادیٔ جمہور کے ترانے گائیں، تلخ حقیقت تو یہی ہے کہ اب جمہوریت اور آمریت میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا ہے۔آمریتیں بھی آتی رہیں اور آمرانہ جمہوریتیں بھی لیکن بھوکوں مرتے عوام کا بھلا کسی کے ہاتھوں نہ ہوا ۔مایوسیاں اُگتی رہیں، محرومیاں پَلتی رہیں اور اشرف المخلوقات کی حالت یہ کہ

فرشتوں نے جسے سجدہ کیا تھا
وہ کَل فُٹ پاتھ پہ مُردہ پڑا تھا

پھر سٹیٹس کو کے خلاف ایک توانا آواز اُٹھی اور حالات کے کچلے انسانوں، خصوصاً نوجوانوں نے اُس آواز پر والہانہ لبیک بھی کہا کہ وہ اپنے خون سے پَلنے والی جونکوں کو مزید مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔یہ توانا آواز عمران خاں صاحب کی تھی جو 1992ء کا ورلڈ کپ جیتنے کے بعد قومی ہیرو کا درجہ

حاصل کر چکے تھے۔ ورلڈ کپ تو ہر چار سال بعد عالمی برادری کا کوئی نہ کوئی کپتان جیت ہی جاتا ہے لیکن عمران خاں صاحب کا اصل کارنامہ تو شوکت خانم کینسر ہسپتال اور نمل یونیورسٹی ہے۔ یہ کارنامے ایسے ہیں کہ جن کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ قوم نے سوچا کہ اگر ایک تنہا شخص اپنے عزمِ صمیم کے ساتھ ایسے کارنامے سرانجام دے سکتا ہے تو یقیناً قوم کی تقدیر بھی بدل سکتا ہے۔ لاریب اُس وقت خاں صاحب کی مقبولیت سمندروں سے وسیع اور ہمالیہ سے اونچی تھی لیکن گڑبڑ وہاں ہوئی جہاں "سٹیٹس کو" کے نمائندوں اور فصلی بٹیروں نے دھڑادھڑ تحریکِ انصاف میں شمولیت اختیار کرنا شروع کی اور خاں صاحب کا رویہ ہر کسی کے لیے کچھ یوں کہ "میرا دَر کھُلا ہے، کھُلا ہی رہے گا تُمہارے لیے"۔ تب اذہان و قلوب میں شَک کے سنپولیے رینگنے لگے اور سوچوں کا محور یہ کہ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"۔ اِس کے باوجود بھی لوگوں نے سوچا کہ خاں صاحب کی قدآور شخصیت سٹیٹس کو کے اِن نمائندوں کو سیدھا کر دے گی۔ خاں صاحب نے بھی باربار یہ کہا کہ اگر سَربراہ دیانتدار ہو تو کوئی بَددیانتی کی جرات نہیں کر سکتا۔ شخصی خامیوں کے بارے میں لوگ یہی کہتے تھے کہ معصوم عن الخطا تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے قوم نے 2013ء کے انتخابات میں تحریکِ انصاف کو پاکستان کی دوسری بڑی سیاسی جماعت کے درجے پر فائز کر دیا۔ تحریکِ انصاف کو خیبر پختونخوا کی حکومت بھی ملی اور پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کی حزبِ اختلاف کی قیادت بھی۔ پہلے پہل تو اپنی اِس کامیابی پر

کپتان صاحب مطمئن بھی نظر آئے لیکن پھر ''صلاح کاروں'' کے ایسے ہتھے چڑھے کہ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں'' کی سی کیفیت ہو گئی ۔وہ کپتان کہ جنکے '' بارے میں ہم وثوق سے کہا کرتے تھے کہ اُن کی باتیں سچائی کی مہکار سے لبریز ہیں ،اُسی کپتان نے اتنے یوٹرن لیے اور ایسی زبان استعمال کرنا شروع کی کہ ندامت محسوس ہونے لگی ۔ایچی سَن اور رآکسفورڈ کے پڑھے عمران خاں ایسے تو ہر گز نہ تھے جیسے اب ہیں،پتہ نہیں یہ زہر اُگلتی زبان کس کی ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ یہ اُس صحبت کا اثر ہے جو آجکل خاں صاحب کو میسر ہے۔اسی لیے تو کہا جاتا ہے

با بداں کم نشیں کہ صحبتِ بد
گرچہ تُو پاکی ترا پلید کنند

خاں صاحب کے پہلو میں براجماں شیخ رشید نامی ایک فصلی بٹیرے کو تو ہم بھی جانتے ہیں جو انتخابات سے پہلے تک نواز لیگ میں واپسی کے لیے ہر کسی کے تلوے چاٹتا رہا لیکن جب کسی نے گھاس نہ ڈالی تو کپتان صاحب کی ''چوکیداری'' میں ہی عافیت ڈھونڈ لی ۔ننکانہ صاحب کے جلسے میں اُس نے اپنی بد زبانی اور بد کلامی کی انتہا کر دی ۔پیپلز پارٹی پر گرجتے ہوئے اُس نے کہا ''قائم علی شاہ کہتے ہیں کہ مٹھی میں بچے بھوک سے نہیں مرے ،قائم علی شاہ کو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے ۔اگر یورپ میں کوئی کُتے یا بلّی کا بچہ بھی

بھوک سے مرتا ہے تو حکومت ختم ہو جاتی ہے''۔بالکل بجا کہ عین اسلام یہی ہے اور حضرت عمرؓ تو اِس بات سے بھی لرزہ بَراندام تھے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے بھوک سے ایک کُتا بھی مَر گیا تو روزِ قیامت اُن کی پُرسش ہو گی۔سوال مگر یہ ہے کہ شیخ صاحب کا اپنا کردار کیا ہے؟۔اُن کے مربی و محسن آمر مشرف کے دَور میں مظلوموں مجبوروں اور مقہوروں کے ساتھ کون سا ظلم ہے جو روا نہیں رکھا گیا۔کتنے بے گناہ قتل ہوئے اور کتنے پاکستانیوں کو عالمی دہشت گرد امریکہ کے ہاتھوں بیچا گیا لیکن اُس وقت تو شیخ صاحب بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ پرویز مشرف کی والدہ نے اُن کو اپنا بیٹا بنا رکھا ہے۔اگر شیخ صاحب میں ذرا سی بھی شرم ہوتی تو بھلے ڈوب نہ مرتے ، کم از کم وزارت سے چمٹے تو نہ رہتے۔ننکانہ صاحب میں شیخ صاحب نے بڑھکیں لگاتے ہوئے کہا عوام کرپٹ ،چور ،ڈاکو ،بے ایمان ،کمینے ،کمینی حکومت کے خلاف 30 نومبر کو باہر'' نکلیں ، ماریں ،مَر جائیں ،جلاؤ گھیراؤ کریں''۔ قوم کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسانے والا یہ پیغام تحریکِ انصاف کے پلیٹ فارم سے دیا گیا اِس لیے لامحالہ یہی سمجھا جائے گا کہ تحریکِ انصاف قوم کو بغاوت پر اکسا رہی ہے۔میں نے ذاتی طور پر تحریکِ انصاف کے چند لوگوں سے رابطہ کرکے استفسار کیا کہ کیا تحریکِ انصاف شیخ رشید کے اِس بیان کی ذمہ داری قبول کرتی ہے؟۔مجھے خوشی ہے کہ سبھی نے اِس سے بیزاری کا اظہار کیا اور اب تو محترم عمران خاں صاحب نے بھی بہ اندازِ حکیمانہ شیخ رشید صاحب کے اِس بیان سے یہ کہہ کر لاتعلق

کا اظہار کر دیا ہے کہ ’’30 نومبر کے بعد حکومت کے خلاف جو کچھ کریں گے وہ پُرامن ہی ہوگا‘‘۔ اکابرینِ تحریکِ انصاف بھی ’’ٹاک شوز‘‘ میں شیخ صاحب کی بڑھکوں سے لاتعلقی کا اظہار ہی کرتے نظر آتے ہیں اِس لیے ہم اب بھی تحریکِ انصاف سے نااُمید نہیں۔ اگر خاں صاحب شیخ رشید جیسے فصلی بٹیروں سے جان چھڑا لیں تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملکی سیاسی تاریخ کا اثاثہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ اُمیدِ بہار رکھنے میں ہرج ہی کیا ہے۔

فیصلہ ہوگیا

پرویز مشرف آئین شکنی کیس پاکستان کی آئینی و قانونی تاریخ کا اہم ترین کیس ہے کیونکہ اِس کیس کے نتائج ہی نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ملک میں آئین کی حکمرانی ہوگی یا ''جس کی لاٹھی ،اُس کی بھینس'' کا قانون رائج ہوگا۔ یہ کیس فی الحال تو ختم نہیں ہوا لیکن خاتمے کی طرف گامزن ضرور ہوگیا۔ آئین شکنی کیس کے لیے قائم کی گئی خصوصی عدالت نے پرویز مشرف کی طرف سے دائر کردہ درخواست پر جو فیصلہ سنایا اس سے بظاہر تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ معاملہ ''ٹائیں ٹائیں فِش'' ہوگیا۔

پرویز مشرف صاحب کے وکیل فروغ نسیم نے خصوصی عدالت میں یہ درخواست دائر کی تھی کہ 3 نومبر 2007ء کی ایمرجنسی میں اُن کے ساتھ 600 فوجی اور سول معاونین بھی تھے اِس لیے اُن کو بھی شاملِ تفتیش کیا جائے۔ خصوصی عدالت نے یہ درخواست جزوی طور پر منظور کرتے ہوئے اُس وقت کے وزیرِاعظم شوکت عزیز، وزیرِ قانون زاہد حامد، چیف جسٹس آف پاکستان عبدالحمید ڈوگر اور دیگر کو بھی مقدمہ میں شامل کرنے کا حکم جاری کیا۔ خصوصی عدالت نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ اِن اصحاب کے بیانات قلمبند کرکے دو ہفتوں میں دوبارہ درخواست دائر کی

جائے۔فیصلہ سُنتے ہی پرویز مشرف کے وکیل کے مُنہ سے نعرۂ تحسین بلند ہوا اور نواز لیگ کے وکیل ''نیویں نیویں'' ہو کر عدالت سے نکل گئے۔اِس فیصلہ پر حکومتی ردِ عمل تو ظاہر نہیں ہوا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت ''وَخت''میں ضرور پڑ گئی ہوگی کیونکہ ایمرجنسی کا ڈرافٹ اُس وقت کے وزیرِ قانون زاہد حامد نے تیار کیا تھا۔یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پاکستان میں ''لوٹا کریسی''اب فَن کی شکل اختیار کر چکی ہے۔زاہد حامد نے بھی ہوا کا رُخ پہچانتے ہوئے 2013ء کے انتخاب سے پہلے نواز لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور انتخابات کے بعد وفاقی وزیر بن گئے۔ عدالتی فیصلہ آنے کے 15 منٹ بعد ہی زاہد حامد صاحب نے ''بستر بوریا''لپیٹ کر اپنا استعفیٰ وزیرِ اعظم صاحب کہ بھیج دیا ۔ہمارے وزیرِ اعظم صاحب اتنے ''دبنگ''ہیں کہ بِنا سوچے سمجھے قدم بڑھا دیتے ہیں اور جب ''وخت''میں پڑتے ہیں تو پھر گلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''لوگ کہتے تھے کہ قدم بڑھاؤ نواز شریف ہم تمہارے ساتھ ہیں لیکن جب میں نے قدم بڑھایا تو پیچھے کوئی بھی نہ تھا''۔اب بھی اُنھوں نے آئین و قانون کی حکمرانی کے شوق میں قدم تو بڑھا دیا لیکن یہ نہیں سوچا کہ اُن ''مشرفیوں''کا کیا بنے گا جو کل مشرف کے دست و بازو تھے اور آج اُنکے کاسہ لیس ۔ ہمارے ''خادمِ اعلیٰ''کے بڑے بھائی ''خادمِ اعظم'' تو پہلے ہی علامہ قادری اور کپتان صاحب کے ہاتھوں ''اوازار'' تھے اب خصوصی عدالت نے بھی کھڑاک''کر دیا۔سیانے کہتے ہیں کہ ''خود کردہ را علاج نیست'' اِس لیے موجودہ'' صورتِ حال کے تناظر میں ہم یہی

کہہ سکتے ہیں کہ

اب کیوں اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں

اِس طرح تو ہوتا ہے اِس طرح کے کاموں میں

دروغ بَر گردنِ راوی جونہی پرویز مشرف صاحب تک عدالتی فیصلے کی خبر پہنچی تو اُنہوں نے وفورِ مسرت سے طبلے اور سارنگی پر راگ ملہار چھیڑ دیا اور آخری خبریں آنے تک وہ گاتے ہی چلے جا رہے ہیں کیونکہ جانتے وہ بھی ہیں کہ اب معاملہ لمبا ہی کھنچے گا، شاید اتنا لمبا کہ ''کون جیتا ہے تیری زلف کے سَر ہونے تک''۔ سوال مگر یہ ہے کہ ہمارا آئین ہے کہاں اور قانون کی حکمرانی کِس چڑیا کا نام ہے؟۔اِس آئین و قانون کی دھجیاں بکھرتے ہم پچھلے سو دِنوں سے تو دیکھ ہی رہے تھے ،اب آئین کے محافظوں نے بھی دھماکہ کر دیا۔ ہم تو میمو گیٹ سکینڈل میں ایک مستعفی سفیر کو امریکہ سے پاکستان نہ لا سکے ، بھلا سابق وزیرِ اعظم شوکت عزیز کو کیسے لائیں گے۔ اگر خصوصی عدالت کی دیگر'' سے مراد وہ 600 افراد ہیں جنہیں پرویز مشرف صاحب نے شاملِ تفتیش کرنے'' کی درخواست کی تھی تو پھر اِس کیس کا فیصلہ اگلی صدی تک ہی ممکن ہے ۔اِس لیے ہمیں یقین ہے کہ پرویز مشرف کے ''پڑپوتوں'' کی اولاد یہ فیصلہ سُن ہی لے گی، اگر وہ بھی نہ سُن سکی تو ہم گارنٹی دیتے ہیں کہ اُن کی اولاد ضرور سُنے گی ۔اِس فیصلے کے بعد اگر کسی طالع آزما کو'' طالع آزمائی'' کا شوق چرائے تو اُسے نوید ہو کہ

پاکستانی عدالتیں ایسے فیصلے ''صدیوں'' تک کھینچ لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ سپریم کورٹ ہی سب سے ''اُچی تے وَڈی'' عدالت ہوتی ہے لیکن ہماری خصوصی عدالت نے تو اُس کے فیصلے کو بھی ''پھڑکا'' کے رکھ دیا۔ عدلیہ بحالی کے بعد 2009ء میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی سَربراہی میں سپریم کورٹ کے رُکنی فُل کورٹ نے متفقہ فیصلہ دیا تھا کہ صرف پرویز مشرف ہی 3 نومبر 2007ء 17 کی ایمرجنسی کے واحد ذمہ دار ہیں۔ فیصلے میں یہ بھی واضح طور پر لکھا گیا تھا کہ ایف آئی اے سمیت کسی بھی تحقیقاتی ادارے کی انکوائری میں کور کمانڈرز یا سول حکومت کے ملوث ہونے کا ثبوت نہیں ملا۔ دوسری دفعہ لارجر بینچ کی قیادت چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے کی اور اِس مرتبہ بھی یہی فیصلہ سامنے آیا کہ پرویز مشرف صاحب ہی 3 نومبر کی ایمرجنسی کے واحد ذمہ دار تھے۔ اب بھی خصوصی عدالت کے رُکن جسٹس یاور علی کے مطابق پرویز مشرف صاحب کے وکیل نے خصوصی عدالت میں ایسا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جس سے ثابت ہو سکے کہ 3 نومبر کی ایمرجنسی میں کوئی اور بھی ملوث تھا۔ خصوصی عدالت کے اِس فیصلے میں جسٹس یاور علی کا اختلافی نوٹ بھی شامل ہے۔ اُنھوں نے دیگر 2 اراکین کی رائے سے یکسر مختلف نوٹ لکھا۔ جسٹس یاور نے سپریم کورٹ کے فیصلے کے عین مطابق یہ لکھا ہے کہ پرویز مشرف ہی اِس اقدام کے واحد ذمہ

دار تھے۔جب سے خصوصی عدالت میں پرویز مشرف آئین شکنی کیس شروع ہوا ہے ،اس پر ''بزر جمہروں'' کے متواتر تبصرے سُن سُن کر کان پک گئے۔ہمیں تو یقین تھا کہ پرویز مشرف سزا سے نہیں بچ سکیں گے لیکن آئینی و قانونی موشگافیوں سے نابلد ہونے کے باوجود اتنی سمجھ ہمیں بھی ہے کہ پرویز مشرف صاحب پر آرٹیکل چھ کا اطلاق اب شاید ممکن نہ رہے اور اِس کیس میں بھی ''نظریۂ ضرورت'' کا ہی سہارا لینا پڑے۔

جماعتِ اسلامی کا اجتماعِ عام

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

تھَرکے مظلوموں، مجبوروں سے بے نیاز،لاکھوں مقہور آئی ڈی پیز سے لاتعلق ہوسِ اقتدار میں باہم دست وگریباں رہنماؤں نے بے یقینی ،بَداعتمادی اور افراتفری کی ایسی فضا قائم کردی کہ مایوسیوں کے اندھیرے کچھ اور گہرے ہوگئے ۔قحط الرجال کا یہ عالم کہ علم وحکمت کے سارے کواڑ بند اور اور روشنی کی ہلکی سی کرن بھی مفقود ۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابدی صداقتوں کی شمعیں روشن کرنے اور بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کرکے والے لَدچکے، ضمیر مُردہ ہوچکے، رگوں میں دوڑنے والا لہو جم چکااور اب صحنِ چمن میں کبھی موسمِ گُل آئے گا نہ بادِ نسیم کے معطر بھونکوں سے فضائیں عطربار ہونگی ۔اِس مایوس کُن ماحول اور بَددلی کی فضا میں جماعتِ اسلامی کا اجتماع تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہورہا ہے۔لاکھوں مرد وزن مینارِپاکستان میں خیمہ زن لیکن کوئی شور نہیں ،کوئی دعویٰ نہیں ،ٹریفک رواں دواں ،ماحول سنجیدہ اور رَبِّ ذوالجلال کی باتیں ۔امیرِ محترم سراج الحق کی ہر بات میں دِلی درد، کسک ،تڑپ اور کچھ کر گزرنے کی اُمنگ لیکن مارو مَرجاؤ،جلاؤ گھیراؤ سے نہ سول نافرمانی سے ،بَس تائیدِربی کی دُعا وپکار ۔یہ پیغام جابجا کہ قادرِ مطلق کے ہاں کوئی بڑا

نہیں، کوئی چھوٹا نہیں، کسی عربی کو عجمی پر فوقیت ،نہ گورے کو کالے پر مگر اعمالِ صالح

۔

آقاﷺ نے فرمایا ''تم میرے پاس حسب نسب نہیں ،اعمال لے کر آؤ''۔لیکن ہمارے ہاں تو بات حسب نسب، فلاں ابنِ فلاں اور ''پدرم سلطان بود'' سے شروع ہو کر اسی پہ ختم ہو جاتی ہے۔صرف جماعت اسلامی ہی ایسی ہے جہاں جماعت کے پانچوں امراء میں سے کسی ایک کا بھی باہمی تعلق حسب نسب یا رشتے داری پر استوار نہیں بلکہ وہی بنیاد کہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت نہ گورے کو کالے پر مگر اعمالِ صالح۔امیرِ جماعت قاضی حسین احمد مرحوم ومغفور کہا کرتے تھے کہ وہ عرصۂ دراز تک جماعت اسلامی کے لیے دریاں بچھاتے اور صفیں سیدھی کرتے رہے۔آج جماعت اسلامی کی امارت اُس شخص کے سپرد کہ جسے ایک مزدور کا بیٹا ہونے پر فخر ہے۔مینارِ پاکستان کے اجتماع میں امیرِ محترم سراج الحق نے قوم کے سامنے اپنی زندگی کا ایک ایک پرت کھول کے رکھ دیا۔2008ء کے اجتماع میں اُن کی داڑھی میں کہیں کہیں سفید بال تھے اور اب 2014ء کے اجتماع میں کہیں کہیں سیاہ۔قدرے جوان امیرِ جماعت نے جب اپنی زندگی کی کٹھن راہوں کی داستان شروع کی تو لاکھوں سامعین کی آنکھیں پُرنَم ہوتی چلی گئیں اور دُنیا کے پچیس ممالک سے آئے ہوئے وفود اُنہیں حیرت سے تکنے لگے۔جب اُنہوں نے سکول کی فیس نہ ہونے پر اپنی والدہ کی بے بسی کا ذکر کیا تو سامعین کی آنکھیں اشک بار۔اُنہوں

نے بڑے لطیف انداز میں کہا کہ اُنہیں فُٹ پاتھ پر رات گزارنے اور زمین پر بیٹھ کر کام کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ یہ دراصل اُن کا اسلامیانِ پاکستان کو پیغام تھا کہ محلوں میں رہنے والے اور مخملی بستروں پہ آرام کرنے والے بھلا کیا جانیں کہ بے کس و بے بس اور مجبور و مقہور زندگی کی کِن کٹھن راہوں سے گزرتے ہیں۔اُن کا یہ پیغام تھا کہ قوم بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ایک مِلّت میں گم ہو جائے اور قائدِاعظم کے فرمان کے عین مطابق پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ میں ڈھال دے۔وہ چاہتے ہیں کہ اشرافیہ کے دیو استبداد کو زیر کرکے پاکستان میں مدینہ منورہ کی طرز کی ایسی مثالی ریاست قائم کی جائے جو حضرت عمرؓ کے فرمان کے عین مطابق ہو کہ ”امیر المومنین صرف اُس وقت ہی گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے جب اُس کو یقین ہو جائے کہ اُس کی رعایا کو گیہوں کی روٹی میسر ہے
۔

پون صدی قبل اگست 1941ء میں مشرقی پنجاب کے شہر پٹھان کوٹ سے ایک قافلۂ سخت جاں چلا جس میں کُل 75 افراد تھے اور قافلہ سالار وہ جو حضرتِ اقبالؒ کے اِن اشعار کی عملی تصویر

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

یہ تھے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جنہیں 1953ء میں سزائے موت کا حکم ہوا، موت کی کوٹھری میں بند لیکن لوگ حیران کہ رات کے وقت اُن کی کوٹھری خراٹوں سے گونج رہی تھی۔اسی کو ''نفسِ مطمعنہ'' کہا جاتا ہے۔جرات واستقامت کے پہاڑ مُرشد مودودیؒ کے دھیمے سُروں میں نکلنے والے الفاظ کی حلیمی دلوں میں اتر جاتی اور تدبر کی طاقت سامعین کو مسحر کر لیتی ۔مجھے فخر ہے کہ میں نے یونیورسٹی کے دَور میں مُرشد کی امامت میں کئی نمازیں بھی پڑھیں اور عصر سے مغرب تک اُن کے لیکچر بھی سنے ۔اپنے پروانوں کے لیے اُن کا ہمیشہ یہی درس ہوتا کہ

گزر جا بن کے سیلِ تُند خو کوہ و بیاباں سے

گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ظالموں ، جابروں اور طاغوتی طاقتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنا تو اُن کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔ یہ مُرشد مودودی کی کاوشوں ہی کا ثمر ہے کہ دستورِ پاکستان میں قراردادِ مقاصد شامل ہوئی ، یہ الگ بات ہے کہ اُس پر عمل درآمد تاحال مفقود ہے ۔جب قافلہ سالار ایسا ہو اور منزل کا تعین بھی تو پھر ہار جیت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔جماعت اسلامی کا قافلۂ حریت بھی یہی سوچتے

ہوئے جانبِ منزل گامزن ہے کہ

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی زندگی میں ہی جماعت کی قیادت میاں طفیل محمد مرحوم کو سونپ دی۔ میاں طفیل محمد کے بعد قاضی حسین احمد امیرِ جماعت بنے، پھر سید منوّر حسن اور اب محترم سراج الحق۔ جماعت اسلامی کے طرزِ سیاست پر تو اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن اُن کے بدترین دشمنوں نے بھی آج تک نہ تو اُن کے خلوصِ نیت پر شک کیا ہے اور نہ ہی ذاتی کردار پر اُنگلی اُٹھائی ہے۔ عالمی سازشوں میں گھرے پاکستان کے لیے جماعت اسلامی کا وجود کسی نعمت سے کم نہیں کیونکہ یہی تو وہ جماعت ہے جو مایوسیوں میں گھری قوم کو اُمید کی روشنی دکھاتی اور یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ انشاء اللہ پاکستانی قوم بھی ترقی یافتہ اور باوقار بنے گی کیونکہ دینِ مبیں کے مطابق مایوسی کفر ہے۔ بَس ضرورت ہے تو صرف اتنی کہ اللہ کے بندوں پر اللہ ہی کا دیا ہوا نظام نافذ کر دیا جائے۔

ہم بھول چکے

خونی آندھیاں اُٹھ رہی ہیں، جابجا تباہی و بربادی کی خونچکاں داستانیں رقم ہو رہی ہیں اور کوچہ وبازار میں ایک عجیب افراتفری کا عالم ہے۔ لوگ جھولیاں اٹھا کر ملکی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں لیکن مستعجیب کے ہاں ہماری دعائیں بھی مستعجاب نہیں کہ ہمارے اعمال ہی ایسے ہیں اور ہم اصلاح کے لیے تیار بھی نہیں۔ اگر کہا جائے کہ رَبّ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو تو کہتے ہیں کہ امریکہ تو نظر آتا ہے مگر (نعوذباللہ) رَبّ کی رَسّی نظر نہیں آتی۔ کہا جائے کہ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے اور قُرآن آئین کی مستند ترین کتاب کہ یہ اُسی حاکمِ اعلیٰ نے تصنیف کی ہے جو ہمارا خالق بھی ہے اور مالک بھی، تو کہتے ہیں کہ انسان آسمان کی وسعتوں کو چیر چکا، ستاروں پہ کمند ڈال چکا، چاند مسخر ہو چکا لیکن یہ رجعت پسند ابھی تک زمین پر رینگ رہے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کِس قسم کے لوگ ہیں کہ جن کی فصیلِ فہم سے کوئی منادی، کوئی صدا، کوئی آواز ٹکراتی ہی نہیں۔ دِلوں پہ مہریں لگ چکیں، کان بہرے اور آنکھوں پر پردے پڑ چکے۔
چلیں ہماری نہ سنیں، تاریخ کا مطالعہ ہی کر لیں، مشرکینِ مکہ کا حال ہی جان لیں تاکہ فیصلہ تو ہو سکے کہ امان کِس نظام میں ہے۔ فسق وفجور میں ڈوبے

بچیوں کو زندہ دفن کرتے، مٹکوں میں شراب پیتے، معمولی باتوں پر قتل وغارت کا، بازار گرم کرتے، غلاموں پر بے پناہ تشدد کرکے قہقہے لگاتے مشرکینِ مکّہ۔ پھر نور کی کرنیں پھوٹیں، آقا ﷺ تشریف لائے، اللہ کا آئین اترا، اسلام پھیلا اور چشمِ فلک نے دیکھا کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب زیور سے لدی پھندی ایک عورت تنہا مکّہ سے مدینہ تک سفر کرتی ہے اور راستے میں کوئی چور، ڈاکو نہ لُٹیرا۔ ذرا آج کے معاشرے کا قبل از اسلام کے مشرکین سے موازنہ تو کیجیے، آپ کو جدیدیت کا لبادہ اوڑھنے والی، اپنی ترقی پہ نازاں یہ دُنیا اپنے اعمال وافعال میں اُن وحشی قبائل سے کہیں آگے نظر آئے گی۔ کونسا گناہ ہے جو اِس معاشرے میں پنپ نہیں رہا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان ارتقائی منازل طے کر رہا ہے یا پھر پتھر کے زمانے میں لوٹ رہا ہے؟۔ رجعت پسند کون ہے ؟۔ ہم یا وہ جو لبرل ازم کی آڑ میں ہر برائی کے حق میں دلائل تراش لیتے ہیں ۔آئین کی اسلامی شقوں پر ناک بھوں چڑھانے والے اور آرٹیکل 63/62 پر ضیاء الحق مرحوم کو کوسنے والے، سیکولر نظریات کے حامل اگر اِن آرٹیکلز سے لفظ

اسلامی'' نکال کر دُنیا کے دساتیر سے موازنہ کرکے دیکھیں تو سرِ مو فرق بھی نظر نہیں'' آئے گا، البتہ یہ فرق ضرور کہ اگر عالمی برادری کا کوئی فرد اِن ضابطوں پر عمل نہیں کرتا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے جبکہ ہم نے اپنی اسمبلیاں ایسے ہی لوگوں سے بھر لیں اور اب کہتے ہیں کہ مجبوری ہے، اگر 63/62 پر عمل کر دیا گیا تو اسمبلیوں میں اُلّو بولنے لگیں گے۔ یہی

باتیں جب امیرِ جماعت اسلامی محترم سراج الحق نے مینارِ پاکستان کے سبزہ زار میں سجائے گئے اجتماعِ عام میں کہیں تو مجھے خلفائے راشدین کا دَور یاد آنے لگا۔ جماعتِ اسلامی سے میرا ناطہ اُس وقت سے ہے جب میں محض ایک سٹوڈنٹ تھی۔ تب سے اب تک یہ جاننے کے باوجود کہ اقتدار کے ایوان ابھی جماعت سے دُور، بہت دور ہیں کیونکہ جماعت اسلامی کی ساری توجہ شہروں پر مرکوز ہے جبکہ 70 فیصد ووٹر دیہاتوں میں رہتے ہیں جہاں جماعت کا ''وَرک'' نہ ہونے کے برابر ہے اور موجودہ جمہوری نظام میں کوئی بھی جماعت اُتنی دیر تک اقتدار کے ایوانوں تک نہیں پہنچ سکتی جب تک اُس کا اثرورسوخ دیہاتوں میں نہ ہو۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود میرے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی کیونکہ اپنا تو عقیدہ بقولِ اقبالؒ یہ ہے کہ

مِلّت کے ساتھ رابطہَ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے، اُمیدِ بہار رکھ

میں اجتماع کے تینوں دِن باقاعدگی سے مینارِ پاکستان جاتی رہی۔ مینارِ پاکستان پر پاکستان کی تاریخ کا خواتین کا سب سے بڑا اجتماع دیکھ کر میرے وجود میں خوشی کی لہریں مَوجزن ہوگئیں۔ اِس اجتماع کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں انتہائی پاکیزہ ماحول میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی باتیں ہی ہوتی رہیں۔ جب امیرِ محترم نے اپنی زندگی کی کٹھن راہوں کا ذکر

چھیڑا تو اہلِ دِل کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ میں تب بھی یہی سوچ رہی تھی کہ ہم چودہ سو سال کی ساری تاریخ فراموش کر چکے۔ ہم بھول چکے کہ خندق کھودتے وقت ایک صحابی آقا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مارے بھوک کے اُس نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا ہے۔ آقا مسکرائے اور اپنا "کُرتہ" تھوڑا سا اوپر اٹھادیا، پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ ہم بھول چکے کہ خواتینِ جنت کی سردار حضرت فاطمہؓ بنتِ رسولؐ کے ہاتھوں پر چکّی پیستے پیستے آبلے پڑ جاتے تھے۔ ہم بھول چکے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کو اپنا جسم ڈھانپنے کے لیے اپنے بیٹے سے چادر مستعار لینی پڑی۔ ہم بھول چکے کہ جب قیصرِ روم کا ایلچی حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو اُس وقت حضرت عمرؓ مسجدِ نبوی کی چٹائی پر سو رہے تھے لیکن اب زمانہ بدل چکا۔ اب تو سلطانئ جمہور ہے۔ ایسی سلطانئ جمہور کہ جس میں سلطان مسرور اور جمہور مجبور و مقہور۔ اب تو قیصر و کسریٰ کی طرح ہمارے رہنماؤں کے بھی ایکڑوں پر پھیلے محل، بُلٹ پروف گاڑیاں اور قطار اندر قطار حفاظتی دستے ہیں شاید اسی لیے لوگوں کو امیرِ محترم کی باتیں عجیب لگیں کیونکہ اُن کے نزدیک تو رہنما وہ ہوتا ہے جس کی آمد سے گھنٹوں پہلے ٹریفک بند کر دی جاتی ہے، بھلا وہ شخص کیسے رہنماء ہو سکتا ہے جو فُٹ پاتھوں پر سوتا رہا ہو۔ بہر حال یہ تو طے ہے کہ بے کسوں، بے بسوں کے درد سے آشنائی تو اُسی کو ہو سکتی ہے جس نے زندگی کے کئی ماہ و سال فُٹ پاتھ پر گزارے ہوں، صبح سکول گیا ہو اور شام کو مزدوری کی ہو، سکول اور کالج کی فیس

نہ ہونے کا درد سہا ہو۔ باتیں تو سبھی سچ تھیں اور ہیں کہ آج بھی خطِ غربت سے نیچے بسنے والوں کو انہی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن سے امیرِ محترم گزرے ہیں لیکن جو لازمۂ انسانیت سے خالی ہو وہ بھلا اِس درد کو کیا جانے۔

اُنھوں نے فرمایا

ایک دفعہ پھر اسلام آباد کو ''یرغمال'' بنایا جا رہا ہے۔ دھرنوں سے قوم کو اربوں روپے کا ٹیکہ لگ چکا،اب دیکھیں 30 نومبر کو کتنے کا لگتا ہے۔خاں صاحب نے قوم سے مکمل ثبوتوں کے ساتھ 28 نومبر کی پریس کانفرنس میں انکشافات کا وعدہ کیا لیکن ''دیکھنے ہم بھی گئے پہ تماشہ نہ ہوا''۔ وہی پرانی باتیں ثبوت ایک بھی نہیں۔عارف علوی نے کہاکہ وہ ''ڈیٹا'' تودیں گے مگر ثبوت فراہم نہیں کر سکتے۔علوی صاحب کے ''انکشاف'' کے مطابق 50 لاکھ ووٹ زیادہ پرنٹ کیے گئے جو نوازلیگ کوڈالے گئے لیکن الیکشن کمیشن نے تردید کرتے ہوئے کہاکہ صرف 8 لاکھ ووٹ زیادہ پرنٹ ہوئے اورہر الیکشن میں کچھ زیادہ ووٹ ہی پرنٹ کیے جاتے ہیں۔خاں صاحب نے فرمایاکہ پری پول دھاندلی ہوئی نہ پولنگ ڈے پر،ساری دھاندلی پولنگ کے بعد آراوزنے کی''۔عرض ہے کہ میں نے اپنی سروس کے دَوران بلدیاتی سمیت ہرالیکشن میں بطورپریذائیڈنگ آفیسر کام کیا۔اِس لیے مجھے علم ہے کہ ہرپریذائیڈنگ آفیسر اپنے پولنگ سٹیشن کے نتائج کی مصدقہ کاپی ہراُمیدوارکے پولنگ ایجنٹ کو دینے کاپابند ہوتاہے۔خاں صاحب اُنہی مصدقہ نقول کی بنیادپر انتخابی نتائج کا جائزہ لے لیں،دودھ کا دودھ اورپانی کاپانی ہوجائے گا۔خاں صاحب نے فرمایاکہ وزیرِاعظم کی الیکشن والے دِن 11.20پرکی جانے والی تقریرنے نتائج

اُلٹ دیئے۔ اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر میں کہہ سکتی ہوں کہ پولنگ کا وقت ختم ہونے کے زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے بعد انتخابی نتائج پولنگ ایجنٹس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور تب تک تو ہر اُمیدوار مکمل نتائج سے آگاہ ہو چکا ہوتا ہے اِس لیے یہ الزام بے معنی 11.20 ہے ۔خاں صاحب کہتے ہیں کہ 2008ء میں 68 لاکھ ووٹ لینے والی نواز لیگ 2013ء میں ڈیڑھ کروڑ ووٹ کیسے لے گئی ؟۔ جواباً عرض ہے کہ 2002ء میں ڈیڑھ لاکھ ووٹ لینے والی تحریکِ انصاف 2013ء میں 78 لاکھ ووٹ کیسے لے گئی ؟۔ نواز لیگ نے تو تقریباً دوگنے ووٹ لیے لیکن تحریکِ انصاف تو 50 گُنا سے بھی زیادہ ووٹ لے گئی ۔کیا یہ بھی دھاندلی کا ہی شاخسانہ ہے ؟۔ مکرّر عرض ہے کہ 2008ء میں ٹَرن آؤٹ 44 فیصد اور 2013ء میں 52 فیصد رہا اور ووٹر کی تعداد بھی پہلے سے ایک کروڑ تیرہ لاکھ زیادہ تھی ۔اِسکے علاوہ میاں برادران جلاوطنی کاٹ کر الیکشن سے چند دِن پہلے پاکستان آئے اور افراتفری میں تمام حلقوں میں مناسب اُمیدوار بھی کھڑے نہ کر سکے جبکہ موجودہ انتخابات میں ہوم ورک مکمل اور میاں شہباز شریف کی پانچ سالہ محنت سب کے سامنے تھی ، جس کا ثمر اُنہیں مل گیا۔ تحریکِ انصاف سے سوال ہے کہ اُس نے ویب سائیٹ سے تسنیم نورانی کی سَربراہی میں قائم کی جانے والی کمیٹی کی رپورٹ کیوں ہٹادی جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ٹکٹیں فروخت کی گئیں اور الیکشن میں کوئی دھاندلی نہیں ہوئی ۔افلاطون نے کہا ’’سخت کلام آگ کا وہ شُعلہ ہے جو اپنا داغ چھوڑ جاتا ہے ‘‘۔ خاں صاحب کی سخت کلامی اور

الزام تراشی حدوں سے نکل چکی۔وہ جب تقریر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ربِّ کریم کا یہ فرمان بھی بھول جاتے ہیں ''تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو لوگوں پر طعن اور برائیاں کرنے کا خوگر ہو'' (الھمزۃ)۔لیکن خاں صاحب تو صرف طعنوں سے ہی کام لیتے ہیں اور بقول غالب

نکالا چاہتا ہے کام تُو طعنوں سے کیا غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

جو کپتان صاحب کی ہاں میں ہاں ملائے وہ فرشتہ باقی سب ''بَونے'' اور ''بُوزنے'' ۔اُنہوں نے پہلے تو فخرالدین جی ابراہیم ،چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور نجم سیٹھی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے لیکن الیکشن ہارنے کے بعد سبھی بے ایمان ٹھہرے ۔خاں صاحب کی ضِد پر عدلیہ کی زیرِ نگرانی انتخابات ہوئے لیکن انتخابات کے بعد خاں صاحب نے عدلیہ کے ریٹرننگ آفیسرز کے کردار کو ''شرمناک'' قرار دے دیا۔جب سپریم کورٹ نے اِس بَدزبانی پر اُنہیں طلب کر لیا تو بڑے بھولپن سے فرمادیا مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ شرمناک گالی ہوتی ہے''۔19 مئی 2014ء کو جب محترم'' تصدق حسین جیلانی چیف جسٹس تھے تو خاں صاحب نے فرمایا ''اللہ کرے ملک کو تصدق حسین جیلانی اور ناصرالملک جیسے لوگ میسر ہوں ۔اُن پر آنکھیں بند کرکے اعتبار کیا جاسکتا ہے''۔اِدھر تصدق حسین جیلانی ریٹائر ہوئے ،اُدھر خاں صاحب نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے

فرمادیا ''جیلانی صاحب! آپ اچھے آدمی ہیں لیکن ہمیں آپ بطور چیف الیکشن کمشنر قبول نہیں''۔اِن فرمودات کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے جسٹس بھگوان داس اور پھر جسٹس تصدق حسین جیلانی نے چیف الیکشن کمشنر بننے سے صاف انکار کردیا اور اب اعلیٰ عدلیہ نے بھی الیکشن کمیشن کو ریٹرننگ آفیسرز دینے سے صاف انکار کردیا ہے۔خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ وہ شیخ رشید کو اپنا ''چوکیدار'' رکھنا بھی پسند نہیں کرتے لیکن اب وہی چوکیدار ہمہ وقت اُن کے پہلو میں پایا جاتا ہے۔خاں صاحب نے تو اپنوں کو بھی نہیں بخشا جاوید ہاشمی بَددِل ہوکر تحریکِ انصاف چھوڑ گئے، خیبر پختونخوا میں اپنے اتحادی آفتاب شیرپاؤ کی جماعت کے وزراء پر کرپشن کا الزام دھر کر چھُٹی کرا دی لیکن کوئی انکوائری نہ ثبوت۔محترم سراج الحق صاحب کو کہا'' وکٹ کے دونوں طرف کھیلنا بند کریں اور بتلائیں کہ آپ تحریکِ انصاف کے ساتھ ہیں یا نواز لیگ کے ساتھ''۔مرنجاں مرنج امیرِ جماعت نے اپنے ساتھیوں کو تلقین کر دی کہ کوئی جواب نہیں دے گا۔اگر محترم سراج الحق کی جگہ کوئی اور ہوتا تو معاملہ ''گڑبڑ'' ہو جاتا کیونکہ مولانا فضل الرحمٰن نے تو حکومت گرانے کے لیے ''ڈنڈ بیٹھکیں'' بھی لگانا شروع کردی تھیں۔کپتان نے کہا میڈیا ہاؤسز لکھاری اور اینکر پرسنز، بکاؤ مال اور ضمیر فروش ہیں۔آئی بی کو اِن کے'' ضمیر خریدنے کے لیے 2 ارب 70 کروڑ روپے دیئے گئے لیکن اُنہیں یہ پتہ نہیں کہ کِس کو کتنا ملا'' ۔جب صحافیوں نے ''صحافتی ڈنڈا'' اُٹھایا تو شاہ محمود قریشی کے سمجھانے پر PFUJ کے صدر افضل بَٹ اور دیگر

اراکین کی موجودگی میں فرمایا ’’حکومت نے صحافیوں کو خریدنے کے لیے بھاری رقوم کی پیش کش کی لیکن صحافیوں نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومتی پیش کش کو ٹھوکر ماردی‘‘۔آخر میں فقط اتنا کہ خاں صاحب فرصت کے لمحات میں اپنی ’’اداؤں‘‘ پر غور فرمالیں کیونکہ بہتری اسی میں ہے۔

30 نومبر بھی گزر گیا

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

بعد از خرابیَ بسیار نواز لیگ کے میڈیا سیل کو ہوش آ ہی گیا اور اُس نے الیکٹرانک میڈیا پر بھرپور، مدلل اور مؤثر تشہیری مہم کا آغاز کر دیا۔اِس مہم میں کئی ایسے دستاویزی ثبوت پیش کیے گئے ہیں جن کی تردید اکابرینِ تحریکِ انصاف کے لیے ناممکن ہے۔اِس تشہیری مہم سے عیاں ہو جاتا ہے کہ عمران خاں صاحب کی ساری تگ ودَو کا محور و مرکز اقتدار پر قبضہ ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ نسلِ نَو کو گمراہ کرکے اُن کی طاقت سے موجودہ حکومت کا خاتمہ کر دیں۔ حصولِ مقصد کے لیے وہ ''جنگ اور محبت میں سب جائز ہے''کے فارمولے پر عمل پیرا ہیں۔اُن کی شخصیت کے اِس رُخ کا اندازہ اُن کے دھرنوں کے دَوران کی جانے والی تقاریر سے ہوا، جہاں وہ ایک ''ہیرو''کی بجائے اکھڑ، ضدّی، اناپرست اور نرگسیت کے شکار ایسے شخص کے روپ میں نظر آئے جو اِس فارمولے پر عمل پیرا ہے کہ ''جھوٹ اتنے تواتر سے بولو کہ سچ کا گماں ہونے لگے۔

14 اگست کے دھرنے کے شور میں جب علامہ طاہر القادری نے بھی دھرنے کا اعلان کر دیا تو حکومتی حلقوں میں ہلچل مچ گئی اور وزیرِ داخلہ چودھری نثار صاحب نے

بوکھلا کر پولیس، رینجرز، ایف سی اور فوج کے چالیس ہزار جوان اکٹھے کر لیے جن پر دھرنوں کے دَوران لگ بھگ ایک ارب روپے صَرف ہوئے۔ جب تک عوامی تحریک کا ساتھ رہا، دھرنوں کا کچھ نہ کچھ بھرم قائم رہا، سچ تو یہی ہے کہ دھرنا صرف علامہ قادری اور اُن کے عقید تمندوں نے دیا، خاں صاحب تو دو گھنٹوں کے لیے میوزیکل کنسرٹ میں تشریف لاتے اور پھر اپنے بنی گالہ کے محل میں تشریف لے جاتے۔ دیگر اکابرین سرینا اور میریٹ ہوٹل میں چلے جاتے، پرویز خٹک اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خیبر پختونخوا ہاؤس اور پنڈی اسلام آباد سے آئی ہوئی محفلِ موسیقی کی شوقین نَسلِ نَو اپنے اپنے گھروں میں۔ خاں صاحب کے ساتھ لاہور اور دیگر شہروں سے آئے ہوئے سونامیے "تو دو دِنوں کے بعد ہی اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ علامہ قادری کے" عقیدتمند محفلِ موسیقی کی رونق بڑھاتے رہے لیکن جونہی قادری صاحب نے دھرنا لپیٹا شاہراہِ دستور پر اُلّو بولنے لگے لیکن انا پرست خاں صاحب پھر بھی شام کو ڈیڑھ، دو سو افراد کے دھرنے سے خطاب کرتے رہے۔ اُنھوں نے اپنے کنٹینر سے جو بھی حکم جاری کیا وہ سونامیوں نے ہوا میں اُڑا دیا۔ سول نافرمانی پر کسی نے عمل کیا نہ یوٹیلٹی بِلز کی ادائیگی میں خلل آیا اور "لندن پلان" کے مطابق نہ ہی امپائر کی انگلی کھڑی ہو سکی البتہ یہ ضرور ہوا کہ تحریکِ انصاف کے اراکینِ پارلیمنٹ میں اچھی بھلی پھوٹ پڑ گئی۔ جنھوں نے استعفے لکھ کر دیئے تھے وہ بھی ہواؤں کا رُخ دیکھ کر سپیکر صاحب کا سامنا کرنے سے کترانے لگے۔ اگر اُن کی نیتوں میں فتور

نہ ہوتا تو وہ مخدوم جاوید ہاشمی کی طرح پارلیمنٹ میں جاکر مستعفی ہو جاتے۔پلان اے اور بی کی ناکامی کے بعد خاں صاحب نے 30 نومبر کو پلان سی کا اعلان کر دیا۔پلان اے اسلام آباد کے ڈی چوک میں دھرنا دینا اور امپائر کی انگلی کھڑی ہونے کا انتظار کرنا تھا۔جب انگلی کھڑی نہ ہو سکی تو پلان بی پر عمل کیا گیا اور پارلیمنٹ ہاؤس ،وزیرِاعظم ہاؤس اور پی ٹی وی پر قبضے کی کوشش کی گئی۔مقصد صرف تصادم کی فضاء پیدا کرکے احتجاج کرنے والوں کی لاشوں پر سیاست کرنا لیکن حکومت ''طرح'' دے گئی۔علامہ قادری تو بَددِل ہو کر دھرنا سمیٹنے کی سوچنے لگے۔وہ ایک ماہ تک خاں صاحب کو دھرنا ختم کرنے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن خاں صاحب کے متواتر انکار پر علامہ نے دھرنا لپیٹ لیا۔تَب نرگسیت کے شکار کپتان نے 30 نومبر کو ایک دفعہ پھر اسلام آباد میں دَس لاکھ کے جلسے کا اعلان کر دیا۔بھرپور کوشش بھی کی ،جگہ جگہ جلسے کرکے 30 نومبر کے جلسے میں شرکت کی اپیلیں بھی کیں ،کروڑوں روپے کا چندہ بھی اکٹھا کیا لیکن دَس لاکھ تو کیا اُس کا عشرِ عشیر بھی اکٹھا نہ کر سکے۔سکیورٹی ادارے کہتے ہیں کہ پینتیس ہزار کا مجمع تھا،اگر یہ ستّر ہزار کا بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا۔اگر جلسوں کی تعداد سے ووٹ ملتے تو علامہ قادری کا امیدوار بھکر کے ضمنی انتخاب میں صرف تیرہ ہزار ووٹ نہ لیتا حالانکہ قادری صاحب کے بھکر کے جلسے میں چالیس ہزار لوگوں نے شرکت کی اور بیماری کے باوجود چار دنوں تک علامہ صاحب بھکر میں بیٹھ کر لوگوں کو قائل

بھی کرتے رہے۔نتیجہ کیا نکلا ؟۔انعام اللہ نیازی کے اڑتالیس ہزار،نوانی کے سینتالیس ہزار اور علامہ کے محض تیرہ ہزار۔

اب عمران خاں صاحب نے اپنا پلان سی ظاہر کر دیا۔اُنھوں نے کہا کہ حکومت عدالتی کمیشن بنا کر چار سے چھ ہفتوں میں دھاندلی کی تحقیقات کرائے بصورتِ دیگر تحریکِ انصاف 4 دسمبر کو لاہور،8 کو فیصل آباد،12 کو کراچی اور 16 دسمبر کو پورا پاکستان بند کر دے گی۔عرض ہے کہ وزیرِاعظم تین ماہ پہلے سپریم کورٹ کو عدالتی کمیشن کے لیے خط لکھ چکے ہیں۔اب یہ سپریم کورٹ کا کام ہے کہ وہ کمیشن تشکیل دے لیکن سپریم کورٹ شایداِس لیے کمیشن تشکیل نہیں دے رہی کہ آرٹیکل 225 کے تحت صرف الیکشن ٹریبونل ہی ایسی تحقیقات کا مجاز ہے۔سپریم کورٹ 14 مختلف درخواستوں پر بار بار یہ فیصلہ بھی دے چکی ہے۔چار سے چھ ہفتوں میں قومی اسمبلی کے 272 حلقوں میں دھاندلی کی تحقیقات ناممکن ہے اور جن چار حلقوں کا خاں صاحب بار بار ذکر کرتے ہیں وہ پہلے ہی الیکشن ٹریبونل میں کھُل چکے ہیں اور اُن پر تحقیقات جاری ہیں۔دراصل خاں صاحب کا مقصد بھی وہی ہے جو اُن کے پہلو میں کھڑے ''خودکُش بمبار'' شیخ رشید کا ہے۔شیخ رشید نے 30 نومبر کو بھی مرنے مارنے اور جلاؤ گھراؤ کی باتیں کیں۔خاں صاحب ملک میں انارکی اور تصادم کی فضا پیدا کرکے اپنی تحریک کو انسانی خون سے کامیاب بنانے کی تگ ودَو کر رہے ہیں لیکن وہ اِس پلان سی میں بھی بری

طرح ناکام ہونگے کیونکہ اُن کے سونا میے مولانا قادری کے عقید تمندوں جیسے نہیں جو اُن کے ایک اشارے پر مرنے مارنے پر تیار ہوجائیں۔ یہ نسلِ نَو کے پڑھے لکھے نوجوان ہیں جنہیں جذباتی نعروں سے گمراہ تو ضرور کیا گیا ہے لیکن وہ تصادم کے لیے ہرگز تیار نہیں ہونگے اور خاں صاحب جو 16 دسمبر کو سانحہ مشرقی پاکستان کی تاریخ دہرانے جارہے ہیں، وہ اِس میں بھی انشاء اللہ بُری طرح ناکام ہونگے۔

سب پہ بھاری

پیپلزپارٹی کے یومِ تاسیس کے موقعے پر جنابِ آصف زرداری نے اپنے بحریہ ٹاؤن لاہور والے بَم پروف گھر میں جیالوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''گونواز گو کا نعرہ میرے کانوں کو بھی بہت اچھا لگتا ہے لیکن ابھی اِس کا وقت نہیں آیا۔ نواز شریف جائیں تو عمران خاں کی پچ پر کیوں جائیں۔ وہ جائیں گے تو ہماری پچ پر جائیں گے۔ ابھی عمران خاں کو باؤلنگ کرنے دیں۔ جب وہ پچ سیدھی کرلیں گے تو پھر ہم باؤلنگ کریں گے''۔ ایسے خواب دیکھنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن زرداری صاحب اور اکابرانِ PPP اپنے دَور میں جو گُل کھلا چکے ہیں اُنہیں مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے کاغذوں میں تو پیپلزپارٹی ''ڈائیں ڈائیں فِش'' ہو چکی۔ زرداری صاحب کا طرزِ سیاست انوکھا ہے نہ نرالا۔ اپنے دَورِ حکومت میں تو وہ ''مقتدر قوتوں'' کے سامنے سرِ تسلیم خم کرکے ہی گزارا کرتے رہے اور اسی ''سجدہ ریزی'' میں اُنھوں نے پانچ سال یہ کہتے کہتے حکومت کرلی

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بَن کر
آڑے آئی میرے تسلیم سِپر کی صورت

کاغذ کے ایک ٹکڑے کی آڑ میں پیپلزپارٹی پر قبضہ کرنے والے زرداری صاحب کہتے

کے نہیں بلکہ ٹیسٹ میچ کے کھلاڑی ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں T20 ہیں کہ وہ وَن ڈے یا کہ وہ کھلاڑی نہیں اناڑی ہیں جنکے دَورِ حکومت میں جیالے مایوس ہو کر گھروں میں بیٹھ رہے اور پیپلزپارٹی صرف سندھ تک محدود ہو کے رہ گئی۔ زرداری صاحب نے بینظیر کے ساتھیوں کو چُن چُن کر ''نکرے'' لگایا اور اپنے لیے ایسی ٹیم تشکیل دی جس کی ''غضب کرپشن کی عجب کہانیاں'' آج بھی زباں زدِ عام ہیں۔ خادمِ اعلیٰ نے اِس ٹیم کو زربابا چالیس چور'' کا خطاب دیا اور قوم سے اُنہیں سڑکوں پر گھسیٹنے کا وعدہ بھی کیا'' لیکن کپتان صاحب نے میاں برادران کو ایسی ''سُڑکی'' میں پھنسایا کہ اُنہیں پیپلزپارٹی کا سہارا لینا پڑا۔ جب سید خورشید شاہ نواز لیگ کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہونگے تو پھر کہاں کی سڑکیں اور کہاں کا گھسیٹنا۔ اِس لیے ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ کڑے احتساب کی راہ میں تحریکِ انصاف ہی سدِ سکندری بن کے کھڑی ہو گئی ہے۔

اُدھر ہمارے کپتان صاحب جو وَن ڈے کے ماہر کھلاڑی ہیں، اُنہیں نواز لیگ سے ٹیسٹ میچ کھیلنا پڑ رہا ہے جس کی بنا پر وہ ہر وقت تیوریاں چڑھائے رکھتے ہیں۔ ویسے بھی جب فاسٹ باؤلر کو وِکٹ نہ ملے تو وہ باؤنسر پھینک پھینک کر بیٹس مین کے ''گھٹنے سیکنے'' کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہی کام ہمارے کپتان صاحب بھی کر رہے ہیں۔ اُدھر میاں صاحب نے اپنے پورے جسم کو پارلیمنٹ کے عطا کردہ ہیلمٹ میں چھپا رکھا ہے اور ہیلمٹ کے پیچھے سے طنزیہ ہنسی بھی ہنستے رہتے ہیں

جس سے ہمارے کپتان صاحب کا پارہ آسمانوں کو چھونے لگتا ہے۔اُنھوں نے اپنا پلان کی دھمکی بھی دے دی لیکن اگلے ہی دِن پلان تبدیل بھی ''D'' ظاہر کر دیا اور '' C'' کر دیا۔اِس پلان کے مطابق پہلے لاہور، فیصل آباد اور کراچی کو بند کیا جانا تھا اور پھر پورے پاکستان کو لیکن شاہ محمود قریشی صاحب نے وضاحت فرما دی کہ شہر بند کرنے کا یہ ہر گز مطلب نہیں کہ ہم شٹر ڈاؤن کروائیں گے یا ٹریفک جام کریں گے ،ہم تو صرف بڑی شاہراہوں پر پُرامن احتجاج کریں گے۔شہر بند کرنے کا یہ انوکھا اور نرالا مطلب صرف تحریکِ انصاف کی کور کمیٹی ہی نکال سکتی ہے۔تحریکِ انصاف کی ''کور کمیٹی'' کو '' کروڑ کمیٹی'' تو کہا جا سکتا ہے کیونکہ اُس میں کروڑوں ،اربوں کے مالک ہی جگہ پا سکتے ہیں لیکن ہیں سبھی ''کور عقل''۔ایک ماہ سے پلان سی پر مشورے ہو رہے تھے اور جب یہ پلان فائنل ہوا تو اگلے ہی دِن اُسے تہس نہس کرکے رکھ دیا۔اگر ہم کور کمیٹی میں ہوتے تو مشورہ دیتے کہ خاں صاحب عزت اسی میں ہے کہ ''نیویں نیویں'' ہو کر نکل جائیں کیونکہ جِن لوگوں سے ''مَتھا'' لگا ہے وہ آپ سے بھی زیادہ ضِدّی ہیں۔لیکن ہماری کون سُنتا ہے ،ہمیں تو لوگ لکھاری ماننے کو بھی تیار نہیں۔ویسے ہمیں حیرانی ہوتی ہے کہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دیکھنے کے باوجود لوگ خاں صاحب کی تحریک کے حق میں کالم لکھنے کی ہمت کیسے کر لیتے ہیں۔ایک چوہے نے ہاتھی کی عمر پوچھی۔ہاتھی نے جواب دیا ''دو سال''۔پھر ہاتھی نے چوہے کی عمر پوچھی تو چوہے نے کہا ''ہے تو میری عمر بھی دو سال ہی

لیکن میں بیمار شمار رہتا ہوں''۔ لگتا ہے کہ یہ لوگ بھی ذہنی طور پر ''بیمار شمار'' ہی رہتے ہیں۔

تحریکِ انصاف کی ''کور کمیٹی'' کی بَدحواسیوں کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ میاں برادران بَچ گئے۔ یاد رہے کہ ابھی کپتان کی ''پٹاری'' میں بہت کچھ باقی ہے۔ ضیاء الحق مرحوم کے دَور میں دو جیالے محوِ گفتگو تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا ''یار! یہ ضیاء الحق کب جان چھوڑے گا؟''۔ دوسرے نے جَل بھُن کر کہا ''اتنی جلدی جان نہیں چھوڑنے والا۔ یہ قوم کو پورا قُرآن سُنا کر ہی جائے گا اور ابھی تو اُس نے صرف سورۃ فاتحہ ہی سنائی ہے''۔ اسی طرح میاں برادران ہوشیار باش، ابھی تو خاں صاحب نے قوم کو پلان سی'' دیا ہے اور پلان ''ڈی'' سے ''زیڈ'' تک 23 پلان باقی ہیں۔ وثوق سے کہا جا'' سکتا ہے کہ کپتان صاحب تو پلان پہ پلان دیتے چلے جائیں گے کیونکہ وہ ''ویہلے'' ہیں اور اُنہیں اِس کے سوا کوئی کام ہی نہیں لیکن میاں برادران خود ہی ''ہَپھ'' کر میدان چھوڑ جائیں گے۔ خاں صاحب نے 30 نومبر کو اسلام آباد میں میلہ لگا دیا جس میں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، سلیمان احمد ابرار الحق اور دیگر گلوکاروں نے سماں باندھ دیا۔ نسلِ نَو والہانہ رقص کرتی رہی اور خیبر پختونخوا کے وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک کو بھی یہ کہنا پڑا ''لوگ کہتے ہیں پرویز خٹک رقص کرتا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ جہاں اتنا جنون ہو، وہاں رقص تو کرنا ہی پڑتا ہے''۔ دروغ بَر گردنِ

راوی وہاں تو پولیس والوں نے بھی سفارشیں ڈلوا ڈلوا کر اپنی ڈیوٹیاں لگوائیں کیونکہ مفت میں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی سننے کو مِل جائے تو کس کا وہاں جانے کو جی نہیں چاہے گا۔ میاں برادران اپنے دِل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ کیا اُن کے جلسوں میں جناب چودھری نثار، پرویز رشید، خواجہ آصف، خواجہ سعد رفیق اور خود خادمِ اعلیٰ ایسا والہانہ رقص کر سکتے ہیں؟۔ اور جس طرح کنٹینر پر کھڑے کپتان صاحب جھوم رہے ہوتے ہیں، ایسے میاں نواز شریف جھوم سکتے ہیں؟۔ اگر نہیں تو پھر میاں صاحب مستعفی ہو کر حکومت کپتان صاحب کے سپرد کر دیں کیونکہ نسلِ نَو کو عالمِ مستی میں جھومنے والے رہنما ہی پسند ہیں۔

مائل بہ کرم

شنید ہے کہ آجکل قاف لیگ والے چودھری پرویزالٰہی نے علامہ طاہرالقادری سے مایوس ہو کر طبلے سارنگی پر ''راگ ملہار'' سیکھنا شروع کر دیا ہے تاکہ جب اُستاد پرویزمشرف کی سنگت نصیب ہو تو اُنکی تان میں تان ملاسکیں۔ چودھری برادران نے تو علامہ قادری کی ''مُریدی'' اِس لیے اختیار کی تھی کہ ایک دفعہ پھر اقتدار کا نشہ چکھ سکیں لیکن علامہ بیچ منجدھار چھوڑ کر کھسک لیے۔ پرویزالٰہی صاحب سپیکر بھی رہ چکے ، وزیرِاعلیٰ اور ڈپٹی پرائم منسٹر بھی جبکہ چودھری شجاعت صاحب تو بقلم خود 90 روزہ وزیرِاعظم بھی رہے ہے اِس لیے اقتدار کے شب و روز اُنہیں بے کَل کیے رکھتے ہیں۔ اقتدار کا نشہ ہی ایسا ہے کہ ''چھٹتی نہیں یہ کافر مُنہ سے لگی ہوئی''۔ اُدھر شیخ رشید بھی آٹھ مرتبہ وزیرِ باتدبیر رہ چکے اور دَورِ وزارت کی سہانی یادیں اُن کے دِل میں بھی ''یوں یوں'' کرتی رہتی ہیں۔ شیخ صاحب نے خاں صاحب کی ''چوکیداری'' قبول کر لی اور چودھری برادران نے علامہ صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر دیا لیکن علامہ صاحب صحنِ چمن میں بہارِ اقتدار کی سُن گُن نہ پا کر ''پھُر'' کیا ہوئے گویا چودھری برادران کو ''سیاسی یتیم'' کر گئے۔ چاروناچار چودھریوں نے اپنے سابق مربی و محسن پرویزمشرف سے رجوع کر لیا لیکن شیخ صاحب تاحال چوکیداری کا فریضہ بطریقِ احسن سرانجام دے رہے

ہیں ۔وجہ یہ کہ خاں صاحب ''مردِ میدان'' نکلے ۔وہ تاحال ڈٹے ہوئے ہیں اور اب تو اُنہیں کنٹینر کے بغیر چین ہی نہیں آتا۔اُنہوں نے خود ہی فرمایا کہ وہ سوچتے ہیں کہ اگر دھرنا ختم ہوگیا تو پھر اُنکی شامیں کیسے گزریں گی ؟۔گویا

اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے

اب رہائی ملی بھی تو مَر جائیں گے

ہم نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ خاں صاحب تو ''ویہلے'' ہیں اور دھرنوں میں اُنکا جی لگ تک پلان آتے رہیں گے اور حکومت اُنکے ہر یوٹَرن سے Z سے D گیاہے اِس لیے مستفید'' ہوتی رہے گی ۔ویسے اب کی بار اُنہوں نے جو یوٹَرن لیاہے وہ ملک و قوم کے '' لیے بہتر ہے اور حکومت کے لیے بھی ۔اِس میں خاں صاحب کی سیاسی فہم وفراست کی جھلک بھی نمایاں ہے۔یوں لگتاہے کہ وہ بڑی تیزی سے ''سیاسی بلوغت''کی طرف گامزن ہیں ۔اب وہ باربار فرمارہے ہیں کہ حکومت مذاکرات کرے اور سپریم کورٹ کا تحقیقاتی کمیشن بنائے ۔لیکن دوسری طرف اب حکومت ''نَخرے'' دکھا رہی ہے ۔پرویز رشید صاحب نے تو مذاکرات سے ویسے ہی صاف انکار کردیا تھا،چودھری نثار کہتے ہیں کہ ہم مذاکرات کے لیے تیار ہیں اور اسحاق ڈار کہتے ہیں کہ جب وزیرِ اعظم لندن سے واپس آئیں گے تو اُن سے مشورہ کرکے مذاکرات کا ڈول ڈالا جائے گا لیکن وزیرِ اعظم صاحب تو لندن میں

ڈیوڈ کیمرون کے ''کھد، پائے'' کھانے میں مصروف ہیں۔ پتہ نہیں اُنہیں کب فُرصت ملے گی۔ اب اسحاق ڈار صاحب نے ایک ڈھیلاڈھالا بیان داغ دیا ہے کہ حکومت اتوار کو مذاکرات کے لیے تیار ہے اِس لیے تحریکِ انصاف فیصل آباد کے احتجاج کا اعلان واپس لے لیکن خاں صاحب نے صاف کہہ دیا کہ جتنی دیر تک کمیشن قائم نہیں ہوتا اُتنی دیر تک احتجاج جاری رہے گا۔ اکابرینِ تحریکِ انصاف کہتے ہیں کہ اُنہیں مذاکرات کی کوئی باضابطہ اطلاع نہیں دی گئی۔ اِس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اب بال حکومت کی کورٹ میں ہے اور عمران خاں بیانگِ دہل کہہ سکتے ہیں کہ ''ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں''۔ سیاسی جرگہ کے رُکن رحمٰن ملک کہتے ہیں کہ سپریم کورٹ نے میموگیٹ سکینڈل پر تو فوراً کمیشن بنا دیا تھا اب الیکشن دھاندلی پر کمیشن کیوں نہیں بنایا جا رہا ؟۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میموگیٹ کا تعلق الیکشن سے نہیں تھا اِس لیے کمیشن بن گیا لیکن یہاں آرٹیکل 225 سدِّ راہ ہے جس کے مطابق صرف الیکشن ٹریبونل ہی دھاندلی کیسز کی سماعت کر سکتا ہے دوسری کوئی عدالت نہیں۔ ایسا کرنے کے لیے آرٹیکل 225 میں ترمیم کرنا ہو گی۔ تحریکِ انصاف سے تمامتر اختلافات کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ اب تحریکِ انصاف راہِ راست پر ہے اور حکومت الجھاؤ کا شکار ہے اور کَل کلاں کپتان صاحب یہ کہنے میں حق بجانب ہونگے کہ

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

اُدھر جنابِ آصف زرداری اُس وقت تک تو "چسکے" لیتے رہے جب تک تحریکِ انصاف اور نواز لیگ باہم دست و گریباں تھیں لیکن جونہی اُنھوں نے محسوس کیا کہ معاملات الجھاؤ کی بجائے سلجھاؤ کی طرف گامزن ہیں تو بلاول زرداری کو "نُکرے" لگا کر وہ خود لنگوٹ کَس کر سیاسی اکھاڑے میں کود پڑے۔ ہم نے تو یہ محاورہ سُنا اور پڑھا تھا کہ "نو سو چوہے کھا کے بِلّی حج کو چلی" لیکن زرداری صاحب تو چھ سو "چِڑے" کھا کر میدان میں اُترے ہیں۔ پہلوانوں کے شہر گوجرانوالہ میں اُنکے لیے بکروں کے 250 پائے اور نَلی، 600 چِڑے، 600 بٹیرے اور دریائے چناب کی مچھلی کا اہتمام کیا گیا۔ شُنید ہے کہ گجرانوالے کی ساری چڑیاں ہڑتال پر ہیں اور شدید احتجاج کرتے ہوئے نَوحہ کناں ہیں کہ وہ بیوہ ہو گئی ہیں کیونکہ اُنکے "خاوند" زرداری صاحب ڈکار گئے اور زندہ بچ جانے والے مارے خوف کے "پھُر" ہو گئے۔ خبری نے یہ بھی بتایا ہے کہ چڑیوں نے تحقیقاتی کمیشن کا مطالبہ کرتے ہوئے گوجرانوالے کے پہلوانوں کے اکھاڑوں میں دھرنا دینے کی تیاری مکمل کر لی ہے۔ فی الحال 12 اکھاڑوں میں دھرنا دینے کا پروگرام ہے جسے بعد ازاں پورے گوجرانوالے میں پھیلا دیا جائے گا۔ بٹیروں کی مؤنث کا مجھے علم نہیں، شاید "بٹیرنیاں" ہو گا لیکن اُنکی طرف سے ابھی کسی احتجاجی تحریک کا اعلان نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اُسی تحقیقاتی کمیشن کے انتظار میں ہوں جو "چِڑوں" کی بیوگان کے لیے تشکیل دیا جائیگا۔

کارکنوں سے خطاب کے دَوران زرداری صاحب سے بار بار یہ سوال کیا جاتا رہا کہ پیپلزپارٹی کے ''وارثِ اعلیٰ'' بلاول زرداری کہاں ہیں ؟۔زچ ہو کر زرداری صاحب نے کہہ دیا'' بلاول کے بارے میں خاندان فیصلہ کرے گا کہ اُسے کب میدان میں اتارنا ہے۔ کراچی کے جلسے میں اُس نے 100 بندوں کو ناراض کر دیا۔اگر اُسے پنجاب میں لے آتا تو پتہ نہیں اور کتنے بندوں کو ناراض کر دیتا''۔یہ خاندانِ زرداریہ کا گھریلو معاملہ ہے جس میں ہم دخیل نہیں لیکن ہمیں اتنا تو بتا دیا جائے کہ آخر وہ ہیں کہاں کیونکہ اب نہ اُن کا کوئی بیان آتا ہے اور نہ ہی وہ ٹویٹ کرتے ہیں۔کیا وہ نظربند ہیں اور اُن کی زباں بندی بھی کر دی گئی ہے ؟۔

قومی یکجہتی کی ضرورت

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

وزیرِاعظم نواز شریف صاحب نے بی جے پی کے نَو منتخب بھارتی وزیرِاعظم نریندر مودی کی تقریبِ حلف برداری میں شرکت کرکے اقوامِ عالم کو یہ پیغام دیا کہ پاکستان اپنے ہمسائیوں کے ساتھ افہام و تفہیم سے رہنا چاہتا ہے۔ اگر وہ تقریبِ حلف برداری میں نہ جاتے تو یقیناً انڈیا شور مچاتا کہ پاکستان کو امن و سکون پسند نہیں۔ وزیرِاعظم نواز شریف کے اِس اقدام کو اقوامِ عالم نے تحسین کی نگاہ سے دیکھا لیکن جواباً مودی صاحب نے بغیر کسی وجہ کے سیکرٹری خارجہ کی سطح پر ہونے والے مذاکرات کو منسوخ کر دیا اور سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ میاں صاحب نے اقوامِ متحدہ میں مسئلہ کشمیر کو بھرپور انداز میں اجاگر کرکے عالمی ضمیر کو جھنجوڑنے کی کوشش کی لیکن بے سود کہ ضمیر نام کی کوئی شے اقوامِ عالم کے ہاں مفقود ہے۔ اگر اُن میں ضمیر کی خلش ہوتی تو ''عالمی درندہ'' امریکہ ویت نام پر نیپام بموں کی آگ نہ برساتا، ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بموں کی برسات سے قیامتِ صغرا بپا نہ ہوتی، لاطینی امریکہ میں وحشت و بربریت کا ننگا ناچ نہ ہوتا، فلسطین کے مقہوروں، افغانستان کے مظلوموں اور عراق کے مجبوروں کی آہیں نہ سنائی دیتیں۔ عالمی

درندے کی اپنا ہی قانون ہے اور اپنا ہی آئین ۔ روس افغانستان میں داخل ہوا تو اسامہ بن لادن مجاہد اور جب ''درندے'' نے چڑھائی کی تو دہشت گرد اور بنیاد پرست ۔ ذلت آمیز ہزیمت کے بعد روس افغانستان سے نکلا تو ملا عمر مجاہد اور امیر المومنین ، امریکہ حملہ آور ہوا تو دہشت گرد، ''جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے'' ہم تب بھی امریکہ کے ساتھ تھے اور اب بھی ہیں ۔ امریکی دوستی میں ہم نے ساٹھ ہزار شہری اور آٹھ ہزار سے زائد فوجی جواں شہید کروائے ، سو ارب ڈالر سے زائد کا نقصان کیا ، معیشت پاتال میں اتر گئی ، بھوک اور افلاس نے ڈیرے ڈال دیئے ، کلاشنکوف کلچر نے جنم لیا ، خود کش حملوں اور بم دھماکوں نے ہمارے گھر کا رستہ دیکھ لیا ، ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خوری عام ہو گئی اور ملکی اندرونی حالت یہ کہ ''نے ہاتھ باگ پر ہے ، نہ پا ہے رکاب میں'' اِس سب کچھ کے باوجود بھی ہیلری کلنٹن ڈیڑھ ارب ڈالر سالانہ کی امداد پر اتراتی رہی ۔ اُدھر ہمارے رہنماؤں کی فہم وفراست کا یہ عالم کہ

کم ہونگے اِس بساط پہ ہم جیسے بَد قمار
جو چال بھی چلے ہم نہایت بُری چلے

حکمرانوں نے طالبان سے مذاکرات کی سرتوڑ کوشش کی لیکن اُنہیں تو انسانی خون کی چاٹ لگ چکی تھی ۔ چار و ناچار آپریشن ''ضربِ عضب'' کرنا پڑا اور تب پتہ چلا کہ طالبان کتنے طاقتور تھے ۔ صرف میراں شاہ اور میر علی سے اتنا اسلحہ اور

بارود ملا کہ اگر طالبان ہر روز تین بم دھماکے کرتے تو پندرہ سال تک متواتر یہ دھماکے کر سکتے تھے۔اسلحہ اتنا جدید ترین کہ دیکھنے والے دَم بخود۔سوال مگر یہ ہے کہ یہ سب کچھ کہاں سے آیا؟۔سوائے افغانستان کے اور تو کوئی راستہ نہیں جس کے ذریعے طالبان کو یہ اسلحہ پہنچایا جاتا۔افغانستان میں امریکی افواج ہے یا بھارتی انٹیلی جینس ایجنسیوں کے کارندے۔اِس لیے کہا جا سکتا ہے کہ طالبان کو یہ جدید ترین ہتھیار پہنچانے والے یا تو امریکی ہو سکتے ہیں یا پھر بھارتی۔امریکہ ہمارا کبھی دوست نہیں رہا،ویسے بھی سابق امریکی وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر نے کہا تھا کہ امریکی دشمنی سے امریکی دوستی زیادہ خطرناک ہے۔امریکہ پینسٹھ سالوں سے ہمارا دوست ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ امریکہ نے ہمیشہ عین موقعے پر بیوفائی کی۔ہندوستان ہمارا ہمسایہ ہے،ایسا ہمسایہ کہ جس نے کبھی ہمارے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔حکومت خواہ کانگرس کی ہو یا بی جے پی کی،پاکستان دشمنی مسلمہ ہے۔پھر پتہ نہیں ہم کیوں امن کی آشا کے دیپ جلائے پھرتے ہیں۔کیا اُس شخص سے خیر کی اُمید کی جا سکتی ہے جس کا نام نریندر مودی ہے؟۔یہ وہی مودی ہے جس سے گجرات کے مسلمانوں کے بے دریغ قتلِ عام پر ایک صحافی نے سوال کیا ''کیا آپ کو مسلمانوں کے قتل پر افسوس ہوا؟''۔چنگیزیت کے علمبردار نریندر مودی نے جواب دیا ''اگر آپ کی گاڑی کے نیچے کتا آ کر مر جائے تو افسوس تو ہو گا''۔صرف مودی ہی نہیں،کانگرس نے بھی ہمیں وہ گھاؤ دیئے ہیں جو ہمارے اندر

ناسور کی طرح پک رہے ہیں۔یادوں کے ادھ کھُلے دریچوں سے اب بھی وہ کربناک منظر دکھائی دیتا ہے جب ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جنرل اروڑا نے ہماری غیرتوں کے تمغے نوچے ،پاکستان دولخت کیا ہوا گویا اقبال کا خواب اور قائد کی محنت بھی دولخت ہو گئی۔تب کانگرس کی حکومت تھی اور اندراگاندھی وزیرِ اعظم۔ہم تو اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے رہے لیکن رب کے نام پر بنائے ہوئے اِس ملک کے دولخت ہونے کا انتقام خود ربِ ذوالجلال نے لے لیا۔ملک کو دولخت کرنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی طبعی موت نصیب نہ ہوئی۔شیخ مجیب الرحمٰن اپنے خاندان سمیت قتل ہوا،صرف حسینہ واجد بچی جو اُس وقت ہندوستان میں تھی،بھٹو کو پھانسی ہوئی،دونوں بیٹوں اور بیٹی کے نصیب میں غیر طبعی موت لکھ دی گئی،اندراگاندھی اور اُس کا بیٹا راجیو قتل ہوئے اور سنجے گاندھی طیارے کے حدثے میں مارا گیا اور یحیٰی گمنامی اور ذلت کی موت مرا۔یہ میرے رَبّ کا انتقام تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے اِس سے سبق حاصل کیا؟۔
واقعی تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔قومی و ملیّ یکجہتی کی جتنی ضرورت آج ہے پہلے کبھی نہ تھی لیکن پھر بھی ملک میں افراتفری اور انارکی کا سا عالم ہے۔اقتدار کی، جنگ جاری ہے اور ہوس کی ٹپکتی رالوں نے فضاؤں کو مسموم کر رکھا ہے۔اہلِ دل چیخ رہے ہیں کہ ملک لخت لخت ہونے کو ہے لیکن رہنماؤں

کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔لاشوں پر سیاست کرنے والوں کی انتھک کوشش ہے کہ کچھ لاشیں مل جائیں تاکہ وہ اپنی تحریک کی انسانی خون سے آبیاری کر سکیں اور لاشوں پہ قدم رکھتے ہوئے اقتدار کے ایوانوں تک پہنچ سکیں۔فیصل آباد میں نواز لیگ اور تحریکِ انصاف کے کارکن آمنے سامنے ہیں۔اللہ نہ کرے کہ کوئی سانحہ رونما ہو لیکن اگر ایسا ہوا تواِس خونِ ناحق کا ذمہ دار کون ہوگا ؟۔کیا تحریکِ انصاف یا پھر نواز لیگ ؟۔

لال حویلی والے کی جیت

ابھی تک کانوں میں مارو، مَرجاؤ، جلاؤ گھراؤ کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ یہ اشتعال انگیز باتیں ننکانہ صاحب کے جلسے میں مُنہ سے کَف چھوڑتے ہوئے شیخ رشید احمد نے نسلِ نَو کو مخاطب کرتے ہوئے کہیں اور پھر ہر جلسے میں متواتر مرنے مارنے کا درس ہی دیتے چلے گئے۔ شور اُٹھتا رہا کہ انارکی کا درس دینے والے پر آرٹیکل 6 کا اطلاق کرکے پابندِ سلاسل کیا جائے لیکن حکومت ہمت ہی نہیں کر پائی۔ تحریکِ انصاف کے سابق صدر اور محرم درونِ خانہ جاوید ہاشمی نے کہا تھا کہ تحریکِ انصاف اور عوامی تحریک کو پندرہ بیس لاشوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی تحریکوں میں انسانی خون شامل کرسکیں۔ کوشش تو بہت ہوئی لیکن نواز لیگ نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اِس خواہشِ ناتمام کی بنا پر دونوں جماعتوں کے دھرنوں کے غباروں سے ہوا نکل گئی۔ قادری صاحب تو اپنا دھرنا سمیٹ کر اپنے ''وطن'' لوٹ گئے لیکن خاں صاحب شیخ رشید کے ہتھے چڑھ گئے جس نے اپنی ابلیسیت کو بروئے کار لا کر نسلِ نَو کو جلاؤ گھراؤ، مارو مرجاؤ کا درس دینا شروع کر دیا اور اسی درسِ ابلیس نے فیصل آباد میں وہ کچھ کر دکھایا جس کی خواہش خاں صاحب پونے چار ماہ سے پالتے چلے آ رہے تھے۔ مطمئن شیخ صاحب اب کہتے ہیں کہ تحریک میں انسانی خون شامل ہو گیا ہے اِس لیے نواز لیگ کا جانا ٹھہر گیا۔ قصور اِس میں نواز لیگ کا بھی بھرپور کہ

جس نے اپنے کارکنوں کو کھلی چھٹی دے کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔

تحریکِ انصاف نے 8 دسمبر کو فیصل آباد میں پُرامن احتجاج کا اعلان کیا تھا لیکن تحریک کے کارکنوں نے 8 دسمبر کی صبح سے ہی جگہ جگہ ٹائر جلا کر سڑکیں بند کرنا شروع کر دیں، سکولوں میں گھس کر بند کروانے کی کوشش کی اور دوکانوں کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے کر بند کروا دیا گیا لیکن پولیس خاموش تماشائی بنی رہی۔ معاملہ کچھ آگے بڑھا تو تحریکِ انصاف اور نواز لیگ کے کارکن آمنے سامنے آ گئے، تصادم ہوا، ایک لاش گری اور کئی زخمی ہو کر ہسپتالوں میں جا پہنچے۔ معیشت کا جو نقصان ہوا سو ہوا لیکن انسانی جان کی تو کوئی قیمت ہی نہیں اور نہ ہی انسانی جان کا کوئی ازالہ۔ عمران خاں کہتے ہیں کہ اُن کے کارکنوں کو ''برگر فیملی'' کہا جاتا تھا اور رانا ثناء اللہ سمجھتے تھے کہ پی ٹی آئی والے بھاگ جائیں گے لیکن اُنہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ وہ کراچی بھی جائیں گے مگر لاہور جانے کا زیادہ انتظار ہے۔ جو کچھ فیصل آباد میں ہوا، وہی اگر لاہور میں دہرایا گیا تو وہ مقابلہ کرکے دکھائیں گے۔

تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ اپوزیشن تو احتجاج کرتی ہی ہے، حکومت کو تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ کیا حکومت کی ذمہ داری صرف تحمل ہی ہے، عوام کی جان

ومال کی حفاظت نہیں؟۔ پھر تحمل بھی کتنا؟۔ گزشتہ پونے چار ماہ سے حکومت تحمل کا مظاہرہ ہی تو کر رہی ہے۔ وجہ یہ نہیں کہ تحمل اور بُردباری حکمرانوں میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہے بلکہ یہ کہ حکومت جان چکی تھی کہ تحریکِ انصاف اب آخری حربے کے طور پر لاشوں پہ سیاست کرنا چاہتی ہے اِس لیے وہ محتاط تھی لیکن وہاں احتیاط کا کیا کام جہاں شیخ رشید جیسے صلاح کاروں سے ''متھا'' لگا ہو۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انارکی پھیلانے کا یہ گُر خاں صاحب نے شیخ رشید ہی سے سیکھا ہے کیونکہ خاں صاحب نے جب شہر اور ملک بند کرنے کا اعلان کیا تو اُس سے اگلے ہی دن شاہ محمود قریشی صاحب نے پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ ''شہر بند کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوکانیں یا ٹریفک بند کی جائے گی، ہم صرف بڑی شاہراہوں پر پُرامن احتجاج کریں گے۔ اُنہوں نے ایک ٹاک شو میں اسحاق ڈار صاحب سے کہا کہ اگر حکومت 6 دسمبر تک مذاکرات کا اعلان کر دے تو وہ خاں صاحب کو احتجاجی تاریخ مؤخر کرنے پر منا لیں گے۔ ڈار صاحب نے وعدہ کیا اور 6 دسمبر کو اعلان بھی کر دیا کہ حکومت مذاکرات کے لیے تیار ہے اور وہ گارنٹی دیتے ہیں کہ حکومت اتوار سے مذاکرات شروع کر دے گی اِس لیے خاں صاحب اپنے احتجاج کو مؤخر کر دیں لیکن خاں صاحب پر تو شیخ رشید کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اُنہوں نے تحریک مؤخر کرنے سے صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ احتجاج تب تک ختم نہیں ہوگا جب تک تحقیقاتی کمیشن نہیں بنتا اور چار سے چھ ہفتے تک فیصلہ نہیں آ جاتا۔ تب حکمرانوں نے بھی کہہ دیا کہ مذاکرات اور

احتجاج ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے ۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے ،اب پتہ نہیں قصور کس کا ہے ،نوازلیگ کا یا تحریکِ انصاف کا؟۔ یا پھر شاید اُن جذباتی نوجوانوں کا ہوگا جنکی لاشوں پر سیاست کا گندا کھیل کھیلا جا رہا ہے ۔ایک ماں کی کوکھ اُجڑ گئی اور ہمارے رہنماؤں نے اُس کی لاش پر سیاست شروع کر دی ۔ خاں صاحب بنی گالہ کے محل سے پرائیویٹ طیارے میں فیصل آباد تشریف لائے تو اُنہیں پورا پروٹوکول دیا گیا ۔ پولیس کی پانچ گاڑیوں کا حصار اور درمیان میں خاں صاحب کی بم پروف گاڑی ۔کیا پولیس کو تنخواہ میاں برادران کی فیکٹریوں سے دی جاتی ہے ؟۔کیا یہ سچ نہیں کہ یہ عوام کی رگوں سے نچوڑا ہوا خون ہے جس پر ادارے پلتے ہیں ؟۔تو پھر قوم کے مُنہ سے نوالہ چھین کر اپنی عطشِ اقتدار کو سیراب کرنے کی سعی کرنے والوں کی حفاظت چہ معنی دارد ؟۔جو 400 کنال کے گھر میں رہتا ہے اور جس کے کتے کی روزانہ کی خوراک اتنی تھی کہ جس سے ایک عام کنبہ مہینوں گزارا کر سکتا ،کیا وہ اپنی حفاظت کا انتظام خود نہیں کر سکتا؟۔ خلفائے راشدین کا دَور لوٹانے کا وعدہ کرنے والے ،اپنی ہر تقریر کا آغاز قُرآنی آیت سے کرنے والے اور بھرے مجمعے کے سامنے نماز پڑھنے والے خاں صاحب کیا یہ بتا سکتے ہیں کہ خلفائے راشدین کا حفاظتی دستہ کتنے افراد پر مشتمل تھا ؟۔کیا وہ نہیں جانتے کہ چار میں سے تین خلفائے راشد نے جامِ شہادت نوش کیا لیکن کسی کو حفاظتی دستے کا خیال تک نہ آیا۔ لیکن وہ تو اللہ والے تھے اور یہ دُنیادار ۔۔۔۔ خالص دُنیادار جن کی ہوسِ اقتدار اُنہیں ایک پَل بھی چین نہیں لینے دیتی

جنہیں ملک کی پرواہ ہے نہ قوم کی۔ لیکن ہوسِ اقتدار صرف تحریکِ انصاف ہی کا المیہ، نہیں ،اِس حمام میں تو سبھی ننگے ہیں۔

قارئین سے سوال

ایک لکھاری کے لیے سب سے زیادہ محترم اُس کا قاری ہی ہوتا ہے کیونکہ اُسی کی تنقید و تنقیص سے ہی لکھاری کو حوصلہ ملتا ہے۔ بعض لکھاری تو اِس بات پر بھی بہت خوش ہوتے ہیں کہ سوشل میڈیا پر سب سے زیادہ گالیاں اُنہی کو پڑتی ہیں۔ گویا ’’بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا‘‘۔ تحریکِ انصاف پر تنقیدی کالم لکھنا تو بھِڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے کیونکہ ’’سونامیہ‘‘ خواہ کہیں کا بھی ہو ہر وقت ’’چارج‘‘ ہی رہتا ہے شاید اسی لیے میرے قارئین مجھے اکثر ڈی چوک اسلام آباد سے باہر نکلنے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ قارئین کا حکم سَر آنکھوں پر، سوال مگر یہ کہ بندہ لکھے تو کیا اور کِس موضوع پر لکھے؟۔پرویز مشرف کا مقدمہ قصۂ پارینہ بن چکا۔اِس گھسے پِٹے موضوع پر بات کرنے کی اِس لیے ضرورت نہیں کہ اب یہ معاملہ اتنا لٹک چکا کہ ہماری زندگی میں تو اِس کا فیصلہ ممکن نہیں۔اللہ پرویز مشرف کے طبلے سارنگی کو قائم ودائم رکھے، راوی اُن کے لیے عیش ہی عیش لکھتا ہے۔۔۔ تھَر کے مظلوموں، مجبوروں اور مقہوروں کا ذکر اِس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ بقول وزیرِ اعلیٰ سندھ سیّد قائم علی شاہ یہ سب الیکٹرانک میڈیا کی ’’ڈرامے بازی‘‘ ہے۔وہ کہتے ہیں کہ تھَر میں پہلے بھی بچے مرتے رہتے تھے لیکن اُس وقت الیکٹرانک میڈیا نہیں تھا۔جب ہماری باری آئی تو الیکٹرانک میڈیا

ٹپک پڑا اور ہمیں ''ایویں خوامخواہ'' وقفِ مصیبت کر دیا۔ایک خبر کے مطابق تھر میں ہونے والی اموات کا جائزہ لینے کے لیے 230 پروفیسرز، سینئر اور ینگ ڈاکٹرز جذبۂ ہمدردی کے تحت تھر میں پہنچے لیکن وہاں کی پولیس نے اُنہیں تین گھنٹوں کے اندر تھرپارکر چھوڑنے کا حکم صادر فرما دیا۔اُن ڈاکٹرز کو اتنا خوفزدہ کیا گیا کہ خواتین ڈاکٹرز تو باقاعدہ رونے لگیں۔بندہ اِن ڈاکٹرز سے پوچھے کہ اُنہیں ''پنگا'' لینے کی کیا ضرورت تھی۔کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ سندھ حکومت کا بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑنے والوں کا یہی حشر ہوگا۔ہماری طرف سے پولیس کی اِس بَروقت کارروائی پر شاباش اور مبارکباد۔تھر کے مظلوموں جیسے ہی وزیرستان کے آئی ڈی پیز ہیں۔بے یارومددگار آئی ڈی پیز کو بے جرم وخطا یہ سزا دی جا رہی ہے لیکن قصور خیبرپختونخوا حکومت کا بھی نہیں کیونکہ وہ خاں صاحب کے ساتھ مل کر نئے پاکستان کی بنیادیں اُٹھانے میں مصروف ہے۔جب نیا پاکستان بن جائے گا تو پھر زندہ بچ رہنے والے آئی ڈی پیز کی طرف ضرور دھیان دیا جائے گا۔اِس لیے معزز قارئین نیا پاکستان بننے کا انتظار کریں تاکہ اِس موضوع پر بھی خامہ فرسائی کی جا سکے۔ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ نئے پاکستان میں وزیرستان کی گنجائش ہی نہ ہو کیونکہ الطاف بھائی اور علامہ قادری تو ڈھیروں ڈھیر صوبے بنانے کے چکر میں ہیں لیکن کچھ لوگ ڈھیروں ڈھیر پاکستان بنانے کی تگ ودَو بھی کر رہے ہیں۔۔۔جب دہشت گردی کے خلاف آپریشن ضربِ عضب شروع نہیں ہوا تھا تب ہم نے طالبان کے خلاف کئی کالم

لکھے لیکن اب ہمارے جری جوان دہشت گردوں کا خوب خوب ''ٹھکو ٹھپ'' رہے ہیں ، 90 فیصد سے زائدعلاقہ خالی کروا لیا گیااورانشاء اللہ جلد پورے وزیرستان میں ایک دفعہ پھر سبزہلالی پرچم لہرانے لگے گا۔اِس لیے اِس موضوع پر بھی مزید لکھنے کی گنجائش نہیں ۔۔۔داعش نامی تنظیم ابھی اپنے پَرپُرزے نکال رہی ہے ، حکمرانوں کی بھی اِس پر کوئی توجہ نہیں اور ہمارا علم بھی اِس معاملے میں فی الحال ناقص ہی ہے ۔جب یہ تنظیم جَڑ پکڑ کر حکمرانوں کو ''وَخت''میں ڈال دے گی تو پھر ہمارا قلم بھی رواں ہو جائے گا۔ کالم نگار لکھ لکھ کر تھک بلکہ ''ہَپھ'' چکے لیکن مہنگائی، بیروزگاری ،ٹارگیٹ کلنگ اور بھتہ خوری میں سَرِ موفرق نہیں آیا البتہ بین الاقوامی سرویز کے مطابق کرپٹ ترین ممالک کی فہرست میں ایک درجہ کی ضرور آئی جس پر حکمران بغلیں بجارہے ہیں ۔پٹرولیم مصنوعات کی قیمتیں محض اِس لیے کم ہوگئیں کہ عالمی منڈی میں تیل کی قیمت گِر گئی ۔عمران خاں صاحب ''ایویں خوامخواہ''اِس کا کریڈٹ لے رہے ہیں ۔ پٹرول کی قیمتیں گرنے کی وجہ سے بجلی کی فی یونٹ قیمت میں دو روپے بتیس پیسے کمی ہو گئی۔اب خاں صاحب اِس کا کریڈٹ لینے کی بھی کوشش کریں گے ۔۔۔الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کو پیمرا جتنے جی چاہے ''ہدایت نامے''جاری کرلے اُس پر کچھ اثر نہیں ہونے والا۔جب چینل مالکان پیمرا کو بھی ''لفٹ''نہیں کرواتے تو پھر بھلا ہمارے لکھے سے نیوزچینلز پہ

بیٹھے چائے کی پیالی پر طوفان اُٹھانے والے اپنی حرکتوں سے کیسے باز آ جائیں گے ۔اینکرز کو ریٹنگ کی ضرورت ہے اور چینل مالکان کو بھی کیونکہ ریٹنگ ہوگی تو دھڑادھڑ دولت آئے گی۔اُنہیں تو صرف اپنی تجوریاں بھرنے سے غرض ہے اِس سے کچھ غرض نہیں کہ اُن کے چینلز کی مہربانی سے ملک کا کیا حشر ہو رہا ہے۔

چلیے تحریکِ انصاف اور نواز لیگ کے جھگڑے کو جانے دیتے ہیں کہ یہ اناؤں کا مسئلہ ہے جس میں کسی قانون ،اصول اور ضابطے کی کوئی گنجائش نہیں ۔ویسے بھی دونوں طرف سقراط ،بقراط ،افلاطون اور ارسطو بھرے پڑے ہیں اِس لیے اُن کے ''پھڈے''میں ہم جیسے ''صلاح کاروں'' کی مطلق گنجائش نہیں۔جب بھی کوئی معاملہ ''ٹھنڈا ٹھار'' ہونے لگتا ہے تو کسی نہ کسی طرف سے کوئی ''بقراط'' ٹانگ اڑا دیتا ہے ۔دھرنے اپنی موت آپ مرنے ہی والے تھے کہ فیصل آبادی ''بقراطوں'' نے اُن میں پھر سے جان ڈال دی ۔ایک لاش گری تو خاں صاحب کی آنکھوں کی چمک اور لہجے کی تلخی میں سوگُنا اضافہ ہوگیا۔اب وہ کہتے ہیں کہ ''لاہور کا میچ بڑا دلچسپ ہوگا۔میں بڑی شدت سے لاہور جانے کا انتظار کر رہا ہوں ۔اگر نواز لیگ کے گُلوں بٹوں نے وہی کچھ کیا جو فیصل آباد میں ہوا تھا تو میں نواز شریف کا لاہور میں رہنا مشکل کر دوں گا''۔اُمیدِ واثق ہے کہ جب تک طرفین کے '' صلاح کار'' باقی ہیں پھڈا چلتا ہی رہے گا اور اب تو عدلیہ کے فُل بنچ نے بھی ہاتھ کھڑے کرکے کہہ دیا ہے'' حکومت کو اپنی کمزوریوں اور تحریکِ انصاف کی چالاکیوں سے خود ہی

نپٹنا پڑے گا۔ کنٹینر لگانے کا کیا فائدہ، کیا حکومت کو جلوسوں کے ساتھ چلتی کرین نظر نہیں آتی؟"۔ البتہ ہمیں فُل بنچ کے اِس بیان سے بالکل اتفاق نہیں کہ "تحریکِ انصاف نے پوری قوم کو ذہنی طور پر پریشان کر رکھا ہے"۔ کیونکہ ہم ذہنی طور پر "تماش بین" ہیں اور ہلّے گُلّے میں ہی خوش رہتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے اگر دو چار لاشیں گِر بھی جائیں تو بیس کروڑ کی آبادی کو کیا فرق پڑتا ہے۔ رہی معیشت کی بربادی کی بات تو، زیادہ دولت کا کرنا بھی کیا ہے، یہ بھی تو بڑے بڑے مگرمچھوں کے پیٹ میں ہی جانی ہے۔
اب معزز قارئین خود ہی فیصلہ کرلیں کہ ہم کس موضوع کا انتخاب کریں؟۔

غُنڈہ راج

چکوال موٹروے کا افتتاح کرتے ہوئے وزیرِاعظم میاں نواز شریف نے فرمایا ''ہم جب بھی ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے لگتے ہیں تو رکاوٹیں کھڑی کردی جاتی ہیں ۔پہلے رخنے ڈالے جاتے تھے اب دھرنے آتے ہیں ''۔اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ''میرا بھی ایک پلان ''ڈی'' ہے لیکن میں نے ڈویلپمنٹ والا''ڈی'' سامنے رکھا ہے جبکہ دوسروں کا ڈسٹرکشن والاڈی''۔وزیرِاعظم صاحب نے کاشغر سے گوادر ،کراچی سے لاہور ،اور حویلیاں سے بُرہان تک موٹروے بنانے کا اعلان کرتے ہوئے کہاکہ اِس سے معیشت کا پہیہ چلے گا اور ملک ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گا۔ وزیرِاعظم صاحب کافرمان سَرآنکھوں پر لیکن ہم اُن سے دست بستہ اپیل کرتے ہیں کہ ہمیں ترقی چاہیے نہ معیشت کا رواں پہیہ کیونکہ یہی تو وہ منصوبے ہیں جو ملک میں افراتفری کا باعث بن رہے ہیں ۔ایک گروہ کے سربراہ کو یہ یقین ہوچلاہے کہ اگر یہ منصوبے کامیاب ہوگئے تو اُسے خوابوں خیالوں میں بھی وزارتِ عظمیٰ نہیں ملے گی اِس لیے وہ ''کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے''کے فارمولے پر عمل پیرا ہیں۔ویسے بھی ایسے منصوبے تو صرف اُن حکومتوں کو زیبا ہیں جو غنڈہ گردی اور دہشت گردی کو جَڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی صلاحیت رکھتی ہیں لیکن ہمارے حکمران تو اتنے نرم مزاج اور رحمدل ہیں کہ اگر کوئی اُن کے

گال پر ایک تھپڑ مارے تو وہ جھٹ سے دوسرا گال آگے کر دیتے ہیں۔ رہی پولیس کی بات تو وہ تو صرف غرباء اور شرفاء کو "ہتھکڑیاں" لگانے کے لیے بھرتی کی جاتی ہے یا پھر پروٹوکول کے لیے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر لاہور میں غنڈہ گردی کا ننگا ناچ دیکھنے کے باوجود پولیس کئی کئی فرلانگ پیچھے آرام کیوں فرماتی رہی؟۔ کیا اُنہیں ایسا کرنے کا حکم اوپر" سے آیا تھا یا پھر وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھی رہی۔ ویسے قصور" بیچاری" پولیس کا بھی نہیں کہ اگر ڈنڈا چلائے تو معطل ہونے کا خطرہ اور اگر نہ چلائے تو" اُس کے "کھُنے سیکنے" والے بہت۔ یہ بجا کہ احتجاج ہر پاکستانی کا آئینی حق ہے لیکن یہ آئینی حق اُس وقت ختم ہو جاتا ہے جب کسی کی ناک سامنے آ جاتی ہے اور اگر احتجاج ناک" سے آگے نکل جائے تو پھر اسے آئینی حق نہیں غنڈہ گردی کہا جاتا ہے جس کا قلع" قمع کرنا حکمرانوں کا فرضِ منصبی لیکن لاہور کے احتجاج میں حکومتی نمائندے بڑے دردناک انداز میں عوام کی پریشانیوں کا ذکر تو کرتے رہے، غنڈوں کی سرکوبی نہیں۔ طوفانِ بَلا گزر جانے کے بعد وزیرِ داخلہ چودھری نثار نے فرمایا "حد ہو چکی لوگوں کو غنڈہ گردی کے ہاتھوں یرغمال نہیں بننے دیں گے"۔ اِس بیان پر ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں "بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے"۔

لاہور کی ہر شاہراہ تحریکِ انصاف کے غنڈوں کے قبضے میں۔ بے بس اور مجبور عوام گو عمران گو، ہمیں راستہ دو" اور شیم شیم کے نعرے بلند کرتے رہے لیکن بے"

سود۔اِس دہشت گردی کے دَوران ایمبولینسز کو بھی راستہ نہ دیا گیا۔فیروزوالا کا 15 سالہ بچہ ،شاہدرہ کی 17 دِن کی سدرہ ،ایک 16 سالہ لڑکی اور دِل کا ایک مریض ایمبولینسز میں ہی جان سے گئے۔ایک مجبور باپ اپنے ایک سالہ بیمار بچے کو ہسپتال لے جارہا تھا کہ تحریکی غنڈوں میں پھنس گیا۔اُس نے منتیں کیں ،ہاتھ جوڑے لیکن غنڈوں نے اُس کی ایک نہ سنی اور بچہ جان کی بازی ہار گیا۔میں نے نیوز چینل پر سترہ دِن کی سِدرہ کی لاش دیکھی تو خیالوں میں ایسا کھوئی کہ زاروقطار روتی چنگیز خاں کی روح سے ملاقات ہو گئی۔میں نے رونے کا سبب پوچھا تواُس نے کہا ''میں تو سمجھتا تھا کہ وحشت وبربریت میں میرا کوئی ثانی نہیں لیکن پتہ نہیں یہ نیا ''خاں'' کہاں سے ٹپک پڑا جو مجھے بھی مات دے گیا''۔میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''تمہارا آج بھی کوئی ثانی نہیں''۔تب چنگیز خاں نے دھاڑتے ہوئے کہا ''میں تواُن لوگوں کی کھوپڑیوں کے مینار بنا کر جشن منایا کرتا تھا جو میرے خلاف جنگ کرتے تھے لیکن تمہارا خاں تو بیکسوں ،بے بسوں مجبوروں اور مقہوروں کی لاشوں پر لاہور میں جشن منانے کا اعلان کر رہاہے۔کیا سترہ دِن کی سدرہ اور ایک سال کا بچہ بھی تمہارے خاں کے مخالف تھے جو اُس نے اُنہیں سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا؟۔نہیں ! میں تمہارے خاں کا مقابلہ نہیں کر سکتا''۔چنگیز خاں کی روح تو غائب ہو گئی لیکن تب سے اب تک میں یہی سوچ رہی ہوں کہ آخر کپتان صاحب کو جابجا نفرتوں کے بیج بونے سے کیا حاصل ہوگا؟۔میڈیا سے عدلیہ اور سیاستدانوں سے عام انسانوں تک خاں صاحب

جو نفرت کے بیج بو رہے ہیں ،اُس نفرتوں کی کھیتی کو کاٹنا بھی خود عمران خاں کو ہی پڑے گا لیکن تب شاید بہت دیر ہو چکی ہو گی ۔ایک وحشی کہتا ہے ”ایسی ہلکی پھلکی موسیقی تو چلتی ہی رہتی ہے “۔اسی ”ہلکی پھلکی“ موسیقی نے جب اُنکی ”حویلی“ کا گھیراؤ کیا تو تب پتہ چلے گا کہ یہ ہلکی پھلکی موسیقی تھی یا نفرتوں کا الاؤ۔

خاں صاحب اگر یہ سمجھتے ہیں کہ جیو نیوز کی ثنا مرزا کے آنسو رائیگاں جائیں گے یا امین حفیظ اور خواجہ عامر پر غلیلوں سے چلائی گئی کانچ کی گولیوں کا کچھ اثر نہیں ہوگا تو یہ اُنکی بھول ہے ۔آج تو خاں صاحب یہ کہتے ہیں کہ جب جھوٹ بولا جائے گا تو پھر ردِ عمل بھی آئے گا لیکن جب کل کلاں ”تحریکِ انتشار“ کے غنڈے مکافاتِ عمل کا شکار ہوئے تو یہی یُوٹرن کے ماہر خاں صاحب اُن سے لاتعلقی کا اظہار کرنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہیں لگائیں گے ۔میڈیا پر تحریکی غنڈوں کی غُنڈہ گردی پر انصار عباسی نے کہا کہ یہ بے غیرتی بے شرمی اور بے حیائی کی انتہا ہے ۔ تحریکِ انصاف کے لیے اپنے دِل میں بہت سے نرم، گوشے رکھنے والے حسن نثار بھی چیخ اُٹھے کہ یہ انتہائی بے غیرتی ہے ۔عاصمہ شیرازی نے کہا کہ اگر خاں صاحب نے میڈیا کی خواتین کے ساتھ ہونے والی بد تمیزی پر بھرپور ایکشن نہ لیا تو سارا میڈیا اُنہیں ”بُزدِل خاں“ کہنے پر مجبور ہو جائے گا۔ عاصمہ نے یہ بھی کہا کہ تحریکِ انصاف کے جلسوں کی کوریج

کرتے ہوئے تحریک کی کئی نوجوان لڑکیوں نے شکایت کی کہ تحریکِ انصاف کے لڑکے اُنکے ساتھ ایسی نازیبا زبان استعمال کرتے ہیں جو ناقابلِ بیاں ہے۔ اینکر فریحہ ادریس نے بھی عاصمہ شیرازی سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ایسی غنڈہ گردی دیکھی نہ سُنی۔ چیئرنگ کراس لاہور میں سٹیج سے بار بار یہ اعلانات ہوتے رہے کہ خواتین کا احترام ملحوظِ خاطر رکھا جائے لیکن جو فطرتاً بد ہو، اُس پر بھلا اِن اعلانات کا کیا اثر۔ سوال مگر یہ کہ جب خواتین کے ساتھ متواتر ایسا سلوک ہو رہا ہے تو پھر وہ ''تحریکِ انتشار'' کے جلسوں اور دھرنوں میں جاتی ہی کیوں ہیں اور اُنکے والدین اُنہیں بھیجنے کی ہمت کیسے کر لیتے ہیں۔

اِس پرچم کے سائے تلے

ہم تو سمجھتے تھے کہ وہ اکھڑ، ضدّی، انا پرست اور نرگسیت کا شکار ہے۔ یہ وہم بھی ہو چلا تھا کہ وہ کسی غیر ملکی ایجنڈے پر کام کر رہا ہے لیکن ہم غلط تھے، سرے سے غلط۔ لہجہ تلخ سہی لیکن اُسکے اندر ایک دھڑکتا ہوا دِل بھی ہے جو درد کی ٹیسوں کو محسوس بھی کرتا ہے اور، نونہالانِ وطن کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ بھی نہیں کرتا۔ اُس نے ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اور اپنی 126 روزہ تپسیا کو فراموش کرکے یہ نعرۂ مستانہ بلند کر دیا کہ وہ حکومت کے کندھے سے کندھا ملا کر دہشت گردی کی جنگ لڑے گا۔ نہیں معلوم کہ اُس کا سیاسی قد اونچا ہوا یا نہیں لیکن وہ لاریب انسانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ضرور ہو گیا۔ وہ ضدّی تو ہے اور ضدّی بھی فیض کے اِس شعر کی عملی تصویر

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

اُس نے ''طالبان خاں'' جیسا طعنہ برداشت کر لیا مگر طالبان کے خلاف ایکشن کی مخالفت پہ ڈٹا رہا۔ لیکن جب اُس کے دِل پر چوٹ پڑی تو وہ اپنا سارا سیاسی مستقبل داؤ پر لگا کر اُنہی طالبان کو نیست و نابود کرنے کے لیے اُس شخص کے

کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو گیا جسکے اندازِ سیاست کا وہ شدید مخالف ہے۔ باقی سبھی سیاسی جماعتیں تو پہلے ہی میاں نواز شریف کی دست و بازو تھیں۔ ثابت تو صرف کپتان نے کیا کہ ''اِس پرچم کے سائے تلے، ہم ایک ہیں، ہم ایک ہیں''۔ خاں صاحب نے کنٹینر پر کھڑے ہو کر انتہائی کرب کے عالم میں کہا کہ بڑوں کی لڑائی میں بچوں کو کیسے مارا جا سکتا ہے۔ عرض ہے کہ خون آشام درندوں کو تو اپنی درندگی کا ثبوت دینا تھا جو آرمی پبلک سکول پشاور میں دے دیا گیا۔ وزیرِ اعظم صاحب نے کہا ''بچوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لیں گے''۔ ہمیں یقین ہے کہ میاں صاحب ایسا ہی کریں گے لیکن یہ خوف بھی دامن گیر کہ کہیں یہ وقتی جوش کی لہر نہ ہو۔ نپولین نے کہا ''جنگ کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ لوگ مَر جاتے ہیں لیکن تکلیف دہ پہلو یہ کہ ہم اُنہیں فراموش کر دیتے ہیں''۔ ہماری فراموش کر دینے کی تاریخ تو ویسے ہی بہت تلخ ہے، ہم تو بہت کچھ بھلا کے بیٹھے ہیں اور ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی سانحے پر چند دِن شور اُٹھتا ہے اور پھر وہ وقت کی دھول میں گم ہو جاتا ہے لیکن سانحہ پشاور بھلایا جا سکتا ہے نہ مٹایا کیونکہ اِس میں ہمارے بچوں کا خون شامل ہے۔ اگر حکمرانوں کے اُٹھتے قدموں میں ذرا سی بھی لرزش آئی تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ قوم تو اُن کا دھماکا کرے گی ہی، تاریخ بھی اُنہیں معاف نہیں کرے گی۔ میاں صاحب! قوم کا مطالبہ ہے کہ آپ یکسو ہو کر اپنی تمام تر توانائیاں اِس فتنے کی سَرکوبی کے لیے وقف کر دیں۔ یہ ویسا ہی ''فتنہ خوارج'' ہے جسکے خلاف حضرت علیؓ کی تلوار اُٹھی اور فتنہ

نیست ونابود ہوگیا۔وہ ساتوں وحشی واصلِ جہنم ہوئے اور لگ بھگ ڈیڑھ سو شہید سیدھے جنت میں جا کر ڈٹ گئے۔جہنم سے نکلے ہوئے ابلیسیت کے علمبردارو! تُم بھلا اُس قوم کے جذبوں کو کیسے شکست دے سکتے ہو جس کی ایک پرنسپل کو وحشیوں نے سکول چھوڑنے کا حکم دیا لیکن وہ اپنے سکول کے بچوں کو چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہ ہوئیں ،ایک ٹیچر کلاس روم کے دروازے میں ڈٹ کر کھڑی ہو گئ اور اپنے بچوں کی یوں حفاظت کی جیسے وہ اُس کی کوکھ سے جنمے ہوں۔وہ دونوں مری نہیں، امر ہو گئیں اور وحشی واصلِ جہنم۔ننھی خولہ اپنے باپ کے ساتھ سکول میں داخل ہونے کے لیے گھر سے خوشی خوشی آئی ،اُسے یزیدی فوج کے ایک سپاہی نے باپ کی گود میں ایسے ہی شہید کر دیا جیسے علی اصغرؓ کو کوفیوں نے حضرت امام حسینؓ کی گود میں شہید کیا تھا۔باپ ہسپتال میں موت سے برسرِپیکار اور معصوم کلی منوں مٹی کے نیچے ،بھائی کبھی خولہ کو آوازیں دیتا ہے تو کبھی اپنے باپ کی زندگی کے لیے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر دعائیں مانگتا ہے ۔اُسی سکول کی ایک لیکچرار کے سامنے اُس کے 15 سالہ بیٹے کو شہید کر دیا گیا۔ماں سکتے میں کہ تادمِ مرگ وہ منظر بھول نہ سکے گی ۔عباس تابش نے کہا تھا

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش

میں نے اِک روز کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں ،جگر گوشے کو ڈر لگے تو ساری رات پلک جھپکائے بغیر

گزار دیتی ہیں۔ وہ اب بھی صبح چونک کر اُٹھیں گی کہ جگر گوشوں کو تیار کر کے سکول بھیجنا ہے اور چھٹی کے وقت نظریں دروازے پر کہ کب دروازے کی اوٹ سے چاند نکلتا ہے لیکن کواڑوں کے پیچھے سے نکلنے والے چاند تو ڈوب چکے ،اب تو کرب میں ڈوبی ،دُکھ میں لپٹی ماؤں کی درد بھری صدائیں ہی باقی ہیں لیکن صبر کی تلقین کرنے والے کہتے ہیں

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں ،کوئی نہیں آئے گا

چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف نے سچ کہا کہ دہشت گردوں نے ہمارے دِل پر وار کیا ہے۔آفرین ہے اُن جوانوں پہ جو وطن کی حفاظت کی خاطر اپنے سینوں سے سیسہ پلائی دیوار بنا چکے اور ہزار لعنت ہے اُن یزیدیوں پہ جنھوں نے آرمی پبلک سکول پشاور میں اُن بچوں کو تاک تاک کر شہید کیا جنکے باپ اور بھائی آپریشن ضربِ عضب میں شریک ہیں۔آج حکومت اور فوج ایک صفحے پر ہے اور پوری قوم اُن کی پشت پر۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت اور پُر عزم آرمی چیف اِن معصوم پھولوں کے خون کا بدلہ ضرور لیں گے ۔ ابتدا تو ہو چکی ،دو درندے واصلِ جہنم ہوئے لیکن ہم تو ایک ایک درندے کو پھانسی پر لٹکتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

خون آشام بھیڑیو ! اِس سے پہلے کہ تمھیں نشانِ عبرت بنا دیا جائے ، میں تمہارا

شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ ایک تو تمہارا عبرت ناک انجام قریب تَر ہوگیا اور دوسرے تم نے کراچی سے خیبر تک سب کو یک جان کردیا۔ اب کوئی سندھی، بلوچی، سرحدی یا پنجابی نہیں، سب پاکستانی اور سبھی ایک پرچم تلے۔ سب کا اللہ ایک، رسول ﷺ ایک قُرآن ایک اور مقصدِ حیات بھی ایک، تمہیں نشانِ عبرت بنانا۔ اب تمہارے حق میں، کوئی آواز اُٹھے گی نہ تمہیں شہید ثابت کرنے کے لیے تاویلیں گھڑی جائیں گی۔ اب تو امیرِ محترم سراج الحق نے بھی کہہ دیا کہ یہ حیوانیت اور درندگی کی انتہا ہے۔ اب ہمارا خاں بھی ''طالبان خاں'' نہیں وہی پرانا ہیرو عمران خاں ہے۔ وحشیو! تُم نے 16 دسمبر کا دِن ہمارے زخم کریدنے کے لیے منتخب کیا۔ 16 دسمبر 71ء کو میرا وطن دولخت ہوا اور 16 دسمبر 14ء کو تم نے ہمارے جگر گوشوں کو لخت لخت کردیا۔ ہمارے زخم ضرور ہرے ہوگئے لیکن تم کبھی ہمارے حوصلوں کو شکست نہ دے پاؤ گے۔

ہم بھی ہیں صف آرا

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

چوٹ بہت گہری ،نا قابلِ بیاں ،نا قابلِ برداشت۔درد کی کوئی زباں نہ کَرب کی ۔زبانیں گُنگ اور زنگ آلود ،آنکھیں پتھرائی ہوئیں اور لفظی بازی گری کے سارے حربے ناکام کہ ذہن کے اداس صفحے پر کوئی خیال ٹھہرتا ہی نہیں ۔ ترغۂ وہم وگماں کے کسی دورافتادہ گوشے میں بھی یہ شائبہ تک نہ تھا کہ کوئی اتنا وحشی ،اتنادرندہ ،اتنا شقی القلب بھی ہو سکتا ہے کہ معصوم پھولوں اور کلیوں کو مسل کر اپنی مردانگی کا ثبوت دے گا۔صبر کا یارا نہیں پھر بھی اَب خاموش کہ یہی اذنِ ربی اور یہی حکمت کی کتاب میں درج ''کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر مر نہیں سکتا، موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے '' (آل عمران)۔ربِ لم یزل نے خود ہی یہ حکم دے دیا'' شہید کو مُردہ مت کہو ،وہ زندہ ہے ''۔اِس لیے ہم اپنے شہیدوں کو مردہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتے ۔دُنیادیکھ لے کہ ہمارے معصوم شہیدوں کے لہو سے ٹپکتی نور کی کرنوں نے ہماری بے حسی کے سارے قفل توڑ کر کچھ کر گزرنے کی امنگوں کو جواں کر دیا ورنہ ہم تو نااُمیدی کی بکل اوڑھے یہی سمجھتے رہے کہ

دور لگے وہ وقت ابھی جب ٹھہری رات کے آنگن میں
پھیکا پڑکے چاند ہمیں آثارِ سحر دکھلائے گا

پوری قوم یکسو اور ہر کسی کی زبان پر حضرت عمرؓ کا یہی قول کہ ’’ظالموں کو معاف کرنا مظلوموں پر ظلم کے مترادف ہے‘‘۔طالبان کے جذباتی حامی بھی اُن سے نفرت کا برملا اظہار کر رہے ہیں۔ محترم عمران خاں نے اپنی ساری سیاسی سرگرمیاں ترک کرکے اعلان کر دیا کہ وہ میاں نواز شریف کی قیادت میں یہ جنگ لڑنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن نے کہا ’’ہم اپنے نونہالوں کو خون آلود مستقبل دینے پر شرمندہ ہیں اور ہم اُنہیں امن کی نوید بھی نہیں دے سکتے‘‘۔ محترم سراج الحق نے سانحہ پشاور کو حیوانیت قرار دیتے ہوئے کہا ’’ہم نے جنازوں پر پھول تو دیکھے لیکن آج ہم نے پھولوں کے جنازے پڑھے ہیں‘‘۔اکابرینِ جماعت اسلامی نے سانحہ پشاور کی
بھرپور مذمت کی اور چھوٹے بڑے کئی شہروں میں اِن پھولوں کی غائبانہ نمازِ جنازہ بھی پڑھی لیکن ایک بدفطرت اینکر نے طالبان کے حوالے سے جماعت اسلامی کو بدنام کرنے کی بھرپور کوشش کی۔اُس بدکُن نے یہ تک نہ سوچا کہ جتنی ملّی یکجہتی کی آج ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی کیونکہ اب اِس میں معصوم شہیدوں کا لہو بھی شامل ہو چکا ہے۔
جب اینکر موصوف سے سوال ہے کہ اگر طالبان سے مذاکرات کی حمایت کرنے والا اور اُن کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھنے والا لائقِ تعزیر ہے تو پھر محترم عمران خاں سمیت اِس جرم میں سبھی سیاسی جماعتیں شریک ہیں اور افواجِ پاکستان بھی کیونکہ صرف جماعت اسلامی ہی نہیں ،اُس وقت سبھی مذاکرات کے

حامی تھے لیکن جب اُن کے مکروہ چہرے سامنے آئے تو سبھی نے نہ صرف اِس کی بھرپور مذمت کی بلکہ دہشت گردوں کو نیست ونابود کرنے کا عہد بھی کیا۔ سبھی جانتے ہیں کہ اینکر موصوف کی زبان سے کبھی سچ نہیں نکلا اسی لیے وہ عدالتوں میں دھکے کھاتے اور رسوا ہوتے رہتے ہیں لیکن چونکہ موصوف جھوٹ بولنے کے نفسیاتی مریض ہیں اِس لیے بے بس ہیں۔

طالبان سے مذاکرات کا ڈول ڈالا گیا اور مذاکرات کا مینڈیٹ حاصل کرنے کے لیے اے پی سی بلائی گئی اور مذاکرات کا فیصلہ بھی ہوگیا تو تب بھی میں نے یہی لکھا کہ یہ محض وقت کا زیاں اور طالبان کو اپنی صفیں درست کرنے کا موقع دینے کے مترادف ہے ۔میں نے یہ بھی عرض کیا کہ

پکڑ کے زندہ ہی جس درندے کو تم سدھانے کی سوچتے ہو

بدل کے گا نہ سیدھے ہاتھوں وہ اپنے انداز دیکھ لینا

لیکن تب سبھی اتمامِ حجت کے چکر میں تھے اور وزیرِاعظم صاحب نے بھی پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر یہ فرمایا تھا کہ ''ہم مذاکرات کو ایک اور موقع دینا چاہتے ہیں''۔دوسری طرف طالبان نے مذاکرات کو حکومتی کمزوری سمجھتے ہوئے ہمارے دلوں پر ایسے گہرے گھاؤ لگائے کہ ہم آپریشن ضربِ عضب پر مجبور ہوئے اور محترم جنرل راحیل شریف کی قیادت میں جری جوانوں نے وہ کچھ کر دکھایا جس

کے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ یہ ناممکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سانحہ پشاور بجھتے دیے کی لَو ہے اور وحشی درندوں کا انجام قریب۔

عین اُس وقت جب پوری قوم حالتِ سوگ میں ہے، پتہ نہیں مولانا عبدالعزیز کے مَن میں کیا آئی کہ انہوں نے انتہائی شَر پسندانہ بیان داغ دیا۔ سانحہ لال مسجد کا ہم نے کئی روز تک سوگ منایا اور کالم بھی لکھے۔ آمر پرویز مشرف کے حکم پر جس طرح سے جامع حفصہ اور لال مسجد کے معصوم طلباء وطالبات کو فاسفورس بموں سے جلایا گیا وہ آج بھی اُتنا ہی اذیت ناک ہے جتنا کہ اُس وقت تھا لیکن لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز نے یہ کیا کہہ دیا کہ یہ آپریشن ضربِ عضب کا ردِ عمل ہے۔ وہ بھلے دہشت گردوں کی مذمت نہ کریں کہ قوم کو اُن کی مذمت کی ضرورت بھی نہیں لیکن اپنا مُنہ بند رکھیں کہ یہ اُنہی کے لیے بہتر ہے کیونکہ قوم کے جذبات کا الاؤ اپنی انتہاؤں پر ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ مولانا جذبات کے اِس الاؤ میں بھسم ہو جائیں۔ مولانا عبدالعزیز سے سوال ہے کہ قیدیوں کا قتل کس شریعت کا درس ہے؟۔ نہتے، معصوم اور بے گناہ مسلمانوں کو بم دھماکوں اور خود کش حملوں میں مار دینا کہاں کا اسلام ہے؟۔ درسگاہوں، امام بارگاہوں اور مساجد پر حملے کس دین میں جائز ہیں؟۔ کیا قُرآن وحدیث اور کسی بھی فقہ میں ایسی وحشت و درندگی کی اجازت ہے کہ ننھے منے معصوموں کو بے جرم وخطا شہید کر دیا جائے؟۔ میرا دین تو کھیتوں، کھلیانوں کو اجاڑنے سے بھی

منع کرتا ہے لیکن اِن درندوں نے تو ہسپتالوں ، مارکیٹوں ، بازاروں ، شاہراہوں بینکوں حتیٰ کہ جنازوں تک کو بھی نہیں چھوڑا۔اِن بزدلوں کا ٹارگٹ تو ہر وہ جگہ ہے، جہاں نہتے عوام کا ہجوم ہو۔ مولانا صاحب ! آپ اپنا دین اور اپنی شریعت اپنے پاس سنبھال کر رکھیں کیونکہ دینِ مبین میں تو اِس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی حوالے سے اکابرینِ ایم کیو ایم اور خصوصاً الطاف بھائی سے استدعا ہے کہ اتنی دور نہ نکل جائیں کہ مراجعت ممکن نہ ہو۔ محترم حیدر عباس رضوی نے مولانا عبد العزیز کے خلاف مذمتی بیان میں فرمایا ''پاکستان کا سنٹر آف گریوٹی کراچی ہے، کراچی کا سنٹر آف گریوٹی نائین زیرو اور نائین زیرو کا مالک الطاف حسین''۔ گویا پاکستان کے مالک محترم الطاف حسین ہیں۔ یہ بجا کہ کراچی پاکستان کا سنٹر آف گریوٹی ہے اور نائین زیرو کے مالک الطاف حسین ہی ہیں لیکن کراچی کا سنٹر آف گریوٹی نائین زیرو ہرگز نہیں۔ کراچی سب کا ہے اور ہر پاکستانی کے دل میں بستا ہے اِس لیے ایم کیو ایم کراچی پر اپنا حقِ ملکیت ثابت کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ ایسا کرنے سے نقصان بہر حال اُن کا ہی ہوگا۔

گلی گلی میں ضربِ عضب

سانحہ پشاور نے طالبان کے چہروں پر پڑا نقاب مکمل طور پر ہٹادیا اور اُنکے مکروہ چہرے سامنے آ گئے۔اب کی بار اُنھوں نے براہِ راست حصولِ علم کے پروانوں پر وار کرکے یہ ثابت کردیا کہ وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتے اور اُن کی طالبانی شریعت کا دینِ مبین سے کوئی تعلق نہیں ۔میرے دین میں حصولِ علم پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے ۔آقاﷺ نے اسے مومن کی گمشدہ میراث کہا اور حکمت کی کتاب میں ربِّ کردگار نے یہ فیصلہ ہی فرمادیا کہ ''ربّ کو جاننے والے اُس کے عالم بندے ہیں ''۔وحشی درندوں نے معصوم ''طالبانِ علم ''کے خون سے ہولی کھیل کر یہ ثابت کردیا کہ اُن کا قتل ہر مسلمان پر واجب ہی نہیں ،فرض بھی ہے ۔اِن درندوں نے اساتذہ کے خون سے ہاتھ رنگ کے اپنے آپ کو دائرۂ اسلام سے خارج کرلیا۔یہ وحشی اتنا بھی نہیں جانتے کہ اسلام میں استاد کو باپ کا درجہ دیا گیا ہے اور عالمِ اسلام کی اولین درسگاہ ''صفہ ''کے معلمِ اعظم خود میرے آقا تھے ۔کسی نے ایک بار سکندر سے پوچھا کہ وہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ عزت اپنے استاد ارسطو کی کیوں کرتا ہے ؟۔سکندر نے جواب دیا ''باپ مجھے آسمان سے زمین پر لایا اور استاد مجھے زمین سے آسمان پر لے گیا ''لیکن اِن باتوں کا جنونی درندوں پر کیا اثر جن کے مُنہ کو انسانی خون کی چاٹ لگ چکی ہو ۔

بائرن نے کہا ’’زندگی تو اُس پنڈولم کی مانند ہے جو آنسوؤں اور قہقہوں کے درمیان جھولتا رہتا ہے ۔ہم نے زندگی کا یہ سبق سیکھ لیا اور برداشت بھی کر لیا۔خون آلود گھڑیاں گزر چکیں اب بدلہ چکانے کا وقت ہے اور پوری قوم عزم صمیم کے ساتھ یکسو۔ساری سیاسی جماعتیں ایک صفحے پر اور افواجِ پاکستان پُر عزم ۔وزیرِ اعظم میاں نواز شریف نے فرمایا ’’ایک آپریشن ضربِ عضب قبائلی علاقوں میں جاری ہے اور دوسرا شہروں میں ۔اب اِن دہشت گردوں کے خلاف فیصلہ کُن جنگ ہوگی ۔ہم دہشت گردوں اور اُن کو پناہ دینے والوں میں کوئی تفریق نہیں کریں گے ۔دہشت گردی اور فرقہ واریت پاکستان کے لیے ایک کینسر ہے اور اب اِس ملک کو اِس سے نجات دلانے کا وقت ہے ۔پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ میاں شہباز شریف نے فرمایا ’’نئی نسل کو محفوظ پاکستان دینے‘‘ کی ذمہ داری نبھائیں گے ۔یہ وقت ’’ڈُو آر ڈائی‘‘ کا ہے‘‘۔اگر یہی جذبہ سلامت رہا تو وہ وقت دور نہیں جب انشاء اللہ اِس فتنے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی ۔ویسے جس جانفشانی سے گلی گلی میں دہشت گردوں کا تعاقب ہو رہا ہے اور اُن کو پورے پاکستان میں واصلِ جہنم کیا جا رہا ہے اُس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ اب گلی گلی میں ضربِ عضب جاری ہے ۔اُدھر افغان فورسز نے پاکستان کے مطالبے پر افغانستان کے صوبہ کنڑ میں آپریشن شروع کر دیا ہے ۔پاکستان تو عرصۂ دراز سے افغان حکومت سے یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ مُلّا فضل اللہ کنڑ میں چھپا ہوا ہے ،اُسے پاکستان کے حوالے

کیاجائے لیکن وہ تو افغان انٹیلی جنس کی پناہ میں تھا اور کرزئی حکومت اُسے پاکستان کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھی ۔ سوات کے بھگوڑے مُلا فضل اللہ نے فوجی آپریشن کے بعد افغانستان پہنچ کر یہ اعلان کیا کہ وہ بحفاظت افغانستان پہنچ گیا ہے ۔ کرزئی حکومت کے خاتمے کے بعد پہلی دفعہ ایسا ہو رہا ہے کہ دونوں حکومتیں طالبان کے خاتمے کے لیے ایک صفحے پر ہیں ۔ کنڑ میں کارروائی پر وہاں کے گورنر نے کہا کہ یہ ساری کارروائی حکومتِ پاکستان کے مطالبے پر ہو رہی ہے ۔افغان حکومت کا یہ بیان انتہائی خوش آئند ہے ،اگر افہام و تفہیم کی یہی فضاء قائم رہی تو ملا فضل اللہ بھی جلد واصلِ جہنم ہو جائے گا ۔

اِدھر طالبان کے خلاف بھرپور کارروائی ہو رہی ہے تو اُدھر کچھ لوگ اپنی سیاسی دوکانداری چمکانے کی کوششوں میں مگن ہیں ۔لال مسجد کے خطیب مولانا عبد العزیز نے انتہائی نامعقولیت کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف سانحہ پشاور پر طالبان کی مذمت سے انکار کیا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ یہ آپریشن ضربِ عضب کا ردِ عمل ہے اور طالبان ایسے حملے کرتے رہیں گے ۔ مولانا عبدالعزیز کے اِس بیان پر ایم کیو ایم کے الطاف بھائی بھڑک اُٹھے اور جامع حفصہ اور لال مسجد کو گرانے کا مطالبہ کرتے ہوئے جواز یہ پیش کیا کہ حضورِ اکرمؐ نے بھی ''مسجدِ ضرار'' کو گرانے کا حکم دیا تھا۔ عرض ہے کہ مسجدِ ضرار کی کہانی ذرا مختلف ہے ۔آقاؐ کے مدینہ منورہ تشریف لے جانے سے پہلے مدینہ میں ابو عامر نامی عیسائی کی

درویشی اور علمی وقار کا سکہ چل رہا تھا۔آ قاؐ جب مدینہ تشریف لائے تو اُس راہب کو اپنی درویشی ڈانواں ڈول ہوتی نظر آئی اور اُس نے مدینہ کے منافقین کے ایک گروہ کے ساتھ مل کر ایک سازش تیار کی۔یہ لوگ آ قاؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے درخواست کی کہ چونکہ مسجدِ قباء اور مسجدِ نبویؐ اُن سے کافی فاصلے پر ہیں اِس لیے اُنہیں مسجدِ ضرار بنانے کی اجازت دی جائے۔آ قاؐ نے اجازت مراحمت فرمادی اور یوں مسجدِ ضرار کی صورت میں سازشوں کا گڑھ تیار ہوگیا۔یہ مسجد آ قاؐ نے اُس وقت گرانے کا حکم دیا جب ربِ کردگار نے اِس مسجد کا سارا پول سورۃ توبہ میں کھول کر رکھ دیا (سورۃ توبہ 106-110) اور لال مسجد اور جامع حفصہ نہ تو کسی اسلام مخالف گروہ نے تعمیر کیں اور نہ ہی وہاں دینِ مبیں کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں۔یہ بالکل بجا کہ اِس وقت لال مسجد کا خطیب ایک ایسا شخص ہے جسے نرم سے نرم الفاظ میں ہوش وحواس سے عاری کہا جا سکتا ہے لیکن منافق ہر گز نہیں اِس لیے لال مسجد گرانے کا مطالبہ کسی بھی صورت میں درست نہیں۔یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مسجدِ ضرار علیم وخبیر ربِ کائینات کے حکم سے گرائی گئی اور آ قاؐ نے اُس وقت تک اِس مسجد کو گرانے کا حکم نہیں دیا جب تک اللہ کا واضح پیغام نہیں آگیا۔مسجدِ ضرار غالباً اسلام کی وہ پہلی اور آخری مسجد ہے جسے مسلمانوں نے خود اپنے ہاتھوں سے گرایا۔ہم ”زمینی خُداؤں“ کو ہر گز یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ اپنی زبانوں پر اِس قسم کے الفاظ بھی لائیں۔البتہ یہ ضرور کہ لال مسجد کو

مولانا عبد العزیز سے پاک کر دیا جائے تاکہ شر نہ پھیلے۔

پوری قوم ایک صفحے پر

ہم بھی عجیب لوگ ہیں۔جب بھی کوئی جانکاہ حادثہ رونما ہوتا ہے تو ہم جذبات کے الاؤ میں اپنے پرانے زخم کریدنے لگتے ہیں، سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں، نئے نئے منصوبے تراشتے ہیں لیکن نتیجہ ہمیشہ ''ڈھاک کے تین پات''۔دہشت گردوں نے ساٹھ ہزار شہید کر دیئے، پریڈلین مسجد، جی ایچ کیو، نیول ایئر بیس، کراچی ایئرپورٹ، کونسی جگہ ہے جو دہشت گردوں نے چھوڑی ہو۔اُن وحشیوں نے تو مساجد، جنازگاہیں، مارکیٹیں اور چرچ تک نہیں چھوڑے لیکن ہم نے اپنے آپ کو فقط منصوبوں تک محدود رکھا، عملی اقدام نہ ہونے کے برابر۔پھر دلوں کی دنیا اُجاڑ دینے والا سانحہ پشاور ہوگیا اور ہم ایک دفعہ پھر سر جوڑ بیٹھے لیکن اب کی بار منظر دوسرا تھا۔پاکستان اور عالمِ اسلام ہی نہیں، پوری دنیا نے اِس درد کو محسوس کرتے ہوئے بھرپور مذمت کی، کوئی طالبان کا حامی باقی نہ بچا حتیٰ کہ سیّد منور حسن نے بھی کہہ دیا ''یہ قتال فی سبیل اللہ نہیں، قتال فی سبیل الشیطان ہے''۔سانحہ پشاور پر آل پارٹیز کانفرنس بلائی گئی اور بنا حیل وحجت سبھی دہشت گردی کے خلاف یکسو ہوگئے۔

اللہ نظرِبَد سے بچائے، سیاسی و عسکری قیادت میں جتنی معجزاتی ہم آہنگی آج

نظر آ رہی ہے وہ پاکستان کی تاریخ میں دیکھی نہ سُنی ۔اِس کے باوجود کچھ کور چشم ''بزرجمہروں'' کو یہ ہم آہنگی نظر نہیں آ رہی ۔ایک ارسطوئے دَوراں جو ''حبِ علیؓ نہیں بغضِ معاویہؓ کے تحت ہمیشہ نواز لیگ کے خلاف محض اِس لیے زہر اگلتے رہتے ہیں کہ 2013ء کے انتخابات میں نواز لیگ نے اُنہیں ٹکٹ سے محروم رکھا،اُنھوں نے وزیرِاعظم کے جی ایچ کیو کے دورے پر فرمایا ''جب وہ پشاور میں ہونے والی درندگی کے بعد جی ایچ کیو گئے تو اُن کے چہرے کے تاثرات دیکھنے والے تھے ۔فیصلہ ساز فوجی جنرل اور جنگ میں قوم کی قیادت کرنے والوں کو علم ہی نہ تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے ۔وہ وہاں سکوت کا مظہر بنے بیٹھے تھے ''۔ہم تو سمجھتے تھے کہ موصوف صرف لکھاری ہیں لیکن اب پتہ چلا کہ وہ ایسے ماہرِ نفسیات بھی ہیں جو چہروں کو پڑھ کر دِل کا حال معلوم کر لیتے ہیں ۔ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موصوف کے پاس ''سلیمانی ٹوپی'' ہو جسے پہن کر وہ دنیا کی نظروں سے غائب ہو کر میاں صاحب کے پیچھے پیچھے جی ایچ کیو میں ہونے والی میٹنگ میں جا پہنچے ہوں کیونکہ جس قطعیت سے موصوف نے میاں صاحب کے ''سکوت کا مظہر'' بنے بیٹھنے کا ذکر کیا ہے اُس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی میاں صاحب کے پہلو میں ہی براجماں تھے ۔ہم اُن کی سلیمانی ٹوپی پر ایمان لے آتے لیکن 24 دسمبر کی طویل ترین آل پارٹی کانفرنس کے بعد موصوف کا بھانڈا پھوٹ گیا کیونکہ وہاں تو ناقابلِ یقین ہم آہنگی نظر آئی اور سبھی نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حکومت اور فوجی قیادت ایک صفحے پر ہے ۔دراصل محترم لکھاری

دھرنے ختم ہونے پر بوکھلا گئے ہیں کیونکہ وہ تو سمجھتے تھے کہ حکومت کے دِن گنے جا چکے لیکن اب تو تمام سیاسی جماعتوں نے میاں نواز شریف کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کر دیا جس کی بنا پر وہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئے۔

محترم لکھاری کی طرح چودھری.برادران کی بوکھلاہٹ تو اُس وقت سے جاری ہے جب سے علامہ قادری اُنہیں داغِ مفارقت دے کر عازم امریکہ ہوئے۔ شنید ہے کہ علامہ صاحب کے کھسک لینے کے بعد لوگ دھڑا دھڑ چودھری.برادران سے دھرنے کی تعزیت کرنے اُن کے گھر پہنچنے لگے۔ اُن لوگوں میں شیخ رشید بھی شامل تھے جو چودھری .برادران کو یہ طفل تسلیاں دے رہے تھے کہ ابھی کپتان کا دھرنا باقی ہے اور کپتان تو اُن کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتے اِس لیے خاطر جمع رکھیں لیکن چودھری.برادران تو علامہ قادری کی جدائی میں اتنے بے کَل تھے کہ متواتر گاتے ہی چلے جا رہے تھے کہ سانوں اِک پَل چین نہ آئے سجناں تیرے بِنا"۔ ایک کونے میں احمد رضا قصوری اُداس" اُداس بیٹھے تھے۔ کسی نے اداسی کا سبب پوچھا تو فرمانے لگے کہ دھرنا تھا تو کچھ آسرا بھی تھا لیکن اب تو پرویز مشرف صاحب کا مستقبل تاریک ہی لگتا ہے اور خطرہ ہے کہ ملک ایک "عظیم فنکار" سے محروم ہو جائے گا۔ ہمارے علامہ قادری بھی عجیب شَے ہیں۔ جب وہ کینیڈا سے تشریف لائے تو حکومت پریشان ہوئی اور جب گئے تو کچھ راندہ درگاہ سیاستدان اور کاروباری لوگ پریشان ہوئے۔ راندہ درگاہ اِس لیے کہ سوائے

آستانۂ قادریہ" کے اُنکی کوئی جائے پناہ نہیں تھی اور کاروباری اِس لیے کہ وہ توڈی" چوک کو مارکیٹ میں بدلنے کے منصوبے بنائے بیٹھے تھے لیکن پتہ نہیں علامہ صاحب کے مَن میں کیا آئی کہ اچانک اپنا دھرنا سمیٹ کراُن کے کاروبار پہ لات ماردی۔کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ علامہ صاحب نے بھکر کے ضمنی انتخابات میں مایوس کُن کارکردگی کی بناپر ایک دفعہ پھر انتخابات میں حصّہ لینے سے توبہ کرلی ہے اور صحت یابی کے بعد وہ انقلاب لانے پاکستان تشریف لارہے ہیں لیکن اب کی باراُنہیں کپتان صاحب کا ساتھ میسر نہیں ہوگا کیونکہ اب کپتان صاحب قومی دھارے میں شامل ہو چکے ہیں اور دہشت گردی کے خلاف اُن کا عزم اتنا صمیم ہے کہ اُنھوں نے آل پارٹی کانفرنس میں بَرملا کہہ دیا" تمام مسلح جتھوں سے ہتھیار واپس لیے جائیں،کوئی عسکری ونگ نہیں ہونا چاہیے ہتھیار صرف ریاستی فوج کے پاس ہونے چاہییں۔خاں صاحب کی اِس تجویز کو، وزیرِاعظم اور آرمی چیف نے بھرپور انداز میں سراہا۔یہ بھی اُمید کی جارہی ہے کہ ایک آدھ دِن میں حکومت اور تحریکِ انصاف کی مذاکراتی کمیٹیاں کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گی۔اِس لیے کپتان صاحب تواب علامہ قادری کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونے سے رہے البتہ الطاف بھائی سے اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ "اوئے جاگیردارا" کا نعرہ لگاتے ہوئے قادری صاحب کے ساتھ آن ملیں۔ویسے بھی آجکل وہ بہت "اوکھے اوکھے بیانات دے رہے ہیں۔پہلے اُنھوں نے مولانا عبدالعزیز سے پھڈا ڈالا،پھر مارشل" لاء کی بات کی اور اب ایک دفعہ

پھر نئے انتظامی یونٹ اور صوبے بنانے کا مطالبہ کر دیا ہے۔ ملٹری کورٹ پر بھی سب سے زیادہ اعتراض ایم کیوایم کو ہی تھا۔ فاروق ستار صاحب نے فرمایا ''پہلے جب ملٹری کورٹس بنے تھے تو ہمارے خلاف ہی استعمال ہوئے تھے''۔ افہام و تفہیم کی فضا کو برقرار رکھنے کی خاطر چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف صاحب نے کہہ دیا ''ماضی کو چھوڑیں، آگے بڑھیں، میں ذاتی گارنٹی دیتا ہوں کہ ملٹری کورٹ کا غلط استعمال نہیں ہوگا''۔ ہو سکتا ہے کہ الطاف بھائی یہ سب کچھ حفظِ ماتقدم کے طور پر کر رہے ہوں تاکہ 1992ء کی تاریخ نہ دہرائی جائے اور ایم کیوایم کے باقی رہنماؤں کو بھی الطاف بھائی کی طرح رات کے اندھیرے میں فرار نہ ہونا پڑے۔

سوال یہ ہے کہ

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔سرگوشیاں

سانحہ پشاور پر احتجاج دم توڑ رہا ہے، سرد راتوں میں چوراہوں پر معصوم پھولوں اور کلیوں کی یاد میں جلائی جانے والی شمعیں بھی بجھ چکیں۔الیکٹرانک میڈیا حسبِ سابق سب کچھ بھلا کر اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آیا۔وہی ریٹنگ کی جنگ، وہی چائے کی پیالی میں طوفان اور وہی مزاحیہ پروگرام جن میں ہزل گوئی، پھکڑپَن، جگت بازی اور ذو معنی جملوں کی بھرمار۔لیکن اندھیری راتوں میں بند کواڑوں کے پیچھے بے کل ماؤں کی سسکیاں اب بھی راتوں کا سکوت توڑ رہی ہیں،اُن کی اُجڑی کوکھیں اب بھی نوحہ کناں اور گھر گھر میں صفِ ماتم۔ہم اِس سولہ دسمبر کو اُسی طرح بھولتے جا رہے ہیں جس طرح سولہ دسمبر 71ء کو بھول چکے۔تب تو ہمارا پڑوسی دشمنی نبھانے کے لیے ہمارے سامنے تھا اور سقوطِ ڈھاکہ کے بعد اندرا گاندھی نے بڑے فخر سے کہہ بھی دیا ’’ہم نے نظریہ پاکستان کو خلیجِ بنگال میں ڈبو دیا‘‘۔معاملہ اب بھی وہی درپیش، ملکی سلامتی داؤ پر لیکن اب کی بار دشمن خارجی نہیں، داخلی ہے اور ہم اسے پہچانتے بھی نہیں۔کوئی نہیں جانتا کہ اُس کے ساتھ بیٹھا شخص محبِ وطن ہے یا دہشت گرد۔جس کی شناخت ممکن ہے اُس پر ہاتھ ڈالنے کی کسی میں ہمت ہے نہ سکت۔کوئی حکمرانوں سے یہ سوال کرنے کی

جرات بھی نہیں کرتا کہ افلاس کے مہیب سایوں میں اُن دَس لاکھ سے زائد زبردستی کے مہمانوں (افغان مہاجرین) کو اُن کے گھروں میں کیوں نہیں بھیجا جاتا؟۔ قوم نہیں جانتی کہ پچاس لاکھ سے زائد ازبک، چیچن، تاجک، صومالین، نائجیرین، سوڈانی، برمی، بنگلہ دیشی اور آذربائیجانی آسمان سے گرے یا زمین سے اُگے۔ اگر سرحد پار کرکے آئے تو ہماری تین درجن خفیہ ایجنسیاں کس مرض کی دوا ہیں اور اُن پر اربوں روپیہ کیوں صرف کیا جارہا ہے؟۔ کوئی بتلائے تو سہی کہ CIA کے ہزاروں ایجنٹوں کو بنا کسی تصدیق کے کس نے ویزے جاری کیے اور دہشت گردوں کو جدید ترین ہتھیار اور بارود کے ڈھیر فراہم کرنے والے کون ہیں؟۔ اور ہاں وہ جو میموگیٹ سکینڈل پر ہمارے وزیرِ اعظم خود کالا کوٹ پہن کر سپریم کورٹ جا پہنچے تھے، اُس سکینڈل کو بحرِ ہند میں غرق کیا یا بحرِ عرب میں؟۔ باتیں بہت کہ یہاں تو "قدم قدم پہ ہے جائے نالہ وفریاد" لیکن چلیں یہ سب کچھ یہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں کہ ہمارے سپہ سالار نے کہا "ماضی کو چھوڑیں آگے بڑھیں"۔ سوال مگر یہ کہ آگے بڑھیں تو کیسے؟۔ یہ بجا کہ ہمارے پُر عزم سپہ سالار آپریشن ضربِ عضب میں بے مثل کامیابیاں سمیٹ رہے ہیں اور یہ یقین کہ انشاء اللہ عنقریب وہ وزیرستان سے دہشت گردوں کا مکمل صفایا کر دیں گے لیکن بصد ادب گزارش ہے کہ یہ ناسور تو وطنِ عزیز کی نَس نَس میں سما چکا، اس گلتے ناسور کی بُو سے تو وطنِ عزیز کی فضائیں مسموم ہو چکیں۔ اس ناسور کی جراحی کون کریگا؟۔

سیاسی اور عسکری قیادت نے متفقہ طور پر بیس نکاتی ایکشن پلان کی منظوری دے دی لیکن کیا یہ بھی سوچا کہ اِس پر عمل درآمد کیسے ممکن ہے ؟۔ وزیرِاعظم صاحب نے توانا آواز میں دہشت گردوں کو منطقی انجام تک پہنچانے کا عزم کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک آپریشن ضربِ عضب افواجِ پاکستان فاٹا میں کر رہی ہیں ، دوسرا آپریشن ضربِ عضب ہم پورے ملک میں کریں گے ۔ ہمیں وزیرِاعظم صاحب کی نیت پر کوئی شک ہے نہ عزمِ صمیم پر لیکن راستہ اتنا طویل ، کٹھن اور پُر خار ہے کہ سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے ۔

طالبان نامی دہشت گردوں کے خلاف تو آپریشن کامیابی سے جاری ہے لیکن یہاں تو کئی قسم کی دہشت گردی کا سامنا ہے ۔ جن مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے اپنے عسکری ونگز بنا رکھے ہیں کیا وہ دہشت گرد نہیں ؟۔ کیا نفرت انگیز لٹریچر چھاپنے اور فرقہ واریت کو ہوا دے کر فسادات کروانے والے دہشت گرد نہیں ؟۔ کیا ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خوری دہشت گردی نہیں ؟۔ دین میں شدت کا عنصر داخل کرنے والے تو دہشت گرد ہیں ہی لیکن کیا فسطائیت کا دفاع کرنے والے ''لبرل'' دہشت گرد نہیں ؟۔ کیا نیوز چینلز پر بیٹھ کر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات کی صریحاً خلاف ورزی کا درس دے کر قوم کے جذبات بھڑکانے والے دہشت گرد نہیں؟۔ ''پنبہ کجا کجا نہم'' کے مصداق وزیرِاعظم صاحب کِس کِس کے گرد شکنجہ کسیں گے ؟ ۔ سبھی جانتے ہیں کہ کچھ مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے عسکری ونگ بنا رکھے ہیں اور انہی سیاسی جماعتوں پر ٹارگٹ کلنگ

اور بھتہ خوری جیسے الزامات بھی لگتے رہتے ہیں۔کیا مرکزی حکومت کراچی سمیت پورے ملک میں بلاامتیاز کارروائی کرنے کے لیےپُر عزم ہے ؟۔

ہمیشہ بلندآہنگ سے دینی NGO's غیر ملکی فنڈنگ پر پلنے والی سیکولر نظریات کی حامل ومذہبی جماعتوں کے خلاف زہر اُگلتی رہتی ہیں کیونکہ اُنھیں فنڈنگ ہی منافرت پھیلانے کی ملتی ہے۔دوسری طرف مذہبی جماعتیں بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی رہتی ہیں جس کی پر ہاتھ ڈال سکتی ہے؟۔ہماری NGO's بناپر تصادم کی فضاپیدا ہوتی ہے۔کیاحکومت اِن خفیہ ایجنسیاں بھی یہ تسلیم کرتی ہیں کہ دینی مدارس کی غالب اکثریت میں صرف دینی تعلیم ہی دی جاتی ہے لیکن کچھ مدارس ایسے بھی ہیں جودہشت گردوں کی تربیت گاہیں اور پناہ گاہیں ہیں۔کیاحکومت تمام دینی مدارس کو آئین وقانون کے دائرے میں لانے کی ہمت رکھتی ہے ؟۔ہم توصرف دعاہی کرسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو عزمِ صمیم کی دولت سے مالامال کرے لیکن یہ کام اگر ناممکن نہیں توانتہائی مشکل ضرورہے اوراسے تووہی پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتاہے جوحضرت خالدبن ولید کی طرح سفینے جلانے کی ہمت رکھتاہو۔

وزیرِاعظم صاحب کے متواتر بیانات سے یقین ہوچلاہے کہ اب اُن میں کچھ کرگزرنے کی اُمنگ جوان ہے،یہ الگ بات کہ کچھ لکھاری اب بھی یہ ماننے کو

تیار نہیں۔شاید یہ بغضِ معاویہ ہی ہے کہ ایک لکھاری میاں صاحب کے بارے میں فرماتے ہیں ”یہ صلح جو روحیں ہیں جو صرف مذاکرات اور امن کی راگنی ہی چھیڑ سکتی ہیں اور اگر فعالیت کا مرحلہ درپیش ہو تو کُل جماعتی کانفرنس کی ڈھال کے پیچھے پناہ کا آپشن موجود رہتا ہے۔۔۔جب میں ایم این اے تھا اور مجھے پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کرنا ہوتی تھی تو وہاں یہی نغمہ گونجتا تھا کہ ”میاں صاحب ! اٹھارہ کروڑ افراد آپ کے منتظر ہیں۔۔تو شام کو مجھے مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اسکاٹ لینڈ کی عمدہ ترین مصنوعات میں سے ایک کی ضرورت پڑتی تھی۔وزیرِاعظم ہاؤس میں گزارے ہوئے ایک دِن میں پتہ نہیں جرنیل صاحبان نے مُنہ کا ذائقہ کیسے بدلا ہوگا“۔عرض ہے کہ لکھاری موصوف کو شام تو کیا،ہر وقت ہی اسکاٹ لینڈ کی عمدہ ترین مصنوعات میں سے ایک کی ضرورت پڑتی رہتی ہے لیکن لکھاری موصوف خاطر جمع رکھیں ہمارے جرنیل صاحبان کو مُنہ کا ذائقہ بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ویسے جس شے ”سے موصوف مُنہ کا ذائقہ بدلتے رہتے ہیں اُس سے بندہ ایسے ہی مخبوط الحواس“ ہو جاتا ہے جیسے ہمارے یہ ” عظیم لکھاری“ آجکل ہو چکے ہیں۔ ویسے اگر محترم لکھاری نوازلیگ کی پالیسیوں سے اتنے ہی نالاں تھے تو 2013ء کے الیکشن میں میاں برادران سے ٹکٹ کی بھیک کیوں مانگتے رہے اور جب ایم این اے تھے تو اپنی غیرت و حمیت کو مہمیز دیتے ہوئے مستعفی کیوں نہیں ہوئے؟۔

بِلّا آزادی پھرتا رہے گا کیا۔۔؟

گڑھی خُدابخش میں بینظیر شہید کی برسی پر پیپلزپارٹی کے شریک چیئرمین جناب آصف زرداری اور دیگر اکابرین نے بہت سی باتیں کیں، بی بی شہید کے کارنامے گنوائے، اُنکی سیاسی رفعتوں سے جیالوں کو روشناس کرایا لیکن اگر کسی نے ذکر نہیں کیا تو اِس بات کا کہ بی بی کے قاتل ابھی تک زندہ کیوں ہیں۔جب بھی جیالے یہ نعرہ لگاتے ہیں ''بی بی ہم شرمندہ ہیں، تیرے قاتل زندہ ہیں''تو پیپلزپارٹی سے کوئی تعلق نہ رکھنے کے باوجود خود ہمیں بھی شرمندگی محسوس ہونے لگتی ہے کیونکہ بی بی کی شہادت کے بعد پیپلزپارٹی نے ہی پانچ سال تک حکومت کی لیکن قاتلوں کا سراغ لگانے میں نہ صرف ناکام رہی بلکہ سچ تو یہی ہے کہ ایسی کوئی سنجیدہ کوشش کی ہی نہیں گئی۔البتہ جب بیت اللہ محسود ڈرون حملے میں مارا گیا تو اُس وقت کے وزیرِاعظم یوسف رضا گیلانی نے بڑے فخر سے کہہ دیا ''ہم نے بی بی شہید کے قتل کا بدلہ لے لیا''۔جبکہ بی بی کی شہادت کے فوراً بعد بیت اللہ محسود یہ اعلان کر چکا تھا کہ ''ہم عورتوں پر حملے نہیں کیا کرتے''۔اُس وقت زرداری صاحب نے بھی دوٹوک الفاظ میں کہا کہ بی بی کے قتل میں طالبان ملوث نہیں۔اُنھوں نے تو قاف لیگ کو موردِالزام ٹھہراتے ہوئے ''قاتل لیگ''قرار دیا۔یہی قاتل لیگ بعد میں ''قابل لیگ''قرار پائی اور قاف لیگ کے وزراء کی فوج ظفر موج کے علاوہ چودھری

پرویز الٰہی پیپلزپارٹی کے ڈپٹی وزیرِاعظم بھی قرار پائے۔ ویسے یہ اقتدار کا نشہ بھی کتنا عجیب ہے کہ زرداری صاحب نے اقتدار بچانے کی خاطر بی بی شہید کے قاتلوں کو گلے لگالیا اور چودھری جو ساری زندگی چودھری ظہور الٰہی شہید کے قتل کا الزام پیپلزپارٹی پر دھرتے رہے، وہ حصولِ اقتدار کی خاطر اُسی پیپلزپارٹی کے پہلو میں جا کھڑے ہوئے۔ پیپلزپارٹی نے پرویز مشرف پر بھی بی بی کے قتل کا الزام لگایا لیکن پھر اسی پرویز مشرف کو پورے پروٹوکول اور گارڈ آف آنر کے ساتھ ایوانِ صدر سے رخصت بھی کیا۔ جب تک پیپلزپارٹی کا دَورِ حکومت رہا ''بِلّا'' پاکستان میں آزاد ہی پھرتا رہا اور سپریم کورٹ کے فُل بنچ کے فیصلے کے باوجود پیپلزپارٹی نے اُس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت تک نہ کی لیکن نوازلیگ کی حکومت کے آتے ہی پتہ نہیں یکایک کیا ''کایا کلپ'' ہوئی کہ جنابِ آصف زرداری کا جذبۂ انتقام جاگ اُٹھا اور اُن کی تقریروں میں ''بِلّا'' میاؤں میاؤں کرنے لگا۔ میاں صاحب کو تو زرداری صاحب بار بار تلقین کرتے ہیں کہ ''بِلّے کو جانے نہ دینا'' لیکن جب بِلّا اُن کے قبضۂ قدرت میں تھا تب وہ کہاں سوئے رہے، تب اُن کے دِل میں بی بی شہید کے قتل کے درد نے انگڑائی کیوں نہ لی؟۔ یہ یقین کہ وہ نوازلیگ کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتے ہیں لیکن نوازلیگ نے تو تمام تر خدشات کے باوجود اپنا کندھا'' پہلے ہی حاضر کر رکھا ہے۔ میاں صاحب کو بزدلی کا طعنہ ''

دینے والے شاید اُن کا ماضی فراموش کر چکے ہیں۔یاددہانی کے لیے عرض ہے کہ میاں نواز شریف صاحب نے اپنے کسی بھی دورِ اقتدار میں ڈکٹیشن نہیں لی۔1993ء میں صدر غلام اسحاق خاں سے ٹکرائے اور قوم سے خطاب کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ڈکٹیشن نہیں لوں گا،اسمبلی نہیں توڑوں گا اور نہ ہی استعفیٰ دوں گا''۔اسی تقریر کی بناپر'' اُنہیں وزارتِ عظمیٰ سے ہاتھ دھونے پڑے۔1998ء میں امریکی صدر بِل کلنٹن کے شدید دباؤ اور دھمکیوں کے باوجود ایک دو نہیں پورے چھ ایٹمی دھماکے کرکے پاکستان کو عالمِ اسلام کی پہلی ایٹمی طاقت بنادیا۔پرویز مشرف نے کارگل کی جنگ میاں صاحب کی مرضی اور ایماء کے بغیر شروع کی جس پر میاں صاحب نے 1999ء میں جنرل وحیدالدین بٹ کو چیف آف آرمی سٹاف بنادیا لیکن مشرف اور اُسکے کچھ ساتھی جرنیلوں نے حکومت کا تختہ الٹ کر میاں صاحب کو پورے خاندان سمیت جَلاوطن کردیا۔میاں صاحب کے ماضی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زرداری صاحب خاطر جمع رکھیں،میاں صاحب مشرف کیس سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے البتہ اگر عدالتیں مشرف کے حق میں فیصلہ کردیں تو الگ بات ہے۔ویسے تین رُکنی تحقیقاتی کمیشن نے جو فیصلہ سنایا ہے اُس سے تو ہر چشمِ بینا کو یہی نظر آنے لگا ہے کہ ''بِلّا'' آزاد ہی پھرتا رہے گا۔جنابِ آصف زرداری نے فرمایا ''میں دیکھ رہا ہوں کہ ''بِلّا'' ضمانت پر گھر میں بیٹھا ہے جس کے ایک طرف فوج چل رہی ہے اور ایک طرف وہ سیاست کررہا ہے۔بلّے کو سیاست کرنی ہے تو فوج سے ہٹ جائے اور اگر فوج کو اُس سے سیاست کروانی ہے تو بتادے کہ وہ اُن کا

نمائندہ ہے تاکہ ہمیں پتہ چل جائے، ہم اُن کا مقابلہ کریں گے''۔ عرض ہے کہ افواج پاکستان نے اپنے قول، فعل یا عمل سے کبھی ثابت نہیں کیا کہ وہ پرویز مشرف صاحب کی پشت پر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آمر عدالتوں میں دھکے کھا رہا ہوتا نہ بیماری کا بہانہ بنا کر اے ایف آئی سی راولپنڈی میں پناہ ڈھونڈتا۔ رہی مقابلہ کرنے کی بات تو عرض ہے کہ دو دوست ایک جنگل میں جا رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا ''اگر اچانک سامنے سے شیر آ جائے تو تم کیا کرو گے؟''۔ دوسرے نے جواب دیا ''جو کچھ کرے گا شیر ہی کرے گا، میں نے کیا کرنا ہے''۔ اگر فوج نے پرویز مشرف کو اپنا سیاسی نمائندہ بنانے کی ٹھان لی تو پھر جو کچھ کرے گی، فوج ہی کرے گی اور کامیاب بھی رہے گی کیونکہ آمروں کو تو دَس بار وردی میں منتخب کروانے والے سیاستدان ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ آمریت کے خلاف بڑھکیں لگانے والے یا تو چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں گھُس جاتے ہیں یا پھر آمر کے پہلو میں۔ انگلیوں پہ گنے چند صحافی اور سیاستدان ہی ایسے تھے جو آمریتوں کے خلاف سینہ تان کر کھڑے ہوئے اور بدترین تشدد کا شکار بھی ہوئے۔ یہ تسلیم کیے بنا کوئی چارا نہیں کہ بی بی جمہوریت کے حُسن کے ''لشکارے'' ابھی اُس مقام تک نہیں پہنچے کہ سیاستدانوں کی جھولی میں بھی کچھ آن گرے۔ بڑھکیں جتنی جی چاہے لگا کر خوش ہو لیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہماری ''نرم و نازک'' جمہوریت آج بھی اسٹیبلشمنٹ کی مرہونِ منت ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے جب الیکٹرانک میڈیا پر امپائر'' کی انگلی اُٹھنے کا شور تھا اور''

کچھ ''میڈیائی بزر جمہر'' تو تاریخیں تک دے رہے تھے لیکن اسٹیبلشمنٹ فی الحال اِس موڈ میں نظر نہیں آتی۔

ہمیں یقین ہے کہ زرداری صاحب نے مقابلہ کرنے کی بات اپنے جیالوں کو خوش کرنے کے لیے کی ہے کیونکہ وہ تو اتنے صلح جُو ہیں کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی کے ماتھے کی ایک شکن دیکھ کر ہی اُنھوں نے ریٹائرمنٹ سے چھ ماہ پہلے ہی جنرل صاحب کی مدت ملازمت میں تین سال کی توسیع کر دی۔ بلاول زرداری نے الطاف بھائی کے بارے میں سخت الفاظ کیا کہے کہ زرداری صاحب نے اُسے سیاست سے ہی '' آؤٹ '' کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ''پہلے بلاول نے کراچی میں تقریر کرتے ہوئے 100 لوگوں کو ناراض کیا اگر لاہور آ جاتا تو پتہ نہیں اور کتنے ناراض ہوتے۔اِس لیے مقابلہ کرنے کی بات تو، زرداری صاحب چھوڑ ہی دیں کیونکہ کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔اُدھر بلاول زرداری کہتے ہیں کہ ''آصف زرداری کمان ہیں اور میں تیر ہوں''۔ہم نوجوان بلاول کی اِس بات سے مکمل اتفاق کرتے ہیں لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ وہ ''کمان سے نکلا ہوا تیر'' ہیں جو کسی کے بَس میں بھی نہیں ہوتا۔

میلادالنبی ﷺ کے تقاضے

آج یومِ ولادتِ رسول ﷺ ہے۔ یہ دِن ہر سال بڑے احترام سے منایا جاتا ہے اور ہر مسلمان آقا پر اپنی عقیدتوں کے پھول نچھاور کرنے کی تگ ودَو میں مگن نظر آتا ہے۔ جلسے، جلوس اور ریلیاں نکلتی ہیں، محافلِ نعت سجتی ہیں اور فضائیں حبِ رسولؐ سے عطر بار ہو جاتی ہیں۔ میلاد کی محافل میں آقا کی شان بیان کی جاتی ہے اور رات کو چراغاں ہوتا ہے جس سے پورا پاکستان بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ اس دِن تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پوری قوم عشقِ رسولؐ میں ڈوب چکی ہو لیکن حیرت انگیز طور پر اگلے ہی دن ہم زندگی کی پرانی ڈگر پر لوٹ آتے ہیں یعنی "وہی ہے چال بے ڈھنگی، جو پہلے تھی سو اب بھی ہے"۔ کسی کو یہ بھی یاد تک نہیں رہتا کہ ہمارا تو ایمان ہی اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک ہمارے عشق کا یہ عالم نہ ہو جائے کہ آقا ﷺ ہمارے ماں باپ، عزیز، رشتے دار حتیٰ کہ دُنیا کی ایک ایک چیز سے پیارے نہ ہو جائیں۔ یہ کیسا عشقِ رسولؐ ہے جو صرف ایک دِن ہی قائم رہتا ہے اور یہ کیسی محبت ہے جس میں ہم اپنے محبوبؐ کی سنت پر عمل کرنا محض اِس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ ہمیں "جدیدیت" بہت مرغوب ہے۔ ہمیں ذرا رُک کر یہ سوچنا ہوگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم محض اِس لیے مسلمان کہلاتے ہوں کہ ہم مسلم گھرانے میں پیدا ہو گئے، اگر کسی ہندو کے گھر میں پیدا ہوتے تو ہندو ہوتے اور اگر عیسائی کے گھر پیدا ہوتے

تو عیسائی۔ ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ کیا ہمارا ایمان مطلوب و مقصودِ ربی کے مطابق ہے یا پھر ہم نے اپنی مرضی کے ایسے ایمان گھڑ رکھے ہیں جو دنیوی زندگی میں ہمارے لیے منافع بخش ہوں۔ ہمیں خود سے یہ سوال بھی کرنا ہوگا کہ کہیں ہمارا ایمان محض حمد و نعت اور جذباتی نعروں تک محدود تو نہیں اور کہیں ایسا تو نہیں کہ

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
مَن اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

ہمیں اپنے مَن میں ڈوب کر یہ سراغ بھی لگانا ہوگا کہ کہیں ہم ذات پات، رنگ و نسل اور فرقہ واریت کے اسیر تو نہیں اور بقول اقبال کہیں ایسا تو نہیں کہ

یوں تو مرزا بھی ہو، سیّد بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

یاد رکھیے کہ ربِ جبار و قہار نے عالم بے عمل کے لیے دوہری سزا مقرر کر رکھی ہے اور واضح کر دیا گیا ہے کہ جاننے والے اور نہ جاننے والے ہرگز برابر نہیں۔ اگر ایک عالم کی جزا ربِ کریم کے ہاں بہت زیادہ ہے تو عالم بے عمل کی سزا بھی اُتنی ہی سخت۔ ہمارے معاشی و معاشرتی رویوں سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم سبھی کچھ ہیں لیکن مسلمان نہیں کیونکہ ہم تو مسلمان ہونے کی اُس اولین

شرط پر بھی پورا اترنے سے قاصر ہیں جو میرے آقاؐ نے اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرمائی اور ساتھ ہی یہ گارنٹی بھی دے دی کہ اگر اس شرط پر پورا اتروگے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے ۔یہ شرط قُرآن وسنت کو مضبوطی سے تھامے رکھنا ہے لیکن اِس دَورِ جدید کی کشش نے ہمیں تارکِ قُرآن بنا دیا جس کی بنا پر ہم نے سنتِ رسولؐ پر عمل کرنا چھوڑ دیا ۔ایک مسلمان کی جنسِ گراں مایہ تو ایمان پر مضبوطی سے قائم رہنا ہے لیکن ہمارا ایمان تو اتنا متزلزل ہے کہ ہم محض ٹامک ٹوئیاں مارتے اور اپنی مرضی کا ایمان گھڑتے رہتے ہیں ۔حبِّ رسولؐ کے سبھی دعوے دار لیکن فرقہ واریت کا ناسور جا بجا، شیعہ سُنی جھگڑے گلی گلی اور ایک دوسرے کی گردن مارنے کو ہمہ وقت تیار۔

میرے آقاؐ تو اُس بیمار عورت کی عیادت کو بھی چلے گئے جو ہر روز آپؐ پر کوڑا پھینکتی تھی ۔لیکن ہم ایسے کم نصیب کہ اگر پڑوس میں مَرگ ہو جائے تو بچوں کو صرف یہ تلقین کرتے ہیں کہ ٹی وی کی آواز آہستہ کر دو پڑوس میں مرگ ہوئی ہے۔سانحہ پشاور نے بیشمار ماؤں کی کوکھ اجاڑ کے رکھ دی۔پوری دنیا نے اِس کَرب کو محسوس کیا،نریندر مودی جیسے اسلام اور مسلمان دشمن نے بھی اِس کَرب کو محسوس کرتے ہوئے پورے ہندوستان کے سکولوں میں دو منٹ کی خاموشی کا اعلان کر دیا اور برادر اسلامی ملک ترکی نے تو سوگ میں ایک دِن کے لیے اپنا جھنڈا سر نگوں کر دیا، لیکن ہم ؟۔۔۔ہم سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ نئے سال کی خوشیاں

منانے اور ہلّا گُلا کرنے سے باز رہتے حالانکہ اسلامی معاشرے میں تو ''ہیپی نیو ایئر'' کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ یہ رسم ِبَد تو اہلِ مغرب کے ہاں پائی جاتی ہے اور میرے آقا نے سب سے زیادہ ممانعت کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کرنے سے فرمائی ہے ۔آقا کا فرمان ہے ''جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی ،وہ انہی میں سے ہے ۔یوں تو ہم عشقِ رسول ﷺ کے بڑے داعی ہیں اور حرمتِ رسول ﷺ پہ مرنے'' مارنے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن سنتِ رسولؐ پہ عمل کرنے سے گریزاں ہی رہتے ہیں ۔ہمارا تو یہ عالم ہے کہ جو اُم الخبائث سے مُنہ کا ذائقہ بدلنے کی بات کرے وہ عظیم ''لکھاری اور تجزیہ نگار گردانا جاتا ہے۔ جو مُنہ ٹیڑھا کرکے انگریزی میں بات'' کرے ،اقوامِ مغرب کی سی شباہت اختیار کرے اور مفکرینِ یورپ کی مثالیں دے اُس سے ہم فوراََ متاثر ہو جاتے ہیں ۔ جو خواتین آزادیٔ نسواں اور حقوقِ نسواں کی آڑ میں دین کا مذاق اُڑاتی ہیں وہ الیکٹرانک میڈیا کو سب سے زیادہ مرغوب ہیں۔ اور اُن کی دریدہ دہنی پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آزادیٔ نسواں کی علمبردار خواتین کا مطالبہ کیا ہے؟ ۔اگر یہ حقوق کی بات کرتی ہیں تو یہ حقوق تو چودہ سو سال پہلے دینِ مبیں نے عطا کر دیئے اور اتنے عطا کیے کہ سوائے اسلامی معاشرے کے اور کوئی معاشرہ عطا کر ہی نہیں سکتا۔ حکمت کی کتاب میں درج کر دیا گیا ''اِن عورتوں کے بھی معروف طریقے پر ایسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق اِن پر ہیں (البقرہ 228) ۔سب سے پہلے دینِ مبین نے ہی عورت کو مکمل انسان تسلیم

کیا اور سورۃ النساء کے مطابق مردوں کو عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا۔ جس بیٹی کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اُسے ''اللہ کی رحمت'' قرار دیا اور نیک بیوی کو دنیا کی بہترین متاع۔ جس آزادی کا پرچار آزادیٔ نسواں کی علمبردار یہ خواتین کرتی ہیں وہ تو مادر پدر آزادی ہے۔ مغرب کے ایجنڈے پر کام کرنے والی یہ خواتین ویسی ہی جنسی آزادی چاہتی ہیں جیسی مغرب میں موجود ہے۔ جس جنسی بے راہروی کی یہ علمبردار ہیں، اُس میں تو ''حرامی بچے'' ہی جنم لے سکتے ہیں جس پر اہلِ مغرب کو تو کوئی ندامت نہیں ہوتی لیکن دینِ مبیں ایسے مرد وزن کو سنگسار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسلامی تعزیرات کو یہ ''سیکولر'' وحشیانہ فعل قرار دیتے ہیں اور حیرت ہے کہ مسلمان بھی کہلواتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ قُرآن کے ایک حرف سے انکار بھی پورے قُرآن سے انکار کے مترادف ہے۔ اسی لیے دین میں پورے کے پورے داخل ہو جانے کا حکم ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم دین کے کچھ حصّے اپنا لیں اور کچھ چھوڑ دیں۔ جس طرح فرقانِ حمید کے احکامات کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے اسی طرح سنتِ رسول ﷺ کی پیروی کے بغیر کوئی بھی شخص مسلمان کہلانے کا مستحق ہے نہ سچا عاشقِ رسول ﷺ کہلوانے کا۔ میلادالنبیؐ کا جشن منانے والو! یہ جشن مناؤ اور بھرپور طریقے سے مناؤ کہ اسی میں حبِ رسول ﷺ مضمر ہے لیکن محض جشنِ میلادالنبیؐ ہی نہیں، حبِ رسول کے تقاضے اور بھی ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف قومی رہنماء متحد۔۔۔؟

ہم تو حیران بلکہ پریشان تھے کہ انہونی کیسے ہو گئی۔ وزیرِ داخلہ بھی اسے انہونی ہی کہتے ہیں کہ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں ایک ہی ایکشن پلان پر متفق ہو گئیں۔ یقین تو نہیں آتا تھا لیکن سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھ کر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے تیز و طرار اور بیباک الیکٹرانک میڈیا کا جس نے سارا پول کھول کے رکھ دیا۔ اب تک جتنے سیاسی رہنماء نیوز چینلز پر آئے سبھی کا مؤقف ایک۔ سارے سیاسی ''میاں مٹھو'' ایک ہی رَٹ لگا رہے ہیں کہ چونکہ باقی جماعتیں ملٹری کورٹ پر متفق تھیں اِس لیے ہِلّی یکجہتی کی خاطر اُنھوں نے بھی طوہاََ و کرہاََ یہ کڑوا گھونٹ پی لیا البتہ مولانا فضل الرحمٰن ''پھڈا'' ڈال کے بیٹھ رہے اور پیپلز پارٹی نے تو ایسا جواز ڈھونڈا کہ ہم عش عش کر اُٹھے۔ اکابرینِ پیپلز پارٹی نے فرمایا کہ پانچ جنوری چونکہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی سالگرہ کا دِن ہے اور وہ بھٹو مرحوم ہی تھے جنہوں نے آمریت کے خلاف سب سے پہلی بغاوت کی اِس لیے وہ اِس دِن اکیسویں ترمیم کے حق میں ووٹ نہیں دے سکتے۔ پیپلز پارٹی کے بزرجمہروں کا کہا سَر آنکھوں پر لیکن شاید وہ بھول چکے کہ فوج کی نرسری میں پَل کر جوان ہونے والے بھٹو مرحوم ایوبی دَور کے انیس وزراء میں سے واحد سول وزیر تھے، باقی سارے وزراء فوجی۔ وہ یہ بھی بھول چکے کہ یہ اعزاز بھی

بھٹو مرحوم ہی کے حصے میں آیا کہ اُنھوں نے اپنے اقتدار کا آغاز بطور سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کیا جو دُنیا کی واحد مثال تھی۔ یہ تو ''نَو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی'' والی بات ہو گئی لیکن پھر بھی پیپلز پارٹی کی مہربانی کہ اُس نے تمام تر اختلافات و خدشات کے باوجود اکیسویں ترمیم کے حق میں نہ صرف ووٹ دینا قبول کر لیا بلکہ وہ اِس پر ڈٹ کر کھڑی بھی ہو گئی البتہ مولانا فضل الرحمٰن نے ''ٹکا سا'' جواب دیتے ہوئے کہہ دیا کہ وزیرِ اعظم صاحب نے مسودہ تیار کرنے میں اپوزیشن کو تو ساتھ رکھا لیکن اُنہیں اعتماد میں لیے بغیر ''چوری چوری'' مسودہ ''پھڑکا'' دیا اِس لیے وہ اِکیسویں ترمیم کے حق میں ووٹ نہیں دیں گے۔ جمعیت علمائے اسلام مذہبی اور فرقہ وارانہ دہشت گردی کے خلاف ترامیم کو عمومی دہشت گردی میں تبدیل کروانا چاہتی ہے جبکہ دیگر مذہب جماعتوں کا استدلال یہ ہے کہ لسانی اور قومیت کی بنیاد پر ہونے والی دہشت گردی کو بھی اِس بِل میں شامل کیا جائے کیونکہ دہشت گردی خواہ کسی بھی مقصد کے لیے کی جائے، دہشت گردی ہی ہوتی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ایم کیو ایم مذہبی اور فرقہ وارانہ دہشت گردی کو ترمیم کا حصہ بنانے پر تُلی بیٹھی ہے، جو مذہبی جماعتوں کو قبول نہیں جبکہ قومیت اور لسانیت کی بنا پر ہونے والی دہشت گردی کی براہِ راست زد ایم کیو ایم پر پڑتی ہے جس کے لیے ایم کیو ایم تیار نہیں۔ اُدھر نواز لیگ پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر بآسانی یہ ترمیم منظور کروا سکتی ہے لیکن یہ ترمیم متفقہ نہیں کہلائے گی جس کے لیے نواز لیگ تیار نہیں۔ ویسے اگر

نواز لیگ ''زرداری فارمولے'' پر عمل کرلے تو وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا ''فَتْافَٹ'' مان جائیں گے۔ پیپلزپارٹی نے جنابِ آصف زرداری کی قیادت میں پانچ سال اِسی طرح پورے کیے کہ

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی میرے تسلیم، سَپر کی صورت

لوگوں کو یاد ہوگا کہ ایک دفعہ مولانا جنابِ آصف زرداری سے روٹھ گئے، وجہ یہ تھی کہ مولانا کی نظر اسلامی نظریاتی کونسل کی ''چیئرمینی'' پر تھی لیکن پیپلزپارٹی اِس پر تیار نہیں تھی اِس لیے مولانا کا روٹھنا تو بنتا تھا۔ اُن دنوں حکومت بچانے کے لیے جنابِ زرداری کو مولانا کی اشد ضرورت تھی اِس لیے مولانا شیرانی کو اسلامی نظریاتی کونسل کا چیئرمین بنادیا اور مولانا فضل الرحمٰن پھر پیپلزپارٹی کے ''پکّے'' اتحادی بن گئے۔ دوسری دفعہ مولانا پھر پیپلزپارٹی سے روٹھے لیکن تب تک جنابِ زرداری ''پکا'' بندوبست کرتے ہوئے قاف لیگ کو ساتھ ملا چکے تھے اِس لیے مولانا کا روٹھنا بیکار گیا۔ وزیرِاعظم صاحب یہ تو جانتے ہی ہیں کہ مولانا پہلے ہی خیبرپختونخوا کی حکومت تحریکِ انصاف کے سپرد کرنے پر اُکھڑے اُکھڑے رہتے ہیں اور اب کی بار تو میاں صاحب نے حد ہی کردی مشورہ ہی نہیں کیا۔ مولانا اُن دَس فیصد مدارس کی نشاندہی بھی چاہتے ہیں جو دہشت، گردی میں ملوث ہیں۔ مولانا خاطر جمع رکھیں، ہماری خفیہ

ایجنسیاں اُن مدارس سے بخوبی آگاہ ہیں اور جب اُن پر ہاتھ ڈالا جائے گا تو مولانا کے علم میں بھی آ جائے گا۔ یہ یقین کہ مولانا کے مدارس اُن دَس فیصد میں شامل نہیں کیونکہ مولانا تو ''بقلم خود'' حکومت کے اتحادی ہیں البتہ ''مولانا اتحادی'' سے مشاورت نہ کرنا ایسا جرمِ عظیم ہے جس کی کم از کم سزا یہ ہے کہ نواز لیگ فوری طور پر ایک اور وزارت مولانا کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔ اگر حکومت نے ایسا نہ کیا تو لاریب حکومت اکیسویں ترمیم آسانی سے منظور کروا لے گی لیکن یہ ترمیم متفقہ نہیں ہوگی کیونکہ مولانا روٹھے ہی رہیں گے۔ دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ پوری قوم نے مل کر لڑنی ہے۔ سانحہ پشاور کے شہداء کے خون نے پوری قوم کو تو یکجا کر دیا لیکن ہمارے رہنماء اب بھی سیاست کر رہے ہیں۔ ہر کسی کے ذہن میں یہی خدشہ کلبلا رہا ہے کہ اگر ملٹری کورٹس بنانے کے باوجود دہشت گردی پر قابو نہ پایا جا سکا تو اُن پر یہ الزام دھرا جائے گا کہ اُنہوں نے اکیسویں ترمیم کے حق میں ووٹ دیا۔ اسی لیے سبھی اِسے ''کڑوا گھونٹ'' کہہ رہے ہیں تاکہ کل کلاں کو وہ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے سکیں۔ وکلاء تنظیمیں اگر ملٹری کورٹس کی مخالفت کرتی ہیں تو بات کچھ سمجھ میں بھی آتی ہے کہ اُن کا کام ہی آئین و قانون کی گتھیاں سلجھانا ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ آئین میں ایسے ملٹری کورٹس کی گنجائش نہیں لیکن سیاسی رہنماؤں کا کیا کیجئے کہ جو آل پارٹیز کانفرنس میں ایک بات کرتے ہیں اور باہر نکل کر دوسری۔

وکلاء کو تو شاید یہ جواز پیش کر کے مطمئن کیا جا سکتا ہو کہ غیر معمولی حالات میں غیر معمولی اقدامات اُٹھانے ہی پڑتے ہیں اور ایسا صرف پاکستان ہی نہیں پوری دنیا میں ہوتا آیا ہے۔ اگر دہشت گردی کا یہ عالم ہو کہ جج صاحبان کو براہِ راست دھمکیاں ملتی ہوں اور کچھ جج صاحبان اپنے خاندانوں سمیت ملک سے ہجرت کر چکے ہوں تو پھر آفرین ہے اُن حاضر سروس ملٹری آفیسرز پر جو ملٹری کورٹس کی سربراہی کریں گے کیونکہ وہ بھی گوشت پوست کے انسان ہی ہیں اور اُن کے بھی خاندان ہیں جنہیں دھمکیاں بھی مل سکتی ہیں اور خدانخواستہ اُن دھمکیوں پر عمل درآمد بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بجا کہ بدترین جمہوریت بھی بہترین آمریت سے بہتر ہوتی ہے اور کوئی بھی عقیل و فہیم کسی بھی صورت میں مارشل لائی آمریت کو قبول نہیں کر سکتا لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ زلزلے آئیں، دہشت گردی ہو یا سیلاب آئیں تو فوج پہلی صف میں نظر آتی ہے۔ تھر میں قحط پڑے تو فوج کی ضرورت اور سرحدوں کی حفاظت مقصود ہو تو سینوں پر گولیاں کھا کر شہید ہونے والی بھی فوج۔ یہ ہمارے ہی بھائی بیٹے ہیں جو دہشت گردوں کو نیست و نابود کرنے اور اُنہیں انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے سینہ سپر ہیں اور مقصد صرف ایک کہ قوم سکھ کی نیند سو سکے۔ اسی لیے آل پارٹیز کانفرنس میں چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف نے برملا کہہ دیا کہ ملٹری کورٹس فوج کی نہیں، قومی ضرورت ہیں
۔

تبدیلی آگئی ہے

ہم تو بار بار یہ کہتے رہے کہ کپتان صاحب قول کے سچّے اور دُھن کے پکّے ہیں ، وہ جو کہتے ہیں ، کر گزرتے ہیں لیکن ہماری تو کوئی سُنتا ہی نہیں تھا۔اُنھوں نے ''تبدیلی''کا نعرہ لگایااور دیکھ لیں تبدیلی لاکر دکھادی۔کیا ہوا جو یہ تبدیلی ''نئے پاکستان''کی صورت میں نہیں آئی ،اُنکی زندگی میں تو آ گئی ۔اُنھوں نے سوچا ہوگا کہ قوم تواب دہشت گردی کے خلاف جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور وہ خود فی الحال ''ویہلے''اِس لیے '' ہنی مون''منانے کا یہی بہترین موقع ہے۔ہمیں اُن کی شادی پر خوشی تو بہت ہے لیکن ساتھ تھوڑا غم بھی کہ سانحہ پشاور کے شہیدوں کا زخم ابھی تازہ ہے ،اگر وہ شہداء کے چہلم کے بعد شادی کر لیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ویسے تو ہم نے یہ بھی سُن رکھا ہے کہ نکاح تو 7 محرم کو ہی مفتی سعید صاحب نے پڑھا دیا تھا،اِس کا باقاعدہ اعلان جمعرات 8 جنوری کو کیا گیا، جس میں محض گواہان ہی موجود تھے ۔ بہر حال نکاح جب بھی ہوا ، ہو گیا لیکن اِس نکاح کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہمارے خاں صاحب اپنے گھر میں دولہا بَن کے بیٹھ رہے اور بارات ریحام خاں لے کر آئی ۔ فوٹو شوٹ پر بھی ریحام خاں پُر اعتماد نظر آئی جبکہ ہمارے خاں صاحب دولہنوں کی طرح شرماتے رہے اِس لیے تو ہم کہتے ہیں کہ تبدیلی آ نہیں رہی ، تبدیلی آ گئی ہے۔ تبدیلی آنے کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ خاں صاحب اور ریحام خاں کی یہ

شادی ''ایمر جنسی''میں ہوئی۔ ہوا یوں کہ ریحام خاں ہمارے کپتان صاحب کا انٹرویو کرنے گئیں اور چھوٹتے ہی یہ سوال داغ دیا ''بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے، ہم توڈیڑھ سال سے انتظار میں تھے''۔ خاں صاحب نے لبوں پر میٹھی مسکان سجاتے ہوئے جواب دیا''پہلے آپ نے صحیح طریقے سے بلایا ہی نہیں تھا''۔ پھر انٹرویو کا باقاعدہ آغاز سیاست اور اختتام ''اَکھ لڑی بَدو بَدی''پر ہوا۔ دروغ بَر گردنِ راوی، خاں صاحب نے ریحام خاں کو کہا ''دو بچوں کا پاپا پھر بھی آئی لَو یو''۔ جواباََ ریحام خاں نے بھی جھَٹ سے کہہ دیا''تین بچوں کی ماما پھر بھی آئی لَو یُو''۔ ریحام خاں یہ تو تسلیم کرتی ہیں کہ کپتان صاحب نے اُنہیں ''پَرپوز''کیا تھا لیکن ''اندر کی بات''وہ بھی نہیں بتاتیں۔ بہرحال ایمر جنسی''میں ہی سہی، شادی تو ہو گئی اِس لیے کب، کیوں اور کیسے ہوئی جیسے سارے'' سوال بے معنی ہیں البتہ ہم خاں صاحب کو چاہنے ''والیوں''کو یہ پیغام دینے میں حق بجانب ضرور ہیں کہ ''اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر''۔

سونامیوں کے ہاں آج کل سب سے مقبول نعرہ یہ ہے کہ ''بھابی آ نہیں رہی، بھابی آ گئی ہے''۔ کچھ سونامیے تو اِس تبدیلی پر باقاعدہ مٹھائیاں بانٹتے اور بھنگڑے ڈالتے بھی نظر آئے لیکن یہ تک نہ سوچا کہ اِس شادی خانہ آبادی نے کتنے دِلوں کی بربادی کی اور کتنے دل ''توڑ مروڑ'' کے رکھ دیئے۔ اب تو گلی گلی میں ''ٹھنڈی ٹھار''آہوں کا شور ہے۔ ایک دِل جلی نے اگر یہ ٹویٹ کیا کہ

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے
تو دوسری یوں گویا ہوئی کہ
اے عندلیب آ کریں مل کے آہ وزاریاں
تُو ہائے گُل پُکار، میں چلاؤں ہائے دِل

ہمیں تو یہ بھی پتہ چلا ہے کہ کچھ ''دِل جلیوں'' نے گلیوں میں با قاعدہ کورس میں یہ گانا شروع کر دیا ہے کہ

جیہڑے توڑدے نیں دِل برباد ہون گے
اَج کسے نوں روایا، کل آپ رون گے

دِل جلیوں کی اِس ''تبدیلی'' نے ہمیں پریشان کر دیا ہے کیونکہ اگر انھوں نے بنی گالہ کے باہر ''دھرنا'' دینے کا پروگرام بنالیا تو ''دِل جلے'' بھی اُن کی مدد کو پہنچ جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نواز لیگ ڈی چوک اسلام آباد کا بدلہ لینے کے لیے بذریعہ رانا ثناء اللہ اِن دِل جلیوں کی چوری چوری مدد کرنا شروع کر دیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو خاں صاحب کی شادی کا سارا مزہ کِر کرا ہو کے رہ جائے گا۔اِس لیے ہم تو دِل جلیوں کو یہی نصیحت کر سکتے ہیں کہ وہ دِل کے پھپھولے جتنے جی چاہے پھوڑ لیں لیکن ''کُھ'' فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ قوم

کو تو ''بھابھی'' مل چکی۔

عمران خاں کی شادی کی افواہوں پر جناب نجم ولی خاں نے بڑا پُر مغز ''حسابی'' تجزیہ کرتے ہوئے اِس شادی کی خامیاں اجاگر کی ہیں لیکن خوبی ایک بھی نہیں۔اِس کے باوجود بھی یہ اُنکی مہربانی ہے کہ ہماری طرح وہ بھی خاں صاحب کی شادی پر ذاتی طور پر خوش ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ''یہ الگ بات ہے کہ اُنکی پارٹی میں شامل بہت سی نوجوان لڑکیاں اِس شادی پر خوش نہ ہوں۔ عین ممکن ہے اُن کے جلسوں میں آنے والی خوبصورت لڑکیوں کی تعداد میں نمایاں کمی ہو جائے، میرے خیال میں یہ تحریکِ انصاف سے پہلے اُن ٹی وی چینلوں کا نقصان ہوگا جو اِن جلسوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے چاند سے چہرے دکھاتے ہیں کہ اِس سے اُنکی ریٹنگ میں اضافہ ہوتا ہے۔ تحریکِ انصاف کا یہ سیاسی نقصان ہو سکتا ہے کہ وہ بہت سارے نوجوان جلسوں میں جانا چھوڑ دیں گے جو ٹی وی چینلوں پر نظر آنے والے چہرے دیکھتے ہوئے ہر جلسے میں باڑیں اور رکاوٹیں پھلانگ کر لڑکیوں والے حصّے میں جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابھی تک یہ خدشہ موجود ہے کہ عام انتخابات میں ہونے والی مبینہ تحقیقات کے لیے حکومت تحقیقاتی کمیشن قائم نہ کرے، ایسے میں تحریکِ انصاف کے پاس ایک مرتبہ پھر لانگ مارچ اور دھرنے کے سوا کیا راستہ ہو سکتا ہے مگر عمران خاں کی شادی کے بعد تحریکِ انصاف کے جلسے بھی مسلم لیگ نون کے جلسوں جیسے ہو سکتے ہیں جہاں نظر آنے والے زنانہ چہروں کو دیکھ کر

نواز لیگ کے نوجوان فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ ٹی وی پر ہی اُن کا خطاب سُن لیں، جلسے میں جا کر اپنا ٹمیسٹ (یعنی ذائقہ) خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے''۔ محترم نجم ولی کا کہا بجا البتہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شادی ہمارے اینکروں اور لکھاریوں نے کروائی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ خاں صاحب متواتر ''کُرلاتے'' رہے کہ حکومت نے نیوز چینلز کے اینکروں کو خرید لیا ہے لیکن کسی اینکر کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بالآخر خاں صاحب نے ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق اینکروں کو سبق سکھانے کے لیے خود ایک ایسی اینکرنی'' سے شادی کر لی جو اینکرنی کم اور ''ٹائیگرنی'' زیادہ لگتی ہے، یقین نہ آئے'' تو محترم نبیل گبول سے پوچھ لیں۔ جہاں تک صبیح و ملیح چہروں کے جلسوں اور دھرنوں میں شرکت نہ کرنے کا سوال ہے تو مشتری ہوشیار باش، خاں صاحب نے قوم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ''نیا پاکستان'' بنانے کے بعد شادی کریں گے، اب جب نیا پاکستان بن جائے گا تب وہ یقیناً اپنا وعدہ بھی پورا کریں گے اِس لیے پکچر ابھی باقی ہے اور اُمیدیں قائم ودائم۔ شاید اسی لیے خاں صاحب نے مستقبل کی ''خاتونِ اوّل'' کی اناؤنسمنٹ بھی روک رکھی ہے کیونکہ جب ہمارے کپتان صاحب وزیرِ اعظم بنیں گے تب پتہ نہیں کون خاتونِ اوّل'' قرار پائے گی۔۔۔ اور ہاں نواز لیگ کے جلسوں میں مانا کہ خاں صاحب'' کے جلسوں جیسی رونقیں نہیں ہوتیں لیکن یہ اتنے ''ماٹھے'' بھی نہیں ہوتے جتنے نجم ولی صاحب نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈھونڈنے والے کیمرے کی آنکھ کو کچھ نہ کچھ مِل ہی جاتا ہے البتہ اگر مولانا فضل الرحمٰن نے واقعی ڈی چوک میں

دھرنا دینے کا پروگرام بنالیا تو وہاں نوجوانوں کو "کچھ" نہیں ملے گا کیونکہ مولانا کے جلسوں میں صباحت و ملاحت نامی کسی "شے" کا وجود تک نہیں ہوتا۔

ترمیم تو ہو گئی لیکن۔۔۔

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

پتہ نہیں کب دَورِ کرب شگفتِ بہار میں تبدیل ہوگا، پتہ نہیں کب نااُمیدیوں کے لق ودق صحرا میں میں اُمید کی کلیاں کھلیں گی، پتہ نہیں کب ہماری ہی ضیاء سے منور ہونے والے ہم سے کراہت وبیگانگی کا وطیرہ چھوڑیں گے، پتہ نہیں بے برگ وثمر کھیتیاں کب ہری بھری ہونگی، پتہ نہیں کب صحنِ چمن میں کوئل کوکے گی اور پپیہا ''پی کہاں'' کی رَٹ لگائے گا اور پتہ نہیں کب ہماری دعائیں عرشِ بریں تک پہنچیں گی۔ لیکن ایسا تو تبھی ہوگا جب ہم اپنے مَن میں ڈوب کر زندگی کا سراغ لگانے کے اہل ہونگے۔

آقا ﷺ نے تو فرمایا ''وہ طویل سفر میں ہے، پراگندہ حال، غبار آلود، دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر کہتا ہے، اے رَب، اے رَب! مگر اُس کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام اور غذا حرام۔ بھلا ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے''۔ ہماری دعائیں بھی تبھی مستجاب ہونگی جب ہمارے ایمان وایقان کو قُرآن وسنت کی وہی بنیاد فراہم کر دی جائے گی جسے مضبوطی سے تھام لینے پر کبھی گمراہ نہ ہونے کا وعدہ خود میرے آقا ﷺ نے فرمایا ہے۔ لیکن ہم تو مِن حیث القوم تارکِ قُرآں ہیں۔ اِس کتابِ حکمت کی حفاظت کا ذمہ تو خود ربِ لم یزل نے لیا ہے لیکن تفسیر، تشریح اور تاویل ہماری اپنی اپنی۔ یہی وجہ ہے کہ معاملہ مذہبی ہو، مسلکی یا ملکی ہم کہیں بھی یکسو نظر نہیں آتے۔ اکیسویں

ترمیم منظور ہو گئی اور کھلی آنکھوں سے تو یہی نظر آ رہا تھا کہ یہ ترمیم ''مقتدر قوتوں'' کی خواہش ، ایماء اور طاقت کی بنا پر پایۂ تکمیل کو پہنچی لیکن مقتدر قوتیں بھی اِس ترمیم کو متفقہ قرار دلوانے میں ناکام رہیں ۔جب پہلی اور دوسری آل پارٹیز کانفرنسوں میں سب کچھ طے ہو چکا تھا تو پھر تیسری کانفرنس میں پتہ نہیں اچانک کیا ہوا کہ جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام نے پارلیمنٹ میں آنے سے انکار کر دیا ۔اب صورتِ حال یہ ہے کہ سانحہ پشاور کے معصوموں کے لہو کی خوشبو ابھی تک فضاؤں میں ہے لیکن ہم بکھر چکے ۔ سول سوسائٹی کو اکیسویں ترمیم منظور نہیں ، وکلاء اِس ترمیم کے خلاف کمربستہ اعلیٰ عدالتوں میں اسے چیلنج کیا جا چکا ، نئی آئینی بحثوں اور قانونی موشگافیوں کے دروازے کھُل چکے ،الیکٹرانک میڈیا پر بحث جاری ،اینکرز اپنی ریٹنگ بڑھانے کے چکر میں ملّی یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کمربستہ ، مساجد ، مدارس کے معاملے پر دینی جماعتیں میدان میں آ چکیں ، سندھ میں ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی باہم دست و گریباں اور محترم عمران خاں بھی سانحہ پشاور کو فراموش کر کے ایک دفعہ پھر سڑکوں پر آنے کے لیے بیتاب ۔کیا قومی اتحاد اسی کا نام ہے اور کیا جنگیں ایسے ہی لڑی جاتی ہیں ؟۔ کیا تاریخِ عالم میں کبھی ایسا ہوا کہ پارہ پارہ قومی اتحاد کے دامن سے فتح و نصرت کے شادیانوں کی گونج سنائی دینے لگے ۔

مسئلہ اتنا بڑا تو نہیں تھا کہ حل نہ ہو پاتا ۔آج وزیرِ اعظم کہتے ہیں ''ہم سب

کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں اور ملک کو جو حالات درپیش ہیں، کوئی بھی جماعت تنہا اُنکا مقابلہ نہیں کر سکتی، آئینی ترمیم پر تحفظات دور کیے جائیں گے"۔ سوال مگر یہ ہے کہ ایسا پہلے کیوں نہیں کیا گیا، وکلاء اور سول سوسائٹی کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا گیا اور دینی جماعتوں کے تحفظات کیوں دور نہیں کیے گئے اور نواز لیگ کو اکیسویں ترمیم کی منظوری کروانے کا سہرا اپنے سَر بندھوانے کی اتنی جلدی کیوں تھی۔ اگر دو چار دن اور صبر کر لیا جاتا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑتی۔ دینی جماعتوں کو اعتراض ہے تو فقط اتنا کہ دہشت گردی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ صرف مذہب، عقیدے اور مسلک کے گرد گھومتی نظر آتی ہے ۔نیوز چینلز اور اخبارات میں بھی یہی اشتہارات آتے رہتے ہیں کہ مسجدوں اور مدرسوں پر نظر رکھیں اور جہاں کہیں دہشت گرد نظر آئے اُس کے بارے میں رپورٹ کریں جبکہ ہمارے وزیرِ داخلہ اور وزیرِ اطلاعات و نشریات یہ بھی فرماتے ہیں کہ صرف دَس فیصد مدارس ایسے ہیں جہاں دہشت گردوں کو پناہ دی جاتی ہے یا دہشت گردی کی تعلیم۔ مذہبی جماعتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو دہشت گردوں کے خلاف ایکشن کی مخالفت کرتی ہو یا اُسے ملٹری کورٹس پر اعتراض ہو۔ اعتراض ہے تو صرف یہ کہ دہشت گرد کا کوئی مذہب ہوتا ہے نہ مسلک جبکہ اکیسویں ترمیم صرف مذہب، مسلک اور فرقے کے گرد گھومتی نظر آتی ہے اِس لیے دہشت گردی کی یہ تعریف نہ صرف ادھوری بلکہ مہمل بھی ہے۔ عالمی قوتیں تو پہلے ہی دہشت گردی کے ناطے اسلام سے جوڑنے کے لیے کوشاں نظر آتی ہیں، اگر اس ترمیم کو صرف مذہبی انتہا پسندی

تک محدود کر دیا گیا تو پھر ہم نے گویا اُنکی بات پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

وثوق سے کہا جاسکتا ہے اگر اکیسویں ترمیم کی آڑ میں صرف مذہب، مسلک اور عقیدے کو دہشت گردی کی بنیاد بنا کر مدارس اور مساجد کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تو ملٹری کورٹس تو ناکام ہونگی ہی، ملک میں انارکی بھی پھیل جائے گی۔ ہماری ایجنسیوں کے پاس کم وبیش ایسے دو سو مدارس کی مکمل معلومات ہیں جو جہاں دہشت گردوں کو پناہ دی جاتی ہو یا جہاد کے نام پر دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہو۔ ایسے مدرسوں کے خلاف ایکشن پر کسی دینی جماعت کو اعتراض ہے نہ ہونا چاہیے لیکن ایجنسیوں کے پاس ایسی معلومات سیاسی جماعتوں کے بارے میں بھی ہیں۔ پھر صرف مساجد اور مدارس کیوں، عسکری ونگ رکھنے والی، ٹارگٹ کلرز اور بھتہ خوروں کی سرپرستی کرنے والی لسانی اور سیاسی جماعتیں کیوں نہیں۔ شرجیل میمن کہتے ہیں کہ سندھ میں ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خوری کے تین ہزار کیسز زیرِ التواء ہیں۔ کیا ہماری ایجنسیاں نہیں جانتیں کہ اِن ٹارگٹ کلرز اور بھتہ خوروں کی غالب اکثریت کا تعلق کس جماعت سے ہے؟۔ عروس البلاد اور روشنیوں کا شہر کہلانے والا کراچی عرصۂ دراز سے خونم خون ہے۔ اِس شہرِ کم نصیب میں صرف طالبان اور القاعدہ ہی نہیں، لسانی، فرقہ واریت اور سیاسی عناصر بھی ٹارگٹ کلنگ میں مصروف ہیں اور اب تو یہ حال ہے کہ کراچی میں جنگجوؤں کی بھرتی کے مرکز تک کھُل چکے ہیں۔ کیا کراچی میں ہونے والی دہشت گردی کسی کو نظر نہیں آتی

؟۔کیا یہ غلط ہے کہ ایک سیاسی جماعت ہر دوسرے دِن کراچی محض اس لیے بند کروا دیتی ہے کہ پولیس اور رینجرز کے مطابق جو دہشت گرد قرار پاتا ہے، وہ اُسی جماعت کا معصوم اور بے گناہ کارکن نکلتا ہے ؟۔ مسجد، مکتب اور مسلک کی آڑ میں ہونے والی دہشت گردی کے خلاف بھرپور آپریشن پر کسی کو اعتراض نہیں لیکن یہ آپریشن صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب سیاسی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر بلا امتیاز کیا جائے۔

''سوچ نگر'' کا ماجد''

گزری اتوار عبدالماجد ملک کی کتاب ''سوچ نگر'' کی تقریبِ رونمائی میں جانے کا موقع ملا۔ ماجد کے بلاوے میں اصرار اور خلوص ہی اتنا تھا کہ ڈھونڈے سے بھی معذرت کے الفاظ نہ ملے۔ تقریب میں جا کر احساس ہوا کہ اگر میں معذرت کرکے گھر بیٹھ رہتی تو ایک خوشگوار دِن گزارنے کا لطف کھو دیتی۔ تقریب کے صدر نشیں محترم سجاد میر اور مقررین میں نمایاں ڈاکٹر اجمل نیازی، نجم ولی خاں، گلِ نوخیز اختر، مظفر محسن، فرخ شہباز وڑائچ، ناصر محمود ملک اور کچھ دوسرے لوگ شامل تھے۔ مجھے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے کہا گیا لیکن میں نے معذرت کر لی کیونکہ کچھ نجی مصروفیات کی بنا پر میں تو ''سوچ نگر'' کے داخلی دروازے پر دستک تک بھی نہ دے سکی تھی۔ ویسے کچھ مقررین نے میری طرح یہ اعتراف تو ضرور کیا کہ اُنہیں سوچ نگر کے مطالعے کا وقت نہیں ملا لیکن پھر بھی وہ لمبا چوڑا اظہارِ خیال کر گئے جس سے کم از کم یہ تو ثابت ہو گیا کہ ''تبدیلی آ نہیں رہی، تبدیلی آ گئی ہے''۔ یہ تبدیلی نہیں تو اور کیا ہے کہ اب ہم کتاب پڑھے بنا بھی تجزیوں اور تبصروں کے ماہر ہو گئے ہیں۔

گلِ نوخیز اختر فنِ مزاح نگاری میں خراماں خراماں آگے بڑھتے چلے جا رہے

ہیں۔اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ''اظہارِ خیال''کر کے محفل لوٹ لی ۔وہ بولتے رہے اور ہم قہقہے لگاتے رہے۔ ناصر محمود ملک اور مظفر محسن نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں رنگ جمایا جبکہ نجم ولی خاں نے دِل کی بات انتہائی جذباتی انداز میں کہی۔وہ کتاب کے بارے میں بہت کم بولے کیونکہ اُن کا دُکھ دوسرا تھا۔اُنھوں نے کہاکہ آل پارٹیز کانفرنسز میں تو جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام دہشت گردی کے خلاف یکسو تھیں لیکن جب آئینی ترمیم کی باری آئی تو دونوں نے ہی راہِ فرار اختیار کرنے میں عافیت جانی۔نجم ولی کا جذباتی انداز اُن کے دلی دُکھ کا عکاس تھا جو مجھے بہت اچھا لگا کیونکہ ہونا بھی یہی چاہیے کہ

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دِل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

اب ایسا بھی نہیں کہ میں ''سوٹڈ بوٹڈ'' نجم ولی خاں کو قلندر ہی سمجھ بیٹھوں لیکن یہ ضرور کہ اُن کے اندر کہیں نہ کہیں ایک قلندر چھپا بیٹھا ہے جو کبھی کبھار عالمِ غیض میں نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے باہر نکل آتا ہے۔ڈاکٹر اجمل نیازی نے فرمایاکہ وہ تقریب میں آنے سے معذرت کرنا چاہتے تھے لیکن جب اُنہیں پتہ چلا کہ ماجد میانوالی کے گاؤں ''رکھی'' کا باسی ہے تو اُن سے رہا نہ گیا کیونکہ اُن کا اپنا آبائی گاؤں بھی ''رکھی'' سے ملحق ہے۔ڈاکٹر صاحب نے

دَورانِ تقریر عمران خاں اور ریحام خاں کا ذکر بھی کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اِس شادی سے اداکارہ میرا اور عائلہ ملک کے دِل ٹوٹ گئے ،تب پیچھے سے آواز آئی کہ اور بھی بہت سے دِل ٹوٹے ہیں جس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا ''مینوں تے ایناں دوواں دا ای پتہ اے ،باقیاں دا تینوں پتہ ہووے گا'' (میں تو اِن دونوں کے بارے میں جانتا ہوں ،باقیوں کا آپ کو پتہ ہوگا)۔ محترم سجاد میر نے اپنے خطبہء صدارت میں فنِ کالم نگاری کے بارے میں ایسی بہت سی باتیں کیں جو نوآموز لکھاریوں کے لیے مشعلِ راہ تھیں ۔یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ایک استاد اپنے طلباوطالبات کو لیکچر دے رہا ہو ۔یوں ہنستے مسکراتے یہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچی لیکن یہ بتانا میں بھول ہی گئی کہ ساری تقریب کا مزہ تو اُس وقت دوبالا ہوا جب ہم ڈائننگ ہال میں پہنچے ۔ تقریب کے اختتام تک چار بج چکے تھے اور مارے بھوک کے بُرا حال ۔ڈائننگ ہال کی میزوں پر سجے طرح طرح کے کھانوں نے ہماری آنکھوں میں اشتہا کی چمک کو کئی گنا کر دیا اور پھر ہمیں نہیں پتہ کہ ہم نے کیا کھایا، کتنا کھایا اور کیوں کھایا۔

گھر پہنچ کر ہم نے سوچا کہ اب چونکہ ماجد کا نمک کھا چکے اِس لیے ''سوچ نگر'' کا مطالعہ کر ہی لینا چاہیے کیونکہ اگر نہ کرتے تو یہ ''نمک حرامی'' ہوتی ۔سوچ نگر کے مطالعے کے بعد میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ اگر ماجد کی تحریروں کو ادبی معیار پر نہ پرکھا جائے تو اُن میں وہ سبھی کچھ موجود ہے جو کسی بھی

مثبت سوچ رکھنے والے شخص کے دل کی آواز ہو سکتی ہے۔ماجد سے میرا تعارف زیادہ پرانا نہیں لیکن اُس سے جب بھی ملاقات ہوئی، مجھے محسوس ہوا کہ اُس نوجوان میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی اُمنگ جواں ہے۔وہ مُنہ ٹیڑھا کرکے، انگریزی کے جملے جھاڑ کر دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش تو نہیں کرتا لیکن اپنی فطری سادگی کے سبب اپنا حلقۂ احباب وسیع ضرور کرتا جارہا ہے۔ساری زندگی اُردو ادب پڑھنے اور پڑھانے کی بنا پر مجھے ہمیشہ نسلِ نَو کے وہ لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو اُردو ادب کے محافظ بن کر اُبھر رہے ہیں ۔اُردو ہماری قومی زبان ہے لیکن ہم نے ہمیشہ اِس سے سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا ہے ۔اگر ماجد ملک جیسی نسلِ نَو اُردو کی حفاظت کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہے تو ہمیں اُنکی تحریروں میں ادبی موشگافیوں کی تلاش کی بجائے اُنکی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے ۔ماں کے پیٹ سے تو کوئی لکھاری پیدا ہوتا ہے نہ تجزیہ و تبصرہ نگار، سبھی اِس دشتِ پُرخار کی سیاحی کے شوق میں نکلتے ہیں ۔کچھ تھک کر یہ سفر ادھورا چھوڑ دیتے ہیں اور کچھ سفر جاری رکھتے ہوئے نمایاں ہو جاتے ہیں ۔جس ماجد کو میں جانتی ہوں اُس نے چھوٹی سی عمر میں زندگی کے سارے نشیب و فراز کو دیکھا، پرکھا اور سہا۔یہی وجہ ہے کہ اُنکی تحریروں میں ایک سبق موجود ہے اور لائقِ تحسین یہ کہ یہ سبق دینِ مبیں کے تابع ہے ۔جو قاری بھی سوچ نگر کا مطالعہ کرے گا اُسے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی کہ ماجد کے اندر ایک "نوجواں مسلم" کا دل دھڑکتا ہے ۔اُس کی یہی خوبی اُس کی ساری ادبی خامیوں اگر کوئی ہیں)پر حاوی ہو جاتی ہے)

۔اُس کا دُکھ یہ ہے کہ وہ جب تہذیبِ حاضر کو دین میں سے متصادم دیکھتا ہے تو چِلا اُٹھتا ہے اور جذبات کی یہی رَواُسے ادبی پختگی سے دور لے جاتی ہے لیکن اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ قاری پر اپنا نقطۂ نظر ضرور واضح کر جاتا ہے اور میرے نزدیک ایک اچھّی تحریر کی خوبی بھی یہی ہونی چاہیے۔ سرسید احمد خاں کی تحریروں کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی نے لکھا تھا کہ سرسید کی حالت تو اُس شخص کی سی تھی جس کے گھر میں آگ لگی ہوئی ہو اور وہ لوگوں کو مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ ماجد بھی جب یہ کہتا ہے کہ ''میں تو شرمندہ ہوں اِس دَور کا انساں ہو کر'' تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ تہذیبِ حاضر کے درندوں سے نبرد آزما ہے۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ماجد خود اپنی تلاش میں ہو۔ اسی لیے کبھی وہ شہرِ خموشاں میں نکل جاتا ہے تو کبھی قیامت کی نشانیاں ڈھونڈنے لگتا ہے، کبھی تفرقوں میں نہ پڑنے کا درس دیتا ہے تو کبھی اسلاف کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔ حصولِ منزل کی لگن اور ''ادھوری سوچیں'' ہی اُس کا سرمایۂ حیات ہیں۔ اگر اُس نے اپنا سفر جاری رکھا تو مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دِن اُسے ڈھیروں ڈھیر قاری بھی مل جائیں گے۔

شعلہ فشانی سے گریز بہتر

پاکستان میں اگر ''رشیدوں'' کی زباں بندی کردی جائے تو قوم کی بھلائی کا غالب امکان ہے۔ پہلے شیخ رشید کی پیشین گوئیاں اور بڑھکیں سُن سُن کر طبیعت ''اوازار'' ہوتی رہی اوراب ٹھنڈے ٹھار پرویز رشید بھی آتش فشاں بنے بیٹھے ہیں۔ شیخ صاحب نے لاٹھیاں اُٹھا اُٹھا کر مارو، مَرجاو، جلاؤ گھیراؤ کی بڑھکیں تو بہت لگائیں لیکن ''کَکھ'' فائدہ نہ ہوا اور اب مایوسیوں کے سمندر میں غوطے کھاتے شیخ صاحب کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ

اُڑتے اُڑتے آس کا پنچھی دُور افق میں ڈوب گیا

روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

اُدھر میاں برادران بھی شیخ صاحب کے ساتھ ''ہَتھ'' کر گئے۔ شیخ صاحب نے آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت کے لیے واسکٹ بھی سلوالی اور لال رنگ کا نیا مفلر بھی خرید لیا لیکن نواز لیگ نے شیخ صاحب کو ''لفٹ'' ہی نہیں کروائی اسی لیے شیخ صاحب ''کُرلاتے'' رہتے ہیں کہ یہ آل پارٹی کانفرنس نہیں تھی کیونکہ اِس میں عوامی مسلم لیگ کی نمائندگی ہی نہیں تھی۔ ویسے نواز لیگ کی یہ ''حَرکت'' ہرگز لائقِ تحسین نہیں کیونکہ عوامی مسلم لیگ ایک رجسٹرڈ سیاسی جماعت ہے، یہ الگ

بات ہے کہ شیخ صاحب کی یہ سیاسی جماعت اتنی بڑی ہے کہ وہ اسے اپنی جیب میں بینت سنبھال کر رکھتے ہیں تاکہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ویسے بھی پاکستان میں ڈاکو لٹیروں کی کمی نہیں ،اگر کسی نے شیخ صاحب کی پارٹی چُرا لی تو اُن کے پلّے تو ''ککھ'' بھی نہیں بچے گا اسی لیے شیخ صاحب حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنی پارٹی کو اپنی جیب میں ہی رکھتے ہیں۔شیخ، صاحب کی تو خیر نواز لیگ سے 51/7 تھی اِسی لیے اُنہیں اے پی سی میں مدعو نہیں کیا گیا لیکن کپتان صاحب تو اُن کے ''بیلی'' تھے ،وہ بھی شیخ صاحب کے بغیر ہی اے پی سی میں چلے گئے حالانکہ بات بات پر ''مُنہ بسورنے'' والے خاں صاحب حکمرانوں کو صاف صاف کہہ سکتے تھے کہ ''اگر شیخ رشید نہیں تو میں بھی نہیں''۔شاید خاں صاحب نے سوچا ہو گا کہ سانحہ پشاور کا زخم ابھی تازہ ہے اور فوجی قیادت کی آنکھیں بھی گھری ہوئی پڑی ہیں اِس لیے اے پی سی میں ''نیویں نیویں'' ہو کر جانا ہی بہتر ہے۔ویسے بھی اُن دنوں ہمارے کپتان صاحب بھی ''وَخت''میں پڑے ہوئے تھے کیونکہ اُنکی ریحام خاں سے شادی کی خبریں گرم تھیں اور اِن خبروں سے پریشان ریحام خاں ہمارے کپتان کو تَڑیاں'' لگا رہی تھی ۔اِس لیے ہو سکتا ہے کہ عالمِ بَدحواسی میں کپتان اپنے ''بیلی'' کو'' بھول گئے ہوں۔

دوسرے ''رشید'' ہمارے اپنے وزیرِ اطلاعات محترم پرویز رشید ہیں ۔وہ دھرنوں کے موسم میں تو برف میں لگے رہے اور ہم شور مچاتے رہے کہ نواز لیگ کا میڈیا سیل

خراٹے لے رہا ہے لیکن جونہی خاں صاحب ''برفیلے'' ہوئے پرویز رشید صاحب کی گُل فشانی شعلہ فشانی میں بدل گئی اور اُنھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''عمران خاں پہلے فاسٹ باؤلنگ کرتے تھے اب ''سپِن باؤلنگ'' پہ آ گئے ہیں''۔اگر پرویز رشید صاحب کو سپِن باؤلنگ اچھی نہیں لگتی تو کپتان صاحب کو دوبارہ فاسٹ باؤلنگ کرنے کی درخواست کی جا سکتی ہے۔اگر ایسا ہو گیا تو پھر حکومت کو اعتزاز احسن کی ''ٹھُگلیوں''کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔پہلے کپتان صاحب ہر دو دِن بعد اڑتالیس گھنٹوں کا الٹی میٹم دیتے تھے اب پرویز رشید صاحب بھی وہی کام کر رہے ہیں جس سے تنگ آ کر کپتان صاحب نے بھی کہہ دیا ''مجھے پرویز رشید کا دماغی توازن ٹھیک نہیں لگ رہا''۔کالے ، سبز اور نیلے رنگوں سے بال رنگوا کر سمارٹ لگنے کی کوشش کرنے والی شیریں مزاری بھلا کسی سے پیچھے کیوں رہتیں۔اُنھوں نے پرویز رشید صاحب کی علمیت کا بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑتے ہوئے کہہ دیا ''اگر پرویز رشید کو حلقہ 122 کے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ پڑھنی نہیں آتی تو کسی دوسرے سے پڑھوا لیں یا پھر خاموش رہیں''۔حلقہ 122 کا معاملہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ایک عدالت اندر تحقیقات کر رہی ہے اور دو عدالتیں باہر ۔خاں صاحب تحقیقاتی رپورٹ کو بنیاد بنا کر ہر روز پریس کانفرنس میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم جیت گئے'' جبکہ دَر جوابِ آں غزل پرویز رشید صاحب اُن کو چیلنج کر دیتے ہیں اور'' جج'' بیچارے پریشان کہ ''کیہڑی مَنیے تے کیہڑی نہ منیے''۔اب ہمارے سپیکر ایاز صادق'' صاحب بھی میدان میں کود پڑے لیکن شکر ہے کہ اُنھوں نے اپنی

سپیکری‘‘ کا بھرم رکھتے ہوئے قابلِ قبول بیان ہی جاری کیا۔ وہ کہتے ہیں ’’عمران خاں کی ’’ گزشتہ روز ہونے والی پریس کانفرنس سے لگتا ہے کہ میں نے اُنہیں دِن میں تارے دکھا دیئے ہیں۔ جسٹس عمران خاں نیازی نے اپنے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ مجھے جسٹس کاظم علی کے فیصلے کا انتظار ہے‘‘۔ جنابِ پرویز رشید بھی اگر عدالتی فیصلے کا انتظار کرلیں تو یہ حکومت کے حق میں ہی بہتر ہوگا کیونکہ خاں صاحب کے پاس تو کھونے کو کچھ نہیں، جو نقصان ہوگا حکومت کا ہی ہوگا۔

ویسے تو ہمارے ایک ’’رشید‘‘ ایم کیوایم کے محترم رشید گوڈیل بھی ہیں جو ہر وقت تڑپتے پھڑکتے اور مچلتے رہتے ہیں لیکن اُنکی جماعت میں تو ’’آوے کا آوا‘‘ ہی تلواریں سونت، بیٹھا رہتا ہے اِس لیے رشید گوڈیل کو قابلِ معافی قرار دیا جاسکتا ہے البتہ جماعت اسلامی کے تربیت یافتہ تحریکِ انصاف کے میاں محمود رشید کو شاید افہام و تفہیم راس نہیں آتی اسی لیے اُنھوں نے یہ بیان داغ دیا کہ ’’عوام بھوک، گیس، لوڈشیڈنگ اور مہنگائی کے عذاب میں مبتلاء ہیں اور وزیرِ اعظم نے غیر ملکی دَوروں کی آڑ میں قومی خزانے کو چالیس کروڑ کا ٹیکہ لگا دیا۔ میاں محمود الرشید کا فرمایا ’’مستند‘‘ لیکن وزیرِ اعظم اِس کے عوض کچھ نہ کچھ لے کر بھی آئے البتہ تحریکِ انصاف نے تو ’’نیا پاکستان‘‘ بنانے کے شوق میں قوم کو اتنے پیسوں کے صرف گانے ہی سنا دیئے اور نتیجہ کیا نکلا؟ ’’ساڈے گھر

آئی بھرجائی''۔اب 18 جنوری کو پھر ہلا گُلا شروع ہونے جا رہا ہے اور قوم خوفزدہ کہ کہیں یہ خاں صاحب کی طرف سے تیسری شادی کا عندیہ نہ ہو۔

سانحہ پشاور کے بچوں کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے لیے خاں صاحب 32 گاڑیوں کے پروٹوکول کے ساتھ آرمی پبلک سکول پہنچے جس کا بہت بُرا منایا گیا۔خاں صاحب نے فرمایا کہ پروٹوکول کی گاڑیاں تو صرف 6 تھیں، باقی سب وزراء کی گاڑیاں تھیں جو محترمہ ریحام خاں کی پہلی دفعہ پشاور آمد پر استقبال کے لیے آئے تھے۔بجا ارشاد لیکن ریحام خاں صاحبہ تو خود بیس گاڑیوں کے پروٹوکول کے ساتھ آرمی پبلک سکول کی شہید پرنسپل کے گھر تعزیت کے لیے پہنچیں۔اس پروٹوکول کا کیا جواز تھا؟۔خاں صاحب سے استدعا ہے کہ پہلے ریحام خاں صاحبہ کو''خاتونِ اوّل''بن لینے دیں پھر جی بھر کے اُن کے پروٹوکول کا اہتمام کرتے رہیں۔ویسے بھی جب تعزیت کے لیے جاتے ہیں تو تزک واحتشام کے ساتھ نہیں، سادگی کے ساتھ ہی جانا بہتر ہوتا ہے۔شہداء فورم کے احتجاج پر خیبر پختونخوا کے وزیرِاطلاعات مشتاق غنی نے کہا''شہداء فورم نواز لیگ، اے این پی اور دیگر لوگوں کی تنظیم ہے۔یہ بدمعاشی کی سیاست کو فروغ دے رہے ہیں، ہم آئندہ ایسا نہیں ہونے دیں گے''۔شہداء فورم نے فوری طور پر تردید کرتے ہوئے کہہ دیا کہ احتجاج کرنے والوں میں سے کسی ایک کا بھی کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔تحریکِ انصاف نے یہ تو کہہ دیا کہ وزیرِاعلیٰ پرویز خٹک نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ کیا یہ''

تمہارے باپ کا سکول ہے" لیکن مشتاق غنی نے تو سب کچھ میڈیا کے سامنے کہا، کیا شہداء کے والدین کو "بدمعاش" کہنے پر اُن کی جواب طلبی ہوئی؟؟؟۔

حرمتِ رسول ﷺ پہ قربان

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

جدید سکیورٹی انفراسٹرکچراور انتہائی فعال خفیہ ایجنسیوں کی موجودگی کے باوجود دو عرب تژاد بھائیوں ، شریف اور سعید نے پیرس کے وسط میں واقع ''چارلی ہیبڈو''کے دفتر میں گھس کر 12 افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس سے پورے فرانس میں ہلچل مچ گئی اور یہ کہا جانے لگا کہ یہ فرانس کا نائن الیون ہے ۔فرانس میں ہونے والا یہ واقعہ پہلا ہے نہ آخری ،جب تک مغرب کے ابلیس ایسی خبیثانہ حرکتیں کرتے رہیں گے ،ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے ۔چارلی ہیبڈو میگزین میں یہ گستاخانہ خاکے پہلی بار شائع نہیں ہوئے بلکہ 2006,11 ,13ء میں بھی یہ خاکے شائع ہوئے لیکن فرانسیسی حکومت نے اسے آزادیٔ اظہارِ رائے کا نام دے کر کوئی کارروائی نہیں کی ۔ میرا دین تو قانون کو ہاتھ میں لینے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا لیکن جب عالمی ضمیر بے غیرتی کا کفن لپیٹ کر بے حمیتی کی لحد میں لیٹ رہے ،جب آزادیٔ اظہار کے نام پر 40 ممالک کے سربراہان ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر مادر پدر آزادی کے علمدار بن جائیں اور جب عالمِ اسلام کے حکمران بے حیائی کی ''بکل'' مار کر آنکھیں موند لے تو پھر ایسے واقعات ناگزیر ہو جاتے

ہیں کیونکہ نفرتوں کے نخل خون کی آبیاری سے ہی پھلتے پھولتے ہیں ۔اگرفرانسیسی حکومت ایسی آزادیٔ اظہارِ رائے پہ لعنت بھیج کر"چارلی ہیبڈو کے خلاف کارروائی کرتی تونوبت یہاں تک نہ پہنچتی لیکن وہاں تو مسلمانوں سے نفرت کے اظہار کے لیے ڈیڑھ ملین لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور چالیس ممالک کے سربراہان بھی لیکن طرفہ تماشہ یہ کہ اُن میں چند اسلامی ممالک کے سربراہان بھی شامل تھے ۔اِس یکجہتی مارچ میں ملعون جریدے کے بڑے بڑے پوسٹر نمایاں تھے جنہیں دیکھ کر مراکش کے وزیرِ خارجہ نے احتجاجاً شرکت نہ کرکے اپنے غیرت مند مسلمان ہونے کا ثبوت دیا ۔اِس سے پہلے بھی وہ مراکشی مجاہد ہی تھا جس نے ہالینڈ سے تعلق رکھنے والے اُس مصور کو واصلِ جہنم کیا تھا جس نے میرے آقا ﷺ کے گستاخانہ خاکے بنائے اور ایک فاحشہ عورت کے برہنہ جسم پر قُرآنی آیات لکھیں۔

آج 12 افراد کے مرنے کو فرانس کا "نائن الیون" کہا جارہا ہے لیکن اِن عالمی درندوں کو عراق اور افغانستان کے لاکھوں شہیدوں کا لہو کیوں یاد نہیں رہتا ، فلسطین کے مظلوموں کی آہ وبکا کیوں سنائی نہیں دیتی اور کشمیر میں بھارتی افواج کے مظالم کیوں نظر نہیں آتے ۔اقوامِ عالم کے اِن درندوں سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا آزادیٔ اظہار کا یہی مطلب ہے کہ ایسا مواد شائع کیا جائے جو دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی دِل آزاری اور اشتعال کا باعث بنے ۔ چلیں مان

لیا کہ مغرب میں آزادیٔ اظہار کا تصور یہی ہے تو پھر ''ہولوکاسٹ'' اور گیس چیمبرز کو جھوٹ کا پلندہ قرار دینے والوں کو اُلٹا کیوں لٹکا دیا جاتا ہے ؟۔کیا صرف اِس لیے کہ اِس سے یہودیوں کی دل آزاری ہوتی ہے ؟۔یہودی تو عام انسان ہیں لیکن میرے آقاﷺ تو نبی آخر الزماں ہیں اور ہمارے ایمان کا جزوِ لاینفک کہ ہمارا دین ہی اتنی دیر تک مکمل نہیں ہوتا جب تک آقاﷺ ہمیں کائینات کی ایک ایک چیز سے پیارے نہ ہو جائیں ۔جب حبِ رسولؐ کا یہ عالم ہو تو پھر بھلا آقاﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کو کیسے معاف کیا جا سکتا ہے ۔اگر مغربی معاشرہ آزادیٔ اظہار کے نام پر چارلی ہیبڈو جیسے غلیظ میگزین کے ملعون مالکان کو نہیں روک سکتا تو پھر آقا کے دیوانوں اور پروانوں سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ ابلیسیت کے اِن علمبرداروں کو واصلِ جہنم نہیں کریں گے ۔

عالمِ اسلام کے حکمران اگر متحد ہو کر اقوامِ متحدہ میں احتجاج کریں تو یقیناً آزادیٔ اظہار کی حدود و قیود کا تعین کیا جا سکتا ہے لیکن صد حیف کہ ہمارے حکمران منصورِ حقیقت ہیں نہ سقراط کہ سچ کی خاطر سولی پہ چڑھ جائیں یا زہر کا پیالہ پی لیں ۔اُنہیں تو ہر لمحہ عالمی درندوں کے جبڑوں میں پھنسا اپنا اقتدار بچانے کی فکر ہوتی ہے اسی لیے وہ سچ کو بھی اُس ناجائز بچے کی مانند چھپائے رکھتے ہیں جس کے ظاہر ہونے پر تہمت کا خوف ہو۔وہ تو عالمی درندوں کے قدموں میں ہی حیاتِ جاوِدانی کا خواب دیکھتے ہیں لیکن اِس خواب

کو بالآخر موت کے ہونٹوں کو بوسہ دینا ہی پڑتا ہے۔اسی حیاتِ جاوداں کی خواہش کبوتر کو بلّی کے سامنے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ بلّی کا لقمۂ تر بن جاتا ہے ۔لیکن ہمارے حکمران یہ ابدی حقیقت یکسر فراموش کر چکے کہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اگر مسلم اُمّہ کمزور ہوتی تو ہم بھی صبر کرکے بیٹھ رہتے لیکن ربِ کردگار نے تو اسے دُنیا کی ہر نعمت سے نوازا ہے۔اگر یہ متحد ہو جائیں تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں لیکن عالمِ اسلام میں تو ویسی ہی نفسا نفسی کا عالم ہے جیسی روزِ قیامت ہوگی۔

مغرب کو کیا الزام دیں کہ ہمارے ہاں کے سیکولر دانشور بھی آزادیٔ اظہار کے بارے میں وہی رائے رکھتے ہیں جو مغرب کی پسندیدہ ہے۔اِن گستاخانہ خاکوں پر لکھتے ہوئے ہمارے سیکولر دانشور بہ اندازِ حکیمانہ اِن کا رُخ مذہبی انتہاپسندی کی طرف موڑ دیتے ہیں اور اپنا پورا زور دینی جماعتوں کی نفرین پر صرف کر دیتے ہیں۔ایسے ہی ایک سیکولر دانشور لکھتے ہیں ”اگر ظلم و جبر ہو تو اُس کے مقابلے پر زبان کھولنا بلکہ گولی تک چلانا ایک قابلِ قدر جذبہ

قرار دیا جاسکتا ہے لیکن علمی و فکری اختلاف پر تشدد کرنا جہالت اور حیوانیت کے سوا کچھ نہیں ''۔ کوئی اُس ارسطوئے دوراں سے پوچھے کہ کیا گستاخانہ خاکے علمی و فکری اختلاف کے زمرے میں آتے ہیں ؟۔ کیا ماں بہن کی گالی علمی و فکری اختلاف ہے ؟۔ اگر نہیں تو پھر کیا ایسی گستاخی پر خاموشی اختیار کرکے ہم مسلمان کہلوانے کے حقدار ٹھہرتے ہیں ؟۔ عیسائیوں کے روحانی پیشوا پوپ فرانسس نے تو اِن گستاخانہ خاکوں کی بھرپور مذمت کرتے ہوئے کہا ''اگر کوئی میری ماں کو گالی دے گا تو اُسے میرے مُکے کے لیے تیار رہنا چاہیے ''۔ لیکن کیا ہمارا ایمان اتنا ہی کمزور ہو چلا کہ ہم اپنے احتجاج کو عقل و خرد کے پیمانوں پر ناپنا شروع کر دیں۔ لاریب اِن گستاخانہ خاکوں سے میرے آقا کی عظمتوں پر کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اُن پر تو رب العالمین اور اُس کے فرشتے بھی درود بھیجتے ہیں ، آپؐ تو عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ، آپؐ کو تو جنت کے افضل ترین مقام ''مقامِ محمودہ'' کی نوید سنادی گئی اور زندگی میں ہی آسمانوں کی سیر کروادی گئی اِس لیے وقت کے فرعونوں ، شدادوں ، نمرودوں اور ملعونوں کے غلیظ چھینٹوں سے آپؐ کی ذاتِ اقدس پر تو کچھ اثر نہیں پڑتا لیکن یہ معاملہ میرے ایمان کا ہے اور امتحان میرے عشق کا ۔ کوئی اقوامِ مغرب کو جا کر یہ کہہ دے کہ بات جب ہمارے نبی ﷺ کی ذات پر پہنچے گی تو پھر ہماری جنوں خیزی کے سامنے کوئی بند نہیں باندھ سکے گا۔ یہ اُن دو عربی نژاد بھائیوں کا جنوں ہی تو تھا جس نے سکیورٹی کے مضبوط ترین جال توڑ کر اُن خبیثوں کو واصلِ جہنم کیا جو

متواتر میرے آقا ﷺ کی شان میں گستاخی کر رہے تھے۔وہ شہید ہوئے لیکن اپنے
عشق کی صداقتوں پر اپنے لہو سے مہرِ تصدیق ثبت کر گئے۔اسی لیے تو کہتے ہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اِس جان کی کوئی بات نہیں

اب اُسے ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

پہلے CNG بند پھر گھریلو گیس کی لوڈشیڈنگ اور اب پٹرول بھی بند۔ گویا پوری زندگی ہی بند۔اِن ''بندشوں'' نے حالت یہ کردی ہے کہ '' نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں''۔ دو حکومتی وزراء (جن کا پٹرولیم مصنوعات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں) نے برملا کہہ دیا کہ یہ حکومتی کوتاہی ہے جبکہ اپوزیشن نے اسے نااہلی قرار دیا البتہ'' ذمہ داروں'' نے بڑے بھولپن سے کہا کہ اُن کا تو سرے سے کوئی قصور ہی نہیں ۔وزیرِ پٹرولیم شاہد خاقان عباسی نے فرمایا کہ پٹرول تو اُتنا ہی آ رہا ہے جتنا پہلے آتا تھا لیکن سستا ہونے کی وجہ سے اِس کی کھپت بہت بڑھ گئی ہے۔وزیرِ پٹرولیم کے اِس بیان سے ہمیں مکمل اتفاق ہے کیونکہ ہم ''بقلم خود'' اِسکا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ہم نے دیکھا کہ ایک شخص بڑی سی گاڑی میں واپڈا ٹاؤن کے گول چکر پر گول گول گھوم رہا تھا۔اُس نے جب بیس چکر پورے کیے تو ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور ہم نے اُسے روک کر گھومنے کی وجہ پوچھی تو اُس نے جواب دیا کہ بی بی دُنیا چونکہ گول ہے اِس لیے میں چشمِ تصور میں دُنیا کے گرد گھوم رہا ہوں جسکی واحد وجہ یہ ہے کہ پٹرول سستا ہوگیا ہے اِس لیے دُنیا گھومنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ہم نے اُس کی اِس سوچ پر لعنت بھیجی اور گھر جانے کے لیے اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔گاڑی میں بیٹھتے

ہی ہمارے ذہن میں اچانک خیال آیا کہ ذرا دیکھیں تو سہی کہ اُس شخص کو گول گول گھومنے میں کیا مزہ آ رہا تھا۔ پہلے ہی چکر پر ہمیں بھی بہت مزہ آیا اور ہم نے سوچا کہ پٹرول تو ستا ہو ہی گیا ہے اور ہماری گاڑی کی ٹینکی فُل اِس لیے ایک چکر اور سہی ۔دوسرے کے بعد تیسرا پھر چوتھا اور آخرکار ہوا یوں کہ وہ شخص آگے آگے اور ہم اُس کے پیچھے گول گول گھومتے رہے۔ ہمیں تو پٹرول کے بحران کی یہی وجہ سمجھ آتی ہے کہ ہم ''ایویں خوامخواہ'' ہی پٹرول ضائع کر رہے ہیں اور الزام بیچارے شاہد خاقان عباسی پر۔

وزیرِ اعظم صاحب جب سعودی عرب کے دورے سے واپس آئے تو اُنہیں پتہ چلا کہ پنجاب میں تو قیامتِ صغرا بپا ہے اور لاہوریے اب ''فوڈ سٹریٹوں'' کی بجائے پٹرول پمپوں پر پائے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے چار ذمہ داران کو تو پہلے ''ہلّے''میں ہی نکرے''لگا دیا اور باقیوں کا اجلاس طلب کر لیا۔ اُنھوں نے صاف کہہ دیا'' پٹرول بحران سے حکومت کی سبکی ہوئی اور وزراء سمیت جو بھی کوئی اِس کا ذمہ دار ہوا اُس کو نہیں چھوڑا جائے گا، ہر ذمہ دار کے خلاف کارروائی ہو گی'' ۔ شنید ہے کہ اجلاس میں خوب گرما گرمی ہوئی اور وزراء ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کرتے رہے۔ اجلاس کے بعد وزیرِ خزانہ جناب اسحاق ڈار نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے کہا کہ تیل کا بحران دراصل حکومت کے خلاف سازش ہے اور وزارتِ خزانہ کسی بھی طور پر تیل بحران کی ذمہ دار نہیں۔ اسحاق ڈار صاحب نے یہ نہیں بتلایا

کہ یہ سازش امریکہ نے کی ہے یا انڈیا نے ،مُلّا فضل اللہ پنجاب کا سارا پٹرول پی گیا یا داعش نے پٹرول کے کنٹینرز اغواء کرلیے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سازش تحریکِ انصاف نے شیخ رشید کی لال حویلی میں بیٹھ کر تیار کی ہو کیونکہ اب صرف شیخ رشید ہی ہیں جو کپتان صاحب کو بار بار شہروں کو بند کرنے کے لیے اکسا رہے ہیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ریحام خاں کا جس سے شادی کے بعد خاں صاحب کا غصہ ''برفیلہ'' ہو چکا ہے اور اُن کا پلان ڈی اب تخریبی نہیں ، تھوڑا تھوڑا تعمیری محسوس ہونے لگا ہے۔

شیریں مزاری کہتی ہیں کہ تحریکِ انصاف کو شہر بند کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی کیونکہ حکومت نے خود ہی سارے شہر بند کر دیئے۔ اُن کا کہنا بجا لیکن حقیقت یہی ہے کہ نواز حکومت کا ایجنڈا بھی وہی ہے جو تحریکِ انصاف کا۔ ابھی دو دن پہلے محترم عمران خاں نے کہا تھا کہ وہ خیبر پختونخوا کے شہروں میں صفائی کروا رہے ہیں۔ سو ہا میے یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ دھوئیں سے ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ ہوتا ہے اور لاہور میں تو اتنی زیادہ ٹریفک ہے کہ صرف آلودگی ہی آلودگی نظر آتی ہے ''ماحول'' کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ اگر دس بارہ دن ٹریفک نہیں چلے گی تو ماحولیاتی آلودگی یکسر ختم ہو جائے گی فضائیں آکسیجن سے بھر جائیں گی اور لاہوریے تندرست و توانا۔ اگر تحریکِ انصاف، پشاور میں صفائی کروا سکتی ہے تو ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ لاہور کو ماحولیاتی آلودگی سے پاک کریں۔ کپتان

صاحب کو جتنا پشاور عزیز ہے، میاں برادران کو لاہور اُس سے کہیں زیادہ عزیز۔ اُنھوں نے خود بدنامی مول لے لی لیکن لاہوریوں کی صحت کا خیال رکھا۔

پٹرول بحران کی ایک وجہ شادیوں کی بھرمار بھی ہو سکتی ہے۔ آجکل شادیوں کا موسم ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ شادیوں میں پٹرول کا بے تحاشہ استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو ہماری قوم کو شادیوں کا شوق ہی بہت ہے، آبادی تیزی سے بڑھتی جارہی ہے لیکن یہ شادی پہ شادی ''کھڑکائے'' جارہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے سردار ذوالفقار کھوسہ نے عمر کے اُس حصّے میں شادی رچالی جب اُن کے اللہ اللہ کرنے کے دن تھے پھر عمران خاں بھی ''ابھی تو میں جواں ہوں'' کا نعرہ لگاتے ہوئے ریحام خاں کے ہو لیے اِس لیے ہو سکتا ہے کہ حکومت نے سوچا ہو کہ آبادی پر کنٹرول کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ شادیوں کے موسم میں پٹرول نایاب کردیا جائے۔ ''آم کے آم، گٹھلیوں کے دام'' کے مصداق اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ شادیاں کم ہونگی، آبادی پر کنٹرول ہوگا اور لوگوں کو بچت کی عادت بھی پڑجائے گی۔ اگر دیکھا جائے تو اِس میں بھی ہماری ''مہربان'' حکومت عوام ہی کا بھلا سوچ رہی ہے لیکن عوام ''ایویں خوامخواہ'' گو نواز گو کے نعرے لگارہے ہیں۔ خادمِ اعلیٰ نے انہی نعروں سے تنگ آکر لاہور میں فوری طور پر CNG سٹیشن کھولنے کا مطالبہ کردیا۔ CNG سٹیشن کھلے بھی لیکن پھر بند ہوگئے کیونکہ ایک تو سٹیشن مالکان دودنوں کے لیے سٹیشن کھولنے کو تیار ہی نہیں تھے اور دوسرے

تو تبھی ملتی جب بجلی ہوتی اور بجلی تو اپنے خواجہ صاحب سیالکوٹی کی مہربانی سے CNG کسی حسینۂ دِل نواز کی طرح کبھی کبھی جھلک دکھلاتی ہے۔ میرے میاں نے جب سے بھائی عطاالحق قاسمی کا کالم پڑھا ہے، وہ متواتر سوچ رہے ہیں کہ گاڑی بیچ کر ایک تانگہ خرید لیں اور پھر اُس میں بیٹھ کر پورے لاہور کی مفت سیر کرتے ہوئے یہ گاتے پھریں کہ "تانگہ لاہوری میرا، گھوڑا پشوری میرا۔۔۔" لیکن ہمیں اِس پر اعتراض ہے کیونکہ ایک تو تانگہ فیروزپور روڈ پر جا نہیں سکتا اور لاہور میں نئی چیز تو خادمِ اعلیٰ کی مہربانی سے صرف فیروزپور روڈ ہی ہے جس کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر کئی لوگ تو باقاعدہ خودکشی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور دوسرے تانگہ خریدنے میں قباحت یہ ہے کہ ڈرائیور تو گھوڑے کو چارہ ڈالے گا نہیں اور میرے میاں دنیا جہاں میں سب سے زیادہ سست اور کاہل الوجود اِس لیے ظاہر ہے کہ گھوڑے کو چارہ بھی مجھے ہی ڈالنا پڑے گا۔ اسی بنا پر میں نے تانگہ خریدنے والی نامعقول تجویز کو "ویٹو" کر دیا۔ پھر بھی اگر میرے میاں بضد رہے تو مجھے لازماً حقوقِ نسواں کی کسی ایسی NGO سے رابطہ کرنا پڑے گا جو تاحال حکومتی "چھاپوں" سے بچی ہوئی ہو۔

یہ کیسا اندازِ سیاست ہے؟؟

پاکستانی سیاست کو سمجھنے کے لیے افلاطونی ذہن چاہیے جو ہمارے پاس نہیں ہے اِس لیے ہم ٹامک ٹوئیوں سے ہی کام چلاتے رہتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس کوئی چڑیا، طوطا، مینا یا کوا تو ہے نہیں جو ہمارے لیے مخبری کر سکے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم ایسے سیاسی جنگل کے باسی ہوں جس میں سب اپنی اپنی بولیاں بولتے رہتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن حکومت کے اتحادی بھی ہیں اور ''تڑیاں'' بھی لگاتے رہتے ہیں۔ جماعت اسلامی خیبر پختونخوا میں تحریکِ انصاف کی اتحادی اور پختونخوا کا بلدیاتی الیکشن بھی تحریکِ انصاف سے مل کر لڑنے جا رہی ہے لیکن اکیسویں ترمیم کے معاملے میں مولانا فضل الرحمٰن کی اتحادی۔ طرفہ تماشہ یہ کہ تحریکِ انصاف اور مولانا فضل الرحمٰن کا ہر وقت ''اِٹ کھڑکا'' چلتا رہتا ہے۔ ایم کیو ایم کے ''موڈ'' پر منحصر ہے کہ اُس نے کب سندھ حکومت میں شامل ہونا ہے اور کب ''داغِ مفارقت'' دینا۔ قاف لیگ اور عوامی مسلم لیگ ''وَن مین شو'' ہیں، یہ الگ بات کہ سب سے زیادہ ''رولا'' یہی جماعتیں ڈالتی ہیں۔ پیپلز پارٹی کی ساری سیاست جنابِ آصف زرداری کے گرد گول گول گھومتی رہتی ہے لیکن آجکل اِس میں بلاول زرداری کی وجہ سے کچھ رخنے نظر آنے لگے ہیں۔ زرداری صاحب جو بیان دیتے ہیں بلاول اُس کے بالکل اُلٹ بیان داغ دیتا ہے

اور بیچارے معصوم جیالے حیران کہ ''کیدی منیے تے کیدی نہ منیے''۔ یہ بجا کہ ''پہلے تولو، پھر بولو'' لیکن اِس سیاسی جنگل کے ''شیر'' تو ایسے کہ '' تولتے تولتے'' ہی اتنی دیر کر دیتے ہیں کہ اُن کے بولنے سے پہلے ہی کوئی نہ کوئی ''کھڑاک'' ہو جاتا ہے۔ محترم عمران خاں لہو گرم رکھنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تراشتے رہتے ہیں۔ پہلے اُنہوں نے اپنے
''پلّے'' سے چھینٹی پروگرام شروع کیا لیکن نواز لیگ کی ''ڈنگلی'' سے چاروں شانے چِت''
۔تب شور مچا دیا کہ الیکشن کمیشن اور نگران حکومتیں تو اُن کے خلاف تھیں ہی ، ستم بالائے ستم یہ کہ ''جِن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے ''جس چیف جسٹس کی بحالی کی خاطر وہ پورے چھ دِن جیل میں رہے ،اُسی کے حکم پر RO's نے ''روندی'' مار دی ۔خاں صاحب تو شاید صبر شکر کرکے بیٹھ ہی رہتے لیکن بُرا ہو علامہ قادری سے لندن میں ہونے والی ملاقات کا جس میں ''لندن پلان'' تشکیل پایا اور خاں صاحب کو یقین دلا دیا گیا کہ اِدھر وہ ڈی چوک پہنچے اور اُدھر امپائر کی انگلی کھڑی ہوئی ۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ امپائر کا تو ''وہ ہاتھ سو گیا تھا سرہانے دھرے دھرے''۔اُدھر دھرنوں کے شور میں میاں برادران ''کچی نیند'' سے بیدار ہوئے اور اسحاق ڈار صاحب کو مذاکرات کا فریضہ سونپ دیا ۔ڈار صاحب کی یہ خوبی کہ وہ وکیل تو نہیں لیکن وکیلوں کی طرح تاریخ پہ تاریخ لینے کے ماہر ۔وہ تو مولانا فضل الرحمٰن جیسے گھاگ سیاستدان سے بھی ہَتھ'' کر گئے ۔ ہوا یوں کہ اکیسویں ترمیم کی متفقہ منظوری کے شوقین وزیرِ اعظم صاحب'' خوب جانتے تھے کہ مولانا صاحب کوئی نہ کوئی پھڈا

ضرور ڈالیں گے۔ اُنھوں نے ڈار صاحب کو مولانا کے چیمبر میں بھیجا، اُدھر ڈار صاحب نے مولانا کو باتوں میں لگایا اور اِدھر پارلیمنٹ نے اکیسویں ترمیم کی متفقہ منظوری کا "کھڑاک" کر ڈالا۔ اب مولانا نے تمام دینی جماعتوں کو اکٹھا کرکے کہا ہے "ہمارے مطالبات مانو ورنہ ہم مدرسے بند کرکے جیلیں بھر دیں گے"۔ مولانا کا اصل مطالبہ تو ایک آدھ مزید وزارت کا حصول ہے لیکن آڑ مساجد اور مدارس کے خلاف ایکشن کی۔ مولانا کی بے چینی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ چیف جسٹس ناصر الملک صاحب نے ملٹری کورٹس" کے بارے میں تین رکنی بنچ تشکیل دے دیا ہے اور عام خیال یہی ہے" کہ بنچ متوازی عدالتی نظام گردانتے ہوئے ملٹری کورٹس کو "پھڑکا" دے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر مولانا کی جماعت کو نئی وزارت تو ملنے سے رہی البتہ پہلی دو وزارتیں بھی چھن جانے کا خطرہ بہرحال موجود ہے۔

اسحاق ڈار صاحب نے مذاکرات کے نام پر تحریکِ انصاف کو "ٹرک کی بتی" کے پیچھے لگا دیا جس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ "ہپھ" گئے۔ مولانا قادری تو تھک کر کسی نئی پلاننگ کے لیے چندہ اکٹھا کرنے اپنے "دیس" سدھارے لیکن خاں صاحب ڈٹے رہے یہ الگ بات ہے کہ اُداس خاں صاحب اپنے کنٹینر کے اندر ہر وقت گنگناتے رہتے تھے،

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اِس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

دھرنا ابھی جاری تھا کہ ''سانحہ پشاور'' ہوگیا اور خاں صاحب کو مجبوراً دھرنا ختم کرنا پڑا ۔خاں صاحب نے دھرنوں کے دَوران ایک بار کہا تھا ''سوچتا ہوں کہ اگر دھرنا ختم ہوگیا تو میری شامیں کیسے گزریں گی''۔ گویا

اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے

اب رہائی ملی بھی تو مر جائیں گے

یہی وجہ ہے کہ خاں صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنی ''اُداس شاموں'' کو خوشگوار بنانے کے لیے ''نیا پاکستان'' بنانے سے پہلے ہی ریحام خاں سے شادی کرکے اپنی زندگی میں ''تبدیلی'' لے آئے۔ خیال تو یہی تھا کہ خاں صاحب نے تبدیلی کا وعدہ پورا کر دیا اِس لیے اب ایک اچھے شوہر کی طرح اپنی بیگم صاحبہ کی خدمت میں جُت جائیں گے لیکن ہماری توقعات کے بالکل برعکس خاں صاحب پھر ''اِن ایکشن'' ہیں ۔ کپتان صاحب نے سوچا ہوگا کہ مومن کی تلوار اگر میان میں رہے تو زنگ آلود ہو جاتی ہے اِس لیے سونامیوں'' کو کسی نہ کسی کام پر لگا دینا چاہیے ۔اُنھوں نے سوچا کہ ضمنی انتخاب'' تو ہونے سے رہے اِس لیے چلو اپنے ''ٹائیگروں اور ٹائیگرنیوں'' کا انتخاب ہی کروا دیتے ہیں۔اب نوجوان ٹائیگر دھاڑتے اور ٹائیگرنیاں چنگھاڑتے ہوئے انتخابات میں حصّہ لے رہی ہیں اور خود خاں صاحب خیبر پختونخوا کو جنت نظیر بنانے نکل کھڑے ہوئے ۔اُنھوں نے

دنوں میں نیا پاکستان بنانے کا اعلان کیا لیکن ہماری بد قسمتی کہ وہ حقِ حکمرانی سے 90 کوسوں دور رہے۔ پھر چھ ماہ میں خیبر پختونخوا کی قسمت سنوارنے چلے لیکن ''لندن پلان'' آڑے آگیا۔ اب دیکھیں بہشت بَر سرِ زمیں کب بنتا ہے۔

اُدھر ٹائیگر اور شیر باہم گتھم گتھا اور اِدھر ''شکاری'' تاک میں۔ مانا کہ شکاری کے تیر آجکل نشانے پر نہیں بیٹھ رہے لیکن جب زرداری صاحب جیسا گھاگ شکاری ہو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اُنھوں نے اپنا جال پھیلا دیا ہے اور پہلی قسط کے طور پر تحریکِ انصاف کے چار ''پرندے'' بھی شکار کر لیے اب سندھ اسمبلی تحریکِ انصاف سے خالی ہو گئی ۔دراصل پیپلز پارٹی کو خطرہ تھا کہ کہیں تحریکِ انصاف دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر اُن کی سینیٹ میں ایک دو سیٹیں کم نہ کر دے اِس لیے اُس نے یہ کھڑاک کر دیا ۔اُدھر ایم کیو ایم کی ''پتنگ'' ہواؤں کے دوش پر اونچی اُڑان میں اِس لیے پیپلز پارٹی سے مفاہمت کا امکان مفقود۔ ویسے بھی الطاف بھائی لندن میں بیٹھ کر ہر روز یہ بڑھک لگا دیتے ہیں کہ فوج اقتدار سنبھال لے ۔اِس سے پہلے شیخ رشید بھی پانچ سال تک کرلاتے'' اور اپنی ''قلم دوات'' سے فوج کو اقتدار سنبھالنے کی عرضیاں لکھتے رہے لیکن'' شیخ صاحب ہی کے بقول فوج ''ستّو'' پی کر سوتی رہی ۔اب شیخ رشید کی جگہ الطاف بھائی نے لے لی ہے لیکن فوجی دَور میں اقتدار کے مزے لوٹنے والی قاف لیگ تا حال خاموش، وجہ یہ کہ اُن کی سائیکل کی ''پھوک'' نکلی ہی رہتی ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ سائیکل کو نئے

ٹائرٹیوب“ کی ضرورت ہے لیکن وہ دستیاب نہیں کیونکہ وہ تو دوکان ہی بند ہو چکی اور ”
پرانا دوکاندار بوڑھا، بیمار، لاچار، نکبت میں گرفتار۔ نئی دوکان کھلنے کا فی الحال دور دور تک
کوئی امکان نہیں۔

امریکی صدر کا دورہ بھارت

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔سرگوشیاں

دریاؤں ، پہاڑوں ، مرغزاروں ، آبشاروں اور لہلہاتی کھیتیوں کے مجموعے کا نام ریاست نہیں ۔ریاست تو ایسے انسانوں کے مجموعے کا نام ہے جو اپنا فرض پہچانیں ، مواقع سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے دفاع کہ صلاحیت رکھتے ہوں جبکہ ہمارا یہ عالم ہے کہ من حیث القوم ہمیں اپنے فرائض کا سرے سے ادراک ہی نہیں، مواقع سے فائدہ اٹھانے کا یہ عالم کہ نائین الیون کے بعد ہمارا ''کمانڈو''امریکہ کے سامنے شرائط رکھنے کی بجائے وہ کچھ بھی مان گیا جس کا امریکہ نے تقاضہ ہی نہیں کیا تھا ،رہی دفاعی صلاحیت تو بلاشبہ پاکستان عالمِ اسلام کی واحد ایٹمی طاقت ہے ،ہمارے ایٹمی میزائیل بھارت کے ایک ایک شہر کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اسرائیل کے عین وسط تک پہنچنے کی صلاحیت بھی ۔اِس کے باوجود بھی ہم امریکی غلام اور اُس کی ڈگڈگی پر ناچنے والے سدھائے ہوئے بندر جو امریکی غلامی کا طوق گلے میں ڈال کر سکھ کی تلاش میں نکلے اور دکھوں کی غارِ عمیق میں جا گرے ۔ہم نے اُن پر اعتبار کیا جنکی دوستی کھیتوں پر چھائے اُس کہر کی مانند ہوتی ہے جو ظہورِ خورشید کے ساتھ ہی فضاؤں میں تحلیل ہو جاتا ہے ۔ہم اُس کے اتحادی بنے جس کے سابق وزیرِ خارجہ نے کہا کہ امریکہ کی دشمنی سے زیادہ اُس کی دوستی خطرناک ہے اور تحقیقاتی ادارے ''کانفلکٹ

مانیٹرنگ سنٹر'' نے اسے سچ ثابت کردیا جس کے مطابق افغانستان میں چھپے ہوئے پاکستان مخالف دہشت گردوں نے پانچ سو سے زائد مرتبہ پاکستان پر حملہ کیا۔ یہ دہشت گرد افغانستان کے صوبہ کنڑ، ننگرہار اور پاکتیا میں مکمل آزادی کے ساتھ ٹھکانے بنائے ہوئے ہیں لیکن کسی امریکی ڈرون کی آنکھ اُنہیں دیکھ نہیں پاتی۔ ہماری خارجہ پالیسی کا یہ عالم کہ ہمیشہ بے ثبات امریکی سایوں کو مہرِ درخشاں سمجھتے رہے۔ ہم کشکولِ گدائی بڑھاتے رہے اور اوہ بقدرِ اشکِ بلبل دیتے رہے لیکن وہ بھی تضحیک و استہزا کے ساتھ۔ جب حساب کیا تو پتہ چلا کہ امریکہ نے تو 1948ء سے آج تک پاکستان کو صرف پینسٹھ ارب ڈالر امداد دی لیکن ہم تو افغان وار میں نہ صرف سَو ارب ڈالر سے زائد کا نقصان اٹھا چکے بلکہ سانحہ پشاور جیسے کئی سانحات نے ہمارے دلوں کی دنیا اجاڑ کے رکھ دی۔ اِس کے باوجود امریکی تجزیہ نگاروں کے نزدیک پاکستان امریکہ کا ''جہنم سے نکلا ہوا اتحادی'' ٹھہرا۔ پاکستان کی ایسی خارجہ پالیسی کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ

کم ہوں گے اِس بساط پر ہم جیسے بد قمار
جو چال بھی چلے ہم، نہایت بری چلے

امریکی صدر بارک اوباما انڈیا کے دورے پر پہنچ گئے اور بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کو آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔ یہ وہی نریندر مودی ہے جسے کچھ عرصہ

پہلے امریکہ نے ویزہ تک دینے سے انکار کر دیا تھا۔اُدھر نریندر مودی بھی طے شدہ
پروٹوکول توڑتے ہوئے خود ایئرپورٹ پہنچ گئےِاس لیے کہا جاسکتا ہے کہ جہاں مفادات
عزیز ہوں وہاں کوئی آئین، قانون نہ اخلاقیات۔اوبامہ کہتے ہیں کہ عالمی امن کے لیے
بھارت کا کردار بہت اہم ہے جبکہ میاں نواز شریف نے کہاکہ ''ورکنگ باؤنڈری
پر کشیدگی سے امریکہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ بھارت امن کے لیے کتنا سنجیدہ ہے''۔جب
نریندر مودی نئی دہلی کے ایئرپورٹ پر بارک اوبامہ کے گلے مل رہے تھے عین اُس
وقت سیالکوٹ کی ورکنگ باؤنڈری پر بھارتی فورسز بلااشتعال فائرنگ کر رہی تھیں
۔پاکستان اور بھارت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ بھارت امریکہ کے ساتھ برابری کی
بنیاد پر بات کرتا ہے، مشترکہ پریس کانفرنس میں جہاں نریندر مودی امریکی صدر کو
باربار ''باراک'' کہہ کر مخاطب کرکے یہ کہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اُن کی امریکی
صدر سے دوستی بے تکلفی کی حدتک گہری ہے وہیں اُنہوں نے یہ بھی کہہ دیاکہ
بھارت پر کسی ملک کا دباؤ نہیں ہوتا''۔ جبکہ دوسری طرف امریکی پاکستان کو دوست''
نہیں غلام سمجھتے ہیں اور ہم نے بھی جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے امریکی
غلامی کو ہی اپنا طرۂ امتیاز سمجھ رکھا ہے۔ایوبی آمریت میں ہم سیٹو سینٹو، کے رکن تھے
اور روس مخالف گروپ میں شامل۔ جنرل ضیاء الحق کی آمریت میں ہم افغان جنگ
میں امریکہ کی بھرپور مدد کرتے ہوئے روس کے خلاف سینہ سپر ہوئے اور
آمر پرویز مشرف کے دور میں تو ہم نے پورا ملک ہی امریکہ کے حوالے کر دیا۔یہ جنگ
ہماری نہیں تھی

لیکن لڑی ہم نے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم تو آج بھی اِس اندھی اور بے چہرہ جنگ کا شکار ہیں جس میں ہم نے اپنے پچاس ہزار سے زائد شہری شہید کروائے اور آٹھ ہزار سے زائد جری جوانوں کی قربانی دی۔امریکہ کو فوجی اڈے بنانے کی اجازت ہم نے دی ہزاروں جانیں قربان کیں،دہشت گردی کے عفریت کا سامنا کیا اور اپنی معیشت، کو اپنے ہی ہاتھوں تباہ و برباد کر لیا لیکن اوبامہ ایک نہیں دو،دو دفعہ بھارت کا دورہ کرتا ہے،اُس شخص کو گلے لگاتا ہے جس کے ہاتھ گجراتی مسلمانوں کے خون سے رنگے ہیں اُس فوج سے سلامی لیتا ہے جو مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی شدید ترین خلاف، ورزیوں میں ملوث ہے اور اُس حکومت کی دعوتیں اُڑاتا ہے جس کے سیکولرازم کی چھتری تلے مسلمانوں اور مسیحیوں کو زبردستی مسلمان بنایا جاتا ہے اور انکار کی صورت میں زندہ بھی جلا دیا جاتا ہے۔آج تو بارک اوبامہ انتہائی ڈھٹائی سے یہ کہہ رہا ہے کہ افغانستان میں بھارت امریکہ کا قابلِ اعتماد پارٹنر ہے لیکن سوال کیا جا سکتا ہے کہ افغان جنگ میں بھارت نے امریکہ کو کتنے فوجی اڈے دیئے؟۔اُس کے کتنے فوجی اِس جنگ میں کام آئے اور اُس کی معیشت کو کتنے ارب کا نقصان ہوا؟۔ یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان اِس جنگ میں امریکہ کا ساتھ نہ دیتا تو کیا بھارتی حکومت کی مدد سے امریکہ اپنے اہداف تک پہنچ پاتا؟۔

دورۂ بھارت میں صدر اوبامہ اربوں ڈالرز کے معاہدے لے کر آئے۔اُنہوں نے ایٹمی

ٹیکنالوجی پر بھارتی مطالبات تسلیم کرتے ہوئے واشنگٹن جوہری مواد کی نگرانی سے دستبرداری کا اعلان بھی کردیا اور ڈرون کی مشترکہ تیاری سمیت دفاعی اور تجارتی تعلقات کے فروغ کا عندیہ اور سلامتی کونسل میں بھارت کی مستقل رکنیت کی حمایت کا اعلان بھی لیکن پاکستان کے لیے وعدۂ فردا بھی نہیں۔ آج تو نریندر مودی بڑے فخر سے یہ کہہ رہا ہے کہ بھارت اور امریکہ کی پارٹنرشپ گلوبل اور فطری ہے لیکن ہم تو اپنے فطری اتحادی کو اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کہ

پھینکے ہیں طرف اوروں کے گُل بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

عین اُس وقت جب امریکی صدر کا ہندوستان میں والہانہ استقبال کیا جا رہا تھا، ہمارے بے لوث دوست چین نے پاکستان کو اپنا ''آئرن فرینڈ'' قرار دیتے ہوئے پاک فوج کے آرمی چیف جنرل راحیل شریف کو کہہ دیا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کے خلاف ہر ممکن تعاون کرے گا اور شدت پسندی کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے کسی بھی حد تک جائے گا۔ ہم تو اپنے ارسطوانِ خارجہ امور سے دست بستہ یہی درخواست کر سکتے ہیں کہ خُدارا امریکی غلامی کا طوق گلے سے اتار کر اُس طرف ہاتھ بڑھائیں جہاں آپ کو عزت بھی ملتی ہے اور اعتماد بھی۔

پیار بھرا نمسکار

امریکی صدر بارک اوباما کی نئی دہلی آمد سے پہلے کتوں، بندروں اور ''گؤ ماتاؤں'' کی شامت آ گئی۔ کتے اور بندر تو دہلی کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے تھے لیکن بارک اوباما کے دَورے کو بہانہ بنا کر بھارتی حکومت نے اُن سے یہ جاگیر چھیننے کی کوشش کی۔ حکومتی اہلکار پوری دہلی میں اُن کا پیچھا کرتے پائے گئے لیکن وہ بھی ایسے ''مستقل مزاج'' کہ کہیں نہ کہیں سے سَر نکال بیٹھتے اور حکومتی ہرکارے بیچارے اُن کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہلکان ہو جاتے۔ البتہ گائے ٹھہری شریف جانور اِس لیے تمام ''گؤ ماتائیں'' اپنے بال بچوں سمیت انتہائی شرافت سے دِلی سے ہجرت کر گئیں۔ کتے اور بندر شائد امریکی صدر کی ''دہشت'' سے ناواقف تھے اِس لیے دہلی چھوڑنے کی بجائے کونوں کھدروں میں گھُس گئے۔ ایک کتا تو انتہائی پُر عزم، دلیر لیکن ''مخولیا'' تھا کہ '' راشٹریہ پتی بھون ''میں امریکی صدر کو گارڈ آف آنر پیش کیے جانے کے موقعے پر وہ بھی سلامی لینے آن پہنچا۔ سوشل میڈیا پر یہ بحث جاری ہے کہ وہ محفل بارک اوباما کے لیے سجائی گئی تھی یا کتے کے لیے۔ ویسے حیرت ہوتی ہے کہ پورے دہلی کو تو آسمانوں سمیت بند کر دیا گیا، تین دنوں کے لیے دلی کو ''نو فلائی زون''قرار دے دیا گیا، 80 ہزار اہلکار اوباما کی حفاظت پر مامور اور پوری دہلی میں '' سی سی ٹی وی ''کیمروں کی بھرمار، پھر وہ کتا سب

کی نظروں سے بچ کر راشٹریہ پتی بھون پہنچ کیسے گیااور وہ بھی عین اُس وقت جب اوباما گارڈآف آنر کا معائنہ کر رہے تھے ؟۔اگر یہ شرارت تھی تو یقیناً پاکستان نے ہی کی ہو گی لیکن تاحال انڈین سکیورٹی ایجنسی ''را'' نے اِس قسم کا کوئی بیان جاری نہیں کیا، ہو سکتا ہے اوباما کی واپسی کا انتظار ہو۔

بارک اوباما جب اربوں ڈالرز کے معاہدوں کی گٹھڑی سر پر رکھ کر نئی دہلی ایئرپورٹ پر اُترے تو نریندر مودی بنفسِ نفیس اُن کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اوباما، مودی کے قریب پہنچے، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر مودی صاحب نے آگے بڑھ کر اُنہیں ایسی جادو کی ''جپھی'' ڈالی کہ اوباما نہال ہو گئے۔ایک کمی البتہ ضرور محسوس کی گئی کہ امریکی خاتونِ اوّل مشعل اوباما تو وہاں موجود تھیں لیکن اُن کے استقبال کے لیے بھارتی خاتونِ اوّل یشودابین مودی کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔جب یشودابین سے رابطہ کیا گیا تو اُس نے شکوہ کرتے ہوئے کہا''مجھے پتہ ہے کہ جب اوباما کا استقبال ہو رہا تھا تب مجھے بھی دہلی میں ہونا چاہیے تھا مگر صاحب (مودی) نے بلایا ہی نہیں۔یشودابین بیچاری سُرخ ساڑھی پہن، سج سنور کر گجرات میں اِس اُمید پر بیٹھی رہی کہ شائد پچاس سال بعد ''اپنے میاں'' سے ملاقات ہو جائے۔وہ کہتی ہیں ''وہ اگر مجھے آج بلائیں گے تو میں کل پہنچ جاؤں گی لیکن میں پہلے کبھی نہیں جاؤں گی۔یہ میری عزتِ نفس کا معاملہ ہے اِس سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ہم دونوں کے درمیان مرتبے

یا حیثیت کی کوئی بات نہیں، ہم دونوں انسان ہیں''۔ بیچاری یشودا نہیں جانتی کہ نریندر مودی جیسے انسان تو ویسے ہی لازمۂ انسانیت سے خالی ہوتے ہیں، اُن کے ہاتھوں سے ابھی تک گجرات کے معصوم اور بے گناہ مسلمانوں کا خون ٹپک رہا ہے، وہ بھلا گجرات کے دور دراز گاؤں کی یشودا کا درد کیا جانیں۔ اُنہیں تو یشودا اُس وقت اچھی لگتی ہوگی جب وہ خود چائے بیچا کرتے تھے۔ اب وہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے سربراہ ہیں، اُنہیں بھلا یشودا کہاں یاد ہوگی۔ ویسے امریکی صدر سے یہ سوال تو کیا جاسکتا ہے کہ وہ جو پاکستانی NGO's کی خواتین کو ''اندر کھاتے'' پیسے دے کر ''مولویوں'' کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں، کیا اُنہیں یشودا بین نظر نہیں آتی؟۔ خواتین کے حقوق کے علمبردار اہلِ مغرب یوں تو آزادیٔ نسواں اور حقوقِ نسواں کا بہت رَولا'' ڈالتے رہتے ہیں لیکن پچاس سال سے اپنے میاں کے انتظار میں نظریں بچھائے ''یشودا'' پہ اُن کی نظر کیوں نہیں پڑتی؟۔ حقیقت یہی ہے کہ جہاں اہلِ مغرب کو اپنے مفادات نظر آتے ہیں وہیں اخلاقیات کے سارے درس بھی سامنے آجاتے ہیں اور جہاں اپنے مفادات پر ضرب پڑتی ہو وہاں کیسی اخلاقیات اور کہاں کی اخلاقیات۔ ہندوستان کے صدارتی محل میں امریکی صدر کے اعزاز میں دی جانے والی دعوت دنیا کی سب سے بڑی دعوت تھی۔ اِس عشائیے میں انواع واقسام کی 36 ڈشز تیار کی گئی تھیں اور ہاضمے کے لیے ''ہربل چائے'' بھی۔ نریندر مودی صاحب نے امریکی

صدر پر ”رعب شعب“ ڈالنے کے لیے 36 لاکھ روپے کا سوٹ سلوار کھا تھا جس پر سونے کی تاروں سے اُن کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ دعوت میں کُرتوں کی بھر مار دیکھ کر اوباما صاحب نے کہا ”میں بھی کُرتا پہننے کا سوچ رہا تھا۔ دروغ بَر گردنِ راوی، اُنہیں مشعل اوباما نے کُرتہ پہننے سے روکا کیونکہ مشعل کے خیال میں کُرتہ پہن کر جنابِ اوباما امریکی صدر نہیں ”کچھ اور“ ہی لگتے۔ سوال مگر یہ ہے کہ وہ جو بھارتی حکومت نے امریکی خاتونِ اوّل مشعل اوباما کے لیے کروڑوں کی مالیت کی 100 ساڑھیاں بنوا رکھی ہیں، مشعل اُنہیں پہن کر کیسی لگیں گی؟۔ اگر مشعل یہ ساڑھیاں نہیں پہنتیں تو یہ بھارتی تحفے کی توہین ہوگی اور اگر پہنتی ہیں تو امریکی ”خاتونِ اوّل“ وہ بھی نہیں لگیں گی۔ اِس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ساڑھیوں کے اِس تحفے نے مشعل کو ”وَخت“ میں ڈال دیا ہے۔

مشترکہ پریس کانفرنس میں امریکی صدر نے اپنے ابتدائی الفاظ ادا کرتے ہوئے ہندی میں کہا ”میرا سب کو پیار بھرا نمسکار“۔ اِس نمسکار کے بعد اُنھوں نے ایٹمی ٹیکنالوجی پر تمام بھارتی مطالبات تسلیم کر لیے اور جوہری مواد کی نگرانی کے مطالبے سے دستبردار بھی ہوگئے۔ دونوں ممالک میں دفاع، تجارت، ماحولیات اور دیگر شعبوں میں تعاون کے معاہدے بھی ہوئے اور امریکہ نے بھارت کو سرمایا کاری اور قرضوں کی مَد میں چار کھرب روپے دینے کا اعلان بھی کیا۔ امریکی صدر نے اسی پریس کانفرنس میں یہ بھی کہا کہ امریکہ سلامتی کونسل میں بھارت کی

مستقل رکنیت کی حمایت کرتا ہے۔اِن اعلانات سے یوں لگتا ہے کہ جیسے ''ہندو لالے'' کا واسطہ ''امریکی لالے'' سے پڑگیا ہو کیونکہ جوہری مواد کی نگرانی عالمی نیوکلیئر واچ ڈاگ IAEA کے سپرد ہے جس کے لاء میں ایسی کوئی گنجائش نہیں۔بھارت کا سلامتی کونسل کا رُکن بننے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں، یہ محض بھارت کے لیے امریکہ کی طرف سے لولی پاپ'' ہے کیونکہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 23 میں سلامتی کونسل میں'' توسیع کی کوئی گنجائش نہیں۔بھارت کو چھٹا مستقل رُکن بنانے کے لیے آئین میں ترمیم کرنی ہوگی اور یہ ترمیم اکثریتی رائے سے نہیں بلکہ تمام (193) رُکن ممالک کے متفقہ فیصلے سے ہی ممکن ہے۔اگر ایک رکن ملک بھی مخالفت کر دے تو یہ ترمیم ممکن نہیں ہو سکتی۔اگر ہم ایک لحظے کے لیے یہ تسلیم کرلیں کہ یہ ترمیم ممکن ہے تو پھر بھی پاکستان کو آئرن برادر''قرار دینے والا ہمارا قابلِ اعتماد دوست چین اِس کو ویٹو کر دے گا۔رہی'' چار کھرب امداد کی بات تو سبھی جانتے ہیں کہ امریکہ ایک روپیہ دے کر ایک ہزار نکلواتا ہے اِس لیے اب دیکھنا یہ ہے کہ جیت کس کی ہوتی ہے، ہندو لالے یا امریکی لالے کی۔

ہوئے تم دوست جس کے

بارک اوباما نے جب پہلی بار امریکہ کے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا تو مسلمان بہت خوش تھے کیونکہ اوباما کے نام کے ساتھ حسین کا ''لاحقہ'' بھی لگا ہوا تھا اور دنیا بھر کے مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ بارک حسین ''اندر کھاتے'' مسلمان ہی ہیں۔ اسی لیے مسلمانوں نے ''چوری چوری'' اُن کی کامیابی کی دعائیں بھی بہت کیں۔ امریکی صدر بننے کے بعد جب اوباما نے پَر پرزے نکالنے شروع کیے تو مسلمانوں کو پتہ چلا کہ وہ تو اسلام دشمنی میں جارج ڈبلیو بُش سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ اب محترم حامد میر نے اپنے کالم میں یہ چونکا دینے والا انکشاف کیا ہے کہ بھارت کے نئے '' فطری اتحادی'' تو ہنومان (بندر) کے بھگت ہیں اور اسی کی پراتھنا بھی کرتے ہیں۔ بطور ثبوت اوباما نے صحافیوں کو اپنی جیب سے ہنومان کی مورتی نکال کر بھی دکھادی تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ اب اصولاََ تو ہنومان کے اِس بھگت کا نام '' لالہ بارک حسین اوباما مسیح'' ہونا چاہیے لیکن ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے ابھی اپنے نام کے ساتھ یہودیت کا ''تَبَرّکہ'' بھی لگانا ہو اِس لیے وہ پرانے نام پر ہی اکتفا کر رہے ہوں۔ اوباما نے بھارت پر نوازشات کی بارش کرتے ہوئے ''ہندو والوں'' کا جی خوش کر دیا لیکن امریکہ کی تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

بھارت کو ہنومان کا بھگت مبارک ہو اور پاکستانی قوم کو زیادہ مبارک باد کیونکہ اب اُمید ہو چلی ہے کہ ہماری جان ہمارے اِس ''سٹریٹجک پارٹنر'' سے جلد چھوٹ جائے گی اور ہم بھی سُکھ کا سانس لے سکیں گے ۔خیال تو یہی تھا کہ صرف ہم ہی یوٹرن کے ماہر ہیں لیکن اوباما تو ہمارے بھی استاد نکلے ۔اُنہوں نے بھارت جاتے ہی '' مذہبی یوٹرن'' لے کر ثابت کر دیا کہ اِس معاملے میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔شاید یہ مغرب کی ہواؤں کا اثر ہو کہ ہمارے اپنے الطاف بھائی بھی آئے روز یوٹرن لیتے رہتے ہیں اور مغرب کی فضاؤں میں عمرِ عزیز کا ایک حصّہ گزارنے والے عمران خاں بھی۔

لندن میں بیٹھے الطاف بھائی گزشتہ کئی روز سے بار بار مارشل لاء کا مطالبہ کر رہے تھے ۔وہ کبھی جنرل راحیل شریف سے ملک میں مارشل لاء کا مطالبہ کرتے اور کبھی وزیرِاعظم صاحب سے استدعا کرتے کہ سندھ میں مارشل لاء لگا دیا جائے لیکن 29 دسمبر کو اپنی تین گھنٹوں پر محیط تقریر میں اُنہوں نے یوٹرن لیتے ہوئے فرمایا کہ آئی ایس آئی اور رینجرز میں بہت سے لوگ اُن کے خلاف ہیں اور اسٹیبلشمنٹ کو ایم کیوایم تو قبول ہے، الطاف حسین نہیں اِس لیے وہ 30 دسمبر کو حیدر آباد میں قائم کی جانے والی الطاف حسین یونیورسٹی''کی افتتاحی ''

تقریب کے موقعے پر اپنی سیاست کی اختتامی تقریر فرمائیں گے جس کے بعد اُن کا ایم کیوایم سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ الطاف بھائی اِس سے پہلے بھی کئی بار ایم کیوایم کی قیادت چھوڑنے کی ''پھوکی'' دھمکیاں دے چکے تھے۔ اُن کی یہ دھمکی بھی ''پھوکی'' ہی نکلی اور وہ ایک دفعہ پھر ''پبلک کے پُرزور اصرار پر'' ایم کیوایم کی قیادت سنبھالنے کے لیے تیار ہوگئے۔ ویسے ایم کیوایم کے اکابرین اگر جی کڑا کرکے ایک بار الطاف بھائی کو کہہ دیتے کہ واقعی وہ ایم کیوایم کی قیادت کرتے کرتے تھک بلکہ ''ہپھ'' چکے ہیں اِس لیے ایم کیوایم اُن پر مزید بوجھ ڈال کر اُنہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ وہ آرام کریں کیونکہ اب اُن کے آرام کرنے کے دن ہی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جواباً الطاف بھائی یہی کہتے ''میں تو مخول کر رہا تھا تُم نے سچ ہی جان لیا''۔ لیکن بیچاری ایم کیوایم میں اتنی ہمت کہاں۔

ہمارے کپتان صاحب بھی یوٹرن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ چھوٹے بڑے یوٹرن لیتے ہی رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں اُنہوں نے قومی اسمبلی کے حلقہ 122 کے تحقیقاتی کمیشن کے خلاف ایک بڑا یوٹرن لیتے ہوئے اُس پر عدمِ اعتماد کا اظہار کر دیا حالانکہ وہ بار بار اسی تحقیقاتی کمیشن پر اندھے اعتماد کا اظہار کرتے رہے اور اسی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ پر وزیرِ اطلاعات پرویز رشید صاحب اور خاں صاحب کی چشمک بھی جاری رہی۔ یہ چھوٹے بڑے یوٹرن تو اپنی جگہ لیکن اب اُنہوں

نے ایک یوٹرن ایسا بھی لیا جس کی ''اہمیت'' کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن کا نام گینزبُک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہونا ضروری ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اسلام آباد کے ڈی چوک کے دھرنوں کے ابتدائی ایام میں ہی خاں صاحب نے اپنے چاہنے والوں اور'' والیوں'' کو سول نافرمانی کا حکم نامہ جاری کیا تھا۔ سول نافرمانی کی کال توبُری طرح پِٹ گئی اور تحریکِ انصاف کے وائس چیئرمین شاہ محمود قریشی تک نے بھی اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا لیکن کپتان صاحب ڈٹے رہے لیکن جب اُن کی شادی ''خانہ آبادی'' ہوئی تو اُنہوں نے بھی اپنے بنی گالہ والے محل کا لاکھوں روپے کا بجلی کا بل ادا کرکے اپنے ہی ہاتھوں اپنی سول نافرمانی کو ہوا میں اُڑا دیا۔ جب ایک صحافی نے اِس بارے میں سوال کیا تو خاں صاحب نے فرمایا ''میں تو ٹھنڈے پانی سے نہا سکتا ہوں لیکن میری بیوی اور گیارہ سالہ بچی نہیں نہا سکتیں اِس لیے مجبوراً بجلی کا بِل ادا کرنا پڑا''۔ یہ غالباً انسانی تاریخ کی سول نافرمانی کی پہلی کال تھی جسے ایک خاتون کے قدموں پہ نچھاور کردیا گیا۔ سچّے عاشقوں کو تو یہی کہتے سنا گیا ہے کہ ''رکھ دیا قدموں میں دل نذرانہ ، قبول کرلو'' لیکن ہمارے کپتان صاحب نے ہماری بھابی کے قدموں میں سول نافرمانی رکھ کے ایسی انوکھی اور نرالی مثال قائم کی ہے جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

ایک یوٹرن ہمارے پیارے مرنجاں مرنج گورنر پنجاب چودھری محمد سرور نے بھی لے

لیا۔ یہ بھی غالباً مغربی فضاؤں کا ہی اثر تھا کیونکہ چودھری صاحب تو اپنی عمرِ عزیز کا غالب حصّہ انگلینڈ میں گزار کر پاکستان تشریف لائے اور گورنری کا منصب سنبھالا۔ وہ جاتے جاتے حکومت کو ''چارج شیٹ'' کرتے ہوئے کہہ گئے کہ پاکستان میں سچ کا قحط ہے اور یہاں توقبضہ گروپ بھی گورنر سے مضبوط ہیں۔ دراصل چودھری صاحب کے اندر کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی اُمنگ جواں تھی لیکن وہ اُتنے ہی بے اختیار تھے جتنی کہ ملکہ برطانیہ ۔ عقیل و فہیم چودھری صاحب کو گورنری کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی یہ سوچ لینا چاہیے تھا کہ پاکستان میں صدر اور گورنر کا عہدہ '' علامتی'' اور مکمل طور پر بے اختیار ہوتا ہے ۔ اگرچودھری صاحب نے گورنری سے لطف اندوز ہونا تھا تو پھر وہ ''دَورِ آمریت'' میں یہ عہدہ سنبھالتے کیونکہ پاکستان میں تو صرف دَورِ آمریت میں ہی سارے اختیارات صدراور گورنرز کو منتقل ہوا کرتے ہیں، جمہوری دَور (خواہ وہ کیسا ہی کَٹا پھٹا کیوں نہ ہو) میں تو یہ عہدہ بس ''ایویں ای'' ہوتا ہے۔ ہمارے چودھری صاحب کے ساتھ تو ایک ہَتھ ''یہ بھی ہوا کہ اُن کا ''مَتھا'' میاں شہباز شریف جیسے وزیرِاعلیٰ سے لگ گیا جو'' اِرتکازِ اختیارات کو ہی اپنی زندگی کا محور و مرکز سمجھتے ہیں۔ بھلے وہ دو چار وزارتیں بانٹ بھی دیں لیکن اُن کے اختیارات بھی اپنے ہاتھ میں ہی رکھتے ہیں۔ چودھری صاحب کو اِس کا ادراک تو دو چار ماہ میں ہی ہو گیا تھا اور اسی وقت سے وہ ''پھُر'' ہو جانے کے لیے پَر بھی تول رہے تھے لیکن شاید اُن کی طبعی شرافت آڑے آتی رہی اور وہ اتنا عرصہ نکال گئے۔

ایک اور نظریہ ضرورت

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

وزیرِاعظم پاکستان میاں نواز شریف نے بیدیاں روڈ لاہور میں انسدادِدہشت گردی فورس کی پہلی پاسنگ آوٹ پریڈ سے خطاب کرتے ہوئے کہاکہ قوم ،فوج اورادارے متحد ہیں اوردہشت گردوں کے عبرت ناک انجام کاوقت قریب آگیا۔اُنھوں نے فرمایا ''دہشت گردی کے خلاف جس طرح سیاسی جماعتوں ،صوبائی حکومتوں اورافواج پاکستان نے کردار اداکیا وہ قابلِ ستائش ہے اورماضی میں اِس کی مثال نہیں ملتی ''۔ یہ بجاکہ دہشت گردی کے خلاف حکومت اور فوج ایک صفحے پر ہے مگر۔۔۔ سیاسی جماعتیں ؟۔نوازلیگ کی حلیف ،جمعیت علمائے اسلام نے توپہلے دن سے آنکھیں دکھانی شروع کردیں ۔اُس نے اکیسویں ترمیم کے حق میں ووٹ دیانہ وہ اِس ترمیم کو تسلیم کرتی ہے ۔یہی حال جماعت اسلامی کا بھی ہے ، وہ دہشت گردی کے خلاف ایکشن کی توبھرپور حمایت کرتی ہے لیکن اکیسویں ترمیم سے الگ تھلگ کھڑی نظرآتی ہے ۔ محترم عمران خاں نے دہشت گردی کے خلاف ایکشن کی نہ صرف بھرپور حمایت کی بلکہ ملکی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنادھرنا بھی ختم کردیا لیکن عملی طورپر وہ آج بھی دھاندلی کے خلاف سراپا احتجاج اور سڑکوں پر آنے کے لیے تیار ۔ایم کیوایم کراچی میں ہونے والے ہرپولیس اور رینجرز ایکشن سے نالاں اور سندھ حکومت کو موردِالزام ٹھہراتی ہوئی ۔اِس منظرنامے کو

مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ حکومت اور فوج دہشت گردی کی لعنت کے خاتمے کے لیے یکسو ہے اور قوم بھی لیکن دیگر سیاسی جماعتوں کی ''وہی ہے چال بے ڈھنگی ، جو پہلے تھی سو اب بھی ہے''۔

ہماری سیاسی اشرافیہ دہشت گردی کے خلاف تین بار اکٹھی ہوئی اور اعلیٰ عسکری قیادت بھی اِس مشاورت میں شامل رہی۔ عسکری قیادت تو ہر قسم کی قربانی کے لیے یکسو تھی لیکن سیاسی اکابرین کے چہروں پر بیزاری ، تھکاوٹ اور بناوٹ عیاں ۔ہر سیاسی جماعت نے میڈیا کے سامنے یہی رونا رویا کہ وہ بحالتِ مجبوری ملٹری کورٹس کو قبول کر رہی ہے ۔ جمہوریت بچانے کی فکر میں غلطاں اِن بزرجمہروں سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا اُن کی اپنی جماعتوں میں جمہوریت ہے ؟۔اکیسویں ترمیم کی سینٹ میں منظوری پر پیپلز پارٹی کے سینئر رضا ربانی آبدیدہ ہو گئے ۔اُنہوں نے فرمایا کہ ووٹ پیپلز پارٹی کی امانت تھا جو دے دیا لیکن ضمیر پر ہمیشہ بوجھ رہے گا۔ سوال مگر یہ ہے کہ محترم رضا ربانی اُس وقت آبدیدہ کیوں نہیں ہوئے جب ایک آمر کے این آر او کی چھتری تلے بی بی شہید پاکستان تشریف لائیں ؟۔ وہ جانتے ہیں کہ پیپلز پارٹی میں موروثیت ہے جمہوریت نہیں، پھر موروثیت کے خلاف بات کرنے سے پہلے اُن کی زبان پر لکنت کیوں طاری ہو جاتی ہے؟ ۔بلاول زرداری نے ٹویٹ کیا کہ پیپلز پارٹی نے اکیسویں ترمیم کے حق میں ووٹ دے کر اپنی ناک کٹوا دی ۔ یہ ناک اُس وقت کیوں نہیں کٹی جب بلاول زرداری کو بیٹھے

بٹھائے ''بھٹو'' بنا دیا گیا۔ یہ ناک اُس وقت بھی سلامت رہی جب ''غضب کرپشن کی عجب کہانیاں'' منظرِ عام پر آتی رہیں۔ یہ ناک تب بھی سلامت رہی جب میموگیٹ سکینڈل کے مرکزی ملزم کو پہلے ایوانِ صدر اور پھر وزیرِ اعظم ہاؤس میں پناہ دی گئی اور یہ ناک اُس وقت بھی سلامت رہی جب ایک طرف تو نواز لیگ کے ساتھ ''میثاقِ جمہوریت'' پر دستخط کیے جا رہے تھے اور دوسری طرف آمر پرویز مشرف کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں۔ واہ ! کیا بات ہے پیپلز پارٹی کی اِس موم کی ناک کی کہ جس کو جب، جہاں اور جیسے موڑ لیں، وہ سلامت ہی رہتی ہے لیکن آج جب قوم پر دَورِ ابتلاء ہے اور قوم دہشت گردی کے خلاف یکسو تو پیپلز پارٹی کی بیٹھے بٹھائے ناک کٹ گئی۔ ایم کیو ایم کے الطاف بھائی کہتے ہیں کہ اگر پورے ملک میں مارشل لاء نہیں لگانا تو کم از کم سندھ کو ہی فوج کے حوالے کر دیا جائے تاکہ شہرِ قائد کو بھتہ خوروں، قبضہ گروپوں اور ٹارگٹ کلرز سے پاک کر دیا جائے۔ الطاف بھائی شاید یہ بھول چکے کہ یہ سارے نخل اُنہی کی نرسری میں اُگے اور اُنہی کی کاوشوں سے آج ایسے تن آور درخت بن چکے جنہیں جڑ سے اکھاڑنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ یہ بجا کہ اب کراچی میں بھی دہشت گردوں نے جا بجا ٹھکانے بنا لیے ہیں لیکن نو گو ایریاز، عقوبت خانے اور ٹارگٹ کلنگ تو اُس دور کی پیداوار ہیں جب الطاف بھائی نے اپنے کارکنوں کو گھریلو سامان بیچ کر اسلحہ خریدنے کا حکم دیا۔ ایم کیو ایم (حقیقی) کے کارکنوں کا قتلِ عام بھی تاریخ کا حصہ ہے اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی کراچی آمد پر بہائے

گئے خون کے دھبے بھی ابھی مٹ نہیں پائے۔اسلحے سے بھرے ہزاروں کنٹینرز بھی اسی دور میں گم ہوئے جب ایم کیوایم کے بابر غوری پورٹس اینڈ شپنگ کے وزیر تھے ۔''مہاجر لبریشن آرمی''کی گونج بھی کراچی ہی میں سنائی دی اور وزیرِداخلہ چودھری نثاراحمد کا یہ مضحکہ خیزبیان بھی سامنے آیا کہ مہاجرلبریشن آرمی کی رپورٹس تواُن تک پہنچیں لیکن یہ رپورٹس سپریم کورٹ میں داخل کروانے کے لیے نہیں تھیں۔یہ بھی کوئی سربستہ راز نہیں کہ 90 کی دہائی سے پہلے ہر کسی کواپنی آغوشِ محبت میں سمیٹنے والے روشنیوں کے شہر کراچی کو لسانی ، نسلی اور گروہی منافرتوں میں کس نے تقسیم کیا؟۔ خونم خون کراچی کی بربادیوں کے افسانے سب سے پہلے ایم کیوایم نے لکھے پھر پیپلزپارٹی اوراے این پی بھی اِس میں شامل ہوگئیں۔ایک کراچی کے اندر کئی کراچی بن گئے ،جگہ جگہ بابا لاڈلااور عزیر بلوچ جنم لینے لگے ۔جب سیر کو سواسیر مِل گیا تو الطاف بھائی نے بھی کراچی کو فوج کے حوالے کرنے کامطالبہ کردیا۔ہم تویہی کہہ سکتے ہیں کہ

اب کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اِس طرح تو ہوتا ہے ،اِس طرح کے کاموں میں

کچھ قلم فروشی کادھندا کرنے والوں کو چھوڑ کر سبھی متفق تھے کہ پیپلزپارٹی کے دورِحکومت میں جنابِ زرداری کامفاہمتی رنگ اُن کی مجبوریوں کا عکاس تھا

اور مفاہمتی پالیسی ''کرسی'' بچانے کی تگ ودو البتہ میاں نواز شریف کے سامنے ایسی کوئی مجبوری نہیں کیونکہ اُنہیں پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت حاصل ہے، پھر بھی وہ پارلیمنٹ کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں جسے خالصتاً جذبۂ تعمیر کہا جاسکتا ہے۔ نواز لیگ بھی متوازی عدالتی نظام کے ہرگز حق میں نہیں اور اقتدار کے ایوانوں سے اِس کا برملا اظہار بھی کیا جاچکا لیکن جب حالات اِس نہج پر پہنچ جائیں کہ زندگی اور موت میں کسی ایک کا انتخاب مقصود ہو تو پھر طارق بن زیاد کی طرح سفینے جلانے ہی پڑتے ہیں۔ ہم نے چار دہائیاں ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت گزار دیں۔ آمروں نے اپنی آمریت کو استحکام بخشنے کے لئے ہمیشہ اعلیٰ عدلیہ کو ''نظریۂ ضرورت'' کے لیے استعمال کیا۔ اب اگر قوم کو اسی ''نظریۂ ضرورت'' کی ضرورت آن پڑی تو اعلیٰ عدلیہ ایک سول حکومت کو دو سال کے لیے ''ملٹری کورٹس'' کی اجازت دے دے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

شریفانہ ''اجتماع''

گزشتہ دنوں مناواں ٹریننگ سینٹر میں نئی تشکیل پانے والی '' کاؤنٹر ٹیررازم فورس'' کی پاسنگ آوٹ پریڈ کے موقعے پر وزیرِاعظم پاکستان میاں ''نواز شریف'' ، چیف آف آرمی سٹاف جنرل ''راحیل شریف ''اور وزیرِاعلیٰ پنجاب میاں ''شہباز شریف''سٹیج پر کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھے تھے ۔جب ایک ہی جگہ پر تینوں اعلیٰ ترین ''شریف'' موجود ہوں توپھر'' اَنہونی'' کو ''ہونی''میں بدلنا کونسا مشکل کام ہے۔دہشت گردی کے خلاف ''شریفوں''کے اِس اجتماع کو دیکھ کر ہمیں بھی یقین ہو چلا ہے کہ اب دہشت گردوں کے ''گھُٹنے''سیکنے میں تیزی آ جائے گی اور یہ ''شریفانہ اجتماع'' بالآخر ''بدمعاشانہ دہشت گردی''کا خاتمہ کرکے ہی دَم لے گا۔اِس سے پہلے صرف ایک ''شریف''نے دہشت گردوں کو ''وَخت''میں ڈالا ہوا تھا لیکن اب تو تین تین شریف اکٹھے ہو گئے ۔ویسے بھی ''شریفوں''کی عملداری میں ''بدمعاشوں''کا کیا کام ۔ کاؤنٹر ٹیررازم فورس کے قیام کا تصور تو وزیرِاعظم صاحب کے ذہن میں پہلے ہی موجود تھا لیکن اِس تصوّر کو حقیقت میں بدلنے کے لیے اُنہیں کچھ عرصہ لگ گیا۔اُنہوں نے جب اِس فورس کے قیام کے لیے میاں شہباز شریف صاحب کو کہا تو وہ

فوراً تیار ہوگئے کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ ہمارے خادمِ اعلیٰ کو تو ایسے "اوکھے اوکھے" کام کرنے میں مزہ ہی بہت آتا ہے۔اُنھوں نے 9 ماہ پہلے اِس فورس کے لیے نوجوانوں کا انتخاب کیا اور پاک فوج کی زیرِ نگرانی ٹریننگ شروع کروادی۔کاؤنٹر ٹیرارزم فورس کے پہلے بیچ میں 405 جوان اور 16 لڑکیاں شامل ہیں۔میاں شہباز شریف صاحب کے مطابق اِس بیچ میں اکثریت ایم اے ،ایم فِل ،ڈاکٹرز اور انجینئرز اور ماہرینِ نفسیات کی ہے جو اُس ناسور کو ختم کرنے کے لیے پُر عزم دکھائی دیتی ہے جو انسانیت کے نام پر بدنما داغ ہے۔یہ سنگ دِل ،عیار ،مکار اور ابلیسیت کے علمبرداروں کا ایسا گروہ ہے جو معصوم بچوں تک کو نہیں چھوڑتا۔اُس کے نزدیک مسجد کا کوئی تقدس ہے نہ مدرسے کا۔وہ مسجدوں ،امام بارگاہوں اور سکولوں پر حملے کرکے اسے جہاد کا نام دے کر دینِ مبیں کو بدنام کرنے کی ناپاک کوشش کر رہے ہیں۔یہ امر اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ بیرونی قوتوں کے خفیہ ہاتھ اِن دہشت گردوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔اِن حالات میں ڈاکٹرز ،انجینئرز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کا کاؤنٹر ٹیرارزم فورس میں شامل ہونا اُن کے عزم بالجزم کی دلیل ہے اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ فورس انشاء اللہ پاک وطن کی مٹی کو اِن دہشت گردوں کے ناپاک وجود سے پاک کردے گی۔پاکستان میں دہشت گردی تو 2007ء سے جاری ہے لیکن اِس دہشت گردی کے خلاف صرف افواجِ پاکستان ہی کارروائیاں کرتی رہی لیکن اندرونی دہشت گردی سے نپٹنے کے لیے سوائے پولیس کے کوئی فورس موجود نہیں تھی۔پولیس کو کاؤنٹر ٹیرارزم کی کوئی ٹریننگ تھی ،نہ

اُس کے پاس مناسب اسلحہ اور دیگر سہولیات۔ موجودہ حکومت نے اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے ایسے اداروں کا قیام ضروری سمجھا جو اندرونی دہشت گردی کا خاتمہ کریں تاکہ فوج یکسو ہو کر سرحدوں کی حفاظت کر سکے۔ کاؤنٹر ٹیررازم فورس کے جوان جب پاسنگ آؤٹ کے لیے میدان میں اُترے تو اُن کے چہروں پر عزمِ صمیم کی ایسی جھلک نمایاں تھی جسے دیکھ کر اقبال کے ''شاہیں'' کا تصور تازہ ہو گیا۔ اِن نوجوانوں کی چُستی اور پھرتی دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ اقبال کے یہ پُردَم شاہیں ہر میدان میں کامیاب ہوں گے کیونکہ

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ افتاد

ہمیں یقین ہے کہ یہ پُرعزم جوان دہشت گردی کے سامنے سدِّ سکندری بن جائیں گے لیکن اِس کے لیے جس قومی یکجہتی کی ضرورت ہے، وہ کہیں نظر نہیں آتی۔ وزیرِاعظم صاحب تو کہتے ہی رہتے ہیں کہ چیلنجز سے نپٹنے کے لیے سیاسی جماعتوں کو متحد ہونا ہوگا کیونکہ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے سیاسی استحکام ناگزیر ہے لیکن ہمیں یہ سیاسی استحکام کہیں نظر نہیں آتا۔ ہر کسی کی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔ محترم عمران خاں اب بھی وہی رٹی رٹائی باتیں دہرا رہے ہیں اور جوابِ آں غزل کے طور پر وزیرِ اطلاعات جناب پرویز رشید بھی وہی کچھ کہہ رہے ہیں جسے سُن سُن کر کان پک گئے ہیں۔ اُنہوں نے فرمایا ''عمران خاں جھوٹ

بولتے رہیں، ہم سچ سامنے لاتے رہیں گے۔پاکستان کوسکون سے نہ رہنے دینا عمران خاں کی سیاست کا حصہ ہے۔ شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں کو پتھر مارنے کی عادت اُن کو مہنگی پڑے گی''۔ہم نے بار بار عرض کیا کہ کپتان صاحب کے پاس گنوانے کو کچھ نہیں، جو نقصان ہوگا، حکومت کا ہی ہوگا لیکن ہماری کون سُنتا ہے۔کیا پرویز رشید صاحب کو یہ بھی ادراک نہیں کہ ''شیشے کے گھر''میں ہمیشہ حکومت ہی ہوتی ہے، اپوزیشن نہیں۔اپوزیشن کا کام تو شیشے کے گھر کے مکینوں کو پتھر مارنا ہی ہوتا ہے پھر بھلا یہ پتھر مارنے کی ''عادت'' خاں صاحب کو کیسے مہنگی پڑ سکتی ہے؟۔ویسے صرف خاں صاحب ہی نہیں، حکومت پر تو چاروں طرف سے پتھروں کی برسات ہو رہی ہے۔خاں صاحب اگر جھوٹ بولتے ہیں تو سارا سچ پرویز رشید صاحب بھی نہیں بولتے۔اِس باہمی چپقلش سے قوم پریشان اور سوچنے پر مجبور کہ آخر کس راہ کا انتخاب کرے کہ اِس گھوراندھیرے میں کوئی راہ دکھائی دیتی ہے نہ سجھائی۔یہی عالم ہمارے سیاستدانوں کا ہے۔عوام تو ہر پانچ سال بعد بڑے شوق سے قطار اندر قطار خوشیاں خریدنے نکلتے ہیں لیکن اُن کے ساتھ عشروں سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے کہ

کَل دھوپ کے میلے سے خریدے تھے کھلونے\
جو موم کا پُتلا تھا، گھر تک نہیں پہنچا ہے

اُن کی اُمیدیں نا اُمیدیوں اور سُکھ، دُکھ میں ڈھلتے رہتے ہیں۔پرویز رشید صاحب

کہتے ہیں کہ پاکستان کو سکون سے نہ رہنے دینا عمران خاں کی سیاست کا حصہ ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ قومی مایوسی اور بے سکونی میں کچھ حصہ حکومت کا بھی ہے۔ پرویز رشید صاحب سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ پونے دو سال میں حکومت نے کون سے ایسے کارنامے سرانجام دیئے ہیں جن پر فخر کیا جا سکے؟۔ سانحہ ماڈل ٹاؤن سے لے کر پٹرول کی قلت تک حماقتوں کی ایک طویل فہرست ہے جو اِس حکومت کے کھاتے میں ہی جاتی ہے۔ پیپلزپارٹی کے گزشتہ دور میں خادمِ اعلیٰ صاحب نے دو سال کے اندر لوڈشیڈنگ کے مکمل خاتمے کا متعدد بار اعلان کیا لیکن اب ہمارے پانی بجلی کے وزیر خواجہ آصف صاحب فرماتے ہیں کہ 2018ء سے پہلے لوڈشیڈنگ کا خاتمہ ممکن نہیں۔ بجا کہ تا حال حکومت پر کرپشن کا کوئی الزام نہیں لگا لیکن قوم سے تو یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ کرپشن کے مگرمچھوں کو سڑکوں پر گھسیٹا جائے گا۔ اُس وعدے کا کیا ہوا؟۔ کیا قوم یہ یقین کر لے کہ

تیرے وعدے پہ جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مَر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

اور حرفِ آخر یہ کہ ہمیں میاں برادران کی خلوصِ نیت پر کوئی شک ہے نہ اُن کے "میڈ اِن پاکستان" ہونے پر لیکن اُن کا جن لوگوں نے گھیراؤ کر رکھا ہے، ہمیں اُن کی صلاحیتوں پر اعتبار ہے نہ نیتوں پر۔ کیا میاں صاحب اِس طرف بھی توجہ فرمائیں گے؟۔

جعلی جمہوریت اور جعلی آمریت

5 فروری کو یکجہتی کشمیر کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے خاں صاحب نے فرمایا ''پے درپے آمریتوں اور جعلی جمہوریتوں کی وجہ سے ہمیں ابھی تک آزادی میسر نہ آ سکی ۔ہمیں جمہوریت کے ساتھ آمر بھی جعلی ملے ۔اگر کوئی اچھا ڈکٹیٹر مل جاتا تو ملک آگے نکل جاتا''۔ دراصل ہمارے خاں صاحب جس ''انگلیسی جمہوریت'' کی تلاش میں ہیں ،وہ توجمہوریت کی ''نانی،پڑنانی'' ہے جبکہ پاکستانی جمہوریت ''نَو مولود''۔ دو عشرے انگلستان میں گزارنے والے کپتان صاحب مغربی جمہوریت سے متاثر ہیں۔
خارزارِ سیاست میں قدم رکھتے ہی اُن کا واسطہ ''پاکستانی جمہوریت'' سے پڑا جس سے وہ بجا طور پر بَددل ہو گئے ۔پھر جب ''مشرفی آمریت'' مسلط ہوئی تو خاں صاحب کو اس میں کشش نظر آئی اور وہ تحریکِ انصاف کا جھنڈا اٹھا کر پرویز مشرف کے جلسوں میں شریک ہونے لگے ۔اُس زمانے میں وہ پرویز مشرف کے ہر اقدام کی بھرپور تحسین کرتے نظر آئے ۔تمام سیاسی جماعتوں نے مشرف کے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا لیکن خاں صاحب نے بھرپور ساتھ دیا۔گَڑبڑ تو 2002ء کے الیکشن کے بعد ہوئی جب ''بے وفا ڈکٹیٹر'' طوطا چشم نکلا۔خاں صاحب تو نیا پاکستان بہت پہلے بنا چکے ہوتے اگر پرویز مشرف خاں صاحب سے کیا گیا وعدہ وفا کرتے ہوئے اُنہیں وزیرِ اعظم بنا دیتے لیکن اُس ''جعلی آمر'' نے تو کئی لوگوں سے وزارتِ عظمیٰ کا وعدہ کیا ہوا تھا مگر قرعہ فال نکلا ڈیرہ مراد جمالی

کے میر ظفراللہ جمالی کے نام ،جنکے بارے میں کسی نے سوچا تک نہ تھا۔تب خاں صاحب کو سوفیصد یقین ہوگیا کہ یہ ڈکٹیٹر جعلی ہے۔دوسری بار خاں صاحب کے ساتھ پھر ''ہَتھ'' اُس وقت ہوا جب اُنہیں یقین دلادیا گیا کہ اِدھر وہ ڈی چوک اسلام آباد پہنچے اوراُدھر'' اچھے ڈکٹیٹر''کی انگلی کھڑی ہوئی ۔خاں صاحب توحسبِ وعدہ بڑے طمطراق سے ڈی چوک پہنچے لیکن طویل انتظار کے باوجود ''انگلی''کھڑی نہ ہو سکی ۔اِس سانحے''کے بعد تو یہ خاں صاحب کا جزوِایمانی بَن گیا کہ پاکستان میں جمہوریت توجعلی'' تھی ہی ،ڈکٹیٹر بھی جعلی ہی ہیں۔اب صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں جمہورت جعلی آمریت جعلی ،الیکشن کمیشن جعلی ،نگران حکومتیں جعلی ،تحقیقاتی کمیشن جعلی ،عدلیہ جعلی، اور سب سے بڑھ کرحکومت جعلی ۔ایسے میں یہ خاں صاحب ہی کی ہمت اور حوصلہ ہے کہ وہ اِن ''جعلی فضاؤں''میں بذریعہ ڈی جے بٹ قوم کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ

حق کا پرچم لے کر اُٹھو

باطل سے ٹکراؤ

مارو یا مر جاؤ

ویسے آپس کی بات ہے کہ اگر انتھک محنت کرنے والے جرّی پُرعزم اور وطن کی مٹی سے والہانہ محبت کرنے والے جنرل راحیل شریف ایک ''اچھے ڈکٹیٹر''بن کر ملک کی باگ ڈور سنبھال لیتے تو کپتان صاحب خوش ہوجاتے اورلندن میں بیٹھے

الطاف بھائی بھی۔ جنرل صاحب کو دَس بار وردی میں منتخب کروانے والے بھی ڈھیروں ڈھیر مل جاتے اور لال حویلی بھی روشنیوں سے جگمگا اُٹھتی لیکن ''نشانِ حیدر'' گھرانے کے سپوت جنرل راحیل شریف صاحب اِس کے لیے مطلق تیار نہیں۔ اِس لیے خاں صاحب کو جنرل صاحب کے ریٹائر ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔ اُن کے جانے کے بعد ہو سکتا ہے کہ خاں صاحب کی اُمید بَر آئے۔ ویسے بھی جنرل صاحب کی ریٹائرمنٹ تک اتنا عرصہ تو گزر چکا ہوگا کہ جمہوریت کو ''ستانے'' کے لیے گھر بھیج دیا جائے ۔خاں صاحب کا عزمِ صمیم اُنہیں اتنا عرصہ تو انتظار کرواہی سکتا ہے کیونکہ اُنہوں نے خود ہی فرمایا ''ہم حکومت پر محمود غزنوی کی طرح حملے کرتے رہیں گے'' محمود غزنوی نے ہندوستان پر 17 حملے کیے تھے اِس لیے ہم خوش تھے کہ ابھی پاکستانی ''محمود غزنوی'' کے سولہ حملے باقی ہیں جن کے لیے پچیس سال درکار ہوں گے۔ اِس دَوران چینی صدر کا دَورہ بخیر و خوبی انجام پا جائے گا اور حکمرانوں کو بھی یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ اُنہیں کام نہیں کرنے دیا گیا لیکن ہمارے ''شریر'' وزیرِ اطلاعات فرماتے ہیں کہ ''عمران خاں کے استعفے پر SHO صاحب بات تو وزیرِ اعظم کے استعفے سے شروع کرتے ہیں لیکن مان جاتے ہیں'' اگر وزیرِ اطلاعات پرویز رشید صاحب طنز کے ایسے ہی تیر برساتے رہے تو بات وزیرِ اعظم کے استعفے تک بھی پہنچ ہی جائے گی۔

اگر خاں صاحب یہ کہتے ہیں کہ پاکستانی جمہوریت جعلی ہے تو کچھ غلط بھی نہیں

کہتے کیونکہ پاکستان میں آمریت اور جمہوریت میں بس نام ہی کافرق ہے۔ قوم کا واسطہ ہمیشہ ''جمہوری آمروں'' سے پڑتا رہا اس کے باوجود بھی یہی سمجھا جاتا رہا کہ ''بدترین جمہوریت، بہترین آمریت سے بہتر ہے''لیکن آج خاں صاحب نے یہ انکشاف کرکے ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ آمر بھی جعلی ہو سکتا ہے۔ہم اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ آمر صرف آمر ہوتا ہے، اصلی نہ نقلی۔ اِس لیے اگر خاں صاحب نے آمر پرویز مشرف کا ساتھ اِس لیے دیا کہ وہ ''اچھا ڈکٹیٹر'' تھا، تو غلط کیا۔ وزیرِ اطلاعات ونشریات نے کپتان صاحب کے بیان کے بعد فرمایا''عمران خاں کشمیر ایشو پر بات کرنے کی بجائے اپنی جھوٹ اور فریب پر مبنی داستان لوگوں کو سنا رہے ہیں۔ ریفرنڈم کے حامیوں کو آج بھی ڈکٹیٹر یاد آ رہے ہیں۔ خاں صاحب یومِ کشمیر پر بھی وزیرِ اعظم کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے سے باز نہیں آئے۔ وہ نہ جانے کب ذاتیات سے باہر نکلیں گے''

۔پرویز رشید صاحب نے باقی باتیں تو بس ''ایویں ای''کی ہیں اصل بات وہ چھپا ہی گئے ۔اُنہیں اصل غصہ کپتان صاحب کے اِس بیان پر ہے کہ ''نواز شریف اور زرداری اِس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے بچھڑے ہوئے بھائی ہوں''۔اب پرویز رشید صاحب کو کون سمجھائے کہ کپتان صاحب کے بھی ایک بھائی ہوا کرتے تھے جو خاں صاحب کو ''بیچ منجدھار'' چھوڑ کر کینیڈا سدھار گئے اور ہمارے کپتان اکیلے رہ گئے۔اب خاں صاحب جب بھی کسی کو گلے ملتا دیکھتے ہیں تو اُنہیں ''اپنے بھائی''کی یاد ستانے لگتی ہے۔ میاں صاحب اور زرداری صاحب کی الفت، محبت اور یگانگت کو دیکھ کر خاں صاحب کا

دُکھ'' سمجھ میں آتا ہے اور بقول عبد الحمید عدم''

گلے ملتے ہیں جب آپس میں دو بچھڑے ہوئے ساتھی

عدم اِن بے سہاروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے

اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے پروفیسر رشید صاحب نے جب یہ سُنا کہ خاں صاحب نے اپنے آپ کو محمود غزنوی سے تشبیہ دی ہے تو اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے آپ کو پنڈت جواہر لال نہرو ہی سمجھ لیا۔ایک دفعہ نہرو نے کہا تھا کہ ''میں اتنے پاجامے نہیں بدلتا جتنے پاکستان میں وزیرِ اعظم بدلتے ہیں''۔پروفیسر رشید صاحب چونکہ'' پاجامہ'' پہنتے ہی نہیں اِس لیے اُنھوں نے خاں صاحب کے جواب میں یہ کہہ دیا ''میں اتنے کوٹ نہیں بدلتا جتنے خاں صاحب بیان بدلتے ہیں''۔خاں صاحب کے بیانات بدلنے کو تو رکھیے ایک طرف ،پہلے یہ پتہ چلانا چاہیے کہ قوم کو کڑوی گولی کھانے کا درس دینے والے پروفیسر رشید صاحب کے پاس کوٹ ہیں کتنے اور آئے کہاں سے ؟۔

کہاں ہیں پٹرولیم مصنوعات میں کمی کے ثمرات؟

گزشتہ اتوار وزیرِ اعظم نواز شریف صاحب نے اشیائے خورونوش کا جائزہ لینے کے لیے اسلام آباد کی آب پارہ مارکیٹ اور جی ٹین مرکز کے بازاروں کا اچانک دورہ کیا اور صارفین کے درمیان گھوم پھر کر سبزیوں اور پھلوں کے ریٹ معلوم کرتے رہے ۔اُنھوں نے دوکانداروں سے بھی پوچھا کہ وہ آلو ، ٹماٹر ،گاجر ،ادرک ،پیاز ،پالک اوردالیں وغیرہ کس نرخ پر خریدتے اور کس قیمت پر بیچتے ہیں۔دوکانداروں نے جو بتایا سو بتایا، سوال مگر یہ ہے کہ کیا وزیرِ اعظم صاحب نے کبھی یہ اشیاء خریدی ہیں جو وہ موازنہ کر سکیں کہ قیمتوں میں کیا کمی بیشی ہوئی۔اُن کے تو ملازموں کے ملازم ہی یہ چیزیں خریدتے ہوں گے اِس لیے وہ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتے کہ قوم مہنگائی کی کس چکی میں پِس رہی ہے۔دوسری بات یہ کہ وزیرِ اعظم صاحب کو یہ اچانک کیا سوجھی کہ اُنھوں نے ''خادمِ اعلیٰ''کا سا اندازاختیار کر لیا؟۔یہ تو ہمارے خادمِ اعلیٰ ہی ہیں جو کبھی موٹر سائیکل ، کبھی میٹرو ، کبھی پیلی ٹیکسی اور کبھی ''لانگ شوز'' پہنے کشتی میں سوار نظر آتے ہیں۔وہ تو پیپلز پارٹی کے دَور میں لوڈشیڈنگ کے دَوران شدید گرمی میں ہاتھ میں پنکھا لے کر مینارِ پاکستان جا پہنچتے تھے لیکن ہمارے نازک مزاج میاں نواز شریف صاحب نے تو ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ہو سکتا ہے کہ خادمِ اعلیٰ کی مقبولیت کو دیکھ

کہ اُنہیں بھی یہ شوق چرایا ہو۔ دوسری طرف خادمِ اعلیٰ اب آہستہ آہستہ اپنے بڑے بھائی کی پیروی کرنے لگے ہیں۔ محترم بھائی رؤف طاہر نے اپنے کالم میں لکھا ہے کہ ایک خبر کے مطابق حکومتِ پنجاب نے ساڑھے 33 لاکھ روپے کی لاگت سے ایک لگژری کنٹینر خریدنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں گرم کھانے کو گرم اور ٹھنڈے کو ٹھنڈا رکھا جاسکے ۔ خبر کے مطابق میٹنگز کے بعد وزیرِ اعلیٰ صاحب کو کھانے کی اشیاء اکثر ٹھنڈی ہی پیش کی جاتی تھیں جس کی بنا پر انتظامیہ نے ریفر کنٹینر خریدنے کا فیصلہ کیا اور وزیرِ اعلیٰ صاحب نے اِس کی منظوری بھی دے دی۔ بھائی رؤف طاہر کہتے ہیں کہ پہلے تو اُنہیں اِس خبر پر یقین نہیں آیا لیکن پھر اُنہوں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ فائلوں کے انبار اور بے پناہ دباؤ میں وزیرِ اعلیٰ اِس فائل پر ضروری توجہ نہ دے پائے ہوں۔ ہمیں تو اب بھی اِس خبر کی صحت سے انکار ہے اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر ہم بھی خادمِ اعلیٰ کی طرح لہک لہک کر گانے لگیں گے کہ

ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو
میں نہیں جانتا، میں نہیں مانتا

ویسے آجکل ''بھول چوک'' کا موسم ہے اور صرف خادمِ اعلیٰ ہی نہیں اور بھی بہت سے سیاستدانوں سے ''چُوک'' ہو رہی ہے۔ سب سے بڑی چُوک تو ہمارے کپتان صاحب کرنے جارہے ہیں۔ اُنہوں نے سابق گورنر پنجاب چوہدری سرور صاحب سے ملاقات بھی

کرلی اور انہیں تحریکِ انصاف میں شرکت کی دعوت بھی دے ڈالی جبکہ چودھری سرور صاحب نے تحریکِ انصاف کی وائس چیئرمینی کا عہدہ طلب کر لیا جس پر تحریکِ انصاف کے وائس چیئرمین شاہ محمود قریشی بہت چیں بجبیں ہوئے۔ اُنھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں آ سکتیں اُسی طرح ایک جماعت میں دو وائس چیئرمین بھی نہیں ہو سکتے۔ خاں صاحب نے چودھری صاحب سے وقت مانگ لیا اور شنید ہے کہ اب چودھری صاحب کو ''باغی'' کی جگہ تحریکِ انصاف کا صدر بنایا جا رہا ہے۔ ہم تو کپتان صاحب سے یہی کہیں گے کہ اب بھی وقت ہے کہ وہ دوسرے ''باغی'' کی پارٹی میں شمولیت سے باز رہیں لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا ۔ ہمارے اعتراض کی وجہ یہ ہے کہ سیاست میں خاں صاحب کی پہچان ضدی اور مَن مانی کرنے والے لیڈر کے طور پر کی جاتی ہے جبکہ دوسری طرف چودھری سرور صاحب کو تو لیڈری'' کا شوق ہی بہت ہے۔ اگر اُن کے ذہن میں ''لیڈری'' کے جرثومے کلبلا نہ رہے'' ہوتے تو آج بھی پنجاب کے گورنر ہوتے اور میاں برادران کے قریبی دوست۔ اِس لیے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے والے چودھری سرور صاحب سے حذر ہی بہتر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ عنقریب خاں صاحب یہی گنگناتے نظر آئیں گے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

ایک چوک ہمارے لندن والے الطاف بھائی سے بھی ہو گئی جنھوں نے ''ایویں خوامخواہ'' بھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈال دیا۔اُنھوں نے جوشِ خطابت میں تحریکِ انصاف کے دھرنوں کے بارے میں انتہائی غیر پارلیمانی اور ناشائستہ زبان استعمال کی اور جوابِ آں غزل کے طور پر عمران خاں صاحب نے ایسے ''غیر پارلیمانی'' چھکے مارے کہ ایم کیو ایم کے ہاتھوں کے طوطے اُڑے ہی نہیں بلکہ ''پھُر'' ہو گئے۔حیدر عباس رضوی صاحب کچھ سنبھالا دینے کی کوشش کرتے ہوئے غیر ملکی اخبارات کے ایسے پلندے اُٹھالائے جن میں کپتان صاحب کی ذاتی زندگی کے بارے میں (جھوٹے سچّے) انکشافات کیے گئے تھے۔گویا بات اب سیاست سے نکل کر ذاتیات پر آ گئی جو انتہائی افسوسناک البتہ نواز لیگ اور میڈیا کے لیے خوش خبری کہ ایم کیو ایم اور تحریکِ انصاف باہم گتھم گتھا ہونے کی بنا پر نواز لیگ کو سکون کہ کچھ لمحے میسر آ جائیں گے اور میڈیا خوش کہ اُن کے ہاتھ ایک ایسا ''چٹ پٹا'' موضوع آ گیا جسے اب وہ کئی دنوں تک ''رگڑا'' دیں گے۔

بات پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں کمی سے شروع ہوئی لیکن پتہ نہیں کہاں سے کہاں جا پہنچی ۔آمدم بَر سرِ مطلب ہم تو اپنے وزیرِ اعظم صاحب سے یہی عرض کریں گے کہ وہ اِس قسم کے ''چھاپے'' خادمِ اعلیٰ پر چھوڑ دیں کیونکہ ''جس کا کام ،اُسی کو ساجھے'' اور خود مفلسی کے ہاتھوں تنگ قوم کی فلاح کے لیے کوئی ایسا لائحہ عمل بنائیں جس سے پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں نمایاں کمی

کا براہِ راست فائدہ عوام تک پہنچے۔باوجودیکہ یہ کمی عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں کمی کی وجہ سے ہوئی لیکن اُتنی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔جب عالمی منڈی میں خام تیل 115 ڈالرفی بیرل تھاتب ملک میں پٹرول 108 روپے لیٹر تھا۔اب عالمی منڈی میں پٹرول 47 ڈالرفی بیرل ہے اوراس لحاظ سے توپاکستان میں 50 روپے فی لیٹر سے بھی کم ہوناچاہیے لیکن یہ 70.30 روپے فی لیٹر ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چارماہ میں پٹرول کی قیمت میں 34 روپے کی کمی بھی غنیمت ہے لیکن اِس کمی کے اثرات عوام تک نہیں پہنچے۔سبزیوں کی قیمت میں نمایاں کمی نئی فصل کی منڈیوں میں آمدکی وجہ سے ہے اورباقی اشیائے خوردونوش میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں کمی کاٹرانسپورٹر مافیانے سِرے سے کوئی اثرہی نہیں لیا۔اگرکسی نے کمی کی بھی تومحض آٹے میں نمک کے برابر۔کراچی کے ٹرانسپورٹر تونہ صرف کرائے کم نہیں کرتے بلکہ حکومت کو ''ٹھینگا'' بھی لگاتے ہیں۔کیاحکومت بے خبرہے کہ ٹرانسپورٹر اپنی گاڑیوں کے کرائے ڈیزل کے ریٹ کے مطابق طے کرواتے ہیں اورگاڑیاں سی این جی پرچلاتے ہیں جو اب بھی ڈیزل سے کہیں کم قیمت پر دستیاب ہے۔پاکستان میں چلنے والی 90 فیصدسے زائد پبلک ٹرانسپورٹ سی این جی پرہی چلتی ہے جس کی وجہ سے اِس نعمت سے استفادہ ناممکن ہوچلاہے۔آخراس میں قباحت ہی کیاہے کہ ملک میں چلنے والی تمام پبلک ٹرانسپورٹ کے لیے حکماََسی این جی بندکردی جائے اوراگر حکومت اپنے تئیں اتنی ہمت نہیں پاتی توکرائے

سی این جی ریٹس کے مطابق طے کیے جائیں تاکہ عوام کو کچھ تو فائدہ پہنچے۔

ریٹنگ کا سوال ہے بابا

محترم مجیب الرحمٰن شامی کو پتہ نہیں کیا سوجھی کہ اُنھوں نے ’’ ویلنٹائن ڈے‘‘ پر رائل پام میں CPNE کی تقریب منعقد کرڈالی جس کے مہمانِ خصوصی وزیرِاعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف تھے۔اُدھر عاشقان سڑکوں پر گلاب کے پھول ہاتھوں میں لیے قطاراندر قطار کھڑے ’’ایک محبت کا سوال ہے بابا‘‘کہہ کر کسی حسینہ دلنواز سے تھپڑ کھا رہے تھے اور کسی سے گالیاں سُن کر بھی بدمزہ نہیں ہو رہے تھے اور اِدھر وزیرِاعظم صاحب صحافیوں سے ’’ہتھ ہولا رکھنے‘‘کا تقاضہ کر رہے تھے۔یہ شاید ویلنٹائن ڈے کا اثر تھا کہ وزیرِاعظم صاحب کا انداز بھی کچھ کچھ عاشقانہ ہی تھا۔صحافی ’’محبوباؤں‘‘کے جھرمٹ میں وزیرِاعظم صاحب سنبھل سنبھل کے کچھ یوں کہتے نظر آئے کہ

یہ کیسا دستورِ زباں بندی ہے تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

وزیرِاعظم صاحب کو احساس تھا کہ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے چند تلخ جملے بھی رائی کا پہاڑ بنا دیں گے اور نیوز چینلز پر ’’ہاہاکار‘‘مچ جائے گی۔یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے صحافیوں کو ایسے ہی مخاطب کیا جیسے کوئی عاشقِ صادق اپنی محبوبہ

دِلنواز کو اپنے دِل کا حال بیان کر رہا ہو۔یوں تو میاں صاحب کی تقریر کا لُبِ لباب ''رکھ دیا قدموں میں دِل نذرانہ، قبول کرلو'' ہی تھا لیکن اُنہوں نے کچھ گلے شکوے بھی کیے کے لیے اسلام آباد میں قطعۂ زمین دینےCPNE اور چھیڑ چھاڑ بھی۔اُنہوں نے جہاں کا وعدہ کیا اور پانچ کروڑ روپے کی امداد بھی، وہیں میڈیا ہاؤسز کے کردار پر ہلکی پھلکی تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ دھرنوں کے موقعے پر میڈیا کا کردار قابلِ ستائش نہیں تھا ۔اُنہوں نے کہا پرویز مشرف نے جب منتخب جمہوری حکومت کا تختہ اُلٹا تو کچھ صحافی اِس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اِس آئین شکنی پر پرویز مشرف کو سپریم کورٹ کی طرف سے ملنے والی آئینی ترمیم کا حق ملنے کی کھلی حمایت کی ۔انتہا پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے اُنہوں نے کہا ''میڈیا کم از کم دو سال کے لیے اپنی ریٹنگ بھول جائے۔ نیشنل ایکشن پلان پر جس طرح ملک کی تمام سیاسی جماعتیں متفق ہوئی ہیں اور مسلح افواج جس طرح اِس کا حصّہ ہیں اسی طرح میڈیا کو بھی اِس پلان کا حصّہ ہونا چاہیے''۔وزیرِ اعظم صاحب تو دلی درد کے ساتھ یہ ساری باتیں کہہ رہے تھے لیکن ہمیں یقین ہے کہ میڈیا ہاؤسز پر اس کا ''کَکھ'' اثر نہیں ہونے والا کیونکہ ''ریٹنگ کا سوال ہے بابا''۔اگر میڈیا ہاؤسز اپنی ریٹنگ بھلا کر دہشت گردی کے خلاف حکومت اور فوج کی طرح ایک صفحے پر ہو جائیں تو اُن کا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا اور اینکر اور اینکرنیاں'' سڑکوں پر مونگ پھلی بیچتی نظر آئیں گی۔اس لیے کہے دیتے ہیں کہ'' وزیرِ اعظم صاحب

کو اس معاملے میں تو مایوسی ہی ہو گی اور بالآخر انہیں کہنا ہی پڑے گا کہ

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سَر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ہمارے آزاد اور بے باک میڈیا کا تو یہ عالم ہے کہ اُن کے نزدیک تو "خبر" وہی ہوتی ہے جس میں ریٹنگ ہو۔ اگر ریٹنگ ذوالفقار مرزا جیسے شخص کی وجہ سے بڑھتی ہے تو میڈیا حاضر اور قدم بوس۔ ایک موقع ایسا بھی تھا جب سارا میڈیا ذوالفقار مرزا کے پیچھے تھا اور مرزا صاحب نخرے دکھا رہے تھے۔ آج میڈیا بھی وہی اور ذوالفقار مرزا بھی وہی لیکن اب اُن کے "رخِ روشن" کی ایک جھلک بھی ٹی وی سکرین پر نظر نہیں آتی۔ لال حویلی والے شیخ رشید میڈیا ہاؤسز کی اسی لیے "جِندجان" ہیں کہ اُن کی "بے باک" گفتگو سے ریٹنگ بڑھتی ہے۔ ایک زمانے میں وینا ملک بھی نیوز چینلز کی محبوب ترین ہستی ہوا کرتی تھی۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وینا ملک انڈیا میں بیٹھ کر پاکستان کی بدنامی کا باعث بن رہی تھی۔ اُدھر وینا ملک نے شادی کی اور اِدھر وہ نیوز چینلز کی خبروں سے آؤٹ۔ ویسے ہمارے نیوز چینلز اب ریٹنگ کے معاملے میں بھی خود کفیل ہوتے جا رہے ہیں۔ چینلز پر اب ایسے اینکرز کی بھرمار ہے جو نہ صرف اپنے آپ کو "بزرجمہر" سمجھتے ہیں بلکہ اپنی "خوش اخلاقی" میں شیخ رشید صاحب جیسوں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ آقا ﷺ کا تو فرمان یہ ہے کہ جب کوئی بات کر رہا ہو تو

اُسے اپنی بات مکمل کر لینے دو، درمیان میں مَت ٹوکو لیکن ہمارے اینکرز تو مہمان کی بات مکمل ہونے سے پہلے کئی کئی بار درمیان میں ''پھُدکتے'' رہتے ہیں کیونکہ اُن کے خیال میں اِس سے ریٹنگ بڑھتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ناظرین اب ایسے اینکرز سے ''اوازار'' ہوتے جا رہے ہیں جو ''پھُدکنے'' کے مرض میں مبتلاء ہیں۔ سب سے پہلے خبر نشر کرنے کا جنون بھی سَر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ہر نیوز چینل ایک ہی وقت میں اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ چیخ رہا ہوتا ہے کہ سب سے پہلے خبر اُسی نے نشر کی۔ سانحہ پشاور ہو یا بلدیہ ٹاؤن، خبر یہ نہیں کہ کتنے گھروں میں صفِ ماتم بچھی اور کتنے معصوموں کے سَروں سے مَوجِ خوں گزر گئی۔ خبر یہ ہے کہ کِس چینل نے سب سے پہلے خبر نشر کی۔ ریٹنگ بڑھانے کا ایک ذریعہ نیوز چینلز کے مزاحیہ پروگرام بھی ہیں۔ یہ ایسے پروگرام ہوتے ہیں جن میں ہزل گوئی، پھکڑپَن اور ذومعنی جملوں کی بھرمار کے ساتھ پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں۔ ایسے پروگراموں پر سٹیج فنکار قابض ہیں اور اِن میں وہی کچھ نظر آتا ہے جو سٹیج ڈراموں میں نظر آتا ہے، جسے شرفاء نے کبھی پسند نہیں کیا۔ سٹیج ڈرامے تو ایک محدود طبقہ ہی پسند کرتا ہے لیکن اب تو الیکٹرانک میڈیا کی بدولت گھر گھر میں سٹیج ڈرامے نظر آتے ہیں۔ تقریباً تمام نیوز چینلز اِس مرضِ بد میں مبتلاء ہو چکے ہیں لیکن کیا کریں ''ریٹنگ کا سوال ہے بابا''۔

پرویز مشرف نے اپنے دَورِ آمریت میں پتہ نہیں کِس ''ایجنڈے'' کے تحت الیکٹرانک

میڈیا کو پروان چڑھایا اور پھر وہ اتنا ''چڑھ'' گیا کہ خود پرویز مشرف کے قابو میں بھی نہ رہا۔ جمہوری ملکوں میں میڈیا آزاد ہی ہوا کرتا ہے اور بے باک بھی لیکن جتنی آزادی اور بے باکی ہمارے ہاں پائی جاتی ہے اُتنی شاید دُنیا کے کسی بھی جمہوری ملک میں نہیں ہوگی۔ آج وزیرِ اعظم صاحب کہہ رہے ہیں کہ میڈیا اپنا ''ضابطۂ اخلاق'' خود تیار کرے لیکن کیا ضابطۂ اخلاق کے بغیر ہی میڈیا ''سَرپَٹ'' ہے؟۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر پیمرا نامی ایک ادارہ بھی ہوا کرتا تھا، اُس کا کیا بنا؟۔ ہمارے ٹھنڈے ٹھار وزیرِ اطلاعات جناب پرویز رشید تو اپنی بے بسی کا ہر وقت رونا روتے رہتے ہیں اور یہ بھی غالباً اُنہی کا فرمان ہے کہ پیمرا کا تو کیبل آپریٹرز پر بھی زور نہیں چلتا، میڈیا ہاؤسز پر کیا خاک چلے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ میڈیا ہاؤسز کے لیے ضابطۂ اخلاق بھی حکومت کو خود ہی تیار کرنا پڑے گا اور اُس پر عمل درآمد کے لیے پیمرا کو مضبوط اور فعال کرنے کی ذمہ داری بھی حکومت کی ہی ہے کیونکہ نیوز چینلز مالکان تو محض کاروبار کر رہے ہیں اور اُنہیں اپنا کاروبار چمکانے کے لیے قومی و ملّی یکجہتی نہیں، ریٹنگ کی ضرورت ہے۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں

ہم ایسی بینظیر قوم ہیں کہ جس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ہم نتیجہ تو ہمیشہ اپنی مرضی کا چاہتے ہیں لیکن عمل سے ہمیشہ غافل ہی رہتے ہیں۔شاید عمل ہماری سرشت میں سرے سے شامل ہی نہیں البتہ یہ یقینِ محکم ضرور کہ فتح ہمارا ہی مقدر بنے گی۔جب نتیجہ ہماری مرضی کے مطابق نہیں نکلتا تو ہم اسے ''مقدر کا لکھا'' سمجھ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ہم عالمِ دیں تو نہیں لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ بقول اقبال

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اِس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

لیکن کیا کیجئے کہ یہاں تو پوری قوم ہی تقدیر کی زندانی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ آسمان سے فرشتے اُن کی مدد کو اتریں گے اور وہ کامران ٹھہرے گی۔ گزری اتوار پاکستان اور بھارت کا کرکٹ میچ تھا۔پورا لاہور سنسان اور ''گلیاں ہو جان سونجیاں ، وچ مرزا یار پھرے'' کی عملی تصویر۔پوری قوم ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے یہ دیکھنے کے لیے بیتاب کہ کب دِلی کے لال قلعے پر سبز ہلالی پرچم لہراتا ہے۔الیکٹرانک میڈیا کئی دنوں سے پاکستانی شاہینوں کے جھپٹنے ، پلٹنے

کی نوید سناتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا

پُر دم ہے اگر تُو تو نہیں خطرہ افتاد

قوم کو فتح کا اتنا یقین کہ ہر کسی کی زبان پر ’’تُم جیتو یا ہارو، ہمیں تُم سے پیار ہے‘‘۔ ہوا مگر یہ کہ بھارت نے ہمارے شاہینوں کی وہ ’’دھلائی‘‘ کی کہ شاہین کَرگس بن گئے اور وہی الیکٹرانک میڈیا جو پیار بھرے نغمے گا رہا تھا ایسا طوطا چشم نکلا کہ فوراََ ہی یہ کہنے پر اُتر آیا

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں

اُسے کیا خبر کہ کیا ہے راہ و رسمِ شاہبازی

ہندوستانی الیکٹرانک میڈیا نے جب طنز کے تیروں کی بوچھاڑ کر دی تو شرمندہ شرمندہ سے سکندر بخت کو یہ کہنا پڑا ’’پکچر ابھی باقی ہے میرے دوست‘‘۔ پکچر تو واقعی ابھی باقی تھی اور ہمارا ایمان بھی متزلزل نہیں ہوا تھا کیونکہ ہر طرف یہی شور تھا کہ میچ فِکس‘‘ تھا۔ کسی نے بے پَر کی یہ بھی اُڑا ڈالی کہ بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی نے ’’ وزیرِ اعظم پاکستان کو فون ہی انڈین ٹیم کی لاج رکھنے کے لیے کیا تھا۔ کسی نے یہ کہا کہ جتنی دیر تک سِری نواسن آئی سی سی کا صدر رہے، پاکستان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہے گا تو کسی نے اسے ’’بِگ تھری‘‘ کا

کارنامہ قرار دیا لیکن یہ سوچا تک نہ گیا کہ جب ورلڈ کپ کی تاریخ کے معمر ترین کپتان کی سربراہی میں ٹیم میدان میں اُترے گی تو پھر ''اِس طرح تو ہوتا ہے ،اس طرح کے کاموں میں''۔ ہمارے ''ٹُک ٹُک مصباح'' کے بارے میں مشہور ہے کہ جس میچ میں وہ نصف سینچری سکور کر لیں وہ میچ پاکستان لازمی ہار جاتا ہے۔اس میچ میں بھی مصباح نے ٹُک ٹُک کرتے 76 رنز بنا لیے اور پاکستان میچ ہار گیا، گویا ''گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے''۔

چونکہ بقول سکندر بخت پکچر ابھی باقی تھی اس لیے ہم نے بھی اپنے عزمِ صمیم کو ''مہمیز'' دی اور ایک دفعہ پھر ویسٹ انڈیز کے خلاف ہونے والے میچ کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ ویسٹ انڈیز میں تو کوئی ''لال قلعہ'' بھی نہیں جس کے چھِن جانے کے خوف سے لرزہ بَراندام ویسٹ انڈیز کا سربراہ ہمارے وزیرِاعظم کو درخواست کرے گا۔اب سری نواسن کا خوف تھا نہ بِگ تھری کا اِس لیے یہ میچ تو ہم آسانی سے جیت جائیں گے۔ ہمارے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ ویسٹ انڈیز تو ورلڈ کپ کی کمزور ترین ٹیم آئرلینڈ سے بھی ہار چکا ہے اِس لیے وہ بھلا ہمارے شاہینوں''کا کیا مقابلہ کرے گا لیکن ہمارے بوڑھے شاہین ٹُک ٹُک مصباح نے یہ کہہ'' کر ہمیں ڈرا دیا کہ ''ہماری ٹیم میں ایسے کھلاڑی ہیں کہ جس دِن یہ کھلاڑی پَرفارم کر گئے، وہ دِن ہمارا ہوگا''۔ مصباح کے اِس بیان کے بعد ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر ہماری ٹیم ورلڈ کَپ کے آخری میچ تک بھی

پَرفارم نہ کر سکی تو پھر ہمارا کیا بنے گا؟۔جب میں نے یہی بات اپنی ایک دوست سے کہی تواُس نے کہا''فکر نہ کرو، ورلڈکَپ ہماراہی ہے''۔میں نے حیرت سے پوچھا وہ کیسے ؟۔ اُس نے کہا''1992 ء کے ورلڈکَپ میں بھی اسی طرح سے پاکستانی ٹیم کی دُھلائی اور دھنائی ہورہی تھی لیکن ہم پھر بھی ورلڈکَپ جیت گئے کیونکہ یہ کَپ ہمارے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔اب بھی وہی کچھ ہورہاہے اور جگہ بھی وہی اِس لیے مجھے یقین ہے کہ پاکستان ''جِتے ای جِتے''۔ہم پریشان تھے کہ اگرواقعی کوئی ایسا معجزہ رونما ہوگیا توکہیں ایسانہ ہوکہ ہمارے ٹُک ٹُک مصباح بھی وزارتِ عظمیٰ کے مضبوط ترین اُمیدوار بن کر سامنے آجائیں ۔میاں برادران کی توایک کپتان کو بھگتے بھگتے کمر دوہری ہو چلی ہے ،اگر دوسرا کپتان بھی میدانِ سیاست میں کود پڑاتو پھر میاں برادران کاکیا بنے گا؟۔ویسے ہمیں یقین ہے کہ ایسا ہونے والانہیں کیونکہ ہم نے دینِ مبیں کے عین مطابق اپنے گھوڑے تیار رکھنے کی بجائے ''خچروں'' کومیدان میں اتارا ہواہے جس کا نتیجہ تووہی ہونا تھا جوہمارے سامنے ہے۔جَو کاشت کرکے گندم کی اُمید رکھنا احمقوں کی جنت میں بسنے کے مترادف ہے لیکن کیا کیجئے کہ ہم توایسے ہی ہیں۔

لیجئے ! پاکستان ویسٹ انڈیز سے بھی 150 رنز سے ہارگیااورالیکٹرانک میڈیا پھر چیخنے لگاکہ ''پاکستانی کرکٹ ٹیم کے شیر ،کرائسٹ چرچ میں ڈھیر''۔یہ

بجاکہ یہ شکست بھی ذلت آمیز ہے لیکن ہمیں خوشی ہے کہ پاکستانی شاہینوں نے ایک ورلڈ ریکارڈ'' اپنے نام کرلیا۔ ہوا یوں کہ جب ہمارے شاہینوں کو یقین ہوگیا کہ وہ'' کسی صورت میں بھی 311 رنز کا پہاڑ عبور نہیں کر سکتے تواُنھوں نے ایک ایسی چال چلی کہ دنیا نگشت بدنداں رہ گئی۔ ہمارے شاہینوں نے صرف ایک سکور کے عوض اپنے 4 کھلاڑی آؤٹ کرواکر وَن ڈے کی تاریخ کاایسا ریکارڈ قائم کیا جسے رہتی دنیا تک نہیں توڑا جاسکے گا۔ ہمارے شاہین بہت جھڑ کے پتوں کی طرح ایک ایک کرکے جھڑتے اور کالے ''ڈانس کرتے رہے۔ اِس ہار کے بعد تو سکندر بخت نے بھی نہیں کہا کہ ''پکچر ابھی باقی ہے میرے دوست''۔ شاید اُنہیں بھی یقین ہو چلا ہے کہ ''اِن تلوں میں تیل نہیں''۔ اِس لیے بہتر یہی ہے کہ ورلڈ کَپ میں فتح کے خواب دیکھنے کی بجائے ہم اپنی روزمرہ زندگی کی طرف لوٹ آئیں اور ''شاہینوں'' کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں لیکن اعتزازاحسن کہہ رہے تھے کہ کھیل میں ہارجیت ہوتی رہتی ہے، یہ ہمارے بچے ہیں، ہمیں اِن پر تنقید کرنے کی بجائے اِن کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور اپنا رویہ یہ رکھنا چاہیے کہ

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

بجا، بالکل بجا سوال مگر یہ ہے کہ اگر وہ لڑ کر ہارے ہوتے تو ہم بھی کہتے کہ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں، لیکن وہ تو راہ و رسمِ شاہبازی سرے سے

بھول چکے ہیں، اُن کی حوصلہ افزائی کیوں کر کی جا سکتی ہے۔

ہارس ٹریڈنگ

آجکل پورا ملک گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے گونج رہا ہے۔پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ سیاسی جماعتوں میں بھی ”گھوڑے“ ہی زیرِ بحث ہیں اور ہم لکھاریوں کے ہاتھ ایک ایسا ”چٹ پٹا“ موضوع لگ گیا ہے جس پر اب ڈھیروں ڈھیر کالم لکھے جاتے رہیں گے ۔ ہارس ٹریڈنگ پر تو ہم بعد میں بات کریں گے پہلے ذرا گدھوں کی بپتا سُن لیجئے جن کی قصابوں کے ہاتھوں شامت آئی ہوئی ہے۔ہر روز کہیں نہ کہیں سے گدھے کا گوشت برآمد کرکے قصابوں کو ”وقفِ مصیبت“ کیا جارہا ہے جو ہمارے نزدیک بہت زیادتی ہے کیونکہ قوم ٹھہری گوشت خوراور پاکستان میں ”گدھوں“ کی کمی نہیں۔گدھوں کے گوشت پرزیادہ سے زیادہ یہی الزام دھرا جاسکتا ہے کہ یہ گوشت حرام ہے لیکن ”حرام خوری“ تو ہماری نَس نَس میں سما چکی ہے اِس لیے اگرپاکستان میں استعمال ہونے والی دیگر بہت سی حرام چیزوں میں گدھا بھی شامل کرلیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔گدھے کے گوشت کو حلال قرار دلوانے کے لیے ہمارے ذہن میں کچھ تجاویز آئی ہیں جنہیں ہم اپنے قارئین سے ”شیئر“ کررہے ہیں۔پہلی تجویز یہ کہ سیکولر دوستوں سے مشورے کے ساتھ حکومت کو یہ تجویز دی جاسکتی ہے کہ وہ ”حکومتی مفتیوں“ سے فتویٰ لے کرگدھے کو بھی حلال جانوروں میں شمار کرلے ۔اگر حکومت لیت ولعل سے کام لے تواُس کے خلاف جلوس نکالا اور دھرنا دیا جاسکتا ہے۔اگرایسا ممکن نہ ہو تو

نظریۂ ضرورت''کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ ایسی آئینی راہ ہے جسے جب
جہاں اور جیسے جی چاہے استعمال کیا جاسکتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ نظریۂ ضرورت،
صرف پاکستان میں ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔اگرکچھ بھی بَن نہ پڑے تو سید شریف الدین
پیرزادہ کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی آئینی راہ
نکال کر گدھے کو حلال قرار دلوا ہی دیں گے۔

ہم گدھوں کی حمایت میں یہ ''بھرپور'' دلائل محض اِس لیے دے رہے ہیں کہ ایک
طرف تو''گھوڑوں''کے نخرے اٹھائے جارہے ہیں اور دوسری طرف اِس شریف جانور کا
ہر جگہ استحصال ہو رہا ہے جبکہ بنیادی طور پر گدھے ،گھوڑے میں کوئی فرق نہیں بلکہ ہم
تو سمجھتے ہیں کہ گدھا گھوڑے سے کہیں زیادہ مفید جانور ہے۔وہ گھوڑے سے سو گُنا زیادہ
کام انتہائی شریفانہ انداز میں کرتا رہتا ہے اور کبھی اُف تک نہیں کرتا البتہ کبھی
کبھار احتجاجی ''دولتی''ضرور جھاڑ دیتا ہے لیکن اُس کی شرافت کی انتہا دیکھیں کہ وہ تھوڑی
ہی دیر میں اپنی ''احتجاجی دولتی'' بھول کر کام میں جُت جاتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اُسے
یاد ہی نہیں رہتا کہ کبھی اُس کی انانیت بھی جاگی تھی۔کچھ بزرجمہر یقیناً یہ اعتراض کریں
گے کہ گدھا قدکاٹھ میں گھوڑے سے کہیں کمتر ہے لیکن شاید ایسے بزرجمہروں کو
سمجھانے کے لیے ہی شیخ سعدی نے کہا تھا''ہر کہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتراست''۔یعنی
جس کا قد چھوٹا،اُس کی قیمت زیادہ البتہ ہمارے ہاں معاملہ اُلٹ ہے۔اگر کسی سے

سوال کیا جائے کہ ایسا کیوں ہے تو کثرت جواب آتا ہے کہ گھوڑے کا تعلق ''طبقۂ اشرافیہ'' سے ہے جبکہ گدھا ''کمی کمین''۔ گدھے کی اسی شرافت کو ''بیوقوفی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے حالانکہ آج تک کبھی کسی نے گدھے کی کوئی بیوقوفی نہیں پکڑی۔ جبکہ دوسری طرف گھوڑے کے تو نخرے ہی نہیں مان کے۔ اُس کی ''تہل تواضع ''میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جاتی پھر بھی وہ جب جی چاہے '' لوٹا'' بَن جاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو خیبر پختونخواہ اور فاٹا میں جا کر بچشمِ خود مشاہدہ کر لیجئے جہاں اِن کے ریٹس دو کروڑ سے بڑھ کر پانچ کروڑ تک جا پہنچے ہیں۔ اگر ہمارے ملک میں ہارس ٹریڈنگ کی بجائے ''ڈونکی ٹریڈنگ'' کا رواج ہوتا تو ایک تو گدھوں کی عزتِ نفس مجروح نہ ہوتی اور دوسرے گھوڑوں سے کہیں کم قیمت پر دستیاب ہوتے۔

ہمارے مُرشد ڈاکٹر طاہر القادری کہتے ہیں کہ نواز لیگ نے ''گھوڑوں'' کی خریداری پر بارہ ارب روپے صرف کر دیئے ہیں۔ مُرشد اگر کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے اور یقیناً یہ اُن الہامی کیفییات کا اثر ہوگا جو گاہے بگاہے اُن پر وارد ہوتی رہتی ہیں۔ انہی الہامی کیفییات کے زیرِ اثر اُنہیں سات سمندر پار بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ نواز لیگ نے بارہ ارب روپے گھوڑوں پر صرف کر دیئے اور اب ہارس ٹریڈنگ روکنے کے لیے محض ڈرامے رچا رہی ہے۔ وزیرِ اعظم صاحب کی زیرِ صدارت وفاقی کابینہ کے اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ ہارس ٹریڈنگ روکنے کے

لیے آئینی ترمیم لائی جائے۔اِس آئینی ترمیم کے لیے سیاسی جماعتوں سے رابطے کرنے کے لیے دو کمیٹیاں قائم کی گئیں۔وزیرِاطلاعات جناب پرویزرشید کہتے ہیں کہ ’’ 5 مارچ سے قبل 22 ویں آئینی ترمیم کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔عمران خاں اپنی انا چھوڑیں اورپارلیمنٹ میں آکر ہارس ٹریڈنگ کے خاتمے کے لیے اپنا کردار
ادا کریں‘‘۔ہم اسے نون لیگی ڈرامہ سمجھتے ہیں کیونکہ الیکشن کمیشن نے واضح طورپر کہہ دیاہے کہ اگرسینٹ کے انتخابات مؤخر ہوئے توسینٹ تحلیل ہوجائے گی اوراگرآئینی ترمیم لائی گئی تواِس کااطلاق سینٹ کے موجودہ انتخابات پر نہیں ہوگا کیونکہ شیڈول جاری ہوچکاہے اوراب انتخابی عمل تبدیل نہیں ہوسکتا۔گویااگرحکومت 5 مارچ تک آئینی ترمیم لے بھی آتی ہے توپھر بھی ’’گھوڑے‘‘ بکتے ہی رہیں گے کیونکہ اِس ترمیم کاآمدہ سینٹ الیکشن پر ’’کَکھ‘‘اثر نہیں ہونے والا۔
اُدھر کپتان صاحب بھی پریشان کہ اُن کے کئی گھوڑےاِدھراُدھر ہوگئے ہیں جن کی تلاش جاری ہے لیکن وہ ’’چمک‘‘ دیکھ کرایسے سَرپَٹ ہوئے کہ اب ہاتھ آنے مشکل ہیں ۔بچے کھچے گھوڑوں کے گرد وزیرِاعلیٰ پرویزخٹک ’’کُنڈلی‘‘ مار کربیٹھ گئے ہیں کیونکہ خاں صاحب نے صاف کہہ دیاہے کہ اب اگر کوئی گھوڑااِدھراُدھر کھسکا توخٹک صاحب کی خیر نہیں۔ تحریکِ انصاف میں نَووارد سابق گورنر پنجاب چودھری سرورنے بھی تحریکی گھوڑوں کے سَرپَٹ ہونے پر کہہ دیاکہ

تحریکِ انصاف کو بیرونی نہیں اندرونی خطرہ ہے۔چودھری صاحب نے نواز لیگ کو اُس وقت ''داغِ مفارقت'' دیا جب نواز لیگ شاید اپنی سیاسی زندگی میں پہلی بار اسٹیبلشمنٹ کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط نظر آتی ہے اور تحریکِ انصاف اندرونی ٹوٹ پُھوٹ کا شکار۔ چودھری صاحب اچھے بھلے عقیل و فہیم سیاستدان ہیں،اُنہوں نے ایسے وقت میں جب تحریکِ انصاف اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے تحریک میں شمولیت اختیار کرکے ہمیں شک میں بتلاء کر دیا ہے اوراب ہم دور کی کوڑی لاتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ چودھری صاحب گئے نہیں، بھیجے گئے ہیں ۔ وہ اب تحریکِ انصاف میں بیٹھ کر نواز لیگ کے لیے وہی کام کریں گے جو نجم سیٹھی صاحب کی ''چڑیا''اُن کے لیے کرتی ہے ۔اِس لیے اکابرینِ تحریکِ انصاف کو کہے دیتے ہیں کہ ذرا بچ کے''۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کلاں چودھری صاحب ''باغی'' ہو جائیں اور شاہ محمود قریشی صاحب کا حلق داغی داغی کے نعرے لگاتے خشک ہو جائے۔

بکاؤمال

ہارس ٹریڈنگ توہماری جمہوریت کاجزِولاینفک ہے۔کیامزہ ایسی سیاست میں جس میں کوئی ''لوٹا'' ہو نہ ''بکاؤمال''۔ساری رونقیں توانہی کے دَم قدم سے ہیں ،اگر یہ نہ ہوں توہماری سیاست پر جمود طاری ہوجائے اِس لیے کوئی کچھ بھی کہے ،ہم توہارس ٹریڈنگ کے حق میں ہی ہیں ۔حیرت ہے کہ جمہوریت کی روحِ رواں ''ہارس ٹریڈنگ'' کو رواج دینے والے ہی آج اِس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں ۔شاید وہ 1989ء کاوہ دَور بھول چکے جب ہارس ٹریڈنگ کاشور اُٹھا،میاں صاحب اپنے اراکین کو چھانگامانگا لے گئے اوربی بی شہید اپنے اراکین کوجہازوں میں بھرکے سوات جا پہنچیں ۔ تبھی ہارس ٹریڈنگ اور لوٹا کریسی کارواج پڑاجو آج تک جاری وساری ہے ۔نوازلیگ اور تحریکِ انصاف نے اِس خریدوفروخت پر بہت شور مچایااور وزیرِاعظم صاحب نے توپارلیمانی لیڈروں کا اجلاس بھی بلالیا لیکن ''دُکھ'' فائدہ نہ ہوا۔پیپلزپارٹی اورجمعیت علمائے اسلام نے تو ''ٹکاسا'' جواب دے دیااور سوائے تحریکِ انصاف ،جماعت اسلامی اورایم کیوایم کے کسی نے کھُل کر 22ویں ترمیم کی حمایت بھی نہیں کی ۔نوازلیگ بلوچستان میں ''وَخت'' میں پڑی ہوئی ہے ۔بلوچستان کے نوازلیگ سے تعلق رکھنے والے اراکینِ اسمبلی کوغصہ یہ ہے کہ وزیرِاعظم صاحب نے اکثریت رکھنے کے باوجود بلوچستان کی حکومت ڈاکٹر عبد

الممالک کے سپرد کیوں کی۔اب وہ اپنے ووٹ بیچ کر میاں صاحب کو سبق سکھانے کی تگ ودَو میں ہیں۔کچھ ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا خیبر پختونخوا میں ہمارے کپتان صاحب کو ہے۔اُنھوں نے جذبات میں آ کر اسمبلیوں سے استعفے تو دے دیئے لیکن یہ سوچا تک نہیں کہ اِس کا ردِ عمل بھی آ سکتا ہے۔اب صورتِ حال یہ ہے کہ خیبر پختونخوا میں تحریکِ انصاف کے بہت سے گھوڑے اِدھر اُدھر مُنہ مارتے پھِر رہے ہیں اور وزیرِاعلیٰ بے بَس ۔جماعت اسلامی تحریکِ انصاف کے اتحاد سے خیبر پختونخوا میں اپنا ایک سینیٹر منتخب کروا سکتی ہے لیکن ہارس ٹریڈنگ کی صورت میں نتیجہ کیا نکلتا ہے،اللہ جانے یا "گھوڑے"۔

اُدھر شاطرانہ چالیں چلنے کے ماہر محترم آصف زرداری اِس ساری صورتِ حال کا فائدہ اٹھانے کی تگ ودَو میں ہیں۔اُن کے 40 میں سے 21 سینیٹر فارغ ہونے کے باوجود بھی وہ سینٹ کی چیئرمینی چاہتے ہیں۔پیپلز پارٹی کو سندھ سے تو آسانی سے 7 سیٹیں مِل جائیں گی لیکن مرکز سمیت باقی کسی بھی صوبے میں وہ اپنا کوئی بھی سینیٹر منتخب کروانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔اگر وہ کسی نہ کسی طریقے سے مزید تین چار سینیٹر منتخب کروانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر باقی اتحادی جماعتوں کے ساتھ مِل کر وہ سینٹ کی چیئرمینی کی دَوڑ میں شامل ہو سکتی ہے اِس لیے اُسے ہارس ٹریڈنگ ہی راس ہے کیونکہ اِس کے بغیر تو سینٹ کی چیئرمینی محض خواب ہی رہے گی۔اب ہمارے ہی ووٹوں سے منتخب ہونے والے رہنماؤں کی منڈی سج

چکی ۔ ہر ضمیر فروش نے اپنی قیمت اپنی پیشانی پہ لکھ لی ۔انسانوں کی اِس منڈی میں سب سے زیادہ قیمت خیبر پختونخوا، بلوچستان اور فاٹا کے ''گھوڑوں'' کی ہے کیونکہ پنجاب میں نواز لیگ کو قطعی اکثریت حاصل ہے اور سندھ میں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کا الحاق ہونے کے بعد سندھ کی صورتِ حال بھی پنجاب جیسی ہی ہے۔سب سے زیادہ بولی فاٹا کے گھوڑوں کی لگ رہی ہے کیونکہ وہاں صرف تین ووٹوں سے ایک سینیٹر منتخب ہو سکتا ہے ۔ شنید ہے کہ یہ بولی چالیس کروڑ روپے تک پہنچ چکی ہے ۔بلوچستان میں دَس ووٹوں سے ایک سینیٹر منتخب ہوگا اور خیبر پختونخوا میں 14 ووٹوں سے ،اِس لیے ارب پتی انہی علاقوں سے ضمیر فروشوں کی تلاش میں ہیں ۔

ہمارے کپتان صاحب نے تو بہت پہلے سے ہارس ٹریڈنگ کا شور مچانا شروع کر دیا تھا لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی البتہ جب محترم آصف زرداری نے چو مکھی چال چلنا شروع کی تو نواز لیگ کو بھی ہوش آیا اور وزیرِ اعظم صاحب نے ہارس ٹریڈنگ روکنے کے لیے ٹھکٹ سے آل پارٹیز کانفرنس طلب کر لی جس میں تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا ''ووٹ خریدنا ضمیر خریدنے کے مترادف ہے ۔سب کو مل کر سینٹ کے تقدس میں اضافہ کرنا ہوگا اور ضمیر فروشی کے اِس کاروبار کو روکنا ہوگا کیونکہ پیسے دے کر ووٹ خریدنا سب کے لیے بدنامی کا باعث ہے ۔اِس اے پی سی کا نتیجہ یہ نکلا کہ حریف حلیف بن گئے اور حلیف حریف ۔ پیپلز پارٹی،

جو جمہوریت کی بقا کی خاطر نواز لیگ کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی تھی اُس نے 22 ویں ترمیم کے حق میں ووٹ دینے سے صاف انکار کر دیا اور مولانا فضل الرحمٰن جو نواز لیگ کی حکومت کا حصّہ ہیں، نے فرمادیا کہ وہ 21 ویں ترمیم کے ڈسے ہوئے ہیں اور مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا اِس لیے وہ بھی 22 ویں ترمیم کے حق میں ووٹ نہیں دیں گے ۔ مرنجاں مرنج سیّد خورشید شاہ نے کہا ''ہم جان بوجھ کر حکومت کو ''ٹَف ٹائم'' نہیں دیتے لیکن ارکانِ پارلیمنٹ پر چور اور کرپٹ کا الزام لگانا مناسب نہیں''۔ دوسری طرف تحریکِ انصاف ڈٹ کر حکومت کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور یہ عندیہ بھی دے دیا کہ اگر 22 ویں ترمیم کے حق میں ووٹ دینے کے لیے پارلیمنٹ میں بھی آنا پڑا تو آ جائیں گے ۔ ایم کیو ایم نے بھی حکومت کا بھرپور ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔

موجودہ منظر نامے کو مدّ نظر رکھتے ہوئے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہارس ٹریڈنگ کی اصل قصوروار سیاسی جماعتیں ہیں ، گھوڑے نہیں۔ وہ سیاسی جماعت جو ایک سیٹ بھی حاصل نہیں کر سکتی ،اُس نے بھی تین ، تین اُمیدوار کھڑے کیے ہوئے ہیں ۔ پیپلز پارٹی پنجاب ، خیبر پختونخوا اور بلوچستان سے ایک سینیٹر بھی منتخب نہیں کروا سکتی لیکن اُس نے ہر جگہ اپنے امیدوار کھڑے کیے ہوئے ہیں۔اُس کے خیبر پختونخوا میں صرف پانچ اراکینِ اسمبلی ہیں جبکہ ایک سینیٹر کو منتخب کروانے کے لیے 17 اراکینِ اسمبلی کی ضرورت ہے اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اُس

نے وہاں سے بھی تین اُمیدوار کھڑے کیے ہیں۔ پیپلزپارٹی، اے این پی اور عوامی وطن پارٹی، تینوں مِل کر خیبر پختونخواسے بمشکل ایک سینیٹر منتخب کرواسکتی ہیں جبکہ اِن تینوں کے تین، تین اُمیدوار میدان میں ہیں اور اِن سبھی کی رال تحریکِ انصاف کے اراکین پر ٹپک رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کپتان صاحب ہارس ٹریڈنگ کا سب سے زیادہ شور مچا رہے ہیں۔ آفتاب شیرپاؤ صاحب نے سینیٹر وقار اور گلزار کے خاندان کے عمار کو ٹکٹ دے کر میدان میں اتارا ہے۔ آفتاب شیرپاؤ کے پاس صرف 9 ووٹ ہیں باقی 5 ووٹ یہ ارب پتی خاندان خریدنے کی تگ ودَو میں ہے مولانا فضل الرحمٰن کے پاس 17 ووٹ ہیں اور اگر کوئی ووٹ کھسک نہ لیا تو وہ اپنے بھائی مولانا عطاء الرحمٰن کو تو سینیٹر منتخب کرواہی لیں گے لیکن مولانا بھی دو سینیٹرز کے خواہش مند ہیں۔ وزیرِاعظم صاحب نے بالکل بجاکہا کہ ووٹ خریدنا ضمیر خریدنے کے مترادف ہے لیکن جب سیاسی جماعتیں ہی اِس ضمیرفروشی کے دھندے میں ملوث ہوں تو پھر کیا آمریت جمہوریت سے بہتر نہیں؟ ۔اگر نہیں تو پھر ہارس ٹریڈنگ میں حرج ہی کیا ہے۔

کرپشن کا زہر

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

کہتے ہیں کہ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا لیکن ہماری سیاست کے سینے میں تو صرف دِل ہی نہیں غیرت ، حمیت ،انا اور خودداری نامی بھی کوئی چیز نہیں پائی جاتی ۔کرپشن کے ناسور کا موادِبَد قوم کی نَس نَس میں سما چکا ہے جس کی بنا پر شگفتِ بہار کی اُمید دَم توڑتی دکھائی دیتی ہے۔قحط الرجال کا یہ عالم کہ قطار اندر قطار جہلاء کے جلوس اور چند ''گنے چُنے'' عقیل وفہیم ربِّ علیم وخبیر کی ودیعت کردہ دانش کو بروئے کارلانے کی بجائے تضحیک کے ڈر سے خاموش ۔ہم حالتِ جنگ میں ،لیکن وقت کے فرعون اپنی ذات کے گنبد میں گُم ۔پورا ملک دہشت گردوں کے نشانے پر لیکن سینٹ کی ''کھلی منڈی'' میں ''گھوڑوں''کی خرید وفروخت جاری ۔اسی خرید وفروخت سے پریشان ہو کر حکومت نے آئین میں 22 ویں ترمیم کا ڈول ڈالا لیکن پیپلزپارٹی اور جے یو آئی نے صاف انکار کر دیا۔حکومت کے اتحادی مولانا فضل الرحمٰن کی رال ایک آدھا ضافی سینیٹر کے حصول پر ٹپک رہی ہے اور آصف زرداری صاحب ایک بار پھر اپنا چیئرمین سینٹ بنوانے کی تگ ودَو میں دَردَر کے بھکاری بنے نظر آتے ہیں ۔کپتان صاحب سے لاکھ اختلاف کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ کرپشن کے عفریت کے سامنے سینہ تانے کھڑے ہیں۔اِس سارے منظر نامے میں قصور کس کا ہے ؟۔کیا سیاستدانوں کا ؟۔ہر گز نہیں

قصور تو ہمارا اپنا ہے کہ ہم اپنی تقدیر ہمیشہ انہی ہاتھوں میں سونپتے ہیں جو ہم سے زیادہ، کرپٹ ہوں۔جب یہ ہمارے ہی ہاتھوں کے تراشیدہ بُت ہیں تو سوال یہ ہے کہ اگر یہ گھوڑے''ہیں تو پھر ہم کیا ہیں؟۔''

آقا ﷺ کا فرمان ہے ''اللہ جب کسی قوم کو سزا دینا چاہتا ہے تو اُس پر ظالم وجابر حکمران مسلط کردیتا ہے''۔جب ہم من حیث القوم ہی کرپٹ ہیں تو پھر ہمارے ساتھ یہی ہونا تھا جو ہو رہا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ ہم تو وہ سدھائے ہوئے بندر ہیں جو اپنے مفادات کی خاطر ہر صاحبِ مکر وریا کی ڈگڈگی پر ناچتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی ہاتھ کچھ نہیں آتا سوائے رسوائیوں کے۔ربِ لم یزل نے تو ہمیں دنیا جہاں کی نعمتوں سے مالامال کیا ۔سونا اُگلتی زمینیں،آسمان سے باتیں کرتی پہاڑوں کی چوٹیاں،جنت نظیر وادیاں لہلہاتے کھیت اور زمین کے اندر تہ در تہ سونے،تانبے،لوہے،کوئلے،جپسم،کرومائیٹ، سنگِ مَرمَر، تیل اور گیس کے لامحدود ذخائر لیکن لاریب ہم اِن سے مستفید نہیں ہو سکتے، ۔وجہ یقیناً یہ ہے کہ ہم نے رَب کے نام پر زمین کا یہ ٹکڑا حاصل کیا۔قائدِ اعظم نے فرمایا کہ ہمیں زمین کا ایک ایسا ٹکڑا چاہیے جسے ہم اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکیں ۔زمین کا وہ ٹکڑا تو ہمیں مل گیا لیکن ''اسلام کی تجربہ گاہ''کہاں ہے؟۔ہم نے وطنِ عزیز کا نام تو اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھ دیا لیکن یہ اسلامی ہے نہ جمہوری۔اسلام کے نام ہی سے ہمیں چِڑ ہے اور جمہوریت

زورآور کے گھر کی لونڈی اور دَر کی باندی۔ہم نے اپنی زندگیوں سے "رب" کو نکال کر رسوائیوں کو گلے لگا لیا۔حفیظ جالندھری نے کہا تھا

منظور، منظور اے اہلِ دنیا

اللہ میرا، باقی تمہارا

لیکن ہم نے اللہ کو چھوڑ کر باقی سب کو اپنا خُدا مان لیا جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے ۔حکمت کی کتاب کہتی ہے "اے نبیؐ ! اِن سے پوچھو کہ ایک تو وہ ہے جو دَردَر کا بھکاری ہے اور ایک وہ جو صرف ایک دَر پہ جھکا ہے۔بتاؤ اِن دونوں میں سے بہتر کون ہے؟"۔لیکن ہم ایسے نافرمان کہ ایک دَر چھوڑ کر دَردَر کے بھکاری بَن گئے۔اللہ کی نعمتیں ٹھکرانے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔قوم بنی اسرائیل بھی رَب کی محبوب قوم ہوا کرتی تھی اُس پر مَن و سلویٰ اتارا گیا، بادلوں کی چھت تیار کی گئی ،فرعون کو اُس کی سپہ سمیت دریائے نیل میں غرق کیا گیا، لیکن وہ ایسی باغی ،بدبخت اور احسان ناسپاس قوم کہ مَن وسلویٰ کی جگہ ساگ پات کا مطالبہ کر دیا۔ساگ پات کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے اللہ نے اُن کے لیے شہر مسخر کیا اور شہر کے مرکزی دروازے سے داخل ہوتے وقت مخصوص الفاظ کی ادائیگی کا حکم دیا لیکن بنی اسرائیل نے اُن الفاظ کو الٹ کر دیا اور تب اُنہیں ہمیشہ کے لیے بھٹکنے کو چھوڑ دیا گیا۔قُرآنِ مجید میں بنی اسرائیل کا قصہ پڑھتے وقت رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ربّ

لم یزل سے بغاوت کے معاملے میں ہم بھی بنی اسرائیل سے کم نہیں ۔ہمارے بھی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر برملا احکاماتِ ربانی کا مذاق اُڑایا جاتا ہے ۔ہمارے علماء بھی حبِ جاہ کے اسیر ہیں ۔ہمارے مدبر بھی اپنا سارا تدبر اِس امر پر صرف کردیتے ہیں کہ فی زمانہ دینِ مبیں قابلِ عمل نہیں ۔اُنھوں نے ”لبرل اسلام“ کی ایسی اصطلاح گھڑی ہے کہ جس کی آڑ میں وہ دینِ مبیں کا مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں ۔ایسا کرتے ہوئے وہ یکسر بھول جاتے ہیں کہ میرے آقا ﷺ نے یہ گارنٹی دی تھی کہ اگر قرآن و سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھوگے تو قیامت تک گمراہ نہیں ہوگے لیکن ہم تو وہ گارنٹی بھی بھول چکے ۔اب یہی دیکھ لیجئے کہ ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود ہم عالمی دہشت گرد امریکہ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہیں ۔اگر کوئی غیرت کی بات کرے تو ہمارے سیکولر بزرجمہر ”غیرت بریگیڈ“ کا نام دے کر اُس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔یہ ربِّ کردگار سے کھلی بغاوت کا شاخسانہ ہی تو ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ۔چنیوٹ کے علاقے رجوعہ میں کھربوں ڈالر کا لوہا، سونا اور تانبا ملا جس کی مالیت کا تخمینہ ارب ڈالر لگایا جارہا ہے ۔تھر میں دنیا کا چوتھا بڑا کوئلے کا 175 بلین ٹن کا ذخیرہ 2500 جو سعودی عرب اور ایران کے تیل کے مجموعی ذخائر کے برابر ہے ۔جس کی مالیت 25 کھرب ڈالر اور جہاں سے 200 سال تک مسلسل ایک لاکھ میگاواٹ سالانہ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے ۔چاغی کے علاقے ریکوڈک میں معدنی ذخائر 6 ارب ٹن، جن سے 22 ملین پاؤنڈ تانبا اور 13 ملین اونس سونا حاصل ہوسکتا ہے لیکن

کینیڈا کمپنی بیرک گولڈ نے یہ مقدار اِس سے کئی گنا زیادہ بتائی ہے کیونکہ چاغی میں 300 کلومیٹر کے وسیع علاقے میں ایسے ذخائر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بلوچستان میں گوادر ایک ایسی پورٹ ہے جو چین، روس، مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کی باہمی تجارت میں آسانیاں پیدا کر دے گی۔ گوادر پورٹ پاکستان کو نہ صرف مضبوط بلکہ خطے کی سیاست میں انتہائی اہمیت کا حامل ملک بھی بنا سکتی ہے۔ عالمی اندازے تو یہی ہیں کہ اگر ہم اِن قدرتی خزانوں سے استفادہ کرنے کے قابل ہو جائیں تو پاکستان دنیا کا دسواں امیر ترین ملک بن سکتا ہے لیکن ہم تو کشکولِ گدائی تھامے دَر دَر کے بھکاری ہیں اور بھکاری ہی رہیں گے کیونکہ اِن سارے خزانوں کا مالک تو اللہ ہے۔ یہ خزانے ہماری پہنچ سے اُس وقت تک دور ہی رہیں گے جب تک ہم اپنے اقوال، افعال اور اعمال سے یہ ثابت نہیں کرتے کہ ہم صرف اسی کے بندے ہیں جس کے یہ خزانے۔

! واہ مولانا واہ

تحریکِ انصاف نے کہا کہ ہارس ٹریڈنگ روکنے کے لیے اگر پارلیمنٹ میں 22 ویں ترمیم لائی گئی تو اِس ترمیم کے حق میں ووٹ دینے کے لیے پارلیمنٹ میں بھی آ سکتی ہے ۔ تحریک کے اِس بیان کے ساتھ ہی مولانا فضل الرحمٰن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور اُنہوں نے درِزرداری پہ پناہ لینے میں ہی عافیت جانی ۔ دو شاطروں کی یہ ملاقات رنگ لائی اور مولانا کے سَر سے 22 ویں ترمیم کی لٹکتی تلوار ہٹ گئی اور فی الحال یہ طے ہو گیا کہ کھوتوں گھوڑوں کی کھلی منڈی میں خرید و فروخت آئین کے عین مطابق ہے ۔ زرداری صاحب سے ملاقات کے بعد کِھلتی باچھوں کے ساتھ مولانا نے فرمایا کہ کچھ لوگ گائے کی دُم پکڑ کر پارلیمنٹ میں آنا چاہتے ہیں جو ہمیں منظور نہیں ۔ دراصل مولانا یہ کہنا چاہتے تھے کہ تحریکِ انصاف پارلیمنٹ میں آنے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے لیکن وہ ایسا ہونے نہیں دیں گے ۔ مولانا کا فرمان بجا لیکن مولانا خود بھی تو ہمیشہ گائے کی دُم پکڑ کر ہی اقتدار کے ایوانوں میں آتے رہے ہیں اور اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ اِس تاڑ میں رہتے ہیں کہ کب اُنہیں موقع ملے اور وہ اپنی بلیک میلنگ کا آزمودہ نسخہ کیمیا استعمال کر سکیں ۔ اُنہیں اِس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ حکومت پیپلز پارٹی کی ہے ، نواز لیگ کی یا کسی آمر کی ، اُنہیں تو بَس اُس روزن کی تلاش ہوتی ہے

جس میں گھس کر وہ مسندِ اقتدار تک پہنچ سکیں لیکن ہمیشہ مسئلہ یہی آن پڑتا ہے کہ موٹے تازے مولانا اُسی روزن میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ بھولی بھالی جماعت اسلامی کو ایم ایم اے کی صورت میں اپنے جال میں پھانسا، عوام نے بھی امریکہ مخالف ووٹ دینے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا اور ایم ایم اے بڑی شان سے پارلیمنٹ میں پہنچی۔ اُس وقت مولانا وزارتِ عظمیٰ کے گرما گرم اُمیدوار تھے اور اُن کے مُنہ سے اقتدار کی رالیں ٹپکتی صاف دکھائی دیتی تھیں، جنہیں وہ اپنے کندھے پہ پڑے رومال سے صاف کرنے کا تکلف بھی نہیں کرتے تھے۔ اُنھوں نے تو مغربی سفیروں سے خفیہ ملاقاتیں کر کے اُنہیں یہ یقین دلانا بھی شروع کر دیا کہ اگر وزارتِ عظمیٰ کے حصول کے لیے اُن کی مدد کی جائے تو وہ اُن کے خادم بلکہ خادمِ اعلیٰ ثابت ہو سکتے ہیں لیکن بُرا ہو پرویز مشرف کا جس کی نگاہِ انتخاب میر ظفر اللہ جمالی پر جا ٹھہری اور مولانا کے دِل کے ارماں دِل ہی میں رہ گئے۔ دَورِ مشرف میں ساری رسوائیاں جماعت اسلامی کے حصے میں آئیں اور مولانا مرکز میں قائدِ حزبِ اختلاف اور خیبر پختونخوا میں وزارتِ اعلیٰ کے مزے لوٹتے رہے ۔جب پرویز مشرف نے وردی اتارنے کا وعدہ ایفاء نہ کیا اور ایم ایم اے شدید تنقید کا نشانہ بننے لگی تو جماعت اسلامی نے اسمبلیوں سے مستعفی ہو کر سڑکوں پہ آنے کا فیصلہ کیا لیکن اُس کے اتحادی مولانا فضل الرحمٰن نے صاف انکار کر دیا کیونکہ اُن پر تو اقتدار کا نشہ چڑھ چکا تھا۔ جماعت اسلامی مستعفی ہو کر اسمبلیوں سے باہر آ گئی اور مولانا اقتدار کے مزے لوٹتے رہے۔ پیپلز پارٹی

کے دَورِ حکومت میں مولانا پیپلز پارٹی کے اتحادی بن کر اُبھرے اور ایک دفعہ پھر اپنا نسخۂ کیمیا'' استعمال کرنے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ زرداری'' صاحب کی کمزور ترین حکومت اتحادیوں کے ستونوں پر کھڑی ہے اِس لیے جوں ہی اُنہیں موقع ملا وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی چیئرمینی لے اُڑے۔ دوسری دفعہ پھر اُنہوں نے زرداری صاحب کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی لیکن تب تک زرداری صاحب ''قاتل لیگ'' کو اپنے ساتھ ملا چکے تھے اِس لیے اُنہوں نے مولانا کو گھاس نہ ڈالی اور مولانا روٹھ کر زرداری صاحب سے الگ ہوگئے۔

2013ء کے انتخابات سے پہلے مولانا نے نوازلیگ سے ناطہ جوڑ لیا کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اب پیپلز پارٹی کے پلّے ''کَکھ'' نہیں بچا اور اقتدار کے مزے لوٹنے کے لیے نوازلیگ سے بہتر کوئی آپشن نہیں۔ وہی ہوا جس کا مولانا اندازہ لگائے بیٹھے تھے۔ اب مولانا نے مرکز میں وفاقی وزراء اور خیبرپختونخوا کی حکومت کی آس لگالی۔ اُنہوں نے تو خیبرپختونخوا کی حکومت کے حصول کے لیے ''ڈنڈ بیٹھکیں'' بھی لگانا شروع کر دی تھیں لیکن میاں صاحب کے جی میں پتہ نہیں کیا آئی کہ اُنہوں نے تحریکِ انصاف کو حکومت بنانے کا موقع دے دیا۔ مولانا چیختے چلاتے بلکہ چنگھاڑتے رہے کہ وہ نوزلیگ کے ساتھ مل کر آسانی سے خیبرپختونخوا کی حکومت پر ہاتھ صاف کر سکتے ہیں لیکن میاں نواز شریف صاحب پر ''کَکھ'' اثر نہ ہوا۔ خیبرپختونخوا کی حکومت سونامیے لے اُڑے اور مولانا کے سارے خواب چکنا چور ہوگئے۔ تب سے اب تک

وہ ماہر شکاری کی طرح گھات لگائے بیٹھے تھے۔اب جونہی اُنہیں موقع ملا،اُنھوں نے نوازلیگ کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔اب نوازلیگ یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ

دیکھا جو تیر کھاکے کمیں گاہ کی طرف

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

کیونکہ مولانا صاحب کے بارے میں تو سبھی جانتے ہیں کہ وہ ایسے ہی تھے، ہیں اور رہیں گے۔اب صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ حکومتی اتحادی مولانا صاحب اپنے دیرینہ دوست جنابِ آصف زرداری کی بانہوں میں باہیں ڈالے کھڑے ہیں اور نوازلیگ ''وَخت''میں کہ سینٹ کی چیئرمینی ہاتھوں سے کھسکتی دکھائی دے رہی ہے۔پیپلزپارٹی دعویٰ کررہی ہے کہ سینٹ کے الیکشن کے بعد اتحادیوں سے مل کراُس کے پاس 53 ووٹ ہوجائیں گے اوروہ سینٹ کی چیئرمینی لے اُڑے گی۔لطیفہ یہ کہ خیبرپختونخوا میں پیپلزپارٹی کے 5 ووٹ ہیں اوراُس نے پانچ ہی اُمیدوار کھڑے کیے ہیں جبکہ ایک سینیٹرکے انتخاب کے لیے 17 ووٹ درکارہیں اِس کے باوجود پیپلزپارٹی کویقین ہے کہ وہ خیبرپختونخوا میں اپنے 3 سینیٹر منتخب کروانے میں کامیاب ہوجائے گی۔اِن تین سینیٹرکے انتخاب کے لیے یاتو مولاناکی دعاؤں کے زیرِاثرآسمان سے فرشتے ووٹ ڈالنے کے لیے اُتریں گے یاپھر کھوتوں،گھوڑوں کی خریداری کی جائے گی۔اگرکھوتوں گھوڑوں کی خریداری ہوتی

ہے تو پھر یہ یقیناً تحریکِ انصاف کے اصطبل سے ہی رسے تڑوا کر نکلیں گے ۔ اسی لیے ہمارے کپتان صاحب کی بے چینی عروج پر ہے اور ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' کے مصداق کپتان صاحب پریشان۔ دو، چار روز پہلے تک تو گیم اُن کے ہاتھ میں تھی ۔ وہ پرویز خٹک صاحب کو ''قائل'' کرکے خیبر پختونخوا اسمبلی توڑ دیتے اور پھر قہقہے لگاتے ہوئے کہتے کہ ''کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے''لیکن اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔ شاید وجہ یہ ہو کہ وہ میدانِ سیاست کے نَو وارد اور نَوآموز ہیں اور ابھی مولانا فضل الرحمن اور آصف زرداری صاحب کی طرح شاطرانہ چالیں چلنے کے ماہر نہیں ہوئے ۔ ویسے بھی اب یہ حربہ تو ناقابلِ استعمال ہو چکا کیونکہ کل تو سینٹ کے الیکشن ہیں۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

15 مارچ کو میری بیٹی کی رخصتی تھی جس کی بناپر دو ہفتے پہلے ہی کالم لکھنا چھوڑ دیئے ۔وجہ یہ تھی کہ بیٹی سے بچھڑنے کا غم میرے پورے وجود پر حاوی ہوگیا۔یہ ایک ماں ہی جان سکتی ہے کہ اپنی بیٹی کو"پیا دیس" بھیجنے کے بعد دِل کی کیا حالت ہوتی ہے۔سچ کہاہے عباس تابش نے کہ

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اِک روز کہا تھا، مجھے ڈر لگتا ہے

لیکن کیاکیجئے کہ رسمِ دُنیایہی ہے،دستور بھی یہی اور میرے دین کا حکم بھی یہی کہ بیٹیاں تو ہوتی ہی پرایادھن ہیں۔فرض کی ادائیگی کی خوشی کے ساتھ بچھڑنے کے غم کی تلاطم خیز موجوں نے دِل کی دُنیااجاڑ کے رکھ دی۔سات سمندرپار جانے والی بیٹی کے سامنے توضبط کیے کھڑی رہی لیکن جب گھر پہنچی تو مہمانوں کی موجودگی کے باوجود ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور میں جی بھر کے رودی۔مجھے گھر کے درودیوار سے عجیب سی وحشت ٹپکتی ہوئی محسوس ہوئی اوریوں لگا کہ جیسے

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر

اداسی بال کھولے سو رہی ہے

دو، تین دِن اسی کیفیت میں گزرے اور پھر جب طبیعت ذرا سنبھلی تو قلم تھام لیا کہ قلم کاقرض ابھی باقی تھااور اُن احباب کا بھی جو طوفانِ بادوباراں کی پرواہ کیے بغیرانتہائی خلوص سے اِس تقریب میں شریک ہوئے۔میں شکر گزار ہوں محترم بھائی عطاء الحق قاسمی ،جناب مجیب الرحمٰن شامی ،بھائی رؤف طاہر ، محترم حفیظ اللہ نیازی ، محترم نجم ولی خاں، بھائی فرید احمد پراچہ، محترم احسان اللہ وقاص ، جسٹس (ر) ظفراقبال چودھری ، ناصر محمود ملک ،پی ایف یو جے کے محترم میاں رفعت قادری، محترمہ عمرانہ مشتاق ، پی ایف یو سی کے محترم عبد الماجد ملک ،فرخ شہباز، نور الہدیٰ اور دیگر احباب کا جو بیٹی کے لیے اپنی ڈھیروں ڈھیر دعاؤں کے ساتھ پہنچے ۔ محترم صدیق الفاروق ،الطاف حسن قریشی ، سجاد میر اور ارشاد عارف کی راہ میں طوفانِ بادوباراں سدِسکندری بَن کر کھڑا ہوگیا لیکن اُن کی دعائیں ہم تک پہنچ گئیں ۔ محترم بھائی لیاقت بلوچ صاحب نے نکانہ صاحب سے فون کرکے بتایاکہ وہ بارش کے طوفان میں پھنسے ہوئے ہیں لیکن اُن کی دعائیں بیٹی کے ساتھ ہیں ۔شکر گزار ہوں ربِ لم یزل کی کہ جس نے ہمیں اِس فرض کی ادائیگی کے قابل بنایا اورایک دفعہ پھردل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں اُن تمام مہمانانِ گرامی کی جنھوں نے اِس تقریب میں شرکت فرمائی۔

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے ٹوٹا رابطہ جب بحال ہوا تو پتہ چلا کہ پاکستانی سیاست میں کئی طوفان آ کر گزر چکے۔ ایم کیو ایم کے مرکزی دفتر نائن زیرو پر رینجرز نے چھاپا مار کر بہت سا جدید ترین اسلحہ برآمد کیا اور سینکڑوں کارکُن گرفتار ہوئے۔ رینجرز کو قتل کی دھمکیاں دینے پر الطاف حسین کے خلاف کرنل طاہر محمود کی تحریری درخواست پر دہشت گردی کا مقدمہ درج ہوا جس پر جنابِ آصف زرداری نے ایم کیو ایم کو صوبائی حکومت میں شامل کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا ''پیپلز پارٹی کڑے وقت میں ایم کیو ایم کو تنہا نہیں چھوڑے گی''۔ لیکن سارا معاملہ اُلٹ پلٹ تو اُس وقت ہوا جب پھانسی سے چند گھنٹے قبل ایم کیو ایم کے ٹارگٹ کلر صولت مرزا کا ویڈیو بیان الیکٹرانک میڈیا کی زینت بنا۔ اپنے بیان میں صولت مرزا نے ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین صاحب کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا کہ اُس نے سارے قتل الطاف حسین کے حکم پر کیے اور الطاف حسین صاحب کی طرف سے سارے احکامات بابر غوری صاحب کے ذریعے ملا کرتے تھے۔ صولت مرزا نے یہ بھی کہا کہ وہ پھانسی کی سزا سے معافی کا خواستگار نہیں لیکن اتنا ضرور چاہتا ہے کہ اُس کی پھانسی کچھ عرصے کے لیے مؤخر کی جائے تاکہ وہ سارے راز افشاء کرکے اپنے گناہوں کا بوجھ کچھ ہلکا کر سکے۔ الطاف بھائی اور ایم کیو ایم کے اکابرین نے تو ان الزامات کو جھوٹ کا پلندا قرار دیا لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ الزامات نئے نہیں بلکہ اِن کی بازگشت تو گزشتہ دو عشروں سے جاری ہے اور ہم تو اپنے کئی کالموں میں متحدہ کے عسکری ونگز کا ذکر بھی کر چکے۔ حقیقت یہی ہے کہ پرنٹ

اور الیکٹرانک میڈیا کے بہت سے احباب ایم کیوایم کی سرگرمیوں سے واقف ہیں لیکن اِن کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے قلم تھرتھرانے لگتے ہیں اور زبانوں پر لکنت طاری ہو جاتی ہے لیکن اب شاید وہ وقت آن پہنچا ہے جب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہے گا۔

وزارتِ داخلہ نے صولت مرزا کی پھانسی کو 90 روز تک مؤخر کرنے کی سمری ایوانِ صدر بھیج دی ہے جس پر تاحال کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ صولت مرزا کو تو اُس کے گناہوں کی سزا ملنی ہی چاہیے ،آج نہیں تو 90 روز بعد سہی لیکن اگر اس معاملے کی تہ تک نہ پہنچا گیا تو ایسے صولت مرزا پیدا ہوتے ہی رہیں گے اور روشنیوں کا شہر کراچی خونم خون ہی رہے گا۔ آج اگر حکومت اور فوج کراچی کی روشنیاں لوٹانے کے لیے ڈٹ چکے ہیں تو پھر اُن کے بڑھتے ہوئے قدم رکنے نہیں چاہییں ۔ ویسے حالات سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہے گا کیونکہ شاطرانہ چالوں کے ماہر جناب آصف زرداری بھی اُلٹے پاؤں پھِر گئے اور پیپلز پارٹی کے اکابرین الیکٹرانک میڈیا پر زور و شور سے یہ بیانات دینے شروع کر دیئے کہ جنابِ آصف زرداری نے تو یہ کہا ہی نہیں کہ ”پیپلز پارٹی کڑے وقت میں ایم کیوایم کو تنہا نہیں چھوڑے گی“۔اب تو نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ پیپلز پارٹی نے جنابِ آصف زرداری کی ہدایت پر اب متحدہ قومی موومنٹ کی سندھ حکومت میں شمولیت کا فیصلہ بھی مؤخر کر دیا ہے۔اُدھر پرویز مشرف بھی اپنے

طبلے سارنگی" کے ساتھ میدان میں اُتر آئے اور اُس سیاسی جماعت پر برس پڑے جسے" وہ تکّے لہرا لہرا کر اپنا دست و بازو قرار دیتے رہے۔ اُنھوں نے کہا "ایم کیو ایم پر دہشت گردی پھیلانے کا تاثر پورے ملک میں تقویت حاصل کر چکا ہے۔ میں نے اپنے دَورِ حکومت میں ایم کیو ایم کو بہت سمجھایا تھا جبکہ آج کل بہت کنفیوژن ہے۔ الطاف حسین کو اِس بارے میں سوچنا ہو گا کہ ایم کیو ایم پر دہشت گردی کی چھاپ لگ چکی ہے۔ پنجاب، سرحد، ہر جگہ یہی تاثر ہے"۔ ملک میں تیسری سیاسی قوت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں پرویز مشرف صاحب نے کہا "پیپلز پارٹی اور نواز لیگ چار، چار بار اقتدار حاصل کر چکے اور یوں ملک کا بیڑا غرق ہو گیا۔ اب ایک نئی فورس کی ضرورت ہے اور میں خود کو ایک بڑے رول کے حوالے سے دیکھ رہا ہوں"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر پرویز مشرف صاحب کچھ محنت کریں تو "طبلے سارنگی" کے حوالے سے تو اُن کا کوئی بڑا رول ہو سکتا ہے لیکن ملک کی خدمت کے حوالے سے نہیں کیونکہ اپنے دَورِ حکومت میں وہ ملک و قوم کی جو "خدمت" کر چکے ہیں وہ کئی دہائیوں کے لیے کافی ہے۔

مایوسی کفر ہے

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

دہشت گردی، بھتہ خوری، ٹارگٹ کلنگ، خودکُش حملوں، بم دھماکوں اور بارود کی بُو سے رچی فضاؤں کے باوجود وطنِ عزیز میں امیدوں اور آشاؤں کی توانا کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ گھٹنوں کے بَل رینگتی معیشت اپنے قدموں پر کھڑی ہو رہی ہے، مہنگائی کے طوفانِ بلاخیز کے آگے بند باندھنے کی کوششیں ثمرآور ہو رہی ہیں۔ دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے جری جوان اپنے خون سے عزم وہمت کی لازوال داستانیں رقم کر رہے ہیں اور عالمی اعتماد آہستہ آہستہ بحال ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ اِس لیے ممکن ہوا کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ حکومت اور فوج ایک صفحے پر ہے۔ افہام و تفہیم کی اِس فضاء میں اُمید ہو چلی ہے کہ بوستانِ وطن میں بہار آنے کو ہے۔ لاریب اُمید کے دیپ جلانے میں کچھ حصہ ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا بھی ہے۔ ہمارا میڈیا آزاد بھی ہے اور بے باک بھی۔ یہ بے باکی اکثر اپنی حدوں سے تجاوز بھی کر جاتی ہے لیکن اِس کے باوجود بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسی میڈیا نے اذہان و قلوب کے آئینوں کی دھندلاہٹ کو یوں صیقل کیا ہے کہ اب اِن میں ''رہبروں'' کا ظاہری نہیں باطنی عکس دکھائی دینے لگا ہے۔ ابھرتے ہوئے شعور کی روشنی شبِ تار میں دراڑیں ڈال رہی ہے اور عوامی شعور آگہی کے زینے ایک ایک کرکے طے کرتا جا رہا ہے۔ جب عوامی شعور اِس منزل تک پہنچ جائے

توپھر مایوسیاں ہوا ہوجاتی ہیں اورآشاؤں کی تتلیاں فضائے بسیط میں رقص کناں ہو جاتی ہیں۔

ابو العلا معری نے کہا ’’بھیڑیے کی سب سے بڑی تمنایہ ہوتی ہے کہ وہ چرواہا بن جائے‘‘۔ایسی ہی خواہش ہمارے لندن میں بیٹھے الطاف بھائی نے بھی پال رکھی ہے لیکن وقت بدل چکا۔اب عنانِ حکومت اُن لوگوں کے ہاتھ میں جو کراچی کی روشنیاں لوٹانے کاعزم کرچکے ہیں ۔کیاکبھی کسی نے تصور بھی کیاتھاکہ کوئی نائن زیرو کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی دیکھ سکے گا؟۔کیاکوئی سوچ بھی سکتاتھاکہ شہرِ قائدکے’’ نوگوایریاز‘‘ ختم اورساری رکاوٹیں دور کردی جائیں گی ؟۔پتہ سب کو تھالیکن زبانیں گُنگ ۔وزیرِ داخلہ چودھری نثارنے بہت پہلے کہہ دیاکہ ایجنسیوں کی رپورٹس موجودہیں ،ٹارگٹ کلرزاور بھتہ خوروں کی شناخت کرلی گئی ہے ،اُنہیں معلوم ہے کہ کون کس کی سرپرستی کررہا ہے ۔اُنھوں نے تویہاں تک کہہ دیاکہ عسکری ونگزکی رپورٹس موجودہیں ۔پھرپتہ نہیں کس مصلحت کے تحت اُنہوں نے یہ بھی کہہ دیا’’یہ رپورٹس سپریم کورٹ کے لیے نہیں‘‘۔ سبھی جانتے تھے کہ نوگوایریاز، عقوبت خانے اورٹارگٹ کلنگ سب اُسی دَورکی پیداوارہیں جب مہاجر قومی موومنٹ نے جنم لیااور ہرکسی کواپنی آغوشِ محبت میں سمیٹ لینے والاکراچی لسانی ،نسلی اورگروہی منافرتوں میں یوں تقسیم ہواکہ ایک کراچی کے اندرکئی کراچی بن گئے ۔وقت کے ساتھ ساتھ ہرجگہ عزیربلوچ

اور بابا لاڈلا جنم لینے لگے اور کراچی یوں خونم خون ہوتا چلا گیا۔ جتنی لاشیں مصر اور شام میں ایک سال میں گرتی رہیں اُتنی کراچی میں ایک ماہ میں لیکن ایکشن کی ہمت کسی میں نہ تھی ۔ الیکٹرانک میڈیا بھی خوف کی فضاء میں ایم کیوایم کے قائد الطاف حسین کی تقاریر گھنٹوں بلکہ پہروں نشر کرتا رہا جس میں سوائے بڑھکوں اور ''پھٹریوں'' کے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ایم کیوایم کا سیاسی جماعت ہونے کا حق سبھی تسلیم کرتے ہیں لیکن اگر سیاست میں دہشت کا عنصر بھی شامل ہو جائے تو پھر کسی کو بھی قبول نہیں ۔ ایم کیوایم اگر واقعی سیاسی دھارے میں شامل ہونا چاہتی ہے تو پھر اسے اپنی اداؤں پر غور کرتے ہوئے اپنی صفوں سے بھتہ خوروں اور قاتلوں کو نکالنا ہی ہوگا۔

بعد از خرابیٔ بسیار حکومت نے خون میں نہلائے کراچی کی روشنیاں لوٹانے کا عزم کر ہی لیا۔ اِس عزم میں افواجِ پاکستان برابر کی شریک ہیں ۔ رینجرز نے نائن زیرو پر چھاپا مار کر ڈھیروں ڈھیر اسلحہ برآمد کیا اور ٹارگٹ کلرز بھی گرفتار کیے ۔ اِن ٹارگٹ کلرز میں جیو نیوز کے صحافی ولی خاں بابر کے قتل کا سزا یافتہ مجرم بھی شامل تھا۔ نائن زیرو سے برآمد کیا گیا جدید ترین اسلحہ اُنہی نیٹو کنٹینرز سے چرایا گیا تھا جو پورٹس اینڈ شپنگ کے وزیر ایم کیوایم کے بابر غوری کے دَورِ وزارت میں غائب ہوئے ۔ جب اسلحے سے بھرے اِن کنٹینرز کے غائب ہونے کا الزام اُس وقت کے کراچی کے ڈی جی رینجرز میجر جنرل رضوان اختر نے براہِ

راست پورٹس اینڈ شپنگ کی وزارت پر لگایا تو تب سمجھ میں آیا کہ ایم کیو ایم یہ وزارت ہر حال میں اپنے پاس رکھنے پر کیوں بضد تھی ۔اِن کنٹینرز کی گمشدگی پر شور تو بہت مچا لیکن پھر سیاسی مصلحتیں آڑے آئیں اور معاملہ دبا دیا گیا۔نائن زیرو پر رینجرز کے ایکشن پر ایم کیوایم چیں بہ چیں تو بہت ہوئی اور محترم آصف زرداری نے بھی ازراہِ ہمدردی متحدہ کی پیٹھ تھپتھپانا ضروری سمجھا لیکن ہواؤں کا رُخ دیکھ کر زرداری صاحب مراجعت فرما گئے اور ایم کیوایم نے بھی اپنی آواز دھیمی کرنے میں ہی عافیت جانی ۔اب وزیرِاعظم صاحب سے ملاقات کی بھیک مانگتی ایم کیوایم کو واضح پیغام دے دیا گیا کہ عافیت اسی میں ہے کہ سارے ٹارگٹ کلر اور بھتہ خور حکومت کے حوالے کر دیئے جائیں ۔اُنہوں نے برملا کہہ دیا کہ وہ عروس البلاد ،روشنیوں کے شہر کراچی کی روشنیاں لوٹا کر ہی دَم لیں گے ۔

کراچی کو فوج کے حوالے کرنے کی ضِد تو محترم الطاف حسین کی ہی تھی لیکن اُن سے یہ چوک ہو گئی کہ اُنھوں نے چیف آف آرمی سٹاف محترم راحیل شریف صاحب کو بھی آمر پرویز مشرف جیسا ہی جانا۔اُنہیں نہیں معلوم تھا کہ شہیدوں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے جنرل راحیل شریف کی نَس نَس حبِ وطن سے لبریز ہے۔ کراچی کو فوج کے حوالے تو نہیں کیا گیا لیکن رینجرز کو مکمل اختیارات دے کر کراچی کا امن لوٹانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی جس میں کامیابی کے واضح

اشارے یوں نظر آتے ہیں کہ گزشتہ کئی دنوں سے ٹارگٹ کلنگ ہوئی نہ تاجروں کو بھتہ خوروں کی طرف سے پرچیاں موصول ہوئیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکمران کراچی کو ٹارگٹ کلرز، بھتہ خوروں اور دہشت گردوں سے پاک کرنے کے عزم پر قائم رہتے ہیں یا ایک دفعہ پھر سیاسی مصلحتیں آڑے آ جاتی ہیں۔

ویراں ہے میکدہ

ہمارے ٹُک ٹُک مصباح تو اپنے پورے وَن ڈے کیرئر میں سینچری بنائے بغیر ہی ریٹائر ہوگئے لیکن ہمارے ''الطاف بھائی'' نے سویں مرتبہ قیادت سے دستبرداری کا اعلان واپس لے کر اپنی سینچری مکمل کر لی جس پر ہم اُنہیں دِل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ پیر اور منگل کی درمیانی شب نائن زیرو پر ذمہ داران کے ہنگامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے الطاف بھائی نے ''حسبِ سابق'' قیادت سے دستبرداری کا اعلان کیا لیکن پھر ''پبلک کے پُرزور اصرار پر'' فوراً ہی یہ فیصلہ واپس بھی لے لیا حالانکہ پہلے وہ ایسے فیصلے اپنے گھنٹوں بلکہ پہروں طویل ''پُرمغز'' خطبات کے آخری ''سیگمنٹ'' میں واپس لیا کرتے تھے۔ الطاف بھائی نے بعض شریر اور شرپسند تجزیہ نگاروں اور اینکرز کا نام لیے بغیر کہا کہ اسٹیبلشمنٹ کے پے رول پر کام کرنے والے یہ اینکر اور تجزیہ نگار مسلسل اِس بات کو اچھال رہے ہیں کہ الطاف حسین کے بغیر ایم کیو ایم بہت اچھی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ الطاف بھائی کے بغیر تو نائن زیرو کا میکدہ بالکل ہی ویران ہو جائے گا۔ یہ ویرانی تو نائن زیرو کے در و بام پر پہلے ہی چھائی ہوئی ہے اور بقول ناصر کاظمی

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

اب اگر الطاف بھائی بھی روٹھ گئے تو باقی کیا بچے گا۔ ہمارے اینکروں، ''اینکرنیوں'' تجزیہ نگاروں اور ''تجزیہ نگارنیوں'' کو اتنا تو سوچنا چاہیے کہ الطاف بھائی تو آنے والی، نسلوں کے بہتر مستقبل اور پاکستان کے مظلوم عوام کی زندگی سنوارنے کے لیے 1992ء سے دیارِ غیر میں ''انتہائی کسمپرسی'' کے عالم میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ الطاف بھائی کی اِس بے کسی، بے بسی اور کسمپرسی کی زندگی پر ہمیں ترس آنے لگا ہے۔ ایک طرف سکاٹ لینڈیارڈ نے اُن کا ناطقہ بند کر رکھا ہے، مَنی لانڈرنگ اورڈاکٹر عمران خاں قتل کیس کی تلوار سَر پر لٹک رہی ہے جبکہ دوسری طرف پارٹی میں بغاوت کے جرثومے کلبلا رہے ہیں جس کا بَرملا اظہار الطاف بھائی نے ایک ٹاک شو میں یہ کہہ کر کیا کہ اُن کی پارٹی پر گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اِس پہ مستزاد وہ شریر اینکر پرسنز اور تجزیہ نگار ''ایویں خوامخواہ'' اُن سے پنگا لیتے رہتے ہیں۔ ہم نے ایک ''شریر'' اینکر سے اِس کی وجہ پوچھی تو اُس نے جواب دیا کہ

جی چاہتا ہے چھیڑ کے ہوں اُن سے ہمکلام
کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں

جونہی الطاف بھائی نے نائن زیرو پر دِل کے پھپھولے پھوڑے، ایک شریر

اینکر پرسن نے اپنی دوکان داری چمکانے کے لیے ”چھکے“ لے لے کر صولت مرزا کی اہلیہ کا انٹرویو شروع کر دیا جس پر فاروق ستار بہت چیں بہ چیں ہوئے۔ صولت مرزا کی اہلیہ نے کہا” جب میں نے ملاقات پر صولت مرزا کو بتایا کہ الطاف حسین نے تو اُسے سرے سے جاننے سے ہی انکار کر دیا ہے تو صولت مرزا سُن ہو گئے اور یہ بات سُن کر ششدر رہ گئے۔ تھوڑی دیر اُنھوں نے زمین کی طرف دیکھا اور پھر سَر اُٹھایا۔ اُنھیں اِس بات پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ صولت مرزا کو پشیمانی تھی کہ وہ غلط لوگوں کے ہاتھ میں پھنس گئے جنھوں نے نظریہ کے نام پر اُنھیں استعمال کر کے اچانک پھینک دیا“۔ صولت مرزا کی اہلیہ نے مزید بتایا کہ صولت مرزا نے کہا” اِن لوگوں پر اعتبار کر کے غلطی ہو گئی۔ اب میں اِن تمام چیزوں کا کفارہ ادا کروں گا“۔ انٹرویو میں صولت مرزا کی اہلیہ نے یہ بھی بتایا کہ بہت سے لوگ ایم کیو ایم کے خلاف بیان دینا چاہتے ہیں۔ اُس نے کہا” یہ سنگین مذاق ہے کہ ایم کیو ایم صولت مرزا کو نہیں جانتی۔ میرے پاس اِس حوالے سے بہت سے ثبوت ہیں، جیل حکام بھی اِس بارے میں بتا سکتے ہیں۔ 2 فروری تک ہم نائن زیرو جاتے رہے اِس کے بعد فاروق ستار نے فون کر کے کہا اب ہمارا آپ کا رشتہ ختم ہو گیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام جانے۔ جتنا ہم نے کرنا تھا، کر لیا۔ فاروق ستار کی کال کے بعد نائن زیرو کے لیے ہمیں مُکا چوک سے ہی آگے نہیں جانے دیا گیا۔ اگر ایم کیو ایم صولت مرزا سے یوں اظہارِ لاتعلقی نہ کرتی تو وہ پھانسی چڑھ جاتا لیکن کبھی زبان نہ کھولتا“۔ اِس انٹرویو میں بہت سی ایسی

تصاویر بھی دکھائی گئیں جن میں ایم کیوایم کی قیادت مختلف مواقع پر صولت مرزا کے ساتھ کھڑی نظر آئی اِس لیے یہ تو طے ہے کہ صولت مرزا ایم کیوایم کا سرگرم کارکُن تھا جسے بچانے کے لیے سندھ کے گورنر عشرت العباد سمیت سبھی نے مقدور بھر کوشش بھی کی لیکن جب بچا نہ پائے تو اعلانِ لاتعلّقی کر دیا۔ صولت مرزا کو چاہیے تھا کہ وہ پارٹی کی خاطر چُپ چاپ پھندے سے جھول جاتا کہ " خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا" ۔ لیکن وہ بزدِل نکلا اور بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑ کر ہمارے الطاف بھائی کو "وَخت" میں ڈال گیا۔ الطاف بھائی شاید سکاٹ لینڈیارڈ سے تو بچ جاتے لیکن صولت مرزا اور اُس کی اہلیہ کے انکشافات اتنے خوفناک ہیں کہ بچنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی ۔اُدھر تحریکِ انصاف کے عمران خاں نے بھی موقع غنیمت جان کر ایم کیوایم پر باؤنسر پہ باؤنسر پھینکنے شروع کر دیئے حالانکہ دھرنوں کے "موسم" میں وہ الطاف بھائی کی مدد کے خواستگار تھے جس کی آڈیو ٹیپ بھی سامنے آ چکی ہے۔ خاں صاحب نے خود تو سوائے خیبر پختونخوا کے تمام اسمبلیوں کا بائیکاٹ کر رکھا ہے اور وہ "دھاندلی زدہ" الیکشن کو کسی صورت بھی قبول کرنے کو تیار نہیں لیکن کراچی کے ضمنی الیکشن میں ایم کیوایم کے مقابلے میں عمران اسماعیل کو کھڑا بھی کر دیا۔ اب ایک دفعہ پھر تحریکِ انصاف اور ایم کیوایم میں "جوڑ" پڑنے والا ہے لیکن الطاف بھائی نے بھی صاف کہہ دیا کہ اگر قومی اسمبلی کے حلقہ NA 246 کے ضمنی انتخاب کا نتیجہ عوام کے فیصلے کے خلاف آیا تو ملک سے جمہوریت کے خاتمے

کا آغاز ہو جائے گا۔ظاہر ہے کہ عوام کا فیصلہ تو وہی ہونا چاہیے جو الطاف بھائی چاہتے ہیں
۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اِس کے بر عکس فیصلہ آنے پر الطاف بھائی ایم کیو ایم کو کراچی کے
مکا چوک ''میں دھرنا دینے کے احکامات صادر کرتے ہیں یا اسلام آباد کے ڈی چوک''
میں۔ویسے اگر عمران خاں صاحب نے بھی اپنی توقعات کے بر عکس فیصلہ آنے
پر ''مکا چوک'' میں دھرنا دینے کا فیصلہ کر لیا تو ایم کیو ایم مشکل میں پڑ جائے گی کیونکہ
خاں صاحب کے تو دھرنے بھی چار، چار ماہ طویل ہوتے ہیں۔

جوڈیشل کمیشن بن گیا

مستقبل کی خاتونِ اوّل محترمہ ریحام خاں کی سالگرہ کے موقعے پر نواز لیگ نے اُنہیں جوڈیشل کمیشن کا تحفہ دے کر ہمارے کپتان صاحب کا جی خوش کر دیا۔ صدارتی آرڈیننس جاری ہو چکا جس کے تحت سپریم کورٹ کے تین معزز جج صاحبان اِن تین بنیادی سوالوں کا جواب تلاش کریں گے کہ آیا 2013ء کے عام انتخابات منظم، ایماندارانہ، شفاف ،غیر جانب دارانہ اور قانون کے مطابق تھے یا پھر دھاندلی ہوئی ۔اگر دھاندلی ہوئی تو پھر کیا منظم انداز میں کسی منصوبے کے تحت اِن انتخابات پر اثرانداز ہونے کی کوشش کی گئی ؟۔ تیسرا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا مجموعی طور پر 2013ء کے انتخابی نتائج درست ہیں اور اِن میں عوام کی جانب سے دیئے گئے مینڈیٹ کی درست عکاسی ہوتی ہے ؟۔ تحقیقاتی کمیشن میں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ عام انتخابات میں مسلم لیگ نون کو اقتدار میں لانے کے لیے منظم انداز میں دھاندلی ہوئی تھی تو پھر بھی اِس آرڈیننس میں وزیرِ اعظم کے استعفے یا اسمبلیوں کی تحلیل کرنے کی کوئی بات شامل نہیں۔ گویا اِس تحقیقاتی کمیشن کی کوئی آئینی حیثیت ہے نہ قانونی اور یہ صرف اخلاقی بنیادوں پر قائم کیا گیا ایسا کمیشن ہو گا جس کی تحقیقات اور سفارشات پر عمل درآمد بھی صرف اخلاقی بنیادوں پر ہی کیا جا سکے گا، آئینی و قانونی بنیادوں پر نہیں۔ اب یہ اعلیٰ عدلیہ نے طے کرنا ہے کہ کیا ایسا کوئی کمیشن

تشکیل پا بھی سکتا ہے یا نہیں۔ کمیشن کی تشکیل کی صورت میں بھی بہت سے ایسے سوالات جنم لیتے نظر آتے ہیں جن کا جواب آنے والے وقتوں میں ہی دیا جا سکتا ہے مثلاً اگر تحقیقاتی کمیشن یہ طے کر دیتا ہے کہ عام انتخابات میں منظم دھاندلی ہوئی تو کیا، وزیرِ اعظم صاحب قومی اسمبلی تحلیل کر دیں گے؟۔ سندھ اور بلوچستان (جہاں انتخابی دھاندلیوں کا اتنا شور نہیں جتنا پنجاب میں ہے) کیا اِن دونوں صوبوں کے اربابِ اختیار اپنی حکومتیں ختم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے؟۔ خیبر پختونخوا کے انتخابات کے بارے میں تو خاں صاحب متعدد بار یہ کہہ چکے ہیں کہ وہاں انتخابات شفاف ہوئے۔ کیا خیبر پختونخوا کی حکومت بھی ختم کر دی جائے گی؟۔ اور اگر ایسا ہوا تو کیا یہ عوامی مینڈیٹ کی توہین نہیں ہو گی؟۔ سوالات تو اور بھی بہت سے ہیں لیکن ابھی تو عدالتی کمیشن بھی تشکیل نہیں پایا اِس لیے ہم انہیں "قبل از مرگ واویلا" کے مصداق ٹھہراتے ہوئے یہیں پر چھوڑتے ہیں۔

ایم کیو ایم اور اے این پی کے بزرجمہروں کی ماہرانہ رائے یہ ہے کہ یہ سب "ٹھک مکا" کی سیاست ہے۔ ایم کیو ایم والے کہتے ہیں کہ کپتان صاحب کی زبان تو پیپلز پارٹی اور نواز لیگ پر ٹُک مکا کا الزام دھرتے نہیں تھکتی تھی لیکن اب وہ بھی اسی سیاست کا حصہ بن گئے لیکن ہماری "ارسطوانہ" سوچ کے مطابق ایسا ہرگز نہیں البتہ یہ ضرور کہ تحریکِ انصاف نے بعد از خرابیٔ بسیار اُسی

پر اکتفا کر لیا جو کچھ وزیرِ اعظم صاحب نے 12 اگست 2014ء کو اپنے قوم سے خطاب میں دینا چاہا لیکن کپتان صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ تحریکِ انصاف اُس سے بہت کم پر راضی ہو گئی جو اُسے دھرنوں کے دنوں میں دیا جا رہا تھا۔ تب چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف صاحب نے خاں صاحب کو یہ کہا تھا کہ اگر وہ وزیرِ اعظم کے استعفے سے پیچھے ہٹ جائیں تو باقی تمام مطالبات حکومت سے منوائے جا سکتے ہیں لیکن اُس وقت خاں صاحب ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے کیونکہ اُن کے صلاح کار لال حویلی والے شیخ رشید جیسے لوگ تھے جنہیں کسی زمانے میں کپتان صاحب اپنا
چوکیدار'' رکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ بہرحال دیر آید، درست آید کے مصداق'' حکومت اور تحریکِ انصاف جوڈیشل کمیشن کے نکات پر متفق ہو گئے اور صدارتی آرڈیننس بھی جاری ہو گیا۔ اِس صدارتی آرڈیننس کی تشکیل کے بعد سیاسی جماعتوں نے نہ صرف اسے سراہا بلکہ سُکھ کا سانس بھی لیا کیونکہ کپتان صاحب ایک دفعہ پھر ''اوکھے اوکھے'' بیانات دینے لگے تھے۔

نوازلیگ اور تحریکِ انصاف میں جن نکات پر اتفاق ہوا ہے اُنہیں مدِ نظر رکھتے ہوئے تو یہ نظر نہیں آتا کہ تحریکِ انصاف کے ہاتھ کچھ آنے والا ہے کیونکہ کسی بھی صورت میں یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ 2013ء کے الیکشن میں ''منظم دھاندلی'' ہوئی اور اِس دھاندلی کے پیچھے نوازلیگ کا ہاتھ تھا۔ تحریکِ انصاف کے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں۔ کنٹینر پر کھڑے ہو کر کاغذوں کے پلندے ہوا میں

لہرانا اور بات ہے اور جوڈیشل کمیشن میں ثبوت پیش کرکے اپنی بات ثابت کرنایکسر مختلف۔دوسری طرف نواز لیگ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ چاروں صوبوں اور مرکز کی نگران حکومتوں میں وہی لوگ آئے جو پیپلزپارٹی کے منتخب کردہ تھے ۔چیف الیکشن کمشنر فخرالدین جی ابراہیم کی دیانتداری پرعمران خاں صاحب کواندھا اعتماد تھا۔ نجم سیٹھی کے انتخاب کواُنہوں نے سراہااور خود ضِد کرکے 2013ء کے الیکشن عدلیہ کے زیرِ نگرانی کروائے ، یہ الگ بات ہے کہ حسبِ منشاء نتائج نہ آنے پر خاں صاحب نے ''آراوز''کے کردار کو ''شرمناک'' قرار دیا جس پراُنہیں سپریم کورٹ آف پاکستان سے یہ کہہ کرجان چھڑوانی پڑی کہ اُنہیں تو پتہ ہی نہیں تھاکہ '' شرمناک'' گالی ہوتی ہے ۔اُنہوں نے چیف جسٹس آف پاکستان افتخارمحمدچودھری صاحب کو بھی اُن کی ریٹائرمنٹ کے بعد الیکشن دھاندلی میں ملوث قرار دیتے ہوئے سرِعام یہ کہا''چودھری صاحب ! آپ کتنے میں بِکے؟''۔افتخارچودھری صاحب ، محترم خاں صاحب کے خلاف ہتک عزت کادعویٰ کرچکے ہیں اور صدارتی آرڈیننس کے بعد وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ اب عمران خاں صاحب کوجوڈیشل کمیشن میں یہ ثابت کرناہوگاکہ میں الیکشن دھاندلی میں ملوث تھا۔اُنہوں نے کہا''میرے نزدیک یہ بہت اچھاموقع ہے کہ میں جو الزامات عمران خاں نے مجھ پرلگائے ہیں ،اُن کابہت اچھا جواب دوں'' ۔پنجاب کے سابق نگران وزیرِاعلیٰ نجم سیٹھی بھی خاں صاحب کے خلاف اعلیٰ عدلیہ میں جا چکے ہیں۔خاں صاحب نے کہاتھاکہ انہوں نے وہ

آڈیوٹیپ خود سنی جس میں نجم سیٹھی صاحب 35 پنکچروں کا ذکر کر رہے تھے۔ نجم سیٹھی کہتے ہیں کہ اب خاں صاحب کو وہ آڈیوٹیپ بھی جوڈیشل کمیشن کے سامنے پیش کرنی ہوگی جس کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ خاں صاحب نے جنگ جیو گرپ پر بھی الزام لگایا کہ 2013ء کی الیکشن دھاندلی میں یہ گروپ بھی ملوث تھا۔ اُنہوں نے تو کافی عرصے تک جنگ جیو گروپ کا بائیکاٹ بھی کیے رکھا۔ جسٹس خلیل رمدے صاحب پر بھی دھاندلی میں ملوث ہونے کے الزامات لگائے گئے حالانکہ وہ تو الیکشن سے پہلے ہی ریٹائر ہو چکے تھے۔ ایسے ہی الزامات تمام الیکشن کمشنرز پر بھی لگائے گئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سبھی لوگ انصاف کی خاطر سپریم کورٹ کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ گئے تو 45 دنوں میں تحقیقاتی کمیشن کیسے فیصلہ کر پائے گا؟۔ ہمارا عدالتی نظام تو ایسا ہے کہ ''دادا'' کیس کرتا ہے اور ''پوتا'' فیصلہ سنتا ہے جبکہ یہاں تو ہزار بارہ سو انتخابی حلقوں کی تحقیقات مقصود ہے۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ صرف پینتالیس دنوں میں تحقیقاتی کمیشن اِن تین بنیادی سوالوں کا جواب دے پائے۔ اِس لیے ہم یہی سمجھتے ہیں کہ نواز لیگ نے تحریکِ انصاف کے ساتھ ''ہَتھ'' کر دیا ہے اور بہتر یہی ہے کہ تحریکِ انصاف کے سبھی اراکین ''نیویں نیویں'' ہو کر اسمبلیوں میں چلے جائیں کیونکہ اسی میں اُن کا بھلا ہے۔ اگر اُنہوں نے یہ موقع بھی گنوا دیا تو پھر سوائے پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

مشرقِ وسطیٰ کی جنگ میں ہمارا کردار

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔سرگوشیاں

اقوامِ مغرب اوراسرائیل خوش کہ عالمِ اسلام باہم دست وگریباں ، گولی مسلمان کی اور سینہ بھی مسلمان کا، خونِ مسلم کی ارزانی کا یہ عالم کہ ٹپکنے والا لہو مسلمان کااور لہو ٹپکانے والا بھی مسلمان ۔ارسطونے کہا ''ہر غلطی آپ کوکچھ نہ کچھ سکھا سکتی ہے بشرطیکہ آپ کچھ سیکھنا چاہیں ''لیکن رہنمایانِ عالمِ اسلام کچھ سیکھنے کو تیار ہی نہیں ۔روزِ روشن کی طرح عیاں کہ عشروں سے طاغوتی طاقتیں عالمِ اسلام کوآپس میں لڑانے اورداخلی انتشارپیدا کرنے کے لیے سرگرم لیکن عالمِ اسلام کو سوچ بچار کی فرصت ہی نہیں ۔پہلے ایران عراق جنگ ، پھر عراق کویت تصادم اور فائدہ کس کو؟امریکہ اوراُس کے اتحادیوں کو۔اب عراق شام اور یمن میں خون ریزفسادات جولاریب پورے عالمِ اسلام کواپنی لپیٹ میں لے لیں گے لیکن ہم ایمان وایقان کی منہدم بنیادوں کے ساتھ مصلحتوں کے اسیر اور نرغۂ وہم وگماں میں۔عالمی طاقتیں مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال کوشیعہ سنی جنگ بناکر عالمِ اسلام کوبدنام کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں حالانکہ یہ شیعہ سنی جنگ نہیں۔عالمی اہل سنت والجماعت کی مشترکہ پریس کانفرنس میں یہ واضح کردیا گیاہے کہ حوثی قبائل کا تعلق شیعہ فرقہ سے نہیں بلکہ اہلِ سنت سے ہے اور یہ جنگ شیعہ سنی کی نہیں بلکہ علاقائی مفادات کی جنگ ہے۔حقیقت یہی ہے کہ حوثی

قبائل اور اُن کے اتحادی یمن میں اقتدار میں شراکت چاہتے ہیں اور ایران اُن کی درپردہ حمایت کر رہا ہے جبکہ حوثی قبائل کی یہ بغاوت سعودی عرب کے مفادات سے ٹکراتی ہے اِس لیے سعودی شاہ سلیمان بن عبدلعزیز نے شرم الشیخ میں ہونے والے عرب لیگ سربراہی اجلاس میں واضح اور دو ٹوک الفاظ میں یہ کہا کہ یمن میں مکمل استحکام تک فوجی کارروائی نہیں رکے گی۔ سعودی حکومت نے داخلی استحکام کے لیے پاکستان سے فوجی دستے بھیجنے کا مطالبہ کیا لیکن ایٹمی پاکستان کا تو یہ عالم کہ لینے کے پیمانے اور، دینے کے اور۔ حرمین شریفین کی حرمت پہ کٹ مرنے کی توانا آوازیں چار سو لیکن اِس کے آگے خبثِ باطن ہی خبثِ باطن۔ وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب نے یمن میں حوثی باغیوں کے خلاف سعودی عرب کی مکمل حمایت کا عزم ظاہر کیا لیکن سعودی عرب میں فوج بھیجنے کا معاملہ پارلیمنٹ پر چھوڑ دیا۔ چہ عجب کہ ہم امریکہ کی ایک ڈانٹ پر اپنا سب کچھ نثار کر دیتے ہیں لیکن اُس سعودی عرب کی پکار پر گومگو کا شکار ہو جاتے ہیں جو ہر مشکل اور کڑے وقت میں ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوتا ہے۔ موجودہ مالی بحران کے دوران جب ہمارے اثاثے چھ ارب ڈالر کی کمترین سطح تک پہنچ چکے تھے تو بِن مانگے ڈیڑھ ارب ڈالر کی امداد دی۔ 1998ء کے ایٹمی دھماکوں کے موقعے پر جب امریکہ پاکستان کے خلاف اقتصادی پابندیاں لگا رہا تھا تب بھی سعودی عرب نے امریکہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پاکستان کو تیل کی مفت فراہمی شروع کر دی اور سعودی فرمانروا شاہ فیصل بن عبد العزیز تو پاکستان کو اپنا دوسرا گھر

قرار دیتے رہے۔

ہم دوسروں سے حاصل کی جانے والی امداد کو تو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں لیکن جب کوئی مدد کے لیے پکارے تو آئیں بائیں شائیں اور بہانے بسیار۔ جنابِ آصف زرداری کہتے ہیں ''حرمین شریفین کے دفاع کے لیے میں خود جا کر لڑنے کو تیار ہوں لیکن افغانستان اور پاکستان میں خون بہہ رہا ہے اِس لیے حکومت دوسروں کی مدد سے پہلے اپنا ملک دیکھے۔ ہمیں اپنے آپ کو نقصان پہنچا کر کسی اسلامی ملک کی مدد نہیں کرنی چاہیے جتنی ہم برداشت کر سکیں۔ ماضی میں دوسروں کی لگائی آگ سے ہمارا اپنا گھر جل گیا''۔ عمران خاں بھی یہی کہتے ہیں ''مکہ مدینہ کے لیے ہر مسلمان جان دینے کو تیار ہے لیکن ہمیں اِس جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ دس کروڑ عوام دو وقت کی روٹی نہیں کھا سکتے، تعلیم و صحت کا برا حال ہے۔ افغان جد و جہد کا حصہ بنیں تو کلاشنکوف کلچر پھیل گیا۔ ہم پارلیمنٹ میں یمن میں فوج بھیجنے کی بھرپور مخالفت کریں گے''۔ بنی گالا میں کور کمیٹی کے اجلاس میں تحریکِ انصاف نے پارلیمنٹ میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سانحہ پشاور پر تحریکِ انصاف کو دھرنا ختم کرنے کا بہانہ مل گیا اور اب جنگِ یمن کا بہانہ بنا کر تحریکِ انصاف پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں شرکت کرکے قومی دھارے میں شامل ہو رہی ہے۔ اس شرکت سے تحریکِ انصاف کی اخلاقی پوزیشن انتہائی کمزور ہو جائے گی کیونکہ جس جوڈیشل کمیشن کی تشکیل کی شرط کے ساتھ تحریکِ انصاف اسمبلیوں میں

جانے کو تیار ہوئی اُس کے بارے میں تو ابھی تک حکومت نے سپریم کورٹ کو خط بھی نہیں لکھا۔ دو دِن پہلے جہانگیر ترین ایک ٹاک شو میں کہہ رہے تھے کہ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں شرکت کے معاملے پر تحریکِ انصاف میں اتفاق نہیں کیونکہ ابھی تک جوڈیشل کمیشن کی تشکیل نہیں ہوئی اور نہ ہی سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ محض ایک صدارتی آرڈیننس پر تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ کمیشن کی تشکیل کے بعد بھی یہ خطرہ بہرحال موجود رہے گا کہ کوئی بھی اِس تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرسکتا ہے۔ جوڈیشل کمیشن کو ایک طرف رکھتے ہوئے تحریکِ انصاف نے جنگِ یمن کا بہانہ تراشا اور پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں جانے کا فیصلہ کرلیا لیکن ساتھ ہی محترم خاں صاحب نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ جوڈیشل کمیشن میں اور سڑکوں پر بھی دھاندلی کے خلاف آواز بلند کریں گے کیونکہ نواز لیگ کو 2013ء کے انتخابات میں 70 لاکھ جعلی ووٹ پڑے ہیں۔ خاں صاحب کا فرمان بجا لیکن جس بلند آہنگ سے وہ اسی پارلیمنٹ کو متواتر چوروں، ڈاکوؤں اور جعل سازوں کی بدبودار جعلی اسمبلی قرار دیتے رہے ہیں، اب اُسی پارلیمنٹ میں وہ کس مُنہ سے جائیں گے؟۔ ویسے قوم سپیکر قومی اسمبلی محترم ایاز صادق سے یہ پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ اُنھوں نے کس آئین کے تحت سات ماہ تک تحریکِ انصاف کے پارلیمنٹیرینز کے استعفے منظور نہیں کیے؟۔ اِس سوال کا جواب آج نہیں تو کل بہرحال سپیکر صاحب کو دینا ہی ہوگا۔

بات دوسری طرف نکل گئی، آمدم بر سرِ مطلب عرض ہے کہ میاں صاحب سعودی عرب کو اقرار کر سکتے ہیں نہ انکار۔ سعودی عرب ہماری عقیدتوں اور محبتوں کا مرکز ہی نہیں بلکہ شاہ فیصل سے لے کر شاہ سلیمان تک ہر سعودی حکمران ہمیشہ پاکستان کے بے لوث دوست رہا ہے اِس لیے پاکستان کسی بھی صورت میں سعودی عرب کو دو ٹوک انداز میں انکار نہیں کر سکتا۔ سرد مہری اور لیت و لعل کی صورت میں بھی گلف میں موجود اُن لاکھوں پاکستانیوں کے لیے مصیبت کھڑی ہو جائے گی جو ہر سال اربوں ڈالر کا زرِ مبادلہ پاکستان بھیجتے ہیں جبکہ دوسری طرف فوج بھیجنے کی صورت میں حکومت کو شدید ترین تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اِن حالات میں میاں صاحب سعودی عرب میں فوجی دستے بھیجنے کا رسک لیتے نظر نہیں آتے۔ اب صرف ایک ہی راہ بچتی ہے یعنی متحارب گروہوں کو مذاکرات کی ٹیبل تک لانا، جس کے لیے میاں صاحب صبح و مسا تگ و دَو کر رہے ہیں اور تحقیق کہ یہی راہ فلاح کی راہ بھی ہے کیونکہ میرے آقا ﷺ کا فرمان ہے "کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں جو نماز، روزہ اور صدقہ و خیرات سے بڑھ کر ہے، وہ آپس میں صلح صفائی ہے کیونکہ آپس میں جھگڑا اور فساد ہلاکت میں ڈالنے والی چیزیں ہیں"۔

سونامیوں کی واپسی

کیا یہ ہمارے کپتان صاحب کی ''عظمتوں'' کا بیّن ثبوت نہیں کہ وہ محض ملک و قوم اور جمہوریت کی خاطر سات ماہ تین دِن بعد چوروں، ڈاکوؤں اور جعلسازوں کی بوگس پارلیمنٹ میں طوہاًو کرہاً تشریف لے آئے ؟۔کچھ لوگ اسے ''ایک اور یوٹرن'' بھی کہتے ہیں لیکن ہم تو اسے جمہوریت کا حسن ہی سمجھتے ہیں ۔اوروں کا تو ذکر ہی کیا، یہاں تو یہ عالم ہے کہ ہمارے بھائی رؤف طاہر کو بھی کسی نے گمراہ کر دیا اور اُنھوں نے بھی اپنے کالم میں تحریکِ انصاف کی پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں آمد کو نہ صرف یوٹرن قرار دیا بلکہ اِس حوالے سے ایک لطیفہ بھی نذرِ قارئین کیا۔لطیفہ تھا تو مزیدار لیکن ہم اُسے پڑھ کر جَل بھُن کر کباب ہو گئے ۔رہی '' یوٹرن'' کی بات تو اِس پر بھی ہمیں بھائی رؤف طاہر سے شدید اختلاف ہے۔اِسی لیے ہم اپنا احتجاج ویسے ہی ریکارڈ کروا رہے ہیں جیسے قائدِ حزبِ اختلاف سیّد خورشید شاہ نے پارلیمنٹ میں ریکارڈ کرواتے ہوئے کہا ''مسلم لیگ نون کو احتجاج کرنا ہے تو اپنی حکومت کے خلاف کرے جو تحریکِ انصاف کو ایوان میں لائی ہے''۔ویسے یہ کتنی زیادتی کی بات ہے کہ نواز لیگ پہلے ''منتوں، ترلوں'' سے تحریکِ انصاف کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں لائی اور پھر خود ہی بذریعہ خواجہ آصف سیالکوٹی اُس کی ''دھنائی'' بھی کر دی۔پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں تحریکِ انصاف کی موجودگی پر شور تو پہلے

ہی بہت تھا لیکن خواجہ آصف صاحب نے یہ کہہ کر جلتی پر تیل چھڑک دیا کہ ''کچھ شرم ہوتی ہے، کچھ حیا ہوتی ہے، اخلاقیات کو سمجھو، خُدا کا خوف کرو، کنٹینر پر بیٹھ کر ہمیں گالیاں دیتے رہے ہو اور اسمبلی کو جعلی اور دھاندلی کی اسمبلی قرار دیتے رہے ہو، آج کھڑے ہو کر اِس بات کا اقرار تو کرو کہ آپ نے استعفے دیئے ہیں''۔ خواجہ صاحب کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن کیا یہ عین حقیقت نہیں کہ تحریکِ انصاف کو بذریعہ جوڈیشل کمیشن پارلیمنٹ میں لانے والی بھی خود نواز لیگ ہی ہے؟۔

اجلاس کے پہلے سیشن میں مولانا فضل الرحمٰن نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی کوشش کی لیکن سپیکر صاحب نے اُنہیں ''ٹھپ'' دیا۔ مولانا نے سوال کیا کہ یہ لوگ اسمبلی میں کِس آئینی حیثیت سے آئے ہیں تو جواباً سپیکر صاحب نے کیا آئینی موشگافی کی کہ ''مولانا! اگر یہ اندر بیٹھے ہیں تو ممبر ہیں''۔ اُنہوں نے یہ بھی فرمایا'' استعفے اپنی موت آپ مَر گئے'' ۔تب سے اب تک ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ اگر کوئی ستم ظریف سپیکر صاحب کی کرسی خالی دیکھ کر اُس پر بیٹھ گیا تو ہمارے ایاز صادق صاحب کا کیا بنے گا ۔پھر تو یہی کہا جائے گا کہ '' چونکہ سپیکر صاحب کی کرسی خالی تھی اِس لیے اُس پر جو بیٹھا وہی سپیکر''۔ ہمارے ایاز صادق صاحب کو تو پہلے ہی تحریکِ انصاف نے ''وَخت''میں، ڈالا ہوا ہے اِس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی یہ ''آئینی رولنگ'' واپس لے لیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ

وہ ''سپیکری'' سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں ۔پارلیمنٹ کے دوسرے سیشن میں مولانا کو جب موقع ملا تو اُنھوں نے بھی ''کھڑاک'' کر دیا۔ مولانا نے فرمایا ''سپیکر صاحب نے آئین و قانون اور ضابطوں سے بالاتر ہو کر ایسی رولنگ دے دی ہے جو متنازع ہو سکتی ہے ۔بحیثیت ممبر اسمبلی ہمارے لیے احتساب کا نظام نہیں ۔ سپیکر کی توہین کی جائے ،پارلیمنٹ پر حملہ کریں ،پارلیمنٹ کو گالیاں دیں، سپیکر کی ذات کو تسلیم نہ کریں ۔ بھرے ایوان میں اِن سے پوچھا جائے کہ انہوں نے استعفیٰ دیا تھا کہ نہیں ؟۔اگر ہاتھ سے استعفیٰ نکل جائے تو پھر واپس نہیں ہوتا''۔ سچی بات ہے کہ مولانا صاحب کے اِس بیان کے بعد مارے خوف کے ہمیں تو ''تریلیاں'' آنے لگیں۔ ہمارے خوف کا سبب یہ تھا کہ اگر مولانا صاحب نے یہ فتویٰ جاری کر دیا کہ جس طرح تین طلاقوں کے بعد حلالہ ''ضروری ہو جاتا ہے اُسی طرح استعفے کا ''حلالہ '' بھی ضروری ہے ، تو پھر ہم '' سونامیوں کا کیا بنے گا؟۔فی الحال تو بات صرف آئین کی ہے شرعی نہیں اور آئین تو موم کی وہ ناک ہے جسے ہم جب اور جیسے موڑنا چاہیں ، موڑنے پر قادر ہیں لیکن اگر بات شریعت تک جا پہنچی تو پھر ہمارا ''ککھ'' باقی نہیں بچے گا۔

ایم کیو ایم کے محترم فاروق ستار ایوان میں بار بار آئین کی کتاب لہرا لہرا کر یہ شور مچاتے رہے کہ پارلیمنٹ میں ''اجنبی''گھس آئے ہیں۔وہ کہتے رہے '' اراکین کے استعفے منظور نہیں کیے جاتے اور یہ بھی نہیں بتلایا جاتا کہ آئین کے

کس آرٹیکل کے تحت استعفے منظور نہیں کیے گئے''۔ شاید بھولے فاروق ستار نہیں جانتے کہ استعفے آئین کے اُس سب سے ''پاورفُل آرٹیکل'' کے تحت منظور نہیں کیے گئے جسے نظریۂ ضرورت'' کہتے ہیں اور یہ تو فاروق ستار بھی جانتے ہی ہوں گے کہ نظریۂ'' ضرورت آئین کا ایسا آرٹیکل ہے جس کے آگے سپریم کورٹ بھی بے بس ہے کیونکہ یہ آرٹیکل'' خود سپریم کورٹ کا ہی پیدا کردہ ہے اور اسے ہمیشہ بگڑے کام سنوارنے کے'' لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بجا کہ آئین کے آرٹیکل 64 کی شِق ایک کے مطابق سپیکر قومی اسمبلی کسی بھی رکنِ اسمبلی سے صرف یہ کنفرمیشن کرنے کا مجاز ہے کہ استعفے پر اس کے دستخط جعلی تو نہیں اور اُس نے کسی دباؤ کے تحت استعفیٰ تو نہیں دیا۔ کسی بھی رکنِ اسمبلی کے استعفے کو منظور یا نامنظور کرنا سپیکر صاحب کا صوابدیدی اختیار ہرگز نہیں ۔آرٹیکل 64 کی شق 2 کے مطابق جو رُکنِ پارلیمنٹ کوئی معقول وجہ بتائے بغیر پارلیمنٹ کے اجلاس سے متواتر 40 دن تک غیر حاضر رہے تو اُس کی رکنیت خود بخود ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ سب آئینی باتیں ہیں اور جس طرح ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' اُسی طرح نظریۂ ضرورت کے پاؤں میں سارا آئین ۔ایم کیوایم نے تحریکِ انصاف کی پارلیمنٹ میں آمد پر شور بھی بہت مچایا اور اُنہیں اجنبی قرار دے کر پہچاننے سے بھی انکار کر دیا جسے دیکھ کر ہمیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے ساری ایم کیوایم مرضِ نسیاں میں مبتلاء ہو گئی ہے اور اسے اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ یہ وہی تحریکِ انصاف ہے جس کے دھرنا کھڑاک'' میں شمولیت پر وہ ''اندر واندری'' راضی بھی''

ہو گئی تھی لیکن پھر ''نامعلوم'' وجوہات کی بناپر مُکر بھی گئی۔ شاید اُسے کہیں سے یہ سُن گُن مل گئی ہوگی کہ ''امپائر'' کی انگلی کھڑی نہیں ہونے والی اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ایم کیوایم گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کرتی۔

پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس یمن کی صورتِ حال پر بحث کرنے کے لیے بلایاگیا تھا جس میں وزیرِ دفاع خواجہ آصف صاحب نے پالیسی بیان دیتے ہوئے یہ بتلایا کہ سعودی عرب نے پاکستان سے بری، بحری اور ہوائی مدد طلب کی ہے۔ انتہائی اہمیت کا حامل یہ اجلاس شورشرابے اور تحریکِ انصاف کے استعفوں کی نذر ہوگیا۔ شاید جمہوریت کا حُسن اسی کو کہتے ہیں۔

ہم بھی مہاجر، تم بھی مہاجر

پچھلے دنوں ہمارا پیارا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پریشان کہ دھرنے ختم ہوئے، تحقیقاتی کمیشن بھی بن گیا، دہشت گردی میں جان باقی بچی نہ دہشت گردوں میں، کچھ واصلِ جہنم ہوئے اور بچے کھچے کونوں کھدروں میں۔ سعودی عرب اور یمن کی جنگ میں بھی کوئی کشش نہیں کہ حکومت، اپوزیشن اور فوج ایک صفحے پر، یک زبان، متفقہ قرارداد بھی آ چکی ۔اِن حالات میں الیکٹرانک میڈیا ''بریکنگ نیوز'' کو ترسا ہوا اور گزارا ایسی بریکنگ نیوز پر کہ سائیکل فُٹ پاتھ سے ٹکرا گیا یا بھینس نے چہل قدمی کرتے ہوئے فیروزپور روڈ بند کر دی۔اُن دنوں الیکٹرانک میڈیا کی حیرانی و پریشانی دیدنی تھی لیکن اللہ بھلا کرے کپتان صاحب کا جنھوں نے ''جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا'' کی عملی تصویر بنتے ہوئے اپنی توپوں کا رُخ ایم کیو ایم کی طرف موڑتے ہوئے کراچی کے حلقہ 246 کے ضمنی انتخاب میں حصّہ لینے کا ''کھڑاک'' کر دیا جس پر ایم کیو ایم بڑی چیں بچیں ہوئی کیونکہ اسی حلقے میں ''نائن زیرو'' بھی ہے۔ شروع میں تو ایم کیو ایم کو یہی محسوس ہوا کہ جیسے کوئی بیرونی طاقت اُن کی سلطنت پر حملہ آور ہو گئی ہو۔ اسی لیے ایم کیو ایم کا ردِ عمل بھی بہت سخت تھا لیکن پھر حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے الطاف بھائی نے اپنے کارکنوں کو تحریکِ انصاف کی ریلی پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرنے اور ایم

کیوایم کی ساری قیادت کو کپتان صاحب کا استقبال کرنے کا حکم صادر فرما دیا۔ الیکٹرانک میڈیا نے یہ جانا کہ جیسے حلقہ 246 کا نام ہی پاکستان ہے اور واحد لیڈر عمران خاں یا پھر اُن کی اہلیہ ، مستقبل کی ''خاتونِ اوّل'' ریحام خاں۔ بریکنگ نیوز پہ بریکنگ نیوز چلتی رہیں اور الیکٹرانک میڈیا قوم کو یہ ''مفید'' اطلاعات پہنچا کر نہال ہوتا رہا کہ خاں صاحب کراچی جانے کے لیے بنی گالا سے باہر نکل آئے ،گاڑی کے پاس پہنچے ،گاڑی کا دروازہ کھلا خاں صاحب اندر بیٹھ گئے ، ریحام خاں نے رخصت کیا۔۔۔۔ ایئرپورٹ پہنچ گئے ، گاڑی کا دروازہ کھلا ، خاں صاحب نے ایک قدم باہر نکالا اور رررر وہ دوسرا قدم بھی ، باہر نکل آیا، خراماں خراماں خصوصی طیارے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے ،جہاز کا دروازہ بند ہوا اور خاں صاحب پرواز کر گئے ۔یہی پریکٹس ریحام خاں کے کراچی جانے پر بھی دہرائی گئی اور کراچی میں خاں صاحب اور ریحام خاں کی مصروفیات کی لحہ بہ لحہ رپورٹس تو اتنی زیادہ کہ لکھنے کے لیے کئی سو صفحات درکار۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میڈیا کی سوئی عمران خاں اور ریحام خاں پر اٹک گئی ہو۔ انتہائی افسوسناک امر یہ کہ الیکٹرانک میڈیا بے نیل و مرام ، کہیں لاٹھی چلی نہ گولی ،اگر ایسا ہو جاتا تو ہمارے میڈیا کی چاندی ہو جاتی۔ ریحام خاں نے سارا کریڈٹ کپتان صاحب کو دے دیا۔ اُنہوں نے کہا ''جب عمران خاں نے کہا، بس بہت ہو چکا، ہم یہ غنڈا گردی کب تک برداشت کریں گے ،تب لہجوں میں تبدیلی آئی''۔ مستقبل کی ''خاتونِ اول'' شاید نہیں جانتی کہ ایم کیوایم تو پہلے ہی

رینجرز کے ہاتھوں ''وَخت''میں پڑی اپنا وجود بچانے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔اِن حالات میں وہ کوئی نیا ''پنگا'' لینے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔اسی لیے تو فاروق ستار نے کہہ دیا ''ہمارے پاس ڈنڈا ہے نہ انڈا اور نہ ہی ٹماٹر''۔اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر خاں صاحب کی دھمکیاں؟؟۔۔۔چہ پِدی، چہ پِدی کا شوربہ۔یہ وہی حلقہ ہے جس میں 2013ء کے انتخابات کے موقعے پر تحریکِ انصاف کو کوئی پولنگ ایجنٹ بھی میسر نہ تھا۔ہو سکتا ہے کہ یہ اب کسی کا'' دستِ شفقت''ہو جس نے خاں صاحب کو سینہ تان کر ایم کیوایم کے گھر میں گھسنے پہ قائل اور مائل کیا؟۔کیا قوم ایک دفعہ پھر کسی ''امپائر''کی انگلی کھڑی ہونے کا انتظار کرے؟۔

کراچی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے خاں صاحب نے انکشاف کیا کہ آدھے ''مہاجر وہ بھی ہیں کیونکہ اُن کی والدہ بھی ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان'' آئی تھیں۔دَرجوابِ آں غزل، محترم الطاف حسین نے فرمایا کہ عمران خاں آدھے نہیں ''پورے'' مہاجر ہیں۔پہلے ہم دونوں پاکستانی تھے،اب ''مہاجر'' اِس لیے بھائی بھائی ہیں۔اُنھوں نے کہا''خاں صاحب نائن زیرو آئیں اور بھابی ریحام خاں کو بھی ساتھ لائیں،ہم اُن کی دعوت کریں گے اور بھابی کو تحفے بھی دیں گے''۔ریحام خاں نے تو یہ کہہ کر نائن زیرو جانے سے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی'' غیر ملکی'' کی دعوت قبول نہیں کر سکتی لیکن گئے عمران خاں بھی نہیں

اوریوں نائن زیرو پر کیے جانے والے سارے انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے
۔اب الطاف بھائی نے حکم دیا ہے کہ خریدے گئے تحائف خاں صاحب تک پہنچائے
جائیں اوراگر وہ وصول کرنے سے انکار کر دیں تو بنی گالا کی سیڑھیوں پر رکھ کرلوٹ
آئیں۔ کراچی سے تو خاں صاحب تحائف وصول کیے بنا ہی واپس آ گئے لیکن آخری خبریں
آنے تک اُنھوں نے اِس سے ہرگز انکار نہیں کیا کہ وہ بطور مہاجر الطاف حسین کے بھائی
نہیں۔اب جب کہ دونوں بھائی بھائی بن ہی چکے تو بہتر ہے کہ خاں صاحب کو بھی
عمران بھائی'' کہہ کر مخاطب کیا جائے البتہ ریحام خاں کو احتیاط برتنی ہوگی کیونکہ ''
اگراُنھوں نے بھی ''رواروی''میں خاں صاحب کو''عمران بھائی'' کہہ دیا تو مولانا فضل
الرحمٰن ٹھک سے فتویٰ جاری کر دیں گے کہ ''حلالہ''واجب ہوگیا۔پارلیمنٹ میں واپسی
پرایک ''حلالہ''تو تحریکِ انصاف پر پہلے ہی واجب ہوا پڑا ہے اور سبھی مولوی وغیر مولوی
مفتی وغیر مفتی شور مچارہے ہیں کہ تحریکِ انصاف کے مستعفی اراکین پارلیمنٹ حلالہ،
دیتے ہوئے اسمبلیوں کے الیکشن دوبارہ لڑیں۔شرعی حلالے کا تو ہمیں کچھ کچھ ادراک ہے
لیکن سیاسی حلالے کے بارے میں ہمارا علم ناقص ۔اگر مولانا فضل الرحمٰن سے رجوع
کریں تو ہمیں ڈر ہے کہ وہ تو یہی کہیں گے کہ تحریکِ انصاف کے اراکین پہلے کسی
دوسرے ملک کی اسمبلی کا الیکشن لڑیں ،پھر وہاں سے مستعفی ہو کر پاکستان آئیں اور الیکشن
لڑیں تو تبھی حلالے کی شرائط پوری ہوتی ہیں البتہ اگر محترم سراج الحق صاحب سے فتویٰ
لیا جائے تو وہ کہیں گے کہ کسی ''حلالے

والاے‘‘کی ضرورت نہیں۔ہمیں تو تحریکِ انصاف کاشکر گزار ہوناچاہیے کہ اُس نے اسمبلیوں میں’’ قدم رنجہ ‘‘فرما کر جمہوریت بچالی ۔ہمارے محترم سراج الحق بھی بھولے بادشاہ‘‘ہیں۔’’پیوستہ رہ شجر سے ،اُمیدِ بہار رکھ‘‘کے قائل محترم سراج الحق’’ اب بھی خیبر پختونخوا میں تحریکِ انصاف سے جُڑے بیٹھے ہیں اور پروگرام یہی کہ بلدیاتی الیکشن بھی ایک ہی پلیٹ فارم سے لڑیں گے لیکن ہم سمجھتے ہیں اُن کے ہاتھ کَکھ‘‘ نہیں آنے والاکیونکہ تحریکِ انصاف ’’سیاسی ریوڑیاں‘‘آپس میں ہی بانٹ‘‘ کھائے گی ۔ہمارے’’ ارسطوانہ تجزیے ‘‘کی بنیاد یہ ہے کہ اگر تحریکِ انصاف مخلص ہوتی توپھر کراچی میں جماعتِ اسلامی کامطالبہ تسلیم کرتے ہوئے اپنااُمیدوار اُس کے حق میں دست بردار کروادیتی ۔ سبھی جانتے ہیں کہ کراچی میں جماعت اسلامی کی کوششوں کاوشوں اور قربانیوں کی ایک تاریخ ہے اوربدترین حالات میں بھی اِس منظم جماعت، کااچھا خاصہ حلقۂ اثر موجود رہاہے۔آج بھی متحدہ قومی موومنٹ کواصل خطرہ تحریکِ انصاف سے نہیں ،جماعت اسلامی سے ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایم کیوایم نے جماعت اسلامی کی انتخابی ریلیوں پر حملے شروع کردیئے ہیں۔اِن حالات میں ایم کیوایم کی ’’غُنڈہ گردی‘‘کامِل کرمقابلہ کرنے سے ہی بہتر نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔یہ عین حقیقت ہے کہ ایم کیوایم کے گھر(حلقہ 246) سے اُسے شکست دینافی الحال ممکن نہیں لیکن اگرمقابلہ کرناہی ٹھہرگیاتوپھر تحقیق کہ ہر لحاظ سے جماعت اسلامی کاحق ہی فائق ہے۔

یہ حوثی بغاوت ہے، تنازع نہیں

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں منظور کی جانے والی متفقہ قرارداد سے کشید کیا گیا ''امرت'' یہ کہ پاکستان یمن تنازعے میں ''غیر جانبدار'' رہے گا اور اگر سعودی عرب کی سلامتی کو خطرہ ہوا تو پاکستان سعودی عرب کا ساتھ دے گا۔ پارلیمنٹ میں براجمان بزرجمہروں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا اب یہ سعودی حکومت کی بجائے ہماری پارلیمنٹ طے کرے گی کہ سعودی عرب کی سلامتی کو کب خطرہ ہوگا اور کب نہیں؟ اور کیا جنگِ یمن سیاسی تنازع ہے یا ایک گروہ کی بغاوت؟۔ اگر یہ دو برادر اسلامی ممالک کے درمیان تنازع ہے تو اسے سفارتی سطح پر حل کرنے کی کی سعی کی جانی چاہیے لیکن اگر یہ بغاوت ہے تو پھر باغیوں سے کیسی مصالحت اور کیسے مذاکرات، کیسی غیر جانبداری اور کیسی ثالثی۔ حوثیوں کے اذہان و قلوب میں تو اِس قرارداد سے مارے خوشی کے لڈو پھوٹ رہے ہونگے کہ اُنہیں باغی قرار دینے کی بجائے متوازی طاقت سمجھا جا رہا ہے اور ثالثی کا ڈول ڈالتے ہوئے کچھ لو، کچھ دو کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ شاید اسی لیے سعودی عرب کے وزیرِ مذہبی امور ڈاکٹر عبدالعزیز بن عبداللہ نے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ یمن کی صورتِ حال میں ثالثی کی بات کرنا مذاق کے مترادف ہے۔ اُنہوں نے کہا ''ایک فیصد آبادی کو ننانوے فیصد پر بزورِ طاقت مسلط ہونے کی اجازت کوئی نہیں دے سکتا۔ اِس مسئلے

کا حل یہ ہے کہ باغی ہتھیار پھینک دیں، قانونی حکومت دوبارہ بحال ہو اور پھر حوثی انتخابات میں حصہ لیں۔ وہ اگر اس طریقے سے قانونی حکومت حاصل کرلیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں''۔ ڈاکٹر عبدالعزیز کے اِس بیان سے ظاہر ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کو پاکستان کی ثالثی قبول ہے نہ غیر جانبداری۔ وہ پاکستان سے دوٹوک جواب چاہتے ہیں جو ہمارے حکمرانوں کو دینا ہی پڑے گا۔ امام شافی کا قول ہے ''وقت ایک تلوار ہے اگر تم اسے نہ کاٹو گے تو یہ تمہیں کاٹ دے گا'' اِس لیے ہماری خارجہ پالیسی کے افلاطونوں کو بہرحال کوئی ایسی راہ نکالنی ہوگی جس سے بے لوث دوست سعودی عرب مطمئن ہوسکے۔ اِس تکلیف دہ صورتِ حال سے بہ اندازِ حکیمانہ بچا جاسکتا تھا، اگر ہمارے حکمران ''مشترکہ قرارداد کے شوق میں اپنے تیار کردہ ڈرافٹ میں ایسا اضافہ نہ کردیتے جو کسی بھی برادر اور بے لوث اسلامی ملک کے لیے باعثِ آزار ہوتا۔ شنید ہے کہ غیر جانبدار'' کا لفظ تحریکِ انصاف نے ضِد کرکے قرارداد میں شامل کروایا اور انتہائی'' محترم امیرِ جماعت اسلامی سراج الحق صاحب یمن اور سعودی عرب میں ثالثی پر زور دیتے رہے۔ کپتان صاحب نے توبَرملا کہہ دیا ''یمن کے معاملے پر پارلیمنٹ کی مشترکہ قرارداد میں تحریکِ انصاف نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ہم یمن تنازعے پر حکومت کو خفیہ مفاہمت سے باز رکھنے کے لیے پارلیمنٹ میں گئے۔ پرائی جنگ میں پہلے ہی نقصان اٹھا چکے اب خفیہ ڈیل نہیں ہونے دیں گے''۔ تحریکِ انصاف نے واک آوٹ کی دھمکی دے کر ڈرافٹ سے یہ بھی حذف کروادیا کہ ''پاکستان یمنی باغی حوثیوں

کی شدت پسندی کو غیر قانونی اور غیر اخلاقی سمجھتا ہے''۔قحط الرجال کی انتہا کہ ''متفقہ قرارداد'' کے شوق میں فہم وادراک سے ماورا ایک متنازع قرارداد منظور کرلی گئی ۔حکمرانوں کے اِس ''شوق'' کو مدِ نظر رکھ کر کہنا ہی پڑتا ہے کہ

کم ہونگے اِس بساط پر ہم جیسے بَد قمار

جو چال بھی چلے ہم ، نہایت بری چلے

جنگِ یمن خالصتاً سیاسی مسئلہ ہے جسے اقوامِ مغرب فرقہ واریت کا رنگ دے کر اسلام کو بدنام کرنے کی کوششوں میں مگن اور ہمارا ''جہنم سے نکلا ہوا اتحادی'' امریکہ خوش کہ عالمِ اسلام کے باہم تصادم کی کوئی تو راہ نکلی ۔مسئلہ حرمین شریفین کی حفاظت کا بھی نہیں کہ اُن کی حفاظت کا ذمہ خود ربِ لَم یزل نے لے رکھا ہے ۔اگر کوئی بَد باطن ابرہہ کی طرح پھر حرمین شریفین کی طرف میلی آنکھ اُٹھانے کی جرات کرے گا تو ہمارا ایمان کہ ربِ کائینات اُسے ''کھائے ہوئے بھُس کی مانند'' کر دے گا،اِس کے باوجود یہ بھی ربِ کردگار کا حکم کہ ''اپنے گھوڑے تیار رکھو''۔اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ پارلیمنٹ کا فیصلہ رائے عامہ کا عکاس ہے نہ قومی مفاد کا۔اگر قرارداد میں لفظ ''غیر جانبدار'' نہ ہوتا اور اصل ڈرافٹ کے مطابق حوثیوں کو باغی قرار دیا جاتا تو متحدہ عرب امارات کے وزیرِ خارجہ ڈاکٹر انور قرقاش کی یہ انتہائی نامناسب اور نامعقول دھمکی بھی

سامنے نہ آتی کہ ’’پاکستان کو یمن بحران پر مبہم مؤقف کی بھاری قیمت ادا کرنا ہو گی
۔ڈاکٹر صاحب ہمارے لیے انتہائی محترم کہ ایک برادر اسلامی ملک کے وزیرِ خارجہ لیکن‘‘
یہ بھی عینِ حقیقت کہ ہم پاکستانیوں پر دھمکیوں کا ہمیشہ اُلٹا اثر ہوتا ہے اور من حیث القوم
ہماری نَس نَس میں موجزن خونِ گرم کی لہروں نے ہمارا یہ مزاج بنا دیا ہے کہ

کب دہلا ہے آفاتِ زمانہ سے میرا دِل
طوفاں کو جو آنا ہے تو دروازہ کھلا ہے

لیکن شاید ڈاکٹر صاحب ہمارے مزاج آشنا نہیں یا پھر اُنھوں نے جذبات کی رو میں بہہ
کر ایک ایسا بیان دے دیا جس پر ڈاکٹر عبدالعزیز بن عبداللہ کو بھی یہ کہنا پڑا کہ ’’عرب
امارات کے وزیر کا بیان گلے شکوے سے زیادہ کچھ نہیں‘‘۔یقیناً ایسا ہی ہو گا لیکن شکوہ
جب حد سے گزر جائے تو گالی بن جاتا ہے۔دوسری طرف ہمارے وزیرِ داخلہ چودھری
نثار احمد نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے یہ فرمانا اپنا فرضِ منصبی سمجھا کہ
اماراتی وزیر کی دھمکیاں ستم ظریفی ہی نہیں لمحۂ فکریہ بھی ہیں،پاکستانی قوم غیرت ’’
مند ہے اور مروجہ بین الاقوامی تعلقات کے اصولوں کے مطابق اماراتی وزیر کا یہ بیان
پاکستان اور اُس کے عوام کی توہین اور ناقابلِ قبول ہے‘‘۔حکومتی حلقے تو مصلحتاً ڈاکٹر انور
قرقاش کے اِس متنازع بیان پر خاموش ہی رہے اور وزارتِ خارجہ نے بھی ٹویٹ

کیے گئے اِس بیان کو کوئی اہمیت نہ دی لیکن چودھری نثار صاحب سے جلتی پر تیل چھڑکنے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ اگر اماراتی وزیر کا بیان سفارتی آداب کے منافی ہے تو محترم وزیرِ داخلہ کا بیان بھی حکومتی پالیسی کے مطابق نہیں۔ شنید ہے کہ محترم وزیرِاعظم بھی چودھری صاحب کے اِس غیر متوقع بیان پر برہم ہوئے لیکن ہمارے وزیرِ داخلہ صاحب نے پہلے کبھی پرواہ کی نہ اب کرنے کا ارادہ۔

قصّہ ایک قرارداد کا

ہر مشکل گھڑی میں کندھے سے کندھاملا کر کھڑے ہونے والے سعودی عرب کو ہماری پارلیمنٹ نے ''غیر جانبداری'' کا ایسا تحفہ دیا کہ سعودی بھائی تلملا اُٹھے۔ ہمارے دفترِ خارجہ نے جو مسودہ تیار کیا تھا اُس میں تو واضح طور پر حوثی قبائل کی مذمت کرتے ہوئے اُنہیں باغی قرار دیا گیا تھا لیکن تحریکِ انصاف نے ضد اور دھونس سے اُس مسودے میں کچھ ایسی تبدیلیاں کروائیں کہ پوری قرارداد ہی مبہم اور غیر واضح ہو گئی۔ طُرفہ تماشہ یہ کہ پوری قرارداد میں حوثی قبائل اور اُن کے غیر قانونی اقدامات کا ذکر کرنے کی بجائے ''غیر جانبداری'' اور ثالثی پر زور دیا گیا تھا۔ گویا قرارداد کے مطابق پاکستانی پارلیمنٹ نے اپنے مشرقِ وسطیٰ کے دوستوں کو یہ پیغام دیا کہ پاکستان یمن کے باغیوں اور قانونی حکمرانوں کے مابین تنازعے میں غیر جانبدار رہے گا۔ یہ ''نادر اور منفرد'' قرارداد ''صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں'' کی عملی تصویر تھی کہ ایک طرف غیر جانبداری اور ثالثی کا اعلان اور دوسری طرف سعودی عرب کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونے کی یقین دہانی۔ اِس مبہم قرارداد پر سعودی حکومت کے ردِ عمل سے پہلے متحدہ عرب امارات کے وزیرِ خارجہ ڈاکٹر انور قرقاش نے ''ایویں خوامخواہ'' کھڑاک کرتے ہوئے الطاف بھائی کی طرح یہ ''بڑھک'' لگادی کہ پاکستان کو اِس قرارداد کی بھرپور قیمت ادا کرنی پڑے

گی۔ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر انور قرقاش نے یہ ''کھڑاک'' کرکے ہم پر احسان ہی کیا کیونکہ اِس کھڑاک سے نہ صرف سعودی حکومت کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا بلکہ اُسے یہ وضاحت بھی کرنی پڑی کہ متحدہ عرب امارات کے وزیر کا بیان محض وقتی اشتعال تھا۔اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ''نادان دوست سے دانا دشمن بہتر''۔ایسے ہی ایک نادان دوست ہماری حکومت کے پاس بھی ہیں،نام اُن کا چودھری نثار احمد،جو وزارتِ داخلہ کا قلمدان سنبھالے ہوئے ہیں ۔چودھری صاحب نے بھرپور انداز میں اماراتی وزیر کو نہ صرف للکارا بلکہ یہ پیغام بھی دے دیا کہ

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں

پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

قوم تو خوش کہ چودھری صاحب نے عوامی جذبات کی ترجمانی کی (ویسے اِس بیان پر تھوڑا تھوڑا غصّہ ہمیں بھی آرہا تھا) لیکن وزیرِ اعظم پریشان کہ چودھری صاحب نے بنا سوچے سمجھے اور مشورہ کیے بیان داغ دیا۔چودھری نثار صاحب کو یہ تو پتہ ہی ہوگا کہ جن قوموں کا انحصار کاسۂ گدائی پر ہوتا ہے اُنہیں ''مخدوم'' کہلانے کا کوئی حق نہیں ہوتا ۔اسی لیے تو میرے آقا ﷺ نے کہا تھا کہ دینے والا ہاتھ ،لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔

متحدہ عرب امارات کے نائب وزیر کی دھمکیوں اور شیخ صالح بن عبدالعزیز کے

اِس بیان کے بعد کہ '' یمن پر ثالثی مذاق ہے'' ضروری ہوگیا کہ مشرقِ وسطیٰ کے برادر اسلامی ممالک کی غلط فہمی دور کی جائے ۔ معاملات چونکہ کچھ زیادہ ہی بگاڑ کی طرف گامزن تھے اِس لیے وزیرِ اعظم صاحب کو ذاتی حیثیت میں یقین دہانی کرانا پڑی کہ حکومت حوثی قبائل کی پُرزور مذمت کرتی ہے اور یمن میں صدر ہادی کی حکومت کی بحالی چاہتی ہے ۔ وزیرِ اعظم صاحب نے فرمایا ''سعودی عرب سٹریٹیجک پارٹنر ہے ، ہم اِس کے ساتھ کھڑے ہیں۔ سعودی عرب کی علاقائی خود مختاری کی کسی بھی خلاف ورزی یا حرمین شریفین کو خطرے کی صورت میں سخت ردِ عمل دیا جائے گا۔ ہم یمن میں حوثیوں اور دیگر غیر ریاستی عناصر کی جانب سے قانونی حکومت کو گرانے کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ ہم اپنے دوستوں اور سٹریٹیجک پارٹنرز کو تنہا نہیں چھوڑیں گے''۔ وزیرِ اعظم صاحب کے اِس واضح اور غیر مبہم بیان کے بعد پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں منظور کی جانے والی متفقہ قرارداد کے غبارے سے ہوا نکل گئی یہ الگ بات ہے کہ وزیرِ اعظم صاحب نے کچھ لوگوں کی اشک شوئی کی خاطر یہ بھی کہہ دیا ''یمن بحران پر پارلیمنٹ کی قرارداد حکومتی پالیسی کے مطابق ہے البتہ خلیجی اتحادی اسے صحیح طور پر سمجھ نہیں سکے''۔ خلیجی اتحادی صحیح طور پر سمجھے ہوں یا نہ ، ہم ضرور سمجھ گئے کہ وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب کی ''حسِ مزاح'' تاحال قائم ودائم ہے حالانکہ ہم تو سمجھتے تھے کہ طویل جلاوطنی کے دُکھ نے میاں صاحب سے یہ ''حِس'' چھین لی ہے۔ اسی لیے میاں صاحب کے چہرے پر چھائی گھمبیر سنجیدگی کبھی کبھی ہمیں پریشان بھی کر دیتی تھی ۔ میاں صاحب

نے اپنے دوستوں کو واضح، دوٹوک اور غیر مبہم پیغام پہنچا کر خوش بھی کر دیا اور پارلیمانی قرارداد کی ''لاج'' بھی رکھ لی۔ اُنھوں نے تحریکِ انصاف کا غیر جانبداری'' کا بھرم بھی رکھ لیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ''ہم تو ہرگز غیر جانبدار نہیں''۔ اُنھوں نے تحریکِ انصاف کی ضد پر قرارداد میں حوثی قبائل کا براہِ راست ذکر کرنے سے گریز کیا اور پالیسی بیان میں باغی حوثیوں کی بھرپور مذمت بھی کر دی۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ میاں صاحب بڑے ''مخولیے'' ہیں۔

افہام و تفہیم کی اِس فضاء میں پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے سعودی وزیر برائے مذہبی امور شیخ صالح بن عبد العزیز نے پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد کو پاکستان کا اندرونی معاملہ قرار دیتے ہوئے برملا کہہ دیا کہ پاکستان اور سعودی عرب مذہب اور دوستی کے مضبوط دیرینہ رشتوں میں جُڑے ہوئے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رشتے مستحکم ہو رہے ہیں۔ اُنھوں نے سعودی حکومت کے خدشات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ''اسلحے اور طاقت کے زور پر ناجائز طریقے سے یمن میں حکومت کی تبدیلی کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔ سعودی حکومت کے پاس ایسی مصدقہ اطلاعات موجود ہیں کہ حوثی باغیوں نے 500 کلومیٹر دور تک مار کرنے والے میزائل حاصل کر لیے ہیں جس سے اُن کے عزائم واضح ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ میزائل لبنان پر داغنے کے لیے تو نہیں منگوائے گئے''۔ وزیرِاعظم صاحب کے پالیسی بیان کے بعد شیخ صالح بن عبد العزیز کو بہرحال یہ تو یقین ہو گیا ہو گا کہ حالات خواہ

کوئی بھی نہج اختیار کریں، پاکستان بہرحال سعودی عرب کے کندھے سے کندھا ملا کر
کھڑا ہوگا کیونکہ ہم مذہب اور دوستی کے ایسے مضبوط بندھن میں بندھے ہوئے ہیں جسے
اہلبیت کے علم بردار انشاء اللہ کبھی نہیں توڑ سکیں گے۔

اُمیدِ بہار

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

تین عشروں سے کراچی کے در و بام سے ٹکراتی خوف اور دہشت کی فضاء میں عائشہ منزل سے ایک ایسا نعرۂ مستانہ بلند ہوا جس میں مایوسیوں کی شبِ تار میں دراڑیں ڈال دیں۔ روشنیوں کا وہ شہر جس کی آغوشِ محبت میں اپنے پرائے سبھی پناہ پاتے تھے ، وہ ایسی نظرِ بَد کا شکار ہوا کہ اُمیدِ صبح کا روزن تک مفقود ، در و بام پہ مایوسیوں کے ڈیرے ، ہر گھر میں صفِ ماتم اور ہر دَر پہ نوحہ خوانی ۔ تب اہلِ بصیرت کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے

دور لگے وہ وقت ابھی جب ٹھہری رات کے آنگن میں
پھیکا پڑ کے چاند ہمیں آثارِ سحر دکھلائے گا

مایوسیوں کے اِس گھٹا ٹوپ اندھیرے سے ابھرنے والی توانا للکار امیرِ جماعتِ اسلامی محترم سراج الحق کی تھی جس کا لبِ لباب یہ کہ ''مجھے ہے حکمِ اذاں لاالٰہ الااللہ''۔ زبان میں سختی مگر اخلاقی حدوں کے حصار میں ، انداز عوامی کہ وہ ''عوام'' میں سے ہی ہیں ، اُن بصارت و بصیرت سے محروم تَن اجلے مَن میلے لوگوں میں سے نہیں کہ جن کی خواہشوں کے عفریت ''ھِل مَن مزید'' کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ یوں تو ہر امیرِ جماعت محترم لیکن سیاسی فہم و ادراک میں محترم سراج

الحق فزوں تر۔ ہر غیر جانبدار تجزیہ نگار کا یہی تجزیہ اور ہر صائب الرائے کی یہی رائے کہ محترم سراج الحق کے آنے سے جماعت اسلامی کا سیاسی گراف رفعتوں کی جانب گامزن ۔فُٹ پاتھ سے اُٹھ کر پاکستان کی منظم ترین جماعت کی ''امارت'' کے منصب تک پہنچنے والے سراج الحق صاحب نے چونکہ زیست کے ہر کٹھن پَل کو اپنے وجود پہ جھیلا ہے اِس لیے اُن سے بہتر کون جانتا ہے کہ ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات''۔ حرفِ حق کا تقاضہ یہی کہ نہاں خانۂ دِل میں چھپی بات کو کھلے گلاب کی مانند بَرملا کہا جائے اور

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دِل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

محترم سراج الحق صاحب نے بھی دِل میں چھپی ہر بات کو برملا کہتے ہوئے ''اُن'' لوگوں کو للکارا جنہوں نے روشنیوں کے شہر کو اندھیروں کی نذر کر دیا۔ایم کیوایم نامی یہ جماعت ضیاء الحق مرحوم کا ''تحفہ'' ہے۔اُنہوں نے اپنی حکومت کو دوام بخشنے اور جماعت اسلامی کو سبق سکھانے کے لیے کراچی میں ایم کیوایم کی بنیاد رکھی اور پھر اُس کی بھرپور سرپرستی بھی کی۔تب ایم کیوایم نے کراچی میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے تشدد کے ایسے حربے استعمال کیے کہ انسانیت شرم سے مُنہ چھپانے لگی۔ نوگوایریاز اور عقوبت خانے اُسی دَور کی پیداوار ہیں۔ یہ وہ دَور تھا جب حقارتوں کے حصار میں سسکتے کراچی کے عوام پر ہر ظلم

روار کھا گیا لیکن تمام تر ہولناکیوں کے باوجود جماعتِ اسلامی ڈٹ کر میدان میں کھڑی رہی ۔ بہت پہلے ، الیکشن کے ہنگام ، کسی صحافی نے پروفیسر غفور احمد مرحوم سے سوال کیا کہ کیا وہ کراچی میں الیکشن جیت جائیں گے ؟۔اُن کا جواب تھا کہ ہرگز نہیں لیکن وہ میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہتے کیونکہ آج نہیں تو کل یہ ''لسانی جماعت'' اپنی موت آپ مرجائے گی۔تب اُس کی جگہ لینے کے لیے جماعتِ اسلامی کو ہی آگے آنا ہے ۔ وہ وقت توقریب آ لگا کہ ایم کیوایم پہلے سے کمزور ، کہیں کمزور اور پروفیسر غفور احمد کی پیشین گوئی درست ثابت ہونے کو لیکن جب طبلِ جنگ بج چکا تو اپنے ہی بیگانے بن کر سامنے آ گئے۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر تحریکِ انصاف جماعت اسلامی کے لیے میدان خالی کردیتی تو مقابلے کی فضاء قائم ہو جاتی ۔ جماعت اسلامی برسوں سے اِس نشست پر ایم کیوایم کا مقابلہ کرکے دوسری پوزیشن حاصل کرتی چلی آ رہی ہے ۔ 2002ء کے الیکشن میں اسی حلقے سے جماعت نے تیس ہزار سے زائد ووٹ حاصل کیے اور 2004ء کے ضمنی انتخاب میں اسی حلقے سے اُس کے 17 کارکُن شہید ہوئے۔ 2013ء میں جماعت نے صرف 2 گھنٹے بعد کراچی میں الیکشن کا بائیکاٹ کردیا پھر بھی 10 ہزار سے زائد ووٹ حاصل کیے۔اِس لیے حق تو یہی تھا کہ یہ حلقہ جماعت اسلامی کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ بھلے ایم کیوایم انتخاب جیت جاتی کہ یہ حلقہ اُس کا گھر اور قلعہ ہے لیکن مقابلے کی فضاء میں یہ اندازہ ضرور ہوجاتا کہ ایم کیوایم پر کتنے ''ڈینٹ'' پڑ چکے ہیں۔اب نتیجہ آنے پر ایم کیوایم سینہ تان کر یہ کہہ سکتی ہے کہ کراچی میں وہ اپنی مقبولیت

کی اوج پر ہے۔

محترم فرید احمد پراچہ نے اتوار کی شب علماء اکیڈمی منصورہ میں ایک خوبصورت محفل سجائی ۔مہمانِ خصوصی محترم سراج الحق صاحب تھے اور اہلِ صحافت کے تقریباً تمام چیدہ وچنیدہ اصحاب بھی موجود۔ امیرِ محترم کا خطاب مختصر مگر جامع ۔سوال ہوا کہ جب جماعتِ اسلامی اور تحریکِ انصاف کا مقصد ایک ہی ہے اور دونوں جماعتیں خیبر پختونخوا حکومت میں اتحادی بھی تو پھر ایم کیو ایم کے مقابلے میں ایک ہی امیدوار کیوں نہیں ؟۔ محترم سراج الحق نے جواب دیا کہ اُنھوں نے تو کچھ تجاویز دی تھیں جن کا چار روز بعد جہانگیر ترین صاحب نے جواب دیا کہ تحریکِ انصاف کو وہ تجاویز قبول نہیں۔ اتوار ہی کی شب (محترم سراج الحق کے اعزاز میں دیئے گئے عشائیے سے کچھ پہلے) محترم ہارون الرشید ٹی وی ٹاک شو میں یہ کہہ رہے تھے کہ وہ اِس بات کے گواہ ہیں کہ جماعتِ اسلامی کچھ شرائط کے ساتھ (جن کا تعلق آمدہ بلدیاتی انتخابات سے تھا) اپنا امیدوار تحریکِ انصاف کے حق میں دستبردار کرنے کو تیار تھی لیکن جہانگیر ترین صاحب نے بیل منڈھے نہیں چڑھنے دی ۔جب میں نے امیرِ محترم کی زبان سے بھی یہی باتیں سُنیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ ہارون الرشید صاحب کا کہا سچ تھا (حالانکہ میں ہارون الرشید صاحب کے کہے پہ کم کم ہی یقین کرتا ہوں) ۔سچ تو یہی ہے کہ الیکشن 2013ء کی طرح تحریکِ انصاف اب بھی غلط فہمیوں کے جلو میں ہے ۔اگر جلسے ،

جلوسوں، ریلیوں اور ناچ گانوں سے انتخابی نتائج کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا جا سکتا تو آج تحریکِ انصاف دو تہائی اکثریت کے ساتھ حکمرانی کے مزے لوٹ رہی ہوتی لیکن تحریکِ انصاف کی تو "وہی ہے چال بے ڈھنگی، جو پہلے تھی، سو اب بھی ہے"۔ محترم عمران خاں جب پہلی دفعہ کراچی گئے تب "حسبِ سابق" اِدھر اُدھر سے لوگ اکٹھے کرکے خوب ہلا گُلا کیا۔ اُس وقت تک جماعت اسلامی نے اپنی الیکشن مہم شروع بھی نہیں کی تھی۔ تب سروے میں ایم کیو ایم پہلے اور تحریکِ انصاف دوسرے نمبر پر اور جماعتِ اسلامی کہیں نہیں۔ پھر محترم سراج الحق نے کراچی کا دورہ کیا اور عائشہ منزل پر اُن کے ایک ہی خطاب نے وہ رنگ دکھایا کہ دوسرے ہی سروے میں جماعت اسلامی دوسرے نمبر پر آ گئی۔ یہ صورتِ حال تاحال برقرار ہے لیکن پھر بھی خوش فہمیوں کی جنت میں بسنے والی تحریکِ انصاف اپنی ضد پر قائم ہے۔ ہم تو بار بار لکھ چکے کہ قول کے کچے لوگوں سے نسبت کیسی لیکن امیرِ محترم اب بھی تحریکِ انصاف سے مایوس نہیں۔

دیدہ و دِل فرشِ راہ

چین کے صدر شی جن پنگ جب پاکستان کے تاریخی دَورے پر راولپنڈی کی ایئر مارشل نور خاں ایئر بیس پر پہنچے تو اُن کا والہانہ اور پُر تپاک استقبال کیا گیا۔ صدرِ پاکستان ممنون حسین ،وزیرِ اعظم پاکستان میاں نواز شریف ،وفاقی وزراء اور تینوں مسلح افواج کے سربراہان نے معزز مہمان کا استقبال کیا۔ استقبالیہ دُھنوں اور تالیوں کی گونج میں جب چینی صدر اپنی اہلیہ محترمہ کے ہمراہ طیارے سے باہر تشریف لائے تو اُنہیں 21 توپوں کی سلامی دی گئی اور پاکستان کے ثقافتی لباس میں ملبوس بچوں نے پاک چین دوستی کے نعرے لگائے۔ ایئر پورٹ پر باقی سب لوگ تو موجود تھے لیکن ہمیں وزیرِ داخلہ چودھری نثار احمد صاحب ایئر پورٹ پر نظر آئے نہ معاہدوں پر دستخط کرنے کی تقریب میں۔ مانا کہ چودھری صاحب آجکل کچھ ’’روٹھے روٹھے‘‘ سے ہیں لیکن چینی صدر تو ہمارے معزز ترین مہمان تھے۔ اُنھوں نے یوں تو اسلام آباد سے ہی اپنا دَورہ مکمل کرکے واپس چلے جانا ہے لیکن یہ پاک چین لازوال دوستی ہی کا اعجاز ہے کہ لاہور سمیت پورے پاکستان کے شہروں میں خیر مقدمی بینرز آویزاں ہیں۔ ایسے میں وزیرِ داخلہ صاحب کی عدم موجودگی ہر کسی کو بُری طرح کھٹکتی رہی۔

معزز مہمان کی پُرجوش پذیرائی کا ایسا انداز پہلے کبھی نظر نہیں آیا اور یہ بھی غالباً پاکستان کی تاریخ کا پہلا موقع ہے کہ پاکستان کے صدر، وزیرِاعظم ،اور تینوں مسلح افواج کے سربراہان کسی غیر ملکی مہمان کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ وار فتگی اور والہانہ پَن صرف میزبانوں کے چہروں سے ہی نہیں بلکہ خود چینی صدرِ محترم اور اُن کے ساتھ آئے ہوئے وفد کے چہروں سے بھی عیاں تھا۔ محترم شی جن پنگ تو اپنے دَورے سے پہلے ہی یہ فرما چکے تھے کہ پاکستان کے دَورے پر جاتے ہوئے اُنہیں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے وہ اپنے بھائی کے گھر جا رہے ہوں۔ پاک چین تجارتی معاہدوں کے حجم کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ چینی صدرِ محترم واقعی اپنے بھائی کے گھر ہی آئے تھے۔ چینی حکومت نے پاک چین دوستی کی نئی تاریخ رقم کرتے ہوئے اقتصادی راہداری کے 30 منصوبوں سمیت 51 معاہدوں پر دستخط کیے اور آئندہ 2 سالوں میں دوطرفہ تجارتی حجم 20 ارب ڈالر تک لے جانے پر بھی اتفاق کیا۔ چینی حکومت کے سٹریٹجک شراکت داری سمیت 46 ارب ڈالر کے معاہدے پاکستان کے روشن مستقبل کی بنیاد ہیں ۔خواجہ آصف کہتے ہیں کہ چینی صدر کے دورے سے پاکستان کا معاشی نقشہ یکسر تبدیل ہو جائے گا اور ترقیاتی منصوبے مکمل ہونے سے پاکستان کی جان ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف سے بھی چھوٹ جائے گی لیکن پنجاب اسمبلی کے قائدِ حزبِ اختلاف تحریکِ انصاف کے میاں محمود الرشید کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ اُنہیں اِن منصوبوں میں تو کوئی خامی نظر نہیں آئی لیکن دِل کی بھڑاس نکالنا بھی تو ضروری تھا۔ وہ دور کی کوڑی لاتے ہوئے فرماتے

ہیں ”اگر پاکستان میں اندھیروں کا خاتمہ چینی صدر نے ہی کرنا ہے تو حکمران کس مرض کی دوا ہیں۔ حکمران خود کچھ کرنے کے قابل نہیں تو پھر ان کے پاس اقتدار میں رہنے کا کیا جواز ہے۔ اُن کو فوری طور پر اقتدار سے الگ ہو جانا چاہیے“۔ میاں محمود الرشید صاحب کا حکم سر آنکھوں پر لیکن ہمارے ”میاں برادران“ بھی کچھ ضدی واقع ہوئے ہیں اسی لیے تو 126 دنوں کے ”تاریخی“ دھرنے کے باوجود اقتدار سے چمٹے رہے، حالانکہ اکابرینِ تحریکِ انصاف کو تو یقین تھا کہ اِدھر وہ ڈی چوک پہنچے، اُدھر امپائر کی انگلی کھڑی ہوئی۔ 126 روزہ دھرنے کو میں نے تاریخی اِس لیے لکھا ہے کہ اگر یہ دھرنا نہ ہوتا تو چینی صدر 7 ماہ پہلے ہی پاکستان تشریف لا چکے ہوتے اور جن معاہدوں پر آج دستخط ہو رہے ہیں، اُن پر بہت سا کام ہو بھی چکا ہوتا۔ اِس لحاظ سے ڈی چوک والا دھرنا تاریخی ہی ہے کہ وہ چینی صدر کے دورے کی راہ میں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور معزز مہمان کو چھ ماہ انتظار کرنا پڑا۔ بہرحال اب تو چینی صدر پاکستان آ بھی چکے اور معاہدوں پر دستخط بھی ہو گئے۔ اگر نواز لیگ کے دورِ حکومت میں اِن معاہدوں پر بیس، پچیس فیصد عمل بھی ہو گیا تو پھر تحریکِ انصاف ”چراغِ رُخِ زیبا لے کر“ اقتدار ڈھونڈتی ہی رہ جائے گی۔ ویسے محترم محمود الرشید سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب ”شوکت خانم“ عوام کی اعانتوں اور زکواۃ کے پیسوں سے چلتا ہے، علاج ڈاکٹرز کرتے ہیں تو پھر کپتان صاحب ”ایویں خوامخواہ“ شوکت خانم ہسپتال بنانے کا کریڈٹ کیوں لیتے رہتے ہیں؟۔

ہمارے ''لندن والے'' الطاف بھائی اِس بات پر پریشان ہیں کہ میاں شہباز شریف نورخاں ایئر بیس پر کیا کر رہے تھے اور اگر وہ تھے تو پھر دوسرے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کیوں نہیں تھے؟۔ الطاف بھائی کی ''بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی''۔ سوال چونکہ الطاف بھائی کا ہے اور ہم اُن سے خوفزدہ بھی بہت اِس لیے ''ڈرتے ڈرتے'' عرض ہے کہ ہم نے بہت پہلے اداکار عمر شریف کا ایک ڈرامہ دیکھا۔ اُس زمانے میں پاکستان میں ہاکی عروج پر تھی اور ہر کوئی ہاکی کا دیوانہ۔ ڈرامے میں عمر شریف ہاکی پر رواں تبصرہ یوں کر رہے تھے کہ ۔۔۔ گیند کلیم اللہ سے سمیع اللہ ۔۔۔ سمیع اللہ سے کلیم اللہ ۔۔۔ کلیم اللہ سے سمیع اللہ ۔۔۔ سمیع اللہ سے کلیم اللہ ۔۔۔ کلیم اللہ سے سمیع اللہ ۔۔۔ کلیم اللہ اور سمیع اللہ کھیل رہے ہیں، باقی ساری ٹیم چائے پی رہی ہے۔ عرض ہے کہ ملک و قوم کی بہتری کے لیے بھاگ دوڑ کرتے تو میاں برادران ہی نظر آتے ہیں باقی سب تو ''چائے'' ہی پی رہے ہیں۔ ''مکھن مار'' قسم کے کالم لکھنے کی ہمیں عادت نہیں لیکن جب چین کے صدر بھی ہمارے وزیرِ اعظم کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہیں کہ آپ انتہائی تجربہ کار ہیں، آپ نے حکومت سنبھالتے ہی اصطلاحات کا آغاز کیا جو'' پاکستان کے لیے بہت ہی اہم ہیں'' تو پھر ماننا ہی پڑتا ہے کہ یہ وزیرِ اعظم صاحب کی انتھک کاوشوں کا ہی ثمر ہے جو آج چین کے ساتھ 46 ارب ڈالرز کے معاہدوں پر دستخط ہوئے ۔ میاں شہباز شریف کی انتھک محنت کا اعتراف تو پوری چینی قیادت کرتی ہے جبکہ دوسری طرف وزیرِ اعلیٰ

خیبر پختونخوا دھرنوں میں مصروف رہے اور اب بھی اُنھیں کپتان صاحب کے احکامات کی بجاآوری سے فرصت نہیں، محترم قائم علی شاہ اب عمر کے اُس حصّے میں ہیں کہ اُن سے بھاگ دوڑ کی توقع عبث ہے، وہ صرف ''اونگھ'' ہی لیں تو بہت ہے اور انتہائی شریف النفس ڈاکٹر عبدالمالک بھی تاحال کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے۔ الطاف بھائی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ محترمہ مریم نواز وہاں کیا کر رہی تھیں۔ شاید الطاف بھائی کے علم میں نہ ہو کہ چین کے صدرِ محترم کے ہمراہ چینی خاتونِ اوّل بھی پاکستان اِس خوبصورت انداز میں تشریف لائیں کہ اُنھوں نے پاکستانی جھنڈے کی مناسبت سے سبز اور سفید رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو بلاشبہ اُن کی پاکستان سے محبت کا بیّن ثبوت تھا۔ وزیرِاعظم صاحب کی اہلیہ محترمہ بیگم کلثوم نواز اور بیٹی مریم نواز اُسی چینی خاتونِ اوّل کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ کہے دیتے ہیں کہ تنقید برائے تنقید سے ''کچھ'' حاصل نہیں ہوتا البتہ شرمندگی ضرور۔

یہ تو سبھی جانتے تھے کہ حلقہ 246 میں ایم کیوایم کو شکست دینا ناممکنات میں سے ہے کیونکہ اسی حلقے میں ایم کیوایم کے قائد الطاف حسین کا ''نائین زیرو'' نامی گھر ہے اور یہ متحدہ کا قلعہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ تجزیہ نگار تو محض اِس انتظار میں تھے کہ کیا تحریکِ انصاف اور جماعت اسلامی ابتلاء میں گھری متحدہ کی مقبولیت میں کوئی ''ڈینٹ'' ڈال سکتی ہیں یا نہیں؟۔ مسلم لیگ (ن) اور پیپلزپارٹی عقلمند نکلیں کہ اُنہوں نے یہ حلقہ کھلا چھوڑ دیا۔ جماعت اسلامی گزشتہ تیس سالوں سے اسی حلقے سے انتخاب لڑتی چلی آرہی ہے اِس لیے اُس کا ضمنی الیکشن میں حصّہ لینا بنتا تھا لیکن ہمارے کپتان صاحب کو پتہ نہیں کیا سوجھی کہ وہ بھی اپنے ''ہلّے گُلّے'' کے ساتھ میدان میں آن کودے، بہانہ یہ کہ کراچی میں چھائی ہوئی خوف کی فضاء کا خاتمہ مقصود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے ٹارگیٹڈ آپریشن کی بنا پر خوف کا کافی حد تک خاتمہ ہو چکا تھا اور یہی وجہ تھی کہ تحریکِ انصاف کو حلقہ 246 میں ''کھُل کھیلنے'' کا موقع ملا وگرنہ 2013ء کے الیکشن میں تو تحریکِ انصاف کو اِس حلقے سے پولنگ ایجنٹ بھی میسر نہ تھے ۔ حیرت ہے کہ جب پولنگ ایجنٹ میسر تھے نہ ''ڈی جے بٹ'' تب تحریکِ انصاف 32 ہزار ووٹ لے گئی اور اب ''دھوم دھڑکے'' کے باوجود صرف 24 ہزار۔ 2013ء کے انتخاب میں جماعت اسلامی نے ووٹنگ

کے صرف 2 گھنٹے بعد کراچی الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا اِس کے باوجود بھی اُس کے حصّے میں دَس ہزار ووٹ آئے اور اب بائیکاٹ نہ کرنے کے باوجود بھی وہی 10 ہزار۔ یہ ضمنی الیکشن متحدہ قومی موومنٹ نے مہاجر قومی موومنٹ بن کر لڑا اور تحریکِ انصاف سے چار گُنا زیادہ ووٹ لے گئی۔ 2013ء کے الیکشن میں بھی ایم کیو ایم نے چار گُنا ہی زیادہ ووٹ لیے تھے۔ تب بقول نبیل گبول پولنگ سٹیشن خالی پڑے تھے، جہاں صرف متحدہ ہی کے کارکن تھے جو "ٹھپے" لگا رہے تھے لیکن اب تو پولنگ سٹیشنز پر سی سی ٹی وی کیمرے بھی نصب تھے اور اندر باہر رینجرز کا مکمل کنٹرول بھی۔ ایسا زبردست انتظام کہ پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا تھا اِس کے باوجود بھی نتیجہ تو وہی آیا اور ووٹوں کا تناسب بھی وہی جو 2013ء میں تھا۔ کپتان صاحب کہتے ہیں کہ ایم کیو ایم نے گزشتہ الیکشن میں ایک لاکھ پینتالیس ہزار ووٹ حاصل کیے تھے۔ تب اگر اُس نے دھاندلی نہیں کی تھی تو اب اِس کے ووٹوں میں 45 ہزار کی کمی کیوں؟۔ دَر جوابِ آں غزل بھائی رؤف طاہر نے اپنے کالم میں لکھا "تب ٹَرن آؤٹ 55 فیصد کے لگ بھگ تھا جو اِس بار 35 فیصد رہا اور یہ بھی کہ اُس وقت ایم کیو ایم کے مخالف (تحریک اور جماعت) کے مجموعی ووٹ 43 ہزار تھے اب یہ 33 ہزار کیوں"؟۔ ہمارے کپتان صاحب بڑے "حسابی" ہیں۔ وہ گزشتہ دو، سالوں سے یہ "رولا" ڈال رہے ہیں کہ 2008ء کے الیکشن میں نواز لیگ کے 75 لاکھ ووٹ تھے جو 2013ء کے الیکشن میں "دوگنے" ہوگئے۔ پَس ثابت ہوا کہ منظم دھاندلی ہوئی۔ جب اُن سے یہ پوچھا جاتا ہے

کہ 2002ء کے الیکشن میں تو تحریکِ انصاف کے ایک لاکھ بیس ہزار ووٹ تھے ج،وہ 2013ء کے الیکشن میں بڑھ کر ''بہتر گُنا'' کیسے ہو گئے ؟ تو خاں صاحب تیوریاں چڑھا کر کہتے ہیں کہ چھڈّیار ! مخول نہ کراور محترمہ شیریں مزاری تو مرنے مارنے پہ تُل جاتی ہیں۔

تحریکِ انصاف کے ہارنے والے اُمیدوار عمران اسماعیل کہتے ہیں کہ تحریکِ انصاف ایم کیوایم سے ہار کر بھی جیت گئی کیونکہ اُس نے خوف کی فضاء ختم کی ۔ خوف کی فضاء کے خاتمے کا دعویٰ تو نوازلیگ بھی کرتی ہے،سوال مگر یہ ہے کہ کراچی میں جاری آپریشن نائن زیرو پر چھاپے اورٹارگٹ کلرز کی گرفتاری کے باوجود کیاایم کیوایم کمزور ہوئی یااُس، کی مقبولیت پر کوئی ''ڈینٹ''پڑا ؟۔واضح اور قطعی جواب یہی کہ اِس الیکشن نے یہ ثابت کردیا کہ ہم لاکھ ایم کیوایم پرٹارگٹ کلنگ ،بھتہ خوری اور عسکری ونگز کا الزام لگائیں، کراچی، خصوصاً حلقہ 246 کے عوام اُس سے متنفر نہیں ۔اگر جمہوریت کے حوالے سے دیکھاجائے تواس میں ''بندوں کوگنا کرتے ہیں ،تولا نہیں کرتے''۔ گنتی میں بہرحال ایم کیوایم اب بھی آگے ہے ،بہت آگے ۔ تحریکِ انصاف کے ہلّے گُلّے اور شور شرابے کے باوجودایم کیوایم تحریکِ انصاف سے چارگُنازیادہ ووٹ لے گئی۔خوب کہاجیتنے والے کنورنوید جمیل'' تحریکِ انصاف کے لوگ تو کراچی میں '' میلے ٹھیلے''کے لیے آئے تھے ۔محترم عمران خاں نے ایم کیوایم کے زیرِاثر''

کراچی کے عوام کو ''زندہ لاشیں''قرار دیا تھا۔ لیکن اُن ''زندہ لاشوں'' نے ایک بار پھر یہ ثابت کردیا کہ اُن کی ہر ''قبر'' کا ہر راستہ نائن زیرو پر ہی جا کر ختم ہوتا ہے۔

ایم کیوایم کی کامیابی سے اِس تاثر کی بھی نفی ہو جاتی ہے کہ 2013ء کے الیکشن میں کوئی منظم دھاندلی ہوئی ہوگی کیونکہ اِس ضمنی انتخاب سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ضمنی انتخاب میں حصّہ لینے والی سیاسی جماعتوں کے مینڈیٹ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔اِس صورتِ حال میں جوڈیشل کمیشن کے سامنے تحریکِ انصاف کا کیس کمزور ہوا ہے۔ویسے بھی تاحال تو تحقیقاتی کمیشن کے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں پہنچا۔ تحریکِ انصاف کو ثبوت جمع کروانے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت دی گئی لیکن اُس نے 15 اپریل کو داخل کروانے والے نکات کی ہی وضاحت کے بعد وہی جواب دوبارہ داخل کروادیا جس پر جسٹس امیر مسلم ہانی صاحب نے کہا کہ یہ تو محض گزشتہ نکات کی وضاحت ہے کوئی نئی بات نہیں۔ محترم چیف جسٹس ناصرالملک نے تحریکِ انصاف کے وکیل عبدالحفیظ پیرزادہ سے پوچھا کہ ''دھاندلی کا منصوبہ کس نے بنایا، کہاں اور کیسے اِس پر عمل ہوااور اِس میں کون لوگ ملوث تھے''؟۔ عبدالحفیظ پیرزادہ کا وہی گھڑا گھڑایا جواب تھا جو محترم عمران خاں نے حلقہ 122 کے الیکشن ٹربیونل کے سامنے دیا تھا۔ پیرزادہ صاحب نے کہا کہ الیکشن ریکارڈ کے معائنے، گواہوں کے بیانات اور عمومی عوامی تاثر ہی وہ شہادتیں ہیں

جن کی بنیاد پر کمیشن کو پیش رفت کرنی چاہیے۔ سوال مگر یہ ہے کہ محترم عمران خاں جو گزشتہ دو سالوں سے جلسے، جلوسوں، ریلیوں، پریس کانفرنسوں اور ٹاک شوز میں تواتر کے ساتھ یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اُن کے پاس ڈھیروں ڈھیر ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہیں اور جونہی تحقیقاتی کمیشن بنا منظم دھاندلی ثابت ہو جائے گی۔ اب جبکہ تحقیقاتی کمیشن بن چکا، پھر ''ثبوتوں کا کنٹینر'' تحقیقاتی کمیشن کے سامنے پیش کرنے میں کوتاہی کیوں؟۔ کیا یہ ثبوتوں کی ویسی ہی ''پوٹلی'' تو نہیں جیسی معاہدہ تاشقند کے بعد بھٹو مرحوم کے پاس تھی، وہی ''پوٹلی'' جس کا راز کھولے بغیر بھٹو مرحوم اسے اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گئے۔ اگر کپتان صاحب کے پاس کوئی ثبوت ہے تو اسے جوڈیشل کمیشن کے سامنے پیش کریں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکے اور اگر نہیں تو پھر قوم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ 126 روزہ دھرنے کی صورت میں قومی معیشت کا بیڑا غرق کرنے کی سعی کر کے اُنھوں نے قوم سے کس جرم کا بدلہ لیا ہے؟۔ خاں صاحب نے اب نادرا کے چیئرمین کو خط لکھ دیا ہے کہ اُنہیں حلقہ 122 میں انگوٹھوں کے نشانات کی تصدیق کرنے والے نادرہ کے ڈی جی ڈیٹا پر اعتماد نہیں۔ سچ کہا تھا 2013ء کے الیکشن سے پہلے احسن اقبال صاحب نے ''خاں صاحب سارا الیکشن کمیشن خود تشکیل دے لیں اور ساری نگران حکومتیں خود بنا لیں لیکن یہ لکھ کر دے دیں کہ انتخابی نتائج آنے کے بعد وہ یہ نہیں کہیں گے کہ دھاندلی ہو گئی''۔

جوڈیشل کمیشن کے تین سوال

الیکشن 2013ء میں دھاندلی کی تحقیقات کرنے والے سپریم کورٹ کے جوڈیشل کمیشن نے سیاسی جماعتوں کے لیے ایک سوالنامہ تیار کیا جس کا 29 اپریل (آج) تک جواب مانگا ہے۔ یہ سوالنامہ تین سوالات پر مشتمل ہے۔ پہلا سوال یہ کہ 2013ء کے انتخابات شفاف، غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تھے یا نہیں، اگر شفاف نہیں تھے تو اِس کی وجہ کیا ہے؟۔۔۔ دوسرا سوال یہ کہ کیا الیکشن 2013ء میں منظم طریقے سے دھاندلی کی گئی؟ اگر ایسا ہے تو یہ منصوبہ کس نے بنایا؟، منصوبہ کیا تھا، منصوبے پر عمل درآمد کس نے کیا اور عمل درآمد کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا گیا؟۔۔۔ تیسرا سوال یہ کہ کیا دھاندلی صرف قومی اسمبلی کی نشستوں پر کی گئی یا اِس میں صوبائی اسمبلیاں بھی شامل تھیں۔ اگر صرف قومی اسمبلی کے حلقوں میں دھاندلی ہوئی تو کیا چاروں صوبوں میں ہوئی یا کچھ مخصوص صوبوں میں؟۔ تحقیقاتی کمیشن نے ان تمام سوالوں کے جوابات ثبوتوں سمیت مانگے جس پر ہمارے کپتان صاحب نے ''تھپ کر'' صاف کہہ دیا کہ گزشتہ دو سالوں سے ثبوتوں کی ساری بلیاں تھیلوں میں بند ''میاؤں میاؤں'' کر رہی ہیں لیکن کوئی انہیں باہر نکالنے کو تیار ہی نہیں۔ تحریکِ انصاف نے جلسے کیے، جلوس نکالے، دھرنے دیئے، لیکن مجال ہے جو کسی کے کان پر جوں تک رینگی ہو۔

اگر تحریکِ انصاف نے عبدالحفیظ پیرزادہ کی جگہ ہماری خدمات حاصل کی ہوتیں تو ہم وہیں کھڑے کھڑے جوڈیشل کمیشن کو سارے سوالات کے جوابات دے دیتے۔ ہم کہتے کہ اگر 2013ء کے انتخابات شفاف ہوتے تو ہمیں 126 دنوں تک ڈی چوک اسلام آباد کو ''گندہ'' کرنے کی کیا ضرورت تھی اور یہ جو ہم نے نقد ڈیڑھ لاکھ صفحات جوڈیشل کمیشن میں جمع کروائے ہیں کیا یہ بَس ''ایویں ای'' ہیں؟۔ نواز لیگ لاکھ کہے کہ یہ توِادھر اُدھر سے اکٹھی کی گئی ''ردی'' ہے لیکن ہم جوڈیشل کمیشن سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ''ثبوتوں والے'' اِن قیمتی صفحات کا غور سے مطالعہ کرے، کمیشن کو سارے ثبوت مل جائیں گے کیونکہ ہمارے کسی بھی ''ثبوت'' نے سلیمانی ٹوپی نہیں پہن رکھی جو کسی کو نظر نہ آئے۔ ہم یہ بھی برملا کہہ دیتے کہ اگر معزز جوڈیشل کمیشن کو ان ڈیڑھ لاکھ صفحات کے مطالعے کے لیے وقت درکار ہے تو ہم ''کھُلا وقت'' دینے کو تیار ہیں البتہ یہ استدعا ضرور کہ الیکشن 2018ء سے پہلے اِن صفحات کا مطالعہ ضرور کر لیا جائے۔ رہی انتخابات شفاف نہ ہونے کی وجہ ۔۔۔ وجہ تو صاف ظاہر ہے کہ جس وزارتِ عظمیٰ کا تاج ہمارے کپتان کے سَر پر سجنا چاہیے تھا، اُسے کوئی اور لے اُڑا اور ہم ''نیا پاکستان'' بناتے بناتے رہ گئے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ صرف ہم ہی ہیں جو دلی درد کے ساتھ ملک و قوم کی بہتری چاہتے ہیں لیکن ایک گھناؤنی سازش کے تحت ہمیں ایوانِ وزیرِ اعظم سے کوسوں دور کر دیا گیا جو ہمارا نہیں، ملک و قوم کا نقصان ہے۔۔۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ الیکشن 2013ء میں انتہائی منظم طریقے سے

دھاندلی کی گئی ۔اِس سوال کے دوسرے حصّے میں یہ پوچھا گیا ہے کہ منصوبہ کیا تھا، کس نے بنایا، کس نے عمل درآمد کیا اور عمل درآمد کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا گیا؟۔دھاندلی کا منصوبہ تو صاف ظاہر ہے کہ اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنا تھا البتہ ’’منصوبہ ساز‘‘ ایک نہیں بلکہ کئی تھے ۔ہم کہتے ہیں کہ پنجاب میں دھاندلی کا منظم منصوبہ نواز لیگ نے بنایا، نواز لیگ کہتی ہے کہ سندھ میں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم منصوبہ ساز تھیں، مولانا فضل الرحمن اور اے این پی والے ہر وقت یہ ’’رولا‘‘ ڈالتے رہتے ہیں کہ خیبر پختونخوا میں تحریکِ انصاف نے الیکشن کی شفافیت کو داغدار کر دیا البتہ بلوچستان کے بارے میں سبھی سیاسی جماعتوں نے ’’ہَتھ ہَولا‘‘ ہی رکھا ہوا ہے ۔دھاندلی منصوبے پر عمل درآمد کے لیے اختیار کیے گئے طریقہ ہائے کار بھی ’’وَکھو وَکھ‘‘ ہیں جس کی تحقیقات جوڈیشل کمیشن کے ذمہ ہے ۔ویسے بھی اگر سارا کچھ ہم نے ہی کرنا ہے تو پھر تحقیقاتی کمیشن کی ضرورت ہی کیا ہے ۔۔۔ تیسرے سوال کا جواب یہ کہ یوں تو دھاندلی سوائے خیبر پختونخوا کے ہر جگہ اور ہر حلقے میں ہوئی لیکن پنجاب میں تو دھاندلی نہیں ’’دھاندلے‘‘ ہوئے اِس لیے ہمارا فوکس صرف پنجاب پر ہے ۔ویسے بھی جو پنجاب جیتے وہی پاکستانی سیاست میں ’’مقدر کا سکندر‘‘ کہلاتا ہے اور ’’اقتدار کا ہما‘‘ اُسی کے سَر پر بیٹھتا ہے اِسی لیے ہم پنجاب میں ہونے والے ’’دھاندلوں‘‘ پر نوحہ خواں ہیں۔ معزز جوڈیشل کمیشن سے بھی استدعا کہ وہ بھی صرف پنجاب کو ہی فوکس کرے کیونکہ ظلم صرف ہمارے ساتھ ہوا ہے اور جوڈیشل

کمیشن میں پہنچنے والے باقی سبھی لوگ توبَس ”ایویں ای بیگانی شادی میں عبد اللہ دیوانے“ ہیں۔

معاملہ چونکہ جوڈیشل کمیشن میں ہے اور ہمارے کپتان صاحب نے بھی بَرملا کہہ دیا ہے کہ جوڈیشل کمیشن جو بھی فیصلہ کرے ،اُنہیں قبول ہوگا اِس لیے اِس موضوع کو یہیں چھوڑتے ہوئے کچھ بات خیبر پختونخواہ میں آنے والے طوفانِ بادوباراں کی ۔عرض ہے کہ دنیامیں آنے والے طوفانوں کو پانچ کیٹگریز میں تقسیم کیاگیا ہے۔کیٹگری وَن کم ترین طوفان کوظاہر کرتی ہے جبکہ خیبر پختونخوا میں آنے والاطوفان کیٹگری وَن سے بھی کم تھالیکن پھر بھی 45 جانیں چلی گئیں اور ہسپتال زخمیوں سے بھرگئے۔وجہ یہ کہ مفلسی کے ماروں کے گھر محل نہیں، جھونپڑے ہوتے ہیں اور بوسیدگی کا یہ عالم کہ ذرا تیز ہوا بھی چلے تولرزنے لگتے ہیں۔ریحام خاں کہتی ہیں کہ محکمہ موسمیات نے اگربَروقت اطلاع دی ہوتی تومالی نقصان جو ہوتا، سو ہوتا لیکن انسانی جانیں بچائی جاسکتی تھیں ۔یہ بَروقت اطلاع نہ ملنے کاشاخسانہ ہے کہ اتنی جانوں کازیاں ہوگیا جبکہ محکمہ موسمیات کا کہنا ہے کہ وہ توجمعے کوہی طوفان کی اطلاع دے چکے تھے اور خیبر پختونخوا حکومت کو ہفتے کو بھی بتلایا تھا۔خیر جو ہوا سو ہوا، یہ ایک اندوہناک حادثہ تھاجس سے کئی گھروں کے چراغ گُل ہوگئے۔سوال مگر یہ کہ مَوجِ خوں سَر سے گزر جانے کے باوجود بھی خیبر پختونخوا کی حکومت کہاں تھی؟۔ ریحام

خاں نے کہاکہ عمران خاں صاحب جوڈیشل کمیشن میں مصروف تھے اِس لیے نہیں پہنچ سکے اوراُن کی جگہ وہ خود آ گئی ہیں۔ عرض ہے کہ ذمہ داری ریحام خاں کی تھی نہ عمران خاں صاحب کی ،ذمہ داری تو خیبر پختونخوا حکومت کی تھی جس کے سربراہ جناب پرویز خٹک ہیں۔دھرنوں کے دنوں میں بھی پشاور میں طوفان آیا تھاتب بھی لوگ طوفان کے ہاتھوں مرتے رہے اور خٹک صاحب دھرنے میں ڈانس کرتے رہے۔اب بھی جب خٹک صاحب جب 22 گھنٹوں کے بعدلیڈی ریڈنگ ہسپتال پہنچے توصحافیوں نے اُن سے بَروقت نہ آنے کی وجہ پوچھی ،جس پر ''ماڑی جان'' پرویز خٹک نے غصے سے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا ''میں ڈاکٹر ہوں نہ ایڈمنسٹریٹر ،میرے وزیر اور دوسرے لوگ یہاں پہنچے ہوئے ہیں۔میں کسی کے کہنے پر نہ کہیں جاتا ہوں نہ آتا۔میرا اپنا پروگرام ہوتاہے''۔خٹک صاحب نے بالکل بجا کہا کیونکہ ہوتا ہوگا کہیں اور ''قوم کا سردار ،قوم کاخادم''۔ہمارے ہاں تو قوم کے سردار ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے پرویز خٹک صاحب۔

زبان کا رَس

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔سرگوشیاں

ایک زبان دراز شخص کامارے بھوک سے .براحال تھا۔ کئی دَر کھٹکھٹانے کے بعد بالآخر اُسے ایک گھرسے مٹھی بھرکچے چاول مل گئے لیکن مسٔلہ یہ آن پڑااِن چاولوں کو پکائے کون ؟۔کافی تگ ودَوکے بعدایک.بڑھیااُس کے چاول پکانے کو تیار ہو گئی ۔جب .بڑھیانے چاول چولہے پرچڑھائے تواُس شخص نے.بڑھیاسے پوچھاکہ اِس.بڑھاپے میں اُس کاذریعہ معاش کیاہے اور گزربسر کیسے ہوتی ہے۔.بڑھیانے جواب دیاکہ اُس کاایک ہی جوان بیٹاہے جو محنت مزدوری کرکے اتنا کمالاتاہے کہ زندگی آرام سے گزررہی ہے ۔اُس زبان درازنے.بڑھیاسے سوال کیا''اماں !اگر تمہارابیٹامَرجائے توپھر تمہاراکیا بنے گا؟''۔.بڑھیاغصّے میں آ کربولی '' اپنی جھولی پھیلاؤ'' اُس شخص نے اپنی جھولی پھیلائی تو.بڑھیانے اُبلتے چاول اُس کی جھولی میں اُنڈیل کرکہا''اب یہاں سے دفع ہوجاؤ''۔ گاؤں کی گلی سے گزرتے ہوئے اُبلے چاولوں کاپانی اُس زبان درازکی جھولی سے ٹپک رہاتھا۔لوگوں نے پوچھاکہ اُس کی جھولی سے کیاٹپک رہاہے ؟۔اُس نے جواب دیا''زبان کارَس''۔

محترم الطاف حسین کی تقریرنے بحرِسیاست میں ایساارتعاش پیداکیاکہ ہرطرف ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔غیرپارلیمانی زبان اورالزام تراشی تواب ہماری سیاست

کا جزوِ لاینفک، جس کے جو مُنہ میں آتا ہے، بولتا چلا جاتا ہے لیکن الطاف حسین نے تو ہر حَد" پھلانگ دی۔ فوج کا ردِ عمل مناسب اور بَروقت" ISPR کے میجر جنرل عاصم باجوہ صاحب نے اِس خطاب کو بیہودہ قرار دیا۔ اُن کے ٹویٹ کے بعد اب ہر کوئی" حصّہ بقدرِ جثہ" ڈال رہا ہے اور کچھ تو جثّہ سے بھی زیادہ۔ بلوچستان اسمبلی کی مذمتی قرارداد پاس ہو چکی۔ سندھ اور پنجاب کی اسمبلیوں میں بھی ایسی ہی قراردادیں لانے کا شور اور سینٹ و قومی اسمبلی میں بھی اسی کی بازگشت۔ الطاف حسین صاحب نے معافی مانگ لی اور ایم کیوایم والے وضاحتیں پیش کر کرکے تھک چکے لیکن سیاست دانوں میں خونِ گرم کی لہریں ابھی تازہ دَم۔ سب سے معتدل اور متوازن ردِ عمل قائدِ ایوان اور قائدِ حزبِ اختلاف کا۔ محترم وزیرِ اعظم نے فرمایا"معافی مانگنا ایک اچھا اقدام ہے" اور سید خورشید شاہ نے کہا"جب معافی مانگ لی گئی تو پھر معاملہ ختم ہو جانا چاہیے۔ لیکن کچھ لوگ ایم کیوایم سے گِن گِن کے بدلے لینے کے درپے۔ سوال یہ کہ" اگر واقعی ایم کیوایم ایک دہشت گرد جماعت ہے، ٹارگٹ کلرز اور بھتہ خور اُس کی پناہ میں ہیں، اُس کے اپنے نو گو ایریاز اور عقوبت خانے ہیں، اسے بھارت سے فنڈنگ ہوتی ہے اور اُس کے کارکن" را" سے تربیت حاصل کرتے ہیں تو پھر اِس جماعت پر پابندی چہ معنی دارد؟۔ اُس کے ساتھ تو وہی سلوک ہونا چاہیے جو طالبان نامی دہشت گردوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ لیکن اگر یہ محض الطاف حسین کی لغو، بیہودہ اور بے بنیاد تقریر کا ردِ عمل ہے تو پھر

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

اگر ایم کیوایم کو قومی دھارے میں لانا مقصود ہے تو پھر اس کا طریق کار یہ تو نہیں، جو نظر آ رہا ہے۔ حکمرانوں کو چاہیے کہ اکابرین ایم کیوایم کو اُن کی سیاسی حدود و قیود سے آگاہ کریں اور پھر اس پر سختی سے عمل درآمد بھی ہو۔ اُنہیں یہ سمجھانا کچھ مشکل نہیں کہ محض اُن کے قائد کی تقریروں کا ردِ عمل ہے جو گاہے بگاہے اُنہیں وقفِ مصیبت کرتا رہتا ہے۔ حضرت علیؑ کا قول ہے ''زبان ایک ایسا درندہ ہے کہ اگر تُو اسے کھلا چھوڑ دے تو عین ممکن ہے کہ تجھے ہی پھاڑ کھائے''۔ الطاف حسین صاحب کی زبان کبھی بھی اُن کے قابو میں نہیں رہی۔ یہ آج کی بات نہیں، عشروں سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے، کبھی گھریلو سامان بیچ کر اسلحہ خریدنے کا حکم، کبھی کارکنوں کو فوجی ٹریننگ حاصل کرنے کی ہدایت، کبھی ''چھری اور پلے'' پر طنز اور کبھی یہ کہ ''دیکھتے ہیں دریائے سندھ کا پانی کس کے لہو سے سرخ ہوتا ہے''۔ یہ الطاف حسین صاحب کی زبان کا رَس ہی ہے جو ایم کیوایم کو وقفِ مصیبت اور گرفتارِ بلا کرتا رہتا ہے۔ شیخ سعدی کہتے ہیں ''وہ شخص جس کی زبان کَٹی ہوئی ہو، اُس شخص سے بدرجہا بہتر ہے جس کی زبان قابو میں نہ ہو''۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ اعضائے جسمانی میں سے سب سے زیادہ نافرمان زبان ہی تو ہے اور الطاف حسین صاحب کی زبان کچھ زیادہ ہی نافرمان۔ ہم نے

تو انہی کالموں میں کئی بار دست بستہ استدعا کی کہ
اتنا نہ اپنی جائے سے باہر نکل کے چل
دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ، سنبھل کے چل

لیکن نقار خانے میں تُوتی کی آواز بھلا کون سنتا ہے اور الطاف حسین صاحب تو ویسے بھی "مَن موجی" قسم کے انسان ہیں۔ وہ اپنے کارکنوں سے گھنٹوں بلکہ پہروں کبھی "ویڈیو اور کبھی آڈیو لنک پر خطاب کرتے رہتے ہیں اور خود سامعین کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اُنھوں نے کب، کیا کہہ گزرنا ہے۔ یہ اُن کی ذہنی رَو کا شاخسانہ ہے کہ وہ کبھی تلاوت کرتے کرتے لہک لہک کر گانا، گانا شروع کر دیتے ہیں اور کبھی گانا گاتے گاتے تلاوت۔ یقین ہے کہ اُن کا ہر خطاب الیکٹرانک میڈیا کے لیے بھی ہمیشہ "باعثِ آزار" ہوتا ہے لیکن میڈیا مجبور اور بے بس کہ اگر "الطاف بھائی" کا براہِ راست خطاب نہ دکھایا گیا تو کراچی میں رہنا مشکل بلکہ انجام ولی خاں بابر جیسا۔ اِس "میڈیائی بے بسی" کا اعلاج صرف حکمرانوں کے پاس لیکن وہ بھی خاموش اور "ٹُک ٹُک دیدم، دم نہ کشیدم" کی عملی تصویر۔ پیپلزپارٹی کو سب پتہ لیکن سیاسی مصلحتیں دامن گیر، نواز لیگ بھی خوب آگاہ مگر فی الحال خاموش۔ پیمرا محض عضوِ معطل، اگر فعال ہوتا تو میڈیا چاہے جتنا بھی آزاد اور بے باک ہو اپنی حدود وقیود سے باہر نکل کر ایسے بیہودہ خطابات کی لائیو نشریات سے گریز ہی کرتا۔ حل تو بہت آسان کہ کسی بھی رہنماء

کا بیان براہِ راست نشر نہ کیا جائے اور آڈیو، ویڈیو خطاب پر مکمل پابندی۔ یہ تبھی ممکن ہے جب ہمارا پیمرا مکمل طور پر فعال اور سیاسی آلائشوں سے پاک ہو لیکن یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ پیمرا نامی ادارہ صرف تنخواہوں اور مراعات کے حصول کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ عوام کی رگوں سے کشید کیے گئے خون پر پلنے والے اِس ادارے کی فعالیت پہلے کبھی نظر آئی، نہ اب آنے کی توقع۔

تحریکِ انصاف کی پہلی جیت

خواجہ سعد رفیق کے حلقہ 125 (لاہور) کے الیکشن ٹربیونل نے انتخاب کو کالعدم قرار دے کر 60 دنوں میں دوبارہ انتخاب کروانے کا حکم دے دیا۔ الیکشن ٹربیونل کا فیصلہ آتے ہی سونامیوں کے ''تنِ مُردہ'' میں گویا جان پڑ گئی۔ وہ رات گئے تک بھنگڑے ڈالتے اور مٹھائیاں تقسیم کرتے نظر آئے۔ ہمیں ایک سونامیے نے کہا ''اَج میرا نچنے نوں جی کردا'' تو ہم نے بھی مسکرا کے کہا کہ یہ تو اُس کا حق ہے کیونکہ یہ پہلی دفعہ ہے جب سونامیوں نے وقتی طور پر ہی سہی لیکن لیگیوں کو ''نکرے'' لگایا تو ۔ تحریکِ انصاف کی پوری قیادت بھی سڑکوں پر جھوم رہی ہے۔ میاں محمود الرشید، عبد العلیم خاں اور اعجاز چودھری خوشی سے نہال اور چہروں کی چمک پہلے سے کئی گنا زیادہ۔ وجہ یہ کہ کنٹونمنٹ بورڈ کے الیکشن میں تحریکِ انصاف کی بُری ہزیمت کے بعد ان اصحاب کی توشامت آئی ہوئی تھی اور وہ ہر کس و ناکس کی تنقید کا نشانہ۔ اب خواجہ سعد رفیق کا انتخاب کالعدم قرار دیئے جانے کے بعد وہ ایک دفعہ پھر ''ٹائیگر'' بن گئے۔ شیریں مزاری کہتی ہیں ''دھاندلی کے چہرے سے نقاب سرکنے لگا''۔ کپتان صاحب کا فرمان '' اب دھاندلی پر شک نہیں ہونا چاہیے۔ خواجہ سعد رفیق دو سال سے پارلیمنٹ میں ''اجنبی'' تھے ، وزیرِاعظم بھی جلد ''اجنبی'' ہو جائیں گے۔ نواز لیگ کب تک عوام کو بیوقوف بنائے گی۔ 2015ء الیکشن کا سال ہے

۔اِدھر سونا میبے جی بھرکے خوشیاں منا رہے ہیں اور اُدھر مُنہ بسورتے لیگئے کہتے ہیں کہ'' اگر صرف ایک حلقے کے انتخابات کالعدم قرار دیئے جانے کو بنیاد بنا کر عمران خاں صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ جوڈیشل کمیشن کا فیصلہ اُن کے حق میں آ جائے گا اور وہ 2015ء میں الیکشن کے بعد دو تہائی اکثریت سے جیت کر ایوانِ وزیرِاعظم میں جا پہنچیں گے تو یہ محض '' ایسے ہی ہے جیسے ''بلّی کو چھیچھڑوں کے خواب

الیکشن ٹربیونل نے خواجہ سعد رفیق کے خلاف فیصلہ تو دے دیا ،ٹربیونل کا فیصلہ سَر آنکھوں پر لیکن اِس فیصلے نے بہت سے سوالات کو بھی جنم دے دیا، جس پر نواز لیگ کی طرف سے تحفظات کا اظہار کیا جا رہا ہے ۔ حلقہ 125 سے ہارنے والے امیدوار حامد خاں کہتے ہیں '' کمیشن کے سامنے دھاندلی کے ثبوت پیش کیے تبھی تو اُس نے الیکشن کالعدم قرار دیا'' ۔ لیکن الیکشن ٹربیونل کے فیصلے میں لکھا گیا ہے ''امیدواروں کا دھاندلی میں ملوث ہونا ثابت نہیں ہوا'' ۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو الیکشن ٹربیونل یہ تسلیم کرتا ہے کہ انتخابی عملے سے غفلت ہوئی جبکہ دوسری طرف خواجہ سعد رفیق اور میاں نصیر احمد کو دو سال کی تنخواہیں اور مراعات واپس کرنے کا حکم بھی جاری کرتا ہے ۔ گویا ''ڈِگا کھوتے توں ، کَن مروڑے کمہاری دے'' ۔ اگر غفلت انتخابی عملے سے ہوئی تو سزا خواجہ سعد رفیق اور میاں نصیر احمد کو کیوں ؟ ۔ الیکشن ٹربیونل نے 265 پولنگ سٹیشن میں سے صرف 7 پولنگ

سٹیشنز کے تھیلے نادرا کو تصدیق کے لیے بھجوائے اور نادرا کی رپورٹ کے مطابق 125 ووٹ ایسے تھے جہاں ایک ایک ووٹر نے چھ ،چھ بار ووٹ ڈالا۔ الیکشن ٹریبونل نے اسی کو بنیاد بنا کر الیکشن کالعدم قرار دیتے ہوئے دوبارہ انتخاب کا حکم دے دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا125 جعلی ووٹوں کو بنیاد بنا کر حلقے کے تین لاکھ سے زائد ووٹرز کو سزا کیسے دی جا سکتی ہے؟۔ خواجہ سعد رفیق تو حامد خاں سے لگ بھگ 40 ہزار ووٹوں کے فرق سے جیتے تھے کیا محض 125 ووٹوں کو بنیاد بنا کر اُنہیں گھر بھیجا جا سکتا ہے؟۔ سبھی جانتے ہیں کہ ایسی، چھوٹی موٹی دھاندلی تو ہر جگہ ہوتی ہے ،آپ خواہ کسی بھی حلقے کے پولنگ سٹیشن کا جائزہ لے لیں ،وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اِس قسم کی دھاندلی ہر جگہ نظر آ جائے گی جو بَدانتظامی کا شاخسانہ ہوتی ہے۔ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ پولنگ سٹیشن پر تعینات انتخابی عملے کی مناسب ٹریننگ نہ ہونے کی بنا پر ہی ایسی بدانتظامی سامنے آتی ہے ۔مجھے دورانِ سروس تین ،چار بار بطور پریذائیڈنگ آفیسر کام کرنے کا موقع ملا،اس لیے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ انتخابی عملے کی ٹریننگ کا کسی بھی الیکشن میں مناسب انتظام نہیں کیا جاتا۔ انتخابی عملے کو چند گھنٹوں کے لیے ٹریننگ کی خاطر بلایا ضرور جاتا ہے لیکن اُنہیں صرف ’’انتخابی کتابچہ ہدایات‘‘ دے کر ٹرخا دیا جاتا ہے۔

آج تحریکِ انصاف خوشیاں منا رہی ہے لیکن شاید کسی بھی ’’سونامیے‘‘ میں اتنی

اخلاقی جرات نہیں کہ وہ قوم کو یہ بتلاسکے کہ تحریکِ انصاف نے الیکشن 2013ء کے بعد اپیلیں دائر کیں جن میں سے لگ بھگ پچاس اپیلوں کا فیصلہ ہو چکا اور کسی ایک اپیل 59 کا فیصلہ بھی تحریکِ انصاف کے حق میں نہیں آیا۔ حلقہ 125 کا فیصلہ وہ واحد فیصلہ ہے جو تحریک کے حق میں آیا جس پر بھنگڑے ڈالے اور مٹھائیاں تقسیم کی جا رہی ہیں۔ اِس فیصلے کے خلاف اگر نواز لیگ نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی تو امکانِ غالب ہے کہ فیصلہ خواجہ سعد رفیق کے حق میں ہی آئے گا کیونکہ یہ فیصلہ خامیوں سے مبرا نہیں لیکن ''جذباتی'' خواجہ سعد رفیق تو ایک دفعہ پھر ''لنگوٹ'' کَس کے انتخابی اکھاڑے میں اترنے کو تیار ہے۔ یہ وہی حلقہ ہے جہاں سے تحریکِ انصاف تازہ تازہ کنٹونمنٹ بورڈ کے انتخاب میں ہزیمت اٹھا چکی ہے اور فوج کی نگرانی میں ہونے کی وجہ سے تحریکِ انصاف نے اِن انتخابات کو قبول بھی کر لیا۔ الیکشن ٹربیونل نے 60 دنوں میں دوبارہ انتخاب کا حکم دیا ہے لیکن خاں صاحب کہتے ہیں کہ جتنی دیر تک اِس حلقے کے '' آر اوز'' کے خلاف تادیبی کارروائی نہیں کی جاتی، اتنی دیر تک الیکشن نہ کروایا جائے۔ یہ محض تاخیری حربہ ہے کیونکہ خاں صاحب خوب جانتے ہیں کہ اگر کراچی کے حلقہ 246 کی طرح سی سی ٹی وی کیمروں اور رینجرز کی کڑی نگرانی میں بھی حلقہ 125 کا انتخاب کروایا گیا تو نتیجہ وہی ہو گا جو پہلے تھا۔

محترم خاں صاحب نے ایک دفعہ پھر 2015ء کو الیکشن کا سال قرار دے دیا ہے۔ اگر خاں

صاحب کو حلقہ 125 کے الیکشن ٹریبونل کی طرح باقی ٹریبونلز پر اعتماد ہے اور یہ ٹریبونل اُن کے ''معیار'' پر پورے اترتے ہیں تو پھر 2015ء میں تو الیکشن ہوتے نظر نہیں آتے کیونکہ اِن ٹریبونلز نے کل 387 انتخابی عذرداریوں میں سے 355 کے فیصلے سنا دیئے، کچھ لوگ نااہل بھی قرار پائے لیکن کسی ایک کی بنیاد بھی ''منظم دھاندلی'' نہیں تھی ۔ ویسے تو تحریکِ انصاف نے تحقیقاتی کمیشن میں منظم دھاندلی کا کوئی ایک بھی قابلِ قبول ثبوت پیش نہیں کیا لیکن اگر جوڈیشل کمیشن صرف الیکشن ٹریبونل کے فیصلوں کو ہی مدِ نظر رکھتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرے تو پھر بھی منظم دھاندلی توثابت نہیں ہو سکتی اور اگر منظم دھاندلی نہیں تو پھر 2015ء الیکشن کا سال بھی نہیں۔ اگر تحریکِ انصاف یہ سمجھتی ہے کہ جوڈیشل کمیشن محض خواجہ سعد رفیق صاحب کے حلقے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچے گا اور باقی تمام ٹریبونلز کے فیصلوں سے صرفِ نظر کرے گا تو یہ اُس کی بھول ہے اور ''دِل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے''۔ جوڈیشل کمیشن سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی سربراہی میں قائم ہے اور تحقیق کہ اُس نے کسی بھی نتیجے پر پہنچنے کے لیے اپنی راہیں خود متعین کرنی ہیں، کسی فیصلے کو مدِّ نظر رکھ کے نہیں۔

بارش کا پہلا قطرہ

پی ٹی آئی خواجہ سعد رفیق کے حلقے NA-125 میں دوبارہ الیکشن کے حکم کو بارش کا پہلا قطرہ قرار دے رہی ہے اور توقع یہ کہ اب موسلادھار بارش بھی ہوگی۔ یوں تو توقع باندھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھنگھور گھٹائیں اُٹھتی ضرور ہیں لیکن ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر بِن برسے ہی گزر جاتی ہیں۔ تحریکِ انصاف کے دھرنے، جلسے، جلوس اور ریلیاں گھنگھور گھٹائیں ہی تو تھیں جو پاکستانی سیاست میں کوئی قابلِ ذکر ہلچل پیدا کیے بغیر اُفق کے اُس پار گم ہو گئیں۔ پھر بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نمودار ہوا جس سے بارش کا صرف ایک قطرہ گرا جس نے ایک دفعہ پھر تحریکِ انصاف کی آشاؤں اور اُمیدوں کے سارے دیپ روشن کر دیئے۔ اُمیدِ بہار رکھنا تحریکِ انصاف کا حق ہے لیکن یاد رہے کہ جب آشاؤں کے گھروندے کرچی کرچی ہوتے ہیں تو تکلیف بھی بہت ہوتی ہے۔ بخدا ہمیں تحریکِ انصاف سے ذاتی مخاصمت ہے نہ بطور سیاسی جماعت ناپسندیدگی کی کوئی وجہ۔ یہ عین حقیقت ہے کہ نواز لیگ اور پیپلز پارٹی کے مقابلے میں ابھر کر سامنے آنے والی تحریکِ انصاف اِس لحاظ سے ملکی سیاست کے لیے نیک شگون ہے کہ کوئی تو ہو جو حکمرانوں کی غلط پالیسیوں پر نوک ٹوک کر سکے اور اُنہیں ''صراطِ مستقیم'' پر رکھنے کی سعی۔ پی ٹی آئی کے چیئرمین عمران خاں صاحب سے لاکھ اختلاف کے باوجود ہم آج بھی اُنہیں ایک

ایسا قومی ہیرو سمجھتے ہیں جس نے پاکستان کے لیے نہ صرف ورلڈ کپ جیتا بلکہ شوکت خانم کینسر ہسپتال اور نمل یونیورسٹی جیسے کارنامے بھی سرانجام دیئے۔ لاہور کے بعد اب پشاور میں بھی شوکت خانم کینسر ہسپتال تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ خاں صاحب کے اِن رفاعی کارناموں کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ کسی ایک میدان کا شہسوار ہر معاملے کا مردِ میدان ثابت ہو۔ دشتِ سیاست کی سیاحی کرتے خاں صاحب کو انیس برس بیت گئے لیکن تاحال ہم جیسے کم فہموں کو اِس کی سمجھ نہیں آئی۔ اب تو خاں صاحب کے عاشقِ زار "کالمی درویشوں" والے صاحب بھی بَرملا اقرار کرتے رہتے ہیں کہ خاں صاحب کو سیاست کی سوجھ بوجھ نہیں۔ پریشانی تو اُس وقت ہوتی ہے جب خاں صاحب اپنے انہی کارناموں کو سیاست میں خلط ملط کرنے کی کوشش کرتے اور "حصولِ مقصد" کے لیے وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جس پر بعد میں سوائے ندامت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ماضی کے فاسٹ باولر کا غصہ ہمیشہ اپنی انتہاؤں کو چھوتا نظر آتا ہے حالانکہ سیاست تو نام ہی افہام و تفہیم کا ہے اور فہم وتدبر کا تقاضہ بھی یہی کہ انسان اپنے دوستوں میں اضافہ کرے، دشمنوں میں نہیں لیکن خاں صاحب کی نگاہوں میں تو کوئی جچتا ہی نہیں۔ گلگت بلتستان میں اُنہوں نے ایک ہی بال سے کئی وکٹیں اڑانے کی کوشش کی۔ وہ بیک وقت نواز لیگ، پیپلزپارٹی، اے این پی، متحدہ قومی موومنٹ اور جمیعت علمائے اسلام پر گرجتے برستے رہے۔ اُن کے اِس غصّے کی بھینٹ اپنے پرائے سبھی چڑھتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں اُنہوں نے یہ کہہ کر اپنی ہی پارٹی

پر ’’باؤنسر‘‘ پھینک دیا کہ کیونکہ اُن کی جماعت کو کوئی لیڈر میسر نہیں اِس لیے وہ منظم نہیں ہو سکی۔ خواجہ سعد رفیق کے حلقہ 125 میں دوبارہ الیکشن کا حکم ہوا تو خاں صاحب نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر 2015ء کو الیکشن کا سال قرار دینے جیسا ’’نعرہ مستانہ‘‘ بلند کر دیا جس پر خواجہ سعد رفیق نے کہا کہ خاں صاحب تو چاہتے ہیں کہ جب وہ سو کر صبح اُٹھیں تو وزیرِ اعظم ہوں۔ بہتر ہوتا کہ خاں صاحب الیکشن ٹربیونل کے تفصیلی فیصلے کا پہلے مطالعہ کرتے، دوستوں اور وکلاء سے مشورہ کرتے اور پھر کوئی بیان جاری کرتے۔ یہ تفصیلی فیصلہ اپنی نوعیت کا شاید واحد فیصلہ ہے جسے مسلم لیگ نواز اور تحریکِ انصاف اپنے اپنے حق میں کیا جانے والا فیصلہ قرار دے رہی ہیں۔ یہ فیصلہ اب سپریم کورٹ میں چیلنج ہو چکا حالانکہ جذباتی خواجہ سعد رفیق دوبارہ ’’لنگوٹ‘‘ کَس کر میدان میں اترنے پر بضد تھے لیکن جب اکابرینِ نواز لیگ نے اُنہیں یہ سمجھایا کہ اگر وہ دوبارہ الیکشن میں جاتے ہیں تو اِس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اُنہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ حلقہ 125 میں واقعی شدید نوعیت کی بے ضابطگیاں ہوئیں۔ تب کہیں جا کر خواجہ رفیق شہید کے بیٹے نے سپریم کورٹ کا رُخ کیا۔

پتہ نہیں ہمارے کپتان صاحب کو یکایک کیا سوجھی کہ اُنہوں نے بیٹھے بٹھائے نادرا آفس کا رُخ کر لیا۔ چیئرمین نادرا نے خاں صاحب کو قومی سطح کا لیڈر گردانتے ہوئے آٹھ، دس منٹ کی ملاقات بھی کر لی لیکن ملاقات کے بعد خاں صاحب

نے نادرا آفس کے سامنے پریس کانفرنس ''کھڑکا'' دی۔اُنھوں نے صحافیوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے تین نکات کا بار بار ذکر کیا اور کاغذات کا پلندا ہوا میں لہراتے ہوئے فرمایا کہ یہ نادرا کی پری سکین رپورٹ ہے جس میں شدید ترین بے ضابطگیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔پریس رپورٹر نے یہی جانا کہ خاں صاحب کو وہ رپورٹ چیئر مین نادرا نے دی ہوگی اِس لیے کسی نے بھی رپورٹ کے حصول کی بابت سوال نہیں کیا اور نہ ہی خاں صاحب نے وضاحت کی۔خاں صاحب کی اِس پریس کانفرنس کے بعد چیئر مین نادرا کو ایک ہنگامی پریس کانفرنس بلانی پڑی جس میں اُنھوں نے وضاحت کی کہ خاں صاحب نے جو کچھ کہا،اُس کا تو سارے فسانے میں کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔اُنھوں نے فرمایا کہ خاں صاحب کو نہ کوئی پری سکین رپورٹ دی گئی اور نہ ہی اِس سلسلے میں کوئی بات ہوئی۔اِس آٹھ،دس منٹ کی ملاقات میں خاں صاحب نے رپورٹ کی تکمیل میں تاخیر کی وجہ پوچھی جس پر اُنہیں مطمئن کر دیا گیا۔اگلے روز نادرا آفس کی جانب سے ایک وضاحتی بیان جاری ہوا جس میں تحریکِ انصاف کا نام لیے بغیر یہ بتلایا گیا کہ ایک سیاسی جماعت کی طرف سے یہ غلط تاثر پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ حلقہ 122 کی پری سکین رپورٹ میں 30 پولنگ سٹیشنز میں ڈپلیکیٹ سیریل نمبرز کی کاؤنٹر فائلز کی نشاندہی کی گئی ہے۔وضاحتی بیان میں کہا گیا کہ اِس قسم کی کوئی ایک مثال بھی پری سکین رپورٹ میں موجود نہیں۔اِس تاثر کو بھی غلط قرار دیا گیا کہ 50 پولنگ سٹیشنز کے بیلٹ پیپرز مخصوص تھیلوں میں نہیں تھے۔وضاحتی بیان میں یہ بھی کہا گیا کہ

ایک حلقے کی جانب سے اِس بات کا تاثر دینا سرے سے غلط ہے کہ حلقہ 122 میں جعلی بیلٹ پیپر استعمال کیے گئے۔نادرا کے ترجمان نے کہا کہ پری سکین رپورٹ میں کسی واحد مثال کا تذکرہ بھی نہیں ہے کہ ایسی کوئی بیلٹ پیپر بک پکڑی گئی ہو جو الیکشن کمیشن کے لیے مختص نہ کی گئی ہو۔نادرا ترجمان کی اِس NA 122 نے جاری نہ کی ہو یا حلقہ وضاحتی بیان کے بعد خاں صاحب سے یہ پوچھا جانا چاہیے کہ آخر اُنھوں نے کس بنیاد پر صحافیوں کے سامنے اُن تین نکات کا ذکر کیا جنہیں نادرا ترجمان نے مکمل طور پر بے بنیاد قرار دیا۔خاں صاحب نے یہ وضاحت تو کر دی کہ اُنہیں پری سکین رپورٹ نادرا آفس سے نہیں بلکہ ٹریبونل سے ملی تھی لیکن یہ سوال اپنی جگہ کہ خاں صاحب حلقہ میں خود ایک فریق ہیں اور کیا کسی بھی فریق کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ یوں چوری 122 چھُپے ''آفیشل ریکارڈ'' کے حصول کی تگ ودَو کرے۔

پاکستان ترقی کی شاہراہ پر

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

ماؤزے تنگ نے کہا''سو طرح کے پھولوں کو بہار دکھانے دو، سو طرح کے افکار کو مقابلہ کرنے دو۔ خوشبو وہی حاوی ہوگی جو بہتر ہے، رنگ وہی غالب آئے گا جو حقیقی ہوگا''۔ روشنی زمان و مکاں کی پابند ہوتی ہے نہ خوشبو اِس لیے یہ طے کہ سچ کی خوشبو پھیلے گی اور عدل کی روشنی بھی۔ شگفتِ بہار کی ترسی ہوئی قوم اِس انتظار میں کہ ''میزانِ عدل'' کس کو کھرا قرار دیتی ہے اور کسے کھوٹا، کس کا وجود بادِ نسیم کے جھونکوں سے معطر ہوتا ہے اور کون بادِ سموم کے ہاتھوں راندۂ درگاہ۔ جوڈیشل کمیشن کی تیزی اور تیز رفتاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یقین ہو چلا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے کو ہے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ قوم نے نواز لیگ کو ہی اپنے مینڈیٹ سے نوازا لیکن اگر اعلیٰ ترین عدالت کا فیصلہ کچھ اور ہوگا تو بدبخت ترین ہوگا وہ شخص جو نواز لیگ کی حمایت میں اپنا قلم آلودہ کرے گا۔ حیرت مگر یہ کہ جا بجا عدالتیں سج چکیں، الیکٹرانک میڈیا کے اینکرز جج کے فرائض سنبھال چکے اور بلائے جانے والے مہمان ''مَن بھاتی'' تشریحات میں مصروف، حالانکہ جب معاملہ عدالت میں ہوتا ہے تو فیصلہ آنے تک اُس پر بحث نہیں کی جا سکتی لیکن ہمارا الیکٹرانک میڈیا تو ماشاءاللہ کچھ زیادہ ہی آزاد و بے باک اور پیمرا خوابِ خرگوش کے مزے لوٹتی ہوئی۔ عدالتیں بھی اِس

میڈیائی احتساب'' سے نالاں اور تنبیہ کرتی ہوئی لیکن کسی پر پرکاہ برابر بھی'' اثر نہیں۔جب نواز لیگ اور تحریکِ انصاف، دونوں جوڈیشل کمیشن پر متفق تو پھر یہ شاہراہی عدالتیں'' کیوں؟۔اگر فیصلے سڑکوں یا نیوز چینلز پر ہی ہونے ہیں تو پھر عدالتی'' نظام ٹھپ کر دیں۔درست کہا وزیرِ داخلہ چودھری نثار احمد نے کہ ''ججز اُن کو شٹ اپ کال کیوں نہیں دیتے''۔

خاں صاحب کی عدالت تو ہر روز کسی نہ کسی جگہ سجتی ہے۔اُنہوں نے چار روز پہلے نادرا آفس کے سامنے کچھ کاغذات لہراتے ہوئے فرمایا کہ ''یہ نادرا کی پری سکین رپورٹ ہے''۔پھر صحافیوں کے سامنے اُس رپورٹ کے مندرجات کے بارے میں جو کچھ کہا نادرا کی رپورٹ سامنے آنے پر سب جھوٹ ثابت ہوا اور پتہ چلا کہ جو کچھ خاں صاحب فرمارہے تھے اُس کا تو پورے'' افسانے ''میں کہیں ذکر تک نہ تھا۔پھر بھی خاں صاحب کی پیشانی عرقِ ندامت سے تَر نہ ہوئی البتہ اُنہوں نے اُن 93 ہزار ووٹوں کو جعلی قرار دے دیا جن کے بارے میں نادرا نے لکھا کہ انگوٹھوں کے نشانات کی تصدیق ممکن نہیں۔اب خاں صاحب فرماتے ہیں کہ وہ ایک ایک شناختی کارڈ کی خود پڑتال کریں گے کیونکہ اُنہوں نے 26 لاکھ روپیہ جمع کروایا ہوا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ نادرا نے کہیں بھی نہیں لکھا کہ حلقہ 122 کے 93852 ووٹ جعلی تھے۔نادرا نے نہ صرف اِن ووٹوں کی تصدیق کی بلکہ یہ بھی بتایا کہ اِن ووٹرز کے شناختی کارڈ اصلی تھے جو کہ اسی حلقے میں رجسٹرڈ تھے اور ہر ووٹر نے

درست پولنگ سٹیشن پر ووٹ ڈالا البتہ جن کاؤنٹر فائلز کا استعمال کیا گیا، نادرا اُس کی تصدیق نہیں کر سکا کیونکہ اِن کاؤنٹر فائلز پر ثبت انگوٹھوں کے نشانات کا معیار ناقص تھا جس کی بنا پر نادرا کا AFIS نظام اِن ووٹوں کی تصدیق نہیں کر سکا۔ اب خاں صاحب نے شناختی کارڈز کی خود تصدیق کرنے کا اعلان فرمادیا گویا اُنہیں نادرا پر بھی اعتماد نہیں۔ اُنھوں نے تو یہ بھی کہا کہ ''نادرا کے تصدیق شدہ 70 ہزار بیلٹ پیپرز میں سے کم از کم 15 ہزار جعلی ہیں''۔ سوال یہ ہے کہ اگر خاں صاحب کے مطابق حلقہ NA-122 میں صرف 55 ہزار بیلٹ پیپر ہی ''اصلی'' ہیں باقی سب جعلی اور یہ بھی کہ یہ تمام درست (55 ہزار) ووٹ صرف اور صرف خاں صاحب ہی کے بیلٹ بکس کی زینت بنے اور باقی سب اُمیدواروں کو صفر ووٹ ملے۔ تو پھر اس حساب سے تو خاں صاحب کے حاصل کردہ 84 ہزار ووٹوں میں 26 ہزار جعلی قرار پاتے ہیں۔ کیا خاں صاحب قوم کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ اُنھوں نے یہ ''جعلسازی'' کیسے اور کس کے ذریعے سے کی؟۔ اگر خاں صاحب نے دھاندلی نہیں کی تو پھر 26 ہزار جعلی ووٹ کیا فرشتے ڈال گئے ؟۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اُس مقناطیسی سیاہی کا شاخسانہ ہے جو پی سی ایس آئی آر نے الیکشن کمیشن کو مہیا کی۔ 2013ء کے الیکشن کے بعد پارلیمنٹ کے ابتدائی اجلاسوں میں ہی وزیرِ داخلہ چودھری نثار احمد نے پارلیمنٹ میں خطاب کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر کسی بھی انتخابی حلقے کے ووٹوں کے انگوٹھوں کے نشانات کی نادرا سے تصدیق کروائی جائے تو وہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہر حلقے میں پچاس سے ساٹھ ہزار انگوٹھوں کے

نشانات کی تصدیق نہیں ہو سکتی جس کی ایک وجہ تو انتخابی عملے کی نا اہلی اور دوسری ناقص مقناطیسی سیاہی کا استعمال ہے۔

محترم خاں صاحب کا دعویٰ تھا کہ اُردو بازار سے جعلی بیلٹ پیپر چھپوائے گئے جبکہ نادرا رپورٹ کے مطابق تمام بیلٹ پیپر الیکشن کمیشن کے مہیا کردہ ہیں اور کوئی ایک بیلٹ پیپر بھی جعلی نہیں نکلا۔ نادرا رپورٹ کے مطابق لگ بھگ 7100 بیلٹ پیپرز ایسے ہیں جو بد انتظامی ،انتخابی عملے کی نا اہلی یا کسی اور وجہ سے منسوخ کیے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ سارے ووٹ محترم ایاز صادق کے کھاتے سے نکال بھی دیئے جائیں تو پھر بھی جیت ایاز صادق کی ہی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود شنید ہے کہ اب ''آزادی کنٹینر'' لاہور کی سڑکوں پر رواں دواں ہوگا۔ سمجھ سے بالاتر کہ آخر محترم عمران خاں چاہتے کیا ہیں۔ کیا وزارتِ عظمیٰ کے حصول کی خاطر وہ ملکی سالمیت ہی داؤ پر لگا دیں گے؟۔ جب اُن کی ضد پر جوڈیشل کمیشن تشکیل پا چکا تو اب فیصلے کا انتظار کیوں نہیں کیا جاتا۔ کیا جوڈیشل کمیشن پر اعتبار نہیں یا مقصد کچھ اور ہے؟۔ ویسے تحریکِ انصاف پنجاب کے صدر اعجاز چودھری ایک ٹاک شو میں دل کی بات زبان پر لے آئے۔ اُنھوں نے کہا ''موجودہ دورِ حکومت میں چینی صدر کا دورہ مستقبل کے سہانے خوابوں کے علاوہ کچھ نہیں''۔ حقیقت یہی ہے کہ تحریکِ انصاف چینی صدر کا دورہ اور 46 ارب ڈالرز کے منصوبوں کو ہضم نہیں کر پا رہی کیونکہ اگر یہ منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچ گئے تو تحریکِ انصاف کا مستقبل

تاریک ہو جائے گا اور وہ خوابوں، خیالوں میں بھی اقتدار کے ایوانوں تک نہیں پہنچ سکے گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تحریکِ انصاف نے ایک دفعہ پھر سڑکوں پر نکلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ خبر بھی تحریکِ انصاف کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں کہ جسٹس انور ظہیر جمالی کی سربراہی میں قائم کردہ تین رکنی بنچ نے حلقہ 125 میں الیکشن ٹریبونل کا فیصلہ معطل کرکے خواجہ سعد رفیق کی قومی اسمبلی کی نشست کو بحال کر دیا ہے اور پی پی 155 کی صوبائی نشست بھی بحال کر دی گئی ہے۔ غیر جانبدار تجزیہ نگاروں کا یہی خیال تھا کہ اگر الیکشن ٹریبونل کا فیصلہ سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا تو فیصلہ نواز لیگ کے حق میں ہی آئے گا۔ شاید اسی خبر نے خاں صاحب کی تلملاہٹ میں اضافہ کر دیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ

خواہش تو ہے کہ دِل کو سکوں آشنا کریں
کم ہوں نہ شورشیں ہی تو کیا کریں

اور ہم بھی تحریکِ انصاف کے لیے دعا گو ہیں کہ

آئے نہ پھر بہار اُڑانے تیرا مذاق
اے برگِ زرد آ تیرے حق میں دعا کریں

ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے

سچ تو یہی ہے کہ ہم سنجیدہ کالم لکھ لکھ کر تھک بلکہ ''ہپھ'' چکے اور یہ بھی عین حقیقت کہ خشک کالم ہم سے لکھے جاتے ہیں نہ پڑھے۔ کتنے خوبصورت تھے وہ دِن جب دھرنوں کا موسم تھا اور ہم اپنے کالموں میں کبھی کپتان صاحب اور کبھی علامہ قادری کے بارے میں طرح طرح کی موشگافیاں کرتے رہتے تھے۔ قادری صاحب ''کینیڈا'' کے ہو رہے اور کپتان صاحب جوڈیشل کمیشن کے۔ شنید ہے کہ اب آزادی کنٹینرلاہور کی سڑکوں پر رواں دواں ہوگا۔ اگر ایسا ہوگیا تو ہماری پانچوں گھی میں لیکن فی الحال تو روکھے پھیکے کالموں پر ہی گزارا کرنا پڑے گا کیونکہ اب نہ تو شیخ رشید کی مارو، مَرجاؤ، جلاؤ، گھراؤ جیسی بڑھکیں سنائی دیتی ہیں نہ الطاف بھائی کے ''گنڈاسے'' کی چمک۔ شیخ صاحب اپنی حسرتوں پہ آنسو بہاتے لال حویلی کے ہو رہے اور الطاف بھائی کی للکار، پھنکار، چِھکار اور مہکار سب ''کراچی آپریشن'' کی نظر ہو گئی۔ اِس کے باوجود بھی الطاف بھائی کہتے ہیں ''ہاتھی مرا سوا لاکھ کا''۔ پہلے تو الطاف بھائی ہر دوسرے دن متحدہ کی قیادت چھوڑنے جیسا ''مخول'' کرتے رہتے تھے لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ لوگ تو سنجیدہ ہی ہو گئے اور فضاؤں میں ''مائنس وَن'' فارمولے کی سرگوشیاں بھی سنائی دینے لگیں تو اُنھوں نے ایک تازہ بہ تازہ ''کھڑاک'' کرتے ہوئے کہہ دیا کہ ''نہ تو کبھی ایم کیو ایم کی

قیادت چھوڑنے کی بات کروں گا اور نہ ہی جیتے جی چھوڑوں گا''۔ ویسے آفرین ہے الطاف بھائی پر کہ مشکلات میں گھرے ہونے کے باوجود وہ تاحال تازہ دَم ہیں اسی لیے تواُنھوں نے گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد کو گورنری چھوڑنے کا حکم صادر فرما دیا ہے۔ اُدھر ماضی کے دو کردار بھی ہمارے کالموں کا پیٹ بھرتے رہتے تھے لیکن اب وہ بھی مفقود الخبر۔اللہ سلامت رکھے ہمارے پہلوان راجہ ریاض فیصل آباد کے ہو رہے اور رانا ثناء اللہ کو سانحہ ماڈل ٹاؤن ''ڈکار'' گیا۔رانا ثناء اللہ تو پھر بھی کبھی کبھی جھلک دکھلا جاتے ہیں لیکن جب سے پیپلز پارٹی ''آؤٹ'' ہوئی ہے راجہ ریاض بھی سدھار گئے۔ اب نہ پیپلز پارٹی کا دَور لوٹے ،نہ راجہ صاحب ''اِن'' ہوں۔یوں تو آجکل میاں برادران کی ''جے جے کار'' ہو رہی ہے لیکن میاں نواز شریف صاحب کی شگفتہ بیانی جلاوطنی کے الاؤ میں جَل چکی ۔اب تواُنھوں نے اپنے ارد گرد بھی پرویز رشید اور مصدق ملک جیسے لوگوں کا ایسا ہجوم اکٹھا کرلیا ہے جو سیاستدان کم اور ''لکھنوی مزاج'' زیادہ لگتے ہیں۔اُن کی اسی ''لکھنویت'' کی بنا پر تحریکِ انصاف اُنہیں پورے ایک سو چھبیس دنوں تک ''پھڑکاتی'' رہی اور یہ ''ٹکٹ ٹکٹ دیدم ،دَم نہ کشیدم'' کی عملی تصویر بنے رہے۔ خادمِ اعلیٰ کا پچھلا پانچ سالہ دِور بڑا ہنگامہ خیز تھا۔اُن کی ہلتی ہوئی انگشتِ شہادت بڑے بڑوں کا ''پِتا پانی'' کر دیتی ۔اُنھوں نے سڑکوں پہ گھسیٹنے کے وعدے تو بہت کیے

لیکن ''وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا''۔آجکل وہ بھی ''ٹھنڈے ٹھار'' ہو کر اکثر بیرونی دَوروں پر ہی رہتے ہیں۔جب سے مولانا قادری ''پرلوک'' سدھارے، چودھری برادران بھی ''ٹھنڈے ٹھار'' ہو کر گھر بیٹھ رہے۔اب اُن کی طرف سے کوئی نرم خبر آتی ہے نہ گرم۔بلاول زرداری اگر ذوالفقار مرزا کا ''تڑکا'' قبول کر لیتے تو شاید کچھ بات بَن جاتی اور ہمارے کالم بھی راہ پا جاتے لیکن بلاول نے بھی ''انکل'' ذوالفقار مرزا کا ساتھ نہیں دیا۔جب یہ صورتِ حال ہو تو بھلا کوئی لکھے بھی تو کیا لکھے لیکن ہم نے بھی ایک راہ نکال لی ہے۔پہلے تو ہم اپنا لکھا کالم بھی نہیں پڑھتے تھے لیکن اب دن میں کئی کئی کالم ''چَٹ'' کر جاتے ہیں، مقصد صرف یہ کہ کوئی محترم کالم نگار کوئی نہ کوئی ایسی بات لکھ جائے کہ ہمیں بات سے بات نکالنے میں آسانی ہو، جیسے ایک محترم لکھاری نے بھائی عطاء الحق قاسمی کی شان میں ایسا کالم لکھا کہ ''اوازار'' طبیعت ہشاش بشاش ہوتی چلی گئی۔اُنہوں نے قاسمی صاحب کے بارے میں لکھا ''آپ اردو مزاح نگاری کی دنیا کے صدر بھی، وزیرِ اعظم بھی اور گورنر بھی۔کیا یہ کم ہے کہ آپ نے مال و دولت کے ذخائر جمع نہیں کیے، تمام عمر قلم کی حرمت کا خیال رکھا، کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا اور جس کو سچ سمجھا، وہی لکھا''۔اِس تعریف و توصیف کے بعد موصوف نے اپنے کالم کی تان جن جملوں پر توڑی، اُنہیں پڑھ کر طبیعت ''ڈبل اوازار'' ہو گئی۔موصوف نے لکھا ''میں آپ کے اُس نون لیگی سچ کا پاسبان نہیں بن سکتا جس میں جگہ جگہ جھوٹ کے پیوند لگے ہوئے ہیں۔الحمدُ للہ آپ کی آنکھیں

دیکھنے کی اہلیت رکھتی ہیں ۔ابھی وقت ہے ،ذرا غور کیجئے‘‘۔ محترم لکھاری کے اِن آخری جملوں کو پڑھ کر مجھے وہ گھساپٹا لطیفہ یاد آگیا کہ ایک وزیر باتدبیر پاگل خانے کا معائنہ کرنے گیا۔ وہاں اُسے ایک ایسا پاگل بھی ملا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقیل و فہیم لگتا تھا۔اُس نے وزیر صاحب کے ساتھ بڑی خوبصورت اور متاثر کُن گفتگو کی ۔ وزیر نے اُس سے پوچھا کہ وہ پاگل خانے کیسے چلا آیا؟۔اُس نے جواب دیا کہ وہ پاگل ہر گز نہیں ،دراصل اُس کے رشتہ داروں نے اُس کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اُسے پاگل ثابت کرکے پاگل خانے بھیج دیا۔وزیر نے کہا’’ میں ابھی تمہاری رہائی کا حکم جاری کرواتا ہوں‘‘۔ جب وزیر واپس جانے کے لیے مُڑا تو پاگل نے اُس کی کمر پر زور سے لات رسید کرتے ہوئے کہا بھولنا نہیں‘‘۔وزیر نے مسکرا کے کہا’’اب تو بالکل نہیں بھولوں گا‘‘۔ محترم لکھاری نے ’’ بھی شاید کچھ ایسا ہی کیا،پہلے تعریف و توصیف اور پھر۔۔۔لیکن شاید یہ سب کچھ ’’بغضِ معاویہ‘‘ کے تحت ہوا۔میاں نواز شریف کی تقاریر اگر کچھ لوگوں کے کانوں میں رَس گھولتی ہیں تو کچھ کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بھی انڈیلتی ہیں ۔ معصوم عن الخطا کوئی بھی نہیں ، شریف برادران نہ کوئی اور لیکن اگر بغض و عداوت کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو قاسمی صاحب کے سچ میں جھوٹ کی پیوندکاری کہیں نظر نہیں آئے گی ۔کیا یہ غلط ہے کہ نواز لیگ کے حکومت سنبھالنے سے پہلے 10 ہزار ارب روپے سے زائد معیشت کا نقصان ہو چکا تھا،امریکی جنگ میں 6 ہزار ارب روپے جھونکے جا چکے تھے اور 7 ہزار فوجی جوانوں کے علاوہ 50 ہزار شہری شہید ہو چکے تھے ۔ کراچی

خونم خون تھااور ملکی خزانے میں صرف 6 ارب ڈالر۔ کیا یہ غلط ہے کہ اب قومی خزانے میں ساڑھے سترہ ارب ڈالر سے زائد کے اثاثے ہیں، دہشت گردی کا تقریباً خاتمہ ہو چکا اور کراچی میں بھتہ خور، ٹارگٹ کلرز اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا یہ بھی غلط ہے کہ رحیم یار خاں میں قائدِ اعظم سولر پلانٹ 100 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کے لیے تیار ہے جو دو سال میں 1000 میگاواٹ تک پہنچ جائے گی، مظفر گڑھ میں ترکی کے تعاون سے 100 بستروں کے ہسپتال کا افتتاح ہو چکا، ساہیوال میں کول پاور پلانٹ کی بنیاد رکھی جا چکی، رجوعہ چنیوٹ میں سونے، تانبے اور لوہے کے اربوں ڈالرز کے ذخائر کی تلاش شروع ہو چکی اور پٹرول کی قیمتوں میں حیرت انگیز کمی ہو چکی۔ کیا یہ بھی غلط ہے کہ چین کے 46 ارب ڈالرز کے منصوبوں پر دستخط کرنے کے بعد بین الاقوامی سرمایہ کاروں کا اعتماد بحال ہو چکا اور معیشت کی ڈوبتی کشتی کو سہارا مل چکا۔ کہا جاتا ہے کہ ''لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں لیکن یہ لاہور کو پیرس بنا رہے ہیں''۔ عرض ہے کہ چین نے بلٹ ٹرین، ایکسپریس ہائی وے اور بلند و بالا عمارتیں کھڑی کرکے چینیوں کو عظیم قوم بنا دیا لیکن اب بھی وہاں 75 فیصد افراد کی فی کس آمدنی 5 ڈالر یومیہ سے کم ہے۔ بھارت میں 80 کروڑ افراد خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں، کروڑوں فُٹ پاتھوں پر سوتے ہیں، پھر بھی وہاں 400 ارب روپے سے ایکسپریس ہائی وے بنائی جا رہی ہے۔ خیبر پختونخوا اور سندھ کی حکومتوں کے حلق ''جنگلا بَس سروس'' کا شور مچاتے مچاتے خشک ہو گئے لیکن اب وہ بھی اسی راہ پر چل نکلے۔

کیا میرے محترم لکھاری اسے ترقیٔ معکوس کہیں گے۔ دست بستہ عرض ہے کہ "ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے"۔ یہ تو صرف 18 ماہ کی کارکردگی ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

بڑا دشمن بنا پھرتا ہے

وہ اہلبیت کے نمائندے نہیں ہو سکتے کہ ابلیس تو خود اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سوچ رہا ہے، ہلاکو اور چنگیز بھی نہیں کہ وہ اپنی تمام تر وحشتوں کے باوجود سامنے آ کر جنگ کرتے تھے اور یہ بزدل چھُپ کر وار کرتے ہیں۔ محبِ وطن پاکستانی تو ہر گز نہیں کہ اُنھوں نے جن معصوموں کے خون سے ہولی کھیلی اُنہی کے سربراہ، سَر آغا خاں، آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے سربراہ بھی تھے۔ وہ مسلمان تو ہو ہی نہیں سکتے کہ مسلمان شقی القلب نہیں ہوا کرتے۔ میرا دین تو الفت و محبت اور یگانگت کا دین ہے اور میرے رَبّ کا فرمان کہ جس نے کسی ایک بے گناہ کو قتل کیا، گویا اُس نے پوری خُدائی کو قتل کر دیا (مفہوم)۔ پھر وہ کون تھے؟۔ شاید یزیدی فوج کے سپاہی جن کی شباہت تو مسلمانوں جیسی تھی لیکن کربلا کی تپتی ریت کو خانوادۂ رسول ﷺ کے خون سے رنگین کرنے والے بھی وہی۔ انجام ”یزیدیوں“ کا بھی بُرا ہوا اور لاریب اِن کا بھی ہو نا طے کہ جن کا نام پتہ نہیں طالبان ہے یا داعش یا پھر فرقہ واریت کو ہوا دینے والے وہ ناسور جو دھرتی ماں کے آنگن میں لاشوں کے ڈھیر لگاتے رہتے ہیں۔

انسانیت کے یہ دشمن 16 دسمبر 2014ء کو آرمی پبلک سکول پشاور کے معصوموں کے

خون سے ہولی کھیل کر بڑے اتراتے پھرتے تھے لیکن پھر چشمِ فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ یہی بزدل چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں گھستے پھرتے اور پاک فوج کے جری جوان اُنہیں بلوں سے نکال نکال کر واصلِ جہنم کرتے رہے۔اب بھی کچھ چوہے اپنے بِلوں میں گھسے ہوئے ہیں جنہیں جہنم کا ایندھن بنایا جا رہا ہے۔کوئی دِن جاتا ہے جب میری سوہنی دھرتی انسانیت کے اِن دشمنوں سے پاک ہو جائے گی۔ہم سمجھتے ہیں کہ کراچی میں ہونے والا المناک "سانحہ صفورا" بجھتے دیئے کی لَو ہے کہ دِیا جب بجھنے لگتا ہے تو اُس کی لَو آخری بار بھڑکتی ضرور ہے۔سانحہ پشاور پر پوری قوم نے یہ عزم کیا کہ وہ دہشت کے ہر نشان کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گی اور اب "سانحۂ صفورا" میں اِس عزم بالجزم کی تجدید ہو گئی۔ اسماعیلی کمیونٹی کی بَس پر حملہ انشاء اللہ دہشت گردی کے تابوت پر آخری کیل ثابت ہو گا۔

اسماعیلی کمیونٹی کے اِن معصوموں کا قصور تھا تو فقط اتنا کہ وہ انتہائی محبِ وطن، شریف النفس اور مرنجاں مرنج لوگ تھے۔ مرنے والوں کی تعداد سینتالیس ہو چکی جن میں انیس خواتین بھی شامل ہیں۔ہمارے سپہ سالار جنرل راحیل شریف سری لنکا کے تین روزہ دَورے پر جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے کہ اِس سانحے کی اطلاع مِل گئی۔اُنہوں نے اپنا دَورہ منسوخ کیا اور کراچی پہنچ گئے۔ وزیرِ اعظم صاحب پاک چین اقتصادی راہداری پر متفقہ مؤقف کے لیے آل پارٹیز کانفرنس میں مصروف

تھے۔وہ کئی گھنٹوں پر محیط اِس کانفرنس کے بعد انتہائی تھکن کے باوجود رات ہونے سے پہلے کراچی پہنچ گئے۔پھر سیاسی اور عسکری قیادت سَر جوڑ کر بیٹھی اور دہشت گردی کے خلاف اِس جنگ کو آخری اور فیصلہ کُن مرحلے میں داخل کرنے کے لیے اختیار کی جانے والی تدابیر کی نوک پلک سنواری جانے لگی۔اعتراض ہوا کہ وزیرِ اعظم صاحب کانفرنس چھوڑ کر فوری طور پر کراچی کیوں نہیں پہنچے۔ایک صاحب جو بیک وقت کالم نگار، اینکر گلوکار، اداکار، مصلح اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ ہیں، نے اپنے کالم میں لکھا ''کمال تو یہ ہے کہ، کراچی میں لاشوں پر لاشیں اُٹھائی جا رہی تھیں اور قوم کے ''عظیم رہنما'' ملکی تاریخ کے اہم ترین اجلاس'' میں آئس کریم، کباب، سموسے، ڈرائی فروٹ اور دیگر ''اشیائے بحالیٔ توند'' مزے لے لے کر تناول فرما رہے تھے، کراچی جانا کسی کے لیے ضروری نہیں تھا۔اسفندیار ولی نے آنکھیں نکال کر منع کیا تو فضل الرحمٰن نے عام سا حادثہ قرار دے کر نظر انداز کر دیا۔مشاہد حسین کے لیے اجلاس ضروری تھا کیونکہ ''آئس کریم ''بہت اچھی تھی اور تحریکِ انصاف کو یہاں سے ایک اور دھرنے کی خوشبو آ رہی تھی''۔محترم نے جو کچھ لکھا، شاید دلی درد کے ساتھ لکھا لیکن اُنہیں یہ غور تو کرنا چاہیے کہ جو طاغوتی طاقتیں پاک چین اقتصادی راہداری کے پلان کو سبوتاژ کرنا چاہتی ہیں آخر اُنھوں نے سانحہ صفورا کے لیے عین اُسی دن کا انتخاب کیوں کیا جس دِن وزیرِ اعظم صاحب اسی اقتصادی راہداری کی بابت بلائی گئی آل پارٹیز کانفرنس میں مصروف تھے۔صاف ظاہر ہے کہ طاغوتی طاقتوں کا مقصد ہی یہ

تھا کہ افرا تفری میں وزیرِاعظم صاحب عازمِ کراچی ہوں اور معاملہ لٹک جائے۔ایوانِ وزیرِاعظم میں منعقدہ آل پارٹیز کانفرنس کے تمام شرکاء کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ کانفرنس جاری رکھی جائے۔اگر یہ کانفرنس منسوخ کردی جاتی تو پاکستان کی ترقی کے دشمنوں کا ایجنڈا پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا۔کانفرنس کے شرکاء کے لیے ظہرانے کا اہتمام پہلے سے کیا جا چکا تھا لیکن مصدقہ اطلاعات کے مطابق وزیرِاعظم صاحب نے دل گرفتگی کے عالم میں ظہرانے کی میز کی طرف رُخ ہی نہیں کیا۔محترم لکھاری نے اپنے کالم میں بھی ذکر کیا اور ہمارے سیکرٹری خارجہ اعزاز احمد چودھری نے بھی اسلام آباد میں ہونے والی ایک تقریب میں برملا کہا ''پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی اور داخلی معاملات میں را'' کی مداخلت کے ناقابلِ تردید شواہد سے بھارت کو بار بار آگاہ کیا جا چکا ہے''

۔اگر بھارت نے پاکستان کو عدم استحکام کا شکار کرنے والی کارروائیوں کا سلسلہ بند نہ کیا تو پھر پاکستان بھرپور جواب دینا جانتا ہے۔بھارت اپنی حد میں رہے اور ''را'' کو بھی قابو میں رکھے''۔افغانستان کے مختصر دَورے پر بھی وزیرِاعظم صاحب اور چیف آف آرمی سٹاف صاحب نے افغانی صدر کو ایسے ناقابلِ تردید ثبوت پیش کیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ''را'' کے ایجنٹ افغانستان کے راستے پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کرتے ہیں۔افغانی صدر اشرف غنی صاحب نے نہ صرف پاکستان کا موٴقف تسلیم کیا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اُن کے پاس بھی ایسے ثبوت ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ را''کے ایجنٹ افغانستان کے راستے''

پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کرتے ہیں۔ سانحۂ صفورا میں یقیناً ''را'' ہی کا ہاتھ ہے اور مقصد اُس پاک چائنہ اکنامک کوریڈور منصوبے کو ثبوتاژ کرنا جس کے منظرِ عام پرآتے ہی بھارت کے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگے ہیں۔

چلتے چلتے کچھ ذکر کپتان صاحب کے ملتان کے جلسے کا۔ تحریکِ انصاف نے ملتان میں ہونے والے پنجاب اسمبلی کے ضمنی انتخاب کی ایک سیٹ کی خاطر اپنے امیدوار کی حمایت میں جلسہ کرکے انتخابی ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا۔ یہ معاملہ الیکشن کمیشن جانے یا تحریکِ انصاف ، ہمیں دکھ ہے تو صرف یہ کہ خاں صاحب کے پاس سانحۂ صفوراکے لواحقین کے دُکھ میں شریک ہونے کا تو وقت نہیں تھا ، کبھی خاں صاحب کی طبیعت خراب ہوتی رہی تو کبھی موسم کی ، اسلام آباد سے کراچی تک خراب موسم کے باوجود جہاز اُڑان بھرتے رہے لیکن خاں صاحب کا طیارہ نہ اُڑسکا البتہ یہی طیارہ ''خوشی خوشی'' ملتان ایئرپورٹ پر پہنچ گیا۔ سانحۂ صفوراکے لواحقین سے تعزیت تو رکھیں ایک طرف ، تحریک کے جلسے میں تو ناچ گانے کا وہی عالم تھا جو اب تحریک کے جلسوں کی پہچان بن چکا ہے ۔اِس دفعہ تو شاہ محمود قریشی صاحب بذاتِ خود ''روسٹرم'' پر کھڑے تھرکتے'' پائے گئے ۔ کم از کم صرف دودِن پہلے ہونے والے دِلخراش سانحۂ'' صفوراچورنگی کا ہی خیال کرلیا جاتا۔

پاک چین اقتصادی راہداری

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔سرگوشیاں

14 اگست 1947ء کو ہم نے لاکھوں شہیدوں کے خون سے رنگین ''پاکستان'' نامی ایک مکان تو حاصل کر لیا لیکن اڑسٹھ سال گزرنے کے باوجود اُس مکان کو ''گھر'' میں تبدیل نہیں کر سکے۔ وجہ یہ کہ اِس مکان کے ''اہلِ اختیار'' نے ''اہلِ اعتبار'' کو لہولہان ساعتوں میں بھی سبز باغ ہی دکھائے کہ وطیرہ اِن کا یہی اور نیت بھی یہی۔ اِس مکان کے مکیں دو واضح حصوں میں تقسیم۔ اہلِ اختیار دُنیا جہاں کی نعمتوں سے مالامال اور نہال جبکہ اہلِ اعتبار پا شکستہ، سراسیمہ اور ایسے نڈھال کہ اگر اُن میں زیست کی رمق ہے بھی تو نرغۂ وہم و گماں میں، تہی دامانی کا یہ عالم کہ دشت در دشت ایک ایک بوند کو ترسے ہوئے اور کم نصیبی ایسی کہ اندوہِ رفتہ کو بھلانے کی سعی کرتے کرتے فلک تازہ زخم دے جاتا ہے۔ اگر کسی روزن سے اُمید کی کرن پھوٹتی دکھائی دے تو اہلِ اختیار اُس کو بند کرنے کی تگ ودَو میں اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لے آتے ہیں۔ خلیل جبران نے کہا ''ترس کھاؤ اُس قوم پر جو کسی سرکش انسان کو اپنا ہیرو بناتی ہے''۔ لیکن ہمارا تو واسطہ ہی ایسے سرکشوں سے ہے جو پاکستان کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔

چینی صدر کے دَورہ پاکستان کے بعد صرف امریکہ ،یورپ اور بھارت ہی نہیں، ہمارے اپنے بھی حیران وپریشان کہ چھیالیس ارب ڈالرز کے منصوبوں کو کیسے سبوتاژ کیا جائے ۔وزیرِاعظم میاں نواز شریف صاحب نے قومی اتفاقِ رائے پیدا کرنے کے لیے وزیرِاعظم ہاؤس میں 13 مئی کو آل پارٹی کانفرنس بلائی ۔اُسی دن کراچی میں صفورا چورنگی پر اسماعیلی کمیونٹی کی بس پر دہشت گردوں نے حملہ کرکے 47 بیگناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔اِس افراتفری میں اے پی سی نتیجہ خیز تو ثابت نہ ہو سکی لیکن احسن اقبال صاحب نے شرکاء کو مقدور بھر مطمئن کرنے کی کوشش ضرور کی البتہ نیتوں کے فتور کا علاج تو کسی کے پاس بھی نہیں ۔اِس اے پی سی کے چار روز بعد عوامی نیشنل پارٹی نے کوئٹہ میں ایک اور اے پی سی بلالی ۔یہ وہی اے این پی ہے جس کے بانی باچا خاں'' نے دمِ واپسیں وصیت کی کہ مرنے کے بعد اُسے پاکستان میں دفن نہ'' کیا جائے ۔یہ وہی اے این پی ہے جس نے کالاباغ ڈیم بننے نہ دیا حالانکہ اگر یہ ڈیم بن جاتا تو نہ صرف لاکھوں ایکڑ بارانی زمین سیراب ہو جاتی بلکہ لوڈشیڈنگ کا عذاب بھی نہ جھیلنا پڑتا ۔کالاباغ ڈیم کے بارے میں تمام ماہرین کی متفقہ رائے یہی تھی اور ہے کہ اِس میں فائدہ سبھی کا اور نقصان کسی کا بھی نہیں ۔اب یہی اے این پی کہتی ہے کہ اقتصادی راہداری کے منصوبے کو ''کالاباغ ڈیم'' بنا دیں گے ۔کوئٹہ میں منعقدہ اے پی سی میں اے این پی بلوچستان کے صدر اصغر اچکزئی نے دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ یہ منصوبہ کالاباغ ڈیم کے منصوبے کی طرح ناکام بھی ہو سکتا ہے ۔پیپلز پارٹی

بھی اِس منصوبے میں واضح نہیں۔ جنابِ آصف زرداری 46 ارب ڈالرز کے منصوبوں کا کریڈٹ خود لیتے رہتے ہیں جبکہ سید خورشید شاہ صاحب کو اِن میں جھول نظر آتی ہے ۔وزیرِاعظم صاحب کی طرف سے بلائی گئی اے پی سی کے بعد شاہ محمود قریشی صاحب نے کہاکہ احسن اقبال نے شرکاء کو بہت احسن انداز میں ''بریف''کیا لیکن کپتان صاحب کو اس میں خامیاں نظر آتی ہیں ۔ سبھی بیک زبان کہ حکومت نے اقتصادی راہداری کے روٹس'' میں تبدیلی کی لیکن احسن اقبال کا چیلنج کہ اگر روٹ میں ایک انچ کی تبدیلی بھی'' ثابت ہو جائے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیاست چھوڑ دیں گے ۔ پھر بھی ''میں نہ مانوں''کی رَٹ ،اصل معاملہ یہ کہ اقتصادی راہداری سے پنجاب کو''بھی'' فائدہ پہنچنے کا احتمال ، جیسے پنجاب تو پاکستان کا حصہ ہی نہیں۔ اندریں حالات حکمرانوں کا یہ عالم کہ

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

انسانی تاریخ تو یہی بتلاتی ہے کہ جب بھی قوموں کو بحرانوں کا سامنا ہوا ، وہ یک جان ویک زباں ہو گئیں۔ قوم تو یک جان ویکسو ہے لیکن رہبری کے داعی منتشر۔ ہر کسی کی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ۔اب قوم کی نظریں جنرل راحیل شریف پر کہ اُن پر اعتبار سینوں میں جگہ پا چکا۔ سانحہ صفورا کے فوری بعد جنرل صاحب سری لنکا کا دورہ منسوخ کرکے کراچی جا پہنچے، حالات کا جائزہ لیا، سول اور عسکری

اداروں سے کئی میٹنگز کیں ،ایک میٹنگ میں وزیرِاعظم صاحب بھی شریک ہوئے اور کراچی آپریشن کو کامیاب بنانے کے لیے کئی فیصلے ہوئے۔اِن فیصلوں کی ایک جھلک نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی میں ''امن، سکیورٹی اور گورننس'' کے موضوع پر بلائی گئی کانفرنس میں کورکمانڈر کراچی ، لیفٹیننٹ جنرل نوید مختار کے خطاب میں دکھائی دی ۔جنرل صاحب نے لفظی بازی گری سے بے نیاز ہو کر صاف اور کھرے لہجے میں کہا کہ اُنہیں معلوم ہے کہ خرابیاں کہاں ہیں۔یہ خرابیاں اچانک پیدا نہیں ہوئیں،انہیں ایک مخصوص اور طے شدہ اسلوب میں اِس شہرپر مسلط کیا گیا اور مافیا نے اِس عروس البلاد کو یوں یرغمال بنایا کہ دَم گھٹنے لگا۔اب کراچی کی روشنیاں لوٹانے کی ساعت آن پہنچی ہے جس کے لیے ملک میں متوازی حکومتوں اور طاقت کے مراکز کا خاتمہ کرنا ہوگا،انتظامیہ اور پولیس کو سیاسی آلائشوں سے پاک اور دہشت گردوں کی مالی معاونت کرنے والوں کا ہر صورت خاتمہ کرنا ہوگا۔اُنہوں نے کہا کہ کراچی میں سیاست اور دہشت گردی میں فرق ختم ہوگیا ہے۔سیاست تشدد سے اور میڈیا خوف سے آزاد ہونا چاہیے ،سیاسی اور مذہبی جماعتیں اپنے عسکری ونگز ختم کریں۔اُن کا یہ بیان تو قوم کے لیے مژدۂ جاں فضاء اور تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا کہ ''ہم انشاء اللہ اِن تمام پیچیدہ معاملات کو جلد حل کرلیں گے کیونکہ ہمارے پاس آپریشن کی ناکامی کا کوئی آپشن نہیں۔قوم کی دعاؤں کے ساتھ ہم کراچی کی روشنیاں لوٹا کر ہی دَم لیں گے''۔جنرل نوید مختار صاحب کا خطاب یقیناً پالیسی بیان ہے اور اچھی خبر یہ ہے کہ اِس معاملے پر سیاسی اور عسکری

قیادت ایک صفحے پر ہے۔ اگر افہام و تفہیم کی فضاء قائم رہی (جو انشاء اللہ ضرور رہے گی) تو ''را'' اور ''موساد'' پاک چین اقتصادی راہداری منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے 30 کروڑ ڈالر تو کیا 30 ارب ڈالرز کا ''سیل'' بھی قائم کرلے، یہ منصوبے انشاء اللہ پایۂ تکمیل تک پہنچ کر ہی رہیں گے لیکن اِس کے لیے بھارت کو اُسی کی زبان میں جواب دینا ہوگا اور یہ جواب پاکستان کی محبِ وطن اور بے مثال خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی دینا خوب جانتی ہے۔ بھارت کو یاد رکھنا ہوگا کہ اگر بلوچستان میں بی ایل اے اور بی ایل ایف نامی چھوٹے چھوٹے گروہ ''را'' کی سرپرستی میں علیحدگی کے لیے کوشاں ہیں تو ہندوستان میں علیحدگی کی کئی ایسی تحریکیں سرگرم۔ اگر بھارت اچھے پڑوسیوں کی طرح امن وسکون سے رہنا چاہتا ہے تو اسے ''را'' کو لگام ڈالنا ہوگی وگرنہ نریندر مودی ''چراغِ رخِ زیبا'' لے کر امن وسکون اور ''شانتی'' کو ڈھونڈتے ہی رہ جائیں گے۔

ہر چند کہ زخمی ہیں قدم، ساتھ دیا ہے

پہلے خلیفۂ راشد حضرت ابو بکر صدیقؓ سے امیر المومنین کا منصب سنبھالنے کے بعد صحابہ کرامؓ نے اُن سے سوال کیا کہ بیت المال سے اُن کی کتنی تنخواہ مقرر کی جائے تو آپؓ نے فرمایا" اُتنی ہی جتنی ایک مزدور کو ملتی ہے"۔ صحابہ کرامؓ نے حیرت سے پوچھا"کیا آپ اتنی قلیل تنخواہ میں گزارا کرلیں گے""؟۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا"اگر ایک مزدور اتنی تنخواہ میں گزارا کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں؟۔اگر یہ تنخواہ میرے لیے ناکافی ہوئی تو پھر میں مزدور کی تنخواہ بھی بڑھادوں گا"۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے بارے میں تو ایسے بہت سے واقعات زبان زدِ عام ہیں۔اُن کا فرمان ہے" امیر المومنین اُس وقت تک گیہوں کی روٹی نہیں کھا سکتا جب تک اُسے یقین نہ ہو جائے کہ اُس کی رعایا میں سے ہر ایک کو گیہوں کی روٹی میسر ہے"۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی زندگیوں پر نظر دوڑا کر دیکھ لیجئے آپ کو کہیں بھی وہ شان و شوکت نہیں ملے گی جو قیصر و کسریٰ کے شہنشاہوں کا خاصہ تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہمارے حکمران خلفۂ راشدین کا دَور لوٹانے کی کوشش کرتے کیونکہ ہم نے زمین کا یہ ٹکڑا ربِ لم یزل سے اِسی عہد کے ساتھ حاصل کیا تھا لیکن ہمارے حکمرانوں نے تو قیصر و کسریٰ کا سا وطیرہ اپنالیا۔ عہد یہ تھا کہ ہم زمین کے اِس ٹکڑے کو اسلام کی تجربہ گاہ بنائیں گے ،نام بھی اسی لیے" اسلامی

جمہوریہ پاکستان" رکھا اور آئین میں بھی درج کر دیا کہ دینِ مبین سے متصادم ہر آئینی شِق کو اسلامی سانچے میں ڈھال دیا جائے گا۔ حصولِ مقصد کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل بھی تشکیل دے دی گئی لیکن آئین اسلامی بن سکا نہ جمہوری۔ میرے رَبّ کا تو یہ فرمان ہے کہ حقوق اللہ تو معاف کیے جا سکتے ہیں (اگر اللہ چاہے تو) لیکن حقوق العباد ہرگز معاف نہیں ہونگے۔ ہمیں حقوق اللہ یاد نہ حقوق العباد کی پرواہ۔ حکمران جب ہماری ہی رگوں سے کشید کیے گئے خون میں سے بقدرِ قطرۂ شبنم ہمیں لوٹاتے ہیں تو انداز ایسا کہ جیسے ہم بھکاریوں کو وہ بھیک دے کر احسانِ عظیم کر رہے ہوں۔ سچ کہا اقبالؒ نے کہ

دستِ دولت آفریں سے مُزد یوں ملتی رہی

اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ہمارے ہاں دنیا جہاں کی ساری نعمتیں اشرافیہ کے لیے مختص اور خزاں دیدہ قوم کے لیے زرد پتوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایک محترم کالم نگار نے اپنے کالم میں اراکینِ پارلیمنٹ کی تنخواہوں اور مراعات کے بارے میں لکھا کہ اراکینِ قومی اسمبلی کی تنخواہ 68 ہزار سے بڑھا کر ایک لاکھ 30 ہزار روپے ماہانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ قومی اسمبلی یا سینٹ کے اجلاس میں شرکت پر ہر رکن کو لگ بھگ 4 ہزار روپے روزانہ ملتا ہے اور یہ رقم قائمہ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت پر بھی ہر رکن کو ملتی ہے۔ چیئرمین قائمہ کمیٹی کو گاڑی، پٹرول اور عملے سمیت

کئی اضافی مراعات بھی ملتی ہیں۔ہر رکنِ اسمبلی کو10 روپے فی کلومیٹر ٹریول الاؤنس ، 3 لاکھ روپے سالانہ کے ٹریول واؤچرز ،90 ہزار روپے نقد ،جہاز کی بزنس کلاس میں سفر کی سہولت ، سرکاری ریسٹ ہاؤس اور بچوں اور والدین کی طبّی سہولتیں میسر ہیں۔شنید ہے کہ اب مرکزی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص پوری زندگی میں ایک بار بھی رکنِ پارلیمنٹ منتخب ہوا ہو تو اُسے اور اُس کے اہل وعیال کو یہ طبّی سہولتیں تا دمِ مرگ میسر رہیں گی ۔ محترم لکھاری نے اپنے کالم میں دِل کے پھپھولے تو خوب پھوڑے اور یہاں تک لکھ دیا کہ اگر اُن کا کہا غلط ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا ، وہ اُن کی سزا لیکن شاید وہ نہیں جانتے کہ حکمرانوں کی نظر میں ہمارے اراکینِ پارلیمنٹ اتنے مجبور، بے کس اور بے بَس ہیں کہ اپنی جیب سے ادویات لینے کی سکت ہی نہیں رکھتے۔وہ تو نانِ جویں کے محتاج ہیں پھر بھلا مہنگی ادویات کے لیے پیسہ کہاں سے لائیں ؟۔اسی لیے ہماری حکومت نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اُن کی ’’بماریوں، شماریوں‘‘کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھالیا کیونکہ یہ کندھے قوم کا خون چوس چوس کر بہت مضبوط ہو گئے ہیں۔بھلے ٹیکسوں کی صورت میں ہمارے اپنے ہی خون سے کشید کیے گئے پیسے سے ہمیں حکومتی ہسپتالوں سے ’’پیناڈول‘‘ کی ایک گولی بھی میسر نہ ہو پھر بھی ہم خوش ہیں کہ گزشتہ 18 ماہ کے دَوران اراکینِ پارلیمنٹ پر لگ بھگ 29 کروڑ روپے صرف تو ہوئے۔ہم سلامِ عقیدت پیش کرتے ہیں اپنے حکمرانوں کو جو’’رہبرانِ قوم‘‘ کی صحت کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔یہ انکشاف تو ہمارے لیے

واقعی حیران کُن ہے کہ ہماری خواتین اراکینِ پارلیمنٹ ''ہتھ'' کرنے میں مردوں سے بھی ''دو ہاتھ'' آگے ہیں۔ وہ اپنی صحت کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے بیماری کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتیں لیکن اِس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ وہ ''طبّی سہولیات'' سے مستفید نہیں ہوتیں۔ ''حصولِ حق'' کے لیے اُنھوں نے کیا خوب راہ نکالی کہ وہ ادویات کے بدلے ''کاسمیٹکس'' کی خریداری کرلیتی ہیں۔ ہمیں اِن کی اِس ''واردات'' پر تو کوئی اعتراض نہیں کہ ہمارا تعلق بھی طبقۂ نسواں سے ہی ہے اور ہم بھی حقوقِ نسواں کے علمبردار البتہ حکومتِ وقت سے یہ گلہ ضرور کہ 20 کروڑ عوام کے لیے صحت کی مَد میں جی ڈی پی کا صرف 0.7 فیصد اور انگلیوں پہ گِنی اشرافیہ کی پانچوں گھی میں۔ کہنا ہی پڑتا ہے کہ

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

ایک طرف تو اشرافیہ کے لیے دنیا جہاں کی نعمتوں کے دَر کھُلے جبکہ دوسری طرف گورنمنٹ ملازمین کا یہ عالم کہ سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنا بھی مشکل بلکہ ناممکن ۔ایک طرف بُلٹ پروف گاڑیوں اور حفاظتی دستوں کے جلو میں سڑکوں پر دندناتی اشرافیہ اور دوسری طرف اُنہی سڑکوں پر احتجاج کرتے ،روتے پیٹتے ملازمین۔ ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ اب اِن ملازمین کی بھی سنی جائے گی لیکن اخباری اطلاعات کے مطابق بجٹ 2015-16 ء میں تنخواہوں اور پنشن میں پانچ سے

دَس فیصد تک اضافہ کیا جا رہا ہے۔ پورا سال سڑکوں پر احتجاج کرنے والے ملازمین کے ساتھ ایسا سلوک سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر یہ خبر درست ہے تو ہم حکمرانوں سے دست بستہ عرض کریں گے کہ وہ بقدرِ قطرۂ شبنم یہ اضافہ بھی اراکینِ پارلیمنٹ کی ادویات اور دوسری سہولتوں کے لیے مختص کر دیں کیونکہ ملازمین تو اِس اضافے کے بغیر بھی خارزارِ زیست کا سفر کاٹ ہی لیں گے لیکن ''نرم ونازک'' اراکینِ پارلیمنٹ کو ''تتی ہوا'' نہیں لگنی چاہیے۔ ہم اپنے مہربانوں کو یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ

گُل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

اے خانہ بَر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

کیونکہ

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب

کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

دوستی کا مضبوط بندھن

ہم سمجھتے ہیں کہ پاک چائنا اکنامک کوریڈور محض دو ملکوں کے باہمی مفادات کا ایک منصوبہ ہی نہیں بلکہ دونوں ملکوں کی اخوت، محبت اور دوستی کا اٹوٹ بندھن بھی ہے۔ امریکہ تو عشروں سے گوادر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا لیکن اب اُسے بھی یقین ہو چلا ہے کہ آبنائے ہرمز سے گزرنے والے دنیا کے 33 فیصد تیل کا چودھری بننے کا اُس کا دیرینہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ اِسی لیے امریکہ میں ہر سطح پر ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ اُدھر بھارتی وزیرِاعظم نریندر مودی کو جب سے اِس منصوبے کا علم ہوا ہے وہ بھی ''مرضِ اسہال'' میں مبتلاء ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر حیران و پریشان کہ ''اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا''۔ سنا ہے کہ اب بھارت کے حکیموں اور ویدوں سے مشورے جاری ہیں تاکہ مودی صاحب کو اِس ''مرضِ نامعقول'' سے چھٹکارا دلایا جا سکے۔
دشمن تو خیر دشمن ہی ہوتا ہے اور وار کرنا اُس کا حق لیکن ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں کے پیٹ میں ''ایویں خوامخوا'' مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔ وزیرِاعظم صاحب نے اکنامک کوریڈور پر اے پی سی بلوائی جہاں احسن اقبال صاحب نے پوری جزئیات کے ساتھ اِس منصوبے کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ تب تو وہاں تنقید و تعریض کی کوئی

تو اہا آواز نہیں اُٹھی لیکن اے پی سی کے خاتمے کے ساتھ ہی ''اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ''۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وزیرِ اعظم صاحب کے پُرتکلف ظہرانے کا اثر ہو کہ شرکائے اے پی سی نے خاموشی اختیار کی۔ وزیرِ اعظم صاحب کی اے پی سی کے چار روز بعد اے این پی نے کوئٹہ میں ایک اور اے پی سی بلا لی جس میں لسانی عصبیت پھیلانے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اِس اقتصادی راہداری منصوبے کو نواز لیگ متنازع بنانے کی کوشش کر رہی ہے اور وہ اِس منصوبے کے فوائد سے خیبر پختونخوا اور بلوچستان کو محروم رکھنے کی تگ ودَو میں ہے۔ ایک محترم لکھاری جو یہ سمجھتے ہیں کہ افلاطون، ارسطو اور بزرجمہر سمیت تمام دانشوروں کی روحیں اُن میں حلول کر چکی ہیں اور اُن کا فرمایا ہوا اتنا مستند کہ اگر کوئی اختلاف کی جرات کرے تو قابلِ گردن زنی، وہ بھی اپنے کالموں میں اقتصادی راہداری کے روٹ پر اکثر ''رولا'' ڈالتے رہتے ہیں۔ ہمیں اِس روٹ کا تو ''کَکھ'' پتہ نہیں تھا البتہ یہ ضرور جانتے تھے کہ اِس منصوبے کی تکمیل سے پاکستان کی نہ صرف قسمت جاگ اُٹھے گی بلکہ غربت و افلاس بھی قصۂ پارینہ بن جائے گی۔ اِس لیے ہمیں رہ رہ کر نواز لیگ پر غصّہ آ رہا تھا کہ وہ اِس منصوبے کو خوامخواہ متنازع بنانے کی کوشش کیوں کر رہی ہے۔ اسی غصّے نے ہماری تحقیق کو مہمیز دی اور تھوڑی سی تحقیق کے بعد ہی ہمیں علم ہو گیا کہ قوم کو گمراہ کرنے کے لیے ''سفید جھوٹ'' بولا جا رہا ہے۔ رہی سہی کسر وزیرِ منصوبہ بندی، ترقی و مواصلات احسن اقبال صاحب کے کالم نے نکال دی۔ اُن کا کالم پڑھ

کر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ نریندر مودی نے تو''ایویں ای'' 39 کروڑ ڈالر دے کر ''را'' کو اِس اقتصادی منصوبے کی ناکامی کا مشن سونپا ہے ،اُنہیں یقین ہونا چاہیے تھا کہ پاکستان کے اندر بھی ایسے ''ماہرین'' موجود ہیں جو اِس منصوبے کو ''کالاباغ ڈیم'' بنا کر ہی دَم لیں گے۔

اقتصادی راہداری کا صرف ایک روٹ نہیں بلکہ تین روٹ ہیں جن میں سے کوئی ایک روٹ بھی ایسا نہیں جو بلوچستان اور خیبر پختونخوا سے نہ گزرتا ہو۔ مغربی ،وسطی اور مشرقی روٹس میں سے مغربی روٹ گوادر ،بسیمہ ،سریاب، قلات، کوئٹہ، قلعہ سیف اللہ ژوب ،ڈیرہ اسماعیل خاں ،اسلام آباد اور پشاور سے خنجراب جبکہ وسطی روٹ گوادر، بسیمہ ،خضدار ،رتوڈیرو اور انڈس ہائی وے پشاور سے خنجراب تک ہے۔ مشرقی روٹ، گوادر ،بسیمہ ،خضدار، سکھر، کراچی ،ملتان ،لاہور ،اسلام آباد، پشاور سے خنجراب تک ہے۔اِن تینوں روٹس کو سامنے رکھتے ہوئے کسی عام فہم آدمی کو بھی یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہو گی کہ اقتصادی راہداری کا سب سے زیادہ فائدہ بلوچستان اور خیبر پختونخوا کو ہی پہنچنے والا ہے۔ مغربی روٹ پر تیزی سے کام جاری ہے اور یہ روٹ 2016 ء میں فعال ہو جائے گا۔اِس روٹ سے پنجاب کا کوئی ایک شہر بھی منسلک نہیں۔اسی روٹ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اِس کا سب سے زیادہ فائدہ بلوچستان کو پہنچے گا۔ بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں بلوچستان اقتصادی راہداری کا گیٹ وے بننے جارہا ہے۔ گوادر سے کوئٹہ

اور گوادر سے سکھر اقتصادی راہداری سے اندرون بلوچستان کے تمام پسماندہ علاقے ملک کے دیگر حصوں سے منسلک ہوجائیں گے جس سے نہ صرف روزگار کے لاتعداد مواقع میسر ہوں گے بلکہ ایسی سیاسی بیداری پیدا ہوگی جو بلوچی سرداروں کو ہر گز قبول نہیں کیونکہ اگراندرون بلوچستان پسماندگی اورجہالت دور ہو گئی تو یہ سرداراپنے سیاسی مقاصدحاصل نہیں کر سکیں گے۔

اب آیئے ''ارسطوئے دَوراں''کے جھوٹ کی اُس پٹاری کی طرف جسے محترم اپنے کالموں میں کھول کے قوم کوگمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔اپنے حالیہ کالم (23 مئی) میں اُنھوں نے ''دَرجوابِ آں غزل''احسن اقبال صاحب کے کالم کاجواب دینے کی کوشش ضرورکی لیکن اِدھراُدھر کی باتوں اور'' طعنوں مہنوں''کے سوااُس میں ''کچھ'' نہیں تھا۔محترم لکھاری کی خدمت میں دست بستہ عرض ہے کہ

نکالا چاہتا ہے کام تُو طعنوں سے کیا غالب

تیرے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پہ مہرباں کیوں ہو

لکھاری موصوف نے کہاکہ حکومت نے روٹ تبدیل کرکے اچھانہیں کیا جبکہ جناب احسن اقبال کہتے ہیں کہ کالم نگار 2013ء سے پہلے کے جس نقشے کاذکر کررہے ہیں اُس کا کہیں وجودتک نہیں تھا۔اُنھوں نے کہا''2013ء میں معاہدے کے

بعد ہی انفراسٹرکچر، توانائی اور گوادر بندرگاہ کے ورکنگ گروپس تشکیل دیئے گئے جس کے بعد دونوں ممالک کے ماہرین نے روٹس کی نشاندہی کے لیے کام کا آغاز کیا اِس لیے کوئی نقشہ 2013ء سے پہلے کیسے بن گیا''۔ محترم لکھاری کے جھوٹ کی پٹاری کا سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ بلوچ اور پختون علاقوں کو صنعتی زونز سے محروم رکھا جا رہا ہے اور سارے صنعتی زون پنجاب میں ہی بنا دیئے گئے ہیں۔ اپنے حالیہ کالم میں بھی اُنھوں نے پھر وہی دہرایا ''مشرقی کی بجائے مغربی روٹ کو تجارتی روٹ بنانا اور اکنامک زونز وہاں تعمیر کرنا ضروری ہے ''۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ احسن اقبال صاحب نے اکنامک زونز کے بارے میں کسی بھی طرح کی وضاحت کرنے کی بجائے سارا وقت اُن کی نیت پر شک کرنے اور اُنہیں جھوٹا ثابت کرنے پر صرف کیا ہے۔ شاید محترم لکھاری نے احسن اقبال کا کالم غور سے پڑھنے کی زحمت ہی نہیں کی کیونکہ اُنھوں نے تو پوری صراحت سے لکھا ہے کہ فی الحال گوادر میں صرف ایک صنعتی زون بن رہا ہے (گوادر پنجاب میں نہیں)، باقی زونز کا فیصلہ دونوں ممالک کا مشترکہ ورکنگ گروپ کرے گا جس کا قیام دو ماہ بعد عمل میں لایا جائے گا اور حکومت صنعتی زون کے قیام سے پہلے تمام صوبوں سے مشاورت کرے گی۔ اِس لیے یہ بھی محترم لکھاری کی ذہنی اختراع ہی ہے کہ سارے صنعتی زون پنجاب میں بنائے جا رہے ہیں۔ دراصل اے این پی اور لکھاری موصوف کو اعتراض ہے تو صرف اُس مشرقی روٹ پر جو پنجاب سے گزرتا ہے۔ پہلے بھی اے این پی کو کالا باغ ڈیم پر صرف یہی اعتراض تھا کہ اگر یہ ڈیم بن

گیا تو پنجاب کی لاکھوں ایکڑ بارانی زمین سیراب ہو جائے گی۔

ایک روشن دِن

ہندو بنیئے نے تقسیمِ ہند کو کبھی بھی دِل سے تسلیم نہیں کیا۔پاکستان کا وجود اُس کے دِل میں ہمیشہ کانٹے کی طرح چبھتا رہا۔بھارت آج بھی پاکستان کو لخت لخت کرنے کے لیے دہشت گردی سمیت ہر حربے کو جائز سمجھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایسے عیار و مکار پڑوسی کی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لئے پاکستان کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔جب دسمبر 1971ء میں پاکستان کو دو لخت کرنے کے بعد بھارت نے 1974ء میں ایٹمی دھماکہ بھی کر لیا تو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے یہ سوچتے ہوئے کہ دنیا کی تیسری بڑی فوج ،چوتھی بڑی فضائیہ اور پانچویں بڑی بحریہ کا مقابلہ روایتی ہتھیاروں سے نہیں کیا جا سکتا ،یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان بھی ایٹم بم بنائے گا۔ بھٹو مرحوم نے کہا ''گھاس کھا لیں گے لیکن ایٹم بم بنائیں گے''۔ جواباً اُس وقت کے امریکی وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر نے اُنہیں ''نشانِ عبرت'' بنا دینے کی دھمکی دی اور پھر ضیاء الحق کے ذریعے اُس دھمکی پر عمل درآمد بھی کر کے دکھایا۔ بھٹو تو سولی پر چڑھ گئے لیکن پاکستان کا ایٹمی پروگرام جاری رہا اور محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبد القدیر کی سربراہی میں ہمارے ایٹمی سائنس دانوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ بظاہر تو یہ کسی الف لیلوی داستان کا ایک حصّہ ہی لگتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ تمام تر دھمکیوں، خباثتوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود ہمارے

سائنس دانوں نے جدوجہد کی لازوال داستانیں رقم کرتے ہوئے انتہائی قلیل مدت میں ایٹمی طاقت کا جھومر پاکستان کے ماتھے پر سجا دیا۔

یوں تو پاکستان 1983ء میں ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکا تھا اور 1984ء میں ایٹمی دھماکوں کے لیے چاغی اور خاران میں سرنگیں بھی کھودی جا چکی تھیں لیکن سیاسی مصلحتیں آڑے آتی رہیں اور ڈیڑھ عشرے بعد دھماکے کر پائے۔ ایٹمی صلاحیت کے حصول کے بعد کہوٹہ کی سکیورٹی مزید سخت کر دی گئی۔ اُن دنوں ہم ملازمت کے سلسلے میں کہوٹہ میں مقیم تھے جہاں انتہائی سخت سکیورٹی کا مشاہدہ ہم اپنی آنکھوں سے کرتے رہتے تھے۔ اگر کسی کام کے سلسلے میں راولپنڈی جانا پڑتا تو واپسی پر جگہ جگہ سکیورٹی کلیئرنس کا سامنا کرنا پڑتا۔ انتہائی سخت سکیورٹی کے باوجود کئی غیر ملکی جاسوس پکڑے گئے اور یہی نہیں بلکہ کئی سفارت کاروں کی ''دھنائی'' بھی ہوئی۔ اُدھر ہمارا ایٹمی پروگرام تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا اور اِدھر غیر ملکی جاسوس ''سُن گُن'' لینے کے چکر میں ''چھینٹی'' کھاتے رہے۔ اُنہی ایام میں بھارت نے پاکستان کے خلاف جارحیت کی ٹھانی، بات ضیاء الحق کے کانوں تک پہنچی تو وہ فوراً ''کرکٹ ڈپلومیسی'' کے تحت بھارت جا پہنچے۔ ایئرپورٹ پر استقبال کے لیے آئے ہوئے بھارتی وزیرِ اعظم راجیو گاندھی تھوڑی دور کھڑے تھے۔ ضیاء الحق خود اُن کی طرف بڑھے، راجیو نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن ضیاء الحق نے اُنہیں گلے سے لگا کر اُن کے کان میں کہا کہ پاکستان

ایٹم بم بنا چکا ہے اور اگر بھارت نے جارحیت کی تو پاکستان ایٹم بم چلانے سے دریغ بھی نہیں کرے گا۔ خود بھارتی مصنفین کے مطابق راجیو گاندھی کا رنگ پیلا پڑ گیا اور ٹانگوں کی لرزش نمایاں طور پر نظر آنے لگی۔ ضیاء الحق مرحوم کے اِس اعلان کے بعد ''لالہ جی'' کو خود اپنی جان کے ''لالے'' پڑ گئے اور پاکستان پر چڑھائی کا پروگرام ہَوا ہو گیا۔

مئی 1998ء میں بھارت نے چار ایٹمی دھماکے کرکے پاکستان کو مجبور کر دیا کہ وہ بھی اپنی ایٹمی صلاحیت کا اعلان کرے کیونکہ اِن ایٹمی دھماکوں کے فوراً بعد بھارت نے ہر سطح پر دھمکی آمیز لہجہ اختیار کر لیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے بھارت کو سرے سے یقین ہی نہ ہو کہ پاکستان ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکا ہے۔ بھارتی دھماکوں کے بعد نواز لیگ کی حکومت تو ایٹمی دھماکوں کے لیے تیار تھی لیکن بہت سے تجزیہ نگار مخالفت میں پیش پیش۔ اُنہیں ہر گز احساس نہیں تھا کہ بھارت کی نِت نئی دھمکیاں ہماری غیرتوں پر تازیانہ ہیں۔ میرے آقا ﷺ کا فرمان ہے ''اللہ غیرت مند ہے اور غیرت مندوں کو دوست رکھتا ہے''۔ مومن کی تو شان ہی یہی ہے کہ وہ غیرت وحمیت کا مجسمہ ہوتا ہے۔ سچ کہا اقبالؒ نے

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

بھرپور عوامی مطالبے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس وقت کے وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب نے ایٹمی دھماکوں کا ارادہ کر لیا۔جب یہ طے ہوگیا کہ پاکستان ایٹمی دھماکا کرنے کو ہے تو بین الاقوامی ''چودھریوں'' نے آسمان سَر پر اُٹھالیا۔پڑوس میں ہونے والے ایٹمی دھماکوں پر تو یہ ''چودھری'' خاموش ہی رہے لیکن جب اُنہیں پتہ چلا کہ عالمِ اسلام کا ایک ملک بھی ایٹمی طاقت بننے جا رہا ہے تو اُن کے پیٹ میں ''مروڑ'' اُٹھنے لگے۔ امریکی صدر بِل کلنٹن نے ایک طرف تو لالچ کا ہتھیار استعمال کیا جبکہ دوسری طرف معاشی پابندیوں کی دھمکی بھی دے ڈالی۔اِس کے باوجود میاں نواز شریف صاحب ڈٹے رہے اور بالآخر 28 مئی 1998ء کا دِن آن پہنچا جب ساری دنیا کو پتہ چل گیا کہ پاکستان عالمِ اسلام کی پہلی ایٹمی طاقت بن چکا ہے۔ 28 مئی کی سہ پہر پاکستانی قیادت اور ایٹمی سائنس دان چاغی کی پہاڑیوں پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔جونہی چاغی کی پہاڑیوں پر سفید دھوئیں کی چادر پھیلی ،فضاء تکبیر کے نعروں سے گونج اُٹھی۔کئی سَر سجدے میں گرے اور وفورِ مسرت سے بہت سی آنکھیں نَم ہوگئیں۔صرف پاکستانی ہی نہیں،پورے عالمِ اسلام کا سَر فخر سے بلند ہوگیا۔یہ پاکستان کی تاریخ کا ایسا روشن ترین دِن ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔یہ وہی دِن ہے جب بلوچستان کے ضلع چاغی کی پہاڑیوں سے اُٹھتے سفید دھوئیں نے ہندو بنیئے کے چہرے پر مایوسیوں کی کالک تھوپ دی اور اُس کے طاقت کے زور پر پاکستان کے حصّے بخرے کرنے کے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔چار بھارتی ایٹمی دھماکوں کے مقابلے میں پاکستان نے پہلے چاغی

میں پانچ دھماکے کیے اور پھر چھٹا دھماکہ خاران کی پہاڑیوں میں بھی کر کے دشمن کو یہ واضح پیغام دے دیا کہ وطن کی مٹی کی حفاظت کے لیے ہم کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ ایٹمی طاقت بننے کے فوراً بعد پاکستان کو اقتصادی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ پابندیاں حسبِ سابق پاکستان کے ''دوست'' امریکہ نے ہی لگائی تھیں۔ عجیب بات ہے کہ جب بھی کوئی پاک بھارت تنازع اٹھا، ہمارے اِس ''دوست'' کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہی رہا۔ 65ء کی جنگ میں ہم امریکہ کی اقتصادی پابندیوں کا شکار ہوئے اور 71ء کی جنگ میں ہم ساتویں امریکی بحری بیڑے کا انتظار کرتے ہی رہ گئے اور ملک دولخت ہوگیا۔ اُدھر امریکہ نے پاکستان پر پابندیاں لگائیں لیکن اِدھر برادر اسلامی ملک سعودی عرب نے اِن پابندیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے تیل کے کنوؤں کا رُخ پاکستان کی طرف موڑ دیا۔ ایٹمی دھماکوں کی مناسبت سے مجتبیٰ رفیق نے اِس دِن کا نام ''یومِ تکبیر'' تجویز کیا جسے نام کا انتخاب کرنے والی کمیٹی نے بے حد پسند کیا۔ واقعی یہ نام بہت خوبصورت اور بامعنی ہے کہ جب تکبیر کا نعرہ بلند ہوتا ہے تو تائید و نصرتِ ربی بھی اِس میں شامل ہو جاتی ہے۔ مجتبیٰ رفیق آجکل بے روزگار اور اربابِ اختیار کی عدم توجہی کا شکار ہے۔ حکمرانوں کو ایسے باصلاحیت افراد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے کہ اسی میں ملک و قوم کا بھلا ہے۔

دھماکوں کی سرزمین

28 مئی 1998ء بروز جمعرات شام تین بجکر پندرہ منٹ پر پاکستان میں چاغی کے پہاڑوں میں پانچ ایٹمی دھماکے کرکے پاکستان کے دفاع کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔ 17 سال بعد اُسی دِن، تاریخ اور وقت پر ہماری سیاسی قیادت نے پاک چائنا اکنامک کوریڈور پر ''ہم آواز'' ہو کر اقتصادی دھماکا کر دیا۔ ابلیسیت کی علمبردار وہ قوتیں جو آس لگائے بیٹھی تھیں کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اِس اکنامک کوریڈور کو ''کالا باغ ڈیم'' بنادیں گی، اُنہیں مُنہ کی کھانی پڑی لیکن ''مشتری ہوشیار باش'' یہ طاغوتی طاقتیں ابھی مایوس نہیں ہوئیں۔ ابلیس کے یہ چیلے خوب جانتے ہیں کہ اگر ناقابلِ تسخیر دفاع کے ساتھ معاشی میدان میں بھی پاکستان ناقابلِ تسخیر ہو گیا تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی، اِس لیے وہ افراتفری پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔
دھماکے تو طالبان نامی دہشت گردوں نے بھی بہت کیے لیکن اب خود اُن کا دھماکہ ہو چکا، ایک سیاسی جماعت کے ''بھائی'' کے آڈیو، ویڈیو دھماکے بھی دَم توڑ چکے لیکن اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دھماکے ختم ہو گئے یا ہو جائیں گے کیونکہ ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں''۔ ایک دھماکہ تو ہمارے مُرشد علامہ

طاہر القادری بھی کرنے آرہے ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا ہے کہ وہ جون میں اپنے اگلے لائحہ عمل کا اعلان کریں گے۔ کچھ بدبخت یہ بھی کہتے ہیں کہ علامہ صاحب کا اگلا لائحہ عمل اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ''دیت'' کی اگلی قسط کب، کہاں اور کیسے وصول کی جائے۔ علامہ صاحب نے سانحہ ماڈل ٹاؤن پر تشکیل دی جانے والی جے آئی ٹی کی رپورٹ کو مضحکہ خیز اور انصاف کا قتل قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''ہمیں نواز، شہباز رانا ثناء اللہ، آئی جی اور توقیر شاہ کے سانحہ ماڈل ٹاؤن میں براہِ راست ملوث ہونے میں کوئی شک نہیں''۔ ہمیں یقین ہے کہ وہی لوگ ملزم بلکہ مجرم ہیں جن کا ذکر ہمارے مُرشد نے کیا کیونکہ مُرشد کے ''حُجرے'' میں مقیم مریدنے ہمیں ''بقلم خود'' بتلایا کہ علامہ صاحب کو جو بشارت ہوئی اُس میں انہی لوگوں کو مجرم ٹھہرایا گیا۔ اِسی لیے وہ آئی ایس آئی کی تحقیقات کو مانتے ہیں نہ آئی بی یا کسی دوسری کی ایجنسی کی تحقیقات کو۔ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ مُرشد کی ہر بشارت اصلی ہوتی ہے اور اُس پر ایمان لانا مریدین کا فرضِ عین لیکن کبھی کبھار شیطان کے ورغلانے پر ہمارا ایمان بھی متزلزل ہو جاتا جس پر ہم ایمان کی مضبوطی کے لیے فوراً انٹرنیٹ پر موجود مُرشد کے خوابوں کے '' کلپس دیکھ کر اپنا ایمان تازہ کر لیتے۔ مُرشد نے یہ چشم کشا انکشاف بھی کیا ''شریف سلطنت'' پاکستان میں داعش کا راستہ ہموار اور اپریشن ضربِ عضب کی قربانیوں کو ضائع کرنے کے راستے پر چل رہی ہے'' جبکہ دشمنانِ مُرشد یہ کہتے ہیں کہ مُرشد کو ڈھیروں ڈھیر نذرانے دے کر اقتصادی راہداری

پروگرام کا بیڑا غرق کرنے کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ کوئی اِن عقل کے اندھوں سے پوچھے کہ بھلا مُرشد کو چائنا کے 46 ارب ڈالر کے اقتصادی پیکیج اور اکنامک کاریڈور کو سبوتاژ کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو مہمیز دینے کی کیا ضرورت ہے، یہاں چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا کر اقتصادی راہداری کو نقصان پہنچانے والے بہت۔ ابھی تو وزیرِاعظم صاحب کی کوششوں اور کاوشوں سے اے پی سی میں صرف مغربی روٹ پر اتفاق ہوا ہے، وسطی اور مشرقی روٹس تو باقی ہیں اور صنعتی زونز بھی۔

جون کی چلچلاتی دھوپ میں مُرشد ایک دفعہ پھر اپنے مریدین کا صبر آزمانے آ رہے ہیں۔ شُنید ہے کہ مُرشد کے "کنٹینر" کے ایئر کنڈیشنر کی سروس کی جا رہی ہے اور دروغ بَر گردنِ راوی ایئر کنڈیشنر کی صفائی ستھرائی سابق گورنر پنجاب چودھری سرور اپنی نگرانی میں کروا رہے ہیں۔ نہیں معلوم کہ چودھری صاحب یہ کام کپتان صاحب کی اجازت سے کروا رہے ہیں یا مفادِ عامہ کے تحت۔ ویسے ہمیں یقین ہے کہ وہ مفادِ عامہ کے تحت ہی کر رہے ہوں گے کیونکہ سارے جہاں کا درد اُن کے نہ صرف جگر بلکہ پھیپھڑوں میں بھی سما چکا ہے۔ ویسے کچھ لوگ "اندر کی بات" بتلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ چودھری صاحب کو تحریکِ انصاف نے "چیف آرگنائزر" بنانے کا جھانسا دیا لیکن یہ عہدہ لے اُڑے شاہ محمود قریشی۔ اِس لیے چودھری صاحب نے احتجاجاً "کنیڈوی کنٹینر" کی صفائی ستھرائی کا کام سنبھال لیا۔ ہمارے لندن پلٹ چودھری صاحب جب سے پاکستان آئے ہیں، اُن کے ساتھ "ہتھ" ہی

ہو رہا ہے ۔پہلے نواز لیگ نے جھانسا دے کر گورنر ہاؤس میں بند کر دیا ، وہاں سے رہائی ملی تو تحریکِ انصاف نے ''سہانے سپنے'' دکھا کر اپنے ساتھ ملایا جس کا انگلینڈ والوں نے بُرا مناتے ہوئے یہ دھماکہ کر دیا کہ چودھری صاحب کا بیٹا الیکشن میں چاروں شانے چت ہو گیا اور اب تحریکِ انصاف بھی ''طوطا چشم'' بن گئی ۔فی الحال تو وہ تحریکِ انصاف ہی میں ہیں ،آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ اگر ہمارے پاس بھی کوئی ''چڑیا'' ہوتی تو ہم بھی بتا دیتے کہ چودھری صاحب اب کس ٹہنی پر بیٹھنے والے ہیں۔

ہمیں کپتان صاحب کے جذبۂ حب الوطنی پر پہلے کبھی شک تھا نہ اب ہے لیکن حقیقت یہی کہ اُن کے دھرنوں نے ملکی معیشت کو بہت نقصان پہنچایا اور اب جبکہ وطنِ عزیز ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کو ہے ، وہ ایک دفعہ پھر ''اُوکھے اُوکھے'' بیان دینے لگے ہیں۔ اُن کا تازہ ترین بیان ہے کہ ''سونامی تو اب شروع ہوئی ہے۔ سونامی سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ پہلے نواز شریف اور آصف زرداری سونامی کے خوف سے بھائی بھائی بنے اب سیکولر اے این پی اور مولانا اکٹھے ہو گئے۔ میں سب کو شکست دوں گا'' ایسے دعوے کپتان صاحب نے پہلے بھی بہت کیے لیکن ہوا کیا؟، خواب چکنا چور ہوئے اور ایک بال سے کئی وکٹیں گرانے کا دعویٰ کرنے والے خاں صاحب سڑکوں پر۔ اُنھوں نے کہا ہے'' اب نئے پاکستان سے پہلے نیا خیبر پختونخوا بنے گا''۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن خاں صاحب نے تو پہلے 90 دنوں

میں نیاپاکستان اور پھر 180 دنوں میں نیا خیبر پختونخوابنانے کادعویٰ کیا۔اب ساڑھے سات سودنوں کے بعدوہ کہہ رہے ہیں کہ ”پہلے نیا خیبر پختونخوا بنے گا“۔ وہ 180 دنوں میں نیا خیبر پختونخوابنانے کادعویٰ کیاہوا؟۔ کیاکپتان کی خدمت میں دست بستہ عرض کیاجا سکتاہے کہ

تیرے وعدے پہ جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مَر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

خاں صاحب فرماتے ہیں”30 مئی کے بعد ایسابلدیاتی نظام آنے والاہے جس کے بعد قومی اور صوبائی اسمبلی کے اراکین بلدیاتی نمائندوں کے پاس آئیں گے کیونکہ سارے اختیارات بلدیاتی نمائندوں کے پاس ہوں گے“۔ اگرواقعی سارے اختیارات بلدیاتی نمائندوں کو سونپ دیئے جائیں گے توپھران اراکینِ اسمبلی اوروزیروں شزیروں کومفت میں تنخواہیں اور مراعات کِس کھاتے میں؟۔ اگر کوئی کہے کہ یہ آئین میں ”ترمیمیں شرمیمیں“کریں گے توہم کہتے ہیں کہ اگران میں سے ایک فیصداراکینِ اسمبلی کو بھی آئین کی شُدبُد ہو تو جوچور کی سزا، وہ ہماری۔جب کپتان صاحب نے یہ کہاکہ تبدیلی سڑکوں اورمیٹرو بس سے نہیں آتی توکسی ستم ظریف نے آوازلگائی ”جی ہاں! تبدیلی توشادی سے آتی ہے“۔خاں صاحب نے فرمایا”پنجاب اور سندھ کی حکومتوں نے بلدیاتی انتخاب اِس لیے نہیں کروائے کہ وہ فنڈز کو اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتی ہیں“۔ بالکل بجاارشاد

پنجاب اور سندھ کی حکومتیں ہیں ہی ایسی، سوال مگر یہ کہ اُن کی حکومت خیبر پختونخوا، میں دو سال تک کس انتظار میں رہی؟۔ اگر بلوچستان میں بہت پہلے بلدیاتی انتخاب ہو سکتے تھے تو خیبر پختونخوا میں کیوں نہیں؟۔ اب تو دو اڑھائی ماہ بعد پنجاب اور سندھ میں بھی بلدیاتی انتخاب ہو رہے ہیں، تو کیا فرق ہوا پنجاب اور ''نئے خیبر پختونخوا'' کی حکومتوں میں؟۔

خیبر پختونخواہ کے بلدیاتی انتخابات

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

یوں توبوستانِ سیاست کے سبھی ''باغباں'' ہمہ وقت سہانے سپنوں کی دوکانداری ہی چمکاتے رہتے ہیں لیکن ایک باغباں نے توخوابوں کا ایسا الف لیلوی گلستاں سجایا کہ قعرِ مذلت میں گھری قوم نے سمجھا، یہ تووہی مسیحا ہے جو کوہِ الم کی تسخیر کے لیے آسمانوں سے اترا ہے۔تب دامانِ الفت وا ہوئے اوروطنِ عزیز کی فضائیں لبیک لبیک کی صداؤں سے گونج اُٹھیں۔ لکھاریوں کے قلم متحرک ہوئے اور مدح سرائی کے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ اُس ''مسیحا'' کی باتوں پریقین کا یہ عالم کہ ایک مدح سرانے تویہاں تک لکھ دیا''نواز شریف اورزرداری توکیا قومیں جب عزم اورولولے کے ساتھ اُٹھیں تونمرود وفرعون بھی ہار گئے۔روااور ناروا کی تفریق سے بے نیاز محترم لکھاری نے محترم میاں نواز شریف اور محترم آصف زرداری کااستعارہ باندھا بھی توکس سے۔۔۔۔ نمرود وفرعون سے۔آجکل وہی لکھاری ایک نیوزچینل پربیٹھ کر قوم کو''درسِ بیداری'' دیتے ہوئے متواتر فرماتے رہتے ہیں کہ کپتان کوتو سیاست کی الف بے بھی نہیں آتی (پیپلز پارٹی کے پچھلے دَورِحکومت میں یہی لکھاری محترم آصف زرداری کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ جو شخص ''کونسلر'' بننے کی اہلیت نہیں رکھتا، اُسے ہم نے صدرِ مملکت بنادیا۔ محترم لکھاری کے ''کالمی درویش ''زرداری حکومت کے خاتمے اورمِڈ ٹرم الیکشن

کی تاریخ پہ تاریخ دیتے رہے لیکن پیپلز پارٹی نے اپنی مدت پوری کی اور آصف زرداری صاحب نے بھی)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کپتان صاحب اب بھی ملک و قوم کا اثاثہ ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ انتھک ہیں اور چمن زارِ دہر میں وہی کامران ٹھہرتا ہے جو انتھک اور راہِ عمل پہ گامزن ہو۔ خالقِ کائینات کا فرمان ہے "اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہیں بدلتی"۔ کپتان صاحب کی انتھک سعی کسی شک و شبہے سے بالاتر لیکن یہ تبھی بار آور ہو سکتی ہے جب وہ اپنا لہجہ درست اور اندازِ سخن بدل لیں، ضِد، ہٹ دھرمی اور نرگسیت کو جھٹک دیں لیکن عریاں حقیقت یہی ہے کہ خاں صاحب کی فطرت جس سانچے میں ڈھل چکی ہے، اُس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ کپتان صاحب کی ساری تگ و دَو کا محور و مرکز اقتدار کی سب سے اونچی "مسند" ہے اور یہ اسی ہوسِ اقتدار کا شاخسانہ ہے کہ خاں صاحب کے دیوانوں، پروانوں، مستانوں کے خوابوں کا گلستاں اُجڑ کے رہ گیا اور اب حالت یہ کہ

بَر مزارِ ما غریباں نَے چراغے نَے گُلے
نے پَرِ پروانہ سوزد نے سراید بلبلے

بتقاضۂ عقل، خاں صاحب کو چاہیے تو یہ تھا کہ جو کچھ ملا اُسی پر قناعت کرتے ہوئے اپنی تمام تر توانائیاں خیبر پختونخوا کو ماڈل صوبہ بنانے میں صرف کر دیتے لیکن اُنہوں نے احتجاج کا راستہ اپنایا جو اُن کے لیے بہتر ثابت ہوا نہ تحریک

انصاف کے لیے اور نہ ہی ملک و قوم کے لیے ۔آج اُن کی حکومت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور پارٹی میں واضح انتشار۔30 مئی کو ہونے والے بلدیاتی انتخابات نے جو نہاں تھا وہ بھی عیاں کر دیا۔ خیبر پختونخوا کے بلدیاتی انتخابات کو اِس لحاظ سے خونی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اب تک سترہ افراد کی جانیں لے چکے ہیں۔ 19 اضلاع میں تشدد کے 100 سے زائد واقعات ہوئے ،پورے صوبے میں ہر جگہ انارکی ہی انارکی دکھائی دی اور شاید ہی کوئی پولنگ سٹیشن ایسا بچا ہو جہاں پُر تشدد واقعات نہ ہوئے ہوں ۔اکثر پولنگ سٹیشنوں پر وقفے وقفے سے پولنگ رکتی رہی ،چارسدہ میں اُمیدوار قتل ہوا ،ڈیرہ اسماعیل خاں میں بیلٹ بکس جلائے گئے ،زنخے عورتیں بن کر ووٹ ڈالتے رہے ،پولیس ٹھپے لگاتی رہی اور ووٹر سرِ عام مہریں لگا کر ووٹ کا تقدس پامال کرتے رہے۔ تحریکِ انصاف کے ایک وزیر باتدبیر تو بیلٹ بکس ہی اٹھا کر بھاگ گئے ، ہتھکڑی تو اُس وزیر کو لگنی چاہیے تھی لیکن لگ گئی انتہائی دیانتدار اور مرنجاں مرنج میاں افتخار حسین کو۔یہ سب کچھ الیکٹرانک میڈیا کے کیمروں نے محفوظ کر لیا۔ تحریکِ انصاف کی اتحادی جماعت اسلامی سمیت سبھی سیاسی جماعتوں نے اِن انتخابات کو بدترین دھاندلی کا شاہکار قرار دیا۔ آصف زرداری صاحب نے کہا ''قوم نے دھاندلی دیکھ لی ،عمران خاں کے خلاف ایکشن لیا جائے''۔ الطاف حسین نے کہا ''الیکشن کمیشن انتخابات کالعدم قرار دے کر نئے انتخاب کروائے''۔ نوازلیگ نے کہا'' نئے پاکستان کا خواب دکھانے والے کے پی کے میں عملی طور پر ناکام رہے اور ملکی تاریخ کی بدترین دھاندلی دیکھنے میں

آئی''۔ فیئر اینڈ فری الیکشن نیٹ ورک (فافن) کی رپورٹ ہے کہ ''بلدیاتی انتخابات میں 26 فیصد دھاندلی ہوئی۔ عام انتخابات کی نسبت زیادہ لوگ ووٹ ڈالنے نکلے لیکن بے قاعدگیوں، ناقص انتظامات، پرتشدد واقعات اور دھاندلی کی وجہ سے ٹرن آؤٹ بہت کم رہا۔ لیکن خیبرپختونخوا کے وزیرِاعلیٰ پرویز خٹک نے کہا کہ بلدیاتی الیکشن میں حلقہ چھوٹا ہوتا ہے اِس لیے جس کا زور چلتا ہے، وہ کر گزرتا ہے۔ گویا پرویز خٹک صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مختشم ہی کامیاب وکامران، باقی سب بیکار۔

خیبرپختونخوا کے بلدیاتی انتخابات اِس لحاظ سے منفرد تھے کہ یہ ''نئے خیبرپختونخوا'' کے بلندبانگ دعووں کی گونج میں کروائے جارہے تھے لیکن 30 مئی کو سارا پول کھُل گیا اور لوگ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دِل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خون نکلا

دھاندلیوں اور الیکشن کمیشن کے مقرر کردہ ضابطۂ اخلاق کی سنگین خلاف ورزیوں کے باوجود بھی محترم عمران خاں پریس کانفرنس میں اپنی حکومت کی ستائش میں مصروف رہے۔ وہ پُرجوش انداز میں یہ کہہ رہے تھے کہ بلدیاتی انتخابات اُن کی حکومت کا بہت بڑا کارنامہ ہے (حالانکہ یہ بلدیاتی انتخابات سپریم کورٹ کے حکم

پر کروائے گئے) ۔ اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ مسلم لیگ کی حکومت نے چھ، چھ باریاں لینے کے باوجود ایک مرتبہ بھی بلدیاتی انتخابات نہیں کروائے ۔ حقیقت یہ ہے کہ نواز لیگ نے اپنی حکومت کے اِن ادوار میں تین مرتبہ بلدیاتی انتخابات کروائے لیکن یہ نہ تو خونی تھے اور نہ ہی دھاندلی زدہ۔ اگر انتخاب اسی کا نام ہے جس کا نظارہ قوم نے خیبر پختونخوا میں کیا تو ایسے انتخاب سے مفر ہی بہتر۔ محترم خاں صاحب اور وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک صاحب یک زبان ہیں کہ جس کو کوئی اعتراض ہے وہ الیکشن کمیشن میں جائے۔ حیرت ہے کہ گزشتہ دو سال سے غیر جانبدار تجزیہ نگاروں کے حلق یہی کہتے کہتے خشک ہو گئے کہ اعتراضات کا فورم صرف الیکشن کمیشن ہے لیکن پوری تحریکِ انصاف اِس پر کان دھرنے کو تیار نہیں تھی لیکن آج وہ خود بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ کیا اُس وقت تحریکِ انصاف غلط تھی یا اب ؟۔

نیا خیبر پختونخوا

ہتھیلی پہ سَرسوں جمانا اسی کو کہتے ہیں، اُدھر ہمارے کپتان صاحب نے گلگت بلتستان کی ''ٹھنڈی ٹھار'' وادیوں میں ''نئے پاکستان سے پہلے نیا خیبر پختونخوا'' بنانے کا اعلان کیا اور اِدھر ''گرما گرم'' خیبر پختونخوا بن بھی گیا۔ نئے پختونخوا کی پہلی جھلک ہم نے بلدیاتی انتخابات میں اُس وقت دیکھی جب تحریکِ انصاف کے وزیر باتدبیر علی امین گنڈاپور اپنے مسلح ساتھیوں سمیت ڈیرہ اسماعیل خاں کی یونین کونسل ''ہمت'' کے ایک پولنگ سٹیشن میں گھس گئے۔ ڈیوٹی پر موجود SHO نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی مگر ایک ہی تھپڑ کھا کر ''نکرے'' لگ رہے۔ جب علی امین گنڈاپور کے حکم پر بیلٹ بکس گاڑی میں رکھے جا رہے تھے تو کسی ستم ظریف نے جمعیت علمائے اسلام کو اطلاع دے دی۔ مولانا حضرات نے مساجد میں اعلان کروا دیا کہ فوراً متعلقہ پولنگ سٹیشن تک پہنچا جائے۔ معروف کالم نگار بھائی رؤف طاہر کو لوگوں کے پولنگ سٹیشن تک پہنچنے اور ''کھڑاک'' کرنے پر تو کوئی اعتراض نہیں البتہ یہ اعتراض ضرور ہے کہ نیشنل ایکشن پلان کی رو سے مساجد کے لاؤڈ سپیکر صرف پانچ وقت کی اذان اور جمعے کے عربی خطبے کے لیے ہی استعمال کیے جا سکتے ہیں جبکہ لاؤڈ سپیکر سیاسی استعمال میں لائے گئے۔ اُنھوں نے تو یہ بھی کہا کہ اِس ''شَرانگیز'' فعل پر خیبر پختونخوا کی حکومت ایکشن میں آ سکتی ہے

۔ عرض ہے کہ حکومت ایکشن میں آئے گی کیسے ،وہ تواب بھی الیکشن ہی میں ''گوڈے گوڈے'' دھنسی ہوئی ہے اوربقول امیر جماعت اسلامی پشاور، اب بھی آراوز سے دھڑادھڑ نتائج تبدیل کروانے میں مصروف۔ شاید اسی لیے خیبر پختونخواکے صوبائی امیر جماعت اسلامی پروفیسر ابراہیم نے کہا''پی ٹی آئی دھاندلی کی چیمپئن بن چکی ہے''۔ خیبر پختونخواکے صوبائی وزیرِاطلاعات مشتاق غنی کو شکوہ ہے توفقط یہ کہ حلیف ہونے کے ناطے یہ تحریکِ انصاف اورجماعتِ اسلامی کااندرونی معاملہ تھاجسے پبلک''کرنے کی بجائے دونوں مِل کر''اندر کھاتے'' طے کرلیتے۔کپتان صاحب بھی'' یہی کہتے پائے گئے کہ

دیکھا جو تیر کھاکے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

اُنہوں نے فرمایا''جماعت اسلامی کی جانب سے دھاندلی کے الزامات پر صدمہ پہنچا،ہم فوج کی نگرانی میں دوبارہ بلدیاتی الیکشن کروانے کے لیے تیار ہیں''۔ دوسری سیاسی جماعتیں مگر کہتی ہیں کہ ''فارمولا'' ایک ہی ہوناچاہیے ۔اگر 2013ء کے انتخابات میں دھاندلی کے الزامات پروزیرِاعظم سے استعفیٰ مانگاجا سکتاہے توپختونخواکے بلدیاتی انتخابات میں دھاندلی کے واضح ثبوتوں کے بعدوزیرِاعلیٰ پرویزخٹک سے استعفے کامطالبہ کیوں نہیں کیاجاسکتا؟۔ بھائی لیاقت بلوچ مگرکہتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے 2013ء کے انتخابات کے بعد

وزیرِاعظم سے استعفے کا مطالبہ کیا تھا، نہ اب وزیرِاعلیٰ سے کر رہے ہیں۔ اُن کا مطالبہ تو صرف دھاندلی کی شفاف تحقیقات کروانے تک محدود ہے۔ ہماری جماعت اسلامی بھی ہمیشہ گھاٹے کا ہی سودا کرتی ہے۔ اگر جماعت اسلامی کی بجائے جمعیت علمائے اسلام تحریکِ انصاف کی حلیف ہوتی تو مولانا فضل الرحمٰن نے مزید دو، تین ''وَذی، وَذی''، وزارتوں پر ہاتھ صاف کرکے چُپ ہو رہنا تھا کیونکہ اُن کی کتابِ سیاست میں ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت سب جائز ہے۔

علی امین گنڈاپور تو ہجوم کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ''پھُر'' ہو گئے لیکن دوسری طرف اے این پی کے میاں افتخار حسین کو خیبر پختونخوا کی ''غیر سیاسی'' پولیس نے قتل کے ایک مقدمے میں ''دَھر'' لیا۔ طُرفہ تماشہ یہ کہ میاں افتخار کو پولیس نے تین بجے سہ شام پانچ بجے کٹی۔ ایک محترم لکھاری نے اِس پر تبصرہ FIR پہر گرفتار کیا جبکہ قتل کی کرتے ہوئے لکھا ''زیادہ واویلا کرنے کی بجائے انصاف کی طرف دیکھنا چاہیے

۔ مولانا فضل الرحمٰن اور الطاف حسین نے بُغضِ معاویہ میں یہ مطالبہ بھی کردیا کہ میاں افتخار حسین کو فی الفور رہا کیا جائے۔۔۔ قانون سب کے لیے ایک ہونا چاہیے، سب کے ساتھ سلوک بھی ایک جیسا ہونا چاہیے، قانون کی عدالت میں امیر اور غریب میں فرق دکھانے کی کیا ضرورت ہے''۔ بالکل بجا کہ یہ تو امیر المومنین حضرت عمرؓ کا بھی فرمان ہے اگر کسی کی وجاہت کے خیال سے قانون کا پلڑا اُس کے حق میں جھک جائے تو اللہ کی '' بادشاہت اور قیصر و کسریٰ کی

حکومت میں کیا فرق ہے''۔ سوال مگر یہ کہ ایک طرف تو حکومتی وزیر علی امین گنڈاپور، جس کی ''واردات'' سب پہ عیاں لیکن وہ تین دنوں تک آزاد گھومتے رہے جبکہ دوسری طرف بے گناہ میاں افتخار حسین، جنہیں سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کی اتنی جلدی ؟۔ میاں افتخار حسین تو مقتول کے والد کی گواہی پر رہا ہو گئے لیکن شدید ترین عوامی ردِ عمل کے بعد جب علی امین (جس کے خلاف دو مقدمات درج ہیں) کے گھر پولیس نے ''واردات'' کے تیسرے دِن چھاپا مارا تو وہ پچھلے دروازے سے پھِر ''پھُر'' ہو گئے ۔شاید گنڈاپور صاحب کے ذہن میں یہ ہو کہ جو پولیس اُنہیں ''پروٹوکول'' دیتی ہے اب اُسی کے ہاتھوں گرفتاری اُن کی توہین ہے۔وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک کی ''منتوں تَرلوں'' اور کپتان صاحب کے حکم کے بعد علی امین گرفتاری دینے پر بادلِ نخواستہ تیار ہو ہی گئے۔ پیشی کے بعد علی امین گنڈاپور عدالت سے ہتھکڑیاں پہنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے یوں نکلے کہ جیسے وہ ''سلطان راہی'' ہوں اور عدالت کوئی فلمی سٹوڈیو۔ جس ''حرکت'' پر سَر ندامت سے جھک جانا چاہیے تھا، اُسی پر فخر ؟۔ کیا قوم کی رہنمائی کا دعویٰ کرنے والوں کا چلن یہی ہوتا ہے ؟۔

KPK کے بلدیاتی انتخابات کے بارے میں کپتان صاحب اور پرویز خٹک ،دونوں نے یہ کہا کہ امن وامان الیکشن کمیشن کی ذمہ داری تھی اور اگر الیکشن کمیشن مرحلہ وار انتخاب کروا دیتا تو بَد نظمی سے بچا جا سکتا تھا لیکن الیکشن کمیشن نے واضح

تردید کرتے ہوئے کہاکہ امن وامان الیکشن کمیشن نہیں، صوبائی حکومت کی ذمہ داری تھی اور الیکشن کمیشن نے تو دومرتبہ صوبائی حکومت کو مرحلہ وار انتخابات کی تجویز بھی دی تھی جو مسترد کردی گئی۔ اب پتہ نہیں سچا کون اور جھوٹا کون البتہ ہمارا حسنِ ظن یہی ہے کہ اگر خاں صاحب کہتے ہیں تو پھر ''ٹھیک ہی کہتے ہوں گے''۔ ویسے بھی ایک بزرگ صحافی اپنے کالموں میں باربار یہ لکھ چکے کہ ''کپتان جھوٹ نہیں بولتا''اور ہمیں لکھاری کے لکھے پہ ''اعتبار''۔ سچے اور جھوٹے کی بحث میں پڑے بغیر قوم سوال کرتی ہے کہ اِس خونی الیکشن کی وجہ سے جو 23 افراد جان سے گئے، اُن کا لہو کِس کے ہاتھ پہ تلاش کریں؟۔اگر صوبائی حکومت ذمہ دار ہے تو خونِ ناحق کا مقدمہ کپتان صاحب کی عدالت میں کہ وہ گزشتہ 2 سالوں سے اسی دھاندلی کو بنیاد بناکر حکمرانوں سے استعفے کا مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں۔2013ء میں تو نگران حکومتوں کے تحت الیکشن ہوئے جن میں دھاندلی کا پتہ چلانے کے لیے تحقیقاتی کمیشن بن چکا لیکن 30 مئی کو تو تمام اختیارات کی مالک ایک منتخب حکومت تھی جس کی موجودگی میں انتخابات ہوئے اور نہ صرف یہ کہ دھاندلی کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے بلکہ قتلِ عام بھی ہوا۔کیااب بھی خیبر پختونخوا حکومت کے مستعفی نہ ہونے کا کوئی جواز ہے؟اور کیا تحریکِ انصاف کاانصاف یہی کہتاہے کہ اگر دھاندلی ہوئی ہے تو دوبارہ الیکشن کروالیتے ہیں؟۔

اپنوں نے غم دیئے تو۔۔۔۔

پیپلز پارٹی کا پچھلا دَورِ حکومت بَدترین، ''غضب کرپشن کی عجب کہانیاں'' زباں زدِ عام، رشوت سفارش اپنے عروج پر اور انتظامی معاملات ایسے کہ ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں'' لیکن جب وفاقی وزیرِ خزانہ اسحاق ڈار صاحب نے تیسرا بجٹ پیش کیا تو ایک پرانا، مقبول گانا میرے ذہن میں گھومنے لگا جس کے بول کچھ یوں تھے کہ

'اپنوں نے غم دیئے تو مجھے یاد آ گیا
اِک اجنبی جو غیر تھا اور غمگسار تھا

پیپلز پارٹی کے پانچ سالہ دَورِ حکومت میں گورنمنٹ ملازمین کی تنخواہوں میں لگ بھگ 150 فیصد اضافہ ہوا لیکن نواز لیگ کی حکومت کے پہلے بجٹ پر یہ بہانہ کہ معیشت برباد ،خزانہ خالی ، پیپلز پارٹی نے عوام کے لیے ''ککھ'' نہیں چھوڑا۔ دوسرے بجٹ پر بھی لفظی ہیرا پھیری کے ساتھ یہی بہانہ لیکن تیسرے بجٹ پر کیا ہوا؟۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر یہ خبریں تو متواتر آ رہی تھیں کہ تنخواہوں اور پنشن میں پانچ سے سات فیصد تک اضافہ کیا جا رہا ہے لیکن ہم نے اِن پر یقین نہیں کیا کہ اِس شدید ترین مہنگائی میں بھلا یہ کیسے ممکن ہے لیکن جب بجٹ آیا تو اسحاق ڈار صاحب نے ہماری توقعات کے برعکس گورنمنٹ ملازمین اور پینشنرز

کے گلے پرچھُری پھیر دی۔اُنھوں نے سرکاری ملازمین کے ساتھ انتہائی بھونڈامذاق کرتے ہوئے تنخواہوں اورپنشنز میں ساڑھے سات فیصداضافہ کرکے گویااُن کے مُنہ میں ''پولیوکے قطرے'' ٹپکادیئے۔کبھی ہمارے ایک وزیرِخزانہ سَرتاج عزیز ہواکرتے تھے جنھیں لوگ ''سَرچارج عزیز'' کہاکرتے تھے۔جب اُن سے وزارتِ خزانہ کا قلمدان واپس لیاگیاتو''بہتوں'' نے سُکھ کاسانس لیالیکن اب لوگ کہتے ہیں کہ سَرتاج عزیزنے توآتی جاتی سانسوں کاراستہ کھُلارکھالیکن ہمارے ''ڈالرصاحب'' نے تو یہ راستہ بھی بندکرنے کی سعی کرڈالی۔ماناکہ حکمران صبح ومساملکی ترقی کے لیے کوشاں، موٹروے بجا،میٹرو زبردست اور گرین لائن منصوبہ بھی مفیدمگراِن سبھی سے لطف اندوزتو تبھی ہواجاسکتاہے جب سانس کی ڈورسلامت رہے۔ہم نے پہلے بھی لکھاتھاکہ یہ اضافہ بھی اُن ''غریب پارلیمنٹیریز'' میں تقسیم کردیں جن کی تنخواہوں کوتازہ تازہ دوگنا کیاگیاہے اور''بینظیرانکم سپورٹ فنڈ'' کے اصلی حقدارہی بے کس ،بےبَس اور مجبورومقہورپارلیمنٹیریز ہی ہیں جن کی فیملیزکے لیے پارلیمنٹ لاجز میں 36 کروڑروپے کے فیملی سوئٹس تعمیرکیے جارہے ہیں۔حکومت ''ایویں خوامخوا'' مفلسوں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے،سارے مفلس توپارلیمنٹ میں بیٹھے ہیں۔گورنمنٹ ملازمین کی تمام ایسوسی ایشنزنے اونٹ کے مُنہ میں زیرے کے مترادف اِس اضافے کویکسر مستردکردیا ۔ہم نے اِس ظالمانہ بجٹ پراپنے میاں سے بات کرناچاہی تواُنھوں نے اُداس نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا''ظالمانہ ہی توہے۔سگریٹ

پہلے ہی مہنگے تھے ،ظالموں نے مزید مہنگے کر دیئے ''۔ میاں کی یہ بات سُن کر ہمارا جی اپنا سَر پیٹ لینے کو چاہا لیکن پھر یہ سوچ کرچُپ ہو رہے کہ اُن کا مہنگائی ماپنے کا پیمانہ تو ہمیشہ صرف سگریٹ ہی ہوتے ہیں، سگریٹ مہنگے تو بجٹ بکواس ، سستے تو واہ وا۔

تنخواہ دار طبقہ ایک طرف ،اِس بجٹ میں تو خطِ غربت کے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کے لیے بھی ''کچھ'' نہیں۔ ہم ماہرِ معاشیات ہیں نہ معیشت کی سُدھ بُدھ لیکن وزیرِ خزانہ کی بجٹ تقریر سُن کر اتنا اندازہ ہم نے بھی لگالیا کہ یہ بجٹ محض خوبصورت الفاظ کا ایسا گورکھ دھندہ ہے جس میں اشرافیہ کو کچھ ملے تو ملے ، مجبوروں مقہوروں کو کچھ نہیں ملنے والا۔ ہمارے حکمران کیا جانیں کہ ایک غریب کی معیشت پیٹ سے شروع ہو کر پیٹ پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ سچ لکھا ہے عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی نے

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لیے
وہ سُن کے بولا بابا خُدا تُم کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سورج نہ تارے ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

اسحاق ڈار صاحب کہتے ہیں کہ افراطِ زر میں کمی ہوئی۔اوّل تو یہ کمی صرف کاغذوں میں نظر آتی ہے لیکن اگر ہوئی بھی تو ڈار صاحب کی پالیسیوں کی بدولت نہیں بلکہ عالمی منڈی میں تیل کی قیمت کم ہوجانے کی وجہ سے ہوئی اور دوسرے اگر واقعی افراطِ زر میں کمی ہوئی تو اس کا اثر خورونوش کی بنیادی اشیاء پر ہرگز دیکھنے میں نہیں آیا۔جولائی 2014ء سے اب تک روزمرہ ضرورت کی اشیاء میں 25 سے 150 فیصد تک اضافہ ہوا جبکہ ڈار صاحب کی ''معیشت'' میں یہ اضافہ بقدرِ اشکِ بُلبُل ہے۔مارکیٹ میں ہر شے کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہے، سبزیوں کی قیمتیں سُن کر پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور فروٹ خریدنے کی تو کسی عام آدمی میں سکت ہی نہیں۔اب تو لوگوں نے پھلوں کی قیمتیں پوچھنا بھی بند کر دی ہیں۔جس ملک میں دال ماش 180 ، دال مونگ 170 اور مسور کی دال 142 روپے فی کلو مل رہی ہو، اُس کے وزیرِ خزانہ کا یہ بیان کسی لطیفے سے کم نہیں کہ افراطِ زر میں کمی ہوئی ہے۔دراصل جب مرسڈیز اور بی ایم ڈبلیو گاڑیوں کے مالک ''ٹھنڈے ٹھار'' بنگلوں میں بیٹھ کر بجٹ بنائیں گے تو پھر بھلا وہ فُٹ پاتھ پہ سونے والوں کے درد آشنا کیسے ہو سکتے ہیں۔جس نے غُربت دیکھی نہیں، جو مُنہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا، وہ بھلا غریبوں کا دُکھ کیا جانے۔پھر تو ایسا ہی بجٹ بنے گا جیسا ڈار صاحب نے بنایا۔حضرت عمرؓ نے فرمایا''امیرالمومنین اُس وقت تک گیہوں کی روٹی نہیں کھا سکتا جب تک اُسے یقین نہ ہوجائے کہ اُس کی رعایا میں سے ہر ایک کو گیہوں کی روٹی میسر ہے''۔

اسحاق ڈار صاحب نے بجٹ تقریر کرتے ہوئے بڑے فخر سے کہا کہ کم از کم تنخواہ اور پنشن
ہزار سے بڑھا کر 13 ہزار کی جارہی ہے۔ دست بستہ عرض ہے کہ اِس 13 12
ہزار میں تو شاید ڈار صاحب اپنے صرف ایک دِن کے اخراجات بھی پورے نہ کر سکتے
ہوں پھر بھلا 13 ہزار میں ایک ماہ کا خرچہ کیسے پورا کیا جا سکتا ہے؟۔ڈار صاحب بہت
بڑے ماہرِ معاشیات ہیں اور اُن کی صلاحیتوں کے سبھی معترف، وہ چھوڑیں اِس بجٹ
وَجٹ کو بَس اتنا کر دیں کہ 13 ہزار روپے ماہانہ کا بجٹ بنا کے دکھا دیں۔ اگر وہ ایسا کر گئے
تو پھر ہم بھی اُن کی صلاحیتوں کے معترف ہو جائیں گے اور اگر نہیں تو پھر

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی

میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

یہ مکافاتِ عمل ہی تو ہے کہ آج تحریکِ انصاف کو اُسی بادِ مخالف کے تھپیڑوں کا سامنا ہے جو دھرنوں کے ایام میں نواز لیگ کے خلاف چلی اور خوب چلی۔ نواز لیگ تو اپنا دامن بچا کر نکل آئی کہ کسی ''امپائر'' کی انگلی کھڑی نہ ہو سکی لیکن جن پے در پے طوفانوں کا سامنا اب تحریکِ انصاف کو ہے اُن سے شاید وہ نکل نہ سکے۔ جس سونامی کا ذکر کپتان صاحب کی زبان پر ''ورد'' کی طرح جاری تھا، اب وہی سونامی تحریکِ انصاف کو گھیرے ہوئے ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اپنی شخصیت کا سحر توڑنے کے ذمہ دار بھی کپتان صاحب خود ہی ہیں۔ قوم نے تو دشتِ سیاست کے اِس نَو وارد کے وجود کو عطر بیز ہوا کا تازہ جھونکا جان کر والہانہ استقبال کیا لیکن جلد ہی بھید یہ کھلا کہ جسے وہ بادِ شمیم و نسیم سمجھ بیٹھے تھے وہ تو ایسی بادِ سموم ہے جو چلے تو صحنِ چمن اُجڑ کے رہ جاتا ہے ۔جب اہلِ عقل و دانش پر عیاں ہوا کہ خاں صاحب کی تگ و دو کا محور و مرکز مسندِ اقتدار ہے اور حصولِ مقصد کے لیے وہ ''جنگ اور محبت میں سب جائز ہے'' جیسے فارمولے پر عمل پیرا ہیں تو اُن کا ردِ عمل بھی شدید تر تھا۔ نتیجہ یہ کہ 2013ء کے انتخابات میں نتائج خاں صاحب کی توقعات کے بالکل برعکس ، جنہیں اُن کا قلب و ذہن تا حال قبول کرنے

کو تیار نہیں۔ دھرنوں کے ایام میں خاں صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو بھی کھل کر سامنے آگیا کہ نوجوانوں کے یہ محبوب رہنماء ضدی، اناء پرست اور نرگسیت کا شکار ایسے شخص ہیں جن کی ''کتابِ سیاست''میں یہ درج کہ جھوٹ اتنے تواتر سے بولو کہ سچ کا گماں ہونے لگے۔ ''دھرنا سیاست'' میں بُری طرح ناکام تحریکِ انصاف کو دھرنوں سے جان چھڑانا اُس وقت مشکل ہو گئی جب مولانا قادری اپنے عقیدت مندوں کے ہمراہ دھرنوں کو خیر باد کہہ کر اپنے ''دیس''سدھارے اور اپنے ساتھ ہی تحریکِ انصاف کی محفلیں بھی سونی کر گئے۔ پھر انتہائی کربناک ''سانحۂ پشاور''ہوا جس کی آڑ میں خاں صاحب نے نہ صرف دھرنے ختم کیے بلکہ کچھ عرصے بعد اُسی پارلیمنٹ میں جا بیٹھے جس کے خلاف وہ ایسی غیر پارلیمانی زبان استعمال کیا کرتے تھے جسے لکھتے ہوئے بھی قلم مارے شرم کے تھر تھرانے لگتا ہے۔

خیبر پختونخوا کے بلدیاتی انتخابات میں پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی دھاندلی ہوئی۔ اِن خونی انتخابات میں ستائیس افراد لقمۂ اجل بنے اور شاید ہی کوئی ''وارڈ''ایسا بچا ہو جہاں دھاندلی کے ریکارڈ نہ ٹوٹے ہوں۔ ریٹرننگ آفیسر اور پریزائیڈنگ آفیسر کو لکھ کر دیا کہ وزیرِ اعلیٰ پرویز خٹک کے بھائی لیاقت خٹک کے حلقے کی پولنگ رات بارہ بجے تک جاری رہی، خیبر پختونخوا کے وزیر علی امین گنڈاپور بیلٹ بکس لے کر فرار ہوئے۔ بیلٹ بکس جلائے گئے، پولیس والے سرِعام ٹھپے لگاتے رہے اور یہ سب کچھ الیکٹرانک میڈیا کے کیمروں نے قوم

کو دکھلا بھی دیا۔ خود کپتان صاحب نے یہ تسلیم کیا کہ دھاندلی ہوئی اِس لیے وہ فوج کی نگرانی میں دوبارہ انتخابات کروانے کو تیار ہیں۔ خیبر پختونخوا حکومت نے اسی سلسلے میں اے پی سی بلوائی جس میں اے این پی ، جمعیت علمائے اسلام ، پیپلزپارٹی اور نوازلیگ نے شرکت سے انکار کر دیا کیونکہ اُن کا مطالبہ ہے کہ پہلے حکومت مستعفی ہو کیونکہ اِس حکومت کی موجودگی میں شفاف انتخابات ممکن نہیں۔ تحریکِ انصاف کی اتحادی جماعت اسلامی حکومت کے مستعفی ہونے کا مطالبہ تو نہیں کر رہی لیکن دھاندلی کے خلاف سب سے توانا آواز بھی اُسی کی ہے۔ اب عمران خاں صاحب کہتے ہیں ''حکومت سے مستعفی ہونے کا مطالبہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ہم سے استعفےٰ مانگنے والوں نے نواز شریف سے استعفیٰ کیوں نہیں مانگا؟۔ 2013ء کے انتخابات میں دھاندلی ہوئی تو وفاقی حکومت مستعفی کیوں نہیں ہوئی ؟۔ ہم نے جوڈیشنل کمیشن کے فیصلے تک حکومت سے مستعفی ہونے کو نہیں کہا جبکہ حکومت KPK اے این پی ، جمعیت علمائے اسلام اور پیپلزپارٹی والے کہہ رہے ہیں کہ مستعفی ہو جائے''۔ عرض ہے کہ 2013ء کے انتخابات ایسی نگران حکومتوں کے تحت ہوئے جو پیپلزپارٹی کی منتخب کردہ تھیں، چیف الیکشن کمیشن تحریکِ انصاف کی مرضی سے منتخب ہوا ، عدلیہ ریٹرننگ آفیسرز تحریکِ انصاف کے مطالبے پر دینے کے لیے تیار ہوئی اور الیکشن سے پہلے تحریکی حلقوں کی جانب سے کسی قسم کی کوئی شکایت سامنے بھی نہیں آئی ۔یہی وجہ ہے کہ خاں صاحب نے میاں نواز شریف صاحب کو الیکشن میں بھرپور کامیابی پر مبارکباد بھی دی ۔ دوسری طرف

خیبر پختونخوا میں نگران نہیں بلکہ منتخب حکومت تھی جس کے ''زیرِ سایہ'' دھاندلی کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ نگران تو الیکشن کروا کر اپنے گھر چلے گئے لیکن کے پی کے حکومت تاحال برسرِ اقتدار ہے اِس لیے ''آزمودہ را آزمودن جہل است'' کے مصداق اِس حکومت کے ہوتے ہوئے بلدیاتی انتخابات کا دوبارہ ڈول ڈالا جانا جہالت ہی ہے۔

خاں صاحب نے یہ بھی بالکل غلط کہا کہ اُنہوں نے جوڈیشل کمیشن کے فیصلے تک حکومت کو مستعفی ہونے کو نہیں کہا کیونکہ وزیرِ اعظم صاحب نے تو قوم سے خطاب کرتے ہوئے 12 اگست 2014ء کو ہی جوڈیشل کمیشن کے قیام کا اعلان کر دیا تھا جسے تحریکِ انصاف نے تسلیم نہ کرتے ہوئے اسلام آباد کے ڈی چوک میں 126 روزہ دھرنا دیا۔ دھرنے کے دوران پارلیمنٹ ہاؤس، وزیرِ اعظم ہاؤس اور پی ٹی وی پر قبضے کی کوششوں کے علاوہ امپائر کی انگلی کھڑی ہونے کا انتظار بھی کیا جاتا رہا۔ جوڈیشل کمیشن کا فیصلہ اسی ہفتے متوقع ہے اور ہمیں یقین ہے کہ منظم دھاندلی ثابت نہیں ہو سکے گی کیونکہ کنٹینر پر کھڑے ہو کر کچھ کاغذات کو ہوا میں لہراتے ہوئے جذباتی نوجوانوں کو ورغلانا اور بات ہے اور ٹھوس ثبوت پیش کرنا یکسر مختلف۔ تحقیقاتی کمیشن ٹھوس ثبوت مانگتا ہے جس میں تحریکِ انصاف تاحال بُری طرح ناکام ہے۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ اِس میدان میں بھی تحریکِ انصاف کو ہزیمت کا سامنا ہی کرنا پڑے گا۔

تحریکِ انصاف کا وجود قوم کے لیے اِس لیے ضروری ہے کہ حکمرانوں کو راہِ راست

پر رکھنے کا فریضہ اپوزیشن ہی سرانجام دیتی ہے اور اگر اپوزیشن مضبوط ہو تو حکمران کبھی من مانی نہیں کر سکتے۔ بدقسمتی سے خاں صاحب سمیت اکابرینِ تحریکِ انصاف کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے اُفقِ سیاست پر اُبھرتی ہوئی یہ جماعت اپنی مقبولیت متواتر کھوتی چلی جارہی ہے جس کا واضح ثبوت ملک کے طول و عرض میں ہونے والے ضمنی انتخابات ہیں جن میں تحریکِ انصاف کو زیادہ تر ہزیمت کا سامنا ہی کرنا پڑا۔ حال ہی میں ہونے والے ننکانہ صاحب اور منڈی بہاؤالدین کے قومی اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں تحریکِ انصاف کو نون لیگ کے مقابلے میں 35 ہزار سے زائد مارجن پر شکست ہوئی۔ منڈی بہاؤالدین کی نشست تو تحریکِ انصاف کی خالی کردہ تھی پھر بھی نوازلیگ کے امیدوار کو 77 ہزار سے زائد ووٹ ملے جبکہ تحریکِ انصاف کے امیدوار کو صرف 40 ہزار۔ گلگت بلتستان کے انتخابات میں نوازلیگ نے واضح کامیابی حاصل کرتے ہوئے 27 میں سے 14 نشستیں جیت لیں جبکہ پیپلزپارٹی کا صفایا ہوگیا اور اُس کے سابق وزیرِاعلیٰ گلگت بلتستان بھی ہار گئے۔ تحریکِ انصاف کو بھی ہزیمت کا ہی سامنا کرنا پڑا اور اس کے حصے میں صرف ایک نشست ہی آسکی۔ 2013ء کے انتخابات کے بعد ہونے والے ضمنی الیکشنز اور گلگت بلتستان کے الیکشن سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نوازلیگ کی مقبولیت کا گراف متواتر بڑھتا چلا جارہا ہے اِس لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ محترم خاں صاحب ''منظم دھاندلی'' کا شور مچانے کی بجائے قومی دھارے میں شامل ہو کر اپنی صلاحیتیں ملک و قوم کی بہتری کے لیے وقف کردیں۔

امن ہی بہتر ہے مگر۔۔۔۔

امن کی آشا کے گیت گانے اور سرحدوں پر الفت و محبت کے دیپ جلانے والوں کو نوید ہو کہ بھارتی وزیرِاعظم نریندر مودی نے پاکستان توڑنے کی سازش کا اعتراف کر لیا ۔اپنے دَورہ بنگلہ دیش کے موقعے پر اُنھوں نے کہا کہ بھارتی فوجیوں کا خون بھی بنگلہ دیش کی تشکیل میں شامل ہے ۔ہر بھارتی چاہتا تھا کہ بنگلہ دیش بنے ۔بھارتی افواج بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے مکتی باہنی کے ساتھ مل کر لڑیں اور بنگلہ دیش کے خواب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مدد کی ۔مودی نے یہ بھی کہا کہ وہ 1971ء میں مکتی باہنی کی حمایت میں ستیہ گرہ تحریک میں بطور رضا کار شرکت کے لیے دہلی آئے تھے ۔بنگلہ دیشی وزیرِاعظم حسینہ واجد اور نریندر مودی کی آپس میں اِس لیے گاڑھی چھنتی ہے کہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ دونوں ہی چنگیزیت کے علمبردار اور انتہائی کینہ پرور۔ حسینہ واجد چُن چُن کر اُن بنگلہ دیشی مسلمانوں کو نام نہاد عدالتوں کے ذریعے پھانسیاں دلوا رہی ہے جنھوں نے 1971ء میں پاکستان کی حمایت کی تھی اور نریندر مودی کی وحشت و درندگی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔یہ وہی مودی ہے جسے گجرات کے بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے پر آج بھی فخر ہے ۔یہ وہی نریندر مودی ہے جسے امریکی حکومت نے دہشت گرد قرار دیتے ہوئے ویزہ دینے سے انکار کر دیا۔ مودی کی راہوں میں آنکھیں بچھانے والی بنگلہ دیش

وزیرِاعظم نے مودی کی خدمت میں ایک تصویر پیش کی۔یہ وہی تصویر تھی جو اُس وقت لی گئی جب ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جنرل نیازی نے ہتھیار ڈالے۔حسینہ واجد کا بھارتی وزیرِاعظم کی خدمت میں ایسا ''تحفہ'' پیش کرنا دراصل اُس کی پاکستان اورپاکستانیوں سے شدید ترین نفرت کا کھُلا اظہار تھا۔اِس کے باوجود بھی اب اگر کوئی حسینہ واجد کے حق میں کلمۂ خیر کہے تو اُس کی غیرت وحمیت سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔امن اور شانتی کی امید باندھنا عین انسانیت لیکن جو شخص لازمۂ انسانیت سے خالی ہو اُس سے ایسی اُمید رکھنا عبث اوراحمقوں کی جنت میں بسنے کے مترادف۔بھارتی وزیرِاعظم پاکستان دشمنی میں اتنے مخبوط الحواس ہو چکے ہیں کہ اُنہوں نے ''اعترافِ گناہ'' کرتے وقت یہ تک نہ سوچا کہ عالمی برادری پراِس اعتراف کا کتنا منفی اثر ہو سکتاہے۔ہمارے دفترِخارجہ نے کہاہے'' عالمی برادری مشرقی پاکستان میں بھارتی مداخلت کے اعتراف کانوٹس لے کیونکہ یہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی کھلی خلاف ورزی ہے''۔شاید ہمارے امورِخارجہ کے بزرجمہروں کو اتنا بھی علم نہیں کہ اقوامِ متحدہ توامریکہ اوراُس کے حواریوں کے گھر کی لونڈی اوردَر کی باندی ہے،اُس میں بھلا اُس مخبوط الحواس وحشی درندے کی زباں بندی کی سکت کہاں ؟۔ویسے بھی یہ مسلمہ حقیقت تو یہی ہے کہ ''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے''۔

نریندر مودی کی تلملاہٹ کا اصل سبب یہ ہے کہ اُس کو نہ تو چین کے 46 ارب ڈالر کے منصوبے ہضم ہو رہے ہیں اور نہ ہی اقتصادی راہداری۔ جنگ چھیڑنے کے وہ متحمل ہو نہیں سکتے کہ اگر ایسی حماقت ہوئی تو ''اُن کی داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں'' ۔یہ 71ء نہیں، 2015ء کا پاکستان ہے جو دفاعی لحاظ سے ہمالیہ سے بھی زیادہ مضبوط۔ 28 مئی 98ء کے دھماکوں کے بعد پاکستان نے ایٹمی وار ہیڈ دشمن کے ٹھکانوں تک داغنے کے لیے 6 اپریل 99ء کو شاہین وَن کا کامیاب تجربہ کیا۔اِس میزائل کی رینج 900 کلومیٹر ہے اور یہ اپنے ٹارگٹ کو 100 فیصد درست نشانہ لگانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شاہین ٹو کی رینج 2200 کلومیٹر اور شاہین تھری کی 2750 کلومیٹر ہے۔ فروری 2015ء میں شاہین تھری نے بحرِ ہند میں 2750 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ''فلوٹنگ ٹارگیٹ'' کو درمیان میں سے دو ٹکڑے کر ڈالا۔ شاہین تھری انڈیا کی جزائر اِنڈیمان میں واقع آخری دفاعی تنصیبات کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ شاہین تھری ہی ہے جس کا نام سنتے ہی بھارتی منصوبہ سازوں کو ''تَریلیاں'' آنے لگتی ہیں۔ ہمارے سائنس دان رعد اور بابر نامی کروز میزائلوں کا بھی کامیاب تجربہ کر چکے ہیں۔ پاکستان دُنیا کا چوتھا ملک ہے جس نے کروز میزائل کا کامیاب تجربہ کیا۔اِس سے پہلے امریکہ، روس اور فرانس ہی یہ میزائل بنا رہے تھے۔ یہ صلاحیت بھارت کے پاس نہیں البتہ اُس نے دنیا پر یہ دھاک جمانے کی کوشش ضرور کی کہ وہ کروز میزائل

بنا چکا ہے۔ ہوا یوں کہ بھارت نے روس سے چار کروز میزائل لیے اور اُنہیں فائر کرکے شور مچا دیا کہ اُس نے کروز میزائل کا کامیاب تجربہ کرلیا ہے لیکن خود روس نے ہی اُس کا بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑ دیا۔ کروز میزائل دشمن کے ریڈار کو دھوکہ دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ لڑاکا طیاروں، بحری جہازوں سے زمین اور زمین سے زمین پر بھی فائر کیا جا سکتا ہے۔ بابر کروز میزائل کی رفتار 900 کلومیٹر فی گھنٹہ ہے اور یہ زمین سے صرف 100 میٹر اوپر بھی پرواز کر سکتا ہے۔ یہ کوئی الف لیلوی داستان نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ ''بابر'' کروز میزائل اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو عبور کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا اور رات کے اندھیرے میں بھی اپنے ٹارگٹ کو درست نشانہ لگا سکتا ہے۔ وطن کی محبت سے سرشار ہمارے ایٹمی سائنس دانوں نے ایک ایسے میزائل کا تجربہ کیا ہے جس پر صرف بھارت ہی نہیں مغربی دنیا بھی حیران و پریشان ہے۔ نام اِس میزائل کا ''نصر'' ہے اور یہ چشمِ زدن میں دشمن کے ہزاروں فوجیوں کو نیست و نابود کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہم ڈرون بھی بنا چکے اور 23 مارچ کو اِس کی نمائش بھی کرڈالی۔ یوں تو ہمارے پاس اور بھی بہت کچھ ہے لیکن ہندو لالے کو راہِ راست پر رکھنے کے لیے یہ بھی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ ویسے یہ تو ہندو بنیا بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ جذبۂ شوقِ شہادت سے لبریز افواجِ پاکستان اپنی صلاحیتوں میں لاثانی ہیں اِس لیے نہ تو ''لالہ جی'' ہم پر کبھی حملہ کرنے کی جرات کر سکتا ہے اور نہ ہی اُس کی ''گیدڑ بھبکیوں کا ہم پر اثر ہونے والا ہے لیکن اگر اُس نے ایسی کوئی ''حماقت

کرڈالی تو پھر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اُسے اپنی ''دھوتی'' سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ بھارت ''پاک چائنا کوریڈور'' منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے وہی کچھ کر سکتا ہے جو وہ کر رہا ہے یعنی ''را'' کے ایجنٹوں کے ذریعے افراتفری۔ بہت عرصے تک تو ''را'' کا نام لینے پر بھی ہمارے حکمرانوں کی زبانوں پر لکنت طاری ہوتی رہی جبکہ دوسری طرف بھارت ہر الزام آئی ایس آئی پر دھرتا رہا لیکن اب ہمارے حکمران بھی کھُل کر پاکستان میں دہشت گردی کا سبب ''را'' کو قرار دے کر ''عالمی ضمیر'' کو جھنجھوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے وزیرِاعظم صاحب اور محترم چیف آف آرمی سٹاف افغان حکومت کو مکمل ثبوتوں کے ساتھ یہ باور کروا چکے ہیں کہ ''را'' کے ایجنٹ اپنی تخریبی سرگرمیوں کے لیے افغانستان کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ افغان حکومت نے بھی اِس معاملے میں پاکستان کی بھرپور مدد کی یقین دہانی کروائی ہے لیکن اِس کے باوجود بھی بھارت اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آئے گا کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ اگر یہ کوریڈور بَن گیا تو بھارت کا علاقے کا چودھری بننے کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔ اگر دفاعی لحاظ سے مضبوط پاکستان اقتصادی لحاظ سے بھی مضبوط ہو گیا تو پھر بھلا اُسے کون چودھری مانے گا؟۔

UMT کے ناشتے کا قصّہ

ڈاکٹر عمرانہ مشتاق کے اندر یقیناً کوئی بے چین روح حلول کر چکی ہے جو اُنہیں ہمہ وقت وہمہ دَم بے چین و بیقرار رکھتی ہے۔ سعداللہ شاہ تو اُنہیں کہتے ہی ''بے چین روح'' ہیں۔آئے روز کوئی نہ کوئی ادبی ''کھڑاک کرنا'' عمرانہ مشتاق کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ یہ اُن کا شعروادب سے خصوصی شغف کا کمال ہے کہ وہ اکثر شاعروں ،ادیبوں اورلکھاریوں کو ایک چھت تلے جمع کرنے کی سعی کرتی رہتی ہیں۔ گزری اتوار اُنہوں نے ہمیں بھی UMT میں ''لاہوری ناشتے'' کی دعوت دی۔اُن کا ''بلاوا'' ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا کہ وہ خلوص کی خوشبو سے معطر تھا۔جون کے مہینے میں یوں تو گھر سے نکلنا محال ہوتاہے اوروہ بھی اتوارکے دِن لیکن ایک تو ادبی کانفرنس جس کی کنوینئر خود ڈاکٹر عمرانہ مشتاق تھیں اور دوسرے لاہوری ناشتے کی کشش ، گویا ایک پنتھ دوکاج کے مصداق اُردو کانفرنس میں شرکت بھی اورلاہوری ناشتہ بھی ۔سُنا ہے کہ '' نشہ بڑھتاہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں'' لیکن ہمیں پتہ نہیں کہ خوبصورت اشعار میں نشہ زیادہ ہوتاہے یا لاہوری ناشتے میں۔ لاہوریوں کی ''کھابے'' کھانے کی عادت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے (ہم خود بھی لاہوری ہیں) توبَرملا کہا جاسکتا ہے کہ لاہوری ناشتے کا نشہ سَرچڑھ کے بولتاہے۔دیسی پائے اور پیڑوں والی لسّی میں جتنا نشہ ہے وہ بھلا شعروں میں کہاں۔ اُردو کانفرنس

میں شرکت کا مصمم ارادہ باندھ کر ہم نے اپنے میاں سے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا لیکن توقع کے عین مطابق اُنھوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔اِس قسم کی محافل میں اُن کو لے جانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ہم نے اُنہیں مکھن لگانے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے کہا ''UMT نے ایک اُردو کانفرنس کا انعقاد کیا ہے اور اُردو ادب کا اُستاد ہونے کے ناطے کیا آپ کا فرض نہیں کہ کانفرنس میں شرکت کرکے اپنی اُردو سے محبت کا ثبوت دیں ۔اُنھوں نے کہا ''پہلی بات تو یہ کہ میری اُردو سے محبت لیلیٰ مجنوں والی ہے نہ ہیر رانجھے والی، میری اُردو سے محبت کی وجہ یہ ہے کہ بابائے قوم نے اِسے ''قومی زبان'' کا درجہ دیا اور میں اسی میں اپنی ''شناخت'' تلاش کرتا رہتا ہوں ۔پاکستان میں ہونے والی اُردو کانفرنسیں نشستن ، گفتن ،برخاستن سے آگے نہیں بڑھ پاتیں''۔میاں تو شاید تقریر کے موڈ میں تھے لیکن ہم نے بیچ میں ہی ٹوک کر پینترا بدلتے ہوئے کہا '' لاہوری ناشتے میں ''پائے'' بھی ہوتے ہیں''۔اعلیٰ پائے کے ''پائے'' کھانے کا اُنہیں جنون ہے اِس لیے میرا یہ حربہ کار گر رہا، پائے کا نام سُنتے ہی اُنھوں نے کہا ''UMT تو ہمارے گھر کے قریب ہی ہے ، اگر تم مجبور کرتی ہو تو چلو وہاں کے پائے بھی چکھ ہی آتے ہیں''۔

UMT پہنچ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ اِس تعارفی تقریب میں اُردو سے محبت کرنے والوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔یقیناً یہ سب کچھ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق کی

محنتوں کا ہی ثمر ہوگا۔ معروف لکھاری محترم رؤف طاہر نے کمال شفقت سے اپنی ٹیبل پر ہمارے بیٹھنے کا انتظام کیا۔ میرے ساتھ والی نشست پر محترمہ فاطمہ قمر بیٹھی تھیں جن کی اُردو سے والہانہ محبت دیکھ کر ہمیں یقین ہوگیا کہ ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں''۔ بھائی رؤف طاہر نے میرے میاں کو بھی اُسی میز پر بیٹھنے کے لیے کہا لیکن اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا ''میں خواتین کے ساتھ نہیں بیٹھا کرتا''۔ دراصل اِس تقریب میں اُنہیں کئی شناسا چہرے نظر آ رہے تھے جنہیں مِل کر وہ ''عمرِ رفتہ'' کو آواز دینا چاہتے تھے۔ ہماری نظر کچھ دور بیٹھے روزنامہ نئی بات کے گروپ ایڈیٹر اور نیوز چینل نیو''کے اینکر انتہائی محترم عطاء الرحمٰن پر پڑی تو ہم اُنہیں سلام کرنے کے لیے گئے۔ اُن'' کا انداز وہی مشفقانہ جس کا اظہار وہ ہر ملاقات میں کرتے ہیں۔ عطاء بھائی نے ''ایویں خوامخواہ'' اپنے اوپر بزرگی کا خول چڑھا رکھا ہے حالانکہ اپنے کالموں میں وہ بھرپور جوان'' نظر آتے ہیں۔ سچی بات ہے کہ ہم تو ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی'' نے کنبہ جوڑا'' کے مصداق اِدھر اُدھر سے خبریں اُٹھا کر کالم پیٹ بھر دیتے ہیں لیکن عطاء بھائی کے کالم معلومات کا خزانہ اور نئے لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ۔

تقریب کا آغاز اُردو کانفرنس کی کنوینئر ڈاکٹر عمرانہ مشتاق نے کیا جس میں کانفرنس کی غرض وغائت بیان کرتے ہوئے یہ کہہ کر جی خوش کر دیا کہ اسی چھت تلے

ایسی تقاریب منعقد ہوتی ہی رہیں گی۔ ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی کی گفتگو تھی تو پُر مغز تھی لیکن سامعین کی نظریں ناشتے کی میزوں پر ٹکی تھیں کہ کب برتن ''کھڑکیں'' اور وہ تکبیر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ایسے ہی ناشتے پر ''جھپٹ'' پڑیں جیسے افواجِ پاکستان طالبان نامی دہشت گردوں پر۔ جونہی ناشتے کا اعلان ہوا، لوگ ناشتے کی میزوں کی طرف لپکتے بلکہ جھپٹتے دیکھ کر مجھے اقبالؒ یاد آ گئے جنہوں نے کہا تھا کہ

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

لیکن یہاں احباب لہو گرم رکھنے کے لیے نہیں بلکہ پائیوں پر جھپٹتے، پلٹتے اور پھر پلٹ کر جھپٹتے پائے گئے۔ '' نفسا نفسی'' کا ویسا ہی عالم جیسا روزِ قیامت ہو گا۔ کچھ لوگ تو عالمِ بیخودی میں پائے یوں ''ادھیڑتے'' نظر آئے جیسے اُن سے جنم جنم کا بدلہ چکا رہے ہوں۔ اُدھر پائے آتے، اِدھر لمحوں میں صاف۔ ڈِش میں پڑا شوربہ حیرت کی تصویر بنا پائیوں پر جھپٹنے والوں کی شوریدہ سَری دیکھتا رہ جاتا۔ دوسری طرف عالم یہ کہ پلیٹوں میں پڑی پائیوں کی ہڈیاں کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں کا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ وہاں ''پایہ پیا'' تو بہت تھے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ''چوٹی'' کِس نے سَر کی۔ دراصل پائے تھے ہی اتنے مزیدار کہ کسی کو ''صبر و قرار ذرا نہ رہا''۔ اُس دِن مجھے بیچارے بکروں پر

بہت ترس آیا۔

UMT کے اربابِ اختیار نے ناشتے کا ''کھُلاڈُلا'' انتظام کر رکھا تھا۔ حلوہ، پوری، چنے نان اور پائے وافر مقدار میں تھے۔ آملیٹ اور سلائس بھی تھے لیکن اُن کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ چائے اور کافی کا انتظام بھی تھا لیکن ''لَسّی'' کہیں نظر نہیں آئی حالانکہ یہ تو ''لاہوری ناشتے'' کا لازمی جزو ہے۔ میرے میاں خالی پلیٹ ہاتھ میں لیے ناشتے کی میزوں کا طواف کرتے نظر آئے تو ہم نے ''خالی پلیٹ'' کا سبب پوچھا۔ کہنے لگے ''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں''۔ ہم نے کہا ''سارے نون لیگئے ایسے ہی ہوتے ہیں''۔ اِس سے پہلے کہ اُن کی زبان سے کوئی ''سَڑابُسا'' جملہ پھسلتا، ہم وہاں سے کھِسک لیے۔ ناشتے کے بعد ہم نے ڈاکٹر عمرانہ مشتاق سے اجازت لے کر گھر کی راہ لی۔ خیال تو یہی تھا کہ کچھ دیر شعر و شاعری کا ''مزہ'' بھی چکھ لیا جائے لیکن گھر میں کچھ مہمانوں کی آمد متوقع تھی اِس لیے مجبوراً واپس آنا پڑا۔ واپسی پر میرے میاں عالمِ غیض میں تھے شاید یہ پائیوں پہ ہاتھ صاف نہ کرنے کا دُکھ ہو۔ وہ بڑبڑاتے اور ہم سنتے رہے۔ اُنھوں نے کیا کہا اور ہم نے کیا سُنا، یہ راز کی باتیں ہیں جنہیں سرِعام نہیں کہا جا سکتا۔

شہیدوں کا وارث کون۔۔۔؟

اللہ بھلا کرے ڈی جی رینجرز سندھ میجر جنرل بلال اکبر کا جن کے ویکس کمیٹی کے اجلاس میں ایک ہی ''نعرۂ مستانہ '' سے وہ بھی بے حجاب ہو گئے جنھوں نے مفاہمت نامی منافقت کا نقاب اوڑھ رکھا تھا۔اپنے یہ آصف علی زرداری بھی عجیب شَے ہیں۔کہاں تو ایسی مفاہمتی پالیسی کہ اُس ''قاتل لیگ '' کو''قابل لیگ ''بنا کر ڈپٹی پرائم منسٹری دے ڈالی جس کے سیکرٹری جنرل مشاہد حسین سید پیپلز پارٹی کی سیاست کے بارے میں یہ کہا کرتے تھے کہ ''لُٹو تے پھُٹو''۔پرویز مشرف کو گارڈ آف آنر دے کر رخصت کیا، ایم کیو ایم اور اے این پی کو ''کھُل کھیلنے ''کا موقع دیا اور مولانا فضل الرحمٰن کے نخرے۔برداشت کرتے کرتے تھک بلکہ ''ہپھ ''گئے اور کہاں یہ ''کھڑاک ''کہ مفاہمتی نقاب نوچ کر سیدھے اکھاڑے میں۔متھا بھی لگایا تو کس سے ؟۔۔۔اُس ادارے سے کہ جس کے جوان حرمتِ وطن کی خاطر قربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کر رہے ہیں۔تاریخِ پاکستان کا یہ کردار بھی عجیب ہے کہ ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' سے اپنی سیاسی زندگی کا سفر شروع کیا اور پھر ترقی کرتے کرتے ''مسٹر ہنڈرڈ پرسینٹ ''بن گئے۔ترقی کا یہ سفر رُکا نہیں، جاری رہا اور پھر ایک دِن ایسا بھی آیا کہ '' جعلی وصیت '' کو بنیاد بنا کر ایوانِ صدر تک جا پہنچے۔ملکی تاریخ میں کسی سیاسی لیڈر نے ایسا سوچا بھی نہیں ہوگا جو زرداری صاحب نے

کہہ ڈالا۔ اُنھوں نے اسٹیبلشمنٹ کو براہِ راست دھمکی دیتے ہوئے کہا ’’ہمیں تنگ مت کرو ورنہ اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ پیپلزپارٹی جنگ سے نہیں ڈرتی ،جنگ کرنا ہمیں ہی آتاہے ،ہمیں معلوم ہے کہ عدالتوں میں کتنے کیس چل رہے ہیں اور کتنے چلنے والے ہیں جن میں آپ کے ’’پیٹی بھائی‘‘ مجرم ہیں۔میں نے فہرست بنائی تو کئی جرنیلوں کے نام آئیں گے ،پھر جواب دیتے رہنا‘‘۔ عین اُس وقت جب ہمارے فوجی جوان اور رینجرز دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں،زرداری صاحب کا یہ بیان انتہائی نامناسب ،غیر مہذب اور ہتک آمیز ہے۔مسئلہ اُس ایپکس کمیٹی میں دی جانے والی بریفنگ سے کھڑاہوا جس کی سربراہی وزیرِاعلیٰ سندھ قائم علی شاہ کے سپرد ہے۔جنرل بلال اکبر نے جوکچھ کہا ،سچ کہااور آئین و قانون کے دائرے میں رہ کر کہالیکن اُن کا کہا پیپلزپارٹی کو منظور تھا نہ ایم کیوایم کو۔بات شاید طول نہ پکڑتی اگر 6 سابقہ اور 11 موجودہ وزراء کے خلاف تحقیقات کے لیے نہ کہاجاتا۔جب معاملہ اِس موڑ پر پہنچ گیاتو زرداری صاحب کویوں محسوس ہونے لگاکہ جیسے سندھ میں گورنر راج کی آمدآمد ہے اسی لیے وہ پھٹ پڑے۔

زرداری صاحب نے بہت کچھ کہااور جوکچھ کہا سبھی نامناسب۔اُنھوں نے کہا’’جب پیپلزپارٹی ہلتی ہے توپوراملک ہِل جاتاہے۔ہم جب چاہیں اور جب تک چاہیں فاٹا سے کراچی تک پوراملک بند کر سکتے ہیں‘‘۔ عرض ہے کہ اگرزرداری صاحب دِن میں خواب دیکھناچھوڑ دیں تواُن کی ’’صحت‘‘ کے لیے اچھاہوگا۔ بھٹومرحوم نے بھی

کہا تھا کہ اُن کی موت پر ہمالیہ بھی روئے گا، ہمالیہ تو نہیں رویا البتہ بھٹو مرحوم گڑھی خُدا بخش میں ابدی نیند ضرور جا سوئے۔ یہ اُس دَور کی بات ہے جب پیپلز پارٹی اپنی مقبولیت کی رفعتوں کو چھو رہی تھی لیکن اب تو اِس کی طبعی موت ہو چکی اور اِس موت کے ذمہ دار بھی زرداری صاحب خود ہی ہیں۔ ضیاء الحق مرحوم نے پیپلز پارٹی کو ختم کرنے کی ہر کوشش کر ڈالی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ''پاکستان کھَپے'' کا نعرہ لگا کر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے والے آصف زرداری صاحب نے البتہ اپنے پانچ سالہ دَورِ حکومت میں اپنی ہی پارٹی کے ساتھ وہ '' ہَتھ'' کیا کہ بیچاری سکڑ سمٹ کر سندھ تک محدود ہو گئی۔ اگلے الیکشن میں شاید سندھ بھی چھِن جائے اور پھر اِس کی ''داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں''۔ ''پاکستان کھَپے'' جیسے نعرے کی حقیقت بھی سب پہ عیاں ہو چکی۔ کون نہیں جانتا کہ بینظیر کی شہادت کے بعد عین اُس وقت جب زرداری صاحب کھَپے کھَپے'' کہہ رہے تھے ،اُن کے فرستادہ امین فہیم صاحب پرویز مشرف سے '' اندر کھاتے'' ملاقاتیں کرکے اُنہیں یہ یقین دلا رہے تھے کہ پیپلز پارٹی اُن کے کندھے '' سے کندھا ملا کر کھڑی ہے۔ ''پاکستان کھَپے'' کا نعرہ تو محض اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے کا ایک بہانہ تھا، وطن کی محبت نہیں۔ ویسے یہ تو ماننا پڑے گا کہ اپنے دَورِ اقتدار میں زرداری صاحب نے پاکستان کو واقعی ''کھپا'' کے رکھ دیا۔

محترم آصف زرداری پیپلزپارٹی کو شہیدوں کی پارٹی اور اپنے آپ کو شہیدوں کی پارٹی کا وارث کہتے رہتے ہیں۔ پیپلزپارٹی تو شہیدوں کی پارٹی ہے کہ سوائے نصرت بھٹو کے کسی کو بھی طبعی موت نصیب نہیں ہوئی لیکن اِس کے وارث نقلی ۔اصلی وارث تو ذوالفقار جونیئر ہے بلاول نہیں کہ اپنے نام کے ساتھ ''بھٹو'' کا لاحقہ لگا دینے سے کوئی بھٹو نہیں بن جاتا۔ حیرت ہے کہ زرداری صاحب نے اپنا نام ''آصف بھٹو زرداری'' کیوں نہیں رکھا؟۔ویسے زرداری صاحب اپنے آپ کو شہیدوں کی پارٹی کا وارث کیسے قرار دے سکتے ہیں ؟کہ ذوالفقار علی بھٹو کو جب پھانسی دی گئی تو موصوف کے والد حاکم علی زرداری مرحوم پیپلزپارٹی میں نہیں بلکہ اے این پی میں تھے ، شاہنواز بھٹو جلاوطنی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے ۔تب بھی آصف زرداری صاحب کا پیپلزپارٹی سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا، میر مرتضٰے بھٹو کے قتل پر آج بھی انگلیاں زرداری صاحب کی طرف ہی اُٹھتی ہیں۔ وہ قتل اندھا تھا تو نہیں لیکن بنا دیا گیا۔ رہا بی بی شہید کا معاملہ تو ذوالفقار علی مرحوم کے فرسٹ کزن ممتاز بھٹو آج بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ بی بی شہید کے قتل میں آصف زرداری ملوث نہیں تھے۔ سابق وزیرِ اعلیٰ سندھ ارباب غلام رحیم کا یہ طنزیہ جملہ آج بھی لوگوں کو ازبر ہے کہ ''بعض اوقات کھُرا خود کھوجی کے گھر میں بھی جا پہنچتا ہے''۔ قتل یہ بھی اندھا نہیں تھا لیکن بنا دیا گیا۔ میاں نواز شریف صاحب نے کہا تھا کہ وہ برسرِ اقتدار آ کر بینظیر کے قاتلوں کو بے نقاب کریں گے لیکن پتہ نہیں کس ''مفاہمتی پالیسی'' کے تحت

وہ بھی خاموش ہیں۔ ہمیں تو زرداری صاحب کسی بھی لحاظ سے شہیدوں کی پارٹی کے وارث نہیں لگتے لیکن وہ اگر کہتے ہیں تو "پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے"۔

زرداری صاحب نے جن کو مخاطب کرکے یہ کہا "آپ کو تین سال رہنا اور چلے جانا ہے ۔ پھر ہم نے ہی رہنا ہے" دراصل وہی تو شہیدوں کے وارث اور شہیدوں کے خاندان، سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ اپنے خون سے قربانی کی لازوال داستانیں رقم کرنے والے شہیدوں کی وراثت چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف کے پاس ہی تو ہے۔ شجاعت اور قربانی اُن کی گھٹی میں پڑی ہے۔ وہ ایک نشانِ حیدر (میجر شبیر شریف شہید) کے بھائی اور دوسرے نشانِ حیدر (میجر عزیز بھٹی شہید) کے بھانجے ہیں۔ بھلا زرداری صاحب کا شہیدوں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے اِس "شجاع" سے کیا مقابلہ۔ وہ شہیدوں کے "نقلی" اور یہ "اصلی" وارث۔ کہا جا سکتا ہے کہ "چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک"۔۔۔ اور ہاں جنرل صاحب نے تو تین سال بعد بھی اِدھر ہی رہنا ہے البتہ زرداری صاحب کا "کُھ" پتہ نہیں کہ وہ دبئی میں مستقل سکونت اختیار کرتے ہیں یا لندن میں۔

کون، کس پہ بھاری۔۔۔؟

ہمارے طلال چودھری پہلودار شخصیت کے مالک ہیں۔ یوں تو وہ پکّے نون لیگئے ہیں لیکن تحریکِ انصاف کی محبت میں بھی سرشار رہتے ہیں۔ اُن کی جنوں خیزی کا یہ عالم کہ وہ تحریکِ انصاف سے بات کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کی تحریکِ انصاف سے چھیڑ چھاڑ کا بَس ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ

جی چاہتا ہے چھیڑ کے ہوں اُن سے ہم کلام
کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں

اِس "اِٹ کھڑکے" میں اُن کی ایک اور خواہش بھی پنہاں ہوتی ہے کہ سونامی کو جوش میں آتا دیکھ کر وہ زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہیں کہ

کتنے "شیریں" ہیں تیرے لَب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوا

19 جون کو پارلیمنٹ کے اجلاس میں اُنہوں نے محترمہ شیریں مزاری کو "آنٹی" کہہ دیا جس پر وہ بھڑک اُٹھیں۔ اُن کا آگ بگولا ہونا بالکل بجا کہ خواتین اپنی

عمر کے بارے میں حسّاس ہی بہت ہوتی ہیں۔ شیریں مزاری چونکہ خاتون ہیں اِس لیے ہماری تمام تر حمایت اور ہمدردیاں اُن کے ساتھ ہیں۔ بننا سنورنا ہر عورت کا بنیادی حق ہے اور اگر شیریں مزاری صاحبہ اسی حق کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے اپنے بالوں کو "سہ رنگی ٹچ" دینے کے لیے کئی کئی گھنٹے صَرف کر دیتی ہیں تو دوسروں کے پیٹ میں کیوں مروڑ اُٹھنے لگتے ہیں؟۔ ہم سمجھتے ہیں کہ طلال چودھری کا اُنہیں "آنٹی" کہہ دینا انتہائی غیر پارلیمانی ہے۔ حقوقِ نسواں کی NGO's یقیناً اِس "بَد تمیزی" پر بینرز اور پلے کارڈز اُٹھائے سڑکوں پر نکل آتیں لیکن ایک تو آجکل وہ خود "حکومتی تخریب کاری" کے ہاتھوں "وَخت" میں پڑی ہوئی ہیں، دوسرے گرمی بھی بہت اور سب سے اہم بات یہ کہ اِس "احتجاج" پر ڈالر یا پاؤنڈ ملنے کی ہرگز توقع نہیں۔ ہم نے آئین کی کتاب کھول کر کوئی ایسا آرٹیکل تلاش کرنے کی کوشش کی جسے طلال چودھری کی اِس بَد تمیزی پر لاگو کیا جا سکے لیکن "کَکھ" پلّے نہ پڑا۔ اِس لیے چار و ناچار ہمارا مشورہ تو یہی ہے کہ چودھری صاحب پر آرٹیکل چھ لاگو کر دیا جائے تاکہ "نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری"۔

ہمارے سپیکر ایاز صادق صاحب نے طلال چودھری کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ غیر پارلیمانی لفظ "آنٹی" کی بجائے پارلیمانی لفظ "آپا" استعمال کرے۔ کوئی سپیکر صاحب سے پوچھے کہ طلال چودھری کوئی "چُوچہ" ہے جو شیریں مزاری کو "آپا" کہے؟۔ دونوں میں بس اُنیس، بیس کا ہی فرق ہوگا اور یقیناً شیریں

مزاری ہی ''انیس'' ہیں۔ چودھری صاحب شیریں مزاری سے پلٹے تو ہمارے ''تیلی پہلوان'' پر اقرباء پروری کا الزام دھرتے ہوئے مستقبل کی خاتونِ اوّل محترمہ ریحام خاں تک جا پہنچے ۔اُنھوں نے کہا ''ریحام خاں صاحبہ خیبر پختونخوا حکومت کے ہیلی کاپٹر کو رَکشے'' کی طرح استعمال کرتی رہتی ہیں''۔ ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے '' شدید گرمی نے چودھری صاحب کی ''مَت'' ماردی ہے۔ اگر ریحام خاں نے اپنے ہی صوبے کا ہیلی کاپٹر بھی استعمال نہیں کرنا تو پھر اُنہیں کپتان صاحب سے شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ریحام خاں کے ذکر پر تو تحریکِ انصاف نے صرف تلملانے پر اکتفا کیا لیکن جونہی کپتان صاحب کا نام نامی ، اسمِ گرامی طلال چودھری کے لبوں پر آیا ساری اپوزیشن پھٹ پڑی اور ''واک آؤٹ'' کر گئی۔ پھر طلال چودھری نے سپیکر صاحب کو دَھر'' لیا۔ وہ قومی اسمبلی کے حلقہ 122 پر بات کرنا چاہتے تھے۔ سپیکر صاحب نے'' اُنہیں لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ ''پیو یار ، تنگ نہ کر ، یہ میرا حلقہ ہے جس پر میری موجودگی میں بات کرنا مناسب نہیں'' لیکن چودھری تو چودھری ہوتا ہے اور وہ چودھری ہی کیا جو مان جائے اِس لیے مجبوراً ایاز صادق کو بھی ''واک آؤٹ'' کرنا پڑا۔ شاید طلال چودھری یہ سوچ کر پارلیمنٹ میں آئے تھے کہ ''گلیاں ہو جان سونجیاں، وِچ مرزا یار پھرے''۔ کہا جا سکتا ہے کہ طلال چودھری پارلیمنٹ کے اِس اجلاس میں تحریکِ انصاف پر بہت ''بھاری'' پڑے۔ ویسے تو جسٹس (ر) وجیہ الدین بھی آجکل تحریکِ انصاف پر بہت بھاری پڑ رہے ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ کپتان صاحب کو

تحقیقاتی کمیشن" بنانے کا شوق ہی بہت ہے۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ مسلم لیگ نون" تحقیقاتی کمیشن بنانے میں لیت ولعل سے کام لے رہی ہے تو اپنا شوق پورا کرنے کے لیے اپنی ہی پارٹی میں تحقیقاتی کمیشن بنادیا۔ کام اِس کا "انٹراپارٹی الیکشن" میں بدعنوانیوں کی تحقیقات کرنا اور سربراہی جسٹس وجیہ الدین کے ذمہ۔ جسٹس صاحب نے تحقیقات شروع کی تو ابتداء ہی میں کپتان صاحب کو احساس ہوگیا کہ وہ غلطی کر بیٹھے ہیں اِس لیے اُنہوں نے تحقیقاتی کمیشن توڑ دیا لیکن جسٹس صاحب نے فرمایا "حتمی فیصلہ آنے تک کمیشن نہیں ٹوٹا کرتے"۔ اب اُن کا فیصلہ آیا جس میں اور کئی لوگوں کے علاوہ جہانگیر ترین کی بنیادی رکنیت بھی ختم کر دی گئی اور ساتھ ہی یہ حکم نامہ بھی کہ اب وہ کبھی بھی تحریکِ انصاف کے رکن نہیں بن سکتے۔ اُدھر کپتان صاحب کا یہ عالم کہ جہانگیر ترین کے ذاتی طیارے کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی ناممکن۔ پتہ نہیں لوگ ریحام خاں کے ہیلی کاپٹر اور عمران خاں کے پرائیویٹ جہاز میں سفر پر اتنے چیں بہ چیں کیوں ہوتے رہتے ہیں۔

پیپلزپارٹی میں یہ نعرہ بہت مقبول ہے کہ "ایک زرداری، سب پہ بھاری"۔ لیکن وقت نے ثابت کیا کہ زرداری صاحب صرف اپنی پارٹی پر ہی "بھاری" ہیں اور یہ بھی اُن کی کرشماتی" شخصیت کا "کرشمہ" ہے کہ اُن کے دَور میں پیپلزپارٹی سکڑ سمٹ کر سندھ تک" محدود ہو گئی اب شاید اُن کی "پلاننگ" ہے کہ پیپلزپارٹی

کا ''خاتمہ بالخیر'' ہی کر دیا جائے۔ اُنہوں نے ''متھا'' بھی لگایا تو کس سے ؟۔۔۔ فوج سے۔ جب زرداری صاحب نے کہا ''ہم اینٹ سے اینٹ بجادیں گے'' تو ہمیں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ دو دوست جنگل میں جا رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا ''اگر سامنے سے شیر آجائے تو تم کیا کروگے ؟''۔ دوسرے نے جواب دیا ''میں نے کیا کرنا ہے، جو کچھ کرے گا شیر ہی کرے گا''۔ بڑھکیں لگانے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ زرداری صاحب نے کیا کرنا ہے جو کچھ کرے گی فوج ہی کرے گی۔ ویسے بھی جنرل راحیل شریف شاید واحد چیف آف آرمی سٹاف ہیں جن سے پوری قوم والہانہ محبت کرتی ہے، وجہ صرف یہ کہ وہ ملک سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ زرداری صاحب اپنی افطار پارٹی کو اے پی سی کا رنگ دینا چاہتے تھے لیکن ناکام رہنے پر کہہ دیا کہ یہ اتحادی جماعتوں کی افطاری ہے۔ اُنہوں نے افطاری میں مٹن پکوڑا، چکن پکوڑا، فش پکارا، چکن سموسے، دہی بھلے، فروٹ چاٹ، چنا چاٹ اور ڈنر میں، مٹن قورمہ، وائٹ مٹن، چانپ چکن شاشلک، سندھی بریانی بنوائی اور پھر چراغِ رُخ زیبا لے کر ''اتحادی،

سر براہوں'' کے انتظار میں بیٹھ رہے لیکن ہوا یہ کہ اسفندیار ولی بیمار ''پڑ'' گئے۔ مولانا فضل الرحمٰن کو اچانک مہمان ''پڑ'' گئے، الطاف بھائی تو ہوتے ہی لندن میں ہیں البتہ چودھری شجاعت ضرور آئے لیکن زرداری صاحب کو یہ سمجھانے کے لیے کہ ''مٹی پاؤ، مٹی پاؤ''۔ افطاری سے پہلے اچھے بھلے سمجھ دار زرداری صاحب کو یہ تو سوچ لینا چاہیے تھا کہ بھلا شیر کے مُنہ میں ہاتھ ڈالنے کو کون تیار ہوگا؟۔ اب پیپلز پارٹی کہہ رہی ہے

کہ زرداری صاحب نے تو جو کچھ کہا، سابقہ آمروں کے لیے کہا۔ سوال مگر یہ کہ مانے گا کون؟۔جب زرداری صاحب کہتے ہیں ''آپ کو تین سال رہنا اور چلے جانا ہے، پھر ہم نے ہی رہنا ہے'' تو کیا وہ ایوب، یحییٰ اور ضیاء کی روحوں سے مخاطب تھے یا ''بمار شمار'' پرویز مشرف سے؟۔ اگر زرداری صاحب نے اپنی روش نہ بدلی تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آنے والے دن اُن پر بہت بھاری پڑنے والے ہیں۔

پتہ نہیں کب۔۔۔؟

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

پتہ نہیں کب ارضِ گلستاں میں برگِ سبز پر طائرانِ خوش الحان کا ڈیرہ ہوگا، پتہ نہیں کب دشتِ کرب پر ابرِ نیساں کا سایہ ہوگا، پتہ نہیں کب فہم وادراک کے شناور اربابِ حل وعقد اِس قوم کا نصیبہ ٹھہریں گے اور پتہ نہیں سیاسی ''بگلا بھگتوں'' سے کب جان چھوٹے گی۔پتہ نہیں کب کراچی کی روشنیاں لوٹیں گی، بی ایل اے کے دہشت گردوں کو نشانِ عبرت بنایا جائے گا، فرقہ واریت کو جڑ سے اکھاڑا جائے گا، نَس نَس میں سمائے لسانیت کے زہر کو عزمِ صمیم کی جراحی سے صاف کیا جائے گا اور مہنگائی کے ''قارونوں'' کو بیچ چوراہے لٹکایا جائے گا۔پتہ نہیں سُکھ کی چند سانسوں کو ترسی خلقِ خُدا کی دعائیں کب مستجاب ہوں گی اور پتہ نہیں کب یہ قوم بلوغت کی وادیوں میں قدم رکھے گی کہ فی الحال تو ہم وہ سدھائے ہوئے بندر ہیں جو کبھی ایک اور کبھی دوسرے کی ڈگڈگی پر ناچ ناچ کے نڈھال ہو چکے۔ہمیں تو بس یہی آتا ہے کہ کبھی ''آوے ای آوے، جاوے ای جاوے'' کے نعرے اور کبھی سڑکوں پر ٹائر جلا کر لوڈ شیڈنگ کا استقبال۔

اب کی بار تابشِ آفتاب نے تاب وتواں چھین لی۔سورج نے وہ جلوے دکھائے کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے، مردہ خانوں میں جگہ باقی نہ بچی۔صرف کراچی میں تین

دنوں میں ساڑھے چار سو سے زائد افراد لقمۂ اجل بنے اور تین ہزار سے زائد افراد کا ''ہیٹ سٹروک'' کا علاج ہوا لیکن حکمرانوں کے پاس ایک ہی جواب کہ ماہِ مقدس کے پہلے ہی روزے پر بجلی کی کھپت میں اچانک چار ہزار میگاواٹ کا اضافہ ہوگیا جس نے لوڈشیڈنگ کے سارے نظام کو تلپٹ کرکے رکھ دیا۔ کیا زندہ قوموں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے کہ گرفتارِ بلا ہونے تک خوابِ غفلت میں رہیں؟۔ سچ تو یہی ہے کہ ہمارے پاس الفاظ کی وہ سواریاں ہی نہیں جن پر اپنے '' مدوحین کی شان'' کو سوار کرکے فضاؤں میں بکھیر سکیں پھر بھی تمام ترنیک تمنائیں حکمرانوں کے ساتھ۔ ترقی کا سفر بجا، میٹرو اور گرین لائین منصوبے بھی سرآنکھوں پر لیکن بصد معذرت کیا فرق ہے پیپلزپارٹی کے گزشتہ اور نواز لیگ کے موجودہ دورِحکومت میں ؟۔ راجہ رینٹل نے کہا تھا دسمبر 08ء تک بجلی کا بحران ختم ہوجائے گا لیکن پورے عہدِ حکومت میں بحران پہلے سے فزوں تر۔ خادمِ اعلیٰ نے بھی مختلف اوقات میں چھ ماہ سے دو سال کا وقت دیا۔ دو سال کا عرصہ بھی گزر چکا لیکن خادمِ اعلیٰ کا نام اب بھی میاں محمد شہباز شریف۔ سچ کہا ہے چودھری نثار احمد نے کہ حکومت کا اصل مقابلہ سیاست دانوں سے نہیں لوڈشیڈنگ سے ہے لیکن یاد رہے ککہ قوم میں تاب وتواں باقی نہیں۔ اگر لوڈشیڈنگ کے عفریت پر قابو نہ پایا جا سکا تو دسمبر 17ء دور، بہت دور، آمدہ بلدیاتی انتخابات میں ہی نتیجہ سامنے آجائے گا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ عابد شیر علی یا خواجہ آصف لوڈشیڈنگ کے عفریت پر قابو پالیں گے تو غلط بالکل غلط۔ اُن کی نیتوں پر شک نہیں لیکن ''لائین لاسز'' اور بلوں کی،

وصولی اُن کے بَس کا روگ نہیں۔ اب جب کہ سیاسی و عسکری قیادت کے تعلقات اپنی رفعتوں کو چھورہے ہیں اور افہام و تفہیم کی ایسی فضاء کہ یقین نہ آئے ، توکیوں نہ واپڈاکو کرپشن سے پاک کرنے کی ذمہ داری بھی فوج کے سپرد کر دی جائے ۔آخر 1998ء میں بھی تو واپڈا کرپشن کے خاتمے کے لیے فوج ہی کا سہارا لیا گیا تھا۔ عابد شیر علی صاحب دو سالوں میں دس ہزار مرتبہ بلوں کی عدم ادائیگی اور لائین کاسز کا رونا رو چکے لیکن معاملہ بدستور وہیں۔ سیاسی جماعتوں کی توکچھ مجبوریاں ہوتی ہیں اور وہ ایک حد سے آگے جا بھی نہیں سکتیں لیکن یہاں یہ معاملہ آن پڑا کہ

پکڑ کے زندہ ہی جس درندے کو تم سدھانے کی سوچتے ہو

بدل سکے گا نہ سیدھے ہاتھوں وہ اپنے انداز دیکھ لینا

مسلمہ حقیقت کہ ''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے'' اِس لیے اِن ''بھوتوں'' کو بھی فوج کے سپرد کر دینے میں ہی عافیت ہے ۔اگر نیتوں میں فتور نہ ہوتو فرشتے بھی آسمانوں سے مدد کے لیے اتر آتے ہیں۔ ہمیں سپہ سالار کی نیت میں کوئی شک ہے نہ اُن کے عزم بالجزم پہ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ کام جو کسی اور کے بس کا روگ نہیں تھا، فوج کی سربراہی میں رینجرز نے کر دکھایا۔ آج کراچی میں بلاامتیاز کرپشن کے مگرمچھوں کو پکڑا جا رہاہے اور کوئی دن جاتا ہے جب کرپشن کا ابرِ سیاہ تاب چھَٹ جائے گااور کراچی ایک دفعہ پھر روشنیوں کے شہر میں

ڈھل جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مافیاز کے سرپرستوں کی راتوں کی نیندیں حرام ہوچکیں۔ محترم آصف زرداری تو گزشتہ چھ ماہ سے اسٹیبلشمنٹ کے اقدامات کی گہرائی کو محسوس کررہے تھے لیکن اُن کا خیال تھا کہ شاید معاملہ ایم کیوایم تک ہی محدود رہے گا لیکن جب پندرہ جون کو سندھ بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کے ڈی جی منظور قادر کاکا کے دفتر پر رینجرز نے چھاپہ مارا تو اپنے گرد شکنجہ کستا دیکھ کر زرداری نہ صرف پھٹ پڑے بلکہ بازاری زبان پر اتر آئے اور یہاں تک کہہ دیا ''ہمیں تنگ نہ کیا جائے ورنہ اینٹ سے اینٹ بجادیں گے''۔ حالانکہ فوج یا رینجرز نے نہ تو زرداری صاحب کے معاملات میں براہِ راست دخل اندازی کی اور نہ ہی سندھ حکومت کو تنگ کیا۔ یہ تو ایپکس کمیٹی میں طے ہوچکا تھا کہ مافیاز کی سرپرستی کرنے والوں کو بھی گرفتار کیا جائے گا۔ جن 26 افراد کی فہرست ڈی جی رینجرز کی طرف سے سندھ حکومت کو دی گئی وہ سبھی کسی نہ کسی حوالے سے بھتہ خوروں، ٹارگٹ کلرز، دہشت گردوں، کالعدم تنظیموں اور لینڈ مافیا کی سرپرستی ہی میں ملوث تھے لیکن زرداری صاحب کے حکم پر سندھ حکومت نے اِن کے خلاف ایکشن لینے یا انکوائری کرنے سے صاف انکار کر دیا جس پر رینجرز حرکت میں آئی اور اِن لوگوں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ اب پتہ نہیں کیوں وزیرِاعلیٰ سندھ یہ کہہ رہے ہیں کہ رینجرز اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہی ہے۔ اول تو یہ اختیارات سے

تجاوز ہے ہی نہیں اور جو ایکشن بھی لیا جا رہا ہے وہ آئین و قانون کے دائرے میں رہ
کر ہی لیا جا رہا ہے لیکن اگر یہ اختیارات سے تجاوز ہے بھی تو قوم کو دل کی گہرائیوں سے
منظور کہ کوئی تو ہے جو کرپشن کے مگر مچھوں پر ہاتھ ڈالنے کی سکت رکھتا ہے۔ ویسے بھی
ڈی جی رینجرز نے جو کچھ کہا وہ نیا نہیں، یہ سب کچھ تو سپریم کورٹ 2013ء میں کہہ چکی
البتہ عمل درآمد اب شروع ہوا۔ شنید ہے کہ ایف آئی اے نے سندھ حکومت کے سات
صوبائی وزراء، چار سابق وزراء، پیپلز پارٹی کے آٹھ اراکینِ قومی اور بیس صوبائی
اسمبلی کے علاوہ سندھ حکومت کے 100 سے زائد بیوروکریٹس کے ملک سے باہر جانے
پر پابندی لگا دی ہے اور امیگریشن حکام کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ اگر یہ لوگ ملک سے
زبردستی باہر جانے کی کوشش کریں تو انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ یہ وہی لوگ ہیں کہ
جو زمینوں پر قبضے اور جرائم پیشہ گروہوں کی سرپرستی میں ملوث ہیں۔ دوسری طرف اِن
لوگوں نے ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے عدالتوں سے رجوع کر لیا ہے۔ اگر یہ سب سچ
ہے تو آمدِ بہار کی اُمید کی جا سکتی ہے۔

PINA کا سیمینار اور غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کا فیملی شو

17 جون کو ہمیں بیک وقت دو تقاریب میں شرکت کرنا تھی۔انتہائی محترم الطاف حسن قریشی صاحب نے PC میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل افیئرز (PINA) کے زیرِ انتظام سیمینار میں شرکت کا حکم دے رکھا تھا جبکہ فلیٹیز ہوٹل میں غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے پروگرام میں جانا بھی ضروری تھا کیونکہ اِس ٹرسٹ کے کارنامے محیرالعقول اور ٹرسٹ کے اربابِ اختیار کی تعلیم وتعلم کے لیے کاوشیں لائقِ تحسین۔غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ سے میرا قلبی لگاؤ اِس لیے بھی ہے کہ عمرِ عزیز کا غالب حصّہ پڑھتے، پڑھاتے گزرا۔اِس لیے اپنی تمامتر مصروفیات کے باوجود ٹرسٹ کے پراگراموں میں شرکت کرتی رہتی ہوں۔ویسے بھی یہ ایک فیملی پروگرام تھا جس میں انور مسعود کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل رہا تھا۔الطاف حسن قریشی صاحب کا حکم اور غزالی ٹرسٹ کی کشش، دونوں تقاریب میں شرکت ضروری لیکن ''اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے'' کا خطرہ بھی موجود۔میرے میاں پروفیسر مظہر صاحب نے بھائی رؤف طاہر سے مشورہ کیا تو اُنہوں نے چٹکیوں میں مسئلہ حل کرتے ہوئے فرمایا کہ پہلے محترم الطاف حسن قریشی صاحب کے سیمینار میں شرکت کرتے ہیں اور پھر فلیٹیز ہوٹل چلے جائیں گے کیونکہ سیمینار چھ بجے شروع ہوگا اور فلیٹیز کا پروگرام آٹھ بجے۔ہم طے شدہ

پہنچ گئے۔ سیمینار کی اچھی بات یہ تھی کہ قریشی صاحب PC پروگرام کے تحت چھ بجے نے اہلِ فکرودانش کو تو بلا رکھا تھا لیکن سیاستدانوں سے گریز ہی کیا۔ اگر اہلِ سیاست بھی آ جاتے تو یقیناً یہ سیمینار ''سیاسی دھوم دھڑکے''میں تبدیل ہو جاتا۔ صدرِ مجلس سابق سیکرٹری جنرل امورِ خارجہ محترم اکرم ذکی اور نظامت کے فرائض معروف تجزیہ نگار محترم سجاد میر کے ذمے۔ دیگر احباب میں پروفیسر سجاد نصیر، سینئر تجزیہ نگار جناب رؤف طاہر سابق سفیر جاوید حسین، میجر جنرل (ر) جاوید حسین، پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ، ڈاکٹر سلیم، مظہر، ڈاکٹر عمرانہ مشتاق، ڈاکٹر صغریٰ صدف اور صوفیہ بیدار کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے عقیل وفہیم احباب شامل تھے۔ سیمینار کا موضوع "A comprehensiv strategy to meet Indian challenge" تھا۔ اہلِ دانش کی اِس گفتگو کا لبِ لباب یہ تھا کہ بھارتی گیدڑ بھبکیوں سے مرعوب یا مشتعل ہونے کی بجائے ہمیں اپنے آپ کو سیاسی، اقتصادی اور فوجی اعتبار سے مضبوط کرنا چاہیے اور ہمارا قومی ہدف یہ ہونا چاہیے کہ پاک چین اقتصادی راہداری کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے کیونکہ اِس کی تکمیل سے عالمی منظر نامہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ بھارت اشتعال دلا کر ہمیں اپنے اصل ہدف سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اب یہ ہمارے سیاسی تدبر کا امتحان ہے کہ ہم مشتعل ہوئے بغیر کیسے اِس مکروہ بھارتی سازش کو ناکام بناتے ہیں۔

کوئی دو گھنٹے بعد، وقفے کے دوران ہم وہاں سے کھسک لیے لیکن بھائی رؤف

طاہر نے ہمیں عین موقع پر بالکل اسی طرح دھوکہ دیا جس طرح میاں نواز شریف صاحب نے طے شدہ ملاقات کے باوجود جناب آصف زرداری سے ملنے سے انکار کر دیا۔ یہ نون لیگیئے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ فلیٹیز پہنچنے پر پتہ چلا کہ محفل تو ابھی جمی ہی نہیں ۔ ہمیں تھوڑا دُکھ ہوا کہ اگر کچھ دیر اور سیمینار میں ٹھہر جاتے تو احباب کی پُر مغز گفتگو سے مزید لطف اندوز ہو لیتے ۔ نوجوان نورالھدیٰ نے ایک ظلم یہ کیا کہ ہمیں سب سے آگے والی نشستوں میں لا بٹھایا جہاں سے کھسکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خُدا خُدا کرکے پروگرام کا آغاز ہوا تو غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے ایگزیکٹو ڈائرکٹر سید عامر محمود صاحب نے انکشاف کیا کہ ابھی بہت سے لوگ راستے میں ہیں لیکن وقت کی کمی کے پیشِ نظر پروگرام شروع کیا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں ہم پاکستانیوں کی ہمیشہ دیر سے آنے کی عادت کب ختم ہو گی ۔ ٹرسٹ کا یہ پروگرام رات گیارہ بجے تک جاری رہا لیکن پروگرام اِس خوبصورت انداز میں ترتیب دیا گیا تھا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ ویسے بھی جہاں محترم انور مسعود ہوں وہاں صرف قہقہوں کی بہار ہوتی ہے تیزی سے گزرتے وقت کی پکار نہیں۔

غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کی تقاریب میں میری شرکت کا یہ تیسرا موقع تھا۔ یقین جانیے کہ مجھے ٹرسٹ کی اتنی تیز رفتار ترقی پر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے۔ یوں تو ٹرسٹ کے اربابِ اختیار خود بھی جوان ہیں لیکن اُن کا عزم جواں تر۔ یہ اُن کی

بیس سالہ جہدِ مسلسل کا ثمر ہے کہ اُنھوں نے دیہی پاکستان کا سب سے بڑا ایسا تعلیمی نیٹ ورک قائم کیا جس کی تعریف عالمی فلاحی ادارے بھی کر چکے ہیں۔ تعلیم و تعلم سے والہانہ عشق کرنے والے اِن لوگوں کا فوکس دیہاتوں میں بسنے والے ایسے مجبور و مقہور اور راندۂ درگاہ بچے ہیں جن کے والدین اپنی عسرت کے سبب چاہتے ہوئے بھی اُنہیں علم کے نور سے منور نہیں کر سکتے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق اِس وقت ٹرسٹ کے 634 سکول ہیں جہاں 70 ہزار سے زائد کم وسیلہ خاندانوں کے طلباء وطالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اِن 70 ہزار میں سے 42 ہزار طلباء وطالبات کی مکمل تعلیمی سرپرستی ٹرسٹ کی جانب سے کی جارہی ہے۔ سید عامر محمود نے بتایا کہ ٹرسٹ نے ضلع مظفر گڑھ کے چھوٹے دیہاتوں میں حال ہی میں 240 سکول قائم کیے ہیں جہاں ماہِ جون تک ایسے 12 ہزار بچے رجسٹرڈ ہو کر تعلیمی سفر کا آغاز کر چکے ہیں جو اِس سے پہلے کسی بھی حکومتی یا نجی سکول میں نہیں جارہے تھے۔ ٹرسٹ نے سپیشل بچوں کی بحالی کے لیے خصوصی تعلیمی پروگرام بھی ترتیب دیا ہے جس میں بچوں کو کتابوں، کاپیوں اور یونیفارم کے علاوہ موسم کی مناسبت سے کپڑے، عیدین پر تحائف اور ماہِ رمضان میں خصوصی فوڈ پیکیج بھی تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ٹرسٹ نے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے اقلیتوں، خصوصاً ہندوؤں کے بچوں کی تعلیمی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے جنوبی پنجاب سے ہندو بچوں کے لیے الگ سکولوں کا آغاز بھی کر دیا ہے جسے مرحلہ وار دیگر اضلاع تک پھیلایا جائے گا۔

غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے اربابِ اختیار صنعت کار ہیں نہ زمیں دار۔ اُن کا تعلق سیاستدانوں سے ہے نہ لینڈ مافیا سے گویا اُن کا دامن عزم بالجزم سے تو معمور ہے لیکن جیب خالی۔ وہ تو ہم جیسے ہی ہیں، ایک عام پاکستانی، دردِ دل رکھنے والے شہری البتہ اُن کا پاکستانیوں کو علم کے نور سے منور کرنے کا جذبہ لائقِ تحسین۔ وہ کام جو حکومت کو کرنا چاہیے، اُس کا بیڑا اِن بے لَوث نوجوانوں نے اُٹھا رکھا ہے۔ وہ تو ڈھیروں ڈھیر نیکیاں کما ہی رہے ہیں لیکن کیا ہمیں بھی اِن نیکیوں میں حصّہ نہیں ڈالنا چاہیے؟۔ ہمارے دین کا تقاضہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے، علم کی روشنی پھیلائی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "رَبّ کو جاننے والے اُس کے عالم بندے ہیں" اور آقا ﷺ نے بھی فرمایا "ایک عالم ہزار عابدوں سے وقیع ہے"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اِس ماہِ مقدس میں اگر زکواۃ وعطیات کا اگر کوئی سب سے زیادہ حقدار ہے تو وہی جو وطنِ عزیز کو نورِ علم سے منور کرنے کی تگ ودَو میں ہے۔ غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کا اکاؤنٹ نمبر 0081-0007-047153-01-4 بینک الحبیب نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ہے جو اہلِ ثروت کا منتظر ہے۔

BBC کاکھڑاک

پیپلزپارٹی اور متحدہ قومی موومنٹ دو ایسی سیاسی جماعتیں ہیں جن میں بہت کچھ مشترک۔ کرپشن دونوں کو محبوب و مرغوب، ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری اور زمینوں پر قبضے کے الزامات دونوں پر۔ بڑھک بازی میں دونوں لاثانی۔ متحدہ کے قائد الطاف حسین تو "بڑھکیں" لگاتے ہی رہتے ہیں اور بقول خواجہ آصف "یہ لوگ عشاء کے وقت بات کرکے سحر کے وقت معافی مانگ لیتے ہیں" لیکن جنابِ آصف زرداری نے پہلی بار کھل کر اسٹیبلشمنٹ سے "متھا" لگایا اور پھر چاروناچار معذرت کیے بغیر اپنے خاندان سمیت دبئی "پھُر" ہو گئے۔ بلاول زرداری البتہ ایک دفعہ پھر اپنے باپ سے بغاوت کرتے ہوئے پیپلزپارٹی کی قیادت سنبھالنے پاکستان لَوٹ آئے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں اُسی طرح اب پیپلزپارٹی میں بھی "دو زرداری" نہیں سما سکتے۔ شنید ہے کہ زرداری صاحب امریکہ پہنچ بھی چکے، امریکہ سے واپسی کب ہوتی ہے یہ اللہ جانے یا زرداری صاحب۔ اویس مظفر ٹپی اپنے بھائی کی لاش لینے لندن پہنچے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ زرداری صاحب کی بہن فریال تالپور بھی اپنے "فرنٹ مین" محمد علی شیخ کی گرفتاری اور انکشافات کے بعد بیرونِ ملک کھسک گئیں اور زرداری صاحب کے اِدھر اُدھر بسنے والے احباب اور آفیسرز بھی یوں غائب ہوئے جیسے گدھے کے سَر سے سینگ۔ باقی بچی "بیچاری"

ایان علی یا پھر اُس کے ''باڈی گارڈ'' فاروق ایچ نائیک اور لطیف کھوسہ۔ وزیرِ داخلہ چودھری نثار احمد نے پہلے تو اپنی پریس کانفرس میں ایان علی کو ''بیچاری'' کہہ دیا لیکن پھر الیکٹرانک میڈیا کے خوف سے فوراً ہی وضاحت بھی کر دی کہ ایان علی تو محض ایک ذریعہ'' ہے اِس لیے اُسے بیچاری کہا۔ وہ تو اُس ''خفیہ ہاتھ'' کی تلاش میں ہیں جس'' نے اِس بیچاری، معصوم، بھولی بھالی ماڈل کو گرفتارِ بَلا کر دیا۔ چودھری صاحب بتائیں کہ ایان علی کو جیل میں دی جانے والی وی، وی، آئی پی سہولیات کیا حکومت کی طرف سے ہیں یا اُسی ''خفیہ ہاتھ'' کی طرف سے جس نے بقول چودھری صاحب ایان علی کو ''گرفتارِ بَلا'' کیا؟۔ حضرت عمرؓ نے تو فرمایا تھا ''اگر کسی کی وجاہت کے خوف سے قانون کا پلڑا اُس کی طرف جھکٹ جائے تو پھر اللہ کی بادشاہت اور قیصر و کسریٰ کی حکومت میں کیا فرق ہے؟'' لیکن یہ کیسی اسلامی حکومت ہے جس میں ایان علی کو تمام سہولیات، حتیٰ کہ میک اَپ کی سہولت بھی بہم پہنچائی جا رہی ہے؟۔ وہ گردن پر ''ٹیٹو'' بنائے پورے طمطراق سے عدالت میں یوں آتی ہے جیسے امریکی ''خاتونِ اوّل''۔

جیلر صاحب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ ایان علی کو میک اَپ کروانے کے لیے ''بیوٹی پارلر'' بھیجا جاتا ہے یا پھر جیل میں ہی بیوٹی پارلر کھول دیا گیا ہے۔

آمدم بَر سرِ مطلب، زرداری صاحب نے ہمارے سپہ سالار کا نام لیے بغیر یہ ''بڑھک'' لگائی کہ ''آپ نے تین سال بعد چلے جانا ہے، پھر ہم نے ہی رہنا ہے''۔

جواباً ہم نے اُسی دِن (18 جون کو) اپنے کالم میں لکھا کہ " جنرل صاحب نے تو تین سال بعد بھی اِدھر ہی رہنا ہے البتہ زرداری صاحب کا ''کُھ'' پتہ نہیں کہ وہ دبئی میں مستقل سکونت اختیار کرتے ہیں یا لندن میں ''لیکن یہ ہمیں بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی ''کھسک'' لیں گے۔۔۔۔ پیپلزپارٹی اور ایم کیوایم میں بہت کچھ مشترک ہونے کے باوجود ایک واضح فرق کہ پیپلزپارٹی اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود محبِ وطن لیکن متحدہ کے صحافی اون بینٹ جونز نے BBC کی حب الوطنی پر عشروں سے سوالیہ نشان۔ اب اپنی ڈاکومینٹری میں جو ''کھڑاک'' کیا اُس سے تو پورا پاکستان ہِل کے رہ گیا۔ اُس نے یہ ہولناک انکشاف کیا کہ گزشتہ 10 سالوں سے بھارتی خفیہ ادارے ''را'' کی طرف سے متحدہ کے کارکنوں کو تربیت دی جارہی ہے اور ''را'' اِن تربیت یافتہ کارکنوں کو نہ صرف اسلحہ بلکہ مالی امداد بھی دیتی ہے۔ سوشل میڈیا پر ایم کیوایم کے رہنماء اور رابطہ کمیٹی کے سابق رُکن طارق میر کا برطانوی پولیس کو 30 مئی 2012ء کو دیا گیا بیان بھی آگیا جس میں طارق میر نے اعتراف کیا کہ ایم کیوایم کے 1994ء سے بھارت سے رابطے تھے ایم کیوایم کے کارکنوں کو تربیت کے لیے بھارت بھجوایا جاتا تھا اور ایم کیوایم کو بھارت سے سالانہ 8 لاکھ پاؤنڈز رقم ملتی تھی جو الطاف حسین کو دے دی جاتی ۔ گزشتہ دنوں ایس ایس پی کراچی راؤ انوار نے بھی اپنی پریس کانفرنس میں ایسے ہی الزامات لگائے جس کی بنا پر اُن کا تبادلہ کر دیا گیا۔ وزیرِ دفاع خواجہ آصف صاحب نے بھی ''شرم کرو، حیا کرو'' کی گونج

میں کہاکہ متحدہ کی لوڈشیڈنگ ہونے والی ہے اور یہ شام کو ''استغفار'' کرتے نظر آئیں گے ۔اُسی دِن برطانوی صحافی اون بینٹ جونز کی ڈاکومینٹری سامنے آ گئی جس کی بناپر یہ شور مچاکہ خواجہ صاحب کوپہلے سے ہی علم تھا۔ہم اپنے سیالکوٹی خواجہ صاحب کو''ہَتھ ہَولا'' رکھنے کی استدعا کرتے ہوئے یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ حکومت کی جانب سے ایساکوئی بیان سامنے نہیں آنا چاہیے جس سے یہ تاثرپیدا ہوکہ یہ سب کچھ حکومتی ایماء پر ہو رہا ہے۔

ایم کیوایم ایک سیاسی حقیقت ہے لیکن اُسے اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اپنی صفوں سے شَرپسند عناصر کو نکالنا ہوگا البتہ ہم سمجھتے ہیں کہ ''الطاف بھائی''کی قیادت میں ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ الطاف حسین اپنے خطاب میں کہتے کہ ایم کیوایم کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کر رہی ہے مگر وہ تواُلٹا BBCبرطانوی عدالت میں دھمکیوں پر اُتر آئے۔اُنھوں نے کہا''وزیرِاعظم ایم کیوایم کے ساتھ ''مَتھا'' نہ لگائیں۔حکومت اوراسٹیبلشمنٹ بتائے کہ ہمیں جینے دیناہے کہ ہمارے ساتھ لڑناہے۔ہم اوپر سے لوڈشیڈنگ کر سکتے ہیں،نیچے سے بھی۔ وزیرِدفاع کی حرکتوں سے پاکستان کا دفاع تونہیں ہو سکتا،پاکستان دفع ضرور ہو سکتاہے''۔ عرض ہے کہ جس نے پاکستان سے ''دفع'' ہوناتھا وہ تو1992ء میں ہی رات کے اندھیرے میں ''دفع'' ہوچکا۔ اب اورکس کس نے ''دفع'' ہوناہے،اِس کافیصلہ محبِ وطن پاکستانی کریں گے۔

بھارت تو تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی پاکستان کے ''ضمیرفروشوں'' کی خریداری میں مگن ہے۔ قائدِاعظم نے تو قیامِ پاکستان کے 70 دِن بعد، 24 اکتوبر 1947ء کو ہی ایک منظم منصوبے کاذکر کردیا تھاجس کامقصد پاکستان کومفلوج کرکے اتنا مجبور کردینا تھاکہ وہ خود انڈیا میں شمولیت کی استدعا کرے۔ اُس وقت کاوزیرِاعظم جواہرلال نہرو تو جہنم واصل ہوا لیکن اُس کی بیٹی اندراگاندھی پاکستان کے دو ٹکڑے کرنے میں محض اِس لیے کامیاب ہو گئی کہ تاریخی حقائق کے مطابق شیخ مجیب الرحمٰن تو1962ء سے ہی ''را'' کے ہاتھوں میں کھیل رہاتھااوراُس نے اُسی سال پاکستان سے علیحدگی کے لیے ایک خفیہ تنظیم کی بنیاد بھی ڈال دی تھی۔الطاف حسین شایدیہ بھول گئے کہ 1971ء اورآج کے حالات میں بہت فرق ہے۔ اُس وقت مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہزار میل لمبی سرحدپر مکاردشمن.براجمان تھا لیکن اب ضمیرفروش توموجود لیکن سرحد کوئی نہیں ۔اگرثابت ہوگیاکہ.برطانوی صحافی نے جوکچھ کہا وہ سچ تھاتو پھر کراچی کے محبِ وطن شہری ہی ایم کیوایم کونیست ونابود کرنے کے لیے کافی ہیں۔ الطاف حسین کہتے ہیں ''ایم کیوایم کوختم کرناپاکستان کاخاتمہ ہے''۔ پتہ نہیں الطاف حسین کویہ زعم کیسے ہوگیاکہ متحدہ اورپاکستان لازم وملزوم ہیں۔ اگروہ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج مکتی باہنی کے روپ میں لڑی ویسی ہی کوئی سازش کراچی میں بھی پنپ سکتی ہے تووہ احمقوں کی جنت میں

بستے ہیں کیونکہ بھارتی کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ بھارت کا ایک ایک شہر ہمارے ایٹمی میزائلوں کے نشانے پر ہے۔ وہ تو ضمیر فروشوں کو خرید کر صرف افراتفری پھیلانا چاہتے ہیں تا کہ دفاعی لحاظ سے مضبوط پاکستان اقتصادی لحاظ سے بھی مضبوط نہ ہو جائے۔

احتیاط، احتیاط، احتیاط

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

ایٹمی پاکستان کو امریکہ نے کبھی دل سے تسلیم کیا نہ بھارت اور اسرائیل نے۔ پاک چائنا اکنامک کوریڈور پر بھی اِن کا نقطہ نظر ایک۔ بھارت اکنامک کوریڈور پر برملا اپنے تحفظات کا اظہار کر چکا لیکن امریکہ مصلحتاً خاموش۔ اب چین کے اقتصادی تعاون اور روس سے بڑھتے دفاعی تعلقات نے امریکہ اور بھارت کو مزید پریشان کر دیا۔ دونوں کی شدید ترین خواہش کہ پاکستان میں افراتفری پیدا کرکے دفاعی اعتبار سے مضبوط پاکستان کو اقتصادی لحاظ سے اتنا کمزور کر دیا جائے کہ وہ سر نہ اٹھا سکے۔ پاکستان اقتصادی راہداری کی صورت میں چین کو مشرقِ وسطیٰ اور یورپ جانے کا مختصر، محفوظ اور آسان ترین راستہ فراہم کر رہا ہے جو بھارت کو قبول ہے نہ امریکہ کو۔ دوسری طرف امریکہ چین کا مقابلہ کرنے کے لیے بھارت کے ساتھ عسکری اور جوہری تعاون متواتر بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ جس کی شہ پاکر بھارتی ریشہ دوانیاں شترِ بے مہار۔ وہ ایٹمی پاکستان پر حملہ کرنے کی جرأت تو کبھی نہیں کرے گا لیکن سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ اور اندرونِ ملک ''را'' کے ذریعے افراتفری پیدا کرنے کے لیے کسی بھی حربے سے باز نہیں آئے گا۔ اندریں حالات ہمیں ہر قدم پھونک کے رکھنا ہو گا لیکن اپنی یہ حالت کہ سیاسی جماعتوں

میں ''مباہلہ جاری۔ ملکی سلامتی کی ناؤ بھنور میں پھنسی، ڈگمگاتی، ہچکولے کھاتی ہوئی لیکن ناخداؤں کی محفل (پارلیمنٹ) میں شرم کرو، حیا کرو، ڈوب مرو کا شور۔ آلودگیٔ زباں میں سبھی بے مثل لیکن دعویٰ یہ کہ زبان آبِ کوثر میں دھلی ہوئی، فصاحت و بلاغت کے موتیوں سے مزین۔ صرف اُن لمحات میں ''جوئے نغمہ خواں'' جب ووٹوں کی بھیک درکار، مطلب نکل جانے کے بعد ''سیلِ تندخُو'' البتہ زورآور کی چوکھٹ پہ ہمہ وقت زانوئے تلمذ تہ۔ خبطِ عظمت میں سبھی مبتلاء لیکن اِن ارسطوانِ دہر کی ہر دلیل ناقص، حکمت و دانائی نام کو نہیں، فکر میں گہرائی نہ گیرائی، الفاظ میں حسن نہ معانی میں وسعت۔ ساری سیاست ذاتی مفادات کے گرد گھومتی ہوئی۔ زباں پہ زباں بدلنے میں مہارتِ تامہ، ذرا جھجک نہیں، ذرا شرم نہیں، ذرا خجالت نہیں۔ دَھن کی دُھن میں سب ایک، زانو بہ زانو لیکن ایسے زیاں کار کہ اُسی درخت کی جڑوں پہ کلہاڑا چلانے میں مگن جس کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے ہیں، اُسی دھرتی ماں کی کوکھ اجاڑنے کی سعی جس نے اپنی آغوشِ محبت میں پال پوس کے بڑا کیا۔

اب ایک ''مولوی'' پاکستان پر تیسری بار حملہ آور ہونے آ چکا۔ ارسطو نے کہا ''زیادہ باتیں کرنا دیوانگی کی دلیل ہے، چاہے وہ باتیں کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں''۔ خلیل جبران کے خیال میں ''جو جتنا زیادہ بولتا ہے، وہ اتنا ہی کم عقل ہوتا ہے'' لیکن یہ حضرت'' گھنٹوں بلکہ پہروں بولتے ہی چلے جاتے ہیں۔ وہ کم''

عقل ہوں یا نہ لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ اُن کے طویل خطبات میں سچ کی آمیزش آٹے میں نمک کے برابر۔ دس، بیس ہزار کے مجمعے کو پچیس، تیس لاکھ ثابت کرتے وقت ذرا جھجک نہیں، ذرا شرم نہیں، ذرا خجالت نہیں۔ اُس مسلوب الحواس کی صدا ''ایک مخصوص حلقے کے سوا کہیں مسموع نہیں۔ وہ حلقہ مریدین اور ارادتمندوں کا'' کہ جنہیں اُس کا جھوٹ بھی سچ لگتا ہے۔ اگست 2014ء میں یہی حضرت اسلام آباد پر حملہ آور ہوئے تب کپتان صاحب بھی اِن کے ہمراہ تھے اور ملکی و بیرونی مقتدر قوتوں کی پشت پناہی بھی حاصل۔ ایم کیو ایم کی تمام تر ہمدردیاں مولانا کے ساتھ اور چودھری برادران غلامِ بے دام۔ تب پیپلز پارٹی نے جی بھر کے نواز لیگ پر طنز کے تیر برسائے جواباً بے بسی کی تصویر بنی نواز لیگ ''ٹُک ٹُک دیدم، دم نہ کشیدم''۔ سارا الیکٹرانک میڈیا دھرنوں کی پشت پر اور لحہ بہ لحہ لائیو کوریج، چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے والے تجزیہ نگار حکومت جانے کی تاریخ پہ تاریخ دیتے ہوئے لیکن نتیجہ یہ کہ ''بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے''۔ مولانا بستر بوریا سمیٹ کر ''اپنے دیس'' سدھارے اور کپتان صاحب نے نہ صرف سانحہ پشاور کی آڑ میں دھرنا ختم کیا بلکہ اُسی پارلیمنٹ میں واپس آ گئے جسے جعلی کہتے کہتے اُن کا حلق خشک ہو گیا۔ اب مولانا آئے تو بیرونی قوتوں کے حکم پر اقتصادی راہداری منصوبے کو سبوتاژ کرنے کے لیے ہیں لیکن اب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ مولانا نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی کپتان صاحب کو اپنا سیاسی ''کزن'' تو قرار دے دیا لیکن اسی کزن سے مشورہ کیے

بغیر مولانا دھرنوں کے دنوں میں اُنہیں بیچ منجدھار چھوڑ کر داغِ مفارقت دے گئے تھے ۔اب پتہ نہیں کپتان صاحب اُسی ''سوراخ'' سے دوبارہ ڈسے جاتے ہیں یا نہیں۔ ایم کیوایم نے بھی اپنی سیاسی آڑھت چمکانے کے لیے مولانا کا ''اخلاقی'' ساتھ دیا لیکن اب لندن میں بیٹھے الطاف بھائی وقفِ مصیبت اور پاکستان میں ایم کیوایم کے گرد گھیرا تنگ اِس لیے اب کی بار مولانا نے جوکچھ بھی کرنا ہے اپنے مریدین کے زور پر ہی کرنا ہے البتہ بیرونی طاقتیں اُن کی کامیابی کے لیے دعاگو ضرور ہوں گی۔

پاکستان کی تاریخ میں شاید پہلی بار یہ معجزہ رونما ہوا کہ سیاسی اور عسکری قیادت ایک صفحے پر، ایک خاموش معاہدہ مابین ''شریفین'' کہ افہام و تفہیم کی اِس فضاء کو ہر حالت میں شک کی زہرناک بادِ سموم سے پاک رکھا جائے گا۔ میاں صاحب نے بہت اچھا کیا جو ملک کے دگرگوں اندرونی معاملات کے سلجھاؤ کے لیے اسٹیبلشمنٹ کو صفِ اول پہ لے آئے کہ سیاسی جماعتوں کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں، یقیناً نواز لیگ کی بھی ہوں گی لیکن اسٹیبلشمنٹ کی کوئی مجبوری نہیں۔ فوج کراچی کو امن کے نور سے منور کرنے کے لیے پُرعزم ،دہشت گردی ، مذہبی انتہاپسندی ،ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خوری کے خاتمے کے لیے بلاامتیاز آپریشن جاری ، بلوچستان میں باغیوں کی سرکوبی کے لیے پرعزم ، بہت سے باغی ہتھیار ڈال چکے اور باقی قومی دھارے میں شامل ہونے کے لیے بیقرار۔ سپہ سالار نے ملک دشمنوں کے

ناقابلِ تسخیر قلعوں میں اپنے عزمِ صمیم کی منجنیقوں سے دراڑیں ڈال دیں۔زیادہ عرصہ نہیں جب یہ قلعے مسخر بھی ہوجائیں گے۔ دوسری طرف مرکزی حکومت وطنِ عزیز کو اقتصادی رفعتوں تک لے جانے کے لیے بیقرار۔ہر محبِ وطن کی خواہش کہ نواز لیگ کو"فری ہینڈ" ملنا چاہیے کہ اُمید کے سارے رشتے اسی کی ڈور سے بندھے ہوئے۔اگر نواز لیگ قوم سے کیے گئے وعدے ایفاء نہ کر سکی تو پھر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ پیپلزپارٹی کی طرح اِس کی بھی داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

میاں نواز شریف صاحب نے 29 جون کو کیا جانے والا کراچی کا دورہ ملتوی کر دیا جس کی پر نشر کی BBC وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہماری وزارتِ خارجہ نے.برطانوی حکومت سے جانے والی اون بینٹ جونز کی ڈاکومینٹری اور30 مئی 2012ء کو طارق میر کے.برطانوی پولیس کو دیئے جانے والے بیان کی تصدیق چاہی ہے۔ شنید ہے کہ.برطانوی حکومت نے تصدیق تو کر دی ہے لیکن باضابطہ طور پر آگاہ نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ وزیرِاعظم صاحب اسی کا انتظار کر رہے ہوں تاکہ جب وہ بات کریں تو پورے وثوق سے کریں۔اِس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ سب کچھ درست ہے تو پھر ایم کیو ایم پر پابندی بھی لگنی چاہیے اور اس کے رہنماؤں کے خلاف آرٹیکل چھ کے تحت مقدمہ بھی درج ہونا چاہیے۔ ایک خوف بہرحال دامن گیر کہ کہیں یہ سب کچھ کسی "گریٹ گیم" کا دیباچہ تو نہیں؟۔ عین اُس موقعے پر جب سیاسی اور عسکری

قیادت اکنامک کوریڈور کے لیے پُر عزم۔.برطانوی صحافی نے دھماکہ کر دیا، طارق میر کا
.برطانوی پولیس کو دیا گیا بیان اچانک سوشل میڈیا پر آگیا اور مولانا قادری بھی پاکستان
پہنچ گئے۔ آپریشن تو کسی صورت بھی ختم نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی ننگ ِ دیں ، ننگ ِ ملک
ننگ ِ وطن ضمیر فروشوں کے لیے رعایت لیکن احتیاط ،بہت احتیاط کہ افراتفری نہ پھیلے۔
چال خرگوش کی نہیں کچھوے کی۔

کرپشن کے شہنشاہ حاضر ہوں!!!

30 جون کو سپریم کورٹ کے جسٹس جوادایس خواجہ کی سربراہی میں جسٹس عظمت سعیداور جسٹس مقبول باقر پر مشتمل تین رکنی بنچ نے نیب کو میگا کرپشن کے 50 مختلف سکینڈل کے حوالے سے رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی۔ سپریم کورٹ نے کہاکہ قوم نیب کی جانب سے بدعنوانی کے خاتمے کا پرچار سُن سُن کر تھک بلکہ ''ہپھ'' چکی لیکن نیب کی کارکردگی کا یہ عالم کہ لوگ بدعنوانی کی شکایات رینجرز، پولیس یامیڈیاکے پاس تولے جاتے ہیں ،نیب کے پاس نہیں کیونکہ نیب ''پلی بارگیننگ'' کے تحت معمولی سی رقم رضاکارانہ طورپر لے کر ملزمان کو چھوڑ دیتی ہے اورپھر کرپشن کے مگرمچھ نیب کی چھتری تلے آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ جسٹس مقبول باقرنے سوال کیاکہ کیانیب بڑے فراڈیوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ بن چکی ہے؟۔ جسٹس جوادایس خواجہ نے کہا''کیا حکومت نے کبھی اِس امر کا جائزہ لیاہے کہ ملک میں کیاہو رہاہے۔ ہر طرف کرپشن کے چرچے ہیں۔ آخر کرپشن کے اِس سلسلے کوکس طرح روکا جائے گا؟۔ کرپشن پاکستان کاالمیہ بنتاجارہاہے۔ عدالت کومالیاتی کرپشن ،لینڈمافیا اوراختیارات کے ناجائز استعمال کے حوالے سے 50 بڑے سکینڈلز کی تفصیلات بتائی جائیں کیونکہ جتناوقت اورپیسہ ایک پٹواری کے خلاف ایکشن پر لگتاہے اتناہی وقت اوروسائل اربوں روپے کی کرپشن

کرنے والے فرد کے خلاف تحقیقات اور کارروائی پر لگتے ہیں''۔
قوم کی خوش قسمتی ہے کہ بالآخر سپریم کورٹ کو بھی کرپشن کے میگا سکینڈلز پر ہاتھ ڈالنے کا خیال آ ہی گیا۔ سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے دَور میں تو سپریم کورٹ ازخود نوٹس لیتی ہی رہتی تھی اور کرپشن کے مگرمچھوں کو ''پھڑکانے'' میں چودھری صاحب کا کوئی ثانی نہیں تھا لیکن بعد میں آنے والوں نے ''ہَتھ ہَولا'' رکھنے کی پالیسی اختیار کرلی ۔ اب سندھ میں کرپشن کے فنکاروں نے وہ اودھم مچایا اور غضب کرپشن کی ایسی ایسی عجب کہانیاں سامنے آئیں کہ قوم انگشت بدنداں۔ اُدھر ٹارگٹ کلرز، بھتہ خوروں اور دہشت گردوں کی کارروائیاں عروج پر۔ تنگ آمد، بجنگ آمد کے مصداق مرکزی حکومت نے سندھ رینجرز کو فری ہینڈ دے دیا جس نے بلاامتیاز ہر جگہ چھاپے مارنے شروع کردیئے جس پر سندھ کے وزیرِاعلیٰ سید قائم علی شاہ نے رینجرز حکام کو خط لکھ دیا کہ وہ اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہے ہیں۔ جواباً رینجرز نے کہا کہ ایپکس کمیٹی میں یہ طے ہوا تھا کہ بھتہ خوروں، دہشت گردوں اور ٹارگٹ کلرز کی سرپرستی کرنے اور اُنہیں مالی امداد مہیا کرنے والوں کو بھی پکڑا جائے گا۔ وہ اُنہی لوگوں پر ہاتھ ڈال رہے ہیں جن کے بارے میں مصدقہ اطلاعات ہیں کہ وہ مافیاز کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں دو شخصیات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی ۔ایک ''ٹُک ٹُک مصباح'' جو بیالیس سال کی عمر میں بھی پاکستانی کرکٹ ٹیم کی کپتانی چھوڑنے

کو تیار نہیں اور دوسرے ہمارے سید قائم علی شاہ جن کی عمر کا حساب لگانے کے لیے کسی اعلیٰ درجے کے کیلکولیٹر کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب کے بارے میں امیرِ جماعت اسلامی محترم سراج الحق نے کہا کہ وزیرِ اعلیٰ سندھ اب اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں کہ اب اُنہیں فرج میں رکھ دینا چاہیے ۔شاید محترم سراج الحق صاحب یہ کہنا چاہتے ہوں کہ شاہ صاحب کو سرف میں لگا دینا چاہیے تاکہ بوقتِ ضرورت اُنہیں ''ڈی فریز'' کرکے کام میں لایا جاسکے کیونکہ ہمارے شاہ صاحب اب اتنے بھی ''منحنی'' نہیں کہ کسی فریج میں سما سکیں۔ محترم جسٹس جواد ایس خواجہ نے نیب سے کرپشن کے 50 میگا سکینڈلز کی تفصیلات تو طلب کرلیں، دیکھتے ہیں کہ ''دمادم مست قلندر'' ہوتا بھی ہے یا نہیں کیونکہ ہماری عدالتوں میں جانے والے کیسز بیچارے تو ''رل تُل'' ہی جاتے ہیں۔ ہمیں اِن میگا سکینڈلز کی پریشانی ہے نہ اِن سے کچھ لینا دینا، ہم تو صرف اِس لیے پریشان ہیں کہ کہیں سپریم کورٹ ہمارے ''گدی نشین'' کو بھی ''دَھر'' نہ لے۔ اُن کا ''ہار سکینڈل'' اگرچہ کرپشن کے میگا سکینڈل کے زمرے میں تو نہیں آتا لیکن یہ ہماری عزت کا ''میگا میگا سکینڈل'' ضرور ہے۔ویسے بھی ہمارے یوسف رضا گیلانی صاحب سے سپریم کورٹ کی بڑی پکی اور پرانی ''دوستی'' ہے اِس لیے ہم خوفزدہ ہیں کہ کہیں کوئی نیا ''کھڑاک'' ہی نہ ہو جائے۔ یہ سب شرارت ہمارے وزیرِ داخلہ چودھری نثار احمد کی ہے ۔وہ بظاہر تو سنجیدہ نظر آتے ہیں لیکن اندر

سے ہیں بہت ''مخولیے''۔ اُنھوں نے چند ہفتے قبل یہ انکوائری شروع کروادی کہ تُرک خاتونِ اوّل'' کاعطیہ کیا گیا قیمتی ہار کہاں غائب ہوگیا۔ قصہ اِس ہار کا یہ ہے کہ تُرک'' وزیرِاعظم کی اہلیہ نے 2010ء میں سیلاب متاثرین کی امداد کے لیے اپنا قیمتی ہار عطیہ کیا جسے نادرا کے سابق سربراہ نے نادرا کی طرف سے 15 لاکھ روپے میں خرید کر ہار کو اُس وقت کے وزیرِاعظم محترم یوسف رضا گیلانی کے سپرد کر دیا تاکہ وزیرِاعظم ہاؤس میں نمائش کے لیے رکھا جاسکے۔ 15 لاکھ روپے سیلاب متاثرین میں تقسیم ہوگئے اور ہار وزیرِاعظم ہاؤس کی زینت بن گیا۔جب نواز لیگ کی حکومت آئی تو اِس ہار کی تلاش شروع ہوئی اور نادرا کے سابق ''چغل خور'' سربراہ نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔جب یہ خبر ہمارے'' گدی نشین'' کے کانوں پر گری تو اُنھوں نے فوراً اقرار کر لیا کہ ہار تو اُن کے پاس ہے۔ تب ایف آئی اے نے اُنہیں تین دنوں کے اندر ہار واپس کرنے کے لیے خط لکھ

دیا۔گیلانی صاحب نے وہ ہار اگلے دن ہی اسلام آباد کے لیے روانہ کر دیا۔ تب چودھری نثار نے مسکراتے ہوئے کہا''ہار ملتان سے چل پڑا ہے ،اب اسلام آباد پہنچ ہی جائے گا''۔ لیکن اصل کہانی کچھ اور ہے جو گیلانی صاحب نے اتنے دردناک انداز میں بیان کی کہ ہماری تو آنکھوں میں آنسو ہی آ گئے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ترکی کے اردوان خاندان سے اُن کی قربت بہت زیادہ ہے اور ترک خاتونِ اوّل کو اُنھوں نے اپنی بہن بنا رکھا ہے اِس لیے وہ ہار اپنے ساتھ لے گئے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ بہن کے مال پر ہاتھ صاف کرنا عین عبادت ہے۔ہم تو یہی سمجھتے

رہے کہ بھائی ساری زندگی اپنی بہنوں کو دیتے ہی رہتے ہیں، لیتے کچھ نہیں اور ہمارے بڑے بزرگ تو یہ تک کہہ گئے کہ بہن کے گھر سے پانی بھی نہیں پینا چاہیے لیکن اب پتہ چلا کہ بہنوں سے لیتے ہیں، اُنہیں کچھ دیتے نہیں۔ بات چونکہ ہمارے سابق وزیرِ اعظم نے کہی جو ''گدی نشین'' بھی ہیں اِس لیے'' وہ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے''۔ کچھ بَدبخت کہتے ہیں کہ اصل کہانی وہ نہیں جو گیلانی صاحب نے بیان کی بلکہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیا دھرا گیلانی صاحب کی اہلیہ محترمہ کا ہے جنہوں نے ایوانِ وزیرِ اعظم سے دَمِ رخصت گیلانی صاحب سے کہا کہ جب وہ وزیرِ اعظم تھے تو ''ادھورے'' کہ شاہ محمود قریشی اور ڈاکٹر بابر اعوان تو اُنہیں سِرے سے ''لِفٹ'' ہی نہیں کرواتے تھے اور رحمٰن ملک خود ''وَڈے'' وزیرِ اعظم جن کے بارے میں وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ رحمٰن ملک اُن کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں کے مصداق'' ایوانِ صدر میں بیٹھے ''حاکمِ اعلیٰ'' کا حکم بھی گیلانی صاحب کے لیے بمثلِ مرگِ مفاجات۔ بیگم صاحبہ نے مزید کہا کہ اُنہیں تو ایسی وزارتِ عظمیٰ کا ''کَکھ'' مزہ نہیں آیا اِس لیے وہ ''بھاگتے چور کی لنگوٹی'' کے مصداق یہ ہار تو وہ نہیں دیں گی۔ گیلانی صاحب نے اُنہیں مثالیں دے دے کر سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ پورے وزیرِ اعظم نہ سہی لیکن بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے میں اُنہوں نے بھی کوئی کَسر نہیں چھوڑی۔ اُنہوں نے بیگم صاحبہ کو لندن کے سب سے مہنگے ڈیپارٹمنٹل سٹور سے لاکھوں پاؤنڈز کی خریداری بھی یاد دلائی لیکن بیگم صاحبہ

اپنی ضد پر اڑی رہیں چنانچہ چاروناچار گیلانی صاحب وہ ہار ملتان لے گئے جسے ہزیمت اٹھا کر واپس بھی کرنا پڑا۔ مالِ مسروقہ تو برآمد ہو گیا لیکن دروغ بر گردنِ راوی اب کی تیاریاں ہیں۔ اسی لیے قمر الزماں کائرہ کہتے ہیں کہ FIR گیلانی صاحب کے خلاف چودھری نثار احمد کی پیپلز پارٹی سے دشمنی ڈھکی چھپی نہیں۔

تحقیقاتی کمیشن کی کارروائی مکمل

3 جون کو صدارتی آرڈیننس کے تحت قائم کیے گئے تحقیقاتی کمیشن کی کارروائی مکمل ہو گئی۔ کمیشن کے سربراہ چیف جسٹس آف پاکستان محترم ناصرالملک نے وکلاء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ اب چھٹیاں منائیں اور کمیشن کو اپنا کام کرنے دیں۔ یہ کمیشن تین بنیادی سوالوں کی تحقیقات کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے تشکیل پایا۔ 21 میں سے 19 سیاسی جماعتوں نے کمیشن سے رجوع کیا لیکن سوائے تحریکِ انصاف کے کسی سیاسی جماعت نے سماعت میں حصہ نہیں لیا البتہ 39 دنوں کی کارروائی میں کپتان صاحب تقریباً ہر کارروائی میں شریک ہوئے۔ کمیشن کی ایک کارروائی میں تو وہ محترمہ ریحام خاں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے جس میں تھوڑی بدمزگی اِس طرح پیدا ہوئی کہ جونہی خاں صاحب تحقیقاتی کمیشن کے سامنے پہنچے تو وہاں استقبال کے لیے آئی ہوئی خواتین نے خاں صاحب کے ساتھ ''سلفی'' بنانی چاہی جس پر ریحام خاں نے اُنہیں جھڑکتے ہوئے کہا کہ وہ اب کپتان صاحب کی ''بلاشرکتِ غیرے'' مالک ہیں اِس لیے اب ایسا نہیں چلے گا۔

تحقیقاتی کمیشن کی ہر سماعت کے بعد نوازلیگ اور تحریکِ انصاف، دونوں کی جانب سے ''کھڑاک'' ہوتا رہا۔ ایک طرف عمران خاں اور اُن کی ٹیم جبکہ دوسری طرف

دانیال عزیز، طلال چودھری اور انوشہ رحمٰن۔ عمران خاں تحقیقاتی کمیشن سے باہر نکلتے ہی نعرہ زن ہوتے کہ ’’آج تو منظم دھاندلی ثابت ہی ہو گئی‘‘ جبکہ دوسری طرف سے آواز آتی ’’ہم نے منظم دھاندلی کے الزام کو ’’پھڑکا‘‘ کے رکھ دیا۔ تحقیقاتی کمیشن کے سربراہ چیف جسٹس آف پاکستان محترم ناصرالملک بار بار تنبیہ کرتے رہے کہ ہر روز باہر لگنے والا تماشا بند کیا جائے لیکن تحریکِ انصاف نے اِس پر کان دھرے نہ نواز لیگ نے اور ’’تماشا‘‘ جاری رہا۔ 39 دِن جاری رہنے والے اِس تماشے کا اختتام ہوا، اب فیصلے کا انتظار ہے۔ نواز لیگ کہتی ہے کہ فیصلہ اُس کے حق میں آئے گا جبکہ تحریکِ انصاف کے محترم عمران خاں سمیت تمام رہنماء کہتے ہیں کہ اُنہوں نے ’’منظم دھاندلی‘‘ کے مکمل ثبوت فراہم کر دیئے۔ سونا میے کہتے ہیں کہ اُنہوں نے ایک لاکھ چھبیس
ہزار کاغذات پر مشتمل دھاندلی کے ثبوت تحقیقاتی کمیشن میں جمع کروائے لیکن نواز لیگ ایویں خواہ مخواہ رَولا‘‘ ڈال رہی ہے کہ یہ سارے تو ’’ردی‘‘ کاغذ تھے جن کا 2013ء’’ کے الیکشن سے کوئی تعلق نہ واسطہ۔ یہ کاغذات اب کارروائی کا حصہ ہیں اور تحقیقاتی کمیشن انہی کاغذات میں سے اُس ’’گیدڑ سنگھی‘‘ کو تلاش کرے گا جو کپتان صاحب کو اقتدار کے اونچے ایوانوں تک پہنچا سکے اور اُن کے ادھورے خواب پورے ہو سکیں۔
ہمارے پاس اندر کی خبریں دینے والی کوئی ’’چڑیا‘‘ تو نہیں، اِس کے باوجود بھی یہ یقین کہ انتخابات تو 2018ء ہی میں ہوں گے جن میں ’’نئے پاکستان‘‘ کی بنیاد بھی رکھ دی جائے گی۔ اگر 2015ء میں الیکشن کروانے ہیں

تواُس کاایک ہی طریقہ ہے کہ میاں نواز شریف صاحب وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیں اور ہمارے کپتان صاحب پورے پاکستان میں تین چوتھائی اکثریت سے کامیاب ہوکر وزارتِ عظمیٰ کا تاج اپنے سرپر سجالیں لیکن محترم بھائی عطاء الحق قاسمی کے خیال میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ وہ کہتے ہیں ”خاں صاحب کئی ماہ تک دھرنا دیئے بیٹھے رہے اور بچوں کی طرح ٹانگیں پسار کرمچلتے رہے اور ضد کرتے رہے کہ میں نے پاکستان کاوزیرِ اعظم بنناہے مگرنواز شریف بھی اتنے سنگدل نکلے کہ اُنھوں نے اِس ”بچے“کی ایک معصوم سی ضد پوری کرنے کے لیے وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دیناگوارا نہ کیا“۔ سونامیے کہتے ہیں کہ اُنہیں کسی کی بھیک نہیں چاہیے ، وہ جوکچھ بھی کریں گے اپنی سونامی“کے زورپر ہی کریں گے خواہ اِس کے لیے اُنہیں دوسرا جنم ہی کیوں نہ ” لیناپڑے۔ ویسے یہ نوازلیگ کے لیے لمحۂ فکریہ ہوناچاہیے کہ جیالے اورجیالیاں اب پیپلزپارٹی سے مایوس ہوکر” سونامیے اورسونامیاں“ بنتے جارہے ہیں اور اوکاڑہ میں تو سوائے منظوروٹوکے سارے جیالے تحریکِ انصاف میں شامل ہوگئے۔جیالوں کو صرف ڈھوم دھڑکے“ والی جماعتیں ہی راس آتی ہیں اسی لیے اُنھوں نے تحریکِ انصاف” کاانتخاب کیا۔ اگرنوازلیگ کے جلسے جلوس ”ٹھنڈے ٹھار“ نہ ہواکرتے توجیالے اِس طرف بھی رجوع کرسکتے تھے۔ایک اوربات کہ تحریکِ انصاف کاسب سے زیادہ فائدہ لوٹوں“ کوہواہے۔پہلے صرف نوازلیگ اورپیپلزپارٹی ، صرف دوجماعتیں ہواکرتی” تھیں اور لوٹے ”پھُدک“ کرکبھی اِدھراور کبھی

اُدھر لیکن اب اُنہیں انتخاب کرنے میں آسانی اور میدان وسیع ۔ اب جیالے اور سونامیے مِل کروہ دھوم دھڑکا کریں گے کہ نواز لیگ کو لگ پتہ جائے گا۔
سونامیے کہتے ہیں کہ اُنہیں کچھ کچھ شک ہونے لگاہے کہ تحقیقاتی کمیشن میں فیصلہ اُن کے خلاف بھی آسکتا ہے اِس لیے اُنہوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر مولاناطاہر القادری کو بھی پاکستان بلالیا ہے تاکہ بوقتِ ضرورت اُن کے ''مریدین''کو بھی استعمال میں لایا جاسکے ۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ لال حویلی والے صاحب تو پچھلے سال متواتر کہتے رہے کہ قربانی سے پہلے قربانی ہوگی''لیکن ہوا''کچھ'' بھی نہیں۔ وجہ شاید یہ تھی کہ اُنہیں'' ایوانِ وزیرِاعظم تک پہنچنے کی جلدی ہی بہت تھی، اسی لیے اُنہوں نے ''شارٹ کَٹ'' استعمال کیالیکن حسبِ وعدہ ''امپائر'' کی انگلی ہی کھڑی نہ ہو سکی اِس لیے وہ ناکام ہو گئے لیکن اب اِس عیدِ قرباں سے پہلے سونامیوں کا قربانی کا''پکا''پروگرام ہے اِسی لیے کپتان صاحب 2015ء کو الیکشن کا سال قرار دیتے رہتے ہیں۔ محترم عمران خاں کے 2015ء کو الیکشن کاسال قرار دینے کی تکرار سے گھبرا کر ہمارے سپیکر قومی اسمبلی محترم ایاز صادق نے سوچا کہ عمران خاں کے تواتر سے جھوٹ بولنے کو بنیاد بنا کر اُن پر آرٹیکل 63/62 کااطلاق کر دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ یہ آرٹیکلز ضیاء الحق مرحوم نے آئین کا حصہ بنائے مگراُن کے دَور سے لے کرآج تک اِن پر عمل درآمد ہو سکا نہ آئندہ ہونے کی توقع کیونکہ اگر یہ آرٹیکلز اپنی

پوری توانائیوں کے ساتھ لاگو ہو گئے تو پھر ہماری اسمبلیوں میں ''ٹاواں ٹاواں'' بندہ ہی باقی بچے گا۔ یہ بجا کہ خاں صاحب نے جلسے، جلوسوں اور کنٹینر پر کھڑے ہو کر متعدد بار کہا کہ سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری، سابق جسٹس سپریم کورٹ خلیل رمدے، ایم آئی کے ایک بریگیڈئیر، سابق نگران وزیرِاعلیٰ پنجاب نجم سیٹھی اور جنگ، جیو گروپ الیکشن 2013ء کی دھاندلی میں ملوث تھے۔ نجم سیٹھی کے 35 پنکچرز کی گونج تو ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر بیرونی ممالک تک بھی جا پہنچی۔ خاں صاحب نے یہ بھی کہا کہ جعلی بیلٹ پیپر اُردو بازار لاہور سے چھپوائے گئے لیکن تحقیقاتی کمیشن میں اِن میں سے کچھ بھی پیش نہیں کیا گیا۔ تحریکِ انصاف کے رہنماء نعیم الحق کہتے ہیں کہ اُن کے وکیل حفیظ پیرزادہ صاحب نے کہا تھا کہ ایسے الزامات جنہیں ثابت نہ کیا جا سکے، تحقیقاتی کمیشن میں پیش نہیں کرنے چاہییں، اِس لیے تحقیقاتی کمیشن میں اِن لوگوں کے نام پیش نہیں کیے گئے جبکہ محترم عمران خاں نے حامد میر کو 35 پنکچروں کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ''یہ تو ایک سیاسی بیان تھا''۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عمران خاں صاحب اب ''پکے'' سیاستدان ہو گئے ہیں کیونکہ پاکستان میں سیاست جھوٹ کا دوسرا نام ہے اور خاں'' صاحب تو اب جھوٹ اِس تواتر سے بولتے ہیں کہ سچ کا گماں ہونے لگے۔ اگر اِن ''سیاسی جھوٹوں'' کو بنیاد بنا کر ایاز صادق صاحب ہمارے کپتان پہ آرٹیکل 63/62 لاگو کرنا چاہتے ہیں تو یہ اُن کی خام خیالی ہے۔ وہ اِن آرٹیکلز کو نہ ہی چھیڑیں تو بہتر ہے کیونکہ ہمارے پاس ''حاضر سٹاک

میں فی الحال ایسے ہی سیاستدان ہیں جو سیاست اور جھوٹ کو لازم وملزوم سمجھتے ہیں۔''

عمران خاں کا اندازِ سیاست

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

خلیل جبران نے کہا "ترس کھاؤ اُس قوم پر جو کسی سرکش انسان کو اپنا ہیرو بناتی ہے"۔ فرق ہے، بہت فرق بہادری اور سرکشی میں۔ بہادر اپنے عزم وہمت کے زور پر دلوں کو مسخر کرتا اور مقبولیت کی رفعتوں کو چھوتا ہے لیکن سرکش کے حصے میں ہزیمت، صرف ہزیمت۔ ضد، ہٹ دھرمی اور سرکشی اُس میں کوٹ کوٹ کر بھری، نرگسیت کے سرکش بتوں کو حلیمی کے ہتھوڑے سے پاش پاش کرنے کو وہ تیار نہیں اِسی لیے " اپنے بھی خفا اُس سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش"۔ محترم عطاالحق قاسمی صاحب کی یہ خواہش کہ "خاں صاحب اپنی غلط بیانی پر نجم سیٹھی سے معذرت ضرور کریں، اِس سے آپ کا قد چھوٹا نہیں، بڑا ہوگا" لیکن جانتے وہ بھی ہیں کہ خاں صاحب ایسا کبھی نہیں کریں گے کیونکہ نرم خُو تو وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ آقا ﷺ کا فرمان ہے "جو شخص نرمی کی صفت سے محروم کر دیا گیا وہ سارے خیر سے محروم کر دیا گیا"۔ اظہارِ ندامت اور معذرت تو "خیر" کی علامت ہے جس کی توقع خاں صاحب سے عبث۔ ویسے بھی جن صلاح کاروں نے خاں صاحب کو گھیر رکھا ہے، اُن کا یہ عالم کہ جب حامد میر نے خاں صاحب سے ایک "سچ" اگلوایا اور عارف علوی نے

اظہارِ ندامت کیا تو سبھی سیخ پا، مدح سرا تو اتنا زیادہ کہ بَرملا لکھ دیا'' یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ 35 پنکچر والا بیان سیاسی تھا''۔قُرآن وحدیث کے بغیر لقمہ نہ توڑنے اوراپنے ''کالمی درویشوں'' کے زور پر قوم کو گمراہ کرنے کی سعی کرنے والے سینئر لکھاری کی خدمت میں عرض ہے کہ میرے آقا ﷺ نے تو یہ فرمایا کہ ''جو شخص دنیا میں دوُرخا پن اختیار کرے گا، قیامت کے روزاُس کے مُنہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی ۔کیا محترم لکھاری طلبِ دنیا میں اتنا ہی آگے نکل چکے کہ اگر کوئی اپنے جھوٹ کا اقرار'' کرنے کی ہمت کر ہی بیٹھے تو اُسے یہ مشورہ کہ'' اقرار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''۔کیا اُن کے خیال میں پاکستان میں قحط الرجال اب اِس حد تک پہنچ چکا ہے کہ لوگ سچ اور جھوٹ کو نتھارنے سے بھی عاری؟۔ نہیں محترم ! ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں جنہیں میرے آقا ﷺ کا فرمان اَز بَر ہے کہ ''آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ جوں ہی وہ کوئی بات سنے ،بغیر تحقیق اور غور وفکر کے اُسے پھیلاتا پھرے''۔ آپ کے ممدوح نے تو غور وفکر اور تحقیق کی عادت سرے سے پالی ہی نہیں،اسی لیے اُنہیں بار بار یوٹرن لینا پڑتا ہے ۔حامد میر کے سامنے کہا کہ 35 پنکچر والا بیان سیاسی تھا جبکہ تیسرے دن کراچی میں انہی 35 پنکچروں کے بارے میں کہہ دیا کہ یہ آغا مرتضےٰ پویا نے بتایا تھا اور یہ سچ ہے جبکہ مرتضےٰ پویا اور امریکی سفارتکار بہت پہلے اِس بیان سے برأت کا اظہار کر چکے ۔اصل کہانی یہ کہ'' فافن'' کی ایک سروے رپورٹ آئی جس میں قومی اسمبلی کے پینتیس حلقوں کا

ذکر کیا گیا جن میں مسترد شدہ ووٹ، جیتنے اور ہارنے والے امیدواروں کے درمیانی فرق سے زیادہ تھے۔ تحریکِ انصاف نے اسی سروے کو بنیاد بنا کر نگران وزیرِ اعلیٰ نجم سیٹھی پر الزام دھر دیا کہ اُنہوں نے نواز لیگ کے کہنے پر "35 پنکچر" لگائے جبکہ حقیقت اِس سروے کی یہ ہے کہ فافن کی رپورٹ کے مطابق اِن حلقوں کا تعلق پورے پاکستان سے تھا، صرف پنجاب سے نہیں جبکہ نجم سیٹھی صرف پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ۔

مقبولیت کی انتہاؤں کو چھونے والے کپتان صاحب نے تو اپنے سیاسی محل کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی تھی اسی لیے اُنہیں بار بار ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ تحقیقاتی کمیشن کا فیصلہ آنا باقی لیکن خاں صاحب کی ضد پر تشکیل دیئے گئے اِسی کمیشن کی بنا پر خاں صاحب کے جھوٹ کے کھلیان کا ایک ایک دانہ یوں بکھرا کہ قوم پر سب کچھ عیاں ہو گیا۔ غیر جانبدار تجزیہ نگار تو سالوں سے لکھ رہے تھے کہ خاں صاحب عوامی اجتماعات میں جو کچھ کہتے ہیں، اُن کے افعال اِس کی گواہی نہیں دیتے۔ جب وہ مقبولیت کی انتہا پر تھے تو کہا کہ اُن کی جماعت ایسے لوگوں کو ٹکٹ دے گی جو "دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں" لیکن ہوا یہ کہ "درِ عمران" ہر اُس شخص کے لیے کھل گیا جس نے زندگی میں کبھی ایک الیکشن بھی جیتا تھا۔ ایسے لوگ دھڑا دھڑ تحریکِ انصاف میں شامل ہوتے چلے گئے جن کا نام سنتے ہی حبِ وطن کی کسک محسوس کرنے والوں کی طبیعت منغض ہونے لگتی تھی

۔خاں صاحب نے بھی یوٹرن لیتے ہوئے کہہ دیا ’’سبھی نہیں لیکن زیادہ تر ایسے لوگ ہوں گے جنکے دامن پر کوئی داغ نہیں ہوگا‘‘۔ اور پھر۔۔۔ایک اور یوٹرن کہ ’’آسمان سے فرشتے نہیں اُتریں گے ، انہی سے کام چلانا ہوگا‘‘۔جب شدید ترین تنقید کا سامنا کرناپڑا تو کہہ دیاکہ اگر سربراہ دیانتدار ہو تو سبھی خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ الیکشن 2013ء کے انتخابات کو پہلے تسلیم کیااور میاں نواز شریف کو مبارکباد بھی دی لیکن پھرچھ ماہ کے اندر ہی ایک اور یوٹرن لیتے ہوئے یہ کہناشروع کر دیاکہ انتخابی نتائج تسلیم لیکن قومی اسمبلی کے چار حلقوں کی اعلیٰ سطحی تحقیقات کروائی جائے۔کچھ عرصہ بعدمسکراتے ہوئے یہ بھی کہہ دیاکہ میاں برادران اچھی طرح سے جانتے تھے کہ اگران چار حلقوں میں دھاندلی ثابت ہو گئی تو میں نے تمام انتخابی نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیناہے اسی لیے وہ چار حلقے کھولنے سے گریزاں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگران چار حلقوں میں دھاندلی نہ بھی ثابت ہوتی تو خاں صاحب نے پھر بھی سڑکوں پر ہی ہونا تھا۔الیکشن 2013ء سے پہلے ایک ٹی وی ٹاک شو میں محترم احسن اقبال نے کہاتھا کہ عمران خاں صاحب پانچوں نگران حکومتیں اور ساراالیکشن کمیشن خود تشکیل دے لیں لیکن یہ لکھ کر دے دیں کہ وہ انتخابی نتائج کو تسلیم کرلیں گے ۔اُس وقت تو یار لوگوں نے احسن اقبال صاحب کے اِس بیان کو مسکراکے ٹال دیا لیکن وقت نے ثابت کیاکہ حقیقت وہی تھی جس کااظہار اُنہوں نے کیا۔ اب بھی خود عمران خاں صاحب اور تحریکِ انصاف کے رہنماؤں کی طرف سے بار بار یہ کہاجا

رہا ہے کہ تحقیقاتی کمیشن کے فیصلے کو تسلیم کیا جائے گا لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ تحریکِ انصاف کے میاں محمود الرشید نے تو دھاندلی ثابت نہ ہونے لیکن انتخابی بے ضابطگیوں پر احتجاجی تحریک لانے کا عندیہ بھی دیا۔ مولانا قادری پاکستان پہنچ چکے ،سابق گورنر پنجاب چودھری سرور کی خفیہ سرگرمیاں جاری ،چودھری برادران اور مولانا قادری سے اُن کے مسلسل رابطے کسی نئی تحریک کا پیش خیمہ دکھائی دیتے ہیں۔ اُدھر پرویز مشرف کی سربراہی میں نئی مسلم لیگ کی بنیاد رکھنے کے لیے حامد ناصر چٹھہ، سردار ذوالفقار کھوسہ اور سید غوث علی شاہ متحرک، نام اِس کا ہوگا ''متحدہ مسلم لیگ''۔ کپتان صاحب اور قادری صاحب کے متحرک ہونے پر یہ متحدہ مسلم لیگ بھی اُن کا ساتھ دے گی ۔پرویز مشرف صاحب کی تو مولانا قادری سے ٹیلی فونک بات ہو چکی اور پرویز مشرف نے مولانا قادری کو کراچی میں ملاقات کی دعوت بھی دے ڈالی ۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیوایم حکومت سے ناراض لیکن مقتدرہ قوتیں آج بھی نواز لیگ کے شانہ بشانہ ۔ پہلے نواز مخالف تجزیہ نگاروں کی زبانیں یہ کہتے نہیں تھکتی تھیں کہ سیاسی اور عسکری قیادت ایک صفحے پر نہیں لیکن جب کچھ بَن نہ پڑا تو اب یہ واویلا کہ اصل اقتدار تو جنرل راحیل شریف کے پاس، نواز لیگ تو محض ہاتھی کے دانت لیکن حقیقت اِس کے بالکل برعکس ۔افواجِ پاکستان وہی کرتی ہیں جو اُنہیں کرنے کو کہا جاتا ہے۔ مدح سرا کے ''کالمی درویشوں'' کی یہ اطلاع بالکل غلط کہ ''میاں نواز شریف، زرداری صاحب کو پیہم پیغامات بھیج رہے ہیں کہ میں آپ کی مدد کرنے

کاآرزومند ہوں مگر مجبور ہوں"۔ اگرایسا ہوتا تو میاں صاحب زرداری صاحب سے نہ
تو طے شدہ ملاقات سے انکار کرتے اور نہ ہی روس میں بیٹھے جنرل راحیل شریف کو فون
کرکے زرداری صاحب کے بیان کی نفرین کرتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ میاں
صاحب خاموشی اختیار کر لیتے لیکن اُنھوں نے تو ہر سطح پر بانگِ دہل زرداری صاحب کے
بیان کے بخیے ادھیڑے۔

کیا کھویا، کیا پایا

آج سے ایک ماہ پانچ دِن بعد میرا وطن 68 سال کا ہو جائے گا اور ہم اِس کی اُنہتر ویں سالگرہ مناتے ہوئے لہک لہک کر گا رہے ہوں گے ''سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے''۔ اِن اڑسٹھ سالوں میں ہم نے بہت ترقی کی کیونکہ ہمارے نزدیک ''ترقی تو ترقی ہوتی ہے، خواہ وہ ترقیِ معکوس ہی کیوں نہ ہو''۔ سڑے بُسے تجزیہ نگاروں کی آنکھوں میں شائد ''ککرے'' ہیں جو اُنہیں یہ بھی نظر نہیں آتا کہ اِن اڑسٹھ سالوں میں ہم نے کھویا کچھ نہیں، بس پایا ہی پایا ہے۔ لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد تو ہماری ترقی میں اتنی تیزی آ گئی کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی کہنا پڑا ''میں اتنے پاجامے نہیں بدلتا جتنے پاکستان میں وزیرِ اعظم بدلتے ہیں''۔ دراصل بھارت کو ہمارے ہر معاملے میں ''ایویں خواہ مخوا'' ٹانگ اڑانے کی عادت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آئین ہر پاکستانی کو وزیرِ اعظم بننے کا حق دیتا ہے اور اسی لیے ہم وزیرِ اعظم پہ وزیرِ اعظم بدلتے چلے گئے تا کہ کوئی رہ نہ جائے۔ چونکہ نہرو کی شرارت کا جواب دینا بھی ضروری تھا اِس لیے ہم وزیرِ اعظم، وزیرِ اعظم کھیلنا چھوڑ کر ایوب خاں کو لے آئے۔ ایوب خاں کے دَس سالہ دَورِ حکومت میں سیاستدان گھر بیٹھ کر اپنی تھکن اتارتے رہے اور بعض نے تو سیاست کے نئے نئے گُر سیکھنے کے لیے ''ٹیوٹر'' بھی رکھ لیے۔ آکسفورڈ کے پڑھے ذوالفقار علی

بھٹوالبتہ تھوڑے چالاک نکلے جنھوں نے ''ہوم ٹیوشن'' کی بجائے فوج کی نرسری جوائن'' کرلی۔ ایوب خاں کی 19 رکنی کابینہ میں بھٹو مرحوم واحد سویلین تھے، باقی'' سب فوجی۔ ایوب خاں کو ''ڈیڈی'' کہنے والے ذوالفقار علی بھٹو نے ترقی کاایک زینہ طے کرتے ہوئے اپنے ''ڈیڈی'' سے ہی بغاوت کر ڈالی جس کے نتیجے میں یحییٰ خاں برسرِاقتدار آئے۔ اُن کا قوم پر یہ ''عظیم احسان'' ہمیشہ یادرہے گاکہ مشرقی پاکستان نامی ''خواہ مخوا'' کے بوجھ سے پاکستان کو چھٹکارا دلادیا لیکن ہمیں اُن کی یہ ادا پسند نہیں آئی اور ہم ذوالفقار علی بھٹو کو لے آئے۔ بھٹو مرحوم نے 1977ء کے ''شفاف ترین'' انتخابات کرواکر نئی تاریخ رقم کی لیکن یہ انتخابات ''مولویوں'' کو پسند آئے نہ سیاستدانوں کو کیونکہ بھٹو دو، تہائی اکثریت سے جیت گئے اور 9 جماعتوں کے اتحاد (پی این اے) کے حصے میں ''کچھ'' نہ آیا۔ دھاندلی کا شور مچا اور قوم سڑکوں پر۔ یوں تو پی این اے 9 جماعتوں پر مشتمل تھا لیکن صفِ اوّل میں جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلباء ہی تھی۔ اسی زمانے میں پی این اے کی احتجاج کرتی خواتین کو سبق سکھانے کے لیے بھٹو مرحوم نے پولیس کی خواتین فورس قائم کی جسے پی این اے نے ''نتھ فورس'' کا نام دیا۔ دھاندلی کا شور جب اپنے عروج پر پہنچا تو ضیاء الحق بطور ''منصف'' ٹپک پڑے۔ اُنہوں نے 90 دنوں میں نئے انتخابات کا وعدہ کیا لیکن ہماری ترقی کا تو راز ہی یہ ہے کہ ہم وعدے وفا نہیں کرتے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں ''وعدے قرآن و حدیث نہیں ہوتے''۔ ضیاء مرحوم کا پروگرام تو نوے کی بجائے 9

ہزار دنوں تک حکومت کرنے کا تھا لیکن موت نے اُنہیں بیچ سے ہی اُچک لیا۔اُس زمانے میں یہ لطیفہ بہت مشہور ہوا کہ ایک جیالے نے دوسرے جیالے سے پوچھا ''یار! یہ ضیاء الحق کب جان چھوڑے گا''۔ دوسرے جیالے نے جل بھُن کو جواب دیا ''اُس نے قوم کو پورا قُرآنِ پاک سنائے بغیر جان نہیں چھوڑنی اور ابھی تو اُس نے قُرآنِ پاک کی پہلی ہی سورۃ سنائی ہے''۔

ضیاء الحق کی رحلت کے بعد میاں نواز شریف اور محترمہ بینظیر کے مابین اقتدار کی ''سانپ، سیڑھی'' کا کھیل شروع ہوا۔ کبھی بینظیر مسندِ اقتدار پر تو کبھی نواز شریف۔جب اقتدار کے اِس کھیل نے طوالت اختیار کی تو پرویز مشرف نے تنگ آ کر دونوں کی چھٹی کروادی اور خود ''طبلے سارنگی'' سمیت ایوانِ صدر میں براجمان ہو گئے۔ اُن کے دَور میں ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ بہت مقبول ہوا لیکن آصف زرداری نے ''پاکستان کھپے'' کا نعرہ لگا کر پرویز مشرف کے نعرے سے ہوا نکال دی۔ پرویز مشرف گارڈ آف آنر کے ساتھ رخصت ہوئے اور زرداری صاحب پاکستان ''کھپانے'' کے لیے ایوانِ صدر آن پہنچے۔ اُنھوں نے اپنے پانچ سالہ دَورِ حکومت میں بہت ترقی کی جس کی بازگشت آجکل سندھ میں سنائی دے رہی ہے اور پاک فوج کی سربراہی میں رینجرز فورس زرداری صاحب کی ترقی کے سارے راز ایک ایک کر کے افشاء کرتی جا رہی ہے۔ آجکل میاں نواز شریف صاحب اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ ملک میں سڑکوں کا جال بچھایا جا رہا ہے تاکہ ''بھاگنے'' میں آسانی

رہے۔ پاک چائنا دوستی کی علامت کے طور پر ''اقتصادی راہداری'' بھی بنائی جارہی ہے جس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ اِس کی تکمیل پر پاکستان کی تقدیر بدل جائے گی۔ ہم تو بچپن سے ہی یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ پاکستان کی تقدیر بدلنے والی ہے لیکن ہوا ''کَکھ'' بھی نہیں۔ اب دیکھیں یہ اقتصادی راہداری کیا گُل کھلاتی ہے۔''

ڈاکٹر سلیم اختر نے اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ لکھی جسے ہم نے دَورانِ تعلیم طوطے کی طرح ''رٹ'' لیا۔ آج ہم نے بھی پاکستان کی مختصر ترین تاریخ لکھ ماری، نسلِ نَو کو چاہیے کہ وہ بھی اس کا ''رٹا'' لگالے تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے لیکن ذرا ٹھہریے، یہ تاریخ ادھوری ہے، پوری تو صرف اُس وقت ہوگی جب اُس عظیم کردار کا ذکر کیا جائے گا جس نے قوم سے ''نیا پاکستان'' بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ نیا پاکستان بنانے کی بنیاد تو ''ڈھول ڈھمکے'' کے شور میں رکھی جاچکی لیکن درمیان میں دو ''بیریر'' ایسے آگئے جن کی بنا پر نئے پاکستان کا کام ابھی بنیادوں پر ہی رُکا پڑا ہے۔ پہلا ''بیریر'' تو اُس وقت لگا جب خاں صاحب ملک میں ''تبدیلی'' لاتے لاتے اپنے گھر میں ''تبدیلی'' لے آئے۔ ریحام خاں اُن کی زندگی میں داخل ہوئیں اور وہ ''گھر گرہستی'' میں مصروف ہوگئے۔ پہلے تو خاں صاحب بِلا شرکتِ غیرے ''ٹھکاٹھک'' فیصلے کرتے چلے جاتے تھے لیکن دروغ بَر گردنِ راوی اب صرف ریحام

خاں کی ہی مرضی چلتی ہے اور ہمارے کپتان صاحب تو بَس ''ایویں ای'' ہو کر رہ گئے ہیں۔ دوسرا ''بیریر'' ڈی جے بَٹ نے محض 8 کروڑ روپے کی خاطر لگا دیا۔ ڈی جے بٹ کہتا ہے کہ اُس کے تحریکِ انصاف کی طرف 18 کروڑ روپے واجب الادا تھے جن میں سے 10 مِل گئے اور باقی 8 کروڑ کے لیے وعدۂ فردا۔ دھرنوں اور جلسے جلوسوں کا موسم قریب ہے اور اگر جلسوں میں ڈی جے بٹ نہ ہوا تو کیا خاک مزہ آئے گا۔ وہ تحریکِ انصاف کا جزوِ لاینفک ہے جسے منانا بہت ضروری ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ نواز لیگ ڈی جے بٹ سے مسلسل رابطے میں ہے اور محترم پرویز رشید نے تو کہہ بھی دیا کہ حکومت ڈی جے بٹ کی بھرپور مدد کرے گی۔ ایک ٹاک شو میں خواجہ آصف سیالکوٹی نے بھی کہا کہ اگر ڈی جے بٹ نے رجوع کیا تو ہم اُس کی مدد کریں گے۔ اِس لیے ڈی جے بٹ کو منانا اور ضروری ہو گیا ہے۔ ہمارے کپتان صاحب کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ تو صرف ایک ہی ''فنڈ ریزنگ شو'' میں آٹھ، دَس کروڑ اکٹھا کر لیتے ہیں، بس ایک ''شو'' کریں اور معاملہ صاف۔ لیگئیے کہتے ہیں کہ جو جماعت صرف میوزیکل کنسرٹ پر اٹھارہ اٹھارہ کروڑ صرف کر دیتی ہے وہ غریبوں کا ''نیا پاکستان'' کیا خاک بنائے گی لیکن ہم کہتے ہیں کہ میوزیکل کنسرٹ سے ہی تو لوگ کھنچے چلے آتے ہیں، اگر میوزیکل شو نہ ہو تو ''سونا میے'' آتے ہیں نہ ''سونامیاں''۔ اِس کا تجربہ ہم دھرنوں کے آخری دنوں میں کر چکے۔ تب ڈی جے بٹ کی عدم موجودگی میں دھرنوں کا یہ عالم تھا کہ کنٹینر پر کپتان صاحب سمیت پندرہ بیس افراد اور سامنے ڈیڑھ دو سو سامعین۔ آخری خوشی کی خبر یہ ہے کہ

کپتان صاحب کی قائم کردہ ''کمیٹی'' نے ڈی جے بٹ کو منا لیا، معاملات طے ہو گئے اور سونامیوں کو نوید ہو کہ اب وہ ایک دفعہ پھر ''دھوم مچانے'' آ رہا ہے۔ بُری خبر یہ کہ انکم ٹیکس والوں نے ڈی جے بٹ کو ایک کروڑ اٹھائیس لاکھ روپے کے ٹیکس کا نوٹس بھیج دیا ہے۔ یقیناً یہ نواز لیگ ہی کی ''شرارت'' ہو گی۔ ہم تو پہلے بھی کہہ چکے کہ ''یہ نواز لیگیئے ہوتے ہی ایسے ہیں''۔

اوفامیں پاک بھارت وزرائے اعظم کی ملاقات

روس کے شہر اوفامیں نواز، مودی ملاقات ہوچکی۔ یہ ملاقات بھارتی وزیرِاعظم نریندر مودی کی خواہش اور دعوت پر ہوئی جسے وزیرِاعظم پاکستان میاں نواز شریف نے قبول کرلیا۔ یہ دعوت ایک لحاظ سے نریندر مودی کی مجبوری بن چکی تھی کیونکہ اُن کی بنگلہ دیش میں لاف زنی کواقوامِ عالم میں سے کسی نے بھی پسند نہیں کیااوراُن کی ''بڑھکوں'' سے یہ تاثراُبھر کرسامنے آیاکہ بھارت نے دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت کاوطیرہ اختیار کر رکھاہے۔اُدھربی بی سی کے پاکستان میں ''را''کے دہشت گردی میں ملوث ہونے کے انکشافات نے معاملات کومزید گھمبیر بنا دیا اورپاکستان نے ''را''کی مداخلت کوعالمی فورم پراٹھانے کافیصلہ کیا۔ مودی نگاہِ عالم میں اِس معاملے کی ''حدت'' کو کم کرناچاہتے تھے اسی لیے اُنہوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر میاں نواز شریف صاحب کوملاقات کی دعوت دے ڈالی۔ دوسری طرف ہمارا''جہنم سے نکلاہوا اتحادی'' امریکہ بہادر بھی پاک چائنابڑھتے ہوئے دفاعی واقتصادی تعلقات اورروس کے ساتھ بڑھتے ہوئے دفاعی تعاون سے ناخوش اورپریشان۔ امریکہ بھی چاہتا تھا کہ دونوں سربراہان مذاکرات کی میز پر بیٹھیں تاکہ پاک امریکہ تعلقات میں پیدا ہونے والی سَرد مہری میں کچھ کمی کی جاسکے۔ 55 منٹ پر محیط یہ ملاقات،بَس نشستن ، گفتن ،برخاستن تک محدودرہی۔ تاؤکایہ

عالم کہ دونوں سربراہان کے چہرے سپاٹ اور ''مسکراہٹوں'' کا تبادلہ تک مفقود۔
نریندر مودی نے تو سفارتی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انتہائی گھٹیا حرکت یہ کی کہ اپنی نشست سے چند قدم آگے بڑھ کر میاں نواز شریف کا استقبال کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ اگر نریندر مودی کا ماضی مدِّ نظر ہو تو اُس سے اچھائی کی توقع عبث۔ میاں صاحب نے بھی طوہاً و کرہاً اِس ملاقات پر آمادگی کا اظہار کیا کیونکہ اگر وہ انکار کر دیتے تو اقوامِ عالم میں اچھا تاثر نہ جاتا۔
یوں تو اِس ملاقات میں ''کُکھ'' بھی نہیں تھا لیکن ہمارے تجزیہ نگاروں نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ سبھی اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں۔ وزیرِ اعظم صاحب ابھی روس سے لوٹے بھی نہیں لیکن ملاقات کا ''پوسٹ مارٹم'' جاری۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ''بزرجمہری'' تجزیہ نگار سلیمانی ٹوپی پہن کر اِس ملاقات میں بنفسِ نفیس شریک تھے کیونکہ جو بات بھی کہی جا رہی ہے، پوری قطعیت کے ساتھ۔ حکومتی تجزیہ نگار اِس ملاقات کے حق میں اور حکومت مخالف تجزیہ نگار مخالفت میں دلائل کے انبار لگا رہے ہیں۔ دراصل ہماری تجزیہ نگاری اب مدح سرائی میں ڈھل چکی ہے۔ کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے تک فنِ قصیدہ گوئی اپنے عروج پر تھا اور درباری قصیدہ گو اپنے ممدوح کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتے تھے۔ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے دَور تک یہ صنفِ سخن جاری رہی۔ ابراہیم ذوق، بہادر شاہ ظفر کے استاد ہی نہیں، درباری قصیدہ

گو بھی تھے۔ آجکل یہ صنف مفقود لیکن اِس لحاظ سے زندہ کہ ہمارے کالم نگاروں نے اسے اپنالیا ہے۔اچھا قصیدہ تو وہی سمجھا جاتا تھا جس میں ممدوح کی تعریف وتوصیف کے ساتھ مخلصانہ مشورے بھی دیئے جاتے، خواہ وہ ممدوح کو کتنے ہی ناگوار کیوں نہ گزریں لیکن ہمارے ہاں تو ''پاپی پیٹ'' کا سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اِس لیے ہمارے لکھاریوں کے کالم توعمروعیار کی اُس زنبیل کی مانند ہیں جس میں مدح سرائی کے سارے گُر، اور یکے بعد دیگرے اُن کا استعمال۔ سارے نہیں لیکن غالب اکثریت ایسے ہی لکھاریوں پر مشتمل ہے جنہیں ''درباری لکھاری'' کہا جا سکتا ہے۔ایسے درباری لکھاری ایوب خاں سے لے کر پرویز مشرف تک ہر آمر اور بھٹو مرحوم سے لے کر میاں نواز شریف تک ہر سیاست دان کو ٹھوک کے حساب سے دستیاب۔اب تو یہ عالم کہ کالم نگار کا نام سنتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس کے حق میں لکھے گا اور کس کی مخالفت میں۔ اسی لیے الفاظ کی حرمت باقی نہیں بچی۔ الیکٹرانک میڈیا میں بہ راجمان اینکر اور ''اینکرنیاں'' اپنے ''سیٹھ'' کے اشارہ ابرو کے منتظر رہتے ہیں اور سیٹھوں کا ایک ہی پیغام کہ ریٹنگ بڑھنی چاہیے خواہ اِس سے ملکی سلامتی کا سوال ہی کیوں نہ اُٹھ کھڑا ہو۔ نیوز چینلز میں بھی یہ تفریق بہت واضح نظر آتی ہے اور تقریباً ہر چینل پر کسی نہ کسی سیاسی جماعت کا ''ٹھپہ'' بھی۔ اب اگلے کچھ دنوں تک نواز، مودی ملاقات زیرِ بحث رہے گی جس میں ''اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ''۔

تنقید و تنقیص اپوزیشن کا حق لیکن بغض، عداوت اور کینے کی بنیاد پر نہیں۔ تحریکِ انصاف کی ترجمان محترمہ شیریں مزاری ایک ٹی وی ٹاک شو میں فرما رہی تھیں کہ ''نواز شریف کی جانب سے مودی کی خوشامد افسوس ناک ہے''۔ لگتا ہے کہ محترم نجم سیٹھی کی طرح شیریں مزاری کے پاس بھی کوئی چڑیا ہے جس نے میاں صاحب کو مودی کی خوشامد کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا کیونکہ شیریں مزاری نہ تو اُس ملاقات میں شریک تھیں اور نہ ہی کیمرے کی آنکھ نے میاں صاحب کو خوشامد کرتے ہوئے دکھایا۔ ہم نے تو یہی دیکھا کہ میاں صاحب کے چہرے پر تہ در تہ سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور یہ سنجیدگی اُس وقت بھی برقرار تھی جب میاں صاحب ملاقات ختم کرکے باہر نکلے۔ شیریں مزاری نے یہ بھی فرمایا'' میاں صاحب کی نریندر مودی کو سارک کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینا شرمناک ہے''۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اگلی سارک کانفرنس پاکستان میں منعقد ہو رہی ہے اور جس ملک میں بھی سارک کانفرنس منعقد ہوتی ہے، اُس کا سربراہ ہمیشہ سارک ممالک کے دیگر سربراہان کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ اگر میاں صاحب نے نریندر مودی کو شرکت کی دعوت دے ڈالی تو یہ ''شرمناک'' کیسے ہو گئی؟۔ شرمناک تو وہ جھوٹ اور یوٹرن ہیں جو تحریکِ انصاف کے پلیٹ فارم سے متواتر بولے جاتے ہیں اور اُن پر جبینِ ندامت ذرا بھی تَر نہیں ہوتی۔ سچ کہا تھا خواجہ آصف سیالکوٹی نے ''کچھ شرم ہوتی ہے، کچھ حیا ہوتی ہے''۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ملاقات دونوں ممالک کے نزدیک محض ایک دکھاوا تھی جس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا محض سعیٔ لاحاصل۔ اِس

ملاقات میں کسی نے کچھ کھویا، نہ پایا۔ پاکستان اب بھی بھارتی ''دَراندازی'' کا مسئلہ عالمی فورم پر بھرپور انداز میں اٹھانے کو ہے اور بھارت کے رویے میں بھی کہیں لچک دکھائی نہیں دیتی۔ کشمیر کے مسئلے کو وزیرِاعظم پاکستان نے پہلے بھی اقوامِ متحدہ میں بھرپور انداز میں اجاگر کیا اور اب بھی کریں گے جبکہ بھارت کی ''اٹوٹ انگ'' کی رَٹ اب بھی جاری وساری۔ عالمی سطح پر چونکہ ہمیشہ مذاکرات کو ہی اولیت دی جاتی ہے اِس لیے نریندر مودی نے بھی اپنی ''خباثتوں'' کو مذاکرات کی ڈھال کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔ اِس کے سوا تو ہمیں اِس ملاقات میں ''کُچھ'' نظر نہیں آتا۔

حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔سرگوشیاں

حکمت کی عظیم الشان کتاب نے منادی کردی ''جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے ،اُس کی سزا جہنم ہے ،وہ اِس میں ہمیشہ رہے گا۔ اُس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا۔ اُس پر اللہ کی لعنت ہے اور اللہ نے اُس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے'' (النساء)۔ میرے نبی ﷺ نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ ''مسلمان تو وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں''۔ لیکن بزعمِ خویش مسلمان کہلانے والوں نے کراچی خونم خون کر دیا۔ اُدھر سے آنے والی ہواؤں کے جھونکے بھی سوگوار کہ اُن میں خون کی بو رچی تھی ۔ موجِ خوں سروں سے گزرتی رہی لیکن لبوں پہ مہرِ خاموشی، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا بھی ''ٹک ٹک دیدم ،دم نہ کشیدم''۔ایسا ہرگز نہیں کہ اذہان وقلوب کی کھیتیاں بنجر ہوئیں یا فہم وادراک زنگ آلود البتہ خوف ۔۔۔ جو زبانوں پہ لکنت طاری کر دیتا، خوف جو کسی اندھی گولی کے جسم میں ترازو ہو جانے کا تھا، خوف ، جرمِ ضعیفی کا خوف ۔خوف کی تنی چادر تلے تلاشِ رزق میں نکلے ''پرندے بہ نوکِ تیر سجتے رہے لیکن کسی منصورِ حقیقت نے صدا بلند نہ کی ، سچ یہی کہ ''انا الحق'' کا نعرۂ مستانہ بلند کرنے والا منصورِ حقیقت کوئی تھا ہی نہیں، سبھی طاغوت کے خوف سے لرزہ براندام۔ کھلی چھٹی تھی لندن میں بیٹھے اُس ''زبان دراز'' کو جس کے ہاتھ سے

کوئی محفوظ تھا نہ زبان سے۔ وہ سمجھتا رہا کہ لوگ اُس کی تعظیم کرتے ہیں لیکن حقیقت اِس کے برعکس کہ اُس کی تعظیم محض اُس کے شَر کے خوف سے تھی۔ الیکٹرانک میڈیا پر اُس کی اجارہ داری، وہ گھنٹوں بلکہ پہروں ''زباں درازی'' کرتا رہا لیکن اُسے تو اِس قولِ علیؓ کا پتہ ہی نہیں تھا کہ ''انسان جب عقل میں پختہ ہو جاتا ہے تو اُس کا کلام مختصر ہو جاتا ہے''۔ اُس کے زہر میں بجھے نشتر چلتے رہے، فضائیں زہرناک ہوتی رہیں لیکن اُس کی طرف بڑھتے ہاتھوں پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ غلط فہمی تھی اُس نرگسیت کے شکار کو کہ وہ پاکستان کا مالک ہے اور عزّووقار کی رفعتوں پر، لیکن آقاﷺ کا تو فرمان ہے ''لوگوں میں سب سے بُرا وہ ہے جس کی تعظیم اُس کے شَر کے خوف سے کی جائے''۔

پھر میرے رَب کی دراز رسی تَن گئی اور فضائے بسیط میں اُمیدوں کے چراغ ٹمٹمانے لگے۔ سیاسی اور عسکری قیادت ایک صفحے پر، ''شریفین'' کا یہ عہد کہ بَس اب بہت ہو چکا۔ سیاسی جماعتیں بھی ساتھ دینے کے لیے آمادہ و تیار لیکن خباثتوں سے متعفن دلوں میں یہ تمسخر کہ ''یہ بارہا میرے آزمائے ہوئے ہیں''۔ شاید اُنہیں ادراک ہی نہیں تھا کہ اب کے موسموں کے تیور کچھ اور ہیں اور فضاؤں میں جاں فزاء اُمیدوں کی سرگوشیاں۔ جب عزمِ صمیم میں گندھے ہاتھ خائنوں، بددیانتوں، کرائے کے قاتلوں، بھتہ خوروں اور دہشت گردوں کے گریبانوں تک پہنچنے لگے تو سبھی چونک اُٹھے۔ ایک نے کہا ''اینٹ سے اینٹ بجادیں گے''۔ دوسرے نے کہا ''جن

افسران نے نائن زیرو میرے گھر پر چھاپہ مارا، وہ بڑے مرد کے بچے ہیں، وہ رینجرز کے افسران تھے، وہ تھے اور انشاء اللہ ''تھے'' ہو جائیں گے''۔ ایک دبئی میں ''پناہ گزین'' ہوا اور دوسرا توء 92 سے ہی لندن میں بیٹھا ہزیان بک رہا ہے۔ جب ایک اینکر نے اُس سے سوال کیا کہ وہ ایسی متنازع زبان کیوں استعمال کرتا ہے تو اُس کا جواب تھا دو، تین سالوں سے ذہنی دباؤ کا شکار ہوں، اسی لیے زبان سے غلط باتیں بھی نکل '' جاتی ہیں لیکن معافی بھی مانگ لیتا ہوں۔ کیا معافی کافی نہیں؟''۔ حقیقت یہی کہ وہ عالم بیخودی میں ہزیان بکتا اور معافی مانگتا رہتا ہے۔ پہلے وہ سیاستدانوں پر گرجتا برستا رہتا تھا لیکن اب افواج پاکستان اور رینجرز براہِ راست اُس کے نشانے پر۔ اِس دریدہ دہنی پر پوری قوم تلملا اٹھی اور حکمرانوں کو بھی ہوش آ گیا۔ اُس نے انتہائی محترم جنرل راحیل شریف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ پاک فوج کو اس میں شامل کالی بھیڑوں سے صاف کریں۔ ڈی جی رینجرز کراچی میجر بلال اکبر کو طنزیہ انداز میں کراچی آپریشن کی بجائے کشمیر میں لڑنے کا مشورہ دیا اور رینجرز کو کہا کہ وہ نوکری چھوڑیں، دو سال بعد اپنی سیاسی جماعت بنائیں اور کرنل طاہر کو جنرل سیکرٹری بنا ڈالیں۔ اُس نے اتنی گھٹیا زبان استعمال کی کہ اخبارات نے اسے چھاپنا بھی گوارا نہ کیا۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ میاں نواز شریف صاحب کی ایماء پر ہو رہا ہے تو بالکل درست کہ یہ سعادت میاں صاحب کے حصے میں ہی آنی چاہیے تھی لیکن شاید وہ نہیں جانتا کہ صرف میاں صاحب ہی نہیں محترم جنرل راحیل شریف بھی

کراچی آپریشن کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے پُر عزم ہیں۔ وہ شاید یہ بھی نہیں جانتا کہ محترم سپہ سالار اور ڈی جی آئی ایس آئی محترم جنرل رضوان اختر ذاتی طور پر "نیشنل ایکشن پلان" کی نگرانی کر رہے ہیں۔ یہ وہی جنرل رضوان اختر ہیں جو کچھ عرصہ پہلے کراچی میں ڈی جی رینجرز ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت اُنھوں نے کہا تھا کہ نیٹو کے اسلحے سے بھرے ہزاروں کنٹینرز کراچی میں غائب ہو جاتے ہیں۔ تب لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ پورٹس اینڈ شپنگ کی وزارت ہمیشہ ایم کیوایم کے وزیر بابر غوری کے پاس کیوں رہتی تھی اور ایم کیوایم اِس وزارت پر سمجھوتا کرنے کو تیار کیوں نہیں ہوتی تھی۔ جنرل رضوان اختر صاحب سے بہتر ایم کیوایم کی اصلیت اور کون جان سکتا ہے، وہ تو ایم کیوایم کی خباثتوں کے چشم دید گواہ ہیں۔ اُنہی دنوں مہاجر ریپبلکن آرمی کا شور بھی اٹھا اور وزیرِ داخلہ چودھری نثار احمد نے یہاں تک کہہ دیا "مہاجر ریپبلکن آرمی کی رپورٹ تو تھی لیکن یہ رپورٹ سپریم کورٹ میں پیش کرنے کے لیے نہیں تھی"۔ اُس وقت بھی حکومت کے پاس "ایکشن" کے لیے بہت کچھ تھا لیکن نامعلوم مصلحتیں آڑے آتی رہیں۔ جب پانی سَر سے اونچا ہونے لگا تو پھر چودھری نثار احمد کو بھی کہنا پڑا "متحدہ کے قائد نے اپنی تقریر میں تہذیب، شائستگی اور شرافت کی تمام حدیں پار کر دیں، فوج اور رینجرز کے بارے میں اخلاق سے گری ہوئی باتیں، باعزت لوگوں کو گالم گلوچ اور دھمکیاں دینا ناقابلِ برداشت ہے۔ موجودہ صورتِ حال کا ذمہ دار پاکستان، افواج یا رینجرز نہیں، اُن کے اپنے کرتوت ہیں۔ اب وقت

آگیا ہے کہ برطانیہ سے اِس سلسلے میں باضابطہ بات کی جائے''۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا''الطاف حسین نے ہمارے سکیورٹی اور دفاعی اداروں کے حوالے سے ایسی بدترین زبان استعمال کی جو کسی بھی صورت قابلِ قبول نہیں۔ یہ زبان ہمارے دشمن بالخصوص بھارت عرصۂ دراز سے ہمارے خلاف استعمال کر رہا ہے۔1971ء کے حوالے سے الطاف حسین نے جو زبان استعمال کی ہے ہو بہو وہی زبان بھارت بھی استعمال کرتا ہے''۔ عرض ہے کہ کیا حکمران نہیں جانتے الطاف حسین تو عشروں سے ایسی زبان ہی استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں؟۔ کیا اُنہوں نے کارکنوں کو گھریلو سامان بیچ کر اسلحہ خریدنے کا حکم نہیں دیا تھا؟۔ کیا حکمران لاعلم تھے کہ الطاف حسین نے بھارت میں جا کر برِصغیر کی تقسیم کو غلط قرار دیا، جناح پور کا منصوبہ بنایا، عسکری ونگز قائم کیے، نو گو ایریاز اور عقوبت خانے بنائے، بھتہ خوری اور ٹارگٹ کلنگ کو عروج دیا، کارکنوں کو ''را'' سے تربیت دلوائی اور بھارت سے پاکستان میں افراتفری پھیلانے کے لیے فنڈز بھی وصول کرتے رہے؟۔ پھر حکمران کس مصلحت کے تحت خاموشی کی ''بُکل'' مارے سوتے رہے؟۔ جو کام عشروں پہلے ہو جانا چاہیے تھا اُس کے لیے اگر آج ڈول ڈالا جا رہا ہے تو پھر اسے منطقی انجام تک پہنچنا بھی چاہیے۔ قوم کی دعائیں اُن کے ساتھ ہیں۔

اُردو ہے جس کا نام

بالآخر محترم جسٹس جواد ایس خواجہ کا ''کھڑاک'' کام دکھا ہی گیا اور حکومتی وکیل نے سپریم کورٹ میں وزیرِ اعظم صاحب کا 6 جولائی کو جاری کردہ حکم نامہ جمع کروادیا جس کے تحت صدر، وزیرِ اعظم، وزراء اور سرکاری نمائندگان اندرون اور بیرونِ ملک اُردو میں خطاب کیا کریں گے۔ حکم نامے میں یہ بھی درج ہے کہ 90 دنوں میں تمام سرکاری و نیم سرکاری ادارے اپنی پالیسیوں اور قوانین کا اُردو ترجمہ کریں گے، عوامی رہنمائی کے سائن بورڈ اُردو میں ہوں گے اور تمام دفتری کارروائی اُردو میں ہی ہوا کرے گی۔ قائدِ اعظم نے تو تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی اُردو کو قومی زبان قرار دے دیا لیکن اِس پر عمل درآمد کسی بھی دَورِ حکومت میں نہ ہو سکا۔ اقوامِ عالم کی تو اپنی قومی زبان، قومی لباس اور قومی شناخت ہوتی ہے لیکن ہم ٹھہرے ''کالے انگریز'' یا پھر یوں بھی کہا جا سکتا ہے ''کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی چال بھی بھول گیا''۔ 68 سال گزر چکے لیکن یہ ''زندہ قوم'' تا حال سیاست سے ثقافت تک ''اُدھار'' پر ہی گزارا کر رہی ہے۔ یوں تو ہم دِلی کے لال قلعے پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کے خبط میں مبتلاء ہیں لیکن ہندوانہ رسوم ورواج کی پابندی کو بھی اپنا فرضِ عین سمجھتے ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ اقوامِ مغرب اور امریکہ نے کبھی پاکستان کی بھلائی نہیں چاہی، اِس موضوع پر لکھتے ہوئے ہم جذباتی بھی بہت ہو جاتے ہیں

اور یہ بھی جانتے ہیں کہ حکمت کی عالی شان کتاب نے یہ فیصلہ ہی کر دیا کہ یہودی اور عیسائی ہمارے کبھی دوست نہیں ہو سکتے لیکن پھر بھی تہذیبِ مغرب ہماری نَس نَس میں سما چکی ہے۔ اقبالؒ نے تو اقوامِ مغرب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

تمہاری تہذیب آپ اپنے خنجر سے خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیاں بنے گا، ناپائیدار ہو گا

لیکن ہمیں تو طبقۂ اشرافیہ کا فرد کہلانے کا شوق ہی اتنا ہے کہ ہماری تہذیب مغربی، لباس مغربی اور زبان بھی مغربی۔ ہم نے انگریزوں سے آزادی کے لیے لازوال قربانیاں دیں لیکن رہے غلام ابنِ غلام۔ انگریزی تہذیب و ثقافت، انگریزی لباس اور انگریزی زبان کو ہی ہم اشرافیہ کی پہچان قرار دیتے ہیں۔ آقا ﷺ کا فرمان ہے "جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ اُنہی میں سے ہے"۔ لیکن ہمارا تو یہ عالم کہ ہمارے سربراہان بھی بیرونی ممالک کے دَوروں کے دوران انگریزی "جھاڑتے" نظر آتے ہیں جبکہ دیگر ممالک کے سربراہان، اپنے ملک میں ہوں یا بیرونی دوروں پر، ہمیشہ اپنی قومی زبان کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ 14 جولائی کو ایران اور چھ بڑی طاقتوں کے مابین جوہری معاہدہ طے پایا تو ایرانی وزیرِ خارجہ نے اپنی قومی زبان (فارسی) میں خطاب کیا، انگریزی میں نہیں۔ اگر برادر اسلامی ملک ایران اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے اپنی قومی زبان کو ترجیح دے سکتا ہے

توہم کیوں نہیں؟۔

وثوق سے کہاجا سکتاہے کہ ’’ نسلِ نَو‘‘ نہیں جانتی ہوگی کہ ہماری قومی زبان دنیامیں بولی جانے والی زبانوں میں تیسری بڑی زبان ہے اور یہ وہ واحد زبان ہے جسے متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی زبان قرار دیا جاتا تھااور انگریز مستشرقین اسے مور تھ ’’یعنی مسلمانوں کی زبان کہتے تھے لیکن ہم نے اسے قومی زبان توقرار دے‘‘ دیامگر وہ توقیر کبھی نہیں بخشی جس کی یہ حقدار تھی ۔ہم نے اِس کے ساتھ ہمیشہ وہی سلوک کیاجو قومی کھیل ہاکی کے ساتھ کر رہے ہیں۔آج ہمارے قومی کھیل کایہ عالم کہ ہماری ٹیم ورلڈکپ کے لیے کوالیفائی کر سکی نہ اولمپک کے لیے۔ قومی ٹیم کے کپتان نے بڑے دُکھ سے کہا ’’نان چنے کھاکر عالمی ٹیموں سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا‘‘۔ کچھ ایساہی سلوک ہمارے بیوروکریٹس اُردوکے ساتھ کر رہے ہیں۔ ذہنی طور پر انگریزوں کے غلام اِس طبقے کی اولادیں یورپ وامریکہ میں پڑھتی ہیں اسی لیے وہ اردو لکھنے ،پڑھنے اور بولنے والوں کو تیسرے درجے کاشہری سمجھتے ہیں البتہ جومُنہ ٹیڑھاکرکے چار حرف انگریزی کے بول لے یہ اُس سے متاثر بھی بہت جلد ہوجاتے ہیں۔ کیایہ قومی المیہ نہیں کہ قوم کی رہنمائی کادعویٰ کرنے والا بلاول زرداری قومی زبان بول سکتاہے نہ لکھ اورپڑھ سکتاہے ۔اُسے کون بتلائے کہ یہ اُسی کے ’’نانا‘‘ کابنایا ہواآئین ہے جس میں واضح طورپر لکھاہے کہ 15 سالوں کے اندراُردو

کو قومی زبان کی حیثیت سے سرکاری زبان اور ذریعۂ تعلیم کے طور پر رائج کردیا جائے گا۔ کہا جاسکتا ہے کہ آئینِ پاکستان کے باقی آرٹیکلز پر کون سا عمل ہوا جو اِس پر ہو جاتا۔ ضیاء الحق مرحوم نے بھی قومی زبان اور قومی لباس کا بڑا پرچار کیا لیکن ہوا ''کچھ'' بھی نہیں۔ وہ بھی بیرونی دوروں پر انگریزی ہی میں تقریریں کرتے رہے اور اقوامِ متحدہ میں بھی اُنھوں نے ہمیشہ انگریزی ہی میں خطاب کیا۔ اب چار عشروں سے زائد گزرنے کے بعد میاں نواز شریف صاحب نے 73ء کے آئین پر عمل درآمد کا ڈول ڈالا ہے، دیکھیں اِس پر عمل درآمد بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ ہمیں وزیرِاعظم صاحب کی نیت پر تو کوئی شک نہیں لیکن اُنھوں نے جو ٹائم فریم دیا ہے وہ ہے بڑا خطرناک۔ وہ 90 دنوں میں پورے پاکستان میں اُردو کی حکمرانی کا خواب دیکھ رہے ہیں لیکن یہ 90 کا ہندسہ تو ہے ہی منحوس''۔ ضیاء الحق مرحوم نے 90 دنوں میں الیکشن کرانے کا وعدہ کیا لیکن وہ نوے دِن 9 سالوں سے بھی آگے بڑھ گئے پھر محترم عمران خاں نے 90 دنوں میں ''نیا پاکستان'' بنانے کا وعدہ کیا لیکن وہ نوے دنوں میں نیا پاکستان تو کیا نئے خیبر پختونخوا کی ایک گلی بھی نہ بنا سکے۔ وہ تبدیلی تو ضرور لائے لیکن خیبر پختونخوا میں نہیں اپنی ذاتی زندگی میں۔ اب محترمہ ریحام خاں بزعمِ خویش ''خاتونِ اوّل'' ہیں اور اُنہیں، خیبر پختونخوا کی حد تک وہی پروٹوکول دیا جا رہا ہے جو کسی بھی ملک کے سربراہ کی

اہلیہ کو دیا جاتا ہے حالانکہ کپتان صاحب وزیرِ اعظم تو کجا، خیبر پختونخوا کے وزیرِ اعلیٰ بھی نہیں۔جب ہم یہ کالم سپردِ قلم کر رہے تھے تو الیکٹرانک میڈیا پر ریحام خاں کی ''جعلی ڈگری'' کا شور مچا ہوا تھا۔ جس برطانوی اخبار نے محترم عمران خاں کی ریحام خاں سے شادی کی خبر سب سے پہلے بریک کی تھی اُسی اخبار کی رپورٹ کے مطابق ریحام خاں کا یہ دعویٰ ہے کہ اُنہوں نے نارتھ لینزے کالج سے ''براڈکاسٹ جرنلزم'' کی ڈگری حاصل کی جبکہ لنزے کالج کے اربابِ اختیار کا دعویٰ ہے کہ وہ تو یہ '' کورس'' کرواتے ہی نہیں اور نہ ہی اُن کے ریکارڈ کے مطابق ریحام خاں کسی بھی کورس میں اُن کی سٹوڈنٹ رہی ہیں۔اخباری رپورٹ اور لنزے کالج کی وضاحت کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ ریحام خاں ''جھوٹ'' نہیں بولتیں ،البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کالج کا نام بھول گئی ہوں۔ خیر یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں جن کے ہاں ''ڈگری ،ڈگری ہوتی ہے ، خواہ اصلی ہو یا جعلی''، ہم تو بات کر رہے تھے 90 دنوں کی جن میں بقول وزیرِ اعظم ہماری پیاری زبان نے ''آ جانا اور چھا جانا ہے''۔ ہمیں 90 دنوں سے اِس لیے بھی ڈر لگتا ہے کہ کراچی میں ایک جگہ نائن زیرو (90) بھی ہے جو اتنی خطرناک کہ اُس کا نام سنتے ہی بڑے بڑوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ خود نائن زیرو کے مالک کا فرمان ہے '' نائن زیرو پر تو لوگ آتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں لیکن جنہوں نے چھاپا مارا وہ بڑے مرد کے بچے تھے، وہ تھے اور ''تھے'' ہو جائیں گے''۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ جنہوں نے چھاپا مارا وہ ''ہیں'' اور رہیں گے البتہ اب انشاء اللہ

تھے ''وہی ہوں گے جنہوں نے روشنیوں کے شہر کو خونم خون کر دیا۔ محترم میاں ''
صاحب بھی 90 دنوں ہی کی بات کر رہے ہیں لیکن کیا یہ وعدہ پورا ہو گا؟۔ اتنی قلیل
مدت میں یہ سب کچھ ہونا بظاہر تو ناممکنات میں سے ہے کیونکہ '' وارث شاہ نہ عادتاں
جاندیاں نے''البتہ یہ بھی درست کہ ''ڈنڈا پیر استاد اے وگڑیاں تگڑیاں دا''۔ اگر میاں
صاحب نے عزمِ صمیم کا ''ڈنڈا'' اٹھا لیا تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بیوروکریسی بھی
سیدھی ہو جائے گی کیونکہ اُردو کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بیوروکریسی ہی تو ہے۔
ہمارے اراکینِ قومی وصوبائی اسمبلی تو اِس راہ کی رکاوٹ ہرگز نہیں۔ وہ بیچارے تو ہماری
طرح سے ہی اِس ''ٹُٹ پَینی'' انگریزی سے بہت تنگ ہیں۔

ہم نہ کہتے تھے۔۔۔۔

ہم نے تو اپنے پچھلے کالم میں ہی کہہ دیا تھا کہ ہماری مستقبل کی ''خاتونِ اوّل'' محترمہ ریحام خاں جھوٹ نہیں بولتیں وہ یقیناً یونیورسٹی کا نام بھول گئی ہوں گی۔ اُسی دِن اُنہوں نے ہمارے لکھے کی یوں تصدیق کی کہ اپنے فیس بُک اکاؤنٹ پر لینزے یونیورسٹی کا نام مٹا کر لکھ دیا کہ اُنہوں نے میڈیا جرنلزم میں ماسٹرز نہیں کیا بلکہ 2006ء میں کسی دوسرے انسٹی ٹیوٹ سے ایک سالہ ڈپلومہ کیا ہے۔ ہم نے جان بوجھ کر اُس انسٹی ٹیوٹ کا نام نہیں لکھا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں ایک دفعہ پھر ''بھلکّڑ'' ریحام خاں یہ کہہ دیں کہ انہوں نے اِس ادارے سے نہیں بلکہ کسی دوسرے ادارے سے ڈپلومہ کیا تھا اور وہ بھی میڈیا جرنلزم میں نہیں بلکہ ''سلائی کڑھائی'' میں۔ دراصل یہ برطانوی اخبار ''ڈیلی میل'' اور ہمارے ''شَرپسند'' الیکٹرانک میڈیا کی مشترکہ سازش اور شرارت ہے جنہوں نے ''ایویں خواہ مخوا'' رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ پتہ نہیں اِس ''مَرجانی'' ڈیلی میل کو دوسروں کے گھروں میں جھانکنے کی عادتِ بَد سے کب چھٹکارا ملے گا۔ بات صرف اتنی سی کہ ''قومی بھابی'' ریحام خاں نے اپنی ''ٹھور ٹھور'' جمانے کے لیے فیس بُک پر اپنی ایجوکیشن کے بارے میں لکھا جس پر ڈیلی میل نے افسانہ گھڑ دیا اور ہمارے ''ویہلے'' الیکٹرانک میڈیا نے کھڑاک پہ کھڑاک۔

شنید ہے کہ نواز لیگئے اب اِس ''ٹوہ''میں ہیں کہ کہیں ریحام خاں کی بی اے کی ڈگری بھی جعلی تو نہیں؟۔ ہمیں یقین کہ لیگیوں کو مُنہ کی کھانی پڑے گی کیونکہ ریحام خاں نے پشاور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور آجکل وہ خیبر پختونخوا کی ''خاتونِ اوّل'' ہیں ۔اِس لیے کسی مائی کے لال کی یہ مجال کہاں کہ وہ اُن سے ٹکرلے سکے۔ سچی بات ہے کہ ریحام خاں کی مقبولیت کو دیکھ کرہم تو یہ اندازے باندھ بیٹھے ہیں کہ ہو سکتا ہے اگلی مرتبہ وہ وزارتِ عظمیٰ کی مسندِ زریں پہ وہی جلوہ فگن ہوں اور انتہائی محترم کپتان صاحب گھر گرہستی'' سنبھالتے نظر آئیں۔ اگر محترمہ بینظیر پاکستان کی وزیرِ اعظم اور جنابِ'' آصف زرداری ''مردِ اوّل'' ہو سکتے ہیں تو پھر محترمہ ریحام خاں وزیرِ اعظم کیوں نہیں؟۔ ہم نے یہ بزرجمہری اندازہ محض ایک واقعے سے لگایا۔ ہوایوں کہ کپتان صاحب جمعے کے روز عیدالفطر بنّوں کے آئی ڈی پیز کے ساتھ منانا چاہتے تھے لیکن بُرا ہو موسم کا جو اُن کی راہ میں سدِّ سکندری بن کر کھڑا ہوگیا۔ پہلے بھی خراب موسم ہی کی بناپر لاہور ایئرپورٹ پر خاں صاحب کا ہیلی کاپٹر اِدھر اُدھر ''پھڑپھڑاتا'' رہا۔اِس لیے محتاط کپتان صاحب نے تو بنّوں جانے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن قومی درد رکھنے والی ریحام خاں کا ارادہ متزلزل نہ ہو سکا۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر پروٹوکول کی 16 گاڑیوں اور 450 سپاہیوں کے جلَو میں بنّوں جا پہنچیں۔ ایسی قومی درد رکھنے والی خاتون کا وزارتِ عظمیٰ کے منصبِ جلیلہ

پر فائز ہونے کا حق تو بنتا ہے دوستو! ۔

محترمہ ریحام خاں کی بے پناہ مقبولیت کو دیکھ کر نواز لیگئے تو جل بھُن کر ''سیخ کباب'' ہی ہو گئے ۔اُنہیں اور کچھ نہ سوجھی تو اُن کے پیٹوں میں یہ مروڑ اُٹھنے لگے کہ آخر پروٹوکول کی 16 گاڑیوں اور 450 سپاہیوں کی کیا ضرورت تھی ۔ عرض ہے کہ یہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کا دَور نہیں کہ مسجدِ نبوی میں جھاڑو دیتے دیتے تھک جائیں تو وہیں چٹائی پر لیٹ کر سو جائیں، کوئی محافظ نہ کوئی دربان۔ یہ اکیسویں صدی ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں اور اوّلین تقاضہ نمود و نمائش۔ اگر سبھی اِس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں تو پھر مستقبل کی وزیرِ اعظم یا کم از کم ''خاتونِ اوّل'' ریحام خاں کیوں نہیں۔ دراصل یہ سب کیا دھرا اِن استحصالی مردوں کا ہے جن کو ''ٹھنڈے پیٹوں'' کسی خاتون کی مقبولیت ہضم ہی نہیں ہوتی ۔یقیناً این جی اوز کی خواتین اِس معاملے پر متحرک ہوتیں لیکن آجکل وہ بیچاری تو خود گرفتارِ بَلا ہیں کیونکہ چودھری نثار احمد نامی ایک '' استحصالی مَرد'' اُن کے پیچھے ''لَٹھ'' لے کر پڑا ہے۔چودھری نثار کو تو رکھیئے ایک طرف ،اب تو چیونٹیوں کے بھی پَر نکل آئے ہیں۔ خواتین سے بغض ، عداوت اور کینہ رکھنے والا شیخ رشید احمد کہتا ہے میں عمران خاں کی ڈگری کی صفائی تو دے سکتا ہوں لیکن ریحام خاں کی ڈگری کی'' نہیں''۔ یہ وہی شیخ رشید ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ ہمارے کپتان صاحب کا ''بغل

بچہ'' بنا پھرتا ہے لیکن جہاں ریحام خاں کا ذکر آیا وہاں وہ بھی طنز کے تیر چلانے سے باز نہ آیا۔ بندہ پوچھے کہ اُس سے صفائی مانگی کس نے ہے اور اُس کی گواہی کی ریحام خاں جیسی ''قدآور'' شخصیت کے سامنے حیثیت ہی کیا ہے؟۔ جب کپتان صاحب نے خود ہی ایک ٹاک شو میں یہ وضاحت کر دی کہ ڈگری ڈگری ہوتی ہے ،اصلی یا نقلی ہونے کا سوال تو تب اُٹھے جب اُس ڈگری کی بنیاد پر کوئی ملازمت حاصل کی جائے ۔اگر ریحام خاں کی ڈگری جعلی ہوتی تو بی بی سی والے ہی اسے نکال دیتے اِس لیے ریحام خاں کی ڈگری'' اصلی'' ہے۔ خاں صاحب کی اِس ''ارسطوانہ'' وضاحت کے بعد تو بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں بچتی ۔ طنز کے تیر چلانے والوں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر بابر اعوان جیسے لوگ کسی ''نامعلوم'' یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرکے تادمِ تحریر ''ڈاکٹر بابر اعوان'' کہلا سکتے ہیں تو پھر ریحام خاں کی ڈگری پر شورِ قیامت کیوں؟۔ شنید ہے کہ بابر اعوان تو پی ایچ ڈی کی 2 ڈگریاں لے کر آئے تھے ،ایک خود رکھ لی اور دوسری رحمٰن ملک صاحب کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کی لیکن ملک صاحب نے یہ ڈگری لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اُن کے پاس توپہلے ہی ایسی ڈھیروں ڈھیر ڈگریاں پڑی تھیں۔ اب پتہ نہیں بابر اعوان صاحب نے یہ ڈگری کِس کو فروخت کی۔ بات شیخ رشید صاحب کی ہو رہی تھی لیکن بات سے بات یوں نکلی کہ کسی اور طرف ہی چلی گئی ۔ہم کہہ رہے تھے کہ شیخ رشید صاحب کے کہے کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ اُنھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ''پرویز مشرف کادَور اِس جمہوری دَور سے بہتر تھا ،وہ کرپٹ نہیں تھے۔

سپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق کے دن گنے جا چکے ،الیکشن کمیشن کا فیصلہ سامنے آتے ہی عمران خاں لال چوک میں کھڑا ہوگا۔ اکتوبر اور نومبر تبدیلی کے لیے اہم مہینے ہیں"۔ عرض ہے کہ بلی کو ہمیشہ چھیچھڑوں کے خواب ہی آتے ہیں۔ پہلے نواز لیگ اور پھر قاف لیگ میں وزارتوں کے مزے لوٹنے والے شیخ رشید کو وہ "سنہرے دِن" بھلائے نہیں بھولتے جب وہ پروٹوکول کے مزے لوٹا کرتے تھے۔ آجکل تو وہ لال حویلی کے "تھڑے" پر بیٹھے سموسے پکوڑے کھاتے پائے جاتے ہیں لیکن سمجھتے وہ اب بھی اپنے آپ کو وزیر شزیر" ہی ہیں۔ جب سے اُن کا وزارتوں سے ناطہ ٹوٹا ہے وہ ایسی ہی پیشین" گوئیاں "پھڑکا" کر "دَل پشوری" کرتے رہتے ہیں۔ ہم تو انہیں یہی مشورہ دیں گے کہ وہ فال نکالنے والا طوطا لے کر کسی فُٹ پاتھ پر بیٹھ رہیں۔ جتنے چَرب زبان وہ ہیں، وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا یہ کاروبار خوب چمکے گا۔ لال حویلی والے نے یہ تو کہہ دیا کہ اکتوبر نومبر اہم مہینے ہیں لیکن نہ تو اُنہوں نے سال بتایا اور نہ ہی یہ کہ اُن کے نزدیک یہ مہینے اہم کیوں ہیں؟۔ ویسے تو ہم بھی پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ اکتوبر نومبر 2017ء انتہائی اہم مہینے ہوں گے کیونکہ اِن دنوں عام انتخابات کی آمد آمد ہوگی اور سیاسی سرگرمیاں عروج پر۔ شیخ صاحب نے آمریت کو جمہوریت پر ترجیح دیتے ہوئے دَورِ مشرف کی تعریف بھی کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ پرویز مشرف کرپٹ نہیں تھا۔ سوال مگر یہ کہ کیا کبھی کسی نے کسی گورنمنٹ ملازم کو کروڑوں ،اربوں میں کھیلتے دیکھا؟۔ اگر نہیں تو پرویز مشرف کے پاس اتنی دولت کہاں سے

آئی؟۔ دراصل لال حویلی والے کو کہیں سے بھنک پڑ گئی کہ نواز لیگ سمیت دیگر سیاسی جماعتوں سے نکلے یا نکالے گئے لوگ پرویز مشرف کی سربراہی میں ''متحدہ مسلم لیگ'' تشکیل دے رہے ہیں۔ شیخ صاحب کو اور کوئی جماعت تو ''قبولنے'' کو تیار نہیں اسی لیے اُنہوں نے سوچا ہوگا کہ شاید آمر پرویز مشرف کی ''کاسہ لیسی'' کرنے سے ''کام'' بن ہی جائے۔ اُدھر کپتان صاحب بھی آجکل شیخ صاحب کو کَم کَم ہی ''لفٹ'' کرواتے ہیں اِس لیے اُنہوں نے کہیں نہ کہیں تو زانوئے تلمذ تہ کرنا ہی ہے۔

فیصلہ آگیا

آج ہم بہت پریشان ہیں اور حیران بھی۔ کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے نہ پینے کو البتہ رونے کو کہ ہمارے ساتھ یہ کیا ''ہتھ'' ہوگیا۔ جمعرات کی شب الیکٹرانک میڈیا پر شور مچا کہ تحقیقاتی کمیشن نے اپنی سر بمہر رپورٹ وزارتِ قانون کو بھجوادی ہے اور حکومتی ذرائع کے مطابق نوازلیگ ''کلین سویپ'' کرچکی ہے لیکن ہم نے ہرگز اعتبار نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ ہم بے پَر کی اُڑانے والے ''شَرپسند'' الیکٹرانک میڈیا کو خوب جانتے ہیں۔ ویسے بھی ہماری بے یقینی کی کئی وجوہات تھیں ۔پہلی یہ کہ بقول ایک سینئر لکھاری ''کپتان جھوٹ نہیں بولتا'' اور کپتان صاحب ''بقلم خود'' تحقیقاتی کمیشن کے 84 دنوں کے دوران ہم جیسے سونامیوں کو 370 سے زائد مرتبہ یہ یقین دلا چکے تھے کہ اُنھوں نے تحقیقاتی کمیشن میں ایسے ناقابلِ تردید ثبوت جمع کروائے ہیں جنہیں دیکھتے ہی تحقیقاتی کمیشن نوازلیگیوں کو ''پھڑکا'' کے رکھ دے گا۔ تحقیقاتی کمیشن کی ہر کارروائی کے بعد وہ یہ اعلان کرتے رہے کہ فیصلہ تحریکِ انصاف کے حق میں ''آوے ای آوے'' کیونکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ناقابلِ تردید ثبوت تحقیقاتی کمیشن میں جمع ہو چکے۔ ویسے ''رولا شولا'' تو نوازلیگ کی ''طوطیاں اور طوطے'' بہت ڈالتے رہے لیکن ہم نے اُن کے کہے کو کبھی ''لفٹ'' نہیں کروائی کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ''سچ'' صرف تحریکِ انصاف کی دوکان سے

ملتا ہے۔ ہماری یقین نہ کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ہم شاہراہِ دستور پر 126 روزہ دھرنا دے کر گینز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میں سنہری حروف میں لکھوا چکے تھے۔ ہم چاہتے تو اُس وقت بھی حکومت پر قبضہ کر لیتے لیکن ہم ٹھہرے "جمہوری لوگ" اِس لیے قبضے کا صرف "ٹریلر" چلانے پر ہی اکتفا کرتے ہوئے پہلے پارلیمنٹ ہاؤس اور پھر ptv پر قبضہ کیا اور پھر خود ہی پیچھے ہٹ گئے۔ ہم وزیرِ اعظم ہاؤس پر بھی بڑی آسانی سے قبضہ کر لیتے لیکن وہاں بھی ایک تو ہماری جمہوریت پسندی آڑے آئی اور دوسرے وزیرِ اعظم ہاؤس کے سامنے قطار اندر قطار کھڑے فوجی جوان۔ اُن دنوں چونکہ ہمیں افواجِ پاکستان سے بہت پیار تھا اور ہم کسی کی "انگلی" کھڑی ہونے کے منتظر بھی تھے اِس لیے قبضہ کیے بغیر ہی پلٹ آئے۔ جب ہماری کاوشوں سے چینی صدر کا دَورہ ملتوی ہوا تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میاں صاحب حب الوطنی کا ثبوت دیتے ہوئے وزیرِ اعظم ہاؤس اُس کے "اصلی حقدار" کے سپرد کر کے خود اللہ اللہ کرنے سعودی عرب چلے جاتے لیکن اُنہوں نے تو اُس "جعلی پارلیمنٹ" میں پناہ لے لی جہاں سارے جعلی اراکینِ پارلیمنٹ "اکٹھ" کیے بیٹھے تھے۔ اصلی اراکین تو صرف وہی تھے جنہوں نے جعلی پارلیمنٹ میں جانے کی بجائے مستعفی ہونا پسند کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب کئی مہینے گزرنے کے باوجود ہمارے استعفے منظور نہ ہوئے تو ہمیں مجبوراً پارلیمنٹ میں واپس جانا پڑا جہاں خواجہ آصف سیالکوٹی نے "کچھ شرم ہوتی ہے، کچھ حیا ہوتی ہے" جیسے "دِلپذیر" جملوں سے ہمارا استقبال کیا۔ کسر تو خیر کسی بھی سیاسی

جماعت نے نہیں چھوڑی لیکن خواجہ سیالکوٹی کے استقبالی جملے ''بلے بلے''۔
بے یقینی کی تیسری بڑی وجہ یہ کہ ہم نے نیاپاکستان بنانے کی خاطر جلسے ،جلوسوں اور دھرنوں میں ایسااندار اختیارکیاجسے بے تحاشہ پذیرائی ملی۔جونہی ہمارا پروگرام''شروع ہوتا نسلِ نَو خود بخود کھنچی چلی آتی ۔یہ بجاکہ ہمیں اِس اندازِ سیاست'' کواپناتے ہوئے کروڑوں اربوں خرچ کرنے پڑے اور صرف ڈی جے بٹ نے ہی ہم سے کئی کروڑ ''ہتھیا'' لیے لیکن کچھ پانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کھوناہی پڑتاہے۔حاسدین الزام دھرتے رہے کہ سونا میے اور سونامیاں تو میوزیکل کنسرٹ دیکھنے آتے ہیں نیاپاکستان بنانے نہیں لیکن ہم نے کبھی پلٹ کرجواب دینابھی گوارانہیں کیاکہ، حاسد حسد کی آگ میں خود ہی جلاکرے''۔ ہم نے نیاپاکستان بنانے کی خاطر کئی جانوں'' کی قربانی بھی دی لیکن یہ سوچ کرصبر شکر کرلیاکہ ''خونِ صدہزار انجم سے ہوتی ہے سحرپیدا''۔انہی اور دیگر کئی وجوہات کی بناپر ہمیں یقین تھاکہ فیصلہ ہمارے حق میں ہی آئے گالیکن جمعے کی صبح پتہ چلاکہ '' ہونی'' توہوچکی اور''ہونی'' کوتو ہوکر ہی رہناہوتاہے۔۔۔۔ تحقیقاتی کمیشن کا فیصلہ آگیاکہ 2013ء کے انتخابات صاف اور شفاف تھے ،دھاندلی کاشائبہ تک نہ تھااور منظم دھاندلی کاتو سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔ تحقیقاتی کمیشن نے الیکشن کمیشن کو''رگڑا'' بھی دیااور ہماری اشک شوئی کی خاطر اپنی

رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا کہ تحریکِ انصاف کا تحقیقاتی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا لیکن ہمارے دِلی درد کو چیف جسٹس محترم ناصر الملک سمجھ سکے نہ جسٹس امیر ہانی مسلم اور نہ ہی جسٹس اعجاز افضل۔ ہم تو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اب وزیرِاعظم ہاؤس سونامیوں کا ہو گا لیکن ہمارے خواب چکناچور ہو گئے اسی لیے اب سارے سونامیے مِل کر تواتر کے ساتھ یہ گا رہے ہیں

دِل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے
ہم بھری دنیا میں تنہا رہ گئے

تنہا تو خیر ہم پہلے بھی تھے کہ پاکستان کی ساری ''دو نمبر'' سیاسی جماعتوں سے ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں تھا لیکن اب تو یہ تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے کیونکہ اب ''دھوم دھڑکے'' والا ڈی جے بَٹ بھی پرایا ہو گیا، ٹینٹ سروس والوں نے بھی بائیکاٹ کر رکھا ہے اور دھرنے کے دنوں کے لاکھوں روپے کے بِل پکڑے جلوس نکال رہے ہیں۔ ہمارے ''لوٹے'' بھی سب کھوٹے نکلے۔ یہ سب کیا دھرا انہی لوٹوں کا ہے جنھوں نے ایویں خواہ مخوا'' ہمارے کپتان صاحب کو گمراہ کرکے تحقیقاتی کمیشن بنوایا جس نے بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اگر بات تحقیقاتی کمیشن تک نہ پہنچتی تو ہم آج بھی منظم دھاندلی کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہوتے اور نواز لیگ آج بھی ''نکرے'' لگی ہوتی لیکن اِس تحقیقاتی کمیشن نے تو ہمارے پلّے

کگھ'' نہیں چھوڑا۔ اب ہمارے کپتان صاحب کے پاس کہنے کو کچھ باقی نہیں بچا۔ نہ '' پائے رفتن ،نہ جائے ماندن کے مصداق اگر تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کو تسلیم نہیں کرتے تو نہ صرف توہینِ عدالت کا خطرہ بلکہ ساری سیاسی جماعتیں اور میڈیا ہمارے پیچھے لَٹھ لے کر دَوڑ پڑے گا اور تسلیم کرنے کی صورت میں میدانِ سیاست ہمارے لیے اُتنا ہی دور ہو جائے گا جتنا مریخ۔ اب تحریکِ انصاف کی کور کمیٹی سَر جوڑے بیٹھی ہے، وکیلوں سے مشورے ہو رہے ہیں۔ حیرت مگر یہ کہ مشورے بھی (جعلی ڈاکٹر) بابر اعوان سے لیے جارہے ہیں۔ کیا تحریکِ انصاف میں اتنا ہی قحط الرجال ہے کہ اُسے کوئی ڈھنگ کا وکیل بھی میسر نہیں ؟۔ ہمارے بھولے بھالے کپتان صاحب نے ''نامعقول'' مشیروں کے مشورے پر حکومت پر دباؤ ڈال کر تحقیقاتی کمیشن پہلے بنوایا اور دھاندلی کے ناقابلِ تردید ثبوت اکٹھے کرنے کی باری بعد میں آئی۔ اب تحریکِ انصاف کے بزرجمہروں نے سارا الزام شیخ رشید پر دھر دیا۔ سوال مگر یہ کہ شیخ رشید کا تو تحریکِ انصاف سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ اُسے تو جب کہیں جائے اماں نہ ملی تو کپتان صاحب نے گلے لگا لیا۔ جب وہ خاں صاحب کو غلط مشورے دے رہے تھے تو یہ بزرجمہر کہاں سوئے ہوئے تھے ؟۔ ویسے تحریکِ انصاف کے شبلی فراز ایک ٹاک شو میں کہہ رہے تھے کہ منظم دھاندلی تو ہوئی اِس لیے قوم سے معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ ہم تحقیقاتی کمیشن کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہیں۔ اُنکے اِس بیان سے ہمیں کچھ حوصلہ ملا لیکن ہمارے چودھری سرور نے تو کمال ہی کر دیا۔ اُن کا یہ بیان تو سونے کے پانی سے

لکھے جانے کے قابل ہے کہ عدالتوں میں 90 فیصد مجرم عدم ثبوت کی بناپر بری ہو جاتے ہیں۔ اب ہم بھی نوازلیگیوں کو کہہ سکتے ہیں کہ ہم کل بھی سچے تھے اور آج بھی سچے ہیں البتہ ہم اپنا کیس صحیح طریقے سے پیش نہیں کر سکے۔

کرپشن کا ناسور

کچھ لوگ بے پَر کی اُڑا کر ''چسکے'' لینے کی عادتِ بد میں مبتلاء ہوتے ہیں۔ایسا کرتے ہوئے وہ یہ تک بھی نہیں سوچتے کہ جس شخص کو وہ طنز کے تیروں سے گھائل کر رہے ہیں وہ مسندِ احترام کے کس درجے پر فائز ہے ۔اِن لوگوں نے توپروفیسر ڈاکٹر علامہ طاہر القادری کو بھی نہیں چھوڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ علامہ صاحب ڈی چوک اسلام آباد میں دیا جانے والا دھرنا ایک ''ڈیل ''کے تحت ختم کرکے ''پھُر'' ہوگئے۔ایسا پراپیگنڈا کرنے والے ہمارے مُرشد پر انتہائی لغو اور بے بنیاد الزام لگا رہے ہیں۔اُنہوں نے دھرنا کسی ڈیل کے تحت نہیں بلکہ خرابیٔ صحت کی بنا پر چھوڑا تھا۔ سبھی جانتے ہیں کہ علامہ صاحب دھرنے کے دنوں میں روزانہ 36 مختلف اقسام کی ادویات استعمال کیا کرتے تھے اور یہ تمام ادویات بیرونی ممالک سے درآمد کی جاتی تھیں کیونکہ اُنہیں پاکستان میں بنی ادویات پر سرے سے اعتبار ہی نہیں۔جب ''سازشی'' نوازلیگ نے ''اَندرواَندری'' سازش کرکے اُن کی ''درآمدی ادویات'' پرپابندی لگائی تو مولانا بیمار پَڑ گئے۔جس طرح دھرنوں کے دنوں میں ہمارے پختون بھائی ''نسوار''کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے اسی طرح ہمارے علامہ صاحب ادویات کی تلاش میں سَر گرداں۔ چاروناچار اُنہیں دھرنا چھوڑکر ''اپنے دیس''سدھارنا پڑا جسے سازشیوں نے ''ایویں خواہ مخوا''ڈیل کا نام دے کر علامہ صاحب کو بدنام

کرنے کی ناپاک سازش شروع کردی ۔یہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ علامہ صاحب پاکستان جیسے چھوٹے موٹے غریب ملکوں کے سربراہان سے ڈیل تو کجا، بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے ۔وہ توہمیشہ امریکہ ،کینیڈا جیسے ملکوں سے ڈیل کرکے ہی پاکستان تشریف لاتے ہیں۔ پھر بھلا اُنہیں پاکستانی حکمرانوں سے ڈیل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے اُنہیں یہ غریب ملک دے بھی کیا سکتا ہے۔اُن کے تو ایک اشارۂ اَبرو پر بیرونی ممالک اُن کے قدموں میں ڈالروں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں ۔کچھ شَرپسند کہتے ہیں کہ علامہ کو ''فارن فنڈنگ'' انارکی پھیلانے کے لیے کی جاتی ہے جو سرے سے غلط ہے ۔یہ تواُن کی علمی وجاہت کا ثمر ہے کہ بیرونی قوتیں اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے بیٹھی ہیں

۔ مولانا اپنی تحریروں اور تقریروں میں متعدد بار غیر ملکی سربراہان سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کر چکے ہیں ۔علامہ صاحب نے میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے فرمایا''صحت کا ایشو آیا تھامگر علاج کے بعد میں انقلاب کے لیے مکمل تیار ہوں۔ ڈِیل کی تہمت کاحکومتی پراپیگنڈا اپنی موت آپ مرگیا۔سانحہ ماڈل ٹاؤن کے قاتل زیادہ عرصہ اسلام آباد اور لاہور کے ایوانوں پر مسلط نہیں رہ سکیں گے''۔

علامہ صاحب دراصل بلدیاتی انتخابات کے ذریعے ملک میں انقلاب لانے کے جذبے کے ساتھ پاکستان تشریف لائے لیکن حکمرانوں نے مولانا کی نیت بھانپتے ہوئے بلدیاتی انتخابات پر ہی ''پھڈا'' ڈال دیا۔ الیکشن کمیشن نے انتخابی شیڈول

مؤخر کرتے ہوئے بلدیاتی انتخابات کے التوا کے لیے سپریم کورٹ سے رجوع کرلیا۔ الیکشن کمیشن کا مؤقف یہ ہے کہ پنجاب حکومت نے سیلاب متاثرین کی بحالی اور ریلیف میں مصروفیات کے باعث ڈیوٹیوں کے لیے سرکاری ملازمین کی خدمات الیکشن کمیشن کے سپرد کرنے سے معذرت کرلی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ 55 ہزار سے زائد نشستوں پر انتخاب میں حصہ لینے والے 2 لاکھ سے زائد اُمیدوار مایوسیوں کے بحرِ عمیق میں غوطے کھارہے ہیں کیونکہ 2013ء سے اب تک بار بار اُن کے ساتھ یہی ''ہتھ'' ہورہا ہے۔ اُن کے 9 کروڑ روپے سیکیورٹی کی مد میں قومی خزانے میں جمع ہیں جن کی واپسی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ وہ بیچارے ''نیب'' میں بھی نہیں جا سکتے کیونکہ وہاں ''پلی بارگین'' کے تحت 9 کروڑ میں سے صرف 9 سو روپے ملنے کی ہی توقع ہے۔ نیب تو ہم نے بنایا ہی اِس لیے ہے کہ اگر کرپشن کے مگرمچھوں کو کہیں اور پناہ نہ ملے تو نیب حاضر ہے۔ مگرمچھ اربوں، کھربوں کی کرپشن کرتے ہیں اور لاکھوں، کروڑوں دے کر پاک صاف اور مزید کرپشن کے لیے پھر تیار۔ نیب نے اپنے قیام سے لے کر اب تک سالوں میں پلی بارگین کے تحت صرف 18 فیصد رقم وصول کی اور وہ بھی ایسے کہ 14 کئی بڑے مگرمچھ جھانسا دینے میں کامیاب ہوگئے۔ 150 مگرمچھوں نے پلی بارگین کے تحت رہائی حاصل کی اور نیب کو کئی سو ارب روپے کے بدلے میں صرف 2 ارب روپے وصول ہوئے، باقی سب ''پھُر'' ہوگئے۔ سپریم کورٹ میں جمع کرائی گئی رپورٹ کے مطابق 262 ارب روپے کی رقم پر 15 ارب روپے کی پلی بارگین ہوئی لیکن وصول ہوئے صرف 2 ارب روپے۔ کئی کھرب

روپے ہڑپ کر جانے والے 285 فراڈیوں نے نیب کو چند ارب روپے دینے کا وعدہ کرکے رہائی حاصل کی لیکن فراڈ ثابت ہونے کے باوجود وہ بھی نیب کو جھانسا دینے میں کامیاب رہے۔اب یہ حقیقت تو کھُل کر سامنے آچکی ہے کہ آمر پرویز مشرف نے بااثر افراد کو بلیک میل کرکے اپنے ساتھ ملانے کے لیے یہ ادارہ قائم کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں بااثر افراد کو بچانے کے لیے نیب پلی بارگین کا سہارا لیتا رہا اور کرپٹ ترین افراد سے اونٹ کے مُنہ میں زیرے کے برابر رقم لے کر اُنہیں پاکیزگی کے ایسے سرٹیفیکیٹ جاری کرتا رہا کہ ''دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں''۔

پرویز مشرف صاحب نے نیب کی صورت میں جو ''گند'' ڈالا، اب اُسی گند کو عزمِ صمیم کے مالک جنرل راحیل شریف صاف کرنے میں مگن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کی تمامتر ہمدردیاں اور دعائیں اُن کے ساتھ ہیں۔وہ اتنے انتھک ہیں کہ صبح شمالی وزیرستان کے اگلے مورچوں پر ہوتے ہیں تو شام کو کوئٹہ۔ سیاسی قیادت نے پاکستان کو اقتصادی بلندیوں پر لے جانے کے لیے چین کے ساتھ گوادر سے خنجراب تک اقتصادی راہداری بنانے کا معاہدہ کیا جس پر ہندو لالے کے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگے۔اُس نے نہ صرف سرحدوں پر اشتعال انگیز کارروائیاں شروع کر دیں بلکہ ہر فورم پر اقتصادی راہداری کے خلاف واویلا بھی شروع کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر جگہ اسے ''شٹ اَپ'' کال کا سامنا ہی کرنا پڑا۔ ہمارے سپہ سالار نے

ہندوالے تک یہ دوٹوک پیغام پہنچادیا کہ اقتصادی راہداری ہر صورت میں بنے گی خواہ اِس کے لیے فوج کو کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ اُنھوں نے فرمایا ’’فوج ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہے‘‘۔ حیران کُن ، انتہائی حیران کُن کہ محض چندماہ میں اقتصادی راہداری کے 870 کلومیٹر میں سے پاک آرمی نے 502 کلومیٹر سڑک بنا بھی ڈالی۔ ۔۔۔ کراچی آپریشن کسی بھی صورت میں ممکن ہی نہیں تھا اگر اِس کے پیچھے وزیرِاعظم صاحب کی شدید ترین خواہش اور فوج کی طاقت نہ ہوتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ’’شریفین‘‘ کا ایک صفحے پر ہونا ہی دراصل قوم کی خوش بختی کی علامت ہے۔ بھلا کون یہ سوچ سکتا تھا کہ کراچی ایک دفعہ پھر روشنیوں کی طرف اپنا سفر شروع کر سکے گا۔ کسے خیال تھا کہ کراچی سے ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ خوری ختم ہو سکے گی ۔ کون جانتا تھا کہ نوگوایریاز اور عقوبت خانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیا نائن زیرو پر متواتر چھاپوں کا کوئی تصور بھی کر سکتا تھا؟۔ کیا کسی کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ مختلف اداروں میں بیٹھے کرپشن کے مگرمچھوں کے گریبانوں تک رینجرز کے ہاتھ پہنچ پائیں گے ؟۔ اگر نہیں تو پھر یقین جان لیں کہ یہ سب کچھ ہوا، تاحال ہو رہا ہے اور ’’شریفین‘‘ کے عزم کے مطابق اُس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک ہر کس و ناکس کو اپنی آغوشِ محبت میں سمیٹ لینے والا کراچی ایک دفعہ پھر روشنیوں کے شہر میں ڈھل نہیں جاتا۔

وعدے، دعوے اور نعرے

حکمران آمر ہوں یا جمہوری آمر، سبھی وعدوں اور دعووں سے ہی کام نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر سیاسی جماعتوں کے وعدوں اور دعووں کو مدِ نظر رکھا جائے تو اِس وقت تک پاکستان کو ترقی میں امریکہ اور یورپ کے ہم پلہ ہونا چاہیے لیکن ایسا کچھ ہوا نہ ہونے کی توقع کیونکہ ہم ترقی تو ضرور کر رہے ہیں لیکن ترقیَ معکوس۔ ہم اپنے اپنے بتوں کی پوجا میں مگن یہ قوم نواز لیگ کو ''میڈان پاکستان'' اور پیپلز پارٹی کو ''چاروں صوبوں کی زنجیر'' سمجھتی ہے۔ اب پجاریوں کی پوجا میں تحریکِ انصاف بھی شامل ہو گئی کہ اُس کے بغیر ''نئے پاکستان'' کا تصور بھی ناممکن۔ یہ تو طے ہے کہ قوم نے نواز لیگ کو اپنی حالت سدھارنے کا مینڈیٹ دیا تھا۔ عقلمندی کا تقاضہ تو یہ کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلایا جائے لیکن سڑکوں، شاہراہوں کے شوقین میاں برادران بجٹ کا غالب حصّہ صحت، تعلیم اور مہنگائی کے عفریت پر قابو پانے کی بجائے اپنے شوق کی تکمیل پر صرف کر رہے ہیں۔ یہ میٹرو شیٹرو تو بعد میں بھی بن جاتی پہلے خادمِ اعلیٰ قوم سے کیا گیا لوڈشیڈنگ کا وعدہ تو پورا کر لیتے۔ اُنھوں نے تو چھ ماہ میں لوڈشیڈنگ کے خاتمے کا دعویٰ کیا، اب تو دو سال سے زائد عرصہ گزر چکا لیکن لوڈشیڈنگ کے خاتمے کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ خُدا کرے کہ اب

حکمرانوں کے اگلے دعوے اور وعدے کے مطابق 2017ء تک ہی لوڈشیڈنگ پر قابو پایا جاسکے لیکن ہمیں بہر حال کوئی امید نظر نہیں آتی۔ حکمرانوں کو یاد رکھنا ہوگا کہ یہی لوڈشیڈنگ پیپلزپارٹی کی جڑوں میں بیٹھی اور وہ سکڑ سمٹ کر سندھ تک محدود ہو گئی۔
پیپلزپارٹی میں کھلی کرپشن کا عنصر اُس وقت داخل ہو جب آصف زرداری صاحب نے اِس میں قدم رکھا۔ وہ بینظیر صاحبہ کے پہلے دَورِ حکومت میں ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' اور دوسرے دَور میں ترقی کرتے کرتے ''مسٹر سنٹ پرسنٹ'' بن گئے۔ بینظیر کی شہادت کے بعد تو نہ صرف پیپلزپارٹی کے بلاشرکتِ غیرے مالک بن بیٹھے بلکہ چشمِ فلک نے یہ عجب نظارہ بھی دیکھا کہ جسے جیل کی کال کوٹھڑی میں ہونا چاہیے تھا، وہ ایوانِ صدر پر قابض ہوگیا۔ آجکل محترم پیپلزپارٹی کی قیادت نوجوان بلاول زرداری کو سونپ کر خود دبئی جابسے ہیں۔ زرداری صاحب کا دیگر سیاسی جماعتوں کو بہر حال ایک فائدہ تو ضرور ہوا کہ جس جماعت کو ضیاء الحق مرحوم اپنی شدید ترین خواہش کے باوجود ختم نہ کر سکے، اُس کے خاتمے کی زرداری صاحب نے بنیاد رکھ دی۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ نوجوان بلاول زرداری پیپلزپارٹی کی گرتی ہوئی ساکھ کو بچا نہ پائیں گے۔
محترم عمران خاں صاحب کی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ پر بہت سبکی ہوئی۔ جن کی خاں صاحب کے سامنے دَم مارنے کی مجال نہ تھی، وہ بھی اِس ہزیمت پر چلا اٹھے۔
جہانگیر ترین اور شیخ رشید احمد پر سی ای سی میں کھل کر تنقید ہوئی اور جسٹس وجیہ

الدین کے اِس فیصلے کی بازگشت بھی سنائی دی کہ ''جہانگیر ترین کی نہ صرف رکنیت ختم کی جاتی ہے بلکہ وہ کبھی بھی دوبارہ تحریکِ انصاف کے رکن نہیں بن سکیں گے''۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اِس ہزیمت پر خاں صاحب اپنا محاسبہ کرکے اپنی لغزشوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے لیکن وہاں تو ''وہی ہے چال بے ڈھنگی، جو پہلے تھی سو اب بھی ہی''۔ طوہاًوکرہاً تحقیقاتی کمیشن کا فیصلہ قبول کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ فیصلہ ادھورا ہے اور وہ اِس سے مطمئن نہیں۔ اب محترم فرماتے ہیں ''جوڈیشل کمیشن کا فیصلہ ہماری جیت ہے''۔ اگر جیت اسی کا نام ہے تو پھر ''ہار'' کسے کہتے ہیں؟۔ شاید خاں صاحب کے ارسطوانہ ذہن میں یہ خیال آیا ہو کہ چونکہ اکابرینِ نوازلیگ تواتر سے کہہ رہے ہیں کہ تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کسی کی ہار ہے نہ جیت، اُس لیے یہ کہنا ضروری ٹھہرا کہ یہ تو دراصل ہماری جیت ہے''۔ اُنھوں نے ایک مقامی ہوٹل میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے'' ہوئے یہ عندیہ دے دیا کہ وہ تصادم کی راہ سے پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ اُنھوں نے فرمایا ''نوازشریف کی جگہ میں ہوتا اور پتہ چلتا کہ کوئی جنرل حکومت کے خلاف سازش کر رہا ہے تو کیا میں جنرل کو چھوڑ دیتا؟ میں انکوائری کرواتا، حکومت انکوائری کیوں نہیں کروا رہی؟ حکومت تحقیقات کروائے اور جو ملوث ہو اسے پکڑے''۔ خاں صاحب خوب جانتے ہیں کہ اُنھیں اِس دلدل میں دھکا کس نے دیا جس سے نکلنے کی وہ بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ وہ تو تواتر سے سونامیوں کو امپائر کی انگلی کھڑی ہونے کی نوید سناتے رہے۔ کیا وہ قوم کو یہ بتانا پسند

کریں گے کہ وہ ''امپائر'' کون ہے؟۔ اب تو یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکا کہ خاں صاحب سابق ڈی جی آئی ایس آئی جنرل احمد شجاع پاشا کی انگلیوں پر ناچتے رہے۔ جنرل ظہیرالاسلام تو اِس گیم میں اُس وقت شامل ہوئے جب جیو گروپ نے حامد میر پر قاتلانہ حملے کا الزام براہِ راست جنرل ظہیرالاسلام پر لگایا اور نوازلیگی بزرجمہر وزیرِ اطلاعات پرویز رشید نے کہا ''ہم قلم والوں کے ساتھ ہیں، غلیل والوں کے ساتھ نہیں''۔ اگر خاں صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ اِس قسم کے بیانات سے اُن کی ہزیمت کا اثر زائل ہو جائے گا تو یہ اُن کی بھول ہے۔ ویسے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر خاں صاحب نواز شریف کی جگہ ہوتے تو انکوائری کروانا تو دور کی بات، وہ ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتے۔ خاں صاحب نے فرمایا ''حکومت نے ہمیں ڈی سیٹ کر بھی دیا تو ہم دوبارہ الیکشن لڑکے اسمبلیوں میں آئیں گے لیکن حکومت جلدی فیصلہ کرے''۔ ایک تو ہمارے خاں صاحب کو جلدی ہی بہت ہوتی ہے لیکن اب اِس جلدی میں مولانا فضل الرحمٰن بھی شامل ہو گئے ہیں، دونوں کی فطرت ایک اور دونوں ہی حصولِ اقتدار کے شوقین۔

مولانا صاحب کا خیال ہے کہ اگر تحریکِ انصاف کے اراکینِ قومی اسمبلی ڈی سیٹ ہو گئے تو تحریکِ انصاف کی 28 میں سے 27 سیٹیں تو اُن کی پکی۔ وہ اسی دِل خوش کُن خیال کے مزے لوٹ رہے ہیں کہ اگر انہیں 27 سیٹیں مِل گئیں تو پھر پارلیمنٹ میں اُن کا پارلیمانی گروپ سب سے بڑا اور مضبوط ہو جائے گا۔ اگر قائدِ حزبِ اختلاف کا منصب نہ بھی مِلا تو پھر بھی کم از کم نوازلیگ کو بلیک میل کرنے میں تو آسانی

رہے گی لیکن مولانا صاحب خیالِ خام کے اسیر ہیں۔اگر مولانا صاحب کی خواہش پوری کر بھی دی جائے تو پھر بھی اُن کے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا کیونکہ ڈی سیٹ ہونے کی صورت میں ہمدردی کا تمامتر ووٹ تحریکِ انصاف کے کھاتے میں چلا جائے گا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ طاقت کے ساتھ ابھر کر سامنے آئے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ نواز لیگ نے تحریکِ انصاف کے اراکین کو ڈی سیٹ نہ کرنے کا فیصلہ کرکے انتہائی مستحسن فیصلہ کیا ہے۔اگر اس موقعے پر اُنہیں ڈی سیٹ کر دیا جائے تو اُن کے حق میں ہمدردی کی ایک ایسی لہر اُٹھے گی جو اُن کے تنِ مردہ میں جان ڈال دے گی۔خاں صاحب کی تو یقیناً یہ خواہش اور کوشش ہو گی کہ اُنہیں ڈی سیٹ کر دیا جائے تاکہ وہ ایک دفعہ پھر سونامیوں کی ہمدردیاں سمیٹ سکیں اور تحقیقاتی کمیشن کی اڑتی دھول بھی بیٹھ جائے۔اسی لیے وہ ایک دفعہ پھر نواز لیگ کے خلاف "اَوکھے اَوکھے" بیان دے کر اُسے بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ نواز لیگ ایسا کوئی قدم ہرگز نہیں اٹھائے گی جس سے افراتفری بھی پیدا ہو اور نواز لیگ کے ہاتھ بھی کچھ نہ آئے۔ خاں صاحب نے یہ اعلان تو کر دیا کہ اب وہ اپنی تمامتر توجہ خیبر پختونخوا کو ماڈل صوبہ بنانے پر صرف کریں گے اور اُن کی جماعت پارلیمنٹ میں اپنا بھرپور پارلیمانی کردار ادا کرے گی لیکن

تیرے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

ہم سب ایک ہیں

بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ پوری قوم تمامتر خامیوں، خرابیوں اور کوتاہیوں کے باوجود حب الوطنی کے جذبے سے ہمیشہ سرشار رہتی ہے۔ یہ جذبہ، یہ جنوں قومی دنوں کے مواقعے پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ تب کوئی سندھی ہوتا ہے نہ بلوچی، پنجابی ہوتا ہے نہ پختون، سب پاکستانی، صرف پاکستانی۔ دودِن پہلے کراچی سے خیبر تک پوری قوم نے 69واں یومِ آزادی اُسی جوش وجذبے سے منایا جو اِس کا خاصہ ہے۔ اِس بار تو یومِ آزادی کچھ زیادہ ہی "کھُلے ڈُلے" انداز میں منایا گیا۔ سبب یہ کہ محترم جنرل راحیل شریف کی زیرِ قیادت پاک فوج کے جرّی جوانوں نے دہشت گردی کے ناسور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ زیادہ تر واصلِ جہنم ہوئے اور بچے کھچے چوہوں کی طرح اپنے بِلوں میں گھُس گئے۔ بلوچستان میں یومِ آزادی پر 400 علیحدگی پسندوں نے ہتھیار ڈال کر قومی پرچم تھام لیے۔ کوئٹہ میں ریکارڈ قومی پرچم فروخت ہوئے اور کراچی میں تو یومِ آزادی کی تقریبات کی شان ہی نرالی تھی۔ 13 اور 14 اگست کی درمیانی شب جونہی 12 بجے، پورا کراچی سڑکوں پر امڈ آیا اور روشنیوں کا شہر آتش بازی سے جگمگا اُٹھا۔ 14 اگست کو دو لاکھ سے زائد افراد نے مزارِ قائد پر حاضری دی۔ اب کی بار اہلِ کراچی نے جشنِ آزادی منانے کے لیے خریداری کا 40 سالہ ریکارڈ توڑتے ہوئے 5 ارب روپے سے زائد کی خریداری کی۔ یہ اہلِ کراچی کا اہل

وطن کو ہر سُو یہ پیغام تھا کہ ’’ہم سب ایک ہیں‘‘۔یہی حال لاہوریوں کا بھی تھا۔لاہوریے تو ویسے بھی ہلّے گُلّے کے شوقین ہوتے ہیں۔منچلے 13 اگست کی شب کو گھروں سے نکلے اور 15 اگست کی صبح لوٹے۔پاکستان کے تمام صوبوں کے تمام شہروں میں یہی عالم رہا۔ہر جگہ بچے،بوڑھے،جوان اور عورتیں ہاتھوں میں قومی پرچم تھامے آزادی کے گیت گاتے رہے۔

اُدھر بھارت کی سخت ترین پابندیوں اور ظلم ستم کے باوجود مقبوضہ کشمیر میں بھی جشنِ آزادی بھرپور طریقے سے منایا گیا۔حریت رہنما آسیہ اندرابی نے پاکستانی پرچم لہراتے ہوئے کہا ’’ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان ہمارا ہے‘‘۔اسی تقریب میں پاکستان کے ملّی نغمے بھی گائے گئے۔9 اگست کو محترم الطاف حسن قریشی کی PINA اور UMT کے تعاون سے ’’مسئلۂ کشمیر علاقائی امن و سلامتی کے لیے چیلنج‘‘ کے عنوان کے تحت ایک PC میں سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس میں محترم سجاد میر نے بھارتی صحافی کلدیپ نائر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اُس نے اپنے آرٹیکل میں لکھا ’’کشمیر اتنا بدل گیا ہے کہ اب پہچانا ہی نہیں جاتا۔جب میں نے گزشتہ بار سری نگر کا وزٹ کیا تھا تو محسوس ہوا کہ وادی نمایاں طور پر بھارت دشمن بن چکی ہے۔سری نگر کے اندرونی علاقوں میں سبز پرچم لہراتے نظر آتے ہیں۔اِس کا مطلب ہے کہ کشمیریوں کی بیگانگی اب برگشتگی میں تبدیل ہو چکی ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں سماجی تعلقات بھی بڑی حد تک منقطع ہو چکے ہیں‘‘۔

کلدیپ

نائرکے اِس آرٹیکل کی تصدیق مقبوضہ کشمیر کے باسیوں نے پاکستان کا جشنِ آزادی بھرپور طریقے سے منا کر کردی ۔اِس سیمینار میں گلگت بلتستان کے وزیرِ اعلیٰ حافظ حفیظ الرحمٰن، ممتاز سفارت کار مسعود خان ، عطاء الحق قاسمی، ایس ایم ظفر، عطاء الرحمٰن سردار آصف احمد علی، رؤف طاہر ،رشید ترابی، حافظ حسین احمد اور سردار ابراہیم کے، صاحبزادے خالد ابراہیم کے علاوہ کئی اہم شخصیات نے بھی شرکت کی۔ ابتدائی کلمات جناب الطاف حسن قریشی نے ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ مقبوضہ کشمیر میں تحریکِ آزادی نئے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور نسلِ نَو کو حقائق سے باخبر رکھنا بہت ضروری ہے ۔محترم عطاء الحق قاسمی نے بات تو بہت مختصر کی لیکن اُن کی کشمیری بھائیوں سے محبت کے جذبوں میں گُندھی نظم ''تمہارے رستے میں روشنی ہو''میں وہ سب کچھ تھا جو ہم سننا چاہتے تھے۔''بے چین روح'' ڈاکٹر عمرانہ مشتاق ،ڈاکٹر سعدیہ بشیر اور فاطمہ احمد نے اپنی شاعری سے ماحول کو گرمائے رکھا۔ چار گھنٹوں پر محیط اِس مذاکرے کا لبِ لباب یہ تھا کہ کشمیر کے تنازعے کے حل ہونے کا وقت قریب آن لگا ہے اور بھارتی ظلم وجور کی گرتی دیواروں کو بس ایک دھکے کی ضرورت ہے۔

آمدم بَرسرِ مطلب ، اب کی بار جشنِ یومِ آزادی کی شان ہی نرالی تھی ۔اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ پوری قوم کے ایک صفحے پر ہونے کا سبب ''شریفین''کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونے میں مضمر ہے۔

پاکستان کی تاریخ تو یہی بتاتی

ہے کہ سیاسی و عسکری قیادت نے کبھی ایک ''میز'' پر بیٹھنا گوارا نہیں کیا جس کی بنا پر ہمیشہ مارشل لاؤں کی صورت میں ایسے رونما ہوتے رہے لیکن اب کی بار یہ معجزہ رونما ہوا کہ وزیرِاعظم میاں نواز شریف صاحب اور چیف آف آرمی سٹاف محترم جنرل راحیل شریف ہر جگہ اور ہر مقام پر اکٹھے نظر آئے۔ اسی یگانگت نے وزیرستان میں دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور ہر کسی کے لیے اپنی آغوشِ محبت وا کرنے والے کراچی کی روشنیوں کا سفر پھر سے شروع ہو گیا جو باہر بیٹھے الطاف بھائی کو گوارہ نہ ہوا کیونکہ اگر کراچی ایک دفعہ پھر عروس البلاد بن گیا تو الطاف حسین کو ''بھائی'' کون مانے گا۔ اپنے استعفے کی نصف سینچری'' مکمل کرنے کے بعد الطاف حسین نے اچانک اپنے اراکینِ پارلیمنٹ'' سینیٹرز اور ممبران صوبائی اسمبلی کو مستعفی ہونے کا حکم دے دیا۔ بہانہ یہ کہ،

رینجرز کا کراچی میں اپریشن غیر جانبدارانہ نہیں، ایم کیو ایم کے خلاف ہے اِس لیے

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

غلط، بالکل غلط، اگر آپریشن صرف ایم کیو ایم کے خلاف ہوتا تو زرداری صاحب کو یہ نہ کہنا پڑتا کہ ''اینٹ

سے اینٹ بجا دیں گے''۔ لیاری میں ہر روز چھاپے پڑتے نہ سُنّی تحریک کے مرکز پر دھاوا بولا جاتا۔ حقیقت یہی کہ آپریشن بلاامتیاز دہشت گردوں، بھتہ خوروں، پرچی

مافیہ اور ٹارگٹ کلرز کے خلاف ہو رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ الطاف حسین کا اچانک استعفوں کا فیصلہ اقتصادی راہداری کو سبوتاژ کرنے کی گہری سازش کا حصّہ ہے۔ پاکستان دشمن قوتوں، خصوصاً بھارت کو یہ اقتصادی راہداری کسی صورت قبول نہیں۔ بھارت ''را'' کے ذریعے پاکستان میں افراتفری کے منصوبے بناتا رہتا ہے اور یہ بھی اظہر من الشمس کہ ''بھائی'' کو ''را'' سے فنڈنگ ہوتی رہی۔ اس لیے لامحالہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ الطاف حسین استعفوں کے ذریعے افراتفری پیدا کرکے اپنے غیر ملکی آقاؤں کے ایجنڈے کی تکمیل چاہتے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ اُن کے مکروہ عزائم انشاء اللہ کبھی پورے نہیں ہوں گے۔

تمھیں وطن کی فضائیں سلام کہتی ہیں

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

ہفتے کی رات رگ وپے میں درد کی لہروں کو جنم دینے والی یہ خبر پہنچی کہ اسلام اورپاکستان سے والہانہ محبت کرنے والے جنرل (ر) حمید گُل اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔وہ رات اہلِ وطن پر بہت بھاری تھی کہ مسلم اُمہ کے لیے ہمہ وقت تڑپنے ،مچلنے والادِل ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔جنرل (ر) حمید گُل کے خیالات سے تواختلاف کیاجاسکتاہے کہ معصوم عن الخطا کوئی بھی نہیں اورکامل صرف ذاتِ ربی لیکن اُن کی مسلمانیت اورپاکستانیت شک وشبہ سے بالاتر۔عالمِ اسلام کا وہ سچا سپاہی اللہ کے نظام کے نفاذ کی بات ایسے خوبصورت پیرائے میں کرتاکہ مسلوب الحواس سیکولردانشور تلملاء اٹھتے ۔اِن نام نہاد ''لبرلز'' کوشکایت یہ تھی کہ یہ دبنگ جرنیل نظریۂ پاکستان کی تشریح دینِ مبیں کے حوالے سے کیوں کرتاہے حالانکہ ہم نے تو یہ ملک ہی لاالہ اللہ کی بنیادپر حاصل کیااور قائدِاعظمؒ کاخواب بھی اسے ''اسلام کی تجربہ گاہ'' بنانے کاہی تھا ۔قائدکایہ خواب تاحال ادھوراہے اورشاید ادھوراہی رہے کہ ہماری نیتوں میں فتور ہے۔ہم نے قراردادِمقاصد کوآئین کاحصّہ توبنادیالیکن چار عشرے گزر چکے ،تاحال عمل مفقود ہ۔اسی بناپر جنرل (ر) حمید گُل ایسی جمہوریت سے بدظن تھے جوقراردادِ مقاصدکی پابند تھی نہ ہے۔معروف لکھاری محترم رؤف طاہر لکھتے

ہیں ’’وہ جمہوریت کو خلافِ اسلام قرار دیتے (حالانکہ پاکستانی جمہوریت مغرب کی مادر پدر آزاد جمہوریت کے برعکس قراردادِ مقاصد کی پابند ہے)‘‘۔ بصد ادب گزارش ہے کہ محترم بھائی رؤف طاہر ہمیں بھی ’’قراردادِ مقاصد‘‘ کی تابع جمہوریت کی ہلکی سی جھلک دکھادیں تاکہ ہم بھی اِس ’’بی بی جمہوریت‘‘ کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو سکیں۔ ہمارا تو المیہ ہی یہ ہے کہ ہم جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ اگر جنرل (ر) حمید گُل ایسی جمہوریت‘‘ سے بدظن تھے تو ایسے غلط بھی نہیں تھے۔ اُن کی تو ساری زندگی یہی درس‘‘ دیتے گزری کہ نیابتِ الٰہی میں ہی فلاحِ انسانیت مضمر ہے۔

اتوار کی صبح سوگواری تھی اور بقول ناصر کاظمی یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

اسی سوگوار اور بوجھل فضاء میں اچانک یہ خبر گونجی کہ اٹک میں کرنل (ر) شجاع خانزادہ کے ڈیرے پر خودکش حملہ ہوگیا۔ نیوز چینلز پر پھیلتی خبروں میں پَل پَل بڑھتی شہادتوں کا ذکر تو ہوتا رہا لیکن کرنل صاحب کی خیریت کی خبر مفقود۔ پھر ایسی خبریں آنے لگیں کہ کرنل صاحب زندہ تو ہیں لیکن شدید زخمی اور بالآخر یہ بریکنگ نیوز کہ وہ شہید ہو گئے۔ اسم بامسمّٰی شجاع خانزادہ کو تو شہید ہونا ہی تھا کہ اُن کا مطلوب و مقصود ہی شہادت تھا۔ یاد آیا کہ بدر کا میدان، سامنے

غالب عددی اکثریت اور حربی سامان سے لیس مشرکینِ مکہ کی فوج، دوسری طرف بے سروساماں 313 اللہ کے سپاہی۔ ایک صحابیؓ مٹھی میں چند کھجوریں دبائے آقاﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یارسولؐ اللہ ! کیاجنت میں اِس سے بہتر کھجوریں ملیں گی؟"۔ آقاﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا "یقیناً بہت بہتر"۔ تب صحابیؓ نے وہ کھجوریں زمین پر پھینک دیں اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے "اب جنت کی کھجوریں ہی کھاؤں گا"۔ وہ میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوگئے کیونکہ اُنہیں یاد تھااور اُن کے ایمان کاحصہ بھی کہ شہید کو مردہ مت کہو، وہ زندہ ہے اوراپنے رب کے ہاں سے خوراک حاصل کررہا ہے۔۔۔۔ پھریاد آیاکہ حضرت خالدبن ولیدؓ کی آنکھوں سے وقتِ رحلت آنسو رواں ہوگئے۔اُن کے پاس کھڑے صحابیؓ نے سوال کیا"کیا موت سے ڈرلگتا ہے؟"۔ آپؓ نے فرمایا"موت سے کیساخوف، میں تواِس لیے رورہا ہوں کہ ساری زندگی دشمن کی صفوں میں گُھس گھس کرحملے کرتارہا، پھربھی شہادت نصیب میں نہیں تھی، طبعی موت مررہا ہوں"۔لاریب شہادت کی سعادت نصیب والوں کے حصے میں ہی آتی ہے۔

کالعدم لشکرِ جھنگوی کے سربراہ ملک اسحاق کی پولیس مقابلے میں ہلاکت کے بعد کرنل شہید کو دہشت گردوں کی طرف سے مسلسل قتل کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ خفیہ اداروں کی اطلاعات بھی یہی تھیں کہ ایک مخصوص گروہ کے اُنہیں اُن کی رہائش گاہ شادی خاں) پر ٹارگٹ کرنا چاہتا ہے لیکن اُنہوں نے اِس کی مطلق پرواہ نہ)

کی ۔ایک اخبار نویس نے اُن سے سوال کیا کہ قتل کی دھمکیوں کے باوجود وہ اپنے گرد سکیورٹی حصار کیوں قائم نہیں کرتے ؟۔ کرنل شہید کا جواب تھا کہ وہ ملک کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار ہیں اور اُن کا مطمعٔ نظر ملک و قوم کی حفاظت ہے ،اپنی نہیں۔ایک سال سے بھی کم عرصے میں کاؤنٹر ٹیررازم ڈیپارٹمنٹ کی تشکیلِ نَو کرکے کرنل شہید نے دہشت گردی کے ناسور پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ تمام دہشت گرد تنظیموں نے مل کر اُن کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ سامنے آکر کبھی نہ وار کرنے والے بزدل دشمن کی بزدلانہ کارروائی سے کرنل شجاع خانزادہ تو شہید ہو گئے لیکن اُن کا جسدِ خاکی تو آج بھی پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ

کرو کج جبیں سے سرِ کفن ، میرے دشمنوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن ، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

وزیرِ اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں خونِ شہید کی قسم اٹھا کر کہا کہ وہ اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک دہشت گردوں کو واصلِ جہنم نہیں کر لیتے۔ ہمیں یقین ہے کہ خادمِ اعلیٰ اپنے اِس عہد کی ضرور پاسداری کریں گے لیکن کرنل شہید کی کمی تو بہر حال محسوس ہوتی ہی رہے گی ۔وہ تو باغِ بہشت سے ہنستے مسکراتے یہ پیغام دے چکے کہ

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم ، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

لیکن اُن کی شہادت کا بدلہ ہم پر قرض ہے اور فرض بھی۔

بھابی ! ہم اب کیا کریں

ہمیں اِس سے کچھ لینا دینا نہیں کہ موروثی سیاست کے خلاف صبح ومسا تگ ودَو کرتے کپتان صاحب نے اچانک ریحام بھابی کو خارزارِ سیاست میں کیوں دھکیل دیا۔ ویسے ہمارا ''حسنِ ظن'' ہے کہ ہمارے بھولے بھالے کپتان صاحب کو پتہ ہی نہیں تھا کہ بیوی بھی خاوند کی وراثت میں حصّے دار ہوتی ہے ۔اگر پتہ ہوتا بھی تو اِس سے ''کچھ''فرق نہیں پڑتا کہ ''یوٹرن'' تو ہماری سیاست کا جزوِ لاینفک ہے اور اِس کی تاریخ پرانی ۔ بھٹو مرحوم روٹی ، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر مسندِ اقتدار تک پہنچے لیکن پھر یوٹرن لیتے ہوئے کہہ دیا ''میں کوئی سونے کا انڈا دینے والی مرغی نہیں ، خود کماؤ اور کھاؤ''۔ ضیاء الحق مرحوم 90 دنوں کا وعدہ کرکے آئے اور یوٹرن لیتے ہوئے اُس وقت تک اقتدار سے چمٹے رہے جب تک اللہ میاں نے اپنے پاس نہیں بلا لیا۔ پرویز مشرف نے قوم کے سامنے دسمبر 2004ء تک وردی اتارنے کا وعدہ کیا لیکن انہوں نے بھی کہہ دیا ''وردی تو میری کھال ہے''۔ پرویز مشرف کو بے آبرو کرکے ایوانِ صدر سے نکالنے والے آصف زرداری صاحب کے ہاں تو ''وعدے قُرآن وحدیث نہیں ہوتے جن سے انکار نہ کیا جا سکے''۔ اگر ہمارے کپتان صاحب نے دس ، پندرہ یوٹرن لے لیے اور اُن میں سے ایک ریحام بھابی کو سیاست میں ''اِن'' کرنا بھی ہے تو دشمنوں کے پیٹ میں کیوں مروڑ اُٹھنے لگے۔ آمدہ اطلاعات کے مطابق کپتان صاحب نے کہہ

دیا کہ آئندہ ریحام خاں تحریکِ انصاف کی کسی تقریب میں شرکت کریں گی ، نہ انہیں کوئی پارٹی عہدہ دیا جائے گا اور نہ ہی پروٹوکول۔ اُنھوں نے NA-19 میں ضمنی انتخاب کے بعد اپنی اہلیہ پر ہونے والے تنقیدی حملوں کے بعد انتہائی اکتاہٹ اور بیزاری کے عالم میں یہ فیصلہ کیا۔ دروغ بَر گردنِ راوی یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ کپتان صاحب نے اپنے بچوں کی ریحام خاں پر شدید تنقید کے بعد انتہائی مجبوری کے عالم میں یہ فیصلہ کیا۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر ''اندر کھاتے'' بھی اپنے فیصلے سے ریحام بھابی کو آگاہ کر سکتے تھے لیکن پتہ نہیں ایسی کون سی مجبوری آن پڑی کہ اُنھوں نے سرِعام سب کچھ کہہ کر ہماری بھابی کے پلّے ''دُکھ'' نہیں چھوڑا۔ ہم تو خوش تھے کہ بینظیر شہید کی طرح ایک اور خاتون اُبھر کر سامنے آ رہی ہے اور آپس کی بات کہ ہم نے تو بھابی کو مستقبل کی خاتونِ اوّل کی بجائے نہ صرف وزیرِ اعظم سمجھنا شروع کر دیا بلکہ اُن کے لیے یہ نعرہ بھی گھڑ لیا ''چاروں صوبوں کی ہے جاں ۔۔۔ ریحام خاں ، ریحام خاں'' لیکن ہمارے سارے خواب ''چکناچور'' ہو گئے کہ ریحام بھابی ابھی اُڑنے بھی نہ پائی تھیں کہ ''گرفتارِ شوہر'' ہو کر گھر کی ہو رہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ایسا کیا ہوا جو ہمیں ہر میدان میں ہزیمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دھرنوں کے بعد ہونے والے ہر ضمنی الیکشن میں شکست ، تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ ہمارے خلاف حالانکہ ہمیں یقین تھا کہ تحقیقاتی کمیشن

کا فیصلہ ہمارے حق میں ''آوے ای آوے''۔پارٹی میں شدید انتشار کی خبریں لیکن اِن کا ذمہ دار تو ہم جسٹس (ر) وجیہہ الدین کو سمجھتے ہیں جنھوں نے ناک میں دَم کر رکھا ہے۔وجیہہ الدین صاحب کو کپتان صاحب نے پارٹی میں ہونے والی انتخابی بے ضابطگیوں کا جائزہ لینے کے لیے تحقیقاتی کمیشن کا سَربراہ مقرر کیا لیکن وہ چیف جسٹس آف پاکستان ہی بن بیٹھے۔ جسٹس صاحب تو جہانگیر ترین ، عبد العلیم ،نادر لغاری اور ہمارے محترم ''تیلی پہلوان''کے پیچھے ہاتھ دھو کر ہی پڑ گئے ۔بندہ پوچھے کہ اگر اِنہیں پارٹی سے نکال دیا گیا تو باقی بچے گا کیا؟۔ پھر ہمارے پاس ذاتی جہاز ہو گا نہ ہیلی کاپٹر اور نہ ہی بوقتِ ضرورت پیسوں کا انتظام۔ جسٹس صاحب پارٹی پر رحم کرتے ہوئے اتنا موقع تو دے دیں کہ وہ اپنے قدموں پر جَم کر کھڑی ہونے کے قابل ہو سکے ۔ویسے بقول جسٹس وجیہہ الدین کپتان صاحب اِن اصحاب کو ''پھڑکانے''کے لیے مناسب موقعے کی تاک میں ہیں اور وہ مناسب موقع تبھی آ سکتا ہے جب پارٹی اندرونی طور پر مضبوط ہو جائے۔

ہری پور کے ضمنی الیکشن میں تو ہمیں یقین تھا کہ بے مثل کامیابی ہماری راہوں میں آنکھیں بچھائی بیٹھی ہے اسی لیے کپتان صاحب نے ریحام خاں کو سیاسی اکھاڑے میں اتارنے کے لیے ہری پور کا انتخاب کیا۔ویسے بھی بقول ریحام خاں ہری پور اُن کی ''جنم بھومی'' ہے اسی لیے ہمیں یقین تھا کہ کامیابی مستقبل کی ''وزیرِ اعظم''کے قدم چومے گی ۔ ریحام بھابی نے تحریکِ انصاف کی ''فضیلت

بیان کرتے ہوئے بجاطور پر پختون بھائیوں کو بتلایا کہ تحریکِ انصاف پاکستان کی وہ'' واحد جماعت ہے جس میں خان بھی ہے، جوان بھی اور بھابی بھی اِس لیے کامیابی کی حقدار صرف تحریکِ انصاف ہی ٹھہرتی ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا ''آپ ہمیں ووٹ دے کر جتوائیں اِس کے بعد اگر خاں صاحب نے آپ کی بات نہ مانی تو پھر اُنھوں نے کیا گھر نہیں آنا؟۔۔۔ہمارے یقین کی دوسری وجہ یہ تھی کہ عام انتخابات میں بھی یہ سیٹ تحریکِ انصاف کے پاس تھی جو بعد میں الیکشن کمیشن کی ''مہربانی'' سے نوازلیگئے لے اُڑے۔ پھر سپریم کورٹ کے حکم پر ضمنی انتخاب کا ڈول ڈالا گیا۔ ہری پور چونکہ صوبہ خیبر پختونخوا میں واقع ہے اِس لیے ہمیں یقین تھا کہ مسلم لیگ کوئی ''ہینکی پھینکی'' نہیں کر سکتی۔ اِس کے علاوہ تازہ تازہ بلدیاتی انتخابات میں تحریکِ انصاف کو ڈسٹرکٹ کونسل کی 24 سیٹیں ملیں جبکہ نوازلیگ کو صرف 2 ۔ خود نوازلیگئے بھی سخت مقابلے کی پیشین گوئیاں کر رہے تھے جبکہ غیر جانبدار تجزیہ نگاروں نے تو یہ سیٹ ہماری جھولی میں ڈال ہی دی تھی ۔اِن تمام عوامل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے ''ایویں خواہ مخوا'' جذباتی ہو کر کچھ نوازلیگیوں سے ڈنر کی شرط باندھ لی۔ اب اُدھر سے فون پہ فون ''کھڑکائے'' جارہے ہیں لیکن ہم جواب دینے کی بجائے ''یوٹرن'' کی سوچ رہے ہیں۔ ہمیں وقفِ مصیبت کرنے والی تو بہرحال ریحام بھابی ہی ہیں جنھوں نے پوری قطعیت کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ ہری پور میں تحریکِ انصاف کے اُمیدوار کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ اسی اُمید پر ہم نے ''ڈنر'' کی شرط باندھ لی ۔ اب بھابی

ہی بتائیں کہ ''اب ہم کیا کریں''۔ ڈی جے بٹ اور ٹینٹ سروس والوں کی طرح دھرنا دے نہیں سکتے کہ ہم ٹھہرے ''پکّے'' سونا میے اور پیسہ ہمارے پلّے نہیں اِس لیے مکرر کہتے ہیں ''بھائی ! اب ہم کیا کریں''۔

کیا انصاف اسی کا نام ہے۔۔۔؟؟

لال بجھکڑ کی حکومت میں ایک شخص نے قتل کر دیا۔ جج نے اسے موت کی سزا سنائی ۔جب جلاد قاتل کو پھانسی دینے لگا تو پتہ چلا کہ قاتل کی گردن بہت پتلی ہے اور پھانسیکا پھندا بہت کھلا۔ سبھی پریشان کہ اِس کا کیا حل نکالا جائے ۔ چارونا چار طے ہوا کہ سارا مسئلہ بادشاہ سلامت کے گوش گزار کیا جائے۔جب بادشاہ سلامت (لال بجھکڑ) کے سامنے مسئلہ رکھا گیا تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا ''اتنی معمولی سی بات کے لیے میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی، کوئی موٹی گردن والا ایسا بندہ تلاش کرو جس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ''فِٹ'' بیٹھتا ہو اور اُس کو پھانسی دے دو۔ کچھ ایسی ہی واردات ہمارے مشاہداللہ خاں کے ساتھ بھی ہو گئی ۔ وہ بطور وزیر باتدبیر غیر ملکی دَورے پر تھے کہ اُن کے ساتھ 'ہَتھ'' ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ ''ممدوح'' نے اُنہیں پَرے جھٹک دیا بلکہ وزارت بھی گئی۔ دروغ بَر گردنِ راوی وہ اداسیوں کے جلو میں ایوانِ وزیرِاعظم سے نکلے اور ''وہ جا رہا ہے اپنی وفا کا لُٹا ہوا'' گنگناتے سیاسی اندھیروں میں گم ہو گئے۔ سچی بات ہے کہ ہمیں مشاہداللہ خاں کے ساتھ ہونے والی اِس ''واردات'' پر دلی دُکھ ہوا کیونکہ ''مجرم'' کوئی اور تھا لیکن پھندا موٹی گردن والے مشاہداللہ خاں کی گردن میں فِٹ ہو گیا۔

یہ بجاکہ شاید پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ چشمِ فلک نے یہ دیکھا کہ سیاسی وعسکری قیادت کے مابین افہام و تفہیم کا یہ عالم کہ جیسے ''میں تے ماہی اِنج مِل گئے جنویں ٹِچ بٹناں دی جوڑی''۔ قائدین ہر قومی وبین الاقوامی مسئلے پر ہم آہنگ۔ان، حالات میں مشاہداللہ خاں کو پنڈورابکس کھولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سوال مگر یہ کہ پنڈورابکس'' کھولنے والا کون؟ کیا مشاہداللہ خاں یا کوئی اور؟۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ'' دھرنوں کے ایام میں محترم جنرل احمد شجاع پاشااور محترم جنرل ظہیرالاسلام کے بارے میں ایسی افواہیں زباں زدِ عام تھیں؟۔ سوال یہ بھی ہے کہ ایسی غلط فہمیاں پیدا کرنے والا تھا کون؟۔یقیناً وہی جو تواتر کے ساتھ امپائر کی انگلی کھڑی ہونے کے دعوے کرتا رہا وہ تھے ہمارے محترم عمران خاں صاحب۔ یہ سوال توخاں صاحب سے پوچھاجانا چاہیے، کہ وہ ''امپائر'' کون تھا جس کی انگلی کھڑی ہونے کی نوید وہ سونامیوں کو دیتے رہے ۔محترم جاوید ہاشمی نے تحریکِ انصاف کی صدارت چھوڑنے کے بعد اپنے پہلے انٹرویو میں ہی یہ راز فاش کردیا کہ وہ امپائر کون تھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ کپتان صاحب ہر میٹنگ میں کہتے تھے کہ ''وہ'' ہمارے ساتھ ہیں (ہاشمی صاحب نے دونوں کندھوں پر ہاتھ لگاکر یہ واضح اشارہ دیاکہ بقول عمران خاں فوجی جرنیل اُن کی پشت پر ہیں)۔ مشاہداللہ خاں نے جو کہا، وہی کچھ توپی ٹی آئی کے بریگیڈیئر (ر) سائمن نے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا۔بریگیڈیئر صاحب کے دعوے

کے مطابق جنرل ظہیرالاسلام کا مطمحِ نظر وزیرِاعظم اور آرمی چیف کے مابین غلط فہمیاں پیدا کرکے اُن کو آپس میں لڑوانا اور پھر دونوں کی چھٹی کرواکے خود حکومت پر قبضہ کرنا تھا۔ مشاہداللہ خاں نے بھی تو یہی کچھ کہا پھر اگر بریگیڈیئر سائمن (جو سابقہ فوجی ہیں) کے خلاف تحقیقات نہیں ہو سکتیں تو کیا مشاہداللہ خاں کے خلاف صرف اِس لیے کہ وہ ''سویلین'' ہیں؟۔

مسئلہ اگر ایک وفاقی وزیر کے مُنہ سے نکلے ہوئے غیر ذمہ دارانہ الفاظ کا تھا تو اِس معاملے میں بھی مشاہداللہ خاں مجرم نہیں ٹھہرتے کیونکہ کھلے ڈُلے وزیرِ دفاع خواجہ آصف صاحب نے تو ایک نہیں دو، دوبار جنرل احمد شجاع پاشا اور جنرل ظہیرالاسلام کو موردِالزام ٹھہرایا لیکن اُن کے خلاف تادیبی کارروائی تو ایک طرف ، ایوانِ وزیرِاعظم کی طرف سے اُن کے بیان کی تردید بھی نہیں آئی۔ یہ بھی طشت از بام کہ میاں شہباز شریف اور چودھری نثار احمد نے متعدد بار اعلیٰ عسکری حکام کو جنرل ظہیرالاسلام کے دھرنوں میں ادا کیے جانے والے کردار کے بارے میں آگاہ کیا اور میاں شہباز شریف صاحب نے تو دھرنوں کی پشت پر کارفرما ہاتھ کی تحقیقات کے لیے پارلیمانی کمیٹی کے قیام کا مطالبہ بھی کیا لیکن شور اُٹھا نہ ہاہاکار مچی ۔ مشاہداللہ خاں نے بی بی سی کو دیئے گئے پورے انٹرویو میں کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خود موقع پر موجود تھے یا اُن کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اُنھوں نے تو اپنے انٹرویو کی بنیاد ہی ''سُنی سنائی

باتوں پر رکھی اور اِس کا بَرملا اقرار بھی کیا۔ سبھی جانتے ہیں کہ انٹرویوز کو ''ایڈٹ'' کرکے معانی ومفاہیم کو یکسر تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن اِس کے باوجود بھی'' اگر پورے انٹرویو میں کچھ قابلِ گرفت ہے تو وہی جس کا خواجہ آصف صاحب پہلے ہی برملا اظہار کر چکے تھے ۔اصل بات یہ ہے کہ ''پھندہ'' صرف مشاہداللہ خاں کے گلے میں ہی فِٹ بیٹھتا تھا، باقی سب تو ''تگڑے'' تھے ۔۔۔ بہت تگڑے۔

ایوانِ وزیرِاعظم کی طرف سے مشاہداللہ خاں کے بیان کی فوری تردید اور افراتفری میں لیے گئے استعفے کی بنا پر سیاسی و عسکری قیادت میں پیدا ہونے والی غلط فہمیاں دَم توڑ گئیں اور وہ جو اِس بیان پر بغلیں بجا رہے تھے کہ اب تماشا ''ہووے ای ہووے'' ، اُن کی اُمیدوں پر اَوس پڑ گئی ۔الیکٹرانک میڈیا پر بیٹھے اینکر ،اینکرنیاں اور تجزیہ نگار بھی ٹھنڈے ٹھار'' ہوگئے اور اُن کے پاس چائے کی پیالی پر طوفان اٹھانے کو ''کَکھ'' باقی نہ بچا۔اِس سے پہلے تو یہ عالم تھا کہ چیونٹیوں کے بھی پَر نکل آئے اور ہر کہ ومہ نے افلاطونی تجزیوں کی آڑھت سجالی۔ تحریکِ انصاف نے دو قدم آگے بڑھ کے سارے معاملات کی تحقیقات کا مطالبہ کر دیا۔ شاید اُس نے جوڈیشل کمیشن کی رپورٹ سے سبق نہیں سیکھا۔ کہے دیتے ہیں کہ اگر حکمرانوں نے (عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے) کوئی تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دے ڈالی تو پھر سونا میے اور سونامیاں گلی گلی یہ گاتے پھریں گے کہ ''جو بچا تھا وہ لُٹانے کے لیے آئے ہیں''۔اُنہیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ جس تواتر سے

یہ خبریں یا افواہیں پھیلتی رہیں اور رہا حال پھیل رہی ہیں، اگر اُن میں دَس فیصد سچائی بھی ہوئی تو تحریکِ انصاف کے پلّے کچھ باقی نہیں بچے گا۔

اکھنڈ بھارت کا خواب

برِ صغیرپاک وہند میں تموّج اور تناؤ پیدا کرنا بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کی سرشت میں شامل اور مسلمانوں سے نفرت گھٹی میں پڑی۔ جوع الارض کا یہ نفسیاتی مریض ہمیشہ اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔جب گجرات کا وزیرِ اعلیٰ تھا تو سکولوں کے نصاب میں اکھنڈ بھارت کا ایسا نقشہ شامل کروایا جس کے مطابق پاکستان ،بنگلہ دیش ،افغانستان، سری لنکا ،نیپال ، بھوٹان ،تبت اور برما اکھنڈ بھارت کے ''اٹوٹ انگ''۔ اب اسی احمقانہ خواب کی تکمیل کے لئے دیدۂ حکمت سے تہی یہ کور چشم پورے برِ صغیر کی سلامتی داؤ پہ لگانے کے درپئے۔اسی بنا پر نہ صرف بھارت بلکہ اقوامِ عالم میں بھی اُس کے خلاف توانا آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ ہندوستان ٹائمز نے اپنے اداریے میں لکھا ''مسلۂ کشمیر پر نریندر مودی کی پالیسی تضادات کا شکار ہے''۔ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز نے لکھا کہ کشمیر کے معاملے پر بھارت احتیاط سے کام لے، اگر دونوں ملکوں میں جنگ چھڑی تو بھارت کا بہت زیادہ نقصان ہوگا۔بی بی سی نے کہا ''مودی حکومت نے ایک طرف پاکستان سے مذاکرات کا راستہ کھول رکھا ہے جبکہ دوسری طرف کنٹرول لائن پر دَراندازی اور فائرنگ میں مصروف ۔بھارت کا خیال ہے کہ وہ مضبوط حالت میں ہے اور پاکستان کو اپنا مؤقف تسلیم کرانے کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق

حکومت کا یہ مؤقف خطرات سے پُر اور ملک کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے''۔ جنگی جنون میں مبتلاء یہ سوفسطائی اِس وہم میں مبتلاء ہے کہ اُس کا خواب پورا ہو جائے گا جبکہ حقیقت یہی کہ وہ بھارتی سلامتی پر سوالیہ نشان ہے کہ دو ایٹمی طاقتوں کے ٹکراؤ کا نتیجہ صرف تباہی۔ جس کشمیر پر بھارتی بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے وہاں ساڑھے چھ عشروں سے جہد للبقا میں مصروف کشمیری قربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کرتے ہوئے۔ یہ الگ بات کہ اقوامِ عالم بے حمیتی کی ''بُکل'' مارے ہوئے اور امریکی گھر کی باندی در کی لونڈی اقوامِ متحدہ ''ٹُک ٹُک دیدم، دَم نہ کشیدم''۔ اسی اقوامِ متحدہ نے ایک قرارداد کے ذریعے کشمیریوں کا ''حقِ خود ارادیت'' تسلیم کیا اور بھارت کے اولین وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اِس قرارداد پر عمل درآمد کا وعدہ بھی کیا لیکن اب بھارتی اس کے ذکر پر بھی بدک اٹھتے ہیں۔

روس کے شہر ''اوفا'' میں جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیے میں واضح طور پر یہ لکھا گیا کہ تمام متنازع امور مذاکرات کے ذریعے حل کیے جائیں گے۔ اسی بنا پر پاکستانی مشیرِ خارجہ کو مذاکرات کی دعوت بھی دی گئی لیکن پھر بھارت کا خبثِ باطن عیاں ہوتا چلا گیا۔ پہلے پاکستان میں کامن ویلتھ سپیکرز کانفرنس کو سبوتاژ کرنے کے لیے یہ احمقانہ مطالبہ کیا کہ اِس کانفرنس میں مقبوضہ کشمیر کے سپیکر کو بھی مدعو کیا جائے۔ جس پر پاکستان نے نہ صرف صاف انکار کر

دیابلکہ کامن ویلتھ سپیکرز کانفرنس کی میزبانی سے بھی معذرت کر لی۔ پھر عین موقعے پر مذاکرات سے فرار کے لیے یہ بہانہ تراشا کہ سرتاج عزیز کشمیری رہنماؤں سے ملاقات سے گریز کریں بصورتِ دیگرمذاکرات منسوخ کر دیئے جائیں گے۔ سرتاج عزیز صاحب نے توصاف کہہ دیاکہ پاکستان گزشتہ بیس سالوں سے ہمیشہ حریت رہنماؤں سے ملاقاتیں کرتا آیاہے اوراب بھی کرے گا،اگراس بنیادپر مذاکرات ملتوی ہوتے ہیں تو ہوجائیں۔ پھربھارت نے ایک اور پینترا بدلااور مذاکرات سے صرف ایک دِن پہلے بھارتی وزیرِخارجہ سشماسراج نے کہہ دیاکہ مذاکرات صرف دہشت گردی پر ہونگے کسی اورایشوپر نہیں۔ بھارت کی ایسی احمقانہ بوکھلاہٹوں کی وجہ سے پاکستان کامن ویلتھ سپیکرز کانفرنس کی میزبانی اورپاک بھارت مذاکرات کے بغیرہی سرخرو کہ اقوامِ عالم میں مسئلہ کشمیراپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آگیااور دنیا نے دیکھ لیاکہ پاکستان کارویہ مفاہمت کی خوشبوسے معمور جبکہ بھارت کاانتہائی معاندانہ اور مخاصمانہ۔ جہاں پاکستانی حکومت کارویہ مدبرانہ رہاوہاں ہمارے پرنٹ اورالیکٹرانک میڈیانے بھی مسئلۂ کشمیرپر الجھاؤ کی بجائے سلجھاؤ کی پالیسی پرہی زور دیاجبکہ زٹل بازبھارتی میڈیا جلتی کے زیرِانتظام بھارت اور کشمیرکے موضوعات پرتیل چھڑکنے میں مصروف۔ PINA مجھے کے آرگنائزر محترم الطاف حسن قریشی اِس PINA پردوسیمینارز میں شرکت کاموقع ملا۔ ڈھلتی عمرمیں بھی اپنے عزم، حوصلے

اورپاکستانیت میں جوانوں سے زیادہ جوان ہیں۔انہیں مِل اور سُن کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ”ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں“۔اُن کے احترام کا یہ عالم کہ جسے بلایا،دوڑا چلا آیا۔دونوں سیمینارز میں زرخیز اذہان کے مالک عقیل وفہیم مقررین نے خطاب کیااور سامعین ہر طبقۂ فکر کے چیدہ وچنیدہ احباب پر مشتمل۔مسٔلہ کشمیر پر ایسی پُر مغز اور سیر حاصل گفتگو ہوئی کہ تشنگی کا احساس تک نہ رہا، کئی ایسے گوشے بے نقاب ہوئے، جن کا شاید سامعین کی اکثریت کو علم تک نہ تھا۔مقررین کی گفتگو میں جذبات کا عنصر ضرور لیکن مدلل۔کسی نے دلی کے لال قلعے پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کی بات نہیں کی لیکن یہ عہد ضرور کہ ہم کسی خبیث کو لاہور کے ”جمخانہ“میں شراب پینے کی ناپاک جسارت بھی نہیں کرنے دیں گے۔دو ماہ کے قلیل عرصے میں منعقد ہونے والے اِن دونوں سیمینارز کا لبِ لباب یہ کہ دونوں پڑوسی ممالک کے متنازع امور کا حل صرف مذاکرات کی میز پر۔

عین اُس وقت جب بھارتی وزیرِ خارجہ بڑی نخوت سے مذاکرات کے لیے پیشگی شرائط عائد کر رہی تھی ،لاہور کے حلقہ 122 کے الیکشن ٹریبونل نے دھماکہ کرتے ہوئے ایسا عجیب وغریب فیصلہ صادر فرمایا کہ سَر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔اِس انتہائی متعصبانہ فیصلے کا کوئی سَر ہے نہ پَیر۔شاید یہ پاکستان کی تاریخ کا واحد فیصلہ ہے جس میں جج صاحب اپنی تعریفوں کے پُل باندھتے نظر آئے۔ہم محترم جج کو یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ کتنے میں بِکے؟“نہ محترم عمران خاں سے سوال”

کہ ''اُنھوں نے فیصلہ کتنے میں خریدا؟''۔ احترام واحتیاط لازم ۔البتہ یہ سوال کرنے کا حق ضرور کہ جب سپریم کورٹ کے چیف جسٹس صاحب کی سربراہی میں قائم شدہ جوڈیشل کمیشن یہ فیصلہ دے چکا کہ انتخابی بے ضابطگیوں کی بناپر الیکشن کالعدم قرار نہیں دیا جاسکتا تو پھر کیا اُن کا یہ فیصلہ توہینِ عدالت کے زمرے میں نہیں آتا؟۔ اگر محترم کاظم ملک صاحب جوڈیشل کمیشن کی 902 صفحات پر مشتمل رپورٹ کا مطالعہ کرنے کی زحمت کرلیتے تو وہ اپنی تعریف وتوصیف کی بجائے وہی فیصلہ کرتے جو مبنی بر حق ہوتا۔

سیاسی مجبوریاں

ہمارے ہاں اقتدار کا ہما جس کے سَر پر بھی بیٹھتا ہے ،اُسی کو سیاسی مجبوریوں کا تارِ عنکبوت جکڑ لیتا ہے۔ محترم آصف زرداری نے اپنے اقتدار کے پانچ سال اتحادیوں کی ''منتیں تَرلے'' کرتے گزارے۔اب نواز لیگ کا المیہ بھی یہی۔ تحریکِ انصاف نے آنکھیں دکھائیں تو دیگر سیاسی جماعتوں کے ہاں پناہ گزین، خوف کا یہ عالم کہ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں اعتزاز احسن نے کسی ''کپتی ساس'' کی طرح چودھری نثار احمد کو رَکھ رَکھ کے طعنے دیئے لیکن حکومتی لَبوں پہ مہرِ خاموشی، تحریکِ انصاف مستعفی ہوئی تو استعفے منظور کرنے میں صریحاً غیر آئینی ہچکچاہٹ۔ حامد میر نے محترم ایاز صادق سے چبھتا ہوا سوال کیا کہ جب آئینی طور پر تحریکِ انصاف کے اراکینِ پارلیمنٹ کے استعفے ہو چکے تھے تو اُنہیں منظور کرنے میں کوتاہی کیوں برتی گئی؟۔ سپیکر صاحب کا جواب تھا کہ آئین اُنہیں انفرادی تحقیق وتصدیق کی اجازت دیتا ہے۔ حامد میر نے کہا کہ عمران خاں تو ہر روز کنٹینر پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتے تھے کہ وہ مستعفی ہو چکے پھر خاں صاحب کا استعفیٰ کیوں منظور نہیں کیا گیا؟۔ ایاز صادق کا جواب بہت دلچسپ کہ پارلیمنٹ کے باہر سب باتیں سیاسی اور پارلیمنٹ کے اندر آئینی وقانونی۔ گویا آئین کی عمل داری صرف پارلیمنٹ کے احاطے تک محدود۔ اب ایم کیو ایم بھی مستعفی ہو چکی لیکن پھر ''نظریۂ ضرورت''

آڑے۔ اوّل اوّل تو نواز لیگ ڈٹی رہی اور کہا

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو

ایم کیو ایم نے تو اپنی ''خُو'' نہ چھوڑی البتہ نواز لیگ کو اپنی ''وضع'' بدلنی پڑی اور اب سبک سَری کا یہ عالم کہ استعفوں کی واپسی پر حکمران آمادہ البتہ باہر بیٹھے ''بھائی'' کے فیصلے کا انتظار۔

استعفے لینے اور دینے کے شوقین کپتان صاحب تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ ''گلیاں ہو جان سنجیاں وِچ مرزا یار پھرے''۔پہلے وہ استعفے کے لیے وزیرِ اعظم ہاؤس پر چڑھ دوڑے اور اب چاروں صوبائی الیکشن کمشنرز اور چیئرمین نادرا کو مستعفی ہونے کا حکم صادر۔ صوبائی الیکشن کمشنرز نے خاں صاحب کے خط کا ''ٹکا سا'' جواب دے دیا ہے اِس لیے ہو سکتا ہے کہ تحریکِ انصاف ایک دفعہ پھر پارلیمنٹ کو داغِ مفارقت دے جائے لیکن ہم کہیں گے کہ تحریکِ انصاف اب کی بار ایسا نہ کرے کیونکہ جب وہ دوبارہ ''نیویں نیویں'' ہو کر پارلیمنٹ میں جائیں گے اور اُن کا استقبال ''کچھ شرم ہوتی ہے ،کچھ حیا ہوتی ہے'' جیسے استقبالی نعروں سے ہو گا تو ہمیں شرم بہت آئے گی۔

عشقِ عمران میں ''گوڈے گوڈے'' دھنسے ہوئے ایک محترم لکھاری فرماتے ہیں
اخلاقیات کاتقاضہ یہ تھاکہ سردار ایاز صادق اعلیٰ ظرفی کامظاہرہ کرتے ،اپنی تنخواہوں''
مراعات اور بیرونی دَوروں کا حساب کرتے پھراُن اخراجات کو جمع کرتے ۔ جو حساب،
کتاب ہوتا،خاموشی سے سرکاری خزانے میں جمع کروادیتے ،مگرافسوس ایسانہ ہوسکا''۔
افسوس ، صدبلکہ ہزارافسوس کہ نہ سردارایاز صادق یہ پیسے دینے کوتیاراور نہ ہی
نیاپاکستان بنانے کاعزم لے کراُٹھنے والے سولہ ، سولہ لاکھ واپس کرنے کے لیے آمادہ۔
ویسے سردار صاحب کافیصلہ توابھی سپریم کورٹ میں ہونا باقی ہے لیکن نئے پاکستان کے
بانیان'' تواپنی مرضی سے استعفےٰ دے کر بھی بقایاجات وصول کرچکے ۔ محترم لکھاری''
نے ایاز صادق صاحب کو یہ ''اخلاقیاتی ''مشورہ بھی دیاہے کہ وہ خواجہ سعد رفیق کی
طرح ''سٹے آرڈر''کے پیچھے چھپنے کی بجائے عوام کی عدالت میں جائیں۔ مشورہ تومفید
ہے لیکن ایسے مشورے وہ اپنے ممدوح عمران خاں کو کیوں نہیں دیتے جن کی جماعت کے
مرادسعید ، قیصر جمال اور رائے حسن نواز سمیت چھ سے زائد اراکینِ پارلیمنٹ سپریم
کورٹ کے سٹے آرڈر کی ''بُکل'' مارے بیٹھے ہیں۔ محترم لکھاری نے جسٹس کاظم ملک
کے فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''قوم کوایسی سوچ پر ماتم کرناچاہیے جوانصاف
اورانصاف دینے والوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے ۔۔۔۔ جوڈیشل کمیشن کی رپورٹ
سامنے آئی توعمران خاں نے اِس فیصلے کو من وعن قبول کیاحالانکہ عمران خاں کو بہت کچھ
بتایاگیامگراُس نے کہاکہ نہیں، میں یہ کہہ چکاہوں کہ جو بھی

فیصلہ آیا وہ قبول ہوگا لہٰذا اب میں اِس پر کوئی تنقید نہیں کرسکتا''۔ عرض ہے کہ جوڈیشل کمیشن کے فیصلے کے بعد سے خاں صاحب متواتر یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ نوازلیگ الیکشن کمیشن اور آر اوز نے مِل کر دھاندلی کی جبکہ تحقیقاتی کمیشن نے اپنے 902 صفحات پر مشتمل فیصلے میں صراحت کے ساتھ لکھا کہ دھاندلی ہوئی نہ کوئی سیاسی جماعت منظم دھاندلی میں ملوث ہے۔ جس انداز میں خاں صاحب نے جوڈیشل کمیشن کا فیصلہ تسلیم کیا بالکل ویسے ہی ایاز صادق نے بھی سپریم کورٹ میں اپیل کا حق محفوظ رکھتے ہوئے کاظم ملک صاحب کے فیصلے کو تسلیم کیا۔ پھر سارے اخلاقی سبق اور ساری تلملاہٹ صرف نوازلیگ کے خلاف ہی کیوں؟۔ ویسے محترم کاظم ملک نے جو فیصلہ دیا وہ تو متنازع ہے ہی کیونکہ انہوں نے 2014ء میں دیئے جانے والے اپنے ہی فیصلے کی نفی کردی۔ وہ سپریم کورٹ کا حوالہ دے کر یہ فیصلہ دے چکے کہ اگر کاؤنٹر فائلز کی پشت پر مہر اور دستخط نہ ہوں لیکن باقی سب درست ہو تو ڈالا جانے والا ووٹ درست تسلیم ہوگا لیکن حلقہ 122 کا الیکشن کالعدم قرار دینے کی بنیاد ہی 23 ہزار کاؤنٹر فائلز کی پشت پر پریذائیڈنگ آفیسر کی مہر اور دستخط نہ ہونے پر رکھی گئی۔ حقیقت یہ کہ پولنگ سٹیشنز پر صبح کے اوقات میں بے تحاشہ رش ہوتا ہے اِس لیے مختصر سے انتخابی عملے کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ کاؤنٹر فائل کی پشت پر مہر اور دستخط کرسکیں۔ جب رَش کم ہوتا ہے تو پھر کاؤنٹر فائل کی پشت پر مہر اور دستخط جیسی ''بے کار'' پریکٹس کی جاتی ہے۔ بطور پریزائیڈنگ آفیسر میں نے کئی مرتبہ ڈیوٹی سرانجام دی اور ہمیشہ

اِس الجھن کا شکار رہی کہ جب کاؤنٹر فائل ہر لحاظ سے مکمل ہوتی ہے تو پھر اُس کی پشت پر مہر اور دستخط کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟۔ جب جوڈیشل کمیشن یہ طے کرچکا کہ انتخابی بے ضابطگیوں کی بنیاد پر الیکشن کالعدم قرار نہیں دیا جا سکتا اور عوامی نمائندگی ایکٹ 1976ء کی شِق 68(2) کے مطابق اگر ٹریبونل مطمئن ہو کہ کوئی کرپٹ یا غیر قانونی عمل کسی امیدوار یا اُس کے الیکشن ایجنٹ کی مرضی یا اکسانے پر نہیں ہوا تو انتخاب کالعدم قرار نہیں دیا جا سکتا تو پھر محترم جج نے ایاز صادق صاحب پر دھاندلی کا کوئی الزام لگائے بغیر صرف انتخابی بے ضابطگیوں کو بنیاد بنا کر حلقہ 122 میں دوبارہ پولنگ کا حکم کیسے صادر فرما دیا؟۔

شرم تم کو مگر نہیں آتی

نریندر مودی کی انتہاپسندانہ ذہنیت سے اقوامِ عالم اُسی وقت متعارف ہو گئیں جب وہ گجرات کا وزیرِاعلیٰ بنا اور اُس نے مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنا شروع کر دیئے ۔یہ وہ زمانہ تھا جب مودی کی دہشت گردی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے امریکہ نے اسے ویزہ دینے سے بھی انکار کر دیا لیکن جب مودی کے سَر پر بھارتی وزارتِ عظمیٰ کا تاج سجا تو امریکی صدر بارک اوباما اُسے مبارکباد دینے والوں کی صفِ اوّل میں شامل تھے۔ آج وہی مودی پاکستان کے خلاف سرگرم اور دہشت گردی کا کوئی موقع کھونے کو تیار نہیں ۔پاکستان کے اندر ''را'' دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث اور ورکنگ باؤنڈری پر ہر روز چھیڑ چھاڑ۔ جب سے نریندر مودی برسرِاقتدار آیا تب سے 100 سے زائد مرتبہ لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزیاں ہو چکیں۔ 27 اگست کو رات گئے سے 28 اگست کی صبح تک سیالکوٹ کے چاروا، مندروال، باجرہ گڑھی، چپراڑ، ہڑپال اور سجیت گڑھ سیکٹرز پر بھارتی گولہ باری سے 8 پاکستانی شہری شہید اور خواتین، بچوں سمیت 47 زخمی ہو گئے۔ میرا دین تو حالتِ جنگ میں بھی خواتین، بچوں، بوڑھوں اور ہتھیار نہ اٹھانے والوں کی حفاظت کا حکم دیتا ہے اور بین الاقوامی قوانین بھی یہی لیکن جہاں نریندر مودی جیسے دہشت گردوں سے واسطہ ہو وہاں انسانیت نامی کسی ''چڑیا'' کا کیا کام ۔ ہم لاکھ امن کی آشاؤں کے گیت گاتے اور سرحدوں

پر دوستی کے دیپ جلاتے رہیں، ہندو ذہنیت کبھی نہیں بدلنے والی۔ ہمارے سیکولر بھائی تو ہمہ وقت امن کی فاختائیں اُڑاتے رہتے ہیں لیکن حقیقت یہی کہ

پکڑ کے زندہ ہی جس درندے کو تُم سدھانے کی سوچتے ہو
بدل سکے گا نہ سیدھے ہاتھوں وہ اپنے انداز دیکھ لینا

ہمارے سپہ سالار جنرل راحیل شریف نے سیالکوٹ ورکنگ باؤنڈری کے ہنگامی دورے کے موقع پر کہا ''پاکستان میں دہشت گرد کارروائیوں میں بھارت ملوث ہے اور بھارت نے پاکستان کی شہری آبادی کو نشانہ بنا کر دہشت گردی کی ہر حد پار کرلی۔ ورکنگ باؤنڈری اور کنٹرول لائن پر سیز فائر کی خلاف ورزی بین الاقوامی ضابطوں کے منافی ہے''۔ عزمِ صمیم کی رفعتوں کو چھونے والے سپہ سالار کا فرمان بجا لیکن یہ بھی عین حقیقت کہ ''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے

۔

دفاعی امور کے ماہر تمام تجزیہ نگاروں کی متفقہ رائے کہ حکومت کو اِس بلا اشتعال فائرنگ کا مُنہ توڑ جواب دینا چاہیے۔ بھارت کو جان لینا چاہیے کہ اگر ہماری سلامتی اور خود مختاری پر آنچ آئی تو بھارت کے تمام شہر ہمارے ایٹمی ہتھیاروں کی زد پر ہیں پاکستانی فوج دنیا کی مضبوط ترین فوج ہے اور پاکستانی قوم دنیا کی مضبوط ترین قوم جو ہر، محاذ پر افواجِ پاکستان کے شانہ بشانہ لڑنے کو تیار۔ ہمارا عزم جواں اور جذبۂ جہاد قوی لیکن دینِ مبیں کے عین مطابق ہم

صلح جُو قوم ہیں جسے کمزوری سمجھنے والا احمقوں کی جنت میں بستا ہے۔

2003ء میں لائن آف کنٹرول اور ورکنگ باؤنڈری پر دونوں ممالک نے جنگ بندی کا معاہدہ کیا اور 12 سال تک دونوں ممالک نے اِس معاہدے کی پاسداری بھی کی ۔چھوٹی موٹی جھڑپوں کے علاوہ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جسے معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیا جاسکے لیکن جونہی انتہاپسندانہ ذہنیت کا حامل ''وحشی'' برسرِاقتدار آیا، بھارت اور مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگے اور یہی نہیں بلکہ لائن آف کنٹرول کے نزدیک سرحدی گاؤں بھی بھارتی جارحیت کی زد میں آ گئے۔

نریندر مودی کے برسرِاقتدار آتے ہی دہشت گرد بھارت نے پاکستان کے خلاف چومکھی ''لڑائی لڑنا شروع کر دی ۔ایک طرف ''را'' پاکستانی ''بے ضمیروں'' کو خرید کر'' انارکی وافراتفری کے لیے کوشاں تو دوسری طرف وزیرستان کے دہشت گردوں اور بلوچستان کے علیحدگی پسندوں کی سرپرستی۔ بھارتی ذہنیت کا اندازہ اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابوظہبی کے دورے کے موقعے پر نریندر مودی نے ابوظہبی کے حاکم کو کہا کہ سعودی عرب کے شاہ کو اُن کا یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ اگر سعودی عرب پاکستان کی دوستی سے ہاتھ اٹھالے تو بھارت یمن کے معاملے میں اُس کی ہر قسم کی مدد کرنے کو تیار ہے ۔ہمارے عظیم دوست سعودی عرب نے تو اِس ہندو لالے کو ''شٹ اَپ'' کال دے دی لیکن اِس سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ بھارت پاکستان کو ہر پہلو سے زُک پہنچانے کے لیے کوشاں ہے

۔حقیقت یہی کہ نریندر مودی اپنے ’’اکھنڈ بھارت ‘‘کے احمقانہ خواب کی تکمیل کے لیے بوکھلاہٹ کاشکار ہو چکاہے جس سے کوئی بھی سانحہ جنم لے سکتاہے کیونکہ پاکستان اوربھارت دونوں ہی ایٹمی قوتیں ہیں اوربقول چودھری شجاعت ’’ہم نے ایٹم بم شب ۔برات پر پھُل جھڑیوں کی جگہ چلانے کے لیے نہیں رکھاہوا‘‘۔ دنیانے دیکھ لیاکہ ہم پُرامن قوم ہیں لیکن اگرہم پرجنگ مسلط کی گئی توپھر پیچھے ہٹنے والے بھی نہیں۔ ہمارے وزیرِ دفاع خواجہ محمدآصف نے کہا’’ پاکستان پرحملے کی صورت میں ردِعمل کاانحصار ہم پرہوگا۔ردِعمل کی نوعیت اوروقت پاکستان طے کرے گا۔پاکستان اوربھارت میں محدود جنگ کاآپشن نہیں۔بھارت کی طرف سے پاکستان پرحملہ کیاگیاتو جواب اپنی مرضی سے دیں گے‘‘۔ وزیرِداخلہ چودھری نثاراحمد نے۔برطانوی وزیرِخارجہ فلپ ہیمنڈ سے ملاقات میں کہاکہ پاکستان نے خطے میں امن اورہمسائیوں سے اچھے تعلقات کے حوالے سے ایک واضح مؤقف اپنایاہواہے لیکن دوسری طرف سے امن کی تمام کوششوں کوسبوتاژکیاجارہاہے۔امن کی کوششوں کایہ ہرگزمطلب نہیں کہ کسی ملک کی اجارہ داری یاتسلط قبول کرلیاجائے۔باخبرچودھری نثاراحمد سے بہترکون جانتاہے کہ بھارت کی تمام ریشہ دوانیاں دراصل پاک چائناقتصادی راہداری کو سبوتاژ کرنے کے لیے ہیں کیونکہ اُسے پتہ ہے دفاعی اعتبارسے مضبوط پاکستان اگراقتصادی لحاظ سے بھی مضبوط ہوگیاتو پھرخطے میں اُس کی چودھراہٹ کاخواب چکناچور ہوجائے گا۔ یہ بھی عین حقیقت کہ اقتصادی راہداری امریکہ کو قبول نہ۔برطانیہ کوکیونکہ عالم

اسلام کی واحدانیتی طاقت اُن کے دلوں میں بھی کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔.برطانیہ صرف الفاظ کی حد تک ہی پاکستان کی اشک شوئی کرے گا اور کچھ نہیں اِس لیے ہم اپنے وزیرِ داخلہ کو کہے دیتے ہیں کہ

میر کیا سادہ ہیں ، بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

بھارتی جشنِ فتح

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

راشٹریا سیوک سنگھ نظریے سے وابستہ، شیو سینا کا پروردہ، ابنِ حماقت، عبدِ جہالت، خود بینی، خود ستائی و خود نمائی کے مرضِ مہلک میں مبتلاء بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی صحرا کو گلستاں ثابت کرکے نسلِ نَو کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کوشاں ہے لیکن اُس کا خروش محض سمع خراشی کہ اُس کا خریطہ دلائل سے خالی۔ اُس نے بھارت میں جنگِ ستمبر 65ء کی گولڈن جوبلی تقریبات کو ''جشنِ فتح'' کے طور پر منانے کا اعلان کیا ہے۔ دراصل یہ سب اُس جنگی جنوں کا شاخسانہ ہے جو بھارتی وزیرِ اعظم کے سر چڑھ کے بول رہا ہے۔ مذہبی جنونی نریندر مودی اِس خیالِ خام کا ''صید'' کہ وہ پاکستان کو بھارت کا دبیل اور غلام بے دام بنالے گا۔ اگر اُس نے پاکستان پر چڑھ دوڑنے کی حماقت کی تو پھر بھارت کی ''داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں''۔ ہم پُرامن قوم ہیں اور دینِ مبیں کے عین مطابق پڑوسیوں سے اچھے تعلقات کے خواہاں۔ امن کی خواہش پالنا ہمارے دین کا جزوِ لاینفک کہ یہی حکمِ ربی لیکن طاغوت کے خلاف ہمارے ''گھوڑے'' بھی تیار کہ یہ بھی حکمِ لم یزل۔ بہتر یہی کہ مودی صاحب اپنے ذہنی خلجان کو دور

اور خیرہ سری کو جھٹک کر اِس خیالِ فاسد کو ذہن سے نکال دیں کہ وہ اپنے مکروہ مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بھارتیوں کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ امریکہ نریندر مودی کی پیٹھ تھپتھپا رہا ہے اور مودی مسلم دشمنی میں اندھا ہو کر امریکہ کے بچھائے دامِ تزویر میں پھنستا چلا جا رہا ہے۔امریکہ اِس وقت اقتصادی و معاشی تباہی کے دہانے پر ہے۔ سات لاکھ سے زائد افراد کو ملازمتوں سے نکالا جا چکا، کئی اسلحہ فیکٹریوں کو تالے لگ چکے اور چین کو اقتصادی طور پر تباہ کرنے کا جنون پالنے والا اب خود چین سے بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔اِس لیے عسکری اور معاشی طور پر تباہ حال ایشیاء ہی امریکہ کی آخری اُمید ہے اور خواہش یہ کہ تیسری عالمی جنگ کا میدان برِصغیر پاک و ہند ہو، تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے ،اب یہ سوچنا بھارتیوں کا کام ہے کہ وہ بھارت کو ناگاساکی اور ہیروشیما جیسی ''جائے عبرت'' بنانا چاہتے ہیں یا دنیا کی سب سے بڑی پُرامن جمہوریت۔

جہاں تک ''جشنِ فتح'' کا سوال ہے تو حقیقت یہی کہ بدمست بھارتی فوج نے اپنی چھ گنا طاقت کے زعم میں 6 ستمبر 1965ء کو غیر اعلانیہ جنگ شروع کی جس میں اُسے ذلت آمیز ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔اِس ہزیمت کا اعتراف بھارتی فوج نے بھی کیا اور میڈیا نے بھی ۔ایئر مارشل بھارت کمار نے اپنی کتاب ''دی فسٹ انڈو پاک وار'' میں تسلیم کیا کہ پاکستان کے مقابلے میں بھارت کو زیادہ نقصان

اٹھاناپڑااورپاکستان نے صرف دو دنوں میں 35 بھارتی طیارے تباہ کر دیئے حالانکہ اُس وقت بھارت کے پاس 28 لڑاکا سکوڈرن تھے جبکہ پاکستان کے پاس صرف 11 ۔ٹائمز آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق بھارتی وزارتِ دفاع کے ریکارڈ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ستمبر 65 کی جنگ میں بھارت کو بھاری جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا،تاہم جنگ ہارجیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہو گئی۔بھارتی اخبارات میں بھی تنقید ہو رہی ہے کہ ہارجیت کے بغیر ختم ہونے والی جنگ پر فتح کا جشن چہ معنی دارد۔اگراِس جنگ میں بھارت فتح یاب ہوتا تو پھر وہ اقوامِ متحدہ میں جا کر کبھی جنگ بندی کی بھیک نہ مانگتا اور نہ ہی وہ ''معاہدہ تاشقند'' طے پاتا جسے پاکستانیوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ایوب خاں کو صدارت چھوڑنی پڑی۔تب بھارتی وزیرِ داخلہ نے کہا''کیا پاکستانیوں نے ہمیں اتنا ہی کمزور سمجھ رکھا ہے کہ جنگ بندی کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے ہیں''۔ دورانِ جنگ پاک فوج نے بھارتی جنرل راجندر پرشاد کی فوجی جیپ پر قبضہ کیا۔اِس جیپ میں بھارت کے جنگی منصوبوں کی دستاویزات موجود تھیں جن میں 72 گھنٹے میں مغربی پاکستان پر قبضہ کرنا شامل تھا۔اسی منصوبے کے تحت بھارتی فوج نے 6 ستمبر کو علی الصبح واہگہ بارڈر پر حملہ کر دیا۔بھارتی '' سورماؤں'' کا خیال تھا کہ وہ اسی شام لاہور کے جمخانہ کلب میں شراب کے جام لنڈھاتے جشنِ فتح منائیں گے لیکن ہوا یہ کہ میجر شفقت بلوچ کی صرف 110 جوانوں پر مشتمل کمپنی

نے نہ صرف 10 گھنٹے تک بھارتی بریگیڈ کو روکے رکھا بلکہ پورے بریگیڈ کو جہنم واصل بھی کر دیا۔ دنیا کی جنگی تاریخ میں یہ ایسا ریکارڈ ہے جو آج تک نا قابلِ تسخیر ہے۔ واہگہ بارڈر پر بی آر بی ہماری آخری دفاعی لائن ہے جسے عبور کرنے کی صورت میں لاہور شہر بھارت کے قبضے میں ہوتا لیکن میجر عزیز بھٹی شہید (نشانِ حیدر) نے اپنے پاکیزہ لہو کی ایسی لکیر کھینچی کہ بدمست بھارتی سینا "پورس کے ہاتھی" ثابت ہوئی۔ دینِ مبیں کے پروانے کٹ کٹ کر گرتے رہے لیکن دشمن کو پاک سرزمین پر ایک انچ بھی آگے بڑھنے نہ دیا۔ اِس نہر کو اب "شہیدوں کی نہر" بھی کہا جاتا ہے۔ ذلت آمیز ہزیمت کے بعد بھارتی وزیرِ دفاع نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ " بعض وجوہات کی بنا پر بھارتی فوجیں لاہور اور قصور سیکٹر سے پیچھے ہٹ گئی ہیں اور اِس وقت پاکستانی توپوں کے گولے فیروزپور کے قریب گر رہے ہیں"۔ اُدھر پاکستانی قوم کے جذبہ وجنوں کا یہ عالم کہ لاہوری ڈنڈے لے کر واہگہ باڈر پر پہنچ گئے جنھیں بڑی مشکل سے واپس جانے کے لیے راضی کیا گیا لیکن اِس کے باوجود بھی لاہوری ہر روز صبح فوجی بھائیوں کے لیے اتنا ناشتہ لے کر پہنچ جاتے جو جری جوانوں کی ضرارت سے سو گُنا زیادہ ہوتا۔ جب بھارتی جنگی جہاز لاہور کی فضاؤں میں پہنچتے اور پاکستانی شاہین اپنے شکار پر جھپٹتے تو لاہوری خوفزدہ ہو کر مورچوں میں دبکنے کی بجائے چھتوں پر چڑھ کر "بوکاٹا، بوکاٹا" کی آوازیں لگاتے جس پر ریڈیو پاکستان سے بار بار درخواست کی جاتی کہ وہ چھتوں سے نیچے اتر جائیں تاکہ کسی جانی نقصان کا احتمال نہ

رہے۔اسی 17 روزہ جنگ میں سکوارڈن لیڈر ایم ایم عالم نے چشم زدن میں 6 بھارتی طیاروں کو تباہ کرکے نیا عالمی ریکارڈ قائم کیااور پاک بحریہ نے بھارتی جہاز ’’فریگیٹ‘‘ اوردوارکا (سومناتھ)کا بحری وہوائی اڈہ تباہ کیاجبکہ پاک بحریہ کو معمولی سا بھی نقصان نہیں پہنچا۔اِس سترہ روزہ جنگ میں پاکستان نے 1617 مربع میل علاقے پر قبضہ کیا۔ لڑاکا طیارے،500 ٹینک، سینکڑوں توپیں اور ہزاروں فوجی گاڑیاں تباہ کیں، 130 سیالکوٹ کے چونڈہ سیکٹر پر بھارت نے 600 ٹینکوں سے حملہ کیااوردنیانے دیکھاکہ جری جوانوں نے چونڈہ کو بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بنادیا۔یہ بھی تاریخ کہ اِس جنگ میں پاکستان کا بھارت سے کئی گنا کم نقصان ہوا۔اِس کے باوجود بھی ’’جشن عظیم فتح‘‘؟۔

کچھ اپنوں کے بارے میں

عمرِ عزیز کے بہت سے ماہ وسال درس وتدریس کی نذر کرنے کے بعد ہمیں کالم نگاری کا شوق چرایا اور پھر ہوا یوں کہ ہم کالموں ہی کے ہو رہے۔۔اب تو زندگی کالم لکھنے ،پڑھنے کے گرد گول گول گھومتی رہتی ہے۔ویسے ہمیں کالم لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق ہے حالانکہ اِس ''قبیلے'' کے لوگ تو اپنا لکھا بھی نہیں پڑھتے ، کسی دوسرے کا لکھا کیا خاک پڑھیں گے ۔ کچھ کالم ایسے کہ جنہیں پڑھ کر ''کَکھ'' پلے نہیں پڑتا لیکن کچھ ایسے بھی کہ جنہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہے۔لکھاری قبیلے کے نَو وارد ناصر محمود ملک کا پچھلے دنوں لکھا گیا کالم کچھ ایسا ہی تھا۔یہ کالم دراصل محترم وجاہت مسعود کا خاکہ تھا جو ایسا چٹ پٹا کہ یقیناً وجاہت صاحب نے بھی ''چَسکے'' لے لے کر پڑھا ہوگا۔ناصر ملک کا ہر جملہ شائستہ وشُستہ۔بھاری بھر کم الفاظ کا ایسا استعمال کہ سلاست وروانی میں کہیں رکاوٹ نہیں۔ ہر جملے میں پہلوداری کا ایسا عمدہ استعمال کہ پڑھنے والا ''بحرِ مزاح'' میں بہتا چلا جائے ۔ہم تو جس ناصر ملک کو جانتے ہیں وہ تو ہمیشہ سنجیدگی کی ''بُکل'' مارے رہتا ہے مگر یہ'' چھپا رستم'' پتہ نہیں کون ہے ؟۔اِس ''مولوی ٹائپ'' ناصر ملک کی حسِ مزاح اتنی توانا کہ الحفیظ والاماں۔ہو سکتا ہے یہ گلِ نوخیز اختر کی صحبت کا اثر ہو کہ

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کبوتر با کبوتر، باز با باز

ناصر ملک کے اندر بیٹھے ''شریر بچے'' نے وجاہت مسعود کے '' لتّے لینے ''میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن انداز ایسا کہ کہیں طنز کے نشتر نہیں۔ ویسے اُس نے جو کچھ لکھا، اُس سے ہمیں بھی کلّی اتفاق کہ ہم نے جب بھی وجاہت مسعود کے کالموں کو پڑھنے کا ''حوصلہ'' کیا اپنے پاس پانی کا گلاس اور سَر درد کی گولیاں رکھ کر ہی کیا پھر بھی لاکھ ٹامک ٹوئیاں مارنے کے باوجود ''کچھ'' پلّے نہ پڑا۔ مشکل پسندی تو وجاہت مسعود کے چہرے ہی سے ٹپکتی ہے۔ اسی لیے ہمیں اُن کی علمی ''وجاہت'' کا اُسی طرح اقرار جس طرح مرزا غالب کی شاعری کے پہلے دَور (جسے مشکل پسندی کا دَور کہا جاتا ہے) کے مشاعروں میں اُنہیں بے تحاشہ داد ملتی۔ وجہ اُس داد کی یہ کہ مرزا صاحب کے اشعار اہلِ محفل کے سَروں سے کئی سو گز اوپر سے گزر جاتے لیکن اپنی کم علمی اور کج فہمی کو ایک دوسرے سے چھپانے کی خاطر وہ بڑھ چڑھ کر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے رہتے۔ آپس کی بات ہے کہ بھائی وجاہت مسعود کے کالم ''پلّے'' ہمارے بھی نہیں پڑتے اور نہ آئندہ پڑنے کی توقع کیونکہ ہم نے تو اُن کے کالموں کا ایک ایک جملہ الگ کرکے بھی تفہیم کی کوشش کی پھر بھی ''پلّے'' کچھ نہ پڑا۔ اُدھر ہم ٹھہرے اردو ادب کے اُستاد، اِس لیے اپنی ''اُستادی'' کا بھرم رکھنے کے لیے ہم ''شرموشرمی'' داد دیتے رہتے ہیں۔ ایک دِن ہم نے اپنے میاں (پروفیسر مظہر صاحب) سے وجاہت مسعود کے

کالموں کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملادیئے جس کے بعد ہمارے لیے اور بھی ضروری ہوگیا کہ ہم بھی داد دیتے رہیں کیونکہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم اپنے میاں کے سامنے اپنی کج فہمی کا اقرار کرلیں۔ویسے آخری خبریں آنے تک یہ تصدیق نہیں ہوسکی کہ ہمارے میاں کے پلّے بھی کچھ پڑتا ہے یا وہ بس ''ایویں ای'' ہم پر '' رعب شُعب'' جماتے رہتے ہیں۔ایک اور بات جو خالصتاً ہمارے ارسطوانہ ذہن کی پیداوار ہے، یہ کہ پرائیڈ آف پرفارمنس کا فیصلہ کرنے والی ''کمیٹی'' کے پلّے بھی یقیناً ''کُکھ'' نہیں پڑا ہوگا اسی لیے اُس نے بھی اپنی علمیت کا بھرم رکھنے کے لیے بھائی وجاہت مسعود کو پرائیڈ آف پرفارمنس کا حقدار ٹھہرادیا حالانکہ اِس کے اصل حقدار تو ''ہم'' خود تھے یا پھر گلِ نوخیز اختر جسے عرصۂ دراز تک تو ہم ''محترم '' کی بجائے محترمہ'' ہی سمجھتے رہے۔ یہ عقدہ تو بہت بعد میں واہوا کہ وہ تو ''صنفِ نازک'' کی'' بجائے ''صنفِ کرخت'' سے تعلق رکھنے والا ایسا شخص ہے جو مزاحیہ کالم نگاری میں تیزی سے ارتقائی منازل طے کرتا جارہا ہے۔اُسے جُگت بازی میں ملکہ حاصل ہے۔جہاں قہقہے پورا محلّہ سُن رہا ہو، سمجھ لیجئے وہاں ''جانِ محفل'' گلِ نوخیز اختر موجود ہے۔یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ نوخیز موجود ہو اور محفل زعفران زار نہ ہو۔پروفیسر صاحب سے اُس کا ''اِٹ کھڑکا'' چلتا ہی رہتا ہے۔یوں تو وہ اپنے آپ کو ''وارُستہ طبع'' ثابت کرنے کی بھرپور سعی کرتا ہے لیکن ہے اندر سے ''پکّا مولوی''۔اسی لیے مظہر صاحب نوخیز کے

بارے میں اکثر کہتے ہیں کہ ''قلبِ اُو مومن، دماغش کافراست''۔ مظہر صاحب اور گلِ نوخیز اختر کی ''چشمک'' کی وجہ یہ کہ مظہر صاحب ٹھہرے پکے رجعت پسند اور نوخیز اُن سے ہمیشہ ''اُلٹے پُلٹے'' سوال کرتا ہے۔ شاید وہ گھر سے یہ ارادہ باندھ کے نکلتا ہے کہ

جی چاہتا ہے چھیڑ کے ہوں اُن سے ہمکلام
کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں

اُس کی انہی ''حرکات'' کی وجہ سے مظہر صاحب کا پارہ آسمانوں کو چھونے لگتا ہے۔ وہ ڈرائینگ روم میں بیٹھے چیختے بلکہ چنگھاڑتے رہتے ہیں اور ہم لاؤنج میں بیٹھے اُن کی دھاڑ چنگھاڑ بلکہ للکار سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں تو ہم ڈر جاتے تھے کہ، کہیں یہ ''اِٹ کھڑکا'' تصادم میں نہ ڈھل جائے اور ہمارا ڈرائینگ روم بھی ''پارلیمنٹ'' کا سا منظر پیش نہ کرنے لگے لیکن اب ہمیں بھی ادراک ہو گیا کہ یہ سب ''پھوکی بڑھکیں'' ہیں۔ گلِ نوخیز اکثر ہمارے ہاتھ کے پکے کھانوں کی تعریف کرتا ہے۔ ہم تو اُس کی تعریفوں پر پھول کر ''کُپّا'' ہو جاتے ہیں لیکن مظہر صاحب کے خیال میں وہ صرف مکھن'' ہی لگا رہا ہوتا ہے۔ اُس نوجوان کی ایک لائقِ تحسین خوبی یہ کہ اُس کا ماضی کھلی'' کتاب ہے، ایسی کتاب کہ جسے وہ خود ہی پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سناتا رہتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ اپنا ماضی اتنے دردناک پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ جھوٹ کا گماں ہونے لگے۔ پچھلے

کی سالانہ ورکشاپ میں اُس نے یہی ''آزمودہ گُر'' آزمایا اور ساری PFUC دنوں
محفل کی ہمدردیاں سمیٹ کر یہ جا، وہ جا۔

نہ سمجھوگے تو مِٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو

یہ بھارتی وزیرِاعظم نریندر مودی بھی بڑی خاصے کی شَے ہیں۔اُن کے شیطانی ذہن نے نسلِ نَو کو گمراہ کرنے کے لیے تاریخی حقائق کو مسخ کرتے ہوئے ستمبر 65ء میں اُٹھائی جانے والی ''عظیم ہزیمت'' کو عظیم فتح قرار دے کر ''جشنِ عظیم فتح'' کا اعلان کردیا اور پورے بھارت میں اِس ''عظیم فتح'' کی گولڈن جوبلی تقریبات منانے کا حکم صادر فرما دیا۔انتہا پسند ہندو تنظیموں کے نمائندہ نریندر مودی دراصل اپنی'' لاف زنی'' کے ہتھیار سے نسلِ نَو کو جنگی جنون میں مبتلاء کرکے کسی سانحے کو جنم دینا چاہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بھارت کا اعتدال پسند طبقہ اُن کی شدید مخالفت کررہا ہیااور بھارت میں عام خیال یہی ہے کہ شاید نریندر مودی کی متعصبانہ پالیساں اور جنگی جنوں بھارت کو وسط مدتی انتخاب کی طرف لے جائے کیونکہ بھارتی خوب جانتے ہیں کہ اگرپاکستان کے ساتھ جنگ چھڑی تو یہ روایتی ہتھیاروں کی بجائے ایٹمی جنگ میں ڈھل جائے گی، وہ یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ باطل کے سامنے سرنگوں ہونا پاکستانیوں کی سرشت میں سرے سے شامل ہی نہیں اور افواجِ پاکستان کی جرات ،ہمت ،عزم اور حوصلے پر بھارت تو کیا پوری دنیا حیراں کہ یہ کِس ناجیے کے لوگ جن کی انوکھی وضع ہے، سارے زمانے سے نرالے ہیں

یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
اُنہیں کیا معلوم کہ یہ بستی تو ''خُدا کی بستی'' ہے جس کے باشندوں کو بس ایک ہی سبق ازبَر کہ ''شہید کو مردہ مَت کہو، وہ زندہ ہے اور اپنے رَب کے ہاں سے خوراک حاصل کررہا ہے البتہ تمہیں ادراک نہیں''۔یہی وجہ ہے کہ طاغوت کی ہر یلغار ناکام اور دین مبیں کے متوالے کامیاب وکامران۔ سچ تو یہی کہ

کچھ بات ہے کہ ہستی مِٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دَورِ زماں ہمارا

اور وہ ''کچھ بات'' یہی کہ اِدھر'' اللہ اکبر'' کے نعروں کی گونج میں جری جوان سَر پہ کفن باندھ کر نکلتے اور اُدھر فرشتے قطار اندر قطار نصرت کی نوید سناتے، یہ اعلان کرتے میدانِ کارزار میں اترتے ہیں کہ ''جاءَ الحق وزھق الباطل، ان الباطل کان زھو قا ۔۔۔ سورۃ الاسراء: ۸۰'' (حق آگیا اور باطل مِٹ گیا، تحقیق کہ باطل کو مٹنا ہی تھا) ۔یہی وہ جذبۂ حریت ہے جو ہر مسلمان کے قلب وذہن کو مسخر کرتے ہوئے یہ درسِ خودی دیتا ہے کہ

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

ہندو لالا'' پہلے اپنے اندر یہ جذبہ تو پیدا کرلے، پھر جشنِ فتح بھی منالے''

ستمبر 65ء کی جنگ کے تاریخی حقائق کو مودی صاحب جھٹلا سکتے ہیں نہ اُن کے حواری ۔ حقیقت یہی کہ وہ واہگہ بارڈر ہو یا چونڈہ، کھیم کرن ہو یا کھنور، فاضل کا ہو یا راجستھان، ہر جگہ بھارت کے حصے میں ہزیمت ہی آئی۔ اِس ہزیمت کا بین ثبوت یہ کہ بھارت خود ہی اپنے حلیف روس کے ذریعے جنگ بندی کی بھیک مانگنے اقوامِ متحدہ پہنچا جو معاہدہ تاشقند کی صورت میں سامنے آیا جس کے خلاف پاکستانی قوم کا ردِ عمل بھی تاریخ کا حصّہ ہے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا کہ بھارت نے جنگ بندی کے لیے اقوامِ متحدہ کا سہارا لیا ہو۔ اِس سے پہلے بھی بھارتی فوج کشمیر میں ذلتوں کا سامنا کر چکی۔ ہوا یوں کہ قیامِ پاکستان کے وقت مہاراجہ کشمیر نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا لیکن بعد میں بَدعہدی کرتے ہوئے اُس نے بھارت سے الحاق کا اعلان کر دیا جسے کشمیریوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اُس وقت پاک فوج اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھی اِس لیے کشمیری مجاہدین اور قبائلیوں نے مل کر بھارتی فوج کا راستہ روکا اور جب مجاہدین جموں اور سری نگر پر قبضہ کرنے ہی والے تھے تو بھارت واویلا کرتا ہوا اقوامِ متحدہ پہنچ گیا جہاں امریکہ اور روس کی مدد سے کشمیر میں ''استصواب رائے'' کی شرط پر جنگ بندی کی قرارداد پاس کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ اِس قرارداد پر بھارت کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے عمل درآمد کا اعلان بھی کیا لیکن

اُس ''کشمیری پنڈت'' کے مَن میں پہلے دِن سے ہی کھوٹ تھا اُس لیے اُس نے قرار داد پر عمل درآمد کی بجائے کشمیریوں پر ظلم و بربریت کے سارے دَروا کر دیئے۔ جواہرلال نہرو نے بخشی غلام محمد کی کٹھ پتلی وزارتِ عظمٰی بنا کر اتنے ظلم ڈھائے کہ انسانیت مُنہ چھپانے لگی ۔بھارتی وزیرِ داخلہ لال بہادر شاستری نے بھی وحشت و بربریت کی انتہا کر دی (یہ وہی لال بہادر شاستری تھا جو بعد میں وزیرِاعظم بنا اور معاہدہ تاشقند کے وقت واصلِ جہنم ہوا)۔ کشمیریوں پر ستم کے پہاڑ ٹوٹتے رہے لیکن وہ ڈٹے رہے اور بالآخر 8 اگست 1965ء کو اعلانِ بغاوت کرتے ہوئے مقبوضہ جموں کشمیر میں انقلابی کونسل'' قائم کی جسے بھارت نے پاکستانی'' حملہ آور''قرار دے کر آزاد کشمیر'' پر حملہ کر دیا۔ یکم ستمبر کو پاک فوج نے جب جوابی کارروائی شروع کی اور مقبوضہ کشمیر میں اندر تک گھُس گئی تو بھارت نے 6 ستمبر 65ء کی صبح غیر اعلانیہ جنگ چھیڑ دی ۔پاک فوج نے اپنے سے چھ گُنا بڑی طاقت کو نہ صرف ناکوں چنے چبوائے بلکہ واضح فتح بھی حاصل کی۔اِس 17 روزہ جنگ میں افواجِ پاکستان نے بھارت کے 130 ہوائی جہاز اور 500 ٹینک تباہ کیے ۔7 ہزار فوجی واصلِ جہنم ہوئے اور 8 سو فوجی قیدی بنائے گئے ۔پاک بحریہ نے کوئی نقصان اُٹھائے بغیر بھارت بحری جہاز فریگیٹ اور ''دوارکا کا بحری وفضائی اڈہ بھی تباہ کیا۔ 17 سو مربع میل علاقے پر قبضہ ،ڈھیروں گولہ'' و بارود،امریکی اسلحہ ، توپیں ، گنیں اور 18 ٹینک بالکل درست حالت میں ہاتھ آئے جبکہ پاکستان کا نقصان اِس سے کہیں کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا

۔اگر اسی کا نام "فتح" ہے تو پھر بھارت کو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔
کہے دیتے ہیں کہ ہم پُرامن قوم ہیں اور امن ہی ہماری اولین ترجیح۔بھارتی اپنے
انتہا پسند رہنما پر کان دھرنے کی بجائے اپنی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں جن کے مطابق
شکتی بھی، شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے
لیکن اگر وہ کسی احمقانہ زعم میں مبتلاء ہیں تو پھر
نہ سمجھوگے تو مِٹ جاؤگے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اپنی جاں نظر کروں

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

جتنی ''افواہ ساز'' فیکٹریاں پاکستان میں ہیں شاید دنیامیں اور کہیں نہیں ہوں گی۔ شاید یہ واحد ''جنس'' ہے جس میں پاکستان خود کفیل ہے۔ ہمارے لکھاری چسکے لے لے کر سازشی تھیوریوں کو جنم دیتے رہتے ہیں۔ سیاسی قوتیں باہم دست و گریباں تو بِڈٹرم الیکشن کی باتیں، حالات بہتری کی جانب گامزن ہوں تو سیاسی و عسکری قیادت کے مابین انفاق وافتراق کی جستجو، سانحہ ماڈل ٹاؤن ہوتو کاؤنٹ ڈاؤن شروع اور دھرنا ہو تو امپائر کی ''انگلی'' کی جستجو۔ عسکری قیادت سیلاب زدگان کی مدد کرے، آپریشن ضربِ عضب کو منطقی انجام تک پہنچانے کا عزم کرے، بلوچستان کے علیحدگی پسندوں کی سرکوبی کے لیے صبح ومسا تگ ودَو کرے، پاک چائنا اقتصادی راہداری کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا اظہار کرے اور کراچی کی روشنیاں لوٹانے کا ارادہ کرے تو پھر شورِ قیامت کہ مرکزی حکومت محض عضوِ معطل، سب کچھ فوج کے ہاتھ میں اور کوئی دن جاتا ہے جب ایک دفعہ پھر پاکستان کی فضائیں ''میرے عزیز ہم وطنو!'' سے گونج اُٹھیں گی ۔ایک محترمہ، جن کا یہ عالم کہ ''الجھاؤ ہے زمیں سے، جھگڑا ہے آسماں سے'' اُنہوں نے تو قوم کو متنبہ کر بھی دیا کہ ''پاکستان میں ''منی مارشل لاء'' لگ چکا۔ محترمہ کو ہر بات میں کیڑے نکالنے کی پرانی عادت ہے۔ عدلیہ سے نالاں، عسکری قیادت سے

ناخوش، انتہائے خود پسندی کی صید یہ خاتون اِس وہم میں مبتلاء کہ ضیائے شعور صرف اُسی کا ذہنی اثاثہ، باقی سب نہلے دہلے۔

اگر یہ ''مدبّرانِ عالی مقام'' کبھی چشمِ خرد سے دیکھنے کی زحمت گوارا کرلیں تو اُنہیں اپنی ہی پیدا کردہ افواہوں پر ندامت محسوس ہونے لگے لیکن ضیائے شعور سے تہی، چشمِ بینا سے عاری مگر بزعمِ خویش ارسطوانِ دہر اور طائرانِ سدرہ آشنا اپنے کہے کو حرفِ آخر اور اپنے لکھے کو صحیفۂ آسمانی ثابت کرنے کے لیے ہمہ وقت برسرِپیکار۔ دوستوں کی محفل میں ایک مہربان نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا ''آپ کے ہر کالم میں جنرل راحیل شریف کی تعریف ہی ہوتی ہے''۔ عرض کیا کہ سیاست میں فوجی مداخلت ناقابلِ قبول لیکن جنگیں تو ہمیشہ فوج ہی لڑا کرتی ہے اور اِس وقت ہم حالتِ جنگ میں۔ اندرونی وبیرونی دونوں محاذوں پر حالات مخدوش، بیرونی دشمن واضح لیکن اندرونی چھپا ہوا اِس لیے زیادہ خطرناک۔ پاک فوج ہر دو محاذوں پر قربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کرتی ہوئی اور جوشِ اضطراب سے سیماب وار سپہ سالار اگر بمانند شمعِ جہاں افروز، دیدۂ بیدار کے ساتھ یہ ادراک کرتے ہوئے کہ مجبوروں، مقہوروں اور حلقۂ دامِ تمنا میں اُلجھنے والے سیاہ بختوں کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے تو اِس میں بُرا کیا ہے؟۔ اگر سپہ سالار طلسمِ ظلمتِ شَب کو توڑ کر بہارِ جاوداں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تو کیا اُس کے ہاتھ مضبوط نہیں کرنے چاہییں؟۔ گفتار کے غازی تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتے

ہیں لیکن کردار کا غازی پہلی بار میسر ہوا۔ وہ درآمد شدہ نہیں، خالص پاکستانی ہے جس کے گھر کے در و دیوار خونِ شہیداں سے لہو رنگ۔ جس کا گھر شہیدوں کے پاکیزہ لہو کی خوشبو سے معطر ہو، وہ بھلا ''مارشل لائی تعفن'' سے اپنے گھر کی فضاء کو مسموم کیوں کرنے لگا۔ جو اپنی مقبولیت کی اوج ثریا پہ مقیم ہو، وہ کوئی ایسا فعل سرانجام کیوں دینے لگا جو اسے تاریخی پستیوں کی نظر کر دے۔ مکرر عرض کیا کہ میں نے ہمیشہ ''شریفین'' (میاں نواز شریف، جنرل راحیل شریف) کا ایک صفحے پر ہونا قوم کے لیے ''نیک فال سمجھا اور برملا لکھا کہ پاکستان کی تاریخ میں یہ معجزہ پہلی بار رونما ہوا کہ سیاسی و عسکری قیادت افہام و تفہیم کی رفعتوں کو چھو رہی ہے۔ ایسے میں انتشار کی باتیں وہی کر سکتا ہے جسے ملک سے ہمدردی ہے نہ قوم سے۔ یہی وقت ہے خفتگانِ کنجِ اماں کو جھنجھوڑ کر جگانے اور ایسے لوگوں کو مُنہ توڑ جواب دینے کا جو امتیازِ رفعت و پستی سے محروم محض اپنی سازشی تھیوریوں کے بَل پر زندہ ہیں۔

جب کبھی فضائے بسیط میں اُمید کے دیئے روشن ہونے لگتے ہیں تو انتشار کی آڑھت سجانے والے بھی سرگرم ہو جاتے ہیں۔ اب جبکہ ایٹمی دھماکوں کے بعد معاشی دھماکوں کا موسم قریب آن لگا تو ایک دفعہ پھر حکومت کے جانے کے دن گننے والے اپنے بلوں سے باہر نکل آئے۔ کسی نے اکتوبر کی تاریخ دی تو کوئی دسمبر سے پہلے حکومت کے خاتمے کی شرطیں باندھنے لگا۔ کہا جا رہا ہے کہ جنابِ آصف

زرداری نے دبئی میں ہنگامی اجلاس بلایا ہی اِس لیے ہے کہ استعفوں کے آپشن پر غور کیا جاسکے۔ ایم کیوایم پہلے ہی اسمبلیوں سے استعفے دے چکی اگر پیپلزپارٹی نے بھی اسمبلیوں سے باہر آنے کا فیصلہ کرلیا تو تحریکِ انصاف بھی یقیناً اُن کا ساتھ دے گی اور ایسا کرتے وقت اُسے ہرگز پرواہ نہیں ہوگی کہ ماضی میں اُس کے قائدان دونوں سیاسی جماعتوں کے بارے میں کیا کچھ فرما چکے ہیں کیونکہ یوٹرن لینا اُس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ ایسا ہونے کی صورت میں الیکشن ناگزیر ہو جائیں گے۔ ایسی سازشی تھیوریوں کو جنم دینے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ جب ایک عامی تک بھی یہ افواہیں پہنچ رہی ہیں تو کیا وزیرِاعظم صاحب اور اسٹیبلشمنٹ اِس سے آگاہ نہیں ہو گی؟۔ دراصل ایسی افواہوں کے خالق اپنے تجزیوں کے تانے بانے ہی اِس بنیاد پر بنتے ہیں کہ اِس وقت سول ملٹری ریلیشن شپ انتہائی نازک موڑ پر ہے اور باہمی غلط فہمیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جارہاہے حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں اور حقیقت یہی کہ سول ملٹری تعلقات مثالی ہیں، اتنے مثالی کہ شاید پاکستان کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ ہوئے ہونگے۔ پاک چائنا اقتصادی راہداری کی تکمیل وزیرِاعظم کا خواب اور جنرل راحیل شریف کا بھی، دہشت گردی کے خلاف دونوں یکسو اور کراچی آپریشن پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو ہرگز تیار نہیں۔ دونوں رہنماء ہفتے میں ایک دو بار لازماً سرجوڑ کر بیٹھتے اور ملکی حالات پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔ جنرل صاحب متعدد بار جمہوریت کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ کا اعلان کرچکے وزیرِداخلہ بھی،

بار بار سول ملٹری مثالی تعلقات کا اعادہ کر چکے اور دیگر وفاقی وزراء تو ہر روز ان مثالی تعلقات کے گُن گاتے نظر آتے ہیں لیکن سازشی تھیوریوں پر قلم گھسیٹنے والے ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔ سمجھ سے بالاتر کہ سول ملٹری تعلقات میں خرابی کی افواہوں کو ہوا دینے والے ہمارے عقیل و فہیم تجزیہ نگاروں کو اِس گناہِ بے لذت سے کیا فائدہ ہوگا ۔

ہماری قومی زبان

ہم نے اپنے 17 جولائی کے کالم میں لکھا ’’ بالآخر محترم جسٹس جواد ایس خواجہ کا ’’کھڑاک‘‘ کام دکھا ہی گیا اور حکومتی وکیل نے سپریم کورٹ میں وزیرِ اعظم صاحب کا 6 جولائی کو جاری کردہ حکم نامہ جمع کروا دیا جس کے تحت صدر، وزیرِ اعظم، وزراء اور سرکاری نمائندگان اندرون اور بیرونِ ملک اُردو میں خطاب کیا کریں گے۔ 90 دنوں میں تمام سرکاری و نیم سرکاری ادارے اپنی پالیسیوں اور قوانین کا اُردو ترجمہ کریں گے، عوامی رہنمائی کے سائن بورڈ اُردو میں ہوں گے اور تمام دفتری کارروائی اُردو میں ہی ہوا کرے گی‘‘۔ ہماری اطلاع کے مطابق تقریباً 2 ماہ گزرنے کے باوجود ہماری ’’سوٹڈ بوٹڈ‘‘ بیوروکریسی نے تا حال اِس سلسلے میں ’’کُچھ‘‘ بھی نہیں کیا اور کہا جا سکتا ہے کہ ’’وہی ہے چال بے ڈھنگی، جو پہلے تھی سو اب بھی ہے‘‘۔ چیف جسٹس آف پاکستان محترم جواد ایس خواجہ چونکہ حکمرانوں کے مزاج آشنا اور بیوروکریسی کی ’’حرکتوں‘‘ سے بخوبی آگاہ ہیں اِس لیے اُنہوں نے اپنی مدت ملازمت ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے حکم نامے میں حکمرانوں کو اُن کا عدالتِ عظمیٰ سے کیا گیا وعدہ ایک فیصلے کی صورت میں یاد دلا کر نیا ’’کھڑاک‘‘ کر دیا۔ اب یا تو عدالتِ عظمیٰ کی مقرر کردہ مدت میں اردو کو قومی و سرکاری زبان کا درجہ مل جائے گا یا پھر توہینِ عدالت۔ ویسے حکمرانوں کو یاد رکھنا ہو گا کہ

کبھی کبھی توہینِ عدالت کا ثمر مسندِ اقتدار چھِن جانے کی صورت میں بھی ملتا ہے جیسا کہ ہمارے ''گدی نشین'' کو مِلا اور اب وہ چراغِ رُخِ زیبا لے کر بیتے دنوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ہمیں چونکہ حکمرانوں سے ہمدردی ہے اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ موجودہ دَور میں اُن سے بہتر کوئی متبادل بھی نہیں اِس لیے بہتر یہی ہوگا کہ کوئی ''ہینکی پھینکی'' کیے بغیر سپریم کورٹ کے فیصلے پر اُس کی اصل روح کے مطابق عمل درآمد کر دیں کیونکہ اسی میں اُن کا بھلا ہے۔ ویسے ہمیں شک ہے کہ مقررہ مدت کے بعد بھی حکمران لیت ولعل سے کام لیتے ہی نظر آئیں گے۔ دراصل ہمارے حکمرانوں کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بھی بیوروکریسی ہی ہے جس کے سامنے وہ خود بھی بے بس ہیں۔

ہمارے پاس آئین نامی ایک ایسی کتاب بھی ہے جسے ہم بہت معتبر، متبرک اور مقدس جانتے ہیں لیکن اِس کے کسی بھی آرٹیکل پر عمل درآمد سے ہمیشہ گریزپا، البتہ جہاں ہمارے ذاتی مفادات پر ضرب پڑتی ہو وہاں ہم آئین آئین چلانے لگتے ہیں۔ اسی آئین کے آرٹیکل 251 کے تحت 1988ء تک اُردو کو سرکاری ودفتری زبان کے طور پر رائج ہو جانا چاہیے تھا لیکن 42 سال گزرنے کے باوجود یہ آرٹیکل ہمارے ہر حکمران کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ اب سپریم کورٹ نے یہ حکم نامہ صادر فرمایا ہے کہ آرٹیکل 251 فوری طور پر نافذ العمل ہوگا۔ سوال مگر یہ ہے کہ اِس کا نفاذ تو بیوروکریسی نے کرنا ہے اور بیوروکریسی کے تو اپنے مُنہ انگریزی

بول بول کے ٹیڑھے ہو چکے ہیں وہ بھلا اُردو کا نفاذ کیسے ہونے دیں گے۔ چیف جسٹس صاحب بھلے فیصلہ اُردو میں سناتے رہیں لیکن ہماری بیوروکریسی پر ''ککھ'' اثر نہیں ہونے والا کیونکہ جن کے اپنے بچے آکسفورڈ جیسے اداروں میں زیرِ تعلیم ہوں وہ بھلا ''ٹھاٹ نشینوں'' کی زبان کو کیسے نافذ ہونے دیں گے۔ قائدِ اعظم اَز راہِ تفنن کہا کرتے تھے ''میری اُردو تو تانگے والے کی اُردو ہے'' لیکن اُنہوں نے تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی قومی شناخت کے لیے اُردو کا بطور قومی زبان انتخاب کیا لیکن 68 سال گزرنے کے باوجود ہمارے ''بابوؤں'' نے انگریزی زبان، لباس اور تہذیب و معاشرت کو ہی اپنا اثاثہ جانا۔ اب بھی نفاذِ اُردو کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہوں گے۔

عدالتِ عظمیٰ نے اپنے فیصلے میں لکھا ''حکومت کی جانب سے اِس عدالت کے روبرو عہد کرتے ہوئے جولائی 2015ء کو اِس حوالے سے عمل درآمد کی جو میعاد مقرر کی گئی ہے اُس کی ہر حال میں پابندی کی جائے''۔ ہمارے چیف جسٹس جواد ایس خواجہ صاحب بھی ''بھولے بادشاہ'' ہی نکلے۔ جس عہد کی پابندی کا وہ حکم دے رہے ہیں اُس کی مدت ختم ہونے میں بس مہینہ، سوا مہینہ ہی باقی ہے۔ آج تک تو اِس پر کچھ کام ہوا نہیں تو پھر کیا اگلے تیس، چالیس دنوں میں ہو جائے گا؟۔ اطلاعاً عرض ہے ''مقتدرہ قومی زبان'' تو 1981ء میں ہی اپنی سفارشات پیش کر چکی جن پر 34 سال گزرنے کے باوجود رائی کے دانے کے برابر بھی عمل نہیں

ہواتوکیااِس قلیل ترین مدت میں ہو جائے گا؟۔اگر بات عدلیہ کے ’’رعب شُعب‘‘ کی ہے تو مشتری ہوشیار باش ،ہم توآئین کوپرکاہ.برابر حیثیت نہیں دیتے پھر بھلاآئین کے ماتحت عدلیہ کس کھیت کی ’’مولی گاجر‘‘ ہے۔ یہ بجاکہ جولائی 2015ء میں ہمارے حکمرانوں نے عدالتِ عظمیٰ کے روبرو یہ عہدکیاکہ 3 ماہ کے اندروہ سب کچھ کردیا جائے گاجو 8 اگست کے فیصلے میں لکھاگیالیکن مکرر عرض ہے کہ جس عہدکی پاسداری کاحکم ہمارے بھولے بادشاہ (جوادایس خواجہ) دے رہے ہیں اُس کا مسلمہ اصول ہمارے بڑے’’طے کرچکے۔جب پوری قوم اِس اصول کو جانتی ہے توپھر اُردو کو بطور دفتری‘‘ زبان رائج کرنے کاحکم دینے والا عدالتی بنچ بھی جانتاہی ہوگاکہ ’’وعدے قُرآن وحدیث نہیں ہوتے‘‘۔

جسٹس جوادایس خواجہ کی سربراہی میں جسٹس دوست محمد خاں اور جسٹس قاضی فائز عیسٰی پر مشتمل تین رکنی بنچ نے 9 نکات پر مشتمل جوحکم نامہ جاری فرمایاہے اُن پر عمل درآمد کی کوئی صورت اِس لیے بھی نظرنہیں آتی کہ یہ سب کچھ طبقۂ اشرافیہ کوپسند ہے نہ بیوروکریسی کو۔ عدلیہ نے توکہہ دیاکہ ’’جب ریاست اِس بات پر مصر ہوجائے کہ وہ زبانیں جوپاکستانی شہریوں کی اکثریت بولتی ہے ،اِس قابل نہیں کہ اِن میں ریاستی کام انجام پاسکے توپھر ریاست اِن شہریوں کو حقیقی معنوں میں اُن کے انسانی وقار سے محروم کررہی ہے۔اسی طرح جب ریاست پاکستانی شہریوں کو معاشی اورسیاسی مواقع تک رسائی سے محض اِس

بناپر محروم کردے کہ وہ اپنی قومی یا صوبائی زبانوں پر تو عبور رکھتے ہیں مگر انگریزی زبان نہیں جانتے تو وہ اِن کو قانون کی نظر میں برابری کے حق سے محروم کردیتی ہے ۔لہذا آرٹیکل 251 کا عدم نفاذ پاکستانی شہریوں کی اکثریت کو، جو ایک غیر ملکی زبان سے ناواقف ہے ،بنیادی حقوق سے محروم کرنے کا سبب بن رہا ہے''۔ دست بستہ عرض ہے کہ راندۂ درگاہ اور مجبوروں ، مقہوروں کے صرف فرائض ہی فرائض ہوتے ہیں حقوق نہیں۔ جن حقوق کی بجاآوری کا حکم دیا جارہاہے وہ قوم کو پہلے کبھی ملے، نہ ہی، آئندہ ملنے کی توقع ۔

صدا کر چلے

پاکستان میں سیاسی شعور کو جلا بخشنے میں سب سے مؤثر کردار ہمارے آزاد اور بیباک میڈیا کا ہے۔ دَس، بارہ سال پہلے صرف پی ٹی وی ہی ہوتا تھا جو دن رات صرف حکومتِ وقت کے گُن گاتا رہتا۔ پھر پرویز مشرف کے دَور میں الیکٹرانک میڈیا کا رواج ہوا، نیوز اور انٹرٹینمنٹ چینلز کھلنے شروع ہوئے اور کھلتے ہی چلے گئے۔ انٹرٹینمنٹ چینلز نے اسلامی تہذیب و تمدن اور معاشرت کی دھجیاں بکھیر کے رکھ دیں اور نیوز چینلز کی بدولت سیاسی شعور بیدار تو ضرور ہوا لیکن تصادم کی فضاء اور چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے کے ذمہ دار بھی یہی۔ نیوز چینلز پر بیٹھے ''کھمبیوں'' کی طرح اُگے اینکرز اور ''اینکرنیوں'' (نذیر ناجی انہیں چھاتہ بردار کہتے ہیں) کا مطمعٔ نظر چینلز مالکان کو ریٹنگ دینا خواہ اِس کے لیے حقائق کو کتنا ہی توڑ مروڑ کر پیش کیوں نہ کرنا پڑے۔ ناظرین کسی بھی مرد یا خاتون اینکر کو دیکھ کر ہی پہچان جاتے ہیں کہ اُس نے کس سیاسی جماعت کے حق میں ڈنڈی مارنی ہے۔ تسلیم کہ کچھ اینکر ایسے بھی جو صحافت میں کثافت کی آمیزش سے بالاتر اور بیزار لیکن یہ ہیں کتنے ؟۔۔۔ کہتے ہیں کہ ایک گندی مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے لیکن جہاں پورا تالاب ہی گندی مچھلیوں سے بھرا ہو وہاں چند'' اچھی مچھلیاں ''بیچاری سوائے تڑپنے، پھڑکنے کے اور کر بھی کیا سکتی

ہیں۔اصل مسئلہ یہ کہ ''سیٹھوں'' نے خالصتاً کاروباری نقطۂ نگاہ سے الیکٹرانک میڈیا کا رُخ کیااور اب چاروں طرف یہی سیٹھ دندناتے پھرتے ہیں جنہیں قوم سے کوئی غرض نہ ملکی مفاد سے۔ اُنہیں تو بس ریٹنگ چاہیے کہ ریٹنگ ہی سے اُن کی تجوریاں بھر سکتی ہے۔اب تو''ماشاء اللہ'' ریٹنگ بڑھانے اور''نمبروَن'' بننے کے لیے ایسے ایسے حربے استعمال کیے جارہے ہیں کہ سَر شرم سے جھک جاتے ہیں۔

پرنٹ میڈیا کا حال بھی کم وبیش یہی ۔روزمرہ کے واقعات سے ہر کوئی آگاہ کہ دوردراز دیہاتوں میں بھی ٹی وی موجود ۔اخبارات کے مستقل قارئین کی ساری توجہ کالموں، تجزیوں اور تبصروں پر لیکن یہاں بھی محض چندہی لوگ جوآ بروئے صحافت باقی سب ڈنگ ٹپاؤ'' مہم پر نکلے ہوئے۔سیاسی جماعتوں کی تواپنی اپنی ڈفلی اور اپنااپنا راگ،'' ہر کوئی بزعمِ خویش اُفقِ سیاست کا ماہِ منور اوراپنے بیچ میں ''حسبِ ذائقہ'' جھوٹ کا تڑکہ لگانے کا ماہر لیکن اب تو یہ مرضِ بَد ہمارے لکھاریوں میں بھی بدرجہ اتم موجود کہ اپنے ممدوح کی مدح سرائی میں اتنا جھوٹ تو''عین عبادت''ہے دوستو! ۔اگراتنا بھی نہ کرسکے توپھر درِ ممدوح پہ ''کس مُنہ سے جاؤگے ۔۔۔۔''کچھ لکھاری ایسے بھی جن کے پاس کالموں کا پیٹ بھرنے کے لیے جب کچھ باقی نہیں بچتا تو وہ ذاتی تعلقات کی نمائش کی ''پوٹلی'' کھول بیٹھتے ہیں۔اُن کا خیال ہے کہ ایسے کالموں سے ''رعب شُعب''

بھی پڑتا ہے اور ''ٹھور ٹھور'' بھی ہو جاتی ہے۔ قاری پر تو اِس کا ''دُکھ'' اثر نہیں ہوتا البتہ لکھاری کا احساسِ کمتری ضرور ظاہر ہو جاتا ہے۔

نوجوان کالم نگاروں کی ایسی ''نئی (PFUC) پاکستان فیڈرل یونین آف کالمسٹس نویلی'' تنظیم ہے جو فی الحال تو ایسی آلائشوں سے پاک ہے۔یہی وجہ ہے کہ قلیل ترین عرصے میں یہ تنظیم بغیر کسی ''سیاسی پناہ'' کے اپنا ''دھماکے دار'' تعارف کروا چکی۔ اچھی بات یہ کہ خارزارِ صحافت میں قدم رکھنے والے یہ نوجوان لکھاری اکثر سینئر لکھاریوں سے کَسبِ فیض حاصل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تراشتے رہتے ہیں لیکن مطمعٔ نظر یہ ہرگز نہیں کہ

اپنی طرف سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے

اخبار میں تو نام میرا چھاپ دیجئے

یہ تو نوجوانوں کا ایسا گروہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔اِس ۔''انبوہِ لکھاریاں'' میں آپ کو پیپلزپارٹی کے جیالے بھی مِل جائیں گے اور نوازلیگ کے متوالے بھی، تحریکِ انصاف کے شیدائی بھی اور جماعتِ اسلامی کے فدائی بھی، لیکن سبھی باہم شیر وشکر،ایک دوسرے کی بات سننے ، سمجھنے ،ماننے والے کہ نقطۂ ارتکازفلاح واصلاح معاشرہ۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر ہماری سیاسی جماعتیں بھی ملک و قوم کو رفعتوں سے روشناس کرانے کی خاطر ان

نوجوانوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے ایسا ہی ''اکٹھ'' کرلیں تو ملک کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ یہ ہماری خواہش تو ہو سکتی ہے لیکن ہم آپ سبھی جانتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن تھا ہے اور نہ ہوگا۔ اِن نوجوانوں کی تعریف و توصیف میں کچھ لکھنا کارِ بیکار کہ ''ہاتھ کنگن، کو آرسی کیا ہے'' البتہ قلیل ترین عرصے میں اپنے قدم جما لینے والوں کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ ''ہونہار بِروا کے چکنے چکنے پات''۔ اب ایسا بھی نہیں کہ وہ کامل ہو چکے، ابھی بہت سا سفر باقی اور ارتقائی منازل کے سبھی زینے سدِّ راہ۔ ایک خوف بہرحال دامن گیر کہ جب یہ نوجوان اپنی مقبولیت کی (انشاء اللہ) انتہاؤں کو چھونے لگیں گے تو کہیں اِن کی گردنوں میں بھی ''مقبولیت کا سریا'' تو نہیں آ جائے گا؟۔

پچھلے دنوں PFUC کے زیرِ انتظام ''فنِ کالم نگاری'' پر سالانہ تربیتی ورکشاپ کا سوائے ہوٹل میں اہتمام کیا گیا جس میں سینئر کالم نگار مجیب الرحمٰن شامی، سجاد میر، ڈاکٹر اجمل نیازی، گلِ نوخیز اختر، سلیمان عابد، اختر عباس، پروفیسر رشید انگوی اور ڈاکٹر شفیق جالندھری سمیت ملک بھر سے آئے ہوئے چیدہ و چنیدہ لکھاریوں نے شرکت کی۔ اِن احباب نے مختلف یونیورسٹیوں سے آئے ہوئے جرنلزم کے طلباء کو فنِ کالم نگاری کی نئی جہتوں سے آگاہ کیا، لُبِ لباب یہ کہ اچھا کالم وہی جو دِل سے نکلے اور دِل میں ترازو ہو جائے۔ تقریب کے اختتام پر سینئر کالم نگاروں نے شرکاء میں ایوارڈز اور اسناد تقسیم کیں۔ یہ پُر رونق

اور پُر وقار تقریب پاکستان فیڈرل یونین آف کالمسٹس کے عبدالماجد ملک، حافظ زاہد کے میرِ کارواں PFUC اور فرخ شہباز کی کوششوں اور کاوشوں کا ثمر تھی۔ اب یہ شہزاد چودھری کا فرضِ عین ہے کہ اگر انہوں نے جذبۂ تعمیر کے ساتھ یہ "لشکر" ترتیب دیا ہے تو پھر اس کی کچھ اِس ڈھب سے رہنمائی بھی کریں کہ وہ اپنے کالموں میں غیر جانبداری کا بھرم رکھتے ہوئے تعمیری تنقید کرتے ہوئے بے جا توصیف سے پرہیز کریں کیونکہ یہی وہ راہ ہے جس میں ملک و قوم کی بہتری مضمر اور صحافت، عبادت میں ڈھل سکتی ہے۔ اِن نوجوانوں کے جوش و جنوں کو دیکھ کر دِل سے دعا نکلتی ہے کہ

خُدا کرے کہ میری ارضِ پاک پہ اُترے
وہ فصلِ گُل کہ جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

اُردو کا نفاذ، آئینی تقاضا

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔سرگوشیاں

اُس دبنگ شخص نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ پاکستان کا موجودہ نظامِ انصاف لوگوں کو انصاف کی فراہمی میں ناکام ہوچکا جس کی ذمہ داری ججوں ،وکیلوں اور معاشرے کے منفی رویوں پر عائد ہوتی ہے۔ انصاف کی سب سے اونچی مسند پر بیٹھے محترم جوادایس خواجہ کو نظامِ انصاف کی بہتری کے لیے صرف بائیس دِن ملے جنہیں وہ بائیس سالوں میں تو نہ ڈھال سکے لیکن پھر بھی کچھ فیصلے ایسے کر گئے جو اُنہیں تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ''امر'' کرنے کے لیے کافی ہیں۔اُردو کو تین ماہ کے اندر بطور قومی وسرکاری زبان اختیار کرنے کا حکم بھی انہی فیصلوں میں سے ایک ہے۔یہ فیصلہ محترم جوادایس خواجہ کی ذاتی خواہش نہیں بلکہ ایک آئینی تقاضا تھا جو گزشتہ 42 سالوں سے کسی ایسے ہی حکم کا منتظر تھا۔73ء کے آئین کے آرٹیکل 251 کے مطابق1988ء تک اُردو کا بطور قومی وسرکاری زبان نفاذ ہو جانا چاہیے تھا لیکن ہمارا آئین تو اشرافیہ کے گھر کی باندی اورافسر شاہی کے گھر کی لونڈی ہے۔یہ تو موم کی وہ ناک ہے جسے نظریۂ ضرورت کے تحت جس طرف چاہیں ، موڑا جاسکتا ہے۔اگر آئینی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو 73ء کے آئین کو عشروں پہلے اسلامی قالب میں ڈھل جانا چاہیے تھا لیکن

اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات آج بھی جوادایس خواجہ جیسے دبنگ شخص کے حکم کی منتظر ہیں۔ہو سکتا ہے موجودہ چیف جسٹس انور ظہیر جمالی ایسا کر جائیں کہ دینِ مبین اُن کا مطلوب اور بہت مرغوب۔

قائدِاعظم نے 21 مارچ 1948ء کو ڈھاکہ میں اپنی گرج دار آواز میں کہا ''میں آپ کو واضح طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی ،صرف اُردو اور اُردو کے سوا کوئی زبان نہیں ہوگی''۔ حضرتِ قائدنے یہ الفاظ اُس ماحول میں ادا کیے جب اُنہیں بار بار یہ مشورہ دیا جا رہا تھا کہ چونکہ مشرقی پاکستان میں ''بنگالی'' کو قومی زبان کا درجہ دینے کے لیے شدید احتجاج ہو رہا ہے اِس لیے مصلحت سے کام لیا جائے لیکن قائدؒ نے ایسے مشوروں کو پرکاہ برابر بھی حیثیت نہ دیتے ہوئے دبنگ لہجے میں اُردو کے سرکاری زبان قرار دیا اور تاریخ بتاتی ہے کہ جب حضرتِ قائدؒ کے مُنہ سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے تب پورے مجمعے پر گھمبیر خاموشی طاری تھی اور اُن کی تقریر کے بعد بھی کسی قسم کا کوئی احتجاج نہ ہوا۔اگر قائد کے اِعلان کو مدِنظر رکھا جائے تو پھر 42 نہیں 68 سال گزرنے کے بعد اُردو زبان کی آبرو کے ایک محافظ نے قائدؒ کے فرمان کی بجاآوری کرتے ہوئے حاکمانِ وقت کو اُردو کے نفاذ کا حکم دیا لیکن سلگتا ہوا سوال یہ ہے کہ کیا قائدؒ کے فرمان اور آئینی تقاضوں کی بجاآوری ممکن ہوگی؟۔۔۔ مرکزی حکومت نے جولائی 2015ء کو سپریم کورٹ میں اُردو کے نفاذ سے متعلقہ کیس کے سلسلے 6

میں یہ جواب جمع کروایا تھا کہ 3 ماہ کی مدت میں اُردو کا بطور قومی و سرکاری زبان مکمل نفاذ کر دیا جائے گا۔ سپریم کورٹ نے بھی اسی جواب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فیصلہ سنایا اور حکومت کو اپنے عہد کی پاسداری کا حکم دیا۔ اگر اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو ''عہد کی پاسداری'' میں صرف 18 دن باقی ہیں۔ کیا حکمران اِن اٹھارہ دنوں میں اُردو زبان کا مکمل نفاذ کر پائیں گے ؟۔ اگر نہیں تو پھر کیا موجودہ چیف جسٹس محترم انور ظہیر جمالی حکمرانوں کی جواب طلبی کریں گے یا پھر کوئی نیا ''نظریۂ ضرورت'' گھڑ لیا جائے گا؟۔

جب سے سپریم کورٹ کا فیصلہ سامنے آیا ہے تہذیبِ مغرب کے ذہنی غلاموں کہ نوحہ خوانی جاری ہے۔ سب سے بڑا اعتراض یہ کہ عصرِ حاضر میں ساری سائنس اور ٹیکنالوجی اقوامِ مغرب کا ورثہ ہے اور اُن کی زبان انگریزی ۔ اِس لیے سائنسی اصطلاحات کا اُردو ترجمہ ممکن نہ اِن کا کوئی متبادل۔ اُردو کی تاریخ سے ناواقف یہ '' ذہنی غلام'' شاید نہیں جانتے یا جاننا نہیں چاہتے کہ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب '' لشکر'' ہے اسی لیے اِس کو ''لشکری زبان'' بھی کہا جاتا رہا۔ یہ وہ زبان ہے جو عربی ، فارسی ، ترکی ، سندھی بلوچی ، پشتو ، پنجابی ، برج بھاشا ، کھڑی بولی ، سنسکرت اور انگریزی زبانوں کا ملغوبہ ہے، اور اِس زبان میں بہرحال یہ گنجائش موجود ہے کہ یہ کسی بھی زبان کا کوئی بھی لفظ بغیر کسی ترمیم و اضافے کے اپنے دامن میں سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ذہنی

غلام اگر تھوڑی سی توجہ فرماتے ہوئے اردو زبان کا مطالعہ کرنے کی کوشش کریں تو اُنہیں ٹیکنالوجی اور سائنسی اصطلاحات سمیت انگریزی کے ایسے بیشمار الفاظ مل جائیں گے جو بغیر کسی ترمیم واضافے یا تلفظ کی تبدیلی کے اردو زبان میں موجود اور مستعمل ہیں۔اِس لیے یہ اعتراض انتہائی بیہودہ اور بے بنیاد ہے کہ سائنسی اصطلاحات کا متبادل تلاش کرنا ممکن نہیں کیونکہ بحالتِ مجبوری ایسی اصطلاحات کو بعینہٖ اردو میں شامل کیا جا سکتا ہے۔1981ء میں ''مقتدرہ قومی زبان'' نے جو سفارشات پیش کی تھیں وہ آج بھی اپنے نفاذ کی منتظر ہیں اور مقتدرہ قومی زبان کے مطابق تمام علوم کو اردو میں ڈھالنا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اگر جرمنی ،فرانس ،روس ،چین ،جاپان ،اٹلی ،ناروے ، سپین حتیٰ کہ ایران تک اپنی اپنی قومی زبان میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں تو پاکستان کیوں نہیں ؟۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں تو آج سے سو سال پہلے سائنسی اور میڈیکل علوم اُس وقت اردو میں پڑھائے جاتے تھے جب اِس کا ذخیرہ الفاظ موجودہ دَور کی نسبت انتہائی محدود تھا۔اگر تب ایسا ممکن تھا تو اب کیوں نہیں ؟۔

تبصرہ نگاروں کے اِن تبصروں سے کلی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ نفاذِ اردو کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری ''افسر شاہی'' ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ افسر شاہی کی تربیت ہی کچھ اِس ڈھب سے کی جاتی ہے کہ وہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی اپنے آپ کو حاکم اور عامیوں کو محکوم سمجھنا شروع کر دیتی ہے۔ میاں شہباز شریف

بھلے اپنے آپ کو خادمِ اعلیٰ کہتے پھریں لیکن اُن کی چھتر چھایہ میں پلنے والی افسر شاہی کسی بھی صورت میں اپنے آپ کو ''خادم'' سمجھنے کو تیار نہ جذبۂ خدمت سے سرشار۔ یہ المیہ صرف پنجاب تک محدود نہیں بلکہ پورا پاکستان ہی حاکمیت کا شوق رکھنے والی خودسَر افسر شاہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ یہ افسر شاہی بھلا سرکاری سکولوں کے پڑھے ''عامیوں'' کی زبان کا نفاذ کیسے ہونے دے گی؟۔ اُن کے تو ذہنوں میں یہ خنّاس سما چکا ہے کہ اردو گھٹیا درجے کی زبان ہے جو صرف عامیوں کے لیے ہے، افسروں کے لیے نہیں اور یہ خوف بھی دِل میں جا گزیں کہ اگر اردو زبان کا نفاذ کر دیا گیا تو پھر کیا فرق رہ جائے گا خادم اور مخدوم میں؟۔

عالمی یومِ جمہوریت

بی بی جمہوریت کا عالمی دِن خاموشی کی ''بُکل مارے'' آیا اور گزر بھی گیا۔چونکہ ہم اور ہمارے حکمران '' انتہائی'' جمہوریت پسند ہیں اِس لیے جہاں ہمارے ''کھُتّے سکنے'' کاڈر ہوتاہے وہاں ہم جمہوریت کی زُلفِ گرہ گیرکے اسیر ہو کر جمہوریت ، جمہوریت چلانے لگتے ہیں۔ہمارے حکمرانوں کو بھی تحریکِ انصاف کے 126 روزہ دھرنوں میں جمہوریت کی یادنے بہت ستایااور وہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کواکٹھا کرکے جمہوریت کی گھنی سیاہ زلفوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے رہے لیکن جونہی دھرنوں کا موسم ختم ہواتو پھر''تُوں کون تے مَیں کون'' ۔جمہوریت بہترین انتقام کہنے والی پیپلزپارٹی کے سربراہ زرداری صاحب کسی کی'' اینٹ سے اینٹ'' بجاتے بجاتے باہر کھسک لیے اوراب دور بیٹھے جمہوریت کاراگ الاپ رہے ہیں۔مجنونِ جمہوریت نے کہا''جمہوریت انتخاب کرواکر اقتدار سیاسی پارٹیوں اور افراد کو منتقل کرنے کانام ہی نہیں بلکہ قانون کی حکمرانی ،آئین کی حدود کا احترام ،شفاف اور مساویانہ احتساب ،برداشت اور سیاسی مخالفین کی رائے کے احترام کانام ہے''۔اپنے پانچ سالہ دَورِحکومت میں توزرداری صاحب کویہ سب کچھ یادنہیں تھاکہ تب تووہ اقتدارکے نَشے میں دھت تھے۔تب توبیچاری جمہوریت ''نیر'' بہاتی پھرتی تھی اورغالباََیہ اُنہی کادَورِ حکومت تھاجب

عدلیہ کے فیصلوں کو پرکاہ برابر بھی حیثیت نہ دی جاتی۔ سیاسی برداشت اور سیاسی مخالفین کی رائے کے احترام کا یہ عالم کہ پنجاب میں گورنر راج اُنہی کے حکم پر لگا۔ شفاف اور مساویانہ احتساب کا اُن کی لغت میں یہ مطلب کہ "اُٹھو تے پھٹّو"۔ اب جب آہنی ہاتھ اُن کے گریبان تک پہنچ گئے تو اُنہیں بھی "بی بی جمہوریت" کا حسن یاد آ گیا۔ وہ خود تو الطاف حسین کی طرح محفوظ جگہ پہ جا بیٹھے اور اب "حسنِ جمہوریت" سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے "گلِ نوخیز" بلاول بھٹو زرداری کو سیاسی اکھاڑے میں اتار دیا۔ بلاول نے لاہور میں "کھڑاک" کرنے کی کوشش تو بہت کی لیکن بات بنی نہیں۔ سچی بات ہے کہ ہم تو بلاول کی تقریر سے اُسی طرح لطف اندوز ہوتے رہے جیسے گلِ نوخیز اختر" کے کالموں کو پڑھ کر۔ بلاول جو کہتا اُس کے چہرے کے تاثرات اُس" کا ساتھ نہ دیتے۔ وجہ یہ کہ اُس کے سامنے "رومن" میں لکھی اُردو تقریر تھی جس کے ہر جملے کو اُسے تین، تین بار دیکھنا پڑتا۔ اسی لیے وہ اپنی "اداکاری" کا رنگ جما نہ سکا۔ آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ بلاول اگر اسی تقریر کو "رٹا" لگا کر فی البدیہہ تقریر کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتا تو یقیناً رنگ چوکھا ہوتا اور جیالوں کو بھی بی بی شہید یاد آ جاتی۔ اُس نے اپنی تقریر کے خاتمے پر سٹیج سے جیالوں کے درمیان چھلانگ لگا کر اپنے نانا بھٹو مرحوم کا سا تاثر قائم کرنے کی کوشش تو ضرور کی لیکن وہ صرف آصف زرداری کا سا تاثر ہی قائم کر سکا، جن کا نامِ نامی اسمِ گرامی یاد آتے ہی نہ صرف غضب کرپشن کی ساری

عجب کہانیاں یاد آ جاتی ہیں بلکہ اُن کا مسٹر ٹین پرسینٹ سے مسٹر سینٹ پرسینٹ تک کا سفر بھی۔ شنید ہے کہ بلاول اپنے نام کے ساتھ لگا ''زرداری'' کا لاحقہ ہٹانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ دروغ بَر گردنِ راوی، اُسے ناہید خاں اور صفدر عباسی نے قائل کر لیا ہے کہ جیالے ''بلاول بھٹو زرداری'' کو نہیں صرف ''بلاول بھٹو'' کو پسند کرتے ہیں کیونکہ اب تو زرداری صاحب کی کرپشن کی داستانیں گلی گلی میں، جن سے جیالے بھی بیزار۔

بلاول نے کہا ''پنجاب پر ایسے حکمران مسلط کر دیئے گئے جو بابا بُلھے شاہ کی دھرتی پر کسی سزا سے کم نہیں''۔ بالکل بجا کہا اُس نوجوان نے، ہم تو خود کافی عرصے سے اندر کھاتے'' یہ تحریک چلا رہے ہیں کہ پنجاب کو کسی ''خادم'' کی ضرورت ہے نہ '' اعلیٰ'' کی۔ ہمیں تو سیّد قائم علی شاہ جیسا وزیرِ اعلیٰ چاہیے جس کا مشیرِ خصوصی '' ڈاکٹر عاصم اور مشیرانِ عمومی محمد علی شیخ، منظور کاکا، انور مجید اور سومرو جیسے لوگ ہوں۔ اگر ان سب پر فریال تالپور کو ''نگرانِ اعلیٰ ''مقرر کر دیا جائے تو سونے پر سہاگہ۔

اگر ہماری تجویز کردہ ٹیم پنجاب کا انتظام و انصرام سنبھال لے تو یہ جو خادمِ اعلیٰ ''ایویں خواہ مخوا'' اپنی انگشتِ شہادت لہراتے پھرتے ہیں، ایک تو اِس ''انگشت'' سے نجات مِل جائے گی اور دوسرے وہ افسر شاہی بھی ہمیں دعائیں دے گی جو ''وَخت'' میں پڑی ہوئی ہے۔ بلاول نے یہ بھی بالکل درست کہا ''میرے پنجاب کو دہشت گردوں کے یاروں کے حوالے کر دیا

گیا''۔ ہمارے ایجنڈے میں تو ہمیشہ یہ رہا ہے کہ پنجاب کے ''انتظامی امور'' جمہوریت پسند ایم کیو ایم کے حوالے کر دیئے جائیں کیونکہ جس طرح سانپ کے کاٹے کا تریاق بھی سانپ کا زہر ہی ہوتا ہے اسی طرح ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ دہشت گردوں کا علاج صرف دہشت گردی سے ہی ممکن ہے اور یہ کام ''را'' کے تربیت یافتہ ایم کیو ایم کے ٹارگٹ کلرز'' بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ کتنا مزہ آئے جب پنجاب کی سڑکوں پر'' را'' کے تربیت یافتہ ٹارگٹ کلرز دندناتے پھریں اور یہ ''موئے'' دہشت گرد اُن کے خوف سے کونوں کھدروں میں چھپتے پھریں۔ اِس سلسلے میں اگر محبِ وطن پیپلز پارٹی کی خدمات بھی حاصل کر لی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اُن کے پاس بھی عزیر بلوچ اور بابا لاڈلا جیسی ''عظیم'' جمہوریت پسند شخصیات موجود ہیں۔

بلاول نے کہا ''6 مہینے میں بجلی لانے کے وعدے کہاں گئے؟۔ میاں صاحب ! بتائیں بجلی نہ لا سکنے والوں کو کس نام سے پکارا جائے؟''۔ بلاول پریشان نہ ہو، اُس کے انکل'' خود ہی اپنے لیے کسی اچھے سے نام کی تلاش میں ہیں کیونکہ ''خادمِ اعلیٰ'''' بہت پرانا ہو چکا۔ ویسے بھی اگر اگلی بار وہ صرف پنجاب کی بجائے ملکی خدمت کا بیڑا اُٹھانے کو تیار ہو جاتے ہیں تو پھر خادمِ اعلیٰ تو اُنہیں ''سُوٹ'' ہی نہیں کرے گا کیونکہ جس طرح کرپشن کی داستانیں سنتے ہی پیپلز پارٹی کے ''سنہری اَدوارِ حکومت'' یاد آ جاتے ہیں اُسی طرح خادمِ اعلیٰ

نہ صرف پنجاب بلکہ جا وبیجا سڑکوں، پُلوں، میٹرو بسوں اور گرین لائین منصوبوں کے
لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ جیسے ایٹمی دھماکوں کی مناسبت
سے اُس دن کا نام ''یومِ تکبیر'' رکھا گیا اور آجکل اُسی کی دیکھا دیکھی ملک ریاض بحریہ
ٹاؤن لاہور اور کراچی کی عظیم مساجد کے نام کی تلاش میں ہیں، خادمِ اعلیٰ بھی اپنے لیے
کوئی اچھا سا نام تجویز کرنے کے لیے اخبارات میں اشتہار دے دیں تاکہ ہم بھی
قسمت آزمائی'' کرتے ہوئے اُن کا نام ''خادمِ ملّت'' رکھ سکیں۔ اگر اُنہیں ہمارا مجوزہ''
نام پسند آگیا تو پھر ہمارے ''وارے نیارے'' ہو جائیں گے اور ''بلّے بلّے'' بھی۔

تم پہ قرباں ہے اپنی جاں

بَداصل وبَداعمال ،بَدعہد وبَدکار ،بَدباطن وبَداطوار طالبان نامی دہشت گرد مسلمان تو کجا انسان کہلانے کے لائق بھی نہیں۔ لازۂ انسانیت سے تہی یہ نابکار ونابنجار ناستک ہیں، پکے ناستک کہ ادیانِ عالم میں سے کسی دین کے ساتھ بھی اِن کا کوئی تعلق نہیں کہ کوئی بھی دین وحشت وبربریت کی اجازت نہیں دیتا۔ لادین وحشیوں کا یہ بزدِل ٹولہ دینِ مبیں کی آڑ میں گاہے بگاہے اپنی یزیدیت کے ثبوت فراہم کرتارہتا ہے۔ کہنے کو تو یزید بھی مسلمان ہی تھا لیکن حقیقت یہ کہ

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

میرا دین تو بچوں ،بوڑھوں ، عورتوں اور ہتھیار نہ اٹھانے والوں کے لیے جائے اماں ہے لیکن یہ کیسے لوگ ہیں جن کازور ہی معصوم اور بے گناہ لوگوں پہ چلتاہے۔اِن بَدخُو وبَدنہاد وحشیوں کی دست بردسے کوئی مسجد محفوظ ہے نہ مکتب۔ پہلے جی ایچ کیو راولپنڈی کی پریڈلین مسجد میں بارگاہِ ایزدی میں جھکے نمازیوں پر حملہ آور ہوئے اور مسجد کے درودیوار کو معصوم شہیدوں کے پاکیزہ

لہو سے رنگین کر گئے پھر آرمی پبلک سکول پشاور کے معصوم فرشتوں کو خونم خون کیا اور اب پشاور کے نواحی علاقے بڈھ بیر کے متروک فضائی مستقر کی اقامتی کالونی پر چڑھائی کی اور نشانہ یہاں بھی ربِ لم یزل کی بارگاہ میں سجدہ ریز نمازی۔ افواجِ پاکستان کے جذبۂ شوقِ شہادت سے لبریز جرّی جوانوں نے ہر جگہ اور ہر مقام پر ان وحشیوں کو واصلِ جہنم کیا۔ فضائی مستقر (ایئر بیس کیمپ) پر حملہ کرنے والے تمام، 13 دہشت گرد جہنم کا ایندھن بنے لیکن 20 نہتے نمازیوں سمیت 29 افراد بھی شہادت کا جام پی کر بارگاہِ ایزدی میں سرخ رُو ہوئے۔ یہ شوقِ شہادت ہی تھا جو نوجوان کیپٹن اسفندیار بخاری کو متروک فضائی مستقر تک کھینچ لایا۔ اُن کا تو کوئیک ریسپانس فورس سے براہِ راست کوئی تعلق ہی نہیں تھا لیکن جونہی اُنھوں نے دہشت گردوں کے حملے کے بارے میں سنا، اُن کے تَن بدن میں شوقِ شہادت انگڑائیاں لینے لگا۔ وہ اپنے آفیسر سے اجازت لے کر کوئیک ریسپانس فورس میں شامل ہوئے اور یوں یہ ثابت کر چلے کہ

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

عشقِ حقیقی سے لبریز اِن جری جوانوں کا تو مطلوب و مقصود ہی شہادت ہوتا ہے۔ اسی ایئر بیس کے 3 ٹیکنیشنز اگر چاہتے تو اپنی جان بچا سکتے تھے۔ ویسے بھی ایک ٹیکنیشن کا تو جنگ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا لیکن یہ بھی نعرۂ تکبیر بلند

کرتے ہوئے نکلے اور دہشت گردوں پر ٹوٹ پڑے، 5 دہشت گردوں کو واصلِ جہنم کیااور خود بھی رتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ باقی 8 وحشیوں کو کوئیک ریسپانس فورس نے جہنم کا ایندھن بنایا۔اِس سانحے کے فوری بعد چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف اور ایئر چیف مارشل سہیل امان پشاور پہنچ گئے، وزیرِاعظم میاں نواز شریف بھی اپنا ''لواری ٹنل'' کا دورہ منسوخ کرکے پشاور پہنچے اور زخمیوں کی عیادت کے علاوہ شہداء کی نمازِ جنازہ میں بھی شرکت کی۔اعلیٰ ترین سیاسی وعسکری قیادت کا یوں اکٹھے ہونا بہرحال یہ توثابت کرگیا کہ جہاں قومی وقار کا سوال اُٹھے گا، وہاں پوری قوم ایک صفحے پر ہوگی۔اِس میں کوئی شک نہیں کہ دہشت گردوں کی کمر ٹوٹ چکی اور روزانہ کی بنیاد پر ہونے والے بم دھماکے اور دہشت گرد حملے اب مہینوں میں ہوتے ہیں۔اِس لیے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ بجھتے دیئے کی ''آخری لَو'' ہے، دیا جب بجھنے لگتا ہے تو اُس کی لَو ایک دفعہ بھڑکتی ضرور ہے۔ہماری سیاسی وعسکری قیادت کو اب صرف اِس بھڑکتی لَو'' کا ہی سدِّباب کرنا ہے۔ شنید ہے کہ سول اور ملٹری قیادت اگلے تین دنوں'' میں کسی بھی وقت سَرجوڑ کر اس اَمر کا جائزہ لینے کے لیے بیٹھے گی کہ اِس ''بھڑکتی لَو'' کا سدِّباب کیونکر ممکن ہے۔

آئی ایس پی آر کے ترجمان میجر جنرل عاصم باجوہ نے پریس بریفنگ میں بتایا کہ حملہ آور نہ صرف افغانستان سے آئے تھے بلکہ حملے کی منصوبہ بندی بھی افغان

سرزمین پر ہی کی گئی اور افغانستان سے ہی اُنہیں ہدایات مِل رہی تھیں۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ دہشت گردی کی اِس واردات میں افغان حکومت یا ریاست ملوث نہیں۔ مانا کہ افغان حکومت اِس دہشت گردی میں براہِ راست ملوث نہیں ہو گی لیکن یہ تو اب کوئی راز نہیں کہ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہے اور افغانستان اِس کا بیس کیمپ جہاں بھارت نے دہشت گردوں کی تربیت کے لیے اڈے قائم کر رکھے ہیں اور اِن اڈوں کے عوض افغان حکمرانوں کو بھاری رقوم بھی عطا کی جاتی ہیں۔ حملہ آوروں کا نمازِ فجر کے وقت خانۂ خُدا میں گھُس کر نمازیوں کو بے دریغ شہید کرنا ثابت کرتا ہے کہ یہ دہشت گرد مسلمان ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ یقیناً اسلام اور پاکستان دشمن قوتوں کے آلہ کار تھے اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ بھارت اور امریکہ کو اقتصادی راہداری قبول ہے نہ پاکستان میں امن وامان ۔ایک طرف لائن آف کنٹرول پر چھیڑ چھاڑ اور دوسری طرف افغانستان کے راستے دہشت گردی کو بھارت نے اپنا وطیرہ بنا رکھا ہے۔ مقصد وہی جس کا ہم اپنے کالموں میں کئی بار ذکر کر چکے کہ ایٹمی پاکستان کی اقتصادی مضبوطی بھارت کو کسی بھی صورت قبول نہیں کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو خطے میں ایک تو اُس کی چودھراہٹ پر براہِ راست ضرب پڑے گی جو بھارتی دہشت گردوں کے لیے یقیناً ''ضربِ عضب'' سے کم تر نہیں ہو گی اور دوسرے انتہا پسندانہ ذہنیت کے حامل مخبوط الحواس بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کا ''اکھنڈ بھارت'' کا خواب بھی ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ دوسری طرف امریکہ بہادر کو

بھی پاک چائنا اقتصادی راہداری قبول نہیں کہ جہاں ایک طرف اُس کے دِل میں ''ایٹمی پاکستان'' کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے تو دوسری طرف یہ ''عالمی چودھری'' نہیں چاہتا کہ چین جیسی کوئی طاقت اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کی ''چودھراہٹ'' کو چیلنج کرے۔ وہ تو گوادر کی بندرگاہ پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے بہانہ بنا کر افغانستان پر حملہ آور ہوا تھا مگر ہوا یہ کہ اُس نے افغان جنگ میں اپنی معیشت کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا لیکن پھر بھی گوادر کی بندرگاہ ہاتھ آئی نہ ''گریٹر بلوچستان'' کا خواب
پورا ہوا۔ اقتصادی راہداری پر اُس کی تلملاہٹ کا اصل سبب یہ ہے کہ نہ صرف اقتصادی طور پر مضبوط چین مزید مضبوط ہو جائے گا بلکہ پاکستانی معیشت بھی مضبوط بنیادوں پر استوار ہو جائے گی جو امریکہ اور بھارت دونوں کے لیے کسی سانحے سے کم نہیں ہوگا۔

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

جانے کیوں خیالات کی امر بیل نے جکڑ رکھا ہے۔ عشروں پہ محیط زندگی کے سفر کا ایک ایک منظر نظر کے سامنے، یوں جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ وہ چٹکتے غنچے، مہکتی کلیاں، لہلہاتا سبزہ دمکتی شبنم، سبز کمخواب بُنتی کھیتیاں، سونا اُگلتے کھلیان، فلک بوس چوٹیاں، جنت نظیر وادیاں، گنگناتے جھرنے، بل کھاتی ندیاں، جھومتی گھٹائیں، معطر فضائیں، نکھرتے منظر، بدلتے موسم، کوئل کی کو کو، پپیہے کی پی کہاں، چڑیوں کی چہکار، بوستانوں کی مہکار اور سب سے بڑھ کر اٹوٹ رشتوں میں بندھی زندگی۔ بخدا یہ الفاظ کی میناکاری ہے نہ لفظی بازیگری، یہ سب نظارے میرے دیس کے تھے اور ہیں، یہ الگ بات کہ اب یہ نفرت وکدورت، منافرت ومنافقت اور لسانیت وفرقہ واریت کی دُھن میں گم۔ یہ تاریخ کہ نوزائیدہ پاکستان اتنی تیزی اور تیز رفتاری سے ترقی کی راہ پہ گامزن کہ دنیا انگشت بدنداں۔ کوریا نے ترقی کا راز پانے کے لیے وفد بھیجا، اقوامِ عالم ایک ابھرتی ہوئی اسلامی طاقت کے تخمینے لگاتی رہی لیکن ہوا یہ کہ

ساری دنیا کو تلقین کرتے رہے، ذوقِ تعمیر کی حسنِ تدبیر کی

خود تباہی کی جانب رہے گامزن، ہائے دیوانہ پن ہائے دیوانہ پن

ہم نے اتنی ترقیِ معکوس کی کہ دنیاایک بار پھر انگشت بدنداں، آمریتوں نے ڈیرے ڈالے ،ملک دولخت ہوااور ''اسلام کی تجربہ گاہ'' کو سوشلزم اور سیکولرازم کا گھُن چاٹنے لگا۔رہی سہی کسر دائیں اور بائیں بازو کی تفریق نے یوں پوری کی کہ ہم اپنوں کے خلاف ہی سینہ سپر، باہم دست و گریباں۔ ہماری دعائیں بھی مستجاب نہیں کہ ہمارا خُدا سے تعلق کسی بگڑے بچے کی مانند۔ واللہ یہ ''جگ بیتی'' نہیں ''ہڈبیتی'' ہے جس کی پوری قوم گواہ کہ جس نے

یہ جو کچھ ہے جہاں میں اِس کے بیش و کم کو یکھا ہے

ہمیں کیا دیکھتے ہو ، ہم نے اِک عالم کو دیکھا ہے

سارا قصور آمریتوں کا بھی نہیں کہ سلطانیٔ جمہور کے دعویدار بھی آمریت کے علمبردار۔ پتہ نہیں یہ سلطانیٔ جمہور کی کونسی قسم ہے کہ دلیل کا جواب الزام اور الزام کا بَدزبانی بَدکلامی اور کبھی کبھی گالی بھی۔ لفظ تو موتیوں کی لڑی ہوتے ہیں لیکن ہمارے مہربانوں، کے ہاں لفظ خنجر، لفظ نشتر۔ جنوں تو بس ایک کہ اقتدار کی مسندِ زرنگار ہاتھ آ جائے ، باقی سب جائے بھاڑ میں۔ کششِ اقتدار کا یہ عالم کہ درِ آمر پر زانوئے تلمذ تہ۔ بھٹو مرحوم، ایوب خاں کی اٹھارہ رکنی کابینہ کے واحد سول وزیر، ایوب خاں کو ''ڈیڈی'' کہنے والے ۔میاں نواز شریف ضیاء الحق کو اتنے محبوب و مرغوب کہ اُس نے دعا دی ''خُدا کرے کہ اسے میری عمر بھی لگ جائے''۔ بی بی بینظیر کو پاکستان آنے کے لیے آمر مشرف کے این آر او

کی چھتری کا سہارا لینا پڑا۔
پرویز مشرف کو دَس بار وردی میں منتخب کروانے کے دعویدار گجرات کے چودھری۔ نیا پاکستان بنانے اور قوم کی تقدیر بدلنے کے بلند بانگ دعوے کرنے والے عمران خاں نے آمر کے جھنڈے اٹھائے ،اُس کے ریفرنڈم کی حمایت میں گلی گلی ڈھول بجائے مقصد پھر وہی کہ اقتدار کا ہما سَر پہ بیٹھ جائے۔ جب اقتدار مقدر نہ ٹھہرا تو آمریت کی مکروہات یاد آنے لگیں۔ کچھ ''شرپسندوں'' نے دوبارہ اقتدار کا جھانسا دے کرورغلایا تو پھر امپائر کی انگلی کی یاد ستانے لگی، یہ تک نہ سوچا کہ احتجاجی سیاست اور دھرنوں سے ملک و قوم کو کتنا نقصان ہوگا۔ ایم کیوایم ہر آمر کی ''بی ٹیم'' رہی کہ اسے اپنی وحشتوں اور دہشتوں کے لیے کسی ایسے ہی سہارے کی ضرورت ۔ حقیقت ، تلخ حقیقت یہی کہ اُدھر آمریت مسلط ہوئی اور اِدھر میر جعفر و صادق تھوک کے حساب سے ۔یہ صرف سیاستدانوں پہ ہی موقوف نہیں، اِس حمام میں تو سبھی ننگے۔ عدلیہ نے بھی ہر آمر کے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے ''نظریۂ ضرورت'' پیدا کیا، کسی کو آئین یاد آیا نہ قانون البتہ صرف چند لوگ جو ضمیر کی آواز پر گھر بیٹھ رہے یا پابندِ سلاسل۔ چند دیوانوں کے سوا میڈیا بھی دست و بازو کہ آتشِ شکم کی سیری کے لیے یہ لازم۔ مکرر عرض کہ سارا قصور آمریتوں کا نہیں، ہمیں اپنے گریبانوں میں بھی جھانکنا ہو گا۔

اب البتہ فضاؤں میں دِل خوش کُن سرگوشیاں کہ تیرگی کے مہیب جنگل میں اِک شمع فروزاں ہو گئی جس کی ضیاء سے خودرو گلوں پر سبک روتتلیاں محوِ رقص، خزاں رسیدہ اشجار پر اُمید کی کونپلیں پھوٹنے لگیں ،زعفرانی مہک کے آثار نمایاں۔ منادی ہے یہ اِس امر کی کہ بہار کے پلٹ آنے کا موسم قریب آن لگا کیونکہ جراح وقت نے اپنے عزمِ صمیم کے نشتر سے ارضِ وطن کی نَس نَس میں بھرے موادِ بَد کی جراحی کا ارادہ کر لیا۔ اب عرشِ رعونت کے خداؤں کی خدائی اِس خوف سے لرزاں بَر اندام کہ فرعونی دستاروں کی طرف اٹھتے ہاتھ اب رُک نہ پائیں گے۔ ہمارا ایمان کہ یہ سعادت بحکمِ ربی چیدہ و چنیدہ لوگوں کے حصّے میں ہی آتی ہے۔ یقین ہو چلا کہ

کوئی ہو موسم تھم نہیں سکتا رقصِ جنوں دیوانوں کا
زنجیروں کی جھنکاروں میں شورِ بہاراں باقی ہے
برگِ زرد کے سائے میں بھی جوئے ترنم جاری ہے
یہ تو شکستِ فصلِ خزاں ہے، صوتِ ہزاراں باقی ہے

یہ اعجاز ہے اُس افہام و تفہیم کا جو پاکستان کی تاریخ میں شاید پہلی بار سول اور ملٹری قیادت کے مابین دیکھی جا رہی ہے۔ تجزیہ نگار لاکھ کہیں لیکن حقیقت یہی کہ ”شریفین“ ایک صفحے پر، اُن کا مقصد ایک اور منزل بھی ایک۔ نواز لیگ نے اپنے منشور میں کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا قوم سے وعدہ کیا لیکن

طریقۂ واردات" انوکھا اور نرالا۔ سبھی جانتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کی کچھ مجبوریاں" ہوتی ہیں۔ اگر نواز لیگ کرپشن کے مگرمچھوں پر براہِ راست ہاتھ ڈالتی تو گلی گلی شور اُٹھتا، جلسے ہوتے، جلوس نکلتے، دھرنے دیئے جاتے۔ شاید اسی لیے "باہمی مشاورت" سے یہ سعادت سپہ سالار کے حصّے میں آئی۔ اُن کے آہنی ہاتھ بلاامتیاز کرپشن کے مگرمچھوں کے گریبانوں پر، پھر بھی کوئی شور نہیں، سبھی گُم سُم اور اینٹ سے اینٹ بجانے کے دعوے کرنے والے مفرور۔

میں نہیں مانتا

ہم تو مخدوم جاوید ہاشمی کو ہی باغی سمجھتے رہے لیکن اب پتہ چلا کہ اصل باغی تو ہمارے کپتان صاحب ہیں جن کے مقابلے میں جاوید ہاشمی تو ''کَکھ'' بھی نہیں۔ ہمیں کپتان صاحب کی بغاوت کا ادراک تھا اسی لیے ہم نے نواز لیگیوں کو بہت سمجھایا کہ ''نہ چھیڑ ملنگاں نوں'' لیکن ''اثر اُن پر ذرا نہیں ہوتا''۔ شاید اُنہیں بھی ''چسکے'' لینے کی عادت سی ہو چلی ہے۔ اب دیکھئے ناں ! یہ ''چسکا'' نہیں تو اور کیا ہے کہ ایاز صادق کو ایک دفعہ پھر میدان میں اتار دیا۔ خیال تو یہی تھا کہ وہ بھی خواجہ سعد رفیق کی طرح سپریم کورٹ سے حکمِ امتناہی حاصل کر لیں گے لیکن وہ تو لنگوٹ کَس کے میدان میں ہی اتر آئے اور کپتان صاحب کو ''وَخت'' میں ڈال دیا۔ ''وَخت'' میں اِس لیے کہ 2002ء کے انتخابات میں ایاز صادق نے اُنہیں 19 ہزار اور 2013ء کے انتخابات میں 9 ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ اِس سے پہلے میاں نواز شریف صاحب عمران خاں کو 5 ہزار کے مقابلے میں 50 ہزار ووٹوں سے شکست دے چکے۔ متکبر لیگئیے کہتے ہیں کہ اب 50 ہزار ووٹوں سے شکست دیں گے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ''اندر کھاتے'' نواز لیگ سے ملے ہوئے الیکشن کمیشن نے ہمارے کپتان صاحب کو ضمنی انتخابات میں عبد العلیم خاں اور جہانگیر ترین کے حلقوں میں انتخابی مہم چلانے سے منع

کردیا حالانکہ یہ دونوں اصحاب تو خاں صاحب کی ''جندجان'' ہیں کیونکہ لمبے چوڑے عطیات توانہی سے ملتے ہیں۔ اگر تحریکِ انصاف کے یہ دمکتے ستارے ''روٹھ'' گئے تو ہم ڈی جے بَٹ تو کجا ٹینٹ سروس والوں کو بھی پیسے دینے کے قابل نہیں رہیں گے ۔ ہیرے موتیوں کے بھاؤ بِکنے والے اِن ''نگینوں'' کی انتخابی مہم میں حصّہ نہ لینے کے حکم نے خاں صاحب کو مغضوب الغضب کردیا اور اُنہوں نے اعلانِ بغاوت کرتے ہوئے کہہ دیا ''ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو ، میں نہیں جانتا ، میں نہیں مانتا''۔ خاں صاحب کی اِس بغاوت پر ہم بہت خوش ہیں کہ ایک دفعہ پھر ''دھوم دھڑکا'' ہوگا لیکن تھوڑے تھوڑے ڈرے ہوئے بھی کہ کہیں سپریم کورٹ اُنہیں ''پھڑکا'' کے نہ رکھ دے اور الیکشن کمیشن اُن کی ''پکّی پکّی چھُٹّی'' نہ کروادے۔ اگر کارزارِ سیاست میں خاں صاحب نہ ہوئے تو جلسے جلوسوں اور دھرنوں میں ''کَکھ سواد'' نہیں آئے گا۔ یہ بجا کہ 20 جنوری 2013ء کو الیکشن کمیشن نے تمام سیاسی جماعتوں کی مشاورت سے 40 نکات پر مشتمل ضابطۂ اخلاق جاری کیا جس میں ضمنی انتخابات کے لیے یہ شِق بھی شامل تھی کہ الیکشن شیڈول کے اعلان کے بعد صدر ، وزیرِاعظم ، سپیکر وڈپٹی سپیکر، چیئرمین وڈپٹی چیئرمین سینٹ ، گورنر ، وزرائے اعلیٰ ، وزراء ، وزرائے مملکت اور وفاقی وصوبائی اراکین نہ تو کسی حلقے کادورہ کریں گے اور نہ ہی خفیہ یااعلانیہ طورپر کوئی پیش کش کریں گے، عطیہ دیں گے نہ وعدہ کریں گے اور کسی منصوبے کاافتتاح کریں گے نہ منصوبے کاوعدہ کریں گے لیکن کپتان صاحب جیسی عظیم ترین ہستی کے

استثناء کے لیے کوئی ''نظریۂ ضرورت'' گھڑا جا سکتا تھا جو خاں صاحب کے ازلی ابدی دشمن الیکشن کمیشن نے گھڑا، نہ گھڑنے کا ارادہ اِس لیے بغاوت تو بنتی ہے دوستو! ۔

خاں صاحب تو خیر قومی لیڈر رہیں لیکن یہاں تو چیونٹیوں کے بھی پَر نکل آئے۔ سپریم کورٹ نے ''نفاذِ اُردو'' کا حکم صادر فرمایا لیکن ہماری افسر شاہی نے کہا ''ظلم کے ضابطے ہم نہیں مانتے''۔ نفاذِ اُردو انگریزوں کے ذہنی غلاموں پر تو ظلم ہی کے مترادف ہے، لیکن ہماری قومی شناخت ؟۔ ''نفاذِ اُردو تحریک'' کے شعبہ خواتین کی صدر اور نفاذِ اُردو کی جذباتی حامی محترمہ فاطمہ قمر سے اکثر اِس موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ اُن کا بھی یہی خیال ہے کہ نفاذِ اُردو کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ''افسر شاہی'' ہی ہے ۔افسر شاہی کو تو رکھیے ایک طرف، یہاں تو کئی لکھاری بھی ''جترِز'' ہو رہے ہیں۔ایک معروف اخبار کے لکھاری جو ماشاء اللہ'' بیرسٹر'' بھی ہیں، اُنھوں نے انگریزی زبان کے حق میں کالم لکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ میاں نواز شریف کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اُردو کی بجائے انگریزی میں خطاب کرنا چاہیے، وجوہات اُنھوں نے دو بتلائیں لیکن دلائل ناقص اور بھونڈے۔پہلی وجہ یہ کہ مترجم کبھی بھی اصل الفاظ اور جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتا، مثال یہ کہ ''پنجابی کا کرپشن کے بارے میں ایک جملہ یا محاورہ ہے ''اوتھے اَنّی پئی ہوئی اے'' جس کا انگریزی میں

۔'' عرض ہے کہ کیا یہ Blind woman as lying there مترجم نے ترجمہ یوں کیا قصور پنجابی زبان کا ہے یا اُس نااہل اور نالائق مترجم کا جسے اتنا بھی نہیں پتہ کہ پنجابی میں ''انی پئ'' کا مطلب کرپشن ہوتا ہے۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ مترجم ہمیشہ وہی شخص ہوتا ہے جسے دونوں زبانوں پر عبور ہو۔ چلیں مان لیا کہ مترجم نالائق تو کیا میاں صاحب کی اُردو میں کی جانے والی تقریر کا بامحاورہ انگریزی میں ترجمہ کرکے مترجم کو نہیں دیا جا سکتا؟۔ جنرل اسمبلی سے ہر ملک کا سربراہ اپنی قومی زبان میں ہی خطاب کرتا ہے لیکن ایسا لطیفہ'' سُنانہ سُننے کا امکان جیسا کہ بیرسٹر صاحب نے لطائف کی کسی کتاب سے پڑھ '' کراپنے کالم کی زینت بنادیا۔ بیرسٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ''میرا مشورہ ہے کہ وزیرِ اعظم پاکستان اقوامِ متحدہ میں انگریزی زبان میں تقریر کرکے یہ پیغام دیں کہ ہم پاکستانی تعصب کی سیاست سے پاک ہیں''۔ بجاارشاد، سوال مگر یہ کہ کیا چین، روس، فرانس جاپان، جرمنی اور دیگر ممالک جو اپنی قومی زبان میں خطاب کرتے ہیں وہ سبھی، بیرسٹر صاحب کی نگاہ میں متعصب ٹھہرے اور تعصب سے پاک صرف انگریزی میں تقریر کرنے والے؟۔ ایسی بھونڈی دلیل کی کسی بیرسٹر سے تو بہرحال توقع نہیں کی جاسکتی لیکن چونکہ وہ بیرسٹر ہیں اِس لیے ''جو چاہے اُن کا حسنِ کرشمہ ساز کرے''۔ ابھی کل ہی کی بات ہے عظیم چین کے صدر تین روزہ دورے پر پاکستان تشریف لائے اور دورانِ قیام اُنہوں نے انگریزی کا ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ کیا وہ بھی بیرسٹر صاحب کی نظر میں متعصب ٹھہرے؟۔ ویسے

بیرسٹر صاحب کو اتنا تو پتہ ہی ہوگا کہ سپریم کورٹ کی حکم عدولی کی سزا کیا ہے ؟۔ کیا بیرسٹر صاحب چاہتے ہیں کہ میاں نواز شریف صاحب بھی ''میں نہ مانوں'' کا نعرہ لگا کر اپنا انجام یوسف رضا گیلانی جیسا کروالیں ؟۔

آئینہ اُن کو دکھایا تو بُرا مان گئے

2013ء کے عام انتخابات میں نواز لیگ نے وعدے بھی بہت کیے اور دعوے بھی لیکن اڑھائی سال گزرنے کے باوجود اُن کے وعدے محض ادھورے خواب۔ اگر پچھلے اڑھائی سالوں میں کچھ نہیں ہو سکا تو اگلے اڑھائی سالوں میں حکمران کیا تیر مار لیں گے۔ پیپلزپارٹی کے گزشتہ دَورِ حکومت میں سب سے زیادہ شور لوڈشیڈنگ کے خلاف تھا اور حقیقت یہی کہ اسی لوڈشیڈنگ نے پیپلزپارٹی کو "نکرے" لگا دیا۔ اب یہی لوڈشیڈنگ نواز لیگ کے ساتھ بھی "ہتھ" کرنے جا رہی ہے۔ سابق وزیرِاعظم راجہ پرویز اشرف کا نام ہی لوگوں نے "راجہ رینٹل" رکھ دیا، اب نندی پور پاور پروجیکٹ اور سولر پارک پر انگلیاں اُٹھ رہی ہیں۔ یہ "پھڈے" ابھی درمیان میں ہی تھے کہ "نیپرا" نے بھی "کھڑاک" کر دیا۔ نیپرا رپورٹ کے مطابق 70 فیصد صارفین کو غلط بِل بھیجے جاتے ہیں، میٹر ریڈنگ زیادہ کی جاتی ہے، بجلی کا نیا میٹر سسٹم ناکارہ، شارٹ فال جعلی اور لوڈشیڈنگ جان بوجھ کر کی جاتی ہے۔ بعض پاور پلانٹس کی مشینیں 3 سال سے بند ہیں، تھرمل پاور پلانٹ کی انتظامیہ نے جان بوجھ کر مشینوں اور پاور یونٹس کو بند کر رکھا ہے۔ نیپرا کی یہ رپورٹ حکومتی کارکردگی پر سوالیہ نشان ہے۔ پتہ نہیں یہ ہیسکو، لیسکو، کیسکو، فیسکو، میپکو، آئیسکو اور اُس جیسی دوسری بلائیں کہاں سے آن ٹپکیں جنہوں نے

قوم کا جینا دوبھر کر دیا۔ حکومت کو چاہیے کہ ''اِسکو، اُسکو، سَبکو'' ختم کرکے ''ڈِسکو'' میں ضَم کردے تاکہ حکمران نچاتے اور ہم ناچتے رہیں۔ پتہ نہیں اِس فراڈ کی ذمہ داری پانی و بجلی کے وزیر خواجہ آصف قبول کرتے ہیں یا پھر خود وزیرِاعظم صاحب لیکن یہ طے کہ بجلی کے بِلوں کی صورت میں عوام کی جیبوں پر جو ''بجلی'' گرائی گئی اُس کا کوئی ''والی وارث'' نہیں کہ مجبوروں، مقہوروں کی بھلا کون سنتا ہے۔ ویسے بھی اصول یہی کہ ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' اور حکمران اسی فارمولے پر عمل پیرا۔ اگر'' مہربانوں کا یہی وطیرہ رہا تو پھر کہے دیتے ہیں کہ 2018ء کے انتخابات دور نہیں۔

سوال مگر یہ کہ اگر نواز لیگ سے دامن چھڑا لیا جائے تو پھر کون سی ایسی جماعت ہے جو قومی اُمنگوں پر پوری اتر سکتی ہے؟۔ کیا قاف لیگ جس نے اقتدار کی خاطر درِ آمریت پہ زانوئے تلمذ تہ کیا، یا پھر ایم کیو ایم جو ہمیشہ آمروں کی بی ٹیم رہی، جس نے عروس البلاد کراچی کو خونم خون کر دیا۔ کیا پیپلز پارٹی، جو کئی بار حکومت میں آئی لیکن ہمیشہ اُس کا نعرہ بقول سیّد مشاہد حسین ''لُٹو تے پھُٹو'' ہی رہا یا پھر تحریکِ انصاف جس کی کوئی کَل'' سیدھی نہیں اور جس کا اندازِ سیاست یہ کہ''

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

کپتان صاحب کے معیار پر سیاسی جماعتیں پوری اترتی ہیں نہ الیکشن کمیشن اور نہ ہی عدلیہ۔ نواز لیگ ، پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم سے الجھاؤ عیاں مگر یہاں تو عالم یہ کہ اُن کی نگاہوں میں کوئی جچتا ہی نہیں۔ اُن کے قریب ترین عزیز حفیظ اللہ نیازی نے اُن کے بارے میں لکھا "روزِ اوّل سے سیاست کی ساری اُمیدیں سیاسی جماعتوں کی موت سے نتھی ہیں ، نا اُمیدی جناب کی دیکھا چاہیے ، جب کوچۂ سیاست میں قدم رنجہ فرمایا ، اُمید ، خواہش آرزو ، آسرا ، ایک ہی ، صدر فاروق لغاری دونوں پارٹیوں کو چلتا کریں۔ "سنجیاں ، گلیاں" میں سیاست سجانے کا شوق آج بھی اُسی طرح موج زن "۔ حفیظ اللہ نیازی نے یہ کیا لکھ دیا ، بھائی ! آپ تو عشروں تک کپتان صاحب کے رازداں رہے۔ آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے لیکن پتہ کر لیجیے کہ آپ کا کالم پڑھ کر کپتان صاحب کہیں ہر وقت یہ گنگناتے تو نہیں رہتے کہ

کیا غمخوار نے رسوا ، لگے آگ اِس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

خواجہ سعد رفیق ، ایاز صادق اور صدیق بلوچ الیکشن ٹریبونلز کی مہربانی سے نا اہل قرار پائے تو تحقیقاتی کمیشن کی "ڈسی" تحریکِ انصاف کے تنِ مُردہ میں جان پڑ گئی۔ جلسے ، جلوسوں ، ریلیوں اور دھرنوں کی باتیں ہونے لگیں اور

NA-154 سونامیوں نے بھی ''لنگوٹ'' کس لیے لیکن سپریم کورٹ نے حلقہ لودھراں کے صدیق بلوچ کی رکنیت بحال کرکے نیا ''کھڑاک'' کردیا اوراِس حلقے میں کروڑوں صرف کرنے والے جہانگیر ترین ہاتھ ملتے رہ گئے۔ غصے میں بھرے کپتان صاحب نے بنی گالہ میں پریس کانفرنس کرتے ہوئے الیکشن کمیشن اور نواز لیگ پر اُنہی الزامات کی ایک دفعہ پھر بوچھاڑ کردی جن کا ذکر وہ گزشتہ اڑھائی سالوں سے متواتر کرتے چلے آرہے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ نواز شریف کبھی اپنے امپائر کے بغیر نہیں کھیلتے، الیکشن کمیشن حکمرانوں کا زرخرید اور پنجاب پولیس حکمرانوں کی ''گلو بٹ''۔ اُنہوں نے اپنے احتجاجی پروگرام میں ردوبدل کرتے ہوئے یہ اعلان بھی کردیا کہ 4 اکتوبر کو ڈی چوک اسلام آباد کی بجائے حلقہ 122 لاہور میں جلسہ ہوگا، 9 اکتوبر کو الیکشن کمیشن کے خلاف لاہور میں احتجاج اور پھر 11 اکتوبر کے بعد سونامیوں کا رُخ ڈی چوک اسلام آباد کی طرف موڑ دیا جائے گا۔ غالباً ہمارے کپتان صاحب کو بھی قومی اسمبلی کے حلقہ 122 میں واضح شکست نظر آرہی ہے اسی لیے اُنہوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ڈی چوک کا انتخاب 11 اکتوبر کے بعد کیا ہے کیونکہ یہ تو طے ہے کہ اِس حلقے میں عبدالعلیم خاں کی شکست کو تحریکِ انصاف ''ٹھنڈے پیٹوں'' ہضم نہیں کرنے والی۔ آج کپتان صاحب اور جہانگیر ترین سمیت سبھی سونامیے یہ الزام لگارہے ہیں کہ نواز لیگ حکمِ امتناہی کے پیچھے چھُپ گئی۔ حیرت ہے کہ اگر تحریکِ انصاف کے غلام سرور خاں، قیصر جمال، اعجاز چودھری اور راجہ عامر زماں حکمِ امتناہی کے پیچھے چھپیں تو

درست لیکن خواجہ سعد رفیق اور صدیق بلوچ سپریم کورٹ کا رُخ کریں تو غلط، بالکل غلط۔ اطلاعاً عرض ہے کہ الیکشن ٹربیونل نے جس رکنِ اسمبلی کے خلاف بھی فیصلہ دیا اُس نے سپریم کورٹ کا دَر ضرور کھٹکٹایا۔ آج بھی تحریکِ انصاف، نواز لیگ، پیپلز پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کے قومی وصوبائی اسمبلیوں کے 35 اراکین عدالتی حکمِ امتناعی کے زور پر اسمبلیوں میں براجماں ہیں اِس لیے یہ الزام سَراسر بلاجواز کہ صرف نواز لیگ حکمِ امتناعی کے پیچھے چھپی بیٹھی ہے۔ آخر میں فقط اتنا کہ ہم تو مہربانوں کو آئینہ دکھاتے رہیں گے، یہ الگ بات کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہے۔

چور مچائے شور

30 ستمبر کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے جامع خطاب کے دَوران وزیرِاعظم میاں نواز شریف نے بھارت کو چار نکاتی امن ایجنڈے کی پیش کش کرتے ہوئے فرمایا کہ سیاچن سے غیر مشروط فوجی انخلاء کیا جائے، کشمیر کو غیر فوجی زون بنایا جائے، دونوں ملک کنٹرول لائن پر سیز فائر معاہدے کی پابندی کریں اور دونوں ممالک ایک دوسرے کو دھمکیاں دینے اور طاقت کے استعمال سے گریز کریں۔ اُنہوں نے کنٹرول لائن پر اقوامِ متحدہ کے مبصر گروپوں کو مزید فعال بنانے کی ضرورت پر بھی زور دیا اور یہ بھی فرمایا کہ پاکستان اور بھارت تنازعات کے حل کے لیے جامع مذاکرات کا سلسلہ شروع کریں۔ دَرجوابِ آں غزل بھارت کی وہی ''میں نہ مانوں'' کی رَٹ حالانکہ میاں نواز شریف صاحب کے چاروں نکات حقیقت پسندانہ ہیں لیکن چونکہ بھارت کے پاس اِن نکات کا کوئی جواب نہیں تھا اسی لیے اُس نے اِنہیں مسترد کر دیا۔ میاں نواز شریف صاحب نے کشمیر کو جو ''غیر فوجی زون'' بنانے کا مشورہ دیا، پرویز مشرف کے دَورِ حکومت میں دونوں ممالک کشمیر کو غیر فوجی زون بنانے پر متفق بھی ہو چکے تھے لیکن اب بھارت مُکر گیا۔ سینکڑوں انسانی جانوں کو بغیر کسی جنگ کے نگلنے والے دُنیا کے بلند ترین محاذ سیاچن سے فوجوں کے اِنخلاء کی تجویز بھی انتہائی مناسب کہ یہ انخلاء دونوں کے مفاد میں ہے کیونکہ فوجوں کی موجودگی کی بنا پر

سیاچن گلیشیئر پگھل رہا ہے جو خطے کے ماحولیات کے لیے شدید نقصان دہ ہے لیکن اکھنڈ بھارت" جیسے احمقانہ خواب دیکھنے والوں کی سمجھ میں بھلا یہ مدبرانہ تجاویز کیسے آ تیں؟۔

میاں نواز شریف کے خطاب کے دوران بھارتی "شُرلی" وزیرِ خارجہ سُشما سوراج غصّے سے بار بار پہلو بدلتی رہی اور بالآخر لال پیلی ہوتی یہ شُرلی دَورانِ خطاب ہی اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ اگلے دِن اُس نے جنرل اسمبلی میں اپنے دِل کی بھڑاس خوب نکالی کیونکہ سیلفیاں بنوانے کے شوقین مخبوط الحواس نریندر مودی تو پہلے ہی مختلف تقریبات میں غلط سلط انگریزی" جھاڑ" کر نیویارک سے "پھُر" ہو چکے تھے اِس لیے جنرل اسمبلی سے خطاب کا قرعہ فال سُشما سوراج کے نام نکلا۔ اُس نے میاں نواز شریف کا چار نکاتی امن منصوبہ مسترد کرتے ہوئے میاں صاحب کا نام لے کر کہا کہ اُن کے چار نکات کی ضرورت نہیں، نکتہ صرف ایک ہے کہ دہشت گردی ختم کرکے بات چیت شروع کریں۔ پاکستان سے مذاکرات صرف بھارت کی شرائط اور ایجنڈے کے مطابق ہوں گے۔ اُس نے بھارتی مؤقف کا اعادہ کرتے ہوئے کہا" 2008ء کے ممبئی حملوں کے بارے میں بھارت جانتا ہے کہ اِن کے پیچھے کون تھا۔ جو ممالک دہشت گردوں کو محفوظ پناہ گاہیں دیتے ہیں اُن سے اُن کے اِس عمل کی بھاری قیمت لی جانی چاہیے۔ ممبئی حملے کے ماسٹر مائنڈ پاکستان میں آزادی سے گھوم پھر رہے ہیں۔ اُن پر مقدمہ چلائیں یا ہمارے حوالے کریں"۔ سشما سراج نے

یہ بھی کہا کہ پاکستان نے دہشت گردی کے نیٹ ورکس کے خلاف کریک ڈاؤن کرنے کی نہ صرف ماضی کی یقین دہانیوں پر عمل نہیں کیا بلکہ پاکستان سے بھارت میں نئے حملے بھی ہوئے۔

اسے کہتے ہیں ''چور مچائے شور''۔ بھارت اپنی خفیہ ایجنسی ''را'' کے ذریعے پاکستان میں دہشت گردی پھیلا رہا ہے، کراچی، بلوچستان اور فاٹا میں بھارت کی دہشت گردی کے ٹھوس ثبوت ڈاکٹر ملیحہ لودھی نے اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو پہنچا بھی دیئے ہیں لیکن کسی قسم کا کوئی ثبوت نہ ہونے کے باوجود بھارت پاکستان کو دہشت گردی میں ملوث کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ ہمارے اربابِ اختیار کو چاہیے تھا کہ وہ کھُل کر بھارتی چہرہ دنیا کے سامنے لاتے اور میاں نواز شریف صاحب کے جنرل اسمبلی سے خطاب سے پہلے بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کے پاکستان میں دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہونے کے سارے ثبوت اقوامِ عالم کے سامنے رکھتے لیکن سشما سوراج کے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کے بعد ڈاکٹر ملیحہ لودھی نے ''را'' کی ریشہ دوانیوں کی دستاویز بان کی مون کو پیش کی۔ وزیرِ اعظم صاحب کی تقریر سے پہلے اقوامِ عالم کے سامنے بھارتی دہشت گردی کے ثبوت رکھے گئے نہ ہی میاں نواز شریف صاحب نے اپنے خطاب میں اِن کا ذکر کیا جس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ شاید وہ اپنے چار نکات پر بھارتی ردِ عمل دیکھنا چاہتے ہوں۔ جب بھارت نے اِن نکات کو یکسر مسترد کر

دیا تو پھر یہ ثبوت سامنے لائے گئے جن سے اقوامِ عالم کم از کم یہ تو جان جائیں گی کہ حقیقت پسندانہ رویہ کس کا ہے اور غیر حقیقت پسندانہ کس کا۔ دنیا جانتی ہے کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں 60 ہزار سے زائد انسانی جانوں اور 10 ہزار فوجی جوانوں کی قربانی دے چکا، معیشت کا کھربوں روپے کا نقصان اِس کے علاوہ جبکہ دوسری طرف بھارت کا سارا انحصار صرف پراپیگنڈے پر ہے۔اُس نے دہشت گردی کے خلاف انسانی جانوں کی قربانی دی نہ معیشت کو جھٹکا لگا۔ وہ ممبئی حملوں میں آج تک کوئی ایک ٹھوس ثبوت بھی پیش نہیں کر سکا۔ بھارت نے حافظ سعید صاحب پر الزام دھرا تو حافظ صاحب نے بَرملا کہہ دیا کہ وہ دنیا کی کسی بھی عدالت میں پیش ہونے کو تیار ہیں سوائے بھارت کے۔ کشمیر کا مسئلہ گزشتہ 68 سالوں سے فیصلے کا منتظر ہے۔ بھارت خود ہی یہ مسئلہ اقوامِ متحدہ میں لے کر گیا اور بھارت کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کو تسلیم بھی کیا لیکن اقوامِ متحدہ کی قرارداد پر آج تک عمل نہیں ہوا۔ وزیرِ اعظم میاں نواز شریف صاحب نے بالکل درست کہا "مسئلہ کشمیر حل نہ ہونا اقوامِ متحدہ کی ناکامی ہے، جھوٹے وعدوں اور سفاک مظالم نے کشمیر کی تین نسلیں اجاڑ دیں۔ دو طرفہ حل کی تمام کوششیں ناکام ہو چکیں۔ بھارت کہتا ہے کشمیر پر بات نہ کریں۔ ہمارے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ پاکستان اور کشمیر صدیوں سے جغرافیائی، مذہبی اور ثقافتی رشتوں سے جڑے ہیں۔ پاکستان کشمیر کو اپنی شہ رَگ سمجھتا ہے۔ 1947ء سے کشمیر پر سلامتی کونسل کی قراردادیں عمل کی

منتظر ہیں''۔ سپہ سالار جنرل راحیل شریف نے بھی رائل، یونائٹڈ، سروسز انسٹی ٹیوٹ لندن سے خطاب کرتے ہوئے ایک بار پھر پوری قطعیت سے کہہ دیا کہ کشمیر برِ صغیر کی تقسیم کا نامکمل ایجنڈا ہے اور یہ تب تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ حرفِ آخر یہ کہ اگر بھارت پُرامن پڑوسیوں کی طرح رہنا چاہتا ہے تو اُسے اپنے دماغ سے چودھراہٹ کا خناس نکال کر تمام متنازع امور کے حل کے لیے بِنا کسی پیشگی شرط کے مذاکرات کی میز پر آنا ہوگا۔

ہنگامہ ہے کیوں برپا

آجکل لاہور میں انتخابی گہما گہمی اپنے عروج پر ہے۔ایک طرف بلدیاتی امیدوار کشکول تھامے گلی گلی ووٹوں کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں تودوسری طرف NA-122 کے ضمنی انتخاب میں نواز لیگ اور تحریکِ انصاف کھڑاک پہ کھڑاک کیے جارہی ہیں۔ حقیقت یہی کہ سارا ''کھڑاک'' ہمارے کپتان صاحب کی مہربانی سے ہورہاہے جنہوں نے ضمنی انتخاب کو سردار ایاز صادق اور عبدالعلیم خاں کی بجائے اپنے اور میاں نواز شریف کے مابین معرکہ قراردے دیا۔ ایک طرف ساری تحریکِ انصاف حلقہ 122 کا گھیراؤ کیے بیٹھی ہے تودوسری طرف سارے حکومتی وزیر شزیر سمن آباد کی گلیاں ماپتے پھرتے ہیں۔ تحریکِ انصاف کے امیدوار عبدالعلیم خاں نے اِس انتخابی معرکے میں اخراجات کی ساری حدیں تہس نہس کردیں،الیکشن کمیشن کا ضابطہ اخلاق جائے بھاڑ میں۔ میری پسندیدہ جماعتِ اسلامی کے بزرجمہروں نے تحریکِ انصاف کاساتھ دینے کافیصلہ کرلیا۔ پتہ نہیں ''اندرکھاتے'' کیا ''مُک مکا'' ہواکہ جماعتِ اسلامی نے بھی لنگوٹ کَس لیا۔ اُدھر خیبرپختونخوا میں آفتاب شیرپاؤ کو ساتھ ملانے کے بعد وزیرِاعلیٰ پرویز خٹک نے یک لخت آنکھیں پھیرلیں اور دروغ بَر گردنِ راوی آجکل وہ جماعت اسلامی کے وزیروں کے پیچھے لَٹھ لے کر دوڑ رہے ہیں جبکہ ادھر حلقہ 122 میں تحریکِ انصاف اورجماعتِ اسلامی کا یہ عالم کہ ''میں

تے ماہی اِنج مِل گئے جیویں ٹچ بٹناں دی جوڑی''۔ شاید جمہوریت کا حسن اسی کو کہتے ہوں گے۔ شنید ہے کہ یہ سب کچھ چودھری سرور کا کیا دھرا ہے جنھوں نے بار بار منصورہ جا کر جماعتِ اسلامی کا ناک میں دَم کر دیا۔ جماعت اسلامی کی اعلیٰ قیادت نے تو تحریکِ انصاف کے وفد سے ملاقات سے بھی انکار کر دیا تھا لیکن لاہور کے امیر میاں مقصود احمد کو چودھری سرور نے بالآخر گھیر ہی لیا۔ ویسے میاں مقصود احمد نے بھی سوچا ہو گا کہ جماعت اسلامی تو گزشتہ دو عشروں سے اُس حلقے میں اپنا امیدوار ہی کھڑا نہیں کر رہی اور یہاں جماعت کا ووٹ بھی ''ٹانواں ٹانواں'' ہی ہے اِس لیے تحریکِ انصاف کو ''کَکھ'' فائدہ نہیں ہونے والا، اگر مفت میں احسان ہاتھ آتا ہے تو اِس میں بُرا کیا ہے۔

4 اکتوبر کو کپتان صاحب نے سمن آباد کی ''ڈونگی گراؤنڈ'' میں ''ڈونگا'' جلسہ کر کے سونامیوں کا جی خوش کر دیا۔ ویسے تو جلسے سے پہلے خاں صاحب نے اِس جلسے میں نواز لیگ کے متعلق بڑے بڑے انکشافات کا اعلان کیا تھا لیکن اب تو سونامیے بھی جان چکے کہ خاں صاحب انکشافات کا کہتے ضرور ہیں لیکن کرتے کبھی نہیں۔ کپتان صاحب کے انکشافات کا عالم تو بھٹو مرحوم کی معاہدہ تاشقند والی پٹاری کی مانند ہے جسے بھٹو مرحوم کھولے بغیر ہی اپنی قبر میں لے گئے۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ کپتان صاحب کے نزدیک یہ بھی بہت بڑا انکشاف ہو کہ اُنھوں نے ایک دفعہ پھر یوٹرن لیتے ہوئے ریحام خاں کو دوبارہ سیاست میں ''اِن'' کر دیا۔ ہری

پورے ضمنی انتخاب میں خوفناک شکست کے بعد دونوں نے ٹویٹ کیا تھا کہ ریحام خاں
اب سیاست پہ تین حرف بھیج چکیں لیکن معاملہ چونکہ عبدالعلیم خاں کا تھا جو تحریکِ
انصاف کے ''اَن داتاؤں''میں سے ایک ہیں اِس لیے ریحام خاں کا حلقہ 122 میں آنا
توبنتا تھا دوستو۔ریحام خاں کے دوبارہ سیاست میں آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے
کہ ہمارے شَرپسند الیکٹرانک میڈیا نے ''ایویں خوامخواہ'' شور مچا دیا کہ عمران خاں اور
ریحام خاں کی ازدواجی زندگی کا''ابا ؤٹرن'' ہوچکااور کوئی دن جاتا ہے جب عمران خاں
ایک دفعہ پھر کسی کنٹینرپر کھڑے ہو کر سونامیوں کو کہیں گے کہ ''جلدی جلدی
نیاپاکستان بناؤتاکہ میں شادی کرلوں'' اسی لیے خاں صاحب ریحام خاں کو میدان میں
لے آئے تاکہ افواہیں دَم توڑ سکیں۔

ڈونگی گراؤنڈ میں جلسے سے خطاب کرتے ہوئے خاں صاحب نے فرمایا ''نوازلیگ ہمیشہ
سٹے آرڈرکے پیچھے چھُپ جاتی ہے اِس لے اِس کانام نوازلیگ نہیں ''سٹے آرڈرلیگ''
رکھ دیناچاہیے''۔اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک لیگئے نے کہا''شرم تم کومگر نہیں آتی۔
خودچھ ،چھ بندے سٹے آرڈرکی ''بکل'' مارے بیٹھے ہیں اور نوازلیگ کے صرف دو
بندوں کے سٹے آرڈرپر چیں بچیں''۔پروفیسر رشید صاحب نے دَرجوابِ آں غزل فرمایا
تحریکِ انصاف کانام ''تحریکِ الزام'' ہوناچاہیے'' لیکن ایک شَرپسند لیگئے کے خیال''
میں تحریکِ انصاف کانام ''پھڈا تحریک'' سب

سے زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ ’’ پھڈے باز‘‘ میں اِس کا کوئی ثانی نہ شکست کو ٹھنڈے پیٹوں‘‘ قبول کرنا اِس کی عادت ۔ خود خاں صاحب کا فرمان ہے کہ ’’تحریکِ انصاف وہ واحد جماعت ہے جس کی ڈکشنری میں شکست قبول کرنا نہیں لکھا‘‘۔ظاہر ہے کہ انوکھا لاڈلا‘‘ جب کھیلن کو چاند مانگنے کی ضد کرے گا تو پھر ’’پھڈا‘‘ بھی ہوگا اور ’’کھڑاک‘‘ بھی۔اِس لیے اِس جماعت کا ’’پھڈا تحریک‘‘ سے بہتر کوئی نام ہو ہی نہیں سکتا۔ خاں صاحب کو اِس بات کی بھی بہت پریشانی ہے کہ میاں نواز شریف صاحب بوئنگ 777 پر امریکی دَورے پر کیوں جارہے ہیں۔اِس کا حل خواجہ سعد رفیق نے یہ نکالا کہ وزیرِ اعظم صاحب کو ’’رکشے‘‘ پر امریکہ بھیج دیا جائے، وہ کبھی نہ کبھی تو امریکہ پہنچ ہی جائیں گے۔ جَل بھُن کر کباب ہونے والے ایک لیگئے نے کہا کہ اگر کپتان صاحب کا بَس چلے تو وہ باتھ روم میں بھی جہانگیر ترین کے جہاز میں جائیں لیکن اگر وزیرِ اعظم امریکی دَورے پر بوئنگ میں جائیں تو سونامیوں کے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگتے ہیں۔

کپتان صاحب نے فرمایا’’نواز شریف جب بھی جِم خانہ میں کرکٹ کھیلتے تو امپائر کو ساتھ ملا لیتے ۔وہ جب آؤٹ ہوجاتے تو امپائر نو بال قرار دے دیتا‘‘۔ لیگئے کہتے ہیں کہ امپائر تو عمران خاں نے بھی ساتھ ملایا تھا لیکن اگر امپائر کی انگلی کو ہی ’’ فالج‘‘ ہوگیا تو اِس میں ہمارا کیا قصور۔ ویسے اگر امپائر سے مراد خاں صاحب کی ضد پر بنایا گیا تحقیقاتی ’’کمیشن لیا جائے تو اُس نے ’’نو بال

بالکل درست قرار دیا کہ قوم کو اپنی اعلیٰ عدلیہ پر اعتماد ہے۔ اسی جلسے میں ہمارے لال حویلی والے بھی آئے ہوئے تھے جنہوں نے فرمایا "ایاز صادق نے دو سال تک مجھے اسمبلی میں بولنے نہیں دیا جس کی وجہ سے عوام نے اُن کی بولتی بند کر دی"۔ ایاز صادق کی بولتی تو 11 اکتوبر کو پھر کھُل جائے گی اور وہ پارلیمنٹ میں اپنی نشست بھی سنبھال لیں گے لیکن شیخ صاحب کی "بولتی" صرف الیکٹرانک میڈیا تک ہی محدود رہے گی جسے اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے ذوالفقار مرزا، الطاف حسین اور شیخ رشید جیسے لوگوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ آخر میں قوم کے سوچنے کے لیے یہ سوال کہ "ہنگامہ ہے کیوں برپا"۔ کیا یہ جنگ ملک و قوم کے مفاد میں لڑی جا رہی ہے یا محض حصولِ اقتدار کی خاطر؟۔

ایک عہد کی سرگزشت

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

متعدد بار انہی کالموں میں لکھ چکا کہ صحافت عبادت ہے اور سعادت بھی شرط مگر یہ کہ کثافت سے پاک ہو۔ وطنِ عزیز میں اب کوہِ استقامت کے اُن مکینوں جیسے کہیں نظر نہیں آتے جو ''شہرِ صحافت'' کی تابندہ روایات کے امین ہوا کرتے تھے ۔ حقیقت یہی کہ

میں اُن کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر

وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے

اب تو عالم یہ کہ سیاستدان بزعمِ خویش زمینی خدا اور صحافت ایسے ''سیاسی لنگروں'' کے ہتھے چڑھی ہوئی جو بساطِ فتنہ کو لپیٹنے اور بکھرے ہوئے شیرازۂ وحدت کو سمیٹنے کی بجائے مزید ہوا دینے میں مگن کہ ریٹنگ کا سوال ہے۔ دھرتی ماں کی یہ حالت کہ ہر گھر میں صفِ ماتم اور ہر دَر پہ نوحہ خوانی، افلاس کے تنوروں میں جلتے نانِ جویں کے محتاج کسی معجزے کے منتظر کہ زیست کی ہر سانس پھانس بن کر گلے میں اٹکی ہوئی لیکن یہ اپنی دوکانداری چمکانے میں جُتے ہوئے اور حالت یہ کہ ہر کسی کا اپنا اپنا قبلہ اپنا اپنا کعبہ ۔ اب فیصلے پارلیمنٹ یا حکومتی ایوانوں میں نہیں الیکٹرانک میڈیا کے استھانوں میں ہوتے ہیں ۔اِس قحط الرجال

میں انگلیوں پہ گنے چند لوگ آبروئے صحافت، جمیل اطہر قاضی اُن میں سے ایک جن کی ایک عہد کی سرگزشت''پڑھ کریقین ہو چلا کہ ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں''۔یہ اُس شخص کی داستانِ حیات ہے جس نے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں 120 روپے تنخواہ پر کوچہ صحافت میں قدم رکھااور پھر اپنی محنت ،ریاضت اورماں کی دعاؤں سے آسمانِ صحافت کی رفعتوں کو چھولیا،وہ آج چار اخبارات کامالک ہے۔یہ ایک ایسے شخص کی آپ بیتی ہے جو نہ صرف قومی سیاسی تاریخ کاشاہد ہے بلکہ اسے معروف ترین قومی شخصیات کے قرب نے ایسا صیقل کیاکہ اُس نے باتوں ہی باتوں میں پاکستان کی مستندتاریخ رقم کرڈالی۔ محترم جمیل اطہر قاضی نے زیست کے دریدہ راستوں پہ اپنی شکستہ پائی کاسارا سفرایک سچے فنکار کی طرح عیاں کر دیا،کچھ نہاں نہ رکھا۔ نئی مسافتوں کے کھوج میں زندگی کے ماہ وسال گزارنے والے جمیل اطہر صاحب نے حیاتِ بے مہارکے ایک ایک لمحے کارَس نچوڑ کرایک ایسی کتاب مرتب کی جوآنے والی نسلوں کے لیے مستندحوالہ ہوگی۔دشتِ حقیقت کے ٹیلوں سے جھانکتی سچائی کے انمول موتیوں کی چمک سے منور ''ایک عہد کی سرگزشت'' میں قاری کو وہ سب کچھ مل جاتاہے جس کی اسے طلب۔ ڈاکٹر مجاہد منصوری نے بالکل درست لکھا۔''ایک عہد کی سرگزشت'' تاریخ صحافت پر تحقیقی کام کرنے والے پی ایچ ڈی،ایم فِل سکالرز اورایم اے کے طلباء کے لیے بہت مفید ریفرنس بک کے طورپر صحافتی تاریخ کے لٹریچر میں انتہائی مفیداضافہ ہے''۔جمیل اطہرصاحب کی یہ کتاب 108 بچھڑے ہوؤں کی عملی

زندگیوں کا احاطہ کرتی ہے جن میں علمائے کرام ،اخبارات کے مدیران ،کارکن صحافی اساتذہ کرام ،سیاستدان ،روحانی شخصیات ، احباب ،اخبار فروش رہنماء ،بیوروکریٹس، اورشعراء کرام شامل ہیں۔ علمائے کرام میں میرے مُرشد سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اوراحباب میں میرے انتہائی قریبی دوست پروفیسر ظہیر الدین کاذکر بھی ہے جسے پڑھ کرمجھے یونیورسٹی کاوہ زمانہ یادآ گیاجب ذوالفقار علی بھٹوکے دَورِ عروج میں پنجاب یونیورسٹی کے درودیوار ''سیدی ،مُرشدی ۔۔۔ مودودی ، مودودی'' جیسے نعروں سے گونجاکرتے تھے ۔اُن دنوں مَیں بھی باقاعدگی سے تونہیں لیکن اکثر مولاناکی ذیلدارپارک اچھرہ میں مولاناکی رہائش گاہ پرنمازِعصر سے مغرب تک منعقدہونے والی سوال وجواب کی نشستوں میں شریک ہواکرتا تھا۔پروفیسر ظہیرالدین کے ساتھ توعمرِعزیزکے بہت سے ماہ وسال گزارے ۔ وہ جب پی پی ایل اے کے جنرل سیکرٹری تھے تواکثرپی پی ایل اے کے صدر رانااصغر علی کے ساتھ میرے گھرآیا کرتے تھے لیکن جب اِس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے توکسی کوکان وکان خبرتک نہ ہونے دی۔

جمیل اطہرقاضی صاحب کی سرگزشت 1947ء سے 2015ء تک کے واقعات کی سچے جذبوں میں گوندھی ہوئی تحریر ہے۔ تقسیمِ ہند کی پیچیدہ ساعتوں میں بے گھری اور بے دری کے سوگ میں ڈوب کر جمیل اطہرنے لکھا ''ہم آگ اورخون کے اِس طوفان سے نکل کربہادرگڑھ کے کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جہاں مسلمانوں کی لُٹے پٹے

قافلے، سکھوں کی درندگی اور بربریت کا بوجھ اٹھائے پاکستان جانے کے منتظر تھے۔ ہمیں بھی کیمپ میں ایک بیرک میسر آ گئی جس کی چھت کی لکڑیاں چولہا روشن کرنے کے کام آ چکی تھیں۔ ایک روز میری والدہ کے حصے میں جو روٹی آئی وہ اُسے تھام کر منتظر تھیں کہ اِس کا کچھ حصہ اپنے بیٹوں کو دے سکیں کہ اچانک ایک کتا روٹی اُن کے ہاتھ سے چھین کر لے گیا، اپنی والدہ کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو دیکھ کر اُن کے بچوں کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں''۔ ایم کیو ایم والے خود ہی فیصلہ کرلیں کہ اصل مہاجر کون ہیں، وہ جو ہندوستان کی تقسیم کو غلط قرار دیتے ہیں یا وہ جو اپنا سب کچھ لُٹا کر بھی مادرِ وطن کے عشق سے سرشار ہیں؟۔ جمیل اطہر قاضی صاحب نے جو کچھ دیکھا لگی لپٹی رکھے بغیر بیان کر دیا۔ وہ چار اخبارات کے مالک ہونے کے باوجود انتہائی بے باکی سے لکھ جاتے ہیں کہ ''حمید نظامی کا نام زبان پر آتا ہے تو صحافت کے اُس دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جب مدیروں کا قد و قامت صحافت کا اصل حسن اور بانکپن تھا۔ جب تصویروں کی بجائے تحریریں صحافت کی آبرو تھیں۔ جب بہنوں اور بیٹیوں کی تصاویر سے اخبارات کو آراستہ کرنے کی بجائے قلم کو ماں بہن کی عصمت کا درجہ دیا جاتا تھا''۔ اُردو ادب کے طالب علم کی حیثیت سے مجھے سب سے زیادہ متاثر اُن کی تحریروں میں جھلکتے ادبی رنگ نے کیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے الفاظ کی سواریاں ہاتھ باندھے اُن کے دَر پہ کھڑی ہوں۔ جب وہ لکھتے ہیں ''حضرتِ انساں کی زندگی جہاں رنج و الم کا عمیق سمندر ہے وہیں شگفتگی، رعنائی اور حسین و خوش

گوار لمحوں کی بھرپور کہکشاں بھی ہے‘‘تو میرے جیسا اُردو ادب کا طالب علم ایک بار چونکتا ضرور ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال کوئی فن نہیں، اصل فن تو یہ ہے کہ ایسے الفاظ تحریر کی روانی کی راہ میں روڑے نہ اٹکائیں۔ جمیل اطہر صاحب کی چشمِ تصور میں مولانا ظفر علی خاں سے ملاقات کی سرگزشت اِس کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔

جیتے گا کون۔۔۔؟

آج حلقہ 122 لاہور کے ضمنی الیکشن میں جہاں ایک طرف شیر دہاڑ رہا ہے تو دوسری طرف بَلّا رَنز اُگل رہا ہے۔ ابھی پولنگ جاری ہے لیکن بے صبرے لاہوریے نتیجے کے لیے بے چین۔ ہمیں چونکہ پیشین گوئیاں کرنے کا شوق ہی بہت ہے اِس لیے بتائے دیتے ہیں کہ ایاز صادق نے میدان مار لینا ہے لیکن اگر جیت ایاز صادق کے حصّے میں نہ آئی تو پھر عبد العلیم خاں کی سیٹ پکّی البتہ پیپلز پارٹی کے بیرسٹر عامر حسن کا کوئی چانس نہیں کیونکہ ہمیں تو ابھی تک اُن کا نام بھی "مُنہ زبانی" یاد نہیں ہوا۔ ویسے سیانے کہتے ہیں کہ کبھی کبھی ریس میں لنگڑا گھوڑا بھی "اَپ سیٹ" کر جاتا ہے اِس لیے اگر بیرسٹر جیت گیا تو پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ ہماری اِس پیشین گوئی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے اگلے کالم میں اپنی گردن میں سَریا بلکہ "گاڈر" ڈال کر کہنا ہے "دیکھا ! ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ "اُس" نے ہی جیتنا ہے حالانکہ ہمارے پاس کوئی چڑیا ہے نہ کوّا، کوئی طوطا ہے نہ مینا، ہمیں تو بَس اپنے تجزیوں پر اعتماد ہے جو ہمیشہ سَو فیصد سچ ثابت ہوتے ہیں"۔ اگر یقین نہ آئے تو نتیجے کے بعد ہمارا کالم دوبارہ پڑھ لیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ۔ ہمارے افلاطونی تجزیے میں ایاز صادق کی جیت اِس لیے یقینی ہے کہ وہ شریف النفس

آدمی ہے۔اُس کی مونچھوں پر مت جائیے ،وہ تو محض اپنی سرداری کا ’’رعب شعب‘‘ ڈالنے کے لیے رکھی ہوئی ہیں ،اندر سے تو وہ ’’پکّے مولوی‘‘ ہیں ۔ویسے بھی وہ اسی حلقے سے تین بار جیت چکے۔ 2002ء کے الیکشن میں جب میاں برادران جلاوطن تھے،ہمارے کپتان صاحب کو پرویز مشرف کی مکمل اشیرباد حاصل تھی ،تب بھی ایاز صادق نے اپنے پرانے ’’بیلی‘‘ کو تقریباً دوگنے ووٹوں کے فرق سے شکست دی، 2008ء کے الیکشن میں اسی حلقے سے پیپلزپارٹی کے عمر مصباح الرحمٰن کو 55 ہزار ووٹوں کے فرق سے شکست سے دوچار کیا اور 2013ء کے الیکشن میں تقریباً 9 ہزار ووٹوں کے مارجن سے ایک دفعہ پھر کپتان صاحب کی اِسی حلقے سے دَوڑیں لگوادیں لیکن کپتان صاحب کا چونکہ ذاتی گھر بھی اسی حلقے میں ہے اِس لیے محمود غزنوی کی طرح بار بار حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ شاید اُنہیں شرم آتی ہوگی کہ لوگ کہیں گے ’’اپنے گھر سے بھی ہار گیا‘‘۔اب کی بار کپتان صاحب اپنی طاقتور علیم خاں کی دولت کا سہارا لے کر میدان میں اُترے ہیں۔ ہمارا ارسطوانہ تجزیہ کہتا ہے کہ عبدالعلیم خاں بھی کسی سے کم نہیں۔ وہ بھی صوبائی اسمبلی کے اسی حلقے سے جماعت اسلامی کے امیر العظیم کو شکست دے چکے (وہ شکست کیسے دی ؟ یہ ایک الگ کہانی ہے جو پھر کبھی) ۔مزید یہ کہ عبدالعلیم ہمارے کپتان صاحب کو بہت مرغوب اور اُن کے محبوب ہیں کیونکہ وہ ’’کھُلا ڈُلا‘‘ کھاتے اور کھلاتے ہیں (یہ الگ بات کہ جسٹس وجیہ الدین کمیشن نے اُن کی تحریکِ انصاف کی رکنیت ہمیشہ کے لیے ختم کر رکھی ہے)۔ دروغ بَر گردنِ راوی عبدالعلیم خاں

نے 5 کروڑ روپے تو بینرز، فلیکس اور ہورڈنگز پر ہی لگا دیئے۔ بھائی عطاء الحق قاسمی نے NA-122 کے جملہ اپنے کالم میں اُن کی ''شاہ خرچی'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ''حلقہ مومنین کو نوید پہنچے کہ اب اُنہیں صبح کے ناشتے، دوپہر کے کھانے، شام کی چائے اور رات کے کھانے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، اللہ مسبّب الاسباب ہے اور اُس نے آنے والے تین دنوں یعنی 11 اکتوبر کی شام تک پی ٹی آئی کے اُمیدوار علیم خاں کو یہ توفیق عطاء فرمائی ہے کہ وہ اِس حلقے کے جملہ مومنین کی کفالت فرمائیں۔ میں نے گڑھی شاہو کے علاقے میں یہ انتظام و انصرام دیکھا ہے، باقاعدہ ویٹر یہ خدمات سَرانجام دے رہے ہیں''۔ عطاء بھائی نے اِس ''دعوتِ شیراز'' کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اُسے پڑھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے علیم خاں نے حاتم طائی کی قبر پر بھی لات مار دی ہو اِس لیے علیم خاں کی جیت تو بنتی ہے دوستو! لیکن عطاء بھائی نے سارا کریڈٹ عمران خاں کی جھولی میں ڈالتے ہوئے لکھ دیا ''جملہ خواتین و حضرات! عمران خاں کی درازیٔ عمر کی دعا کرتے رہیں کہ ملک بھر میں انشاء اللہ ہر ویک اینڈ پر کہیں نہ کہیں الیکشن ہوتے ہی رہیں گے اور عوام کے کام و دہن کی تواضع کا بندوبست ہوتا ہی رہے گا''۔ ویسے عطاء بھائی سے پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ گڑھی شاہو میں علیم خاں کی دعوتِ شیراز میں کرنے کیا گئے تھے؟۔ میاں برادران ہوشیار باش کہ ''مُنڈا بِگڑا جائے''۔

حلقہ 122 کا درجہ حرارت اپنے عروج پر پہنچ چکا، الزامات کی بوچھاڑ دونوں طرف۔ میاں برادران الیکشن کمیشن کی پابندی کی بنا پر اِس حلقے میں کسی جلسے سے خطاب تو نہیں کرسکے لیکن ''چور چوری سے جائے ، ہیرا پھیری سے نہ جائے'' کے مصداق میاں نواز شریف صاحب نے 9 اکتوبر کو بھکھی پاور پلانٹ کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا ''کنٹینر پر چڑھ کر بِل جلانے سے بجلی نہیں آتی۔ عمران خاں صاحب ! آپ کی گالیوں پر دعا دیتا ہوں کہ اللہ آپ کو ہدایت دے۔ کھیل کود والے سیاستدان گالیوں کی سیاست چھوڑ دیں ملکی ترقی کنٹینر پر چڑھنے والوں کے بَس کی بات نہیں''۔ 9 اکتوبر کو ہی نواز لیگ نے ڈونگی گراؤنڈ سمن آباد اور تحریکِ انصاف نے قرطبہ چوک مزنگ چونگی پر ''محافلِ سیاست'' کا اہتمام کیا۔ کپتان صاحب نے جتنے الزامات اُنہیں ''مُنہ زبانی'' یاد تھے میاں نواز شریف کی ذات پر دھر دیئے لیکن ساتھ ہی حفظِ ماتقدم کے طور پر یہ بھی کہہ دیا کہ دھاندلی کی تو حکومت کا چلنا مشکل کر دیں گے۔ گویا علیم خاں جیت گیا تو ٹھیک بصورتِ دیگر دمادم مست قلندر۔ ڈونگی گراؤنڈ کے جلسے میں حمزہ شہباز بھی خوب گرجے برسے لیکن اخلاقی حدیں توڑ کر باہر نہیں نکلے۔ ہمارے ''ٹھنڈے ٹھار'' وزیرِ قانون واطلاعات پرویز رشید نے بھی غصے سے کھولتے ہوئے عمران خاں کو چور، پاکستان کا دشمن، یہودی وہندو لابی کا ایجنٹ اور غدار قرار دیتے ہوئے کہا ''تحریکِ انصاف نے یہودی اور ہندو لابی کی طرف سے فراہم کیے گئے لاکھوں ڈالر پاکستان میں جمہوریت کا تختہ الٹنے ، وزیرِ اعظم ہاؤس ، پارلیمنٹ اور سرکاری ٹی وی پر حملے

اور 2013ء کے عوامی مینڈیٹ کو چرانے کے لیے استعمال کیے۔ اگر وہ جھوٹا اور چور نہیں تو وہ اُن امریکی دستاویزات کو غلط ثابت کرے جن پر اُس کے دستخط موجود ہیں۔

اگر عمران خاں پاکستان مخالف قوتوں کا آلہ کار نہیں تو صبح مجھے عدالت میں لے کر جائے"۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا "الیکشن کمیشن عمران خاں سے ملّی بھگت کر کے 13 ماہ سے معاملے کو عوام سے چھپانے کا انتظام کرتا رہا۔ الیکشن کمیشن انتخابی مہم پر جانے پر ہمیں تو نوٹس دینے میں تاخیر نہیں کرتا مگر عمران خاں یہودیوں اور ہندوؤں کی غیر ملکی فرموں سے فنڈز لے کر گھیراؤ جلاؤ کی سیاست میں مصروف رہا"۔ پرویز رشید صاحب خوب جانتے ہیں کہ یہ آرٹیکل چھ کا کیس ہے جو صرف مرکزی حکومت ہی دائر کر سکتی ہے اِس لیے یہ اُن کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ تحریکِ انصاف کو چیلنج کرنے کی بجائے خود یہ کیس سپریم کورٹ میں لے کر جائیں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکے۔

دامن کو ذرا دیکھ

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔سرگوشیاں

صحنِ چمن میں اپنی سرفروشی کے ''قصہ خواں'' بہت اور لاف زنی میں یدِطولیٰ رکھنے والے بھی ڈھیروں ڈھیر مگر زیست کے بیابانوں میں بھٹکنے والوں کی دستگیری کرنے والے معدوم، مخدوم بہت خادم ایک بھی نہیں۔ لاہور میں ضمنی الیکشن نہیں ،اقتدار کا معرکہ بپاہوا،خواجہ سعد رفیق نے کہا ''قبضہ ہارگیا،جذبہ جیت گیا لیکن ہم کہتے ہیں کہ ضابطۂ اخلاق ہارگیا، الیکشن کمیشن ہارگیا اور بدزبانی ،بَدکلامی ،بد تمیزی ،بدتہذیبی ،بداخلاقی ،بددیانتی ،بدخواہی اور بدطینتی جیت گئی۔ یہ اقتدار کی جنگ تھی جس میں تحریکِ انصاف کی جانب سے غیرپارلیمانی زبان ، طعنوں اور گالیوں کا کھلم کھلااستعمال ہواجواباً نوازلیگ نے بھی کوئی کسراٹھانہیں رکھی البتہ میاں برادران نے احتیاط کادامن چھوڑانہ ایازصادق نے۔جیت جس کامقدر تھی وہ لے اُڑااور نرگسیت کے گنبد میں بند شخص کواُس کی ''زبان کارَس'' مِل گیا۔ یہ ہارنے والے کی قومی اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں مسلسل آٹھویں شکست تھی لیکن اُس کی لن ترانیاں اب بھی جاری اور میں نہ مانوں کی رَٹ بھی برقرار۔ حقیقت یہی کہ جب حرص کی یورش ''سونامی''بن جائے توتہی دامانی مقدر ٹھہرتی ہے اور چشمِ ناشناس رہینِ یاس۔ اپنے آپ کو عصرِ رواں کاکوہ کُن سمجھنے والادودھ کی نہریں بہانے

نکلا لیکن حریص کرگسوں کی بھیڑ میں ایسا گُم ہوا کہ اپنے وجود کی اچھائیوں کا ادراک بھی کھو بیٹھا۔ اُس نے ''شوکت خانم'' جیسا عظیم ہسپتال بنایا اور نمل یونیورسٹی بھی لیکن تب اُس نے حرص کے زاغ کو قریب بھی پھٹکنے نہ دیا، یہی سبب کہ پورا پاکستان اس کا گرویدہ اور اُس کی ایک آواز پہ ''لبیک'' کہنے والا۔ تب آج کے رقیبوں (میاں برادران) نے ہی اسے شوکت خانم ہسپتال کی تعمیر کے لیے زمین الاٹ کی اور ڈھیروں ڈھیر امداد بھی۔ لیکن جب ہوسِ اقتدار کا زہر اُس کی نَس نَس میں سمایا تو اُس نے وہ افتتاحی لوح'' بھی اکھاڑ پھینکی جسے اُس نے کبھی بڑے شوق سے میاں نواز شریف کے'' ہاتھوں نصب کروایا تھا۔ انانیت اور نرگسیت کے بتوں کی پوجا کرنے والا میدانِ سیاست میں اپنی مسلسل ناکامیوں سے یوں بوکھلایا کہ دشنام کو بھی گوہر فشانی سمجھنے لگا۔ ہم جیسے لوگ جو تمام تر اختلافات کے باوجود برملا کہتے تھے ''کپتان جھوٹ نہیں بولتا'' یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ''کپتان سوائے جھوٹ کے کچھ نہیں بولتا''۔ وہ ''نیا پاکستان'' بنانے کا دِل خوش کُن نعرہ لے کر نکلا لیکن وہ دھن نہ جذبہ اور نہ ہی مقصد سے عشق، محض اقتدار کی ہوس۔ تحقیق کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہوتا ہے، کپتان صاحب کی نیت میں جب تک اقتدار کا فتور شامل نہیں ہوا وہ محیر العقول کارنامے سرانجام دیتے رہے لیکن جونہی اقتدار کے ہما کی تلاش میں نکلے، اُن کی شخصیت کا ایک ایک پرت کھل کر سامنے آتا چلا گیا۔ سب نے جان لیا کہ فقط مسندِ اقتدار ہی اُن کے درد کا درماں جو ہر گزرتے دن اُن سے دور ہوتی جارہی ہے اور رخشِ

عمر تیزی سے بڑھاپے کی طرف رواں دواں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگراب بھی وہ اناکے آہنی حصاروں کو توڑ اور حقیقتوں سے گریز کی عادتِ بد کو چھوڑ کر قومی دھارے میں شامل ہو جائیں تو قومی سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں لیکن اگراُنھوں نے ''میں نہ مانوں'' کی رٹ لگائے رکھی تو پھر وہ وقت دُور نہیں جب عود کر آنے والی تنہائیاں اُنہیں بھی اصغر خاں بناکر تاریخ کے اوراق میں گم کر دیں گی اصغر خاں کی تحریکِ استقلال بچی نہ کپتان کی تحریکِ انصاف بچ پائے گی۔ پیپلز پارٹی کا، حشر بھی اُن کے سامنے کہ کبھی وہ بھی پاکستان کی مقبول ترین جماعت ہوا کرتی تھی لیکن اب تنہائیوں کا شکار کہ اُس کے دامن میں سوائے کرپشن کے داغوں کے اور کچھ نہیں۔ سچ یہی کہ ایسا شجر جو تمازتوں میں کمی نہ کرسکے بھلا اُس کی چھاؤں میں کون بیٹھے گا۔

اگر کپتان صاحب اناکی بوسیدہ زندگی سے باہر جھانک کر دیکھیں تواُنہیں دنیابہت خوبصورت نظر آئے گی، اگر وہ اِس طرف مائل نہ ہوئے تو پھر وہ وقت دور نہیں جب اُن کے نہاں خانۂ دِل سے یہ صدا اُبھرے گی کہ

رفتہ رفتہ زندگی کو ڈس گئیں تنہائیاں
بڑھتے بڑھتے دِل کی ویرانی بیاباں بَن گئی

ہم اب بھی پُر یقین کہ پرویز رشید نے عالمِ غیض میں کپتان صاحب پر ملک دشمنی

کا غلط الزام دھر دیا لیکن خاں صاحب کو بھی اتنا تو ادراک ہونا چاہیے کہ ارضِ وطن کو قومی و ملّی یکجہتی کی جتنی آج ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ ہمارے دیکھے ، اَن دیکھے دشمن قطار اندر قطار اور پوری قوم مصروفِ پیکار۔ نوشتۂ دیوار یہی

آبادیوں کی خیر منانے کا وقت ہے
جنگل کی آگ پھیل رہی ہے ہوا کے ساتھ

ایسے میں قومی دھارے میں شامل ہونے کا وقت ہے نہ کہ احتجاجی سیاست کا۔ وہ احتجاج ضرور کریں کہ یہ اُن کا آئینی حق ہے لیکن پہلے دھرتی ماں پہ آیا ہوا کڑا وقت تو ٹال لیں۔

ضمنی انتخابات نواز لیگ کے لیے بھی لمحۂ فکریہ کہ لاہور میں پنجاب اسمبلی کی نشست کھو بیٹھی اور اوکاڑہ میں اُس کی نگاہِ انتخاب جس شخص پر پڑی وہ چاروں شانے چِت۔ اُسے بھی ادراک کر لینا چاہیے کہ قوم اب شعور کی اُس منزل پر ہے کہ اُس کی چشمِ بیدار میں صرف وہی جچتا ہے جس کا دِل قومی درد سے لبریز ہو۔ محسن لطیف نے اپنے حلقے میں اڑھائی سال تک جھانک کر بھی نہ دیکھا، نتیجہ سب کے سامنے۔ سیاسی جماعتوں کو جان لینا چاہیے کہ لاہور نواز لیگ کا ہے نہ تحریکِ انصاف کا اور نہ ہی پیپلز پارٹی کا۔ اب یہاں صرف وہی کامران ہو گا جس کے

اندر کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی امنگ جواں ہو گی۔ یہ بجا کہ ایاز صادق کی جیت نے دھاندلی کے تمام الزامات کو مسترد کرتے ہوئے یہ ثابت کردیا کہ تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ بالکل درست اور الیکشن ٹریبونل کے جج کا فیصلہ بالکل غلط تھا، یہ بھی درست کہ NA-122 کے ضمنی انتخابات میں ووٹ حاصل کرنے کی شرح کم وبیش 2013ء کے عام انتخابات جتنی ہی تھی۔2013ء میں نواز لیگ نے ڈالے گئے ووٹوں کا 51.6 فیصد حاصل کیااور 2015ء میں 50.6 جبکہ تحریکِ انصاف نے عام انتخابات میں ڈالے گئے ووٹوں کا 46.8 اور ضمنی انتخاب میں 48.7 فیصد حاصل کیا جس سے دھاندلی کے الزامات کی تویکسر نفی ہو گئی لیکن یہ بھی ثابت ہوگیا کہ تمام تر ترقیاتی کاموں کے باوجود نواز لیگ اپنی مقبولیت آہستہ آہستہ کھوتی چلی جارہی ہے۔ یہ شاید تاجر برادری کا غصہ ہو یا پھر عائشہ ممتاز کے جا و بے جا چھاپوں کا اثر۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے نواز لیگ کو اپنی مقبولیت کو لگے اِس گھُن کا بَروقت علاج کرنا ہو گا کہ اسی میں اُس کی سیاسی بہتری مضمر ہے۔

چاروں شانے چِت

لاہور کا معرکہ سَر کرنے کے بعد پرویز رشید نے کہا ''عمران خاں چوتھی بار بولڈ ہو گئے''۔ ایسے میں بھلا ہمارے خواجہ آصف سیالکوٹی کسی سے پیچھے کیوں رہتے۔ اُنہوں نے بھی تحریکِ انصاف کے لیے ٹویٹ پھڑکا دیا ''کچھ شرم ہوتی ہے، کچھ حیا ہوتی ہے'' لیکن بارہ مصالحے والا بیان میاں شہباز شریف کا کہ ''نون نے قارون کو شکست دے دی''۔ ویسے بصد ادب ''بریف کیس'' کی سیاست کا الزام تو نواز لیگ پہ دھرا جاتا تھا لیکن اب کی بار ''سیر کو سوا سیر'' مِل گیا اور لیگیوں کو بھی کہنا پڑا ''نوٹ کو ووٹ سے شکست دیں گے''۔ دروغ بَر گردنِ راوی علیم خاں نے الیکشن کمیشن کے ضابطۂ اخلاق کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے پچیس کروڑ سے زائد صرف کر ڈالے لیکن مِلا ''ککھ'' بھی نہ۔ گِھسا پِٹا لیکن حسبِ حال لطیفہ کہ ایک امیر کبیر شخص کے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ وہ شخص وکیل کے پاس گیا تو اُس نے پچیس ہزار روپے فیس مانگی۔ امیر شخص نے یہ سوچتے ہوئے کہ اتنی کم فیس والا وکیل بَس ''ایویں ای'' ہو گا اِس لیے اُس نے پچیس لاکھ والا نامی گرامی وکیل ہائر کر لیا۔ ایک سال بعد اُس امیر شخص کی پہلے وکیل سے سرِ راہے ملاقات ہو گئی۔ وکیل نے پوچھا ''کیس کا کیا بنا؟''۔ اُس نے جواب دیا ''بیٹے کو پھانسی ہو گئی''۔ وکیل بولا ''جو کام میں نے پچیس ہزار میں کروا دینا تھا، تُم نے ''ایویں خوامخواہ'' اُس پر پچیس

لاکھ ضائع کردیئے ''۔ ہمارے کپتان صاحب اگر ویٹو پاور استعمال کرتے ہوئے علیم خاں کی بجائے چودھری سرور کو کھڑا کر دیتے تو چودھری صاحب نے پچیس کروڑ والا کام پچیس ہزار میں کر دینا تھا۔ لیکن علیم خاں تو کپتان صاحب کا ''خفیہ ہتھیار'' تھا جو ''ٹھُس'' ہوگیا۔ اب خاں صاحب کہتے ہیں '' اگر علیم خاں کی جگہ میں کھڑا ہوتا تو یقیناً جیت جاتا۔ سوال مگر یہ کہ کپتان صاحب کو روکا کس نے تھا؟ اور وہ تو ہر روز یہ ''کھڑاک'' کرتے تھے '' مقابلہ علیم خاں اور ایاز صادق کے نہیں میرے اور نواز شریف کے مابین ہے''۔ محترمہ مریم نواز نے ٹویٹ کیا ''شیر آ نہیں رہا، شیر آ گیا ہے'' لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ شیر تو کبھی گیا ہی نہیں تھا البتہ آجکل وہ تھوڑا کمزور لگ رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سردار ایاز صادق کی قومی اسمبلی کی سیٹ کے نیچے صوبائی اسمبلی کی دونوں سیٹیں تحریکِ انصاف کے پاس نہ جاتیں اور اوکاڑہ میں مسلم لیگ کا اُمیدوار چاروں شانے چِت نہ ہوتا۔ شنید ہے کہ میاں نواز شریف تو '' پکّے لیگئے '' ریاض الحق جج کو ٹکٹ دینے کے حق میں تھے لیکن پارٹی فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خَم کرتے ہوئے علی عارف کو ٹکٹ دے دیا۔ اگر نواز لیگ ایسے ہی ارسطوانہ فیصلے کرتی رہی تو پھر وہ دن دور نہیں جب اِس کی بھی ''داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں''۔

انتخابی نتائج کے بعد ہنگامی پریس کانفرنس میں جہانگیر ترین نے کہا ''کل سے 2013ء اور 2015ء کی ووٹر لسٹوں کا تقابل کریں گے۔ سینکڑوں ووٹ دوسرے شہروں کو منتقل کے بعض مکینوں کے بڑی NA-122 کر دیئے گئے''۔ چودھری سرور نے کہا''۔ تعداد میں ووٹ اچانک دوسرے حلقوں میں تبدیل کر دیئے گئے جس کے باعث متعدد ووٹر اپنا ووٹ نہیں ڈال سکے''۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب ''ہتھ نہ پہنچا، تھُو کَوڑی'' کے مصداق ہے۔ جہاں تک ووٹرز کو اچانک دوسرے حلقوں میں تبدیل کر دینے کا الزام ہے تو اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ الزام ہی بے بنیاد ہے کیونکہ ووٹر لسٹیں الیکشن کمیشن چسپاں بھی کرتا ہے اور اُن پر اعتراض کے لیے مناسب وقت بھی دیا جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ الیکشن سے بہت پہلے تمام امیدواروں کو ووٹر لسٹیں مہیا کر دی جاتی ہیں اور انہی ووٹر لسٹوں کی بنیاد پر اُمیدوار اپنی اپنی ''پولنگ سکیم'' تیار کرتے ہیں۔ کیا تحریکِ انصاف کے اربابِ اختیار اتنے ہی نااہل تھے کہ اُنہیں یہ تک پتہ نہ چل سکا کہ اُس کے ہزاروں ووٹ ''چوری'' ہو گئے۔ حقیقت یہی کہ جب کپتان صاحب نے حلقہ 122 کے انتخاب کو اپنی ''بڑھکوں'' سے عام انتخابات میں ڈھال دیا تب نواز لیگ جاگی اور خوب جاگی۔ دوسری طرف سونامیے تین بجے تک محوِ استراحت رہے اور جب انگڑائیاں لیتے ہوئے پولنگ سٹیشنوں تک پہنچے تو وقت ہاتھوں سے سرک چکا تھا۔ چودھری سرور نے کہا'' جس طرح سرکاری مشینری کا استعمال ہوا، مہذب معاشروں میں ایسا نہیں ہوتا''۔ بجا ارشاد لیکن مہذب معاشروں میں ڈال ڈال ''پھُدکنے'' والے بھی نہیں ہوتے۔ چودھری صاحب

کبھی گورنر ہاؤس کے ''باسی'' بھی ہوا کرتے تھے، تب اُنہیں بالکل پتہ نہ چلا کہ سرکاری مشینری بھی استعمال کی جاسکتی ہے لیکن تحریکِ انصاف میں پہنچتے ہی سب کچھ عیاں ہو گیا۔ ویسے جہاں سے وہ ''امپورٹ'' ہوئے وہاں انتخابی نتائج کو تسلیم نہ کرنے کا رواج ہے نہ ملکی بربادی کے لیے دھرنے دینے کا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ شاید یہ پاکستان کی تاریخ کا واحد انتخاب ہے جس میں الیکشن کمیشن نے صرف ایک سیاسی جماعت کے حکم کو صحیفۂ آسمانی سمجھا، خاں صاحب حکم پہ حکم دیتے چلے گئے اور الیکشن کمیشن چوں چراں کیے بغیر سرِ تسلیم خَم۔ اِس کے علاوہ خاں صاحب نے پورے ملک سے دَس ہزار سونامیوں اور دو ہزار وکیلوں کو پولنگ سٹیشنوں پر تعینات کر دیا لیکن افسوس، صد افسوس کہ پھر بھی ''چاروں شانے چِت'' اور اوکاڑہ میں تو ضمانت بھی ضبط۔

اب نسیم الحق زاہدی کی کتاب ''سپہ سالارِ امن'' کے بارے میں کچھ باتیں۔ اِس نفسانفسی کے دَور میں نسیم الحق زاہدی کا مذہب کی طرف رجحان خوشگوار حیرت کا باعث بنتا ہے کیونکہ عمومی طور پر ہمارے کالم نگار اپنے کالموں میں مذہب گریز پالیسی پر عمل درآمد کرتے نظر آتے ہیں لیکن نسیم الحق مذہب کے دائرے سے باہر جھانکنا پسند نہیں کرتا۔ اُس کے بقول اُس نے جب آقا ﷺ کی شان میں لکھے گئے کالموں کو کتابی شکل دینے کا ارادہ باندھا تو بزعمِ خویش عقیل و فہیم مدبرین نے اُس کی حوصلہ شکنی کی لیکن دھُن کے پکّے نے اپنے عزم کو عملی جامہ

پہنا کر ہی دم لیا۔ اُس کی کتاب میں شاید وہ سب کچھ تو نہ ملے جو مارکیٹ میں بِکتا ہے لیکن دینِ مبیں کے متوالوں کے لیے بہت کچھ ہے کہ زاہدی تو قُرآن و حدیث کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتا۔ اُس نے اپنی کتاب میں نہ صرف اسلام کے تمام بنیادی اصولوں کی تشریح کی بلکہ دیگر ادیانِ عالم کے دینِ مبیں پر اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دینے کی بھی سعی کی۔ وہ قرونِ اولیٰ اور آج کے مسلمانوں کا موازنہ کرتے ہوئے انتہائی بیباک ہو جاتا ہے۔ اُس نے لکھا ''جس معاشرے میں نبی اکرم ﷺ تھے، محبت کی سزا موت ہو، وہ معاشرہ کبھی بھی سلامت نہیں رہ سکتا''۔ اُس نے پاکستان میں معاشی و معاشرتی نا انصافیوں پر بھی کھُل کر تنقید کی۔ اُس کا دُکھ وہی جو پوری قوم کا ہے۔ معاشی و معاشرتی ناہمواری پر کڑھتے ہوئے اُس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور اُس کی تحریریں بے باکی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ نسیم الحق زاہدی میں اور زیادہ زورِ قلم پیدا کرے کہ نسلِ نَو کو ایسے ہی بیباک کالم نگاروں کی ضرورت ہے۔

ہماری سیاسی جماعتوں کا المیہ

مسلم لیگ (نواز)، پاکستان پیپلزپارٹی اور تحریکِ انصاف ہی ایسی سیاسی جماعتیں ہیں جنہیں قوم نے حقِ حکمرانی تفویض کیا۔ نواز لیگ اور پیپلز پارٹی تو پہلے بھی کئی بار حکومت کر چکیں لیکن تحریکِ انصاف کو پہلی بار خیبر پختونخوا میں حقِ حکمرانی ملا لیکن المیہ یہ کہ تینوں ہی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار۔ پیپلزپارٹی نے اپنے پچھلے پانچ سالہ دَورِ حکومت میں جو ''گُل کھلائے'' اُس کا بدلہ قوم نے اُسے سندھ تک محدود کرکے دے دیا، پنجاب میں اُس کا وجود تک ختم ہونے کو ہے اور آمدہ بلدیاتی انتخابات میں اُس کا کوئی ٹکٹ تک لینے کو تیار نہیں۔ مخدوش صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے آصف زرداری خود تو دبئی جا بیٹھے اور پارٹی قیادت کے لیے نوجوان بلاول زرداری کو آگے کر دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ بینظیر بھٹو کا بیٹا ہونے کی بنا پر جیالے ایک دفعہ پھر بلاول کے گرد اکٹھے ہو جائیں گے لیکن بلاول کی سیاست میں آمد کے باوجود پیپلزپارٹی کی مقبولیت میں رائی کے دانے کے برابر بھی بہتری دیکھنے میں نہیں آئی۔ کہتے ہیں کہ جہاز جب ڈوبنے لگتا ہے تو چوہے سب سے پہلے چھلانگیں لگاتے ہیں۔ یہی حال پیپلزپارٹی کے ڈوبتے جہاز کا ہے کہ جس کے ''چوہے'' تو دھڑا دھڑ چھلانگیں لگا رہے ہیں لیکن عوام میں اُن کی پذیرائی مفقود۔ پیپلزپارٹی سے تازہ تازہ تحریکِ انصاف میں شامل ہونے والے

اشرف سوہنا کو تحریکِ انصاف نے اوکاڑہ کے قومی اسمبلی کے ضمنی انتخاب میں محض اِس بھروسے پر ٹکٹ دیا کہ سونامیے اور جیالے مل کر چھوٹا موٹا "کھڑاک" ضرور کردیں گے۔ کپتان صاحب نے اوکاڑہ میں انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے یہ "بڑھک" تو نہیں لگائی کہ تحریکِ انصاف جیت جائے گی کیونکہ اُنہیں بتا دیا گیا تھا کہ اشرف سوہنا کی حالت بہت "وپتلی" ہے البتہ یہ ضرور کہہ دیا کہ "تگڑا مقابلہ کریں گے" لیکن ہوا یہ کہ اشرف سوہنا کو سونامیوں نے "لفٹ" کروائی نہ جیالوں نے اور "سوہنا" بیچارہ اپنی ضمانت بھی ضبط کروا بیٹھا۔

کہتے ہیں کہ گھر کی بات گھر ہی میں رہے تو اچھا ہے کہ اگر باہر نکل جائے تو لوگوں کو مرچ مصالحہ لگانے کا موقع مل جاتا ہے اور بات کا "بتنگڑ" بن جاتا ہے۔ آجکل کیا اینکرز کیا لکھاری، سبھی نواز لیگ کے اندرونی اختلافات کی کہانیاں "چسکے" لے لے کر بیان کر رہے ہیں لیکن قصور اُن کا بھی نہیں کہ "گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" ۔ ہمارے خواجہ آصف سیالکوٹی نے اپنے اور چودھری نثار علی کے مابین اختلافات کا بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑتے ہوئے کہہ دیا کہ اُن کی تو چودھری نثار سے گزشتہ تین، چار سال سے بول چال بھی بند ہے۔ جب ایک پریس کانفرنس میں یہی سوال چودھری نثار علی سے پوچھا گیا تو اُنھوں نے فرمایا "میں نے کبھی جوابی ردِ عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کی، کیونکہ

میرا نقطۂ نظر ہے کہ پارٹی اور حکومت کے معاملات متعلقہ فورم تک ہی محدود رہیں تو بہتر ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ لوگوں کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ بن سنور کر باقاعدہ سوٹ ٹائی کے ساتھ ہر دوسرے روز ٹی وی پر آ جاتے ہیں۔ وزیرِ دفاع تو اب ایک سال سے آئے ہیں اِس سے پہلے بھی میرا جی ایچ کیو اور سول آرمڈ فورسز سے براہِ راست رابطہ تھا، مجھے یا وزارتِ داخلہ کو فوج سے رابطے کے لیے کسی دوسرے وسیلے کی ضرورت نہیں''۔ بھلے وزیرِ داخلہ چودھری نثار علی خاں کی ''پہنچ'' بہت دور تک ہو اور جی ایچ کیو سے براہِ راست رابطہ بھی لیکن قوم تو بہرحال پریشان کہ جب پورا پاکستان حالتِ جنگ میں، اندرونی و بیرونی دشمنوں سے نبرد آزما، ایسے میں دو اہم ترین وزارتوں کے سَر براہان کے مابین یہ چپقلش کہیں کسی سانحے کو جنم نہ دے دے ۔ ذاتی معاملات میں وہ بھلے ''لحد'' تک ایک دوسرے سے نفرت کریں، قوم کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا لیکن قومی معاملات میں افہام و تفہیم کا فقدان کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں ۔ حیرت ہے کہ وزیرِاعظم کی طرف سے ابھی تک کوئی ''شٹ اَپ'' کال بھی نہیں آئی۔ آمدہ خبروں کے مطابق نواز لیگ کے اندر دو واضح دھڑے قائم ہو چکے ،ایک دھڑے کی سربراہی چودھری نثار علی اور دوسرے کی خواجہ آصف کے پاس جبکہ وزیرِاعظم صاحب ''ٹُک ٹُک دیدم ،دَم نہ کشیدم'' ۔ یہی نہیں بلکہ وزارتِ خارجہ کے مشیرانِ ''گرامی قدر'' سرتاج عزیز اور طارق فاطمی کی بھی آپس میں بالکل نہیں بنتی دونوں کے خیالات میں بُعدالمشرقین لیکن دونوں ہی نازک ترین وزارت کے۔

کرتا دھرتا۔ اُدھر فیصل آباد میں رانا ثناء اللہ گروپ اور چودھری شیر علی گروپ تلواریں سونت کر ایک دوسرے پہ پِل پڑنے کو تیار۔ چودھری شیر علی نے پریس کانفرنس میں کہا کہ رانا ثناء اللہ بیس افراد کا قاتل ہے اور اُنھوں نے اپنے بیٹے عابد شیر علی کو کہہ دیا ہے کہ وہ وزارت چھوڑ کر مسلم لیگ سے الگ ہو جائے۔ درجوابِ آں غزل رانا ثناء اللہ نے کہا کہ چودھری شیر علی کا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو فیصل آباد کا میئر بنانے کے لیے میاں شہباز شریف کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ کہ مرکز میں وفاقی وزراء آمنے سامنے اور پنجاب میں بلدیاتی انتخابات میں نواز لیگ کے اندر متحارب گروپس، ایسے میں میاں برادران کے لیے کامل یکسوئی کے ساتھ ملکی ترقی کے لیے جدوجہد کیسے ممکن ہے۔

پاکستان کی تیسری بڑی جماعت تحریکِ انصاف کا اندرونی انتشار اظہر من الشمس۔ اِس کے باوجود بھی اُس کی کوئی کَل سیدھی نہیں۔ احتجاجی سیاست کے رنگ ڈھنگ بھی نرالے، احتجاج کرنا حزبِ اختلاف کا حق ہے لیکن گالی گلوچ اور بنا کسی ثبوت کے الزام پہ الزام دھرے جانا ہرگز احتجاجی سیاست نہیں۔ کپتان صاحب کا یہ عالم کہ ''وہی ہے چال بے ڈھنگی، جو پہلے تھی سو اب بھی ہے''۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ ضمنی انتخابات میں ایاز صادق کی جیت سے تحریکِ انصاف کی احتجاجی سیاست دَم توڑ جائے گی لیکن ہم نے تَب بھی لکھا کہ ایاز صادق کی جیت

تحریکِ انصاف کو سڑکوں پر لے آئے گی کیونکہ کپتان صاحب کو یقین ہے کہ اگر نواز لیگ نے صرف لوڈشیڈنگ پر ہی قابو پالیا تو 2018ء کا الیکشن بھی اُس کی جھولی میں آن گرے گا۔ آج وہی کچھ ہونے جارہا ہے اور خاں صاحب کے کرپشن کے الزامات میں تیزی آتی جارہی ہے۔ اُن کی حلقہ 122 کی پٹاری میں سے تو کچھ نکلا نہیں البتہ بے بنیاد الزامات کی سیاست کرنا مقصود ہو تو پھر ''پٹاری'' لبالب۔ شاید اسی لیے میاں نواز شریف کبھی یہ کہتے ہیں ''قوم راستہ روکنے والوں کو آئینہ دکھائے، ٹانگیں کھینچنے والے پیچھے رہ جائیں گے، ہم آگے بڑھتے جائیں گے''۔ تو کبھی یہ کہ ''لوگ گردوغبار اُڑاتے رہیں گے، ہم منزل تک پہنچیں گے''۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو کہ اسی میں ملک و قوم کی بھلائی مضمر ہے۔

وزیرِ اعظم پاکستان کی امریکی یاترا

پروفیسر مظہر۔۔۔۔۔۔ سرگوشیاں

ایجنڈا واضح ، ''کچھ لو، کچھ دو''لیکن دونوں کے تصورات ، خیالات اور مطالبات میں بعدالمشرقین۔ امریکہ کی نظر میں پاکستان نااحسان سپاس جبکہ پاکستان کے خیال میں امریکہ قدرناشناس ،اتحادی مگر جہنم سے نکلا ہوا، دوست مگر دشمن سے بدتر کہ بقول ہنری کسنجر امریکہ کی دشمنی بُری لیکن دوستی بہت بُری۔ اُدھر ہمارے فضاؤں میں بکھرے سارے خواب ادھورے کہ ہمارے سراسیمہ ،نڈھال اور بدحال رہبر 68 سال گزرنے کے باوجود ابھی تک خارجہ پالیسی کی نوک پلک سنوارنے سے قاصر ،چین اور امریکہ کے درمیان ''سینڈوِچ'' بنے کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ جن پہ قوم کو تکیہ وہ بھوکے گدھ کہ اقتدار کی ہوس میں سب کچھ فراموش ،ملکی سلامتی کی پرواہ نہ قومی وقار کی ،ساری تگ ودَو کا محور و مرکز حصولِ اقتدار۔ قوم حیراں وانگشت بدنداں کہ

خطروں نے جہاں دی نہ میری آنکھ بھی لگنے
اُس شہر کا اِک شخص بھی بیدار نہ دیکھا

اسی اندرونی کشمکش اورافراتفری کا بوجھ اٹھائے وزیرِاعظم عازمِ امریکہ ہوئے جہاں اُن کا ''ٹاکرا'' ابلیسیت کے اُن علمبرداروں سے جن کے دل میں ایٹمی

پاکستان کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔امریکہ کا پہلا مطالبہ جوہری ہتھیاروں کو محدود کرنے کے گرد ہی گھومے گا جو پاکستان کے لیے ناقابلِ قبول کہ واسطہ بھارت جیسے پڑوسی سے جس کا ہر وزیرِاعظم ''اکھنڈ بھارت'' کا نعرہ لگا کر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچتا ہے اور اب تو بھارت کی تمام انتہا پسند ہندو تنظیموں کا متفقہ نمائندہ، نریندر مودی وزیرِاعظم جو سب سے بڑا انتہا پسند اور مسلمانوں کا بدترین دشمن۔ 19 اکتوبر کو انتہا پسند شیوسینا نے پاکستانی کرکٹ بورڈ کے وفد کے ساتھ جو کچھ کیا وہ سب کے سامنے۔ کیا امریکہ کے پاس بھارت کی کسی بھی ممکنہ جارحیت سے پاکستان کو محفوظ رکھنے کا کوئی حل ہے؟۔اگر نہیں تو پھر کیا وہ پاکستان کی ایٹمی قوت کو محدود کرکے اُسے بھارت کا تَر نوالہ بنانا چاہتا ہے؟۔ ساری عالمی طاقتیں مل کر بھی بھارت کو کشمیر پر اقوامِ متحدہ کی ''استصواب رائے'' کی قراردادوں پر عمل درآمد کے لیے مجبور نہیں کر سکیں، بھارتی جارحیت کے خلاف پاکستان کا کیا خاک ساتھ دیں گی۔ ہمیں بھارتی جارحیت کا جواب دینے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، ہم ایٹمی قوت ہیں اور بوقتِ ضرورت جوہری ہتھیاروں کے استعمال سے ہرگز گریز نہیں کریں گے۔

پاکستان بھارتی دہشت گردی اور جارحیت کے تمام ثبوت اوباما کے سامنے رکھ کر کشمیر سمیت تمام متنازع امور کے حل پر زور دے گا جو اوباما کے لیے ناقابلِ قبول۔ اُس کا لیت ولعل سے کام لینا اظہر من الشمس کہ بھارت ٹھہرا اُس کا

اسٹریٹیجک پارٹنر جسے چین اور روس کے بڑھتے تعلقات سے خوفزدہ امریکہ اتنا طاقتور دیکھنا چاہتا ہے کہ بوقتِ ضرورت کام آسکے۔ ویسے بھی دفاعی اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط پاکستان امریکہ کو پہلے کبھی قبول تھا، اب ہے نہ آئندہ ہوگا کیونکہ اُسے خطرہ ہے کہ گرم پانیوں پر حکمرانی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ مضبوط پاکستان ہی ہوگا۔ پاکستان امریکہ سے بھارتی طرز کے سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی تعاون کا مطالبہ بھی کرے گا جس کا ٹکا سا جواب ملنے کی توقع کہ امریکی پالیسی سازوں کے ہاں تو پہلے ہی نیویارک ٹائمز کی اِس رپورٹ پر ہلچل مچی ہوئی ہے کہ پاکستان ممکنہ بھارتی حملے کو روکنے کے لیے چھوٹے جوہری ہتھیار نصب کرنے جارہا ہے حالانکہ یہ ''گُر'' توپاکستان نے امریکہ سے ہی سیکھا ہے جس نے روس کے امکانی حملے کو روکنے کے لیے یورپ میں چھوٹے جوہری ہتھیار نصب کیے تھے، جواباً روس نے بھی ایسے ہی جوہری ہتھیار کیوبا میں نصب کر دیئے جس سے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ سرد جنگ میں ڈھل گیا۔ آج اگر پاکستان وہی حربہ آزمانا چاہتا ہے تو امریکی پالیسی ساز چیں بجبیں کیوں؟۔ شاید امریکہ ممکنہ تیسری عالمی جنگ کا میدان برِصغیر پاک و ہند کو بنانا چاہتا ہو۔ پاکستان کی طرف سے چھوٹے جوہری ہتھیاروں کی تنصیب سے بھارتی پالیسی سازوں کو کم از کم اتنا تو یقین ہوجائے گا کہ پاکستان بھارت کی کسی بھی ممکنہ جارحیت کا مُنہ توڑ جواب دینے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔

امریکہ کا پاکستان سے بنیادی مطالبہ یہ ہوگا کہ پاکستان افغانی طالبان کو مذاکرات کی میز پر لانے کے لیے اُس کی مدد کرے۔ طالبان مذاکرات کے لیے تیار تو ہیں لیکن اِس شرط پر کہ پہلے تمام غیر ملکی افواج افغانستان سے چلی جائیں۔امریکہ سمجھتا ہے کہ پاکستان اِس ''کڑی شرط'' کے بغیر بھی طالبان کو مذاکرات کی میز پر لا سکتا ہے اور اگر ایسا ممکن ہوا تو افغانستان میں چودہ سالہ ہزیمت کے بعد باعزت واپسی کی کوئی راہ نکل آئے گی ۔نائن الیون کا بہانہ بنا کر 7 اکتوبر 2001ء کو جدید ترین اسلحے سے لیس 60 ہزار امریکی فوجی افغانستان پر چڑھ دوڑے ،افغانستان میں شمالی اتحاد کے ہزاروں جنگجو بھی ساتھ دینے آن پہنچے اور برطانیہ بھی ۔ 2003ء میں دنیا کے 18 طاقتور ترین ملک بھی مدد کو آ گئے اور 2006ء میں مزید 46 غلامِ بے دام ممالک بھی۔ دنیا جہان کے ہر قسم کے جدید ترین اسلحے سے لیس لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ نیٹو افواج اور 2 لاکھ افغانی فوج 14 سال تک اُن نہتے افغان مجاہدین سے برسرِ پیکار رہی جن کے پاس کوئی جہاز تھا نہ ٹینک، بکتر بند گاڑی تھی نہ ہیلی کاپٹر۔ پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ بدترین ہزیمت اُن کے حصے میں آئی جو اپنی طاقت کے زعمِ بد میں گرفتار تھے اور سرخرو وہ جن کا یہ جزوِ ایمانی کہ ''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی''۔ آج نیٹو افواج کا 70 ملکوں کا یہ ''اکٹھ'' تتر بتر ہو چکا، باقی رہ گیا صرف امریکہ جسے واپسی کی کوئی راہ دکھائی دیتی ہے نہ سجھائی۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بارک اوباما نے کہا کہ عالمی مسائل طاقت اور دولت

کے زور پر حل نہیں کیے جاسکتے ۔اُس نے یہ اعتراف بھی کیاکہ امریکہ کو افغانستان اور عراق میں اِس کا تجربہ ہوچکا لیکن وہ یہ اقرار کرنا بھول گئے کہ بہت پہلے ویت نام کی جنگ میں بھی اُنہیں ایسی ہی ہزیمت سے دوچار ہوناپڑا تھالیکن عالمی چودھری بننے کانشہ ہی ایساہے کہ امریکہ کوبار بار ذلتوں کا سامنا کرناپڑتاہے پھر بھی وہ باز نہیں آتا۔''تاریخ کاسب سے بڑا سبق یہ کہ تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا''۔طالبان کومذاکرات کی میزپر لانے میں مدد کرنے کامطالبہ ہی وہ نکتہ ہے جس پرپاکستان اپنے مطالبات کی عمارت استوار کر سکتاہے۔ وثوق سے کہاجا سکتاہے کہ امریکہ جواباًپاکستان کوامداد کی پیش کش توکر سکتاہے لیکن باقی مطالبات پرٹال مٹول سے کام لے گاجبکہ دوسری طرف میاں نواز شریف امریکہ سے دوٹوک بات کرنے کے موڈ میں نظر آتے ہیں پاکستانی کشکول میں امریکی امداد کی تگ ودَو میں نہیں۔اِس لیے اُمیدِ واثق تویہی کہ وزیرِاعظم صاحب امریکی یاتراکے اختتام پر یہی گنگناتے نظرآئیں گے

چل دوں ابھی تو روکنے والانہیں کوئی

کن بے مروتوں کے یہاں آگیا ہوں میں

حکمران جماعت تباہی کے دہانے پر۔۔۔۔۔؟؟

بھارت میں شیوسینا کی خباثتیں جاری ۔شہریار خاں کی سربراہی میں پی سی بی کے بھارت جانے والے وفد کی بھارتی کرکٹ بورڈ سے طے شدہ ملاقات شیوسینا کے طوفانِ بدتمیزی کی بنا پر ممبئ میں ممکن نہ ہو سکی تو دہلی میں ملاقات کا قصد ہوا لیکن وہاں بھی بھارتی کرکٹ بورڈ نے ملاقات سے انکار کر دیا۔تب مایوس و نامراد شہریار خاں نے دہلی میں پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہا ''دونوں ممالک کے درمیان کرکٹ سیریز کا کوئی امکان نہیں تاہم بھارت میں ہونے والے T20 ورلڈکپ کا بائیکاٹ نہیں کریں گے'' ۔اوّل توشہریار خاں کو بھارت میں پریس کانفرنس کرنی ہی نہیں چاہیے تھی لیکن اگر کر ہی لی تو تھوڑی سی غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے جاوید میاں داد کی طرح کہہ دیتے کہ بھارتی کرکٹ جائے بھاڑ میں ،ہم T20 ورلڈکپ کا بائیکاٹ کریں گے ۔زندگی میں پہلی اورشاید آخری دفعہ لال حویلی والے شیخ رشید کی اِس بیان سے مکمل اتفاق کہ ''شیوسینا کو چاہیے تھاکہ شہریار خاں کا مُنہ کالا کرتے اورجب شہریار پاکستان آتے تو واہگہ بارڈر پر ہی غیرت مند پاکستانی اُس کا مُنہ کالا کر دیتے''۔اِن حالات میں جب پاکستان میں ''را'' کی دہشت گردی جاری ، بھارت امریکہ گٹھ جوڑپاکستان کو ایک ایسی طفیلی ریاست میں ڈھالنے کی تگ ودَو میں جو کبھی اُن کے سامنے سَر نہ اٹھاسکے ،شہریار خاں کو کرکٹ سیریز کی بھیک مانگنے

بھارت جانا ہی نہیں چاہیے تھا لیکن اگر جانے کی غلطی کر ہی بیٹھے تو تھوڑی سی غیرت کا تو ثبوت دیتے۔

اُدھر وزیرِ اعظم مطالبات کی گٹھڑی سَر پہ اٹھائے امریکہ پہنچ چکے لیکن کسی بھی مطالبے کی پذیرائی کا امکان صفر کے برابر کہ امریکہ ہماری سیاسی جماعتوں کی اندرونی کشمکش سے بخوبی آگاہ۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وزیرِ اعظم اے پی سی بلوا کر متفقہ طور پر امریکی دَورے کا ایجنڈا طے کرتے تاکہ پوری قوم یک جان دو قالب نظر آتی لیکن میاں نواز شریف صاحب نے اِس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اِن حالات میں جب ارضِ وطن کو افہام و تفہیم کی اشد ضرورت ہے کچھ ''ارسطو'' افراتفری کے لیے کوشاں۔ بعد از خرابیٔ بسیار سہی لیکن عمران خاں نے کہہ ہی دیا کہ اب الیکشن 2018ء میں ہوں گے۔ خاں صاحب کے اِس بیان کی تمام سیاسی جماعتوں نے تحسین کی اور قوم نے بھی سُکھ کا سانس لیا کہ اب جلسے جلوسوں اور دھرنوں کا موسم انجام کو پہنچا لیکن ایک ''افلاطون'' کو کپتان صاحب کا یہ مدبرانہ رُخ پسند نہیں آیا۔ اُس نے کہا ''عمران خاں کو دھاندلی بھول کر آگے دیکھنے کی بجائے اُسی جگہ ہتھوڑے مارنے چاہییں، جب تک یہ شیطانی چکر ٹوٹ نہ جائے۔ جس دِن یہ شیطانی چکر ٹوٹے گا جاہلوں کو بھی سمجھ آ جائے گی کہ عمران خاں جو کرتا رہا وہ صحیح تھا''۔ پتہ نہیں ''افلاطون'' کے نزدیک جاہلیت کا معیار کیا ہے کیونکہ پاکستان کی کسی بھی سیاسی جماعت نے خاں صاحب کے

دھرنوں کی تحسین کی نہ احتجاجی سیاست کو پسند کیا۔ اِس لیے مجہول تو وہی جو اِس قسم کے مشوروں سے اپنی دوکانداری چمکائے۔ موصوف کو ملکی ترقی کی پرواہ نہ قومی وقار کی اسی لیے اُس نے کہا ''عمران خاں کو چاہیے دھاندلی کا ورد کرتا رہے تاکہ نوازلیگ عمران خاں کا ورد کرتی رہے''۔۔۔۔ گویا دونوں کا ''اِٹ کھڑکا'' جاری رہے، ملکی ترقی جائے بھاڑ میں۔

پلڈاٹ کے تازہ ترین سروے کے مطابق نوازشریف 75 فیصد ریٹنگ کے ساتھ مقبولیت کے بلند ترین درجے پر اور نوازلیگ 70 فیصد کے ساتھ مقبول ترین سیاسی جماعت لیکن افلاطون'' کہتا ہے ''نون لیگ کو پی ٹی آئی تقریباً ''ری پلیس'' کر چکی، پی ٹی آئی نے'' میں نون لیگ کو مکمل شکست ہوئی''۔ NA-122، نون لیگ کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیئے اب قارئین خود ہی فیصلہ کرلیں کہ اِس قسم کا تجزیہ کرنے والے کو مخبوط الحواس کے سوا اور کیا کہا جائے؟۔ سبھی جانتے ہیں کہ ایاز صادق کو 2013ء کے مقابلے میں ایک فیصد کم ووٹ ملے اور علیم خاں کو 2 فیصد زیادہ۔ جس کی ایک وجہ تو نوازلیگ کے خلاف تقریباً تمام چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں کا ''اکٹھ''، دوسری وجہ کپتان صاحب کا اِس حلقے کو فوکس'' کرنا، تیسری علیم خاں کا کوڑوں روپے پانی کی طرح بہانا اور چوتھی بنیادی'' وجہ نوازلیگ کی یہ احمقانہ سوچ کہ وہ بغیر کسی تگ ودَو کے جیت جائے گی۔ اِس کے باوجود جیت نوازلیگ ہی کے حصّے میں آئی جسے موصوف '' مکمل شکست'' کہہ رہے ہیں۔

بَدزبانی اوربَدکلامی تو موصوف کی نَس نَس میں سما چکی ہے ،اسی لیے کئی ٹاک شوز میں گالی گلوچ تک کی نوبت بھی آتی رہی۔ یہ الگ بات کہ وہ ''گالیاں کھاکے بھی بَدمزہ نہ ہوا''۔ اب وہ خواتین کے خلاف بھی تلوار سونت کر نکل آئے ہیں۔ فرماتے ہیں ''مرد سیاستدانوں کو تو چھوڑیں ،سیاستدان عورتوں میں بھی بے حسی اورڈھٹائی نظرآتی ہے ۔کل تک جوپرویزمشرف کے تلوے تھے یاچودھری پرویزالٰہی کے دسترخوان پر مکھیوں کی طرح بھنبھناتے تھے اُنھوں نے بے شرمی اورڈھٹائی سے آج اپنی وفاداریاں تبدیل کرلی ہیں''۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا ''میراپہلا اورآخری رومانس پیپلزپارٹی رہی ہے ،میں نے پیپلزپارٹی کے لیے میگزین نکالے اور جیلیں تک کاٹیں''۔۔۔۔ موصوف اِس غلط فہمی میں مبتلاء کہ قوم مرضِ نسیاں کا شکار جبکہ حقیقت یہی کہ موصوف کا''رومانس'' ہردَورمیں مختلف رہا۔ پیپلزپارٹی کے زوال کے بعد وہ قاف لیگ کے دسترخوان پر ''بھنبھناتے'' نظرآئے اور یہ موصوف ہی تھے جنھوں نے چودھری پرویزالٰہی کے بیٹے مونس الٰہی کی ''فراڈکیس'' میں رہائی کے بعداُس کی مدح میں پوراکالم لکھ مارااوراپنے ممدوح کی مدح میں اتنا آگے نکل گئے کہ اُسے مستقبل کاعظیم رہنماء تک قراردے دیا۔ آجکل چودھری مونس الٰہی کہاں پائے جاتے ہیں ،کسی کو ''کچھ'' پتہ نہیں۔آمرپرویزمشرف کودَس باروردی میں منتخب کروانے کی خواہش رکھنے والے چودھری پرویزالٰہی کے یہ ''کاسہ لیس'' یقینا

پرویز مشرف کے "تلوے" بھی رہے ہوں گے کیونکہ دَرِ مشرف پہ زانوئے تلمذ تہ کرکے ہی چودھری اقتدار کے ایوانوں تک پہنچے۔اِس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اگر پرویز مشرف چودھریوں کا "پِیر" تھا تو موصوف کا "دادا پِیر"۔ موصوف ایم کیوایم کی شان میں بھی ہمیشہ رطب اللّسان ہی رہے اِس لیے کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کا ایم کیوایم سے بھی رومانس" بہت پرانا ہے۔آجکل وہ کپتان صاحب کے نہ صرف قصیدہ گو، بلکہ دھرنے" کے دنوں میں کنٹینر پر کھڑے کپتان صاحب کے پہلو میں بھی پائے جاتے رہے البتہ نوازلیگ کے ساتھ ہمیشہ "اِٹ کھڑکا" ۔اُنھوں نے کہا2018ء میں توانائی بحران کے خاتمے کا دعویٰ بھی صرف ٹوپی ڈرامہ ہے۔اگر 2018ء سے پہلے اُن کی حکومت چلی گئی تو دعوے کریں گے کہ ہم نے تو بحران بَس ختم ہی کر دیا تھا"۔ شیخ رشید کی طرح تاریخ پہ تاریخ دینے والے لکھاری موصوف کی خدمت میں عرض ہے کہ خاطر جمع رکھیں، نوازلیگ کی حکومت 2018ء سے پہلے کہیں نہیں جانے والی اور اگر اُس نے 2018ء سے پہلے توانائی بحران پر قابو پا لیا تو پھر 2023ء میں بھی یہی حکومت کچھ لوگوں کے سینوں پر مونگ دلنے کے لیے موجود ہو گی۔